اگست ۱۹۸۴ء

ایک روپیہ پچاس پیسے

اس شمارے کے قلم کار:

اختر شیرانی مرحوم، صالحہ عابد حسین، علی جواد زیدی
جوگندر پال، کاظم علی خاں، محسن الحق، چترا مدگل
حجاب ہاشمی، نامی انصاری، نگار عظیم
قمر محمود، شہاب دہلوی، اعجاز علی ارشد اور دوسرے
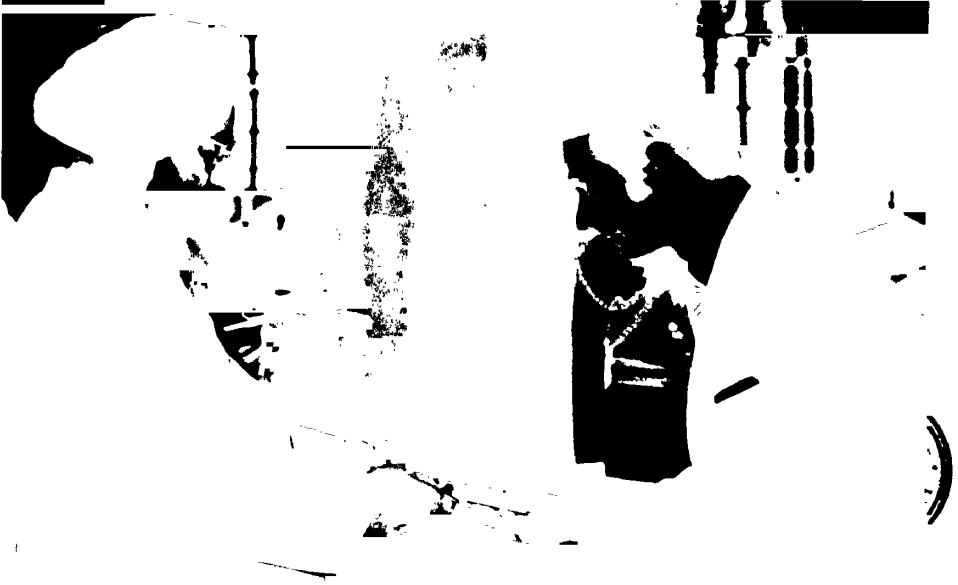
یونان کے سفیر عزت مآب جارج سیورس نے ، ۱۰۔جولائی ۱۹۸۴ء کو راشٹرپتی بھون میں صدرِ جمہوریۂ ہند، شری ذیل سنگھ کو کاغذاتِ سفارت پیش کیے ۔

پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق ، مرکزی وزیرِ مملکت برائے اطلاعات ونشریات شری ایچ ۔ کے ۔ ایل بھگت کے ساتھ ۔ اپنے حالیہ دورۂ پاکستان کے دوران شری بھگت ۸۔ جولائی ۱۹۸۴ء کو اسلام آباد میں ، جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے تھے ۔

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

# آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر: راج نرائن راز

| جلد : ۴۳ | شمارہ : ۱ | اگست ۱۹۸۴ء |
| --- | --- | --- |
| قیمت : ایک روپیہ پچاس پیسے | فون : ۳۸۷۰۶۹ | شراون ـ بھادر شک ۱۹۰۶ |


## ترتیب



سرورق: [illegible]


بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ

اسسٹنٹ بزنس منیجر (سرکولیشن): ایم۔ ایس۔ [illegible]

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:

ایڈیٹر: آجکل، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ:

بزنس منیجر، [illegible]

[illegible]

# ہر انسان میں خدا بستا ہے

صدرِ جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ نے ۱۷ اپریل ۱۹۸۴ء کو قوم کے نام اپنے پیغام میں کہا:

میں آج ایسے وقت میں آپ کو مخاطب کر رہا ہوں، جب میرا دل دُکھ اور گہرے افسوس کے جذبات سے بھرا ہوا ہے۔ ایک لمبے عرصے سے پنجاب سے ایسی خبریں آتی رہی ہیں، جن کی وجہ سے یہ سارے واقعات رُونما ہوئے۔ گوردوارے ہیں، ست گوروؤں نے ساری انسانیت کو کھلے درشن دینے کا، سب کا بھلا چاہنے کا، رُوحانی ترقی اور رُوحانی طاقت کو بڑھانے کا اُپدیش دینے کا آدرش اپنایا تھا۔ شری گورو گرنتھ صاحب میں یہ لکھا ہے کہ "گوردوارے پرمیسر تن تھیئے، ست گورو سجینٹ ہر جن مکھ سنتیے، دوجی اور نہ جائی" ایسے اعلیٰ اقوال سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ گوردوارے سب کے لیے کھلے تھے۔ اُن سے سب کو امن کا پیغام ملتا تھا۔ گورو کی بانی میں ہے:

"اندر گوردوارا دھنا جیرا جپ گرو ناواں، نیتر وسد گرو دیکھنا سروئی سنسار گرو ناواں، سندگر وسیتی رہتا وارتے پاتیے ٹھاؤ" لیکن یہ آوازیں ختم ہوگئی تھیں۔ وہاں پر کس بات کا پرچار تھا؟ انتہا پسندوں کا قبضہ تھا۔ وہاں کے بڑے بڑے عہدے دار ان کے سامنے نہیں بول سکتے تھے۔ اس لیے کہ وہاں دہشت پسندوں اور غلط فہمیوں میں پھنسے اور گمراہ شدہ [illegible] کی گئی تھی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ اس کی [illegible] ان کے [illegible] ہے، جن لوگوں کے ہاتھ میں

ان مقدس مقامات کا انتظام تھا اور جو اُن کے سربراہ تھے۔ وہاں ایسی باتوں کی روک تھام نہیں کی گئی۔ وہاں اونچے درجے کے مذہبی رہ نماؤں کا کہنا بھی نہیں مانا جاتا تھا۔ نتیجتاً ایسے حالات پیدا ہوئے کہ دہشت پسندوں نے بہت لوگوں کو قتل کیا، لوٹا، مارا، آتش زنی کی، تباہی مچائی۔ ان میں ہمارے ہندو اور سکھ بھائی سبھی شامل ہیں۔ ان میں ہر علاقے کے لوگ ہیں۔ اخبار نویس بھی شامل ہیں۔ بیوپاری، کسان، مزدور، علما اور سیاسی لیڈران بھی شامل ہیں۔ تشدد یہاں تک بڑھتا گیا کہ شری اکال تخت صاحب کے سابق جتھے دار گیانی پرتاپ سنگھ کو بھی اُن کے گھر میں قتل کر دیا گیا۔ گیانی پرتاپ سنگھ جی اس بیسویں صدی کے ایک عظیم انسان تھے۔ ایثار و قربانی کا پتلا تھے، عظیم عالم تھے، ادیب تھے، مذہبی خیالات کا پرچار کیا کرتے تھے، گورو گھر کے عقیدت گزار تھے۔ ہو سکتا ہے، اُن کے خیالات اُن سے نہ ملتے ہوں، اُن کو بھی قتل کیا گیا۔ حالات واقعی افسوس ناک تھے۔

پنجاب کا انتظام چلانے والوں کی وجہ سے، گوردواروں کے منتظمین کی وجہ سے، انتہا پسندوں کی وجہ سے پنجاب کی یہ حالت ہوئی کہ سرکار کو وہاں فوج بھیجنی پڑی، جس کے نتیجے میں وہاں تصادم ہوا۔ دو مذہبی اور سیاسی لیڈروں نے فوج کی تنبیہ پر اپنے آپ کو فوج کے حوالے کر دیا۔ بہت سے لوگوں نے اپنے آپ کو فوج کے حوالے کر دیا۔ اُنھوں نے گوردوارہ

صاحب کی پاکیزگی اور تقدس کو قائم رکھنے کے لیے ایسا کیا۔ مگر یہ دہشت پسند، جن کے لیے یہ ایسا خیال ہے کہ وہ کبھی گورومت کے ماننے والے نہیں تھے۔ وہ بھی ہتھیار ڈال دیتے تو گوردوارہ کے، اس مقدس مقام کی بے حرمتی نہ ہوتی اور ایسے حالات پیدا نہ ہوتے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس صدمے کو برداشت کرتے ہوئے صحیح راستے پر چلیں۔ قوموں پر ایسے حادثات آتے رہتے ہیں۔ اور اسی وقت قوم کے صبر و حوصلہ کو، دُور اندیشی کو، بہادری کو، اور اس کی رہ نمائی کو پرکھا جاتا ہے۔ میں صرف سکھوں ہی سے نہیں، بلکہ تمام دیش واسیوں سے کہتا ہوں کہ ایسے واقعات کے بعد ہمیں کیا کرنا چاہیئے، اس کے لیے ہم کو سوچنا ہوگا۔

ناجائز طور پر ہتھیاروں کا آنا، بھاری تعداد میں آنا اور بہت خطرناک ہتھیاروں کے علاوہ بہت سی ایسی چیزیں، جو گوردوارے میں داخل نہیں ہو سکتیں، ان کا آنا اور ان ساری باتوں کے باوجود مجھے اس بات کا تھوڑا سا اطمینان ہے کہ شری ہرمندر صاحب کی پاکیزگی برقرار رہی۔ فوج کے افسروں اور جوانوں نے جو مجھے بتایا کہ اُنھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی جانیں دے دیں گے، لیکن اس مقدس مقام کی طرف گولیاں نہیں چلائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ اس جھگڑے میں اس مقدس مقام پر کچھ بے قصور لوگ بھی مارے گئے ہوں۔ مجھے سبھی مرنے والوں کا بڑا غم ہے۔ جوانوں کی بھی جانیں گئیں۔ افسر بھی کام آئے۔ ایسی حالت میں ہم کو بہت صبر اور دُور اندیشی سے سوچنا ہوگا کہ پھر ایسے حالات پیدا نہ ہوں۔ اپنے ملک کی یک جہتی کو بنائے رکھنے کے لیے اور لوگوں کا آپسی پیار قائم رکھنے کے لیے ہمیں بھرپور کوشش کرنا ہوگی۔ مجھے بہت دُکھ ہے۔ سارے ملک کا میں ایک نمائندہ ہوں۔ عوام کا بڑا شکر گزار ہوں۔ ان ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے میں صرف ایک صوبے کو نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن جہاں بھی کچھ حادثات ہوتے ہیں، اس کا دُکھ مجھے محسوس کرنا پڑتا ہے اور میں واقعی محسوس کرتا ہوں۔

پنجابیوں سے خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری روایات، ہماری تاریخ ایسی ہے کہ ہم کبھی علیٰحدہ نہیں ہوئے۔ ہم مل جل کر زندگی گزر بسر کرتے آئے ہیں۔ ہمارا کھانا پینا ایک جیسا ہے۔ ایک جیسی ہماری آب و ہوا ہے۔ ہمارے دُکھ سُکھ سانجھے ہیں۔ ہم مل کر روتے اور ایک ساتھ ہنستے رہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو ہماری سانجھی نہ ہو۔ لیکن اب ایک دراڑ سی نظر آرہی ہے۔ ہمیں ان کھائیوں کو مٹانا ہوگا۔ ہم کو ایک ہوکر چلنا ہوگا۔ اپنے مُلک، اپنی قوم، اپنے دھرم کے مفاد میں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہمیں اب کیا کرنا چاہیئے۔

سب سے بڑی بات میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہماری سرکار اور ہمارے مُلک کے لوگ بھرپور کوشش کریں گے کہ پھر کبھی ایسے واقعات رونما نہ ہوں۔ ان کے اسباب ہی پیدا نہ ہوں تاکہ ہم اپنے ملک کو اور اپنے ملک کے عوام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یک جہت رکھتے ہوئے، مضبوط بناتے ہوئے آگے بڑھ سکیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے سکھ دھرم کے گوروؤں نے ہم کو جو اُپدیش دیا، دسویں گورو جی نے جو ہم سے کہا کہ میرے بعد سکھوں کا گورو، گورو گرنتھ صاحب ہے۔ گورو گرنتھ صاحب کی بانی کے اُپدیش پر ہم کو چلنا چاہیے۔ گورو بانی نے ہم کو سکھایا ہے کہ ہم رحم، دھرم، دوسروں کی بھلائی، ایثار، خدمت، قربانی کے جذبات کو فروغ دیں، غریبوں کی حفاظت کریں اور ساری انسانیت کو ایک سمجھ کر چلیں۔

ہر انسان میں خدا بستا ہے۔ کہیں کوئی غلطی کرتا ہے، نقصان کرتا ہے، اس کو بھی ہمیں سمجھنا ہے۔ اس کو محبت کے جذبے کے ساتھ ملا کر رکھنا ہے۔ بابا جی کا اُپدیش ہے کہ "نانک ست گرو ایسا جانیئے جو سب سے لئے ملائے جیو"۔ یہ اُپدیش دینے والے صرف سکھ ہی نہیں ہیں، ہندوستان میں اور لوگ بھی ہیں، جن کے دل میں اس بات کا احترام ہے۔ پہلے ہی وہ سکھ نہیں۔ ست گورو نے پورے ہندوستان کو ایک سمجھا۔ ہمیشہ ہندوستان ہی کو ترجیح دی کسی ایک صوبے کو نہیں۔ کوئی ایسا علاقہ نہیں، جہاں گورو صاحب

دسوں گوروؤں نے خاص طور پر گورو نانک، گورو تیغ بہادر اور گورو گوبند سنگھ جی تشریف لے گئے ہوں۔ یہ ہندوستان کا چپہ چپہ سکھوں کا ہے، یہ ہندوستان کا چپہ چپہ عیسائیوں کا ہے، مسلمانوں کا ہے جینیوں کا ہے، بودھوں کا ہے، ہندوؤں کا ہے، کسی ایک کا نہیں، اس لیے ہمیں گہری نظر سے، دُور اندیشی سے، سوچ بچار کرنا چاہیئے کہ ہم ان دُکھوں کو دُور کرسکیں۔ عظیم مقدس مقامات کی پاکیزگی کو قائم رکھیں، باہمی پیار محبت رکھیں، شری گورو گوبند سنگھ جی کے یہ لفظ یاد رکھیں:- سانچ کہوں سن لے ہو سبھے جن پریم کیو، تن ہی پربھ پایو (میں سچ کہہ رہا ہوں سبھی سنیں، جو دوسروں کے ساتھ پیار محبت رکھتے ہیں، پربھو، پرماتما اُنہیں کو ملتا ہے)۔

## آہ! ظفرادیب

اُردو کے مشہور ادیب، شاعر، صحافی اور مترجم جناب بھیم سین ظفر ادیب کا ۲۴رجون کی شام ساڑھے آٹھ بجے طویل علالت کے بعد نئی دہلی کے ارون اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ظفر صاحب مرحوم متعدد کتابوں کے مصنّف، مرتّب اور مترجم تھے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں کئی اکادمیوں کی طرف سے انعامات سے بھی نوازا گیا۔ انہیں کلا پریشد ایوارڈ بھی ملا تھا۔ ان کی آخری رسوم نگم بودھ گھاٹ پر ادا کی گئیں۔ ادارہ مرحوم کی ناوقت رحلت پر افسوس کا اظہار کرتا ہے۔

## گیان پیٹھ ایوارڈ برائے ۱۹۸۳ء

۱۹۸۳ء کا گیان پیٹھ ایوارڈ کنڑ زبان کے ادیب ماستی ونکٹیش آئنگر کو ان کے ناول "چکویر راجیندر" پر دیئے جانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ یہ انعام ڈیڑھ لاکھ روپے کا ہے۔

شری نیواس صاحب کے ۱۷ شعری مجموعے، ۱۸ ناٹک، تین ناول، ۱۷ افسانوی مجموعے اور ۴۶ آپ بیتیاں اور دیگر تخلیقات شائع ہو چکی ہیں۔

## بقیہ: احساس

موت تو سب سے بڑی برکت ہے ـــ قانون؟ ـــ قانون کو چھوڑو۔ قانون کی آڑ میں تو ہم نے صرف حرامی بچے پیدا کئے ہیں۔ اِسی لیے سر نکالتے ہی انھوں نے ہم سے اپنا تعلق توڑ لیا اور ہم سے بڑھ چڑھ کر کائناتی روشنیاں گل کرنے میں جُٹ گئے۔

مگر شکر کا مقام ہے سبھدرا، کہ بڑھاپے کی بوسیدگی میں رشتے بے عذاب ادھڑتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے دراصل یہی ہوا ہے سبھدرا، کہ میرا اب کسی سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میرے ذہن میں چھوٹے بابا نے بھی دم توڑ دیا ہے۔ اب تو مجھے اپنے آپ سے اپنا رشتہ اُدھڑنے کا انتظار ہے۔ نہیں سبھدرا، مجھے عیسیٰ اور بدھ کی طرح موت کو کوئی بڑا دھوکا دے کر آئندہ نسلوں کے دل و دماغ میں پناہ نہیں لینی ہے۔ ـــ نہیں، مجھے کسی ایک کے ذہن میں چھپ کر بھی نہیں جیے جانا ہے۔ مجھے اپنا آپ بڑی ایمانداری سے موت کو سونپ دینا ہے اور سارے کا سارا مر کر اپنی کوتاہ ترجیحوں اور تعصبوں سے آزاد ہونا ہے۔ تمہیں ـــ جو تم نہیں ہو ـــ پالینے کا یہی ایک اُپائے ہے ـــ جب میں مر چکا ہوں گا سبھدرا، تو خوب خوشیاں منانا کیونکہ میں تمہاری کوکھ میں پیدا ہو جاؤں گا۔

[illegible] زیدی

# میگھ دوت کے مترجم قمر بحری آبادی

"میگھ دوت" کالیداس کا وہ ادبی شاہکار ہے، جس پر سنسکرت زبان ہی نہیں، عالمی ادب کو بجا طور پہ ناز ہے۔ اس کے ترجمے بھی کئی یورپی اور بھارتی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ اس معاملے میں اردو کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ آج اسی ادبی شہ پارے کے ایک مترجم کا تعارف مقصود ہے۔

مولوی قمر احمد قمر اب تاریخ کی بدلیوں میں چھپے ہوئے چاند بن گئے ہیں، لیکن اُن کے کارنامے ایسے نہیں ہیں کہ اُنہیں آسانی سے فراموش ہو تے دیا جائے۔ اگر وہ دُور افتادہ غازی پور (اُتر پردیش) کے دُور افتادہ اور نسبتاً کم معروف قصبہ بحری آباد کے باشندے نہ ہوتے بلکہ اُن کا وطن کسی ایسے شہر میں ہوتا، جہاں نشر و اشاعت کی روشنی کبھی ماند نہیں پڑتی اور جہاں کے ادبی، سیاسی اور ثقافتی حلقے نمایاں افراد کی یادیں جگاتے رہتے ہیں تو اُن کو بھلا دینا اتنا آسان کبھی نہ ہوتا۔ ابھی ۱۹۵۱ء کو کتنے دن ہوئے ہیں، لیکن اس قلیل مدت میں ہم نے اس ہنگامہ آرا ہستی کو بھول چوک کے طاق میں رکھ دیا!

ایسا بھی نہیں ہے کہ قمر اپنی زندگی میں بالکل ہی غیر معروف رہے ہوں یا اُن کی زندگی بحری آباد میں محصور رہی ہو۔ زمانۂ طالب علمی میں وہ الہ آباد اور علی گڑھ یونی ورسٹیوں میں دادِ ذہانت دیتے رہے۔ اس کے بعد غازی پور میں وکالت شروع کی لیکن ابھی چار ہی برس پریکٹس کر پائے تھے کہ تحریکِ خلافت شروع ہو گئی۔ اس تحریک کے دَوران اُنہوں نے وکالت ترک کر کے سودیشی کپڑوں کی دکان کھول لی۔ پھر بمبئی پہنچے اور روزنامہ "خلافت" کے شعبۂ ادارت سے وابستہ ہو گئے اور کئی برس تک وہاں مقیم رہے۔ وہاں سے پھر غازی پور واپس آئے اور از سرِ نو وکالت شروع کی۔ آخر عمر میں پھر وکالت کو آخری بار ترک کیا اور اپنے وطن بحری آباد کو پھر سے آباد کیا۔ وہاں بے کاری سے بچنے کے لیے مقامی ہائی اسکول میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ ۳ر جون ۱۹۵۱ء کو مختصر سی علالت کے بعد جان، جان آفریں کے سپرد کر دی اور اپنے آبائی قبرستان میں ابدی آرام گاہ پائی۔

قمر ۱۹۱۹ء سے لے کر مرتے دم تک کھدر پوش اور کانگریس سے وابستہ رہے۔ طبیعت مرنجاں مرنج پائی تھی۔ بے حد زندہ دل تھے۔ جس محفل میں بیٹھ جاتے، اُسے زعفران زار بنا دیتے۔ ہر طرح کے جھگڑے اور فساد سے ہمیشہ کنارہ کش رہتے۔ طبیعت میں سادگی تھی اور فقیر دوستی کی طرف میلان تھا۔ تحریکِ خلافت کے دوران مولانا شوکت علی کے کافی قریب آ گئے تھے اور شوکت علی کہا کرتے تھے کہ "قمر تو فقیر آدمی ہے"۔ اس سادگی کے باوجود مزاج میں بڑی استواری تھی اور اصول کے معاملے میں وہ بے باک اور غیر متزلزل تھے۔ چنانچہ مولانا شوکت علی کے رویّے کے برعکس، اُنہوں نے ہمیشہ قومی تحریک کا ساتھ دیا اور اپنے دلی دوست اور صحافی معین الدین حارث کی جو راہ ابتدا میں اپنائی تھی، اُسی پر قائم رہے۔ برطانیہ دشمنی میں بہت شدید اور بے لچک تھے۔

قمر کا صحیح سنہ ولادت معلوم نہ ہو سکا۔ اُنہوں نے تقریباً ۶۵ برس کی عمر پائی تھی۔ اس حساب سے ان کی ولادت ۱۸۸۶ء کے آس پاس ہوئی ہو گی۔ جس بحری آباد میں وفات پائی وہیں پیدا بھی ہوئے تھے۔ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ سے بی اے اور ۱۹۱۵ء میں الہ آباد یونی ورسٹی سے ایل ایل بی کیا۔ اسی سال وکالت شروع کی اور شہر غازی پور کے محلہ سید واڑہ میں ایک مکان کرائے پہ لے کر رہنے لگے۔ ۱۹۲۵ء میں سنٹرل خلافت کمیٹی نے اُنہیں حاجیوں کا رہبر بنا کر حجاز بھیجا اور حج سے مشرف ہوئے۔ وہاں سلطان عبدالعزیز سے ایک وفد کی شکل میں ملے اور خلعت پائی۔

گیا میں کانگریس کا جو سالانہ اجلاس سی۔ آر۔ داس کی قیادت میں ہوا تھا، اُس میں قمر احمد قمر کی نظم پڑھی گئی تو بے حد پسند کی گئی۔ حاجی اشتیاق احمد بحری آبادی

● ۳/۶ محالی باغ کالونی، لکھنؤ

نے آشفتہ بیانی (قلمی) میں تحریر کیا ہے کہ "پچاسوں ہزار آدمیوں کے مجمع میں جس وقت یہ نظم پڑھی گئی، ایک سناٹا چھا گیا اور ہر شخص دم بخود ہو گیا۔" اس طرح کی نظمیں اُنہوں نے شاذ لکھی ہیں۔ عام طور سے وہ تفریحی اور مزاحیہ نظمیں لکھا کرتے تھے۔ طبیعت کو شعر و شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ لیکن اُنہوں نے کبھی اپنے کلام کو جمع کرنے کا خیال نہیں کیا: "ورنہ ایک دیوان ضرور جمع ہو جاتا۔" مزاحیہ کلام علی العموم لوگوں کو بانٹ دیا کرتے تھے۔

خوش قسمتی سے "میگھ دوت" کا اردو ترجمہ باقی رہ گیا ہے۔ یہ منظوم ترجمہ "میگھ دوت" یا "سندلیسیا بادل" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ اس کے شروع میں اُنہوں نے ایک تفصیلی مقدمہ بھی لکھا ہے، جس میں کالیداس کی حیات و تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے خود نظم "میگھ دوت" پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ کالیداس کے خصوصیات اُنہوں نے یہ بیان کئے ہیں:

> "تخیلات میں ندرت، جذبات میں فراوانی و وارفتگی، مناظرہ محاسن قدرت کا بدرجہ اتم احساس کالیداس کی خصوصیات شاعری ہیں۔ اور ان کے ساتھ خدا نے اسے طرزِ ادا کی ایسی زبردست قوت عطا کی ہے، جس سے اُس کی شاعری کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ وہ مناظرِ قدرت کو اس انداز سے بیان کرتا ہے، جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اُسے پتے پتے اور بوٹے بوٹے کی ماہیت کا کما حقہ، احساس ہے، البتہ میگھ دوت میں بھجنوں کی سادگی نہیں بلکہ امتدادِ زمانہ اور اپنے دَور کی خصوصیات سے متاثر ہو کر کالیداس بھی صنایع و بدایع لفظی کے جہاجال میں پھنس گیا۔ گو اس کے دلی جذبات اور جبلی قوتِ ادا اُس کے کلام میں باوجود ظاہری تصنعات و تکلفات کے بھی آورد میں آمد کا زور پیدا کر دیتے ہیں۔ کالیداس اپنے تشبیہات و استعارات میں ایسے حاوی المعنی الفاظ استعمال کرتا ہے اور اس طریقہ پر ذو معنی الفاظ کے لُطف دکھاتا ہے کہ اس کے کلام کا صحیح معنوں میں ترجمہ ہونا دشوار کیا، قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہے اور سچ پوچھیے تو یہی اس کے کلام کی جان ہے۔"

پھر اس کتاب کے ترجمے کی غایت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "ہم نے اس کتاب کے ترجمے کی ہمت اپنی تمام ترکم دریوں اور ترجمے کی دشواریوں کو جانتے ہوئے محض اس خیال سے کی کہ اردو داں پبلک جو قریب قریب سنسکرت کی انشاء پردازی سے بیگانہ ہے، کچھ نہ کچھ اس سے مانوس ہو اور قدیم آرین روایات اور ہندی حکایات سے بے بہرہ نہ رہے....

اس امر کی کوشش پوری طرح کی گئی ہے کہ کالی داس کے استعارات و تشبیہات و تلمیحات کا ترجمہ کر دیا جائے، الفاظ میں کالیداس کی سی حلاوت و خوش نمائی نہ ہو نہ سہی، لطفِ کلام نہ ملے نہ سہی مگر مفہوم کلام تو معلوم ہو جائے گا۔ آج ملک میں نفاق و شقاق کی جو ہوائیں چل رہی ہیں اور ملک میں اُردو ہندی کے دو ایسے کیمپ بن رہے ہیں، جن سے ایک کو دوسرے سے قطعی اجنبیت اور مغائرت پیدا ہے اور ایک دوسرے کے جذبات و احساسات، قومی روایات اور تلمیحات سے سراسر بیگانہ ہے، اس لحاظ سے ہر ایسی کوشش جو باہمی مفاہمت (اور) دوریِ مغائرت کے لیے کی جائے محمود ہے۔ ہمارے خیال میں تو اب وقت آ گیا ہے کہ سنسکرت اور ہندی کی کتابوں کے ترجمے اُردو میں اور عربی اور فارسی اور اُردو کے ترجمے ہندی بھاشا میں کیے جائیں۔" یہاں قدرے ترجمے کے کچھ اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں:

## میگھ دوت یا سندیسیا بادل

ہے سب تعریف اُس خالق کو شایاں — کہ رُت برکھا کی ہے جس سے نمایاں
دیا ابرِ سیہ سے صاف پانی — ملی دنیا کو اک تازہ جوانی
وہ لو وہ دھوپ کی شدت، وہ گرمی — پریشاں جس سے تھی خلقت خدا کی
لبوں پر جان تھی ہر اک کی، آئی — کہ اتنے میں گھٹا رحمت کی چھائی
پڑیں بوندیں جو مینہ کی فضلِ رب سے — تنِ بے جاں میں بس جان آ گئی سب کے
ہوئی رحمت خدا کی آشکارا — حیاتِ تازہ پھر پائی دوبارا

ہے نعت اُس احمدِ مرسل کو زیبا — کہ پیدائش میں پانی جس کا برسا
وہ سردارِ دو عالم جس کی بعثت — زمانے کے لئے ہے ابرِ رحمت
وہ جس کے دم سے تخلیقِ جہاں ہے — وہ جس کی ذات رحمت کا نشاں ہے
درود اُس پر جو ہے دنیا کا سرور — سلام اُس پر جو ہے عالم کا رہبر
تو اب اصلِ مطلب کچھ بیاں ہو — کہ جس سے حالِ دل سب پر عیاں ہو
یہ تھی عرصے سے اس دل کی تمنا — کھنچے نقشہ پرانی شاعری کا
ہے کالیداس اک شاعر گرامی — کہ ہے مشہور جس کا نام نامی
لکھی ہے "میگھ دوت" اک نظم مشہور — اسی کا ترجمہ تھا دل کو منظور
دلِ ناداں کو لیکن یہ خلش تھی — کہ کب ہو ترجمے میں لُطفِ اصلی
ہے کالیداس مشہورِ زمانہ — نہیں یہ ترجمہ، ہے مُنہ چڑھانا
مگر پھر یک بیک یہ دل میں آیا — عبث [illegible] اس لیے میں

[illegible] اہلِ جہاں کو          سناؤں ریختہ میں داستاں کو
[illegible] رنگِ بیاں سے          مگر واقف تو ہوں اس داستاں سے
[illegible] ہے عرب کے ابر اُٹھ کر          برستا ہند میں ہے کس طرح پر
[illegible] جغرافیہ کے پڑھنے والے          ہیں کالیداس کے مضمون نرالے
غرض اب سُنیے وہ رنگیں فسانہ          ہے جس پر وجد میں سارا زمانہ

(۱)

ہمالہ پر جو ہے کیلاش پربت          ہے یکش اور یکشنی کی واں حکومت
یہ بھارت کے پری زاد اور پری ہیں          بظاہر رنج و غم سے یہ بری ہیں
کُبیر اُن کا ہے سردارِ معظّم          ہیں یکش اور یکشنی ہمراز و ہمدم
ہوا اک یکش خدمت سے جو غافل          پھرا اس یکش سے سردار کا دل
جو تھی تنبیہ اس غافل کی منظور          کیا کیلاش سے اس یکش کو دُور
ہوئی اُس کی جدائی یکشنی سے          وہ چھوٹا سال بھر کو اُس پری سے
نہ کچھ سوجھا جب اُس کو رنج و غم میں          بسا وہ رامگیری آشرم میں
جہاں پیڑوں کی ہریالی کے نیچے          کبھی بن باس لی تھی رام جی نے
جہاں پر کہہ سنائی جل کی پاکی          نہاتی تھیں کبھی یاں جانکی جی

(۲)

زبس تھا یکشنی کا اس کو سودا          ہوا تھا سوکھ کر وہ غم میں کانٹا
بندھے رہتے جو بازو بند کس کر          وہ ڈھیلے ہو کے گرتے تھے زمیں پر
تھکے بازو، نہ تھا ہاتھوں میں یارا          اُٹھا سکتا نہ تھا اک سنگ پارا
غرض گھیرا تھا اُس کو بے کسی نے          یونہیں گزر رہے تھے اُس کو جو مہینے
اساڑھ آیا، ہوا بادل نمودار          پڑیں بوندیں تو بس چونکا وہ اک بار
یہ دیکھا ہر طرف سے ابر چھایا          پہاڑی چوٹیوں پر گھر کے آیا
برستا، جیسے فیلِ مست و سرشار          اُڑائے خاک دانتوں سے دھواں دھار

(۳)

اُٹھا وہ لڑکھڑاتا آہ بھر کر          بمشکل اپنے پونچھے دیدۂ تر
ہوا ابرِ سیہ کو دیکھ خاموش          رہا تا دیر وہ از خود فراموش
عیاں ہے ابر سے قدرت خدا کی          نہ پھر کیوں محو ہو خلقت خدا کی
[illegible] دیکھا ہے ہوتے ہیں خاموش          نہ کیوں مہجورِ الفت کے اُڑیں ہوش

(۴)

[illegible] ساون آیا          بندھا اس کو تصور یکشنی کا
[illegible] برسات آئی          قیامت ہو گئی اس کی جدائی
[illegible] سے اب پاس اس کے          پریشاں کر رہے تھے وسواس اس کو
ہوس تھی یار تک پیغام پہنچے          پیامِ عاشقِ ناکام پہنچے
یہ دُھن تھی ابر کو قاصد بناؤں          غمِ ایامِ ہجراں کہہ سناؤں

(۵)

جو سر میں عشق کا سودا سمایا          وہ ناداں یکش اتنا بھی نہ سمجھا
دھواں، پانی، ہوا اور آگ ہے ابر          بخاراتِ زمیں کی جھاگ ہے ابر
نری بس ابر سے بھیجے گا پیغام          جو ہے جوشِ محبت میں تبہ کام
جو تھا وہ یکش ناکامِ محبت          دیا بادل کو پیغامِ محبت
جو تھا ہجراں زدہ آفت کا مارا          نہایت عاجزی سے یوں پکارا

(۶)

کہا اے نونہالِ ابرِ بہمن          تمہارے نام پر قربان تن من
تمہارا خانداں پشکر اور تک[1]          لیے ہو نسل میں تم اپنی بے شک
ہو راجہ اندر کے تم کا مچاری          اسی سے کرتا ہوں بنتی تمہاری
کہ تم عالی نسب با مرتبہ ہو          بڑوں سے مانگئے جو مانگتا ہو
بڑوں کے در سے خالی لوٹ آنا          مگر احساں نہ چھوٹوں کا اُٹھانا

شریفوں ہی کے در کا ہوں بھکاری
کمینوں سے نہ ہو مطلب براری

(۷)

سنو اے میگھ، مہجوروں کے غمخوار          گرفتارِ مصیبت کے مددگار
غضب سردار کا مجھ پر پڑا ہے          برس دن کے لیے گھر در چھٹا ہے
جو ہے الکاپُری[2] یکنیشور کی          وہیں رہتی ہے میری پران پیاری
جہاں بسرام کرتے ہیں مہادیو          جہاں آرام کرتے ہیں مہادیو
چھپے ہیں جس جگہ باغوں میں جیسے          اُنہیں کے دم قدم کے ہیں کرشمے
تمہیں اے میگھ واں جانا پڑے گا          مرا پیغام پہنچانا پڑے گا

(۸)

ہوا پر دیکھ کر صورت تمہاری          تڑپ جائیں گی سب برہن دکھاری
پیے پردیس میں ہیں جن کے پریتم          تجھے دیکھے سے دونا ہو نہیں غم
جہاں اے میگھ تو ہو گا نمودار          وہاں چاہیں گے ہر اک وصلِ دلدار
مگر ہاں ہم سے مہجورِ محبت          جُدا ہیں حکمِ حاکم کی بدولت
میسر کب ہو ہم کو وصلِ جاناں          پڑے ہیں دور دردِ غم سے گریاں

---

[1] پشکر اور تک برساتی میگھ کی دو قسمیں جو اعلیٰ سمجھی جاتی ہیں۔

[2] مشہور ہے کہ الکاپُری اور کیلاش دونوں پہاں پاس پاس ہیں۔ کیلاش میں مہادیو کی، الکاپُری میں کُبیر کی حکومت ہے۔

(۹)

بنے ہیں راہبر جھونکے ہوا کے    تجھے آہستہ آہستہ چلا کے
تری آمد پہ بگلوں کی قطاریں    مسرّت کی صلائیں دے رہی ہیں
شکھی ایسی ہیں جیسے گربھ والی    امیدوں سے ہو محوِ خوش خیالی

تجھے دیکھا تو دل کو چین آیا
تھپک کر اُن کو خوشیوں نے سلایا

(۱۰)

مگر ہاں ایک ناکامِ محبت    وہ میری یکشنی بیمارِ اُلفت
ارے او ابر! اے پیکِ فلک سیر!    ترا گھر مسجد و بُت خانہ و دیر
ارے جا اپنی سھابی پاس جلدی    مرے آنے کا دن وہ گنتی ہوگی
وفا و حُسن کی جو دیویاں ہیں    پیا بن چین سے کب ہیں جہاں ہیں
بھلا ملنے سے کب ہوں گی وہ بے آس    اسی اُمّید پر لیتی ہیں وہ سانس

(۱۱)

بیاں اوصاف کیا ہوں ابر تیرے    زمیں میں پڑ گئی ہے جان تجھ سے
ترے دم سے کشودِ کارِ عالم    ہے اونچی تجھ سے پیدا دارِ عالم

ملیں گے راستے میں ہنس تیرے    تری پیاری گرج جس دم سُنیں گے
اُنہیں یاد آئے گا بس مانسرور[۱]    چلیں گے جانبِ کیلاش اُڑ کر
کنول کے پھول زادِ راہ لے کر    ترے ہمراہ جائیں گے ہوا پر

(۱۲)

مگر اے میگھ! میری بات سُن لے    ذرا پہلے بزرگوں کے چرن لے
تو کر اُس کوہ کی چوٹی کا پھیرا    پڑا رگھو ناتھ جی کا یاں کفِ پا
یہاں پر دیوتاؤں کا نشاں ہے    بزرگی اُس کی رفعت سے عیاں ہے
تڑپتا تھا جُدائی میں یہ تیرے    لگائے گا اگر تو اُس کے پھیرے

اس ترجمے میں بابو ورلشور ناتھ رائے ایڈوکیٹ اور سابق چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ، غازی پور نے بھی متعدد کتابیں فراہم کیں اور دلچسپ مشورے دیے۔ کالیداس کی حیات سے متعلق مواد کی جمع آوری میں مولوی محمد محسن اللہ غازی پوری سے مدد ملی۔ اس سے پتہ چلتا ہے قمر ہی نہیں بلکہ دوسرے مسلمان دانشور بھی کالیداس کے رسیا اور یار بھی تھے۔ قمر کا خیال تھا کہ اگر یہ ترجمہ پسند کیا گیا تو وہ "رتو سنہار" کا بھی ترجمہ اردو نظم میں کریں گے۔ پتہ نہیں کہ وہ اس خیال کو عملی جامہ پہنا سکے یا نہیں۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب تحریکِ آزادی کے زیرِ اثر ثقافتی سطح پر یک جہتی کی ایک قومی تحریک رضاکارانہ طور پر چل پڑی تھی۔ آج قومی یک جہتی کی مہم سرکاری طور پر بھی چلائی جارہی ہے۔ لیکن عملی طور پر اس سمت میں

تیزی سے قدم اُٹھنا چاہیے اور ہمارے دانش وروں [illegible] ہو جانا چاہیے اُس میں کم غلامی کا احساس ہوتا رہتا ہے۔

قمر نے ترجمے ہی پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ اُنھوں نے کالیداس کے حالات بھی مواد فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تو ہم بھی جانتے ہیں کہ اس عظیم شاعر کے حالات تاریخ کے دُھندلکے میں غیر یقینی شکل اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جب قمر حالات جمع کر رہے تھے، اُس وقت صورتِ حال اور بھی غیر یقینی تھی۔ اور بعد میں مزید تلاش و جستجو ہوئی ہے، اس لیے ان حالات پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہے۔ خود کالیداس کی تصانیف سے اس کی جائے پیدائش یا عہد کے بارے میں کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا۔ اور جو اشارے ہیں ان سے ایک سے زیادہ نتائج اخذ کیے جانے کا امکان ہے۔

جب کالیداس نے اپنی مایۂ ناز تصانیف کی تخلیق کی۔ اس دور کی تعین زمانی کی راہ میں مشکلیں بدستور باقی ہیں۔ قمر کی رسائی جن ہندی ذرائع تک ہو پائی تھی، اس کے اعتبار سے کالیداس کا دور پہلی صدی قام تھا۔ لیکن قمر نے دوسرے ذرائع سے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ تصانیف سے کسی ایسے واقعے کا پتہ نہیں چلتا ہے جو اُس عہد کا ہو بلکہ طرزِ بیان سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کالیداس تیسری صدی عیسوی سے پہلے نہیں تھا۔ قمر کے بعد، اب یہ عام طور سے مان لیا گیا ہے کہ کالیداس کا زمانہ پانچویں صدی عیسوی کا ہے، جو لوگ تشکیک کی فضا باقی رکھنے پر مصر ہیں، اُن کے نزدیک یہ زمانہ دوسری صدی ق م اور ساتویں صدی عیسوی کے مابین کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ "مالویکا گنی متر" نامی ڈرامے میں اگنی متر نامی کردار یہ ظاہر کرتا ہے کہ کالیداس ۱۵۰ ق م سے پہلے نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اگنی متر اس سیناپتی پشیہ متر شُنگ کا بیٹا تھا، جس نے موریوں کے آخری راجہ برہدرتھ کو ۱۸۰ ق م میں قتل کر کے شُنگ خاندان کی بنیاد ڈالی تھی، اسی طرح ۶۳۴ء کے ایک دستاویز میں کالی داس کے نام کی موجودگی ساتویں صدی کی ابتدا کو نقطۂ آخر بنا دیتی ہے۔

عام روایت تو یہ ہے کہ وہ ۵۶ ق م میں کسی وکرما دتیہ کے درباری نورتنوں میں شامل تھے۔ لیکن تاریخی تجزیے سے پہلی صدی قبل مسیح میں کسی وکرمادتیہ کا وجود نہیں ملتا اور جن دھنونتری، امرسنگھ، شنکو، بیتال بھٹ، گھٹ کھرپر، کالیداس، ورامہر، ورروچی اور چھپانک وغیرہ نامی جو نورتن گنائے جاتے ہیں، وہ سب ایک دوسرے کے ہم عصر بھی نہیں تھے۔ مشہور بودھ عالم اشوگھوش کی کتاب [illegible] میں بعض اصحاب نے کالیداس کے "کمار سمبھو" اور "رگھوونش" کے اثرات [illegible] کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کا واضح ثبوت موجود نہیں ہے کہ رگھوونش [illegible] کا تتبع کیا ہے یا مؤخر الذکر نے اشوگھوش کا۔ اس کے مقابلے میں کالیداس [illegible] کی اندرونی شہادتوں کی بنا پر پانچویں صدی عیسوی کو اس کا عہد قرار دینا [illegible] معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً عہدِ گپت کے مستند بیانوں اور [illegible] لطیفہ کے میدان میں عہدِ گپت ان میں پہلی بار [illegible] لیے ہوئے گنگا جمنا کی مورتیوں، کشان، گپت کے [illegible]

---

[۱] مشہور ہے کہ برسات آتے ہی ہنس اپنے وطن مانسرور کی راہ لیتا ہے۔

[...] سے منتقل [...] شاعر کا "کمار سمبھو" شیو سمادھی کا بیان گپت شہنشاہوں کے قوانین اور سکوں کی عبارتوں اور کالیداس کی زبان کے مابین گہری مشابہت، شاعر کی تصانیف میں امن اور خوشحالی کا ذکر شاعر پر غالباً تیسری صدی کے واتسائن کے "کام سُوتر" کا موزوں ہونے والا نقش، یونانی جیوتش کے چینی وغیرہ مصطلحات کا استعمال، پانچویں صدی عیسوی میں وکشو ندکا گھاٹی میں بسنے والے ہُنوں کی رگھو کے ہاتھوں شکست۔ ان سب کا تقاضا یہ ہے کہ کالیداس کو عہدِ گپت کا شاعر تسلیم کیا جائے۔ ان کا عہدِ تصنیف و تالیف وہی ہے، جسے تاریخ ہند کا عہدِ زریں کہا جاتا ہے۔ اندازہ ہے کہ ان کی پہلی تصنیف "رِتو سمہار" (سنگھار) ۳۹۰ء کے قریب معرضِ وجود میں آئی۔ (یہ معلومات ہندی دائرۃ المعارف سے اخذ کی گئی ہیں)

دوسرا حل طلب مسئلہ کالیداس کے وطن کا ہے۔ قمر نے اجین کو کالیداس کا وطن قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ جس اندازسے ماحول، تاریخ اور آب و ہوا کا ذکر خود میگھ دوت میں کرتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُجین ہی اس کا وطنِ مالوف ہے، لیکن یہ معاملہ بھی صاف نہیں ہے۔ بنگال، اُڑیسہ، مدھیہ پردیش اور کشمیر بھی اس کی جنم بھومی ہونے کے دعوے دار ہیں، لیکن ظاہری امکانات کی بنا پر کشمیر اور مدھیہ پردیش کے دعوے زیادہ قابلِ توجہ ہیں۔ کالیداس نے "رِتو سمہار" میں چھ موسموں کا حال جن جزئی تفصیلات سمیت بیان کیا ہے، اس سے مدھیہ پردیش سے اُن کی ذاتی واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ "میگھ دوت" کے جلاوطن کردار کا قیام رام گری پر تھا۔ وہ علما کے نزدیک ناگ پور کے قریب واقع رام ٹیک ہے۔ بادل کو رام گری سے آگے کے سفر پر بھیجتے وقت شاعر راستے کی جو تفصیلیں بتاتا ہے، اس سے اس کی مدھیہ پردیش سے واقفیت صاف جھلکتی ہے۔ جو مقامات سیدھے راستے میں نہیں پڑتے، وہاں بھی میگھ (بادل) کو گھسیٹ لے جاتا ہے۔ ایسی ہی جگہ اُجینی (اجین شہر) ہے۔ اسی بنا پر کئی واقف کار محقق کالیداس کا وطن اُجینی کو قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس جو علما کشمیر کو وطن قرار دیتے ہیں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ کالیداس کے دل میں کشمیر کے لیے بڑی کشش ہے۔ "کمار سمبھو" کی پوری داستان اور "میگھ دوت" کا نصفِ اوّل کشمیر ہی سے متعلق ہے۔ "رگھوونش"، "شاکنتل" (شکنتلا) اور "وکرم اروشی" کے بھی اکثر مقام پہاڑی ہیں۔ اس کی پیدائش کشمیر ہی میں ہوئی۔ رام گری اس کے زمانۂ جلاوطنی کی قیام گاہ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کالیداس کشمیر یا کسی دوسرے پہاڑی مقام پر پیدا ہوئے ہوں اور بعد میں رضامندی یا مجبوری سے مدھیہ پردیش چلے گئے ہوں۔ اتنا یقینی ہے کہ اُن کا وطنِ اصلی جہاں بھی رہا ہو، مدھیہ پردیش میں اُن کا قیام کافی عرصے تک رہا۔

"میگھ دوت" مغربی ناقدین کے نزدیک بے حد قابلِ تعریف کارنامہ ہے۔ اس "کھنڈ کاویہ" کا کئی یورپی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو میں بھی کچھ اور ترجمے ہوئے ہیں۔ ان میں خلیل حسن خلیل مانک پوری کا ترجمہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ قمر نے ترجمہ براہِ راست سنسکرت سے نہیں کیا ہے۔ بظاہر انہوں نے ہندی اور انگریزی ترجموں کا سہارا لیا ہے۔ کیونکہ تصانیف کے ناموں کے املا سے سنسکرت سے عدم واقفیت کا سہارا ملتا ہے۔ مثلاً: "مالوکاگنی مترۃ" کی جگہ "مالویکا اگنی مترا" "رگھوونش" کی بجائے "رگھوبنس" "وکرم اردسی" کی بجائے "وکرم اروشی" لیکن انہوں نے ترجمے میں یہ اہتمام ضرور کیا ہے کہ مفاہیم کے ادا کرنے میں کوئی کوتاہی یا نقص نہ آنے پائے اور ترجمے کی روانی میں فرق نہ پڑے۔ اس حد تک قمر کی کوشش مشکور ہے۔ میں قمر کے پوتے فرقان قمر کا ممنون ہوں کہ انہوں نے جناب شاہ عبدالسلام کی وساطت سے یہ مواد مجھ تک پہنچایا اور میں اس قابل ہو سکا کہ بھولا ہوا افسانہ آپ کو یاد دلا سکوں۔ ●●

---

بقیہ

## مورچے پر

بولتے بولتے وہ ہانپنے لگی۔

اس کے اس غیر متوقع غیظ و غضب کو دیکھ کر بیٹی کی گھگھی بندھ گئی۔ راجو بھی سہم گیا — "پلیز ممّا! ایکسکیوز مَی... شی از ریلی گریٹی پاپ..." وہ گڑگڑایا تھا پھر اچانک ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنی طرف دیکھتی بیٹی سے مخاطب ہو کر سہم گیا تھا۔

"ایڈیٹ! عقل ہے؟ جب دیکھو تب منہ کرنے لگتی ہے.... کیا تم سوچتی ہو.... پاپا ہمارے ساتھ ہیں! جو کہے گی، سب ملتا جائے گا؟" کنارے سے جیسے کسی نے تیز دھار میں دھکیل دیا....

اچانک آنکھوں کے سامنے دھنکی جا رہی کپاس کے پھاہے اُڑ اُڑ کر پھیلنے لگے اور لگا کہ آنکھوں میں تحلیل ہوتے ہوئے وہ ریشے اس کی سانسوں میں بھی پھنسنے لگے ہیں۔ اس کی سانس گھٹ رہی ہے۔ یہ بھی لگا کہ کچھ دیر اگر یوں ہی کھڑی رہی تو ضرور بے ہوش ہو کر وہیں کی وہیں ڈھیر سی ہو جائے گی۔

"یو ہیو لوٹلی لوتھ..."

سرد ہوتے جا رہے جسم کے اندر زندگی کے کچھ زندہ حصّے اپنے لیے آپس میں لڑ رہے ہیں.... وہ ان کی تیز تیز آوازوں سے سہم اُٹھی ہے۔

مونہہ سے صرف اتنا نکلا — "راجو! ٹیکسی..." اور ایک ہاتھ سہارے کے لیے بیٹی کے کاندھے سے لگ گیا۔

"..... وِی سِیج آئی کین ناٹ بی.... آئی کین ناٹ بی...." جواب میں اُٹھی رُندھی رُندھی سی آوازوں کو وہ محسوس کر رہی ہے۔ نہ وہ ان کے لیے سدیپ بن سکتی ہے، نہ ان کی جگہ لے سکتی ہے۔ پھر کیسے اُن سے کہے؟ جب سدیپ ان کے ساتھ ہیں۔ کیسے کہہ دے، سدیپ اب نہیں رہے.... اور جب کوئی احساسات میں زندہ ہے، وہ کیسے مر سکتا ہے۔ کیسے کہہ دے وہ کہ..... کیسے....؟؟ ■■

## کاظم علی خاں

# باغ و بہار کے پلاٹ پر ایک نظر

فورٹ ولیم کالج کلکتہ نے اردو کے افسانوی ادب کو جن یادگار اور سدا بہار کتابوں سے مالامال کیا، اُن میں میرامّن کی باغ و بہار ایک لازوال شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ۱۸۰۳ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے طبع ہوئی تھی[1] اور اس کے بعد بار بار شائع ہوتی رہی۔ اب تک باغ و بہار کی بے شمار اشاعتیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

باغ و بہار فارسی کے مشہور قصّے چہار درویش کا اردو ترجمہ ہے، مگر میرامّن نے اس کو لکھنے میں حسین عطا خاں تحسین کی کتاب نوطرزِ مرصّع سے بھی مدد لی ہے جیسا کہ باغ و بہار کی بعض قدیم اشاعتوں میں سرورق کی اس عبارت سے بھی واضح ہوتا ہے: "باغ و بہار تالیف کیا ہوا میرامّن دلّی والے کا، ماخذ اس کا نوطرزِ مرصّع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں[2] کا ہے فارسی قصّہ چہار درویش سے۔" مگر[3] بعد کی اشاعتوں سے یہ عبارت حذف کر دی گئی، جس کے نتیجہ میں مولوی عبدالحق نے غلط فہمی کے تحت یہ رائے قائم کی کہ "میرامّن نے فارسی کتاب اور اس کے ترجمے کا تو ذکر کیا، مگر نوطرزِ مرصّع کا ذکر صاف اُڑا گئے ہیں۔"[4]

نوطرزِ مرصّع یقیناً باغ و بہار کا اہم ماخذ ہے۔ لیکن خود میرامّن کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فارسی قصّے چہار درویش کا اردو ترجمہ ہے۔[5] اس سلسلے میں ایک دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ نوطرزِ مرصّع اور باغ و بہار دونوں ہی کتابیں فارسی قصّے چہار درویش کا اردو ترجمہ ہونے کے باوجود اپنے بعض مندرجات میں ایک دوسرے سے الگ اور مختلف نظر آتی ہیں۔ ایک ہی ماخذ سے ترجمہ ہونے والی دونوں اُردو کتابوں کے بعض اجزا میں فرق اور اختلاف نے محققین کو دعوتِ فکر دی۔ حافظ محمود شیرانی کی تحقیق نے اس مسئلے کو یوں حل کیا کہ یہ دونوں اُردو کتابیں چہار درویش کے دو ایسے الگ الگ فارسی نسخوں پر مبنی ہیں جن میں جزوی طور پر خود متنی اختلافات ملتے ہیں۔[6] ماخذ کے یہی متنی اختلافات دونوں اردو کتابوں میں بھی نمایاں ہیں۔ دونوں اردو کتابوں کے اختلافات کے ضمن میں ایک دلچسپ اور اہم فرق یہ نظر آتا ہے کہ میرامّن نے باغ و بہار میں اصل قصّے سے قبل اپنے دیباچے میں ایک روایت کے ماتحت فارسی قصّے چہار درویش کو امیر خسرو سے منسوب کیا ہے (باغ و بہار ص: ۱۱) اس کے برخلاف تحسین کی نوطرزِ مرصّع میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی۔ حافظ محمود شیرانی کی تحقیق ثابت کرتی ہے کہ قصّہ چہار درویش کو امیر خسرو سے منسوب کرنا درست نہیں۔[7]

فارسی قصّہ چہار درویش اور نوطرزِ مرصّع دونوں ہی باغ و بہار کے اہم ماخذ ہیں، لیکن ان دو کتابوں کے علاوہ باغ و بہار کے قصّوں کے بعض اجزاء جن دوسری متعدد داستانوں سے مماثلت رکھتے ہیں اُن میں ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق حاتم طائی، گُل بکاولی، مدن مںجری کی کتھا، الف لیلہ کی بعض کہانیاں اور گُل و صنوبر وغیرہ کے قصّے شامل ہیں۔[8]

باغ و بہار کے قصّے میں سب سے پہلے پلاٹ پر نظر پڑتی ہے۔ پلاٹ کی خوبی یا خامی کی ذمّہ داری فارسی قصّے چہار درویش کے اصل مصنّف پر عائد ہوتی ہے۔[9] میرامّن اس قصّے کے مترجم ہونے کے باعث پلاٹ کی ذمّہ داری سے بری رہتے ہیں، لیکن باغ و بہار کے مطالعہ میں پلاٹ کا تجزیہ ناقد کا ناگزیر فریضہ ہے۔

باغ و بہار کے پلاٹ میں جدّت نہیں۔ اس میں بادشاہ آزاد بخت کا ایک بنیادی قصّہ ہے، مگر اس بنیادی قصّے کے ساتھ ساتھ چار درویشوں کے قصّے بھی ملتے ہیں۔ چاروں درویشوں کے قصّے بادشاہ آزاد بخت کے اصل اور بنیادی قصّے سے آغاز و انجام کے دونوں سروں پر ملے نظر آتے ہیں۔ ان قصّوں کے علاوہ بادشاہ آزاد بخت کی سرگزشت کے تحت خواجہ سگ پرست کا بھی ایک قصّہ بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح باغ و بہار کے پلاٹ میں بادشاہ آزاد بخت کے اصل اور بنیادی قصّے کے ساتھ ہمیں پانچ مزید قصّے ملتے ہیں۔

● ۲۰۱۔ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق باغ و بہار کے اصل اور بنیادی قصے میں مذکورۂ بالا پانچوں قصے آزاد حیثیت کی ضمنی کہانیوں کی نوعیت رکھتے ہیں[9]

باغ و بہار کے بنیادی قصے کو آگے بڑھانے میں یہ پانچوں قصے کچھ زیادہ معاون نہیں محسوس ہوتے۔ باغ و بہار کے اصل قصے کے پلاٹ کو یہ پانچوں ضمنی کہانیاں وحدت اور سادگی سے محروم کر دیتی ہیں لیکن اس دلچسپ حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ باغ و بہار کے اصل قصے میں وحدت نہ ہونے کے باوجود ان ضمنی قصوں میں سے بعض میں پلاٹ کی سادگی اور وحدت موجود ہے۔ یہ قصے اپنی اپنی جگہ پر خاصے مکمل ہیں۔ ان میں سے پہلے درویش کی کہانی تو دورِ حاضر کی مختصر کہانی سے ملتی جلتی شے معلوم ہوتی ہے۔ ان پانچوں ضمنی کہانیوں کا باغ و بہار کے بنیادی قصے کے ارتقا میں تو کوئی ہاتھ نہیں۔ لیکن باغ و بہار میں قصے کی جان یہی ضمنی کہانیاں ہیں۔ یہ ضمنی کہانیاں اصل اور بنیادی قصے سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔

باغ و بہار کے پلاٹ میں ضمنی کہانیوں کے ساتھ ساتھ داستان نویس نے قصہ در قصہ کی تکنیک سے بھی کام لیا ہے۔ قصہ در قصہ کی نمایاں مثال ہمیں بادشاہ آزاد بخت کی سرگزشت میں ملتی ہے۔ اس سرگزشت میں بادشاہ آزاد بخت خواجہ سگ پرست کی ایک ضمنی کہانی سُناتا ہے مگر اس ضمنی کہانی میں خواجہ سگ پرست بھی بعض قصے بیان کرتا ہے۔ خواجہ سگ پرست کی ضمنی کہانی میں خواجہ سگ پرست کے ذریعہ بیان کیے جانے والے یہ قصے "قصہ در قصہ" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح باغ و بہار کے پلاٹ میں ضمنی کہانیوں کے دوش بہ دوش قصہ در قصہ کی تکنیک کی بھی کارفرمائی موجود ہے۔

باغ و بہار میں بادشاہ آزاد بخت کا اصل اور بنیادی قصہ تو عشقیہ نہیں قرار دیا جاتا اور نہ ہی آزاد بخت کی زندگی میں عشق کا کوئی مقام نظر آتا ہے، لیکن چاروں درویشوں کے قصوں میں عشق کی بھرپور کارفرمائی محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کے بموجب یہ چاروں قصے "لفظِ عشق کی تفسیر ہیں"۔[10]

باغ و بہار کے قصے میں مافوق الفطرت عناصر، عام داستانوں کے مقابلے میں کم ہیں۔ مافوق الفطرت عناصر صرف چند موقعوں پر نظر آتے ہیں۔ اُن کی جھلک نیم روز کے شہزادے اور چوتھے درویش کی سرگزشت میں ملتی ہے یا اُن کا وجود قصے کے خاتمے میں جنوں کے بادشاہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان موقعوں کے علاوہ چاروں درویشوں کے قصوں میں اُن مواقع پر بھی مافوق الفطرت عنصر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جب درویش خودکشی کا ارادہ کرتے ہیں اور سبز پوش سوار کی رہنمائی سے وہ بچ جاتے ہیں۔ ان گِنے چُنے چند مواقع کے علاوہ مافوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی سے باغ و بہار بڑی حد تک بری محسوس ہوتی ہے۔ پہلے اور تیسرے درویش کے قصہ میں فوق فطرت کی شمولیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ بادشاہ آزاد بخت کی سرگزشت کے ماتحت جو کہانی بیان کی گئی ہے وہ بھی فوق فطرت عناصر سے پاک صاف محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح باغ و بہار کی پانچ ضمنی کہانیوں میں سے کم از کم تین کہانیاں مافوق الفطرت عناصر سے خالی ہیں۔

باغ و بہار میں فوق فطرت عناصر کم ہیں، لیکن رودادِ قصہ میں متعدد اجزا محلِ اعتراض قرار دئے جاتے ہیں۔ قصوں میں جگہ جگہ غیبی امداد کا سہارا لیا گیا ہے۔ اتفاقات اور غیبی امداد کا سہارا ایشیائی داستانوں کی مشترک خصوصیت ہے اور اس سے باغ و بہار بھی بری نہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر اعجاز حسین نے لکھا ہے: "صفحات اُلٹتے جائیے اور معلوم ہوگا کہ قصے کی گاڑی .... جاندار مخلوق کے زور سے آگے نہیں بڑھ رہی ہے بلکہ غیبی امداد وقت پر ہو جایا کرتی ہے اور ہیرو کی قسمت بدل جایا کرتی ہے۔ یہ رویّہ غالباً اس لیے اختیار کیا گیا کہ اس وقت کے لوگ خدا کی امداد پر زیادہ سے زیادہ بھروسہ کرنے کے عادی ہو جائیں۔ لیکن اس قسم کا توکّل بجائے قوّتِ عمل کو متحرک کرنے کے اور زیادہ بے حس اور مجہول بنا دینے کے لیے کافی سے زیادہ تھا"۔[11]

قدیم داستانوں کے پلاٹ میں زمان و مکان کی وحدت کا فقدان ہوتا ہے۔ کلیم الدین احمد نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ داستانوں میں "زمان و مکان گویا باقی نہیں رہتے .... " دو متواتر سین میں سال ہا سال کا فرق اور سیکڑوں میل کا بُعد ہو سکتا ہے۔ اس کی ضرورت نہیں کہ زمان و مکان کی خلیج پر پُل بندی کی جائے...."[12] عام داستانوں کی طرح باغ و بہار میں بھی زمان و مکان کے صحیح تصور کا فقدان ہے۔

باغ و بہار میں زمانی فروگزاشت کی ایک نمایاں مثال کے بارے میں ڈاکٹر گیان چند جین رقم طراز ہیں: ".... کتاب کے آخر میں ہر ایک کو اپنا محبوب مل جاتا ہے لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ کتنے وقفے کے بعد۔ کم از کم سات برس۔ چاروں درویش جب بادشاہ کے یہاں جمع ہوتے ہیں اُس وقت شہزادہ بختیار پیدا ہوتا ہے، جب وہ سات برس کا ہوتا ہے اُس وقت درویشوں کی ملک شہپال سے ملاقات ہوتی ہے اور اُن کا مقصود بر آتا ہے، دوسرے درویش کو بصرے کی شہزادی سے جُدا ہوئے کم از کم بارہ برس ہو جاتے ہیں ..... افسانہ نگار یہ نہیں بتاتا کہ اس سات برس سے زیادہ عرصہ میں اُن شہزادیوں پر کیا گزری۔ ایک کے علاوہ سب جنوں یا جادوگروں کے قبضے میں تھیں۔ مصنف نے یہ غور نہیں کیا کہ وہ غیروں کے پاس اتنی مدّت تک کس طرح محفوظ اور باعفّت رہیں ...."[13]

باغ و بہار کے قصے میں مکانی لحاظ سے بھی بعض بے سروپا باتیں ملتی ہیں۔ پہلے درویش کی کہانی میں قصہ کا ہیرو یمن کا باشندہ ہے۔ وہ دمشق میں اپنی محبوبہ کا عیسٰی جرّاح سے علاج کراتا ہے اور عیسٰی جرّاح کو رخصت کے وقت عطر پان پیش کرتا ہے (باغ و بہار ص: ۳۵) ایک یمن کے باشندے کا دمشق میں مہمان کو رخصت کے وقت عطر پان دینا محلِ نظر ہے کیوں کہ یمن اور دمشق میں عطر پان کا رواج نہیں۔ یہ ہندوستان کی خاص چیزیں ہیں اور ان کا استعمال دمشق میں ہونا داستان نویس کی معلومات کی کمزوری کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے بھی اس فروگزاشت پر اعتراض کیا ہے (ادب اور ادیب ص ۱۸۷)۔

ڈاکٹر گیان چند کے مطابق پروفیسر محمود شیرانی نے بھی اس قصّے میں جغرافیائی معلومات کی کمزوریوں پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً خواجہ سگ پرست بحری جہاز کے ذریعہ نیشاپور سے روانہ ہوتا ہے اُسے اس کے بھائی پانی میں گرا دیتے ہیں۔ پانی سے برآمد ہوکر وہ زندانِ سلیمان میں قید ہوتا ہے۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندانِ سلیمان ایران کے قریب کسی اسلامی شہر میں واقع تھا، لیکن جب وہ زندانِ سلیمان سے رہا ہوتا ہے تو وہ زیرباد کا ملک ہوجاتا ہے۔ زیرباد سے خواجہ سگ پرست خشکی کے راستے سراندیپ جاتا ہے۔ زیرباد سے خشکی کے راستے سراندیپ جانا جغرافیائی لحاظ سے اس لیے درست نہیں کہ سراندیپ بحرِ عرب کا ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے اور خشکی کے راستے وہاں جانا ممکن نہیں [12]

باغ و بہار میں تصورِ مکان کے ماتحت ایک دل چسپ خامی کی یہ مثال بھی ملتی ہے کہ تیسرے درویش کی کہانی میں نعمان سیاح ملک فرنگ کی سیاحی کے حالات بیان کرتا ہے اور وہاں کی پختہ شاہ راہوں پر چھڑکاؤ کا ذکر کرتا ہے (باغ و بہار ص ۱۹۱) ملک فرنگ سے مراد انگلستان ہونا چاہیے اور انگلستان جیسے سرد ملک میں سڑک پر چھڑکاؤ داستان نویس کی مضحکہ خیز جغرافیائی معلومات کا مظہر قرار دیا جائے گا۔

باغ و بہار میں تصورِ مکان کی یہ دل چسپ خامی بھی نظر آتی ہے کہ داستان نویس فارس اور عجم کو، جو دراصل ایک ہی ملک یعنی ایران کے دو نام ہیں۔ دو الگ الگ ملک سمجھتا ہے اور اپنے اسی ناقص مفروضے کے باعث دوسرے درویش کو فارس کے بادشاہ کا بیٹا بتاکر تیسرے درویش کو عجم کے بادشاہ کا فرزند کہتا ہے۔ داستان نویس کو اس بات کا احساس مطلق نہیں ہوتا کہ فارس اور عجم ایک ہی مُلک یعنی ایران کے دو نام ہیں اور وہاں ایک ہی وقت میں دو الگ الگ بادشاہوں یا اُن کے لڑکوں کا ذکر سراسر بے سروپا امر ہے۔

باغ و بہار کے پلاٹ پر بعض اور اجزا بھی ناقدین کے اعتراضات کا نشانہ بنے ہیں۔ دوسرے درویش کی کہانی میں نیم روز کے شہزادے کا ہر سلخ (سلخ = قمری مہینے کا آخری دن) کو ایک غلام کا قتل کرنا۔ اگر شہزادے کی دیوانگی مانی جائے تو درویش سے معاملات میں شہزادہ بالکل صحیح الدماغ نظر آتا ہے اور اُس میں دیوانگی کا شائبہ بھی نہیں ملتا۔ شہزادۂ نیم روز درویش کو خونِ ناحق کے خوف سے قتل نہیں کرتا۔ حالاں کہ یہی شہزادہ ہر ماہ ایک بے گناہ غلام کو قتل کرتا ہے ——
شہزادے کے عمل میں یہ بے تکا پن پلاٹ کا نقص قرار دیا جائے گا۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے قصّے کے اس جز پر متعدد اعتراض کیے ہیں۔ (اردو کی نثری داستانیں ص ۳۸۰)

بادشاہ آزاد بخت کی سرگذشت کے ماتحت خواجہ سگ پرست کے قصّے میں بھی بعض بے سروپا اور بے تکی باتیں محلِ اعتراض قرار دی جاتی ہیں۔ مثلاً خواجہ سگ پرست جیسے بوڑھے شخص کی شادی وزیر زادی جیسی گڑیاں کھیلنے والی نوعمر لڑکی سے ہونا پلاٹ میں بے تکے پن کا مظہر ہے۔ اس کے علاوہ خواجہ سگ پرست اپنے بھائیوں کو پنجرے میں بند رکھتا ہے اور اُنہیں کتّے کا جھوٹا کھانا کھلاتا ہے ——
لیکن شہر کا قانون اُسے انسانوں کے جنس بے جا پر روکتا نہیں۔

قصّے میں مذکورۂ بالا بے سروپا باتوں کے علاوہ بعض موقعوں پر بے جا تکرار اور بعض اجزا میں باہمی یکسانیت کی بھی خامیاں ہیں۔ مثلاً دوسرے درویش کی سیر میں نیم روز کے شہزادے کی کہانی میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ شہزادۂ نیم روز حسبِ معمول جب ایک غلام کو قتل کرکے واپس ہوا تو منع کرنے کے باوجود درویش نے شہزادے کا تعاقب کیا۔ شہزادے نے اُسے گھوم کر دیکھا۔ اس کے بعد بیان کیا گیا ہے:

"..... پھر وہ پھرا اور بڑے غصّے سے ڈانٹا، اور مقرر ارادہ میرے قتل کا کیا۔ میں نے سر جھکا دیا اور سوگند دی کہ اے رستم وقت کے! ایسی ہی ایک سیف مار کہ صاف دو ٹکڑے ہو جاؤں، ایک تسمہ باقی نہ رہے، اور اس حیرانی اور تباہی سے چھوٹ جاؤں، میں نے اپنا خون معاف کیا....." (باغ و بہار ص ۱۰۰)

بالکل ایسا ہی واقعہ تیسرے درویش کی کہانی میں بھی نظر آتا ہے ——
تیسرے درویش کی سیر میں فرنگ کی شہزادی کے قصّے کے ضمن میں سوداگر بیان کرتا ہے:

"..... ایک دن بازار میں کھڑا تھا کہ..... ایک طرف سے ایک جوان، رستم کا سا کلّہ جبڑا، شیر کی مانند گرجتا..... نظر آیا اور اس کے پیچھے دو غلام..... ایک تابوت..... سر پر لیے، چلے آتے ہیں۔ میں نے یہ تماشا دیکھ کر ساتھ چلنے کا قصد کیا جو کوئی آدمی میری نظر پڑتا، مجھے منع کرتا۔ لیکن میں کب سنتا ہوں؟ رفتہ رفتہ وہ جوان مرد ایک عالی شان مکان میں چلا۔ میں بھی ساتھ ہوا۔ اس نے پھرتے ہی چاہا کہ ایک ہاتھ مارے اور مجھے دو ٹکڑے کرے۔ میں نے اُسے قسم دی کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں، میں نے اپنا خون معاف کیا، کسو طرح مجھے اس زندگی کے عذاب سے چھڑا دے نہایت تنگ آیا ہوں....."

(ص ۱۹۸)

دوسرے اور تیسرے درویش کے قصّے میں واقعات کی اس مماثلت پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اعجاز حسین نے لکھا ہے: "..... دونوں واقعوں کے آخری جز کو دیکھیے۔ دونوں کرداروں کے جذبات ایک ہیں۔ الفاظ بھی قریب قریب ایک ہیں اور انجام بھی ایک ہی ہے..... واقعات..... میں اتنی مماثلت

بھی ایک بدنما دھبّہ ہے۔" (ادب اور ادیب ص ۷۹)

باغ و بہار کے تیسرے اور چوتھے درویش کے قصّوں میں بھی ایک مماثلت گراں گزرتی ہے۔ تیسرے درویش کی کہانی میں ملک فرنگ کے واقعات کے ضمن میں ہم دیکھتے ہیں کہ بادشاہ رحلت کے وقت اپنے بھائی کو اپنے کم سن شہزادے کے بارے میں وصیت کرتا ہے کہ جب تک شہزادہ سنِ شعور تک نہ پہنچے چچا حکومت کرے۔ شہزادہ جب بڑا ہو جائے تو چچا کی بیٹی سے اُس کی شادی کر دی جائے اور حکومت شہزادے کے حوالے کر دی جائے، مگر چچا اپنے مرحوم بھائی کی وصیتوں پر عمل نہیں کرتا۔ اور اپنے بھتیجے سے دغا کرتا ہے (باغ و بہار ص: ۱۹۵) چوتھے درویش کی سیر میں چین کے شہزادے کی کہانی میں بھی بالکل ایسے ہی واقعات ملتے ہیں۔ چین کا بادشاہ بھی اپنے کم سن فرزند کو اپنے بھائی کی نگرانی میں چھوڑتا ہے اور مرتے وقت وصیت کرتا ہے کہ شہزادے کے بڑے ہوتے ہی چچا حکومت شہزادے کے حوالے کر دے اور ساتھ ہی چچا اپنی بیٹی کی شادی بھی اپنے بھتیجے سے کر دے اور یہاں بھی چچا اپنے بھتیجے سے گھات کرتا ہے اور اپنے بھائی کی وصیّت پر عمل نہیں کرتا (باغ و بہار ص: ۲۰۸ تا ۲۱۱) تیسرے اور چوتھے درویش کے قصّوں میں واقعات کی متذکرہ بالا مماثلتیں بھی پلاٹ میں یکسانیت اور تکرار کی خامی کی مثال ہیں۔

باغ و بہار میں تیسرے اور چوتھے درویش کے قصّے پلاٹ اور کردار دونوں ہی اعتبار سے ناقدوں کی نظر میں کم زور قرار دیے جاتے ہیں ——
وقار عظیم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ ان آخری دو قصّوں میں داستان نویس کے فکر و فن میں تھکن کے آثار نظر آتے ہیں[15] امام مرتضیٰ نقوی نے بھی یہی بات کہی ہے کہ تیسرے اور چوتھے درویش کے قصّے میں داستان نویس تھکا تھکا محسوس ہوتا ہے[16]

باغ و بہار کے پلاٹ میں مجھے کئی واقعاتی فروگذاشتیں اور بھی ملی ہیں۔ جن کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ پہلے درویش کی کہانی میں خواجہ زادۂ یمن یعنی کہانی کا ہیرو دمشق کی شہزادی سے شادی کرتا ہے (باغ و بہار ص ص ۵۰ تا ۵۱) اور شادی کے بعد شہزادی غائب ہو جاتی ہے، لیکن جب باغ و بہار کے آخری حصّہ میں ملک شہپال کی مدد سے دمشق کی شہزادی تلاش کر لی جاتی ہے تو داستان نویس کے حافظے کی کمزوری ایک نیا گُل کھلاتی ہے اور ملک شہپال خواجہ زادۂ یمن کو دمشق کی شہزادی سے دوبارہ بیاہ دیتا ہے۔ (باغ و بہار ص ۲۳۵) اس طرح باغ و بہار کے پہلے درویش کے قصّے میں داستان نویس ہیرو اور ہیروئن کے عقد پر ایک بار اکتفا نہ کر کے اُن کی شادی دوبارہ کرا دیتا ہے۔ کہانی میں یہ واقعاتی فروگذاشت داستان نویس کے حافظے کی بھول چوک ہے۔ اور اسے داستان کے پلاٹ میں وحدت نہ ہونے کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے ——
یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ غلطی میر امّن کی باغ و بہار ہی تک محدود نہیں۔ بلکہ حسین عطا خاں تحسین کی نوطرزِ مرصّع (ص: ۱۲۰ نیز ص ۳۳۱) میں بھی یہی فروگذاشت جلوہ گر ہے۔ حیرت ہے کہ تحسین اور میر امّن دونوں ہی نے اس واقعاتی غلطی کو محسوس نہ کیا اور نوطرزِ مرصّع سے ہوتی ہوئی یہ فروگذاشت باغ و بہار میں بھی راہ پا گئی۔

باغ و بہار کے دوسرے درویش کی کہانی میں ملک نیم روز کے شہزادے کا قصّہ بیان کیا گیا ہے۔ اس قصّے میں نیم روز کا شہزادہ اپنی محبوبہ کو اس کے باپ یعنی جنوں کے بادشاہ سے اس شرط پر حاصل کرتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ سے جنسی تعلق نہ قائم کرے گا۔ نیم روز کا شہزادہ اپنے قول کا پاس نہیں کر پاتا اور سزا میں اس کی محبوبہ پر دائمی بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے اور وہ شہزادے کی کوششوں کے باوجود ہوش میں نہیں آتی۔ شہزادہ نیم روز خود بتاتا ہے: "....افسوس کہ پری ذرا بھی ہوش میں نہ آئی اور وہی حالت بے خودی کی رہی" (باغ و بہار ص ۱۱۲) کہانی میں شہزادۂ نیم روز کی محبوبہ اس طرح صرف بے ہوش رہتی ہے۔ اور غائب نہیں ہوتی۔ لیکن باغ و بہار کے آخری حصّے میں جب تمام کردار ملک شہپال کی مدد سے اپنا اپنا مقصود پاتے ہیں تو نیم روز کے شہزادہ کی محبوبہ عمان کے بادشاہ کے پاس سے برآمد ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں داستان نویس بیان کرتا ہے کہ ملک شہپال نے "ولایت عمان کے بادشاہ سے شہزادی جن کی، جس کے واسطے شہزادہ ملک نیم روز کا..... سودائی بنا تھا، مانگی، اُس نے بھی بہت سی عذر معذرت کر کے حاضر کی۔" (باغ و بہار ص: ۲۳۳) پھر اس کے بعد باغ و بہار کے آخری صفحہ پر بھی داستان نگار بتاتا ہے کہ ملک شہپال نے ".... شہزادہ نیم روز کو جن کی شہزادی حوالے کی" (باغ و بہار ص ۲۳۵)

واقعاتی اعتبار سے یہ بھی داستان نویس کے حافظے کا سہو ہے۔ قصّے میں نیم روز کے شہزادے کی محبوبہ پر دائمی بے ہوشی طاری ہونا تو بتایا گیا ہے، مگر محبوبہ کے غائب ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ جب نیم روز کے شہزادے کی محبوبہ غائب ہی نہیں ہوئی تو قصّہ کے آخر میں عمان کے بادشاہ کے پاس سے اس کا برآمد ہونا یا ملک شہپال کی محبوبہ کو اس کے عاشق کے حوالے کرنا واقعاتی اعتبار سے مہمل بات ہے۔ اور یہ بھی داستان نویس کے حافظہ کا سہو ہے۔ قصّے کی یہ واقعاتی فروگذاشت بھی پلاٹ کی خامی کا ثبوت قرار دی جائے گی۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ پلاٹ کی یہ خامی باغ و بہار ہی تک محدود نہیں بلکہ اسی واقعاتی فروگذاشت کو نوطرزِ مرصّع (ص ص ۲۰۵ تا ۲۰۶ نیز ص ص ۳۲۸ تا ۳۲۹) میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

چوتھے درویش کی کہانی میں ہیرو کو اس کی محبوبہ کا باپ نابینا فقیر کی حیثیت سے ملتا ہے۔ اس فقیر کو پہلے "ہندوستانی" بتایا گیا (باغ و بہار ص ۲۱۶) مگر کئی ہی صفحوں کے بعد وہی ہندوستانی فقیر "مردِ عجمی" بن جاتا ہے (باغ و بہار ص، ایک ہی شخص کو کبھی ہندوستانی بتانا اور کہیں عجمی کہہ دینا باغ و بہار کی وہ دلچسپ واقعاتی فروگذاشت ہے جس سے نوطرزِ مرصّع پاک ملتی ہے۔

قصّے کا بغور مطالعہ کرنے پر مجھے باغ و بہار میں ایک اور واقعاتی غلطی کا

باغ و بہار میں خاتمے کے قریب ملک شہپال کی مدد سے مختلف قصّوں کے بچھڑے ہوئے کردار ملتے ہیں اور متعلقہ عاشقوں کو ان کی محبوبائیں دے دی جاتی ہیں۔ اس موقع پر باغ و بہار (ص: ۲۲۵) میں یہ فقرہ بھی مرقوم ہے کہ "نیم روز کے بادشاہ کی بیٹی کو بہزاد خاں کو دیا"۔ یہ بھی واقعاتی سہو کی ایک دلچسپ مثال ہے۔ نیم روز کے بادشاہ کا ذکر دوسرے درویش کی سیر میں ہے اور بہزاد خاں تیسرے درویش کی سیر کا ایک کردار ہے۔ نیم روز کا بادشاہ اور بہزاد خاں دو مختلف کہانیوں کے کردار ہیں اور قصّے میں ان دونوں میں کوئی باہمی ربط نہیں ملتا۔ مزید برآں نیم روز کے بادشاہ کی کسی بیٹی کا قصّے میں سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ملتا اور جب نیم روز کے بادشاہ کی کوئی بیٹی نہیں تو اسے بہزاد خاں کے حوالے کرنا فاش غلطی ہے۔ یہ غلطی باغ و بہار کے مآخذ نوطرزِ مرصّع (ص ۳۳۱) میں بھی موجود ہے۔ حیرت ہے کہ حسین عطا خاں تحسین اور میر امّن دونوں ہی نے اس غلطی کو دُہرایا ہے۔ اور باغ و بہار کے متعدد ناقدین کو بھی یہ واقعاتی فروگذاشت اپنی جانب متوجہ نہ کر سکی کہ اس کی نشان دہی پہلے ہی ہو جاتی۔

باغ و بہار کے قصّہ اور پلاٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے علی عباس حسینی نے لکھا ہے:

> "جہاں تک قصّے کا تعلق ہے چہار درویش میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ وہی الف لیلہ کا رنگ ہے، شہزادے ہیں، شہزادیاں ہیں، وزیر ہے، سوداگر بچہ ہے، چور دروازے ہیں، سُرنگیں ہیں، تہہ خانے ہیں، مدفون خزانے ہیں، فقراء ہیں، درویش ہیں، جن ہیں، پریاں ہیں۔ پلاٹ میں نہ کوئی تموّج ہے نہ اُلجھاؤ ہے، نہ عروج ہے نہ انکشاف، ایک سپاٹ سیدھا سادہ قصّہ ہے کبھی ناظرین کو مزہ دیتا رہا ہوگا، لیکن جو بیسویں صدی میں بالکل ہی بے نمک اور بے جان ہے۔"[۱۷]

پلاٹ کے اعتبار سے ایسے کمزور قصّے کو میر امّن نے باغ و بہار میں ایسی فن کارانہ مہارت سے پیش کیا کہ وہ داستانی ادب کا شاہکار بن گیا۔ میر امّن کے سحر طراز قلم نے اس داستان میں زبان و بیان، انشاء پردازی، منظر نگاری، مکالمہ نگاری، کردار نگاری اور معاشرتی عکاسی کی مدد سے اس کے پلاٹ کی ساری خامیوں پر خوبیوں کی چادر ڈال دی۔ یہ صورتِ حال بھی میر امّن کی فن کارانہ عظمت پر دال ہے۔

## حواشی

۱۔ باغ و بہار میر امّن۔ مرتبہ رشید حسن خاں۔ مکتبہ جامعہ دہلی طبع دوم ص ص ۶ تا ۷

۲۔ صحیح نام میر محمد حسین عطا خاں تحسین تھا۔ دیکھیے نوطرزِ مرصّع: مرتبہ: ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی۔ ہندوستانی اکیڈمی یوپی الہ آباد۔ طبع ۱۹۵۸ء ص ۲۱

۳۔ امیر الدولہ پبلک لائبریری لکھنؤ میں ٹائپ میں چھپا ہوا باغ و بہار کا ایک قدیم نسخہ "راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے جس پر یہ عبارت درج ہے۔

۴۔ باغ و بہار: مرتبہ مولوی عبدالحق یونیورسٹی پبلشرز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ طبع ۱۹۵۶ء مقدمہ ص ۳

۵۔ باغ و بہار: مرتبہ رشید حسن خاں ص ص ۱۱ تا ۱۲

۶۔ مقالاتِ شیرانی: حافظ محمود شیرانی، کتاب منزل لاہور طبع ۱۹۴۸ء ص ص ۴۴ تا ۵۰ (بحوالہ مقدمہ نوطرزِ مرصّع مرتبہ: ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ص ۳۲ نیز ص ص ۳۷ تا ۴۰)

۷۔ بحوالہ نوطرزِ مرصّع ص ص ۳۲ تا ۳۵

۸۔ بحوالہ باغ و بہار کا تنقیدی جائزہ: امام مرتضیٰ نقوی اردو پبلشرز لکھنؤ طبع ۱۹۷۲ء ص ص ۳۴ تا ۳۵

۹۔ اُردو کی نثری داستانیں: ڈاکٹر گیان چند جین۔ کراچی طبع ۱۹۵۴ء ص ص ۳۷۹ تا ۳۸۰۔

۱۰۔ ایضاً ص ۳۸۰

۱۱۔ ادب اور ادیب: ڈاکٹر اعجاز حسین۔ الہ آباد طبع ۱۹۶۰ء ص ۱۸۴

۱۲۔ اُردو زبان اور فنِ داستان گوئی: کلیم الدین احمد۔ دائرۂ ادب، پٹنہ ص: ۱۸

۱۳۔ اردو کی نثری داستانیں: ص ص ۳۸۱ تا ۳۸۲

۱۴۔ ایضاً ص ۳۸۰ تا ۳۸۱

۱۵۔ ہماری داستانیں: وقار عظیم۔ رام پور۔ طبع نومبر ۱۹۶۸ء ص ص ۸۹ تا ۹۰

۱۶۔ باغ و بہار کا تنقیدی جائزہ ص ۹۹ نیز ص ۱۰۹

۱۷۔ ناول کی تنقید اور تاریخ: علی عباس حسینی۔ انڈین بک ڈپو لکھنؤ طبع اوّل ص ۱۶۱۔

●●

ایم۔ اے۔ حمید

# رونے کا فن

رونا دھونا مہذب سماج میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ آنسو، چاہے وہ خوشی کے ہوں یا سوگواری کے، دیگر افراد کے لیے وبالِ جان ہوتے ہیں۔ چاہے کتنی ہی سنگین افتاد کیوں نہ آن پڑے، سنجیدہ افراد اشک باری سے گریز کرتے ہیں، لیکن آنسوؤں کا سیلاب بعض اوقات حالات کے دباؤ کے نتیجے میں طوفانِ بے کراں کی طرح لمحہ بہ لمحہ اُمڈتا چلا آتا ہے اور نہ صرف سوگوار افراد کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے بلکہ دیگر لوگوں کے لیے بھی افسردگی کا سامان پیدا کرتا ہے۔ شاہدین خواہ کتنے ہی سخت جان اور سنگ دل کیوں نہ ہوں، اپنی بساط بھر کوشش کریں گے کہ گریہ مند کی اشک شوئی کریں۔ صدیوں سے یہ اشک شوئی انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کی جاتی رہی ہے، لیکن جدید تحقیقات کے حوالے سے آج کل یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ رونا پیٹنا انسانی صحت و تن درستی کے لیے نہ صرف مفید بلکہ ناگزیر ہے۔

انسانوں کے علاوہ حیوان بھی وقت بے وقت آنسوؤں کی بوچھار کرتے ہیں، لیکن حیوانوں کے آنسو جذبات سے قطعی طور پر عاری ہوتے ہیں، جب کہ انسان کے آنسو کسی نہ کسی جذباتی رجحان کی عکاسی کرتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ جذباتی ردِ عمل کے طور پر بہنے والے آنسو رونے والوں کے لیے مفید ہوتے ہیں کیوں کہ اس سے قدرتی طور پر رنج و الم یا سوگواری سے متاثر ہونے والے اعضاء کی کارکردگی (جو وقتی طور پر مفلوج ہو جاتی ہے) پھر سے بحال ہوتی ہے۔ ایک بار جب لوگ روتے پیٹتے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں تو اُن کا بوجھ بڑی حد تک کم ہو جاتا ہے۔ گلیسرین کے استعمال سے پیدا ہونے والے آنسو صرف گناہ بے لذت ہوتے ہیں۔ اسی طرح پیاز کاٹتے وقت جو آنسو خود بخود بہہ نکلتے ہیں، اُن کی بھی طبی افادیت ثابت نہیں ہو سکی۔ جب تک انسان کے جسم سے رطوبت مناسب مقدار میں خارج ہوتی رہتی ہے (خواہ آنسو کے ذریعے یا پسینہ کے ذریعہ) اعضائے رئیسہ کی کارکردگی ٹھیک رہتی ہے۔ چنانچہ بعض افراد جو پیہم مصائب و آلام کا شکار ہو کر مسلسل گریہ وزاری میں زندگی کے دن کاٹتے ہیں، بہی لمبی عمروں کو پہنچتے ہیں۔ یہی حال محنت کش افراد کا ہوتا ہے، جو دن رات ایک کر کے گاڑھے پسینہ کی کمائی کھاتے ہیں۔ اُن کے ہر عضو میں فولادی طاقت ہوتی ہے۔ جس طرح گاڑی کی رفتار پر قابو پانے کے لیے وقفہ وقفہ سے گیئر بدلنا پڑتا ہے، گریہ مند بھی روتے وقت کچھ ایسی حکمتِ عملی اختیار کرتے ہیں۔ سب سے پہلے اپنی شکل پر جھاڑو پھیرتے ہیں یعنی نشتر کی طرح تیز ناخنوں کا استعمال کرتے ہیں اور خود اپنے چہرے سے تبسم اور مسکراہٹ نوچ ڈالتے ہیں اور اس کی جگہ حسرت و مایوسی، افسردگی و پژمردگی سے چہرے کو آراستہ کرتے ہیں۔ ایک بار ماحول کی آلودگی کے بارے میں اطمینان ہو جاتا ہے تو دھیمی آواز میں سرگوشیاں کرتے ہوئے سوز آن کیا جاتا ہے۔ رونے کا موڈ بنانے کے لیے کچھ دیر مونہہ بند رکھ کر آواز کی ذخیرہ اندوزی کی جاتی ہے۔ جتنا دبانے کی کوشش کی جاتی ہے اُتنی ہی طاقت سے وہ باہر نکلنے کے لیے جد و جہد کرتی ہے۔ اس دوران کوئی نہ کوئی بے ہنگم آواز ہلکے پھلکے دھماکے کے ساتھ باہر نکل پڑتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے گاڑی MISFIRE کرتی ہے۔ اب اندیشہ ہوتا ہے کہ حلق میں کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہے اس رُکاوٹ کو دور کرنے کے لیے قوالوں اور گویوں کے تجربے سے استفادہ کرتے ہوئے زور زور سے کھوکتے ہوئے حلق صاف کیا جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں غرارہ بھی کرنا پڑتا ہے۔

انسان کے ہر عمل کے دو نمایاں پہلو ہوتے ہیں۔

● بتوسط شیخ عبدالعزیز العبد اللہ السلیمان (انشورنس ڈویژن) پوسٹ بکس ۱۸۶۶، جدہ (سعودی عرب)

ایک کامیاب، دوسرا ناکام، کامیاب طریقے سے رونے کے لیے آنسوؤں کا مناسب مقدار میں اخراج ضروری ہے۔ بعض افراد متبادل راستہ اختیار کرتے ہوئے صرف "آوازوں" سے کام چلاتے ہیں۔ جب لوگ وقت بے وقت مونہہ بسورنے کے عادی ہوجاتے ہیں تو ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جہاں رونا دھونا ان کی شخصیت پر حاوی ہوجاتا ہے۔ جب آپ ان ہستیوں کا سامنا کرتے ہیں تو خود بخود آپ کے دل میں ایسے افراد کے لیے ہمدردی کے جذبات اُمڈنے لگتے ہیں اور آپ رضاکارانہ طور پر ایسے شخص سے اظہارِ تعزیت کرتے ہیں (خواہ وہ اجنبی ہی کیوں نہ ہو) اکثر صورتوں میں تیر غلط نشانے پر بیٹھتا ہے اور جب آپ پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ آپ نے غیر دانستہ طور پر بھلے چنگے انسان پر اپنی تعزیت لُٹائی ہے تو اس حماقت پر آپ سراسر شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلطی آپ کی ناتجربہ کاری کے سبب نہیں ہوتی بلکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ بعض اشخاص شکل و صورت سے "رونے دھونے کا اشتہار" نظر آتے ہیں۔

بعض افراد کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کی آنکھیں خشک سالی کا شکار ہوتی ہیں۔ وہ کسی بھی ناگہانی صورتِ حال سے دوچار ہونے کے باوجود آنسو بہانے سے قاصر رہتے ہیں۔ اشکِ شادی (خوشی کے آنسو) کا تو ذکر ہی کیا، شدید سوگواری کے موقعوں پر بھی اُن کی آنکھیں قحط زدہ نظر آتی ہیں۔ چنانچہ خشک آنکھ والے افراد عزیز و اقارب کے انتقال پر بھاڑے کے ٹٹوؤں کی خدمات حاصل کرتے ہیں، جو مناسب اُجرت پر اندھا دُھند طریقے سے آہ و بکا کرتے ہوئے سوگواروں کے گھر میں کہرام مچاتے ہوئے مصنوعی قیامت بپا کرتے ہیں۔

ہم نے کتابوں میں یہی پڑھا ہے کہ رونا دھونا ایک فطری عمل ہے، جو حالات کے ردِ عمل کے طور پر ہر انسان کو آنسو بہانے پر مجبور کر دیتا ہے، لیکن اس وقت ہمیں اپنی گمراہی کا احساس ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر سوگواری کے موقعوں پر متعلقہ افراد پتھر کے مجسموں کی طرح ساکت و جامد بیٹھے رہتے ہیں اور غیر متعلقہ افراد صورتِ حال کا استحصال کرتے ہوئے غیر ضروری شور و غوغا اور آہ و فغاں بپا کرتے ہیں۔

پیشہ ور اشک فروش آنسوؤں کی باقاعدہ کاشت کرتے ہیں۔ کھاد اور پانی فراہم کرکے آنسوؤں کا اسٹاک گوداموں میں جمع کرتے ہیں۔ متعدد بیماریاں، آفاتِ سماوی اور دنگے فساد ملک کو جب کبھی اپنی لپیٹ میں لیتے ہیں تو اشک فروشوں کا کاروبار چمک اُٹھتا ہے۔ پہلے تو اپنی اُجرتیں دوگنی اور تین گنی کر دیتے ہیں۔ پھر سنجیدگی سے رونے پیٹنے کی بجائے جھوٹ موٹ کے ٹسوے بہا کر دام کھرے کرتے ہیں۔ کیوں کہ اُنہیں ایک لاٹھی سے سب کو ہانکنا پڑتا ہے۔

تمام لوگ اخلاقی طور پر پابند ہوتے ہیں کہ اپنی سماجی حیثیت کے مطابق آنسو بہائیں۔ حکمرانوں کے رونے کا انداز شاہانہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے باوقار منصب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بردباری اور متانت سے روتے ہیں۔ سیاستداں روتے ہوئے ڈھکوسلے بازی کرتے ہیں۔ کمسن بچے روتے وقت پھرتی سے ہاتھ پیر زمین پر پٹختے ہیں۔ عوام کا انداز عامیانہ ہوتا ہے۔ بھکاری پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے مہیب اور بھیانک آوازوں کے ذریعے دوسروں کو متاثر کرتے ہیں۔ کبھی ہلکی پھلکی سسکیوں کا سہارا لیتے ہیں تو کبھی پوری طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گڑگڑاتے ہیں۔ وہ یکے بعد دیگرے پینترے بدلتے جاتے ہیں۔ اگر دوسروں پر خاطر خواہ ردِ عمل ہو رہا ہو تو اپنی کارکردگی کو وسعت دیتے ہوئے ہچکیوں تک پہنچ جاتے ہیں یا نہیں تو غش کھا کر گرنے کا ڈرامہ کرتے ہیں۔

شیر خوار بچے روتے ہیں تو بعض صورتوں میں یہ صحت مندی کی علامت ہے اور بعض اوقات اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُنہیں کچھ نہ کچھ تکلیف ہے یا بھوک لگی ہے۔ سمجھدار بچے روتے ہیں تو یہ ضدی پن کی علامت ہے۔ اس طرح وہ اپنے جائز و ناجائز مطالبات منوانا چاہتے ہیں۔ غنڈے، بدمعاش اور دیگر مجرم تفتیش کے دوران ایذا رسانی سے بچاؤ کی خاطر دل سوز چیخیں مار مار کر اپنی بے گناہی کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔

بعض افراد سیاسی و سماجی مصلحتوں کے پیشِ نظر سوگواری کی محفلوں میں شرکت کرتے ہیں۔ اپنی گوناگوں مصروفیات کے سبب اُنہیں چار آنسو بہانے کی بھی فرصت نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایسے لوگ "سیاہ چشموں" کا استعمال کرتے ہیں۔ جب بھی کسی نامور شخصیت کا انتقال ہوتا ہے تو بازاروں میں سیاہ چشموں کے دام دوگنے ہوجاتے ہیں۔

گریہ و زاری کا محرک چاہے قدرتی اسباب ہوں یا صرف پیشہ ورانہ ضروریات دونوں صورتوں میں آواز کو کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ مشاعروں میں بعض شعراء حاضرین کی اکثریت کا پسندیدہ کلام کبھی مترنم ہوکر، کبھی رقص و سرود کے ساتھ اور کبھی لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ سناتے ہیں۔ وہ مشاعروں کو لُوٹ لیتے ہیں۔ شاعر کو جس بھاؤ سے "داد" یا "بیداد" ملتی ہے اُسے معیار بنا کر اس کا فن پرکھا جاتا ہے۔ چنانچہ کئی بلند پایہ اُستاد اور صاحبِ دیوان شعراء مشاعروں میں غیر معیاری اور نوٹنکی باز شعراء کے ہاتھوں بُری طرح ہزیمت اُٹھاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح سوگواری کے موقعوں پر جو شخص سب سے زیادہ رقت انگیز چیخیں مار مار کر آسمان سر پر اُٹھاتا ہے وہ محفل پر چھا جاتا ہے۔ سب اس کے کمالِ فن کو سراہتے ہوئے اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ وہ انکساری سے جُھک جُھک کر آداب بجا لاتا ہے اور پھر جوش میں آکر مزید اونچی آواز میں گلا پھاڑتا ہے۔ اس دوران ہمدرد اور غم گسار افراد بڑی ہی عقیدت سے بار بار ٹھنڈے پانی کا گلاس بھر کر اس کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ وہ حلق گیلا کرتا ہے اور پھر سے رونے پیٹنے لگتا ہے۔ کافی دیر تک آہ و بکا ہوتی ہے تو ساری فضا مکدر ہوجاتی ہے۔ جو افراد اس دوران اپنے حواس درست کرنے میں مصروف تھے۔ وہ پھر سے تازہ دم ہوکر سرگرمی کے ساتھ رونے لگتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں شہزادوں اور امیرزادوں کو فنِ سپہ گری سے لے کر شہ سواری تک ہر قسم کی تعلیم و تربیت شاہی محلات کی چہاردیواری میں دی جاتی تھی۔ شہزادے کی دل بستگی کی خاطر دو یا تین ہم عمر لڑکے "مصاحب" بنا کر اس تربیت میں شامل کردیے جاتے تھے۔

شہزادوں کا یہ عالم تھا کہ شہزادہ جب کبھی کوئی غلطی کرتا تھا تو اسے سزا کبھی براہِ راست نہیں دی جاتی تھی۔ بلکہ اس کام کے لیے اُس کے مصاحب کو قربانی کا بکرا بنایا جاتا تھا۔ شہزادہ کسی روز اپنا سبق یاد کرنے میں کوتاہی کرتا تھا تو اس کا کمسن حاشیہ بردار ڈانٹ ڈپٹ کا شکار ہوتا تھا۔ شہزادہ سے کوئی سنگین غلطی سرزد ہوتی تھی تو اس کا ساتھی سزا پاتا تھا۔ شہزادہ اس قدر حساس طبع ہوتا تھا کہ جب کبھی اس کے ساتھی کو ڈانٹ ڈپٹ کی جاتی تھی تو وہ خود سہم جاتا تھا۔ ساتھی کو بید پڑتے تھے تو شہزادے کی چیخ نکل پڑتی تھی۔ کچھ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ پھر شہزادہ اتالیق سے درخواست کرتا تھا کہ وہ فوراً اپنا ہاتھ روک لے۔ غرض بادشاہوں اور امراء کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ اپنی اولاد کو رونے دھونے سے ہر طرح محفوظ رکھیں۔

اس قسم کے ماحول میں تربیت پاکر بعض شہزادے جب عملی زندگی میں قدم رنجہ فرماتے تھے تو دل آزاری اُن کے مزاج کا ایک حصہ بن جاتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ ناگہانی صورتِ حال سے دوچار ہونے کے باوجود اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے بے نیاز ہوتی تھیں بلکہ وہ اکثر و بیشتر تفریحِ طبع کی خاطر اپنے حاشیہ برداروں کو رونے کے لیے مجبور کرتے تھے۔ بعض اوقات لگاتار دو دو گھنٹے تک آہ و زاری کی جاتی، شہزادے کو رونے کا انداز پسند آتا تھا تو وہ خوش ہوکر انعام و اکرام کی بارش کرنے لگتا تھا۔

شرابی نشہ کی حالت میں "گریۂ مستانہ" کرتے ہیں۔ وقتی طور پر ان کی یادداشت مفلوج ہوجاتی ہے۔ تازہ واقعات (خواہ خوشی ہو یا غم) اُن کے ذہن سے غائب ہوجاتے ہیں۔ اس کے برخلاف برسوں پرانے واقعات اُن کے دماغ کی کھڑکیوں سے ٹکراتے ہیں۔ اور وہ ان واقعات کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ کبھی اپنی کامیابی کا تصور کرکے اُچھل کود کرتے ہیں تو کبھی اپنی ناکامیوں سے دل برداشتہ ہوجاتے ہیں۔ عمر رسیدہ شرابی جام پر جام لنڈھاتے ہوئے اپنے بچپن کے کسی نہ کسی غمگین واقعہ سے اُلجھ جاتے ہیں۔ عزیزوں کی ریشہ دوانیاں، دوستوں کی بے وفائیاں اور محبوبہ کی بے التفاتیاں، ان تمام واقعات کا تصور کرتے ہی اُن کے زخم ہرے ہوجاتے ہیں۔ اور وہ زار و قطار رونے لگتے ہیں۔ شرابی کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ زندگی کے کئی برس گھول کر پی چکا ہے، لیکن شراب کا نشہ سر چڑھ کر بولتا ہے تو وہ خود کو شیر خوار سمجھتا ہے۔ اور پرانی باتوں کو یکے بعد دیگرے یاد کرکے دُکھ سے بوجھل ہوجاتا ہے۔ جب اس کے پاس بے شمار واقعات کا ذخیرہ جمع ہوجاتا ہے تو وہ باقاعدگی سے اُن کا "پوسٹ مارٹم" کرتے ہوئے روتا ہے۔

عام حالات میں انسان کچھ دیر روتا ہے تو خود بخود تھک جاتا ہے، لیکن کمبخت شراب بھی ایسی چیز ہے، جس کا ردِ عمل مختلف لوگوں پر مختلف صورتوں میں اثر انداز ہوتا ہے۔ بزدل شراب پی کر نڈر اور بے خوف محسوس کرنے لگتا ہے۔ طاقتور شراب کے نشہ میں ڈرپوک بن جاتا ہے۔ نارمل مزاج کا انسان شراب پیتا ہے تو غیر معمولی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ سب سے دلچسپ بات تو یہ ہوتی ہے کہ جو لوگ عام حالات میں ایک دوسرے سے نظر ملانا گوارہ نہیں کرتے وہ شراب کے نشہ میں نہ صرف ہم خیال ہوجاتے ہیں بلکہ "جڑواں بچوں" کی طرح یکساں قسم کی حرکتیں کرنے لگتے ہیں ــــــ چنانچہ دو چار شرابی جب نشہ میں دُھت ہوجاتے ہیں تو تصور کی دنیا میں اپنے کسی قریبی عزیز یا رشتہ دار کی موت کا تماشہ کرتے ہیں۔ مفروضوں کی بنیاد پر ایک شرابی مرنے والے کا بیٹا بن جاتا ہے اور دیگر افراد دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے زور زور سے رونے پیٹنے لگتے ہیں۔ اُن کا رونا اس قدر غیر منظم ہوتا ہے کہ نہ تو آوازوں میں یکسانیت ہوتی ہے نہ اُن کی حرکات میں۔ سب کے سب نیم بے ہوش ہوتے ہیں۔ کسی کا ہاتھ کسی کے سر سے ٹکراتا ہے تو کوئی کسی سے گلے ملتا ہے۔ غرض انہیں خود پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ بعض شرابی روتے روتے یکایک ہنسنے لگتے ہیں۔ کچھ دیر بعد پھر سے رونے کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ ایک جام حلق سے اُتارا، کچھ دیر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا پھر دوسرا جام نوش کیا۔ غرض جتنی بار جام حلق سے اُتارا اُتنی بار ایمانداری سے لمبی لمبی تان کھینچ کر روتا گیا۔

مَردوں کی دُشواری یہ ہوتی ہے کہ جب تک خاطر خواہ "موضوع" ہاتھ نہیں لگتا وہ رونے دھونے سے پس و پیش کرتے ہیں۔ گھنٹوں سوچ بچار کرتے ہیں۔ یادداشت پر زور ڈالتے ہیں اور پچھلی زندگی کی کچھ نہ کچھ افسانہ یا المیہ ڈھونڈ نکالتے ہیں اور روتے ہیں ــــ سیاستداں انتخابات میں حریف اُمیدوار کے ہاتھوں پسپائی کو یاد کرکے رنجیدہ ہوجاتا ہے۔ ایک پنتھ دو کاج کے مصداق عوام کی حالتِ زار پر مگرمچھ کے آنسو بہاتا ہے۔ اس طرح نہ صرف اُن کے زخموں پر نمک چھڑکتا ہے بلکہ اپنے لیے سیاسی فوائد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اداکار پچھلی کئی فلموں کی ناکامی سے دل برداشتہ رہتا ہے اور شوٹنگ کے دوران گلیسرین کے بغیر آنسو ٹپکاتا ہے۔ تاجر انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کے اچانک دھاووں کا تصور کرکے پریشان ہوجاتا ہے۔ اور رونے کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

اس کے برخلاف رونے پیٹنے کے معاملہ میں خواتین کسی بھی "موضوع" کی دست نگر نہیں ہوتیں وہ غیر مشروط طریقہ پر کسی بھی لمحہ آنسو بہا سکتی ہیں اور دھواں دھار گریہ و زاری کرتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کا شاندار مظاہرہ کرسکتی ہیں۔ اُن کے آنسو ہیروشیما اور ناگاساکی پر قیامت ڈھانے والے ایٹم بم کے دھماکوں سے زیادہ مہلک ہوتے ہیں۔ جس نے ان آنسوؤں کو دیکھنے کی جسارت کی، وہ ہمیشہ کے لیے اپنی بینائی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، جس نے گریہ و زاری سُنی وہ سماعت سے محروم ہوجاتا ہے اور جس نے گرما گرم آنسوؤں سے خود کو آلودہ کیا وہ زندگی بھر کے لیے مفلوج اور اپاہج ہوجاتا ہے۔ جس لمحہ عورت کی آنکھ سے آنسو ٹپکتے ہیں، ٹھیک وہیں سے مرد کی بربادی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ عورت آنسو بہاکر وہ سب کچھ حاصل کرنے کی اہلیت رکھتی ہے جو ایک مرد اپنی فطری ذہانت، قابلیت اور طاقت کے باوجود حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

●●

انجمن ترقی اردو (ہند)



## تاثیر
(سانیٹ)

میں نے اک نغمہ سنایا تھا تری محفل میں!
ایسی حالت میں کہ تھا ساز شکستہ میرا
دل کا خوں آنکھ میں تھا، آنکھ کے آنسو دل میں!
یعنی تار نفس آواز شکستہ میرا
میں نے دیکھا کہ ترے دل پہ اثر تک نہ ہوا!
رحم کا تری نگاہوں میں گزر تک نہ ہوا!
میری فریاد حزیں خواب پریشاں ہی رہی
دل میں امید جو تھی یاس بداماں ہی رہی
ساز کو پھینک دیا با دل غمگیں میں نے
اُس کے تاروں نے کبھی پھر نہ سنایا نغمہ
ناامیدی کے سوا کوئی لب پہ نہ آیا نغمہ
گرچہ لکھے ہی کئی نغمۂ خونیں میں نے!
آج حیرت ہے مگر اے جاں مجھے اس راز پہ ہے!
اپنی آواز کا دھوکا تری آواز پہ ہے!

اختر شیرانی

## حباب ہاشمی

مجبور رہتے جو اک سازِ بے صدا مجھ کو
وہ سن سکیں تو سنیں آج بر ملا مجھ کو

مجھے وہ دیکھ کے منزل پہ آج حیراں ہے
سمجھ کے چھوڑ گیا تھا، شکستہ پا مجھ کو

یہ اور بات کہ نظریں بچا گیا لیکن
گزر گیا ہے اِدھر سے وہ دیکھتا مجھ کو

وہیں پہ منزلِ مقصود آ کے ٹھہری ہے
جہاں پہ چھوڑ گیا میرا قافلہ مجھ کو

میں اک ستون ہوں تہذیب اور ثقافت کا
میں گر رہا ہوں ذرا بڑھ کے تھامنا مجھ کو

نہ رہروی کا سلیقہ نہ رہبری کا شعور
مگر یہ ضد ہے کہو اپنا رہنما مجھ کو

حبابؔ جس کو میں اپنا کبھی بنا نہ سکا
تمام عمر رہا اُس سے واسطہ مجھ کو

مرا قیام دیکھنا ، مرا قرار دیکھنا
بکھر گیا ہوں میں قطار در قطار دیکھنا

ابھی سے میری لغزشوں کو دیکھنا فضول ہے
حریف کوئی ہو تو مجھ سا شہسوار دیکھنا

کہر کی چادریں ابھی خلاؤں پر محیط ہیں
فضائیں صاف ہوں تو صبح زر نگار دیکھنا

مرا وجود اِس طرف ، مرا وجود اُس طرف
کھڑا ہوا ہوں میں خلا کے آر پار دیکھنا

شکست خوردگی کے باوجود سرفراز ہوں
زہے نصیب ہر قدم صلیب و دار دیکھنا

نئی غزل صدائے بازگشت اس صدی کی ہے
نئی غزل میں جدّتوں کے آبشار دیکھنا

حبابؔ اس سے دل کی بات کہہ کے مطمئن ہوں میں
بھڑک اُٹھیں نہ پھر کہیں دبے شرار دیکھنا

## قیصر محمود

حُسن اپنی صفات میں گُم ہے
روشنی جیسے رات میں گُم ہے

حُسن چُپ ہے کہ چُپ ہے آئینہ
کون کس کی صفات میں گُم ہے

ذکر تیرے وجودِ معنیٰ کا
سرسری واقعات میں گُم ہے

منحرف ہو کے جستجو سے تری
آدمی کائنات میں گُم ہے

ایک بُت کی تلاش میں قیصرؔ
آگہی سومنات میں گُم ہے

• ۲۳۵۔ بجھتی بازار، الہ آباد ۳ (یو۔پی)
○ محمد خاں ٹھیکیدار ہاؤس، ہاتھی خانہ روڈ، بھوپال (ایم۔پی)

نامی انصاری

ہوائیں اجنبی ، منظر پرانا
ابھرتا لمحہ ، ڈر بر پُرانا

نیا ہو جائے گا مسِ بدن سے
شکستہ ، ریختہ ، پیکر پُرانا

لبوں پر اُس کے روشن حرفِ معنی
مرے لفظوں کا آبِ زر پُرانا

شکستِ بام و در کا سوچنا کیا
کہاں تک ساتھ دے گا گھر پُرانا

وہی آویزشیں دنیا جہاں سے
وہی تیشہ ، وہی تیور پُرانا

فضائے جاں تو ہے سرسبز اب بھی
ہوا میں تیرتا نشتر پُرانا

وہ میرا غیر بھی ہے آشنا بھی
نیا باہر سے ہے اندر پرانا

تحفظ کا ہے جو ہر لمحہ طالب
اُسی کے ہاتھ میں پتھر پُرانا

یہی سب ہے متاعِ شوق نامی
مئے آتش بجاں ، ساغر پُرانا

◘ ۷۱/۹۷ - پر مٹیہ ، کانپور ۲۰۸۰۰۱ - یو - پی

سردار شفیق

مشامِ جاں ہے مرے میہمان کی خوشبو
یہ ایک شخص ہے سارے مکان کی خوشبو

روایتوں میں ہوئی تجربوں کی آمیزش
یقیں کو چھونے لگی ہے گمان کی خوشبو

مری دعا ہے تجھے پھر خدا عطا کر دے
وہی نگاہ کا جادو زبان کی خوشبو

اُڑا کے لے گئی کس کی رقابتوں کی سموم
ہمارے اور ترے درمیان کی خوشبو

برائے نام سہی رابطہ تو رکھتی ہے
مری زمیں سے ترے آسمان کی خوشبو

میں کتنا خوش ہوں مرے مختصر سے آنگن میں
چہک رہی ہے بھرے خاندان کی خوشبو

ہمارے گاؤں کی بارش کا خاص عطیہ ہے
یہ سوندھی سوندھی سی کچے مکان کی خوشبو

دلوں کو چھوتی ہوئی رُوح میں اُتر جائے
ترے سخن کی حلاوت میں بیان کی خوشبو

ترے قریب سے اُٹھا تو یہ ہوا محسوس
بدن سے پھوٹ رہی ہے تکان کی خوشبو

◘ قاسم پورہ ، مئو ناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱ - یو - پی

آزاد گورداس پوری

سفر یہ پیار کا ہے ، صرف دل سے دل تک ہو
رفاقتوں پہ ہماری کسی کو کیوں شک ہو

اک اک گلی میں گئے ، شہر سارا دیکھ آئے
ملا نہ کوئی کہ جنسِ وفا کا گاہک ہو

ہزار راہ ہو اپنی جُدا جُدا لیکن
ملن ہمارا کسی موڑ پہ اچانک ہو

ہم آئینے میں تمہیں دل میں چاند دکھلائیں
سوال یہ ہے ، کوئی کرشن جیسا بالک ہو

برائی چاہیں کسی کی ، کسی کو ایذا دیں
خدا کرے ، نہ ہمارا کبھی یہ مسلک ہو

چٹک رہی ہے کلی اس طرح گلستاں میں
کہ جیسے دل پہ کسی مہ جبیں کی دستک ہو

وہ زندگی کے غم و روز کس طرح کاٹے
عذاب جس کے لیے اپنے دل کی دھڑکن ہو

یہ کیا ضرور ہے ، ہو صاحبِ بصیرت بھی
[illegible] کتابوں کے حق میں [illegible]

حیاتِ شوق کو دو رنگِ دل کشی آزاد
کہ اس فسانے کا انجام کیوں بھیانک ہو

◘ انجنیئر کوارٹر نمبر ۴ بلاک نمبر [illegible]

## ملک زادہ جاوید احمد

رشتوں کے احترام سے انجان ہے بہت
اتنی ہمارے عہد کی پہچان ہے بہت

تنہا ہے چاند رات بھی سنسان ہے بہت
ایسے میں مجھ کو میر کا دیوان ہے بہت

اچھے لگے تو لے لیے انگارے ہاتھ میں
بچوں کی طرح دل مرا نادان ہے بہت

سورج ہوں میں چراغ نہیں، آندھیو سنو
اس جنگ میں تمہارا بھی نقصان ہے بہت

فکرِ معاش نے اسے بوڑھا بنا دیا
آئینہ اس کو دیکھ کے حیران ہے بہت

جاوید اپنی سادہ مزاجی کو چھوڑ دے
اس دور میں لباس کی پہچان ہے بہت

## عشرت ظفر کلیمی

پھول، شعلہ، سنگ، شبنم یا شررؔ جیسا بھی ہے
ہے ہمیں پیارا بہت وہ بے خبر جیسا بھی ہے

نصب تپتی ریت پر ہے خیمہ اُس کی یاد کا
زندگی کے دشت میں اک گوشۂ گھر جیسا بھی ہے

بہہ رہا ہے سبز شاخوں کی رگ و پے میں ہراس
اس ہوائے نرم رو میں کچھ، تبر جیسا بھی ہے

صف میں یاروں کی نمایاں ہو نہ ہو یہ اور بات
سر تو اس کے دوش پر باقی ہے، سر جیسا بھی ہے

خاک کی سوندھی مہک عشرتؔ دکھاتی ہے چراغ
گھُپ، گھنے جنگل میں کوئی راہبر جیسا بھی ہے

## ریاضؔ شیرازی جونپوری

اندھیرے گھر میں اُجالوں کی آس چھوڑ گیا
پلٹ کے آئے گا سورج قیاس چھوڑ گیا

وہ شہسوار مجھے میرِ کارواں کہہ کر
مرے خیال کے ہاتھوں میں راس چھوڑ گیا

ذرا سی بات پہ اس شہرِ دل کا شہزادہ
سجی سجائی حویلی اُداس چھوڑ گیا

مرا وجود جلا دے نہ تشنگی کی دھوپ
وہ میری پیاس سمندر کے پاس چھوڑ گیا

برہنہ جسم نہ دیکھا گیا ریاضؔ اُس سے
وہ اپنے سائے کا مجھ پر لباس چھوڑ گیا

• ۸ حسینی مارکیٹ، لکھنؤ ۳

○ بیوٹی واچ کمپنی، لال املی کراسنگ سائیکل مارکیٹ، کانپور ۲۰۸۰۰۱

○ ریلوے گڈس کلرک، پیپر مل گودام، یمنانگر (ہریانہ)

## شفاعت نقوی فہیم

پاؤں نکلا تو آسمان میں تھا
میں کہ کل اپنے ہی مکان میں تھا
وقت کی چاپ سنتے بھی کیسے
پگھلا سیسہ ہمارے کان میں تھا
پچھلے لوگوں سے یہ روایت ہے
دھوپ کا پہرا سائبان میں تھا
زندگی کیا ہے ؟ کیا سمجھتے ہو ؟
یہ سوال اب کے امتحان میں تھا
تھا ہر اک اپنی کبریت کا امیں
نام رب کا فقط اذان میں تھا
میں نہ ہوں گا تو یہ کہیں گے فہیم
لطف تو اس کی ہی زبان میں تھا

● شفاعت پوتہ ، امروہہ ۲۴۴۲۲۱

## شمس غازی آبادی

دل ترے عشق سے برگشتہ ہوا ایسا بھی نہیں
ہاں مجھے عرضِ تمنا کا سلیقہ بھی نہیں
آنکھ کیا کہہ دے سرِ طور نظاروں کی قسم
اک تماشہ ، کہ تماشہ تھا تماشہ بھی نہیں
کم نگاہی نے مری نازشِ جلوہ رکھ لی
میں نے دیکھا تمہیں کچھ ایسے کہ دیکھا بھی نہیں
بحرِ زخار ہے مرہونِ متاعِ قطرہ
قطرے قطرے کو جدا کیجیے تو دریا بھی نہیں
زندگی ایک صحیفہ ہے تعارف کے بغیر
اور بجز موت کوئی اس کا خلاصہ بھی نہیں
شبِ ہجراں کی طوالت سے پریشاں خاطر
شمس تم آگئے ، دیکھو کہ میں سویا بھی نہیں

● ۱۰۵ - افتخار منزل ، بھٹہ الّو خاں ، غازی آباد (یو پی)

## مناظر حسن شاہین

خوابوں کے عکس عکس پہ چھائی تھی تیرگی
سوتے میں چیخ اٹھا مرے اندر کا آدمی
سچائیوں کا تجربہ کچھ تلخ ہی سہی
اے دوست ! مجھ سے جھوٹ کی پوجا نہ ہو سکی
ساحل پہ آج چھائی ہے تاریکیوں کی دھند
کل رات ریگزاروں میں بکھری تھی چاندنی
بے نور تھی یہ چشمِ تمنا ترے بغیر
دیکھا تجھے تو بڑھ گئی آنکھوں کی روشنی
یادوں کے زخم طنز کے نشتر غموں کی دھوپ
کیسے جئیں کہ موت سے بدتر ہے زندگی
آجا کہ بزمِ دل میں ہے شاہین منتظر
شب بھر ترے فراق میں جلتی ہے شاعری

● پرائمری اسکول ، علاول پور ڈاکخانہ نگواں وایا ترولا ضلع گیا (بہار)

# غزلیں

## جمیل قریشی

دراز دست کو دستِ عطا کہیں نہ ملا
بخیل شہر تھا حاجت روا کہیں نہ ملا
فصیلِ شب پہ سحر کا دیا جلاتا کون
کہ کوئی شخص مجھے جاگتا کہیں نہ ملا
لہو کی آگ بھی روشن ہر اک ہتھیلی پر
کسی بھی ہاتھ پہ رنگِ حنا کہیں نہ ملا
گرا خود اپنی نظر سے تو پوچھتا پھر کون
خودی گنوائی تو مجھ کو خدا کہیں نہ ملا
سبھی ہیں اپنے خداؤں سے بدگمان یہاں
کسی زبان پہ حرفِ دعا کہیں نہ ملا

● معرفت پی ۔ ڈبلیو ۔ آئی ۔ اینس ولیسٹرن ریلوے رانا پرتاپ نگر
ادے پور ۳۱۳۰۰۱ (راجستھان)

## ضیا زخمی کھام گانوی

جو غرقِ آب تھا وہ تشنگی کا پیکر تھا
سراب نکلا وہی شخص جو سمندر تھا
اُگل رہا ہے اندھیرے کا زہر آنگن میں
وہ آفتاب جو صدیوں سے گھر کی چھت پر تھا
ابھرتے عکس کو میں بڑھ کے چوم بھی لیتا
خیالِ یار مگر دسترس سے باہر تھا
جفا کی گرد جمی تھی اسی کے چہرے پر
بدن پہ اوڑھے ہوئے جو وفا کی چادر تھا
اسی وجہ سے کھٹکتے رہے ضیا زخمی
کہ کامیابی کا سہرا ہمارے سر پر تھا

● صرافہ جونی مسجد ، کھام گاؤں ۴۴۴۳۰۳

## حسن نجمی سکندرپوری

گھٹا کی بات چلی ہے یہاں وہاں ویسے
دھواں بھی اٹھے تو ہوگا یہی گماں ویسے
ہے سارے شہر میں چرچا تری تباہی کا
جلا ہے تیرے پڑوسی کا بھی مکاں ویسے
کھنک خزاں کی ہے لہجے میں ، لفظ بے خوشبو
وہ رہ رہا ہے بہاروں کے درمیاں ویسے
یہ قہقہے یہ تبسم ، یہ مرحبا کی صدا
سنا رہا ہے وہ زخموں کی داستاں ویسے
یہ اتفاق ہے نجمی کہ لٹ گئے رہرو
ہے پختہ کار بہت میرِ کارواں ویسے

● ۱۹۳ - گوبند کھنڈ ، وشو کرما نگر ، نئی دہلی ۱۱۰۰۳۲

صالحہ عابد حسین

ام: مصداق فاطمہ عرف صالحہ عابد حسین

الدکا نام: خواجہ غلام الثقلین

الدہ کا نام: مشتاق فاطمہ

یدائش: ۱۸۔ اگست ۱۹۱۳ء

ائے پیدائش (وطن): پانی پت ضلع کرنال

طنِ ثانی: دہلی

علیم: اردو، فارسی، تھوڑی عربی۔ انگریزی حساب وغیرہ کی زیادہ تر تعلیم گھر پر حاصل کی۔

سکول وغیرہ کے امتحان: پانی پت ضلع کرنال سے فرسٹ کلاس میں مڈل کا امتحان پنجاب سے (اونلی انگلش) میٹرک کا امتحان (سیکنڈ کلاس) آنرز ان اردو (ادیب فاضل) کا امتحان فرسٹ کلاس میں پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۴۲ء

ادری زبان اور قلمی زبان: اردو

انگلش، ہندی، فارسی اور عربی کی معمولی قابلیت

شادی: ۷۔ اپریل ۱۹۳۳ء کو ڈاکٹر سید عابد حسین (پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ) سے علی گڑھ میں ہوئی۔

نیف و تالیف: بہت کم سنی سے لکھنا شروع کیا۔ ۹۔۱۰ سال کی عمر سے اور اب تک یہ "تخلیقی" شغل جاری ہے۔ ابتدا میں اخبار "پھول" لاہور اور اخبار "تہذیبِ نسواں" لاہور میں چھوٹے چھوٹے مضامین چھپتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ ہندوستان کے سبھی خواتین کے، بچوں کے، علمی ادبی رسالوں، اخباروں میں مضامین شائع ہونے لگے۔

نو ناول اب تک شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۴۶ء (غالباً) عذرا کتابی دنیا لمٹیڈ، دہلی۔ (اس کے متعدد ایڈیشن پاکستان اور ہندوستان سے اجازت سے اور زیادہ تر بے اجازت شائع ہو چکے ہیں)

۱۹۴۹ء: آتشِ خاموش۔ پہلا ایڈیشن سنگم پبلشرز، دہلی۔ دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا (پاکستان سے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے)

۱۹۵۷ء: "قطرے سے گہر ہونے تک" ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ

۱۹۶۳ء: "راہِ عمل" مکتبہ جامعہ، دہلی (دوسرا ایڈیشن زیرِ اشاعت) پاکستان سے بھی شائع ہوا۔

۱۹۶۶ء: "یادوں کے چراغ" تقسیم کار: نسیم بکڈپو اور مکتبہ جامعہ (پاکستان میں متعدد ایڈیشن شائع ہوئے) آج کل مکتبہ جامعہ میں زیرِ اشاعت۔

۱۹۷۲ء: "اپنی اپنی صلیب" ناولستان، دہلی (۲ ایڈیشن)

۱۹۷۲ء: "ابھی ڈور" ناولستان، دہلی (پاکستان میں بھی شائع ہوا)

۱۹۷۸ء: "گوری سوئے سیج پر" ناولستان، دہلی (غالباً ۲ ایڈیشن)

۱۹۸۴ء: "ساتواں آنگن" ناولستان، دہلی

افسانوں کے اب تک پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۴۰ء: "نقشِ اوّل" لطیفی پریس، دہلی (پاکستان میں بھی شائع ہوا)

۱۹۴۶ء: "سازِ ہستی" کتابی دنیا لمٹیڈ، دہلی (پاکستان میں بھی شائع ہوا)

۱۹۴۸ء: "نراس میں آس" کتاب پبلشرز، بمبئی

۱۹۵۹ء: "نو رنگ" ادارہ انیس اردو، الٰہ آباد

۱۹۷۷ء: "درد و درماں" مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی (ایک مجموعہ غیر شائع شدہ "دھوپ چھاؤں" پاکستان میں کھو دیا گیا)

(ایک اور مجموعہ مرتب شدہ غیر شائع شدہ موجود ہے)

متعدد ڈرامے لکھے، جن میں سے چند شائع ہوئے باقی غیر شائع شدہ ہیں۔ شائع شدہ ڈرامے حسبِ ذیل ہیں۔ (چھ ڈرامے نقشِ اوّل میں شامل ہیں)

۱۹۴۶ء: عفت (ڈراما) آرمی پریس، دہلی

۱۹۵۶ء: امتحان (اردو ڈراما) منسٹری آف ایجوکیشن)

حالی کی جھلک (ڈراما) سنِ اشاعت یاد نہیں۔ کتاب نایاب ہے۔

۱۹۵۷ء: "زندگی کے کھیل" (ڈراموں کا مجموعہ) کتابستان، الٰہ آباد

تعلیم بالغان کے لیے متعدد کتابیں لکھیں کچھ نام سے کچھ بے نام کے۔

گاندھی جی پر اردو اور ہندی میں تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ کے لیے دو پمفلٹ لکھے۔

۱۹۵۸ء: پریم اور سیوا کی جیت (طویل مختصر کہانی) اردو گھر، علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ (ایجوکیشن منسٹری آف انڈیا سے ایوارڈ)

متعدد مضامین متعدد رسالوں کے لیے لکھے۔

۱۹۵۹ء: ایک مجموعہ "سلکِ گہر" کے نام سے شائع ہوا۔ رائے صاحب رام دیال اگروال، آگرہ (امام حسین علیہ السلام اور دیگر شہدائے کربلا پر متعدد پمفلٹ (مضامین) لکھے جو امامیہ مشن، لکھنؤ نے شائع کیے)

## سوانح عمریاں

۱۹۴۹ء: یادگارِ حالی (مولانا الطاف حسین حالی کی سوانح حیات) شائع شدہ انجمن ترقی اردو (ہند) تین اور ایڈیشن شائع ہوئے

متعدد کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے۔

۱۹۷۴ء : سوانحی مضامین "جانے والوں کی یاد آتی ہے" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

۱۹۷۴ء : ذکرِ جمیل۔ خواجہ غلام السیدین کی ادھوری سوانح "مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں" کا دوسرا حصہ جس میں سوانح کو مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ شائع شدہ سیدین میموریل ٹرسٹ

خواجہ الطاف حسین حالی (بڑی عمر کے بچوں کے لیے حالی کی سوانح) نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا نے شائع کی۔

۱۹۸۳ء بھائی۔ (بڑی عمر کے بچوں کے لیے حالی کی سوانح) ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

ہمارے انیس (بڑی عمر کے بچوں کے لیے میر انیس کی سوانح) این۔سی۔آر۔ٹی

۱۹۸۴ء : سلسلۂ روز و شب خود نوشت سوانح پبلشر صغرا مہدی، نئی دہلی

## ادبی تنقید و تذکرہ و مضامین

۱۹۳۶ء: بات چیت (چند ریڈیو تقریروں کا مجموعہ) کتابی دنیا

۱۹۵۹ء : ادبی جھلکیاں (مضامین کا مجموعہ) ادارہ انیس اردو، الہ آباد

۱۹۷۳ء : خواتین کربلا کلام انیس کے آئینے میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

۱۹۷۵ء : انیس سے تعارف (مضامین کا مجموعہ) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی

۱۹۸۳ء سفر زندگی کے لیے سوز و ساز (سفرنامہ) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

۱۹۸۳ء : سفر زندگی کے لیے سوز و ساز (سفرنامہ) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

## مرتب شدہ کتابیں

۱۹۷۱ء : مجالس النساء (حالی) مکتبہ جامعہ دہلی

۱۹۷۷ء : انیس کے مرثیے (حصہ اول) مع مقدمہ تعارف فرہنگ وغیرہ ترقی اردو بیورو نئی دہلی

۱۹۸۰ء : انیس کے مرثیے (حصہ دوم)

۱۹۷۹ء : رہ نوردِ شوق (عابد صاحب کے سفر کے خطوط کو مرتب کیا) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

احباب نامہ (ڈاکٹر عابد حسین کے نام مشاہیر کے خطوط) زیر اشاعت مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی

آوازِ دوست (مرتب شدہ خطوط ڈاکٹر عابد حسین بنام صالحہ) زیر اشاعت

## بچوں کی کتابیں (کہانیاں)

۱۔ ۱۹۷۴ء : بہادر سندر : کتابی دنیا، دہلی
۲۔ بھولی : سنگم پبلشرز
۳۔ جادو کا ہرن
۴۔ سندر چنار ۱۹۵۵ء جاوید پبلشنگ ہاؤس
۵۔ سنہری بالوں والے بچوں کا دیس (ایوارڈ ایجوکیشن منسٹری آف انڈیا)
۶۔ ایک دیس ایک خون (ناول)
۷۔ ہم کھادی (اڈپٹیشن) ناول
۸۔ الزہا اور کالا کنواں (کہانی) اردو بورڈ
۹۔ بچوں کے حالی (حالی کا انتخاب کلام چھوٹے بچوں کے لیے) ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

## ترجمے

۱۹۶۸ء : کثرت میں وحدت (از مہاتما گاندھی یونٹی اینڈ ڈائے ورسٹی) نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی۔

۱۹۷۰ء : باپو۔ حصہ اول، دوم نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی۔

۱۹۷۲ء : بڑا پاپی (کہانی) نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا

ان ۵۲ یا ۵۳ کتابوں کے علاوہ کم سے کم ۳۰۰، ۳۵۰ ریڈیو کی تقریریں لکھیں، کیں اور بعض چھپیں۔ متعدد افسانے ریڈیو پر ہوئے اور رسالوں میں چھپے۔ دو سو سے کم مضامین نہ ہوں گے جو رسالوں، اخباروں میں بھی چھپے اور نہیں بھی چھپے۔ کئی مقالے وغیرہ سیمناروں کے لیے لکھے گئے۔

## اعزاز، ایوارڈ

متعدد کتابوں پر ایجوکیشن منسٹری آف انڈیا سے (بچوں کی کتابیں) ایوارڈ ملا کئی کتابوں پر اردو اکیڈمی سے ایوارڈ ملا۔ جس میں سے ایک ایوارڈ واپس کر دیا گیا۔

۱۹۷۹ء : سرسوتی ایوارڈ، ساہتیہ کلا پریشد دہلی

۱۹۸۳ء : پدم شری، بھارت سرکار

مختلف ممبر شپ مختلف اداروں کی

علاوہ عورتوں کی جامعہ ملیہ کی متعدد انجمنوں کی سکریٹری یا صدر رہی۔ کئی سال تک پنجاب وقف بورڈ کی ممبر رہی

اس کے علاوہ :

۱۔ ممبر ترقی اردو بورڈ
۲۔ ممبر ورکنگ کمیٹی لیو پی
۳۔ ممبر ایگزیکٹو جامعہ اردو علی گڑھ (۱۹۷۵ء سے غالباً ۱۹۷۷ء تک)
۴۔ ممبر انجمن ترقی اردو
۵۔ منسٹری آف ایجوکیشن اینڈ کلچر (مرکزی) لینگوج سیل کی ممبر بحیثیت ایکسپرٹ
۶۔ ممبر یادگار انیس کمیٹی، دہلی
۷۔ ممبر سیدین میموریل ٹرسٹ، دہلی
۸۔ ممبر اسلام اینڈ دی موڈرن ایج سوسائٹی دہلی۔
۹۔ ممبر عابد حسین میموریل ٹرسٹ، دہلی
۱۰۔ ممبر اردو اکیڈمی، دہلی
۱۱۔ جامعہ نگر کی شاخ انجمن ترقی پسند مصنفین ایک عرصہ تک سکریٹری رہی۔ اب ممبر ہوں۔

جوگندر پال

تم پوچھتی ہو سمیدرا، مجھے ایک دم کیا ہو گیا ہے؟
کیا بتاؤں، کیا ہو گیا ہے؟
نہیں، کچھ نہ کچھ ہوا تو ضرور ہے — کیا پتہ، کیا؟ — بابا، شاید مجھے زندگی ہو گئی ہے — نہیں، زندگی ایکدم نہیں ہوتی۔ جیسے بھی ہو پل پل ہوتی ہے۔ مجھے ہوتے ہوتے بھی زندگی کو میری ساری عمر لگی ہے، میری عمر کے پورے پینسٹھ سال۔
کیا تمھیں نہیں لگتا سمیدرا، کہ تمہیں بھی زندگی ہو گئی ہے؟ — ہاں، تمہارے گھٹنوں کی حالت کتنی خراب ہو چکی ہے۔ دو قدم چلنے سے بھی تمہاری جان منہ کی طرف کھنچ آتی ہے — گھبراؤ نہیں، ڈاکٹر کہتا ہے نئی دوا سے تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی — تم پرانی ہو تو کیا، دوا تو نئی ہے۔ پانچ دس دن میں ہی بالکل نئی ہو کر دوڑنے لگو گی — نہیں؟ — نہیں کیوں؟ چند روز کی ہی تو بات ہے — تکلیف ہوتی ہے تو ابھی مت چلو — ہاں، چل چل کے ہمیں جانا بھی کہاں ہوتا ہے؟ ہم جتنا بھی چلیں، پہنچنا تو ہمیں عین وہیں ہوتا ہے جہاں ہم چلے بغیر بھی جا پہنچتے ہیں — اور کیا، سمیدرا؟ موت کو ہم جالیں، یا موت ہمیں آلے۔
مجھے کیا ہو گیا ہے؟ بتا تو چکا ہوں، زندگی، اور کیا؟ جیسے جو بھی ہوا ہوتا ہے، اسے دراصل زندگی ہی ہوئی ہوتی ہے — ہاں بھئی، تم بھی اپنے گھٹنے اسی لیے سیدھے نہیں کر پائی کہ تمہیں زندگی ہو گئی ہے — نہیں، پگلی، زندگی کے روگ کا کوئی علاج نہیں، یا صرف ایک ہی علاج ہے — مگر پہلے میں تمہیں اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ میرے پردادا نے پوری ایک سو ایک برس کی عمر بھوگی۔ جب انھوں نے پران تیاگے تو ان کی ارتھی کو رنگدار کپڑوں میں لپیٹ کر بڑی دھوم دھام سے باجوں کی تانیں اڑا اڑا کے، راہ گیروں میں لڈو بانٹ بانٹ کے مرگھٹ کی طرف لے جایا گیا۔ میں اپنے گھر والوں کو بڑی رنجیدہ حیرت سے دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بڑے بابا کے جانے پر یہ لوگ اتنے خوش کیوں ہیں، مگر بات تو خوشی کی ہی تھی۔ بڑے بابا وہاں تھے ہی کہاں؟ پنچھی کو اڑے تو ایک مدت بیت چکی تھی۔ یہ لوگ تو صرف مٹی کا خالی پنجرہ آگ کے سپرد کرنے جا رہے تھے — ٹھہرو سمیدرا، بے صبر مت ہوؤ۔ خوشی کا مقام یہ تھا کہ پرانے پنجرے کے ٹوٹتے پھوٹتے ہی بھولا بھٹکا پنچھی اچانک لوٹ آیا اور سبھوں کے دل و دماغ کی شاخوں پر جھول جھول کر کوکنے لگا اور جیون کی یہ امر کوک سنتے ہوئے سب کے سب جھوم اٹھے اور راہ چلتوں کو اپنی خوشیوں میں شریک کرنے کے لیے باجے کی تانیں اڑا اڑا کے لڈو بانٹنے لگے۔
ہاں، سمیدرا، بڑے بابا کو بھی زندگی ہو گئی تھی اور جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے، اس روگ کا ایک ہی علاج ہے، موت — اپنے باپ دادا کو ہم ان کی زندگی میں یکسر بھولے ہوتے ہیں — نہیں، اس میں ہمارا کوئی دوش نہیں۔ جسم پر جھریوں کا ٹڈی دل اتر آیا ہو تو بوڑھا آدمی جان بچانے کے لیے جیتے جی ہی جسم کو چھوڑے ہوتا ہے اور نا معلوم کہاں رہ رہا ہوتا ہے۔ پھر اسے دیکھ کر اس کا خیال کیسے آئے؟
میرے دادا نے بھی بڑی لمبی عمر پائی۔ ہم انھیں چھوٹے بابا کہا کرتے تھے — کیوں، گھٹنوں میں درد زیادہ ہونے لگا ہے؟ گولیاں کیوں نہیں کھا لیتیں؟ — سچ پوچھو سمیدرا، درد تو جوں کا توں ہوتا رہتا ہے، ہم ہی اپنے وجود کو سُن کر لیتے ہیں، اب درد کے منجدھار سے گزر کر اُس پار پہنچ کے دم لو، یا سُن کے سُن اسی کنارے پر پڑے رہو — نہیں لو، یہ گولیاں کھا ہی لو — لو، پانی بھی — ہاں، میں تمہیں چھوٹے بابا کے بارے میں بتا رہا تھا۔ چھوٹے بابا اپنے آخری دنوں میں پاگل ہو گئے تھے — نہیں، سمیدرا، قدرت ہماری مدد کرتی ہے، ورنہ ہم بڑھاپے کا روگ کیونکر جھیلیں؟ روگ پرانا ہو جائے تو روگی اکثر پاگل ہو جاتا ہے اور پاگل ہو کر اس کی کسی ہوئی گانٹھیں ڈھیلی ہو جاتی ہیں — ڈھیلا سا ہو کر اسے یقیناً آرام محسوس ہوتا ہو گا۔
اتنی کھنچ کر کیوں بیٹھی ہو سمیدرا۔ برا نہ مانو، تم نے اسی طرح کھنچے کھنچے میرے ساتھ ساری عمر گزاری ہے، اسی لیے کبھی ہماری ملاقات نہیں ہو پائی۔ میں نے دو محبت کرنے والوں کی کہانی پڑھ رکھی ہے — کیا نام تھا اُن کا؟ — خیر چھوڑو — دونوں ساری دنیا سے چھپ کر ایک دوسرے سے ملا کرتے مگر ملاقات کے فوراً بعد دھر لیے جاتے، کیوں کہ ایک کے بدن سے دوسرے کی

اے، ۸۷۵ گریٹر کیلاش، نئی دہلی ۴۸ ۰۰ ۱۱۔

[illegible] ہی ہوتیں — مگر مجھے یہ ڈر لگا رہتا ہے [illegible] ہم ایک دوسرے سے محبت نہ کرنے کے الزام [illegible] جائیں گے۔ جانتی ہو کیا؟ ایک بار تمہاری [illegible] ہوئے مجھے لگا کہ تم کوئی اور ہو۔ شاید اسی لیے میں تمہاری طرف بے اختیار بڑھتا چلا آیا، مگر تمہارے قریب آ کر جوں ہی مجھے پتہ چلا کہ یہ تو تم ہو تو میں رک رہ گیا اور اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بڑی نرمی سے گویا ہوا، ہیلو! — ہمارا رابطہ بس ایک ہیلو میں سمٹ آیا ہے — ہنسو نہیں، سعدرا۔ تم نے ہمیشہ میرا مذاق اڑایا ہے یا پھر تم مجھ سے اتنی سنجیدگی سے پیش آتی ہو کہ میں تمہارا مذاق اڑانے لگتا ہوں۔

مجھے واقعی کچھ ہو گیا ہے سعدرا، شروع کہیں سے کرتا ہوں اور پہنچ کہیں اور جاتا ہوں — پتہ نہیں، کہاں؟ — کیا؟ ہماری محبت؟ — ہاں، جب میں نے تم سے محبت کرنا شروع کیا تھا تو مجھے لگا تھا، ہر بار اسی لیے جنم لیتا ہوں کہ کسی طرح تمہارے پاس آ پہنچوں۔ اپنے ہر جنم میں کُل جہاں کی بھیڑ میں بالآخر تمہیں ڈھونڈ لیتا ہوں اور تمہارا ہاتھ تھام لیتا ہوں، ساری زندگی تھامے رکھتا ہوں کہ دھکم دھکا میں تمہیں کھو نہ دوں اور پھر جب بھیڑ چھٹ چکتی ہے تو میں تمہیں غور سے دیکھتا ہوں اور جانتی ہو، کیا؟ اس وقت مجھ پر یہ کھلتا ہے کہ تم تو کوئی اور ہو۔ میں نے تمہیں زندگی بھر غلطی سے تم ہی سمجھے رکھا — خفا مت ہو، سعدرا؟ میں بھی کہاں وہی ہوں جو تم سمجھتی ہو۔ جو مایوس ہوتا ہے وہ مایوس کرتا بھی ہے — پانی؟ — ہاں، ابھی لو — مجھے بھی ہر دم پیاس لگی رہتی ہے، حالانکہ پانی پی پی کر پیٹ میں ڈوبا ہوتا ہوں — یہ لو، پیو۔ چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرو سعدرا، منہ سے بڑا گھونٹ بھرتی ہو، اسی لیے غوطہ کھا جاتی ہو۔

ہاں، مجھے واقعی کچھ ہو گیا ہے — ہاں، زندگی ہی، اور کیا؟ — چھوٹے بابا کی بات پھر بیچ میں ہی رہ گئی۔ میری ساری باتیں بیچ میں رہ جاتی ہیں۔ چھوٹے بابا کی بات بھی میں نے نامعلوم کونسی بات سنانے کے لیے چھیڑی تھی۔ خیر پہلے تم [illegible] کی بات تو سُن لو۔ بیچ کی باتوں کا سلسلہ تو ساری عمر جاری رہتا ہے۔ تو جب یاد آگئیں، آگئیں۔ چھوٹے بابا نے آخری دس سال پاگل ہو کر بتائے۔ میں نے سُن رکھا ہے کہ وہ چھوٹی دادی پر جان دیتے تھے مگر ہوا یہ کہ چھوٹی دادی نے اپنے پچیسویں برس میں ہی ان پر سچ مچ جان دیدی۔ چھوٹے بابا اب کس پر جان دیتے؟ سو انھوں نے چھوٹی دادی کے خیال میں ڈوبے ڈوبے زندگی گزار دی اور جب آخری دنوں میں سطح پر ابھرے تو وہ آپ تو پچاسی کے ہو چکے تھے مگر اپنے خیال کی تہوں پر سے وہ اسی پچیس سالہ چھوٹی دادی کو ساتھ لے آئے تھے۔ اب پچیس اور پچاسی کے جوڑے میں نبھتی تو کیسے نبھتی؟ چھوٹے بابا بے چارے صدمے کی تاب نہ لا کر پاگل ہو گئے۔ چاہ میں صدمہ تو اُس وقت بھی ہوتا ہے جب کوئی زندگی کی بھیڑ چھٹ جانے پر اپنے محبوب کو غور سے دیکھتا ہے اور اُسے پتہ چلتا ہے کہ وہ تو اپنے دونوں ہاتھوں سے جھریوں کا ٹنڈی دل تھامے ہوئے ہے جو اس کے ہاتھوں سے بڑھتے ہوئے اس کے وجود کو بھی اپنی زد میں لے چکا ہے، مگر یہ صدمہ بجھا بجھا سا صدمہ ہے سعدرا، چھوٹے بابا کے صدمے میں اُس بڑھاپے میں بھی جوانی کی چیخ پکار تھی، اِس لیے ان کا پاگل ہو جانا غیر متوقع نہ تھا۔

تم پوچھتی ہو سعدرا، مجھے کیا ہو گیا ہے؟ بوڑھوں پر تو اس وقت حیرت ہونی چاہیے جب اُنھیں کچھ نہ ہو۔ بوڑھے یا تو چھوٹے بابا کی طرح بیکلی سے پاگل ہو جائیں، یا پھر میری طرح ٹھنڈے ٹھنڈے جیئے جائیں، یعنی ہنسیں نہ روئیں، سوچیں نہ محسوس کریں، لڑیں نہ نفرت کریں، کچھ بھی نہ کریں، صرف ٹھنڈے ٹھنڈے جیتے چلے جائیں — ایک جیوتشی نے مجھے بتایا تھا کہ میں ساٹھ سال تک جیونگا۔ اپنے ساٹھویں سال کے بعد جب میں مہاراج سے ملنے گیا تو وہ اڑ گئے کہ تم مر چکے ہو بچہ، اور تمہارے کھنڈر بدن پر کسی بدروح نے قبضہ جما لیا ہے — ہنسو نہیں سعدرا، ذرا سوچو۔ سوچنے سے ہم گھٹنوں کے بغیر ہی چل پھر لیتے ہیں — مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ جیوتشی مہاراج کا کہنا غلط نہ تھا۔ میں واقعی کوئی اور ہوں — ہاں، اسی لیے تو تمہیں کوئی اور معلوم ہوتا ہوں۔

دیکھو چھوٹے بابا پھر گول ہو گئے۔ اصل میں ہم جس کا قصہ بھی چھیڑے ہوئے ہوں، آپ بیتی ہی سنا رہے ہوتے ہیں — نہیں، میں چھوٹے بابا کی طرح پاگل تو نہیں ہوں۔ میرے ہوش ابھی قائم ہیں، کیا واقعی قائم ہیں؟ مجھے کچھ ہوا نہیں تو پھر تم کیوں پوچھتی رہتی ہو کہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ — تمہارے گھٹنوں کا درد اب سو گیا ہے؟ — چلو، شکر ہے — اگر چاہو تو اب بیٹھ جاؤ۔ لیٹی لیٹی تھک جاؤگی۔

نہیں، سعدرا، میں پاگل تو نہیں ہوں، مگر شاید پاگل ہو جانا چاہتا ہوں، تاکہ تمہیں نہ چاہنے کے الزام سے بری رہوں — نہیں، سعدرا، اس میں غصّے کی کیا بات ہے؟ کڑوی دوا کو شکر میں گھول کر ہم خواہ مخواہ اس کی تاثیر میں کمی واقع کر دیتے ہیں — نہیں مجھے چھوڑو، پہلے چھوٹے بابا کی سن لو۔

ہاں چھوٹے بابا اپنی چاہت ہی کی وجہ سے پاگل ہوئے — نہیں، سعدرا، چاہت سے بچو تو بھی پاگل، اور چاہو تو بھی۔ چھوٹی دادی ہمارے چھوٹے بابا کو بہت تنگ کیا کرتی تھی۔ تصور چھوٹے بابا ہی کا تھا۔ پچاسی کی عمر میں کوئی پچیس کی چھوکری سے بیاہ رچائے گا تو کیسے پاگل نہ ہوگا؟ — ایک بار میں نے دیکھا کہ چھوٹے بابا ضعف سے لڑکھڑاتے ہوئے گھر کی چوکھٹ سے باہر نکل رہے تھے۔

چھوٹے بابا! چھوٹے بابا! چلیئے، اندر چلیئے۔

مگر وہ اپنے حال میں مست آگے ہی آگے لڑکھڑاتے چلے گئے۔

کہاں جا رہے ہیں، چھوٹے بابا؟ — چھوٹے بابا اونچا سنتے تھے، اس لیے میں نے چیختے ہوئے کہا۔

تمہاری چھوٹی دادی کے لیے صندل کا شربت لانے۔

اندر چلیئے، چھوٹے بابا۔

نہیں، بیٹا، شربت لے کر نہ گیا تو وہ مجھے دم نہ لینے دے گی۔

آپ واپس چلیئے، شربت میں لے آؤں گا۔

چھوٹے بابا، چھوٹی دادی کے نام پر ہم سے بھانت بھانت کی کھانے پینے کی چیزیں منگواتے اور پھر انھیں آپ ہی کھاتے ہوئے وہ گویا انھیں چھوٹی دادی کو کھلوا رہے ہوتے — اری کھاؤ، آنکھیں کیوں دکھا رہی ہو؟ مزا آ رہا ہے تو اور کھاؤ — نہیں، آنکھیں مت دکھاؤ، بس کھاتی جاؤ — !

چھوٹی دادی نے کھا کھا کر چھوٹے بابا کا معدہ ناکارہ کر دیا۔ چھوٹے بابا کو چھوٹی دادی کے سوا اور کسی کی خبر ہی نہ تھی مگر جوان جہان چھوٹی دادی کب تک صرف کھا پی کر ان کے ساتھ ٹکی رہتی۔ وہ اچانک ایک دن

فرار ہوگئی اور پھر چھوٹے دادا نے بھی اپنا منہ چھپانے کے لیے دم توڑ دیا، مگر اُدھر ان کی موت واقع ہوئی اور وہ میرے ذہن میں پورے ہوش و حواس میں جی اٹھے ـــــ ارے مُنے، تم اتنے بڑے ہوگئے ہو؟ اپنے چھوٹے بابا سے ایک بار بھی ملنے کا نہ سوچا؟ انھوں نے مجھے اپنے بازوؤں میں اتنا کس کر لپیٹ لیا کہ میری رگ و پے میں سرایت کر گئے اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں ہی چھوٹے بابا ہوں۔

موت ایک نعمت ہے سجدرا۔ موت نہ ہو تو کائنات میں کراہوں کے سوا اور کچھ سنائی نہ دے، اس لیے یہ اچھا ہی ہے کہ موت کو کوئی بھی دھوکا نہیں دے سکتا، مگر نہیں سجدرا، موت جب مرنے والے کے جسم کو ڈھیر کر چکتی ہے تو وہ نظر بچا کے اپنوں کے خیالوں میں آ چھپتا ہے اور انہی کے دلوں میں دھڑک دھڑک موت کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بعض لوگوں کی یہ دھڑکنیں تو نسل بانسل جاری رہتی ہیں لیکن یہ کرتب دکھانے کے لیے۔ بدھ یا عیسیٰ کی ہوشیاری سے کام لینا پڑتا ہے۔ میرے چھوٹے بابا بے چارے تو چھوٹے سے دھوکا باز تھے، بس اک میرے ذہن میں گھس پائے اور جب میں پورا ہو جاؤں گا تو میرے ساتھ وہ بھی آپ ہی آپ پورے ہو جائیں گے۔

کیا کہا، میں؟ ـــــ نہیں سجدرا، کسی ذہن میں چھپ کر مجھے اپنی موت کا خوشیاں دیکھنا نصیب نہ ہوگا ـــــ اس وقت تم بالکل ٹھیک ہونا؟ ـــــ ہاں، بالکل ٹھیک تو ہم اب اسی وقت ہوں گے جب وجود چھوڑ کر چلتے بنیں گے ـــــ نہیں، سجدرا، میں صرف دیکھنے میں ٹھیک ہوں، ورنہ مجھے جو کچھ ہے اُس سے تو اچھا ہے کہ میرے گھٹنوں میں درد ہو، ٹخنے سوج جائیں۔ گردن ٹیڑھی ہو جائے یا جو بھی ہو جائے ـــــ پتہ نہیں، کیا ہے؟ نہ جینے کا احساس ہے نہ مرنے کا ـــــ نہیں، سجدرا، یہی تو مصیبت ہے کہ پتہ نہیں۔ میں اپنی اِس بپتا کو ٹالنے کے لیے ہنسنے کا جتن کرتا ہوں تو میرے مسوڑے سکڑنے لگتے ہیں اور نقلی دانت منہ سے باہر گرنے کو آتے ہیں ـــــ میرا روگ بڑا جان لیوا ہے۔ بس جیسے بھی لڑکھڑاتے ہوئے اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہ پاتا ہوں یہ چھوٹے بابا کے دم سے ہے۔ میں آپ تو اپنے جسم میں مرحوم ہو چکا ہوں، اس میں بس ایک چھوٹے بابا ہی چھوٹے بابا رہ گئے ہیں۔ میری عمر بھی اُن کی عمر میں ملا دو تو وہ اب ڈیڑھ سو برس سے بھی اوپر ہونے کو آ رہے ہیں ـــــ سن رہی ہو سجدرا، میں ڈیڑھ سو برس سے بھی اوپر کا ہوں۔

ہاں، سجدرا، اتنی لمبی یادوں میں اٹکے ہوئے بیتے دن بڑے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ جوانی میں میرا چہرہ سورج کی طرح جلتا تھا اور میرا سارا بدن اس کی روشنی سے منوّر تھا اور ساری کائنات میرے ارد گرد گھوما کرتی تھی مگر تعجب ہے کہ سورج بجھ جانے پر کائنات میں قیامت کیوں نہیں ٹوٹ پڑی، سب کچھ ویسے ہی کیونکر چل رہا ہے؟ بس ایک یہی ہوا ہے کہ سورج کے بجھ جانے سے آج میں ہی کسی کو دکھائی نہیں دیتا ـــــ کل صبح میں کتنی ہی دیر تمہارے سامنے بیٹھا رہا مگر تمہیں نظر ہی نہ آیا۔ میں بے حد دکھی تھا اور میری بڑی خواہش تھی کہ تم مجھ پر ترس کھاؤ پر تم تو اپنے آپ پر ہی ترس کھائے جا رہی تھیں ـــــ بات یہ سجدرا، کہ ہم دو الگ الگ سیارے ہیں جو دور سے ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں مگر اصل میں ایک دوسرے سے لاکھوں میل کی دوری پر ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہیں ـــــ سجدرا، ارے بھئی، میں تمہارا دل لگانے کے لیے یہاں بیٹھا ہوں مگر تم میری باتوں پر دھیان ہی نہیں دے رہی ہو ـــــ جی بے زار ہے؟ اس سے تو اچھا ہے کہ گھٹنوں میں تھوڑا تھوڑا درد ہوتا رہے اور جی لگا رہے ـــــ ہاں میرا جی بھی بے زار ہے سجدرا، آؤ تھوڑی وہسکی پی لیں ـــــ نہیں؟ ـــــ کوئی بات نہیں، میں اکیلے ہی پیے لیتا ہوں۔ تھوڑی سی وہسکی پی کر میرا پرانے دنوں کا وہ سورج بھرا چہرہ میری آنکھوں میں گھومنے لگتا ہے۔ آج کے ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ ہم نے وقت کو محض اپنی سہولت کے لیے ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کر رکھا ہے ـــــ ذرا سوچو سجدرا، تم سوچتی نہیں ہو، اسی لیے گھٹنوں میں درد محسوس کرتی رہتی ہو ـــــ یہ لوگ کہتے ہیں، وقت آگے پیچھے نہیں ہوتا، بلکہ سارے کا سارا ایکدم ہوتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر کیا میں مرنے سے پہلے ہی پیدا ہو گیا یا پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گیا، یا ایکدم پیدا ہوا اور مرا، یا پھر یہ تو نہیں کہ ہم پیدا ہوتے ہیں نہ مرتے ہیں، ہم محض اپنا گمان ہوتے ہیں؟ ـــــ یا پھر جو بھی ہے، کیا ہے؟ ـــــ لو تھوڑی سی پی ہی لو، دوا سمجھ کر پی لو ـــــ نہیں؟ ـــــ پینے کے بعد اگلے دن درد بڑھ جاتا ہے؟ ـــــ تو کیا ہوا بھلی لوگ؟ درد کے لیے ڈاکٹر کی دوا جو ہے ـــــ تم نے ہمیشہ اپنے جینے کو اگلے دن تک اٹھائے رکھا ہے، شیشے میں ذرا اپنا پوپلا منہ دیکھو اور بتاؤ اب کتنے اگلے دن باقی رہ گئے ہیں؟ خیر، میں تو پی رہا ہوں ـــــ چیئرز!

ایک بار میں نے سورج کو دیکھتے ہوئے محسوس کیا کہ وہ صرف ہاتھ بھر پرے ہے۔ مرا جوانی کا وہ چہرہ بھی بعض اوقات مجھے یہیں ہاتھ بھر پرے معلوم ہوتا ہے لیکن میں اُس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں تو وہ بے حساب خلائی دُوریوں پر جا پہنچتا ہے ـــــ نہیں، سجدرا، ماہرین بکواس کرتے ہیں کہ وقت آگے پیچھے نہیں ـــــ اس وقت میری یہ دشا کہاں تھی؟ اس وقت تو ایک میں ہی میں تھا ـــــ آہستہ بیوں؟ ـــــ کیوں ہے ـــــ ایکدم کیوں نہیں؟ ـــــ تمہاری نکتہ چینی نے ہی مجھے اِس حالت پر پہنچایا ہے، ورنہ مجھے بھی وقت ہمہ دم وہی وقت لگتا اور میرا چہرہ سورج ہوتا اور میرا سارا بدن میری ہی روشنی سے منور۔ تم سے ملنے سے پہلے واقعی ایک میں ہی میں تھا، یعنی میں صرف میں نہ تھا، پوری زندگی میں ہی تھا۔ میں جو چاہتا، وہی بن جاتا ـــــ شیر، ہاتھی، مکھی، مچھلی، مور اور ـــــ اور عورت بھی ـــــ ہاں سجدرا، عاشق بھی میں ہی تھا اور معشوق بھی میں ہی، اور میں اور میں ہی آپس میں مصروف رہا کرتے تھے۔

مگر پھر تم کہیں سے بیچ میں آ گئیں اور میں نے غلطی سے تمہیں تم ہی سمجھ لیا، وہ تم، جسے میری بے تاب خواہشوں نے میرے تپیدہ خون کے بہاؤ میں میری سب سے روشن ناڑی سے برآمد کیا تھا۔ میں نے بے اختیار تمہارا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تم تم ہی نہیں۔ تم تمہی ہوتیں تو مجھے اپنا گمشدہ بر تر مل جاتا، مگر اپنے ہر جنم میں مجھے ایک تم ہی نہیں ملتیں، کوئی اور ملتی ہے اور اس کا ہاتھ تھامے میں کشاں کشاں اپنے زوال کے سفر پر نکل پڑتا ہوں اور ساری عمر کا فاصلہ طے کر کے تمہیں دیکھتا ہوں تو اپنے آپ کو جھریوں کے

دل میں بکھرا ہوا پاتا ہوں ۔
تھوڑی سی اور پیوں گا سجدرا ـــــ نہیں؟
ـــــ نہیں، کیوں؟ ـــــ تم نے کبھی میری کسی خواہش کو پورا نہیں ہونے دیا، ہمیشہ اپنی خواہشوں سے کام رکھا ہے اور مجھے اپنا عادی بنا کر اپنی تسکین کی اشیار کا ڈھیر لگا لیا ہے۔ تم نے مجھ سے محبت نہیں کی سجدرا، مجھے ایک کار آمد شئے سمجھ کے برتا ہے، تمہارے جذبے مر چکے ہیں، اپنی اِن جمع کی ہوئی اشیار کی مدد سے اپنے مردہ جذبوں میں دم پھونک کر دکھاؤ تو جانو ـــــ نہیں سجدرا، مجھے ڈراؤ نہیں، تمہیں گھٹنوں میں، چھاتی میں، سر میں کہیں درد نہیں ہوتا۔ درد تو جذبوں کی بدولت ہوتا ہے۔ تم ـــــ تم بے درد ہو سجدرا ـــــ لو، ایک چھوٹی سی وہسکی پی ہی لو ـــــ نہیں؟ ـــــ تمہاری مرضی ـــــ تم یقیناً وہ نہیں سجدرا، جو میری سب سے روشن ناڑی سے برآمد ہوئی تھی، میرا ہی انگ تھی، میرے ہی باطن کی روشنیوں کی پیامبر جس کے بطن سے میرے ہی جگمگاتے پیکر پیدا ہونا تھے ـــــ نہیں، تم وہ معصوم تم نہیں ہو۔ تمہاری تاریک آماجگاہ سے تو مجھے ہمیشہ صرف لذت اور ہوس کے نسب خون مارنے کی ترغیب ہوئی ہے ـــــ نہیں، بیوی، تم میری بیوی نہیں ہو ـــــ ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو، میں بھی تمہارا شوہر نہیں ہوں۔ نہ تم تم ہو، نہ میں میں۔ ہم اپنے اپنے نام کے کوئی دوسرے لوگ ہیں اور صرف اپنے ناموں کی قانونی نشاندہی کے باعث اپنے آپ کو میاں بیوی تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارا رشتہ صرف اسی لیے بنا رہا بیوی، کہ قانون کی کتابوں نے اسے بنائے رکھا۔ غلط کیا ہوا؟ ـــــ ہاں، غلط کیا ہوا؟ ہمارے اس انتظام سے ہی تو ہمارے جینے کی سہولتیں بنی رہیں ہمارا آپسی جذبہ نہ رہا لیکن ہم تو بدستور رہے، ہمیں اپنی زندگی تو کاٹنا تھی۔ جانور بے چارے کتنے بدقسمت ہوتے ہیں کہ آپسی جذبہ مرتے ہی ایک دوسرے کو چھوڑ دیتے ہیں اور اپنا بنا بنایا سنسار چوپٹ کر کے رکھ دیتے ہیں۔

سجدرا، جب میں نے پہلی بار تمہیں کسی غیر مرد سے گھلتے ملتے دیکھا تھا ـــــ کیا نام تھا اس کا؟ ـــــ خیر، چھوڑو، پہلا دسواں ہو، یا دسواں پہلا، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ـــــ جب میں نے پہلی بار تمہیں اس کے ساتھ پینگیں بڑھاتے ہوئے دیکھا تو زمین پر مضبوطی سے اپنے پیر جوڑتے مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ تمہیں طلاق دے دوں، لیکن چند ہی روز میں میرا غصہ آپ ہی آپ رفع ہو گیا، یا شاید میں اپنے آپ کو سمجھانے بجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ عقل سے کام لو۔ جیسے بھی ہے اب بچوں کے باپ ہو گئے ہو، کیوں اپنے رُوٹین میں خلل پیدا کرتے ہو؟ ـــــ ہاں، سجدرا، میں نے کب کہا تم غلط کہہ رہی ہو؟ مجھے بھی یکے بعد دیگرے کئی عورتیں اتنی دلچسپ معلوم ہوئیں کہ میں سوچنے لگا، سیدھے اور پکے راستوں پر کیا رکھا ہے، اصل نظارے تو ٹیڑھی ترچھی راہوں پر سے نظر ہیں آتے ہیں۔

عورتیں چالاک نہ ہوں سجدرا، تو بڑی بھیکی لگتی ہیں۔ تم پھول متی کو تو نہیں بھولی ہو گی۔ ایک طرف تو اُس نے تمہیں اپنے جادو سے رام کر رکھا تھا اور دوسری طرف مجھ پر اپنے ڈورے ڈال رہی تھی۔ بڑی تیکھی عورت تھی۔ مجھے یہی کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کانٹوں میں گھرے ہوئے اس پھول سے میری انگلیاں لہولہان ہو جائیں گی مگر پھر بھی میرے ہاتھ بے اختیار اس کی طرف اٹھ جاتے تھے۔ میرا سنبھلنا اُس وقت ہوا جب اس نے مجھ سے شادی کی پیش کش کی اور اس کے کہنے سننے میں آ کر تم نے طلاق کی۔ شاید مجھ میں ایک خوبی بچی رہ گئی تھی کہ کچھ بھی ہو، فیئر پلے سے ہاتھ نہ کھینچوں، سو میں نے تم دونوں کی پیش کش رد کر دی اور اس طرح ہماری آپسی بے تعلقی کا پکا ناطہ ڈھیلا ہوتے ہوتے پھر کس گیا۔

کوفت مجھے اس وقت ہوا کرتی تھی سجدرا، جب تمہیں ہمارا بے تعلقی کا تعلق بھی قبول کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی تھی۔ بعض اوقات تم میرے ساتھ بیٹھی ہوتیں اور اس دوران اچانک تمہارا دوست سیٹھ گھنشام داس آ نکلتا اور تم ایکدم گھبرا جاتیں جیسے پکڑی گئی ہو اور کہنا چاہتی ہو ـــــ ہم تو یونہی ذرا بیٹھے تھے ـــــ سیٹھ گھنشام داس نے ایک دفعہ مجھ سے کہا تھا سجدرا، یہ لو بلینک چیک، اس میں اپنے لیے جو رقم چاہو، بھر لو، اور سجدرا کو قانونی طور پر میرے حوالے کر دو ـــــ سیٹھ کے مانند مری قطعاً اس میں دلچسپی نہ تھی کہ تمہیں اپنی قانونی ملکیت بنائے رکھوں۔ میں صرف اس لیے چڑھ گیا تھا کہ اس نے تمہیں مفت طلب کیوں نہ کیا۔ آدرشوں کا سودا تو مفت میں ہی ہو تو ہو ـــــ ہاں، سجدرا، تم میری بے تعلقی کا ایک آدرش ہو، جس کی بدولت میرے جینے میں کوئی خلل واقع نہ ہوا۔ میں نے جیسے چاہا، ویسے ہی بے واسطہ تعلقات پیدا کیے مگر۔ مگر سچ پوچھو تو اپنی اس سہولتی زندگی سے موٹا ہو ہو کر میرا چلنا پھرنا دوبھر ہوتا گیا۔ تم اپنے گھٹنوں کے مسلسل درد سے چلنے پھرنے سے قاصر ہو سجدرا اور میں اپنے سُوجے ہوئے ذہن کے مسلسل درد سے میں نے اپنے سارے اولین آدرشوں کو سہولتوں میں گھٹا گھٹا کر صرف اپنی کوتاہیوں کی پرورش کی ہے جو اب اتنی بڑی ہو گئی ہیں اور میں اتنا کوتاہ ـــــ تم پوچھتی ہو سجدرا، مجھے یکلخت کیا ہو گیا ہے؟ مجھے کچھ ہونا تو اسی وقت شروع ہو گیا تھا، جب میں ذہنی طور پر تم سے الگ ہو جانے کے باوجود تمہارے جسم سے جسم جوڑ کر بدستور ٹھنڈا سا پڑا رہا۔ گذشتہ کئی ماہ سے مجھے تم سے الگ ہو جانے کی بڑی بے تاب خواہش ہو رہی ہے مگر اب بیٹھے بیٹھے میرے اعضار جڑ کر رہ گئے ہیں۔ مجھ سے اٹھنا ہو ہی نہیں پا رہا۔ میں کیا کروں؟

غصے میں مت آؤ سجدرا ـــــ ٹھہرو، مجھے اپنے لیے ایک آخری آدھا پیگ لے لینے دو ـــــ ٹھہرو ـــــ میں جو کہہ رہا ہوں، اسے صبر سے سنو اور اس پر غور کرو۔ غور کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے سے طبیعت کو قرار آ جاتا۔ اِن دنوں میں نے کئی بار فیصلہ کیا کہ تم سے طلاق لے لوں مگر ـــــ ہاں، سجدرا، میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ اب اِس عمر میں قانون نہ تمہاری موت کو روک سکتا ہے نہ میری۔ جب ہم مر کھپ جائیں تو اپنے آپ دونوں کی طلاق ہو جائے گی۔ جو فیصلے ہم زندگی میں نہیں کر پاتے، موت آپ ہی بیچ میں آ کے ہمارے وہ فیصلے کر دیتی ہے ـــــ نہیں، سجدرا، موت کے لیے اپنی جھولی سدا پھیلائے رکھو۔

حسین الحق

# چھلاوہ

ارے بھائی۔ بس دو منٹ کے لیے رُک جاؤ۔ ذرا یہ تو پتہ چلا لیا جائے کہ معاملہ کیا ہے؟

"نہیں نہیں —— یہاں سے چلو، ہمیں کیا ضرورت ہے کسی کے پھٹے میں ٹانگ اَڑانے کی؟"

کوئی بھی معاملہ ہو، بڑا یا چھوٹا، گھریلو یا محلّہ جاتی وہ ذرا سی اتھل پتھل سے پریشان اور بدحواس ہو جاتا اور میں اُسے لاکھ سمجھاتا رہتا، مگر وہ بندۂ خدا وہاں رُکنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، ہر ایسی جگہ سے جہاں کوئی انتشار، کشیدگی یا تناؤ کی کیفیت پیدا ہو رہی ہو، وہ کھسک جاتا۔

اس مرتبہ بھی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ محلّہ میں بلکہ دُور کے دو رشتہ داروں میں کچھ تلخ انداز میں گفتگو ہو رہی تھی۔ دونوں طرف کے نوجوان بار بار آستین چڑھا رہے تھے اور بُڈھے اپنے تجربوں کے پیشِ نظر اُنہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ میں خاندان اور محلّے میں ہی نہیں، شہر میں بھی ایک ذی ہوش، عقل مند، غیر جانب دار، امن پسند شہری کی حیثیت سے جانا جاتا ہوں —— اور وہ کہ میرا دوست بھی ہے اور قریبی عزیز بھی —— وہ بھی اوپر بیان کی گئی ساری صفتوں سے متصف ہے۔

مگر بس وہی ایک بات جو میں نے ابھی عرض کی، ذرا سی اتھل پتھل سے گھبرا جاتا ہے۔

اس معاملے میں میں اگر پڑ جاتا تو منٹوں میں معاملہ طے ہو جاتا اور فریقین کے درمیان کوئی خاص کشیدگی بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اس لیے میں چاہ رہا تھا کہ آگے بڑھ کر یہ معاملہ نپٹا دوں، مگر اُس نے میرے پیر پکڑ لیے، ہاتھ باندھ دیئے اور مونہہ سی دیا۔

میں نے اُسے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم جس سماج میں زندہ رہتے ہیں اُس کے دُکھ سُکھ اچھے بُرے، مطمئن اور منتشر ہر لمحے میں اگر ہمارا تعاون شامل نہیں رہے گا تو کل کو اگر مجھ پر یا تم پر کوئی کڑا وقت آن پڑا تب بھلا کون تمہیں سہارا دینے آئے گا۔ مگر اُس بندۂ خدا کی تو ذہنی نہج ہی ٹیڑھی دکھائی دیتی تھی۔

"۳۵ برس کے تو تم بھی ہو چکے ہو اور میں بھی۔ آج تک اُن سے کون سا کام پڑا ہے؟"

"اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ کبھی کوئی کام ہی نہ پڑے، آخر سماج ....؟"

"کیا سماج، سماج کی رٹ لگا رکھی ہے؟"

وہ ہاتھ پیر سے اُکھڑ گیا۔ "اس محلّے میں گھر ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ یہ ہمارا سماج ہے۔ باپ دادا نے گھر بنا لیا تو اس میں ہمارا کیا قصور؟ سماج کا مطلب ہے ذہنی اور رہائشی ہم آہنگی رکھنے والے کچھ افراد کا اجتماع۔ مگر یہاں تو ان میں اور ہم میں کوئی بات مشترک نہیں۔ نہ یہ ہماری طرح صحیح راستے کی صعوبتیں برداشت کر سکتے ہیں نہ ہم ان کی طرح جائز ناجائز ہر طریقے سے مال و دولت جمع کر سکتے ہیں نہ یہ ہماری طرح غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہہ سکتے ہیں نہ ہم ان کی طرح بڑے لوگوں کے تلوے چاٹ سکتے ہیں نہ ان کو تھانے میں بند ہونے اور پولیس کا ڈنڈا کھانے میں ہماری طرح شرم آ سکتی ہے۔ تو پھر ان کا ہمارا واسطہ کیا؟

"بھائی تمہاری بات صحیح ..... مگر ہمارے گھر میں کوئی موت ہو تو کاندھا دینے تو یہی لوگ آئیں گے۔ کل کو کوئی جھگڑا ہو جائے تو پھر انہی کے محفوظ گھر میں اپنے اہل و عیال کو منتقل کرنا ہوگا، رات کو چور آ جائے تو مدد کے لیے انہی کو پکارنا ہوگا۔ تمہاری بیوی اچانک آدھی رات کو دردِ زہ میں مبتلا ہو جائے اور کوئی دائی، نرس یا ڈاکٹر نہ ملے تو انہی کی کوئی ماں، بہن پھوپھی، دادی تمہارے کام آئے گی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے یار۔" وہ منمنایا ..... "مگر تم تو ان سالوں کو جانتے ہو نا؟ اور دیکھ ہی رہے ہو۔ ہم تو دُور کے رشتہ دار ہیں، اپنے ہی بھائی بھیا کو کس

---

• پی۔ جی ڈپارٹمنٹ آف اردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا (بہار)

طرح گالیاں بک رہے ہیں۔ یہ سب تو آپس میں
ہاتھیوں کی طرح ظالمانہ رُوپ اپناتے ہیں ——
نہیں ہم —— اور —— دیکھو، دیکھو —— لڑ گئے
سالے —— لڑ گئے "۔ اُس نے اُچھل کر میرا بازو پکڑ لیا۔
وہ کانپ رہا تھا۔
میں نے بھی دُور ہی سے سہی، مگر نظر جمائی۔
بات تُو تُو مَیں مَیں سے ہاتھا پائی تک پہنچ چکی تھی۔
" دیکھو، میری بات سمجھو —— جانے دو
—— میں ہی اکیلا آدمی ہوں جو اگر اب بھی بیچ
میں پڑ جائے تو دونوں ختم جائیں گے "۔
" مگر یار —— وہ سالا بھی ہے "۔
" کون ؟ "
" ارے وہی —— خلافت میاں کا لونڈا ——
جو قتل کے الزام میں ماخوذ ہے اور فراری مجرم ہے "۔
" نہیں —— وہ کہاں ہے ؟ "
" تم تو پاگل ہو —— وہ دیکھو —— دیکھو ——
ریوالور نکال لیا سالے نے "۔

میں جلدی سے اپنی جگہ پر ہی ایک کونے میں
دبک گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔
وہ —— خلافت میاں کا لونڈا —— دوسرے
گروپ کے ایک آدمی پر نشانہ لے رہا تھا۔
پھر گولی چلی۔ دھماکا ہوا۔ چیخ گونجی۔ لوگ
بھاگے۔ میں بھی کانپتے قدموں سے اپنے گھر کی طرف بھاگا۔
کمرے میں پہنچ کر جلدی سے بستر میں ڈھ گیا۔
میرے پیر بُری طرح کانپ رہے تھے۔ پھر پولیس کی وِسل
سُنائی دی اور میں اُچھل پڑا۔
" سب کھڑکیاں بند کرو۔ دروازے بند کرو "۔
میں پھنسے پھنسے لہجے میں بولا۔
بیوی گولی چلنے کی آواز سُن چکی تھی۔ دَوڑ دَوڑ
کر کھڑکیاں اور دروازے بند کرنے لگی۔
اصل میں خلافت میاں میرے پڑوسی ہیں۔
پولیس نے اُن کے گھر کی تلاشی لی —— اُن
کی چھتوں، دیواروں، دالانوں، کمروں اور آنگن
میں پولیس کے بُوٹوں کی ٹاپ گونجتی —— اور

زمین سے اُٹھتا ہوا ہر بُوٹ میرے سینے پر آکر ٹکتا۔
اور وہ حرام زادہ —— خلافت میاں
کا لونڈا ؟ —— وہ کمبخت کبھی ہاتھ آنے والا ہے؟
اس مرتبہ بھی گولی مار کر چھلاوے کی طرح کہیں
غائب ہو گیا ہوگا۔
کہیں جائے حرام زادہ مجھے اس سے کیا
لینا —— افسوس تو یہ ہے کہ اسی ہنگامے میں میرا
ناصر دوست اور قریبی عزیز بھی نہ جانے کدھر
چلا گیا —— اس قلندر کا بھی عجیب حال ہے ——
وہ بھی خلافت میاں کے لونڈے کی طرح چھلاوہ ہی
ہے۔ مگر اتنی بات ہے کہ اس کے رہنے سے بڑی
ڈھارس سی بندھی رہتی ہے۔ وہ کبھی بزدلی، خوف
اور فرار و گریز کی راہ اختیار نہیں کرتا۔

## بقیہ : نئی کتابیں

مگر ساتھ ہی ساتھ تاحیات ظہوری، نظیری، عرفی، ابوطالب کلیم اور طالب آملی ہی کا دم بھرتے رہے۔ البتہ خسرو ضرور اس سے مستثنیٰ قرار پائے ۔ اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ شبلی نعمانی نے بھی اپنی مشہور اور معرکتہ الآرا تصنیف "شعر العجم" میں امیر خسرو اور فیضی کے علاوہ اور کسی بھی ایسے ہندی النسل شاعروں کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا، جو واقعی توجہ اور تذکرے کے مستحق تھے۔

اس بے انصافی کے پس منظر میں پروفیسر خواجہ محمد حامد صاحب نے وقت کی ایک اہم اور بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے، اس لیے کہ میدانِ ادب کے وہ مردِ مجاہد، جن کے ساتھ زمانہ پورا پورا انصاف نہیں کر سکا۔ اگر ان کا تعارف نہیں کرایا جائے گا تو پھر یہ عظیم و توانا شخصیات وقت کے سمندر میں اپنا وجود کھو دیں گی۔

زیرِ نظر کتاب کو ہم مختلف عنوانات کے تحت کئی ابواب میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ جو صہبائی کے دور، تاریخی پس منظر، حیات و کارناموں، تحقیق و تنقید اور ان کے معاصرین پر پھیلے ہوئے ہیں۔ کتاب کا تیسرا اور خصوصی حصہ صہبائی کی تفصیلی سوانح حیات پر محیط ہے۔ شگفتہ طرزِ تحریر، زبان کا رچاؤ، فکر کی اُٹھان، قاری کے ذہن کو ایک منٹ کے لیے بھی کہیں نہیں بھٹکنے دیتی۔ —— قمر غفار

## بقیہ : آتش فشاں کے آنسو

گاڑی رُکی۔ سب سے پہلے بُرقعہ اوڑھے شہناز نیچے اُتریں اور ماں سے چمٹ گئیں۔ ماں کی بانہوں کا حلقہ تنگ ہو گیا۔ انہوں نے شہناز کو گلے سے لگا لیا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہوں نے کہا "شہناز میں بہت خوش ہوں ..... بے حد خوش ہوں کہ تم آئی ہو اور اپنے بھائی کے ساتھ آئی ہو۔" شہناز نے حیرانی سے پوچھا: "موسی آپ نے مجھے پہچان کیسے لیا؟" ماں نے کہا۔" امرت اور تیرے قدموں کی چاپ کو میں بھلا کیسے بھول سکتی ہوں۔ ماں تا کی کشش ہی ایسی ہے۔ شہناز جو آتش فشاں پہاڑ کی طرح نہ جانے کب اور کیسے پھٹ پڑتی تھی، اب ماں کے بازوؤں میں ممتا کی گرمی سے پگھل کر ایک معصوم بچے کی طرح روئے جا رہی تھی۔

اور میں نے زندگی میں پہلی بار آتش فشاں کو آگ کی جگہ آنسو بہاتے دیکھا تھا۔ ••

نگار نسیم

# عکس

اُف میرے خدا۔ یہ میں نے کیا دیکھ لیا۔ میرا وجود پارہ پارہ ہو کر لرزنے لگا ہے۔ دل کی گھٹن بڑھتی جا رہی ہے ـــ کاش میں نے یہ سب کچھ نہ دیکھا ہوتا۔ کاش اپنی خواہش کو میں نے دل میں ہی دبا دیا ہوتا ـــ بچپن سے لے کر جوانی کے آخر لمحوں کی یادیں میرے ذہن کو جھنجھوڑنے لگیں۔ اس وقت میں کوئی چھ برس کی تھی۔ ایک صبح سوتے میں میری ران پر اتنی زور سے چانٹا پڑا کہ میں بلبلا کر اٹھ بیٹھی۔ چاروں طرف دیکھا کوئی نہ تھا۔ ابا جان کیاری کے پاس بیٹھے تازہ گلاب دیکھ رہے تھے۔ اور حسبِ عادت قرآن پاک کی کوئی سورت بآوازِ بلند پڑھ رہے تھے۔ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ کیا ہوا تھا۔ خود ہی خیال کیا کہ غرارہ پہن کر سو رہی تھی۔ شاید سوتے میں اوپر اٹھ گیا ہوگا۔ یہی اباجان کے غصہ کی وجہ ہو سکتی ہے۔ کتنا غصہ تھا اباجان کو۔ ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ امی جان کو ذرا ذرا سی باتوں کس بُری طرح سے لتاڑتے تھے۔ اور دوسرے ہی لمحہ اُن کے بغیر کھانا بھی نہیں کھاتے تھے۔ جب اباجان اسکول سے پڑھا کر آتے تھے تو کیا مجال جو گھر میں کسی کی ذرا سی بھی آواز نکل جائے یا چڑیا تک بول جائے۔ بقول امی کے تمہارے باپ تھکے ہوئے آئے ہیں، آرام کی ضرورت ہے۔ یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں کہ بچے بھی اسکول سے تھکے ہوئے آئے ہیں ـــ کھیلنے اور چہکنے کی ضرورت ہے۔ بس رات کو اباجان کسی نہ کسی نشست میں ضرور جاتے۔ یہ نام میں بچپن سے ہی سنتی چلی آئی ہوں تو ہم بہن بھائی مل کر خوب دھما چوکڑی مچایا کرتے تھے۔

بچپن کی وہی شریر عادتیں۔ اوروں کے ساتھ ساتھ اباجان کی چیزیں بھی چپکے چپکے چھونا شروع کر دیں۔ ایک دن پین کا نب ٹوٹ جانے پر وہ طوفان برپا ہوا کہ خدا کی پناہ۔ صرف ایک چانٹا اس زور سے پڑا تھا کہ پیشاب نکل گیا۔ کچھ اور بڑے ہوئے تو ایک شامت یہ آئی کہ حساب اباجان نے پڑھانا شروع کیا۔ بس پھر کیا تھا۔ جیسے جیسے پڑھنے کا وقت قریب آتا، خون خشک ہونے لگتا۔ ڈانٹ پڑ جاتی تو آواز بھی نہ نکلتی۔ جوں جوں بچپن جانے لگا، توں توں سمجھ آنے لگی۔ اباجان کی عادتیں کتنی بُری ہیں۔ کبھی کوئی کام خود نہیں کرتے۔ گھڑے میں سے پانی لے کر بھی نہیں پی سکتے۔ ہم بچوں سے کبھی کھیلے بھی نہیں۔ ہنسی مذاق بھی نہیں۔ اتنی سخت مزاجی کہ ہر بات کا آرڈر۔ کسی بات میں نہ سننے کی عادت تو جیسے تھی ہی نہیں۔

پانچ منٹ اسکول جانے میں دیر ہو جائے تو سارا محلہ سر پہ اٹھالیں۔ سالن میں نمک مرچ تیز ہو جائے تو سالن کا پیالہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آنگن میں بکھر جائے۔ ہر وقت، ہر کام قاعدے کا، نپا تُلا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ ہر وقت رعب ہی رعب۔ پاس بلاتے۔ آرڈر ملتا۔ بیٹھو۔ ہم بیٹھ جاتے۔ کہتے کہو بیس بار۔ جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ زبان میں گندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر کہتے: کہو بیس بار دل کی بات نہیں مانتے۔ دل غلط کام کرواتا ہے۔ کس قدر اُکتا دینے والا بچپن تھا وہ ـــ ... خدا کی پناہ ...

اب اباجان مجھے اردو بھی پڑھانے لگے تھے آہستہ آہستہ پتہ چلا کہ اباجان شاعر ہیں۔ دل چاہا چوری چھپے پڑھیں اباجان کیا لکھتے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ اتنے سخت مزاج اباجان شاعر کیسے ہو سکتے ہیں اور ...... شاعری بھی ایسی کہ آہ .... دل تڑپ اُٹھے۔ کیا اباجان اندر سے اتنے نرم ہیں ـ؟؟ کیا اباجان کے دل میں بھی اتنے نرم گرم احساسات ہیں۔ یقین نہیں ہوتا کہ باہر سے اتنے سخت دکھائی دینے والے ہمارے اباجان اتنے حساس ہوں گے اور اتنا جذباتی کلام لکھتے ہوں گے۔ تو پھر یہ غصہ؟؟ شاید خاندانی میلن .....

اب پوری طرح ہمارا شعور جاگ چکا تھا اور اباجان کی پوری شخصیت ہمارے سامنے واضح ہو چکی تھی۔ اباہمیں آہستہ آہستہ بہت اچھے لگنے لگے۔ ہر بات میں مردانگی، حُسن وقار، نفاست پسندی ...

• ۳۴۲-سی ۵۸، شبلہ ہاؤس، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵-۱۱۰

ھنگ کا ڈھنگ۔ سبھی کچھ ابا جان میں بڑے نرالے
میں موجود تھا۔ ابا کا سارا کام میں دوڑ دوڑ کر کرتی
دل ہی دل میں خوش ہوتی۔ ابا خوش ہوتے۔ کہتے
شاباش۔ بہت اچھا جوتا چمکایا ہے میرا
آہستہ ابا کی شخصیت بدلتی جا رہی تھی۔ اب وہ پہلے
رح غصہ میں نہیں ہوتے تھے۔ اب ابا جان کو کسی
میں ہماری دخل اندازی بُری نہیں لگتی تھی۔ ابا جان
لیے پہنیے۔ یہ والا جوتا۔ اور ہاں یہ والا سوئٹر۔
یہ کالا سوٹ اور فلاں خوشبو لگا کر نشست میں
یے گا۔ آج ..... لائیے ابا جان میں کاٹ دوں
کے ناخن۔ بالکل گول کاٹوں گی۔ ذرا بھی کہیں
نہیں بچے گی۔ ابا مسکرا کر قینچی تھما دیتے۔

ایک دن ابا کے دوست جنہیں ہم چاچا کہتے تھے
بود تھے۔ اُنہوں نے فرمائش کی کہ کوئی تازہ غزل
جائے۔ ابا جان شروع ہوئے۔ آخر میں جب مقطع
ہے تھے کہ آخری لائن بے ساختہ میرے مونہہ سے
گئی۔ بڑے تعجب سے مجھے دیکھا اور جب چچا چلے
تو پاس بلایا۔ مجھ سے بولے " ذرا پڑھنا۔ اس وقت کیا پڑھا
مارے ڈر کے کھڑے کھڑے پاؤں کپکپانے لگے۔
ت جواب دے گئی۔ سمجھا کر بولے۔ یہ تمہاری پڑھائی
دن ہیں۔ فضول کاموں کی طرف توجہ نہ دو۔

وقت گزرتا گیا۔ نہ جانے کس جذبے کے تحت
نے افسانے لکھنے شروع کئے۔ چپ چاپ طبع آزمائی
کرتے ایک دن وہ آیا کہ چھوٹے موٹے پرچوں میں وہ
انے چھپنے لگے۔ شوق بڑھتا گیا لیکن ابھی تک اتنی
ت نہ تھی کہ ابا جان کو دکھا سکوں کہ کیسا لکھا ہے۔ ڈر
کہ کہیں برسوں کا گیا طوفان پھر واپس نہ آجائے اور پھر
دن امی نے تذکرہ کر ہی دیا۔ قیامت آگئی۔ سارے
چے طلب کئے۔ ڈرتے ڈرتے ہم نے وہ تمام پرچے
دے دئے، جن میں ہمارے افسانے چھپے تھے۔
دن بعد بلایا۔ افسانہ لکھنے کی تمام باریکیاں سمجھائیں۔
کہا کہ آئندہ کسی پرچہ میں بھیجنے سے پہلے کسی دکھا دیا
ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ یہ کیا بات ہوئی۔
جیسے جیسے ہمارے قدم جوانی کی دہلیز پر بڑھتے گئے

وہی ابا ہمارے آئیڈیل بنتے گئے۔ ان کی ہر بات میں آن
اور ہر ادا میں شان اور وقار نظر آنے لگا۔ مجھے ابا جان
سے اس قدر محبت ہوئی کہ جس کو کہنا اور ظاہر کرنا میرے
بس میں نہیں۔ تمام عزیزوں اور یہاں تک کہ بھائیوں
کی مرضی کے خلاف ابا جان نے اپنی چاروں بیٹیوں میں
سب سے زیادہ مجھے پڑھایا۔ ان کی نظرِ عنایت سب
سے زیادہ مجھ پر رہتی تھی۔ ابا نے ایک دن کہا تھا مجھے
صرف مہر میں اپنا عکس نظر آتا ہے۔ ابا نے اپنے ایک
خط میں مجھے غزل لکھا تھا۔ ابا مجھ سے ہر طرح کی باتیں
بے تکان کیا کرتے تھے۔ امی ٹوکا کرتیں تو کہتے تھے۔ یہ
بیٹی نہیں، بیٹا ہے۔ زمانہ کی اونچ نیچ اور اپنا تجربہ
بتاتا رہتا ہوں۔ تم ٹوکا مت کرو۔ کاش میں کبھی
ابا کو بتا سکتی کہ میں آپ کو کتنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے
اپنا آئیڈیل اور میرے تصور کا مکمل شاہکار نظر آتے ہیں۔
آپ ہر فن میں اُستاد ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے میں
آپ کی تمام خوبیوں کی تعریف کروں۔

عمر کے تیس سال کیسے پر لگا کر اُڑ گئے تھے۔
میں نے ایم۔ اے کر لیا تھا سب کی شادیاں ہو چکی تھیں۔
وقت اور ماحول بدلتا جا رہا تھا۔ ابا کا خاندان طویل
ہوتا جا رہا تھا۔ اور امی خوش و خرم و مطمئن نظر آتی
تھیں۔ ابا کا غصہ اولاد و نواسے نواسیوں اور
پوتے پوتیوں نے ختم کر دیا تھا۔ سب ابا کے کندھوں پر
چڑھے رہتے تھے۔ میری شادی کے بعد ابا بہت
غمگین رہنے لگے تھے۔ ان کی والہانہ محبت کا ثبوت صرف
وہ خطوط ہیں جو وہ مجھے لکھتے رہے ہیں۔

اب ابا کمزور ہو چلے تھے۔ چوڑا چکلا سینہ
نرم پڑنے لگا تھا۔ خود کہا کرتے تھے، اب ہم
چراغِ سحری ہیں اور ایک دن ابا کا یہ کہنا درست
ثابت ہوا۔

ایک ہی ہفتہ پہلے کی بات ہے۔ ابا کی
اچانک طبیعت خراب ہوئی۔ پروسٹریٹ کا آپریشن
ہونے والا تھا۔ سارا گھر مہمانوں سے بھر گیا۔ ابا مسکرا
مسکرا کر سب سے باتیں کر رہے تھے۔ گھر میں تل رکھنے
کی بھی جگہ نہیں تھی۔ جس کو جہاں جگہ ملی پڑ کر سو گیا —

صرف میں ہی تو رہ گئی تھی، ابا بھی سو چکے تھے۔ ہر بستر
پر دو دو تین تین پڑے تھے۔ امی کو بھی بچوں نے
گھیرے میں لے رکھا تھا۔ صرف ابا کا بستر خالی تھا۔
میں چپکے سے ابا کے لحاف میں گھس گئی اور اُن کی پیٹھ
سے چپک کر ایسی سوئی کہ ہوش ہی نہ رہا۔ سویرے
ابا کلبلائے۔ ارے بھئی، یہ میرے پاس کون لیٹ
گیا۔ میں ہوں ابا جی۔ ابا نے چھوٹے بچے کی طرح
مجھے سینے سے چمٹا لیا تھا۔ میری آنکھیں محبت کے
اس لمس سے بھر آئی تھیں۔

آپریشن ہوا۔ تیسرے دن ابا ہم کو چھوڑ کر چل
دئے۔ جس کی تصور سے ہی کلیجہ مونہہ کو آنے لگتا تھا۔
دل بیٹھنے لگتا تھا۔ پاگل ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ وہ ہو
چکا تھا۔

آہ ابا ..... اب میں کس کے لیے لکھوں گی؟ کیا
لکھوں گی؟ کون خوش ہوگا۔ میرے اس ادبی ذوق کے
جنم داتا مجھ کو تنہا ..... کئی دن گزر گئے۔ ہر پل ابا کی
باتیں ہوتی رہتیں۔ ابا سب کو خواب میں نظر آتے۔ کسی
کو کسی طرح کسی کو کسی طرح۔ میرے دل کی خلش دل ہی
میں رہی۔ ابا مجھے نظر کیوں نہیں آتے؟ کیا مجھ سے ناراض
ہیں؟ زیادہ سے زیادہ تلاوت کرتی۔ درود و دعائیں
پڑھتی، ثواب پہنچاتی، تصور کر کے لیٹتی۔ ابا نظر نہیں
آتے۔ کاش میں بھی ابا کو دیکھتی۔ میں ابا کے سب سے
زیادہ قریب تھی۔ بیماری میں بھی، زندگی میں بھی،
خوشی میں بھی، غم میں بھی ابا سب سے زیادہ مجھے چاہتے
تھے۔ کیسا خوش ہوتے تھے، جب ابا کے پاؤں دھلاتی،
سر دھلاتی۔ پھر کیا وجہ ہے! وقت گزرتا گیا میری
بے چینی بڑھتی گئی۔ ابا کاش ایک بار مجھے بھی نظر آئیے۔
کیسے ہیں؟ کہاں ہیں۔ آپ کی ایک ایک یاد میرے ذہن
کے ٹکڑے ٹکڑے کئے دے رہی ہے ..... ابا نظر آئے۔
..... اُف میرے خدا ..... یہ میں نے کیا دیکھ لیا .....
میرا وجود بکھر رہا ہے۔ یہ سب کیا ہے۔ ابا کی پاکیزگی اور
میری والہانہ محبت کا یہ انداز۔ ابا اور میں ......
کاش میں نے ابا کو خواب میں دیکھنے کی خواہش نہ
کی ہوتی۔ کیا میری محبت کی انتہا صرف یہی تھی؟؟ ●●

ایس - ایس - چاولہ

# آتش فشاں کے آنسو

اُن سے کی باتوں سے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ماں، بٹیا، بہو اور پوتا ہوں۔ تین سیٹیں اُن کی تھیں۔ اس فرسٹ کلاس کے ڈبے میں۔ چوتھی سیٹ میری تھی۔ تب بنگلہ دیش نہیں بنا تھا۔ وہ پاکستان ہی کا ایک حصّہ تھا۔ وہاں کے لوگ جب مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان جاتے تو کلکتہ سے ہوتے ہوئے امرتسر اور اس کے آگے لاہور چلے جاتے تھے۔

یہ مسلم خاندان بھی مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان جا رہا تھا۔

اس ڈبے میں قدم رکھتے ہی مجھے ایسا لگا، جیسے وہ گھٹن کے احساس میں مبتلا ہیں۔ ممکن ہے میری موجودگی سے اُن کی آزادی میں کوئی خلل واقع ہوا ہو۔ اُن کی طرح میں بھی بے بس تھا۔ میں نے ٹی ٹی آئی سے کہا بھی کہ مجھے کسی اور ڈبے میں جگہ دے دے۔ اُس نے بڑا رُوکھا جواب دیا تھا۔

اُس نوجوان نے بھی ٹی ٹی آئی سے بات کی تھی اس کو تو اس نے بڑا کورا جواب دیا تھا: اگر تمہیں کوئی الجھن ہے تو کسی دوسری گاڑی سے چلے جاؤ۔ اور پھر گاڑی چل پڑی تھی۔

یہ لوگ بنگالی بول رہے تھے۔ ماں کہہ رہی تھی کہ ہم لوگ کہاں پھنس گئے۔ ان لوگوں سے مشکل سے پیچھا چھڑایا تھا اور پھر یہ ہمارے پلّے پڑ گئے۔ کھانے پینے، بیٹھنے، سونے تک کی دقّت ہے اور پھر وہ اپنے بیٹے پر برس پڑی تھیں۔ ارے تیرے کو اتنی عقل نہیں تھی کہ تُو چاروں سیٹیں بُک کرا لیتا۔ آرام سے تو سفر کرتے۔ لڑکے نے کہا کہ یہ ریزرویشن تو ڈیڈی نے ہی کی تھی۔ تب وہ اپنے شوہر پر برس پڑی، جو وہاں پر موجود نہیں تھا۔ چار دمڑیاں بچائیں اور ہمیں یہاں نرک میں دھکیل دیا۔ ایک تو ماہ جون کی گرمی اور دوسرے یہ اُلجھن۔ آرام سے اُٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتے۔ اللہ ہی بھلا کرے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ میں بنگالی جانتا ہوں۔ وہ اپنی رَو میں بولتی جا رہی تھیں۔ میں خاموشی سے سنتا جا رہا تھا۔ اگر اُن کی آزادی میں فرق آیا تھا تو میں بھی اپنی جگہ ایسے ہی احساس میں مبتلا تھا۔ اور پھر یہ نہ ختم ہونے والا لیکچر، حالانکہ میں ڈاکٹر ہوں، مگر اس کا کیا علاج تھا میرے پاس!

بردوان میں ایک بار پھر میں نے سیٹ بدلنے کی کوشش کی مگر کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اور پھر ایسا محسوس ہوا جیسے یہ آواز اور بات چیت کا انداز بڑے مانوس ہوں۔ میں چکرا گیا۔ اس دفعہ وہ عورت پنجابی میں اپنی بہو کو ڈانٹ رہی تھی۔ وہ ہر فقرے کو دُہراتی تھی۔

"ارے تیرے کو عقل نہیں آئے گی، ارے تیرے کو عقل نہیں آئے گی۔" اور مجھے ایسا لگا جیسے ماضی کے سخت پہاڑوں کی اوٹ سے پیار کے ٹھنڈے پانی کا چشمہ پھوٹ کر بہہ نکلا ہو۔ انہیں پہچان لینے پر میں اپنے پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں نے نوجوان سے انگریزی میں مخاطب ہوتے ہوئے کہا: "آپ دروازہ بند کر لیں میں کہیں نہ کہیں رات کاٹ لوں گا۔ اور صبح سات بجے آ جاؤں گا۔" وہ عورت اس بار انگریزی میں بولی "بیٹا، انہیں کہہ دو کہ ہمیں ایسی ہمدردی نہیں چاہیے۔ ایک رات کی بات ہے اگر جہنم میں بھی کاٹنی پڑی تو ہم خوشی سے کاٹ لیں گے۔ یہ تو کم از کم آرام سے سو سکیں گے۔" میں نے اور کچھ کہا سُنا نہیں اور باہر چلا آیا۔ کنڈکٹر دیکھنے اور سونے چلا گیا تھا۔ سو میں اس کی چھوٹی سی سیٹ پر آرام سے بیٹھ گیا۔ اپنے ساتھ دو کتابیں لے کر آیا تھا۔ سوچا ان کو پڑھتا رہوں گا۔ مگر ہال کی کھڑکی سے ماضی کی طرف کا پردہ آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوا تو میں سب کچھ بھول کر ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔

میری بڑی بہن تھی۔ امرت کور۔ مجھے اس سے بڑا پیار تھا۔ وہ مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی، میرے کپڑے بدلتی۔ مجھے پڑھنا لکھنا سکھاتی۔ رات کو ہمیشہ اس کے ساتھ سوتا تھا۔ جب میں چار سال کا ہوا تھا پرماتما نے اُسے اپنے پاس بُلا لیا۔ میں بہت رویا تھا

• ۴۶/سی، پی کے ٹی ۱۴/اے، ڈی ڈی اے فلیٹس، کالکاجی ایکسٹنشن، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

گھر یا تو مجھے میری بہن واپس لا دو یا مجھے اس کے پاس بھیج دو۔ ایسے میں امرت کور کی سہیلی، دوپٹہ بدل بہن اور پڑوسن شہناز نے میرے زخموں پر مرہم رکھا تھا۔ یہ امیر ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ یہ لڑکی گھر بھر میں ڈکٹیٹر کے نام سے مشہور تھی۔ اکثر اسے آتش فشاں پہاڑ بھی کہا جاتا تھا، جو نہ جانے کہاں اور کب پھٹ پڑے۔ یہ خود سر لڑکی اپنی بات منوا کر ہی دم لیتی تھی۔ جب میں چھ سال کا ہوا تو ہماری تبدیلی ہوگئی۔ شہناز سے بچھڑتے ہوئے میں پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا۔ اس کے آنسو بھی بے قابو تھے۔ رفتہ رفتہ زخم مندمل ہوگئے۔ یادیں سینے میں دفن سی ہوکر رہ گئیں۔ لیکن پرانے زخم کی طرح اب ان میں ٹیس سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پرانے زخموں اور پرانی یادوں کا رشتہ اٹوٹ ہے۔

شہناز کا اندازِ گفتگو ایسا تھا کہ وہ فقرہ دہراتی تھی۔ اس کا یہ انداز اب بھی قائم تھا۔ اور جب مجھے یقین ہوگیا کہ یہ شہناز بہن ہیں تو میرے لیے دو راستے تھے۔ یا تو میں انہیں پرانا رشتہ یاد دلاتا اور یا خاموشی سے باہر چلا آتا۔

جس شدت سے وہ مجھے چاہتیں اور پیار کرتی تھیں، اس کے پیشِ نظر مجھے پرانا رشتہ جتانا مناسب معلوم نہیں ہوا۔ اگر وہ پرانے رشتے کو اپنانے کو تیار نہ ہوتیں ـــ تو ـــ تو میرے سارے سپنے بکھر جاتے۔ اور ایک بھرم یہ کہ اگر امرت کور دنیا میں نہیں رہی تو شہناز بہن کا پیار مجھے ہمیشہ مل سکے گا، وہ شاید ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا۔ میں نے سوچا، مناسب وقت دیکھوں گا تو بات کرلوں گا۔ نہیں تو اپنے سپنے سجائے رکھنے میں کیا قباحت ہے اور ان سپنوں کے ٹوٹنے سے مجھے کیا ملے گا۔

صبح کے سات بجے تھے۔ میں اپنے ڈبے میں لوٹا۔ میں ساری رات جاگتا رہا تھا۔ ناشتہ کیا اور نیند کے جھونکوں میں کھو گیا۔ اچانک میری نیند کھل گئی۔ ان کا ایک سال کا بچہ میرے کپڑوں سے کھیل رہا تھا۔ دادی کا بھرپور تھپڑ اس کے گال پر پڑا اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ گرج رہی تھیں۔ ارے تو کسی کو چین سے سونے نہیں دے گا۔ اری بہو تجھ سے بچہ نہیں سنبھالا جاتا۔

دوپہر کو کھانا کھاتے وقت اس نوجوان نے مجھے کھانا پیش کیا۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کچھ ذرا سا یوں ہی اٹھا لیا۔ بہت کڑوی باتیں تھیں، مگر مجھے ان کی عادت کا پتہ تھا۔ میں مسکرا دیا۔ انہوں نے بڑے روکھے لہجے میں کہا تھا۔ کھانا گھر کا بنا ہوا ہے اور ہم نے بھی کھایا ہے اُن میں کوئی زہر نہیں ملا ہوا ہے۔ دوپہر بھر میں خوب سویا۔

ویسے کل رات سے آج برہمی، بے اعتنائی کم تھی۔ جہاں کل نفرت کے طوفان چل رہے تھے، آج کے موسم میں کچھ پیار کی نمی تھی۔ اُنہوں نے بڑے اُکھڑے لہجے میں پنجابی میں پوچھا: "کہاں کے رہنے والے ہو؟" میں نے کہا، "تقسیم وطن سے کافی پہلے میں کبھی سیالکوٹ میں رہتا تھا۔" تڑپ کر اُنہوں نے پوچھا "سیالکوٹ میں کہاں؟" "پیرس روڈ پر ایک کوٹھی میں"۔ پھر میں بے بس ہو گیا۔ بے اختیار میرے مونہہ سے نکلا۔

"شہناز بہن۔ میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں"۔ اور وہ ایسے بلبلائیں جیسے کسی بچھو نے اُنہیں ڈنک مارا ہو۔ شاید وہ اس بات پر چونکی تھیں کہ میں اُن کا نام کیسے جانتا ہوں۔ مگر میں نے بات جاری رکھی ـــ "تھوڑی دیر میں دلی آجائے گا۔ میری ماں مجھے اسٹیشن پر لینے آئیں گی۔ میں وطن تین سال کے بعد لوٹ رہا ہوں۔ ماں سے بس میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ماں امرت کور تو ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی، لیکن اس دفعہ میں امرت کور کی جگہ شہناز بہن کو، اُن کی بہو اور بیٹے اور پوتے کو ساتھ لے کر آیا ہوں۔ بہن بھائی کو اکٹھا گھر آتے دیکھ کر کون ماں خوش نہیں ہوگی۔

وہ بجلی کی طرح تڑپی۔ متانیکیں۔ اُنہوں نے بڑے زور سے ایک مُکا میری پیٹھ پر دے مارا اور پگڑی کے نیچے سے میرا کان ڈھونڈ کر پکڑ لیا اور پھر کہنے لگیں "ارے۔ یہ تو ہے ارے یہ تو ہے اور کل سے خاموش کیوں تھا۔ تو نے مجھے بے وقوف بنایا ہے۔ تجھے اس کی کڑی سزا دوں گی۔ ویسے تجھے دیکھتے ہی کہیں امرت کور کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے گھوم سی گئی تھی۔ اور تو بے اختیار یاد آیا تھا۔ تو مجھے کل رات ہی بتا دیتا تو میں تو ساری رات نہ خود سوتی، نہ تجھے سونے دیتی ـــ گزرے، سنہرے دنوں کو یاد کرتے۔ خوب خوب باتیں کرتے۔ گزرے ہوئے ایک ایک دن کی ایک ایک بات دُہراتے۔ آج کل اپنے ملتے ہی کہاں ہیں۔ نفرت بھری اس دنیا میں کچھ چین، پیار اور سُکھ کے سانس لیتے۔ وہ ذرا رکیں تو میں نے کہا۔ آپ کا رویہ ذرا سخت تھا اور میں نے آپ کو بردوان گزر جانے کے بعد ہی پہچانا تھا۔ اس وقت آپ نے اپنی پرانی عادت کے مطابق کسی بات کو دُہرایا تھا۔ اگر آپ اس رشتہ کو ماننے سے انکار کر دیتیں تو جو خوب صورت سپنے میں نے اپنی آنکھوں میں آج بھی سجا رکھے ہیں، اُن کے اتنے ٹکڑے ہو جاتے کہ میں پھر اُن کو یک جا نہ کر پاتا۔ چنانچہ جو ایک بھائی کو کرنا چاہیے تھا وہی میں نے کیا۔ میں ڈبہ چھوڑ کر چلا گیا تاکہ آپ آرام سے سو سکیں۔

اب وہ اپنے کئے پر نادم تھیں۔ کہنے لگیں "میری زبان جل جائے کہ میں نے اپنے بھائی کے لیے اتنے سخت الفاظ استعمال کئے۔ اچھا جو ہوا ہو گیا۔ اب اس پر کیا پچھتانا۔ ہاں۔ اب بتا موسی کیسی ہیں؟ تیری شادی ہوگئی؟ کتنے بچے ہیں؟ کیا کر رہا ہے؟"

میں نے کہا، "شادی نہیں کی ہے۔ آپ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ میرے بھیا ڈاکٹر بننا اور میں ڈاکٹر بن گیا۔

اب ان کی آواز میں کڑک تھی۔ "شادی کیوں نہیں کی۔ میں دلی میں رک کر تیری شادی کی بات پکی کر کے جاؤں گی۔ دیکھوں کیسے شادی نہیں کرتا۔ پھر اپنے بیٹے بہو سے بولیں۔ ارے سامان باندھو۔ ہم دلی میں رکیں گے۔ وہاں تمہاری نانی کا گھر ہے اور یہ تمہارے ماموں لگتے ہیں۔ آدھ گھنٹہ پہلے تو کوئی رشتہ داری ہی نہیں تھی اور اب رشتہ داری کے بندھن اتنے مضبوط تھے کہ اُن کو کوئی توڑ نہ سکتا تھا۔

ماں کو میں نے دُور سے دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔

(آگے ص ۶۳ پر)

# مورچے پر

راجو اس کے اٹھنگ گھٹنوں میں چہرہ گڑائے گھٹنوں کے سہارے بیٹھا ہے۔ وہ اُس کی گرم سانسوں کی پُھرر پُھرر سے پریشان ہو گئی ہے۔ بٹّی آہستہ سے اس کے بائیں بازو کی ٹیک لے کر اُس کی گود میں کُھلے پڑے ایک رسالے کے صفحات کو اتنی توجہ سے گھور رہی ہے، گویا پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ بولی کچھ نہیں — اسے حیرت ہو رہی ہے۔ اب تک تو بٹّی اُس سے "اُس فوٹو کے نیچے کیا لکھا ہے ممّا اور اس کے..... اور یہاں.. ..." جیسے تمام سوالات پُوچھ چکی ہوتی۔

وہ عجیب سی ذہنی حالت سے دوچار ہے! حیرت کا نقاب اوڑھے دماغ ہوشیار ہے کہ پہلے ان دونوں میں سے کوئی کچھ بولے تو وہ ان سے مخاطب ہو — ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں بھی اسی انتظار میں ہوں کہ پہلے وہ ان کی طرف متوجہ ہو تو وہ کچھ کہیں۔ صحیح صورتِ حال یہی معلوم ہوئی۔ نہ وہ اس کی سنجیدگی کی دہشت میں جکڑے بیٹھے ہیں۔ اچانک ذہن کے کسی گوشے میں رینگتے ہوئے ایک شبہے نے سر اُٹھایا۔ آخر وہ اتنے خاموش کیوں ہیں اور اس سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟

اسے لگا کہ اس کے چہرے پر کانٹوں کے چھتّے کے چھتّے اُگ آئے ہیں اور سارا شعور جو کتنے محافظ کی طرح ان کانٹوں کی نوکوں کے پاس کھڑا ہو گیا ہے۔ وہ جو بھی کہیں گے، کیا کہیں گے؟

ہو سکتا ہے کہ اس کا شک بے بنیاد ہو۔ وہ اس سے کسی فلم کی فرمائش کرنا چاہتے ہوں یا سیر سپاٹے کے لیے اصرار کرنے آئے ہوں۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ بٹّی فطرتاً نہایت بے صبر اور نڈر ہے۔ جو بھی کہنا ہوتا ہے، اس کے لیے نہ کوئی تمہید باندھتی ہے نہ جھجکتی ہے۔ پھر ان تک ابھی وہ بات پہنچ ہی کیسے سکتی ہے؟ ابھی تو سرکاری طور پر اس اطلاع کی نہ توثیق ہوئی ہے نہ ہی اخبارات میں فہرست شائع ہوئی ہے کہ اُنہیں پاس پڑوس سے اس حادثے کی اطلاع مل جاتی۔ یہ تو اودھی بھیّا کو ہیڈکوارٹر سے بھنک مل گئی ہے..... اور اُنہوں نے اُسے آ کر بتایا ہے۔

"ہیڈکوارٹر کے پاس اطلاع آ گئی ہے...... سدیپ از نو مور..... قید خانے میں مہینوں پہلے اس کی موت ہو گئی تھی۔ کل جو لسٹ آئی ہے، اس میں اس کا بھی نام ہے....."

لڑائی ختم ہوئے آٹھ ماہ سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ پرسوں تک اس کے پاس سدیپ کے گمشدہ ہونے کی اطلاع تھی، جو لڑائی ختم ہونے کے فوراً بعد اسے ہیڈکوارٹر سے بھیجے ہوئے تاریں دی گئی تھی۔ جب جب دونوں ملکوں کے درمیان قیدیوں کا تبادلہ ہوتا..... گمشدگان کی فہرست آتی.....اس میں سدیپ کا نام نہ ہوتا تو وہ خود کو آنے والی لسٹ کی بنا پر سمیٹنے کی کوشش کرتی۔ پاکستان سے آنے والے اگلے بیچ میں...... بھیجی جانے والی اگلی لسٹ میں سدیپ ضرور ہوں گے.... ضرور ہوں گے....

"ایک آدھ روز میں تمہارے پاس توثیق کا تار آ جائے گا....." اُنہوں نے کہا تھا۔ "میں نہیں چاہتا ہیڈکوارٹر سے ایک بیک تار پا کر تم غیر متوقع صدمے کا شکار ہو..... یو ہیو ٹو بی بولڈ..... خود کو سمیٹ لو..... تمہیں ہی بچوں کو بھی خبر دینی ہے۔ آئی نو۔ وہ سدیپ سے کتنے اٹیچڈ ہیں۔ ان کے لیے یہ خبر ایک صدمہ ہوگی۔ ..... بٹ یو ہیو ٹو ہینڈل اٹ مور کیئر فلی...... اُنہیں ذہنی طور پر مضبوط بنانا ہے۔ وہ صرف تمہیں کر سکتی ہو..... تم....."

کاش! اودھی بھیّا اسے یہ اطلاع نہ دیتے..... سدیپ کو لے کر وہ طویل عرصے سے تشکیک کے خلا میں جھول رہی ہے۔ اُنہیں پتہ نہیں، یہ تشکیک ہی تو اس کا حوصلہ بن کر اُسے زندگی سے جوڑے ہوئے تھی۔ شاید اس تشکیک کے سہارے ہی وہ کسی پختہ جلد میں محفوظ کرم خوردہ صفحات کی طرح خود کو سنبھالے بھی رکھتی..... اب!

○ ۴۲، پنکار نگر، باندرا الیسٹ، ممبئی ۴۰۰۰۵۱ □ اڈیٹوریل سکشن، روزنامہ اُدت وانی، جگسلائی، جمشید پور ۸۳۱۰۰۶

... اس کے لیے ایک ایسا سوالیہ نشان بن گیا ہے، جس کا جواب اس کے پاس نہیں ہے۔ وہ سوچ رہی ہے۔ سوچ کے اندھے کنویں میں ڈوبی ہوئی۔

"ناؤ یو ہیو ٹو ایکٹ بوتھ دی پارٹس" اودستی بھیا اسے ترکیب بتا رہے تھے۔ اسی ترکیب کے سہارے وہ خود کو اس زمین پر کھڑا ہونے اور کھڑا کرنے کی کوشش کر رہی ہے جیسے مہاجر ہونے کے بعد کوئی گھر پاتا ہے۔"

"مضبوطی کہاں سے آتی ہے؟ کہیں سے نہیں۔ وہ اپنے اندر ہوتی ہے۔ بس اُسے پہچاننا ہوتا ہے۔ تمہارے اندر ہے، اُسے پہچاننے کی کوشش کرو۔ تم پا لوگی تو انہیں بھی دے سکو گی۔" انہوں نے اس کے شانے تھپتھپائے تھے اور وہ مضبوطی کی تلاش میں اپنے اندر ہاتھ پاؤں پٹک رہی تھی۔

چہرہ صفحات سے الگ کیا۔ اس نے بچّی کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی خاموشی سے سہمے ہوئے تھے۔

"بولو؟"

ان کے چہروں کو جیسے چھوٹ گئی۔ سہما پن چھٹک گیا۔ "تم نے کہا تھا نہ کہ تم ہمیں سیٹر ڈے کو شاپنگ کے لیے لے جاؤ گی؟" بچّی نے اُسے اس کے وعدے کا واسطہ دیا۔ "یاد ہے نا" راجو نے بھی یاد دلانا چاہا۔

"کہا تو تھا۔"

بچّی اتاولی سی بولے جا رہی تھی: "تم نے راجو بھیا کو اسٹیل ہینڈل والا ریکٹ دلانے کا پرامس کیا تھا نا! اور میرے لیے اسکیچ پینس کا؛ اور یہ بھی کہا تھا کہ سیٹر ڈے کو شیور چلوگی۔ آج سیٹر ڈے ہے ..... اور سنو مما! ہم آج تم سے کوئی بہانہ نہیں سنیں گے، تمہیں چلنا ہی پڑے گا۔ چاہے مائیگرین ہو رہا ہو، یا موڈ ہو، نہ ہو۔ ناٹ ایون .... آج رک جاؤ لیے ..... ٹی وی پر "فادر ڈیئر فادر" آ رہا ہے۔ اُسے دیکھتے ہیں، کل چلیں گے ...." بچّی نے آنا کانی کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔

انہیں سمجھا سکتی ہے؟ کن الفاظ میں اور کیسے؟ اپنے ٹوٹنے کے المیے سے گزرنا جتنا جان لیوا ہے۔ اس سے کئی گنا زیادہ اذیت ناک دوسروں کو اس صورتِ حال میں دھکیلنا۔

"کیا سوچ رہی ہو مما؟"

"پرامس از پرامس۔" اس نے آواز میں مضبوطی پرو کر کہا اور اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اندر خانۂ دل میں اُمنڈتے ہوئے بادل کہیں آنکھوں میں نم ہو کر برسنے نہ لگیں۔ اس سے پہلے۔

بلند آواز میں کملی کو پکارا۔ انہیں تیار کرنے کی ہدایت دی۔ یہ بھی بتا دیا کہ وہ ان لوگوں کا کھانا نہ بنائے۔ وہ باہر ہی کھا کر آئیں گے۔ دونوں نے سُنا تو خوشی سے پاگل سے ہو گئے۔ اُسے گھیر کر دائرے میں ناچنے لگے۔ کملی نے بڑی مشکل سے دونوں کو پکڑ کر قابو میں کیا اور دھمکاتی ہوئی کمرے سے باہر لے گئی۔ کملی کی بڑبڑاہٹ اُسے سُنائی دیتی رہی —

"تم لوگ خشانٹ تیار نہیں ہوئیگا تو مما تم کو ادر ہی چھوڑ جائے گا ..... سمجھا؟"

گھومنے جانا ہو ..... میس کی پارٹی ہو ...

نئے سال کے جشن کے لیے کہیں میز مخصوص کروائی ہو .....

اپنی سالگرہ ہو یا اس کی — بس ایک ہی اصرار! اصرار نہیں گویا حکم ہوتا — سفید ساڑی پہنو۔ تم نہیں جانتیں کہ تم سفید ساڑی میں کیا لگتی ہو .... ڈریم سویٹ۔ غنیمت سمجھو کہ میں تمہیں اپنی گاڑی میں لے جاتا ہوں ورنہ ایمبولینس کو فون کرنا پڑ جائے .... اس کا بیچارہ کرو۔"

وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی۔ "ٹھیک ہے ..... میں بس سے آتی ہوں۔ تم ایمبولینس والوں کو فون کر دو۔ دیکھیں تو سہی کتنے زمین بوس ہوتے ہیں۔"

"تو، تو، تو! دماغ خراب ہوا ہے میرا جو بیٹھے بٹھائے مصیبت مول لوں؟ کسی کی نیت خراب ہو گئی تو .....؟"

"چھوڑو —" وہ اس کی بلائیں لینے والے انداز میں کہتی۔ "اسی لیے تو میرا بائی بنا کے لے چلتے ہو۔" سدیپ پر اس کے طعنے کا کوئی اثر نہ ہوتا۔

"وہاٹ میرا بائی —؟ سی۔ یو لُک لائک ہنسنی! سمجھیں مادام! اور اس آمریت سے چھٹکارا ملتا تو بس ایک دن۔ شادی کی سالگرہ کے موقع پر۔"

"آج تم لال، نیلی، پیلی، کالی کچھ بھی ہو سکتی ہو۔" الماری کھولتے ہی ہاتھ آرگنڈی کی سفید ساڑی پر چلا گیا۔ سفید ہائی نیک کا بلاؤز۔ موتیوں کے کرن پھول اور دو لمبی لڑیوں والا (ناف کو چھوتا ہوا) ہار! بس مانگ اور پیشانی کو نہیں چھوا تھا اس نے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے تیار ہو کر کھڑی ہو گئی تو پایا کہ سدیپ کا وہی مانوس 'ڈریم سویٹ'، ہنسنی روپ آئینے کو گھیرے کھڑا تھا — اس پر قہقہے لگاتا ہوا۔

صرف اپنا گرنا اُسے یاد رہا۔

ہوش آیا تو دیکھا بچے سہمے سنتری کی طرح اس کے دونوں جانب بیٹھے ہیں۔ خاموش اور سکتہ زدہ۔ اردلی رام سنگھ اپنی سخت کھردری ہتھیلیوں سے اس کے سرد تلووں کو رگڑ رگڑ کر گرمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کملی ہاتھ میں گرم کافی کا پیالہ لیے — "میم صاحب، کیسا ہے ابی؟" بے صبری سے پوچھ رہی ہے۔

اس نے سب کو اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ اچانک اس نے اُٹھنے کی کوشش کی۔

"مما کیا ہوا؟" راجو نے بھرّائی آواز میں اس کی حالت پر تجسس کا اظہار کیا۔

"کچھ نہیں بیٹے! بس ذرا چکر سا محسوس ہوا —" اچانک رام سنگھ پر نظر گئی۔ شرمندہ ہوتے ہوئے اس نے پاؤں سکیڑ لیے۔ اس کی باپ کی عمر کا ہے رام سنگھ۔

"بی بی جی! آپ فکر نئی کرو۔ تھوڑا ملوں گا نا، تو آرام پہنچے گا۔" رام سنگھ اس کا تذبذب بھانپ گیا۔

مسکرانے کی کوشش کی تاکہ رام سنگھ کی فکر دور ہو سکے۔ کملی کے ہاتھوں سے کافی کا پیالہ لے کر آہستہ آہستہ گھونٹ بھرنے لگی۔ لیکن رام سنگھ گیا نہیں۔ پہلے کی طرح کھڑا رہا: "میجر صاحب کو فون کر دوں؟"

میجر صاحب سے اس کا مطلب اودستی بھیا سے تھا۔ انہیں پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس ذرا

معمولی سا چکر آ گیا.... تم جا کر اپنا کام کرو۔" اس نے رام سنگھ کو مطمئن کرنا چاہا۔

کمرے سے باہر تو آ گیا رام سنگھ، لیکن بی بی جی کے زرد چہرے نے اُسے مطمئن نہیں ہونے دیا — بی بی جی کی ضد بھی اچھی نہیں لگی۔ آخر میجر صاحب کو فون کر دینے میں ہرج ہی کیا تھا۔ آ کر دیکھ لیتے تو کچھ دوا دارو دے دلا دیتے۔ آگے بھی طبیعت چنگی رہتی اور پھر اچانک بگڑ کیوں گئی۔ یہ بھی پتہ چل جاتا۔ ایک بار رام سنگھ کے دل میں آیا بھی کہ بی بی جی کو کہنے لگے بغیر، اسپتال میں فون کر ہی دے۔ میجر صاحب ابھی ڈیوٹی پر ہی ہوں گے۔ فوراً آ جائیں گے۔ لیکن پھر پتہ نہیں کیا سوچ کر رہ گیا۔ اس کے برف جیسے تلوے بھول نہیں پا رہا تھا وہ۔

عجیب سی ہو گئی ہیں آج کل! کہیں آنا نہیں، جانا نہیں۔ بس جو بیسوں گھنٹے اپنے کمرے میں بند پڑی رہتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ نکلیں تو بچّوں کے اسکول جانے کے وقت اُنہیں گیٹ تک چھوڑنے چلی آتیں۔ بچے بس میں چڑھ گئے تو پھر لوٹ کر اسی کمرے میں! اکثر میجر صاحب آ جاتے ہیں۔ وہی وقت ہوتا ہے جب وہ گھنٹوں بیٹھی اُن سے گفتگو کرتی رہتی ہیں۔ بھولے بھٹکے ہنسی بھی کانوں میں پڑ جاتی ہے۔ تب رام سنگھ کا دل بھر آتا ہے۔ جنہیں صبح سے شام تک، شام تک کیا گئی رات تک ہنسی کی کھنک میں ڈوبے دیکھا ہے اور پُورے گھر کو اُسی کھنک میں ڈوبے دیکھا ہے، وہی اب سب کچھ سیاہ نحوست کی چادر میں کیسے غائب ہو گیا ہے.... بٹّی اور راجو بھی اب سہمے سہمے رہنے لگے ہیں۔ پتہ نہیں ان پھول سے بچّوں کا کیا ہو گا! سوچتا ہے تو دل مرجھانے لگتا ہے۔ اور ابھی تک تو صاحب کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے۔

ہمّت کی کمی نہیں ہے بی بی جی میں۔ یہ بھی واضح واضح طور پر دیکھا ہے اُس نے۔ ذمّہ داریاں خواہ گھر کی ہوں یا باہر کی، چہرے پر شکن لائے بغیر نبھا رہی ہیں۔ دوسری عورت ہوتی تو اب تک بستر سے لگ گئی ہوتی۔ اُسے یاد آ گیا وہ واقعہ۔ صاحب کے مِسنگ (MISSING) ہونے کا تار آیا تھا تو اُنہوں نے گھر کے ہر فرد کو ہوشیار کر دیا تھا "بچّوں کو کچھ نہیں معلوم ہونا چاہیے۔ اُنہیں جو پتہ ہے، وہی معلوم رہنے دو۔ باہر سے کچھ سُن سُنا آئیں تو اُنہیں سمجھا دینا۔ زیادہ دن نہیں لگیں گے اُنہیں لَوٹنے میں — ان معصوموں کا دماغ خراب ہو جائے گا نہ!"

بس ایک موہوم سی اُمّید کی ڈور سے بندھی ہے ان کی زندگی جو پاکستانیوں کے ذریعہ بھیجی جانے والی "مسنگس" کی فہرست اپنے مُلک میں پہنچتے ہی فوراً تیز ہو جاتی ہے۔ کتنی کرب ناک ہوتی ہے وہ صورتِ حال۔ وہ کئی کئی دفعہ ہیڈ کوارٹر فون کرتیں۔ بار بار اُس نے اُنہیں فہرست میں شامل ناموں کے بارے میں پُوچھ تاچھ کرتے پایا ہے۔ پھر بھی تسلّی نہیں ہوتی۔ اخبار میں شائع فہرست کو سینکڑوں بار پڑھتی ہیں۔ اُس سے دوسرے سارے اخبار منگواتی ہیں۔ اور ان میں شائع شُدہ فہرستوں کو پڑھ پڑھ کر آپس میں ملاتی ہیں۔ کہیں کسی فہرست میں اگر کوئی نام چھوٹ گیا ہوتا تو اُنہیں شبہ ہو جاتا۔ ہو نہ ہو ہیڈ کوارٹر کی خبر میں کوئی بھول چُوک ہوئی ہے! پھر فون کرتیں میجر صاحب کو بلواتیں — "بھیّا ذرا ہیڈ کوارٹر سے ایک بار پھر تو ویری فائی کرو.... کہیں چھوٹ تو نہیں گیا اُن کا نام! آج کل لاپروائیاں بھی تو کم نہیں ہوتیں!" میجر صاحب ان کی تسلّی کے لیے بار بار ڈائل گھُمانے لگتے۔

رام سنگھ کو فخر ہوتا ہے میجر صاحب پر۔ مطلبی فطرت کے نہیں ہیں۔ جیسے صاحب کے سامنے آتے جاتے تھے۔ ویسے ہی آنا جانا اب بھی بنائے رکھا ہے اُنہوں نے۔ دونوں میں گاڑھی چھنتی بھی تھی۔ میجر صاحب اسپتال میں سرجن ہیں اور اس کے صاحب انفینٹری میں میجر۔ کبھی کبھی تو دونوں رات کے تین بجے تک قہقہے لگاتے۔ پیتے رہتے۔ بی بی جی بھی ساتھ جاگتی رہتیں۔

سب ٹوٹ گیا ہے، بکھر گیا ہے۔ گھر کے ریت رواج ہی بدل گئے ہیں.... بس ایک صاحب کے نہ ہونے سے۔

رات کو اُنہیں برآمدے میں ٹہلتے دیکھتا تو گزارش کرتا۔ "اندر سو جاؤ بی بی جی آپ.... سردی لگ جائے گی۔" مگر وہ پھیکی ہنسی ہنس دیتیں۔ "نیند آئے گی تب نہ۔" مونھ بند ہو جاتا ہے اس کا۔ اندھیرے کے پردے میں اپنی نم آنکھوں کو پونچھ لیتا ہے۔

کیا کرے؟ بڑی دیر تک بیٹھا بے دلی سے بیڑی پھونکتا رہا۔ پھر طے کیا کہ گیراج کھول کر گاڑی دھو ڈالے۔ مہینہ بھر سے گاڑی نہیں دُھلی ہے۔ بند بند بھی دھول سے اَٹ جاتی ہے۔ صاحب تھے تو تقریباً روزانہ ہی دھلتی تھی۔ بی بی جی کو وہ کبھی جیپ میں نہیں لے جاتے تھے۔ گاڑی خریدی ہی ان کے لیے تھی۔

پونچھا مار ہی رہا تھا کہ برآمدے میں آ کھڑی ہوئی بی بی جی کی آواز سُن کر چونک گیا۔ مبہوت سا ان کے پاس پہنچا۔

"ٹیکسی لے آؤ تو ذرا۔"

"باہر جائیں گی؟"

وہ اس کا تفکر سمجھ گئیں۔ دھیرے سے مسکراہٹ لیٹی چہرے پر۔ "ایک دم ٹھیک ہوں۔ ان بے چاروں کو تیار کروا کر بٹھا دیا ہے.... نہیں جاؤں گی تو دل چھوٹا کر لیں گے۔"

اس دلیل سے وہ مطمئن نہیں ہوا۔ لیکن اُسے یہ بھی معلوم ہے کہ لاکھ منع کرنے کے باوجود طے کر لیا ہے تو جائیں گی ضرور۔ بحث مباحثے میں پڑنا ہی بے کار ہے۔ ہمّت! ارے ہمّت ہی تو ہے جو اس عورت کو اٹل چٹان کی طرح جمائے ہوئے ہے۔ کئی بار اس نے مشورہ دیا ہے، میجر صاحب نے بھی کہا ہے کہ کسی کو بلا لیجیے صاحب کے گھر سے۔ اکیلے اکیلے سب سہیں گی تو....!

"سہنا کوئی بانٹ سکتا ہے رام سنگھ؟"

وہ لاجواب ہو جاتا۔ غلط کہاں کہتی ہیں!

ٹیکسی دادر کی جانب دوڑی جا رہی ہے۔

کھڑکی سے چہرہ لگائے وہ سیدھے دیکھ رہی ہے۔ بال بے ترتیبی سے اُڑ رہے ہیں۔ کبھی ناک، کبھی کان، کبھی ہونٹوں پر اور کبھی گردن کے دائرے میں گدگدی کرتے ہوئے سے۔

"شیشہ بھی نہیں چڑھا سکتی۔"

سدیپ اکثر اس کے بالوں کی سیٹنگ بگڑ جانے

کے خیال سے ہاتھ بڑھا کر اس کی بغل والا ونڈو گلاس چڑھا دیتے۔

"تھینک یو" وہ مسکرا دیتی۔

"ہے تھینک یو۔ بس کھیسیں نکالا کرتی ہیں تمہاری.... ذرا ہمارا بھی خیال رکھا کرو.... اپنے آپ قریب آ کر اور پیار کر کے.... تب بات ہو نہ"... آہستہ سے ایک ہتھیلی سرک کر اُسے کمر سے گھیر لیتی۔ قریب اور قریب سٹا کر اچانک گردن گھومتی اور اس کے کھلے کاندھے پر ہونٹ ٹِک جاتے۔ وہ گویا مدہوش نیم خوابی میں جھپکنے لگتی۔ اچانک سڑک پر ہونے کا خیال اُس میں شعور کی پینگیں چھو...

"ہم سڑک پر ہیں" وہ سدیپ کا چہرہ سامنے کی طرف موڑ کر اس کی ہتھیلی اسٹیرنگ پر رکھا دیتی "سامنے دیکھو!"

"آئی لَو ٹو ڈرائیو لائک دِس، ریلی رتی...!

کیسے کوئی مرنا چاہتا ہے اور کیسے مرجاتا ہے۔ ہمارا اختیار ہماری موت پر کیوں نہیں ہوتا۔

سرسراتی ہوئی ہوا کے جھونکوں نے اُسے پیار سے تھپتھپایا۔ لہراتے چلے آ رہے بہاؤ کو اُس نے گلے میں ہی دفن کر دیا۔ کچھ اور سوچنے میں خود کو مشغول کر لینا چاہتی ہے تاکہ بچوں کے سامنے اچانک کوئی ناگوار صورت حال نہ پیدا ہو جائے..... تو کیا سوچے.....

سدیپ سے ہوئی پہلی ملاقات کا واقعہ یاد آ گیا۔

موسی جی کے گھر پر ملی تھی اُس سے۔ بڑے بھیا بنّی کے عرصہ بعد ملے دوست کے روپ میں۔ معمولی قد و قامت اور روکھی اطوار۔

موسی نے ممی کو بتایا تھا" اُسے بنّی نے سب کچھ بتا دیا ہے پھر بھی وہ رتی سے شادی کرنے کو تیار ہے۔ اپنی ماں سے بھی اس کی بات چیت ہو گئی ہے۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ ادھر سے 'ہاں' ہو جائے تو وہ ایک ہی منڈپ میں بیٹے اور بیٹی دونوں سے فراغت حاصل کر لیں۔ جلدی اُنہیں اس لیے بھی ہے کہ اُن کا ہونے والا داماد صرف پندرہ بیس دن کے لیے ہی جرمنی سے آ رہا ہے۔ وہیں اُس کے سارے گھر والے ہیں۔ لڑکا اکیلا ہی آ رہا ہے۔

ممی نے کہا تھا" ذرا رتی سے بھی پوچھ لو"

"پوچھنا کیا؟ دیکھ تو لیا ہے اُس نے۔ بنّی بتا رہا تھا۔ دونوں میں کچھ باتیں بھی ہوئی تھیں"

"پھر بھی! اس کی طبیعت کتنی اکھڑی ہے، تم تو واقف ہو..... پوچھ لینا بہتر ہے..... اب تو جو وہ کہے گی وہی ہوگا" ممی نے ایک لمبی سانس بھر کر اپنی "ہاں" یا "نا" کا دار و مدار رتی پر چھوڑ دیا۔

اُس نے موسی سے کہا تھا" بتاؤں گی"

"ٹھیک ہے سوچ لے" موسی نے ایسا کہہ کر گویا اُسے بالواسطہ طور پر دھمکی ہی دی تھی کہ ایسا لڑکا اور وہ بھی تیرے بارے میں سب جان سمجھ لینے کے بعد ملنے سے رہا۔

وہ سوچتی رہی تھی۔ بالآخر اُس نے طے کیا کہ وہ سدیپ سے فون پر گفتگو کرے گی۔ اپنی طرف سے اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لیے۔ ممکن ہے جس نے اُن سے اُس کے بارے میں بتایا ہوگا سارا قصہ ذرا بچا بچا کر بتایا ہوگا تاکہ ان دونوں کا معاملہ فٹ ہو جائے؛ عام طور پر لوگ یہی سوچتے ہیں اور مانتے ہیں کہ ایک بار شادی ہو جائے تو باقی تمام باتیں خود بخود سُلجھ جاتی ہیں۔ اور معلوم بھی ہو جائے تو کیا بگڑ جاتا ہے۔

سدیپ دوسری بار فون پر ملے۔ اُسے فون پر پاکر اُن کا چونکنا فطری تھا۔ لیکن اتنے بے تکلف لگے کہ اس کے اندر کی ساری جھجک جاتی رہی۔

کالج میں ہوئی محبت.... کپور سے سگائی...

... ڈیڑھ سال تک کپور کے ساتھ گھومنا پھرنا..... اور ٹھیک شادی سے مہینہ بھر پہلے کپور نے اُس کے ساتھ شادی کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ وہ کسی دوسری لڑکی کو پیار کرتے تھے اور اس کے ساتھ وہ کئی ماہ قبل کورٹ میرج بھی کر چکے تھے۔ اس کے ساتھ ان کا جو بھی تعلق بڑھا، اُس کی وجہ تھی اُس کے ساتھ شادی کرنے کی والدین کی ضد اور اصرار۔ کپور نے قبول کیا کہ ماں باپ دونوں ہی جانتے تھے کہ وہ مارتھا سے پیار کرتا ہے اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایک کرسچن لڑکی سے اس کی شادی کے خلاف تھے اور ان کی ضد کے تحت اُنہوں نے.... مگر..... ایک طویل عرصے تک اس کی دوستی نبھانے کے باوجود اُنہیں یہی لگا کہ وہ مارتھا کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اُس نے تو کپور کو محض ایک دوست نہیں سمجھا تھا.....

"جو ہوا ــــ بھول جاؤ ــــ تمہارے بتانے کی ویسے بھی ضرورت نہیں تھی۔ بنّی نے سب بتا دیا تھا۔ اور میرا فیصلہ وہی ہے جو میں نے تمہیں پہلی بار دیکھتے ہی کر لیا تھا۔ وہ ذرا رک کر اچانک قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے تھے" بائی دی وے میں بھی بتا دوں.... ہم نے بھی ایک لڑکی سے محبت کی تھی۔ آج کل وہ اپنی سسرال میں ہے اور تین پیارے ننھے منّوں کی مٹکی سی ماں ہے... مگر اب وہ ایک گزری داستان ہو گئی ہے... صحیح تو یہ ہے رتی! ہفتہ بھر پہلے تمہیں دیکھ کر یہ احساس شدت سے ہوا کہ میں اب بھی پیار کر سکتا ہوں.....!"

اُسے لگا تھا عہدے اور عمر کی جو سنجیدگی سدیپ میں ہونی چاہیے تھی، وہ تھی لیکن مزاج میں کسی پہاڑی جھرنے کا سا رواں دواں شور بھی تھا...

یادوں کا سلسلہ بٹّی کی آواز نے منتشر کر دیا۔

"مما، ہم فلورا ہی چل رہے ہیں نا؟"

بٹّی کی بے صبری نے اُسے جھنجھلا دیا" ہاں رے، فلورا ہی چل رہے ہیں"

بٹّی نے بڑے حوصلے سے پوچھا تھا۔ مما کی غیر متوقع جھنجھلاہٹ نے اُسے اُداس کر دیا۔ ایسا کیا پوچھا تھا اُس نے جو وہ ناراض ہو گئیں؟ سمجھ میں نہیں آتا آخر اچانک اُنہیں کیا ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ آپے میں نہیں رہتیں۔ اب تو حالت یہ ہے کہ اُن سے کچھ کہنا ہوتا ہے تو دل ہی دل میں ڈرتی رہتی ہے۔ بڑی ہمت یکجا کرنی پڑتی ہے۔ پتہ نہیں وہ اس کی بات کو کس طرح سے لیں پھر بھی اتنا تو طے ہے کہ مما کے مزاج میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ پہلے

وہ ہرگز ایسی نہیں تھیں ۔ نہ بات بات میں غصّہ ہوتی تھیں نہ اچانک گم سُم ہو جاتی تھیں ۔ وہ تو ویسی ہی ہے ۔ راجو بھی ٹھیک ویسا ہی ہے ۔ ضد تو وہ پہلے بھی کیا کرتی تھی ۔ پاپا کے سامنے. تب تو وہ اُسے گھنٹوں سمجھاتی تھیں ۔ " راجے راجے " کرتی نہیں تھکتی تھیں ۔ ہاں، جب وہ اس کی شرارتوں سے بہت تنگ آجاتیں تو اُسے لے جاکر باتھ روم میں بند کر دیتیں اور تب تک نہیں کھولتیں جب تک وہ اُن سے کان پکڑ کر " ساری " نہیں کہہ دیتی مگر اب!

بس ایک چڑچڑا پن ...... یا ایک طویل خاموشی .... عجیب نظروں سے دیکھنے لگتی ہیں ۔ کبھی کبھی لگتا ہے، دیکھ اُسے رہی ہیں مگر جیسے پہچان نہیں پا رہیں ۔

راجو بھیا بھی اس کے خیالات سے متفق ہے ۔

گڑبڑ تو کچھ ضرور ہے ۔ کہاں ہے ..........
...... یہ وہ بھی سمجھ نہیں پایا ۔ رام سنگھ سے بھی اس کی بات چیت ہوئی ہے ۔ رام سنگھ کا کہنا ہے کہ چوں کہ صاحب بہت دنوں سے بارڈر پر ہیں اور لڑائی میں کب کیا ہو، اسی اندیشے نے بی بی جی کو متفکر کر رکھا ہے ۔ اکیلا پن بھی ستاتا ہو گا اُنہیں .....

اُس نے مما سے کہا بھی تھا ... " بلیک آؤٹ اب نہیں ہوتا ...... اس کا مطلب ہے لڑائی ختم ہو گئی؟ "

مما نے مختصر سا جواب دیا تھا ۔ " بٹّی کو اچھی طرح یاد ہے ۔ ہاں ختم ہو گئی ۔ "

" تو اب پاپا جلدی گھر آجائیں گے ؟ "

" ہاں راجے ".....

اتنا مختصر جواب اُسے بُرا لگا تھا ۔ پاپا کے بارے میں اتنا حوصلہ شکن رویّہ اُسے اور بھی بُرا لگا تھا ۔ حالانکہ اُس نے کہا کچھ نہیں ۔

رام سنگھ نے ایک اور زبردست وجہ بتائی تھی ۔ جس کی توثیق کملی نے بھی کی تھی ۔ مما اُن لوگوں کو بتاتی نہیں، لیکن اندر ہی اندر اُن کی طبیعت بہت خراب ہے ۔ یہی وجہ اُسے زیادہ صحیح لگ رہی ہے ۔ آج تو اس کا ثبوت بھی مل گیا ہے ۔ کیسے وہ چکّر کھا کر گر پڑی تھیں لیکن اُسے پھر پرسوں والا واقعہ یاد آگیا اور ذہن پھر اُلجھ گیا ۔

اوستھی ماما کے ہال میں قدم رکھتے ہی اُس نے ہمیشہ کی طرح اُنہیں " اسٹیچو! " کہہ کر ساکت کر دینا چاہا تھا ۔ لیکن تین بار اپنی اُنگلی ہلا کر اُنہوں نے اُس کا حکم نامنظور کر دیا ۔ " آج نہیں ... "

اُس نے غصّہ سے اپنے ہونٹ سکوڑ کر آنکھیں نچائی تھیں ۔ " اچھا تو پھر 'راؤنڈ' دلانے لے چلیے ۔ "

" آج نہیں ڈارلنگ ! طبیعت گڑبڑ سے کچھ ... کل کا پرامس رہا ... "

اُنہوں نے اس کی دوسری بات بھی کاٹ دی.

" پچھلی بار بھی آپ نے یہی کہا تھا اور اب تک راؤنڈ پر نہیں لے گئے؟ آج ہم آپ کی ایک نہیں سنیں گے ".
اُس نے گویا الٹی میٹم دے ڈالا ۔ آج نہیں ..... آج نہیں ! "

" اچھا ایسا کرو ۔ سوہن سنگھ بیٹھا ہے جیپ میں ۔ اُس سے کہو جا کر کہ میں نے کہا ہے کہ وہ تم دونوں کو 'راؤنڈ' دلا لائے ..... ٹھیک ؟ "

مجبور ہو کر اُنہوں نے جیسے چھٹکارے کا راستہ ڈھونڈا ۔

" کتنی بڑی بڑی مونچھیں ہیں اُس کی ! چھی، آئی ڈونٹ لائک ٹو گو وِد ہِم ! آپ ہی چلیے ۔ "

وہ سوہن سنگھ کے نام سے بِدکی تھی ۔ پھر سوہن سنگھ کے ساتھ جانے میں کیا مزا ! وہ آئس کریم تھوڑی دلائے گا ! سوچ کر اُس نے انکار میں سر ہلا دیا ۔

" بٹّی ! " تبھی مما کے سخت اور خبردار کرنے والی آواز نے اُسے سہما دیا ۔ گویا اب تک اُس کی ضد کو برداشت کرتے ہوئے خاموش تھی، مگر آخرکار اُس کی شوخی برداشت نہیں کر پائیں ۔ وہ بغیر کسی حیل و حجّت کے ہال سے باہر ہو گئی ۔ راجو بھی اس کے ساتھ چلا آیا ۔ اوستھی ماما نے مما کے ڈانٹنے پر کوئی ردِّ عمل نہیں کیا ۔ بہت " فیل " ہوا تھا اُسے ۔

وہ راؤنڈ پر سے لوٹے تو ہال میں قدم رکھتے ہی اندر کا نظارہ دیکھ کر ششدر رہ گئے تھے ۔ کیسے دل دہلا کر رکھ دینے والی ہچکیاں، جنہیں گلے کی قید سے باہر نہ ہونے دینے کی خواہش میں اُن کا سارا جسم بُری طرح تھرتھرا رہا تھا ۔

دونوں رو ہانسے سے ہو گئے تھے ۔ مما کے رونے کی وجہ وہ نہیں جانتے تھے ۔ لیکن اُن کے لیے یہی وجہ کافی تھی کہ مما رو رہی ہیں ۔ مما رو رہی ہیں تو وہ کیسے چُپ رہ سکتے ہیں ۔ انکل نے البتہ اُنہیں اشارے سے قریب بلایا اور بازوؤں میں بھر کر چُوما تھا ۔

" ارے پگلو ! تمہیں کیا ہو گیا ...... تم کیوں اپنا دل چھوٹا کرتے ہو ؟ دیکھو، مما کی طبیعت ذرا گڑبڑ ہے ۔ بجائے خود رونے کے، ڈو وَن فیور فار ہر ... اُن کا خیال رکھنا "! ...

اُس نے روتے ہوئے انکل سے کہا تھا ۔ " آپ مما کو چیک کر لیجیے نا ! "

وہ اس کا مطلب سمجھ گئے تھے ۔ " ٹھیک ہے، چیک کر لیں گے "۔ شفقت سے اُنہوں نے اس کے گال تھپتھپا دیے تھے ۔ " اب دونوں جاؤ اپنے کمرے میں ۔ ... سنی اِز ویری مچ آل رائٹ، او ۔ کے "

نہ گردن اُٹھائی تھی اُس نے نہ اُن کی طرف دیکھا تھا ۔ آنسوؤں سے لبریز اپنا چہرہ وہ دونوں ہتھیلیوں سے چھپائے سسکیاں بھرتی رہی تھی ۔ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ مما کا چہرہ اپنے ننھّے سینے سے ٹکا کر پیار کرے ۔ مگر اُن کے قریب جانے کی ہمّت نہ اُس کو ہوئی اور نہ راجو کو ہی ۔ وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے تھے ۔

پاپا ہوتے تو مما کو اتنا کبھی نہ رونے دیتے ۔ رونا اُنہیں قطعی برداشت نہیں ہوتا تھا، خاص طور پر ان لوگوں کا ۔ جب کبھی مما اُنہیں کسی بات پر جھڑک دیتیں یا کہیں ہاتھ اُٹھا دیتیں اور وہ بھوں بھوں کر کے زار و قطار رونے لگتے تو پاپا کی قوّتِ برداشت جواب دے جاتی ۔ وہ گھنٹوں مما سے نہ بولتے ۔ بولتے بھی تو ۔ " آئندہ تم نہ میرے بچّوں پر ہاتھ اُٹھاؤ گی نہ اُنہیں بلا وجہ رُلاؤ گی ۔ ٹھیک ہے وہ کوئی غلطی کر بیٹھے ہیں، تو استقلال سے کام لو ...... بٹ بیٹنگ بائی اے لرنیڈ لیڈی .... اُمڈ لوگوں کا طریقہ تو مت اختیار کیا کرو ..... ! "

جس طرح انکل کے سامنے مما نے اُسے ڈانٹا تھا،

...... ڈرائیور! ذرا لے لینا.... فلورا چلنا ہے۔ مما کی حکمانہ آواز نے اُس کے ننھے کے تموج اچانک شانت کر دیا۔ 'فلورا' کے نام سے اُس کے چہرے پر خوشی چھلچھلا آئی۔ بھول گئی کچھ دیر پہلے کا غصہ۔ پرسوں والی غم ناک بات! مما کی کچھ دیر پہلے اچانک بگڑ گئی طبیعت کی فکر....

خوشی کے مارے وہ راجو سے لپٹ گئی۔ کتنے دن ہو گئے! دن کہاں.... مہینوں ہو گئے۔ پاپا کے بارڈر پر جانے سے پہلے وہ آئے تھے 'فلورا'....

ربل ادا کر کے وہ 'فلورا' سے باہر آئے۔ دونوں بچوں کے چہروں سے جھلکتی مسرت نے اُسے میٹھی آسودگی کے احساس سے سرشار کر دیا۔

راجو نے ٹھیک پاپا والے انداز میں سب سے پہلے دو چکن سوپ کا آرڈر دیا تھا۔ پاپا والے انداز ہی میں اُسے ٹوکتا بھی رہا۔ "مما جتنا کھایا جا سکے، اتنا ہی کھاؤ۔ ابھی اور بھی تو ڈشز کھانی ہیں!"

نہ بھی کھایا جا رہا ہو تو وہ چیزیں چھوڑنے کے حق میں نہیں ہوتی۔ اس کا نظریہ ہمیشہ یہی ہوتا کہ اگر اتنے پیسے خرچ ہوئے ہیں تو چیزیں بے کار نہیں ہونی چاہئیں۔ سدیپ اکثر اُس کے اس رویے سے چڑ جاتے۔ جب گھر سے باہر نکلتے ہیں تو چیزیں کھایا کرو پیسے مت کھایا کرو! سدیپ کو نئی نئی 'ڈشز' آزمانے کا شوق تھا۔ نہیں بھائی تو وہ خود بھی چھوڑ دیتے اور اُسے بھی چھوڑ دینے کو کہتے۔ وہ اُن کی اس عادت سے چڑ جاتی۔

راجو نے ڈھیر ساری ڈشز چُنی تھیں اور منگوائی تھیں۔ اور اس سے جو نہیں کھایا گیا اُسے چھوڑ دیا۔ کھایا تو کچھ بھی نہیں جا رہا تھا۔ بچوں کا دل رکھنے کے لیے زہر مار کرتی رہی....

سدیپ ہمیشہ بچوں سے پوچھتے تھے۔ "کہاں چلا جائے؟" بیٹی اپنی پسند کی جگہ کا نام لیتی۔ راجو اپنی پسند کی جگہ کا۔ سدیپ دونوں کا دل رکھتے۔ جوہو پر دو ڈھائی گھنٹے گزار کر گاڑی بینڈ اسٹینڈ کی جانب موڑ دیتے۔

"کہاں چلا جائے؟"

"لنکنگ روڈ۔"

"نہیں دادر۔"

"پہلے دادر چلتے ہیں۔ راستے میں ہی تو پڑتا ہے۔" اُس نے دلیل پیش کی۔

"اسے ریکٹ ہی تو لینا ہے.... وہاں نہیں مل سکتا کیا؟" بیٹی کو راجو کی بات کو فوقیت دینا ناگوار گزرا۔ دادر پہلے پڑتا ہے، اس سے اُسے کوئی مطلب نہیں تھا۔

"لنکنگ روڈ پر چوائس ہے؟" راجو کو اس کی فضول کی ضد پر غصہ آ گیا۔

"صرف ایک دوکان ہے گیمس کی۔ دادر میں کم سے کم پانچ چھ دوکانیں تو ہیں.... اور دام بھی مناسب ہیں...."

"ہنہ —— دام بھی مناسب ہیں....!"

شکست خوردگی کے احساس سے کھسیا کر بیٹی نے اُسے چڑھایا۔ "معلوم وعلوم کچھ ہے نہیں.... مما کو جھوٹ موٹ کو امپریس کرنے کی کوشش کر رہا ہے!"

"تنگ مت کر!" راجو غصے سے بھر گیا ——

اُسے لگا کہ اب اگر بیٹی نے اُسے ذرا بھی چھیڑا تو وہ اُسے مار بیٹھے گا۔ اُس کی توجہ سڑک پر تھی۔ دُور سے خالی ٹیکسی آتی دکھائی دی تو اُس نے ہاتھ ہلا کر اُسے رُکنے کا اشارہ کیا۔ پھر اُن کے تُو تُو میں میں پر جھلائے بغیر پُرسکون لہجے میں بولی۔ "اس میں جھگڑنے کی کیا بات ہے۔ دونوں جگہ چل رہے ہیں نا!"

ٹیکسی پاس آکر ٹھہری تو راجو اگلا دروازہ کھول کر ڈرائیور کی بغل میں بیٹھ گیا۔ بیٹھتے بیٹھتے بیٹی بھنائی ——

"میں بھی آگے بیٹھوں گی۔" راجو جو کچھ کرتا ہے وہ اُسے بھی کرنا ہوتا ہے۔ پیچھے کیسے رہے!

"لڑکیاں ٹیکسی میں آگے نہیں بیٹھتیں.... ہے نا مما!" راجو نے سیٹ پر سے ترچھے ہو کر اس کی تائید چاہی۔

"یس یو آر رائٹ۔" راجو کی سمجھداری پہ اُسے فخر ہوا اور داد دینے والے لہجے میں اُس نے اس کی بات کی تائید کی۔ بیٹی کے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ ذلت کے گھونٹ وہ لگاتار پی رہی ہے۔ پاپا ہوتے تو اُس کے ساتھ ہرگز ایسا نہیں ہوتا۔ پاپا ہمیشہ اُس کی بات پہلے مانتے تھے —— "بھئی، وہی پہلے ہوگا جو ہماری ننھی پرنسیس کہہ رہی ہے۔"

آنکھیں بے اختیار چھلک اُٹھیں۔ کوشش کرنے پر بھی وہ سسکی نہیں روک پائی۔ اُس نے دیکھا تو کھینچ کر اس کے ننھے بدن کو بازو میں سمیٹ لیا۔ "پگلی، روتے ہیں؟.... اتنی چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر؟"

اس کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے کو اس نے ڈھیرے ڈھیرے چوما۔ اندر ہی اندر کانپ اُٹھی۔ کتنے حساس ہیں یہ بچے.... ان سے کیسے کہہ سکے گی۔ کیسے سمجھا سکے گی؟ سدیپ نے اُن کی خواہشوں کی تکمیل اپنا فرض نہیں، زندگی سمجھی ہے، خوشی سمجھی ہے۔ بچوں کے مسئلے پر کبھی اُنہیں مشتعل ہوتے نہیں دیکھا —— روٹھی ہوئی بیٹی یا تنکے ہوئے راجو کو بغیر صبر کھوئے گھنٹوں مناتے رہتے۔ جب کہ اُسے اپنا آپا کھوتے دیر نہ لگتی.....

"ہم انہیں کیا دے سکتے ہیں....؟" وہ اُس کے سارے دلائل پر سوالیہ نشان لگا دیتے.....

سدیپ.... سدیپ.... سدیپ!

تیز رفتار ٹیکسی سے ٹھیک مخالف سمت اُس کا ذہن بھاگنے لگا۔ انہیں جہاں سے کھینچ کر لانا چاہتی ہے، وہاں خود بھی تو بار بار پہنچ جاتی ہے۔ جب خود پر ہی اُس کا اختیار نہیں ہے تو اُنہیں کس طرح اور کیسے تسلی کے قطروں پر صبر کر لینے کی اُمید باندھے.....

اُس نے بے بسی کی غفلت کو خود پر حاوی نہ ہونے دینے کی غرض سے بیٹی کے گرد بازوؤں کی گرفت کچھ اس قدر کس لی کہ اس کے گدگدے بدن کے گنگنے لمس نے اس کے خانۂ دل کی چوکھٹ پر معنبوطی کے آسمان چھوتے لیکلپٹس کھڑے کر دئے.....

لمحہ بھر پہلے بیٹی کے نازک ذہن میں گھلتی ہوئی کڑواہٹ اچانک دھل کر صاف ہو گئی۔ مما کا اُسے

پیارے سینے میں بھر لینا بےحد بے حد اچھا لگا ـــــ مما ٹھیک پہلے کی طرح ہو گئی ہیں ـــــ میٹھی میٹھی! فل آف وارم! جو پاپا اکثر ہوتے ہیں۔ مما کبھی کبھی ہو جاتی ہیں۔ آج پھر ویسی ہی لگیں۔

'اسکیچ پین' کا پیکٹ تھا۔ بٹی پرجوش ہو رہی تھی۔ تجسس کے مارے اس نے پیکٹ وہیں کھول ڈالا۔ اور نہایت اطمینان سے ہر پین کا ڈھکن کھول کر اپنی ہتھیلی پر رنگ کا نقطہ لگا کر اس نے رنگ کا جائزہ لیا اور پین کی درستی کا معائنہ کیا۔ اس کی اس حرکت پر راجو کو بہت کوفت ہوئی۔ ایک دو قلم بدل دینے کی بات پر تو وہ اور چڑ گیا۔ دوکان دار کے سامنے ہی بول پڑا ـــــ

"مینرس نہیں ہے اسے۔"

"کیپ پیشنس"۔ اس نے راجو کو ڈانٹا۔ "اسے جیسا چاہیے، لے لینے دو۔" ڈانٹ کھا کر راجو کا چہرہ اتر گیا۔ 'ریکیٹ' کا پیکٹ سنبھالے وہ ان سے ذرا دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور شوکیس میں قرینے سے سجی چیزوں کو دیکھنے لگا۔ اس نے اسے دل برداشتہ دیکھا تو پکارا "راجو؟"

"جی!" وہ پلٹ کر قریب آ گیا۔

"فٹافٹ بولو..... اور کیا کیا لینا ہے؟ پھر شکایت نہیں کرنا کہ آپ نے یہ نہیں دلایا، وہ نہیں دلایا۔" زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے اُن کے تذبذب کو توڑنا چاہا۔ جانتی ہے کہ وہ اس سے کافی کھلے ہوئے ہیں، مگر پھر بھی سدیپ سے وہ جتنے بے تکلف ہوتے ہیں اس سے نہیں ہو پاتے۔ کہیں نہ کہیں ہچک آڑے آ ہی جاتی ہے۔

راجو نے تذبذب میں مبتلا ہونے پر بھی انکار میں سر ہلا دیا۔

بٹی کی آنکھوں میں چمک کوندی۔ "میں بولوں؟"

"ہاں ہاں بولو۔"

"ایک آٹوگراف بک دلوا دیجیے نا!"

اس نے دوکان دار سے بٹی کو آٹوگراف بک دکھلانے کو کہا۔ بٹی آٹوگراف بک پسند کرنے میں مشغول ہو گئی۔ درمیان میں اس نے بس اتنا ہی پوچھا "کوئی سی بھی لے لوں؟" اس کا مطلب داموں سے تھا۔ اس نے اپنی منظوری دے کر اسے پوری طرح مطمئن کیا کہ وہ اپنی پسند کی چیز لے سکتی ہے۔

راجو نے اپنی خواہش پر ضبط کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن آٹوگراف بک کے لالچ سے وہ خود کو بچا نہیں پایا۔ اس نے بھی ایک خوب صورت سی آٹوگراف بک اپنے لیے چن لی۔ "میں اس پر سب سے پہلے پاپا کا آٹوگراف لوں گا۔" اسے آٹوگراف بک دکھاتے ہوئے راجو نے پُرمسرت اور مضبوط لہجے میں اعلان کیا۔

"چھن!" سے وہ کرچ کرچ ہو کر بکھر گئی..... مگر دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو سمیٹنے میں جزوی کامیابی حاصل کر لی۔

"میرے برش ایک دم خراب ہو گئے ہیں۔" راجو نے کہا۔

"لے لو۔"

"کچھ ڈرائنگ پیپرز بھی؟"

"وہ بھی لے لو۔"

کوشش برابر جاری تھی۔

کاؤنٹر کی طرف بڑھنے سے قبل اس نے ایک بار پھر ان سے پوچھ لیا۔ "اور کچھ؟"

"نو مما! تھینک یو سو مچ"۔ بٹی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

راجو نے "سو نائس آف یو" کہہ کر اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔

دوکان سے باہر آتے ہی اس کی نظر بغل والے آئس کریم اسٹینڈ پر ٹھہری۔ یاد آ گیا کہ سدیپ بغیر آئس کریم کھلائے گھر نہیں لے جاتے۔

"آئس کریم کھانی ہے!" اس کے پوچھتے ہی ان میں خوشی کا فوارہ پھوٹ پڑا۔

"اوہ مما! یو آر ریلی گریٹ!" بٹی نے آنکھیں سکوڑ کر، چہرے کو دائیں بائیں کھینچ کر اسے توصیف کی خوشبو دار مالاؤں سے لاد دیا۔ دونوں اپنے اپنے پیکٹ سنبھالے اسٹینڈ کی جانب لپکے۔ ان کا ساتھ بنائے رکھنے کے لیے اسے تقریباً دوڑنا پڑا۔

راجو نے پائن ایپل لی۔ بٹی نے اس بار پرانڈ بدلا۔ چاکلیٹ کا آرڈر دیا۔ دونوں نے اسے اپنی اپنی آئس کریم میں سے ایک ایک لقمہ لینے کا اصرار منت بھرے لہجے میں کیا۔ اسے ماننا ہی پڑا۔ سدیپ ہوتے تو لاکھ انکار کرنے کے باوجود اسے ایک کپ تھما ہی دیتے۔ "کھانی ہی پڑے گی۔" والا رُعب ہوتا اُن کا ــــ حکم عدولی کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

اچھا ہوا کہ بچوں نے اس سے کھانے کی ضد نہیں کی۔ اس کے لیے بھی لے لیتے تو اُن کی بات ٹالنا مشکل ہو جاتی۔ اور وہ کسی بھی حال میں نہ کھا پاتی۔ ایسے ہی ان کا موڈ اور اُکھڑ جاتا۔

"مما!" بٹی نے اسٹک چاٹتے ہوئے ناآسودہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"لے لو۔ مگر لکڑی مت چاٹو اس طرح۔ پہلے اسے پھینکو۔"

"کیا لے لیں؟" راجو نے پوچھا۔

"جو جی میں آئے، لے لو۔" وہ متوازن بنی رہنا چاہتی تھی، لیکن دماغی گھوڑے تھے کہ پوری طرح سے اسے روند ڈالنے کی فکر میں کسمسا رہے تھے۔ اس نے کھاتے ہوئے بچوں پر نظر ٹکا دی۔ ان کے چہرے پر پھیلتے جا رہے آسودگی کے احساس کو مبہوت سی دیکھتی رہی۔ وہ سچ مچ کھانے میں محو تھے۔

چلنے کو تیار ہوئے تب ہی بٹی کی نظر آئس کریم اسٹینڈ سے لگے جوس اسٹینڈ پر ٹھہر گئی۔ فوراً مچل اٹھی۔

"مما، جوس پلوا دو۔"

"آئس کریم کے اوپر جوس؟"

"تو کیا ہو گیا!" بٹی نے بے خوف لہجے میں دلیل دی۔

وہ خود کو متوازن نہیں رکھ پائی۔ پھر بھڑک کر چیخ

"دماغ ٹھکانے بھی ہے تمہارا؟ آئس کریم کے اوپر جوس پیتا ہے کوئی؟ گلا نہیں بیٹھ جائے گا! ان سے ویسے ہی تنگ کیے رہتے ہو..... چیزیں بیجا کی ٹھونسی جا رہی ہیں کہیں؟ آخر اتنی بھکری کیوں سمائی ہے تم (باقی صفحہ پر)

**غالب کے خطوط (جلد اوّل) مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم**
**سائز ۲۲×۱۸/۸ ، صفحات : ۴۸۲ ، قیمت : ۷۵ روپے**
**ناشر : غالب انسٹی ٹیوٹ ، ایوانِ غالب مارگ نئی دہلی**

مرتبہ
خلیق انجم
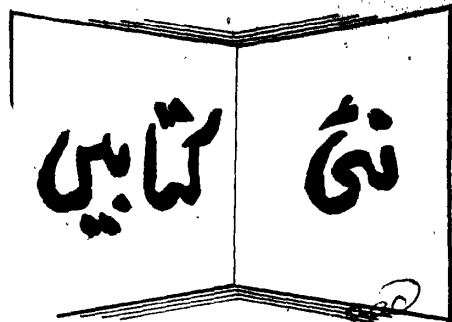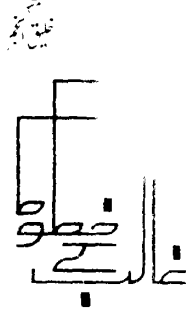
غالب کے خطوط

غالب کے خطوط غالب کی زندگی سے لے کر آج تک یکساں طور پر محققین اور اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کی توجہ کا مرکز رہیں۔ اب تک ان کے خطوط کے بے شمار مجموعے اور ان کے ری پرنٹ شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں بالکل کاروباری انداز کے مجموعے بھی ہیں۔ اور تحقیق و تنقید کی روشنی میں مرتب کئے ہوئے ایڈیشن بھی ہیں لیکن بیشتر محققین کی سہل پسندی، ناشرین کی عجلت اور کاتبوں کی ستم رانیوں کا نمونہ تھیں۔ چونکہ مجموعوں اور ری پرنٹ کی صورت چراغ سے چراغ جلانے کی رہی۔ اس لیے ایک کے بعد دوسرے میں کچھ اور غلطیوں کا اضافہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ مرتبین کی قیاسی اصلاح نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ مکاتیبِ غالب مرتبہ : مولوی امتیاز علی عرشی میں پہلی بار اس کا باقاعدہ اہتمام کیا گیا کہ مشمولہ خطوط کا مکمل اشاریہ تیار کیا گیا اور غالب کی سوانح و انشائے غالب سے تفصیلی بحث کی گئی اور حواشی لکھے گئے۔

خطوطِ غالب پر اب تک جو کچھ بھی کام ہوا اس میں آج تک کے دریافت شدہ تمام خطوط کا احاطہ نہیں ہو سکا تھا۔ اور اس بات کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ وہ تمام خطوط جو مختلف مجموعوں، رسائل اور اخبارات میں بکھرے ہوئے ہیں، انہیں یک جا کر کے حواشی، اشاریے اور تصحیح کے ساتھ شائع کیا جائے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ان تمام خطوط کو اکٹھا کر کے برسوں کی محنت اور دیدہ ریزی کے بعد چار جلدوں میں تاریخی ترتیب، تفصیلی حواشی اور اشاریے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ غالب کے خطوط کا زیرِ نظر مجموعہ اس کی پہلی جلد ہے۔ جس میں ۱۲۳ خط مرزا تفتہ اور ۵۸ خط نواب علاؤالدین احمد خاں علائی کے نام شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مرزا ہرگوپال تفتہ اور علائی کے نام جو خطوط بخطِ غالب مل سکے ہیں، ان کے عکس دیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم اردو کے مشہور محقق ہیں اور اس سے قبل غالبیات پر ان کی دو کتابیں غالب اور شاہانِ تیموریہ اور غالب کی نادر تحریریں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ مرزا رفیع سودا پر ان کا تحقیقی کام اور اصولِ تحقیق و تنقیدِ متن پر ان کی کتاب، متنی تنقید، اردو تحقیق میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ وہ محنت سے لگن سے کام کرنے کے عادی ہیں۔ تحقیقِ متن کے سائنٹیفک طریقۂ کار اور اصولوں پر ان کی نگاہ بہت گہری ہے۔ اسی لیے ان کا شمار اردو کے ذی علم محققین میں ہوتا ہے۔

خطوطِ غالب کا زیرِ نظر مجموعہ صرف ڈاکٹر خلیق انجم کی تحقیقی دیدہ وری ہی کا نمونہ نہیں، بلکہ اردو میں تحقیق و ترتیبِ متن کا بھی ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس مجموعے کے ابتدائی ۲۲۸ صفحات میں غالب کے خطوط کے مختلف ایڈیشن، غالب کا اردو املا، بعض الفاظ کا تلفظ، غالب کی زبان پر فارسی اثرات، غالب کے یہاں انگریزی الفاظ کا استعمال اور خطوطِ غالب کا تنقیدی مطالعہ، اور غالب سے قبل اردو کا نثری سرمایہ اور مکتوب نگاری کے آغاز سے مدلّل بحث کی گئی ہے۔ یہ بحث ڈاکٹر خلیق انجم کی تنقیدی و تحقیقی بصیرت کی نشاندہی کرتی ہے۔ انہوں نے جس طرح سے غالب کے خطوط سے ایک ایک لفظ کے املا کے فرق کو ظاہر کیا ہے اور جس محنت سے خطوط کی تاریخوں کا تعین کیا ہے اور فارسی و انگریزی الفاظ سے بحث کی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ شگفتنِ گلہائے ناز اور نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر کے عنوان کے تحت انہوں نے غالب کے القاب و آداب، غالب کا آئین نامہ نگاری، مکالمہ نویسی، مقفّیٰ عبارتیں، اشعار کا استعمال، مرقع نگاری اور بساطِ دہلی لٹ جانے کا ماتم اور ان کے تعزیت نامے کا جائزہ لیا ہے۔ غالب سے قبل اردو کا نثری سرمایہ اور اردو مکتوب نگاری کا آغاز، غالب کے خطوط کے مطالعہ کے لیے ایک پس منظر قائم کرتا ہے، جس کی روشنی میں غالب کی نثر اور ان کی خطوط نگاری کی اہمیت میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کا یہ تحقیقی کارنامہ یقیناً مطالعۂ غالب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے لیے وہ اردو دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ غالب کے خطوط

کتابت و طباعت کی نفاست کے اعتبار سے بھی اردو کی ایک مثالی کتاب ہے ۔

سائز : ۱۸/۸ × ۲۲ ، صفحات : ۵۲۰ ، قیمت ۸۰ روپے
ملنے کا پتہ : ۱/۲۴-۱-۹ ، لنگر حوض حیدر آباد

یوسف زلیخا نہ صرف اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہے بلکہ تحقیقی معیار کے لحاظ سے بھی اردو تحقیق میں اپنی ایک جگہ رکھتی ہے ۔ یہ کتاب دبستانِ گولکنڈہ کی پہلی مثنوی "یوسف زلیخا" کا تحقیقی و تنقیدی ایڈیشن ہے ، جسے ڈاکٹر سیدہ جعفر نے مرتب کیا ہے ۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر کا شمار مشہور ادبی محققین میں ہوتا ہے ۔ مولوی عبدالحق ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور ، نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر عبدالقادر سروری کے بعد دکنی ادب کے ماہرین میں ڈاکٹر سیدہ جعفر کا نام سرِ فہرست آتا ہے ۔ انہوں نے اب تک دکنی ادب سے متعلق بہت سے اہم کام کئے ہیں ، جن میں من سمجھاون ، دکنی رباعیاں ، سکھ انجن اور دکنی ادب کا انتخاب بہت اہمیت رکھتے ہیں ۔ دکنی ادب سے متعلق ایک بہت بڑا کام کلیات محمد قلی قطب شاہ کا تحقیقی و تنقیدی ایڈیشن ہے جس میں قلی قطب شاہ اس کے عہد اور ان کی شاعری کے بارے میں انہوں نے کئی نئے انکشافات کئے ہیں ۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر کی زیرِ نظر کتاب دکن کے مشہور و معروف شاعر شیخ احمد شریف گجراتی کی مثنوی "یوسف زلیخا" ہے ، جو احسن القصص کے نام سے بھی مشہور ہے ۔ یہ مثنوی دکن کی پہلی عشقیہ مثنویوں میں شمار ہوتی ہے ۔ یوسف زلیخا کا قصہ اردو اور دوسری زبانوں میں برابر پیش کیا جاتا رہا ہے ۔ شاعری اور خاص طور پر غزل میں اس قصہ سے متعلق تلازمے اور تلمیحات اس قدر عام ہیں کہ شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس کے کلام میں اس قصے کے اشارے نہ ملتے ہوں ۔ ورنہ بازارِ مصر ، یوسف ، بوئے پیراہن ، زلیخا ، ماہ کنعاں ، برادرانِ یوسف ، یعقوب ، دامنِ یوسف وغیرہ تلمیحات و تراکیب ہر جگہ نظر آتی ہیں ۔ دکن میں بھی شیخ احمد شریف کے علاوہ ہاشمی ، امین ، معتبر خاں عمر وغیرہ نے اس واقعہ پر مثنویاں لکھی ہیں ، لیکن اس کی اولیت احمد شریف گجراتی کو ہی حاصل ہے ۔ اس مثنوی کا اب تک صرف ایک ہی نسخہ دریافت ہو سکا ہے ، جو مولوی عبدالحق کے ذاتی کتب خانے کراچی میں موجود ہے ۔ اس مخطوطے کو ڈاکٹر سیدہ جعفر نے مرتب کیا ہے

زیرِ نظر کتاب ۵۱۹ صفحات پر مشتمل ہے ، جس میں ۱۹۶ صفحات پر احمد شریف گجراتی کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات کو بڑی کاوش کے ساتھ جمع کیا گیا ہے اور ان کی تصانیف ، غزلیں ، رباعی ، مرثیے ، اور ان سے متعلق بیشتر باتیں یک جا کر دی گئی ہیں ۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے احمد شریف کے حالاتِ زندگی ان کے نام ، تاریخ پیدائش ، وطن ، مذہب ، خلافت وغیرہ کے سلسلے میں ممکن ماخذوں سے استفادہ کیا ہے ۔ اور بعض اختلافات کے سلسلے میں سیر حاصل بحث کرنے کے بعد نتیجہ اخذ کیا ہے ۔ حالاتِ زندگی اور شاعرانہ اہمیت کے ذکر کے بعد انہوں نے مثنوی کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا ہے ۔ اس میں مخطوطے کے تعارف کے بعد اس کی ادبی حیثیت ، ہندوستانی عناصر ، تراکیب ، محاورے ، زبان ، صرفی و لسانی تجزیے ، پنجابی ، مراٹھی اور برج کے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے ۔ مثنوی کا لسانی مطالعہ ... کی زبان ، اور زبان کے تدریجی ارتقا کے ... بے حد اہم ہے صفحہ ۱۹۷ سے لے کر ... تک مثنوی کا اصل متن ہے ، جس کی کتابت میں خاص طور پر جلی قلم استعمال کیا گیا ہے تاکہ ... کے پڑھنے میں دشواری نہ ہو ۔ آخر میں ایک ... فرہنگ ہے ، جس میں معانی کے ساتھ مراٹھی ، گجراتی ، سنسکرت ، برج اور پنجابی کے الفاظ کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے ۔

احمد شریف گجراتی کا شمار دکن کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے ۔ زیرِ نظر مثنوی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں زبان اور الفاظ پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی ۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بہت صحیح لکھا ہے کہ :

" احمد گجراتی کی زبان سے نہ صرف پنجابی کی جزوی مماثلتوں کا پتہ چلتا ہے بلکہ وہ برج کے اثرات کی بھی ترجمان نظر آتی ہے ۔ مرہٹی کے الفاظ کو بھی اس نے جگہ دی ہے ۔ اور دکنی کے مخصوص صوتیے اور املے استعمال کئے ہیں ۔"

احمد شریف گجراتی کی اس مثنوی کا ذکر اور اس کی اہمیت کا اظہار اردو کے تمام محققین کرتے رہے ہیں ۔ لیکن ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اس کے متن کو تحقیقی مقدمے کے ساتھ مرتب کر کے ایک قابلِ مبارک کام انجام دیا ہے ۔ ان کا یہ کام اردو میں تحقیق اور ترتیب و تدوین کی ایک اچھی مثال ہے ، جس سے اردو ادب و تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کو کئی نئی راہیں ملیں گی ۔ شارب ردولوی

نام کتاب : "آم کے آم" رام لعل نابھوی
قیمت : تیس روپے
تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لمٹیڈ ، جامعہ نگر ...

اردو کے اہم انشائیہ نگاروں میں ... نابھوی نے اپنا ایک مقام بنا لیا ہے ... ان کے انشائیوں کا دوسرا مجموعہ ہے ... پہلے وہ "تبسم" کے ساتھ ہمارے سامنے ...

لیوں کے دام

آم کے آم



رام لعل نابھوی

نابھوی صاحب کے اس مجموعے میں فنِ انشائیہ نگاری پر ایک مضمون کے علاوہ کل سولہ انشائیے شامل ہیں۔ ان کے طرزِ تحریر کی سب سے نمایاں خصوصیت ایک سادہ، بے تکلف اور رواں بلکہ ایک حد تک مترنم انداز ہے۔ اُکھرے اور گہرے، سادہ اور پیچیدہ، عام فہم اور بلند پایہ خیالات کا ایک طویل سلسلہ الفاظ کے بہاؤ میں آہستہ آہستہ اس طرح شامل ہوتا جاتا ہے کہ کسی رُکاوٹ یا اُلجھن کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اسی بے تکلف اندازِ بیان کے بطن سے ایک پُرکیف لطافت اور شگفتگی جنم لیتی ہے، جو ایک مضمون کی رگوں میں خون بن کر دوڑتی ہے۔ الفاظ کی تکرار، اشاروں اور کنایوں کے اقوال، قولِ محال اور رعایتِ لفظی کے سہارے نابھوی ایک ایسی صورت پیدا کر دیتے ہیں جسے میں "معصوم شگفتگی" کہنا سب سے بہتر سمجھتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ کیفیت قاری کو اپنے اندر پوری طرح جذب کر لیتی ہے۔ اور مضمون نگار کی تخلیق کردہ سحر انگیز فضا سے وہ اسی وقت باہر آتا ہے جب اچانک مضمون ختم ہوتا ہے۔ میں نے اچانک لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا ہے، کیوں کہ نابھوی کے مضامین اسی طرح اختتام کو پہنچتے ہیں جیسے ٹی وی پر فلم دیکھتے ہوئے بجلی یکایک غائب ہو جائے۔ یہ صورت قاری کے ذہن میں احساسِ تشنگی کے ساتھ ساتھ کچھ سوالات بھی پیدا کرتی ہے۔

رام لعل نابھوی کے طرزِ تحریر کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے اکثر غیر مرئی اشیاء اور جذبات و کیفیات کو مادی شخصیت عطا کی ہے — تمثیل نگاری کی یہ صورت اردو نثر میں سب سے زیادہ محمد حسین آزاد کے یہاں نظر آتی ہے۔ نابھوی اس مرتبے تک تو نہیں پہنچے مگر انتظار، فیشن، مسئلہ اور تنہائی وغیرہ کو اُنھوں نے بڑے فن کارانہ انداز میں مجسّم کیا ہے۔ وہ اپنی اس صلاحیت کا مناسب استعمال کریں تو اردو کو ایک اچھا تمثیل نگار مل سکتا ہے۔

نابھوی اُبھری مزاحیہ تحریریں لکھنے کے زیادہ قائل نہیں ہیں۔ عام طور پر وہ مسکرانے کے لیے لطیفے نہیں گھڑتے۔ زندگی کے تضادات اور ناہمواریوں کی تلاش اور نشاندہی خود بخود مسکراہٹ کو جنم دیتی ہے، اس لیے ان کی تحریریں لذّتِ کام و دہن کے ساتھ دعوتِ غور و فکر بھی دیتی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کے بارے میں صحیح لکھا ہے کہ ان کی اکثر تحریروں نے پہلے سوچ کر مہمیز لگائی ہے اور پھر ہنسی کو تحریک دی ہے۔

"آم کے آم" کی ابتدا میں انشائیہ کی تعریف و تاریخ بیان کرتے ہوئے ایک انگریز نقّاد کے حوالے سے رام لعل نابھوی نے لکھا ہے:

" ایسّے کی یہی خصوصیات یعنی اختصارِ تحریر کی غیر رسالیت، بیان میں سادگی، بے تکلفانہ پن اور شخصی ہونا کم و بیش اردو انشائیے کی بنیادی خصوصیات ہیں۔"

میں سمجھتا ہوں کہ خود نابھوی کے انشائیے بھی اس تعریف پر سو فی صد پورے اترتے ہیں اور اس طرح اردو میں انشائیہ نگاری کا ایک اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ البتہ یہ بات شاید کچھ لوگوں کے لیے باعثِ تکدّر ہو (میرے لیے بھی ہوئی) کہ ان کے بیشتر مضامین کی ابتدا ایک ہی انداز میں ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض جملوں کی تکرار بھی ملتی ہے۔

کتاب بہت خوب صورت چھپی ہے اور اُمید ہے کہ نابھوی کے پیش کردہ "آم" خریدنے والوں کو مایوس نہیں کریں گے۔ اب رہا گٹھلیوں کے دام وصول کرنا تو یہ قارئین پر منحصر ہے۔

نام کتاب: جاوید نامہ
مترجم: مضطر مجاز
قیمت بیس روپے
ناشر: اقبال اکیڈمی، حیدر آباد۔ ۲۹

"جاوید نامہ" اقبال کی مشہور و معروف تصنیف ہے۔ اس کے مذہبی، سیاسی و سماجی اور فنی پہلوؤں پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، جس کی تکرار یہاں ضروری نہیں۔ دنیا کی کچھ زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہوا ہے اور زیادہ سے زیادہ زبانوں میں اس کے ترجمے کی ضرورت اب بھی باقی ہے تاکہ فکر و دانش کا یہ سرچشمہ عام لوگوں کو بھی فیض یاب کر سکے۔ اردو زبان میں اس کتاب کے منظوم اور منثور ترجمے ہوئے ہیں، مگر ایک اچھے منظوم ترجمے کی ضرورت عام طور پر محسوس کی جاتی رہی ہے۔ مضطر مجاز کا پیشِ نظر ترجمہ اس ضرورت کو بڑی حد تک پوری کرتا ہے۔

کتاب کی ابتدا میں مشہور اسکالر پروفیسر رشید احمد (?) شمیم کا ایک مختصر مگر بھرپور پیش لفظ ہے، جس میں اقبال کی اس گراں قدر شعری تصنیف کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے مضطر مجاز کے منظوم اردو ترجمے کو سراہا گیا ہے۔

مضطر مجاز نے ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ کتاب کی افادیت میں فٹ نوٹس سے اضافہ ہوا ہے۔ آخر میں جاوید نامہ کے مختلف کردار و مقامات کا ایک مختصر تعارف اس کی افادیت

میں مزید اضافہ کا سبب بنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مترجم نے کافی محنت کی ہے۔ اور اقبال کی مخصوص اصطلاحات، تراکیب اور تلمیحات کے ساتھ ساتھ ان کے منفرد اسلوب کو بھی ترجمے میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں اپنی کوتاہیوں کا بھی انہیں احساس رہا ہے اور انہوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ ترجمہ اصل کتاب کا متبادل نہیں بلکہ معاون ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ان کے ترجمہ شدہ بیشتر اشعار پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ "تاروں کا گیت" کے یہ اشعار دیکھئے: ؎

عقل ہے حاصلِ حیات، عشق ہے سرِ کائنات
پیکرِ خاکِ منتظر! تیرا ہے عالمِ جہات
زہرہ و ماہ و مشتری تیرے لیے بنے رقیب
تیری نگاہ کے لیے کشمکشِ تجلیات

مضطر مجاز کی ایک انفرادیت یہ رہی ہے کہ انہوں نے اقبال کے اشعار کا اردو ترجمہ انہیں بحروں میں پیش کیا ہے، جو اقبال نے "جاوید نامہ" میں استعمال کی ہیں۔ جب کہ بعض دوسرے ترجمہ نگاروں نے ایسا نہیں کیا اور اپنی سہولتوں کے مطابق بحر بدل دی ہے۔

مجموعی طور پر "جاوید نامہ" کا یہ ترجمہ مضطر مجاز کی فنی مہارت اور شاعرانہ صلاحیتوں کا ثبوت ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ اردو دنیا میں کئی جہتوں سے مشہور و مقبول ہوگا۔

# اندازِ بیاں اور

(غالب کی زمین میں مزاحیہ اور طنزیہ غزلیں)

ہاشم عظیم آبادی

قیمت: ۲۵ روپے، ملنے کا پتہ: ہاشم عظیم آبادی، نہرو روڈ، پٹنہ ۶

غالب کی شخصیت اور شاعری بے شمار نثری و شعری تخلیقات کی محرک رہی ہے اور یہ سلسلہ اب تک بند نہیں ہوا۔ ہاشم عظیم آبادی کا مجموعۂ کلام "اندازِ بیاں اور" اس کی تازہ ترین مثال ہے۔ کتاب کا انتساب ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے نام ہے، جنہوں نے اس کتاب کا مسودہ پڑھنے کے بعد بے حد پسند فرمایا تھا۔ ابتدا میں پروفیسر عطا کاکوی، پروفیسر سید حسن اور قتیل دانا پوری کی مختصر رائیں زینتِ کتاب ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہاشم عظیم آبادی نے ایک نئی راہ نکالی ہے۔ دیوانِ غالب کی ہر غزل پر طنزیہ یا مزاحیہ غزل لکھنا شاید کسی اور سے ممکن نہ ہوسکا۔ اطلاعات شاہد ہیں کہ ہاشم صاحب نے یہ کام آج سے برسوں پہلے مکمل کرلیا تھا، مگر غالب کی طرح ان کی آہ کو بھی اثر کی منزل تک پہنچنے میں ایک عرصہ لگ گیا۔

ہاشم صاحب کے بیشتر اشعار، بیوی، فیشن اور مولوی کی تکون کے گرد چکر کاٹتے ہیں۔ نئے زمانے نے جن نئے مسائل و حالات کو جنم دیا ہے ان کا یا تو ہاشم صاحب کو احساس نہیں یا وہ ان حالات سے چشم پوشی میں راہِ نجات سمجھتے ہیں۔ دراصل اس میں تنہا ہاشم عظیم آبادی کا ہی قصور نہیں۔ پچھلے پچیس تیس برسوں میں اردو کی ظریفانہ شاعری کا عمومی مزاج یہی رہا ہے۔ حالانکہ سماجی و سیاسی سطح پر ہر دم رونما ہونے والی ناہمواریوں نے ظرافت نگاروں کو اظہارِ خیال کے نت نئے مواقع فراہم کئے ہیں اور نثر نگاروں نے ان سے استفادہ بھی کیا ہے، مگر اردو کی ظریفانہ شاعری مجموعی طور پر اب تک اس مقام سے آگے نہیں بڑھ سکی جہاں اکبر الہ آبادی مرحوم اسے چھوڑ گئے تھے۔ ایسی صورت میں ہاشم عظیم آبادی کے یہاں موضوعات کی فرسودگی قابلِ اعتراض نہیں۔ قدیم موضوعات پر بھی انہوں نے بعض اچھے اشعار کہے ہیں، جو بے ساختہ دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

ہاشم عظیم آبادی میں فنی صلاحیتوں کی کمی نہیں، مگر وہ روایتوں کے اسیر ہوکر دروں بینی اور دور بینی سے محروم ہیں۔ اگر وہ اپنے ذہن کا دریچہ کھلی رکھیں، طرزِ کہن پہ اڑنے اور آئینِ نو سے ڈرنے کی روش ترک کردیں تو فکر و فن کی بہت ساری چنگاریاں جو ان کے فن میں پوشیدہ ہیں، شعلہ بھی بن سکتی ہیں اور اردو کی ظریفانہ شاعری کے سرمایے میں گرانقدر اضافہ ہوسکتا ہے۔ بہرحال اپنی موجودہ صورت میں بھی ہاشم عظیم آبادی کا یہ کلام صرف لائقِ مطالعہ نہیں بلکہ قابلِ داد بھی ہے۔

نام کتاب: حصار، مصنف: جلیل تنویر

قیمت: بارہ روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، بمبئی، علی گڑھ

"حصار" ایک ابھرتے ہوئے افسانہ نگار جلیل تنویر کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے، جو جناب صلاح الدین نیر اور طیب انصاری کی حوصلہ افزائی کے سبب طباعت کی منزلوں سے گزر کر منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس مجموعے میں کل سولہ مختصر افسانے اور چار منی کہانیاں شامل ہیں۔ پیش لفظ کے تحت ڈاکٹر مغنی تبسم نے جلیل تنویر کے افسانوں سے متعلق چند اہم باتیں کہی ہیں:

نقشِ اول کی حیثیت سے جلیل تنویر کی کہانیاں خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے اکثر افسانوں میں جذبات کی بالائی سطح ہی پیش کی گئی ہے اور انسانی دکھ درد یا مسائل و نفسیات کی تہوں میں اترنے کی کوشش بہت کم ملتی ہے تاہم جلیل تنویر کو کہانی کہنے کا سلیقہ آتا ہے اور وہ ذاتی و عمومی تجربات کو افسانے کا پیراہن عطا کرسکتے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر مغنی تبسم نے لکھا ہے، وہ کچھ نئے فنی آفاق کی تلاش میں بھی مشغول ہیں اور "سفر" یا "گمشدگی" جیسی کہانیوں میں علامتی اور تمثیلی اندازِ بیان نے ایک نیا حسن پیدا کردیا ہے۔

دراصل جلیل تنویر کے تمام افسانے دو واضح رجحانات کے تحت تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔ نصف سے زیادہ افسانے تو ایسے ہیں، جن میں ترقی پسندوں کے عام موضوعات اور رویے کی جھلک ملتی ہے۔

... افسانے ایسے گئے ہیں جن میں ... اجتماعی زندگی کے پیچیدہ ... گئی ہے۔ یہ مسائل اکہرے انداز میں ... آتے۔ بلکہ اپنے مخصوص سیاسی، سماجی اور ... تناظر میں ابھرتے ہیں اور سوالات کا ایک سلسلہ ... پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ اجتماعی مسائل کے سلسلے میں ... کی کہانی "سفر" کا ذکر ناگزیر ہے، جو موجودہ نسلِ ... انسانی کی ناآسودہ اور بکھری ہوئی زندگی کو پیش کرتی ... ہے۔ سکون کی تلاش سبھوں کو ہے اور اس تلاش ... کے دوران مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی ... جانب، ایک تہذیب سے دوسری تہذیب کی طرف ... ایک لاحاصل سفر مسلسل جاری ہے۔ "گمشدگی" اور ... "کھوج کرنوں کی" جیسی کہانیاں بھی بعض ایسے ہی اہم مسائل کو چھیڑتی ہیں۔ دوسری طرف انفرادی مسائل پر لکھے گئے بعض افسانے بھی خاصے کام یاب ہیں۔ "بیچارہ"، "آسیبی لمحے" اور "انمول عطیہ" میں انسانی نفسیات کی کچھ ایسی لہروں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے، جو عام نہ ہونے کے باوجود قابلِ توجہ ہیں۔

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

انعکاس، مظفرپور (فراق نمبر)
مدیر اعلیٰ: منظر اعجاز صفحات: ۲۸۲
قیمت: ۲۵ روپے فی کاپی۔ پتہ: مکتبہ انعکاس کنہولی ناکا روڈ، مظفرپور ۸۴۲۰۰۱

اردو کی جدید شاعری کے ممتاز اور صاحبِ طرز غزل گو شاعر فراق گورکھپوری کے فکر و فن سے متعلق انعکاس مظفرپور کا خاص نمبر بڑے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ ۲۸۲ صفحات پر مشتمل اس خصوصی نمبر کے ... کے چند اہم عنوانات یہ ہیں: "تاثریاتی ... تنقید"، تجزیاتی مطالعے، ناقدانہ جائزے، ... ناقدانہ بصیرت، فراق اور ان کا نقطۂ نظر ... منظوم حصے کو چھوڑ کر اس میں ۴۴ وقیع اور فکرانگیز مضامین شامل ہیں۔

تازہ مضامین کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، سید احتشام حسین، عزیز احمد، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید اختر، جمیل جالبی، ڈاکٹر سید جعفر، سید صفدر حسین اور سعادت نظیر جیسی ممتاز شخصیتوں کے شائع شدہ مضامین کو یک جا طور پر پیش کر کے ادارہ انعکاس نے ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ تازہ اور نئے مضامین میں آچاریہ جانکی ولبھ شاستری، ظفر عدیم، ڈاکٹر اشفاق اعظمی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر مرتضیٰ اظہر، ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی، ڈاکٹر سید حامد حسین، اور بعض دوسرے تنقید نگاروں کے مضامین خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کے لائق ہیں۔ ان تنقید نگاروں کے مضامین خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کے لائق ہیں۔ ان تنقید نگاروں نے فراق گورکھپوری کی شاعری کو مختلف جہتوں سے سمجھنے اور پرکھنے کی کاوشیں کی ہیں۔ شعورِ تنقید کے توازن، سنجیدگی اور احتیاط نے ان کے ناقدانہ مطالعوں اور تجزیوں کو فکر طلب اور بصیرت افروز بنا دیا ہے۔ تعریفِ بے جا اور تنقیصِ محض، دونوں ہی انتہاؤں سے گریز کیا گیا ہے۔ اس خصوصیت نے انعکاس کے اس فراق نمبر کو "فراقیات" کا انتہائی اہم باب بنا دیا ہے۔ آہنگِ فراق کے شائقین کے لیے اس کا مطالعہ بے حد سود مند ثابت ہوگا۔

ظاہر حسین

نام کتاب: امام بخش صہبائی، شخص، شاعر، شارح
مصنف: پروفیسر خواجہ محمد حامد
قیمت: ڈی لکس ایڈیشن، چالیس روپے عام ایڈیشن ۳۰ روپے
ملنے کا پتہ: بزمِ غالب، کامٹی (مہاراشٹر) ۴۴۱۰۰۱

ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کا آغاز خصوصیت سے غزنویوں کا مرہونِ منت ہے۔ ہندوستان کی سرزمین اس زبان کو خوب راس آئی۔ یہاں یہ خوب پھلی پھولی ایک نیا رنگ و روپ اپنایا، جس کو لہجے کے اعتبار سے "فارسی ہندی" کہا گیا اور عالمِ شعر کے مکتب میں جس فکر و اندیشہ کی بنیاد پڑی اس کو سبک ہندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، لیکن اس توانائی اور مقبولیت کے باوجود انگریز حکمرانوں کی نظر اور تاریخی حالات کے تقاضوں کی آنچ سے اس کی آب و تاب محفوظ نہ رہ سکی۔

امام بخش صہبائی اس ہی رفتن دور کی یادگار ہیں۔ صہبائی، ظہوری و بیدل اور غالب ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ ساتھ ہی دل چسپ بات یہ ہے کہ جہاں غالب قدر شناسی کے باوجود ناقدری کا رونا روتے نظر آتے ہیں، وہاں صہبائی کے یہاں کثیر التصانیف ہوتے ہوئے بھی شکایت کا غلغلہ نہیں ہے، لیکن پروفیسر خواجہ محمد حامد صاحب کی "امام بخش صہبائی، شخص، شاعر اور شارح" میں اس خاموشی کو خوب گویائی بخشی ہے اور جس طرح صہبائی نے دم توڑتی ہوئی فارسی میں اپنی ادبی کاوشوں سے روح پھونکنے کی بھرپور کوشش کی، اسی طرح موصوف نے صہبائی کے تعارف کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ تاریخ کے پس منظر میں ان کی شخصیت اور ادبی سرگرمیوں کو بڑے حسن و خوبی اور فن کارانہ چابک دستی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ مثلاً صہبائی کی سرسید سے قربت، دلی کالج سے وابستگی، علمی و ادبی صحبتیں، سیاسی دلچسپیاں، زندگی کی عام مصروفیات و معمولات اس ترتیب و تزئین کے ساتھ سامنے آتی ہیں کہ صہبائی ایک صدی سے اوپر کے فاصلے کو طے کر کے بالکل اپنے قریب آجاتے ہیں۔ ساتھ ہی مصنف کی یہ کوشش، فارسی زبان و ادب کی دور بہ دور ترقی اور تاریخ کا ایک بصیرت افروز تجزیہ بھی ہے۔

ہندوستانی فارسی زبان و ادب کے ساتھ یہ بڑی ستم ظریفی رہی کہ اس کو "سبک ہندی" کا نام دے کر ایران زدہ طبقہ نے اس کی خدمات کو گردانا ہی نہیں۔ اگرچہ ہند کی آٹھ سو سالہ فارسی ادب کی تاریخ نے اپنے دامنِ عاطفت میں ایسے ایسے علماء، شعراء اور ادباء کو پروان چڑھایا کہ جنہیں ایرانی معاصرین کے ہم پلہ نہیں تو کم بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مگر ستم بالائے ستم غالب اپنی ناقدری کا رونا تو روتے ہی رہے (آئندہ صفحہ پر)

## لکھنا اِسے کہتے ہیں :

ایڈیٹروں کو خط لکھنا مشکل کام ہے ۔ ان خطوں کا ایک مخصوص پیٹرن ہوتا ہے ۔ شاعروں کو بھی خط لکھنا کچھ کم مشکل نہیں ہوتا اور مشکل یہ آن پڑی ہے کہ آپ دونوں ہی ہیں ۔

’ آج کل ‘ کے مئی کے شمارے کے بارے میں تعریفی خط لکھنے کو بہت جی چاہا ۔ پروفیسر عبدالمغنی اور اسعد بدایونی کے مضامین بہت پسند آئے ۔

یہ بیر راجہ کون ہیں ۔ کیا کہانی لکھی ہے ۔ ان کا صحیح تلفظ کیا ہے ۔ ” مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بَیر رکھنا “ والے بَیر ہیں یا بیربل کا جزوِ اوّل یا بیر اور امرود سے تعلق ہے ۔ یہ بیر تو BEAR تو ہو نہیں سکتے ۔ غیر معمولی کہانی لکھی ہے ۔ ایک زمانہ بعد ایسی کہانی پڑھی جس سے آنکھیں نم ہوئیں ۔

وامق جونپوری کو دو چار دن پہلے ہی ٹی وی پر سُنا ۔ لکھنؤ کا مشاعرہ تھا ، جس کی وہ صدارت ( خاموش صدارت ) کر رہے تھے ، لیکن جب نظم نامکمل سحر سُنائی تو معلوم ہوا کہ بولنا اسے کہتے ہیں ۔ ” تجلیِ شاعر “ میں دیکھئے کس غضب کا شعر کہا ہے ؎

ممکن ہے اس کو توڑ کے نکلے کوئی درخت<br>
پتھر کے سامنے چلو چل کر دُعا کریں

اظہر عنایتی کی غزلیں بھی اچھی ہیں ۔

محافظ حیدر نے ایک زمانے کے بعد اپنے قلم میں روشنائی ڈالی ۔ ہندوستان کے لاپرواہ افسانہ نگاروں میں یہ شروع کے دو تین لوگوں میں سے ہیں ۔ یعنی سرِ فہرست ۔

آپ نے اپنی غزل کس سے منتخب کروائی : کیا اُسی سے جس کے بارے میں کہا ہے :

اظہار : آپ سوچئے کس کی ادا کا ہوں

یوسف ناظم

## باریک بینی کا ثبوت :۔

عام طور پر کوئی قاری کسی ماہ نامے سے یہ توقع نہیں کرتا کہ وہ اس کے سامنے ٹھوس اور عمر بھر قائم رہنے والی قدر کا ادب پیش کرے گا ، مگر میر تقی میر نمبر دیکھ کر ایک حیرت انگیز مسرت ہوئی کہ آپ نے اس نمبر میں یہی کیا ہے ۔ اس نمبر کو ایک رسالہ یا ماہ نامہ سمجھنا غلط ہوگا ۔ یہ تو میریات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے ۔ جو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ میر کو سمجھتے ہیں انہیں یہ نمبر پڑھ کر اپنی میر فہمی پر نظرِ ثانی کرنی پڑے گی ۔ اس نمبر کے تقریباً سبھی مضامین نہایت قیمتی اور قابلِ قدر ہیں ۔

مجھے اس نمبر کو دیکھنے سے پہلے یہ معلوم نہیں تھا کہ جناب محمد ہدایت اللہ صاحب شعر و ادب سے اتنی گہری دلچسپی رکھتے ہیں کہ اپنی مصروفیت کے باوجود میر پر اس قدر کامیاب مضمون لکھنے کے لئے وقت نکال سکتے ہیں ۔ جناب مالک رام مشہور ادیب ہیں ۔ اُن کا مضمون میر و غالب بہت دلچسپ ہے ۔ جناب آل احمد صاحب سرور کا مضمون ’ میر میری نظر میں ‘ نہایت سنجیدہ اور پُر وقار ہے ۔ سرور صاحب سے یہی توقع بھی تھی ۔ جناب جمیل جالبی کا مضمون قابلِ تعریف ہے ۔ انتظار حسین صاحب کا مضمون میر اور جانوروں کے تعلقات پر ہے ۔ بالکل نیا پہلو ہے ۔ قابلِ داد ہے ۔ خواجہ احمد فاروقی صاحب کے مضمون سے میر جن شہروں میں رہے ، اُن کے متعلق بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں ۔ جناب گوپی چند نارنگ کے مضمون کی تعریف کرنے کے لئے ایک مضمون لکھنے کی ضرورت ہے ۔ جناب وارث علوی صاحب کی زبان کا کیا کہنا ۔ مختلف مشہور اشعار کی طرف نہایت لطیف اشارے کئے ہیں ۔ عبدالمغنی صاحب کا مضمون خوب ہے ۔ نیر مسعود صاحب کے مضمون سے میر کے قیامِ لکھنؤ سے متعلق بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں ، جنہیں عام طور پر لوگ نہیں جانتے ۔ حنیف کیفی صاحب نے میر کے جانے مانے اشعار میں نئے معنی پیدا کئے ہیں اور بڑی باریک بینی کا ثبوت دیا ہے ۔

یوگیندر پال صابر ، شکوہ آباد

## متوازن

کلیم الدین کی تنقید نگاری سے متعلق ڈاکٹر عبدالمغنی کا مضمون خوب ہے ۔ پسند آیا ۔ اسعد بدایونی نے جدید غزل کی روایت کا جائزہ مناسب انداز میں لیا ہے ۔ لیکن نئے دَور کے شعراء کے اشعار کے انتخاب میں اُنہوں نے جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے ۔ بہر حال کوشش اچھی ہے ۔ شارب ردولوی کے تبصرے ہمیشہ کی طرح متوازن ہیں ۔

کامران غنی ، پٹنہ

## تحقیق کا حق :

یوں تو ” آجکل “ نے آج تک جتنے نمبر نکالے ہیں وہ سب دستاویزی

کے مالک ہیں، لیکن تازہ تقریبی نمبر (میر تقی میر نمبر) ایک اعتبار سے سب
زیادہ معیاری ہے کیوں کہ اس معیار کے تنقیدی مضامین شاید ہی کہیں
چھپے ہوں۔ یوں تو ہر مضمون اپنی جگہ مثالی ہے۔ لیکن آلِ احمد سرور،
شمس الرحمن فاروقی اور گوپی چند نارنگ کے مضامین نے خاص طور سے متاثر کیا۔
لیکن ایک تو اس کمی کا احساس ہوتا ہے کہ میر کی مرثیہ نگاری پر کوئی مضمون نہیں
جب کہ میر کے ۵۰، ۶۰ مراثی موجود ہیں۔ دوسرے یہ کہ میر کے تلامذہ پر بھی
اگر کوئی مضمون ہوتا تو وہ بھی بہت سے لوگوں کی معلومات میں اضافے کا سبب بنتا۔
اور تیسری کمی یہ رہ گئی کہ اردو غزل کے اس خدا کو اس راستے جس نے لگایا اور
رہ نمائی کی (جس کا اظہار خود میر نے اپنے تذکرے میں بھی کیا ہے) یعنی سید سعادت علی
امروہوی ان کا کوئی ذکر نہیں۔ ایک مختصر مضمون سعادت اور میر کے بارے میں
ہوتا تو ان مضامین سے تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیق کا بھی حق ادا ہو جاتا۔

عظیم امروہوی، امروہہ
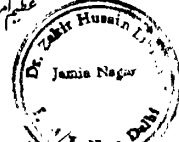


## عمدہ افسانے

مئی کے شمارے میں محافظ حیدر کا "بت جاگ گیا"، اور بیر راجہ کا
"نمبر دو": "نمبر ایک" عمدہ افسانے ہیں۔

عابد سہیل، لکھنؤ

## مفید اضافہ

جون کا ماہ نامہ 'آج کل'، نظر نواز ہوا۔ آپ نے "من کہ" کے عنوان سے زندہ
ادیبوں کے سوانحی خاکے کا سلسلہ شروع کر کے ایک نئی روایت کا آغاز کیا ہے، جو
اردو ادب میں ایک مفید اضافہ ہے۔

پروفیسر محمد مجیب صاحب کے سوانحی خاکے میں کتابت کی ایک غلطی رہ گئی
ہے۔ شمارہ جون کے صفحہ ۲۵، کالم ایک کے بالکل آخر میں دو تاریخیں ایک ساتھ
گڈمڈ ہو گئی ہیں اور پہلی تاریخ کی عبارت نامکمل رہ گئی ہے۔ صحیح عبارت حسب ذیل
ہے:-

۱۹۲۶ء - دسمبر: ماہنامہ "جامعہ" میں ڈراما نگاری پر پہلا مضمون شائع ہوا۔
۱۹۲۷ء - دسمبر: ماہنامہ "جامعہ" میں "مقدمہ" کے عنوان سے پہلا علمی مضمون
شائع ہوا، جو دراصل جان اسٹورٹ مل کی کتاب:
"لبرٹی" کے ترجمہ "آزادی" (از: سعید انصاری مرحوم)
میں بطور مقدمہ شامل ہے۔

پچھلے شمارے (بابت ماہ مئی ۱۹۸۴ء) کے صفحہ ۳۴ پر آزاد قاسمی علیگ صاحب
نے بیگم مجیب صاحب کے مضمون کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خط میں لکھا ہے:

"مجیب صاحب عظیم انسان تھے" تھے کیا معنی ہیں۔ خدا کے فضل سے وہ حیات ہیں۔
اور صحت کی خرابی کے باوجود دن رات لکھنے پڑھنے میں وقت صرف کرتے ہیں۔ خدا
ان کی زندگی میں برکت دے کہ حسبِ معمول علم و ادب کی مفید خدمت انجام دیتے رہیں۔

عبداللطیف اعظمی، نئی دہلی

## چاندنی اساڑھ کی

"..... بہت دنوں بعد راز صاحب کی غزل پڑھنے کو ملی

خاموش، موج موج، سمندر صدا کا ہوں
اظہار، آپ سوچیے کس کی ادا کا ہوں

خوب ہے۔ "آج کل" کے صفحات سے چاندنی اساڑھ کی" کا یہ شاعر کہاں
گم تھا؟"

شہنشاہ مرزا، لکھنؤ

## درست آید

مئی کا "آج کل" تاخیر سے ملا، مگر "دیر آید درست آید" کی تازہ ترین
مثال معلوم ہوا۔ ادیبوں کے خود نوشت تعارف کا سلسلہ بہت خوب ہے۔
یہ دو صفحات ایک دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں، جن کی افادیت اور
اہمیت آنے والے دنوں میں بڑھتی جائے گی۔ آخری صفحے پر مرحوم ساغر نظامی
کی تصویر دل تڑپا گئی۔ اور آپ کی اس حقیقت بیانی کی داد کس طرح دوں کہ

شبنم صفت میں سایہ گھنیری گھٹا کا ہوں
میں پہلا حرف، صبح کی پہلی دعا کا ہوں

اعجاز علی ارشد، پٹنہ

## خوشبو

"آج کل" کی خوشبو کسی نہ کسی شمارے سے مجھ تک پہنچ جاتی ہے، لیکن اب جی یہ
چاہتا ہے کہ یہ مہک تسلسل کے ساتھ مجھ تک آئے، اسی لیے آپ سے درخواست
ہے کہ میرا نام "آج کل" کے پرستاروں کی فہرست میں درج فرمائیں۔ تازہ شمارہ کا انتظار
رہے گا۔

اظہر عنایتی، رام پور

## سختی برتیں

مغنی صاحب کا مقالہ مئی ۱۹۸۴ء کے شمارے کی جان ہے۔ یوں تو موصوف نے
بہت پہلے کلیم الدین احمد کی ناقدانہ حیثیت (نقطۂ نظر) تحریر فرما کر اپنے قلم کا کمال دکھا چکے تھے
اس بار رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ موصوف کے یہ مقالے کلیم الدین احمد کو سمجھنے کے لیے
اتنا ہی ضروری ہوں گے جتنا کہ اپنی شکل و صورت کا جائزہ لینے کے لیے آئینہ۔
'من کہ' ایک اہم قدم ہے۔ افسانے دلچسپ ہیں۔ غزلوں کے انتخاب میں ذرا سختی برتیں۔

رضوان عثمانی، نئی دہلی

رگ وید میں لکھا ہے ”راجہ کو چاہیے جگہ جگہ اپنے عالموں اور دانش وروں کو رکھے، تاکہ لوگوں تک اُن کے افکار کی روشنی پہنچ سکے۔ میں سوچتی ہوں کہ ہم سب کے ہوتے ہوئے، ہمارے مُلک کے جو حالات ہیں، چاہے وہ پنجاب کے ہوں، آسام کے، بمبئی کے یا کسی ریاست، کسی گاؤں کے، محسوس ہوتا ہے ہم سے کہیں کوئی خطا ضرور ہوئی ہے۔ ہم قصوروار ہیں۔ ہم اپنے افکار کو انسانیت میں جو ہمارا یقین ہے، اس کو لوگوں تک نہیں پہنچا سکے ہیں“ ان خیالات کا اظہار پنجابی کی مشہور و معروف شاعرہ امرتا پریتم نے ۲۵۔ جون ۱۹۸۴ء کو پبلی کیشنز ڈویژن میں قومی یک جہتی کے موضوع پر منعقدہ شعری نشست میں کیا۔

پبلی کیشنز ڈویژن کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب قومی یک جہتی پر تین زبانوں کے شاعروں کا مشاعرہ منعقد ہوا۔ پنجابی، اردو اور ہندی زبانوں کے بیس سے زیادہ شاعروں نے اس میں شرکت کی۔ شعری نشست کی صدارت پبلی کیشنز ڈویژن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیام سنگھ ششی نے کی۔
شعری نشست میں جب امرتا پریتم کا مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے پھول مالا سے خیر مقدم کیا گیا تو انہوں نے کہا ”آپ مجھے مہمانِ خصوصی نہ کہیں، کیوں کہ مجھے لگے گا کہ میں خصوصی خطاوار ہوں۔ آج پھول لینے اور دینے کا دن نہیں۔ سوچتی ہوں، ہم ایسے پھول دیں، فکر کے، جن سے انسانیت کی مہک آئے۔“ اس کامیاب شعری نشست میں محترمہ امرتا پریتم کے علاوہ پنجابی کے نوجوان شعرا، جناب موہن جیت سنگھ، جناب جسونت دیپ، جناب اشانت۔ ہندی کے جناب رماناتھ اوستھی، ڈاکٹر شیام سنگھ ششی، جناب بال سروپ راہی، جناب مدھر شاستری، جناب رام اوتار تیاگی، جناب گنگا پرشاد بمل، ڈاکٹر جے پال ترنگ، جناب نریندر سنہا، جناب کیدار ناتھ کومل، جناب سریش نیرب، جناب وجے کپور، جناب ونود شرما اور اردو کے جناب مخمور سعیدی، جناب رفعت سروش، جناب کمار پاشی، راج نرائن راز اور عابد کرہانی نے شرکت کی۔

تصویر میں دائیں سے: محترمہ امرتا پریتم اپنا کلام سُنا رہی ہیں۔ صدرِ مشاعرہ ڈاکٹر شیام سنگھ ششی۔ اُوپر: پنجابی شاعر جناب موہن جیت سنگھ۔ وسط: ہندی شاعر جناب وجے کپور اور نیچے اُردو شاعر جناب مخمور سعیدی اپنا کلام سُناتے ہوئے۔

Regd. No. D(DN) 103
R.N. 9^8/57

Licensed U(DN)-50 to post without pre-payment
at Civil Lines, Post Office, Delhi.

Vol. 4? No. 1 AJKAL (URDU) August, 1984

جولائی ۸۴ ۱۹ء کو ایوانِ غالب، نئی دہلی میں منعقدہ ایک خصوصی تقریب میں، وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ... غالب ایوارڈ تقسیم کئے۔ اُوپر: وزیرِ اعظم حاضرین
... اب کرتے ہوئے ـــــ نیچے انعام پانے والوں کے ساتھ: دائیں سے بائیں: جناب مجتبیٰ حسین (ساگر سوری غالب انعام برائے طنز و مزاح) جناب ریوتی سرن شر
... ہم سب غالب انعام برائے اردو ڈراما) جناب محمد خلیق ٹونکی (پدم چند گپتا غالب انعام برائے خطاطی) بیگم ذکیہ سلطانہ نیّر، اہلیہ ساغر نظامی مرحوم (مودی غالب انعا
... ئے اُردو شاعری) وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی، محترمہ قرۃ العین حیدر (مودی غالب انعام برائے اردو نثر) پروفیسر خلیق احمد نظامی (فخر الدین علی احمد غالب انعام برائے تحقی...
اور جناب عابد علی خاں (سلوانیا لکشمن غالب انعام برائے اردو صحافت)۔

Published by the Director Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001, Printed by the Manager, Govt. of India Photolitho Press, Faridabad.

آجکل

راجیہ سبھا نے بھارت کے چھٹے
نائب صدر جمہوریہ
شری ہدایت اللہ کے اعزاز میں
ان کے عہدے کی میعاد مکمل ہونے پر
۲۴ اگست ۱۹۸۴ء کو
ایک الوداعی تقریب کا اہتمام کیا۔
تصویر میں شری ہدایت اللہ کے ساتھ،
لوک سبھا کے اسپیکر
شری بلرام جاکھڑ دیکھے جا سکتے ہیں۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی
۱۵ اگست ۱۹۸۴ء کو یوم آزادی
کی ۳۷ ویں سال گرہ کے موقع پر
لال قلعہ کی
فصیل سے قوم کو
خطاب کرتے ہوئے۔

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

# آجکل
نئی دہلی

ایڈیٹر: راج نرائن راز

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابد کرہانی

جلد: ۴۳ شمارہ: ۲ ستمبر ۱۹۸۴ء

قیمت: ایک روپیہ ۵۰ پیسے فون: ۳۸۷۰۶۹ بھادر۔آشون شک سمت ۱۹۰۶



## ترتیب



سرورق: رجون اڈیچہ

بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر: "آجکل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ:
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

زر سالانہ: ۱۵ روپے — دو سال کے لیے: ۲۷ روپے — تین سال کے لیے: ۳۸ روپے

# ملاحظات

# اوّلین فرض

صدرِ جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے آزادی
۷ ویں سالگرہ کے موقع پر ۱۴ اگست کو ریڈیو اور
ی پر قوم کے نام اپنے پیغام میں کہا :

"میں آزادی کی ۳۷ ویں سال گرہ کے موقع
پ سب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اپنی
خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

آج کے دن ہمیں اپنے اُن ہم وطنوں کی یاد
ہے، جنہوں نے آزادیٔ وطن کے لیے عظیم قربانیاں
ں۔ ہم اُن کے بڑے احسان مند ہیں۔ ہم اُن سبھی
ن الوطنوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں، جنہوں نے
ار و قربانی و ہمت سے ملک کی جدّ و جہدِ آزادی میں
نہ لیا تھا۔ یہ ہماری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ حصولِ
ادی کے بعد کے برسوں میں ہمیں ایک ذہین اور
ر اندیش قیادت نصیب ہوئی۔ ایک متحد، مستحکم
ر ترقی پسند قوم کی ظہور پذیری کے لیے بنیادیں رکھی
ں۔ تاریخی میراث نیز پیار، امن اور رواداری کی عزیز
یار کو مدِ نظر رکھ کر ہمارے قومی رہنماؤں نے ایک
ن تیار کیا، جس نے ہمیں ایسا طرزِ حکومت دیا، جو کہ
ارے ملک سے مطابقت رکھتا ہے اور جو سیکولرازم،
اج واد اور جمہوریت پر مبنی ہے۔

آزادی کے بعد سے بھارت کے سیاسی نظام نے
ر رونی اور بیرونی تخریب پسند قوتوں کے ذریعہ پیدا
نگئے چیلنجوں کا بڑی کامیابی سے سامنا کیا ہے حال

ہی میں پنجاب میں کچھ افسوسناک واقعات ہوئے ہیں۔
۱۷ رجون کو میں نے قوم کے نام اپنے پیغام میں ان باتوں
کا ذکر کیا تھا، جن کی وجہ سے وہاں ایسے واقعات
رونما ہوئے اور اس بات پر زور دیا تھا کہ روایتی
رواداری اور بھائی چارے کو پھر سے فوراً قائم کرنے
کی بھرپور کوشش کرنی چاہیئے۔ کچھ گمراہ عناصر دیش
کے کچھ دیگر علاقوں میں بھی بدامنی پیدا کر رہے ہیں —
ہمارا اوّلین فرض ہے کہ ہم ان تخریب کار قوتوں کو
ملک کے لوگوں کو گمراہ کرنے کا موقع نہ دیں۔

بھارت کی آزادی ملک کے مختلف عقائد کو
ماننے والے سبھی ہم وطنوں کی مجموعی کوششوں کا نتیجہ
تھی۔ بھارت کے سبھی لوگ، چاہے وہ ملک کے کسی
بھی حصّے کے رہنے والے ہوں اور کوئی بھی زبان بولتے
ہوں، مہاتما گاندھی اور ہمارے دوسرے قومی رہنماؤں
کی پکار پر بڑی ہمت اور جوش کے ساتھ اُٹھ کھڑے
ہوئے تھے۔ اس طرح ہماری آزادی کسی ایک
طبقے یا فرقے کی نہیں بلکہ سب کی مشترکہ میراث ہے،
جس کے حصول کے لیے ہمارے ہم وطنوں نے زبردست
قربانی دی تھی۔ اب اس کے تحفّظ کی ذمہ داری
ہم سب پر ہے۔

آزادی کے بعد بھارت کی اقتصادی حالت
میں لگاتار بہتری آئی ہے۔ بھارت میں ایک مضبوط
اور ٹھوس بنیادی ڈھانچہ تیار ہو گیا ہے۔ مجھے اس
بات پر از حد مسرت ہے کہ ملک میں ۸۴-۱۹۸۳ء میں
۱۵۱۰ لاکھ میٹرک ٹن اناج پیدا ہوا، جو گزشتہ سال
کی پیداوار سے ۷ فی صد زیادہ ہے۔

ملک میں صنعتی ڈھانچہ تیار ہو جانے کی وجہ سے
بھارت اب دنیا کا ایک اہم صنعتی ملک بن گیا ہے۔
منصوبوں کی شروعات سے جو سائنٹیفک بنیاد ملک
میں رکھی گئی ہے، اس کا فائدہ ہمیں ملنے لگا ہے —
بھارت سائنس اور ٹکنالوجی کے متعدد میدانوں خصوصاً
نیوکلیائی اور خلائی سائنس نیز تجربات میں بتدریج ترقی
کر رہا ہے۔

زراعت اور صنعت کے میدان میں لگاتار
پیداوار بڑھ رہی ہے۔ ہمیں اس رفتار کو برقرار
رکھنا ہوگا تاکہ ہم اپنے عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کر سکیں۔
ہمیں غریبی، بھوک، ناخواندگی، بیماری کو بھی جڑ سے
ختم کرنا ہوگا۔ یہ ہمارا سب سے اہم کام ہے اور اس
میں تاخیر نہیں کی جا سکتی۔

آئیے، ہم عہد کریں کہ ہم سچائی، پیار اور امن
کے راستے سے نہیں ہٹیں گے اور ان جاوداں اصولوں
پر کاربند رہیں گے، جن کی بھارت ہمیشہ حمایت کرتا
رہا ہے۔ ملک کی ترقی، امن اور خوشحالی کے اس
عظیم کام کو پورا کرنے میں ہر شہری کو اپنا رول نبھانا ہوگا۔
مجھے یقین ہے کہ ہمارے ہم وطن اس سلسلے میں پوری
پوری کوشش کریں گے اور متحد ہو کر آگے بڑھیں گے۔

یہ سبھی کو معلوم ہے کہ کسی بھی تہذیب کی خوبی
اقلیتوں اور خواتین کے تئیں اس کے رویّے سے جانچی
اور پرکھی جاتی ہے۔

بھارت کا رویّہ دونوں کے ساتھ اچھا
رہا ہے اور ان کے لیے اپنی اہلیت کے مطابق ترقی
کرنے کے پورے مواقع موجود ہیں۔ یہاں اقلیتوں
کو اکثریتوں کے مساوی حقوق حاصل ہیں۔ خواتین
سیاست، قانون، تعلیم، سائنس، تجارت، صنعت
اور دیگر سبھی شعبوں میں اعلیٰ سطح پر موجود ہیں۔ وہ
مردوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر آگے
بڑھ رہی ہیں۔ ابھی حال ہی کی ایک مثال ہے کہ

ایک بھارتی خاتون ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

ہماری افواج میں ملک کے سبھی حصوں کے رہنے والے، مختلف عقائد رکھنے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگ شامل ہیں۔ وہ سبھی حب الوطنی اور نظم وضبط کے جذبے کے ساتھ مل جل کر کام کر رہے ہیں۔ ملک ان کی فرض شناسی کے لیے ان کی ستایش کرتا ہے۔

میں اس برس کے ۳ر اپریل کے اس تاریخی واقعہ کا بھی ذکر کرنا چاہوں گا، جب ہماری فضائیہ کے ایک افسر نے خلائی سفر کیا اور اس کے ساتھ ہی بھارت خلائی دور میں داخل ہوگیا۔ ان الفاظ کے ساتھ میں اپنے ہم وطنوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ملک کی ترقی، استحکام، اتحاد اور سالمیت کے لیے لگاتار کوشش کرتے رہیں۔

## آزادی کا تحفظ

یوم آزادی کے موقع پر وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۵ر اگست کو لال قلعہ کی فصیل سے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"یہ کوئی تقریب نہیں ہے۔ یہاں ہم اُن بہادروں کو یاد کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں، جنہوں نے آزادی کی لمبی لڑائی میں مصیبتیں جھیلیں اور اپنی جانیں قربان کیں۔ اس تحریک میں بھارت کے ہر حصے اور ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔ تلک، دادا بھائی نوروجی، دلّی کے ڈاکٹر انصاری، طیب جی صاحب، بہت سے ایسے لوگ تو ایک پُشت کے لوگ تھے پھر مہاتما گاندھی بھارت واپس آئے اور آزادی کی راہ نے ایک نیا موڑ لیا ـــــ صرف دانشور اور بڑے بڑے لوگ ہی نہیں بلکہ سارے دیش کے کسان، مزدور، نوجوان نسل اور سبھی لوگ اس میں ساتھ ہوئے۔

میں یہ بات بار بار اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ہم سمجھیں کہ یہ ملک آزاد کیسے ہوا۔ کیوں کہ سب مذاہب کے لوگ، سب زبانوں کے بولنے والے، سب ریاستوں کے باشندے اور سب فرقوں کے لوگ ایک تھے۔ ان کا نصب العین ایک تھا۔ لہٰذا بھارت کو آزادی ملی۔ آج ہمیں آزادی کا تحفظ کرنا ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جب میں خطرے کی بات کرتی ہوں تو لوگوں کا دھیان ملک کے اندرونی مسائل سے ہٹانا چاہتی ہوں۔ اس سے بڑی غلط فہمی کوئی دوسری نہیں ہو سکتی، کیوں کہ ملک کی جو آج کی تکالیف ہیں، جو ہر طبقہ کی پریشانیاں ہیں، اگر ہم ان سے آگاہ نہیں اور ان مسائل کو حل نہیں کرتے تو ہم ملک کو کیسے مستحکم بنا سکتے ہیں۔ آج ہمیں خوشی ہے کہ ہم لوگ آزاد ہیں، لیکن ہمارا دل خوشی سے بھرا ہوا نہیں ہے۔ دُکھ اس بات کا ہے کہ ہم نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ افسوس ہے کہ آج بھی ملک میں کچھ ایسی طاقتیں سر اُٹھا رہی ہیں، جو ملک کے اتحاد کو مذہب کے نام پر خطرے میں ڈال سکتی ہیں۔

آندھرا پردیش، کرناٹک، مہاراشٹر اور اُتر پردیش میں فرقہ وارانہ دنگے ہوئے۔ حادثے دوسری ریاستوں میں بھی ہوئے ہیں، جہاں بھی کسی کو دُکھ ہے وہ نہ فرد کا، نہ کنبے کا، نہ اس فرقے کا دُکھ ہے بلکہ سارے بھارت کا دُکھ ہے۔ وہ بھارت پر ایک کلنک ہے اور ہم سب کا فرض ہے کہ ان بُرائیوں کو اپنے مُلک سے جڑ سے نیست و نابود کر دیں۔

اختلافات تو ہوتے ہیں اور خاص طور سے جو جمہوری روایات ہم نے اپنائی ہیں، ان میں اور بھی اختلافات کے لیے جگہ ہے، لیکن ہمیں ان سے اوپر اُٹھنا ہے۔ جب ہم آزادی کے لیے لڑ رہے تھے تو ہم صرف سیاسی آزادی کیلیے نہیں بلکہ سماجی انصاف، مساوات اور اقتصادی انصاف کے لیے لڑ رہے تھے۔ ایک پڑاؤ طے ہوگیا، دوسرا ابھی جاری ہے۔ راستہ لمبا اور دشوار ہے اور دشمن جیسے پہلے سامنے دکھائی دیتے تھے آج وہ چھُپے ہوئے دشمن ہیں۔ کچھ تو حقیقی دشمن ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو بغیر سوچے سمجھے کچھ لوگوں کی باتوں میں آکر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ میں پنجاب کی کہانی نہیں سُنانا چاہتی ہوں، لیکن چونکہ غلط پروپیگنڈا ہو رہا ہے، اس لیے میں چند الفاظ کہوں گی: جو تحریکیں چلتی ہیں، چاہے ایک ریاست میں یا دوسری ریاست میں، وہ کسی بھی خیال سے ہوں، ان میں دوسرے لوگ گھس آتے ہیں، جن کی مانگیں ہی نہیں ہوتی ہیں یا دوسری مانگیں ہوتی ہیں اور جو اس تحریک کو اپنا ہی موڑ دیتی ہیں۔ تشدد، قتل اور دہشت ـ ہر طرح کی بُرائی اس میں لاتے ہیں۔ وہ تحریک چلانے والوں کے قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ یہی پنجاب میں ہوا۔ کچھ پروپیگنڈا ہو رہا ہے، خصوصاً میں نے غیر ملکی اخبارات میں اور ٹی وی پر دیکھا ہے کہ جیسے ہم نے مطالبات پر کبھی گفت و شنید ہی نہیں کی۔ ہماری پالیسی چاہے مُلک کے اندر یا ملک کے باہر سے متعلق ہو ہمیشہ یہی رہی ہے یعنی گاندھی جی، جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کی سکھائی ہوئی پالیسی۔ جہاں تک ممکن ہو سکے سمجھوتہ کرنا چاہئے، دوستی کرنی چاہیے۔ ہماری طرف سے لڑائی نہیں ہے۔ لیکن میری طاقت بھی محدود ہے۔ کبھی ایسے مطالبات پیش کیے جاتے ہیں جو کچھ لوگوں کو پسند ہوتے ہیں اور دوسروں کو مشتعل کر سکتے ہیں۔ دوسری ریاست میں گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ جو لوگ مطالبات رکھتے ہیں، چاہے ان کا تعلق علاقائیت سے ہو، مذہب یا زبان سے ہو، ان سے میری اپیل ہے کہ وہ اپنی تکلیف کی طرف ضرور دیکھیں، لیکن اپنے چاروں طرف بھی دیکھیں کہ ان کے مطالبات کو پورا کرنے سے دوسروں کو تکلیف تو نہیں ہوگی۔ بھارت پر اقتصادی یا دوسرا ایسا بوجھ تو نہیں پڑے گا، جس سے بھارت کمزور ہو یا اس بوجھ سے دب جائے۔ ہم نے اپنے منصوبے کے اندر سب پر توجہ دی ہے اور ہماری کوشش ہے کہ سب طبقوں کو اور سب ریاستوں کی اس سے مدد ہو۔ ترقی کا کام آگے بڑھے۔

۶۱-۱۹۶۰ء میں جہاں مرکز سے ریاستوں کو ۵۰۰ کروڑ روپے کی رقم کا تبادلہ ہو رہا تھا، وہاں آج بارہ ہزار کروڑ کا ہو رہا ہے۔ کتنی رقم بڑھی ہے لیکن نہ ریاستیں مطمئن ہیں اور نہ ہی ہماری مرکزی وزارتیں

مطالبات تو ہمیشہ رہیں گے اور ان میں اضافہ بھی ہوگا۔ ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ جو خوشحال ہیں، جو دوسروں سے زیادہ اچھی حالت میں ہیں، ان کے مطالبات پورے کرنے سے کہیں جو غریب ہیں، جو دبے ہوئے لوگ ہیں، کمزور ہیں، ان کے مطالبات نظر انداز نہ ہو جائیں۔ وہ بھارت کے غریب لوگ ہیں۔ وہ مضبوط ہوں گے تو سارا ملک مضبوط ہوگا۔

اسی لیے ہمارا نعرہ رہا ہے کہ کمزور طبقوں کی زیادہ مدد کی جائے۔ بیس نکاتی پروگرام کا بھی یہی نصب العین تھا اور اس کے تحت ڈیڑھ کروڑ کنبوں کو اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے میں مدد دی گئی ہے۔ ڈیڑھ کروڑ تو بہت سے ملکوں کی تمام آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن جہاں ۷۰ کروڑ آبادی ہے، اس میں تو یہ کم ہیں۔ کوئی جادو نہیں ہے، جس سے ہم ۷۰ کروڑ تک جلدی سے پہنچ جائیں۔ بیس نکاتی پروگرام تو ابھی حال ہی میں شروع ہوا ہے۔ اس پروگرام کے تحت وہ بے روزگار جو ہمارے دیہات کے ہیں یا تعلیم یافتہ ہیں یا دوسرے نوجوانوں کو روزگار دینے کا بھی بندوبست ہے اور اس میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ قرضہ فراہم کرنے اور دوسرے پروگراموں میں بھی کامیابی ملی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ کمیاں بھی ہیں۔

ہم نے سینچائی کے کام کو تو بہت بڑھایا ہے۔ ہمارے کچھ کسان بھائی تحریک چلا رہے ہیں، لیکن جتنا ہم نے ان گزشتہ چار برسوں میں کسانوں کے لیے کیا، اتنا شاید کبھی نہیں ہوا۔ وہ ہمارے اَن داتا ہیں۔ جو وہ پیدا کرتے ہیں، اس کی قیمت بھی پہلے سے کافی بڑھی ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ جن چیزوں کی ان کو ضرورت ہے، ان کی کچھ قیمتیں بڑھی ہیں۔ جیسے جیسے ترقی ہوتی ہے ویسے ویسے مانگیں بھی بڑھتی ہیں۔ جو لوگ دو تین سال پہلے ٹریکٹر کے بارے میں سوچتے بھی نہیں تھے، تھریشر کے بارے میں سوچتے بھی نہیں تھے، اتنی کھاد یا کیڑے مارنے والی دوا کا استعمال نہیں کرتے تھے، آج اُن کی وہ مانگ بڑھی ہے، اتنی پیداوار نہیں بڑھتی، اس لیے دام بڑھتے ہیں۔ جتنا ہم ان پر منحصر ہیں، اتنا وہ بھی کارخانوں کی پیداوار پر انحصار کرتے ہیں۔ تو مزدوروں کی طرف بھی توجّہ دینا ہے کہ ان کو انصاف ملے — کسانوں کی، مزدوروں کی مشکلات ہیں اور گھریلو خواتین کی مشکلات ہیں، جنہیں سستے سے سستے میں اس مہنگائی کے زمانے میں اپنا گھر چلانے کی کوشش کرنی ہے۔ مہنگائی کے شکار صرف بھارت کے لوگ نہیں، ساری دنیا کے لوگ ہیں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ جو ضروری اشیا ہیں وہ لوگوں تک پہنچیں اور اس سلسلے میں جو راشن کا نظام ہے، اس کے ذریعہ اناج تقسیم کرنے اور دُور دُور تک پہنچانے کے لیے ۵۰۰ کروڑ روپے خرچ کیے جا رہے ہیں۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں تو ہمارا نعرہ ہے کہ قوم خود کفیل ہو، لیکن قوم کے معنی کیا ہیں؟ کوئی زمین نہیں۔ لیکن آپ میں سے ہر شہری چاہے وہ کہیں بھی رہتا ہو، جہاں تک ممکن ہو، آپ میں خود انحصاری پیدا کرے۔ یہی ہماری کوشش ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ آپ اپنے فرض کو بھی ادا کریں۔ آپ دیکھیں کہ تشدّد نہ ہو۔ آپ دیکھیں کہ جو مقدّس مقامات اور مذہبی جگہیں ہیں وہ تشدّد کے مرکز نہ بن جائیں۔ اسلحہ جمع کرنے کے ٹھکانے نہ بن جائیں، بُرے کاموں کے اڈّے نہ بن جائیں۔ آپ کا فرض ہے کہ فرقہ پرستی کا نعرہ بلند نہ ہو اور جہاں بلند ہوتا ہے آپ خود وہاں جائیں، جیسے آزادی کے زمانے میں ہمارے کارکن جاتے تھے اور لوگوں میں امن بحال کرتے تھے۔

مُلک کے اندر ہمیشہ خطرے رہتے ہیں۔ جہاں اتنی رنگا رنگی، اتنے مذہب اور زبانیں، اتنے نظریے اور رسمیں ہیں وہاں کچھ نہ کچھ تو ایک دوسرے سے مقابلہ چلتا ہی ہے، لیکن ہم نے ہمیشہ یہی سوچا کہ یہ رنگا رنگی کمزوری کی نشانی نہیں، یہ خوشحالی کی نشانی ہے۔ یہ بھارت کو اور خوبصورت بناتی ہے۔ ہمارے معاشرے کو حسین بناتی ہے، اس لیے ہم نہیں چاہتے کہ کسی کے مذہب پر آنچ آئے۔ سب اپنے راستے پر چلیں۔ لیکن وہ سب راستے ملنے چاہئیں جیسے ندیاں سمندر میں جا ملتی ہیں۔ ویسے ہی ہندوستانیت کے سمندر میں یہ سب الگ الگ روایات، الگ الگ نظریے اور رسمیں ملیں جس سے ہم سب فخر سے کہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں۔

ہر مذہب نے بھائی چارہ سکھایا ہے، محبت اور رحم دلی سکھائی ہے اور اس مذہبی راستے پر اگر ملک چلے تو ہم ایک نیا سماج بنا سکتے ہیں۔ اس وقت بھی معاشرے میں نیا پن لایا جا رہا ہے۔ ہم اپنی پرانی روایات پر قائم رہ کر جدیدیت کی طرف جا رہے ہیں۔

ان چار برسوں میں آپ نے دیکھا ہوگا یا پڑھا ہوگا کہ ہر سال کوئی نہ کوئی کام ایسا ہوا ہے جس سے بھارت کا وقار باہری ملکوں میں اور ہمارے دلوں میں بڑھا ہے۔

اب ہم پر ایک نئی ذمہ داری بھی آئی ہے۔ مُلک کی تو ہے ہی، لیکن کچھ باہر کے ملکوں کی بھی ہے۔ لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے درمیان بھی اختلافات ہیں۔ کچھ ممالک کے درمیان لڑائی ہو رہی ہے اور ہم اُسے روک نہیں پائے لیکن کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ جیسے ایران اور عراق کے بیچ۔ وہاں کے رہنماؤں کے ساتھ ہر وقت رابطہ اور خط و کتابت ہے۔ دوسرے رہنماؤں سے بھی ہے کہ کیا ہو سکتا ہے؟ ہماری پوری کوشش جاری ہے۔ اور بھی ملک ہیں، جہاں جھگڑے ہیں۔ حال ہی میں ہمارے ایک پڑوسی ملک میں بھی جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ہماری پالیسی ہمیشہ دوستی کی رہی ہے اور ہم نے کوئی ایسا راستہ نہیں اپنایا جس سے دوستی مضبوط نہ ہو۔ چاہے پاکستان ہو یا بنگلہ دیش، نیپال ہو یا سری لنکا یہ ہمارے نزدیک کے پڑوسی ہیں۔ پاکستان کو بہت سال پہلے جب جواہر لال نہرو وزیرِ اعظم تھے، تب اُنہوں نے سمجھایا تھا کہ اس

بات پر سمجھوتہ ہو کہ ہم ایک دوسرے سے لڑائی نہیں کریں گے۔ اور اس بات کو الگ الگ صورت میں پہلے قابلِ تعظیم شاستری جی نے اور پھر میں نے دوہرایا۔ لیکن اس کو وہ برابر ٹھکراتے رہے۔ اب جا کر کچھ سال پہلے، اب جب میں وزیرِ اعظم بنی، جس وقت اُنہیں جدید قسم کے زبردست ہتھیار اور اسلحہ جات ملے، انہوں نے اس پر زور دیا کہ ایسا سمجھوتہ ہونا چاہیئے۔ ہم اس طرح کے سمجھوتے کے مخالف نہیں ہیں۔ ہم خود ایسا سمجھوتہ چاہتے ہیں، لیکن ہم نے ایک بات کہی کہ ابھی تک آپ اسے ٹھکراتے رہے، اب آپ اسے اُٹھا رہے ہیں تو کیا اس کے لیے ایک معقول ماحول نہیں بنانا چاہیے اور اس کے لیے کیا ہم دوستی، تعاون اور امن کا ایک سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ اگر ہم یہ سمجھوتہ کرتے ہیں تو قدرتی بات ہے کہ لڑائی ہوگی ہی نہیں۔ ویسے تو یہ سب باتیں تحریری طور پر شملہ معاہدے میں آہی گئی تھیں اور اس پر دونوں ممالک کے دستخط ہیں۔ لیکن اگر وہ اس سمجھوتے کو نہیں چاہتے تو اس طرح کا ایک اور معاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ ہم دوستی، تعاون اور امن کا سمجھوتہ نہیں بلکہ یہ سمجھوتہ کریں گے کہ جنگ نہ ہو تو یہ چیزیں کیسے چل سکتی ہیں۔ اس کو گہرائی سے کیسے لے سکتے ہیں، لیکن ہم کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اب بھی ایسا ہو۔ ہمیں دُکھ ہے کہ وہاں کے ٹی وی اور وہاں کے اخبارات میں اب بھی بھارت کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ سچائی سے بہت دُور ہے، جس کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے اندرونی معاملے میں دخل دیا جا رہا ہے۔ لیکن ہم بہت مہذب طریقے سے، دوستی کے الفاظ میں ان سے بات کرتے جا رہے ہیں، لیکن بھارت کی کیا عزت ہے؟ بھارت کا کیا مقام ہے؟ کیا اس کو کوئی بھی سرکار نظر انداز کر سکتی ہے؟ سری لنکا کی صورتِ حال تو بہت سنگین ہے اور سب سے زیادہ دُکھ جس سے کہ میرا دل غمگین ہے، ان لوگوں کے لیے ہے، جو بے قصور ہیں اور جنہوں نے کچھ نہیں کیا، ان پر حملہ ہو رہا ہے۔ وہاں بھی انتہا پسند ہیں اور ظاہر ہے کہ کسی کی بھی سرکار کو ان کا سامنا کرنا ہے۔ لیکن جس طرح ایک طبقے پر حملہ ہو رہا ہے کئی برسوں سے، اس سے وہاں امن نہیں قائم ہو سکا ہے۔ وہاں کی صورتِ حال اور بگڑتی گئی۔ ہم دخل نہیں دینا چاہتے۔ ہم دوسرے مُلک کے اتحاد میں کسی طرح کی رُکاوٹ نہیں ڈالنا چاہتے۔ یہ ہمارے مفاد میں بھی نہیں ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ ہمارے پڑوسی ملک مستحکم رہیں، مضبوط رہیں، ہمارے دوست رہیں تو دوستی کا ہاتھ ہم نے بڑھایا اور کہا کہ اگر ہم مدد کر سکتے ہیں کہ آپ کی بات چیت ہو سکے اور کچھ نتیجہ نکل سکے، جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو، تو وہ آپ کے لیے بھی مفید ہوگا اور ہم مصیبت سے بچیں گے۔ ہمارا دُکھ کیا ہے۔ دُکھ تو سارے بھارت کا ہے۔ جو ہمارے تامل لوگ ہیں، ان کو زیادہ دُکھ اور تکلیف پہنچی۔ چالیس ہزار پناہ گزین وہاں آ ہی گئے ہیں۔ اب ان کے ساتھ دوسرے لوگ بھی آ سکتے ہیں، جاسوس بھی آ سکتے ہیں، باہر کے لوگ آ سکتے ہیں۔ تو اس لیے سری لنکا کے صدر سے میری اپیل تھی کہ کسی نہ کسی طرح سے بیٹھ کر بات چیت ہو — اُنہوں نے خود مشورے دیئے اور ہمیں توقع تھی کہ شاید ان کی قیادت سے یہ بات آگے بڑھے گی، کچھ سمجھوتہ ہوگا، لیکن ابھی تک جب اخبار کھولتے ہیں تو کسی حادثے کی خبر ملتی ہے۔ ہماری پوری توجہ اس طرف ہے اور جن لوگوں کو تکلیف ہے ان کے ساتھ ہماری پوری ہمدردی ہے۔

میں جب پہلے بیس نکاتی پروگرام کا ذکر کر رہی تھی تو میں نے بتایا کہ ہم غریبوں کو کیسے اُٹھائیں، کمزور لوگوں کی، چھوٹے کسانوں کی کیسے مدد کریں۔ ایک ہزار کروڑ روپے سے زیادہ اس نئے پروگرام پر لگایا جا رہا ہے، جہاں سے کچھ مشکل سی آواز آتی ہے، اس کی طرف ہم دیکھتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ جو ساتواں پنجسالہ منصوبہ اب شروع ہو رہا ہے، اس کا بنیادی مقصد کیا ہے۔ خوراک، روزگار اور پیداوار۔ یہ تینوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ پیداوار نہیں بڑھے گی تو نوکری نہیں مل سکتی اور کھانا نہیں مل سکتا۔ اگر ہم ان تینوں چیزوں کو آگے بڑھا سکتے ہیں اور ابھی کافی روپیہ اس کے لیے الگ رکھا ہے تو مُلک کی بنیاد اور مضبوط ہوگی۔

بھارت امن کے لیے کوشش کر رہا ہے حال ہی میں پانچ اور ملکوں کے صدور اور وزراء اعظم کے ساتھ مل کر میں نے ایک اپیل دوسری سب دنیا سے کی کہ یہ جو ایٹمی ہتھیار جمع ہو رہے ہیں، اس میں شاید سواں حصہ بھی ساری دنیا کے بنی نوع انسان کو ختم کر سکتا ہے۔ ابھی لوگ ایٹمی ہتھیار بنا رہے ہیں۔ ابھی انہیں اکٹھا کیا جا رہا ہے اور الزام کس کو دے رہے ہیں؟ بھارت کو! بھارت میں تعمیری طاقت اتنی بڑی طاقت نہیں، چھوٹی طاقت لیکن تب بھی ہمارے سائنس دانوں نے دکھایا کہ وہ کیا کر سکتے ہیں۔ کس لیے؟ بم بنانے کے لیے نہیں اور ایک بھی بم ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس سے ہم بجلی بنائیں اس سے اپنے کسانوں کی مدد کر سکیں۔ اس سے دیکھیں کہ ہم ڈاکٹری علاج میں کیا مدد کر سکتے ہیں۔ ہمارے جو پروگرام ہیں چاہے خلائی پروگرام ہو، چاہے کھیل کود کو فروغ دینے کا ہو، تب تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک نوجوان اس کام میں آگے نہیں بڑھتے۔ اگر ان میں اہلیت اور صلاحیت نہیں ہوتی تو ہمیں کامیابی نہیں ملتی۔ یہ سب کام ہم اس لیے کر رہے ہیں تاکہ بھارت کے جو غریب اور متوسط طبقے کے لوگ ہیں، ان کی دشواریاں کچھ کم ہوں کچھ معلومات ہمیں حاصل ہوں، جس سے کہ ہم ان کی اور مدد کر سکیں تاکہ یہ مُلک زیادہ مضبوط ہو اور ہر طرح سے اس کی طاقت بڑھے۔

مجھے معلوم ہے کہ قابلیت ہماری نوجوان نسل میں، ہمارے ان نوجوان بچوں میں جو یہاں بیٹھے ہیں، اسکول میں ہوں، کالج میں ہوں، یا دوسرے اداروں میں ہوں، موجود ہے۔ کیسے ان خوبیوں کو اُجاگر کیا جائے۔ بھارت کے جو قدیم آدرش تھے، اُنہیں ہم بھول رہے ہیں۔ ہم مذہب کا نام لیتے ہیں۔ (آگے صفحہ ۳۵ پر)

مظفر حسین برنی

# امیر خسرو — ایک ہمہ جہت شخصیت

**خواجہ** حسن نظامی میموریل سوسائٹی سال بھر میں کم از کم تین بڑے جلسے منعقد کرتی ہے ۔ ایک حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہیؒ کے عُرس پر، دوسرا حضرت خواجہ امیر خسروؒ طوطیٔ ہند کے یوم وصال پر اور تیسرا شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کے عرس کے موقع پر ۔ آج کا یہ علمی اجتماع بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے ، جس میں آپ نے بہت سے صاحبانِ علم و فضل کے مقالات اور تقریریں سُنی ہیں ، جن سے حضرت امیر خسروؒ کی زندگی ، شخصیت اور فن کے نئے نئے گوشے سامنے آئے ہیں ۔ لیکن آج کا یہ جلسہ اس اعتبار سے بہت ممتاز ہے کہ آپ نے "حضرت امیر خسروؒ اور انسان" کے موضوع پر ایک ایسی ذی علم شخصیت کا خصوصی لیکچر سماعت فرمایا ہے ، جس کو تاریخ اور تصوّف میں سند کا مرتبہ حاصل ہے ۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے اُن ممتاز اساتذہ میں سے ہیں ، جنہیں ہندوستان ہی میں نہیں ، بلکہ بین الاقوامی حلقوں میں بھی اپنے موضوع کے سنجیدہ عالموں میں شمار کیا جاتا ہے ۔ اُنہوں نے ہندوستان میں تصوّف کے مطالعہ کو ایک زندہ روایت بنایا ہے اور تاریخ سے اس کا رشتہ جوڑ کر تاریخ اور تصوّف دونوں کو ہی صحیح سمت دکھائی ہے ۔ اس طرح تصوّف کے مطالعہ میں زیادہ حقیقت پسندی اور تاریخی شعور پیدا ہوا ہے تو دوسری طرف تاریخ کو بھی ملفوظات اور کتبِ صوفیا کی صورت میں ایسے نئے مصادر (Sources) مل گئے ہیں جنہوں نے تاریخ کا رشتہ عوامی زندگی سے زیادہ گہرا کر دیا ہے — آج اس بات کو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ تصوف کی کتابوں میں مؤرخوں کے لیے مطالعہ کا بہترین مواد موجود ہے اور اس شعور کو بیدار کرنے میں سب سے نمایاں حصہ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا رہا ہے ۔

اُن کے اس عالمانہ لیکچر کے بعد اس موضوع پر کچھ کہنے کی گنجائش کم سے کم میرے لیے تو باقی نہیں رہ جاتی ہے ، لیکن میرے عزیز دوست پروفیسر امیر حسن عابدی کے مقالے نے اس طرف متوجّہ کیا ہے کہ امیر خسروؒ کی تمام تصانیف کو از سرِ نو فراہم کرنے ، ترتیب دینے اور اُن کے بہترین ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت ہنوز باقی ہے ۔ اس صدی کے اوائل میں جو کام علی گڑھ میں نواب محمد اسحاق خاں مرحوم کی نگرانی اور بہت سے ممتاز علماء کے تعاون اور نظام حیدر آباد کی سرپرستی میں شروع ہوا تھا ، وہ یقیناً بہت قابلِ قدر ہے ۔ لیکن ابھی امیر خسروؒ کا بہت سا کلام نظم و نثر غیر مطبوعہ باقی ہے پچھلے پچیس تیس برسوں میں بہت سے نئے قلمی نسخے دریافت ہو گئے ہیں ۔ ترکی کے کتب خانہ توپ کاپی سرائے میں حضرت امیر خسروؒ کی متعدد تصانیف کے اچھے قلمی نسخے موجود ہیں ، جنہیں پروفیسر عابدی خود دیکھ کر آئے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہوئے اُنہوں نے متعدد مضامین و مقالات لکھے ہیں ۔ اور امیر خسروؒ کے نئے غیر مطبوعہ کلام سے ہمیں روشناس کرایا ہے ۔

پروفیسر عابدی دہلی یونی ورسٹی میں اپنے طلبا سے ہندوستانی فارسی ادب پر عموماً اور حضرت امیر خسروؒ پر خصوصاً تحقیقی کام بھی کراتے رہے ہیں ۔ یونی ورسٹی سے باہر بھی بعض اہلِ علم نے اس طرف توجّہ کی ہے ، لیکن جس نظم و ترتیب اور پلاننگ کے ساتھ اس کام کو ہونا چاہیے وہ ابھی تک نہیں ہو سکا ہے ۔ نیشنل امیر خسروؒ کمیٹی بھی موجود ہے ۔ خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی ہے ۔ دہلی ، علی گڑھ ، لکھنؤ ، حیدر آباد وغیرہ یونیورسٹیوں میں ایسے اساتذہ ہیں ، جو اس بڑے منصوبے میں حصہ لے سکتے ہیں ۔ ضرورت یہ ہے کہ ایک مرحلہ وار پروگرام بنایا جائے

---

● گورنر ہریانہ ، ہریانہ راج بھون ، چنڈی گڑھ

خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی ، دلّی نے حضرت امیر خسروؒ پر ایک سیمینار ، ۱۸ جولائی ۱۹۸۴ء کو منعقد کیا تھا ۔ اس میں یہ خطبۂ صدارت پڑھا گیا ۔

اور اس پر دل جما کر کام کیا جائے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نیک کام میں حکومتِ
ہند کا بھی مکمل تعاون ضرور حاصل ہو سکے گا۔ ابھی ایک کام تو امیر خسرو کی
ببلیوگرافی تیار کرنے کا بھی تشنہ رہ گیا ہے ۔ اردو میں ایسے Cumulative
Index کی روایت تو نہیں ہے ، لیکن تحقیق میں یہ بنیادی کام ہے اور اس
طرح کے کچھ کام غالب اور اقبال پر ہوئے بھی ہیں ۔ امیر خسرو کی بھی ایک مکمل
ببلیوگرافی تیار ہونی چاہیے ۔ اور یہ کام پروفیسر عابدی کی نگرانی میں دہلی
یونی ورسٹی میں بھی ہو سکتا ہے ۔ اس سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ حضرت
امیر خسرو پر اب تک کیا لکھا گیا ہے اور اس کی موضوعاتی تقسیم سے ظاہر
ہوگا کہ کون سے پہلو ہنوز تشنۂ تحقیق ہیں ۔ اسی طرح یہ معلوم ہو سکے گا کہ ہندوستان
کی معروف اور غیر معروف لائبریریوں اور شخصی ذخیروں میں امیر خسرو پر کتنا مواد
ملتا ہے ۔ ہندوستان سے باہر کے کتب خانوں میں کون کون سے نسخے دستیاب
ہیں ۔ اور مجموعی طور پر یہ بات معلوم ہونا ضروری ہے کہ امیر خسرو کی کس تصنیف
کے کتنے قلمی نسخے ملتے ہیں اور ان میں کون کون سے زیادہ قدیم ہیں ۔ اس
بنیادی مواد کے فراہم ہونے سے پہلے کتابوں کی ترتیب و تدوین کا کوئی مستند
کام نہیں ہو سکتا ۔

عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ ایرانی اسکالرز ہندوستان کے فارسی
نگاروں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے ۔ لیکن اس پہلو سے بھی ہمیں غور کرنا ہوگا کہ
ہم نے ہندوستان کے کتنے فارسی نگاروں کو سلیقے کے ساتھ متعارف کرنے کی
کوشش کی ہے ۔ امیر خسرو کا کلام وہی نولکشور والا ایران میں چھپا ہے اور
اس پر ایک عام سا مقدمہ بھی ہے ۔ بیدل پر افغانستان میں کچھ کام ہوا ہے
اور اچھا ہوا ہے ۔ ایران میں اس پر کوئی کتاب نہیں چھپی ۔ فیضی پر کوئی
کتاب نہیں ہے ۔ غالب پر نہیں ہے ۔ اقبال پر اب چند کتابیں وہاں شائع
ہوئی ہیں ۔ ہندوستانی فارسی ادب بے مغز اور بے جان شے نہیں ہے —
اس میں ہمارے لیے کوئی شرمندگی کا سامان بھی نہیں ہے ۔ صرف اسے چھان
پھٹک کر سلیقے سے پیش کرنے کی ضرورت ہے ۔ مجھے امید ہے کہ خواجہ حسن نظامی
میموریل سوسائٹی مستقبل میں اپنے کاموں کی توسیع کے وقت ان ضرورتوں
کو پیش نظر رکھے گی۔

امیر خسرو تیرھویں صدی کے شاعر ہیں ، مگر ماہ و سال کا یہ زنگار اُن
کی شخصیت اور شاعری کے زرنگار نقوش کو دھندلا نہیں کر سکا ہے ۔ وہ اب صرف
ایک شاعر ہی نہیں ، ایک داستان ، ایک روایت اور ایک کہاوت بن چکے ہیں ۔
ان کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں ۔
ہر مذاق کے انسان کو اُن کی شخصیت میں اپنے من بھاتے رنگ نظر آجاتے ہیں ۔
صدیوں میں ایسی ہمہ جہت شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں ۔ اور ان کا شمار انگلیوں پر کیا
جا سکتا ہے ۔ ابو ریحان محمد بن احمد الخوارزمی البیرونی نہ صرف مشہور مورخ تھا بلکہ اعلیٰ
پایہ کا ادیب و شاعر ، ریاضی داں ، سنسکرت کا عالم اور علم جیوتش کا ماہر تھا ۔ اس
کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ ایک بار سلطان محمود غزنوی نے ایک چہار
دروازہ عمارت تعمیر کروائی ۔ اس میں داخل ہو کر البیرونی سے پوچھا" بتاؤ
میں کس سمت کے دروازے سے باہر جاؤں گا ؟ البیرونی نے جواب دیا —
" جہاں پناہ ! میں اس کا جواب لکھ کر وزیر اعظم کو دے دیتا ہوں " چنانچہ
اس نے ایسا ہی کیا ۔ محمود کسی سمت کے دروازے سے باہر نہ آیا بلکہ ایک
طرف کی دیوار تڑوا کر باہر نکلا ۔ البیرونی نے بعینہٖ یہی اس پرچہ میں لکھ کر وزیر اعظم
کو دیا تھا ۔ اس پر سلطان محمود غیض و غضب میں آگیا اور حکم دیا کہ البیرونی
کو قلعہ کی فصیل سے نیچے پھینک دیا جائے ، لیکن ایسا کرنے سے پہلے اس
نے البیرونی سے دریافت کیا " کیا بتا سکتے ہو کہ اب تمہارا حشر کیا ہوگا ؟ "
اس نے وہی جواب دیا ۔ " عالم پناہ ! میں اپنے مستقبل کے بارے میں لکھ کر
وزیر اعظم کو دیتے دیتا ہوں " چنانچہ البیرونی کو قلعہ کی فصیل سے پھینکا گیا ۔
لیکن محمود نے یہ التزام کر دیا تھا کہ نیچے خادمان ایک بڑا قالین لیے کھڑے رہیں ۔
تاکہ البیرونی اس پر گرے ۔ چنانچہ یہی ہوا اور یہی البیرونی نے اس پرچہ میں لکھا
تھا جو وزیر اعظم کو دیا تھا کہ بادشاہ مجھ کو قلعہ کی فصیل سے پھنکوانے کا حکم دے گا ۔
لیکن میں زندہ سلامت بچ جاؤں گا۔[1]

پندرھویں صدی عیسوی میں یورپ میں ایک ایسی ہی شخصیت
Leonardo Da Vinci کی تھی ، جو نہ صرف اپنے دور کا عظیم مصور تھا
بلکہ اس کا شمار دنیا کے عظیم ترین مصوروں میں ہوتا ہے ۔ اس کی مشہور عالم تصویر
Mona Lisa کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر اللہ میاں خود بھی یہ تصویر
بناتے تو شاید وہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پیدا نہیں کر سکتے تھے ، جو اس کا طرۂ امتیاز
ہے ۔ Leonardo Da Vinci نہ صرف مصور تھا بلکہ ایک زبردست
سائنس داں بھی تھا ۔ حال ہی میں اس کی چند Sketch-Books اسپین
میں ملی ہیں ، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے Helicopter کا Design
اس وقت پیش کیا تھا ۔

ہمارے دور میں ایسی ہی many-splendoured personality
تھی Bertrand Russell کی جو نہ صرف فلسفی تھا بلکہ ریاضی داں تھا
ماہر سیاسیات و معاشیات تھا اور باکمال ادیب بھی تھا ۔ اس پر طرہ یہ کہ ع
حسن نسوانی تھا بجلی اس کی فطرت کے لیے
امیر خسرو بھی ایک ایسی ہی ہمہ جہت شخصیت تھے ۔ وہ شاعر تھے ، نثر نگار
تھے ، موسیقار تھے ، مورخ تھے ، امیر تھے ، فقیر تھے ، صوفی تھے ۔ نہ صرف اہل قلم

---

[1] ماخذ : پروفیسر براؤن ( Prof.E.G.Browne ) کی تصنیف
History of Persian Literature

تھے بلکہ اہلِ سیف بھی تھے ۔

افسوس کہ ہمارا دَور Sperialisation کا دَور ہے۔ اور اب تو یہ عالم ہے کہ ایک ڈاکٹر دائیں گُردہ کا ماہر ہے تو دوسرا بائیں گُردہ کا ماہر ہے۔ یہ دَور microchips کا ہے، miniaturization کا ہے، computers کا ہے۔ گویا یہ دَور بَونوں کا ہے، دیو زادوں کا نہیں۔

میں علامہ اقبالؔ کے الفاظ میں حضرت امیر خسروؒ کو ہدیۂ عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں ؎

خسروِ شیریں زباں، رنگیں بیاں      نغمہ ہایش از ضمیرِ کُن فکاں

(خسروؔ شیریں زبان اور رنگیں بیان تھے۔ ان کے نغمے ضمیرِ تخلیق سے پھُوٹتے تھے، گو الہامی تھے)

فطرتش روشن مثالِ ماہتاب      گشت از بہرِ سفارت انتخاب

(ان کی فطرت چاند کی طرح روشن تھی اور درجۂ مصاحبت کے لیے موزوں تھی)

چنگ را پیشِ قلندر چوں نواخت      از نوائے شیشۂ جانش گداخت

(قلندر یعنی حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں ساز بجاتے تھے تو اس کی تانوں سے ان کی رُوح گداختہ ہو جاتی تھی)

شوکتے کو پختہ چوں کہسار بود      قیمتِ یک نغمۂ گفتار بود

(وہ شان و شوکت جو پہاڑ کی طرح اٹل تھی، ان کے ایک نغمہ اور نظم کا مول تھی)

امیر خسرؔو ہر صنفِ سخن میں کمال رکھتے تھے۔ بادشاہوں اور امیروں کی تعریف میں قصیدے بھی لکھتے تھے اور صلے میں ہزاروں روپے اور اشرفیاں اور خلعتیں بھی پاتے تھے۔ مگر دربار سے باہر آکر وہ روپیہ مساکین اور ضرورت مندوں میں بے دریغ تقسیم بھی کر دیتے تھے۔ اُنھوں نے خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی گزاری، مگر نہ اپنے لیے عالی شان محل کھڑے کئے نہ خزانہ جمع کیا نہ فضول قسم کے رئیسانہ ٹھاٹ اور چونچلے اختیار کئے۔ ایک متوازن زندگی سلامت روی کے ساتھ گزاری۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں جب سلطنت حاصل کرنے کے لیے ریشہ دوانیاں اور سازشیں ہوتی رہتی تھیں اور ایک بادشاہ کو قتل کرکے دوسرا تخت نشین ہوتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ مقتول بادشاہ کا کوئی نام لیوا یا ہمدرد بھی زندہ نہ رہنے پائے تاکہ وہ انتقام لینے کی سازش نہ کر سکے۔ امیر خسرؔو نے ہر بادشاہ کے دربار سے اپنی وابستگی کو باقی رکھا اور کسی نے ان پر سازش، کینہ دوزی یا ریشہ دوانی کا شبہ نہیں کیا۔ یہ وہ کیفیت تھی، جسے صوفیا کی اصطلاح میں "با ہمہ اور بے ہمہ" کہتے ہیں۔

وہ خانقاہی آدمی بھی تھے اور خانقاہ بھی کیسی جس کے سربراہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہیؒ جیسے عظیم المرتبت جلیل القدر صوفی تھے۔ خانقاہ سے وابستہ ہونے والوں کو سرکاری ملازمت قبول کرنے یا کوئی مستقل ذریعۂ معاش پیدا کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ مگر حضرت امیر خسروؒ اس شرط سے بھی مستثنیٰ تھے۔ اُنھوں نے سلطانِ وقت کی مدح سرائی ضرور کی ہے، مگر اپنے پیر و مرشد کی منقبت بادشاہ کی تعریف سے پہلے ہی لکھی ہے اور دونوں میں آورد اور آمد کا فرق صاف نظر آتا ہے۔

وہ واقعہ تو بہت ہی مشہور ہے کہ بادشاہ جلال الدین خلجی نے بھیس بدل کر حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں حاضری دینے کا ارادہ کیا۔ حضرت کا قاعدہ تھا کہ نہ خود دربار میں تشریف لے جاتے تھے نہ بادشاہوں کو اپنی خانقاہ میں آنے کی اجازت دیتے تھے۔ امیر خسرؔو نے بادشاہ کے اس ارادے سے اپنے پیر و مرشد کو آگاہ کر دیا تو آپ دلّی چھوڑ کر اجودھن روانہ ہو گئے۔ بادشاہ نے امیر خسروؒ پر عتاب کیا کہ تم نے ہمارے ارادے کی اُنھیں اطلاع کیوں دی تو خسروؒ نے کہا کہ جہاں پناہ کی نافرمانی سے مجھے زیادہ سے زیادہ جان کا خطرہ تھا، مگر اپنے مرشد کی نافرمانی میں زوالِ ایمان کا خطرہ تھا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' وہ یک فنے شاعر نہیں تھے۔ قصیدہ، غزل، مثنوی، ترانہ، رُباعی سب کچھ اُنھوں نے یکساں قدرت کے ساتھ نظم کیا ہے۔ بقولِ ضیاء الدین برنی اُن کا کلام پورے کتب خانہ کے برابر ہے۔ دولت شاہ سمرقندی نے لکھا ہے کہ پانچ لاکھ سے کم اور چار لاکھ سے زاید ابیات لکھیں۔ صرف نظم ہی نہیں اُنھوں نے نثر میں بھی اپنے علمی کمالات کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ اس زمانے میں فارسی انشاء پردازی کا جو مقبول اسلوب تھا، اس کے علاوہ ہر طرح کی لفظی و معنوی صنعتوں کے ساتھ فارسی نثر کے اسالیب کو برتا ہے۔ آج ہمیں "دلائل الاعجاز" کی نثر متاثر نہ کرے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ نثر ہی ناقص ہے بلکہ اب مذاق بدل گئے ہیں اور جو باتیں اس زمانے میں دلیلِ کمال سمجھی جاتی تھیں، اب انہیں اسلوب کے معائب میں شمار کیا جاتا ہے۔

غزل میں اُنھوں نے سادگی اور صفائی کے ساتھ سوز و گداز اور شیریں کلامی کا ایسا حسین مرکب تیار کیا کہ آج تک قوّالی کی محفلوں میں ان کے اشعار پر وجد و کیف ہوتا ہے۔ ایک زندہ آواز ہے، جو صدیوں سے گُونج رہی ہے۔ وہ فارسی ہی میں بند نہیں تھے۔ ہندی اُن کی مادری زبان تھی۔ قبائلی زبان ترکی اور اس عہد کی مذہبی زبان عربی تھی۔ تصنیف و تالیف کے لیے فارسی کا رواج تھا کہ وہ علمی زبان سمجھی جاتی تھی۔ بعض حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ ہندوستان کی مختلف بولیوں کا تذکرہ ہمیں سب سے پہلے ان کی تصانیف میں ملتا ہے۔ ہندی میں اُن کا کلام ضرور تھا اور ایک دیوان کے برابر تھا۔ مگر وہ اُنھوں نے کبھی سنجیدگی سے جمع نہیں کیا۔ لکھ کر دوستوں کو دے دیتے تھے۔ آج سینکڑوں کہہ مکرنیاں، پہیلیاں، دوہے، دو سخنے، گیت اور ملہار حضرت امیر خسروؒ سے منسوب ہیں۔ اور عوام کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ ان کی تاریخی سند کا ملنا تو مشکل ہے، مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ صدیوں تک سینہ بہ سینہ

منتقل ہوتے آئے ہیں۔ ان میں لفظی ردّ و بدل بھی ضرور ہوا ہوگا۔ مگر اُن کی اصلی صورت حضرت امیر خسروؒ کی تخلیق رہی ہوگی۔ اس میں الحاقی کلام کو چھوڑ کر باقی کلام کا دوسرا دعوے دار بھی نہیں ہے، اس لیے جس کے نام سے مشہور ہوگیا سند ہونے پر بھی اسی کا مانا جائے گا۔ البتہ ایسے کلام سے ادبی اور لسانی ارتقاء وغیرہ کے نتائج برآمد کرنا اصولِ تحقیق کے خلاف سمجھا جائے گا۔

آج ساری دنیا میں (Folk Literature) ادب العوام کی سماجی اور تہذیبی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ کسی قوم کے مزاج کا آئینہ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں حضرت امیر خسروؒ کو اس ادب العوام کا سب سے بڑا نمائندہ سمجھنا بے جا نہ ہوگا۔

ایک اور پہلو حضرت امیر خسروؒ کی موسیقی دانی کا ہے۔ انہوں نے اس فن میں بھی وہ کمال حاصل کیا کہ آج تک اس فن کے ماہرین ان کو اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے بعض نئے ساز ایجاد کئے اور روایتی سازوں میں ترمیم کرکے انہیں نئی شکل عطا کی۔ ہندوستانی اور ولایتی راگوں کو ملاکر نئے راگ، راگنیاں تیار کیں۔ وہ باقاعدہ موسیقار نہیں تھے، مگر فرصت یا انبساط کے لمحوں میں اپنے پیر و مرشد کا دل بہلانے کے لیے کچھ سنایا کرتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو پوربی راگ بہت پسند تھا اور فرماتے تھے: "ہم بوڑھے ہوگئے مگر یہ راگ سدا جوان ہے۔" امیر خسروؒ اس میں نئے نئے سُر اور ریتیاں لگاتے تھے۔

جو لوگ بادشاہوں اور امیروں کی صحبت میں رہتے تھے، اُن کا مجلسی علم بھی خوب ہوتا تھا۔ وہ بات کہنے کا سلیقہ جانتے تھے۔ بہت معمولی سی بات کو غیر معمولی بناکر پیش کرنا یا کسی غیر مانوس بات کو مانوس انداز میں کہنا اُن کا خاص سلیقہ ہوتا تھا۔ امیر خسروؒ نے رنگا رنگ بزم آرائیاں کی تھیں اور سو بادشاہوں کا دربار تو "شاہنشہِ بے سریر و بے تاج" حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ تھی، جہاں سلیقہ غلام اور تہذیب باندی بن کر رہتے تھے۔ امیر خسروؒ کی شیرینیٔ کلام کا یہ عالم تھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا: "کچھ لمحات ایسے ہوتے ہیں کہ میں ہر شخص سے اُکتا جاتا ہوں مگر اس تُرک (یعنی امیر خسروؒ) سے کبھی نہیں اُکتاتا۔" حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ اگر قیامت کے دن خدا مجھ سے پوچھے گا کہ دنیا سے کیا لے کر آیا، تو میں کہوں گا کہ "سوزِ سینۂ خسروؒ" لایا ہوں۔" یہ کوئی معمولی ریمارک نہیں ہے۔ ان چار لفظوں میں امیر خسروؒ کی پوری شخصیت سمٹ کر آگئی ہے اور اس سے بڑھ کر نہ کوئی تعریف ہوسکتی ہے نہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے زیادہ کوئی اس "سوزِ سینہ" کا قدر داں ہوسکتا ہے۔ یہ سوز ہی کفر و دین کا ماحصل ہے۔ یہی سب کچھ بلکہ سب کچھ کا حاصل ہے۔ اسی لیے عطارؒ نے دعا مانگی تھی ۵

کفر کافر را و دیں دیندار را
ذرّہ دردے، دلِ عطّار را

(کافر کو کفر اور دین دار کو دین عطا ہو اور ذرا سا درد عطار کے دل کو عطا کر)

یہ نعمتِ درد امیر خسروؒ کو اپنے پیر و مرشدؒ کی خانقاہ سے ملی تھی — انہوں نے اسے اپنے کلام کے وسیلے عام کردیا۔ یہ اسی کا ہلکا سا کیف ہے جو ہمارے آپ کے دل میں آج بھی کسک بن کر جاگ اُٹھتا ہے۔

اس عہد میں خواص کا تعلق درباروں سے اور عوام کا ربط صوفیا کی خانقاہوں سے تھا۔ دونوں دنیائیں الگ تھلگ بس رہی تھیں اور ان میں کوئی تال میل نہیں تھا، مگر امیر خسروؒ کے کلام میں یہ دونوں افق مل گئے ہیں اور پورا ماحول ایک وحدت کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

حضرات! یہ معروضات کچھ طویل ضرور ہوگئے مگر ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

(کہانی دلچسپ تھی اس لیے ذرا زیادہ لمبی ہوگئی)

امیرؒ کی شخصیت کے کس پہلو پر گفتگو ہو اور کسے چھوڑا جائے۔ یہ فیصلہ کرنا بہت دشوار ہوجاتا ہے۔ آخر میں اُن کی صرف دو خصوصیات کی طرف اشارہ کروں گا۔

عہدِ سلطنت میں تاریخ نویسی کا آغاز ہوچکا تھا، مگر اس زمانے کی بہت سی کتابیں ضائع ہوگئیں۔ تاہم اس عہد کے بعض شاعروں کا کلام آج کے مؤرخوں کا مستند ماخذ ہے۔ امیر خسروؒ اس اعتبار سے بھی منفرد ہیں کہ انہوں نے تاریخی مثنویاں لکھی ہیں۔ جیسے قران السعدین، دول رانی خضر خاں، تغلق نامہ اور خزائن الفتوح، ان میں سے بعض تو اپنے دَور کا واحد ماخذ ہیں۔ تاریخ ہند کے مؤلف ایلیٹ نے جابجا اُن کے بیانات کے حوالے دیئے ہیں۔

دوسری خصوصیت ان کی وطن دوستی اور قوم پرستی ہے، جسے آج ہم "قومی یک جہتی" کی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں اور جس کا حال یہ ہوگیا ہے کہ بقولِ سودا ۵

جس سے پوچھا میں، دلِ خوش ہے کہیں دُنیا میں؟
رو دیا اُن نے، اور اتنا ہی کہا "کہتے ہیں!"

اس زمانے میں مغرب کا دیا ہوا تحفہ "نظریۂ قومیت" نہیں تھا مگر قومی یک جہتی ضرور موجود تھی۔ امیرؒ کے زمانے میں بھی متعدد شاعر تھے، اُن سے پہلے بھی ہوئے۔ بعد کی نسلوں میں بھی شاعروں کی کمی نہ ہوئی، مگر کسی کے کلام میں ہندوستان اور ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی ایسی دل کش اور رنگا رنگ جھلکیاں نہیں ملتیں جتنی ہمیں امیرؒ کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ وہ ہندوستان کے سچے پرستار ہیں۔ یہاں کے موسموں کو سراہتے ہیں، پھلوں اور پھولوں کا محبت سے ذکر کرتے ہیں۔ بولی ٹھولی، رسم و رواج، میلے ٹھیلے، لباس، غذائیں، بود و باش، رہن سہن سب سے اپنی گہری دلچسپی اور پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ (آگے ملاحظہ)

۵ فارسی کا مشہور صوفی شاعر

ظ۔ انصاری

ساغر نظامی

ساغر کو سلیقے سے تھامنے والے نسوانی ہاتھ تو کہیں ۳۵ برس بعد زندگی کی خلوت وجلوت میں شریک ہوئے لیکن خلوت وجلوت کا سلیقہ ساغر صاحب کو فطرت پہلے ہی عطا کر چکی تھی۔ زندگی سے منصفانہ اور جچا تُلا برتاؤ اُنھوں نے کسی سے اگر سیکھا ہوگا تو اتنا ہی جتنا مچھلی کا بچّہ تیرنا سیکھے۔

ساغر صاحب نے، جو گھر کے نام صمد یار خاں سے شروع ہوئے تھے علی گڑھ ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں "سومنہ" میں اپنے بچپن کا ماحول بڑی للک سے بیان کیا ہے:

..... برگد کا وہ گھنا درخت، جس کا سایہ پجاریوں کے لیے آرام گاہ تھا، اپنی زمین میں نہیں، میرے دل میں ہے
..... اس گھنے برگد کے سائے میں سیتلا دیوی کا مندر تھا، جہاں منگل کے منگل لوگ آتے اور پُوجا پاٹ کر کے چلے جاتے۔ برگد کے پاس بڑی جھیل مجھے یاد ہے، جس میں سارس اپنے فاختئی شہپروں کو سکیڑے ہوئے اپنی مادہ سے آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرتا اور میں اس کی باتیں اس طرح سنتا جیسے سن ہی تو رہا ہوں.....
ان کھیتوں میں لال پیلی چولیاں کسے گاؤں کی ناریاں ہنستی ہوئی نمودار ہوتیں۔ کولہوں پر گاگریں اُٹھائے، ہاتھوں میں گُڑیاں لیے وہ آتیں اور کیاریوں میں پانی دے کر کنوئیں پر لوٹ جاتیں۔ جاتے جاتے ان میں سے کوئی بے تحاشا ہنس پڑتی اور بے محابا مُٹھی بھر موتی میرے مونہہ پر مار کر چلی جاتی اور میں دیکھتا رہ جاتا اور میں کچھ نہ سمجھ سکتا۔
مسجد میں بستی کے مسلمان آکر نماز پڑھتے اور جب باہر نکلتے تو ایک ٹھٹھا کر اپنے شناسا سے پوچھتا۔ کچھ میرے لیے بھی خدا سے دعا مانگی؟ مندر میں پُوجا پاٹ کے بعد لوگ باہر آتے تو ایک مسلمان بچے کو لیے کھڑا ملتا۔ اجی اس بیمار بالک پر تو پھونکتے جاؤ.....
اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ، جن میں غریب امیر، برہمن، ویش، کھتری، سبھی کے بچے ہوتے۔ اسکول جاتا، جاتے جاتے باغ میں مولسری کا درخت مجھے اپنے پھولوں کی نازک زنجیروں میں کس لیتا اور میں دیکھتا گھاس پر چاروں طرف بے شمار پھول پڑے ہیں۔ پھول ہی پھول اور میں سوچتا ان پھولوں کو چھوڑ کر اسکول کیسے جاؤں؟ ان سب کو بین کیوں نہ لوں؟ اور میں وہ پھول اپنے رُوئی کے کوٹ کی جیبوں میں بھر لیتا.....

بچپن کا یہ منظر یا ان مناظر کا بچپن ہم سے بہت کچھ کہتا ہے۔ پھول، پنگھٹ، گھریلو خوش گواری، کھنکتے قہقہوں اور دن رات کے ڈھڈھوں کے درمیان پلنے والے لڑکپن کو شاعری اختیار کرنے کے لیے اور کیا رہ جاتا ہے۔ طبیعت کی موزونی، احساس کی شدّت اور قوّتِ مشاہدہ کی بیداری، سو یہ نعمت بھی ساغر صاحب کو اُسی عمر سے نصیب تھی۔
پرائمری اسکول کے استاد پنڈت جی کے بارے میں ساغر بتاتے ہیں:

● ۳۲ 'سعیر پی' ۳۱-کولابہ، بمبئی ۴۰۰۰۰۱

..... وہ مجھے اپنے پاس بُلاتے اور سب پھول جیبوں سے نکلوا لیتے اور اتنے پھول دیکھ کر وہ مسکرا دیتے اور کہتے دیکھو کنول پانی میں اور پھول اپنی شاخ ہی پر بھلا لگتا ہے ....

انجانے میں کتابوں پر پھول کو ترجیح دینے والے نوخیز شاعر کو گمان بھی نہ ہوگا کہ یہ ایک شگون ہے۔ اب وہ زندگی بھر کتابوں کی بجائے پھولوں سے اپنی گود بھرتے رہیں گے۔ اور رسمی تعلیم جس کا کوئی بدل نہیں اور جس کی کمی دُور کرتے کرتے آدمی کا کھُرکس نکل جاتا ہے۔ اس رسمی تعلیم سے ساغر اپنے وجود کی جیبیں بھرے بغیر گزر جائیں گے۔ اچھی صحبت، ذہن، آداب و اطوار پر سان رکھتی ہے، علم کی تشنگی بھی صیقل کرتی ہے، ساغر کو اچھی صحبت ملی یا یوں کہنا چاہیئے کہ انہوں نے عمر و تجربہ کی منزلیں مارتے وقت اعلیٰ درجے کی اور اچھی صحبتیں اپنے لیے چنیں، اُن سے فیض اُٹھایا تاہم آداب و اطوار کے نباہنے میں اتنی فرصت زمانے نے نہ دی کہ وہ جی لگا کر گرد و پیش سے بے نیاز اور شبانہ نشستوں سے بے مروت ہو کر علم کی تشنگی بجھاتے اور من بھاتے موضوعات پر اس طرح جم کر مطالعہ کر لیتے جس طرح بڑے فن کار کیا کرتے ہیں (شاعرِ اعظم پوشکن، شاہی اسکول کا گریجویٹ ہمیشہ اس کا رونا رویا کرتا تھا کہ اس کی تعلیم ناقص رہ گئی ہے۔ دنیا بھر سے کتابیں منگا منگا کر مطالعے اور علمی آگاہی کے گڑھے بھرتا رہتا تھا)

## ساغر —— نظامی

ساغر اپنے گاؤں سے نکلے۔ چار قدم پر علی گڑھ کا ایم اے او کالج بھی یونی ورسٹی بنا تھا، اس کا ہائی اسکول تھا، مگر وہ اِدھر نہیں گئے۔ آس پاس کے مشاعروں میں جانے لگے۔ حسن نظامی دہلوی کا اُن دنوں شہرہ دُور و نزدیک تھا۔ ساغر نے اُنہی سے نسبت پیدا کی۔ صمد یار خاں ایک خوش رو، خوش گلو، خوش کلام، خوش اندام، خوش لباس، نفاست پسند ہونہار شاعر کے حق میں چشتی صوفی کی شفقت بھی امرت ہوتی اگر ان کے درمیان حضرت نظام الدین اور امیر خسرو کا سا رشتہ قائم ہو سکتا۔ مگر حسن نظامی ایک ڈیرہ دار صوفی خود نہایت منفعت پسند دنیا دار تھے۔ والیانِ ریاست اور امرائے خوش ذوق سے ان کا ربط ضبط رہتا تھا۔ وہیں تک ساغر کو بھی پہنچا دیا۔

تصدیق نہیں ہو سکی، لیکن قیاس کہتا ہے کہ مہاراجہ سرکشن پرشاد (وزیرِ اعظم ریاست حیدرآباد)، سر سالار جنگ (حیدرآباد) نواب ٹونک (راجستھان) سروجنی نائیڈو کی ادب نواز محفلوں میں ساغر صاحب کی رسائی اسی راہ سے ہوئی ہوگی۔ پھر جب ایک بار آمد کامیاب رہی تو آمد و رفت کا سلسلہ چل نکلا اور ساغر رفتہ رفتہ ان صحبتوں کے رسیا ہوتے گئے۔

## سیماب اور ساغر

علی گڑھ سے آگرہ قریب تھا اور اس علاقے میں ایک ہی اُستاد (سیماب اکبرآبادی) ایسا تھا، جو بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں سے باخبر، موضوعات میں تازہ تر، شعر کے دھارے کو حالات کی طرف موڑ دینے کے لیے بے چین اور ادبی مشقت کو کُل وقتی باضابطہ پیشہ بنائے ہوئے اپنے ماہ ناموں اور شاگردوں کا حلقہ بڑھائے جا رہا تھا۔ یوپی کے شاعروں میں شاگردوں کی پوری کھیپ لے کر اُترتا اور مشاعروں کی فضا بدل ڈالنے کا ہر ایک جتن کیا کرتا تھا۔ ساغر کو استاد نے چُنا یا اُستاد کو ساغر نے، لیکن ان کے حلقۂ ارادت میں آ جانے سے یہ ضرور ہوا کہ اُدھر کی بے نمکی نے ساغر کی لہک مہک سے تلافی پائی اور ساغر کی تنہا روی کو سیماب کا پورا کارواں نصیب ہو گیا۔ جس مشاعرے میں دونوں جاتے، اُستاد کو احترام ملتا، شاگرد کو داد۔ اُستاد کا لوگ ادب کرتے، شاگرد پر پھول چڑھاتے استاد کے بیٹے بھی شاعر تھے۔ مگر ساغر کے آگے سبھا کس کا طوطی بولتا۔ اُستاد ایک پُرگو، قادر الکلام، مگر نہایت محتاط اور ساتھ ہی بدانتظام، شاگرد اچھلتی موج پر بہکنے والا، بے محابا چھکنے والا، قومی تحریک آزادی سے دونوں متاثر، دونوں ہم نوا، مگر زبان دونوں کی جُدا جُدا۔ ساغر کی اُٹھان تھی اسی نسبت سے جوش و خروش اور دل کشی بھی۔ سیماب اور ساغر کا ساتھ بہت عرصہ نہیں رہا۔ صرف ایک تعلقِ خاطر رہ گیا۔

## قومی پلیٹ فارم

ہندوستانی سیاست میں اور اسی کے ہم رکاب قومی بیداری میں ۲۰ ویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی بڑی فیصلہ کُن گزری ہے۔ آج تک ہم اُن اٹھارہ اُنیس برسوں کے پھول اور کانٹے چُن رہے ہیں۔ یہی زمانہ ہے جب تہذیبی، مذہبی، سیاسی جلسوں میں قومی نظمیں سُنائی جانے لگی تھیں اور بڑے مشاعروں میں غزل کا بازار مندا ہو گیا تھا۔ یہی زمانہ ہے جب مولانا آصفی لکھنوی، ظریف لکھنوی، احمق پھپھوندوی، حفیظ جالندھری اور جوش کے ساتھ اُن کے حریف روش صدیقی، احسان دانش اور ساغر نظامی موضوعاتی نظمیں بھرے عوامی جلسوں میں سُناتے اور روداد پاتے تھے۔ انہی لوگوں نے آئندہ کے ترقی پسندوں کے لیے راہ ہموار کی ہے۔

اختر شیرانی، حفیظ جالندھری اور ساغر نظامی کے پاس گیت بھی تھے، رسیلی آواز بھی تھی۔ اور نئے زمانے کے شاعر کی حیثیت سے ایک امیج بھی بن گیا تھا۔ اس امیج کے سبب اور کچھ اپنے لسانی مرکزوں کے ادب آداب کے اختلاف کے باعث ساغر اور حفیظ میں معاصرانہ بلکہ علاقہ دارانہ چشمک بھی رہنے لگی اور اس چقماق سے مشاعرے اور چمکنے لگے۔ ساغر کی شاعری کا دَورِ شباب یہی ہے۔

یہی وہ دور رہے جس میں اُنہیں قومی رہنماؤں سے ملنے ملانے اور ان کی نظر میں چڑھنے کے موقعے ملے۔ قومی تحریکِ آزادی کے عام دھارے میں چوں کہ مُلک کی سوشلسٹ کمیونسٹ نہریں بھی ملی جلی چل رہی تھیں۔ جوش، قبلۂ رندانِ جہاں، کہ اوّل تا آخر آزادہ رو اور آزادی پسند رہے۔ اسی دھارے میں بہتے بہتے کمیونزم کے نظریات سے لب تر کرنے لگے۔ مبہم سا عمومی سا اثر، جوش کے ساتھ ساغر کا دامن بھی رنگین کر گیا۔ ان دونوں میں فرق ہلکے اور گہرے رنگ کا نہیں، شخصیتوں کا، ذہنی رسائی کا اور تدبیر و بے تدبیری کا بھی تھا۔ ساغر قوم پرستانہ جیسے کاموں سے ہم آہنگ اور اس راہ پر ثابت قدم رہتے ہوئے بھی تدبیر سے کبھی غافل نہیں رہے۔ پاؤں رکاب میں تو ہاتھ باگ پر بھی ہوتے۔ ساحل پر سفینہ سلامت رکھنا ساغر کے سلیقے کا ہی ایک سلسلہ تھا۔ جوش و ساغر کے نام ساتھ ساتھ آنے کا اور یکے بعد دیگرے فلمی نگارخانے میں اُترنے کا یہ ایک ہی زمانہ ہے۔

ساغر نے مشاعروں سے جتنا فیض اُٹھانا تھا، اُٹھایا، مگر اُنہیں کافی کبھی نہ جانا۔ وہ اپنے ذہنی کس بل کو، انتظامی قابلیت کو، خیالات کی ترنگ کو ماہنامہ "ایشیا" کے صفحات پر جلوہ گر کرتے تھے اور پہلے میرٹھ میں پھر بمبئی میں، ساغر کے گھر سے نکلنے والا یہ ماہ نامہ اپنے وقت کے نہایت کارگر اور ممتاز ادبی رسائل میں شمار ہوتا تھا۔ اس کا اپنا ایک علمی و ادبی حلقہ بنا۔ میرٹھ میں مستقل یا عارضی سکونت رکھنے والے اہلِ علم و اہلِ قلم محمد یحییٰ، گوپی ناتھ سنہا، صفدر حسین، مقصود زاہدی، ابوالکاظم قیصر، اختر الایمان وغیرہ کسی نہ کسی حیثیت میں "ایشیا" کے شریک رہے۔ پرانی روش کے استاد شاگرد والے جمے جمائے ادبی حلقے اس رسالے اور اس کے "عطائی شاعر" سے سخت برہم تھے۔ جہاں موقع ملتا اس برہمی کا اظہار کر کے اپنا جی ٹھنڈا کر لیتے۔

## میرٹھ اور ساغر

بے محل نہ ہوگا اگر ہم میرٹھ کالج کے ایک سالانہ مشاعرے کا منظر یہیں لکھتے چلیں: ۱۹۳۹ء کی سردی کا موسم ہے۔ اس پُرشور کالج کا سالانہ مشاعرہ ہونے والا ہے۔ کالج کے اور شہر کے معززین اپنے بہترین لباس میں درجہ بدرجہ صف بہ صف جمے ہوئے ہیں۔ سیکڑوں میں ایک کرسی بھی خالی نہیں۔ اسی کالج کے ایک منچلے اور محترم طالب علم ابوالقاسم قیصر سے کہا جاتا ہے کہ وہ اسٹیج پر آئیں اور مشاعرہ باقاعدہ شروع ہونے تک اپنا کلام سنائیں۔ قیصر آتے ہیں۔ ترش خودداری کے لہجے میں اعلان کرتے ہیں کہ وہ خلا کو بھرنے کے کام نہیں آئیں گے۔ کلام نہیں سنائیں گے۔

انتظار اور اسی کے ساتھ نوجوان حاضرین کی بے چینی طول پکڑتی جا رہی ہے۔ سب کی نظریں بار بار گیٹ کی طرف اُٹھتی ہیں کہ اب اور تب وہ فورڈ کار احاطے میں داخل ہوا اور اس میں سے بہزاد لکھنوی نکلیں۔ یہ کار بہزاد کو لینے دہلی گئی تھی۔ بہزاد لکھنوی کی ان دنوں بڑی دھوم تھی۔ اختری بائی فیض آبادی (بعد کو بیگم اختر) کے گائے ہوئے ریکارڈ گلی گلی بجتے۔

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے

اور اس ریکارڈ کے ساتھ بہزاد کے عشق و جنون کے افسانے۔ ان افسانوں اور گانوں کے ساتھ نئے نئے آل انڈیا ریڈیو کے نغتیہ پروگرام، بہزاد ہی بہزاد۔ ان کی دردبھری آواز اور شیروانی میں دل کے مقام پر لٹکی ہوئی ایک سفید دھجی کو بار بار کھینچنے کی دھج۔

ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے!

میرٹھ کے اساتذہ برہم کہ یہ ایسا کہاں کا شاعر ہے۔ دو لخت مصرعے اور دم شکستہ استعارے لکھ کر ایسا اہم ہو گیا کہ وہ نہ آئے تو مشاعرے کی رسم ادا نہ ہو۔ خدا خدا کر کے وہ "حقیقتِ منتظر" لباسِ مجاز در بہزاد میں آ گئی اور مشاعرہ اس قیامت کی سردی میں گرم ہوا۔ سبھی شعر کہنے اور سنانے والے اس صورتِ حال سے جلے بھنے بیٹھے تھے کہ ساغر صاحب کا نام پکارا گیا۔ آوازیں آئیں۔

..... جوانی لُٹا دی

پٹ مندر کے کھول پجارن .....

ساغر صاحب نے تازہ تازہ ایک نظم سنانی شروع کی:

آ — میں تجھے تن من میں بسا لوں اے بانی کے باسی

ہم لوگ جو ساغر صاحب کی شخصیت کے طلسم میں گرفتار تھے، ابھی داد نہ دینے پائے تھے کہ مجمع میں اِدھر اُدھر سے پھر وہی آوازیں "جوانی لُٹا دی" وغیرہ بلند ہوئیں۔ اب ان آوازوں میں تمسخر یا ہوٹنگ کا رنگ کھلا تھا۔ ساغر صاحب اُکھڑ گئے۔ نظم روک دی۔ تن کر آستینیں چڑھانے لگے۔

"جن صاحب کی ہمت ہو، سامنے آئیں۔ میں نے پٹھانی کا دودھ پیا ہے۔" مجمع میں سناٹا ہو گیا۔ ہوٹنگ کی نیت رکھنے والے یقیناً پٹھانی کا دودھ پیے بغیر آئے تھے۔ پھر مشاعرہ چلا، ساغر چلے، خوب چلے اور آخر میں بہزاد چلے۔ وہی اس مشاعرے کا گلِ سرسبد تھے۔

## جوش و ساغر

جوش اور ساغر دونوں میں ایک صفتِ مشترک "پٹھانی کا دودھ" بھی تھا، جو کسی بے محل بات یا واقع پر ایسے وقت میں یاد آتا تھا، جب پیمانی دودھ کے دو چار جام خالی ہو چکے ہوں۔ جوش تو سارے بدن سے تھرانے لگتے تھے۔ اور ساغر آستینیں چڑھا کر شیروانی کے بٹن کھولنے بند کرنے لگتے تھے — حفیظ، فراق، سلام اور کس کس ہم مشاعرہ سے ایسے ہی موقعوں پر بگڑی اور پھر بنی نہیں۔

ویسے ساغر اپنی طرف سے نہایت وضع دار، مروّت، لحاظ والے اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ خود کسی کی توہین کے درپے نہ ہوتے تھے۔ کسی حال میں ہوں، سرِ عام نہ دوسروں کی تذلیل انہیں پسند تھی نہ اپنی سبکی گوارا تھی۔ مشاعروں میں بڑوں کا لحاظ کرتے، چھوٹوں کا دل بڑھاتے اور جس کسی میں کوئی ہنر دیکھتے، اس کی کھلے دل سے داد دیتے۔

چوتھی دہائی کے شروع میں وہ پونا گئے۔ پونا فلم کمپنی میں جو گزری (اور اس کے بعد کے چند سال) اس کی کچھ جھلک جوش کی "یادوں کی بارات" میں ملتی ہے۔ جوش و ساغر کم از کم تیس سال ہم نوالہ ہم پیالہ رہے، لیکن ساغر کے وقتاً فوقتاً زبانی ریمارکوں سے اور جوش کے "ذکرِ ساغر" سے ایسا کھلتا ہے کہ ان کے دل میں ایک دوسرے کے لیے جگہ نہیں تھی۔ پہلے پونا اور پھر بمبئی میں دونوں نے ایک جیسے سرمستی اور تنگ دستی کے حالات دیکھے جتنی امیدیں لے کر شمالی ہند سے آئے تھے، چار سال کے اندر اندر سب نے دغا دی اور گھر بار سمیت بمبئی منتقل ہوئے تو ملک میں افراتفری شروع ہو چکی تھی۔ (۱۹۴۵ء - ۴۶) اور فلم انڈسٹری میں نفسا نفسی۔

کئی یادداشتوں میں اہلِ قلم کی اس وقت کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ جوش نے بھی اپنی سوانح میں، براگندہ نقاب سوانح میں اپنی ہی نہیں، بلکہ ایک حد تک ساغر صاحب کی جھلک دکھائی ہے۔ میں نے اس بُرے وقت میں، ان کی زندگی کے سب سے آزمائشی وقت میں، انہیں ہمت کھوتے زمانے کی جان کو روتے اور تنگ دل ہوتے نہیں دیکھا۔ ہاتھ کھلا تھا، خرچ اجلا تھا، مکان سلیقے کا تھا۔ بیوی ایسی مثالی جس کے ساتھ چودہ برس کا بن باس بھی ہنستے کھیلتے کٹ جائے۔ قریب کے لوگ جانتے ہیں کہ انہوں نے ہر ممکن تدبیر کی کہ "ایشیا" ماہنامہ نکلتا رہے اور اس سے لکھنے والوں کو بھی معاوضہ پہنچتا رہے۔ سارے جتن کر ڈالے۔ خود انتہائی ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی دوسرے دن کی ضرورت میں دامے درمے کام آتے رہے اور باہر کی شان بنائے رکھی۔ بھوک میں مونچھوں کو گھی، پلاؤ قورمے کی چکنائی سے تاؤ دے کر محفل کا سامنا کرنا گہرے کلچر اور عالی ظرفی کی نشانی ہے۔ یہ نشانی اس زمانے کے ساغر اور بیگم ساغر کے چہروں اور لباسوں سے بہت مانوس ہو گئی تھی اور اس کی بدولت اردو شاعروں کا بھرم بنا رہتا تھا۔

## قومی سرکار اور ساغر

ترقی پسند ادبی حلقوں میں (۱۹۴۸ء کی پارٹی لائن کے کارن) انتشار اور تفرقے کی فضا خواجہ احمد عباس اور ساغر نظامی تک نام نہاد انجمن کی ممبری سے خارج کہ دونوں کا جھکاؤ جواہر لال نہرو کی کانگریس کی طرف تھا۔ سکّہ بند اور لیبل پسند کمیونسٹ اہلِ قلم سرکاری اداروں اور سرکاری پرچوں سے راندۂ درگاہ

(ان سطروں کا لکھنے والا بھی اپنی بساط بھر انہی میں شامل تھا)

ٹھیک انہی حالات میں جوش سرکاری رسالے "آج کل" کے ایڈیٹر ہو کر دہلی چلے گئے اور انہیں وہاں کچھ معاشی فراغت نصیب ہوئی تو ساغر صاحب اوّل اوّل اُن کے اس "ہرجائی پن" سے خفا رہے۔ ان کے عمل سے عبرت پکڑی۔ پھر اُسے مثال بنایا اور بالآخر چار پانچ سال بعد پونا ٹھیک دیا۔ چار و ناچار "ایشیا" کے ادارے سمیت دہلی چلے آئے اور حکومتِ ہند نے انہیں آل انڈیا ریڈیو کے ایک عہدے میں کھپا لیا۔ نہ ان کا دل بدلا تھا نہ دل ــــ شروع سے ہی وہ اس لائن کے آدمی تھے اور ریڈیو میں وہ صرف تنخواہ اور الاؤنس لینے نہیں بلکہ اُسے کچھ دینے کا حوصلہ لیے ہوئے آئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی آمد سے اس میڈیا کو جو فیض پہنچا تھا، وہ اپنی جگہ، لیکن ایک طرف ساغر صاحب نے چن چن کر روشن خیال اہلِ قلم کو نشریات دیے، کام دیا، کام لیا اور دوسری طرف نشریات پر اکتفا کر کے نہیں بیٹھ رہے۔ فلمی نگار خانوں سے دید شنید (AUDIO VISUAL) تکنیک کے تجربوں سے اور ۵۰ برس غنائی اور قومی شاعری کی پختہ مشق سے جتنا کچھ ذخیرہ خزانہ دانہ کر کے سمیٹا ہوگا، سب کو ٹھکانے لگانے اور کارِ رواں میں لٹانے کا وقت آ گیا تھا اور وقتِ عزیز کو ساغر نے رائیگاں نہیں جانے دیا۔ عمر کے یہ آخری بیس سال انہوں نے جی لگا کر، دن رات ایک کر کے، ادبی مہم بنا کر، وقت کی مجبوری اور اپنی صحت و آسائش، دونوں پر ڈاکہ ڈال کر لگاتار اتنے ورق سیاہ کیے، اتنا لکھا کہ ساٹھ برس کا کام اٹھارہ بیس برس میں کر کے رکھ دیا۔

## کارناموں کے بیس سال

منظوم ترجمے، اصل نظم نگاری سے زیادہ جوکھم کا کام ہے۔ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں کئی نامور شعرا نے دوسری زبانوں کی شاعری کو اپنی زبان میں ڈھالا ہے اور ایک زمانے کی شعری مشق کے بعد ہی یہ بھاری پتھر اٹھایا ہے (مثال کے طور پر جرمن، انگریزی اور روسی میں ایسا ہی ہوا) ہماری شاعری کے تالاب میں یہ کنول یوں بھی کم ہی کھلے اور پھر ان کی قدر اتنی کم ہوئی کہ کم حوصلے کا شاعر منظوم ترجمے کے لیے قلم اٹھاتے ڈرتا ہے کہ کہیں وہ تخلیق کار سے گھٹ کر مترجم نہ رہ جائے۔ چنانچہ آپ دیکھیں کہ ایک صدی میں جو کئی سو نظمیں مانوس ملکی و غیر ملکی زبانوں سے ترجمہ ہو کر چھپی ہیں، ان میں کسی معروف شاعر کے ترجمہ کیے ہوئے چند سو شعر بھی یک جا نہیں ملیں گے۔ وجہ وہی: خود اعتمادی کی کمی اور حوصلے کی پستی۔ فرسودگی کی منڈی میں اس جنسِ گراں کی ناقدری۔

## "شکنتلا"

ساغر صاحب جوانی گزارنے کے بعد منظوم ترجمے کے سوئمبر میں اُترے۔

اور رام بان اُٹھایا۔

"بادۂ مشرق" اُن کا پہلا مجموعۂ کلام ۳۵-۱۹۳۴ء میں چھپا تھا ــ اس میں بلند و پست سبھی طرح کی چیزیں تھیں۔ اہلِ نظر کی پسند اور تماش بینوں کی دلچسپی، نوجوانی کی لپک اور ناپختگی کی بھبک، سبھی کچھ ـــــ ساغر اس کے بعد بھی لکھتے رہے۔ سُناتے رہے، داد پاتے رہے، مگر پچپن ۵۵ سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے جو اُنھوں نے ایک اور تازہ دم اور بھرپور زندگی جینے کا تہیہ کیا تو عظیم شعری کارنامے "شکنتلا" پر ہاتھ ڈالا۔

کالی داس کا یہ سنسکرت مہاکاویہ نظم و نثر میں ہے، جو لوگ سنسکرت پر عبور رکھتے ہیں، وہ جانتے ہوں گے کہ ایک بندۂ فانی کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ کس طرح آسمانی صحیفوں کے جلال و جمال سے ہم وزن ہو گئے ہیں۔ ساغر سنسکرت نہیں جانتے، حُسن کے تقاضوں کو پہچانتے ہیں۔ "پٹھانی کا دودھ" اور پھولوں سے بھری جبلیں اُن کی فطرت کا مزاج اور مذاق کی تربیت میں دُور تک گئی ہیں۔ "شکنتلا" رزمیہ نہیں، بزمیہ ہے، یہاں جمال ہی جمال ہے ــ آدمی اور فطرت کا پُراسرار اور دل نواز رشتہ، ارضی اور ماورائی کرداروں کی آنکھ مچولی، ترکِ لذّات کا مرحلہ اور پھر ترکِ ترک کی منزل، جہاں پہنچ کر انسان اپنے عمل کا دائرہ پورا کر لیتا ہے، ان مقامات کا باہمی ربط، یہ سب اور اس کے علاوہ حُسنِ بیان، مُحسنِ کلام اور فطری ترنم، اس کا عرفان یقیناً ساغر صاحب کو ہوا ہے۔ اُنھوں نے "شکنتلا" پر جو اسّی صفحے کا فکر انگیز دیباچہ لکھا ہے، اہلِ سنسکرت سے لاعلمی کے باوجود نہایت علمی پہلوؤں کو اپنے دائرے میں سمیٹے ہوئے یہ اسّی صفحات ایک فطری شاعر کے دھڑکتے ہوئے دل اور بلند حوصلگی اور برسوں کی دیدہ ریزی کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اسے پُورے منظوم "شکنتلا" کے برابر تولا جا سکتا ہے۔ تولا جانا چاہیئے تھا۔ آج تک کسی منظوم ترجمے پر اتنا وقیع، اتنا قیمتی، عالمانہ، مگر شاعرانہ دیباچہ ہماری نظر سے نہیں گزرا (حالاں کہ ہم خود اس کوچے سے نابلد نہیں گزر رہے ہیں)

الفاظ، انداز، بحروں، لہروں اور ترکیبوں استعاروں کے انتخاب کے بارے میں شاعر کا نقطۂ نظر یہ ہے:

"..... دراصل اچھے اور بُرے الفاظ کا ترازو صرف معنی ہی نہیں ہیں، سماعت بھی ہے۔ ہماری سماعت الفاظ کی صوتی لہروں کے بہاؤ اور سکون کو قبول اور مسترد کرتی ہے۔ جو کانوں کو بھلا لگے وہی لفظ استعمال کے لیے موزوں ہے۔ ہندی اور سنسکرت سے ترجمہ کرتے وقت اپنی زبان کے ہم معنی الفاظ لکھنے پر ہی قناعت نہیں کرنی چاہیئے۔ کان لگا کر سُننا بھی چاہیئے کہ لفظوں کے ساز سے کون سی صدا پھُوٹ رہی ہے۔ لفظ آپس میں باتیں بھی کرنے لگے ہیں یا نہیں۔ الفاظ و معانی کے رشتے مسلّم سہی، لیکن آہنگ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔....."

یکم نومبر ۱۹۶۰ء کی تاریخ پڑی ہے اس دیباچے پر۔ اسی سال کے آخر میں نہایت اہتمام، سلیقے، ہوش مندی اور ہر ممکن نفاست کے ساتھ ساغر صاحب کی منظوم "شکنتلا" نکلی۔ پنڈت جواہر لال، ڈاکٹر تارا چند اور سجاد ظہیر کے دیباچے اس کے شروع میں یہ بتانے کو کافی تھے کہ خود ساغر صاحب اپنے اس کارنامے کو کیا حیثیت دیتے ہیں۔ اس منظومے پر تبصرے، ریمارک اور مضامین چھپ چکے ہیں۔ مقبول و نامقبول سبھی کچھ کہا جا چکا ہے تب بھی وہ بات کہنے اور سمجھانے کو باقی ہے۔ جو سنسکرت، کالی داس اور اردو کلاسکی شاعری کا کوئی ایک عالم، ایک ودوان ایک نہ ایک دن کہے گا۔ ممکن ہے وہی بتا سکے کہ اگر یہ کہانی جوں کی توں اردو میں ہوتی اور ساغر کو دے دی جاتی تو وہ اُسے نظم میں ڈھالتے وقت یہی صورت اور معیار رکھتے یا اس سے مختلف ــ تب اُس دن ساغر کے کارنامے کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہو گا۔

## "انارکلی"

"شکنتلا" پر جو داد بیداد کا شور مچا اس نے ساغر کا نشہ اور تیز کر دیا۔ اور اس بار انہوں نے ڈرامے کی دنیا کا گھسا پٹا موضوع "انارکلی" لے کر اُسے اوپیرا کی تیکنیک اور اپنے تصوّر کے سانچے میں ڈھالا۔ اب یہ ساغر کی انارکلی تھی۔ اُن کے تخیل کا عالمِ خواب و بیداری، جس میں شہزادہ سلیم مثالی عاشق ہے، جس کے عشق کو زمین پر بے بسی مقدّر ہوئی تھی۔ اور عالمِ بالا پر حُسن کی پرستش کا پُورا اختیار۔ ساغر نے یہاں فرد اور سماج، اطاعت و سرکشی، حسن و عشق، جبر و اختیار، جذبۂ اقتدار جیسے مسائل کے سنگلاخ میدان میں اشہبِ قلم کو دوڑنے کی پُوری چھُوٹ دی ہے۔ اور اپنی اس معرکہ آرا نظم کے تعارف میں لکھا ہے (۱۹۶۳ء)

"منظوم شکنتلا کی طرح انارکلی بھی مثنوی نہیں ہے نہ اس پر طویل نظم ہونے کا شبہ کرنا چاہیئے۔ دونوں غنائیے پڑھنے کے خیال سے نہیں لکھے گئے۔ ان کے فرائض میں اسٹیج ہونا بھی شامل ہے یہاں اس میں اور شکنتلا میں ایک امتیازی فرق ضرور ہے۔ شکنتلا میں کرداروں کی خود کلامی ڈرامائی تسلسل میں تھوڑے روک پیدا کرتی تھی، مگر یہ اصل کا عکس تھا۔ انارکلی اس عنصر سے محفوظ ہے کیوں کہ خود اپنی اصل ہے۔ مگر اس میں بھی ڈرامائی مد و جزر اور جذبات کے کیف و کم کے لحاظ سے بحروں کا تغیر و تبدل عمل میں لایا گیا ہے اور ضرورت کے مطابق ایسی بحریں اختیار اور وضع کی گئی ہیں تاکہ نفرت و محبت، الم و مسرت، غیظ و رحم،

> حرکت و سکون اور انتشار و توازن کی بھرپور نمائندگی
> ہو سکے۔ اور جب اسٹیج پر کردار مکالمے بولیں تو تجربے
> مقصود جذبہ خود بخود بول اُٹھے۔"

لیکن اس ڈرامائی نظم سے مقصود جذبہ جس کا نام یہاں نہیں آیا، وہی ہے جو بالآخر ہر ایک فن کار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جبر و اختیار کی کش مکش کا اگلا پچھلا حساب طلب کیا کرتا ہے۔ ساغر نے اپنی ہم پیشہ برادری کے عام مزاج سے ہٹ کر "انارکلی" میں انسانی اختیار کے سر سہرا باندھا ہے۔ جودھا بائی کی ماتا اور انارکلی کی سپردگی دونوں ہی ساغر کے عالمِ خیال کی شکست گزار نظر آتی ہیں۔

اس نفیس، دل کش، آراستہ، پیراستہ شعری مجموعہ کے گلے میں دو قیمتی ہار پڑے ہیں: ۳۲ صفحے کا عالمانہ دیباچہ انگریزی کے پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا اور ۵۵ صفحے کا مقدمہ خود ساغر صاحب کا۔ وہ کلچر پرل کا۔ یہ مولسری کے پھولوں کا۔ ساغر نے یہاں پھر اپنی شاعرانہ نثر سے منظومے کی رہی سہی کسر نکال دی ہے۔

## نہرونامہ

ان کا تیسرا طویل منظومہ "نہرونامہ" ہے۔ جس کے بارے میں وہ معمول سے زیادہ جذباتی ہو گئے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے ساغر کو مدّتوں کا خصوصی نیاز حاصل تھا۔ ان کے فکر و عمل کی راہ بھی وہی "نہروانہ" تھی۔ پنڈت جی کا انتقال مئی ۱۹۶۴ء میں ہوا۔ اگلے سال یہ نظم لکھی گئی۔ سال ڈیڑھ سال کے شب و روز میں تمام ہوئی، پھر اشاعت کی دھوم دھام ہوئی۔ درمیان میں جو بیتی وہ ساغر اور اُن کے کلام کی مہتمم بیگم ذکیہ سلطانہ سے ہی سنیے:

> ۱۶ اگست ۱۹۶۵ء کی رات پونے بارہ بجے عرس حضرت
> محبوبِ الٰہیؒ کے موقع پر عرس محل نظام الدین اولیاء میں
> دل کا حملہ ہوا، مگر ان کی جان ان کے جسم میں کہاں
> تھی، نہرونامے میں تھی۔ موت ان تک غلط پہنچی تھی۔
> پورا ایک سال (۶۶ء) دل کی بیماری میں بیتا
> لیکن وہ اس نازک ترین حالت میں بھی نہ مانتے۔ ذرا جان آئی
> تھی کہ پھر وہی دن رات شروع ہو گئے۔ وہ صبح و شام
> پھر زندگی سے مذاق کرنے لگے۔ اس مرتبہ پھر تخلیقی عمل،
> ترمیم و تنسیخ، نقل نویسی اور "مرصّع کاری" کے ساتھ ساتھ
> نہرونامے کے انگریزی ترجمے کا کام بھی شروع ہو گیا۔"
> (جولائی ۶۷ء)

"نہرونامہ" جیسی طول طویل، مختلف بحروں، کیفیتوں، ہسکوں اور مشکلوں سے گزرتی ہوئی نظم شاید ہی کسی زبان میں نہرو کی سمادھی کو نصیب ہوئی ہو۔ اگر آئندہ بھی ہو جائے تب بھی ساغر کا "نہرونامہ" سب سے آگے، دو قدم آگے ہی نظر آئے گا۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے طول نے شعریت کو اور اور شاعر کے جذبۂ بے اختیار کو بار بار پیچھے کھینچا ہے۔ یہاں تک کہ بعض مصرعے بُری طرح ناہموار ہو گئے ہیں اور منطقی ربط راہ سے بے راہ۔

"نہرونامہ"، جذباتی شدت کے عالم میں اور نہرو جیسی تاریخ ساز شخصیت کی موت پر اُن قدروں کی یاد دہانی کی نیت سے شروع کیا گیا تھا جو قدریں خود قومی آزادی کے اُبال میں اُٹھنے والے ساغر کو بھی اتنی ہی عزیز تھیں۔ موضوعِ سخن کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش میں آمد نے آورد کو راہ دی اور آورد میں بعض فنی خامیاں در آئیں (مثلاً ص ۱۸۳ پہ "سہل" کی جگہ آسان کے مکرر الفاظ)

## "مشعلِ آزادی پروجیکٹ"

نظم تمام ہوتے ہوتے ساغر نظامی کی جہاں دیدہ اور سرد و گرم چشیدہ آنکھوں نے غالباً اس کے دنیاوی امکانات بھی دیکھ لئے اور جولائی ۶۷ء میں جب وہ واقعہ ظہور پذیر ہوا جسے واقعی زیورِ طباعت سے آراستہ ہونا کہتے ہیں تو اس پر ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر تارا چند، ڈاکٹر سیّد محمود، سجّاد ظہیر کے علاوہ انور صدیقی، ممنور جالندھری، بلراج کومل اور ذکیہ سلطانہ ساغر کے قابلِ ذکر مضامین بھی شعری معرکوں کے ایک فاتح کے سینے پر تمغوں کی طرح سجے ہوئے تھے۔ اب وہ [سرکاری منصب سے ریٹائر ہونے پر] اپنے لیے نئے معرکے اور وسیع ترمیدان کا تقاضا کر رہے تھے ——— ساغر اور اُن کے کارنامے اور اُن کے تمغے۔ چنانچہ ذاکر صاحب کی زندگی میں ہی ساغر کو ان کے حسبِ مراد ایک اہم، قومی پیمانے کا عظیم الشان فریضہ سونپ دیا گیا ——— پوری جنگِ آزادی کو منظوم کرنا، اس پروجیکٹ پر وقت، سرمائے اور ضخامت کی کوئی پابندی نہیں مانی گئی۔

یوں ساغر نے زندگی سے جو آخری سودا کیا۔ وہ بھی بڑے سلیقے سے، خودداری کے ساتھ اور مول بھاؤ میں اپنا بول اونچا رکھ کر کیا اور عمر بھر کی کمائی کو ارزاں نہیں جانے دیا۔

خود کو اس طرح منوالینا محض فنی ریاضت اور ذہنی محویت سے نصیب نہیں ہوا کرتا۔

دس سال سے اوپر انہوں نے اسی منظوم تاریخ کی تکمیل میں بسر کیے۔ اگرچہ وہ مکمل نہ ہو سکی۔ تاہم "مشعلِ آزادی" کی جو ایک جلد ہمارے سامنے آئی ہے، وہ ساغر صاحب کے تھکتے ہوئے بیمار جسم اور جاگتے ہوئے تہہ دار ذہن اور حوصلے کی قدم قدم پر گواہی دے رہی ہے۔ اگر انہوں نے یہ کام "شکنتلا" کے منظوم ترجمے

....... کے وقت میں اُٹھا یا ہوتا تو اُنہیں بار بار کی ترمیم، اصلاح اور تکمیل کا وقت مل جاتا۔ اگر ساحر نے تھم تھم کر، وقفے دے دے کر اس صہبائے تند کو آبگینے میں ڈھالا ہوتا تو اس پر دوستوں دشمنوں کے طعنے، آوازے اور تقاضے کچھ کام آتے، لیکن ہونی انہونی میں اگر مگر کا دخل کچھ بھی نہیں۔ اب یہ منظوم تاریخِ آزادی جیسی کچھ ہے، ساحر صاحب کا سرمایہ ہے۔ جاتی فصل کا آخری پھل پھول ـــــ ارمغاں قیمت آنکنے کے لیے نہیں، ایک ایسی بیش قیمت یادگار ماننے کے لیے، جس تک پہنچانے والی پگڈنڈی سبزے سے ڈھکی رہے گی۔

۷۸ برس پورے کر کے ۱۷ فروری ۱۹۸۴ء کو جب ساحر نظامی سکونِ قلب کے ساتھ قلب کے آخری حملے میں دنیا سے سدھارے تو ان کا جنازہ اس شان سے اُٹھا کہ امیر کبیر رشک کریں۔ اور اسی شام غالب اکیڈمی میں جس ادبی جلسے کی وہ صدارت کرنے والے تھے وہ جلسہ اُن کا پہلا تعزیتی اجلاس بن گیا۔ زندگی سے انہوں نے انصاف کیا تھا۔ موت نے اُن سے مروت برتی۔ جس آن بان سے وہ جیے تھے، وہ شان دیر تک اُن کی یاد کے ساتھ سلامت رہے گی۔

---

# جھلکیاں

میں نے گھنٹہ گھر میرٹھ کے بازار سے جلدی جلدی گزرتے ہوئے ساحر نظامی کو اس وقت دیکھا تھا، جب میں پنجوں کے بل اُچک کر ہی انہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ میرٹھ کے ایک نامور شاعر اور میں عربی زبان و ادب کا ایک بے حیثیت طالب علم۔

اُن کے والد جو محکمۂ صحت کے ایک انسر تھے، داروغہ جی کہلاتے اور گھوڑے پر دورہ کرتے نکلتے تھے۔ اپنے ایک اسسٹنٹ، میرے شفیق و عزیز ماموں (امداد علی) پر خصوصیت سے مہربان تھے۔ میں کچھ تو ماموں کے رشتے سے اور کچھ ساحر صاحب اور اُن کے نامور مہمانوں کی زیارت کی خاطر ساحر صاحب کے مردانہ مکان پر آنے جانے لگا۔ جوش ملیح آبادی اور نیاز فتحپوری کو پہلی بار وہیں دیکھا۔ اہلِ قلم ایسے قدآور اور شان دار ہوتے ہیں، یہ سوچ کر میں اپنے کمزور اور حقیر جسم سے بہت شرمایا تھا اور اس کے ساتھ طے کیا تھا کہ بڑے ناموں سے دن کی روشنی میں پہلی بار کبھی ملنے نہیں جاؤں گا۔ یہ مونہہ اور مسور کی دال!

پھر انہیں ریڈیو پر سُنا۔ ریڈیو نیا نیا چلا تھا۔ جس گھر میں ہوتا آس پاس کے مرد عورتیں لوگ سرِشام خبریں اور نشریئے سننے جمع ہو جاتے۔ اہلِ قلم کا نام گھر گھر پہنچانے میں بھی ریڈیو پروگراموں کا دخل بڑھ گیا تھا۔ جنگ شروع ہوئی (ستمبر ۳۹ء) تو نیشنل وار فرنٹ کے مشاعرے اور ادبی پروگرام، ناچ گانے سبھی سنے جانے لگے۔ جنگی خبروں کو لوگ مشتبہ سمجھتے اور ادبی پروگراموں کو معتبر

ساحر نظامی ہر مشاعرے میں چمکتے اور گونجتے۔

۱۹۴۰ء میں، جب گاندھی جی نے جنگ کے خلاف (یعنی جنگِ عظیم میں ہندوستان کو خواہ مخواہ گھسیٹنے کے خلاف) انفرادی ستیہ گرہ شروع کی تو ساحر صاحب کا دل ستیہ گرہ کے ساتھ تھا اور ان کی کھنکتی ہوئی آواز ان شاعروں کے ساتھ، جو سرکاری سرپرستی میں مشاعروں کا بازار گرم کیا کرتے تھے، جوش ان سے برے رہنے۔ ساحر کی بے داغ شیروانی پر آنچ نہیں آئی۔ اب اُن کے سر کنبے کا بوجھ بھی تھا۔

بھاری بھرکم کنبہ۔ بڑے خرچ اور کمانے والا شاہ خرچ باپ ریٹائرڈ۔ جن پر گزری ہے وہ جانتے ہوں گے کہ جنگ کے شدت اختیار کرتے کرتے جب قیمتیں تیزی سے بڑھ رہی تھیں، ایک بڑے کنبے کو شاعری کے کنویں سے شاداب رکھنے کے لیے آدمی کو کیا کیا جتن کرتے پڑتے ہوں گے اور پھر ساحر جیسا کھلے ہاتھ کا آدمی، جو ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دے۔ سخت آزمائش کا توڑ آنے سے پہلے ہی جوش، ساحر، کرشن چندر، اختر الایمان اور بھرت ویاس کو پونا (شالیمار پکچرز ـــــ ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد) سے بلاوا آ گیا اور برا وقت ٹل گیا۔

اس شاہانہ ملازمت کے الّلے تلّلے ہم نے کچھ سُنے ہیں، کچھ پڑھے ہیں۔ (کرشن چندر اور جوش کی زبانی)۔ انجام اس کمپنی اور ملازمین کا ہندوستان کی خونی تقسیم کے ساتھ ہوا۔ سب بکھر گئے۔

ساحر بمبئی آئے تو یہ سوچ کر چھپر چھایا تھا کہ فلمی دنیا میں دھوم مچا دیں گے۔ نخشب جارچوی (مرحوم) نے، کہ ایک نمبر کے خطر پسند اور مہم دوست اور جواں مرگ شاعر تھے، کسی خلوت میں ساحر صاحب کو مشورہ دیا کہ یہاں جس سے تنخواہ یا معاوضے کی اُمید ہو، اُس کے ساتھ شام کے شراب و کباب میں شرکت سے پرہیز کیا کیجیے۔ آپ خود کو قومی لیول کا شاعر سمجھتے ہیں، نہ جانے ترنگ میں کیا کہہ جائیں۔ وہ خود کو سیٹھ یا مالک سمجھ کر آپ کی بات نیچی کرے گا۔ انجام بخیر نہیں ہو سکتا۔ مگر ساحر صاحب خود نخشب کو کہاں خاطر میں لاتے تھے، جو یہ مشورہ دل پر لیتے۔ انجام بخیر نہیں ہوا۔

گھر کے اندر کی بات ہے کوئی نہیں بتائے گا، اس لیے بتائے دیتا ہوں کہ بیگم ساحر نے اس کٹھن گھڑی میں برے سے برا وقت دیکھا اور شاعر شعر ہر کو سنبھالے رہیں۔ انہوں نے کاروبار کی ٹھانی۔ مچھلی ڈبوں میں بند کر کے ایکسپورٹ کرنے کا ڈول ڈالا۔ مچھلی ایکسپورٹ ہونے سے تڑپ کر نکلی تو روزمرہ کی غذا میں چمکنے لگی اور ساحر صاحب اپنی قوتِ تخئیل سے مچھلی، فاسفورس اور دماغی قوت کا باہمی رشتہ سمجھاتے رہے۔ یہاں تک کہ ہفتوں لگا تار مچھلی کھانے کے بعد جو دماغ روشن ہوا تو انہوں نے بمبئی کی فلمی دنیا کو اس کے ناہنجار حال میں چھوڑا اور خود قومی حکومت اور اس کے رہنماؤں سے رجوع کیا۔ اس رجوع کا

مجلس اردو ادب کو (۸۱ - ۱۹۵۵ء) پچیس ۲۵ برس تک برابر ملتا رہا۔ پروگراموں کی ترتیب، پابندیٔ اوقات، فرض کی ادائیگی، تصنیف و تالیف میں انہماک مجلسی زندگی میں سرگرمی، قومی مسائل میں شرکت، سبھی میں ساغر کا سلیقہ مثالی تھا۔

انہیں دو بار ملک سے باہر جانے کا موقع ملا۔ پہلی دفعہ دو رُکنی وفد میں پولینڈ گئے تھے۔ باہر کے ادیبوں اور ادبی سرگرمیوں کا مشاہدہ ان کے لیے بڑا حوصلہ افزا نکلا۔ دوسری بار وہ ۱۹۶۲ء میں ادیبوں کے ایک بھرپور وفد کے ساتھ سوویت یونین گئے۔ مشرقی یورپ دیکھا اور آزاد بندوں کی عزیز سیرگاہ پیرس میں گھومے۔

ماسکو میں ایک روز سُنانے لگے: افسوس، ظ انصاری صاحب، ہم نے یہ دنیا اتنی دیر سے دیکھی۔ یہاں تو قدم قدم پر.... کیا صاف ستھرے شہر ہیں! کیا دل رُبا نقشے ہیں، علم کی گرم بازاری ہے اور ایک ہم وہاں اپنی ڈفلی بجاتے رہے!

ساغر صاحب، میں تو یہاں بھی اپنی ڈفلی بجا رہا ہوں۔

نہیں صاحب، ذرا غور کیجئے۔ وہ اپنے اردو ہندی کے تنگ نظر ماحول پر، شرمیلی قوم پر (قوم کے لیے یہ لقب میں نے پہلی بار اُنہی کی زبانی سُنا، بعد میں جوشؔ کی آپ بیتی میں نظر آیا۔) میں نے دبی زبان سے عرض کیا: کیا پیرس میں بھی شرمیلی قوم کا یہ شاعر شرماتا گزرا؟

فرمایا: اجی چھوڑیئے، لاحول ولاقوۃ! میں نے دنکرجی سے کہا (دنکرجی = رام دھاری دِنکر) گوی مہاشے، آؤ، شام کا سمے ہے۔ پیرس کے بدنام کوچوں کی سیر کرالاؤں، کیا یاد کرو گے! بولے تابندھو، ہم اس کوچے کے کام کے نہیں رہے۔ یہ کہا اور ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے دودھ دہی پیتے رہے۔

ساغرؔ مہذب آدمی تھے، بیدار حواس کے آدمی تھے، یار باش آدمی تھے، مگر شرمیلی قوم کی نمائندگی پر راضی نہیں تھے۔ جو کیا دھڑلے سے کیا اور جو تہیہ ایک بار کرلیا اُس پر جٹ گئے۔ گفتار میں بھی، کردار میں بھی۔ آخری بیس برسوں کی شعری کاوش کے پانچ مجموعے جہاں اُن کے حوصلے اور سلیقے کے گواہ ہیں۔ وہیں اس کے بھی کہ ساغر کے ملک گیر تعلقات، لبرل نظریات اور دیارِ مغرب کے سفر اس حوصلے اور سلیقے میں برابر کے شریک تھے۔ وہ بھی انہیں اُکساتے رہتے تھے۔ انسپریشن یا اُتساہ کے عجیب عجیب سرچشمے ہوتے ہیں اور کام صرف اُتساہ سے نہیں چلتا۔ پبلک ریلیشنز کی چکی چلانے اور جھولا جھلانے والے ہاتھوں کی بھی ضرورت رہتی ہے۔ سو یہاں اس کی کمی نہ تھی۔

## لطیفہ

ساغرؔ صاحب کے نام اور کام کے اس ہلکے سے جائزے کو ایک لطیفے پر تمام کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ان کی جو تصنیف کھولتا ہوں، اس کے سرورق پر ساغرؔ صاحب کے دستخط ہیں، تاریخ و مقام درج ہیں۔ ایک آدھ مخلصانہ جملہ ہے عزّت افزائی کا اور ہم عمر یا ہم عصر کو خطاب کرنے کا سا لہجہ ہے۔

"نہرو نامہ" کے سرورق پر تو اُنہوں نے ۱۹۷۶ء میں لکھا تھا:

۱۷ سال کے دِلی تعلّقات کی یادگار

اپنے عزیز محترم ڈاکٹر ظ انصاری کے لئے

تب ساغرؔ صاحب ۷۱ کے ہوئے تھے اور وہ مجھے بھی (نہ جانے کیوں) ۷۱ کا سمجھے تھے۔ جو اپنی عمر کسی اکسیری نسخے کی بدولت چھپائے پھر رہا ہے۔ کئی بار اُنہوں نے زبان اور قلم سے مجھے ہم عمری اور ہم عصری کا اعزاز بخشا اور میں نے یہ غلط فہمی دُور نہ ہونے دی تاکہ ہم مشربی کا لُطف نہ جانے پائے۔

"انارکلی" کا تحفہ دیتے وقت لکھا تھا:

اسے پڑھنا اور مجھے نہ بھولنا۔

اگر میں نے اسے نہ پڑھا ہوتا تب بھی ان کو بھول نہ پاتا کہ میں نے خود ساغرؔ صاحب کو چالیس سال پڑھا تھا۔ اور ہمیشہ اُنہیں ایک ہمدرد، حوصلہ مند اور قدردان انسان پایا تھا۔ آخری دَم تک وہ یاد رکھے جانے کے قابل ایک یادگار رشتہ تھے اور آخری دَم تک زندہ و تابندہ رہے۔ شاعری سے ہٹ کر بھی ان کے دو تین مقالے جو مقدمے کے طور پر شعری تصانیف میں شامل ہیں۔ اہلِ نظر اپنا صلہ طلب کرتے رہیں گے۔ ایسے کاموں کا کیا کھا کے کوئی صلہ دے گا!

نقط ● ●

---

## بقیہ: امیر خسروؒ

مثنوی "نہ سپہر" میں پورا ایک باب ہندوستان کی تعریف کیلئے وقف کردیا ہے جس میں ۴۵۰۹ (چار ہزار پانچ سو نو) اشعار ہندوستان کی مدح میں ہیں وہ ہندوستان کو ساری دنیا سے افضل بتاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؔ کے ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا سوتا یہیں پھوٹتا ہے۔

امیر خسروؒ قومی یک جہتی کے سب سے اوّل علمبردار تھے اور آج ضرورت ہے کہ ان کے کلام اور پیغام کو عام کیا جائے۔

●

• پنڈت اونکارناتھ ٹھاکر

# کلاسیکی موسیقی — ایک جائزہ

قیصر قلندر

**موسیقی**، دیگر فنونِ لطیفہ کے مقابلے میں فوری طور پر توجہ مبذول کرانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ موسیقی تک بڑی آسانی سے رسائی ممکن ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہمارے احساسات کو بڑی سرعت سے چھو لیتی ہے۔ ہم جب بھی موسیقی سنتے ہیں تو ہمارا دھیان از خود اس کی اور جاتا ہے، اس طرح ہمیں سننے کے لیے کوئی خاص ارادہ یا کاوش نہیں کرنی پڑتی

اور لَے اور آہنگ کا ارتباط اور لحن کی شیرینی ہماری سماعت کا مرکز بن جاتی ہے۔ غیر دانستہ یا غیر ارادی طور پر ہم سُروں کی لطافت کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی آہنگ، کوئی نغمہ، کوئی سُر یا کوئی بول پہروں بلکہ دنوں تک احساسات پر حاوی ہو جاتا ہے اور اکثر و بیشتر ایسی کیفیت کا جواز تلاش کرنا محال ہو جاتا ہے۔ ہمارے لیے اس طرح سے تفریح کا ایک دلچسپ اور انوکھا سبب پیدا ہو جاتا ہے۔ ذہن وقت بے وقت سُر یا بول اندر ہی اندر دُہراتا ہے۔ اور گنگناتا ہے۔ کبھی کبھی لَے اور آہنگ کا ساتھ پَیر یا اُنگلیاں بھی دیتی ہیں۔ ریتھم (Rythm) یا تال ہماری حرکتوں کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اس کیفیت میں کسی ارادے کا عمل دخل نہیں ہوتا۔

"موسیقی ہمارا اندرون ہے، ہماری رُوح ہے۔ ہماری لطیف حِس کی ہمزاد ہے"۔ سُر من کے تار چھو لیتے ہیں اور من سرشار ہو جاتا ہے۔ کیف و مستی اس وقت اور بڑھ جاتی ہے، جب سامع بھی موسیقی سے مَس رکھتا ہو یا اپنی لگن رہا ہو۔ جہاں تک سنجیدہ موسیقی کا تعلق ہے۔ اس کے مدّاح بہت زیادہ نہیں ہیں۔ یہ آج ہی کی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ سلسلہ بہت پُرانے

---

• "گلریز" ۱۹۸۔ جواہر نگر، سری نگر، کشمیر ۱۹۰۰۰۸

زمانے سے جاری ہے۔ البتہ لوک ورثے
Folk Heritage میں سے لوک گیت، منظوم
لوک داستان، لوک ساز اور لوک ناچ روح و
دل کے تار کسی شکل کے بغیر ہی چھو لیتے ہیں سرور
بخشتے ہیں۔ اور سامع کو وجدانی سرشاری سے
دوچار کرتے ہیں۔ میں نے "سنجیدہ" کا لفظ سوچ سمجھ
کر اور سنجیدگی سے استعمال کیا ہے۔ کیونکہ مجھے
کلاسیکی موسیقی کا خیال آیا تھا۔ جس کے حاصل کرنے
والے اتنے ہی محدود ہیں جتنے کہ اس کے سمجھنے والے۔
اس لیے اس صنفِ موسیقی کا سب سے بڑا مرحلہ رسائی
کی شکل ہے۔ ذہن رسا ہو تو فن کا جمال بھی واضح طور
پر نظر آتا ہے۔ (سنائی دیتا ہے) سنگیت سبھاؤں میں
ایسے منظر بھی دکھائی دیتے ہیں کہ سننے والے یا تو
شوقیہ شامل ہو جاتے ہیں یا ارادتاً چلے آتے ہیں
دھرپد دھمار کی گہرائی اور گمبھیرتا، خیال کی نزاکتیں
تان کا استادانہ مظاہرہ، ترانے کی باریکیاں، ٹھمری
کا سحر نگار اور ساز کی لے کاری سے وہی سامع یا
ناظرین لطف اٹھاتے ہیں، جنہیں کلاسیکی موسیقی کی
شد بد یا مس ہو ورنہ ایسی سبھاؤں میں جانا
ایک طرح کا نام نہاد کلچرل سمبل بن جاتا ہے۔ ایسے
شائقین، لوک سنگیت کی محفلوں میں خال خال ہی
قدم رکھتے ہیں۔ ان کا کوئی قصور نہیں بلکہ جب سماج
میں کسی عمل، شے یا روش کا چلن ہو جاتا ہے تو ایسی
مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ
نئے "صاحبِ استطاعت" طبقے اپنی دلچسپیوں کا یوں
بھی مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔

چند برس سے غزل گائیکی کا رواج بڑھ رہا
ہے۔ مجھے نامی گرامی غزل گانے والے فن کاروں کو
قریب سے سننے اور دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ ایسی کئی
محفلوں میں شرکت کی ہے جہاں کلاکار اپنے فن کا مظاہرہ
کرتے رہے ہیں۔ ایسے اجتماعات میں ہمیشہ ایک بات
کھٹکتی رہی ہے کہ اکثر سننے والے قافیہ اور ردیف
کی داد دیتے ہیں۔ ان کی مٹھاس اور الفاظ کی
ادائیگی انہیں اپنی طرف کم ہی کھینچتی رہی ہے۔ فن کی
باریکیوں اور فن کار کے حسنِ ادا سے بہت ہی کم لوگ
محظوظ ہوتے رہے۔ غزل کی محفلوں ہی کی بات نہیں۔
تان سین کا میلہ ہو یا ہربلبھ کا سنگیت سمیلن،
خواتین کا ایک طبقہ ضرور "جشنِ اژدہام" سے لطف
اندوز ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے ملبوسات اور زیورات
کے ساتھ ساتھ اپنی امارت کا بھی مظاہرہ کرتی
ہیں۔ موسیقار اپنی آواز اور فن کا جادو ہی کیوں نہ
جگاتا ہو، وہ اپنی ہی دھن میں محو رہتی ہیں۔ بعض
دفعہ موسیقار کی اس قدر حوصلہ شکنی ہوتی ہے کہ
اس کی ادائیگی پر اثر پڑتا ہے، لیکن موسیقار سنگیت
سبھاؤں میں جانے سے پہلے دریافت کرتے ہیں کہ
سننے والے کس قسم کے ہوں گے۔ کم و بیش بھیر
سنگیت وددھیالوں کے طلبا یا ان کے اساتذہ
کی خاصی تعداد شامل ہو کر فن کار کی صلاحیتوں سے
روشناس ہو جاتی ہے۔ ان کے لیے استفادہ کا بہت
مناسب اور موزوں موقع فراہم ہوجاتا ہے۔
گویا کہ پھر کلاسیکی موسیقی کا دائرہ محدود ہوجاتا ہے۔
اور نفوذ میں کمی ہو جاتی ہے۔ یہاں ترسیل و ابلاغ
کا اسی حد تک مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ عام سامع
فن کی باریکیوں سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوتا اور
نہ ہی ایسے وقتی سامع (Casual Listner)
سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ آروہی اور
اوروہی، سمپورن یا اوڈو، راگ کی تدوین، سُروں
کی تقسیم، شرتیوں کی ترتیب، وکرت یا اچل سُروں
کے مقام، سمجھنے کی صلاحیت یا واقفیت رکھتا ہو ـــ
موسیقی کی ان فنی نزاکتوں اور ضرورتوں کی جانکاری
کی توقع صاحبِ فہم و فن سے ہو سکتی ہے۔ یہاں
صائب کا وہ شعر صادق آتا ہوا نظر آتا ہے، جس میں
"تحسین ناشناس" اور "سکوتِ سخن شناس" والی بات
کہی گئی ہے۔ کلاسیکی موسیقی کا یہ المیہ تو نہیں کہ
اس کے سننے والے یا جاننے والے بہت ہی کم ہیں۔
ظاہر ہے کہ اس کے پرستار بھی تھوڑے ہیں ایسا
اگرچہ نہیں ہے، لیکن پھر بھی کلاسیکی موسیقی جیسے
عظیم ورثے کا تحفظ اور مناسب ترویج و تشہیر نہ
نہ ہونے سے قومیں غریب ہوجاتی ہیں۔

ہمارے ملک میں موسیقی کے کئی سرپرست
رہے ہیں۔ امراء، رؤساء، شہزادے، راجے
مہاراجے، نواب اور زمیندار اس کی سرپرستی
کرتے رہے ہیں۔ ان محدود متوالوں اور مداحوں
کی بدولت محفلیں آباد تھیں، مگر عوام الناس کلاسیکی
موسیقی کے عظیم ورثے سے پوری طرح واقف نہ تھے۔
وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان "سرپرستوں" کی
تعداد بھی گھٹتی گئی۔ کیوں کہ راجوں، مہاراجوں اور
نوابوں میں سے بہت سے ایسے بھی تھے، جو اپنے
ان آقاؤں کی خوشامد یا تہذیبِ مغرب کے آویزہ
ہو کر مغربی موسیقی کو دل بیٹھے تھے اور ان کی توجہ
ملکی موسیقی سے ہٹتی گئی۔ کیوں کہ ایسے سرپرستوں
اور مربیوں کی محفلوں اور درباروں سے کئی موسیقار
وابستہ ہی نہ تھے۔ بلکہ ان کے آزوقہ کا انحصار
ان کی حاضری اور پیشوائی پر ہی تھا۔ موسیقار ـــ
گائک یا سازندہ ـــ نسلاً بعد نسل ایسے درباروں
یا محفلوں سے منسلک رہتے تھے۔ ان کے فن کی اجارہ
داری کا ایک یہ بھی پہلو تھا، عوام تک کلاسیکی موسیقی
ـــ ہندوستانی اور کرناٹک ـــ پہنچانے کا
آغاز اس صدی کی تیسری دہائی میں ہوا، جب
ریڈیو منصۂ شہود پر آیا۔

ریڈیو کے مروج ہونے سے قبل موسیقاروں
کے فن کے اظہار کا ایک اور ذریعہ میسر آیا تھا۔
وہ تھا کمرشل تھیٹر۔ اسٹیج پر موسیقی پیش کرنے کا مزہ ہی
مختلف اور منفرد تھا۔ ایک تو فن کی ادائیگی اور
دوسرے فن کار کی شخصیت، ناظرین کی دلنوازی اور
دلکشی کا موضوع بنتے ہیں۔ اس طرح کے اظہار
فن کا سلسلہ قدیم کلاسیکی روایت سے ملتا تھا۔ نغموں
کی طوالت کم کر دی گئی۔ ہارمونیم جو ابتدا میں ساتھ
ہو گیا تھا، دھیرے دھیرے فن کا رہبر حاوی ہوتا
گیا۔ ایسی نشستوں اور درباری محفلوں میں ایک اور
بیّن فرق یہ تھا کہ فن پاروں کی میعاد duration
مختصر کر دی گئی۔ تاکہ اسٹیج پر ایک ہی نشست میں شریک

دوسرے موسیقاروں کو بھی ادائیگی اور پیش کش کا موقع مل سکے۔ موسیقاروں کی جاذبِ نظر شخصیت اُن کی کامیابی میں مدد دیتی —— ناظرین مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے اور حسبِ توفیق فیس داخلہ ادا کرکے تھیٹر جاتے۔ غرض جو بھی ٹکٹ خریدتے، اُن میں عموماً موسیقی کے شائقین ہی نہیں بلکہ شناسا بھی ہوتے۔ اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں اسٹیج مغربی اثرات سے متاثر ہوا۔ لیکن سنگیت ناٹکوں سے الگ نہیں ہوا۔ موسیقاروں نے بحیثیت کمپوزر یا ڈائرکٹر نیا رول ادا کرنا شروع کیا۔

تھیٹر کے بعد موسیقاروں کا ایک اور سرپرست معرضِ وجود میں آیا۔ وہ تھا گراموفون۔ یہ ایک حیرت انگیز دریافت ہی نہیں بلکہ نیا تجربہ تھا۔ جس کی وجہ سے گانکوں اور سازندوں کو معین میعاد اور معیار کے مطابق اپنے فن کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ بڑے بڑے نامی گرامی موسیقار جیسے اُستاد عبدالکریم خاں استاد فیاض خاں، استاد بڑے غلام علی خاں، پنڈت اونکارناتھ ٹھاکر، اُستاد بندو خاں، اُستاد علاؤالدین خاں وغیرہ گراموفون کمپنی کے خاص ضابطے اور اصول کے تحت راگ یا خیال ریکارڈ کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ سنگیت سبھاؤں میں اور محفلوں میں بھی موسیقار رات رات بھر ایک ہی خیال یا راگ گاتے اور پیش کرتے نہیں تھکتے تھے بلکہ فن کا بھرپور مظاہرہ کرنے کا موقع مل جاتا۔ اس کے برعکس گراموفون ریکارڈ کے لیے یہی موسیقار صرف ۳½ منٹ میں خیال یا راگ گاتے یا بجاتے۔ وہ اپنی فنّی صلاحیت، ذہانت اور واقفیت کو اتنی قلیل مدت میں بخوبی پیش کرتے۔ گراموفون ریکارڈ کے بعد LPs (Long Playing Disc) کے ساتھ ساتھ Tape (فیتہ) کی بدولت پابندیاں کچھ کم ہونے لگیں اور موسیقاروں کو ذرا سا لمبے عرصہ یا میعاد (Time and duration) میں فن پارے پیش کرنے کا موقع ملا۔ موسیقاروں کو ایک اور سرپرست

● اُستاد فیاض خاں

مل گیا تھا۔ اور ذریعۂ معاش کا ایک اور وسیلہ پیدا ہوا تھا۔

تھیٹر کے بعد سنیما یا بائیسکوپ نے موسیقاروں کو اظہارِ فن کی ایک اور راہ سجھائی۔ شروع شروع میں فلموں کی موسیقی کی دھنیں کلاسیکی موسیقی کے ہی آدھار پر بنائی جاتی تھیں۔ اس کے بعد علاقائی موسیقی نے فلموں میں راہ پائی۔ کلاسیکی موسیقاروں کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی کہ گیتوں کی طرزیں کلاسکیت سے یکسر عاری نہ ہوں۔ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے کہ استاد جھنڈے خاں نے کیدار شرما کی فلم "چترلیکھا" کے لیے دس بارہ دھنیں صرف بھیرویں کے سُروں ہی میں مرتب کرلی تھیں اور کافی مقبول ہوئیں۔ ان میں ایک اپنی ہی طرح کی کوشش تھی۔ رام چندر بورال، کھیم چند پرکاش، نوشاد علی، غلام حیدر، سجاد حسین، خیام، حتیٰ کہ پنڈت روی شنکر اور دوسرے موسیقاروں نے بھی فلمی سنگیت کو کلاسیکی موسیقی پر مرتب کیا۔ یہاں فلمی موسیقاروں کا ذکر ارادتاً نہیں بلکہ ضمناً آیا۔ سنیما اور کلاسیکی موسیقی ایک الگ موضوع ہے جو Functional Music کے زمرے میں آتا ہے۔

آئیے، ذرا اُس سرپرست کی بات آگے بڑھائیں، جو ہمارے ملک میں اس صدی کی تیسری دہائی میں منظرِ عام پر آیا تھا اور جس نے نہ صرف کلاسیکل موسیقاروں کے لیے آزوقہ تلاش کیا بلکہ تھیٹر اور سنیما سے وابستہ کلاکاروں کی روٹی روزی کی بھی سبیل پیدا کی۔ اس سرپرست کا حوالہ میں پہلے

ہی دے چکا ہوں۔ یہ ہے ریڈیو۔ موسیقاروں کو عوام تک پہنچانے کا سب سے زیادہ موثر اور زود اثر وسیلہ ریڈیو بن گیا۔ موسیقی درباروں اور محفلوں کے حصار سے نکل آئی اور تشہیر و ترویج کا نہایت موزوں سامان پیدا ہو گیا۔ موسیقاروں کو دوگنا فائدہ یہ ہوا کہ سنگیت سبھاؤں اور محفلوں کے منتظمین کو انتخاب میں آسانی ہوتی گئی۔ اور دوسری جانب موسیقاروں کو حسبِ رتبہ اور حسبِ منشا معاوضہ حاصل کرنے میں چنداں دشواری نہیں آئی۔ یہ میں مانتا ہوں کہ شروع شروع میں یہ سبھائیں بہت زیادہ نہیں ہوتی تھیں مگر پھر علاقہ وار، اور موسموں اور تہواروں کی مناسبت سے جشن اور محفلیں آراستہ ہونے لگیں۔ اور کلاکاروں کی آمدنی کا ایک اور ذریعہ۔ مستقل نہ سہی ۔۔۔ نکل آیا۔ ریڈیو ترسیل و تشہیر کا نہایت معقول ذریعہ بنتا گیا۔ ریڈیو سے موسیقار براہِ راست (Live) براڈ کاسٹ بھی کرتے تھے اور ان کے گراموفون ریکارڈ بھی نشر ہوتے رہے تو اُن کی وہ معاشی بدحالی دُور ہوتی گئی، جس سے وہ درباری سرپرستی چھن جانے سے شکار ہو گئے تھے۔ ریڈیو نے موسیقی کی تشہیر ہی میں نہیں بلکہ موسیقاروں کے نظریوں میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ۔۔۔ اُن کی ایک نئے انداز سے سرپرستی ہونے لگی۔

یہاں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ شروع شروع میں "معزز" قسم کے فن کاروں نے ریڈیو کو اپنا تعاون نہیں دیا کیوں کہ اہلِ ریڈیو نے پیشہ ور گانے والیوں کے پروگراموں سے ریڈیو پروگراموں کی ابتدا کی (معزز فن کاروں پر یہ بات عیاں ہو گئی کہ خواہ مخواہ کی دست کشی اور عدمِ تعاون ان کے حق میں نہیں اور نہ ہی اس عمل سے فن کو فائدہ پہنچ سکتا ہے پھر انہی فن کاروں کی یلغار سے پیشہ ور گانے والیاں اپنے ہی کوٹھوں تک محدود ہو کر رہ گئیں) دھیرے دھیرے پیشہ ور موسیقاروں کے دوش بدوش بہتر تعلیم یافتہ فن کار بھی نہ صرف موسیقی کی طرف راغب ہوتے گئے۔ بلکہ تحصیلِ فن کے بعد ریڈیو پروگراموں میں حصہ لینے لگے۔ یہاں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ریڈیو نے سنگیت میلوں کی ایک نئی طرح ڈالی۔ سالانہ مقابلوں کے ساتھ ساتھ سالانہ سنگیت میلوں کا انتظام و انصرام بھی کیا۔ ریڈیو اگرچہ مہاراجوں نوابوں یا امرا کی درباری محفلوں کا بدل نہیں تھا۔ تاہم موسیقاروں کو عوام الناس تک پہنچانے اور کلاسیکی موسیقی کو قبولِ عام دلوانے کا بے حد مفید عامل ثابت ہوا۔ موجودہ صورت سے ہم سب واقف ہیں۔ اب ٹیلی ویژن نے موسیقی اور موسیقاروں کے لیے ایک نئی جہت پیدا کی ہے۔ اور اس طرح سے موسیقی کے نفوذ کے لیے ایک نئی راہ نکل آئی۔ ریڈیو کی بہ نسبت ٹیلی ویژن نے بے شمار گھروں کو زندہ محفلوں (Living Conserts) میں بدل دیا۔ اب کسی تھیئٹر یا محفل میں جا کر داخلہ کا ٹکٹ خریدنے کی ضرورت نہیں رہی۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ جب بھی میں نے کسی نئے ذریعہ ترسیل کا ذکر کیا تو اس کے ساتھ موسیقاروں کی بدلتی ہوئی معاشی حالت کا بھی ذکر کیا ہے۔ آپ اور ہماری طرح سے موسیقاروں کو بھی زندہ رہنے کے لیے خورد و نوش کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ خالی پیٹ اور خالی ہاتھ کوئی فن کار کیا سیکھ سکتا ہے اور کیا لوگوں کو دے سکتا ہے؟ اس لیے میں اسے ایک بنیادی ضرورت گردانتا ہوں۔ فن کے پنپنے اور فن کار کی ذہنی آسودگی کے لیے اس کی معاشی حالت کی بہتری انتہائی ضروری ہے۔

آئیے ذرا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے کردار پر مزید بات نہ کرتے ہوئے موسیقی کے تدریجی ارتقار پر نظر ڈالیں۔ بھارتیہ سنگیت مختلف اندرونی اور بیرونی اثرات کا حامل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ادوار میں اس میں تبدیلیاں نمودار ہوتی رہی ہیں۔ بھارت کے ناٹیہ شاستر کے سیدھے سادے جاتی گیتوں اور راگ داری کے جامع اور فکر انگیز دور تک موسیقی کا ایک متنوع عالم رہا ہے۔ دسویں صدی عیسوی تک راگ داری میں تدریجی ارتقار کی صورت نمایاں ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود بھی کم و بیش یکساں بنیادی نظام رائج العمل تھا، جو لگ بھگ تیرھویں صدی تک جاری رہا۔

پراچین بھارت میں سنگیت دھرم اور ریتی رواج سے گہرے طور سے وابستہ رہا اور اسی لیے مندروں سے وابستگی ناگزیر تھی۔ سنگیت کا لازمی جُزو نرتیہ (ناچ) بھی رہا۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ الگ ہو کر جداگانہ حیثیت کا حامل بن گیا۔ موسیقی کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس سے لوگ مذہبی جذبات کی تسکین اور جذباتی آسودگی حاصل کرتے رہیں۔ اولاً سنسکرت منتروں اور شلوکوں کا استعمال ہوتا رہا اور نابلد عوام صرف روایت کی وجہ سے سنتے تھے یا چونکہ سنسکرت خواص کی زبان ہو کر رہ گئی تھی۔ جب دیسی یا علاقائی زبانوں کے بول، الفاظ، شعر یا مکھڑے استعمال ہونے لگے شاستریہ سنگیت کو عوام تک پہنچانے میں آسانی ہوئی۔ شمالی بھارت میں ابتدائی پربندھ نے دھرپد کے وجود کو آسان بنایا۔ بھاؤ بھٹ کی تحقیق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دھرپد میں دونوں سنسکرت اور دیسی یا علاقائی بھاشاؤں کا رواج ہوا، جس کی بدولت کلاسیکی موسیقی عوام تک پہنچنے لگی اور وہ اس کی خوب صورتیوں سے واقف ہوتے گئے۔

بھارت کے شمالی علاقوں پر یونانی حملے اور سکندرِ اعظم کی واپسی کے بعد ثقافتی اختلاط کا ایک واضح اور مستقل عمل شروع ہوا۔ یونانیوں اور آریاؤں کے آبرود گنگا تک پہنچ جانے تک موسیقی کے ارتقار میں کئی موڑ آئے۔ اس سے پہلے بھارتیہ بھیتا سے بیرونِ ملک میں بدلتی جنتا کافی حد تک واقف ہو گئی تھی۔ مگر مختلف ادوار میں اس ارتباط میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہاں بات ہو رہی تھی سکندرِ اعظم کی مراجعت کی۔ ان کے ساتھ موسیقار بھی آئے تھے تو انہوں نے جاتے جاتے یہیں ایک نیا اور نغمہ آفریں سازندیا جو

● استاد علاؤالدین خاں

● استاد بندو خاں

اس وقت ہمارے پاس سنتور کی شکل میں موجود ہے۔
اس عہدِ قدیم سے لے کر مسلمانوں کی آمد تک موسیقی کے دو نمایاں دبستان (Schools) یا نظام (System) —— ہندوستانی اور کرناٹک —— کا روپ دھارن کرتے جا رہے تھے۔ مسلمانوں کی آمد سے جہاں مجموعی ثقافتی زندگی متاثر ہوئی، وہاں شمالی بھارت پر گہرا اثر پڑا۔ جہاں موسیقی عبادت گاہوں میں معتقدوں کی جذباتی تسکین کا باعث بنتی رہی، وہاں درباروں میں اس کا چلن بڑھتا گیا۔ کیوں کہ درباروں میں سنسکرت کا زیادہ چلن نہیں رہا۔ البتہ ہی حکمرانوں کو سنسکرت بھاشا کی واقفیت تھی اور وہ ہندو دیو مالائی اور اساطیری علامتوں اور مذہبی رسوم سے نابلد تھے تو دھرپد گائیکی بڑی متاثر ہوئی، مگر ساتھ ہی نغماتی نظام (Tonal Structure) اور تجریدی موسیقی (Abstract Music) پر کوئی نمایاں اثر نہیں پڑا۔ کیوں کہ ان میں بول یا الفاظ کا عمل دخل نہ تھا۔ ان ہی حالات میں دھیرے دھیرے دھرپد کی جگہ خیال گائیکی وجود میں آئی۔ دھرپد گائیکی میں ایک قسم کی غیر مرغوب یکسانیت اور جمود آنے لگا تھا۔ یہ بات بھی اس شخص سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی جس نے ہندوستان کے علوم و فنون کی ابتدا و ارتقا کا تدریجی تاریخی مطالعہ کیا ہو۔ یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر علم، فن یا ہنر ایک خاص حد تک پہنچ کر آئندہ ترقی سے اس وقت تک محروم ہو جاتا ہے، جب تک کہ اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو یا تغیر کا کوئی امکان نہ رہے۔ سنگیت کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ یہ صورتِ حال سیاسی اسباب کی بنا پر پیدا ہوتی گئی۔ یا یوں بھی ہوا کہ کوتاہ نظر قدامت پسندی مادہ ایجاد کی کمی یا مذہب سے غیر معمولی لگاؤ —— کچھ بھی ہو، واقعہ یوں ہے کہ علم موسیقی کے قاعدے کلیے اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔" خیال گائیکی میں تخلیق کاروں کو اظہار کا ایک انقلابی اسلوب میسر آیا۔ اس نئی گائیکی میں موسیقار کو اپنے علم (ساہتیہ) کے اظہار کا مناسب موقع ملنے لگا۔ دیکھا گیا ہے کہ شروع شروع میں "خیال اور خیال گائیکی چند گھرانوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اور دلّی ہی اس گائیکی کا مسکن رہا۔ اس اعتبار سے دلّی گھرانے کی قدامت آشکار ہو جاتی ہے۔ جو شہر پایۂ تخت ہو، دارالسلطنت ہو وہی مقامِ علم و فن کا مرکز اور ماہرینِ فن کا گہوارہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی آج تک خاص طور سے موسیقی کا مرکز بنا رہا۔ اور اسی وجہ سے تمام بڑے بڑے ماہرینِ فن اور مایۂ ناز فن کار اسی شہر سے وابستہ رہے —— اسی شہر میں بہت حد تک موسیقی کے علمی اصول و قواعد اور عملی رموز و نکات کی جانچ پڑتال بھی ہوتی رہی۔"

دلّی کے علاوہ شمالی بھارت میں کشمیر بھی علم و فن کا مرکز رہا ہے۔ مغلوں سے پہلے سلاطینِ کشمیر اور ان سے بہت پہلے راجوں مہاراجوں کے عہد میں عالموں، فن کاروں، سنگیت کاروں اور کلاکاروں کو درباری سرپرستی حاصل تھی۔ موسیقی کے ضمن میں کشمیر کے ایسے مراکز کا ذکر و بیان صرف تاریخی کتابوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

جنوبی بھارت میں کرناٹک سنگیت کے کئی

قدیم مراکز تھے اور نامی گرامی سنگیت کاروں نے
اس فن کی پوری طرح آبیاری کی۔ سرپرستوں
اور فن کاروں میں مہاراجے ہی نہیں بلکہ سنگیت ودوان
اور سنگیت کار شامل تھے۔ سمپاگا راجہ، ترلوچن
کے علاوہ بے شمار ماہرین فن کا نام لیا
جاسکتا ہے۔ انہوں نے علم موسیقی میں گراں قدر
اضافہ کئے۔

زندہ فن کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں
تخلیق کا عمل جاری رہے۔ جہاں کہیں فن کار کو یہ
گمان گزرنے لگے کہ اس نے اپنی زندگی اور فن کی
آخری چیز پیش کی ہے تو اس کی فنی موت واقع
ہوجاتی ہے۔ فن مسلسل کاوش چاہتا ہے۔ تخلیق کا
عمل متواتر توجہ کا طالب ہوتا ہے۔ یہ تصور کہ فن
کمال تک پہنچ گیا اور اب کسی اصلاح یا تعمیر و ترقی
کی گنجائش یا حاجت نہیں، نری تنگ نظری اور کم
مائیگی کی دلیل ہے۔ مہادیو کے وقت سے
موجودہ زمانے تک موسیقی کا ارتقائی عمل بہت
سے اثرات و تغیرات کا حامل رہا ہے۔ عبادت
گاہوں سے ٹیلی ویژن اسٹوڈیوز تک موسیقی کئی نازک
اور دشوار مقامات سے دوچار ہوتی ہے ۔۔۔
اور مختلف زمانوں میں اس کی نوک پلک سنورتی
رہی ہے۔

موسیقی دو طرح کی ہے ۔۔۔ گائیکی
اور سازوں کا سنگیت ۔۔۔ گائن تین بنیادی
چیزوں سے بنتا ہے۔ سُر، تال ۔۔۔ اور بول۔
سنگیت کی بھاشا میں ان کا ذکر یوں بھی ہوتا ہے۔
سُر ادھیایہ، تال ادھیایہ اور بول ادھیایہ۔
اس کے برعکس سازوں کی موسیقی میں دو بنیادی
باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ تال اور سُر ۔۔۔
سُر کا گیان ہر دو طرح کے سنگیت کے لیے لازمی
خصوصیت رکھتا ہے۔ لحن کی شیرینی، گائن میں
سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ آواز بھدی
اور کرخت ہو، مٹھاس سے عاری ہو تو "صوت الحمیر"
کی طرح ابھرتی ہے۔ اپنی طرف کھینچتی نہیں بلکہ دور
بھاگنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اگر ویدوں کا اُچارن
میٹھی آواز میں نہیں ہوا کرتا تو منتروں میں
شردھا لو اُن سے موہت نہ ہوتے اور نہ ہی اُن
کا من لُبھا سکتا۔ اگر مقدس اوستا اور گاتھا
مترنم آواز میں پیش نہیں ہوتے تو پجاری اُن سے
لو نہیں لگاتے اور اگر قرآنی آیات کی قرأت کے
لئے خوش آہنگ ہونا ضروری نہ ہوتا تو سماعت
پر ان کوشش نہیں ہوتی۔ یہاں مجھے حضور رسالت
مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے ایک خوش الحان
فرد کا نام یاد آیا ہے وہ ابوموسیٰ اشعری تھا جس
کو اللہ نے لطیف و دل نواز آواز ودیعت کی تھی۔
اُن کی قرأت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پسند
کرتے اور فرماتے تھے: ابوموسیٰ اشعری کے آہنگ
میں لحن داؤدی بازیاب ہوا ہے۔ ابوموسیٰ اشعری
سے ارشاد فرماتے کہ قرأتِ کلام پاک کی تزئین اپنی
خوش آہنگ آواز سے کرو۔ کیوں کہ ہر شے کے لیے
تزئین و زینت کی ضرورت ہوتی ہے اور کلام پاک
کی زینت دل کش آواز ہے"۔

آواز کا اپنا حسن ہوتا ہے، مٹھاس اور شیرینی
حسن کو دوبالا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر سُر
کا گیان ہونے کی جان کاری ہو تو وہ اہم ضرورتیں
پوری ہوجاتی ہیں، جن سے ایک موسیقار کو واقف
ہونا ہوتا ہے۔ یہ ضرورتیں لازمی اور بنیادی نوعیت
کی ہیں۔ نظام موسیقی سے آگاہی کے لیے صحیح تربیت
اور پھر مستقل ریاض کی ضرورت ہے۔ جب ہر فن
کی آبیاری خونِ جگر سے ہوتی ہے تب اُس میں نکھار
پیدا ہوجاتا ہے اور فن کار اپنے علم کا با اعتماد مظاہرہ
کرسکتا ہے" تحصیل علم دو صورتوں سے ہوسکتی ہے۔
یا تو ہم ایک موضوع یا مضمون کو خود ہی جان لیں یا
ہمیں یہ معلوم ہو کہ متعلقہ معلومات کہاں سے اور
کن ماخذ سے حاصل ہوسکتی ہیں"۔ موسیقی کے
فن کے لیے ان دونوں کی ضرورت رہتی ہے۔ علم
موسیقی ریاضیات سے ربط رکھتا ہے۔ سُروں کی
تقسیم، راگوں کی ترتیب اور لَے یا تال کی تدوین
ایک نظام کے تحت ہوتی ہے۔ اگر اس نظام
کی پیروی میں کہیں لغزش آجاتی ہے تو موسیقار کی
تحصیل فن میں سقم رہ گئے ہیں۔ اب ذرا راگ ادھیایہ
کو لیجیے۔ راگ کیا ہے؟ "چند مخصوص سُروں اور
مقررہ ترتیب کا نام"۔ ہماری موسیقی کا دارومدار
سات سُروں پر ہے، جو تیور اور کومل کے لحاظ سے
بارہ مانے جاتے ہیں۔ بلکہ بہ الفاظ دیگر "سُر ہی
موسیقی کی الف بے ہیں"۔ بارہ مقاموں میں سات
بنیادی نوعیت کے ہیں یعنی:

| سا | رے | گا | ما | پا | دھا | نی |
|---|---|---|---|---|---|---|
| شڑج (کھرج) | رکھب | گندھار | مدھم | پنچم | دھیوت | نکھاد |

شڑج سے نکھاد تک ایک سپتک پوری ہوجاتی ہے۔
ایک سپتک میں علاوہ ان تیور اور کومل سُروں کے اور بھی
چھوٹے سُر ہوتے ہیں۔ جنہیں شُرتی کہتے ہیں، جن
کی تعداد موسیقی کی ضرورت کے لیے بائیس مانی جاتی
ہے۔ ان شُرتیوں کی اہمیت کو نظرانداز نہیں
کیا جاسکتا۔ سارے ۔۔۔ چھوٹے بڑے ۔۔۔ سُر،
راگ یا خیال کا تانا بانا ہے۔ جیسے زندگی کے لیے
پانی اور روشنی کی ضرورت ہوتی ہے، ویسے ہی کلاکار
کی صحیح سُروں سے واقفیت اُس کی تخلیقی زندگی کا
لازمی جزو ہے۔

بھارتیہ سنگیت میں نظام تحریر (Notation)
کی کوئی روش نہیں تھی، یہ فن استاد اپنے شاگردوں
کو سینہ بہ سینہ اور مونہہ زبانی منتقل کرتے رہے ہیں۔
سائنٹیفک طریقے سے راگ کے سُروں کو منضبط و مرتب
کرنے کی کوئی روایت نہیں رہی تھی، مگر اس ضمن میں پنڈت
بھات کھنڈے اور پنڈت وشنو دگمبر پلسکر نے
بہت ہی اہم کام سرانجام دیا۔ ان دونوں فن کاروں
کی ان تھک کوششوں نے ایک نئی راہ معین کردی۔
بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے موسیقی کے احیاء نو
کی بنیاد رکھی۔

دھرپد سے خیال تک کا سفر مرحلہ وار طے ہوا۔

مختصراً ان کے بارے میں اگلی سطروں میں لکھا گیا ہے کہ کن عوامل کی بنا پر دھرپد کی ہر دل عزیزی گھٹ گئی۔ اور خیال گائیکی کا آغاز ہوا۔ خیال کا جنم وقت کی ایک ضرورت کے مترادف تھا۔ امیر خسروؔ (۱۲۹۸ء سے ۱۳۲۸ء تک) کو خیال اور خیال گائیکی کا جنم داتا کہتے ہیں۔ امیر خسروؔ نے کئی بادشاہوں کے زمانے دیکھے۔ ان میں سلطان علاؤالدین خلجی بھی شامل ہے۔ سلطان کو سنگیت سے رغبتِ خاص تھی۔ اس کا عہد موسیقی کے لیے نئے نظام و ترتیب کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس کے درباری مشیروں میں نذیر خاں بہروز، چنگی اور امیر خسروؔ مقتدر موسیقار تھے۔ اس کے بعد دلّی ہی کے دوسرے حکمرانوں میں مبارک شاہ اور محمد شاہ تغلق بھی موسیقی کے شائق تھے۔ محمد تغلق نے اپنے نئے دارالحکومت دولت آباد میں ایک ایسی عمارت بنوائی تھی، جسے طرب آباد کہتے ہیں، جہاں مغنیائیں اور نائیکائیں ذہنی فرحت اور آسودگی کا سامان مہیا کیا کرتی تھیں۔ سلطانوں کا ذکر چلا ہے تو سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ کشمیر کے اس حکمران نے رقص و موسیقی کے فنونِ لطیفہ کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ اُن کی ترویج و تشہیر کے باقاعدہ انتظامات کئے۔ اس کے موسیقاروں میں مرد و زن دونوں اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ تحصیلِ فن کے لیے ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ جس میں ہندوستانی موسیقاروں کے علاوہ بدیشی فن کار بھی تدریس کا انتظام چلاتے تھے۔ یہ روایت بڈشاہ کے بعد بھی جاری رہی۔ اس کے پوتے حسن شاہ نے ملکی امور کے ساتھ فنونِ لطیفہ اور خاص طور پر موسیقی و رقص کی طرف دھیان دیا۔ ان دونوں اَدوار میں جہاں کشمیری موسیقاروں کی بھرپور حوصلہ افزائی ہوتی تھی وہاں ایرانی، افغانی، ہندوستانی اور کرناٹک کے فن کاروں کو بھی دربار میں باریابی کا شرف حاصل تھا۔ کشمیر حسبِ معمول کئی موسیقیوں کا سنگم بنا اور اس فن کارانہ اشتراک

● اُستاد بڑے غلام علی خاں

● اُستاد عبدالکریم خاں

کی بدولت ایک منفرد کلاسیکی موسیقی کی رُوپ ریکھا نکھر آئی، جسے عرفِ عام میں 'صوفیانہ موسیقی' کہتے ہیں اس صنفِ فن میں جہاں بھارتیہ کلاسیکی موسیقی کے نام ملیں گے، وہاں ساتھ ساتھ ایرانی اور افغانی بھی ہوں گے۔ یہی نہیں بلکہ "تبیلا نہ (یہ لفظ کرناٹکی سنگیت سے مستعار لیا گیا ہے اور ترانہ کا بدل ہے) صوفیانہ موسیقار بھی مختلف مقاموں میں حسبِ ضرورت گاتا ہے۔ صوفیانہ موسیقی میں راگ کا نعم البدل مقام ہے — یہ لفظ وسط ایشیائی موسیقیوں سے لیا گیا ہے۔

بھارتیہ موسیقی کا ذکر مختلف سفرناموں اور مستشرقین کی تصانیف میں ملتا ہے۔ ان میں ابنِ بطوطہ

کے سفرنامے میں محمد شاہ تغلق (۱۳۲۵ سے ۱۳۵۱ء) کے دربار کا ذکر ہے، جس نے موسیقی کے لیے ایک خاص ادارہ قائم کیا تھا اور اس کے مہتم و منتظم کا نام شمس الدین تبریزی لکھا ہے۔ وہ ایرانی نژاد موسیقار تھا۔ ابن بطوطہ کے مطابق مسلمان حکمران موسیقاروں اور رقاصاؤں کا منتظم و معتمد ہمیشہ ایرانی موسیقار یا رقاص ہوتا تھا۔ دلّی میں محمد شاہ رنگیلے کے عہد (۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۰ء) میں درباری گویّے نعمت خاں سدا رنگ اور فیروز خاں ادا رنگ نے خیال اور خیال کی گائیکی کو اپنی فطانت و ذہانت کی نئی خوبیوں سے آراستہ کیا اور کلاسیکی موسیقی کو نئی جہتیں عطا کیں۔ ان دونوں نے عجیب ذہن پایا تھا۔ ان کے بارے میں اُستاد چاند خاں نے لکھا تھا۔ سدا رنگ اور ادا رنگ نے اپنی فنی صلاحیت و قابلیت سے کام لے کر خیال کو مختلف رنگوں سے رنگ دیا۔ جس کی بدولت خیال کی مختلف اقسام وجود میں آکر منظر عام پر آئیں۔ مثلاً: (۱) سواری کے خیال (۲) پالکی کے خیال (۳) سہرے سہاگ کے خیال (۴) بلمپت کے خیال (۵) رات کے خیال (۶) آڑے خیال (۷) ڈیوڑھے خیال (۸) موسمی خیال (۹) جھنپری خیال .... وغیرہ وغیرہ۔ یوں لگتا ہے کہ موسیقی کو معاصرانہ سطح پر لاکر اس کی بنیادی ضرورتوں کا خاص طور سے خیال رکھا گیا۔ یہی نہیں بلکہ پوری خیال گائیکی کو متنوع بناکر آنے والے فن کاروں کے لیے مزید تخلیقی عمل کی کوشش بھی پیدا کی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ راگ، موسم اور روز و شب کے اوقات کے اعتبار سے مرتب کیے اور گائے جاتے تھے۔ اس طرح سے فن کے شیدائی کی توجہ راگوں یا نغموں کی باریکیوں کی طرف پلٹ جاتی اور سننے والے یا حاضرین کے ذہنوں پر حسب استعداد اثرات مرتب ہو جاتے۔ خیال کے بول میں بھی تنوع پیدا ہوتا رہا۔ مذہبی تقریبوں، بھگتی سبھاؤں اور تہواروں پر فن کا مظاہرہ ہی نہیں ہوتا بلکہ موسیقی تفکر و تفریح کا لازمی حصہ بن جاتی۔ امیر خسرو سے جو سلسلۂ

ارتباط شروع ہوا تھا اور ہندی، ایرانی اور عربی موسیقیوں کے اختلاط و امتزاج نے کلاسیکی موسیقی کو مختلف سمتیں بخشیں۔ ساتھ ہی ساتھ بھارتیہ نظام و اصول کو بھی برقرار رکھا گیا۔

بھارتیہ موسیقی کا سنہری زمانہ وہ ہے جب مغلوں نے ہندوستان کو مستقلاً اپنا مسکن و وطن بنایا۔ "آلِ تیمور کے عہدِ شہنشاہی میں دکنی اور ہندوستانی سنگیت کا ارتباط ہوا۔ کیوں کہ دونوں کو شہنشاہ اکبر اور ابراہیم عادل شاہ بیجاپوری جیسے سرپرست، قدرداں اور مربی ملے۔ دونوں حکمرانوں کو موسیقی کی مصطلحات کی آگاہی تھی۔ اکبر کے بارے میں کہتے ہیں کہ اُس نے آہنگ و نغمہ کو دو سو ایرانی مقامات سے روشناس کرایا اور ابراہیم عادل شاہ نے کئی نئے راگ ایجاد کیے۔" ابراہیم عادل شاہ سے مشہور تصنیف "نورس" منسوب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کرناٹک سنگیت اس کے نظامِ موسیقی کے اثرات قبول کر چکا تھا اور اس کے تخلیق کیے گئے کئی راگ کرناٹک موسیقی سے متعلق ہو گئے تھے۔ اس کے اسلاف میں یوسف عادل شاہ بھی فنِ موسیقی میں مہارت رکھتا تھا۔ اکبر و ابراہیم کے درباروں سے مشتاق موسیقار وابستہ تھے، لیکن اکبر سبقت لے گیا تھا۔ کیوں کہ اس کے دربار سے تان سین جیسا عظیم المرتبت موسیقار وابستہ تھا۔ دیکھا جائے تو اکبر اور ابراہیم کے عہدوں میں ہندوستانیت پیدا کرنے پر زیادہ توجہ مرکوز رہی۔" اکبر کے تخلیقی اضافے کے بارے میں مزید کھوج کی ضرورت ہے، جس کا ذکر کچھ مورخوں نے کیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ چونکہ اُن کے دربار میں موسیقاروں کو خاص باریابی حاصل تھی۔ اور وہ ممنونِ الطافِ شہنشاہی تھے تو انہوں نے موسیقی میں اضافے کیے اور نام بادشاہ کا دیا۔ کشمیر میں اکبر کا ہم عصر بادشاہ یوسف شاہ چک تھا۔ وہ شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مسلّم موسیقار بھی تھا۔ اس کی سب سے مشہور ملکہ حبّہ خاتون تھی، جس میں خداداد ذہانت کے ساتھ موسیقی اور شاعری کا ملکہ بھی تھا۔ آواز بڑی رسیلی تھی۔ نسوانی کشش بے پناہ تھی۔ یوسف شاہ

بھی خوب رُو اور وجیہہ تھا۔ دونوں چونکہ ادب و موسیقی کے دلدادہ تھے تو انہوں نے موسیقی پر زیادہ توجہ دی۔ حبّہ خاتون نے صوفیانہ موسیقی پر بھرپور دھیان دیا۔ صوفیانہ موسیقی کا ایک مقام "راست کشمیری" اس سے منسوب کیا ہے۔

یوسف شاہ چک کو اکبر نے ورغلا کر گرفتار کروایا اور کشمیر مغل بادشاہ کے تصرف میں آگیا۔ حبّہ خاتون اپنے سلطان کے فراق میں دیوانی ہو گئی۔ اور موسیقی نے دو اہم سرپرستوں کو گنوا دیا۔ جہانگیر اگرچہ موسیقی کا اتنا دلدادہ نہ تھا جتنا کہ اکبر تھا، مگر پھر بھی اس کے دربار سے چھتر خاں، پرویز داد، خرم داد، بلاس خاں ابن تان سین اور دوسرے کئی موسیقار وابستہ تھے۔ دیگر مغل حکمرانوں نے مقدور بھر موسیقی کی سرپرستی کی۔ شاہجہاں کے وقت میں موسیقی پر ایک اہم کتاب "شمس الاصوات" تصنیف ہوئی۔ اس سے پہلے اکبر کے عہد میں ایک اور کتاب "تحفۃ الہند" مرزا خاں نے مرتب کی تھی۔

یہاں مجھے ڈاکٹر سمتی تھا تکر کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ مغلوں کے آخری ایام میں اور اُن کے زوال کے ساتھ ہی دربارِ شہنشاہی سے سنگیت ملک کی مختلف ریاستوں سے منسلک ہونا شروع ہو گیا۔ اور موسیقار کئی ریاستوں کے حکمرانوں کے دربار تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جن میں گوالیار، جے پور، اودے پور، رام پور، الور، لکھنؤ، بڑودہ، حیدرآباد، پٹیالہ، بھوپال وغیرہ شامل ہیں، وہاں راجوں اور نوابوں نے کھلے دل سے فن کاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ اس طرح سے فنِ موسیقی پنپتا رہا۔ دیکھا جائے تو اس ریاستی سرپرستی کی وجہ سے مختلف گھرانوں میں رقابت اس قدر بڑھ گئی کہ حسد کا گمان ہونے لگا۔ ان گھرانوں میں تال میل کم ہوتا گیا۔ یہ درست ہے کہ گھرانہ اپنی امتیازی حیثیت برقرار رکھنے کے برابر جتن کرتا رہا۔ مگر باہمی ارتباط کی کمی کی وجہ سے ہر گھرانہ اپنی "پونجی" کی سختی اور احتیاط سے حفاظت کرتا رہا۔

باہمی ارتباط کی کمی کی وجہ سے موسیقاروں

میں ایک طرف تو رقابت بڑھی دوسری طرف فن موسیقی کو زک بھی پہنچتی رہی۔ اگر باقاعدہ طور پر سرپرستوں کی نگرانی میں مختلف موسیقاروں کی باقاعدہ طور سے رہنمائی ہوتی تو ممکن تھا کہ گھرانوں کی انفرادیت قائم رہنے کے ساتھ ساتھ ارتقاء کے کئی پہلو اُجاگر ہو جاتے۔ میں اس بات کے قطعی خلاف ہوں کہ ان گھرانوں کو ایک ہی جھنڈے تلے ایک ہی ڈگر پر ڈال دیا جاتا۔ تب تخلیقی عمل میں سکوت اور جمود پیدا ہونے کا اندیشہ پیدا ہوسکتا تھا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ فن کسی کی میراث نہیں ہے نہ ہی کسی کی نجی جائیداد۔ فن ملک و قوم کا سرمایہ ہے۔ اس کے سرمائے میں اضافہ کرنا ہر فن کار کا فریضہ ہے۔ سنگیت ہمارے لوک ورثے کا دلچسپ حصہ ہے۔ سنگیت کار اگر چھوٹی چھوٹی رقابتوں کا اسیر ہو جاتا ہے تو دوسروں کو فن کے اسرار و رموز سے کیسے واقف کرا سکتا ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ وہ اپنے شاگردوں تک ہی تعلیم و تدریس کا دائرہ محدود رکھتا ہے! کیوں؟ میری دانست میں ایسے شیوہ اور وطیرہ سے موسیقی کو نقصان ہی ہو سکتا ہے، نفع نہیں۔

اب ذرا کچھ دوسرے علاقوں پر نظر ڈالیں۔ پندرھویں صدی عیسوی میں جونپور میں سلطان حسین شرقی موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اس نے خیال کی گائیکی کو سنوارنے کا نمایاں کام انجام دیا۔ اس سے شمالی سنگیت راگ جونپوری، حسینی توڑی کا نہڑا اور دوسرے راگ منسوب ہیں۔ کہتے ہیں ان کے علاوہ کچھ اور بھی راگ عطا کئے۔ اسی طرح گجرات میں سلطان بہادر (۱۵۲۶ء سے ۱۵۳۶ء) کے عہد میں نائیک بیجو مشہور ترین موسیقار تھا۔

موسیقی کی ترویج و ترقی ہوتی رہی اور معاصر اثرات اور ضرورتوں کے پیش نظر ایم کلاسیکی موسیقی کا چلن شروع ہوا۔ اظہار فن کے دو نیم کلاسیکی اسٹائل ٹھمری اور دادرہ مرتب اور مروج ہوئے۔ شاید بہت زیادہ سنجیدہ طرح کی راگ داری کے بعد زیادہ شرنگار اور کم سنجیدہ اسٹائل کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ اس کی موسیقی کی تخلیق اُن ایام میں ہوئی، جب ملک کا سیاسی ڈھانچہ ٹوٹ چکا تھا۔ سلطنتِ مغلیہ دم توڑ رہی تھی۔ اور کمپنی کی حکومت کا جال دُور دُور تک پھیل گیا تھا۔ اور راجہ مہاراجہ اور نواب باج گزار بنتے جا رہے تھے اور اپنی محکومی کے غم کو جام و نغمہ میں غلط کرتے تھے۔ اسی انحطاط پذیر دور میں دربارِ لکھنؤ کی جان نواب واجد علی شاہ تھے، جس کے عہد میں نیم کلاسیکی موسیقی نے فروغ پایا۔ شاید اس کی تعمیر میں نواب کی رنگین مزاجی زیادہ کارفرما تھی۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ ٹھمری اور دادرہ میں جذبات کو نغماتی آہنگ دینے کا وافر موقع مل جاتا ہے۔ شاید اسی ٹھمری کو "کلاسیکی گیت" کہتے ہیں۔ ٹھمری دادرہ کے ساتھ ساتھ علاقائی اختراعوں کا سلسلہ جاری رہا۔ پنجاب میں "ٹپہ" نے جنم لیا۔ "اس کے موجد کا نام شوری میاں (اصلی نام غلام نبی) بتایا جاتا ہے۔" واجد علی شاہ خود شاعر، تمثیل نگار، موسیقار اداکار اور رقاص تھا۔ وہ سنگیت و ناچ کا رسیا ہی نہیں بلکہ شاعری کا بھی دلدادہ تھا۔ اس سے کچھ راگ منسوب ہیں۔ جیسے جوگی اور شاہ پسند۔

نیم کلاسیکی موسیقی کے فروغ سے ایک نئی تحریک نے جڑ پکڑ لی اب "ثقیل اور مشکل" راگوں کے بدلے عوام پسند اور آسان سنگیت رائج ہونے لگا۔ دھرپد، دھمار، خیال کے ساتھ موسیقاروں کے لیے دوسری اصناف میں ماہرانہ صلاحیت کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملنے لگا۔ مجموعی طور سے موسیقی کو نئی جہتیں ملنے لگیں تنوع کے موقعے نکل آئے۔ برطانوی اقتدار کا سورج جب ہندوستان کے اُفق سے اُترا اور بحرِ ہند میں ڈوب گیا تو نئے ماحول میں کلاسیکی موسیقی کو سرکاری اور رعایا کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ تعلیم و تدریس کے نئے اسلوب تراشے گئے اور نئی راہیں تلاش کی گئیں نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت کلاسیکی موسیقی کو سمجھنے اور حاصل کرنے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہونے لگا۔ جس کی تفصیل میں جانا مناسب نہیں۔ میں نے کلاسیکی موسیقی کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ بھی ایسی کاوش جاری رہے۔

---

## کتابیات:


۱۔ pproach to Music
y Lawrance Abbot

۲۔ usical Instruments
r Karl Geiringer

۳۔ pects of Indian Music

۴۔ e Word, Voice & Music
Prof. Kurt Blankopf

۵۔ llosophy in a New Key
Susanne Langer

۶۔ ographis Literaria

۷۔ e Legacy of Islam
H.G. Farmer

۸۔ تاریخ حسن

۹۔ خیال کی گائیکی از: اُستاد چاند خاں

۱۰۔ انکشافِ موسیقی از: " "

۱۱۔ امیر خسرو۔ ڈاکٹر وحید قریشی

۱۲۔ مضامینِ موسیقی

از: مصنف مطبوعہ شیرازہ۔ کشمیر کلچرل ا

# بہ خطِ شاعر

## بشریٰ سعید

اُداسی کا یہ پتھر آنسوؤں سے نم نہیں ہوتا
ہزاروں جگنوؤں سے بھی اندھیرا کم نہیں ہوتا

کبھی برسات میں شاداب بیلیں سوکھ جاتی ہیں
ہرے پیڑوں کے گرنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا

بہت سے لوگ دل کو اس طرح محفوظ رکھتے ہیں
کوئی بارش ہو یہ کاغذ ذرا بھی نم نہیں ہوتا

بچھڑتے وقت کوئی بدگمانی دل میں آجاتی
اُسے بھی غم نہیں ہوتا مجھے بھی غم نہیں ہوتا

یہ آنسو ہیں — انہیں پھولوں میں شبنم کی طرح رکھنا
غزل احساس ہے - احساس کا ماتم نہیں ہوتا

میرا اُس سے وعدہ تھا — گھر رہنے کا
اپنی چھت کے نیچے دکھ سکھ سہنے کا

بارش بارش کچی قبر کا گھلنا ہے
جان لیوا احساس اکیلے رہنے کا

اب کے آنسو، آنکھوں سے دل میں اُترے
رُخ بدلا کیسا، دریا نے بہنے کا

ہجر و وصال کے سارے قصے جھوٹے ہیں
حق ملتا ہے کس کو اپنا کہنے کا

جگمگ جگمگ ہیرے جیسی آنکھوں میں
ایک عجیب غبار، حویلی ڈھنے کا

راج کھبتی

## بچپن

تتلیاں پکڑ لینا
اُڑتے اُڑتے رنگوں کو
مٹھیوں میں بھر لینا
اور یوں حیات اپنی
خوشگوار کر لینا

## خواب

رنگ، رُوپ اور مستی
چاندنی، مہک، خوشبو
ان کی آرزو کرنا
خواب دیکھتے رہنا

## تخلیق

کچھ حسیں خیالوں کو
لفظ اور معانی کا
جب لباس ملتا ہے
خواب گیت بنتے ہیں
نغمے ڈھلنے لگتے ہیں

## حقیقت

خواب سچ نہیں ہوتے
خواب ٹوٹ جاتے ہیں
نیند جب اُچٹ جائے
میت چھوٹ جاتے ہیں

## خوبصورتی

درد و غم کی راتوں میں
جو بھی خواب دیکھے ہیں
کتنے خوبصورت ہیں
زندگی میں وہ اکثر
رنگ بھرتے رہتے ہیں

---

خوف، تنہائی، بے صدا جنگل
دل کو دہلا گیا گھنا جنگل

وحشتیں ناچتی ہیں شہروں میں
کٹ گیا کب ہرا بھرا جنگل

رُوح میں کوئی پھڑپھڑاتا ہے
راہ روکے ہے جسم کا جنگل

اب اُجالے نظر نہیں آتے
کن اندھیروں میں گھر گیا جنگل

جب سے چھوڑا ہے ساتھ سایوں نے
کتنا سنسان ہو گیا جنگل

رآج شہروں میں جی نہیں لگتا
دے رہا ہے مجھے صدا جنگل

---

میرے سینے میں ہمیشہ جو اُٹھا ہے اے دوست
میں نے وہ درد اکیلے ہی سہا ہے اے دوست

میرے کانوں میں اندھیروں نے یہ سرگوشی کی
نہ کوئی چاند، نہ جگنو، نہ دیا ہے اے دوست

میں بھی ہمدم ہوں ترا، ساتھ ذرا چل میرے
تُو اکیلا کہاں منزل کو چلا ہے اے دوست

دن ہو یا رات کسی پل بھی مجھے چین نہیں
ایک پتھر مرے سینے پہ دھرا ہے اے دوست

جوشِ جذبات کا، احساس کا آئینہ ہے
رآج نے اپنی غزل میں جو کہا ہے اے دوست

---

● سُوداں محلہ، موتی بازار، پھگواڑہ (پنجاب)

# غزلیں

## شاہد کبیر

سمجھے ہوئے لوگوں کو بھی ہر بار سمجھنا
مشکل ہے بہت شہر کا معیار سمجھنا

دم بھر کی رفاقت بھی غنیمت ہے، سفر میں
دیوار کو بھی سایۂ دیوار سمجھنا

جس پھول کی ٹہنی میں نزاکت کا ہو احساس
اس پھول کی ٹہنی کو بھی تلوار سمجھنا

وہ شخص جو دیتا ہے گناہوں کی شہادت
اس کو بھی برابر کا گنہگار سمجھنا

چلنے کی تمنا تھی، پہنچنے کی نہیں تھی
میں ڈوب بھی جاؤں تو مجھے پار سمجھنا

یہ شہر ہی جب آپ کو پیارا ہے تو شاہدؔ
نفرت بھی اگر دے تو اسے پیار سمجھنا

● ڈائرکٹوریٹ آف مارکیٹنگ اینڈ انسپکشن، نیو سکریٹریٹ
ناگپور ۴۴۰۰۰۱

## فاطمہ وصیبہ جائسی

زندگی کیسے کہیں تجھ سے کہ شرمندہ ہیں
غم ملے کتنے مگر پھر بھی تو ہم زندہ ہیں

شبِ مہتاب ہو، یا دن کے اُجالے ہمدم
سب یہ انسان کی تصدیق سے تابندہ ہیں

در تمہارا ہے، مگر یہ بھی تو کڑوا سچ ہے
ہم نے جو نقش بنائے ہیں وہ پائندہ ہیں

زندگی تجھ کو برتنے کے لیے دنیا میں
لوگ ایسے بھی تو کچھ ہیں جو نمائندہ ہیں

وہ یہ سمجھے تھے کہ مر جائیں گے ہم ہو کے جُدا
اُن کو حیرت ہے کہ ہم — اور ابھی — زندہ ہیں!

آپ ہی آپ ہیں محفل میں وصیبہؔ تو
اور کچھ لوگ اگر ہیں بھی تو کارندہ ہیں

● ۳۷- ساتویں لائن، نشاط گنج، لکھنؤ

## ملکہ نسیم

شام آئے گی تو انداز نرالے ہوں گے
تیری یادوں کے ہر اک سمت اُجالے ہوں گے

میں تھی اِک پیڑ، ہوا لے گئی پتے میرے
مجھ پہ اے فصلِ خزاں تیرے مقالے ہوں گے

بے خطاؤں کی یہ پہچان بہت آساں ہے
اپنے کندھوں پہ صلیب اپنی سنبھالے ہوں گے

فرش پہ بیٹھ کے جو ڈھونڈ رہا تھا خوشیاں
قہقہے اُس نے ہواؤں میں اُچھالے ہوں گے

تبصروں سے نہ شکن آئے ترے ماتھے پر
لب پہ تالے اسی احساس نے ڈالے ہوں گے

میر و غالبؔ کی زباں دیکھے گی وہ دن بھی نسیمؔ
سب کے ہاتھوں میں جب اُردو کے رسالے ہوں گے

● فاریسٹ کالونی، رائسین ۴۶۴۵۵۱

نورالحسن ہاشمی

نام : سید نورالحسن ہاشمی ولد سید مجتبیٰ علی

وطن : سندیلہ، ضلع ہردوئی (یوپی)

ساکن : محلہ قطب پور، ڈالی گنج، لکھنؤ ۲۰

تاریخِ ولادت : ۲۱ اگست ۱۹۱۱ء

تعلیمی استعداد : ایم اے (انگریزی)۔ لکھنؤ یونیورسٹی ۱۹۳۵ء
ایم اے (اُردو)۔ علی گڑھ ۱۹۳۹ء
پی ایچ ڈی (اردو)۔ علی گڑھ ۱۹۴۵ء
موضوع : دلّی کا دبستانِ شاعری
ایم اے (فارسی)۔ لکھنؤ ۱۹۵۰ء
ڈی لٹ (اُردو)۔ لکھنؤ ۱۹۵۴ء
تدوینِ کلیاتِ ولی

معلمی تجربہ : لیکچرر (بہ حیثیت ریسرچ اسکالر) شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۴۳-۱۹۴۰ء
لیکچرر، شعبۂ اُردو، دلّی کالج، دہلی ۴۵-۱۹۴۴ء
لیکچرر، شعبۂ اُردو و فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی ۶۳-۱۹۴۵ء
ریڈر و صدر 〃 〃 ۶۵-۱۹۶۳ء
پروفیسر و صدر شعبۂ اردو 〃 ۷۴-۱۹۶۵ء

## مطبوعات :

۱۔ مثنوی سراپا سوز (صادق خاں اختر لکھنوی) نسیم بکڈپو لکھنؤ ۱۹۵۴ء
۲۔ ایک نادر روزنامچہ پہلا ایڈیشن ادارہ فروغِ اردو لکھنؤ ۱۹۵۴ء
۳۔ ترجمہ کینڈڈا (برناڈشا) دوسرا ایڈیشن نسیم بکڈپو، لکھنؤ ۱۹۵۴ء
۴۔ مزیدار قاعدہ (باتصویر) (بچوں کے لیے) نسیم بکڈپو، لکھنؤ ۱۹۶۰ء
۵۔ طوطی نامہ از حسرت دہلوی پہلا ایڈیشن نسیم بکڈپو، لکھنؤ ۱۹۶۱ء
۶۔ کلیاتِ حسرت دہلوی ثم لکھنوی پہلا ایڈیشن یو جی سی کے مالی اشتراک سے ۱۹۶۶ء
۷۔ تدوین۔ تذکرہ مشاہیرِ سندیلہ (اُردو اکادمی کے مالی اشتراک سے) ۱۹۷۶ء
۸۔ ادب کیا ہے (تنقیدی نثر پارے) چوتھا ایڈیشن۔ ادارہ فروغِ اُردو، لکھنؤ ۱۹۷۷ء
۹۔ بکٹ کہانی (بہ شرکت ڈاکٹر مسعود حسین خاں) تیسرا ایڈیشن۔ اُردو اکادمی ۱۹۷۸ء
۱۰۔ ادب کا مقصد (تنقیدی مضامین) چوتھا ایڈیشن۔ ادارہ فروغِ اُردو، لکھنؤ ۱۹۷۸ء
۱۱۔ نوطرزِ مرصع دوسرا ایڈیشن ہندوستانی اکادمی، الہ آباد ۱۹۷۸ء
۱۲۔ (ترجمہ) سیاسی نظریے دوسرا ایڈیشن اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۰ء
۱۳۔ ترتیب اُردو لُغت (زیرِ طبع) ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی
۱۴۔ ناول کیا ہے (بہ شرکت ڈاکٹر محمد احسن فاروقی) چھٹا ایڈیشن نسیم بکڈپو، لکھنؤ ۱۹۸۲ء
۱۵۔ تدوینِ کلیاتِ ولی تیسرا ایڈیشن فخرالدین علی احمد کمیٹی کے مالی اشتراک سے ۱۹۸۲ء
۱۶۔ دلّی کا دبستانِ شاعری پانچواں ایڈیشن اُردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۳ء
۱۷۔ انتخابِ "سب رس" مع مقدمہ پہلا ایڈیشن اُردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۳ء
۱۸۔ اندرونم (مجموعۂ کلام) پہلا ایڈیشن فخرالدین علی احمد کمیٹی کے اشتراک سے ۱۹۸۴ء

ریسرچ طلبہ کی نگرانی :

اُردو کے ۶ طلبہ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۳ نے ڈی لٹ کیا۔
فارسی کے دو طلبہ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۲ نے ڈی لٹ کیا۔

دیگر :

۱۔ اڈیٹر رسالہ جامعہ (مکتبہ جامعہ نئی دہلی) ۴۳-۱۹۳۹ء
۲۔ سکریٹری اُردو اکادمی، جامعہ ملیہ، نئی دہلی ۴۰-۱۹۳۹ء
۳۔ اڈیٹر رسالہ فروغِ اُردو، لکھنؤ ۶۸-۱۹۵۴ء
۴۔ یوپی سرکار کی ہائی پاور کمیٹی (کتابوں پر انعامات دینے کے لیے نیز مستحق اُدبا کو وظائف دینے کے لیے) کا ممبر ۷۲-۱۹۶۲ء
۵۔ ممبر جنرل کونسل انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی ۸۱-۱۹۷۶ء
۶۔ ممبر مجلسِ انتظامیہ، رضا لائبریری، رام پور ۸۰-۱۹۷۵ء
۷۔ ممبر کونسل و مجلس عاملہ، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ ۷۵-۱۹۷۲ء
۸۔ وائس پریسیڈنٹ یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ ۷۵-۱۹۷۳ء
۹۔ پریسیڈنٹ یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ ۷۹-۱۹۷۷ء

●●

غیاث احمد گدی

# رونے کی آواز

اس دن ساؤتھ اکسٹنشن جا رہا تھا۔ ہریش کے پاس سات روپے بارہ پیسے نکلتے تھے نا! جی وہی موٹر سائیکل جو بیچی تھی ساڑھے تین ہزار میں۔ جسے کل اٹھائیس سو میں خریدا تھا، اور دو سو روپے ٹیپ ٹاپ میں لگے تھے یعنی کل ملا کر تین ہزار دس روپے بنتے ہیں نا اس کے وہ تو ہریش بچپن کا دوست تھا۔ اس لیے اس کے بہت رونے گانے پہ محض ساڑھے تین ہزار میں دے دی پھر مجھے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ ورنہ دو تین مہینے روک لیتا تو چار ہزار سے کم تھوڑے ملتے تو ماتا سندری روڈ کے بس اسٹاپ پر کھڑا تھا۔ ہریش کے پاس جانے کے لئے وہ آدمی مل گیا اس نے پیچھے سے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

ارے تم ملہوترا جی تم تو بہت دنوں بعد ملے ہیں تو بھائی سچ پوچھو تو بالکل مایوس ہو گیا تھا، اس نے بشاشت سے کہا، خیر کہو کیسے ہو؟ کہاں رہتے ہو؟ میں دنگ یہ آدمی کون ہے جو اتنی بے تکلفی سے کندھے پر ہاتھ رکھے باتیں کر رہا ہے

"معاف کیجیے میں نے آپ کو پہچانا نہیں" بہت سوچا ذہن پر بہت زور دیا۔ بالکل یاد نہیں آیا کہ یہ آدمی مجھے کہاں ملا تھا۔ تب میں نے ان صاحب کا ہاتھ کندھے پر سے ہٹاتے ہوئے کہا بھائی صاحب مجھے تو بالکل یاد نہیں آپ مجھے کیسے جانتے ہیں"

ارے مجھے نہیں پہچانا میں بلراج ہوں بلراج.....

اس آدمی نے اپنے نام پر زور دیتے ہوئے کہا

"ارے وہی بلراج جس کے ساتھ تم نے کاٹھ گڑھ والوں سے کبڈی کھیلی تھی اور انھیں منہ کی کھانی پڑی تھی ارے بھائی بھول گئے" اور اس کبڈی میں چوٹ لگنے کے سبب بھلوا کیسے بک بک کر رو رہا تھا تم نے جب کی ٹانگیں پھنسا کر زمین پر گرا دیا تھا......

"وہ آدمی ذرا کی ذرا رکا اور میرے چہرے کے تاثرات پڑھا۔ ذرا کھسیانا ہو کر دیکھا کہ میری پیشانی اسی طرح شکن آلود ہے تو ذرا کھسیانا ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور ذرا دھیمے لہجے میں بولا ارے وہی بھلوا جس کی گھر والی کے ساتھ ...... تیرا اکٹھ کا تھا...... وہی لاجو جس کے لئے تم نے.........

وہ آدمی چپ چپ ہو گیا اور جب دیکھا کہ مجھے بھلوا کی گھر والی لاجو کی بھی یاد نہیں آ رہی ہے جس کے ساتھ میرا اس کے کہنے کے مطابق کھٹکا تھا........ لیکن مجھے اچھا لگا خواہ اس آدمی سے بھول ہو رہی تھی مگر جو کچھ وہ کہہ رہا ہے یہ مطلب ہے وہ جو کچھ کہنے جا رہا ہے وہ دلچسپ ضرور ہوگا چنانچہ ساؤتھ اکسٹنشن جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا "کیوں نہیں سامنے والے چائے خانے میں جا کر چائے پی جائے اور ساتھ ہی............

اس آدمی نے کہا "ہاں ہاں کیوں نہیں چلو چائے پیتے ہیں....... وہ میرے ساتھ بے تکلفی سے چلتا ہوا چائے خانے میں آیا میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے دو پلیٹ سموسے منگوائے اور چائے کا بھی آرڈر دیا۔

ہاں تو کیا قصہ تھا، بھلوا کی گھر والی لاجو ــــ ؟ میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

تجھے یاد نہیں ـــ ارے لاجو بھی یاد نہیں.....؟

اس نے حیرت سے کہا تو ذرا مجھے جھینپ لگی" اور میں نے جھوٹ موٹ ہی کہہ دیا "ہاں ہاں...... یاد ہے لیکن ذرا...... ذرا....... جب سے کاروبار میں پڑا ہوں۔ اتنی مصروفیت رہتی ہے کہ پچھلی باتیں .......

"اس کا مطلب ہے تمہیں اپنا ستار بجانا بھی یاد نہیں ہے؟ "ستار بجانا؟ میں ستار بجاتا تھا؟"

"ہاں ہاں ستار بجاتے تھے بلکہ مست ہو کر جب تم اپنی انگلیاں جھنجھناتے ہوئے تاروں پر پھیرتے تھے تو آس پاس کے چلتے ہوئے راہ گیروں کے پاؤں تھم تھم جاتے تھے جیسے ان کے پاؤں کسی نے گاڑ رہے سے زمین میں گاڑ دیے ہوں ـــ پھر اس ستار کا کمال تھا ـــ نہیں کمال تو تمہارے بجانے کا تھا، کہ جس کو سن کر لاجی سات چھتیں پھلانگ کر تمہاری چھت پر آ گئی تھی اور لپک کر تمہاری انگلیوں کو پکڑ لیا تھا کہ بھگوان کے لئے یوں نہ بجایا کرو کہ کسی دن میرا دم ہی نکل جائے......." اور پھر اس دن یہ بھی تو

معلوم ہوا تھا کہ لاجی اپنے خاوند کے پہلو سے اٹھ کر بھاگ آئی تھی۔

پھر اس کی ڈھونڈیا مچی تھی اور آدھی رات کے وقت لاجی کا خاوند، اس کا سسر اور اس کے دو بھائی گاؤں کی گلی گلی لاجی کو ڈھونڈھتے ہوئے تمہاری چھت پر آئے تھے اور اسے تمہارے قدموں پر تیم بیہوش پایا تھا جب تم دھیمے دھیمے گہرائیوں میں اتر کر ستار بجانے میں مگن تھے جیسے کوئی تاریک تہ خانے میں جہاں تہاں چراغ جلاتا چلا جائے اور وہ لاجی تمہارے قدموں پر پڑی منڈی منڈی آنکھوں سے ہر جلنے والے چراغ کی روشنی اور تپش کو اپنی رگوں میں دوڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

جب ہی کندن لاجی کا خاوند اور اس کے باپ نے تمہیں گردن سے پکڑ لیا تھا، اور پھر کندن نے لاجی کی چٹیا پکڑ کر ایک لات ماری تھی سالی حرام جادی روج روج بھاگتی ہے........ روج روج جاتی ہے......

تب کندن کے باپ جوالا نے کندن کو ایک جھانپڑ رسید کیا تھا "ارے بے غیرت جب روج روج بھاگتی ہے تو چیر کیوں نہیں دیا ٹانگوں سے پکڑ کر کتیا کو......

جواب میں کندن نے گال سہلاتے ہوئے کہا تھا پر باپو روج اس طرح تھوڑے ہی بھاگتی تھی چھنال؟

تب کس طرح بھاگتی تھی ——؟

اس طرح کہ میری چارپائی پر میرے سنگ لیٹی ہوئی ہے اور دھیان.........

تب تو نے پوچھا کچھ، پوچھا بار بار پوچھا کہ سالی حرام جادی تو میرے پاس سوتی سوتی کہاں چلی چلی جاتی ہے....؟

پھر یار تجھے یاد نہیں کندن نے تیرے سامنے ہی اپنے باپو کو بتایا تھا کہ بار بار ٹہوکا دینے پر لاجی نے کھوئے کھوئے انداز میں اس بات کا جواب دیا تھا اس آدمی نے چائے کی لمبی چسکی لی۔

کیا جواب دیا تھا؟

"پرلوک چلی جاتی ہوں"

"پرلوک؟" کندن چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کیا کہا پرلوک؟؟

"نہیں اندرلوک" لاجی نے اسی رو میں بتایا۔ پھر لاجی نے یہ بھی بتایا کہ لگتا ہے اندرلوک میں دور دور تک اگر کی بتیاں جلتی رہتی ہیں۔ اور چاروں اور سوگندھ ہی سوگندھ کا راج ہے۔ اور ایسے میں لگتا ہے دور دھند لکے میں کوئی ستار لئے دھیمے دھیمے بجا رہا ہے جس کے تاروں سے نکلتی ہوئی آواز جھولتی مچلتی مدھ ماتی میرے کانوں میں نشے ٹپکانے لگتی ہے اور تبھی میرا سارا اپنا آپ لڑکھڑانے لگتا.........

کندن لاجی کے بارے میں یہ سب کہتا جا رہا تھا اور اس کے باپو اور دونوں بڑے بھائی اور وہ سارے لوگ جو شور و غل سن کر وہاں جمع ہو گئے تھے وہ سارے کے سارے مبہوت کر ٹم ٹم چھٹی چھٹی آنکھوں سے کبھی لاجو کو دیکھتے کبھی تجھے دیکھتے اور کبھی کندن کو تکے جا رہے تھے۔ اور.........

"اور کیا؟" میں نے خود کھوئے کھوئے انداز میں سوال کیا "اور کیا"

اور اس وقت بھی لاجی کی وہی کیفیت تھی آنکھیں آدھی بند تھیں آدھی کھلی لوگوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا لاجی تمہاری چارپائی کی پٹی سے لگی اس طرح بیہوش سی پڑی تھی۔

پھر کیا ہوا کہ یہ سب بتاتے بتاتے کندن کو ایک دم غصہ آ گیا اور اس نے لپک کر لاجی کی چوٹی پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا کہ باپو نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے کان میں آہستہ سے سرگوشی کی۔

ارے پگلے چھوڑ دے اسے یہ لاجی نہیں ہے۔

لاجی نہیں ہے تو پھر کون ہے باپو؟" کندن نے پلٹ کر پوچھا

"جو کوئی بھی ہو پر لاجی ہرگز ہرگز نہیں"

تب کندن کے دونوں بھائیوں کو ایک ایک ٹہوکا ملا" اور انہوں نے بھی یہی کہا کہ یہ اپنی لاجی نہیں کندنا!

"میں پوچھتا ہوں تو پھر کون ہے"

"پھر کون ہے......... کندن کے بھائیوں نے کہا "یہ تو باپو بتائیں گے

اس کے باپو نے کہا" جو کوئی بھی بیٹا پر اپنی لاجو تو نہیں"

اس کے بعد تو وہاں جتنے لوگ تھے سبھوں نے ہاں میں ہاں ملائی اور چپ چاپ لاجی کے سسرال والوں کے ساتھ تیری چھت سے نیچے اتر آئے ——

"اور وہ لاجی۔؟" میں نے قصہ سنتے سنتے چونک کر پوچھا

" ارے تجھے تو کچھ یاد ہی نہیں۔ لاجی کو وہیں تیرے پاس چھوڑ آئے.......

تھوڑی دیر میں سورج نکلا کہ لاجی چونکی اور چونک کر اس نے تیری طرف دیکھا۔ پھر اپنے بکھرے بکھرے بالوں اور اَست ویست حالت کا جائزہ لیا کچھ بھاگی ہوئی سی ٹھیاں پھلانگتی محلے کی گلیوں کو روندتی اپنے گھر یعنی اپنی سسرال پہنچی اسے ڈر تھا کہ سسرال والے اسے چیر کر رکھ دیں گے لیکن وہاں پہنچتے ہی وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ جیسے ہی اس نے دہلیز پر پاؤں رکھا اندر چارپائی پر لیٹا ہوا اس کا سسر جوالا اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ جوڑ کر تھوڑا جھک گیا"

آؤ دیوی آؤ پدھارو"

لاجی جس نے سسر پر نظر پڑتے ہی لمبا سا گھونگھٹ کھینچ لیا تھا" یہ دیکھ کر کاٹھ ہو گئی پہلے تو اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھا کہ کوئی اور تو نہیں پھر گھگھیانے لگی کہ" باپو میں ہوں تیری بہو لاجی"

اتنے میں گھر کے اور لوگ بھی آ گئے اور لاجی کو گھیر کر یوں کھڑے ہو گئے گویا واقعی کوئی اجنبی دیوی سمان مہیلا آئی ہوئی ہو۔ کندن کے باپو جوالا نے کہا۔

دیوی تو لاجونت ضرور ہے۔ اس میں کوئی سندیہ نہیں پر میری بہو نہیں۔ مجھے پاپی نہ بناؤ ہم نیچ ذات کے بنیا آدمی کوئی دیوی ہماری بہو کیسے ہو سکتی ہے ہم اس کے لوگیہ کہاں.........

پھر جوالا نے آسن بڑھاتے ہوئے اس طرح کہا" بیٹھ جائیے دیوی"

اب لاجو لاکھ منتیں کرتی ہے کہ میں وہی لاجو ہوں۔ وہی تمہارے بیٹے کی پتنی اور تمہاری بہو لیکن بوڑھا مانتا ہی نہیں وہ اسی طرح ہاتھ جوڑے

گھگھیا کر جواب دیتا کہ نہیں دیوی میرے لئے یہ سوچنا بھی پاپ ہے ۔

پھر جیسے جیسے لاجو کی آواز کمزور پڑتی گئی ویسے ویسے جوالا کا اصرار مضبوط ہوتا چلا گیا ۔ آخر لاجو پچھاڑ کھا کر وہیں فرش پر گر گئی ۔

اب آدھا دن بیت چکا تھا لگ بھگ سارا گاؤں کندن کے گھر سمٹ آیا تھا ۔ عالم یہ تھا کہ ادھر لاجو فرش پر بیٹھی بین کر رہی کھگھیا رہی ہے ادھر اس کا سسر سر جھکائے ہاتھ جوڑے گنہگار کی طرح کھڑا ہے ۔

نہیں دیوی ہم کو اور پاپی نہ بناؤ ...... ہم کو اور پاپی نہ بناؤ ...... !

رات کو پنچایت ہوئی ، گیس بتی کی چکا چک روشنی میں مہنگو گوالے کی چوپال میں لوگ باگ بیٹھے حقہ آیا چلم سلگائی گئی ، پہلا کش مکھیا نے لیا ، دھواں چھت کی اور پھینکا ۔ ایک بار پلٹ کر لاجو کی طرف دیکھا ، اسکی آنکھوں میں لاج نہیں لالی آ گئی ، سونا لمبا رعین اسکی ناک کے نیچے بیٹھا ہوا تھا ۔

اس نے ایک کر مکھیا کی آنکھوں کی طرف دیکھا پھر چلم کی ڈھکنی اٹھا کر زور زور سے پھونکتے ہوتے بولا ۔

میں سمجھا تمباکو کی جگہ کسی مسکھرے نے گانجا تو نہیں بھر دیا ۔ چلم میں ........

پھر پنچایت کی کارروائی شروع ہوئی ۔

سارے پنچ ایک طرف یہ کہتے رہے "لاجو نادان بے بچی ہے ابھی گرہستی کو نہیں سمجھتی ستار کی آواز سے ملدھ آدھی سوئی آدھی جاگی پتی کی چارپائی سے بھاگی ۔ پہلا قصور ہے معاف کر دیا جائے دل کو صاف کر دیا جائے ۔

لیکن سارے پنچ ایک طرف اور وہ بڑھو کندن کا باپ ایک طرف ، دیکھنے میں بھولا بھالا لیکن من کا ایک دم کالا ، ہاتھ جوڑے کھڑا رہا " پنچو ! ہم لوگ اس دیوی کے لائق نہیں جب تک نہیں جانتے تھے نہیں جانتے تھے پر اب جان گئے تو جان بوجھ کر ایسا پاپ نہیں کر سکتے " ایسا گھور پاپ کر کے نرگ بھاگی نہیں بن سکتے ۔

" پر تین سال سے تیری بہو ہے نا ؟ "

" بہو تھی ، اب نہیں ..........

پر تین سال تک تیرے بیٹے کندنا کے ساتھ سوئی تو تھی ۔ "

" مگر میرے بیٹے نے اسکے ساتھ کبھی کچھ نہیں کیا " بڑھو نے اسی دھیرج سے جواب دیا

" کیا کہا تیرے بیٹے نے بھوگ نہیں کیا " کسی نے کڑک کر پوچھا ۔

نہ بھوگ ، نہ سمبھوگ ...... " کندن کے باپ نے وثوق سے یقین دلایا " میرے بیٹے کو ہزار بار انکار ہے وہ بھری پنچایت میں کیا بولے جب بھی کندنا نے دیوی لاجونت کی طرف ہاتھ بڑھایا ۔ اسکی دیہہ سے چنگاریاں جھڑنے لگیں ۔ کندن کا باپ اپنی ضد پہ اس طرح ڈٹا رہا کہ سارے پنچ ہار گئے ۔

اور یوں لاجو کی جو مٹی خراب ہوئی کہ زبردستی پنچو نے اسے تمہارے سر منڈھ دینے کے سوائے کوئی چارہ نہیں دیکھا ۔

" یہ سب ایک ستار کے کارن ہوا " میں نے آہستہ سے کہا ۔

" پتہ نہیں اس آدمی نے جواب دیا ۔ یہ تیرے سوچنے کی بات تھی ۔ ستار کے کارن ہوا کہ تیرے بجانے کے کارن "

ذرا ٹھہر کر اس آدمی نے چونک کر پوچھا ، لیکن لاجو اب تیرے پاس خوش تو ہے ....... ؟

" لاجو میرے پاس ، کون لاجو ...... ! " میں نے غور کرتے ہوئے کہا مجھے تو یار کچھ یاد نہیں "

لاجو یاد نہیں ........ اس آدمی نے حیرت سے کہا پھر تو تجھے ستار بجانا ...... اچھا وہ ستار کہاں ہے وہ تو گھر پر ہی ہے نا ...... ؟ "

" ستار ..... ستار ... " جب میں نے بہت غور کیا تو ذرا ذرا یاد آیا ۔

اسے بیچ کر جو پیسے ملے نا اس پیسے سے دھندہ شروع کیا ۔ اس مہانگری میں دھندہ تو اول چیز ہے نا .........

" ستار بیچ کر ...... لیکن وہ ستار کہاں بیچی ... کون خرید لے گیا ...... وہ آدمی مبہوت سا میرے چہرے کو تکے جا رہا تھا ....

" سو تو یاد نہیں بھائی " میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا ...... پر کبھی جی بی روڈ کی طرف سے گذرتا ہوں ، اور کوٹھوں پر سے گانے بجانے کی آواز سنتا ہوں ، مجھے ایسا لگتا ہے نغموں کے بیچ کوئی بین کر رہا ہے ۔ کوئی رو رہا ہے ......

اور لاجو ...... لاجو تو یاد ہی نہیں ... بالکل یاد نہیں ۔

عابد سہیل

# جینے والے

جودھے نے اپنی ٹانگیں دھیرے دھیرے پھیلائیں یہ دیکھنے کے لیے کہ جب وہ چیتی کے برخلاف جو ایسی بے خبر سوتی ہے کہ اسے کُھلے ڈھکے کا خیال بھی نہیں رہتا سوتے میں بھی آدھا جاگتا رہتا ہے۔ کتنی دُور تک اپنے پیر پھیلا سکتا ہے تو بس ذرا کی ذرا میں اس کا انگوٹھا ستّدو کے سر سے ٹکرا گیا اور اس نے جلدی سے اپنی ٹانگیں سکوڑ لیں۔

"ابھی سوئے نہیں رے۔" ستّدو نے پُوچھا اور وہ جواب دینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ سڑک پر ایک ٹرک اتنی تیزی سے گزرا کہ پل کی منڈیر تو کیا، سارا پل ایسے کانپنے لگا جیسے اس کا دل اس دن کانپا تھا جب اس نے جان بُوجھ کر اپنی ٹانگیں دھیرے دھیرے چیتی کی طرف بڑھائی تھیں اور اپنے پیر کی اُنگلیوں کو اس کی ادھ کُھلی ٹانگوں پر اس طرح بے جان چھوڑ دیا تھا جیسے یہ سب کچھ انجانے میں ہو گیا ہو۔

ٹرک کا شور اور پُل کا کانپنا ایک ساتھ کم ہوئے اور اس نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ستّدو پھر بول اُٹھا۔

"اے سوجا ——— بارہ کا گھڑیال بجا ہی چاہتا ہے۔ اب بھی نہ سویا تو پھر کب سوئے گا۔ تین بجے صبح سے تو پھر لڑکوں کا تانتا بندھ جاتا ہے اور بھونپو اتنے زور سے بجاتے ہیں کہ ایک بار مُردہ بھی زندہ ہو جاتے۔"

مُردے کے زندہ ہو جانے کی بات پر جودھے کے دماغ میں جواب گڑبڑا گیا۔ کہنے تو وہ یہ جا رہا تھا کہ نیند نہیں آ رہی ہے پر اس کے موہنہ سے نہ جانے کیسے نکل گیا "مُردہ زندہ ہو جاتا تو شرفو نہ زندہ ہو گیا ہوتا۔"

"شرفو ——— وہی نہ جو پچھلے سال جیٹھ کی رات میں نیچے نالے میں گر کر مر گیا تھا۔"

"بے چارہ شرفو ——" جودھے نے کہا "ہو سکتا ہے ایک منٹ کے لیے زندہ بھی ہو گیا ہو۔ پر اپن کو تو اگلے دن جب منڈیر پر اس کی جگہ خالی رہ گئی تھی، اس کے غائب ہونے کا پتہ چلا تھا۔ پھر اگلی صبح اس کی ڈھنڈیا مچی تھی تو لاش نالے میں پڑی ملی تھی۔"

"سالے نے کروٹ لی ہو گی۔ جب ہی تو گر پڑا۔" جودھے نے کہا۔ "ویسے تھا دل کا اچھا۔ لیکن ذرا کام چور تھا۔ خوب جی مار کر دن بھر ٹھیلا کھینچتا تو اتنا تھک جاتا، اتنا تھک جاتا کہ کروٹ بھی نہ لے پاتا۔ کام چوری کی اچھی سزا ملی۔"

"تھا دل کا اچھا۔" ستّدو نے جودھے کا جملہ دُہرایا۔

"پر تھا سچ مچ کام چور۔ اسی دن جس کی رات کو وہ نہیں رہا، ٹھیلا کھینچتے کھینچتے میرے پیٹ کے نیچے کا حصّہ رسّی سے چھل گیا تھا۔ سیٹھ نے مال ہی اتنا لاد دیا تھا۔ رکاب گنج کی چڑھائی، اتنا سامان اور پیچھے سے زور لگانے والوں میں شرفو۔ بایاں پہیہ گڈھے میں پڑا۔ ٹھیلے نے ایک دم موڑ کھایا تو اگلا حصّہ ہوا میں لہرا کر سامنے سے آنے والی بس سے ٹکرا گیا۔ وہ تو قسمت تھی کہ میرا پیر ان سٹک کر نیچے سڑک پر گر گیا، نہیں تو شرفو تو رات میں مرا، میں دن ہی میں ختم ہو گیا ہوتا۔"

"سچ بتا۔ تُو نے ہی اسے رات میں دھکا تو نہیں دے دیا تھا۔" ستّدو نے آہستہ سے پُوچھا کہ کوئی اور نہ سن لے۔

"میں ایسا نہیں ہوں۔" کہہ کر جودھے نے اپنی جیب ٹٹولی۔ ایک بیڑی نکالی۔ اسے جلانے کے بعد لمبا سا کش لیا اور بولا۔

"تو بھی پیے گا؟"

"ہاں دے دے۔ نیند نہیں آ رہی ہے۔ بیڑی ہی پیوں ——— لیکن سچ سچ بتا دے کہیں دن کا

---

• معرفت نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

غصہ رات کو تو نہیں اُتارا تھا۔ میں نے بھی بہت دنوں ٹھیلا گھسیٹا ہے۔ جانتا ہوں کہ جب مال زیادہ لدا ہو اور پیچھے سے سہارا نہ مل رہا ہو تو کتنا غصہ آتا ہے اور اس دن تو تُو اس کے کارن مرتے مرتے بچا تھا۔"

شندو اپنی بات دھیرے دھیرے، تھم تھم کر جتنی دیر کہتا رہا، جودھے جلدی جلدی بیڑی کے کش لگاتا رہا۔ پھر جب بیڑی کا جلتا ہوا حصہ اس کی انگلیوں کے بالکل پاس پہنچ گیا تو اُس نے بیڑی نیچے نالے میں پھینک دی اور ذرا غصہ میں بولا: "ایسی بات کرے گا تو بیڑی نہیں دوں گا۔" اور اپنا بڑھا ہوا ہاتھ جس میں دو انگلیوں کے بیچ بیڑی دبی ہوئی تھی، اپنی طرف کھینچ لیا۔

"ارے اس میں ایسی غصہ ہونے کی کیا بات ہے۔ میں نے تو بیاک کیا تھا۔ تُو کیوں اسے دھکا دیتا۔ تُو تو اس وقت بھی مُنڈیر پر سوتا تھا۔ اس کے مر جانے سے تیرا نمبر آنے والا ہوتا تو بھی ایک بات ہوتی۔"

جودھے کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ اُس نے بنڈل سے دو بیڑیاں اور نکالیں اور پھر دونوں کو انگلیوں کے بیچ میں داب کر دیا سلائی کی ایک تیلی بجانے کے لیے اُنہیں ایک ساتھ جلایا۔ تیلی بجھ گئی تو بیڑیوں کے سروں کو دیکھا۔ ہاتھ ہوا میں لہرایا تو ان کے سرے چمک اُٹھے پھر ایک اپنے مونہہ میں لگائی اور دوسری شندو کو دے دی۔

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا پھر ایک ٹرک شور مچاتا ہوا گزرا اور سڑک اور مُنڈیر پر روشنی پھیل گئی۔ تو دونوں کی نظر جیسے ایک ساتھ جیتی پر پڑی، جو تن بدن سے بے خبر دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے لیٹی تھی۔ دونوں ہی شاید بات کرنے کے لیے کوئی بات سوچ رہے تھے کہ ان کے مونہہ سے تقریباً ایک ساتھ نکلا۔ "دن بھر نہ جانے کہاں کہاں ماری ماری پھرتی ہے۔ کیسی بے کھبر سو رہی ہے۔"

"پرسوں تو رات کو بھی نہیں تھی۔"

"چار دن کی چاندنی ہے۔" جودھے نے عقل مند بننے کی کوشش کی۔ "اس کے بعد جب کوئی نہیں پوچھے گا تب تو سیدھے مونہہ بات کرے گی۔" جودھے نے کہا۔

"لیکن شرفو اسے سچ مچ چاہتا تھا۔"

"بے چارہ شرفو۔"

"لیکن اس نے گھاس نہیں ڈالی"——

—— شندو کو اس بات کا واقعی افسوس تھا۔

"ابھی تُو نے کہا تھا نا کہ" جودھے بولا کہ "میں نے شرفو کو دھکا دے دیا تھا —— اب میرے دل میں کھیال آیا کہ اگلی شام کو جب اس نے اس کی جگہ خالی دیکھی تھی اور سب کو جیسے ایک دم یاد آ گیا تھا کہ انہوں نے اُسے نہ صبح دیکھا تھا نہ دن میں کسی وقت نہ پھر شام کو تو عبدل کتنا خوش خوش لگ رہا تھا۔ اُس نے اپنا انگوچھا کتنی شان سے شرفو کی جگہ پر بچھا دیا تھا اور کیسے مزے سے لیٹ گیا تھا۔

شندو نے کچھ سوچا اور بولا "ہاں ہاں مجھے بھی یاد پڑتا ہے۔ وہ اس دن بہت خوش تھا۔ اور پھر اُس نے سب کو آدھا آدھا کوپ چائے بھی پلائی تھی اور ایک ایک بیڑی بھی بانٹی تھی۔"

"تُو کہنا کیا چاہتا ہے؟" جودھے نے پوچھا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ جب سب سو گئے ہوں اور رات کے بارہ ایک بجے کے بعد سواریوں کا آنا جانا بالکل رُک گیا ہو اور ٹرک بھی نہ آ جا رہے ہوں تو اُس نے چپکے سے اُٹھ کر شرفو کو دھکا دے دیا ہو۔"

"ہو تو سکتا ہے۔" شندو نے ہاں میں ہاں ملائی۔

اور پھر اگلے دن شام کو سب سے پہلے اُسی نے تو کہا تھا کہ شرفو اب تک نہیں آیا۔"

"ہاں یہ بھی یاد پڑتا ہے۔" شندو نے ایک سال پرانی بات یاد کی۔

"پر ایک بات ہے سچ سچ کہوں؟" جودھے بولا۔

"کہو ——!"

"جب مجھ کو مُنڈیر پر سونے کی جگہ ملی تھی، شرفو کی موت سے ایک سال پہلے، رامائن کے نالے میں گرنے کے بعد تو تُو نے اس رات تو شکی کی کہانی سُنائی تھی۔ خوب خوش ہو ہو کر اور لہک لہک کر گانا بھی سُنایا تھا۔ کیا تھا وہ —— "میں تو لیلیٰ ہی لیلیٰ پکارا کروں۔"

اب شندو اُٹھ کر بیٹھ گیا "تو کہنا کیا چاہتا ہے۔ میں نے رامائن کو دھکا دے دیا تھا کیا؟ کہ سڑک کے کنارے سونے کی بجائے پُل کی مُنڈیر پر جگہ مل جائے۔ یہی کہنا چاہتا ہے نا؟"

"نہیں نہیں، میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا بس ایک کھیال آ گیا۔"

"لیکن شرفو میں اور کوئی عیب نہیں تھا۔ ذرا کام چور تھا اور ڈرپوک۔" شندو نے بات بدلی۔

"ڈرپوک" جودھے نے حیرت سے کہا۔

"ڈرپوک نہ ہوتا تو جیتی کو بس اشاروں اشاروں میں پیار کرتے کرتے جان دے دیتا۔ آٹھ دس روپے روز تو کماتا ہی تھا۔ دو روپے اس کی طرف سیدھے سیدھے پھینکتا۔ پھر دیکھتے کیسے آنا کانی کرتی لیکن ہمت ہی نہ کر سکا۔ کون جانے جب پھد سے نیچے نالے میں گرا ہو تو اس نے یہی سوچا ہو کہ جیتی کی گود میں گر گیا ہے۔"

"بے چارہ شرفو ——" دونوں نے ایک بار پھر کہا اور ایک دم جلنے والے سڑک کے بلبوں کی روشنی میں جو شام سے اندھیرے پڑے تھے۔ جیتی کو ایک ساتھ دیکھا اور دونوں کی نظریں ٹکرائیں تو دونوں ہی شرمندہ ہو گئے۔

"شرفو تو اُسے آنکھ بھر کے دیکھتا بھی نہیں تھا۔" وہ جیتی کو شرافت سے رام کرنا چاہتا تھا ——" جودھے نے غصّے سے کہا اور مُڑ کر پُل کے نیچے تھوک دیا۔

"اچھا اب سو جا —— صبح سیٹھ نے جلدی بلایا ہے۔ گودام سے مال اسٹیشن لے جانا ہے۔"

لیکن جودھے کو نیند اب بھی نہیں آ رہی تھی سو اُس نے نئی بات چھیڑ دی۔ "ابے تو مار کر ٹُلائی کم

لیتا ہے؟"

"ایک روپیہ بنڈل۔" شدّو نے کہا۔

"لیکن بابو نے تو اب چوتی سے اٹھتی کر دی ہے۔ تو نے نہیں بڑھائے۔ بابو نے اپنی رسوت بڑھا دی ہے تو ہم نے بھی اپنی بے ایمانی بڑھا دی۔" جودھے بولا۔

"اچھا اب سو بھی جا۔" شدّو کی آنکھیں اب شاید نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

دونوں سیدھے لیٹے لیٹے تھک گئے تھے۔ دونوں نے ہی کمر کو کچھ پیچھے کر کے سر اور ٹانگیں آگے کی طرف بڑھا کر کروٹ لی۔ ہاتھ پھیلا کر ٹٹولا کہ منڈیر کے بیچوں بیچ ہیں کہ نہیں۔ پھر جودھے تھوڑی دیر بعد سیدھا سیدھا لیٹ گیا۔ شدّو نے بھی اسی احتیاط سے دوسری طرف کروٹ لی اور ان کے خراٹوں سے عبدل کی آنکھ کھل گئی تو وہ بڑبڑایا۔

"سالے سونے بھی نہیں دیتے۔"

صبح سب سے پہلے شدّو جاگا۔ اُسے کام بھی بہت تھا۔ گودام میں کام شروع ہوتے ہی ٹھیلے پر مال لد جائے تو ایک پھیرا اور ہو جاتا ہے اور ایک پھیرے کے معنی ہوتے ہیں چھ سات روپے اوپر کے۔ پچھلی برسات میں جب وہ گاؤں گیا تھا تو اس کی بیٹی نے چندریا کی فرمائش کی تھی۔ اُسے اس وقت اپنی بیٹی کا بھی خیال آیا اور بیوی کا بھی ــــ" ایک ــــ دو ــــ تین" اُس نے سات تک انگلیوں کے پوروں پر گنتی کی۔ سات سال ہو گئے اُسے لکھنؤ آئے ہوئے۔ اس بیچ گاؤں کے بس سات آٹھ ہی پھیرے ہوئے تھے۔ ایک زیادہ اُس وقت ہوا تھا جب اس کی ماں اُسے یاد کرتے کرتے مر گئی تھی۔ اُسے ماں کے مرنے کی خبر کئی دنوں بعد گاؤں کے ایک آدمی سے ملی تھی اور وہ دو دن بعد سیٹھ کے گاہکوں کے سارے کام جلدی جلدی نپٹا کر گاؤں چلا گیا تھا۔ گھر میں کیسا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اُسے ایسا لگتا تھا جیسے ماں بس ابھی ابھی مری ہو، لیکن پھر دھیرے دھیرے سب کچھ پرانا سا ہو گیا تھا۔ جہاں دن بھی کام ہو رات بھی کام، سکون کا ایک لمحہ بھی نہ ہو وہاں سب کچھ کتنی جلدی ٹھیک ٹھاک ہو جاتا ہے۔ ان سات برسوں میں اس کی بیٹی چمپا کتنی بڑی ہو گئی تھی۔ پچھلے سال برسات میں جب وہ گاؤں گیا تھا تو چمپا کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اپنا بدن چرائے چرائے وہ اس کے سامنے آئی تھی۔ اور اس کے بار بار کہنے پر اُس نے لال چندری کی فرمائش کی تھی۔ ایسی چندری جس میں گول گول چاند سی ٹکیاں لگی ہوتی ہیں۔ "کتنے میں ملے گی؟" اُس نے دل ہی دل میں سوچا۔ "ہوگی کوئی دس بارہ روپے کی۔" اُس نے فوراً ہی جواب دیا۔

وہ گاؤں، بیوی، ماں اور چمپا کے خیالوں میں جانے کتنی دیر کھویا رہتا، لیکن ایک تو سڑک چلنے لگی تھی۔ رکشے اور دوسری سواریاں تیزی سے گزر رہے تھے اور پھر کلوخاں کے لڑکے راج بلی نے جس کے ایک ہاتھ میں بانس کی ٹوکری تھی جس میں کلہڑ تھے اور دوسرے ہاتھ میں چائے کی بڑی سی کیتلی زور سے آواز لگائی تھی۔

"جس کو چائے لینا ہو فٹافٹ لے لے۔"

اس کی آواز سنتے ہی منڈیر کے سارے سونے والے اپنے اپنے ڈنلپ پلو کے بستروں سے ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کسی نے پُل کے کونے والے نل سے کُلّی کی، کسی نے موتہہ ہاتھ دھویا اور کوئی یونہی چائے کا ایک کپ چڑھا گیا۔

تھوڑی دیر بعد پُل کی منڈیر خالی پڑی تھی۔ سڑک جاگ پڑی تھی، شہر جاگ پڑا تھا۔ دوکانوں کے شٹر دھڑا دھڑ کھلنے لگے تھے اور رکشوں، موٹروں اور اسکوٹروں پر چلنے والوں میں سے کسی کو خیال بھی نہیں آتا تھا کہ رات جب ڈوبتی ہے اور سڑک جب اونگھتی ہے تو پُل کی یہ منڈیر آباد ہو جاتی ہے۔

پھر سارے دن کی لُو دھوپ میں شام کا انتظار کر کے رات جب سوئی تو منڈیر پر سونے والوں کا دن ختم ہوا۔ کوئی دوکانداروں سے مزدوری پر جھگڑ کر لوٹا تھا۔ کوئی ایک چکر کا گھپلا کر کے سیٹھ کو آٹھ دس روپے کا چل دے کر، کوئی ہار کر، کوئی جیت کر اور کوئی ایسا کہ نہ ہارا تھا نہ جیتا تھا۔

جودھے نے پٹرول پمپ کے پاس والے ڈھابے میں کھانا کھایا۔ ٹنکی کے نل سے ہاتھ دھو کر باہر نکلا تو چمپی چاٹ کے ٹھیلے کے پاس کھڑی دونا چاٹ رہی تھی۔

"بہت مجا آ رہا ہے۔" جودھے نے چھیڑا۔

"چل حرامی کے پلّے ــــ ندیدے۔" چمپی بولی "گانٹھ سے رکم کھرچ کرتے جان جاتی ہے اور دُونا دیکھ کر موتہہ میں پانی بھر آتا ہے۔ پیسے کھرچ کر اور دونا لے کر تو بھی مجا لے ــــ اس ندیدے پن سے کیا ہوگا۔"

جودھے کا دل اس ڈھکے چھپے اشارے پر جو ایسا ڈھکا چھپا بھی نہ تھا، ایک بار ڈولا لیکن پھر اُسے چمپا کی چاند تارے ٹکی چندریا یاد آ گئی اور وہ رال پی گیا۔ اور بیڑی سُلگا کر پُل کی طرف چل پڑا۔

رات اور ڈوبی تو جیسے سب کو ایک دم خیال آیا کہ نصیبے کی جگہ خالی ہے۔

"نصیبے جانے کہاں رہ گیا ہے" شدّو نے کہا۔

"آتا ہوگا ــــ بائیسکوپ دیکھنے چلا گیا ہوگا۔"

"ہو سکتا ہے۔" عبدل بولا۔

پھر رات کچھ اور ڈوبی اور نصیبے کی جگہ پھر بھی خالی رہی تو جودھے نے کچھ ایسے کہا جیسے اسے کوئی اور بات کرنے کو نہیں مل رہی تھی۔

"نصیبے اب بھی نہیں آیا۔ پہلا شو تو بہت پہلے ختم ہو گیا ہوگا۔"

"صبح تو سایَد تھا۔" عبدل نے عقلی گدّا مارا۔

"میں نے تو نہیں دیکھا۔" شدّو بولا۔

"مجھے بھی نہیں یاد پڑتا۔" جودھے نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"کون ــــ نصیبے۔" چمپی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ "سوتا تو منڈیر کے کونے پر تھا، لیکن چائے میرے پاس ہی بیٹھ کر پیتا تھا، لیکن آج صبح وہ تھا یا نہیں یہ تو مجھے بھی یاد نہیں پڑتا۔"

"بھائی، کسی نے نصیبے کو صبح دیکھا تھا؟" بُڈّھے کا کا نے جو کئی برسوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گاؤں

واپس جانے کی بات کر رہے تھے اونچی آواز میں پوچھا۔
سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس رات کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ نصیبے کی جگہ خالی رہی۔ لائن میں لگا پلٹو، جس کا نمبر بس اب آنے ہی والا تھا۔ روز کی طرح منڈیر کے نیچے سڑک کے کنارے ہی سو گیا۔

اگلی صبح سب سے پہلے جودھے اٹھا۔ منڈیر سے نیچے جھانک کر اس نے دیکھا تو نالے کے بیچوں بیچ کوئی لمبی لمبی چیز پڑی تھی۔

" دیکھ تو شدّو نالے میں کیا پڑا ہے؟"

شدّو نے تقریباً آدھا بدن لٹکا کر پل کے نیچے دیکھا پھر دو ایک بار آنکھیں ملیں۔

" یہ تو نصیبے ہے۔ اس کا لال انگوچھا گردن میں لپٹا ہوا ہے۔"

اور تھوڑی ہی دیر میں نصیبے کی موت کی خبر پل کی منڈیر کے اس کونے سے اس کونے تک پھیل گئی۔

شام ہوئی اور سامنے کے ہوٹل کو بجلی کے بلبوں سے خوب سجا دیا گیا تو جودھے کو جانے کیسا ایک بات یاد آگئی۔

" شدّو تجھے یاد ہے نا پچھلے سال تنرو بھی کل ہی کے دن منڈیر پر سے گر کر مر گیا تھا۔

" کل ہی کے دن" شدّو بولا " یہ تو یاد نہیں پر اتنا ضرور یاد ہے کہ تھے گرمیوں کے ہی دن"

" تجھے دن کیسے یاد رہا؟"

" یہ سامنے والا ہوٹل اس دن بھی خوب سجایا گیا تھا۔ رات بھر گانا بجانا ہوتا رہا تھا" جودھے نے کہا۔

" ہاں ہاں اب یاد آگیا؛ اس دن بھی یہ ہوٹل خوب سجا تھا۔ شدّو کو سب کچھ یاد آگیا تھا۔

" اور اس سے بھی ایک سال پہلے جب رامائن منڈیر سے گر کر مرا تھا تب بھی"

" ہاں، اس کے اگلے دن بھی ہوٹل خوب سجا تھا" چیتی بولی " مجھے خوب یاد ہے"

" تو اس کا مطلب ہے" جودھے نے اپنی ٹانگیں بلا سوچے سمجھے منڈیر پر پھیلائیں ــــ " اب ایک سال کی چھٹی ــــ خوب ٹانگیں پھیلا کر سوؤ۔ کچھ ہونے والا نہیں"

وہ سارے دل، جو نصیبے کے نالے میں گر کر مر جانے سے بوجھل بوجھل تھے۔ ان پر سے بوجھ ایک دم ہٹ گیا تھا۔ اب ایک سال کی بوت کو چھٹی ــــ بات بالکل پکی تھی۔

■■

---

## بقیہ: ملاحظات

اس کا جو مقصد ہے، اس کا جو اصول ہے، اس کی جو بنیاد ہے، یعنی اچھائی، بھلائی، دوسروں کی طرف دھیان دینا، اور سب سے زیادہ امن کا ماحول رکھنا، ان سب آدرشوں کو ہم بھول رہے ہیں۔ اگر ہم ان کو بھول جائیں گے تو آگے کیسے بڑھیں گے؟ ہمیں سماجی تبدیلی لانا ہے۔ اقتصادی صورتِ حال بہتر کرنی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اپنی روحانی قوت کو بھی بڑھانا ہے۔ اس کے بغیر آپ عظیم ملک نہیں ہو سکتے۔ جو اخلاقی اقدار ہیں ان کو ہمیں فروغ دینا ہے اور بھارت میں ایسی چیزیں ہیں، ایسی خوبیاں ہیں جو اب شاید ہی کسی جگہ بھی ہوں۔ ہم کبھی اس کو نہ کھو دیں۔ یہی میری آج کے دن آپ سے استدعا ہے۔

## نیا تصویری سلسلہ

آگرہ کے جناب برجندر سیال کا شمار غالب کے پرستاروں بلکہ ملک کے غالب شناسوں میں ہوتا ہے۔ اردو کے علمی و ادبی حلقوں میں ان کا شہرہ ملک اور بیرونِ ملک میں ہے۔ سیال صاحب نے غالب کی تفہیم میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔ چغتائی، صادقین، غلام رسول سنتوش، دیگر ممتاز مصوّروں نے غالب کے اشعار سے تصویری پیکر تیار کئے ہیں، وہ تفہیمِ غالب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ سیال صاحب نے اپنے تخلیقی اظہار کی ایک نئی راہ نکالی۔ چھوٹے بڑے سنگ ریزوں کو ملا کر غالب کے اشعار کو منہ بولتے مجسموں کی شکل دی ہے۔

سیال صاحب اب تک غالب کے ایک سو سے زائد اشعار کو مجسموں کی شکل دے چکے ہیں۔ ان کی نمائش بھی متعدد بار کر چکے ہیں۔ غالب اکیڈمی دہلی میں ایسے پچاس مجسمے نمائش کے لیے رکھے ہوئے ہیں ــ یہ موصوف نے اکیڈمی کو تحفے کے طور پر پیش کئے ہیں۔

مطلوب سنگ ریزوں کی تلاش کارِ دشوار ہے مگر غالب کا سارا کلام حفظ ہونا اور مختلف نوعیتوں کے سنگ ریزوں کو دیکھتے ہی موزوں کلام کا ذہن اور زبان پر آنا اور تخلیق کے عمل کا مکمل ہونا بھی کارِ سہل نہیں۔ سیال صاحب کی صناعی لائقِ رشک ہے۔

مشہورِ زمانہ مصوّر اور شاعر صادقین صاحب نے غالب کے اشعار کی جو تشکیل فرمائی، اس کے بعض نمونے ہمیں 'آج کل' کے سرورق پر شائع کرنے کا شرف حاصل ہے۔ اسی طرح تفہیمِ شعر کے طور پر بنائے ہوئے سیال صاحب کے مجسموں کی تصویریں شائع کرنے کا شرف بھی 'آج کل' کو حاصل ہوا ہے۔ ہم اس گراں قدر تعاون کے لیے سیال صاحب کے شکر گزار ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے قارئین اس نئے تصویری سلسلے کو پسند فرمائیں گے۔

●●

ہر مسعود رضوی

# اعضائے خمسہ

پہلے حواس خمسہ بنائے گئے یا اعضائے خمسہ؟ یہ ضروری سوال اسی طرح لاینحل ہے جس طرح صدیاں بیت جانے پر بھی اس سوال کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا کہ پہلے مرغی ہوئی یا انڈا؟ لہٰذا اس کو بھی ہم انڈے اور مرغی یا مرغی اور انڈے کے ساتھ چھوڑ کر آگے بڑھتے ہیں۔

یہ بات بہرحال طے شدہ ہے بلکہ اس پر جملہ محققین کا اجماع ہے کہ حواس خمسہ سے مستفید ہونے کے لیے اعضائے خمسہ یعنی ہاتھ، کان، زبان، آنکھ اور ناک کا وجود ضروری ہے۔ آگے انہیں اعضا اور ان کے خاص خاص منصبی اور غیر منصبی فریضوں کا ذکر آتا ہے۔

## ١۔ ھاتھ

ہاتھوں کا اصل کام یوں تو صرف چھونا ہے، مگر گھونسے تھپڑ لگانے اور جیب وغیرہ کاٹنے کے اہم اور ضروری فرائض بھی انہیں کے ذریعے ادا کیے جاتے ہیں۔ ہمارے شاعر سراپا ناز پر "پیش دستی" بھی انہیں سے کرتے ہیں اور انہیں کے ذریعے جوابی دھول دھپے سے سرفراز ہوتے ہیں۔

کچھ دن پہلے تک ہاتھوں کو تراش خراش کر لکھنے کے کام میں بھی لایا جاتا تھا مگر صرف جنوں کی حکایات خوں چکاں، دیگر دستاویزات سینٹھے کے قلم ہی لکھی جاتی تھیں۔

ہاتھوں کا ایک "فعل دوائی" بھی ہے۔ بہت سے ہاتھوں میں جو شفا ہے وہ مجرب اور تیر بہدف قسم کی دواؤں میں بھی نہیں ملتی۔ یاروں کے لیے تو یہ اکسیر کا کام کرتے ہیں۔ ان کی ذرا تگڑی خوراک اتار دی جائے تو بہت سے جز بلی بیماریاں پلک جھپکتے کافور ہو جائیں اور اگر مکرر ارشاد کر دی جائے تو آئندہ سات پشتیں بھی نروگ پیدا ہوں۔

ہاتھ کی لکیروں میں قسمت کا حال بھی لکھا ہوتا ہے مگر یہ تحریر کسی کے مصحف رخسار پر منتقل ہو جائے تو ہمیشہ بدبختی کی علامت ہے۔

## ٢۔ کان

کان جو سننے کے لیے بنائے گئے ہیں، اس منصبی فرض سے زیادہ پڑوسیوں کی دیوار میں لگانے کے کام آتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔

کان کا استعمال عمر کی مختلف منزلوں میں مختلف ہوتا ہے۔ بچپن میں یہ اپنے مالک سے زیادہ اپنے خاندان کے بڑے بوڑھوں اور اساتذۂ کرام کے تصرف میں رہتا ہے۔ لڑکپن میں اس کا ایک پلہ نصیحتیں سننے اور دوسرا انہیں اڑانے کے کام آتا ہے۔ جوانی میں رقیبوں کی گالیاں سن کر بے مزہ نہ ہونے کی ذمہ داری بھی ان کی ہے۔

انہیں بھیجے کے ہمراہ نوش بھی کیا جاتا ہے۔

## ٣۔ زبان

زبان کا اصل کام ذائقہ یعنی چکھنا ہے۔ کسی زمانے میں ایک آدمی کے پاس ایک ہی ہوا کرتی تھی مگر جدید تقاضوں سے مجبور ہو کر ایک ایک آدمی کئی کئی رکھنے لگا ہے۔

اسے ڈاکٹر کھینچ کر دیکھ لے تو کوئی مضائقہ نہیں، خود سے دکھا دی جائے تو لوگ بہت برا مانتے ہیں۔ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ زبان سے کرتب بھی دکھائے جاتے ہیں۔ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

اسلاف کی زبان ایک ہی ہوتی تھی جس کے پاس زیادہ ہوتیں اس کی مردانگی مشکوک سمجھی جاتی۔ اسی لیے شاہانِ سلف کو مردانگی کا امتحان لینا مقصود ہوتا تھا تو اسے گدی سے کھنچوا کر دیکھ لیا کرتے تھے۔ عورتوں کی مردانگی جانچنے کے لیے بھی یہی طریقہ رائج تھا۔ کچھ بے وقوف مورخ اسے بادشاہ کی ظالمانہ ذہنیت پر محمول کرتے ہیں۔

ادبستان، دین دیال روڈ، لکھنؤ۔ ٣-٢٢٦٠٠

'زبان یار' ہمیشہ تُرکی ہوتی ہے جس سے وہ تُرکی بہ تُرکی چلتا ہے اور عاشق بےچارہ جسے تُرکی پڑھنے سے اللہ واسطے کا بیر ہے، تال سے بےتال ہو جاتا ہے۔

زبان دو رنگ کی ہوتی ہے۔ سرخ یا سیاہ۔ سیاہ زبان والے کو کل جبا کہتے ہیں۔ کل جبے میں پیش گوئی کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہوتی ہے مگر تھوڑے سے فرق کے ساتھ۔ اس کی پیش گوئیوں کا تعلق سراسر تیرہ بختی سے ہوتا ہے۔ حالانکہ ہر پیش گوئی کے بعد خود اس پر سیختیری وقت آپڑتا ہے۔

## ۴۔ آنکھ

آنکھ دیکھنے کے لیے عطا ہوئی ہے مگر اسے بیشتر مارنے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ یہ اپنا شہتیر نہیں دیکھ پاتی مگر دوسرے کی آنکھ کی پھانس دیکھ لیتی ہے۔

جاہ و مال کے حصول کے لیے آنکھ میں سور کا بال ڈالنا بہت مفید ہوتا ہے حالانکہ کچھ آدمی بھی اتنے با برکت ہوتے ہیں جن کے لیے سور تک کی آنکھیں ترستی ہیں۔

آنکھیں کئی رنگ کی ہوتی ہیں۔ سفید اور لال پیلی زیادہ ہوتی ہیں۔ سفید کی سیتا پور آئی ہاسپٹل اور لال پیلی کی افراط تھانوں میں ہوتی ہے۔

لوگ عجیب عجیب چیزیں آنکھ میں لگانے کی حسرت رکھتے ہیں۔ ایک صاحب جو گھوڑ دوڑ کے شوقین تھے، کہا کرتے تھے کہ عربی نسل کا گھوڑا تو اب آنکھ میں لگانے کو نہیں ملتا۔ کچھ دنوں بعد خبر ملی کہ وہ اندھے ہوگئے۔ غالباً انہیں مذکورہ نسل دستیاب ہوگئی تھی۔

پہلے ایک آنکھ خراب ہو جانے پر آدمی کانا اور دونوں خراب ہو جانے پر زندگی بھر اندھا رہتا تھا مگر اب عمل جراحی کے ذریعے خراب آنکھ جیتی جاگتی آنکھ سے بدلی جا سکتی ہے۔ معشوق کی آنکھیں آپریشن کے بغیر بھی بدل جاتی ہیں۔ ثبوت کے لیے دیکھیے دیوان آغا حسن امانت معروف بہ "خزائن الفصاحت"

کہتے ہیں دل کے بھی آنکھیں ہوتی ہیں مگر ان سے دیکھنے کے لیے چہرے پر لگی ہوئی روایتی قسم کی آنکھوں کو بند کرنا ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے محض دل کی آنکھوں کے سہارے سڑک پار کرنے کی کوشش کی تھی نتیجے میں آج تک بیساکھیوں کے سہارے چل رہے ہیں۔

آنکھیں کھلی رکھنا اچھی صفت ہے اور اچھی صفت کی قدر نہیں ہوتی اسی لیے لوگ نیند کی گولیاں کھاتے ہیں۔

راہ چلتے آنکھوں کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے، گدی کے پیچھے نہیں، (کہ وہ مقام عقل کے لیے مخصوص ہے) یا یوں کہیے کہ گدی کو ہمیشہ پیچھے رکھنا چاہیے آنکھوں کے سامنے نہیں۔

## ۵۔ ناک

ناک کا اصل کام اگرچہ سونگھنا ہے، لیکن اس کو بہت سے دیگر کار ہائے نالائقہ میں بھی (بلا اجازت صدر) استعمال کیا جاتا ہے۔ سیدھی راہ چلنے کے لیے یہ کمپاس کا کام بھی دیتی ہے۔ اسی لیے ٹیڑھی ناک والے کج رو ہوتے ہیں۔ ناک کی کجی اگر داہنی طرف ہے تو ایسے آدمی کو داہنے بازو والا اور بائیں طرف ہو تو کیا کہیں گے؟ ظاہر ہے۔ "بائیں طرف ٹیڑھی ناک والا"۔

[illegible] ممکن کام بھی الہ دین کے چراغ کی طرح ناک رگڑنے سے پورے [illegible] ہیں بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ الہ دین کا چراغ بھی اسی کے رگڑنے سے حاصل ہوا تھا۔

ناک پکڑنا لوگوں کا محبوب مشغلہ ہے۔ بعض حضرات تو چچا غالب کی طرح عرش سے تحت تک کی ناک تھامے رہتے ہیں۔ خواہ اس کے لیے ہاتھ کو کتنا ہی گھمانا پڑے۔ اس کوشش میں کبھی کبھی ناک اکھڑ کر ہاتھ میں آجاتی ہے اور معنی و مطالب شارح کو چوچنج دکھا کر رفوچکر ہو جاتے ہیں۔

اگلے وقتوں میں (اگر اگلے سے مراد پچھلے ہے) ناک اونچی رکھنے کی خاطر گلے [illegible] معمولی معمولی فائدوں کے لیے اسے جڑ سے اُڑا دینے میں کوئی [illegible] نہیں سمجھا [illegible] ناک کٹنے کے بعد آدمی دُم کٹے کتے کی مانند بےجھجک اور حیا [illegible] اور زبردست سب پر بھونکتا ہے۔ ایک کو دبا کر اور دوسرے سے لاتیں کھا کر خوش رہتا ہے۔ ایک کھیل بھی ایسا ہے جس میں ناک آؤٹ کی بڑی اہمیت ہے۔

بقول سید محمد جعفری ناک کی ایک قسم 'خندناک' بھی ہوتی ہے۔ یہ ہمہ وقت پھولتی پچکتی رہتی ہے اور اس میں سے نزلے کے بغیر [illegible] کی آواز آیا کرتی ہے۔

ناک والوں کو دقیانوسی سمجھا جاتا ہے۔ ناک کی وجہ سے ہونے والی محرومیوں کا احساس بڑھاپے میں شدید ہوتا ہے جبھی تو ضعیف لوگ زکام کے بہانے رومال سے پکڑ پکڑ کر ناک کو اکھاڑنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔

راقم السطور بذاکو، جیسی بھی ہے، اپنی ناک عزیز ہے لیکن کبھی کبھی کی زبردستی سے تو کبھی کبھی اپنی ناک بھی کٹا دینے کو جی چاہنے لگتا ہے اور بےساختہ یہ کلمۂ کفر زبان سے پھسل پڑتا ہے کہ "بارالہٰ، اگر ناک بنائی تھی تو مکھی نہ بنائی ہوتی اور مکھی بنانی اتنی ہی ضروری تھی تو راقم السطور کو ناک سے آزاد رکھا ہوتا یا کم سے کم دونوں کی تخلیق کی مصلحت سے تو آگاہ کر دیا ہوتا۔"

موتی نندی / ایس۔ ایم۔ جیات

# شہر کی سیر

دلال پچاس سال کی عمر ہو جانے کے باوجود ابھی کنوارا تھا. وجہ یہ تھی کہ اس کا کوئی بھی رشتہ دار نہیں تھا، جو اس کی شادی کے لیے کوشش کرتا. وہ درزی کی دکان پر کام کرتا اور ماہانہ اسی روپے اجرت پاتا. اپنے نیک دل پڑوسیوں کی کوششوں سے اس نے آخر قریب کے گاؤں کی ایک لڑکی سے شادی کرلی.

اس لڑکی کا بھی کوئی نہ تھا اس لیے دلال اس کا خاص طور پر خیال رکھتا. ایک دن وہ اپنی بیوی سے وعدہ کر چکا تھا کہ اسے کسی دن کلکتہ شہر گھمالائے گا. ایک دن اس نے پانچ روپے زیادہ کمالیے تو وہ اپنی بیوی کو ساتھ لیے کلکتہ گھومنے نکل پڑا. آدھے دن کی چھٹی منظور کرالی. شیو بنائی، جوتوں کو پالش سے چمکایا اور لانڈری سے منگوائے ہوئے دھلے کپڑے پہنے، بالوں کو اتنی احتیاط سے سجایا کہ چاندی کا جو بالہ اس کے سر پر چمک رہا تھا، چھپ جائے۔ تھوڑے بہت سفید بال کھینچ کر نکال بھی دیئے۔

اس کی بیوی گری بالا نے بھی اپنی بیش قیمت ساری پہنی۔ سبز ریشمی ساری، جو اسے پلیڈر صاحب کی بیوی نے تحفے کے طور پر دی تھی. پلاسٹک کی چوڑیاں پہنیں، سبز سلیپر پہنے، جن میں چاندی نما فیتے بندھے ہوئے تھے، پیروں کو گلابی رنگ سے سجایا. بالوں کو سرخ فیتے میں باندھ کر انہیں ایک بن کی شکل میں نہایت ہی سلیقے سے باندھا. چہرے کو صابون سے خوب رگڑ رگڑ کر صاف کیا. دلال کو جوتے بری طرح کاٹ کھانے لگے تھے. اس کے علاوہ اسے محلے کے لڑکوں نے ایسی شرارت آمیز نظروں سے دیکھا تھا کہ وہ پریشان ہو گیا اس خیال سے کہ وہ شہر کی بھیڑ میں اپنی بیوی گری بالا کو کہیں کھو نہ دے اور بھی بے چین اور پریشان تھا. وہ گھر سے نکلے ہی تھے کہ ہیلتھ سینٹر کی ایک نرس نے کھڑکی سے جھانک کر گری بالا کو اپنے پاس اندر بلایا. اس کی پیشانی پر پھیلے ہوئے پاؤڈر کو پونچھا. اس کے ماتھے پر ایک ٹیکا لگا کر اس کے گال نوچتے ہوئے دلال سے کہا "تمہیں کتنی خوبصورت بیوی ملی ہے". یہ سن کر دلال کا سینہ فخر سے تن گیا اور وہ اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لیے ایک خاص ادا کے ساتھ گلی کے فرش پر اپنے بوٹوں سے کھٹا کھٹ کی آواز پیدا کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا.

ٹرین میں بہت بھیڑ نہیں تھی. پھر بھی کھڑکیوں کے پاس کی سیٹوں پر مسافروں نے قبضہ کر لیا تھا. گری کو کھڑکی کے پاس بیٹھنا شاید اچھا لگے، یہی سوچ کر دلال نے ایک مسافر سے کہا "یہ عورت بیمار ہے، اسے ہوا کی ضرورت ہے، کیا آپ اس کے لیے اپنی سیٹ دے سکتے ہیں؟" مسافر نے پہلے تو اخبار کی اوٹ سے دلال کو دیکھا۔ پھر گری پر ایک نظر ڈالی اور دوسری سیٹ پر چلا گیا. گری نے اپنے شوہر پر تحسین نظر ڈالی۔ دلال کا سینہ فرطِ مسرت سے پھول گیا اور اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ آج بیڑی نہ پیئے گا.

ہوڑہ اسٹیشن پر اترتے ہی دلال نے گری کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا کیونکہ اوباش لوگ ان کے گرد گھومنے لگے تھے. وہ گری کو سنبھالتے ہوئے اسٹیشن سے باہر لے گیا. ہوڑہ پر بنے لوہے کے پل کو وہ حیرت سے دیکھنے لگی. غیر ارادی طور پر گری کے منہ سے حیرت کا اظہار ہو ہی گیا. پھر دلال نے کسی شہنشاہ کی طرح، جو اپنی دولت کا مظاہرہ کر رہا ہو، ندی کے اس طرف کھڑی ایک فلک بوس عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "دیکھا تم نے! وہ بیس منزلہ عمارت ہے. میں ایک بار اسے دیکھ چکا ہوں!"

یہ سراسر جھوٹ تھا. دلال اس کے پاس تک نہیں پہنچا تھا. دوسری فلک بوس عالی شان عمارتوں کا نظارہ کرنے کے بعد گری بالا کی نگاہوں میں بھری حیرت اور استعجاب کو دیکھ کر دلال خود کو بہت اونچا محسوس کرنے لگا. وہ ایک بت دنی سنجیدگی اور شان کے ساتھ بتاتا چلا جا رہا تھا۔ "یہ بسیں ڈبل ڈیکر کہلاتی ہیں. میں تمہیں ان میں بٹھاؤں گا. واپس لوٹتے لوٹتے رات ہو جائے گی. ہم ہوڑہ پل پر سے گزریں گے. بہت اچھا معلوم ہوگا. تم دیکھو گی کہ کتنی خوبصورت جگہ ہے."

گری ندی کے زینے پار کرکے نچلے زینے تک پہنچی، بہتے پانی کو چھوا، اور اپنے دونوں ہاتھوں کو عقیدت سے جوڑتے ہوئے سر کو احتراماً جھکا دیا۔ یہ منظر دیکھتے ہوئے دلال نے بھی یہی کیا۔

"کتنا اچھا ہوتا اگر ہم پانی کا جگ یا کوئی اور برتن ساتھ لاتے!" گری بالا نے کہا۔

دلال کو یہ عجیب سا محسوس ہوا۔

"اور تم پانی کا برتن لیے سارا شہر گھومتی پھرو گی! فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں کل ہی گنگا جل سے بھرا ایک برتن لا دوں گا۔"

دونوں بس میں بیٹھے اور بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ پل پر سے گزرتے وقت ہوا کے ایک تند جھونکے سے گری بالا کی ساری کا پلو —— لہرانے لگا۔ گری بالا کو یہ بہت اچھا لگا۔ وہ ساری کے پلو کو مضبوطی سے پکڑے بیٹھی رہی۔ دلال سرِ راہ گزرتے ہوئے نظاروں کی تفصیلات بتاتا جا رہا تھا۔ ڈلہوزی پہنچتے ہی، جہاں بہت سے دفتر ہیں، بس میں مسافروں کی بھیڑ بڑھنے لگی۔ اور اس کے ساتھ ہی دلال کی پریشانی بھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح دھرم تلہ پر اترے۔ وہ گری بالا کو لیے آگے بڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں بدمعاش لوگ اس کی بیوی کو پیچھے سے چھو نہ لیں۔ پھر وہ مجبوراً بھیڑ میں سے جگہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ لیکن۔ گری بالا آگے بڑھ نہ سکتی تھی۔ وہ جہاں رہتی وہیں رک جاتی اس سے پیچھے کھڑے ہوئے مسافر مضطرب اور بے چین ہو جاتے۔ بعض جھلاہٹ میں فقرہ بازی پر اتر آتے تھے۔ کسی نہ کسی طرح گری بالا نچلے حصے میں آ گئی۔ وہ بہت تھک گئی تھی۔ بس کے نچلے حصے کی حالت اور بھی بری تھی۔ اس بار گری بالا نے بہت ہمت کی۔ اس کے آگے جو بھی آتا اسے دھکیلتے ہوئے آگے بڑھنے لگی اور اپنی منزل پر اتر گئی۔ بس فوراً چل پڑی۔ دلال نے محسوس کیا کہ دو مضبوط اور کرڈیل ہاتھ اس کا راستہ روکے ہوئے ہیں۔

بس چل پڑتے ہی وہ چیخنے لگا۔ یہاں تک کہ اس نے چھلانگ لگا دینے کی کوشش کی لیکن کسی مسافر نے اس کے کالر کو پکڑ کر اسے اندر گھسیٹ لیا۔ "کیا بس کے نیچے دب کر مرنے کا ارادہ ہے؟" اب بس رفتار پکڑ چکی تھی۔ "لیکن وہ اکیلی ہے" اس نے ہمکلامی کے انداز میں کہا۔ اس کے بدن پر کپکپی سی طاری ہو چلی تھی۔ وہ خوف زدہ اور پریشان سا ہو گیا۔ دوسرے اسٹاپ پر اس نے محسوس کیا کہ اسے باہر دھکیل دیا گیا ہے۔ گرتے سنبھلتے وہ کھڑا ہو سکا اور پھر دوڑنے لگا۔ چند قدم دوڑتا — اور پھر رک کر اپنے گرد و پیش پر نظر ڈال کر اپنی گری بالا کو تلاش کرتا — لیکن گری بالا کہیں نظر نہ آئی، وہ پھر دوڑنے لگتا۔ آخر اسے گری بالا مل گئی۔ اپنے چہرے کو ساری کے پلو سے آدھا چھپائے وہ کھڑی رو رہی تھی۔ دلال اس کے پاس پہنچا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی اور اسے صرف تکتی رہ گئی۔

"ارے تم ڈر گئیں؟ یہاں پر گم ہو جانا اتنا آسان نہیں ہے" — دلال نے ایک جبری مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر پیدا کرکے کہا۔

جب وہ دونوں چلنے لگے تو گری بالا نے بتایا کہ اس کا ایک سلیپر بس ہی میں رہ گیا ہے۔ دلال پریشان ہو گیا۔ پھر اس نے سوچا کوئی بات نہیں۔ میں دوسری خرید لوں گا۔ اس ایک سلیپر کو اپنی جیب میں ٹھونستے ہوئے اس نے دیکھا گری بالا کے پاؤں کتنے چھوٹے ہیں!

وہ گلیوں اور کوچوں میں گھومتے رہے۔

آخر گری بالا کے چہرے پر تھکن کے آثار نمودار ہو گئے۔ اسے آرام کی سخت ضرورت تھی۔ دلال کو فوراً یاد آیا کہ گلی کے موڑ پر بائیں طرف اس کے دوست رائے کی چائے کی دوکان ہے۔ لیکن دلال کو فوراً یہ خیال آیا کہ پانچ سال قبل اس نے رائے سے دو روپے بطور قرض لیے تھے، لیکن وہ اسے ادا نہ کر سکا تھا۔ اگر اس بوڑھے کو وہ پرانا قرضہ یاد آ گیا اور وہ ادائیگی کا مطالبہ کر بیٹھے تو بات بگڑ جائے گی۔ بات نازک تھی لیکن آج تو اس کے پاس پانچ روپے کا ایک بالکل نیا نوٹ ہے اور کچھ ریزگاری بھی۔ اگر وہ مطالبہ کرے تو یہ ادا کر دے گا۔ لیکن رائے ایک نیک دل انسان ہے۔ خوش اخلاق اور سلیم الطبع بھی۔ اس نے قرض معاف کر دیا ہوگا۔ اور آج تو گری بالا بھی اس کے ساتھ ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ان دونوں کی چھوٹی سی ضیافت کا اہتمام بھی کر دے۔

"کبھی تم نے کٹ لٹ کھایا ہے؟" دلال نے گری بالا سے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"چلو میرے ساتھ، میں آج تمہیں کٹ لٹ کھلاؤں گا۔"

وہ گری بالا کو ساتھ لیے اس ریستوران پر پہنچا لیکن وہاں کاؤنٹر پر اس کا دوست نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی جگہ ایک خوبصورت نوجوان بیٹھا تھا۔ اس کے حوصلے پست ہو گئے۔ اس کا سارا جوش صابون کے جھاگ کی طرح بیٹھنے لگا۔ بوڑھا اس ریستوران کو فروخت کر دے۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ یہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ اسی وقت کندھے پر رومال رکھے آدمی نے انہیں اندر آنے کے لیے اشارہ کیا۔

"رائے نظر نہیں آ رہے ہیں؟" دلال نے ہمت کرکے پوچھا۔

"وہ آج کل دکان پر نہیں آتے۔ سارا کاروبار ان کے بیٹے ہی سنبھال لیتے ہیں۔ بابوجی شام کو تھوڑی دیر کے لیے آتے ہیں۔"

رائے بہت ہی ہوشیار اور کافی سمجھدار آدمی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا کاروبار کے گر جان لے۔ اسے تجربہ ہو جائے گا۔ وہ شام کو یہ دیکھنے کے لیے آتا ہے کہ اس کا یہ خیال کہاں تک صحیح ہے۔

دلال خوش پوش نوجوان کے پاس

پہنچا اور اس سے پوچھا۔ "تم رائے کے بیٹے ہو؟ بہت خوشی ہوئی تمہیں دیکھ کر۔ تم بہت چھوٹے تھے۔ میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ میرا نام دلال منّا ہے۔ میں الو بیری کا رہنے والا ہوں۔ رائے اور میں دونوں جنگ سے پہلے سیالدہ میں ایک بورڈنگ ہاؤس میں کام کرتے تھے۔"

نوجوان نے اپنی عینک کے شیشوں سے ان دونوں کو تلخ نظروں سے دیکھا۔ دوسرے گاہک کا بل لینے کے بعد اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "بابا آج نہ آئیں گے۔"

دلال کو مایوسی ہوئی۔ کیا وہ واپس لوٹ جائے؟

نوجوان نے خشک لہجے میں پوچھا۔ "کوئی خاص کام ہے بابا سے؟"

"جی نہیں، ہمارا برسوں کا یارانہ ہے۔ میں جب بھی کلکتہ آتا ہوں اُن سے ملے بغیر نہیں جاتا۔ رائے مجھ سے ہمیشہ اپنے چھوٹے بھائی کا سا برتاؤ کرتے رہے۔ ان سے ملے کافی مدت ہوگئی ہے۔"

نوجوان کی بے توجہی سے ظاہر تھا کہ دلال کی باتوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ حساب کتاب درست کرنے لگا تھا۔ دلال دم بخود کھڑا رہا۔ پھر گری بالا کے پاس آیا۔ "رائے ابھی تک نہیں آیا ہے، ہم باہر ہی اس کا انتظار کریں گے۔"

وہ دونوں ریستوران سے کچھ دور ہی کھڑے ہو گئے۔ ڈھیلی سی قمیص پہنے ایک لانبے سے قد کا آدمی ریستوران میں داخل ہوا۔ اس کی شباہت رائے جیسی ہی تھی۔ دلال نے اسے بغور دیکھا۔ اُس نے دیکھا رائے کا بیٹا اسے کچھ بتا رہا ہے۔ وہ بوڑھا آدمی سر لٹکائے سب کچھ سنتا رہا۔ یہ رائے کے سوا دوسرا کوئی ہو نہیں سکتا۔ دلال کو یقین ہو گیا۔ رائے ریستوران کے باہر جھکے قدموں سے چلا آیا۔ اس کا چوڑا چکلا جسم خمیدہ ہو چکا تھا۔ اس کے لانبے لانبے ہاتھ بانس کی طرح اس کے جسم سے چپکے ہوئے تھے۔ جوانی میں وہ اتنا خوبصورت اور شکیل تھا کہ اس پر کسی یونانی دیوتا کا گمان ہوتا تھا۔ یہ کتنا بدل گیا ہے۔ اس کی مونچھیں بھی غائب ہوگئی ہیں۔

"کیوں بھئی رائے۔ پہچانا مجھے؟" دلال نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"اوہو! دلال!! کیسے ہو یار؟" رائے نے دلال کا ہاتھ نہایت ہی گرم جوشی سے تھام لیا۔

"بس گزر رہی ہے لیکن تم نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔؟"

"کرتا بھی کیا۔ بڑھاپا آگیا ہے۔ زندگی کے ساٹھ سال گزر چکے ہیں۔ صحت جواب دے چکی ہے لیکن تم تو ویسے کے ویسے ہی ہو!"

"تمہیں پتہ ہے۔ میں نے شادی کرلی ہے۔" دلال نے ایک احمقانہ ہنسی کے ساتھ کہا۔

"اس عمر میں؟ یہ کیا کیا تم نے؟ وہ تو بچی سی لگ رہی ہے کیسے نبھ رہی ہے؟" رائے نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

غلطی کا احساس دلال کے بشرے سے مترشح تھا۔ اس کی آنکھیں زمین میں دھنستی جا رہی تھیں۔ اس نے ندامت کے انداز میں کہا۔ "گری بالا بہت اچھی لڑکی ہے۔ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ گری! اپنے بھائی صاحب کے پیر چھوؤ۔"

گری نے رائے کے پیر چھوئے۔ محلے کے لوگوں کے لیے یہ ایک دلچسپ منظر رہا۔ رائے نے دعائیں دیں اور کہا۔ "مجھے معاف کرنا بھائی، میرے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں میں تمہیں بٹھاتا اور خاطر تواضع کرتا۔ اب دکان میرے بیٹے کی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ تم نے اپنے بیٹے کے لیے کتنی محنت مشقت کی۔ کتنی تکلیفیں اُٹھائیں، کتنی سختیاں جھیلیں۔ اب تمہیں آرام کی ضرورت ہے" دلال نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

رائے نے سڑک پر ادھر اُدھر گھومتے ہوئے لوگوں پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈالی اور حسرت بھری آواز میں کہا۔ "تمہیں معلوم ہے۔ وہ مرگئی؟"

"تمہارا مطلب ہے۔ وہ بیٹھک خانہ والی؟"

"ہاں، ہیضہ ہوگیا تھا۔ میں نے لاکھ کوشش کی، لیکن وہ بچ نہ سکی۔ مقروض بھی ہوگیا۔ گھر میں ایک زبردست طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ آخر میں نے دوکان اپنے بیٹے کو سونپ دی۔ گھر پر کچھ کھانے کو مل جاتا ہے اور سر چھپانے کے لیے تھوڑی سی جگہ بھی۔ شراب کی لت بھی چھٹ گئی۔ بیٹے سے ہمیشہ پیسے مانگ بھی نہیں سکتا۔ تمہارے اپنے بیٹے کے ہاتھوں تمہاری ذلت ہو، یہ بہت شرمناک بات ہے۔ تم نہ سمجھ سکوگے، خیر، اس طرف کیسے نکل پڑے؟" رائے نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ اس کا چہرہ کرب اور غم کا مرقع بن چکا تھا۔

"تمہیں یاد ہوگا، میں نے تم سے دو روپے بطور قرض لیے تھے۔ یہ پرانا قرض مجھے لوٹانا تھا اور گری بالا کو کلکتہ گھمانے کا ایک وعدہ بھی تھا۔"

رائے کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"دیکھا تم نے۔ یہ میرا فرض تھا کہ میں تمہاری مہمان نوازی کرتا۔ لیکن تم مجھے میرا پرانا قرض لوٹا رہے ہو۔!"

"میں تکلفات پسند نہیں کرتا۔"

دلال نے اپنی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا۔ اُسے ریزگاری کی ضرورت تھی۔ اس کے ذہن میں ایک بات آئی۔

"تھوڑی دیر یہیں رہو۔ میں نے گری کو کٹ لٹ کھلانے کا وعدہ کیا ہے ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔"

دلال اپنی بیوی کو لیے ریستوران میں داخل ہوا۔ کاؤنٹر پر کھڑے بیرے نے انہیں تحقیر آمیز نگاہوں سے دیکھا، جس پر دلال کو غصہ آگیا۔

"کیا یہاں بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ خالی ہے؟" دلال نے کرخت لہجہ میں پوچھا۔

گری بالا چونک پڑی۔

"کیا چاہیے آپ کو؟"

"ہم کچھ کھانا چاہتے ہیں۔"

"اندر آجائیے آپ"۔

دونوں ایک کیبن میں جا بیٹھے۔

"دو کٹ لٹ لے آؤ اور ہاں، بالکل تازہ چاہیئے۔" دلال نے آرڈر دیا۔

دیوار پر ایک عورت کی تصویر آویزاں تھی۔ گری بالا نیچی نگاہیں کیے بیٹھی رہی۔

"سنا تم نے بیرے نے کیا کہا؟" اس نے زیر لب گری سے کہا۔ "تم نے دیکھا۔ اس کا برتاؤ ہمارے ساتھ کیسا تھا۔ ٹھیک ہے، میں بیرے کو چونی بخشش میں دیدوں گا۔"

جبھی ایک بلی ٹیبل کے نیچے گھس آئی۔ اس کی دم دلال کے قدموں کو چھونے لگی تھی۔ دلال نے بیچاری بلی کو ایک زوردار لات مار کر بھگا دیا۔ ساتھ ہی کٹ لٹ کی پلیٹ بھی صاف کر دی۔

"اب ہم چاپس کھائیں گے۔ ایسا نالائق بیٹا کسی دشمن کے بھی نہ ہو۔ بوڑھا باپ اس سے کچھ مانگے اور وہ اسے دھتکار دے۔ نہ جانے کیا سمجھ بیٹھا ہے وہ اپنے آپ کو۔ سب کو اپنے باپ کی طرح بھکاری سمجھ رکھا ہے۔"

چاپس تیار ہونے میں دیر تھی۔ دلال چیخا

"ارے چاپس کب آئے گی؟ جلدی کرو!"

نوجوان نے پردہ کھسکا کر اندر دیکھا اور کہا۔ "چلاتے کیوں ہو۔ چاپس تلنے میں دیر ہی ہو گی۔"

"میرے پاس فاضل وقت نہیں ہے۔ جو کچھ بھی تیار ہو لے آؤ!"

"شوربا تیار ہے۔ بھجوا دوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ جلدی کرو!"

نوجوان کے چلے جانے کے بعد دلال نے اپنی بیوی سے کہا۔

"میں جانتا ہوں کس طرح رائے نے اس بزنس کو بنائے رکھنے کے لیے دن رات محنت کی۔ آج اس کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں بیرے کو اٹھنی بخشش دوں گا۔ تاکہ اس نوجوان کو پتہ چلے کہ اس کا باپ اپنے وقت کے معزز ہستیوں کو جانتا اور پہچانتا تھا۔"

شوربا ختم کرنے کے بعد دلال نے بل طلب کیا۔

"چائے نہیں پیو گے صاحب؟"

"نہیں ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔"

بل آیا۔ اس کی رقم کو دیکھ کر دلال کا پیٹ خالی خالی نظر آنے لگا۔ گری بالا اپنے دانتوں میں اٹکے ہوئے گوشت کی نس کو نکالنے میں مضحکہ خیز شکل بنائے بیٹھی تھی۔ دلال نے پانچ روپے کا نوٹ پلیٹ میں رکھ دیا۔ بیرا بقیہ رقم کے لیے چلا گیا۔ اس دوران دلال نے جلدی سے بل کا حساب لگایا۔ دو روپے بارہ آنے، باقی رہے دو روپے چار آنے جو ٹرین کے سفر کے لیے کام آجائیں گے۔ رائے کو ادا کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی رقم باقی نہ رہے گی۔

بیرا بل اور چند سکے لے آیا۔ اسے اپنا ارادہ یاد آیا کہ وہ بیرے کو اٹھنی ٹپ دے گا۔ تب اس کے پاس ٹرین کے سفر کے لیے کچھ پیسے نہ بچیں گے۔ انہیں کلکتہ شہر سے الوبیرے کی مسافت پیدل ہی طے کرنی پڑے گی۔ اس نے بچت کی ساری رقم اپنی جیب میں ڈال لی۔ باہر جھانکا۔ رائے کہیں نظر نہ آیا تھا۔ وہ خوش خوش گلی میں اتر آیا۔ وہ جونہی میٹھا پان خرید کر آگے بڑھا، اسے رائے کی آواز سنائی دی۔ وہ گلی کے اس موڑ سے آواز دے رہا تھا۔ دلال پتھر کے بت کی طرح کھڑا ہو گیا۔ رائے کے ہاتھ میں پلاسٹک کا شنگرفی کیس تھا۔ اس نے گری بالا کو وہ کیس دیتے ہوئے کہا۔ "تم اتنی دور آئی ہو اور میں تمہیں بغیر کسی تحفے کے صرف آشیرواد دوں، یہ اچھا نہ معلوم ہوا۔ یہ تحفہ قبول کر لو۔"

گری بالا رائے کو اسی حیرت سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ ہوڑہ پل اور دوسری فلک بوس عمارتوں کو دیکھتی رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر دلال نے نوٹوں کو ڈھونڈ نکالا۔ "تو تم یہاں ہو؟"

"میں بہت دنوں کے بعد آج شراب پیوں گا تمہارا بے حد شکریہ میرے دوست۔" رائے نے دلال کے کان میں سرگوشی کی اور بے تحاشہ بھاگنے لگا۔

"میں نے ویٹر کو بخشش نہیں دی۔ نہیں دی نا۔؟" دلال نے اپنے حافظہ پر زور دیا۔

"مجھے پتہ نہیں!" گری بالا نے کہا۔

دلال نے اپنی جیب سے سارے سکوں کو نکالا اور گننے لگا۔ ترپن پیسے نکلے۔ وہ سیدھے ریستوراں پہنچا۔

"کیا آپ اس ویٹر کو بلا سکتے ہیں جس نے ہماری خدمت انجام دی۔ میں اسے بخشش دینا بھول گیا تھا۔"

دلال نے ویٹر کی ہتھیلی پر سارے سکے رکھ دیئے۔

ویٹر نے حیرت سے دلال کے آگے اپنا سر جھکا دیا۔

ہوڑہ برج پر سے گزرتے ہوئے دلال نے محسوس کیا کہ سانس لینی مشکل ہو گئی ہے۔ وہ باڑ کا سہارا لئے کر کھڑا ہو گیا اور سیاہی مائل پانی کو دیکھنے لگا۔ کیا یہ سب کچھ مصیبت اٹھانے کے لائق ہے۔ قریب سے دوڑتی ہوئی ٹرام گاڑیوں کی رفتار سے پل ہلنے لگا تھا۔ کیا یہ عظیم الشان لوہے کا پل ٹوٹ جائے گا۔؟ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ غریب آدمی تھا۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اسے زندہ رہنے کی تمنا تھی۔ گری بالا کو پالینے کے بعد وہ بہت دنوں تک زندہ رہنا چاہتا تھا۔ صدیوں تک زندہ رہنا چاہتا تھا۔

"ہم گھر کیسے لوٹیں گے؟" اس نے رازدارانہ انداز میں گری بالا سے پوچھا۔ "میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔"

گری بالا نے حیرت سے پھٹی آنکھوں سے دلال کو دیکھا اور مسکرانے لگی اور کہا۔ "تمہیں پتہ ہے جبکہ ویٹر تمہارے آگے ادب سے سر جھکائے کھڑا تھا تو تم پولیس کے کوئی بڑے افسر معلوم ہو رہے تھے"

وہ دونوں مسکراتے ہوتے اپنی راہ پر چل پڑے ۔۔۔!!

■■

مہدی عباس حسینی

# ذات کی تلاش اور ماضی کی بازیافت

ذات کی تلاش کے دو طریقے ہوتے ہیں ۔ یا تو شاعر میرا جی کی طرح خود مرکوز ہو کر ذات کی بھول بھلیاں میں گم ہو جاتا ہے یا وہ ذات کی جڑوں کو فطرت اور سماج میں ڈھونڈتا ہے ۔ والی آسی اپنے مجموعۂ کلام "شہد" میں اپنی جڑوں کی تلاش میں کنبے اور قصبے کی اکائی تک جا پہنچے ہیں ۔ جہاں شریف شرفا، جن کا شمار اب نچلے متوسط طبقے میں ہوتا ہے، بچے کچھے مشترکہ کنبے میں بیوی، بچوں کو پیچھے چھوڑ کر روزی روٹی کی تلاش میں باہر نکل جاتے ہیں ۔ والی اس قصبے کو ان لفظوں میں یاد کرتے ہیں!

اندھیرا ہی نصیبوں میں لکھا کر لائے ہیں، لیکن
دیئے کچھ مقبروں میں کر کے روشن چھوڑ آئے ہیں

اس مہاجرت کے باعث دیہی اور شہری زندگی میں جو آویزش ہوتی ہے' اس کا بیان اردو غزل میں شاید پہلی بار والی آسی نے کیا ہے ۔

یہاں کچھ کارخانے کچھ ملوں کی چمنیاں ہوں گی
نہ اب گیہوں نہ سرسوں کی سنہری بالیاں ہوں گی

کسی آواز پہ ٹھہرے تو ہو جاؤ گے پتھر کے
کہ اس جنگل میں چاروں اور جادوگرنیاں ہوں گی

بکھرتے ٹوٹتے رشتوں کی اک لمبی کہانی ہے
کسی کو کیوں کوئی الزام دے، مجبوریاں ہوں گی

شہروں کی تپتی سڑکوں پہ جلتی ہوئی دوپہروں میں ہمیں
سونے سونے دالانوں کے ٹھنڈے کمرے یاد آتے ہیں

دو وقت کی روٹی کی خاطر بہروپ بھرے پردیس پھرے
چلو والی اب گھر لوٹ چلیں نیچے بابے یاد آتے ہیں

آسی کا دوسرا مسئلہ جو آج کل ہر حساس ادیب انسان کا مسئلہ ہے، فسادات ہیں

خدا میری بینائی کو چھین لے
اگر اب کسی سر کی چادر جلے

مرے گھر میں کہرام ہوتا رہا
مگر میرا ہمسایہ سوتا رہا

مجھے دو میٹھے بولوں کی طلب ہے
لیے ہاتھوں میں کاسہ پھر رہا ہوں

اکیلا قاتلوں کی بستیوں میں
کئی دن سے نہتا پھر رہا ہوں

میں بچوں کی طرح کاغذ کے ٹکڑے
ہواؤں میں اڑاتا پھر رہا ہوں

والی آسی کا ایک اور لہجہ بھی ہے، جو ہندی شاعری کی روایات سے قریب تر ہے ۔ ان کی بہتیری غزلوں میں محبوبہ نہیں، برہ کی ماری بیوی کا ذکر ہے ۔ کبھی کبھی والی کی زبانی:

سگرٹیں، چائے، دھواں، رات گئے تک بحثیں
اور کوئی پھول سا آنچل، کہیں نم ہوتا ہے

تمام عمر مری راہ دیکھنا لیکن
کبھی چڑھے ہوئے دریا کو پار مت کرنا

اور کہیں کہیں خود اس کی زبانی:

لکیریں کھینچ کر دیوار پر ہم روز گن لیں گے
مگر خط بھیجنے کا روز تم بھی سلسلہ رکھنا

اسی امید پہ بالوں کو چاندی کر لیا ہم نے
نہ جانے گرمیاں کب آئیں گی کب چھٹیاں ہوں گی

غزل کا ایک اور نیا لہجہ جس میں کلاسیکی نکھار بھی ہے اور نئی بات کہنے کا عزم بھی اصغر حیدری ہوش کی "گریز" میں ملتا ہے ۔ ہوش متوسط طبقہ کی امیدوں اور مایوسیوں، کم ہمتی اور حوصلہ اور حقائق سے چشم پوشی کی سعی لاحاصل کی عکاسی بھی کرتے ہیں ۔ اور اس پر طنز بھی

کبھی وہ قرب نہ پایا کہ اس کو چھو لیتا
میں اس کو چھو نہ سکوں اتنا فاصلہ بھی نہیں

پرچھائیوں کو لوگ سمجھنے لگے ہیں قد
اس بات کا جواب تو بس دوپہر میں ہے

برپا کیا گیا تھا غریبوں کا جشن
شامل تھے اس میں شہر کے سارے امیر لوگ

اس پیڑ کے پرندے بھی کتنے عجیب ہیں
بیٹھے ہیں خشک ڈال پہ اور بال و پر میں ہیں

آؤ، چلو تلاش کریں زندگی کہیں
اس شہر میں تو لوگ ابھی خیر و شر میں ہیں

زندگی کی تلاش میں "اضافہ" کے شاعر رحمت امروہوی نے ترکِ وطن بھی کر کے دیکھ لیا ۔ امروہہ کے زمیندارانہ ماحول سے احمد آباد کے مل مزدوروں کی دنیا تک کے سفر نے رحمت کو ایک کھری حقیقت پسندی کا سبق دیا ہے، جس سے ایسے شعر پیدا ہوتے ہیں:

کسی پتھر پہ کچھ پیغام لکھیے
درختوں کے بدن پر نام لکھیے

●

ہم خوگرِ غم ہیں، غم و آلام ہمیں دو
بگڑا ہوا، الجھا ہوا ہر کام ہمیں دو
مے خانہ کی تعمیر میں اپنا بھی لہو ہے
صہبا نہ سہی، دُردِ تہِ جام ہمیں دو

خشک پتے ہیں ہوا کیا دیں گے    ٹھیس لگتے ہی بکھر جائیں گے

قدم قدم پہ عداوت، قدم قدم خطرے
بتا رہے ہیں کہ منزل کا فاصلہ کم ہے

تھک گیا دُعا کر کے، دستِ بے دُعا دیکھوں
کوئی پھل گرے شاید، شاخ تو ہلا دیکھوں

اور پھر وہی فسادات کی بات:

یہ کیسی بھیڑ لگی ہے یہ کیوں کھڑے ہیں لوگ
خدا نہ خواستہ آپس میں لڑ پڑے ہیں لوگ
جدھر سے پہلے بھی اک بار کھو گئے تھے سب
جنوں میں پھر سے اُسی سمت چل پڑے ہیں لوگ

ان تینوں مجموعوں سے ایک بار پھر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو غزل کے امکانات لامحدود ہیں۔ اپنی ساری پابندیوں اور کوتاہیوں کے باوجود، اردو غزل نئے موضوعات، نئی علامات اور نئے خیالات کو ادا کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت اور قدرت کی حامل ہے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ نئی بات ..... سوچنے اور کہنے کا ہی نہیں، سننے کا بھی حوصلہ چاہیے۔

نثر کی چند نئی کتابوں میں قدرِ مشترک ماضی کی بازیافت ہے۔ 'نظیر اکبر آبادی' 'مضامینِ وحشت' "اردو ادب اور بنگالی کلچر" 'کردار کے غازی' قاضی محمد عدیل عباسی اور "سبزہ و گل" سبھی میں چند عہد ساز اور عہد شکن ہستیوں کے تذکرے پائے جاتے ہیں۔ ان میں نظیر اکبر آبادی اور قاضی محمد عدیل عباسی اتر پردیش اردو اکیڈمی کے تعاون سے شائع ہوئی ہیں اور باقی تین کتابیں مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے شائع کی ہیں۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے حیدر آباد میں آنکھیں کھولیں اور وہیں اردو سے اُن کے ابتدائی تعلقات قائم ہوئے، جو خوش قسمتی سے بنگال آنے کے بعد بھی قائم رہے۔ "اردو ادب اور بنگالی کلچر" میں نہ صرف مغربی بنگال بلکہ سابق مشرقی بنگال (حال بنگلہ دیش) میں اردو ادب کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ضمن میں بھٹاچاریہ اس نتیجے پر بھی پہنچے ہیں کہ نہ صرف بنگال میں باہر سے آنے والے اردو ادیب بلکہ خود بنگال میں پیدا ہونے والے اردو ادیبوں نے بھی اپنے کو بنگالی کلچر سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کی ہے جس کا باعث شاید خوش فہمی پر مبنی ایک احساسِ برتری تھا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ جب مشرقی پاکستان وجود میں آیا تو اُس نے اردو سے مونہہ پھیر لیا لیکن تو آج کے بنگلہ دیش میں اُردو کے نام لیوا اب بھی پائے جاتے ہیں (بھٹاچاریہ نے بنگلہ دیش میں شائع ہونے والی اردو کتابوں اور رسائل کی ایک فہرست بھی دی ہے) لیکن وہ محض معدودے چند ہیں۔ تصویر کا دوسرا رُخ پیش کرتے ہوئے بھٹاچاریہ نے دو ایسے اردو ناولوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، جن میں بنگالی کلچر کی صحیح عکاسی کی گئی ہے۔ یہ ناول ہیں: فضل احمد کریم فضلی کا "خونِ جگر ہونے تک" اور "قرۃ العین حیدر کا "آخرِ شب کے ہم سفر" جو یقیناً اردو ادب میں ایک اعلیٰ مقام کے حامل ہیں۔

دراصل بنگال میں اردو کی جڑیں تلاش کرنے اور مُلک کے دیگر علاقوں کو بنگال کے اردو ادیبوں سے روشناس کرانے کا کام علامہ رضا علی وحشت کلکتوی نے شروع کیا تھا، جو نہ صرف سرزمینِ بنگال کے سب سے بڑے اردو شاعر اور پرستارِ غالب تھے، بلکہ اردو اور فارسی کے مسلّم الثبوت عالم اور معلّم بھی۔ مضامینِ وحشت اُن کے اردو مضامین کا مجموعہ ہے جسے جلال الدین صدّیقی نے مرتّب کیا ہے۔ یہ مضامین ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۵۴ء تک شائع ہوئے اور اگر ان میں وہ چند خطوط بھی شامل کر لیے جائیں، جو اس کتاب میں شامل نہیں تو علامہ کی نثری تحریروں کا یہ سلسلہ ۱۹۵۷ء تک جا پہنچا ہے۔ بیشتر مضامین بنگالی اور اردو کے موضوع پر ہیں۔ ان میں "اردو کا تعلق بنگالہ سے" بنگال کا ایک شاعر۔ سید محمود آزاد" ۔ قاضی محمد صادق اختر" "عبد الغفور نسّاخ" "شمس کلکتوی" " وحشت بہ زبانِ خود" اور مکتوبات جو ڈاکٹر عندلیب شادانی کے نام ہیں اور جن میں لطیف ادبی بحثیں ہیں، خاص توجہ کے مستحق ہیں۔

مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی شائع کردہ ایک اور کتاب "سبزہ و گل" ایک مشہور اور کہنہ مشق صحافی جناب رئیس الدین فریدی کی سرگزشتِ حیات اور انتخابِ کلام ہے۔ لیکن چونکہ ۲۶۰ صفحات کی اس کتاب میں حصۂ نظم محض ۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ لہٰذا اُسے نثری کتاب ہی سمجھنا چاہیئے۔ حصۂ نظم یوں بھی روایتی اور صحافیانہ ہے۔ بطور سوانح یہ ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ اس کا باعث یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں آپ بیتی کم اور جگ بیتی زیادہ ہے۔ مصنّف نے بمبئی، دلّی، حیدر آباد اور کلکتہ میں اپنی صحافتی زندگی قلم بند کرتے ہوئے نہ صرف اپنے صحافتی بلکہ ادبی ہم عصروں کا بھی حال لکھا ہے۔ چنانچہ جو حضرات جگر مراد آبادی، روش صدّیقی، ساغر نظامی، حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی، سیدہ اختر، مخدوم محی الدین، شاہد صدّیقی، مولوی سمیع اللہ، گلزار دہلوی، پرویز شاہدی، ہیرالال چوپڑہ وغیرہم کے بارے میں اپنی معلومات میں دلچسپ اضافے کرنا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کی ضرور قدر کریں گے۔

علی احمد فاطمی نے نظیر اکبر آبادی پر خاصا کام کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب نظیر پر اُن کے چھ مضامین پر مشتمل ہے۔ جو بقول اُن کے "نیم تنقیدی اور نیم تحقیقی نوعیت کے ہیں"۔ مصنّف کی رائے میں نظیر کی قلندرانہ شخصیت اور حیات کے اُن گوشوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے، جو ابھی تک مبہم اور تاریک ہیں۔

"نظیر اکبر آبادی کا سماجی و سیاسی پس منظر" میں نہ صرف اس پس منظر کی تفاصیل درج ہیں بلکہ نظیر کے کلام میں اس پس منظر کی نشان دہی بھی کی گئی ہے "سوانح نظیر کے چند حقائق" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نظیر ۱۷۳۵ء میں دلّی میں پیدا ہوئے لیکن چار پانچ سال کے سن میں اکبر آباد چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے "نظیر اور غالب" میں یہ بحث اُٹھائی گئی ہے کہ آیا غالب نظیر کے شاگرد تھے اور اُسے مزید تحقیق طلب کہہ کر چھوڑ دیا گیا ہے۔

ہمیں فاطمی کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ نظیر کا بنیادی کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے "اردو شاعری کو ہندوستانی کلچر سے مالا مال کیا" نظیر اکبر آبادی کی قدآور شخصیت اور اردو شاعری کو اس کی بیش قیمت دین کے پیش نظر یہ ماننا پڑے گا کہ عبدالغفور شہباز اور مخمور اکبر آبادی کی مساعی کے باوجود نظیر پر ہنوز کوئی جامع اور شایانِ شان کام نہیں ہو پایا ہے۔ کیا علی احمد فاطمی اس جہت میں سعی کریں گے۔ یہ ایک سوال بھی ہے اور دعوت بھی۔

قاضی محمد عدیل عباسی (۱۸۹۸-۱۹۸۰) صرف اقبال سے بے حد متاثر تھے۔ بلکہ اُن کے پیش کردہ مسلم آئیڈیل "یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم" کے ہمہ تن مصداق بھی تھے۔ قاضی صاحب نے ۱۹۲۰ء میں بی۔ اے کیا۔ پھر پکّے کانگریسی ہونے کے ناتے تحریکِ ترکِ موالات کے تحت تعلیم ترک کر دی۔ گھر پر مخالفت ہوئی تو سب کو چھوڑ چھاڑ کر اپنے پیر و مولانا حسرت موہانی کے پاس چلے گئے۔ ۱۹۲۱ء سے اُن کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔ پہلے "مدینہ" بجنور کے ادارتی عملے سے وابستہ ہوئے، وہاں کی محتاط روش پسند نہ آئی تو مولانا ظفر علی خاں کے پاس لاہور چلے گئے۔ اور جب مولانا جیل گئے تو یہ "زمیندار" کے مدیرِ اعلیٰ ہو گئے۔ غلام رسول مہر جوائنٹ ایڈیٹر تھے اور حفیظ جالندھری دفتر "زمیندار" میں کلرک تھے۔ جلد ہی قاضی صاحب نے ایک ایسا اداریہ لکھ ڈالا، جس کی پاداش میں اُنہیں ایک سال کی سزا لاہور جیل میں کاٹنی پڑی۔

پھر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے ایم۔ اے اور ایل ایل بی کر کے ۱۹۲۷ء میں بستی میں وکالت شروع کر دی۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۱ء تک مسلسل ڈسٹرکٹ بورڈ بستی کے ممبر رہے پھر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک مسلسل اُتر پردیش اسمبلی کے ممبر رہے۔ ۱۹۵۷ء میں الیکشن ہارنے کے بعد عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تو اردو کی خدمت میں تن من دھن سے لگ گئے۔ بستی میں انجمن ترقی اُردو (ہند) کی شاخ از سرِ نو کھولی۔ انجمن نے اردو کی حمایت میں بیس لاکھ دستخط جمع کرنے کی جو تحریک چلائی، قاضی صاحب نے اس میں نمایاں حصّہ لیا۔ پھر اُنہوں نے دینی مکاتیب کے احیاء کی تحریک میں جو رُوح پھونکی اور بستی ضلع میں "انجمن تعلیمات دینی" کے تحت آزاد و خودکفیل مکاتیب کا جو منظم سلسلہ چلایا وہ اُن کی لگن اور عملی سُوجھ بوجھ کی زندہ مثال ہے۔ آج یہ انجمن ایسے دس ہزار مکتبوں کو چلا رہی ہے، جن کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے اور یہاں کے سند یافتہ بچّوں کو سرکاری اسکولوں کے چھٹے درجے میں داخلہ مل سکتا ہے۔

قاضی صاحب قوم و ادب کے بے لوث خدمت گزار ہی نہیں، سچے عاشق بھی تھے۔ اُن کے صاحب زادے قاضی محمد ارشد عباسی نے لکھا ہے کہ جب رفیع احمد قدوائی نے وقتی طور پر کانگریس چھوڑ کر ایک نئی پارٹی بنائی تو پنت جی کو اندیشہ ہوا کہ کہیں قاضی صاحب اس پارٹی میں شامل نہ ہو جائیں۔ چنانچہ اُنہوں نے حافظ محمد ابراہیم کی معرفت قاضی صاحب کے خیالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ حافظ جی نے فون کیا تو قاضی صاحب نے کہا: "پنت جی سے کہہ دیجئے کہ میں نہ رفیع صاحب کی وجہ سے کانگریس میں ہوں اور نہ اُن کے، نہ جواہر لال کے کہنے سے کانگریس چھوڑ دوں گا۔ میں کانگریس پارٹی میں اپنے ذاتی یقین و اعتقاد (CONVICTION) کی بنا پر ہوں اور جس دن یہ یقین و اعتقاد ختم ہو جائے گا میں پارٹی سے مستعفی ہو جاؤں گا۔"

زیرِ نظر کتاب "کردار کے غازی" قاضی محمد عدیل عباسی" میں ڈاکٹر اختر بستوی نے تقریباً تیس ادیبوں دوستوں، عزیزوں اور مدّاحوں کے خراج ہائے عقیدت جمع کر دیئے ہیں، جو اُنہوں نے فدائے قوم اور شیدائے اُردو قاضی عدیل عبّاسی کو پیش کئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اب وہ سانچے ہی ٹوٹ گئے جن میں ایسے لوگ ڈھلا کرتے تھے۔

---

**شہد** (غزلوں کی کتاب) مصنف: والی آسی
مکتبہ دین و ادب، امین آباد، لکھنؤ
قیمت: بیس روپے

**ناگزیر** مصنف: اصغر مہدی ہوش
پوئٹ پبلی کیشنز، پورانی بازار، جون پور، اتر پردیش
۱۹۸۴ء صفحات: ۱۵۲۔ قیمت: بیس روپے

**اضافہ** مصنف: رحمت امروہوی قیمت: پچیس روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ دین و ادب، امین آباد لکھنؤ

**کردار کے غازی**: قاضی محمد عدیل عباسی
مرتب: ڈاکٹر اختر بستوی قیمت تیس روپے
ملنے کا پتہ: مرزا اینڈ سنز ریتی کا ئیل، گورکھ پور

**نظیر اکبر آبادی** مصنف: علی احمد فاطمی
پتہ: تہذیب نو پبلی کیشنز ڈویژن، ۲۷۲۔ چک الہ آباد

مغربی بنگال اردو اکیڈمی کی کتابیں
(۱۷۔ سندری موہن اونیو، کلکتہ ۱۴)

**اُردو ادب اور بنگالی کلچر** قیمت: بارہ روپے
مصنف: شانتی رنجن بھٹاچاریہ

**مضامینِ وحشت** قیمت: سترہ روپے
جمال احمد صدیقی (مرتب)

**سبزہ و گل۔ سرگزشت اور انتخابِ کلام**
مصنف: رئیس الدین فریدی امروہوی

# مکتوبات
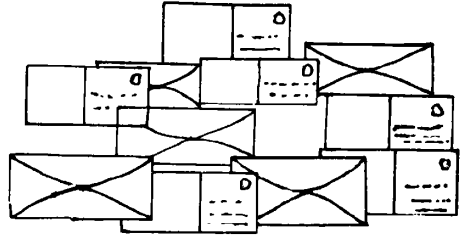
## انکسار

آپ کی تحریر سے یہ مترشح ہوا کہ "من کہ" کا مطلب Bio-Data ہے ۔ ویسے تو بہت آسان کام اور تلاش کروں تو چھپے چھپائے Bio-Data کی نقل کاغذات میں مل جائے گی، مگر میں اپنا Bio-Data 'آج کل' میں اس لیے نہیں دے سکتا کہ وہ شرم ناک حد تک ناقابلِ پذیرائی ہے ۔ یعنی کم از کم تعلیمی دور تو ایسا گزرا ہے ۔ جو نا قابلِ بیان ہے صحت کی مسلسل خرابی اور نصابی کتابوں سے پیدائشی نفرت ۔ کھیل کود یعنی Extra Curricular مشاغل اور کتابوں اور مضامین سے بے حد دلچسپی رہی ۔ نتیجہ میں ۱۹۲۶ء میں Hy. School اور ۱۹۳۵ء میں B.A. اور ۱۹۳۸ء میں L.L.B. کیا ۔ اپنے مضامین اساتذہ سے کم اور اختلاط اور دوسری Discipline کے پروفیسروں سے زیادہ راہ و رسم ۔ ان سب کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں اور تو کسی کام کو جم کے نہ کر سکا البتہ ادیب ہو جانے کی رسوائی زندگی سے کمیل بن کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لپٹ گئی ۔ تو عزیزم 'من کہ' سے تو میرا استعفیٰ (جیسا کہ سرکاری نوکریوں سے مستعفی ہوتا رہتا تھا ۔)

وامق جونپوری

## کاوش

کیا اچھا ہوتا کہ 'آج کل' پابندی سے ہر ماہ مجھ کو ملتا رہتا اور کیا ہی بہتر ہو تا کہ اس میں لکھنے والوں کو ان کی شائع شدہ تخلیقات پر کوئی معاوضہ نہ ملا کرتا ۔ تو مجھ جیسے لوگ اس میں جلد جلد اپنی تخلیقات کو بھیجنے سے گریز نہ کرتے ۔

اپنے صاف ستھرے گٹ اپ، معیاری ادب پاروں، نفیس کاغذ، نفیس کتابت اور طباعت کو دیکھتے ہوئے آج کل مجھ کو بہت پسند ہے اور دل چاہتا ہے کہ ہر ماہ اگر نہیں تو ہر دوسرے مہینہ اس میں کوئی نہ کوئی نئی اور معیاری چیز ضرور بھیجتے رہیں ۔ مگر وہی مور کا پیر یعنی معاوضہ کا خیال قلم پکڑ لیتا ہے، مگر اب تو میری غزل چھپے ہوئے کئی مہینے ہو گئے ہیں، اس لیے اپنی ایک بہت دلچسپ تصنیف 'آج کل' میں اشاعت کے لئے بھیج رہا ہوں ۔ غزل در غزل انتہائی مقصدی اور عصری لب و لہجہ سے مزین ۔ گزشتہ نصف صدی میں غزل پر جو مظالم ہوئے ہیں اس کا شاید کچھ ازالہ ہو جائے اور میرے نظریۂ غزل کو قبولِ عام کی سند ملے ۔

وامق جونپوری

## حُسن اتفاق :

میرے ایک عزیز لکھنؤ سے آئے تو 'آج کل' کا تازہ شمارہ بھی اپنے ساتھ لائے ۔ ایک خالص ادبی رسالہ پڑھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا، مگر تھوڑی دیر میں سارا رسالہ پڑھ ڈالا اور یوں محسوس ہوا کہ یہ ایک گراں قدر تحفہ ہے ۔ سبھی تخلیقات معیاری اور تاثر انگیز ہیں ۔ خاص طور پر محسن خاں کا افسانہ "نکٹو" بہت پسند آیا ۔ اسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے ۔

کوثر جمال، سیتا پور

## غیر مناسب

جون کا "آج کل" کافی دیر سے ملا ۔ قیمت میں اضافے کے ساتھ ردی کاغذ استعمال کیا جانے لگا ہے ۔ کسی معیاری رسالے کے لیے یہ بات بالکل غیر مناسب ہے ۔ مذکورہ شمارے میں جناب فصیح اکمل کی غزل بشیر بدر صاحب کا لہجہ لیے ہوئے ہے ۔ مظہر امام کی غزل بھی پسند آئی ۔ میری رائے ہے کہ جن شعراء کی تخلیق بخطِ شاعر میں شائع ہوتی ہے، چند سطروں میں سوانحی خاکے کے ساتھ اُن کا مختصر تعارف بھی ہوتا تو بہتر تھا ۔

افروز عالم، دربھنگہ

## میری پسند

جون کے شمارے میں رونق رضا اور سیدہ شانِ معراج کی لکھی ہوئی غزلیں اور اُردو افسانہ "میگیٹو" بھی بہت ہی پسند آیا ۔

فاروق شبنم، لڈورہ، سوپور، کشمیر

## نمایاں ترقّی

'آج کل' نے صوری و معنوی دونوں حیثیت سے نمایاں ترقّی کی ہے ۔ میز بہت خوب ہے ۔ آپ کے حُسنِ سلیقگی کی داد دیتا ہوں ۔ "من کہ" کا اضافہ قابلِ تعریف ہے ۔ غزل، نظم اور افسانہ آپ کی ادبی بصیرت کے آئینہ دار ہوتے ہیں ۔ اس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں ۔

شرر فتحپوری، ہریانہ

آزادی — ایک نعمت — ایک موقعہ
37 سال قبل ہم نے غلامی کی زنجیریں توڑ دی تھیں اور ہم آزاد ممالک کی صف میں شامل ہو گئے تھے
تب سے ہم نے زندگی کے تمام میدانوں میں بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی
• آج ہمارے کسان قوم کی ضرورت کے لئے کافی اناج پیدا کرتے ہیں۔
• صنعتی پیداوار میں ہم نے دنیا کے تمام ملکوں میں ایک قابل فخر مقام حاصل کر لیا ہے۔
نیا بیس نکاتی پروگرام ہماری مسلسل عملی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہے تاکہ سب کو سماجی اور اقتصادی انصاف مل سکے۔
صرف اسی نشانے پر کاربند رہ کر ہم اندرونی اور بیرونی خطرات کے خلاف اپنی آزادی اور ملکی سالمیت کا تحفظ اور دفاع کر سکتے ہیں۔
آیئے۔ آزادی کے 38 ویں سال میں داخل ہوتے ہوئے ہم کڑی محنت اور مل جل کر کام کرنے کا عہد کریں۔ تبھی ہم اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔
دیکھئے — ہم میں کوئی پھوٹ نہ ڈالے
84/98

Regd. No. D(DN) 103
R.N. 948/57

Licensed U(DN) - 50 to post without p e-payment
at Civil Lines, Post Office, Delhi.

Vol. 43 No. 2 AJKAL (URDU) September 1984

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

Publishedby the Director Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001, Printed by the Manager, Govt. of India Photolitho Press, Faridabad.

# آجکل

اگست ۱۹۸۴

ایک روپیہ ۵۰ پیسے



اِس شمارے کے قلم کار:

راجندر سنگھ بیدی، محمد محسن، ستیش بترا۔ انیس فاروقی
وید راہی، حسن نعیم، بشیر فرازاحمد، محمد منشاءالرحمٰن خان منشا
شہنشاہ مرزا، پرویز یداللہ مہدی، محمد بشیر مالیرکوٹلوی
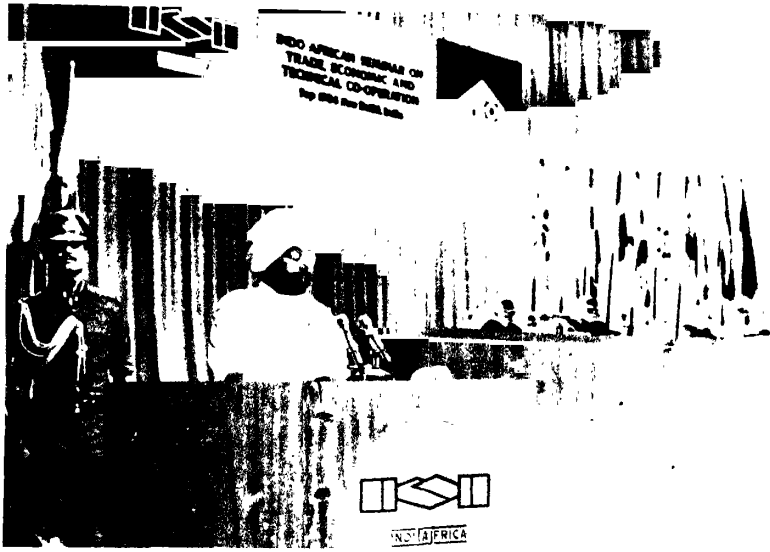
صدرِ جمہوریۂ ہند شری ذیل سنگھ، ۴ ستمبر ۱۹۸۴ء کو نئی دہلی کے وگیان بھون میں تجارت، اقتصادیات اور تکنیکی تال میل کے موضوع پر منعقدہ ہند افریقی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے

وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی، ۲۴ اگست ۱۹۸۴ء کو نئی دہلی میں انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے۔
وزیرِ اعظم کی بائیں طرف شری محمد ہدایت اللہ اور جناب حکیم عبدالحمید دیکھے جا سکتے ہیں۔

Dialouge writer
Dr. Rahi Masoom Raza.


اُردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہنامہ

# آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر: راج نرائن راز

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابد کرہانی

| جلد : ۴۳ | شمارہ : ۳ | اکتوبر ۱۹۸۴ء |
|---|---|---|
| قیمت : ایک روپیہ ۵۰ پیسے | فون : ۳۸۷۰۶۹ | اشون کارتک شک سمت ۱۹۰۶ |


## ترتیب



سرورق : جیون اڈلجہ


بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ     اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ پنجال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :

ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ :

بزنس منیجر :- پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

زرِ سالانہ: ۱۵ روپے   دو سال کے لیے: ۲۷ روپے   تین سال کے لیے : ۳۸ روپے

جب سے حکومت نے منصوبہ بند ترقی کا عمل شروع کیا ہے اسی وقت سے سرکاری شعبے کے ادارے ترقی و فروغ کا اہم ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ مختلف صنعتی سرگرمیوں کو انجام دینے کے لئے مختلف برسوں میں قائم کئے گئے۔ یہ ادارے مستقبل کی اقتصادی ترقی میں انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ ۳۱ مارچ ۱۹۸۳ء کو ملک میں سرکاری شعبے کے اداروں کی تعداد ۲۲۳ تھی جبکہ ۱۹۵۱ء میں منصوبہ بند ترقی کی شروعات کے وقت ان اداروں کی تعداد محض پانچ تھی۔ گذشتہ ۳۲ برسوں میں ان اداروں کی سرمایہ کاری ۲۹ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۳۰۰۳۹ کروڑ روپے ہوگئی ہے۔

سرکاری شعبے کے دس ادارے اسٹیل اتھارٹی آف انڈیا کے تحت ہیں جہاں مجموعی سرمایہ کاری کا ۵۰ فی صد لگا ہوا ہے اور یہ سرفہرست ہے۔ گذشتہ دس برسوں میں سرمایہ کاری میں پانچ گنا اور کاروبار میں چھ گنا کا اضافہ ہوا جو ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۴۱ ہزار کروڑ روپے تک پہونچ گیا۔

بھارت کو تیزی سے ترقی کرنی تھی لہٰذا سرکاری شعبے کا نظریہ بنایا گیا۔ بجلی فولاد اور مشینی آلات وغیرہ جیسی بنیادی صنعتوں کے قیام کے لیے کثیر سرمایہ کاری کی گئی۔ سرکاری اداروں میں وہ ادارے بھی شامل ہیں جو غیر سرکاری ہاتھوں میں نقصان میں چلنے کی وجہ سے سرکار نے اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں۔ پس ماندہ علاقوں میں بہت سے سرکاری ادارے محض اسی مقصد کے تحت قائم کئے گئے تاکہ ملک کی مختلف علاقوں کی متوازن ترقی کو یقینی بنایا جا سکے۔

## رفتار ترقی

چھٹے منصوبے کے ابتدائی چار برسوں میں سرکاری شعبے کے اداروں میں قابل قدر پیداوار ہوئی ——— ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران کوئلے کی پیداوار ۹ر۷ فی صد گنا ئٹ اور خام پٹرولیم کی پیداوار میں ۱۰۰ فیصد قابل فروخت فولاد کی پیداوار میں ۸ر۷۷ فی صد تانبے اور سیسے کی پیداوار میں سو فی صد، جست کی پیداوار میں ۴ر۱ فی صد، نائٹروجن آمیز کھاد کی تیاری میں ۳.۶۴ فی صد، فاسفیٹ آمیز کھاد کی تیاری میں ۲۹ر۴ فی صد اور ٹیلی فون نیز ٹیلی پرنٹر کی تیاری میں ایک سو فی صد کا اضافہ ہوا۔ یہ سازو سامان ملک کی اقتصادی ترقی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ گذشتہ دس برسوں میں سرکاری شعبے کے اداروں میں کی گئی سرمایہ کاری لگ بھگ چار گنا ہو گئی ہے۔ سب سے زیادہ سرمایہ کاری فولاد (۹۴۱۵ کروڑ روپے) پٹرولیم (۳۰۳۴ کروڑ روپے) کوئلہ (۳۲۶۱ کروڑ روپے) معدنیات اور دھات (۲۸۱۹ کروڑ روپے) اور انجینئرنگ (۲۷۴۶ کروڑ روپے) میں کی گئی ہے۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں پورے ہونے والے دس برسوں میں اس سرمایہ کاری کے نتیجے میں ہونے والا کاروبار بھی ۱۵۸ فی صد تک پہونچ گیا۔

## محض منافع نہیں

سرکاری اداروں کا مقصد محض منافع کمانا ہی نہیں ہے بلکہ سماجی اور اقتصادی مقاصد کے حصول کے لئے بھی اہم کردار ادا کرنا ہے۔ پسماندہ علاقوں کی ترقی، رعایتی نرخوں پر رفاہ عام کی سہولیات فراہم کرنا، مناسب قیمتوں پر بنیادی خام مال اور مصنوعات کی فراہمی نیز طبی، رہائشی اور تعلیمی سہولیات مہیا کرنے پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔

سرکاری شعبے کے اداروں نے دس برس کے عرصے میں سرمایہ کاری کے اعتبار سے ۲۳ء۶ فی صد سے ۱۳.۰۵ فی صد کے درمیان مجموعی منافع کمایا۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں ان اداروں میں سرمایہ کاری ۴۲ر۱۱ اور ۱۹.۵۲ فی صد کے درمیان رہی اور سود لگنے سے پہلے زیادہ سے زیادہ منافع ۵۴۵ کروڑ روپے رہا۔ ان اداروں کی مالی کارکردگی کا جائزہ لیتے وقت اس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھا جانا چاہیے کہ سرکاری ادارے مختلف صنعتوں کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے کام کرتے ہیں اور انہیں رکاوٹوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔

## فولاد کی صنعت کا تجربہ

فولاد کی صنعت کو تاریخ کے بدترین مندے کا سامنا ہے۔ ۸۳-۱۹۸۲ء سے اندرون ملک فولاد تیار فولاد کی مانگ میں کمی آرہی ہے۔ مذکورہ سال میں تیرہ لاکھ ۱۷ ہزار ٹن درآمدی فولاد کے آنے سے صورتِ حال مزید بدتر ہوگئی۔

۸۴-۱۹۸۳ء میں حساب کتاب صاف کرنے اور فولاد کی درآمد کم کرنے پر زور دیا گیا۔ مختلف مالی اقدامات کرکے مال ذخیرہ کرنے کی حد کو ۷۷۰۰۰۰ ٹن تک کردیا گیا۔ ان اقدام میں قرضے کی سہولیات میں توسیع اور قیمتوں میں ردّ و بدل شامل ہے تاکہ فولاد کی بعض اقسام اندرونِ ملک صارفین کو بین الاقوامی قیمت پر مہیا کی جائیں اور اس طرح برآمد میں اضافہ ہو سکے۔ ۸۴-۱۹۸۳ء کے دوران اعلیٰ اور عمدہ قسم کی فولاد

کی درآمد کو ۴۵۰۰۰۰ ٹن تک کی سطح پر محدود رکھنے کے لئے زور دیا گیا ہے۔ تاہم منافع میں اس وقت تک خاطرخواہ اضافہ ممکن نہیں جب تک کہ خام مال کی قیمتوں پر توجہ دی جائے۔ اس سلسلے میں کدریمکھ آئرن اور کمپنی کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ کمپنی ریکارڈ مدت میں تکمیل کو پہونچ گئی لیکن خام لوہا اٹھانے میں ایران کی ناکامی کی وجہ سے اب تک کوئی خاص پیداوار شروع نہیں کرسکی۔

۸۳-۱۹۸۲ء میں سرکاری شعبے کے اداروں کی تعداد ۱۱۵ تھی اور ٹوٹ پھوٹ کے اخراجات نیز منافع کو نکال کر ان کے داخلی وسائل کی مالیہ ۲۲۷۰٫۸۳ کروڑ روپے تھی۔ اگر سرمایہ کاری سے مقابلہ کیا جائے تو یہ بہت زیادہ اطمینان بخش اعداد و شمار نہیں ہیں۔

## غیر ملکی زرمبادلہ

سرکاری اداروں نے ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۹۴۴٫۹۴ کروڑ روپے غیر ملکی زرمبادلہ کی شکل میں کمائے جو پچھلے سال کے مقابلے میں ۷۰ فی صد زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں تعمیر کا کام کرنے والے گروپ کی کامیابیاں قابل ذکر ہیں جس سے غیر ممالک میں ۴۶۹ کروڑ روپے کی مالیت کے تعمیرات کے ٹھیکے حاصل کرکے انہیں پایہ تکمیل تک پہونچایا۔ فولاد جیسے مال کی برآمد کو بڑھانے کے لیے جس کی ملک میں زیادہ مانگ نہیں ہے۔ برآمد بڑھانے کے لئے ٹھوس کوشش کی جارہی ہے تاکہ اس سے نہ صرف غیر ملکی زرمبادلہ حاصل ہوسکے بلکہ کارخانوں کی صلاحیت کا بھی بہتر طور پر استعمال ہوسکے۔

## روزگار کا اہم ذریعہ

۸۳-۱۹۸۲ء میں سرکاری شعبے کے اداروں میں ۲۰ لاکھ افراد برسرِ روزگار تھے جن کی سالانہ اوسط فی کس آمدنی اٹھارہ ہزار روپے سے زیادہ تھی۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ۸۲-۱۹۷۲ء میں صارفین کی قیمتوں کے کل ہند عدد اشاریہ میں اوسطاً ۱۲۵ فی صد کا اضافہ ہوا جبکہ اس عرصے میں ان اداروں کے ملازمین کی اُجرت میں ۲۱۰ فی صد کا اضافہ ہوا۔ سرکاری شعبے کے اداروں میں ۱۹۸۳ء تک درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں سے تعلق رکھنے والے ۱۸٫۳ فی صد اور ۴٫۸ فی صد افراد کو علی الترتیب روزگار ملا ہوا تھا۔

ایک مثالی آجر کی حیثیت سے سرکاری شعبے کے ادارے اپنے ملازمین کو مکانات اور فلاحی سہولیات بھی مہیا کررہے ہیں۔ تقریباً سرکاری اداروں نے بستیاں قائم کی ہیں۔ جہاں تعلیم و صحت کے مرکز خریداری کے لئے مارکیٹ موجود ہیں۔ اس کے علاوہ تفریحی سہولیات بھی حاصل ہیں۔ اب تک ملازمین کے لئے ۵٫۴۸ لاکھ مکانات تعمیر کئے جاچکے ہیں اور ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران فلاحی سرگرمیوں پر ہی (سرمایہ کاری کے علاوہ) ۳۷۸ کروڑ روپے صرف کئے گئے۔ سرکاری شعبے کے متعدد اداروں نے اپنی فیکٹریوں یا بستیوں کے قریب واقع دیہات کو ترقی دینے کے لیے بھی انہیں اپنالیا ہے اور پانی صفائی ستھرائی نیز اسپتال کی بنیادی سہولیات مہیا کرنے میں رقوم بھی فراہم کی ہیں۔

۱۹۷۰ء کی دہائی سے بھی معاون صنعتوں کا فروغ شروع ہوا ہے۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۱۱۷۶ معاون ادارے تھے۔ جنہوں نے ۲۸۰ کروڑ روپے کی مالیت کی خدمات مہیا کی تھیں۔

سرکاری شعبے کے ادارے سماجی انصاف اور اقتصادی خوشحالی کے لئے پُل کی حیثیت رکھتے ہیں اور انہیں ملک کی اقتصادی ترقی میں اہم رول ادا کرنا ہے۔ سرکاری شعبے کے اداروں کی عمدہ کارکردگی قومی معیشت کے لیے انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ عمدہ اور پائدار سرکاری شعبے کی انتظامیہ کی بدولت جہاں قیادت کا بھی تسلسل ہو ان اداروں کی کارکردگی میں بہتری آنا ایک لازمی امر ہے۔ ●●

راجندر سنگھ بیدی

# پربودھ اور میتری

بیدی کا فن محسوس کراتا ہے کہ فطرت نے اپنی بڑا اسرار وحدت کو عورت مرد کے دو ناموں میں توڑ کر ان کے ملنے — بچھڑنے — اور نہ ملنے کا ایک تماشا برپا کیا ہوا ہے۔ اس تماشے کو دیکھنے اور سمجھانے کی کوشش ہی بیدی کی تخلیقی زندگی کا سفرنامہ ہے — اور اس سفرنامے کو بیدی نے بڑی چابک دستی اور حسن و ایجاز کے ساتھ جس قرطاس پر سجایا ہے اُس کا نام ہے: ایک چادر میلی سی۔

بیدی نے ۱۹۶۴ء میں اس ناول پر ایک پیش لفظ لکھا تھا، جو اسٹار پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہونے والے پاکٹ ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔ یہ پیش لفظ بیدی کے ناول کے اسرار و رموز کھولنے کی اہم کلید ہے — یہ پیش لفظ بیدی صاحب کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔

امر کتھا سنتی ہوئی پاربتی اونگھ گئی۔ شیو نے دیکھا بھی مگر سہاگ اور دستور کی مستی میں اپنی بات کہتے گئے۔ جوں چھائیں اور کہیں بیٹھے ہوئے کبوتر اور کبوتری کے جوڑے پربودھ اور میتری نے سُن لی اور امر ہو گئے۔

جُگ ہی بیت گئے۔ کال کے کانٹے پر پربودھ اور میتری سے لیے کُند ہو چکے تھے۔ پربودھ نے کہا "اب تو وقت ہی اور آ گیا ہے، رانی! مگر تمہیں وہ دن یاد ہے جب آدم کے بیٹے قابیل نے اپنے سگے بھائی ہابیل کو ایک پتھر سے مار ڈالا تھا؟"

"ہاں —" میتری بولی: "ایک بے شکل سی لڑکی کے پیچھے، جو ان کی اپنی ہی بہن تھی —"

پربودھ جھلا اُٹھا: "تمہیں ابھی تک نہیں معلوم — مرد اور عورت قدرت کے دو اصول ہیں۔ ان میں ذات اور رشتے کی بات ہی کیا ہے؟"

"ہاں — مگر —"

"مگر کیا —؟" پربودھ نے میتری سے کچھ پرے ہٹتے ہوئے کہا۔ "قدرت کیا اس بات کا حساب رکھتی ہے کہ کس پیڑ کا جوہر، کن ہواؤں سے کسی دوسرے پیڑ پر جا گرتا ہے؟ قدرت کا قانون افزائشِ نسل ہے چاہے وہ کیسے ہی ہو، کسی سے بھی ہو —"

اس وقت پربودھ اُن ہزاروں کبوتریوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جو بے حد حسین تھیں کیوں کہ وہ فانی تھیں۔ اُن کے گلوں کے حلقے رالتوں کے پیار سے کالے اور چمکیلے ہو رہے تھے اور انڈے رُوئی کے گالوں ایسے نرم، کورے اور چٹے — پربودھ جیسے خیالوں کے اختلاط سے خود ہی تھک گیا اور بولا۔ "عورت کی وجہ سے ہمیشہ لڑائی ہوتی آئی ہے اور ہوتی رہے گی۔"

"عورت ہی کیوں؟" میتری بِپھر اُٹھی۔ "زر اور زمین بھی تو ہیں۔"

پربودھ نے شہوانی نظروں سے میتری کی طرف دیکھا اور بولا: "زمین بڑی ہے اور زر اس سے بڑا — مگر تم نے کبھی سوچا ہے کہ یہ عورت ہی کے دو رُوپ ہیں — ؟"

میتری نے اپنی نازک سی گردن گھمائی اور اپنی سوچ میں گُم ہو گئی۔ پھر پیار کی کمندیں پربودھ پر پھینکتی، اپنا داہنا پر پربودھ کے بائیں پر میں پھنساتی ہوئی بولی: "مجھے چھا بخریں لا دو نا۔ جو ایتھنز کے کھنڈر میں ابھی تک لوگوں کی نظروں سے اوجھل پڑی ہیں — پھر میں تمہیں وہ پیار دوں گی کہ —"

بہ شکریہ: ڈاکٹر شمس الحق عثمانی۔ جن کا راجندر سنگھ بیدی کی شخصیت اور فن پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ عن قریب شائع ہونے والا ہے۔ (ادارہ)

پرلودھ نے جھانجروں کے بارے میں سوچنے سے پہلے ہی گھوں گھوں کرتے پھوٹتے ہوئے اپنی چونچ میتری کی چونچ میں اس کے تالو تک گھونپ دی اور پھر خود ہی علیحدہ ہوتے ہوئے بولا "کیا فائدہ اس پیار کا جس میں ہم مر بھی نہ سکیں۔ کسی وقت تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے جینا نہیں مرنا امر ہے۔" اور پھر وہ کہہ اٹھا: "سب الٹ پلٹ ہو گیا ہے ——"

میتری بھی جانتی تھی کہ پرلودھ اس وقت جھانجریں نہ لاکر دے گا۔ جب تک اس کی سوچ میں کوئی خود غرضیاں نہ ہوں گی۔

پھر پرلودھ بچھڑی صدیوں کی باتیں کرنے لگا اور اُن راسوں کی جو دمیتر یاس نے اسکندریہ میں البفرودیتی کے ساتھ سمندر کے کنارے رچائی تھیں۔ پھر ایڈے پس کی جس نے نادانی میں اپنی ماں سے شادی کر لی تھی۔ اور جب اُسے پتہ چلا تو صدمہ نہ سہ سکا —— ویرکنال کی باتیں جس کی محبوبہ اس کے باپ کے ساتھ ساجھی ہو گئی تھی اور جس کے کارن کنال کو اپنی آنکھیں دینا پڑیں۔ —— پھر بھرتری ہری کی جس نے حسن اور جوانی کو دائم قائم رکھنے والا سیب اپنی رانی کو دے دیا۔ مگر رانی نے اپنے عاشق ایک دھوبی کے حوالے کر دیا جس نے اُسے اپنی محبوب طوائف کو دے دیا جو ساری دنیا کا بھلا کرنے کے لیے اُسے وقت کے بادشاہ بھرتری ہری کے پاس لے آئی۔

پرلودھ اور میتری نے ابد سے سب کچھ دیکھا تھا اور اب ازل دیکھنا چاہتے تھے۔ مرد اور عورت کے درمیان یہ لاقانونیت دیکھ کر میتری بولی "آخر کوئی تو قانون ہونا ہی چاہیئے۔" حالانکہ وہ آپ من ست کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جو نیچے پنجاب کے میدانوں میں ایک پرانے سے ٹبر پر رہتا تھا اور بےحد جوان اور لاجوردی گردن والا خوب صورت کبوتر تھا —— اس لیے کہ وہ فانی تھا —— اور اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میتری کا پورا بدن مہک اٹھا اور پیٹ میں ایک کسمساہٹ سی دوڑ گئی۔ وہ من ست کی بات کچھ اس انداز سے کرنے لگی جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔ مگر اس کا نام سنتے ہی پرلودھ خون کے بل کھڑا ہو گیا اور اس کے پر پھڑ پھڑانے لگے۔ پرلودھ کے غصے اور لرزے کو دیکھ کر میتری ڈر بھی رہی تھی اور اندر سے کسی جذبے سے خوش بھی ہو رہی تھی۔ نظریں چراتی ہوئی وہ بولی "زندگی کی فلاح کے لیے ہم ہی قانون بناتے ہیں —— کیا خود انہیں توڑ نہیں سکتے؟"

پرلودھ جو کچھ دیر پہلے کہہ رہا تھا —— "قدرت کا قانون افزائش نسل ہے۔ چاہے وہ کیسے بھی ہو، کسی سے بھی ہو ——" جلدی سے کہہ اٹھا۔ "نہیں ——"

**ایک** دن کسی لمبی پرواز کے بعد پرلودھ اور میتری اپنے گھونسلے میں لوٹ آئے۔ من ست اڑتا ہوا امرناتھ کی گپھا تک پیچھے آیا تھا اور پھر مایوس ہو کر واپس ہو لیا۔ میتری کو اس بات کی خوشی تھی اور افسوس بھی تھا —— خوشی اس لیے کہ اس کا پرلودھ اب بھی اُسے آسمانوں سے ہمیشہ نازل ہونے والی بلاؤں سے بچا سکتا تھا اور پھر وہ خود بھی اب تک اتنی خوب صورت اور جوان تھی کہ میدانوں کا من ست فرسنگوں اس کے پیچھے اڑ کر آسکتا تھا اور مایوس ہو کر واپس جا سکتا تھا اور افسوس اس بات کا کہ پرلودھ اُسے کسی وقت بھی ایک آزاد پرواز سے روکتا تھا۔

گھونسلے میں پہنچتے ہی پرلودھ اور میتری کو ایک عجیب سی نرمی اور گرمی، سکھ اور آرام کا احساس ہوا۔ جب پرلودھ نے اپنی مستی بھری آنکھوں سے میتری کی طرف دیکھتے ہی اپنے پر اس پر پھیلا دیئے اور کہنے لگا۔

"رانی! ہم نے کتنی دنیا دیکھی ہے —— کتنے جُگ —— کتنے دیش —— پر اس دھرتی پر ایک ایسا دیش ہے جس کی کوئی مثال نہیں۔"

"پنجاب" میتری نیچے میدانوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ اٹھی اور پھر اُس نے ایک سرد آہ بھری جسے پرلودھ نے نہ دیکھا۔

"تم نے کیسے بوجھ لیا؟" پرلودھ نے ششدر ہو کر پوچھا اور اس کی لمبی چونچ نے ایک سُرخی پکڑ لی۔

میتری کہنے لگی: "وہی تو ایک دیش ہے، جس کی دھرتی میں سے آٹھوں پہر لوبان کی خوشبو اٹھتی رہتی ہے، جس کا لمس بدن میں صحت کی خارش پیدا کرتا ہے ——"

"ہاں" پرلودھ نے حامی بھری۔ "اس کے پربت آسمانوں کے ہمسائے ہیں اور دھرتی کی ہری اوڑھنی پہ ویرانی کے رنگ کا ایک بھی چھینٹا تو نہیں۔ اس کے دریا تو ایک طرف، پوکھر بھی الوراگ سے واقف ہیں۔"

"جہاں کے مرد اکھڑ ہیں۔ عورتیں جھگڑالو۔ وہ خود ہی اپنے قانون بناتے ہیں اور اگلے ہی پل بےبس ہو کر خود ہی انہیں توڑ بھی دیتے ہیں اور پھر نئے قانون وضع کرنے کے لیے چل نکلتے ہیں۔ دیوی ماں سرزد ہونے سے پہلے ہی ان کے گناہوں کو معاف کر دیتی ہے۔ کیوں کہ انہوں نے بہت دُکھ دیکھا ہے۔ اُتر پچھم سے ان پر سینکڑوں حملے ہوئے۔ مگر انہوں نے اپنی فولاد سے زیادہ سخت چھاتیوں کو ڈھال بنایا اور آلام کی سب ضربیں ان پہ لیں۔ انہوں نے اپنی ماؤں اور بہنوں کی عزت دے دی، پورے دیش کی ماؤں اور بہنوں کی عصمت بچانے کے لیے —— وہ کسی وقت بھی سونے کو مٹی میں رول دیتے ہیں اور پھر اسی مٹی کو کھنگال کر اس میں سے کندن پیدا کر لیتے ہیں —— عجیب کیمیاگر ہیں وہ ——"

"نہ معلوم وہ کس مٹی سے بنے ہیں۔ جمتی ہوئی برفوں اور تپتی ہوئی ریتوں میں وہ بس سکتے ہیں۔ جہاں دنیا کے لوگ دوسروں ہی کی نکتہ چینی میں لگے رہتے ہیں ——"

"وہاں پنجابی ہی ہے جو اپنے آپ پر بھی ہنس سکتا ہے۔ وہ اچھا دوست ہے اور برا دشمن —— جہاں بھی لوگ تمہیں ایک بلند آواز سے ہنستے، قہقہہ لگاتے

آگے صـ۲۲ پر

محمد محسن

# ادبی تنقید اور نفسیات

لفظ تنقید کا مشتق نقد ہے جس کے منجملہ اور معنوں کے ایک معنیٰ پرکھنا بھی ہے۔ تنقید کی اصطلاح اسی مفہوم کو ادا کرتی ہے۔ اس لیے دوسرے لفظوں میں تنقید کو ہم اندازہ قدر (evaluation) بھی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی جانچ پڑتال کھوٹے کھرے کی تمیز۔ تنقید کا اطلاق ہم ہر شے پر کر سکتے ہیں۔ مثلاً یہ بیان کہ "برسات کی چاندنی رات کی اور بات ہے۔ سردیوں کے موسم میں چاندنی کی وہ بہار نہیں ہوتی" موسم سرما کی تنقید ہے۔ عموماً تنقید کا استعمال ہم انسان کے قول فعل تقریر و تحریر کے تعلق سے کرتے ہیں۔ علمی یا ادبی سیاق و سباق میں تنقید کا موضوع کسی عالم، دانشور یا ادیب کی نگارشات ہوا کرتی ہیں۔ ہر تخلیق، خواہ علمی ہو یا ادبی، اس کی جانچ پڑتال کرنے میں ہمارے سامنے اس کا مواد اور اسلوب یا انداز بیان دونوں ہی ہوتے ہیں۔ علمی نگارشات اور ادبی تخلیقات مواد اور اسلوب دونوں ہی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ علمی یا سائنسی نگارشات کے اجزائے ترکیبی واقعہ، خیال، تصور، نظریہ وغیرہ جیسے وقوفی (cognitive) عناصر پر مشتمل ہوتے ہیں، احساسات و جذبات کے جیسے عناصر کی ان میں شمولیت نہیں ہوتی۔ ادبی تخلیقات کا مواد بھی وقوفی ہو سکتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ تاثراتی affective یعنی احساساتی و جذباتی مواد کے بغیر کوئی تخلیق ادبی یا فنی نہیں کہی جا سکتی۔ ایسے ہی مواد ادبی تخلیق کے طرۂ امتیاز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

علمی یا سائنسی مقالہ اور ادبی تخلیق کے مواد کا بنیادی فرق ہی ان کے اسلوب یا انداز بیان کے فرق کا تعین کرتا ہے۔ علمی مقالہ کی زبان غیر مبہم ہوتی ہے۔ الفاظ کی کفایت اور ان کے ذریعہ مفہوم کی بے کم و کاست ادائیگی اس کا خصوصی وصف ہوتا ہے تاکہ قلمکار کے مافی الضمیر کی قاری کے ذہن میں جہاں تک ممکن ہو ہو بہو عکاسی ہو سکے۔ جملوں کی ترکیب و ترتیب میں معنی کی مناسبت سے ان کی موزونیت پر توجہ دی جاتی ہے۔ ترکیب و ترتیب کے حسن، عبارت کی فنکارانہ تراش خراش کے لحاظ کی علمی یا سائنسی انداز بیان میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی چونکہ اس کا مواد محض وقوفی ہوتا ہے اس لیے اس کے اسلوب کی تعمیر و تشکیل بھی اس طور سے کی جاتی ہے کہ یہ فکر و دانش، تعقل و استدلال کو کمال صحت کے ساتھ بروئے کار لانے کا وسیلہ بن سکے۔ اس سے قاری کے احساسات و جذبات کو ابھارنے کا مصرف نہیں لیا جاتا ہے۔ ادبی تخلیقات میں چونکہ احساسات و جذبات کے عناصر ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے ان کا اسلوب بھی علمی مقالوں سے جداگانہ ہوتا ہے۔ ادبی تخلیقات کی زبان احساساتی emotive ہوتی ہے۔ مواد کے احساساتی اور جذباتی عناصر کے اظہار میں پیکر تراشی سے کام لینا پڑتا ہے انھیں الفاظ کے گوشت پوست میں متشکل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے لیے تشبیہ و تلمیح، علامت و استعارہ، یہاں تک کہ اشارہ و کنایہ کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے ؎

مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام
بنتا نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

(غالب نسخہ کا دیانی جرمنی)

الفاظ کا انتخاب، ان کی ترکیب و ترتیب، جملوں کی تراش خراش میں ان کی موزونیت سے زیادہ ان کی زیبائش و آرائش پر توجہ دی جاتی ہے تاکہ وہ قاری کی فکری صلاحیت کے بجائے اس کے احساس جمال کو برانگیختہ کر سکیں اس پر اصرار نہیں کیا جاتا کہ جس تصور یا خیال کی ترجمانی کی جا رہی ہے قاری کے ذہن میں معکوس ہو جائے۔ یہ ملحوظ ہوتا ہے کہ فنکار کے ذاتی تاثرات، احساسات و جذبات کے بالش احساسات و جذبات قاری کے اندر موجزن ہونے لگیں۔ فنکار اور قاری کے درمیان اشتراک احساس (empathy) کی تا حد امکان تکمیل ہو۔ اسی وجہ سے ادبی تخلیقات کی مختلف صنفوں کے باہمی فرق کو مواد پر کم زیادہ

● دارالامن - بھادر پور کھر - پٹنہ ۴ ۸۰۰۰

روز کے اعتبار سے متعین نہیں کیا جاتا بلکہ ہیئت کو مواد پر کم یا زیادہ اہمیت دے کر متعین کیا جاتا ہے۔ مثلاً غزل کے اشعار میں ہیئت کو مواد پر فوقیت دی جاتی ہے۔ اس کے بر خلاف نظم میں ہیئت کا درجہ مواد سے بڑھایا نہیں جاتا۔ نثری فن پاروں میں ہیئت کی اہمیت قائم رکھتے ہوئے مواد پر نسبتاً زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔

علمی یا سائنسی مقالہ اور ادبی تخلیق کے مابین فرق کو ذہن میں رکھ کر ہم تنقید کے عمل کی وضاحت کریں چونکہ ادبی تنقید میں ہیئت اور مواد دونوں اہمیت کے حامل ہیں اس لیے تنقید نگار دونوں ہی کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھتا ہے جہاں تک ہیئت کا تعلق ہے، تنقید نگار اس کی جمالیاتی قدر کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہے یعنی وہ فنی اعتبار سے تخلیق کے حسن و قبح کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ یہ جاننا اور بتانا چاہتا ہے کہ زیر نقد تخلیق قاری پر کس طرح کا تاثر پیدا کرنے کے امکانات کی حامل سمجھی جاسکتی ہے۔ یعنی اس کی ہیئت قاری کے لیے فردوس گوش یا جنت نگاہ ہوسکتی ہے یا نہیں تخلیق کی زبان کی تراش خراش الفاظ کی ترکیب و ترتیب حسین و جمیل کہے جانے کی مستحق ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ کسی تخلیق کا تاثراتی ردعمل (affective reaction) خالصاً موضوعی ہوگا۔ اس کی چھان پھٹک کے لیے کوئی معروضی معیار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کا فیصلہ کرنا کہ اس تخلیق کی تشکیل قاری کی حسِ جمال کو بیدار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے یا نہیں، ایک دشوار امر ہے۔

حسِ جمال کے وجود اور اس کی نوعیت کی بابت اب تک نفسیات کسی فیصلہ کن نتیجے تک نہیں پہونچ سکی ہے۔ یہ سارے سوالات کہ حسِ جمال کے آخذ (receptor) کیا ہیں؟ احساس جمال کا کس طرح وجود ہوتا ہے؟ جس طرح ہمیں کسی شئے کے طول و عرض کا ادراک ہوتا ہے کیا اس کے حسن کا شعور بھی اسی طرح حاصل ہوتا ہے؟ اب تک ہمارے لیے عقدہ لاینحل بنے ہوتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسن کی کوئی معروضی اساس نہیں ہے یعنی کوئی شئے بذاتِ خود حسین یا قبیح نہیں ہوتی۔ کسی شئے کا ادراک جو تاثراتی ردعمل (affective reaction) پیدا کرتا ہے اس کی خوشگواری یا ناخوشگواری اس شئے کے حسن یا قبح کی ضامن بن جاتی ہے دوسرے لفظوں میں وہی شئے حسین ہے جس سے ہماری نگاہ کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ یعنی حسن تسکینِ نظر کا دوسرا نام ہے۔ لیکن ادبی تخلیق کی ہیئت کی جمالیاتی قدر کے اندازے میں جو مشکل درپیش ہے، احساس جمال کا یہ تجزیہ اور حسن کی یہ تعریف اسے آسان نہیں کرتی جب تک ہم اس کا تعین نہ کر سکیں کہ کسی شئے کا وہ کون سا وصف ہے جو ہمارے لیے تسکین نظر کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ ہم حتمی طور پر کسی ادبی تخلیق کی ہیئت کے حسین یا قبیح ہونے کا فیصلہ نہیں کرسکتے۔ تنقید نگار کی نگاہ میں جو اندازِ بیان حسین و جمیل نظر آتے ممکن ہے کہ قاری کی نگاہ سے اس کا حسن اوجھل رہے۔ وہ اس کی تسکین نظر کا وسیلہ نہ ثابت ہو۔ ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ اس کی ہیئت کے ضمن میں ادبی تخلیق کی کوئی تنقید معروضی نہیں ہوسکتی۔

اگر معروضی کی تعریف ہم بجائے تصوراتی (Conceptual) یا ترکیبی (constitutive) کے تفاعلی (operational) اعتبار سے کریں تو شاید ہماری مشکل آسان ہوسکے۔ معروضی کا حقیقی تصور وجود بالذات کی نشاندہی کرتا ہے۔ یعنی جس کا وجود ماورائے محسوسات و تجربہ ہو۔ معروضی کی تفاعلی تعریف کی نوعیت تجرباتی ہوگی یعنی معروضی وہ ہے جس کے بابت بین التجربہ انتہائی توافق maximum agreement کا ثبوت ملتا ہو کسی جانی پہچانی خارجی شئے کے ادراک میں نارمل انسانوں کے درمیان مکمل موافقت ہوتی ہے۔ ادراک کا فعل بذات خود موضوعی ہوتے ہوئے بھی اس شئے کی معروضیت کے متعلق ہمیں کسی طرح کا شبہ نہیں ہوتا — دوسرے لفظوں میں معروضی سے ہماری مراد یہ ہے کہ جس پر کسی انفرادی انداز نظر کی چھاپ نہ ہو۔ جیسے ہم ایک غیر شخصی تجربہ کہہ سکیں مسلسل تجربوں کی بنیاد پر یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ عام طور پر مقبولیت یافتہ ادبی تخلیق کی ہیئت ایک خاص رنگ کی لفظیاتی ترکیب و ترتیب، الفاظ کی غنائیت، الفاظ کی پر شوکت صوتی تکرار، تشبیہوں، تلمیحوں، علامتوں اور استعاروں، پیکر تراشی اور محاکاتی مصوری کے ایسے نمونوں کی حامل ہوتی ہے جن کی دلکشی اور دلآویزی اتفاق رائے سے مسلم ہے ایسی تخلیق کے اجزائے ترکیبی کا تجزیہ کرکے ہم ادبی تخلیق کی جمالیاتی قدر کے اندازے کے لیے انہیں معیاری حیثیت دے سکتے ہیں لیکن ہمیں ایک دوسری حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا ہے یعنی

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

آج جس اندازِ بیاں اور ہیئت کے ہم دلدادہ ہیں، جو ہمارے اندر خوشگوار تاثر پیدا کرتی ہے ممکن ہے کل اس کا تواتر اور یکسانیت اسے فرسودہ اور بے وقعت بنا دے وہ ہمارے لیے اکتاہٹ اور بیزاری کا سامان بن جائے اور اس سے وابستہ حسن آفرینی کے امکانات معدوم ہو جائیں۔ اس لیے اندازِ بیاں یا اسلوب کی جدت طرازی، نت نئی ترکیبیں، اچھوتی تشبیہیں اور علامتیں، انوکھی پیکر تراشی بھی ادبی تخلیق کے فنی حسن و جمال کی آئینہ داری کرتی ہیں اس طرح ادبی تخلیقات کی جمالیاتی قدر کی جانچ پرکھ میں طرزِ بیاں کی جدت بھی کافی توجہ کی مستحق ہے۔

اسلوب یا ہیئت کی حسن کاری کے غیر شخصی اور تفاعلی معیار کی وضاحت کے بعد اب ہم ادبی تخلیقات کے مواد سے متعلق عمل تنقید کی نوعیت اور لوازمات کو واضح کریں۔ مواد کی سیر حاصل تشریح و تفسیر، تنقید کے لیے ضروری ہے۔ استعمال شدہ الفاظ کے مفہوم کا تعین اور ان کی صحت کی جانچ پڑتال

ان کے مضمرات کی تفصیل' الفاظ کی ترکیب و ترتیب کی موزونیت کا جائزہ' تنقید کے لسانی لوازمات ہیں۔ ان کے علاوہ جس تصور' خیال' فکر' احساس' جذبہ کی ترجمانی ان الفاظ کے ذریعہ کی گئی ہے ان کا تجزیہ' خیال کی ندرت' فکر کی بلاغت اور بلوغت' مشاہدہ کی وسعت' دقیق رسی اور گیرائی' احساس و جذبہ کا خلوص اور شدت ان سب کا سراغ اور نشاندہی تنقید کے نفسیاتی لوازمات کہے جاسکتے ہیں۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے کہ ادبی تنقید میں نفسیات کا کس حد تک دخل ہو سکتا ہے اور اس کی نوعیت اور امکانات کیا ہیں' نفسیات کے خصوصی موضوعات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

کسی فرد سے جو بھی فعل سرزد ہوتا ہے' نفسیات کی اصطلاح میں ہم اسے کردار کہتے ہیں۔ اس لیے اس کی عام تعریف کے مطابق نفسیات کردار کا باضابطہ اور بالترتیب مطالعہ ہے۔ نفسیات ان سارے داخلی کوائف و عوامل کی چھان بین کرتی ہے جو فرد کے کردار کے پیچھے بروئے کار ہوتے ہیں۔ ان کی روشنی میں پیش نظر کردار کے داخلی اسباب اور ان کے صحیح مفہوم تک ہماری رسائی ہو جاتی ہے۔ آدمی حیوان ناطق ہے۔ اس کے نطق نے اُسے ترسیل و ابلاغ کی صلاحیتوں سے بہرہ ور کیا ہے۔ وہ اپنے محسوسات و خیالات کو' ان کی گوناگوں پیچیدگیوں کے باوجود' دوسرے افراد تک پہونچا سکتا ہے۔ اس کے لیے وہ الفاظی علامتوں (verbal symbols) سے کام لیتا ہے۔ جن کا استعمال وہ گفتگو کے ذریعہ یا انہیں قید تحریر میں لاکر کرتا ہے۔ آدمی کے کردار میں ہم اس کی ادائیگی الفاظ یعنی گفتگو اور تحریر بھی شامل کرتے ہیں نفسیات انہیں الفاظی کردار (verbal behaviour) کا نام دیتی ہے۔

اس کا یہ الفاظی کردار آدمی کے لیے طرہ امتیاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح عضوی یا جسمانی کردار کی نوعیت اور اسباب کو سمجھنے کے لیے خارجی اور داخلی دونوں حالات اور کوائف کو پیش نظر رکھتے ہیں اسی طرح الفاظی کردار کے معنی و مطلب اخذ کرنے کے لیے خارجی ماحول کے علاوہ داخلی کوائف و عوامل کا علم ضروری ہو جاتا ہے۔

ادبی تخلیقات' خواہ ان کا کسی بھی صنف ادب سے تعلق ہو' الفاظی کردار کے زمرے میں شامل ہیں۔ اور آدمی کے دوسرے کردار کے مقابلے میں ہم اس کے علمی اور ادبی کارناموں کو آدمی کا مابہ الامتیاز کردار قرار دے سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے نفسیات کا ادبی تخلیقات سے ایک نہایت قوی رشتہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کسی بھی تخلیق کا مطالعہ نفسیات سے آنکھیں چرا کر مکمل نہیں سمجھا جا سکتا۔ آدمی کے دوسرے کردار کی طرح اس کے تخلیقی کارناموں کے صحیح معنی و مطلب تک پوری طرح رسائی کے لیے ہمیں صرف ان حالات کو پیش نظر نہیں رکھنا ہوگا جن میں فنکار کی شخصیت پروان چڑھی تھی۔ یا جس خارجی ماحول میں وہ سانس لے رہا ہے' بلکہ ان داخلی کوائف و عوامل' رجحانات و عادات' اغراض و مقاصد کی تہہ تک بھی پہونچنا ہوگا جن کے عمل اور جن کی تحریک کا اس کی تخلیقات کو کرشمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

نفسیات جب کسی ادبی تخلیق کا مطالعہ کرتی ہے تو اس کے سامنے یہ سوال کھڑا ہو جاتا ہے کہ اس تخلیق کے اسباب کیا تھے۔ اس سوال کے جواب کے لیے پہلے ان حالات پر نگاہ ڈالی جاتی ہے جن کے پس منظر میں وہ تخلیق مورد وجود میں آئی اس کے بعد فنکار کی شخصیت کو ٹٹول کر ان داخلی کوائف اور عوامل کی چھان بین کی جاتی ہے جو اس تخلیق کے پیچھے برسر کار تھے اس کے لیے فنکار کی سرگذشت حیات کا خاکہ تیار کرنا ہوتا ہے جو اس کی شخصیت کے غالب عناصر اور ان کی ترتیب و تشکیل کی ذمہ دار ہے۔ اس مہم کو سر کرنے کے لیے ان ماخذوں کی چھان بین کرنی ہوتی ہے جن سے وہ سارے مواد حاصل کیے جاسکیں جن کی بنیاد پر فنکار کی زندگی کی تاریخ مرتب ہو سکے۔ یہ ماخذ خود فنکار کے ذاتی بیانات جو اس تخلیق یا اسکی دوسری تخلیقات اور تحریروں میں پائے جاتے ہوں' یا فنکار کے متعلق دوسروں کے بیانات پر مشتمل ہوں گے۔ ان سارے بیانات کو اکٹھا کر کے ان کے مواد کی تشریح کی جاتی ہے۔ مواد کے ان حصوں کا جن سے فنکار کی شخصیت کے غالب عناصر اور اس کی شخصیت کی ترتیب و تنظیم پر روشنی پڑتی ہو' چھان پھٹک کر ان کی قدر کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد زیر غور تخلیق کو سامنے رکھ کر اس بات کا فیصلہ کیا جاتا ہے کہ فنکار کی شخصیت کے وہ کون سے عناصر و عوامل تھے جنہیں اس کی تخلیق میں بروئے کار سمجھا جا سکتا ہے۔ اس طرح نفسیات کی مدد سے اس تخلیق کے داخلی اسباب کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ اس نوع کے نفسیاتی مطالعہ کی مثال قاری کو راقم کی حالیہ تصنیف "سعادت علی منٹو اپنی تخلیقات کی روشنی میں؛ ایک نفسیاتی تجزیہ" میں ملے گی۔ چونکہ ادبی تخلیق کے سلسلے میں اس کی خوبی اور خامی سے متعلق کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اس کی تشریح و تفسیر ضروری ہو جاتی ہے اس لیے کسی زیر نقد تخلیق کا نفسیاتی ڈھنگ سے مطالعہ' اس تخلیق کے پیچھے نفسیاتی کوائف و عوامل کی چھان بین تنقید کی جامعیت میں قابل قدر اضافہ ہوگی۔ سطور بالا میں ہم اس کا اقرار کر چکے ہیں کہ کسی تخلیق کی جمالیاتی قدر و منزلت کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے میں ہمیں نفسیات سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ احساس جمال نفسیات کا ایک اہم مسئلہ ضرور تصور کیا جاتا ہے لیکن ابھی تک اس کی تحقیق و تفتیش میں کوئی ایسی پیش رفت نہیں ہوئی ہے جس سے ہم کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہونچ سکیں۔ البتہ کسی تخلیق کے مواد کی تہہ تک پہونچنے میں نفسیات کی دخل اندازی ناروا نہیں سمجھی جائے گی۔

مختلف تنقید نگاروں نے اپنے تنقیدی کارناموں میں فن تنقید کے ساتھ جس انداز سے برتاؤ کیا ہے اس کی بنیاد پر انہیں الگ الگ گروہوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک کو نفسیاتی تنقید نگار کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ نفسیاتی مطالعہ کے موضوع اور اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھ کر راقم اس سے

آگے صفحہ ۱۶ پر

فیروز احمد

# فسانۂ عجائب کا ایک اہم ایڈیشن

رجب علی بیگ سرور کا شمار اردو کے ان نثر نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ جن کی شہرت امتدادِ زمانہ کے ساتھ بڑھتی رہی ہے۔ گذشتہ ربع صدی میں سرور اور ان کے کارناموں سے متعلق متعدد تنقیدی اور تحقیقی کتابیں بھی منظرِ عام پر آچکی ہیں جن میں ادبی اجتہادات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے مطالعے سے بنیادی طور پر یہ بات سامنے آئی ہے کہ سرور کے جملہ کارناموں میں جو ادبی مرتبہ فسانۂ عجائب کو حاصل ہوا ان کی دوسری تصانیف اس مقام اور مرتبہ کو نہ پہنچ سکیں۔ **فسانۂ عجائب سے اس غیر معمولی دلچسپی کے سبب نہ صرف اس کی بے شمار اشاعتیں** منظرِ عام پر آئیں بلکہ اس کے "بنیادی متن" **کی تلاش کے ساتھ مصنف کے "تصحیح" یا "نظر یافتہ" مطبوعہ نسخوں کی مدد سے نئے متن بھی** تیار کیے گئے۔ پچھلے ۱۵ برسوں میں جدید اصول تدوین کی روشنی میں ایسے جو ایڈیشن سامنے آئے ہیں ان میں فسانۂ عجائب مرتبہ اطہر پرویز (مطبوعہ اسرار کریمی پریس الٰہ آباد ۱۹۶۹ء) اور فسانۂ عجائب مرتبہ سید سلیمان حسین (ناشر اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۱ء) **اس لحاظ سے خاصے اہم ہیں کہ ان کے مرتبین نے اپنے اپنے نسخوں کی بنیاد عام طور پر ان نسخوں پر رکھی ہے جن میں سرور نے ترمیم یا اضافہ کیا ہے۔**

ڈاکٹر اطہر پرویز کے پیش نظر جو مطبوعہ نسخے رہے ہیں ان میں ایک کانپور کا ہے اور دوسرا دلی کا۔ یہ دونوں نسخے بالترتیب ۱۲۷۶ھ اور ۱۹۷۹ء میں چھپے۔ ان میں اوّل الذکر پر سرور نے اور ثانی الذکر پر مہتمم مطبع محمد حسین خاں نے خاتمۃ الطبع لکھا ہے۔ ڈاکٹر اطہر پرویز لکھتے ہیں —

"..... میں نے اپنے نسخے کی بنیاد ان دونوں نسخوں پر رکھی ہے اور میرا خیال ہے کہ ان سے بہتر نسخے ہیں بھی نہیں [۱]....."

ڈاکٹر سلیمان حسین اپنے نسخہ کی بابت تحریر کرتے ہیں —

"..... فسانۂ عجائب کا زیر نظر متن دو مطبوعہ نسخوں کی مدد سے تیار کیا گیا ہے اصل متن اس نسخے پر مبنی ہے جو مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء میں چھپ کر شائع ہوا اس کے بارے میں خیال ہے کہ یہ مصنف کی زندگی کا آخری "نظر یافتہ" نسخہ ہے ..... دوسرا نسخہ وہ ہے جو مولوی محمد حسین کی سعی سے ۲۲ ربیع الآخر ۱۲۶۷ھ/ ۲۴ فروری ۱۸۵۱ء کو مطبع محمدی کانپور سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن کے خاتمۃ الطبع سے معلوم ہوتا ہے کہ ناشر نے سرور سے پوری کتاب پر نظر ثانی کرنے کو کہا تھا جسے انھوں نے بخوشی قبول کیا اور "کوشش عظیم سے ملاحظہ کر کے" تیار کیا تھا...... اس کے دیباچہ میں لکھنؤ کے جن باکمال افراد کے ناموں کا اضافہ ملتا ہے وہ یہ ہیں : مولوی مخدوم، میرن صاحب مجتہد، میر سید محمد، مرزا نظر علی صاحب اور صاحبِ نوطرز مرصع میر محمد حسین عطا خاں تحسین۔ اس نسخے میں بکثرت تبدیلیاں (اصلاحیں) کی گئی ہیں جن کی بدولت یہ ایک بالکل نیا نسخہ معلوم ہوتا ہے [۲]....."

فسانۂ عجائب کے متعدد قدیم مطبوعہ نسخوں سے متعلق تفصیلی معلومات ڈاکٹر نیر مسعود[۳] اور اطہر پرویز[۴] نے فراہم کردی ہیں۔ اس سلسلہ میں مزید "تحقیقی مشاہدات" ڈاکٹر گیان چند جین کے ایک تازہ مضمون[۵] میں ملتے ہیں۔ یہ ساری معلومات فسانۂ عجائب میں وقتاً فوقتاً مصنف کے ذریعے کی جانے والی تبدیلیوں (یعنی ترمیم اور تنسیخ) کے نقطۂ نظر سے خاصی اہم ہیں۔ ان سے فسانۂ عجائب کے متعلق مصنف کے بدلتے ہوئے خیالات کا پتہ چلتا ہے اور یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ تبدیلیاں کب کن حالات میں اور کن کن کی فرمایش یا خوشنودیٔ طبع کی خاطر کی گئیں۔ ان ہی قدیم نسخوں کے خاتمۃ الطبع سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور نے فسانۂ عجائب کے دو ایسے نسخے بھی لکھے تھے جن کا تعلق بظاہر کسی کی فرمایش یا اصرار سے نہیں بلکہ خود مصنف کی مرضی و منشا سے تھا۔ فسانۂ عجائب کی قدیم اشاعتوں میں ایک نسخہ وہ ہے جو

● شعبۂ اردو، راجستھان یونیورسٹی، جے پور

سلسلہ تھا۔[۱۱] مگر ان صبر آزما حالات میں بھی سرور تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول رہے اور فسانہ عجائب کو خوب سے خوب تر بنانے کا جتن کرتے رہے چونکہ فسانہ عجائب کی مخالفت اور اس پر اعتراضات کی لے روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور اسی کے ساتھ سرور کی عمر بھی اور اس بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ یہ احساس بھی روز افزوں تھا کہ اس ادبی جنگ میں فتح و کامرانی کا سہرا انھیں کے سر بندھنا چاہیے اس لیے "بہ پاس خاطر خود" فسانہ عجائب پر از سر نو محنت کی گئی سرور نے افضل المطابع محمدی کے خاتمۂ عبارت میں جو یہ لکھا ہے کہ "دو نسخے اور مصنف نے تازہ لکھے ہیں ...... الخ" غلط یا محض برائے بیت نہیں۔ یہ فقرے واضح طور پر فسانہ عجائب کے ایسے نسخوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو افضل المطابع محمدی کے مذکورہ نسخہ سے الگ وجود رکھتے ہیں چنانچہ ایسے ہی نسخوں میں سے ایک نسخہ وہ ہے جو مطبع احمدی سے ۱۲۷۶ھ میں چھپ کر شائع ہوا۔ فسانہ عجائب کا یہ واحد نسخہ ہے جو اکبر آباد سے شائع ہوا اور اب تک کی معلومات کی روشنی میں فسانۂ عجائب کے **مختلف ایڈیشن کی بحث کے ذیل** میں کہیں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ **اس نسخہ کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ** اطہر پرویز اور سید سلیمان حسین کے مرتب کردہ نسخوں سے مختلف ہے اگرچہ اس کے **خاتمۃ الطبع** میں سرور کا نام درج نہیں لیکن "جو رعایتیں از قسم متانت الفاظ اور سلاست **عبارات** و لطف روزمرہ چکیدہ نفرات عمدہ شعرائے خوش گو، زبدہ نثاران اردو مرزا رجب علی بیگ سرور رحمہ الغفور نے اس نسخۂ بے نظیر میں **مرعی رکھیں**....." سے **واضح** طور پر اشارہ ملتا ہے کہ **سرور کی نظر فیض اثر** نے اس نسخہ پر جا کر اور اسے **نسبتاً** بہتر بنانے میں کوئی دقیقہ **اٹھا نہیں** رکھا یہاں پر دو **الجھنیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ ایک** یہ کہ اگر سرور نے افضل المطابع **محمدی کے خاتمۂ عبارت میں** دو تازہ نسخوں کے لکھنے کی بات کہی ہے تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ان میں سے ایک زیر نظر نسخہ ہی ہو اور کیا یہ ممکن نہیں کہ مطبع احمدی کا یہ ایڈیشن کسی سابقہ ایڈیشن کی نقل ہو؟ دوسرے یہ کہ بالفرض یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے تو دوسرا نسخہ کب اور کہاں چھپا۔ دوسرے نسخہ کی بابت یقین اور وثوق کے ساتھ کچھ کہنا فی الوقت ممکن نہیں لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ افضل المطابع محمدی کا نور کے بعد طبع ثانی (۱۲۸۰ھ) کا ذکر [illegible] نے کیا ہے وہی یہ نسخہ ہوسکتا ہے۔ اب پہلی دقت یوں رفع ہو گئی ہے کہ مطبع احمدی کا یہ ایڈیشن کم از کم ان چاروں نسخوں سے مختلف ہے جن کی بنیاد پر اطہر پرویز اور سید سلیمان حسین نے اپنے اپنے نسخے ترتیب دیے ہیں۔ اس لیے یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ فسانہ عجائب کا یہ ایڈیشن سرور کے مذکورہ "دو تازہ نسخوں" میں سے ایک ہے۔

ہے۔ شروع میں اوپر کی جانب "ومن یتوکل علی اللہ فہو حسبہ" درمیان میں "فسانہ عجائب" اور نیچے "در مطبع احمدی باہتمام مولوی سبحان احمد خاں طبع شد" لکھا ہے "در مطبع ... طبع شد" کے بیچ میں "سنہ ۱۲۷۶ ہجری" درج ہے۔ خاتمۃ الطبع گذشتہ اوراق میں نقل کیا جا چکا ہے۔ یہ نسخہ ناقص الاول ہے۔ سرورق کے بعد چار صفحات غالبا جلد بندی میں نکل گئے ہیں اس طرح "بیان لکھنو" کی حسب ذیل عبارت سے اصل نسخہ کا آغاز ہوتا ہے:

"...... دو بیبی [illegible] کا نیل یا حنا کا [illegible] [illegible] کرنی والا ایسا ملا کہ سہاگ کا عطر [illegible] ہو گیا جو دیکھی دل سرد ہو گیا۔ پھر عطر کی روئی رکھی کان میں جا بیٹھتا کسی [illegible] کی دکان میں ......"

پوری کتاب اسی طرح قدیم طرز املا میں لکھی گئی ہے جا بجا حاشیہ پر مشکل الفاظ، اصطلاحات اور [illegible] عربی فقروں کے [illegible] بیان لکھنو" کے ذیل میں ایک جگہ "مذکور عہد حاکم دوران سلطان ابن سلطان میرزا نصیر الدین حیدر بادشاہ نوجوان" کا عنوان قائم کر کے فسانۂ عجائب کی تالیف سے متعلق یہ عبارتیں تحریر کی گئی ہیں:

"... اچھے آغاز کا انجام بخیر ہوتا ہے اللہ تعالی کسی کی مشقت بیکار نہیں کھوتا ہے۔ یہ فسانہ شروع زمانہ غازی الدین حیدر بادشاہ میں ہوا ہوا تھا اور تمام عہد میں سلطان ابن سلطان ابو النصر نصیر الدین حیدر خلد اللہ ملکہ کی ہوا [illegible] شاہ جم جاہ اریکہ نشین ہوا اس نام کا نام [illegible] ماند حرف غلط مٹایا فقیروں کو امیر بنایا...." (ص ۱۰-۹)

'وجہ تالیف' کے تحت میر امن کی باغ و بہار اور زبان دہلوی کا ذکر کرتے ہوئے سرور لکھتے ہیں:

"... اگر چہ اس ہیچمدان کو یارا نہیں کہ دعوی اردو زبان پر لائے یا اس فسانہ کو پیش سخن سنجان با تمکین کو سنائے جو ساکن یہاں یا دکن کے ممکن اہل زبان کبھی [illegible] ہندوستان تمام دیا بہ چند سے جو دیار گرتا فصیحوں کو تلاش کرتا اور ان سے تحصیل ما حاصل ہوتی تو شاید اس زبان کی کیفیت حاصل ہو [illegible] میر امن صاحب نے قصہ چہار درویش کا باغ و بہار نام [illegible] لکھا ہے کہ ہم لوگوں کی زبان کی حصہ میں یہ زبان آئی ہے [illegible] اول میر امن خان کی سوبگڑ منہ کی کہانی ہے لکھا ہے کہ ہم دلی کے روڑے ہیں پر نادانوں کی بانہہ پاؤں ٹوٹے [illegible] اس ہیچمدان کا نام [illegible] ہوتا ہے مصنف میں نیک بد نام ہوتا ہے......" (ص ۱۲)

آغاز داستان سے قبل دیباچہ تالیف کا آخری حصہ درج ذیل ہے:

"... القصہ امید ناظرین پر تمکین سے یہ ہے کہ جو کچھ عیب ہو بنظر الاصلاح ملاحظہ فرمائیں جہاں سہو یا غلطی پائیں اصلاح سے مزین فرمائیں کیسی ہی

---

فسانۂ عجائب کا زیر نظر نسخہ ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ آخری صفحہ "صحت نامہ" کے لیے وقف کیا گیا ہے جس میں ۷۴ الفاظ کی تصحیح کی گئی ہے۔ سرورق خوبصورت

طبیعت عالي ہوممکن نہیں جو بشر خطا سي خالی ہو۔ تحریر اس کی ایفائی تقریر ہي قصہ دلچسپ بے نظیر ہي۔ مطالعي سي خاطر خطیر اگر شاد ہو عاصي دعاي خیر سي یاد ہو۔ اس کي لکھنے میں نمود نظم و نثر کا خیال نہ تھا۔ شاعري کا احتمال نہ تھا بلکہ نظر ثاني میں جو لفظ دقت طلب غیر مستعمل عربي یا فارسي کا مشکل نظر آیا اپني نزدیک اوسکو دور کیا اور جو کلمہ سہل ممتنع، روز مرہ یا محاورہ کا تھا رہنے دیا۔ دوست کي خوشي سي کام رکھا فسانہ عجائب اس کا نام رکھا بعنایت ایزدی تمام ہوئی کتاب و انہ العبد والیہ المعاب۔" (ص ۲۱۳)

اب تماشا ہي نہ سیر ہي، خاتمہ بالخیر ہي" کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ کیجئے۔

"..... اوسی روز شاہ فیروز بخت نے تاج و تخت بیٹي کو حوالے کیا آپ گوشۂ تنہائی اختیار کیا۔ بادشاہ تو شب اپني عبادت و بیداري میں سحر کرتا تھا۔ وہ تو قایم اللیل صایم النہار مشہور ہوا۔ جان عالم ہر روز تخت پر جلوہ افروز ہو عدل کي داد دیکے شب کو پری پیکروں میں بسر کرتا تھا۔ یہ عادل سخی شجاع یکتاي روزگار مشہور ہوا۔ ذکر دونوں کا تا قیام قیامت صفحۂ روزگار ورق لیل و نہار پر اور بر زبان یگانہ و بیگانہ رہا۔ بابا! ظاہر یہہ فسانہ ہي نادر زمانہ ہي مضمون چکیدہ دل و تحریر خامہ ہي۔ اگر بدیدۂ غور اور نظر تامل سي ملاحظہ کرو تو حقیقت میں کارنامہ ہي مصرعہ گر قبول افتد زہي عز و شرف۔ غرضکہ جس طرح جان عالم کي مطلب ملے اللہ تعالیٰ کل عالم کي مراد اور تمنائي دلی و علی الخصوص سامعین ناظرین مولف راقم کي خواہش اور آرزو بہ تصدق رسول عربي برآئی۔ بحرمتہ النبی و الہ الامجاد بالنون والصاد!" (ص ۱۵۷)

اس کے بعد "چند شعر عبرت آمیز" کے تحت ۱۹ اشعار درج کیے گئے ہیں جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

گلزار کو جہاں کے ہم نے بغور دیکھا ÷ کیا بے ثبات ہے یہ دلچسپ یہ مکاں ہے

ان اشعار کے معاً بعد "تاریخ سرور" ہے۔ پھر یہ عبارتیں تحریر ہیں ؎

"...... جب یہہ کہانی تمام ہوئی اور بطریق اصلاح جناب آغا صاحب کي نظر فیض اثر سي گذري یہہ تاریخ کا قطعہ فرمایا۔

قطعہ

برائی خاطر یاران و احباب سرور ایں مثنوی چوں کرد ایجاد
بجستم سال تاریخش نوازش فلک ایں گلستان بجز ان باد

یہہ فسانہ رائج جو ہوا بند یکے دوست تھے نیک سیرت ستودہ صفات و افعال اکمل ہر کمال تعلق دہر سي شل سرد آزاد لالہ درگا پرشاد ہنر میں عیب پوش تخلص مدہوش خم محبت سي مئي الفت جوش میں آئی اونہوں ني عجب تاریخ مستانہ زیب فسانہ فرمائی۔ یہہ تو بطریق یادگار تاریخ تصنیف باقی رہ گئي وہ یہ سراي سراسر پوچ سي کوچ کر گئي ......" (ص ۱۵۸)

دیگر مروجہ متداول نسخوں کی طرح آخر میں "قطعہ تاریخ مدہوش" ہے جس میں اشعار کی تعداد سترہ ۱۷ ہے۔ یہی قطعہ اطہر پرویز کے نسخہ میں پندرہ ۱۵ اور سلیمان حسین کے نسخہ میں اٹھارہ ۱۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ نسخۂ سلیمان کے مقابلہ میں درج ذیل شعر "اکبرآبادی نسخہ" میں نہیں ہے

کہیں جو آمد کی یار کے کچھ خبر کا چرچا کیا ہے اس نے
تو دیدہ ہر اہل دید کا واں بہ وقف صد انتظار دیکھا

---

فسانۂ عجائب ۱۲۴۰ھ میں لکھا گیا اور اب تک کی معلومات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی بار ۱۲۵۹ھ میں یہ زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ سرور کا انتقال ۱۲۸۶ھ میں ہوا تھا۔ اس طرح کم و بیش ۲۶ برس تک یہ مصنف کی زندگی میں برابر چھپتا رہا اور آج بھی اس کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ کسی تصنیف کی اس درجہ مقبولیت کے ایک سے زیادہ اسباب ہوتے ہیں۔ فسانہ عجائب کے زمانۂ تالیف کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ دور لکھنوی تہذیب کا نقطۂ عروج ہی نہیں بلکہ یہاں عوام سے زیادہ خواص اور ادنیٰ کے مقابلہ میں اعلیٰ کا ایک ایسا طبقاتی تصور ہے جس نے زندگی، ادب اور سماج کی جملہ اقدار کو خاص معنویت بخشی ہے۔ سرور نے لکھنوی تہذیب کے اسی دور کو فسانہ عجائب کے ذریعہ آئینہ دکھانے کی سعی کی ہے ان کی اس سعی کا نقش اول "بنیادی متن" کی شکل میں موجود ہے لیکن نقش ثانی اور متعدد نظر یافتہ نسخے، نقش اول کے خالق کو مزاجاً لکھنوی بنا دیتے ہیں۔ اس طرح لکھنؤ کا یہ ادیب "نمود نظم و نثر و جودت طبع" کا کھل کر مظاہرہ کرتا ہے۔ اُس کے اس انداز و اسلوب پر دوسرے چیں بہ جبیں ہوتے ہیں تو اسے اس کی پرواہ نہیں کہ کسی کو وہ خاطر میں نہیں لاتا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ مخالفین کا یہ انداز اس کے توسن طبع کے لیے مزید تازیانہ کا حکم رکھتا ہے۔ سرور کا یہی مزاج اور رجحان تھا جس نے آخر وقت تک انھیں محتاط بنائے رکھا اور وہ کبھی دوسروں کی خوشی اور اصرار پر اور کبھی ذاتی تسکین کے لیے فسانۂ عجائب کی نوک پلک درست کرتے رہے۔ ان حالات میں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جو کام دوسروں کی خوشنودی کے لیے کیا گیا ہو۔ اس میں ایک طرح کا جبر ہوگا اور جبر یا دباؤ کی حالت میں کیا گیا کام اس کام کے مقابلہ میں کم تر ہوگا جسے "بہ پاس خاطر خود" کیا جائے۔ فسانہ عجائب کا زیر نظر نسخہ اسی لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل نظر آتا ہے کہ یہ سابقہ نسخوں کی طرح مہتمم مطبع یا محبان صادق کی نظر ثانی کی فرمائش پر 'تیار' نہیں بنایا گیا بلکہ ایسا کرکے مصنف اپنی 'انا' کی تسکین چاہتا تھا۔ نسخۂ اکبرآباد کا اس حیثیت سے جائزہ بعض دلچسپ پہلوؤں کی نشاندہی کرتا ہے۔

اطہر پرویز اور سلیمان حسین نے اپنے اپنے نسخوں کی بنیاد ان قدیم مطبوعہ نسخوں پر رکھی ہے جن میں "موقع اور محل کی رعایت سے جلے بڑھائے یا گھٹائے گئے ہیں یا جو کوشش عظیم سے ملاحظہ کرکے" تیار کیے گئے تھے۔ بلاشبہ یہ نسخے سرور کے

نظر یافت رہے ہیں مگر اکبرآبادی نسخہ سے ان کا تقابلی مطالعہ یہ تاثر دیتا ہے کہ مصنف نے زیرِ نظر نسخہ میں نمایاں تبدیلیاں کی ہیں۔ فسانۂ عجائب کے متعدد نسخوں میں پائی جانے والی تبدیلیوں کے متعلق نیر مسعود کا یہ خیال ہے کہ "سرور نے زیادہ تر تبدیلیاں اور اضافے دیباچہ ہی میں کیے ہیں۔ اصل داستان میں عنوانوں کے سوا دوسری تبدیلیاں بہت کم ہیں[11]"۔ پتہ نہیں نیر مسعود صاحب کی "دوسری تبدیلیاں" سے کیا مراد ہے مگر نمایاں تبدیلیوں سے ہماری مراد نفسِ قصہ سے قطع نظر اس انداز و اسلوب سے ہے جو فسانۂ عجائب میں یکساں نہیں مگر سرور کے بار بار نظرِ ثانی کے عمل نے اسے بنیادی حیثیت کا حامل بنا دیا ہے۔ گذشتہ اوراق میں اکبرآبادی نسخہ سے جو اقتباسات نقل کیے گئے ہیں ان کا مقابلہ و موازنہ اطہر پرویز اور سلیمان حسین کے نسخوں سے کیجئے تو پتہ چلے گا کہ سرور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اس باب میں کتنا بدل گئے ہیں۔ ذیل میں ایک اقتباس اور درج کیا جاتا ہے تاکہ تقابلی مطالعہ میں آسانی پیدا ہو سکے :

"...... موج بخشش سي اوس بحر جود و عطا كي ہزاروں سائل لب تشنہ سیراب اور نائرہ غضب کي شعلي سي لاکھوں دشمن جگر سوختہ بیتاب دبدبۂ داد و دہي غلغلہ عدالت سي دشمن دوست جاني چور مسافر كي مال كا نگہبان ڈکیتوں کو عہدہ پاسباني ملک و افر سپاہ بیقیاس خزانہ لا انتہا بیکراں وزیر امیر جانفشاں تاج بخش تاج ستاں فقیر و سائل کا شہر میں نام نہیں داد فریاد آہ و نالہ سي کسیکو کام نہیں۔ رعیت راضي سپاہ سرفروش جاں نثار شاداں دشمن خایف شمع کا چور سر محفل لرزاں اس نام سي یہہ ننگ و نفرت تہي کہ امیروں کا یہ جو رمحل نہ ہوني پاتا تہا دزد حنا کا رنگ نہ جمتا تہا۔ سر دست ہاتہہ باندہا جاتا تہا۔ آنکھہ چراني سي ہم چشم چشمک کرتي تہے۔ کار خیر سي اگر جي چرایا تو نامردکي ہمت اوسپر ہوتي تہي۔ الّا پاس ثروت و حکومت کا شانہ امید کا چراغ گل اولاد بالکل نہ تہی۔ خواہش اولاد فرزند دردل کاہش نہ ہوني کي متصل حسرت پسر میں رَبِّ لَاتَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ ہر ساعت۔ بر بان وَرَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا۔ وظیفہ ہر زمان لڑکي کي تمنا میں مثل گدا دست دراز ایسا لاپروا بی نیاز کي قدرت سي با نیاز آخرش جناب باري تضرّع درازي اوسکي منظور ہوئي لاولدیکي بدنامی دور ہوئي ساٹھہ برس کي سن میں بڑھاپے کی دن میں گوہر آبدار درِ شاہوار صدفِ بطن بانوئِ تختہ اوّل سي پیدا ہوا۔ چھوٹا بڑا اس کي صورت کا شیدا ہوا۔ اس روح افزا کا فیروز بخت ني جان عالم نام رکھا ......" (نسخۂ اکبرآباد ص ۱۵-۱۴)

اس اقتباس سے اندازہ ہوگا کہ سلیمان حسین نے مطبع محمدی کانپور کے نسخہ کی مدد سے جس قدر اضافے کیے ہیں وہ سب اکبرآبادی نسخہ میں نہ صرف موجود ہیں بلکہ یہاں اختلاف نسخ کی صورت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ نسخۂ اکبرآباد میں یہ صورت جا بجا موجود ہے اس کی نوعیت یہ ہے کہ مصنف نے بعض لفظ، فقرہ یا ترکیب ہی نہیں بلکہ عبارتوں کو بھی یکسر بدل دیا ہے۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں دیکھئے :

۱۔ "...... چند قدم بڑہا تھا سواري کا سامان سامني آیا۔ بچو بڑہا ئیو کا شور بلند پایا۔ دیکہا تو ایک خواجہ سرا پرانا بہت زیرک دانا مگر با خاطر حزیں غمگیں اور سیہ پوش حواس باختہ ہوش فراموش اندوہ یا رنج سي ہم آغوش جان عالم ني اوسکي ہمراہیوں سي نام پوچہا معلوم ہوا کہ محبوب علی خاں نام، ي طازم شاہي نظارت سراپردۂ سلطاني کا کام ہي۔ شہزادي ني سلام کیا ....."
(نسخۂ اکبرآباد، صفحہ ۵۱)

"...... چند قدم اور بڑھا سواری کا سامان سامنے آیا۔ "بچو بڑھا ئیو" کا شور بلند پایا۔ دیکھا ایک خواجہ سرا پرانا (بہت بزرگ) زیرک و دانا محبوب علی خاں نام نواب ناظر سراپردۂ شاہی با احترام (مگر) وہ بھی با خاطر حزیں غمگیں (اور) سیاہ پوش، حواس باختہ، ہوش فراموش اندوہ یا رنج سے ہم آغوش۔ جان عالم نے سلام کیا .....[16]

۲۔ "...... جان عالم قدرت حق دیکہتا تہا حواس گم ہوش برجانہ تہا۔ دل سي کہتا تہا تعزّ من تشاء و تذلّ من تشاء۔ جو کچھ چاہا وہ کیا جل جلالہ۔"
(نسخۂ اکبرآباد ص ۵۱)

"...... جان عالم قدرت حق دیکھتا جاتا تھا۔ حواس گم ہوش برجا نہ تھا۔ دل سے کہتا تھا۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (جو کچھ چاہا وہ کیا جل جلالہ)[18]

۳۔ "......... محسنٹن ني پوچہا کیا گذري جواب دیا ملاقات نہ ہوئي کل پہر جاؤں گا اوس نے کہا صبح کا جانا روز سیاہ شام غم دکہائي گا۔ بہور ہو جائي گي پچہتایے گا ......" (نسخۂ اکبرآباد ص ۷۸)

"........ محسنٹن نے حال پوچھا (کیا گذری) بولا۔ ملاقات نہ ہوئی۔ کل پھر جاؤں گا۔ اس نے کہا صبح کا جانا روز الم شام غم دکھائے گا بہت پچھتائے گا......"

۴۔ "......... ایک طرف قوس قزح جیسی دہنک کہتے ہیں بصد جلوہ و شان چرخ پر نمایاں، سرخ، سبز، زرد، دہاني لکیریں عیاں بلبل کی چہچہے درخت سبز لہلہی جہاں تک نظر کام کري سبزہ زار گلہائے صحرا کي بہار ........ کسی جا طاؤسان طناز سرگرم رقص ناز، لب ہر چشمۂ آب مرغابي و سرخاب کبھی نمود ہونا ماہ کا تاروں کا چمکنا چکور کا نعرہ آہ کا ...... یہ سیر ہجر جاناں میں جس کي نظر سي گذر جائي کیوں کہ اس کا دل ٹکڑي ٹکڑي نہو اور چہاتي کس طرح نہ بہر آئي ....." (نسخۂ اکبرآباد ص ۳۵)

"...... ایک سمت قوس قزح جسے دھنک کہتے ہیں بصد عظم و شان فلک پر نمایاں سرخ، سبز، زرد، دھانی لکیریں عیاں، بلبل کے چہچہے درخت سرسبز لہلہے کوسوں تک سبزہ زار پھولوں کی بہار ..... کسی جا طاؤسان طناز سرگرم خرام ناز لب پہ چشمۂ آب مرغابی و سرخاب کبھی نمود ہونا ماہ کا

(تاروں کا چمکنا) چکور کا دوڑنا بھرنا آہ کا ....... یہ سیر جو ہجر جاناں میں نظر سے گذر جائے کیوں کہ دل ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو اور چھاتی (کس طرح نہ بھر آئے)"[۲۰]

۵۔ "...... دنیائی دوں کی معاملی بوقلموں ہیں کس کس کو یاد کیجئے کس امر کا غم کون سی مقدمی سی دل شاد کیجئے ....." (نسخۂ اکبرآباد ص ۸۰)

"...... اے نادان دنیا میں کس (کس) بات کو یاد کیجئے کس (امر) کا غم کون سے مقدمہ سے دل شاد کیجئے ..." [۲۱]

رعایت لفظی و معنوی سے قطع نظر سجع، وضاحت مفہوم اور زور بیان کا نسخہ اکبرآباد میں خاص اہتمام نظر آتا ہے۔ ایسی بعض مثالیں گذشتہ اقتباسات میں بھی گذر چکی ہیں ذیل میں چند اور مثالیں ملاحظہ کیجئے:

۱۔ بی تامل نقش سلیمانی (جو بزرگوں سے امانت اور نشانی چلا آتا تھا صندوق سی نکال کی بازو پر باندھا ..." (نسخۂ اکبرآباد ص ۳۱)

"..... بے تامل نقش سلیمانی (جو بزرگوں سے امانت اور نشانی چلا آتا تھا صندوق سی نکال کے بازو پر باندھا۔" [۲۲]

۲۔ "...... تو اکیلا تمام دن گھبراتا ہوگا خالی مکان اور باغ کاٹی کھاتا ہوگا"

(نسخۂ اکبرآباد ص ۳۱)

"....... تو اکیلا تمام دن گھبراتا ہوگا خالی (مکان اور) باغ کاٹے کھاتا ہوگا" [۲۳]

۳۔ "...... گریبان سحر چاک ہوا رات کا قصہ پاک ہوا ...."

(نسخۂ اکبرآباد ص ۳۰)

"...... گریبان سحر چاک ہوا (رات کا قصہ پاک ہوا)" [۲۴]

۴۔ "...... جب نصف شب گذری لہو ولعب سی فرصت ملی"

(نسخۂ اکبرآباد ص ۳۱)

"..... جب نصف شب گذری (لہو ولعب سے فرصت ملی)" [۲۵]

۵۔ "...... تیری اجازت ہو تو جاؤں دربار کا رنگ دیکھ آؤں ...."

(نسخۂ اکبرآباد ص ۳۰)

"...... تیری اجازت ہو تو جاؤں (دربار کا رنگ دیکھ آؤں)" [۲۶]

۶۔ "...... جب ملکہ پڑھ چکی جان عالم نی یہ شعر سناکی اوس خواص کو متنبہ کیا ....." (نسخۂ اکبرآباد ص ۴۳)

"...... (جب ملکہ پڑھ چکی تو جان عالم نے یہ شعر سنا کے) اس خواص کو متنبہ کیا" ..... [۲۷]

۷۔ "...... القصہ تا در باغ با خاطر فراغ پہنچی ...." (نسخۂ اکبرآباد ص ۱۴)

"...... القصہ تا در باغ با خاطر فراغ پہنچے ...." [۲۸]

۸۔ "...... یکایک اوس آگ سی ہرن نکلا اچھلا کودا پھر اوسی میں غائب ہوا ...." (نسخۂ اکبرآباد ص ۵۹)

"..... (یکایک) ایک ہرن اس آگ سے نکلا اچھل کود کر پھر اسی میں غائب ہوا ...." [۲۹]

۹۔ "...... تقاضائے سن الڑھ پنی کی دن سیر تو یہہ ہوئے دونوں ناتجربہ کار بادۂ الفت کی سرشار کیا کیا گھبرائی ہزاروں طرح کی وہم نئی نئی خیال آئی ...." (نسخۂ اکبرآباد ص ۱۹)

"...... تقاضائے سن الڑھ پنے کے دن (سیر تو یہ ہوئی، دونوں ناتجربہ کار بادۂ الفت کے سرشار اس وقت دونوں (کیا کیا) گھبرائے (ہزاروں طرح کے وہم نئے نئے خیال آئے .....")[۳۰]

۱۰۔ "...... ہرکاری یہہ ماجرا دیکھ کی فوراً بادشاہ کی حضور میں حاضر ہوئی بعد دعا و ثنا دست بستہ عرض کی ای شہریار نصرت آثار فتح مبارک شہزادۂ آفت روزگار فخر رستم و اسفندیار ہی ایک تیر میں وہ آگ کا قلعہ ٹھنڈا کر کی سر گرم راہ ہوا اوس جادوگر کا گھر تباہ ہوا ....."

(نسخۂ اکبرآباد ص ۵۷)

"...... ہرکارے یہ ماجرا دیکھ کے فوراً بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے بعد دعا و ثنا دست بستہ عرض کی "اے شہریار (نصرت آثار) ذوی الاقتدار فتح مبارک (شہزادہ آفت روزگار فخر رستم و اسفندیار ہے) ایک تیر میں وہ آگ کا قلعہ ٹھنڈا کر کے سرگرم راہ ہوا (اس جادوگر کا گھر تباہ ہوا)" [۳۱]

سرور نے درج ذیل اشعار میں ترمیم بھی کی ہے ؎

مری بات یہ دل سے کرنا یقیں ٭ کسی کا کوئی دوست ہرگز نہیں
جو یہ دوست ہیں ان سا دشمن نہیں ٭ نہیں ہیں نہیں ہیں نہیں ہیں نہیں

(نسخۂ اکبرآباد ص ۸۹۔۸۸)

نسخۂ سلیمانی میں یہ اشعار اس طرح درج ہیں ؎

مری بات یاد یہ کرنا یقیں ٭ کسی کا کوئی دوست مطلق نہیں
جو یہ دوست ہیں ایسے دشمن نہیں ٭ نہیں ہیں نہیں ہیں نہیں ہیں نہیں [۳۲]

فسانۂ عجائب کے متن میں جا بجا اشعار درج ہیں۔ ان میں سے اکثر کے خالق کا نام نہیں لکھا گیا ہے سلیمان حسین نے اپنے نسخہ کے حاشیہ پر ایسے اشعار کی نشاندہی کی ہے اور اس پر شاعر کا نام لکھ دیا ہے۔ زیر نظر نسخہ میں اگرچہ یہ صورت حال نظر آتی ہے تاہم بیشتر اشعار اس سے مبرا بھی ہیں۔ صرف ایک مثال دیکھئے ؎

"...... مگر دل شکنی کیسی کی اپنی مذہب میں گناہ عظیم ہی خدا اس بات کا علیم ہی۔ میرسوز سے

عوض ہی دل شکنی کا بہت محال اے یار
جو شیشہ ٹوٹی تو کیجی جواب شیشہ کا

(نسخۂ اکبرآباد ص ۴۰)

سلیمان حسین نے کلیات سودا مرتبہ آسی کے حوالہ سے اسے سودا کا شعر قرار دیا ہے جبکہ نسخۂ اکبرآباد میں یہ شعر میر سوز کا تحریر کیا گیا ہے۔

نفس داستان کے نقطۂ نظر سے اس نسخہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے جو تبدیلیاں کہ نمایاں ہیں ان کا تعلق زبان و بیان اور انداز و اسلوب سے ہے جس میں چند کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات اور قابلِ ذکر ہے کہ نسخۂ اکبرآباد میں قصوں کے جملہ عنوانات تبدیل شدہ ہیں۔ اس باب میں سرور نے خاصی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ذیل میں فسانۂ عجائب کے آخری حصہ کا عنوان درج ہے۔

"اب تماشا ہی دیکھیے، خاتمہ بالخیر ہے۔ دشمن پہونچنا اس سیاحت کا، جہاں گردار کا آرام اور بیٹین بیں۔ قدمبوسی و زیارت ملنا والدین سے، پھر فیروز شاہ کا تخت و تاج جان عالم کو دینا آپ گوشۂ عزلت لینا اور قتل کرنا وزیر زادے کو۔"

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں اب یہ بات بہ آسانی کہی جا سکتی ہے کہ سرور نے فسانۂ عجائب کے جن جن نسخوں پر نظر ثانی اور اس کے نقش و نگار کو اُبھارنے کی کوشش کی ان میں سے ایک نسخہ مطبع احمدی اکبرآباد کا بھی ہے۔ چونکہ یہ نسخہ عام طور پر محققین کی نظروں سے پوشیدہ رہا اس لیے فسانۂ عجائب کے کسی اہم ایڈیشن میں اسے شامل کیا جا سکا اور نہ ہی کسی نئے ایڈیشن کی ترتیب و تدوین میں اس سے فائدہ اٹھایا جا سکا۔

ڈاکٹر سلیمان حسین کے طریقِ کار کا ہمیں علم ہے کہ انھوں نے مطبع محمدی (۱۲٦۷ھ) سے شائع شدہ نسخہ سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور اس کے وہ تمام اضافے جو نول کشوری ایڈیشن (۱۲۸۳ھ) کی عبارتوں سے مربوط ہو سکے بعینہٖ اپنے متن میں شامل کر لیا ہے۔ مطبع احمدی کے زیر نظر نسخہ میں یہ تمام اضافے موجود ہیں اور اس کے موازنے سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ جب ایک ہی نسخہ میں اتنے محاسن موجود ہیں تو دو نسخوں کی مدد سے کسی نئے نسخہ کی ترتیب کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔ اس مسئلہ میں ایک اور بات کی وضاحت ضروری ہے۔ شروع میں مطبع محمدی کانپور کے جس نسخہ کی بابت نیر مسعود کا یہ بیان ظاہر کیا گیا ہے کہ مالکوں نے عام طور پر اسے پسند نہیں کیا اور وہ مطبع حسنی سے طبع شدہ (۱۲٦۷ھ) نسخہ ہی چھاپتے رہے، اس مقام پر غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ مطبع حسنی کے مذکورہ ایڈیشن کے دیباچہ میں سرور نے جس قدر تبدیلیاں کیں ان میں ایک یہ تھی کہ میرامن کی باغ و بہار اور زبان دہلوی کے ذکر کے ساتھ مولف اوّل کا نام بھی شامل کر دیا تھا اور یہ لکھا تھا کہ "بہ نسبت مولف اور عطا حسین خاں تحسین کے، ہر جگہ منھ کی کھائی ہے۔" ۱۲٦۳ھ کے بعد ۱۲٦۷ھ میں دوبارہ اس کی شمولیت نیر مسعود کے خیال کی تردید کرتی ہے اور یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ سرور مولف اوّل کا ذکر کر کے باغ و بہار کے ماخذ اصلی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ یہ خیال اس لیے بھی پیدا ہوتا ہے کہ باغ و بہار سے اس کے قصوں کے ماخذ کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو پھر فسانۂ عجائب کے مصنف کا نوطرز مرصع سے اثرات قبول کرنا یقینی ہے[۱۴] کہ نوطرز مرصع کی جملہ خوبیوں کو نظر میں رکھے بغیر "ہر جگہ منھ کی کھائی ہے" کا فقرہ لکھنا کوئی آسان بات نہیں۔ ■

## حواشی

۱۔ فسانۂ عجائب، مرتبہ اطہر پرویز ص ۴۵

۲۔ فسانۂ عجائب مرتبہ سید سلیمان ص ۳۸ — ۳۷

۳-۴۔ ملاحظہ ہو رجب علی بیگ سرور ص ۳۱ تا ۱۴۴ اور فسانۂ عجائب ص ۲۸ تا ۵۰

۵۔ رسالہ آج کل، فروری ۱۹۸۴ء مضمون بعنوان "فسانۂ عجائب سے متعلق کچھ تحقیقی مشاہدات"

٦۔ فسانۂ عجائب، مرتبہ اطہر پرویز ۴۳ — ۳۳۳

۷۔ ایضاً ص ۴۳

۸۔ رجب علی بیگ سرور مصنفہ ڈاکٹر نیر مسعود ص ۱۳٦

۹۔ ایضاً 〃 ص ۱۳٦

۱۰۔ مرزا محمد علی نام اور عیش تخلص تھا ۱۲۸۳ھ میں نول کشور پریس سے فسانۂ عجائب کا جو نول کشوری ایڈیشن شائع ہوا تھا اس پر مرزا فدا علی نے ہی تقریظ لکھی تھی۔ ملاحظہ ہو رجب علی بیگ سرور، مصنفہ ڈاکٹر نیر مسعود ص ۱۳۱

۱۱۔ رجب علی بیگ سرور، مصنفہ نیر مسعود ص ۱۱۰

۱۲۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے رشید حسن خاں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "ان کا کہنا ہے یہ غلط فہمی عام ہے کہ سرور نے فسانۂ عجائب کے بیشتر ایڈیشنوں پر نظر ثانی کی ہے۔ ان کے مطابق ذیل کے صرف پانچ ایڈیشن سرور کے نظر کردہ ہیں —
۱۔ مطبع حسنی لکھنؤ طبع اول ۱۲۵۹ھ ۔ ۲۔ مطبع حسنی طبع دوم ۱۲٦۳ھ
۳۔ مطبع محمدی کانپور ۱۲٦۷ھ ۔ ۴۔ افضل المطابع کانپور طبع اول ۱۲۷٦ھ
۵۔ افضل المطابع کانپور طبع دوم ۱۲۸۰ھ ان کے نزدیک صرف مندرجہ بالا ۲ تا ۵ ایڈیشنوں پر نظر ثانی ہوئی ہے دوسرے تمام ایڈیشن انہیں پانچ میں سے کسی کی نقل ہیں ... وہ مطبع حیدری ۱۲٦۲ھ کا ذکر نہیں کرتے جس میں مصنف نے غازی الدین حیدر کا نام نکال کر امجد علی شاہ کا ڈال دیا تھا ..."
آج کل، فروری ۱۹۸۴ء ص ۷ — ٦

۱۳۔ اس مضمون میں نسخۂ احمدی اکبرآباد سے جس قدر اقتباسات درج کیے گئے ہیں ان میں اصل املا ملحوظ رکھا گیا ہے۔ راقم

۱۴۔ اطہر پرویز کے مرتبہ نسخہ میں "چند شعر عبرت آمیز" کا ذکر نہیں البتہ سلیمان حسین کے مرتب کردہ نسخہ (ص ۳٦۳) میں یہ شعر اس طرح لکھا ہے ؎
گلبرگ کو جہاں کے ہم نے بغور دیکھا ÷ آتے نگ پہ نہیں ہے نگین اس کا نقشہ

۱۵ اطہر پرویز اور سید سلیمان کے نسخوں میں "قصہ" ہے۔ راقم

۱۶ رجب علی بیگ سرور۔ ص ۱۳۵

۱۷ فسانۂ عجائب۔ مرتبہ سید سلیمان حسین۔ ص ۱۴۳

۱۸ ایضاً 〃 〃 ص ۱۴۳

۱۹ ایضاً 〃 〃 ص ۱۹۸

۲۰ ایضاً 〃 〃 ص ۱۱۰

۲۱ ایضاً 〃 〃 ص ۲۰۲

۲۲ ایضاً 〃 〃 ص ۱۰۳

۲۳ ایضاً 〃 〃 ص ۱۰۲

۲۴ ایضاً 〃 〃 ص ۱۰۰

۲۵ ایضاً 〃 〃 ص ۱۰۲

۲۶ ایضاً 〃 〃 ص ۱۰۰

۲۷ ایضاً 〃 〃 ص ۱۲۷

۲۸ ایضاً 〃 〃 ص ۱۲۳

۲۹ ایضاً 〃 〃 ص ۱۵۳

۳۰ ایضاً 〃 〃 ص ۱۶۸

۳۱ ایضاً 〃 〃 ص ۱۵۴

۳۲ فسانہ عجائب مرتبہ اطہر پرویز میں بھی اسی طرح لکھا ہے' ملاحظہ ہو ص ۲۳۲

۳۳ فسانہ عجائب مرتبہ سید سلیمان حسین ص ۱۲۱

۳۴ ڈاکٹر اطہر پرویز نے نیر مسعود کے اس خیال سے اختلاف کیا ہے کہ "سرور کے ذہن میں لکھنؤ کا حال لکھنے کا خیال پیدا کرنے کے ذمہ دار بظاہر میر حسین عطا خاں تحسین ہیں"۔ انھوں نے اسے "دور کی کوڑی" قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "محض چند جملوں کی مماثلت بہت اہم نہیں"۔ فسانہ عجائب۔ مرتبہ اطہر پرویز ص ۴۸

● ●

## بقیہ: ادبی تنقید

متفق نہیں ہو سکتا۔ نفسیات ایک اثباتی positive سائنس ہے جو کچھ انسان کے تجربہ میں داخل ہے نفسیات اس کا بیان اور تشریح کر کے اس کی توجیہ کرتی کرتی ہے۔ اس کی خوبی یا برائی' یا حسن یا قبح سے نفسیات کو کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ اس کے زیر مطالعہ جو کچھ بھی ہوتا ہے اسے کسی متعین معیار کے مطابق اچھا یا برا' رد یا بلند قرار دینا اس کے دائرہ تحقیق و تفتیش سے باہر ہے اس کے برخلاف تنقید کا ماحصل کھوٹے کھرے کی تمیز کرنا ہے وہ کسی تخلیق کی تشریح و تفسیر کر کے اس کے اچھی یا بری ہونے کا فیصلہ صادر کرتی ہے اس اعتبار سے نفسیاتی تنقید کی اصطلاح نفسیات کے طریقہ تحقیق و مطالعہ سے عدم واقفیت کی غمازی کرتی ہے البتہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تنقید نگار صرف کسی تخلیق کی تشریح و تفسیر کر کے اپنے فرض کی تکمیل کر لیتا ہے اور تخلیق کے اچھی یا بری ہونے کا فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتا ہے' اگر ماہرین تنقید تنقید کے فریضہ کی ادائیگی کے لیے کسی تخلیق پر فیصلہ جاتی انداز سے اظہار رائے کو لازمی نہیں سمجھیں تو راقم کو نفسیاتی تنقید کی اصطلاح پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

سطور بالا میں راقم نے عمل تنقید کی وضاحت کے سلسلے میں معروضی اور موضوعی کے متنازعہ فیہ مسئلے کو بھی ضمنی طور پر چھیڑ دیا ہے اس کی بابت اپنی ذاتی رائے پیش کر دینا غالباً خارج از بحث نہیں سمجھا جائے گا۔ راقم کے خیال میں معروضی تنقید وہی ہوگی جو بے لاگ یا غیر شخصی کہی جا سکے۔ اس کے علاوہ ہر دوسری نہج کی تنقید موضوعی کہی جائے گی ہم اسے نظریاتی بھی کہہ سکتے ہیں۔ جیسے مارکسی تنقید' عمرانی تنقید وغیرہ۔ ہم اس تنقید کو بھی اسی زمرے میں رکھیں گے جو کسی اخلاقی یا مذہبی نظریہ کے تحت کی جاتی ہے۔ ان ساری تنقیدوں میں تنقید نگار اس نظریہ یا مکتب فکر کو جس سے اس کی وابستگی ہوتی ہے اپنے قاری پر وارد کر کے کسی تنقید کے اچھی یا بری ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ میں ایسی تنقید کا منکر نہیں ہوں لیکن تنقید کا وہ فائدہ جسے خالص ادبی نوعیت کا سمجھا جائے نظریاتی تنقید سے حاصل نہیں ہوگا۔ بقول شاد عظیم آبادی' تنقید نگار فنکار کو تخلیق کی انجانی راہ سے بچ بچ کر قدم بڑھانے میں اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہ کسی تخلیق پر محض ادبی نقطہ نگاہ سے سنجیدگی اور غیر جانبداری سے بحث کر کے بھی ممکن ہو سکتا ہے۔

شہنشاہ مرزا

# ناول کا فن

ناول کو موجودہ عہد کا رزمیہ کہا جاتا ہے ۔ اسے ہم قصّے کی جدید ترین شکل کہہ سکتے ہیں ۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کے مطابق یہ لاطینی زبان کا لفظ ہے ، جہاں اسے 'نئے' کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا ۔ اردو میں یہ لفظ براہِ راست نہیں آیا بلکہ انگریزی کے توسّط سے آیا ۔ انگریزی زبان میں ناول کا ارتقا نہایت فطری انداز میں ہوا اور وہاں اس عمل میں صدیاں لگ گئیں ۔ چاسر ( CHAUCER ) کو انگریزی زبان میں شعر و ادب کا باوا آدم تسلیم کیا جاتا ہے ۔ اُس نے چودھویں صدی میں 'جب انگریزی زبان اپنے ارتقا کے ابتدائی دور میں تھی' ، 'کنٹربری حکایات' (THE CANTER BURY TALES) کے عنوان سے انگریزی سماج کے جو دلچسپ قصّے سنائے تھے ، اُن میں ناول کے عناصر بہ آسانی تلاش کئے جا سکتے ہیں ۔ انہیں ناول تو نہیں تسلیم کیا جا سکتا ، لیکن انگریزی ناول کے ابتدائی 'خط و خال' اُن حکایات میں تلاش کئے جا سکتے ہیں ۔

ریکس وارنر ( REX WARNER ) کی رائے یہ ہے کہ ناول لکھنا ایک فلسفیانہ مشغلہ ہے ۔ اگر ہم اس کے مذکورہ الفاظ کی گہرائی میں جائیں تو ہمیں ناول کی اہمیت کا بخوبی احساس ہو جائے گا ۔ فلسفیانہ خیالات کا اظہار ایک سنجیدہ اور مہذّب شعور کے بغیر کسی بھی طرح ممکن نہیں ، لہٰذا ناول لکھنا بھی اُس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا ، جب تک آپ ایک مہذّب اور سنجیدہ شعور کے مالک نہ ہوں ۔ انگریزی میں جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے ، ناول کے امکانات چودھویں صدی سے موجود تھے ۔ چاسر کے بعد سر فلپ سڈنی ، جان للی ، جان بنیین ، ڈیفو اور سولفٹ وغیرہ نے اپنے کارناموں سے ان امکانات کو مزید روشن کیا ، مگر ناول کا باقاعدہ آغاز اٹھارہویں صدی ہی میں ممکن ہو سکا ۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی معاشرہ کی زبان میں ناول کا وجود اُسی وقت قائم ہوتا ہے ، جب اُس کا شعور کافی پختہ اور گہرا ہو چکتا ہے ۔ جس زبان میں ناول کی بنیاد پڑتی ہے ، اُس کی جڑیں بھی جب تک کافی مضبوط و مستحکم نہیں ہو جاتیں ، اُس وقت تک وہاں ناول کا رواج نہیں ہو پاتا ۔ چنانچہ نشاۃ ثانیہ کے بعد ہی یوروپی سماج میں ناول کا رواج عام ہوا ۔ جب مختلف سماجی تبدیلیوں کے سبب زندگی کے متعلق عام نقطۂ نظر میں کافی تبدیلی واقع ہوئی ۔ جس ادب میں زیادہ اچھے ناول لکھے جاتے ہیں ، وہ اتنا ہی پختہ اور سنجیدہ سمجھا جاتا ہے ۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ناول تفریح یا تفننِ طبع کے لیے ہرگز نہیں لکھا جاتا ۔ بلکہ یہ کسی بھی معاشرے کے مہذّب اور ترقّی یافتہ شعور کا مظہر ہے ۔ تفریح اور وقت گزاری کے لیے جو چیزیں لکھی جاتی ہیں اور ہمارے ادب میں جن کی کثرت ہے وہ اور کچھ ہوتی ہوں تو ہوں ناول ہرگز نہیں ہو سکتیں ۔ اس لیے کسی بھی زبان میں ناول کی تاریخ ترتیب دینا انتہائی دشوار کام ہے ۔ کیوں کہ مقبولِ عام اور تفریحی ناولوں کی بھیڑ میں ، اُن ناولوں کو تلاش کر کے علیحدہ کرنا ، جنہیں صحیح معنوں میں ناول قرار دیا جا سکے ، دیدہ ریزی کا کام ہے ۔ اور ناول کے عام ناقد خود کو اس دیدہ ریزی کے لیے آمادہ نہیں کر پاتے ، اس لیے اکثر بھیڑ بکری کو ایک ہی گھاٹ پانی پلانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں ۔

ناول کو سرمایہ دارانہ عہد کی پیداوار قرار دیا جاتا ہے ۔ یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے بعد جب صنعتی انقلاب رُونما ہوا تبھی وہاں سرمایہ دارانہ نظام کی نشو و نما ہوئی اور اس کے تحت معاشرہ میں مختلف نوعیت کی پیچیدگیوں کا جنم ہوا ۔ فرد ایسے معاشرہ میں **خود کو غیر محفوظ** تصوّر کرنے لگا ۔ یہ احساس جتنا شدید ہوتا گیا ، ناول کے امکانات اتنے ہی روشن ہوئے ۔ بڑے ناول اُنہیں معاشروں میں لکھے گئے ہیں جہاں فرد کو زیادہ سنگین نوعیت کے مسائل سے دو چار ہونا پڑا ہے ۔ اردو ہی کے تناظر میں اگر

● ۸۲ - وکٹوریہ اسٹریٹ ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

اس بات کو پرکھا جائے تو معلوم یہ ہوگا کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی پسپائی کے بعد لکھنؤ کا نشاط انگیز معاشرہ بالکل ہی تاراج ہوگیا۔ اُس کی تباہی نے بہت سے اقتصادی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی مسائل کو جنم دیا اور فرد خود کو اس معاشرے میں بالکل ہی غیر محفوظ سمجھنے لگا۔ اُس عہد کے پیچیدہ مسائل اور اس انحطاط پذیر معاشرہ کی جیتی جاگتی تصویریں دیکھنا مقصود ہوں تو "امراؤ جان ادا" کے آئینے میں دیکھئے۔

۱۸۵۷ء کے بعد جو دوسرا اہم سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی انقلاب رونما ہوا۔ وہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم اور فسادات تھے۔ اس تقسیم کے جو خون آشام نتائج برآمد ہوئے اور اس کی وجہ سے ذہنی جلاوطنی اور فرد کی تنہائی کا جو احساس نمایاں ہوا اُسی کے نتائج تھے کہ "آگ کا دریا" اور آگے چل کر "اُداس نسلیں" جیسے یادگار ناول لکھے گئے، جن میں ذہنی جلاوطنی، معاشرتی انقلاب، فرد کی تنہائی اور بے بسی کا احساس بھرپور طور پر نمایاں ہوا ہے۔ جس معاشرہ کے مسائل جس قدر پیچیدہ اور لاینحل ہوتے ہیں، اُس میں اتنے ہی زیادہ اچھے ناول عالم وجود میں آتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آرکیڈیا (ARCADIA) اور رابنسن کروسو (ROBINSON CRUSOE) جیسی چیزوں کو ناول نہیں تسلیم کیا گیا۔ اور ٹام جونس (TOM JONES) اور پرائیڈ اینڈ پریجوڈس (PRIDE AND PREJUDICE) جیسی تخلیقات کو ہی ناول تسلیم کیا گیا۔

ای۔ ایم۔ فارسٹر کا خیال یہ ہے کہ قصہ ناول کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہوتا ہے یعنی کوئی بھی ناول بغیر قصے کے عالمِ وجود میں نہیں آسکتا۔ قصے سے مراد واقعات کی ایسی کڑی سے لی جاتی ہے، جو سلسلہ وار ظاہر ہوں اور جن سے ایک خاص قسم کا نتیجہ برآمد ہو۔ ایک اچھے قصے کی خوبی یہ بتائی جاتی ہے کہ اُسے پڑھتے وقت قاری ہر لمحہ اسی تجسس میں مبتلا رہے کہ اب کیا ہوگا؟ قصے میں واقعات کی مختلف کڑیاں ایک زنجیر کی طرح جُڑی رہتی ہیں۔ کسی ایک کڑی کو الگ کر دینے سے زنجیر ٹوٹ جاتی ہے اور واقعات کا سلسلہ بکھر جاتا ہے۔ اچھا قصہ عموماً وہی سمجھا جاتا ہے، جس میں یہ تسلسل پورے حسن کے ساتھ ابتدا تا آخر برقرار رہے اور اس کا اختتام کسی دلچسپ انداز میں ظاہر ہو۔ لیکن جدید ناول نگار قصے کے اس مروجہ نظریے کے قطعی خلاف ہیں۔ وہ ایک حد تک قصے کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں (بعض یہ بھی نہیں مانتے) مگر وہ اس بات کے قائل نہیں کہ قصے میں واقعات زنجیر کی مربوط کڑیوں کی طرح پیش کئے جائیں۔ اُن کے ناولوں میں زنجیر کی یہ کڑیاں جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی نظر آئیں گی اور قاری اکثر اُلجھن کا شکار نظر آئے گا۔ اُس کی بالکل سمجھ میں نہیں آپاتا کہ اب کون سے واقعات پیش آرہے ہیں اور ان کا قصے سے کیا تعلق ہے۔ قصے کا یہ نیا انداز انگریزی اور فرانسیسی ناولوں میں عام ہے مگر اردو میں یہ چیز ابھی عام نہیں ہوئی ہے تاہم اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اردو ناول میں اس قسم کی سب سے اچھی مثال انور سجاد کا ناول "خوشیوں کا باغ" ہے۔

زیادہ تر لوگ پلاٹ اور قصے میں کوئی فرق نہیں کر پاتے بلکہ دونوں کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ پلاٹ اور قصے میں کافی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پلاٹ دراصل وہ ہے جس کے ذریعہ قصے کو ڈھال کر پیش کیا جائے۔ اسے یوں سمجھیے کہ اگر پلاٹ نہ ہو تو قصہ ترتیب ہی نہیں دیا جا سکے۔ پلاٹ سے مراد اس مخصوص ترتیب سے ہے جس کے تحت ناول نگار اپنے قصے کے مختلف واقعات کا تسلسل قائم کرتا ہے۔ دلچسپ پلاٹ وہی سمجھا جاتا ہے جو نہایت مربوط ہو جیسے "امراؤ جان ادا" کا پلاٹ، مگر جدید ناول نگار پلاٹ کی شکست و ریخت پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اُن کے یہاں پلاٹ کا انہدام اس طرح عمل میں آتا ہے کہ واقعات کا کوئی تسلسل برقرار نہیں رہ پاتا۔ شعور کے بہاؤ (STREAM OF CONSCIOUSNESS) یا آزاد تلازمۂ خیال (FREE ASSOCIATION OF THOUGHTS) والے ناولوں میں تو پلاٹ کی کوئی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اردو میں ابھی اس نوعیت کا کوئی بھرپور ناول نہیں لکھا گیا ہے۔ اگرچہ انگریزی میں اس نوعیت کے دلچسپ تجربے کثرت سے دیکھنے میں آتے ہیں۔ جدید ناول میں زمان و مکان کی لڑیاں اس طرح بکھری نظر آتی ہیں کہ عام قاری یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ یہ ناول ہے یا بکواس۔ عام قاری کے اس سادہ سوال کا جواب شاید کوئی آنے والا جدید ناول نگار ہی بہتر طور پر دے سکے گا۔

ناول میں زندگی کے تماشے کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تماشا جس قدر حقیقی ہوگا ناول اتنا ہی کامیاب سمجھا جائے گا۔ ناول نگار کا یہ فرضِ اوّلین ہے کہ وہ اُسی زندگی کو اپنے ناول کا موضوع بنائے، جس کو اُس نے قریب سے اور بخوبی دیکھا ہو، جس کا مشاہدہ اُس نے ذاتی طور پر نہایت گہرائی سے کیا ہو اور بہتر تو یہ ہوگا کہ وہ اُسی زندگی کو پیش کرے جسے وہ خود جی چکا ہو۔ خیالی توتا مینا اُڑنے کا دور اب ختم ہوچکا ہے اور ہمارے ادب میں داستانوی ادب کا نہایت قیمتی سرمایہ محفوظ ہی ہے جس میں خیالی توتا مینا کے قصے بھرے پڑے ہیں۔ ناول کا مطالعہ تو آج کا انسان اس لیے کرتا ہے کہ وہ اس میں جیتی جاگتی اور حقیقی زندگی کو رقص کناں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے ناول نگار اگر زندگی سے بھرپور واقفیت نہ رکھتا ہوگا تو اس کا ناول محض وقت گزاری کا ایک بوجھل ذریعہ بن کر رہ جائے گا۔ ایسے سستے اور مقبول ناول اُردو میں بہت لکھے جاتے ہیں، جن میں زندگی کا کوئی واضح تجربہ نہ ہونے کی بنا پر اُن کا مطالعہ کر کے وقت گزاری کا نہایت معمولی کام بھی نہیں ہو پاتا — پریم چند ہی کو دیکھ لیجئے کہ اُنہیں ہندوستان کے دیہی ماحول کا گہرا علم تھا — ہندوستان کے دیہاتوں میں بسنے والے غریب مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کا مشاہدہ اُنہوں نے اس قدر قریب سے کر رکھا تھا کہ اُن کے ناولوں میں اُس زندگی کی نہایت سچی اور اچھوتی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اُنہوں نے اپنے ناولوں میں جتنے دیہاتی کردار تخلیق کئے ہیں وہ سب زندگی سے بھرپور نظر آتے ہیں، مگر وہی پریم چند جب شہری کرداروں کی تخلیق کرتے ہیں تو بات بن نہیں پاتی۔ دُور نہ جائیے "گئودان" کے ہوری اور مسٹر مہتہ کا ہی تقابل کر لیجئے۔ ہوری اگر زندگی سے بھرپور نظر آتا ہے تو مسٹر

بہت بے جان مورتی کی طرح دکھائی دیتے ہیں ۔ زندگی دراصل اپنی وسعتوں اور جہتوں کے ساتھ ایسی عجیب و غریب ہے کہ اس کے تماشے کو بھرپور طور پر پیش کر پانا آسان کام نہیں ۔ اس کی تہہ داری اور تنوع ناول نگار کو مبہوت کر دیتا ہے اور اس کی وسعت اور گہرائی انتخاب کے کام کو اور بھی دشوار بنا دیتی ہے ۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول "آگ کا دریا" میں تین ہزار سالہ ہندوستانی زندگی کا انتخاب پیش کیا ہے ۔ تاریخ کے گم شدہ اوراق کی تلاش کر کے انہوں نے ایسے گمنام مگر یادگار کردار تخلیق کئے ہیں کہ ان میں زندگی کی بھرپور رمق دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ۔ شرر کا کوئی ناول اس لیے کامیاب نہ ہو سکا کہ انہوں نے لٹے لٹائے تاریخی کرداروں کو خیالی پیکر عطا کرنا چاہا ہے جو زندگی سے یکسر عاری ہیں ۔ تاریخی ناولوں کی ناکامی کا سبب یہی ہے کہ ہمارے تاریخی ناول نگار محض خیال کے زور پر بے جان کرداروں میں فرضی روح پھونکنا چاہتے ہیں ۔ اسی لیے "آگ کا دریا" یا عصری مسائل پر لکھے گئے کسی بھی ناول کو تاریخی ناول تسلیم کرنے میں تامل محسوس ہوتا ہے ۔

ناول نگار اپنے ناول میں زندگی کے مخصوص مسائل کو مختلف کرداروں اور واقعات کے ذریعہ پیش کرتا ہے ۔ ناول میں ایک موقع ایسا بھی آتا ہے جب قاری کو یہ مسائل حل ہوتے نظر آتے ہیں ۔ یہیں پر ناول نگار کی فن کاری کا امتحان ہوتا ہے ۔ اگر وہ نذیر احمد ہوگا تو ناصح بن کر مسائل حل کرنا چاہے گا ، پریم چند ہوگا تو لوجھل تقاریر اور کھوکھلی نعرہ بازی کے وسیلے سے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتا نظر آئے گا ۔ اور اگر مرزا رسوا ہوگا تو مسئلہ کو اس کی بھرپور شدت کے ساتھ پیش کرنے پر ہی اکتفا کرے گا ۔ دراصل ناول نگار کا یہ منصب ہرگز نہیں کہ وہ ناصح مشفق بن کر نصیحتیں اور تقریریں کرے یا مسائل حل کرنے بیٹھے ۔ اس کا کام تو دراصل یہ ہے کہ وہ جس زندگی کا انتخاب کرے ، اس کے انتشار کو اس طرح پیش کر دے کہ قاری نظم و ضبط کی ضرورت کو محسوس کرنے لگے ۔ وہ زندگی کے تضادات کو یوں نمایاں کرے کہ قاری زندگی کی اصل حقیقت کو سمجھ لے ۔ ناول نگار یہ کام جس قدر فن کاری سے انجام دے گا ، ناول اتنا زیادہ کامیاب سمجھا جائے گا ۔ مشہور روسی ناول نگار دستوئیفسکی نے اپنے شہرۂ آفاق ناول "کرائم اینڈ پنشمنٹ" (CRIME AND PUNISHMENT) میں یہ کہیں نہیں کہا کہ اس کے ہیرو راسکولنکاف نے جو قتل کیے ہیں وہ غلط تھے اور اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا ۔ اس نے تو اپنے ناول میں اس منتشر سماج کی منہ بولتی تصویر پیش کر دی ہے جس میں راسکولنکاف جیسا مفلوک الحال انسان اقدام قتل پر مجبور ہو اٹھتا ہے ۔ چنانچہ قاری راسکولنکاف سے نفرت کرنے کے بجائے اس معاشرے سے بیزاری محسوس کرتا ہے ۔ جس کے پھیلتے ہوئے انتشار نے راسکولنکاف جیسے انتہائی سادہ مزاج اور شریف انسان کو قتل کی واردات پر آمادہ کیا ۔ یہ فن کاری کی وہ اعلیٰ ترین منزل ہے جس تک اردو ناول نگاروں کو پہنچنے میں ابھی نہیں معلوم کتنا عرصہ لگ جائے ۔

ناول کی کامیابی میں کردار نگاری کا بھی بہت گہرا ہاتھ ہوتا ہے ۔ موجودہ دور کے ناول نگار کردار نگاری پر زیادہ زور دیتے ہیں ۔ مشہور امریکی ناول نگار ورجینیا وولف کا تو یہاں تک خیال ہے کہ زیادہ تر ناول کرداروں سے متعلق ہی ہوتے ہیں ۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ ناولوں میں کرداروں کی مرکزی اہمیت ہوتی ہے ۔ وہ جس قدر زندگی سے بھرپور ہوں گے ، ناولوں کے مطالعہ میں اتنا ہی زیادہ لطف ملے گا ۔ کردار جس قدر پیچیدہ اور مختلف ہوتے ہیں اتنے ہی پرکشش معلوم ہوتے ہیں ۔ کردار نگاری کی کامیابی اس پر منحصر ہے کہ ناول نگار جن کرداروں کو پیش کرے وہ ہماری زندگی سے منتخب کئے گئے ہوں ۔ اچھی کردار نگاری کا کمال یہ ہے کہ ہم جب کسی ناول کا مطالعہ کریں ، اس کا کوئی مخصوص کردار اپنے آپ سے اس قدر قریب نظر آئے کہ جب ہم ناول پڑھ کر ختم کریں تو چاہے ناول کی دیگر تفصیلات ہمارے ذہن سے کچھ عرصہ بعد محو ہو جائیں ، لیکن وہ کردار ہمارے ذہن میں ہمیشہ زندہ رہے ۔ جب کبھی ناول کے مختلف کرداروں کا ذکر چلے وہ کردار ہمیں بے اختیار یاد آ جائے اور ہم اس کی مختلف حرکات کو یاد کر کے لطف اندوز ہوں ۔ ناول کی دنیا میں ایسے یادگار کرداروں کی کوئی کمی نہیں ہے ۔ دستوئیفسکی کی کردار نگاری کا انداز دنیا سے نرالا ہے ۔ وہ ان کی نفسیات اور اندرونی ہیجانات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ پڑھنے والا حیران ہو کر رہ جاتا ہے ۔ راسکولنکاف کا شمار ناول کی دنیا کے انتہائی الجھے ہوئے اور پیچیدہ کرداروں میں کیا جاتا ہے ۔ اس کا ایک دوسرا اہم کردار نستاسیا فلی پوونا (ایڈیٹ) بھی اپنی تہہ دار اور پیچیدہ شخصیت کی وجہ سے ہمیشہ ہی ادبی حلقوں میں موضوعِ گفتگو بنتا ہے ۔ اردو ناول میں ابھی اتنے اہم کرداروں کی تخلیق شاید کسی نے بھی نہیں کی ہے ۔ لیکن کردار نگاری پر اردو کے تمام مستند ناول نگار بھی کافی زور دیتے ہیں ۔ رتن ناتھ سرشار کا خوجی (فسانۂ آزاد) پریم چند کا اندھا سورداس (چوگانِ ہستی) قرۃ العین حیدر کی رشا عرف راحت (چائے کے باغ) عبداللہ حسین کا نعیم (اداس نسلیں) الطاف فاطمہ کا صفدر یاسین عرف جانا مین (دستک نہ دو) وغیرہ اردو ناول کے بعض نہایت اہم کرداروں میں شمار کئے جا سکتے ہیں ۔

ای ۔ ایم ۔ فارسٹر نے کرداروں کی دو قسمیں گنوائی ہیں یعنی FLAT اور ROUND ان لفظوں کی تشریح اردو میں مختلف انداز سے کی گئی ہے ۔ ڈاکٹر یوسف سرمست نے ان لفظوں کا ترجمہ "یک رخے" اور "پہلو دار" لفظوں سے کیا ہے [1] ڈاکٹر اسلم آزاد نے انہیں "چپٹے" اور "مکمل" لفظوں سے یاد کیا ہے ۔ [2] جب کہ ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں نے ان لفظوں کا ترجمہ "سادہ یا پختہ" اور "پہلودار یا نامکمل" لفظوں سے کیا ہے ۔ [3] ان میں ڈاکٹر یوسف سرمست کا ترجمہ ایک حد تک درست معلوم ہوتا ہے ۔ فارسٹر کی زبان میں FLAT دراصل وہ کردار کہلاتے ہیں ، جن کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے اور اس کا اظہار اسی وقت ہو جاتا ہے جب وہ پہلی مرتبہ ہمارے سامنے لائے جاتے ہیں ۔ ایسے کرداروں کو یک رخے کرداروں کے نام سے یاد کیا جانا چاہیے ۔ مصنف ان کے یک رخے پن یا ان کی کسی خاص صفت پر اس طرح زور دیتا ہے کہ ہم انہیں

ہزاروں میں پہچان لیتے ہیں۔ عموماً ایسے کردار مزاحیہ یا ٹائپ ہوتے ہیں، جن کی شناخت قاری کے ذہن میں بہت جلد بن جاتی ہے۔ اردو میں ایسے کرداروں کی بہت اچھی مثال خوجی ہے۔ اُسے دیکھ کر اور اُس کی مخصوص حرکتوں کی وجہ سے ہم اسے ہزاروں میں پہچان لیتے ہیں۔ ایسے کرداروں کی تخلیق کوئی بہت بڑا کارنامہ نہیں۔ (ROUND) کردار وہ ہوتے ہیں، جن کی شخصیت خاص تہہ دار قسم کی ہوتی ہے۔ انہیں تین جہتوں والے کردار بھی کہا جاتا ہے۔ انہیں تہہ دار کہنا اس لیے مناسب ہوگا کہ ان کی شخصیت پرت در پرت دھیرے دھیرے پر دے اٹھتے ہیں۔ اور انہیں سمجھنے میں خاصی دشواری محسوس ہوتی ہے۔ ان کرداروں کا ارتقا بتدریج ہوتا ہے اور ان کی تخلیق ایک دشوار امر ہے۔ انہیں وہی ناول نگار بہتر طور پر خلق کر سکتے ہیں، جن کی نظر انسانی نفسیات پر کافی اچھی ہو۔ اور جو خارجیت سے زیادہ داخلیت پر توجہ دیتے ہوں۔ ہنری جیمس کا ناول 'دی پورٹریٹ آف اے لیڈی' (THE PORTRAIT OF A LADY) کی ازابل آرچر ایسے تہہ دار یا سہ جہتی کرداروں کی بہت اچھی مثال ہے۔ دوستوئیفسکی کے تقریباً تمام اہم کردار سہ جہتی ہیں۔ اردو میں 'اداس نسلیں' کا ہیرو نعیم ایسے کرداروں میں ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ قرۃ العین کے ایسے کرداروں میں ریٹا عرف راحت (چائے کے باغ) کے علاوہ چمپا احمد (آگ کا دریا) اور سیتا میر چندانی (سیتا ہرن) کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ الطاف فاطمہ کے یہاں بھی ایسے دل دار کرداروں کی کمی نہیں۔ گیتی (دستک نہ دو) اور روبینہ (نشانِ محفل) ایسے ہی سہ جہتی کرداروں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔

ایک اچھے ناول میں منظر نگاری کی بھی خاصی اہمیت ہوتی ہے۔ اس فن میں ناول نگار کی قوتِ واقعہ نگاری کا امتحان ہوتا ہے۔ وہ اپنے ناول میں زندگی کے مختلف نقشوں، بازاروں اور گلیوں، کہساروں اور سبزہ زاروں وغیرہ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والے کی نگاہوں کے سامنے سارا نقشہ گھوم کر رہ جاتا ہے۔ منظر نگاری کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ مصوری سے قریب معلوم ہو۔ ناول نگار کے بیان کردہ منظر کو پڑھ کر قاری یہ محسوس کرے جیسے کسی ماہر مصور نے تصویر رنگ دی ہو —— منظر نگاری کا فن بیانیہ کے ذریعہ ہی بہتر طور پر اجاگر ہو سکتا ہے۔ ناول نگار میں بیانیہ کی قوت جتنی تیز ہوگی اتنی ہی بہتر وہ منظر نگاری کر سکے گا۔ اردو میں منظر نگاری کا فن قرۃ العین حیدر اور جمیلہ ہاشمی کو خوب آتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کو بیانیہ پر ایسا عبور حاصل ہے کہ وہ منظروں میں جان ڈال دیتی ہیں۔ اُن کی منظر نگاری پر بعض جگہ مصوری کا گمان ہوتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کا فن ماحول سازی سے عبارت ہے۔ وہ گلیوں، بازاروں، دیہاتوں اور قصبوں کی تصویریں اس طرح کھینچتی ہیں کہ ہر منظر زندہ ہو جاتا ہے۔ اُن کے سبھی ناولوں میں پنجاب کے دیہات جی اُٹھتے ہیں۔ مگر جدید ناول نگار منظر نگاری کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ان کی جدید تکنیک میں اس فن کے لیے کوئی گنجائش بھی نہیں۔ رابرٹ ہمفری کی زبان میں جدید ناول نگار کو (WHAT ONE DOES) سے کم ہی دل چسپی ہے۔ اس کی بجائے اس کی ساری توجہ (WHAT ONE IS) پر رہتی ہے[۴] اس لیے اس کے یہاں منظر نگاری یا خارجی دنیا کی تصویر کشی کے بجائے دروں بینی اور داخلی اظہار کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ جدید ناول نگار کا مطالبہ یہ ہے کہ ناول سے غیر ضروری تفصیلات کو قطعی خارج کر دیا جائے۔ آندرے ژید تو یہاں تک زور دیتے ہیں کہ واقعات اور حادثات وغیرہ کے لیے ناول میں کوئی گنجائش نہیں۔ یہ چیزیں تو ناول نگار کو چاہیئے کہ فلم کے لیے چھوڑ دے[۵] جدید ناول میں منظر نگاری کا عنصر کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے جن ناولوں میں شعور کے بہاؤ کی تصویر کشی کی جاتی ہے، اُن میں منظر نگاری کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔

مکالموں کی اہمیت کو ناول میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ مکالمے کے ذریعے قصے کو زیادہ سے زیادہ دل چسپ بنایا جا سکتا ہے۔ جو لوگ مکالموں کی اہمیت کے قائل ہیں اُن کا خیال یہ ہے کہ اچھے مکالمے لکھنا بھی ایک مشکل فن ہے۔ مکالمے لکھتے وقت ناول نگار کو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ وہ اُس زندگی کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں یا نہیں جسے پیش کرنا ناول نگار کا اصل مقصد ہے۔ مکالموں میں اسے وہی زبان استعمال کرنا ہوتی ہے جو عام طور پر گرد و پیش کی زندگی میں مستعمل ہے۔ زندگی کے عام کردار جو زبان عموماً بولتے ہوں، ناول نگار کو اسی زبان میں مکالمے لکھنا چاہئیں وہ چاہے تو اُس زبان میں اپنی فن کاری کے ذریعے ادبی شان پیدا کر دے، مگر اُسے ہر حال میں عام بول چال کی زبان کو ہی اہمیت دینی چاہیے، وہ جس قدر بگڑی ہوئی اور غیر ادبی زبان کو گلے لگاتا ہے، اُسی قدر اُس کے یہاں حقیقت نگاری کا رنگ چوکھا ہوتا ہے۔ حقیقت نگاری کا اصل رنگ بگڑی ہوئی زبان میں ہی نمایاں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے اپنے مضمون "ناول کی زبان" میں اس بحث کو اُٹھاتے ہوئے لکھا ہے:

> "انشا پرداز بگڑی ہوئی زبان کو ٹھکراتا ہے۔ ناول نگار بگڑی ہوئی زبان کو گلے سے لگاتا ہے۔ انشا پرداز کا تعلق معیاری زبان سے ہوتا ہے۔ ناول نگار کا حقیقی زندگی سے"[۶]

اس لیے حقیقت نگاری کا تقاضا یہی ہے کہ ناول نگار اپنے مکالموں میں عام بول چال کی زبان ہی استعمال کرے۔ ہو سکتا ہے یہ زبان غیر ادبی اور نامانوس ہو۔ مگر کرداروں کے صحیح رنگ اُبھارنے کے لیے اُسی زبان کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے۔ اردو میں مکالمے اور زبان کے درست استعمال کے لیے سرشار کا مطالعہ کرنا چاہیئے —— اُنہوں نے معاشرے کے مختلف کرداروں کو پیش کیا ہے اور اُن کے لیے اُن کی ہی بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے بیشتر کردار ایسی کھچڑی زبان بولتے ہیں جس میں انگریزی لفظوں کی بھرمار ہوتی ہے، دراصل اُن کے کردار جس طبقۂ امرا سے عموماً تعلق رکھتے ہیں وہاں ایسی ہی زبان بولی جاتی ہے۔ سچے ناول نگار کا فرض یہی ہے کہ وہ معاشرے کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لیے اس کی صحیح زبان بھی استعمال کرے۔

مکالمے لکھتے وقت اس نزاکت کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے کہ جو کردار جس معاشرے سے تعلق رکھتا ہو، مکالمے بھی اُسی کے مطابق ہوں۔ اگر کردار مہذب طبقے کا فرد ہے تو اس کی زبان شائستہ ہوگی اور اگر اُس کا تعلق دیہی طبقے سے ہے تو یقیناً اُسے دیہاتی زبان میں ہی مکالمے ادا کرنا چاہئیں۔ اسی طرح عورتوں کی زبان الگ ہوتی ہے، مَردوں کی الگ۔ مکالمے لکھتے وقت ناول نگار کو ان تمام باتوں کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ جدید ناول نگاروں کو مکالموں سے کبھی زیادہ لگاؤ نہیں۔ شعور کے بہاؤ یا داخلی خود کلامی والے انداز میں لکھے گئے ناولوں میں مکالموں کی گنجائش بھی نہیں ہوتی۔ آندرے ژید روزمرہ پر مبنی مکالموں کے خلاف ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اچھے ناول میں چست اور برجستہ مکالموں کا ہونا ضروری ہے، مگر یہ درست نہیں کہ بغیر مکالموں کے ناول کا وجود ہی ممکن نہیں۔ داخلی خود کلامی اور شعور کے بہاؤ والے ناولوں میں شعور کی تصویر کشی ہی اصل چیز ہوتی ہے۔ یہ تصویر کشی جس زبان کے ذریعہ کی جاتی ہے، وہ ایسی کچی زبان ہوتی ہے کہ جسے سمجھ سکنا ہر شخص کے بس کی بات بھی نہیں۔ یہی سبب ہے کہ انگریزی ناول نگار جیمس جوائس کے شہرۂ آفاق ناول 'یولی سیس' (ULYSSES) سے بہت کم لوگ لطف اندوز ہو پاتے ہیں۔ اردو میں چونکہ اس نوعیت کا کوئی ناول لکھا ہی نہیں گیا ہے، اس لیے ایسے کسی ناول کو مثال کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی "آگ کا دریا"، "میرے بھی صنم خانے" "لندن کی ایک رات" اور "ایسی بلندی ایسی پستی" کے بہت سے اجزا ایسے ہیں، جنہیں لوگ بے تکلفی سے شعور کے بہاؤ یا چشمۂ شعور یا شعور کی رَو کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

شعور کا بہاؤ یا STREAM OF CONSCIOUSNESS دراصل نفسیات کی اصطلاح ہے۔ جسے سب سے پہلے مشہور ماہرِ نفسیات ولیم جیمس نے اپنی کتاب "اصولِ نفسیات" (THE PRINCIPLES OF PSYCHOLOGY) میں وضع کیا۔ اس نے شعور کی مختلف سطحوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ذاتی شعور کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ اُس کے خیال کے مطابق ذہن میں خیالات کا بہاؤ ہمیشہ جاری و ساری رہتا ہے۔ اور یہ کبھی یکساں حالت میں بھی نہیں رہتا بلکہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ اسی لیے اس کی تصویر کشی کسی بھی زبان میں کر سکنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس نفسیاتی اصطلاح کا اطلاق سب سے پہلے ادب میں ناول کی تنقید کے سلسلے میں مشہور ناقد مے سنکلر نے کیا۔

اس کے بعد رابرٹ ہمفری وغیرہ نے ڈوروتھی رچارڈسن، جیمس جوائس اور ورجینیا وولف کی ناولوں کے سلسلے میں اس اصطلاح کو باقاعدہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اردو والوں نے بھی انگریزی کی دیکھا دیکھی قرۃ العین حیدر، سجاد ظہیر اور عزیز احمد وغیرہ کے ناولوں کے سلسلے میں اس اصطلاح کو بے تکلفانہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جیمس جوائس کے ناول یولی سس یا دوسرے انگریزی ناولوں کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ شعور کا بہاؤ کس حد تک اُن ناولوں میں زبان کا جامہ پہن کر آیا ہے۔ مگر قرۃ العین حیدر، سجاد ظہیر اور عزیز احمد کے ناولوں کے سلسلے میں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان کے ناولوں میں یہ تکنیک نمایاں ہو کر نہیں آسکی ہے "میرے بھی صنم خانے" "لندن کی ایک رات" یا "ایسی بلندی ایسی پستی" جیسے ناولوں میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ داخلی خود کلامی کی کیفیت نمایاں ہو سکی ہے۔ جس کے ذریعے ان مصنفین نے اپنے کرداروں کی داخلی تصویر کشی بہتر طور پر کی ہے۔ اس لیے اسے شعور کے بہاؤ کی بجائے آزاد تلازمۂ خیال کی تکنیک کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس طریقے میں مصنف کرداروں کے نفس میں داخل ہو کر اُن کی نفسیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ تجربہ اردو میں سب سے پہلے سجاد ظہیر نے اپنے ناولٹ "لندن کی ایک رات" میں کیا تھا۔ اس کے بعد اسی طریقہ کو قرۃ العین حیدر نے اپنی ناولوں "میرے بھی صنم خانے" اور "سفینۂ غم دل" میں برتا۔ یہ تکنیک بھی خاصی دشوار ہے۔ اور سجاد ظہیر اور قرۃ العین حیدر کے سوا صرف عزیز احمد اس طریقہ کو کسی حد تک استعمال کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ شعور کے بہاؤ کے نام پر اردو ناول میں ابھی تک کوئی بڑا تجربہ نہیں ہو سکا ہے۔ مگر اس تکنیک میں امکانات کی ایک دنیا آباد ہے اور تعجب نہیں جو آنے والا کوئی بڑا ناول نگار اس تجربے کو زیادہ بہتر طور پر استعمال کر سکے۔

ہر بڑا ناول نگار زندگی کے متعلق ایک واضح نظریہ رکھتا ہے۔ یہ نظریہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زندگی نہایت بے معنی اور فضول ہے۔ مگر بغیر نظریے کے کسی ناول کا وجود ممکن نہیں۔ ہر ناول نگار کا اپنا ایک مخصوص نظریہ ہوتا ہے، جس کا اظہار وہ اپنے ناول میں کرتا ہے، اس لیے ناول کو کسی خاص عقیدے کا اظہار بھی کہا جاتا ہے۔ عموماً ناول نگار کا یہ نظریہ اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بعض چیزوں پر اپنے کردار یا ان کے افعال کے ذریعہ زیادہ زور دیتا ہے اور بعض چیزوں کو رد کرتا ہے۔ اس کے بعض کردار زندگی کی مخصوص قدروں پر شدت سے زور دیتے ہیں۔ اس طرح ہمارے سامنے اُس کے نظریے یا فلسفۂ حیات کا واضح روپ سامنے آجاتا ہے۔ ناول نگار کی شخصیت مجہول نہیں ہوتی بلکہ وہ خلاق ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ وہ اپنی تخلیقی قوتوں کو عمل میں لا کر ایک ایسی دنیا خلق کرتا ہے، جو اس کے نظریۂ حیات کے عین مطابق ہوتی ہے۔ اپنے اس تصورِ حیات کو اُسے مخصوص اور دل نشین اشاروں کے ذریعہ واضح کرنا ہوتا ہے، اس لیے ناول میں علامت کی اہمیت افسانہ کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہے۔ نظریۂ حیات کی وضاحت کرتے ہوئے اگر ناول نگار کے انداز میں ذرا بھی تبلیغی انداز نمایاں ہوا تو اس کا فن غارت ہو جاتا ہے۔ مبلغ بننا اُس کا کام نہیں۔ اُسے ہر حال میں فن کار ہی رہنا چاہئے جب ناول نگار مبلغ بننے کی کوشش کرتا ہے تو ناول کا سارا حُسن غارت ہو کر رہ جاتا ہے۔ پریم چند کے بیشتر ناولوں میں تبلیغی انداز نمایاں ہے، جس کی وجہ سے وہ بڑے فن کار نہیں بن پاتے۔ لیکن اُن کی آخری تخلیق 'گئو دان' میں یہ تبلیغی انداز کم نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کا یہ ناول اُن کے دوسرے سبھی ناولوں سے ممتاز اور مختلف ہو گیا ہے۔ اردو کے بیشتر ناول نگاروں میں یہ کمزوری عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ فن کاری کے نازک مقام تک پہنچنے سے پہلے ہی

بری طرح جھٹک کر رہ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں یا تو اُن کے یہاں تبلیغی شان نمایاں ہوتی ہے یا پروپگنڈے کا بھوت ان کے اعصاب پر اس طرح سوار ہو جاتا ہے کہ فن اور فن کاری سب رخصت ہو جاتی ہے۔ نظریۂ حیات کو مکمل فن کاری کے ساتھ پیش کرنے والے اُردو کے پہلے ناول نگار مرزا رُسوا ہیں۔ جنہوں نے 'اُمراؤ جان آدا' میں ایک طوائف کی آپ بیتی کے پردے میں ایک مٹتے ہوئے معاشرہ کا نوحہ لکھ دیا۔ موجودہ دَور کے ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر، عزیز احمد اور عبداللہ حسین وغیرہ اپنے نظریہ یا عقیدے کو نہایت فن کارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ ناول نگار نہ چاہے تو بھی اُس کے عقیدے کا اظہار اُس کے ناول میں ہو کے رہے گا۔ کیوں کہ ناول نگار ایک مخصوص زندگی منتخب کرکے اُسے ترتیب دے کر یا بے ترتیبی سے پیش کرتا ہے۔ زندگی کا انتخاب ہی اُس کے عقیدے کا اظہار ہے۔ کامیو نے اپنے مشہور ناول "پلیگ" (LA PESTE) میں براہِ راست کسی مخصوص عقیدے کا اظہار نہیں کیا ہے۔ مگر اسے کیا کہا جائے کہ اُس ناول کی ایک ایک سطر سے وجودیت کے فلسفہ کا برملا اظہار ہو رہا ہے۔ ناول کا ہیرو ڈاکٹر ریاں وجودی فلسفہ پر کوئی تقریر نہیں کرتا۔ مگر اُس کا ہر فعل وجودیت سے ہم آہنگ ہے۔ اس لیے عقیدے کے اظہار کو ناول نگار چاہے بھی تو نہیں روک سکتا۔ ناول نگار زندگی کا انتخاب کچھ اس طرح کرتا ہے کہ اُس سے اُس کے فلسفۂ حیات کا اظہار ہو جاتا ہے۔ ناول نگار خواہ کسی بھی قسم کی زندگی کا انتخاب کیوں نہ کرے اُسے ہر حال میں بنی نوعِ انسان کی بہبودی اور بھلائی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ کیوں کہ ناول بنیادی طور پر بنی نوعِ انسان کی فلاح اور بہبودی کے لیے ہی لکھا جاتا ہے۔ اس میں انسان ہی کو موضوع بنایا جاتا ہے اور اُن کے مطالعہ سے انسان کی اہمیت کا احساس ہو جاتا ہے۔ ہنری جیمس، ورجینا ولف اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس جیسے کے ناول نگار اس امر پر متفق نظر آتے ہیں کہ ناول میں انسانی زندگی ہی کو پیش کیا جانا چاہیئے۔

کوئی بھی ناول نگار اپنے عصری مسائل سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ ہر ناول اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے اور اُس میں اس عہد کے عصری مسائل نمایاں ہو کر رہتے ہیں۔ عصری شعور یا عصریت کے بغیر کسی ناول کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ 'اُمراؤ جان آدا' میں اپنے عہد کے عصری تقاضے جس فن کاری کے ساتھ سمٹ آئے ہیں، اُنہوں نے اس ناول کو ایسی توانائی بخشی ہے کہ یہ ناول ہر عہد میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ 'آگ کا دریا' میں جن عصری مسائل کا فن کارانہ اظہار ہوا ہے اُنہوں نے اس ناول کو ایسا تابناک فنی حُسن عطا کیا ہے کہ یہ ناول ہر دَور میں پسند کیا جائے گا۔ 'اُداس نسلیں' میں عصریت یوں جلوہ گر ہوئی ہے کہ یہ ناول ہر عصر کی کہانی بن گیا ہے۔ رالف فاکس نے ناول کی تعریف کرتے ہوئے جو بات کہی تھی وہ شاید ناول کی سب سے خوب صورت تعریف ہو سکتی ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ "ناول سماج اور فطرت کے خلاف فرد کی جدّوجہد کا رزمیہ ہے"۔ کسی صنفِ ادب کی بندھے ٹکے لفظوں میں تعریف کرنا اگرچہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مگر رالف فاکس کی مذکورہ تعریف سے ناول کی انفرادیت اور اُس کی عصریت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ اس لیے اس مختصر تعریف کو دوسری ہزار تعریفوں پر اوّلیت دی جا سکتی ہے۔

حوالے :

۱- ASPECTS OF THE NOVEL, E.M..FORSTER

۲- بیسویں صدی میں اردو ناول، ڈاکٹر یوسف سرمست ص ۲۵

۳- اردو ناول آزادی کے بعد، ڈاکٹر اسلم آزاد ص ۲۱

۴- اردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقا، ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں، ص ۱۳، ۱۴

۵- STREAM OF CONCIOUSNESS IN THE MODERN NOVEL, ROBERT HUMPHERY

۶- بحوالہ "شب خون" الہ آباد، شمارہ ۱۰۱ ص ۱

۷- ادبی تخلیق اور ناول، ڈاکٹر احسن فاروقی ص ۹۲

۸- THE NOVEL AND PEOPLE, RALPH FOX ,P. 74

"(It (Novel) is epic of the struggle of individual against Society,against nature")

●●

---

## بقیہ: بِرلودھ اور مِتری

---

ہوئے سُنائی دیں وہاں ضرور کوئی پنجابی ہوگا۔ کیوں کہ وہ دنیا کا ماتم نہیں کرنے آیا اور نہ فلسفہ دانی اس کا نصب العین ہے۔ وہ جو اندر سے ہے وہی باہر سے۔ — اُس کے جیون کا رہسیہ ہی یہ ہے کہ کوئی رہسیہ نہیں"

" وہ ایک ایسا پودا ہے رانی! جو دنیا کی کسی بھی دھرتی پر پنپ سکتا ہے۔ اس کی اپنی دھرتی کی وسعت، اس کی نگاہ اور دل میں سما گئی ہے اور ہواؤں کی مستی دماغ میں ——"

" رانی! —— پنجاب اور پنجابی کبھی ناش نہیں ہو سکتے۔ نہ معلوم اُنہوں نے کون سی امر کتھا سُنی ہے جس میں وہ اونگھ بھی گئے اور پا بھی گئے۔ پی بھی گئے اور چھلکا بھی گئے۔ زندگی کے رونے دھونے سے ان کی تپیا کھنڈی نہیں ہوتی۔ ہاں —— ہنسنے کھیلنے، کھانے اور پہننے میں ان کا موکش ہے ——"

۵ فروری ۱۹۸۴ء

راجندر سنگھ بیدی

انیس فاروقی

# جدید ہندوستانی بُت سازی پر ایک طائرانہ نظر

دیبی پرساد رائے چودھری "مزدوروں کی فتح" (کانسہ)

بھگونت سنگھ "قحط، بھکاری اور لنگڑا" (پلاسٹر)

فنِ بُت سازی کی روایت برِصغیر ہندوستان میں تقریباً دس ہزار سال قبل مسیح پرانی ہے۔ قرونِ اولیٰ سے ہی مذہبی عقائد، اخلاقی اقدار اور سماجی فلاح و بہبود کے پیشِ نظر اس فن کو خاطر خواہ تقویت ملی، لیکن ان سے کہیں زیادہ تکنیکی اعتبار سے اس میڈیم کی پائیداری نے اس فن کو دوامی حیثیت بخشی ہے۔ یہ فن لطیف ویدک، بُدھ اور جینی عقائد کے مختلف ادوار سے گذرا اور اس دوران مقامی رنگ دیتا ہوا ایک عظیم ورثے کی شکل میں پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ تاریخی اعتبار سے مغلوں اور پٹھانوں کی آمد اور ان کے مختلف عقیدے کے پیشِ نظر اس فن کی اختراعی اور ارتقائی راہوں میں رُکاوٹ ضرور پیدا ہوئی اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس فن کو لوگ تقریباً بھول ہی گئے۔ رجواڑوں کے یہاں سے بھی اس کی سرپرستی جاتی رہی۔ بہرحال مغلیہ سلطنت کے انحطاط اور انگریزی حکومت کے اقتدار نے اس فن کو پلاسٹیہ تازگی بخشی۔ ۱۸۵۸ء کے بعد سرکاری سطح پر فنی اداروں کے قیام کا سلسلہ شروع ہوا۔ جہاں مغربی ممالک سے اساتذہ درس دینے کے لیے بُلائے جاتے تھے۔ یہ کالج آف آرٹ جو ابتدا میں کلکتہ، بمبئی، مدراس اور لاہور میں

گھومنے لگتے۔ ہندوستانی طلباء کی ایک نئی نسل کو تیار کرنے میں بڑے مددگار ثابت ہوئے۔ یہ فن کار مغربی تکنیک اور فنی اصولوں سے واقفیت حاصل کر کے آزادانہ طور سے کام کرتے تھے۔ بُت سازی میں عموماً کام کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ یہ فرمائش کے مطابق مٹی کے ماڈل تیار کرتے تھے۔ اس کے بعد پلاسٹر آف پیرس میں ڈھال لیتے تھے۔ لیکن کانسے یا اور کسی دھات میں شاذ و نادر ہی ڈھلائی کی جاتی تھی۔ حالانکہ ہمارے روایتی فن کار کانسے، پیتل اور تانبے کے استعمال اور اس کی ڈھلائی سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن انہیں خصوصی طور سے مغربی انداز میں شبیہہ کشی کرنا اور اُسے کسی دھات یا پائیدار میڈیم میں ڈھالنے کی مشق نہیں تھی۔ مغربی اساتذہ نے ہندوستانی طلباء کو بڑی بڑی بھٹیوں میں دھات کو گلانے اور اس سے کاسٹ کرنے کے فن سے بخوبی روشناس کروا دیا۔ اس طرح ہمارے طلباء جو ان فنی اداروں سے تعلیم حاصل کر کے نکلے اور اُن کے جو بھی شاہکار ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں اس سے یہ پتہ لگتا ہے کہ مہاراجاؤں یا تعلق داروں کی فرمائشوں پر آدھے قد یا قدِ آدم سائز کی شبیہیں بنانا ان بُت سازوں کا عام مشغلہ تھا۔ اس کے علاوہ جو سب سے زیادہ فرمائش انہیں ملی وہ تھیں یونانی اور رومن شاہکاروں کی کاپیاں کرنا، جو محلوں یا بڑی بڑی حویلیوں میں برائے آرائش نصب کی جاتی تھیں۔ ان ہی انداز میں ملتی جلتی ہندوستانی برہنہ یا نیم برہنہ عورتوں کی مورتیاں بھی اختراع کی گئیں۔ خصوصی طور سے ایسی مورتیوں کی تعداد سنگِ مرمر میں زیادہ ملتی ہے، جن کی ادائیں زیادہ تر جذبات کو بھڑکانے والی ہوتی ہیں۔ مورتیاں رقص و سرود کے محفل خانے میں سجائی جاتی تھیں۔ کلکتہ کے پرانے محلوں میں انہیں اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۹۰۲ء میں سرکاری سطح پر دہلی میں ایک صنعتی نمائش منعقد کی گئی۔ جس میں بمبئی کے جی۔ کے مہاترے کو اُن کی مورتی "مندر جاتے ہوئے" اور لکھنؤ کے بھگوتی سنگھ کو اُن کی تنظیم "قحط، بھکاری اور منگرا" پر قومی اعزازات سے نوازا گیا۔ اس سرپرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خصوصی طرزِ بُت سازی کا وجود عمل میں آیا، جس میں موضوعات ہندوستانی تھے، لیکن طرزِ اظہار مغربی "دبستانِ حقیقت" پر مبنی تھا۔ اس طرز میں جس بات پر زور دیا گیا وہ تھا مغربی فلسفہ "جو ہم دیکھتے ہیں وہ بناتے ہیں" یعنی کہ قدرت کی جہاں تک ممکن ہو سکے ہُو بہُو نقل کی جائے۔ موضوعات کو بلاشبہ منتخب کرتے وقت قدرے احتیاط سے کام لیا جاتا تھا۔ یعنی اس میں آئیڈیلزم کے پہلو کو ترجیح دی جاتی تھی، لیکن یہ بُت پرائیویٹ سوسائٹی کے لیے موزوں نہ تھے۔ انہیں میوزیم میں یا تعلیمی اداروں میں نصب کر دیا جاتا تھا۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اوبنیندر ناتھ ٹیگور کی قیادت میں بنگال کی فنی تحریک نشاۃ ثانیہ کی ابتدا ہوئی۔ جس کے تحت عظیم ہندوستانی فنی روایات کو دوبارہ زندہ کرنے کا بیڑا اُٹھایا گیا۔ لہٰذا فن کاروں نے روایتی کلاسیکی فنی اداروں اور اُن کی اسالیب کا عمیق مطالعہ کیا۔ مثلاً اجنتا، ایلورا، مہابلی پورم، کھجوراہو، اور کونارک کے مندروں میں موجود مورتیوں لائحہ عمل بنایا گیا۔ کلکتہ، شانتی نکیتن، پٹنہ، لکھنؤ، جے پور، حیدر آباد، میسور یعنی جہاں جہاں ٹیگور کے شاگردوں نے تعلیمی درس کا کام اپنے ذمہ لیا، وہاں اُسی روایتی طرز کو فوقیت دی گئی۔ ابتدا میں عام طور سے سہ جہتی مورتیوں کی جگہ ریلیف (دیواری سطح پر اُبھرا ہوا کام) پر زیادہ توجہ دی گئی۔ اس طرز میں دیبی پرساد رائے چودھری اور شری دھر مہاپاترے قابلِ ذکر ہیں۔ بنیادی طور سے اس طرز کو آرائشی کہا جا سکتا ہے۔ جس میں کلاسیکی روایتی حُسن کو بدرجۂ اتم اہمیت دی گئی۔ مثلاً نازک نقوش، پتلی ناک، کھنجن نما آنکھیں، کٹار دار بھویں، لہراتے بال، بھرے بھرے پستان، انتہائی پتلی کمر، موٹے وزنی کولہے، لمبی سڈول ٹانگیں، جن پر شفاف طریقہ کا پیراہن اور اس پر سے مزید زیورات سے آرائش کرنا اس طرز کی خصوصیات میں شامل تھا۔ یہ پیمانۂ حُسن کم و بیش دیوی یا عام صنفِ نازک کے اختراع میں [illegible] جگہ لاگو ہوتا تھا۔ (یہی "اصولِ حُسن" مصوّری میں بھی عام طور سے دیکھنے کو ملتا ہے۔)

اُدھر بمبئی اور مدراس کے فنی ادارے اُنیسویں صدی سے چلے آ رہے مغربی "دبستانِ حقیقت" پر مقامی موضوعات کو لے کر مسلسل طبع آزمائی کر رہے تھے۔ جی کے مہاترے کے بعد بی وی۔ تالم۔ کامتھ، یا واڈکر، گورے گاونکر، کرمارکر اور رینا رے وغیرہ آئیڈیل ریلزم کو لے کر قدِ آدم بڑے بڑے بُت اختراع کر رہے تھے۔ خصوصاً تالم کا ۱۹۲۵ء میں بنایا ہوا کانسے کا بُت "دا داکھیائی نوروجی" اور سنگِ مرمر میں بنا "سائیں بابا" کا بُت اپنی جمالیاتی معیار کے لیے بہت مشہور ہوا۔ تالم کا ایک دوسرا انداز بھی تھا۔ ان کا ایک بُت "سورداس بھجن گاتے ہوئے" فقط ایک شبیہہ ہے۔ جسے پلاسٹر میں تیار کیا گیا۔ لیکن اس کی ادائیگی اتنی حقیقت پر مبنی ہے اور ساتھ ساتھ آئیڈیل ہے کہ اسے صرف شبیہہ کشی نہ کہہ کر تخلیقی تنظیم کے زمرے میں بہ آسانی داخل کیا جا سکتا ہے۔ پلاسٹر میڈیم میں اختراع کیے گئے موضوع کو اور اس کی معصومیت کا اندازہ الفاظ سے نہیں کیا جا سکتا۔ اسے فقط بصری طور سے ہی ملاحظہ کر کے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دیکھا دیکھی اسی انداز میں اور اسی سے ملتے جلتے موضوعات بہت سے لوگوں نے بار ہا دہرائے ہیں، لیکن تالم کی پروازِ حقیقت و معنویت تک نہیں پہنچا جا سکے۔ یوں تو وی پی کرمارکر کے والد کمہار تھے اور یہ لوگ روایتی عوامی طریقے سے کھلونے نُما تماثیل بناتے تھے۔ لیکن کرمارکر کو خدا نے عظیم فن کارانہ صلاحیتیں بخشی تھیں۔ انہیں خداداد صلاحیتوں سے ان کو بہت شہرت نصیب ہوئی۔ بعدازاں ان کے سرپرستوں نے انہیں رائل اکاڈمی لندن بھی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ واپسی پر کچھ عرصے کے لیے کلکتہ اور پھر بعد میں بمبئی میں مستقل قیام کر کے اپنی فنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ یہ اپنے پورٹریٹ (شبیہہ کشی) میں غضب کی مشابہت پیدا کرنے میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے جو بھی تنظیمات اختراع کیں، اُن میں زندگی کا عنصر کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوتا تھا۔ اسی طرح آر ڈی کامتھ نے بھی

رام کنکر بیج "مس مدھوراسنگھ" (کانسہ) شنکھو چودھری "ایک شکل" (کاٹھ)

رائل اکادمی لندن میں تربیت پائی اور وہاں انہیں ایک دیواری بُت (ریلیف) "جنت سے نکالا جانا" پر اعزاز دیا گیا۔ ہندوستان واپس آکر انہوں نے دو بڑے کانسے کے بُت "شیواجی" اور "رانی جھانسی" تیار کئے۔ لیکن اس کے بعد گوا کے اپنے گاؤں میں جاکر کاشت کاری کرنے لگے اور فن کی دنیا سے مستعفی ہوگئے۔

مدراس میں ایس۔ ایم۔ ناگاپا کو ان کے قدِ آدم بُت "مہاراجہ ٹراونکور" پر جو ۱۹۳۹ء میں انہوں نے بنایا، کافی شہرت ملی۔ اسے فنِ شبیہ کشی میں سنگِ میل کہا جاتا ہے۔ مدراس میں او بیندر ناتھ ٹیگور کے اولین شاگردوں میں سے ایک شخصیت دیبی پرساد رائے چودھری بہت عرصے تک گورنمنٹ اسکول آف آرٹ مدراس کے پرنسپل رہے۔ یہ مصوّر، بُت ساز، موسیقار، اچھے شکاری اور ناول نگار بھی تھے۔ جو بھی فن پارے ہمیں دستیاب ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بلاواسطہ قدرت سے فیضان حاصل کرتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا وہ قدرت کے خارجی پہلوؤں کو بہت قوت اور شدت کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ "مزدور کی فتح" نامی بُت جو نیشنل گیلری آف ماڈرن آرٹ، نئی دلی کے باغِ تماثیل میں نصب ہے۔ ان کی فن کارانہ قوت کی ایک بہترین مثال ہے۔ اس میں چند مزدور ایک بڑے پتھر کو راستے سے ہٹاتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔

۱۹۴۰ء کے لگ بھگ پر دوش داس گپتا رائل اکادمی لندن خصوصی طور سے کانسے کی ڈھلائی میں تربیت حاصل کرنے کے لیے گئے۔ وہاں انہوں نے برٹش بُت ساز ہنری مور کے بُتوں کو بہت قریب سے دیکھا، ان کا مطالعہ کیا اور ان سے بلامبالغہ فیض حاصل کیا۔ واپسی پر کلکتہ میں اپنا اسٹوڈیو کھولا اور قحطِ بنگال کے پُر آشوب دور ۱۹۴۳ء میں کلکتہ پروگریسو گروپ کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے انسان کی بے بسی اور بدحالی کی شبیہ کشی کی۔ اس دوران بنگال میں اور بھی نوجوان فن کاروں نے بُت سازی کو اپنا تخلیقی میڈیم چنا اور مغربی دبستان اثریت یا اظہاریت کے تحت کام کرنا شروع کیا۔ چنتامنی کر، رام کنکر بیج، شنکھو چودھری کے نام اس دور کے فن کاروں میں سرِ فہرست آتے ہیں۔ چنتا منی کر نے لکڑی کو تراش کر نہایت سادے طور سے امیج کو نکھارنے کی ابتدا کی۔ شنکھو چودھری نے لکڑی اور سنگِ مرمر دونوں میں یکساں کوششیں جاری رکھیں۔ مرحوم رام کنکر نے کنکریٹ اور سیمنٹ کے میڈیم سے قدِ آدم سے بھی بڑے بُت اختراع کیے۔ جن کی مثالیں شانتی نکیتن کے کلا بھون کے باغیچہ میں اب بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان میں جو توانائی اور قوت اور برجستگی ہے، وہ دوسرے فن کاروں میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مرحوم سدھیر خاستگیر نے رام کنکر کی اس روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی، لیکن زندگی نے زیادہ وفا نہ کی۔ داس گپتا، شنکھو چودھری اور چنتامنی کر اب بھی بُت سازی کے میدان میں اپنے تجربوں کو زیرِ عمل لانے میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے شاگردوں

نے کئی مراکز میں ان کی روایات کو زندہ کر رکھا ہے۔

آزادی کے بعد پانچویں دہائی میں فنِ بُت سازی کو جب یونیورسٹی نصاب میں داخل کیا گیا تو اس میں قدرے دوبارہ جان پیدا ہوئی اور اسے اکاڈمک ڈسپلن کے طور پر اہمیت دی جانے لگی۔ طلباء نے فنِ بُت سازی کے مغربی دبستانوں کا عمیق مطالعہ کیا اور مختلف اسالیب سے فیض حاصل کرکے اختراعی کوششیں جاری رکھیں۔ خصوصی طور سے ۱۹۵۲ء میں بڑودہ یونیورسٹی میں جب فائن آرٹس فیکلٹی کھلی تو اچھے تربیت یافتہ اور ترقی پسند فن کار بطور اساتذہ وہاں اکٹھا ہوگئے۔ اور ان کی ان تھک کوششوں سے جو نسل ہمارے سامنے آئی وہ بلاشبہ قابلِ تحسین ہے۔ اس گروپ میں جی۔ بی۔ کھٹ، بلبیر سنگھ گٹ، ہمت شاہ، رگھوناتھ سنگھ، نریندر پٹیل، مہندر پانڈیا، نرائن کلکرنی، راگھو کنیریا، ہرکھن سندھوا اور کرشنا شرشتھا نے مختلف اسالیب کے تحت مختلف میڈیم میں تخلیقات کی ہیں۔ خصوصی طور سے بلبیر سنگھ گٹ، جی۔ سی۔ کھٹ اور مہندر پانڈیا نے سنگِ مرمر میں کم و بیش تجریدی انداز میں تجربات کئے ہیں۔ نرائن کلکرنی اور راگھو کنیریا نے لوہے کی چھڑوں کو جوڑ جوڑ کر تنظیمات پیش کی ہیں۔ چونکہ بُت سازی میڈیم کے اعتبار سے بہت مہنگا فن ہے۔ لہٰذا اس کی اختراع میں کافی سرمایہ بھی لگتا ہے اور وقت بھی کافی صرف ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان کے پیرِ وکٹن میں خاصی کمی رہتی ہے۔ عام سروے کے مطابق یہ بات محسوس کی جارہی ہے کہ سرمایہ کی عام کمی سے بُتوں کی مانگ دن بدن کم ہوتی جارہی ہے۔ لہٰذا طلباء اس فن میں کم ہی دلچسپی لے رہے ہیں۔

بہر حال کچھ ایسے بھی ہمارے بُت ساز ہیں، جو ان دشواریوں کے باوجود مسلسل کام کر رہے ہیں۔ انفرادی طور سے وہ غیر ممالک میں جاکر اپنی فن کارانہ صلاحیتوں پر دادِ تحسین بھی لیتے ہیں۔ اور معاشی طور سے حسبِ موقع اور منشا مستفیض بھی ہوتے ہیں۔ ایسے بُت سازوں کی فہرست میں امرناتھ سہگل اور ستیش گجرال قابلِ ذکر ہیں۔ امرناتھ سہگل نے اس فن کی تعلیم باضابطہ کہیں حاصل نہیں کی، لیکن اس کے باوجود انہیں للت کلا اکاڈمی نئی دہلی نے گولڈ پلیک (GOLD PLAQUE) حاصل کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ان کا اختراعی میڈیم عام طور سے کانسہ ہے۔ ان کے کم و بیش سبھی بُت کانسے میں ڈھلے ہوتے ہیں۔ ان کے بُتوں کی بنیاد "دبستانِ اظہاریت" پر ہے جس میں حضرتِ انسان یعنی آدم اور حوا کی گوناگوں پریشان زندگی، محرومیاں، مایوسیاں اور چیخ و پکار کی عکاسی ملتی ہے۔ انسان بحیثیت ایک مظلوم مخلوق کے دائمی کیفیت میں ان کے کانسے میں جم کر رہ جاتا ہے۔ اس ایٹمی دنیا میں جو انسان کی بذاتِ خود تخلیق ہے، انسان کی ہستی دن بدن بے معنی بنتی جارہی ہے۔ ہر طرف خوف و ہراس کا دَور دَورہ ہے۔ سہگل اپنی بے چینی و کرب کو اور اسی انسانیت کی بقا کے خطرے کی طرف آگاہ کرتے ہیں۔ ان بامعنی بُتوں کی ہندوستان میں تو کوئی خاص قدر نہ ہوئی لیکن اُن ممالک میں جہاں ایٹمی جنگ کا خطرہ ہر وقت لاحق رہتا ہے، خصوصاً مغربی یورپ کے ممالک میں یقیناً امرناتھ سہگل کے بُتوں کی زبردست مانگ ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ سال کے بیشتر حصے میں یورپ کے اسی علاقے میں مقیم رہ کر تخلیقی تجربات میں مصروف رہتے ہیں، اُنہیں بڑی عزت اور احترام سے دیکھا جاتا ہے۔

ستیش گجرال نے بنیادی طور سے فنِ مصوری کو اپنا لائحہ عمل منتخب کیا تھا، لیکن ساتھ ساتھ بُت سازی میں بھی طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا کچھ وقفے بعد کبھی مصوری اور کبھی بُت سازی کے تخلیقی نمونے دیکھنے کو ملتے رہتے ہیں۔ بُت سازی کے میدان میں خصوصی طور سے مشین کے کردار کو انہوں نے بڑی چابکدستی سے ایک تعمیری پہلو یا امیج کا روپ بخشا ہے۔ ان کا بُت ایک بہت بڑی مشین کے خارجی ڈھانچے کے طور پر جس میں کبھی کبھی بجلی کے ذریعہ رنگ برنگی روشنیاں بھی دیکھی جاسکتی ہیں، ایک سائنسی معمہ کی صورت میں نظر آتا ہے — ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے لطیف احساسات آج مشین کے رحم و کرم پر ہیں — ہماری تخلیقات کا دار و مدار سائنسی کرشموں اور اس کے ذریعہ فراہم کی گئی آسانیوں پر ہے۔ ہم اس تلخ حقیقت سے گریز نہیں کرسکتے۔ مثلاً دو گھنٹے بجلی فیل ہوجانے پر ہمارے تمام تخلیقی کام مفلوج ہوکر رہ جاتے ہیں۔ انسان اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کرنے لگتا ہے۔ مشین کی اسی عظمت اور اس کے آقائی کردار کو ستیش گجرال اپنے بُتوں میں پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کی ایک بہترین مثال اکبر ہوٹل، دہلی کے لاؤنج میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس قسم کے بُتوں کی کھپت اور مانگ بنیادی طور سے شمالی امریکہ میں رہی ہے اور گجرال نے وہیں اکثر اپنے اس تخلیقی روپ کو نمایاں کیا ہے۔

بمبئی میں مقیم پلّو آر لیو چکھانا والا اور بنارس کی لتیکا کٹ دو ایسی خاتون بُت ساز ہیں، جو قدرت میں پائے جانے والے مختلف روپ کو جن میں کھردرے یا غیر کھردرے خارجی اعصاب ملتے ہیں کم و بیش اُن کے اپنے بنیادی اشکال میں پیش کرتی ہیں۔ ان کی تنظیموں میں خوبی خصوصاً سلیقہ کی ہے۔ یعنی وہ مختلف بنیادی ڈھانچے کس سلیقے یا قرینے سے سجائے یا پیش کئے گئے ہیں، ان میں خالص سرور کی بات کی جاسکتی ہے۔ نہ صرف ان سے ذہن کو جھنجھوڑا جاسکتا ہے بلکہ ایک مہذب تعلیم یافتہ شخص کی قوتِ پرواز کو بھی پرکھا جاسکتا ہے۔ اسی فلسفہ کے مدِ نظر مس مدھا (دہلی) کے اقلیدسی بُتوں کو بھی دیکھا جانا چاہیئے۔ جنہوں نے اپنی ساری زندگی بڑی خاموشی سے اس فن کی نذر کر دی۔

جنوبی ہندوستان کی جانب جب ہماری نظر پڑتی ہے تو بہت سے بزرگ اور نئے بُت سازوں کی فہرست سامنے آتی ہے۔ بزرگوں میں بہر حال ایس۔ دھن پال جانکی رام اور نوجوانوں میں ایس نند گوپال قابلِ ذکر ہیں۔ ایس۔ دھن پال نے کم و بیش ٹھوس میڈیم میں تخلیقات کیں۔ حتیٰ کہ کانسے کو بھی ٹھوس طریقے سے استعمال کیا۔ جس سے حجم اور وزن کا احساس دُگنا ہو جاتا تھا۔ سرمایہ بھی کافی صرف ہوتا ہے۔ اُنہوں نے بحیثیت پرنسپل گورنمنٹ کالج آف آرٹ مدراس میں فنِ بُت سازی کی بہت سرپرستی کی اور جانکی رام اتیلا چیکب اور نند گوپال جیسے فن کار پیدا کئے۔ ان بُت سازوں

نریندر پٹیل "اشکال" (سنگِ مرمر) — امرناتھ سہگل "اَن سُنی چیخ و پکار" (کانسہ)

نے تانبہ کی چادروں کو اپنی ضرورت کے مطابق استعمال کیا اور اس میڈیم سے ریلیف نما بُتوں کی تخلیق کی۔ ان فن پاروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ موضوع و مزاج کے اعتبار سے اور طریقۂ کار میں بھی قطعی ہندوستانی ہیں۔ اس میں ہندوستانی پرانی روایت جو ٹھٹھیروں کے پیشہ سے تعلق رکھتی ہے، بدرجۂ اتم استعمال کی گئی ہے۔ موضوع میں جنوبی ہند کی عام مقبول دیویوں اور دیوتاؤں لیکن خصوصاً ناگ دیوتا کو اکثر منتخب کیا جاتا ہے اور ان کے مختلف رُوپ دکھائے جاتے ہیں۔

مشرقی حصے میں خصوصاً کلکتہ میں کھگین باگ، مادھو بھٹاچارجی، راجن دتا، دیب برت چکرورتی اور سمریش چودھری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سبھی ترقی پسند فن کار ہیں۔ اور ان سے کافی توقعات کی جاسکتی ہیں۔ شانتی نکیتن میں اجیت چکرورتی، سربری رائے چودھری اور ترچھری کو تجربات ہیں۔ دہلی میں بھبیش سانیال اور دھن راج بھگت جو پانچویں اور چھٹی دہائی میں فنِ بُت سازی کے رہ نما تھے، اور بطور اساتذہ اُنھوں نے اس فن کی ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ آج اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھی مصروف پائے جاتے ہیں۔ دہلی کی نئی نسل میں ایم۔ دھرمانی، دھرمار تھم، ربیش بھشٹ، مین داس، ایس۔ ایس وُہرا اور محمد صادق، چنڈی گڑھ میں شیو سنگھ، کشمیر میں غیور حسن اور مشیر شورا، نینی تال میں سیّد طاہر کچھ ایسی مثالیں ہیں جن کے سوچنے اور سمجھنے کے انداز میں نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے۔ اُن کی تخلیق کی ڈگر میں نیا پن ہے۔ اور اُن میں نئی روایتیں پیدا کرنے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ مستقبل میں یہ بھی بُت ساز تاریخِ فن میں کس مقام پر فائز ہوتے ہیں۔

بہرحال جو کچھ دورِ حاضر میں دیکھنے کو مل رہا ہے اگر اُسے ہم بین الاقوامی سطح پر رکھ کر موازنہ کرتے ہیں تو ہماری روش زیادہ روشن نظر نہیں آتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے بُت سازوں میں صلاحیتیں نہیں ہیں تکنیکی اعتبار سے وہ دنیا کے کسی بھی ملک کے فن کاروں

(آگے صفحہ ۴۵ پر)

بہ خطِ منشا

## غزل

سخت مشکل کٹھن پُر خطر راستے
ہم کو بھاتے ہیں دشوار تر راستے

ان پہ چلتے ہیں جب ہم سے اہلِ جنوں
اُڑتے ہیں بن کے گردِ سفر راستے

شرط یہ ہے کہ ہو گرمیٔ حوصلہ
راس آجاتے ہیں پُر شرر راستے

کوئی راہی نہ بھٹکے کبھی راہ میں
بولنا سیکھ جائیں اگر راستے

ہم تو دکھلائیں گے اپنی جولانیاں
بے ضرر ہوں کہ ہوں باضرر راستے

چلنے والے تو چلتے ہیں شام و سحر
اجنبی شہر میں پوچھ کر راستے

کاش چھٹ جائے اندھی سیاست کی دھند
صاف آئیں نظر معتبر راستے

لوگ منشا چلے جا رہے ہیں ادھر
اُن کو لے جا رہے ہیں جدھر راستے

محمد منشاء الرحمٰن خان منشا

محمد منشاء الرحمٰن خان منشا

## حسن نعیم

رُوح نے کی گفتگو سب سے الگ انداز میں
کچھ کھلا میرا ہُنر اس شخص کی آواز میں

نغمگی و معنویت بھی لہو کے رقص ہیں،
ورنہ کچھ حرفِ نوا میں ہے نہ حرفِ ساز میں

اب تو میں ہوں خانقہ میں اور یہ ویراں صفیں
ہاؤ ہُو کا دم کہاں ہے، سینۂ دم ساز میں

کھو گیا تو آج بھی پاؤں کی زنجیر ہے
ورنہ ہر شے گرد پا تھی دشت کے آغاز میں

آدمی دل چسپ بھی ہے، علم والا بھی نعیم
بس کمی کچھ عقل کی ہے اس نئے ہمراز میں

---

تم جہاں ہو، ہم وہاں سے دُور ہیں
تم ہو زہرہ، ہم زمیں کا نُور ہیں

جس طرح چاہا، اسے اپنا لیا
ہم ہی سرمد ہیں، ہمیں منصور ہیں

زر پرستی ہر عطائی کا اُصول
فن پرستوں کے الگ دستور ہیں

وہ ہوا میں ہیں مگر کتنے اُداس
ہم زمیں پر ہیں مگر مسرور ہیں

کم نہیں رُتبے میں ہم بھی حسن سے
وہ ہے سرمایہ تو ہم مزدُور ہیں

رشک سے پُوچھے تو اک دن وہ نعیم
یہ حسیں غزلیں کہاں کی حُور ہیں

---

چھوڑیئے اندازِ جنگل، آدمی بن جائیے
اِس طرح دنیا سے لڑیئے، روشنی بن جائیے

مثل بارش بھیجئے ویراں زمینوں کی دُعا
کوہ سے نیچے اُتریئے، اک ندی بن جائیے

سب گزر جاتے ہیں پل میں کوئی اپنا ہے نہ غیر
حادثے گزریں تو جیسے اجنبی بن جائیے

ایک چادر ہے خوشی کی، ایک گٹھری غم کی ہے
سر پہ دونوں کو اُٹھا کر، یاتری بن جائیے

طنز میں احباب کہتے ہیں، مگر خود سوچئے
کیا بُرائی ہے جو صُوفی واقعی بن جائیے

حضرتِ بیدل کو پڑھئے، سیکھئے کوئی ہُنر
یوں حسن بھئے، نوائے خوش دِلی بن جائیے

لمحہ لمحہ کون دیتا ہے صدا مجھ کو نعیم
"کیجئے کچھ کام ایسا، اک صدی بن جائیے!"

---

٥ سی ۔ ۳۹ ، شالیمار ، ٹونگیک نگر دہی سر (ایسٹ) بمبئی ۶۸

راجندر سنگھ بیدی

# مَن کہ ...
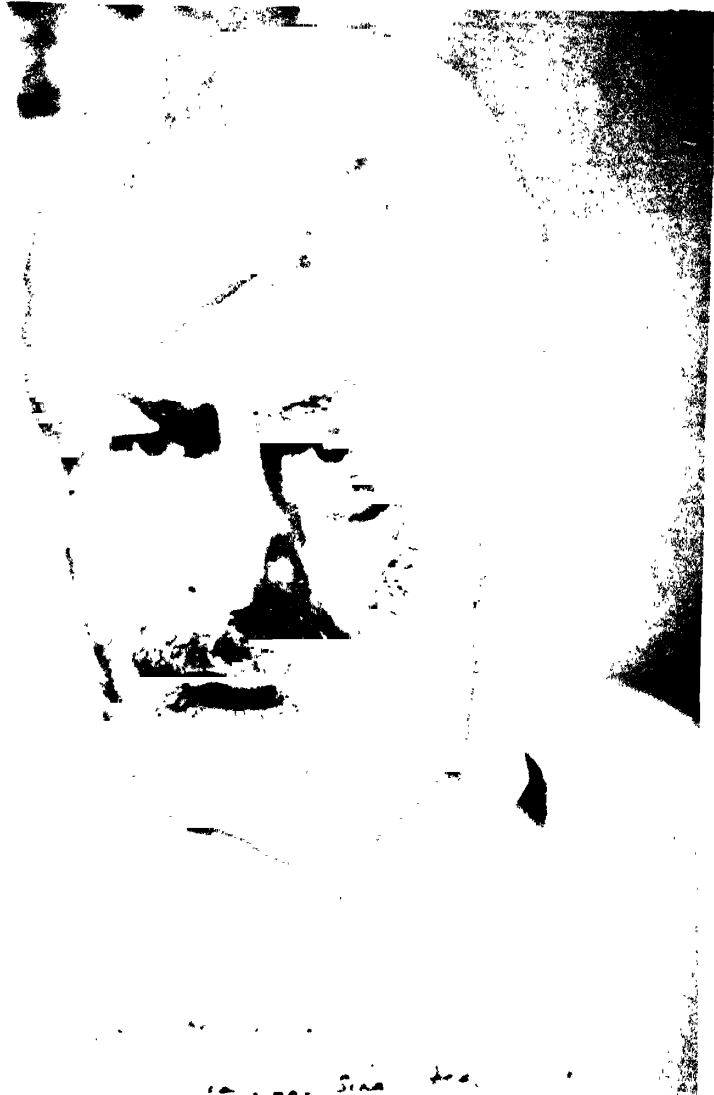
نام : راجندر سنگھ بیدی    والد کا نام : ہیرا سنگھ بیدی کھتری

ماں کا نام : سیوا دئی ۔ برہمن

تاریخ پیدائش : پہلی ستمبر ۱۹۱۵ء ۔ بمقام لاہور

وطن مالوف : گاؤں ڈلّے کی ۔ تحصیل ڈسکا ۔ ضلع سیالکوٹ

تعلیم : ۱۹۳۱ء میٹری کولیشن (ایس ۔ بی ۔ بی ۔ ایس ۔ خالصہ اسکول ، لاہور)

۱۹۳۳ء انٹرمیڈیٹ ، ڈی ۔ اے ۔ وی کالج ، لاہور

۱۹۳۲ء : ادبی زندگی کا آغاز

(طالب علمی کے زمانے میں محسن لاہوری کے نام سے انگریزی ، اردو اور پنجابی میں نظمیں اور کہانیاں لکھیں ، جو شائع بھی ہوئیں لیکن کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں) ۔

پہلی ملازمت : پوسٹ آفس لاہور ۔ بحیثیت کلرک

۱۹۴۳ء : استعفیٰ (ڈاک خانے کی ملازمت کی مدت دس سال)

چھ ماہ دہلی میں مرکزی حکومت کے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں کام کیا

تیسری ملازمت آل انڈیا ریڈیو لاہور میں بحیثیت آرٹسٹ

۱۹۳۴ء : شادی : (عمر ۱۹ سال)

بیوی کا نام : سوما وتی ۔    سسرال کا نام : ستونت کور ۔ وفات ۱۹۷۷ء

۱۹۴۶ء : اشاعتی کام کا آغاز سنگم پبلشرز لمیٹڈ

۱۹۴۷ء : لاہور کو خیرباد

۱۹۴۸ء : دہلی میں منتقلی ۔ ادیبوں کے وفد کے ساتھ کشمیر

۱۹۴۸ء : جموں ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر کا عہدہ

۱۹۴۹ء : دہلی کو واپسی ۔ ۱۹۴۹ء ہی میں دہلی سے بمبئی کو منتقلی

۱۹۴۹ء : بمبئی میں فلمی زندگی کا آغاز

(سن ۴۶ ۔ ۱۹۴۵ء میں لاہور میں مہیشوری فلم کے لیے "کہاں گئے" نامی فلم لکھی) بمبئی میں : تقریباً چالیس فلموں کے مکالمے لکھے ، جن میں "بڑی بہن" (۱۹۴۹ء) "داغ" (۱۹۵۲ء) "مرزا غالب" (۱۹۵۴ء) "دیوداس" (۱۹۵۵ء) "ابھیمان" (۱۹۵۷ء) "مدھومتی" (۱۹۵۸ء) "انورادھا" (۱۹۶۰ء) "انوپما" (۱۹۶۶ء) وغیرہ شامل ہیں ۔ کچھ دوستوں کے ساتھ اور انفرادی طور پر خود بھی فلمیں بنائیں ، جن کے نام ہیں : گرم کوٹ (۱۹۵۵ء) ایک چادر میلی سی ، سہاگن (۱۹۵۸ء) رنگولی (۱۹۶۲ء) ، دستک اور آنکھن دیکھی (آخرالذکر فلم ابھی ریلیز نہیں ہوئی) ۔

تصانیف :

۱۹۳۶ء : (۱) دانہ و دام (افسانے) مکتبہ اردو لاہور بار دوم ۱۹۶۳ء

عنوانات : بھولا ، ہمدوش ، من کی من میں ، گرم کوٹ ، چھوکری کی لوٹ ، پان شاپ ، منگل اشٹکا ، کوارنٹین ، اُگلادان ، دس منٹ بارش میں ، حیاتین ب ، بچھن ، ردِ عمل ، موت کا راز ۔

۱۹۴۲ء : (۲) گرہن (افسانے) نیا ادارہ ، لاہور ۔ بار دوم ۱۹۸۱ء

عنوانات : گرہن ، رحمن کے جوتے ، بکی ، اغوا ، غلامی ، ہڈیاں اور پھول ، زین العابدین ، لاروے ، گھر میں بازار ، دوسرا کنارا ، آلو ، معاون اور میں ، چھچک کے داغ ، ایوالانش ۔

۱۹۴۳ء : (۳) بے جان چیزیں (ڈرامے)

عنوانات : کارکی شادی ۔ ایک عورت کی نہ ۔ روحِ انسانی ۔ اب تو گھبرا کے ۔ بے جان چیزیں ۔ خواجہ سرا ۔

۱۹۴۶ء : (۴) سات کھیل (ڈرامے) سنگم پبلشرز لمیٹڈ بمبئی ۔ بار دوم : ۱۹۸۱ء

عنوانات : خواجہ سرا ۔ چانکیہ ۔ تلچھٹ ۔ نقلِ مکانی ۔ آج ۔ رخشندہ ۔ پاؤں کی موچ

(دونوں مجموعوں میں کُل گیارہ ڈرامے ہیں ۔ دوسرے مجموعے کا پہلا اور آخری ڈرامہ اوّلین مجموعے میں بھی شامل ہے ۔ "ایک عورت کی نہ" کا عنوان دوسرے مجموعے میں "پاؤں کی موچ" کر دیا گیا)

۱۹۴۹ء : (۵) کوکھ جلی (افسانے) کتب پبلشرز ، بمبئی

بار دوم : ۱۹۷۰ء بار سوم : ۱۹۸۱ء

عنوانات : لمس ۔ کوکھ جلی ۔ بیکار خدا ۔ نامراد ۔ مہاجرین ۔ کشمکش ۔ جب میں چھوٹا تھا ۔ (ایک مطالعہ) ایک عورت ۔ ٹرمینس ۔ گالی ۔ خطِ مستقیم اور توہین ۔ ماسوا ۔ آگ ۔

۱۹۶۲ء : (۶) ایک چادر میلی سی (ناول) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، دہلی ۔ بار دوم : ۱۹۷۵ء

۱۹۶۵ء : (۷) اپنے دُکھ مجھے دے دو (افسانے) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، دہلی

بار دوم : ۱۹۷۳ء بار سوم : ۱۹۷۹ء

عنوانات : لاجونتی ، جوگیا ، ببل ، لمبی لڑکی ، اپنے دُکھ مجھے دے دو ، ٹرمینس سے پرے ، حجام الہ آباد کے ، دیوالہ ، یوکلپٹس ۔

۱۹۷۴ء : (۸) ہاتھ ہمارے قلم ہوئے (افسانے) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، دہلی

بار دوم : ۱۹۸۰ء

عنوانات : ہاتھ ہمارے قلم ہوئے ۔ (ایک اعتراف) ۔ صرف ایک سگریٹ ۔ کلیانی ۔ متھن ۔ باری کا بخار ۔ سونفیا ۔ وہ بڈھا ۔ جنازہ کہاں ہے ۔ تعطل ۔ آئینے کے سامنے ۔

۱۹۸۲ء : (۹) مکتی بودھ (افسانے) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، دہلی

عنوانات : افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل ۔ مکتی بودھ ۔ ایک باپ بکاؤ ہے ۔ چشمِ بد دور ۔ بوبو ۔ بلی کا بچہ ۔ گیتا ۔

(آگے صہ ۳۶ پر)

ستیش بترا

# پھیلتے سمٹتے فاصلے

میں پندرہ سال کے طویل وقفے کے بعد اسے اپنے وطن سے دور ایک پردیسی ملک میں مل رہا ہوں۔ وہ میرے لئے اپنی خوبصورت نئی کار کا دایاں دروازہ کھول دیتا ہے۔ میں ایک لمحہ کے لئے جھجکتا ہوں۔ اپنے ملک میں تو اگلی سیٹ پر بٹھانے کے لئے بائیں طرف کا دروازہ کھولتے ہیں۔ وہ میری اس جھجک کو فوراً بھانپ لیتا ہے۔

"انکل۔ یہاں کی ہر چیز الٹی ہے! آجائیے نا!" میں ایک کھسیانی ہنسی کے ساتھ اس کے قہقہہ میں شامل ہو جاتا ہوں۔ اس کی ہوشیار، سمجھدار نگاہوں نے میرا ذہن ٹٹول لیا ہے۔ اب وہ دس سال کا معصوم بچہ نہ تھا جسے میں نے دہلی میں اسکے باپ کے گھر میں دیکھا تھا۔

"میں شاید اب بڑا ہو گیا ہوں، انکل!" اس کا ذہن میرے خیالات کا ہم قدم تھا! "حالانکہ ماں باپ کی نظروں میں بچے ہمیشہ بچے ہی رہتے ہیں!" وہ مسکرا دیتا ہے۔

"ہاں بھئی! لیکن اب تم جوان ہو! ایک بارسوخ امریکن کمپنی کے الیکٹرانک انجینیر ہو!"

"مگر میں جانتا ہوں آپ مجھ میں وہی دس سال والا بچہ ہی تلاش کر رہے ہیں جسے آپ نے اپنے دوست کے ہاں لودھی روڈ والے چھوٹے سے فلیٹ میں دیکھا تھا!"

وہ حیرتناک طریقے سے میرے خیالوں کی عکاسی کر رہا تھا۔

دراصل میرے ذہن میں آجتک آپ کا وہی امیج ہے! آپ اس بلیو سوٹ میں بہت جچتے تھے۔ آپ کے کوٹ کی جیب میں سفید رومال تھا اور کالر میں ایک نوشگفتہ گلاب کا پھول!"

وقت اپنی تیز رفتاری کے باوجود منجمد سا رہ گیا معلوم ہوتا تھا۔ شاید اس نے مجھے اپنا آئیڈیل سمجھ لیا تھا۔ ایک کامیاب بزنس ایگزیکٹیو جس کے پاس ایک بہت بڑا گھر تھا پھولوں سے سجا لان۔ ایک دمکتی کار اور جو اس کے باپ سے کہیں زیادہ کماتا تھا۔ جس کے رکھ رکھاؤ میں غالباً ان کے یہاں سے برتر نفاست تھی اور جو خوش اخلاقی سے اپنے دوست کے بیٹے کے لئے ایک چابی والی ٹرین لایا تھا۔

"انکل! وہ آپ کی دی ہوئی ٹائے ٹرین میرے پاس آج بھی رکھی ہے! آپ میرے فلیٹ میں جب چلیں گے تو میں دکھاؤں گا!"

آج کا الیکٹرانک انجینیر وقت کے فاصلوں میں سکڑ کر پھر ایک دس سالہ بچہ بن گیا تھا، جس میں آج بھی اپنی کچھ پسندیدہ چیزوں کی نمائش کا جذبہ تڑپ رہا تھا۔

شاید انسان کچھ چیزوں کے بارے میں بالکل نہیں بدلتا!

لیکن نہیں۔ وقت ذہنی طور پر بھلے ہی نہ سہی، جسمانی طور پر تو انسان کو بوڑھا کر ہی دیتا ہے۔ میں نوکری سے فراغت پا چکا ہوں۔ زندگی کو مشغول رکھنے کیلئے تھوڑا بہت کچھ کر لیتا ہوں۔ آخر وقت کو دھکا تو دینا ہی پڑتا ہے

اس کی کار میں ہر طرح کی سہولیات ہیں۔ ایرکنڈیشنر ہے، ریڈیو ہے کیسٹ پلیر ہے بہت ہی قیمتی اور آرام دہ نشستیں ہیں کار ہے کہ سڑک پر خاموش لڑھکتی جا رہی ہے میلوں کی مسافت منٹوں میں طے کیے جا رہی ہے۔ وہ جب بھی مقررہ رفتار کو پار کرتی ہے تو الارم بج اٹھتا ہے اور وہ اسے رفتار کی حدود میں رکھنے کے لیے ایکسیلریٹر کی گرفت میں ڈھیل دے دیتا ہے یہ میرے پاس رہی ہوئی کسی بھی کار کو آسانی سے مات دے سکتی ہے!

"انکل! یہ کار مجھے میری کمپنی نے دی ہے۔ سب سے زیادہ سیلز کرنے پر ایک تحفہ!"

میں اسے مبارکباد دیتا ہوں۔ ذہن کے کسی کونے میں رشک کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ نے بھی اپنے زمانے میں زیادہ سیلز کرنے پر کئی انعامات جیتے ہیں!"

"لیکن ایسے شاندار تحفے اپنے دیش میں ذرا کم ہی ملتے ہیں!"

وقت کے ساتھ ساتھ انعامات کی قدر و قیمت میں بھی تو اضافہ ہوتا رہتا ہے!" وہ میری طرف بدستور اسی اشتیاق سے دیکھ رہا ہے جس کی چمک اس کی

۵۲۰/۱۷ - ۱۶ فرید آباد - ۱۲۱۰۰۲

دس سالہ آنکھوں میں تھی۔ شاید میں اسکے ذہن کے نہاں خانوں میں اسی طرح آباد تھا جیسے پندرہ سال پہلے۔

تیزی سے نہ ختم ہونے والے فاصلے کو کار نگلتی جارہی ہے۔ میں خاموشی کے گھڑیاں پر ایک ضرب لگاتا ہوں۔

تمہیں وطن کی یاد نہیں آتی ؟ تمہارے ماں باپ تو لوٹنے کے لیے بیقرار ہیں!"

ان کی بات دوسری ہے۔ ان کی زندگی کا مدعا حل ہو چکا! وہ لوٹ سکتے ہیں!"

کیا وطن تمہارے لیے کوئی کشش نہیں رکھتا؟ کب تم واپس نہیں لوٹنا چاہو گے؟"

"انکل! آپ کے پہلے سوال کا جواب "ہاں" ہے لیکن دوسرے کا "نہ" ہے

"وہ کیسے؟"

"دیش یاد ضرور آتا ہے لیکن صرف اس کا دھندلا سا نقشہ! وہاں میرے لیے کیا ہے! میں یہیں پڑھا لکھا! میں اسی ماحول کی پیداوار ہوں! میرے دوست، ساتھی........"

اور گرل فرینڈز ——— سبھی تو یہاں ہیں!" میں اس کا فقرہ مکمل کر دیتا ہوں۔ مجھے میرے دوست نے اسکی گرل فرینڈ کے بارے میں بتا دیا تھا۔

اور ہاں گرل فرینڈ بھی!" وہ تائید میں مسکرا دیتا ہے ——— "لیکن یہ کوئی وقتی گرل فرینڈ نہیں میں اس گرل فرینڈ کے بارے میں سیریس ہوں"

عام والدین کی طرح میرا دوست اور اسکی بیوی بھی چاہتے ہیں کہ وہ اپنے دیش کی ہی کسی لڑکی سے شادی کرے۔

میں ممی ڈیڈی کے خیالات اچھی طرح جانتا ہوں ان کے نزدیک مقامی لڑکیاں شاید اتنی پر خلوص اور وفادار ثابت نہ ہوں ——— لیکن کیا ہم اپنے دیش کی ہر لڑکی کے بارے میں کہہ سکتے ہیں ؟"

دہلی والا دس سالہ لڑکا مجھے بالغ نظر معلوم ہونے لگا تھا۔

یہ ٹھیک ہے یہاں دنیا میں شاید سب سے زیادہ طلاق ہوتے ہیں، خودکشیاں ہوتی ہیں باوجودیکہ یہ ملک دنیا کے سب ملکوں سے زیادہ خوشحال کہلایا جاتا ہے لیکن ہر لڑکی یہاں بھی لاابالی، ہرجائی اور بے وفا نہیں ہے۔

یہاں بھی کچھ خاندانوں میں آج بھی اعلےٰ تہذیبی قدروں کا پاس کیا جاتا ہے۔ ممی ڈیڈی لارا سے مل چکے ہیں وہ کئی مرتبہ ہمارے گھر بھی رہ چکی ہے۔ میں نے لارا کو پورا موقع دیا ہے کہ وہ ہمارے گھر کو، میرے والدین کو ہماری قدروں، رسموں اور تہذیب کو اچھی طرح جان لے۔"

اس نے اپنا پرس کھول کر ایک تصویر میری طرف بڑھا دی۔ یہ ان دونوں کی تصویر تھی۔ لارا ایک ——— متناسب جسم، خوبصورت شکل و شبیہ کی پرکشش لڑکی تھی۔ اس کے قریب کھڑے ہوئے میرے دوست کا لڑکا بلیو سوٹ کی جیب میں سفید رومال اور کالر میں ایک گلاب کا پھول سجائے بہت باوقار لگ رہا تھا۔

لارا نے گھر میں آکر کچن میں ہمیشہ ممی کا ہاتھ بٹایا ہے۔ اس نے ان سے اپنے دیش کے کئی قسموں کے کھانے سیکھے ہیں۔ ہمارے مذہبی عقیدوں کو جاننے سمجھنے اور اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساڑھی اور شلوار قمیص پہننے کی ہی نہیں بلکہ انہیں سینے تک کی کوشش کی ہے! مجھے یقین ہے کہ لارا میرے والدین کے بارے میں کبھی کوتاہی نہ برتے گی!"

وہ دس سال کا لڑکا اب نہ صرف بالغ نظر ہو چکا تھا بلکہ ذمہ دار بھی!

میں لارا کو آنٹی سے ملواؤں گا۔ آپکے یہاں میں جب کبھی آیا آنٹی نے ہمیشہ نئے نئے کھانوں سے ہماری تواضع کی ——— وہ شاہجہانی پلاؤ اور شاہی ٹوسٹ تو مجھے بے حد پسند ہیں ——— نہ جانے کیوں میں کبھی بھی ان کے سامنے ان کے کھانوں کی تعریف نہ کر سکا دراصل کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ احترام کے باعث زبان نہیں کھلتی۔ آنٹی کی بھی ایسی ہی شخصیت ہے! اب آنٹی یہاں آئی ہوئی ہیں تو بھلا لارا کو اس سے بہتر موقع کب مل سکتا ہے! انکل ——— آپ آنٹی سے کہیں گے نا!"

اور وہ پچیس سالہ ذمہ دار نوجوان الیکٹرانک انجینیر فاصلوں کی سرنگ کے اس پار کھڑا پھر دس سالہ بچہ بن گیا تھا۔

محمد بشیر مالیرکوٹلوی

# انتقام

موسم کے سخت عذاب سے زمین تقریباً پگھلتی جارہی تھی۔ گرمی کی بدمزاجی سے بچنے کے لیے ہوائیں جانے کہاں روپوش ہو چکی تھیں۔ ہر جاندار اپنے اندر ایک گھٹن اور پریشانی محسوس کر رہا تھا۔ ڈھائی فٹ کا ایک ننھا سا انسان چیتھڑا بغل میں دبائے۔ ننگے پاؤں۔ اپنے بھونڈے انداز میں آوازیں لگاتا چلا جا رہا تھا۔

"ہو جی! ـــــ بابو جی!! ـــــ دو جی!! ـــــ پیسہ جی!!"

وہ گیان تھا جس کے پیچھے اس کا اکلوتا اپنا 'کتا' موتی دم ہلاتا ہوا چل رہا تھا۔ وہ ایک بدشکل بونا تھا جسکو دیکھ کر ہر انسان منہ موڑ لیتا تھا۔ اس کی شکل خوفناک اور مکروہ تھی۔ اکثر وہ بچے جو اسے پہلی بار دیکھتے خوف زدہ ہو جاتے۔ اس کا رنگ بالکل سیاہ تھا۔ سر عام آدمی سے بھی بڑا تھا۔ بڑی بڑی۔ ابلی ابلی سی آنکھیں جو ہمیشہ سرخ رہتی تھیں جن سے پانی رستا رہتا تھا۔ پچکی سی ناک سے ریشہ بہہ بہہ کر، اس کی مونچھوں سے الجھتا ہوا اوپر والے ہونٹ کو ہمیشہ تر رکھتا تھا۔ سرخی مائل زرد دانت بے ڈھنگی اور مختصر داڑھی۔ ٹیڑھی اور چھوٹی چھوٹی ٹانگیں۔ ننھے منے بازو جب وہ چلتا تھا تو کمر سے اوپر کا حصہ عجیب انداز میں۔ دائیں بائیں دبتا اور ابھرتا تھا۔

آج بازار میں رونق برائے نام تھی۔ کہیں کہیں کوئی آدمی سر پر کپڑا ڈالے نظر آجاتا تھا۔

● اوقاف آفیسر، پنجاب وقف بورڈ۔ مین بازار۔ فرید آباد۔ ہریانہ

گیان اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے مسافت طے کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

"ہو جی! ـــــ بابو جی!! ـــــ دو جی!! ـــــ پیسہ جی!!"

اس کی آواز پر نہ تو کوئی سکہ اس کی طرف اچھلا تھا۔ نہ ہی۔ شاید وہ خود اس وقت پیسے کا طالب نظر آرہا تھا۔ بس حسب عادت وہ آواز لگاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ جیسے کسی کھلونے میں ایک دو مکالمے ٹیپ ہوں اور وہ مسلسل بولتا رہے۔ چلتا رہے۔ گیان اچانک ایک مورتی والے کی دوکان کے آگے رک گیا۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے دوکاندار نے صرف بنیان اور دھوتی پہن رکھی تھی۔ وہ گدی پر بیٹھا۔ دیوار سے سر ٹیکے سو رہا تھا۔ دوکان کے اندر چھوٹی بڑی ہر قسم کی مورتیاں سجی ہوئی تھیں۔ کافی اونچی جگہ پر پڑی ہوئی کرشن جی کی ایک چھوٹی سی مورتی دیکھ کر گیان خوش ہو گیا۔ اس نے دوکاندار کو خوش ہو کر پکارا۔

"ہو جی!! ـــــ بابو جی!!"

دوکاندار بدستور آنکھیں بند کیے سوتا رہا۔ ایک دو بار مزید کوشش کے بعد گیان دوکان کے زینے پر چڑھ گیا۔ اور زور سے بولا۔

"ہو جی!! ـــــ سنو جی!! ـــــ بابو جی!!"

دوکاندار چونک پڑا، اس نے آنکھیں پھاڑ کر گیان کو دیکھا، اور مونہہ اس طرح بنا لیا، جیسے وہ نیم کے پتے چبا رہا ہو۔ اس کا ہاتھ فوراً ڈنڈے پر گیا جس کے ایک سرے پر کپڑا بندھا ہوا تھا جو مورتیاں جھاڑنے کے کام آتا تھا وہ دھتکارتے ہوئے بولا۔

"چاچا! ـــــ معاف کر!! ـــــ کہاں آگیا سالا دوپہری میں، منحوس!!"

گیان سہم کر زینے سے سڑک پر آگیا۔ اور بغل والا کپڑا سنبھالتے ہوئے بولا

"ہو جی! ـــــ پیسہ مانگنے نہیں آیا جی!!"

"تو پھر کیا، ادھر اپنی اماں کو ڈھونڈنے آیا ہے!؟ ـــــ بہن کا ـــــ!!" دوکاندار نے ڈنڈا ہوا میں لہرایا۔

"ہو جی! ـــــ سنو تو جی!! ـــــ گیان کی بات!!"

گیان عاجزی سے بولا۔

"سالے! ـــــ تو سنائے گا گیان کی بات!؟ ـــــ ٹھہر جا، تیری تو!!!"

گیان دوکان سے تھوڑا دور ہٹ گیا، اور روہانسا ہو کر بولا۔

"مجھے بھگوان چاہئیں جی!!"

دوکاندار بے زاری سے بولا "چاچا! جیب سے نہیں۔ بھگوان خریدنے لگا سالا!!"

گیان نے اپنی کلائی سے ناک رگڑی، ہونٹ پر لگے ہوئے، ریشے کو زبان کی نوک سے صاف کیا، اور بولا

"پیسہ ہے جی!—— لے لوجی!!—— بھگون دیدو گیان کو جی!!!"
دوکاندار کو تسلی ہونے لگی، پیسے کا نام سن کر اس کے مزاج میں ٹھہراؤ آگیا۔
"پورے!—— سات روپے کی ہے!!"
مارے خوشی کے گیان کے ہونٹ کھِل گئے۔ موتی وقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دکان کے چبوترے کے نیچے، گندی نالی میں دبک کر بیٹھ گیا تھا۔ کپڑا سنبھالتے ہوئے گیان زینے پر چڑھ گیا اور ریزگاری چبوترے پر ڈھیر کرتے ہوئے بولا: "لوجی!—— گن لوجی پیسہ!!"
دوکاندار نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا اور الٹا ہاتھ مار کر بولا "دور ہٹ!—— سالا گندہ!!"
گیان مسکراتا ہوا سڑک پر اتر آیا۔ اور دوکاندار کو ریزگاری گنتے ہوئے دیکھ کر خوش ہونے لگا۔ جو اپنی شہادت کی انگلی سے سکّوں کو یوں چھو رہا تھا، جیسے مری ہوئی چھپکلی کو چھیڑ رہا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد ریزگاری سمیٹ کر دکاندار نے محفوظ کر لی۔ کھڑے ہو کر مورتی اٹھائی، حسب عادت اُس پر کپڑا مارا اور جھک کر گیان کی طرف مورتی بڑھاتے ہوئے اس کے چہرے کو دیکھ کر بولا: "ارے!؟—— تجھے کسی نے مارا!!؟"
گیان نے اچک کر مورتی پکڑ لی اور دوکاندار کی بات کا جواب دیئے بغیر چل دیا۔ موتی نے جب اسے جاتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی باہر نکل آیا۔ اس کی ٹانگیں اور پیٹ بھیگ گئے تھے۔ وہ دُم ہلاتا ہوا گیان کے پیچھے ہو لیا جو آوازیں لگاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔
"ہو جی!—— بابو جی!!—— دو جی!!—— پیسہ جی!!"
گیان کچھ زیادہ ہی خوش تھا۔ وہ مورتی کو کپڑے میں لپیٹے کچھ اس طرح چھاتی سے چمٹائے ہوئے چل رہا تھا، جیسے کوئی ماں اپنے اکلوتے بیمار بچے کو سنبھال سنبھال کر لیئے جا رہی ہو۔ اپنی ٹیڑھی میڑھی ٹانگوں سے سارا بازار عبور کر کے وہ بس اسٹینڈ سے گزرتا ہوا شمشان گھاٹ کی طرف بڑھنے لگا۔
سورج مسلسل شعلے برسا رہا تھا۔ سائے تھوڑا مشرق کی طرف سرکنے لگے تھے۔ دور سے آتی ہوئی فاختہ کی آواز چاروں طرف پھیلے ہوئے سنّاٹے کے جسم میں چھید کر رہی تھی۔ گرمی کے قہر سے پریشان درخت سر جھکائے شام کے دھندلکوں کا انتظار کر رہے تھے۔ لُو کی سخت مزاجی کو برداشت کرتے کرتے گھاس اپنا رنگ کھو بیٹھی تھی۔ گیان ایک جلتی ہوئی پگڈنڈی پر چل رہا تھا۔ جو دور ایک چھوٹے سے مکان کے کھنڈر تک رہنمائی کر رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد گیان کھنڈر میں پہونچ کر اپنے ٹھکانے کی طرف لپکا۔ یہ ایک شکستہ سا کچا کوٹھا تھا۔ جس کی صرف دو دیواریں کمزور حالت میں کھڑی تھیں۔ شمالی دیوار پر چھت کا ایک سرا ٹکا ہوا تھا۔ دوسرا سرا جنوبی دیوار کے قدموں میں پڑا تھا—— شہر سے دور یہی گیان کا گھر تھا، جہاں اس کے گندے اور بوسیدہ کپڑے پڑے ہوتے تھے۔ ایک طرف تین چار ٹوٹے پھوٹے ڈبے تھے دوسری طرف مٹی کے ایک دو گندے سے برتن اور ایک ٹوٹا ہوا گھڑا پڑا تھا۔ کہیں ردی کاغذ بکھرے تھے تو کہیں کولڈ ڈرنکس کے ڈھکن پڑے تھے
ایک سخت تنکے کی مدد سے ایک مشہور ایکٹریس کی تڑی مڑی سی تصویر کچی دیوار پر ٹنگی ہوئی تھی۔ درمیان میں ایک بوسیدہ سا ٹاٹ بچھا ہوا تھا۔ جو شاید گیان کا بستر تھا۔ بدبو کچھ اس طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے قریب ہی کسی جانور کی لاش سڑ رہی ہو۔ چھت کے نیچے آ کر گیان نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، آہستہ آہستہ مورتی کو ٹاٹ پر رکھ کر باہر نکل گیا۔ وہ ایک جھاڑی کی طرف لپکا۔ جہاں اسے ایک سالم اینٹ پڑی مل گئی اس نے اینٹ کو اپنے ننھے منے ہاتھوں میں اٹھا لیا جو زیادہ گرم نہ تھی۔ موتی دوسری جھاڑی میں دبکا اس کی نقل و حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ اینٹ دیوار کے ساتھ رکھ کر اس نے اس پر ہاتھ پھیرا۔ اور اس پر ایک کاغذ بچھا کر آہستہ سے مورتی کپڑے سے نکالی اور اینٹ پر رکھ دی۔ خود ٹاٹ پر بیٹھ گیا اور کرشن جی کو دیکھنے لگا جو ایک شفقت بھری مسکراہٹ کے ساتھ بانسری کو ہونٹوں سے لگائے گیان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے تو ہمیشہ آنکھوں کی نفرت ہی دیکھی تھی۔ آج پہلی بار کسی کی آنکھوں سے اس نے محبت جھلکتی دیکھی تھی وہ برداشت نہ کر سکا۔ جانے کہاں سے اسکی آنکھوں سے سمندر کی لہریں اُمڈ آئیں۔ آج اس ٹوٹی ہوئی چھت کے سائے تلے۔ انسانوں کی بستی سے دور، کوئی اس کا دکھ بانٹنے والا اس کے ساتھ تھا ورنہ وہ تو ساری زندگی اکیلا ہی تڑپتا رہا۔ سسکتا رہا۔
اس نے جب ہوش سنبھالا تو وہ سڑک کے کنارے پڑا تھا اور اس کے ہاتھ بھیک کے لیے اٹھے ہوئے تھے کتنے ہی سالوں تک تو اسے اپنی پیدائش کے بارے میں یہی خیال رہا۔ کہ سڑک کا سینہ پھٹا ہوگا اور وہ نکل کر باہر آگیا ہوگا۔ بڑے ہی پیار سے وہ سڑک کے درمیان ایک دراڑ کو دیکھا کرتا تھا جو میونسپلٹی والوں کی بے توجہی سے برسوں سے وہاں موجود تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اسے معلوم ہوتا گیا کہ اس نے بھی کسی انسان کی کوکھ سے جنم لیا ہے، اسے بھی کسی ماں نے پیدا کیا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ کچھ زیادہ ہی پریشان ہو اٹھتا تھا اس کے اندر ایک ہی آواز گونجتی تھی ایک ہی سوال کا زہر اس کے ذہن میں پھیلتا رہتا تھا "ماں!!—— کہاں ہے میری ماں!!؟—— ماں!!—— ماں!!"
جب وہ لوگوں کی دھتکار، ٹھوکروں اور گالیوں سے سخت پریشان ہو جاتا۔ تو بڑے مندر کا رخ کرتا سیڑھیوں پر بیٹھ کر دور سے بھگوان کرشن کی چوکھٹ کو دیکھا کرتا تھا۔ جس سے اس کا دکھ قدرے کم ہو جاتا۔
کئی بار اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی آگے بڑھے بھگوان کے قدموں میں پھول چڑھائے اور اس سے پوچھے، کیوں اس نے اسے اتنا بھیانک روپ دیا؟ کیوں ساری دنیا اس سے نفرت کرتی ہے دھتکارتی ہے ٹھوکریں مارتی ہے۔ وہ جب بھی شردھا سے بھگوان کی طرف جانے کی کوشش کرتا تو لوگوں کی چبھتی نظریں، اور پجاری کی دھتکار اسے وہیں روک دیتی۔ وہ مورتی کے آگے بیٹھا پھوٹ پھوٹ کر روتے جا رہا تھا۔ روتے روتے اس نے ماتھا زمین پر ٹیک دیا اور ہچکیاں لینے لگا کچھ دیر یوں ہی پڑے رہنے کے بعد وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اس کے ماتھے اور ناک پر مٹی لگ گئی منہ پہ

ہاتھ پھیر کر وہ مورتی کی طرف گھورتے ہوتے بولا۔
"ہو جی! ـــــ تو میرا بھگوان نہیں جی!! ـــــ مانس بنایا جی!! ـــــ یہ روپ دیا جی!!؟ ـــــ کیوں دیا ایسا روپ جی!!؟ ـــــ ہر کوئی تھوکتا جی!! ـــــ گالی دیتا جی!! ـــــ اور میری ماں!!؟ ـــــ ماں آں آں! کہاں ہے میری ماں جی!!؟ ـــــ کیوں پھینکا جی مجھے، جنم دے کر اس نے!!؟ ـــــ بول بول!! میرے دشمن بول! ـــــ بول ـــــ!! بول!!! ـــــ آں آں، ہوں اوں اوں!! ـــــ آں آں!!!؟" وہ روتا رہا اور دل کی بھڑاس نکالتا رہا پھر ایک دم سنبھل کر بولا۔

"پرسوں! ـــــ ایسے ہی ہنستا رہا جی تو!! ـــــ اس سالے پنڈے نے! ـــــ یہ! ـــــ یہ دیکھ، دیکھ میری آنکھیں جی! ـــــ یہ! ـــــ یہ میرا پھٹا ہوا ہونٹ! ـــــ یہ سوجا ہوا مونہہ، دیکھ، دیکھ جی! ـــــ اور کھوب ہنس!! کھش ہو جی!!"

پرسوں سویرے ہی، جانے کیوں وہ اداس تھا۔ حسب عادت اس نے مندر کا رخ کیا اور زینے پر جا بیٹھا۔ وہ دور سے ہی حسرت بھری نگاہوں سے کرشن جی کے مندر کی طرف دیکھتا رہا۔ دوپہر کے قریب جب سب لوگ چلے۔ تو پجاری نے گیان کو ڈانٹا اور اس سے جانے کے لیے کہا۔ اس نے پجاری کی طرف ہاتھ جوڑ دیئے۔ پجاری ناک چڑھا کر بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ لو سے بچنے کے لیے مندر میں رہنے والے دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے کمروں میں گھس کر سستانے لگے۔ مندر میں اب مکمل خاموشی تھی۔ وہ ایک ٹک دروازے کی طرف دیکھے جا رہا تھا جو پیتل کا بنا ہوا تھا۔ ادھر ادھر دیکھ کر وہ اچانک کھڑا ہو گیا۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی غیبی طاقت اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔ وہ تپتے ہوتے پتھروں کی سیڑھیوں پہ چڑھتا ہوا صاف و شفاف سنگ مرمر کے فرش پر چل کر دروازے تک جا پہنچا۔ اس نے پٹ کھول دیئے۔ سامنے کرشن جی ہاتھوں میں بانسری لیتے پھولوں کے ڈھیر میں کھڑے تھے۔ اسے یوں لگا، جیسے وہ مسکرا کر کہہ رہے ہوں

"گیان! ـــــ آگے چلے آؤ!! ـــــ میرے بھگت!!"

وہ سرشار ہو اٹھا، دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر وہ اپنی ترنگ میں بولا۔

"ہو جی! ـــــ بھگون!! ـــــ آ گیا جی گیان!!"

پجاری اپنے کمرے سے ہی چلایا "ادملیچھ! ـــــ کر دیا فرش گندہ!!؟"

بس قیامت آ گئی۔ اس کے تصور کا آئینہ کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔ پجاری کی ایک ٹھوکر اس کی آنکھ پر پڑی۔ دوسری ٹھوکر اس کے ہونٹ کو زخمی کر گئی۔ وہ بلبلا اٹھا اس کا سر چکرا گیا۔ کرشن جی بدستور مسکرا رہے تھے وہ چیخیں مارتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بھاگا اور لڑھکتا ہوا زمین پر آ گرا دوسرے لوگ بھی پجاری کے ساتھ کھڑے گندے فرش کو دیکھ کر برا سا مونہہ بنا رہے تھے وہ روتا چلاتا مندر سے باہر چلا آیا تھا۔

"کیا لگتا جی! ـــــ وہ پنڈا تمہارا!؟ ٹھیکیدار جی ـــــ دو دن بھوک کاٹی جی!! ـــــ تم کو کھبر دی جی!! ـــــ پھر بس کھراب کیا جی تمہارا!! ـــــ اس نے مارا!! ـــــ تم!! ـــــ تم ہنستا رہا جی!!" پھر وہ ایک دم تن کر بولا "اگر وہ ٹھیکیدار جی!! ـــــ تو روک لے گیان کو!! ـــــ گیان اب تم کو یہاں رکھے گا، اس گندی جگہ جی!! ـــــ روج اپنا گھناؤنا منھ دکھاؤں گا جی تم کو!! ـــــ دکھ سنتا گیان کا! تم کو گھٹن ہو جی!!؟ ـــــ ہوتی رہے!! ـــــ تم کو یہیں رہنا ہوگا جی!! ـــــ گیان کے پاس۔ اپنے دشمن کے پاس!!"

وہ ایک دم باہر نکل گیا پھر پلٹ کر آنسو پونچھ کر بولا۔

"سویرے سویرے! ـــــ جنگلی پھول چڑھایا کروں گا جی! ـــــ آ کر تو، تو میرا بھگون ہے جی!"

وہ پگڈنڈی پر چلتے ہوتے بولا "آؤ جی ـــــ موتی جی!!"

موتی جھاڑی سے نکل کر اس کے پیچھے ہو لیا دھوپ کمزور ہو چلی تھی۔ سائے اپنی حد تک دراز ہو چکے تھے۔ وہ آواز لگاتا ہوا شہر کی طرف جا رہا تھا، "ہو جی! ـــــ بابو جی!! ـــــ دو جی!! ـــــ پیسہ جی!!" ●

---

## بقیہ : من کہ ...

---

مزاحیہ :

خواجہ احمد عباس ۔ چلتے پھرتے چہرے۔ بیوی یا بیماری مہمان ۔ فلم بنانا کھیل نہیں ۔

(مذکورہ چھ افسانوی مجموعوں کو اساسی مجموعے کہا جا سکتا ہے۔ ان میں شامل افسانے، کچھ اور ناموں سے بھی کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کتابوں کو ضمنی مجموعے کہا جا سکتا ہے۔ ضمنی مجموعوں کی تعداد چار ہے :

۱ ڈرم کوٹ
۲۔ لمبی لڑکی
۳۔ جگنیا
۴۔ مہمان (اس مجموعے کی چار تحریریں، بعد ازاں مکتی بودھ میں شامل کی گئیں، جو مکتی بودھ کی فہرست میں نمبر ۔ ۸ ۔ ۹ اور ۱۰ کے تحت درج ہیں)

اعزازات :

۱۹۶۵ء : ساہتیہ اکادمی ایوارڈ
۱۹۷۲ء : پدم شری
۱۹۷۸ء : مودی غالب ایوارڈ
فلم فیئر اور دوسرے کئی ریاستی ایوارڈ ۔
۱۹۷۹ء : فالج کا حملہ بمقام بمبئی
دائیں آنکھ، دایاں ہاتھ اور دایاں پیر متاثر
۱۹۸۴ء : بیماری کا شدید حملہ
دو مرتبہ آپریشن
فی الحال خانہ نشین

پرویز یداللہ مہدی

# پڑوسی، پڑوسن اور وہ

ہم نے غلطی سے امریکی فلم LOVE THY NEIGHBOUR عرف "پڑوسی سے وہ کیجیے" دیکھ لی تھی بس تب ہی سے ہمارے دل میں پڑوسیوں کے لیے ایک بار پھر محبت اور خلوص کا تلاطم بپا ہوگیا۔ ورنہ اس سے پہلے صرف ایک بار یہ جذبہ پوری شدت کے ساتھ بیدار ہوا تھا لیکن اس کا جو حشر ہوا، ملاحظہ فرمایئے۔ موجودہ بستی میں سکونت اختیار کرنے سے پہلے ہم ایک کالونی میں رہتے تھے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کالونی کے مکان وضع قطع کے اعتبار سے اس قدر مماثلت رکھتے ہیں کہ ہر گھر پر اپنے گھر کا دھوکہ ہوتا ہے اور ہر گھر والی خواہ مخواہ اپنی معلوم ہوتی ہے بہرحال اس زمانے میں ہم ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ پڑوسیوں کی خوشی میں بھلے ہی شریک نہ ہوں لیکن ان کے غم بانٹنے میں پیش پیش رہیں، چنانچہ ایک روز جیسے ہی اپنے ایک پڑوسی مسٹر اے۔ کے۔ چندی والا کی بیوی کے انتقال کی خبر سنی، دوڑے دوڑے ان کے ہاں پہنچے اور دھیمے لہجے میں پرسہ دینا شروع کیا:۔ "مجھے یہ روح فرسا خبر سن کر بڑا افسوس ہوا مسٹر چندی والا کہ آپ کی چندی ——— میرا مطلب ہے بیوی اچانک اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئیں ———" ہم اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ مسٹر چندی والا حسرت بھرے لہجے میں ہماری بات کاٹ کر بولے:۔ "کاش آپ کی یہ بات سچ ہوتی ———" اب ہمارے گڑبڑانے کی باری تھی انہوں نے آگے انکشاف کیا:۔ "آپ رانگ نمبر ڈائیل کر رہے ہیں جناب، میں وہ خوش نصیب چندی والا نہیں، انتقال دراصل اے۔ کے چندی والا کی بیوی کا ہوا ہے اور میں بی۔ کے۔ چندی والا ہوں ———!"

وہ تو ہمارے نصیب اچھے تھے ورنہ سرنیم Sir Name کی یکسانیت کی وجہ سے پٹ گئے ہوتے، البتہ اس غلط فہمی کے نتیجے میں ہم نے قسم کھائی کہ آئندہ کبھی پڑوسیوں کے دکھ میں بھی شریک ہونے کی حماقت نہیں کریں گے ——— لیکن خدا بھلا کرے اس امریکی فلم کا جس نے ہمیں قسم توڑنے پر مجبور کردیا تاہم اس فلم میں پڑوسیوں سے میل جول بڑھانے کے جو سائینٹفک طریقے دکھائے گئے تھے انہیں اپنے یہاں عملی جامہ پہنانا اپنے جامے اور موم جامے، دونوں کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا کیونکہ مغربی ممالک میں پڑوسی سے محبت کرنے کے جو مواقع فراہم ہیں جو سہولتیں حاصل ہیں اپنے ہاں ان کا عشرِ عشیر بھی میسر نہیں، لیکن یہ جذبہ چونکہ بڑی شد و مد کے ساتھ بیدار ہوا تھا اور اسے دوبارہ سلانا بھی ناممکن نظر آتا تھا اس لیے ہم نے سب سے پہلے اس مسئلہ پر غور کیا کہ محبت کی ابتدا کس سے کی جائے، پڑوسی سے یا پڑوسن سے! اس نکتے پر پہنچ کر ہماری ہستی کے منارے ہل گئے کہ ہمارے معاشرے میں پڑوسن سے میل جول بڑھانا معیوب سمجھا جاتا ہے اور جن سرپھروں کے نام اس سلسلے میں سند کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ان کے بارے میں مشہور ہے کہ اس مہم کا آغاز ہی انہوں نے سر سے کفن باندھ کر کیا تھا۔ البتہ ان کفن پوش سرپھروں کے بھیانک انجام کو دیکھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سر سے کفن باندھنے کے لیے سر کی مضبوطی سے زیادہ دل گردے کی مضبوطی شرط ہے اور بدقسمتی سے ہم ان موخرالذکر اعضا کے معاملے میں پیدائش ہی سے عجیب و غریب امراض میں مبتلا ہیں۔ اب تک ہمارے دل و گردے کو اتنے پیوند لگ چکے ہیں کہ اب یہ بھی سائیکل کے اس خستہ ٹیوب کی طرح ناقابلِ استعمال ہو چکے ہیں جس کے 'پنکچروں' کی مسلسل اور متواتر مرمت نے اس حال کو پہنچا دیا ہو کہ اب اسے سائیکل کے پہیئے میں استعمال کرنے کے بجائے اس کے ٹکڑے پیوند کی شکل میں دوسرے ٹیوب میں جوڑے جاتے ہوں۔ لہٰذا اپنے خستہ اور شکستہ دل گردے کی حفاظت کے پیشِ نظر ہم نے اپنی فہرست سے 'پڑوسن' کو بیک جنبشِ قلم، قلم زد کردیا، البتہ پڑوسیوں کے معاملے میں ہم چونکہ دودھ کے جلے تھے اس لیے براہِ راست کسی پڑوسی کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے سے قبل اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا ضروری سمجھا، اس سلسلے میں ہماری نظرِ انتخاب محلے کے 'چھپرہ ہوٹل' کے باہر والے پر پڑی، جو تھا تو باہر والا، لیکن محلے کے ہر گھر کے اندر کی خبر رکھتا تھا۔ اس کا منہ کھلوانے کے لیے ہمیں اپنی جیب کا منہ اس قدر کھولنا پڑا کہ جیب اور دامن کے بیچ کا فاصلہ یکسر مٹ گیا باہر والے نے سب سے پہلے ہمارے قریب ترین پڑوسی ریٹائرڈ پروفیسر ب۔ خان صدر شعبۂ اخلاقیات کے بارے میں تفصیلی معلومات بہم پہنچائیں جو ہم مختصراً آپ کے

★ ۲۱۹۔ بہرام۔ باندرہ ایسٹ۔ بمبئی ۴۰۰۰۵۱

گوش گذار کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب کو محلّے کے شر پسند اصحاب 'پروصفر' کے نام سے پکارتے ہیں اور دیگر شرفا انہیں 'پورے صفر' کے لقب سے یاد کرتے ہیں، دوسری اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ موصوف اپنے گھر کی خواتین کے تعلق سے اس قدر شکی واقع ہوئے ہیں کہ جب بھی گھر کی دیوار پر، کبوتر کوا ، فاختہ یا اس قبیل کا کوئی پرندہ پر مارتا نظر آتا ہے جو پیغام رسانی کے فرائض انجام دینے میں تاریخی ریکارڈ رکھتا ہو تو موصوف فوراً مشکوک نظروں سے پہلے پرندے کو پھر گھر کی خواتین کو، پھر ہر دو کو اس وقت تک گھورتے رہتے ہیں جب تک کہ پرندہ یا گھر کی کوئی خاتون اڑن چھو نہیں ہو جاتی ـــــ معلومات کے پہلے ہی تھپڑ نے ہمیں خاصا دہلا دیا۔ باہر والے نے ہمارے اندر والے اور باہر والے دونوں کو پیلا پڑتا دیکھ کر ایک آنکھ دبا کر فرمایا :۔" کیوں بابوجی، سب خیریت ہے نا! کہیں پروصفر صاحب کی کسی لڑکی سے آنکھ تو نہیں لڑا بیٹھے!" کم بخت نے ایسے چٹخارے دار لہجے میں آنکھ لڑانے کی بات کہی جیسے اس کی نظر میں آنکھ لڑانے اور بلبل لڑانے میں کوئی فرق ہی نہ ہو، پھر دوسری آنکھ دبا کر مزید بولا :۔" جب تک سلامت ہیں ہم آپ کو کیا غم، آپ بس میرا خیال رکھیے بابوجی! میں پروصفر صاحب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر آپ کے دل کی بات ان کی لڑکی تک پہنچا دوں گا، مگر پہلے یہ بتائیے آپ کس چھوکری پر لٹو ہوئے ہیں، وہ جو بغیر لاؤڈ اسپیکر کے سن نہیں سکتی یا وہ جو بغیر چھوئے بغیر ٹٹولے عورت اور مرد میں تمیز نہیں کر سکتی ـــــ" معلومات کے دوسرے تھپڑ نے ہمیں چاروں شانے چت کر دیا اس سے پہلے کہ ہم کچھ کہتے، باہر والے نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے ہانک لگائی ـــــ" وہ دیکھیے بابوجی، پروصفر صاحب سڑک کے بازو والے گڑھے میں اُتر رہے ہیں ـــ!" اس عجیب و غریب اطلاع پر ہم لپک کر کھڑکی کے پاس پہنچے اور باہر جو دیکھا تو واقعی ایک مختصر سا گول مٹول شخص ٹیلی فون کیبل کے لیے کھودے گئے گڑھے میں اُتر رہا تھا، ہم نے حیرت سے پوچھا :۔" پروصفر صاحب اس گڑھے میں کس لیے اُتر رہے ہیں!" باہر والا رازدارانہ لہجے میں بولا ـــــ" بابوجی یہ تو روز ہی اس گڑھے میں چھپ کر اپنے گھر کی عورتوں کی جاسوسی کرتے ہیں کہ کون گھر کے سامنے سے گزرتا ہے، کیا کیا حرکتیں کرتا ہے اور جواب میں گھر کی عورتیں کیا جوابی کارروائی کرتی ہیں!"

یہ انکشاف ہماری معلومات کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔ ہم نے تو محض اس لیے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی کہ ان کی روشنی میں اگلا قدم اٹھا سکیں لیکن پہلے ہی پڑوسی کے بارے میں جو انکشافات ہوئے ان کے نتیجے میں بجائے روشنی کے گھور اندھیرا ہمارے ہاتھ لگا۔

اگلے دو دن تک ہم یہی سوچتے رہے کہ آیا معلومات کے اس اندھیرے ہی میں ٹھوکریں کھاتے رہیں یا کسی دوسرے پڑوسی کے بارے میں معلومات کا سورج آن کریں ان دو دنوں میں یہ بھی خیال آیا کہ ہو سکتا ہے باہر والے نے اپنی کسی ذاتی خصومت کی بنا پر پروصفر صاحب کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا ہو۔ اب رہی موصوف کی محکمۂ ٹیلی فون کے گڑھے میں اترنے والی حرکت تو ہو سکتا ہے ان کی کوئی قیمتی چیز گڑھے میں لڑھک گئی ہو جسے اُٹھانے کے لیے انہیں گڑھے میں اترنا پڑا ـــــ کیا آدمی صرف مرکر ہی گڑھے میں جاتا ہے؟

کافی غور و خوض کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ باہر والے کی فراہم کردہ معلومات پر اندھا دھند بھروسہ کرنے کے بجائے ہمیں خود پروصفر صاحب سے ملنا چاہیے چنانچہ بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق کے مصداق ہم آتشِ عشقِ پڑوسی میں کود پڑے ـــــ سب سے پہلے پروصفر صاحب کو سرِ راہ پکڑنے کی کوشش کی، وہ بھی سلام کی ڈور سے لیکن موصوف نے ہر بار رعونت کی قینچی سے اس ڈور کو کاٹ دیا، ہم نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری جب بھی سامنا ہوتا تن ڈور باندھ کر سلام کی پتنگ ہوا میں چھوڑ دیتے۔ آخر ایک روز ہمارے سلام کے ٹھمکوں اور جھٹکوں نے اپنا اثر دکھایا ـــــ موصوف ذرا سا پگھلے، یعنی ہمارے اتنا راغب سلام کے جواب میں کنایاتی وعلیکم السّلام سے نوازا اور اس پہلی پہلی کامیابی پر ہم نے خود اپنی پیٹھ ٹھونکی اور اس طرح اپنی ہمّت بندھائی ؎

راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار سلاموں میں

اور پھر واقعی دو چار سلاموں کے بعد موصوف مثلِ موم بتی کے پگھل گئے۔ یوں لگا جیسے آتشِ نمرود سچ مچ گل گلزار ہو گئی۔ موصوف ہمیں سیدھے ٹیلی فون کیبل کے گڑھے میں لے گئے۔ اندر پہنچ کر جو نقشہ دیکھا تو ہماری آنکھوں کا نقشہ بدل کر رہ گیا۔ موصوف نے گڑھے کو دیوان خانہ بنا رکھا تھا، ایک طرف دو عدد دبلی ٹانگوں والی کرسیاں اور چھوٹی سی تپائی پر کچھ کتابیں دھری تھیں تو دوسری طرف ایک عدد صراحی معہ گلاس کے رکھی ہوئی تھی۔

پروصفر صاحب نے ایک عدد کرسی خود سنبھالی اور دوسری ہماری خدمت میں پیش کی اور پھر پہلا سوال داغا ـــــ" جناب کا اسمِ گرامی ؟"

عرض کیا ـــــ" خاکسار کو شیخ چاند حیا بے حیا کہتے ہیں"

چہک کر بولے ـــــ" حیا بے حیا دونوں ایک ساتھ یعنی ڈبل ایکٹنگ ؟"

ہم نے وضاحت کی ـــــ" اصل میں یہ دونوں میرے تخلص ہیں قبلہ! سنجیدہ شاعری میں بے حیا اور مزاحیہ شاعری میں حیا ـــ!"

منہ بنا کر فرمایا :۔" شاعری کے مرغ کی چونچ سے سورج کے گولے کو کھینچنے کی تو کوشش نہیں کرتے!"

توبہ استغفار کرتے ہوئے جواب دیا :۔" جی بالکل نہیں کرتا"

تبسّم فرماتے ہوئے بولے " پھر ضرور ہتھوڑا اور درانتی چھاپ شاعری کر کے ایک طرف ہتھوڑا چلا کر مزدوروں کو اُلّو بناتے ہو تو دوسری طرف درانتی گھما کر سرمایہ داروں سے اپنا اُلّو سیدھا کرواتے ہو ـــ!"

عرض کیا " جی نہیں، میں شاعری کو کسی 'ازم'

کا پروپیگنڈہ، کسی تحریک کا ایجنڈا' اور کسی سیاسی پارٹی کا جھنڈا نہیں سمجھتا ــــ" اس جواب پر بچّوں کی طرح تالیاں بجانے لگے پھر پوچھا ۔

"شاعری میں فارم کے قائل ہو ــــ!"

ٹھوس لہجے میں جواب دیا ــــ" بالکل قائل ہوں بلکہ شاعری ہو یا زندگی دونوں میں ایک ہی فارم کا قائل ہوں۔"

دریافت فرمایا ــــ" کون سا فارم "

عرض کیا ــــ "پولٹری فارم"

چہک کر بولے ــــ" بہت اچھے، اب یہ بتاؤ، کیا ابھی تک کنوارے ہو؟"

کہا :- " جی اس لمحے تک تو ہوں۔"

اچانک مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے استفسار فرمایا ــــ" گھر کی دیواروں کے اُدھیڑے ہوئے پلستر کو چھپانے کے لیے کیلنڈر لگانے کے قائل ہو؟"

جواباً اثبات میں اقرار کیا تو مزید دریافت کیا" عموماً کس قسم کے کیلنڈر پسند کرتے ہو! قدرتی نظاروں والے یا وہ جن میں حسین دوشیزاؤں کو فطری پیراہن میں دکھایا جاتا ہے!"

عرض کیا :-" میں دراصل کسی بھی قسم کے کیلنڈر ٹانگنے کا قائل نہیں ہوں۔"

پوچھا ــــ" پھر تاریخ کس طرح معلوم کرتے ہو؟"

جواب دیا :-"جن دوستوں کے ہاں کیلنڈر پائے جاتے ہیں ان کے ہاں جاکر دیکھ لیتا ہوں۔"

شریر لہجے میں فرمایا ــــ"کیا دیکھ لیتے ہو۔ تاریخ یا کیلنڈر سے جھانکتی ہوئی حسینہ کو!"

جی . . ی . . وہ ــــ" ہم بُری طرح گڑ بڑا گئے۔ ہماری گڑبڑاہٹ کو نظرانداز کرکے اگلا سوال اچھالا :-" کبھی محبت میں چوٹ کھائی ہے؟"

سر سہلاکر جواب دیا :-" جی نہیں کبڈی میں چوٹ کھائی ہے۔"

"بہت خوب! ویسے محبّت کے کھیل کو دیگر کھیلوں سے الگ سمجھتے ہو؟"

"جی نہیں ــــ" ہم نے ٹھوس لہجے میں کہنا شروع کیا :-" بلکہ میری تو یہ عین خواہش ہے کہ کھیلوں کے اولمپک مقابلوں کی طرح محبّت کے بھی اولمپک مقابلے منعقد کیے جائیں۔"

پوچھا ــــ" کیا یہ مقابلے پُرلطف ثابت ہو سکتے ہیں؟"

عرض کیا :-" بالکل ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر تصوّر کیجیے کہ محبّت کے اولمپک مقابلے میں ایک طرف سے چینی محبوبہ، یہ کہتے ہوئے میدان میں اترتی ہے۔" چوں چوں چیاؤں میاؤں چوں چوں چاخ" تو دوسری طرف سے ایرانی محبوب یہ کہتے ہوئے میدانِ محبّت میں کودتا ہے۔" زبانِ یارِ من چینی، ومن چینی نمی چوں چوں، نمی چوں چوں۔"

متحیّر لہجے میں فرمایا :-" تعجب ہے محبّت کے بارے میں ایک طرف تو اس قدر دور کی سوچتے ہو اور دوسری طرف ابھی تک کنوارے ہو۔ کہیں کوئی سینہ راز والی پوشیدہ بیماری تو نہیں!"

"جی . ی . ی . بالکل نہیں" ہم ٹپٹا کر رہ گئے۔

" تو پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے!"

عرض کیا :-" فی الحال ارادہ نہیں ہے۔"

"کبھی تو کروگے!"

"جی ضرور کروں گا!"

مجھے ضرور یاد رکھنا۔"

"جی ـ آپ کو . . . یعنی کہ ــــ ہم مشکوک نظروں سے انہیں دیکھنے لگے تو گڑبڑا کر بولے :-" لاحول ولا قوۃ" میرا وہ مطلب نہیں بلکہ میرا اشارہ اپنی لڑکی کی طرف ہے، دو دو بیاہنے لائق بیٹھی ہیں۔"

"آپ کا اشارہ کون سی لڑکی کی طرف ہے" ہم نے بے ساختگی سے پوچھا :" وہ جو اونچا سنتی ہے یا وہ جو بغیر چھوئے بغیر ٹوٹے . . . ." ہمارا فقرہ ادھورا رہ گیا کیونکہ موصوف نے بُری طرح چلّانا شروع کر دیا :- "نامعقول پاجی۔ بدمعاش اٹھو یہاں سے نکلو باہر . . . . پولیس . . . . پولیس۔"

اس چیخ پکار اور پولیس کی للکار پر ہم نے جو گڑبڑا کر باہر نکلنے کی کوشش کی تو پہلے دونوں کرسیوں سے الجھے پھر صراحی اور گلاس سے ٹکرائے پھر پروفیسر صاحب کو رگیدتے ہوئے بمشکل تمام اس گڑھے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے اور جب کھلی فضا میں دوبارہ سانس لینا میسّر ہوا تو جی چاہا کہ چلا چلا کر ساری خدائی سے کہیں۔ لوگو! تم نے چاند کی سرزمین پر قدم رکھ کر آنے والے خلا بازوں کو دیکھا ہوگا لیکن مجھے دیکھو جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو کر میں ابھی ابھی عذابِ قبر سے گذر کر زندہ اور صحیح سلامت قبر سے باہر آیا ہوں!۔

عذابِ قبر سے ملتے جلتے اس جھٹکے نے اگرچہ آتشِ عشقِ پڑوسی پر تھوڑی سی اوس ضرور ڈال دی تھی پھر بھی ہم نے سوچا کیا ضروری ہے کہ ہر پڑوسی پروفیسر صاحب کی طرح عجوبۂ روزگار ہو، چنانچہ آخری کوشش کا بیڑہ اٹھایا اور کسی بھی قسم کی معلومات حاصل کیے بغیر ایک شام اس پڑوسی کے درِ دولت پر جا پہنچے جس کے دروازے پر لگی نیم پلیٹ نے بارہا متوجہ کیا تھا۔ سیاہ رنگ کی تختی پر اُجلے حروف میں لکھا تھا ــــ "آئی۔ ایم۔ کانچ والا" نام کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ہم نے بڑی آہستگی سے اطلاعی گھنٹی بجائی کہ انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو۔

کچھ توقف کے بعد دروازہ کھلا اور سچ مچ ایک عدد آبگینہ نمودار ہوا، نازک مہین، چھوئی موئی سا بلّور کے پتلے کی طرح یوں لگا جیسے خالقِ کون و مکان نے ازراہِ مذاق زنانے کی چیز مردانے میں بھیج دی ہے۔ ہم نے آبگینے کو گھورتے ہوئے پوچھا :" مسٹر کانچ والا ہیں؟"

" بالکل ہیں بلکہ اس وقت آپ کے رو برو موجود ہیں" آبگینے نے شرماتے ہوئے فرمایا، گویا مسٹر کانچ والا سچ مچ اسم بامسمّیٰ ثابت ہوئے، ہم نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو فوراً بولے :-" میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں 'چھپرہ ہوٹل' کے باہر والے سے آپ کے بارے میں بہت کچھ سُن چکا ہوں۔ میں تو خود آپ سے ملنے کا بے حد مشتاق تھا، اچھا ہوا آپ خود چلے آئے ــــ آیئے

تشریف لائیے!"

ہم پر حیرتوں کے بے شمار پہاڑ توڑکر کانچ والا ہمیں اندر لے گئے، گھر کے اندر کی خاموشی صاف بتا رہی تھی کہ موصوف ایک دم بے پال و پُرآدمی ہیں سب سے پہلے موصوف نے اپنے "صاحبِ فریج" ہونے کا رعب ہم پر ڈالا یعنی ٹھنڈے مشروب سے ہماری تواضع کی۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیں۔ البتہ جب اس گفتگو کا دھارا سیاست، ادب، فلم وغیرہ سے ہوتا ہوا ہماری مجرّد زندگی کی چٹان سے ٹکرایا اور ہم نے گھبراکر اجازت طلب کی تو آبگینے نے بڑی لگاوٹ سے اٹھلاکر فرمایا:۔" بیٹھیے نا ابھی ابھی تو آپ آئے ہیں۔"

اتنا کہہ کر بدلے ہوئے تیور کے ساتھ ہماری طرف کھسکتے ہوئے آگے بولے:۔" دورانِ گفتگو جو لوگ گھڑی گھڑی، گھڑی کی طرف دیکھتے ہیں وہ مجھے گھڑی بھر کو بھی اچھے نہیں لگتے اور آپ قسم سے پہلی ہی گھڑی میں سجھے اچھے لگے۔"

کھسکتے ہوئے وہ ہمارے اس قدر قریب ہوگئے تھے کہ ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ غالباً وہ بھی ہماری اس غیر کیفیت کو بھانپ چکے تھے لہٰذا پینترا بدل بولے:۔" آیئے پہیلیاں بوجھیں۔ بتایئے وہ کون سی کلی ہے جو کبھی پھول نہیں بنتی؟"

جواب میں ہم انہیں گھورتے رہے کیونکہ وہ خود ایک پہیلی نظر آرہے تھے۔ ہماری خاموشی پر مسکراکر بولے:۔" اتنی آسان پہیلی کا بوجھ نہیں معلوم آپ کو! جناب وہ کلی جو کبھی پھول نہیں بنتی اکثر گھر کی دیواروں پر نظر آتی ہے یعنی چھپکلی۔" اتنا کہہ کر خود ہی ہنسنے لگے اور ان کی ہنسی کی گونج پر ہمیں کہیں دور کانچ کے چٹخنے کا گمان ہوا۔

جب جی بھر کر ہنس چکے تو اگلی پہیلی داغی:۔ اب یہ پہیلی بوجھیے، بتایئے وہ کون سی چیز ہے جو لڑکپن میں مونث ہوتی ہے مگر جوان ہوکر مذکر بن جاتی ہے۔" ہم بھلا ان کی عجیب الخلقت پہیلیاں کس طرح بوجھتے، دماغ ہی ٹھکانے پر نہیں تھا چنانچہ وہ خود بولے:۔" یہ ذرا مشکل پہیلی ہے، میری بنائی ہوئی ہے نا، وہ چیز جو مونث سے مذکر میں تبدیل ہوجاتی ہے اصل میں پھول ہے، کلی جب تک کھلتی نہیں مونث ہوتی ہے اور جب کھل جاتی ہے تو پھول کہلاتی ہے اور پھول ظاہر ہے کہ مذکر ہے۔ موصوف کی ان عجیب و غریب پہیلیوں اور اس سے زیادہ ان کے عجیب و غریب رویئے نے ہمیں حیرت زدہ کردیا تھا۔ ہماری حیرت کو نظرانداز کرتے ہوئے مزید فرمایا:۔" اب آخری پہیلی، ایک چیز ایسی ہے جو تھوڑی اِدھر ہے تھوڑی اُدھر ہے بتایئے باقی کدھر ہے!" ہم اس وقت تک لاوے کی طرح پک چکے تھے اچانک پھٹ پڑے:۔" وہ بیچ ادھر، والی چیز آپ ہیں، آپ ہیں اور صرف آپ۔" ہماری اس کراری چوٹ پر بجائے بگڑنے کے بچّوں کی طرح کلکاری مارکر بولے:۔" افوہ کتنے ہشیار ہیں آپ، کتنا جلدی پہچان گئے۔" اور پھر اس سے پہلے کہ یہ آبگینہ خود کو ٹھیس پہنچانے کے ارادے سے براہِ راست ہم سے ٹکراتا، وہاں سے جو بھاگے تو پھر بھاگتے چلے گئے اور پتہ نہیں کب تک بھاگتے رہتے کہ ایک موڑ پر اچانک کسی سے بُری طرح ٹکرائے اور پھر اس کو ساتھ لیے ہوئے ہی ڈھیر ہوگئے ـــــ جب حواس درست ہوئے تو دیکھا کہ ہم ایک ساتھ دو عدد راہ گیروں سے ٹکرائے تھے اور انہیں ساتھ لئے ہوئے محکمۂ ٹیلی فون کے کیبل والے گڑھے میں پہنچ گئے تھے اور سوئے اتفاق کہ وہ دونوں راہ گیر کوئی اور نہیں بلکہ ایک تو پروفیسر صاحب تھے اور دوسرا چھیرہ ہوٹل کا باہر والا تھا ـــــ پروفیسر صاحب شکی لہجے میں غصّہ سے پھٹ پڑے:۔" میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ تمہارا رجحان کس طرف ہے، مرد آدمی کا کافی عمر تک مجرّد رہنا اسے اکثر غلط لتوں میں مبتلا کردیتا ہے۔

اس روز ہم کس طرح اس گڑھے سے نکلے اور پھر کیسے گھر پہنچے اسے جانے دیجیے البتہ اس دن کے بعد سے ہم نے یہ عہد کرلیا ہے کہ اب کبھی پڑوسیوں سے میل ملاپ بڑھانے کی حماقت نہیں کریں گے تاوقتیکہ اس لائق پڑوسی نہیں پیدا ہوجاتے اور پڑوسی و پڑوسن کے درمیان پائی جانے والی 'وہ' قسم کی مخلوق پر ایک بار پھر آسمان سے پتھروں کی بارش نہیں ہوجاتی!!

★ ویدراہی / ● یش سروج

# کل تارا ڈوب جانا ہے

موڑ مڑتے ہی سامنے رام بن تھا۔ اندھیرا بڑا گہرا تھا۔ سڑک کنارے کی دو دُکانوں کے بند دروازوں سے جھانک رہی دھیمی دھیمی روشنی اور قریب ہی بہتے دریا کی کبھی نہ ختم ہونے والی شاں شاں کی آواز کے سوا زندگی کا احساس دلانے والی وہاں اور کوئی چیز نہ تھی۔

چُنّی نے تترّو کے ڈھابے کے سامنے ٹرک روک دیا۔ ٹرک کی آواز رکی تو دریا کا شور اور بھی بڑھ گیا۔ گاڑی کے آگے کی بتّیاں بجھاتے ہی چُنّی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی بہت بڑے اندھیرے کنوئیں میں ڈوب گیا ہو۔ اس نے گھبرا کر ہارن بجایا۔ تھوڑی دیر بعد ڈھابے کا دروازہ کھُلا۔

"کون ہے ؟" تترّو نے کھلے دروازے سے جھانک کر سوال کیا۔

"میں ہوں تترّو !" چُنّی نے جواب دیا اور گلوبند کو سر سے پیٹتا ہوا ٹرک سے باہر نکل آیا۔

"آؤ۔ آؤ۔ چُنّی شاہ ! کہو کیا حال ہے ؟"

"ٹھیک ہے" کہتے ہوئے چُنّی دوکان کے اندر داخل ہو گیا۔ مارے سردی کے وہ بری طرح کپکپا رہا تھا۔

دوکان میں دھوئیں سے کالی ہوئی لالٹین جل رہی تھی۔ دھندلی روشنی اور چاروں طرف دھوئیں سے بھری بدبو نے دوکان کی فضا میں گرماہٹ گھول رکھی تھی۔

"جلدی سے پوا لے آ تترو۔ مجھے آگے جانا ہے۔"

"رات یہاں کیوں نہیں ٹھہر جاتے ؟ اتنی ٹھنڈ میں رات کو گاڑی چلانے کا کیا فائدہ ؟"

"دن نکلنے سے پہلے مجھے جموّں پہنچنا ہے۔ مالکوں کا حکم ہے۔"

"دیکھتا ہوں آج تمہارے ساتھ کوئی لڑکا بھی نہیں ؟" تترو نے پوا اور گلاس چنّی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"آج ہی بیمار پڑ گیا سالا۔ سرکاری اسپتال میں داخل کرا آیا ہوں" کہتے ہوئے چُنّی نے آدھا پوا ایک ہی سانس میں ختم کر دیا۔ گلے سے پیٹ تک پگھلی ہوئی آگ کی دھار تیزی سے اتر گئی "بھئی ! کچھ کھانے کے لیے ہو تو لے آ تترو۔"

تترو جب تک گوشت کی پلیٹ اور تین آدھے جلے ہوئے پھلکے لے کر آیا تب تک چُنّی پورا پوا ڈھال چکا تھا۔

"تم نے سچ ہی دن نکلنے تک جموّں پہنچنا ہے چُنّی شاہ ؟"

"تو کیا جھوٹ کہہ رہا ہوں ؟ تترو اگر ہم نہیں پہنچیں گے تو اور کون پہنچے گا ؟" چنّی نے اپنی چھاتی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"اور اگر پتنی ٹاپ میں برف ہوئی ؟"

"تو ہم برف چیر کر گذر جائیں گے۔ مالکوں کا حکم ہے۔ پیچھے بھی ہم پیر پر برف چیرتے ہوئے آئے ہیں۔ دو دن سے کوئی گاڑی اس پار نہیں آسکی ہے۔ لیکن ہم خالی ٹرک لے کر اندھیرے اور سردی میں ہی چلے آئے ہیں۔ مالکوں کا حکم جو ہے۔"

"میری ایک بنتی ہے چُنّی شاہ۔ میرے لڑکے کو ساتھ لے جاؤ۔ کل دوپہر تک اس کا بشناہ پہنچنا ضروری ہے۔ اسے اپنی بیوی کو لانا ہے۔ کل نہیں لائے گا تو پرسوں تارا ڈوب جائے گا۔ ہم کل سارا دن انتظار کرتے رہے لیکن کوئی بس ہی نہیں آئی۔ اگر تم اسے لے جاؤ تو وہ اپنی بیوی کو لے آئے۔"

"ٹھیک ہے۔ بھیج دو۔ مجھے کون سا اسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جانا ہے لیکن ذرا جلدی سے گاڑی میں بٹھا دو اسے۔ زیادہ وقت نہیں ہے۔" چنّی نے سگریٹ سلگا لیا اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔

متّرو دو دو پتّو اوڑھے گہری نیند سویا ہوا تھا۔ تترّو نے جب اسے خوب جھنجھوڑا تب کہیں اس کی نیند ٹوٹی "کیا ہے باپو ؟"

"اُٹھ بے جلدی کر۔"

"اتنی ٹھنڈ میں کیوں اٹھا رہے ہو باپو ؟" متّرو نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا

"پیر پار کر کے پہلا ٹرک آیا ہے۔ میں نے اسے روک رکھا ہے۔ اگر تجھے بشناہ پہنچنا ہے تو جلدی سے

---

★ بی۔ ۳۵ سرواتم ہاؤسنگ سوسائٹی، ارلا برج، اندھیری ویسٹ، بمبئی ۵۸ ۴۰۰۰

● ۱۳/۴، اولڈ راجندر نگر، نئی دہلی ۶۰ ۱۱۰۰

اٹھ کر ٹرک میں بیٹھ جا۔ اسے صبح جموں پہنچنا ہے۔"

بشناہ کا نام سنتے ہی متّرو تڑ دور پھینک کر ایسے اٹھ کھڑا ہوا جیسے بھونچال آیا ہو۔ "اتنے قہر کے جاڑے میں کون سا ٹرک جموں جا رہا ہے؟"

"زیادہ پوچھ تاچھ مت کر۔ جلدی جا کر ٹرک میں بیٹھ جا۔"

تھوڑی دیر کے بعد ٹرک رام بن سے چل پڑا۔

ایک تو نشے کا خمار، دوسرا جیب میں پڑے ہوئے پوّے کی گرمی۔ چُنّی کے پیر کا دباؤ ایکسیلیٹر پر بڑھتا جا رہا تھا۔ آدھی نیند میں ہی اٹھا دیا گیا متّرو ابھی بھی اس بات پر یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ سچ مچ ہی بشناہ جا رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی آنکھیں مل رہا تھا۔ اندھیرے میں ہی اس پر ایک لفظ ڈالتے ہوئے چُنّی بولا: "متّرو ولد تتّرو! بھئی کوئی بات کر۔ سفر ویسے ہی بہت لمبا ہے۔"

تتّرو کی حالت ٹھٹھرے ہوئے چوزے کی طرح ہو رہی تھی۔ اس نے لوئی کو اپنے گرد اور بھی لپیٹتے ہوئے کہا: "استاد جی! جب یہاں ہی اتنی ٹھنڈ ہے تو پتنی کا کیا حال ہوگا، ذرا سوچو تو؟!"

"سوچنا کام سودائی کا۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ ہمیں دن نکلنے سے پہلے جموں پہنچنا ہے۔ مالکوں کا حکم ہے۔" کہتے کہتے چُنّی کی سوچ کی سوئی مالکوں کے حکم کے ریکارڈ پر اٹک گئی اور دنیا جہان کی یاد اسے بھول گئی۔ اب اس کی نظریں سامنے سڑک کی ہر اس چیز پر پڑ رہی تھیں جو ہیڈ لائٹ کی روشنی میں آ جاتی تھی۔ اب اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ اور ایکسیلیٹر پر اس کا پیر مشین کی طرح کام کر رہے تھے۔

جیب میں سے سگریٹ کی ڈبی نکال کر اس نے ایک سگریٹ سلگالی۔

"استاد جی!" متّرو نے کچھ سردی کی وجہ سے اور کچھ ڈر کی وجہ سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: "گاڑی ذرا آہستہ چلاؤ۔ بڑے پیچ دار راستے ہیں۔ آپ نے سنا نہیں، 'گڈی بلیں بلیں، ان گلیں گلیں' (گاڑی دھیرے چلانی چاہیے اور عورت کو باتوں سے رام کرنا چاہیے)۔"

"واہ بھئی واہ! متّرو ولد تتّرو۔ کیا بات کو گھمایا ہے جیسے ہمیں خبر ہی نہیں کہ اصل مثل ہے، ڈھک بلیں بلیں (چڑھائی دھیرے دھیرے)۔ ٹھیک ہے یا غلط؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں استاد جی۔ لیکن میری مانو تو گاڑی آہستہ ہی چلاؤ۔ ہاتھ جوڑتا ہوں۔ دل بُری طرح دھڑک رہا ہے۔"

"متّرو ولد تتّرو، اگر میں تمہارے دل کی دھک دھک سنتا رہا تو دن نکلنے سے پہلے جموں پہنچ چکا جانا نہیں مالکوں کا حکم ہے۔"

تھوڑی دیر دونوں خاموش رہے۔ پھر چُنّی نے ہی سوال کیا: "کیوں بے متّرو ولد تتّرو، تو نے شادی......"

"ہماری کیا پوچھتے ہو استاد جی۔ ہم تو کسی بدنصیب گھڑی میں پیدا ہوئے تھے۔ پہلے تو ہماری کہیں بات ہی نہیں بنتی تھی۔ قسمت میں ڈھابے کے تندور پر بیٹھ کر سوا روٹیاں سینکنے کے اور کچھ نہیں لکھا تھا۔ ہاں کبھی کبھی آنکھیں ضرور سینک لیتا تھا۔ باپو نے بہت کوشش کی۔ کئی تیر تُکّے مارے لیکن کوئی سلسلہ ہی نہیں جڑا۔ آخر بڑی مشکل سے گوٹ فٹ ہوئی اور ہمارا پارا اتارا ہوا۔ لیکن کیا کہوں کیسے ناؤ سنبھلتے ہی سیلاب آ گیا۔ بس یہی سمجھ لو آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گیا۔ ابھی گونا بھی نہیں ہوا تھا کہ سسر بھگوان کو پیارا ہو گیا۔ بیوی ماتم منانے بیٹھ گئی اور میں تندور میں پڑی روٹی کی طرح جلتا رہا۔ دو مہینے بعد اسے لینے جانا تھا کہ چاروں طرف پالا پڑ گیا۔ جیسے میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ دو دن تک کسی گاڑی کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔ استاد جی سچ کہتا ہوں آپ نے سو سال جینا ہے مجھے وہاں پہنچا کر۔ اگر میں کل وہاں نہیں پہنچا تو پرسوں تارا ڈوب جانا ہے اور ساتھ ہی ہمارا بھی بو بو رام ہو جانا ہے۔"

متّرو بولتا بھی جا رہا تھا اور ٹھنڈ کی وجہ سے لوئی کو اپنے گرد کستا بھی جا رہا تھا۔ چُنّی اس کی باتوں کا مزہ لیتا گاڑی کو تیز اور تیز چلا رہا تھا۔ پیڑے کی پستی پار کرنے کے بعد ٹرک اب بٹوت کے قریب پہنچ رہا تھا۔

"مارے گئے!" اچانک ہی چُنّی کے مُنہ سے نکلا

"کیا ہوا استاد جی!" متّرو نے لوئی میں سے سر باہر نکالا۔

"بوندیں گرنے لگیں۔"

"تھوڑا ٹھہر جاؤ نا گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے۔"

"کوئی عقل کی بات کر متّرو ولد تتّرو۔ اگر ان بوندوں سے ڈر کر میں گاڑی کھڑی کر دوں تو جموں کون پہنچے گا تیرا باپ؟"

چنّی کی بات سن کر متّرو بری طرح سہم گیا۔ ناراض ہو کر استاد جی کہیں اسے گاڑی سے نیچے ہی نہ اتار دیں، اس بات سے ڈرتے ہوئے اس نے خاموش رہنے میں ہی بھلائی سمجھی

اُدھر چُنّی کو باہر کی چیزیں اور بھی کم نظر آنے لگی تھیں۔ دھیرے دھیرے بارش کی بوندیں برف کے گالے بنتی جا رہی تھیں

لوئی میں لپٹا بیٹھا متّرو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی چُنّی کو تو کبھی ہیڈ لائٹ کی روشنی میں گرتے برف کے گالوں کو دیکھتا اور خوف سے آنکھیں بند کر لیتا۔

"استاد جی! بٹوت آگیا کیا؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" چُنّی نے سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے ٹرک کی اسپیڈ کچھ اور بڑھا دی۔ وہ چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے پتنی ٹاپ پار ہو جائے "اگر زیادہ برف گری تو اوپر جا کر رُکنا پڑ سکتا ہے"۔ وہ سوچ رہا تھا۔

ابھی ٹرک ڈاک بنگلے کے پاس ہی پہنچا تھا کہ چنّی کو سڑک پر عجیب سی روشنی دکھائی دی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے پھر غور سے دیکھنے پر اس نے جانا کہ کوئی ٹارچ کی روشنی اس کی طرف ڈال رہا تھا۔ کچھ اور قریب جانے پر اسے یہ دیکھنے میں دیر نہ لگی کہ دو تین سپاہی اسے رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ جھٹ ہی بریک لگا کر اس نے گاڑی روکی لیکن آگے کی لائٹ بند نہیں کی۔

متّرو نے بھی لوئی میں سے منہ باہر نکالا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن لائٹوں کی روشنی میں اسے سوائے برف کے گالوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیا۔

چھنی ٹرک سے باہر کود گیا۔ جو سپاہی ٹارچ پکڑے
ہوئے تھا آگے بڑھا اور پھر اس نے چھنی سے پوچھا۔
"اس وقت کہاں جا رہا ہے ؟"
"جموں" چھنی نے بتایا " مجھے دن نکلنے سے
پہلے وہاں پہنچنا ہے۔ مالکوں کا حکم ہے "
"پیچھے کیا لاد رکھا ہے ؟"
"کچھ نہیں"
"ٹھیک ہے۔ ہم بھی تیرے ساتھ چلیں گے "
"چلو۔ بیٹھ جاؤ " چھنی نے بے رخی سے کہا۔
"ٹھہرو۔ ڈاک بنگلے سے ایک لاش لانی ہے"
چھنی کے نشے کی پینگ ٹوٹ گئی سپاہیوں کے
آگے کچھ بول نہیں سکا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ مرنے
والا کون ہے ؟ وہ کیسے مرا ؟ اس کی لاش اسی وقت
لے جانا کیوں ضروری ہے ؟ لیکن وہ کچھ نہیں پوچھ سکا
دو سپاہی ڈاک بنگلے کی طرف چلے گئے۔ تیسرا
وہاں ہی کھڑا رہا۔
بارش کی چھوٹی چھوٹی بوندوں سی برف گر رہی تھی
سگریٹ سلگا کر چھنی ٹرک کے پاس کھڑا ہو گیا۔
اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے ؟ ہو سکتا
ہے کہ اس کے نہ کرنے پر سپاہی اسے ابھی اندر کر دیں
اور آپ ہی ٹرک لے کر چل دیں۔ چھنی نے سوچا اور
پھر سپاہیوں پر دل ہی دل میں ناراض ہوتا ٹرک
میں اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی کی اگلی
لائٹیں بھی بجھا دیں۔
متّرو نے دھیرے سے پوچھا " کیا ہوا استاجی ؟"
"ٹرک میں مردہ ڈال کر بیٹھنا ہو گا"
"مردہ ؟! متّرو ڈر سے کانپ اٹھا۔ کس کا مردہ
استاجی ؟"
"تیرے پیدا کرنے والوں کا" چھنی نے متّرو کو
ڈانٹ دیا۔
متّرو چپ تو ہو گیا لیکن دل کی پریشانی نے اس
کے گرد لوئی کی لپیٹ ڈھیلی کر دی۔ چھنی کے دل میں
بھی اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ وہ ٹرک سے نیچے کود گیا اور
پھر سپاہی کے پاس جا کر بولا " بھائی جی، کون صاحب
ہیں جن کا کال ہوا ہے ؟"
"تھانیدار سمیال صاحب۔ کل ہی ایک معاملے کی
تفتیش کرنے آئے تھے۔ اچھے بھلے تھے۔ ابھی ایک گھنٹے
پہلے تو ہمارے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھائی تھی انھوں نے پتہ
نہیں کیا ہوا اچانک۔ بیٹھے بیٹھے ہی لڑھک گئے لگتا
ہے ہارٹ فیل ہو گیا"
"بے چارے! میں نے کئی بار دیکھا تھا ان کو"
چھنی کے منہ سے یہ بول کوئی اوپر کے من سے نہیں نکلے
تھے۔ اس نے سچ ہی کئی بار سمیال صاحب کو دیکھا تھا۔
اچھے جوان تھے، دوہرے بدن کے۔
"بھائی جی ان کے گھر والوں کو پتہ دے دیا گیا ؟"
"جموں تھانے کو فون کر دیا ہے ہمارے پہنچنے سے
پہلے گھر والوں کو پتہ چل ہی جائے گا"
"لاش کے ساتھ آپ میں سے کوئی جا رہا ہے کیا؟"
"دو سپاہیوں کا ساتھ جانا ضروری ہے "
"لیکن میرے ساتھ ایک سواری بیٹھی ہوئی ہے"
"یہ نہیں ہو سکتا۔ سواری کو یہاں ہی اتارنا ہو گا"
اسی وقت کچھ آہٹ ہوئی تو چھنی نے اوپر ڈاک
بنگلے کی طرف دیکھا۔ چار آدمی کھاٹ اٹھائے سمیال
صاحب کی لاش لا رہے تھے۔ ایک سپاہی ٹارچ جلائے
راستہ بتاتا آگے آگے آ رہا تھا۔ سگریٹ سلگائے
ہوئے چھنی ٹرک کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے
ایک لمبا کش لے کر متّرو کی طرف کا دروازہ کھول دیا
اور کہا۔ "نیچے اتر آ متّرو، آج تجھے یہاں ہی رکنا ہو گا"
"یہ کیا کہہ رہے استاجی ؟"
"لاش کے ساتھ دو سپاہیوں کا جانا ضروری ہے
تو کل کوئی اور گاڑی پکڑ کر آ جانا"
"کیوں مجھے جیتے جی مار رہے ہو استاجی ؟ میں
بشناہ نہ پہنچا تو میری تو چتا ہی جل جاتی ہے" متّرو
گڑگڑاتے ہوئے بولا۔
"میں کیا کروں بتا ؟ ان سپاہیوں کے سامنے
کون کچھ کہہ سکتا ہے ؟"
"میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں استاجی۔ اس
مردے کے لیے میرے پران نہ لو"
سپاہیوں نے کھاٹ ٹرک کے پیچھے رکھی۔ چھنی
نے اوپر چڑھ کر پچھلا تختہ کھولا۔ دو سپاہی اوپر چڑھ
گئے۔ نیچے کھڑے دو سپاہیوں نے آگے پیچھے ہو کر
کھاٹ اٹھائی اور اوپر والوں نے دھیرے دھیرے پورا
بستر ٹرک پر کھینچ لیا اور ساتھ ہی لاش کو بھی۔ ٹارچ کی
روشنی میں بستر ٹھیک کر دیا گیا اور لاش کو اس طرح
رضائی اوڑھا کر لٹا دیا گیا جیسے لاش نہیں بلکہ سمیال
صاحب خود ہی بستر پر سوئے ہوئے ہوں۔
"ٹرک اوپر سے ڈھکا ہوا ہوتا تو اچھا تھا" ایک
سپاہی بولا۔
"اب جو ہے سو ہے۔ جلدی سے چل دو" دوسرے
نے کہا اور اوپر سے نیچے چھلانگ لگا دی۔
یہ ساری کارروائی ہوتے ہوتے چھنی نے پوا گلے
سے نیچے اتار لیا۔
ادھر متّرو گٹھری بنا، اپنا کلیجہ تھام کر بیٹھا تھا۔
اسے اپنی موت سر پر منڈلا رہی دکھائی دے رہی تھی۔
سپاہی کی آواز سن کر وہ کانپ اٹھا۔
"کون ہے بے تو ؟"
"یہ رام بن سے میرے ساتھ آیا ہے" چھنی نے آگے
بڑھ کر جواب دیا " کل اس کا بشناہ پہنچنا ضروری ہے"
"نہیں نہیں، نیچے اتر" سپاہی نے کڑک کر کہا۔
تب تک دوسرا سپاہی بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ متّرو کو
دونوں سپاہی راکشسوں سے کم نہیں جان پڑ رہے تھے
"اتر جلدی، تو کل کسی اور گاڑی میں آ جانا" سپاہی نے تلخی
سے کہا۔
"مہاراج، راستے خراب ہیں۔ کوئی گاڑی آ جا نہیں
رہی۔ اگر میں بشناہ نہیں پہنچا تو...."
"نہیں، نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ دیکھتا نہیں ہم پر کیا
ایمرجنسی آ پڑی ہے۔ چل اتر جلدی، دیر نہ کر"
آخر متّرو کو نیچے اترنا ہی پڑا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ
وہ چھاتی کوٹ کوٹ کر رونے لگے۔
چھنی نے سگریٹ کا آخری کش لے کر ٹکڑے کو دور
پھینکا اور چھلانگ لگا کر اوپر اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ دونوں
سپاہی بھی بیٹھ گئے۔ ٹھنڈ کی وجہ سے گاڑی اسٹارٹ ہوتے

میں کچھ دیر لگ گئی۔

اُدھر گھگو بنا مترو اندھیری سڑک پر ایک طرف کھڑا سوچ رہا تھا کیسی قسمت خراب ہے۔ اچھا بھلا لوئی لپیٹ کر بیٹھا، سوچا جا گا سفر کر رہا تھا کہ یہ موت کے دوت آن ٹپکے اور اب وہ شامت کا مارا اس وقت اتنے پالے میں بھوت کی سڑک پر اکیلا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں ٹرک بھی چلا جائے گا اور وہ بالکل تنہا رہ جائے گا۔ یہاں کوئی رونے والا بھی تو نہیں ہے پاس میں اور اگر جاڑے میں پران بچ بھی گئے تو کل تک جموں تو پہنچ نہیں پائے گا اور اگر بشناہ نہیں پہنچا تو ویسے بھی مٹی خراب ہو جانی ہے اس کی! اور تب ہی مترو کو ایک بات سوجھی۔ وہ مسکرا دیا —— "کیوں نہ جیسے تیسے جموں پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ مرنا ہی ہوگا تو راستے میں مروں گا!"

اس وقت ٹرک اسٹارٹ ہو کر اس کے سامنے سے نکلنے کو ہی تھا۔ مترو نے لوئی اتار کر کندھے پر رکھ لی اور جیسے ہی ٹرک اس سے تھوڑا آگے نکلا اس نے لوئی اچھال کر ٹرک کے پچھلے تختے کے اوپر سے اندر پھینک دی اور پھر دوڑ کر ٹرک کے ساتھ جا لٹکا اور پھر آہستہ آہستہ اوپر چڑھ گیا۔ اب مترو سمیال صاحب کی لاش کے قریب کھڑا تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔

ننگا ٹرک، برف اور ٹھنڈی ہوا۔ مترو کو اپنے بدن میں برف کے چھرے چُبھتے محسوس ہو رہے تھے۔ پھٹا پکڑ کر وہ بڑی مشکل سے کھڑا تھا۔ ٹرک نے اب تک رفتار پکڑ لی تھی۔ کوئی موڑ آتا تو ٹرک کے ساتھ اسے بھی جھٹکا لگتا اور اس کے لیے خود کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔ حالانکہ اس نے لوئی کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا تھا لیکن ٹھنڈ تھی کہ لوئی کے ساتھ ہی اس کے بدن سے لپٹ گئی تھی اور اس کے جسم کو جکڑتی جا رہی تھی۔ اسے بار بار یہ خیال آتا کہ لوئی کا کساؤ بدن کے گرد ڈھیلا پڑ گیا ہے اور وہ اسے اور بھی لپیٹ لیتا لیکن خون جیسے بوند بوند کر کے جمتا جا رہا تھا۔ آخر وہ گٹھری سا بنا لاش کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اسے اس بات سے بھی ڈر لگ رہا تھا کہ وہ لاش کے پاس بیٹھا ہے اور ساتھ ہی اس بات کا اطمینان بھی تھا کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔

چُنی کو اب راستہ بہت کم دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی برف شیشے پر جمتی جا رہی تھی۔ ہاتھوں میں اکڑن آجانے کی وجہ سے اسٹیرنگ پر ان کا کساؤ کم ہو گیا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ سڑک پر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار بالکل کم ہو گئی تھی۔ پتنی ٹاپ اب مشکل سے دو کلومیٹر دور رہ گیا تھا۔

اُدھر مترو کو اب اپنا وجود جمے ہوئے لہو کا ایک جسم محسوس ہونے لگا تھا۔ ہاتھ، پیر، منہ، سر۔ جیسے ساتھ ہی نہیں تھے۔ سانس لینے میں بھی سینے میں کھنچاؤ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ سمیال صاحب کا مردہ تو قریب تھا ہی اب اپنی موت بھی اسے صاف نظر آ رہی تھی۔

اچانک ٹرک کا پہیہ کسی گڑھے میں پڑ جانے سے مترو کو اتنے زور کا دھکا لگا کہ اس کا گٹھری جسم گیند سا لڑھک گیا۔ مترو نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن اُٹھ نہ سکا۔ سکت ہی نہ رہ گئی تھی۔ اسے لگا کہ اب وہ کبھی اُٹھ کر نہیں بیٹھ سکے گا۔ آس پاس کا سارا اندھیرا اس کی آنکھوں میں اُتر آیا اور ٹھنڈی رات کا پالا اس کی رگوں میں خون منجمد کرنے لگا۔ سانس ڈوبنے لگی، ہوش اڑنے لگے اور اس کے چہرے پر برف جمنے لگی۔

کسی گہرے کنوئیں میں ڈوبتے ڈوبتے اسے اپنے ایک ہاتھ میں خون رینگتا محسوس ہوا۔ بدن میں تھوڑی گرمی آئی۔ اس نے ہاتھ ہلانے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی دوسرا ہاتھ تھا۔ مترو کو جیسے بجلی کا تار اچھو گیا۔ وہ ایک ہی جھٹکے کے ساتھ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے یہ دیکھ کر ٹھنڈا پسینہ آگیا کہ اس نے رضائی کے اندر ہاتھ ڈال کر لاش کا ہاتھ تھام رکھا ہے۔ اس نے گھور کر لاش کی طرف دیکھا۔ سمیال صاحب کی لاش پوری طرح رضائی سے ڈھکی تھی اور رضائی کے اوپر تھوڑی برف جمی تھی۔

ٹرک اب آخری موڑ مڑ کر پتنی ٹاپ جا پہنچا تھا۔ آسمان کی کالی سیاہ چادر کال سمے کی طرح چاروں سمت تنی ہوئی تھی۔ سڑک کے دائیں، بائیں چیڑ اور دیار کے درخت اندھیرے میں بھوتوں کی طرح کھڑے تھے۔ ان کی ٹہنیوں پر پالا اس طرح چپ چاپ پڑا تھا جیسے آدمی کے جسم پر موت اپنی پرچھائیاں خاموشی سے ڈالے۔

مترو نے لاش کی رضائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس پر گری برف کو جھاڑنے لگا لیکن ہاتھ اتنا اکڑ چکا تھا کہ پوری برف جھاڑی نہیں جا سکی۔ پھر اس نے رضائی کو اپنی طرف کھینچا۔ وہ بھی اس سے کھنچی نہیں گئی۔ اس نے تھک کر اپنے شل ہوئے ہاتھ رضائی کے اندر ڈال دیئے۔ ایک مانوس سی حرارت، جو اس نے ابھی کچھ دیر پہلے محسوس کی تھی اس کے بدن میں رینگنے لگی۔

اس کی آنکھوں کے آگے اس وقت مردہ کھانے والے گدھ منڈلا رہے تھے۔

ٹرک پتنی ٹاپ پار کر چکا تھا اور اب کُد کی طرف اتر رہا تھا۔ چُنی دھیمے سُر میں کوئی ڈوگری گیت گنگنا رہا تھا۔ دونوں سپاہی ایک دوسرے کے اوپر گرے پڑے سو رہے تھے۔

کُد پار کرتے ہی برف گرنی بند ہو گئی اور اُدھم پور کے قریب پہنچتے پہنچتے چھٹپٹا ہو گیا۔ جھجر کوٹلی کا پل پار کر کے چُنی نے ٹرک ایک طرف کھڑا کر دیا۔ اس وقت تک دن پوری طرح سے نکل آیا تھا لیکن آسمان میں بادلوں کی وجہ سے دھوپ نہیں نکلی تھی۔ نیند سے بوجھل آنکھوں سے اس نے سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ ایک حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھ کر یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ کون سی جگہ ہے جبکہ دوسرا ابھی بھی گہری نیند سویا ہوا تھا۔

"میں ہاتھ منہ دھو کر آتا ہوں" کہتے ہوئے چُنی پُل سے نیچے اُتر گیا۔

کچھ دیر بعد دونوں سپاہی بھی جنگل کی طرف چلے گئے۔

چُنی چونکہ ساری رات جاگ کر ٹرک چلاتا رہا تھا اور اِدھر رات کو پی شراب کا نشہ بھی ٹوٹ چکا تھا اسلیئے اسکی آنکھوں میں بڑی جلن ہو رہی تھی۔ چہرے پر ٹھنڈے

پانی کے چھینٹے مارنے کے بعد اسے اپنی آنکھوں کی جلن اور بدن کی تھکن کچھ کم ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ تازہ دم ہو کر لوٹ آیا اور ٹرک کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اچانک ہی اسے خیال آیا کہ وہ ساری رات اپنے ٹرک میں ایک مُردے کو ڈھوتا رہا ہے۔ اس کا دل متلانے لگا۔ لاش کے خیال کو ذہن سے جھٹکنے کے لیے اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سُلگا لی۔

تب تک سپاہی بھی لوٹ آئے۔ چُنی نے ان سے کہا: "پیچھے ایک نظر ڈال لینی تھی۔"

"کیا کرنا ہے دیکھ کر، لاش ہی تو ہے کوئی قیمتی سامان تو ہے نہیں جو خراب ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہے چلو چلیں۔"

"برف ہی جھاڑ لینی تھی۔"

"برف تو اب تک پگھل گئی ہو گی اور اگر نہیں بھی پگھلی تو آگے جا کر گُھل جائے گی۔"

"چلو چل دو جلدی سے، دیر ہو جائے گی" دوسرے سپاہی نے کہا اور پھر تینوں ٹرک پر سوار ہو گئے۔

چُنی نے ٹرک اسٹارٹ کر دیا۔

جب ٹرک اس گلی کے باہر پہنچا، جہاں سمپال صاحب کا گھر تھا، تو فوراً ہی بہت سارے لوگ جمع ہو گئے۔ رونا پیٹنا تو پہلے سے ہی چل رہا تھا۔ اب روتی چلّاتی عورتیں گھر سے باہر آنے لگیں۔ ایک عورت پچھاڑیں کھا رہی تھی اور دو چار عورتیں اسے پکڑ کر کھڑا رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ چُنی سوچ رہا تھا: اس نے لاش کو لا کر اچھا ہی کیا ہے، اپنی سیٹ سے اُتر کر وہ ٹرک کے پیچھے پہنچ گیا۔ دونوں سپاہی بھی وہاں موجود تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ گھر کے لوگ آ گئے ہیں تو انہوں نے چُنی کو ٹرک کا پچھلا تختہ کھولنے کے لیے کہا۔

چُنی اوپر چڑھ کر تختہ کھولنے لگا۔ اچانک ہی اس کی نظر رضائی سے باہر نکلے چار پیروں پر پڑی۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر گیا۔

سب لوگ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ عورتیں رونا پیٹنا بھول گئیں۔ سپاہیوں نے آگے بڑھ کر چُنی کو جھنجھوڑا۔ چُنی نے آنکھیں کھول دیں اور ڈر سے رُندھی آواز میں پوچھا۔

"ٹرک میں ایک لاش ہے یا دو ...؟"

"ایک" سپاہی نے کہا اور پھر گھبرا کر سوال کیا۔ "کیوں؟"

"اوپر جا کر تو دیکھو۔"

ایک سپاہی ڈرتا ڈرتا اوپر چڑھا۔ اس نے بھی لاش کے چار پیر دیکھے اور خوف زدہ ہو کر جھٹ سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

"کیا ہوا؟" دوسرے سپاہی نے پوچھا۔

"چار پیر نظر آ رہے ہیں" ٹرک سے چھلانگ لگانے والے سپاہی نے کہا۔

"پھٹا تو کھول ذرا" دوسرے سپاہی نے چُنی سے کہا۔

چُنی نے نیچے کھڑے کھڑے ہی بڑی مشکل سے تختہ کھولا۔ رضائی میں سے چار پیر باہر نکلے ہوئے تھے۔ جو بھی آگے بڑھتا، ڈر سے کانپ کر پیچھے ہٹ جاتا۔

آخر چُنی نے ہی ہمت کی۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھتا لاش کے قریب پہنچا اور پھر اس نے ایک ہی جھٹکے سے رضائی کھینچ کر ایک طرف پھینک دی۔ سمپال صاحب کی لاش کے ساتھ متّرو لیٹا ہوا تھا۔ وہ زندہ تھا یا مردہ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔

سمپال صاحب کی لاش تو ان کے گھر والوں نے اٹھا لی اور متّرو کو چنی ویسے ہی ٹرک میں لادے ہوئے بڑے اسپتال لے گیا۔ بڑی کوشش کے بعد ڈاکٹر اسے ہوش میں لا سکے۔

دوپہر کو جب چُنی اڈے سے اسپتال لوٹا تو اس نے دیکھا کہ متّرو اب بات چیت کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔

چُنی نے جاتے ہی پوچھ لیا: "کیوں بے متّرو ولد تتّرو، تجھے ڈر نہیں لگا لاش کے ساتھ سوتے ہوئے؟"

"لاش کے ساتھ؟" متّرو کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہو استاد جی؟"

"اب یہ بھی بھول گیا؟ میں نے تجھے جٹوت میں ٹرک سے اُتار دیا تھا۔ لیکن تو چوری سے پیچھے چڑھ گیا۔ اور جب ہم نے جموں میں سمپال صاحب کی لاش اُتاری تو دیکھا کہ تو لاش کے ساتھ رضائی میں مردہ سا پڑا ہے۔

بھئی بیوی کو لانے کے لیے کوئی اتنی ہمت دکھاتے یہ ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

بیوی کی بات سنتے ہی متّرو اچھل کر بیٹھ گیا: "استاد جی، آپ بھی مجھے کہاں لے آئے؟ مجھے آج بشناہ پہنچنا ہے ـــ"

"چپ چاپ لیٹا رہ متّرو ولد تتّرو۔ ڈاکٹروں نے تجھے دو دن تک پورا آرام کرنے کے لیے کہا ہے۔"

"اجی بھاڑ میں جائیں آپ کے ڈاکٹر" کہہ کر متّرو پلنگ سے اُتر کر کھڑا ہو گیا: "کل تارا ڈوب جانا ہے، اگر آج میں بیوی کو اس کے گھر سے نہیں لایا تو میں تو ویسے ہی مارا جاؤں گا۔"

"ابے ٹھہر تو سہی، میری بات تو سن"

متّرو جو اب تک دروازے کے پاس پہنچ چکا تھا اچانک رُک گیا: "استاد جی ہاتھ جوڑتا ہوں، اب مجھے پیچھے سے آواز نہ دینا۔ بیوی کو لینے جا رہا ہوں۔ پھر کوئی بدشگونی نہ ہو جائے۔" کہتا ہوا متّرو باہر نکل گیا۔

---

بقیہ : جدید ھندوستانی بُت سازی

---

سے کم نہیں ہیں۔ فقط کمی اس بات کی ہے کہ اُنہیں مواقع فراہم نہیں ہوتے، خاطر خواہ سرپرستی نہیں ملتی۔ چونکہ عوام میں بھی جمالیاتی شعور کا نسبتًا ابھی فقدان ہے اور سرمایہ لگانے والے گھرانے بھی محتاط ہیں لہٰذا اس فن کو جو مقام حاصل ہونا چاہیئے تھا، وہ نہ ہو سکا۔ آج فنی اسکولوں اور کالجوں میں فنِ بُت سازی کے شعبہ میں فقط ایک یا دو طلباء دیکھے جاتے ہیں، جو غالبًا اپنے والدین کی مرضی کے بغیر اپنی زندگی کو داؤ پر لگاتے ہیں۔ کیوں کہ اُنہیں اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی ٹھوس ضمانت کی اُمید نہیں دکھائی دیتی۔ لہٰذا اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے سرکاری سطح پر قدم اُٹھانے کی ضرورت ہے تاکہ یہ عظیم فن جو ہماری شاندار روایت کا شاہد ہے دوبارہ زندہ جاوید ہو کر بین الاقوامی سطح پر اپنا جائز مقام حاصل کرے۔

(تصاویر: بشکریہ نیشنل گیلری آف ماڈرن آرٹس نئی دہلی) ●●
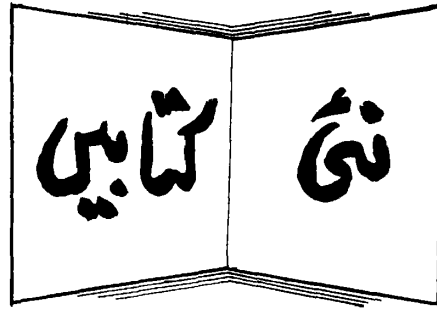
**نام کتاب : اقبال کا نظامِ فن**

**مصنف : ڈاکٹر عبدالمغنی**

**صفحات : ۵۵۲ قیمت : تیس روپے**

**ملنے کا پتہ : بک ایمپوریم ، سبزی باغ ، پٹنہ ۴۔۰۰۰۸**

اقبال پر اب تک جتنا لکھا جاچکا ہے شاید اردو کے کسی دوسرے شاعر پر نہیں لکھا گیا ہوگا۔ لیکن زیادہ تر تصنیفات میں اقبال کی فکر کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ اقبال کے فن پر ویسی توجہ نہیں دی گئی جس کا وہ مستحق ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی نے اپنی ضخیم کتاب "اقبال اور عالمی ادب" میں اقبال کی عظمت اور عالمی ادب میں اقبال کا مقام متعین کرنے کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ زیادہ تر کلیم الدین احمد کی کتاب "اقبال ایک مطالعہ" کا تنقیدی جائزہ ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر عبدالمغنی نے اقبال کے فن پر براہِ راست بحث کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ان کی زیر تبصرہ کتاب "اقبال کا نظام فن" بقول ان کے ایک منظم منصوبہ بند سلسلۂ تصنیفات کی پہلی کڑی ہے، جس میں انہوں نے اقبال کی اردو شعری تخلیقات کو تنقیدی مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی یہ تصنیف اقبالیات میں ایک گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالمغنی اقبال کے شیدائی ہیں۔ ابتدائی دور تعلیم میں ہی اقبال کی اردو شاعری سے ان کی شناسائی ہوئی اور ذوق کی بالیدگی کے ساتھ ساتھ اقبال سے ان کی دل چسپی بھی پروان چڑھی۔ ان کی اس تصنیف سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اقبال کا جیسا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے شاید ہی اقبال سے دلچسپی رکھنے والے کسی دوسرے باذوق اہل قلم نے کیا ہوگا۔ حقیقت میں اقبال کی تخلیقات پر عبور حاصل کرنے کے لیے جیسی علمی استعداد کی ضرورت ہے، اس کے جو مواقع انہیں ملے اکثر دوسرے ماہرین اقبالیات ان سے محروم رہے ہیں۔ مدرسہ شمس الہدیٰ کے ایک مایہ ناز طالب علم ہونے کی وجہ سے مشرقی علوم، فارسی وعربی اور اسلامیات پر انہیں کامل دسترس حاصل ہے۔ انگریزی زبان وادب میں صرف ام۔ اے ہی نہیں بلکہ ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے کی سعی میں انھوں نے قدیم و جدید انگریزی ادب کی بھی پوری طرح خوشہ چینی کی ہے۔ چنانچہ اقبال کی فکری بلوغت اور فنی بلاغت کی پرکھ کے لیے ان کے ذہن اور ذوق میں کسی طرح کی کمی کا گمان نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر مغنی کی اس ۵۵۲ صفحات پر مشتمل کتاب کا کوئی باب دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اس کا ایک باب، جس میں انہوں نے اقبال کے تصور فن کی وضاحت کی ہے، ہر اعتبار سے معرکۃ الآرا سمجھا جاسکتا ہے۔ اقبال کے فن کی جانچ کے لیے انہوں نے اقبال کے تصورِ فن سے ہی مدد لی ہے۔ اپنے ذاتی تصور فن کو اس میں دخل انداز نہیں ہونے دیا ہے، جیسا عام تنقید نگاروں کا رویّہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی نظریات وتصورات کو جو خود ان کی اپنی تخلیق کم اور دوسروں سے مستعار زیادہ ہوتے ہیں، قاری کے سامنے پیش کرکے کسی فنکار کی ادبی تخلیقات کی جانچ پرکھ کرتے ہیں۔ اقبال کے فن کی وضاحت کرنے میں بھی ڈاکٹر مغنی نے اقبال کے کسی مقالے یا دوسروں کی رائے سے استفادہ نہیں کیا ہے، بلکہ خود اقبال کے ان متعدد اشعار کا استعمال کیا ہے جن میں اقبال کے نظریہ فن کی ترجمانی ہوتی ہے اور اس بنیاد پر ایک ایسا جامع اور فاضلانہ مقالہ اقبال کے تصوّرِ فن پر تخلیق کیا ہے جو اردو تنقید میں صرف "امتیاز نہیں بلکہ اجتہاد" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے ایسے ایسے نکات کا انکشاف وتجزیہ کیا ہے اور ایسے ایسے سوالات کی گرہیں کھولی ہیں جو اب تک دوسروں کی نگاہ سے پوشیدہ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس باب کا مسودہ تیار کرتے وقت ڈاکٹر مغنی کا قلم اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ گیا ہے۔ اپنی اس تحریر میں انھوں نے ایسی دقیق فنی بلاغت اور زبان و بیان پر قدرت کے جوہر دکھائے ہیں جو قاری کو صرف غور وفکر کی دعوت ہی نہیں دیتے، بلکہ اس کے احساسِ جمال کو بھی انگیخت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مغنی نے اردو میں اقبال کی ساری شعری تخلیقات کی فنی بلاغت وعظمت پر جو روشنی ڈالی ہے، اس کے فہم کے لیے بھی اس باب کا مطالعہ قاری کی مشکل کشائی کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ اقبال کی غزلوں میں ترتیب و تسلسلِ خیال کی بنا پر انہیں غزل گو تسلیم کیے جانے میں جس شک وشبہہ کا اظہار کیا جاتا ہے، ڈاکٹر مغنی نے اسی باب میں اس کا مختصراً لیکن نہایت معقول انداز میں ازالہ کیا ہے، اور بعد کے ابواب میں بانگِ درا، بال جبریل اور ضربِ کلیم کی غزلوں میں اقبال کے رنگِ تغزل کی نہایت کامیابی سے نشاندہی کی ہے اسی طرح اقبال کی نسبتاً طویل نظموں کی تشریح کرکے ان کے فنی کمالات اور شعری محاسن پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ الغرض اقبال کی اردو تخلیقاتِ شعری کی

ساری اصناف، نظموں کی مختلف اور متنوع ہیئتیں، موضوعات کی بوقلمونی، ان سب کو ہر نہج اور ہر زاویے سے پوری طرح کھنگال کر ان کی فنی بلاغت و عظمت کی نقاب کشائی کی ہے۔

(پروفیسر) محمد محسن

**نام کتاب: کلاسیکیت و رومانیت اور دوسرے مضامین**
مصنفہ: ڈاکٹر اُمِّ ہانی اشرف
ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
قیمت: ۱۲ روپے

زیر نظر کتاب ڈاکٹر ام ہانی اشرف کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین اپنے موضوعات کے اعتبار سے متنوع ہیں۔ گو ان مضامین میں پختگی اور بصیرت کی سطحیں مختلف ہیں اور کہیں کہیں تشنگی کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن اکثر مضامین میں مصنفہ افہام و تفہیم کے عمل سے سنجیدگی اور ذمہ داری کے ساتھ گذری ہیں اور ان کے تاثرات ایک تربیت یافتہ قاری کے تاثرات ہیں۔ ان مضامین کی زبان زیادہ تر سادہ اور صاف ستھری ہے لیکن اگر درجِ ذیل قسم کی نثر سے پوری طرح دامن بچایا جاتا تو اچھا تھا:

غزل اردو زبان کی آبرو ہے تو حسرت غزل
کی عفت و عشوہ طرازی، پاکیزگی و تردامنی اور
سادگی و گلُ پیرہنی کے ادا شناس ہونے
کی وجہ سے غزل کی آبرو۔

(حسرت کا طرزِ سخن، صفحہ ۲۷)

قصیدہ ڈاکٹر اُمّ ہانی اشرف کا خاص موضوع ہے اور انہوں نے شمالی ہند کے قصائد کی فرہنگ پر ریسرچ بھی کی ہے۔ اِس مجموعۂ مضامین میں غالب اور ذوق کے قصائد کے مطالعے شامل ہیں۔ توقع کی جا سکتی تھی کہ ان مطالعوں میں غالب اور ذوق کے قصائد کا سیر حاصل تنقیدی جائزہ ہوگا لیکن یہ دونوں مضامین کچھ تو اپنے اختصار کی وجہ سے اور کچھ غیر ضروری باتوں کی شمولیت کی بناء پر اس توقع کو پورا نہیں کر پاتے۔ سودا اور ذوق کا تقابل ضروری تھا لیکن اس تقابل کو مختصر کر کے ذوق کے قصائد کا ذکر اور زیادہ تفصیل کے ساتھ کیا جا سکتا تھا۔ دونوں مضامین کے وہ حصے بہتر ہیں جن میں تجزیاتی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ غالب کے قصیدے 'دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں' کی مشہور تشبیب کا مطالعہ کیا گیا ہے اور تراکیب کی طرف توجہ دلائی گئی ہے لیکن اس تشبیب کی معنی آفرینی ایک مکمل مضمون کا تقاضہ کرتی ہے۔

'ہجو نگاری کا فن اور سودا' ایک جامع مضمون ہے جس میں مصنفہ نے ہجو نگاری کا ایک معیار قائم کر کے اُس پر سودا کو پرکھا ہے اور باوجود سودا کی ہجویات کی بعض خوبیوں کے اعتراف کے ان ہجویات کو ناقص پایا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ سودا کی "ہجویاتی نہج کے پس پُشت کوئی ایسا مثبت پیغام، ایسا واضح نظام اقدار یا ایسا حیات بخش فلسفہ نہیں جو قاری کو فنی اور جمالیاتی آسودگی بخش سکے۔" ہمارے یہاں ہجو کی روایت تفریحی انداز میں اپنے غم و غصے کے اظہار کی رہی ہے۔ ہجو میں ادبی اوصاف تو ہو سکتے ہیں لیکن اسے کسی اہم شعری کارنامے کا درجہ حاصل نہیں تھا۔ یہ سوال بحث طلب ہے کہ مغربی تنقید سے برآمد شدہ ہجویہ شاعری کے معیار پر اردو کی ہجویہ شاعری کو پرکھنے میں ہم کہاں تک حق بجانب ہیں

'حسرت کا طرزِ سخن' ایک نسبتاً طویل مضمون ہے حسرت کی عشقیہ شاعری کو ان کی سب سے اچھی شاعری قرار دے کر کہا گیا ہے کہ حسرت نے ۱۹۰۲ء سے ۱۹۱۶ء تک اپنی بہترین شاعری کی۔ مصنفہ حسرت کو اردو کے دوم درجے کے غزل گو شعراء میں ایک نمایاں اور بڑا شاعر مانتی ہیں۔ اِن واضح تنقیدی تعینات کے باوجود مضمون میں کچھ الجھاؤ ہے اور بعض ایسے مباحث درمیان میں آ گئے ہیں جن سے بچا جا سکتا تھا۔ حسرت کی سیاسی شاعری کے ضمن میں بڑی بصیرت افروز بات یہ کہی گئی ہے کہ "حسرت کی دلچسپی ملکی سیاست سے تھی نہ کہ سیاسی شاعری سے۔" اس کے علاوہ حسرت کے اِس نظریے کی وضاحت میں کہ جذبات کی صحیح ترجمانی فاسقانہ غزل گوئی نہیں ہے، پرنسپل عبدالشکور کے انتخابِ حسرت کے حوالے سے حسرت کے ایک غیر مطبوعہ مضمون کا ایک بہت اہم اور قابلِ قدر اقتباس نقل کیا گیا ہے۔ کسی حد تک ناہموار ہونے کے باوجود یہ مضمون موضوع سے لکھنے والے کے شغف اور ایک لگن اور محنت کا مظہر ہے۔

حسرت کو ڈاکٹر ام ہانی اشرف نے اپنے طور پر پڑھا ہے مگر بغیر تنقیدی حوالوں کے نہیں پڑھا ہے۔ 'بیدی کے نسوانی کردار'، جو کتاب کا سب سے طویل مضمون ہے اِس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس مضمون میں مصنفہ کی شخصی کاوش نمایاں ہے اور یہ ایک تقریباً غیر مشروط تنقیدی مطالعہ ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے اِس مطالعے کا دائرہ محدود ہے لیکن ام ہانی اشرف کا ذوقِ جستجو قابلِ داد ہے کہ وہ بیدی کی فکشن کے سمندر سے گوہرِ مطلوب ڈھونڈ لائی ہیں۔ بیدی کے افسانوں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ اپنی کلیت ہی میں اچھے اور بامعنی لگتے ہیں۔ مصنفہ کا موضوع اِس بات کا مقتضی تھا کہ بیدی کے مختلف افسانوں کے چھوٹے چھوٹے اقتباسات لے کر اُن کی ایک ایسی ترتیب قائم کی جائے جو عورت کی اُس تصویر کو منعکس کر سکے جو بیدی نے پیش کی ہے اور یہ کام مصنفہ نے سلیقے کے ساتھ انجام دیا ہے

اس مجموعۂ مضامین کے پہلے دو مضامین 'کلاسیکیت اور رومانیت' اور 'ڈیوائن سیڈی۔ ماخذ اور موضوع' اپنی نوعیت کے لحاظ سے معلوماتی ہیں جن کا مقصد مغرب کے بعض ادبی رجحانات اور تخلیقات کو اردو میں متعارف کرانا ہے۔ دونوں مضامین (خاص طور سے دانتے کی عظیم تخلیق' تعارفی مطالعہ) بہت اچھے لکھے ہوئے ہیں۔ 'نو کلاسیکیت اور رومانیت' زیادہ تر انگریزی شاعری تک محدود ہے لیکن مضمون کا سلجھا ہوا وضاحتی انداز قابلِ تعریف ہے۔ دانتے کی نظم کے ماخذات کے بارے میں یہ پتے کی بات کہی گئی ہے کہ یہ ماخذات شاعری میں منتقل ہو گئے ہیں۔

وقار حسین

# ملتقیات



## نمایاں تبدیلی

"آج کل" میں نمایاں تبدیلی یہ محسوس کی کہ نئے قلم کاروں کو بھی مواقع مل رہے ہیں اور یہ مجلّہ مختلف صوبوں کی مناسب نمائندگی کر رہا ہے۔ خاص نمبر اچھی تعداد میں شائع ہو رہے ہیں۔ میر نمبر میں مجھے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی کمی محسوس ہوئی تھی۔ جون ۱۹۸۴ء کے شمارے میں پروفیسر محمد مجیب کا سوانحی خاکہ بہت معلوماتی ہے اور ایک بڑی کمی کو دُور کرتا ہے۔ جناب عبداللطیف اعظمی صاحب شکریہ کے مستحق ہیں۔ اُمید ہے کہ اب قمر اعظم ہاشمی صاحب کی تصنیف — "مجیب صاحب کی ڈرامانگاری" جلد ہی شائع ہو جائے گی۔ ہاں سوانحی خاکے میں مجیب صاحب کی تصنیف "آؤ ڈراما کریں" شامل نہیں ہے۔ یہ تصنیف پہلی بار ۱۹۸۲ء اور دوسری بار فروری ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس تصنیف میں پروفیسر محمد مجیب کی ڈرامے کے فن کاروں کے ساتھ ایک تصویر بھی ہے۔ جولائی کے شمارے میں پروفیسر وہاب اشرفی اور ڈاکٹر ابن فرید کے مضامین پسند آئے۔

اخلاق اثر، بھوپال

## صحیح صورتِ حال

"آج کل" ماہ اگست ۱۹۸۴ء میں صفحہ ۴۷ پر جناب یوگیندر پال صابر کے مکتوب میں جس رائے کا اظہار کیا گیا ہے، اس کا تعلق ڈاکٹر نیّر مسعود صاحب کے مقالے کے بجائے شاید خود میرے مقالے "میر اور لکھنؤ" سے ہے، جو "آج کل" کے "میر نمبر" (ص ص ۸۵ تا ۹۰) میں شامل ہے۔ براہِ کرم "آج کل" میں صحیح صورتِ حال شائع فرمائیں۔

کاظم علی خاں، لکھنؤ

## بہتر

آج کل میں جو تصاویر پہلے اور آخری صفحات پر شائع ہوتی ہیں، وہ

بھی اگر ہم اردو سے متعلق ہوں اور اُن کے ذریعہ اُردو کے تہذیبی اور ادبی پروگراموں کی جھلک بھی مل سکے تو بہتر ہو۔

تشکیل اختر، مرادآباد

## فکر کی بات:

"آج کل" کے جون کے شمارے میں محترم بالا دوبے صاحب کا افسانہ "اہانت" پڑھا اور اُس نے دل پر ایسا اثر کیا کہ محترم بالا دوبے صاحب کو ایک خط لکھا اور مبارک باد بھی دی۔

میری دلی تمنا ہے کہ آپ اس قسم کے واقعات کو جو انسان کو انسان ثابت کرتے ہیں، ضرور شائع کیا کریں۔ میں کیا بتاؤں کہ جب بھی کسی جگہ کسی قسم کے جھگڑے، فساد یا مار پیٹ یا آگ لگانے کے واقعات پڑھتا ہوں اور سنتا ہوں تو دل کی حالت بیان سے باہر ہو جاتی ہے اور بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔ اللہ ہم سب کو سمجھ دے کہ ہم سب انسان بن کر رہیں۔

جون کے شمارے مرحوم پریم ناتھ پردیسی پر دونوں مضمون اچھے ہیں۔ دونوں میں پردیسی مرحوم آنکھوں کے سامنے آ گئے ہیں۔

حبیب احمد خاں مالیر کوٹلوی، بمبئی

## نکھار

"آج کل" کا مطالعہ ایک عرصے سے کرتا ہوں۔ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ "آج کل" اردو کے چند خوب صورت اور معیاری رسائل میں منفرد مقام کا حامل ہے، لیکن اِدھر آپ نے کچھ نمایاں اضافے کئے ہیں، جن سے رسالے کے حُسن (صوری اور معنوی دونوں میں بڑا نکھار آ گیا ہے۔

ہلال فرید، علی گڑھ

## وضاحت

جولائی کے شمارے میں میری غزل شائع کرنے کا شکریہ۔ کتابت کی غلطی کے سبب مطلع کے دوسرے مصرعے میں 'دَور' کی جگہ 'دَرد' چھپ گیا ہے اور مقطع میں 'میزاں' کی جگہ 'میراں' چھپ گیا ہے۔ اگلے شمارے میں اس کی وضاحت کر دیں۔

ایم۔ اے ضیا، کریم گنج، گیا

●●

پچھلے ۱۵ ستمبر ۱۹۸۴ کو نابینا افراد کی امداد کے لیے ملک بھر میں فلیگ ڈے منایا گیا۔ تصویر میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی عطیہ دیتے ہوئے

"قومی ایکتا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس کام میں ترجمے سے بڑی مدد مل سکتی ہے"۔ یہ بات نائب وزیر اطلاعات و نشریات شری غلام نبی آزاد نے پبلی کیشنز ڈویژن میں منعقدہ ایک مذاکرے میں کہی۔ قومی ایکتا میں ترجمے کے رول کے موضوع پر یہ مذاکرہ پبلی کیشنز ڈویژن اور بھارتیہ انوواد پریشد کے اہتمام میں ہوا۔ اس موقع پر بولتے ہوئے پبلی کیشنز ڈویژن کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیام سنگھ ششی نے کہا۔ "اس ملک میں کہ جہاں مختلف مذہبوں کے لوگ مختلف زبانیں بولتے ہیں، ترجمہ ہی ایک ایسا موثر وسیلہ ہے جو تمام ہندوستانیوں کو ایک جہتی کے تاگے میں پرو سکتا ہے" ——— تصویر میں مذاکرے کا ایک منظر: دائیں سے: شریمتی کارگی گپتا (بھارتیہ انوواد پریشد کی صدر)، ڈاکٹر شیام سنگھ ششی ڈائریکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، اکھلیش کمار جین، ڈاکٹر لوکیش چندر ممبر پارلیمنٹ اور جناب دیانند ورما۔

Regd. No. D (DN) 103
R.N. 948/57

Licensed U(DN)-50 to post without pre-payment
at Civil Lines, Post Office, Delhi

Vol. 43 No. 3 AJKAL (URDU) October,

تشکیل شعر:
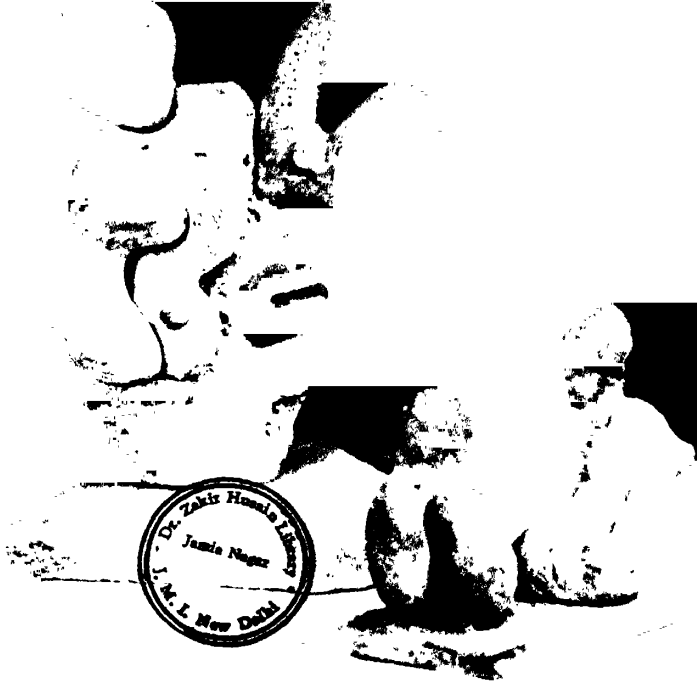
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
(غالبؔ)

برجیندر سیال

Publishedby the Director Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001, Printed by the Manager, Govt. of India Photolitho Press, Faridabad.

# آجکل

[illegible] ۱۹۸۳ء

ایک روپیہ ۵۰ پیسے

اس شمارے کے قلم کار:

گیان چند، جذبی، بیر راجہ،
شمیم نکہت، م۔ک۔ مہتاب، ندا فاضلی، حفیظ نیولپوری،
بلدیو شرما، وشوناتھ درد، فہیم باسط،
سرداری لال نشتر، انجانا سدھیر، شکیل اعجاز،
اختر الواسع، رام پرکاش راہی اور دوسرے

۲ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو قوم نے ، راشٹر پتا مہاتما گاندھی کو ، اُن کی ۱۱۵ ویں سالگرہ کے موقع پر خراجِ عقیدت پیش کیا۔ تصویر میں : صدرِ جمہوریہ شری ذیل سنگھ ، دہلی میں مہاتما گاندھی کی سمادھی راج گھاٹ پر پھول چڑھاتے ہوئے۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۸ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو ٹرامبے میں واقع بھابھا ایٹمی ریسرچ سینٹر کا معائنہ کیا۔

اردو کا مقبول عام مصوّر ماہنامہ

# آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر:
راج نرائن راز

جلد: ۴۳ | شمارہ: ۴ | نومبر ۱۹۸۴ء

قیمت: ایک روپیہ ۵۰ پیسے | فون: ۳۸۷۰۶۹ | کارتک۔ اگرہائن شک سمت ۱۹۰۶




## ترتیب



سرورق: جیون اڈلجہ


بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ — اسسٹنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منہال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر: "آجکل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ:
بزنس منیجر: پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

زرِ سالانہ: ۱۵ روپے — دو سال کے لیے: ۲۷ روپے — تین سال کے لیے: ۳۸ روپے

## بہتر ماحول — بہتر زندگی

بقول شریمتی اندرا گاندھی تحفظ کا تعلق آج اور آنے والے کل سے ہے۔ اس سے ہمیں ایک درس ملتا ہے: ترقی فوری ضروریات اور طویل مدتی سماجی مفادات سے ہم آہنگ ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ ترقیات تحفظ سے الگ نہیں ہے۔

آزاد بھارت کی حکومت کا پہلا قدم یہی تھا کہ ملک کی معیشت کو بحال کیا جائے، جن کا شیرازہ غیر ملکیوں کے استحصال نے بکھیر دیا تھا۔ جب ہمارے منصوبہ سازوں نے معیشت کو بہتر بنانے کے لیے باقاعدگی کے ساتھ کام شروع کیا تو انھیں ماحولیاتی مسائل، بڑھتی ہوئی آبادی زیادہ شرح پیدائش اور اموات، مفلسی جیسے اہم مسائل کا احساس ہوا اور جب یہ سب حالات ایک معاشرے میں پائے جائیں تو حالات مزید خراب ہو جاتے ہیں۔ رہن سہن کے خراب حالات، بڑے شہروں میں دباؤ، بے روزگاری اور غریبی یہ سب بہتر ماحول کے فروغ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

صنعتی فروغ، ماحولیاتی کثافت اور آبی آلودگی بھی بہتر ماحول کے فروغ کے لیے رکاوٹ ثابت ہوئے۔ جلد ہی اس امر کا احساس ہو گیا کہ ترقی کا مطلب محض اقتصادی ترقی نہیں بلکہ اس میں معیارِ زندگی میں بہتری کو بھی شامل کیا جانا چاہیے جو صاف ستھرے اور متوازن ماحول پر انحصار رکھتی ہے۔

چوتھے پنج سالہ منصوبے میں ماحول سے متعلق مسائل کا بھرپور جائزہ لیا گیا اور ماحولیات کے بارے میں مربوط منصوبہ بندی کی گئی۔ ماحولیاتی ... تحفظ سے متعلق اقدام پہلے ہی ہندوستانی آئین میں موجود ہیں۔

حکومتِ ہند نے ماحولیات کے تحفظ سے متعلق پروگرام کو مزید تقویت دینے کی غرض سے چھٹے پنج سالہ منصوبے کی مدت میں متعدد اقدام کیے۔ یکم نومبر ۱۹۸۰ء کو اس سلسلے میں ایک علیحدہ محکمہ قائم کیا گیا۔ ماحولیات کے تحفظ کے لیے بہت سے قانونی اور انتظامی اقدام کا پہلے ہی آغاز کیا جا چکا ہے۔ جنگلات لگانا اور سماجی بھلائی کے مقصد سے شجرکاری بیس نکاتی پروگرام کا جزو ہیں۔

ترقیاتی پراجیکٹوں کے ماحولیاتی اثرات کی جانچ پڑتال اور ان کے جائزے کے لیے ایک طریقۂ کار وضع کیا جا چکا ہے۔ متعلقہ ادارے اور منصوبہ بندی کمیشن ان پراجیکٹوں کی منظوری دینے سے قبل ان سب پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہیں — مالی ادارے بھی اس امر پر اصرار کرتے ہیں کہ مالی امداد حاصل کرنے کی غرض سے انہیں دی جانے والی رپورٹ میں صنعتوں کے ان اقدامات کی تفصیل بھی دی جائے جو انہوں نے کثافت پر قابو پانے اور ماحول کے تحفظ کے لیے کیے ہوں۔

چھٹے منصوبے کے دوران درجۂ اوّل میں آنے والے شہروں میں پانی کے نکاس سے متعلق ضابطوں کے نفاذ کے لیے رہنما اصول مرتب کیے گئے ہیں جن میں کثافت پھیلانے والی صنعتوں کا جائزہ اور یہ صنعتیں کس حد تک کثافت پھیلاتی ہیں، اس کی تفصیل نیز اس کی روک تھام کے اقدام شامل ہیں۔

جنگلی جانوروں کے تحفظ کے لیے ۱۹۸۳ء میں ایک قومی منصوبہ تشکیل دیا گیا تھا، جس کے تحت محکمۂ ماحولیات نے حال ہی میں گینڈوں کو گوہاٹی سے اتر پردیش کے دودھوا نیشنل پارک منتقل کیا ہے۔ اس اقدام کا مقصد گینڈے کی ختم ہوتے والی نسل کی ایک نئی جگہ پر محفوظ طریقہ پر پرورش کرنا ہے۔

ماحولیات کا محکمہ جنگلی جانوروں کو ان کے قدرتی ماحول میں پرورش کی غرض سے شروع کیے گئے طویل مدتی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا ذمہ دار ہے۔ اب تک اس سلسلے میں تیرہ مقامات کی نشاندہی کی جا چکی ہے اور نیل گری (کرناٹک اور کیرالہ) نندا دیوی (اروناچل) اترکھنڈ اور نندا دیوی (اتر پردیش) پراجیکٹ سے متعلق دستاویزات تیار کی جا چکی ہیں۔

مختلف نسلوں اور ثقافت سے تعلق رکھنے والے تقریباً تین کروڑ ۸۰ لاکھ قبائلی افراد بھارت کے مختلف حصوں میں آباد ہیں۔ یہ لوگ قدرتی ماحول میں اس قدر رچ بس گئے ہیں کہ انہیں پیڑ پودوں اور مویشیوں کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل ہو گئی ہیں۔ پیڑ پودوں اور مویشیوں کے سلسلے میں جو پراجیکٹ چلایا جا رہا ہے اس کا مقصد قبائلیوں کے استعمال میں آنے والے پیڑ پودوں اور مویشیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور ان کی نشاندہی کرنا نیز ان کی قدیم

خوراک، کپڑے، چارے، دواؤں اور سانپ کے کاٹنے وغیرہ کے علاج کے بارے میں جانکاری نیز دستاویزات مرتب کرنا ہیں۔

اس اہمیت کو سمجھتے ہوئے کہ غریبی اور آبادی ماحولیات کے لیے سب سے بڑے خطرہ ہیں، اقوامِ متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام کی گورننگ کونسل نے ۲۸ مئی ۱۹۸۴ء کو کینیا کے شہر نیروبی میں ماحول سے متعلق ایک ہندوستانی قرارداد کو اتفاقِ رائے سے منظور کر لیا۔ اس قرارداد میں وضاحت کی گئی ہے کہ آبادی کے اضافے میں کمی لانے میں کام[illegible] ا وجود [illegible] آبادی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جس کی وجہ سے [illegible]تی وسائل اور ماحول پر بھی دباؤ بڑھ رہا ہے۔

اس قرارداد میں اقوامِ متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام کی گورننگ کونسل پر زور دیا گیا ہے کہ وہ آبادی، وسائل کی ترقیات اور ماحولیات کے متوازن فروغ کو اولین ترجیح دے۔ قرارداد میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ میکسیکو میں آبادی سے متعلق منعقد ہونے والی دوسری کانفرنس کی روشنی میں ۱۹۸۵ء کی ماحول سے متعلق رپورٹ میں ماحول کے تعلق سے آبادی کو بھی ایک معاملے کے طور پر شامل کرے۔

## صاف پانی کی فراہمی

ریاستوں اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں سے موصولہ اطلاعات کے مطابق ۲ لاکھ ۳۱ ہزار دیہات مذکورہ بالا زمروں میں آتے ہیں نیز ان گاؤں میں پانی مہیا کیا جانا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۵ لاکھ ۷۶ ہزار دیہات میں تقریباً ۳ لاکھ ۴۵ ہزار گاؤں میں چھٹے منصوبے کے شروع میں پینے کے پانی کی فراہمی کا کوئی نہ کوئی وسیلہ موجود تھا۔

چھٹے پانچ سالہ منصوبے (۸۵-۱۹۸۰ء) میں کم از کم ضروریات کے ریاستی شعبے اور دیہی علاقوں میں جلد از جلد پانی مہیا کرنے سے متعلق مرکزی پروگرام کے تحت بالترتیب ۱۱۴۰ر۷ کروڑ روپے اور ۶۰۰ کروڑ روپے مختص کئے گئے تھے۔ کم از کم ضروریات کے تحت مخصوص کردہ رقم کو اضافہ کر کے ۱۱۴۴ر۳ کروڑ روپے کر دیا گیا۔ ۲۰ کروڑ روپے آندھرا پردیش کے لیے اور ۱۷ کروڑ روپے کرناٹک کے لیے بڑھائے گئے۔ چھٹے منصوبے کی دستاویز میں ایک لاکھ ۹۰ ہزار دیہات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جہاں پینے کے پانی کا کم از کم ایک ذریعہ مہیا کیا جانا ہے۔

## بیس نکاتی پروگرام

جنوری ۱۹۸۲ء میں جب نئے بیس نکاتی پروگرام کا اعلان کیا گیا تو اس میں پینے کے پانی کی فراہمی کو شامل کیا گیا۔ اس کے تحت چھٹے منصوبے کے دوران پینے کے پانی کے مسئلے سے دوچار دیہات کی نشاندہی کی جائے گی اور ان دیہات میں کم از کم ایک ایسا وسیلہ مہیا کیا جائے گا جس کے ذریعے پورے سال پینے کا پانی فراہم ہوتا رہے۔

ریاستوں اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں سے موصولہ اعداد و شمار کے مطابق چھٹے منصوبے کے پہلے سال میں (۸۱-۱۹۸۰ء) ۲۵۹۷۸ دیہات میں (نشانے کا ۲۵ر۱۱ فیصد) پینے کا پانی فراہم کیا گیا اور اس پر ۳۲ر۲ کروڑ روپے صرف ہوئے۔ ان اخراجات میں دیہی علاقوں میں جلد از جلد پانی فراہم کرنے سے متعلق مرکزی اسکیم کے تحت خرچ کی گئی رقم بھی شامل ہے۔

چھٹے پانچ سالہ منصوبے کے دوسرے سال میں ریاستوں اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں سے ۲۹۸۳۷ گاؤں میں پینے کا پانی فراہم کیے جانے کی اطلاع ملی، جو نشانے کا تقریباً ۱۳ فیصد ہے۔ اور اس پر ۲۴۶ کروڑ روپے خرچ ہوئے۔

نئے بیس نکاتی پروگرام پر ۸۳-۱۹۸۲ء سے عمل کیا جا رہا ہے اور پینے کے پانی کے مسئلے سے دوچار دیہات میں پینے کا پانی فراہم کرنے کی غرض سے زیادہ سے زیادہ مالی وسائل کا بندوبست کرنے کے لیے ٹھوس کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔

## پہلی عالمی مزاح کانفرنس

زندہ دلانِ حیدرآباد نے آندھرا پردیش سرکار اور بعض مرکزی وزارتوں بشمول وزارتِ اطلاعات و نشریات کے اشتراک و تعاون سے پہلی عالمی مزاح کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کیا ہے۔ یہ کانفرنس حیدرآباد میں ۱۶ تا ۱۹ نومبر ۱۹۸۴ء ہوگی۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں اور بعض غیر ملکی زبانوں کے دو سو مزاح نگاروں کی شرکت متوقع ہے۔

پہلی عالمی مزاح کانفرنس کا بنیادی مقصد مختلف زبانوں کے شاعروں اور ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر افہام و تفہیم کے مواقع فراہم کرنا، اور اس طرح قومی یک جہتی و باہمی ہم آہنگی کے لیے فضا کو سازگار بنانا ہے۔

توقع ہے کہ اس چار روزہ کانفرنس کا افتتاح صدرِ جمہوریۂ ہند شری زیل سنگھ فرمائیں گے۔

پہلی عالمی مزاح کانفرنس کی کارروائیوں، اس کے مختلف جلسوں میں، مختلف زبانوں کے مزاحیہ ادب پر پڑھے جانے والے مضامین اور تخلیقات پر مشتمل ہم 'آج کل' کا خصوصی مزاح نمبر شائع کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ نمبر آئندہ فروری/مارچ ۱۹۸۵ء میں شائع کیا جائے گا۔ تفصیلات آئندہ شمارے میں دی جائیں گی۔

کرشن شرما

# آغا حشر : چند یادیں

آغا حشر کا نام زبان پر آتے ہی آنکھوں کے سامنے اس صدی کے شروع کے اردو پارسی تھیٹر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے ـــــــ ایکٹر ایکٹریسوں کے زرق برق لباس، اسٹیج کے رنگا رنگ سین سینری، مسجّع و مقفّیٰ مکالمے اور جا بجا اشعار کا استعمال، ذرا ذرا سے وقفے پر گانے اور گانے بھی موقع کے مطابق راگ راگنیوں میں بندھے ہوئے۔ اس پس منظر میں آغا حشر ہزار پہلو شخصیت بن کر ابھرے۔ وہ شاعر تھے، ڈرامہ نگار اور خطیب بھی، ایکٹر، مکالمہ نویس اور ہدایت کار بھی۔ ان کی شخصیت کے کس کس پہلو کا ذکر کیا جائے؟ جہاں سے ورق الٹیے ایک نئی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔

## مکالمے کا کمال :

ایک دفعہ آغا صاحب کے چند دوستوں نے ان سے کہا کہ بھئی اگر کسی کمین ذات کا بیٹا نالائق نکل جائے، ماں باپ کا کہنا نہ مانے اور بری صحبت کا شکار ہو جائے تو باپ اسے بُری سے بُری گالی دے کر اور مار پیٹ کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال لے گا۔ لیکن اگر شریف اور مہذب خاندان کا لڑکا اوباش ہو جائے، والدین کی رتّی بھر پروا نہ کرے اور دادِ عیش دینے لگے تو باپ اس سے گالی گفتار سے تو بات نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ والد خود اس قسم کی زبان سے ناواقف ہوگا۔ اس صورت میں باپ بیٹے کو راہِ راست پر لانے اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرے گا۔ اس کے متعلق کسی وقت ہمیں اپنے خیالات سے مستفید فرمایئے گا۔

آغا صاحب نے اس موضوع کو لے کر ایک نیا ڈرامہ (خوابِ ہستی) ہی کھڑ دیا ڈرامے کا آغاز نواب کے دیوان خانے کے منظر سے ہوتا ہے، جہاں نواب صاحب اضطراب کی حالت میں ٹہل رہے ہیں۔ رات نصف گزر چکی ہے اور ان کا بیٹا صولت ابھی تک عیاشی کے اڈوں سے نہیں لوٹا ہے۔ نواب کی بے چینی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی ہے کہ اچانک بیٹا دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی نواب صاحب ابل پڑتے ہیں :

نواب : "شرم کر۔ شرم کر۔ بے حیائی کے پتلے شرم کر۔
شریروں کے شر سے، بروں کے اثر سے
دغا سے، خطا سے، ریا سے بھرا ہے
جفا کار، عیار، مکار، موذی
فرشتے سے شیطان پیدا ہوا ہے
نہ قدرِ محبت نہ پاسِ شرافت
نہ توقیرِ عزت نہ شرم و حیا ہے
برائی کا بندہ، طبیعت کا گندہ
نہ دنیا کی عزت نہ خوفِ خدا ہے
مری شان و شوکت، بزرگوں کی عزت
مٹی دو جہاں میں ترے شہدہ پن سے
برائی بھی کہتی ہے تجھ کو برا ہے
ندامت بھی نادم ہے تیرے چلن سے

باپ کی یہ ملامت بیٹے کو ناگوار گزرتی ہے اور وہ دو بدو جواب دینے لگتا ہے۔ باپ اسے پھٹکارتا ہے :-

نواب : "باپ اور بیٹے کے مونہہ سے بدزباں ایسی سنے!"
صولت : "ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے!!
نواب : "دور ہو، دور ہو ..... جا شیطان کی طرح مردود ہو اور اس کے ایمان کی طرح نابود ہو، میری خوشی کی طرح مٹایا جائے، کانٹے کی

• ای ۶۸ - ساکیت، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

طرح بڑھے، گھاس پھوس کی مانند کٹے اور کوڑے کرکٹ کی طرح جلایا جائے ۔

لقمۂ حرص، غذائے دوزخ، کافرِ بے دیں، بندۂ زر کا
دل کا زخم، بدن کا پھوڑا، جان کا غم، ناسورِ جگر کا
ننگِ شرافت، لائقِ لعنت، کور نمک، بدخواہ پدر کا
دشمن گھر کا، دشمن در کا، دشمن زر کا، دشمن سر کا

آغا صاحب کی زبان سے یہ ڈائیلاگ سن کر اُن کے دوست عش عش کر اُٹھے۔

یہ صحیح ہے کہ حشر اکثر اپنے دوستوں کے کہنے پر یا ان کی فرمائش پر ناٹک لکھ دیا یا لکھوا دیا کرتے تھے۔ "لکھوا دیا" اس لیے کہا ہے کہ وہ خود ٹہلتے رہتے اور منشیوں کو مکالمہ بولتے جاتے۔ اور بیک وقت ٹریجڈی اور کامیڈی لکھوا دیتے۔ اس ضمن میں سعادت حسن منٹو کی شہادت موجود ہے ــــ جب منٹو آغا صاحب سے ملاقات کے لیے گئے تو آغا کے میزبان پنڈت محسن ان سے تقاضا کر رہے تھے کہ آغا صاحب میرے تھیئٹر کے لیے دو ایکٹ کی کامیڈی لکھوا دیجیے۔ میزبان کے بار بار کے تقاضے سے تنگ آکر آغا نے جھنجلا کر جواب دیا: "ابے چپ کر۔ یہاں ٹریجڈی کی باتیں ہو رہی ہیں، تجھے کامیڈی کی پڑی ہے۔" اس وقت آغا صاحب واقعۂ کربلا پر بسیط لیکچر دے رہے تھے۔

## ہندی زبان :

آغا حشر کو تاؤ بہت جلد آیا کرتا تھا۔ ان کے ایک ہم عصر پنڈت نارائن پرساد بیتاب نے، جن کا ڈرامہ "مہا بھارت" بے حد مقبول ہوا تھا۔ کہیں کہہ دیا کہ آغا اگر اردو میں لکھتے ہیں تو کیا کمال کرتے ہیں۔ اردو تو ان کی کی زبان ہی ہے۔ مزا تو جب ہے کہ وہ ہندی میں لکھ کر دکھائیں۔ کسی کمبخت نے یہی بات جا کر آغا کو جڑ دی۔ وہ بھڑک اُٹھے اور گالی لُڑھکا کر بولے: "اس ننھے بچے سے کہہ دینا کہ اب ہم بھی ہندی میں ڈرامے لکھیں گے۔ چنانچہ حشر نے "بن دیوی" لکھا، جو اسٹیج پر خوب چلا۔ اس کے بعد حشر نے زیادہ تر ناٹک ہندی زبان میں لکھے۔ "بلوا منگل عرف سورداس" (۱۹۱۵ء)، الوکھا بلیدان (۱۹۱۷ء)، ماتری بھگتی (۱۹۱۹ء)، بھاگیرتھ (گنگا) (۱۹۲۰ء)، بھیشم پرتگیا (۱۹۲۹ء) وغیرہ وغیرہ۔

دراصل آغا صاحب جن دنوں عیسائی اور آریہ سماجی لیڈروں سے مناظرے لڑا کرتے تھے، ان دنوں اُنہوں نے ہندوؤں کی دھارمک کتابوں کا مطالعہ کیا تھا، جو بعد ازاں ڈرامہ نگاری میں ان کے بہت کام آیا۔

ہندی ڈرامے ہی کی وساطت سے مشہور ڈرامہ نویس پنڈت رادھے شیام کی ملاقات آغا صاحب سے ہو گئی۔ پنڈت جی ایک عرصے سے آغا حشر سے ملنے کے متمنی تھے۔ مگر ملاقات کا کوئی موقع نہیں نکل رہا تھا۔ آخر اُنہوں نے پہلی بار کانپور میں آغا صاحب کو دیکھ لیا۔ حشر اپنا ناٹک سورداس (بلوا منگل) نیو الفریڈ کمپنی کو فروخت کرنے آئے تھے اور کمپنی کے مالک سہراب جی اوگرا سے ایک ہزار روپیہ معاوضہ طلب کر رہے تھے۔ سہراب جی خود بہت بڑے ایکٹر اور ڈائریکٹر تھے۔ اُنہوں نے کچھ سین سننے کی خواہش ظاہر کی۔ ناٹک سناتے وقت حشر صاحب نے پنڈت رادھے شیام کو بھی بلا لیا اور بڑی حلیمی سے کہا ــــ

"میں مسلمان ہوں اور اردو میری زبان ہے۔ یہ دھارمک ناٹک ہے اور ہندی زبان میں ہے۔ اس لیے کہیں کوئی خامی ہو تو بلا جھجک مجھے بتائیے گا۔" یہ آغا کا بڑکپن تھا۔ ان کے سین پڑھنے سے پنڈت جی سمجھ گئے کہ فنِ خطابت اور اپنی شے کو بیچنے کے فن میں حشر صاحب کو کمال حاصل ہے اور سہراب جی بھی کہہ اُٹھے کہ آغا صاحب آپ کا تو ایک سین ایک ہزار روپے کا ہے۔ جہاں چنتامنی (طوائف) بلوا منگل سے کہتی ہے کہ "جتنا مجھے چاہا ہے اتنا بھگوان کو چاہتے تو کلیان (مغفرت) ہو جاتا۔"

شہر کے رئیس برہمن رامداس کا اکلوتا بیٹا بلوا منگل اپنی خوبصورت بیوی رمبھا کو چھوڑ کر چنتامنی ویشیا کے عشق میں گرفتار ہے۔ باپ، "رمبھا جیسی بھارت کی ہندو لڑکی جس کی ذات میں پرماتما نے شکنتلا کی خوب صورتی، سیتا کا پتی برت دھرم اور رادھیکا کی محبت جمع کر دئے ہیں" کی جانب اشارہ کر کے بیٹے کو طوائف کے پاس جانے سے روکتا ہے۔ مگر بیٹا نہیں مانتا۔ چنانچہ رام داس اُبل پڑتا ہے:

"چنتا، چنتا، کون چنتا؟ ارے وہی بازاری طوائف، وہی دنیا کی قے، وہ ہزاروں کے موہنہ کا اُگلا ہوا نوالہ، وہ سیکڑوں ہوس پرستوں کی چچوڑی ہوئی ہڈی ...... جس کا پیشہ بدکاری، جس کی زندگی بے شرمی۔ اُس ڈراچارنی کی خاطر ایسی ستی دیوی (یعنی بیوی رمبھا) سے آنکھیں بند کرتا ہے؟ ہیرے کو ٹھوکر مار کر کنکر کو پسند کرتا ہے؟"

طوائف کا یہ کردار حشر ہی اُجاگر کر سکتے تھے۔ وہ اربابِ نشاط کے درمیان رہے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ طوائف اپنے دھندے کو گناہ نہیں بلکہ اپنا دھرم بیوپار سمجھتی ہے۔ اور اس بیوپار میں یہ اکیلی نہیں سماج بھی حصہ دار ہے۔ انہوں نے طوائف کے موضوع پر کئی ناٹک لکھے۔ حشر نے ہندی اسٹیج کی بھی قرار واقعی خدمات انجام دیں۔

آغا صاحب لکھنے اور پڑھنے ...... کے بے حد شوقین تھے۔ حتیٰ کہ جن کاغذوں میں سودا سلف لپٹ کر آتا تھا، اُن کاغذوں پر لکھی تحریر بھی ضرور پڑھا کرتے۔ ایک زمانہ میں ان کے پاس محمد ابراہیم محشر انبالوی بطور منشی کام کیا کرتے تھے۔ محشر نے ان کے چند مسودے رد و بدل کے بعد اپنے نام سے مشہور کر دئے۔ مگر کرتا خدا کا محشر کی بیوی ماسٹر رحمت کے ساتھ بھاگ گئی (جو

بہت بڑے ایکٹر تھے) اور اپنے ساتھ ان ڈراموں کے مسودات بھی لے گئی
ن کی بدولت ماسٹر رحمت ڈرامہ نویس بنے۔ اس طرح محشر کو آغا حشر کے
رقہ کا بدلہ رحمت کے ہاتھوں چکانا پڑا۔

آغا حشر اپنی تھیٹریکل کمپنیاں (شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی اور
یٹ الفریڈ تھیٹریکل کمپنی) بنا کر بھی چلا نہ پائے۔ دراصل شاعر کی لاابالی
ندگی اور چیز ہے اور کاروباری چکر دوسری چیز —— دونوں یک جا ہو
نہیں سکتے۔ جب اس راز کو آغا صاحب سمجھ گئے تو انہوں نے ڈرامہ نویس
نے رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

روپیہ خرچ کرنے میں وہ اتنے شاہ دل تھے کہ نئے ڈرامے سے
چار پانچ ہزار روپے ملتے وہ چار پانچ مہینے بھی نہ چل پاتے۔ ایک دن تو
ہ بھی آیا کہ پنڈت رادھے شیام سے کہنے لگے۔ "اکنی ہو تو دینا، پان کھائیں
گے۔ آج تو پان کھانے کو بھی جیب میں پیسہ نہیں ہے۔" یہ کلکتہ کا واقعہ
ہے، جہاں آغا میڈن کمپنی کے مانے ہوئے ڈرامہ نویس تھے اور ان کی عزت
بھی وہاں خوب کی جاتی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ستر سے زیادہ ناٹک
لکھے اور متکلم فلموں کا رواج ہونے پر ان کے بعض ناٹکوں کو فلمایا بھی گیا مثلاً
بوا منگل (۱۹۳۲ء) یہودی کی لڑکی (۱۹۳۳ء) شیریں فرہاد (۱۹۳۴ء) فلم
بنڈی داس کی کہانی اور مکالمے بھی انہیں کے لکھے ہوئے تھے اور ایک دو جگہ
ہ سین میں خود آئے بھی تھے۔ (۱۹۳۴ء)

## گالی کا فن :

منٹو کا کہنا ہے کہ گالی دینے کا سلیقہ ہونا چاہیئے۔ اگر گالی کھانے والے
و رس گلے کا سا لطف نہ آئے تو سمجھو کہ گالی بے کار گئی۔ شاید آغا صاحب بھی
ہی سمجھتے تھے اور خوب کھری کھری سنایا کرتے تھے۔ ان کا تو تکیۂ کلام
ی گالی تھا۔ مضمون کیسا ہی اہم اور موضوع کتنا ہی سنجیدہ کیوں نہ ہو، حشر
الی کو نگینے کی طرح جڑ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ امرتسر کی مشہور طوائف مختار بیگم
سے والہانہ عشق ہونے کے باوجود اسے بھی گالی دینے سے نہ چوکتے تھے۔ افسوس
ہ وہ گالیاں احاطۂ تحریر میں نہیں آ سکتیں۔

بقول شورش کاشمیری جن دنوں آغا حشر لاہور آئے ہوئے تھے۔
شہر میں بھاٹی دروازے کے باہر کراؤن ٹاکیز تعمیر کیا گیا۔ مالکوں نے افتتاح کے
لیے آغا صاحب کو بلا لیا۔ انہوں نے کلکتہ کی بلند و بالا اور سر بفلک عمارتیں دیکھ
رکھی تھیں۔ افتتاح کرنے کے بعد چھوٹتے ہی کہنے لگے : (بخیل کی ........
...... جتنا تو منڈوا اور افتتاح کے لیے انڈین شیکسپیئر آغا حشر کاشمیری کو
طلب کیا ہے۔"

ایک اور موقع پر آغا نے شورش اور ان کے چند ساتھیوں کے سامنے بعض
اچھوتے محاورے اور ان کے معنی بیان کیے، لیکن یہ تمام محاورے گالی دینے
سے متعلق تھے۔

بیتاب کا کہنا ہے کہ یوں تو آغا صاحب گالیوں کا طومار باندھ کر بات
کیا کرتے تھے، مگر ایک گجراتی ایکٹر اور ڈائرکٹر امرت لال سے ان کی خاص طور
پر چھوٹ چلتی تھی۔ بیتاب نے ایک سین لکھا اور امرت لال آغا صاحب سے
کہنے لگا۔ "ابے اِدھر آ، مجھے سین سناؤں" اور پھر سین سنانے لگے۔ قصہ یہ ہے
کہ کسی بوڑھے پادری کی کنواری بیٹی کو بدکار شہزادے کے دلال زبردستی
اٹھا لاتے ہیں۔ اس پر پادری انہیں یوں کوستا ہے :۔

گھڑی ناپاک اور قسمت غلاموں کی لڑی ہوگی
تمہارے جسم کی بنیاد چھپ چھپ کر پڑی ہوگی

شعر سنتے ہی آغا صاحب نے بیتاب کو گلے لگا لیا اور کہا کہ اس سے بہتر گالی
کا شریفانہ پہلو اور کیا ہو سکتا ہے؟

آغا لسی کے بے حد شوقین تھے۔ لاہور آتے تو رات گئے کھلے پشاوری
تانگے میں انارکلی تشریف لاتے "کبھی کنجر ساتھ ہوتے کبھی مختار"۔ اور ایک
سکھ لسی والے کی دوکان سے دو چار گلاس لسی پی کر واپس چلے جاتے۔

## اہلیہ کی وفات :

حشر کی شادی چھوٹی عمر میں ہو گئی تھی۔ لیکن شادی کے چار پانچ سال بعد
بیوی لاہور ہی میں گزر گئی۔ اس کا انہیں بہت صدمہ ہوا۔ کہنے لگے : "نیک بخت
میں بھی جلد ہی تیرے پاس آؤں گا"۔ میت کو سپرد خاک کرتے ہوئے ۳ مئی ۱۹۱۸ء
کو یہ شعر بھی کہا ؎

وارث ہے اب سے قبر مرے مہ جبین کی
یں دے چلا زمیں کو امانت زمین کی

اس کے بعد جب کبھی بیمار پڑتے لاہور پہنچ جاتے۔ "وہ سہراب رستم" فلم میں پارٹ
کے لیے مختار بیگم کو لینے لاہور آئے تھے کہ یہیں رُک کر بھیشم پرتگیہ فلمانا شروع
کر دی۔ اسی بیچ میں ان کو بلاوا آ گیا۔

ان کے اندر کا شاعر آخیر دم تک سرگرم رہا۔ اپنی موت سے چند گھنٹے پیشتر
مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر "زمیں دار" کا فون آنے پر فی البدیہہ کہا : ؏

حشر اب صحت مری گرتی ہوئی دیوار ہے

اور یہ گرتی ہوئی دیوار بالآخر ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو زمیں بوس ہو گئی۔ رہے نام
اللہ کا۔ انہیں بھی میانی صاحب کے قبرستان میں دفنا یا گیا۔ بقول شورش کاشمیری
جنازے میں ڈوم ڈھاڑیوں کے علاوہ ان کے دوستوں میں سے صرف فقیر محمد
چشتی شریک تھے۔ ناقدروں میں تثیر ہندی اور عقیدت مندوں میں خود
شورش اور بس —— جائے عبرت! ان کی زندگی میں ماہ اپریل کو بہت دخل رہا۔
اپریل میں پیدا ہوئے، اپریل ۱۹۱۰ء میں شادی ہوئی اور ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو
خالق حقیقی سے جا ملے

●●

ریں باسط

# اختر اورینوی : روز و شب کے آئینے میں

اختر صاحب دراصل ہم لوگوں کے بڑے ابّی تھے۔ بہت پیار سے بڑے
. ہم سب بھائی بہنیں اُنہیں بڑے ابّی ہی کہا کرتے تھے۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ بڑے ابی ایک نارمل انسان تھے۔ نہایت
ازن، خلیق اور ملنسار۔ ان کی شخصیت میں کوئی غیر معمولی بات نہیں
۔ پھر بھی انسان کی گھریلو زندگی باہر کی دنیا سے مختلف ہوتی ہے۔
ں کہ انسان اپنے گھر میں تمام بندشوں سے آزاد ہو کر ایک کھلی فضا
سانس لیتا ہے۔ یہی دنیا اس کی اصلی دنیا ہوتی ہے۔ اسی دنیا سے وہ
ن کے لیے مواد حاصل کرتا ہے۔

بڑے ابّی کے مزاج میں بڑی سادگی اور خاکساری تھی۔ انہیں
پسندی اور تصنع سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ رہنے سہنے، اُٹھنے بیٹھنے اور
چیت کے انداز میں اس قدر دلکشی کہ ہم لوگ اکثر حیرت میں پڑ جاتے۔
نے اور پینے کے بارے میں بہت زیادہ نفاست پسند تھے۔ میٹھی
وں سے انہیں زیادہ رغبت تھی۔ فرنی اُنہیں خاص طور پر مرغوب تھی۔
وجہ تھی کہ فرنی ضرور اُن کے ناشتے یا کھانے کے ساتھ ہوتی۔ صبح
ناشتے کے وقت وہ صرف دو پھلکوں اور ایک انڈے پر اکتفا
نے۔ دوپہر کے کھانے میں دو پھلکوں کے ساتھ تھوڑے سے چاول
سبزی اور بھنا ہوا گوشت ہوتا۔ ان کی خوراک بہت کم تھی۔
ی اور مرغن کھانوں سے دور کا واسطہ نہ تھا۔ دعوت وغیرہ
محض ہلکی پھلکی چیزیں کھا کر اُٹھ جاتے۔ اور اس کمی کو اپنی پسند کی کسی
ی چیز سے پورا کر لیا کرتے۔ دودھ پینے سے اُن کی طبیعت بھاری
جایا کرتی تھی۔ اس لیے دودھ کے بجائے اوولٹین یا بورن ویٹا زیادہ
پسند کرتے تھے۔

ہرا چنا شوق سے کھاتے۔ پھلوں میں آم انہیں بے حد پسند تھا۔
ویسے کیلے اور امرود بھی ضرور ان کے کھانے کی میز پر رہتے۔ وہ اکثر ان پھلوں
کے فوائد ہم لوگوں کو بتایا کرتے۔ کیوں کہ بڑے ابّی کی صحت شروع ہی
سے کمزور تھی۔ اس لیے اُن کے کھانے پینے اور مکمل آرام کا خاص خیال
رکھا جاتا تھا۔

گرمیوں کے زمانے میں سفید ململ کا کرتا اور سفید پاجامہ زیب تن
رہتا۔ سادگی میں وہ زیادہ خوبصورت اور شاداب نظر آتے۔ کالج سوٹ
پہن کر جاتے۔ سوٹ میں بڑے وجیہہ معلوم ہوتے تھے۔ ویسے پینٹ
اور شرٹ بھی خوب زیب دیتے تھے۔ بڑے ابّی کی شخصیت اتنی پُر وقار
تھی ایک بار مل لینے کے بعد انہیں بھلانا ناممکنات میں ہے۔

سردی کے دنوں میں کبھی کبھار جب بڑے ابّی اپنے کمرے سے
گرم چاکلیٹ رنگ کی شال اوڑھے ہوئے کھانے کے کمرے میں آجاتے
تو گھر بھر کے سبھی لوگوں کی آنکھیں چمک اُٹھتیں۔ وہ بالکل بنگالیوں
جیسے معلوم ہوتے۔

بڑے ابّی تنہائی پسند واقع ہوئے تھے۔ غل اور ہنگامے انہیں پسند نہ
تھے، اسی لیے اُن کا کمرہ عام رہائشی کمروں سے دُور ہوا کرتا تھا۔ کمرے
میں اعلیٰ درجے کا فرنیچر نہیں تھا۔ ایک مسہری، ایک لکھنے پڑھنے کے لیے
بڑی سی میز کی بغل میں بائیں طرف دو بید کی کرسیاں، دو
الماریاں، ایک اسٹیل کی اور ایک لکڑی کی۔ اسٹیل کی الماری میں وہ
اپنے ضروری کاغذات اور امتحان کے پرچے وغیرہ رکھا کرتے۔ لکڑی
کی الماری میں اُن کے کپڑے، تولیے، چادر وغیرہ رکھے ہوئے ہوتے۔
اپنی اسٹیل کی الماری کی چابی وہ کسی کو نہیں دیتے تھے۔ انہیں اندیشہ

---

لکچرار شعبۂ اردو شیلا بالا ویمنز کالج، کٹک ۷۵۳۰۰۱۔ اُڑیسہ

رہتا کہ لوگ ان کی چیزیں الٹ پلٹ دیں گے ۔ وہ اپنی چیزوں کو بڑے سلیقے سے رکھا کرتے ۔ کمرے کے ایک گوشے میں ایک چھوٹا سا ٹیبل تھا۔ جس پر آئینہ، کنگھی اور شیو کا سامان رکھا ہوا تھا۔ دیوار سے لگی ہوئی ایک شیشے کی الماری تھی ۔ جس میں کتابیں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں ۔ ان سب کے علاوہ دوسرے کمرے میں اور چار الماریاں تھیں جو ان کی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ حافظہ بہت اچھا تھا ۔ کون سی کتاب کس الماری کے کس ریک پر ہے ، اور کس کتاب کی بغل میں کون سی کتاب ہے ، اس کی جلد کس رنگ کی ہے ۔ یہ سب باتیں انہیں یاد رہتیں ۔ یہی کتابیں ان کی کل کائنات تھیں ۔

جب گھر میں مہمانوں کی بھیڑ بھاڑ ہوتی تو بڑے ابی احتیاطاً کمرے میں تالا لگا کر کالج چلے جاتے ۔ اُن کی ایک چیز بھی اگر ادھر سے اُدھر ہو جاتی تو وہ بہت پریشان نظر آتے ۔ ان کا گھر ہمیشہ بچوں، رشتہ داروں اور مہمانوں سے بھرا رہتا اور وہ ان ہنگاموں سے بے نیاز ہو کر اپنے کمرے میں کام میں مصروف رہتے ۔

اگر بڑے ابی کسی روز اپنی مصروفیتوں سے جلد فرصت پا لیتے اور تھکے ہوئے نہ ہوتے تو مسکراتے ہوئے ہم لوگوں میں آجاتے ۔ سب سے ملتے ، مزے دار باتیں کرتے ، خوب ہنستے اور ہم لوگوں کو بھی ہنساتے بچوں سے ان کے اسکول کی تعلیم کے متعلق پوچھتے پھر انہیں پیار کر کے خوش خوش اپنے کمرے میں لوٹ جاتے ۔

بڑے ابی کے احباب کا حلقہ وسیع تھا ۔ ان کے تعلقات ہر طبقے کے لوگوں کے ساتھ تھے ۔ ان کے دوستوں کا حلقہ زیادہ تر نقادوں ، ادیبوں ، شاعروں اور پروفیسروں پر مشتمل تھا ۔ ویسے ان کے خاص دوستوں میں محترمی احتشام حسین ، آلِ احمد سرور ، معین حسن جذبی ، مجاز خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔

پٹنہ میں دوستوں کا ایک اور حلقہ تھا جس میں شرف عظیم آبادی رضا کریم ، رضا نقوی واہی ، ڈاکٹر محسن ، سہیل عظیم آبادی ، جمیل مظہری بہار الدین صاحب وغیرہ شامل تھے ۔ یہ سب بڑے ابی کے بے تکلف دوستوں میں شمار ہوتے تھے ۔ بڑے ابی اپنے احباب کے ساتھ بہت کم ڈرائنگ روم میں بیٹھا کرتے ۔ ان کے سونے کا کمرہ ہی ان کا ڈرائنگ روم ہوتا ۔ جہاں وہ اپنے بڑے سے بڑے مہمان کو بھی بے تکلف سادگی کے ساتھ بٹھا لیا کرتے ۔

اکثر ایسا بھی ہوتا کہ بڑے ابی اپنی مسہری پر بیٹھے یا لیٹے ہوئے ہیں اور دوستوں کے ساتھ علم و ادب کے گہرے مسائل پر گرما گرم بحث ہو رہی ہے ۔ کبھی سیاست پر گفتگو ہو رہی ہے تو کبھی حالاتِ حاضرہ پر تبصرے ہو رہے ہیں ۔ کبھی شعر و شاعری کی رنگین اور دلچسپ محفلیں آراستہ ہوتیں ۔

بڑے ابی بڑی حساس طبیعت کے مالک تھے ۔ ملک میں کوئی پریشان کن مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا تو اس کا ان کے دل و دماغ پر بڑا گہرا اثر پڑتا ۔ اُنہیں اپنی قوم سے والہانہ محبت تھی ۔ قوم کے درد و غم کو وہ اپنا درد و غم تصور کرتے تھے ۔ بنگلہ دیش کے ہنگاموں کا اُن کے دل و دماغ پر اتنا گہرا اثر پڑا ، صحت ایسی بگڑی کہ پھر شفایاب نہ ہو سکے ۔

بڑے ابی کبھی اپنی بیماری کی وجہ سے پڑھانے نہ جا پاتے تو بڑے بے چین ہوتے ۔ کسی نہ کسی طرح ڈیپارٹمنٹ کی دن بھر کی خبریں ضرور منگوا لیا کرتے ۔ وہ بیماری کے دنوں میں گھر کے سارے لوگوں کو ہدایت کرتے کہ کسی کے آنے پر مجھے جگانا نہیں ، لیکن اگر کسی طرح انہیں معلوم ہو جاتا کہ کوئی طالب علم آیا ہے تو فوراً پکار کر کہتے کہ اسے میرے کمرے میں بھیج دو اور پھر اس طرح باتوں میں مصروف ہو جاتے کہ یہ سمجھنا مشکل ہوتا کہ بڑے ابی ابھی واقعی کچھ دیر پہلے بیمار بھی تھے یا نہیں۔ انہیں اپنے طلبا سے بے انتہا محبت تھی ۔ ان لوگوں سے باتیں کر کے وہ بے حد خوشی محسوس کرتے ۔ ہر سال کسی نہ کسی طالب علم کی مالی امداد ضرور کرتے۔ وہ ذہین طلبا کو وظیفہ دلوانا اپنا فرض سمجھتے تھے ۔

وہ پٹنہ سے باہر بہت کم جاتے تھے ۔ چھٹیوں میں بھی وہ پٹنہ ہی میں رہ کر بہت سارے ادھورے کاموں کو مکمل کرنے کا پروگرام بنا لیا کرتے ۔ اس ضمن میں آپا جان (شکیلہ اختر) کو ہمیشہ ان سے اختلاف رہا ۔ مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ صحت کی خرابی کے باوجود بارہ بجے رات تک پڑھتے رہتے ۔ مسہری پر لیٹے ہیں ، ٹیبل لیمپ روشن ہے ۔ مطالعہ جاری ہے ۔ میں نے محسوس کیا کہ بڑے ابی مطالعہ کرتے وقت کتاب کو ........
.... آنکھوں کے بہت قریب رکھتے تھے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی بینائی بہت کمزور ہو گئی تھی ۔ ویسے موٹے شیشوں کا چشمہ ان کی آنکھوں سے ایک منٹ کے لیے بھی الگ نہیں ہوتا تھا۔

اُنہیں صبح میں بہت جلد اُٹھنے کی عادت تھی ۔ نماز ادا کرنے کے بعد ہوا خوری کے لیے نکل جایا کرتے تھے لوٹتے تو قرآن شریف کی تلاوت میں منہمک ہو جایا کرتے ۔ روزانہ اخبار ضرور پڑھتے ۔ اس کے بعد شیو کرتے ۔ شیو کرنے میں وہ آدھا گھنٹہ ضرور لگاتے تھے ۔ اگر گھر کے کسی بچے کو جتانا ہوتا تو وہ شیو کرتے جاتے اور انہیں بتلاتے جاتے ۔ یا پھر اُنہیں کسی کو خط لکھنا ہوتا تو یہی اس کے لیے ان کا مخصوص وقت تھا ۔ گرمی کے دنوں میں پڑھنے لکھنے کا کام وہ اپنے کمرے ہی میں کیا کرتے تھے جاڑے کے موسم میں گھر کے احاطے میں امرود کے پیڑ کے نیچے میز

یاں لگوا دیا کرتے جیسے جیسے دھوپ ڈھلتی جاتی آپ کی کرسی بھی
طرح کھسکتی جاتی ۔ اگر کوئی ملنے کے لیے آتا تو وہیں پر اور کرسیاں
جاتیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر تک کمر سیدھی کرنے
عادت تھی ۔گرمی کے دنوں میں وہ اپنے کمرے میں سوتے ، لیکن
اڑے کے دنوں میں اندر کے برآمدے میں جو تخت پر فرش بچھا ہوتا
ی پر آرام کرتے کیوں کہ اس جگہ دھوپ چار بجے شام تک رہتی تھی اور اسی
ت پر آپا جان (شکیلہ اختر صاحبہ) اپنی بہنوں کے ساتھ بیٹھی مختلف باتوں میں مشغول رہتیں۔
انہ داری کی الجھنوں ، رشتہ داروں کے مختلف مسئلوں پر یا پھر
وسٹر کی ڈیزائنوں پر گفتگو ہوتی ۔ ان سبھوں کے درمیان بڑے ابی تکیہ
ئے کمبل ڈالے کچھ سوتے ہوئے کچھ جاگتے ہوئے چپ چاپ پڑے رہتے ۔ ان کی
کھیں بند ہوتیں ، لیکن کان کھلے ہوتے ۔ بیچ بیچ میں ایک دو جملہ
ل کر مجلس کو اور زیادہ دلچسپ بنا دیتے ۔ گھر کے اکثر معاملوں
ن وہ صرف مشورے دیا کرتے تھے ۔ کبھی کسی بات کو زبردستی منوانے
انہوں نے کبھی کوشش نہیں کی ۔

جاڑے کے موسم میں بڑے ابی چائے کے شوقین ہو جاتے ۔
ن کے ساڑھے تین بجتے اور ان کے کمرے سے چائے کی آواز آنے
ی ۔ چائے پی کر یا تو تیار ہو کر وہ باہر نکل جاتے یا پھر کبھی موڈ نہیں
تا تو لحاف لپیٹ کر اپنے کاموں میں مشغول ہو جاتے ۔

بڑے ابی کا اپنا ایک خاص ملازم الگ سے ضرور ہوا کرتا ۔ اسے
کم تھا کہ جب تک میں گھر پر رہوں وہ گھر کے کسی دوسرے کام
ں ہاتھ نہ بٹائے ۔ ان کی اس ہدایت پر ہر ملازم بڑی ذمہ داری
ے عمل کرتا ۔ بڑے ابی کو اپنی زندگی میں طرح طرح کے نوکروں سے
سطہ پڑا ۔ وہ نوکروں کو بہت عزیز رکھتے تھے ۔ لیکن اگر کسی نوکر نے
ن کے کاموں میں ذرا سی بھی کوتاہی کر دی تو پھر اس نوکر کی شامت آجاتی۔
سے مرغا بننے کی سزا دی جاتی ۔ گھر میں اس کے مرغے کی آواز نکالنے
بڑا مزے دار تماشا ہوا کرتا تھا ۔ اپنے نوکروں کو اس قسم کی مزے دار
زا دے کر چند دنوں تک وہ بڑی ہمدردی سے پیش آتے ۔ اور اسے
نما کے لیے پیسہ دے کر چھٹی دے دیا کرتے تھے ۔

میں چھ سال کی عمر سے اپنے والدین کو چھوڑ کر بڑے ابی کے ساتھ
یں رہنے لگی تھی کیوں کہ جمشید پور میں کسی اچھے اسکول کا انتظام نہیں ہو سکا۔
علیم کے لیے بڑے ابی کے گھر سے بڑھ کر کوئی اور گھر خاندان والوں کا نہ تھا۔
رے آنے کے بعد میرا خالہ زاد بھائی نعیم بھی آگیا ۔ ہم دونوں بھائی بہن نے
کر سب سے پہلے بڑے ابی کے گھر کو ایک خوب صورت ہوسٹل کی شکل
ے دی ۔ نعیم ، جسے ہم لوگ پیار سے نمی کہا کرتے تھے ۔ وہ بڑے ابی کے
چھوٹے بھائی فضل احمد صاحب کا بڑا لڑکا تھا ۔ کیونکہ بڑے ابی کی کوئی اولاد
نہیں تھی ، اس لیے انہوں نے شروع ہی سے نمی کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا ۔
اس طرح نمی مستقل طور پر بڑے ابی کے یہاں آگیا اور ان کا واحد پیارا
بیٹا بن گیا ۔ اس نے اپنی پوری تعلیم بڑے ابی کے ساتھ رہ کر پوری کی ۔
اور ایم ۔ بی ۔ بی ۔ ایس کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کناڈا روانہ ہو گیا۔
بڑے ابی نمی کو بہت پیار کرتے تھے ۔ اس کا انہیں کوئی غم نہیں تھا کہ
ان کی کوئی اولاد نہیں ہے ۔ ہر وقت نمی کو نمو نمو کر کے بلایا کرتے ۔ طالب علمی
کے زمانے میں نمی کو اگر گھر واپس آنے میں دیر ہو جاتی تو بڑے ابی بے چین
ہو اٹھتے ۔ کبھی ان کی نگاہ گھڑی پر ہوتی تو کبھی گیٹ کی طرف جاتی ——
اور جب ان کی پریشانی ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ جاتی تو وہ تیز تیز
قدموں کے ساتھ برآمدے اور لان میں ٹہلنے لگتے ۔ ہم لوگ بھی بڑے ابی
کی پریشانی دیکھ کر سہمے سہمے سے رہتے ۔ اور نمی کی سلامتی کے لیے دل ہی
دل میں دعائیں کرنی شروع کر دیتے ۔ اور جب نمی ہنستا ہوا آجاتا تو ہم
لوگوں کی جان میں جان آجاتی ۔ بڑے ابی اسے بہت پیار سے دیکھتے
ہوئے اتنا کہہ کر مطمئن ہو جاتے کہ نمو بیٹے اتنی زیادہ دیر مت کیا کرو جانتے ہو
مجھے بہت گھبراہٹ ہونے لگتی ہے ۔

اختر صاحب دراصل ہم لوگوں کے بڑے ابی تھے ۔ بہت پیارے
بڑے ابی ۔ یوں تو شکیلہ اختر ہم لوگوں کی خالہ جان ہیں اور چند بچوں
کی پھوپھی جان بھی ۔ لیکن ابتدا ہی سے ہم لوگوں نے انہیں ان کے سارے
بھائی بہنوں کو آپا آپا کہتے سنا ، اس لیے بچپن ہی سے ہم لوگوں نے
یہی سمجھا کہ یہ آپا ہم لوگوں کی بھی آپا ہیں ۔ نتیجتاً وہ مستقل آپا بن گئیں ۔

وقت گزرتا گیا اور آپا جان اور بڑے ابی کے خوب صورت
ہوسٹل میں بچوں کی تعداد بڑھنے لگی ۔ جہاں آم اور امرود کی ایک ایک
شاخ ، لیموں کی ایک ایک ٹہنی اور شہتوت کی ڈالیوں پر تنہا نمی کا قبضہ
تھا ۔ اب دوسرے بچوں نے بھی ان پر اپنی ملکیت جمالی ۔ ان بچوں
کے ساتھ بھی یہی مجبوری تھی کہ جن شہروں میں ان کے والدین رہتے
تھے ، وہاں کوئی اچھا انگلش میڈیم اسکول نہیں تھا ۔

آپا جان کا رعب سارے بچوں پر یکساں تھا ، لیکن ان
لوگوں سے آپا جان کی محبت اس قدر بے پایاں تھی کہ اسکول سے آکر
اگر کسی بچے نے آپا جان کو نہیں دیکھا تو وہ اداس ہو جاتا ۔ اس میں شک
نہیں کہ آپا جان نے ہم سب بہن بھائیوں کو ایک مثالی ماں جیسی محبت
دی ۔ سویرے سے اٹھ کر رات کے سونے تک وہ سارے بچوں کی دیکھ
بھال میں مصروف رہتیں ۔ حسب ضرورت مختلف بچوں پر الگ الگ توجہ
کرتیں ۔ بڑے ابی اور آپا جان کی تعلیم و تربیت میں ہم لوگوں نے وہ اثرات

پائے جو کبھی زائل نہ ہوں گے۔ اتنی شفیق ماں اور اس قدر پیار دینے والا عظیم باپ اب کہاں۔ اور کسے نصیب !!؟

بڑے ابی کو گھر کے سارے بچوں سے بے حد پیار تھا۔ ان کی محبت، اُن کے مزاج کی نرمی، اُن کی دلچسپ باتیں، مزے دار لطیفے یہ تمام چیزیں ایسی تھیں، جن کی وجہ سے بچے بڑے ابی سے بے حد بے تکلف اور مانوس تھے۔ بڑے ابی اکثر اپنے کمرے میں بچوں کو بُلا بُلا کر چھوٹی چھوٹی انگلش اور اردو کی نظمیں سنتے۔ بچوں کو انعام ملتا۔ کتابیں ملتیں۔ اور بہت سارا پیار۔ اس کے علاوہ بچوں کو الاؤنس دینے کا انہیں بڑا شوق تھا۔ ہر ماہ کی پہلی یا دوسری تاریخ تک وہ بڑے پیارے بچوں کو..... کمرے میں بلا بلا کر پیسے دیتے۔ پیسوں کی صورت یہ ہوتی کہ بڑے لڑکوں کو زیادہ اور چھوٹوں کو بالترتیب کم۔ عمر کے لحاظ سے نمی کو ۲۵ روپے۔ مجھے لڑکی کی حیثیت سے پندرہ روپے اور اس طرح کم ہوتے ہوتے ننھی رومی کو صرف ایک روپیہ ملا کرتا۔ رومی غریب کو اپنے حصّہ کی اتنی چھوٹی سی رقم پر بڑا افسوس تھا۔ وہ اکثر پوچھتی بڑے ابی میں اور کتنے دنوں کے بعد شیریں آپا جیسی بڑی ہو جاؤں گی۔ تو آپ مجھے بھی پندرہ روپے دیں گے۔ رومی کے اس بھولے پن کے سوال پر بڑے ابی ہنس دیا کرتے، لیکن رومی کا چہرہ اداس رہتا۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ میرا ماموں زاد بھائی تنویر احمد کہیں سے آیا اور میری چھوٹی بہن زرّیں یوں اُسے اچانک آتے دیکھ کر بے اختیار بول اُٹھی :

آپ آئے تو خیالِ دلِ ناشاد آیا
کتنے بھولے ہوئے زخموں کا پتہ یاد آیا

اس کے فوراً بعد بڑے ابی کی آواز اُن کے کمرے سے آئی۔ زرّیں اِدھر آؤ تو۔ ہم لوگوں نے سمجھا کہ اب ضرور زرّیں کو ڈانٹ پڑے گی۔ اور اس انتظار میں تھے کہ زرّیں آنسو ٹپکاتی ہوئی پہنچے گی۔ لیکن اس وقت ہم لوگوں کو بہت تعجب ہوا جب زرّیں کے گانے کی آواز بڑے ابی کے کمرے سے آنے لگی۔ آہستہ آہستہ ہم دو تین بھائی بہن بھی پردے کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے اور اندر جھانکنے لگے۔ ہم لوگوں نے دیکھا کہ زرّیں بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھی ہوئی گانا سُنا رہی ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں دو روپے کا لال نوٹ ہے۔ دروازے پر بڑے ابی نے ہم لوگوں کو دیکھ لیا۔ تو اُنھوں نے بڑے پیار سے کہا بچو! اندر آ جاؤ۔ پھر کیا تھا کوئی کرسی پر، کوئی اُن کی مسہری پر، کوئی دریچے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ چھوٹی بے بی نے پُوچھا۔ ”بڑے ابی آپ نے زرّیں آپی کو پیسہ کیوں دیا۔ پہلے تو وہ مسکرائے پھر بولے ارے اس نے تنویر کے لیے بہت ہی عمدہ شعر پڑھا ہے۔ بڑے ابی یہ شعر نہیں ہے یہ تو گانا ہے۔ بڑے بچے بے بی کی معصومیت پر ہنس پڑے۔ لیکن بڑے ابی نے اُسے بتایا کہ گانا شعر ہی سے بنتا ہے۔

اکثر چھٹیوں میں بڑے ابی اور آپا جان گھر کے تمام بچوں کو لے کر پٹنہ کے ہارڈنگ پارک کو جایا کرتی تھیں۔ ہم لوگوں کے ساتھ کچھ ناشتہ اور پھل وغیرہ بھی ہوتے۔ بڑے ابی جوتا اُتار کر ایک طرف نرم نرم گھاس پر بیٹھ جاتے۔ یا کبھی ہاتھ کا سہارا لے کر لیٹ جاتے۔ اس کے بعد ہم لوگوں کا پورے پارک میں چکر لگانا شروع ہو جاتا۔ جب بڑے ابی کے قریب آتے تو دیکھتے کہ بڑے ابی آپا جان سے محوِ گفتگو ہیں۔ ایک ایک پھول کے حسن و نزاکت، رنگ و روغن پر تبصرہ ہو رہا ہے۔ وہ دونوں پھولوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ پارک میں کسی نہ کسی نماز کا وقت ضرور ہو جایا کرتا اور بڑے ابی سارے بچوں کو لے کر وہیں نماز پڑھتے۔ لوگوں کی نظر ہم لوگوں کی طرف ہوتی، لیکن بڑے ابی کسی کی بھی پروا نہیں کرتے۔ بڑے ابی پردے کے معاملے میں بڑے سخت تھے۔ بُرقع پہننے کی ہدایت گھر کی ساری عورتوں کو دے رکھی تھی۔ اُن کے سامنے کوئی بغیر برقع کے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ بچوں کو اکثر اپنے پاس بٹھا کر اُن کے سامنے اسلام کی خوبیاں بیان کرتے۔ کیوں کہ بڑے ابی کا تعلق احمدی فرقے سے تھا اور پٹنہ میں احمدیوں کی کوئی الگ مسجد نہیں تھی، اس لیے جمعہ کی نمازیں گھر پر ہی ہوا کرتی تھیں۔ بڑے ابی خطبے دیا کرتے تھے اور خطبوں میں زیادہ تر انہیں امور کا اظہار کرتے، جن سے ہفتہ بھر گھر کے لوگوں کی غلطیوں سے بڑے ابی کو تکلیف ہوتی رہتی تھی، لیکن پھر بھی اُن کی باتوں میں اتنا پیار ہوتا، اتنی مٹھاس ہوتی، جس سے ہم لوگوں کی اصلاح ہو جاتی۔

بڑے ابی غریب رشتہ داروں اور پڑوسیوں کا خاص خیال رکھتے۔ عید اور بقرعید کے موقع پر ہر امیر اور ہر غریب رشتہ دار کے یہاں جانا، گلے ملنا اُن کے معمول میں داخل تھا۔ تحفے تحائف لینا دینا بھی بڑے ابی کو بہت پسند تھا۔ جب بھی وہ باہر جاتے تو کسی نہ کسی کے لیے کچھ نہ کچھ چیزیں ضرور لاتے۔ لوگوں کی دعوتوں کا بھی اُنہیں شوق تھا اور سال میں ایک دو بار بڑی شان دار دعوتیں اور چھوٹی موٹی پارٹیاں ہوا کرتیں۔ جب باہر کے اساتذہ اُن کے یہاں امتحان یا موڈریشن کے سلسلے میں آ کر ٹھہرا کرتے تو ان لوگوں کے اعزاز میں گھر پر ہی بہت بڑی نشستیں ہوتیں۔ کھانا کھلانے کا پُر تکلف انتظام ہوتا۔ بالآخر مشاعرے پر یہ صحبت ختم ہوتی۔

بڑے ابی کی صحت اکثر خراب رہتی تھی، اس لیے وہ ریسرچ کا کلاس گھر پر ہی لیا کرتے تھے۔ اپنی مسہری پر وہ لیٹ جاتے۔ آنکھوں کو بند

کرکے اُنگلیوں سے دو تین بار پیشانی پر لکیریں کھینچتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتے۔ پھر چند لمحوں کے بعد ریسرچ اسکالروں سے کہتے اچھا بھائی اب لکھنا شروع کیجئے۔ ہم بولتے جاتے ہیں۔ یہ اُن کے پڑھانے کا ایک خاص ڈھنگ تھا۔ مسلسل تین چار گھنٹے تک بڑے ابی تھکے بغیر روانی اور تسلسل کے ساتھ اس طرح بیش بہا خزانے لٹاتے رہتے تھے۔

بڑے ابی سفر کرنا تو پسند کرتے تھے۔ لیکن اپنے کنبے کے ساتھ ہر اسٹیشن پر کوئی نہ کوئی چیز... خریدی جاتی۔ جیسے مونگ پھلی، ہرے چنے، بھنے چنے وغیرہ۔ وہ خود بھی بڑے شوق سے ان چیزوں کو کھاتے اور ہم لوگوں کو کھلا کر بہت خوش ہوتے۔ بڑے ابی کے ساتھ سفر کرنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ وہ بالکل دوست بن کر ہم لوگوں کا ساتھ دیتے۔

بڑے ابی کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک لمحہ ایک نامکمل ایک نہ ختم ہونے والی داستان۔ ۱۹۷۰ء میں بڑے ابی کی طبیعت خراب ہونی شروع ہوئی۔ مرض اس قدر بڑھا کہ آخری وقت تک اس سے نجات نہ مل سکی۔ اس مرض نے بڑے ابی کے شیشۂ وجود کو چکنا چور کر دیا۔ آہ، وہ حساس اور نازک طبیعت رکھنے والا پھول جیسا ادیب کیا سے کیا ہو گیا۔ اب حال یہ تھا کہ اُنہوں نے کب سے دنیا چھوڑ دی تھی اور بالکل گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے آسمان پر سارے ستارے ماند پڑ چکے ہیں۔ ان کی روشنی، ان کی جھلملاہٹ ماند پڑ چکی تھی۔ وہ باغ و بہار انسان جس کے دل کش قہقہوں سے سارا عالم گونج اُٹھتا تھا، وہ اپنی بھری پُری دنیا کو صرف خاموش اور حسرت بھری نگاہوں سے تک رہا تھا۔ ہم سارے لوگوں کے لیے ابی کا یہ مرض ایک جانکاہ حادثہ ثابت ہوا۔ بڑے ابی اپنے مرض سے ذہنی طور پر بے حد متاثر تھے۔ ان کا وجود ٹوٹ کر رہ گیا تھا، لیکن اپنی بے بسی کے آگے ان کی زبان خاموش تھی۔ پانچ سال کی انتھک کوششیں اور رات دن کی تڑپتی ہوئی دعائیں بڑے ابی کو بچا نہ سکیں۔ وہ تیس (۳۰) مارچ ۱۹۷۷ء کی بڑی منحوس رات تھی۔ ویران، گہری کالی۔ وہ دو بجے رات کو چپکے سے اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔

---

## بقیہ: ہماچل کے لوک گیت

جب ہجر کی ستائی محبوبہ اپنے محبوب کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک جاتی ہے تو اس کے تڑپتے دل کے جذبات لوک گیت میں اس طرح ظاہر ہوتے ہیں:

آ مِل آ مِل او میرے بانکے ماٹو آ
راہ تیری دِکھی ہاری گئی اکھیاں
روئی روئی دن بیتے تڑپی کے رتیاں
تیرے بِنا میرا ہور کُن ماٹو آ؟
آ مِل آ مِل او میرے بانکے ماٹو آ
جینا بو بھار ہو یا تیرے بِنا ماٹو آ

(اے میرے پیارے! جلدی جلدی آ کر مجھے مِل جاؤ۔ تمہاری راہ دیکھ کر میری آنکھیں بھی ہار گئی ہیں۔ میں نے کئی دن روتے روتے اور کئی راتیں تڑپ تڑپ کر کاٹ دی ہیں۔ میری جان سے زیادہ پیارے! تمہارے بغیر میرا اس دنیا میں اور ہے بھی کون؟ اب تم آ جاؤ اور مجھ سے ملو۔ میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔)

---

ایک اور پہاڑی دوشیزہ کی حالت دیکھئے، جسے نہ ہی کوئی خط لکھ کر دیتا ہے اور نہ ہی کوئی اس کا پیغام محبوب تک پہنچاتا ہے:

تیرا الگدا منڈا اور گدّیا تیرا لگدا منڈا
نکا نِکا چھلڈو، پچھے چھوڑی گیا تو
گھا پتر نیوں کھاندا، او گدّیا
تیرا لگدا منڈا او گدّیا

(اے پیارے گڈریے! مجھے تمہاری جدائی بہت ستا رہی ہے۔ تم جاتی بار جو اپنا بکری کا بچہ سونپ گئے تھے، وہ بھی اب تمہاری فرقت میں گھاس اور پتے کھانا چھوڑ چکا ہے۔)

---

## بقیہ: بیچ کا فاصلہ

"کیا تم نے میری سب ڈائریاں پڑھ لی ہیں؟"
حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ ضرور پڑھ چکی ہوگی۔ وہ تیزی سے اُٹھ کر میری ڈائری اُٹھا لائی، جس میں لکھا ہوا میں خود بھی بھول چکا تھا۔ وہ شروع کے دنوں کی پچکانی ڈائری تھی۔"

"تم ذرا اسے پڑھ کر سناؤ۔"
"نہیں پڑھ پاؤں گا۔"
"کیوں؟"
"پھر مجھے کئی دن نیند نہیں آئے گی۔"
وہ وحشت کے دن تھے میں وہاں لوٹنا نہیں چاہتا تھا۔

اُس نے ڈائری میز پر رکھ دی۔ ہم چُپ تھے بیچ میں کوئی فاصلہ نہیں تھا، جو حقیقت میں ہوتا بھی نہیں۔ کچھ کارنوں سے ہم اُسے محسوس کرنے لگتے ہیں..... یا بنا لیتے ہیں۔ میرے من میں اس خط کو پڑھنے کی خواہش تھی، جو ایک بھید کی طرح ابھی جیب میں پڑا تھا۔

●●

حفیظ اللہ نیولپوری

# اردو لائبریری آف اڑیسہ — تشکیل سے تکمیل تک

اواخر ۱۹۶۹ء کی کسی شام جناب امجد نجمی کے سیٹی کرشیل ٹریننگ کالج بختی بازار کٹک میں جناب معین الدین احمد سے میرا تعارف ہوا۔ موصوف کمشنر آف ٹیکس کے عہدے سے حال ہی میں سبکدوش ہوئے تھے۔

احمد صاحب نے ملازمت سے سبکدوش ہونے سے قبل کٹک میں ایک بین لسانی پبلک لائبریری قائم کرنے کا خاکہ ذہن میں مرتب کر رکھا تھا۔ اور اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ خود غرضی اور نفس پرستی کے دور میں ایک عظیم لائبریری کا قیام جان جوکھم میں ڈالنے کا کام تھا لیکن احمد صاحب کے پیش نظر اندرون اور بیرون ملک کے کئی لوگوں کی انفرادی کد و کاوش سے عظیم لائبریریوں کے قیام کی مثالیں موجود تھیں۔ موصوف نے کٹک میں ایک ایسی لائبریری کے قیام کا منصوبہ بنایا جس کی کٹک کے لوگوں کو اور خصوصی طور پر لسانی اقلیت کے اردو داں طبقہ کو شدید ضرورت تھی تاکہ وہ اردو کے ساتھ ساتھ صوبائی زبان و ادب سے بھی مساوی طور پر اپنی دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے ادب و صحافت کے ارتقا میں اپنی شناخت قائم کر سکیں۔

احمد صاحب نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے مقرب دوستوں اور دانشوروں سے انفرادی طور پر اس ضمن میں صلاح و مشورے کیے اور بالآخر ۱۹ جون ۱۹۷۰ء کی شام اپنی رہائش گاہ "نشاط" میں چند موقر دوستوں اور عزیزوں کو عشائیہ پر دعوت دی۔ مقصد کٹک میں ایک بین لسانی لائبریری کے قیام پر مشورہ کرنا تھا۔ اس نشست کی صدارت اڑیسہ کے سابق ایم ایل اے سید فضل حق مرحوم نے کی تھی۔ اس نشست میں ایک پبلک اردو لائبریری کے قیام پر ہمہ جہت تبادلہ خیال ہوا جب کہ اس وقت اس منصوبہ کی تکمیل کے لیے کوئی فنڈ یا ممکن اثاثہ پیش نظر نہیں تھا۔ عملی طور پر کوئی بھی احمد صاحب کے ساتھ پیش قدمی کے لیے تیار نہ تھا۔ البتہ اس نشست میں کئی تجاویز منظور ہوئیں اور ان کی رو سے احمد صاحب مجوزہ لائبریری کے صدر منتخب ہوئے۔ اب سب کچھ کرنا ان کے سر تھا۔ اگرچہ یہ ایک بین لسانی لائبریری کا خاکہ تھا لیکن چونکہ پورے صوبہ اڑیسہ میں اس نوعیت کی کوئی لائبریری موجود نہ تھی اس لیے تجویز کے مطابق لائبریری کا نام **اردو لائبریری آف اڑیسہ** رکھا گیا۔ حالانکہ کٹک میں اقبال میموریل لائبریری۔ گاندھی میموریل لائبریری۔ نجمی لائبریری۔ راوڑکیلا میں پبلک اردو لائبریری۔ نیولپور میں احسان میموریل لائبریری اور بھدرک میں بھی ایک اردو لائبریری کا قیام عرصہ دراز سے عمل میں آچکا تھا لیکن ان میں سے اکثر و بیشتر لائبریریاں معطل ہو چکی تھیں۔

ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے ساتھ اردو داں طبقہ کو صوبائی زبان اڑیا اور انگریزی زبان و ادب کے مطالعہ کے لیے بیک وقت ہر ممکنہ سہولت کی فراہمی کے نقطہ نظر سے یہ ایک ایسی لائبریری کا خاکہ تھا جو بین لسانی دلچسپیوں کو برقرار رکھتے ہوئے قارئین کے حلقہ میں قومی یکجہتی، محبت، اخوت اور فراخدلی کا جذبہ پیدا کر سکے۔

(الف) لائبریری کا نام اردو لائبریری آف اڑیسہ ہوگا۔

(ب) لسانی اقلیت کے مطالعہ کی تمام سہولتیں فراہم کی جائیں گی اور اس کے علاوہ صوبہ میں مروجہ دوسری زبانوں کے مطالعہ کے لیے بھی سہولتیں فراہم ہوں گی۔

(ج) شہر کے مناسب علاقہ میں لائبریری کی عمارت تعمیر کی جائے گی جس میں دارالمطالعہ (Reading Room) لکچر ہال اور ثقافتی شعبوں کے لیے وسیع کمرے ہوں گے۔ اور نچلی منزل میں چند ایسے کمرے بھی تعمیر ہوں گے جنہیں تجارتی مقصد سے کرایہ پر دے کر اس کی آمدنی سے لائبریری مستقبل میں خود کفیل ہو سکے گی۔

(د) لائبریری کی تعمیر کے عطیہ کی رقم کم از کم پانچسو روپے ہوگی۔ عطیہ دینے کے بعد اگر کسی وجہ سے کوئی اپنی رقم لینا چاہے تو وہ اس کا مجاز ہوگا۔

(س) تعمیر عمارت کے لیے دو سال کی مدت میں کم از کم پچاس ہزار روپیے فراہم کیے جائیں گے بصورت دیگر یہ منصوبہ منسوخ کر دیا جائے گا اور عطیہ کی تمام رقوم متعلقہ افراد کو واپس کر دی جائے گی۔

---

مرزا پور بھدرک — ۷۵۶۱۰۰ — اڑیسہ

(ز) اگر دو سال کے اندر پچاس ہزار روپے فراہم ہو جاتے ہیں تو لائبریری کی عمارت کے لیے خرید ا جائے گا۔ عمارت کی تعمیر کے لیے مزید تین لاکھ روپیوں کی فراہمی کے لئے جد و جہد جاری ی۔

لائبریری کی تعمیر کے سلسلہ میں احمد صاحب نے مذکورہ بالا چھ شدت پسند اصول قائم کیے اب نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ اڑیسہ کے اردو داں طبقہ کی مالی استطاعت کا غالباً سانے کوئی خیال نہیں رکھا۔ اڑیسہ جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد مشکل سے دو فیصد ہو عاشی حالت بھی اچھی نہیں جہاں ماحول پر جمود طاری ہو۔ اور فرد اپنی مرکزیت کا سودائی ساتھ دینے والا کوئی نہ ہو۔ زبان و ادب کے نام پر قومی خدمت کے جذبہ کے تحت جہاں آج گمان گذرے کہ ع

ایک اک کر کے ہوئیں تاریک ساری بستیاں

ایسے ماحول میں دو سال کے اندر پچاس ہزار روپے کی فراہمی اور لائبریری کی عمارت لیے مزید تین لاکھ روپیوں کا حصول دور دراز کار باتیں تھیں۔ لیکن کسی میں احمد صاحب کو کرنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ بس یہی کہا کرتے کہ لسانی اقلیت کو اگر اپنے لیے ایک شایان شان ہ قائم کرنے کی توفیق نہیں ہے تو کسی مضحکہ خیز ادارہ کی تشکیل کی بہ نسبت اس خیال سے باز ی بہتر ہے۔ بہر حال انہوں نے اپنے ذہنی خاکہ کے متعلق لائبریری کی عمارت کا بلیو پرنٹ صول و ضوابط تیار کیے۔ مقامی اخبارات میں "اردو لائبریری" کے قیام کی منصوبہ بندی سامنے ۔ انہوں نے اپنے منصوبہ کا خاکہ شایع کر کے لوگوں میں تقسیم کروایا۔ ٹیلی فون پر موقر حضرات سے رابطہ قائم کیا اور اندرون و بیرون اڑیسہ کے اہم لوگوں کو اس سلسلہ میں خطوط لکھے۔ اپنے ریسہ کے مختلف شہروں کا دورہ کرتے رہے۔ کلکتہ سے دہلی اور دہلی سے کالی کٹ تک کا مر کیا۔ مقصد صرف ایک ہی تھا کہ کس طرح اس دور افتادہ اور بنجر علاقہ میں علم و عرفان کی شمع شن ہو اور ایک بے مثال لائبریری کا قیام عمل میں آسکے۔

لائبریری کے قیام کے سلسلہ میں انہوں نے اس زمانہ میں اڑیسہ کے گورنر ڈاکٹر کت اللہ انصاری۔ وزیر اعلیٰ اڑیسہ۔ ریاست کے اعلیٰ افسران۔ ممتاز شہریوں اور مقامی وں سے ملاقاتیں کیں اور لائبریری کی تشکیل کے سلسلہ میں سرگرم عمل رہے۔ یہ وہ زمانہ ا کہ کٹک کے کچھ شر پسند عناصر نے ان کی سخت مخالفت بھی کی لیکن احمد صاحب اپنے منصوبہ شب و روز سرگرم عمل رہے۔ لائبریری فنڈ کا آغاز انہوں نے خود سے کیا۔ یکم جولائی سنہ…ء کی بات ہے۔ لیکن اس کے بعد انتہائی کوشش کے باوجود ایک ماہ تک دوسرا کوئی لیہ حاصل ہو نہیں سکا۔ فنڈ میں احمد صاحب کے عطا کردہ پانچ سو ایک روپے پڑے ہے۔ کٹک میں ایک ماہ کی کوشش میں ناکامی کے بعد احمد صاحب نے بھونیشور کا رخ کیا۔ وہاں معروف کنٹریکٹر سردار سنتوکھ سنگھ نے پانچ سو ایک روپے کا عطیہ دیا۔ اسی دوران قامی روزنامہ "سماج" کے مدیر پدم بھوشن ڈاکٹر رادھا ناتھ رتھ نے فون پر احمد صاحب گوپ بندھو بھون میں چائے کی دعوت دی۔ احمد صاحب پہونچے تو ڈاکٹر رادھا ناتھ رتھ ے ساتھ اتر پردیش کے سابق گورنر وشوناتھ داس جی بھی ان کے منتظر تھے۔ دونوں حضرات ے کٹک میں ایک بین لسانی لائبریری کے قیام کے منصوبہ کو کافی سراہا اور لوک سیوک منڈل کی جانب سے لائبریری عمارت کی تعمیر کے سلسلہ میں پانچ ہزار روپے عطیہ دینے کا وعدہ کیا یہ گویا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا تھا۔

لوک سیوک منڈل کے اس رضا کارانہ عطیہ کے اعلان اور لائبریری کی رسم افتتاح کے لیے گورنر کی تشریف آوری کی خبر نے رقم کی فراہمی کے مشن کو مہمیز لگایا اور احمد صاحب نے شب و روز کی لگن، محنت، سخت کوشش اور مسلسل رابطوں سے ۳۰؍اگست سنہ…ء سے قبل لوک سیوک منڈل کی موعودہ رقم کے علاوہ کسی طرح گیارہ ہزار پانچ سو روپے فراہم کیے۔ اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے کسی سے بھی کوئی عطیہ کیش میں وصول نہیں کیا بلکہ سب سے چیک لیے۔ اس دوران جو خرچ ہوتا رہا، وہ اپنی جیب سے سب کی کفالت کرتے رہے۔ ان کے پیش نظر ایک آہنی اصول تھا کہ اگر دو سال کے اندر پچاس ہزار روپے کی فراہمی نہ ہو سکی تو متعلقہ لوگوں کو ان کی عطا کردہ رقم واپس کر دی جائے گی Doners کو دی جانے والی ہر رسید پر یہ عبارت چھپی ہوئی تھی)

۱۹؍جون سنہ…ء کی تجویز کے مطابق اردو لائبریری کی مجلس عاملہ کے دس اراکین منتخب ہوئے تھے، جن میں معین الدین احمد بہ حیثیت بانی و صدر، ڈاکٹر سید مشتاق علی سکریٹری اور سابق سول سرجن ڈاکٹر جلال الدین احمد (مرحوم) ٹریزرر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اردو لائبریری کا منصوبہ اور اس کی تشکیل کا آغاز گرچہ معین الدین احمد کی رہائش گاہ واقع مدھو پٹنہ کٹک میں ہوا لیکن شہر سے کسی قدر دوری کی بنا پر شہر کے مرکز بخشی بازار میں واقع مدرسہ سلطانیہ کا ایک کمرہ کرایہ پر لیا گیا جہاں لائبریری کا دفتر قائم ہوا اور وہی کمرہ مستقبل کی تمام سرگرمیوں کا مرکز بنا۔

۳۰؍اگست سنہ…ء کو گورنر اڑیسہ ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری کی صدارت میں کٹک کے ناری سنگھ سدن میں رسم افتتاح کی تقریب ہوئی جس میں مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر رادھا ناتھ رتھ اور اڑیسہ اولمپک ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری شری بیرب چرن مہانتی نے مقرر خاص کے طور پر شرکت کی۔ اسی شام مدرسہ سلطانیہ کے مذکورہ کمرے میں اردو لائبریری کے ریڈنگ روم کا آغاز ہوا اور لائبریری کا وجود عمل میں آیا۔

لائبریری شام کے چھ بجے سے روزانہ رات کے ۹ بجے تک کھلی رہا کرتی۔ احمد صاحب بلا ناغہ آیا کرتے اور ان کے علاوہ مجلس عاملہ کے اراکین میں سے ڈاکٹر جلال الدین احمد (مرحوم) محمد یٰسین (مرحوم) محمد فضل امین محمد یونس اور محمد رفیق بھی آتے رہے۔

۳۰؍اگست سنہ…ء سے ۳۱؍جولائی سنہ…ء تک یعنی چار سال گیارہ مہینوں تک اردو لائبریری اسی کمرے میں محدود رہی لیکن اس کی سرگرمیاں لا محدود رہیں۔

۲۵؍اکتوبر سنہ…ء کو لائبریری کی ثقافتی سرگرمیوں کا آغاز "یوم نجمی" سے ہوا اور اڑیسہ کے نامور شاعر حضرت امجد نجمی کو لائبریری کی جانب سے سپاس نامہ اور نذرانہ پیش کیا گیا۔ ان کے تخلیقی سفر پر مقالے پڑھے گئے اور تقریریں ہوئیں۔

یکم اگست سنہ…ء کی صبح لائبریری مشن روڈ پر اپنی زیر تعمیر ذاتی عمارت میں منتقل ہو گئی۔ تعمیر کا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا لیکن عمارت کا ایک حصہ مکمل ہو چکا تھا۔ لائبریری کے سرگرمی عمل کا آغاز تو چار سال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اگرچہ شہر کٹک میں بزم سخن

اڑیسہ کے زیر اہتمام ہر ماہ کے آخری یکشنبہ کو باقاعدگی کے ساتھ طرحی اور غیر طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے اب اردو لائبریری کے زیر اہتمام بھی ماہانہ مشاعرے ہونے لگے۔ اگر باہر سے کوئی معزز ادیب یا شاعر تشریف لاتے تو ان کے اعزاز میں بھی فوری طور پر اردو لائبریری میں نشست کا انتظام کیا جاتا جیسا کہ ڈاکٹر ظفر حمیدی کے اعزاز میں ہوا۔ مشاعرہ کے علاوہ ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں دن بہ دن بڑھنے لگیں۔ ادیبوں اور شاعروں کی حیات اور ادبی خدمات پر اور دیگر ادبی سماجی اور سماجیاتی موضوعات پر مذاکرے بھی ہونے لگے۔

۱۹۷۱ء میں احمد صاحب نے کلکتہ، پٹنہ، جمشید پور، دہلی، مدراس اور کالی کٹ کا دورہ کیا اور چند اہم لوگوں سے تعاون حاصل کیا انہوں نے وزیر اعظم مسز گاندھی سے ملاقات کی اور ان کے سامنے کٹک میں اردو لائبریری کے قیام کا منصوبہ رکھا۔ وزیر اعلیٰ اڑیسہ نندنی ست پتھی نے بھی ان کی پرزور تائید کی پیہم کوششوں کے بعد مرکزی حکومت سے اردو لائبریری کو دو قسطوں میں تیس ہزار روپے کی مالی معاونت حاصل ہوئی۔ احمد صاحب نے دہلی میں حکیم عبدالحمید صاحب سے رابطہ قایم کیا۔ اگرچہ لائبریری کی تعمیر کے لیے انھوں نے کسی طرح کی مالی مدد نہ دی لیکن ہمدرد نیشنل فاونڈیشن کی طرف سے اڑیسہ کے ذہین و مفلس طلبا کے لیے ایک ہزار روپے کا سالانہ وظیفہ عطا کیا جو بعد میں ڈیڑھ ہزار کر دیا گیا۔

دوسرے سال احمد صاحب پھر دہلی گئے اور نائب وزیر تعلیم پروفیسر یادو سے ملاقات کی اور لائبریری کی تعمیر کے لیے دس ہزار روپے کا مالی عطیہ حاصل کیا احمد صاحب نے لائبریری کے قیام اور اس کی عمارت کی تعمیر میں جو قربانیاں دیں اس کی مثال خال خال ہی کہیں نظر آسکتی ہے۔ ان کے استقلال اور عزم مصمم کی اور ایک زندہ مثال ملاحظہ فرمائیے۔ انہوں نے نظام حیدرآباد کے Charitable Trust کو لائبریری کی تعمیر عمارت کے لیے مالی معاونت کی درخواست بھیجی لیکن وہاں سے کوئی جواب موصول نہ ہوا تو بذاتِ خود حیدرآباد پہونچے۔ کٹک سے حیدرآباد کا سفر خاصا طویل ہے۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ٹرسٹ کے چیرمین پرنس مفخم جاہ بہادر لندن میں ہیں اور ان کی واپسی تقریباً چار ماہ بعد ہوگی۔ احمد صاحب بے نیل و مرام واپس لوٹے۔ اس کے بعد ٹرسٹ کے افسران سے رابطہ قائم رکھا۔ بالآخر ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پرنس مفخم جاہ سے ملاقات کے لیے اپوائنٹ منٹ پانے پر جاکر حیدرآباد میں ملاقات کی اور مدعا بیان کیا۔ پرنس نے بتایا کہ ٹرسٹ کی آمدنی کے ذرائع محدود ہو گئے ہیں اس لیے کسی بھی بیرونی ادارہ کی مالی امداد ممکن نہیں۔ محض احمد صاحب اور ان کے منصوبہ سے متاثر ہوکر پرنس نے بورڈ آف ٹرسٹیز سے پرزور سفارش کی نتیجہ کے طور پر چار ماہ بعد اردو لائبریری کی تعمیر کے سلسلے میں وہاں سے ۹ ہزار روپے دستیاب ہوئے۔

احمد صاحب نے بمبئی جاکر داؤدی بوہرہ جماعت کے روحانی پیشوا ڈاکٹر برہان الدین سے ملاقات کی اور ان کے سامنے اپنا منصوبہ اور تفصیلی حالات رکھے تو انہوں نے لائبریری کی تعمیر عمارت کے لیے پانچ ہزار روپے کا چیک عنایت کیا۔ جمشید پور کے سفر میں احمد صاحب نے کریمیہ ٹرسٹ کی توجہ بھی اردو لائبریری کی تعمیر کی جانب مبذول کرائی۔ وہاں سے تعمیر فنڈ کے لیے تین ہزار روپے حاصل ہوئے اور راوڑکیلا کے تاجر سراج الدین اور ان کے شریک تجارت حاجی عبدالغفور سے مذکورہ مد میں تین ہزار روپے کا عطیہ حاصل ہوا۔ اڑیسہ کے وزیر اعلیٰ وشوناتھ داس نے بھی ریاستی حکومت کی جانب سے نو ہزار روپے تعمیر کے سلسلے میں منظور کیے تھے۔ بعد میں اردو لائبریری کا ایک وفد ڈاکٹر رادھاناتھ رتھ کی قیادت میں اس وقت کی وزیر اعلیٰ نندنی ست پتھی سے ملا انھوں نے حکومت کی جانب سے پندرہ ہزار روپے منظور کیے۔ ڈاکٹر رادھا ناتھ رتھ نے اردو لائبریری کی تشکیل سے تعمیر تک ہر قدم پر ممکنہ خدمات انجام دیں۔

اڑیسہ وقف بورڈ نے تعمیر عمارت کے لئے دس ہزار روپے منظور کیے لیکن وقف بورڈ سے اس رقم کی وصولیابی میں طرح طرح کی سیاسی رخنہ اندازیاں ہوئیں اور بالآخر جناب معین الدین احمد کی متواتر کوششوں اور اعلیٰ اثرات کے تحت یہ رقم انتہائی مشکلوں سے وصول ہوئی اور خدا خدا کر کے اس "مرد کامل" کی متواتر ۲۰ مہینوں کی کوششوں سے ۲۰ فروری ۱۹۷۲ء کو لائبریری کی تعمیر کے لیے متعینہ رقم فراہم ہو سکی۔

جہاں اردو لائبریری کی تعمیر کے سلسلہ میں مختلف مالی وسائل کا ذکر سامنے آیا وہیں عمارت کی تعمیر کے سلسلہ میں مقام کے تعین کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے۔ مجلس عاملہ کے اراکین میں سے کچھ کی رائے تھی کہ لائبریری کا قیام ایسی جگہ ہو جہاں اقلیت کی اکثریت آباد ہو۔ لیکن بانی لائبریری کے سامنے دو صورتیں قطعی مختلف تھیں۔ اول تو یہ کہ لائبریری کا قیام شہر کے ایسے علاقہ میں ہو جہاں قارئین کی وافر تعداد سہولت کے ساتھ پہونچ سکے اور ساتھ ساتھ وہ علاقہ بزنس کے اعتبار سے بھی اہم ہو تاکہ لائبریری سے منسلکہ کمروں کا زیادہ سے زیادہ کرایہ وصول ہو سکے تاکہ مستقبل میں لائبریری خود کفیل ہو سکے۔ دوسری نفسیاتی بات یہ تھی کہ لسانی اقلیت کے لوگ الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے عدم اعتماد کا شکار ہو رہے ہیں۔ اگر انھیں غیر اردو داں لوگوں کے ساتھ مل کر مطالعہ کرنے کا موقع مل جائے تو بین لسانی رابطوں سے قومی یکجہتی کی راہیں ہموار ہو سکتی ہیں اور فرد احساس کمتری کے خول سے باہر نکل سکتا ہے۔ لیکن مسئلہ تھا مجوزہ عمارت کی تعمیر کے لیے پلاٹ کے انتخاب کا۔ شہر کٹک میں بخشی بازار کو شہر کا مرکزی حصہ سمجھا جاتا ہے۔ مشن روڈ بخشی بازار چوراہے سے ہوتا ہوا مغرب کی جانب شیل بالا ویمنز کالج تک جاکر کٹک چنڈی کے چوراہے میں ضم ہو جاتا ہے۔ اس سڑک پر سیدھے چلتے جائیے تو داہنی طرف بخشی بازار نیو مارکیٹ کی دلکش دکانیں۔ ذرا آگے بڑھیئے تو گوپ بندھو باغ سے متصل خوبصورت میونسپل گیسٹ ہاؤس۔ بائیں طرف نگاہ اٹھائیے تو مدرسہ سلطانیہ کا وسیع احاطہ جسے شہر کی انفرادی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز سمجھا جاتا ہے ذرا آگے چل کر داہنی طرف روزنامہ سماج کا دفتر "گوپ بندھو بھون" اور بیس قدم آگے چلیئے تو اردو لائبریری آف اڑیسہ کی عمارت۔ لیکن یہ عمارت آج جس سرزمین پر ایستادہ ہے اس کے حصول میں حاجی معین الدین احمد نے بڑی دشواریاں جھیلی ہیں۔

دراصل یہ خطہ خاص محال کا تھا اور اسے کسی کو بھی لیز پر دیا نہیں جا سکتا تھا۔ احمد صاحب کی متواتر کوششوں کی بناء پر اور گورنر اڑیسہ کی سفارش پر وزیر اعلیٰ شری وشوناتھ داس نے مذکورہ زمین کی مستاجری کا حکم جاری کیا اور معمول سے صرف دس فیصد پر

قیمت مقرر کردی شہر کے متعدد لوگوں اور مختلف اداروں کی ۳۶ درخواستیں مذکورہ پلاٹ کے لئے پہلے سے رکھی ہوئی تھیں جن میں روزنامہ سماج کی درخواست سرفہرست تھی۔ ایسی صورت حال میں ڈاکٹر رادھا ناتھ رتھ اردو لائبریری کے حق میں روزنامہ سماج کی طرف سے دست بردار ہو گئے۔ تب کہیں اردو لائبریری کے نام یہ قطعہ زمین ۱۳ اپریل ۱۹۷۲ء کو الاٹ ہوا جس پر وزیر اعلیٰ وشوناتھ داس نے ۲۷ اپریل ۱۹۷۲ء کو لائبریری کا سنگ بنیاد رکھا۔

۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۵ء کے دوران لائبریری کی نچلی منزل میں کرایہ پر دی جانے والی دکانوں کے چھ کمرے۔ استقبالیہ کمرہ اور اس سے ملحقہ کمرہ، وسیع لوٹیکو اور موزائیک زینے مکمل ہو چکے تھے۔ اوپری منزل کی تعمیر کا کام جاری تھا جو ۱۹۷۷ء میں تکمیل کو پہونچا۔ ۱۹۷۹ء میں لائبریری کے غسل خانے، بیت الخلا اور Caretaker کے قیام کے لئے فیملی کوارٹر کی تکمیل ہوئی۔ پچھلی چہار دیواری سے متصل ایک مستقل ڈائس بنایا گیا۔ مختصر یہ کہ حاجی معین الدین احمد کی مسلسل دس سال کی عرق ریزی اور سخت کوشی کے بعد ان کے خواب کی تعبیر "اردو لائبریری آف اڑیسہ" کے وجود کی تکمیل ہوئی تب ایسا لگا ؎

نگہہ وقت اگر ڈھونڈ سکے ڈھونڈ ہمیں
ہم ہیں اس دور کے گم گشتہ خزینوں کی طرح

اب آئیے لائبریری کے جمہوری کردار پر ایک نظر ڈالیں۔ یہاں موجود اڑیا اور انگریزی کی ۵۰۰۰ اہم کتابوں کے ذخیرہ میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ لائبریری کا ایک وسیع ریڈنگ روم ہے جو شام کے پانچ بجے سے رات کے ۹ بجے تک کھلا رہتا ہے۔ اس میں ملک سے شایع ہونے والے اردو، انگریزی اور اڑیا زبان کے تقریباً تمام موقر اخبارات، رسائل و جرائد قارئین کے لئے پابندی کے ساتھ مہیا کیے جاتے ہیں۔ مطالعہ کے علاوہ یہاں علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں بھی جاری رہتی ہیں۔ علمی و ادبی، تعلیمی، سماجیاتی اور ثقافتی موضوعات پر باقاعدگی کے ساتھ تقریریں اور مذاکرے ہوا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اگر پہلا مذاکرہ اردو میں ہوتا ہے تو دوسرا اڑیا میں اور تیسرا انگریزی میں۔ اس طرح بین لسانی ہم آہنگی کے لیے ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں ایک طرح سے توازن قائم رہتا ہے۔ اس طرح کی تقریبات میں شائقین جوق در جوق آتے ہیں۔

مذاکروں کے علاوہ لائبریری کے ثقافتی شعبہ کے زیر اہتمام دسمبر ۱۹۷۷ء میں اقبال کا جشن صد سالہ منایا گیا۔ بعد میں "غالب ہفتہ" منایا گیا اور اواخر جنوری ۱۹۸۰ء کلچرل فیسٹول منایا گیا۔ اس دن اردو لائبریری میں احمد صاحب نے سترہ ہزار روپے کا اسکالرشپ فنڈ قائم کیا۔ کلچرل فیسٹیول میں اردو گرلز اسکول کی لڑکیوں نے ایک ڈراما "کھلونا" پیش کیا۔ ۱۹۸۲ء میں لائبریری کے زیر اہتمام "نجمی ڈے" منایا گیا۔

## اردو کا پوسٹ گریجویٹ شعبہ

اڑیسہ کے دس ڈگری کالجوں میں اردو کی تدریس کا انتظام ہونے کے باوجود افسوس کا مقام ہے کہ آج تک اڑیسہ کی کسی بھی یونی ورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ سطح پر اردو تعلیم کا انتظام نہیں ہے اس کے باوجود مختلف علاقوں کے طلبا جنہیں اردو میں ایم اے کرنے کا شوق ہوتا ہے یا ضرورت آن پڑتی ہے تو وہ اتکل یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر ہی امتحان دے پاتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالات کا تقاضا تھا کہ اڑیسہ کے اردو داں طبقہ کا تعلیمی معیار بلند کیا جائے نتیجہ کے طور پر اردو لائبریری کے زیر اہتمام ۱۹۷۷ء میں عارضی طور پر اردو ایم اے کی تدریس و تعلیم کا خاصا انتظام کیا گیا جس میں ڈاکٹر شیریں باسط، سید منظر دسنوی، ڈاکٹر کرامت علی کرامت، حفیظ اللہ نیولپوری، افتخار احمد آزاد، ڈاکٹر نسیمہ بیگم، ڈاکٹر سید مسیح اللہ، مرزا انجلی ڈے، شیخ مبین اللہ اور شبیر احمد خاں نے ایم اے کی تعلیم اور تدریس کے فرائض انجام دیے۔ تعلیمی انتظامات کی ذمہ داری پروفیسر عبدالباسط خاں اور ان کی بیگم ڈاکٹر شیریں باسط کے سپرد رہی۔ مذکورہ لائبریری کے زیر اہتمام اردو ایم اے میں امتیازی کامیابی حاصل کرنے والے امیدواروں میں سے مس کشور جہاں کا تقرر رگنگ کے راونشا کالج میں اور مس فرحت شریف کا تقرر بھدرک کے گورنمنٹ کالج میں بہ حیثیت اردو لکچرر ہو چکا ہے

## اردو لائبریری کے وظائف

اردو لائبریری آف اڑیسہ کی جانب سے ہر سال ذہین اور مستحق طلبا کو وظیفے عطا کیے جاتے ہیں اور یہ سلسلہ زمانہ دراز سے چلا آ رہا ہے ۱۹۷۵ء میں معین الدین احمد نے اپنے والد مرحوم حاجی اشرف علی کے نام پر لائبریری کے اسکالرشپ فنڈ کو دس ہزار روپے کا عطیہ دیا تھا اور ان کے صاحبزادہ احمد اے خالد اور صاحبزادی تسنیم نیل اشرف نے مشترکہ طور پر اس مد میں پانچ ہزار روپے کا عطیہ دیا۔ حاجی معین الدین احمد کے برادر محترم حاجی سراج الدین صاحب نے بھی اسکالرشپ فنڈ کو دس ہزار روپے کا عطیہ عنایت کیا۔ ان رقوم کے علاوہ مختلف ۲۰ افراد نے ۵۰۰ روپے فی کس کے حساب سے لائبریری کی تعمیر فنڈ کے لیے جو عطیات دیئے تھے ان کی خواہش کے مطابق وہ رقم اسکالرشپ فنڈ کو دیدی گئی۔ حاجی عنایت کریم صاحب کے دو ہزار روپیوں کا عطیہ اور متفرق لوگوں کے مذکورہ دس ہزار روپے کل بارہ ہزار سے خیر سگالی اسکالرشپ فنڈ قائم ہوا۔ لائبریری کے اسکالرشپ فنڈ سے ہر سال ۱۰-۱۲ ماہوار وظیفے عطا کیے جاتے ہیں اور مجبور اور بے بس مریضوں کو بھی بغرض علاج و معالجہ ممکنہ مالی امداد دی جاتی ہے۔

اب اڑیسہ کے مختلف اداروں کی جانب سے اردو اکیڈمی کے قیام کے لیے زور دیا جا رہا ہے ۱۳ نومبر ۱۹۸۳ء کی آل اڑیسہ اردو کانفرنس کے موقع پر جناب معین الدین احمد نے وزیر اعلیٰ شری جانکی ولبھ پٹنایک کو مخاطب کر کے اپنی تقریر میں اردو اکیڈمی کے قیام پر زور دیتے ہوئے اپنی پچھلی تمام کوششوں اور حکومت کی تسلیوں کا پر زور الفاظ میں ذکر کیا اپنی تقریر کے دوران وزیر اعلیٰ شری جانکی ولبھ پٹنایک نے احمد صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ خاطر جمع رکھیں اڑیسہ میں اردو اکیڈمی بہت جلد قایم ہوگی اور احمد صاحب سے یہ بھی کہا کہ وہ اردو اکیڈمی کا خاکہ اور دوسری تفصیلات انھیں فراہم کر دیں۔

۱۹ دسمبر ۱۹۸۳ء کو اردو لائبریری آف اڑیسہ نے اپنی حیات کے ۲۳ سال

بقیہ صفحہ ۴۲ پر

بچت کی رقمیں تیزی سے بڑھتی ہیں
چھوٹی رقمیں بچانے والوں کے لئے
آسان منصوبہ
معمولی رقمیں بڑھتے بڑھتے
اچھا خاصہ سرمایہ بن جاتی ہیں
ہر ماہ 10 روپے بچانے پر
807.60 روپے حاصل ہوتے ہیں
معیاد پوری ہونے پر اور زیادہ بڑی رقوم پر نسبتاً زیادہ
شرح سود (سود 5 11 فیصد سالانہ
مرکب ہو جاتا ہے)
آپ 5 روپے یا اس کے
حاصل ضرب سے لامحدود رقم تک
کھاتہ کھول سکتے ہیں۔
جمع رقوم کا 50 نیصد
نکلوانے کی سہولت۔
5, 10, 15 یا 20 روپے کا
ایک کھاتہ خود بخود تحفظاتی مفاد کا
حامل ہے یعنی کہ کچھ محفوظ بچت منصوبہ
6 یا 12 ماہ کی پیشگی رقوم
رعایت کے ساتھ قابل قبول۔
کھاتے ماہانہ اقساط کے ساتھ دس برسوں
تک جاری رکھے جا سکتے ہیں یا معیادی
رقم دلکش سود کے ساتھ پانچ سال تک
مزید جمع رکھی جا سکتی ہے۔
خدمات پے رول سیونگز گروپوں اور
مہیلا پردھان ایجنٹوں کے ذریعے عین
آپ کے دفتروں یا گھروں پر دستیاب۔
ڈاک گھر 5- سالہ
مکرر جمع کھاتہ
قومی بچت ادارہ
12 سیمینری ہلز،
ناگپور- 440006
davp 84/103

# ہماچل پردیش کے لوک گیت

سرداری لال نیّر

"پہاڑاں دا رہنا چنگا او" ——— لوک گیت گاتے ہوئے ہماچل کے کنوری لوگ

ہماچل پردیش کوہ ہمالیہ کی وادیوں میں بسا ہوا ایسا پُر فضا سرسبز پہاڑی علاقہ ہے' جو اپنی مثال آپ ہے۔ یہ سرزمینِ ہند کا وہ حسین اور رنگین خطّہ ہے، جہاں قدرت اپنی تمام دل فریبیوں ........ اور تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ مدام برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں والے پہاڑوں کی سرسبزی و شادابی، سرد ہوائیں، نسیم کے ہلکے ہلکے جھونکے، بادِ صبا کی اٹھکھیلیاں چلتے ہوئے پانی، بہتی ہوئی ندیاں، شفاف و سیمیں چشمے، قدرتی جھرنے، خوب صورت جھیلیں و آبشار، سرکشیدہ پہاڑ، پھولوں کے تختے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالیاں، چیل اور دیار کے درخت اور ان کے ہرے بھرے پتے اور بلند شاخیں، سبزے کا فرشِ زمردیں، لہکتے ہوئے چھوٹے چھوٹے کھیت اور سنہرے خوشے جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش ہیں۔ یہی سرچشمہ ہیں ایسے لوک گیتوں کا، جن کی بحر اور تال میں رُوحانی مسرتوں کا سنگیت سُنائی دیتا ہے۔

یوں تو ہر علاقے کے لوک گیت اُس کے احساسات کے آئینہ دار ہوتے ہیں، لیکن ہماچل پردیش کے مچلتے، گاتے، دل میں بس جانے والے لوک گیتوں میں جو لطیف جذبات ملتے ہیں، وہ اپنا جُداگانہ لُطف و اثر رکھتے ہیں۔ ان کے پہاڑی سُریلے بولوں میں ایسی سرمستی ہے کہ سُننے والا سرشار ہو اٹھتا ہے۔ ان گیتوں کے بول نرم رو پہاڑی جھرنے کے خرام کے مماثل ہیں۔ جس طرح چراغ کی روشنی، شعلے کی گرمی اور پھول کی خوشبو اپنے گرد و نواح کو اپنی خصوصیت اور کیفیت سے معمور کر لیتی ہے، اُسی طرح ہماچل کے رُوح پرور لوک گیتوں کی ہر بھیل کے ساری کائنات کو ہم آہنگ فطرت بنادیتی ہے۔

گاؤں کے مرد اور عورتیں، اونچی نیچی پہاڑیوں اور ندیوں کے آس پاس' ہر وقت کوئی نہ کوئی رومانی گیت الاپتے سُنائی دیتے ہیں۔ ان سے جنگل اور پہاڑیاں گونج اُٹھتی ہیں پہاڑی سنگیت میں ڈھلے ہوئے اِن لوک گیتوں کی رُوح افزا نغمگی، فضاؤں کو ایک عجیب کیف و نشاط عطا کرتی ہے۔ تہواروں اور میلوں میں ڈھول نگارے، رن سنگے اور شہنائی کی آوازیں سُن کر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ جب ہماچل کے لوگ خوب صورت لباس اور زیورات پہنے، ہاتھوں میں رومال لیے، پہاڑی سنگیت کی مدبھری اور سُریلی تانوں پر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کچھ قدم آگے بڑھا کر، کچھ پیچھے کر کے، جسم کو تھرکن دے کر دل کش انداز سے لوک گیت گاتے ہیں' تو سارے ماحول میں ایک مستی سی چھا جاتی ہے۔

---

● ایل ۱۱، دی مال، شملہ ۱۰۰۱ ۱۷۱

ہماچل کے لوک گیت یہاں کی پہاڑی زندگی اور پرسکون ماحول کی حقیقی ترجمانی کرتے ہیں — یہاں کی تہذیب و تمدن کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہماچل کے لوک گیت ہی ہیں، جو پہاڑی رقص اور موسیقی کے ساتھ، رُوح اور دل کو یوں سرشار کرتے ہیں کہ ان کی نغمہ آرائی خود فراموشی کا عالم پیدا کر دیتی ہے۔

یہ پردیش عہدِ قدیم سے اپنی پاکیزہ تہذیب، اخلاق و کردار اور نفاست و نزاکت کا مرکز و مسکن رہا ہے۔ یہاں کے نیک نفس، شریف اور سادہ لوح لوگ ابتدا ہی سے موسیقی کے دلدادہ ہیں — موسیقی اُن کے لیے زندگی کا سہارا ہے، دماغی کاوشوں کا مداوا اور جسم و رُوح کی تفریح ہے۔ اور جب یہ موسیقی، یہاں کے لوک گیتوں میں رس گھولتی ہے، تو ایک وجدانی کیفیت کا سماں بندھ جاتا ہے۔ جس وقت پہاڑوں کی خنک، سرد ہوا، دیودار اور چیڑ کے درختوں سے ہو کر بہتی ہے، تو پہاڑی موسیقی سے لبریز لوک گیت کی گونج بھی ہوا میں پھیل جاتی ہے :۔

پہاڑاں دا رہنا چنگا او گڈیا
پہاڑاں دا رہنا چنگا او
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلدی
برفاں دا پانی پینا او
جینا پہاڑاں دا جینا او
شہراں شہراں بیچ تاؤ بڑے بگڑے
پہاڑاں بچ بگدیاں گنگا او
اِکلے شہراں بیچ گرمی جو ہُندی
پہاڑاں دا سیت نہ جاندا او
پہاڑاں دا رہنا چنگا او
جینا پہاڑاں دا جینا او

(پہاڑوں کی زندگی ایک بے بہا نعمت ہے۔ — یہاں روح کو تازگی دینے والے، سرد ہواؤں کے لطیف جھونکے ہیں اور پینے کے لیے برف کا ٹھنڈا پانی ہے — شہروں میں چھوٹے چھوٹے نالے — لیکن پہاڑوں میں شفاف بلوریں چشمے بہتے ہیں۔ — شہروں میں ہوش رُبا گرمی — لیکن پہاڑوں کا جاں فزا موسمِ سرما — بے بہا نعمت ہے — زندگی کا اصل لُطف پہاڑوں ہی میں ہے!)

ایسے کئی لوک گیت ہیں، جن میں قدرتی مناظر کا دل کش بیان اور اُن کے حُسن کی تعریف نہایت خوبصورتی کے ساتھ کی گئی ہے۔ اہلِ ہماچل کو کتنا پیار ہے اپنی دھرتی سے، اپنے وطن سے — یہ اس لوک گیت سے ظاہر ہوتا ہے : ؎

آساں را ہماچل آساں جو پیارا ہو
دیوی دیوتاں را پیارا ہو!
ہماچل دلیش مہارا ا ہو!
ہماچل سوَرگ مہارا ا ہو!
ہماچل مہارا بڑا پیارا ہو
بانکا دلیش پیارا ہو!
نیلی نیلی دھارا ں او —
ہماچل مہارا پیارا او!
سندر سوہنا نیناں را او —
دلیش مہارا نہیں ہورا را او!
کمی کر دے جائیں جائیں
کردے مہنی سائیں سائیں
آساں را ہماچل پیارا ہو
ہماچل سوَرگ مہارا ہو

(اے حسین و جمیل ہماچل! اے فردوسِ بریں ہماچل! تیرا حُسن بے مثال ہے۔ لازوال ہے۔ تیرے حُسن کا دنیا میں جواب نہیں۔ تجھ میں ایسی لطافت ہے جو بے مثل ہے۔ اے بہشتِ جاوداں! تو معصوم و شگفتہ روحوں کا مسکن ہے اور حیا و داتی مسرتوں کا مخزن! تیرے آغوش میں پہاڑی جھرنے ہمیشہ سہانے گیت الاپتے رہتے ہیں۔ اے میرے پیارے وطن! اے میرے ہزاروں نعمتوں سے مالا مال وطن! میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ تیری پگ ڈنڈیوں پر صبح شام محنت کرتا اور تیری خدمت کے لیے دن رات کوشاں رہتا ہوں)

پہاڑی سنگیت کی سب سے بڑی خاصیت یہی ہے کہ اس کے درد بھرے بول دل پر سیدھی چوٹ کرتے ہیں۔ لمبی تانیں اُونچے بول، راگ ا تال سے بھرپور — جیسے پہاڑی راستوں کے گھماؤ دکھلائے جا رہے ہوں۔ رہ رہ کر ہونٹ گنگ اُٹھتے ہیں : ؎

پل بھر بہئی لیتا او چندا
بروٹے دی چھاواں پل بھر بہئی لیتا لو
چھلیاں دی روٹی، چھائی دا کٹورا
ایہہ ہے بلوچاں دا کھانا لانا
چھوٹے چھوٹے ٹوپو لمبے لمبے چولوٹ
ایہہ ہے بلوچاں دا پانا لانا
پل بھر بہئی لیتا لو
بروٹے دی چھاواں پل بھر بہئی لیتا او

(او پیاری چندا! ایک لمحہ بیٹھ جا۔ اس درخت کی چھاؤں تلے ایک لمحے کے لیے بیٹھ جا۔ مکئی کی روٹی اور چھاچھ کا کٹورا — یہ ہے ہم پہاڑیوں کا کھانا۔ چھوٹی چھوٹی ٹوپیاں اور لمبے لمبے کُرتے یہ ہے ہمارا لباس — پیاری چندا! آ ایک لمحہ بیٹھ جا، اس درخت کی چھاؤں میں!)

پہاڑی عورتیں کوئی بھی کام بغیر گیت کے نہیں کر سکتیں۔ کئی گاؤوں میں دُور سے پانی لانا ہے۔ جو گاؤں جتنی زیادہ بلندی پر واقع ہے اُتنی ہی پانی لانے میں اتنی ہی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے سر پر گھڑے اور گاگریاں رکھ کر پنگھٹ جاتی ہیں۔ یہ حسین و جمیل دوشیزائیں جب اپنی پہاڑی بولی میں یہ لوک گیت گاتی ہیں تو سماں بندھ جاتا ہے : ؎

پانی کیاں کری بھرنا
سِکر جیہے دِیاں دھاراں
جیہے دِیاں دھاراں، کون بھواراں
انگیارجی جاندا سارا
لو پانی کیاں کری بھرنا

(میں پانی کیسے بھروں؟ پہاڑ کی چوٹی سے پانی
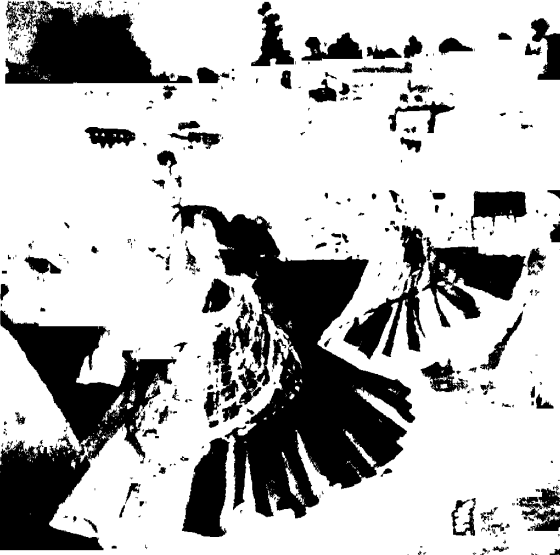
آسان نہیں۔ پانی یہاں بھرنے ..........
سے گرتا ہے۔ اس کی پھوار سے کپڑے بھیگ جاتے
ہیں۔ ہائے رے! پانی کیسے بھروں؟

---

چمبہ ہو یا کلو، مہاسو ہو یا سرمور، منڈی ہو
یا کانگڑہ، لاہول سپتی ہو یا کنور ـــــ ان سب مقامات
کے لوک گیت، محبت بھرے دلوں کی دھڑکنوں اور
حسن و عشق کی رومانی داستانوں سے بھرے پڑے ہیں۔
ان رسیلے لوک گیتوں میں ایک وجدانی کیفیت ہے۔
جو حسین ہے اور دل نشین ہے۔ اس خصوصیت کو
اگر پہاڑی تہذیب و معاشرت کا آئینہ [illegible] ورنہ
کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اپنے [illegible] لوک گیتوں میں
جھینجھ گیت، جھوری گیت، بھلیا گیت، بال گیت،
لامن گیت، پریم گیت، جدائی گیت، سپری گیت،
بارہ ماسا گیت اور رسم گیت [illegible]۔ ان کے
علاوہ کنجو، چنجلو [illegible] بھلو [illegible] لوکا،
[illegible] اور جنڈو نام کے پیار و محبت سے
[illegible] لوک گیتوں کو بھی بے حد شہرت حاصل ہے۔
[illegible] حسن و محبت" اور "ہجر و وصال [illegible] لوک
گیت تو نہایت دلچسپ ہیں۔ اس قسم کی چند
مثالیں ملاحظہ ہوں:

او میرئیے شیلا ـــــ
تیری تئیں رانیئے اے
ٹھالوں ہانڈو ہاندو تا سیلا او
لاگا کو رے ڈو بیئے
بیکا کو نے چھاپرے شیلا او
او میرئیے شیلا ـــــ
تیرے تائیں رانیئے اے
بھاؤں پورا جا کری جانا او
بانگ لاگا [illegible] نی
جاؤں لاگا کب شاکھا تا او

(اے میری رانی! تیری خاطر چاہے مجھے تھانا تحصیل
جانا پڑے، دولت خرچ ہو جائے، یہاں تک کہ
میرے گھر کے چھپر کی سلیٹیں بھی بک جائیں، میں تمہیں
حاصل کر ہی لوں گا۔ اے میری شیلا! تیرے لیے اگر
مجھے کسی کی ملازمت بھی کرنی پڑے تو وہ بھی کر لوں گا۔
بھانک چن لوں گا۔ روکھی سوکھی کھا لوں گا۔)
یہ سن کر اس کی محبوبہ بھی اسے یقین دلاتی
ہے:

اے میرے ساتھوا ـــــ
تیرے تائیں سونگیا، جبنی لاگال تینی
بنیا کو ڑوں کھوٹیا، گھر کروں پاتھرا چھینی او
او میرے ساتھوا، او میرے سونگیا!

(اے میرے ساتھی! تمہارے لیے میں بھی سب
کچھ سہنے کو تیار ہوں۔ میں زمین میں کھیتی کر لوں گی۔
میں اپنی محنت سے مکان بھی بنا لوں گی۔)
ایک طرف اس طرح کا کامل یقین ہے، تو
دوسری طرف محبوب کچھ فکر مند بھی ہے۔ اسے ڈر ہے
کہ کہیں اس کے رشتہ دار ڈھیری کی رقم نہ
دیں:

داہ لاگا دور دا، جو لاگا باہت کیھبا
بُرے میرے گھر بند رُو، ڈھیری نہ لوگئے ایچھا او
(مجھے تیرا درد ہے، تیرے درد کا احساس ہے
لیکن میرے گھر کے لوگ بُرے ہیں۔ وہ لوگوں کی
"ڈھیری" خرچ کرنا منظور نہیں کریں گے۔)
اس پر رانی کہتی ہے:

ڈھیری دے ڈھگنے، ڈھیری نہ ہونی ساتھیا
ڈھیری ہیری میں کھیتری لے سوہنی ساتھیا او
(ڈھیری کی فکر نہ کر لے میرے ساتھی! میں بچت
کر لوں گی۔ کھیتی مزدوری کر کے ڈھیری کی رقم جمع
کر لوں گی) ـــــ کتنا لطیف جذبہ ہے! کتنا بڑا قلیہ
ہے دلی محبت کا!

ہماچل کے لوک گیتوں میں "ہجر و وصال" کو بھی
خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایک نہیں، سینکڑوں
لوک گیت جدائی کے درد میں ڈوبے ہوئے ہیں ـــــ

آگے ملاحظہ

چمبہ علاقے کی گدی لڑکیاں لوک گیت گاتی ہوئی، پہاڑی لوک گیت ـــــ "پونڈیاں لکڑی دی بھرا"

گیان چند

# من کہ ...

نام : گیان چند ولد بجال سنگھ

منصب اور ذات : دگامبر جین ۔ قوم ویش اگروال (یعنی بنیا) گوتر گویل

وطن : سیوہارہ، ضلع بجنور (یوپی)

تاریخِ ولادت : محقق نہیں ۔ جنم پتری میں کچھ اور تھی ۔ ہائی اسکول سرٹیفکیٹ میں کچھ اور ۔ ایک جانکار نے جنم پتری دیکھ کر کہا تھا کہ یہ صریحاً غلط ہے۔ اب وہ بھی گم ہو گئی ۔ اس میں دی ہوئی ہندی تاریخ متوازی ہے ۱۹۔ستمبر ۱۹۲۳ء کے ۔ اس کی تائید میں کوئی تحریری سند نہیں ۔

تعلیم : انگریزی مڈل ۔ مسلم قدرت اسکول، سیوہارہ ، ۱۹۳۷ء

ہائی اسکول : پارکر ہائی اسکول، مراد آباد ۔ ۱۹۳۹ء ، فرسٹ ڈویژن فارسی اور ریاضی میں امتیاز ۔

انٹرمیڈیٹ : گورنمنٹ انٹر کالج مراد آباد، ۱۹۴۱ء سیکنڈ ڈویژن ۔

بی ۔ اے : الٰہ آباد یونیورسٹی ۱۹۴۳ء سیکنڈ ڈویژن ۔

ایم ۔ اے اردو : الٰہ آباد یونیورسٹی ۱۹۴۵ء فرسٹ کلاس فرسٹ

ڈی فل اردو : الٰہ آباد یونیورسٹی جون ۱۹۴۷ء میں مقالہ داخل کیا ۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں ڈگری ملی ۔

ایم اے سوشالوجی : آگرہ یونی ورسٹی ۱۹۵۴ء سیکنڈ ڈویژن

ڈی لٹ اردو : آگرہ یونی ورسٹی ۱۹۶۰ء

لسانیات کے موسم گرما اسکول ساگر یونیورسٹی سے ابتدائی سرٹیفکیٹ جون ۱۹۶۱ء

لسانیات کے موسم گرما اسکول' کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ سے ایڈوانسڈ سرٹیفکیٹ جون ۱۹۶۲ء

نوٹ : ڈی لٹ کے مقالے کا اصلاً عنوان تھا " شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا " اس کو دو ممتحنین پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر آلِ احمد سرور نے پاس کیا ۔ لیکن تیسرے ممتحن کلیم الدین احمد نے ترمیم کے لیے واپس کر دیا ۔ چوتھے ممتحن ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کو بھیجا گیا ۔ انھوں نے بھی ۱۹۵۷ء میں ترمیم کے لیے واپس کر دیا ۔ میں نے از سرِ نو " اردو مثنوی شمالی ہند میں " کے عنوان سے رجسٹریشن کرایا ۔ اسے تینوں ممتحنین پروفیسر سروری، پروفیسر سرور اور رشید احتشام حسین نے ۱۹۶۰ء میں پاس کر دیا ۔

خاندان : بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس " اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر " کے مصنف ہیں ۔ ۱۹۵۳ء میں میری شادی ایک ایم اے ہندی پاس خاتون سے ہوئی ۔ اولاد : ایک لڑکی' دو لڑکے ۔ اولاد کی اولاد چار عدد ۔

ملازمت : لیکچرر (۲۰۰ تا ۴۵۰ روپے) حمیدیہ کالج بھوپال ۱۰ جولائی ۱۹۵۰ء تا ۲۷ اگست ۱۹۵۳ء

سینئر لیکچرر : (۳۰۰ تا ۶۰۰ روپے) حمیدیہ کالج بھوپال ۲۸ اگست ۱۹۵۳ء تا ۱۵ جولائی ۱۹۵۶ء

پروفیسر : (۵۵۰ تا ۹۵۰ روپے) حمیدیہ کالج بھوپال ۱۶ جولائی ۱۹۵۶ء تا ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۵ء

۱۹۵۹ء میں ترقی دے کر پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج سیہور مقرر کیا گیا، لیکن انکار کر دیا ۔

پروفیسر جموں یونی ورسٹی : ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۵ء تا ۵ اکتوبر ۱۹۷۶ء

پروفیسر الٰہ آباد یونی ورسٹی : ۷ اکتوبر ۱۹۷۶ء تا ۲۵ مارچ ۱۹۷۹ء (اگست ۱۹۷۸ء میں الٰہ آباد یونی ورسٹی کی پرو وائس چانسلری کی پیش کش کو مسترد کر دیا) پروفیسر یونیورسٹی آف حیدرآباد ۲۶ مارچ ۱۹۷۹ء تا حال ۔

تصانیف : پہلی شائع شدہ ادبی کاوش " فانی بدایونی " پر ایک تنقیدی مضمون پارکر ہائی اسکول میگزین ۳۹ - ۱۹۳۸ء

کتابیں :

۱۔ اردو کی نثری داستانیں (ڈی فل کا مقالہ) پہلا ایڈیشن ۱۹۵۴ء انجمن ترقی اردو پاکستان ۔
ترمیم و اضافہ شدہ طبع دوم ۱۹۶۹ء کراچی ۔ مزید اضافہ شدہ ایڈیشن یوپی اردو اکیڈمی میں زیرِ طبع ۔

۲۔ تحریریں (مضامین کا مجموعہ) فروغِ اردو لکھنؤ دسمبر ۱۹۶۴ء

۳۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں (ڈی لٹ کا مقالہ) طبع اوّل ۱۹۶۹ء انجمن ترقی اردو ہند
دوسرا ایڈیشن وہیں ۱۹۷۸ء سے زیرِ طبع ۔

۴۔ تفسیرِ غالب (غالب کے منسوخ کلام کی شرح) سنہ اشاعت ۱۹۷۱ء درج ہے، دراصل ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی ۔ ناشر جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز ۔

۵ لسانی مطالعے (لسانیاتی مضامین) طبع اوّل جنوری ۱۹۷۳ء نیشنل بک ٹرسٹ دہلی ۔ طبع دوم کا سنہ مجھے نہیں بتایا گیا ۔

۶۔ تجزیے (تحقیقی و تنقیدی مضامین) اپریل ۱۹۷۳ء مکتبہ جامعہ دہلی
۷۔ رموزِ غالب (غالب سے متعلق مضامین) مکتبہ جامعہ دہلی، فروری ۱۹۷۶ء
۸۔ حقائق (تحقیقی و تنقیدی مضامین) ناشر خود، جولائی ۱۹۷۸ء الہ آباد
۹۔ ذکر و فکر (تحقیقی و تنقیدی مضامین) ناشر خود، سنہ طبع ۱۹۸۰ء
درج ہے۔ دراصل ۱۹۸۱ء الہ آباد۔

غیر مطبوعہ:

۱۰۔ عام لسانیات ۱۹۷۵ء سے ترقی اردو بورڈ دلی میں زیرِ طبع
۱۱۔ اردو کلامِ اقبال کی تاریخی تدوین ۱۹۰۷ء تک
۱۲۔ تاریخ ادب اردو ابتدا سے ۱۷۰۰ء تک۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کی شرکت
میں ترقی اردو بورڈ کے لیے

زیرِ ترتیب:

۱۔ اپنے شعری کلام کا انتخاب
۲۔ مضامین کا مجموعہ

انعامات:

۱۔ رسالہ 'روبی' دہلی میں سحر عشق آبادی کی غزل بہ طور مسمط کی تقطیع پر
۱۰۰ (سو) روپے
۲۔ 'اردو مثنوی شمالی ہند میں' پر یوپی اردو اکیڈمی کا ۷۱۔۱۹۶۹ء کا انعام
مارچ ۱۹۷۳ء میں ملا۔ دو ہزار روپے۔
۳۔ تفسیرِ غالب پر یوپی اردو اکیڈمی کا ۷۲ء کا انعام مارچ ۱۹۷۳ء میں ملا۔
۳ ہزار روپے۔
۴۔ لسانی مطالعے پر یوپی اردو اکیڈمی کا ۷۳ء کا انعام مارچ ۱۹۷۴ء میں ملا۔
۲ ہزار روپے۔
۵۔ تفسیرِ غالب پر غالب انسٹی ٹیوٹ دلی کا ۱۹۷۳ء کا انعام ۱۱ اپریل
۱۹۷۴ء کو ملا۔ ۵ ہزار روپے۔
۶۔ تجزیے پر جموں کشمیر اکیڈمی کا انعام ۱۹۷۵ء میں ۲ ہزار روپے
۷۔ میر اکیڈمی لکھنؤ کا امتیازِ میر انعام ۲۷ نومبر ۱۹۷۷ء کو پانچ سو روپے۔
۸۔ حقائق پر یوپی اردو اکیڈمی کا ۱۹۷۸ء کا انعام مارچ ۱۹۷۹ء میں ملا۔
۳ ہزار روپے۔
۹۔ ذکر و فکر پر ساہتیہ اکادمی سے ۱۹۸۲ء کا انعام ۱۲ فروری ۱۹۸۳ء
کو ملا۔ ۵ ہزار روپے۔

انعاموں کی جملہ رقم: ۲۳۶۰۰ روپے

رکنیت: ا۔ سابق

۱۔ گجرال کمیٹی برائے فروغِ اردو،
۲۔ ترقی اردو بورڈ
۳۔ گیان پیٹھ کی اردو کمیٹی۔
۴۔ ساہتیہ اکادمی کی اردو کمیٹی
۵۔ نائب صدر یوپی ہندوستانی کمیٹی الہ آباد

ب۔ موجودہ:

۱۔ حیاتی رکن مجلس عام انجمن ترقی اردو ہند۔
۲۔ بورڈ آف اردو اسٹڈیز عثمانیہ یونیورسٹی
اور کسی کمیٹی کا رکن نہیں۔

امراض و جراحی:

ا۔ ۶ آپریشنوں کا تجربہ جن میں ایک نس بندی کا اور پانچ ہرنیا
کے تھے۔
ب۔ خون میں سفید خلیوں کی کثرت یعنی مزمن (کرانک) لیوکیمیا
محض ۵۔۴ فی صد امکان ہے کہ کئی سال میں بڑھ کر سرطانِ
خون ہو جائے۔
ج۔ موتیا بند کی وجہ سے بینائی، اہلِ اردو میں اکبر الدین صدیقی
کو چھوڑ کر سب سے کمزور۔

---

## بقیہ اردو لائبریری آف اڑیسہ۔

پورے کٹک لائبریری کے تیرھویں جشن سالگرہ کے موقع پر ڈاکٹر رادھا ناتھ رتھ نے صدارت کی۔ گورنر اڑیسہ ڈاکٹر بی این پانڈے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے اور شریمتی پانڈے نے حاجی معین الدین احمد کی تصنیف

"Origin and Development
of Urdu Library of Orissa".

کی رسم اجرا ادا کی اس تقریب میں لائبریری کی جانب سے اڑیسہ کے تین مستند ادبا (شیخ حبیب اللہ، ڈاکٹر کرامت علی کرامت، حفیظ اللہ نیولپوری) اور ایک ابھرتے ہوئے اردو کے صحافی شیخ قریش کو سپاسنامے اور گورنر اڑیسہ کی طرف سے مالی عطیہ عنایت کیا گیا۔

مختصر یہ کہ جناب حاجی معین الدین احمد نے اپنی مسلسل جد و جہد سے سرزمین اڑیسہ میں اپنی نوعیت کی منفرد لائبریری قائم کی اور اس کے کل اثاثہ کو لائبریری ٹرسٹ کے حوالے کر کے اپنے عزم و عمل کے وافر ثبوت فراہم کئے۔

# بہ خطِ شاعر

## غزل

منزل اگر ملی ہے تو بیتابیاں بھی ہیں
راہوں کے پیچ و خم بھی ہیں گمراہیاں بھی ہیں

اک گوشۂ حیات میں محفل کی شورشیں
اک گوشۂ حیات میں تنہائیاں بھی ہیں

سمجھے تو کوئی گریۂ بے اختیار کو
اس آبجوئے درد میں گہرائیاں بھی ہیں

کیا لیجئے کیا نہ لیجئے کہ اس بزمِ ناز میں
دلداریوں کے ساتھ دل آزاریاں بھی ہیں

ملتے نہیں ہیں پھر بھی خریدار جنسِ درد
مانا کہ جنسِ درد کی ارزانیاں بھی ہیں

کچھ فردِ عمل نے راہ دکھائی ہے سوئے مے
کچھ محتسب کی ضد میں یہ میخواریاں بھی ہیں

١٦/٣/٥٦

# یاترا

## وشواناتھ درد

(۱)

ڈگر ڈگر پہ تھی قوسِ قزح امنگوں کی
نگر نگر میں تھیں پریاں حسیں ترنگوں کی
ہر ایک موڑ تھا رہبر اچھوتی منزل کا
رہِ طلب کی مسافت تھی اندھے رنگوں کی

(۲)

قدم قدم پہ اُمنگیں دیئے جلاتی ہیں
نفس نفس کا اندھیرا مٹائے جاتی ہیں
ہوائیں چیخ رہی ہیں کہ بج رہے ہیں کان
ہر ایک سمت سے اب تو صدائیں آتی ہیں

(۳)

سُنو سُنو کہ فضاؤں میں درد پلتے ہیں
روِش روِش پہ گلوں کے چراغ جلتے ہیں
ابھی تو فکر کا سورج بلندیوں پر ہے
مگر یہ وقت کے سائے ضرور ڈھلتے ہیں

(۴)

تصورات کی چلمن سے جھانکتے نہ رہو
تم اپنی آنکھ کی بے نور کھڑکیاں کھولو
صدا جو ساز کے پردے میں قید ہے کب سے
بصد خلوص ذرا اس کا مُدعا تو سُنو

(۵)

سفرِ حیات کا جب سے ہوا ہے لامحدود
اڑی ہے گرد کی مانند منزلِ مقصود
سمٹ گئے ہیں زمانے خرد کے نکتے پر
اتر رہا ہے خلاؤں میں آدمی کا وجود

(۶)

گناہ گار کا بے حس ہو جس طرح سے ضمیر
پڑے تھے راہ میں پتھر کچھ اس طرح دلگیر
میں دیکھتا تھا اُنہیں اور سوچتا تھا یہ
پڑھے گا اِن کے مقدر کی کب کوئی تحریر

(۷)

نہ جانے کتنے زمانوں کی گرد چاٹی ہے
یہ جسم ہے کہ کوئی جان دار ماٹی ہے
ہر ایک سانس ہوئی ہے بڑی کٹھن منزل
یہ عمر ہے کہ کوئی دِل شکن سی گھاٹی ہے

نگاہ پیار کی ڈالی ہے ہم نے دنیا پر
ہمارے ذوقِ سفر کی نظر ہے فردا پر

★

● ۲۶۸/۲ پشچم پوری ، نئی دہلی ۶۳ ۱۱۰۰

## غزلیں

### ندا فاضلی

ہر گھڑی خود سے اُلجھنا ہے مقدر میرا
میں ہی کشتی ہوں، مجھی میں ہے سمندر میرا
کس سے پوچھوں کہ کہاں گُم ہوں کئی برسوں سے
ہر جگہ ڈھونڈتا پھرتا ہے مجھے گھر میرا
ایک سے ہو گئے چہرے ہوں کہ موسم سارے
میری آنکھوں سے کہیں کھو گیا منظر میرا
مدتیں بیت گئیں خواب سُہانا دیکھے
جاگتا رہتا ہے ہر نیند میں بستر میرا
آئینہ دیکھ کے نکلا تھا میں گھر سے باہر
آج تک ہاتھ میں محفوظ ہے پتھر میرا

●

ممکن ہے سفر ہو آساں اب ساتھ بھی چل کر دیکھیں
کچھ تم بھی بدل کر دیکھو، کچھ ہم بھی بدل کر دیکھیں
آنکھوں میں کوئی چہرہ ہو، ہر گام پہ اک پہرہ ہو
جنگل سے چلیں بستی میں دنیا کو سنبھل کر دیکھیں
سورج کی تپش بھی دیکھی شعلوں کی کشش بھی دیکھی
اب کے جو گھٹائیں چھائیں برسات میں جل کر دیکھیں
دو چار قدم ہر رستہ پہلے کی طرح لگتا ہے
شاید کوئی منظر بدلے کچھ دور تو چل کر دیکھیں
اب وقت بچا ہے کتنا جو اور لڑیں دنیا سے
دنیا کی نصیحت پر بھی کچھ روز عمل کر دیکھیں

## حسرت شادانی

چہرہ بجھا بجھا ہے، بدن زرد زرد ہے
عالم تمام تا بہ فلک، گرد گرد ہے

امن و سکونِ قلب عبث ڈھونڈتے ہیں آپ
یہ دور جس میں صیدِ بلا فرد فرد ہے

آئے کہاں سے زور و کشش جذبِ عشق میں
جب کہ مزاجِ حُسن ہی کچھ سرد سرد ہے

صد مشکلات اور مصائب کے باوجود
ثابت قدم رہا جو، وہی مرد، مرد ہے

کچھ رہ گیا نہ رنج و مسرت میں امتیاز
حسرت خوشی خوشی ہے نہ اب درد درد ہے

● محلہ کالی [illegible] کی کانہ بیتیا، مغربی چمپارن (بہار)

## نواب احسن

نہ حق شناس تھا وہ اور نہ راہبر کوئی
اسے چڑھا نہ سکا کیوں صلیب پر کوئی

میں جانتا تھا کہ میری تلاش بھی ہوگی
اسے پتہ تو بتا یا نہیں ہے گھر کوئی

میں وہ نہیں ہوں جو محدود ہو صحیفے میں
مرے وجود کو سمجھے نہ مختصر کوئی

وہ رسم آج بھی جاری ہے اُس قبیلے میں
بلند نیزے پہ جس نے کیا تھا سر کوئی

فریب دیتے رہوگے کہاں تک احسن کو
کبھی کرو تو ذرا بات معتبر کوئی

● ۱۵۴/۲۲۶ - بخشی بازار، الہ آباد (یو۔پی)

## مہتاب پسروری

بتائیں کیا جفائے آشنا سے دل پہ کیا گزری
اٹھیں موجوں پہ موجیں جب تو پھر ساحل پہ کیا گزری

نقاب اُس نے سرِ محفل کچھ اس انداز سے اُلٹا
نہ پوچھ اے ہم نشیں اُس دم ہمارے دل پہ کیا گزری

ترے رندوں نے توڑے جب صراحی، جام اور مینا
بتا اے پیرِ مے خانہ کہ تیرے دل پہ کیا گزری

ہوئی گُل شمع، پروانے ہوئے جل جل کے خاکستر
اندھیرا ہو گیا محفل میں جب محفل پہ کیا گزری

لیا مہتاب تم نے نام جب اُس کا محبت سے
خدا معلوم اُس دم پھر دلِ قاتل پہ کیا گزری

● ۳۱۲ - محلہ ڈونگر، شاہدرہ، دہلی ۱۱۰۰۳۲

# غزلیں

## عبدالقادر ادیب

زخم گہرا ہے مگر درد چھپا رکھا ہے
آندھیوں میں غمِ جاناں کو بچا رکھا ہے

میں نے ہر غم ترا سینے سے لگا رکھا ہے
تری یادوں کا کنول دل میں کھِلا رکھا ہے

تری آواز کی نرمی سے یہ ہوتا ہے گماں
جیسے پلکوں پہ حسیں خواب سجا رکھا ہے

تری ہر سانس سے ملتی ہے حیاتِ ابدی
مسکراہٹ میں تری آبِ بقا رکھا ہے

غم کا طوفاں ہو کہ آندھی ہو، وہ آئے تو ادیب
ہم نے بھی دل کے چراغوں کو جلا رکھا ہے

● ۲۵ - چھپیا ہاسپٹل روڈ، سیکنڈ اسٹیج، اندرا نگر، بنگلور ۵۶۰۰۳۸

## عزیز انصاری

یوں بظاہر تو کتنا سخت ہوں میں
دیکھئے دل تو لخت لخت ہوں میں

تو نہ مانے یہ اور بات مگر
تیری دنیا ہوں تیرا بخت ہوں میں

بیرا ین کہ ترا شیے مجھ کو
پتھروں سے زیادہ سخت ہوں میں

مجھ میں سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں
جیسے تصویر کا درخت ہوں میں

آگ اُگلتی ہوئی زمیں پہ عزیز
یوں بچھا ہوں کہ جیسے تخت ہوں میں

● ۱۳۱ - ساؤتھ توڑا، اندور (ایم۔پی) ۴۵۲۰۰۱

## بزمی عباسی چڑیا کوٹی

تنہا جنونِ عشق کا کیوں نام لیجئے
کچھ اپنے سر تو آپ بھی الزام لیجئے

لائے ہیں میرے اشکِ تر دل کی کائنات
خونِ وفا کیا ہے تو انعام لیجئے

اب میرے غم کا ناز اُٹھانا ہے آپ کو
ہے آپ ہی کے واسطے پیغام لیجئے

کوئی وفا شعار زمانے میں ہے تو آپ
چلیے وفا سے اب تو ذرا کام لیجئے

بزمی ہمیں خطائے محبت کا اعتراف
آپ اپنی چشمِ ناز کا بھی نام لیجئے

● اکاؤنٹس انچیسر، گورنمنٹ سینٹرل سلک فارم، پریم نگر، دہرہ دون

بیر راجہ

# بیچ کا فاصلہ

وہ مجھے کناٹ پلیس کے پارک میں ملی ۔ یہ سچ نہیں بلکہ اُس نے مجھے آدبوچا ۔ اس وقت بھُو کا لیٹا ہوا اپنے اور آسمان کے درمیان دیکھتے ہوئے گل مہر کے لال پھولوں کو دیکھ رہا تھا ۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ ٹریفک کے شور سے بھی تیز تھی ، جس میں آس پاس تاش کھیلتی ہوئی ٹولیوں کا شور بھی گھُل رہا تھا ۔ نہ جانے بھوک کے اُن لمحوں میں جب دوسرے کسی نہ کسی چیز کو ذمہ دار ٹھہرا کر اپنی جھلاہٹ مٹاتے ہیں ، اس وقت میں بہت عجیب و غریب حرکتیں کرتا ہوں ۔ بھوک بھی کئی طرح کی ہوتی ہے ۔ میری بھوک ایسی ہوتی ہے ، جس کا احساس مجھے خود کبھی نہیں ہوتا ۔

گرم لُو کے تھپیڑوں سے جسم تپ رہا تھا ۔ کپڑے پسینے میں تر تھے ۔ ۔ ۔ ۔ اِرد گِرد کے سبھی لوگوں کی نظریں اس پر ٹکی ہوئی تھیں ۔ خوش مذاق فقرے ، دو معنوں والے الفاظ اور اشارے ہوا میں اُچھل رہے تھے ۔ وہ سب سے بے نیاز اور بے خبر مجھ پر جھکی ہوئی تھی ۔

اُس کا ملنا مجھے کھل رہا تھا ، جب کہ مجھے کوئی کام نہیں تھا اور نہ ہی وہ کہیں جانے کے دن تھے ۔ دن کئی طرح کے ہوتے ہیں ۔ چھوٹے دن ۔ بڑے دن ۔ ڈرانے والے دن ، اکیلا کر دینے والے دن ۔ کچھ دن بھُولنے والے دن ہوتے ہیں تو کچھ یاد رکھنے والے دن وہ بہت بے کار اور خود کو بہت چھوٹا کرنے والا دن تھا ۔ کسی پارک کے کونے میں گل مہر کے نیچے لیٹنے والا دن ۔ اُسے دیکھتے ہی لگا جیسے اُس نے مجھے چوری کرتے پکڑ لیا ہو ۔ دوسروں سے بھاگ کر ان باتوں پر سوچنا جو حقیقت میں کہیں کہیں ہی تھیں ـــــ یہ بھی ایک چوری ہی ہے ۔ چوری نہ کرنے کی چوری ، جس طرح میں نے اُس کا کچھ نہیں چُرایا تھا ۔

اُس وقت نئی دلّی کی شان و شوکت میں مجھے اپنی یتیمی کا گہرا احساس ہو رہا تھا اور من چاہ رہا تھا کہ کوئی بھی نہ دکھائی دے جائے ۔ اس کے ساتھ چل دوں ۔ اس کا ملنا ویسے ہی ایک بوجھ کی طرح مجھ پر حاوی رہتا جب کہ آج تک اُس نے کبھی مجھے تنگ نہیں کیا ۔ اُلٹا میں نے ہی اُسے ہمیشہ پریشان کیا ۔ نہ ہی اُس نے کبھی کوئی فرمائش کی نہ کسی چیز کے لیے اصرار کیا ۔ کچھ بہت معمولی باتیں کبھی کبھی پریشان کرتی ہیں ۔ جیسے اُس کی خاموشی اور کچھوے کی چال ۔ وہ ہمیشہ آہستہ آہستہ میرے پیچھے چلتی ، جب کوفت بڑھتی تو میں بھاگنے سا لگتا ۔ وہ بھی ہانپتی ہوئی میرے پیچھے دوڑنے سی لگتی ۔ تنگ کرنے کے لیے کسی راہ چلتے کو روک کر فضول باتیں کرنے لگتا ۔ وہ کچھ فاصلے پر کھڑی ہو کر خاموشی سے مجھے گھُورا کرتی ۔ میں پھر چل پڑتا تو وہ بھی چل پڑتی ۔ کئی بار اسی طرح سارا دن گھوم کر رات کو لَوٹتے اور آپس میں کبھی ایک بات بھی نہ کرتے ـــــ ایسی خاموشی میں نہ جانے اُسے کیا ملتا اور مجھے بھی ۔

آخر میں تھکے ماندے ہمیشہ کافی ہاؤس ہی لَوٹتے ۔ کوئی دوسری جگہ بھی نہیں تھی جہاں بنا پیسوں یا کم پیسوں کے بہت سارے لوگوں کے درمیان پُورے ادھیکار سے بیٹھا جا سکتا ۔ وہاں پہنچتے ہی بہت سی نگاہیں ہم پر چپک جاتیں ۔ سب مجھے اس طرح گھُورتے جیسے میں اُن کی کوئی پیاری چیز سے اُڑا ہوں ۔ اُن کی آنکھوں میں چالاک ، عیار اور سستی ہنسی ہوتی ۔ وہ کسی کی پروا کئے بغیر ، کسی خالی کرسی پر قبضہ جماتے ہی اپنا بیگ میز پر پھینک دیتی ۔ میں بھی شرارت بھری نظروں سے سب کو دیکھتا ۔

" فری لورز . . . . خاموش پرندے . . . . . گونگا جوڑا . . . " چاروں طرف کی کھُسپھُساہٹ اور کانا پھُوسی سے چھنتی ہوئی آوازوں کو سنتا اور اندر ہی اندر دُہرایا کرتا ۔

سبھُو کی نگاہیں اُسے نچوڑنے میں مشغول ہو جاتیں ۔ وہ بھی بہت بے باکی سے میرے تھیلے میں سے کوئی کتاب

● سپنا ایمپوریم ، بی ۱۱۰ ۔ سیکٹر ۵ ، اندرا نگر ، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۶

نکال کر پڑھنے کا سوانگ رچتی۔

یہ سلسلہ روز چلتا ــــ ایسے ہی ایک دن جب ات کو میں نے تھیلے سے کتاب نکالی تو دیکھتے ہی چونک ٹھا۔ حاشیئے پر ایک جگہ لکھا تھا کہ: وہ نگاہیں میرے پڑے اُتارنے کو اُتاولی ہیں۔ سب کپڑوں کے اندر یوں جھانکتے ہیں؟ کیا ایک عورت اور مرد کا سوائے بستر وئی دوسرا رشتہ نہیں ہو سکتا؟ کیا ہماری دوستی ذہنی ہیں ہو سکتی؟ لوگ کمینگی سے ہماری دوستی کے دوسرے رتھ کیوں لیتے ہیں؟ سب کسی لڑکی کا ایک لڑکے ے ساتھ گھومنا اس طرح کیوں لیتے ہیں؟

میں نے کتاب بند کر دی تھی۔ اس رات پھر پھر پڑھنے کا من نہیں ہوا۔ وہ کبھی کبھی ایسی چبھتی ہوئی ساف باتیں لکھ دیتی جنہیں ہم لڑکیوں سے سننے کے ادی نہیں ہوتے۔ ایک بار ہم ایک میٹنگ میں گئے۔ ہاں میرے ایک دوست نے عورت کی آزادی اور ابری پر بڑھ چڑھ کر باتیں کیں۔ اس رات میرے تھیلے ں سے پرچی نکلی کہ تمہارا یہ تقریر باز دوست صبح سے ات تک کافی ہاؤس میں بیٹھا رہتا ہے۔ کافی ہاؤس ند ہونے کے بعد کہیں پیتا ہے پھر گھر جاتا ہے۔ اس ، بیوی کو آزادی کون دے گا، کیا وہ اس کی جائیداد ہے؟

دوسرے دن میں نے بھی ایک پرچی اس کی کتاب ں رکھ دی جس میں لکھ دیا کہ وہ سب وچاروں سے رابری چاہتے ہیں، لیکن اُنجانے میں یہ گوارا نہیں کرتے لوئی عورت ان کے ارد گرد، اُن کی دنیا میں، اُن کی ح، اُن پہ بنا نر بھر ہوئے رہے۔ ایسے لوگوں کو معاف ریا کرو ــــ وہ بے چارے اس وقت اُس کے فقے دار نہیں ہوتے۔ یہ تو وہی ہے جس کا بوجھ وہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس کے بعد تمہیں اُن کی نگاہیں اُنہیں بُری ں لگیں گی..... اُن میں بسی ہوس بھی۔

پرچی پڑھنے کے بعد اس نے مجھے ایک دوسرے پ میں دیکھا تھا۔ شاید اُسے یقین نہیں تھا کہ میں طرح سے سوچ سکتا ہوں۔ اس رات جو پرچی مجھے اس پر میری آخری سطر لکھی تھی ــــ اُس وقت وہ کسی عورت کو نہ دیکھ کر کیوں اپنی بھوک کو دیکھ رہے ہوتے ہیں' تمہاری یہ بات مجھے بہت اچھی لگی۔

" آج ہم شہر سے باہر چلیں گے " اس کی اس بات سے مجھے ڈر لگا۔ شہر سے باہر جہاں ہم نہیں ہوتے ..... جہاں ٹوٹے پھوٹے کھنڈر، پرانے قلعے، مقبرے پرانی عمارتیں ..... پہاڑ اُداس میدان ... جہاں پہنچتے ہی اپنے ہونے اور نہ ہونے کا احساس اپنے اندر ایک گہرا اکیلاپن بھر دیتا ہے۔ چاہے تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی۔

اُس دن اتنی دُور جا کر کچھ ایسا حاصل کرنا اور محسوس کرنا بہت مشکل تھا۔ جب کہ اُس نے بہت عرصہ بعد پہلی بار کہیں چلنے کے لیے کہا تھا۔ ہمیشہ جدھر میں چل دیتا اُدھر وہ بھی چل پڑتی ــــ میرا دھیان گلی ہوئے پھولوں سے ہٹ کر اپنے پسینے میں تر کپڑوں، خالی جیبوں اور خالی پیٹ کی کھنچی ہوئی انتڑیوں کی طرف چلا گیا۔ مجھے لگا اُس نے مجھے اپنی خالی جیبوں میں جھانکتے ہوئے پکڑ لیا ہے۔ جب کہ میں نے ابھی صرف ایسا سوچا ہی تھا۔

ایسا کیوں ہوا؟ میں نے کبھی بھی اپنی مجبوری کی وجہ سے خود کو کمتر نہیں سمجھا۔ پھر ایسا کیوں ہو جاتا ہے اپنے آپ؟ میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے دیکھنے کے بجائے اِدھر اُدھر ٹٹولتا ہوا کچھ ڈھونڈنے لگا۔ وہاں کوئی پہچان کا آدمی نہیں تھا۔ کناٹ پلیس کی گول سڑک پر کاریں بھاگ رہی تھیں۔ فواروں سے پانی آتش بازی کے انار کی طرح اُوپر اُٹھ رہا تھا۔ پانی کی پھوار کے پیچھے اُونچی کئی منزلہ عمارتیں تھیں جن کی کھڑکیاں رات کے اندھکار میں موتیوں کی طرح چمکتیں گول برآمدے میں ہمیشہ کی طرح چہل پہل تھی۔

" کیا سوچ رہے ہو؟"

اس کے خوب صورت چہرے پر سدا کی طرح اُس کے لمبے ریشمی بال آگے کو جھک آئے تھے۔ اُس کی ناؤ کے آکار کی موٹی سیپ سی آنکھوں میں چمک کے ساتھ ایک اُداس نمی بھی تھی۔ وہ آنکھیں جدھر اُٹھتیں، اُدھر ہی سب اُسے دیکھتے رہ جاتے ...

اس وقت محسوس ہوتا جیسے وہ دوسروں کا حال اندر تک پڑھ لیتی ہے ..... وہی آنکھیں مجھ پر ٹکی تھیں۔ شاید یہی وجہ رہی ہو گی کہ کبھی میرا دھیان اُس کی خوب صورتی کی طرف نہیں گیا۔ وہ مجھ سے سٹ کر کھڑی تھی۔ اُس کے جسم اور آنکھوں کی تپش سے مجھے خوف محسوس ہوا۔ اُس کی چپلیں دُھول میں اٹی تھیں۔ ظاہر تھا کہ وہ مجھے میرے سبھی ٹھکانوں سے ڈھونڈنے کے بعد ہی آئی تھی۔

" چاہو تو شیواجی پارک اسٹیڈیم کے پاس کلاک ٹاور چلیں؟"

وہ اس کا دل پسند ریستوراں تھا۔

چاہو تو چھت والے کافی ہاؤس چلیں یا سلسلہ اوپن ایر"

میں اس کی آواز سننا نہیں چاہتا تھا۔ کئی آوازیں بُری نہیں ہوتیں، ایک خاص مقام پر ہی وہ ہمیں بُری لگتی ہیں۔ اپنے اندر کے کسی پریت کے کارن۔ وہ پہلی بار اپنے پن سے بولی تھی، کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ کسی اور وقت بولی ہوتی؟

"سیلر چلیں"

ریگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ شرارت سے اُس کی آنکھیں مُند سی گئیں گالوں میں گڈھے پڑ گئے۔

" تم تھوڑی دیر رُکو، میں ابھی آیا"

" میں تمہارے ساتھ چلوں گی"

اس کی آواز میں پورا ادھیکار تھا۔ وہ میرا کھیل تاڑ چکی تھی۔ بھاگ کر کہیں سے کچھ اُدھار لینے کا اب سوال ہی نہیں تھا

" مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے؟" اُس کی آواز میں جھوٹ نہیں تھا بلکہ ایک ڈانٹ تھی۔

"کسی ریستوراں میں بیٹھنے کا میرا موڈ نہیں ہے ہم باہر چلیں گے"

میں نے شیخی بکھیری۔ اندر ہی اندر ڈر رہا تھا کہ آج اتنی دُور کیسے چل سکتا ہوں۔ پھر وہ وہاں پہنچتے ہی سب کچھ بھول جائے گی۔ کسی کونے میں بیٹھ کر ادھر

کھلے میں اُڑتے پرندوں کو دیکھتی، کھوجتی، چھوٹے چھوٹے کنکر اُٹھا کر اِدھر اُدھر پھینکنے لگے گی۔ آنکھیں بنا جھپکے ایک ٹک قدرت کے حسن کو پیتی رہے گی۔ اور بیچ بیچ میں کچھ یاد آنے پر چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر کچھ لکھ کر بیگ میں بھرتی جائے گی۔ جیسے ساری باتیں شہر سے باہر قبروں کی گہری خاموشی اور کھنڈروں کے پاس آتے ہی اُسے یاد آتی ہوں۔ جو اسکیچ وہ ایسی جگہوں پر اپنی کاپی میں بناتی، اُس کا تعلق اس جگہ کے ماحول سے نہ ہو کر اس ماحول سے پیدا ہوئے ذہنی ماحول سے ہوتا۔

پہلی بار وہ مجھے بجن کے ساتھ کافی ہاؤس میں ملی تھی۔ وہ کوئی بہانہ بنا کر وہاں سے کھسک گیا تھا۔ ہم اُس کے انتظار میں دیر تک بیٹھے رہے۔

"آپ کے پاس کچھ پیسے ہیں؟" وہ سمجھ چکی تھی کہ بجن نہیں آئے گا۔ اور اُسے کوسنے لگی۔ میں بھی سمجھ چکا تھا کہ وہ نہیں آئے گا اُس کی بُزدلی کو چھپانے کے لیے بل چُپکے سے ادا کر آیا تھا۔

"آپ میرے ساتھ تغلق آباد فورٹ چلیں گے؟" کافی ہاؤس سے باہر نکلتے ہی اُس نے مجھ سے پُوچھا تھا۔ وہاں سے سیدھے ہم تغلق آباد کے قلعے ہی پہنچے تھے۔ قلعے کے اوپر سے چاروں طرف پھیلی خاموشی میں چلتے ہوئے اسکوٹر رکشہ کی آواز پورے ماحول میں اچھی لگ رہی تھی...... ایک بہت دُور سے آتی ہوئی دُھن کی طرح۔ اُس نے دُور تک دکھائی دینے والی ہر شے کو دیکھا۔ اِدھر اُدھر گھوم کر ایک کونے میں بیٹھ گئی تھی۔ کاپی نکال کر اسکیچ بنانے لگی تھی۔ میں نے اُوب کر پوچھا تھا "اب چلو گی نہیں؟"

اُس کی نگاہیں سامنے ڈوبتے ہوئے سُورج کی لالی پر تھیں۔ جو درختوں کے اوپر ٹک سی گئی تھی۔ وہ کہیں وہیں ڈوبی ہوئی تھی۔ اُس نے میری آواز سنی بھی نہیں تھی۔ شاید نہ چاہتے ہوئے ایک چڑ سی اسی دن پیدا ہو گئی تھی۔ جب کہ اگر اُس دن اُس کے ساتھ نہ گیا ہوتا تو ہماری دوستی بھی شروع نہ ہوتی اور ایک دوسرے سے جو سیکھتے ہیں ہم وہ بھی دُور رہ جاتا.....

"نہیں! ہم دور نہیں جائیں گے۔" اس نے مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ کیا معلوم میری ٹانگوں میں بسی تھکاوٹ اور کمزوری کو وہ بھانپ چکی ہو۔

اس دن میں اُس کے آگے تو کیا اُس کے ساتھ بھی نہیں چل پا رہا تھا۔ ہمارے بیچ کا سمجھوتہ جو کبھی نہیں ہوا تھا پہلی بار ٹوٹتا ہوا لگا۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ زمین سے دہکتے ہوئے انگارے جسم میں پیوست ہو رہے ہوں جیسے۔

"آج ہم قطب سے آگے تک چلیں گے۔" میں نے پوری طاقت بٹوری۔ اُس سے مات کھانے کے مُوڈ میں نہیں تھا۔ میرے لہجے میں جوش اور مردانگی تھی۔ جو اکثر مردوں میں لڑکیوں کی موجودگی میں خود بخود آجاتی ہے۔ اس وقت ہم جن پتھر پر تھے۔

"تم ہوش میں نہیں ہو۔" اُس نے اشارے سے اسکوٹر روک لیا۔ اُس کی آواز میں انسیت تھی مجھے کمتر بنانے کی خواہش نہیں تھی۔

"نہیں، ہم پیدل چلیں گے۔" میں غصّے میں چیخ اُٹھا۔

"پہلے بیٹھ جاؤ۔ سڑک پر تماشہ نہ کرو۔" اُس نے سختی سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ویسے بھی یہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ پہلے وہ بیٹھتی اور بعد میں میں ..... یہ اُس کی حفاظت کے لیے ایک عادت بنا لی تھی میں نے۔ اور راجدھانی کی کسی ٹیکسی اور اسکوٹر میں بیٹھنے کے یہی آداب بھی ہیں شاید۔

"ہم اور آگے نہیں چلیں گے۔"

"کیوں؟"

اُس نے فوراً بیگ سے پیسے نکال کر ڈرائیور کو دے دیئے۔ اتنی تیزی میں سب ہوا کہ ڈرائیور کو میری طرف دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ سمجھ چکی ہے۔ نہیں تو پیسے کیوں دیتی؟ جب کہ ہمیشہ میں ہی دیا کرتا ہوں۔ وہ دوڑ کر سامنے کھوکھوں سے دو پتے پکوڑے اور ایک ڈبل روٹی لے آئی۔ جیسے میں لایا کرتا تھا ———— وہ اشوک پیڑ سے آگے نکل کر پیچھے والے کھنڈر کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ ایک پتّہ اور آدھی ڈبل روٹی میرے سامنے رکھ دی۔ اسی طرح جس طرح میں رکھا کرتا تھا۔ مجھے شرمندگی محسوس ہوئی کہ ہم ایک ہی پتے میں کیوں نہیں کھایا کرتے تھے؟ اس بات نے مجھے بہت چھوٹا بنا دیا۔ اگر اس کی جگہ میرے ساتھ میرا کوئی مرد دوست ہوا کرتا تو تب بھی کیا ہم الگ الگ کھایا کرتے.....

شام تک وہاں بیٹھے قطب مینار پر چڑھے لوگ تکتے رہے، جو بونوں کی طرح چھوٹے دکھائی دے رہے تھے۔ وہاں سے لوگ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پھینک رہے تھے، جو ہوا میں اِدھر اُدھر اُڑ رہے تھے۔ اس کی نگاہیں ان ٹکڑوں پر ٹک جاتیں اور ان ہی کے ساتھ اُن کا تعاقب کرتی ہوئی پھر کسی پگڈنڈی پر جم جاتیں۔ مانو وہ صرف ان اُڑتی ہوئی پرچیوں کو دیکھنے کے لیے ہی وہاں آئی ہو اور اسی کھیل میں کئی پریمی جوڑے تنہائی کا فائدہ اُٹھانے اُدھر جدھر دیوار ایک پرچھائیں سی دکھائی دیتی ایک دوسرے کو چُومتے اور الگ ہو جاتے۔ چار سائے لمبے ہو رہے تھے۔ جھٹ پٹے میں او آکاش میں پرندوں کے جُھنڈ بھاگے جا رہے تھے

"تم کو مجھ سے کچھ پوچھنا تھا؟"

اس نے اونچے مینار کی طرف دیکھا۔

اوپر سے پرندوں کا بڑا جھنڈ جا رہا ہے۔ ان کی سنہری روشنی کبھی کبھی چمک سی اُٹھتی۔

"بہت دیر ہو گئی۔"

جیسے پرندوں کے آنے میں دیر ہو گئی آواز پرندوں کی آوازوں میں کھو گئی۔ اُس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ رُکی ہوا نے جھومتے درختوں کو طرح بے حس اور ساکن کر دیا تھا۔ پرانی دلی مینار سے سنہری دھوپ کی لالی سرکتی محسوس ہو کھنڈروں کے پیچھے سے کسی آواز کے سنائی ہوتا جو ایسی جگہوں پر اکثر ہوا کرتا ہے۔

"تم نے وہ کویتا پڑھی ہے، جس میں

ارادن شہر کی گلیوں، بازاروں اور اُجاڑ جگہوں میں
ھوم کر آخر میں گونگوں کی طرح جُدا ہو جاتے ہیں۔۔۔
ری ایک خاموش گواہ ـــــ غریبی بانٹنے والا۔" وہ
نی آہستہ بول رہی تھی کہ اوپر سے گزرتے ہوئے پرندوں
، آوازیں تو سُنی جا سکتی تھیں، لیکن اس کی نہیں۔
"ہر چیز کو محسوس کرنے کا ایک خاص وقت ہوتا
ہے۔"

"تم کو مجھ سے کچھ پوچھنا تھا؟"

" وہ کوئی ضرور تیز حسیات کا ہو گا۔ جس
نے خاموشی کو بہت قریب سے سمجھ لیا۔ میں تمہیں پوری
دیا سُناتی ہوں۔"

"تم میرا اپمان کر رہی ہو۔" میں غصہ میں کھڑا
ہو گیا۔

"آپ۔۔۔ ماں۔۔۔" وہ چونکی اور ہڑبڑاہٹ
بں کھڑی ہو گئی۔ "نہیں۔" اُس کی آواز کھری تھی جس
یں جھوٹ کی آمیزش نہیں تھی بلکہ وہ کچھ اس طرح
یکھ رہی تھی۔ جیسے میں نے اُس کی بے عزتی کر دی ہو۔
س کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ اُس نے مونہہ پھیر لیا۔

باہر میدان میں سیلانی لڑکیوں کی دو ٹولیوں میں
لمی گیتوں کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ ریستوراں کی سب میزوں
کے گرد لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ لڑکے لڑکیاں اب بھی رنگ
یل رہے تھے۔ وہ تیزی سے پھاٹک کی طرف بھاگی
جا رہی تھی۔

اسکوٹر میں ہم چُپ تھے۔ مرکری ٹیوبوں کی
بلی دودھیا روشنی پوری سڑک پر پھیلی ہوئی تھی ـــ
سامنے سے آتی ہوئی کاروں کی روشنی آنکھوں کو چوندھیا
یک پل کے لئے اندھا سا کر دیتی۔ جیسے ہی کار نکل جاتی
پھر پہلے کی طرح دکھائی دینے لگتا۔ صفدر جنگ اور
برج سے ہوائی اڈے کی پٹی پر لگی بتیاں جگنوؤں کی
طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ پُل کے بیچوں بیچ دھرتی
سے چپکی ترچھی بتیوں کی روشنی کبھی جلتی کبھی بجھتی سی
کھ مچولی کرتی محسوس ہوتی۔ جیسے ایک کے بعد ایک ـــ
ہمیں دیکھ کر اپنی آنکھ کھول رہی ہو۔

مین بازار کے پاس اُس نے اسکوٹر روک لیا اور
بولی کہ ہم بازار ہو کر ہی گھر چلیں گے۔ مجھے گھر کا نام سنتے
ہی ہنسی آگئی۔ اندر ویسا ہی محسوس ہوا جو گورکی کے
ایک کردار کو لفظ سے ہوا تھا۔

لوگ ساری عمر گھر بناتے دم توڑ دیتے ہیں۔
لیکن اُنہیں گھر کی سمجھ آخر تک نہیں ہوتی۔ میں نے
بھی ابھی تک اس کے معنی نہیں سمجھے۔ جہاں اپنی اینچی
وہاں اپنا گھر۔ ایک سے دوسرا۔ دوسرے سے تیسرا۔
اسی طرح ایک لمبا سلسلہ۔ ایک سیلانی کے کئی گھر۔ گھر
کے نام سے کتنے گھر یاد آتے ہیں ـــ جہاں حرارت ہوتی
ہے۔ کچھ گھر اُداس ہوتے ہیں اور اکیلے۔ کچھ گھروں کی
کھڑکیاں ہمیشہ اندر کی طرف کھُلتی ہیں۔ جہاں سے
کوئی راستہ باہر نہیں جاتا۔ کچھ گھر موٹی دلواروں اور
چھتوں سے گھرے ہوتے ہیں۔ اور ان کے دروازوں
پر موٹے بھاری بھرکم پردے گرے ہوتے ہیں۔ جہاں
سب کچھ پُراسرار ہوتا ہے۔ کچھ گھر ایسے بھی ہیں، جہاں
مجھے سکون، اطمینان اور ٹھہراؤ ملا ـــ ایسے گھروں
میں پہنچ کر مجھے ایسی باتیں یاد آتی ہیں، جنہیں ابھی مجھے
مکمل کرنا ہے۔ یا ایسی باتیں جنہیں میں بھُولا رہتا ہوں۔
ایسے گھروں کے دروازے کھڑکیاں ہمیشہ باہر کو کھُلتی ہیں۔
ایسے گھروں میں جا کر اُن کے لئے موہ میں ہمدردی اُبھرتی
ہے، جو نشے میں ڈوب کر اپنے اندھیرے کمروں میں بیٹھے
روشنی ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

میری زندگی میں گھروں کی ایک قطار ہے۔
جہاں بچپن کے ایک چھوٹے سے گھر کی تصویر بھی ہے۔
جہاں ہر وقت سیلن، اچار اور سبزیوں کی بُو اُٹھتی
رہتی تھی۔ چارپائی پر لیٹی ماں بڑبڑایا کرتی کہ مجھے
کوئی تکلیف نہیں۔۔۔ میں چنگی ہوں۔ جب تک وہ رہی
میں بھی جُڑا رہا۔ ماں کے بعد ایک لمبا ناہموار سلسلہ
ہے، وہاں سے یہاں تک۔۔۔۔ گھر کے نام سے میرا ہنسنا بھی
صحیح تھا اور بہکنا بھی۔۔۔۔۔

"کیوں ہنسے تم؟" اُس نے بازار کی طرف
مُڑتے ہوئے پُوچھا۔

"میں اُدھر نہیں جاؤں گا۔ میں نے لوگوں کے
پیسے دینے ہیں۔" میں نے سچ بولا۔

"ہم اُنہیں فیس کریں گے۔۔۔ پھر کیا ہوا؟"

ہم خاموشی سے چل رہے تھے۔ کسی نے نہ مجھے
ٹوکا نہ کوئی تقاضا ہوا اور نہ کسی نے آواز دی۔ جب
کہ آنے والے خطرے اور بے عزتی سے نپٹنے کے لیے برابر
سوچ رہا تھا۔ ڈھابے کے سامنے رُکنا مشکل تھا۔ وہ
کبھی کبھی میرے ساتھ وہاں آیا کرتی۔ اس کے پہنچتے ہی
وہاں ہر چیز حرکت میں آجاتی۔ سب کے چہروں پر
خوشی دوڑ جاتی۔ تمام کام کرنے والے لڑکے آنکھوں سے
اشارے کرتے اور چہکتے کہ مال آگیا ہے۔ گاہکوں
کی نظریں اس کے جسم پر چپک جاتیں۔ وہاں جو اُدھار
سہولتیں ملتیں وہ شاید اسی کی وجہ سے۔ اس پر کوئی
اثر نہ ہوتا۔ یہی بات مجھے پریشان کرتی اور مونہہ کا
ذائقہ کڑواہٹ سے بھر جاتا۔ ہمارے پہنچتے ہی کھلبلی
مچ گئی۔ وہ کھانا پیک کرانے لگی۔

"شاہ جی کدھر دن آئے؟ کوئی چیز گھٹ تو نہیں
تھی؟" ڈھابے کا مالک کھڑا ہنس رہا تھا۔ اس کے تینوں
سونے کے دانت زیادہ ہنس رہے تھے۔ میرے سبب
نہیں۔

"تم نے اچھا نہیں کیا۔" اُس نے میری طرف
دیکھا بھی نہیں۔

تبھی مجھے وہ دن یاد آیا جب پہلی بار کلاک
ٹاور میں مجھے روک کر ایک برابر کے دوست کی طرح
اس نے بل ادا کیا تھا۔ میں اندر ہی اندر خوش ہوا تھا۔
کہ پہلی بار ایک لڑکی نے ایک مرد کی طرح کے پُورے
حق کے ساتھ پرس سے پیسے نکالے تھے۔ اُس دن
میں نے پہلی بار اس کی طرف غور سے دیکھا تھا اور وہ مجھے
اچھی لگی تھی۔ آج کیوں برداشت نہیں کر پا رہا؟

"میں نے سب بل چکا دئے ہیں۔ تمہارا سامان
بھی ڈھابے سے اُٹھا لائی ہوں۔" اُس نے کھانے کا
پیکٹ مجھے پکڑا دیا۔

"اور تم نے جھوٹ بولا کہ میں باہر گیا ہوا تھا؟
تم نے مجھے ذلیل کر دیا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ پُوری زندگی
میں نے کسی سے کچھ مانگا نہیں۔ تم میرا سامان بیچ کر

اپنے پیسے وصول کر لینا۔ تم نے مجھ پر ترس کھایا ہے۔" میں نے اُسے غصّے میں کھینچا اور متوسط طبقے والی شان کے ساتھ کہا۔

"تم چلے جاؤ۔ پھر کبھی صورت نہ دکھانا۔" اُس نے انگریزی میں کہا اور منہ دوسری طرف کر لیا۔ وہ دیر تک راستے ہی میں کھڑی رہی۔ "تم میں اور دوسروں میں کیا فرق ہے؟"

'فرق' لفظ ایک گالی کی طرح لگا جو مجھے اندر تک چیر گیا۔ اس کے لیے یہ ناقابلِ یقین تھا کہ میں بھی کبھی ایسی بات کہہ سکتا ہوں۔ میں خود حیران تھا کہ من میں تو میں نے ایسا سوچا نہیں تھا۔ پھر ایسا کیوں ہو گیا۔ بارہا میری زندگی میں ایسے موقعے آئے، جن سے مجھے لگاؤ ہوتا ہے۔ ان سے باتیں کرتے کرتے مجھے خود بخود ایک تناؤ آجاتا ہے اور میں ایک اچھے آدمی کی طرح سلوک کرنے لگتا ہوں۔ اور اور تب میں اس وقت خود پر کوئی قابو نہیں رہتا۔ کئی گندی باتیں منہ سے نکل جاتی ہیں، جو دراصل میری نہیں ہوتیں۔ مجھے لگتا میں وہ بننا چاہتا ہوں جو میں نہیں ہوں —— راستے میں کھڑا دیکھ کر ہر کوئی ہمیں گھور رہا تھا۔

مجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ کوئی ہمیں بھک منگوں کی طرح سمجھے۔ اس کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ اُس نے گالی سے بھی بڑا تھپڑ مجھے مارا۔ وہ وہی تھی۔ لیکن مجھے بدلی ہوئی لگی۔ اس کے پورے معنی ہی بدل گئے۔ میرے اندر گناہ کا احساس بیدار ہو گیا۔ کہیں میں انجانے میں اُسے ایک لڑکی اور کمتر سمجھ کر ہی تو یہ سلوک نہیں کر رہا تھا۔ نہیں تو ایک لڑکی کی مدد میں نے اس طرح کیوں قبول نہیں کی جیسے کسی دوست سے کر سکتا تھا۔ اگر اُس نے میری بے عزتی کی تو آج تک میں کیا کرتا رہا اس کے ساتھ؟

"نہیں تمہارا کیا قصور؟ تمہارے لیے تو ابھی میں اجنبی ہوں؟"

"اجنبی!" اُس نے مجھے گھورا۔ "یہ تم کہہ رہے ہو؟"

"ہم دونوں ہی۔" میں نے گرم جوشی میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"سچ؟"

"وہ مجھ سے سٹ گئی۔ اس کی تیز سانسوں کا لمس میرے چہرے کو چھونے لگا۔ اُس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور مسکرا دی۔" میں برابر تمہیں ڈھونڈتی رہی۔ سوچتی تم کہاں رہتے ہوگے؟ کہاں سوتے ہوگے؟ کہاں پڑھتے لکھتے ہوگے؟ کمرہ چھین گیا تو مجھے خبر کیوں نہیں دی ہے؟"

"معاف کر دو۔" میں نے جذبات میں بہہ کر کہا۔

"میں نہیں جانتی تم مجھے کیوں اچھے لگتے ہو؟ تمہارے ساتھ رہ کر لڑکی نہ ہو کر ایک دوست کی طرح آزاد ہوتی ہوں...... دوسرے دو باتوں کے بعد پھسل کر ننگے ہو جاتے ہیں۔ اور وہیں آجاتے ہیں جہاں مرد کو آنا ہوتا ہے۔ اخلاق میں کہی ہوئی باتوں کے معنی بھی دوسرے نکال لیتے ہیں لوگ۔

اُس نے بیگ سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر دیا۔ میں نے سگریٹ سُلگائی اور پچھلی بیتی ہوئی خاموش ملاقاتوں کی طرف پہلی بار دھیان گیا۔ دوسرے معنوں میں۔

"پہلی بار تمہیں کہتے ہوئے سُنا تھا کہ تم اپنے مشن کے لیے بھوک برداشت کر سکتے ہو بنا ٹوٹے ہوئے۔"

اس دن میں دوستوں میں گھرا ہوا تھا اور کسی نے میری توہین بھی کی تھی۔ تبھی میں بوکھلا اُٹھا تھا۔

"سچ پوچھو تو میں بھی اسی لیے زندہ ہوں۔ بہت باتیں بھری ہیں اندر لیکن کوئی سننے والا ہی نہ تھا۔ دوسروں کی بنائی ہوئی دنیا کے کارن ہم کیوں برباد ہوں۔ اس میں رہنا مجبوری ہے تو کیا ہم دنیا چھوڑ دیں؟"

ایک تھپڑ تھا میرے چہرے پر، جو بلا وجہ جھوٹی شان کے لیے سب سے چھپتا رہا۔ لیکن اسے اس تھپڑ کا احساس نہیں تھا۔

"جو اپنے وقت میں بغاوت کر کے کچھ حاصل کرتے ہیں بعد میں وہی دوسروں کو وہی ادھیکار کیوں نہیں دیتے؟ ماں اور پتا کی شادی بھی ایک ایسی ہی بغاوت تھی۔ اب وہی باتیں انہیں اپنی اولاد کے لیے غلط لگتی ہیں۔"

"تم گھر سے لڑ کر آئی ہو؟" میں نے اُسے ٹوکا۔

"تم تو اس طرح پوچھ رہے ہو جیسے میں کوئی گڑیا ہوں۔ میں اپنے فیصلے خود کرتی ہوں۔" 'خود' لفظ پر اُس نے بہت زور دیا۔ نہ جانے وہ سختی گھر والوں کے لیے تھی یا میرے لیے۔

"مجھے وہ لڑکا پسند نہیں تھا۔ نہ ہی وہ پرانی باتیں جو وہ دہرانا چاہتے تھے۔ پتا مجھے اپنے دوست کے لڑکے کے ساتھ بیاہنا چاہتے تھے۔" میں نے حیرانی سے اُسے دیکھا۔ پہلی بار اُس کے بارے میں کچھ معلوم ہوا۔ ایسی لڑکی آج تک خاموش کیوں رہی؟

"ہاں ہاں، وہ لین دین کی باتیں بھی۔" وہ ہنس پڑی۔ اس نے کچھ اس انداز میں کہا۔ جیسے میری کسی بات کا جواب دیا ہو۔

"پتا سیلف میڈ آدمی ہیں۔ انہیں دوسروں کی ہر بات غلط لگتی ہے۔ ہر ایک کے اوپر اپنا غلبہ چاہتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ تھوڑا آگے اس لیے آئے تھے کہ پھر پیچھے لوٹنے کے لیے ہیں... جہاں سے زندگی شروع ہوتی ہے، وہاں ختم کر لی۔ ہمارے یہاں بھی پریم وواہ اسی انت میں ختم ہوتے ہیں۔ پھر انہیں میری پینٹنگ بھی بے کار لگتی ہے۔"

اس کی آواز دوسروں سے الگ اور جُدا تھی۔ دوسرے ایک قرار کی طرح۔ ایک ماحول سے بھاگ کر تھوڑی دور پر ہی کچھ آپس میں بانٹنے لگتے ہیں۔ اپنے چھوٹے سے تجربے کو خوش گوار سمجھ کر اپنے پرانے سنسار میں لوٹ آتے ہیں —— ایسے لوگ اور ایسی آوازیں دوسروں کے لیے پُرکشش تو ہو سکتی ہیں —— ہوتی بھی ہیں، لیکن انہیں چھپانے میں رومانیت ہوتی ہے..... وہ اپنے میں مکمل نہیں ہوتے کبھی......

من میں بار بار اُٹھتا کہ اس سے کچھ پوچھوں۔

رُک جاتا۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ میں بھی ویسی باتیں پوچھ رہا ہوں جو لوگ مزہ لینے کے لیے بھگوڑوں سے پوچھتے ہیں۔ خاص کر لڑکیوں سے۔

"پچھلے دنوں ماں آئی تھی۔" اُس نے کچھ اس طرح چونک کر کہا کہ جیسے عرصے کے بعد کوئی بھولی ہوئی بات یاد آئی ہو۔ "مجھ سے بولیں "اگر پتا سے معافی مانگ لو تو گھر لوٹ سکتی ہو۔" سنتے ہی مجھے ہنسی آگئی۔ اُن کا لہجہ ایسا تھا جیسے میں نے لوٹنے کے لیے بڑا رستعفا کی ہو۔

وہ اب بھی اس طرح ہنس رہی تھی جیسے ماں اُس کے سامنے کھڑی ہو ــــ اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں سمجھ دار ہے، مگر شادی کے بعد دوسری عورتوں کی طرح وہ خاوند کی مرضی کے مطابق ڈھلتی رہی۔ وہ سہولتوں کی بھوکی نہیں، تب بھی اس میں اپنا کچھ نہیں رہا۔

"ماں لوٹ گئیں؟"

"تو کیا رہنے آئی تھیں؟ انہوں نے ساری عمر کچھ چھپا لیا ہے۔ اپنوں سے بھی اور دوسروں سے بھی۔ جاتے وقت وہ یہ پیسے اور خط میرے بیگ میں رکھ گئی تھیں۔" اُس نے تُڑا مُڑا خط مجھے پکڑا دیا۔

"کیا اس کی ماں ایسی ہے؟ کیا یہ اتنی باریکی سے نیچے تہہ تک اُتر جاتی ہے؟ خط میں نہ جانے کیا بھید ہو؟ گرم ہوا کبھی کبھی ہمیں چھو جاتی۔ سڑک میں ابھی تپش تھی۔ بجلی کے کھمبوں کے نیچے روشنی کے دائرے بہت دھندلے تھے۔ آمد و رفت اپنی رفتار میں تھی۔ ہم دونوں خاموشی سے چلنے لگے۔ میرے اندر کچھ پرتیں خودبخود کھلتی جا رہی تھیں ــــ جیسے کوئی اُن کے اوپر سے اُٹھاتا جا رہا ہو ــ کچھ باتیں ایک جھٹکے کی طرح سامنے آتی ہیں جو جذباتی بنا کر یادوں کو، اوجھل احساسوں کو ایک تیز حرکت دیتی ہیں۔ اس وقت میرا دماغ خیالوں کے بھنور میں گھومتا ہے، لیکن رشتوں کے معاملوں میں ایسا نہیں ہوتا اور نہ ہی میں نے تعلقات کبھی نپے تلے طریقے سے قائم کیے ہیں۔ وہ تو دھیرے دھیرے خودبخود انجانے میں بنتے رہتے ہیں اور جب اُن کا احساس ہوتا ہے تو کوئی حیرانی بھی نہیں ہوتی۔ پچھلی باتیں اپنے آپ کھلنے لگتی ہیں۔ انہی باتوں کو قدرتی طور پر ہم قبول نہیں کر [illegible] ہمارے رشتوں کو جو دراصل پرانے ہی ہیں۔ [illegible] میرے لیے ہی اپنے معنی میں نئے ہوتے ہیں ــــ اس لمبے سلسلے کو پکڑنے لگا۔

مجھے حیرت ہونے لگی۔ کیا حقیقت میں رشتے ہوتے [illegible] ہیں؟ وہ تو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ ایک حد تک اپنی غرض تک ہی انہیں محسوس کرتے ہیں۔

پچھلے دنوں جو حالت میری رہی۔ وہ میری اپنی ہی وجہ سے تھی۔ اس پر کسی کا دباؤ نہیں تھا، نہ ہی کوئی ڈر۔ تب بھی مجھے ایک اندیشہ ہمیشہ رہا۔ میں کیوں کتراتا رہا؟ جب کہ مجھے کبھی بے کاری نے کی فکر نہیں ہوئی۔ اپنے اصولوں کی خاطر کبھی برسرِ روزگار کہلانے کا شوق پیدا نہیں ہوا۔ میرے اصول؟ سب کچھ کھوکھلا معلوم ہوا۔ میں وہاں کیوں نہیں گیا، جہاں سے مجھے اپنی پسند کا کام مل سکتا تھا؟ کیوں؟

میرے اندر کا اشارہ اس طرف تھا جہاں سے ایک سَر سَراہٹ ہوتی ہے۔ ضرورتوں اور ذمہ داریوں کو پھر جہاں سے ایک ڈھرے پر چلنے سے اُوب پیدا ہو جاتی ہے.....

"ماں نے ہمارے تعلقات کو بری نگاہ سے ہی دیکھا۔ جب تک رہی ایک اسی شبہ میں پڑی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کوئی لمبی مدت تک بغیر جسمانی تعلقات کے کیسے رہ سکتا ہے؟ اُس نے طعنہ مارا تھا کہ ــــ "چلو تم نے ڈھونڈ تو لیا۔" لہجہ وہی تھا کہ بعد میں پچھتاؤ گی ــــ چلتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ ایک خوف دُور ہوا کہ تم بہت سے لوگوں کی محبوبہ نہیں ہو۔" اُس وقت میں نے ماں کو گالی دی تھی۔

وہ خاموشی سے چلنے لگی۔ اچانک ڈر کی کوئی پرچھائیں اس کے چہرے پر دکھائی دی۔ وہ ٹھٹھک گئی۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔ "جس دن ماں یہاں تھی بین پی کر آیا تھا۔ اس سے میری ہاتھا پائی بھی ہوئی تھی۔"

"تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

مجھے خود ہی اپنی بات پر شرمندگی محسوس ہوئی۔ اندر اُٹھا ہوا غصہ بھی دب گیا۔

"وہ اب کبھی آنے کی ہمت نہیں کرے گا۔"

اس نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور مسکرا دی۔

"ماں نے جانے سے پہلے مجھ سے معافی مانگی تھی۔ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ ایک عورت اور مرد کا رشتہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ کوئی مجھے پسند ہو گا تو میں فوراً اُس سے جسمانی تعلقات بنا لوں گی۔ چھپاؤں گی نہیں۔"

میرا ہاتھ جیب میں چلا گیا۔ خط کے بھید کو جاننے کی جستجو بڑھنے لگی۔

"ماں نے میری سب ڈائریاں پڑھ ڈالیں۔ جو ان کے من میں میرے لیے تھا، وہ غلط نکلا، جو اُن کے لیے میرے دل میں تھا اُسے پڑھ کر انہیں لگا کہ انہیں کوئی سراغ مل گیا ہو۔" اور انہیں معلوم ہوا کہ وہ ہمیشہ خود سے دُور اور الگ رہی ہیں ــــ وہ روتی رہیں.... اُنہوں نے کہا تھا کہ اب کبھی وہ لوٹنے کو نہیں کہیں گی۔ یہ سب انہوں نے خط میں بھی لکھا ہے۔ انہیں حیرانی تھی کہ جو باتیں انہوں نے کبھی کسی سے نہیں کہیں اور نہ کبھی خود سوچیں۔ وہ مجھے کیسے پتہ چلیں؟"

کمرہ ہمارے سامان سے دو حصوں میں بٹا تھا۔ ہر چیز سلیقے اور قرینے سے رکھی تھی۔ لیکن دیکھنے پر ایک ہی کمرے کا احساس ہوا..... ڈوبا اور اپنے میں سوچتا ہوا کمرہ۔ ایک طرف اس کا سامان ــــ ایک صندوق جس کا دیوان بنا تھا۔ سوٹ کیس، کتابوں کا ریک، برش، رنگوں کی ٹیوبیں، تیل کے ڈبے، پلیٹیں اِدھر اُدھر رکھی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ اس کی پینٹنگ ٹکی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے پاس اسٹینڈ پر اس کی ادھوری پینٹنگ رکھی تھی۔

اس کی اتنی پینٹنگ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ اتنا کام کب کرتی رہی ہے؟ دیواروں پر جہاں

جگہ تھی وہاں اس کی پینٹنگ ٹنگی ہوئی تھی ۔ فرش پر بھی اس کے فریم پڑے تھے ۔ اس کی پینٹنگ میرے سامنے تھی ۔ غیر قدرتی ، ان میں شکلیں نہ ہو کر صرف نہ دکھائی دینے والے احساس تھے ۔ اس کی اسکیچ بُکیں دیکھ کر حیران ہوا ۔ ایک ایک پینٹنگ کی کھوج میں کئی کئی اسکیچ تھے ۔ اکثر اُس نے ان جگہوں پر بیٹھ کر بنائے تھے ، جہاں میں اس کے ساتھ جایا کرتا تھا ۔

—— دوسری طرف میری کُل دنیا تھی ۔

ایک چھوٹی سی میز ۔ ریک میں میری کتابیں ۔ ڈائریاں ، نوٹس ، کاپیاں ، فائلیں پرانے رسالوں کے پلندے ایک کونے میں رکھے تھے ۔ میرے کپڑے جو آج تک کبھی ٹھیک طرح سے نہیں پہنے گئے تھے ، دُھلے ہوئے تھے اور ہینگروں پر لٹک رہے تھے ۔ میز پر ایک ٹائپ مشین رکھی تھی ۔ جو لاکھ چاہنے پر بھی مجھے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی ۔

" یہ ٹائپ رائٹر تم لائی ہو ؟ " اندر ایک زخم تھا کہ کتنی ضروری چیزیں کبھی ہم حاصل نہیں کر سکتے ۔

" جانتے ہو جب میں نے ماں کو کہا کہ تم ہمیشہ چلتے ہوئے ، لیٹے ہوئے ، دوسرے کے گھروں میں پہنچتے ہی سوچنے لگتے ہو اور تھوڑے دنوں کے بعد بھول جاتے ہو ۔ اور اتنا بھی یاد نہیں رہتا کہ تم نے وہ باتیں سوچی تھیں ۔ سُن کر ماں ہنسی تھیں ۔ ماں نے میری بات کو ایک چالاک بچے کی طرح دوسری طرف موڑ دیا ، جو کسی ڈر سے سب کا دھیان کہیں اور کر دے ..... جانتے ہو ماں نے کیا کہا تھا ؟ اس کے لیے ایک ٹیپ ریکارڈر خرید لینا .... "

" نہیں ! اس کی کوئی ضرورت نہیں —— مجھے چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر لکھنے کی تمہاری عادت بہت اچھی لگی ہے ۔ اسے میں بھی اپنا چکا ہوں ۔ باہری سلوک سے ہٹ کر جو اندر سوچتے ہیں ، محسوس کرتے ہیں ، اُسے یاد رکھنے کا اس سے بہترین طریقہ کوئی اور نہیں ہو سکتا ۔ لیکن تمہیں میرے بارے میں یہ باتیں کس نے بتائیں ؟ "

" میں نے پیسے ماں کو واپس بھیج دئے ۔ لکھ دیا کہ آئندہ کبھی پیسے نہ بھیجے ۔ "

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا ۔ بتانے لگی کہ ماں نے گھر پہنچتے ہی اُسے پیسے بھیجے تھے —— تاکہ وہ میرے لیے سب چیزیں خرید لے ۔

" کھانا نکالو مجھے بھوک لگی ہے " ۔ کوئی بھید اس کے اندر ضرور تھا ۔ یا پھر اس کی کلپنا میں کوئی بات اٹک گئی تھی ۔ کونے میں رکھی ہوئی ٹوکری سے پلیٹیں نکالنے لگی ۔

" جانتے ہو ماں نے تمہاری بھی سب ڈائریاں پڑھ ڈالیں ہیں ۔ دوسروں کی آپ بیتی پڑھنا اُن کی کمزوری ہے ۔ "

میز خالی کر کے پاس مونڈھے رکھ دئے —— پردے کو دیوار کے ساتھ سٹا دیا ۔ جو دو پرانی ساڑھیوں کو جوڑ کر بنا تھا ۔ جس کے نیچے چھوٹے چھوٹے گھنگھرو لگے تھے ، جو کمرے کی خاموشی میں دھیرے دھیرے بجنے لگے ۔

" تمہاری ماں دوسروں کے جیون میں خود کو ڈھونڈتی ہے ، اور اُنہیں اپنی بھولی ہوئی باتیں یاد آتی ہیں ..... دوسروں کی زندگی کی یاترا کے ساتھ ہی ۔ "

وہ صراحی سے گلاس میں پانی اُنڈیلتی ہوئی ٹھٹھک گئی ۔ ایک لمحہ کے لیے اُس کی آنکھوں سے چمک غائب ہو گئی ۔ اس کی اداس گیلی آنکھوں میں پھر خوشی دوڑ گئی ۔

" تم میں اتنا آزاد رہنے کی ضد کہاں سے آئی ؟ "

" ضد ! "

اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا ۔ وہ کچھ ڈھونڈتی اور ٹٹولتی ہوئی لگی ۔ جیسے زندگی میں پہلی بار کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو ۔

" ماں سے پیار اور ترس نے ہی شاید مجھے اُکسایا ۔ پتا بات بات پر ماں کو ڈانٹ دیا کرتے تھے ۔ کبھی ہاتھ بھی اُٹھا دیتے ۔ جیسے ان کے راستے میں ماں کوئی رکاوٹ ہو ۔ شروع میں وہ اُن کے سامنے بولتیں .... بعد میں چُپ رہنے لگیں ۔ دوسروں کی موجودگی میں بے عزّتی برداشت کرنے لگیں ۔ کچھ ایسے ہی کارن ہو سکتے ہیں ۔ "

لیکن میں کہیں اور تھا ۔ ان باتوں اور فرصتوں کی طرف من بھاگ رہا تھا ۔ جو اب کے بعد شروع ہو جائیں گی ۔ تمام عمر اکیلے رہنے کے بعد یہ ڈر واجبی تھا ۔ پھر دوسروں کے پاس پہنچتے ہی میری کوئی ضرورت نہیں رہتی ۔ یہ گھماؤ دار راستوں پر چلنے کے بعد کی عادت ہے ۔ یہ اتنے چھوٹے کمرے میں کیسے کام کرے گی ۔ اب ہماری گاڑی بنا کام کے کیسے چلے گی ۔

" تم خوش نہیں ہو " مجھے لگا کہ وہ بہت دیر کے بعد بولی ہے ۔ میں اتنے سے ہی پگھل گیا ۔

" نہیں ، میں ہمیشہ تنہا رہا ہوں ... مجھے ... "

" تم نے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ میں نے تم سے کیا پوچھنا تھا ؟ " اُس نے ٹوکا ۔

" مجھے معلوم ہے ۔ "

وہ سنتے ہی بچوں کی طرح چہکنے لگی ۔ کچھ دیر پہلے اس کی باتیں زہر کی طرح اندر اُتر رہی تھیں ۔ اب اس کی باتیں ایک سُکھ کی طرح تھیں ۔ اس کی موجودگی باعثِ خوشی بن گئی ۔ اس کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے وہی احساس ہوا جو کلاک ٹاور میں اُسے بل ادا کرتے دیکھ کر ہوا تھا ۔ اور اگلی والی ٹیبل پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے اپنے پریمی کو آنکھ سے اشارہ کیا تھا ۔ ہم دونوں بہت دیر تک ہنسے تھے اُس دن ۔ وہ آج بھی اسی طرح ہنس رہی تھی ۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ میں اُسے لمبے عرصے سے جانتا ہوں ۔ کبھی اُس کا 'گھر پریوار' اور دوسری باتیں معلوم ہی نہیں تھیں —— میرے اندر نئی باتیں اُٹھنے لگیں کہ کل سے لوگ ہماری نئی زندگی کے بارے میں کیسی کیسی باتیں کریں گے ؟ ہر بات کو دوسرے معنوں میں لیا جائے گا ۔ بات اتنی معمولی نہیں ہے ..... جب اُس کے پاس ہونے سے ایک سُکھ کا احساس ہو رہا ہے تو کیا اس کمرے میں ہم دونوں کا ہونا من سے شریر تک نہیں پہنچ سکتا ؟

" میں تمہیں وہی کو بتا سناتی ہوں " آگے ملاحظہ

م۔ک۔ مہتاب

# کمینے مرد

ودیا ہمارے آفیسرز کلب کی دوسری خاتون ممبر ہے وہ کلب کی ممبرشپ کی مستحق تو نہیں کیونکہ وہ آفیسر نہیں لیکن اس کی رکنیت پر کسی کو اعتراض نہیں بلکہ رنجنا ساہنی نے جو ایک پراجیکٹ آفیسر ہے خود ودیا کے نام کی سفارش کی تھی۔ اول تو اس لیے کہ اسے کلب میں ایک عورت کا ساتھ مل جائے گا اور دوسرے اس لیے کہ ودیا ہمارے جوائنٹ ڈائرکٹر کی پی اے ہے۔ قریباً سب آفیسر اسی کی وساطت سے جوائنٹ ڈائرکٹر کو ملنے کے لیے جاتے ہیں اور سب افسروں کی یہ کوشش بھی رہتی ہے کہ انھیں ودیا کے ذریعہ دفتر کے اہم فیصلوں کی خبر ملتی رہے

ہمارا کلب کوئی رسمی یا بڑا کلب نہیں ہے محض مل بیٹھنے چائے پینے اور تھکاوٹ دور کرنے کا اک بہانہ ہے ساڑھے گیارہ بجے قبل دوپہر اور شام چار بجے دس بارہ لوگ جمع ہو کر ایک انڈر سکریٹری کے کمرے میں آجاتے ہیں گرم گرم چائے پر پچیس تیس منٹ دفتری معاملات اور حالاتِ حاضرہ پر تبادلہ خیال ہوتا ہے کبھی کبھی ذاتی اور گھریلو معاملات بھی زیرِ بحث آجاتے ہیں۔ چائے پانی کی تمام تر ذمہ داری ودیا کے سپرد ہے جسے وہ ایسی خوبی سے انجام دیتی ہے کہ نہ کبھی کسی ممبر کو شکایت کا موقع ملا ہے اور نہ کبھی کسی نے یہ محسوس کیا ہے کہ وہ کسی اجنبی جگہ پر چائے پی رہا ہے۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فرحت بخش گھریلو ماحول میں تھکاوٹ دور کی جارہی ہے جس میں ہر جگہ ودیا ساہنی کا ہنستا مسکراتا چہرہ چھایا ہوا دکھائی دیتا ہے کبھی کبھی کوئی رکن ودیا کے حسن انتظام کی تعریف کر دیتا ہے تو کوئی اس کے سلیقے کی سراہنا کرتا ہے جس سے وہ چائے کے وقت سے پہلے ہی کراکری وغیرہ نہایت قرینے سے سجا سنوار کر رکھا دیتی ہے

ودیا جاذبِ نظر تو ہے ہی خوش گفتار بھی بہت ہے۔ بات بات میں ہنسی کا پہلو نکال لیتی ہے اور اس کے گلابی گلابی ہونٹوں میں موتیے کی کلیاں مسکرانے لگتی ہیں۔ اس کے بھورے بالوں کی لمبی سی چوٹی اس کی کمر پر جھولتی رہتی ہے اور جب وہ کام کرتے ہوئے اپنی ساڑھی کا پلو ناف کے قریب اُڑس لیتی ہے تو اس کے حسن کا چمن مہک اٹھتا ہے اس کے جسم کے خطوط اور زاویوں کو دیکھ کر گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دو بچوں کی ماں ہوگی جب کلب کے مرد رکن دفتری ذمے داریوں کے بوجھ تلے دبے تھکے ماندے چائے کی میز پر آتے ہیں ودیا ہمیشہ شگفتہ پھولوں سے لدی شاخ کی مانند مہکتی لہکتی ان کے خیر مقدم کے لیے موجود ہوتی ہے۔ اسی سبب وہ کلب کی سب سے ممتاز رکن دکھائی دیتی ہے۔

مرد خواہ عمر کے کسی حصے میں پہنچ جائے ارادی یا غیر ارادی طور پر نسوانی دلکشی سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا کرتا رہتا ہے چنانچہ کلب کے کئی ممبر جو ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ چکے ہیں وہ بھی آتے ہیں ودیا کو تلاش کرتے ہیں ایک آفیسر نے تو ایک دن کہہ ہی دیا کہ ودیا کلب کی جان ہے دوسرا جھٹ سے بول اٹھا "سچ تو یہ ہے کہ جس دن ودیا نہ آئے یوں محسوس ہوتا ہے آج چائے میں چینی نہیں ڈالی گئی"۔

اسی مقبولیت کے سبب افسر نہ ہوتے ہوئے بھی ودیا اور دوسرے افسروں کے درمیان کوئی جھجک حائل نہیں۔ سب کسی بھی موضوع پر ہم مرتبہ افراد کی مانند اظہارِ خیال کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو ودیا اپنی دلیل سے مردوں کو بھی قائل کر جاتی ہے۔ ودیا کے اندازِ بیاں میں ایک شگفتگی ہے اسی لیے لوگ کئی بار نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے متفق ہو جاتے ہیں۔ ہاں رنجنا کو میں نے کئی بار ودیا سے حسد کرتے دیکھا ہے۔ اول تو اس لیے کہ رنجنا کی عام واقفیت کا دائرہ محدود ہے مرد لوگ دفتری معاملات سے ہٹ کر اس سے زیادہ بات کرنا درست نہیں سمجھتے۔ دوسرے اس لیے بھی کہ ودیا کی جسمانی دلکشی کے مقابلے میں رنجنا کا خانہ خالی ہے۔ جس دریا میں کوئی موج ہی نہ ہو وہاں کوئی گنے کا کیا؟ ایک دو بار تو رنجنا کی پرخاش کا یہ جذبہ ابھر کر سامنے بھی آگیا جب اس نے ودیا کی دلیل کاٹنے کی کوشش کی یا اگر ودیا کی عدم موجودگی میں کسی نے اس کا ذکر کیا تو رنجنا نے جھٹ موضوع بدلنے کی کوشش کی

---

اے-۱۸۷/ اپشچم وہار نئی دہلی — ۱۱۰۰۶۳

مردوں کی موجودگی میں عورتوں میں یہ احساسِ برتری پا لینا ایک فطری چیز ہے اس لیے مجھے رنجنا کے طرزِ عمل پر کبھی تعجب نہیں ہوا - حالانکہ میں خود اپنے آپ پر ہنس دیتا ہوں کہ میں وِدیا سرین کو اتنی اہمیت کیوں دیتا ہوں۔ یا مجھے اس سے ایک گونہ ہمدردی کیوں ہے؟ کیا اسے کسی قسم کی محبت کا نام تو نہیں دیا جا سکتا؟ -

کبھی کبھار وِدیا کوئی فائل دینے کے لیے میرے کمرے میں بھی آجاتی ہے اور کئی بار میں بھی فائل چپراسی کے ہاتھ بھیجنے کے بجائے خود ہی جاتا ہوں اور جب تک مسٹر کول فارغ نہ ہوں وِدیا کے پاس بیٹھا گپ لڑایا کرتا ہوں

لیکن کچھ دیر سے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ مردوں کے تئیں وِدیا کے لہجے میں کچھ تبدیلی بلکہ سرکشی آگئی ہے میں اس تبدیلی کا سبب نہیں سمجھ سکا کیونکہ میں نے ہمیشہ اس کی باتوں میں ایک اپناپن پایا ہے ہمدردی پائی ہے ایک بار میں نے یونہی وِدیا سے ذکر کیا کہ میرا بچہ بہت بیمار ہے تو وہ کیسے بے چین ہو اٹھی تھی گویا اس کا اپنا بچہ بیمار ہو وہ خواتین کی انجمن کی طرف سے چلائی جا رہی ایک ڈسپنسری کی سرکردہ رکن بھی ہے وہ وہاں سے میرے بچے کے لیے کتنی قیمتی دوائیں لے آئی تھی یہاں تک کہ وہ شام دفتر سے لوٹتے ہوئے میرے بچے کی تیمارداری کے لیے ہمارے گھر بھی چلی گئی حالانکہ اس کی آمد ایک غلط فہمی پیدا کر گئی۔

"آج آپ کی ایک خوبصورت سہیلی بچے کی مزاج پرسی کے لیے آئی تھی" میں اپنی بیوی کے ان الفاظ کے نیچے چھپی ہوئی چبھن اور کڑواہٹ کو اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ ہوا یوں کہ میں گھر پر نہیں تھا اور وِدیا سرین نے میری بیوی سے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا

"مہندر جی میرے دوست ہیں ہم ایک ہی دفتر میں کام کرتے ہیں"

میں نے بیوی سے کہا حسد عورت کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ کسی عورت کی زبان سے اپنے شوہر یا محبوب کا ذکر سن کر تمہارا دماغ خراب ہو جاتا ہے تم نے اس عورت کے ہمدردی کے جذبے کی قدر نہیں کی کہ وہ گھر جا کر اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرنے کی بجائے تمہارے بچے کی مزاج پرسی کے لیے چلی آئی۔ اس کی اس نرم دلی کا شکریہ ادا نہیں کیا کہ وہ تمہارے بچے کے مرض کا پتہ چلتے ہی کتنی قیمتی دوائیں لے آئی۔ بس تمہیں اتنا یاد رہ گیا "تمہاری ایک خوبصورت سہیلی آئی تھی" عورت ذات عورت ہی رہے گی۔ خواہ وہ کسی مرتبے پر ہی کیوں نہ پہنچا دی جائے۔

دوسرے روز مجھے اپنے اس غصے پر کچھ ندامت کا احساس بھی ہوا کہ میں نے سب عورتوں کو کیسے ایک ہی رسی میں باندھ دیا؟ وِدیا سرین بھی تو ایک عورت ہے اس نے کبھی اس انداز میں نہیں سوچا۔ البتہ کچھ دنوں سے میں یہ ضرور محسوس کر رہا ہوں کہ مردوں کے تئیں وِدیا کے رویے میں واضح تبدیلی آ رہی ہے۔ کئی بار میں نے اس کے الفاظ میں تیکھے پن کی چبھن محسوس کی ہے۔

ایک دن جب مسٹر کول دورے پر چلے گئے تھے وِدیا ایک فائل لے کر میرے کمرے میں آگئی۔ چائے کا وقت تو نہیں تھا پھر بھی مل بیٹھنے کا کوئی بہانہ تو چاہیے میں نے چائے منگوا لی۔ وِدیا کچھ تھکی تھکی سی دکھائی دے رہی تھی آنکھیں خواب آلود تھیں گویا کئی روز سے پوری نیند سوئی نہ ہو۔ اگرچہ اس حالت میں وہ پہلے سے بھی زیادہ معصوم اور حسین دکھائی دے رہی تھی۔ اِدھر اُدھر کی کچھ باتوں کے بعد وہ کہنے لگی:

"مہندر جی! اب آپ کلب کی ذمہ داری کسی اور کے سپرد کر دیجیے"

"کیوں آپ اچھی بھلی کام کر رہی ہیں۔ ہر رکن آپ کی تعریف کرتا ہے۔ پھر آپ کو کوئی زیادہ وقت بھی صرف نہیں کرنا ہوتا چپراسی سارا کام کر دیتے ہیں۔ چندہ ممبر لوگ خود جمع کرا دیتے ہیں آپ کو صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ چائے وقت پر لگ جائے اور بسکٹ کم نہ پڑ جائیں۔ پھر آپ اس ذمہ داری سے سبکدوش کیوں ہونا چاہتی ہیں؟"

"بس یوں ہی۔ میں نے دو تین برس تک یہ ذمہ داری سنبھالے رکھی ہے۔"

"پھر کیا ہوا۔ ہمارا یہ کلب تھوڑے ہی ہے۔ ایک دوستانہ گھریلو ماحول ہے کیا گھر کی کوئی ذمہ دار عورت دوسرے افراد سے یہ کہہ سکتی ہے کہ اپنا اپنا کھانا خود پکایا کریں۔ کیا آپ کے پاس دفتر کے کام کا بوجھ بڑھ گیا ہے؟"

"نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تو کیا آپ مردوں کی رفاقت یا کمپنی سے اُوب گئی ہیں؟" یہ کہتے کہتے میں نے وِدیا کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی کے سائے کچھ اور گہرے ہو گئے تھے۔ اس کے سینے کا زیر و بم کچھ تیز ہو گیا تھا گویا سمندر میں جوار بھاٹا آ رہا ہو۔ یا جذبات کا کوئی ریلا دل کی گہرائیوں سے ابھر کر باہر آنا چاہتا ہو مگر راہ نہ مل رہی ہو۔

وہ میری بات کا کوئی جواب نہ دے سکی البتہ اس کی نیلگوں بھوری آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک لہر سی ابھر آئی۔

میں ایک دم پریشان ہو اٹھا۔ یقیناً کلب کے کسی مرد ممبر سے کوئی غلطی ہوئی ہے ورنہ پھول سی وِدیا کے چہرے پر میں نے کبھی شبنم کے قطرے نہیں دیکھے تھے۔ میں نے اس سے پھر پوچھا:

"وِدیا! تم مجھے اس شخص کا نام بتاؤ۔ ہم اسے خاموشی سے کلب کی رکنیت سے خارج کر دیں گے"

"نہیں مہندر جی! مجھے کسی ممبر سے کوئی گلہ نہیں بس آہستہ آہستہ مجھے مردوں سے ہی ایک قسم کی بیگانگی ہوتی جا رہی ہے۔ میں سوچنے لگی ہوں کہ یہ جنس مختلف ہے اس کا سوچنے کا انداز الگ ہے۔ وہ عورت کو پہلے عورت پھر انسان سمجھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ عورت سب کچھ برداشت کرتی رہے اور اس سے آگے قدم نہ بڑھائے ایسے ماحول میں غلط فہمیوں کا احتمال ہو سکتا ہے۔ ہر دل سمندر کی طرح وسیع نہیں ہوتا جہاں طوفان موج بن جاتے ہیں بلکہ اکثر دلوں میں لہریں بھی طوفان بن جاتی ہیں۔"

لیکن آپ تو اکثر ایسے مباحثوں میں عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی صفات کی وکالت کیا کرتی ہیں۔ یاد ہے آپ نے ایک بار اپنے ایک دوست کے بارے میں کتنی پُرلطف باتیں سنائی تھیں"

"ہاں وہ ایسا تھا بھی" وِدیا نے ایک گہری سانس

لی سینے پر لٹک رہے منگل سوتر کو درست کیا دونوں گھٹنے میری میز سے ٹکا کر کمر کو کرسی کی پشت سے لگاتے ہوئے بڑی بے تکلف ہو کر کہنے لگی:

"مہندر جی! ہر آدمی گوپال شرما تو نہیں ہو سکتا۔ وہ بچپن سے میرا دوست ہے۔ بی اے تک ہم جماعت رہے۔ ہم ایک دوسرے سے اتنے گھلے ملے تھے کہ نہ اس نے کبھی سوچا کہ میں ایک لڑکی ہوں اور نہ میں نے کبھی خیال کیا کہ وہ ایک لڑکا ہے ہم تو بس دوست تھے۔ ہر کام میں ایک دوسرے کی مدد کرنا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ گوپال چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے بہت اچھا کام دھندا ہے خوب کماتا ہے اور خرچ کرتا ہے۔ اس نے میری شادی پر اتنے قیمتی تحفے دیئے کہ کوئی بھائی بھی اپنی بہن کو کیا دے گا کیونکہ وہ دوستی کا مقام رشتے داری سے بہت بلند سمجھتا ہے۔ اپنی اور میری گھریلو ذمہ داریوں کے باوجود اب بھی وہ سمجھتا ہے کہ ہم دوست پہلے اور انسان بعد میں ہیں۔ اسے ایک لڑکی اچھی لگی تو اس نے مجھ سے کہا کہ پہلے میں اس لڑکی کو پسند کر دوں تب وہ اس سے شادی کرے گا۔ اس کے لڑکا پیدا ہوا تو جتنی خوشی مجھے ہوئی شاید ہی اسے اور اس کی بیوی کو ہوئی ہو۔ اب آپ ہی بتائیے کہ کیا دوستی کے اس پاک جذبے کے لیے اس دور میں کوئی جگہ ہے؟ جہاں ہر شخص فرائڈ کے نظریے کا قائل ہو کر یہ سمجھنے لگا ہے کہ ہر قسم کے لگاؤ اور چاہت کے نیچے جنسی بھوک چھپی رہتی ہے۔"

میں نے ودیا کو پہلے کبھی اتنا جذباتی ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بہت مطمئن زندگی گذارتی ہے۔ اس کا شوہر دیپک سرین ایک کپڑا مل میں سیلز ایگزیکیٹو ہے۔ میاں بیوی مل کر گھر کی گاڑی اچھی طرح چلا رہے ہیں۔ دو خوبصورت بچے ہیں۔ متوسط الحال مسرور کنبہ ہے۔ دیپک ایک دو بار دفتر آیا تو مجھے بھی ملا۔ اچھا مہذب، نرم گو اور بردبار قسم کا آدمی ہے۔ ایک بار تو میں نے ودیا سے ازراہِ مذاق کہا بھی تھا کہ تمہارا شوہر تم سے بھی اچھا آدمی ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں ودیا کو شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ پھر ودیا کو مردوں کے بارے میں ایسی بدگمانی کیوں ہوتی جا رہی ہے کہ وہ مردوں کی صحبت سے ہی منہ موڑ لینا چاہتی ہے۔

ودیا کہہ رہی تھی کہ اگر عورتیں مردوں کی ہمدرد اور بہی خواہ ہو سکتی ہیں تو مرد عورتوں کے سچے دوست کیوں نہیں ہو سکتے یہ دوستی مشکوک کیوں سمجھی جاتی ہے گوپال شرما میرا ہی نہیں سارے کنبے کا دوست ہے۔ شاید ہی کوئی مہینہ ایسا گذرتا ہو جب وہ ہم سب کی خیر و عافیت دریافت کرنے نہ آتا ہو۔ وہ کبھی خالی ہاتھ نہیں آتا۔ بچوں کے لیے کھلونے مٹھائی وغیرہ ضرور لاتا ہے۔ جھکی سا آدمی ہے۔ خدا نے دے بھی بہت کچھ رکھا ہے پیسے کو ہاتھ کی میل سمجھتا ہے۔ جبکہ ہم اس کے مقابلے میں ٹھیک ٹھیک ہی ہیں۔ دیپک نے مجھے کئی بار کہا بھی ہے کہ ہم تو گوپال کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ میرا جواب ہمیشہ یہی رہا ہے کہ دوستی دوکانداری نہیں ہوتی کہ ایک ہاتھ دو اور دوسرے ہاتھ لو اگر ہم سب لوگ گوپال سے اتنا پیار کرتے ہیں تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ کچھ بچوں کے لیے آتا ہے تو وہ اس پیار کی قیمت ہے۔"

قریب ایک ماہ کی بات ہے گوپال کی شادی کی سالگرہ تھی۔ وہ شام کے وقت ہمارے گھر آیا۔ دیپک اپنی مل کے کام سے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ گوپال نے کہا آج میری شادی کی سالگرہ ہے چلو بچوں کو کچھ کھلا پلا لائیں۔ مجھے گھر پر کچھ خاص کام نہیں تھا۔ میں بچوں کو لے کر گوپال کے ساتھ بازار چلی آئی۔ راستے میں گوپال نے اپنی بیوی کو لیا اور ہم اس کی کار میں ایک آئس کریم بار میں آ بیٹھے۔ میں نے کہا ہے نا گوپال ایک خبطی قسم کا آدمی ہے۔ اس روز آئس کریم کی شاید ہی کوئی قسم ہوگی جو اس نے ہمیں نہ کھلائی ہو۔ خوب گپ شپ ہوتی رہی۔ راستے میں وہ جوتوں کی اپنی پسندیدہ دکان پر رک گیا۔ سالگرہ پر جوتا خریدنا اس کے لیے لازمی تھا۔ اس نے اپنے لیے جوتا خریدا۔ بیوی کو سینڈل لے کر دیے۔ اور میرے لیے بہت قیمتی سینڈل اور دونوں بچوں کے لیے ایسے خوبصورت جوتے پسند کر کے دیے کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکی۔ مگر وہ کہے جا رہا تھا۔

"دیکھو تمہیں کچھ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میری خوشی کی بات ہے اور ایک دوست کے ناطے مجھے اتنا حق تو حاصل ہے کہ اس موقع پر دو چار روپے خرچ کر سکوں۔"

"مگر میری حیثیت ......." میں کچھ کہنا چاہتی تھی۔

"خوشی میری ہے اس لیے سوال میری حیثیت کا ہے" اور اس نے پیکٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

بچے اتنے اچھے جوتے اور موزے لیکر پھولے نہیں سماتے میں بھی ایک بار تو نئے سینڈل پہن کر اپنے پاؤں کی جانب دیکھتی رہ گئی۔ کتنا اعلیٰ ذوق ہے اس کا۔ میں نے سوچا کہ دیپک کے دورے سے لوٹنے کے بعد گوپال اور اس کی بیوی کو انکی شادی کی سالگرہ کی خوشی میں بہت عمدہ کھانے پر مدعو کروں گی۔ لیکن دیپک نے یہ تجویز رد کر دی۔ ٹھیک بھی ہے دوستی دوکانداری تو ہے نہیں کہ بدلے میں ضرور کچھ کیا جاتے۔ اپنی اپنی توفیق کی بات ہے۔ زندگی میں خوشی کے کتنے موقع آتے رہتے ہیں۔ مجھے دیپک کی تجویز بری نہیں لگی۔

لیکن تین دن ہوئے جب میں دفتر سے گھر لوٹی تو دیپک صاحب گھر پہ نہیں تھے۔ دونوں لڑکے کچھ اداس اداس دکھائی دیئے میں نے وجہ پوچھی تو چھوٹا لڑکا اپنی ہتھیلیوں کی پشت سے آنسو بھری آنکھیں ملتا ہوا کہنے لگا:

"ممی! ڈیڈی نے تینوں جوتے اٹھا کر مکان کے پچھواڑے میں بہہ رہے گندے نالے میں پھینک دیے ہیں۔"

"میں دھک سے رہ گئی جیسے اعتماد کی دیوار ڈھے گئی ہو دیپک سے میری کوئی بات نہیں ہوئی۔ البتہ مجھے رات کو ٹھیک سے نیند نہیں آ رہی۔ یہی سوچتی رہتی ہوں:

کیا مرد عورت میں ایک ہی رشتہ ہے؟

کیا دونوں کے درمیان ایک ہی رشتہ ہو سکتا ہے؟"

بقیہ صفحہ ۴۲ پر

شمیم نکہت

# دو آدھے

میرے رکھے اکو آپ ـــــ مانو کے کچھ نا ہیں ہاتھ۔

پانچویں گروشری ارجن دیو کی یہ بانی بے بے جی نے اس کے کیس سلجھاتے ہوئے بہت بار دہرائی تھی۔ اور سنتے سنتے وہ بھی ایسا ہی سوچنے لگا تھا کہ سب کچھ بھگوان کی مرضی سے ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی ایسی ویسی بات ہو جاتی تو وہ بڑی معصومیت سے اپنی گردن اونچی کر کے اوپر کو دیکھنے لگتا کیونکہ بھگوان اوپر رہتا ہے۔ اور پھر نیلے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں جب کوئی کالی سی ٹکلی ڈر ڈولتی نظر آتی تو وہ سمجھ لیتا، ہو نہ ہو بھگوان کی مرضی یہی ننھی سی ٹکلی ہے۔ دور سے آتی ہوئی کہیں کبھی چپک جائے گی۔ اور وہ ڈر جاتا۔ اس نے بہت بار۔ رنبیر سے اسی بات پر جھگڑا بھی کر لیا تھا ـــــ رنبیر کہتا ـــــ چال ـــ یہ تو چیل ہے۔ بھگوان کی مرضی کہیں ایسی ہوتی ہے ـــــ؟ بابا تو کہتا ہے ـــ اور سکھبیر بابا کی بات ان سنی کر کے لٹوں کی ڈوری کھینچ لیتا اور لٹو زمین پر گھومنے لگتا ـــــ لٹو کو گھومتے دیکھ رنبیر بھی ـــــ بابا کی بات بتاتے بنا ـــــ جلدی جلدی اپنے لٹو پر ڈوری لپیٹنے لگتا۔

اور پھر دونوں ہی اپنے ہاتھوں کے بل بوتے پر ہار جیت کا فیصلہ کرنے لگتے ـــــ اکثر کھیلتے کھیلتے جھگڑ پڑتے۔ ایک بار تو ایسے گتھم گتھا ہوئے کہ قمیص کے دو الگ الگ حصے کندھوں پر لٹک پڑے تھے۔ اور سکھبیر کے کیس کھل کر بکھر گئے تھے۔ رنبیر کے گالوں اور کانوں پر سرخ کھرونچیں ابھر آئی تھیں۔ دونوں کی ماؤں نے ایک دوسرے کو برچھیوں جیسی تیز نظروں سے چھید ڈالا تھا۔ لیکن کیا مجال جو منہ سے آواز نکل جاتی۔ ابھی! بے بے جی زندہ تھیں ـــ دونوں ہی گھروں کی مالکن ـــــ

کسی کو نہیں معلوم تھا کہ دو ننھے ننھے بچوں کی نازک سی نوجوان بیوہ ماں وقت کی آگ پر تپ کر کندن بن جائے گی۔ پر ہوا ایسا ہی تھا ـــ اور اسی کندن کو سارے گاؤں والے بے بے جی کے نام سے پکارتے تھے ـــ

جب پہلی بار ان کی گود بھری تو بزرگھوں کی بنی ریت پر انہوں نے بچے کے کیس رکھائے تھے ـــــ اس خاندان میں یہی ہوتا آیا ہے کہ پہلا بیٹا ـــــ گروؤں کے نام پر پانچوں ککے دھارن کرتا ـــــ اور وہی خوشی خوشی بے بے جی نے بھی کیا تھا ـــــ اور چونکہ سکھبیر بڑے کا بیٹا تھا ـــــ سو اسکے بھی کیس تھے ـــــ

تاہم رنبیر اور سکھبیر میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اکثر لوگوں کو شک ہوتا کہ دونوں جڑواں تو نہیں ہیں ـــــ اگر رنبیر کے کیس بڑھا دیے جاتے یا سکھبیر کے کیس نہ ہوتے تو دونوں میں تل برابر فرق نہ رہتا ـــــ مزاج بھی دونوں کا یکساں تھا ـــــ اور پسند بھی ـــــ دونوں ہمیشہ ساتھ ہی ساتھ دیکھنے میں آتے تھے۔

دن بھر خاک دھول اڑا کر رات میں جب زبردستی الگ ہونا پڑتا ـــــ تو دونوں ہی اپنے اپنے کھیس میں منہ کر کے ـــــ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامتے ـــــ اور پریوں کے دیس میں سیر کو نکل جاتے ـــــ اور دن نکلتے ہی دونوں پھر جڑ جاتے۔

دونوں ساتھ ہی دیوی ماں کے درشنوں کو گئے تھے۔ اور گپھا کی مدھم روشنی میں جھل جھل کرتے موتی جیسے پانی کو ماتھے سے لگایا تھا ـــــ کہ پانی زندگی کی علامت ہے اور تمام کثافتوں کو دھو دینے کا واحد ذریعہ بھی ـــــ سو امرت سر میں بھی دونوں نے سدا۔ امرت پان ایک ساتھ کیا تھا ـــــ دونوں ایک ہی جو تھے۔

دونوں کے باپ تو خیر سگے بھائی تھے ـــ پر ماؤں میں بھی کبھی ایسی کھٹا پٹی نہیں ہوئی کہ آواز باہر جاتی ـــــ البتہ بے بے جی نے دونوں کے گھر اپنی مرضی سے الگ ضرور کر دیے تھے۔ ایک گھر میں لینا کا پاٹھ ہوتا تو دوسرے میں گرو گرنتھ کا۔ لیکن نہ سکھبیر نے ان باتوں پر کان دھرے اور نہ رنبیر نے ـــــ دونوں کو پرساد سے مطلب تھا ـــــ سو دونوں ـــــ ننھی ننھی ہتھیلیاں ایک دوسری پر رکھ کر پرساد لے لیتے ـــ ماتھے سے لگاتے اور منہ میں رکھ کر نو دو گیارہ ہو جاتے۔

آمنے سامنے بنے گھروں سے انہیں کوئی مطلب نہیں تھا ـــ لیکن دونوں کے بیچ کھڑے پرانے

نیم کے نیچے کی ساری زمین ان کی اپنی ملکیت تھی ــــ اور دونوں ہی اس کے حصہ دار تھے ــــ ایسے ہی جیسے روح اور جسم ہو ــــ سمندر اور لہریں ہوں ــــ برف اور ٹھنڈک ہو ــــ ان کا وجود ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا ــــ اسی لیے ایک دوسرے کے بغیر آدھا رہتا ــــ بڑے مثال دیتے ــــ جوان ہنستے اور برابر والے اس جوڑی کو دیکھ کر جلتے ــــ

دھیرے دھیرے دونوں گبرو اونچے ہو رہے تھے ــــ اور ان کی دوستی بھی گہری ہوتی جا رہی تھی ــــ اس کی ابتدا تو اس وقت ہوئی تھی، جب کپڑوں سے بے نیاز ــــ ننھے ننھے ہاتھوں میں چمکیلے کڑے پہنے پیروں اور ہاتھوں کے بل چلتے ہوتے دونوں نیم کے نیچے پہونچ جاتے ــ اور پھر دونوں ہاتھوں سے مٹی اچھال اچھال کر کلکاریاں بھرتے ــ ننھی ننھی کنکریاں اور کڑوی کسیلی نمکولیاں منہ میں ڈال لیتے ــــ مائیں دوڑتی ہوئی آتیں ــ اور جلدی جلدی منہ میں انگلی ڈال کر بہتی ہوئی رال کے ساتھ نمکولیاں اور کنکریاں نکال لیتیں ــ

پھر دونوں ہاتھ زمین سے اٹھ گئے تھے کمر پر کچھے لٹکنے لگے تھے ــ اور دو چھوٹے چھوٹے پاؤں آنگن سے باہر اور باہر سے نیم تلے دوڑنے لگے تھے ــ اور دونوں نیم کی جھکتی ہوئی ڈالیوں کو چھونے کے لیے اونچے ہونے لگے تھے ــــ رنبیر ذرا موٹا اور سکھبیر ذرا دبلا تھا ــ پر اونچائی میں دونوں نے شرط لگا رکھی تھی ــــ دونوں اسکول بھی ساتھ جاتے تھے ــ لیکن پڑھائی سے زیادہ پہلوانی میں جی لگتا ــ آتی جوانی نے سب سے پہلے ــــ چوڑے چکلے سینوں کو چوما تھا ــــ اور بانہوں کی مچھلیاں اچھل پڑی تھیں ــــ گاؤں کی کنواریاں کوٹھے کی منڈیروں اور دیواروں کی آڑ سے تاک جھانک کرتیں ــــ اور دونوں کا نام لے کر ایک دوسرے کو چھیڑتیں ــــ تو ان کی کنپٹیاں دہک اٹھتیں ــــ ایک دوسرے کے بگوٹے نوچ کر اپنی بے تابیوں کا اظہار کرتیں ــــ اور کبھی آتے جاتے آمنا سامنا ہو جاتا تو موم کی طرح پگھل جاتیں ــــ ان کی ٹانگوں کا دم نکل جاتا اور وہ سن سن کرنے لگتیں ــ

اور بلیوں اچھلتا دل حلق میں اٹک جاتا

پھر رنبیر کی موسی شہر سے آئی اور سب کچھ تتر بتر ہو گیا تھا ــ وہ رنبیر کو اپنے ساتھ لے جا رہی تھی ــــ جوڑی ٹوٹنے کا غم بچھڑنے والوں کو ہو نہ ہوا ــــ پر گاؤں میں جیسے سناٹا چھا گیا ــــ جوان دل دھڑک اٹھے تھے ــــ اور چنیوں کے آنچل بھیگ گئے تھے ــــ اور ــــ اور کھیتوں کی منڈیا ــــ گلیارے چوہٹر سب نے اداسیوں کی چادر اوڑھ لی تھی ــ

سکھبیر رو پڑا تھا ــــ رنبیر کو نہ چاہتے ہوئے بھی جانا پڑ رہا تھا ــــ اس نے سکھبیر کی طرف کھوکھلی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا ــ ارے یار کیا تو لونڈیا ہے جو ٹسوے بہا رہا ہے ــــ میں جلدی ہی تجھے بھی کھینچ لوں گا ــ اور پھر اس نے اپنی بانہوں کی طرف اشارہ بھی کیا تھا ــ اسے یقین تھا کہ موسی کی فیکٹری میں لگتے ہی وہ اپنے آدھے کو جلدی سے بلا لیگا ــــ پڑوس کے ٹیلیویژن پر دونوں نے بہت سی فلمیں ساتھ ساتھ دیکھی تھیں ــــ اور شہر کے بارے میں اچھی خاصی جانکاری ہو چکی تھی ــ

ماسی کا تانگہ تیار ہو چکا تھا ــ اسمیں چھوٹی بڑی گٹھریوں کا انبار لگا ہوا تھا ــــ یہ چھوٹی بڑی گٹھریاں اور تھیلے اصل میں عزیزوں اور ملنے والوں کے تحفے ــــ یا یوں سمجھئے مان و محبت کے سرٹیفکٹ تھے ــــ

انسان بھی کیسا بے اعتبارا ہے ــــ وہ اپنے اوپر ــــ اپنی محبت پر ــــ اپنے خلوص پر خود اعتبار نہیں کرتا ــــ اور جب اعتبار کمزور ہو تو ثبوت کے لیے سند تو چاہیئے ہی ــــ تو یہ سب چھوٹے بڑے ثبوت تھے ــــ اور سب کو معلوم تھا کہ ماسی کی شہر میں فیکٹری بھی ہے ــــ تو کوئی پیچھے کیسے رہ جاتا ــ

ماسی کو بڑی مشکل سے بیچ میں فٹ کر کے ــ جب رنبیر نے جھک کر سارے بڑوں کے پیر چھوتے ــ تو دھرتی سرسر پیچھے پھسلتی معلوم ہوتی تھی ــــ اور ــــ اور سکھبیر تو اسے صاف دکھائی بھی نہیں دیا تھا ــــ سکھبیر بے یقینی کے دلدل میں دھنسا ان ہونی ــ ہوتے ہوتے دیکھ رہا تھا ــــ رنبیر نے تانگہ کا ڈنڈا پکڑ کر ــــ جب دھرتی سے پاؤں اونچا کیا ــــ تو ایکبار تانگہ بھی لرز سا گیا ــــ گھوڑے کی تنی ہوئی گردن میں کئی جھٹکے لگے اور بہت سے گھنگرو ایک ساتھ بج اٹھے تھے ــــ سکھبیر اور رنبیر کے ہاتھ ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑے ہوتے تھے ــــ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ تانگہ آگے بڑھ گیا اور دونوں کے پھیلے ہوئے ہاتھ ہوا میں معلق رہ گئے تھے ــــ سکھبیر کا آدھا دور ہوتا جا رہا تھا ــــ اور اس کے خشک ہونٹوں پر پیاس کی جھاڑیاں سی اگ آئی تھیں ــــ اور وہ جیسے ــــ زندگی کے لق و دق صحرا میں بالکل تنہا کھڑا تھا ــــ یا پھر کسی ظالم نے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے بھول بھلیوں میں چھوڑ دیا تھا ــــ جہاں ہزاروں سوچوں کے سمندر رحم کر پہاڑ بن جاتے ہیں اور زمین سے تلوؤں کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے ــــ آواز جیبھ کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے ــــ اور آنسو سینہ کے اندر پلٹ جاتے جہاں لاوا کھولنے لگتا ہے ــــ اور دیکھنے والا صرف پھیلی پھیلی دو آنکھیں اور پتھر سا چہرہ دیکھ سکتا ہے ــــ سو سکھبیر پر بھی لوگوں کو ترس آ رہا تھا ــــ

سکھبیر جیسے چونک پڑا ــــ اس نے جلدی سے اپنا ایک شانہ اچکایا ــــ پھر دوسرا ــ جیسے وہ یقین کر لینا چاہتا ہو ــــ اس کے دونوں بازو اس کے پاس ہیں ــــ یا نہیں ــــ اسے اپنے وجود کی بے یقینی کا احساس ہو رہا تھا ــــ وہ آدھا کیسے بچارہ گیا ــــ

اور اس کا آدھا کیسے اس سے چھن گیا تھا ــ اس نے تو ہمیشہ ہی سنا تھا ــــ دونوں ایک ہیں ــــ یا پھر مل کر گیارہ بن جاتے ہیں ــ اس نے اپنے اور رنبیر کے بارے میں کبھی دو کا تصور بھی نہیں کیا تھا ــ اور پھر بچھڑتے وقت وہ آدھا کیوں رہ گیا ــــ ؟

ان دونوں کا ایک ہونا تو اتنا پکا تھا کہ گاؤں کی لڑکیاں بھی رنبیر اور سکھبیر کو ادل بدل کرنے پر کبھی اعتراض نہ کرتیں ــــ خوشی خوشی ــــ

ایک ایک گبھرو بانٹ لیتیں ـــــ اور ـــــ ہوائیں ہنسی
کی پھلجھڑیوں سے رنگین ہو جاتیں ـــــ
یہ بات! یہ دونوں بھی جان گئے تھے اسی لیے
مسکراہٹیں بکھیرتے ۔ سینہ تانے ـــــ انجان بنے سامنے
سے گذر جاتے ـــــ

تانگہ اب بس اسٹاپ پر پہونچنے والا ہوگا
زمین میں کچھ موتی اور سما گئے ـــــ چاروں طرف سناٹا
تھا ـــــ گاؤں کی دھرتی بھی جیسے ایک کے بنا اداس
اس کا ایک لال اس طرف کو چل پڑا تھا جیسے لوگ شہر
کہتے ہیں شہر کے گرجتے ـــــ ٹھاٹھیں مارتے
انسانی سمندر میں اس کا وجود ایک ننھی سی کنکری یا
معمولی سے تنکے جیسا تھا ـــــ اس کی کیا گنتی؟ ـــــ
وہاں تو چاروں طرف رینگتی ہوئی قطاروں کا ایک نہ ختم
ہونے والا سلسلہ تھا ـــــ قطرہ قطرہ سمندر بوجھل ہو رہا
تھا ـــــ یہ قطاریں انسانوں کی تھیں ـــــ جو سانس
لیے بنا ـــــ اوپر کو منہ اٹھاتے چلی آ رہی تھیں ـــــ اور
دھیرے دھیرے اپنی ذات ـــــ اپنی پہچان ـــــ اور یہاں
تک کہ زندگی ہارنی جا رہی تھیں ـــــ کاش ـــــ اس
عظیم انسان نے سوجھ بوجھ اور ایکتا کا سبق ننھی سی چیونٹی
سے سیکھا ہوتا ـــــ کہ ان کی قطاریں قدم قدم پر
تجربوں کا سبق ایک دوسرے کے کانوں میں پھونکتی ـــــ
آگے بڑھتی ہیں ـــــ

رنبیر کا تانگہ کب کا بس اسٹاپ پہنچ چکا تھا
ـــــ اور بس ـــــ اپنے پیچھے سیاہی کی لکیر چھوڑتی ہوئی
ـــــ آگے جا چکی تھی ـــــ لیکن سکھبیر اب تک
نیم کے نیچے تنہا بیٹھا ـــــ ایک سوکھی ٹہنی سے
زمین پر لمبی لمبی لکیریں بنا بنا کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں
میں کاٹتا جا رہا تھا ـــــ زمین پر لکیروں کا ایک جال ابھر
آیا تھا ـــــ

گلیارے جانوروں کی واپسی کے بعد سنسان
ہو گئے تھے ـــــ نیم کے نیچے سیاہی گہری ہوتی
جا رہی تھی ـــــ سیکڑوں چڑیاں آس پاس درختوں پر
بیٹھ رہی تھیں اور ان کی باریک سوئی جیسی آوازیں اس کے
دماغ میں پیوست ہوتی جا رہی تھیں ـــــ

سکھبیرا ـــــ آواز دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی
ـــــ اس نے گردن اونچی کی ـــــ سامنے والے باغ کی کاہی
لگ رہی سورج کی تھالی سرخ ہو چکی تھی ـــــ اور بادل کے
آوارہ ٹکڑے اس کے گرد منڈلا رہے تھے ـــــ

سکھبیرا ـــــ اسے آواز پھر سنائی دی ـــــ
ماں دروازے پر کھڑی تھی ـــــ شاید سکھبیر کی ہچکچی
ماں کے احساس پر کانٹے اگا رہی تھی ۔ وہ پہلے بھی کئی بار
دہلیز پر آکر جھانک گئی تھی ـــــ اب تو خاصا اندھیرا ہونے
لگا تھا ـــــ سکھبیر اٹھ کھڑا ہوا ـــــ اس نے سوکھی
شاخ کو ایک طرف اچھالتے ہوئے ـــــ رنبیر کے
دروازے پر نظر ڈالی ـــــ کوئی سایہ اندر کھسک
گیا تھا ـــــ اس کے قدم رک سے گئے ـــــ ایسے
لگا کہ رنبیر دوڑ کر باہر آجائے گا ۔ دوسرے ہی لمحہ وہ
جاگ اٹھا تھا ـــــ وقت تیرے کی ـــــ وہ تو دور بس
میں اڑا چلا جا رہا ہوگا ـــــ اسے جھٹکا سا لگا ۔ وہ چلا کیسے
گیا ـــــ اپنے آدھے کو ٹیکر ـــــ وہ بھی تو آدھا ہی
رہ گیا ہوگا ـــــ سب ہی اکہرے تھے ـــــ اور سچ
بھی یہی تھا ـــــ اس کی سوچوں میں پرانی مشین کی
طرح جھٹکے آنے لگے تھے ـــــ سوچنے کی ان دونوں
کو عادت ہی نہیں تھی ـــــ کبھی کچھ سوچنے کو تھا ہی نہیں
ـــــ جس کسی نے کچھ کہا سن لیا جو جی میں آیا کہہ دیا ـــــ
پھر بھی اسے آج ایک انجانی عجیب سی لذت کا احساس
ہو رہا تھا ـــــ تنہائی کا عجب احساس اور وہ پل پل
ڈول رہا تھا ـــــ

رات چارپائی پر جیسے ہی لیٹا ـــــ مانو
آنکھوں سے جوالا مکھی ابل پڑا ہو ـــــ پھر بہت دن تک
ایسا ہی ہوتا رہا ـــــ دن بھر جگ جگ کر رکھتا ـــــ اور
رات میں قطرہ قطرہ لٹا دیتا ـــــ پھر آہستہ آہستہ صبر
کے پتھروں نے یادوں کے غار ڈھکنا شروع کر دیے
تھے ـــــ لیکن یہ غار پٹے ہیں ـــــ؟ جب شائیں
شائیں کرتا طوفان آتا ـــــ سارا جمع جتھا ـــــ
تتر بتر ہو جاتا ـــــ

اب بات پرانی ہو چکی تھی ـــــ پھر بھی رنبیر
کے جانے کے بعد سکھبیر کا داہنا کوئی نہ بن سکا تھا۔
وہ سارے کام کاج معمول کے مطابق کرتا ـــــ وہ
صبح منہ اندھیرے گھر سے نکلتا ـــــ

رنبیر کے دروازے سے اس کی یاد اٹھا کر کندھے پر
بٹھاتا اور سارا سارا دن کھیتوں اور بازاروں کے چکر
لگاتا ـــــ پھر رات کو چارپائی پر جاتے ہی شہر سے آتی
تازہ چٹھی مٹھیوں میں بھینچ بھینچ لیتا ـــــ جس میں
رنبیر کی بے چینی سطر سطر چھپی ہوتی ـــــ اگر
بابا یوں نہ چل بستا تو سکھبیر بھی کب کا شہر پہونچ چکا
ہوتا ـــــ اپنے آدھے کے پاس ـــــ رنبیر بھی
یہی لکھتا کہ وہ شہر میں اٹک آدھا ہی ہے ـــــ اور
یہ بھی کہ شہر میں وہ اپنے کو پورا کبھی کر بھی نہیں پائیگا
ـــــ وہاں دوست نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ـــــ وہاں
لوگ سانپ کی طرح کینچل بدلتے ہیں اور نئے بن جاتے ہیں۔
پر وہاں تو اس نے دن میں کئی کئی بار لوگوں کو کینچل بدلتے
ہوتے دیکھا تھا ـــــ اس نے بڑے افسوس کیساتھ
لکھا تھا ـــــ یار ـــــ کوشش کے باوجود شہر میں
کسی انسان سے نہیں مل سکا ہوں ـــــ اور یہ کہ آدمی کی
شکل شہر میں عنقا ہے ـــــ سب طرح طرح کے
کھوٹے اپنے چہروں پر لگاتے رہتے ہیں ـــــ اور مزے
کی بات یہ ہے کہ اس پر بھی اکتفا نہیں کرتے ۔ چند مزید
کھوٹے جیبوں میں رکھتے ہیں جو وقت ضرورت کام آتے
ہیں ـــــ یہی کھوٹے اوپر چڑھنے کی سیڑھیاں ہیں ـــــ
اور وہاں آدمی ناپنے کے فیتے کا نام کرسی ہے ـــــ اسی
کی اونچائی سے آدمی اونچا یا نیچا مان لیا جاتا ہے اور اس
نے بہت سے بونوں کو اونچی کرسی پر سوار دیکھا تھا ـــــ
رنبیر یہ سب کچھ تو بڑی تفصیل سے لکھتا لیکن اپنی
واپسی کے بارے میں کبھی کوئی اشارہ نہیں کرتا ـــــ اور
سکھبیر کے صحرا جیسے ذہن میں شک کے کانٹے سر اٹھاتے
ـــــ اس نے بھی ضرور کوئی مکھوٹا لگا لیا ہوگا ـــــ تبھی
تو گاؤں آنے سے کتراتا ہے ـــــ

وقت گذرتا رہا ـــــ لیکن جب کبھی یادوں
کی برف پگھلتی ـــــ تو ماضی پر انی تمام دھول نہ جانے
کہاں بہا لے جاتی ـــــ
پھر اس کے قدم خود بخود شہر کی طرف دوڑ پڑے

تھے ـــــ دونوں بالکل بچوں کی طرح بغلگیر ہو کر خوب ہنسے تھے ـــــ بہت اونچی آواز سے ـــــ لوگ رک رک کر دیکھنے لگے تھے ـــــ کہ یوں ملنا بدتہذیبی تھی ـــــ اس نے گاؤں کی اور رنبیر نے شہر کی بہت ساری باتیں بے صبری سے ایک دوسرے پر انڈیل دی تھیں ـــــ اور پھر رنبیر نے یقین دلایا تھا کہ وہ ابتک اپنے لیے کوئی بھی کھوٹا نہیں خرید سکا ـــــ سستا ہونے کے باوجود وہ حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے ـــــ اور اس کے پاس وہی پرانا گاؤں والا چہرہ ہے ـــــ جس کی وجہ سے وہ بار بار نقصان اٹھاتا رہا ہے

واپس اگر سکھبیر پھر آتے جاتے ڈاکیہ کو سنیہ سری اکال کرنے لگا تھا ـــــ کبھی کبھار ـــــ ہوا کے دوش پر سوار کوئی چٹھی آجاتی ـــــ تو ماضی کے سمندر میں یادوں کی سیپیاں چمک اٹھتیں اور پھر پل بھر میں سب کی سب گہرائیوں کے دلدل میں منہ چھپا لیتیں ـــــ اور وہ اپنے ادھورے پن کے سناٹوں میں پھر ڈولنے لگتا ـــــ

ابتو ماں بھی روٹھی رہتی ہے ـــــ ماں کو اس کا آدھا ہونا کھاتے جا رہا تھا ـــــ اور رنبیر کا خط پا کر اس نے ہاں بھی کر دی تھی ـــــ پھر ـــ آج ہی ـــــ ماں نے سرخ ستاروں والی چنّی خریدی تھی ـــ ہاتھی دانت والے چوڑے کی فرمائش وہ رنبیر کو لکھ چکی تھی ـــــ اور بھی بہت کچھ نہ جانے کیا کیا ـــــ اس نے اپنے سارے سارے زیوروں کی گٹھری نکالی اور بیچ آنگن میں بازار لگا کر بیٹھ گئی ـــــ پھر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا ـــ پتہ نہیں اسے اپنا دلھنا پا یاد آیا تھا ـــــ یا بہو کا چہرہ جو اس نے پاس والے گاؤں میں پسند کر رکھا تھا ـــــ

لیکن سکھبیر کی یادوں کی ڈوری ـــــ دور تک کھنچتی چلی گئی تھی ـــــ جس کے دوسرے سرے پر دھندلا دھندلا رنبیر ڈول رہا تھا ـــــ اس نے رنبیر کے آنے کے وعدے پر ہی حامی بھری تھی ـــــ وہ رنبیر کو راضی کر لے گا ـــــ ہو سکتا ہے اس نے کوئی پسند بھی کر رکھا ہو ـــــ اور سینما کے کئی سین اس کی نظروں میں گھوم گئے ـــــ

رنبیر صبح آئے گا ـــــ وہ اندھیرے میں ہی بس اسٹاپ پہونچ جائے گا ـــــ کبھی بس پہلے آگئی تو ـــــ اور وہ بے چین ہو اٹھا تھا ـــــ کیسے شام ہو ـــــ پھر رات آئے اور پھر صبح ہو جائے ـــــ اس نے وقت کے پہیے کو تیزی سے گھمانا چاہا ـــــ لیکن وہ خود تنہا گھوم کر رہ گیا ـــــ وقت بڑی سنگدلی کے ساتھ اپنی رفتار پر ڈول رہا تھا ـــــ وہ رات کو سو بھی نہیں سکا تھا ـــــ ہر لمحہ گردن اٹھا کر کبھی گھڑی کی سوئیاں دیکھتا ـــ اور کبھی کھڑکی سے باہر پھیلے ہوئے سرمئی تاروں بھرے آسمان کو ـــــ

وہ لمحہ بھر کو کھویا تھا کہ اسے کچھ شور سنائی دیا جیسے جنم اشٹمی کی رات مندر کے دوار پر ڈھول تاشے بج رہے ہوں ـــــ اور سارے گاؤں کے ہندو مسلمان اور سردار اکٹھا ہو کر جشن منا رہے ہوں ـــــ یا ـــــ یا پھر گرو پرب پر گاؤں کا پھیرا لگاتی ہوئی سیر بھات پھیری باجے گاجے کے ساتھ واہ گرو ـــــ واہ گرو کا نعرہ لگاتی ہوئی قریب ہوتی جا رہی تھی ـــــ

اس نے اپنی آنکھیں ملیں ـــــ شور کا انداز بھیانک معلوم ہوا ـ اس کے ذہن میں ایک دھماکا ہوا ـــــ اور وہ ایک ہی چھلانگ میں دروازے سے باہر نیم کے نیچے پہنچ چکا تھا ـ

ماں کی آواز نے پیچھا کیا ـــــ سکھبیرا ـــــ سکھبیرا رک جا ـــــ کچھ گڑبڑ لگتی ہے ـــــ اور سکھبیرا آنکھیں پھاڑے گلیاروں میں بھاگتے خوفزدہ کتوں کو گھور رہا تھا ـــــ اور دو انسان بھونک رہے تھے ـــــ جانے پہچانے چہرے انجانے بنے بھاگ رہے تھے ـــــ عورتیں اور بچے کونوں کھدروں میں منہ چھپائے تھر تھر کانپ رہے تھے

مردوں نے اپنی آن رکھنے کی ٹھان لی تھی ـــــ کرپانیں ـــــ چھرے برچھیاں ـــــ اور انسانیت کو زخمی کرنے والے سارے آلات بکسوں سے ابل کر باہر آچکے تھے ـــــ فضا میں انسانی خون کی بو بس چکی تھی ـ اور ہر طرف ویرانیوں کے خیمے پھڑپھڑا رہے تھے ـــــ تعصب کے گدھ انسانوں کے جسم کے ملائم گوشت کو اپنی خونخوار نکیلی چونچوں سے نوچنے کی لذت محسوس کر رہے تھے ـــــ حملہ کس نے کس پر کیا تھا ـــــ کسی کو نہیں معلوم تھا ـــــ کل تک تو گردوارہ ـــــ مندر اور مسجد سب ہی عبادت گاہیں تھیں ـــــ سب کے لیے متبرک اور پاک ـــــ پھر آج کیا ہو گیا تھا ـــــ جو سڑک اور پگڈنڈی پر موت چنگھاڑ رہی تھی ـــــ اور لپ لپ کرتی خون آلودہ زبان نکالے انسانوں کو گھور رہی تھی ـــــ

سکھبیر بھی سڑک کی طرف بھاگا ـــــ کہ زیادہ لوگ اسی طرف کو بھاگ رہے تھے ـــــ اور پھر اس نے دیکھا الٹی پھنکی ایک بس کھڑی تھی ـــــ لاشیں بکھری پڑی تھیں ـــــ کہیں کہیں آگ کے سرخ دیدے چمک رہے تھے ـ اور کہیں خون سے بجھی آگ سلگ سلگ کر انسانیت کے اس روپ پر ماتم کر رہی تھی ـ سڑک کے کنارے گڑھوں میں ـــــ بے شناخت خون بھرا تھا ـ صرف خون ـ

انجانا سا خون سکھبیر کے مساموں سے گھس کر اس کے سارے جسم کے خون کو منجمد کرتا جا رہا ہے ـــ ادھ جلے چکیلے کپڑوں کے پاس ہی ـــــ ایک دوسرا ڈھیر دھندلا دھندلا ـــــ غیر اہم سا ـــــ خون میں لت پت ـــــ سکھبیر کے پیر خود بخود رک گئے ـ ہلکی سی روشنی میں اس نے جھک کر دیکھا ـ دور جاتے ہوئے تانگے کے جھٹکے نے دو مضبوط پکڑے ہوئے ننھے ننھے ہاتھوں کو جدا کر دیا تھا ـــــ محبتوں اور یادوں کے اس ڈھیر پر نفرت قہقہے لگا رہی تھی ـــــ اور درندگی اپنا سفاک جبڑا پھیلائے انسانی خون چاٹ رہی تھی

رنبیر ـــــ اور رنبیرا ـــــ وہ بہت آہستہ سے بڑبڑایا اس کا وہ احساس مر چکا تھا ـــــ جس کے ذریعہ غم آنسوؤں کی شکل اختیار کر لیتا ہے ـــــ وہ تو بس بہت سی بکھری ہوئی خون میں لت پت لاشوں کے ڈھیر میں خود بھی بکھر چکا تھا ـ

چاروں طرف خون کی بو ـــــ دھواں بن کر انسانیت کے چہرے کو مسخ کر رہی تھی ـــــ وہ آہستہ آہستہ رنبیر کی لاش کے پاس بیٹھ گیا ـــــ رنبیرا ـــــ اور رنبیرا ـــــ میرا ویر ـــــ تو تو میرا بیاہ کرانے آیا تھا ـــــ اتنے دنوں بعد گاؤں کو لوٹا تھا ـــــ پورا ہونے کو

بقیہ ص ۴۳ پر

## شکیل اعجاز

# ادبی رسائل

جھلملاتے، چمچماتے، پھولوں جیسے رنگ برنگے رسالوں کے اسٹال پر کچھ ایسے رسائل نظر آئیں جو احساسِ کمتری سے کسی گوشہ میں بے یار و مددگار پڑے ہوں تو یہ شرط جیتی جاسکتی ہے کہ وہ اردو کے ادبی رسائل ہیں۔

کاغذ پیلا، چھپائی واجبی، کتابت گوارہ، سرِ ورق کے نام پر مضامین کی فہرست یا کسی مفلوک الحال کی تصویر جو یقیناً اردو کا نامور شاعر یا ادیب ہوگا۔ ان رسائل میں اس بات کا پورا بندوبست ہوتا ہے کہ ورق گردانی کرکے بھی خریدنے کی خواہش سر نہ اٹھا سکے۔ اس لیے ان میں جنسی بیماریوں، اسنو پاؤڈر، اور بنیان انڈر ویر، کے ایسے اشتہارات نہیں ہوتے جن میں لڑکیوں کی عریاں تصاویر کو خواہ مخواہ ٹھونس جاسکے۔ ادبی رسائل کی پہچان یہ بھی ہے کہ یہ پابندی سے نہیں نکلتے۔ اس سے ان کی ادبی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ یہ رسائل کئی دفعہ آخری سانسیں لیتے ہیں۔ کچھ برس پہلے تک یہ معاملہ تھا کہ رسالے کی میعادِ اشاعت ایک ماہ ہوتی لیکن یہ تین ماہ میں ایک بار نظر آتا۔ اس سے خواہ مخواہ واویلا مچا رہتا کہ پابندی سے نہیں نکل رہا ہے۔ اس کا یہ حل نکلا کہ دو ماہی، سہ ماہی رسائل نکلنے لگے ہیں۔ یہ بھی وقت پر نہیں آتے چنانچہ غور کیا جارہا ہے کہ ان کی برسیاں منائی جائیں اور دو برسی، سہ برسی قسم کے رسائل جاری کیے جائیں۔

ہمارے خیال میں کسی سے دشمنی نکلنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ادبی رسالہ جاری کرنے کا مشورہ دیا جائے اگر وہ ورغلانے میں آکر جاری کرلے اور بدنصیبی سے ادبی حلقوں میں اس کی پزیرائی بھی ہونے لگے تو دو رکعت شکرانہ ادا کیجیے۔ مراد بر آئی ہے۔ اب وہ نہ رسالہ بند کر سکے گا نہ جاری رکھ سکے گا۔ جس دن کسی اداریے میں ذکر کر دے کہ رسالہ آخری سانسیں لے رہا ہے تو ادبی حلقوں میں زندگی کی لہر دوڑ جائے گی لوگ سینکڑوں خطوط لکھیں گے کہ اس رسالے سے ملک میں اردو کی آبرو برقرار ہے۔ وغیرہ اگلے شمارے میں ہوتا ہے کہ گو ہم نے بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تاہم قارئین کے خطوط اور خریداروں کے تعاون سے دوبارہ جاری کر رہے ہیں یہ خبر ادبی حلقوں پر نیند کا کام کرے گی اب یہ اس وقت تک نہیں جاگیں گے جب تک دوسری آخری سانس کی اطلاع نہ ملے۔ کسی شہر میں ان رسائل کے قارئین کی تعداد بھی اتنی ہی ہوتی ہے جتنی ملک میں ادبی رسائل کی ہوتی ہے۔ یعنی گنتے وقت انگلیاں زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔

ادبی رسائل چونکہ اپنے اصول میں سخت ہوتے ہیں اور اوسط قسم کی تخلیقات صرف کبھی کبھی شائع کرتے ہیں اس لیے اس قسم کے شعراء وادباء بدظن رہتے ہیں۔ ان میں خامیاں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اپنی تخلیق کی اشاعت یا عدم اشاعت کے مطابق رسائل کا معیار بھی ان کی نظروں میں گھٹتا یا بڑھتا رہتا ہے۔ مثلاً مسلسل بھیجنے پر بھی غزلیں شائع نہ ہوئیں تو ایک صاحب یوں کہیں گے۔

"انداز" کا معیار تو بالکل گر گیا ہے۔ تازہ شمارہ دیکھا آپ نے؟ خواہ مخواہ صفحات کالے کیے ہیں۔ ادبی رسائل بھی پیسہ کمانے کا ذریعہ بنتے جارہے ہیں۔ اب سے دس برس قبل جب میری غزل شائع ہوئی تھی۔ یہ ملک کا واحد معیاری رسالہ تھا۔"

"نہیں صاحب۔ آپ انتہا پسندی سے کام لے رہے ہیں۔ اتنا بھی گھٹیا نہیں ہے" ابھی پچھلے ماہ میری غزل شائع کی ہے۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ غیر معیاری ہوتا جارہا ہے"۔

چند ماہ بعد ان کی بھی غزل شائع ہو جاتی ہے شام کو دوستوں کی محفل میں رسالہ جیب میں چھپائے تمہید باندھتے ہیں۔

آپ اس دن "انداز" کے معیار کے بارے میں کیا فرما رہے تھے؟

یہی کہ اتنا گھٹیا نہیں جتنا آپ سمجھتے ہیں۔

اس دن گھر جاکر میں نے غور کیا۔ چند شمارے نکال کر دیکھے تو یقین ہوگیا کہ آپ ٹھیک

---

مومن پورہ، اکولہ ۴۴۴۰۰۱ (مہاراشٹر)

فرما رہے تھے۔ تازہ شمارہ دیکھا آپ نے؟

جی نہیں۔

(جیب سے نکالتے ہوئے) یہ شمارہ تو قابل تعریف نکلا ہے۔ مضامین اور غزلوں سے لے کر اشتہارات تک معیاری ہیں (تھوڑا توقف کرنے اور اس دوران مخاطب کو کنکھیوں سے دیکھنے کے بعد) اس مرتبہ میری غزل بھی شائع کر دی ہے۔

اب مخاطب کی باری ہے کہ اس کے غیر ادبی ہونے کے ثبوت فراہم کرے اور یہ اعتراف کرے کہ اس دن میں غلطی پر تھا آپ ٹھیک فرما رہے تھے کہ "ادب آج کل غیر معیاری ہوتا جارہا ہے۔"

یوں تو ادبی رسائل کی بنیادی پالیسی یہی ہوتی ہے کہ ان کی ادبی حیثیت ہو تاہم ہر رسالے کی ایک ضمنی پالیسی بھی ہوتی ہے جو بنیادی پالیسی سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ ضمنی پالیسیوں کا وصف یہ ہے کہ ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتیں ہر رسالہ اس ضمنی پالیسی کو لے کر چلتا ہے۔ اسی کے پیش نظر فن پاروں کو لفٹ ملتی ہے (فنکاروں کو لفٹ نہیں سیڑھیاں ملتی ہیں) ضمنی پالیسی ہی کی وجہ سے کسی فن پارے کا ایک رسالے میں استقبال ہوتا ہے اور دوسرے میں ذلیل کرکے نکال دیا جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ مخصوص رسائل سے مخصوص فنکار وابستہ ہو جاتے ہیں۔ یہ کسی دوسرے رسالہ میں نظر بھی آتے ہیں تو مہمان کی طرح۔ کہ چائے شربت پیا اور روانہ ہوتے۔ ضمنی پالیسی کے نام پر بدعتیں نکالی جاتی ہیں۔ ایک رسالہ میں فنکاروں کے نام چھوٹے اور کہانیوں کے موٹے حروف میں لکھے جاتے ہیں۔ دوسرے میں فنکاروں کے نام بہت نمایاں اور کہانی کا عنوان ننھے حروف میں ہوتا ہے۔ اس رسالہ سے فنکار بہت خوش ہوتے اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اب ہماری تخلیقات ہمارے ناموں سے جانی جاتی ہیں لوگ ہمارے نام پر رسائل خریدتے ہیں۔ اس طریق اشاعت میں قارئین کا سراسر نقصان ہے اگر وہ کسی فرد مخصوص کی تحریروں سے ادب چکے ہوں تو نام دیکھتے ہی ورق پلٹ دیتے ہیں۔ کبھی کبھی نامور فنکار کی تحریر یا کہانی واقعی اچھی ہوتی ہے لیکن قاری پچھلے تلخ تجربہ کی بنا پر اس مرتبہ ایک اچھی کہانی سے محروم رہ جاتا ہے بعض انتہا پسند رسائل فنکار کا نام ہی غائب کر دیتے ہیں۔ صرف کہانی چھاپتے ہیں۔ ایک رسالہ اب بھی ہے جو نہ کہانی چھاپتا ہے نہ کہانی کار کا نام۔ لیکن یہ ابھی جاری نہیں ہوا۔

رسائل اور ادبی تحریکوں کا درزی کپڑوں کا ساتھ ہے۔ اس لیے بعض رسائل تحریکوں کے زیر اثر چلتے ہیں اور کچھ معصوم تحریکیں رسائل کے دست شفقت سے زندہ رہتی ہیں۔

ادبی رسائل کے مدیر حضرات ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہوتے ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ ان کے نظریاتی اختلافات رسائل کے صفحات یا سیمینار کی حد تک ہوتے ہیں۔ لیکن انہی نظریاتی اختلاف یعنی ضمنی پالیسیوں کی وجہ سے ہر شہر کے ادبی حلقوں میں آپسی رقابت پیدا ہو جاتی ہے۔

کہتے ہیں ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب ادبی رسائل زیادہ اور لکھنے والے کم تھے۔ اب حالات اس کے برعکس ہیں۔ رسائل والے پریشان ہیں ہر ماہ سیکڑوں تخلیقات موصول ہوتی ہیں۔ ماہنامہ تین ماہ میں ایک بار نکلتا ہے اس میں بھی زیادہ سے زیادہ سو غزلیں اور تین چار کہانیاں سما سکتی ہیں۔ اس لیے ان دنوں اس قسم کے ضروری اعلان شائع ہوتے ہیں۔

غیر طلبیدہ تخلیقات ارسال نہ کریں۔

دفتر میں غزلوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ لوگ ردی کاغذ کا بیوپاری سمجھنے لگے ہیں۔

کم سے کم پانچ برس تک کوئی کچھ نہ بھیجے (پانچ برس بعد پھر یہی اعلان کیا جائے گا)۔

رسائل اس طرح گھٹتے اور لکھنے والے بڑھتے رہے تو یہ معاملہ ایک قدم یوں بھی بڑھ سکتا ہے۔

غیر طلبیدہ تخلیقات بھیجنے والوں کے ساتھ سخت قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

منی آرڈر کے بغیر تخلیقات پر غور نہیں کیا جائے گا منی آرڈر اس حساب سے روانہ کیے جائیں۔

| | |
|---|---|
| غزل | سو روپے |
| نظم | نوے روپے |
| افسانہ | ستر روپے |
| مزاحیہ مضمون | پچاس روپے |
| انشائیہ | چالیس روپے |
| ترجمہ | بیس روپے |
| تنقیدی مضمون | دس روپے |

(تحقیقی مضامین مفت شائع کیے جائیں گے)

ادبی رسالہ کی سب سے اہم چیز اس کا اداریہ ہوتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ صرف اسی ایک صفحے کے لیے پورا رسالہ چھاپا گیا ہے۔

---

**بقیہ کمینے مرد**

یعنی ناجائز رشتہ"

یہ کہتے کہتے وہ دیا سر بن اٹھ کھڑی ہوئی۔ جیسے اس سے آگے کچھ نہ کہہ پا رہی ہو۔ وہ حلق میں اٹکے ہوئے جذبات کو ٹھوکر کرکے ردی کی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی جیسے کہہ رہی ہو: "کمینے مرد"۔

---

**بقیہ دو آدھے**

—— لے —— لے۔ اب یہ پگڑ تو باندھ لے —— کہ سب جان لیں —— تو میرا بھائی ہے —— میرا ویر —— میرا خون —— اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی پگڑی اتار کر رنبیر کے سر پر رکھ دی ——

نریندر دوے / مترجم : انجنا سندھیر

# سچا جھوٹا

نریندر دوے

انجنا سندھیر

مجھے بتایا گیا :

"اس کا نام رنچھوڑ لعل ہے"

اور ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا، صاحب پورا ٹھگ ہے، یہ ایک نمبر کا پاجی ۔

تحصیل میں ہیڈ کلرک کا چارج لینے کے بعد، جب میں نے پوری طرح کام سنبھال لیا، تو اس سے میرا سامنا ہوا۔ بھولے ان پڑھ دکھی کسانوں کی عرضیاں لکھنے والے کے روپ میں، کچہری میں سادہ اور ان پڑھ کسانوں کی مشکلات کو کاغذ پر منتقل کرنے ان کے دکھ درد کو لفظوں کا جامہ پہنانے والا وہ فرشتہ کسانوں کی نظر میں بہت بھولا بھالا اور سیدھا سادھا تھا وہ میرے پاس کسی کسان کی عرضی لے کر آیا تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا ؟" میں نے پوچھا"

"لوجی بھانا پٹیل !"

"کسان ہو تم ؟"

"ہیں.. ہیں... ہیں نہیں صاحب برہمن اور نام ہے لوجی بھانا پٹیل۔ ہیں... ہیں... ہیں تو یہ عرضی دینے والے کا نام ہے۔ میں تمہارا نام پوچھ رہا ہوں ؟"

ہیں... ہیں... ہیں... رنچھوڑ لعل ۔

"کب سے ہو یہاں ؟"

"ہیں... ہیں... ہیں...!"

"پچھلے پانچ سال سے"

"پہلے کیا کرتے تھے ؟"

ہیں... ہیں... ہیں... اسکول میں ماسٹر تھا۔ اب ریٹائر ہو گیا ہوں۔ تو یہ کام...!

"اچھا"

"جی"

"ٹھیک ہے جاؤ"

اور وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد سب لوگ کہنے لگے۔ صاحب ہوشیار رہنا نمبر ایک کا پاجی ہے! یہ سن کر مجھے تعجب ہوا۔ میلے کچیلے کپڑوں میں پھٹے حال دکھائی دینے والا وہ برہمن! ہوسیں جکڑ کھاتی زمین کی طرف گرتی پڑتی آتی ہوئی کٹی پتنگ جیسی چال چلتا۔ ہیں... ہیں... ہیں... میں دکھ بھری ہنسی کے ساتھ ہر بات شروع کرنے والا رنچھوڑ لعل کیسے پاجی ہو سکتا ہے؟ اس میں کون پاجی پن ہو سکتا ہے ؟

دکھی کسانوں کی سرکار کی طرف سے مقرر فیس پر عرضی لکھنے والے رنچھوڑ لعل کی عرضی کو میں دیکھنے لگا۔ کسی غریب کسان کو ہل بنانے کے لیئے درخت کاٹنے کی منظوری چاہیے تھی۔ وہ عرضی اس طرح تھی۔

جے بھارت کے ساتھ

میں کسان کرم شیبل پٹیل دونوں ہاتھ جوڑ کر حضور کے قدموں میں عرض کرتا ہوں کہ بہت ہی غریب ہوں اور کنبے میں ایک ہی کمانے والا ہوں۔ بچوں والا ہوں۔ گھر میں چھ لڑکیاں ہیں۔ اندھا باپ اور بہری بوڑھی ماں ہے۔ ان سب کا کھانا پینا کپڑا لتا میرے ہی ذمہ ہے اس لیے مہربانی فرما کر ہل بنانے کے لیے لکڑی کاٹنے کی اجازت عطا فرمائیں،

میں سوچنے لگا۔ ایسے دکھیوں کی درد بھری پکار کو آج پانچ سال سے لفظوں کا جامہ پہنانے والے اس رنچھوڑ لعل کے دل میں پاجی پن کیونکر ہو سکتا ہے؟ کیسا بھی پاجی دل ہو، مگر ہر روز ایسے دکھ درد سن کر اور لکھ لکھ کر پگھل نہ جاتے گا، اس پر بھی لوگ اسے پاجی کیوں کہتے ہیں ؟ سب یہی تو کہتے ہیں کہ وہ خود غرض ہے بدمعاش ہے کمینہ ہے ۔ میں نے بہت سوچ بچار کیا مگر مجھے اس میں کچھ بھی پاجی پن نظر نہیں آیا ۔

دکھی کسانوں کے ہمدرد رنچھوڑ لعل کی لکھی ہوئی عرضیاں آئے دن میرے پاس آنے لگیں۔ کوئی عرضی بیلوں کے لیے ہوتی تو کوئی ہل کے لئے۔ تو کوئی کنواں کھودنے کے مقصد سے قرض کے لیے۔ اس کی لکھی ہوئی عرضیوں کو پڑھ کر میں بے چین سا ہو اٹھتا اور سوچنے لگتا: اوہ، آزادی کے بعد بھی کسانوں کی ایسی حالت! کتنی غریبی ہے!...... ابھی مفلسی کے بھیانک دیو نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی ۔ میرا دل بھر آتا۔ رنچھوڑ لعل کی لکھی عرضیاں میرے دماغ میں ایک گہرا اثر چھوڑ جاتیں ۔ بیچارے سیدھے سادے ان پڑھ کسان جنہیں ہم ان داتا کہتے ہیں۔ ان کا ایسا حال ہے! اور اس پر مشکل یہ کہ کمانے والا ایک اور کھانے والوں کا گھر میں ایک جمگھٹ

میں نے ساری عرضیوں پر نظر ڈالی اور بات کی تہہ تک پہونچنے کی کوشش کی۔ بیچارے کسان..... بے علم..... بھولے بھالے..... سیدھے سادے۔ کھانے کے لالے اور اس پر بچوں کی فوج۔ کسی کے چھ بچے

● بی-۲- اورینٹ اپارٹمنٹس، نزد اردو ما اسکول عثمان پورہ، احمد آباد- گجرات
■ ۶۸ - ۳ لکشمی نگر سوسائٹی، احمد آباد ۱۲

کسی کے آٹھ اور کسی کسی کے اس سے بھی زیادہ۔ مگر آئے دن لوگوں کی یہ بڑھتی ہوئی تعداد اپنے ساتھ مفلسی نہیں لائے گی تو اور کیا؟ خاندانی منصوبہ بندی تو ہونی ہی چاہئے۔ نہیں تو مفلسی بڑھتی جائے گی۔ بڑھتی ہی جائے گی اس حد تک کہ ایک دن ......

پر یہ نادان گاؤں والے خاندانی منصوبہ بندی کو کہاں سمجھتے ہیں؟

کوئی دوسرا علاج!

رنچھوڑ لال کی عرضیاں میرے سوچتے ہوئے ذہن میں طرح طرح کے مشکل سوال پیدا کر رہی تھیں۔

ایک روز رنچھوڑ لعل کی لکھی ہوئی ایک عرضی میرے سامنے آئی۔ ایک بیچارے کسان کو جس کے گھر کھانے کے لالے ہیں، آٹھ بچے ہیں، بوڑھے ماں باپ ہیں، بیل خریدنے کے لیے قرض چاہیئے تھا۔

صاحب نے اس عرضی کو نامنظور کر دیا۔ میں نے صاحب سے کہا: صاحب! بیوی بچوں والا غریب کسان ہے۔ اس کی عرضی تو نامنظور نہ کیجئے۔

"جھوٹا جھوٹا۔ ایک دم جھوٹا۔" "کون؟"

"یہ رنچھوڑ لعل"!

"مگر صاحب اس عرضی سے رنچھوڑ لعل کا کیا تعلق ہے؟ میں تو عرضی گذارنے والے کسان کی بات کر رہا ہوں"

"نوین لعل .... تم نہیں سمجھو گے" صاحب ہنس کر بولے "رنچھوڑ لعل" بڑا پاجی ہے"

صاحب بھی اسے پاجی بتا رہے تھے .... کیوں!..

میں نے طے کر لیا کہ رنچھوڑ لعل میں ایسا کون پاجی پن ہے معلوم کرنا ہی چاہیئے۔

میں نے دفتر کے عملے سے دریافت کیا اور کہا کہ تم سب لوگ اس بیچارے رنچھوڑ لعل کے پیچھے پڑے ہوتے ہو۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ وہ ایسا کیا کرتا ہے، جس کے لیے تم اسے پاجی کہتے ہو۔

سب لوگ کہنے لگے' اجی صاحب! بڑا پاجی ہے۔ وہ بالکل جھوٹا"

"لیکن کس طرح؟"

"بڑا بدمعاش ہے۔ آپ اس کی لکھی ہوئی عرضیوں کو تو دیکھئے نا!"

"مطلب"؟

"یہی کہ وہ ایک نمبر کا جھوٹا ہے"

"بھئی صاف صاف بتاؤ نا"

"سالا حرامی سب کو ایک ہی طرح کی عرضی لکھ دیتا ہے:"

"میں کسان فلاں فلاں .....

بیوی بچوں والا .......

چھ بچے' بوڑھے ماں باپ........

اس مہنگائی میں پورا نہیں ہوتا.......

کھانے کے لالے ہیں.....

بہت دکھی ہوں........

مطلب یہ صاحب کہ چاہے کوئی کسان کان میں سونے کی بالیاں پہن کر آیا ہوں، لیکن یہ سب کو ایک ہی قسم کی عرضی لکھ کر دیتا ہے"

"میں غریب......

پورا نہیں ہوتا......

بیوی بچوں والا.......

بھوکا مر رہا ہوں.......... صاحب یہ رنچھوڑ لعل جھوٹا ہے۔ جھوٹا ایک نمبر کا جھوٹا....؟"

میں چونکا' تو کیا رنچھوڑ لعل سے متعلق میرا خیال غلط ہے! سوچنے لگا: بھکمری' غریبی اور زیادہ بچے! یہ بھارت میں طاعون سے بھی بدتر بیماریاں ہیں۔ اور ان بیماریوں سے بیچارے سبھی کسان دکھی ہیں۔

لیکن یہ تو نئی بات کھلی میں نے رنچھوڑ لعل کی لکھی ہوئی ساری عرضیوں کو پھر سے پڑھا...... اوہ.... عملے کی بات واقعی ٹھیک تھی۔

ہر عرضی میں یہی باتیں تو تھیں۔ کہ غریب ہوں..... چھ لڑکے ہیں...... بوڑھا باپ ہے اور بوڑھی ماں مہنگائی کا زمانہ...... رنچھوڑ لعل کو میں نے آڑے ہاتھوں لیا۔

"رنچھوڑ لعل"!

"ہیں...ہیں...ہیں..... فرمائیے حضور" تم گاؤں والوں کو جھوٹی عرضیاں لکھ کر دیتے ہو؟"

"ہیں...ہیں...ہیں صاحب کس نے کہا؟"

"کسی نے بھی کہا ہو؟ تم سچ سچ بتاؤ"

"ہیں...ہیں...ہیں" وہ ہنس کر بے زبان ہو گیا۔

"کانوں میں سونے کی بالیاں پہنے والے کمر میں چاندی کی وزن دار جھالر لٹکانے والے کسان جس کے گھر میں نہ پھول کا جھگھٹ ہے' نہ کسی طرح کا اور کوئی دکھ۔ تم غریب' بیوی بچوں والا' چھ چھ بچوں والا وغیرہ وغیرہ بتاتے ہو؟"

"ہیں...ہیں...ہیں"

"جواب دو؟"

"ہاں صاحب!"

"کیوں؟"

"سچ بولوں صاحب! صاف صاف کہوں!"

"کہو! میں تمہیں سچا اور بھلا آدمی سمجھتا تھا پر..."

"اگر صاحب! ایسی عرضیاں نہیں لکھوں تو پھر... پھر مجھ سے عرضیاں کون لکھوانے آئے گا۔ اور اگر کوئی عرضی لکھوانے نہیں آئے گا تو گھر گرہستی کیسے چلے گی"

"کیا مطلب؟"

"سچ کہوں صاحب" رنچھوڑ لعل کا چہرا اتر گیا۔ ہونٹوں پر تھرکنے والی ہیں...ہیں...ہیں کی ہنسی مرجھا گئی اور اس کی جگہ گہری اداسی چھا گئی۔

"صاحب میں ایک غریب ریٹائرڈ ماسٹر ہوں۔ ساری عمر ماسٹری کر کے ہی پیٹ پالا۔

"صاحب میں ایک غریب ریٹائرڈ ماسٹر ہوں۔ ساری عمر ماسٹری کر کے ہی پیٹ پالا نہیں نہیں جیسے تیسے پیٹ کا گڑھا بھرتا رہا" گھوڑے کے لیے کوئی طویلہ نہیں...... اور اس پر صاحب۔ (اس کی آنکھیں بھر آئیں) کیا کہوں' ماں باپ ابھی بیٹھے ہیں نحیف' نزار ان کی سیوا چاکری اور.... بیوی؟ زندگی بھر گھر گرہستی کے جھمیلوں اور بیماری کے چکر میں پڑی رہی۔ اور اب تو پانچ سال سے کھٹیا توڑ رہی ہے اور پھر بچے!"

"کتنے ہیں"

"پانچ۔ پانچ"!

ہاں صاحب' پانچ۔ پورے پانچ۔ دو لڑکے' تین لڑکیاں۔ ایک لڑکا تو پیدائش ہی سے نابینا ہے۔ ایک آوارہ۔ ایک لڑکی سسرال۔ ایک لڑکی بیوہ اور ایک

گھر والا ہے صاحب ۔ مجھے ان سب کا بوجھ اکیلے اٹھانا
پڑتا ہے...... یہ عمر صاحب...... یہ عمر...... یہ بڑھاپا۔
اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔
"روؤ نہیں" میں نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا...
حوصلہ رکھو رنچھوڑ لعل..!
" صاحب زندگی ہارا ہوا ہوں ۔ دل ٹوٹ چکا ہے۔
ساری طاقت پانی کے ریلے کی طرح باہر نکل گئی ہے۔ اب
تو یہ سچی جھوٹی عرضیاں لکھ کر پیٹ کا گڑھا بھر رہا ہوں۔ طمانچہ
مار کر منہ لال کیے ہوں صاحب... صاحب اسی لیے سب
لوگ مجھے جھوٹا کہتے ہیں۔ خود غرض کہتے ہیں۔ پاجی کہتے ہیں۔
مگر صاحب دنیا ہی پاجی ہے ۔ دنیا ہی جھوٹی ہے۔ دنیا ہی
خود غرض ہے...... پاجی دنیا مجھ جیسوں کو پاجی قرار دیتی
ہے۔ پاجی دنیا' پاجی کہتی ہے ۔ چور کوتوال کو ڈانٹتا ہے"
میری نظروں میں رنچھوڑ لعل کی لکھی ہوئی عرضیاں
ناچنے لگیں ۔ ان سفید کاغذوں پر کالی ٹیڑھی میڑھی
سانپوں جیسی سطریں سانپ کی طرح پھن اٹھا کر پھنکار
رہی تھیں۔
پہلی پھنکار...... میں پٹیل لاکھا...... ......
بہت غریب...... کھانے کے لالے...... گھر میں بیوی
بچے بوڑھے ماں باپ۔
دوسری پھنکار...... میں پٹیل پانچا...... گھر
میں چار لڑکے تین لڑکیاں....
تیسری پھنکار...... میں پٹیل کرم شیل......
کمانے والا ایک' کھانے والے چھ...... بیوی بچے۔
ایک ساتھ ہزاروں منھ والے اژدھوں کی پھنکاریں
میرے کانوں میں گونج اٹھیں۔
پٹیل لاکھا...... پٹیل پانچا...... پٹیل کرم شیل
...... سب کی عرضیوں میں ایک ہی آواز کیوں گونج رہی ہے!
ایک ہی آواز بار بار کیوں کانوں میں آ رہی ہے...... ہاں
وہ ساری عرضیاں کہہ رہی تھیں......
"میں رنچھوڑ لعل"
"میں غریب"
"گھر میں دو لڑکے' تین لڑکیاں......
"ایک لڑکا پیدائشی نابینا......

ایک آوارہ......
ایک لڑکی بیوہ....
ایک گھر داماد......
بوڑھے ماں باپ......
بیمار بیوی... میں رنچھوڑ لعل ان سب کا بوجھ کیسے
اٹھاؤں"
کبھی ان لاکھاؤں ۔ پانچاؤں ... کرم شیلوں کی
بالکل جھوٹی عرضیوں کے ذریعے خود رنچھوڑ لعل اپنے
دکھ درد کو لفظوں کا جامہ پہنا کر اسے دور کرنے کی کوشش
کر رہا تھا۔
اضطراری طور پر میں نے بڑی محبت سے رنچھوڑ لعل
کی طرف دیکھا۔
رنچھوڑ لعل ...... روؤ نہیں .... لو یہ
پانچ روپے"
ہیں... ہیں... ہیں ..... پہلی جیسی ہنسی اس کے
ہونٹوں پر پھیل گئی ۔ پہلے کی طرح اس کا چہرا مسکرا اٹھا'
اس کی للچائی ہوئی نظریں پانچ روپے کے نوٹ پر جم
گئیں ۔ اس کا ہاتھ بھی میرے ہاتھ میں رکھے پانچ روپے
کے نوٹ کو لینے کے لیے بڑھا' مگر ٹھٹھک گیا۔
وہ بولا" نہیں صاحب میں نہیں لوں گا"
"کیوں"
صاحب لوگ باگ پھر کہیں گے کہ رنچھوڑ لعل
ٹھگ ہے ۔ صاحب کے سامنے جھوٹ موٹ رو کر پانچ
روپیہ ٹھگ کر لے گیا"
نہیں نہیں ۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے ۔ رنچھوڑ لعل
لو یہ لو ۔
اور پھر جس طرح ایک شیر اپنے شکار پر جھپٹا
مارتا ہے' اس نے فوراً پانچ کا نوٹ لے لیا اور پھر
ہیں... ہیں... ہیں کر کے ہنسا ۔ اور پھر ہوا میں چکر
کھاتی' زمین کی طرف گرتی پڑتی ہوئی کٹی ہوئی پتنگ جیسی
چال چلتا ہوا ۔ باہر نکل گیا
وہ پاجی..... وہ رنچھوڑ لعل....!

## بقیہ : نئی کتابیں

کتاب مہدی کی متعدد غزلوں کا احاطہ کرتی ہے جن
میں گلے گا ہے سادہ الفاظ کا دروبست ، فنی
بے ساختگی اور تازہ خیالوں کے دل پذیر نقوش واضح
نظر آتے ہیں ۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتیں' سیدھے
سادے تجربے اور مشاہدے ان کے اشعار میں اس
طرح در آئے ہیں کہ قاری کو ان کی کہی ہوئی بات اپنی
ہی بیتی لگتی ہے ۔

تیرگی سے لڑنا ہی قدر مشترک ٹھہری
تم نے شمع روشن کی میں نے دل جلایا ہے
آپ اپنے سے لپٹ کر رو لیے
جب کبھی جی اپنا گھبرایا بہت
زیست کے مسئلوں میں الجھا ہوں
مجھ کو خود سے ملے زمانہ ہوا

مہدی پرتاپ گڑھی کا لہجہ نئی غزل کا لہجہ ہے
جسے انھوں نے اپنا آہنگ عطا کرنے کی کوشش بھی
کی ہے ۔ ان کے ہاں جدیدیت کا مثبت کردار نمایاں
نظر آتا ہے ۔

بہتے پانی پہ عکس کس کا تھا
کیوں ہیں ششدر دلوں کے آئینے
پرائی آگ میں جلنا عذاب ہے لیکن
کوئی عجیب سی لذت بھی اس میں پنہاں ہے

شاعر کی یہ پہلی پیش کش مطالعہ کی مستحق ہے ۔
(رام پرکاش راہی)

# نئی کتابیں

نام کتاب: اب جن کے دیکھنے کو....
مصنفہ: انیس قدوائی
ناشر: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
قیمت: بارہ روپے پچاس پیسے

بیگم انیس قدوائی کا نام علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی حلقوں میں اپنی شخصیت کی پُر وقار سادگی، انسانی دردمندی، بے خوفی اور لب ولہجہ کی صداقت بھری شگفتگی کے لیے محتاجِ تعارف نہیں ــــ وہ روایت اور تجدد دونوں کی صالح اور جائز حدود میں قائل بھی ہیں اور نمونہ بھی۔ اُنھوں نے جدّوجہد آزادی کو قریب سے دیکھا اور اس میں حصّہ لینے والے نامور مجاہدین پر جو کچھ بیتی اس کو محسوس کیا۔ سیاسی، سماجی علمی اور ادبی سرگرمیاں اُنھیں ورثہ میں ملیں۔ ان کے والد ولایت علی بمبوق، مولانا محمد علی جوہر کے رفیقِ کار آزادی کے متوالے اور صاحبِ طرز انشا پرداز تھے۔ رفیع احمد قدوائی ان کے عم زاد تھے۔ خود ان کے شوہر اسی فکر و عمل کے مردِ میدان تھے ــــ اس ... میں بیگم انیس قدوائی کی حساس طبیعت نے جلا پائی اور اُنھوں نے خدمتِ خلق اگلی نسلوں تک حق اور حق شعار اف کی ترسیل کو اپنی تحریر

امین کا مجموعہ
سی اور

گہرا تعلق رہا ہے۔ اس فہرست میں ولایت علی بمبوق، رفیع احمد قدوائی، مولانا محمد علی جوہر، شفیق الرحمٰن قدوائی، چودھری محمد علی ردولوی، مرزا ابوالفضل، ڈاکٹر کچلو، مردولا سارا بھائی، جواہر لال نہرو، قدسیہ زیدی، حافظ جمّن، ڈاکٹر سید عابد حسین کے نام شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور مضمون "اجتماعِ ضدّین" کے عنوان سے بھی ہے، جس میں رفیع صاحب کے گھر ایک بار ایسی تین ہستیوں کے جمع ہو جانے کی کہانی بیان کی گئی ہے جو نہ تو تاریخ ساز تھیں اور نہ ہی "تاریخ کا جزو" لیکن:

"....تاریخ کا ایسا عنوان جس کا
نفسِ مضمون سے چاہے برائے نام تعلق
ہو، مگر وہ سرورق پر چسپاں ہونے
کی کوشش ضرور کرتی ہیں اور ناکامی کی
صورت میں ماضی کی دھول بن جاتی ہیں۔"

اس مجموعہ میں جیسا کہ اوپر ظاہر ہو چکا ہے "تاریخ ساز"، "تاریخ کا جزو" اور "ماضی کی دھول" بن جانے والے شخصیتوں کا ذکر ہے، جو تنوع اور رنگا رنگی کا مظہر ہے۔ مختلف النوع شخصیتوں پر قلم اُٹھانے سے خود مصنفہ کی اپنی شخصیت کی ہمہ رنگی و ہمہ جہتی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ اس مجموعہ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ مصنفہ نے اپنے "ذاتی تذکرہ" کو کم سے کم تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے اور جہاں موجود ہے وہاں ناگزیر تھا۔

اس مجموعہ میں شامل مضامین کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ بیگم انیس قدوائی نے ہر حال میں "حق" سے منھ نہیں موڑا ہے۔ وہ جب مردولا بہن یا ڈاکٹر کچلو کا تذکرہ کرتی ہیں تو ان کے لہجہ میں طنز کی کاٹ صاف اور واضح طور پر محسوس ہوتی ہے اور قاری کو سماجی و سیاسی سطح پر موجود بے حسی اور بے اعتنائی کا بھرپور احساس دلاتی ہے۔ اس کے برعکس چودھری محمد علی ردولوی اور حافظ جمّن پر لکھے گئے مضامین میں مزاح کا عنصر مسکراہٹ کو جنم دیتا ہے۔

ولایت علی بمبوق، رفیع احمد قدوائی، جواہر لال نہرو اور مولانا محمد علی پر لکھے گئے مضمون ہماری جدّوجہد آزادی کا تاریخی باب بھی ہیں اور ایثار و قربانی کی مثالی روایات کی سچی کہانیاں بھی۔ شفیق الرحمٰن قدوائی اور قدسیہ زیدی پر لکھے گئے مضامین سے خدمتِ خلق اور انسانی ہمدردی کے خوب صورت مرقعے سامنے آتے ہیں۔ مرزا ابوالفضل اور ڈاکٹر سید عابد حسین پر مضامین سے علم اور اہلِ علم کے لیے مصنفہ سے عقیدت و محبت سامنے آتی ہے۔

غرض یہ کہ بیگم انیس قدوائی کے شخصی خاکوں کا یہ مجموعہ ہماری سیاسی تاریخ، قدیم روایات اور سماجی ناہمواری کی ایک خوب صورت تصویر کشی ہے۔ جس سے خود مصنفہ کی علمی و ادبی شخصیت کے بہت سے ظاہر و باطنی پاکیزہ جوہر سامنے آتے ہیں۔

نام کتاب: محفلے دیدم
مصنف: حیرت شملوی / مرتب سید انیس شاہ جیلانی
ناشر: حیرت شملوی اکادمی، محمد آباد، تحصیل صادق آباد (پاکستان)
قیمت: درج نہیں۔

حیرت شملوی کا نام اُردو کے شعری حلقوں میں یقیناً اجنبی نہیں۔ آزادی سے پہلے اور اس کے بعد بھی بہت سے رسائل و جرائد میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ حیرت صاحب شملہ میں پیدا ہوئے اور علی گڑھ سے اُنھوں نے بی اے کیا، سرکاری ملازمت کی۔

حیرت صاحب نے صرف شاعری ہی نہیں کی

بلکہ نثر میں بھی ان کے مضامین، تراجم اور بعض دیگر تصانیف شائع ہوئیں۔ آزادیٔ وطن کے بعد وہ کوئی ۱۵ سال تک ہندوستان میں ہی رہے، لیکن ۱۹۶۲ء میں پاکستان چلے گئے اور وہیں کراچی میں ۹ ستمبر ۱۹۶۴ء کو ان کا انتقال ہوا۔

زیرِ نظر تصنیف حیرت صاحب کے مختلف واقعات اور شخصیتوں کے بارے میں ان تاثرات کا مجموعہ ہے جو حیرت صاحب نے نوٹ کر لیے تھے اور سیّد انیس شاہ جیلانی نے ان کو ترتیب دے کر حیرت شملوی اکادمی سے شائع کیا ہے۔

"محفلِ دیرم" نامی اس مجموعے میں تقریباً ۴۳ شخصیتوں پر مرحوم کے طویل اور مختصر نوٹس ہیں۔ ان شخصیتوں میں علامہ اقبال، مولانا آزاد، ڈاکٹر انصاری، مہاتما گاندھی، مسز سروجنی نائیڈو، ایڈورڈ ہشتم، جوش ملیح آبادی، اقبال سہیل، جگر مرادآبادی، مولانا ثناءاللہ امرتسری، احمق پھپھوندوی، میر باقر علی داستان گو، عبدالمجید سالک، خواجہ کمال الدین، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، علی برادران، سر شانتی سروپ بھٹناگر، آصف علی، عرشی ملسیانی، مالک رام، عطاءاللہ شاہ بخاری، لارڈ ریڈنگ، سر راس مسعود، شاد عارفی، رفعت بے، ڈاکٹر ذاکر حسین، لارڈ لن لتھگو، لالہ لاجپت رائے، ظفر علی خاں —— نیاز فتحپوری، ملا واحدی، نواب بھوپال وغیرہ شامل ہیں۔

یہ تمام تاثرات ذاتی ملاقات کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ بعض ان میں سے "دور کے تماشائی" کی حیثیت سے بھی احاطۂ تحریر میں لائے گئے ہیں۔ ان تاثرات کو پڑھ کر خود مصنف کے اپنے مزاج اور اس کے عہد کی سیاسی و سماجی بے چینی اور غیر یقینی صورتِ حال کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ان شخصی تاثرات کے علاوہ حیرت صاحب نے روزنامہ "زمیندار" "تحریکِ عدم تعاون" ملکی حالات، علی گڑھ، انجمن ہدایت الصلوٰۃ، یونٹی کانفرنس، سیاسی حالات، اسمبلی، آل انڈیا کانگریس، آل انڈیا ریڈیو وغیرہ پر جو کچھ اپنی یادداشتوں میں لکھا وہ بھی اس میں شامل ہے۔ مثال کے طور پر یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو کانگریس کی اپیل پر ہونے والی ہڑتال کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے:

"کانگریس نے کہا ہڑتال کرو۔
مسلم لیگ (محمد علی جناح) نے کہا ہڑتال مت کرو۔
پولیس نے کہا ہڑتال نہ کرنے والوں کی حمایت کے لیے ہم موجود ہیں۔
لیکن ہڑتال ہوئی اور خاصی کامیاب رہی۔ اگر کہیں چھوٹی موٹی دوکانیں کھلی بھی رہیں تو اس میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی، مسلمان جوتے والوں میں اکثر دوکانیں بند تھیں اور بڑے بڑے بازاروں میں ہڑتال کا اثر غالب تھا۔
نمائش بند تھی اور شہر کے بائیسکوپ بھی بند۔"

اس طرح یہ کتاب اپنے عہد کا ایک ایسا مرقع ہے جس میں ایک حساس شخص نے اپنے ذاتی مشاہدات، تاثرات اور تجربات کو تحریر میں لاکر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ کتابت و طباعت معمولی ہے۔ تاہم کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہوتا ہے کے مصداق اس کتاب کا خیر مقدم کرنا ہمارا فرض ہے۔

اختر الواسع

نام کتاب: **دھنک رنگ**
ناشر: نوبہار صابر، مرشیہ آشرم، راگھو مزرعہ، پٹیالہ (پنجاب)
قیمت: ۲۲/- روپے

کسی شاعر کی تخلیقات میں آفاقیت جیسی خوبی کا پہلا تعارف اسی بات سے ہو جاتا ہے کہ اس نے کتنی اصنافِ شعر اور کتنے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور اپنے اس رویے کو بروئے کار لانے کے لیے کن فکری وسعتوں، شاہداتی سچائیوں اور تجرباتی تلخیوں سے کام لیا ہے۔ یہی صورتِ حال بلا کم و کاست، ہمیں جناب نوبہار صابر کے اس مجموعے میں میسر آتی ہے۔ موصوف کی نصف صدی کے عرصے میں کئی تصنیفات اور تالیفات شائع ہوئی ہیں۔ یہ ایسے تخلیقی وجدان اور فنی ارتقا کی داستان ہے جسے عمر کے ناگزیر تقاضوں سے بھی ماورا رہنے کا شرف حاصل ہے۔ 'دھنک رنگ' واقعی ایک رنگا رنگ سلسلہ ہے جس میں غزل، نظم، آزاد نظم کی ملی جلی فضا ہمیں ہر زاویے سے دیکھنے اور پرکھنے کو ملتی ہے۔

غزل میں صابر صاحب کی مستند اور پختہ کاوشیں روایت کے گہرے شعور کا آئینہ ہیں۔ ان کے لب و لہجہ میں جدت افکار میں عصری آگہی اور اسلوب میں انفرادیت ہے۔ لطیف طنز و تعریض کے پیرایے میں انہوں نے فرد کے المیہ اور سماج کی ستم ظریفیوں کے بیان میں حسنِ اعتراف سے خوب خوب کام لیا ہے۔

روشنی، دھوپ، ہوا، پھول، ستارے، بادل
مجھ سے ملتا ہے کوئی روپ بدل کر کتنے

کون ہے، اس کو کب دیکھا تھا، کہاں، یہ کچھ معلوم نہیں
رہ رہ کر آنکھوں کے آگے منڈلائے اک سایا سا

صابر صاحب کی نظم کے فنی رموز پر گرفت بہت مضبوط ہے۔ ان کے اظہار میں تازگی، الفاظ میں نغمگی، ادا میں بلا کا محاکاتی لطف و اثر ہے۔ ان کی نظمیں تاثراتی، فکری اور حسیاتی ہیں۔ مستزاد یہ کہ ان کی نظمیں بڑی کشادہ فضا کی حامل ہیں۔ صابر صاحب کا یہ تازہ مجموعہ ہر اعتبار سے لائقِ مطالعہ ہے۔

نام کتاب: **نئے نئے آسمان**
مصنف و ناشر: مہدی پرتاب گڑھی
قیمت: پندرہ روپے

نئے شعرا کی ابھرتی ہوئی کھیپ میں مہدی پرتاب گڑھی ایک جانا پہچانا نام ہے۔ موصوف کی غزلیں آئے دن ملک کے موقر جریدوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ زیرِ نظر

باقی صفحہ ۴۲ پر

## فرق

'آج کل' کے سابقہ شماروں کا موازنہ حالیہ شماروں سے کرنے پر زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ غالب نے جس سادگی و پرکاری کو موضوعِ سخن کیا تھا، عملی طور پر آپ نے اُسے ممکن کر دکھایا۔ نظری، فکری ــــ ہر طور سے 'آج کل' خوب سے خوب تر ہے۔ سرورق کی معقولیت و انفرادیت میں مزید اضافہ کیا ہے۔ تجلّیِ شاعر میں آپ شاعر کا فوٹو اور اس کی قلم برداشتہ تخلیقات شائع کرتے ہیں۔ اگر اس کے ساتھ شاعر کا مختصر تعارف اور دورِ حاضرہ میں کوئی خاص معرکہ آرائی بھی شائع کریں تو یہ بات مستقبل کے تذکرہ نگاروں کے لیے مشعلِ ہدایت ہوگی۔

اختر الاسلام، میرٹھ

## اچھوتا انداز

"آج کل" اگست ۱۹۸۴ء میں جوگندر پال کی کہانی "اُتار" نے کافی متاثر کیا۔ اس میں شک نہیں کہ پال کا کہانی کہنے کا اپنا اچھوتا انداز ہے۔ ان کے بعض جملے تو اتنے گہرے اور دل کش ہوتے ہیں کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

حسین الحق ان دنوں بہت ہلکی پھلکی کہانی لکھنے لگے ہیں۔ اس بار ہندی کہانی کے ترجمے نے دل کو چھو لیا۔ جاوید اقبال نے ہندی کی بہترین کہانی کا انتخاب کیا ہے۔ چترا مدگل نے جس خوب صورتی سے جذبات نگاری کی ہے اس کی تعریف ممکن نہیں۔ ہر ہر موڑ پر قاری کردار کے سانچے میں ڈھلتا محسوس کرتا ہے۔

'آج کل' کے تبصرے ان دنوں بہت جان دار ہونے لگے ہیں۔ خدا کرے اس کی یہ انفرادیت برقرار رہے۔

مشتاق احمد نوری، پورنیہ

## خوبصورت افسانہ

جوگندر پال صاحب تو اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ہم میں اتنی طاقت کہاں کہ اُن کے بارے میں لکھیں۔ بس یہ جملہ کہ "سعیدا! شاید مجھے زندگی ہو گئی ہے!" بہت ہی اچھوتا اور نیا خیال ہے۔

دیگر افسانوں میں محترمہ نگار عظیم کا افسانہ بہروں احساس پر حاوی رہا۔ بہت ہی خوبصورت نفسیاتی افسانہ ہے۔ نگار صاحبہ نے اپنے سابقہ افسانہ "فرق" (شائع شدہ "آج کل" ستمبر ۱۹۸۴ء) کی روایت قائم رکھتے ہوئے قارئین کو یہ ایک نہایت خوب صورت افسانہ دیا ہے۔

ایم۔ انوار انجم، مالیر کوٹلہ

## پرہیز

اگست کے شمارے میں شائع شدہ افسانہ "عکس" نے، جسے نگار عظیم صاحبہ نے لکھا ہے، مجھے اس قدر متاثر کیا کہ خط لکھنے بیٹھ گیا۔ بلاشبہ یہ ایک نفسیاتی افسانہ ہے۔ لیکن اختتام کو پہنچتے پہنچتے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے نفسیات کے کون سے باب کو ٹچ کیا ہے۔ میری گزارش یہ ہے کہ وہ اس قسم کے افسانے لکھنے سے گریز کریں۔

زماں شفق، کلکتہ ۲۳

## جان دار

تجلّیِ شاعر کے تحت اختر شیرانی مرحوم کا سانیٹ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ عشرت ظفر، ریاض شیرازی اور سردار شفیق کی غزلیں پڑھ کر تازگی کا احساس ہوا۔ مقالات البتہ پسند نہیں آئے۔ بالخصوص کاظم علی خاں کا مقالہ محض معلومات کا پلندہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس افسانے بڑے جان دار ہیں۔ جوگندر پال کا "اُتار" چترا مدگل کا "موڑ پہ" اور ست ایس۔ ایس۔ چاولہ کا آتش فشاں کے آنسو بڑی پُراثر اور جذباتی تخلیقات ہیں۔ پال صاحب، خلیل جبران سے بہت متاثر اور قریب نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جابجا فلسفیانہ نکات کی پیش کش اور اسلوبِ بیان کی روانی کی وجہ سے ان کو اردو کا خلیل جبران کہا جانا چاہیئے۔

کامران نجمی، پٹنہ

## سہو

جناب نریندر لوتھر کے انشائیہ "انتظار" مطبوعہ جولائی ۱۹۸۴ء میں صفحہ ۱۴ پر، دوسرے کالم میں سطر پندرہ سولہ میں درج شعر یوں پڑھا جائے:

عمرِ دراز مانگ کر لائے تھے چار دن<br>دو آرزو میں کٹ گئے، دو انتظار میں جڑ گئے
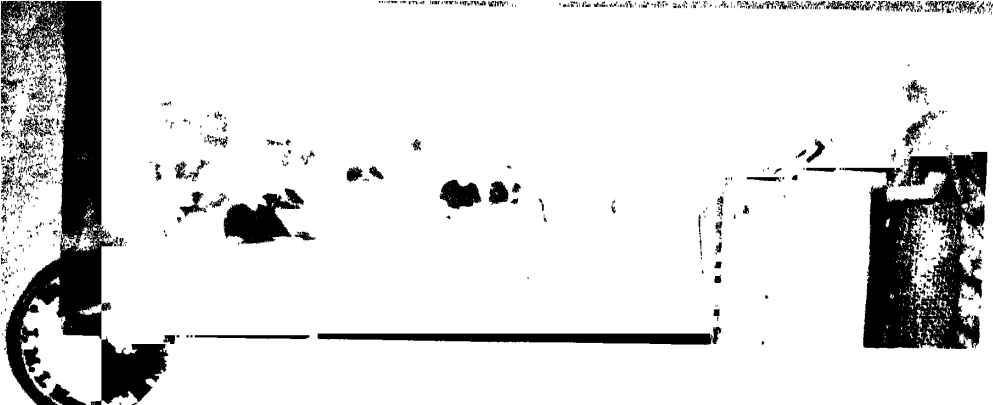
وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی دس اکتوبر ۱۹۸۴ء کو نئی دہلی میں بدھ مت اور قومی کلچر کے موضوع پر منعقدہ پہلی بین الاقوامی کانفرنس کا افتتاح کر رہی ہیں۔

کیمیکلز اور فرٹی لائزرز کے مرکزی وزیر شری وسنت ساٹھے نے ۲۰ ستمبر ۱۹۸۴ء کو ایوانِ غالب نئی دہلی میں مشہور اردو شاعر جناب کمار پاشی کے ۲۵ سالہ شعری انتخاب "زوالِ شب کا منظر" کی رسم اجرا ادا فرمائی ــــــ تصویر میں دائیں سے: جناب پی۔ سی۔ اگروال (چیئرمین استقبالیہ کمیٹی) جناب کمار پاشی، جناب وسنت ساٹھے، جناب مالک رام (صدرِ جلسہ) جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور جناب کمار پاشی کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ ــــــ تصویر: فدا علی

دسمبر ۱۹۸۴ء

## [illegible] ذیل سنگھ کا پیغام

صدر جمہوریہ ہند شری ذیل سنگھ نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو قوم کے نام مندرجہ ذیل پیغام نشر کیا:

میرے عزیز ہموطنو!

آج اپنی زندگی کے غمگین ترین دن جب میں آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں تو خود کو سیاہ بختی کے تاریک بادلوں سے گھرا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ ہماری محبوب شریمتی اندرا گاندھی اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ میں اپنے عزیز ترین دوست سے محروم ہو گیا ہوں۔ ہم سب اپنے ملک کے ایک عظیم ترین لیڈر سے اور دنیا امن کے علمبردار سے جو بلاشبہ بنی نوعِ انسان کی تاریخ میں عظیم ترین خاتون رہنما تھیں۔

ان کے خاندان سے میرے تعلقات چالیس سال سے بھی زیادہ پرانے ہیں۔ پنڈت جی کا انتقال میرے لیے پہلا ذاتی صدمہ تھا۔ اور شریمتی اندرا گاندھی کا گزر جانا میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ ان کی اپنی سرکاری ذمہ داریوں میں انتہائی مصروف رہنے کے باوجود ہماری اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ ان کے ساتھ ہر ملاقات میرے لیے ایک قابلِ یادگار تجربہ ہوتا تھا۔ وہ شریف النفس، نرم گفتار، انتہائی ذہین و طباع اور تہذیب کا مجسمہ تھیں۔ وہ ایسی بیٹی تھیں، جن پر پنڈت جی کو بھی فخر ہوتا۔

اب وہ سب ختم ہو گیا ہے۔ قاتلوں کی یہ بزدلانہ حرکت صرف وحشیانہ اور انسانیت سوز ہی نہیں ہے بلکہ اس نے ساری قوم کو ہماری تاریخ کے ایک انتہائی نازک مرحلہ پر ایک سخت آزمائش سے دوچار کر دیا ہے۔ قوم کی ایکتا اور سالمیت کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔ ہمارے دکھ کو بہ حیثیت افراد اور قوم ہماری سمجھ اور پختگی کو متاثر نہیں کرنا چاہیے۔ خدا ہمیں نے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت دے گا۔ ہمیں ان آدرشوں کا سہارا لینا ہے جو ہمیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملے ہیں۔ ہمیں دنیا پر یہ ثابت کر دینا چاہیے کہ بھارت کے استحکام کو انسانیت سے گرے ہوئے مٹھی بھر قاتل نقصان نہیں پہنچا سکتے۔"

## وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی کا پیغام

وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو قوم کے نام درج ذیل پیغام نشر کیا:

"بھارت کی وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ وہ صرف میری ہی ماں نہیں بلکہ سارے ملک کی ماں تھیں۔ انہوں نے اپنے خون کے آخری قطرہ تک ملک کی خدمت کی۔ بھارت کی ترقی کے لیے انہوں نے جو انتھک اور بے لوث خدمت کی، اسے پورا ملک جانتا ہے۔ آپ سبھی لوگ جانتے ہیں کہ انہیں ایک متحد، پُر امن اور خوشحال بھارت کا خواب کتنا عزیز تھا۔ وہ ایک ایسا بھارت چاہتی تھیں جس میں سبھی بھارتی، مذہب، زبان اور سیاسی عقائد کے امتیازات کے بغیر باہمی مقابلہ آرائی اور تعصب سے پاک ماحول میں ایک بڑے کنبے کی طرح رہیں۔ ان کی ناوقت موت سے ان کا یہ کام نامکمل رہ گیا ہے۔ اب ہمیں اس کام کو پورا کرنا ہے۔

یہ ایک بڑے دکھ کا وقت ہے۔ اس وقت کی سب سے اہم ضرورت اپنے توازن کو برقرار رکھنا ہے۔ اس افسوسناک آزمائش کا ہمیں ہمت و دانشمندی کے ساتھ کرنا ہے۔ ہمیں سکون اور صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ ملک کے کسی بھی حصے میں تشدد کے ہونے سے اندراجی کی روح کو دکھ پہنچے گا۔ اس وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ ہمارا ایک قدم صحیح سمت میں اٹھے۔ اندرا گاندھی کی وفات ہو گئی ہے، لیکن ان کی روح زندہ ہے۔ بھارت زندہ ہے۔ بھارت امر ہے، بھارت کی روح امر ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ملک ذمہ داری کو سمجھے گا۔ اور ہم اس بوجھ کو ہمت و عزم کے ساتھ اٹھائیں گے۔

حکومت کی سربراہی کی جو ایک بڑی ذمہ داری ملک نے مجھ پر رکھی ہے، اسے میں صرف آپ کی حمایت اور تعاون سے ہی پورا کروں گا۔ ملک کے اتحاد، سالمیت اور وقار کو برقرار رکھنے کے لیے آپ کی رہنمائی میرے لیے اہمیت کی حامل ہے۔"

# ہم سوگوار ہیں

ہاتھ جو حفاظت پر مامور تھے، ہتھیار سے ہو گئے ۔ سفاک، قاتل، خون میں لت پت ۔ ایک مثالی محبِ وطن جاتا رہا ۔ تحریکِ آزادیٔ اقوام نے ایک غیر متزلزل مجاہد کھو دیا، انسانیت کی آفاقی قدریں ملک کا سیکولر کردار، رواداری، بھائی چارہ، امن، اتحاد، آشتی پل بھر میں اپنی شناخت کھو بیٹھے ۔ دنیا کی پسماندہ اور ترقی پذیر قومیں ایک حقیقی ہمدرد، ایک بہی خواہ سے اور ہندوستان کے غریب عوام ایک جگری دوست سے، ایک دستگیر سے محروم ہو گئے ۔

فضا نعروں سے گونج رہی تھی ؛ جب تک سورج چاند رہے گا ۔ اندرا تیرا نام رہے گا ۔ لیکن اندرا ! اندرا گاندھی ـــــ ملک کی محبوب وزیرِ اعظم ! زندگی کا ساز بے صدا ہو گیا تھا ۔ گونج البتہ باقی تھی ۔ باقی ہے ۔ باقی رہے گی ۔ اندرا تیرا نام رہے گا ۔

وہ تاریک بدھ تھا ۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کی ایک منحوس صبح ـــــ عمل : ۹ بج کر ۱۸ منٹ مقام : وزیرِ اعظم کی سرکاری قیام گاہ، ۱ صفدر جنگ روڈ نئی دہلی ۔ ایک عینی شاہد کے مطابق وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی آئرش فلمی وفد سے ملنے کے لیے ۱ ۔ صفدر جنگ روڈ سے ملحقہ عمارت ۱ ۔ اکبر روڈ کی طرف چلی جا رہی تھیں ۔ اُن کے گیٹ میں داخل ہونے سے قبل دو محافظوں نے اُن کے جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دیا ۔ وزیرِ اعظم کی قیام گاہ پر تعینات بھارت تبت سرحدی فوجوں کے جوانوں نے جوابی گولیوں سے محافظوں کو مار گرایا ۔ انتشار اور افراتفری کے عالم میں وزیرِ اعظم کو فی الفور آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ لے جایا گیا ۔ ساڑھے نو بجے سے لے کر ڈھائی بجے تک ڈاکٹروں نے جی توڑ کوششیں کیں ۔ متعدد آپریشن کیے ۔ اُن کے جسم میں پیوست گولیاں نکالیں ایک کے بعد ایک خون کی دس بوتلیں چڑھائی گئیں ۔ ڈاکٹر ہاری ہوئی لڑائی لڑ رہے تھے ۔ بالآخر ہار گئے ۔ ڈھائی بجے دن میں ڈاکٹر نے اُن کے مُردہ ہونے کا اعلان کیا ۔ شعلۂ مستعجل خاموش ہو چکا تھا ۔ شریمتی اندرا گاندھی نے آنکھیں کیا بند کیں اندھیرا ہو گیا ۔ ایک دل نے دھڑکنا کیا بند کیا، کروڑوں دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں ۔ اعصاب میں اینٹھن، فشارِ خون بڑھ گیا ۔ فساد کا باعث بنا ۔ اقلیتیں اپنے محافظِ حقیقی سے محروم ہو گئیں ۔ اکثریت حواس کھو بیٹھی ۔ ہجوم ہذیان میں مبتلا ۔ ایک جنون طاری تھا ۔ عمل اور ردِ عمل ۔ دونوں انسانیت سوز ۔ اول : سوچا سمجھا جس کی کوئی اور مثال مہذب دنیا کی تاریخ سے پیش نہیں کی جا سکتی ۔ دوم : ایک جذبہ فی الفور، جنونی، بے مہار، دونوں دشمنِ جاں ۔ اب ملک کے ستر کروڑ عوام کا دھڑکتا ہوا دل خاموش ہو چکا تھا ۔ اندھیرا اجالے پر غالب آ گیا تھا ۔ دلوں کو گرم اور آنکھوں کو منور رکھنے والی روشنی کھو گئی تھی ۔

سبھی آنکھیں نم تھیں ۔ ساری قوم سوگوار تھی ۔

شریمتی اندرا گاندھی محض ہماری وزیرِ اعظم نہیں تھیں ۔ وہ ملک کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز و ملجا تھیں ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر شے کا انحصار انہیں پر ہے ۔ مشکل سے مشکل اور کڑا وقت بھی ہمارے لیے کچھ ایسا مشکل نہیں، اپنے بے سہارا ہونے کا، اپنی بے بسی کا، ہمیں ایسا احساس اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا ۔"

اس المناک گھڑی میں الفاظ بے اثر معلوم ہوتے ہیں ۔ اُن کی موت میں قوم نے کیا کھویا ہے اس کا مکمل اظہار ممکن نہیں ۔ اس دل برشتگی اور افسردگی میں غم و غصہ، تلخی، مایوسی، بے بسی، اور نا اُمیدی سبھی کچھ عجیب طرح سے آمیز ہو گئے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے پیروں تلے زمین نہیں رہی ہے ہم ہوا میں معلق ہیں ۔

قومی سیاست میں شریمتی اندرا گاندھی ایک مرکزی شخصیت کی حامل تھیں ۔ اُن کے حلیف اس وسیع و عریض ملک کی تمام اچھائیوں اور اُن کے حریف ستر کروڑ عوام کی قوم کی تمام مبینہ خرابیوں اور کوتاہیوں کے لیے اُن کو ذمہ دار ٹھہراتے تھے ۔ اُن کے سیاسی مخالفین اُنہیں سے تقویت پاتے اور اُنہیں شکست دینے کے لیے ایک متحدہ محاذ پر جمع ہونے کی سعی کرتے تھے ۔ ۱۹۶۶ء میں وزیرِ اعظم بننے کے بعد سے اُن کے حریف اور حلیف اُن کے حوالے کے بغیر بات نہ بنا پاتے تھے ۔ آج وہ اہم شخصیت ہمارے درمیان نہیں رہی ۔ زیاں اور صرف زیاں کا احساس دلوں میں گھر کیے ہوئے ہے ۔

۱۹۶۶ء کے بعد سے ملک طرح طرح کے ادبار و ادوار سے گزرا ہے، لیکن جس سلامت روی کا مظاہرہ شریمتی اندرا گاندھی نے کیا ۔ اس کی دنیا بھر میں کوئی اور مثال آسانی سے پیش نہیں کی جا سکتی شریمتی اندرا گاندھی کی تقریباً ساری زندگی ہی مختلف آزمائشوں اور ابتلا میں گزری خطرات کا سایہ ہمیشہ سر پہ رہا، جو ملک کی سیاسی فضا کے

پیشِ نظر کبھی گھٹا، کبھی بڑھا تاہم برابر بنا رہا۔ البتہ اندیشے ادھر بڑھ گئے تھے۔ ملک کی ایکتا اور علاقائی سالمیت کے پیشِ نظر جس کارروائی کے احکام انہیں گزشتہ ۲۶ جون کو جاری کرنا پڑے، اس کے ردِ عمل سے وہ کچھ بے خبر نہ تھیں۔ ہاں وہ نوشتہ دیوار کو نوشتۂ تقدیر بھی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھیں۔ اُن کے نزدیک فرض کی ادائیگی ہر قیمت پر مقدم تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کے معمولات میں معمولی سا فرق بھی نہ آیا تھا۔ گویا اُن کے نرم و نازک پیکر میں فولاد کا دل اور آہن کا جگر تھا۔ اس فولاد اور آہن کو تقویت عوام کے اعتماد سے حاصل تھی۔ یہی اعتماد مختلف اوقات میں مُلک کے مختلف حصوں میں اُن کی اُنگلی تھامے رہا۔ وہ اس سے بخوبی آگاہ تھیں کہ کسی عظیم جمہوری مُلک کا رہنما کسی محفوظ قلعہ کے اندر سے اپنے آدرشوں، اپنے عوام کی بھلائی کے کاموں اور ملک کے ترقیاتی منصوبوں کو بروئے کار نہیں لا سکتا۔

اس امر کا انکار مشکل ہوگا کہ قومی سطح پر جو ترقیاں، اقتصادی، سماجی اور سائنسی شعبوں میں پیدا ہوئیں اور بین الاقوامی سطح پر ہندوستان کے وقار میں جو نمایاں اضافے ہوئے وہ شریمتی اندرا گاندھی کی مستحسن مساعی کا نتیجہ اور حصّہ ہیں — اُن کی بدولت ہر ہندوستانی اپنے آپ کو سربلند، سرفراز محسوس کرتا ہے۔ بہ ظاہر اُن کے بغیر ہندوستان کا تصور ہی نہیں کرتا۔

یہ صحیح ہے کہ اس بار ضرب کچھ زیادہ کاری لگی ہے۔ وہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء تھی جب راشٹر پتا مہاتما گاندھی گولی کا نشانہ بنے۔ تب ملک کے بار کو سنبھالنے کے لیے جواہر لال نہرو، سردار پٹیل اور مولانا آزاد جیسے جیالے رہنما موجود تھے۔ حالات ایسے بے قابو نہ ہو رہے تھے —— ممکن ہے بعض ایسا محسوس کرتے ہوں کہ اُن کے مرتبے کے قائد آج ہمارے درمیان موجود نہیں، لیکن ستر کروڑ عوام کی اس عظیم قوم میں قابل، اہل، مدبر، حیلہ جُو، کارساز رہنماؤں کی کوئی کمی بھی نہیں ہے۔ بیس برس پیشتر ہمیں شریمتی اندرا گاندھی کے اس قد آور اس مرتبے کا اندازہ ہی کب تھا۔

ہماری تاریخ شاہد ہے، جب جب اُفتاد پڑی ہے، قوم زیادہ قوت کے ساتھ اُبھر کر سامنے آئی ہے۔ جیسا کہ خود شریمتی اندرا گاندھی نے کہا: اُن کے خون کا ہر قطرہ ہندوستان کو زیادہ مضبوط زیادہ فعال اور مزید متحرک بنائے گا۔

ہماری محبوب وزیرِ اعظم اُن آدرشوں میں امر ہوگئی ہیں، جو اُنہوں نے اپنے سامنے رکھے، جو ملک کا نصب العین قرار پائے۔ آزمائش کی اس گھڑی میں شریمتی اندرا گاندھی کے تئیں ہر ہندوستانی کا بہترین خراجِ عقیدت یہی ہے کہ وہ اُن آدرشوں کو دل کے قریب رکھے۔ استعداد بھر ملک کو ترقی دینے، متحد اور مضبوط بنانے کی جی جان سے کوشش کرے۔ اسی سے اُن کی آتما کو شانتی ملے گی —— آتما امر ہے۔ ہندوستان امر ہے۔ ●●

عالم کی دوست
SECRETARY GENERAL
QIAN QICHENG

... میں شائع کیے ... کی شکل دیتے ہوئے یہ احساس بڑی ... سے ہوا کہ اس نمبر میں اردو صحافت کے بعض پہلوؤں کا احاطہ نہیں ہو پایا۔ فرداً فرداً ریاستوں میں اردو صحافت کے ارتقاء اور فروغ کا جائزہ نہیں لیا جا سکا۔ یہی محسوسات صحافت نمبر حصہ دوم کی تحریک کا باعث بنے۔ حسبِ وعدہ حصہ دوم حاضرِ خدمت ہے تاہم تشنگی اب بھی محسوس ہو رہی ہے۔ خیال تھا سارے مضامین ایک شمارے میں سما جائیں گے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ریاستوں میں اردو صحافت کے فروغ سے متعلق مضامین اب بحالتِ مجبوری آئندہ شمارے میں شائع کئے جائیں گے۔ اس التوا میں بہتری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس اثنا میں، ممکن ہے بعض موعود اور متوقع مضامین مزید موصول ہو جائیں۔

• گو صحافت نمبر کو ہر اعتبار سے جامع و بہتر بنانے کی سعی کی گئی ہے تاہم بعض مواقع پر تفصیلات کی کمی تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔ بعض مواقع پر ایسا ایجاز برتا گیا ہے کہ ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے اور کہیں اطناب نے نفسِ مضمون کی طنابیں غیر ضروری تفصیلات میں الجھا دی ہیں۔ مختصراً سابقہ (صحافت نمبر حصہ اوّل) اور پیشِ نظر مواد نیز آئندہ شمارے میں شامل مضامین کی نوعیت بحیثیتِ مجموعی اچھے خام مواد کی ہے، جس سے اردو صحافت کی ایک مربوط تاریخ بخوبی مرتب کی جا سکتی ہے۔

ادبی اور صحافتی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

**حسرت نمبر:** "آج کل" نے اگست ستمبر ۱۹۸۲ء میں حسرت نمبر شائع کیا تھا۔ "آج کل" کے خاص نمبروں کی روایت کے مطابق یہ نمبر بھی ادبی حلقوں میں بڑا مقبول ہوا تھا۔ حسرت موہانی جیسے محبِ وطن، مجاہدِ آزادی اور ملنگ شاعر پر، یوں تو بعض اور رسائل کے نمبر بھی شائع ہیں۔ تاہم ایک تشنگی کا احساس برابر بنا رہتا ہے۔ ہم اسی امر کے پیشِ نظر فروری ۱۹۸۵ء کا شمارہ حسرت موہانی مرحوم کے لیے مخصوص کر رہے ہیں۔ اس نمبر میں جن اہلِ قلم کا رعل کی شرکت متوقع ہے، ان میں جناب مالک رام، ڈاکٹر عبدالمغنی، ڈاکٹر احمر لاری، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر وحید اختر کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائقِ ذکر ہیں۔

## وفیات

امسال اکتوبر کی طرح نومبر بھی غارت گرِ ہوش ثابت ہوا۔ ادب کی دو اہم ہستیاں راجندر سنگھ بیدی اور نوبہار صابر ہمارے درمیان سے اٹھ گئیں۔

نوبہار صابر کا انتقال ۹ نومبر کی شب میں پٹیالہ میں ہوا۔ موصوف ایک طویل عرصے سے فریش تھے۔ نوبہار صابر کا نام نوبہار سنگھ مڑیہ تھا۔ ان کی ولادت ۱۱ نومبر ۱۹۰۷ء کو ٹوہانہ ضلع حصار میں ہوئی۔ تعلیم پٹیالہ میں حاصل کی۔ موصوف گزشتہ ساٹھ برس سے شعر و ادب کی خدمت کر رہے تھے۔ اوّل اوّل ادبی سطح پر اُن کا نام ۱۹۳۲ء میں نمایاں ہوا، جب اُن کی پانچ انقلابی نظموں کا مجموعہ "پیامِ بیداری" کے نام شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ حکومتِ برطانیہ نے ضبط کر لیا تھا۔ یہ نظمیں بعد میں اُن کے قومی و وطنی نظموں کے مجموعے "دھرتی کی خوشبو" (۱۹۷۶ء) میں شائع ہوئیں۔ نوبہار صابر صاحب کی پہلی تصنیف ڈرامہ "راج کماری للتا" ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اُن کی تصانیف میں "کارواں خیالوں کے" (۱۹۶۹ء) "زرد پتے" (۱۹۷۸ء) اور "دھنک رنگ" (۱۹۸۲ء) خاص طور پر لائقِ ذکر ہیں۔ تالیفات میں "لہو ترنگ" (۱۹۶۶ء) "ارمغانِ تاشقند" (۱۹۶۷ء) اور "لہو پکارے گا آستیں کا" (۱۹۷۳ء) شامل ہیں۔

نوبہار صابر ہریانہ و پنجاب کے راج کوی تھے۔ انہیں ہریانہ سرکار نے ۱۹۷۱ء میں شاعرِ وقت کے اعزاز و خطاب سے نوازا تھا۔ مرحوم کے پسماندگان میں اُن کی بیوہ اور دو صاحبزادے ہیں۔

---

راجندر سنگھ بیدی مرحوم کا ایک مضمون "پریوڈ اور میٹری" اور "من کہ" ہم اکتوبر ۱۹۸۴ء میں شائع کر چکے ہیں۔ ادھر گزشتہ ایک عرصہ سے جو دھڑکا لگا ہوا تھا، وہ بالآخر ہو کر رہا۔ کینسر بلائے جان ثابت ہوا اور یہ عہد آفریں قلم کار، افسانہ و ناول نگار ۱۱ نومبر کی صبح میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ اُن کی موت سے فلم اور ادب کی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ شاید کبھی پُر نہ ہوگا۔ ہم مرحوم کے غم میں سوگوار، اُن کے متعلقین کے غم میں شریک ہیں۔

---

## بقیہ: اردو اخبارات کیلئے تربیت یافتہ عملے کی ضرورت

گلہ کرتے رہے ہیں۔

اس کا ایک جواب یہ ہو سکتا ہے کہ حقیقت پسندی سے کام لیا جائے کیا یہ ضروری ہے کہ پریس رجسٹرار کی رپورٹ میں تیرہ سو اردو اخبارات کی تعداد شامل کر کے نام نہاد شہرت حاصل کی جائے۔ جب روزناموں کے پاس خبریں اور مضامین خریدنے یا تربیت یافتہ عملے کو ملازم رکھنے کے وسیلے نہیں ہیں تو چھوٹے وقار پر کیوں ضد کی جائے۔ دو دو تین تین روزناموں کو ملا کر مالی اعتبار سے کامیاب جمالیاتی و معنوی خوبیوں پر مبنی ایک ایک اخبار کیوں نہ چلایا جائے جہاں عملے کو اچھا معاوضہ اور قارئین کو مطالعہ کے لیے اچھا مواد مل سکے۔

اگر اردو صحافت سے وابستہ افراد ان امور پر غور کریں اور ذاتی خیالات کی تشہیر پر کاروباری تقاضوں کو ترجیح دیں تو موجودہ دور میں بھی اردو صحافت کا مستقبل روشن ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ ؎

مال اچھا ہے تو دنیا میں خریدار بہت ●●

# ہندوستان کو مضبوط اور عظیم بنائیں

وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی

ے ہم وطنو!

کل اندرا گاندھی کی استھیاں، اُن کی خواہش
مطابق ہمالیہ کے سپرد کر دی گئیں۔ اُن کی امر
ہمیں دعوت دے رہی ہے کہ ہم اُن کے خوابوں
ہندوستان تعمیر کریں۔

مہاتما گاندھی نے ہمارے قدیم ملک میں
نئی رُوح پھونکی۔ ہمیں آزادی دلوائی اور
ایا کہ صداقت، محبت اور عدم تشدد سب سے
اوصاف ہیں۔ جواہر لال نہرو نے سیاسی اور
لی طور پر ایک جدید جمہوری، سیکولر، سوشلسٹ
با وابستہ بھارت کی بنیادیں استوار کیں۔

اندرا گاندھی نے ان بنیادوں کو مزید مضبوط
ا۔ اُنہوں نے عوام کی خود مختاری کو حقیقت
پ دیا اور اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش
ہماری پالیسیاں اور قانون اُن کے حقوق
ظت کریں۔ انہوں نے سبھی طرح کی تنگ
اور تعصب کے خلاف جہاد کیا۔ اُنہوں نے
ستان کو زراعت، صنعت اور ٹکنالوجی کے
شعبوں میں خود انحصار بنایا۔ غریبی کے خلاف
ل لڑائی لڑی۔ آج کی مختلف کشیدگیوں میں
ا دنیا میں بین الاقوامی امن کے لیے آواز بلند
کی ـــــ سب سے اہم بات یہ کہ اُنہوں نے
ہم میں خود اعتمادی پیدا کی ـــــ اصل مقصود کا احساس
دلایا۔ ہمارا وقار بحال کیا۔ یہ شاندار ورثہ ہمیں
اندرا جی سے ہی ملا۔ میں عہد کرتا ہوں کہ میں اس
عظیم میراث کا تحفظ کروں گا۔ اور یہ کہ میری تمام تر
کوششیں ایک ایسے مضبوط اور متحد، خوشحال ہندوستان
کی تعمیر میں کام آئیں گی، جو امن کے لیے وقف ہو۔

ہندوستان کے اتحاد اور سالمیت سے
زیادہ اہم کوئی اور دوسری شے نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان
ناقابلِ تقسیم ہے۔ سیکولرازم ہماری قومیت کا بنیادی
اصول ہے۔ اس کے معنی صرف رواداری نہیں، رواداری
سے سوا ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ امن اور توازن کو
بنائے رکھیں۔ کوئی بھی مذہب نفرت اور نارواداری
کا درس نہیں دیتا۔ ملک کے اندر اور باہر مفاد پرست
عناصر مذہبی جذبات کے استحصال اور تشدد کے
ذریعے ہندوستان کے ٹکڑے کروانا چاہتے ہیں۔
فرقہ پرستی کا جواب فرقہ پرستی نہیں ہے۔ اس سے
تخریب اور علیحدگی پسند طاقتوں ہی کو مدد ملے گی۔
عوام اور حکومت کی باہمی طاقت اُن کے منصوبوں
کو مٹی میں ملا دے گی۔ ہندوستان ایک ہے اور
ہم سب کا ہے۔

## بنیادی مقصد: غریبی کا خاتمہ

ہمارا بنیادی مقصد جلد سے جلد غریبی کو
ختم کرنا ہے۔ حکومت کی کارکردگی کا اندازہ اس
بات سے لگایا جاتا ہے کہ وہ کیسی اور کتنی
ترقی دے سکتی ہے۔ پانچ برس پہلے جب عوام
نے اندرا جی کو وزیرِ اعظم کی ذمہ داری دوبارہ سونپی
تو اُنہوں نے ایک مؤثر کارگر سرکار کا وعدہ کیا تھا۔
اُنہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اناج اور توانائی کی
ریکارڈ پیداوار ہوئی ہے۔ سائنس کے شعبے نے
اہم ترقیاں کی ہیں۔ صنعتیں پھر تیز رفتاری سے
ترقی کرنے لگی ہیں۔ روزگار کے مواقع بڑھ رہے ہیں۔
ہماری معیشت نے قحط سالی اور سیلابوں جیسے
انتہائی شدید قدرتی مصائب اور بین اقوامی بحرانوں
کا مقابلہ کیا۔ دنیا میں ہندوستان کا سیاسی اور
اقتصادی مقام و مرتبہ پہلے سے کہیں بلند ہے۔

## سماج واد اور منصوبہ بندی کی حمایت

میں سماج واد اور منصوبہ بندی کی حمایت
کا پھر اقرار کرتا ہوں۔ ہماری ترقی منصوبہ بندی
کی بدولت ہی ممکن ہوئی ہے۔ ہمارے نصب العین
ہیں ملک کو مسلسل جدید بنانا، پیداوار میں اضافہ
کرنا اور سماجی انصاف کو تیز رفتاری سے بڑھاوا
دینا۔

ہمارے منصوبوں میں دیہات کی ترقی پر
زیادہ دھیان دیا جائے گا۔ ہمارا مقصد ہوگا اناج،
دالوں اور تلہن کی پیداوار بڑھانا، سینچائی کی سہولتوں

ـــــــــــــــ

دسمبر ۱۹۸۴ء کو قوم کے نام نشری پیغام۔

[illegible] کاریگروں کو
[illegible] کو فروغ دینا،
[illegible] کو ختم کرنے اور سماجی امن کو
[illegible] کے لیے روزگار کے مواقع بڑھانا ضروری
ہے۔ خاص طور پر دیہی و شہری نوجوانوں کے لیے
اس کے لیے زراعت اور صنعت کی رفتارِ ترقی کو
اور تیز کرنا ہوگا۔

سرکاری حلقے کے اداروں و کارخانوں نے
ایک جدید اقتصادی نظام کی بنیادیں قائم کرنے
میں بڑا تاریخی حصہ ادا کیا ہے۔ سرمایہ میں اضافہ
کرنے کے لیے انہیں زیادہ ذمہ داریاں سنبھالنا ہوں
گی، بہتر کارکردگی دکھانا ہوگی۔

قومی پالیسیوں کے اندر رہتے ہوئے معیشت
کی امکانی پیداوار صلاحیت بڑھانے کے لیے نجی
حلقے کے اداروں، کارخانوں کو وافر مواقع میسّر
ہیں۔ صحت مند مقابلے کے جذبے سے طاقت
حاصل کرتے ہوئے انہیں پیداواری لاگت گھٹانا
ہے۔ نئی ٹکنالوجی استعمال میں لانا ہے۔ نجی
اور سرکاری دونوں حلقوں کو لازماً نئے
کام شروع کرنا ہیں۔ مال کی کوالٹی کو بہتر بنانا
اور دیسی ٹکنالوجی کو فروغ دینا ہے۔

کسان اور مزدور ہمارے اقتصادی نظام
کے بنیادی ستون ہیں۔ ان کے حالات کو سدھارنے
کا کام تیزی سے کیا جائے گا۔

## بیس نکاتی پروگرام مؤثر ڈھنگ سے

سرکار نے درج فہرست ذاتوں، درج فہرست
قبیلوں، پچھڑے ہوئے طبقوں، کاریگروں،
کھیت مزدوروں، عورتوں اور شہروں کے غریبوں
کے رہن سہن اور کام کاج کے حالات کو بہتر بنانے کا
عہد کیا ہے۔ اندرا گاندھی کے بیس نکاتی پروگرام
کا مقصد لوگوں کی فوری ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔
اس پروگرام کو سچے دل سے اور زیادہ مؤثر طریقے
سے لاگو کیا جائے گا۔

ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہمارے عوام
ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ افراد اور کنبے اپنی امکانی
صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اس مقصد
سے ہم کنبے کی منصوبہ بندی، غذائیت، عورتوں
اور بچوں کی بھلائی، بیماریوں کی روک تھام، ابتدائی و
بالغوں کی تعلیم، کھیل کود اور بہتر رسل و رسائل
کے پروگراموں پر زیادہ زور دیں گے۔

## زیادہ بہتر خدمات:

میں عوام کی خدمت کو بہتر بنانے کا پابند
ہوں۔ میں اس کام میں شریک سبھی لوگوں کو
یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر وہ نیک نیتی اور لگن
سے کام کریں گے تو انہیں باہری دباؤ اور دخل
اندازی سے پورا پورا تحفظ دیا جائے گا۔ میں
اُن سے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ بدعنوان، کاہل
اور نکمّے لوگوں کو ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا۔

ہمارے انتظامیہ نظام کو لازمی طور پر ایسا
بننا پڑے گا کہ اس کی زیادہ سے زیادہ توجہ مقاصد
کے حصول پر رہے۔ کام کا ایک نیا اصولِ اخلاق
بنانا ہوگا۔ ایک نئی ذہنی فضا تیار کرنا ہوگی جس
میں حکومت دفتری کارروائی کے بجائے نتائج
کی پابند ہو۔ صلے اور سزا کا انحصار لازماً کارکردگی
پر ہوگا۔ سبھی اداروں کو بہتر کارگزاری دکھانا
ہوگی۔

پچھلے چند برسوں میں سائنس اور ٹکنالوجی
کے میدان میں بڑی اہم ترقیاں حاصل ہوئی ہیں۔
اندرا گاندھی کے سائنس دانوں کے ساتھ بڑے
خوش گوار تعلقات تھے۔ ان سے قوم کا بہت بھلا ہوا۔
میں ان تعلقات کو بنائے رکھوں گا۔

فنون، زندگی کو باطنی صداقت اور حُسن کی
بصیرت عطا کرتے ہیں۔ ہم اپنے دستکاروں کے

ان مند ہیں کہ انہوں نے صدیوں پرانی جمالیاتی
یات کو بنائے رکھا۔ ہم اتنے ہی احسان مند
ہ مصنفوں، مصوروں اور فن کاروں کے بھی
۔ ہمیں اپنی اس انمول میراث کو محفوظ رکھنا
۔ ایک ایسی فضا تیار کرنا ہے جس میں فنون
ں پھولیں۔

تعلیمی نظام کو بھی نئے سرے سے مرتب کرنے
ضرورت ہے تاکہ وہ قومی فروغ اور اتحاد میں
دہ مددگار ثابت ہو۔ میں اس تعلیمی نظام پر
یع تبصرہ کرانا چاہتا ہوں اور اس میں سدھار
نے کے لیے عام رائے بنانا چاہتا ہوں۔

## وسی ملکوں کے ساتھ پُرامن تعلقات :

قومی تعمیر و ترقی کی پہلی شرط امن ہے۔
وسی ملکوں کے ساتھ امن اور عالمی امن۔ ہماری
امن کی فضا بگڑی ہوئی ہے۔ ہمارے پڑوس
ں اور بحرِ ہند میں بڑے پیمانے پر جدید ہتھیار جمع
کئے گئے ہیں۔ ملک کے استحکام کو یقینی بنانے کے
ہم اپنی ہتھیار بند فوجوں پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔

حکومت اس بات کے لیے ہمیشہ کوشش کرتی رہے گی
کہ ملک کے دفاع کو اور جدید بنایا جائے۔ فوج
میں کام کرنے والوں اور اُن کے کنبوں کی بھلائی
کے لیے کام کئے جائیں۔ میں اس موقع پر اپنے فوجی
جوانوں اور افسروں کو مبارک باد دیتا ہوں، جن
کے ہاتھوں میں ہماری قوم کا وقار اور سالمیت محفوظ
ہیں۔

پچھلے ہفتے ۔۔۔ ممتاز رہنما
اپنے عوام کی ہمدردیوں کے اظہار کے لیے یہاں آئے تھے۔
میں نے اُن پر یہ بات واضح کی کہ ہندوستان
عالمی امن، دوستی اور باہمی تعاون کے لیے برابر کام
کرتا رہے گا۔

جواہر لال نہرو نے ایک ایسی خارجہ پالیسی ہمیں
وراثت میں دی ہے، جسے اندرا گاندھی نے بڑے تخلیقی
انداز سے بڑھاوا دیا۔ میں اسی پر عمل کروں گا۔ میں
اقوامِ متحدہ اور ناوابستہ ملکوں کی تحریک سے اپنی
وابستگی کا اقرار کرتا ہوں۔ ہم پہلے کی طرح نئی اور
پرانی نو آبادیوں کی مخالفت کریں گے اور دنیا
میں اقتصادی نابرابری کو کم کرنے کے لیے کوششیں
جاری رکھیں گے۔

ہم اپنے پڑوسی ملکوں کے ساتھ امن،
دوستی اور باہمی تعاون کے جذبے سے تعلقات
بڑھانا چاہتے ہیں۔ ہم نے پاکستان کو اسی کی
پیش کش کی۔ ہم نے ہمیشہ دوسرے ملکوں کے
اندرونی معاملوں میں دخل نہ دینے کے اصول
پر عمل کیا۔ پُرامن بقائے باہمی اور ناوابستگی
ہمیشہ ہمارے تعلقات کے رہنما اصول رہے
ہیں۔ ہم جنوبی ایشیا کی مشترک علاقائی ترقی
کے کاموں میں لگے رہیں گے۔ چین سے ہمارے
تعلقات بہتر ہو رہے ہیں۔ اور ہم مسائل کا
ایک اطمینان بخش حل ڈھونڈ نکالنے کی کوششوں
کو جاری رکھیں گے۔

سوویت یونین کے ساتھ ہماری دوستی
وقت کی کسوٹی پر کھری اُتری ہے۔ یہ آپسی
تعاون پر منحصر ہے۔ سوویت یونین نے وقت پڑنے
پر ہمارا ساتھ دیا ہے ہم اُن کی دوستی کی دل سے
قدر کرتے ہیں۔

ہم ہمیشہ مغربی اور مشرقی دنیا کے دوست

رہے ہیں۔ ہم ان کے درمیان اپنے تعلقات کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔

امریکہ سے ہمارے ہمہ پہلو تعلقات ہیں۔ ہم اُن کے ساتھ اقتصادی، تکنیکی اور ثقافتی تعاون کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔

میں عرب دنیا، جنوب مغربی اور جنوب مشرقی ایشیا، مشرق بعید اور خطۂ بحرالکاہل، افریقہ، لاطینی امریکہ، کیریبین اور مغربی و مشرقی یورپ کے ممالک کو بھی یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہم اُن کے ساتھ اپنے سیاسی اور اقتصادی تعلقات کو اور مضبوط بنانا چاہتے ہیں۔

اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ آج دنیا کو بڑا خطرہ نیوکلیائی جنگ کا ہے۔ اسلحہ کی دوڑ کے خلاف جو اُن تھک جہاد اُنہوں نے شروع کیا تھا اُسے ہم جاری رکھیں گے۔ وہ عالمی اقتصادی بحران کے بارے میں بھی اتنی ہی فکرمند تھیں۔ ہم اُن کے اس کام کو بھی آگے بڑھائیں گے اور شمال اور جنوب کے درمیان بات چیت کے سلسلے کو بڑھاوا دینے کی ہمیشہ کوشش کریں گے۔ ہم انصاف پر مبنی عالمی اقتصادی نظام کی تشکیل کی کوشش کریں گے۔

## سیکولرازم اور رواداری

اندرا گاندھی کے قتل نے ساری قوم کو جھنجھوڑ دیا ہے۔ یہ سنگین اور نازک موقع ہے۔ نازک وقت پڑنے پر ہندوستان ہمیشہ ہوشیار و چوکنا ہوا ہے۔ اُس نے ہمیشہ نئی تعمیری کوششوں سے کام لیا ہے۔ افراتفری سے لازمی طور پر ایک نئی ذات پیدا ہونی چاہیے جو اتحاد کے انتہائی اہم شعور کو جنم دے۔ امن قائم کرے اور انسان اور انسان کے بیچ گہرے انسانی رشتے کو برقرار رکھے۔

ہماری قدیم روایات اور ثقافت اور آزادی کے مجاہدوں سے حاصل میراث کی بنیادیں سیکولرازم اور رواداری پر ہیں۔ اندرا گاندھی نے اُنہیں اصولوں کے لیے اپنی زندگی قربان کر دی۔

ہمیں اپنے قدیم رشی منیوں کی دانش مندی اور سائنس اور ٹیکنالوجی میں توازن قائم کرنا ہے۔ ہمیں اپنی سیاسی، ثقافتی اور فکر و فلسفہ کی روایات کو محفوظ و برقرار رکھنا ہے۔ ہم اپنے قدرتی وسائل کے ساتھ ایک مناسب تعلق قائم کرنا چاہتے ہیں۔ خود اپنے بل بوتے پر ترقی کرنے کی جو صلاحیت ہم نے ادھر حاصل کی ہے اُسے بڑھاوا دینا ہے۔

عوام کی زندگی کو زیادہ بامقصد اور زیادہ تعمیری بنانے کے لیے ہمیں اپنے کام کے طریقوں میں تبدیلی لانا ہے۔ نئی قدروں کا شعور پیدا کرنا ہے۔

ہم جیسا حال کو بنائیں گے ویسا ہی ہمارا مستقبل ہوگا۔ ہم مل جل کر ۲۱ ویں صدی کا ہندوستان تعمیر کریں گے۔ جو بدلنا ہے مل کر بدلیں گے۔ ترقی کے راستے کی رکاوٹوں کا مل کر مقابلہ کریں گے۔ مل کر ایک مضبوط، دانشمند اور عظیم ہندوستان بنائیں گے۔ یہ ہندوستان امن اور رواداری کی مشعل ہوگا۔

جے ہند۔

اِندر سروپ دت نادان

## ایک نظم فردا کے لیے

تُو کہاں سمجھے گا میرا درد بگلے
تُو کہ اُن پیڑوں کے سائے میں ابھی تک جی رہا ہے
جن کا رشتہ ہے ترے پُرکھوں کے لمس جاوداں سے
اور میں ماں باپ سے بچھڑے ہوئے بچے کی صورت
اُن گھنے پیڑوں کی جانب
اشک آلودہ نظر سے تک رہا ہوں
جو مجھے پُرکھوں سے ورثہ میں ملے تھے
جن کے ہر پتے نے دیکھی تھی مری چڑھتی جوانی
جن کے نیچے بیٹھ کر لکھی تھی میں نے
پیار کی پہلی کہانی
جن کے پتوں میں جھلکتی زندگی نے
میری مٹی میں ہزاروں بیج بوئے
اور جب وہ فصل کی صورت میں پھوٹے
تو اُنہیں کھانے کو دوڑی
ایک ناہنجار آندھی
کیا سناؤں داستاں
تجھ کو میں اُس بیداد گر کی
جس کے ہاتھوں
میرا وہ پندار ٹوٹا
جو مجھے دیرینہ رشتوں نے دیا تھا....
ہو مبارک تجھ کو
ان پیڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں پیارے
بات لیکن یہ بھی دل پر نقش کر لے
دیر کچھ لگتی نہیں ہے
آندھیوں کا رُخ بدلتے
آ کہ وہ تاریک دن آنے سے پہلے
آندھیوں کے دیوتاؤں پر
قیامت بن کے لوٹیں!

## لہو کا چراغ

ظہیر ناشاد دربھنگوی

اے مورخ اُٹھا قلم اپنا
داستاں لکھ لہو سے اب اُس کی
زندگی عہد ساز تھی جس کی
اہلِ گیتی کو ناز تھا جس پر
نام جن کا مدبروں میں تھا
جس کے سینے میں پیار ماں کا تھا
اس صدی کی عظیم رہبر تھی
شانتی، امن اور جرأت کی
راہ جس نے دکھائی دنیا کو
ذہن میں جس کے مسکراتا تھا
خواب تھا اک حسین دنیا کا
جس کی اُلجھی ہوئی سیاست کا
ذکر تھا محفلِ سیاست میں
عزم و ہمت کی جو ہمالہ تھی
تیرگی میں جو اک اُجالا تھی
مادرِ ہند کی وہ بیٹی تھی
سارے عالم کی وہ پہیلی تھی
اندرا روشنی کی دیوی تھی
روشنی قتل ہو نہیں سکتی
سنگ دل قاتلوں کی گولی سے
اے مورخ اُٹھا قلم اپنا
اس حقیقت کی ترجمانی کر
اندرا کے لہو کی بوندوں سے
آ رہی ہے یہی صدا پیہم
وقت کو روشنی مبارک ہو وقت کو روشنی مبارک ہو

• روم نمبر ۳۸ - ۱۱ - وارث گنج اسٹریٹ خضر پور کلکتہ

عالمی شہرت یافتہ مصور ایم ایف حسین کی بنائی مسز اندرا گاندھی کی تصویر جس میں گولیوں کے ۱۶ نشان دکھائے گئے ہیں

## وزیرِ اعظم ہند الوداع

۱۴۰۵ھ

پُرنصیب ومضطرب شمیم امروہوی

۱۹۸۴ء

| | | |
|---|---|---|
| ۵۰ | نئی کشمکش میں ہے سارا وطن | ۵۰ |
| ۳ | جواہر کی بیٹی نے پہنا کفن | ۵۰ |
| ۶۰ | سدا خدمتِ قوم کی بے دریغ | ۱۰۰۰ |
| ۵۰ | نہ چھوڑا کبھی خاندانی چلن | ۵۰ |
| ۵۰ | تھا ورکیا اپنا موتی سا لعل | ۳۰ |
| ۴ | جبیں پر نہ آئی مگر اک شکن | ۵۰ |
| ۹۰۰ | ظلیمِ نگہبانِ کورِ نمک | ۲۰ |
| ۲۰۰ | رہینِ الم کشتۂ پُرمحن | ۵ |
| ۴ | درخشندہ نقطۂ اتحاد | ۴ |
| ۲۰ | کرشمہ گرِ نیّرِ انجمن | ۵۰ |
| ۶۰ | سروشِ اجل نے یہ رو کر کہا | ۱ |
| ۵ | ہوا خونِ اندرا بھی نذرِ چمن | ۵۰ |
| ۱۴۰۵ھ | ۱۹۸۴ء | ۱۴۰۵ھ |

• قاضی زادہ، امروہہ ۲۴۴۲۲۱ (یو پی)

## آج وہ شمعِ وطن ہے خاموش

کرشن موہن

کتنی بے کیف ہے ہنگامۂ عالم کی نمود<br>
ایک دھوکا ہے شہود<br>
جو محافظ تھے وہ قاتل نکلے<br>
باعثِ ننگِ بشر، ننگِ زمیں<br>
لعنتِ مذہب و دیں<br>
اُن کی وحشت کے سبب تیرہ و تاریک ہے دہر<br>
سر اُٹھائے ہے غم و غصّہ کی لہر<br>
دل بہ دل، شہر بہ شہر<br>
اندرا گاندھی کہ تھا جس کا وجود<br>
سارے عالم کے لیے<br>
باعثِ نشوونما، کیف و کشود<br>
آج ہے بزمِ جہاں سے مفقود<br>
ماتمِ لوزِ مجسم میں سیہ پوش ہیں ہم<br>
غم سے ہے سارا زمانہ بے ہوش<br>
جس کے اعجاز سے تھی رونقِ ہستی قائم<br>
آج وہ شمعِ وفا ہے خاموش<br>
آج وہ شمعِ وطن ہے خاموش

• ۱۵۸- پنیا کھلی، دہلی ۱۱۰۰۹۲

## مختار شمیم

(۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو وزیرِ اعظم ہند محترمہ اندرا گاندھی کے بہیمانہ قتل اور اس کے بعد پورے ملک میں پُرتشدد واقعات کے پس منظر میں درج ذیل اشعار غزل کی صورت میں کہے گئے ہیں):

جو شاخ شاخ ہری تھی ملک اُٹھی کیسے ؟<br>
قبائے گُل میں مگر آگ یہ لگی کیسے ؟

لہو کا دریا مری آنکھ میں اُتر آیا<br>
نشہ کچھ اور تھا، یہ موجِ غم بڑھی کیسے ؟

وہ رنگ کیسا تھا، نفرت کا یا عداوت کا<br>
سوال یہ ہے کہ تصویر یہ بنی کیسے ؟

نہ کوئی بات، نہ قصہ، نہ کوئی افسانہ<br>
تمہیں بتاؤ کہ یہ بات پھر بڑھی کیسے ؟

وہ شاخِ گُل! کہ تھی آئینۂ بہارِ چمن<br>
بھری بہار میں وہ شاخِ گُل جلی کیسے؟

زبان بند، دہن چپ، نظر نظر خاموش<br>
مگر حکایتِ دل بھی کہی گئی ؟! کیسے ؟

وہ ماہتاب تمنّا، وہ آفتابِ اُمید<br>
کنارِ آب مگر روشنی بجھی کیسے ؟

• ہیڈ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ آف اردو، گورنمنٹ گرلز پوسٹ گریجویٹ کالج، اندور ۴۵۲۰۰۴

# بہتر زندگی کی طرف ...

ہندوستانی معیشت کا بیشتر انحصار
پر ہے ۔ ہماری تین چوتھائی آبادی کا
ر زراعت پر ہے ۔ ہمارے ۷۰ فی صد
ں کو زراعت ہی میں روزگار حاصل ہے۔
ہمیت اس اعتبار سے بھی مسلّم ہے کہ ہماری
نی کا ۴۲ فی صد حصّہ ہمیں زراعت سے حاصل
ہے ۔ ملکی برآمدات میں زراعت کا حصّہ ۳۴ فی صد
آزادی کے بعد زراعت کے ترقیاتی پروگراموں
پر توجہ دی گئی ہے ۔ ملک کے ترقیاتی پنج سالہ
ے اس امر کے آئینہ دار ہیں ۔ کھیتی باڑی
ں کو، جدید خدمات کو بہتر بنا کر اور اعلیٰ
بیج اور کھاد اور کیڑے مار دوائیاں وغیرہ فراہم
پیداوار بڑھانے کے اقدام کئے گئے ہیں ۔
انہی کوششوں کے نتیجے میں توقع ہے کہ
۱۹۸۳ء میں سال گزشتہ کی پیداوار کے
مقابلے میں ۹ فی صد شرح ترقی متوقع ہے ۔ توقع
ہے کہ ۸۴-۱۹۸۳ء میں اناج کی پیداوار ۱۴۲۶۳
لاکھ ٹن ہوگی ۔ یہ گزشتہ سال کے مقابلے میں
۱۴ فی صد یا ۱۸۰ لاکھ ٹن زیادہ ہوگی ۔ یاد رہے کہ
پچھلے سال ۱۲۸۴ لاکھ ٹن اناج پیدا ہوا تھا ۔ یہ
ایک ریکارڈ پیداوار ہوگی ۔ اس سال دالوں اور
تلہن کی متوقع پیداوار بالترتیب ۱۲۰ لاکھ ٹن اور
۱۲۵ لاکھ ٹن ہوگی ۔ ۸۳-۱۹۸۲ء کے مقابلے میں یہ
پیداوار بالترتیب ۴ لاکھ ٹن اور ۲۰ لاکھ ٹن زیادہ ہے۔
اناج کی پیداوار بڑھانے کے سلسلے میں
بیجوں کی بہتر قسموں نے اہم حصّہ ادا کیا ہے ۔ ۱۹۶۶ء
۶۷ ۱۹ء میں ۱۸۰۹ لاکھ ہیکٹر آراضی میں زیادہ پیداوار
دینے والی قسمیں بوئی جا رہی تھیں ۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں
یہ آراضی اضافے کے بعد ۵۰۷۴۸ کروڑ ہیکٹر
ہوگئی ۔ ۸۴-۱۹۸۳ء میں مزید ۲۵۰۵ کروڑ ہیکٹر
آراضی اس اسکیم کے تحت لائی جائے گی ۔ جب کہ
۸۶-۱۹۸۵ء کا نشانہ ۶۰۵ کروڑ ہیکٹر رکھا
گیا ہے

دالوں اور تلہن کی پیداوار بڑھانے کے لیے
کسانوں کو بہتر قسموں کے بیج فراہم کئے جا رہے
ہیں ۸۴-۱۹۸۳ء میں بہتر بیجوں کی ۳۰۰۳۵
لاکھ تھیلیاں تقسیم کی گئیں ۔ جب کہ ۸۳-۱۹۸۲ء میں
ان تھیلیوں کی کُل تعداد ۳۴۰۸ لاکھ اور ۸۱-۱۹۸۰ء
میں ۳۱ ہزار تھی ۸۴-۱۹۸۳ء میں مصدقہ بیجوں کی
فراہمی میں بھی ایک نیا ریکارڈ قائم ہوا ۔ اس برس
کسانوں کو ۲۷ لاکھ کوئنٹل مصدقہ بیج دیئے گئے ۔
جب کہ سابقہ ریکارڈ ۲۴ لاکھ کوئنٹل کا ہے۔

۸۴-۱۹۸۳ء میں کیمیائی کھادوں کی
کھپت کا نشانہ ۷۲ لاکھ ٹن رکھا گیا ہے ۔ جب کہ
پچھلے برس کُل ۶۳۰۹ لاکھ ٹن کیمیائی کھادوں

کی کھپت ہوئی تھی۔

۸۳-۱۹۸۲ء میں چھوٹے اور حاشیائی کسانوں کو پیداوار بڑھانے میں امداد دینے کے لیے ایک نیا پروگرام زیرِ عمل لایا گیا ہے۔ یہ پروگرام ملک کے سبھی پانچ ہزار بلاکوں میں لاگو کیا گیا ہے۔ اس کے تحت ۲۵۰ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر بلاک کے حصے میں پانچ لاکھ روپے آئیں گے۔ یہ رقم مرکزی و سرکاری ریاستیں برابر برابر ادا کریں گی۔ بے کار اراضی کو قابلِ کاشت بنانے کے سلسلے میں بھی مفید کام ہو رہا ہے۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۳٫۸۳ لاکھ ہیکٹر اراضی کو اور اس برس ساڑھے تین لاکھ ہیکٹر اراضی کو قابلِ کاشت بنایا گیا۔

## زیادہ دودھ، مچھلی، انڈے

۸۳-۱۹۷۳ء کے دہے میں دودھ کی پیداوار میں ۴٫۲ فی صد سالانہ اضافہ ہوا۔ توقع ہے کہ ۸۴-۱۹۸۳ء میں دودھ کی پیداوار ۳۶۲ لاکھ ٹن ہوگی جو سالِ گزشتہ کے مقابلے میں ۱۵ لاکھ ٹن زیادہ ہوگی۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۸۱ء تک پچھلے تین دہوں میں مچھلی کی پیداوار میں تین سو فیصد اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں انڈوں کی کل پیداوار ۲۸۱٫۱۰ کروڑ ہوئی تھی۔ توقع ہے کہ ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۱۲۰۰ کروڑ انڈے حاصل ہوں گے۔ ہندوستان میں پائی جانے والی بھیڑوں کی تعداد ۴۰٫۸ لاکھ ہے ان سے ۳۶٫۰ لاکھ ٹن خام اون پیدا ہوتی ہے۔

## جنگلات:

موسمیاتی توازن اور ماحولیاتی استحکام کے پیشِ نظر کم سے کم ۱۱۰۰ لاکھ ہیکٹر آراضی میں جنگلات کو برقرار رکھنے کی قومی پالیسی بنائی گئی ہے۔ اس وقت ملک بھر میں کل ۷۵۰ لاکھ ہیکٹر اراضی میں جنگلات ہیں۔ قومی پالیسی کے پیشِ نظر ۸۴-۱۹۸۳ء میں لائقِ توجہ پیش رفت ہوئی ہے۔ فروری ۱۹۸۴ء تک ۲۲۹٫۰۸ کروڑ پودے لگائے گئے جو مقررہ نشانے سے زیادہ ہیں۔

## سینچائی

بارشوں کی غیر یقینی نوعیت کے پیشِ نظر سینچائی کے پروگراموں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے کہ زرعی پیداوار کا بنیادی انحصار اسی پر ہے۔ ۱۹۵۱ء میں کل ۲۲۶ لاکھ ہیکٹر اراضی میں سینچائی ہوتی تھی۔ ۸۰-۱۹۷۹ء میں یہ اراضی، اضافے کے بعد ۵۶۵ لاکھ ہیکٹر ہوگئی تھی .... ۸۳-۱۹۸۰ء کے عرصے میں ۶۸٫۲ لاکھ ہیکٹر میں امکانی سینچائی کی صلاحیت پیدا کی گئی ہے۔ ۸۴-۱۹۸۳ء کے لیے ۲۳٫۷ لاکھ ہیکٹر کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ چھٹے پنج سالہ منصوبے میں ۱۳۷٫۴ لاکھ ہیکٹر میں اضافی سینچائی کی امکانی صلاحیت پیدا کرنے کا نشانہ رکھا گیا تھا۔

اناج کی پیداوار بڑھانے کے لیے، آبپاشی کا ایک اور پروگرام بھی زیرِ عمل ہے۔ یہ پروگرام اب ۱۷ ریاستوں اور مرکزی انتظام والے ایک علاقے میں ایسے ۱۰۲ پراجیکٹوں پر محیط ہے۔

## صنعتوں کا فروغ

بہتر کل کی اتنی ہی اہم بشارت ہمیں صنعت کے میدان میں ہوئی ترقیوں سے ملتی ہے۔ صنعتی ڈھانچے کو متنوع بنانے اور توسیع دینے کی جو کوششیں پنج سالہ منصوبوں میں بروئے کار لائی گئیں۔ اُن کے خاطر خواہ نتائج نکلے ہیں۔ ۱۹۵۱ میں ملک میں نجی حلقے میں فولاد کے صرف دو کارخانے تھے، آج ان کی تعداد چھ ہے اور ان کی مجموعی پیداواری صلاحیت ۸۷ لاکھ ٹن ہے۔ آج انجینئرنگ کی صنعت بجلی پیدا کرنے، ریلوں، بری ذرائع آمد و رفت اور مواصلات کی سبھی ضروریات پوری کر

موقف میں ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ٹریکٹر، الیکٹرانک زو سامان، کیمیائی کھادیں وغیرہ ملک میں ر نہ ہوتی تھیں۔ لیکن ان شعبوں میں آج ہمارے لک کی ترقی لائق رشک ہے۔ کپڑے کی صنعت ی اب پٹ سن اور کپاس تک محدود نہیں — نی، سیمنٹ اور صارفین کی ضرورت کی متعدد تیار بنانے کی مشینیں اب نہ صرف بھارت ں تیار ہوتی بلکہ برآمد کی جاتی ہیں۔

## سرکاری حلقے کے کارخانے

۱۹۵۱ء میں سرکاری حلقے میں کل پانچ رخانے تھے۔ اپریل ۱۹۸۳ء میں، اضافے کے عد ان کی تعداد ۲۰۹ ہوگئی تھی۔ اسی طرح ان بن لگا سرمایہ ۲۹ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۳۰،۰۰۰ کروڑ روپیہ ہوگیا۔ سرکاری حلقے کے ھاری کارخانوں کی متوقع پیداوار کی مالیت کا اندازہ ۲۲۹۰۰ کروڑ روپے ہے۔ اندازہ ہے کہ اس طرح ان کارخانوں کو ۳۰۷ کروڑ روپے کا منافع ہوگا۔ جب کہ ۸۳-۱۹۸۲ء میں کل منافع ۱۴ کروڑ روپے اور اس سے پچھلے سال ۱۰ کروڑ روپے منافع ہوا تھا۔

ترقیاتی کوششوں کے نتیجے میں سبھی صنعتوں ں قابل لحاظ ترقی ہوئی ہے۔ اس کے نتیجے میں نعتی پیداوار کی شرح ترقی ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۵،۱ فی صد ہوگئی، جب کہ گزشتہ برس شرح قی محض ۳،۹ فی صد تھی۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں ں ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۳۲۶۰۰ کروڑ روپے کی لیت کا سامان تیار ہوا تھا جب کہ ۸۳-۱۹۸۲ء یں ۳۵۰۰۰ کروڑ روپے کی مالیت کا سامان تیار ہوا۔ گویا اس میں ۷،۴ فی صد ترقی ہوئی۔

## زیادہ روزگار

اسی طرح روزگار کے مواقع میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۷،۵ لاکھ افراد کو روزگار مہیا کیا گیا تھا۔ گزشتہ برس یعنی ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۷،۹ لاکھ افراد کو روزگار فراہم کیا گیا گویا ۳،۵ فی صد کی شرح سے اضافہ ہوا۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں چھوٹے پیمانے کے ۳۶۵۲۴۳ نئے کارخانے لگائے گئے۔ ان میں ۱۱،۸۲ لاکھ افراد کو روزگار حاصل ہوا۔

۸۳-۱۹۸۲ء کے ۶۴۷ کروڑ روپے کے مقابلے میں توقع ہے کہ ۸۴-۱۹۸۳ء میں کھادی دیہی صنعتوں میں ۷۶۳ کروڑ روپے کی مالیت کا سامان تیار ہوگا۔

## نقل وحمل

ہندوستانی ریلیں اس وقت نہ صرف ملک بھر میں سرکاری حلقے کا سب سے بڑا ادارہ ہے بلکہ یہ ایشیا بھر میں سب سے بڑا ہے۔ دنیا بھر میں اس کا نمبر چوتھا ہے۔ اس صنعت کا سرمایہ ۶۲ ۸۲ ۸۸ کروڑ روپے ہے۔ اس میں ۱۵،۸ لاکھ افراد کو باقاعدہ روزگار حاصل ہے۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۳۶۵،۵۴ کروڑ مسافروں کو سفری سہولیات فراہم کرنے کے علاوہ ہماری ریلوں نے ۲۵۶ کروڑ ٹن مال ڈھویا۔ ریلوں کا محکمہ تقریباً گیارہ ہزار

ریل گاڑیاں ہر روز چلاتا ہے۔ یہ ۷،۰۶۸ مقامات کو ملاتی ہیں۔ اس وقت محکمۂ ریلوے کے پاس ۷،۱۰۰۸ ریل انجن، ۳۲،۵۳۹ سواری ڈبے اور ۴۲۹۴۳۰۳ مال ڈبے ہیں۔

ریل انجن چترنجن، ڈیزل سے چلنے والے ریل انجن وارانسی، اور سواری و مال ڈبے پیرمبور، کی فیکٹریوں میں تیار ہوتے ہیں۔

## جہاز رانی

ترقی پذیر ملکوں میں، تجارتی جہازوں کا سب سے بڑا بیڑا ہندوستان کے پاس ہے۔ دنیا بھر میں ہندوستان کا نمبر سولہواں ہے۔ ستر جہاز راں کمپنیوں میں سے ۷ ایسی ہیں جو مخصوص طور پر ساحلی تجارت کے کام میں لگی ہیں۔ بقیتا لیس کمپنیوں کے جہاز سمندر پار کے ممالک کو مال بھیجنے اور لانے کے کام میں مصروف ہیں۔ سرکاری ادارے شپنگ کارپوریشن آف انڈیا کے پاس ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۱۴۳ بحری جہاز تھے۔

اس وقت سرکاری حلقے میں جہاز سازی کے چار کارخانے — کوچین شپ یارڈ، کوچین، ہندوستان شپ یارڈ، وشاکھاپٹنم، گارڈن ریچ شپ بلڈرز، کلکتہ، اور مزگاؤں ڈاک، بمبئی ہیں۔ تجارتی بیڑے میں تین سو سمندری جہاز شامل ہیں۔ بھارت تقریباً ۲۰ ہزار کروڑ روپے تک کی تجارت کرتا ہے جو تقریباً سبھی سمندری راستے کے ذریعے ہوتی ہے۔ ۳۳ فی صد سے زائد تجارت ہندوستانی بحری جہازوں کے ذریعے کی جاتی ہے۔

## سڑکیں

دنیا بھر میں سب سے زیادہ بڑا سڑکوں کا جال ہمارے ملک میں بچھا ہوا ہے۔ ۸۱-۱۹۸۰ء میں تو کل رہائشی اور تعمیرات عامہ کی سڑکوں کی کل لمبائی ۸،۴۴۵۵ کیلومیٹر تھی۔

## سیاحوں کی آمد

۱۹۸۳ء میں ۱۳،۰۴،۹۷۶ سیاح ہندوستان آئے۔ ان کی تعداد گزشتہ برس کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ توقع ہے کہ ۱۹۸۳ء میں سیاحت سے ۸۲۵ کروڑ روپے کا زرمبادلہ حاصل ہوگا — ۱۹۸۲ء میں حاصل ہونے والے زرمبادلہ کی مالیت ۷۵۰ کروڑ روپے تھی۔

## مواصلات

ڈاک کا جدید نظام ملک میں ۱۸۵۴ء میں رائج کیا گیا تھا۔ اس وقت ملک میں کل ۰۰۰ ڈاک گھر تھے۔ ریلوں سے ڈاک بھیجنے لانے کا آغاز ۱۹۰۰ء میں ہوائی ڈاک کا آغاز ۱۹۱۱ء میں ہوا۔

۳۱ دسمبر ۱۹۸۳ء کو ملک بھر میں ۱،۴۴،۱۴۷ ڈاک گھر کام کر رہے تھے۔ ان میں سے ۱۵۲۶۸ ڈاک گھر شہروں اور ۱،۲۹،۸۷۹ ڈاک گھر دیہات میں تھے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۸۳ء تک ملک کے ۹۹ فی صد دیہات میں روزانہ ڈاک کی تقسیم کا انتظام مکمل کر لیا گیا تھا۔

چھٹے پانچ سالہ منصوبے کے عرصے میں دیہات میں ۸۹۰۰ مزید ڈاک گھر کھولے جائیں گے۔ ڈاک کی بلاتاخیر ترسیل کا انتظام بخوبی چل رہا ہے۔ اسی طرح ٹیلی فون، ٹیلیکس اور براہِ راست نمبر ملانے کی سہولت بھی حاصل ہے۔

مصنوعی سیارہ ان سیٹ ون بی اگست ۱۹۸۳ء میں چھوڑا گیا تھا۔ یہ ۲۰ زمینی مراکز کو برقی مواصلات کے ذریعے ملاتا ہے۔ اس کی بدولت دور افتادہ اور ناریں پہاڑی مقامات تک برقی مواصلات سے رابطے کی سہولیات حاصل ہیں۔ ملک کی بیرونِ ملک سے برقی مواصلات کی ۹۹ فی صد ضروریات انٹل سیٹ کے ذریعے پوری ہوتی ہیں۔ ہندوستان کا براہِ راست ٹیلی فون رابطہ ۲۳ ملکوں، ٹیلیکس رابطہ ۴۳ ملکوں اور تار کے ذریعے رابطہ ۲۷ ملکوں سے ہے۔

## تعلیم

آزادی کے بعد سے ملک میں تعلیم اور خواندگی کی توسیع ترقی کے کام میں لائق توجہ کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں ملک بھر میں صرف ۱۶٫۶۷ فی صد لوگ خواندہ تھے۔ ۱۹۷۱ء میں اور ۱۹۸۱ء میں شرح خواندگی بالترتیب ۲۹٫۴۵ فی صد اور ۳۶٫۲۳ فی صد تھی۔

چھ سے چودہ اور پندرہ سے پینتیس (۳۵) برس کے عمر گروپ میں ابتدائی تعلیم کو عام کرنے کے کام
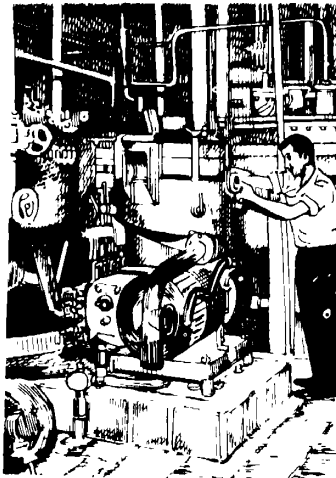
کو چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں ترجیحی بنیادوں پر انجام دینے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ اس مد کے لیے ۹۰۵ کروڑ روپے مختص کیے گئے تھے۔ یہ تعلیم کے کل اخراجات — ۲۵۲۴ کروڑ روپے — کا ۳۶ فی صد ہے۔

ملک بھر کے سبھی سرکاری اور مقامی اداروں کے اسکولوں میں پہلے پانچویں درجے تک مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ اتر پردیش کو چھوڑ کر باقی سبھی ریاستوں میں چھٹے سے آٹھویں درجے تک کی مفت تعلیم کی سہولت ہے۔ لوئر سیکنڈری سطح تک لڑکوں اور لڑکیوں کو مفت تعلیم کی سہولت گیارہ ریاستوں .......... اور مرکزی انتظام والے سات علاقوں میں حاصل ہے۔

اعلیٰ تعلیم ملک بھر میں قائم ۱۲۳ یونیورسٹیاں دیتی ہیں۔ ملک کی اقتصادی منصوبہ بندی میں تکنیکی تعلیم کو اعلیٰ ترجیح والا شعبہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس وقت ملک بھر میں ۴۰۰ پالی ٹکنیک ہیں۔ ان میں ۶۵۰۰۰ طالب علم تکنیکی تعلیم پا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ۴۷ پالی ٹکنیک ہیں، جن میں صرف لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ ان میں ہر برس ۶۰۰۰ لڑکیوں کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ ملک میں اس وقت ۱۶۰ انجینئرنگ کالج ہیں۔ ان میں ہر برس ۳۰۰۰۰ طالب علم داخلہ لیتے ہیں۔ ملک میں اس وقت ۹۶ انسٹی ٹیوٹ ایسے ہیں جن میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا انتظام ہے۔ ان کے علاوہ بیس تعلیمی ادارے ایسے ہیں جو سبھی سطحوں کے مینیجمنٹ کورسوں کا انتظام کرتے ہیں۔

بالغوں کی تعلیم کو بھی اب ترجیحی بنیادوں پر انجام دیا جا رہا ہے۔ چھٹے منصوبے میں سبھی ناخواندہ لوگوں کو اس پروگرام کے تحت لانے کا پروگرام ہے۔ ایسے افراد کی تعداد ۱۹۹۰ء میں تقریباً ۱۱ کروڑ ہوگی۔ مختلف اداروں کے توسط سے ۱،۵۰،۹۶۹ مراکز بالغوں کو تعلیم دے رہے ہیں۔

ٹیلی ویژن کے آغاز اور فروغ کے ساتھ ملک نے ترقیاتی میدان میں ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ ملک میں ٹیلی ویژن پروگراموں کا آغاز ۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء کو ہوا۔ ۱۶ نومبر ۱۹۸۴ء کو دوردرشن کے ملک بھر میں ۱۶۵ ٹرانسمیٹر تھے۔ ان میں ۸ خاص کیندر، ۹ ریلے سینٹرز، ۸ ان سیٹ مرکز اور ۲۱ ایل پی ٹی مرکز شامل ہیں۔ ٹیلی ویژن پروگرام اب ملک بھر کی ۲۹ فی صد آبادی کو دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن جس ترقیاتی اسکیم پر اس وقت عمل ہو رہا ہے، اس کے نتیجے میں ۰۰ علاقائی ٹرانسمیٹر لگائے جائیں گے۔ نتیجتاً ملک کی ستر فی صد آبادی ٹیلی ویژن پروگراموں سے استفادہ کر سکے گی۔

# پچھڑے طبقوں کی بہتری کے لیے نیا بیس نکاتی پروگرام

پچھلے دو برسوں کے دوران 'نئے بیس نکاتی پروگرام پر ہوئی عمل درآمد نے عوام، خاص طور پر دیہی غریب عوام کا معیارِ زندگی بہتر بنانے پر خاصا اثر ڈالا ہے۔ اس پروگرام پر عمل درآمد کے لیے ایک وسیع بنیادی ڈھانچہ پہلے ہی تیار کیا جا چکا ہے اور مقصد کے حصول کے لیے اس کی کارکردگی کو مزید مؤثر بنایا جا چکا ہے۔

نظرِ ثانی شدہ نئے بیس نکاتی پروگرام نے اپریل ۱۹۸۳ء تا مارچ ۱۹۸۴ء کی مدت کے دوران جو کامیابی حاصل کی ہے، ذیل میں اس کی نکتہ بہ نکتہ تفصیل درج کی جا رہی ہے:

## مربوط دیہی ترقی پروگرام

اس پروگرام کے تحت چھٹے منصوبے کے دوران ڈیڑھ کروڑ خاندانوں کو ترقی دینے کا نشانہ ہے۔ اس پروگرام سے مستفید ہونے والوں کو 'مختلف دیہی سرگرمیوں کے لیے' امداد اور قرضوں سے حاصل کردہ پیداواری سامان استعمال کرنے میں مدد دی جائے گی۔ ان مختلف دیہی سرگرمیوں میں ڈیری، مرغی خانہ، سؤر پالن، ریشم کے کیڑے پالنا، ماہی گیری، چھوٹی اور دیہی صنعتیں اور قرض کی صورت میں مربوط تعاون کے ذریعے والی تجارتیں نیز دیگر خدمات اور تکنیکی امداد تربیت، سامان کی سپلائی اور فروخت کی سہولتیں بھی شامل ہیں۔

اس پروگرام کے تحت جو لوگ مستفید ہوں گے اُن کے لیے چھٹے منصوبے کے دوران مختص تین ہزار کروڑ روپے کے قرض کی سہولیات میں ڈیڑھ ہزار کروڑ روپے کی وہ کُل امداد شامل ہوگی، جس میں مرکز اور ریاستوں کا برابر کا حصہ ہوگا۔ اس پروگرام سے فائدہ پانے والوں کی ایک بڑی تعداد درجِ فہرست ذاتوں اور قبائل سے تعلق رکھنے والوں کی ہوگی۔

دستیاب معلومات کے مطابق ۸۴-۱۹۸۳ء میں نشانہ تیس لاکھ تیرہ ہزار لوگوں کو فائدہ پہنچانے کا تھا۔ لیکن اس سے بڑھ کر تینتیس ہزار نوّے لاکھ لوگوں کو اس پروگرام سے فائدہ پہنچایا گیا۔ یہ تعداد نشانے کا ۱۰۷ر۷۳ فی صد ہوتی ہے — آٹھ ریاستوں / یونٹوں سے متعلق معلومات صرف فروری ۱۹۸۴ء تک کی ملتی ہیں۔ جب مکمل معلومات موصول ہو جائیں گی تو تقابلی کارکردگی پچھلے برسوں سے کہیں بہتر نظر آئے گی۔ جو ۸۱-۱۹۸۰ء میں ستائیس لاکھ ستائیس ہزار ۸۲-۱۹۸۱ء میں ستائیس لاکھ تیرہ ہزار اور ۸۳-۱۹۸۲ء میں چونتیس لاکھ پچپن ہزار تھی۔ سال ۸۴-۱۹۸۳ء کی تقابلی کارکردگی کے مطابق سب سے زیادہ لوگوں کو فائدہ ہریانہ میں پہنچا جو نشانے کا ۱۸۰ فی صد تھا۔ جن سے ۱۵۰۰۹۰ر۳۳ افراد کو فائدہ پہنچا — ان میں ۱۳،۴۳،۱۱۹ درجِ فہرست ذاتوں / قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے (جن میں ۹،۸۸،۲۳ درجِ فہرست ذاتیں اور ۳،۵۴،۹۶۷ درجِ فہرست قبیلے شامل تھے) یہ تعداد مقررہ کم از کم تعداد ۳۰ فی صد کے برخلاف ۳۰.۶۸ فی صد ہوتی ہے۔ اس طرح اس پروگرام سے فائدہ اُٹھانے والوں کی کُل تعداد کا ۳۰ فی صد درجِ فہرست ذاتیں اور ۱۰.۶۸ درجِ فہرست قبائل تھے۔

## قومی دیہی روزگار پروگرام

چھٹے منصوبے میں اس پروگرام کے لیے کُل ۱۶۲۰ کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔ جس کا مقصد ہر سال تین کروڑ سے چار کروڑ کام کے دنوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرنا ہے۔ ۸۴-۱۹۸۳ء کے لیے ۲۳۰ کروڑ روپے کی گنجائش رکھی گئی ہے — اور روزگار کے مواقع پیدا کرنے کا نشانہ ۳۲۲۴ کام کے دن ہیں۔ اس کے برخلاف روزگار مواقع کی کُل تعداد ۲،۹۲،۲ ہوتی ہے جو نشانے کا ۸۷ فی صد ہے۔ چونکہ مکمل معلومات ابھی موصول ہونا باقی ہیں، اس لیے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ ۸۴-۱۹۸۳ء کے دوران پیدا شدہ روزگار مواقع کی تعداد بڑھ کر کُل تین کروڑ کام کے دن سے تھوڑا آگے ہی چلی

۳۵۰ر۹ گاؤوں میں پینے کے پانی کی سہولت فراہم کی گئی - یہ کام یابی نشانے کا ۱۸۴٫۸ فی صد ہے - گجرات ، اترپردیش ، کیرالہ ، پنجاب اور ہریانہ نے بھی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے -

## مکان کی تعمیر کے لیے جگہ اور امداد

۸۴-۱۹۸۳ء کے دوران ۱۱٫۰۸٫۵۰۲ خاندانوں کو مکان بنانے کے لیے جگہیں دی گئیں - جب کہ نشانہ ۸٫۰۰٫۰۹۶ خاندانوں ہی کا تھا - ان اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ نشانے کا ۱۳۴٫۸۰ فی صد کام یابی حاصل کی گئی -

۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران اس اسکیم کی کارکردگی ۱۰۲٫۴۶ فی صد تھی - ۹٫۰۸٫۳۵۰ خاندانوں کے نشانے کے خلاف ۴۶۶ [illegible] خاندانوں کو مکان بنانے کے لیے جگہیں فراہم کی گئیں - ریاستوں میں [illegible] اترپردیش اور گجرات نے ۸۴-۱۹۸۳ء کے لیے مقرر [illegible] نشانے سے زیادہ کام یابی حاصل کی ہے اور آندھرا پردیش ، اترپردیش ، مہاراشٹر ، راجستھان ، تامل ناڈو ، مغربی بنگال ، مدھیہ پردیش ، کرناٹک اور ہریانہ نے نشانے کا ۱۰۰ فی صد کام یابی حاصل کی -

جہاں تک مکان کی تعمیر کے لیے امداد کا سوال ہے ۸۴-۱۹۸۳ء کے دوران ۴٫۶۳٫۰۳۴ خاندانوں کو اس قسم کی امداد دی گئی - یہ نشانے کا ۶۵٫۴۰ فی صد تھی -

## گندی بستیوں کی بہتری

شہر کی گندی بستیوں کی ماحولیاتی بہتری کی اسکیم کا مقصد ان علاقوں کے عوام کی زندگی کا معیار بہتر بنانا ہے -

۸۴-۱۹۸۳ء کے لیے ۲۱ لاکھ ۲۰ ہزار ایسے باشندوں کی حالت زار بدلنے کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا ، لیکن اصل عمل درآمد کے دوران ۲۵ر۲ ملین باشندوں کو اس اسکیم کے تحت لایا گیا جو نشانے سے ۱۱ فی صد زیادہ ہے -

## معاشی طور پر کمزور طبقوں کے لیے مکانات

سماج کے معاشی طور پر کمزور طبقوں کے لیے مکانات فراہم کرنے کی اسکیم کے تحت سال ۸۴-۱۹۸۳ء کے لیے ۲٫۰۷٫۲۲۴ یونٹوں کی تعمیر کا نشانہ تھا — ۲٫۴۰٫۸۴۳ مکان بنانے میں کام یابی حاصل کی گئی جب کہ ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۱٫۸۶ لاکھ یونٹوں کے نشانے کے خلاف ۱٫۴۶ لاکھ مکانات بنائے گئے تھے - اس پروگرام کے لیے "ہڈکو" ریاستی حکومتوں کو قرضوں کے ذریعے مسلسل امداد دیتی رہتی ہے — ۸۴-۱۹۸۳ء کے دوران "ہڈکو" نے معاشی طور پر کمزور طبقے کے زمرے کے لیے ۸۶۹ و ۲٫۰۱۳ مکانات کی منظوری دی ہے -

## خاندانی منصوبہ بندی پروگرام

۸۴-۱۹۸۳ء کے دوران کل ۴۴٫۲۲ لاکھ نس بندی آپریشن کئے گئے - جو سالانہ نشانے کا ۷۵٫۷ فی صد ہیں - ۸۳-۱۹۸۲ء کے مقابلے میں یہ کارکردگی ۱۲ فی صد زیادہ ہے -

بڑی ریاستوں میں پنجاب سب سے اوّل رہا ، جہاں نشانے کا ۱۰۵٫۱ فی صد کام یابی حاصل کی گئی - اس کے بعد ہریانہ اور مہاراشٹر کا نمبر رہا - ۸۴-۱۹۸۳ء کے دوران ۸۳-۱۹۸۲ء

ے مقابلے ۲، ۵، فی صد بہتر کارکردگی رہی — سام اور جموں و کشمیر کے علاوہ تمام ریاستوں ے اس پروگرام پر عمل درآمد میں پچھلے سال سے ز کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

## حت پروگرام

**وڑھ کا خاتمہ:** اس سلسلے میں نئے ریضوں کا پتہ لگانے اور پہلے سے معلوم مریضوں کا لاج کرنے کے سلسلے میں بہت اچھی کارکردگی کا مظاہرہ وا ہے۔ ۸۴-۱۹۸۳ء کے دوران ۳۰، ۴ لاکھ نئے ریضوں کا پتہ لگایا گیا ہے جو اس سلسلے میں طے شدہ نشانے ، ۴ لاکھ مریضوں کا ۹۰ فی صد ہے۔ اس سلسلے ں ہریانہ، گجرات، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، نجاب، تریپورہ، اروناچل پردیش، دہلی، گوآ، من اور دلیو نے طے شدہ نشانے سے آگے بڑھنے میں امیابی حاصل کی۔

**اندھے پن پر قابو:** ۸۴-۱۹۸۳ء کے دوران موتیابند، کے ۵۸، ۱۲ لاکھ آپریشن کرنے کا نشانہ طے تھا جب کہ اصل کیے گئے آپریشنوں کی تعداد ۶۳، ۸ لاکھ رہی۔ ریلوے اور ای۔ ایس۔ آئی کی طرف سے کیے گئے ۱۶۰۰۰ آپریشنوں کو شامل کرکے کل تعداد ۶۸، ۸ لاکھ ہو جاتی ہے جو نشانے کا ۶۹ فی صد ہے۔

**تپ دق کی روک تھام:** ۸۴-۱۹۸۳ء کے لیے ٹی۔ بی کے ۵۰، ۱۲ نئے مریضوں کا پتہ چلانے کا نشانہ رکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ "پرائمری ہیلتھ سینٹرز" کے تحت ۴۰، ۳۴ لاکھ معائنوں کا نشانہ تھا۔ ان تمام نشانوں کے خلاف ۵۶، ۱۱ لاکھ نئے مریضوں کا پتہ چلا جو نشانے کا ۵۰، ۹۲ فی صد تھا۔

## بچوں کی نشو و نما سے متعلق مربوط اسکیم

"انٹی گریٹیڈ چائلڈ ڈیولپمنٹ سروسز" کا مقصد اضافی غذائیت، بیماریوں سے بچاؤ، صحت کی دیکھ بھال اور اس سے متعلق تعلیم دینا وغیرہ ہے۔

اس وقت ملک میں ۱۱۰۱ منصوبے اس اسکیم کے تحت چلائے جا رہے ہیں، جن میں ۱۰۰۵ مرکزی اور ۱۱۲ ریاستی منصوبے ہیں۔ ان میں سے ۳۵، مرکزی منصوبوں کی ترقی سے متعلق رپورٹ موصول ہوئی ہے۔ جن میں سے ۷، ۵ منصوبے مکمل طور پر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

۳۵، منصوبوں کی ۲۶، ۶۳ "آنگن باڑیوں" میں سے ۱۹۱، ۵۲ "آنگن باڑیاں" تین سال سے کم عمر کے ۲۶، ۱۵ لاکھ بچوں کو اضافی غذائیت مہیا کر رہی ہیں۔ ایسی ہی غذائیت تین سے چھ سال کے ۹۵، ۱۸ لاکھ بچوں اور ۶۵، ۸ لاکھ حاملہ خواتین کو بھی مہیا کی جا رہی ہے۔

## عوامی تقسیم کا طریق کار

"پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم" کے ذریعے نئے بیس نکاتی پروگرام میں صارفین کے تحفظ کی تحریک چلائی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جو اہم قدم اٹھائے گئے ہیں، ان میں مختلف اسکیمیں رکھی گئی ہیں۔ جن میں "کنزیومر پروٹیکشن کونسل" بھی شامل ہے — اس میدان میں کام کے لیے ۶۱، ۱ لاکھ روپے کی امداد دی گئی ہے تاکہ صارفین کے مفادات کا تحفظ کیا جا سکے۔ اس کے تحت شکایت درج کرنے کے کاؤنٹر اور صارفین کی تربیت کے لیے اشتہارات وغیرہ کا انتظام کیا گیا ہے۔

ریاض عظیم آبادی

# اُردو صَحافت: تکنیک، نئے تجربے اور مسائل

**صحافت** ۲۵ سال بعد چار صدیوں کا سفر مکمل کرلے گی، جبکہ اردو صحافت کا آغاز ۲۱۲ سال بعد یعنی ۱۸۲۲ء میں ہوا۔ اتنی مدت گزر جانے کے باوجود کم از کم ہندوستان میں اردو صحافت اس لائق نہیں کہ اسے انگریزی، ہندی، بنگلہ اور دوسری زبانوں کے مقابلہ میں رکھا جا سکے۔ تکنیکی اعتبار سے اردو صحافت میں ایک حد تک انقلاب تو آیا مگر اس کا دائرہ بھی محدود ہے۔ اس کے اثرات وسیع پیمانے پر رونما نہیں ہوئے۔ پاکستان میں اردو صحافت نے تکنیکی اعتبار سے جو ترقی کی ہے، ہندوستان کی صحافت اس کے مقابلے میں بہت پیچھے ہے۔

تکنیکی اعتبار سے کسی بھی فن کے ارتقا کا تعلق اس فن کے شیدائیوں کے مزاج سے ہوتا ہے۔ پڑھنے والوں کا ثقافتی و تہذیبی معیار کیا اور کیسا ہے؟ خود اس زبان کے مزاج کی کیفیت کیا ہے؟ مادی اور ذہنی حالات کیا ہیں؟ جس ادارے کے زیر سرپرستی وہ فن پروان چڑھ رہا ہے۔ اس کا نصب العین کیا ہے؟ انہیں باتوں کے پیش نظر کسی فن کے تکنیکی انقلاب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

پاکستان میں اردو صحافت نے جو ترقی کی ہے، اس کی ایک وجہ کالم نگاری کی روایت کا پروان چڑھنا ہے۔ چراغ حسن حسرت اور عبدالمجید سالک نے جو روایت قائم کی، اسے احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین اور عطاء الحق قاسمی جیسے کالم نگار زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ پاکستان میں کالم نگاری کے فروغ کی وجہ سے صحافت میں ادب کی چاشنی شامل ہوئی۔ نتیجتاً اردو صحافت اردو ادب کا اٹوٹ حصہ بنتی جا رہی ہے۔

آزادی سے قبل ۱۹۴۷ء میں اردو اخبارات و رسائل کی تعداد ۵۴۸ تھی۔ ان میں ۹۰ اردو روزنامے تھے۔ آزادی کے بعد ان میں ۲۸ روزنامے پاکستان میں رہ گئے۔ ۱۹۵۳ء میں کل تعداد ۴۱۰ تھی جن میں ستر روزنا[مے تھے۔] مجموعی تعداد اشاعت ۶،۷ لاکھ تھی۔ ۱۹۷۱ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۱۰۰۵ [ہو گئی۔] اس میں ۱۰۲ روزنامے تھے۔ ان کی مجموعی تعداد اشاعت ۱۳،۶۷ لاکھ [تھی۔] گویا آزادی کے بعد نہ صرف اخبارات و رسائل کی تعداد میں اضافہ ہوا بلکہ اشاعت بھی بڑھی۔ رجسٹرار آف نیوز پیپرز کی ۱۹۸۰ء کی رپورٹ کے م[طابق] ہندوستان میں ۱۲۰ روزنامے، ۵۹۸ ہفتہ وار، ۱۶۷ پندرہ روزہ ۲۹۴ ماہنامے شائع ہو رہے ہیں۔ اس وقت اردو زبان میں شائع [ہونے] والے اخبارات و رسائل چوتھے نمبر پر ہیں۔

جدید تکنالوجی کے دور میں صحافت بہت آگے نکل چکی۔ لیکن آج کی اردو صحافت اس لیے جدید نہیں ہو پا رہی ہے کہ اس کی آمدنی نہیں ہے۔ چونکہ آمدنی نہیں ہے، اس لیے اردو صحافت جد[ید] تکنالوجی سے محروم ہے۔ لیکن آج بھی ہندوستان میں چند ایسے اخبارا[ت و] رسائل ضرور ہیں، جنہوں نے تکنیکی اعتبار سے قابلِ لحاظ ترقی کی ہے۔ [اور] نئے تجربات کر رہے ہیں۔

حیدرآباد سے عابد علی خاں کی ادارت میں شائع ہونے والا "سیاست" یقیناً ایک اچھا اخبار ہے۔ اسی طرح اسی شہر کا "رہنمائے دکن" ا[س نے] بھی اپنا معیار بنائے ہوئے ہیں۔ سری نگر سے شائع ہونے والا روزنامہ "آفتا[ب]" پاکستانی اخباروں کے طرز پر شائع ہوتا ہے، مگر سرنامہ کے اوپر پرنٹ لائن کر کے تمام جدت کی نفی کر دیتا ہے۔ سری نگر کا روزنامہ "سری نگر ٹائمز"، بنگلو[ر کا] روزنامہ "سالار" اور بھوپال سے شائع ہونے والا "آفتاب جدید" بھی آفسٹ پر [شائع] ہو رہے ہیں اور تکنیکی اعتبار سے ترقی کرتے جا رہے ہیں۔ اردو صحافت میں چند تکنیکی اصولوں کی شروعات روزنامہ "قومی آواز" میں جناب حیات اللہ انصاری نے کی تھی، جسے عشرت علی صدیقی نے مزید فروغ دیا۔ روزنامہ "ملاپ" جالندھر، د[ہلی،] حیدرآباد سے اور روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ، دہلی اور پٹنہ سے شائع ہو رہا۔

● 7/45، روڈ نمبر ۱۔ ای، راجندر نگر، پٹنہ ۱۶-۸۰۰۰

بمبئی سے روزنامہ انقلاب اور روزنامہ اردو ٹائمز نے تکنیکی تجربے کرکے اپنا معیار بلند کیا ہے۔ ایک روزنامے کے اعتبار سے ہند سماچار اردو کا سب سے بڑا اخبار ہے۔

حالانکہ اردو زبان کو پروان چڑھانے میں منشی پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، فراق گورکھپوری، منور لکھنوی، آنند نرائن ملا، مالک رام جیسے غیر مسلم ادیبوں نے نمایاں رول ادا کیا ہے، مگر یہ اردو زبان کا المیہ ہے کہ اس زبان کو ایک فرقے کی زبان سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ اردو اخبارات شائع کرنے والوں میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے، جو غیر مسلم ہیں۔ ہند سماچار، ملاپ، پرتاپ، تیج، یہ ایسے اخبارات ہیں، جو زیادہ تر ہندی زبان کو اردو رسم الخط میں لکھا کرتے ہیں۔ پرتاپ دہلی اور جالندھر سے شائع ہوتا ہے اور اس کی زبان کچھ اور ہی کہانی سناتی ہے۔ ان روزناموں کی تعداد اشاعت میں اضافہ ہوا ہے۔ گجرال کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ہند سماچار ۱۹۶۶ء میں ۶۲۳، ۱ چھپتا تھا جو ۱۹۷۱ء میں بڑھ کر ۲۰،۱۲۰ ہو گیا۔ ملاپ کا دہلی ایڈیشن ۲۶،۷۶۶ سے بڑھ کر ۲۵۰،۳۴ ہو گیا۔ اس وقت تعداد اشاعت کے حساب سے ہند سماچار سب سے آگے ہے۔ ایسے اخباروں کا لہجہ، انداز تحریر، گٹ اپ اور زبان ملتی جلتی ہے۔

ٹھیک اس کے برعکس ویسے روزنامے جن کے ایڈیٹر حضرات اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں، بالکل الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ ان کا لہجہ، انداز تحریر اور زبان بالکل ہی دوسرے ڈھنگ کی ہے۔ ان میں زیادہ تر اخبارات ایک فرقہ کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر اشتعال انگیز خبریں شائع کرنے سے باز نہیں آتے۔

تکنیکی اعتبار سے سب سے بہترین مقابلہ جاتی تجربہ مغربی بنگال میں کیا جا رہا ہے۔ وسیم الحق صاحب نے تجارتی نقطۂ نظر سے اخبار مشرق جاری کیا۔ انہیں کامیابی بھی ملی۔ آفسٹ پر جب اخبار شائع ہوا تو مقبول ہو گیا۔ آزاد ہند کے ایڈیٹر احمد سعید ملیح آبادی نے جو ہندوستان کے چند بڑے اردو صحافیوں میں شمار کیے جاتے ہیں، جنہیں منیر نیازی جیسے صحافی کا تعاون حاصل ہے، آزاد ہند کو آفسٹ پر شائع کرنا شروع کیا۔ بہترین سرخی لگانا، چست اداریہ تحریر کرنا اور اسٹرو کے ساتھ خبر بنانا آزاد ہند کے خاص اوصاف ہیں۔ ایک سال قبل کلکتہ ہی سے جناب عمر حیات خاں نے روزنامہ "اقراء" کا اجرا کیا۔ یہ ہندوستان کا پہلا اردو روزنامہ ہے جو دو رنگوں میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اقراء اپنی تکنیکی خامیوں کے باوجود بڑی تیزی کے ساتھ مقبول ہوا بلکہ آج اقراء نے بنگال کی سرحد کو پار کرکے بہار کی راجدھانی پٹنہ میں بھی اپنی جگہ بنا لی ہے۔

ابھی اردو صحافت کی دنیا میں عابد علی خاں، عشرت علی صدیقی، احمد سعید ملیح آبادی، محمود انصاری، حسن کمال، شاہد لکھنوی، راج نرائن راز، جمنا داس اختر جیسے مایہ ناز اردو صحافی موجود ہیں۔ لیکن کیا یہ بتا سکتے ہیں اگر تمام اردو روزناموں کو ایک جگہ رکھ دیا جائے تو کیا ان میں یکسانیت پائی جائیگی؟ انگریزی اور ہندی صحافت میں جب کسی چیز کا چلن شروع ہوتا ہے تو سبھی اخباروں میں ایک جیسا ہی نظر آتا ہے۔ گٹ اپ کے معاملے میں بھلے ہی جدا ہوں مگر انداز تحریر کے معاملے میں اور اصطلاحات کے معاملے میں ایک سے ہوتے ہیں۔ اردو صحافت کے لیے بھی اصطلاحات کی ڈکشنری ہونی چاہیئے، ورنہ زبان کے معاملے میں پھیلی ہوئی نراجیت اردو صحافت کو آگے بڑھنے سے روکتی رہے گی۔ وہ اخبار جو تکنیکی اعتبار سے آگے بڑھے ہیں ان کے یہاں بھی یہ کمزوری دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ صرف ترجمہ پر انحصار رکھتے ہیں۔ قومی ایجنسیوں کی خدمات حاصل کر لیتے ہیں اور خبروں کا ترجمہ کرکے شائع کر دیتے ہیں۔ یا تو انہیں نامہ نگار ملتے نہیں یا پھر وہ رکھتے نہیں — کالم نگار کی کمی حسب سابق ہے۔ گجرال کمیٹی نے اس مسئلہ کا اپنی رپورٹ میں ذکر کیا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں دہلی میں کل ۲۶۶۔ اکریڈیٹڈ نامہ نگار تھے۔ ان میں اردو اخباروں میں صرف "آبشار" (کلکتہ) آج (بمبئی) الجمعیۃ (دہلی)، ہند سماچار (جالندھر) ملاپ (دہلی، حیدرآباد اور جالندھر) مسلمان (مدراس)، ندیم (بھوپال)، پاسبان (بنگلور)، پربھات (جالندھر) پردیپ (جالندھر)، پرتاپ (نئی دہلی اور حیدرآباد)، صدائے عام (پٹنہ)، سیاست جدید (کانپور) تیج (دہلی)، تیج دیوان کا کارٹونسٹ (دہلی) کے اکریڈیٹڈ نمائندے تھے۔ کل ۱۳ اخباروں کے نمائندے تھے۔ ان کی تعداد آج بڑھنے کے بجائے شاید کچھ کم ہوئی ہے۔

اردو صحافت کو زندہ رکھنے میں لیتھو پریس نے اہم رول ادا کیا ہے۔ آزادی کے بعد سے ناموافق حالات کے باوجود اردو اخبارات زندہ رہے۔ اس کی وجہ لیتھو پریس ہے۔ لیکن آج صورت حال بدل چکی ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد سے ہندوستان میں اردو زبان کی حالت بتدریج بہتر ہوئی ہے۔ شریمتی اندرا گاندھی نے اس زبان پر توجہ دی تو صورت حال میں نمایاں فرق محسوس کیا جانے لگا۔ ۱۹۷۲ء سے قبل آفسٹ پر ایک دو ہی روزنامے شائع ہو رہے تھے جبکہ اب ان کی تعداد کافی بڑھی ہے۔ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے سے اہل اردو کے اندر نیا حوصلہ پیدا ہوا ہے۔

اردو صحافت کے تکنیکی اعتبار سے تیزی کے ساتھ ترقی نہ کرنے کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک وجہ ٹیلی پرنٹر سروس کا نہ ہونا ہے۔ اردو زبان میں کوئی نیوز ایجنسی نہیں ہے۔ جو ترجمے کیے جا رہے ہیں ان کا معیار دن بہ دن پست ہوتا جا رہا ہے۔ اگر اردو صحافت کو کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے جدید بنانا ہے تو اردو ٹیلی پرنٹر وقت کی سب سے اہم ضرورت اور اہم ترین تقاضا ہے۔ اس سلسلے میں پیش رفت ضروری ہے، خواہ اس کے لیے ہمیں پڑوسی اور دوسرے ملکوں کا تعاون ہی کیوں حاصل نہ کرنا پڑے۔

دوسرا مسئلہ کتابت کا ہے۔ مرکزی وزارت تعلیم کے ترقی اردو بیورو کی مدد سے اس مسئلے پر کچھ حد تک قابو پا لیا گیا ہے، لیکن کتابت کے معیار میں مزید

"آج کل" نئی دہلی۔

سدھار کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں اردو کے ہفتہ واروں نے تکنیکی اعتبار سے ترقی کی ہے۔ بلٹز (بمبئی) اخبار عالم (بمبئی)، نئی دنیا، دعوت، الجمعیۃ، اخبار نو، اور ہماری زبان (سبھی دہلی)، سالار کا ہفت روزہ ایڈیشن (بنگلور) اور کئی دیگر ہفتہ واروں نے اپنا گٹ اپ بہتر بنایا ہے۔ ان میں اچھی کتابت نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو ماہناموں نے تو کافی ترقی کی ہے۔ شمع، روبی، بیسویں صدی، کھلونا، بانو، آجکل، شبستان، مجرم، ھدیٰ، چہار رنگ، ہزار رنگ، خاتون مشرق، عالمی ڈائجسٹ، ہما نے تکنیکی لحاظ سے کافی ترقی کی ہے۔ ان کی تعداد اشاعت بھی تسلی بخش ہے۔ لیتھو پر شائع ہونے والے ماہنامے شاعر (بمبئی)، اور شگوفہ (حیدرآباد)، اپنے ادبی معیار و اعلیٰ کتابت، طباعت کی وجہ سے آج بھی تنہا ہیں۔

اردو صحافت کا تیسرا اہم مسئلہ طباعت کا ہے۔ لیتھو مشین کی رفتار ایک گھنٹہ میں ایک ہزار سے زیادہ نہیں بڑھ سکتی ہے یعنی پانچ ہزار سے زیادہ اخبار لیتھو پر نہیں چھپ سکتا ہے۔ بڑا اخبار نکالنے کے لیے آفسٹ کا سہارا لینا پڑے گا۔ آفسٹ کی چھپائی مہنگی ہے۔ پلیٹ سازی کے لیے حیدرآباد کے روزنامے نے ون ڈائیک پروسیز کو اپنا رکھا ہے جس کی وجہ سے فلم کا خرچ بچ جاتا ہے۔ اردو اخبارات و رسائل کی کم تعداد اشاعت کے پیشِ نظر اسی طریقۂ طباعت کو فروغ دینے اور اپنانے کی ضرورت ہے کہ یہ نسبتاً کفایتی ہے۔

اردو صحافت کا سب سے اہم مسئلہ اچھے صحافیوں کا فقدان ہے۔ بہار اردو اکیڈمی کی جانب سے، میں گذشتہ دنوں کلکتہ میں، مغربی بنگال اردو اکادمی کے زیر اہتمام صحافت تربیتی کورس کا جائزہ لینے کے لیے گیا تھا۔ انیس ایدن فریدی صاحب اس کے انچارج ہیں۔ اسی نہج پر اب بہار میں بھی صحافت تربیتی کورس کی شروعات ہو رہی ہے۔ آج ضرورت تربیت یافتہ صحافیوں کی ہے۔ جیسے جیسے اردو اخبارات تکنیکی اعتبار سے بلند ہوتے جائیں گے۔ ویسے ویسے انہیں تربیت یافتہ صحافیوں کی ضرورت پیش آئے گی۔ لیکن یہاں پر بھی ایک مسئلہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ وہ ہے: کوڈ آف کنڈکٹ اور مشترک اصطلاحات کے تعین کا۔ یہ کام مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات اور ترقی اردو بیورو مل کر کر سکتے ہیں۔ اگر ہندوستان کے منتخب ایڈیٹروں اور صحافیوں کو ملا کر ایک ورکشاپ کیا جائے اور اردو اخبارات کو تکنیکی اعتبار سے سدھارنے پر غور کیا جائے تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ ورنہ جو بھی ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک جیسے معیار کے طالب علم اُبھر کر سامنے نہیں آئیں گے۔ بلکہ ان پر مختلف پڑھانے والوں کے مختلف اثرات مرتب ہوں گے۔

اردو صحافت کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہم صحافت، تجارت اور قومیت، تینوں کو ساتھ لے کر نہیں چل پاتے۔ اب تک ہم اردو اخبارات کو دوسری زبان کے اخبارات کی طرح انڈسٹری بنانے میں ناکام رہے ہیں۔ تجارت کے پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے اگر اردو اخبار کو شائع کیا جائے تو یقیناً اسے تکنیکی اعتبار سے بلند تر بنانے کی کوشش کریں گے، اچھے صحافیوں کی خدمات لے سکیں گے۔ آخر یہ ۸ کالمی، ۶ کالمی، ۵ کالمی سرخیوں کا سلسلہ کب بند ہوگا؟ سرخی اور متن کے درمیان اکثر زیادہ تر کوئی ربط نہیں ہوتا۔ انٹرو لگانے کا شعور بہت کم اخباروں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اداریہ پڑھنے سے ایسا لگتا ہے، جیسے وہ خانہ پُری کر رہے ہیں۔ یا پھر وعظ دے رہے ہیں۔ سیاسی بصیرت اور کاروباری اخلاق کا فقدان تو رہتا ہی ہے۔ زیادہ تر اخبارات انگریزی اور ہندی اخباروں کے ترجمے اور وہ بھی بغیر کسی حوالہ کے شائع کر دیتے ہیں۔ یعنی اگر دو درجن اردو اخباروں کو ایک ساتھ رکھ دیا جائے تو اس امر کی اچھی مثالیں دیکھنے میں آئیں گی۔ گجرال کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ۸۳٫۶ فی صد اخباروں کے پاس اپنا پریس نہیں ہے۔ صرف ۱۳٫۸ فی صد اخبارات اپنا پریس رکھتے ہیں۔ ان میں صرف ۱٫۴ فی صد کوآپریٹو یا جوائنٹ سیکٹر میں شائع ہوتے ہیں۔ اردو صحافت کے معیار کو بلند کرنے کے لیے انڈسٹری کا روپ دینا ہوگا۔ جب تک ایک ہی فرد مالک، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، منیجر رہے گا، اخبارات میں سدھار نہیں ہوگا۔

آج اردو صحافت کا ایک تاریک پہلو یہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نسل اردو صحافت کو اپنا کیریر بنانے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے کہ یہ منفعت بخش نہیں۔ اگر کوئی شخص بہ امر مجبوری اسے اپنا کیریر بناتا ہے تو لامحالہ اسے ہندی یا انگریزی یا دونوں کا سہارا لیتے ہی بنتی ہے۔

اردو اخباروں کی تنظیم ہے بھی تو وہ دراصل مالکوں کی تنظیم بن کر رہ گئی ہے۔ وہ اشتہارات اور کاغذ کا رونا تو روتے ہیں مگر تکنیک کو سدھارنے اور اخبار کو بہتر بنانے کی تدابیر پر غور کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ ڈی اے وی پی کا اشتہار اردو اخباروں کو زندہ رکھنے کے لیے ناکافی ہے۔ اشتہارات کا سب سے بڑا ذریعہ پبلک سیکٹر کے اشتہارات ہیں، جو اردو اخبارات کو نہیں کے برابر ملتے ہیں۔ مالی طور پر مستحکم ہوئے بغیر جدید تکنیک کا استعمال ممکن نہیں ہے۔ آج بھی شمع گروپ، بیسویں صدی گروپ، نئی دنیا کا گروپ مالی طور پر مضبوط ہیں۔ اگر یہ چاہیں تو تکنیکی اعتبار سے معیاری روزنامہ شائع کر سکتے ہیں۔ آج تک اسی بے توجہی کی وجہ سے ہی ہندوستان میں اردو کا کوئی قومی اخبار شائع نہیں ہو سکا ہے۔ قومی آواز اپنے تمام تر وسائل کے باوجود تعداد اشاعت کے لحاظ سے قومی اخبار نہیں بن سکا۔

تاہم اردو صحافت میں تکنیکی تجربات کا سلسلہ جاری ہے مگر رفتار بہت سست ہے۔ اگر اردو کے صحافی مل کر اس مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں تو حالت میں نہ صرف سدھار ممکن ہے، بلکہ ایک نیا انقلاب بھی لایا جا سکتا ہے۔

■ ■ ■

ا۔ک۔مہتاب

# اردو اخبارات کے لیے تربیت یافتہ عملے کی ضرورت

ھندوستان میں اردو صحافت کی تاریخ تقریباً دوسو برس پرانی ہے۔ اس دوران میں اردو صحافت نے کئی ادوار اور کئی نشیب و فراز دیکھے۔ سیکڑوں اخبار نکلے اور بند ہوئے۔ ہر دور میں ملک کے مختلف حصوں سے نکلنے والے اخبارات کو عملے کی ضرورت رہی ہے۔ نامور ادیب رہنما اور صحافی اخبارات سے وابستہ رہے ہیں، لیکن اردو اخبارات کو ملکی صحافت میں باعزت مقام دلانے کے لیے تربیت یافتہ عملے کی جتنی ضرورت آج ہے، اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔

اخبارات کی موجودہ صورتِ حال اور ضروریات کا جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اردو صحافت کے پس منظر پر نگاہ ڈالیں۔ بے شک ہندوستان میں مطبوعہ اخبارات کا دور انگریزی اخبارات کی اشاعت سے ۱۷۸۰ء میں شروع ہو گیا تھا۔ لیکن پہلا اردو اخبار "اخبارِ جہاں نما" ۱۸۲۲ء میں کلکتے میں منظرِ عام پر آیا۔ اور چھ برس کے بعد بند ہو گیا۔ اس وقت تک اردو کو دفتری زبان کا درجہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ تعلیم عام نہیں تھی۔ پڑھے لکھے لوگوں کو زیادہ دل چسپی فارسی زبان سے تھی۔ اردو بول چال یا شاعروں کی زبان تھی۔ لہٰذا اردو میں کوئی معیاری اخبار جاری کرنا آسان کام نہیں تھا۔ فارسی اخبارات کا چلنا بھی سہل نہیں تھا۔ راجہ رام موہن رائے کا فارسی اخبار "مراۃ الاخبار" بھی زیادہ دیر نہ چل سکا۔

لیکن کمپنی بہادر کے قدم جوں جوں آگے بڑھے اور اس کے ساتھ مغربی تہذیب کی پرچھائیاں ہندوستانی روایات پر حاوی ہونے لگیں، عوام میں غیر ملکی غاصبوں کے خلاف بے چینی کی دبی دبی لہر پیدا ہونے لگی، جس نے بعد میں جاکر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور اس کے بعد تحریکِ آزادی کی شکل اختیار کی۔ بے چینی اور بے اطمینانی کی اس فضا نے لوگوں میں غیر ملکی حاکموں کے خلاف معلومات حاصل کرنے اور غیر ملکی حکومت کے متعلق اپنے جانے پہچانے رہنماؤں کے خیالات پڑھنے میں دل چسپی پیدا کی۔ چنانچہ اگر اردو صحافت کے ابتدائی دور کے اخبارات کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس دور میں نکالے گئے قریب قریب ہر اخبار سے کوئی سیاسی یا مذہبی شخصیت وابستہ تھی۔ یہ اخبار نیوز پیپر نہیں ویوز پیپر تھے۔ ان اخبارات کے قارئین کو اتنی دل چسپی اطلاعات سے نہیں تھی جتنی اخبارات سے وابستہ سیاسی یا دینی رہنماؤں کے خیالات اور مدیروں کے اداریوں سے تھی۔

جیسے کہ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا:

جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

مختلف مکاتبِ فکر کے رہنما جو کسی اور طریقے سے انگریز کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے یا مغربی کلچر کی یلغار کو نہیں روک سکتے تھے، اخبارات کو اپنے خیالات کی توسیع اور ترجمانی کے لیے آلۂ کار بنایا۔ اس عمل میں سینکڑوں چھوٹے موٹے اخبارات شائع ہوئے اور بند ہوئے، لیکن ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔ بلکہ انہوں نے اردو صحافت کی ترقی اور تحریکِ آزادی کی تقویت کے لیے ٹھوس کام کیا۔

اردو اخبارات کا مرکز ابتداً کلکتہ تھا۔ بہت جلد ایسے مراکز شمالی ہند کے شہروں میں قائم ہو گئے۔ ۱۸۳۷ء میں مولوی محمد باقر نے جو مولانا محمد حسین کے والد تھے، دہلی سے دہلی اردو اخبار کا اجرا کیا۔ اخبار ایک حلقۂ فکر کا ترجمان تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے محمد باقر کو پھانسی دے دی اور اخبار بند ہو گیا۔ اس وقت تک لاہور، سیالکوٹ، لدھیانہ، ملتان، لکھنؤ، آگرہ اور حیدرآباد

---

● لے - ۷۸/۱، پشچم وہار، نئی دہلی

سے کئی اخبارات نکلنے لگے تھے۔ ان میں سے بیشتر اخبارات پندرہ روزہ یا ہفت روزہ تھے اور نہایت قلیل تعداد میں چھپتے تھے۔ ان اخبارات کو اکثر ایک ہی شخص چلاتا تھا اور ان کے لیے کسی عملے یا تجربے کی ضرورت نہیں تھی۔ لوگ صرف متعلقہ ایڈیٹر یا رہنما کے خیالات سے لطف اندوز ہونے کے لیے اخبار خریدا کرتے تھے۔ ہر اخبار کا مرکز الگ تھا، اندازِ فکر جُدا تھا۔ لہٰذا اُن میں مقابلہ بازی کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔

اس دَور میں سر سید احمد خاں نے مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت اور ترقی پسند خیالات کی ترویج کے لیے دو اخبارات 'سائنٹیفک سوسائٹی' اور 'تہذیب الاخلاق' کے نام سے شروع کیے۔ جو صرف اُن کے مضامین کے لیے خریدے اور پڑھے جاتے تھے۔

جنگِ آزادی کے بعد اردو صحافت میں روزانہ اخبارات کا دَور شروع ہوا۔ لاہور کے اخبارِ عالم، پیسہ اخبار اور لکھنؤ کے اخبارِ اودھ اس دَور کے نقیب کہے جا سکتے ہیں۔ یہ اخبار اوّل تو محدود علاقہ کے لیے تھے، دوسرے ان سے بڑے بڑے ادیب اور سیاسی رہنما وابستہ تھے۔ مثلاً اخبارِ اودھ میں رتن ناتھ سرشار اور مولوی عبدالحلیم شرر کام کرتے تھے۔ لوگ خبروں سے زیادہ سرشار کے سلسلہ وار مضامین فسانۂ آزاد پڑھنے کے لیے اخبار خریدتے تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب اُردو صحافت پروان چڑھ رہی تھی، برطانوی غلامی کا شکنجہ پوری طرح کس جا چکا تھا۔ لوگ غلامی اور محرومی کو محسوس کرنے لگے تھے۔ چنانچہ لوگ ہر اُس رہنما کے خیالات پڑھنے کے لیے بے قرار رہتے تھے جو دینی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی کسی پہلو سے بھی غیر ملکی حکومت اور اس کے ایجنٹوں پر چوٹ کر رہا ہو۔ کچھ اخبارات مثلاً پیسہ اخبار اور اخبارِ عالم ذاتی مصلحتوں کے لیے انگریزوں کی خوشامد کرتے تھے، لیکن عوام میں ان کی زیادہ قدر و منزلت نہیں تھی۔ عوامی مقبولیت اُن اخباروں کو ہی ملتی جن کی روش باغیانہ ہو ——— بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اردو اخبارات نے بہت حد تک جدّوجہدِ آزادی کی رہنمائی کی۔

اس دَور میں بے شک اردو اخبارات کی تعداد زیادہ نہیں تھی، لیکن تربیت یافتہ اور تجربہ کار صحافیوں کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی۔ لاہور کے اخبار زمیندار نے ایک نئی طرز کی اخبار بینی کا شوق عوام میں پیدا کیا۔ یہ پہلا اردو اخبار تھا، جس نے ایک غیر ملکی خبر رساں ایجنسی سے اطلاعات حاصل کرنا شروع کیں۔ پھر زمیندار کی ادارت غیر ممالک سے تعلیم یافتہ عالم، شاعر، مضمون نگار اور صحافی مولانا ظفر علی خاں کے ہاتھ میں تھی۔ جن کا قلم آگ اُگلتا تھا۔ اُن کی بے باکی کی بدولت ایسے دَور میں جب اخبارات کی اشاعت چند سو ہوا کرتی تھی، زمیندار کی اشاعت بیس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ اسی دَور میں مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلیٰ اور بالمکند گپتا نے اخبار ہندوستان نکا[لا]
جو اپنے اپنے سیاسی عقیدوں کی بدولت عوام میں مقبول ہوئے۔ مولانا محمد علی کے اخبار ہمدرد اور مولانا آزاد کا اخبار الہلال غلامی سے تنگ آچکے لوگوں کے ترجمان تھے۔ ان اخبارات نے لوگوں کے دل و دماغ سے انگریز کی غلا[می] کا خوف دُور کیا۔ ان اخبارات کی ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ ان کے مالکوں مدیروں کو قید کی سزا ہوئی، لیکن وہ حق گوئی سے باز نہیں آئے۔ جس اخ[بار] پر جتنی زیادہ سختی کی جاتی وہ اتنا ہی زیادہ مقبول ہوتا۔

دہلی اور لاہور اس وقت تک اردو روزناموں کے بڑے مراکز بن [گئے] تھے۔ یہاں سے شائع ہونے والے اخبارات اگرچہ اپنے اپنے سیاسی عقائد [کی] اشاعت کرتے تھے، لیکن جہاں تک غیر ملکی حکومت کا تعلق تھا، اُن کا رویّہ قر[یب] قریب ایک جیسا تھا۔ کیوں کہ عوامی مقبولیت کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ اب ایک ایک شہر سے کئی کئی روزنامے شائع ہونے لگے تھے لہٰذا اُن میں کا[روباری] رقابت اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا جذبہ یا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ ہر اخبار اچھے عملے کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ قارئین کو بہتر [...] مضامین اور غزلیات کا لالچ بھی دیا جاتا، لیکن اب بھی ان اخبارات کی [عوام] میں مقبولیت کا راز ان اخبارات کے مؤسس یا مدیر دینی یا سیاسی رہنما ہی [تھے۔] اس ضمن میں لاہور کے مشہور اخبار پرتاپ کے مالک مہاشہ کرشن، ملاپ [کے] مالک خوشحال چند خورسند اور بندے ماترم کے بانی لالہ لاجپت را[ئے،] انقلاب لاہور کے صحافی عبدالمجید سالکؔ اور غلام رسول مہرؔ، تیج دہلی کے سوا[می] شردھانند اور دیش بندھو گپتا، احسان لاہور سے وابستہ ڈاکٹر اقبال او[ر] چراغ حسن حسرتؔ، نوائے وقت کے حمید نظامی، جنگ دہلی کے میر خلیل الرح[من] اور صدائے عام پٹنہ کے نذیر حیدر کا نام لیا جا سکتا ہے۔

سکھوں کے جذبات کی ترجمانی کے لیے لاہور سے اخبار اجیت نکالا گیا جس کی مقبولیت کا راز اکالی رہنما ماسٹر تارا سنگھ اور سادھو سنگھ ہمدرد کے مض[امین] تھے۔

دوسری جنگِ عظیم اور آزادی کی جدوجہد نے اردو اخبارات کی تر[قی میں] بہت مدد دی۔ قارئین کا ایک وسیع حلقہ پیدا ہو گیا۔ جو ان دونوں موضوعا[ت] کے بارے میں اطلاعات اور خیالات ان اخبارات سے حاصل کرتا تھا۔ اطلاعات کی تشنگی اتنی زیادہ تھی کہ جو کچھ بھی اخبارات میں چھپتا اُسے قبو[ل] کر لیا جاتا۔ اخبارات کے عملے کو نہ کسی تجربے کی ضرورت تھی نہ تربیت کی۔ تر[جمہ] کرنے کی قابلیت سب سے بڑی خوبی خیال کی جاتی تھی۔

لیکن بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے آخر میں اردو اخبارات کے درمیان کاتی مقابلہ بازی شروع ہو چکی تھی۔ جنگ بند ہو جانے کے سب[ب] قارئین کی تعداد میں بھاری کمی آگئی تھی۔ چنانچہ اشاعت کو برقرار رکھنے کے

بارات اپنی خوبیوں میں اضافہ کر رہے تھے۔ وہ صرف اپنے اداریوں پر انحصار نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے صفحات کی خوبصورتی، چھپائی، نہ ترین اور خصوصی اطلاعات اور کتابت کی جانب بھی توجہ دی۔ ایک بار کا تجربہ کار عملہ بہتر معاوضے پر دوسرے اخبار میں جانے لگا۔ اس طرح خبارات میں تجربہ کار عملے کی قلت محسوس ہونے لگی۔ لیکن یہ قلت پوری کرنے کے لیے کوئی تربیتی ادارہ نہیں تھا۔ عملے کی یہ کمی ناآموز افراد کو بھرتی کر کے کہنہ مشق ادیبوں اور صحافیوں کے زیرِ سایہ تربیت دلاکر پوری کی جانے لگی۔

اس زمانے میں جمالیاتی اور معنوی خوبیوں سے آراستہ لکھنؤ کے قومی آواز جیسے اخبارات کا اجرا ہوا۔ بے شک اخبارات اپنی اشاعت بڑھانے کے لیے تجربہ کار عملے پر زیادہ انحصار رکھنے لگے تھے۔ لیکن اب بھی مقبولیت کے لیے اُن کا تکیہ وہ بزرگ اور سیاسی رہنما تھے، جن کے ناموں کی کشش قارئین کی دل چسپی کا سب سے بڑا باعث تھی۔ ان اخبارات کی پیشانی پر اخبارات کے بانیوں کا نام جلی حروف میں لکھا ہوتا اور اداریے سیاسی یا دینی رہنماؤں کے دستخط سے شائع ہوتے۔ اگر کسی اداریے کے نیچے مدیر کا نام نہ ہوتا تو قارئین وہ ادارتی نوٹ نظر انداز کر دیتے۔

متحدہ پنجاب کے یونینسٹ وزیرِ اعلیٰ سر سکندر حیات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ صبح سب سے پہلے پرتاپ اخبار دیکھتے اور اس میں سب سے پہلے یہ دیکھتے کہ اخبار کے ایڈیٹر مہاشہ کرشن نے اپنے اداریے میں کیا لکھا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اخبارات کا اطلاعات کی نسبت خیالات پر کتنا زیادہ انحصار تھا۔

آزادی کے بعد پشاور سے لے کر لاہور تک کا وسیع حلقۂ اشاعت اردو اخبارات سے چھن گیا۔ منظر بدل گیا۔ مسائل بدل گئے، لیکن عوام میں اخبار بینی کا ذوق پیدا ہو چکا تھا۔ اردو اخبارات درمیانہ طبقے کے لیے حصولِ معلومات کا ذریعہ بن چکے تھے لہٰذا اس ذوق کی تسکین کے لیے نئے اخبارات کا سلسلۂ اجرا جاری رہا۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں اظہارِ خیال کی جو آئینی ضمانت دی گئی اس کی بدولت اردو اخبارات نے تعداد کے لحاظ سے آزادی سے پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ترقی کی۔ اس دور میں جو بڑے بڑے اخبارات منظرِ عام پر آئے ان میں جالندھر کا 'ہند سماچار' بمبئی کا 'انقلاب' کلکتہ کا 'آزاد ہند' حیدرآباد کا 'سیاست'، 'رہنمائے دکن' اور 'منصف' قابلِ ذکر ہیں۔ قومی آواز، ملاپ اور پرتاپ جیسے اخبارات ایک سے زیادہ شہروں سے شائع ہو رہے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ تعداد کے لحاظ سے آزادی کے بعد اردو اخبارات کی بھرمار ہو گئی ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک میں اردو اخبارات کی کُل تعداد ۵۱۰ تھی، لیکن ۱۹۸۲ء میں یہ تعداد تقریباً ۱۳۰۰ تھی۔ ان میں سے ۱۹ اخبارات ایسے ہیں جن کی اشاعت ۱۵ سے ۵۰ ہزار کے درمیان ہے۔ ریاست جموں کشمیر سے گیارہ اچھے روزنامے اردو میں شائع ہوتے ہیں۔ ملک کی سولہ ریاستوں سے اردو اخبار شائع ہوتے ہیں۔

## تقابلی جائزہ

اردو اخبارات کی یہ عددی فوقیت بے شک خوش کُن ہے، لیکن اگر اردو اخبارات کا مقابلہ ملک کی دوسری زبانوں کے اخبارات سے کیا جائے جو ایک ایک ریاست سے ہی شائع ہوتے ہیں تو صورتِ حال مایوس کُن دکھائی دیتی ہے۔ بنگالی، ملیالم، گجراتی، کنڑ، تلیگو، تامل اور اڑیہ زبانوں میں کتنے ہی ایسے معیاری اخبار شائع ہوتے ہیں۔ جن کی اشاعت کئی کئی لاکھ ہے۔ اُن کی ضخامت اور معیار اردو اخبارات سے کہیں بہتر ہے۔

اس تقابلی جائزے کے دو پہلو ہیں۔ تجارتی اور پیشہ ورانہ۔ ملیالم زبان کے اخبار ملیالم منورما کے ایک منتظم نے بتایا کہ اُن کے اخبارات لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہیں۔ اُن کی کامیابی کا راز کاروباری اہلیت اور پیشہ ورانہ مہارت ہے۔ یہ اخبار بہترین پیشہ ورانہ مہارت اور جدید ترین کاروباری طریقوں کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے قارئین کو مطالعہ کے لیے اتنا کچھ دیتے ہیں کہ انہیں اپنی علمی یا ذہنی تشنگی مٹانے کے لیے کسی اور جانب جھانکنے کی ضرورت نہ رہے۔

اس کے مقابلے میں اکثر اردو اخبارات تہی دامن نظر آتے ہیں۔ اکثر اردو اخبار دینی یا سیاسی ہیں۔ وہ اب بھی پیشہ ورانہ خوبیوں کی بجائے بڑے بڑے ناموں اور اُن کے خیالات پر بکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صرف کچھ اخبار ایسے ہیں جو جدید آفسیٹ مشینوں پر چھپتے ہیں باقی سب لیتھو مشینوں پر چھپتے ہیں۔ اور کئی بار اُن کی عبارت پڑھی بھی نہیں جا سکتی۔ اردو میں ایسے اخبارات کی تعداد تو اُنگلیوں پر گنی جا سکتی ہے، جنہیں مکمل اخبار کہا جا سکتا ہو۔ مکمل اخبار صحافت کی دنیا میں اُسے سمجھا جاتا ہے، جسے پڑھنے کے بعد کسی اور اخبار کے عام طور پر مطالعہ کی ضرورت نہ رہے۔ سیاست، انقلاب اور قومی آواز کا نام ان اخبارات کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان سے شائع ہونے والے ایسے اخبارات کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ کراچی، لاہور اور راولپنڈی سے 'جنگ' کراچی "حریت" "امروز"، "نوائے وقت"، "مشرق" وغیرہ کئی اخبارات نکلتے ہیں۔ جن کی اشاعت لاکھوں میں ہے اور جنہیں مکمل اخبار کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں بہت کم اردو اخبارات ایسے ہیں جن میں قارئین کو سیاسی خبروں کے علاوہ انگریزی اخباروں کی مانند ہر روز سائنس، زراعت، اقتصادیات، طب، تجارت، تعلیم، موسیقی، ڈرامے، خواتین، بچوں اور کھیلوں کے بارے میں مضامین اور اطلاعات ہر روز حاصل ہو سکیں۔

اردو اخبارات کو اپنی اس تنگ دامانی کا اعتراف کرنا چاہیے اور

ساری ذمہ داری قارئین پر نہیں ڈال دینی چاہیے کہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔ اس دلیل میں زیادہ وزن نہیں۔ اگر قارئین کی تعداد کم ہورہی ہے تو ہند سماچار کی اشاعت گزشتہ چند برسوں میں بیس ہزار سے اسی ہزار تک کیسے پہنچ گئی ہے۔ انقلاب اور سیاست اتنے مقبول کیوں ہیں۔ بیسویں صدی، بلٹز، شمع وغیرہ کی اشاعت کیوں بڑھ رہی ہے۔ اردو اخبارات کے قارئین کی قوتِ خرید کی دلیل بھی وزن دار نہیں کیوں کہ وہ زیادہ سے زیادہ قیمتی میگزین خریدنے کو تیار رہتا ہے۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ قاری کو دیتے کیا ہیں؟

اردو اخبار پڑھنے والا اب آزادی سے قبل کا قاری نہیں رہا — جسے زیادہ تر اردو زبان کی واقفیت تھی یا کسی تحریک سے وابستگی تھی۔ موجودہ ہندوستان میں اکثر لوگوں نے زبانوں کے فارمولے کے تحت اردو کے ساتھ ساتھ دو اور زبانوں کی تعلیم بھی پائی ہے۔ انہیں اردو سے خواہ کتنی بھی رغبت ہو، وہ اخبار خریدتے وقت اس کا دوسرے اخباروں کی جمالیاتی اور معنوی خوبیوں سے مقابلہ کریں گے۔

اس طرح اردو اخبارات کا مقابلہ صرف اردو اخبارات سے ہی نہیں، دوسری زبانوں کے اخبارات سے بھی ہوگیا ہے۔ مسلمانوں کو عموماً اردو اخبارات کا خریدار سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ دہلی اور گرد و نواح میں مسلمانوں کی بھاری تعداد ہندی اخبار "جن ستہ" خریدتی ہے۔ کیوں کہ وہ اخبار اردو اخبارات کی نسبت ضخیم، صاف ستھرا اور پُر از معلومات ہوتا ہے۔ دوسرے اس کی زبان ہندوستانی سے ملتی جلتی ہے۔ کم تعلیم یافتہ مسلمان ہندی بھی اتنی ہی جانتا ہے جتنی اردو۔ لہٰذا وہ اپنے پیسے کے عوض بہتر اخبار خریدنا پسند کرتا ہے۔

ان حالات میں اردو اخبارات کے لیے اپنی مقبولیت کو برقرار رکھنے کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ وہ بھی اپنی جمالیاتی اور معنوی خوبیوں میں اضافہ کریں۔ یہ اصلاح یا بہتری اردو اخبارات میں پیشہ ورانہ مہارت اور تربیت رکھنے والے عملے کے ذریعے ہی لائی جا سکتی ہے۔ اس کے برعکس اردو اخبارات پر نظر ڈالنے سے مستقبل کے متعلق مایوسی ہوتی ہے — عام اخباروں کا حجم کم ہو رہا ہے۔ چھپائی اور کتابت کا معیار گھٹ رہا ہے اور صحافتی خوبیوں میں بھی کوئی اضافہ نہیں ہو رہا۔ لہٰذا ان اخبارات میں تربیت یافتہ عملے کی پہلے سے کہیں زیادہ کمی محسوس کی جارہی ہے۔

اکثر بڑے اردو اخبارات کو چھپائی کی نئی مشینوں کی سہولت حاصل ہے، لیکن سب اخبارات میں اچھے کاتبوں کی سخت کمی ہے۔ گزشتہ تیس برسوں میں ملک میں کاتبوں کی تربیت کا کوئی باقاعدہ ادارہ قائم نہیں ہوا۔ لوگوں نے اردو کو روبہ تنزل زبان سمجھ کر اس فن کی جانب توجہ نہیں دی۔ صرف کشمیر کے محکمۂ لسانیات نے سری نگر میں کتابت کا ایک اسکول جاری کیا ہے۔ دہلی کی غالب اکیڈمی میں بھی ایسی تربیت کی کچھ سہولت حاصل ہے، لیکن یہ سہولت مانگ کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ سری نگر اسکول کے طلبا ریاست میں ہی کھپ جاتے ہیں۔ جالندھر کے اردو اخبارات میں کاتبوں کی اتنی کمی ہے کہ انھوں نے اپنے صفحات کم کر دیئے ہیں۔ ان اخبارات میں آپ کو ایسے ایسے کاتب کام کرتے دکھائی دیں گے، جن کی نگاہ بہت کمزور ہو چکی ہے۔ ہاتھ لرزتے ہیں۔ قلم پر قابو نہیں۔ انھوں نے لاہور میں یہ کام شروع کیا تھا، لیکن مالکان ان سے اب بھی کام لیے جارہے ہیں۔ کیونکہ نئے تربیت یافتہ کاتب نہیں ملتے۔ کاتبوں کی اس کمی کے سبب اچھی مشینوں کے باوجود اردو اخبارات خوبصورت نہیں چھپتے۔

اخبارات کے لیے تربیت یافتہ عملے کی دوسری کمی صحافیوں یعنی مدیروں، نائب مدیروں، کالم نویسوں، نامہ نگاروں، خصوصی مضامین نویسوں اور پروف ریڈروں کے زمرے میں ہے۔ آج تک اردو اخبارات میں تربیت یافتہ عملہ ملازم رکھنے کی بہت کم ضرورت محسوس کی گئی ہے — ادارتی عملے سے مراد تھوڑے بہت پڑھے لکھے لوگوں سے رہی ہے — جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرلیں اور پروف پڑھ سکیں۔ باقی زمروں کے ادارتی عملے کی تربیت پر کبھی زور نہیں دیا گیا۔ کیوں کہ اخبارات ترجمے اور تراشوں سے کام لیتے رہتے ہیں۔ اس لیے کبھی تربیت یافتہ افراد ملازم رکھنے پر زور نہیں دیا گیا۔ جو اردو میں اچھی رپورٹنگ اور ایڈیٹنگ کر سکیں۔ اس کے مقابلے میں دوسری زبانوں کے نامہ نگار ہر شہر میں موجود ہیں اور اخبار کی ضروریات کے مطابق اطلاعات بھیجتے رہتے ہیں۔ یا دفتر میں جو ملازم کے جدید اصولوں کے مطابق خبروں کی تدوین کا کام کرتے ہیں۔ اگر اردو اخبارات کو اچھے اردو اخبارات یا دوسری زبانوں کے اخبارات کا ہم پلّہ بنائے رکھنا ہے تو تربیت یافتہ عملہ ملازم رکھنا اشد ضروری ہے۔ جو اخبار کے دفتروں میں ہی نہیں باہر بھی کام کر سکے۔ ریاستی قانون ساز اداروں اور پارلیمنٹ کی کارروائی کو اردو میں لکھ کر اخباروں کی پالیسی کے مطابق اپنے قارئین کے لیے پیش کر سکے۔ دیکھا گیا ہے کہ ہندوستان کی ہر بڑی زبان کے اخبارات کے نمائندے پارلیمنٹ کی پریس گیلریوں میں موجود رہتے ہیں، لیکن شاید ہی ملک کا کوئی اردو اخبار ہو، جس کا نمائندہ پارلیمنٹ میں موجود رہ کر کارروائی کی اہم معلومات اور دلچسپیاں اپنے اخبار کے لیے بھیج رہا ہو۔

اردو اخبارات میں تربیت یافتہ عملے کی کمی سیاست کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں کالم اور مضمون نویسوں کی ہے۔ آج ایک مکمل اخبار کے لیے ضروری ہے کہ وہ سائنس، زراعت، ادب، تعلیم، موسیقی، فلم، تجارت، ڈرامے، کھیلوں کے میدانوں میں ہونے والی سرگرمیوں سے اپنے

و آگاہ رکھے ۔ سوائے ایک دو اردو اخبارات کے باقی سب
ت میں اس قسم کی خبریں اور مضامین لکھنے کے لیے کوئی تربیت یافتہ
ں ہے ۔ دوسرے اخبارات سے نقل اور ترجمہ کر کے کچھ کمی پوری
، کوشش کی جاتی ہے ۔ لیکن شنیدہ کے بود مانند دیدہ کے مصداق
یقی مضامین کا کہاں مقابلہ کر سکتے ہیں ۔ یہ کام وہی صحافی انجام
سکتے ہیں جنہوں نے ان مضامین کی اعلیٰ تعلیم کے بعد صحافت کی
ہ حاصل کی ہو ۔

خوش قسمتی سے اس وقت ملک کی ۲۳ یونیورسٹیوں میں صحافت
بیت کے نصاب رائج ہیں ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو پڑھے
نوجوان ان نصابات کی تربیت حاصل کرنے کے بعد اردو اخبارات میں کام
۔ اس طرح اخبارات کے منتظمان کو بھی چاہیے کہ اگر انہیں اخبارات
دوسرے اخبارات کے ہم پلّہ بنانا ہے تو وہ ان نوجوانوں کو معیاری تنخواہوں
لازم رکھیں ورنہ وہ دوسری زبانوں کے اخبارات کی جانب رجوع کریں گے ۔

بنگال کی اُردو اکیڈیمی نے اردو میں جرنلزم کی تربیت کا اہتمام
کیا ہے ۔ اسی قسم کا انتظام حیدرآباد ، ناگپور اور دوسری جگہ . . .
بھی ہے ۔ اگر مختلف صوبوں میں اردو اکیڈمیاں اردو کی ترقی کے لیے
قائم کی گئی ہیں تو اُن کا فرض ہے کہ وہ اردو صحافت کی تربیت یافتہ عملے کی
ضرورت پوری کرنے کے لیے اپنے اپنے یہاں اردو میں جرنلزم کے نصابات
کا اہتمام کریں ۔ اگر مختلف مقامات میں یہ انتظام ہو جائے تو چند برس
میں ہی اردو اخبارات کے لیے تربیت یافتہ عملے کی کمی پوری کی جا سکتی ہے ۔
لیکن اس ضمن میں خود اردو اخبارات پر بھی ایک ذمہ داری عائد ہوتی ہے
انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ اِدھر اُدھر سے اکٹھا کر دی گئی اطلاعات اور
مضامین سے اخبارات کے وقار میں وہ اضافہ نہیں ہو سکتا جو اردو میں
مرتّب کی گئی اطلاعات اور تحریر کردہ مضامین سے ہو سکتا ہے ۔ مزید برآں
ترجمہ کرنے سے مضمون کا آدھا لُطف ختم ہو جاتا ہے نہ اُس میں انگریزی
کی چاشنی باقی رہتی ہے نہ اُردو کی رنگینی آ سکتی ہے ۔ ٹیکنیکل مضامین کے
ترجمے میں تو بعض اوقات مضحکہ خیز غلطیاں ہو جاتی ہیں ۔ جس سے اخبار
کا معیار گرتا اور اعتبار کم ہو جاتا ہے ۔

چوتھا شعبہ جہاں اردو اخبارات کی تربیت یافتہ عملے کی ضرورت
ہے ، کاپی رائٹروں یا اشتہارات کے لیے والوں کا ہے ۔ بڑے بڑے
ایڈورٹائزنگ اداروں میں اردو اشتہار بنانے والوں کی سخت کمی محسوس کی جا رہی
ہے ۔ لہٰذا انگریزی سے ترجمے پر انحصار رکھتے ہیں ۔ اس وقت اکثر اخبارات
کو اشتہارات انگریزی زبان میں موصول ہوتے ہیں ۔ یہ اشتہارات انگریزی محاورے
اور ادب کے مطابق تیار کیے جاتے ہیں ۔ لیکن مترجم ترجمے کا حق ادا نہیں
کر سکتے ۔ لہٰذا اردو اشتہار میں وہ دل کشی نہیں ہوتی ، جو انگریزی میں
ہوتی ہے ۔ موجودہ دَور میں اخباروں کی ایک دل کشی ڈسپلے ایڈورٹائزمنٹ
بھی ہے ۔ کئی قارئین خبروں سے زیادہ دلچسپی عمدہ اشتہاروں میں لیتے ہیں ۔
لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اردو اخبارات میں شائع ہونے والے اشتہار بھی ویسے
ہی دلچسپ اور دل کش ہوں جیسے دوسری زبانوں میں ہوتے ہیں ۔ ہر بڑے
اخبار میں اشتہارات کا محکمہ الگ ہوتا ہے ۔ اردو اخبارات کی ترقی کے لیے
بھی تربیت یافتہ عملے پر مبنی ایسے شعبے قائم کرنا ضروری ہے ۔ ورنہ اردو
اخبار پڑھنے والوں کو اشتہارات کے لیے انگریزی یا دوسری زبان کے اخبارات
پر انحصار رکھنا پڑے گا ۔

اردو اخبار خریدنے والے ایک ٹھیکیدار نے مجھے بتایا کہ وہ انگریزی
اخبار صرف ٹینڈر دیکھنے کے لیے خریدتا ہے ۔

"کیا یہ ٹینڈر اردو میں نہیں شائع ہوتا ؟"

"ہوتا تھا ہے ۔ لیکن ترجمہ کرتے وقت اس کی شکل اتنی بگاڑ دی جاتی ہے کہ
عبارت پر یقین نہیں آتا ۔"

اُردو اخبارات کے لیے تجربہ کار عملے کی پانچویں ضرورت اردو خبر رساں
ایجنسیوں کی وساطت سے بھی ہے ۔ اس وقت ہندی میں چار خبر رساں
ایجنسیاں لوک وارتا ، یونی وارتا ، ہندوستان سماچار اور سماچار بھارتی
کام کر رہی ہیں ۔ جو ہندی اور دوسری زبانوں کی بہت سی ضروریات صحافت
کے جدید تقاضوں کے مطابق پوری کرتی ہیں ۔ لیکن کسی اردو اخبار کو کسی اردو
نیوز سروس کی ایسی خدمت حاصل نہیں ۔ پریس ایشیا انٹرنیشنل یا ایک آدھ
اور سروس ہے ، جن کا دائرۂ عمل محدود ہے ۔ ان کے پاس ٹیلی پرنٹر سروس
بھی نہیں ۔ ان میں اردو خدمت کے لیے عملہ بھی بہت زیادہ نہیں ۔ ان میں
اردو نیوز سروس بڑی تعداد میں تربیتی عملے سے چلائی جائے اور اردو اخبارات
یہ سروس خرید کریں تو اردو اخبارات کو بہت بڑی سہولت حاصل ہو سکتی ہے ۔
اردو اخبارات میں پہلے ہی عملہ بہت کم ہوتا ہے ، جو لوگ ہوتے ہیں وہ
انگریزی تاروں یا ٹیلی پرنٹر پیغامات کا ترجمہ کرنے پر لگے رہتے ہیں ۔ خبروں
کو مرتب کرنے ، لکھنے یا بہتر شکل میں پیش کرنے کے لیے اُن کے پاس وقت نہیں
ہوتا ۔ اس لیے اگر تربیت یافتہ عملے کی مدد سے چلائی گئی کوئی اردو سروس
انہیں جدید طرز پر تحریر کردہ خبریں اور مضامین ارسال کر سکے تو اس سے اردو
اخبارات کے ادارتی عملے پر بوجھ کم ہوگا ۔ اور وہ اخبار کا معیار بلند کرنے
کے دوسرے پہلوؤں پر توجہ دے سکیں گے ۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اردو تعلیم یافتہ نوجوانوں کی صحافت
کے مختلف شعبوں میں تربیت کا اہتمام ہو بھی جائے تو انہیں اچھی ملازمت
کہاں ملے گی ۔ کیوں کہ اکثر اردو اخبار اپنی مالی دشواریوں اور تنگ دامانی کا

(آگے صلا پر)

مہدی عباس حسینی

# صحافت کا کاروباری پہلو

صحافت کا پیشہ تین بنیادی اجزا پر مشتمل ہے، ادارت، طباعت اور تجارت۔ بیشتر لوگ اسے محض ادارت اور طباعت کا مسئلہ سمجھتے ہیں اور یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ اخبار یا رسالہ نکالنا ایک ذریعہ آمدنی بھی ہے یہ ایک بزنس ہے جس میں سرمایہ لگایا جاتا ہے اور جس سے منافع کی توقع کی جاتی ہے۔

کاروبار شروع کرنے سے پہلے بازار کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا اخبارات کو تین زمروں میں تقسیم کرتا ہے۔ پندرہ ہزار تک کی اشاعت والے اخبارات "چھوٹے" کہلاتے ہیں۔ پندرہ ہزار ایک سے پچاس ہزار تک کی اشاعت والے "متوسط" کہلاتے ہیں اور پچاس ہزار سے زیادہ شائع ہونے والے اخبار "بڑے" کہلاتے ہیں۔ رجسٹرار کے مطابق ملک میں نوے سے پچانوے فی صد اخبار "چھوٹے" ہیں اردو اخباروں میں کوئی ستانوے فی صد "چھوٹے" ہیں

چھوٹے اخبار کا "حلیہ" حسب ذیل ہوتا ہے۔ یہ کسی چھوٹے شہر سے علاقائی زبان میں شائع ہوتا ہے۔ اس کا مالک کوئی فرد واحد یا خاندان واحد ہوتا ہے۔ اکثر یہ

ع خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ

کا مصداق ہوتا ہے۔ یعنی مدیر خود ہی ناشر ہوتا ہے۔ اگر اس میں کوئی ادارتی یا انتظامی عملہ بھی ہوتا ہے تو وہ غیر تربیت یافتہ ناتجربہ کار سستا اور گھٹیا ہوتا ہے۔ اس کا اپنا رپوٹر یا نامہ نگار نہیں ہوتا۔ اپنا پریس نہیں ہوتا۔ اپنی لائبریری یا ریسرچ کا عملہ نہیں ہوتا۔ یہ کسی نیوز ایجنسی کا خریدار نہیں ہوتا۔ اس کی بیشتر آمدنی سرکاری یا فلمی اشتہاروں سے حاصل ہوتی ہے۔

ہر سال کوئی ایک ہزار شوقین رجسٹرار کے دفتر میں درخواست دیتے ہیں کہ وہ ایک نیا اخبار یا رسالہ نکالنا چاہتے ہیں۔ غور طلب یہ ہے کہ ہر پیشہ یا ہنر کے لئے چند لازمی اہلیتیں معین ہوتی ہیں۔ وکیل، ڈاکٹر، ٹیچر، سرکاری ملازم ہر ایک کے لئے کوئی ڈگری، ڈپلوما یا تجربہ لازمی ہوتا ہے۔ مگر صحافت ایک ایسا انوکھا پیشہ ہے جس میں مدیر یا ناشر دونوں کے لئے کوئی اہلیت یا شرط لازمی نہیں۔

• ۴۵، سیکٹر ۸ - آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی ۶۶ ۰۰ ۱۱

بھانت بھانت کے لوگ اخبار نکالنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ ان مخلص لوگوں سے قطعِ نظر جو کسی خاص مقصد کی ترویج و اشاعت کے لیے اخبار نکالتے ہیں۔ اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو محض اپنی شہرت چاہتے ہیں۔ ان میں آپ کو ایسے شاعر و ادیب بھی مل جائیں گے جنہیں پبلشر نہیں ملتا۔ ایسے وکیل بھی ملیں گے جن کی وکالت نہیں چلتی یا اتنی زیادہ چلتی ہے کہ وہ وکالت سے اوب چکے ہیں۔ ایسے تاجر بھی ملیں گے جو محض اپنا مال بیچنا چاہتے ہیں۔ یہ سب سمجھتے ہیں کہ شہرت حاصل کرنے کا سب سے آسان اور سستا نسخہ یہ ہے کہ خود اپنا اخبار یا رسالہ نکالا جائے چاہے اس کے چھ شمارے بھی نکل نہ پائیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھئے گا کہ چھوٹے اخباروں کی کوئی اہمیت نہیں ہے ضلع اور کچہری سطح کے شہروں قصبوں اور دیہی علاقوں میں ان اخباروں کی ہر کاپی کو تقریباً پانچ یا پانچ آدمی پڑھتے ہیں۔ ایسی جگہ پر اخبار کی قدر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ لوگ انھیں بار بار پڑھتے ہیں، خبروں پر تبادلہ خیال کرتے ہیں سنی سنائی باتوں سے خبروں کا موازنہ کرتے ہیں اور اخبار کے اداریوں کی رائے قبول کرنے اور اپنانے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ عام لوگوں کی رائے میں ان کا "اخبار کوئی غلط تھوڑی لکھے گا" یہ لوگ اخبار کے مدیر کی علمیت اور اصابت رائے کا لوہا مانتے ہیں۔ سماج میں ایڈیٹر یا سمپادک کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ایک لحاظ سے صحافت طاقت کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔

اردو میں کسی اخبار یا رسالہ چلانے کے چند آزمودہ نسخے ہیں جن کی مدد سے کوئی بھی پرچہ چند مہینے ضرور چل سکتا ہے اور اگر مالک یا مدیر شاطر کھلاڑی ہو اور اس کا مقصد محض پیسے کمانا ہو تو دیر تک بھی چل سکتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ ایسے پرچوں کو "سیاست" یا "قومی آواز" اور "آج کل" یا "شاعر" جیسا وقار حاصل نہ ہو۔ نسخے حسب ذیل ہیں

۱۔ خبروں کو سنسنی خیز سرخیوں کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ سرخی کا متن سے کوئی تعلق ہو۔ زیادہ احتیاط مدنظر ہو تو موٹی سرخی کے بعد باریک خط میں ایک سوالیہ نشان بھی ڈال دیا جاتا ہے۔

۲۔ سیاسی لیڈروں اور ہستیوں کی نجی زندگی کے بارے میں لکھا جاتا ہے

تی حملے کئے جاتے ہیں بعد میں معافی مانگ لی جاتی ہے۔
ایک جاسوسی یا مار دھاڑ کا ناول قسطوں میں چھاپا جاتا ہے اس میں جنسیات
رہ ہو تو کامیابی ضروری ہے۔
وقتاً فوقتاً کوئی چٹ پٹا افسانہ یا ننگی تصویر شائع کی جاتی ہے
فلم مذہبیات، قسمت کا حال سے متعلق کالم اور ادبی معمے شایع کئے
ہیں۔
خریداروں کی تحریریں، تصویریں اور خطوط بھی نمایاں طور پر شایع کیے
تے ہیں۔
اور اس کے بعد بھی پرچہ نہ چلے تو کاغذ کا کوٹہ لیکر اسے بلیک میں بیچ
سے بھی لالچی ناشروں کی کافی آمدنی ہو جاتی ہے۔ اکثر ان کا انجام بھی
ل ہوتا ہے۔
یوں تو شوقیہ اخبار نکالنے والے کا کسی نے ہاتھ نہیں پکڑا ہے۔ اگر آپ کو کنٹرول
نباری کاغذ اور رعایتی شرح ڈاک نہیں چاہیے تو بغیر کسی انتظار کے اخبار نکال لیجئے
رسنجیدگی سے اخبار نکالنا ہے تو حسب ذیل ہفت خواں طے کرنا ہوں گے۔
ضلع کلکٹر سے اجازت لینا کہ آپ کسی خاص نام کا اخبار یا رسالہ نکالنا چاہتے

۔ اگر آپ نے اپنے اخبار کا نام "سود و زیاں" طے کیا ہے تو ضلع کلکٹر رجسٹرار آف نیوز
فارانڈیا سے اس کی تصدیق کرائے گا کہ اس نام کا کوئی اور اخبار تو شایع نہیں
ہونے کی تجویز ہے۔
۔ رجسٹرار کے پاس تقریباً دو لاکھ مجوزہ یا مقررہ ناموں کا کھاتا ہے۔ اگر اس رجسٹر
ود و زیاں" درج نہیں تو یہ نام آپ کے حق میں ریزرو ہو جائے گا" کلکٹر کو مطلع کر دیا جائے
، وہ آپ کو اخبار نکالنے کی اجازت دیدے گا۔
۔ اب ڈاکخانے میں تقریباً سو خریداروں کے پتے بھیجنے ہوں گے جس کے بعد آپ کو رعایتی
پر اخبار بذریعہ ڈاک بھیجنے کی اجازت مل جائے گی۔
۔ اب کاغذ کا انتظام کرنا ہے۔ اس کیلئے پھر رجسٹرار آف نیوز پیپرز کا در کھٹکھٹانا
خبار کو ایک ہزار تک اشاعت کے لئے بغیر کسی دقت کے اخباری کاغذ کا کوٹہ مل
ہے۔ دوسرے سال اس سے دس فی صد زاید کا کوٹہ بھی مل جائے گا۔
۔ لیکن اگر آپ دوسرے سال یا سال کے دوران یہ دعویٰ کریں کہ "سود و زیاں" کی
عت سولہ ہزار ہو گئی ہے تو رجسٹرار اپنی حساب فہمی شروع کر دے گا۔
۔ اول تو آپ کو اپنے سارے حسابات ایک چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے تیار کرانا ہوں گے۔
ے رجسٹرار کا عملہ خود آپ کے دفتر اور پریس میں جاکر تحقیق کرے گا۔ اس کے
بملہ جو اشاعت تسلیم کرے گا اسی لحاظ سے کاغذ کا کوٹہ ملے گا۔
کاغذ کے کوٹے کی اہمیت سمجھنے کے لئے ایک اردو اخبار کے اخراجات
مط سمجھنا ضروری ہے۔ ایک اندازے کے مطابق یہ اوسط یوں ہے

کاغذ، پچپن فی صد۔ تنخواہیں، سولہ فی صد۔ طباعت، دس فی صد۔ کتابت ۷
فی صد۔ متفرق، بارہ فی صد۔
یعنی اخراجات کا نصف سے زیادہ حصہ محض کاغذ پر اور ۱۷ فی صد محض کاغذ
کتابت اور طباعت پر خرچ ہو جاتا ہے۔ واضح ہو کہ یہ اندازہ بھی تقریباً دس سال پرانا ہے
اب اخباری کاغذ کے دام کا جائزہ لیجئے۔ پچھلے پانچ برسوں میں داموں میں
حسب ذیل اضافہ ہوا ہے۔

**اخباری کاغذ کے دام** (روپیہ فی ٹن)

| سال | درآمد شدہ کاغذ | دیسی کاغذ |
|---|---|---|
| ۱۹۸۰-۸۱ | ۴۴۷۹ تا ۴۵۱۵ | ۳۶۸۲ تا ۳۹۵۶ |
| ۱۹۸۱-۸۲ | ۴۶۱۰ تا ۵۸۶۰ | ۴۲۷۷ تا ۴۷۰۰ |
| ۱۹۸۲-۸۳ | ۶۰۱۰ تا ۶۰۵۰ | ۵۲۰۰ تا ۵۶۰۰ |
| ۱۹۸۳-۸۴ | ۵۴۰۰ تا ۵۹۵۰ | ۵۶۰۰ تا ۶۰۰۰ |
| ۱۹۸۴-۸۵ | ۵۴۰۰ تا ۵۸۰۰ | ۶۰۰۰ (اپریل ۱۹۸۴ء) |

نوٹ ۔ ۱۹۸۲ء سے ملک میں مدھیہ پردیش کی نیپا مل کے علاوہ کیرالہ
اور کرناٹک میں بھی اخباری کاغذ کی ملیں چالو ہو گئیں۔ مگر نئی ملوں کا کاغذ ابھی تک نیپا
کاغذ سے بھی زیادہ مہنگا ہے۔
اس جدول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گزشتہ پانچ سال کے اندر اندر، بدیسی
کاغذ کے دام میں کوئی تیس فی صد کا اضافہ ہوا ہے جبکہ دیسی کاغذ کے دام میں ساٹھ فی صد اضافہ
ہوا ہے۔ یہ بھی مدنظر رہے کہ بدیسی کاغذ کے دام کسٹم ڈیوٹی منہا کر کے لکھے گئے ہیں۔
کیونکہ چھوٹے اخباروں سے (جن میں اردو اخبار شامل ہیں) اخباری کاغذ پر کسٹم ڈیوٹی نہیں لی جاتی۔
مرکزی سرکار مہربان سہی۔ لیکن مل والے اور ڈیلر اتنے مہربان نہیں۔ دیسی کاغذ
کی ملیں "چھوٹے" (اردو) اخباروں سے پیشگی دام مانگتی ہیں۔ جبکہ متوسط اور بڑے اخبار
محض بینک کے حوالے سے مال منگا سکتے ہیں۔
دوسری دقت۔ اخباری کاغذ مل سے رول کی شکل میں یعنی کپڑے کے
تھان کی طرح لپٹا ہوا آتا ہے۔ یہ روٹری پریس پر تو براہ راست چلا جاتا ہے لیکن جو
اخبار روٹری پر نہیں چھپتے انہیں یہ کاغذ سائز کے مطابق کٹوانا پڑتا ہے۔ کٹائی کے دام
الگ سے پڑتے ہیں۔
یہ تو تھی اخراجات کی ایک جھلک۔ اب آمدنی کا جائزہ لیجئے۔ اخبار شاید وہ واحد
مال ہے جو عموماً لاگت سے کم قیمت پر بیچا جاتا ہے (یہ مسلمہ چھوٹے چار صفحے والے اخباروں پر
لاگو نہیں) یعنی اگر اخبار کی ایک کاپی کی لاگت نوے پیسے آتی ہے تو اسے ستر پیسے میں بیچ
دیا جاتا ہے۔ بیس پیسے فی کاپی کے خسارے کو اشتہاروں کے ذریعہ پورا کیا جاتا ہے
اور اشتہار ہی منافع بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ جب تک اشتہاروں کا پیشگی انتظام نہ ہو جائے
اخبار نکالنا گھاٹے کا سودا رہے گا۔

ملک میں اشتہار دینے والا سب سے بڑا ادارہ ڈی اے وی پی (ڈائیکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ وژوئل پبلسٹی) ہے جو مرکزی وزارت اطلاعات ونشریات کا ایک محکمہ ہے۔

ڈی اے وی پی حسب ذیل نوعیت کے اشتہار دیتا ہے :

ا۔ عام مہم۔ مثلاً پنج سالہ پلان، فیملی پلاننگ، قومی بچت، مذہبی ہم آہنگی وغیرہ۔ اس قسم کے اشتہار اردو اخباروں کو آسانی سے مل جاتے ہیں۔ لیکن سال میں ایک مخصوص مدت کے لیے جاری کئے جاتے ہیں۔

۲۔ سیلز پروموشن (بکری بڑھاؤ) ایسے اشتہارات بینک، بیمہ کمپنی، ریلوے، پوسٹ آفس وغیرہ جاری کرتے ہیں۔ یہ اشتہار عام طور پر چھوٹے اخباروں کو نہیں ملتے۔

۳۔ اعلانات نوٹس وغیرہ۔ یہ بھی اردو اخباروں کو کم ملتے ہیں۔

اس کے علاوہ ریاستی سرکاریں بھی اپنے کسی محکمے کی کارگذاری یا ریاستی سرکار کے کارناموں کی پبلسٹی کے لئے اشتہار دیتی ہیں ان کے حاصل کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے یا اثر ورسوخ استعمال کرنا پڑتا ہے۔

جہاں تک نجی اشتہاروں کا تعلق ہے یہ زیادہ تر سامانِ صرف (دوا، سگریٹ، صابن، منجن، سائیکل، ریڈیو، ٹی وی، فرج وغیرہ) سے متعلق ہوتے ہیں یا نوکری، تعلیم، شادی، نیلام، ٹینڈر، سمن وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں۔ ان میں کمپنیوں کے نوٹس۔ اعلانات اور رپورٹیں بھی شامل ہوتی ہیں جو اردو اخباروں کو کم ہی ملتی ہیں۔

قصہ مختصر اشتہار کے بغیر گذارہ بھی نہیں ہو سکتا اور اشتہار ملتے بھی مشکل سے ہیں۔ خصوصاً اردو اخباروں کو۔

مرکزی سرکار کا ذکر چھوڑ ئیے۔ وہ تو چھوٹے (اردو) اخباروں کی خاص حمایتی اور ہمدرد ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کے اشتہاری بجٹ کا نصف سے زاید حصہ چھوٹے اخباروں کے لیے مخصوص رہے گا۔ (اردو اخباروں کو دیگر رعایتیں بھی حاصل ہیں نہ ریڈیو سے سست رفتار بلیٹن شروع کیا گیا ہے تاکہ اخبار اسے نقل کر سکیں۔ پریس انفارمیشن بیورو نے اپنی اطلاعات کے علاوہ چہرہ بسر دس بھی چلاتی ہے کہ جس کے ذریعہ اردو اخباروں کو پیسلے کاغذ پر فوٹو اور خاکے حاصل ہو جاتے ہیں۔ لیکن ریاستی سرکاریں ابھی اس پالیسی سے کلیتاً متفق نہیں اور نجی سیکٹر میں تو معاملہ بالکل الٹا ہے۔ ایک ہی سایز کا اشتہار اگر کسی چھوٹے یا اردو اخبار میں شائع ہوگا تو اس کے کم پیسے دیئے جائیں گے اور اگر کسی بڑے اخبار میں شایع ہوگا تو اس کے زیادہ پیسے دیئے جائیں گے۔

بیشتر اشتہار براہ راست نہیں حاصل ہوتے۔ کمپنیاں اشتہاری ایجنسیوں کے ذریعہ اشتہار دیتی ہیں۔ یہ ایجنسیاں نہ صرف اشتہار لکھتی اور ڈیزاین تیار کرتی ہیں بلکہ کمپنیوں کو یہ صلاح ومشورہ بھی دیتی ہیں کہ کہاں، کب اور کس اخبار یا رسالے میں اشتہار دینا چاہیے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نظر سے گذر سکے یا مخصوص طبقہ کی نظر سے گذرے تاکہ خاطر خواہ نتائج برآمد ہو سکیں۔ بعض اشتہاری ایجنسیاں کمپنیوں سے فیس لیتی ہیں تو اخباروں سے کمیشن۔ ظاہر ہے کہ بڑے یا موسط اخبار زیادہ کمیشن ادا کر سکتے ہیں لہٰذا زیادہ اشتہار انہی کو ملتے ہیں۔

عام انتخابات آنے والے ہیں۔ لہٰذا ملک کے ہر حصہ سے ہر شہری زبان میں نئے اخباروں کی ایک تازہ نسل نمودار ہوگی لیکن یہ اخبار ایک وقتی ضرورت یا مانگ کو پورا کریں گے اور جلد ہی افق میں گم ہو جائیں گے۔ اب اگر آپ واقعی سنجیدگی سے کوئی ایسا اخبار شایع کرنا چاہتے ہیں جو نفع بخش ہو اور تادیر قایم رہے تو باقاعدگی سے پہلے ایک مارکٹ سروے کرا لیجیے

مارکٹ سروے کے ذریعے چند بنیادی باتوں کی جانکاری حاصل ہوتی ہے یعنی آبادی، تعلیم، آمدنی اور ذرایع کی نقل وحرکت سے متعلق معلومات۔

آپ جس شہر سے اخبار نکالنا چاہتے ہیں اس کے ارد گرد سو میل کے رقبے میں اردو پڑھنے والوں کے بارے میں اعداد وشمار حاصل کیجیے۔ محض حرف شناسی کافی نہیں، کم از کم مڈل درجے کی لیاقت کے لوگوں کی تعداد معلوم ہونا ضروری ہے۔ پھر ان مڈل پاس یا اس سے زیادہ لیاقت رکھنے والے اردو داں حضرات کی آمدنی کے بارے میں جانکاری ضروری ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان کی قوت خرید کیا ہے۔ بہت سے کسان، مزدور، کاریگر قوت خرید رکھتے ہیں لیکن اردو سے نابلد ہوتے ہیں اور جو اردو جانتے ہیں مثلاً طالب علم، استاد، شاعر، ادیب وغیرہ ان کی قوت خرید مشکوک ہوتی ہے۔ اسکے بعد یہ جانکاری بھی ضروری ہے کہ جن علاقوں میں قوت خرید رکھنے والے اردو داں پائے جاتے ہیں وہاں ذرایع نقل وحرکت یعنی سڑکیں، بسیں، ٹرین، اسٹیشن، ڈاک گھر وغیرہ آسانی سے مہیا ہیں کہ نہیں۔ اس مکمل جانکاری کے بعد اگر آپ اس نتیجے پر پہونچیں کہ اس علاقہ میں اردو اخبار یا رسالے کے پہنچنے کے اچھے امکانات ہیں تو شوق سے اخبار یا رسالہ نکالیے ورنہ کسی اور کاروبار میں روپیہ لگائیے۔

بعض لوگوں کو شاید سطورِ بالا ہمت شکن لگیں۔ مقصد صرف اتنا تھا کہ شوقیہ اخبار نکالنے والوں کو آگاہ کر دیا جائے کہ اخبار نکالنا ایک کاروبار ہے

- تاہم اگر آپ کا مقصد واضح ہے، وسائل مہیا ہیں، اور آپ مارکٹ سروے کرکے سوچ سمجھ کر اخبار نکالنا چاہتے ہیں تو بہ صد شوق نکالیے ہم آپ کی کامیابی کے لیے دعا خواہ ہیں۔ بقول غالب

مل ہی رہے گا بوسۂ لب اس کا ایک دن
شوق فضول وجرأت رندانہ چاہیئے

●●

---

## بقیہ : مولانا ابوالکلام آزاد اور ہفتہ وار "پیغام"

کی ضرورت پیش آئے تو اس سے پیچھے نہ ہٹیں۔ یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ مولانا نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے الہلالی اردو کے بجائے عام فہم رواں دواں زبان کو اظہار کا ذریعہ بنانے کی دانستہ کوشش کی تاکہ عام لوگ ان کی بات سمجھ سکیں، اس کی تہہ تک پہنچ سکیں اور حصول مقصد میں ان کی مدد کر سکیں ——— اور اس مقصد میں مولانا ابوالکلام آزاد ہر طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔

●●

ساحل احمد

# اُردو میں گُلدستوں کی رَوایت

جس طرح اردو اخبار و رسائل نے ملکی اور عصری ضرورتوں کی تکمیل کی، اسی طرح اردو شعرار کے کلام اور اُن کے حالات و مشاغل سے واقفیت بہم پہنچانے کے لیے ہندوستان (اب اس میں پاکستان بھی شامل ہے) کے مختلف شہروں اور قصبوں سے گُلدستے جاری کیئے گئے۔ ان میں لاہور، دہلی، آگرہ، لکھنؤ، حیدرآباد، میرٹھ، رام پور وغیرہ کو تقدّم حاصل ہے۔ ان میں لکھنؤ قدرے زیادہ فوقیت کا حامل ہے۔ یہاں سے مختلف اوقات میں تقریباً دو درجن سے زائد گُلدستے جاری کیئے گئے۔ مشہور و معروف گُلدستوں میں "پیامِ یار" (۱۸۸۲ء) (ادارت: منشی نثار حسین خاں نثار) "گُلدستۂ شعرار" (اشاعت پہلی بار ۱۸۵۹ء، چند برسوں کے وقفہ سے فتح محمد تائب کی ادارت میں دوبارہ ۱۸۷۴ء میں جاری ہوا) "گلدستۂ سخن" (۱۸۷۶ء، ادارت: منشی رام سہائے تمنّا) اور "فیضِ سخن" (۱۸۸۳ء، ادارت عبّاس حسین عاشق) شامل ہیں۔

عبّاس حسین ہوش کی ادارت میں "رعنا" (۱۸۸۳ء)

محمد معصوم علی محشر کی ادارت میں "تحفۂ عشاق" (۱۸۸۴ء)

قمر مینائی کی ادارت میں "دامنِ گلچیں" (فروری ۱۸۸۵ء)

منشی درگا پرساد کی ادارت میں "خنجرِ عشق" (۱۸۸۵ء)

محبوب بیگ عاشق کی ادارت میں "بہارِ ہند" (۱۸۸۷ء)

سخاوت علی موج کی ادارت میں "انتخاب" (۱۸۸۹ء)

تصور حسین خاں کی ادارت میں "پیامِ عاشق" (۱۸۸۳ء)

عاشق حسین عاشق کی ادارت میں "مرقع نگار" (۱۸۸۴ء)

وسیم خیرآبادی کی ادارت میں "گلچیں" (۱۸۹۱ء) اور مولانا صفی لکھنوی کی ادارت میں "معیار" (۱۸۹۸ء) جاری ہوئے۔ ان کے علاوہ اسی لکھنؤ شہر سے "ریاض الاشعار" (۱۸۸۱ء) اور "نغمۂ بہار" (۱۸۸۶ء) بھی شائع ہوئے۔

دہلی کے گلدستوں میں: "گلِ رعنا" (۱۸۴۵ء) "مشاعرہ" (۱۸۸۳ء) "گلدستۂ کلام" (۱۸۸۶ء) "پنجۂ نگارین" (۱۸۹۹ء) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

آگرہ سے "معیار الشعرار" (۱۸۴۸ء) "گلدستۂ سخن" (۱۸۸۲ء) "خیالِ یار" (۱۸۹۲ء) "گلکدۂ زیبِ سخن" (۱۸۸۳ء) "دامنِ بہار" (۱۸۹۲ء) "گُلدستۂ شعرار" (۱۸۴۸ء) وغیرہ جیسے گلدستے جاری ہوئے۔

حیدرآباد کے گلدستوں میں: "گل کدۂ مشتاق" (۱۸۸۳ء) "مذاقِ سخن" (۱۸۸۳ء) "جوہرِ سخن" (۱۸۸۵ء) "خیالِ محبوب" (۱۸۸۷ء) "گلزارِ سخن" (۱۸۸۷ء) "گل و بلبل" (۱۸۸۷ء) "پیامِ محبوب" "فصاحت" "محبوب الکلام" وغیرہ لائقِ ذکر ہیں۔

کلکتہ سے: "گُلدستۂ نتیجۂ سخن" (۱۸۸۲ء) "گوہر" (۱۸۸۳ء) "لختِ جگر" (۱۸۸۵ء) "مہرِ انتخاب" (۱۸۸۲ء) شائع ہوئے۔

دیگر مرکزوں سے جاری ہونے والے گلدستوں کا اجمالی ذکر حسبِ ذیل ہے:

بمبئی سے : "گلدستۂ ناز" (۱۸۸۴ء) "عروجِ بہار" (۱۸۹۴ء) "ارمغانِ فرخ"

میرٹھ سے : "گلشنِ سخن" (۱۸۸۵ء) "پروانہ" (۱۸۹۶ء) "لسان الملک" (جون ۱۸۸۷ء)

لاہور سے : "گلدستۂ انجمن" (۱۸۸۳ء) "کلیدِ جنّت" (۱۸۸۹ء)

---

● سپرنٹنڈنٹ ہاؤس، ٹرنر ہاسٹل، ایونگ کرسچن کالج، الہ آباد ۲۱۱۰۰۲

کان پور سے : "چمنستانِ سخن" (۱۸۸۴ء) "بہارِ سخن" (۱۸۸۴ء)
"تہذیبِ سخن" (۱۸۸۶ء) "ریاض الصفیٰ" (۱۸۸۷ء)
"خیالِ یار" (مئی ۱۸۹۶ء)

بنارس سے : "گلزارِ ہمیشہ بہار" (۱۸۴۹ء) "گلدستۂ بنارس" (۱۸۸۲ء)
"نامۂ عشاق" (۱۸۸۵ء) "نغمۂ عنادل" (۱۸۸۶ء)

مدراس سے : "نالۂ عشاق" (۱۸۸۴ء) "حدیقۃ الشعراء" (۱۸۸۴ء)
"جلوۂ سخن" (۱۸۸۷ء)

متھرا سے : "خیالِ یار" (۱۸۸۵ء) "تصویرِ سخن" (۱۸۸۶ء) "ریاضِ ہند" (۱۸۸۶ء) "مذاقِ سخن"

رام پور سے : "ریاضِ سخن" (۱۸۸۸ء) "گلدستۂ فرخ" (۱۸۸۵ء)

بدایوں سے : "گلدستۂ بدایوں" (۱۸۷۴ء) "چمنِ سخن"

گورکھپور سے : "بہارِ سخن" (۱۸۸۷ء) "گلچیں" (۱۸۹۲ء) "فتنۂ عطرِ فتنہ" (۱۸۸۰ء)

قنوج سے : "پیامِ عاشق" (۱۸۸۳ء) گلدستۂ حسنِ یار (۱۸۸۵ء)
"گلزارِ خلد" (۱۸۸۵ء)

خیر آباد سے : "کرشمۂ دلبر" (۱۸۸۴ء) "گلکدۂ ریاض" (۱۸۷۵ء)

رتلام سے : "نامۂ یار" (۱۸۸۴ء) "بہارِ سخن" (۱۸۸۵ء) "گلشنِ داغ" (۱۸۸۸ء)

اجمیر سے : "نالۂ عشاق" (۱۸۸۴ء) "داغ" (۱۸۸۶ء)

کولہاپور سے : "تہذیبِ سخن" (۱۸۸۶ء)

سرسی سے : "آفتابِ سخن" (۱۸۸۸ء)

انبالہ سے : "آئینۂ سخن" (۲۵ دسمبر ۱۸۸۵ء)

لدھیانہ سے : "گلدستۂ سخن" (۱۸۹۵ء)

جھجھر سے : "مدائح النبی" (۱۸۹۵ء)

شملہ سے : "غنچۂ مراد" (۱۸۸۶ء) "چمنِ ہند" (۱۸۸۶ء)

رائے پور سے : "گلدستۂ نعتیہ" (۱۸۸۶ء)

علی گڑھ سے : "شورِ عنادل" (۱۸۸۷ء)

مظفر نگر سے : "جلسۂ احباب" (۱۸۹۲ء)

فتحپور سے : "آئینۂ سخن" (۱۸۸۶ء) "سحرِ بابل" (۱۸۸۶ء)

پرتاب گڑھ سے : "ریاضِ رنگیں" (۱۸۸۵ء)

فیض آباد سے : "بہارِ انجمن" (۱۸۸۲ء)

مارہرہ سے : "ریاضِ خلیل" (۱۸۹۶ء) "ریاضِ سخن" (۱۸۹۶ء)

فتح گڑھ سے : "گلدستۂ شعراء" (۱۸۶۳ء)

فرخ آباد سے : "آشوبِ محشر" (۱۸۸۸ء)

بریلی سے : "ہوش افزا" (۱۲۹۰ھ)

آنولہ سے : "چمن سخن" (۱۸۸۴ء)

اندور سے : "نامۂ دل سوز" (۱۸۸۵ء)

سوراج پور سے : "نالۂ زخمی" (۱۸۸۶ء) "ریاض النبی" (۱۸۸۷ء)

سید پور سے : "گلکدۂ شفق" (۱۸۸۳ء)

سہسوان سے : "گلکدۂ بہار" (جنوری ۱۸۸۵ء)

اورنگ آباد سے : "مطلعِ سخن" (۱۸۷۷ء)

جودھپور سے : "سیماب سخن" (۱۸۸۹ء)

الہ آباد سے : گلدستۂ نیم روز (۱۸۸۸ء)

شاہجہانپور سے : "ارمغان" (جولائی ۱۸۹۶ء) وغیرہ جاری ہوئے، جن میں سے چند کا تذکرہ اگلے صفحات میں کیا گیا ہے :

**گلدستۂ شعراء :** ۱۸۵۹ء میں جاری ہوا۔ لیکن بہ وجوہ بند ہو گیا۔ چند برسوں کے وقفہ سے فتح محمد تائب کی ادارت میں دوبارہ ۱۸۷۴ء میں شائع ہونا شروع ہوا۔ بڑے سائز پر عمدہ کاغذ پر چھپتا تھا۔ اس میں اسیر لکھنوی، مرزا آغا حیدر افسوں، نواب حامد حسین خاں حامد، اعتماد الدولہ، سید یوسف علی خاں عزیز، نواب احمد حسن خاں جوش، نواب حسن علی خاں امیر، نواب اکرام الدولہ مرزا حسین خاں فراق، نواب اشرف علی خاں اوج، امیر مینائی، نواب شاہ مرزا آزاد۔ صغیر بلگرامی وغیرہ کا کلام شائع ہوتا تھا۔

**گلکدۂ ریاض :** اس کے ایڈیٹر ریاض خیر آبادی تھے، جنہوں نے "ریاض الاخبار" روزنامہ "تار برقی" "صلح کل" "فتنہ و عطرِ فتنہ" "گلچیں" وغیرہ کی بھی ادارت کی، ۱۸۷۹ء میں خیر آباد سے جاری ہوا۔ یہ رخشاں پریس خیر آباد میں $\frac{30 \times 20}{16}$ کے سائز پر شائع ہوتا تھا۔ سالانہ قیمت ڈیڑھ روپیہ تھی۔ کسی قدر باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا۔ ۱۸۸۲ء میں جن پابندی سے شامل ہونے والے شعراء میں ریاض خیر آبادی، انداز، نوشہ، وسیم خیر آبادی، امانت، امیر، اسیر، تسلیم لکھنوی، منیر شکوہ آبادی، اکبر الہ آبادی، داغ دہلوی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

**پنجۂ نگارین :** ابراہیم علی خاں نے اگست ۱۸۹۹ء میں بہ مقام دہلی جاری کیا تھا۔ ۱۶ صفحات پر مشتمل یہ گلدستہ ہر انگریزی مہینے کی پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ شروع کے آٹھ صفحات پر طرحی غزلیں اور آخری آٹھ صفحات پر قسط وار ناول شائع ہوتا تھا۔ نگراں کی حیثیت سے آغا شاعر دہلوی اور بطور مرتب آغا منظر علی بیگ کا نام تحریر ہوتا تھا۔ چندہ سالانہ : ڈھائی روپے تھا۔

**پیامِ یار :** لکھنؤ سے محمد نثار حسین نثار کی ادارت میں جنوری ۱۸۸۳ء میں جاری ہوا۔ اس میں ڈیمائی سائز کے ۲۴ صفحات ہوتے تھے۔

ت قومی پریس لکھنؤ میں ہوتی تھی۔ اس کو ملک کے مشہور و معروف شعرا کا تعاون حاصل
سرورق رنگین شعر سے مزین ہوتا تھا۔ یہ ہر انگریزی مہینے کی آخری تاریخ میں منظر عام پر آتا تھا۔
میں طرحی اور غیر طرحی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ سرورق کی پیشانی پر یہ
درج ہوتا تھا۔ "جن حضرات کے ذمہ قیمت باقی ہے، ان کو آئندہ
پیام یار" ویلو روانہ ہوگا۔ اس کے نیچے انگریزی اور اردو میں پیام یار
حسب دستور درج ذیل شعر لکھا رہتا تھا:

نالۂ بلبل شیدا تو سنا ہنس ہنس کر
اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

سرورق پر اغراض و مقاصد اور اصول و عرائض درج کئے جاتے تھے۔ نظم و نثر کے دو حصوں پر مشتمل اس رسالے کی سالانہ قیمت کے متعلق یہ لکھا جاتا تھا کہ "پیام یار" میں دو حصے ہیں۔ نظم اور نثر۔ نظم میں لائق شعرا کا کلام طرح میں، منتخب نثر میں اعلیٰ درجے کا ناول۔ قیمت دونوں حصوں کی عام سے عار سالانہ معہ محصول و رؤسا و والیانِ ملک سے ۶؎ (چھ روپے) سالانہ صرف ناول قیمت عام عہ (ایک روپیہ چار آنہ) سالانہ معہ محصول۔ صرف حصۂ نظم کی قیمت عام عہ (ایک روپیہ) سالانہ معہ محصول"۔

یہ اپنے دور کا اہم گلدستہ تھا جس میں پابندی سے شریک ہونے والے شعرا میں آرزو لکھنوی، سید امداد علی اختر بلگرامی، منشی غلام محی الدین اقبال، سید احمد شاہ اثر لکھنوی، شیخ محمد علی آفاق مونگیری، محمد شبیر الدین افسر اورنگ آبادی شاگرد داغ دہلوی، غلام غوث خاں بیدار، سید تجمل حسین تجمل جلالپوری، جلال لکھنوی، جلیس مچھلی شہری، ڈاکٹر ممتاز حسین حیرت جائسی، سید محمد عزیز خورشید سندیلوی، سید حسن مرتضیٰ اشفق عماد پوری، سید محمد کاظم حسین شیفتہ کنتوری، عزیز مارہروی، مرزا عبدالمجید فہیم گورکھپوری، فطرت کاکوروی، ریاض خیرآبادی، جوہر بنارسی، قمر سندیلوی، کمال لکھنوی اور ریاض لکھنوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

## گلچیں :

لکھنؤ سے جنوری ۱۸۹۱ء میں جاری ہوا تھا۔ سید محمد عسکری وسیم کی ادارت میں نامی پریس واقع چینی بازار لکھنؤ سے جنوری ۱۸۹۱ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے سرپرستوں میں راجہ محمد نوشاد علی خاں تعلقدار جہانگیر آباد، شیخ مذار رسول نائب الریاست جہانگیر آباد، شیخ زاہد حسین تعلقدار، محمد شہنشاہ حسین خاں، برادر خلف اکبر راجہ محمد سرفراز حسین خاں بہادر تعلقدار بٹوا مئو، محمد عالی جاہ فضا، رئیس لسواں، بابو فتح چند مہاجن لکھنؤ اور بابو ہری کرشن عرف کھنکھن مہاجن لکھنؤ، کے نام نامی شامل ہیں۔

اس پرچے کی عام سالانہ قیمت معہ ناول عہ (دو روپے) اور بلا ناول عہ (ایک روپیہ ۸ ر) معہ محصول ڈاک اور خصوصی خریداروں سے صہ (پانچ روپے) یا اس سے زائد مقرر تھی۔ نمونے کے لیے تین آنہ (۳ ر) کے پیشگی ٹکٹ کا بھیجنا ضروری تھا۔

سرورق رنگین اور سادہ ہوتا تھا۔ صفحۂ پیشانی پر "جن حضرات کے ذمہ قیمت باقی ہے آئندہ "گلچیں" ویلو روانہ ہوگا" درج رہتا۔ سرورق پر ہی سرپرستانِ گلچیں کے نام درج ہوتے تھے۔ پرچے کے نگراں حضرات میں فضا اور جگر بسوانی کا نام تحریر ہوتا تھا۔

اس طرحی گلدستے میں پابندی سے شرکت کرنے والوں میں افضل الدولہ مظفر الملک سید محمد افضل علی خاں افضل لکھنوی خلف و شاگرد اسیر لکھنوی، مرزا آغا حسن آغا لکھنوی شاگرد صبا لکھنوی، چھوٹے خاں نثر لکھنوی شاگرد فصاحت لکھنوی، محمد افتخار علی جگر بسوانی، سید فرزند حسین ذاخر ہمشیرزادہ و شاگرد نواب سید اصغر حسین فاخر لکھنوی، محمد علی طیب طپاں مولوی حکیم محمد عابد علی خیرآبادی، شاگرد امیر مینائی، نواب مرزا لکھنوی ملک شاگرد پیارے صاحب رشید، بابو فتح چند شوخ وغیرہ لائق ذکر ہیں۔

## گلدستۂ تیمۂ سخن :

منشی محمد وزیر علی خاں نے بڑی آب و تاب کے ساتھ ۱۸۸۲ء میں کلکتہ سے جاری کیا تھا جو ۱۹۱۱ء تک جاری رہا۔

## گلشنِ داغ :

مرزا داغ دہلوی نے ۱۸۸۸ء میں جاری کیا تھا۔ اس میں تلامذۂ داغ اور دوسرے شعرا کا کلام شائع ہوتا تھا۔

## گلدستۂ حُسنِ یار :

قنوج ضلع فرخ آباد سے ۱۸۸۵ء میں سر سید حسن صحیح مختار عدالت تحصیل قنوج اور شیخ تہور علی تہور نے مشترکہ طور پر بڑی آب و تاب کے ساتھ جاری کیا۔ اس میں زیادہ تر قرب و جوار کے معروف و غیر معروف شعرا کا کلام شائع ہوتا تھا۔

## ریاضِ سخن :

ماہِ اکتوبر ۱۸۹۶ء میں مارہرہ سے احسن مارہروی اور آزاد مارہروی کی ادارت میں جاری ہوا۔ ارشاد علی خاں کے زیر اہتمام مرقع عالم پریس ہردوئی میں اس کی طباعت کا انتظام کیا گیا تھا۔ عمدہ کتابت و طباعت کی وجہ سے اس نے تھوڑے ہی عرصے میں ملک کے نامور شعرا اور ادب نوازوں کو اپنی جانب ملتفت کر لیا تھا۔ اس رسالے کی کتابت کی ذمہ داری مجید حسین جلال آبادی نے قبول فرمائی تھی۔ رسالے کو بھیکم پور (علی گڑھ) کے نواب محمد عبدالجلیل خاں صاحب اثر کی سرپرستی حاصل تھی۔

رسالہ معنوی اور صوری دونوں لحاظ سے مقبولِ خواص و عام تھا۔ سرورق رنگین اور جدول کے درمیان "ریاضِ سخن" لکھا جاتا تھا اور درج ذیل شعر سرورق کی زینت ہوا کرتا تھا:

پھولے ہیں اب تو مردمِ دیدہ چمن کے پھول
آنکھوں سے چُن رہے ہیں ریاضِ سخن کے پھول

سرورق کے آخری صفحہ پر رسالے کے اغراض و مقاصد اور اصول درج ہیں۔ ان کا خلاصہ یوں ہے: یہ گلدستہ "ریاض سخن" جس کے سولہ صفحوں میں نظم اور آٹھ صفحوں میں نثری حصہ مشتمل ہوتا ہے، ہر مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ عام خریداروں سے عہ (ایک روپیہ آٹھ آنہ) قیمت سالانہ پیشگی معہ محصول ڈاک اور رؤسا سے بحیثیت قدردانی قبول کی جائے گی۔

یہ گلدستہ اس دور کا ایک معیاری شعری ماہ نامہ تھا۔ اس میں طرحی غزلوں کے علاوہ نثری مضامین بھی مقتدر حضرات کے شائع ہوتے تھے۔ اس میں "نور علی نور" نام کا ناول بھی قسط وار شائع ہوتا رہا ہے۔

اشاعت کلام میں خریدار اور غیر خریدار کی کوئی قید نہیں تھی۔ غیر طرحی کلام کی اشاعت (بشرط گنجائش) کے لیے ا ر (ایک آنہ) فی شعر اور اشتہار کے لیے ۲ ر (دو آنہ) فی سطر کی اجرت ایک بار کے لیے مقرر تھی۔ اس طرح کی تمام خط و کتابت اور ترسیل زر کے لیے احسن مارہروی کو مجاز کیا گیا تھا۔

امیر مینائی، احسان شاہجہاں پوری، احسن مارہروی، نثار احمد خاں، تائب شاہ جہاں پوری، جلال لکھنوی، داغ دہلوی، سید امیر حسن دلیر مارہروی، سید محمد نوح، شہیر مچھلی شہری، فطرت کاکوری، ذاکر حسین ہنر غازی پوری، آشفتہ مارہروی، محمد حسین خاں راز جلال آبادی، متین مچھلی شہری وغیرہ کا قلمی تعاون رسالہ کو حاصل تھا۔

**پیام عاشق:** قنوج کا یہ شعری ماہ نامہ ۱۸۸۹ء میں جاری ہوا۔ اس میں ہر ماہ طرحی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ اسے بھگو خاں رحیم اپنے ذاتی پریس رحیمی پریس قنوج (فرخ آباد) سے ۲۲×۲۰ کے سائز پر ہر ماہ کی ۲۵ تاریخ کو شائع کرتے تھے۔ سرورق سادہ، منقش اور اشعار سے آراستہ ہوتا تھا۔ ایک شعر حسب ذیل ہے:

گوش وہ ہے جو رہے تیرے سخن کا مشتاق
چشم وہ ہے جو تری دید کی حسرت میں رہے

سرورق پر دستور العمل کے عنوان سے رسالہ کے قواعد ضروریہ درج ہیں:

۱۔ اس کا سالانہ پیشگی عام سے مع محصول ڈاک ایک روپیہ مابعد میں تین روپے۔
۲۔ راجہ نوابوں سے جو ملے سب کچھ ہے۔
۳۔ تین آنہ بھیجیے پر ایک دفعہ یوں بھی جھلک دیکھنے میں آجائے گی۔
۴۔ بیرنگ خط لیا نہیں جاتا۔ جواب کے لیے آدھ آنہ کا ٹکٹ آنا چاہیے۔
۵۔ عاشقانہ غزلیں، پھڑکتے ہوئے مضامین، ظرافت، دنیا کی خبریں درج ہوتی ہیں۔
۶۔ خریدار اور غیر خریدار کلام سب کا درج ہوتا ہے۔ طرح کے عمدہ ۷ اشعار تک لکھے جاتے ہیں۔

سرورق کے صفحہ ۲، ۳ اور ۴ پر ادبی اور غیر ادبی اشتہار شائع ہوتے تھے۔ ان ادبی اشتہاروں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں قنوج جیسے قصبہ میں بھی علم و ادب کا چرچا عام تھا۔ شعری و ادبی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ "قنوج پنچ" (۱۸۹۰ء) اور "گلزار خلد" (۱۸۸۵ء) بھی اس دور کے اہم رسالے تھے۔ خود رحیم صاحب کی سخن فہمی اور سخن سنجی مشہور تھی۔ ان کے مرتب کردہ دو تذکرے بہ نام "پیارا تذکرہ" اور "رسالۂ دل فریب" ان کی یادگار ہیں۔

**معیار الشعراء:** لالہ شیو نرائن آرام نے ۱۸۴۸ء میں آگرہ سے جاری کیا۔ اس گلدستے کے اجرا کے سلسلے میں ماسٹر رام چندر کے فوائد الناظرین (نومبر ۱۸۴۸ء) میں جو اشتہار بہ صورت خط یا اپیل شائع ہوا تھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی ابوالحسن اس گلدستے کے مہتمم اعلیٰ تھے اور ان کے مکان پر منعقدہ طرحی مشاعرہ میں پڑھی گئی غزلیں زینت انتخاب ہوتی تھیں۔ ان کا ایک خط جو محمد عتیق صدیقی نے اپنی کتاب "ہندوستانی اخبار نویسی" کے صفحہ نمبر ۲۸۸ پر مندرج کیا ہے۔ اس سے گلدستہ بنام معیار الشعراء کے شائع کرنے کے ارادہ کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ خط ۱۱ر نومبر ۱۸۴۸ء کو مولوی ابوالحسن نے ماسٹر رام چندر کو برائے اشاعت "فوائد الناظرین" لکھا تھا۔ اس کے تعلق سے خود رام چندر نے مولوی ابوالحسن کی تعریف کرتے ہوئے اس گلدستہ کی خریداری کی سفارش کی ہے، مگر اس سے گلدستہ کی تاریخ اشاعت کا تعین نہیں ہوتا۔ صرف قیاس ہے کہ یہ ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا ہوگا۔ اس گلدستہ کے ضمن میں مرزا غالب کا خط بنام لالہ شیو نرائن لال کا مطالعہ بھی دل چسپی سے خالی نہیں۔ اس خط کے مندرجات سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا غالب نے امیر مینائی کی غزلیں شائع کرنے کی سفارش کی تھی کہ امیر احمد ان کا نام ہے امیر تخلص کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے ذی عزت باشندے ہیں۔ میرا نام لے کر ان غزلوں کو چھاپ دو۔[1] یہ واقعہ ہے کہ "معیار الشعرا" اپنے دور کا ایک عمدہ اور معیاری گلدستہ تھا۔ ۱۸۵۲ء میں منشی قمرالدین قمر اور گلاب خاں نے اس کی ادارت قبول کی اور اسے وقیع بنانے کی ہر ممکنہ کوشش کی۔ لالہ شیو نرائن آرام کے مطبع مفید الخلائق میں اس کی طباعت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اور وہیں سے شائع ہوتا تھا۔

**گل رعنا:** اردو کا پہلا گلدستہ جسے مولوی کریم الدین احمد نے اپنے ذاتی "مطبع رفاہ عام" دہلی سے ۱۸۴۵ء میں جاری کیا تھا۔ اس رسالے یا گلدستے کی جدت طبع کو دیکھ کر ہندوستان کے دوسرے شہروں سے بھی گلدستے جاری ہوئے۔ اس گلدستہ کی اشاعت کے بعد ہی غالب

---

۱؎ بحوالہ ہندوستانی اخبار نویسی صفحہ ۲۹

لالہ شیو نرائن آرام کا "معیار الشعراء" (۱۸۴۸ء) آگرے سے جاری ہوا۔ یہ اردو کا دوسرا گلدستہ ہے۔ اسی طرح بنارس کا "گلزار ہمیشہ بہار" تیسرا گلدستہ ہے جو ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا۔

**خیالِ یار:** آگرہ کا یہ مشہور و معروف گلدستہ ۱۸۹۲ء میں میر نثار علی کی ادارت میں انہیں کے مطبع "نثارِ ہند" کٹرہ گار فیبی بانان سے جاری ہوا تھا۔ سرورق پر اردو خط کے ساتھ دائرہ وی شکل میں The ... Yar بھی لکھا جاتا تھا اور اس کے نیچے: ؎

تہ و بالا ہو دل پہلو میں سینے میں جگر تڑپے
یہ وہ نالے ہیں جو اک دم سُنے دو دو پہر تڑپے

اسی صفحہ پر اغراض و مقاصد اور اصولِ رسالہ درج ہیں جسب دستور طرحی و غیر طرحی دونوں طرح کا کلام شائع ہوتا تھا۔

اسی طرح ایک دوسرا "خیالِ یار" انور گنج کانپور سے مئی ۱۸۹۶ء میں دارالعافیہ سے محمد فخرالدین فخر لکھنوی کی ادارت میں جاری ہوا تھا۔ سالانہ چندہ مع محصول ڈاک ۶ آنے اور آدھ آنہ فی پرچہ قیمت تھی۔ زیادہ تر غیر معروف شعراء کا کلام چھپتا تھا۔

**دامنِ بہار:** آگرہ سے ہی ایک اور معیاری گلدستہ "دامنِ بہار" مہتمم کارخانہ دبدبۂ حیدری مرزا فدا حسین کی ادارت میں مئی ۱۸۹۲ء میں جاری ہوا تھا۔ مرزا نثار حسین کا اسم گرامی مالک مطبع و رسالہ کی حیثیت سے درج ہوتا تھا۔ دفتر کٹرہ حاجی حسن میں واقع تھا۔ اور جملہ خط کتابت اسی پتہ پر ہوتی تھی۔ چندہ سالانہ خواص سے پانچ روپے اور عوام سے ایک روپیہ ۵۰ پیسے مقرر تھا۔ غیر طرحی کلام کی اشاعت کے لیے دو آنہ فی شعر کی اُجرت مقرر تھی۔ غزل ہر ماہ کی یکم کو بھیجنی ضروری تھی۔ پرچہ کی تاریخ اشاعت ۱۵ مقرر تھی۔ اصول کے مطابق ہر پرچے میں آئندہ تین ماہ کے لیے طرحی مصرعے بھی شائع ہوتے تھے۔ تاکہ شعراء بہ سہولت طبع آزمائی کر سکیں۔

**لسان الملک:** ۲۶×۲۰ کے سائز کا یہ گلدستہ سید محمد مرتضیٰ بیانؔ یزدانی میرٹھی کی ادارت میں عمدہ کاغذ اور اچھی کتابت و طباعت کے ساتھ جون ۱۸۸۷ء سے نکلنا شروع ہوا۔ ہر ماہ دو طرحی مصرعے ہوتے تھے۔ جو بنام "دیوانِ خاص" اور برائے "دیوانِ عام" لکھے جاتے تھے۔ لیکن یہ تقسیم باعثِ تفریق نہ تھی۔ بس ایک جدت تھی۔ جو مدیرِ محترم کی ذہنی اختراع کا نتیجہ تھی۔ خود بیانؔ یزدانی میرٹھی پختہ مشق شاعر اور نثار تھے۔ لسان الملک میں فارسی کلام بھی چھپتا تھا۔

**آئینۂ سخن:** "آئینۂ سخن" کا پہلا شمارہ ۲۵ دسمبر ۱۸۸۵ء کو مطبع ٹیمپل پریس واقع رجبی بازار انبالہ چھاؤنی سے شائع ہوا۔ ۱۲ صفحات پر مشتمل اس رسالے میں طرحی اور غیر طرحی کلام شائع ہوتا تھا۔ رسالے کے سرورق پر حاشیہ دوہری لائن کا کشید کیا گیا ہے۔ پیشانی پر "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" لکھا ہوا ہے اور نیچے یہ شعر درج ہے: ؎

ہاتھ آئے گا یہ موقع نہ تمہیں پھر ہرگز
عاشقو دوڑو کہ تصویرِ صنم کھینچی ہے

درمیان سرورق "آئینۂ سخن عرف سراپائے معشوق" اور یہ شعر نقل کیا گیا ہے: ؎

کھینچ رہا ہے قدِ دلدار کا نقشہ اس میں
دیکھتے جاؤ قیامت یہ سراپا ہوگا

اور اگلے صفحات کی ابتدا بسم اللہ سے کی گئی ہے۔ ٹائیٹل کی دوسری جانب کارٹون اور ابتدائی سرورق کی دوسری جانب ماہ نامے کا دستور العمل بھی تحریر کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ ہر ماہ کی ۲۵ تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ سالانہ قیمت کی جگہ بطور نذرانہ عام شائقین سے ایک روپیہ اور خواص سے حسبِ حیثیت لیا جاتا تھا۔ مراسلت کے لیے عبدالحلیم نادم مینجر گلدستہ کو مجاز کیا گیا تھا۔

گلدستے کی اس مروجہ روایت میں ۱۸۸۵ء اور ۱۸۸۶ء کے سال بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ ان ہی برسوں میں گلدستوں کی تعدادِ اشاعت میں ترقی ہوئی تھی۔ لیکن بیسویں صدی کے اوائل سے قطع نظر اس موجودہ صدی میں گلدستہ کا وہ جادوئی اثر باقی نہیں رہا جو اُسے اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں حاصل تھا۔

---

## بقیہ: اُردو کی ادبی صحافت

اور آج کے مدیر کو ان تمام تجربوں کے نتائج حاصل ہیں۔ اس کے مختلف مرحلوں کا ماحصل یہ ہے کہ یک رخہ اور لکیر کا فقیر رسالہ زیادہ دم نہیں مار سکا اور آج تو یک رنگی اور قدامت پسندی سراسر بے فیض ہیں۔ ●

---

## بقیہ: دیانرائن نگم

اور غالباً یہی سبب ہے کہ جہاں زمانہ کے بیشتر رسالوں اور معاصر جرائد و رسائل میں سے بیشتر نے اپنے مدیروں کو حیاتِ جاوید عطا کی، وہاں منشی جی کے رسالہ نے اپنے لکھنے والوں کو زندہ جاوداں بنا دیا۔ منشی جی خود کو نمایاں کیے بغیر اپنے لکھنے والوں کو نمایاں کرتے رہے۔ ○

نند کشور وکرم

# ہفتہ وار اخبارات : ایک جائزہ

تاریخِ صحافتِ اُردو میں ہفت روزوں کو دیگر اخبارات و رسائل پر کئی اعتبارات سے اولیت و فوقیت حاصل رہی ہے ۔ اہم اولیت تو یہی ہے کہ اردو اخبار نویسی کی ابتدا ایک ہفتہ وار "جامِ جہاں نُما" سے ہوئی تھی ۔ دوسری یہ کہ آج تک شائع ہونے والے اخبارات و جرائد میں سب سے زیادہ تعداد اور تعدادِ اشاعت بھی ہفتہ وار اخباروں کی رہی ہے ۔ رجسٹرار آف نیوز پیپرز کی رپورٹ ۱۹۸۲ء کے مطابق ۱۹۸۱ء میں ملک میں شائع ہونے والے اخبارات و جرائد کی کُل تعداد ۱۲۹۹ تھی ، جن میں ۱۲۸ روزنامے ، ۷ سہ روزہ ، ۶۳۷ ہفتہ وار ، ۱۸۷ پندرہ روزہ ، ۳۰۱ ماہانہ ، ۲۶ سہ ماہی اور ۱۳ دیگر اخبارات اور رسائل تھے ۔ ان کی تعدادِ اشاعت بالترتیب ۳۴۰۰۰ ، ۸۰۰۰ ، ۸۹۱۰۰۰ ، ۱۲۹۰۰۰ ، ۴۵۸۰۰۰ ، ۳۳۰۰۰ اور ۱۰۰۰ تھی ۔ گویا ہفتہ وار اخبارات کی تعداد مجموعی تعداد کا ۴۹ فی صد اور تعدادِ اشاعت ملک میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی کل تعدادِ اشاعت کا لگ بھگ ۴۱ فی صد ہے ۔

تاریخِ صحافت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا پہلا اخبار "ہفت روزہ "جامِ جہاں نُما" ۲۸ مارچ ۱۸۲۲ء کو منظرِ عام پر آیا ۔ چونکہ اُس وقت اردو اخبارات کے خریداروں کا فقدان تھا اور انگریزی نہ جاننے والے عموماً فارسی اخبارات کو ترجیح دیتے تھے ۔ لہٰذا اشاعت کے لگ بھگ دو ماہ بعد اُسے اردو کے بجائے فارسی میں شائع کیا جانے لگا اور پھر ایک سال کے بعد اس فارسی اخبار کے ساتھ اردو ضمیمہ بھی شائع ہونے لگا ۔ اس کا مقصد اردو سیکھنے کے شوقین انگریزوں کی ضرورت پوری کرنا تھا ۔ اردو کا یہ اخبار ۲۳ جنوری ۱۸۲۸ء تک شائع ہوتا رہا ۔

اردو کے اس پہلے ہفت روزہ اخبار میں زیادہ تر خبریں شائع ہوتی تھیں یہ اکثر مقامی انگریزی اخبارات کا ترجمہ ہوتی تھیں ۔ بعض دیسی اخباروں سے نقل کی جاتی تھیں ۔ کبھی کبھار اس میں کوئی غزل بھی شائع ہو جاتی تھی ۔ چونکہ اخبار کے یوروپی قارئین زبانِ اردو میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اس کا مطالعہ کیا کرتے تھے اور انہیں اس میں شائع خبروں سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی تھی ۔ لہٰذا یکم مارچ ۱۸۲۶ء سے اس میں خبروں کی اشاعت کا سلسلہ منقطع کر کے تاریخِ انگلستان کو قسطوں میں شائع کیا جانے لگا ۔ بعلاوہ ازیں نپولین کے جنگی کارناموں کو بھی اس میں چھاپا گیا ۔

اس اخبار کے بعد جس اردو اخبار کو شہرت ملی وہ تھا دہلی کا اردو اخبار جس کے مدیر شمس العلما ، مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر تھے ۱۸۳۶ء سے اشاعت پذیر ہونے والے اس اخبار میں مغل حکمراں بہادر شاہ اور قلعۂ معلیٰ کی سرگرمیوں کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے متعلق خبریں بھی ہوتی تھیں ۔ اس کے علاوہ اس میں تمدنی ، تعلیمی ، سیاسی اور معاشرتی زندگی کے بارے میں بھی مواد چھاپا جاتا تھا ۔ کبھی کبھار یہ اخبار بعض خبروں پر مختصراً تبصرہ بھی کیا کرتا تھا ۔ اس اخبار میں اس دور کے معروف شعراء ذوق ، مومن ، بہادر شاہ ظفر اور ملکہ زینت محل وغیرہ کا کلام بھی شائع ہوتا تھا ۔ اس اخبار کے مُدیر مولوی محمد باقر اُستاد ذوق کے گہرے دوستوں میں سے تھے ، لہٰذا وہ اُن کا حامی تھا اور غالب کے تئیں معاندانہ رویہ رکھتا تھا ۔ اسی اخبار نے غالب کے یہاں جُوا خانہ پکڑے جانے کی خبر شائع کی تھی ۔ علاوہ ازیں یہ اخبار مذہبی اختلافات رکھنے والے معزز شرفاء پر ذاتی حملے بھی کرتا تھا اور اپنے مخالفین کے خلاف ہرزہ سرائی میں

● جے ۶، کرشن نگر، دہلی ۱۱۰۰۵۱

پیش پیش تھا۔

اس اخبار کی اشاعت کے ایک سال بعد دہلی ہی سے سرسید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے "سید الاخبار" کا اجرا کیا۔ موصوف سرکاری ملازمت میں تھے۔ اس لیے ادارت کے فرائض مولوی عبدالغفور کے سپرد تھے۔ اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ قانونی مسائل پر خیال آرائی کرتا تھا، اس لیے یہ وکلا میں بڑا مقبول تھا۔ یہ ہفتہ وار ۱۸۵۰ء میں بند ہو گیا۔ مذکورہ بالا دہلی کے اخباروں کے علاوہ ان کا ہم عصر اخبار "مظہر الحق" تھا جسے اس دور میں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔

۱۸۳۷ء ہی میں مرزاپور، اترپردیش سے پادری آر۔ سی۔ ماتھر نے "خیر خواہِ ہند" کا اجرا کیا۔ ابتدا میں یہ فارسی اور رومن رسم الخط میں شائع ہوتا تھا، لیکن مضامین اردو میں چھاپے جاتے تھے۔ بعد میں جب ۱۸۶۱ء میں اس کا احیا ہوا تو فارسی اور دیوناگری رسم الخط میں مضامین شائع کئے جانے لگے۔

۱۸۴۵ء میں دہلی کالج کے ماسٹر رام چندر نے "فوائد الناظرین" جاری کیا۔ اس کے دو برس بعد انھوں نے "محبِ ہند" کی شروعات کی جو اس سے بیشتر "خیر خواہِ ہند" کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ اسی سال دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر شپرانگر نے "قران السعدین" کا اجرا کیا۔ اس میں سیاست وادب کے علاوہ سائنس سے متعلق مضامین بھی ہوتے تھے۔ اس کی ادارت اسی کالج کے شعبۂ انگریزی کے سینئر ریسرچ اسکالر پنڈت دھرم نراین کے سپرد تھی۔

نومبر ۱۸۴۶ء میں اردو اخبار پریس نے "فوائد الشائقین" نامی ہفت روزہ جاری کیا۔ جس کے مدیر پربھو دیال تھے۔ یہ اخبار انگریزی گزٹ کا اردو ایڈیشن تھا۔ اس میں منصفی کا امتحان دینے والے امیدواروں کے لیے سوال جواب کا سلسلہ بھی ہوتا تھا۔ اس اخبار میں قانونی مضامین، عدالتی فیصلے، دیوانی اور فوجداری قواعد وضوابط بھی شائع کئے جاتے تھے اور اس کی تعدادِ اشاعت ۱۱۰۰ کے قریب تھی۔

۱۸۴۷ء میں آگرہ سے "اسعد الاخبار" اور بریلی سے "عمدۃ الاخبار" کا اجرا ہوا۔ اول الذکر ہفتہ وار قمر الدین نے جاری کیا تھا۔ اس کی قیمت آٹھ آنہ تھی۔ اس اخبار میں پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم صاحب کی سوانح عمری کو مسلسل شائع کیا گیا تھا۔ "عمدۃ الاخبار" بریلی اسکول کے مسٹر ٹریگر نے شروع کیا تھا۔ یہ بریلی کا پہلا اخبار تھا۔ پہلے اس کے ایڈیٹر مولوی عبدالرحمان اور بعد ازاں منشی لچھمن پرشاد مقرر کئے گئے۔

اسی عرصہ میں وارانسی سے "بنارس" اخبار کی شروعات ہوئی۔

خبروں پر مشتمل اس اخبار کی کتابت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے اسے پڑھنے میں دشواری ہوتی تھی۔

۱۴ جنوری ۱۸۵۰ء کو لاہور سے ہفتہ وار "کوہِ نور" کا اجرا ہوا۔ اسے ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔ یہ بعد ازاں ہفتہ میں دو بار اور پھر تین بار اشاعت پذیر ہوتا رہا۔ یہ اخبار لگ بھگ پچپن برس تک جاری رہا۔ اس سے کئی نامور صحافی وابستہ رہے۔ اسی سال گوجرانوالہ سے منشی گنڈا مل نے "گلزار پنجاب" جاری کیا۔

"کوہِ نور" کی اشاعت کے چند ماہ بعد سراج الدین کی سرپرستی اور شہاب الدین کی ادارت میں "دریائے نور" کی شروعات ہوئی۔ اس اخبار کے ایک مدیر منشی مہدی حسن نے اختلافِ رائے کی وجہ سے اخبار سے استعفیٰ دے کر بعد ازاں ملتان سے "ریاضِ نور" کا اجرا کیا تھا۔

۱۸۵۵ء میں ملک میں مزاحیہ اخبارات کا سلسلہ شروع ہوا، جس کی ابتدا رام پور کے ہفتہ وار "مذاق" سے ہوئی۔ اس کے چار سال بعد مدراس سے "مدراس پنچ" ظہور پذیر ہوا۔ جنوری ۱۸۷۶ء میں بمبئی سے "فرحت الاحباب" کی شروعات ہوئی۔ اور پھر مراد آباد سے "روہیلکھنڈ پنچ" اور پٹنہ سے "بہار پنچ" جاری ہوا۔

جنوری ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے "اودھ پنچ" منظرِ عام پر آیا۔ اسے ملک گیر شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔ اس سے رتن ناتھ سرشار، اکبر الہ آبادی، تربھون ناتھ ہجر، منشی جوالا پرشاد اور سید محمد آزاد ایسے ادبا وشعرا وابستہ رہے۔ ۱۸۵۸ء کو لکھنؤ سے "اودھ اخبار" کا اجرا ہوا جو بعد ازاں سہ روزہ اور پھر ۱۸۷۴ء میں روزنامے میں تبدیل ہو گیا۔ اس اعلیٰ پائے کے اخبار سے رتن ناتھ سرشار، مولانا عبدالحلیم شرر، میر جالب دہلوی، مرزا حیرت دہلوی وغیرہ کا تعلق رہا۔ ۱۸۵۹ء میں مدراس سے سید عبدالستار لیبین کی ادارت میں "شمس الاخبار" کی شروعات ہوئی جس میں جنگِ روم وروس میں ترکی کی حمایت میں خبریں اور مضامین ہی نہیں شائع کئے گئے تھے، بلکہ اس کے لیے چندہ کی اپیل کر کے ہزاروں روپیہ اکٹھا کیا گیا تھا۔ اس اخبار کی ان خدمات پر سلطان ترکی عبدالمجید ثانی نے تمغۂ مجیدیہ عطا کیا تھا۔ تقریباً پچاس برس شائع ہونے کے بعد یہ اخبار بیسویں صدی کے اوائل میں بند ہو گیا۔

۱۸۶۵ء میں بنگلور کے معروف شاعر منشی محمد قاسم تجم نے بنگلور سے "قاسم الاخبار" جاری کیا، جو اپنے مضامین اور گٹ اپ کی وجہ سے قارئین میں بڑا مقبول ہوا۔ اس کے بعد اسی شہر سے ۱۸۷۳ء میں "میسور" اخبار منظرِ عام پر آیا۔ جو "قاسم الاخبار" سے کم قیمت ہونے کی وجہ سے وہاں عوام

کی توجہ کا مرکز بنا۔ ان دونوں اخبارات کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں اشتہارات شائع نہیں ہوتے تھے۔ اسی شہر سے "سلطان الاخبار" بھی اشاعت پذیر ہوا۔

۱۸۶۶ء میں دہلی سے حکیم محمود خاں نے "اکمل الاخبار" جاری کیا۔ اس کے مدیر منشی بہاری لال مشتاق تھے۔ اس کا شمار اپنے عہد کے معروف اخبارات میں ہوتا تھا۔ اسی سال مارچ میں سر سید احمد خاں نے "سائنٹیفک سوسائٹی" کی شروعات کی، جس کا مقصد اہلِ وطن میں نئے تہذیب و تمدّن اور یورپی علوم و فنون کی روشنی پھیلا کر انہیں جدید علم و ہنر سے روشناس کرانا تھا۔ یہ اخبار لگ بھگ ۳۳ برس تک چھپنے کے بعد بند ہوگیا۔ تاہم اس اخبار کی بدولت عوام جدید علوم سے آگاہ ہوئے۔ اور اُن کے خیالات و نظریات میں تبدیلی کا رجحان پیدا ہوا۔

"سائنٹیفک سوسائٹی" کی اشاعت کے چار برس بعد ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو سر سید احمد خاں نے معروف ہفتہ وار "تہذیب الاخلاق" کا اجرا کیا۔ جسے تاریخِ صحافت میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس جریدے میں خبروں کے بجائے مضامین کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ان کا مقصد مسلمانِ ہند کے اندازِ فکر میں تبدیلی لانا تھا۔ اس اخبار کو اپنے دور میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ اسی دور میں پنڈت کلندا رام نے جو "کوہِ نور" میں کاتب تھے لاہور سے "اخبارِ عام" کا اجرا کیا۔ اس کا پہلا شمارہ یکم جنوری ۱۸۷۱ء کو منظرِ عام پر آیا۔ اس کے مدیر پنڈت گوپی ناتھ تھے۔ بعد میں یہ اخبار دو روزہ اور پھر روزنامہ کی حیثیت سے شائع ہوتا رہا۔ اس کا سالانہ چندہ ڈھائی روپے تھا۔ "پیسہ اخبار" سے پہلے اُسے بڑی مقبولیت حاصل تھی۔

۱۸۷۳ء میں کان پور سے "نور الاخلاق" اور جنوری ۱۸۷۷ء میں الہٰ آباد سے "قیصر الاخبار" کی شروعات ہوئی۔ بعد ازاں مؤخر الذکر اخبار کو ۱۱ نومبر ۱۸۷۷ء کو روزنامے میں منتقل کر دیا گیا۔ مگر چند ماہ بعد یہ بند ہوگیا۔ اس ہفتہ وار میں انگریزی کے علاوہ فارسی، عربی اور ترکی اخبارات کے ترجمے بھی شائع ہوتے تھے۔

۶ جنوری ۱۸۷۸ء کو الہ آباد ہی سے حاجی محمد کبیر الحق نے "احسن الاخبار" جاری کیا۔ اس میں عالمِ اسلام کی خبروں کو ترجیحاً شائع کیا جاتا تھا۔

۱۸۸۰ء میں کلکتہ سے "تجارت الاخبار" اور ۱۸۸۲ء میں بنارس سے اخبارِ "گلدستہ" منظرِ عام پر آیا۔ اس کے بعد ۱۸۸۳ء میں لکھنؤ سے "ہندوستانی اخبار" کا اجرا ہوا جو ہفت روزہ تھا۔ جس میں سیاستِ حاضرہ پر جراُت مندانہ مضامین شائع کئے جاتے تھے۔ کانگریس کا حامی یہ جریدہ بعد میں سہ روزہ ہوگیا۔ ۱۸۸۳ء میں حیدرآباد سے "ہزار داستان" اور ۱۸۸۴ء میں بدایوں سے "نسیم سحر" کی ابتدا ہوئی۔ ۱۸۸۵ء میں لاتعداد اخبارات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ یکم جنوری کو لکھنؤ سے "اخترِ اودھ" یکم جولائی کو جھجھر ہریانہ سے "جعفر زٹلی" اور بنارس سے "سروش" کا آغاز ہوا۔ آئندہ برس لاہور سے "امپیریل پیپر" کا اجرا ہوا۔

۱۸۸۷ء میں مولوی محبوب عالم نے لاہور سے "پیسہ اخبار" جاری کیا۔ جو اپنے اعلیٰ مضامین اور کم قیمت کی وجہ سے عوام میں بے حد مقبول و معروف ہوا۔ جہاں سے یہ شائع ہوتا تھا، اُس گلی کا نام بھی "پیسہ اسٹریٹ" ہوگیا۔ میاں محمد دین فوق، لالہ دینا ناتھ اور میر جالب دہلوی ایسے معروف حضرات اس کے مدیر رہے۔ شیخ غلام محمد کا ہفتہ وار وکیل بھی اُس دور کا مقبول اخبار تھا۔ اس سے مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا عبد اللہ منہا مولانا عبد العمادی بھی وابستہ رہے۔

مولانا عبد الحلیم شرر کا "مہذب" بھی اُنیسویں صدی کا معروف اخبار ہے۔ جو یکم اگست ۱۸۹۰ء کو لکھنؤ سے جاری کیا گیا تھا۔ سیاسی، تاریخی، درسی اور ادبی مضامین پر مشتمل یہ ہفت روزہ طباعت و کتابت کے علاوہ مواد کے لحاظ سے بھی اعلیٰ پایہ کا تھا۔

مندرجہ بالا ہفتہ وار اخبارات کے علاوہ اُنیسویں صدی میں سینکڑوں ہفت روزے منظرِ عام پر آئے، جن میں سے کچھ کے نام درجِ ذیل ہیں۔
"گزٹ" (گوالیار) "فتنہ اخبار" (گورکھپور) "مفرح القلوب" (کراچی) "شوخ" "اودھ" (لکھنؤ) "اخبار تمنائی" (لکھنؤ) "احسن الاخبار" (امروہہ) "صادق الاخبار" (بھاولپور) "دبیر الملک" (بھوپال) "ممتاز الا..." (بارہ بنکی) "اردو گائیڈ" (کلکتہ) "مشیرِ قیصر" (لکھنؤ) "محتشم" (جاو...) "شفیق" (حیدرآباد) "مہر نیم روز" (بجنور) "مہر درخشاں" (دہلی) "منظر العجائب" (مدراس) "نور" (بدایوں) "نسیم" (آگرہ) "دبدبہ قیصری" (بریلی) "نجم الاخبار" (اٹاوہ) "پتر ہند" (الہ آباد) "کارنامہ" (لکھنؤ) "مفیدِ عام" (آگرہ) "ہریانہ اخبار" (جھجھر) "دبدبۂ سکندری" (رام پور) "فرید الاخبار" (رنگون) "نسیم ہند" (فتح پور) "شعلۂ طور" (کان پور) "جلوۂ طور" (میرٹھ) "نجم الہند" (مراد آباد) "طوطیٔ ہند" (میرٹھ) "انوار الاخبار" (لکھنؤ) "امیر الا..." (کلکتہ) "حامیٔ ہند" (کرمنا) "حدیقۃ الاخبار" (ریاست ٹونک) "دوربین" (کلکتہ) "دربارِ اکبری" (دہلی) "سرورِ قیصری" (رام...) "گوہر" (کلکتہ) "ستارۂ ہند" (مراد آباد) "کشف الاخبار" (بمبئی) "اسلام" (میرٹھ) "اخبارِ ہند" (لکھنؤ) "مطلعِ نور" (کان پور) "اخبار آزاد" "مرقعِ تہذیب" (لکھنؤ) "شمس الاخبار" (مدراس) "جرعہ روزگار" (مدراس) "انجمنِ پنجاب" (لاہور) "انڈین پنچ" (لکھنؤ)
آج ہمیں خبریں حاصل کرنے کے لیے متعدد ذرائع مثلاً ٹیلی پرنٹر

ی فون، ٹیلی گرام، ریڈیو، ٹیلی ویژن، خبر رساں ایجنسیاں، اخباری
مائندے اور خصوصی نامہ نگار وغیرہ دستیاب ہیں۔ لیکن انیسویں صدی
ں خبروں کے حصول کے ذرائع انتہائی محدود تھے۔ بہت کم اخبارات کے
یگر شہروں میں اپنے نامہ نگار یا نمائندے تھے۔ زیادہ تر اخبار دوسرے
خبار سے بغیر حوالہ دیئے خبریں نقل کر لیتے تھے اور نامہ نگار رکھنے کی صورت
یں کوشش کی جاتی تھی کہ اُسے معاوضہ یا تنخواہ نہ دینی پڑے۔ بعض اخبار
پنے نامہ نگار کو معاوضہ کے بجائے اخبار کی کاپی مفت ارسال کرنے پر اکتفا
کرتے تھے۔

اُن دنوں اخبارات کی اشاعت کم ہونے کی وجہ سے وہ اتنے مہنگے ہوتے تھے کہ اُنہیں خریدنا ہر آدمی کے بس کی بات نہ تھی۔ لہٰذا اخبارات کے جاری رہنے کا انحصار رؤساء و امراء کی مالی اعانت اور چندے پر تھا۔ بعض جرائد کے منتظمین طلب کئے بغیر ہی اپنا اخبار مشہور اور مقتدر افراد کے نام جاری کر دیتے تھے۔ اکثر ایسے اخبار لوٹا دیئے جاتے تھے۔

اخبار نکالنے کا مقصد اپنی تجارت کا فروغ، کسی کی حمایت و مخالفت اور ذاتی تبلیغ و تشہیر ہوتا تھا۔ بعض مالکان کا یہ ذریعۂ معاش تھا۔ وہ کھُل کر لکھنے سے احتراز کرتے تھے۔ مبادا خریدار اُن کی تحریروں سے ناراض ہو کر خریداری نہ بند کر دیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد اخبارات کے اندازِ فکر میں آہستہ آہستہ تبدیلی رونما ہونے لگی۔ دراصل انگریزی سامراج کے ہاتھوں اپنی شرمناک شکست کے بعد اُن کے دل میں آزادی کے لیے ایک تڑپ اور انگریزی حکومت کے خلاف جذبۂ نفرت و حقارت پیدا ہو گیا اور دھیرے دھیرے اخبارات میں بھی آزادیٔ وطن کی آواز سنائی دینے لگی جو بیسویں صدی کے اوائل میں بڑی شدت اختیار کر گئی۔

۱۹۰۲ء میں مولوی انشاء اللہ خاں نے لاہور سے "وطن" کا اجرا کیا۔ یہ ۱۹۱۵ء میں روزنامے میں تبدیل کر دیا گیا۔ لیکن یہ زیادہ عرصہ تک بحیثیت روزنامہ جاری نہ رہ سکا اور پھر سے ہفتہ وار ہو گیا۔ اس کے ایک سال بعد ۱۹۰۳ء میں "زمیندار" منظرِ عام پر آیا۔ اُسے اُردو صحافت میں بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ اسے معروف صحافی و شاعر مولانا ظفر علی خاں کے والد منشی سراج الدین احمد نے لاہور سے جاری کیا تھا۔ بعد ازاں روزنامہ کی حیثیت سے شائع ہوتا رہا۔ اور اسے مولانا ظفر علی کی ادارت میں غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس اخبار سے مولانا نیاز فتح پوری، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، منشی وجاہت حسین جھنجھانوی اور مولانا عبداللہ عمادی ایسی نامور شخصیات وابستہ رہیں۔ یہ اخبار اپنے اداریوں، تبصروں اور مضامین کی وجہ سے مسلم عوام میں بے حد مقبول ہوا۔ تقسیمِ ملک سے پیشتر اس کی تعدادِ اشاعت تیس ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔ یہ مسلم مسائل اور مسلمانوں سے متعلق خبروں کو ایک مخصوص نقطۂ نظر سے پیش کرتا تھا۔ اور یہی اس کی مقبولیت کی وجہ تھی۔

۲۶ اگست ۱۹۰۴ء کو لاہور ہی سے بابو دینا ناتھ کی ادارت میں "ہندوستان" کا اجرا ہوا۔ یہ ایک قوم پرست نیز انگریزی حکومت کا شدید مخالف اخبار تھا۔ لگ بھگ تین سال بعد ایک اور محبِ وطن اخبار "سوراجیہ" کا شانتی نرائن بھٹناگر کی ادارت میں آغاز ہوا۔ اس اخبار کو اپنے باغیانہ اور قوم پرستانہ مضامین کی وجہ سے ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔ اس اخبار کا کوئی بھی ایسا ایڈیٹر نہیں تھا، جسے باغیانہ مضامین لکھنے کی بنا پر دس برس کی قید نہ ہوئی ہو۔ ایڈیٹروں کی گرفتاریوں نے اس اخبار کا تین ہی برس میں دم توڑ دیا۔

بیسویں صدی کے دوسرے دہے میں دو اہم اخبار "الہلال" اور "ہمدرد" منظرِ عام پر آئے۔ ان اخبارات نے ہمارے ملک کے اردو قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ اوّل الذکر اخبار مولانا ابوالکلام آزاد نے جولائی ۱۹۱۲ء میں جاری کیا تھا۔ جو ٹائپ میں سولہ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس اخبار کے عالمانہ مضامین، ٹائپ میں طباعت اور تصاویر نے قارئین میں تہلکہ مچا دیا۔ اور صحافت کی پیش رفت میں اہم حصہ ادا کیا۔ تاریخِ صحافت کے علاوہ اُس نے جنگِ آزادی کی تحریک میں بھی ناقابلِ فراموش حصہ ادا کیا۔ اس کے قوم پرستانہ مضامین سے حکومت بوکھلا اُٹھی۔

حکومت نے پہلے اس سے دو ہزار روپے اور پھر دس ہزار روپے کی ضمانت مانگی۔ آخر الذکر ضمانت مولانا آزاد ادا نہ کر سکے جس سے اُنہیں ۱۵ اپریل ۱۹۱۴ء کو یہ اخبار بند کرنا پڑا۔ ۱۹۲۷ء میں یہ دوبارہ جاری ہوا۔ لیکن چھ ماہ بعد اُس نے پھر دم توڑ دیا۔

فروری ۱۹۱۲ء میں مولانا محمد علی جوہر نے دہلی سے "ہمدرد" کی ابتدا کی۔ پہلے اس اخبار کا نام "نقیبِ ہمدرد" تھا، جو بعد میں تبدیل کر کے "ہمدرد" کر دیا گیا۔ یہ اخبار بھی حکومت کا شدید نکتہ چیں تھا جس کی وجہ سے اس پر انگریزی حکومت نے سینسر شپ بٹھا دیا اور اسے ۷ مئی ۱۹۱۵ء کو اپنی اشاعت بند کرنا پڑی۔ ۹ نومبر ۱۹۲۴ء کو یہ دوبارہ جاری ہوا۔ تاہم ۱۲ اپریل ۱۹۲۶ء کو ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ "ہمدرد" کے ابتدائی دور ہی میں لکھنؤ سے مولانا عبدالباری کا "ہمدم" بجنور سے مولوی عبدالمجید کا "مدینہ" منظرِ عام پر آیا۔ یہ دونوں نیشنلسٹ اخبار تھے۔ اوّل الذکر تقسیمِ ہند کے بعد بند ہو گیا۔ آخر الذکر جاری رہا۔ یہ اخبار خلافت

تحریک میں پیش پیش اور ہمیشہ تحریکِ آزادی سے وابستہ رہا۔

۱۹۱۴ء ہی میں سردار امر سنگھ کا مشہور ہفتہ وار "شیرِ پنجاب" شائع ہونا شروع ہوا۔ اس پرچے کو سکھ سیاست میں بڑا اہم مقام حاصل رہا ہے۔ یہ آج بھی باقاعدگی سے نکل رہا ہے۔

۱۹۲۲ء میں لاہور سے "ہندو" جاری ہوا۔ آزادی کے بعد یہ جالندھر سے شائع ہونے لگا۔ یہ اخبار صرف ہندو مذہب و سیاست سے متعلق مواد شائع کرتا ہے۔ اسے ایک مخصوص ہندو طبقہ بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہے۔

"ہندو" کی اشاعت کے دو برس بعد دہلی سے مشہور صحافی دیوان سنگھ مفتون نے ہفتہ وار "ریاست" کا اجرا کیا۔ اسے ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔ اس اخبار کو دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کے جبر و ستم اور رازہائے درون فاش کرنے کی وجہ سے عوام میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ حصولِ آزادی کے بعد دیسی ریاستوں کے خاتمے کے چند برس بعد اس 'ریاست' کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

اگلے برس لکھنؤ سے "سرفراز" کی اشاعت شروع ہوئی جو شیعہ فرقے کی نمائندگی کرتا ہے اور آج بھی باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

۱۹۳۱ء میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی سرپرستی میں "پیغام" نکالنا شروع کیا اور اسی سال مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ہفتہ وار "سچ" کی شروعات کی۔ جس کا نام ۱۹۳۴ء میں بدل کر "صدقِ جدید" کر دیا گیا۔ اس میں "سچی باتیں" کے عنوان سے شائع ہونے والے شذرات قارئین کی خصوصی دلچسپی کا باعث تھے۔ اسی سال جمعیۃ العلمائے ہند کا ترجمان "الجمعیۃ" منظرِ عام پر آیا۔ جو اب روزنامے کی حیثیت سے شائع ہو رہا ہے۔

۱۹۳۵ء میں لاہور سے مشہور فلمی جریدے "چترا" کی اشاعت کے ساتھ فلمی اخبارات و رسائل کے سلسلے کی ابتدا ہوئی۔ اس پرچے کو فلمی جرائد میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور یہ گزشتہ نصف صدی سے جناب دھرم ویر کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔

۱۹۴۵ء میں کلکتے سے احمد سعید ملیح آبادی نے روزنامہ "آزاد ہند" کے ہفتہ وار ایڈیشن "اُجالا" کا اجرا کیا، جو اب بھی باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

تقسیم ملک سے اُردو اخبارات کو زبردست دھکا لگا۔ بعض اخبارات کی اشاعت بند ہو گئی اور بعض کو ہجرت کرنا پڑی۔ لاہور سے معروف ہفتہ وار مثلاً: چترا، ہندو، پارس، شیر پنجاب وغیرہ ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے۔ اور دہلی یا جالندھر سے شائع ہونے لگے۔ 'پارس' کچھ عرصہ اشاعت پذیر رہا۔ تاہم یہ لالہ کرم چند کی وفات کے بعد بند ہو گیا۔

آزادی کے چند برس بعد ہندوستان میں تقریباً ۱۴۳ ہفتہ وار شائع ہو رہے تھے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل چودہ[1] اخبار تعدادِ اشاعت کے لحاظ سے خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں:

"الفاروق" (لکھنؤ) "بے باک" (سہارنپور) "چترا" (دہلی) "ہندو" (جالندھر) "حریت" (دہلی) "انصاف" (کلکتہ) "کہکشاں" (بمبئی) "مدینہ" (بجنور) "منزل" (لدھیانہ) "پیغام" (دہلی) "قوم" (بنگلور) "ریفارمر" (دہلی) "سیوک" (کپورتھلہ) اور "اُجالا" (جالندھر)

۱۹۵۱ء میں میر مشتاق احمد کا "ایشیا" اور ۱۹۵۳ء میں ممتحن فاروقی کا "پیامِ مشرق" منظرِ عام پر آیا۔ ۱۹۵۵ء میں نئی دہلی سے سوویت سفارت خانہ کی جانب سے باتصویر "سوویت دیس" کا اجرا کیا گیا۔ اور ۱۹۵۶ء میں دہلی سے پریم چند وما کی ادارت میں "حکمت" کی شروعات ہوئی۔ اس کے ایک سال بعد ۱۹۵۷ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے ترجمان "ہماری زبان" کا اجرا ہوا۔ جس کے مدیر آلِ احمد سرور تھے۔ اب یہ اخبار نئی دہلی سے آفسیٹ پر شائع ہو رہا ہے۔

دہلی ہی سے مشہور صحافی مولانا عبدالباقی نے ایک معیاری اور دیدہ زیب ہفتہ وار "کارواں" کی شروعات کی۔ اس پرچہ سے اہلِ اردو کی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں، لیکن باقی صاحب کی موت اس پرچہ کی بھی موت ثابت ہوئی۔

۱۹۶۲ء میں بنگلور سے "نشیمن" کا آغاز ہوا۔ جس کا شمار ملک کے کثیر الاشاعت اخباروں میں ہوتا ہے، لیکن کتابت و طباعت کے لحاظ سے ابھی اس کا معیار دوسرے کئی ہفت روزوں کے مقابلے میں کمتر ہے۔ اس اخبار کی اشاعت کے ایک سال بعد مشہور انگریزی ہفتہ روزہ "بلٹز" کے اُردو ایڈیشن کی اشاعت شروع ہوئی۔ اسی سال گیا (بہار) سے "مورچہ" اور اس سے ایک سال بعد رضوان اللہ کا "عظیم آباد ایکسپریس" ظہور پذیر ہوا۔ اسی عرصہ میں مشہور قوم پرست صحافی انیس الرحمٰن نے دہلی سے "پرچم ہند" کا اجرا کیا جو اس سے پیشتر الہ آباد سے "نئی زندگی" اور "جہاں نما" نکال چکے تھے۔

ادارہ "شمع" نے نئی دہلی سے ظ۔ انصاری کی ادارت میں "آئینہ" کا اجرا کیا۔ جو اپنے خوب صورت گٹ اپ اور عمدہ مضامین کی وجہ سے ملک میں بڑا مقبول ہوا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد بوجوہ مالکان نے اس خوب صورت پرچے کی اشاعت بند کر دی۔ بعد ازاں ظ۔ انصاری نے

[1] ہسٹری آف جرنلزم جے نٹ راجن صفحہ ۲۲۹

"آئینہ" بمبئی سے دوبارہ جاری کیا۔ دوسرے دور میں اس کے کُل دس، بارہ شمارے ہی شائع ہوئے۔

۱۹۷۳ء میں مولانا عبدالوحید صدّیقی نے ہفتہ وار "نئی دُنیا" جاری کیا۔ جو اس سے پیشتر "ہمّت" شائع کرتے رہے تھے اور جو کچھ عرصہ پیشتر بوجوہ بند ہوگیا تھا۔ آج اس ہفتہ وار کا شمار مُلک کے کثیر الاشاعت ہفت روزوں میں ہوتا ہے۔

۱۹۷۸ء میں حکومتِ ہند کی وزارتِ اطلاعات ونشریات کے شعبہ پبلی کیشنز ڈویژن نے "روزگار سماچار" کی شروعات کی، جو ملک کے بے روزگار افراد کو روزگار سے متعلق معلومات بہم پہنچاتا ہے۔

۱۹۸۲ء میں بہار ربرتی کی ادارت میں روزنامہ "الجمعیۃ" کے ہفت روزہ ایڈیشن کا آغاز ہوا۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد ہندوستانی عوام کے دل میں انگریزی حکومت کے خلاف جو نفرت وحقارت کا جذبہ اور آزادی کی تڑپ پیدا ہوئی تھی، اُس نے آہستہ آہستہ شدّت اختیار کرلی اور اس کا اثر اردو اخبارات پر بھی پڑا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اس جذبہ نے طوفانِ بیکراں کی شکل اختیار کرلی اور وطن، الہلال، ہمدرد، زمیندار وغیرہ میں بڑی شدّت سے آزادیٔ وطن کے لیے آواز بلند کی جانے لگی ۔

اخبارات کی اکثریت وطن پرست اور محبِ وطن تھی، جو کہ حصولِ آزادی کے لیے ہر قربانی کے لیے عوام کو تلقین کرتے تھے۔ لیکن اس کے بعد مسلم لیگ کے زیرِ اثر بہت سے اخبارات نے تقسیم ملک کے مطالبہ کی حمایت شروع کردی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے اخبارات دو حصّوں میں بٹ کر رہ گئے۔ ایک تو وہ جن کا منتہائے مقصود آزادیٔ ہند تھا اور جو مُلک کے اتحاد و یک جہتی کے لیے کوشاں تھے۔ دوسرے وہ جو دو قوموں کی تھیوری کی بنا پر مسلمانوں کے لیے الگ مُلک پاکستان کا مطالبہ کرنے لگے تھے۔ حصولِ آزادی اور مملکتِ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد مسلم لیگ کے حمایتی اخبار یا تو پاکستان چلے گئے یا بند ہوگئے۔ کچھ عرصہ تو اُردو اخبارات کی حالت بڑی ناگفتہ بہ رہی، لیکن آہستہ آہستہ حالت میں بہتری پیدا ہونے لگی اور اخبارات ترقی وفروغ کی منازل طے کرنے لگے اور آج یہ صورتِ حال ہے کہ مُلک سے لگ بھگ ساڑھے چھ سو ہفتہ وار شائع ہو رہے ہیں۔ جب کہ تقسیم مُلک کے وقت ان کی تعداد تقریبًا ڈھائی سو تھی۔ موجودہ ہفتہ وار اخبارات میں "بلٹز" (بمبئی)، "نئی دنیا" (دہلی) "کہکشاں" (بمبئی) "نشیمن" (بنگلور) "حیات" (نئی دہلی) "مورچہ" (گیا) "ہماری زبان" (نئی دہلی) "اُجالا" (کلکتہ) "عظیم آباد ایکسپریس" (پٹنہ) "کارواں" (بنگلور) "الجمعیۃ" (دہلی) "حکمت" (دہلی) "اخبارِ نَو" (دہلی) "الجمیل" (بھوپال) "المشرق" (دہلی) "الانصاف" (مالیگاؤں) "اخبارِ عالم" (بمبئی) اور "دعوت" (دہلی) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اُردو اخبارات کی ابتدا ہوئے آج ڈیڑھ سو برس سے زائد مدّت ہوچکی ہے۔ لیکن آج بھی ان میں دوسرے اخبارات سے خبریں اور مضامین نقل کرنے کی روش وہی ہے۔ اگر کبھی کوئی محقق متعدد اخبارات کا مطالعہ کرے تو اُسے معلوم ہوگا کہ متعدد اخباروں میں ایک ہی مضمون نقل کیا گیا ہے۔ نیز طبع زاد مضامین کی نسبت ہندی، انگریزی وغیرہ کے مضامین ترجمہ کرکے شائع کئے گئے ہیں۔

انگریزی، ہندی اور بعض دیگر علاقائی زبانوں کے اخبارات کے مقابلے میں اکثر اردو ہفتہ وار اخبارات کی طباعت اور گٹ اپ اعلیٰ پایہ کا نہیں۔ اس کی ایک وجہ لیتھو گرافی کے ذریعہ اشاعت ہے۔ آج جب کہ آفسیٹ کی جدید مشینیں دستیاب ہیں۔ اردو کے دس فیصد سے بھی کم اخبار آفسیٹ پر شائع ہو رہے ہیں۔

زیادہ تر ہفتہ وار اخبار مقامی نوعیت کے شائع ہوتے ہیں۔ ان سے اپنے علاقے سے باہر کوئی روشناس نہیں ہوتا۔ اس کے بعد ریاستی سطح پر مقبول ہفت روزوں کا ذکر آتا ہے اور سب سے بعد میں اُن پرچوں کا جن کے قارئین ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں تاہم آخر الذکر کی تعداد دو درجن سے زائد نہیں۔

اکثر اخبار سیاسی اور مذہبی خبروں اور مضامین پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اور ان سے کسی انفرادیت کا اظہار نہیں ہوتا۔ بعض میں مضامین بھی ملتے جُلتے یا ہُوبہُو نقل کئے ہوئے ملتے ہیں۔ خبروں اور مضامین پر مشتمل اخبارات کے علاوہ فلموں سے متعلق بھی چند اخبار ہیں، لیکن کھیل کود، آرٹ، خواتین، سائنس، تکنالوجی، انجینیرنگ، قانون، معاشیات، انشورنس، تیکنک، موسیقی وغیرہ سے متعلق اخبارات کا فقدان ہے۔

اردو میں مسلم سیاست پر مبنی اخبارات کثیر تعداد میں بکتے ہیں۔ اس قبیل کے بعض اخبار خبروں کو توڑ موڑ کر اور مبالغہ آمیزی سے پیش کرتے ہیں۔ اور اُن پر قاری کی توجّہ مبذول کرنے کے لیے شہ سُرخی جمائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں تعدادِ اشاعت بڑھانے کے لیے قاری کے جذبات و احساسات کے ساتھ کھلواڑ کیا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض اخبارات زرد صحافت کے زمرے میں آتے ہیں۔

اس کے علاوہ ابھی تک مُلک سے "السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا" "دھرم یُگ" "ساپتاہک ہندوستان" اور "اخبارِ جہاں" جیسا کوئی بھی مکمّل ہفتہ وار شائع نہیں ہوا۔ اس کی اشد ضرورت ہے۔

گربچن چندن

# اردو کی ادبی صحافت

اُردو کی ادبی صحافت نے بڑے نامور رسالے اور بڑے نامور ادیب پیدا کئے ہیں، لیکن ہمارے ملک میں آج تک اس کا کوئی تاریخی جائزہ نہیں لیا گیا۔ زیرِ نظر مضمون اس موضوع پر غالباً اوّلین کوشش ہے۔

فاضل مضمون نگار کے مطابق اس صحافت کا آغاز، ارتقا اور عروج وادیٔ گنگ و جمن میں ہوا۔ محبِ ہند (۱۸۴۷ء) سے آزادیٔ ہند (۱۹۴۷ء) تک اس نے جس ایک صدی کا سفر طے کیا، وہ مختلف اصناف کے تجربوں سے مالا مال ہے۔ تاہم بیسویں صدی کے دوسرے ربع میں یہ نئے ادبی رجحانات، نئے تجربات اور نئے امکانات سے آشنا ہو چکی تھی۔

اس کے اکثر ادوار میں اس کے مشاہیر کے پاس ادبی رسالے کا ایک واضح تصور تھا اور اس تصور کی باوصف تکمیل ہی میں وہ اپنے رسالے کی عظمت تصور کرتے تھے۔ وہ تجارت سے زیادہ رسالے کی صفات کے لیے کوشاں رہے۔

آزادی کے بعد رسائل کی تعداد میں مثالی اضافہ ہوا۔ ادبی حیثیت اور انفرادی اہمیت بڑھی جس کا سہرا اُن کے ناشروں اور مدیروں کے سر ہے۔ (ادارہ)

اُردو کی مطبوعہ صحافت کا آغاز ۱۸۲۲ء میں شہر کلکتہ میں ہوا۔ یہ شہر اُس وقت برطانوی حکومت کا صدر مقام تھا۔ یہ ابتدا ہفت روزہ "جامِ جہاں نما" سے ہوئی۔ اس میں خبریں اور حالاتِ حاضرہ ہوتے تھے۔ مشرقی ہندوستان کے شہر کلکتہ کو قدرت کی طرف سے صرف اردو صحافت کو جنم دینے کا حکم ہوا تھا۔ اس کا ارتقا اور بالخصوص ادبی صحافت کی بالیدگی شمال کی مقسوم تھی۔ شمال میں اس کا گہوارہ وادیٔ گنگ و جمن بنی، جو خود اردو زبان کی جنم بھومی تسلیم کی جاتی ہے، جہاں یہ زبان پھلی پھولی اور پروان چڑھی۔

## اوّلین مظاہر

اس صحافت کے اوّلین مظاہر دہلی کالج کے رسالے تھے۔ اس کالج میں، اس کے پرنسپل مسٹر ابسٹر سنگھ کی زیرِ سرپرستی دیسی زبانوں اور بالخصوص اردو کے فروغ کے لیے ایک سوسائٹی قائم ہوئی۔ اس نے ۱۸۴۷ء میں ایک ماہ نامہ "محبِ ہند" کے نام سے جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر کالج ہی کے ریاضی کے معلم اور سوسائٹی کے ایک سرگرم رکن ماسٹر رام چندر تھے۔

"محبِ ہند" سے قبل ۱۸۴۵ء میں "قرآن السعدین" اور "فوائد الناظرین" اور ۱۸۳۷ء میں "خیر خواہِ ہند" نامی رسالے بھی نکلے۔ یہ مجلاتی صحافت کی ابتدائی کوششیں تھیں۔

"خیر خواہِ ہند" مرزا پور سے ایک پادری آر سی ماتھر نے نکالا۔ اس ماہ نامے کی زبان اردو تھی۔ لیکن یہ ساتھ ہی ساتھ رومن رسم الخط میں بھی چھپتا تھا۔ اس رسالے کا محرک ایک نو مرید عیسائی کا مذہبی جذبہ تھا۔ اس نے عیسائیت کی تبلیغ پر مغرب کی نئی سائنسی ایجادوں سے معلوماتی مضامین کی سبیل ارزانی۔

● ۴۶ جی، جنگ پورہ ایکسٹینشن، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کا یہ وہ مرحلہ تھا، جس میں وہ اپنی تہذیب کے ساتھ، اپنے مذہب کو بھی مقبول بنانا چاہتے تھے — چنانچہ "خیر خواہِ ہند" کے بعد تقریباً پچاس ایسے علمی رسالے شروع ہوئے جن کا مقصد عیسائیت کا پرچار تھا۔ ان رسالوں کی اہمیت فقط اتنی ہے کہ اس نئی جنس کے رواج کے لیے نئے زمینداروں یعنی انگریزوں کے امداد یافتہ خیر خواہوں نے سرعت سے اثر قبول کرنے والے ہندوستانیوں میں اپنی مساعی شروع کیں۔ ان کے جواب میں ہندوستان کے مختلف شہروں سے دوسرے طبقوں نے بھی مذہبی رسالے نکالے۔ اس طرح اردو کی ابتدائی مجلاتی صحافت ملک کی مذہبی امارت اور تہذیب و تمدن کی اشاعت میں مصروف رہی۔

"قران السعدین" ایک باتصویر ہفت روزہ تھا، جو انگلستان کے پینی میگزین کے طرز پر نکالا گیا تھا۔ اس کے طرزِ تحریر کو عمداً دلکش اور دل پسند بنایا جاتا تھا۔

"فوائد الناظرین" ایک پندرہ روزہ تھا۔

یہ دونوں رسالے علمی اور تعلیمی نوعیت کے تھے۔ جو دہلی کالج ہی نے نکالے تھے۔ ان کا مقصد سرکاری اداروں سے نکلنے والے دوسرے جریدوں کی طرح مغربی خیالات اور ترقیوں کی اشاعت تھی۔ بہر حال "قرآن السعدین" نے ایک [illegible] ڈالی۔ اس کی تقلید میں بارہ سے زیادہ جریدے نکلے۔ قرآن السعدین اور فوائد الناظرین کی طرح ان جریدوں کی عمر اور اثر انگیزی بھی محدود اور مختصر رہی۔ ان کی محدودیت کو محسوس کرتے ہوئے دو سال بعد "محبِ ہند" نکالا گیا۔

"محبِ ہند" ایک باتصویر ماہ نامہ تھا۔ اس میں اکثر تاریخی، علمی اور سائنسی مضامین شائع ہوتے تھے، لیکن اس میں ادبی مضامین بھی ہوتے تھے۔ اس نے بہادر شاہ ظفر اور نصیر کی غزل گوئی پر بڑے جامع مضامین شائع کیے۔

اس کے ایڈیٹر ماسٹر رام چندر خود بھی ایک نو مرید عیسائی تھے۔ وہ اپنے دور کے مشہورِ زمانہ عالم اور صاحبِ قلم تھے۔ انہوں نے اپنے رسائل کے ذریعے ادبی ذوق کی تربیت کی۔ اُس نے متعدد موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں ایک "تذکرۃ الکاملین" بھی ہے۔ اس میں انگریزی اور ہندی شعرا اور فلسفیوں کے حالات درج ہیں۔

## صحافت میں ناول نگاری

اُنیسویں صدی کے اسّی کے دہے میں غزلیات کے گلدستوں سے ذرا ہٹ کر ادبی صحافت کی ایک نئی طرح ڈالی گئی۔ جس کے بانی مولانا عبدالحلیم شرر تھے۔ مولانا بڑے ذہین اور صاحبِ کمال ادیب تھے۔ اُنہوں نے عنفوانِ شباب ہی سے مضمون نگاری شروع کر دی تھی۔ انہیں اکیس سال کی عمر میں منشی نول کشور کے مشہور "اودھ اخبار" میں معاون مدیر کی اسامی مل گئی تھی۔ اس اخبار میں چھپنے والے ان کے مضامین کی بڑی دھوم ہوئی اور اچھے اچھے رسائل اُن کے مضامین کے طلب گار ہوئے۔

جنوری ۱۸۸۷ء میں اُنہوں نے اپنا ماہ نامہ "دل گداز" جاری کیا۔ جس نے اس دَور کی صحافت کی نثر میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ ابتدا میں اس رسالہ میں صرف رومانی اور تاریخی مضامین ہوتے تھے۔ لیکن ایک ہی سال کے بعد اس میں ایک جُزو ناول کا بڑھا دیا گیا۔ اب ہر شمارے میں شرر صاحب کے قلم سے ایک ناول یا ڈرامہ ہوتا تھا۔ یہ تخلیقات تاریخِ اسلام کے واقعات پر مبنی ہوتی تھیں، لیکن مولانا کا طرزِ نگارش اس قدر دلچسپ تھا کہ ان کی نگارشات سے لوگوں میں نہ صرف تاریخِ اسلام بلکہ ناول کے مطالعہ میں گہرا شوق پیدا ہو گیا۔

شرر کے ایک ممتاز ہم عصر پنڈت رتن ناتھ سرشار نے "خم کدۂ سرشار" کے نام سے ایک رسالہ نکالا جس میں صرف ان کے ناول چھپتے تھے۔ اس پُر قلم ادیب نے "اودھ اخبار" کے لیے قسط وار "فسانۂ آزاد" لکھا، جو اردو ناول نگاری میں حقیقت پسندی کا آغاز تصور کیا جاتا ہے۔

اِس دَور کی ادبی صحافت کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے ادبی اصناف کو عوام میں مقبولیت بخشی۔

## تہذیب الاخلاق

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی روحِ تخلیق بڑے درد و کرب کے عالم سے گزر رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ناکام ہو گئی تھی۔ برطانوی حکومت اپنے تسلّط کو مضبوط تر کرنے کے لیے ہر قسم کے جبر و استبداد سے کام لے رہی تھی۔ چنانچہ ہندوستان کے اہلِ فکر و دانش کے ایک طبقے نے محسوس کیا کہ نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے پہلے انہیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اور اس ضمن میں عوام کی تعلیمی پسماندگی اور کہنہ رسوم کی غلامی کو دُور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان عوام میں مسلم عوام کی پسماندگی نسبتاً زیادہ تھی۔ اس صورتِ حالات کی اصلاح کے لیے سر سید احمد خاں میدان میں آئے۔ وہ ایک صاحبِ دانش، عالمِ دین، تعلیم داں، محقق، مصنف اور ایک اعلیٰ درجہ کے صحافی تھے۔

سر سیّد نے اپنے خیالات کے فروغ کے لیے ۱۸۷۰ء میں اپنا رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ جو گلدستوں کے مذاق کے برعکس ایک غیر جذباتی نثر نگاری کا نقیب تھا۔ اس جریدے نے تحقیق کے لیے ایک نئی بصیرت اور فکری ادب کے ایک نئے شعور کو جنم دیا۔

"تہذیب الاخلاق" کا رُخ بالخصوص مسلمانوں کی طرف تھا۔

سرسیّد نے اس کے پہلے ہی شمارے میں بتایا کہ اس کا مقصد مسلمانانِ ہند کو کامل درجے کی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کرنا ہے تاکہ ان کا شمار دنیا کی معزز اور مہذّب قوموں میں ہو۔

سرسید کا کام بہت مشکل تھا۔ قدامت پسند طبقے کسی تبدیلی کو اختیار کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے تہذیب الاخلاق کے جواب میں نور الآفاق (کان پور)، نور الانوار (کان پور)، تیرھویں صدی (آگرہ)، تائید الاسلام (مراد آباد) اور کئی اور ایسے جریدے نکالے جن کا واحد مقصد سرسیّد کے خیالات کی تردید کرنا تھا، لیکن سرسید اپنی دُھن کے پکے تھے۔ اُنہوں نے اپنے خلاف کفر کے فتوے تک لگنے کے باوجود اپنا مشن جاری رکھا۔ اس کے زیرِ اثر کئی بے حوصلہ دانشوروں کے قلم متحرک ہو گئے۔ اس تحریک کے فیض سے ۱۸۷۵ء میں وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم ہوا جو آج علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے مرتبے کو پہنچا اور اسی نام سے مشہور ہوا۔

ان سے قبل بنگال میں اخبار سمباد کومدی کے بانی ایڈیٹر راجہ رام موہن رائے نے جب سماجی اصلاحات کے لیے جد و جہد کی تھی تو قدامت پسند برہمنوں نے ان کی سخت مخالفت کی تھی۔ لیکن راجہ رام موہن رائے بالآخر انسدادِ ستی اور شادیِ بیوگان کے قوانین پاس کرانے میں کام یاب ہو گئے تھے۔

اُنیسویں صدی کے یہ دو سماجی ریفارمر ہماری صحافت کے درخشاں کردار ہیں۔ سرسید نے نہ صرف معاشرے کی اصلاح کے لیے بیداری پیدا کی بلکہ اردو زبان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بھی جگایا اور ایک سادہ اور استدلال پرور نثر لکھنے کا رواج ڈالا۔ مولانا حالؔی نے حیاتِ جاوید میں لکھا کہ سرسید کے طرزِ تحریر نے اردو صحافت میں ترقی کی رُوح پھونک دی۔ بعد میں شیخ عبدالقادر نے اپنے ماہ نامہ مخزن کے اولین شمارے (اپریل ۱۹۰۱ء) کے اداریے میں کہا کہ نئے اردو ادب میں سادگی پسندی کا جو نیا مذاق پیدا ہوا، وہ بہت کچھ تہذیب الاخلاق کے نامور ایڈیٹر اور اس کے فاضل مضمون نگاروں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔

## پنچ رسالے

اِس دَور میں اردو کی ادبی صحافت میں ایک اور باب کا اضافہ ہوا۔ طنز و مزاح سے لبریز پنچ رسائل شروع ہوئے۔ ان جریدوں کا مقصد عوام میں سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کا نیا شعور پیدا کرنا تھا۔ 'تہذیب الاخلاق' اور اسی قسم کے دوسرے جریدوں سے فضا میں جو سنجیدگی اور کرختگی پیدا ہو گئی تھی، اسے ان پنچ رسالوں نے متوازن کرنے کا بے مثل کام کیا۔

اس سلسلے کا پہلا رسالہ "مذاق" تھا۔ جو ۱۸۵۵ء میں رام پور سے نکلا۔ پھر تقریباً ربع صدی تک ظرافت کے تقریباً ۴۵ مزید فوارے پھوٹے۔ آج ان کے نام بھی گنوائیں تو اس دَور کا قریب قریب پورا ہندوستان قہقہے لگاتا سامنے آتا ہے مثلاً بہار پنچ (پٹنہ)، روہیل کھنڈ پنچ (مراد آباد)، کلکتہ پنچ (کلکتہ)، دہلی پنچ (لاہور)، میرٹھ پنچ (میرٹھ)، سرپنچ ہند (لکھنؤ)، لکھنؤ پنچ (لکھنؤ)، سرپنچ (بمبئی)، ہریانہ پنچ (جھجر)، کرناٹک پنچ (مدراس)، دہلی پنچ (دہلی)، دکن پنچ (حیدر آباد دکن) آگرہ پنچ (آگرہ) بمبئی پنچ بہادر (بمبئی) بنارس پنچ وغیرہ۔

یہ پنچ رسائل نثر اور نظم دونوں میں اپنے قارئین کی ذہنی تفریح اور تربیت کا سامان مہیا کرتے تھے۔

ان رسائل میں سب سے زیادہ شہرت اودھ پنچ نے پائی۔ اسے منشی سجاد حسین نے ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے جاری کیا تھا۔ یہ تقریباً ۳۶ سال تک ظرافت کی صحافت پر حکمرانی کرتا رہا۔ پنڈت برج نارائن چکبست کے الفاظ میں "جو پھبتی اس میں نکل جاتی وہ مہینوں زبان پر رہتی اور دُور دُور تک مشہور ہو جاتی۔"

اس دور میں انگلستان کے انگریزی رسائل کے اثرات ہماری صحافت پر نمایاں طور پر پڑے مثلاً سرسیّد کا "تہذیب الاخلاق" لندن کے Tatler اور Spectator کی روایت پر نکلا اور "اودھ پنچ" "لندن پنچ" کے طرز پر نکلا۔ "اودھ پنچ" اور دوسرے پنچ رسالوں نے ہندوستان میں ظریفانہ صحافت کو ایک اہم مقام و مرتبہ عطا کیا۔ یہ آج ہماری صحافت کا لائقِ رشک سرمایہ تصوّر کیے جاتے ہیں۔

"اودھ پنچ" ہندوستان کا اوّلین جریدہ تھا، جس نے کسی موضوع کے مضحکہ خیز پہلو کو نمایاں کرنے اور مخالف کو نیچا دکھانے کے لیے کارٹون کا حربہ استعمال کیا۔ اس نے وزیر علی شوقؔ اور گنگا سہائے نام کے اردو صحافت کے اوّلین کارٹون نگاروں کے شاہکار پیش کیے۔ اس کے دیگر قلمکاروں میں پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، مرزا مچھو بیگ ستم ظریفؔ، اکبرؔ الٰہ آبادی، پنڈت تربھون ناتھ ہجرؔ، منشی جوالا پرشاد برقؔ، منشی احمد علی شوقؔ، پنڈت برج نارائن چکبست اور منشی احمد علی کسمنڈوی شامل تھے۔

اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین خود ایک بڑے صاحب طرز اور موثر قلم ادیب تھے۔ ان کے اخبار میں سیاسی نثر کی بھی بڑی گرم بازاری رہی۔ منشی سجاد حسین انڈین نیشنل کانگریس کے جس کا قیام ۱۸۸۵ء میں ہوا، سرگرم رکن تھے۔ اور اس کے مخالفوں سے لوہا لینے میں پیش پیش تھے۔ ان کے کالموں میں سرسیّد کی تحریریں جو کانگریس سے علیحدگی پر زور دیتی تھیں، موضوعِ بحث

رہیں۔

## بیسویں صدی کا آغاز

بیسویں صدی کا آغاز مخزن سے ہوا۔ جو اپریل ۱۹۰۱ء میں لاہور سے جاری ہوا۔ اس کے مالک و ایڈیٹر شیخ عبدالقادر تھے، جنھوں نے اردو کی ادبی صحافت کے نئے امکانات کو محسوس کیا اور ان کے حصول کے لیے ٹھوس اور قابلِ قدر اقدام کئے۔ اُنھوں نے اپنے اوّلین اداریے میں کہا کہ اردو ایک نوعمر زبان ہے۔ جس میں نگارشات کا ذخیرہ تو ہے، لیکن اس کی کیفیت محلِ نظر ہے۔ اس کی سب سے مایۂ ناز صنف نظم میں سرتا سر بناوٹ ہے۔ اُنھوں نے پوچھا کہ اس سے بڑھ کر تصنّع کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ہمارے اکثر شعرا نے لیلیٰ مجنوں، اور شیریں فرہاد کی ناکامیوں کی تشہیر میں اپنی قوتیں صرف کر دیں۔ اُنھیں اس عظیم الشان اور وسیع ملک ہندوستان سے کوئی دوایسے پریمی تلاش کرنے کا خیال نہ ہوا جن کی محبت کے قصّوں سے وہ اپنی نظم میں کام لیں۔ اس کثیر الوقوع معاملے میں وہ کتبِ فارسی کے دست نگر رہے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ جو شوق ہمارے اکثر شعرا نے نظم میں ظاہر کئے ہیں، ان میں سے بہت سے ان کے اصلی شوق نہیں صرف تقلیدی ہیں۔

شیخ عبدالقادر نے اس رجعت پسند ذوق کو بدلنے کے لیے ایک طرف تو ہندوستان کے تخلیقی سرمائے اور جذبے سے کام لینے اور دوسری طرف نو آمدہ انگریزی ادب کے رجحانات سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیا۔

شیخ صاحب کا اندازِ فکر مغربی تھا۔ لیکن اس دور میں نئے رجحانات مغرب ہی سے وارد ہوئے تھے۔ شیخ صاحب کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہمارے قلم کار نئے رجحانات سے متعارف ہوں اور فیض حاصل کریں۔ تاہم اُنھوں نے اعلان کیا کہ مخزن کے مضامین بالعموم ایسے ہوں گے جو کسی ایک مذہب یا ملّت کے مذاق تک محدود نہ ہوں گے۔ اور اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی دل چسپی کا سامان کیا جائے گا۔ چنانچہ ان کے معاونین میں شیخ محمد اقبالؔ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی، لالہ سری رام دہلوی، مولانا فضل الحسن حسرتؔ، لالہ مدن گوپال اگروال، منشی پیارے لال شاکر دہلوی، منشی دیا ترائن نگم، سید سجاد حیدر، جناب غلام بھیک نیرنگ، چودھری خوشی محمد ناظر، قاری سرفراز حسین عزمی دہلوی اور مختلف نظریات کے دیگر ادیب شامل تھے۔

اس رسالے نے اردو ادب کو بناوٹ کی راہوں سے نکال کر سادگی کی راہوں پر گامزن کیا اور اردو شاعری کے لیے بالخصوص نئے رجحانات کی نشاندہی کی۔ اس نے انگریزی کے ممتاز شعرا کے کلام کے منظوم ترجمے شائع کئے۔ جن کے مترجمین میں ڈاکٹر محمد اقبال اور مولانا ظفر علی ایسے صاحبِ استعداد شعرا شامل تھے۔

رسالہ جاری کرنے کے ساڑھے تین سال بعد شیخ عبدالقادر بیرسٹری کی تعلیم کے لیے ولایت چلے گئے۔ اور ادارت کا سارا کام اپنے معاون شیخ محمد اکرام کے سپرد کر دیا۔ بعد میں اس رسالے کے مقاماتِ اشاعت اور اہلِ نظم و عمل میں کئی تبدیلیاں ہوئیں، لیکن اس پر شیخ عبدالقادر کا نام بطور اعزازی ایڈیٹر برابر چھپتا رہا۔

## "زمانہ" کی خدمات

فروری ۱۹۰۳ء میں بریلی سے ایک ماہ نامہ "زمانہ" شروع ہوا۔ جس نے اُردو کی ادبی صحافت کے لیے نہایت منفرد کام کیا۔

اس کے اوّلین ایڈیٹر مہرشی شیوبرت لال ورمن تھے، جو اپنے زمانے کے ایک ممتاز ادیب اور مصنف تھے۔ کثرتِ تصانیف کے اعتبار سے وہ خواجہ حسن نظامی کے ہم پلّہ کہے جا سکتے ہیں۔

نومبر ۱۹۰۳ء میں رسالہ کے بانی اور مالک منشی راج بہادر نے کان پور کے ۲۱ سالہ ایک نئے گریجویٹ منشی دیا نرائن نگم کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ اور پھر ان ہی کی آسانی کے لیے 'زمانہ' کا دفتر بھی کان پور میں منتقل ہو گیا۔

اُنھوں نے 'زمانہ' کے صفحات میں جدید ادبی نثر کا ایک ایسا سرمایہ پیش کیا جس کا معیار اعلیٰ اور مزاج نمایاں طور پر سیکولر ہے۔ [illegible] قومی سیاسیات پر بھی [illegible] نگارشات شائع کیں۔ ان اہلِ قلم میں [illegible] شامل تھے، جن کے افسانوں کی شہرت ہندوستان کی سرحدوں سے باہر بھی پھیلی۔

ڈاکٹر شفیع احمد عثمانی نے [illegible] 'زمانہ' کے سارے فائل کا جائزہ لینے کے بعد بتایا ہے کہ اس کے چھیالیس ۴۶ سال کے شماروں میں ادبی اور دیگر موضوعات پر کُل ۳۴۲۳ نثری مشمولات اور مختلف اصناف میں ۳۹۹۱ منظومات شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ منشی صاحب کے اپنے قلم سے تقریباً ۳۰۰ مضامین ہیں جو بیشتر ان کے مستقل عنوان "رفتارِ زمانہ" کے تحت لکھے گئے۔ ایک طرح سے اس رسالے کے صفحات میں ہندوستان کے حالات اور اردو زبان کی بیسویں صدی کے اوّل نصف کی چشم دید داستان ملتی ہے۔ یہ رسالہ اپنے دور کی ادبی صحافت کا سرتاج تھا۔

منشی دیا ترائن نگم کے پاس مجلاتی صحافت کا ایک واضح تصوّر تھا۔ روایت ہے کہ "مخزن" کے ایڈیٹر شیخ عبدالقادر نے منشی دیا ترائن

نگم کو لکھا کہ وہ 'زمانہ' کو سیاسیات سے الگ رکھیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ سیاسیات کی آمیزش ایک ادبی مجلّے کے ادبی مزاج میں خلل انداز ہو سکتی ہے۔

اس کے برعکس منشی صاحب کا خیال یہ تھا کہ ایک ادبی مجلّہ اپنے قارئین کی سیاسی اور سماجی ضرورتوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

اُنھوں نے شیخ صاحب سے کہا کہ وہ اپنے مجلّہ میں صحت مند سیاسی ذوق کی آبیاری کریں۔

ایک اور روایت ہے کہ ۱۹۲۵ء میں جب وہ 'زمانہ' کا قومی نمبر نکال رہے تھے تو ان کے معاون احسن صاحب نے اس کے خلاف مشورہ دیا اور کہا کہ 'زمانہ' کو خالص ادبی پرچہ رہنا چاہیے۔

منشی صاحب نے کہا "مولانا، زمانہ کے انداز کو سمجھیے۔ حالیؔ، چکبستؔ اور اقبالؔ کی شاعری کو آپ کیا کہیں گے۔ ان کے یہاں کیا نہیں ہے؟ نیشنلزم، مذہبی مسائل، مسلمانوں کا اتحاد، ہندوستان کی آزادی۔ ادب زندگی سے کس طرح الگ ہو سکتا ہے۔ میں تو 'زمانہ' میں سیاست، آرٹ، موسیقی، رقص، مذہب، تاریخ اور سب ہی موضوعات پر مضمون چھاپنا چاہتا ہوں۔ آپ دیکھ لیجئے گا کہ آئندہ ادبی پرچے ایسے ہی ہوں گے اور پھر لوگ کہیں گے کہ اس رنگ کی ابتدا 'زمانہ' سے ہوئی"۔
(نقوش شخصیات نمبر دوئم۔ مضمون از علامہ ابومحمد ثاقب)

## رسائل اور تحریکِ حریت

"زمانہ" کے اجرا کے چھ ماہ بعد جولائی ۱۹۰۳ء میں مولانا فضل الحسن حسرت موہانی نے علی گڑھ سے ماہ نامہ 'اردوئے معلّیٰ' جاری کیا۔ یہ بھی اپنی نوعیت کا معرکہ خیز مجلّہ تھا۔ اس میں ادبی، تاریخی اور تنقیدی مضامین اور عصری رسائل و کتب پر تبصرے ہوتے تھے۔ تاہم اس میں منظومات کا حصّہ غالب رہتا تھا۔ اس میں نامور شعرا کے حالاتِ زندگی اور ان کے دواوین کا انتخاب شامل ہوتا تھا۔

اس رسالہ کی ایک اور خصوصیت تھی کہ یہ سیاسی مسائل میں سرگرم دلچسپی لیتا تھا۔ یہ پہلا رسالہ تھا، جس نے کہ نہ صرف مکمّل آزادی کا مطالبہ بلکہ اس کے لیے جہاد کیا۔ اور یہ جہاد بھی ایک ایسے زمانے میں کیا، جب فرنگی حکومت کسی لب سے آزادی کا لفظ تک سُننے کے لیے تیار نہ تھی۔ چنانچہ یہ رسالہ اپنے آغاز سے قریب دس سال تک حکومت کے جبر و استبداد کا شکار رہا۔ نتیجتاً اس کی اشاعت میں کئی بار رخنے پڑے۔

مولانا حسرت موہانی شاعر اور عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیاست داں اور مجاہدِ آزادی بھی تھے۔ وہ اپنے اس جہاد میں اپنے قارئین اور بالخصوص مسلم قارئین کو شامل کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ اُنھوں نے اپنے رسالے کے بارے میں کہا کہ اس کے اجرا کا مقصد صرف ایک ہے — "اصلاحِ مذاق"۔ یہ اصلاح گلدستوں کی صحافت کی جذباتیت اور مزاحیہ صحافت کے پھکّڑپن سے پیدا ہونے والے ذوق کی اصلاح بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن مولانا نے اسے عوامی مزاج اور بالخصوص مسلمانوں کے مزاج کے دوسرے پہلوؤں تک بھی وسعت دی۔

اردو صحافت کے بے بدل محقق اور مبصّر جناب عتیق صدّیقی مرحوم کے مطابق (ماہ نامہ آج کل حسرت نمبر ۱۹۸۱ء) مولانا کا مقصد مسلمانوں کے اس مذاقِ سیاست کو یکسر بدلنا تھا، جسے اُنیسویں صدی کے آخری چوتھائی میں سرسیّد مرحوم نے اُن کے بالائی اور بالائی متوسط طبقے کے سیاسی مزاج کا خاصہ بنا دیا تھا۔ سرسید نے اپنے زمانے میں سیاست کو مسلمانوں کے لیے شجرِ ممنوعہ قرار دیا تھا۔ مولانا حسرت نے انہیں کانگریس میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔ اردوئے معلّیٰ کے اوراق میں کانگریس کی پالیسیوں کی حمایت میں مقالات اور ادارتی نوٹ ہی نہیں شائع ہوئے بلکہ اس کے سالانہ اجلاس کی کارروائیوں کے ترجمے بھی ضخیم ضمیموں کی شکل میں شائع ہوئے۔

اسی سال (نومبر ۱۹۰۳ء) میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے اپنا ماہ نامہ "لسان الصدق" نکالا۔ یہ ایک علمی، ادبی اور اصلاحی رسالہ تھا، جس کے مقاصد میں اردوئے معلّیٰ کی طرح مسلم معاشرت اور رسوم کی اصلاح کرنا بھی شامل تھا۔

ابتدا میں یہ رسالہ سرسید کی سیاسیات سے متاثر تھا۔ لیکن جلد ہی اس کے ایڈیٹر مولانا آزاد نے اپنے دوست اور "الندوہ" (لکھنؤ) کے ایڈیٹر مولانا شبلی نعمانی کے مشورہ پر قوم پرستی کا مسلک اختیار کیا اور ساری عمر وہ اسی مسلک پر قائم رہے۔ اس کا موثر ترین اظہار ان کے شہرۂ آفاق اخبار اور ہندوستان کے اوّلین سیاسی ہفت نامہ الہلال (کلکتہ ۱۹۱۲ء) میں ہوا۔

'مخزن' اور 'زمانہ' کی طرح "لسان الصدق" نے بھی اردو کی ترقی کے لیے جدید علوم و فنون کے ترجموں کا سلسلہ قائم کرنے کی تلقین کی بہرحال اس رسالہ نے زیادہ عمر نہ پائی۔ اور مئی ۱۹۰۵ء میں بند ہو گیا۔

'مخزن' اور 'زمانہ' نے اردو کی ادبی صحافت پر بڑے گہرے نقوش چھوڑے۔ ان دونوں نے علم و ادب کا امتزاج پیش کرنے کی راہ دکھائی۔ اسی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ۱۹۰۵ء میں دہلی سے ماہ نامہ 'زبان' (ایڈیٹر خواجہ فہمید حسن) ۱۹۰۹ء میں لکھنؤ سے ماہ نامہ 'الناظر' (ایڈیٹر ظفر الملک علوی) ۱۹۱۰ء میں الہ آباد سے 'ادیب' (ایڈیٹر یکے بعد دیگرے نوبت رائے نظرؔ، پیارے لال شاکرؔ میرٹھی اور حسیرؔ عظیم آبادی) ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ سے

صبحِ اُمید (ایڈیٹر برج نارائن چکبست) جاری ہوئے۔ ان رسالوں کے مشمولات آج اردو کی ادبی صحافت کا کلاسیکی سرمایہ ہیں۔ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ) نے اپنے سہ ماہی 'جرنل' میں ان نایاب مشمولات کے انتخابات شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ان میں سے 'ادیب' اور 'صبحِ اُمید' کے انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔

## اردو کی لسانی تحریک

ہندوستان میں فروغِ اردو کی اوّلین اور ممتاز کُل ہند تنظیم انجمن ترقی اُردو ہے جس کا قیام جنوری ۱۹۰۳ء میں ہوا تھا، ۱۹۲۱ء میں اورنگ آباد سے اردو کا وہ اوّلین علمی اور ادبی رسالہ "اردو" شروع کیا، جس نے تحقیق کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت دی۔ اس کے ایڈیٹر مولوی عبدالحق نے جو ۱۹۱۲ء میں انجمن کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے — اُردو کی لسانی، علمی اور ادبی ترقی کے لیے اپنی ساری عمر اور پونجی وقف کر دی۔ اُنہوں نے کئی سال کی لگاتار محنت سے اردو، انگریزی کی ایک معیاری لُغت مرتب کی جو آج تک ہندوستان اور پاکستان میں اپنی قسم کی مستند ترین لغت سمجھی جاتی ہے۔

مولوی عبدالحق کے قائم کردہ "اردو" اور "ہماری زبان" نام کے جریدے آج بھی اردو زبان و ادب کے ترجمان کی حیثیت سے شائع ہو رہے ہیں۔ "اردو" کا نام اب "اردو ادب" ہے اور "ہماری زبان" جو ۱۹۳۹ء میں پندرہ روزہ کی شکل میں شروع ہوا تھا، اب ہفت روزہ کی حیثیت سے شائع ہوتا ہے۔

## منفرد نگار

۱۹۲۲ء میں جناب محمد خاں نیاز فتح پوری نے آگرہ سے ماہ نامہ "نگار" جاری کیا۔ جو ۱۹۲۳ء میں بھوپال اور ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ ان مکانی تبدیلیوں کے باوجود اس کے ایڈیٹر نے اوّلین دو برسوں ہی میں پورے ملک میں اپنے رسالہ کی دھاک بٹھا دی تھی۔

شیخ عبدالقادر اور منشی دیا نرائن نگم کی طرح علامہ نیاز فتح پوری بھی ادبی رسالہ کی جامعیت میں یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے برملا کہا کہ "میں 'نگار' کو خالص ادبی رسالہ تو نہ بننے دوں گا" ان کی کوشش یہ تھی کہ ادبیات کے ساتھ فنونِ لطیفہ، تاریخ، علوم و فنون، مذہب اور سیاست تمام مضامین اور موضوعات اس کے افق بنے۔ اُنہوں نے کہا کہ رسالہ کو ادب و علوم کا سنگم ہونا چاہیے۔

انہوں نے مختلف اصناف سے کام لیتے ہوئے خیال کی آزادی اور فکر کی جراَت کو تقویت دی۔ اُنہوں نے ادبی اور مذہبی دونوں محاذوں پر اپنے خیالات کے لیے جہاد کیا اور بالعموم اس میں کام یاب رہے۔ اُنہوں نے زبان اور خیال کے اعتبار سے اردو کی بھونڈی شاعری کے خلاف آواز بلند کی۔ گُل و بلبل کو داستانِ پارینہ قرار دیا۔ اردو کے عظیم شعرا مثلاً غالب، مومن، اقبال اور جوش وغیرہ کا از سرِ نو جائزہ لیا — اُن کے مراتب کا از سرِ نو تعین کیا۔

اپنے رسالہ کے ابتدائی تین سال میں اُنہوں نے اس کے لیے مختلف موضوعات پر کم و بیش ڈھائی ہزار صفحات خود ہی لکھے۔ کئی دفعہ پورا پورا رسالہ خود ہی تحریر کیا۔ اس کی ایک وجہ تو مضمون نگاروں کی کمی تھی اور دوسری بقول نیاز "مجھے "نگار" کے مخصوص حلقۂ احباب سے گلہ ہے کہ اُنہوں نے اپنے اپنے افکارِ دماغ سے میرا ساتھ نہیں دیا۔ وہ "ملاحظات" کے تحت اپنے خیالات اور نظریات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ایک ہی سال میں اُن کا مطالعہ کا عالم اس قدر وسیع اور دقیع ہو گیا کہ صرف اسی کی وجہ سے کتنے ہی لوگ اس کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔ اُن کے دم سے "نگار" اپنے دَور کی ادبی صحافت کے فکری عنصر کا روشن مینار بن گیا تھا۔

۱۹۲۹ء میں نیاز صاحب نے "نگار" کے خاص نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا اور "بہادر شاہ ظفر نمبر"، مصحفی نمبر، نظیر نمبر، ریاض نمبر، اردو شاعری نمبر، حسرت نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، افسانہ نمبر، علمی تنقید نمبر، داغ نمبر، علمائے اسلام نمبر، اسلامی فرماں روا نمبر، شیخ الاسلام نمبر، خدا نمبر، اسلامی ہند اور پاکستان نمبر جیسے ایک سے ایک اچھوتے نمبر نکال کر اردو کی ادبی صحافت کے کئی گوشوں کو روشن کیا۔

اُنہوں نے اپنی ادبی زندگی کا شاعری اور صحافتی زندگی کا آغاز ایک روزنامے "زمیندار" لاہور، سے کیا۔ لیکن بعد میں نہ شاعری کی زلفوں کے اسیر رہے نہ خبری صحافت کے پابجگزار۔ انہوں نے اپنی راہیں خود دریافت کیں اور اپنی فکری آزادی اور مطابقت پذیری سے یہ راہیں اس بخت اور شان سے دریافت کیں کہ پورے زمانے میں ان کے خیالات کا سکہ چل گیا۔

## فصلِ بہار

وادیٔ گنگ و جمن میں اردو کی ادبی صحافت اب اپنے عروج پر۔ دیگر لائقِ ذکر رسائل میں دہلی کا "ساقی" "تحریر" اور "کلیم"، لکھنؤ کا "فروغ"، آگرہ کا "نقاد" بھوپال کا "افکار" اور "جادہ" پٹنہ کا "صبحِ نو" اور حیدر آباد کا "سب رس" اور "صبا" بمبئی کا "ایشیا" "شاعر" "نوائے ادب" "نیا ادب" اور "مصوّر" شامل تھے۔

شیخ عبدالقادر کے مخزن کے سرورق پر اردو داں علاقے کا ایک نقشہ
ائع ہوا کرتا تھا۔ اس میں دکھایا جاتا تھا کہ اردو صرف لکھنؤ، دہلی، کان پور،
آباد اور بنارس کی مادری زبان ہے۔ پشاور، لاہور اور حیدرآباد میں یہ
عت مروج" ہے۔ اور کلکتہ، بمبئی، مدراس، بنگلور اور کشمیر میں یہ صرف
بھی جاتی ہے۔" مخزن" کے نقشہ میں ڈھاکہ اور کراچی شامل نہیں تھے۔
ہم ۱۹۴۷ء میں اردو کی ادبی صحافت ان شہروں تک بھی پہنچ چکی تھی۔

## ہور کی سبقت :

۱۹۴۷ء میں اس نقشہ کی کیفیت یہ تھی کہ غیر مادری زبان والے
ہور سے نیرنگ خیال، عالمگیر، خیام، ہمایوں، ادبی دنیا، شاہ کار،
ومان، ادبِ لطیف اور سویرا ایسے نمائندہ رسالے شائع ہو رہے تھے۔
ن میں سے اکثر رسالے پورے ملک میں مقبول ہوئے۔ ان کے مواد اور
عیار نے لاہور کو بیسویں صدی کے دوسرے ربع کی اردو صحافت کا نہری
دور عطا کر دیا تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس مرکز نے نئے رجحانات
ور ترقی پسندی کی نئی تحریک کو بڑی گرم جوشی سے لبیک کہا۔ ہندوستان
ں اس تحریک کا اوّلین اجلاس ۱۹۳۶ء میں پریم چند کی صدارت میں
کھنؤ میں ہوا تھا۔ زندہ دلانِ لاہور نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور سویرا کی
صورت میں اس کا ایک باقاعدہ ترجمان جاری کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب
ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد اپنے شباب پر تھی۔ ترقی پسند تحریک
یں اس جدوجہد سے قدم ملانے کا حوصلہ تھا۔ جس نے اسے مقبول بنانے میں
بڑی مدد کی۔ خوش قسمتی سے اس تحریک کو" جس کا شباب آزادی کے چند ہی سال
بعد ڈھل گیا" نظم اور نثر دونوں اصناف میں بڑے اچھے ادیب ملے۔
ان ادیبوں نے ادب کے نئے زاویوں سے نہ صرف پرانے قارئین کو متوجہ
کیا بلکہ نئے قارئین کا بھی ایک پورا جہان تیار کیا۔ ان ادیبوں میں
کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، فیض احمد فیض، عصمت چغتائی، ن۔م۔ راشد،
راجندر سنگھ بیدی، جوش ملیح آبادی، سردار جعفری، قرۃ العین حیدر،
کنہیا لال کپور، اور دیگر مشہور قلم کار شامل تھے۔

بیسویں صدی کے دوسرے ربع میں لاہور میں اتنی اہمیت اختیار
کر لی تھی کہ اتر پردیش میں اہل زبان کے ممتاز نمائندے علامہ نیاز فتح پوری نے
بھی اسے اردو ادب کا جدید مرکز تسلیم کیا۔

بہرحال، ۱۹۴۷ء میں اردو کی ادبی صحافت کا ایک بڑا مرکز لاہور تھا۔
جو تقسیم کے بعد پاکستان کا حصہ ہو گیا۔ یہ تمام رسالے پاکستان کا سرمایہ بن گئے۔
ان کے علاوہ ہندوستان کے کچھ پرانے رسالے بھی وہاں ہجرت کر گئے۔ ان میں
ساقی، افکار اور نگار نمایاں ہیں۔

## آزادی کے بعد :

لیکن ہندوستان تہی دامن نہ ہوا۔ بلکہ اس میں نئے رسالوں کی اشاعت
سے ادبی صحافت کے نئے مرکز قائم ہو گئے۔ کچھ پرانے رسالے بھی جاری و ساری
رہے۔

آج ہندوستان پوری دنیا میں اردو اخباروں اور رسالوں کا سب
سے بڑا مرکز ہے۔ تازہ ترین سرکاری اعداد کے مطابق (دسمبر ۱۹۸۱ء تک)
ہندوستان میں چھپنے والے اردو اخبارات کی مجموعی تعداد ۱۲۹۹ ہے، جو ۱۹۴۷ء
کی تعداد کے دوگنا سے بھی زیادہ ہے۔ اس تعداد میں ادبی اور ثقافتی زمرے
میں ۱۸۹ رسالے ہیں۔ ۱۹۴۷ کی تقسیم کے فوراً بعد ان کی تعداد کیا تھی اس
کے بارے میں کوئی سرکاری اعداد میسّر نہیں۔ البتہ ۱۹۶۰ء میں جس سال
سے یہ اعداد الگ سے ملنا شروع ہوئے، ان کی تعداد ۹۶ تھی۔ ۱۹۸۱ء کی
طویل فہرست میں بہت سے رسالے ایسے ہیں جو بیس سال یا اس سے زیادہ
برسوں سے نکل رہے ہیں۔ ان میں بیسویں صدی (دہلی)، شمع (دہلی)، شانِ ہند
(دہلی) جامعہ (دہلی) فروغ اردو (لکھنؤ) شب خون (الہ آباد) شاعر (بمبئی)
صبحِ اُمید (بمبئی) گگن (بمبئی) سب رس (حیدر آباد) شگوفہ (حیدر آباد)
آہنگ (گیا) سہیل (گیا) اور دیگر شامل ہیں۔

کچھ اور رسالے ایسے ہیں جو دس دس سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ
کی باوصف اشاعت کے بعد اقتصادی یا دیگر وجوہ سے بند ہو گئے۔ ان میں
شاہراہ (دہلی) محور سہ ماہی (دہلی) تحریر (دہلی) تحریک (دہلی) شاہکار (الہ آباد)
کتاب (لکھنؤ) وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن اگر کچھ رسالے بند ہوتے ہیں تو چند اور
نئے بھی نکلتے رہتے ہیں۔

ملک کی سولہ ریاستوں اور یونین علاقوں سے اردو کے ادبی رسالے
نکلتے ہیں۔ بہت ساری مرکزی اور ریاستی حکومتیں اور ان کی اردو اکیڈمیاں
بھی ادبی اور ثقافتی رسالے شائع کر رہی ہیں۔ ان میں ماہ نامہ آج کل
(نئی دہلی) سرِفہرست ہے۔ اس کے علاوہ سہ ماہی دلّی (دہلی) ماہنامہ
نیا دور اور سہ ماہی اکادمی (لکھنؤ) سہ ماہی زبان و ادب (پٹنہ)
ماہ نامہ تعمیر اور شیرازہ (سری نگر) سہ ماہی امکان (بمبئی) ماہنامہ آندھرا پردیش
اور سہ ماہی قومی زبان (حیدر آباد) ماہ نامہ پاسبان (چنڈی گڑھ)
تعمیرِ ہریانہ (چنڈی گڑھ) اور پندرہ روزہ مغربی بنگال (کلکتہ) جن میں سے
اکثر بہت دیدہ زیب اور مقبول ہیں۔

محبِ ہند کے سالِ آغاز ۱۸۴۷ء سے آزادیٔ ہند کے سالِ آغاز ۱۹۴۷ء
تک ادبی صحافت کی ایک صدی مکمل ہوتی ہے۔ اس عرصہ میں اس صحافت کی
کیفیت بڑی رنگا رنگ رہی۔ اس میں کئی تجربے ہو چکے ہیں۔ (آگے ۳۶ پر)

عبدالقوی دسنوی

مولانا ابوالکلام آزاد رانچی میں پہلی بار قید و بند کی زندگی گزارنے کے بعد جب ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا ہوئے تو آپ نہ منفرد اور معتبر صحافی ہی نہیں بلکہ نڈر رہنما اور بے باک سیاست داں بھی شمار کیے جانے لگے تھے۔ پچھلے بیس اکیس سال میں وہ ”خدنگ نظر“، الندوہ اور وکیل کی ادارت میں شامل بھی رہے تھے۔ اور ”المصباح“ ”لسان الصدق“ ”الہلال“ اور ”البلاغ“ کے مالک و مدیر بھی رہ چکے تھے۔ ان میں خاص طور سے آخری دو ہفتہ وار نے اردو صحافت کو زبان دی تھی، وقار عطا کیا تھا اور اسے بامقصد بنانے میں زبردست کردار ادا کیا تھا —— چنانچہ سارے اردو دنیا میں مولانا آزاد، ایک باہمت صحافی اور ہمدردِ ملک و ملت کی حیثیت سے نہ صرف جانے جاتے تھے، بلکہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے۔

صحافت کے میدان میں اُن کی نمایاں کامیابی اور واضح انفرادیت کی وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں ابتدا سے صحافت سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ اس کے فن سے واقفیت رکھتے تھے اور کتابت، طباعت اور تزئین کے بڑے اچھے سلیقے کے مالک بھی تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ”الہلال“ اور ”البلاغ“ اُن کی شخصیت کا حصہ بن گئے۔ اسی لیے مولانا آزاد کی زندگی اور کارناموں کا جب بھی جائزہ لیا جاتا ہے بات الہلال اور البلاغ تک پہنچتی ہے اور ان کی شخصیت کو تکمیل تک پہنچاتی ہے۔ یہ بات یہیں ختم نہیں ہوتی، جب تک یہ کہا نہ جائے کہ الہلال (حصہ اوّل) اور البلاغ ان کی حیات اور خاص طور سے صحافتی زندگی کے بلندترین مقام کی نشان دہی کرتے ہیں۔

● صدر شعبۂ اردو۔ سیفیہ کالج، بھوپال

بلاشبہ اس کے بعد ۱۹۲۷ء میں ایک بار وہ پھر الہلال دورِ ثانی کے شمارے لیے ہوئے صحافت کی قلمرو میں داخل ہوئے ہیں۔ لیکن نقشِ ثانی نقشِ اوّل سے بہتر تو کجا برابری بھی نہیں کر سکا۔ مشابہت ضرور تھی، لیکن مماثلت نہ ہو سکی —— حالانکہ اُس وقت مولانا آزاد ہندوستان کی سیاست میں نمایاں کردار ادا کر رہے تھے۔ ہندوستان کی عظیم سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس کے مطابق صدر اور محترم رہنما شمار کیے جانے لگے تھے۔ اُن کے صحافتی کارناموں کا زوال اسی سیاسی عروج کی وجہ سے ہوا۔ اس لیے کہ اب نہ وہ زیادہ دلچسپی لے سکتے تھے، نہ وقت دے سکتے تھے۔ یہ مجبوری ۱۹۱۹ء کے بعد سے شروع ہوتی ہے، جب وہ پہلی بار قید و بند کی زندگی سے نجات پاکر عملی سیاست میں داخل ہوئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

> ”جنوری ۱۹۲۰ء میں جب میں نظربندی کے گوشۂ قید و بند سے نکلا تو دو سال پیشتر کا یہ نقشۂ عمل میرے سامنے تھا اور اسی لیے نہ تو مجھے واقعات کی رفتار کا انتظار تھا نہ مزید غور و فکر کا، بلکہ صرف شغل و عمل شروع کر دینا تھا۔ میں نے آئندہ کے لیے جن اُمور کا ارادہ کیا تھا، اُن میں ایک بات یہ بھی تھی کہ رانچی سے نکلتے ہی کسی گوشۂ عزلت میں رفقاء و طالبین کی ایک جماعت لے کر بیٹھ رہوں گا اور اپنی زبان و قلم کی خدمات میں مشغول ہو جاؤں گا —— تصنیف و تالیف کے علاوہ جو جماعتی اعمال پیشِ نظر تھے ان کے لیے بھی سیر و گردش اور نقل و حرکت کی ضرورت نہ تھی قیام و استقرار ہی مطلوب تھا۔“[1]

[1] ”پیغام“ کلکتہ ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء ص ۲

گے مزید وضاحت کرتے ہیں :

"میں نے جنوری ۱۹۲۰ء کے آخر تک پوری جدوجہد کی موجودہ تحریک کی خدمات کو اس عنوان سے انجام دوں کہ میرا قرار دادہ اسلوبِ عمل بھی قائم رہے اور اقلاً سیر و گردش کے کاموں سے الگ رہوں؛ لیکن حالات کی نزاکت، مقاصد کی ناگزیر احتیاجات اور اشخاص کے فقدان نے میری کوششوں کو کامیاب ہونے نہ دیا۔ کچھ عرصہ تک کشمکش جاری رہی اور بالآخر مجھے فیصلہ کر لینا پڑا کہ اصلی فیصلہ وہی ہے جو وقت اور ضرورت نے کر دیا ہے اور اب تمام تر اسی کے لیے وقف ہو جانا ہے۔ اس حالت کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنوری ۱۹۲۰ء سے اس وقت تک کا زمانہ جو ۱۸ ماہ سے زیادہ ہو چکا ہے تمام تر پے در پے دوروں اور عام تحریک کی فکروں اور کاوشوں میں بسر ہو گیا اور تمام دوسرے مشغلے یک قلم ملتوی کر دینے پڑے، نہ تصنیف و تالیف کی تکمیل ہو سکی، نہ طباعت و اشاعت کی فکر کر سکا۔ نہ البلاغ جاری کیا جا سکا' نہ اپنے پیشِ نظر مہمات کار دل جمعی کے ساتھ انجام پا سکے۔ ساری باتیں قیام سکون پر موقوف تھیں اور ان اٹھارہ مہینوں میں ایک شب و روز کے لیے بھی میسر نہ آسکا۔ زندگی وہی زندگی ہے جو سب کے لیے مقدر ہوئی ہے۔ وقت وہی شب و روز کا وقت ہے، جو ہمیشہ سے چلا آتا ہے نہ سورج میرے لیے زیادہ دیر تک ٹھہر سکتا ہے نہ رات میری خاطر اپنا معمول بدل دے سکتی ہے۔ ایک زندگی ہے، لیکن سینکڑوں زندگیوں کا حوصلہ دل میں پنہاں ہے۔ کیونکر دنیا کو پلٹ دوں؟ اور کہاں سے اس طاقت کو بلا لوں جو ایک دل و دماغ کے ساتھ سینکڑوں ہزاروں ہاتھوں کو جوڑ دے!"

۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کا زمانہ خلافتِ تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔ سودیشی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ فرنگی مال کے مقاطعہ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، عدم تعاون کی گرما گرمی تھی۔ یہی وقت پرنس آف ویلز کی ہندوستان میں آمد کے خلاف احتجاج کا تھا۔ ان سیاسی لہروں سے سارا ہندوستان متاثر تھا۔ یہ تیز بھی تھیں اور شدید بھی۔ اسی ۱۹۲۰ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ملاقات گاندھی جی سے ہوتی ہے۔ اسی ۱۹۲۰ء میں وہ کانگریس کی رکنیت قبول کرتے ہیں اور اپنے مستقبل کے لیے راہیں متعین کرتے ہیں۔

ایسے سیاسی ہنگاموں اور مصروفیات نے مولانا آزاد کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ کوئی ہفتہ وار جاری ہونا چاہیے تاکہ اس کے ذریعہ اپنی بات دور دور تک پہنچائی جا سکے اور سیاسی حالات و واقعات سے پورے ملک کو نہ سہی اردو والوں کو باخبر رکھا جا سکے اور ذمہ داریوں کا احساس دلایا جا سکے۔ لیکن وہ اپنی معروف زندگی میں نہ تو خود الہلال جیسا رسالہ نکال سکتے تھے، نہ اس کی ذمہ داریوں کو قبول کر سکتے تھے۔ چنانچہ رقم طراز ہیں :۔

"پس اگر بحالتِ موجودہ اس ضرورت کا کوئی علاج میرے اختیار میں تھا تو وہ یہی تھا کہ دیگر اہلِ قلم کے زیرِ اہتمام ایک رسالہ جاری ہو جاتا۔ مسلک و مشرب کی نگرانی میرے ذمہ رہتی اور جس قدر بھی فرصت ہاتھ آتی وقت کے ضروری مسائل و مقامات پر میری تحریرات وقتاً فوقتاً اس میں شائع ہوتی رہتیں۔"

اس الجھن کو انہوں نے ایک ہفتہ وار رسالہ "پیغام" نکالنے کا فیصلہ کر کے سلجھایا۔ سائز الہلال سے چھوٹا مقرر کیا۔ ٹائپ میں چھپنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے لیتھو کی چھپائی ہی کو پسند کیا۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مُدیر کی حیثیت سے انتخاب کیے گئے۔ اور خود نگرانی کی ذمہ داری قبول کی چنانچہ اس کا پہلا شمارہ ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو دفتر البلاغ، ۵۴ رپن روڈ کلکتہ سے شائع ہوا۔ فضل الدین احمد مرزا نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

اور حسبِ ذیل مقاصد طے کیے گئے :

۱۔ موجودہ تحریک کے لیے تبلیغ و ہدایت کا ایک باقاعدہ سلسلہ قائم ہو جائے۔

۲۔ گاہ گاہ علمی و مذہبی مضامین کے لیے بھی گنجائش نکالی جائے گی۔

۳۔ تفسیر قرآن کے بعض مناسب وقت مباحث اور حصے بھی شائع ہوتے رہیں گے۔

۴۔ رسالہ میں مقالات اور مختارات کے علاوہ استفتاء اور استفسارات کے ابواب بھی بالالتزام رہیں گے۔

اور اسلوب و اندازِ بیان کے متعلق یہ اعلان بھی کیا :

"ہر تحریر کا ایک موضوع اور مقصد ہوتا ہے اور اس کا اسلوب اور اندازِ بیان اسی کے مطابق اختیار کیا جاتا ہے۔ اس رسالہ کا مقصد صرف تبلیغ ہے۔ انشاء و ادب نہیں ہے۔ پس جس قدر مضامین نکلیں گے،

نہایت صاف، سہل اور آسان زبان میں ہوں گے۔
اس کے اوراق سے الہلال کے لٹریچر کی توقع صحیح نہ ہوگی۔
یہ بھی وعدہ کیا کہ "وقت کے ضروری معاملات و سوالات کی نسبت" مولانا کی تحریریں بالالتزام شائع ہوتی رہیں گی۔
لیکن اس ہفتہ وار کے کل تیرہ شمارے منظر عام پر آئے۔ شمارہ نمبر ۲، ۳، ۴ یک جا پیش کیے گئے۔ باقی تمام نمبر الگ الگ شائع ہوئے اور مقبول ہوئے۔
یہ بات صحیح ہے کہ پیغام نے اس مختصر مدت میں اپنا کوئی مقام یا مزاج نہیں بنایا، لیکن اس کی یہ خوبی ضروری تھی کہ اس میں اس دور کے ہندوستان کے سیاسی حالات اور ممالک اسلامیہ کی خبریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ساتھ ساتھ مولانا آزاد کے افکار و نظریات، رجحانات و مصروفیات سے آگاہی ہوتی رہتی تھی، جو آج مولانا آزاد کی سوانح حیات سے دل چسپی رکھنے والے کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ رسالے کی مشمولات اور اہم خبریں اور تحریریں ملاحظہ کیجیے:

شمارہ نمبر ۱ ——— ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء

- باب فتح و مقصود کا افتتاح۔ محمد علی شوکت علی کے سفر حق کا اختتام اور گرفتاریوں کی ابتدا (سرورق)
- پیغام: مقالہ افتتاحیہ (ابوالکلام احمد)
- حضرت مولانا کے پیغام ——— (ابوالکلام احمد) علی برادر کی گرفتاری، سودیشی کی فتح، مالیبار کی بدامنی، مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب۔ خلافت کمیٹی کو اب کیا کرنا چاہیے۔
- حضرت امیر شریعت صوبہ بہار کا فرمان (محمد بدرالدین)
- مقالات: انقلاب فرانس (پہلی قسط)
- مسئلہ عرب و شام از: سید محمد رشید رضا ایڈیٹر المنار (مصر)
- عالم اسلامی۔ اناطولیہ
- حضرت مولانا کا دورہ ——— حضرت مولانا ابوالکلام صاحب ۱۹ ستمبر سے دورہ میں ہیں۔ کلکتہ سے دہلی تشریف لے گئے تھے۔ اور وہاں سے کراچی جائیں گے۔"

شمارہ ۲، ۳، ۴ ——— ۳۰ ستمبر / ۷ / ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء ———

- عزم و عمل کی دعوت۔ قانون شکنی کی طرف پہلا قدم۔ مجلس جمعیۃ العلماء ہند کا فیصلہ ضبط شدہ فتویٰ چھاپا جائے اور اشاعت جاری رہے۔ ورکنگ کمیٹی نے سول ڈس اوبیڈینس کی راہ کھول دی ——— جمہوریت کے قیام کی طیاریاں۔ (سرورق)

- ان الحکم الا للّٰہ (الہلال)
- مقالات: انقلاب فرانس ——— شخصی آزادی (گزشتہ سے پیوستہ) (باقی آئندہ)
- جنگ اناطولیہ کی خبریں (عربی اخبارات سے)
- رہنمایان ملک کی گرفتاری (اداریہ)
- مسئلہ عرب و شام (۲) (علامہ سید محمد رشید رضا ایڈیٹر المنار مصر)
- عالم اسلام: مصطفےٰ کمال پاشا اور عصمت پاشا کی تصریحات (الاخبار)
شام آزادی چاہتا ہے۔ جنیوا میں شامیوں کی کانفرنس۔ ترکی میں برطانیہ کے ارادے ——— سلطان المعظم کی مخالفت۔ اناطولیہ کی قومی حکومت: سفیر پولینڈ کی نظر میں۔
- حضرت مولانا کا دورہ ——— حضرت مولانا ابوالکلام صاحب اب تک دورہ میں ہیں اور سردست کراچی میں خادم وطن کی مقدمہ کی وجہ سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔
- مختارات: مشرق میں الزاس ولورین ——— مارننگ پوسٹ کیا کہتا ہے؟
یہودی بیت المقدس میں حکومت نہیں کرسکتے
ایک بااثر امریکن یہودی کے خیالات۔
ہندوستان پہلے خوشحال تھا یا اب ہے؟
امریکہ کے حبشیوں کی حیرت انگیز ترقی (آئی۔ ٹی)
- حضرت امیر شریعت صوبہ بہار کا فرمان
- اعتذار: "ہم نہایت متاسف ہیں کہ پہلے نمبر کے بعد ہی اس کی اشاعت میں کامل دو ہفتہ کا التوا ہوگیا۔ بہرکیف اب تمام انتظامات مکمل ہوگئے ہیں ——— ان شاء اللہ آئندہ کبھی تاخیر نہ ہونے پائے گی اور عین وقت پر اخبار اپنے قدر دانوں تک پہنچا کرے گا۔ ہمیں طباعت کی خرابی کا بھی پورے طور پر احساس ہے اور ہم سخت کوشش کر رہے ہیں

بھاں چھپائی چہرے چہرہ .....

اس نمبر میں جو کمی ہمارے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے وہ حضرت مولانا کی کسی تازہ تحریر کے نہ موجود ہونے کی کمی ہے ۔ اگرچہ ایک مضمون "الہلال مرحوم" سے نقل کر دیا گیا ہے، جو ہر طرح حالاتِ حاضرہ کے مناسب ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اسی وقت کے لیے لکھا گیا تھا ۔ تاہم ہمیں اس کمی کا احساس اور افسوس ہے ۔

حضرت مولانا مدظلہٗ اس وقت بمبئی میں تشریف فرما ہیں ۔ اور سابق کی کثیر مشغولیتوں کے ساتھ اب مرکزی خلافت کمیٹی کے کاموں کا بارِ عظیم بھی انہیں اٹھانا پڑا ہے ۔ جس کی وجہ سے اس مرتبہ بالکل فرصت نہ ملی اور "پیغام" کے لیے کوئی تازہ تحریر نہ روانہ فرما سکے ۔ لیکن ہم اپنے ناظرین کو قوی امید دلاتے ہیں کہ آئندہ انہیں اس کی کبھی شکایت نہ رہے گی ۔ اور ہر نمبر میں وہ حضرت مولانا کے مضامین سے فیض یاب ہو سکیں گے ——

- مولانا محمد علی کا پیغام اہلِ ہند کے نام:

میں قیدِ فرنگ کو نظرِ حقارت و نفرت سے دیکھتا ہوں، اس لیے اپنے ابنائے وطن سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ آئندہ اجلاس کانگریس کے موقع پر جو احمد آباد میں منعقد ہوگا، جمہوریتِ ہند کا اعلان کر کے مجھ کو اس قیدِ فرنگ سے رہا کرالیں ۔

دستخط

محمد علی (خادمِ کعبہ)

- اسیرانِ ملت کا مشترکہ پیغام :

"ہم اپنے تمام مذہبی اور وطنی بھائیوں کی خدمت میں سلامِ شوق پیش کرتے ہوئے ظاہر کرتے ہیں کہ ہم سب گورنمنٹ کی اس کارروائی پر نہایت فراخ دلی اور عالی ہمتی سے صابر ہیں اور خدا کا شکر کرتے ہیں کہ ہم کو اس نے توفیق عطا فرمائی کہ مذہب اور وطن آزادی اور قوم کی وجہ سے ہم پر ہر قسم کے مصائب ڈھانے کی فکریں کی جا رہی ہیں اور ہم اس خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کے فضل و کرم سے نہایت اطمینان و استقامت سے عمل کرنے کے لیے تیار ہیں ۔

آپ سب بھائیوں اور بزرگوں سے ہماری التجا ہے کہ آپ ہماری طرف سے ہرگز فکر مند نہ ہوں بلکہ تحریکاتِ حاضرہ میں اور زیادہ قدم بڑھائیں ۔ نہایت سرگرمی اور دلچسپی سے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیں ۔ اتفاق بڑھائیں —— غافلوں کو چونکائیں، سوتوں کو بیدار کریں ۔

نفسی اور شخصی اغراض کو پس پشت ڈال دیں، نرمی اور تلطف سے کام کریں ۔ نقضِ امن اور خون ریزی وغیرہ سے بچنے کی پوری کوشش کریں، ہمت نہ ہاریں، مایوسی کو پاس نہ پھٹکنے دیں ۔ مردانہ وار قدم آگے بڑھائیں ۔ کوشش کا نتیجہ کامیابی ضرور ہے ۔ سوراج کی منزل اب بہت قریب آگئی ہے ۔ ہم لوگوں کو بھی دعا سے نہ بھولیں ۔ مذہب کے ساتھ ساتھ آپ حضرات اور ہمارا پیارا وطن ہمارے دل میں جاگزیں ہے ۔ خداوند کریم جلد وہ دن لاوے کہ آپ اور ہم نہایت خوشی اور خرمی کے ساتھ آزادی کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں ۔ آمین یا رب العالمین والسلام ۔ محمد علی خادم کعبہ، شوکت علی خادم کعبہ، نثار احمد عفی اللہ عنہٗ، حسین احمد غفرلہ، سیف الدین کچلو، بندہ غلام مجدد عفی عنہ

- مجلسِ جمعیۃ العلماء کا فیصلہ : ضبط شدہ فتویٰ چھپتا ہے اور شائع ہوتا ہے !
- پچاس لیڈروں کا اعلان : سرکاری ملازمت قومی خودداری کے خلاف ہے ۔
- مہاتما گاندھی کی اپیل مسلمانانِ ہند سے ۔
- کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کی تجویزیں ۔ شہزادہ ویلز کی آمد پر ہندوستان بھر میں ہڑتال ہو ۔ ہمسایہ ممالک سے ہندوستان کے تعلقات ۔ انگریزی گورنمنٹ ہندوستان کی نمائندہ نہیں ہے ۔
- ورکنگ کمیٹی کی دوسری نشست ۔ علی برادر کو مبارکباد ۔ کراچی ریزولیوشن کی تائید ۔ انگریزی گورنمنٹ ہندوستان کی نمائندہ نہیں ہے ۔

---

نمبر ۵    ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۱ء ——

قتلِ مسلم ، وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ
جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر ڈالے تو اس کی سزا
جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ
دوزخ کی ہمیشگی ہے اللہ کا غضب ہے اس کی
وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا
پھٹکار ہے اور بڑا ہی دردناک عذاب ہے ۔ جو

اس کے لیے طیار ہو چکا ہے

(سرورق)

- متفرقات
- حضرت مولانا کی مشغولیت : حضرت مولانا ابوالکلام صاحب اب تک کلکتہ سے باہر ہیں اور بمبئی میں مرکزی خلافت کمیٹی کے کاموں کی تنظیم میں مشغول ہیں ۔ ۲۲ ماہ حال کو کراچی تشریف لے جائیں گے ۔ تاکہ رہنمایانِ ملک کے مقدمہ کی نگرانی کریں ۔ اکتوبر کی آخری تاریخوں میں جمعیۃ العلماءِ ہند کے جلسہ کی لاہور میں صدارت فرمائیں گے اور اوائل نومبر میں انشاءاللہ تعالیٰ کلکتہ واپس تشریف لائیں گے ۔
- قتلِ مسلم
- انقلابِ فرانس : (گزشتہ سے پیوستہ)
- مسئلہ عرب وشام (از : علامہ سید محمد رشید رضا ایڈیٹر المنار مصر) (گزشتہ سے پیوستہ)

آزادی قریب ہے
۳۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو یاد رکھو!!

---

نمبر ۶ ، ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء ———

- انگورہ فنڈ یعنی خزینۂ اعانہ دولتِ اسلامیۂ انگورہ و مجاہدینِ اسلام کا افتتاح ۔

حضرت غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی خدمت میں براہِ راست مسلمانانِ ہند کی پیش کش ۔

کم از کم پچاس لاکھ روپیہ آخری دسمبر تک فراہم ہونا چاہیے

جس راہ میں تک قربان کر دینی تھی اس کے لیے صرف روپیہ کی قربانی! آج مسلمانانِ ہند کے لیے سب سے بڑی خدمتِ انسانی ، سب سے بڑی نیکی ، سب سے بڑی مذہبی عبادت ، سب سے زیادہ اجر و ثواب کی خیرات ، سب سے بہتر زکوٰۃ کا مصرف ، قومی عزت کا ذریعہ ، خدا کی رضامندی و محبت کا وسیلہ یہ ہے کہ اُن جان فروشانِ اسلام کی خدمت و اعانت کے لیے اپنا مال قربان کریں جو تمام کرۂ ارضی میں تنِ تنہا اسلام کے لیے اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں ۔ اگر ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے تو ہمارے دعوئ اسلام پر ہزار افسوس !

[سرورق]

- چند قابلِ لحاظ باتیں : منیجر پیغام
- امریکہ نے ترکوں کو ہتھیار دینے کی اجازت دی (العدل) ۔ انگورہ کا سرکاری پیغام (العدل) دو لاکھ یونانی مقتول ہوئے (العدل) حکومتِ انگورہ کا جنگی بیڑہ (العدل) ۔ جنگِ اناطولیہ کے متعلق یونانی اخبار کیا کہتے ہیں (الاخبار)
- جنرل لوڈنراف کی تصریحات ۔
- حضرت مولانا ابوالکلام آزاد بھونڈی میں : مسٹر معظم علی ، بمبئی

کل شب کو مولانا ابوالکلام آزاد موضع بھونڈی کے باشندوں کے اصرار پر وہاں تشریف لے گئے ۔ کیوں کہ یہ لوگ مہینوں سے باصرار مولانا کو بلا رہے تھے ۔ لیکن وہ اپنی مشغولیت کے سبب سے نہ جا سکتے تھے ۔ تقریباً ۱۵ ہزار آدمی اس جلسہ میں شریک تھے ۔ غیر معمولی جوش و خروش پیدا تھا ۔ لوگ مولانا کے بہت ہی مشتاق تھے ۔ یہاں پچھلے کئی روز سے لوگ برابر جمع ہو رہے تھے ۔ تاکہ وہ مولانا کی تقریر سن سکیں ۔ بعض لوگ تو دور دور سے پیدل بھی آئے تھے ۔ حتیٰ کہ بعض آدمی پچاس میل کا پیدل سفر کر کے جلسہ میں شریک ہوئے ۔ مولانا نے لوگوں سے اس بات کی خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ خالص کھدر کے کپڑے پہنیں ۔ جس کا نمایاں اثر پڑا اور تین چار روز تک بھونڈی اور کلیان کے درزیوں کو کھدر کے کپڑے سینے سے فرصت نہ ملی ۔ یہ منظر نہایت ہی پُرمسرت اور دل خوش کُن تھا کہ تمام مجمع صاف کھدر کے کپڑے پہنے ہوئے تھا ۔ کیوں کہ مولانا کھدر کے کپڑے کے استعمال کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور اس پر برابر زور دیتے رہتے ہیں ۔ مولانا نے اس جلسہ میں تقریباً دو گھنٹے تک تقریر کی اور خلافت سوراج ، ترک موالات اور سودیشی کے مسائل پر مفصل طور سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔ بھونڈی میں زیادہ تر جولاہے رہتے ہیں ، جو غیر ملکی سُوت استعمال کرتے ہیں ۔ مولانا نے اُن لوگوں سے قسم لی کہ وہ صرف چرخے سے کتے ہوئے سُوت کا کپڑا بنائیں گے ۔ مولانا نے یہ بھی کہا کہ لوگوں کو اس وقت خلافت کا کام کرنے کے سوا اور کوئی کام نہ کرنا چاہیے اور اس کی صرف یہی صورت ہے کہ سودیشی کا رواج دیا جائے ۔ اس کے بعد مولانا نے انگورہ کی امداد کی لیے نہایت ہی پُر زور اپیل کیا اور بھونڈی کے باشندوں نے انگورہ کے لیے مولانا کو گیارہ ہزار روپے کی ایک تھیلی پیش کی ۔

- اداریہ : کیا آخری منزل آگئی ؟ : حضرت مولانا ابوالکلام صاحب مدظلہ
- یونانی سپہ سالار کے تمغے مال غنیمت میں — سمرنا پر یورش (خبریں)
- حقیقی جمہوریت (مقتبس ایک امریکی رسالہ سے)
- طاغتیہ بنی اُمیّہ کی عدالت میں سعید بن جبیر کا مقدمہ
- ہندوستانی جدوجہد کے متعلق جرمنی میں کیا کہا جاتا ہے ؟
(الاخبار ۳ر اکتوبر)

- شذرات
- غازی مصطفےٰ کمال پاشا کا خطبہ - یونانی شکست کے بعد
(الاخبار ۵ر اکتوبر)
- معرکہ سکاریہ کے بعد مصطفےٰ کمال پاشا کی انگورہ کو واپسی
(الاخبار ۵ر اکتوبر)
- ترکی اور یونان میں صلح — اخبار طان کی رائے (الاخبار ۳ر اکتوبر)
- ایک اسیر حور کا خط — منشی عبدالسمیع خاں ملیح آبادی
- غازی مصطفےٰ کمال پاشا کا اعلان (العدل قسطنطنیہ)
- ترکی خواتین کی حمیت وطنی
- اناطولیہ کی قومی حکومت اور اتحاد قوقازی (الاخبار)

---

نمبر ۷ ۴ر نومبر ۱۹۲۱ء ———

- پرنس آف ویلز کی آمد - ہندوستان کی خودداری اور اسلام کی محبت کی آزمائش۔
۱۷ر نومبر امتحان کا دن ہے - جمعیۃ العلماء مرکزی خلافت کمیٹی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس سیاحت کو پوری طرح بائیکاٹ کیا جائے - ۱۷ر نومبر کو ہر جگہ کامل ہڑتال رہے -
- چین کی حیرت انگیز ترقی دس برس کے قلیل عرصہ میں -
- یونانی اخبار ماتم کر رہے ہیں - ترکوں کی عظیم الشان طیاریاں اور یونانیوں کی بے بسی -
- آزادی کی قدر و قیمت - مذہبی نقطۂ نظر سے (مولانا عبدالرحمٰن صاحب نگرامی، مدرس مدرسہ جامع مسجد کلکتہ -)
- اسلامی اور بالشویکی اتحاد مکمل ہوگیا۔ (الاخبار ۱۶ر اکتوبر)
- یونانیوں کی عبرت انگیز تباہی - ۱۶ ہزار زخمی چھوڑ بھاگے — شاہ قسطنطین انگلستان کا ایجنٹ ہے -
- قتل مسلم (۲)
- فرمان حضرت امیر شریعت صوبہ بہار و اڑیسہ - (دستخط)

مولانا سید شاہ محمد بدرالدین پھلواروی
- پیغام حضور امیر شریعت صوبہ بہار۔ سکون و تحمل کی ہدایت -
(دستخط) مولانا سید شاہ محمد بدرالدین پھلواروی
- قسطنطین اور مصطفےٰ کمال پاشا کے اعلان۔
سپہ سالار عام مصطفےٰ کمال
- فرانس وانگلستان کی پالیسی اسلام کے ساتھ (الاخبار)
- اداریہ - کیا آخری منزل آگئی (۲) جرم کا انتخاب
(از: حضرت مولانا ابوالکلام صاحب مدظلہ)
- کراچی ریزولیوشن (از: مولانا ابوالکلام مدظلہ)
- رہنمایانِ ملت کی سزایابی
- آئرلینڈ، مصر اور ہندوستان کو فرانس کی امداد (الاخبار)

---

نمبر ۸ ۱۱ر نومبر ۱۹۲۱ء ———

- تاریخِ ہند کا یادگار دن - ۱۷ر نومبر
اس دن کے بارہ گھنٹوں کے اندر ہم برسوں اور قرنوں کا کام انجام دے سکتے ہیں -
سچی خدا پرستی و دین داری، بے لوث حب الوطنی و خودداری، کامل اتفاق واتحاد، غیر مسخر قومی و ملکی طاقت، اسلام اور ہندوستان کے لیے فتح مندانہ عزم، یعنی قومی زندگی کی تمام برکتیں۔
ہم اس دن پالیں گے بشرطیکہ اتنا قابو اپنے اوپر پالیں کہ اپنا تمام کاروبار، لین دین، ملنا جلنا، آمد و رفت قطعاً بند کر دیں - کامل امن و سکون خاموشی و وقار کے ساتھ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں اور اس طرح پرنس آف ویلز کے ورود کا یادگار مقاطعہ انجام پائے -

امن اور سکون

ہمارے تمام کاموں کی کامیابی کے لیے پہلی شرط

صرف ہڑتال ہو

کوئی جلوس نہ نکلے، سڑکوں اور بازاروں میں ہجوم نہ کیا جائے - امن اور سکون کے خلاف کوئی حرکت نہ ہو، صرف کامل ہڑتال ہونی چاہیے اور ایک دن کے لیے شہروں، آبادیوں اور بستیوں کو سنسان بنا دینا چاہیے، البتہ اگر ذمہ دار خلافت اور کانگریس کی جماعتیں چاہیں تو شام کو کامل انتظام کے ساتھ ایک جلسہ کرکے بائیکاٹ کی تکمیل کا اعلان کر دے سکتے ہیں۔"

(ابوالکلام)

- اداریہ: اودھ میں زمینداروں کا فتنہ ——— ہوڑہ کا ہنگامہ ——— سول ڈس او بیڈینش ۔ حکومت انگورہ، ترک عراق اور برطانیہ ۔
- قتل مسلم (۳) (الہلال)
- تاریخ استقلال آئرلینڈ کی ایک عشق آمیز داستان ۔ چارلس اسٹوارٹ پارنل (الہلال) (ایک پولٹیکل لیڈر اپنے عشق و محبت کی زندگی میں)
- مقالہ افتتاحیہ: مواعظ و خطب (مولانا ابوالکلام مدظلہ) ماہ ربیع الاول اور تذکار ولادت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم
- اودھ کے زمیندار و کاشتکار ہوشیار ہوجائیں ۔ گورنمنٹ دھوکہ دے رہی ہے ۔ لبرل لیگ کسانوں کی حمایت کرتی ہے ۔ پنڈت گوکرن ناتھ مصر کی تصریحات
- مصر کے جلاوطن لیڈر کا پیغام: اپنے اہل وطن کو! (الاخبار)

| اگر قانون شکنی کی تمنا ہو تو کھدر پہن لو اور چرخہ چلانا سیکھ لو |
|---|

---

نمبر ۹ ۔ ۱۸ نومبر ۱۹۲۱ء ———

کیا ہندوستان تیار ہے؟

سول ڈس او بیڈینس کے شرائط جو کانگریس نے عائد کی ہیں ۔ ایسی مشکل نہیں ہیں کہ اُن پر عمل نہ ہوسکے ۔ یہ وقت حیل و حجت کا نہیں ۔ اگر لوگ واقعی اس کے لیے تیار ہیں، تو اس ثبوت میں کھدر پہن لیں اور ایک ہفتہ کے اندر چرخہ چلانا سیکھ لیں ۔ اور پھر قربانی کے لیے میدان میں نکل آئیں ۔

- چارلس اسٹوارٹ پارنل ۔ ایک پولٹیکل لیڈر ۔ اپنی عشق و محبت کی زندگی میں ——— : مسز اوشی (۱)
- حضرت مولانا کی مشغولیت: حضرت مولانا ابوالکلام صاحب مدظلہ طویل دورے کے بعد ۹ نومبر کو کلکتہ تشریف لائے تھے ——— یہاں علاوہ دوسری مصروفیتوں کے انگورہ فنڈ کے کاموں میں زیادہ وقت صرف ہوا ۔ الحمدللہ کہ کلکتہ میں آپ کے اس چند روزہ قیام سے بہتر نتائج نکلے ۔ لوگ آ آ کر ہدایتیں لے جاتے، جلسے کرتے اور چندہ جمع کرتے رہے ۔ اور انشاءاللہ آئندہ بھی وہ اس میں سرگرم رہیں گے ۔ ۱۳ نومبر کو حضرت نے ایک پرائیویٹ جلسہ میں کلکتہ کے پنجابی تاجروں کی جماعت کو مخاطب فرمایا اور اسی وقت ایک معتدبہ رقم فراہم ہوگئی ۔ جس کی میزان اب تک ہمیں نہیں معلوم ہوسکی ۔
لیکن ملک کے موجودہ حالات مولانا کو شہر میں مقیم نہیں رہنے دیتے ۔ ہر جگہ ضرورت ہے اور ہر طرف سے دعوتیں آتی رہتی ہیں ۔ چنانچہ پورے ایک ہفتہ بھی قیام نہ ہوسکا اور ۱۶ نومبر کو لاہور روانہ ہوگئے ۔ جہاں جمعیۃ علمائے ہند کے سالانہ اجلاس کی صدارت فرمائیں گے ۔ جو اس سال نہایت مہتم بالشان ہوگا اس کے بعد سورت، بمبئی تشریف لے جائیں گے اور کہیں اوائل دسمبر میں واپسی ہوگی ۔ اللہ حافظ و معین ہو ۔
- قتل مسلم (۴)
- آزادی کا سفر اور راہ کی مشکلات (مولانا عبدالرحمٰن صاحب نگرامی صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ کلکتہ)
- جارج واشنگٹن ۔ جمہوریت امریکہ کا بانی
- شذرات:
- حکومت انگورہ اور کُردوں کی قوم (الاخبار)
- سوویت روس کا غصہ ۔ لیگ اقوام ایک منحوس بڑی گلی لاش ہے! (بدرالدین احمد)
- ایک اسیر فرنگ عالم کا خط ۔ جیل میں معافی منگوانے کے لیے ناجائز دباؤ (۳ نومبر ۱۹۲۱ء)
- شکریہ و شکایت (منیجر)

---

نمبر ۱۰ ۲۵ نومبر ۱۹۲۱ء ———

- امتحان و آزمائش کی گھڑی اپنی ہولناکیوں کے ساتھ آگئی! حق و باطل کا فیصلہ کن معرکہ شروع ہوگیا، نتیجہ پر دنیا کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں؟ آئندہ چند ہفتے فیصلہ کردیں گے کہ ہندوستان آزاد ہوگا، یا ہمیشہ کے لیے غلام ——— کامل امن و سکون، مگر پوری استقامت و ثابت قدمی پر ہندوستان کی نجات موقوف ہے ۔ ادنیٰ بے امنی و شورش گورنمنٹ کو کامیاب کردے گی اور ملک کو ناکامیاب!
- آزادی کی تحریک اور حکومت کا طرز عمل (مولانا عبدالرحمٰن صاحب نگرامی مدرس مدرسہ اسلامیہ، کلکتہ)
- جمعیۃ علمائے ہند کا تیسرا سالانہ اجلاس لاہور: حضرت مولانا کی تقریر...... یہ ہمارا اسلامی فرض ہے اگر مسئلہ خلافت رونما نہ ہوتا تو بھی مسلمان ہندوستان کی آزادی کے لیے وہ سب کچھ کرتے جو آج کر رہے ہیں ۔ اور مسلمان اس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک ہندوستان کو ظلم و استبداد سے پاک نہ کردیں گے....
- قتل مسلم (۵)

صدر مدرس مدرسہ جامع مسجد، کلکتہ )

- عراق پر سید احمد شریف سنوسی کی یورش! برطانیہ کی ملک گیری خطرہ میں۔
- خطبۂ صدارت جمعیۃ العلماء ــــ (نمبر سوم) مسائل مہمہ جمعیۃ العلماء (از: مولانا ابوالکلام صاحب مدظلہٗ)

---

نمبر ۱۴    ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۱    (پورا رسالہ ٹائپ میں چھپا ہے)

- جس منزل کا انتظار تھا وہ آگئی ــــ رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند۔

اَلَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ (جن لوگوں نے مشکلوں اور مصیبتوں میں ثابت قدمی دکھلائی اور جو اپنے پروردگار کی مدد اور رحمت پر بھروسہ رکھتے ہیں بالآخر فتحمندی انہی کی ہے)

کیسی مبارک گھڑی ہے جو آگئی؟

خوف و ہراس کے بادل چھٹ گئے، اُمید کی روشنی پھیلنے لگی۔ فتح و مراد کا سورج نکل رہا ہے اور خدا کی رحمت و نصرت بے نقاب ہو کر سامنے آگئی ہے افسوس اُن پر جو اب بھی نہ دیکھیں!

انتظار کی رات بڑی ہی تاریک تھی، لیکن دیکھو اُمید کی صبح بھی کیسی دلفریب اور جانفزا ہے؟ افسوس ان پر جو اب بھی کروٹ نہ لیں!

کیا تم اُفق کی طرف نہیں دیکھتے؟ یہ سچ ہے کہ سورج ابھی نہیں نکلا، لیکن اس کی روشنی تو اچھی طرح نکل آئی ہے اور ہم سورج کو صرف اس کی روشنی ہی میں دیکھ سکتے ہیں۔

آؤ غفلت کا بستر ہمیشہ کے لیے تہ کر دیں۔ خدا کا پاک نام لیں اور راہِ مقصد میں آخری کوچ شروع کر دیں۔ راستہ صاف ہے اور منزل سامنے نظر آرہی ہے۔ ہمت، صبر، قربانی اور استقامت کے چند ایام میں صدیوں کا سفر طے ہو جائے گا۔

رہرو تشنہ لب، نہ گھبرانا
اب لیا چشمۂ بقا تُو نے

اِصْبِرُوْا، وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا، لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

(ابوالکلام)

۱۰ر دسمبر ۱۹۲۱ء

- آزادی کی ایک نشانی ۔ عصا موسیٰ اور ترک موالات:

(از: مولانا عبدالرحمٰن صاحب نگرامی صدر مدرس مدرسہ جامع مسجد، کلکتہ)

- ــــ "یہ تحریر حضرت مولانا کی گرفتاری کے بعد ان کے کاغذات میں سے دستیاب ہوئی ہے۔ جو بجنسہٖ شائع کی جاتی ہے"!

(ایڈیٹر: ابوالکلام)

"آج ۸ر دسمبر ۱۹۲۱ء کی صبح ہے۔ کل شام مجھے قابلِ وثوق ذرائع سے اطلاع مل گئی کہ گورنمنٹ بنگال نے وائسرائے کے مشورے کے بعد میری اور سی آر داس کی گرفتاری کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میری نسبت گورنمنٹ بنگال کا یہ ارادہ ہے کہ اگر میں گیارہ تک کلکتہ سے نہ گیا تو مجھے گرفتار کرلے گی۔ لیکن اگر میں بدایوں کے جلسہ میں جمعیۃ العلماء کے لیے چلا گیا تو پھر اس کے سر سے ٹلا ٹل جائے گی۔ اور صرف مسٹر داس گرفتار کر لیے جائیں گے۔

میرا وقت تمام تر بنگال سے باہر......

- خطبۂ صدارت جمعیۃ العلماء ۔ نمبر چہارم۔ مسئلہ نظم جماعت۔
- رفتار سیاست: کلکتہ میں شاندار قومی نظارہ: ملک و ملت کی زندگی کے آثار۔
- افکار و حوادث: حضرت مولانا کی گرفتاری۔
- ایڈیٹر پیغام کو دو سال کی قید سخت۔
- مختارات: (مشرق کی بیداری) (بقیہ آئندہ)

---

اس رسالہ نے بہت مختصر عمر پائی ۔ ۲۳ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو اس کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا اور ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو اس کا آخری شمارہ ہندوستانیوں کو آخری پیغام پہنچا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس چار ماہ کی مختصر مدت میں اس کے کل تیرہ شمارے ۱۹۲ صفحات پر مشتمل شائع ہوئے۔ ان میں دو شماروں میں آٹھ آٹھ صفحات زیادہ ہیں۔ اور ٹائپ میں ہر آخری شمارہ مکمل ٹائپ میں چھپا ہے۔ ممکن ہے آئندہ شمارے بھی ٹائپ میں چھپتے۔ لیکن پہلے اس کے ایڈیٹر کی گرفتاری پھر خود مولانا آزاد کی قید و بند کی آزمائش نے اس کی اشاعت کو روکنے پر مجبور کر دیا۔

مشمولات کا مطالعہ کیجیے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ تحریریں جو دوسرے ممالک سے متعلق ہیں۔ خاص طور سے اسلامی ممالک کے بارے میں، یا پھر خود ہندوستان کی مختلف تحریکوں یا سیاسی جماعتوں کے مختلف اقدام یا منصوبوں اور فیصلوں کے سلسلے میں، ان سب کا سرا آخر میں ہندوستان کی آزادی کی تحریک سے جا ملتا ہے۔ مولانا آزاد نے ان اندراجات کی مدد سے سارے ہندوستان میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس ملک کے رہنے والے آزادی کی قدر و قیمت کو سمجھیں اور متحد ہو کر اس کو حاصل کریں اور اگر اس مقصد کو پانے میں بڑی سے بڑی قربانی دینی

آگے صفحہ ۳ پر

ہیل

# یا نرائن نگم کی ادبی صحافت

صحافت بنیادی طور پر خبروں، نظریات اور خیالات کو اس طریقہ
یش کرنے کا نام ہے کہ پڑھنے والے ان میں دل چسپی لے سکیں۔ یہ
ہی دو طرح کی ہو سکتی ہے۔ ایک تو وہ جو مضمون یا خبر پڑھنے سے
اس کی پیش کش کے انداز، موضوع یا سُرخی سے اس شخص میں پیدا ہو جس
راس پر پڑے اور دوسری وہ جو خبر یا مضمون کا مطالعہ اس میں پیدا کرے۔
صحافت کا ایک دوسرا پہلو اطلاع اور خبر میں فرق ہے۔ ہر خبر
ع ہوتی ہے، لیکن ہر اطلاع خبر نہیں ہوتی۔ اطلاع خبر اس وقت بنتی ہے
، اس میں پڑھنے والوں یا عام لوگوں کے لیے دل چسپی کا کوئی نہ کوئی
موجود ہو۔ عدالت کے نوٹس یا بالکل ذاتی اور نجی معاملات خبر نہیں بنتے، لیکن اگر ان
ایسے پہلو موجود ہوں جو تمام لوگوں کی دل چسپی کا سبب بن سکیں تو وہ خبر
تے ہیں۔ صحافت کا تیسرا اہم پہلو تین اکائیوں کا بہ یک وقت وجود اور
ن ایک ایسے ربط کی موجودگی ہے جس کے ٹوٹتے ہی سارا تانا بانا بکھر
ہے۔ یہ تین اکائیاں ہیں۔ لکھنے والے یا خبر، مدیر اور قاری۔ گویا
ے کے ایک سرے پر خبر، لکھنے والا یا مضمون نگار ہوتا ہے اور دوسرے
، پر قاری۔ مدیر ان دونوں کے درمیان رابطہ کا کام کرتا ہے ــــ
ں کے مفادات کو ملحوظ رکھ کر پلڑے کو کسی ایک طرف جھکنے نہیں دیتا۔
ہ یہ کام اس خوبی سے انجام دیتا ہے کہ اس کی ذات بہت زیادہ اُبھر
سامنے نہیں آتی۔ ادبی صحافت میں مضامین کے انتخاب سے کر ان
رتیب اور پیش کش تک پر مدیر کی شخصیت کی چھاپ لگی رہتی ہے۔
یہ چھاپ جس قدر پوشیدہ، پہلی نظر میں ظاہر نہ ہونے والی اور لطیف
ہو گی، اس کی اثر آفرینی میں اتنا ہی اضافہ ہو گا۔ اخباری صحافت میں مدیر
کی ایک بڑی مجبوری یہ ہوتی ہے کہ خبروں کا وجود اس کی پسند یا ناپسند سے
آزاد ہوتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ اپنے اخبار میں کسی
خبر کی اہمیت کم کر دے یا کسی کی بڑھا دے یا پھر اداریہ کے کالم یا مضامین کے
صفحات یا صفحہ پر کسی خبر کے پسندیدہ پہلو پر اپنے دل کی بھڑاس نکال لے۔
برخلاف اس کے ادبی صحافت میں مدیر کو مقابلتاً زیادہ آزادی حاصل
ہوتی ہے۔ وہ سبب بتلائے بغیر کسی بھی مضمون یا تخلیق کو مسترد کر سکتا ہے
اور اس کی تعریف یا تنقیص میں یک طرفہ اور فرضی ناموں تک سے لکھے ہوئے
خطوط شائع کر سکتا ہے۔ یہ آزادی ہی دراصل اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ
کا سبب بنتی ہے۔

یہ بات اپنی جگہ پر بالکل درست ہے کہ اردو صحافت ادب کی گود
میں پروان چڑھی ہے، لیکن صرف اس وقت تک جب تک وہ اپنے پیروں
پر کھڑے ہونے اور خود سے چلنے پھرنے کی طاقت سے محروم تھی۔ جیسے جیسے
اس نے اپنے پیروں پر چلنا سیکھا وہ اس محبت بھری گود سے جو اس کے
ارتقا کی راہ میں حائل تھی، خود کو آزاد کرتی گئی۔ راست، غیر پیچیدہ
اور معروضی طرزِ اظہار اخباری صحافت کی بنیاد ہیں ادب یا ادبی طرزِ
اظہار اس کے بنیادی مقصد کی راہ میں رُکاوٹ بنتا ہے۔ چنانچہ صحافت
انہی کو روز بروز ترک کرتی جا رہی ہے۔ صرف اُردو نہیں، ساری زبانوں
میں صحافت کا رُخ اسی جانب ہے۔ چنانچہ ادبی طرزِ اظہار کو ان صفحات
یا کالموں کے علاوہ جو ان کے لیے مختص ہوں، اخبار میں کم سے کم جگہ دی جاتی
ہے۔ لیکن ادبی صحافت میں اظہار اور پیش کش کے وسیلے بھی اخبار کا
صحافت سے مختلف ہوتے ہیں اور مواد بھی۔ وہ اخبار کے مُدیر کی طرح کسی

---

کپور مارکیٹ، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

خبر کی عدم اشاعت یا اشاعت کے سلسلے میں نہ تو وقت کی کمی کا سہارا لے سکتا ہے نہ "خبر کا تقدس" اسے ذمہ داری سے آزاد کر سکتا ہے۔ اخباری صحافت میں ہر خبر کی اشاعت یا عدم اشاعت کے لیے مدیر کو جواب دہ نہیں ہونا پڑتا، لیکن ادبی صحافت میں کم سے کم جو شائع ہوا ہے، اس کے ایک ایک لفظ کے لیے مدیر جواب دہ ہوتا ہے۔ ہر مدیر کا کام اگر صرف ملا کے گھر کا ہو تو شاید یہ صورت پیش نہ آئے، لیکن اسے ہر مضمون اور تخلیق کی اشاعت کے سلسلے میں خود ہی فیصلہ کرنا پڑتا ہے اور انہیں زبان و بیان کی ناہمواریوں سے پاک کرنے کے علاوہ اپنے رسالہ کے کردار اور مزاج کو بھی قائم رکھنا پڑتا ہے۔ مدیر کے نقطۂ نظر سے یا رسالے کے مزاج سے ہم آہنگ مضامین کی اشاعت میں تو کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ لیکن بالکل متضاد نقطۂ نظر کے مضامین نظم و نثر کی اشاعت کے باوجود رسالے کا کردار اور مزاج برقرار رکھنا ایک نہایت مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ منشی دیانرائن نگم ان مراحل سے کس طرح گزرے اور انہوں نے ادبی صحافت میں وہ کون سی راہ اختیار کی، جس کے سبب جریدۂ عالم پر ان کا نقشِ دوام ثبت ہو گیا؟

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ منشی جی نے زمانہ کو اپنی شہرت اور نام و نمود کے لیے نہیں استعمال کیا۔ ان کا نام تقریباً چالیس برس تک بطور مرتب شائع ہوتا رہا۔ ایڈیٹر، مدیر یا مدیرِ مسئول کی اصطلاح انہوں نے اپنے لیے نہیں استعمال کی۔ ادبی جریدوں میں عام طور پر فہرست مضامین کے بعد اداریہ ہوتا ہے، جس میں مدیر کبھی اپنے علم کی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتا ہے، کبھی رسالے کے مسائل کا ذکر کرتا ہے، کبھی مشمولات کے بارے میں اپنی رائے دیتا ہے اور کبھی دوسرے متعلقہ مسائل پر فیصلے صادر کرتا ہے۔ منشی جی کا انداز اس سے بالکل مختلف تھا۔ وہ عام طور سے رسالہ کے آخری صفحات میں رفتارِ زمانہ کے عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ رسالہ یا کسی ادبی مسئلے پر انہیں کچھ کہنا ہوتا تھا تو اس کا اظہار بھی اسی کالم کے آخر میں ہو جاتا تھا۔ انہوں نے زمانہ میں اپنے متعدد مضامین ضرور شائع کیے۔ ان میں سے چند ممتاز ادبی شخصیتوں پر بھی تھے۔ لیکن ان کا انداز "قولِ فیصل" کا نہیں۔ نہ ان میں الفاظ کی کرتب بازی ہے نہ مرعوب کرنے کی کوشش، نہ بہت بہت زیادہ تشبیہیں اور استعارے، نہ اضافتیں، نہ مفرس اور معرب زبان۔ سیدھا سادا اندازِ بیان جس سے اس وقت کی نثر اچھی طرح مانوس بھی نہیں ہوئی تھی، انہیں پسند تھا۔ لیکن اپنے خیالات کی طرح اپنی اس پسند کو بھی انہوں نے زمانے پر نہیں تھوپا۔ رسالے میں لکھنے والوں میں جہاں ایک طرف سادہ نثر لکھنے والے نواب حیدر یار جنگ، طباطبائی، پریم چند، خواجہ عبدالرؤف عشرت، آنند نرائن ملّا، علی جواد زیدی اور اعظم کریوی تھے، وہاں دوسری طرف لالہ لاجپت رائے، سلطان احمد اور نوبت رائے نظر وغیرہ تھے۔ جو نہ صرف مفرس زبان استعمال کرتے تھے بلکہ زمانہ میں ان کے جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں سے متعدد کی ابتدا ہی فارسی اشعار سے ہوتی ہے۔

لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ جو بھی مضامین منشی دیانرائن نگم کو مل جاتے تھے، وہ زبان و بیان کی ناہمواریاں درست کر کے انہیں شائع کر دیتے تھے؟ جی نہیں صورتِ حال یہ نہیں تھی۔ وہ مخصوص موضوعات پر مضامین لکھواتے تھے۔ کسی اچھی چیز کا ذکر سنتے تو اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ خط لکھتے، جواب کے لیے لفافہ بھجواتے، حا... یہ ہے کہ مضامین کے تقاضے کے لیے تار تک دیتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اقبال نے ترانۂ ہندی منشی جی کی فرمائش پر لکھا تھا۔ اس دعوے کا کوئی حتمی ثبوت تو نہیں، لیکن اتنا تو وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظم اقبال نے خود اشاعت کے لیے بھیجی تھی۔ اور "ہمارا دیس" کے عنوان سے ستمبر ۱۹۰۴ء میں زمانہ ہی میں شائع ہوئی تھی۔

اس سب کے باوجود وہ خود کو نمایاں نہ کرتے۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا اپنی اور زمانہ کی تعریف و توصیف رسالہ میں شائع نہ ہونے دیتے۔ جوش ملیح آبادی مرحوم نے اپنی نظم "نگاہِ خلوص" بھیجی جس کا آخری شعر تھا:

مگر مجھے یہ بڑی خوشی ہے کہ اس تماشائے نو بہ نو میں
مری نگاہِ خلوص بیں نے دیانرائن نگم کو دیکھا

بھیجی تو انہوں نے اس کی اشاعت کسی طرح گوارا نہ کی اور یہ نظم اُن کے انتقال کے بعد ہی زمانہ میں شائع ہو سکی۔ نظم کے موصول ہونے پر انہوں نے جو خط جوش کو لکھا تھا، اس کے مندرجۂ ذیل حصے ادبی جریدہ کی ادارت کی معیار بندی کے سلسلے میں بے حد اہم ہیں:

"نفس کو تعریف کا عادی بنانا میں نے ہمیشہ جرم سمجھا اور 'زمانہ' کو بھی اس مصیبت سے بچائے رکھا ہے۔ اسی طرح جیسے کوئی ماں اپنی بیٹی کو نگاہِ بد بیں سے بچاتی ہے۔"

"پرچے میں شاذ و نادر ہی آپ نے میرا ذکر یا احباب کی خواہ مخواہ تعریف دیکھی ہوگی —— اور یہ معمولی سی ادا اُس کارسازِ حقیقی یا منتظمِ عالم کو بھا گئی اور آج اس نے عمر بھر کی کمائی کا حساب

آپ کی نظم کی صورت میں بے باق کر دیا۔ شاید میرا
انعام (اگر میں اس انعام کا مستحق تھا) اس سے
زیادہ ممکن نہ تھا۔ اتنا افسوس ہے کہ میں اس
دولتِ دنیا سے محروم ہوں ورنہ آج قارون
کا خزانہ بھی ہوتا تو آپ کے محبت بھرے اشعار پر
تصدق ہو جاتا۔"

"آپ کے اشعار کا اہل ہونے کے لیے میں
ایک نہیں کئی کئی جنم لینے کے لیے تیار ہوں۔ کسی
انسان کو اس نظم کی تمنّا میں سو برس بھی جینا
پڑے تو کم ہے۔ دعا کیجئے کہ شاعر کے لافانی
اشعار کہیں مجھے مغرور نہ بنا دیں اور کہیں ان سے
نفس کی بدی کو تقویت نہ مل جائے۔ زندگی کے
چند لمحے جو باقی ہیں اسی قرینے سے کٹ جائیں اور
بعد کو اہلِ نظر کو یہ کہنے کا حق نہ ہو کہ جوش جیسے نکتہ
رس شاعر کی "نگاہِ خلوص بیں" دھوکا کھا گئی۔"

"میرے لیے یہ اشعار حاصلِ زندگی ہیں۔
خدا کرے آپ کو یا مجھ کو ان کے لیے کم سے کم
اس جہانِ آب و گِل میں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔"

اقتباس قدرے طویل ہو گیا ہے، لیکن اس سے منشی جی کے
ادارتی معیار و منصب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ خط کا ایک ایک
لفظ خلوص میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ اگر یہ نظم شائع بھی کر دیتے تو جوش کے
ادبی مرتبے کے پیشِ نظر کسی کو ان پر انگلی اٹھانے کا موقع نہ ملتا، لیکن
اُنہوں نے اس کی عدم اشاعت کا فیصلہ کرتے وقت نہ جوش کے ادبی مقام
کو دیکھا اور نہ خود پسندی کے جذبہ کو سر اٹھانے کا موقع دیا۔ اس ضمن میں
ان کا فیصلہ ادارت کے کم سے کم ایک پہلو کے لیے دستور العمل اور قاری
کے لیے پروانۂ آزادی کی حیثیت رکھتا ہے۔

خود کو صرف مرتّب کی حیثیت سے پیش کرنے کے باوجود نگم صاحب
کاتب کے حوالہ کرنے سے قبل ہر مضمون دوبارہ پڑھتے تھے۔ زبان و بیان
کی ناہمواریاں درست کرتے تھے، لیکن اس طرح کہ نفسِ مضمون پر کوئی اثر
نہ پڑے۔ مسٹر سلیم جعفر کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

"مجھے اُمید ہے آپ ایک تجربہ کار مضمون نگار
کی حیثیت سے ایڈیٹوریل حقوق میں تخفیف کا خیال
نہ فرمائیں گے۔"

ایک خط میں "حق پرست" کو لکھتے ہیں :

"میں نے آپ کی لکھی ہوئی ترمیمیں بنا دی ہیں اور
کہیں کہیں خفیف، بہت خفیف ردو بدل کی بھی
جرأت کی ہے۔ مگر اس میں حتی الوسع یہی کوشش
کی ہے کہ مطلب اور مفہوم کے علاوہ آپ کا
اسٹائل بھی نہ بدلنے پائے۔ اوّل تو میں نے ہر جگہ
جہاں آپ نے واؤ لکھا ہے، وہاں واؤ قلمزد
کر دیا ہے۔ دو ایک فقروں کی ترکیب آسان
کر دی ہے۔ تیسرے اکثر الفاظ کی فارسی جمع کی
بجائے اردو جمع لکھ دی ہے۔ اُمید ہے یہ
خفیف دخل در معقولات ناگوارِ خاطر نہ ہوگی۔"

منشی دیا نرائن نگم کی ادبی صحافت کا ایک دوسرا پہلو یہ تھا کہ
انہوں نے علم کو ادب کا حریف نہیں سمجھا۔ ان کا خیال تھا کہ جو ہر علم سے
ادب نئی وسعتوں اور جہتوں سے روشناس ہوتا ہے اور معلوماتی
مضامین کی اشاعت سے کسی ادبی جریدہ کی قدر و قیمت کم نہیں ہوتی۔ چنانچہ
انہوں نے مہاتما گاندھی کا پیغام، لالہ لاجپت رائے کے خیالات، مولانا ابوالکلام
آزاد کی استدعا، آزادیٔ ہند کا مسئلہ اور مسٹر جناح کی نصیحت کے علاوہ
حبِ وطن کی منزل، دیہاتوں کی تنظیم، اسلافِ ہند کے تمدنی کارنامے اور
اردو ادب پر طوائفوں کا اثر ایسے موضوعات پر مضامین چھاپے۔ اس
طرح کے مضامین کی اشاعت محض اتفاقی نہ تھی۔ وہ زمانہ کے قاری کو حالاتِ
حاضرہ سے باخبر رکھنے کے علاوہ عام دلچسپی کے موضوعات پر اس کی معلومات
میں اضافہ بھی کرنا چاہتے تھے۔ مدیرِ 'مخزن' شیخ عبدالقادر سے اس
سلسلے میں اُن سے خاصی خط و کتابت رہی، لیکن نہ وہ منشی جی کو قائل کر سکے
نہ منشی جی شیخ صاحب کو۔ منشی جی نے سیاسی موضوعات پر مضامین میں
تصویر کا صرف ایک رُخ ہی پیش نہیں کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسائل کی مکمل
تصویر اور اس کے مختلف رنگ و آہنگ پیش کر کے فیصلہ خود قاری پر چھوڑ
دیا جائے اور یہی اُنہوں نے ساری زندگی کیا بھی۔

منشی دیا نرائن نگم نے خود کو نہ دیوپیکر شخصیت کے رُوپ میں پیش
کرنا چاہا نہ کبھی پیش کیا۔ وہ اپنے پیشواؤں کے کارناموں سے واقف
تھے، اُن کی قدر بھی کرتے تھے۔ لیکن "بس طبیعت اِدھر نہیں آتی" والی
کیفیت تھی۔ وہ اپنے رسالے کو ایسا آئینہ خانہ بنانا نہیں چاہتے تھے،
جس میں آپ جس زاویہ سے بھی دیکھیں مصنّف اور قاری غائب اور مدیر
جلوہ گر نظر آئے۔ اپنی ساری عظمتوں اور حشر سامانیوں کے ساتھ منشی جی نے
"زمانہ" کو اپنا نہیں، اس میں لکھنے اور اُسے پڑھنے والوں کا رسالہ بنایا تھا۔ (آگے ۷۴ پر)

**شرقی عثمانی**

# ممتاز صحافی

# مولانا ابوسعید بزمی

ہندوستان کی تاریخِ صحافت میں مولانا ابوسعید بزمی کا نام ۱۹۲۷ء میں اُبھرا، اور تیزی سے اردو صحافت کے اُفق پر نمایاں ہوگیا۔ سہ روزہ اخبار "مدینہ" بجنور اس دور کے صفِ اول کے اخبارات میں شمار ہوتا تھا۔ اس کے لیے اعلیٰ قابلیت اور صلاحیت کے اصحاب کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ بزمی صاحب کے 'مدینہ' کے ادارہ میں شمولیت سے قبل مولانا نصراللہ خاں عزیزؔ 'مدینہ' کے چیف ایڈیٹر تھے۔ اور مولانا نصراللہ خاں عزیزؔ کے بعد مولانا حامدالانصاری غازی چیف ایڈیٹر ہوئے، لیکن چند ماہ بعد ہی وہ سبکدوش کردیئے گئے اور مولانا ابوسعید بزمی چیف ایڈیٹر ہوگئے۔

مولانا بزمی اس زمانے کے صفِ اوّل کے ایڈیٹروں میں سب سے کم عمر تھے۔ اپنی غیر معمولی ذہانت، گہرے مطالعے اور عربی و فارسی اور انگریزی تعلیم کے ساتھ اپنے مخصوص اندازِ فکر اور طرزِ بیان کی بنا پر بہت کم وقت میں وہ پورے ملک میں نہ صرف متعارف ہوگئے۔ بلکہ عزت و احترام کے ساتھ دیکھے جانے لگے۔

بزمی صاحب نے ۱۹۳۵ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے عربی ایم اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ آپ نے گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔ اس سے قبل وہ دیوبند اور بھوپال میں عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کرچکے تھے۔ اور الہ آباد یونی ورسٹی اور پنجاب یونی ورسٹی سے عربی، فارسی اور انگریزی کے امتحانات پاس کرچکے تھے۔ تعلیم کے زمانے ہی میں اعلیٰ معیاری اردو اخبارات اور رسائل میں آپ کے تحقیقی و تنقیدی اور ادبی مضامین اور افسانے اور ڈرامے شائع ہونے لگے تھے۔

مدینہ میں شمولیت سے قبل بھوپال سے ایک ہفت روزہ اخبار "رہنما" کے نام سے جاری کیا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی ہر اشاعت پر ضمانت طلب کی گئی۔ اس کا معیار ہندوستان گیر اخبارات کے برابر تھا۔ اسے بہت اشتیاق اور دلچسپی سے لوگ پڑھتے تھے۔ اس اخبار میں جو مضامین شائع ہوتے تھے، وہ بہت دل چسپ، مدلّل، اور فکر انگیز ہوتے تھے۔ ریاستی حکومت اور انگریز سرکار پر سخت تنقید اور عوامی جذبات اور تحریکات کی بھرپور نمائندگی ہوتی تھی۔ چند اشاعتوں کے بعد ہی یہ اخبار ضمانت نہ داخل کرنے کی بنا پر بند ہوگیا۔

بزمی صاحب ستمبر ۱۹۱۰ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ یہیں پرورش پائی اور تعلیم حاصل کی۔ یہاں کے حالات اور ماحول سے پوری طرح واقف تھے۔ برطانوی ہند اور ریاستی ہند کے حالات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ برطانوی ہند میں تحریکِ آزادی کے نتیجے میں عوام کو جو حقوق اور رعایتیں حاصل تھیں، ریاستی ہند کے عوام ان سے محروم تھے اور مطلق العنان فرماں رواؤں کے ظلم و ستم کا شکار رہتے۔ آزادیٔ تحریر و تقریر کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ظلم و زیادتی اور ناانصافی کے خلاف آواز اُٹھانا بھی جرم تھا۔ سرکاری ملازمتوں میں خوشامدیوں اور چاپلوسوں کے لیے سارے مواقع تھے۔ اور حکومت و اقتدار زیادہ تر ریاستوں میں فرماں رواؤں کے غیر ملکی دوستوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اور مقامی لوگوں کو عام طور پر درجہ چہارم اور بہت کم درجہ سوم کی ملازمتیں بڑی کوشش اور خوشامد کے بعد ملتی تھیں۔ نتیجہ میں بے روزگاری بڑھتی گئی اور عوام میں بے چینی اور پریشانی بڑھتی گئی۔ عوامی بے چینی اور پریشانی نے تحریک کی شکل اختیار کرلی اور ابتداً، تو ریاستوں میں ملکی اور غیر ملکی کے نام سے تحریک چلی اور بعد میں جب کل ہند پیمانہ پر اسٹیٹ پیپلز

● مکتبہ شرقیہ، ابراہیم پورہ، بھوپال

کانفرنس قائم ہوگئی تو پھر ریاستوں میں ذمہ دار حکومت کا مطالبہ شروع ہوگیا۔ آل انڈیا اسٹیٹ پیپلز کانفرنس کی قیادت پنڈت نہرو، شیخ عبداللہ اور پٹابھی سیتارمیہ کر رہے تھے۔

بزمی صاحب نے بھوپالی عوام کے درد و دکھ کو محسوس کیا اور اس کے ازالہ کے لیے یہاں چل رہی تحریکات میں حصہ لینا شروع کردیا اور پہلی مرتبہ ۱۹۳۴ء میں "صبحِ وطن" اخبار کے خلاف گرفتاریوں اور سزاؤں پر ایک زبردست احتجاجی جلوس اور عام جلسہ ہوا۔ جلسہ موجودہ کملا پارک میں ہوا اور بھوپال کی سیاسی تاریخ کا بہت بڑا اور اہم جلسہ تھا۔ بزمی صاحب نے اس جلسہ میں جو تقریر کی وہ بہت پسند کی گئی۔ اور پہلی مرتبہ یہ اندازہ ہوا کہ بزمی صاحب میں بہت اچھے مقرر ہونے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

"مدینہ" کی ادارت کے زمانہ میں ہندوستان کی آزادی کی تحریک اور اس کے رہنماؤں سے بزمی صاحب کے تعلقات برابر بڑھتے گئے۔ ادھر ریاستی تحریکات سے بھی بزمی صاحب برابر متعلق رہے اور آپ نے ایک کتاب "ریاستوں کی سیاست" کے نام سے لکھی، جس کے ذریعہ ریاستی تحریکات کو صحیح رُخ پر چلانے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ یہ کتاب ریاستی کارکنوں کے لیے بہترین رہنما ثابت ہوئی۔ اور اس کی وجہ سے ریاستوں میں اسٹیٹ پیپلز کانفرنس پرجا منڈل کا قیام عمل میں آیا۔

"مدینہ" میں بھی ریاستی تحریکات کی خبریں چھپنے لگیں، جس کی وجہ سے ریاستوں میں بھی مدینہ کی اشاعت بڑھنے لگی۔ بھوپال کی حکومت نے "مدینہ" اخبار پر وار کیا اور اس اخبار کا بھوپال ریاست میں داخلہ بند کر دیا گیا۔ یہ پابندی تقریباً ایک سال تک رہی، لیکن "مدینہ" پڑھنے والوں کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ وہ بھوپال ریاست کے باہر مقامات سے مدینہ اخبار خفیہ طور پر منگواتے تھے اور پابندی سے پڑھتے تھے۔

بزمی صاحب ریاستی تحریکات سے برابر متعلق رہے، اس لیے بھوپال میں اُنھوں نے خان شاکر علی خاں اور مولانا طرزی مشرقی کے ساتھ مل کر ایک اندھیری رات میں بارہ بجے کے بعد ایک مسجد میں بیٹھ کر پرجا منڈل کے قیام کا فیصلہ کیا اور ریاست کے کارکنوں کی سہ روزہ کانفرنس کرکے ۱۹۳۸ء میں پرجا منڈل کے باقاعدہ قیام کا اعلان کیا، اس کانفرنس کی صدارت بھی بزمی صاحب نے کی اور پرجا منڈل کے پہلے صدر بھی منتخب ہوئے۔

فروری ۱۹۴۰ء میں بھوپال کی لیجسلیٹو کونسل کا چناؤ ہوا، جس میں صرف برائے نام ہی عوامی نمائندگی ہوتی تھی۔ پرجا منڈل نے چند نشستوں کے لیے چناؤ لڑنے کا فیصلہ کیا اور بزمی صاحب سے خواہش ظاہر کی گئی کہ وہ بھی چناؤ لڑیں، چنانچہ بزمی صاحب اور مسٹر قدوس صہبائی سابق ایڈیٹر روزنامہ ہند کلکتہ کو پرجا منڈل بھوپال سے کھڑا کیا اور یہ دونوں حضرات شاندار طریقہ پر کامیاب ہوئے۔ اس چناؤ میں کامیابی کا بڑا سبب بزمی صاحب کی ولولہ انگیز اور پُرجوش تقریریں اور تحریریں تھیں جن سے متاثر ہوکر لوگوں نے سرکار کے حمایتی اُمیدواروں کو ناکام بنا دیا۔

پرجا منڈل کے ایک نمائندے سیہور سے محمود حسین صاحب کامیاب ہوئے۔ ان تینوں ممبران نے لیجسلیٹو کونسل کے ایوان میں اپنی پرزور، مدلل اور عوامی احساسات و جذبات سے بھرپور تقریروں سے زلزلہ پیدا کردیا۔ کونسل کے اس ہنگامہ خیز اجلاس سے ایوانِ حکومت میں گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ اور سرکار نے اجلاس کونسل کے دو ماہ بعد ایک درجن سے زائد سیاسی کارکنوں کو گرفتار کرکے نقب زنی اور بلوہ کے الزام میں دو دو سال قیدِ سخت اور جرمانہ کی سزا دے کر جیل میں ڈال دیا ان میں خان شاکر علی خاں، پنڈت چتر نرائن مالوی، مسٹر قدوس صہبائی مسٹر سید ظہور ہاشمی مسٹر نور باز خاں، مسٹر لطف اللہ خاں نظمی، مسٹر عمران انصاری، مسٹر حفیظ الرحمٰن خاں شرر وغیرہ شامل تھے۔ بزمی صاحب ان دنوں بجنور میں تھے۔ بھوپال میں نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس وقت گرفتار نہیں کیے گئے۔

بزمی صاحب نے سرکار کے اس رویّہ کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ اور دو پمفلٹ عرض نیاز اور پیام نیاز کے نام سے شائع کیے۔ جب بزمی صاحب لیجسلیٹو کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لیے بھوپال آئے تو کونسل کے اجلاس سے ایک دن قبل ان کو ڈیفینس آف انڈیا کے تحت گرفتار کرلیا گیا اور عوامی احتجاج کے باوجود ان پمفلٹس پر مقدمہ چلا۔ ان دو مقدمات میں ۲۱-۲۱ ماہ قیدِ سخت اور جرمانہ کی سزا دے کر ان کو بھی جیل میں بند کر دیا گیا۔

جب بزمی صاحب اپنی سزا پوری کرکے جیل سے رہا ہوئے تو ۱۹۴۲ء کی ہندوستان چھوڑو تحریک شروع ہوچکی تھی۔ بزمی صاحب نے اس تحریک میں حصّہ لیا۔

بھوپال جیل سے رہائی کے چند ماہ بعد بزمی صاحب پھر "مدینہ" واپس آگئے اور چند سال کے بعد "مدینہ" چھوڑ کر لاہور چلے گئے، جہاں "زمزم" لاہور روزنامہ "شہباز" لاہور اور "احسان" لاہور و کراچی کے چیف ایڈیٹر رہے۔ "احسان" کی ادارت کے زمانہ میں ہی امریکہ گئے تھے، جہاں ان کا حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہوگیا۔ (ستمبر ۱۹۵۲ء)

بزمی صاحب نے اپنی ذہانت، یادداشت اور مطالعہ کی بنیاد پر بھوپال سینٹرل جیل میں تاریخِ انقلاباتِ عالم کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی، جب کہ جیل میں کسی قسم کی لکھنے پڑھنے یا کتب فراہم کرنے کی سہولت نہ تھی۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوچکی ہے۔ یہ آج کل نایاب ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد تنقید و تبصرہ بھی ان کی مشہور کتاب ہے۔ "زندگی کے جائزے" ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے "مسلمان کیا کریں؟" بھی ان کی حکمت انگیز کتاب ہے۔ ● ●
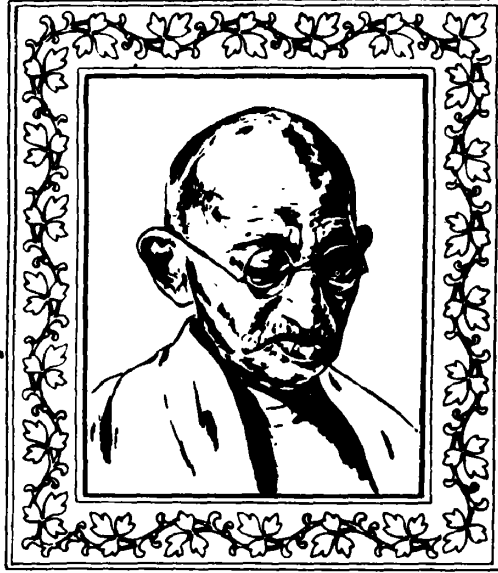
# ہمارا خراجِ عقیدت ——— اتّحاد

"ہم سب ایک ہی خدا کے بندے ہیں، جس کی بندگی ہم مختلف ناموں سے ادا کرتے ہیں۔ اس لئے، یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے لازمی اتحاد کو محسوس کریں، اور انسانوں کے درمیان چھوت چھات، برتری اور کمتری کے احساس کو ترک کر دیں"۔

ایسا کہا تھا مہاتما گاندھی نے جنہوں نے اپنی ہستی کمزوروں کے لئے مکمل طور پر وقف کر دی تھی۔ باپو "پورے سماج کی فلاح" کے علم بردار تھے۔ سماجی انصاف ہمارا قومی نصب العین ہے، جس کے حصول کے لئے ہم کئی ترقیاتی پروگراموں پر عمل کر رہے ہیں، خاص طور سے 20 نکاتی پروگرام پر۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے لفظوں میں، "ملک کی ترقی کے تمام منصوبوں کا مقصد، اقتصادی بنیاد کو مستحکم بنانا ہے، تاکہ ہم لوگ بتدریج، اور اگر ممکن ہو تو بتعجیل، اپنے ملک سے غربت کا خاتمہ کر دیں، اور اپنے سماج سے اقتصادی پسماندگی کو اکھاڑ پھینکیں"۔

## ہمارا عزم ——— پسماندگی کا خاتمہ

84/141

۳ر نومبر ۱۹۸۴ء کو شانتی وَن، دہلی میں ویدک رسموں کے ساتھ سورگیہ شریمتی اندرا گاندھی کے جسدِ خاکی کو آگ کے سپرد کیا گیا۔ پاس میں وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی اور ان کے خاندان کے دیگر افراد سوگوار کھڑے ہیں۔

۱۱ر نومبر ۱۹۸۴ء کو بھارتی ہوائی فوج کے ایک خاص طیارے سے وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی، سورگیہ شریمتی اندرا گاندھی کی استھیوں کو ہمالیہ کے علاقہ گنگوتری پر بکھیرتے ہوئے۔

Regd. No. D(DN) 103
R.N. 948/57

Licensed U(DN) 50 to post without pre-payment
at Civil Lines Post Office, Delhi.

Vol. 43 No. 5 AJKAL (URDU) December 1984

Publishedby the Director Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001, Printed by the Manager, Govt. of India Photolitho Press, Faridabad.

اس شمارے کے قلم کار :

شیام سنگھ ششی ، عابد علی خاں ، نند لال واتل ، غلام ربانی تاباں ،

بانی ، ستیش بترا ، شین مظفر پوری ، مخمور سعیدی ، شانتی رنجن بھٹاچاریہ ،

عبید صدیقی ، نزہت شاہین ، محمد نعمان صدیقی ، فضل المتین ،

محمد یعقوب اسلم ، شمس الحق عثمانی
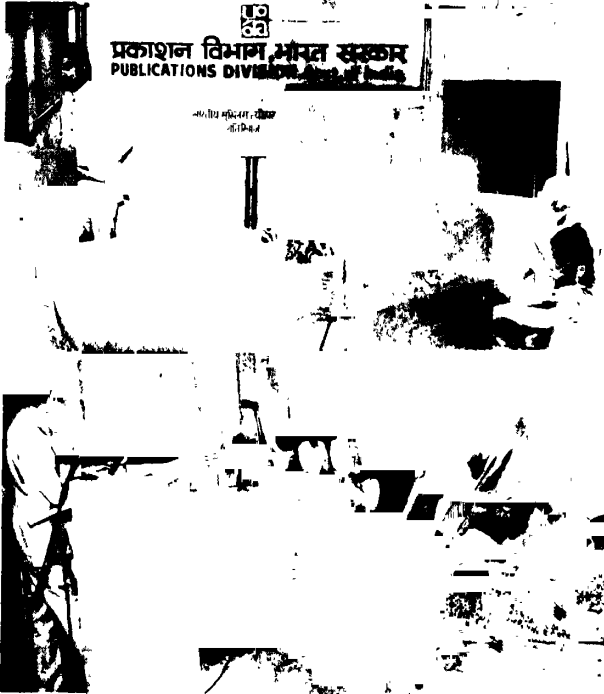
سابق وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی مرحومہ کی سال گرہ کے موقع پر ۱۹ ارنومبر ۱۹۸۴ء کو نئی دہلی میں نائب صدرِ جمہوریۂ ہند شری آر۔ وینکٹ رمن نے اپنی قیام گاہ پر پبلی کیشنز ڈویژن کی انگریزی میں شائع کردہ دو کتابیں: "اندرا گاندھی: ٹری بیوٹس" اور "سلیکٹڈ اسپیچز اینڈ رائٹنگز" از شریمتی اندرا گاندھی جلد سوم کی رسمِ اجرا ادا فرمائی اور یہ کتابیں وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی کو پیش کیں۔
تصویر میں بائیں سرے پر مرکزی وزیرِ مملکت شری ایچ۔ کے۔ ایل۔ بھگت اور دائیں سرے پر نائب وزیرِ اطلاعات و نشریات شری غلام نبی آزاد۔

نائب وزیرِ اطلاعات و نشریات شری غلام نبی آزاد نے پبلی کیشنز ڈویژن میں منعقدہ ایک تقریب میں، ڈاکٹر ماجدہ اسد کی ہندی کتاب "بھارتیہ مسلم تیوہار اور ریتی رواج" کی رونمائی فرمائی۔ نیچے: ڈائرکٹر ڈاکٹر شیام سنگھ ششی تقریر کرتے ہوئے۔

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

ایڈیٹر
راج نرائن راز
اسسٹنٹ ایڈیٹر
عابد کرہانی

قارئین کو
نیا سال مبارک

| جلد : ۴۳ | شمارہ : ۶ | جنوری ۱۹۸۵ء |
| --- | --- | --- |
| قیمت : ایک روپیہ ۵۰ پیسے | فون : ۳۸۷۰۶۹ | پوش۔ ماگھ شک سمت ۱۹۰۶ |


# ترتیب



سرورق : جیون اڈلجہ


بزنس منیجر : ایل۔ آر۔ بترہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منچال

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ :

ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ :

بزنس منیجر : پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

زرِ سالانہ : ۱۵ روپے۔ دو سال کے لیے : ۲۷ روپے۔ تین سال کے لیے : ۳۸ روپے

شیام سنگھ ششی

# فرینک فرٹ بین الاقوامی کتاب میلہ ۱۹۸۴ء

بائیں سے: ڈاکٹر شیام سنگھ ششی، مسٹر وائٹ ہاؤس، قونصل جنرل مسٹر بال کرشن اور مسٹر کے۔ ایس۔ ودیدوان

تہوار اور میلے ہمیشہ سے ہندوستانی روایت کا ایک خاص جزو رہے ہیں۔ خوشی کے لمحات گزارنے اور زندگی کے دُکھ درد کو بھُولنے کا یہ بھی ایک سماجی ذریعہ رہے ہیں۔ میلوں سے جہاں ذہنی اور روحانی سکون کے نئے مواقع میسر آتے ہیں، وہاں یہ انفرادی اور سماجی ضروریات کی تکمیل اور خرید و فروخت کے مواقع بھی مہیا کرتے ہیں۔ یہ سب تو ہے لیکن ہمارے یہاں کتاب میلوں کی روایت کیوں نہیں رہی؟ کیا زرعی معیشت کی وجہ سے پڑھنے لکھنے کی صلاحیتوں کی صحیح نشوونما نہیں ہو سکی؟ یا کوئی اور وجہ ہے؟ یہ تحقیق کا موضوع ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ اوّل اوّل کتاب میلوں کا آغاز مغربی جرمنی کے شہر فرینک فرٹ میں پندرھویں صدی میں ہوا۔ عالمی جنگوں سے پہلے بے شمار کتاب میلے لگتے تھے اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد ۳۶ بین الاقوامی کتاب میلوں نے دنیا کے تمام اشاعتی اداروں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا تھا۔

سالِ رواں میں ۳ اکتوبر کو فرینک فرٹ میں ۳۰ ویں بین الاقوامی کتاب میلہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس میلہ میں شامل ہونے کے لیے راقم الحروف اور محکمۂ اطلاعات و نشریات کے جوائنٹ سکریٹری جناب کے۔ ایس۔ ودیدوان ساتھ ساتھ ایر انڈیا کے طیارے سے روانہ ہوئے۔ فرینک فرٹ میرے لیے کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ میں نے اپنے تخلیقی اور تحقیقی پراجیکٹوں کے سلسلے میں پہلے دو تین بار وہاں جا چکا ہوں تب مقصد رومائوں سے متعلق تحقیق تھا۔ اب پیشِ نظر منصوبہ ہندوستانی فنون اور ثقافت کو دنیا میں روشناس کرانے کا تھا۔ فرینک فرٹ شہر اپنی خوبصورتی اور رنگینی کے لیے مشہور ہے۔ ہوائی اڈے کے ساتھ ہی لگا ہوا خاص ریلوے اسٹیشن ہے۔ اور پھر وہیں سے شروع ہو جاتا ہے تیز سٹرسیا۔ کلبوں اور دوشیزاؤں کی جنت ــــ یعنی "سیکس شاپ"، لیکن ہمیں اس دنیا سے کیا غرض۔ ہمیں تو سرسوتی کے عبادت گزار مصنفوں اور پبلشروں سے ملاقات کرنا تھی۔ آیئے اب ایک نظر اس میلے پر ڈالیں۔

دلّی کے پرگتی میدان کی طرح فرینک فرٹ کی اس عظیم الشان نمائش گاہ میں سات بڑے بڑے ہال ہیں۔ کتاب میلہ تیسرے ہال سے شروع ہوتا ہے جس میں سائنسی، تکنیکی، طبّی اور اسکولی کتابیں نمائش کے لیے رکھی ہوئی ہیں۔ اسی ہال میں بین الاقوامی سطح پر کتابوں کی فروخت کا مرکز بھی ہے۔ ہال نمبر ۴ میں بین الاقوامی اشاعتی ادارے ہیں، جن میں بے شمار ملکوں کی رنگارنگ دیدہ زیب کتابیں عالمی ثقافت کی مختلف جہات کا اشاریہ بنی ہوئی ہیں۔ اسی اسی ہال میں ہمارا بھارت بھی ہے۔ یہ اسٹال نیشنل بک ٹرسٹ کا ہے۔ اس میں ہندوستان کے ایک سو سے زیادہ ناشروں کی کتابیں نمائش کے لیے رکھی ہوئی ہیں۔ اس کے ایک حصہ میں مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات کے پبلی کیشنز ڈویژن کا اسٹال ہے۔ پبلی کیشنز ڈویژن کے اسٹال پر ۲۲ سرکاری اشاعتی اداروں کی ہندوستانی ثقافت اور ملک کی ترقی سے متعلق ۳۰۰ کتابیں سجی ہوئی ہیں۔ یو۔ بی۔ ایس۔ اسٹرلنگ پبلشرز، اسٹار پبلی کیشنز وغیرہ کے جداگانہ اسٹال بھی اسی ہال میں ہیں۔ بھارت کے ۲۱ اسٹالوں پر لگ بھگ ساڑھے تین ہزار کتابیں ہندوستانی زندگی کا آئینہ بنی ہوئی ہیں۔

اس بین الاقوامی کتاب میلہ میں ہندوستان کی کتابوں کی برآمد کے سلسلے میں بعض نئی معلومات حاصل ہوئیں۔ بھارت سے زیادہ تر کتابیں ریاستہائے متحدہ امریکہ درآمد کرتا ہے۔ پچھلے چار برسوں میں ایسی درآمدہ کتابوں کی مالیت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ امریکہ کو برآمد کی جانے والی

باقی نئی جگہ

کتابوں کی مالیت ۸۰-۱۹۷۹ء کے ۶ کروڑ ۲ لاکھ سے بڑھ کر ۸۳-۱۹۸۲ء میں بیس کروڑ روپے تک پہنچ گئی ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے بعد کینیا، متحدہ عرب امارات، کویت، بنگلہ دیش، انگلینڈ، یمن وغیرہ جیسے ممالک ہماری کتابیں درآمد کرتے ہیں۔ ماریشس، فجی اور سری نام میں ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کی کتابوں کی اچھی مانگ ہے۔ فرینک فرٹ کتاب میلے میں ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کی کتابیں بھی نمائش کے لیے رکھی ہوئی ہیں۔

ہندوستانی کتابوں کے سلسلے میں ہم نے کئی غیر ملکی تقسیم کاروں سے بات چیت کی جب ان کا ردِ عمل جاننا چاہا تو معلوم ہوا ہماری کتابیں طباعت، تزئین اور گٹ اپ وغیرہ کے اعتبار سے ابھی پیچھے ہیں۔ اور دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کے مختلف اشاعتی اداروں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں بہت محنت کرنا ہوگی۔ بچوں کے ادب میں انگلینڈ، امریکہ، روس، جاپان، جرمنی وغیرہ ممالک نے بہت ترقی کی ہے۔ کھلونا کتابوں سے لے کر الیکٹرانک تک کتابیں دیکھنے میں آئیں۔ ان کتابوں کے دام بھی کم نہیں ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے بچوں کو آئس کریم اور چاکلیٹ وغیرہ کھلانے کے لیے دس روپے تو خرچ کر سکتے ہیں، لیکن اتنے پیسوں کی کوئی عمدہ کتاب بچوں کو خرید کر نہیں دے سکتے۔ کاش ہمارے ناشروں اور ہندوستانی والدین کی توجہ اس ضرورت کی طرف بھی مبذول ہو پاتی۔

یہ کتاب میلہ بہت بڑا تھا۔ ہمیں اس میں شریک چھ ہزار ناشروں سے فرداً فرداً ملنے کے لیے کئی ہفتے درکار تھے، لیکن میلہ چار یا پانچ دن ہی کا ہوتا ہے۔ فرینک فرٹ والے اپنے یہاں لوگوں کو اس سے زیادہ عرصے کے لیے مہمان بنائیں بھی تو کیوں؟ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم ایک ہفتہ سے زیادہ عرصہ وہاں گزار آئے۔

آئیے —— اب ہال نمبر ۵ میں چلیں —— لیکن یہاں تو کوئی انگریزی زبان بھی نہیں سمجھتا۔ یہاں سب ہی جرمن زبان کے ناشر ہیں، جن کی تعداد ایک سو سے زائد ہے۔ قصے کہانیوں سے لے کر علوم و فنون، سائنس کی کتابوں کا عظیم الشان ذخیرہ۔ یہاں ترجمہ شدہ ادب کم دیکھنے میں آیا۔ یہاں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ ملک اپنی زبان کے بل پر اتنا آگے بڑھا ہے۔

ہال نمبر ۶ میں آرٹ، مذہب، بچوں کا ادب، نقشہ جات اور سفرناموں کے علاوہ متفرق کتابوں کا مرکز بھی ہے۔ ساتواں ہال تکنیکی موضوعات کے لیے مخصوص ہے۔

ہم نے ایک سو سے زیادہ ناشروں اور تقسیم کاروں سے بات چیت کی۔ بہت سے مصنفین اور اخبار نویس اور اساتذہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ اکثریت پیشہ ور ناشروں کی ہے۔ بھارت سے کوئی بے چارہ مصنف وہاں کیوں کر جاتا! اور یہاں ناشروں کو اپنا ہی خسارہ پورا کرنے سے فرصت نہیں ملتی۔ ہاں وہاں مقیم بھارتی عالم، ڈاکٹر اندو پرکاش پانڈے اور ان کی جرمن پتنی شریمتی ہارڈی اور بھارتی قونصل جنرل جناب بال کرشن وغیرہ بھارتی پویلین کی رونق اور وقار میں اضافے کا سبب بنے۔

تراجم کے نقطۂ نظر سے کچھ لٹریری ایجنٹوں سے بات چیت ہوئی۔ بھارت میں یہ لفظ عجیب سا معلوم ہوگا۔ تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ فرینک فرٹ کے کتاب میلے میں لٹریری ایجنٹوں کے کئی اسٹال ہیں۔ یہ لوگ ایک سے دوسرے زبانوں میں تراجم کے علاوہ کتابیں بھی شائع کراتے ہیں۔ ہندی سے انگریزی، فرانسیسی یا جرمنی میں ترجمہ کے لیے ہم کسی ایجنٹ کو نہیں ڈھونڈ سکے۔ ہاں کچھ انگریزی کتابوں کے عربی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں تراجم کے امکانات پر البتہ تبادلۂ خیال ہوا۔

میلے کے منتظمِ خاص شری پیٹر وائٹ ہاؤس سے ایک ملاقات کے دوران ہمیں معلوم ہوا کہ فرینک فرٹ کتاب میلے میں ہر سال لگ بھگ ۶۰۰۰ ناشر اور تقسیم کار شریک ہوتے ہیں اور اس سال اس میلے میں ۹۶ ملکوں کے ۶۱۹۲ اشا[عتی] اداروں نے اپنی کتابیں رکھی ہیں۔ انہوں بتایا کہ اس میلے کا مقصد بین الاقوامی اور قومی سطح پر ادب کا تبادلہ کرنا ہے۔ یہاں کتابیں [فر]وخت کے لیے نہیں بلکہ نمائش کے لیے آتی ہیں۔ ناشر اور تقسیم کار اپنی اپنی کتابوں کی شرائطِ فروخت طے کرتے ہیں۔ اور درآمد، برآمد کے سودے ہوتے ہیں۔ تراجم کے جملہ حقوق اور دوسرے متعلقہ امور پر سمجھوتے کیے جاتے ہیں۔ کون سی کتاب کی قطعی مانگ نہیں رہی یا امکانی مانگ کے ضمن میں کیا توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں وغیرہ جیسے موضوعات پر مباحثے ہوتے ہیں۔

ہم نے جب پیٹر صاحب سے کتاب خریدنے والوں کی گھٹتی ہوئی تعداد کی وجہ پر روشنی ڈالنے کے لیے کہا تو ان کا جواب تھا..... "دیکھیے یہ مقا[لہ] جسے نیویارک یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر نیل پو[سٹ]مین نے لکھا ہے۔ ڈاکٹر نیل کا کہنا ہے کہ آج کیلی اشاعتی روزگار کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ پرنٹ میڈیا (تحریری ادب) کو نگلنے میں لگا ہے۔ ہماری سیاست، ہماری خبریں، ہمارا[...] ہماری تعلیم اور ہماری صنعت و حرفت تحریری ادب کی شکل میں گھٹتا جارہا ہے اور ٹیلی ویژن کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق نئی شکل اختیار کرتا جارہا ہے۔ ٹیلی ویژن کی بنیاد بصری ذرائع پر ہے اور یہ تصویروں کے ذریعے بات کرتا ہے۔ تحریری الفاظ کے ذریعہ نہیں۔ دوردرشن سے ناظرین کا براہِ راست تعلق ہوتا ہے اور اثر بھی زیادہ پڑتا ہے۔

پروفیسر نیل نے ٹیلی ویژن کے متعدد برے نتائج بتائے اور ساتھ ہی عالمی سطح پر اشاعتی دنیا کو اس پہلو پر غور و خوض کی ضرورت د[...]

اسی وقت ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ کتاب میلے کے آنگن میں ایک طرف ٹی وی سیٹ توڑے جا رہے تھے۔ ایک نوجوان کبھی ٹی وی سیٹ توڑ چکا تھا۔ اور وہ جرمن زبان میں کچھ اعلان بھی کر رہا تھا۔ ٹی وی سیٹوں کے ٹوٹنے کے دوران مختلف قسموں کی آوازیں بھی پیدا ہو رہی تھیں۔ پہلے تمام ٹی وی سیٹ کسی جانور کی شکل میں رکھ دیئے جاتے اور پھر انہیں توڑنے کی تیاری ہوتی — یہ تماشا دیکھنے کے لیے کتابوں کے بے شمار شائقین جمع ہو جاتے۔ پروفیسر نیل کی تقریر پڑھنے کے بعد اس تماشے کا کچھ کچھ راز ہم پر کھلا۔

میلے کے پہلے دن مغربی جرمنی کے چانسلر ڈاکٹر ہیلمیٹ کوئل نے اپنی افتتاحیہ تقریر میں کہا تھا..... "اس میں کوئی شک نہیں کہ کتابوں کی اشاعت کے کاروبار کو بصری و سماعی ذرائع ابلاغ کا چیلنج درپیش ہے۔ لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ کتاب چلتی پھرتی تصویروں کی دنیا میں، ٹیلی ویژن اور ویڈیو فلم کے اس دور میں اپنا مقام بنائے رکھے گی۔ فلم سلائڈ یا صرف ٹیلی ویژن یا بحث و مباحثے پر منحصر علم یونی ورسٹی کی تعلیم کا نعم البدل نہیں بن سکتا۔

انہوں نے ایک چٹکی سیاست پر لی — کہا کہ سیاست کی زبان پیچ دار ہوتی ہے۔ سبھی سیاستدان الفاظ کا جال بنتے ہیں، لیکن اس میں ٹھوس بات کچھ نہیں ہوتی۔ وہ الفاظ کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہیں۔ الفاظ کے ہیر پھیر میں عوام کو الجھاتے ہیں۔ نئے الفاظ گھڑتے ہیں، کچھ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیتے ہیں، آج الفاظ کے ساتھ جو جدوجہد نظر آتی ہے، وہی اکثریت کے لیے جدوجہد ہے۔

انہوں نے زبان کے مفاد ذات کے لیے جائز و ناجائز استعمال پر تفصیل سے نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ کتابیں روحانیت اور طاقت میں عدم توازن کی مظہر ہیں۔

میں "جرمن ادب" کے اسٹال کی طرف مڑتا ہوں تو اچانک "رومالٹریچر" کے ایک اسٹال پر نظر پڑ جاتی ہے۔ کچھ لمحات کے لیے ٹھہرتا ہوں تو اچانک جانے پہچانے ماہر سماجیات مل جاتے ہیں۔ ایک کتاب کو الٹ پلٹ رہے تھے۔

پوچھتے ہیں..... "کہیے، آپ اس مرتبہ روماؤں پر کون سی ریسرچ کے لیے آئے ہیں"

میں مسکراتا ہوں..... "بھیا، روما ریسرچ کا زمانہ گیا۔ اب تو اپنے ہی بارے میں ریسرچ کرنی پڑ رہی ہے۔ اپنی، یعنی ہندوستانی کتابوں کو غیر ممالک تک پہنچانے کی" یہ سن کر وہ بولے۔

"اچھا تو آپ کا تاثر آپ کے اندر کے مصنف پر حاوی ہونے لگا ہے۔ میں نے فوراً پیلی کیشنز ڈویژن کی شائع شدہ GIPSY کتاب ان کے ہاتھ میں تھما دی۔

ہر برس مشہور بین الاقوامی میلے کہاں کہاں ہوتے ہیں، اس سے متعلق جو معلومات ہمیں حاصل ہوئیں وہ اس طرح ہیں: فرینک فرٹ، ماسکو قاہرہ، لندن، سنگاپور، منیلا، بحرین وغیرہ۔ جیسے شہروں میں کتاب میلے باقاعدگی سے لگتے ہیں۔ اس سال کا پروگرام اس طرح ہے:

۱۔ قاہرہ ۲۶ جنوری سے ۶ فروری
۲ میکسیکو ۱۰ سے ۸ مارچ
۳۔ لندن ۱۰ سے ۱۳ اپریل
۴۔ بچوں کی کتاب نمائش انقرہ ۱۸ سے ۲۵ اپریل
۵۔ ٹرینیڈاڈ اور ٹوبیگو (اسپین) ۲۷ مئی
۶۔ زمبابوے (۲۸ اگست سے یکم ستمبر)
۷۔ سنگاپور (یکم سے ۶ ستمبر)
۸۔ کیوبا (۱۴ سے ۲۰ ستمبر)
۹۔ فرینک فرٹ (۳ سے ۸ اکتوبر)
۱۰۔ کوالالمپور (۵ سے ۱۴ اکتوبر)
۱۱۔ ماریشس (۲۲ سے ۲۷ اکتوبر) ہندوستانی کتاب میلہ
۱۲۔ بلغاریہ (۲۵ سے ۳۱ اکتوبر)
۱۳۔ خرطوم (سوڈان) ہندوستانی کتاب میلہ (۱۴ نومبر سے ۱۶ نومبر)
۱۴۔ بنگلہ دیش ہندوستانی کتاب میلہ (نومبر، دسمبر)
۱۵۔ تہران (۳ سے ۶ دسمبر)

دوسری عالمی جنگ کے بعد فرینک فرٹ کتاب میلے میں ایک نعرہ دیا گیا تھا — "صرف اونٹ کتاب نہیں پڑھ سکتا"۔ شاید اس کا مطلب کتاب کی اہمیت کو ثابت کرنا رہا ہوگا۔ ادھر کچھ برسوں سے اس میلے کا موضوع متعین کیا جانے لگا ہے۔ مثلاً ۱۹۷۹ء میں لاطینی امریکہ، ۱۹۸۰ء میں تاریک افریقہ، ۱۹۸۲ء میں مذاہب اور امسال آریل ۲۰۰۰ بحث کے موضوعات تھے۔ اگلا میلہ ہندوستانی ناشروں کے لیے ایک خوشخبری ہے۔

فرینک فرٹ کا اگلا بین الاقوامی کتاب میلہ ۱۹۸۶ء میں ہوگا اور اس کا موضوع ہوگا.... "بھارت"۔

اور اس خبر کو لے کر ہم اپنے وطن لوٹ آئے، ۱۹۸۶ء میں پھر اپنے بھارت کو بھارتی [illegible] فرینک فرٹ لے جانے کے لیے۔

## فیض احمد فیض

عظیم انقلابی شاعر اور مفکر جناب فیض احمد فیض کا

(آگے ۲۵ پر)

عابد علی خاں

# جنوبی ہند میں اُردو صحافت

سال حال جولائی میں اردو صحافت نے اپنے ۱۹۲ سال خاموشی سے مکمل کر لیے۔ اُردو نے مُلک کی جدّوجہدِ آزادی میں جو نمایاں رول ادا کیا اور حکومتِ برطانیہ کے رسوائے زمانہ سیاہ قوانین کی بے باکانہ انداز میں مخالفت کی، اس کا اعتراف تک نہیں کیا گیا۔ یہ بڑی بدبختی کی بات ہے کہ آزادی کے بعد اب تک بھی ہماری عوامی حکومت نے ان قربانیوں کا صحیح طور پر اعتراف نہیں کیا، جو اُردو زبان اور اُردو صحافت نے گزشتہ برسوں کے دوران دی ہیں۔

یہ مضمون اگرچہ جنوبی ہند اور خاص کر حیدرآباد کی اُردو صحافت سے متعلق ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُردو صحافت نے گزشتہ ۱۹ دہوں کے دوران جو تاریخی اور تاریخ ساز رول ادا کیا ہے اس کو ہندوستانی صحافت کی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھا جائے گا! کیوں کہ اُردو ہندوستان کی سب سے زیادہ بولی، سمجھی اور لکھی جانے والی زبان ہے۔ اس لیے ہندوستان کی دوسری زبانوں کے اخبارات کے منجملہ اردو اخبارات ہی پر برطانوی حکام کا زیادہ عتاب نازل ہوتا رہا۔ بمبئی کرانیکل ہندو اور بعد ازاں نیشنل ہیرالڈ جیسے انگریزی اخبارات کو چھوڑ کر بڑی حدتک تمام انگریزی اخبارات موافق برطانیہ تھے۔ اور بڑی حد تک برطانوی حکومت کی برقراری کی وکالت کرتے تھے۔ اس کے برخلاف اردو اخبارات نے جدوجہدِ آزادی اور آزادیٔ اظہارِ خیال کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لی اور اس بلند خیالی کی ان کو بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ مولانا محمد حسین آزاد کے والدِ محترم مولانا محمد باقر اس راہ کے پہلے شہید قرار پائے۔ راجہ رام موہن رائے کے علاوہ جو اردو صحافت کے عظیم ... اور فارسی اور اُردو صحافت کے نقیب مانے جاتے ہیں، مولانا محمد علی، ... ابوالکلام آزاد اور مولانا حسرت موہانی اور دیگر حضرات کو بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑے، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں اور ان کے پریس ضبط کر لیے گئے۔ جنوبی ہند میں صورتِ حال قدرے مختلف تھی۔ بجز "مدراس پریسیڈنسی" کے تین دیسی ریاستیں جنوب میں تھیں۔ سلطنتِ آصفیہ جس دنیا کی متموّل ترین شخصیت کی حکومت تھی۔ میسور صنعتی طور پر سب سے زیادہ ترقی یافتہ ریاست تھی، اور ٹراونکور و کوچین بھی ترقی یافتہ اور مہذب ... مانی جاتی تھیں۔ ملک بھر میں تعلیم یافتہ افراد کا تناسب اسی ریاست ... سب سے زیادہ تھا۔ اس سے ہٹ کر مدراس کے عوام انگریزی سے ... قربت رکھتے تھے، اس لیے مدراس میں اُردو صحافت کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ کیرالا سے آج بھی کوئی اردو اخبار شائع نہیں ہوتا نہ پہلے کبھی ہوا تھا۔ کرناٹک میں بھی اردو صحافت نے زیادہ ترقی نہیں کی۔ جدوجہدِ آزادی میں اس ریاست کے اخبارات کا رول جیسے نہ ہونے کے برابر ہے۔ ادھر کچھ عرصے سے بنگلور "سالار" مستحکم بنیاد اور معیاری صحافتی انداز پر شائع ہو رہا ہے۔ تاملناڈو ہمیشہ اردو صحافت میں پیچھے رہا ہے۔ مہاتما گاندھی کی قیادت کے اثر اور "مدراس پریسیڈنسی" میں سیاسی بیداری نے جنوب کی دیسی ریاستوں میں بھی اپنا اثر ضرور دکھایا، لیکن ان ریاستوں کے عجیب و غریب رول کے ... آزادیٔ اظہارِ خیال کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

دوسری جنگِ عظیم نے برطانیہ کو آزادی کی قطعی تاریخ کا اعلان کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس اعلان کے بعد حالات تیزی سے بدلتے گئے۔ ہندوستان ... سیاسی تقسیم کے بارے میں گرما گرم مباحث شروع ہو گئے۔ لیکن شمال ...

---

● ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" جواہر لال نہرو روڈ، حیدرآباد

کشمیر اور جنوب میں حیدرآباد کچھ دوسرے ہی خواب دیکھ رہے تھے۔ اقتدار کی حقیقی منتقلی سے عین قبل تک بھی مسلم انتہاپسند ، قاسم رضوی کی زیرِ قیادت صورتِ حال پر کنٹرول کرنے لگے۔ انھوں نے اپنے آپ کو "انا الملک" (ہم بادشاہ ہیں) کہتے ہوئے سیاسی اقتدار پر کنٹرول حاصل کرنا شروع کر دیا۔ نظامِ وقت حیدرآباد کی آزادی کا اعلان کرنے پر مجبور کر دیئے گئے۔ یہ بڑے افسوس کی بات تھی کہ اُس وقت اخبار "پیام" (ایڈیٹر قاضی عبدالغفار) رعیت (ایم۔ نرسنگ راؤ) نئی زندگی (پروفیسر جے۔ این۔ شرمن) اور صد سالہ اخبار مشیرِ دکن کو چھوڑ کر باقی تمام اُردو اخبارات نے قاسم رضوی کی جذباتی انداز میں حمایت کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ آزادیٔ اظہارِ خیال تو کجا خانگی محفلوں میں سیاسی بات چیت کرتے ہوئے خوف محسوس ہوتا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی روپوش ہو چکی تھی۔ ان حالات میں نوجوان صحافی شعیب اللہ خاں نے اخبار "امروز" جاری کیا۔ راست بازی پر مبنی ان کی تحریریں رضاکار تحریک اور نظام کی شخصی حکومت کے خلاف ہوا کرتی تھیں۔ شعیب اللہ خاں کی تنقیدوں کو اربابِ اقتدار نے برداشت نہیں کیا۔ قاسم رضوی نے زمرد محل ٹاکیز میں منعقدہ ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ایسے عناصر کے خلاف سخت تنقید کی اور انہیں خبردار کیا۔ اس تقریر کا نتیجہ شعیب اللہ خاں کے قتل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ حکومتِ ہند کے لیے اب حالات ناقابلِ برداشت ہو گئے۔ حیدرآباد میں مقیم ہندوستانی نمائندہ مسٹر کے۔ ایم۔ منشی نے دوستانہ تصفیہ کی تلاش کی آخری کوشش کے طور پر تجویز پیش کی کہ ہندوستانی فوج کو سکندرآباد میں ٹھہرایا جائے تاکہ اگر ضروری ہو تو حکومتِ ہند کی جانب سے مداخلت کی جا سکے۔ حیدرآبادی تہذیب کے لیے پنڈت نہرو اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ بلبلِ ہند شریمتی سروجنی نائیڈو کو اپنی ریاست سے والہانہ محبت تھی۔ ان وجوہات کی بنا پر پولیس ایکشن میں تاخیر ہوئی۔ کابینہ میں مناسب نمائندگی دینے کی حکومتِ ہند کی عظیم پیش کش بھی، افسوس ہے کہ قبول نہیں کی گئی۔ تب حکومتِ ہند نے پولیس ایکشن کا حکم دیا۔

پولیس ایکشن نے حیدرآباد میں اردو صحافت کے لیے ایک نیا باب کھولا۔ بیشتر اخبارات یا تو اپنے طور پر بند کر دیے گئے یا پھر فوجی انتظامیہ نے ان کی اشاعت معطل کر دینے کا حکم دیا۔ لیکن وہ اخبارات جنھوں نے سنجیدہ اندازِ فکر اختیار کیا تھا اور ہندوستان میں جمہوری حکومت کے قیام کی وکالت کی تھی، ان کی اشاعت جاری رہی اور انھوں نے ریاست کے سیاسی حالات پر زیادہ کھُل کر اظہارِ خیال کرنا شروع کیا۔ ۱۵ راگست ۱۹۴۹ء کو دو اخبارات "شعیب" اور "سیاست" کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ "شعیب" کے مُدیر جناب انیس الرحمٰن تھے، جن کا تعلق بہار سے تھا۔ اس اخبار کی سرپرستی حکومت نے کی تاکہ شعیب اللہ خاں مرحوم کی بیوہ اور بچوّں کی مدد کی جا سکے اور قومی نظریات کو عام کیا جا سکے۔ "سیاست" ایک آزاد اخبار کی حیثیت سے قارئین تک پہنچا۔ حکومت کی جانب سے مالی امداد کے باوجود اخبار "شعیب" کی اشاعت تھوڑے سے عرصے میں بند ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انیس الرحمٰن صاحب کا تعلق نہ تو حیدرآباد سے تھا اور نہ انہیں حیدرآباد کی تاریخ اور اس کی روایات سے دلچسپی تھی۔ جس منصوبے کے تحت انہیں حیدرآباد لایا گیا تھا، وہ کارگر ثابت نہ ہو سکا۔ اس سے ہٹ کر تجربہ کار صحافی مسٹر ہُدہ ویر کی زیرِ ادارت حیدرآباد سے روزنامہ 'ملاپ' کی اشاعت شروع ہوئی۔ اخبار "رہبرِ دکن" جس کی اشاعت پولیس ایکشن کے بعد مسدود ہو گئی تھی، نام میں قدرے تبدیلی کے ساتھ یعنی "رہنمائے دکن" کے نام سے دوبارہ شروع ہو گئی۔ انتظامیہ وہی رہا جو پہلے تھا۔ جذباتیت سے سنجیدگی اور اعتدال پسند صحافت کی جانب اچانک تبدیلی اور حکومت کی پالیسیوں پر جائز تنقید ریاست کے اردو قارئین کے لیے بالکل نئی بات تھی۔ کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ اخبارات کھُلے بندوں حکومت پر تنقید بھی کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کے جمہوریہ ہونے کے اعلان اور آزاد ہند کے شہریوں کو بنیادی حقوق کی ضمانت دیئے جانے کے بعد مُلک میں صحافت اور بالخصوص ہندوستانی زبانوں کے اخبارات نے تیز رفتار ترقّی کی۔ حیدرآباد سے ان دنوں سات روزنامے اور کئی ہفتہ وار اور دیگر میقاتی جرائد شائع ہو رہے ہیں۔

ریاست میں سیاسی تبدیلی کے بعد یہ بات بجا طور پر محسوس کی گئی کہ قارئین اس نئے ماحول میں جو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی وکالت اور حکومت کی سرگرمیوں اور ترقیاتی پروگراموں کی تشہیر کرتا تھا۔ اور حکومت کی خامیوں پر اداریوں کے ذریعے توجہ دلانے کی جسارت رکھتا تھا، خبریں پڑھنے کے عادی نہ تھے اُنہیں خبروں میں کوئی جذباتیت نہیں ملتی تھی۔ فرقہ وارانہ ہنگامے بھی دب گئے تھے۔ رپورٹنگ واقعاتی اور حقیقی ہوتی تھی۔ ابتداً ایسے اخبارات کی تعدادِ اشاعت کم تھی۔ روزنامہ "سیاست" کی تعدادِ اشاعت زمانۂ آغاز میں آٹھ سو سے کم تھی۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اُردو اخبارات نے سارے قارئین کے دلوں میں جگہ پیدا کر لی اور آج کے دَور میں جذباتیت یا سستی مقبولیت یا زرد صحافت کا کوئی مقام نہیں۔

ماضی میں اردو صحافت کے معیار کو بلند رکھنے کا سہرا قاضی عبدالغفّار مدیر "پیام" کے سر ہے، جن میں مولانا محمد علی، مولانا آزاد اور سید عبداللہ بریلوی کے اوصافِ حمیدہ کی جھلک نمایاں تھی۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ جنوب میں آج اردو صحافت نے عصرِ جدید میں قدم رکھ دیا ہے۔ اور مُلک کے سارے دیسی زبانوں کے اخبارات سے مسابقت کرنے کے موقف میں ہے۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب اردو اخبارات میں شائع شدہ صحیح خبروں پر بھی اعتبار نہیں کیا جاتا تھا تاآنکہ وہ انگریزی اخبارات میں

آگے ص ۱۳ پر

نند لال واتل

# ریاست جموں و کشمیر میں اُردو صحافت

آزادی کے بعد ریاست جموں و کشمیر نے جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں ترقی کی، اسی طرح اردو صحافت کے شعبے میں بھی نمایاں پیش رفت ہوئی۔ اس موضوع پر لکھنے سے پہلے جموں و کشمیر میں صحافت کی تاریخ کے بارے میں چند حقائق پیش کرنا موزوں رہے گا۔ ایک وقت تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ جموں و کشمیر ریاست میں سب سے پہلا اخبار لیہہ (لداخ) میں شائع ہوا تھا۔ اس کا نام تھا "لداخ پھونیاں"۔ ۱۹۰۳ء میں عیسائی مشنریوں نے اسے جاری کیا تھا۔ اور وہاں ہی بودھی زبان میں لیتھو پریس پر چھپتا تھا۔ اس میں مشنریوں کی سرگرمیوں کے علاوہ کچھ مقامی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔

آزادی سے پہلے مزید تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ جموں و کشمیر میں پہلا اخبار ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا۔ ریاست کے سابق پرنسپل انفارمیشن آفیسر اور سرکردہ دانش ور شری بلدیو پرشاد شرما نے ذاتی تحقیق کی بنا پر اس سلسلے میں کچھ اہم معلومات فراہم کیں۔ انہوں نے ایک تحقیقی مضمون میں لکھا ہے کہ :-

"ریاست کا پہلا اخبار ۱۰۸ برس پہلے ۱۸۶۷ء میں جموں سے شائع ہوا تھا۔ اس کا نام "بدیا بلاس" تھا۔ یہ ایک ہفتہ وار اخبار تھا اور اردو اور ہندی رسم الخط میں چھپتا تھا۔ اس اخبار کے وجود کا تذکرہ ہمیں اختر الدولہ حاجی سید محمد اشرف نقوی کی کتاب "اختر شاہنشاہی" (حصہ اول) سے ملتا ہے۔ یہ نایاب کتاب جسے "سوانح عمری اخبارات" کا نام دیا گیا ہے، جون ۱۸۹۴ء میں اختر پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی تھی۔ اس کے مصنف اخبار "اختر ہند" لکھنؤ کے ایڈیٹر اور اختر پریس لکھنؤ کے مالک تھے۔ اس کتاب میں اس زمانے کے ۱۵۱۸ اخبارات کا تذکرہ ہے۔ ان اخبارات کی تاریخ اجرا، مطبع و مقام اشاعت اور بعض صورتوں میں ان کی پالیسی وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔"

شری بلدیو پرشاد شرما نے "اختر شاہنشاہی" کی بنا پر ہی لکھا ہے کہ "۱۸۷۲ء "تحفۂ کشمیر" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار منشی جمنا پرشاد کی ادارت میں شائع ہوا۔ اس کا سالانہ چندہ پندرہ روپے تھا۔ ریاست سے شائع ہونے والا تیسرا اخبار "جموں گزٹ" تھا۔ یہ بھی سرینگر سے شائع ہوتا تھا۔ اس کا ایڈیٹر ایک سرکاری افسر تھا اور اسے "سرکاری گزٹ" کا درجہ حاصل تھا۔ سرکاری محافظ خانہ (RECORD OFFICE) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں اخبار ۱۹۰۵ء سے پہلے ہی بند ہو چکے تھے چنانچہ اسسٹنٹ ریذیڈنٹ کشمیر نے اپنی چٹھی ۲۲۷۳ مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۰۴ء میں ریاست کی کونسل سے یہ دریافت کیا تھا کہ آیا جموں و کشمیر میں کوئی اخبار شائع ہو رہا ہے — اس کے جواب میں کونسل نے اسسٹنٹ ریذیڈنٹ کو اطلاع دی کہ دسمبر ۱۹۰۵ء تک ریاست میں کوئی اخبار شائع نہیں ہو رہا ہے۔ ۱۹۰۷ء میں جیوتشی بشیشر پرشاد صدر ڈوگرہ کمیٹی نے "ڈوگرہ گزٹ" نام کا اخبار جاری کیا۔ لالہ ہنس راج اس کے ایڈیٹر تھے۔ جون ۱۹۲۴ء میں لالہ ملک راج صراف نے "رنبیر" نام کا ہفتہ وار اردو اخبار جاری کیا۔ یہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کا عہد تھا اور اس اخبار کی پیشانی پر یہ شعر درج ہوتا تھا۔[۵]

فخر ہم نامی ہے سمجھو کو جب شری رنبیر کا      داستہ ہے بے خطر تری ہمت و تدبیر کا

جموں و کشمیر میں پریس اور پلیٹ فارم کی آزادی تحریک حریت کی دین ہے۔ ۱۲ نومبر ۱۹۳۱ء کو مہاراجہ ہری سنگھ جی نے عوام کی شکایات کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی کی تقرری عمل میں لائی۔ اس وقت کی حکومت ہند کے فارن اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ایک انگریز افسر مسٹر بی جے گلینسی

○ روزانہ "خدمت"، خدمت ہاؤس، پوسٹ باکس نمبر ۱۱، سرینگر ۱۹۰۰۰۱

(Mr. B.J.GLANCY) اس کے چیئرمین تھے۔ اس
بشن نے اور تجویزوں کے علاوہ یہاں ایک پریس لا نافذ کرنے کی سفارش
، جو مہاراجہ کشمیر نے منظور کی۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں جموں اینڈ کشمیر پریس
یڈ پبلی کیشنز ایکٹ کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔ اس کے فوراً بعد پنڈت پریم ناتھ
ازنے اخبار "وتستا" جاری کیا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ طباعت
ر دیگر مشکلات کے باوجود شری بزاز نے روزانہ اخبار جاری کیا ـــ
۱۹۳ء میں کشمیری پنڈتوں کی جماعت "یودک سبھا" نے روزانہ "مارتنڈ"
اری کیا۔ اس کے بعد مختلف افراد اور جماعتوں نے اپنے اپنے اخبار جاری
یے۔ ۱۹۴۴ء میں سورگیہ شری گواشہ لال کول نے پنڈت ملدیو پرشاد شرما
ی شراکت سے پہلا ہفتہ وار انگریزی اخبار "کشمیر ٹائمز" جاری کیا۔

زادی کے بعد: - آزادی کے بعد جموں وکشمیر میں غیر معمولی حالات
پیدا ہوئے۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی جانب سے ریاست پر حملہ ہوا۔
خصی حکومت ان حالات کا سامنا نہیں کر سکی۔ مہاراجہ نے ہند کے ساتھ الحاق
ی پیش کش کی، جسے منظور کیا گیا اور ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ہندوستانی فوج کا
ہلا دستہ سری نگر پہنچا اور پاکستان کی طرف سے بھیجے گئے قبائلی لشکر کو
پیچھے دھکیلنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس ہلچل میں کئی پرانے اخبار بند ہو گئے۔
ند کچھ نئے اخبار شائع ہونے لگے۔ نئے اخباروں میں اخبار "نوجگ" شامل
ہے، جو شری ایل۔ این۔ ٹیکو کی ادارت میں ہفتہ وار شائع ہوتا تھا، لیکن
بائلی حملے سے پیدا ہوئی صورتِ حال میں عوام کو حالات اور واقعات سے
گاہ کرنے کے لیے اسے روزانہ اخبار میں تبدیل کیا گیا۔ یہ اخبار ۱۹۵۰ء
ں باقاعدگی سے شائع ہونے کے بعد بند ہو گیا۔ ان ایام میں "خدمت" جو
انگریس (آئی) کا ترجمان ہے باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔

۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۷ء کے درمیانی وقفے میں جموں اور سری نگر
سے کئی نئے اخبار جاری ہوئے، جن میں سے چند ایک ہی زندہ رہے باقی کسی
نہ کسی وجہ سے بند ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء میں جموں سے "نیا کشمیر" نام کا ہفتہ وار
اخبار جاری کیا گیا۔ مرحوم سید نذیر حسن سمنانی اس کے بانی اور ایڈیٹر تھے
یہ اخبار بعد میں بند ہو گیا۔ شری وید گپتا نے اخبار "سویرا" جاری کیا جو ۱۹۵۳ء
میں بند ہو گیا۔ "دیش سیوک" شری گنگا ناتھ نے جاری کیا، لیکن زیادہ دیر
تک جاری نہ رہ سکا۔ اس کے علاوہ مختلف اوقات پر کئی اردو اخبار "نیا سماج"
، "لوک راج" "انقلاب"، "نوائے قوم"، "اُجالا" "شیر ڈاگر" "جے سودیش"
"مساوات" "خورشید" "دیپک" "چاند" "حقیقت" "چٹان" "شاردا"
"پنتھ سیوک" "اکال یودھا" "لوک سندیش" "جموں پترکا" "سنگم" "سندیش"
"قومی آواز" اور کئی اور اخبار جاری ہوئے۔ ان اخباروں میں قومی آواز،
اُجالا، چاند اور کچھ دوسرے اخبار باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں۔ جموں
میں اس وقت تقریباً نصف درجن روزنامے اور بہت سے ہفتہ وار اخبارات شائع ہوتے ہیں۔
ان میں روزانہ انگریزی اخبار "کشمیر ٹائمز" بھی شامل ہے جو شری وید بھسین کی ادارت
میں شائع ہوتا ہے۔ روزانہ اخباروں میں "رفتار" بھی شامل ہے۔ اس کے مالک و
مدیر شری موہن یاور اعلیٰ پائے کے ادیب بھی ہیں۔

سری نگر میں اس وقت تقریباً ایک درجن روزانہ اخبارات شائع ہوتے
ہیں۔ ہفتہ وار اخباروں سمیت اردو اخباروں کی تعداد تقریباً ۵۰ ہے۔ ان میں
سب سے پرانا اخبار روزانہ "خدمت" ہے جو جموں وکشمیر پردیش کانگریس
(آئی) کا ترجمان ہے۔ دوسرے روزانہ اخباروں میں "آفتاب" "سری نگر
ٹائمز" "ہمدرد" "سری نگر ایکسپریس" "مارننگ نیوز" "دلیر" "زمیندار"
"مارننگ ٹائمز" "نوائے صبح" "آئینہ" "نوجیون" وغیرہ شامل ہیں۔ ہفتہ وار
اخباروں کی تعداد بھی کافی ہے۔ سری نگر سے اس وقت دو ہفتہ وار انگریزی
اخبار شائع ہوتے ہیں۔ ایک "نوائے صبح" اور دوسرا "مارتنڈ" سری نگر سے
کوئی ہندی اخبار شائع نہیں ہوتا۔ روزنامے آفسیٹ پر چھپتے ہیں اور گیٹ اپ
کے لحاظ سے ملک کے دوسرے اچھے اخباروں کے ہم پلہ ہیں۔ اگرچہ دوسرے
روزناموں کی طرح یہ بھی زیادہ تر جموں وکشمیر سے متعلق خبریں ہی شائع کرتے ہیں
تاہم یہ ملک کی دو خبر رساں ایجنسیوں "پی۔ ٹی۔ آئی" اور "یو۔ این۔ آئی"
سے بھی خبریں حاصل کرتے ہیں۔ اور ان کے دفتروں میں ٹیلی پرنٹر لگے ہیں، باقی
اکثر اخبارات بدستور لیتھو مشینوں پر چھپتے ہیں۔

آزادی کے بعد جموں وکشمیر میں اردو صحافت روبہ ترقی ہے۔ روزانہ اور
ہفتہ وار اخباروں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ اور اب جموں، اننت ناگ
اور سوپور سے بھی ہفتہ وار اخبارات شائع ہونے لگے ہیں۔ دو روزنامے ریاست
کی دو پارٹیوں کے ترجمان ہیں۔ "خدمت" پردیش کانگریس (آئی) کی
ملکیت ہے۔ اور "نوائے صبح" نیشنل کانفرنس کے قائم کردہ ٹرسٹ کی ملکیت
ہے۔ روزانہ "آفتاب" خواجہ ثناء اللہ بٹ نے شائع کیا اور اگرچہ وہ اب بھی
اس کے مدیر اعلیٰ ہیں، لیکن انہوں نے اسے ایک ٹرسٹ کے حوالے کیا ہے۔
ہفتہ وار انگریزی اخبار "نوائے صبح" نیشنل کانفرنس کے قائم کردہ ٹرسٹ کے
تحت چلتا ہے۔ ہفتہ وار "مارتنڈ" آل اسٹیٹ کشمیری پنڈت کانفرنس کی نگرانی
میں چلتا ہے۔ اور اسی کی ملکیت ہے۔ باقی روزنامے اور ہفتہ وار اخبار انفرادی
ملکیت میں چلتے ہیں۔ ان میں آفسیٹ پر شائع ہونے والا روزنامہ "سری نگر ٹائمز"
شامل ہے، جو صوفی غلام محمد صاحب کی ادارت میں چلتا ہے۔ اس اخبار
میں کارٹون بھی شائع ہوتے ہیں۔ اور ان کی بدولت اسی کا حلقۂ اشاعت کافی
بڑھا ہے۔ "سری نگر ٹائمز" ملک کے اردو اخباروں میں شاید واحد روزنامہ
ہے جس میں بڑے انگریزی اخباروں کی طرح "کارٹون" باقاعدگی سے
شائع ہوتے ہیں۔

اردو جموں وکشمیر کی سرکاری زبان ہے۔ ریاست میں شرح خواندگی بھی ۳۰ فی صد سے زیادہ ہے۔ تعلیم کے پھیلاؤ کی وجہ سے لوگوں میں اخبار بینی کا شوق بڑھا ہے۔ نتیجہ کے طور پر مقامی اخبارات کی اشاعت بھی بڑھ گئی ہے اور بیرون ریاست سے شائع ہونے والے انگریزی، اردو اور ہندی روزنامے، ہفتہ وار اور ماہ نامے بھی کافی تعداد میں پڑھے جاتے ہیں۔ پارٹی اخباروں سے قطع نظر دو ایک اخباروں نے یہاں مالی اعتبار سے ترقی تو کی ہے، لیکن باقی اخباروں کے مالکوں اور مدیروں کو ان کے چلانے میں خاصی محنت کرنا پڑتی ہے۔ ان کی آمدنی کا ذریعہ، ان کے گاہکوں کا چندہ اور سرکاری اشتہارات ہیں۔ تین چار اخباروں کو بیرون ریاست کی اشتہاری ایجنسیوں کی سرپرستی بھی حاصل ہوگئی ہے، لیکن باقی اخباروں کو آمدنی کا یہ ذریعہ میسر نہیں۔ ریاست میں بڑے صنعتی اور تجارتی اداروں کی عدم موجودگی میں اخباروں کو مقامی اشتہارات بہت کم ملتے ہیں۔

جموں وکشمیر میں اخباروں کی تعداد میں تو آزادی کے بعد اضافہ ہوا ہے، لیکن ابھی تک صحافت کا پیشہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے باعثِ کشش نہیں بن سکا ہے۔ جو تعلیم یافتہ نوجوان اس پیشہ میں آتے بھی ہیں ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ بیرونِ ریاست اخباروں کے رپورٹر بن جائیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ابھی تک اس پیشہ کو چنداں فائدہ بخش نہیں سمجھتے اور زیادہ تر ان کی نظریں سرکاری محکموں، بینکوں اور ایسے ہی دوسرے بڑے تجارتی اداروں کی ملازمت کی طرف لگی رہتی ہیں۔ دو ایک مثالیں موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کبھی کبھار کوئی تعلیم یافتہ نوجوان اس پیشہ میں آیا بھی تو وہ زیادہ دیر اس سے وابستہ نہیں رہا اور جب اور جونہی اُسے موقع ملا اس پیشہ کو خیرباد کہہ کر سرکاری ملازمت میں چلا گیا۔ البتہ ایک مثال ایسی ہے، جب ایک تعلیم یافتہ نوجوان سرکاری عہدہ چھوڑ کر بیک وقت صحافت اور پبلک زندگی میں آیا۔ میرا روئے سخن مرحوم شمیم احمد شمیم کی طرف ہے۔ وہ محکمۂ اطلاعات میں ملازم ہوگئے اور اس کے ماہ نامے کے ایڈیٹر مقرر کیے گئے۔ ان کی ادارت میں یہ رسالہ کافی مقبول ہوا۔ اور لوگ شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ وہ اس محکمہ میں رہتے تو یقیناً اس کے سربراہ بھی مقرر ہو سکتے تھے۔ لیکن وہ ملازمت کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اُنھوں نے اپنا اخبار 'آئینہ' نکالا، جو پہلے ہفتہ وار تھا، جسے اُنھوں نے بعد میں روزنامے میں تبدیل کیا۔ واقعات شاہد ہیں کہ ان کی ادارت میں "آئینہ" کافی مقبول ہوا اور اسے وہ لوگ بھی پڑھا کرتے تھے جن کو مرحوم شمیم صاحب کی کڑی اور بے باکانہ تنقید کا ہدف بننا پڑتا تھا۔ شمیم صاحب جموں وکشمیر اسمبلی کے ممبر بھی بنے اور لوک سبھا میں بھی اس کے عوام کی نمائندگی کا فرض انجام دیا۔

آزادی سے پہلے یہاں کے اخباروں کو کچھ بندشوں کے تحت کام کرنا پڑتا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب یہاں پنڈت پریم ناتھ بزاز، مولانا محمد سعید مسعودی اور پنڈت کیشپ بندھو جیسے صحافی اس میدان میں تھے، جو شخصی نظام کی عائد کردہ بندشوں کے باوجود مختلف مسائل پر آزادی کے ساتھ لکھتے تھے۔ اس کے لیے ان کو سنسرشپ کی شکل کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ بزاز صاحب کے اخبار "ہمدرد" سے تو ضمانت بھی لی گئی۔ لیکن آزادی کے بعد اس قسم کی بندشیں ختم ہوگئی ہیں۔ اخباروں کو آئین کے دائرے میں ہر مسئلے پر لکھنے کی آزادی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد ہی جب ریاست پر قبائلیوں کا حملہ ہوا اور اس کے نتیجے میں کچھ غیر معمولی حالات پیدا ہوئے تو اخباروں کو کچھ کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن حالات کے معمول پر آنے سے اب اخباروں پر کوئی پابندی نہیں۔ وہ ہر موضوع پر آئین کے دائرے میں آزادی کے ساتھ لکھ سکتے ہیں۔ اور اپنی رائے ظاہر کر سکتے ہیں۔ تعلیم عام ہونے اور لوگوں کا معیارِ حیات بلند ہونے کا عمل جوں جوں بڑھے گا، یہاں کی اردو صحافت بھی ترقی کرے گی۔ وہ اس لیے کہ اردو ہماری سرکاری زبان ہے اور عام لوگوں کو اس زبان اور اس کی ترقی سے گہری دلچسپی ہے۔ اخباروں کی مالی حالت بہتر ہونے سے یہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار بھی مہیا کر سکیں گے اور جب تعلیم یافتہ نوجوان اس پیشہ میں آئیں گے تو قدرتی طور پر ان میں چھپنے والے مواد کا معیار بھی بلند ہو جائے گا۔ جو ان کا حلقہ اشاعت بڑھانے میں شرطِ اوّلیں کا درجہ رکھتا ہے۔ حلقہ اشاعت بڑھنے سے اشتہاری ایجنسیاں ان کی خدمات حاصل کریں گی، جن سے اخباروں کی مالی پوزیشن کو استحکام ملے گا۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ آزادی کے بعد ریاست جموں وکشمیر نے اردو صحافت میں قابلِ قدر ترقی کی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مزید ترقی کرے گی اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں اس کا مستقبل کافی شاندار ہے۔ ●●

رنجن بھٹاچاریہ

# بنگال میں اردو صحافت

ھندوستان میں جدید صحافت یعنی مطبوعہ اخبارات کی ابتدا
ہوئی ہے۔ یہ صرف دو صدی قبل کی بات ہے۔ انگریز جوالیسٹ انڈیا
نام پر بطور تاجر یہاں آئے تھے، جنگِ پلاسی (۱۷۵۷ء) میں کامیابی
جر سے حاکم بنے اور رفتہ رفتہ پورے ہندوستان کے مالک
۔ ہندوستان کا پہلا صحافی ہونے کا شرف جیمس اگسٹس ہکی[۱] کو
ہے، جن کا انگریزی اخبار 'بنگال گزٹ' یا کلکتہ جنرل ایڈ ورٹائزر'
مارہ ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء کو نکلا۔ ہندوستانی زبانوں میں بنگلہ زبان
سے پہلے صحافتی زبان ہونے کا شرف حاصل ہوا چونکہ ۱۸۱۸ء میں
ن کے اخبارات[۲] نکلے۔ اس کے بعد اردو اور فارسی کے اخبارات
میں نکلے[۳] اور پھر ہندی[۴] کا پہلا اخبار بھی کلکتہ ہی سے ۱۸۲۶ء کو
طرح انگریزی، بنگلہ، اردو، فارسی اور ہندی صحافت کی ابتدا
ہوئی ہے۔

انگریزی صحافت کی ابتدا کے کوئی ۴۲ سال بعد اردو صحافت نے جنم
دو کا پہلا اخبار ہفتہ وار "جامِ جہاں نما" ہی نہیں بلکہ اردو زبان کا
نامہ "اردو گائیڈ" بھی کلکتہ سے نکلا، جس کا پہلا شمارہ بطور روزنامہ
نوری ۱۸۵۸ء کو طلوع ہوا تھا۔ دوسرا روزنامہ 'دارالسلطنۃ' کلکتہ
میں بطور روزنامہ شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ یہ ابتدائی اردو اخبارات
تک زندہ نہ رہ سکے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں اخبار
چیز تھی۔ جس کی ضرورت یا اہمیت سے لوگ آگاہ نہ تھے۔ دوسری
کہ اُن دنوں اردو گو عام بول چال کی زبان تھی، لیکن تعلیم یافتہ لوگوں
کی زبان، سرکاری، دفتری اور کاروباری زبان، علمی اور ادبی زبان کے طور
پر فارسی ہی کا چلن تھا۔ لہٰذا اردو کے یہ ابتدائی اخبارات خریداروں کی
کمی کی وجہ سے بند ہو جانے پر مجبور رہے۔ ہفتہ وار "جامِ جہاں نما" کے
صرف چھ شمارے ہی اردو میں نکل پائے اور اس کے بعد مجبوراً مالکان نے
اس کی زبان کو فارسی میں بدل دیا۔ (حالانکہ سال بھر بعد فارسی کے ساتھ
اس کا اردو ضمیمہ بھی نکلنے لگا تھا لیکن وہ بھی کامیابی سے چل نہ سکا) اس
طرح بطور روزنامہ 'اردو گائیڈ' بھی کامیاب نہیں رہا اور جس طرح وہ
(۱۸۵۸ء میں) پہلے ہفتہ وار جاری ہوا تھا۔ بعد میں بھی ہفتہ وار میں بدل
گیا۔ "دارالسلطنۃ" کا حال بھی یہی ہوا۔ یہ ۱۸۸۱ء میں بطور ہفتہ وار نکلا تھا۔
پھر ۱۸۸۷ء میں روزنامہ بنا [illegible] سال بھر بعد پھر سے ہفتہ وار ہو گیا۔

---

[۱] ہکی کے سلسلے میں راقم الحروف کا مضمون "ہکی ہندوستان کا پہلا صحافی" رسالہ "آج کل" دہلی اکتوبر ۱۹۷۱ء کے شمارے میں دیکھیے۔

[۲] گنگا کشور بھٹاچاریہ کا ہفتہ وار "بنگال گزٹ" اور مارشمین کا ماہنامہ "دگ درشن" اور پھر ہفتہ وار "سماچار درپن" "سریرامپور" یہ سب ہی ۱۸۱۸ء میں جاری ہوئے تھے۔

[۳] "جامِ جہاں نما" اردو ۲۸ مارچ کو اور "مراۃ الاخبار" فارسی ۱۲ اپریل ۱۸۲۲ء کو شائع ہوا۔

[۴] ہندی کا پہلا اخبار ہفتہ وار "اودنت مارتنڈ" بھی کلکتہ سے نکلا۔ اس کے مدیر جگل کشور شکل، اسے نمبر ۳۷ امرتلا گلی، کولوٹولہ سے نکالا کرتے تھے۔ اس کے لیے اجازت نامہ مورخہ ۱۶ فروری ۱۸۲۶ء کو دیا گیا تھا اور اس کا پہلا شمارہ ۳۰ مئی ۱۸۲۶ء کو منظرِ عام پر آیا۔ لیکن یہ بھی چل نہ سکا اور ۴ دسمبر ۱۸۲۷ء کا شمارہ اس کا آخری شمارہ رہا ہے۔

---

سندیپنی، مڈاکنا نہ پورنا پٹیاری ۷۴۳۵۰۹، نزد کلکتہ ویسٹ بنگال

اُنیسویں صدی میں اردو کے تمام اخبارات کی داستانِ حیات تقریباً
ں ہے۔ سھورام موہن متر نے پانچ سال تک اردو زبان میں "شمس الاخبار"
کالنے کے بعد (اجرا ۱۸۲۳ء) ۱۸۲۷ء میں اُسے بند کرتے ہوئے ایک
ویل بیان دیا تھا، جس کا انگریزی ترجمہ ۱۲ مئی ۱۸۲۷ء کے گورنمنٹ گزٹ میں
ائع ہوا۔ اُنہوں نے اس بیان میں کہا: "اخبار نکال کر اُنہیں کوئی
ائدہ نہیں ہوا۔ دن رات کی اَن تھک محنت کے بدلے سوائے مصیبتوں کے
رکچھ ہاتھ نہیں آیا۔ ہندوستان میں اخبار نکالنا صرف روپیہ برباد کرنا ہی نہیں
ہے بلکہ آفت بھی مول لینا ہے۔ کیوں کہ یہاں کے لوگ ابھی تک اخبار سے دلچسپی
ہیں لیتے۔" اپنے بیان کے آخر میں اُنہوں نے ایک فارسی شعر درج کیا تھا:
س کا مطلب یہ ہے کہ "چاندنی رات میں شمع رات بھر جلتی رہی، لیکن کسی نے
س کی طرف نگاہِ غلط بھی نہیں ڈالی۔"

بہرحال جہاں تک مجھے علم ہے انیسویں صدی میں بنگال سے حسبِ ذیل
ہم روزنامے اور اخبارات نکلے ہیں۔ روزنامے: (۱) اردو گائیڈ (کلکتہ)
(پہلے ہفتہ وار پھر روزنامہ پھر ہفتہ وار و سہ روزہ) مدیر مولوی کبیر الدین احمد
جرا ۱۸۵۸ء۔ (۲) پیک صبا، کلکتہ، مدیر سید عبدالرحیم آبدؔ اجرا ۶
۲۰ اپریل ۱۸۸۵ء (۳) دار السلطنۃ، کلکتہ (پہلے ہفتہ وار پھر روزنامہ
ور آخر میں ہفتہ وار) اجرا ۴ مئی ۱۸۸۱ء۔

ہفتہ وار:- (۱) برکتی (کلکتہ) حاجی محمد حسین اور برکت اللہ خاں
جرا ۱۸۶۷ء (۲) بشیری (کلکتہ) مولوی واسم اللہ اور غلام سبحان
جرا ۱۸۷۹ء (۳) بنگال پنچ (کلکتہ) مدیر غلام حضرت خاں، اجرا ۱۸۸۰ء
۴) بہارِ ہند (کلکتہ) مدیر سید عبدالرحیم آبدؔ، اجرا ۱۸۸۵ء (۵) تجارت الاخبار
کلکتہ) ایڈیٹر سھورا پرشا دتمر، اجرا ۱۸۸۰ء (۶) جامِ جہاں نما (کلکتہ)
ہری ہر دت اور لالہ سداسکھ، اجرا ۱۸۲۲ء (۷) جریدۂ وطن (کلکتہ)
الک مولوی فرید النبی، اجرا ۱۸۸۴ء (۸) جنرل و گوہر آصفی (کلکتہ)
محمد وزیر، اجرا ۱۸۹۰ء (۹) خیر خواہ اخلاق (کلکتہ) مالک و مدیر علی اصغر
اجرا ۱۸۸۵ء (۱۰) دوربین (کلکتہ) فدا حسین، اجرا ۱۸۳۲ء (۱۱) رفیق الہند
(کلکتہ) بابو ہریش چندر، اجرا ۱۸۶۰ء (۱۲) شمس الاخبار (کلکتہ) مالک مدیر
سھورا موہن متر، اجرا ۱۸۳۲ (۱۳) علم الاخبار، (کلکتہ) مدیر واعظ الدین احمد
اجرا ۱۸۸۵ء (۱۴) گوہر (کلکتہ) حکیم محمد ناظر حسن حسینی اور مولوی محمد علی نجف
اجرا ۱۸۸۵ء (۱۵) مراۃ الاخبار (کلکتہ) (اردو) منشی فرجام علی، اجرا
۱۸۴۷ء (۱۶) محمدی (کلکتہ) مولوی عبدالحق، اجرا ۱۸۷۷ء۔

بیسویں صدی دراصل صحافت کا دَور ہے۔ تاریخِ صحافت پر ایک
سرسری نظر ڈالنے پر ہم دیکھتے ہیں کہ روزِ اوّل سے صحافی اور حاکمِ وقت ایک
دوسرے کے مدِ مقابل رہے ہیں۔ حتیٰ کہ جیمس آگسٹس ہکی کا اخبار بھی روزِ
اوّل سے حکومتِ وقت کا سخت مخالف رہا۔ جس کی وجہ سے گورنر جنرل وارن
ہیسٹنگ نے ہکی کو برباد کرنے کے تمام تر اقدامات کئے۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا۔
مالی جرمانے ہوئے۔ پریس لے لیا گیا۔ پھر ۱۹ ماہ تک ہکی کو قیدِ سخت کی سزا ہوئی
اور صرف ہکی ہی نہیں بلکہ اس کے بعد کئی دیگر انگریز صحافی مثلاً مسٹر ولیم ڈوون مدیر
"بنگال جرنل" اور ڈاکٹر چارلس میکلین CHARLES MACLEAN مدیر
"بنگال ہرکارو" وغیرہ کو بھی زبردستی کمپنی کی حکومت نے ہندوستان سے نکال باہر
کیا اور وہ لوگ انگلستان جانے پر مجبور ہوئے۔ یعنی ہندوستان میں آغازِ
صحافت ہی سے اخبارات پر حکومتِ وقت کی کڑی نگرانی رہی ہے۔ اخبار
نکالنے کے لیے نہ صرف اجازت نامہ لینا پڑتا تھا بلکہ تاریخِ صحافت میں کئی
ایسے سخت مرحلے آئے ہیں جب ایک ایک لفظ شائع کرنے کے لیے حکومت
سے اجازت لینی پڑی ہے۔ پہلی بار جب اپریل ۱۸۲۳ء میں اخبارات کی آزادی
کے خلاف حکومت نے قانون نافذ کیا تب راجہ رام موہن رائے مدیر
"مراۃ الاخبار" (فارسی) کلکتہ۔ وہ پہلے ہندوستانی صحافی ہیں جنہوں نے
پریس کی آزادی کے لیے آواز بلند کی۔ پُرزور احتجاج کے باوجود ناکام ہوتے
پر ایک طویل اداریہ لکھ کر ۴ اپریل ۱۸۲۳ء کو اپنا اخبار بند کر دیا اور اس
طرح اخبار بند کر کے انہوں نے اہلِ صحافت کی لاج رکھ لی۔ پہلی جنگِ
آزادی کو غدر سے پہلے کے فارسی اخبارات میں "سلطان الاخبار" کلکتہ اور
"دُوربین" (کلکتہ) (یاد رہے کہ "دوربین" کے نام سے بعد میں اردو
میں بھی اخبار نکلا۔ اور "سلطان الاخبار" کا بھی کبھی کبھی اردو ضمیمہ ہوتا تھا)
وہ اخبارات ہیں جن کے مدیران کو اپنی بے باکی، حق گوئی اور انگریز دشمنی
کی سزا بھگتنی پڑی ہے، لیکن بیسویں صدی میں آزادی کی لہر جیسے جیسے
بڑھی، انگریزی حکومت نے پریس کی آزادی پر سخت سے سخت پابندیاں
لگانی شروع کر دیں۔

۱۹۱۲ء میں یعنی مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" کی اشاعت
سے تاریخِ صحافتِ اردو میں ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے۔ اس دَور کو ہم "دورِ
بغاوت" قرار دے سکتے ہیں۔ جیسے جیسے غیر ملکی حکومت کے خلاف ہماری
جد و جہد بڑھتی گئی ایک طرف ہمارے اخبارات انگریزی حکومت کے خلاف
آگ بھڑکاتے رہے تو دوسری طرف اخبارات کی آزادی کے خلاف جنگ
کرنے کے لیے غیر ملکی حکومت نے بھی نت نئے قوانین کا سہارا لینا شروع کیا۔
پریس پر پابندی، اخبارات اور چھاپہ خانوں سے مالی ضمانتیں، ضمانتوں کی
ضبطی، اخبارات کو پے در پے وارننگ، جرمانے، اخبارات پر مقدمے
ڈیفنس آف انڈیا رولز سنسر شپ کے سخت قوانین، ایڈیٹروں کی گرفتاری
اُن کو شہر بدر یا مُلک بدر کر دینا اور سخت سزائیں دے کر جیل میں بند کر دینا وغیرہ
وہ اقدامات ہیں، جو حکومت نے اخبارات کا گلا گھونٹنے کے لیے اُٹھائے۔

۱۹۱۲ء کے بعد سے یہ قوانین بدلتے گئے اور سخت سے سخت ترین ہوتے گئے۔ دوسری طرف میدانِ صحافت میں زیادہ وطن دوست، قوم پرور، آزادی کے متوالے، سیاسی لوگ آتے گئے، صحافت ایک "عظیم طاقت" کے طور پر اُبھر کر سامنے آچکی تھی۔ اس "طاقت" کے استعمال سے رائے عامہ کو ہموار کیا جاسکتا تھا، بدلا جاسکتا تھا، عوام میں قومی شعور اور جنگِ آزادی کا جذبہ پروان چڑھایا جاسکتا تھا۔ لہٰذا اس دَور میں ہم دیکھتے ہیں کہ آج ایک اخبار نکلا اور اُس نے حکومت کے خلاف کھُل کر دو باتیں کہیں کہ فوراً حکومت نے اُسے بند کردیا۔ اُس کا بند ہونا تھا کہ اُس اخبار کے نام سے ملتے جُلتے کسی نئے نام سے ایک دو دیگر اخبارات نکل آئے۔ پھر اُن کے بند ہوتے ہوتے پہلے اخبار نے پُنرجنم لے لیا یعنی ایک ہی اخبار نے کئی کئی رُوپ بدلے، نام بدلے —— مثلاً کبھی "ہند" تو کبھی "الہند" اور کبھی "ہندِ جدید" —— یا پھر کبھی "عصرِ جدید" تو کبھی "دَورِ جدید" اور اگر وہ بھی بند ہوا تو "نہی جدید" ہوگیا —— آج نکلا، کل بند ہوا، اور پھر ہفتہ بھر بعد نکلا۔ بلکہ چند تو ایسے بھی ہیں جن کا پہلا شمارہ ہی آخری شمارہ ثابت ہوا۔ ایسا بھی ہوا کہ ایڈیٹر کی گرفتاری سے اخبار بند ہوجانے کا خطرہ لاحق ہوجانے سے کسی کاتب، پریس مین، اخبار کا کوئی ملازم یا کسی سیاسی ورکر کا نام بطور مدیر اخبار چھپتا رہا۔ ایسے انجانے نام جن کی گرفتاری سے اخبار بند ہوجانے کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ لہٰذا اس دَورِ بغاوت میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون سا اخبار کتنے دنوں تک کس نام سے نکلا۔ کون حقیقی ایڈیٹر تھا اور کون برائے نام اور پھر جس جس اخبار کے جو جو شمارے اس دَور میں ضبط ہوئے تھے، وہ تمام شمارے بھی آج کہیں محفوظ نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ سرکاری محافظ خانوں ARCHIVES میں بھی ایسے بیشتر اخبارات موجود نہیں جو کبھی حکومتِ وقت کے خلاف لکھنے کے جرم میں ضبط کرلیے گئے تھے۔

اردو صحافت کی تاریخ اور خاص کر بنگال میں اردو صحافت میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی دو ایسے نام ہیں جن کی صحافتی خدمات کا ذکر چند صفحوں میں نہیں ہوسکتا۔ مولانا آزاد کے "الہلال" کے آخری دَور میں اس کے مدیر مولانا ملیح آبادی رہے اور صرف یہی نہیں بلکہ "پیغام" اور "پیام" کے مدیر بھی مولانا ملیح آبادی ہی رہے ہیں۔ پھر "ہند" سے لے کر "آزاد ہند" اور ہفتہ وار "اُجالا" تک ملیح آبادی کے جاری کیے ہوئے اخبارات ہیں۔ مولانا آزاد کے "الہلال" اور "البلاغ" کو نہ صرف اُردو کے انقلابی اخبارات میں اہم مقام حاصل ہے بلکہ اُردو کی ادبی صحافت میں بھی خاص کر "الہلال" کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ادبی اہمیت کی وجہ سے "الہلال" کے مضامین بار بار چھپے اور مختلف حضرات نے اُن کو مرتب کرکے کتابی صورت میں شائع بھی کیا۔ چونکہ مولانا آزاد اور مولانا ملیح آبادی کی صحافتی خدمات کا ذکر چند صفحات میں ممکن نہیں ہے اور اُن پر کئی مضامین اور تصانیف موجود ہیں، اس لیے میں یہاں اُن کے نکالے ہوئے اخبارات کا ذکر نہ کرتے ہوئے دو ایسے اخبارات کا ذکر کرتا ہوں، جس سے بہت ہی کم لوگ واقف ہیں۔ ان میں سے ایک روزنامہ مولانا اکرم خان کا "زمانہ" کلکتہ ہے اور دوسرا خواجہ محمد اسداللہ اسدؔ کا روزنامہ "احرار" کلکتہ ہے۔ روزنامہ "زمانہ" کلکتہ کا ذکر کسی نے چند الفاظ میں کیا ضرور ہے، لیکن روزنامہ "احرار" کا ذکر جہاں تک میں نے تاریخِ صحافتِ اردو کا مطالعہ کیا ہے یا تاریخِ صحافتِ اردو پر لکھے گئے مضامین پڑھے ہیں۔ اُن میں سے کسی نے کہیں بھی روزنامہ "احرار" کلکتہ کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اس اخبار کے نام تک سے اہلِ علم و قلم حضرات لاعلم ہیں۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ مولانا اکرم خان اور خواجہ محمد اسداللہ اسدؔ کی صحافتی زندگی اور اُن کے اخبارات پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے۔ تاہم سرِدست اس کی گنجائش نہیں۔ ذیل میں ان دونوں اخبارات کے ایک ایک اداریئے سے چند جملے پیش کرتا ہوں جس سے اِن اخبارات کی زبان، اندازِ بیان، بے باکی، حق گوئی، وطن دوستی، جذبہ بغاوت اور انگریز دشمنی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۱) اکرم خان کے اداریئے آگ برساتے تھے۔ مثلاً ۲۸ جولائی ۱۹۲۰ء کو اُنھوں نے 'بانگِ درا' کے عنوان سے جو طویل اداریہ لکھا اُس کا ایک حصہ دیکھیے:

"اُٹھو، کمربستہ ہو، اے فرزندانِ اسلام' کارواں تیار ہے۔ فریاد جرس بلند ہو رہی ہے۔ ہمت تم کو پکار رہی ہے، غیرت تم کو اُبھارتی ہے، واقعات تم کو دعوتِ عمل دے رہے ہیں۔ مشکلات مشعل دکھا رہی ہیں۔ مصیبتیں راستہ بتا رہی ہیں۔ مایوسی کے بادلوں میں اُمید کی بجلیاں چمک رہی ہیں۔ زوال کی پستی سے عروج و اقبال کا ستارہ نظر آرہا ہے۔ اگر رات کی تاریکیوں کے بعد صبحِ درخشاں کی آمد یقینی ہے، اگر خزاں بہار کا پیش خیمہ ہے، اگر تکلیف راحت کا مقدمہ ہے، اگر زوال عروج کی تمہید ہے، تو سمجھنا چاہیے کہ اب گزشتہ پیشین گوئیاں مستقبل سے حال میں اور تمہاری حالت زوال سے کمال میں ہوا چاہتی ہے۔

اُٹھو، لیکن مایوس ہوکر نہیں، اُٹھو لیکن اُداس اور مغموم بن کر نہیں، دل میں نئے ولولے اور تازہ اُمیدیں

ہے کر اٹھو، اٹھو لیکن سر جھکانے کے لیے نہیں، سربلندی کے لیے اٹھو۔ اب زبان سے منت نہ کرو، مطالبہ کرو۔ اب آنکھوں سے آنسو نہ بہاؤ بجلیاں گراؤ۔ اب ہاتھ جوڑ کر نہ کھڑے ہو، ہاتھوں سے کام لو۔ اب پاؤں توڑ کر نہ بیٹھو منزلِ مقصود کو طے کرو۔"

(۲) روزنامہ "احرار" کلکتہ نے ۲۶ نومبر ۱۹۲۱ء کو "جدید تلاشیاں اور گرفتاریاں ——— گورنر بنگال کا اعلانِ جنگ اور پبلک کا فیصلہ" کے عنوان سے اداریہ میں لکھا :۔

"گورنر بنگال نے اپنی پرجوش تقریر میں اس کا اعلان کر دیا ہے کہ گورنمنٹ کے صبر و تحمل کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ عام امن و امان کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ اب سختی سے کام لیا جائے اور گورنمنٹ اپنی پوری طاقت صرف کر دے اور اگر وہ بھی کافی نہ ہو تو مزید اختیار حاصل کرے، لیکن قیامِ امن اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ پبلک پولیس کا ہاتھ نہ بٹائے ——— اس لیے گورنر صاحب پبلک سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ پولیس کی مدد کرے۔

کس غضب کے ہیں حسینانِ ستم ایجاد بھی
کرتے ہیں بیداد ہم پر چاہتے ہیں داد بھی

ایک طرف گورنر بنگال ہیں جو جدید سامانِ جنگ سے مسلح ہیں توپ، بندوق، سنگین، ہوائی جہاز، جنگی جہاز، گولہ بارود، مضبوط قلعہ، جرار فوج، خوشنما محل غرض سب ہی کچھ ہے۔ وہ پبلک سے کہتے ہیں کہ آؤ تم بھی صفیں باندھ کر ہماری طرف کھڑے ہو جاؤ۔ اور ہماری مدد کرو ——— کس چیز میں؟ آزاد قوموں کو غلام بنانے میں۔ اماکن مقدسہ کی بے حرمتی میں، بزرگوں کی جلاوطنی میں، خلیفۂ اسلام کی محصوری میں، معصوم بچوں کی یتیمی میں۔ باعصمت دیویوں کی عصمت دری میں، بے گناہ ہندوستانیوں کی خونریزی میں، خدامِ ملک و ملت کی گرفتاری میں، تحریکِ خلافت و سوراج کی پامالی میں، خلافت و کانگریس کے دفتروں پر ڈاکہ زنی میں، تاکہ دنیا میں امن رہے اور جدید تمدن و تہذیب سے دنیا ہو سکے۔ اس کے عوض تمہیں کیا ملے گا؟ رولٹ ایکٹ مانٹیگ چیمسفورڈ اسکیم۔

دوسری طرف غریب کھدر پوش رضاکارانِ اسلام و وطن ہیں۔ ان کے پاس نہ توپ ہے، نہ بندوق، نہ ہوائی جہاز، نہ مشین گن، نہ تلواریں، نہ نیزے، نہ مضبوط قلعے ہیں، نہ خوشنما محل۔ وہ بھی تمہیں دعوت دے رہے ہیں کہ آؤ ہماری مدد کرو۔ کس چیز میں؟ قانونِ الٰہی کے اجرا میں، وصیتِ نبوی کی تکمیل میں، اماکن مقدسہ کی حفاظت میں، مظلومین سمرنا و تھریس کی امداد میں، خلیفۂ اسلام کی آزادی میں، ..... بیواؤں کی خدمت میں، باعصمت دیویوں کی حفاظت میں، شہیدِ اسلام و پنجاب کی فریادرسی میں، لیڈروں کی رہائی میں، حصولِ آزادی میں۔ اس کے عوض میں تمہیں کیا ملے گا؟ خوش حالی و فارغ البالی، حریت و آزادی، خدا اور اس کے رسول کی خوشنودی، اور دائمی فرحت میں آسائش ——— اب تم خود فیصلہ کر لو کہ کس کا ساتھ دوگے؟ ظالموں کا یا مظلوموں کا! اور غلام بنانے والوں کا یا آزاد اور آزاد کرنے والوں کا ———"

(بشکریہ مغربی بنگال اسٹیٹ آرکائیوز حکومت مغربی بنگال)

بیسویں صدی میں آزادی سے پہلے جو نیشنلسٹ روزنامے نکلے، ا
میں مولانا اکرم خاں کا "زمانہ" اور خواجہ محمد اسداللہ اسد کا "احرار" کے علا
حسبِ ذیل کا نام لینا ضروری ہے۔ (۱) روزنامہ "استقلال" کلکتہ، اج
۱۹۳۰ء مدیر مولانا ابوالکمال کامل۔ کامل صاحب نے "استقلال" سے ۱۹۲۸
میں روزنامہ "طوفان" جاری کیا تھا۔ (۲) "اقدام" کلکتہ اور "رفعت" کا
کے مدیر محی الدین احمد تھے اور اس کے پرنٹر پبلشر محمد نظام الدین احمد۔ یہ اخ
۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۴ء کے ہیں۔ ان اخبارات کی پالیسی بہت بڑی حد تک مولانا
کے "البلاغ" کی سی رہی ہے۔ محمد نظام الدین سے مولانا آزاد کے اچھے تعلقا
بھی تھے، جس کی وجہ سے مولانا آزاد بھی کبھی کبھی "اقدام" میں لکھتے رہے ہیں
(۳) "الکمال" کلکتہ، ۱۹۲۲ء میں جاری ہوا تھا۔ یہ بنگال خلافت کمیٹی کا تر
تھا۔ اس کے مدیر کچھ عرصہ تک حکیم رکن الدین رہے اور پھر مولوی نذیر احمد
جو اس سے قبل "مساوات" کے مدیر تھے۔ (۴) "صداقت" کلکتہ کا س
اجرا ۱۹۱۶ء ہے۔ اس کے مالک و مدیر غلام حیدر خاں تھے۔ اس اخبار میں
مولانا آزاد بھی لکھتے رہے۔ شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی کے مضامین بھی ا
میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ (۵) اردو کے نامور ادیب قاضی عبدالغفور نے ۱۱۷
میں کلکتہ سے "جمہور" جاری کیا تھا۔ یہ اخبار بھی اپنے زمانے میں مشہور ہوا، لیک

حکومت نے اس کا گلا ۱۹۱۹ء میں ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت دبا دیا اور قاضی عبدالغفور کو بنگال چھوڑ دینے کا حکم ہوا۔ لہٰذا وہ دہلی جانے پر مجبور ہوئے۔ اس کے کئی سال بعد ۱۹۲۸ء میں چراغ حسن حسرت نے بھی "جمہور" نام سے ایک اور اخبار جاری کیا تھا جس سے منظور الحق صدیقی اور شاہ خلیل الرحمٰن بعد میں منسلک ہوئے۔ یہ ۱۹۳۲ء میں بند ہوا۔ (۶) "رسالت" کلکتہ کے نام سے بھی دو الگ الگ اخبارات نکلے۔ پہلا ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۹ء زندہ رہا۔ جس کے مالکان میں ابوالقاسم رفیق دلاوری اور مولوی غلام حسین تھے۔ دوسرا ۱۹۲۳ء میں نکلا۔ جس کے مالک و مدیر شیخ عبدل دیوان ولد این۔ این۔ حافظ تھے۔ اوّلین "رسالت" کے مدیر سجاد حسین تھے۔ لیکن وہ ۱۹۱۵ء میں اس سے علیحدہ ہو گئے۔ اور ابوالقاسم رفیق دلاوری ہی بعد میں اسے نکالتے رہے۔

مسلم لیگی اخبارات میں سب سے اہم اخبار "عصرِ جدید" کلکتہ رہا ہے، جس کے مالک اور مدیر (یوں اس کے کئی مدیر بدلے) شائق احمد عثمانی تھے۔ اس کا سنہ اجراء ۱۹۱۸ء ہے۔ بنگال میں مسلم لیگ کو آگے بڑھانے میں جن اردو اخبارات نے حصہ لیا، ان میں اس اخبار کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ اس اخبار پر بھی حکومت کی کڑی نگرانی رہی ہے، جس کے نتیجے میں یہ اخبار بھی کئی بار بند ہوا اور شائق احمد عثمانی پر کئی مقدمے چلے اور ان کو جیل بھی جانا پڑا۔ تقسیم ہند کے بعد شائق احمد عثمانی پاکستان چلے گئے۔ اور خان بہادر محمد جان نے ۱۹۵۰ء میں اسے خرید لیا۔ خان بہادر محمد جان کانگریسی تھے۔ لہٰذا آزادی کے بعد اس کی پالیسی بھی بدل گئی۔ آج بھی یہ اخبار نکل رہا ہے اور بنگال کے موجودہ اخبارات میں یہی سب سے قدیم اردو اخبار ہے۔ "عصرِ جدید" کے علاوہ مسلم لیگ کا ایک اور ترجمان روزنامہ "مسلم لیگ" کلکتہ رہا ہے، جس کے مدیر محمد اسحاق امرتسری تھے۔ ان دونوں اخبارات کے علاوہ مسلم لیگ کے طرف دار کئی اور اخبارات بھی رہے ہیں، جن میں "الحق" کلکتہ (تقسیم ہند سے قبل یہ مسلم لیگ کا طرف دار تھا اور تقسیم کے بعد ۱۹۵۸ء تک یہ نکلتا رہا۔ جس طرح تقسیم کے بعد ہندوستان میں دیگر مسلم لیگی اخبارات کی پالیسی بدل گئی اسی طرح اس کی پالیسی بھی بدلی تھی، لیکن یہ فرقہ پرستی سے ہمیشہ دامن کو پاک نہیں رکھ سکا) اور "نئی دنیا" کلکتہ (اجرار ۱۹۲۸ء مدیر صدّیق انصاری) کے نام بھی شامل ہیں۔

آزادی سے قبل کے چند دیگر اہم روزنامے ہیں: (۱) "الہلال" کلکتہ، مدیر ایس۔ وحیدالدین نقد۔ اجرار ۱۹۳۰ء (۲) "انوار الاخبار" (کلکتہ) اجرار ۱۹۱۵ء مدیر مولوی محمد ارشاد حسین (۳) "ترجمان" کلکتہ، اجرار ۱۹۱۵ء مالک و مدیر سعید علی۔ اس اخبار سے بھی قاضی عبدالغفور منسلک رہے ہیں۔ (۴) "رہبر" کلکتہ اجرار ۱۹۱۸ء، مدیر محمد حبیب اللہ (۵) "رہبرِ کلکتہ" اجرار ۱۹۳۹ء، مدیر شاہ خلیل الرحمٰن (۶) "تصویر" کلکتہ، اجرار ۱۹۴۱ء، مدیر ایس۔ ایم۔ باری (۷) "ٹیلی گرام" کلکتہ، اجرار ۱۹۴۳ء مدیر مہابیر سنگھ (۸) "دینک بازار سماچار" کلکتہ۔ اجرار ۱۹۲۷ء مدیر حکم چند شرما (۹) "رفاقت" کلکتہ، اجرار ۱۹۱۴ء مدیر منشی محمد ناظم الدین اور (۱۰) "سفیرِ کلکتہ" اجرار ۱۹۱۴ء مدیر حکیم علی حسین سیفی وغیرہ وغیرہ۔

بیسویں صدی میں تقسیم ہند سے پہلے جو ہفتہ وار نکلے، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے نکالے ہوئے ہفتہ وار اخبارات کے علاوہ حسبِ ذیل بھی اہم ہفتہ وار تھے: (۱) "جہازی" کلکتہ، مدیر محی الدین، اجرا ۱۹۳۷ء یہ انڈین سی مین یونین یعنی جہازیوں کی انجمن کا ترجمان تھا (۲) "خادم" کلکتہ، اجرار ۱۹۳۲ء، مدیران ایس۔ ایم۔ جعفری اور ابراہیم ہوش (۳) "دارالحکومت" کلکتہ، اجرار ۱۹۰۷ء مدیر و مالک حافظ الٰہی بخش (۴) "عبرت" ہوڑا، اجرار ۱۹۳۴ء، مدیر جوہر غازی پوری۔ اس ہفتہ وار نے سب سے طویل عمر پائی اور ۳۴ تا ۶۴ء یعنی ۳۰ سال تک نکلتا رہا۔ (۵) "مزدور گزٹ" کلکتہ، اجرار ۳۹ء۔ مالک عبدالجبار اور مدیر وائی۔ کے۔ طارق (۶) "نظام" کلکتہ۔ یہ ۴۱ء تا ۴۳ء کلکتہ سے نکلتا رہا۔ پھر بمبئی سے نکلا۔ اس ہفتہ وار کے سرپرست علامہ آرزو لکھنوی تھے۔ مدیر اُن کے نام ور شاگرد سید اطہر حسین پرتو لکھنوی رہے۔ اس ہفتہ وار میں بطور مدیر کام کرنے کے لیے جناب ابراہیم ہوش بھی کلکتہ سے بمبئی گئے تھے۔ (۷) "نقاش" کلکتہ۔ اجرار ۴۱ء۔ یہ چند دنوں تک بطور روزنامہ بھی نکلا ہے۔ اس کے کئی ایڈیٹر بدلے۔ جناب شین۔ مظفر پوری بھی ۱۹۴۵ء میں اس کے مدیر رہے۔ اس ہفتہ وار کے مالک و مدیر یونس نظری تھے۔ (۸) "نئی منزل" کلکتہ۔ اجرار ۱۹۴۶ء۔ یہ چند شماروں کے بعد بند ہو گیا تھا۔ اور پھر ۵۰ء میں بھی اس کے چند شمارے نکلے۔ اس کے مدیر ناظر الحسینی مرحوم تھے۔

ان چند ہفتہ واروں کے علاوہ اس مدت میں چند مزاحیہ ہفتہ وار بھی نکلے۔ مثلاً: (۱) "ٹھوکر" کلکتہ، اجرار ۱۹۴۰ء (۲) "کلکتہ پنچ" اجرا، ۳۲ء (۳) "مجذوم" کلکتہ، ۳۲ء (۴) ہنٹر، ہنٹر سپھٹکار، اور "ہنٹر پنچ" کلکتہ۔ یہ سب اخبارات ۲۴ء تا ۲۸ء کے درمیان نکلے لیکن کلکتہ سے جتنے بھی مزاحیہ ہفتہ وار جاری ہوئے، ان میں عنایت حسین دہلوی کا "چرچخ" سب سے زیادہ مشہور ہوا۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۶ اپریل ۱۹۲۷ء کو نکلا اور یہ ۱۹۴۰ء تک نکلتا رہا۔ "چرچخ" نے صرف اس کا ایک اشتہاری مضمون نقل کرتا ہوں، جس سے اس کے مضامین کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ملاحظہ ہو:-

> " دل کے دُکھ جانے سے ظالم عرش بھی ہل جاتا ہے! کیا
> یہ سچ ہے؟ تو، ٹھہریئے ایک بات ہماری بھی سُنیئے
> دل دُکھنے سے پہلے ہماری طرف مخاطب ہو جایئے یعنی
> شہنشاہِ ظرافت، ہندوستان کا ظریف الدہر ہفتہ وار

"چورنج" کو کلیجے سے لگا لیجئے۔ اُف مزے آجائیں گے۔ دل، جگر، پھیپھڑا تو بہت بڑی چیز ہے، سر میں کبھی درد بھی نہ ہوگا۔ ہنستے ہنستے دُبلا آدمی موٹا اور موٹا آدمی دُبلا ہوجائے گا —— آ —— چھیں ——
سالانہ بے تکلفی پانچ روپے۔ دوستی آدھے سال فقط تین روپے۔ نمونہ کے پرچے ایک روپیہ۔ مفت خوروں کو ٹھینگا۔ ۳۱ جنوری سے پہلے اگر خریدار ہوجائیے گا تو ایک ٹائم پیس مفت۔ کلکتہ سے باہر والوں کو یہ کوفت ہوگی۔ دو سال کا چندہ دس روپے عنایت کرنا ہوگا۔ اگر ٹائم پیس کی ضرورت ہو تب —— وعلیکم —— پرسان حال کو سب کچھ —— ہم ہیں منیجر صاحب "چورنج"۔

آزادی کے بعد بھی کلکتہ سے کئی روزنامے نکلے۔ مثلاً نمبر ۱۔ آبشار (۲) اخوت (۳) انصاف (۴) انگارہ (۵) پیغام (۶) جمہور (۷) رہبر (۸) رہبرِ عالم (۹) رہنما (۱۰) ستارہ (۱۱) سنگم (۱۲) صدائے عام (۱۳) محاذ (۱۴) نقاش (۱۵) نیو مجاہد اور (۱۶) ہوڑہ ٹائمز وغیرہ۔ ان میں بیشتر دو تین ماہ بعد بند ہوگئے۔ لیکن سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ روزنامہ "آبشار" جو ۱۹۵۳ء میں جاری ہوا تھا، مسلسل ۲۹ سال تک نکلتے رہنے کے بعد گزشتہ سال یعنی ۱۹۸۲ء کے نصف اول میں بند ہوگیا۔ اس شام کے اخبار کے مدیر جناب ابراہیم ہوش تھے۔

آج جو روزنامے کلکتہ سے نکل رہے ہیں اُن میں سب سے قدیم اخبار "عصرِ جدید" ہے، جس کا سنہ اجراء ۱۹۱۸ء ہے۔ اس کے بعد "روزنامہ ہند" آتا ہے، جو ۱۹۲۹ء میں جاری ہوا۔ دیگر روزناموں میں عبدالرزاق ملیح آبادی کا جاری کیا ہوا "آزاد ہند" ہے، جس کے موجودہ مدیر اُن کے فرزند نیک احمد سعید ملیح آبادی ہیں۔ یہ اخبار ۸ راگست ۱۹۸۲ء سے آفسیٹ پر چھپنے لگا ہے۔ اور یہ کلکتہ سے آفسیٹ پر چھپ کر نکلنے والا دوسرا روزنامہ ہے اس کے علاوہ "اخبارِ مشرق" ہے جو آفسیٹ پر چھپنے والا پہلا اخبار ہے، جس کا پہلا شمارہ ۲۵ راپریل ۱۹۸۰ء کو نکلا۔ یعنی ۲۵ راپریل ۱۹۸۰ء کلکتہ کی تاریخ میں وہ دن ہے جب یہاں کی صحافت نے پتھر کے دور (لیتھو کی چھپائی) سے آزادی حاصل کی۔ اس کے بعد "اقرار" تیسرا روزنامہ ہے جو آفسیٹ پر چھپ کر ۹ ستمبر ۱۹۸۳ء کو پہلی بار منظرِ عام پر آیا اور آج تک اُسی شان سے نکل رہا ہے۔ یہ تینوں اخبارات نہ صرف مغربی بنگال کے مقبول اخبارات ہیں بلکہ یہ پڑوسی ریاستوں یعنی آسام اُڑیسہ اور صوبہ بہار میں بھی بڑی تعداد میں جاتے ہیں۔ آفسیٹ پر چھپنے والے ان تین روزناموں اور پھر "روزنامہ ہند" اور "عصرِ جدید" کے علاوہ کلکتہ سے اب جو دیگر روزنامے نکل رہے ہیں وہ ہیں "امروز" "شانِ ملت" "وکاس" اور "غازی" اور یہ سب شام کے اخبارات ہیں۔ ان میں سب سے قدیم "امروز" ہے۔ جو ماہِ نومبر ۱۹۵۱ء سے نکل رہا ہے۔ حال ہی میں کلکتہ سے باہر آسنسول ضلع بردوان سے بھی اردو کا ایک روزنامہ نکلنے لگا ہے، جس کا پہلا شمارہ ۱۴ رنومبر ۱۹۸۳ء کو منظرِ عام پر آیا ہے۔

یوں تو آزادی کے بعد سے اب تک مغربی بنگال سے کئی ہفت روزہ اخبارات نکلے ہیں (اور اگر اُن کے ناموں کی ایک فہرست پیش کردوں تو مجھے لگ بھگ چالیس نام لکھنے ہوں گے) لیکن اُن میں سے بیشتر چند ماہ کے بعد بند ہوگئے۔ سوائے ہفتہ وار "فلم ویکلی" کلکتہ کے جو ۱۹۵۶ء سے ۱۹۸۲ء تک نکلا ہے) لہٰذا اس مضمون میں نام گنوا کر مضمون کو طول دینا بے کار محض ہے بہر حال اب جو ہفتہ وار نکل رہے ہیں وہ ہیں:— (۱) "اُجالا" کلکتہ، دو ہفتہ وار ہے جس کو مولانا ملیح آبادی نے جاری کیا تھا اور اب یہ روزنامہ "آزاد ہند" کے سنڈے ایڈیشن کے طور پر شائع ہوتا ہے۔ (۲) "اخبارِ مغرب" کلکتہ مارچ ۱۹۸۳ء سے نکل رہا ہے جس کے مدیر اقبال جاوید ہیں (۳) "آرزوئے ہند" کلکتہ کا اجرا ۱۹۶۶ء میں عمل میں آیا اور اب تک یہ جاری ہے۔ (۴) "اسپورٹس ٹوڈے" کا نام انگریزی ہے، لیکن یہ کھیل کود کا اردو ہفتہ وار ہے جو ۱۹۷۲ء سے جاری ہے (۵) "تسکینِ رُوح" کا اجراء ۲۰ رمئی ۱۹۸۳ء کو عمل میں آیا ہے اور اب تک زندہ ہے (۶) "کسان مزدور" کلکتہ مارکسی کمیونسٹ پارٹی کا ترجمان ہے جو ۱۹۷۲ء سے جاری ہے۔ گزشتہ سال سے یہ بھی آفسیٹ پر چھپ کر نکلنے لگا ہے۔ (۷) "محرک" واحد ہفت روزہ ہے، جو کلکتہ سے باہر آسنسول سے نکلا کرتا ہے۔ اس کے مدیر قیام انیس ہیں اور سالِ اجراء ۱۹۷۵ء۔ ●

فرحت شاہین

# بہار میں اُردو صحافت

ہندوستان میں اردو صحافت کی تاریخ ۱۶۲ سال پرانی ہے۔ صوبۂ بہار میں اردو صحافت کا آغاز اس دور میں ہوا جب صحافت کے لیے حالات سازگار نہیں تھے۔ بہار میں اردو صحافت کا جائزہ لینے کے لیے اسے کئی ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ۱۸۲۳ء سے ۱۸۵۶ء کا ہے؛ جب حالات بہت ہی خراب تھے۔ دوسرا دور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک کا ہے، اسے عہدِ زرّیں کہا جا سکتا ہے۔ تیسرا دور ۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کا ہے، اس دور میں اردو صحافت نے ملک کی آزادی کے لیے جدّوجہد کرنے میں نمایاں رول ادا کیا۔ حالیہ دور کا آغاز ۱۹۴۷ء سے ہوتا ہے۔

## پہلا دور : پُرآشوب

بقول ڈاکٹر مظفر اقبال بہار کا سب سے پہلا اخبار "نور الانوار" ہے، جو آرہ سے ۱۸۵۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے مالک سید محمد ہاشم بلگرامی تھے۔ 'پٹنہ ہرکارہ' ۲۱ اپریل ۱۸۵۵ء کو شائع ہوا، جس کے مالک شاہ ابوتراب تھے۔ "اخبار بہار" پٹنہ سے یکم ستمبر ۱۸۵۶ء کو شاہ ابوتراب نے جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر لالہ بندا پرشاد حسرتی تھے۔ "ویکلی رپورٹ" گیا، یکم مئی ۱۸۶۵ء کو گیا سے جاری ہوا۔

## دوسرا دور : عہدِ زرّیں

۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک صوبہ بہار سے بے شمار اخبارات جاری ہوئے، ان کی تعداد تقریباً ۶۰ ہے۔

۱۔ عظیم الاخبار ہفتہ وار پٹنہ جولائی ۱۸۵۹ء۔
۲۔ نہر الفوائد سہ ماہی، آرہ۔ ۳۱ مارچ ۱۸۶۷ء
۳۔ اخبار الاخبار پندرہ روزہ، مظفرپور۔ ۱ ستمبر ۱۸۶۸ء
۴۔ چشمۂ علم۔ پندرہ روزہ۔ پٹنہ ۱۸۶۹ء
۵۔ گلدستۂ نظائر ماہنامہ گیا، ۱۸۷۱ء
۶۔ شعاعِ مہر، مظفرپور، ۱۸۷۱ء
۷۔ نادر الاخبار ہفتہ وار، مونگیر ۱۸۷۲ء
۸۔ ضیاء الاخبار ہفتہ وار، آرہ۔ ۱۸۷۳ء
۹۔ سفرِ صغیر، آرہ، ۱۸۷۴ء
۱۰۔ اخبار انجمن مذاکرہ علمیہ، پٹنہ، ۹ مارچ ۱۸۷۴ء
۱۱۔ نسیمِ سحر، ہفتہ وار۔ پٹنہ ۱۸۷۴ء
۱۲۔ بہار پنج۔ ہفتہ وار پٹنہ ۲۶ نومبر ۱۸۷۶ء
۱۳۔ انیسِ بہار۔ روزنامہ پٹنہ ۱۸۷۶ء
۱۴۔ قاصد۔ ہفتہ وار پٹنہ۔ ۲ جنوری ۱۸۷۶ء
۱۵۔ مجمع الفوائد۔ ہفتہ وار، مونگیر یکم جولائی ۱۸۷۶ء
۱۶۔ مجموعۂ نظائرِ ہند، گیا ۳۱ جنوری ۱۸۷۶ء
۱۷۔ نسیم سارن، ہفتہ وار چھپرہ یکم جنوری ۱۸۷۸ء
۱۸۔ شیرِ بہار ہفتہ وار پٹنہ ۷ جنوری ۱۸۸۵ء
۱۹۔ انڈین کرانیکل سہ روزہ پٹنہ یکم جولائی ۱۸۸۱ء
۲۰۔ صبحِ وطن ہفتہ وار پٹنہ یکم جون ۱۸۸۱ء
۲۱۔ لمعۂ نور مظفرپور یکم اگست ۱۸۸۳ء

● آریہ کمار روڈ، پٹنہ ۴

۲۲۔ شرف الاخبار ہفتہ وار بہار شریف ۴ر جنوری ۱۸۸۲ء
۲۳۔ گلدستۂ بہار ماہ نامہ بہار شریف' ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۳ء
۲۴۔ مہرِ منور پندرہ روزہ مظفر پور ۱۰ر جون ۱۸۸۴ء
۲۵۔ البلیغ ہفتہ وار پٹنہ ۵ر فروری ۱۸۸۵ء
۲۶۔ صدق دیو قلون صدق پندرہ روزہ بہار شریف ۱۴ر جولائی ۱۸۸۵ء
۲۷۔ گلدستۂ سارن، سارن ۱۸۸۵ء
۲۸۔ نالۂ عشاق، پٹنہ، ۱۸۸۵ء
۲۹۔ آرہ گزٹ ہفتہ وار ۱۸۸۶ء
۳۰۔ نورالاسلام ماہ نامہ پٹنہ ۱۸۸۰ء
۳۱۔ انسٹی ٹیوٹ، ہفتہ وار پٹنہ ۱۸۸۶ء
۳۲۔ اسٹار آف انڈیا، آرہ۔ یکم جون ۱۸۸۶ء
۳۳۔ آفتابِ عالم ماہ نامہ آرہ، ۱۵ر فروری ۱۸۸۶ء
۳۴۔ عالم آرہ، آرہ ۱۸۸۶ء
۳۵۔ انیس ہفتہ وار پٹنہ ۶ر اگست ۱۸۸۷ء
۳۶۔ شہرۂ آفاق ہفتہ وار گیا ۱۸۹۵ء
۳۷۔ الہادی، پٹنہ، جنوری ۱۸۹۷ء
۳۸۔ ادیب ماہ نامہ پٹنہ ۱۸۹۷ء
۳۹۔ اشرف، بہار شریف ۱۸۹۷ء
۴۰۔ رسالہ مخزنِ تحقیق ملقب بہ تحفیہ حنفیہ، پٹنہ ۱۸۹۷ء
۴۱۔ اخبار تہذیب ہفتہ وار پٹنہ، ۳۱ر جولائی ۱۸۹۷ء
۴۲۔ گیا پنچ۔ گیا ۱۸۹۷ء
۴۳۔ رسالہ اصلاح۔ ماہ نامہ پٹنہ ۱۸۹۷ء
۴۴۔ نغمۂ آرزو ماہنامہ بہار شریف ۱۹۰۱ء
۴۵۔ نسیمِ سحر ماہ نامہ گیا ۱۹۰۱ء
۴۶۔ تاج ہفتہ وار پٹنہ، ۱۵ر ستمبر ۱۹۰۲ء
۴۷۔ رفتارِ زمانہ' پٹنہ، جنوری ۱۹۰۳ء
۴۸۔ بہار اور دامنِ بہار' پٹنہ ۱۹۰۳ء
۴۹۔ شیعہ، سارن، جنوری ۱۹۰۴ء
۵۰۔ الشمس، سارن، ۱۹۰۴ء
۵۱۔ بہار گزٹ ہفتہ وار' پٹنہ مارچ ۱۹۰۹ء
۵۲۔ معارف، پھلواری شریف ۱۹۱۲ء
۵۳۔ اتحاد، ہفتہ وار' پٹنہ ۱۹۱۲ء
۵۴۔ پٹنہ اخبار، ہفتہ وار، پٹنہ، مارچ ۱۹۱۳ء
۵۵۔ مشیر، پٹنہ ۱۵ر جولائی ۱۹۱۳ء
۵۶۔ الکلام، سارن ۱۹۱۲ء
۵۷۔ بزمِ سخن، ماہ نامہ گیا ۱۳-۱۹۱۲ء
۵۸۔ بہار پنچ، گیا
۵۹۔ بے باک، پٹنہ
۶۰۔ نورِ ایمان، پٹنہ

اس دور کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ برِ صغیر کا چوتھا روزنامہ "اُنیسِ بہار" صوبہ بہار سے جاری ہوا تھا۔ ہفتہ وار بہار پنچ لکھنؤ کے ہفتہ وار "اودھ پنچ" سے ایک سال قبل شائع ہوا۔ البلیغ مکمل اخبار تھا اور ظریفانہ تھا۔ اتحاد ملک کا مقبول ترین ہفتہ وار تھا، جسے شیخ نور محمد نے نکالا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں اس اخبار سے سلطان احمد وابستہ ہو گئے۔

## تیسرا دَور: جنگِ آزادی کا پیامبر

۱۹۱۰ء میں بدنامِ زمانہ پریس ایکٹ لاگو ہوا، لیکن تمام پابندیوں کے باوجود اردو صحافت نے آزادی کی لڑائی میں اہم رول ادا کیا۔ اسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکی۔ دراصل اردو اخبارات ہی "آزادی کے پیامبر" تھے۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک بہار سے ۴۳ اخبارات جاری ہوئے۔

۱۔ امارت، پھلواری شریف ۱۹۲۱ء۔ ۲۔ البدر' ہفتہ وار' دربھنگہ ۱۹۲۳ء
۳۔ نوید ماہ نامہ پٹنہ ۱۹۲۴ء۔ ۴۔ الاکرام ۱۹۲۶ء
۵۔ پیمانہ، ماہنامہ، دربھنگہ ۱۹۲۶ء۔ ۶۔ پیغام سہ روزہ، پٹنہ ۱۹۲۶ء
۷۔ تصویرِ خیال ماہ نامہ پٹنہ ۱۹۲۶ء۔ ۸۔ رہنما، پٹنہ ۱۹۲۷ء
۹۔ الامین، بہار شریف ۱۹۲۷ء۔ ۱۰۔ عفت ۱۹۲۷ء
۱۱۔ العدل، پٹنہ۔ ۱۹۲۹ء ۱۲۔ آزاد، پٹنہ ۱۹۲۹ء
۱۳۔ بہارستان، ماہنامہ پٹنہ ۱۹۳۱ء۔ ۱۴۔ ندیم، گیا ۱۹۳۱ء
۱۵۔ موجِ نسیم' ماہنامہ، پٹنہ ۱۹۳۱ء۔ ۱۶۔ المبشر، ماہنامہ' پٹنہ ۱۹۳۱ء
۱۷۔ نقیب' ہفتہ وار پھلواری شریف ۱۹۳۲ء ۱۸۔ فطرت' ماہنامہ' راجگیر ۱۹۳۳ء
۱۹۔ سہیل، ماہ نامہ گیا ۱۹۳۳ء۔ ۲۰۔ گنجینہ، ماہ نامہ پٹنہ، ۱۹۳۴ء
۲۱۔ استقلال' سہ روزہ پٹنہ ۱۹۳۵ء۔ ۲۲۔ جمہور' ہفتہ وار' پٹنہ ۱۹۳۵ء
۲۳۔ آئینہ' ہفتہ وار' کشن گنج ۱۹۳۵ء۔ ۲۴۔ مسلم گزٹ' پٹنہ ۱۹۳۵ء
۲۵۔ مساوات' پندرہ روزہ پھلواری شریف ۱۹۳۵ء۔ ۲۶۔ کارواں' پٹنہ ۱۹۳۵ء
۲۷۔ معیار' پٹنہ ۱۹۳۶ء۔ ۲۸۔ شمیم، پٹنہ ۱۹۳۶ء
۲۹۔ مجلہ سلیقہ' دربھنگہ ۱۹۳۶ء۔ ۳۰۔ مسلم' ہفتہ وار' پٹنہ ۱۹۳۶ء
۳۱۔ میل ملاپ' ماہنامہ ۱۹۴۰ء۔ ۳۲۔ الہدیٰ' دربھنگہ ۱۹۴۰ء
۳۳۔ معاصر' سہ ماہی' پٹنہ ۱۹۴۱ء ۳۴۔ صدائے عام' روزنامہ' پٹنہ ۱۹۴۲ء
۳۵۔ کہانی، رانچی ۱۹۴۵ء ۳۶۔ نوجوان، پٹنہ ۱۹۴۵ء

۳۷- الہلال، پٹنہ ۱۹۴۷ء ۳۸- تربیت
۳۹- طلعہ ۴۰- جلیب
۴۱- آتمکشش ۴۲- آفتاب پورنیہ
۴۳- اقدام

اس دور کے بعض اخبارات آج بھی شائع ہو رہے ہیں۔ اس دور کے ایک اہم اخبار 'ندیم' گیا کے ایڈیٹر انجم مان پوری تھے۔ جسے بعد میں ریاست علی ندوی نے جاری رکھا۔ ماہ نامہ 'سہیل' کو ادریس سنبھاروی نے جاری رکھا۔ موصوف کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ 'گنجینہ' کے ایڈیٹر ناصح تھے۔ معیار کے ایڈیٹر قاضی عبدالودود تھے۔ معاصر کو ڈاکٹر عظیم الدین عظیم نے جاری کیا تھا۔ روزنامہ صدائے عام کو حکومت نے جاری کیا تھا، جسے بعد میں سید نظیر حیدر صاحب نے خرید لیا۔ 'نوجوان' کا اجرا غلام سرور نے کیا تھا۔ آزادی کی لڑائی میں جیسا کردار الہلال، زمیندار اور ہمدرد نے ادا کیا، اس طرح کا کردار بہار میں کسی اخبار نے ادا نہیں کیا ہے۔

## حالیہ یعنی چوتھا دور: بڑھتا ہوا کارواں

آزادی کے بعد ہندوستان نے ایک نئی کروٹ لی اس دور میں گویا بہار میں اردو اخبارات کا سیلاب آ گیا۔ ۱۹۷۰ء تک یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا۔ بعد میں حکومت نے جب اشتہارات کو ایک محکمے کے سپرد کر دیا تو اخباروں کی تعداد کم ہونے لگی۔

'نئی کرن' دربھنگہ ۱۹۴۸ء "روزنامہ ساتھی" پٹنہ ۱۹۴۹ء "صبحِ زندگی" دربھنگہ ۱۹۴۹ء ہفتہ وار "سیرت" پٹنہ ۱۹۵۰ء "ساحل" کشن گنج ۱۹۵۰ء ہفت روزہ "عمل" کشن گنج ۱۹۵۰ء ہفتہ وار "انسان" کشن گنج ۱۹۵۱ء "شگوفہ" سہ ماہی' دربھنگہ ۱۹۵۱ء "سہ ماہی ناری' دربھنگہ ۱۹۵۲ء ماہ نامہ "تہذیب" ۱۹۵۶ء ماہ نامہ "صبحِ نو" ۱۹۵۲ء ماہ نامہ 'کرن' گیا ۱۹۵۲ء ہفتہ وار "اشارہ" گیا۔ بعد میں پٹنہ ۱۹۵۲ء ماہ نامہ "زمین" پٹنہ ۱۹۵۲ء "بہار ریخ" پٹنہ ۱۹۵۲ء "نوبہار" پٹنہ ۱۹۵۳ء' روزنامہ "سنگم" ۱۹۵۳ء "طوفان" پٹنہ "جنتا" پٹنہ "جرس" مونگیر "لال مرچ" گیا "بہار ریخ" بہار شریف "پرچم" کشن گنج "غریب نواز" پھلواری شریف "انداز نو" اور "پرواز" ۱۹۵۳ء۔

آزادی کے بعد دس سال تک اردو اخبارات کسی صورت سے شائع ہوتے رہے، لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد یہ سلسلہ طویل ہو گیا۔ ان اخباروں کی فہرست یہاں پر دی جا رہی ہے جو بند ہو چکے ہیں مگر کسی وقت بھی نکل سکتے ہیں۔

روزنامہ "طاؤس" ایڈیٹر اطہر حسین، روزنامہ اردو ایکسپریس، گیا (شاہین محسن) روزنامہ "امروزِ ہند (ہارون رشید)

ہفتہ وار "انجلی" (شمس الہدیٰ بتیاوی) ہمزاد، گیا (احمد حسین آزاد) صدائے ہند (خورشید انور عارفی) غمخوار (شارق اجے پوری) ہمارا پیام (شمیم ربانی) عظیم آباد ٹائمز (عزیز احمد نعمانی) مومن دنیا (خالد انور انصاری) ہاتف (حق منظفر پوری) حال (سہیل عظیم آبادی) نرم گرم (سید محمد) معاشرہ (شمیم احمد صدیقی) الہدیٰ، سیکولر ہندوستان (بشیر احمد) الافکار (یونس مشہدی) الناصر (ناصر زیدی) اصلاح (مولانا سید محمد باقر نقوی) المجیب (اسمٰعیل حسین نقوی) زیور (سلمیٰ جاوید) صحیفہ (رضی احمد) شگوفہ (اعجاز علی ارشد) فکر جمیل، منظر، ترسیل، مطالعہ، قومی دھارا (شین منظفر پوری) احوال اقلیت (معصوم شرفی اسیر) ملن (معصوم شرفی اسیر) صداقت سندیش بہار، دھنباد ایکسپریس، جیوتی، فلاح قوم (ایڈیٹر شفیع عالم) مثلث (نجم الحسن) اقرار (ظفر اکانوی) زبان و ادب، ساز و آواز (غضنفر نواب دانش) مسرت (ضیاء الرحمٰن غوثی، قدوس جاوید) انسان دوست (رضی احمد) ساغر نو، شاخِ گل، صنم، عوامی جمہوریہ، النغم، اورنگ، مفاہیم، سریر، اصناف، لال مرچ، حرف نوید، مرکز، بچوں کا ڈائجسٹ، الخیر، روزنامہ، کردار آئندہ، اشرف العرفان، افق، توازن، نعمت، جامِ نو، ابلاغ، فانوس، قافلہ، کونل وغیرہ وغیرہ۔

اس وقت بہار سے مندرجہ ذیل روزنامے شائع ہو رہے ہیں۔

۱۔ ساتھی:- اسے سہیل عظیم آبادی نے جاری کیا تھا، جسے بعد میں غلام سرور نے خرید لیا بعد میں اُسے خالد رشید صبا نے نکالنا شروع کیا۔ یہ روزنامہ آج بھی پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

۲۔ صدائے عام آزادی سے قبل جاری ہوا۔ سید نظیر حیدر صاحب کے انتقال کے بعد سید رضی حیدر اور محمد مرغوب کی ادارت میں پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

۳۔ سنگم:- پہلے ہفتہ وار تھا۔ بعد میں روزنامہ ہوا۔ الحاج غلام سرور نے اسے جاری کیا۔ آج بھی یہ بہار کا مقبول ترین روزنامہ ہے اب اس کے ایڈیٹر محمد مظاہر الدین ایڈووکیٹ ہیں۔

۴۔ صداقت:- مولانا سید محی الدین ندوی نے جاری کیا۔ ان کے بعد اب ان کے صاحبزادے سید فصیح الدین اسے جاری رکھے ہوئے ہیں۔

۵۔ پیغامِ نہرو:- رفیع الدین راہی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔

۶۔ ہمارا نعرہ } ان دونوں روزناموں کے ایڈیٹر مشہور صحافی شمس الہدیٰ
۷۔ کوہکن } استھانوی ہیں۔

۸۔ راہرو:- اسے شمائل نبی صاحب نے جاری کیا تھا اور اب ان کے برادر شفیق النبی اس کے ایڈیٹر ہیں۔

۸۔ عظیم آباد ایکسپریس :۔ یہ پہلے ہفتہ وار تھا اب روزنامہ ہے۔ اس کے ایڈیٹر مشہور نوجوان صحافی رضوان احمد ہیں۔

۱۔ قومی آواز :۔ دہلی کا پٹنہ ایڈیشن

۔ قومی تنظیم :۔ ایڈیٹر عمر فرید

۱۱۔ دیش بدیس

۱۲۔ نوید صبح

۱۴۔ قومی سوتر

۱۵۔ اندلوں

۱۶۔ ہمارا بہار :۔ ایڈیٹر اسلم آزاد

ہفتہ وار اخباروں میں ہفتہ وار مسائل ۱۹۶۸ء میں جاری ہوا۔ مشہور صحافی ریاض عظیم آبادی اس کے ایڈیٹر تھے۔ ۱۹۷۵ء سے یہ کمیونسٹ پارٹی کا ترجمان ہے اور ایڈیٹر غلام سرور آزاد ہیں۔ ہفتہ وار "آدرش" گیا (ایڈیٹر معین شاہد) "اتحادِ وطن" (ایڈیٹر امین اعجازی) "مورچہ" گیا (ایڈیٹر (ایڈیٹر کلام حیدری) "روشنی" (اس کے ایڈیٹر بہار کے پرانے صحافی سید مطیع الرحمٰن شمیم ہیں) "نقیب" (اس کے ایڈیٹر مشہور صحافی شاہد رام نگری ہیں) "ہمالہ" (اسے جنگِ آزادی کے مجاہد مولانا فاروق الحسینی نے شائع کیا، اب اسے ان کے صاحب زادے نکال رہے ہیں) "آئینِ نو" (ایڈیٹر ایم شمیم) "امانت" (اس کے ایڈیٹر احمد کبیر تھے۔ ان کی موت کے بعد کسی طرح سے جاری ہے۔) "مگدھ پنچ" اسے ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے جاری کیا تھا۔ اب اکرام علی راشد نکال رہے ہیں۔) "سیکولر محاذ" (اس کی مدیرہ سلمیٰ ریاض تھیں، آج کل اسے ریاض عظیم آبادی "آل انڈیا اردو رائٹرس اینڈ جرنلسٹ فورم" کے ترجمان کی شکل میں نکال رہے ہیں) "بیزار" اور "ایک قوم" دونوں کے ایڈیٹر طیب زاہدی ہیں۔ پرستار۔ رفاقت۔

ماہناموں میں گیا سے کلام حیدری، آہنگ اور جمیل، منظر سنسہاروی سہیل پابندی کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ صبحِ نو کے بند ہو جانے کے بعد راجد صافی پٹنہ سے انجمن ترقی اردو بہار نے ماہ نامہ "مریخ" کو نکالنا شروع کر دیا ہے۔ اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالمغنی ہیں، جس کا نصب العین صالح کلاسکی روایات کی ترویج و اشاعت ہے۔ جس کے ردِ عمل میں ماہ نامہ "خطوط" شائع ہوا۔ جو تین شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ "معاصر" بے قاعدگی سے نکلتا ہے۔

بہار اردو اکاڈمی سہ ماہی "زبان و ادب" شائع کرتی ہے۔.......

بہار اردو اکاڈمی ایک خبرنامہ بھی شائع کر رہی ہے۔ سہاکل کچھ سے مناظر عاشق ہرگانوی "کوہسار" شائع کر رہے ہیں۔

## حالات موافق مگر رفتار سست

بہار میں جتنے روزنامے اور ہفتہ وار شائع ہو رہے ہیں، ان کے پیشِ نظر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہار میں اردو اخباروں کا سیلاب آگیا تھا، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ چند ایک کو چھوڑ کر سبھی کا دار و مدار اشتہارات پر ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہار سے کوئی معیاری روزنامہ آج تک شائع نہ ہو سکا۔ صدائے عام، سنگم اور قومی آواز کی تعداد اشاعت نسبتاً زیادہ ہے۔ روزنامہ عظیم آباد ایکسپریس معیار کے اعتبار سے بتدریج بہتر ہوتا جا رہا ہے۔

ہفتہ وار اخبارات میں سہیل عظیم آبادی نے "حال" شائع کیا تھا۔ یہ ایک معیاری ہفتہ وار تھا۔ بہار میں جب اردو صحافیوں کا ذکر آئے گا تو سہیل عظیم آبادی کا نام سرِ فہرست ہوگا۔ ہفتہ وار "مسائل" بھی ریاض عظیم آبادی کی ادارت میں کئی برسوں تک پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ اس نے اپنا ایک الگ معیار قائم کیا تھا۔ ان کی علیحدگی کے بعد سے اب اس کا انداز مختلف ہے۔ بہار کے اوّلین اردو صحافی ہونے کا شرف بھی سید خورشید احمد کو حاصل ہے جو "نور الانوار" کے مہتمم تھے۔ اس کے بعد شاہ ابو تراب کا نام آتا ہے لیکن ایڈیٹر کی حیثیت سے سب سے پہلا نام اخبار بہار میں لالہ ہند پرشاد حسرتی کا شائع ہوا تھا۔

آزادی کے بعد سید نظیر حیدر، غلام سرور، مولانا سید محی الدین ندوی، سہیل عظیم آبادی اور شاہد رام نگری جیسے صحافی ابھرے۔ بہار کے چار صحافی عبدالقیوم انصاری، غلام سرور، شمائل نبی اور خالد خورشید صبا وزیر بن چکے ہیں۔ شاہد رام نگری۔ شین مظفر پوری، سید مطیع الرحمٰن شمیم، محمد مرغوب، کلام حیدری، قیوم خضر آج بھی اچھے صحافیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

بہترین صحافی کی حیثیت سے بہار اردو اکاڈمی نے شاہد رام نگری کو انعام سے بھی نوازا ہے۔ ان دنوں یہ نقیب کے ایڈیٹر ہیں۔ مگر یہ درجنوں روزناموں اور ہفتہ وار اخبارات میں کام کر چکے ہیں۔ ریاض عظیم آبادی جیسے صحافی نے اپنے ایک مضمون میں انہیں استاد لکھا تھا۔

نئی نسل میں ریاض عظیم آبادی، شاہین محسن اور رضوان احمد نے نام پیدا کیا ہے۔ شاہین محسن قومی آواز سے منسلک ہیں۔ شاہین محسن ہی نے گیا سے اردو روزنامہ "اردو ایکسپریس" جاری کیا تھا جو چل نہیں پایا تھا، تاہم اس نے اپنا ایک اثر ضرور چھوڑا۔

بہار میں کالم نگاری کی شروعات ریاض عظیم آبادی نے کی۔ تفتیشی نامہ نگاروں میں انہیں مقام حاصل ہے۔ ریاض عظیم آبادی نے اردو صحافت کو تکنیکی اعتبار سے انگریزی اور ہندی صحافت کے قریب لانے کی کوشش کی۔ بہ حیثیت نامہ نگار وہ ہندی اور انگریزی میں بھی مقبول ہیں۔

بہار میں اردو صحافت کا المناک پہلو یہ ہے کہ بعض اخباروں کے

آگے ۲۸ پر

محمد نعمان خاں

# مدھیہ پردیش میں اردو صحافت ۔ ایک جائزہ

اس وسیع و عریض صوبہ مدھیہ پردیش کی تشکیل یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو وسط ہند کی چار سابقہ ریاستوں، مدھیہ بھارت، وندھیہ پردیش، بھوپال اور مہاکوشل کے علاقوں کو شامل کرکے عمل میں آئی ہے۔

انضمام ریاست یا تشکیل مدھیہ پردیش سے قبل وسط ہند کی متذکرہ ریاستوں کے جن شہروں اور قصبات میں اردو زبان و ادب کا رواج عام تھا، یا جہاں سے اردو اخبارات و رسائل کی اشاعت عمل میں آتی رہی، ان میں بھوپال کے علاوہ اندور، گوالیار، جاورہ، رتلام، برہان پور، جبل پور، اجین، کھنڈوہ، مہو، دھار، سیونی، ساگر، بلاسپور، شیوپوری اور سرونج وغیرہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

مدھیہ پردیش کا سب سے قدیم اور معلوم اخبار ہفتہ وار "مالوہ اخبار" ہے، جو مہاراجہ اندور اور مسٹر ہیملٹن ریزیڈنٹ آف اندور کی زیر سرپرستی زیرادارت دھرم نرائن ۱۸۴۹ء میں اندور سے جاری ہوا تھا۔ آٹھ صفحات پر مشتمل اس اخبار کے ایک کالم میں اردو اور دوسرے کالم میں ہندی میں خبریں شائع ہوتی تھیں، جن کا تعلق اندور کے علاوہ گرد و نواح کی دیگر ریاستوں سے بھی ہوتا تھا۔ جناب عتیق صدیقی نے اپنی کتاب میں "مالوہ اخبار" کی ۶ سالہ اشاعت کا نقشہ پیش کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ اخبار تقریباً ۶ سال تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔

مدھیہ پردیش کا دوسرا قدیم اخبار "گوالیار اخبار" ہے۔ یہ سرکاری اخبار ۱۸۵۳ء میں لکشمی پرشاد کی زیرادارت گوالیار سے جاری ہوا۔ دو کالم پر مشتمل اس اخبار میں ہندی، اردو دونوں زبانوں میں خبریں شائع ہوتی تھیں۔ یہ گزٹ بھی تھا اور اخبار بھی۔ مقامی خبروں کی کثرت کے سبب یہ محض مقامی دلچسپی کا اخبار تھا، جسے گوالیار کے باہر زیادہ شہرت حاصل نہ ہو سکی۔

مدھیہ پردیش کے قدیم اخبارات و رسائل میں "رتن پرکاش" (رتلام) اور جاورہ سے شائع ہونے والے ہفت روزہ "محتشم جاورہ" کے علاوہ "افتخار" اور "انتخاب" رسالے بھی ہیں۔

گارساں دتاسی "رتن پرکاش" کے متعلق رقم طراز ہے کہ:

"رتن پرکاش۔ مہینے میں دو مرتبہ شائع ہوتا ہے اور رتلام (بندھیل کھنڈ) سے گزشتہ مئی سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ یہ اخبار اردو میں شائع ہوتا ہے اور ساتھ ہی ہندی میں ترجمہ بھی ہوتا ہے۔ اس اخبار سے بعض اوقات "اودھ اخبار" اور "اخبار عالم" میں مضامین نقل کیے جاتے ہیں۔ "اخبار عالم" نے خاص کر اس کی ترتیب و ادارت کی بہت تعریف لکھی ہے۔"

متذکرہ اخبار کے علاوہ مدھیہ پردیش کے مختلف شہروں و قصبات سے (بھوپال کو چھوڑ کر) ۔۔ ۔ حسب ذیل اخبارات و رسائل شائع ہوتے ہیں۔

رضی کاکوری اور سرشار کسمنڈوی نے علامہ محوی صدیقی کی زیر نگرانی سیہور سے "حسن خیال" جاری کیا تھا جس میں یہ اشتہار بھی شائع ہوا تھا کہ جنوری ۰۷ء سے ماہنامہ "خیابان" جاری ہوگا۔ اب یہ بتانا امر محال ہے کہ حسب اعلان بعد کو یہ رسالہ شائع ہوا یا نہیں!

گوالیار سے شائع ہونے والا "اخلاق" کے متعلق حکیم سید قمرالحسن مرحوم لکھتے ہیں کہ:

"اخلاق" کے نام سے عبدالغفور خاں نے گوالیار سے ایک پرچہ نکالا، جو مختلف مقامات سے ۳۶ سال تک نکلتا رہا اور اپنے مدیر کے ترکِ مکانی کے ساتھ مقام اشاعت بدلتا رہا، آخر بھوپال میں جب خاں صاحب کا انتقال ہوا تو پرچہ بھی بند ہو گیا۔"

---

★ شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال (ایم۔پی)

مدھیہ پردیش میں اردو صحافت کی تاریخ میں سب سے اہم و نمایاں مقام اس کی راجدھانی بھوپال کو حاصل ہے۔ بھوپال کی اردو صحافت کی تاریخ ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ پر محیط ہے جس کے تحت تقریباً ۲۰۰ اخبارات (روزنامے، سہ روزہ، ہفت روزہ، پندرہ روزہ) اور تقریباً ۷۴ ادبی رسائل شائع ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس مختصر مضمون میں تمام اخبارات و رسائل کا نام اور تفصیلات بیان کرنا ممکن نہیں۔ تاہم یہاں سے جاری ہونے والے اہم اخبارات و رسائل کی تفصیل اس مضمون میں پیش کی جائے گی۔

بھوپال کا پہلا دستیاب اردو اخبار ہفت روزہ "عمدۃ الاخبار" اسی عہد میں ۲۴ مارچ ۱۸۷۱ء کو حکیم اصغر حسین اخگر کی زیر ادارت شائع ہوئے مقبول خاص و عام ہوا۔ ۱۲ صفحات پر مشتمل اس اخبار میں سیاسی، معاشرتی، تمدنی، معلوماتی، سائنسی و سماجی سرگرمیوں و خبروں کے علاوہ انگریزی اخبارات کے تراجم بھی شامل ہوتے تھے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں اس اخبار کے نمائندے پھیلے ہوتے تھے۔ بھوپال سے یہ اخبار کئی سال تک شائع ہوتا رہا۔ بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید: "اصغر حسین نے عمدۃ الاخبار پہلے بھوپال سے شائع کیا۔ اس کے بعد ۱۸۷۱ء میں فرخ آباد سے جاری کیا۔"[۳]

بھوپال کی صحافتی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کے بیشتر اخبارات ایک خاص مقصد کے تحت جاری کیے گئے تھے، جو اپنے عہد کی سیاسی تہذیبی، ادبی اور عوامی سرگرمیوں، تحریکات اور رجحانات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کثیر التعداد اخبارات و رسائل کے تدریجی ارتقا کا جائزہ لینے کے لیے انہیں درج ذیل چار ادوار میں منقسم کیا جا سکتا ہے:

پہلا دور: ۱۸۴۹ء سے ۱۹۲۶ء تک
دوسرا دور: ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۹ء تک
تیسرا دور: ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۵ء تک
چوتھا دور: ۱۹۵۶ء سے ۱۹۸۴ء تک

اگرچہ بھوپال کا پہلا دستیاب اخبار "عمدۃ الاخبار" ۱۸۷۱ء ہے لیکن جس طرح بھوپال میں شعر و ادب کے نمونے قیام ریاست سے پہلے ہی ملنا شروع ہو جاتے ہیں اسی طرح یہاں اردو صحافت کے ابتدائی نقوش ۱۸۷۱ء سے بہت پہلے یعنی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے زمانے میں ہی دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس ضمن میں مقامی فوج کے باغی سپاہیوں میں ولی شاہ کا نام قابلِ ذکر ہے۔ ولی شاہ روزانہ ایک تازہ مضمون تصنیف کر کے اپنے ساتھیوں کو سناتا تھا۔[۴] اس سلسلہ میں جناب مظفر رئیس کی درج ذیل رائے خصوصی توجہ کی حامل ہے:

"ولی شاہ کو بھوپال کا پہلا بے باک صحافی تسلیم کیا
جا سکتا ہے جو اپنے فرض کے ساتھ فن صحافت سے بھی
باخبر تھا، اور اپنے ساتھیوں کو بیداری کا پیغام سنایا
کرتا تھا۔ اگر اس جانباز سپاہی کو پریس کی آسانی
حاصل ہو جاتی تو اس کا یہ خبرنامہ شائع ہو کر
عوام کے سامنے اخبار کے روپ میں جلوہ گر ہوتا۔"[۵]

اس طرح عتیق صدیقی کی تحقیق (بھوپال اخبار ۱۸۴۹ء) اور مذکرہ اقتباسات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ بھوپال میں اردو صحافت کا آغاز "عمدۃ الاخبار" ۱۸۷۱ء سے بہت پہلے ۱۸۴۹ء سے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے زیر اثر ہوا۔

## دورِ اول (۱۸۴۹ء تا ۱۹۲۶ء)

بھوپال سے شائع ہونے والے ابتدائی اخبارات میں "بھوپال اخبار" ۱۸۴۹ء اور ہفت روزہ "عمدۃ الاخبار" ۱۸۷۱ء کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، دیگر اہم اخبارات میں ہفت روزہ "دبیر الملک" "صداقت" "موج نربدا" "ہلال" "مظفری" "اختر ہند" اور "سفیر عام" پندرہ روزہ "مالوہ ریویو" وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ہفت روزہ "دبیر الملک" مولانا محمد امجد علی اشہری کی زیر ادارت جاری ہوا تھا۔ اس کے سنہ اشاعت کے سلسلہ میں ڈاکٹر سلیم حامد رضوی لکھتے ہیں کہ: "دبیر الملک" ۱۸۸۱ء میں مولانا اشہری کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا اور ۱۸۹۳ء تک جاری رہا۔[۶] جبکہ ایم عرفان مرحوم نے اپنے اخبار "شعلۂ حیات" کے مدھیہ پردیش اردو نمبر میں اس کا سنہ اشاعت ۱۸۹۲ تحریر کیا ہے۔ برخلاف اس کے جناب شوکت رمزی اپنے مضمون میں اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں کہ: "۱۸۹۰ء میں منشی امتیاز علی خاں کے عہد وزارت میں مولوی امجد علی نے "دبیر الملک" نکالا جو بہت دنوں تک جاری رہا۔"[۷]

"دبیر الملک" کے سلسلہ میں مذکرہ بالا بیان کے پیش نظر اور اس کا کوئی بھی شمارہ دستیاب نہ ہونے کے باعث اس کے سنہ اشاعت کے سلسلہ میں کوئی حتمی فیصلہ کرنا امر محال ہے۔ البتہ اگر ڈاکٹر سلیم حامد رضوی مرحوم کی رائے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ اخبار تقریباً ۱۲ سال تک جاری رہا۔

۱۸۸۳ء میں عبدالکریم اوج نے ہفتہ وار "صداقت" جاری کیا اور اوج کے بھوپال سے اخراج کے سبب ہوشنگ آباد سے نکلنے لگا۔ ہفتہ وار "موج نربدا" کے سلسلہ میں ڈاکٹر سلیم حامد رضوی تحریر کرتے ہیں: "مولانا اشہری نے ۱۸۸۵ء میں بھوپال سے نکالا لیکن کچھ دن کے بعد عبدالکریم اوج کے سپرد کر دیا جو اسے ہوشنگ آباد سے نکالنے لگے۔"[۸] جبکہ ایم عرفان مرحوم نے "موج نربدا" کا سنہ اشاعت ۱۸۸۴ء تحریر کیا ہے۔[۹] مذکرہ دونوں اخبار دستیاب نہ ہونے کے سبب ان پر تفصیلی تبصرہ ممکن نہیں۔ البتہ دونوں اخبارات کا بھوپال سے جاری ہو کر (مدیر کے اخراج کے بعد) ہوشنگ آباد سے نکلنا اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ مذکورہ دونوں اخبارات حکومت وقت پر سخت تنقید کرتے تھے۔

ارجمند محمد خاں تسلیم نے دو اخبارات "ہلال" اور "مظفری" جاری کیے۔

یہ دونوں اخبارات غیر سیاسی تھے۔ جس میں ہندوستان کے اہم اخبارات کے اقتباسات اور بھوپال کے ادیبوں کے مضامین شائع کیے جاتے تھے۔
"ہلال" ۱۸۹۲ء میں شائع ہوا۔ ایم عرفان مرحوم نے اگرچہ اسے ہفت روزہ اخبارات کی فہرست میں شامل کیا ہے، لیکن یہ پندرہ روزہ اخبار تھا۔ "مظفری" کے سنہ اشاعت کے سلسلہ میں ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اور ایم عرفان مرحوم ۱۸۹۶ء پر متفق ہیں۔ لیکن جناب شوکت رمزی کے مطابق اس کا سنہ اشاعت ۱۸۹۸ء ہے۔

اس دور میں شائع ہونے والے "اختر ہند" اور "صفیر عام" ایسے اخبارات ہیں جو اب کہیں دستیاب نہیں، البتہ "اختر ہند" کا مختصر تذکرہ گارساں دتاسی نے اپنے مقالات حصہ دوم، صفحہ ۳۴۸ پر کیا ہے۔ "صفیر عام" کے متعلق سلیم حامد رضوی مرحوم لکھتے ہیں، "ہفتہ وار اخبار تھا، جسے عبدالواحد نے ۱۸۸۵ء میں جاری کیا، مگر جلد ہی بند ہو گیا۔"[12]

دور اوّل میں شائع ہونے والے پندرہ روزہ اخبارات میں "مالوہ ریویو" ایک اہم اخبار ہے، جس کے مدیران میں سید محمد یوسف قیصر اور کامدار عبدالمتین کا نام شامل ہے۔ ایم عرفان مرحوم نے اس کا سنہ اشاعت ۱۹۱۳ء تحریر کیا ہے۔ جبکہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے مطابق یہ اخبار ۱۹۰۷ء میں جاری ہوا۔[13] بھوپال میں دور اول کی اردو صحافت کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۶ء تک کا زمانہ اخبارات کے اجرا کے اعتبار سے بہت زیادہ امید افزا نہیں ہے۔ اس لیے اس اثنا میں بھوپال سے کوئی اہم اخبار جاری نہ ہو سکا۔ یہ زمانہ مشہور انقلابی مولانا برکت اللہ بھوپالی کا ہے۔ جن کے ذریعے "غدر پارٹی" کا قیام عمل میں آیا جس کے تحت انہوں نے اخبار "غدر" یکم نومبر ۱۹۱۳ء کیلی فورنیا کے شہر سیکرامنٹو سے جاری کیا۔ یہ اخبار اردو، ہندی، مراٹھی اور گورمکھی میں شائع ہوتا تھا اور خفیہ طور پر ہندوستان بھیجا جاتا تھا۔ مولوی برکت اللہ بھوپالی نے ۱۹۰۵ء میں جاپان سے ہفت روزہ "نیا اسلام" اور برلن سے ایک جریدہ "الاصلاح" کے نام سے جاری کیا تھا۔ جس کی کاپیاں ہندوستان بھیجی جاتی تھیں۔ اخبار "غدر" خالصتاً ایک انقلابی اخبار تھا جس کی زبان نہایت پُرجوش اور ولولہ انگیز تھی۔

بھوپال کی اردو صحافت کا دور اوّل ادبی رسائل کی اشاعت کے اعتبار سے خاصا امید افزا ہے۔ ۱۸۸۲ء میں بھوپال کے مطلع صحافت پر طلوع ہونے والا پہلا ادبی رسالہ "ذوالاجاہی" ہے۔ جس کے مدیر مولانا امجد علی اشہری تھے۔ "ذوالاجاہی" میں مولانا اشہری کے مضامین کے علاوہ نواب صدیق حسن خاں کے دولت کدے پر منعقد ہونے والے مشاعروں کا انتخاب شائع کیا جاتا تھا۔ فائل دستیاب نہ ہونے کے سبب یہ بتانا ممکن نہیں کہ یہ رسالہ کتنے عرصہ تک جاری رہا۔ دوسرا اہم رسالہ "گلبن سخن" ہے جو امیر مینائی کی بھوپال آمد و قیام کے سلسلہ میں بطور یادگار، بھوپال میں مقیم ان کے شاگردوں نے جاری کیا تھا۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ "۱۸۹۹ء میں جاری ہوا اور تین سال بعد جاری رہ کر بند ہو گیا۔"[14] جبکہ ایم عرفان مرحوم نے اس کا سنہ اشاعت ستمبر ۱۹۰۰ء تحریر کیا ہے۔ "گلبن سخن" جلد ۱ شمارہ ۱ شعبۂ اردو سیفیہ کالج میں محفوظ ہے، جس کی رو سے یہ رسالہ ۱۳۱۸ ہجری میں مولوی عبدالواسع صفا آنریری مجسٹریٹ دارالاقبال بھوپال کی زیر نگرانی، زیر ادارت عبدالشکور اخلاقی مطبع شاہجہانی میں طبع ہو کر شائع ہوتا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں مولوی نورالحسن سارنگ پوری نے "گل رعنا" جاری کیا تھا جس میں صرف مدیر کا کلام ہی شائع ہوتا تھا۔

دور اوّل کے متذکرہ ابتدائی رسائل اگرچہ بہت زیادہ معیاری اور سیر حاصل نہیں تھے، لیکن اسی دور میں بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی مندرجہ ذیل جو رسائل بھوپال کے مطلع صحافت پر نمودار ہوئے، وہ علمی ادبی معیار کے اعتبار سے منفرد مقام کے حامل تھے۔ ان میں "مہر منیر"، "الحجاب"، "ظل السلطان"، "ندیم" اور "نگار" نہایت اہم اور قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔
ماہنامہ "مہر منیر" کے مدیر مشہور شاعر و ادیب و مترجم میاں ارجمند محمد خاں سلیم تھے۔ رسالے کا سرکولیشن ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا جس میں نامور مقامی و غیر مقامی فارسی و اردو شعرا کا کلام، تذکرہ اور ریویو و تنقید بھی شائع کی جاتی تھی۔ راقم الحروف کے پاس ماہنامہ "مہر منیر" کی جلد ۲ کے ۲ شمارے (جون، جولائی ۱۹۰۴ء) موجود ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ رسالہ غالباً ۱۹۰۲ء اواخر یا ۱۹۰۳ء کے وسط میں جاری ہوا ہوگا اور اس کے ایڈیٹر و منیجر ارجمند خاں سلیم ہی تھے۔ لیکن نہیں معلوم کس غلط فہمی کے تحت ڈاکٹر سلیم حامد رضوی،[15] ایم عرفان[16] مرحوم اور حکیم سید قمر الحسن[19] مرحوم نے اس کا سنہ اشاعت ۱۸۹۶ء تحریر کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

بھوپال کی بیگمات نہایت بیدار مغز اور ادب نواز تھیں، ان کے عہد میں بھوپال میں تعلیم نسواں اور خواتین کی بیداری و ترقی کے لیے بہت سے قابلِ ذکر کام انجام پائے۔ نواب شاہجہاں بیگم کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم نے اس ضمن میں بے پناہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا، جس کے سبب زنانہ لٹریچر کی توسیع و اشاعت کی خاطر، بھوپال سے یکے بعد دیگرے کئی رسائل کی اشاعت عمل میں آئی، جن میں "الحجاب"، "ظل السلطان"، "بانو"، "امہات" اور "آفتاب نسواں" ملک گیر شہرت و مقبولیت کے حامل تھے۔
ماہنامہ "الحجاب" محمد یوسف قیصر بھوپالی نے جون[20] ۱۹۰۹ء میں جاری کیا تھا، جو خالصتاً خواتین کا رسالہ تھا۔ اردو قارئین کی سرد مہری اور عدم توجہی کے باعث ستمبر ۱۹۱۱ء میں بند ہو گیا۔ یہ ایک معیاری، ادبی و اصلاحی رسالہ تھا۔

"الحجاب" کی اشاعت کے بعد ہندوستانی خواتین کی سماجی اصلاح اور علمی وادبی دلچسپیوں کے پیش نظر ایک اور اہم و معیاری ادبی رسالہ ماہنامہ "ظل السلطان" زیر سرپرستی نواب سلطان جہاں بیگم، زیر ادارت محمد امین زبیری و محمد یوسف قیصر ۱۹۱۳ء میں شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہوا۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، جناب ایم عرفان مرحوم اور حکیم سید قمر الحسن صاحب نے اس کا سنہ اشاعت ۱۹۱۵ء تحریر کیا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔

۱۹۲۰ء میں سرور قادری نے رسالہ "حسن خیال" جاری کیا تھا جو چند ماہ بعد ہی بند ہو گیا، اور کوئی خاص تاثر قائم نہ کر سکا۔ ۱۹۲۰ء میں ہی تاج الدین نے چھوٹی تختی کا رسالہ "الحبیب" جاری کیا تھا۔ جس میں صرف مقامی شعرا کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے یہ رسالہ بھی کوئی خاص اہمیت حاصل نہ کر سکا۔ البتہ اس دور کا اہم ترین، معیاری ادبی رسالہ ماہنامہ "ندیم" ہے، جس کے مدیر سعید اللہ خاں رزمی نے اکتوبر ۱۹۲۲ء میں بھوپال سے جاری کیا تھا۔ "ندیم" کے سنہ اشاعت کے سلسلہ میں ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے ۱۹۲۰ء اور ایم عرفان مرحوم، حکیم سید قمر الحسن صاحب اور جناب مظفر رئیس نے اپنے مضامین میں ۱۹۲۳ء تحریر کیا ہے، جو اس وجہ سے درست نہیں ہے کہ شعبۂ اردو سیفیہ کالج میں "ندیم" کی جلد ۱ شمارہ ۱ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۲ء موجود ہے۔

۱۹ ویں صدی کے نصف آخر تک آتے آتے اردو کی ادبی صحافت میں خاصی وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ اس عہد کے رسائل محض روایتی موضوعات اور شعر و شاعری کی حد تک ہی محدود نہ تھے، بلکہ ان میں شائع ہوئے مضامین و مقالات فکر انگیز بھی ہوتے تھے اور زندگی و ادب کو قریب تر لانے والے بھی!

ہندوستان میں اس نوع کے رسائل کا سلسلہ آغاز سرسید احمد خاں کے "تہذیب الاخلاق" سے ہوتا ہے۔ بعدہٗ "الہلال"، "البلاغ"، "ہمدرد"، "مخزن"، "زمانہ"، اور "نیرنگ خیال" وغیرہ کے علاوہ بھوپال سے جاری ہونے والا رسالہ نیاز فتح پوری کا ماہنامہ "نگار" بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان رسائل نے نئی نسل کی نہ صرف ذہنی تربیت کی بلکہ ادب میں مفید و نئے رجحانات و تصورات کو بھی پیش کیا۔ چنانچہ جو اعتبار و معیار ان رسائل نے پیدا کیا وہ آگے چل کر زبان و ادب کے لیے بھی مفید ثابت ہوا۔

چنانچہ اسی فضا و ماحول کو ملحوظ رکھتے ہوئے نیاز فتح پوری اور ان کے احباب (یارانِ نجد) نے فروری ۱۹۲۲ء میں بھوپال سے ماہنامہ "نگار" جاری کیا، جو تقریباً ساڑھے پانچ سال تک بھوپال سے جاری رہ کر بعد میں لکھنؤ اور پھر لاہور سے ایک عرصہ دراز تک (تقریباً ۴۵ سال تک) پورے اہتمام معیار اور پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ "نگار" دور اول میں شائع ہونے والا بھوپال کا ایسا ادبی رسالہ تھا جس نے بھوپال کے شعراء و ادبا کی تربیت اور ذوق و شوق کی تعمیر میں نہ صرف اہم رول انجام دیا بلکہ انہیں بیرون بھوپال کے ادبی حلقوں میں بھی متعارف کرایا۔

دور اول کے آخر میں بھوپال سے شائع ہونے والے رسائل میں "محسن الملک"، "آفتاب نسواں" اور "رسالہ الریاض" کے نام شامل ہیں۔

"محسن الملک" ایک معیاری ادبی ماہنامہ تھا، جس کے مدیر مشہور شاعر حامد سعید خاں بھوپالی تھے۔ یہ رسالہ جنرل عبید اللہ خاں نواب محسن الملک بہادر کے انتقال کے بعد، ان کی علمی ادبی سرپرستی و دلچسپی کے اعتراف میں بطور یادگار ستمبر ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا اور بھوپال کے بیشتر اخبارات و رسائل کی طرح کچھ شماروں کی اشاعت کے بعد بند ہو گیا۔

بھوپال کی خواتین کی نمائندگی کی غرض سے ایک ادبی رسالہ "آفتاب نسواں" ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا، جس کی مدیرہ و مالک سرور جہاں اور انور جہاں تھیں۔ اگرچہ یہ بھی ایک معیاری ادبی رسالہ تھا، لیکن حکومت و عوام کی عدم دلچسپی اور عدم تعاون کے باعث چند شماروں کی اشاعت کے بعد ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

مولوی ریاض الدین نے ۱۹۲۴ء میں "رسالہ الریاض" شائع کیا۔ جس میں علمی و ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس رسالہ کے ہر صفحہ پر دو کالم ہوتے تھے۔ ایک کالم عربی کے لیے اور دوسرا کالم اردو کے لیے ہوتا تھا۔ بعض مخصوص حالات کے سبب یہ رسالہ بہت دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔

## دور دوم (۱۹۲۷ء تا ۱۹۴۹ء)

ریاست بھوپال کا یہ دور علمی، ادبی ترقیات کے علاوہ سیاسی، اقتصادی اور صنعتی اعتبار سے بھی اہم تصور کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس کا آغاز نواب حمید اللہ خاں کے دور حکومت سے ہوتا ہے۔ علی گڑھ کے گریجویٹ ہونے کے باعث ان کی ادب نوازی اور سرپرستی سے ریاست میں دیگر امور کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کو خاصا فروغ ملا۔

چنانچہ ان حالات کو عوام تک پہنچانے، ان میں جذبہ بیداری اور جوش و خروش پیدا کرنے میں یہاں کی علمی، ادبی و سیاسی تحریکات، انجمنوں اور اداروں کے علاوہ مقامی اخبارات نے بھی نہایت اہم و نمایاں خدمات انجام دیں۔ بھوپال ادیبوں، صحافیوں اور سیاست دانوں کے لیے مولوی برکت اللہ بھوپالی کی مجاہدانہ اور ولولہ انگیز انقلابی خدمات اور سرگرمیوں کی مثال سامنے تھی اور ان کے انقلابی اخبار "غدر" کا انداز اور لب و لہجہ بھی ان کے پیش نظر تھا، جو ان کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوا۔

یہ دور بھوپال کی اردو صحافتی تاریخ کا "عہد زریں" کہلانے جانے کا مستحق ہے کیونکہ اس عہد میں سیاسی انقلابات کے ساتھ ساتھ آزاد اور بے باک صحافت کا بھی باقاعدہ طور پر آغاز ہوا۔ سیاسی انجمنیں قائم ہوئیں اور انقلابی اخبارات شائع ہوتے۔ ان اخبارات کی آواز کو دبانے کے لیے حکومت

وقت نے طرح طرح کی انتقامی کارروائیاں شروع کر دیں صحافیوں اور اخبارات کے خلاف مقدمات دائر کیے گئے۔ انھیں قید و بند کی صعوبتیں بھی دی گئیں اور جلاوطن بھی کیا گیا۔

ابتدا اس عہد میں جو اخبارات جاری ہوئے حکومت کی سختیوں کے باعث فوری طور پر بند ہونے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن بھوپال کے بلند حوصلہ صحافیوں نے ہمت پست نہیں کی، اور بھوپال کے مطلع سیاست و صحافت پر یہ دھند تا دیر قائم نہ رہ سکی۔ کوششیں بار آور ہوئیں اور ۲۹ - ۱۹۲۸ء میں بھوپال میں "انجمن حقوق تحفظ وطنی" اور "نیشنل اسمبلی" کا قیام عمل میں آیا۔ بھوپالی اور غیر بھوپالی کے خلاف ہنگامے برپا ہوتے لیکن باوجود سخت جد و جہد اور کوشش کے اخبار جاری کرنے میں کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ البتہ اس زمانے میں "وال پیپرس" کا رواج عام تھا، جن کے ذریعے عوام کو مخاطب کر کے ان کے مفاد کی باتیں تحریر کی جاتی تھیں۔

حکومت کی جانب سے عائد کردہ پابندیوں اور سختیوں کے زیر اثر اگرچہ اس دور کی ابتدا میں کوئی اخبار جاری نہ ہو سکا، لیکن ۱۹۳۲ء سے انضمامِ ریاست یعنی ۱۹۴۹ء کے درمیان شائع ہونے والے روزنامہ، سہ روزہ، ہفت روزہ اور پندرہ روزہ اخبارات کا سلسلہ اس قدر دراز ہوا کہ اس اثنا میں یہاں سے شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد سو سے متجاوز ہو گئی۔ اگرچہ اس عہد میں شائع ہونے والے بیشتر اخبارات محض ہنگامی اور وقتی ثابت ہو کر، چند اشاعتوں کے بعد بند ہو گئے۔ لیکن ان میں سے کچھ اخبارات ایسے بھی تھے، جنھوں نے اپنی انفرادیت، بے باکی، اور بلند معیار کی وجہ سے بھوپال کی سیاست و صحافت پر گہرے نقوش ثبت کیے اور علمی و ادبی، سیاسی و تہذیبی زندگی کی ترجمانی کر کے نئی نسل کی ذہنی و صحافتی تربیت میں اہم رول ادا کیے۔

ان اخبارات میں ہفت روزہ "آواز"، "صبح وطن"، "کارواں"، "رہنما"، "نوروز"، "ندیم" (مصور)، "صبح وطن ثانی"، "اصلاح"، "کائنات"، "احتجاج"، "وکیل"، "ترجمان"، "شاہکار"، "نیا بھوپال"، "الحمرا" (خلیل بدر)، "کارزار"، "کردار"، "پرچم"، "نوجوان"، "مزدور" اور "نئی راہ" ــ روزنامہ اخبارات میں "رہبر وطن"، "ندیم" (محمود الحسن صدیقی)، "ندیم" (حکیم سید قمر الحسن)، "پرچم نو" اور سہ روزہ "بھوپال ٹائمز" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ بالا اخبارات سے جو لوگ وابستہ تھے، ان میں سے بیشتر محض صحافی ہی نہ تھے، بلکہ باصلاحیت و باشعور ادیب اور سیاست داں بھی تھے۔ جن کے پیش نظر ایک واضح نصب العین تھا۔ اس عہد کی اردو صحافت کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو صحافت رائے عامہ کے اظہار کا ایک موثر ذریعہ بن گئی تھی، جس کے تحت اس دور کے اخبارات محض ذریعۂ خبر رسانی کی حد تک ہی محدود نہیں تھے، بلکہ نہایت بے باکی کے ساتھ اپنے عہد کی بدلتی ہوئی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور عمرانی آراء و اقدار نیز ان کے تقاضوں کو پیش کرنے اور آزادیٔ رائے کو فروغ دینے میں پیش پیش تھے۔

دورِ دوم کا پہلا ہفت روزہ اخبار "آواز" ہے، جو ۱۹۳۲ء میں سید اللہ خاں رزمی اور قدوس صہبائی کی زیر سرپرستی، عبدالکریم قریشی، محمد شریف عزمی، اور وکیل واسی کی زیر ادارت جاری ہوا۔ یہ اخبار "انجمن رعایائے بھوپال" کا ترجمان تھا، جو بھوپال میں سیاسی جد و جہد اور انقلابی صحافت کے باقاعدہ طور پر آغاز کا سبب بنا۔

دورِ دوم کا دوسرا اہم ہفت روزہ اخبار خان شاکر علی خاں کا "صبح وطن" تھا، جو "انجمن خدام وطن" کا ترجمان تھا۔ سرزمین بھوپال سے جاری ہونے والا یہ وہ پہلا اخبار تھا، جس نے غیر بھوپالیوں کے بڑھتے ہوئے عمل دخل اور اثر و رسوخ کے خلاف اور بھوپالیوں کے حقوق کی حفاظت و حمایت میں آواز بلند کی۔ "صبح وطن" کا یہ ابتدائی رجحان آگے چل کر عوامی تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ جس کے سبب ایڈیٹر خان شاکر علی خاں اور ان کے معاونین کو گرفتار کر لیا گیا، نیز "صبح وطن" کی بڑھتی ہوئی عوامی مقبولیت کو معدوم کرنے کے لیے حکومت وقت کے اشارے پر "رہبر وطن"، "پیام" اور "فدائے وطن" وغیرہ اخبارات جاری ہوئے۔ کارکنان "انجمن خدام وطن" اور ادارہ صبح وطن کے متعلقین پر توہین عدالت کا مقدمہ چلایا گیا اور صبح وطن میں شائع مضامین و کارٹونوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ ۳۵ء میں "صبح وطن" سے ضمانت طلب ہونے کے بعد، اس سے متعلقہ افراد نے "صبح وطن ثانی"، "شیر وطن"، "کارواں"، "دہقان" اور "کائنات" وغیرہ کے نام سے مختلف اخبارات جاری کر کے اپنے مقاصد کے حصول کی کوششوں کو جاری رکھا۔ جس کے سبب حکومتِ وقت نے ان اخبارات کی باغیانہ روش سے تنگ آ کر ریاست میں ایک پریس آرڈیننس نافذ کر دیا۔

"صبح وطن" کے بعد اس عہد کا ایک اور اہم اخبار "رہنما" تھا، جس کے ایڈیٹر ابو سعید بزمی اور عمران انصاری تھے۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی مرحوم نے اس کے سنہ اشاعت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ البتہ ایم عرفان صاحب نے اس کی تاریخ اشاعت ۱۶ دسمبر ۱۹۳۵ء اور شوکت رمزی صاحب نے ۱۹۳۶ء تحریر کی ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ دراصل "رہنما" ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کی تصدیق جناب آفاق حسین کے درج ذیل اقتباس سے بھی ہوتی ہے:

"۱۹۳۸ء میں قوم میں بیداری پیدا کرنے، سامراج طاقتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے اور اس کے حق کو حاصل کرنے کے لیے جو برطانوی حکومت کے رحم و کرم پر منحصر ہو گیا تھا، انھوں نے اخبار "رہنما" جاری کیا۔ حکومت

غصہ سے کانپ اٹھی. نتیجۃً کار اس آواز کو دبا دیا گیا
اخبار کی اشاعت پر پابندی عائد کردی گئی۔"۲۲

۱۹۳۸ء بھوپال کی تاریخ اردو صحافت کے لیے اس لیے اہم ہے کہ اس سال یہاں سے پہلا روزنامہ "رہبر وطن" جاری ہوا حکیم سید قمرالحسن مرحوم اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ: "مدھیہ پردیش کا پہلا روزنامہ "رہبر وطن" ۱۴ اگست ۱۹۳۸ء میں محمود الحسن صدیقی کی ادارت میں شائع ہوا"۲۳ برخلاف اس کے ایم عرفان صاحب نے اس کی تاریخ اشاعت اپریل ۱۹۳۸ء تحریر کی ہے اور مدیران میں ڈاکٹر دوست محمد خاں اور خلیل احمد کے نام درج کیے ہیں. "رہبر وطن" کی فائل دستیاب نہ ہونے کے سبب یہ بتانا مشکل ہے کہ متذکرہ بالا دونوں حضرات میں سے کس کی رائے درست ہے۔ اگست ۱۹۳۸ء میں ایک اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ ہفت روزہ "ندیم" (مدیر محمود الحسن صدیقی) جو کہ غیر سرکاری اخبار تھا، نیم سرکاری اخبار کی حیثیت سے روزنامہ کی صورت میں شائع ہونے لگا۔

حکومت وقت کی سخت گیری سے بچنے کے لیے "عرفان"، "شاہکار" اور "نیا بھوپال" وغیرہ اخبارات نے ایک انوکھا طریقۂ اظہار ایجاد کیا کہ اپنی بات کارٹونوں کے ذریعے عوام تک پہنچائی جانے لگی

۱۹۴۷ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا اہم سنہ شمار کیا جاتا ہے، بلکہ تحریک آزادی اپنے نقطۂ عروج پر تھی اور ہندوستان کے دیگر صحافیوں کی طرح بھوپال کے صحافی بھی اس میں بھرپور دلچسپی لے رہے تھے۔ یہ سال بھوپال کی سیاسی تاریخ کے لیے بھی اس وجہ سے نہایت اہم ہے کہ نواب آف بھوپال نے کانگریس، مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا کے تین ممبران کو بحیثیت وزیر ریاستی کابینہ میں شریک کرکے عوامی وزارت کی بنیاد ڈالی، اس کے بعد پرجا منڈل اور پرجا پریشد کی مخلوط وزارت کی تشکیل عمل میں آئی. ان تبدیل شدہ حالات کی ترجمانی کرنے والے اخبارات میں "پاسبان"، "کارزار"، "شفق"، "منزل"، "مستقبل"، "راہی"، "اُجالا"، "ہمارا بھوپال"، "آندھی"، "مہاجر"، "پکار"، "نیا راج" "پرجا راج" اور "کانگریس" وغیرہ اخبارات نہایت اہم ہیں۔

۱۹۴۸ء میں تحریک انضمام ریاست بھوپال کا آغاز ہوا تو اس کی ترجمانی کی خاطر رتن کمار اور جوہر قریشی نے "نئی راہ" جاری کیا۔

۱۹۴۹ء ریاست بھوپال کے لیے اس وجہ سے اہم ہے کہ یکم جون ۱۹۴۹ء کو ایک معاہدے کے تحت ریاست بھوپال کا "وفاق ہند" میں انضمام ہوجانے کے باعث، مرکز کے زیر اہتمام بھوپال میں چیف کمشنر راج کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے تحت بہت سی سیاسی و سماجی تبدیلیوں کے علاوہ یہاں کی ادبی فضا بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ دفتروں کی زبان اردو کے بجائے ہندی یا انگریزی ہوگئی۔ اخبارات کی آزادی سلب کردی گئی، اور وقتی طور پر بھوپال کے مطلع سیاست و صحافت پر سکوت کے بادل چھاگئے۔ اخبارات کی تعداد خود بخود کم ہونا شروع ہوگئی۔ صرف روزنامہ "ندیم" (حکیم سید قمرالحسن)، "اسمرا" اور "پرچم نو" ایسے اخبارات تھے جو اس حبس زدہ ماحول میں بھی عوامی مسائل کی ترجمانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس ضمن میں "اسمرا" اور "پرچم نو" کی خدمات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں کہ جس کے مدیران جناب خلیل بدر اور محمود الحسینی مرحوم نے قید و بند کی صعوبتوں کی پروا کیے بغیر چیف کمشنر کے مطلق العنان راج کے خلاف آوازِ احتجاج بلند کی. محمود الحسینی مرحوم نے "پرچم نو" کے ذریعے "تخفیف" (جس کے تحت بھوپال کے متعدد افراد بے روزگار کردیے گئے تھے.) کے خلاف منظم طریقہ سے تحریک چلائی. جس کی پاداش میں محمود الحسینی کو گرفتار کرلیا گیا اور اس عہد کا مشہور اخبار "ترجمان" (جوہر قریشی) بھی حکومت کا نشانہ بنے بغیر نہ رہ سکا۔

بھوپال کی اردو صحافتی تاریخ کے اس دور دوم میں شائع ہونے والے ملک گیر شہرت کے حامل معیاری ادبی رسائل میں ماہنامہ "زرنگار"۲۴ (۲۹ء عبدالقادر آزاد)، ماہنامہ "بانو"۲۵ (خاتون ارشد ۱۹۳۳ء) ماہنامہ "امہات" (قمرالنساء ۱۹۳۴ء) ماہنامہ "خدام وطن" (حکیم سید رفیق حسن ۴۴ء) ماہنامہ "بصائر" (شریف فکری ۴۴ء) "اولڈ بوائے" (محمود الحسن صدیقی ۴۵ء) سہ ماہی "گوہر تعلیم" (ابراہیم خلیل، ستمبر ۴۵ء) "گہوارۂ ادب" (ناصر اٹاوی ۴۳ء) ماہنامہ "افکار"۲۶ (اے. آر. رشدی، صہبا لکھنوی ۴۶ء) ماہنامہ "جادہ"۲۷ (جناب کوثر چاندپوری، جون ۴۷ء) کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

## دورِ سوم (۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۵ء)

۱۹۵۲ء میں بھوپال میں عام انتخابات کے بعد ریاستی اسمبلی کی تشکیل اور عوامی وزارت کا قیام عمل میں آیا، لیکن اس عوامی حکومت میں بھی اردو زبان کے ساتھ خاطر خواہ انصاف نہ ہوسکا. لیکن اس دور میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی تعداد قدرے امید افزا رہی۔ تقریباً ۵ روزنامے ۲۷ ہفتہ وار، ۱۲ ماہنامے، ۲ سہ ماہی اور ایک پندرہ روزہ اخبار شائع ہوئے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے؛

**روزنامہ اخبارات:** "افکار" (اے آر رشدی، اشتیاق عارف ۱۹۵۰ء)، "پیام" (محمود الحسینی، شوکت علی ۵۰ء) "حقیقت" (مقصود عرفان، شوکت رموزی ۵۲ء) "نیا بھوپال" (جوہر قریشی ۵۴ء) "خورشید" (سید خورشید عالم، سید حامد حسن ۵۴ء)

**ہفت روزہ اخبارات:** "سوچنا" (صہبا قریشی ۱۹۵۰ء) "ترجمان" (جوہر قریشی، قمر جمالی ۵۰ء) "نیا بھوپال" (جگن مل، محمد صدیقی ۵۰ء) "پرچم" (طالب قریشی ۵۱ء) "ساچار" (سلیمان آرزو ۵۱ء) "ترجمان نو" (مقصود عرفان ۵۱ء) "کاشتکار" (سلیمان آرزو ۵۱ء) "نئی راہ" (جگن مل ۵۲ء) "روزگار" (عابد حسین فاروقی، حسن الزماں اختر ۵۲ء) "بے باک" (شرر بھوپالی، محمد صدیقی ۵۲ء)

"نیا دور" (عظمت بھوپالی ۵۳ء) "انتاب" (یوسف قریشی، مقصود عرفان ۵۳ء) "نیا سماج" (گوپی کرشن ۵۴ء) "راہی" (قمر اشفاق، صادق رضا ۵۴ء) "فدائے وطن" (عبدالغفار خاں ۵۴ء) "سپہر سماچار" (شوکت رموزی ۵۴ء) "نیا دور" (شاکر علی خاں ۵۵ء) "نیا سفر" (گوہر جلالی ۵۵ء)

**پندرہ روزہ اخبارات:** ۲۶ جنوری ۵۴ء کو جناب ایم عرفان نے پندرہ روزہ "آرٹ اینڈ کلچر" جاری کیا، جو دیدہ زیب طباعت، معلومات افزا مواد اور کارٹونوں وغیرہ کی وجہ سے اپنے عہد کا مقبول عام اخبار تھا۔

**ماہنامے و سہ ماہی رسائل:** اس دور میں تقریباً ۱۲ ماہنامے اور ۲ سہ ماہی ادبی رسائل شائع ہوئے، جن میں تقریباً نصف رسائل محض چند اشاعتوں کے بعد ہی بند ہو گئے، لیکن بعض رسائل کافی عرصے تک جاری رہے، جو بھوپال اور بیرون بھوپال کے نامور قلم کاروں کی تخلیقات سے مزین ہوتے تھے، اور جن کا ادبی معیار بلند ہونے کے باعث انہیں ملک گیر شہرت حاصل تھی۔ ان رسائل میں:

"معیار ادب" (موسیٰ صدیقی مرحوم ۵۲ء) "نور" (قیصری بیگم ۵۴ء) "کردار" (مفتی جنید صدیقی ۵۴ء) "حمیدیہ کالج میگزین" ۵۴ء اور "شب مالوہ" (ایم عرفان ۵۴ء) وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

## چوتھا دور (۱۹۵۲ء تا ۱۹۸۴ء)

۱۹۵۶ء میں ایک اہم سیاسی تبدیلی یہ ہوئی کہ بھوپال کو صوبہ مدھیہ پردیش کی راجدھانی بنا دیا گیا۔ بھوپال کو راجدھانی کا درجہ دلانے میں دیگر عوامل کے علاوہ اردو پریس نے بھی اہم رول انجام دیا۔ لیکن اس وقت بھی قومی سطح کا کوئی ایسا اردو اخبار یہاں سے جاری نہ ہو سکا، جو جدید وسائل کے ساتھ، اعلیٰ پیمانے پر شائع ہو کر بھوپال کی حدود کو پھلانگ کر مدھیہ پردیش یا ہندوستان کے مختلف شہروں میں پہنچ کر بھوپال کی نمائندگی کر سکتا!

تقریباً ۲۸ برسوں پر محیط اس دور میں اگرچہ وقتاً فوقتاً ۳۰-۴۰ اخبارات و رسائل بھوپال سے شائع ہوئے لیکن ماسوائے چند بیشتر اخبارات و رسائل اپنی کم مائگی اور قارئین کی بے توجہی کے سبب جلد ہی بند ہونے پر مجبور ہو گئے۔

یہاں اس دور میں جاری ہونے والے چند ایسے اخبارات کے نام پیش کیے جاتے ہیں، جنہیں اپنی انفرادیت کے باعث مختصر مدت میں ہی قبول عام کی سند حاصل ہو گئی تھی۔ ان اخبارات میں ہفت روزہ "راجدھانی" (آصف شاہمیری، اصغر کمال ۵۶ء) "بھوپال ٹائمز" (قمر جمالی ۵۶ء) "نوائے بھوپال" (عزیز گوالیاری ۵۹ء) "بھوپال پنچ" (عبدالاحد خاں تخلص بھوپالی ۶۰ء) "رفتار" (محفوظ منظر ۶۰ء) "الجبل" (جوہر قریشی ۶۱ء) "سرمایہ" (نقوی بھوپالی ۶۲ء) "شیشہ و سنگ" اسلام الحق ارمان "ایاز" (عارف بیگ، اشفاق مشہدی ندوی ۶۲ء)

**پندرہ روزہ:** "شعلہ حیات" (ایم عرفان، یکم جولائی ۶۲ء) "جست" (گوہر جلالی ۲۲ مئی ۶۴ء)۔

**روزنامہ اخبارات:** اس عہد میں شائع ہونے والے روزنامہ اخبارات کی تعداد بہت کم ہے۔ جناب محمود الحسینی نے ۱۹۶۸ء میں ایک روزنامہ "الحمرا" جاری کیا تھا۔ صبح کے وقت شائع ہونے والا یہ بھوپال کا ایک مقبول عام اخبار تھا جو ہمیشہ مالی مشکلات کا شکار رہ کر تقریباً دس سال بعد ۱۹۷۸ء میں ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اسی طرح روزنامہ "افکار" (اے آر رشدی، اشتیاق عارف) جو ۵۰ء میں بھوپال سے جاری ہوا تھا، تقریباً ۳۰ برس تک جاری رہا اور ۱۹۷۹ء میں اس کا بھی سلسلۂ اشاعت ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ البتہ روزنامہ "ندیم" (حکیم قمر الحسن قمر اشفاق) ہی ایک ایسا اخبار ہے جو تقریباً ۴۵ سال سے آج تک مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

حکیم سید قمر الحسن، اے آر رشدی، محمد مسلم، محمود الحسینی، اشتیاق عارف، قمر جمالی، قمر اشفاق، مقصود عمرانی، منیر بیدار، عیسیٰ صدیقی، مظفر رئیس، انصار النظر، شوکت رموزی، مقصود اصغر وغیرہ حضرات نے متذکرہ بالا اخبارات سے وابستہ رہ کر اپنی صلاحیتوں اور کوششوں کے ذریعے اگرچہ انہیں سنوارنے اور نکھارنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن کثیر سرمائے اور جدید وسائل کی کمی نیز انتظامی امور کی بدنظمی کے باعث متذکرہ بالا کوئی بھی اخبار بین الصوبائی یا ملک گیر شہرت حاصل نہ کر سکا۔

مدھیہ پردیش میں اردو لکھنے، پڑھنے اور بولنے والوں کی تعداد ہندی کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ چنانچہ وقت کی اس اہم ضرورت کے پیش نظر معاصر ہندی روزنامہ "بھاسکر" کے مالکان سیٹھ دوارکا پرشاد اگروال اور رمیش چندر اگروال نے کثیر سرمائے، جدید وسائل اور اعلیٰ ادارتی عملے کے ساتھ ایک روزنامہ "آفتاب جدید" زیر ادارت جناب اشتیاق عارف ۲ ستمبر ۱۹۷۸ء کو بھوپال سے جاری کیا۔ بھوپال کا یہ پہلا کثیر الاشاعت روزنامہ ہے جو مدھیہ پردیش کے اردو قارئین تک پہنچ رہا ہے اور صوبہ کی نمائندگی کر رہا ہے۔

اجین سے شائع ہونے والے رسائل میں "آفتاب مالوہ" اور "شعلہ و شبنم" ۱۹۵۶ء ہیں۔ "آفتاب مالوہ" تقریباً تین سال تک جاری رہنے کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے سنہ اشاعت کے سلسلے میں اپنے مضامین میں حکیم سید قمر الحسن مرحوم نے ۱۹۴۲ء اور سلطان احمد صدیقی ۱۹۳۰ء لکھا ہے۔ "شعلہ و شبنم" ذکی صاحب نے ۵۶ء میں اجین سے جاری کیا تھا جو تقریباً ۲ سال جاری رہ کر بند ہو گیا۔

گوالیار سے شائع ہونے والا پہلا ادبی رسالہ "تان سین" (ماہنامہ) ہے جو پروفیسر نرائن پرشاد درما مہر جانشین داغ دہلوی کی زیر سرپرستی اور

زیرادارت خلیل ہاشمی فروری ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا تھا۔

اندور سے "سفیر مالوہ" اور ماہنامہ "شاہین" ۱۹۷۱ء شائع ہوئے لیکن جلد ہی بند ہو گئے۔ کھنڈوہ سے شائع ہونے والے رسائل میں ماہنامہ "نئے چراغ"، "بہارستان" اور سہ ماہی "طلسم حرف" ہیں "نئے چراغ" ایک معیاری ادبی جریدہ تھا، جو جنوری ۱۹۵۹ء میں زیرادارت جناب مظفر حنفی کھنڈوہ سے جاری ہوا تھا، جو کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا۔ البتہ یہاں سے صفدر کھنڈوی کی زیرادارت ایک ادبی رسالہ سہ ماہی "طلسم حرف" کا سلسلۂ اشاعت ہنوز جاری ہے۔

۱۹۶۷ء میں برہان پور سے ایک معیاری ادبی رسالہ ماہنامہ "شجر" زیرنگرانی حاجی محمد صلاح الدین قریشی شائع ہوا تھا جس کے چیف ایڈیٹر اندرسین آتر اور معاون مدیر اقبال نصیب تھے۔ نہیں معلوم یہ رسالہ کتنے عرصے تک جاری رہ سکا۔ حاجی باب اللہ خاں کی زیرادارت ۱۹۷۴ء میں شیوپوری سے ایک ادبی ماہنامہ "ادراک" سائیکلو اسٹائل فارم پر جاری ہوا تھا، جو جدید ادب کا ترجمان تھا، اور جس میں ملک کے نامور جدید شعرا و ادبا کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ یہ رسالہ کئی سال تک شائع ہوتا رہا۔

سائیکلو اسٹائل فارم پر شائع ہونے والا ایک اور رسالہ ماہنامہ "گلشن کے پھول" زیرادارت گلشن راہی ۱۹۸۱ء میں مہو سے جاری ہوا تھا۔ اس کے متعلق بھی یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ رسالہ کتنے عرصہ تک جاری رہ سکا۔

علمی ادبی سرگرمیوں کے اعتبار سے سرونج کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ پریس کی آسانی نہ ہونے کے سبب یہاں سے اگرچہ کوئی اخبار تو جاری نہ ہو سکا، البتہ کئی معیاری قلمی رسالے ضرور نکالے گئے۔ ۴۷ء میں اختصار احمد ہاشمی نے، ۵۷ء میں ت۔م جواد اور مجروح عرفانی نے "تعمیر نو" ۶۲ء میں خالد محمود اور مختار شمیم نے "راہی"، ۷۰ء میں شان فخری نے ماہنامہ "حصار" نکالا۔ یہ تمام قلمی رسائل تھے لیکن پریس میں طبع ہو کر شائع ہونے والا رسالہ "انتساب" سیفی سرونجی نے ۸۳ء میں سرونج سے جاری کیا تھا۔

اس عہد میں شائع ہونے والے معیاری رسائل کے نام درج ذیل ہیں۔ سہ ماہی "ناگرک" (باسط بھوپالی ۵۶ء) "کائنات" (فرحت بھوپالی ۶۱ء) ماہنامہ "جگنو" (نعیم کوثر ۶۰ء) ماہنامہ "زنجیر" (وکیل بھوپالی، مقصود عرفان، قاسم نیازی ۶۳ء) "شہپر" (شاہد اختر ۶۳ء) "مجلہ سیفیہ" (پروفیسر عبدالقوی دسنوی ۶۲ء) "نوائے سیفیہ" (پروفیسر عبدالقوی دسنوی اکتوبر ۶۳ء) "آذر" (شفا گوالیاری، افسر صہبائی اکتوبر ۶۵ء) "مزاج" (عیسیٰ صدیقی جنوری ۷۰ء)، "تشکیل" (خان باسط جون ۷۳ء) سہ ماہی "شناخت" (ظفر صہبائی، اقبال مسعود ۱۹۸۰) "ادصاف حمیدہ" (انسر صہبائی جون ۱۹۸۱ء) وغیرہ۔

متذکرہ بالا رسائل میں "ناگرک"، "زنجیر"، "مجلہ سیفیہ"، "نوائے سیفیہ" "مزاج" اور "شناخت" ہر اعتبار سے ایسے بلند معیار اور باوقار ادبی رسالے تھے جن میں ہند و پاک کے نامور فنکاروں کی تخلیقات و مضامین شائع ہوتے تھے اور جن کا حلقۂ اشاعت بھی بہت وسیع تھا۔

ماہنامہ "جگنو" بچوں کا رسالہ تھا جو کئی ماہ تک شائع ہونے کے بعد بند ہو گیا

## حواشی

۱؎ پہلے یہ علاقہ ریاست ٹونک میں شامل تھا۔

۲؎ "صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات" ص ۸۷۔

۳؎ ماہنامہ "آج کل" دہلی اردو نمبر اگست ستمبر ۱۹۷۳ء ص ۲۴۔

۴؎ جناب عتیق صدیقی مرحوم نے اپنی کتاب "ہندوستانی اخبار نویسی" (کمپنی کے عہد میں) کے آخری صفحات پر بطور ضمیمہ اردو اخباروں اور چھاپہ خانوں کی فہرست پیش کی ہے جس میں انہوں نے صفحہ نمبر ۳۵۳ پر ۱۸۴۹ء میں بھوپال سے شائع ہونے والا اخبار "بھوپال اخبار" کا ذکر کیا ہے لیکن اس سے متعلقہ دیگر تفصیلات کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جس کے سبب یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ اخبار ہفتہ وار تھا یا سہ روزہ یا پندرہ روزہ! اگر عتیق صاحب کی اس تحقیق کو صحیح مان لیا جائے تو پھر "بھوپال اخبار" بھوپال کا پہلا اردو اخبار تسلیم کیا جائے گا۔

۵؎ "عمدۃ الاخبار" بھوپال کی جلد اول کے تقریباً ۲۹ شمارے کتب خانہ شعبۂ اردو سیفیہ کالج کے گوشۂ بھوپال میں محفوظ ہیں۔

۶؎ "صحافت پاکستان و ہند میں" از عبدالسلام خورشید۔

۷؎ "حیات سکندری" ص ۴۵۔

۸؎ "بھوپال میں اردو صحافت۔ ایک جائزہ"، ہفت روزہ "ایاز" بھوپال نمبر ص ۸۳۔

۹؎ "اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ" ص ۲۶۰۔

۱۰؎ "بھوپال میں اردو صحافت۔ ایک جائزہ" ہفت روزہ "ایاز" بھوپال نمبر ص ۸۱۔

۱۱؎ "اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ" ص ۲۶۰۔

۱۲؎ "شعلۂ حیات" مدھیہ پردیش، اردو نمبر۔

۱۳؎ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ" ص ۲۶۱ ۱۲؎ "تلاش و تاثر" ص ۱۵۳۔

۱۵؎ افغانستان میں حکومت موقتہ ہند کے پہلے وزیر اعظم۔

۱۶؎ "اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ"۔

۱۷؎ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ" ص ۲۶۱

۱۸؎ شعلۂ حیات" مدھیہ پردیش اردو نمبر۔

۱۹؎ "مدھیہ پردیش میں اردو" ماہنامہ "آج کل" دہلی اردو نمبر۔

۲۰؎ ایم عرفان مرحوم اور حکیم سید قمر الحسن مرحوم نے "اسجاب" کا سنہ اشاعت ۱۹۱۱ء تحریر کیا ہے اور اسے پندرہ روزہ شمار کیا ہے جو غلط ہے۔

۲۱ۀ ماہنامہ "ندیم" کی جلد ۱ شمارہ ۲، اکتوبر ۱۹۲۲ء شعبۂ اردو سیفیہ کالج میں محفوظ ہے۔

۲۲ۀ "جنگ آزادی کا ایک مجاہد ـ ایک صحافی"، ابوسعید بزمی "نوائے سیفیہ" جلد ۲ شمارہ ۱ ص ۱۸

۲۳ۀ "مدھیہ پردیش میں اردو" ماہنامہ "آج کل" دہلی اردو نمبر، اگست، ستمبر ۷۳ء ص ۲۴

۲۴ۀ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اور جناب ایم عرفان نے "زرنگار" کا سنہ اشاعت ۱۹۲۳ء تحریر کیا ہے جو غلط ہے۔ میرے نجی کتب خانہ میں موجود "زرنگار" کی جلد اول شمارہ دوم بابت ماہ فروری ۱۹۲۹ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رسالہ جنوری ۲۹ء میں جاری ہوا تھا۔

۲۵ۀ جناب ایم عرفان اور حکیم سید قمر الحسن صاحب نے "بالو" کو ہفت روزہ شمار کیا ہے جبکہ یہ ایک ماہوار رسالہ تھا۔

۲۶ۀ ایم عرفان صاحب نے "بصائر" کا سنہ اشاعت نومبر ۱۹۳۵ء لکھا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ اس رسالہ کی جلد ۱ کا شمارہ ۱ سے شمارہ ۸ تک کتب خانہ شعبۂ اردو سیفیہ کالج کے گوشۂ بھوپال میں محفوظ ہے جس کی رو سے یہ رسالہ ۴۴ء میں جاری ہوا۔

۲۷ۀ جناب ایم عرفان اور جناب مظفر رئیس نے "افکار" کا سنہ اشاعت ۱۹۴۵ء لکھا ہے اور ڈاکٹر سلیم حامد رضوی صاحب کے مطابق یہ رسالہ ۴۰ء میں جاری ہوا تھا۔ متذکرہ بالا تینوں سنہ درست نہیں ہیں کیونکہ میرے نجی کتب خانہ میں موجود "افکار" کی جلد ۱ شمارہ ۱ سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ رسالہ مارچ ۴۶ء کو بھوپال سے جاری ہوا تھا۔

۲۸ۀ ایم عرفان صاحب، حکیم سید قمر الحسن صاحب اور شوکت رمزی صاحب نے اپنے مضامین میں "جادہ" کا سنہ اجرا ۱۹۵۰ء تحریر کیا ہے جبکہ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اور جناب مظفر رئیس نے "جادہ" کا سنہ اشاعت ۱۹۴۶ء لکھا ہے لیکن راقم الحروف کے نجی کتب خانہ میں محفوظ "جادہ" کی جلد ۱ شمارہ ۲ اور شمارہ ۳ بابت جولائی ۴۷ء و اگست ۴۷ء سے ثابت ہوجاتا کہ یہ رسالہ جون ۱۹۴۷ء کو بھوپال سے جاری ہوا تھا۔

۲۹ۀ "شعلۂ حیات" بھوپال مدھیہ پردیش اردو نمبر ص ۱۱

۳۰ۀ "تان سین" کی جلد ۱ شمارہ ۱ کتب خانہ شعبۂ اردو سیفیہ کالج میں محفوظ ہے۔

۳۱ۀ "نئے چراغ" کی جلد ۱ شمارہ ۱ و ۲ کتب خانہ شعبۂ اردو سیفیہ کالج کے گوشۂ بھوپال میں موجود ہے۔

۳۲ۀ یہ رسالہ میونسپل کونسل بھوپال کی جانب سے شائع ہوتا تھا۔ درمیان میں اس کا سلسلۂ طباعت بند رہا، ۸۳ء میں میونسپل کارپوریشن بھوپال کے نئے انتخابات کے بعد اس کی اشاعت دوبارہ شروع ہوئی ہے۔ لیکن نہ تو پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور نہ ہی اس کا معیار اتنا بلند ہے جو پرانے "مرک" (۵۶ء) کا تھا۔

۳۳ۀ ماہنامہ "مزاج" اگرچہ جنوری ۶۷ء میں جاری ہوا لیکن حکیم سید قمر الحسن صاحب نے اپنے مضمون میں ۶۸ء تحریر کیا ہے جو غلط ہے!

## بقیہ : بہار میں اردو صحافت

ایڈیٹر کارگزار نہیں ہیں۔ چند نوجوان صحافی ہیں جو ان کا کام چلاتے ہیں۔ عبدالرافع، امریز فاطمی، افضل عظیم آبادی، معز انصاری، شمیم پھلواروی، ثمر ٹالوی، شبیر احمد، اسرائیل رضا، محمد عذیر نعمانی، سید آفتاب حیدر، قاضی عبدالوارث، ریحان غنی، حامد چھپروی، سکندر بن محسن، خورشید عالم تاباں معین الدین احمد حافظ عبدالوکیل (مراتب کا خیال نہیں) اور دوسرے ایسے صحافی حضرات کا نام اخبار میں شائع نہیں ہوتا، مگر یہ اردو صحافت کو معیاری بنانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کے بعد سے ایک نئی تصنا تیار ہوئی ہے۔ گزشتہ سال ایک سروے ہوا تھا، جس کے مطابق ہندوستان میں سب سے زیادہ اخبارات و رسائل بہار میں فروخت ہوتے ہیں۔ بہار کے اردو عوام اچھے اور معیاری اخباروں کو پسند کرتے ہیں، لیکن ابھی تک بہار سے اردو کا ایک بھی روزنامہ آفسیٹ پر شائع نہیں ہو سکا ہے۔ اس صورتِ حال کا مختصراً اظہار یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ بہار سے مضبوط کاروباری بنیادوں پر کوئی روزنامہ جاری کرنے کی مربوط کوشش بروئے کار نہیں آئی۔ تاہم یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ریاست بہار کل بھی اردو کا سب سے بڑا مرکز تھی، آج بھی ہے۔ ایسے میں مستقبل سے خوش آئند توقعات وابستہ کرنا کچھ بے جا معلوم نہیں ہوتا۔ ●●

## بقیہ : فیض احمد فیض

۲۰ نومبر کو لاہور میں حرکتِ قلب بند ہوجانے کے باعث انتقال ہوگیا۔ وہ ۷۳ برس کے تھے۔ انیس ۱۹ نومبر کی شب میں انہیں دمہ کا شدید دورہ پڑا اور انہیں فی الفور لاہور ہسپتال میں داخل کرادیا گیا۔ دمہ کی تکلیف انہیں گزشتہ کئی برسوں سے تھی۔ ان کے پسماندگان میں ان کی شریکِ حیات اور دو بیٹیاں ہیں۔

جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کے بعد اردو شاعری کی سب سے اہم آواز فیض احمد فیض کی تھی۔ وہ عہد آفریں شاعر تھے۔ ان کی موت کے ساتھ ہماری شاعری کا ایک دور ختم ہوا۔ وہ اپنی انقلابی اور حب الوطنی کی نظموں کے لیے مشہور تھے۔ ان کا تعلق ترقی پسند مصنفین کے ہراول دستے سے تھا۔ انہوں نے ایک نیا طرزِ سخن اختیار کیا جس کی بنیاد سماجی نظریات پر تھی۔ ان کے مقلدین بے شمار تھے لیکن ان جیسا کوئی بھی نہ تھا۔

فضل المتین

# راجستھان میں اردو صحافت: ایک مختصر جائزہ

۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے بعد اخبارات کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ ۱۸۶۱ء میں خیرخواہ خلق نام کا ایک ہفت روزہ اخبار اجمیر سے نکلنا شروع ہوا۔ خیرخواہ خلق سے قبل راجستھان کے دیگر شہروں سے شمس الہدایت اور مظہر السرور نام کے اخبارات نکل چکے تھے، مگر ان کی طباعت اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ہوتی تھی۔ "خیرخواہ خلق" پہلا اردو اخبار تھا جو مکمل طور پر اردو زبان میں طبع ہوا۔ اس لیے یہی راجستھان کا پہلا اردو اخبار ہے۔

قدیم اخبارات اور صحافت پر گفتگو کے لیے ہمارے پاس مآخذ کی بہت کمی ہے۔ پریس اور صحافت پر "اختر شاہنشاہی" جون ۱۸۸۸ء کے بعد ایک کتاب مولوی محبوب عالم، ایڈیٹر پیسہ اخبار نے شائع کی تھی اور پھر ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۲ء میں منشی محمد دین فوق نے چند صحافیوں کا ایک مختصر سا تذکرہ شائع کیا تھا۔ یہ تینوں کتابیں اب کمیاب ہیں۔ سوائے اختر شاہنشاہی دوسری دو کتابوں کا ذکر بھی کم کم ملتا ہے۔

راجستھان میں اردو زبان، ادب اور صحافت کے خاص مراکز اجمیر، جے پور، اور ٹونک رہے ہیں۔ دیگر مقامات پر بھی وقتی طور پر زبان، ادب اور صحافت کے لیے فضا سازگار ہوتی رہی ہے۔

**اجمیر** — یہ شہر راجستھان کا ایک اہم، قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ ایک زمانہ تک ذرائع طباعت اور رسائل اور اخبارات کی اشاعت کا خاص مرکز رہا ہے۔ یہاں ضرورت کے لحاظ سے مطابع کا قیام اور اخبارات و رسائل کا اجرا ہوتا رہا ہے اور بہ یک وقت کئی کئی اخبارات اور رسائل یہاں سے شائع ہوتے رہے ہیں۔

اواخر ستمبر ۱۹۵۸ میں اجمیر سے پہلا اردو اخبار "خیرخواہ خلق" جاری ہوا۔ اس کے بعد جو اخبارات اور رسائل یہاں سے جاری ہوئے، ان میں قابل ذکر یہ ہیں:

راجپوتانہ گزٹ، آستانہ، مناد، کیف، انقلاب، تہذیب، راجستھان مسلم راجستھان، اتفاق، تعمیر، راجپوتانہ، المعین، امت، رہبر، مجاہد، عزیز، پنچ، صلح کل، ظریف، معین، عادل، بلاغ (البلاغ)، انصاف، رہنما، ہادی، کلیم، بارگاہ، سلطان الہند، رسالت اور گورنمنٹ کالج اجمیر اور ٹیچرز ٹریننگ کالج اجمیر۔ کبھی مستقل علیحدہ اور کبھی کبھی چند صفحات اپنے یہاں سے شائع ہونے والے میگزین میں اردو کے رکھتے رہے ہیں۔

اجمیر میرواڑہ، چونکہ براہ راست انگریزی سرکار کی عملداری میں تھا اور یہاں کمشنری تھی اس لیے راجستھان کے ان علاقوں کی بہ نسبت جہاں دیسی ریاستیں تھیں، یہاں تعلیم کا معیار اعلیٰ اور سیاسی شعور و بصیرت زیادہ تھی۔ یہاں سے شائع ہونے والے اخبارات صاف صاف اور کھلے عام عوامی مسائل سے بحث کرتے تھے، اور ریاستوں کے امور پر بھی اظہار رائے کرتے تھے۔ ان پر ریاستی حکام کی گرفت ممکن نہ تھی۔ یہاں سے شائع ہونے والے اخبارات ملک کی دو اہم حریف جماعتوں۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی پالیسیوں کی ہم نوائی اور ترجمانی بھی کرتے تھے۔ بلکہ بعض اخبارات کھلی کھلی جانب داری سے کام لیتے تھے۔

اجمیر سے شائع ہونے والے اخبارات میں "راجپوتانہ گزٹ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ راجپوتانہ گزٹ کی مجموعی اعتبار سے اہم خوبی یہی نہیں تھی کہ اس کی اشاعت باضابطہ ہوتی تھی؛ اس کی کتابت و طباعت اور ترتیب بھی مناسب اور موزوں ہوا کرتی تھی۔ اس میں قریب قریب وہ تمام صحافتی خوبیاں موجود تھیں جن کی توقع کسی بھی اچھے ہفت روزہ اخبار سے کی جا سکتی ہے۔ اس میں اجمیر اور راجستھان کے مختلف علاقوں۔ مثلاً جودھ پور، اودے پور، بیکانیر، جھالاواڑ، کوٹہ وغیرہ نیز ہندوستان کے دیگر شہروں کے حالات پر مفصل صحافتی نوٹس، سیر حاصل مضامین اور دیگر اہم خبریں شائع ہوتی تھیں۔ یہ بلاشبہ ایک مکمل اور کامیاب اخبار تھا۔ اس میں بیرون ہند کی اہم خبریں بھی شائع ہوتی

تھیں۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اس شان کا کوئی اردو اخبار موجودہ راجستھان کے کسی شہر سے اس سے پہلے کبھی نہیں نکلا۔

اجمیر کے ادبی رسائل میں کیف نے ملک گیر شہرت حاصل کرلی تھی۔ اس کا انداز اور معیار پنجاب سے شائع ہونے والے ادبی رسائل جیسا تھا۔ اسے اردو کے اہم اور معروف ادیبوں کا قلمی تعاون حاصل تھا۔ اختر شیرانی کا اس سے خصوصی تعلق تھا اور اسے رفیعی اجمیری نے جاری کیا تھا، جو بحیثیت شاعر، افسانہ نگار اور مضمون نگار اپنا ایک مقام بنا چکے تھے۔ وہ نہ صرف اردو میں بلکہ انگریزی میں بھی برابر لکھتے رہتے تھے۔ کیف کی طباعت اور اشاعت کے ذمہ دار علی نیازی تھے۔

مذہبی رسائل اور اخبارات میں ہفت روزہ "آستانہ" کا، جو بعد میں ماہنامہ ہوگیا تھا، اپنا ایک انفرادی مزاج اور مذاق تھا۔ حسنِ طباعت، مضامین کی ترتیب اور مشہور و ممتاز اہلِ قلم کے تعاون کے باعث اس نے اپنا ایک مقام پیدا کرلیا تھا۔ اس کے اجرا اور ترتیب میں خواجہ معنی اجمیری کا ذہن اور قلم کارفرما تھا۔

یہاں سے شائع ہونے والا ہفت روزہ طوفان، صرف ایک ایسا اخبار تھا جو ایک عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔ یہ ہنگامہ خیز اور ہنگامہ پرور اخبار تھا۔ یہ اخبار اپنے ایڈیٹر ظہور محمد خاں کی وفات کے بعد بند ہوگیا۔ اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ اجمیر کے تمام نامور اہلِ قلم ایک نہ ایک وقت کسی نہ کسی حیثیت سے اس اخبار سے وابستہ رہے ہیں۔ ابھی چند سال پہلے تک یہ شائع ہوتا رہا ہے۔ اپنے نشیب و فراز کے دور میں اس اخبار نے اعلیٰ اور ادنیٰ ہر طرح کی صحافت کے نمونے پیش کیے۔ یہ کئی کئی صفحات پر اور بعض اوقات صرف دو ورقی اشتہار کی صورت میں بھی شائع ہوا ہے۔

**جے پور:**۔ اس شہر میں ۱۸۸۶ء میں اردو کا پریس "خادر نور" قائم ہوا اور یہاں سے نیّرِ راجستھان نامی اخبار جاری ہوا۔ یہاں سے شائع ہونے والے رسائل اور اخبارات میں قابلِ ذکر یہ ہیں:

نیّرِ راجستھان، البیان، تفریحِ احباب، المعلومات، قوم، المصباح، الکمال، جوہرِ سخن، شادمان، شیرِ راجستھان، روشنی، جامِ سخن، ذکرِ حبیب، الاخلاق، اقبال، مشرق، نئی روشنی اور بشارت۔

جے پور سے وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے ادبی رسائل میں "قوم" ایسا رسالہ تھا جس پر ملک کے اکثر رسائل اور اخبارات نے عمدہ تبصرے کیے ہیں۔ یہ ریاض خیرآبادی کے پرچے عطرِ فتنہ کے سائز پر نکلتا تھا۔ یہ ماہنامہ اور پھر پندرہ روزہ بھی شائع ہوا ہے۔

یہاں سے شائع ہونے والے رسائل میں "المعلومات" کی یہ خصوصیت تھی کہ اس میں دو مضمون شائع ہوتے تھے۔ ایک انگریزی ناول کا ترجمہ، دوسرا تاریخ گبن کا ترجمہ۔ یہ اپنی نوعیت کا واحد پرچہ تھا۔

ایک اور اہم رسالہ روشنی ہے۔ اس کے بعض شمارے اپنے مشتملات کی وجہ سے تاریخ ادبِ اردو میں ماخذ کا کام دیں گے اور انفرادیت کے سبب تاریخ صحافت راجستھان میں یادگار رہیں گے۔

آزادیٔ وطن کے بعد بھی یہاں سے اخبارات شائع ہوئے، مگر بقا کسی کو نہ ملی۔ کلیم الدین تجلّی کا بشارت ایسا اخبار تھا جس نے قدم جمالیے تھے۔ مگر تجلّی کے ترکِ وطن کے ارادے کے بعد اسے کوئی نہ سنبھال سکا اور یہ پرچہ کلیم الدین تجلّی کے پاکستان منتقل ہونے سے پہلے بند ہوگیا۔

شعراء کے کلام کے سلسلے میں "الکمال" ایسا پرچہ تھا جس میں علمی و ادبی مضامین کے علاوہ طرحی مشاعروں کی غزلیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ شعرائے جے پور کے نمونۂ کلام کے سلسلہ میں اس کی اہمیت ہے۔

راجستھان کی مختلف ریاستوں کے خاتمہ اور انضمام کے بعد اور موجودہ ریاست راجستھان کی تشکیل پر ریاست کا صدر مقام ہونے کی حیثیت سے اب جے پور کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے۔ یہاں راجستھان اردو اکادمی کا دفتر ہے اور راجستھان اردو اکادمی اب ساہتیہ اکادمی راجستھان (اودے پور) کے اردو ترجمان سہ ماہی نخلستان کو اپنے ترجمان کے طور پر شائع کررہی ہے۔ لیکن اس کی حیثیت ہندوستان کی دیگر اکادمیوں سے شائع ہونے والے رسائل جیسی نہیں۔

**ٹونک:**۔ اختر شاہنشاہی میں ٹونک کے مندرجہ ذیل تین اخبارات اور ایک گلدستۂ سخن کا ذکر ملتا ہے۔

۱۔ امین الاخبار ۱۸۸۴ء ۲۔ حدیقۃ الاخبار ۱۸۸۵ء
۳۔ سفیرِ ٹونک ۱۸۸۶ء اور نوبہار ۱۸۸۵ء (گلدستۂ سخن)

گزٹ ریاست ٹونک بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ سرکاری گزٹ تھا۔ ابتدا میں صرف اردو میں اور بعد میں اردو و انگریزی میں شائع ہوا۔

تاریخِ ادبِ راجستھان میں ٹونک کا علمی وقار اور ادبی حیثیت مسلّم ہے۔ مگر یہاں کی صحافت اس معیار پر پوری نہیں اترتی ہے جو یہاں علم و ادب کا رہا ہے۔ اس کی وجہ شاید نواب کی حکمرانی ہوسکتی ہے۔ ایسی حکمرانی جس کے سبب یہاں کے اہلِ قلم افراد کو ترکِ وطن کرنا پڑا اور وہ جلاوطن کیے گئے۔ یہاں سے کوئی بھی ایسا رسالہ شائع نہیں ہوا ہے جو علمی و ادبی معیار کے لحاظ سے قابلِ ذکر ہو۔

مشہور صحافی مولانا سید عبدالقادر خنداں (اجمیر) سے ترکِ وطن کے بعد ٹونک میں مقیم ہیں۔ اجمیر کے کئی اخبارات کے مدیر اور اجمیر کے مشہور غالب پریس کے مالک رہے ہیں۔ صحافت کے نشیب و فراز سے آگاہ ہیں۔ ان کی بحیثیت صحافی ٹونک میں کوئی قدر دانی نہیں ہوئی۔ ان کے اخبارات "مشعل" اور "جھلک" اپنی روشنی

اور جھلک دکھا کر رخصت ہو گئے۔ مشعل اور جھلک کے علاوہ بھی ٹونک سے چند اخبارات آزادیٔ وطن کے بعد شائع ہوتے ہیں۔ مگر کوئی ایسا نہیں ہے جس کا ذکر کیا جائے۔

**الور** — اس ریاست کے شہر تجارہ سے جون ۱۹۳۰ء میں ایک قابلِ ذکر رسالہ "مسیحائے زماں" کا اجرا عمل میں آیا تھا۔

**بھرت پور** — اس شہر کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہاں سے راجستھان کا پہلا اخبار "مظہر السرور" نکلا۔ یہ اخبار ۱۸۵۱ء میں جاری ہوا اور ۱۸۵۴ء یا ۱۸۵۵ء میں بند ہو گیا۔ اس کو اجمیر سے شائع ہونے والے اخبار پر قدامت حاصل ہے۔ یہ اخبار اردو اور ہندی میں شائع ہوتا تھا جبکہ اجمیر سے شائع ہونے والا صرف اردو ہی میں طبع ہوتا تھا۔

مولوی سید عبداللہ رضوی (پروفیسر آگرہ کالج) کی ادارت میں بھی ایک اخبار نکلا تھا۔ اور مرزا غضنفر حسین عروج اور سید موسیٰ رضا شاعر کی ادارت میں ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۵ء تک ایک رسالہ کلام اردو بھی شائع ہوتا رہا۔

**جودھپور** — اس شہر سے مروج گلدستہ ہائے سخن کی طرح "نغمۂ بہار" ۱۸۸۹ء اور "سحاب سخن" ۱۸۹۰ء کا اجرا ہوا۔ صرف چند شمارے شائع ہو سکے۔

**بیکانیر** — اس شہر سے فرق جامیؔ نے ایک رسالہ جاری کیا تھا۔

**کوٹہ** — اس شہر کی اردو صحافت کے سلسلے میں مفتوں کوٹوی کے مستقل عنوان "راجستھان کی ادبی فضاؤں کی سیر" میں کوئی اخبار یا رسالہ ایسا نہیں ہے جو قابلِ ذکر ہو۔ اس مستقل عنوان سے مفتوں کوٹوی کے بہت سے مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔

للتا پرشاد میرٹھی نے اپنا اخبار "دلشاد" کافی دن تک جاری رکھا اور شاد کوٹوی نے ایک ماہنامہ "تراشِ" یہاں سے نکالا۔ لیکن صرف چند شمارے شائع کر سکے اور عدم تعاون کے سبب خاموشی اختیار کر لی۔

**جھالاواڑ** — پاٹن۔ جھالاواڑ سے مشہور رسالہ "آفتاب" جاری ہوا۔ اس کے مدیران میں سید محمد حسین رضوی، پنڈت پرشوتم لال شرما اور آغا شاعر قزلباش جیسے اشخاص شامل تھے۔ اس کا اپنا ادبی مزاج اور معیار تھا۔ اس نے خاصی شہرت پائی۔

آفتاب کے علاوہ یہاں سے ایک سہ ماہی رسالہ "شاعری کی کایا پلٹ" نامی شائع ہوا تھا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں شعرا کا تین ماہ کا کلام طبع ہوتا تھا۔

**بھیل واڑہ** — راجستھان کے اس شہر سے بھی ایک ادبی ماہنامہ "آگ" کا اجرا عمل میں آیا تھا۔ اردو کے مشہور جوانمرگ شاعر قابل اجمیری کی نظم "مردِ مومن سے خطاب" اسی میں شائع ہوتی تھی اور یہ نظم ہی اُن کے ترکِ وطن کا سبب ہوئی۔

"آگ" کی طباعت اور اشاعت اجمیر سے ہوتی تھی۔ ترسیل زر، خطوط اور مضامین کے لیے پتہ بھیل واڑہ کا تھا اور اس کے مدیر حیدر علی شاہین بھیلواڑہ ہی میں مقیم تھے۔ ■■

## بقیہ: جنوبی ہند میں اردو صحافت

شائع نہ ہو جائیں۔ آج صورتِ حال بالکل بدل گئی ہے۔ حیدرآباد کے اردو اخبارات دیگر کئی اخبارات کے مقابلے میں خبریں نہ صرف جلد شائع کرتے ہیں بلکہ بے باکانہ اظہارِ خیال کے لیے بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ حیدرآباد میں اردو صحافت کا معیار نہایت اعلیٰ ہے۔ اس کی ساکھ کسی شبہ سے بالاتر اور خبروں کی صحت ایک مسلمہ حقیقت بن گئی ہے۔ اربابِ اقتدار ان اخبارات کی آرا پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں۔ جنوب میں اردو صحافت کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ ان اخبارات کی اپنی تیز رفتار پرنٹنگ آفسیٹ روٹری مشینیں ہیں، جن کے ذریعہ جاذبِ نظر اور رنگین میگزینوں اور تصاویر کی طباعت ممکن ہے۔

اردو اخبارات کی تعدادِ اشاعت بہ اعتبار عمومی اور بالخصوص حیدرآباد میں کئی گُنا زیادہ ہو گئی ہے۔ اردو اخبارات کے ایڈیٹر اب اس موقف میں ہیں کہ مختلف پیشہ ورانہ تنظیموں کے عہدوں کے لیے منتخب کئے جا سکیں۔ اس سے قبل ان عہدوں پر انتخاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اردو اخبارات کو آج قدر و منزلت کا مقام حاصل ہو گیا ہے۔ اردو صحافت نے حقیقی معنیٰ میں ترقی پذیر اور اپنے آپ کو سربلند رکھا ہے۔ دیگر زبانوں کے کسی بھی اخبار یا اخبارات سے اردو اخبارات کا تقابل کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عمومی طور پر اردو صحافت ترقی کرتی جائے گی اور ملک بھر میں بلند ترین مقام حاصل کرے گی اور حیدرآباد کے اردو اخبارات اس کے لیے مشعلِ راہ ہوں گے۔ ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جنوب کی اردو صحافت نے تمام جغرافیائی حدود کو توڑ دیا ہے۔ حیدرآباد سے شائع ہونے والے اخبارات نہ صرف ملک بھر میں پڑھے جا رہے ہیں بلکہ بذریعہ طیارہ مختلف ممالک کو بہ پابندی بھیجے جا رہے ہیں۔ بالخصوص عرب ممالک میں جہاں ہزاروں ہندوستانی برسرِ خدمت ہیں، ان اخبارات کی خوب مانگ ہے۔ اس لحاظ سے اردو اخبارات ہندوستان اور سعودی عرب و خلیجی ممالک کے مابین ایک اہم رابطہ کا کام دے رہے ہیں۔ ●●

# بہ خطِ شاعر

## غلام ربانی تاباں

غزل

سنگ و خشت کو تاباں بام و در نہیں کہتے
دلبرا مرا نہ ہو جس میں اُس کو گھر نہیں کہتے

دل کو چھین لیں جس سے لذتیں جراحت کی
اُس کو چوب کہتے ہیں نیشتر نہیں کہتے

بلکہ صرف رہزن ہے زندگی کی راہوں میں
ساتھ چلنے والوں کو ہمسفر نہیں کہتے

کوئی کیسے سمجھائے سادہ دل اسیروں کو
بال و پر کا حسرت کو بال و پر نہیں کہتے

نخلِ دل کی شادابی اک سراب کا عالم
دشت کو بہاروں کی رہگزر نہیں کہتے

سب چراغ بستی کے اور ظلمتیں تاباںؔ
وہ کوئی اُجالا ہو رات بھر نہیں کہتے

غلام ربانی تاباں

# غزل اور گیت

(غیر مطبوعہ)

## بانی

کِھلا بسنت کا سماں ... کِھلا بسنت کا سماں
پَون پَون کِرن کِرن — مدھر مدھر جواں جواں
کِھلا بسنت کا سماں ...............

مہک سے کھیلتی ہوئی — سہاگنیں کنواریاں
لٹوں میں کیسری دُھواں — بدن پہ رچے بوندیاں
سنہری آنکھ میں بھنور — اُمنگ رس، ترنگ شعور
اب آنچلوں کی اوٹ کیا — گئے دنوں کی چوٹ کیا
ہنسا جو کامنا کمل — تو پائلیں گئیں مچل

یہ چرن چرن چھنن چھناں .... کِھلا بسنت کا سماں
پون پون کرن کرن — مدھر مدھر جواں جواں
کِھلا بسنت کا سماں ...........

یہ انگ انگ دھڑکنیں — یہ تتلیوں کی ٹولیاں
یہ کھیت کھیت گھومتی — یہ گیت گیت جھومتی
یہ پھول پھول چومتی — لہرتی، مدھو متی
کوئی گتی، کوئی سُدھا — کوئی سمن، کوئی لتا
یہ پیار کا سہاگ ہیں — یہ سب رُتوں کا راگ ہیں

لو بج اُٹھیں وہ چوڑیاں .... کھلا بسنت کا سماں
پون پون کرن کرن — مدھر مدھر جواں جواں
کھلا بسنت کا سماں ...........
ہری بھری یہ سب زمیں — سکھی وشال آسماں
کھلا بسنت کا سماں ...........
کھلا بسنت کا سماں ...........

چمکتی آنکھ میں صحرا دکھائی صاف دیتا ہے
مرے لہجے میں سناٹا سنائی صاف دیتا ہے

میں اک اسرارِ ماتم لاکھ خود میں گم ہوا جاؤں
مگر سینہ کسی شے کی دُہائی صاف دیتا ہے

وہ کیا کیا بات کرتا ہے نہ پل بھر بھی بچھڑنے کی
مگر لہجہ کہ احساسِ جدائی صاف دیتا ہے

صفیں یوں تو مقابل دشمنوں کی ہیں مگر ان میں
عجب اک مہرباں چہرہ دکھائی صاف دیتا ہے

میں آ پہنچا ہوں اے بانی عجب اندھی جگہ، مانا
ہے اب بھی ایک رستہ جو سُجھائی صاف دیتا ہے

محمور سعیدی

# دو غزلیں

بچھڑ جانے

والی بیٹی

سیما کے لیے

کچھ اتنے پاس سے ہو کر گزر گیا اک شخص
کہ مجھ سے جیسے مجھے دور کر گیا اک شخص

جدا ہوا تو کئی لوگ اور یاد آئے
پرانے زخم سبھی تازہ کر گیا اک شخص

خیال و خواب میں اب بھی بسا ہوا ہے مگر
نگاہ ڈھونڈ رہی ہے کدھر گیا اک شخص

گلی گلی وہی چہرہ مجھے دکھائی دے
اجاڑ شہر کو آباد کر گیا اک شخص

خطر بہت تھے مگر خاک و خوں کے دریا سے
ہنسی ہنسی میں یوں ہی پار اتر گیا اک شخص

وہ آدمی نہیں، بس مشتِ خاک ہو جیسے
ہوا چلی تو اچانک بکھر گیا اک شخص

زہے یہ خوئے تغافل! عزیز چارہ گراں!
تمہیں خبر نہ ہوئی اور مر گیا اک شخص

وہ تیز گام تھا آگے نکل گیا مجھ سے
ادھر تو جاؤں گا میں بھی جدھر گیا اک شخص

ہمیں نے اس کے لیے وا رکھے تھے در سارے
ہمیں سے خود کو بچا کر گزر گیا اک شخص

کھڑا ہے سامنے شعلوں کا پیرہن پہنے
بدن پہ آگ سجا کر سنور گیا اک شخص

دلیر تھا، کوئی آسیب اسے ڈرا نہ سکا
مگر خود اپنے ہی سائے سے ڈر گیا اک شخص

جگا سکیں نہ مرے گھر کو آہٹیں اس کی
گلی کے موڑ پہ آ کر ٹھہر گیا اک شخص

طلوعِ صبحِ ازل کا سماں ہے چہرے پر
ابد کی دھند میں چھپ کر نکھر گیا اک شخص

ٹپک پڑا جو مرے شعر سے لہو بن کر
وہ رنگ میرے تخیل میں بھر گیا اک شخص

قیامت اس پہ جو گزری، گزر گئی مخمور
کسی سے کچھ نہ کہا، گھٹ کے مر گیا اک شخص

وہ تیرگی مرے چہرے پہ مل گیا اک شخص
کہ خط و خال ہی میرے بدل گیا اک شخص

ہمیں تو اس کا بچھڑنا تھا کب قبول، مگر
کریں بھی کیا کہ اسی پر مچل گیا اک شخص

خیال اس کے تعاقب میں اب رہے تو رہے
نظر کی حد سے تو آگے نکل گیا اک شخص

میں جا رہا تھا کدھر، جانے اب کدھر جاؤں
کہ میری سمتِ سفر ہی بدل گیا اک شخص

کسی سے اس نے یہ رنگیں ادائیاں سیکھیں
ہمیں تو سادہ دلی ہی سے چھل گیا اک شخص

عذاب اس پہ ہوئیں بے گناہیاں اس کی
گناہگار نگاہوں میں کھل گیا اک شخص

بہت گھنا تھا اندھیرا شکوکِ باطل کا
کسی چراغ کی مانند جل گیا اک شخص

صداقت اس کی خود اس کے لیے ہلاکت تھی
اٹھا وہ شورِ ملامت، دہل گیا اک شخص

اسی کی ہار ہوئی اور اسی کی جیت ہوئی
خود اپنے ساتھ عجب چال چل گیا اک شخص

لبوں پہ موجِ تبسم، لباس شعلوں کا
کس آن بان سے سوئے اجل گیا اک شخص

لپیٹ لوں میں اسے آنسوؤں کی چادر میں
برہنہ شعلوں کے پیکر میں ڈھل گیا اک شخص

اب اس کا گھر سے جنازہ اٹھاؤں تو کیسے
بُرا بھلا مرے آنگن میں پل گیا اک شخص

سیاہ تر ہیں مرے دن سیاہ راتوں سے
رخِ سحر پہ سیاہی وہ مل گیا اک شخص

پڑے رہو اب اندھیروں میں موت کے تنہا
بجھا کے مشعلِ فکر و عمل گیا اک شخص

زباں کو سونپ گیا نوحہ خوانیاں مخمور
لبوں سے چھین کے حرفِ غزل گیا اک شخص

● ۷-۴۳۰، پھاٹک تیلیان، ترکمان گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

## عبید صدیقی

کروں کس طرح میں ثنائے شب
کہ غذا مرا ہے غذائے شب

مرے گوش و لب ہیں بجھے ہوئے
سرِ رہ گزارِ صدائے شب

کوئی رات دن کا ہے ذائقہ
کوئی دن بتا ہے غذائے شب

مجھے راس ایسے کچھ آ گئی
مِرا گھر بنی ہے سرائے شب

نہ سُجھا دیا کوئی یاد سا
بڑی مہرباں تھی ہوائے شب

یہ غزل جو تُو نے ابھی سُنی
مِری جان ہے یہ عطائے شب

---

خواب آنکھوں میں سوالی ہی رہے
کاسۂ تعبیر خالی ہی رہے

خاک ہو جاتے لہو کی آگ میں
جسم کے کوزے سفالی ہی رہے

سبزۂ میداں پہ کب اُتری خزاں
شور اُس کے ڈالی ڈالی ہی رہے

رقص کرتی خواہشوں کے زیرِ پا
دل شکارِ پائمالی ہی رہے

خون کے چھینٹے بہت چھڑکے مگر
رنگ موسم کے ملالی ہی رہے

چاند نکلا تو غضب ڈھا جائے گا
رات بہتر ہے یہ کالی ہی رہے

---

نہ تو خواب ہے نہ خیال شب
مرا ماضی شب مرا حال شب

ہوا قہر اپنا دکھا چکی
مرے برگ و بار سنبھال شب

سرِ طاق دل ہے دھرا ہوا
کسی آرزو کا زوال شب

یہ جو مضمحل سی ہے روشنی
مجھے کر رہی ہے نڈھال شب

جو سُجھا سکے تو سجھا اُسے
میں نہیں کہ دوں گا ملال شب

کوئی گھر نہیں کوئی در نہیں
کہاں جائے پھر تری آل شب

---

• پروگرام ایگزیکیوٹو، ریڈیو کشمیر، سری نگر ۱۹۰۰۰۱

ستیش بترا

# کوپن ہیگن ننھی جل پری کا دیش

اوسلو سے کوپن ہیگن جانے کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ بذریعہ ہوائی جہاز صرف آدھے گھنٹے کا سفر ہے۔ بھلا یہ سفر بھی کیا ہوا؟ آپ مشکل سے اپنی سیٹ ہی سنبھالتے ہیں کہ "ہوائی سندری" آپ کے منزل پر پہنچنے کا اعلان کر دیتی ہے! بذریعہ کار آپ اوسلو سے سویڈن کی سرحد پار کر کے سویڈی ساحل کے ساتھ ساتھ گوٹن برگ ہوتے ہوئے ہل سنگ برگ پورٹ پر پہنچ جائیے۔ وہاں کار سمیت بحری بجرے یا جہاز پر منتقل ہو جائیے اور ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر کوپن ہیگن کی بندرگاہ پر پہنچ جائیے اس سارے سفر میں آپ کو دن بھر لگ سکتا ہے۔ ہاں اس دوران ایک پڑوسی ملک سویڈن پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالنے کا موقعہ ضرور مل جاتا ہے۔ تیسری صورت ایک نہایت ہی آرام دہ ڈی لکس بحری جہاز میں سفر کی ہے۔ عموماً جہاز ساڑھے چار بجے شام کو اوسلو کی بندرگاہ سے روانہ ہوتا ہے اور اگلی صبح ٹھیک نو بجے کوپن ہیگن کے خوشنما شہر میں پہنچا دیتا ہے۔ اس طرح دن بھی ضائع نہیں ہوتا اور شام بھی ایک نئے خوشگوار ماحول میں بسر ہوتی ہے۔

ہوائی جہاز اور موٹر کار سے سفر کرنے کے تو زندگی میں بیسیوں موقعے ملے تھے۔ سوچا اس بار بحری سفر ہی سے کیوں نہ لطف لیا جائے اور وہ بھی ایک نہایت پر تکلف آرام دہ جہاز میں تاکہ یہ بطور سند یہ ایک یادگار سفر ثابت ہو! اس سروس کا بہترین جہاز جدید ترین قسم کا آٹھ نو منزلہ "سکنڈے نیویا" تھا۔ لہٰذا ہم نے اپنی سیٹیں اسی جہاز کے چار نشستی کیبن میں بک کرا لیں۔ یہ جہاز ۱۹۵۲ء میں بنا تھا۔ اس میں سولہ سو مسافروں اور ۵۳۰ کاروں کے لیے جگہ فراہم تھی۔ ۱۶۰ میٹر لمبا، ۸ میٹر چوڑا اور ۲۲ میٹر اونچا جہاز — سچ مچ ایک چلتا پھرتا شہر تھا۔ ۲۶,۸۰۰ ٹن کے اس جہاز کی چھت پر ایک گرم پانی کا سوئمنگ پول تھا۔ ایک کونے میں بار اور چھوٹا سا ریسٹورنٹ تھا۔ تقریباً ہر منزل پر ہی کوئی نہ کوئی نائٹ کلب تفریح گاہ یا کسی ریستوراں کا انتظام تھا۔ ایک منزل پر کفایتی کیفے ٹیریا بھی موجود تھے اور اس کے عین باہر جوا کھیلنے کی مشینیں بھی۔ غالباً اہتمام یہ تھا کہ کیفے ٹیریا سے بچایا گیا پیسہ کسی صورت میں آپ کی جیب تک نہ پہونچ سکے۔ کیبن کی نچلی برتھیں دن کے وقت بطور صوفہ استعمال کی جا سکتی تھیں اور اوپر کی دو برتھیں اپنے ہاں کی ریل کے فرسٹ کلاس ڈبوں کی طرح کھولی اور بند کی جا سکتی تھیں۔ ہر کیبن میں ٹی۔ وی اور ریفریجریٹر موجود تھا تاکہ آپ اپنے ساتھ لایا ہوا خورد و نوش کا سامان رکھ سکیں۔ منسلکہ باتھ روم میں گرم اور ٹھنڈا پانی مہیا تھا۔ باتھ روم میں ادنیٰ سے ادنیٰ تفصیل کا خیال رکھا گیا تھا حتیٰ کہ تہہ کی جانے والی کپڑے سکھانے کی الگنی تک کا انتظام تھا کیبن کی کیبنیٹ میں تولئے صابن اور سوئی دھاگہ تک موجود تھے۔ دبیز قالین کے علاوہ دیواروں پر خوشنما پینٹنگ لگی تھیں لکھنے کی ڈیسک اس سلیقہ سے لگی تھی کہ آپ سمندر کا نظارہ ہر وقت کر سکتے تھے۔ غرضیکہ یہ سفر عامیانہ الفاظ میں سراسر "رئیسی" تھی۔ اکثر عروسی یار رومان کے متلاشی یا کورٹ شپ کے مرحلوں سے گذرتے جوڑے اپنی یادوں کو ذہنوں میں ابدی طور پر بسانے کے لیے اس بحری سفر کو اختیار کرتے ہیں۔

ناروے، سویڈن اور ڈنمارک کو عام طور پر سکنڈے نیوین ممالک کہا جاتا ہے۔ ان ملکوں کا مشترکہ کلچر ہے لیکن تاریخی اعتبار سے ناروے اور ڈنمارک میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ چار سو سال سے زائد عرصے تک یعنی ۱۸۱۴ء تک، ناروے ڈنمارک راج ہی کا حصہ رہا ہے۔ ڈنمارک کی تاریخ تمام یورپ کی تاریخ سے جڑی ہوئی ہے۔ از راہ مذاق ڈنمارک کے شاہ کرسچین نہم کو یورپ کا "سسر" کہا جاتا تھا۔ ان کی ایک لڑکی ملکۂ انگلستان تھی۔ دوسری روس کے زار سے بیاہی تھی اور ان کا اپنا لڑکا شاہ جارج اوّل یونان کا بادشاہ تھا۔

۱۷ مئی ۱۸۱۴ء میں جب ناروے آزاد ہوا، تو اس کے ۱۱۲ نمائندوں نے جب اپنے بادشاہ کا چناؤ کیا تو وہ بھی ڈنمارک کا قائم مقام گورنر فیڈرک تھا۔ اگلے سال ہی پڑوسی ملک سویڈن نے جب ناروے پر حملہ کر کے اسے جیت لیا تو الحاق کے باوجود انہوں نے ڈنمارک کو اپنے دودھان کو عمل میں لانے کی اجازت دی! بالآخر ۱۹۰۵ء میں جب ناروے دوبارہ آزاد ہوا تو لوگوں نے پھر ڈنمارک کے شہزادہ کارل کو اپنا بادشاہ بنایا۔ ظاہر ہے کہ

---

A-۱۶/۲۰، ۵ فریدآباد، (ہریانہ)

ناروے کے ہر شہری کا ڈنمارک سے جذباتی اور ذہنی رشتہ ہے۔

ابتدائی عیسوی صدیوں میں کوپن ہیگن ماہی گیروں کا ایک چھوٹا سا ساحلی قصبہ تھا۔ اسے HAVAN یعنی "بندرگاہ" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ۱۱۶۷ء میں بشپ ایبسلان نے بحری لٹیروں سے بچنے کے لیے گاؤں کے گرد اونچی اونچی فصیلیں تعمیر کروائیں۔ اس سے تجارت کو فروغ ملنے لگا۔ اور کچھ ہی عرصہ میں یہ نام کوپن ہیگن بہ معنی "سوداگروں کی پناہ گاہ" میں تبدیل ہوگیا۔ موجودہ شہر کی تعمیر میں انہی سوداگروں کا بہت ہاتھ رہا ہے۔ یہیں پر کارلزبرگ CARLSBERG اور ٹوبرگ TUBERG نام کی دنیا بھر میں مشہور بیئر فیکٹریاں ہیں۔ خصوصاً کارلزبرگ خاندان کے اس شہر پر بہت احسانات ہیں۔ اس خاندان نے شہر کی تہذیب کو محفوظ رکھنے کے لیے کئی عجائب گھر، آرٹ میوزیم اور دیگر ادارے قائم کئے ہیں۔

یہ بجا ہے کہ کوپن ہیگن کا نام ذہن میں آتے ہی ننھی جل پری کا تصور جاگ اٹھتا ہے۔ یہ عجیب و غریب کردار جو نصف عورت اور نصف جل پری کا ہے، ڈنمارک کے مشہور کہانی کار ہینس کرسچین اینڈرسن HANS CHRISTIAN ANDERSEN کی دین ہے۔ اینڈرسن نے بچوں کے لیے بہت سی خوبصورت کہانیاں لکھی ہیں جو دنیا بھر کے بچوں اور بڑوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ اسی اینڈرسن کی یاد کو زندہ جاوید رکھنے کے لیے کارلزبرگ خاندان کے کارل جیکبسن KARL JACKSON نے مشہور مجسمہ ساز ایڈورڈ ایرکسن EDWARD ERICKSON (۱۸۷۹-۱۹۵۹) سے ننھی جل پری کا مجسمہ بنوا کر ۱۹۱۳ء میں کوپن ہیگن کی بندرگاہ پر نصب کروایا۔ کانسے کا یہ مجسمہ نیویارک کی آزادی کی دیوی STATUE OF LIBERTY کے مجسمہ کی ایک منزل کے برابر بھی نہیں۔ دراصل اس طرح کا تصور ذہن میں رکھنے والوں کو سخت مایوسی ہوتی ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ قد و قامت کے لحاظ سے تو میں بھی بہت مایوس ہوا لیکن ساخت، کاریگری اور فنی اعتبار سے اس مجسمہ کی ایک اپنی شان ہے، وقعت ہے۔ کوپن ہیگن آنے جانے والے جہازی تو اسے بہت ہی نیک شگون مانتے ہیں۔ ان کا وشواس ہے کہ ان کے سفر اسی مجسمہ کی بدولت خیریت سے طے ہوتے ہیں کبھی کبھی بلا کی مقبولیت آپ اپنی دشمن بن جاتی ہے۔ اس صدی کے ساٹھ کے دہے میں جب کسی منچلے آرٹ دشمن نے اس کا سر کاٹ لیا تو نہ صرف ڈنمارک بلکہ تمام یورپ اور امریکہ میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ ایسی ذلیل حرکت کے خلاف ایک جوش و غصہ کی لہر پھیل گئی۔ مجسمہ کا موجودہ سر پھر سے بنوا کر لگا دیا گیا۔ لیکن اس کا کیا کیجئے کہ حال ہی میں پھر کسی آرٹ دشمن نے وسط جولائی ۱۹۸۴ء میں اس کا ایک بازو کاٹ لیا ہے۔ یہ ننھی جل پری اب کی بار اپنے نئے ہاتھ کا انتظار کر رہی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ اس جل پری کے مجسمہ کے تصور میں کتنی جدت ہے۔ چلتے چلتے ذکر کردوں کہ اس سے بہت کچھ ملتا جلتا مجسمہ میں نے لندن کی آرٹ گیلری میں دیکھا ہے۔ اس مجسمہ کی عورت بھی بالکل اسی انداز میں گھٹنوں پہ بیٹھی ہے اگرچہ جل پری کے پنکھوں کے بجائے اس کی ٹانگیں انسانی ساخت کی ہیں۔ یہ مجسمہ ایڈورڈ ہیلی (EDWARD HAILEY) (۱۸۸۰-۱۹۶۲) کا بنایا ہوا ہے اور اس پر فنکار کے دستخط کا سن ۱۹۴۳ء کندہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایرکسن کے بناتے ہوئے مجسمہ سے یہ مجسمہ کہیں پہلے کی تخلیق ہے۔ یہ بعید از امکان نہیں کہ یہی مجسمہ جل پری کے خالق کے لیے تحریک کا سرچشمہ رہا ہو۔

کوپن ہیگن کے سٹی ہال کے پاس ڈنمارک کے دو سپوتوں کے مجسمے نصب ہیں، جنہوں نے ڈنمارک کو لازوال شہرت بخشی ہے۔ ان میں سے ایک ننھی جل پری والے اینڈرسن کا ہے اور دوسرا مشہور سائنسدان نیلز بور (NIELS BOHR) کا ہے، جسے صحیح معنوں میں اٹیمی دور کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔ بور کے اعتقاد کے مطابق ایٹم جسے ابھی تک مادی اکائی تسلیم کیا جاتا رہا تھا، خود الیکٹرون اور نیوٹرون کا مرکب ہے اور اس کی تقسیم ممکن تھی۔ یہ دونوں مجسمے بہت ہی خوبصورت ہیں انہیں شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔

اسی سٹی ہال کے دوسری جانب ایک اور شاہکار ہے، جو کوپن ہیگن کی شہرت سے منسوب ہو چکا ہے یہ ہے مشہور تفریح گاہ TIVOLI GARDENS وسط شہر میں واقع یہ تفریح گاہ ایک جنت نگاہ ہے، جو سیاحوں اور مقامی باشندوں میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ ایک نہایت ہی خوبصورت باغ ہے جس میں ایک لاکھ اقسام کے پھول، قسم قسم کے درختوں سے سجی شاہراہیں، علی بابا نما مینار، چینی مندر اور پگوڈا وغیرہ ایک ناقابل یقین نظارہ پیش کرتے ہیں۔ اس میں ریل کوسٹر اور دیگر تفریحی کھیل تو ہیں ہی، اس کے علاوہ چینی، جاپانی اسٹیج اور کئی بڑے ہال ہیں جن میں اسٹیج ڈرامہ اور موسیقی کے نامور کلاکار اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ٹیوولی کو یورپ میں فنی درجہ حاصل ہے جو امریکہ میں لاس ویگاز کے مشہور ہالوں کو ہے۔ اس میں طرح طرح کے بے شمار ریستوراں ہیں۔ یہ تفریح گاہ کئی ڈھرکتے دلوں کو قریب لانے کے لیے ذمہ دار ہے۔ شام کے وقت اس کی جگمگاتی دلکش روشنیاں، آتش بازی اور موسیقی ایک ملکوتی سحر آفریں نظارہ پیش کرتی ہیں۔ صبح کے وقت مقامی باشندے یہاں سیر کے لیے آتے ہیں۔ قبل از دوپہر آنے والوں کے لیے نہایت معمولی شرح پر ماہانہ پاس مہیا

کیے جاتے ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے، جس نے ٹیوولی نہیں دیکھا اس نے ڈنمارک نہیں دیکھا!

کوپن ہیگن میں خریداری اپنے تئیں ایک انوکھا تجربہ ہے۔ یہاں کے چند بازار صرف پیدل چلنے والوں کے لیے ہیں، ٹریفک سے بالکل آزاد۔ یہ سجے سجائے کشادہ بازار دراصل ۱۰۰۰ میٹر پر مشتمل، پانچ الگ الگ مگر ایک دوسرے سے جڑے بازار ہیں، جنہیں سٹروگٹ ( STROGET ) کہا جاتا ہے۔ یہاں شیشہ، چاندی، فر اور فرنیچر کے وہ تمام نادر نمونے موجود ہیں، جو اپنے امتیازی ڈینش ڈیزائن کی وجہ سے یورپ بھر میں مشہور ہیں۔ مال پہونچانے کے لیے ٹرکوں اور ڈیلوری گاڑیوں کے الگ راستے اس طرح بنے ہوئے ہیں کہ پیدل چلنے والوں کو ان کا احساس تک نہیں ہوتا۔

عین بندرگاہ کے قریب ایک بڑے سے بلاک کے وسط میں ایک شاندار مجسمے کے گرد چار کونوں میں ایک ہی ساخت کے سہ منزلہ شاہی محلات واقع ہیں۔ اس بلاک کے داخلے پر نہ کوئی چار دیواری ہے اور نہ ہی کوئی گارڈ یا سپاہی۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ ٹہلتے ٹہلتے اچانک ایک بڑے سے آنگن میں نکل آئے ہیں۔ ان محلات میں عام آدمی کے لیے ایک عجب اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ہر محل کے سامنے اکے دکے سپاہی کھڑے ہیں، لیکن شاہی محل جس میں ملکہ ڈنمارک رہتی ہیں، اس کے سامنے ایک چھوٹا سا حفاظتی دستہ تعین ہے۔ جب کبھی ملکہ محل میں رہتی ہیں، دن کے ٹھیک بارہ بجے شاہی گارڈ کی ڈیوٹی بدلنے کی رسم ادا ہوتی ہے جو بہت کچھ لندن کے بکنگھم پیلس کے سامنے گارڈ بدلنے والی رسم سے مشابہ ہے۔ اسی طرح چست رنگین وردیوں میں ملبوس چاق وچوبند یہ مشینی مجسمے آنکھ تک جھپکائے بغیر ڈیوٹی بدلنے کے عمل سے گذرتے ہیں۔ لندن ہی کی طرح سیاحوں کی ایک بہت بڑی بھیڑ، گارڈ کے کسی سپاہی کے ساتھ تصویر کھنچوا کر پھولی نہیں سماتی۔ پہلے دو محلوں کے درمیان سے داخل ہونے کا رستہ ہے۔ بلاک سے گذر کر آخری دو محلوں کے بیچ فریم شدہ سینٹ پال کی نوعیت کا آسمانی نیلے رنگ کا ایک نہایت ہی عالیشان شاہی گرجا ہے۔
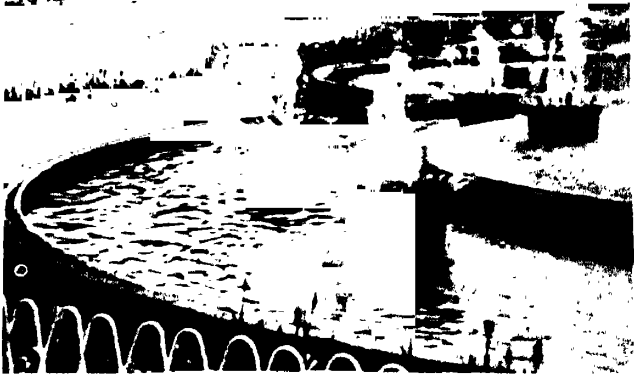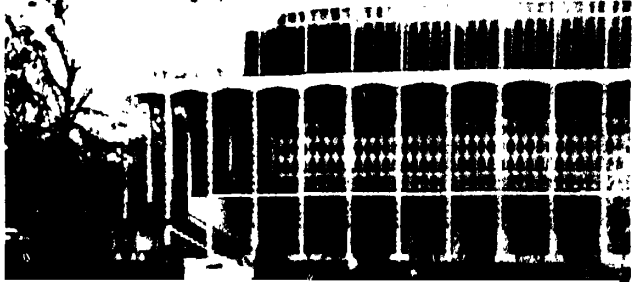
ان چار محلوں میں، ایک میں حکمران وقت رہتا ہے اور دوسرے میں شاہی خاندان کے دیگر افراد۔ حکمران وقت کی موت کے بعد وہ محل جس میں جانشیں رہتا ہے شاہی محل قرار پاتا ہے، اس طرح شاہی محل ہونے کا شرف ہر محل کو کبھی نہ کبھی نصیب ہو جاتا ہے۔

ڈنمارک کے لوگ نہایت ہی خوش مزاج، ملنسار اور من موجی ہیں۔ ان میں باہمی مدد کا جذبہ ایک خصوصی بات ہے۔ یہاں کی سرکار یونیورسٹی تک کی تعلیم، طبی امداد ہر شہری کو مفت مہیا کرتی ہے۔ غریب خاندانوں کو رہائشی کرایوں میں رعایت کی سہولت دیتی ہے۔ ڈنمارک میں ٹیکس میں کافی زیادہ ہیں۔۔ اوسط ٹیکس لگ بھگ پچاس فیصدی ہے۔ عام خریداری پر سیلز ٹیکس کی (حالیہ) شرح ۲۲ فیصدی ہے۔ حال ہی میں ایسا بھی وقت آیا جب کہ لوگوں نے ان ٹیکسوں کے خلاف آواز اٹھائی لیکن جب سوال اس بات کا پیدا ہوا کہ ان ٹیکسوں کو کم کرنے کی صورت میں غریب لوگ بہت سی سہولتوں سے محروم ہو جائینگے تو عوام نے زیادہ ٹیکس دینے کو ترجیح دی ٹیکسوں کی چوری کا رواج بہت کم ہے۔ اور ہر شہری اس بوجھ کو ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے۔ گورنمنٹ بھی ٹیکسوں کی وصولی میں بہت سختی برتتی ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ڈنمارک میں اگر کوئی شخص فٹ پاتھ پر ناشتہ کرنا چاہے یا بیئر کا جگ پکڑے سڑکوں پر بے سرے گانے گانا چاہے یا کوئی جوڑا شادی کئے بنا گھر بسانا چاہے تو گورنمنٹ ان دیکھا کر دیتی ہے لیکن ٹیکس کی چوری کے لیے وہ کسی کو معاف نہیں کرتی۔

کوپن ہیگن کی سیاحت کے بعد ہم ایک بار پھر اوسلو کے واپسی سفر کے لیے اسی بحری جہاز سکنڈے نیویا پر سوار تھے۔ سمندر کی پرسکون لہروں پر جہاز کے انجنوں کی تھرتھراہٹ کسی انسانی دل کی دھڑکن سے مشابہ تھی جہاز کی گول کھڑکیوں میں سے ننھی جل پری اور اس کا دیش آہستہ آہستہ آنکھوں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا۔

شبنم۔ مظفر پوری

# نشی ڈارلنگ

میں یونیورسٹی پروفیسر ہوں۔ میری بیوی نشی ایک کالج میں لیکچرر ہے۔ ہمارا ماجرا بھی عجیب گذرا ہے۔ ماننا پڑتا ہے کہ ایک واقعہ دوسرے واقعہ کو جنم دیتا ہے۔ کبھی کبھی انہونی بھی ہو جاتی ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ انہونی ہی تھی کہ طرح طرح کے فتنوں اور اندیشوں کے ماحول میں وہ میری خلوت کی امین بنی۔

ہوا یوں کہ یونیورسٹی میں ہم دونوں ذرا بے تکلف کلاس فیلو تھے۔ وہ جدید تر کلچر کی امیرزادی ہے۔ میں بھی کچھ ایسا غریب نہ تھا۔ البتہ وہ ذرا زیادہ خوش طبع اور خوش گفتار تھی اور میں ناپ تول کر بولنے والا کم سخن۔ لیکن اپنے تیکھے ریمارکس کے لیے میں مشہور تھا۔ یاروں کو تلملا دیتا تھا۔ نشی اکثر میری زد میں رہتی۔ کبھی کبھی تو میں زبان سے کچھ نہ کہتا اور محض ایک نظر ڈال دیتا تو وہ سمجھ جاتی اور کسمسا جاتی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ایسے دھار دار ریمارکس کرنے والا غیر معمولی ذہین بھی ہوتا ہے۔ شاید یہی باتیں رہی ہوں گی کہ نشی مجھ سے بناتے رکھنے میں عافیت محسوس کرتی ہوگی۔ مگر چونکہ میں ایک دور دراز گاؤں کا رہنے والا تھا، موڈرن کلچر کے رموز و آداب سے ناآشنا تھا۔ اور اپنی جداگانہ تہذیبی شناخت رکھتا تھا۔ اس لیے وہ بیک ورڈ وغیرہ کہہ کر چڑایا کرتی تھی۔ فائنل ایئر میں پہونچ کر محتاط فاصلے کے ساتھ ہمارے درمیان دوستانہ رسم و راہ ہو گئی میں تو تنہا رہتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی اس کے گھر میرا آنا جانا ہونے لگا۔ مگر اس کے گھر کے بہت زیادہ رنگ و روغن والے کلچر اور میک اپ والے آداب سے وحشت سی محسوس ہوا کرتی مجھے صرف نشی اچھی لگتی۔ اس کی ذات ہی میں میری کشش اور دلچسپی تھی۔ وہاں میرے لیے گویا شریف اور وضعدار اجنبیوں کا ماحول ہوتا۔

ایک سال کے میل جول میں ہمارے درمیان کا فاصلہ نہ گھٹا نہ بڑھا۔ ہم دونوں ہی سنجیدہ کردار رکھتے تھے۔ آخری امتحان کے بعد جب ہم کہاں اور تم کہاں کا موقعہ آیا تو اس نے صرف ایک وعدہ لیا۔ اس نے کہا "اپنی شادی میں ہم لوگوں کو ضرور بلانا۔ پرانے مہذب گھرانوں کی شادیاں دیکھنے کا مجھے بہت شوق ہے۔"

"اچھا ہے، وہاں بھی لوگ گھر بیٹھے موڈرن کلچر کا تماشہ دیکھ لیں گے۔"

وہ کچھ سٹ پٹا کر بولی "مگر ایسے شارپ ریمارکس کو اپریشی ایٹ کرنے والی لڑکیاں موڈرن کلچر ہی کے پاس ہیں۔"

اس بات کو میں کاٹ نہ سکا اور ہم دونوں مسکرا کر رہ گئے۔

اور پھر انھیں دنوں ایک شام میری زندگی میں سیاہ انقلاب برپا ہو گیا۔ میں اپنی زخم ہتی کے ساتھ دنیا میں تنہا رہ گیا — میرے وجود کی معنویت گم ہو چکی تھی

صبح مجھے گھر روانہ ہونا تھا۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ میں سامان اور کتابیں وغیرہ درست کر رہا تھا کہ اچانک میرے گاؤں جمن پور کے رمیش چودھری میرے پاس پہنچے۔ ہکا بکا۔ حواس منتشر۔ سکتے کا عالم۔ میرے چہرے پر نظر جماتے پھبھک پھبھک رو پڑے۔ میں گھبرا گیا۔

"کیا بات ہے؟ — کیا بات ہے چاچا؟"

وہ بول نہیں پا رہے تھے۔ آواز حلق میں پھنس پھنس جا رہی تھی۔

"جلدی بتلائیے چاچا۔ کیا ہوا ہے آپ کو؟"

میں بے تابی سے پوچھے جا رہا تھا۔

"غضب ہو گیا بیٹے۔ غضب ہو گیا۔ کس زبان سے کہوں۔"

مجھے ایسا لگا جیسے میں سننے سے پہلے ہی لڑکھڑا کر گر جاؤں گا۔ فوراً بتائیے چاچا۔ میرا سر چکرا رہا ہے؟

"بیٹے سب کے سب مارے گئے۔ کوئی نہیں بچا۔ کچھ بھی نہیں بچا۔ حویلی بھی نہیں۔ راکھشسوں نے — بلوائیوں نے......"

ایک ڈیڑھ منٹ میں رمیش چاچا نے جلدی جلدی سب کچھ بتا دیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ میں بیہوش ہو گیا۔ کہیں سے ایک کالی آندھی اٹھی، میرے گاؤں میں پہونچی اور میری دنیا تاخت و تاراج کر گئی۔ کچھ دوسرے بھی لپیٹ میں آئے۔ لیکن آندھی کا اصل نشانہ میرا ہی آشیانہ تھا۔ ماں، باپ، بھائی، بہن، بھابی، بچے، حویلی — سب کو کالی آندھی ایک ہی جھونکے میں اڑا لے گئی۔

مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کے سوتے خشک پائے۔ رمیش چودھری نے کہا "بیٹے ابھی تم جمن پور مت جانا۔ ذرا شانت ہونے پر میں خود تمھیں بلانے آجاؤں گا۔ امرناتھ جی تو بے چارے باؤلے ہو رہے ہیں۔

● مراد پور — پٹنہ — ۴۰۰۰۰۸

سے درخت نکل آتے ہیں۔ شونا تھ جی کبھی کبھی جھاڑ جھنکار صاف کراتے رہتے ہیں۔ آپ یہاں ہوتے سر تو گاؤں کی عزت بڑھ جاتی۔"

اس نے اور بھی بہت کچھ بتایا۔ میں نے بڑے پیار سے بس اتنا کہا "تم شام کو گھر پر ملو۔"

ابھی رات کے نو بجے میں اپنے بیڈ روم میں بجھا بجھا سا بیٹھا ہوں۔ میری یہ کیفیت اتفاقیہ ہے۔ نشی کی نگاہیں بتا چکی ہیں کہ اس نے میری اس کیفیت کو محسوس کر لیا ہے۔ وہ لڑکا پریم کمار ابھی ذرا دیر پہلے یہاں سے گیا ہے۔ میں جس غیر معمولی التفات اور گرمجوشی سے پیش آیا ہوں اس کو بھی نشی نے یقیناً نوٹ کیا ہے۔ نشی نے خود بھی اس کی بڑی تواضع اور مدارات کی ہے۔ میں نے اس لڑکے کو ایک پیش کش بھی کی ہے "تم یہاں نئے آئے ہو۔ چاہو تو ہمارے مکان میں رہ سکتے ہو۔ ایک کمرہ تمھیں دے دیں گے۔" لڑکے نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا ہے۔

نشی فہم و فراست کی بہت تیز ہے۔ اس کی چھٹی حس نے شاید میرے دل کے چور کو پکڑ لیا ہے۔ شاید وہ اس حقیقت تک پہونچ گئی ہے کہ ماضی اور حال میں گوشت پوست کا رشتہ ہوتا ہے۔ اور شاید وہ یہ بھی تاڑ گئی ہے کہ میرے حال کے کسی نہ کسی گوشے میں تشنگی کا بسیرا ضرور ہے۔

اب آدھی رات جا چکی ہے۔ میں اپنے بستر پہ ایک کتاب سے دل بہلانے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں ستائیس سال پہلے جب رمیش چودھری میرے گھر پر قیامت گذر جانے کی خبر لے کر آئے تو میری آنکھوں میں آنسوؤں کے سوتے خشک ہو گئے تھے۔ مگر آج وہ سوتے ہرے ہوتے محسوس کر رہا ہوں۔ نیند نشی کو بھی نہیں آئی ہے۔ وہ میرے بستر پر آکر بیٹھ گئی ہے۔ وہ مجھ سے کوئی سوال کئے بغیر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی ہے "ایک بار چمن پور جانے کو بہت جی چاہتا ہے۔" میں اس کی اچانک خواہش پر اچانک چونک پڑتا ہوں۔ نہ جانے اس کی خواہش میں کیا کیا پوشیدہ ہے۔ بلا تامل بول پڑتا ہوں "ہاں میری بھی خواہش ہے کہ ایک بار تم میرے پرکھوں کی خاک سے مس ہو جاؤ۔" تب ایک تبسم اس کے لبوں پہ نسیم سحر کی مانند لہرا کر گذر جاتا ہے۔ شاید میرے چہرے پر وہ کوئی تغیر دیکھ پاتی ہے۔ پھر میرے ہاتھ سے کتاب الگ کر کے وہ کہتی ہے "میں سمجھتی تھی تمھیں چمن پور سے نفرت ہو چکی ہوگی ورنہ......" میں بیچ ہی میں بول پڑتا ہوں "مجھے دکسی جگہ سے نفرت ہے نہ کسی آدمی سے۔ قابل نفرت تو وہ شیطانی آندھی تھی۔" مگر میری بات شاید نشی کے دل کو لگی نہیں کیونکہ فلسفوں اور نظریوں پر اسے زیادہ اعتبار نہیں۔ کسی راحت کے احساس سے مجھ پر نیند کا غلبہ ہونے لگا ہے۔

اور آج تیسرے دن ہم دونوں چمن پور کے در و دیوار کے لیے تماشہ بنے ہوتے ہیں۔ ہم اپنے بچوں کو نہیں لاتے ہیں۔ صرف پریم کمار ہمارے ساتھ ہے۔ یہاں تو دنیا بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ نئے چہرے۔ نئے لوگ نئے مکانات۔ گاؤں کا رنگ روپ ہی کچھ اور ہو گیا ہے ہمارے گرد ایک بھیڑ جمع ہو گئی ہے۔ نگاہوں میں ملی جلی حیرت اور اجنبیت ہے۔ دو چار بڑے بوڑھوں کی دھندلائی نظریں مجھے پہچان کر چمک اٹھی ہیں۔ سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ میں شونا تھ ہمارے بارے میں کچھ کچھ بتاتا جا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سارا ماحول ہمیں دل میں سما لینے کو مچل پڑا ہے۔ صرف ایک بوڑھی عورت کی آنکھوں کے کچھ اور ہی تیور ہیں۔ وہ بوڑھی عورت منہ میلا کیے اپنے پہلو میں کھڑی جوان عورت کے کان میں کچھ کہہ رہی ہے۔ اور اس کی انگلی بار بار نشی کی طرف کچھ اس انداز سے اٹھ رہی ہے جیسے ـــــ یہی ہے وہ کلنکنی! مگر نشی کو اس کی کوئی خبر نہیں۔

ایک بوڑھا شخص مجھے بھیڑ سے الگ لے جا کر کہتا ہے "آپ دونوں میرے گھر ٹھہریں گے۔ میرے ساتھ کھائیں گے۔" میرے صاف انکار پر وہ زور دیتا ہے "آپ میرے رشتہ دار ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے؟" اور تب میں ذرا روکھے پن سے اس کو مایوس کر دیتا ہوں "ہرگز نہیں۔ میرا رشتہ دار شونا تھ ہے۔ ہم اسی کے مہمان ہیں۔"

یہ بوڑھا شخص کبھی واقعی میرا رشتے دار تھا۔ میرے کنبے کے معاملات میں اس کا کافی عمل دخل رہتا تھا۔ حویلی کے ایک محفوظ گوشے میں ایک چھوٹی سی زمین دوز خفیہ تجوری تھی۔ آگ اور چوری ڈکیتی کے ڈر سے قیمتی زیورات، چند اشرفیاں، چاندی کے کچھ سکے اور جائداد کی دستاویزات اس میں محفوظ کی ہوئی تھیں گھلنے ملنے ہونے کی وجہ سے اس شخص کو بھی واقفیت تھی۔ ستائیس سال پہلے ایک بار جب امرناتھ چاچا بلا کر چمن پور لائے تو میں نے چپکے چپکے اس دفینے کی تلاش کی۔ لیکن وہ جگہ خالی پڑی تھی۔ دل دھک سے رہ گیا اور میرا دھیان اس شخص کی طرف گیا۔ بڑی کانٹ چھانٹ کے بعد اس نے مجھ پر بس اتنا ترس کھایا کہ جائداد کے کاغذات مجھے دے دیے اور غلط سلط تاویلات پیش کر کے خزانہ ہضم کر گیا۔ وہی ہے یہ میرا نسلی رشتے دار!

چمن پور میں چوبیس گھنٹوں سے زیادہ گذر چکے ہیں۔ خوب آؤ بھگت ہو رہی ہے۔ لوگ ہمیں ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ نشی کے لیے ہر بات نئی اور اجنبی ہے۔ مگر اس دلچسپ اور نئے تجربے پر وہ بہت خوش نظر آ رہی ہے۔ ابھی ابھی اس نے بڑی حیرت سے کہا ہے۔ "اتنا بڑا گاؤں ہے اور سب کے سب تمھارے رشتے دار ہی معلوم ہوتے ہیں۔ شہر میں یہ بات کہاں۔ اگر ہم دلی یا بمبئی گئے ہوتے تو کسی نے نوٹس بھی نہ لیا ہوتا۔ خود اپنے شہر میں پڑوسی تک اجنبی لگتے ہیں۔ نشی کی اس بات سے میرا دل کھل اٹھا ہے۔ گویا میرے اندر کا آدمی اس کے تہ خانے کی راہ پا گیا ہے۔

آج رخصت ہونے سے پہلے میں اپنے ماضی کا مدفن ـــــ حویلی کا کھنڈر دیکھنے آیا ہوں۔ دل قابو میں نہیں ہے۔ صرف نشی میرے ساتھ ہے۔ اس جگہ کے چپے چپے سے حسرت برس رہی ہے۔ دیواریں کہیں پوری کہیں آدھی ڈھ چکی ہیں۔ ادھ جلی اور جھلسی ہوئی شہتیریں اور کڑیاں ملبوں کے اندر سے جھانک رہی ہیں۔ جہاں تہاں شکستہ اور بوسیدہ کواڑوں اور چوکھٹوں کے ٹکڑے دکھائی دے رہے ہیں۔ اینٹیں کچھ بکھری ہوئی اور کچھ ملبوں میں دبی ہوئی۔ ایک ایک گوشے پر نگاہ جا رہی ہے۔ یہاں یہ تھا یہاں وہ تھا۔ اِدھر ایسا تھا اُدھر ویسا تھا۔ میں نشی کو سب کچھ بتا رہا ہوں۔ احساسات کے دباؤ سے میری آواز سوگوار ہو گئی ہے۔ نشی پر کچھ تحیّر اور کچھ رقت کی کیفیت طاری ہے۔ میں پہلی بار اس کو بتا رہا ہوں کہ میری امی ایسی تھیں میرے ابو ایسے تھے۔ میرے بھیا۔ میری بھابی۔ میری نازپروردہ بہن چہچہاتے اور کھلکھلاتے ہوئے بچے، وہ نورانی چہرے والے بوڑھے آبا ـــــ یہ وہ اور بہت کچھ۔ دس

انھوں نے ہی مجھے بھیجا ہے۔"

چودھری نے اور بھی بہت کچھ بتایا ــــ کیا کیا ہوا، کیسے ہوا۔ میں بھو کرسن" ہو گیا۔

مجھ پر جو قیامت گذری تھی اس کی خبر دوسرے دن شام ہوتے ہوتے میرے دوستوں، ساتھیوں اور شناساؤں کو بھی ہو گئی۔ نشی کو بھی۔ اس نے جب ٹریجڈی کی تفصیلات سنیں تو بلبلا کر رو پڑی۔ اس لمحہ میں نے نشی کا جو چہرہ دیکھا وہ آج بھی میری آنکھ کی تپلی میں مقدس نور کی طرح محفوظ ہے۔ اس نور کو کیمرے کی فلم بھی جذب نہیں کر سکتی۔ آج میری دنیا میں اسی نور کا اجالا ہے۔ نشی مجھے اپنے گھر لے گئی۔ کئی دن تک وہ میری مسیحائی کرتی رہی۔ اس کے بھائی وغیرہ تو "چہرہ پڑھ کر رہ گئے مگر اس کے والدین پر میرے المیہ کا گہرا اثر ہوا۔

میرے المیہ نے نشی کے دل میں نہ جانے کس بیساختہ جذبے کو جگایا کہ وہ میری جاں نثار بن گئی۔ اس کی چارہ گری نے نہ صرف میرے زخمی احساسات کو راحت پہونچائی بلکہ احساس بیکسی کو بھی کم کیا۔ میں صرف ایک بار اپنے گاؤں گیا۔ اس کے بعد میرے قدموں نے چمن پور کا رخ کرنے سے انکار کر دیا۔ امرناتھ چاچا اور رمتیش چودھری کبھی کبھی میرے پاس آتے جاتے رہے۔

ایک سال گذرا ــــ دوسرا سال گذرا۔ میں نے دیہات کی ساری جائداد بیچ کر یہاں شہر میں نشی کے والدین کی مدد سے ایک سہ منزلہ مکان خرید لیا۔ گاؤں کی صرف ایک زمین فروخت کرنے سے امرناتھ چاچا نے مجھے روک دیا جس پر میرے پرکھوں کی برباد و شکستہ حویلی کھڑی تھی۔ انھوں نے بڑے کرب سے کہا تھا "بیٹے حویلی نہ رہی مگر نام و نشان تو باقی رہنے دو۔ ایک سمے نے اس کو اجاڑا ہے تو دوسرا سمے اس کو بسا بھی سکتا ہے۔"

اس عرصے میں میرے اور نشی کے جذباتی لگاؤ کے چرچے عام ہو چکے تھے۔ اس کے گھر اور خاندان والوں کو بھی ہمارا رابطہ کچھ کھٹکنے لگا تھا۔ ہمارے رویے سے ظاہر ہو چکا تھا کہ ہم دونوں میں کوئی باہمی مفاہمت پروان چڑھ رہی تھی۔ وہ لوگ روشن خیال اور وسیع المشرب تو تھے مگر طرح طرح کی قباحتوں پر بھی ان کی نظر تھی۔ پھر ایک موقعہ آیا جب گھر میں نشی کی شادی کا سوال اٹھا۔ اور ایک دن بڑے پس و پیش کے بعد نشی نے فیصلہ کن لہجے میں اپنی ممی سے کہہ دیا "انتخاب میں نے کر لیا ہے انتظام آپ لوگ کر دیجئے۔ اگر یہ ہوا تو شادی ورنہ بربادی۔"

نشی کے دل کی بات تو سب پر پہلے ہی روشن تھی اور جب یہ بات اس کی زبان پر بھی آگئی تو گھر کے ماحول پر کئی دن تک سکوت طاری رہا۔ اس ایک بات میں ہی ان لوگوں نے نشی کے جذبے کی شدت اور ارادے کی مضبوطی محسوس کر لی تھی۔ امید و بیم کے اس عرصے میں ایک لمحہ ایسا بھی آیا جب میرے دل سے دعا نکلی کہ اگر یہ عورت میری قسمت میں نہیں تو خدا اسے اٹھالے تاکہ یہ کسی اور کے حصے میں بھی نہ آسکے۔ اس حسن اور محافظ کے بغیر جینا بھی محال ہو جاتا۔

اس کے ڈیڈی نے ایک بار صرف ایک اشارہ اس کو کیا "بیٹی تم میری آنکھ کی روشنی اور کلیجے کی ٹھنڈک ہو۔ تم پر مجھے فخر ہے۔ میں بھی سمجھتا ہوں کہ شادی دراصل وہی ہو سکتی ہے جس کو تمہارا دل قبول کرے۔ مگر تمہاری راہ میں جو راکھشس کھڑا ہے اس کو تم بھی دیکھ رہی ہو نا؟"

"یہ میرے ڈیڈی کے اندر کے فرشتے کی آواز ہے۔ وہ فرشتہ میرے خون میں بھی ہے اور میں راکھشس کی لاش پر سے گذرنے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔ آپ مجھے قسمت کے حوالے کر دیجئے۔"

بات آئیڈیلوجیکل شریفوں کی تھی۔ کچھ اور کہنا سننا باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ان لوگوں نے سر کی جھنڈی دکھا کر کینچلی بدلتی ہوئی تہذیب اور موڈرن کلچر کا کم از کم ایک روشن پہلو میری نظر میں اجاگر کر دیا۔ میرے دل نے محسوس کیا کہ نشی کسی فلسفے، نظریے یا عقیدت کی دین نہیں بلکہ انسانیت کو قدرت کا براہ راست تحفہ ہے۔ سوسائٹی کے بعض حلقوں میں کچھ ردّعمل تو ہوا مگر اس طرح جیسے ہوا کا جھونکا آیا اور گذر گیا۔

ہماری شادی کو پچیس سال گذر چکے ہیں۔ ہم آئیڈیل میاں بیوی اور ہر طرح آسودہ ہیں۔ ہماری صحت اور توانائی بھی ٹھیک چل رہی ہے۔ کوئی ایسی عورت جس کے دامن میں انگارہ پھول بن جاتے دی جینے کا ایسا ماحول بنا سکتی ہے۔ ہماری بیٹی یونیورسٹی اسٹوڈنٹ ہے۔ ایک لڑکا کالج میں اور ایک اسکول میں ہے۔ نشی کے والدین بھی خدا کو پیارے ہو چکے۔ بچے خوبصورت اور ذہین ہیں اور ہم اپنے آپ کو اپنی نسل میں منتقل کرنے کا دل کھلانے والا تجربہ کر رہے ہیں۔

مگر میرے دل میں ایک چور ہے۔

نشی نے مجھے جو کلچر دیا ہے وہ میرے حلق سے نیچے نہیں اتر سکا۔ میں نے اس کلچر کو محض اوڑھ رکھا ہے میں نشی کی زندگی میں صرف اپنی ذات لیکر داخل ہوا تھا مگر اس نے تو اپنے پورے ورثے کے ساتھ میری دنیا بسائی تھی۔ سارے ڈرامے میں فعال کیرکٹر بھی وہی رہی۔ میرے پاس تھا کیا جسے وہ اپناتی۔ لیکن میں کیا کروں کہ میرے اندر کا آدمی آج بھی کیک اور موم بتیوں والے ہیپی برتھ ڈے ٹو یو کلچر سے اجنبیت محسوس کرتا ہے۔ میں اپنے ماضی اور اس کے گہرے نقوش کو اپنی یادداشت سے کھرچ نہیں پایا ہوں۔ یہ کلچر شیر و شکر والا گھریلو ماحول دینے سے قاصر ہے ایسی ساعتیں بھی آتی ہیں جب ایک ہی گھر کے لوگوں میں پڑوسیوں والے میل و ملاپ جیسے مراسم محسوس ہوتے ہیں۔ وہ میری وحشت کے لمحے ہوتے ہیں۔ میرا یہ احساس اتنے دبیز غلاف میں محبوس ہے کہ نشی کو اس کا گمان تک نہیں گذر سکتا۔

زندگی کسی شفاف پہاڑی چشمے کی مانند تھرل تھرل رواں ہے۔ راہ میں کوئی رخنہ نہیں۔ مگر یہ کیا ضرور ہے کہ زندگی کسی تشنگی سے آشنا ہی نہ ہو۔ چاند بہت روشن اور بہت دلکش ہے مگر دھبہ تو اس پر ہے ہی۔ اب اس کا کیا رونا۔ دن ڈھل چکا۔ شام کی نشانیاں نمودار ہو چلی ہیں۔

مگر اتنے برس بیت جانے کے بعد دیوار کے اس پار والے ماضی کی یاد آج ذرا شدت سے آئی ہے۔ آج ہی ایک نوعمر اسٹوڈنٹ پریم کمار مجھ سے یونیورسٹی میں ملا کہنے لگا "سر میں چمن پور کا رہنے والا ہوں۔ میرے دادا رمتیش چودھری آپ کو یاد کیا کرتے تھے۔ آپ تو گاؤں کو بھول گئے مگر گاؤں نے آپ کو نہیں بھلایا ہے۔ آپ کی حویلی کو سورگیہ امرناتھ کے لڑکے شوناتھ نے کانٹے دار تاروں سے گھیر دیا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ حویلی والے کبھی نہ کبھی ضرور واپس آئیں گے۔"

میں صرف مسکراتا رہا۔ وہ کہتا گیا "جھاڑ جھنکاڑ اُگ آئے ہیں۔ امرود، بیر، آم، جامن، ستاڑ، کھجور اور بھی بہت

کھنڈر کے اس وسیع احاطے میں نئے پرانے درختوں کا جھنڈ سا ہو گیا ہے۔ پرانے درخت مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں نشی میرے گم شدہ ماضی کے تصور میں کھو کر رہ گئی ہے۔ میری بھٹکی ہوئی نگاہ ملبے کے اندر سے ذرا ذرا دمکتی ہوئی کوئی شے دیکھ پاتی ہے۔ میں لپک کر اسے کو کریدتا ہوں۔ یہ کانچ کا ایک دانہ ہے۔ میں جلدی سے مسل کر اس کی میل صاف کرتا ہوں۔ مزید کریدنے پر چار پانچ دانے اور نکل آتے ہیں۔ انھیں ہتھیلی پر رکھ کر غور سے دیکھتا ہوں۔ آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپ ٹپ کرنے لگتے ہیں۔ نشی سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں کہتا ہوں "نشی یہ میری امی کی تسبیح کے دانے ہیں۔" نشی کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آتی ہیں۔ اور وہ ان دانوں کو اپنی مٹھی میں سنبھال لیتی ہے۔

اچانک ہی میری نگاہ کچھ دور دھوپ میں مندر کے چمکتے ہوئے کلس پر جا پڑتی ہے "نشی وہ سامنے مندر دیکھ رہی ہو نا؟ یہی وہ مندر ہے جس میں میری بہن نے پناہ لی تھی۔ بلوائیوں کا حملہ ہوا تو صرف میری بہن گھر سے باہر گئی ہوئی تھی۔ کہرام مچا تو وہ بدحواسی میں بھاگتی ہوئی ادھر ہی جا نکلی۔ گھبرائے ہوئے پجاری نے اس کو مندر میں چھپا دیا۔ مگر اس کی بھنک چند بلوائیوں کو مل گئی اور وہ چڑھ دوڑے۔ پجاری نے بہت مزاحمت کی۔ مگر وہ مغلوب ہو گیا۔ اور ایسا زخمی ہوا کہ بعد میں چل بسا۔ نشی تم سن رہی ہو نا۔ بلوائیوں نے میری بہن کو مندر سے باہر گھسیٹ لیا اور —— اور —— نشی میرا حلق سوکھ رہا ہے —— ہاں تو یہی ہے وہ مندر —— پھر ان وحشیوں نے میری بہن کو قتل بھی کر دیا۔ اس کی بے لباس لاش ایک جھاڑی میں پھینک دی۔ اور سنو گی نشی؟ بعد میں ظالموں نے پجاری کے قتل کا ملزم میرے مقتول بھائی کو ٹھہرانے کی اپیل کی اور اپنی بربریت کو اسی کا ردعمل مشہور کیا۔"

نشی پتھر کے مجسمے کی مانند گم صم ہو کر رہ گئی ہے۔

"نشی تم نے کس سیاہ زمانے میں جنم لیا ہے! یہ مذہب کس کتاب میں ہے نشی؟"

نشی زیر لب کہتی ہے "راکھشس کی کوئی کتاب نہیں ہوتی۔"

وہ ذرا لڑکھڑا جاتی ہے اور میں نے اس کو دونوں بازوؤں سے تھام لیا ہے۔ وہ ایک گہری سانس چھوڑتی ہے۔ اور اتنے میں شوناتھ بھی آپہنچا ہے۔ ہمارے افسردہ چہروں پر وہ بار بار نظر ڈالتا ہے۔ نشی کہتی ہے "شوناتھ بھائی جتنی جلد ہو سکے یہ جھاڑ جھنکاڑ۔ یہ ملبہ صاف کرا دیجئے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ ہم یہاں نئی حویلی کھڑی کریں گے۔ بالکل اسی نقشے کی۔"

میں حیرت زدہ سا نشی کی صورت تکے جا رہا ہوں۔

نشی اپنے عزم پر زور دیتی ہے "ہاں" شوناتھ کے چہرے پر خوشی ناچ اٹھی ہے۔

شوناتھ ہمیں کھانے کے لیے بلانے آیا ہے۔ اس کام کی ذمہ داری قبول کر کے وہ کہتا ہے "پتاجی ٹھیک ہی کہا کرتے تھے کہ مٹی کی کشش کبھی نہ کبھی حویلی کے وارث کو کھینچ لائے گی۔"

وہ ہمیں جلدی آنے کو کہہ کر آگے نکل گیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں "نشی یہ یکایک تمھیں کیا سوجھی ہے؟" نشی کہتی ہے —— جیسے اس کے اندر کی گہرائیوں سے آواز آرہی ہو "میرا بائی پھر جنم لے گی۔ مگر جوگن تو پیدا ہوتی ہی رہے گی۔"

اس جذباتی سچ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے میں نشی کو دیکھ دیکھ کر سوچ رہا ہوں کہ ایسے شاہکار کی تخلیق میں قدرت کو کتنی صدیاں بیت جاتی ہوں گی۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ نشی آفتاب ہے۔ میں ایک ذرہ ہوں۔ جوش عقیدت میں اس کے دونوں بازو تھام کر پوچھتا ہوں "نشی ڈارلنگ قیامت سے پہلے تمھیں پھر کب اور کہاں پیدا ہونا ہے؟"

"مگر تم مجھے مرنے دو گے تب نا۔"

وفور رقت سے نشی کے ہونٹ کپکپا اٹھے ہیں۔

## بقیہ : حادثہ

مداوا کون کرے گا؟ ...... میری پیاسی روح ویرانوں میں بھٹک رہی ہے اور میرے جذبات وقت کے بے رحم اور ان دیکھے حادثات کی بھٹی میں تپ رہے ہیں۔ ان کا کوئی علاج سوچو، اچھا خدا حافظ۔"

اور میں نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ اُسے الوداع کہہ دیا۔

تقریباً ایک ہفتہ بعد میں اپنے دفتر میں بیٹھا ڈاک دیکھ رہا تھا کہ مجھے راجیش کی تحریر نظر آئی۔ میں نے بڑی بے تابی اور اشتیاق کے ساتھ لفافہ چاک کیا۔ اس کے اندر اس کا استعفیٰ تھا۔ اور ایک خط جو میرے نام تھا۔

"ڈیئر شرما!

دنیا میں حادثے ہوتے رہتے ہیں اور جہاں تک حادثات کا تعلق ہے میرا خیال ہے ہر شخص انہیں ناپسند کرتا ہے۔ لیکن گزشتہ دنوں میرے ساتھ جو حادثہ پیش آیا وہ ...... Blessing in disguise کی شکل میں تھا اور تم یہ سن کر اچھل پڑو گے کہ جب میں میسور پہنچا تو شیلا چند لمحوں تک مجھے گھورتی رہی۔ پھر "راجیش! تمہیں کیا ہو گیا؟" کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

اب میری زندگی کا خلا پُر ہو چکا ہے —— ہمارے درمیان جو خلیج حائل تھی وہ بھر چکی ہے اور میری زندگی کی کھوئی ہوئی مسرتیں مجھے مل چکی ہیں۔

اب میں پھر اپنی کالج کی ڈیوٹی پر حاضر ہو رہا ہوں۔ تمہیں شاید اس بات کا علم نہ ہو کہ میں یہاں کے انجینیرنگ کالج میں پروفیسر ہوں۔

مجھے تم جیسے دوست سے جدا ہونے کا افسوس تو ضرور ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میری ذمہ داریاں کا ضرور لحاظ کرو گے —— اور مجھے کبھی کبھی یاد کرتے رہا کرو گے۔

تمہارا دوست: راجیش"

خط پڑھنے کے بعد میرے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور میرے ذہن سے وہ بوجھ اتر گیا جو مجھے برابر ملامت کئے جا رہا تھا لیکن میں راجیش کو یہ نہ لکھ سکا کہ یہ حادثہ میں نے ہی ترتیب دیا تھا۔

محمد یعقوب اسلم

# حادثہ

وکا ہماری فیکٹری کا چیف میکینک تھا۔
لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کام کے لیے پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اسے تو کسی یونیورسٹی کا پروفیسر یا شاعر ہونا چاہیے تھا۔ اس کی صلاحیتیں اور مختلف علوم پر اس کی دسترس ناقابلِ انکار تھی۔ وہ بڑا یار باش اور پُر خلوص قسم کا انسان تھا۔ دوستی کرنے اور اُسے نبھانے کے طریقے خوب جانتا تھا، یہی وجہ تھی کہ میں اس فیکٹری کا جنرل منیجر اور اس کا باس ہونے کے باوجود چند ہی دنوں میں اس سے بے حد متاثر ہو گیا تھا۔ اور فرصت کے اوقات کے علاوہ فیکٹری میں بھی اُسے اپنا دوست ہی تصور کرتا تھا۔ اور اس سے محبت اور اپنائیت کا اظہار کرتا تھا۔

چند ہی دنوں پہلے ہماری فیکٹری کے ایک ڈائریکٹر کی سفارش پر اس کا تقرر ہوا تھا۔ وہ نہایت محنتی اور اپنے کام سے خوب واقف میکینک تھا۔ لیکن اس کی ایک عجیب سی عادت تھی۔ کبھی کبھی وہ تنہائی کے عالم میں آسمان کی طرف نظر کر کے بے کراں خلاؤں میں گھورتا رہتا۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کی نظریں اس نیلے آسمان کا سینہ چیر کر رکھ دیں گی۔ شاید اس کے تصورات کی دنیا میں ایک ہلچل سی مچی ہو جس کا حل وہ اس نیلگوں فضا کے بسیط پردوں پر تلاش کر رہا ہو۔

شام کو چھ بجے جب فیکٹری سے چھٹی ہوتی تو ہم دونوں کسی ریستوراں یا کافی ہاؤس میں جا بیٹھتے اور کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے۔ اخلاقیات کی باتیں، مذہب کی باتیں، حکومت اور سیاست کی باتیں، ادب اور شاعری کی باتیں۔ غرض ہر موضوع پر باتیں ہوتیں۔ اور اس طرح ہمیں احساس بھی نہ ہوتا کہ وقت کا کارواں کہاں پہنچ گیا ہے — وقت کا دھارا گویا ایک ہی موڑ پر ٹھہر جاتا اور ہماری گفتگو آگے بڑھتی رہتی۔

ایک دن میں کافی ہاؤس میں اس سے پوچھ بیٹھا — "راجیش تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"
" اس سے کیا فائدہ " اس کا انداز ٹالنے والا تھا۔

"کیوں؟ کیا تم گھر بسانا نہیں چاہتے یا ازدواجی زندگی کی پابندیوں سے گھبراتے ہو — ؟ مجھے دیکھو میری زندگی کتنی پُر سکون ہے۔ چھوٹا سا گھر ہے، بیوی ہے، بچے ہیں۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اب اپنا گھر بسا لو۔"

"لیکن میرا گھر تو بس کر اجڑ بھی چکا ہے میری تمنائیں، میرے خواب سب مٹی کے گھروندوں کی طرح مسمار ہو گئے۔" اس کے جواب میں بڑی تلخی پوشیدہ تھی۔ گویا ایک جہاں کا درد سمٹ آیا ہو ان چند لفظوں میں۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟ تمہاری بیوی مر گئی؟"
"نہیں۔" اس نے نہایت ہی مختصر سا جواب دیا۔

"کیا کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی —" میں نے اس کو کریدنے کی غرض سے ایک تلخ سا سوال کیا۔

" ایسا بھی نہیں ....." اب بھی اس کا جواب مختصر سی تھا۔

" یا تمہیں کوئی اور لڑکی پسند آگئی؟"

"کاش ایسا ہوتا ....." اس کے لہجے میں بڑی حسرت اور مایوسی بھری ہوئی تھی۔

"پھر کیا بات ہے تم اس طرح پہیلیوں کے انداز میں کیوں باتیں کر رہے ہو؟" اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

"شرما!" اس نے نہایت متین انداز میں کہنا شروع کیا۔ "آگ تقریباً بجھ گئی ہے — اب راکھ کریدنے سے کیا حاصل؟" ..... خیر تم سننا ہی چاہتے ہو تو سنو، لیکن تم میری باتوں کا یقین بھی کرو۔ اس پر میں اصرار نہیں کر سکتا۔ آج میں اپنی زندگی کا ایک بھیانک اور دردناک زخم تمہیں دکھلا رہا ہوں۔ ایک عجیب و غریب نفسیاتی اُلجھن اور ایک انوکھا مرض ..... اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر کہنے لگا — "چار سال پہلے شیلا سے میری شادی ہوئی تھی۔"

"محبت کی شادی؟" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا۔

" بالکل نہیں۔ میرے ماں باپ اور رشتہ داروں

● ۹۱ ہاہم ایم۔ بی۔ اسٹریٹ، بڑی پیٹ، ونفباڑی این اے۔ ۶۲۵۰۵۱

کی پسند اور مرضی کے مطابق اور ساتھ ہی میری پسند اور معیار کو بھی اس میں دخل تھا۔ لیکن شیلا مجھ سے دو سال بڑی تھی "۔

"تو شاید تمہارا اس کے ساتھ نباہ نہ ہو سکا ہوگا اور تمہارے مزاجوں میں یکسانیت اور ہم آہنگی نہ رہی ہوگی "۔

لیکن میری بات کا اس نے بالکل بُرا نہ مانا اور اسی سنجیدہ، پُر سکون اور ٹھہرے ہوئے انداز میں کہنے لگا۔

ہمارے مزاجوں میں مکمل ہم آہنگی تھی اور چند ہی دنوں میں ہم ایک دوسرے سے پوری طرح واقف ہو چکے تھے۔ زندگی کی ساری رعنائیاں اور مسرتیں ہمارے دامن میں تھیں اور ہمارے پیار کا بندھن اٹوٹ تھا..... "کچھ لمحوں کے توقف کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا "لیکن شیلا کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا تقریباً میرا ہم عمر اور غیر معمولی طور پر میرا ہم شکل۔ ان کے والدین کے دو ہی بچے تھے۔ شیلا اور راجیو۔ دونوں بھائی بہن میں بڑی محبت تھی۔ ایک قابلِ رشک خلوص تھا۔ پھر ہماری شادی کے دو سال بعد اچانک وقت نے ایک کروٹ بدلی..... " کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس کے لہجے میں بڑی تیزی اور روانی آتی چلی گئی۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا اس وقت وہ ہزاروں کے مجمع سے مخاطب ہے اور ہمارے درمیان اتنی گمبھیرتا پیدا ہو گئی تھی کہ میں پتھر کی مورت بنا خاموشی کے ساتھ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ ماحول پر ایک سوگوار سی اداسی طاری ہو گئی تھی۔ ایک طوفان آیا اور شیلا کا بھائی راجیو ہوائی جہاز کے ایک بھیانک حادثہ میں مارا گیا ــــــ اور یہیں سے شیلا کے اندر وہ نفسیاتی مرض پیدا ہونے لگا جس نے ہمارے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل کر رکھی ہے۔ شیلا کسی صورت اس بات پر رضامند نہیں ہوتی کہ مجھے راجیش کے طور پر اپنے شوہر کی حیثیت سے قبول کرلے

میں نے اس کی دماغی حالت کا معائنہ کرایا۔ اس کی ذہنی حالت بالکل ٹھیک تھی۔ اس کا نفسیاتی علاج کرایا۔ لیکن اس کے باوجود اسے میری صورت سے الرجی رہی۔ میری غیر موجودگی میں وہ لوگوں سے میرے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ اسے میرا پورا احساس رہتا۔ میرے لباس، میرے آرام، میری ضرورتوں کا خیال رہتا۔ اپنی سہیلیوں سے میرے پیار اور میرے خلوص کے تذکرے کرتی، لیکن جب میں اس کے سامنے آتا تو اُسے میری صورت سے وحشت سی ہونے لگتی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں اور وہ پسینے سے شرابور ہو جاتی ــــــ آخر ایک مشہور نفسیاتی معالج نے مشورہ دیا کہ بھائی کی اچانک موت کا صدمہ اس کا نازک ذہن برداشت نہیں کر سکا ہے۔ اس لیے میں سال دو سال کے لیے اس کی زندگی سے کہیں دور چلا جاؤں۔ چنانچہ اس کی بات مان کر میں یہاں چلا آیا۔ اور اس کے بعد ہمیشہ مجھے اس کے خطوط ملتے رہے۔ پیار کی خوشبو سے مہکتے ہوئے خطوط۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ ان خطوں میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ رہی ہو۔ میری جدائی اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو۔ رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس کی ذہنی حالت اعتدال پر آنے لگی ہے۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر کو خط لکھ کر مشورہ طلب کیا اور پھر تین مہینے پہلے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق تقریباً ڈیڑھ سال سے بھی زیادہ عرصے تک اس سے دور رہنے کے بعد میں میسور پہنچا۔ لیکن شرما ـــــ" اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی پھیکی سی مسکراہٹ کے باوجود اس کی روح کا کرب اس کے الفاظ سے چھلک ہی پڑا۔ جیسے ضبط کا بند ٹوٹ چکا ہو ــــ "میری مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہاں جا کر میں نے محسوس کیا کہ اس کا مرض بدستور باقی ہے۔ بلکہ اب کی مرتبہ اس میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ غش کھا کر گر پڑی۔ اس کے جسم پر تشنج کی سی

حالت طاری ہو گئی۔ اور اس کی دونوں آنکھیں کمرے کی چھت پر مرکوز ہو گئیں۔ تقریباً بے جان اور بے نور سی آنکھیں ــــــ مختصر یہ کہ وہ اب بھی اس بات پر آمادہ نہ تھی کہ مجھے اپنا شوہر تسلیم کرے ــــ شرما! تم نے میری داستانِ محبت سُن تو لی۔ شاید تمہیں اس پر یقین کبھی نہ آئے لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے ــ ایک تلخ، دل گداز اور ناقابلِ انکار حقیقت اور میری زندگی کا عجیب و غریب المیہ "۔

اتنا کہہ کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں اب تک کوئی فلم دیکھتا رہا ہوں یا ایک بھیانک خواب ہمارے درمیان میز پر رکھی ہوئی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ لیکن میرے دماغ میں اور میرے جذبات میں ایک حرارت، ایک تپش اور ایک انجانی سی آگ بھڑک اٹھی تھی۔

دوسرے دن میں اپنے دفتر میں بیٹھا چند ضروری کاغذات میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک مجھے اطلاع ملی کہ راجیش ایک حادثہ میں زخمی ہو گیا ہے۔ اس کے چہرے پر ایسڈ گر گیا ہے خبر سنتے ہی میرے جسم سے پسینہ کی دھاریں بہ نکلیں۔ میں نے فوراً ڈاکٹر کو فون کیا اسے فوراً طبی امداد پہنچائی گئی۔ اور وہ ایک ہفتہ تک اسپتال میں رہا۔ لیکن جب وہ باہر نکلا تو اس کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا۔ اس کے بائیں رخسار پر ایک گہرے زخم کا نشان تھا اور دایاں رخسار بھی انتہائی داغ دار ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں بچ گئی تھیں۔ اسپتال سے ڈسچارج ہوتے ہی میں نے اُسے ایک مہینے کی چھٹی دی اور آرام کرنے کے لیے اس کے وطن میسور بھیج دیا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے کہا تھا۔

" شرما! تم میرے چہرے کے ان زخموں کو دیکھ رہے ہو ان کا کیا ہے! یہ ایک دن بھر جائیں گے۔ لیکن میری روح کے زخموں

(آگے صفحہ ۷۲ پر)

# نئی کتابیں

## حالی ، مقدمہ اور ہم

مصنف : وارث علوی

قیمت : ۱۶ روپے

وارث علوی کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ اور کچھ بھی کہہ دینا بہت آسان ـــــ یہاں تک کہ انہیں نقاد کہنا بھی مشکل ہے۔ کیوں کہ ان کی تقریباً تمام تحریریں، تنقید کے اس مانوس و معروف طریق سے مختلف ہیں جس کے ذریعے ادب پاروں کی پہچان اور پرکھ کی سعی کی جاتی ہے۔ وارث علوی کے مضامین اپنے مجموعی تاثر کے ذریعے یہ باور کرلیتے ہیں کہ ہر عمل کے فوری اور ظاہری فوائد کی کشش سے ہمیں مطالعہ برائے تحسین و تنقیص اور مطالعہ برائے امتحانات کا اتنا عادی بنا دیا ہے کہ ہم ادب پارے کے مقصود بالذات لطف و انبساط سے لگ بھگ محروم ہو چلے ہیں۔ وارث علوی کے زیادہ تر مضامین ـــــ اور ایک حد تک زیر نظر کتاب بھی ـــــ اس لطف و انبساط کے لسانی پیکر ہیں جو ایک اچھے قاری کو ادب پارے سے حاصل ہوتا ہے۔ ادب سے اپنی لطف اندوزی کو لفظوں کا پیراہن دیتے وقت وارث علوی کا متنوع مطالعہ اور تاثرات "شعور کی رو" کے انداز میں زیر بحث موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔ شعور کی یہ رو زیادہ تر اتنی بے تکان ہوتی ہے کہ وارث کا اصل موضوع اس سے مشابہ خیالات و حقائق کے طومار میں ایک موہوم نقطہ بن جاتا ہے۔ اس طومار کی اک اپنی لذت ہے۔ بالخصوص جہاں وارث کا اصل سروکار کسی فن پارے کی تفہیم سے ہوتا ہے۔

چار ابواب پر مشتمل وارث علوی کی زیر نظر کتاب ان اعتراضات کی تردید ہے جو کلیم الدین احمد محمد احسن فاروقی، سلیم احمد، وحید قریشی اور شمیم حنفی کی جانب سے الطاف حسین حالی کے "مقدمۂ شعر و شاعری" پر کئے گئے ہیں۔ یہاں بھی وارث علوی نے تقریباً وہی اسلوب اور طریقہ کار اختیار کیا ہے، وہ کسی تخلیقی فن پارے کی تفہیم کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ وارث نے مقدمہ کو از سر نو سمجھا سمجھانا چاہا ہے۔ لیکن تفہیم و تردید کے مشترک عمل میں وہ اپنے تردیدی دلائل کو خاطر خواہ قوت کے ساتھ پیش نہیں کر سکے ـــــ جب کہ مقالے کا اصل اصرار معترضین کی تردید محسوس ہوتا ہے۔

وارث علوی نے حالی کے نظریات اور شخصیت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے جہاں جہاں مقدمے کے متن کا سہارا لیا ہے، وہاں وہاں محسوس ہوتا ہے کہ اگر وارث علوی نے معترضین کی تردید کو اہمیت دینے کے بجائے صرف تفہیم تو پر توجہ کی ہوتی، تو وہ مقدمہ کی مزید صفات کو نمایاں کر سکتے تھے۔ اس معکوس رویّے کے باوجود یہ کتاب حالی اور مقدمۂ شعر و شاعری کی تفہیم نو کے نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتی ہے۔

## اکبر الہ آبادی کی شاعری

مرتب : ساحل احمد ـ قیمت : ۱۵ روپے

اکبر الہ آبادی کی بڑائی صرف اس میں نہیں کہ وہ اردو طنز و مزاح کی تاریخ کا ایک ناگزیر اہم ہیں، بلکہ وہ ایک ایسا سوالیہ نشان بھی ہیں جو "قدیم" اور "جدید" کے مابین انتخاب کے ہر لمحے میں دہک دہک اٹھتا ہے۔

سر سید احمد خاں کے مشن کی آب و تب نمایاں کرنے کی غرض سے اکبر الہ آبادی اور ڈپٹی نذیر احمد کو ایک نیم روشن یا دھندلا نشان ثابت کرنے کا وطیرہ بدستور جاری ہے۔ زیر نظر کتاب میں جو دس مضامین شامل ہیں، وہ اکبر کی شخصیت، ان کی نظم و غزل، ان کے عہد ـــــ اور اقبال و سر سید کے نظریات و افکار سے اکبر کے خیالات و اعتقادات کے موازنے پر مشتمل ہیں۔ ان مضامین کے مصنف : عبدالاحد خاں خلیل، عبدالقادر سروری، آل احمد سرور، وقار عظیم (پروفیسر) مجتبیٰ حسین، عبدالماجد دریا آبادی، سید عبداللہ، ماہر القادری، ملک زادہ طیب انصاری اور محمد ایوب شاہد ہیں۔ کتاب میں شامل زیادہ تر مضامین کو تفہیم اکبر کے باب میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ زیادہ تر مضامین ان حقائق پر اصرار کرتے ہیں کہ ـــــ "مغربی ساحروں نے مشرقی عوام پر جو جادو چلانے کی کوشش کی تھی، اکبر کی ظرافت نے اس کے لیے ردِّ سحر کا کام کیا" (عبدالاحد خاں خلیل) "موجودہ نظام تعلیم ہمیں کس قدر دے سکتا ہے۔ یہ کس قدر ہمارا ہے اور کس قدر ہمارے حاکموں کا۔ انگریزوں سے قربت، انگریزوں کے ساتھ پابندی کے کس حد تک مترادف ہے؛ علی گڑھ مسلمان کتنے پیدا کر رہا ہے اور کلرک کتنے؟ یہ اکبر کی نظر سے پوشیدہ نہ

تھا۔" (آل احمد سرور) "اکبر اور سرسید کے درمیان شخصی طور پر اتنی مغایرت نہ تھی جتنی بعد میں دونوں بزرگوں کے حامیوں نے پیدا کرنے اور دکھانے کی کوشش کی۔" (سید عبداللہ) محمد ایوب شاہد کا خیال ہے کہ اکبر نے وحدت و شہود کی بحثوں سے الگ ہو کر توحید کو اپنی شاعری کے جزوِ اعظم کے طور پر پیش کیا ہے۔ اکبر کے تغزل کا جائزہ لیتے ہوئے ماہر القادری نے لکھا ہے "ہمارے اصلاحی شاعر کی بیتاب انگلیاں ایک طرف نبضِ قوم و ملک پر تھیں۔ تو دوسری طرف چمنستانِ حسن و عشق میں بھی وہ گل چینی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔"

## اقبال کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ

مرتب: ساحل احمد - قیمت: ۱۵ روپے

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں اقبال کی تیرہ نظموں پر ہندوستان اور پاکستان کے تیرہ ناقدوں کے حسبِ ذیل مضامین شائع کیے گئے ہیں:

۱۔ عقل و دل از وزیر آغا
۲۔ ایک آرزو از ملک حسن اختر
۳۔ شمع و شاعر از اسلوب احمد انصاری
۴۔ شکوہ از صدیق شبلی
۵۔ والدہ مرحومہ کی یاد میں از وقار عظیم
۶۔ خضرِ راہ از مسعود حسین خاں
۷۔ طلوعِ اسلام از حسن سجاد
۸۔ مسجدِ قرطبہ از (پروفیسر) مجتبیٰ حسین
۹۔ طارق کی دعا از مولانا ابوالحسن ندوی
۱۰۔ ذوق و شوق از صفی حیدر دانش
۱۱۔ ساقی نامہ از حسن جعفری
۱۲۔ شعاعِ امید از کلیم الدین احمد
۱۳۔ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ از فتح محمد ملک

اقبال اور ان جیسے شاعروں اور ادیبوں کے نظریات وغیرہ پر لکھے گئے مضامین اور کتابوں کے برخلاف، اس نوعیت کی کتابوں کی ایک بڑی اہمیت یہ ہے کہ ایسی کتابیں قاری کو تخلیق سے براہِ راست روشناس ہونے کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ اس طرح نقاد کے وضع کردہ نظریات، ادب پارے سے لطف اندوزی میں کم کم حائل ہو پاتے ہیں۔

اس کتاب میں شامل مضامین کے مصنف متنوع نظریات کے حامل ہیں، کیوں کہ مرتب نے اپنے آپ کو کسی ایک مکتبِ فکر کا اسیر نہیں بنایا۔ اس وسیلے سے یہ دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اقبال اور اُن جیسے بڑے فن کاروں کا جادو ایسے سروں پر بھی چڑھے بغیر نہیں رہتا جو دیگر نوعیتوں کے فسوں کے زیرِ اثر ہوتے ہیں۔ مضامین میں عمیق حنفی کے مضمون: "اقبال کی مسجدِ قرطبہ" کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے کیوں کہ اس نظم پر لکھے گئے دیگر مضامین کے مقابلے عمیق حنفی کے مضمون میں مسجد کے تاریخی و تہذیبی پس منظر کو زیادہ معنی خیز انداز میں نمایاں کیا گیا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ زیرِ بحث تیرہ نظموں کے متن پر مشتمل ہے۔ مناسب ہوتا اگر نظموں کے لیے جداگانہ حصہ قائم کرنے کے بجائے ہر نظم کو متعلقہ مضمون سے قبل شائع کیا جاتا۔ ہر نظم کے اختتام پر اس کا سنِ اشاعت اور مجموعہ کا نام بھی درج کیا جا سکتا تھا کیوں کہ ایسی کتابیں بالعموم طلبہ کے کام آتی ہیں۔

مرتب نے بمشکل دو صفحات کا پیش لفظ لکھا ہے۔ مرتب کی اس درجہ کفایتی شرکت کے باوجود کتاب سے بہ یک نظر گمان گزرتا ہے کہ یہ تالیف نہیں بلکہ تصنیف ہے۔ یہ ادبی اخلاقیات کے منافی ہے۔

## ولی - فن و شخصیت اور کلام

مؤلف: ساحل احمد: قیمت: ۱۵ روپے

یہ کتاب بنیادی طور پر ولی دکنی کی غزلوں کا انتخاب ہے۔ جس میں ولی کی ایک سو پچاس غزلیں اور فردیات کے زیرِ عنوان ستائیس اشعار شامل ہیں۔ انتخاب کے اختتام پر نو صفحات کی فرہنگ دی گئی ہے۔ "احتساب" کے زیرِ عنوان باسٹھ صفحات پر مشتمل مقدمے میں دکن کے سیاسی و تہذیبی پس منظر ـــــ بہمنی سلطنت کے عروج و زوال اور اس زمانے کے ادب ـــــ عادل شاہی، نظام شاہی، برید شاہی اور قطب شاہی، سلاطین و امراء کی ادب پرستی اور ادب و شعر کی صورتِ حال ـــــ اور قلی قطب شاہ، وجہی، نشاطی اور غواصی وغیرہ کی شاعرانہ حیثیت کے ذکر کے بعد ولی کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جائزے میں متعدد حضرات کی تحریروں سے مدد لی گئی ہے۔ جن میں ڈاکٹر زور، نصیر الدین ہاشمی، اور وزیر آغا کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ نعیم سین سحر، بی گوپال ریڈی اور عبادت بریلوی سے بھی اکتساب کیا گیا ہے۔ کچھ عبارتیں ایسی بھی ہیں، جن پر واوین تو لگائے گئے ہیں، مگر ان کا حوالہ درج نہیں ہے۔ یہاں یہ امر بھی توجہ چاہتا ہے کہ ولی کے باب میں مؤلف کی نگاہِ دُوررس ڈاکٹر سید عبداللہ پر کیوں نہیں پڑی۔

"احتساب" میں ولی کی تصوف پسندی، اس کے شعری مزاج کی ہندوستانیت اور زبان کے تئیں آزادانہ رویے پر خاص توجہ دی گئی ہے جو یقیناً با معنی ہے۔ خود ساحل احمد نے بھی زبان کے تئیں کافی آزادانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ مثلاً:

"... ان (عادل شاہی) حکمرانوں کی عملی سرپرستی آج قصۂ پارینہ بن چکی ہے اور صرف تاریخ کے صفحات پر لکھی رہ گئی ہے۔ حالانکہ ان کی اس روایت کو بعد کے حکمرانوں کو باقی رکھنا چاہیے تھا، مگر ذہنی سیاسی اور مذہبی تعصب نے، آج کی عصریت میں جو زہر پاشی کی ہے اور معاشرے میں جس طرح رچائی بسائی گئی ہے، اس کے کھرچنے یا کھینچنے میں تمام ہاتھ بے بس ہیں۔ یہ امر تعجب ہے کہ کل کی تہذیب جو آج کے مقابلے میں کہیں پس ماندہ تھی ـــــ انسان، انسان تھا ـــــ علماء و مشائخ کی پذیرائی

فنونِ لطیفہ کی سرپرستی اور عام فلاح وبہبود میں یہ حکمراں کہیں افضل تھے۔ وہ دَور جس کا ذکر زیرِ قلم ہے، اس دَور کے بیشتر حکمراں انہیں اوصاف کے حامل تھے۔ خصوصاً علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ تا ۱۰۸۳) کو حفظِ ماتقدم حاصل ہے۔" (ص ۲۴ تا ۲۵)

—— لہٰذا کتاب کا مطالعہ کرتے وقت زبان و بیان کی ایسی آزادیوں سے اکتساب میں اجتناب اور احتیاط ضروری ہے۔

## قائم اور اُن کا کلام

مؤلف: ڈاکٹر محمد امین
تقسیم کار: ایجوکیشنل بُک ہاؤس، علی گڑھ
قیمت: بیس روپے

زیرِ نظر کتاب چھ حصّوں میں تقسیم ہے: قائم کے مختصر حالاتِ زندگی —— سیاسی ماحول —— سماجی اور اقتصادی صورتِ حال —— قائم کے عہد میں ادبی صورتِ حال —— قائم کی شاعری پر مختصر تبصرہ —— انتخابِ کلام۔

انتخاب میں کُل ساٹھ غزلوں سے دو سو سینتیس اشعار، چار رُباعیات اور ایک ایک حکایت، ہجو اور قصیدہ شامل کیا گیا ہے۔ انتخاب سے پہلے کلّیاتِ قائم کا تعارف بھی شامل کر دیا جاتا تو طلبہ کے لیے مفید ہوتا۔

ڈاکٹر امین نے قائم چاندپوری (۱۷۲۵ تا ۱۷۹۵ء) کے عہد کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی صورتِ حال کے ذکر کا نقطۂ آغاز اورنگ زیب کی موت (۱۷۰۷ء) کو بنایا ہے، لیکن ساتھ ہی ان حالات کا بھی ذکر کیا ہے، جو پیدا تو عہدِ اورنگ زیب میں ہوئے تھے، مگر اُن کے اثرات بعد میں ظاہر ہوئے اور دیگر نوزائیدہ حالات کی تقویت کا سبب بنے۔ قائم کے عہد کی ادبی صورتِ حال کا اجمالی جائزہ دلّی میں ولی دکنی کی آمد (۱۷۰۰ء) سے شروع کیا ہے۔ کلامِ ولی کے حوالے سے اردو زبان اور شاعری کے اُن پہلوؤں کا ذکر کیا ہے جو شمال و جنوب کے اتصال سے وجود میں آئے تھے۔ اس دَور کی اہم شعری خصوصیات کی نشان دہی کے لیے میرؔ، مصحفیؔ، سوداؔ، حاتمؔ، دردؔ، خان آرزوؔ، وغیرہ کے طرزِ کلام کی جانب اشارے کئے ہیں۔ مذکورہ حالات کے بیان میں جس محنت اور وسیع مطالعہ سے کام لیا گیا ہے، اُس کی شہادت کتابیات میں شامل نسبتاً ساٹھ اسمائے کتب سے بھی ہوتی ہے۔

قائم کی شاعری پر مختصر تبصرے میں ڈاکٹر امین نے لکھا ہے کہ قائم میر سے متاثر تھے۔ "اُن کی (میر جیسے سیاسی وسماجی حالات سے) اثر پذیری اُنہیں ایک باشعور اور حسّاس دل انسان ثابت کرتی ہے۔" اور "دونوں (میر و قائم) کی صدائے سخن کہیں کہیں ہم آہنگ ہو گئی ہے۔" ڈاکٹر امین نے "انسان" اور "کہیں کہیں" کے ماہرانہ استعمال سے غالباً اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو اُن کے دل میں ہے۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو یہ عرض کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قائم اور اُن جیسے دیگر شعراء کے بارے میں، مُدّ درازے سے چلے آرہے فیصلوں اور خیالات کو کب تک جوں کا توں قبول کیا جائے گا؛ حالانکہ اس عہد کو وہ بُعدِ زمانی حاصل ہو چکا ہے، جس کے بعد کسی شاعر کا حقیقی مرتبہ واضح طور پر متعین کیا جا سکتا ہے۔ کتاب سے ظاہر محنت اور دقّتِ نظر کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اگر ڈاکٹر امین چاہیں تو قائم کے ادبی مرتبے کا از سرِ نو تعین کر سکتے ہیں۔

## جوہرِ آئینہ

شاعر: ابرار اعظمی قیمت: ۱۵ روپے
ناشر: شان دار الاشاعت گھر، گورکھپور

یہ مجموعہ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۸۰ء تک کے انتخابِ کلام پر مشتمل ہے۔ اس میں صرف اکتالیس غزلوں، دس نظموں اور ہندی و انگریزی کی سات نظموں کے سات تراجم شامل ہیں۔ اس مجموعے سے بہرصورت، یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابرار اعظمی نے شاعری کو خوش وقتی کے بجائے ایک بردبار عمل سمجھا ہے۔

ابرار اعظمی کا اسلوب، احساسات وکیفیات کو اور کبھی کبھی اشیا کو بھی تحلیل و تصادم کے نہایت پُرپیچ عمل سے گزارتا ہے۔ اس کا اختتام زیادہ تر بعض سوالات اور شکوک پر ہوتا ہے۔ وہ سوال، تشکیک اور تقابل کی نوعیت کو ظاہر کرنے کے لیے بالعموم کافِ مساوات (کہ) کا سہارا لیتے ہیں:

کشش زمیں کی کہ واماندگی کہ حرص و آز
دبی دبی سی شکایت ہے کیوں اُڑانوں میں

اُن کو دیکھا آئینہ دیکھا کہ گُل
چمپئی عارض کہ تاباں زرد پھول

آئینہ در آئینہ دنیا کہ میں
یا مرا چہرہ ہے بختِ آئینہ

اِن سوالات کے پیشِ نظر ابرار کے یہ دو شعر محسوس کراتے ہیں کہ ان کا شعری عمل کن مراحل سے دوچار ہے:

لفظ تھے معنی تھے میں بھی تھا مگر
ربط کا رشتہ اُلجھ کر رہ گیا

گمشدہ ربطِ تمنّا کہ فریبِ امکاں
کس لیے کون سا تھا، احوال ہیں کیا

ظاہر ہے کہ یہ مراحل کسی فیصلے تک پہنچنے کے لیے نہیں بلکہ ان سے اُلجھے رہنا اور سوال در سوال کے ذریعے انہیں سلجھاتے الجھاتے رہنا ہی شاعری کا مقصود اور صلہ ہے۔

ترکیب سازی اور لفظیات کے انتخاب میں ابرار اعظمی کا ذہن بیدلؔ اور غالبؔ کی طرف بار بار متوجہ ہوتا ہے۔ یہ رجحان اس لحاظ سے قابلِ تعریف ہے کہ گہرائی کا ساتھ بھی گہرائی پیدا کرتا ہے، مگر خوردوں کے لیے اس میں یہ خطرہ بہرحال باقی رہتا ہے کہ وہ بڑوں کا بول بالا کرنے میں اپنی بولی بھول سکتے ہیں۔

شمس الحق عثمانی، دہلی

●●

## فنا اور لافانیت

یہ محض اتفاق ہی ہے کہ ادھر آج کل کا اکتوبر ۱۹۸۴ء کا شمارہ منظرِ عام پر آیا اُدھر محترم راجندر سنگھ بیدی کے نام کے ساتھ مرحوم جُڑ گیا (اُنہیں مرحوم لکھتے ہوئے قلم لرزتا ہے) اُن کے انتقال کے بعد "بُرا بودھا اور مسٹسی" پڑھنے سے ایک نیا ہی احساس بیدار ہوا۔ فنا اور لافانیت کا احساس - ازراہِ کرم اُن کی تصویر جو شمارہ ہٰذا میں "من کہ" کے ساتھ چھپی ہے، کسی اگلے شمارے میں اسے رنگین شائع کریں تاکہ بیدی کے پرستاروں کے گھروں کی دیواروں پر لگی مشاہیر کی تصاویر میں ایک اور نقش آویزاں ہو جائے۔

آنند سجاد سیوری، غازی آباد

## توجہ طلب

خسرو: ایک ہمہ جہت شخصیت، جناب مظفر حسین برنی صاحب کا بے مثال معلوماتی کارنامہ ہے۔ اچھا ہوا کہ برنی صاحب گورنر بنا دیئے گئے ورنہ بڑے بڑے کج کلاہ اور جغادری ناقدین کے قلم کی سیاہی سوکھ کر رہ جاتی۔

جناب ظ۔ انصاری صاحب ـــ (قلم پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا) کے مضمون کی تعریف لکھنے کے لیے کہاں کہاں سے الفاظ جمع کروں؟

ظ۔ انصاری شمع ہیں اور میں اُن کا ازلی پروانہ، بلا کے لکھاڑ۔

"ساغر نظامی ـــ جو اپنا کام کر گئے" ـــ خاکہ نہیں، مصوری ہے ـــ ظ۔ انصاری نے قلم سے نہیں برش سے سجایا ہے۔ کیسے کیسے قلم کاروں کو دُور سے بھی دیکھا ہے اور نزدیک سے بھی، جانا بھی ہے اور پہچانا بھی ہے، لیکن ظ صاحب صاحبانِ نقد و نظر کے "مجتہد العصر" ہیں۔

اگر "خطوطِ غالب" کی پرستاری ہو سکتی ہے ـــ تو "مکتوبات" میں محترم واثق جون پوری کا "انکسار" مجھے مدہوش کر گیا ـــ "من کہ ...." کا سلسلہ بڑا اچھا ہے۔ ایک صفحہ کی سیج پر شخصیت کی خوابیدگی جان و دل چھین لیتی ہے۔

صفحہ ۴۱ کے تصویری پیکر کے نیچے غالب کا شعر اہلِ نقد و نظر کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ پہلی بات جو باعثِ غور ہے وہ یہ کہ تصویری پیکر میں کعبہ آگے ہے اور کلیسا پیچھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ غالب نے اپنے شعر میں کلیسا کو جائے کفر قرار دیا ہے۔ کلیسا عیسائیوں کا معبد ہے۔ عیسائی اہلِ کتاب ہیں اور اہلِ کتاب کافر نہیں ہو سکتے۔ جب عیسائی کافر نہیں ہیں تو اُن کا معبد جائے کفر کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اور تمام ناقدینِ اُردو میرے اعتراض پر توجہ دے کر میرا ابہام دُور فرما دیں گے۔

لئیق اختر، منصفی آباد

## مجبوری

میں نے ایک طویل مضمون لکھا ہے۔ "اردو کی اصنافِ نظم" میرا خیال ہے کہ اچھا تحقیقی مضمون ہے۔ کیا آپ دو تین قسطوں میں آج کل میں چھاپ سکتے ہیں؟ کوئی باقاعدہ سہ ماہی تحقیقی رسالہ ہوتا تو پورا مضمون ایک قسط میں چھپوا دیتا۔ بتائیے شاعر، نیا دَور اور آج کل کے علاوہ ہندوستان میں اُردو کا کون سا رسالہ بچتا ہے، جو باقاعدگی سے نکلتا ہو۔ ان میں بھی آج کل نیا دَور کا جو معیار ہے وہ کسی اور کا نہیں۔

گیان چند، حیدر آباد

## مزہ!

ماہ ستمبر ۱۹۸۴ء کا "آج کل" پڑھا۔ بشیر بدر اور شاہد کبیر صاحبان کی غزلیں لاجواب ہیں۔ کلاسیکی موسیقی ـــ ایک جائزہ" کافی معلوماتی مضمون ہے۔ پچھلے کئی شماروں سے سرورق میں تبدیلی نہیں آئی۔ نامور شعرا اور ادبا کی تصویریں سرورق پر شائع ہوں تو مزہ آجائے!

نثار اختر انصاری، ناگپور

## پسند

اگست ۱۹۸۴ء کے شمارے میں "مورچے پر" بہت خوب رہا۔ اُتار بہت پسند آیا۔ مضامین بھی قابلِ تعریف ہیں۔

مقصود اظہر،

## عظیم الشان غلطی

ڈاکٹر بشیر بدر کی غزل "اُداسی کا یہ پتھر آنسوؤں سے نم نہیں ہوتا" دہلی کے ایک ماہ نامے میں غالباً اگست یا ستمبر کی اشاعت میں شائع ہو چکی۔ اسی مطبوعہ غزل کو اب آپ نے "آج کل" ستمبر ۱۹۸۴ء میں پیش کر دیا۔ ایک شاعر کی اس عظیم الشان غلطی کو "سہو" کہا جا سکتا ہے؟

اقبال جعفری،

Regd. No. D(DN) 103
R.N. 948/57

Licensed U(DN)-50 to post without pre-payment
at Civil Lines, Post Office, Delhi

1.43 No. 6 AJKAL (URDU) January 1985



تشکیلِ شعر: برجیندر سیال

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں
(غالب)

Publishedby the Director Publications Division, Patiala House, New Delhi-
110001. Printed by ...

فروری ۱۹۸۵ء
ایک روپیہ ۵۰ پیسے

اِس شمارے کے قلم کار:

ضیا فتح آبادی، یوسف ناظم، ہنسراج رہبر، نریندر لوتھر،
ستیش بترا، قیصر قلندر، زیب غوری، امیر قزلباش،
محمد اشرف، علی امام نقوی، پروین کمار اشک، مدن لعل منجندہ،
ایم۔ آر۔ قاسمی، کرشن شرما، رتن چند جین، صادقہ ذکی،
شارب ردولوی، سہیل بخاری، مزینہ عثمانی۔

راشٹرپتی بھون، نئی دہلی میں، ۳۱ دسمبر ۱۹۸۴ء کو صدر جمہوریہ ہند شری ذیل سنگھ، وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کو عہدے کا حلف دلاتے ہوئے

راشٹرپتی بھون، نئی دہلی میں ۳۱ دسمبر ۱۹۸۴ء کو صدر جمہوریہ ہند شری ذیل سنگھ، اور وزیر اعظم شری راجیو گاندھی، وزراء کی کونسل کے ممبران کے سا

اردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہنامہ

# آجکل

نئی دھلی

ایڈیٹر: راج نرائن راز

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابد کرہانی

| جلد : ۴۳ | شمارہ : ۷ | فروری ۱۹۸۵ء |
|---|---|---|
| قیمت : ایک روپیہ ۵۰ پیسے | فون: ۳۸۷۰۶۹ | ماگھ - پھاگن شک سمت ۱۹۰۶ |


## ترتیب



سرورق : جیون اڈلجہ


بزنس منیجر: ایل ـ آر ـ بترہ ـ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر ـ ایس منچال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :

ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ :

بزنس منیجر : پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اندرونِ ملک : زرسالانہ : ۱۵ روپے ـ دو سال کے لیے : ۲۷ روپے ـ تین سال کے لیے : ۳۸ روپے

ملاحظات

# فرقہ پرستی اتحاد کی دشمن ہے

(وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کا قوم سے خطاب)

وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی نے ۵ جنوری ۱۹۸۵ء کو ریڈیو اور دوردرشن سے قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "آپ نے مجھ میں اور میری پارٹی میں جس بے حساب اعتماد کا اظہار کیا ہے، اس سے زیادہ اور کیا مانگا جا سکتا ہے۔ ہم کیسے خود کو اس کا لائق ثابت کر سکتے ہیں، سوائے اس کے کہ آپ کے مفاد کے لیے لازوال عزم و انکساری کے جذبے اور پوری قوت و توانائی کے ساتھ کام کریں، اس طرح جیسے کہ آپ نے ہمیں اپنے اعتماد اور بھروسے سے نوازا ہے۔

شری گاندھی نے کہا کہ میں اسے اپنی یا اپنی پارٹی کی کامیابی تصور نہیں کرتا جو ملک کے تئیں اپنی خدمات کے ایک سوویں سال میں قدم رکھ رہی ہے۔ یہ ہندوستانی عوام کی کامیابی ہے۔ وزیرِ اعظم نے کہا کہ آپ نے بہت واضح اور غیر مشروط طور پر اپنا فیصلہ دے دیا ہے، جو اتحاد، قوت اور میل جول کے حق میں فیصلہ ہے۔ وزیرِ اعظم نے کہا کہ آج ایک بار پھر تمام دنیا کی نظر بھارت کی جمہوری روایات کی پُراثر قوت پر ہے۔ ہمارے عظیم رہنماؤں گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو اور اندرا جی کے دیے ہوئے سیاسی نظام نے ایک نئی قوت حاصل کی ہے۔ یہ عام چناؤ جمہوریت کی ایک عظیم تشہیر ہے۔ وزیرِ اعظم نے کہا کہ بھارت کی آزادی میں اس کے قدیم ورثے کی جس کی تاریخ بنی نوع انسان کی پیدائش سے شروع ہوئی ایک بار پھر تجدید ہوئی ہے۔

انتخابات کے ہنگامے ختم ہو گئے ہیں، لیکن آندول نے جن جذبات و احساسات کو اُجاگر کیا تھا، انہیں آج مصالحت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے راستہ پر گامزن ہونا چاہیئے۔ بہت سے مسائل ہمارے سامنے ہیں اور ہمیں جذبۂ اتحاد و ہم آہنگی سے انہیں سلجھانا ہے۔ اگر ہم متحد رہیں تو ایسا کوئی بھی چیلنج نہیں ہے جس کا ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔

سیکولرازم ہماری یک جہتی اور اتحاد کی بنیاد ہے۔ فرقہ پرستی اور تنگ نظری اتحاد کی دشمن ہے۔ ان انتخابات نے ہم پر واضح کیا ہے کہ ہمارے عوام ہمیشہ ان مصنوعی اڑچنوں پر فتح حاصل کر لیتے ہیں۔ ہمیں فرقہ پرستی کے خلاف نبرد آزما ہونا ہے۔ نیز شک و شبہ اور غیر محفوظ ہونے کے جذبے کے خلاف بھی جو اُسے تقویت بخشتے ہیں۔ میرا سب سے اوّلین فرض یہ ہے کہ میں ہر عقیدے کے افراد کی جان و مال اور آئینی حقوق کا تحفظ کروں۔ ہمیں تشدد کا قلع قمع کرنا چاہیئے۔ ہمیں ان ذہنوں کو درست کرنا ہے، جن میں تعصب اور نفرت پیدا ہوتے ہیں۔ ہمیں ہر قصبے، ہر گلی اور ہر گاؤں کے اتحاد کے لیے مہم چلانی چاہیئے۔ ہماری یونیورسٹیوں، اسکولوں، کام کرنے کے مقامات اور ذرائع ابلاغ میں فرقہ وارانہ فاشزم کے خلاف نظریاتی جنگ شروع کی جانی چاہیئے۔

شری راجیو نے کہا کہ میری حکومت پنجاب کے مسئلہ کو سب سے زیادہ فوقیت دے گی۔ اس سلسلے میں ایک کابینہ کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جو مقررہ وقت کے اندر مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرے گی اور اس کے پُر امن حل کے لیے متبادل تجویزوں کو نظر میں رکھے گی۔

شری راجیو گاندھی نے کہا کہ نفاق کے اس افسوس ناک باب کا خاتمہ کرنے کے لیے ہر ایک کو اپنا تعاون دینا چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ سکھ بھی اسی طرح بھارت کا ایک حصہ ہیں جس طرح کوئی اور فرقہ۔ انہوں نے آزادی کے حصول وغیرہ میں قابلِ قدر رول ادا کیا ہے۔ میں انہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ان کے جان و مال کی ملک کے ہر حصے میں حفاظت کی جائے گی۔ ملک کی تمام دیش بھگت قوموں کو پنجاب اور ملک کے دوسرے حصوں میں علیحدگی پسندی کی تبلیغ کرنے اور تشدد پر عمل پیرا قوتوں کی مخالفت کرنی چاہیئے۔ ملک میں علیحدگی پسندی کے نظریے اور تشدد کے ساتھ نہ تو کسی طرح کی رعایت برتی جا سکتی ہے اور نہ ہی برتی جائے گی۔ ہندوستان کا اتحاد سب سے مقدم ہے اور باقی ہر چیز اس کے بعد ہے۔

آسام میں غیر ملکیوں کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے بھی پُر خلوص کوشش کی جائے گی۔ کانفرنس کی میز پر "لو اور دو" کے ذریعے جو کامیابیاں حاصل ہو سکتی ہیں وہ تصادم سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔

کچھ ہی ہفتوں بعد ہم ساتویں پنج سالہ منصوبہ کی شروعات کریں گے۔ ہمارے اپنے پرانے دشمنوں یعنی غربت، بے روزگاری، بیماری اور جہالت کے خلاف جنگ جاری رہے گی۔ آئندہ چند ہفتوں میں ہم اپنی موجودہ پالیسیوں اور پروگرام کا جائزہ لیں گے تاکہ اس بات کی یقین دہانی کرا سکیں کہ انصاف پر مبنی ہماری ترقی اور نشو و نما کے بنیادی مقاصد مقررہ وقت کے اندر اندر حاصل کر لیے گئے۔

پبلک سیکٹر ترقی و فروغ کا ایک اہم ذریعہ رہے گا۔ کارکردگی میں جہاں کہیں بھی کمی ہو گی

جلد از جلد قابو پا لیا جائے گا۔ تبدیلی کے لیے کئی ورکس تجاویز مرتب کر لی گئی ہیں اور زیر غور ہیں۔

پیداواریت میں بہتری لانے، جدید تکنالوجی اپنانے اور صلاحیت کو پوری طرح استعمال کرنے کو ہی اہم کا مرتبہ حاصل کیا جانا چاہیے۔ میں نے سائنس و تکنالوجی، صنعت کی وزارتوں کو تلقین کی ہے کہ وہ ان مقاصد کے حصول کے لیے مخصوص تجاویز مرتب کریں۔

میں نے بیرونی تجارت کی پالیسیوں کا جائزہ لیا ہے اور ہدایت کی ہے کہ آئندہ چند ہفتوں کے اندر ہماری برآمدات میں تازہ روح پھونکنے کے لیے جامع اقدام کیے جائیں۔ کمزور طبقوں کے بیس نکاتی پروگرام کو زیادہ موثر بنانے کے لیے اس کی تشکیل نو کی جا رہی ہے۔

جنگلات کے اندھادھند کٹاؤ نے ہمیں ماحولیاتی، سماجی اور اقتصادی بحران سے دوچار کر دیا ہے ــــ جنگلات کے کاٹنے کو روکا جانا چاہیے۔ میری تجویز ہے کہ بے کار زمینوں کی ترقی و فروغ کے لیے فوراً ایک قومی بورڈ قائم کیا جائے جس کا منتہائے مقصود ہر سال ۵۰ لاکھ ہیکٹر زمین پر چارے اور ایندھن کے لیے درخت لگانا ہو۔ ہم درخت لگانے کے سلسلے میں ایک عوامی تحریک کو فروغ دیں گے۔

گنگا ہندوستانی تہذیب [illegible] تاریخ اور روایت کا [illegible] ثقافت سے گھرے ہوئے دریاؤں میں سے ایک ہے۔ ہمیں گنگا کے انتہائی پاک و صاف پانی کو بحال کرنا ہے۔ گنگا اور اس کی معاون ندیوں کو آلودگی سے بچانے کے لیے ایک مرکزی گنگا اتھارٹی قائم کی جائے گی۔ ملک میں صاف پانی اور ہوا فراہم کرنے کے اقدام کی یقین دہانی کی جائے گی۔

وزیر اعظم نے کہا کہ سماجی اور اقتصادی تبدیلی لانے کے لیے انتظامی اصلاح نہایت اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکاری عملہ اور انتظامی اصلاحات کے محکمے کا چارج میں نے اپنے پاس رکھا ہے۔ سرکاری تنظیم، پالیسیوں اور ضابطوں کے جائزہ کا کام پوری طرح جاری ہے۔

میں نے کہا ہے کہ جواب دہی کے طریقے پر عمل پیرائی کے ساتھ فیصلے کرنے کے عوامل میں لامرکزیت پیدا کی جائے۔ فیصلہ کرنے کے عمل میں تیزی لانے کے مقصد سے قواعد و ضوابط کو آسان بنایا جائے گا۔ ضابطوں پر نتائج کو فوقیت حاصل ہوگی۔ میں نے تمام متعلقہ ایجنسیوں کو ہدایت دی ہے کہ وہ شہریوں کو سرکاری محکموں اور ایجنسیوں کے ذریعے خوش اخلاقی اور تیزی کے ساتھ خدمات بہم پہنچانے کو یقینی بنائیں۔ ان دفاتر اور محکموں میں جن کا عوام سے زیادہ تعلق ہے، لوگوں کی مشکلات کا ازالہ کرنے کے لیے ایک موثر مشینری فراہم کی جائے گی۔

سرکاری خدمات کی حوصلہ افزائی کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہم عوامی خدمات کی انجام دہی میں بے جا مداخلت کی روک تھام کریں گے۔ ہمیں عوام کی خدمت کے لیے ایک نئے انتظامی ثقافت کو فروغ دینا چاہیے۔ سماج کی بنیادی قدروں نے استحکام اور مہارت میں اضافہ کرنے کے لیے سرکاری ملازمین کو دی جانے والی تربیت کو از سر نو ترتیب دیا جائے گا۔

انہوں نے کہا تعلیم کو ایسا ہونا چاہیے کہ اس سے قومی یکجہتی اور کام کرنے کے اصولوں کو فروغ حاصل ہو۔ جدوجہد آزادی کی عظمت اور قومی یکجہتی [illegible] کی اہمیت سے بھی طلباء کو روشناس کرانا ہوگا۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں کو نوجوان نسل اور بھارت کے قدیم ورثہ اور ثقافت کے درمیان مطابقت رکھنی چاہیے۔ نصاب اور کتابوں کو ہماری رنگارنگ تہذیب کو تنگ نظر بنانے اور اسے فرقہ وارانہ رنگ دینے سے روکنا چاہیے۔

میں نے اس سلسلے میں کچھ پالیسیوں اور پروگراموں پر غور کیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ایک نئی قومی تعلیمی پالیسی مرتب کی جائے۔

شری راجیو گاندھی نے کہا کہ ہم اپنے اسکولوں میں ایک نئی مواصلاتی ٹیکنالوجی کو بڑے پیمانے پر استعمال میں لانے سے متعلق پروگرام مرتب کر رہے ہیں۔

سرکاری اداروں میں ملازمتوں کے لیے ڈگریوں سے واسطہ نہ رکھنے پر سرگرمی کے ساتھ غور کیا جا رہا ہے۔ ایک "کھلی" یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے اقدام کیے جا رہے ہیں تاکہ سبھی لوگ آسانی کے ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ مرکزی اسکولوں کی تنظیم کو وسعت دی جائے گی۔ یہ اسکول ایک ذہانت اور لیاقت کے مرکز کے طور پر ملک کے ہر ضلع میں کام کریں گے۔ میں تعلیم کو سماج کے پیداواری عوامل سے منسلک [illegible] کرنے پر زور دیتا ہوں۔ ہمیں پیشہ ورانہ تعلیم کو صنعت، زراعت، مواصلات اور معیشت کے دیگر پیداواری شعبوں سے وابستہ کرنے کے مقصد سے از سر نو ترتیب دینا چاہیے۔

ہمیں ورثہ میں ایک اچھی آزمودہ اور مسلسل خارجہ پالیسی ملی ہے۔ جو ہمارے قومی مفاد کو پورا کرتی ہے۔ امن کے لیے کام کرنا ہمارا ہمیشہ سے عقیدہ رہا ہے۔ ہماری پالیسی مفاہمت اور باہمی مفاد کی بنیاد پر سبھی ممالک کے ساتھ دوستی رکھنا ہے۔ ناوابستگی اور انصاف، برابری، باہمی تعاون پر مبنی ایک نئے عالمی اقتصادی نظام کے قیام کے تئیں ہمارا عزم غیر متزلزل ہے۔ اس کا مطلب امن اور ترقی کے کاموں کے لیے اپنے کو پورے طور پر وقف کر دینا ہے۔ ہم ممالک کی آزادی کی حفاظت کرنے اور عدم مداخلت اور عدم دخل اندازی کے اصولوں پر یقین رکھتے ہیں۔

ہماری خارجہ پالیسی کے ایک پہلو پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ ہمارے جنوبی ایشیا میں اپنے قریبی پڑوسیوں کے ساتھ گہرے تاریخی اور ثقافتی روابط ہیں۔ ہم میں غیر ملکی حکومت کی یکساں طور پر یادیں محفوظ ہیں اور ہم اپنے عوام کے بہتر مستقبل اور ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ ہمیں اس بات کا پختہ یقین ہے کہ ہم ان یکساں مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے مل جل کر کام کر سکتے ہیں۔ ہمیں کچھ مسائل کا بھی سامنا ہے، لیکن انہیں ہم باہمی احترام، برابری اور دوستی کے ذریعے حل کرنے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔

(آگے صفحہ ۴۷ پر)

کرشن شرما

# ایک دردناک داستان

شاعر کہتا ہے کہ ع

در محبت چوں زنِ ہندی کسے مردانہ نیست

یعنی محبت کی دنیا میں ہندوستان کی عورت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ مصرع زبان پر آتے ہی ہارڈنگ بم کیس کے شہید بھائی بالمکند اور ان کی دھرم پتنی رام رکھی کی داستان یاد آجاتی ہے۔ اس واقعہ کا تذکرہ بھائی پرمانند نے (جنہوں نے آزادی کی جدوجہد میں بے شمار مصائب برداشت کیے) اپنی کتاب "آپ بیتی" میں کیا تھا۔ مگر اب یہ کتاب نایاب ہے۔ اس کے بعد سے ایسا دردناک واقعہ نہیں سنا۔

کہانی کا آغاز ۲۳ دسمبر ۱۹۱۲ء کی سہانی صبح سے ہوتا ہے جب کہ دلی کے ہندوستان کی راجدھانی بننے پر نئے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کا شہر میں ورود شاہانہ ہوا۔ وائسرائے ہاتھی پر سوار تھا اور اس کی سواری کا جلوس کوئنیز گارڈن میں سے گذر کر چاندنی چوک میں داخل ہونا تھا۔ لیکن وائسرائے کو وسوسہ تھا اور گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ کوئی برا واقعہ پیش آنے والا ہے۔ جب اس نے اپنے ڈھرکے کا بیوی سے ذکر کیا تو لیڈی ہارڈنگ کہنے لگی "آپ کو تزک و احتشام سے ہمیشہ بیزاری رہی ہے"

جلوس ذرا ہی آگے بڑھا ہوگا کہ زور کا دھماکہ ہوا۔ لارڈ ہارڈنگ کے بیان کے مطابق "میری آہنی ٹوپی سڑک پر گری پڑی تھی۔ میں نے کہا یہ بم تھا۔ ایسے لگتا ہے کہ جیسے کسی نے پیٹھ پر زور سے ضرب لگائی ہو اور میرے جسم پر کھولتا ہوا پانی پھینک دیا ہو" وائسرائے بے ہوش ہو گیا مگر اس کی جان بچ گئی۔ لیکن اس کا خدمتگار جو چھتر لیے کھڑا تھا مر گیا۔

کہا جاتا ہے کہ بم انقلاب پسند پارٹی کے لیڈر راش بہاری بوس نے پھینکا تھا مگر وہ وہاں سے کھسکنے میں کامیاب ہو گئے اور چھپتے چھپاتے جاپان پہنچ گئے۔ پولیس نے پوری تفتیش کے بعد ۱۳ اشخاص پر "دلی سازش کیس" کے عنوان سے مقدمہ چلایا جس میں بھائی بالمکند، اودھ بہاری، ماسٹر امیر چند اور بسنت کمار کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔

بالمکند (پیدائش ۱۸۹۱ء شہادت ۱۹۱۵ء) موضع کریالہ ضلع جہلم (یہ علاقہ اب پاکستان میں ہے) کے رہنے والے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر انہوں نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور پھر جلد ہی مشہور انقلاب پسند لالہ ہر دیال اور راش بہاری بوس کے زیر اثر آگئے۔ بالمکند اور اودھ بہاری نے بم بنانے کا طریقہ راش بہاری سے سیکھا تھا۔ بالمکند نے اپنی موت کی سزا کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا تھا "خوشی کا مقام ہے کہ مجھے اسی شہر میں پھانسی دی جا رہی ہے جہاں میرے جدِ امجد بھائی متی داس نے آزادی وطن کی خاطر جان قربان کی تھی خوشا کہ مادرِ وطن کی خدمت کرنے کا ویسا ہی موقع مجھے بھی عطا ہو رہا ہے" بقول بھائی پرمانند جو بھائی بالمکند کے برادر خورد تھے "بھائی بالمکند خوشی سے پھانسی پر چڑھ گیا"۔ جام شہادت نوش کرتے وقت ان کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔

بھائی بالمکند کی شادی کوئی سال بھر پہلے ایک الھڑ دوشیزہ رام رکھی سے ہوئی تھی جو حسن صورت حسن اخلاق حسن عمل کا پیکر تھی۔ گرمیوں کے دن تھے جب بھائی بالمکند جیل میں تھے۔ رام رکھی کھلی فضا میں تڑپ کر رہ جاتی۔ لوگ اسے سمجھاتے تو باؤلی بن کر "وہ رہا ہو جائیں گے" بیوی کہتی۔ وہ دن کب آئے گا وہ شبھ گھڑی کب آئے گی۔

اسی انتظار میں ملزم سے ملاقات کا دن آگیا۔ رام رکھی دلی پہنچی جہاں مقدمہ چل رہا تھا۔ دیکھے جیل کی کوٹھریاں بڑی خوفناک ہیں اور ان تنگ کوٹھریوں کے اندر ساون بھادوں کے امس میں بالمکند کو دن رات رہنا پڑتا ہے۔ دیوی نے پوچھا "کیسے چارپائی ملتی ہے؟"

بالمکند نے جواب دیا "کتنی بھولی ہو۔ یہاں چارپائی کا کیا کام؟"

دیوی — پھر کاہے پر سوتے ہو؟

بالمکند — ایک کمبل بچھا کر سو رہتا ہوں۔

رام رکھی واپس لوٹ گئی۔ رات کو لوگ کھلے چھتوں پر چارپائیاں بچھا کر سوتے لیکن رام رکھی مکان کی سب سے نچلی کوٹھری میں گھس گئی۔ اس نے ایک کمبل زمین پر بچھا لیا اور اس پر لیٹ گئی۔ مچھر و حشرات کاٹ کاٹ کے اس کا بدن پھوڑا بنا دیا۔ اس کی ایک سہیلی نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر کہا "کیا مرنے پر کمر رکھی ہے۔"

رام رکھی بولی "میں کیوں مرنے لگی؟"

سہیلی نے کہا "یہ ڈھنگ تو مرنے ہی کے ہیں۔"

رام رکھی کے منہ سے نکلا "کیا جو اس طرح سو رہے ہیں......"

سہیلی نے جواب دیا "ہاں ہاں مر ہی تو جاتے"

یہ سن کر رام رکھی کی آنکھیں بھیگ گئیں سہیلی اپنے آپ کو کوسنے لگی۔ لیکن رام رکھی کہنے لگی "کسی کا کوئی قصور نہیں۔ میری قسمت پھوٹ چکی جب وہ جیل میں اس طرح سوتے ہیں تو میں اسی طرح کیسے نہ سوؤں؟" (آگے صفحہ ۳۴۳)

ای۔ ۶۸، ساکیت۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

یوسف ناظم

# جادوگر بیدی

اِس یکم ستمبر کو اُنھوں نے اپنی زندگی کے اُنہتر[۶۹] سال پورے کر لیے تھے اور اس کے بعد بھی کوئی ڈھائی مہینے اور زندہ رہے، لیکن یہ اُن کی صحیح عمر نہیں تھی اور اُن کا زندہ رہنا بس دکھاوا تھا۔ اُن کے دُکھوں بھری برسوں اور اُن کی بیماری، معذوری اور نیم بے ہوشی کے ماہ و سال کا حساب رکھا جائے تو وہ اُنہتر[۶۹] سال نہیں جیئے۔ راجندر سنگھ بیدی تو پچھلے کئی برسوں سے بالاقساط مرتے رہے۔ رفیقۂ حیات کا صدمہ اُنھوں نے سہا۔ جوان بیٹے کا غم اُنھیں دیکھنا پڑا اور اس پر مستزاد اُن کی اپنی بیماری، جس کا سلسلہ کارِ جہاں کی طرح دراز ہوتا گیا۔ دائیں آنکھ سے وہ دیکھ نہیں سکتے تھے۔ قلم اپنے ہاتھ میں پکڑ نہیں سکتے تھے اور دائیں پاؤں پر اپنا وزن نہیں ڈال سکتے تھے۔ یادداشت اُن کی کسی سیاسی بہروپیے کی طرح غیر معتبر ہو گئی تھی اور وہ باتیں کرتے کرتے اپنے مخاطب کا نام تک بھول جاتے تھے۔ کوئی پانچ سال پہلے اُن پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ اور بس اُسی وقت ہم سے وہ بیدی چھن گئے تھے، جو محفلوں کی جان ہوا کرتے تھے۔ پچھلے پانچ برسوں میں وہ اِدھر اُدھر آئے گئے بھی۔ جلسوں اور محفلوں میں بھی شریک ہوئے، دلّی کے بھی سفر کیے۔ لیکن یہ وہ راجندر سنگھ بیدی نہیں تھے، جو اپنی بنائی ہوئی کسی فلم کے ناکام ہونے پر خوشی سے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے اور کہتے میرا تو بال بال قرض میں جکڑا ہوا ہے۔ پھر داڑھی پر پھیرتے اور اصرار سے کہتے جی ہاں بال بال۔ بیدی صاحب جتنے ظریف الطبع تھے، اتنے ہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ رقیق القلب۔ ہنستے تو ہم سب ہیں کسی کی بات پر مسکرا دیتے یا زیادہ سے زیادہ تھوڑا سا مونہہ کھول کر دو چار دانت دکھا دیے اسے ہنسنا نہیں کہتے۔ بیدی صاحب ہنستے تو معلوم ہوتا تھا بطیب خاطر ہنس رہے ہیں۔ اُن کا قہقہہ بھی اُن کے ناولوں کی طرح بلند ہوتا تھا۔ اُن کے پاس خوش رہنا بجائے خود ایک فعل تھا، جو کھانے پینے سے جڑا ہوا نہیں تھا۔ جیسا انگریز کہتے ہیں "ایٹ ڈرنک اینڈ بی میری"
(Eat, drink and be merry)

اُن کی مسرت کسی بریوری (Brewery) کی پروردہ یا کسی کچن کی آوردہ نہیں تھی۔ وہ قلبی مسرت کے قائل تھے اور اسی قلب کو وہ رقت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ بات بات پر اُن کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ کہانی پڑھتے تو ایسا معلوم ہوتا جلتے کوئلوں پر ننگے پاؤں چل رہے ہیں اور ان انگاروں کو اپنے آنسوؤں سے بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کس بات پر اُنھیں رونا آتا تھا۔ "صرف ایک اسکریٹ" سنا رہے ہیں اور اس میں کہیں یہ ذکر آ گیا کہ باپ نے بیٹے سے سگریٹ مانگی اور بیٹے نے اس کے جواب میں یہ کہا یا وہ کہا بس اس بات پر رو رہے ہیں۔ جوں توں کر کے کہانی ختم کی۔ تھوڑی ہی دیر میں بحال ہو گئے۔ اور جو بھی شخص قریب میں بیٹھا ہو گا اُس سے پوچھیں گے یہ بھیمانی کہاں ہوتی ہے۔ پھر خود ہی کہیں گے میں اسے ہمیشہ مانی کے قسم کی کوئی چیز سمجھتا رہا — غالب کے شعر کا حوالہ نہیں دیتے لیکن صاف معلوم ہو جاتا کہ اشارہ کس طرف ہے اور ان کا مخاطب پریشان ہو جاتا کہ وہ بیدی کہاں چلے گئے جو ابھی "ایک سگریٹ" کی کہانی سُنا رہے تھے۔ سردار جعفری سے ظاہر ہے اُنھیں کوئی کد تو نہیں تھی، لیکن اتنا ضرور کہتے تھے کہ یہ کیسے سردار ہو گئے۔ سردار تو میں ہوں۔"

اسی مزاج نے بیدی صاحب کو بڑا بھاری مزاح نگار بھی بنا دیا تھا۔ وہ تو کہیے ان کی طبیعت اِدھر نہیں آئی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ مزاح کو تو وہ مالا مال کر دیتے، لیکن اردو افسانہ سسکتا رہ جاتا۔ اُنھوں نے ۴ یا ۵ ہی

○ ۱۹۔ الہلال۔ ۱۳۰۔ باندرہ ری کلیمیشن۔ بمبئی ۴۰۰۰۵

مزاحیے لکھے، لیکن معرکے کے لکھے۔ مہمان، بیوی یا بیماری، الٰہ آباد کے حجام اور خواجہ احمد عباس اور چشمِ بددُور۔ اپنے روتے بسورتے افسانوں اور ان مسکراتے ہنستے مضامین سے راجندر سنگھ بیدی کو "اجتماعِ ضدّین" کا نمونہ بنا دیا تھا۔ راجندر سنگھ بیدی نے عیش و آرام کی زندگی نہیں گزاری۔ کام سے کبھی چھٹی نہیں لی اور پہاڑیوں پر گھومتے نہیں گئے۔ شملہ میں رہے ضرور۔ لیکن اس وقت جب وہاں قتل و خون کا بازار گرم تھا۔ تقسیم کے بعد وہ لاہور سے آئے تھے۔ شملہ گئے تو وہی دیکھنا پڑا جو لاہور میں دیکھ کر آئے تھے۔ اور راستے بھر دیکھتے رہے تھے۔ کشمیر میں بھی رہے، لیکن ملازمت کے سلسلے میں۔ تفریح کے لیے کبھی کہیں نہیں گئے۔ جاتے بھی کیسے۔ جب تک اچھے تھے، روزی کی فکر میں لگے رہے ——— بیٹیوں کی شادی کے لیے پیسہ جوڑا اور جب بیمار ہو گئے تو پھر اچھے ہونے کا نام نہیں لیا۔ اُن کی تفریح بس دوستوں کی محفلوں کی حد تک تھی۔ سیمینار اور ادبی جلسوں میں شریک ہونے کے لیے ادھر اُدھر جاتے لیکن اسے تفریح تھوڑے ہی کہتے ہیں۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کی ایک کانفرنس کی صدارت کے لیے حیدرآباد بھی گئے تھے۔ غالباً ۱۹۶۷ء میں۔ اُسے تفریح کہا جا سکتا ہے، لیکن وہاں بھی تنہا گئے تھے اور کسی سرکاری گیسٹ ہاؤس میں یا فائیو اسٹار ہوٹل میں نہیں ٹھہرے تھے۔ نظام کلب کے چھوٹے سے مہمان خانے میں تھے لیکن بے انتہا خوش تھے۔ دو دن صبح سویرے بلکہ منہ اندھیرے بال کھولے کلب کے باغیچے میں خوب ٹہلے۔ مخدوم محی الدین سے ان کا بڑا یارانہ تھا۔ راج بہادر گوڑ ان کے زبردست فین تھے۔ اُن کے گھر کھانا کھایا تو آم کے اچار کی اتنی تعریف کی کہ غالب کا قصیدہ در صفتِ انبہ یاد آ گیا۔ اور راج بہادر گوڑ اتنے متاثر ہوئے کہ بعد میں جب بمبئی آئے تو دو مرتبان اچار کے ان کے لیے ساتھ لائے۔ اس کانفرنس میں اُنہوں نے بڑا زوردار خطبۂ صدارت پڑھا تھا اور ثابت کر دیا تھا کہ مزاح لکھنے کے لیے ہمہ وقتی مزاح نگار ہونا ضروری نہیں ہے۔

وہ بڑے جیالے تھے۔ اتنے جیالے نہ ہوتے تو کب کے رخصت ہو چکے ہوتے۔ اجل کے فرشتے نے اُنہیں تاک لیا تھا اور بیدی اس عمر میں بھی ایک کھلنڈرے اور ہم سانہ بیدی کی طرح آنکھ بچا کر اُس کے نرغے سے نکل آئے تھے۔ ۱۹۸۴ء اُن کے لیے بڑا سخت سال تھا۔ تین مرتبہ دواخانے جانا پڑا۔ نیچ کینیڈی دواخانے میں رہے۔ بل ادا کیا تو اور رہ گئے۔ اُن کے دوست احباب کو پتہ چل گیا تھا کہ اب بیدی صاحب فرشتۂ اجل کے ساتھ زیادہ آنکھ مچولی نہیں کر سکیں گے۔ دو روز سے اُن کے دوست، رفیق، بھائی، پرستار آئے اور دیکھ دکھا کر چلے گئے۔ اوپیندر ناتھ اشک تو ان کے گرو تھے۔ بیدی صاحب کے خط اشک کے نام آپ پڑھیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ اوپیندر ناتھ اشک اور کوشلیا اشک سے کتنے

قریب تھے۔ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب۔ خطوں میں ایسی ایسی باتیں لکھ کہ حیرت ہوتی ہے۔ ان خطوں میں بڑی معصومیت ہے بلکہ یوں کہیے ایک طفلانہ پن ہے۔ ان خطوں میں ایک تیسرے ہی قسم کے راجندر سنگھ سے ملاقات ہوتی ہے۔ دیکھیے:

"تو یہ ہیں ہماری دوستیاں۔ میں اسی دوستی کا عادی ہوں تمہارے ساتھ ہے، جس میں جب تمہارا جی چاہتا تھا، تم دوڑ کر میر پاس چلے آتے تھے اور میں تمہارے پاس۔ میرے دوست سہگل لکھ ہیں۔ مل کے مالک۔ لیکن جب بھی آتے ہیں میرے ہاں ٹھہرتے ہیں۔ اور کوشلیا کی نظر میں بمبئی کا تصور کرتے وقت کوئی اور شخص ہوتا ہے، الٰہ آباد تمہارے علاوہ میرے لیے ہندوستان کے نقشے پر صرف ایک ہے" ——— "اسی خط میں اُنہوں نے یہ بھی لکھا ہے"۔ گھر اور باہر جملہ حالات کے پیشِ نظر میری ذہنی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اگر میرے دُم ٹانگوں میں دبی ہوئی دکھائی دیتی۔ میں آج کل کسی سے لڑتا نہیں، فوراً ہتھیار ڈال دیتا ہوں اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ ہر کسی اپنے ہونے کی معافی مانگتا پھرتا ہوں۔ جب مدمقابل چلا جاتا ہے تو سوچتا ہوں میں نے کس بات کی معافی مانگی۔ لطف یہ ہے کہ دوسرے نہیں معلوم کہ وہ مجھے اس قدر ذلیل کیوں کر رہے ہیں ..... یہ پورے ا پہلے کا خط ہے۔ اس پر تاریخ پڑی ہے ۱۷ جولائی ۱۹۶۳ء ——— یہ خط ادیب کا خط ہے جس کی ۱۹۶۳ء تک ۶ کتابیں شائع ہو چکی تھیں اور ان ناول بھی شامل تھا، جس پر مصنف کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا تھا۔ بیدی صاحب تنگ دست ہوں تو ہوں تنگ دل ہرگز نہیں تھے او خود بھی بخوبی جانتے تھے کہ جو تنگ دست نہیں ہوتے تنگ دل ضرا ہیں۔

بیدی صاحب آلِ احمد سرور کا بھی اتنا ہی ادب اور لحاظ کر تھے۔ صرف اُن کی موجودگی میں نہیں بلکہ ان کی غیر موجودگی میں بھی۔ بیدی صاحب کی کمزوری تھی۔ وہ غیبت سُن نہیں سکتے تھے ——— اا دو کمزوریاں اور تھیں، مجروح سلطان پوری اور باقر مہدی۔

مجروح سلطان پوری اور راجندر سنگھ بیدی کو تو ایک ہی شعر مصرعے کہا جا سکتا ہے۔ "ایک چادر میلی سی" کا انتساب بھی مجروح ہی ہے اور ان کا ہی مصرع اُن کی نذر کیا گیا ہے: ؎

اپنا لہو بھی سُرخیٔ شام و سحر میں ہے

جب بھی مجروح کا ذکر کرتے اُن کی آنکھیں چمک جاتی تھیں۔ ملنے مواقع کم ہو گئے تھے، لیکن اُن کا حال وہی تھا:

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا      ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار

بیدی صاحب کی آخری کتاب "مکتی بودھ" جو دو سال پہلے مکتبہ جامعہ سے چھپی، باقر مہدی کے نام منتسب ہے۔ باقر مہدی آخر دنوں تک بیدی کے ساتھ اُن کے گھر جاتے رہے۔ بیدی صاحب اگر سوئے ہوتے تو یہ واپس ہو جاتے، لیکن بیدی صاحب کو جب معلوم ہوتا کہ باقر مہدی آ کر واپس چلے گئے تو گھنٹوں متاسف رہتے۔ آخر دنوں میں وہ بہت زیادہ رقیق القلب ہو گئے تھے۔ یہی کہتے میرے لیے دعا کرو۔ کیا دعا کرو یہ بھی نہ کہتے۔ اپنی بہو اور پوتے پوتیوں کی بے حد تعریف کرتے۔ آبدیدہ ہو کر کہتے کون اتنی خدمت کرتا ہے۔ اپنے ملازم ترلوچن کا بھی بڑی محبت سے ذکر کرتے۔ یہی کہتے کہ میری بہو نے اسے دوسرے کاموں سے چھٹی دے دی ہے اور اب یہ ۲۴ گھنٹے میرا ہی کام کرتا ہے۔ لندن کے برنی صاحب کا ذکر کرتے اور روتے کہ میں ان کی محبت کا کیا جواب دوں۔ مکتبہ جامعہ کے بارے میں ہمیشہ اور ہر کسی سے کہتے یہ ہمیشہ وقت پر میرے کام آیا ہے۔

بیدی صاحب کی زندگی ایک کمرے میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں، اُن کی رفیق تھیں۔ سرہانے ایک ٹیلی فون رکھا رہتا تھا اور یہ عید کے دن اپنے سب دوستوں کو ضرور فون کرتے تھے۔ ان کی یادداشت نے اُنہیں یہ بات نہیں بھولنے دی تھی۔ اس دیوالی پر البتہ وہ کسی کو فون نہیں کر سکے ہوں گے۔ ان کے دن ہی کتنے رہ گئے تھے۔

اچھا ہوا کہ بیدی صاحب کی شادی اُس وقت کر دی گئی جب وہ صرف ۱۹ سال کے تھے ورنہ پتہ نہیں ان کی شوخ طبیعت اُنہیں بھلت سنگھ بنا دیتی یا کوئی یار سا۔ یہ اپنی جیب خرچ کے پیسے باغیچے میں کسی جگہ مٹی میں دبا دیتے تھے۔ اور اپنے چھوٹے بھائیوں سے کہتے دیکھو میں ایسا منتر پڑھتا ہوں کہ اس جگہ سے پیسے برآمد ہو جائیں گے۔ منتر پڑھتے، پیسے نکالتے اور بھائیوں کا جیب خرچ بھی ہتھیا لیتے —— بہر حال وہ جادوگر ضرور رہے۔ یہ جادو اُن کے قلم میں تھا۔ جادوگر چلا گیا ہے، لیکن جادو کا جو سرمایہ چھوڑ گیا ہے وہ ہمیشہ بولے گا اور سر چڑھ کر بولے گا۔

بیدی صاحب پر لکھتے وقت رُکنا بھی مشکل ہے اور اُن کی یادوں کو سمیٹنا بھی مشکل۔ مجھے یہ غلط فہمی کبھی نہیں ہوتی کہ میرا نام اُن کے دوستوں کی فہرست میں شامل ہے۔ البتہ اُن کا التفات مجھے خوش فہمی میں ضرور مبتلا کرتا تھا۔ ملتفت تو وہ سب سے ہو جاتے تھے لیکن مجھے اپنی حد تک یہ گمان ہوتا تھا کہ در پردہ چشم یار کے اشارے میری طرف زیادہ تعداد میں ہیں۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ میں نے اپنے ہاں زحمت دی ہو یا کسی اور جگہ، محفل مشاعرے یا جلسے میں شریک ہونے کے لیے اُن سے اصرار کیا ہو اور اُنہوں نے نا کہا ہو۔ 'نہیں' کا رواج شاید اُن کے ہاں تھا نہیں۔

یہ کمشنر آفس (جس سے میں کوئی ۲۲ سال منسلک رہا) اور بیدی صاحب کا ڈائچی فلمز کا آفس تارڈیو میں دو مختلف عمارتوں میں تھے، جو ایک دوسرے سے ملحق تھیں (سنگباری کی سہولت تھی)۔ یہ کمشنر آفس تو اب بھی وہیں ہے لیکن دیوانے دل کی یہ دوکان جس پر ڈائچی فلمز کا خوبصورت بورڈ لگا تھا، وہاں سے ۳، ۴ سال ہی میں اُٹھ گئی۔ یہ ۱۹۶۵ء کے ارد گرد کی بات ہے۔ میں اکثر دوپہر کے وقفے میں اُن کے دفتر چلا جاتا تھا، شاندار آفس تھا —— بیدی صاحب ہی کی طرح۔ نہایت اونچی ۴' ۱۶ انچ کی فوم کی کرسی، خوش وضع میز، میز کی دوسری طرف اسٹیل مع بید کی دو کرسیاں (اُن کا وقت اور روپیہ ضائع کرنے والوں کے لیے)، دائیں طرف ایک صوفہ اور دفتری آرائش کی ساری چیزیں۔ میں جب بھی گیا، بیدی صاحب صدارت کی کرسی سے اُٹھ کر یا تو بید کی کرسی پر بیٹھ گئے یا صوفے پر۔ یہ اُن کا مستقل طریقۂ ملاقات تھا۔ غیر کاروباری وہ فلم پروڈیوسر تھے اس لیے سیچویشن کی بات ہمیشہ اُن کے ذہن میں رہتی تھی۔ سمجھتے تھے کرسی سے صوفے پر نقل مقام کرنے سے دفتری ماحول، گھریلو ماحول کی ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔ چائے کا دور ضروری تھا۔ کبھی کبھی میرے آفس بھی آ جاتے تھے، لیکن جب اُنہوں نے محسوس کیا کہ وہاں مجمع رہتا ہے اور حاضرین میں سے کچھ لوگ اُنہیں جانتے ہیں تو اُنہوں نے اس گلی میں آنا چھوڑ دیا۔ اس زمانے میں اُن کے پاس ایک بڑھیا امپورٹیڈ کار تھی، جو میرے اندازے کے مطابق فل اسکیپ سائز کی تھی۔ اس پر سیفٹ ہینڈ ڈرائیو کی تختی بھی لگی ہوئی تھی اور بیدی صاحب اسے اسی ہدایت کے مطابق چلاتے تھے۔ کار کے معاملے میں اُن کی اپنی ہدایت کاری کی گنجائش نہیں تھی ورنہ بیدی صاحب تو ہر جگہ اپنی ذاتی طرزِ فغاں ایجاد کرنے کے شوقین تھے۔ عمدہ عمدہ سُوٹ پہنتے تھے، درزی کے سلے ہوئے شملے بھی رنگ بدل بدل کر باندھتے۔ کار کی اسٹپنی کی طرح ایک فاضل شملہ دفتر میں بھی رکھتے تھے۔ ٹکٹائی کی اُنہیں ضرورت نہیں تھی، لیکن یہ بھی ہوتی تھی۔ دونوں پاؤں میں ایک ہی رنگ کے موزے پہننے اور جوتے تک نہایت مصفا حالت میں رکھنے کے عادی تھے۔ شروع شروع میں وہ مجھ سے علمی ادبی بھی گفتگو کرتے تھے۔ کبھی جیمس جوائس کے ناولوں کا ذکر کر رہے ہیں تو کبھی ہیمنگ وے کا۔ ایک مرتبہ تو کسی بالزاک کا نام بھی اُن کی زبان پر آیا تھا۔ لیکن جب اُنہیں اندازہ ہو گیا کہ میں کوتاہ قدموں اور یہ بات میرے سر پر سے گزر جا رہی ہے تو پھر ہمیشہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے میں اُنہوں نے اپنی بہتری سمجھی۔ لطیفے سُناتے اور وہ بھی آسان آسان سے۔ غور سے دیکھتے کہ میں سمجھ رہا ہوں یا نہیں، لیکن اپنے کسی دوست یا ملاقاتی سے میرا تعارف کراتے تو کافی بڑا ذخیرۂ الفاظ استعمال کرتے۔ وہ الفاظ کے معاملے میں بھی دریا دل واقع ہوئے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنے دل کو ہمیشہ بڑی بیدردی سے استعمال کیا۔

۴۴ سال کی مدت میں، میں نے اُنہیں بہت زیادہ قریب سے تو نہیں دیکھا (میں ہوں ہی سطحی آدمی) لیکن اتنی دور سے بھی نہیں کہ بائنوکلر کی ضرورت پیش آئے۔ وہ کب اور کہاں لیگ بفور (Leg before) ہوئے یہ مجھے نہیں معلوم لیکن اُنہوں نے کب ہٹ لگائی اور کب امپائر نے اپنے دونوں ہاتھ "دستِ دعا" کی طرح آسمان کی طرف بلند کئے یا پہلیرے گارڈ کی جھنڈی کی طرح اُفقی طور پر ہلائے۔ یہ مجھے ضرور نظر آیا۔ اُن کی کتابیں جب پاکستان میں چھپنی شروع ہوئیں تو اس "ہٹ دھرمی" پر بہت خوش تھے کسی نے اُن سے اجازت نہیں لی۔ لیکن لاہور میں اُن کی کتاب چھپے یہ اُن کے لیے ایسا ہی تھا جیسے وہ برسوں بعد اپنے گھر لوٹے اور ملیتی کے لڈو کھا رہے ہوں۔ "دستک" فلم کے کسی پوسٹر کے کم معیوب ہونے کے سلسلے میں مقدمہ چلا تو اپنے ڈسٹری بیوٹر کے اس تجارتی گُر پر ناشاد تھے۔ میں نے کہا آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کی کتابیں مقدمے کے بغیر ہیں، فلم پر تو کم سے کم مقدمہ ہے۔ کچھ تسلی ہوئی۔ بولے ہاں کتابیں بغیر مقدمے کے اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ "ہاتھ ہمارے قلم ہوئے" عطا کی تو اس پر لکھا" یوسف ناظم صاحب کی نذر۔ راجندر سنگھ بیدی ۳ جون ۱۹۸۱ء خط شکستہ تھا۔ لیکن یاد دلایا اس میں مقدمہ ہے۔ فالج کے حملے کے بعد اُن کے ہاتھ میں رعشہ آ گیا تھا۔ لیکن ۲ سال پہلے تک اُن کی یادداشت برقرار تھی۔ آہستہ آہستہ اس پر بھول کے بادل چھاتے گئے۔ اور بعد میں تو بیدی صاحب خود فراموشی کے عالم کو پہنچ گئے تھے۔ ابھی حال میں پشاور سے بیدی صاحب کا خصوصی نمبر چھپا تو کافی مسرور تھا۔ مکتبہ برھر کی اشاعت پر بھی خوش تھے۔ کیا بہت کم کتابیں میرے پاس آتی ہیں۔ بعد میں کسی وقت ایک کتاب اور یہ نمبر دیا بھی لیکن کتاب پر کچھ لکھ نہیں سکے۔ اب متاسف ہوں کہ یہ کتاب میں نے اُنہیں کیوں واپس کر دی اسی خصوصی نمبر کے ساتھ خیر کوئی بات نہیں۔ "ایک چادر میلی سی" میرے پاس محفوظ ہے۔ اس پر اُن کے دستخط اور تاریخ پڑی ہے، ۱۰ اپریل ۱۹۶۶ء۔ یہی وہ کتاب ہے جو نیا ادارہ لاہور سے چھپی تھی۔ ٹائپ میں۔

"شیرازہ" پشاور کے مضامین اُنہوں نے بار بار پڑھے۔ لوگوں کو بتاتے بھی تھے۔ ایک مرتبہ کہا اس میں آپ کا بھی ذکر ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا مجھ سے یقیناً بہتر ہوگا۔ مسکرائے۔ بولے ہاں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ بیدی صاحب بہت دل گرفتہ رہنے لگے تھے، اس لیے ان میں ۱۹۶۰ء کے بیدی کی تلاش ممکن نہ تھی۔ خاکستر میں صرف چنگاری رہ گئی تھی۔ (جو ہمارے لیے بہت تھی) اُن کی آواز تو نہیں، لیکن انداز "شعلہ سا لپک جائے ہے" کی تصویر تھا۔ اگر وہ موسیقی کی طرف چلے جاتے تو اُن کی غیرتِ ناہید بننے کی گنجائش تو نہیں تھی، لیکن اُن کی تان شاید دیپک ہو ہی جاتی۔ "ہاتھ ہمارے قلم ہوئے" میں لکھتے ہیں۔ "میری آواز اچھی تھی، اس لیے میں سنگیت سیکھنے کی غرض سے راوی روڈ لاہور کے گاندھرو مہا ودیالیہ کی سب سے آخری بٹالین میں بھرتی ہو گیا۔ لیکن میرا جذبہ تھا کہ سا[...] سُروں کی قید میں نہ آتا تھا۔ اور آٹھویں سُر کی اجازت نہ تھی۔ میرا گانا تو ٹیشنو میں آکر گانا نہ گا نہ پڑھا جاتا تھا۔ میں نے ایک دو تمغے مارے لیکن اُستاد بولے خاں بھی ہٹے والے اور امرت سر کے چوتھ رام کی مجلسوں میں جاتے ہی پتہ چل گیا کہ میرے سامنے تو برسوں کے ریاض کی دیوار کھڑی ہے اور آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ مجھے آہستہ آہستہ اور لوکِ زبان سے اسے ہموار کرنا ہوگا چنانچ[ہ] میں یوں الگ ہو گیا جیسا کہ کیلے کے چھلکے پر سے پھسلا ہوا آدمی فوراً اُٹھ کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔ اور پھر اپنی پگڑی سنبھالتا ہوا مونہہ میں کچھ ہنہناتا ہوا اس منظر سے ٹل جانے کی کوشش کرتا ہے"۔ تو میں نے کیا غلط کہا۔ اگر بیدی صاحب اُستاد بولے خاں بھی ہٹے والے یا امرت سر کے چوتھ رام سے کچھ سیکھ لیتے تو۔ شاید وہ فلم پروڈیوسر بن کر اپنا پیسہ نہ گنواتے۔ پلے بیک سنگر یا میوزک ڈائ[رکٹر] ہوتے۔ اور وہاں بیدی صاحب کو پگڑی کی بڑی فکر رہتی تھی۔ ہر اُس آدمی کو کیلے کے چھلکے پر سے پھسلے اُسے وہ پگڑی دار سمجھتے تھے۔ حالانکہ یہ صرف آدمی ہو سکتا تھا۔

ایک دن یعنی ابھی حال حال میں (شاید اگست ۱۹۸۴ء کا مہینہ تھا) پوچھنے لگے "اساطیری" کے کیا معنی ہیں۔ میں گھبرایا۔ ستور کے معنی تو میں سوتے بھی بتا سکتا ہوں، لیکن اسطور کی شرح بیان کرنا، اس طرح اچانک پکڑے جانے پر مجھ سے ممکن نہ تھی۔ میں نے پوچھا آخر اس لفظ کی آپ کو ضرورت کیوں پیش آ گئی۔ بولے وہ جو دلی کے پروفیسر ..... ہیں نا میرے دوست وہ — کیا نام ہے اُن کا بھلا سا۔ اُنہوں نے میری کہانیوں کے اساطیری پہلو کے بارے میں مضمون لکھا ہے — بڑی دیر کے بعد انہیں گوپی چند نارنگ کا نام یاد آیا کچھ دیر میں میں اس قابل ہو گیا تھا کہ اس لفظ کے اگر صحیح نہیں تو کوئی قریبی معنی بتا سکوں۔ بیدی صاحب اگست ۱۹۸۴ء تک اچھے خاصے رہے۔ بہت اور کمزور تھے، لیکن کتابیں پڑھتے تھے۔ کیا پڑھا ہے یہ بھی یاد رکھتے تھے۔ لوگ بھی انہیں یاد تھے، لیکن یہ صرف سنبھالا تھا۔ وہ اُس شمع کی طرح تھے، جو بجھنے کے قریب تھی۔

فکر تونسوی نے اُنہیں ایک خط لکھا تھا، جو میں نے بیدی صاحب کو سنایا تھا۔ خط پڑھنے کی کوشش کی، لیکن فکر تونسوی کا خط پڑھنا آسان کام نہیں۔ میں نے ہی پڑھ کر سنایا تھا۔ کہا آپ ہی میری طرف سے لکھ دیجئے۔ میں نے کہا کے دستخط کا خط چاہتے ہیں تو کہا اچھا میں ہی لکھ دوں گا۔ پتہ نہیں لکھ سکے جب اچھے تھے اکثر کہا کرتے تھے یہ بمبئی کی ادبی فضا کو کیا ہو گیا۔ صحبتیں نہ محفلیں۔ ہم لوگ کہیں مل کر بیٹھتے ہی نہیں۔ ایک مرتبہ اپنے گھر ایک نشست بھی رکھی تھی۔ سیٹھیا سدن والے فلیٹ میں۔ کچھ دن یہ سلسلہ ادھر اُدھر چلا، لیکن پھر وہی تعطل۔ دوبارہ اُنہوں نے بلایا نہیں۔ لیکن جو

بائیں سے دائیں : ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، نوشاد، جاں نثار اختر، آر۔ڈی۔برمن، اختر الایمان، فیض احمد فیض اور راجندر سنگھ بیدی

بُلائے گئے، ضرور گئے۔ ایک مرتبہ تو میرے ہاں اُس وقت پہنچے جب محفل برخاست ہو رہی تھی۔ اُس دن میں نے اپنی کتاب "سائے ہمسائے" کی رسم رونمائی اپنے ہی گھر منعقد کی تھی اور احباب ازراہِ تفنن جمع ہو گئے تھے۔ بیدی صاحب کسی میٹنگ سے آٹھ کر رات میں ۸ بجے صرف یہ کہنے کے لیے آئے کہ "اچھا کیا۔ دوسروں سے کہہ کر اپنی کتاب کی رسم اجرا کا جلسہ کرانے سے تو یہی بہتر ہے کہ یہ کام علی الاعلان کیا جائے۔ جب انہیں اور مجروح سلطان پوری کو غالب ایوارڈ ملا تھا تو اس وقت بھی آئے تھے۔ خاموش بیٹھے رہے۔ یہ بھی اُن کے زمانۂ علالت کی بات ہے۔ اُن کی کہانی شاید جاوید ناصر نے پڑھ کر سُنائی تھی۔ اس سے کئی سال پہلے گورنمنٹ کالونی باندرہ شرقی کے بال صدر ہال میں بھی بیدی اور مجروح ایک مرتبہ ایک ساتھ مسند نشین تھے۔ اور وہ محفل اس لیے یادگار ہو گئی تھی کہ اس میں ان دونوں ایک دوسرے کے دستِ راست نے تکلف اور تصنع سے عاری من تو شدم تو من شدی کی وہ کہانیاں سنائی تھیں جو نیندیں اُچاٹ کر دینے والی کہانیاں کہی جا سکتی ہیں۔ بیدی صاحب نے اپنی داستانِ حیات کے پُرزے اُڑا دیئے تھے۔ مجروح کی گرفتاری کا حال بیان کیا تھا اور بتایا تھا کہ وہ غزل کے کتنے رسیا ہیں اور پھر مجروح سلطان پوری نے اپنی کئی غزلوں کے علاوہ بیدی صاحب ہی کی فرمائش پر وہ غزل سُنائی تھی، جو فلم "دستک" کا حصہ بن گئی تھی۔

مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام<br>
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

"گرم کوٹ" اور "شاید" "آن دیکھی" میں بھی مجروح کے گانے ہیں۔ یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ بیدی، مجروح سلطان پوری، سہگل اور امر کمار چار حضرات علم ہندسہ کے وہ شکل تھے جسے مربع کہا جاتا ہے۔ یہ وہی سہگل صاحب ہیں جن کا بیدی صاحب کے خطوں میں جگہ جگہ ذکر ملتا ہے اور جن کا دلّی میں کاروبار ہے۔ یہ دوڑ دوڑ کر بیدی صاحب سے ملنے بمبئی آتے تھے۔ بیدی صاحب کا چھوٹا بیٹا جتیندر بیدی انہیں کے ساتھ دلّی میں رہتا تھا۔ امر کمار فلم ڈائرکٹر تھے۔ وہ زیادہ دن نہیں رہے ــــ اس چوکھٹے میں کوئی پانچواں آدمی شاید ہی داخل ہوا ہو۔ یہ مربع پہلے مثلث میں تبدیل ہوا۔ اور اب بیدی صاحب نے تو مثلث بھی توڑ دیا۔

یادیں تو اور بھی بہت سی ہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ بیدی صاحب کے بارے میں کچھ لکھنے کا حق مجھے نہیں پہنچتا۔ جو کچھ میں نے لکھا وہ صرف اس لیے کہ بیدی صاحب پر کسی کا اجارہ بھی نہیں تھا (نہ ہے) یہ تو ایک معمولی سا خراج ہے۔ اور اس میں بھی کہیں کہیں "میں" کی جھلک آ گئی ہے۔ جہاں جہاں بھی "میں" ہے شعوری یا نمائشی نہیں، جبریہ ہے، لیکن ہے یہ بھی معیوب۔

●●

ہنسراج رہبر

# راجندر سنگھ بیدی

## خطوط کے آئینے میں

راجندر سنگھ بیدی اب نہیں رہے۔ میں انہیں تب سے جانتا ہوں جب وہ لاہور پوسٹ آفس میں کلرک تھے اور سنت نگر میں رہتے تھے۔ حالانکہ وہ عمر میں مجھ سے ڈیڑھ دو سال چھوٹے تھے، لیکن انہیں شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے ساتھ اردو کے نامور افسانہ نگاروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ میری ادبی زندگی کی ابھی ابتدا ہوئی تھی۔ میں ان سب لوگوں کو شوق سے پڑھتا تھا۔ انہیں پرکھنے اور الگ الگ پہچاننے کا تنقیدی شعور بہت بعد میں پیدا ہوا اور ترقی پسند تحریک پر حاوی گٹ بندی اور غلط رجحانات کے خلاف لوہا لینا شروع کیا۔ تب تک بیدی فلم انڈسٹری سے وابستہ ہو کر بمبئی چلے گئے تھے اور لکھتے کم تھے۔ میں اپنے ہم عصروں میں اردو میں راجندر سنگھ بیدی اور ہندی میں امرت لال ناگر کا مداح تھا۔ میرے نزدیک یہ دونوں ایسے ادیب تھے، جنہوں نے عوام کے دکھ درد کو سمجھا تھا اور اسے نہایت خلوص اور ایمانداری سے پیش کرتے تھے۔ خصوصاً بیدی میں مجھے چیخوف بننے کے امکانات دکھائی دیتے تھے۔ مجھے اس بات کا ملال تھا کہ انہوں نے آرام و آسائش کے موہ میں دیس کے اس عوام سے قطع تعلق کر لیا، جو ان کے افسانوں کا موضوع تھے اور جنہیں ان جیسے مخلص ادیب کی واقعی ضرورت تھی۔ وہ اتنی گوناگوں مصروفیتوں سے وقت نکال کر کبھی کبھار افسانہ بھی لکھتے تھے۔ مگر اس میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی تھی، جو ان کی شروع کی تخلیقات میں تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ فلمی زندگی سے الگ ہو کر اپنے آپ کو ادب اور فن کے لیے وقف کر دیں۔ عوام کا ادیب بنتے اور آرام و آسائش کی زندگی گزارنے میں ایک ایسا تضاد ہے جو تخلیقی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتا ہے۔ ادیب کو ادیب بننے کے لیے ریاضت کرنا ہوتی ہے، تکلیفوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے میں ان کے افسانے برابر پڑھتا اور انہیں اپنی رائے صاف صاف لکھ دیتا تھا۔ اور وہ میری رائے سے ناراض ہونے کی بجائے خوش ہوتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے ان کے کس افسانے پر رائے زنی کی تھی، لیکن اس کے جواب میں ان کا ۲۶ اگست ۱۹۵۲ء کا خط میرے پاس محفوظ ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

"میرے افسانے کے بارے میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے اسے صحیح سمجھتا ہوں ایک تو یہ میری عادت کہ جو چیز لکھ چکتا ہوں، مجھے خود ہی نقائص سے پٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اب آپ کی اس بے لاگ رائے نے مجھے اسے دوبارہ پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے افسانہ زیادہ برا نہیں لگا، تاہم اس میں وہ نہیں ہے جسے مجھے عزیز رکھنے والے دوست "بیدیت" کہتے ہیں۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ آئندہ بہتر چیز لکھوں۔ میں نے لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ اگر مجھے آپ کی پُرخلوص آرا، کا خیال نہ ہوتا تو اب کے میں "شاہراہ" کو ایک افسانہ بھیج دیتا، جو کہ میں نے لکھ رکھا ہے، لیکن میں نے "پہاڑی کوا" کا ایک باب ہی بھیجنے پر اکتفا کیا کیوں کہ نظر ثانی پہ مجھے دوسرا افسانہ کبھی کمزور نظر آیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کی تنقید مجھ میں خود اعتمادی کو کم کر دیتی ہے بلکہ یہ کہ اچھا ادب پیدا کرنے کا جذبہ اور صیقل ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔"

اس خط کا آخری پیرا ہے: "ایک بات میں آپ اور دوسرے ساتھیوں سے کہہ دوں ——— میں ختم نہیں ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ میں لکھوں گا اور بہتر لکھوں گا۔ ایک ایسا موڑ آیا تھا، جس میں یاراں فراموش کردند عشق کا عالم تھا۔

۱۵۵۵/۲۴ - نوین شاہدرہ، دہلی ۱۱۰۰۳۲

لیکن اب وہ قحط سالی ختم ہو گئی ہے۔ "پہاڑی کوّا" ابھی ختم نہیں ہوا۔ ختم کرنے کے بعد اس کی پبلشنگ کے لیے آپ کو لکھوں گا۔"

"کالا کوّا" ناول کا وہ باب "شاہراہ" میں شائع ہوا تھا۔ میں نے اس پر سبھی رائے کا اظہار کیا۔ بیدی نے ۱۳ ستمبر ۱۹۵۲ء کے خط میں جواباً لکھا:

"مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میرے ناول کا باب پسند کیا ہے۔ میں اسے جلد سے جلد مکمل کروں گا اور آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ اس ناول کے مرکزی کردار پنجاب کے کانگریسی لیڈر کیدار ناتھ سہگل تھے، جن کی سیاہ پوشاک ان کی انقلابیت کی علامت تھی۔ اس دَور کی کھوکھلی سیاست پر بھرپور طنز تھی، لیکن یہ ناول مکمل نہیں ہوا۔ ایک باب چھپ کر رہ گیا۔

اس وقت ترقی پسند تحریک پر حاوی گُٹ سے میرے اختلافات واضح ہو چکے تھے۔ اپنے اس خط میں بیدی لکھتے ہیں:

"آپ کا خط ملا۔ ممنون ہوں۔ آج سجاد ظہیر ایسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ کاش ہماری تحریک کے اوائل میں انہوں نے اس ہوش مندی کا ثبوت دیا ہوتا۔ ہم لوگ اپنے گرد و پیش کے احساس کے ساتھ مطلوبہ ادب پیش کر رہے تھے، لیکن ان لوگوں نے ہماری غلط رہنمائی کی۔ اگر براہِ راست کچھ نہیں کہا تو ہمارے "لیڈروں" کی بے راہ روی کے زمانے میں مجرمانہ خاموشی اختیار کیے رکھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے سے بڑے ادیب کے دماغ میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ ہم صرف سیاسی مضمون، مزدور اور کسان کی زندگی اور جنسی زندگی کا واویلا کر سکتے ہیں۔ چونکہ مرد اور عورت کے تعلقات کی طرف توجہ ہوز آمیزول ہو گئی ہے، لہٰذا ایک نام نہاد جنسی آزادی کی مانگ، مزدور کسان کی ہاؤ ہو کے علاوہ اپنے محلّے کے روزمرّہ کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ آج بھی جب بیٹھ کے کسی مضمون پر غور کرتے ہیں تو دماغ انہی چیزوں کی طرف جاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے ان بانیوں نے جہاں ہمارے شعور کو نکھارا کیا، وہاں کئی طریقے سے بے حد نقصان بھی پہنچایا۔ میں تو دعوے سے کہتا ہوں کہ میرا شعور اس تحریک میں آنے سے کم صیقل ہوا۔ میں صرف نیک نیتی اور ایمان داری، خلوص وغیرہ کا ثبوت دیتا تو لکھنا پڑھنا جاری رہتا۔"

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "دانہ و دوام" تبھی چھپ گیا تھا جب وہ لاہور میں تھے۔ جب اس میں "گرم کوٹ"، "گرہن" اور "تلادان" وغیرہ کہانیاں شامل تھیں جو بے حد مقبول ہوئیں اور ان کی شہرت کی بنیاد بنیں۔ ان میں ایک اچھے کہانی کار کے سبھی گُن تھے۔ وہ اپنے موضوع سمجھ سوچ کر چنتے تھے۔ کہانی کے مرکزی خیال کو اُبھارنے کے لیے باقاعدہ پلاٹ بنتے اور اس کے مطابق جزئیات فراہم کرتے تھے۔ کم لکھتا لیکن بہتر لکھتا۔ اس اصول پر اُس دَور کے اگر کسی ادیب نے سختی سے عمل کیا

تو وہ راجندر سنگھ بیدی تھے۔ بنگال کے قحط اور فسادات کو لے کر نام نہاد ترقی پسندوں نے ڈھیروں لکھا جیسے عوام کے دکھ درد کو انہیں نے اوڑھ لیا ہے لیکن جن چیزوں (میں انہیں کہانیاں نہیں کہوں گا) کا ان دنوں خوب چرچا رہا۔ آج ان کے کسی کو نام تک یاد نہیں اور ان پر بنی جھوٹی شہرت بھی زیادہ دنوں نہیں ٹک سکی۔ لیکن دنگوں پر لکھی گئی جو دو کہانیاں اب تک یاد ہیں اور یاد رہیں گی وہ ہیں، سعادت حسن منٹو کی "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور راجندر سنگھ بیدی کی "لاجونتی" (چھوئی موئی)۔ بیدی نے فسادات پر شاید یہی ایک کہانی لکھی ہے، لیکن کیا کہانی ہے اور کیا بات پیدا کی ہے۔

ادیب میں اگر خلوص اور ایمان داری ہے (جیسا کہ بیدی میں تھی) تو وہ اس زندگی کی عکاسی کرتا ہے، جس سے وہ بخوبی واقف ہے، خواہ وہ کتابی ذہین کیوں نہ ہو، اُس کے لیے دُور کی کوڑی لانا ممکن نہیں۔ لوسون عوامی اور انقلابی ادیب تھے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہیں۔ انہیں کسی نے کہا کہ آپ مزدور کے بارے میں لکھتے تو مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں مزدوروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا"۔ پریم چند کو کسانوں پر لکھنے کا حق اس لیے پہنچتا ہے کہ اُنہوں نے دیس کے کسان عوام کو اور ان کا استحصال کرنے والے زمیں داروں اور کارندوں کو بہت قریب سے دیکھا، سمجھا تھا۔ گورکی کی شروع کی کہانیوں کا موضوع 'آوارہ' عناصر تھے، اُنہوں نے مزدور کو اپنی تخلیقات کا موضوع تب بنایا جب روس کا مزدور طبقاتی شعور سے لیس ہو کر اور منظم ہو کر انقلاب کی راہ پر چل پڑا تھا اور گورکی کو اس انقلابی مزدور سے قربت اور ذہنی تعلق تھا۔ سوال یہ نہیں کہ آپ کی تخلیقات کا موضوع کیا ہے؟ سوال یہ ہے کہ آپ کا نظریہ کیا ہے، اُرخ کیا ہے؟ آپ کی ہمدردیاں محنت کش عوام کے ساتھ ہیں یا ان کا استحصال کرنے والوں کے ساتھ!

جنسی آزادی کا رجحان، جسے جنسی زاجیت بھی کہا جا سکتا ہے، مغرب کے انحطاط پسند ادب سے آیا۔ اس کی تہہ میں یہ فرائڈ وادی نظریہ کارفرما تھا کہ بربریت کے دَور میں جب مرد مرد تھا، عورت عورت تھی، اس پر اخلاق اور قانون کا کوئی بندھن یا دباؤ نہیں تھا، تب فرد مکمل طور پر آزاد تھا۔ نام نہاد تہذیب اور اخلاق نے فرد سے اس کی یہ آزادی چھین لی ہے، جو اُسے دوبارہ حاصل کرنی ہے۔ دراصل یہ سماج دشمن اور روایت دشمن رجحان تھا، جو ترقی پسند تحریک پر غالب رہا۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور جیمز جوائس کی اندھی تقلید ہوئی۔ ہر ادیب جو تاریخ کے ارتقائی عمل سے واقف نہیں تھا کم و بیش اس رجحان سے متاثر ہوا۔ میری اپنی ایک کہانی "بیاہ" بھی اس ذیل میں آتی ہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے فرائڈ وادیوں نے اُسے خوب سراہا تھا۔ میں نے اس رجحان کو بعد میں سمجھا اور اس سے نجات پائی۔ بیدی کی "گرہن" بہتر کہانی

اس ذیل میں آتی ہے۔ کہانی کا مطلب یہ ہے کہ بیاہتا عورت اور طوائف میں چنداں فرق نہیں۔ بلکہ گھریلو عورت کے مقابلے میں طوائف کی حالت بہتر ہے۔ کیوں کہ اس پر کسی ایک مرد کی اجارہ داری نہیں۔ فرائڈ وادی نظریئے کا اثر 'لمبی لڑکی' اور کسی حد تک 'میلی چادر' ناولٹ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ اثر بیدیت سے ہٹ کر ہے۔ سفید چادر پر لگے ہوئے ایک داغ کی طرح ہے۔ بیدی نے جس طرح سستی شہرت کے لیے اخبار میں خبر پڑھ کر ہنگامی واقعات پر سطحی اور سپاٹ چیزیں لکھنے سے گریز کیا، اسی طرح سستی مقبولیت کے لیے قاری کی اس کمزوری سے فائدہ نہیں اٹھایا جس سے مرد اور عورت کے تعلقات کی طرف فوراً توجہ مبذول ہوتی ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ شہرت حاصل کرنے کے بعد بیدی نے بھی انہی لوگوں کی روش اپنائی، جو ادب میں کیریئر بنانے آئے تھے، جن کے نزدیک ترقی پسندی کا مطلب یہ تھا کہ جیسے بھی ہو اپنے کو بڑا ادیب مشہور کر دو پھر اس شہرت کو بھنالو۔ "دانہ و دام" کی اشاعت پر حاصل ہوئی شہرت کے بعد انہوں نے ڈاک خانے کی کلرکی چھوڑ دی اور پھر ریڈیو سے ہوتے ہوئے فلم میں پہنچ گئے۔ جتنا پیسہ فلم میں ہے اتنا اور کہیں نہیں۔ پیسے کی کشش پریم چند کو بھی فلم میں لے گئی۔ لیکن وہ زیادہ دنوں وہاں ٹک نہیں پائے، کیوں کہ وہاں ٹکے رہنے کا مطلب تھا اصول اور خلوص کی قربانی دینا۔ نمک کی کان میں اپنے کو نمک ہونے سے بچانا۔ پیسہ یوں ہی نہیں مل جاتا۔ اس کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کرنی ہوتی ہے۔ بیدی نے ۱۸ ستمبر ۱۹۵۲ء کے خط میں لکھا تھا:

"میں آج کل روزگار کی فکر میں ہوں۔ آپ حیران نہ ہوں۔ یہاں ایسے مرحلے بھی درپیش آتے ہیں، جب دوسرے وقت کی روٹی کی فکر ہو جاتی ہے"!

جس روٹی کے لیے اتنی دوڑ دھوپ کرنی پڑے اس میں روٹی اول اور باقی سب چیزیں ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ ادبی تخلیق کے لیے فرصت ملے تو کیسے ملے؟ یہ دوڑ دھوپ آپ کے فن کار کا گلا گھونٹتی ہے اور مرنے پر مجبور کرتی ہے۔ بیدی کے فن کار نے گلا گھٹنے کے کرب کو محسوس کیا۔ ہاتھ پاؤں پٹکے، اپنے آپ کو اور اپنے دوستوں کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ "میں ختم نہیں ہوا۔ لکھوں گا اور بہتر لکھوں گا"۔ لکھا بھی لیکن "اپنے دکھ مجھے دے دو" اور "ایک چادر میلی سی" کے علاوہ کوئی چیز ایسی نہیں لکھ پائے جس سے وہ خود مطمئن ہوتے۔ انہیں اپنے آپ کو دھوکا دینا منظور نہیں تھا۔ جو چیز پسند نہیں آئی، اسے لکھا اور پھینک دیا یا پھر ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ فلم سے الگ ہو کر ایک سچے فن کار کی زندگی جینا چاہتے تھے۔ میں جولائی ۱۹۶۳ء میں حیدر آباد ہوتا ہوا بمبئی گیا۔ اور کوئی پندرہ دن وہاں رکا۔ ایک دن بیدی نے صبح ہی میں مجھے..... بلوا لیا اور وہ پورا دن انہیں کے ساتھ بیتا۔ اپنے بڑے لڑکے نریندر بیدی سے ملایا اور افتخار و مسرت سے ملے جلے لہجے میں کہا:

" I will pass on bucket to him and devote my self to literature"

(میں اپنی ذمہ داریاں اب اسے سونپ دوں گا اور اپنے آپ کو ادب کے لیے وقف کر دوں گا) خوب باتیں ہوئیں۔ بیدی بول رہے تھے اور میں سن رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ دل کے پھپھولے پھوڑ رہے ہیں۔ جس ماحول سے اور جن ترقی پسند لوگوں سے وہ گھرے ہوئے تھے، ان سے وہ بہت ہی ناخوش تھے۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ عوام دوستی کے دعوے جھوٹے ہیں۔ نہ کیریکٹر ہے نہ خلوص ہے۔ انسان اگر اچھا انسان نہیں ہے، تو وہ اچھا ادیب بھی نہیں۔

بیدی بلاشبہ اچھے انسان تھے۔ انہوں نے مجھے مختلف اسٹوڈیوز میں گھمایا اور کئی لوگوں سے متعارف کرایا۔ فلم انڈسٹری میں ان کی بڑی عزت تھی۔ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے شرافت، سنجیدگی اور نیک نیتی پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔ انہوں نے جو ڈائیلاگ لکھے، ان سے بیدیت صاف جھلکتی ہے۔ 'گرم کوٹ'، 'دستک'، 'پھاگن' فلموں پر بھی ان کے کردار کی چھاپ ہے۔ لیکن فلم سے الگ ہو کر ادب کے لیے وقف کرنے کی حسرت پوری نہیں ہوئی۔ ادب کے لیے وقف کرنے کا وقت گزر چکا تھا، مگر لکھنے کی تڑپ بدستور بنی رہی۔ ۱۳ اگست ۱۹۶۴ء کا ان کا خط ہے:

"پیارے رہبر۔ سلام محبت!

بھائی میں قریب قریب ٹھیک ہوں۔ بیمار ضرور ہوا تھا، مگر اتنا نہیں کہ کوئی اسے اخبار میں چھاپ دے۔ دراصل کسی دوسرے طریقے سے شہرت حاصل کرنا چاہتا ہوں، لیکن بہر حال نام کسی بھی طور چلے۔

میں بہت ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اس سلسلے میں "بازپرس" کی۔ آپ کیسے ہیں؟ آج کل کیا لکھا جا رہا ہے۔ میں نے پچھلے دنوں کچھ کہانیاں لکھی تھیں، لیکن پھر فنا فی اللہ ہو گیا۔ ہم اڑنے بھی نہیں پاتے کہ گرفتار ہو جاتے ہیں"

بہت پیار کے ساتھ:

آپکا: راجندر سنگھ بیدی

اس کے بعد میرا زیادہ تر وقت جیلوں میں گزرا اور ہمارا خط و کتابت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

مدن لعل منچندا

# ادبی ذوق

عام طور پر تنقیدی بحث میں ادبی ذوق کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اس کی
جہ شاید یہ ہے کہ ادبی ذوق کی نوعیت سراسر ذاتی اور نجی ہے۔ بعض دفعہ اسی
نا پر ایک تنقید نگار کو صاحبِ ذوق نہیں سمجھا جاتا اور اکثر اس کی ناموافق رائے
ز اس کی ادبی بدذوقی پر محمول کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر تنقید کسی نہ کسی
شکل میں ناقد کے ادبی ذوق سے ہی متاثر ہوتی ہے۔ اگرچہ ادبی ذوق کی صحیح
تعریف پر اختلافِ رائے ہو سکتا ہے۔

ادبی ذوق سے کیا مراد ہے اور اس کی صحیح تفسیر کیا ہے۔ اس کی کوئی
سلی بخش وضاحت ابھی تک نہیں کی جا سکی ہے۔ مثال کے طور پر ڈرامہ نگاری
ی کو لیجئے۔ شیکسپئر کے ڈرامے جو کلاسیکی ڈراموں کے ذیل میں شمار ہوتے ہیں،
س دَور کے عوام میں بھی بے حد مقبول ہوئے تھے۔ بلاشبہ ان سامعین کی
یک خاصی تعداد ان افراد پر مشتمل تھی، جن کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اعلیٰ
دبی ذوق رکھتے تھے۔ اس طرح آج صدیوں کے بعد بھی ان کی شہرۂ آفاق
مقبولیت کم نہیں ہوئی۔ حالانکہ موجودہ دَور ادبی ذوق کے سنورنے اور پنپنے کا
بہترین دَور سمجھا جاتا ہے۔

جدید ناقدوں نے ان ڈراموں کو ہر تنقیدی کسوٹی پر پرکھ کر سراہا ہے۔
ن سب باتوں کے پیشِ نظر ادبی ذوق کو اس میزان یا رشتے سے تعبیر کر سکتے ہیں جو
رنہ آنے کے باوجود تنقید میں ایک توازن لاتا ہے۔

اس بحث سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارا ادبی ذوق ہماری ادبی سمجھ
و فہم کے لیے ذمہ دار ہے۔ اور اسی پر ہماری پسند یا ناپسندیدگی منحصر ہے اور
س نے ادبی تنقید کے اصولوں کو ترتیب دیا ہے۔ ادبی تنقید میں جِلا اور تنوع اسی
دبی ذوق کی پیداوار ہے۔ روایات کو سمجھنے اور ان کو بدلنے اور سنوارنے میں
بھی یہی ادبی ذوق ذمہ دار ہے۔ ادبی ذوق کی تشکیل اور ترویج کے لیے وسیع
مطالعہ، لگن اور بلندیٔ نظر ناگزیر ہیں۔ اس کے علاوہ اگر آپ اس میں نئی راہوں
کے متلاشی ہیں تو آپ کو معین راہوں سے ہٹ کر ایک انفرادی جستجو کا سہارا لینا
ہوگا۔ اور اس جستجو کی یہی تمنا ادبی ذوق کی داغ بیل ہے۔

ہر دَور میں ایک خاصی تعداد ان علماء یا فنی شاہکاروں کے متلاشیوں
کی پائی جاتی ہے، جنہیں صاحبِ ذوق مانا جاتا ہے، لیکن ان ماہرین کی رائے
صرف ماضی کے شاہکاروں اور فنونِ لطیفہ کے بارے میں ہی ملتی ہے۔ خود اُن کے
زمانے میں بہت سے فنی شاہکار ان کی قیمتی رائے سے مستفید نہ ہو سکے۔ دنیا
کے ہر ادب میں اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ہندوستان میں بھی غالب
کے ہم عصر شعراء غالب کو سمجھنے سے قاصر رہے اور اُس وقت غالب کی بلندیٔ فکر
کا صحیح تعین نہ ہو سکا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ تنقید کا واحد کلیہ آئندہ آنے والی نسلوں کی
رائے اور ادب کی حقیقی پرکھ وقت کی کسوٹی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ
کہہ سکتے ہیں کہ ادبی ذوق کا تعلق مختلف ادوار سے ہے۔ اس لیے وہ ناقد جو اپنے
ہی دَور میں عصری ادب کا جائزہ لیتا ہے اور اس کا صحیح مقام متعین کرتا ہے۔ وہ
صاحبِ ذوق کہلانے کا مستحق ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وقت کی آنے والی
نئی منزلوں میں اس کے مقام اور درجہ میں کوئی فرق آ جائے۔ خیال و نظر کی
یہ تبدیلی ناگزیر ہے۔

اس بارے میں ایک بات کہنی بڑی ضروری ہے کہ جب تک دورِ ماضی
میں بدل کر تاریخی اہمیت نہیں حاصل کر لیتا اُس وقت تک اس ادب کی جانچ
اور اس دَور کے تنقیدی اصولوں کا مطالعہ ممکن نہیں ہوتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا
ہے کہ مستقبل کے دَور کا ناقد پرانے دَور کے ادب کی زیادہ صحیح جانچ اور پرکھ کر سکتا
ہے۔ مثلاً میتھیو آرنلڈ جیسے نامور ناقد بھی اپنے دَور کے کئی مصنفوں اور شعراء کا

• ڈی-۳۸۲-موتی باغ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۱

صحیح درجہ اور مقام متعین نہیں کرسکے۔ اسی طرح گوئٹے جیسے بلند پایہ ناقد اور فن کار نے کلائیسٹ جیسے مصنف کے عظیم شاہکار پینتھی سیلیس کو لیبورٹری ٹریجڈی کے رد کر دیا تھا۔ کیوں کہ یہ شاہکار اُس دور کے مقابلے میں آنے والی نسلوں کے ادبی ذوق کی زیادہ ترجمانی کرتا تھا۔

اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہر دور کا ادبی ذوق دوسرے دور کے ادبی ذوق سے مختلف ہوتا ہے۔ تاہم ادبی ذوق سے قطع نظر حقیقی فن پارہ اور شاہکار ہر دور کے ادبی ذوق سے بالاتر ہو کر ایک ابدی شہرت کا حامل بنتا ہے۔ چنانچہ ایسی لازوال ادبی تخلیقات کی کمی نہیں جو ہر دور میں ادبی شاہکار تسلیم کی گئیں۔ اسی طرح ادبی تنقید بھی بنیادی طور پر ہر دور کے ادبی ذوق سے بلند ہو کر ایک فنی شاہکار کی آفاقی اور بنیادی اصولوں پر پرکھ کی متحمل ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک مخصوص دور کا مجموعی ادبی ذوق اس دور کے ادبی رجحان اور تنقید پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے۔

وہ ادبی ذوق جسے ہم برتر ادبی ذوق کا درجہ دیتے ہیں، وہ چند خصوصی ادوار میں ہی نمایاں ہوتا ہے۔ مثلاً ان ادوار میں سماج کی تشکیل کا دارومدار شاہی دربار، امرا اور روٴسا پر رہا ہے۔ ان ادوار میں سلاطینِ وقت اور امرا اور روٴسا کے مخصوص اور واضح ذوق کی جھلک اس دور کے ادب میں واضح طور پر ملتی ہے۔ یوں بھی رہن سہن، لباس و پوشاک اور دیگر فنونِ لطیفہ میں اُن کا ذوق ایک برتری کا حامل تھا۔ لیکن بدقسمتی سے حکمراں طبقے کے ادبی ذوق کی ایک بڑی خرابی یہ رہی ہے کہ وہ اُنہی کے خصوصی اختیارات کے تحفظ یا اُن کی مفاد پروری اور اُن کی شان و شوکت کے لیے استعمال ہوا ہے۔

موجودہ دور میں اُس وقت کے امرا اور روٴسا کی جگہ اعلیٰ طبقے کے امیر اور خوشحال افراد نے لی ہے اور ان کی دولت کی فراوانی ہی موجودہ دور کے ادبی ذوق کی سربراہ نظر آتی ہے۔ مثلاً آج اسٹیج پر تمام تر توجہ سیٹوں، ملبوسات میک اَپ اور روشنی کے بدلتے ہوئے زاویوں پر مرکوز ہوتی ہے۔ فن اور کردار نگاری پر وہ توجہ نہیں دی جاتی۔ ظاہر اور باطن میں بھی ایک خاص فرق نمایاں ہے۔ چنانچہ خوشنما اور خوبصورت کتابی جلدوں میں اکثر خس و خاشاک ہی پڑھنے کو ملتا ہے۔ چند انفرادی مثالوں کو چھوڑ کر نئے دور کی بیشتر تصنیفات ان اعلیٰ اقدار اور صفات سے   ہیں جو ماضی میں اعلیٰ ادب سے وابستہ رہی ہیں۔ نئی تخلیقات میں وہ فنی چابک دستی، خیالات کی گہرائی، متنوع اور اعلیٰ اقدار ملتی ہیں اور شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید مدتوں کا متوازن ذوق اپنے معیار کو کھو چکا ہے۔

ادب میں اس کم مائیگی کے کئی اسباب ہیں۔ لیکن ان سب میں سب سے بڑا سبب عوام کا بدلا ہوا ادبی ذوق ہی ہے۔ موجودہ ادبی ذوق کی وجوہ [illegible] نہیں۔ ہمارے خصائل کی تشکیل سماج سے ہی ہوتی ہے۔ موجودہ انتشار جس میں تعلیمی انتشار بھی شامل ہے اور رہن سہن کے تیزی سے بدلتے ہوئے طریقے جن میں ایک ذہنی تعیش اور رومانس پسند زندگی کو بھی دخل ہے، موجودہ [illegible] کے لیے ذمہ دار عناصر کہے جا سکتے ہیں۔ آج کا نوجوان سہل نگاری، فرار اور تخریبی دنیا کا شکار ہے۔ اور اُس کا ہر عمل ایک راہ روی اور اُلجھن سے عبارت ہے۔ اُس کا ذہن کسی بھی سنجیدہ کوشش پر مائل نہیں ہوتا۔ ان تمام امور کا نتیجہ ادبی ذوق کی گراوٹ میں نمودار ہو گیا ہے۔

چنانچہ ایک سستے اور مبہم ادب کی پیداوار جس کثرت سے آج ہے۔ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس کا ایک براہِ راست اثر یہ پڑا ہے کہ موجودہ [illegible] کو بھی ادبی تخلیقات کے کسی انبار میں ادبی محاسن اور محبوب ڈھونڈنے پڑے اور وہ بھی ادبی ذوق کے اس انتشار کی مزاحمت نہ کر سکا۔ چنانچہ آج کے ادبی نقاد [illegible] سی ایسی ہی تخلیقات کو سراہنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ لیکن تنقید کے عوامی ذوق سے ہم [illegible] ہونے کی یہ مثال نہ نئی ہے اور نہ ہی اسے کسی طور پر خطرناک کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے [illegible] میں بدلتے ہوئے طاقت ور رجحانات ایک ایسی ہمہ گیری رکھتے ہیں جن سے گریز [illegible] نہیں۔ تاہم ادبی ذوق وقت کے دھارے کی مانند تغیر پذیر ہے اور موجودہ [illegible] ذوق اور تنقید میں اس کا وجود موجودہ ادبی دور کے ایک نمایاں نشان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جب یہ دور کروٹ لے گا اور موجودہ انتشار ایک نئے ہم [illegible] اور زیادہ دیرپا دور کو جگہ دے گا تو ادبی ذوق بھی یقیناً ان اثرات کو قبول [illegible] نئے اور اعلیٰ تنقیدی اصولوں کو جنم دے گا۔

چنانچہ ادبی ذوق کو ایک ایسے نظر نہ آنے والے رشتے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو فن اور تنقید میں ایک توازن لاتا ہے۔ اس کا تخلیقی فن اور تنقید [illegible] گہرا اثر لازمی ہے۔ عموماً تنقید اور فن مختلف ادبی ذوق کے حامل نہیں ہو سکتے [illegible] اس کے ساتھ ہی ادبی ذوق کی کوئی معین یا مستقل صورت نہیں ہے اور ہر دور کی سماجی زندگی اور رہن سہن کے طریقے اسے متاثر کریں گے۔

لاس ویگاز کا ایک روشنیوں سے بھرا منظر

# لاس ویگاز ـــــ ویرانے میں جنت

ستیش بترا

لاس ویگاز پہنچنے پر جن دو چیزوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ تھیں یہاں کی روشنیاں اور سکوں کی جھنکار!

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں سب سے مدھر آواز پیسے کی ہے اور اگر سکوں کی جھنکار سننا درکار ہو تو اس جگہ سے موزوں اور کوئی مقام نہ ہوگا۔ یہاں کے جوئے خانوں میں جب مشینوں سے سکے برستے ہیں تو وہ خاص دھات سے بنے ہوئے برتنوں میں گرتے ہوئے ایسی شوخ اور کھنکتی ہوئی آواز پیدا کرتے ہیں کہ آس پاس کے مشینوں کے کھلاڑیوں اور آتے جاتے لوگوں کا تانتا بندھ جانا لازمی ہے۔ مشین کی امتیازی جلتی بجھتی روشنیوں کے درمیان ان سکوں کی آواز سارے ہال میں اس طرح سے گونجتی ہے جیسے چاروں طرف سکے ہی سکے برس رہے ہوں۔

اور پھر اگر یہی مسحور کن آواز ہر چند منٹوں میں کبھی دائیں کبھی بائیں کبھی آگے کبھی پیچھے گونجے تو یقین ہو جاتا ہے کہ اگر آپ نے اس کوشش میں حصہ نہیں لیا تو آپ سا احمق انسان کوئی نہ ہوگا۔

مسکراتے حسین چہرے ـــــ سچ پوچھئے تو ہر مسکراتا چہرہ حسین ہوتا ہے ـــــ ایک دوسرے سے جڑے، گردنیں پھنسائے، پیروں میں ایڑیاں اٹھائے، کچھ حیرت، کچھ رشک اور کچھ حاسد بھری نگاہوں سے اس نظارے کو محو ہو کر دیکھتے ہیں۔

• ۵۴۰-۱۶/ اے فرید آباد ۱۲۱۰۰۲

آتی جاتی دہکی، بئیر یا جوس پلاتی، سڈول ٹانگوں کی نمائش کرتی، زرق برق کپڑوں میں ملبوس، نیم برہنہ لڑکیاں دانستہ طور پر ایسی مغنیوں کے پاس ایک لمحہ کے لیے رک جاتی ہیں تو نہ صرف جیتنے والے کا حوصلہ بلند ہوجاتا ہے بلکہ ہارنے والوں کو بھی عجب تقویت کا احساس ہوتا ہے۔ گرماتی جوانی اور پیسے کا یہ میل ایک عجیب نشہ ہے جو یہاں ہر کسی کو مسحور رکھتا ہے اور ہر کوئی اس نشہ کی پینک میں ان جوئے خانوں کے مالکوں کی جیبیں بھرنے میں ایک نئے عزم کے ساتھ جٹ جاتا ہے۔

ایسے جوئے خانوں کو جہاں تفریح اور ناچ وغیرہ کا انتظام رہتا ہے، فرانسیسی اصطلاح میں کیسینو (CASINO) کہا جاتا ہے۔ یہاں مشینوں کے علاوہ جوئے کے کئی قسم کے کھیلوں کا اہتمام ہے۔ رولٹ (ROULETTE) وہ پہیہ جو آپ کے داؤں پر لگائے ہوئے نشان سے مس ہوتا ہے، اکثر اگلے ہی نشان پر رکتا ہے۔ یا تاش کے مختلف کھیل بلیک جیک (BLACK JACK) پاکر (POKER) "۲۱" وغیرہ جہاں تاش بانٹنے والے کیپٹن کے پاس ہی اور کبھی دائیں بائیں آپ سے بہتر پتے یا اُن کے جوڑ نکلتے رہیں اور جب کبھی آٹھویں دسویں بار قسمت آپ پر مسکراتی ہے تو وارے نیارے نہ بھی ہوں تو کم سے کم ایسا ہونے کی اُمید تو ضرور بندھ ہی جاتی ہے۔ جوئے کے کھیلوں میں نفسیات کے پہلو کو ایک دل فریب حد تک استعمال کیا جاتا ہے۔ کچھ اس طرح سے کہ آپ داسیوں کے نرغے میں تو پہنچ جائیں لیکن وانی ملنے کی اُمید میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگاتے رہیں! لیکن پھر بھی کبھی کبھار جب کوئی منچلا سب سے بڑا انعام جیک پاٹ (JACK POT) جیت جاتا ہے تو ہر ہارنے والا اپنی قسمت کے پلٹنے کا قائل ہوجاتا ہے۔

یہاں پر ہر تاش بانٹنے والے کیپٹن کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ آپ کو کامیابی کے سپنے دکھاتے اپنے کیسینو کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم بٹور سکے تاکہ وہ ایک مناسب حصّہ کا حق دار بن سکے ــــــ بصورت دیگر اس کی اپنی نوکری خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اس کے اس کام کو آسان کرنے کے لیے وہ نیم برہنہ کافر ادا، حسین و جمیل لڑکیاں بھی ہیں جو ہر کھلاڑی کو گاہے گاہے مفت مشروبات پیش کرتی رہتی ہیں۔ وہ چھپے ساتھی بھی ہیں، جو ضرورت پڑنے پر کسی حیثیت سے کھلاڑی کی میز پر کھیل میں شامل ہو جاتے ہیں۔ جب کبھی کوئی بڑی رقم جیت جاتا ہے تو وہ میز کے تمام ساتھیوں کے لیے جام کے دور کا آرڈر کرتا ہے تاکہ وہ اپنی نئی امارت کا سکہ جما سکے اور جب کبھی کوئی بدنصیب بہت کچھ ہار جاتا ہے تو پتے بانٹنے والا کیپٹن اور ایسے ساتھی اُسے تسکین بھرے جملوں سے بھی نوازتے ہیں:

ٹیک اِٹ ایزی (TAKE IT EASY)
کیپ ہارٹ (Keep Heart) یا
بیٹر لک نیکسٹ ٹائم (BETTER LUCK NEXT TIME)

تاکہ جذبات سے مغلوب ہوکر وہ شخص کوئی غیر مناسب حرکت نہ کر بیٹھے۔ پھر بھی سال میں دو چار ایسے اشخاص کی ہوٹل میں جاکر خودکشی کی خبر ملتی رہتی ہے۔ لیکن یہ بھی لاس ویگاز کا معمول ہے اور معمول کی خاطر کوئی اس قدر حسین دل بہلاوے کو کیوں چھوڑ دے!

ان ہی کیسینوز کا ایک اور پہلو ان کا چُست و چوکس باخبر سیکوریٹی اسٹاف ہے! چونکہ ہر کیسینو میں لاکھوں کا ہیر پھیر ہوتا رہتا ہے۔ پیسے کی تمام ذمہ داری نیز کسی بھی گڑبڑ کو سنبھالنا انہیں کی ڈیوٹی ہے۔ وردی میں یا سادے کپڑوں میں ملبوس اُن کی عقاب جیسی نگاہیں کیسینو کے ہر کونے کا جائزہ لیتی رہتی ہیں۔ اُن کی مدد کے لیے پوشیدہ جگہوں پر ٹی وی کیمرے نصب رہتے ہیں۔ اور وہ موقع پڑنے پر وقت سے پہلے ہی حالات پر قابو پا لیتے ہیں۔

لاس ویگاز کو امریکی جوئے کی راجدھانی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ قانونی طور پر جُوا کھیلنے کی اجازت اس شہر کے علاوہ رینو (RENO) اور اٹلانٹک سٹی (ATLANTIC CITY) میں بھی ہے، لیکن یہاں جیسی بات کہاں! لاس ویگاز کی اپنی آبادی آٹھ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ جب کہ یہاں دو کروڑ سے زائد لوگ اپنا شوق پورا کرنے آتے ہیں۔ یہاں کے کیسینو اپنی مثال خود ہیں اور ان کے ساتھ وابستہ دیگر سہولیات اور تفریح کے سامان نے ہی اُسے بجا طور پر اس لقب کا مستحق بنایا ہے۔

یہاں ہر طرح کے ہوٹلوں، موٹلوں اور گیسٹ ہاؤسوں کی بھرمار ہے۔ ان میں سے بیشتر کسی نہ کسی کیسینو سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے اکثریت کے اپنے کنسرٹ ہال ہیں، جہاں امریکہ بھر کے بہترین آرٹسٹ، گلوکار، آرکسٹرا، ڈرامہ اور اوپرا اپنے کمالوں کا مظاہرہ کرنے یہاں آتے رہیں۔ ملک بھر کے اکثر اوّلین شو اور پریمیئر یہیں منعقد ہوتے ہیں۔ اُن کی یہاں پر کامیابی اور ناکامیابی ہی اکثر کسوٹی مانی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سٹرپ ٹیز ڈانسیز، بلیو فلمیں، سیکس شاپ ــــ وغیرہ تو اب ہر جگہ ہی مل جاتے ہیں۔ گاہکوں کو بھی متوجہ کرتے ہیں۔

زیادہ سے زیادہ تعداد میں گاہکوں کو یہاں لانے کے لیے اکثر ہوٹلوں اور کیسینو نے کئی ہوائی اور بس کمپنیوں سے کنٹریکٹ کر رکھے ہیں۔ یہ بس اور ہوائی کمپنیاں، نہایت ہی ارزاں داموں پر گاہکوں کو لاس ویگاز لے آتی ہیں۔ ایسے سفر کے لیے صرف شرط یہ ہے کہ ان مسافروں کو ان کیسینوں میں کم سے کم ۴، ۶ گھنٹے بِتانے ہوں گے۔ کیسینو اپنے سے وابستہ لانے والی بسوں اور ہوائی کمپنیوں کا گھاٹا پورا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہی کیسینو مسافروں کی رہائش و طعام کا انتظام بھی بہت معقول دروں پر کر دیتی ہیں۔ ان کا مقولہ چند الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے: گاہک تم لے آؤ۔ کپڑے

▲ کیسینو سرکس : سرکس کا روشنیوں سے منور ایک منظر (لاس ویگاز)
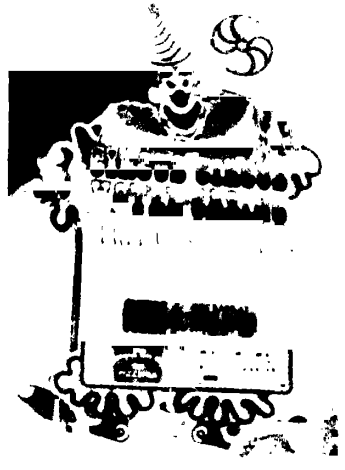
تفریح ، تعیش یا قسمت کی آزمائش : ◀
قمار خانے کا ایک اندرونی منظر

'اُترو انا' ہمارا کام!

ظاہر ہے کہ اس انڈسٹری کو —— اور جوا واقعی ایک انڈسٹری ہے —— چلانے میں کیسینو، ہوٹل اور تفریح گاہوں کے مالکوں کے ساتھ صوبائی سرکار بھی اُن کی آمدنی میں لائسنسوں اور ٹیکسوں کی صورت میں ہی سہی، شریک ہے۔ اس انڈسٹری کو رائج کرنے کے پیچھے تاریخی اور اقتصادی وجوہات کی ایک دلچسپ کہانی ہے۔

نواڈا کا صوبہ جس میں لاس ویگاز اور رینو دونوں ہی واقع ہیں۔ ایک صحرائی علاقہ ہے اور جس کا کچھ حصہ اپنے ہاں کی چمبل گھاٹی کی طرح بلد شتوں اور دریاؤں کے کٹاؤ کا شکار رہے۔ اس ویران علاقہ کی آبادی نہ ہونے کے برابر تھی اور اس کے وسائلِ زندگی بالکل محدود اور ناکافی۔ شاید یہ علاقہ غیر آبادہی رہ جاتا اگر ۱۸۵۰ء کا گولڈ رش لوگوں کی ایک بھاری تعداد کو کیلی فورنیا میں پائے گئے سونے کی طرف راغب نہ کرتا۔ کیلی فورنیا پہنچنے کے لیے نواڈا کا صحرا پار کرنا بھی ضروری تھا۔ اس کی تپتی گرمی اور دشوار راستوں نے بہت لوگوں کی جانیں لیں۔ اسی زمانے میں جب یہاں بھی گولڈ کینین (GOLD CANYON) کے دہانے پر سونا ملنے کی خبر پھیلی تو ہزاروں لوگ سونے کی تلاش میں اس مشکل اور دشوار گزار علاقے میں بھی پہنچنے لگے۔ اصل میں یہ سونا نہیں چاندی تھی۔ کچھ لوگ تو تھوڑا بہت امیر ہو گئے، لیکن بیشتر تباہ ہو گئے۔ جلد ہی وسائلِ زندگی تلاش ہونے لگی۔ سونا چاندی اور بعد میں تانبا لوگوں کی زندگیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔ کچھ لوگوں نے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ پال لیے۔ کچھ نے جلد امیر بننے کے لالچ میں اپنے محدود ذرائع جوئے کے داؤ پر لگانے شروع کر دیے۔ ۱۹۳۰ء کے اقتصادی بحران نے جب امریکہ کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا تو یہاں کی بدحالی اور محدود ذرائع کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سرکار نے جوئے کو باقاعدہ سرکاری اجازت دے دی۔ اور پھر چند ہی سالوں میں ان باضابطہ جوئے خانوں نے اس علاقے کے دن ہی پلٹ دیے۔

جب دولت کی افراط ہو تو جوئے کے ساتھ شادیاں اور طلاق بھی پنپتی ہیں۔ صوبے کے مدبّرین

تے مزید آمدنی کا ذریعہ سمجھتے ہوئے شادی اور طلاق کے قانون میں ڈھیل دینا مناسب سمجھا۔ نتیجہ کے طور پر جوئے کے ساتھ ساتھ جھٹ بیاہ اور جھٹ طلاق کی "صنعت" نے بھی فروغ پایا۔ آج بیویوں سے جلد از جلد نجات حاصل کرنے والے اور نئے ازدواجی رشتوں کے متلاشی ذوق و شوق سے چلے آتے ہیں۔

رشتے ہی رشتے ـــــ یہاں اکثر ہوٹلوں، کلبوں میں کچھ اپنے دیش سے ہی ملتے جلتے شادی بیاہ کے ادارے ہیں۔ آپ اپنی پسند ناپسند کی تفصیلات دیجئے۔ اور مناسب جوڑ حاضر! بعض اداروں میں کمپیوٹر تمام تفصیلات کو یادوں میں بسائے موجود ہیں اور محض منٹوں میں ہی مناسب جوڑ تجویز کئے جا سکتے ہیں۔ تفصیلات کے علاوہ مختلف پوزوں میں فوٹوگراف تک پیش کئے جاتے ہیں۔ شام کو اپنے 'مطلوب' کو کسی ریستوراں میں مل لیجئے۔ اور عہد و پیماں کے مراحل طے کر لیجئے۔ اسے عمل میں لانے کے لیے درجنوں ہوٹل سجے سجائے چیپل (Chapel) اور دعوتِ شادی کا اہتمام کئے، تیار ملیں گے۔ ویڈنگ کیک، بینڈ، آرکسٹرا، گلوکار، مزاحیہ پروگرام پیش کرنے والے آپ کی "ہاں" کی انتظار میں تیار بیٹھے ہیں۔ دولہا یا دلہن چننا آپ کا کام ہے۔ پادری، وکیل، گواہ تو موجود ہیں ہی! اگر کوئی ادارہ یہ سب کچھ گھنٹوں میں فراہم نہیں کر سکتا تو اس کا دو گھڑی ایسے بزنس میں ٹکنا محال ہے۔

طلاق حاصل کرنا تو اس سے بھی سہل ہے۔ آپ کو کسی فیصلے میں وقت گنوانے کی ضرورت تو ہے نہیں! پیشتر کہ آپ کا ذہن ایسے اہم مسئلے پر نظر ثانی کرنا چاہے۔ آپ طلاق کے تمام مراحل سے ہو گزرتے ہیں! شام تک کسی شوہر بیوی کا طلاق حاصل کر کے نئی بیوی، شوہر سے شادی کر لینا عین ممکن ہے!

پھر بھی لاس ویگاز میں دو کروڑ سالانہ سے زائد آنے والوں کی تعداد میں اکثر خوش و خرم جوڑے اپنے بچوں سمیت صرف تفریح کرنے آتے ہیں۔ کیسینو میں قانونی داخلہ کے لیے کم سے کم عمر ۲۱ سال ہے۔ ایسے بچوں کے لیے بھی یہاں مناسب انتظام ہیں۔ یہاں کے مشہور کیسینو سرکس سرکس" نے سرکس کے انداز میں اپنی خیمہ نما بلڈنگ کی اوپری منزلوں پر بچوں کی تفریح کا بخوبی اہتمام کر رکھا ہے۔ یہاں چوبیس گھنٹے ہی سرکس کے حیرت کن کھیل ہوتے رہتے ہیں۔ جنہیں بچے اور بالغ سبھی بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔ ان کھیلوں کو دیکھنے کے لیے کوئی ٹکٹ نہیں ہر عمر کے بچے کے لیے کوئی نہ کوئی کھیل موجود ہے۔ بچے اوپر مشغول رہتے ہیں اور بالغ نہایت اطمینان سے نیچے کیسینو ہال میں اپنی قسمت آزمائی کرتے رہتے ہیں۔

ایک اور کیسینو "سیزر پیلیس" (CAESAR Place) میں "آئندہ کل" کے انداز میں ایک نہایت ہی دلچسپ اومنی نیکس (omninax) سینما ہال ہے۔ ایک کشادہ گنبد کے نیچے نشستوں کے تینوں طرف اور چھت پر اسکرین اس طرح سے لگے ہوئے ہیں کہ فلم چلتے ہوئے آپ اپنے تئیں فلم کا حصہ ہی محسوس کرتے ہیں۔ بھارت میں آئے ہوئے "سرکس راما" کی یہ اضافی ترمیم شدہ مثال ہے۔ ایک ساتھ کئی پروجیکٹر ایک ہی وقت میں ماحول کے جڑے ہوئے منظر اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ ہر پروجیکٹر سے دکھائے ہوئے منظر ایک مکمل تصویر بن جاتے ہیں۔ یہ حیرت انگیز تجربہ الیکٹرانک اصولوں کا نرالا کرشمہ ہے۔ مگر بیش قیمت لوازمات کی وجہ سے اس کا مقبول ہونا بہت مشکل ہے۔ اس کی حیثیت کسی حد تک جدید ترین پلینے ٹوریم (PLANA - TORBUM) کی طرح ہی محدود رہے گی۔

'لاس ویگاز' اپنی بے مثال چکاچوند روشنیوں کے بنا ادھورا ہے۔ اس کی الف لیلوی رنگین روشنیاں، بہترین ڈیزائنوں اور سجاوٹ کے انوکھے نمونوں کی وجہ سے فنی شاہکار تسلیم کی جاتی ہیں۔ امریکہ کے ہر شہر کی سجاوٹ میں روشنیوں کو بڑا دخل ہے لیکن لاس ویگاز کی روشنیاں یکتا بے جوڑ ہیں۔ جمالی حس کی تسکین کرتی ہوئی یہ روشنیاں ذہن پر اَن مِٹ نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ ان روشنیوں کو میں بھلائے نہ بھلا سکوں گا۔

لاس ویگاز سے تقریباً ۵۰، ۶۰ میل دور کولوراڈو ندی پر بنا ہوا ہوور ڈیم (HOOVER DAM) ان خیرہ کرنے والی روشنیوں کے لیے ذمہ دار ہے۔ کولوراڈو جیسی چنچل اور بپھرنے والی نقصان دہ ندی کو سدھانا کوئی معمولی کام نہ تھا ـــــ بالآخر ۱۹۳۵ء میں بڑی جاں فشانی اور قابلیت کے ساتھ اس پر ایک ۷۲۶ فٹ اونچا کنکریٹ ڈیم بنایا گیا۔ ہمارا اپنا بھاکڑہ ننگل ڈیم (اونچائی ۷۴۰ فٹ) بہت کچھ اس سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہاں سالانہ ۴ کھرب کلو واٹ بجلی پیدا کی جاتی ہے جو کہ لاس ویگاز اور نیواڈا کے دوسرے حصوں کے علاوہ کیلیفورنیا اور ایری زونا کے پڑوسی صوبوں کو بھی سپلائی کی جاتی ہے۔

لاس ویگاز کیلیفورنیا گولڈ رش کی طرح ہی جلد سے جلد امیر ہو جانے کے خبط کی پیداوار ہے۔ دولت اور جنس کی انسانی کمزوریوں کی بنیاد پر بنا ہوا یہ شہر آج کل کے مادی کلچر کی نمائندہ مثال ہے۔ ریگ زار ویرانے میں یہ کھلا ہوا پھول ان ہی کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر اپنے بیٹے بیٹیوں کو روزی بخشتا ہے۔

(زیر تصنیف سفر نامہ "سمٹتے فاصلے" کا ایک حصہ)

●●

---

## بقیہ: جنرلس تا لیچ

گھٹنوں پر ہیں۔ تب اس نے بھیڑ کے افراد کو فرداً فرداً دیکھا، جو رہے کو دیکھا، چاروں سمتوں میں جاتے ہوئے راستوں کو دیکھا، ہر طرف پھیلی ہوئی آبادی کو دیکھا اور شفاف آسمان کو دیکھا۔

"بابا!" بچی کے باپ نے بہت واضح الفاظ میں کہنا شروع کیا:

"بابا! تم ہمیشہ سے ہو اور اس دنیا میں کبھی نہیں مر پاؤ گے"۔

ننھی بچی، نوعمر لڑکا، جوان آدمی اور بھیڑ کا ہر فرد حیران ہوا جب انہوں نے دیکھا کہ اس بار بوڑھے کا سر اثبات میں ہلا تھا۔

# بہ خطِ شاعر

## زیب غوری

نقشِ تصویر نہ وہ سنگ کا پیکر کوئی
اس کو جب دیکھو بدل جاتا ہے منظر کوئی

کششِ حرفِ تبسم ہے لبوں میں روپوش
گوشۂ چشم سے ہنستا ہے ستمگر کوئی

چڑھتے دریا سا وہ پیکر، وہ گھٹا سے گیسو
راستہ دیکھ رہا ہے مرا منظر کوئی

جرعۂ آخرِ مے ہے کہ گرانِ خوابیِ شب
چاند سا ڈوب رہا ہے مرے اندر کوئی

صدفِ بحر سے نکلی ہے ابھی لیلیِ شب
اپنی مٹھی میں چھپائے ہوئے گوہر کوئی

کھو گیا پھر کہیں افلاک کی پہنائی میں
دیر تک چمکا کیا ٹوٹا ہوا پر کوئی

صفِ اعدا ہے مرے سامنے اور پشت پہ ہیں
نہ فرشتے نہ ابابیلوں کا لشکر کوئی

ٹوٹ کر گرتی ہے اوپر سے چٹان کرے
بیعتِ سنگ مرے دستِ ہنر پر کوئی

رات بھر طاقتِ پرواز اگاتی ہے انھیں
کاٹ دیتا ہے سحر کو مرے شہپر کوئی

میرے قاتل نے بڑھا دی مرے سر کی توقیر
اس جگہ کے لئے موزوں تھا پیمبر کوئی

آج اس قریۂ ویراں میں یہ آہٹ کیسی
دل کے اندر ہے کوئی اور نہ باہر کوئی

کسی جھاڑی سے کرن پھوٹی ہے سورج کی کہ زیب
چمک اٹھا ہے کسی ہاتھ میں خنجر کوئی

زیب غوری


۹۸/۳۲، بیت الرشید
ناظر باغ، کانپور ۲۰۸۰۰۱

امیر قزلباش

دلہو ہر منظر ہے
کس کے ہاتھ میں پتھر ہے
ہلا دن ہے بارش کا
پانی گھر کے اندر ہے
یاری کے پتھر مار
دنیا خواب کا پیکر ہے
ل قیامت چار طرف
اک قیامت سر پر ہے
ت چُرا لے جائے گی
یہ جو تبسم لب پر ہے
س کی پیاس بجھائے گا!
جیسے دشت سمندر ہے
بیروں کی دھوپ میں جل
سُن - اک لفظ مقدر ہے
دشت سے بیٹھے ہیں لوگ
دل کے اندر محشر ہے
ہ مجھ سے کیا کام آئے
وہ تو مست قلندر ہے
ی ہے پتوار نہیں
چاروں اور سمندر ہے
رہتا ہے رو رز کوئی
میرا جینا دوبھر ہے
دیکھ کے پاس آمیر
منددی لشکر ہے

جنگ جاری ہے خاندانوں میں
غیر محفوظ ہوں مکانوں میں
لفظ بکھرا گئے ہیں ہونٹوں پر
لوگ کیا کہہ گئے ہیں کانوں میں
رات گھر میں تھی سرپھری آندھی
صرف کانٹے ہیں پھول دانوں میں
اب سپر ڈھونڈ کوئی اپنے لیے
اب نہیں تیر تیری کمانوں میں
معبدوں کی خبر نہیں مجھ کو
خیریت ہے شراب خانوں میں
زندگی موت کے حصار میں ہے
ہم ہیں آزاد قید خانوں میں
ناخدا کو خدا رکھے محفوظ
وہ ہوائیں ہیں بادبانوں میں
ڈھونڈتا پھر رہا ہوں خالی ہاتھ
جانے کیا چیز ان دکانوں میں
ڈال چننے میں ہاتھ آئیں گے
جتنے کنکر ہیں کارخانوں میں

نظر میں ہر دشواری رکھ
خواب نہیں بیداری رکھ

دنیا سے جھک کر مت مل
رشتوں میں ہمواری رکھ

سوچ سمجھ کر باتیں کر
لفظوں میں تہہ داری رکھ

خالی ہاتھ نکل گھر سے
زادِ سفر ہشیاری رکھ

ایک خبر ہے تیرے لیے
دل پر پتھر بھاری رکھ

نٹ پاتھوں پر چین سے سو
گھر میں شب بیداری رکھ

شعر سنا اور لکھو کام
اس خدمت کو جاری رکھ

● این - ا - بی ، جنگ پورہ ایکسٹنشن ، نئی دہلی

## پروین کمار اشک

سبز پیڑ کے پھل کیسے تھے ہو
جسم پرندوں کے تیکھے تھے!

جادوگر سر کاٹ رہا تھا
بچے تالی پیٹ رہے تھے!

خوشبو اُڑ کر پھیل چکی تھی
پھولوں پر پھر کیوں پہرے تھے؟

عکس نہیں تھا آئینے میں
لہو کے قطرے چمک رہے تھے!

گھروں کے اندر کوئی نہیں تھا
دیواروں پر نام لکھے تھے!

بادل گرجے بجلی ٹوٹی
بچے چھت پر کھیل رہے تھے!

راہ میں پہلے سمندر آئے گا!
میرے پیچھے پھر ترا گھر آئے گا!

دیکھے گی جب وہ جادوگرنی آنکھ
بھوت میرے تن سے باہر آئے گا!

میری آنکھیں پڑھ نہ پائیں گی تو کیا!
چاندنی کا خط برابر آئے گا!

لقمہ لقمہ جسم نوچے گا مرا
جب پرندہ میری چھت پر آئے گا!

لاکھ سمجھاؤ اشک قیدِ جسم سے
خوشبوؤں کا پھر لشکر آئے گا!

ایک بوٹا! نوازشیں کرتا ہر
سوکھی دھرتی پہ بارشیں کرتا!

ایک لمحہ نہ وصل کا دیتا
عمر بھر آزمائشیں کرتا!

توڑ کر زندگی سے سب رشتے
زندہ رہنے کی کوششیں کرتا!

مچھلیاں قید کر کے شیشے میں
دریا دریا نمائشیں کرتا!

جو زمیں پر قیام کرتا ہو
اس خلا کی پرستشیں کرتا!

کتنا سچا تھا یہ اشک سچائی کو
بھوت گھر میں رہائشیں کرتا!

---

۵ کرشنا اسٹریٹ، پٹھانکوٹ (پنجاب) ۱۴۵۰۰۱

ام زیر و زبر ہم کو بھیج دے
تے ہیں ان کا ہنر ہم کو بھیج دے

ے اس آفتاب کی جو شرمسار ہو
بی کوئی داغِ جگر ہم کو بھیج دے

ہم اطمینان سے سوئیں تمام عمر
پنے جاگنے کی خبر ہم کو بھیج دے

س تھک کے بیٹھ گئے اُن کا ذکر چھوڑ
مت راستوں کا سفر ہم کو بھیج دے

بے گیاہ دشت میں کیسے جئیں بتا؟
ب رنگ و نور کے گھر ہم کو بھیج دے

ؤ شعبدوں کے دام میں آئے نہیں ہنوز!
ے گلوں کا، بادِ سحر ہم کو بھیج دے

ثلِ گرد باد، رواں ہیں یہاں وہاں
نی پہ ہے ہوا کی، جدھر ہم کو بھیج دے

رب و خاک و باد کے ربِّ جلیل اب
کا کوئی ہمارے ہنر ہم کو بھیج دے

## ایم۔ آر۔ قاسمی

دیوارِ تعلق میں بھی در ہو گئے ہوتے
دو دن جو ترے ساتھ بسر ہو گئے ہوتے

جو کچھ بھی کتابوں میں ہے ہوتا تہِ دریا
پیڑوں پہ لکھے نام امر ہو گئے ہوتے

آندھی نے اگر راستہ بدلا نہیں ہوتا
تاراج یقیناً یہ شجر ہو گئے ہوتے

یا تو مری آنکھوں میں یہ بینائی نہ ملتی
یا پھر یہ مناظر ہی دگر ہو گئے ہوتے

لمحے کہ ترے قرب میں پر لگ گئے جن کو
وہ تجھ سے بچھڑ کے بھی بسر ہو گئے ہوتے

اگلوں کو صعوبت کی خبر کیسے پہنچتی؟
گر ختم ہمیں پر یہ سفر ہو گئے ہوتے

یہ برگِ سبز شجر سے اگر اُتر جائے
ہوا کے دوش پہ اُڑ کر نگر نگر جائے

ثواب ہوتا تو تم خود سے منسلک کرتے
عذاب ہے تو یہ بتلاؤ کس کے سر جائے

گراز ڈھونڈ رہا ہے جو کوہِ وحشت پہ
کسی چٹان سے سر پھوڑ کر نہ مر جائے

بکھرنے والے کو بتلاؤ رازِ یکجائی!
سمٹ گیا ہے جو اس سے کہو بکھر جائے

جڑیں ہیں کھوکھلی جس کی وہ کیسے ٹھہرے گا؟
اِن آندھیوں میں تو اچھا بھلا شجر جائے

شگفتی دھوپ میں چلنا ہے قاسمی کو مگر
ملی ہے چھاؤں تو کچھ دیر تک ٹھہر جائے

▪ ہاشمی کلینک، اندرا چوک، جعفر آباد، دہلی ۱۱۰۰۵۳

ضیا فتح آبادی

# من کہ...

نام اور تخلص: جیرالال سونی۔ ضیا، فتح آبادی
وطن مالوف: فتح آباد (نزد گوئندوال) ضلع امرتسر (پنجاب)
خاندان: سونی کھتری۔ والد: لالہ منشی رام سونی، سول انجینئر (وفات: ۱۹۶۸ء) والدہ: شریمتی شنکر دیوی (وفات: ۱۹۴۹ء)
تاریخ اور جائے ولادت: ۸ فروری ۱۹۱۳ء بمطابق اسکول سرٹیفکیٹ (۹ فروری ۱۹۱۳ء بمطابق جنم پتری) کپورتھلہ (پنجاب) ضلع جالندھر
تعلیم: ۱۔ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۲ء: خالصہ مڈل اسکول، پشاور چھاؤنی
۲۔ ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۹ء: دسویں، مہاراجہ ہائی اسکول، جے پور (راجستھان)
۳۔ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء: ایف اے، ہندو سبھا کالج، امرتسر
۴۔ ۱۹۳۳ء: بی اے آنرز اِن پرشین } فورمن کرسچین کالج، لاہور
۵۔ ۱۹۳۵ء: ایم اے (انگریزی) }
ملازمت: جنوری ۱۹۳۶ء تا جولائی ۱۹۷۱ء: ریزرو بنک آف انڈیا، دہلی، کانپور، مدراس اور بمبئی، کلرک سے ڈپٹی چیف آفیسر کی پوسٹ تک، دہلی میں ملازمت شروع کی اور ختم بھی۔
شادی اور اولادیں: ۱۔ ۱۹۳۸ء پہلی، شریمتی ستیہ وتی سیتری ماسٹر منشی رام (موگا) سے
۱۹۴۰ء: لڑکے کا جنم اور انتقال، فوراً بعد ماں کا سورگ باش
۲۔ فروری ۱۹۴۲ء دوسری لالہ مُرلی رام لاہوریا کی بیٹی شریمتی راج کماری سے۔ سات نرینہ اولاد، پہلے بچے کا جنم کے بعد ایک ماہ میں انتقال۔
سیر و سیاحت: ۱۔ ۲۱ تا ۲۶ فروری ۱۹۶۱ء۔ راولپنڈی (پاکستان) میں انٹربنک بینکنگ سمجھوتے کے تحت ہندوستانی وفد کے ساتھ ریزرو بنک کی طرف سے نمائندگی۔ ایک ایک دن کوہ مری اور ٹیکسلا میں۔

شاعری: ۱۹۲۵ء: دورانِ قیام جے پور (راجستھان) معلم اردو جناب اصغر علی حیا جے پوری سے شعر کہنا سیکھا۔
۱۹۲۹ء: جے پور سے امرتسر منتقل، جناب غلام قادر فرخ امرتسری سے اصلاحِ کلام۔ ماہنامہ "چمن" امرتسر میں پہلی غزل کی اشاعت۔
۱۹۳۰ء: علامہ سیماب اکبر آبادی کی شاگردی بذریعہ خط و کتابت۔ ملک کے اخبارات اور رسائل میں کلام کی اشاعت۔
۱۹۴۰ء: نادغ الاصلاح مگر جب تک علامہ سیماب کی صحت نے اجازت دی وہ کلام دیکھتے رہے۔

تصانیف مطبوعہ شعری
۱۹۳۴ء: "طلوع" (قطعات وغیرہ) تعارف از جناب ساغر نظامی ناشر: ادبی مرکز، میرٹھ۔ اس مجموعے کی مقبولیت کا ایک ثبوت جناب منصور احمد مدیر ماہنامہ "ادبی دنیا" لاہور نے اس پر ریویو کرنے کی بجائے مصنف پر دو صفحے کا طویل مضمون لکھ کر شائع کیا۔
دسمبر ۱۹۳۷ء: "نورِ مشرق" (نظمیں، سانیٹ اور گیت) تعارف: از شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی، جناب آنند انصاری اور جناب منظر صدیقی۔ ناشر خود۔
۱۹۳۸ء: ضیا کے سو شعر، ناشر خود۔
۱۹۵۲ء: "نئی صبح" (پابند اور آزاد نظمیں، غزلیں، رباعیاں اور گیت) دیباچہ از جناب مبشر علی صدیقی۔ ناشر خود۔
اگست ۱۹۶۲ء: "گردِ راہ" (پابند اور آزاد نظمیں، غزلیں، رباعیاں اور گیت) دیباچے از جناب اثر احسنی گنوری اور جناب خوشتر گرامی۔ ناشر: مکتبہ "شعلہ و شبنم" دہلی۔
۱۹۶۴ء: "حسنِ غزل" (غزلیں) ناشر: جناب معراج مثل، انبالہ
۱۹۷۷ء: "دھوپ اور چاندنی" (غزلیں) پیش لفظ از ڈاکٹر مسعود سرمدی سرہانی الوَر۔ ناشر: دیویندر کمار، لندن۔
۱۹۸۰ء: "رنگ و نور" (غزلیں) انتخاب و ترتیب از جناب جگدیش بھٹناگر حیات۔ ناشر: "بزمِ سیماب" دہلی۔
فروری ۱۹۸۲ء: "سورج کا سفر" (پابند، آزاد اور نثری نظمیں، سانیٹ اور گیت) انتخاب: از جناب بلراج حیرت۔ ناشر: دیویندر کمار، لندن

تصانیف مطبوعہ نثری:
اکتوبر ۱۹۸۱ء: "سورج ڈوب گیا" (مختصر افسانے) ناشر: دیویندر کمار، لندن۔
یکم جنوری ۱۹۸۳ء: "زاویہ ہائے نگاہ" (۱۹ شعراء و ادبا پر تاثراتی مضامین)

ناشر خود۔

۱۹۸۴ء "ذکرِ سیماب" (علامہ سیماب اکبرآبادی کا سوانحی خاکہ) ناشر: بزمِ سیماب، دہلی۔

تالیف: ۱۹۷۴ء: "شعر و شاعر" (۲۰ شعراء کے خود نوشت سوانح)
ناشر: بزمِ سیماب دہلی دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۶ء میں۔

تصانیف غیر مطبوعہ:

شعری : "وطنیات" (وطنی نظمیں وغیرہ)
"فردا" (غیر مطبوعہ کلام)

نثری : مسندِ صدارت سے (۲۵ خطبات شاعری) یہ کتاب پریس میں ہے۔
"مضامینِ ضیاء فتح آبادی"۔
"ضیاء فتح آبادی کے خطوط"

ایوارڈ/انعام وغیرہ:

۲۷ جنوری ۱۹۵۸ء: "تمغۂ زر" بزمِ پروین کولار کی طرف سے۔

۱ مارچ ۱۹۷۶ء: "سراجِ سخن" کا خطاب ادارۂ بزمِ ادب کامٹی (مہاراشٹر) کی طرف سے۔

۸ مارچ ۱۹۸۰ء: "سال کا ممتاز شاعر" معہ پانچ سو روپے نقد پنجاب ایسوسی ایشن مدراس کی طرف سے۔

۱۹۸۱ء: "رنگ و نور" پر ڈیڑھ ہزار روپے کا انعام، یوپی اردو اکادمی کی طرف سے۔

۱۹۸۴ء: "زاویہ ہائے نگاہ" پر ایک ہزار روپے کا انعام یوپی اردو اکادمی کی طرف سے۔ اس کتاب کی اشاعت میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کی مالی امداد شامل۔

جشن اور اعزازی تقریبات:

۲۷ فروری ۱۹۷۸ء: جشنِ ضیاء فتح آبادی تقریب نئی دہلی میں۔
وزیرِ مملکت عالی جناب عارف بیگ نے ماہرِ غالبیات جناب مالک رام کی کتاب "ضیاء فتح آبادی شخص اور شاعر" کا اجراء کیا اور ایک سو ونیر مرتبہ جناب اوم پرکاش بجاج بھی جاری کیا گیا۔

۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء: بزمِ استقبالیہ۔ یوپی اردو اکادمی لکھنؤ کے ہال میں زیرِ صدارت شہزادہ انجم قدر

۸ نومبر ۱۹۸۱ء: اعزازی تقریب، لندن میں ادارۂ ادب، لندن اور دیگر پانچ انجمنوں کے اہتمام سے زیرِ صدارت شکیب حیدرآبادی۔
ایک سوونیر "ضیائے اردو" مرتبہ: جناب صفیہ صدیقی کا اجراء

۱۹ دسمبر ۱۹۸۱ء: ادارہ ہفت روزہ "راوی" کی طرف سے بریڈفورڈ (یوکے) میں اعزازی بزمِ شاعرہ۔

۱۷ فروری ۱۹۸۲ء: اردو مرکز لندن کی اعزازی نشست۔

۱۷ جون ۱۹۸۲ء: انجمن روحِ ادب الہ آباد کے سپرو ہال میں اعزازی نشست

۸ جنوری ۱۹۸۴ء: اعزازی نشست بزمِ ادب شکور بستی، دہلی کی طرف سے۔

۱۱ اگست ۱۹۸۴ء: اعزازی نشست انجمن شامِ یاراں دہلی کی طرف سے

متفرق :

۱۹۷۹ء "بوڑھا درخت" مطالعہ ضیاء فتح آبادی از ڈاکٹر زرینہ ثانی

صدر بزمِ سیماب دہلی
رکن انتظامیہ کمیٹی انجمنِ ترقی اردو، دہلی شاخ
کل ہند غیر مسلم مصنفین کانفرنس، لکھنؤ منعقدہ اپریل ۱۹۸۱ء کے ڈیلیگیٹ سیشن کا صدر۔

صحت وغیرہ: گزشتہ پانچ برس سے پرانی اور پیچیدہ کھانسی (دمہ) کا شدید حملہ جس کے سبب سانس لینا دشوار۔ ۲۹ ستمبر سے ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء تک سر گنگا رام اسپتال دہلی میں علاج، مگر ع
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی
آنکھوں کی بینائی موتیا زدہ۔

# آلاتِ موسیقی

قیصر قلندر

بھارت میں آلاتِ موسیقی اتنے متنوع اور اتنے وافر ہیں کہ ان کا ذکر اختصار سے بھی نہیں کیا جاسکتا، چہ جائیکہ وہ سیر حاصل ہو۔ سازوں کی ان گنت قسمیں ہیں۔ ان کا شمار بھی ممکن نہیں۔ ان سازوں میں بعض قومی سطح پر معروف و مروّج ہیں اور کچھ علاقائی اور مقامی سطحوں پر۔ بعض ساز جو لوک سنگیت سے وابستہ رہے ہیں، ان کی شہرت اور مقبولیت اکثر دیہی علاقوں تک ہی محدود رہی۔ سازینہ یعنی آرکسٹرا کا تصور بھارتی موسیقی میں بہت پرانا نہیں ہے، بلکہ ہر ساز فرداً فرداً یا دوسرے سازوں کی سنگت میں بجایا جاتا رہا ہے۔ سازینہ کی ایک ابتدائی شکل تو وہ ہو سکتی ہے جب راجوں، مہاراجوں، نوابوں اور شہزادوں کے درباروں میں کچھ ملازم ساز نواز اکٹھا ہو کر کوئی دھن یا کسی راگ کے آدھار پر کوئی نغمہ پیش کیا کرتے تھے، یا کچھ سازندے مذہبی اداروں سے منسلک ہوتے اور وہ کسی بھگتی گیت کی طرز بجاتے۔ کیا ایسی کاوشوں کو سازینہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہاں مقصود نہیں بلکہ قارئین کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ہماری کلاسیکی موسیقی میں سازینہ کا کوئی تصور نہیں رہا ہے۔ سازینہ کی تدوین، ترویج اور اہمیت پر کسی اور وقت بات ہو سکتی ہے!

ساز چونکہ بے شمار ہیں لہٰذا ان پر الگ الگ ایک ایک کر کے کچھ کہنا ممکن نہیں۔ اس لیے انہیں سازوں کا ذکر مقصود ہے جو معروف و مقبول ہیں۔

ایک تو وہ ساز ہیں جو خالصتاً ہندوستانی نژاد ہیں اور دوسرے وہ جو مسلمانوں کی آمد کے بعد بھارتیہ سنگیت سے منسلک ہوئے اور پھر یکے بعد دیگرے کلاسیکی موسیقی میں شامل ہوئے — انگریزوں کے تسلّط کے ساتھ کچھ اور سازوں سے دنیائے موسیقی آشنا ہوئی۔ ان میں سے بھی بعض ایسے ساز ہیں جو کلاسیکی موسیقی کا جزو لاینفک بن گئے ہیں اور مقامی یعنی ہندوستانی سازوں سے زیادہ کچھ قابلِ رشک مقام حاصل کر چکے ہیں۔ پرانے سازوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو ٹکسال باہر ہو چکے ہیں اور جن کا ذکر صرف مسودوں میں ملتا ہے یا وہ سنگتراشی کے فن پاروں میں نظر آتے ہیں۔ مگر قدیم ساز اکثر آج بھی مستعمل ہیں۔ مسلمانوں کے ورود کے ساتھ ایرانی اور عربی ساز بھارتیہ کلاکاروں نے اپنائے مگر ان نئے سازوں کو قبولِ عام حاصل نہ ہو سکا۔ اور وہ بیشتر مسلمان موسیقاروں اور شمالی خطے تک ہی محدود رہے۔ دکن بھارت کے موسیقاروں نے ان سے استفادہ نہیں کیا۔

موسیقی کے فن پر سنسکرت میں وہ دستاویزیں یا کتابیں جو دستِ بردِ زمانہ سے کسی نہ کسی طرح محفوظ رہ سکی ہیں، مختلف سازوں کے بیان کی حامل ہیں۔ لیکن تصویریں بھی ملتی ہیں تو کہیں سنگتراشی کے نمونے دستیاب ہوئے ہیں، جن میں آلاتِ موسیقی کی شبیہیں کندہ ہیں۔ یہاں اُن غاروں یا عبادت گاہوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے، جن میں ماحول و زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان سے وابستہ افعال پتھروں میں کئی اشکال میں کندہ ہیں۔ ہزاروں سال پہلے کے بنے ہوئے بُدھ دیہار اور استوپ بالخاموشی گواہی دے رہے ہیں۔ امراوتی اور سانچی میں کئی سازوں کے نقش ملتے ہیں۔ ہیون سانگ نے اپنے سفرنامے میں خاص طور سے امراوتی کے فنِ سنگتراشی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اُس نے دیواروں اور ستونوں میں کئی سازوں کی تصویریں منقش پائیں۔ ایسی ہی ایک تصویر کا بیان یوں کیا ہے کہ اُس میں اٹھارہ عورتوں کے ایک گروہ کو ڈھول، شنکھ، سُرنا سے ملتا جُلتا کوئی ساز اور قانون کی طرح کا کوئی ساز بجاتے دکھایا گیا تھا۔ اس نے افریقی ساز سانچو سے ملتا جلتا ساز بھی دیکھا تھا، جس کا ذکر یہاں مسودوں اور کتابوں میں نہیں ملتا، مگر اس ساز کو مصری اور آشور کی مصوروں اور سنگ تراشوں نے محفوظ کیا ہے۔ کیپٹن ڈے (تصنیف:

The Musical Instruments of South India and Deccani

کی مزید تحقیق کے مطابق ہیون سانگ کو بعض سنگتراشی کے نمونوں میں رومن سازینہ تیبائی پرے

(Tibae Pares)

سے ملتے جلتے سازوں کی شبیہیں ملی تھیں۔ اس ضمن میں بعض محققوں کا خیال ہے کہ ہیون سانگ کو ہندوستان میں کچھ ایسے سازوں کی تصویریں ملی تھیں جو دراصل قدیم یونان کے متروک ساز تھے۔

سازوں کی مختلف قسموں پر روشنی ڈالنے سے پہلے کچھ سازوں کے سماجی رتبہ کی بات مختصراً ہو تو آگے چلیں۔ ہمارے ہاں کئی ایسے ساز ہیں، جن کا دخل مذہبی عقائد و رسوم میں رہا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ مذہبی پیشواؤں اور اوتاروں سے نسبت رہی ہے۔ غالباً اسی لیے ازمنۂ قدیم سے تا امروز اکثر سازوں کی ساخت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی ہے۔

---

● گلریز - ۱۹۸، جواہر نگر، سری نگر (کشمیر) ۱۹۰۰۰۸

یوں لگتا ہے کہ ان سازوں کے ساتھ کسی طرح کا تقدس وابستہ ہوگیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض افرنگی ماہرینِ موسیقی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ "ہندوستان کے عوام مزاج اور عادات کی رُو سے قدامت پسند رہے ہیں اور سازوں میں کسی تبدیلی کو پسند نہیں کرتے"۔ بہرحال کچھ ساز ہمارے پاس ہیں اور ہم ان سے استفادہ کرتے آئے ہیں۔ مُرلی اور شنکھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مہاراج کرشن جی کی دین ہے۔ اسی طرح سے ہندو دیومالا میں مُرلی کا وہی مرتبہ رہا ہے جو قدیم یونان میں لئیر (Lyre) کا تھا۔ شِو جی مہاراج سے اک تارا قسم کا ساز پنا یا پناکا (Penna or Pinaka) منسوب ہے کہیں یہ وہی اک تارا تو نہیں جو نارد منی بجاتا تھا۔ اک تارا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو پنجاب، ہماچل اور جموں و کشمیر میں متداول ہے اور دوسرا وہ جو بنگال میں معروف ہے۔ دونوں کی ساخت، ہیئت اور طرزِ استعمال میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

سہولت کے لیے سازوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ بادی ساز (Wind Instruments)

۲۔ زہی ساز (Bow instrument)

۳۔ ضربی ساز (Pluck and Percussion Instrument)

بادی سازوں کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ ہے جو زبانہ (Reed) کی بدولت بجائے جاتے ہیں۔ جس میں شہنائی، سُرنا یا سُورنے، ناگا سور یا نا داسورم وغیرہ شامل ہیں اور یورپی بادی سازوں میں اوبو (Obae) کلارنٹ (Clarinet) وغیرہ معروف ہیں۔ دوسرے وہ ساز جو پھونک یا سانس کی مدد سے بجائے جاتے ہیں یعنی بانسری، یورپی فلوٹ (Flute) ارغونِ دہنی Mouth Organ وغیرہ جن میں زبانہ استعمال نہیں ہوتی۔

بادی سازوں میں مُرلی، بانسری، شہنائی، ناگا سورم، الغوزہ، کاشرائی، بین، کما، قرنا، پاسرنا، نفیری، نوبت، کرال، تورائی اور کئی دوسرے ساز شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھینس، ہرن اور دوسرے جانوروں کے سینگوں سے بنے ہوئے ساز، ملک کے مختلف حصوں میں مقامی فن کاروں کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ان سب سازوں میں سے کچھ تو قومی سطح پر معروف ہیں تو کچھ علاقائی یا مقامی یا دیہی سطح پر۔ ادھر سب سازوں کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا جاسکتا۔ البتہ بعض زیادہ مقبول و معروف سازوں پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

## بانسری

پراچین بھارت میں ومسی یا ونشی وہ اوّلین بادی ساز تھا، جس سے مرلی، بانسری، اور پھونک یا مونہہ سے بجانے والے دوسرے ساز بنائے گئے۔ یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ومسی کئی ایسے بادی سازوں کا پیشرو ساز ضرور رہے، جو بانس سے بنائے جاتے ہیں۔ ایشیا کی سرگزشتِ موسیقی کا مطالعہ کرنے سے ہمیں بعض سمیری اور چینی سازوں کا پتہ چلتا ہے، جو بانس سے بنائے جاتے تھے۔ بعض موسیقی دانوں کا خیال ہے کہ عہدِ تاریخ سے قبل اس قسم کے ساز ایشیائی عوام میں قبولِ عام حاصل کر چکنے کے بعد اگرچہ معدوم ہو گئے۔ لیکن مشرقی ایشیائی خطے میں ایک ایسا بادی ساز وجود میں آیا جو بانسری کا ہم پلّہ تھا۔ اور منہ سے بجایا جاتا تھا۔ اُس میں پانچ یا چھ سوراخ ہوتے تھے۔ ان پر انگلیاں رکھی جاتی تھیں تاکہ مطلوبہ سُر اور گونج پیدا ہوں۔ اسے بعض ساز شناسوں نے سمیری ساز ٹی۔جی (ti gi) کا حلیف گردانا ہے۔ چین کا اسی طرح کا ایک قدیم ساز ہسوآن (Hsuan) تھا، جس کا سلسلہ عبادت گاہوں کے اُن سازوں سے ملتا ہے، جو پرستش کے وقت استعمال کئے جاتے تھے۔ اسی ساز کی ترمیم شدہ صورت بعد کا وہ چینی ساز ہے جسے موسیقاروں نے شی ایہہ (CH IH) نام دیا ہے۔ اے ایچ۔ فوکس اسٹرینج وے ........ (A.H.Fox Strengeway) نے اس ساز کا ذکر اپنی تصنیف "ہندوستانی موسیقی میں نظام" میں کیا ہے کہ شی ایہہ بدھ مت کے ساتھ بھارت پہنچا۔ موجودہ دور میں اس ساز کی نمائندگی بانسری یا مُرلی یا فلاگوری (Phillagori) کر رہے ہیں جو مہاراج سری کرشن جی سے منسوب ہیں۔"

مشہور بانسری نواز پنا لال گھوش

بادی سازوں میں سب سے قدیم ترین ساز شاید سرنگا ہے۔ بھینس کا سینگ جو آج بھی نوادرات خانوں میں محفوظ ہے اور کئی علاقوں میں معبد طور پر مستعمل رہا ہے۔ ساز شناسوں نے کوکل، کلاہائے کو سہو وغیرہ کو اسی قبیل کے ساز شمار کیا ہے۔ یہ ساز جلوسوں، تہواروں اور اطلاع دینے کے لیے استعمال ہوئے (ایچ۔اے۔ پوپلے مصنف میوزک آف انڈیا)

عہدِ قدیم سے بھارت اور دوسرے پڑوسی ملکوں کے مابین ثقافتی ارتباط و اختلاط جاری رہا ہے۔ جہاں ادب پارے اور صنعت و حرفت کے نمونے ایک دوسرے ملک میں لے جائے یا پہنچائے جاتے، وہاں آلاتِ موسیقی بھی اس زمرے میں آتے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس ثقافتی تبادلہ میں وہ بادی ساز جو شنی ایہہ کے نام سے مقبول ہو کر معدوم ہو چکا تھا اور پھر از سرِ نو چین پہنچا تو چینیوں کے لیے اجنبی ساز تھا اور اسے تی تون ...... (ti tun) کا نام دیا گیا۔ یہی ساز قرونِ وسطیٰ میں بازنطینی اثرات اور وسائل سے یہی ساز افریقہ میں متداول ہوا اور کئی صورتوں میں نمودار ہوا جن میں شینپور نے۔ قرنا اور سرنا زیادہ مشہور ہیں۔ یہ بھی اغلب ہے کہ جب شنی ایہہ چین سے عرب دیس تک گیا تو اس کی ساخت میں تبدیلی لائی گئی اور متنا پر شنی ایہہ سے شیپور بن گیا۔ یا سپیر (Spar) میں تحریف ہوئی۔ بعض ساز شناسوں کا خیال ہے کہ شیپور، آشوری لفظ (Shopperu) یا عبرانی لفظ (Shopper) یا عربی شب بور (Shabbur) سے مشتق ہے۔ ایران میں بانسری کو سازِ چوپانان (اور نے ہفت بند) بھی کہتے ہیں۔ شاید اسی لیے بانسری چرواہوں اور گڈریوں کا محبوب ساز ہے۔ اونچی نیچی گھاٹیوں اور وادیوں سے بانسری سے نکلے ہوئے میٹھے سُر سارے ماحول میں خوش گوار اور دل پذیر سماں باندھتے ہیں۔ جاپان اور جاپان کے لوک سنگیت سے لے کر موجودہ دور تک بانس کی نے استعمال ہوتی ہے۔ لیش کو ہاؤ (جاپانی بادی ساز ہے) ایک خشک بانس کے ڈھائی فٹ کے ٹکڑے سے بنایا جاتا ہے اور اس سے کیا کیا مدھر تانیں نکلتی اور کس طرح سے رُوح کو مسحور کرتی ہیں۔ اس چوبِ خشک کی تاثیر کیا ہے کہ مولانا روم کی شہرۂ آفاق تخلیق یوں شروع ہوتی ہے:

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائیہا شکایت می کند

ہمارے ملک میں نے نوازی نے کئی مرحلے طے کیے ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی بانسری سے لے کر ایک بڑی بانسری تک رائج رہی ہے۔ چھ انچ سے چار فٹ تک لمبی بانسریاں جداگانہ رسائی ...... (Range) کی حامل رہی ہیں۔ نے نوازوں میں پنالال گھوش کا نام امر اور سرِفہرست ہے، جنہوں نے چوبِ خشک سے بنے ہوئے اس ساز کو بلند کلاسیکی مقام دلوایا۔ ساخت کے تجربے کئے اور پتلے سے بانس کے علاوہ فک سینگ دو انچ قطر والے بانس سے بانسری تراشی۔ جس میں سُر کی گہرائی اور گیرائی کا ایک خوش آہنگ امتزاج پیدا ہوا۔

## شنکھ

شنکھ محدود افادیت کا حامل ہے اور بہت ہی مختصر ضرورت پوری کرتا ہے۔ اس کے سُر بہت محدود ہیں۔ شنکھ کے ساتھ ایک طرح کا تقدس وابستہ ہے۔ مندروں سے لے کر شادی بیاہ کی تقریبوں تک شنکھ استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ اس کی افادیت زیادہ نہیں ہے۔ اس لیے بادی سازوں میں اسے وہ درجہ نہیں مل سکا جو بانسری یا دوسرے بادی سازوں کو میسّر ہے۔

## الغوزہ

بادی آلاتِ موسیقی میں ایک دلچسپ ساز ہے، جو چھوٹی چھوٹی بانسریوں سے بنتا ہے۔ لمبائی ایک سے دو فٹ کے درمیان ہوتی ہے۔ اور عمودی انداز میں مونہہ میں لے کر بجانے کا چلن ہے۔ ساز نواز پوری مہارت سے مطلوبہ سُر پیدا کرتا ہے۔ برِصغیر پاک و ہند میں الغوزہ پنجاب سندھ اور صوبۂ سرحد کے علاوہ کچھ دوسرے علاقوں میں دیہی عوام میں زیادہ مقبول رہا ہے۔ حمید خاں جمالی جیسے الغوزہ نواز بہت ہی کم پیدا ہوئے جو اس مختصر رسائی والے ساز سے لوک دُھنوں، نغموں سے لے کر نیم کلاسیکی دُھنیں بجانے میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔ عرب اور ایرانی ساز شناسوں نے مختلف سازوں کی نشاندہی کی ہے جو اسی قبیلے کے ساز ہیں، جن میں مزمار المثنیٰ، دونائی اور دو آہنگ قابلِ ذکر ہیں۔ ایک رومی ساز (Tibee Pares) کا ذکر بھی اسی ساز کے ساتھ ہوا ہے۔ الفارابی نے بھی دونائی کے بارے میں لکھا ہے کہ دو بانسریوں کی لمبائی یکساں ہوتی ہے۔ ہر ایک میں پانچ پانچ سوراخ ہوتے ہیں اور ایک بانسری اکثر بنیادی سُر دیتی ہے اور اس طرح سے ایک دل پذیر گمک یا گونج پیدا ہوتی ہے

شہنائی اور ناگاسورم کے ذکر سے پہلے مناسب یہ ہے کہ اُن چھوٹے چھوٹے بادی سازوں کا بھی کچھ بیان ہو، جنہیں وہ درجہ حاصل نہیں ہوا ہے جو ان دونوں سازوں کو میسّر ہوا ہے۔ اس قسم کے ساز دیہی ماحول میں مروج رہے ہیں یا علاقائی ماحول میں پنپ چکے ہیں۔ اور کلاسیکی رُتبہ نہیں پا سکے ہیں۔ ایسی صورت میں سازوں کا کوئی قصور نہیں ہے، نہ ساز نواز موردِ الزام ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں ان کی ساخت اور رسائی حائل ہوتی ہے۔ ایسے سازوں میں بین (سپیرے والی تومبی) کما، تورائی، نفیری، نوبت، کرال اور کاشراتی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے علاقائی بادی ساز ہوں گے جو مختلف علاقوں میں متداول ہوں گے، جن کا ذکر میں یہاں نہیں کر پاؤں گا۔

بین تو عام طور سے سپیرے بجاتے ہیں۔ بین سے نکلی ہوئی دھن سے کیسے سانپ قابو میں آتا ہے؟ یہ معاملہ موسیقی والوں کے لیے ہی نہیں بلکہ ماہرینِ حیوانات کا معمہ بنا ہوا ہے، کیوں کہ سانپ سماعت سے محروم ہے۔ البتہ اس میں چھونے کی حس زیادہ تیز بتائی جاتی ہے۔ بہر حال یہ مسئلہ شاید احساس و موسیقی کے زمرے میں آ سکتا ہے جس میں حیوانات پر ہی نہیں بلکہ نباتات پر موسیقی کے اثرات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ تومبی بھی بین کی طرح کا ساز ہے جو سپیرے بجاتے ہیں۔ یہ بھی کدو نما ساز ہے۔ جس کا بالائی حصہ پتلا ہوتا ہے۔ گردن کے مصداق اور نچلے حصے میں دو چھوٹے بانس گزار کر بالائی حصے کے کھلے سرے میں سے نکالے جاتے ہیں۔ انہیں اس طرح سے کاٹا جاتا ہے کہ وہ زبانہ (Reed) کا کام دے سکیں۔ ایک بانس کے سوراخوں کو چھیڑا جاتا ہے تاکہ سُر پیدا ہو سکیں اور دوسرا بانس متواتر بنیادی آواز پیدا کرتا ہے۔

کاشراتی ایک قسم کی بانسری ہے جو کھاسی پہاڑیوں میں لوک سنگیت میں محبوب و مقبول ہے۔ کما، توراتی (ترُاتی) نفیری، نوبت پیتل سے بنائے جاتے ہیں۔ اور نگ بھگ عصری ٹرمپیٹ (Trumpet) کے پیشرو ہیں۔ یہ ساز مختلف مگر محدود مواقع پر استعمال ہوتے ہیں۔ نجران کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مرلی ہی کی طرح کا ساز ہے۔ جس میں اگرچہ مختلف زبانہ استعمال کئے جاتے ہیں مگر اس کی پہنچ یا رسائی محدود ہے اور اس سے کرخت سی صدا نکلتی ہے۔

آیئے، اب ان دو سازوں اور اس سے ملتے جلتے بادی سازوں کا ذکر کریں جو بانسری ہی کی طرح کلاسیکی موسیقی میں ممتاز مقام پا چکے ہیں اور ان کے بجانے والوں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے، یہ ہیں: ناگا سورم اور شہنائی۔ ان دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ چلے گا اور ان کے ساتھ ساتھ سرنا یا سُرنے، سورنائی یا قرنا کی بھی بات ہوگی۔ کیوں کہ یہ سارے بادی ساز ایک ہی قبیلے کے ہیں۔

پیشتر اس کے ہم ناگا سورم یا شہنائی اور ہم جو قسم کے سازوں کا ذکر چھیڑیں، کچھ اور متعلقہ باتوں کا حوالہ یا اعادہ ضروری ہے۔ بارہویں صدی عیسوی سے قبل ہمارے پڑوسی ملکوں، خاص طور پر وسط ایشیائی اور عرب ملکوں میں کئی بادی ساز استعمال ہوتے تھے۔ ساز شناسوں کا قیاس ہے کہ آلاتِ موسیقی میں کامل ترین اور دلچسپ ترین وہی ساز ہے، جو انسان کی آواز کے بالکل قریب ہو۔ کچھ عالموں کا خیال ہے کہ جب انسان کی پہلے پہل اپنے گلو یا حنجرے سے آواز نکلی تو حالات کے تقاضے کے مطابق ایک ایسے ساز نے جنم لیا، جسے مُرلی یا بانسری کہتے ہیں۔ یہ بڑی دلچسپ بات ڈاکٹر مہدی فروغ نے اپنے ایک مقالے "مزمار و نائی" (مطبوعہ: مجلۂ موسیقی۔ ۱۳۔ شہریور ۱۳۳۶۔ تہران ـــــ ۱۹۵۷ء) میں لکھی ہے: "نوائے نے و سائر آلاتِ بادی بیشتر از صدائے سازہائے دیگر بصدائے انسان شباہت دار و یعنی بطبیعت نزدیک ترے باشد۔"

عرب ممالک میں ایک ایسا ساز استعمال میں رہا ہے، جو نفیری، سرنگا اور سرنا کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا نام بُوق تھا۔ ابتدا میں بوق ان حیوانوں کی ہڈیوں سے بنایا جاتا تھا جو شکار کئے جاتے۔ گوشت غذا کے طور کام آتا اور چمڑا پوشاک بنتا اور موزوں ہڈیوں سے بُوق بنائے جاتے۔ بوق کی صدا کافی دُور تک سُنائی دیتی ہے۔ کئی علاقوں میں یہ ساز آج بھی استعمال ہوتا ہے۔ لدّاخ (جموں و کشمیر) میں آج بھی اسی قبیلے کا ایک ساز تونگ ملتا ہے، جو جنگ اور امن میں بھی استعمال ہوتا تھا جیسے کہ نفیری اور سنگھا۔ بوق کے علاوہ قصابہ یراع، شبابہ اور کئی مِی ساز مستعمل رہے ہیں۔ مزمار اور نے کے بارے میں لکھا گیا کہ لکڑی کا نلی نما ساز ہے، جسے نے نواز منہ تک ... ... ... منصور بن محمد معروف بن زیلہ نے جو ابن سینا کا شاگرد رشید تھا، اپنے استاد کی تصنیف، "کتاب النجات" میں اس بات کا بیان کیا ہے۔ ابوالفرج الاصفہانی (تصنیف: کتاب الاغانی) اور ابونصر فارابی (تصنیف علم الانغام) میں مزمار اور دوسرے کئی سازوں کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ فارابی نے لکھا ہے کہ مزمار آٹھ سوراخ والا ساز تھا، جو منہ سے بجایا جاتا تھا اور اس پر پورا اوکٹیو Octave پیش کرنے میں کوئی دقت نہیں آتی تھی۔ اسی ساز کی بدلی ہوئی ہیئت سے سورنائی یا سورنائی یا شہنائی یا سُرنا نے وجود میں آئے۔

عربوں نے موسیقی پر بہت کچھ لکھا ہے، جو عربی ادب کا بہت اہم حصہ بن گیا ہے۔ اس میں تاریخِ موسیقی کے علاوہ نغموں کے مجموعے، ساز شناسی سے متعلق کتابیں، موسیقی کا قانونی پہلو، موسیقی اور جمالیات اور موسیقاروں کی سوانح عمریاں شامل ہیں۔ قدیم ماہرینِ فن میں الفارابی، المسعود الاصفہانی محمد ابن اسحٰق، الورّاق، ابو محمد عبداللہ محمد بن یوسف خوارزمی، ابن غیبی، صفی الدین عبدالمومن، جامی، اولیا چلبی چند قابلِ ذکر موسیقی داں ہیں۔ ابن خلدون نے الاصفہانی کی کتاب الاغانی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ "وہ عربوں کا دیوان ہے"۔ ابن غیبی نے جامع الالحان میں سورنا / قرنا / کرنا کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ بادی ساز ہے۔ ہیئت میں خمیدہ ہے۔ خالی نالی میں سوراخ ہیں۔ منہ سے بجایا جاتا ہے۔ کرنا یا سورنائی کی تخلیق و ترقی کے بارے میں بھی کچھ موسیقی دانوں نے اختلاف کیا ہے۔ اولیا چلبی ایک ترکی ساز شناس جغرافیہ داں نے لکھا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ترکی کے مختلف علاقوں میں سورنائی کو جدا جدا ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس نے کچھ علاقائی نام یوں دئے ہیں: زورنا، زُرنا، طورنا، قرنا۔ ڈاکٹر مہدی فروغ کا قیاس ہے کہ قرنا زورنا شاید

وہی ساز ہے جو ان دنوں مصر میں زمرالکبیر کے روپ میں پایا جاتا ہے، جس کی لمبائی ۹۰ سینٹی میٹر ہے اور اس میں سات سوراخ ہیں، جن سے مطلوبہ سُر نکالے جاتے ہیں۔

کشمیر میں بھی ایک سرنائی یا سُرنے مستعمل ہے جو لوک ناچ اور لوک ناٹک کے کلاکار بجاتے ہیں۔ اس ساز کو اہم لوک درجہ ملا ہے۔ بعض لوگوں کا قیاس ہے کہ سُرنے کبھی کشمیری کلاسیکی موسیقی (صوفیانہ موسیقی) سے وابستہ تھا جو گردشِ روزگار کے ساتھ حافظ (رقاصہ و مغنیہ) سے جُڑا ہوگیا۔ اس طرح سے صوفیانہ موسیقی سے وابستہ یہ تنہا بادی ساز بھی اس سے چھین گیا۔ سُرنے کا صوفیانہ موسیقی سے وابستہ ہونے پر مجھے شک ہے۔ کیوں کہ صوفیانہ موسیقی میں اس قسم کے کھلی فضا والے ساز کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ میں اس قیاس آرائی کا ساتھ نہیں دے رہا ہوں۔ بہرحال کشمیر میں سُرنے نے اپنی قدیم ہیئت برقرار رکھی ہے۔ اس حالت کے کئی اسباب ہیں۔ جن میں سب سے مقدم ثقافتی ارتباط و اختلاط کی کمی اور ساز نواز کی آگاہی کا فقدان ہے۔

مشہور شہنائی نواز استاد بسم اللہ خاں

# شہنائی

## لوک سنگیت سے لے کر شاستریہ سنگیت تک

شہنائی کی وارائی ہے۔ میلے ٹھیلے ہوں یا موسم کے بدلنے کی رُت، فصلوں کی کٹائی کا جشن یا قومی تہوار یا شادی بیاہ کی تقریبیں' شہنائی کی مدھر تانیں مسرت و شادمانی کی نقیب ہوتی ہیں۔ اس ساز سے کچھ عجیب سی عقیدت وابستہ ہے۔ شہنائی اصل میں کھلی فضا کا ساز رہا ہے اور اب وقت گزرنے اور ضرورت کے ساتھ ساتھ یہ محدود فضاؤں کمروں یا ہالوں میں بھی بجائی جاتی ہے۔ سات چھیدوں والا یہ ساز کلاسیکی موسیقی میں معتبر مقام حاصل کر چکا ہے۔ ڈاکٹر نرائن مینن کا کہنا بجا ہے کہ اس درجے تک اگر کسی فن کار نے پہنچایا تو وہ استاد بسم اللہ خاں ہے۔ اس نے اپنی فن کارانہ صلاحیت سے اس ساز پر راگ راگنیاں پیش کیں اور قومی اور بین الاقوامی رتبہ دلانے کی کامیاب کوشش کی۔ استاد بسم اللہ خاں نے اپنے والد استاد پیغمبر بُوا کے علاوہ اپنے خالو استاد علی بخش اور استاد محمد حسین (لکھنؤ والے) سے تربیت و تعلیم حاصل کی۔ ۱۸ سال کی عمر یعنی ۱۹۲۶ء ہی میں ایسی دھاک جمائی کہ ملک کے ممتاز شہنائی نواز کا اعزاز پایا۔

شہنائی قدرے مخروطی ہیئت کی ہوتی ہے۔ اُوپر کے حصے میں دہانہ لگتا ہے۔ یہی حصہ مونہہ سے لگایا جاتا ہے۔ انگلیوں کے پور سوراخوں پر حسبِ منشا و التزام اُٹھائے اور رکھے جاتے ہیں۔ سانس اور انگلیوں کا باہمی تعاون مطلوبہ سُر نکالنے میں مدد کرتا ہے اور ساز نواز اپنی دانست واقفیت اور راگ کی جان کاری سے سماں باندھتا ہے۔ اس ساز کا صوتی حسن اور آہنگ کی رسائی اسے دوسرے بادی سازوں سے منفرد و ممتاز کرتی ہے۔ یہ ساز شمالی بھارت میں زیادہ مقبول ہے۔ اس ساز کا ایک اور روپ ناگا سورم کی صورت میں دکنی بھارت میں موجود ہے۔ دونوں آہنگ کی شدت کے لیے ممتاز و معروف ہیں۔ فرق اتنا ہے شہنائی کی صدا میں ملائمت ہے اور ناگا سورم میں تیزی اور تیکھاپن۔ ڈاکٹر نرائن مینن نے ایک دفعہ شہنائی کے بارے میں لکھا تھا "کم و بیش یہ قدیم اوبو (Oboe) کے مصداق ہے، جب اس میں کنجیوں (Keys) کا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ بہرحال کھلی فضا میں ساز ہونے کے باوجود یہ اپنی صوتی خصوصیات کی وجہ سے کلاسیکی سنگیت کا اہم ساز بن گیا ہے۔ اس طرح سے جیسے کہ مغربی موسیقی میں اُوبو کلاسیکی درجہ پا چکا ہے"۔

شہنائی بجانے کا عمل بانسری اور اوبو سے قدرے مختلف ہے۔ کلاسیکی سنگیت پیش کرتے وقت شہنائی کے ساتھ تان پورا استعمال نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا Drone (بنیادی سُر) قائم رکھنے کے لیے اسی طرح کی چھوٹی سی شہنائی بجائی جاتی ہے، جسے نفیرو یا نفیری کہتے ہیں اس سے ساز نواز کے کان میں مسلسل اور متواتر طور سے بنیادی سُر آجاتا ہے۔ نفیرو یا نفیری بجانے والے کا کام کوئی آسان نہیں ہے اس میں اگر فنی مہارت اور دَم پر قدرت نہ ہو تو وہ ساز نواز کے عمل میں خلل کا باعث ہو سکتا ہے۔

(جاری ہے)

محمد اشرف

# جنرل نالج سے باہر کا سوال

گول چبوترے پہ کھڑے ہو کر چاروں راستے صاف نظر آتے ہیں، جن پر راہ گیر، سواریاں اور خوانچے والے چلتے رہتے ہیں۔

چبوترے پر جو بوڑھا آدمی لیٹا ہے، اُس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہیں۔ کہیں کہیں پیوند بھی لگے ہیں۔ اُس کی داڑھی بے ترتیب ہے اور چہرے پر لاتعداد شکنیں ہیں۔ آنکھوں کی روشنی مدّھم ہو چکی ہے۔

وہ راستے پہ چلنے والے ہر فرد کو بہت حسرت سے دیکھتا ہے۔ جب کوئی خوش خوش اس کے پاس سے گزرتا ہے تو وہ دُور تک اور دیر تک اسے دیکھتا رہتا ہے۔

کسی طرف سے ایک دس گیارہ برس کی بچی آئی — وہ اسکول کی پوشاک پہنے ہوئے ہے۔ بستہ کندھے پر لٹکا ہے۔ ناشتہ کا ڈبّہ ہاتھ میں دبا ہے۔ لڑکی کے بال سنہرے ہیں۔ چہرہ گلابی ہے اور آنکھوں میں ایک سادہ سی چمک ہے۔ بے فکری، خوشحالی اور بچپن جب ایک جگہ جمع ہو جائیں تو آنکھوں میں ایسی ہی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

اسے آتے دیکھ کر بوڑھے کی آنکھوں میں کچھ چمکا۔ جب وہ پاس سے گزری تو بوڑھے نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے پیر چھوئے۔ بچی جھجک کر کھڑی ہو گئی۔ ایک لمحہ تک بوڑھے کو دیکھتی رہی پھر اُس کی آنکھوں میں خوف چمکا۔ گھر کی نصیحتیں ذہن میں کلبلائیں، لیکن بوڑھے کے چہرے پر اس نے جانے کیا دیکھا کہ آنکھوں کا خوف مدّھم پڑ گیا اور بھولا بھالا چہرہ دردمندی کے جذبے سے سرشار ہو گیا۔ اس نے بہت اپنائیت سے پوچھا۔

"کیا بات ہے بابا — بھوک لگی ہے؟"

بوڑھا دھیمے سے مسکرایا —

"ہاں — لیکن میں نے تمہیں اس لیے نہیں روکا۔"

لڑکی کی آنکھوں میں حیرت جاگی۔ اُس نے بوڑھے کا ہاتھ اپنے پیروں پر سے آہستگی کے ساتھ ہٹایا اور چبوترے پر اس کے پاس بیٹھ کر پوچھا۔

"میرے پاس پچاس کا سکّہ ہے۔ تم لوگے؟ تمہیں ضرورت ہے؟"

"ہاں ضرورت ہے، لیکن میں نے تمہیں اس لیے نہیں روکا۔"

لڑکی کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"پھر تم نے مجھے کاہے کو روکا بابا؟"

بوڑھے نے بہت نحیف آواز میں اس سے کہا۔

"مُنّی! بڑا احسان ہوگا اگر تم میرا ایک کام کر دو۔"

بچی نے اپنا بستہ اُتار کر چبوترے پر رکھا اور بوڑھے کے قریب کھسک کر بہت اپنے پن کے ساتھ پوچھا۔

"بتاؤ کیا کام ہے تمہارا — میرے کرنے کا ہوگا تو میں کر دوں گی۔ نہیں تو پاپا سے کہہ کر کرا دوں گی۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ سب کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اس دفعہ سردیوں میں اُنہوں نے پڑوس کے گھر میں دو کمبل دئے تھے۔ جمیلہ کی اماں اور اُس کے سب بھائی کو بہت سردی لگتی تھی۔"

بوڑھے نے یہ سب باتیں بہت لاتعلقی سے سنیں اور کہا۔

"تم میرا ایک کام کر دو۔ مجھے ایک بات بتا دو۔"

"کیا بات ہے۔ پوچھو۔ معلوم ہے جنرل نالج میں سب سے زیادہ نمبر میرے آتے ہیں کلاس میں۔"

"کس چیز میں مُنّی؟"

"یہ ... یہ ایک چیز ہوتی ہے۔ مطلب ایک سبجیکٹ ہوتا ہے۔ اس میں ساری باتیں آ جاتی ہیں۔ جیسے کون سا پہاڑ سب سے اونچا ہے، کون سی

○ ہکم ٹیکس، جے پور ہاؤس، آگرہ (اتر پردیش)

ننھی سب سے چھوٹی ہے اور بہت ساری باتیں۔ تم مجھ سے کوئی بھی سوال پوچھ کر دیکھ لو۔ مگر جلدی سے پوچھ لو۔ دیر ہو جائے گی تو ممی ڈانٹیں گی اور تمہارے پاس کہیں بیٹھا دیکھ لیا تو پاپا تو پٹائی ہی کر دیں گے۔ اب جلدی سے پوچھ لو۔"

"منی" بوڑھے نے نیم دراز ہو کر بہت رازدارانہ لہجے میں قریب آ کر، اتنی قریب کہ بچی نے اس کے چہرے کی ساری شکنیں گن لیں۔ کہا۔

"مجھے یہ بتا دو کہ میری عمر کتنی ہے اور میں کب مروں گا؟"

بچی کا ہاتھ بستہ پر جہاں رکھا تھا وہیں رکھا رہ گیا۔ اس کی نگاہیں بوڑھے کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ پھر اچانک وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"واہ، یہ ہمیں کیا معلوم۔ یہ تو تمہارے ابا کو معلوم ہو گا کہ تمہاری کتنی عمر ہے ـــ اور کب مروگے یہ اللہ میاں کو معلوم ہے۔"

کئی راہ گیر ان کے پاس آ کر جمع ہو گئے۔

بوڑھے نے اُن کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا اور کہا۔

"کوئی مجھے بتا دے کہ میری عمر کتنی ہے اور میں کب مروں گا۔ یہ بچی نہیں بتا پا رہی۔ تم بتا دو بیٹے۔" اس نے ایک نوعمر لڑکے سے کہا جس کے ہاتھوں میں کرکٹ کا بلا تھا۔

وہ لڑکا آگے بڑھا، اُس کے چہرے پر ذہانت جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔

"بابا۔ جب آپ پیدا ہوئے ..... نہیں نہیں۔ جب آپ چھوٹے تھے، تب کی کوئی بات یاد ہے! کوئی بہت ہی خاص بات اگر آپ بتا دیں تو ہم آپ کو آپ کی عمر بتا دیں گے۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔ اُس وقت سب لوگ لڑ رہے تھے۔ کچھ لوگ جیت گئے تھے۔ کچھ لوگ ہار گئے تھے۔" بوڑھے نے سوچ کر کہا۔

"تو آپ پہلی جنگِ عظیم کے وقت پیدا ہوئے ہوں گے۔ مگر آپ کی عمر تو سو سال سے کم معلوم نہیں ہوتی۔ آپ شاید کسی اور جنگ کی بات کر رہے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے حساب سے تو آپ ساٹھ پینسٹھ سال کے ہوں گے صرف۔"

لڑکے نے اپنا بلا چبوترے پر رکھ دیا اور وہیں بیٹھ گیا۔

"نہیں بیٹے" بوڑھے نے کہا "پہلی جنگِ عظیم تو کل کی بات ہے۔"

بھیڑ میں سے ایک جوان شخص آگے نکلا اور حساب لگا کر بتایا۔

"آپ کی عمر تقریباً ایک سو پچیس سال ہے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعہ کو لگ بھگ اتنا ہی وقت بیت چکا ہے۔"

بوڑھے کے مٹیالے سے ہونٹ آہستہ سے کھلے۔ اس سے کچھ بولا نہیں گیا۔ پھر اس نے بہت دقت کے ساتھ کہا۔

"۱۸۵۷ء کی جنگ تو ابھی کا واقعہ ہے۔"

بھیڑ میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ لیکن بوڑھے کے چہرے پر پھیلی ہوئی سنجیدگی نے سب کو مجبور کیا کہ کوئی اس پر شک نہ کرے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

اتنے میں بچی نے تاریخ کی کتاب کا ایک سبق یاد کیا اور مکمل کر لیا۔

"تم پورے دو سو تیئیس سال کے ہو ـــ پانی پت کی تیسری لڑائی ۱۷۶۱ء میں ہوئی تھی۔"

بوڑھے نے اپنا سر انکار میں ہلایا۔

بھیڑ میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ شام بڑھ رہی تھی اور سائے پھیلنے لگے تھے۔ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔

سب نے اپنی اپنی معلومات کو کھنگالا۔

ایک ۳۵، ۴۰ برس کے آدمی نے بڑھ کر کہا۔

"بابا، آپ کی عمر ۴۲۸ برس ہے۔ اکبر نے ہیمو کو پانی پت کی دوسری جنگ ۱۵۵۶ء میں ہرایا تھا۔"

بوڑھے نے بہت مایوسی کے ساتھ اپنا سر نفی میں ہلایا۔

لوگ جنگوں کو یاد کرتے رہے اور حساب لگاتے رہے اور بوڑھے کو اس کی عمر بتاتے رہے۔ اور وہ اپنا سر نفی میں ہلاتا رہا۔

اتنے میں بھیڑ کو چیرتا ہوا بچی کو ڈھونڈتا ہوا اس کا باپ آ گیا۔ اُس نے بچی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اٹھانا چاہا۔ بچی خوف زدہ نظر آ رہی تھی، لیکن ہمت کر کے اُس نے اپنے باپ سے کہا۔

"بابا، ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم ان کے سوال کا جواب دیں گے ورنہ اپنے بابا سے کہیں گے۔ اب آپ آ گئے ہیں۔ آپ ہی بتا دیجئے کہ ان کی کتنی عمر ہے اور یہ کب مریں گے؟"

بچی کے شفیق باپ نے بچی کا ہاتھ چھوڑا۔ اب تک جو بیتا تھا، وہ لوگوں سے سنا اور بوڑھے بابا کو غور سے دیکھ کر کچھ سوچا اور پھر بوڑھے کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔

تب بوڑھے نے اپنے پیوند لگے لبادے سے اپنے گھٹنے چھپائے۔ اتنے میں بھیڑ کے اندر سے ایک شخص نہایت اعتماد کے ساتھ باہر نکلا اور بولا۔

"ہو نہ ہو یہ بوڑھا آدمی سکندرِ اعظم کے وقت میں پیدا ہوا تھا۔"

اس دفعہ بوڑھے سے پہلے بچی کے باپ نے نفی میں سر ہلایا اور دو زانو ہو کر بوڑھے کے پاس بیٹھا۔ اوپر سے نیچے تک بوڑھے کو دیر تک دیکھا اور پھر سر آگے کر کے بہت اعتماد کے ساتھ آہستگی کے لہجے میں بوڑھے سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بابا! میں تمہاری عمر بتا دوں اور یہ بتا دوں کہ تم کب مروگے؟"

بھیڑ میں سب کے چہرے چمکنے لگے۔ بچی کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ سب بہت اشتیاق کے ساتھ بچی کے باپ کو دیکھنے لگے۔

بچی کے باپ نے بہت محبت سے بوڑھے کے گھٹنوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے اور محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ کپڑوں پر نہیں، بوڑھے کے ننگے

(دیکھئے صفحہ ۱۸ پر)

علی امام نقوی

# خصلت

بیّا کے گھونسلے پر نظر پڑتے ہی وہ رک گیا تھا۔ اس کی مادہ اپنی رو میں آگے بڑھ گئی تھی۔ خوخیاتے ہوئے اس نے پہلے تو اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ جب وہ تھم کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ تب اس نے آدمیوں کی طرح دو پیروں پہ کھڑے ہونے کے بعد بائیں ہاتھ سے بیّا کے گھونسلے کی طرف اشارہ کیا۔ مادہ گھونسلے کی طرف متوجہ ہوئی اور اس نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ آس پاس اس کے، اس کی مادہ کے علاوہ کوئی ذی روح موجود نہیں ہے اس نے پھر ایک مرتبہ بیّا کے گھونسلے کو دیکھا۔ دونوں ہاتھوں سے زانو ٹیکے اور اور درخت کی طرف بڑھا..................

"دل چھوٹا نہ کرو۔ اور ہمت سے کام لو۔ پھر یہ حادثہ تمہارے لیے نیا بھی نہیں۔"

"لیکن ضرر ہوتی ہے۔"

"تم یہ بھول رہے ہو کہ کچھ لوگ حد سے گزر جاتے ہیں۔ تمہارے ابو بھی......"

"میں اس بار گھر سے نہیں نکلوں گا۔"

"پچھتاؤ گے۔"

"پھر میں کیا کروں؟"

"کسی بھی قسم کی بدمزگی پیدا ہونے سے پہلے ہی تم اپنی رہائش کا انتظام کر لو۔"

"اس دغاباز شہر میں...... رہائش کا انتظام آسان ہے؟"

"آسان تو نہیں ہے لیکن ناممکن بھی نہیں۔ لیکن یہ تو بتاؤ اس مسئلہ پر تمہاری ماں کا رویہ کیا رہا؟"

.........اس نے ابھی دو چار قدم ہی بڑھائے ہوں گے کہ اس کی مادہ نے پیچھے سے اس کی دم پکڑ لی، جھنجھلا کر پلٹتے ہی وہ اپنی مادہ پہ خوخیایا تو مادہ نے سہم کر دُم چھوڑ دی۔ پھر بے چارگی سے اسے بیّا کے گھونسلے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھنے لگی۔

چند لمحوں بعد ہی وہ پورا گھونسلہ درخت سے اتار لایا تھا اور اب اسی درخت کے سائے میں بیٹھا بڑے انہماک سے گھونسلے کا ایک ایک تار علیحدہ کر رہا تھا۔ درمیان میں جب سڑک پر ایک آدھ کار، ٹھیلا، ٹرک یا بس گزرتی تب چند لمحوں کے لیے اس کے ہاتھ رک جاتے۔ وہ گردن گھما گھما کر دائیں بائیں دیکھتا اور پھر اپنے کو محفوظ جان کر گھونسلے کے تار ادھیڑنے میں مشغول ہو جاتا۔

بالائی خول کے تمام تار جب علیحدہ ہو چکے تو اس کی حیرت زدہ آواز بلند ہو گئی۔ مادہ نے اس کی تحیر زدہ آواز سنی تو اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس نے دیکھا گھونسلے کا ایک تار پکڑے ہوئے وہ اسے تحکمانہ انداز میں اپنے پاس بلا رہا تھا۔ کچھ رکتی، کچھ چلتی ہوئی مادہ بہرحال اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور اس نے بھی اپنی نظریں بیا کے ادھڑے ہوئے گھونسلے پہ مرکوز کر دیں۔ ریشم کے تاروں جیسے مہین تاروں کی بنائی میں اس گھونسلے میں چھوٹے چھوٹے تین کمرے نظر آ رہے تھے۔ ایک کمرہ چاروں طرف سے مکمل طور پر بند تھا۔ صرف ایک چھوٹا سا سوراخ بیّا نے اپنے داخل ہونے کے لیے چھوڑ رکھا تھا۔ دوسرے کمرے میں تین سوراخ تھے۔ دو ایک سمت اور ایک اس کے مدِمقابل۔ تیسرا کمرہ کسی قدر چھوٹا تھا اور اس میں تھوڑا بہت دانا دنکا بھی موجود تھا۔ اسی میں بیا کے انڈے بھی ایک کونے میں رکھے ہوتے تھے۔ مادہ نے ہلکی سی نفرت انگیز نظر نر پر ڈالی اور پھر کسی قدر گھوم کر اس کے سامنے جا بیٹھی۔ نر کی آنکھوں پر موجود تحیر پر بربریت غالب آتی چلی گئی۔ اس نے معنی خیز انداز میں اپنی مادہ کو دیکھا۔ ایک انگلی اور ایک انگوٹھے کی مدد سے اس نے ایک انڈا اٹھایا اور سڑک کی طرف اچھال دیا۔ پھر دوسرا پھر تیسرا۔ پھر کئی۔ ہر انڈے کے تعاقب میں مادہ کی نظر دوڑتی۔ انڈوں کو گرنے سے بچا لینے کی خواہش آنکھوں میں بجلی بن کر کوندتی۔ لیکن نر کا خوف اس خواہش پر غالب آ جاتا ادھر انڈا زمین پر گرتا ادھر مادہ آنکھیں بند کر لیتی۔ آخری انڈا جونہی زمیں پہ گرا۔ ہلکی سی آواز ہوئی، مادہ نے پھر آنکھیں میچ لیں۔ اور ایک نظر نہ آنے والی کپکپی اس کے وجود پہ طاری ہو گئی۔ کافی دیر تک وہ اسی

---

معرفت۔ کونسلیٹ جنرل آف ایران، ہال روتا بھون، ۱۱۶ مہارشی کروے روڈ، بمبئی ۲۰ ۰۰ ۴۰

م میں رہی۔ اور نہ جانے کب تک اس پر مذکورہ کیفیت
ری رہتی۔ لیکن نر کے خوخیانے کی آواز پر اس نے
کھیں کھولدیں۔ اپنے وجود کو سنبھالا، پھر نر کی طرف
بھی، نر نے معنی خیز انداز میں اپنی مادہ کو دیکھا، پھر
کے گھونسلے کے اس سرے کو کھینچنا شروع کیا، جو
س کے ہاتھ میں موجود تھا۔ پھندے کھلتے ہی چلے
لئے۔ کچھ دیر بعد ...... وہاں صرف تاروں کا ڈھیر
ما۔ نر اپنے اس کارنامے پہ خوخیاتے ہوئے مسرت کا
ظہار کر رہا تھا۔ خوخیائی تو مادہ بھی تھی۔ اپنے نر کے
کارنامے پر خوش ہو کر یا پھر اس کی خوخیاہٹ میں اسی
ن دیکھی کپکپی کو دخل تھا۔ نر تو کچھ سمجھ نہیں سکا تھا۔ وہ خوش
تھا۔ اور دیکھ رہا تھا کہ وہ بھی خوش ہے ..........

"سرکشی اور بغاوت کے بیچ زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔!"

یہ چھوٹا سا جملہ ان کے دماغ پر کوئی ایٹم بم گرا گیا تھا۔ اپنی گنوار اور جاہل بیوی سے اس قسم کے جملے کی انہیں ذرا بھی امید نہیں تھی۔ کچھ دیر تک اس جملے کی آگ میں جھلستے رہنے کے بعد انہوں نے بیوی کو دیکھا۔ پھر ایک کونے میں لوہے کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھے ہوئے اپنے منجھلے بیٹے، اس کی بیوی اور اس کی چھوٹی سی بچی کو، بیوی سراپا سوال تھی۔ بیٹا سرکشی اور بغاوت کی سرحد پہ کھڑا تھا۔ بیوی حسرت و یاس کا مجسمہ اور پوتی سہمی سہمی معصوم سی گڑیا۔

"یقیناً تم دونوں بغاوت کے انجام سے بھی واقف ہوگے"

"تب مجھے ایک سوال کا جواب دیں۔ کیا آدمی گھر اس لیے بناتا ہے کہ اپنے ہی ہاتھوں اسے اجاڑ دے؟"

"دیوار میں چنی جانے والی ٹیڑھی اینٹ خود معمار اس ڈھیر میں پھینک دیتا ہے جو روڑی کے کام آتی ہے۔"

"روڑی بہرحال کام کی چیز ہے۔ اور ابھی آپ کہہ چکے کہ معمار اسے روڑی کے ڈھیر پر پھینکتا ہے اور اگر نہ تو دیوار میں چنی ہوئی سیدھی اینٹ ہوتی ہے نہ ...؟"

"احمقانہ باتیں نہ کرو ـــ میں نہیں چاہتا کہ یہ اس گھر میں رہے۔ لیکن یہ میرا فیصلہ ہے!"

"اور مجھے یہ فیصلہ قبول نہیں ہے!"

آخر بیٹے نے سرحد پار کر ہی لی۔ ماں ایک مرتبہ مجسم سوال بنی۔ باپ آگ کا دریا۔ بہو لرز کر رہ گئی اور بچی

معصوم بچی نے ڈر کر ماں کی آغوش میں پناہ ڈھونڈی۔

............ چوزے خوف زدہ ہو کر بھاگے تھے، مرغی نے پر پھیلائے۔ چوزوں کو ان میں سمیٹا۔ ایک بچے ہوئے چوزے کو دونوں پیروں کے بیچ لے کر وہ بیٹھ گئی۔ اس کی گردن دائیں بائیں گردش کر رہی تھی۔ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے وہ مرغے کو ڈربے کا دفاع کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اور بندر اس پر حملے کر رہا تھا۔ دوسرے حملے میں بندر نے مرغے کا کام تمام کر دیا تھا۔ اور ڈربے کے اندر گھس کر تباہی مچادی تھی۔ پانی کا کٹورہ سب سے پہلے اس نے باہر پھینکا تھا۔ پھر بھوسی کی پلیٹ، اور اس کے بعد باہر نکل کر اس نے ڈربے کی چھت پر چڑھنے کے بعد اچھل کود شروع کر دی۔ زیادہ سے زیادہ دو منٹ لگے ہوں گے ڈربے کو منہدم ہونے میں۔ اس کے بعد اچھل کر وہ دیوار پہ چڑھا تھا۔ پھر وہیں سے اچھل کر وہ کوٹھے تک پہنچا تھا............

............ وہ دو تھے۔ اور بڑی خاموشی سے آئے تھے۔ ویسے ان کی آمد اور خاموشی کا بڑا گہرا تعلق تھا۔ ایک نظر نہ آنے والا تعلق۔ جس کی گرہیں دلوں کی دوڑ میں پڑتی ہیں۔ بس ڈور کی ساخت، رنگ اور قسم کا فرق ہوتا ہے۔ سو ایسا ہی تعلق علاقے کے تمام لوگوں سے بھی تھا۔ دلوں میں خوف کی ڈور تھی۔ اور ان دو کا ظلم۔ وقت نے بزدلی کے ہاتھوں ظلم اور خوف کی ڈور میں ایک تعلق پیدا کرنے کے لیے گرہ لگادی تھی۔ اور اب ...... جوں جوں وقت گذر رہا تھا۔ اس گرہ پہ گرہ لگتی جا رہی تھی۔ ایسی ہی گرہ بیٹے کے دل میں بھی لگ چکی تھی۔ اور ان دونوں کو دیکھتے ہی اسے یقین ہو چلا تھا کہ باپ جنگ جیت چکا ہے۔ اور شکست میرا مقدر ہو چکی ہے۔ بس چند ہی لمحے وہ رکا تھا۔ لال لال آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے اس نے دوسرے روز شام تک کی مہلت دی تھی اور چلا گیا تھا۔ خوف اور ظلم کی ڈور والی گرہ پہ گرہ لگا کر..........

........ تیتنے کا چھتہ نیم کے درخت پہ تھا۔ اور معصوم بچی نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ تبھی سے ذہن میں کئی سوالات کلبلائے، تب اس نے ماں سے پہلا سوال کیا:

"امی۔ یہ تتیے کا گھونسلہ ہے نا۔؟"

"گھونسلہ نہیں چھتہ!" ماں نے پیار سے تصحیح کی

"یعنی اس کا گھر؟"

"ہاں! اس کا گھر!"

"یہ سب مل جل کر رہتے ہیں امی"

"ہاں! یہ سب مل کر رہتے ہیں"

"ان کا خاندان ہوتا ہے"

"ہوتا ہے بیٹی۔ ہر جاندار کا خاندان ہوتا ہے"۔

"لیکن ان میں کوئی دادا نہ ہوگا امی"

ہوش و حواس ابھی مجتمع بھی نہ ہو سکے تھے کہ ایک دھماکہ ہوا۔ ماں نے سوچا اس چھوٹی سی عمر میں بچی نے کیا کچھ کہہ دیا۔ یہ سمجھ داری حالات کی دین ہے۔ اجڑنے، بسنے، اجڑنے بسنے اور پھر اجڑنے کے درمیان ہی تو یہ کونپل پھوٹی تھی ہم چاہتے تھے یہ کونپل ہر سرد گرم سے محفوظ رہے لیکن

............... ایک دھماکہ ہوا تھا۔ اور پورا نیم ہلنے لگا تھا۔ نیم پہ بندر کودا تھا۔ اور مختلف شاخوں سے ہوتا ہوا وہ تتیے کے چھتے کے قریب بیٹھا تھا۔ چھتے کو بغور دیکھنے کے بعد اس نے کچھ سوچا۔ نیم کی ایک شاخ توڑی اور چھتے کو کریدنے لگا۔ چھتے کے باسی بھن بھنا کر اڑے..........

.......... ماں کی نظر اڑتے ہوئے تتیوں پہ پڑی۔ اس نے بچی کو دوپٹہ میں چھپا لیا اور خود اپنے سر پر چادر ڈال لی۔

ٹپ، ٹپ، ٹپ

ایک، دو، تین۔ اور پھر آخری چھتہ بھی زمین پہ آرہا۔ دوپٹہ کی اوٹ سے معصوم بچی حیرت سے دیکھتی رہی۔ کبھی چھتوں کو، کبھی بندر کو اور کبھی نیم کے گرد طواف کرتے ہوئے تتیوں کو۔ بندر کی مسرت بھی خوخیاہٹ اس ننھے سے دل پر خوف طاری کیے دے رہی تھی۔ معاً اس نے دیکھا سارے تتیوں نے مل کر بندر پر حملہ کر دیا ہے اور اب بندر بجائے خوخیانے کے چیختا بھی جا رہا تھا اور اپنے بدن کو بے تحاشہ کھجائے جا رہا تھا۔ کھجاتے کھجاتے وہ نیم سے گر پڑا۔ اور زمین پہ لوٹنے لگا۔ لیکن

(باقی صفحہ ۲۲۲ پر)

نریندر لوتھر

# خوشامد

تعریف اور خوشامد دو جڑواں بہنیں ہیں ۔ ایک سادہ اور سیدھی سادی ہے۔ دوسری بڑی چنچل اور شوخ ۔ ایک سگھڑ بی بی ہے دوسری چالو۔ ایک سادگی سے رہتی ہے تو دوسری بڑی بن ٹھن کے نکلتی ہے ۔ ایک سچ بولتی ہے اور دوسری جھوٹ ۔ ایک آپ کے مونہہ پر صاف صاف بات کرتی ہے ، دوسری آپ کے مونہہ پر کچھ اور پیٹھ پیچھے کچھ اور۔ ایک کھری کھری سناتی ہے اور دوسری صرف وہی بات جو آپ سننا پسند کریں۔

آپ یقیناً کہیں گے کہ آپ تعریف کو پسند کرتے ہیں ۔ لیکن عام طور پر جسے آپ تعریف سمجھتے ہیں وہ دراصل خوشامد ہوتی ہے ۔ کیا آپ یہ ماننے کے لیے تیار ہیں کہ آپ تعریف کے قابل ہی نہیں ۔

ہر تعریف خوشامد ہوتی ہے ۔ لیکن ہر خوشامد تعریف نہیں ہوتی ۔ لطف کی بات ؛ خوشامد نے ایسا بھیس بدلا ہوتا ہے کہ بالکل پتہ نہیں چلتا کہ یہ جو ابھی ابھی ہوئی ہے وہ خوشامد تھی ، تعریف نہیں ۔

ہم نے الف لیلہ اور شیخ چلی کی کہانیاں ، اور شیخ سعدی کی حکایتیں اور ایسپ کی کتھائیں پڑھ کے یہ سبق حاصل کیا کہ خوشامد سے سب کام ہو جاتے ہیں ۔ اور یہ بھی پلے باندھ لیا کہ خوشامد سے کوئی نہیں بچ سکتا ۔ اس کے باوجود ہم ہزار بار خوشامد کا شکار ہوتے ہیں ۔ بعد میں پچھتاتے بھی ہیں ، لیکن پھر اس جال میں پھنس جاتے ہیں ۔ آپ بھی جب چاہیں آزما کر دیکھ سکتے ہیں ۔ ہم کسی بھی وقت ، کسی بھی حالت میں خوشامد کا شکار بنائے جا سکتے ہیں ۔ کبھی کبھی ہم سمجھتے ہیں کہ جو چند خوبیاں ہم میں اور بڑے لوگوں میں سانجھی ہیں ، اُن میں خوشامد سے متاثر ہونا ایک ہے ۔

ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ہماری خوشامد کرنے والا ہے اور ہم ہوشیار اور خبردار بھی ہو جاتے ہیں اور اکثر خوشامد کے دوران بھی ہم باخبر اور چوکنا رہتے ہیں کہ اب ہماری خوشامد ہو رہی ہے ۔ اس کے باوجود خوشامدی ٹٹو نہایت کامیابی سے اپنا کام کر لیتا ہے اور ہمیں تب ہوش آتا ہے جب اس کی لگائی ہوئی دولتی کا درد محسوس ہونے لگتا ہے ۔

بھونڈی قسم کی خوشامد کی مثالیں تو ہر روز دیکھنے میں آتی ہیں ۔ خوشامد کے ذریعے ایک لومڑی کا کوے کو یہ یقین دلا دینا کہ وہ بہت اچھا گاتا ہے اور اس طرح اُس کے مونہہ سے پنیر کا ٹکڑا گروا لینا تو بہت معمولی سی بات ہے ۔ اسی لیے یہ کہانی صرف بچوں کی کتابوں میں پائی جاتی ہے ۔ ہمیں وہ کہانی بھی زیادہ پسند نہیں جس میں ایک مصاحب ایک نواب کی خوشامد کرتا ہے ۔ ایک دن نواب صاحب کو بینگن کی سبزی بہت پسند آئی اور اُس نے بینگن کی تعریف میں کچھ کہا مصاحب نے بینگن کی تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے ۔ اور یہاں تک کہہ دیا کہ حضور بینگن واقعی سب سے بہترین سبزی ہے تبھی تو خدا نے اس کے سر پر تاج رکھا ہے ۔ دوسرے دن نواب صاحب کو بینگن کا بھرتہ پسند نہ آیا تو انھوں نے بینگن کے خلاف کچھ کہا ۔ مصاحب نے بھی فوراً پینترا بدلا اور گویا ہوا کہ یہ بدترین ترکاری ہے ، اسی لیے تو قدرت نے اس کا مونہہ کالا کیا ہے ۔

لیکن ہم نے بہت اعلیٰ معیار کی خوشامدیں بھی دیکھی ہیں ۔ ان کو محسوس کر کے لگتا ہے گویا شہد ٹپکنے لگتا ہے اور دماغ عش عش کرنے لگتا ہے ۔ اُس وقت ہمارے دل میں بھی خوشامد کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے لیکن خوشامد کرنا تو ایک آرٹ ہے ۔ جہاں انسان ایک آدھ پیرے ہی میں نہیں سیکھ

---

○ ڈمپل ۹-۳-۱۰۹۰ ، راج بھون روڈ ، حیدرآباد ۵۰۰۴۸۲

بھونڈی خوشامد کرنے والے کو بجا طور پر
کہا جاتا ہے۔ لیکن نفیس اور اعلیٰ پائے کی
امد کرنے والے کو عربی گھوڑا کہا جانا چاہیئے۔

ایک ایسے ہی ماہر خوشامد جو صاحب عرض
تھے، ہمارے پاس آئے۔ اس وقت ہمارا
ہمارے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ہم اکثر جب
لوں سے تنگ آ جاتے ہیں تو کتے کو اپنے پاس
کر اُسے سہلانا شروع کر دیتے ہیں۔

ہمارا کتا بھی جب دوسرے کتوں سے عاجز
ہے تو ہمارے پاس آ جاتا ہے۔ اور ہمیں کئی
ں سے چومنا چاٹنا شروع کر دیتا ہے۔ ہم
ں کو اکٹھے دیکھ کر ہی شاید کسی منچلے نے کہا تھا۔
ب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو"

یقیناً انہوں نے ہمارے کتے کے بارے
بیشتر معلومات حاصل کر لی تھیں۔ کیوں کہ
کے ہمارے شوق کا شہر کے تمام کتوں کو علم ہے۔

آتے ہی وہ کتے کو بڑے پیار سے دیکھ
دے۔ "کیا غضب کا کتا ہے۔ میں نے اپنی
گی میں بہت کتے دیکھے ہیں، لیکن ایسا
ب صورت، اتنا اصیل، اتنا سمجھدار، اتنا
دب کتا...... وہ کہتے ہیں نہ کہ کتے کو دیکھ کر اس
مالک کے خاندانی ہونے کا پتہ لگ جاتا ہے۔"

ہم نے اوب کر جواب دیا۔ "یہ کسی خاص
ل کا کتا نہیں۔ ویسے ہی پکڑ کر پال لیا ہے۔"

وہ کب ٹلنے والے تھے۔ "یہی تو کمال
ہے۔ نسلی کتے کو تو سب پال سکتے ہیں۔ اس میں
یا خاص بات ہوئی؟ اہم بات تو یہ ہے کہ ایک
م کتے کو ایسی تربیت دی جائے کہ وہ نسلی
وں کو شرمندہ کرے۔ یہی تو آپ کے شوق کی
ل ہے!" اتنے میں کتے نے اپنا کان کھجلایا۔
نے کہا۔ "بڑا گندہ کتا ہے اس کو پسو بہت چمٹ
تے ہیں۔"

انہوں نے کتے کے کان کو پکڑ کر اس کے اندر
کا اور جھوم کے بولے۔ "واہ صاحب، کیا کمال کا
پسو ہے۔ ہم نے اپنی زندگی میں بہت پسو دیکھے
ہیں، لیکن اتنا پلا ہوا پسو کبھی نہیں دیکھا۔ دیکھئے نہ
یہ بھی کتے کی تربیت کا ثبوت ہے۔ پسو کے لیے کتنی
قربانی دے رہا ہے۔ اپنے خون سے اس کی
پرورش کر رہا ہے۔" ہم جان گئے کہ ہمارا پالا
کسی عام خوشامدی ٹٹو سے نہیں بلکہ ہاتھی سے پڑا
ہے۔ بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھ کر ہم نے ہتھیار
ڈال دئے۔

آج تک ہم جب کبھی "ڈی پریشن" محسوس
کرتے ہیں تو انہیں صاحب کو بلا لیتے ہیں۔ وہ آن کی
آن میں ہماری طبیعت مفرّح کر دیتے ہیں۔

کئی لوگ ایسے خوشامد کرتے ہیں جیسے وہ
بظاہر آزادانہ رائے دے رہے ہوں اور خوشامد
الیہ کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوتا کہ اس کی خوشامد
ہو رہی ہے۔ ایک وزیر کی ایسی خوشامد ہوتی ہوئی
ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی، کانوں سے سنی اور
نہ دل سے محسوس کی۔ وہ خوشامدی کہہ رہا تھا۔

"یہ جو فیصلہ آپ نے کیا ہے اس کے خلاف
کافی لوگ اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔ ہر جراتمندانہ
فیصلے کے خلاف ہمیشہ شدید ردِ عمل ہوتا ہے۔
اب لوگ دیکھ رہے ہیں کہ آپ میں اتنی ہمت
ہے یا نہیں کہ اس فیصلے پر اٹل رہیں۔ کئی لوگ یہ
باور کرتے ہیں کہ آپ دباؤ کے تحت ایک دو دن
میں یہ فیصلہ بدل دیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اُن
کا مقابلہ کیسے مردِ سے ہے۔

یہ سنتے ہی وزیر نے اپنی چھاتی اتنی پھیلائی
کہ وہ اُس کی توند کے برابر ہونے کو آئی اور پھر
وہ بڑے زعم سے گویا ہوا۔ "آپ دیکھتے رہیئے۔"
ظاہر ہے وہ فیصلہ ایسا تھا جس میں خوشامد کرنے
والے کا فائدہ تھا۔

ایک فریادی کی اپیل ہم نے منظور کر لی۔
وہ حکم نامہ لے کر ہمارے پاس آیا۔ ایک لمبی
سانس لے کر پہلے حکم نامہ کو اور پھر ہمیں بغور
دیکھنے کے بعد گویا خود ہی اپنے آپ سے مخاطب ہوا۔
"یقین نہیں آتا کہ آج کل کے زمانے میں بھی ایسے
انصاف پسند اور بے باک اہل کار موجود ہیں! یہ
فیصلہ صرف آپ جیسا ہی جواں مرد اور شیر افسر کر سکتا
تھا۔ میں کہتا ہوں، بلکہ سارا شہر کہتا ہے کہ اگر
ہندوستان میں آپ جیسے ایک درجن ....
افسر بھی ہوں، تو اس ملک کو "جنت نشان" بنایا
جا سکتا ہے۔"

کتنا صحیح شخص تھا وہ! کتنا انصاف پسند اور
دلیر افسر تھا میں! شہر میں کتنا ہر دل عزیز! اُس
دن سے آج تک میں اپنے جیسے گیارہ اور افسروں کی
تلاش میں سرگرداں ہوں تاکہ ایک قومی جنت کا اہتمام
کیا جا سکے۔ لیکن افسوس آج تک بھی ایک اور افسر
ایسا نہیں ملا جس میں وہ تمام جوہر اور صلاحیتیں ہوں،
جو ناچیز میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ یہ دوسری بات
ہے کہ ہمارے چند افسرانِ بالا اور حکام اس رائے
سے متفق نہیں۔ یہی تو اس ملک کی بدقسمتی ہے۔
لوگ ایسی بادواضح باتوں پر بھی اختلافِ رائے رکھتے
ہیں۔ ایک طرف وہ راست گو، شخص شناس، عربی
گھوڑا اور ہم اور دوسری طرف باقی لوگ۔ کون کہتا
ہے کہ اکثریت ہمیشہ صحیح ہوتی ہے!

جہاں ہم نے دوسروں سے خوشامد کروانی
سیکھ لی ہے بلکہ اُسے پسند بھی کرتے ہیں، وہاں یہ
اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے کہ ہم دوسروں کی خوشامد
کرنے کے آرٹ سے بالکل عاری ہیں۔ ہم نے ایسا
کرنے کی کئی بار پُرخلوص اور پُرزور کوشش کی، لیکن
عین منجدھار میں خوشامد کا ہمارا ٹٹو اڑیل بن جاتا ہے
اور آگے جانے سے انکار کر دیتا ہے اور ہمیں
چار و ناچار ناکام ہو کر واپس ہونا پڑتا ہے۔ کئی
بار تو ہمیں شک ہونے لگتا ہے کہ ہمارا ٹٹو، ٹٹو
نہیں بلکہ گدھا ہے۔ جو عین وقت پر اپنی ڈھینچو ڈھینچو
...... سے سارا کام خراب کر دیتا ہے۔

ہمارا ایک افسر ہمیں بہت چاہتا تھا۔
اس نے ایک شام ہمیں اپنے گھر چائے پر بلایا۔
اس نے ایک نیا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ کافی دیر

تک منتظر رہا کہ ہم سوٹ کا نوٹس لیں ۔ لیکن جب ہم سوٹ کے بارے میں کوئی تعریفی جملہ کہنے کی بجائے کیک اور پیسٹریوں پہ ہاتھ صاف کرتے رہے تو بالآخر اُس نے خود ہی پوچھا " ارے بھئی ہمارے نئے سوٹ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے ؟"

ہم نے پیسٹری کا ٹکڑا نگلتے ہوئے کہا" جی سوٹ تو بہت اچھا ہے ، لیکن اگر آپ کی توند ذرا کم ہو تو واقعی اچھا لگے گا "

اس واقعہ کے بعد نہ جانے کیوں وہ افسر ہم پہ اتنا مہربان نہیں رہا ۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ایک اہم اعتبار سے ہماری تعلیم اور تربیت دونوں ادھوری رہ گئی ہیں ۔ بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ دونوں غلط ہوئی ہیں ۔ ہمیں بچپن میں یہ سمجھایا گیا تھا کہ صرف کمزور اور نااہل لوگ ہی چاپلوسی اور خوشامد کرتے ہیں ۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اپنی قابلیت اور لیاقت کی بنا پر ہی آگے بڑھنا چاہیئے ۔ شیر کبھی کسی کی خوشامد نہیں کرتا ۔ صرف لومڑی جیسے کمزور اور ریاکار جانور ایسا کام کرتے ہیں ۔ اس لیے لومڑی آج تک کتنی بدنام ہے ۔ اگر شیر ہو یا شیر بننا چاہتے ہو تو خوشامد کی کوئی ضرورت نہیں ، لیکن جب ہم حقیقی دنیا کی طرف دیکھتے ہیں تو ہر طرف خوشامد کا بازار گرم پاتے ہیں ۔ شیر جو خوشامد نہیں کرتا ، سرکس کے جنگلوں میں بند ہو جاتا ہے اور اُسے کئی قسم کے کرتب دکھانے پڑتے ہیں ۔ لومڑی آزاد پھرتی ہے ۔ غریب لوگ امیروں کی خوشامد کرتے ہیں ۔ کلرک افسر کی ۔ افسر کسی اور کی ، اور مزید کسی اور کی اور جنتا کی ۔ اس چاپلوسی کے چکر سے چھٹکارا کیسے ممکن ہے ؟

دنیا میں قسم قسم کی چیزوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے ۔ ہر شہر میں بیشتر قسم کی منڈیاں پائی جاتی ہیں ۔ سبزی منڈی ، پھل منڈی ، گھاس منڈی ، دال منڈی ، کپڑے کی منڈی ، چوڑیوں کی منڈی آپ کسی چیز کا نام لیں اس کی منڈی مل جائے گی ۔ بلکہ کچھ ایسی اشیاء جن کا نام لیتے ہوئے آپ کو ہچکچاہٹ ہو ، اُن کی منڈی بھی مل جائے گی ۔ لیکن دنیا بجائے خود خوشامد کی منڈی ہے ۔ ایسی منڈی جس میں خوشامد کا سکہ چلتا ہے اور اسی کے ذریعہ ہر چیز بکتی ہے اور خریدی جا سکتی ہے ۔ ہماری جیب میں تو ہمیشہ سکوں کی کمی رہی ہے ۔ یہ قیمتی سکہ کیسے ملے گا ؟

اب ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ہم بھی خوشامد کرنا سیکھ لیں ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ خوشامد سے نفرت کرتے ہیں ، لیکن دراصل وہ خوشامد سے نہیں ، خوشامد کرنے کے کسی خاص طریقے سے نفرت کرتے ہیں ۔ جولیس سیزر کے قتل کے سازشی گروہ میں سے ایک شخص نے اُسے اُس جگہ لانے کی ذمہ داری لی تھی ، جہاں پر اُسے قتل کرنے کا منصوبہ تھا ۔ اُس نے کہا کہ جب میں جولیس سیزر سے کہتا ہوں کہ آپ کو خوشامد سے نفرت ہے تو وہ میری رائے سے متفق ہوتا ہے ۔ کیوں کہ اس میں بھی اس کی خوشامد ہوتی ہے ۔ جولیس سیزر جیسا شخص خوشامد کی وجہ سے بخوشی قتل ہونے کو تیار ہو گیا ۔ اور ہوا ۔

ہم سب خوشامد سے خوش ہوتے ہیں کیونکہ اس سے ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم خوشامد کئے جانے کے قابل ہیں ۔ ایک بڑے مشکل سے نام والے فرانسیسی فلاسفر نے کہا تھا کہ ہمیں دوسروں کی خوشامد سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا بشرطیکہ ہم خود اپنی خوشامد نہ کریں ۔ لیکن اسی فلاسفر نے دوسرے سانس میں یہ بھی کہا تھا کہ اگر ہم خود اپنی خوشامد نہ کریں تو پھر زندگی میں رہ ہی کیا جائے گا ؟

●●

## بقیہ : دردناک داستان

بیوی کو دوبارہ ملاقات کی اجازت ملی وہ دلی پہنچی حال پوچھا تو بالکشن کہنے لگا ۔

" ہم ایک ہی وقت کھانا کھاتے ہیں "

بیوی کے پوچھنے پر کہ روٹی کیسی ہوتی ہے ؟ اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا اسے دیدیا جسے وہ اپنے ساتھ لے گئی ۔ ملے جلے اناج اور کنکروں کی روٹی تھی ۔ رام رکھی نے گھر پہنچ کر اسی طرح کا اناج بنا کر پیسا اور روٹی پکائی ۔ وہ ایک وقت کھا کر دوسرے وقت پانی پہ گزارہ کرنے لگی ۔

اس طرح کئی مہینے بیت گئے ۔ آخر ایک دن جب رام رکھی اپنی کوٹھری میں اپنے شوہر کا تصور کر رہی تھی ، اچانک باہر سے رونے کی آواز آئی ۔ لوگ کہہ رہے تھے ۔ پھانسی کا حکم ہو گیا ' پھانسی کا حکم ہو گیا ۔ آخری ملاقات کے لیے دیوی پھر دلی پہنچی اور اسی جیل میں ، جہاں جوانوں کی جوانیاں ختم کر دی جاتی ہیں ۔ بالکشن صرف اتنا کہہ پایا کہ " جان من ! یہ دنیا فانی ہے ۔ جو آیا ہے اس کو جانا ہے ۔ کوئی کسی کا ساتھی نہیں ۔ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ کر میں ملک کی بھلائی کے لیے اپنی جان کی قربانی دے رہا ہوں ۔

آخر شمع آزادی پر پروانہ نثار ہو گیا ۔ اپنے خاندان کے افراد کی آہ و زاری سن کر رام رکھی کو معلوم ہو گیا کہ اس کے شوہر کو پھانسی دے دی گئی ہے ۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی ۔ خود ہی صاف پانی لائی ، غسل کیا اس کا چہرہ خوشی اور فخر سے تمتما اٹھا ۔ اس نے شادی کا جوڑا زیب تن کیا جس سے رشتہ داروں کو سخت صدمہ ہوا ۔ مگر دیوی کے چہرے پر نور دیکھ کر وہ زبان نہ کھول سکے ۔ وہ اپنی مقررہ جگہ پر بیٹھ گئی اور دعا مانگی کہ جلد ہی میری روح میرے شوہر سے جا ملے ۔ بھگوان نے اس کی سن لی اور چند منٹوں میں اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ۔

لوگ کہنے لگے بالکشن کی دھرم پتنی ستی ہو گئی ، شاعر نے کہا بلبل گل پر نثار ہو گئی دیوی سمجھ گئی تھی کہ شمع

اندھیری ہے اندھیری ہے میری دنیا جہاں تک

مگر یہ دنیا اندھیری کہاں رہی ! اس نے تو اپنے حسن عمل اور حسن ایثار سے اسے رہتی دنیا تک کے لیے تابندہ و درخشندہ بنا دیا ۔ واقعی حقیقت افسانے سے عجیب تر ہوتی ہے ۔

رتن چند جین

# اندر چپ، باہر سناٹا

میرا بھتیجا راکیش آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں ہاؤس سرجن کے عہدے پر خدمات انجام دے رہا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے کہتا: "انکل میں اپنی زندگی سے بالکل مطمئن نہیں ہوں۔ میں نے اپنے لیے ایسا کیریئر تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میں اپنی زندگی اس طرح برباد کرنا نہیں چاہتا۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ میں امریکہ یا انگلینڈ میں کسی اونچے عہدے پر چلا جاؤں، جہاں زندگی کی ہر خوشی میرے قدم چومے۔"

دراصل راکیش شروع ہی سے روپے پیسے ہی کو سب کچھ سمجھتا رہا ہے اور زندگی میں اپنے کیریئر ہی کو اہمیت دیتا آیا ہے۔ اس کے خیالات معلوم کرکے مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوئی تھی تاہم میں نے اس سے کہا: "بیٹے، دنیا میں دولت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ ڈاکٹری ایک عظیم پیشہ ہے۔ اس کے ذریعے انسانیت کی خدمت کرکے جو سکون حاصل ہوتا ہے اس کے آگے دنیا کی سب خوشیاں، دولت، آسائشیں ہیچ ہیں۔ تم اپنے ملک میں رہ کر کروڑوں ہم وطنوں کی خدمت اور دیکھ بھال کرو۔ ملک کو تم جیسے ڈاکٹروں کی بڑی ضرورت ہے۔" لیکن اس پر میری ان باتوں کا کبھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ تو اچھی زندگی گزارنے کے لیے دولت کو بنیادی ضرورت سمجھتا تھا۔ اس کے دل میں اس قسم کے جذبات کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ بدیس جانے کے لیے بضد تھا۔ خوش قسمتی سے اس کی یہ خواہش جلد ہی پوری ہوگئی۔ اپنی پیشہ ورانہ قابلیت کے باعث اسے جلد ہی ویزا مل گیا۔ اور وہ اپنے بڑے بھائی کی مدد سے امریکہ پہنچ گیا۔ اس نے وہاں نوکری حاصل کرنے کے لیے مقررہ امتحان بھی پاس کرلیا۔ اسے ایک تحقیقی مرکز میں ملازمت مل گئی۔ اس کی سالانہ آمدنی ۲۴ ہزار ڈالر مقرر ہوگئی۔

راکیش کے لیے تو یہ بہت بڑی بات تھی۔ اسے جب اپنے نئے عہدے کے کاغذات ملے تو اس نے ٹیلی فون پر مجھے اور اپنے والد کو یہ خوشخبری سنائی۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اب مزید معاشی نقصان اٹھانا نہیں چاہتا۔ لہٰذا وہ فوراً ہی جوائن کرے گا۔ اور جلد ہی کچھ دن کی چھٹی لے کر ہندوستان آئے گا۔

ہم لوگوں کے لیے بھی یہ بہت خوشی کا موقع تھا۔ ہم اس کے جلد سے جلد ہندوستان واپس آنے کی تمنا کر رہے تھے۔ اس کے کام کاج کے ماحول، رہن سہن اور کھانے پینے کے انتظام کے بارے میں ہمیں ایک خلش سی لگی ہوئی تھی۔ لیکن ہم کو یہ امید نہیں تھی کہ اس کا دورہ ایسا طوفانی ہوگا اور وہ اپنی بھاگ دوڑ سے ہم سب کو پریشان کردے گا۔

جب وہ ایرپورٹ پر پہنچا تو ہم لوگوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا، لیکن یہ خوشی صرف تھوڑی دیر کے لیے تھی۔ گھر پہنچتے ہی سب سے پہلے اس نے اپنے والد سے یہ کہا کہ وہ صرف پندرہ دن کی چھٹی پر آیا ہے اور اس دوران اس کا شادی کرنے کا ارادہ بھی ہے۔

دراصل یہ ایک حکم سا تھا۔ اس کے والد اس کی اس مانگ سے قدرے پریشان ہوئے۔ کیونکہ رسم و رواج کے پابند ایک ہندو خاندان میں پندرہ دن کے دوران شادی کا انتظام کرنا بہت مشکل کام تھا، اسی لیے انہوں نے راکیش سے صاف صاف کہہ دیا کہ اتنے کم وقت میں شادی ممکن نہیں۔

لیکن اس جواب سے راکیش بالکل پریشان نہیں ہوا۔ بولا "کیوں نہیں پتا جی؟ یہ تو بہت ہی معمولی کام ہے۔ بلکہ آپ چاہیں تو ایک ہی دن میں یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ ہم کو لڑکی تو تلاش کرنی نہیں۔ کیوں کہ شوبھا میری پسند کی لڑکی ہے۔ اس کو آپ لوگ بھی بخوبی جانتے ہیں۔ بلکہ بھابی نے تو بہت پہلے ہی سے اس کو میرے لیے پسند کیا ہوا

ہے ۔ آپ فون پر شوبھا کے والد سے بات کرلیں ۔ اور اگلے ہفتے ان لوگوں کو یہاں دہلی میں شادی کے لیے مدعو کرلیں ۔ یہ سب کچھ بغیر کسی دھوم دھام کے بہت سادہ طریقے سے ہونا چاہیئے ۔ پہلے سادگی کے ساتھ شادی کی رسم ادا کی جائے بعد میں ایک پارٹی دے دی جائے ۔ اب آپ ہی بتائیے پتا جی ! کیا اس میں بہت وقت لگے گا اور کیا پریشانی ہوگی؟ میری پریشانی یہ ہے کہ اگر میری شادی اب نہیں ہوگی تو پھر یہ تین سال بعد ہوسکے گی کیوں کہ ملازمت کے معاہدے Contract کے دوران میں پھر چھٹی نہیں لے سکتا ۔ اب آپ جو مناسب سمجھیں کریں ۔

اس کی تمام باتیں سننے کے بعد ہمارے پاس اس کی مرضی کے مطابق شادی کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ۔ وقت کی کمی کے باوجود شادی مقررہ وقت پر ہوگئی اور وہ دونوں ہنی مون منانے شملہ بھی چلے گئے ۔ بعد میں واپس امریکہ چلے گئے تاکہ راکیش ٹھیک وقت پر اپنی نوکری پر جاسکے ۔ اپنی پسندیدہ نوکری اور بیوی حاصل کرکے راکیش بہت خوش تھا ۔

امریکہ پہنچ کر شوبھا کے دن بھی بہت سکون سے گزر رہے تھے ۔ وہ بہت خوش تھی ۔ کچھ عرصہ تک تو اسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ پریوں کے ایسے دیس میں پہنچ گئی ہے جہاں عیش و آرام کا ہر سامان اور تفریح کے سبھی ذرائع مثلاً سینما ، تھیئٹر ، کلب اور ناچ گانے وغیرہ مہیا ہیں ۔

راکیش امریکہ کے قابلِ دید مقامات پر بھی شوبھا کو لے کر گیا تاکہ وہ امریکہ کی تہذیب و رہن سہن سے بھی واقف ہوجائے ۔ شوبھا کے لیے بھی یہ ایک نئی زندگی اور نیا تجربہ تھا ۔ شروع شروع میں تو وہ برہنہ مردوں اور عورتوں کو سمندر کے کنارے ایک دوسرے کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے دیکھ کر مارے شرم کے پانی پانی ہوجاتی تھی ۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ زندگی کے طور طریقوں میں رنگ گئی ۔

شوبھا بہت خوش تھی ، کیوں کہ اس نے امریکہ آنے اور اس طرح عیش و آرام کی زندگی گزارنے کا کبھی سوچا بھی نہیں تھا ۔ لیکن یہ سب کچھ زیادہ دیر نہیں رہا ۔ اس اسنے زیادہ پیار کے بعد راکیش کے دل میں ایک بار پھر مستقبل کو مزید بہتر بنانے کی خواہش کروٹیں لینے لگیں ۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ کس طرح اس ادارے کے ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوجائے ۔ اس عہدے کو حاصل کرنے کے لیے اسے کئی امتحان پاس کرنے تھے ۔ اور امتحان پاس کرنے کے لیے کڑی محنت کی ضرورت تھی ۔ بس یہ دُھن کیا سمائی کہ اس نے فوراً ہی تیاری شروع کر دی ۔ دھیرے دھیرے وہ امتحان کی تیاریوں میں ایسا کھو سا گیا کہ بیوی تک کو لگ بھگ بھول سا گیا ۔ وہ اس کی خوب صورتی اور جوانی کی طرف سے بھی بے خبر ہوگیا ۔ شوبھا اس اچانک تبدیلی پر حیران تھی ۔ جب کبھی وہ کلب جاتے تب بھی راکیش کا ذہن امتحان کی تیاریوں کے منصوبوں میں الجھا رہتا ۔ وہ چاہتا تھا کہ شوبھا اس کام میں جی جان سے اس کی مدد کرے گو کہ وہ امریکی عورتوں کی طرح خوب صورت تھی اور روانی سے انگریزی میں بات چیت بھی کرسکتی تھی ۔ لیکن اس کی پرورش اور تربیت تو بڑے مختلف ماحول میں ہوئی تھی ۔ وہ گھریلو عورت ہے ۔ بچپن سے ہی اُسے اس قسم کی تربیت دی گئی تھی نہ کہ کلبوں میں اپنی خوبصورتی کی نمائش کرنے کی ۔ راکیش اس بات پر کئی بار بہت ناراض بھی ہوتا ، لیکن ہر بار غصّے کو پی جاتا ۔ تاہم شوبھا سب کچھ اچھی طرح سمجھتی تھی ۔

گھر پر بھی بات کرنے کے لیے راکیش کے پاس اپنے پیشہ ورانہ موضوع کے علاوہ کچھ اور نہیں تھا ۔ شوبھا خاص طور پر ان نئی فلموں ، ان نئے فیشنوں کے بارے میں بات چیت کرتی تھی ۔ جو اُسے سارا دن امریکی اور ہندوستانی رسالے پڑھ کر معلوم ہوتے تھے ۔ راکیش کو ان سب باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ وہ اسے وقت کی بربادی سمجھتا تھا ۔

شوبھا چاہتی تھی کہ وقت گزارنے کے لیے وہ کوئی کام کرے ۔ لیکن اشتہاروں میں زیادہ تر سیلز گرلس اور آفس کے کاموں کے لیے ہی "ضرورت" نظر آتی تھی ، جن کی وہ اہل نہ تھی ، کیوں کہ اس نے سلائی کڑھائی ، گھریلو سائنس کے علاوہ اور کوئی ٹریننگ نہ لی تھی ۔ اپنے شوہر کے اونچے عہدے کی وجہ سے وہ کوئی چھوٹا کام بھی نہیں لے سکتی تھی ۔ راکیش کو بھی چھوٹی چھوٹی نوکریاں ناپسند تھیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راکیش کے آفس جانے کے بعد شوبھا کو وہی پرانی اور گھسی پٹی کہانیوں کو پڑھنے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا ۔ شام کو راکیش کے واپس آنے پر جب بھی شوبھا اس سے ایسی گھسی پٹی کہانیوں اور اخباری گپ شپ کا ذکر کرتی تو تھکے ہارے راکیش کا مزاج برہم ہوجاتا ، اُسے ایسی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔

ایک دن وہ ایسے ہی ایک موقع پر کہہ بیٹھا ، "شوبھا کیا یہ ہر وقت بے کار کی باتیں کرتی رہتی ہو ۔ میں تمہاری ان گھسی پٹی باتوں کو سنتے سنتے پریشان ہوگیا ہوں ۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے اور میرے خیالات میں بہت فرق ہے ۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ جلد بازی میں تم سے شادی کرکے میں نے غلطی کی ہے ۔ بہتر یہی ہے کہ تمہیں میں طلاق دے دوں ۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے ۔ اب بھی تم کہیں اور زندگی گزار سکتی ہو بلکہ تم چاہو تو میں اس میں تمہاری مدد بھی کرسکتا ہوں ۔ میں سوچتا ہوں اب ہمیں علاحدگی اختیار کرلینی چاہیئے ۔ یہ باتیں شوبھا کے لیے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھیں ۔ ایک لمحہ کے لیے ایسا محسوس ہوا گویا اس کے دل کی دھڑکن رک گئی ہو اور وہ زمین پر گری جا رہی ہو ۔ دراصل یہ حالات اتنے اچانک رونما ہوئے کہ وہ سکتہ میں آگئی ۔ اس طرح کہ اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا ۔ اس واقعہ کے ذرا بعد راکیش کمرے سے باہر چلا گیا ۔ اور وہ بھی برآمدے میں جاکر اپنی قسمت کو کوسنے لگی ۔ وہ رو رو کر اپنے

دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہ رہی تھی، لیکن پردیس میں جہاں وہ اپنے ماں باپ اور دوسرے عزیزوں سے ہزاروں میل دُور تھی، ایسا کوئی بھی اپنی جان پہچان کا نہیں تھا۔ جس کے سامنے وہ رو رو کر اپنا بوجھ ہلکا کر پاتی اور اس مشکل گھڑی میں کوئی حل تلاش کرتی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی کیا اسی دن کے لیے اس نے راکیش کی خاطر اپنے سبھی رشتہ داروں اور والدین کو ہزاروں میل دُور ہندوستان میں چھوڑ دیا تھا اور اس کے ساتھ اتنی دُور امریکہ میں چلی آئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اچانک راکیش اتنا بدل جائے گا۔ اس کے اس اچانک بدلے ہوئے رویے سے وہ بے چین ہو اٹھی تھی۔

اگلے دن راکیش نے کوئی خاص بات نہیں کی اور شوبھا بھی معمول کے مطابق گھر کا کام کرتی رہی، لیکن دونوں نے الگ الگ کمروں میں اس طرح رہنا شروع کر دیا جیسے وہ شوہر اور بیوی نہیں ہیں۔

شوبھا کے دُکھوں کی انتہا ہو چکی تھی۔ کہاوت مشہور ہے۔ خزاں آتی ہے تو بہار کا موسم بھی لوٹ آتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک روز جب شوبھا بہت پریشان تھی تو اچانک اس کی نگاہ ایک اشتہار پر پڑی، جس میں یتیم لڑکیوں کے ایک آشرم کے لیے ایک ٹیچر کی ضرورت تھی، جو اُن بچیوں کو سلائی کڑھائی اور کھلونے وغیرہ بنانا سکھا سکے۔ شوبھا نے سوچا کہ یہ اشتہار اس کے لیے خدا کی دین ہے۔ کیوں کہ وہ مکمل طور پر اس کی اہل تھی۔ اس نے فوراً ہی ایک درخواست بھیج دی۔ خوش قسمتی سے کچھ ہی دن بعد اُسے وہ ملازمت مل گئی۔ کیوں کہ وہاں اس کے علاوہ کسی اور کی درخواست ہی نہیں پہنچی تھی — وہاں کام کے اوقات ۱۱ بجے سے ۴ بجے تک تھے۔ یہ اس کو بہت پسند آیا۔ کیوں کہ راکیش کے کام کا وقت صبح دس بجے سے شام ساڑھے پانچ بجے تک تھا، اس لیے اُسے شوبھا کے نئے کام کا علم نہ ہوسکا۔ جیسے جیسے اس آشرم کی لڑکیوں اور دوسرے کاموں میں شوبھا کی مشغولیت بڑھتی گئی۔ اس کی ذہنی کشیدگی بھی کم ہوتی گئی۔ دراصل اُس نے اتنی محنت کی کہ وہاں کے تمام ملازم اور طالبات اس کی تعریف کرنے لگیں۔

وقت گزرتا رہا۔ سال کے اختتام پر سالانہ جلسہ کے موقع پر اُنہوں نے بچیوں کی بنائی ہوئی گڑیوں اور سلائی کڑھائی اور رنگائی کی چیزوں کی نمائش کا اہتمام کیا۔ شوبھا کی سخت محنت کی وجہ سے نمائش بہت کامیاب رہی اور وہاں کے مقامی اخبارات کی توجہ بھی اس طرف مبذول ہوئی۔ انہوں نے بھی اس کی بہت تعریف کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ..... جو اس قسم کی چیزوں کا کاروبار کرنے والے بہت سارے لوگ نمائش دیکھنے آئے۔ ان میں سے ایک کماری سونتھی تھی جو ایک ہندوستانی خاتون تھی اور جو اب امریکہ کی شہری تھی اور سِلے ہوئے کپڑوں کا کاروبار کرتی تھی۔ وہ اس نمائش سے اتنی متاثر ہوئی کہ اُس نے شوبھا کو اپنے کاروبار میں شریک ہو جانے کی پیش کش کی۔ وہ اُسے اس کی موجودہ تنخواہ سے کہیں زیادہ تنخواہ دینے کے لیے تیار تھی۔ اس نے یتیم خانے کے لوگوں سے بھی کہا کہ وہ اس کی ترقی کی راہ میں رُکاوٹ نہ بنیں۔ شوبھا کی قابلیت سے وہاں کے ذمہ داران نے جو پہلے ہی بہت متاثر تھے، اس کی ترقی کے پیشِ نظر اسے فوراً ہی نئے کام کی ذمہ داری سنبھالنے کی اجازت دیدی۔ ان لوگوں کی اس خوش سلوکی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے شوبھا نے بھی یہ کہا کہ جب اور جہاں بھی آشرم کو اس کی مدد کی ضرورت ہوگی وہ ہمیشہ اس کے لیے تیار ہوگی۔

شوبھا نے اپنے نئے کام کو بھی بہت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اس سے نہ صرف اس فرم کی برآمدات میں اضافہ ہوا بلکہ اس سے غیر ممالک میں وہ مال بہت پسند کیا گیا تھا۔ کچھ ملکوں میں تو شوبھا کے بنائے ہوئے نئے ڈیزائنوں کے ملبوسات اور ہندوستانی طرز کی گڑیاں عورتوں اور بچوں میں بہت مقبول ہوئیں — بعض ملکوں کی متعدد انجمنوں نے شوبھا کو اپنے یہاں نمائش کا انتظام کرنے، لیکچر دینے اور کام سکھانے کے لیے مدعو کیا۔ وہاں کے اخباروں نے بھی اس کے قابلِ تعریف کام کی بڑی تعریفیں کیں۔ نتیجتاً اُسے ٹیلی ویژن کے پروگرام ملنے لگے تھے۔ اِدھر اُس چڑھتی ہوئی موج کو ساحل مل گیا تھا — امتحانات کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ اس کی مراد بر آئی تھی۔ اب وہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا ڈائریکٹر بن چکا تھا۔ شوبھا کے ساتھ خوش و تلخیوں سے بسر کئے ہوئے لمحوں کی یاد اب اُسے پھر پریشان کرنے لگی تھی۔

ایک روز ٹیلی ویژن پر ایک پروگرام دیکھ کر ہی راکیش کو شوبھا کی سرگرمیوں کا علم ہوا۔ وہ شوبھا کو ٹیلی ویژن پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شوبھا جیسی سیدھی سادی گھریلو لڑکی میں اتنی صلاحیتیں ہوں گی۔ ساتھ ہی اُسے دُکھ بھی ہوا کہ شوبھا نے یہ بات اُس سے چھپائے کیوں رکھی۔ لیکن اُسے فوراً ہی خیال آیا کہ اُس نے شوبھا کو طلاق دینے کے لیے کہا تھا۔ شاید اسی تلخی کی وجہ سے اُس نے اس کو یہ بات نہیں بتائی تھی۔ شوبھا کی اس قابلیت کو دیکھ کر اُسے بہت خوشی ہوئی۔ اب وہ اپنے رویے پر بہت شرمندہ تھا۔ اُسے اس بات کا بھی دُکھ ہوا کہ وہ شوبھا کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو سمجھ کیوں نہ سکا۔ وہ اپنے رویے پر بے حد شرمندہ تھا اور اُس سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔ وہ سب کچھ بھول کر از سرِ نو زندگی شروع کرنا چاہتا تھا۔

ایک رات کے کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے شوبھا کے کمرے میں چلا گیا اور بے اختیار اُس سے لپٹ گیا۔ ندامت کے احساس نے لب سی دیئے تھے۔ (آگے صفحہ ۴۲ پر)

صادقہ ذکی

# من کہ ... تسامحات: تصحیح

ماہ نامہ آج کل، جون ۱۹۸۴ء نظر سے گزرا۔ اس میں "من کہ" کے زیرِ عنوان پروفیسر محمد مجیب کے متعلق بعض تسامحات اندراج پا گئے۔ ذیل میں تصحیح پیش کی جا رہی ہے:

۱۔ مجیب صاحب کی مکمل ابتدائی تعلیم لوریٹو کانونٹ، لکھنؤ Loreto Convent میں ہوئی۔ اس کے بعد تقریباً ایک سال اسلامیہ ہائی اسکول لکھنؤ میں پڑھا۔ ثانوی تعلیم دہرہ دون کے ایک پرائیویٹ اسکول سے حاصل کی۔ بعد میں اسی اسکول سے کیمبرج جا کر کیمبرج کا امتحان دیا۔ مجیب صاحب اس اسکول کے طریقۂ تعلیم سے بے حد متاثر ہوئے۔ (مجیب صاحب کے بیان اور ان کی سوانحی تحریروں کے مطابق)

۲۔ ماہنامہ جامعہ ۱۹۲۶ء میں مجیب صاحب کا پہلا افسانہ "باغی" شائع ہوا۔ یہ کہانی دراصل انگریزی میں ۱۹۲۵ء میں لکھی گئی تھی (ملاحظہ ہو دیباچہ کیمیاگر از: محمد مجیب) اس کا اردو ترجمہ دو قسطوں میں ماہ نامہ جامعہ مارچ و اپریل ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔

مجیب صاحب کے ابتدائی دور کا ایک اور افسانہ "پتھر" ہے، جو دراصل ۱۹۲۵ء میں "Stones" کے زیرِ عنوان The Bharat, trinity Term, Vol. II, Oxfored 1925 میں شائع ہوا تھا۔ یہ ان کے افسانوں کے مجموعے "کیمیاگر" میں شامل ہے۔

۳۔ مجیب صاحب کا پہلا علمی مضمون "روسی انقلابی شاعری" ہے، جو "جامعہ" جون ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا۔ "من کہ ..." میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

ب۔ مجیب صاحب کا مضمون جو سعید انصاری صاحب کی کتاب "آزادی" (جان اسٹورٹ مل کی کتاب لبرٹی کا ترجمہ) میں بطور مقدمہ شامل ہے۔ رسالہ جامعہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس سے پیشتر مجیب صاحب کا ایک اور انگریزی مضمون The Russian Drama بھی علی گڑھ میگزین نومبر ۱۹۲۲ء میں شائع ہو چکا تھا۔

۴۔ مجیب صاحب کے بیرونی ممالک کے جو دورے پیش کئے گئے ہیں ان میں مندرجہ ذیل سفر شامل نہیں ہیں۔

مجیب صاحب یونسکو کی پہلی بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ پیرس (مئی ۱۹۵۶ء) میں ہندوستانی نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ یہ کانفرنس کئی اعتبارات سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں مجیب صاحب نے مغربی ممالک میں پڑھائے جانے کے لیے تاریخ ہند کے مختلف عنوانات کی فہرست پیش کی تھی، جو پیرس میں یونسکو کے کاغذات نمبر ای-ڈی-۸ نومبر ۱۹۵۶ء کے طور پر شامل ہے۔

۱۹۵۸ء میں مجیب صاحب جینیوا اور زیورچ تشریف لے گئے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ ۱۹۶۶ء میں مجیب صاحب انقرہ اور استنبول کی یونیورسٹیوں میں خطبہ دینے کے لیے تشریف لے گئے تھے، لیکن ٹرکی کے علاوہ برلن اور لائبیریا بھی اس سفر کی منزلیں تھیں۔

وہ ۱۹۶۱ء میں میگل یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے مانٹریل گئے، جہاں سے وہ ۱۹۶۲ء میں فرانس گئے۔ بعد میں ہندوستان واپسی ہوئی۔

۵۔ پروفیسر محمد مجیب کی کتاب "ہماری آزادی"

الف۔ جو دراصل India Wins Freedom کا اردو ترجمہ ہے پہلی بار ۱۹۶۱ء میں اورینٹ لونگ مینس دہلی نے شائع کی تھی۔ اس کی تاریخ اشاعت جنوری ۱۹۵۹ء ——— دراصل مولانا آزاد کی اصل کتاب "انڈیا ونز فریڈم" کی اشاعت کی تاریخ ہے۔

ب۔ مجیب صاحب کا ڈرامہ "حبہ خاتون" پہلی بار جون ۱۹۵۱ء میں مکتبہ جامعہ، دہلی سے شائع ہوا۔

ج۔ "دنیا کی کہانی" (نشریات مجیب صاحب) کی تاریخ اشاعت جون ۱۹۳۷ء لکھی گئی ہے جب کہ اس دیباچہ پر جو خود مجیب صاحب کی تحریر کردہ تاریخ جون ۱۹۳۸ء لکھی ہوئی ہے۔ اس کے تمام ایڈیشنوں میں دیباچہ کی تاریخ جون ۱۹۳۸ء ہی درج ہے۔

د۔ "تاریخ ہندوستان کی تمہید" مجیب صاحب کا توسیعی خطبہ ہے۔ جس کی تاریخ ۱۹۳۵ء ہے۔ ۱۹۳۷ء میں مکتبہ جامعہ نے اسے

اُسے شائع کیا تھا۔

۶۔ مجیب صاحب کی پیش کردہ کتابوں کی فہرست میں مندرجہ ذیل کتابوں کے نام شامل نہیں کئے گئے :

۱۔ شیدولا اور دوسری کہانیاں (بچوں کے لیے روسی کہانیوں کا ترجمہ) مکتبہ جامعہ ۱۹۳۵ء۔

۲۔ دنیا کی کہانی (بالغ مبتدیوں کے لیے پانچ حصوں میں) ادارہ تعلیم و ترقی، جون ۱۹۳۸ء۔

۳۔ آؤ ڈراما کریں (بچوں کے لیے ڈرامہ کی تکنیک) مطبوعہ: "پیامِ تعلیم"، دہلی۔ جنوری فروری ۱۹۴۱ء مکتبہ جامعہ سے بھی کتابی شکل میں شائع ہوا۔

۴۔ ادب اور ادیب (کتابچہ) اردو گھر، دہلی ۱۹۴۴ء۔

۵۔ ہمارا دین (کتابچہ) جامعہ اسکاؤٹ ایسوسی ایشن۔

۶۔ تین ناٹک (ٹیگور کے ڈراموں کا ترجمہ) ساہتیہ اکاڈمی ۱۹۶۲ء دہلی۔

۷۔ 'غالب'۔ اردو کلام کا انتخاب، مکتبہ جامعہ ۱۹۷۲ء

۸۔ نگارشات (مضامین کا مجموعہ) مکتبہ جامعہ ۱۹۷۳ء

۷۔ مجیب صاحب کے ان انگریزی خطبات ساتھ شامل کرکے لکھے گئے ہیں۔ مجیب صاحب کی فہرست بھی تشنہ ہے، جو کتابوں کے کے مطبوعہ خطبات ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری میں موجود ہیں۔ درج ذیل ہیں :

1-"First Impression of Western Culture."
South Asian Studies IInd.Edited
by H.R.Maxmullar Bhawan

2-"Can Education save our souls."
The Journal of Central Education
published quarterly by Uni.of Chicago,P.67.71
Vol.XI,No.2,April,1958.

3-"Mahatma Gandhi's Message to Humanity"
Gandhian Ideas on Education.
Their relevance to our times.
I.M.H.(P) Ltd,Delhi

4-"Annual Function And Gandhi Day".
Bachohon Ke Ghar,Daryaganj,Delhi

ان کے علاوہ بھی کچھ اور انگریزی خطبات ہیں، جو مختلف موضوعات کے تحت انگریزی مجموعوں میں مل جاتے ہیں۔

لطیف صاحب نے پروفیسر مجیب کی انگریزی و اردو کتابوں میں کل ۲۹ کی نشاندہی کی ہے۔ جس انداز پر یہ فہرست ترتیب دی گئی ہے، اگر اس کے مطابق دیکھا جائے تو یہ تعداد تقریباً پچاس تک پہنچتی ہے۔ ●●

بقیہ : اندر جیب باہر سناٹا

موزوں الفاظ اور ان کے استعمال سے ذہن یکسر خالی تھا۔ اشکوں کی ندی چڑھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف شوبھا شانت مہاساگر کی طرح پُرسکون تھی۔ نہ کوئی موج نہ ہلچل، نہ اتھل پتھل۔ اندر جیب باہر سناٹا۔

## بقیہ : خصلت

تینوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور آخر اسی عالم میں پہلے اس نے کھڑکی پہ چھلانگ لگائی، پھر غسل خانے کی دیوار پر اور وہاں سے کوٹھے پر........

دن ڈھلے جب باپ لوٹا تو بیٹی نے سارا واقعہ سنا کر پوچھا۔

"بندر نے اس کا گھر کیوں توڑا تھا پاپا۔؟"

"یہ آج کل کچھ زیادہ ہی سمجھ دار ہوگئی ہے۔ شوہر نے بیوی کو دیکھتے ہوئے بچی کا سوال ان سنا کر دیا۔ کچھ دیر تو وہ چپ رہی۔ اس کے بعد اس نے دوسرا سوال کیا:

"کیا بندروں کا گھر نہیں ہوتا؟"

"دیکھا۔ اب میں اسے کیا بتاؤں؟ شوہر نے جواب دینے کے بجائے پھر بیوی کو مخاطب کیا ●●

# نئی کتابیں

کتاب : اقبال اور قومی یکجہتی
مصنف : سید مظفر حسین برنی
ناشر : ہریانہ ساہتیہ اکادمی، چنڈی گڑھ
قیمت : درج نہیں

اقبال کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ ان پر لکھنے کے لیے کسی نئے موضوع کو ڈھونڈ نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ لیکن سید مظفر حسین برنی صاحب نے آخر ایک ایسا گوشہ تلاش کر ہی لیا، جو مطالعۂ اقبال میں نہ صرف بالکل نیا ہے، بلکہ ایسے زمانے میں جب کہ مذہبی، لسانی اور علاقائی تعصب بڑھتا جا رہا ہے، وقت کی ضرورت اور تقاضے کے عین مطابق ہے۔

زیر نظر کتاب "اقبال اور قومی یکجہتی" سید مظفر حسین برنی صاحب کے انگریزی خطبے کا ترجمہ ہے جو انہوں نے بھوپال یونیورسٹی میں جنوری ۱۹۸۴ء میں دیا تھا۔ اسے ساہتیہ اکادمی ہریانہ نے شائع کیا ہے۔ مظفر حسین برنی صاحب حکومت ہند کی مختلف وزارتوں میں اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز رہے ہیں اور اس وقت ہریانہ کے گورنر ہیں۔ اس کے علاوہ اردو و فارسی ادبیات سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس خطبے میں اقبال کے کلام میں حب الوطنی، قومی یکجہتی اور مذہبی رواداری کے پہلوؤں کا تفصیل سے مطالعہ کیا ہے۔ یہ مطالعہ اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ سیاسی تبدیلیوں نے اقبال کے سلسلے میں بعض ذہنوں نے شکوک و شبہات پیدا کر دئے ہیں۔ انہیں دور کرنے کی ایک جامع کوشش اس خطبے میں کی گئی ہے۔

سید مظفر حسین برنی صاحب نے اقبال کے یہاں قومی یکجہتی کے عناصر کی تلاش میں مختلف پہلوؤں سے ان کے کلام کا جائزہ لیا ہے جس میں سب سے پہلے انہوں نے مادر وطن سے محبت کا ذکر کیا ہے، اس لیے کہ قومی یکجہتی کی بنیادی شرط وطن سے محبت ہے۔ اگر وطن سے وفاداری نہیں ہے تو کسی طرح کی یکجہتی کا کوئی تصور پیدا نہیں ہو سکتا۔ اقبال کے کلام میں مادر وطن سے محبت کا جذبہ ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے۔ ان کی نگاہ میں خاک وطن کا ہر ذرہ دیوتا ہے اور جس "فصیل" کو آسمان جھک کر بوسہ دیتا ہے۔ جس کے دریا اقبال کو "جیحون و فرات" سے زیادہ عزیز ہیں۔

اقبال نے جس انداز میں قومی یکجہتی اور مذہبی رواداری کی تعلیم دی ہے اس کی مثال مشکل سے کہیں نظر آئے گی۔ انہوں نے ایک طرف ہم وطنوں کے دلوں میں خودداری، خود اعتمادی اور عمل کی شمع روشن کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف فرقہ واریت سے بلند ہو کر سوچنا سکھایا۔ انہوں نے بتایا کہ کوئی مذہب نفاق و دشمنی کی تعلیم نہیں دیتا۔ فرقہ واریت ہی میں "ہنگامۂ محشر" چھپا ہوا ہے۔ اس لیے فرقہ وارانہ جذبات کے اظہار کے لیے کبھی اپنی زبان نہ کھولنا اور ایسی بات زبان سے نہ نکالنا جس سے کسی کے دل کو تکلیف پہنچے۔ انہوں نے اپنی بہت سی نظموں میں مختلف طرح سے ان جذبات کا اظہار کیا ہے۔

مظفر حسین برنی صاحب نے اپنے خطبے میں اس بات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ اقبال تمام مذاہب اور ان کے بزرگوں کا یکساں طور پر احترام کرتے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

"قومی اتحاد کا جذبہ پیدا کرنے اور اسے باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے دوسرے فرقوں اور مذہبی رہنما اور مذہبی شخصیتوں کے لیے عزت و احترام کا جذبہ پیدا کریں۔ اس سلسلے میں اقبال نے ایک نئی روایت کا آغاز کیا کہ انہوں نے ہندوستان کے سنتوں اور مذہبی رہ نماؤں پر نظمیں لکھیں۔"

اقبال، رام چندر جی، مہاتما بدھ، سوامی رام تیرتھ، گرونانک، وشوامتر اور دوسرے بزرگ اور مذہبی رہ نماؤں سے بہت متاثر تھے۔ اس کے اشارے ان کی مختلف نظموں میں مل جاتے ہیں۔ انہوں نے "گایتری منتر" کا اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا اور اس مطابقت کا اظہار بھی کیا جو گایتری منتر کے مفہوم اور "نور السموات والارض" میں پایا جاتا ہے۔ وہ سری کرشن جی اور ان کی تعلیمات سے بھی بے حد متاثر تھے۔ برنی صاحب نے لکھا ہے کہ

"اقبال" بھگوت گیتا" کے فلسفۂ عمل (کرم) سے بھی متاثر تھے ...... اس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ انسان کو صلہ کی پروا کے بغیر عمل کرنا چاہیے۔ عمل میں انسان کا یہ مکمل تیاگ (ترکِ خواہش) روح کو رفعت بخشتا ہے اور اسے ابدی روح (ہستیٔ مطلق) سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ اپنی مثنوی "اسرارِ خودی" کے پیش لفظ میں اقبال نے گیتا کی تعلیمات کے اصلی محرک پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔"

اس خطبے کا ایک بہت اہم حصہ "اقبال اور پاکستان" ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اقبال پاکستان کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ برنی صاحب نے اقبال کے

بعض خطوط کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال پاکستان کے حامی نہیں تھے بلکہ وہ انڈین فیڈریشن میں مسلم صوبے کی تشکیل چاہتے تھے۔ انہوں نے بار بار اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے تاکہ کوئی غلط فہمی نہ رہے۔ خود پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اپنی مشہور تصنیف "ڈسکوری آف انڈیا" میں اقبال سے اپنی آخری ملاقات کا بیان کرتے ہوئے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مظفر حسین برنی صاحب نے اپنے خطبے میں تاریخی و تحقیقی دلائل کے ساتھ یہ بات ثابت کی ہے کہ اسلام سے گہری وابستگی کے ساتھ اقبال مختلف فرقوں اور مذاہب میں اتفاق اور یگانگت، رواداری اور محبت کے زبردست حامی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بغیر مذہبی رواداری اور اتفاق کے ملک ترقی نہیں کرسکتا۔ اسی لیے انہوں نے جنوری ۱۹۳۸ء میں سال نو کے پیغام میں کہا تھا کہ "انسان اس زمین پر صرف انسان کا احترام کرکے باقی رہ سکتا ہے"۔ مظفر حسین برنی صاحب نے اقبال کی فکر میں یک جہتی، دردمندی اور مذہبی رواداری کے پہلوؤں کو جس طرح اپنے خطبے میں اجاگر کیا ہے اور جس مدلل انداز میں اسے پیش کیا ہے، اس کے لیے وہ یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔ برنی صاحب کا یہ خطبہ بلاشبہ اقبال شناسی کی ایک نئی جہت پیش کرتا ہے۔ ساتھ ہی میں ہریانہ ساہتیہ اکادمی کو بھی قابل مبارکباد سمجھتا ہوں، جس نے اعلیٰ آرٹ پیپر پر بڑی نفاست کے ساتھ اسے شائع کیا ہے۔

شارب ردولوی

کتاب: زبان، اسلوب اور اسلوبیات
مصنف: ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ
قیمت: ۳۰ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ
علی گڑھ

یہ کتاب ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کے ان سات مضامین کا مجموعہ ہے، جو ایک نئے شعبۂ ادب "لسانیاتی اسلوبیات" سے متعلق ہیں۔

جس طرح اٹھارہویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں سر ولیم جونس کے بیان سے لسانیات میں تاریخیت کے ایک نئے باب کا اضافہ ہوا تھا جسے آگے چل کر تاریخی یا تقابلی لسانیات کا نام دیا گیا تھا اور جس نے پوری انیسویں صدی عیسوی میں ماہرین لسانیات کو شبانہ روز نہایت سرگرم اور مشغول رکھا تھا اسی طرح مغرب ہی کے ایک اور مصنف ٹامس رے سیبوک نے مختلف مصنفین کے لکھے ہوئے مقالات کا ایک مجموعہ "اسٹائل ان لینگویج" کے نام سے شائع کرکے بقول ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ ۱۹۶۰ء سے ادبی تنقید میں ایک نئے انداز فکر "لسانیاتی اسلوبیات" کی طرح ڈالی۔

فاضل مصنف نے اپنے پہلے مضمون "ادبی مطالعہ وتنقید اور لسانیات" میں مغربی مصنفین کے حوالے سے اس شعبۂ ادب کی ایک مربوط تاریخ مدون کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مضمون میں ادب، تنقید، اسلوب اور لسانیات سبھی مفاہیم و موضوعات زیر بحث آتے ہیں۔ دوسرے، چوتھے اور پانچویں مضمون میں شعری اسلوب اور تیسرے مضمون میں رشید احمد صدیقی کے نثری اسلوب کا تجزیہ پیش کیا ہے اور چھٹے اور ساتویں مضمون میں اسلوبیات اور اسلوب کی تعریف، تشریح اور توضیح کی ہے۔

فاضل مصنف نے لسانیاتی اسلوبیات کو ادب پر لسانیات کے اطلاق کا نتیجہ بتایا ہے، اطلاقی لسانیات کے ایک نئے شعبے سے اس کا تعلق دکھایا ہے اور مغربی مصنفین کی تحریروں اور حوالوں سے اپنے دعووں کو مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب کے تمام مضامین مصنف کی محنت اور کاوش کے آئینہ دار ہیں جیسا کہ ان کے مفید حواشی سے بھی ظاہر ہے۔ خصوصاً آخری دو مضامین کافی معلومات افزا ہیں۔ کتاب میں مصنف نے اسلوب و اسلوبیات کے نہ صرف معانی و متعلقات پر روشنی ڈالی ہے بلکہ بہت سے ایسے خیالات بھی پیش کئے ہیں جن سے اتفاق کرنا ممکن نہیں مثلاً: ادبی اسلوبیات کا تعلق لہجے، صوتی آہنگ، الفاظ کے دروبست اور کلام میں ان کی ترتیب وغیرہ یعنی ہیئت سے ہوتا ہے اور یہ بات خود مصنف کی فراہم کردہ مثالوں سے بھی ظاہر ہے، لیکن فاضل مصنف نے اسلوب کو معنویات سے بھی مربوط بتایا ہے۔

شاعر و نثار کا مقصد اصلی ابلاغ خیال اور ترسیل معانی ہوتا ہے اور معنی مفرد آوازوں میں نہیں الفاظ میں ہوتے ہیں۔ اس لیے جہاں فاضل مصنف کا یہ بیان درست ہے کہ ان مفرد آوازوں سے صوتی آہنگ پیدا ہوتا ہے اور جن پاروں میں غنائیت آتی ہے جیسا کہ ردیف قافیے کے سنجوگ سے بھی واضح ہے، وہاں ان کا یہ دعویٰ ناقابل تسلیم ہے کہ زبان کی مفرد آوازیں اپنے اندر نہ صرف معانی رکھتی ہیں بلکہ مختلف جذبات انسانی مثلاً خوف، لالچ، غصہ، محبت، نفرت اور حزن وملال کی بھی نشان دہی کرتی ہیں۔ ان کے چند بیانات ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ جن آوازوں کی جتنی زیادہ تکرار ہوگی اتنے ہی زیادہ معانی اس میں پنہاں ہوں گے۔
(ص: ۴۴)

۲۔ دوسری بہت سی آوازوں کی طرح اردو کی کوزی آوازیں مثلاً: /ٹ/ /ڈ/ /ڑ/ اور ان کی ہکاری آوازیں مثلاً /ٹھ/ /ڈھ/ /ڑھ بھی اپنے اندر مخصوص معنوی پہلو رکھتی ہیں۔ (ص ۴۵)

۳۔ اگر کسی شاعر کے کلام میں غم، اداسی اور حزن وملال کا عنصر زیادہ ہے تو اس کے یہاں طویل مصوتوں کے علاوہ /ہ/ اور ہکاری آوازیں مثلاً /پھ/ /بھ/ /تھ/ /دھ/ /چھ/ /جھ/ وغیرہ زیادہ ملیں گی۔
(ص: ۴۵)

۴۔ حزنیہ اور غم انگیز لہجے کی تعمیر میں الفی
آوازوں کی ترتیب و تنظیم، کثرت و تنوع
اور تکرار کو ایک خاص دخل ہے۔
(ص: ۱۱۷)

۵۔ /ر/ کی آواز جمود و تعطل کے اظہار کے
برعکس حرکت، روانی، سرعت، ارتعاش
اور ارتعاش کی کیفیت کی ترجمانی کرتی ہے
/ل/ کی آواز کے ساتھ مل کر اس کے صوتی
تاثر میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔
(ص: ۵۱)

۶۔ فیض کی اس نظم میں /ک/ کی آواز سے
چڑچڑے پن، غصے اور جھنجلاہٹ کی کیفیت
کا پتہ چلتا ہے۔ (ص: ۶۶)

۷۔ غیر مسموع آوازیں مسموع آوازوں کے
مقابلے میں زیادہ سخت اور کرخت ہوتی ہیں۔
(ص: ۶۶)

۸۔ اسی طرح /س/ /ز/ /ز/ اور /ش/ کی صفیری
آوازوں سے سرگوشی، خاموشی، سناٹا،
سکون اور رازدارانہ کیفیات کے اظہار میں
مدد ملتی ہے۔ (ص: ۵۱)

۹۔ صفیری آوازیں سکوت، خاموشی، سرگوشی
اور پراسراریت کے مفہوم سے مطابقت رکھتی
ہیں اور قدرتی مظاہر و مناظر کی کیفیت
کے بیان میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔
(ص: ۱۱۶)

غرض پوری کتاب صوتی معنویت پر شدید اصرار
سے بھری ہوئی ہے۔ فاضل مصنف ہر قسم کی مفرد آوازوں
کو کونی، بکاری، انفی، صفیری وغیرہ میں کوئی نہ کوئی
مخصوص معنی دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کرتے
ہیں اور حقیقت صرف اتنی ہے کہ یہ زیر تجزیہ فن پاروں
کی تاثراتی پرچھائیاں ہیں جنہوں نے مصنف کے ذہن
میں مفرد آوازوں کی معنویت کا التباس پیدا کر دیا
ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس نمبر ۲ میں بھی آوازوں کی
سختی اور کرختگی کوئی عالمگیر لسانی حقیقت نہیں
ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ انفرادی جمالیاتی حس
اور پسند و ناپسند کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔

کتاب میں نثری اور شعری اسالیب کا
جو تجزیہ پیش کیا گیا ہے وہ کافی دقتِ نظر اور عرق ریزی
کا نتیجہ ضرور ہے، لیکن اس سے ان فن پاروں کے
حسن و لطافت کا سراغ نہیں ملتا اور یہ کہ صوتی
معنویت کا مفروضہ قائم کر کے پوری نہیں کی جاسکتی۔

بحیثیت مجموعی یہ کتاب ادبی تنقید میں سوچ
بچار کی نئی راہ کھولنے کی ایک دلچسپ کوشش ہے۔

سہیل بخاری

کتاب: کتاب الکلیات
مصنف: لابی الولید محمد ابن رشد
ترجمہ: لٹریری ریسرچ یونٹ، لکھنؤ
قیمت: ۳۵ روپے

یہ کتاب ازمنہ وسطیٰ کے ایک عظیم (عربی)
فلسفی و طبیب کی فن طب پر عربی زبان میں ایک
کتاب "کتاب الکلیات" کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ
ترجمہ جناب حکیم شکیل احمد شمسی صاحب کے زیر نگرانی
انجام پایا

اس کتاب کا مصنف ابن رشد مشرق سے
زیادہ مغرب میں مشہور ہوا۔ اس نے فلسفہ اور طب کے
علاوہ علم کلام، فقہ و اصولِ فقہ، علم نحو اور علم ہیئت
پر بھی کتابیں لکھیں۔

زیر نظر کتاب میں طب کے تمام موضوعات
کے اصول کلیہ بیان کیے گئے ہیں۔ اس تصنیف میں
فلسفہ کا رنگ شامل ہے کیونکہ ابن رشد بذاتِ
خود ایک عظیم فلسفی تھا، جس نے ارسطو کے فلسفے کی
شرحیں لکھیں، جن کی بنا پر یورپ کے فلسفی ابن رشد
کو ارسطو کا ترجمان سمجھتے ہیں۔

اس کتاب کا اصل عربی نسخہ اسکوریال
لائبریری (اسپین) میں موجود ہے اور اس کے
لاطینی و عبرانی زبان میں ترجمے پندرھویں اور سولھویں
صدی عیسوی میں شائع ہو چکے تھے۔

سات ابواب پر مشتمل اس کتاب میں جسم
انسانی کے تمام اعضا کے منافع اور مزاج طبیعی،
جسم کی حالت مرض، تمام بدن اور اس کے ہر عضو
کی علامات صحت و امراض کی علامات اور ان کے
اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ادویہ و
اغذیہ کی تعریف اور ان کا فرق نیز مجرب ادویہ
مفردہ کے افعال و خواص، ان کے مزاج و درجات
بیان کیے ہیں۔ ساتھ ہی قوی ادویہ ثانی و ثالث
بیان کرتے ہوئے ادویہ کو مرکب بنانے کے قوانین
اور مرکبات کے امزجہ و قوی کے درجات معلوم کرنے
کا طریقہ بھی بیان کیا گیا ہے۔

کتاب کے چھٹے باب "کتاب حفظ الصحت"
میں حفظانِ صحت کی اقسام اور حفظانِ صحت کے
طریقوں پر بحث کی گئی ہے اور حفظ ما تقدم یعنی تندرست
اجسام کو بیماری کے پیدا ہونے سے روکنے کے طریقے
بیان کیے گئے ہیں۔

باب ہفتم کتاب شفاء الامراض سے غیر طبیعی
حالات (یعنی امراض) کا بیان کرتے ہوئے علاج
بالتدبیر کے طریقے درج کیے گئے ہیں۔

یہ کتاب طب یونانی کے طلبا کے لیے ایک
بہترین اور مکمل کتاب ہے۔

کتاب: طب یونانی میں گھریلو ادویہ اور عام معالجہ کی کتاب
مرتبین: طبیبہ ام الفضل و حکیم محمد عبدالرزاق
قیمت: ۵ روپے

زیر نظر کتاب علم الادویہ پر ایک مختصر مگر جامع
کتاب ہے، جس میں ہر بیماری کا علاج مختصر طور پر
بیان کیا گیا ہے اور مجرب اور آسانی دستیاب
ہونے والی ادویہ سے نسخہ جات مرتب کیے گئے
ہیں۔ ان میں کچھ مشہور مرکبات و گھر میں استعمال
ہونے والے مصالحہ جات جیسی مفرد ادویہ بھی
شامل ہیں۔

اس کتاب میں امراض راس، امراض عین،
امراض اذن، امراض انف، امراض فم، امراض حلق،

امراض صدر، امراض ثدی ، امراض معدہ ، امراض کبد وطحال (جگر وتلی کے امراض)، امراض امعاء (آنتوں کی بیماریاں)، امراض کلیہ ومثانہ (گردوں اور مثانہ کی بیماریاں)، امراض مردانہ، امراض زنانہ ، حمیات (بخار) امراض جلد اور امراض متفرقہ یعنی مختلف بیماریوں کے علاج کے لیے آسان، کم خرچ اور مؤثر نسخے بالترتیب درج ہیں۔

علاوہ ازیں حفظانِ صحت کی ہدایات، دواؤں کی تیاری کے طریقے، انہیں محفوظ رکھنے اور استعمال کرنے کی ہدایات بھی بیان کی گئی ہیں۔ نیز مساوی ناپ و مقدار خوراک کا بھی مختصر بیان ہے۔

آخر میں اشاریہ میں کتاب میں درج تمام ادویہ کے انگریزی مترادفات بھی دیے گئے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کتاب نہ صرف اطباء اور طلباء کے لیے مفید ہے بلکہ یہ گھریلو علاج کے لیے بھی بہترین رہبر ہے۔ یہ کتاب اردو کے علاوہ ہندی، انگریزی، تامل اور تیلگو زبانوں میں بھی دستیاب ہے۔

# تعارف

کتاب : آئینۂ سرگزشت (سوانح شیخ الرئیس بوعلی سینا)
تصنیف : لٹریری ریسرچ یونٹ، اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

قیمت : ۵ روپے

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے شہنشاہ طب شیخ الرئیس بوعلی سینا کی سوانح حیات ہے۔ اس کا اصل نسخہ عربی زبان میں استانبول یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔ اس کا ایرانی محقق آقائی سعید نفیسی نے فارسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اسی فارسی ترجمہ کی بنیاد پر علی گڑھ ریسرچ یونٹ نے یہ اردو ترجمہ کیا ہے۔

اس دستاویز میں شیخ کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے خاص خاص حالات و واقعات مختصر طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں ان کی طبی خدمات کے تذکرہ کے علاوہ ان کی اہم اور مقبول تصانیف کی مکمل فہرست بھی دی گئی ہے، جن کی تعداد ۹۵ ہے۔

کتاب : کتاب الابدال
مقالة فی الابدال الادویة المستعملة فی الطب والعلاج

مؤلف : ابوبکر محمد ابن ذکریا رازی
مترجمین ومشرح : حکیم تبارک کریم تکمیلی، حکیم غلام مہدی، خالد جاوید شمسی، حکیم شکیل احمد شمسی۔

قیمت : ۹ روپے

یہ کتاب ابوبکر محمد ابن ذکریا رازی کی تالیف مقالہ فی الابدال الادویہ المستعملۃ فی الطب والعلاج (عربی) کا ترجمہ ہے۔

اس کتاب میں ۱۲۲ ادویہ مفردہ کے بدل درج ہیں۔ پہلے عربی اور بعدہٗ ان کا اردو ترجمہ مع تشریحات درج ہے۔

تشریحات میں ان تمام ادویہ کے ہندی و نباتی نام، خواص، بدل اور پھر ان ابدال کے بھی مختلف زبانوں نیز نباتی ناموں کے ساتھ ان کے خواص بھی بیان کیے گئے ہیں۔

علاوہ ازیں اسی کتاب کے مصنف کے مختصر حالاتِ زندگی اور کارناموں پر مشتمل ایک مضمون اس کتاب کے شروع میں شامل کیا گیا ہے۔

# دیگر مطبوعات

سی سی آر یو ایم نے اردو کے علاوہ ہندی، انگریزی، تامل اور تیلگو زبانوں میں بھی کچھ کتابیں چھاپی ہیں۔ جن میں اس ادارے کی سالانہ رپورٹ اور سیمیناروں کو بھی کتاب کی شکل میں طبع کیا ہے۔

مذکورہ بالا کتب سینٹرل کاؤنسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، ۵ - پنچ شیل مارگ، شاپنگ سینٹر نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ نے شائع کی ہیں۔

کتاب : تشریح الہیکل (حصہ اوّل)
مصنف : سید کمال الدین ہمدانی
قیمت : ۱۱ روپے

یہ کتاب جسم انسانی کے ڈھانچے کی تشریح پر ایک عمدہ کتاب ہے۔ اس میں نہ صرف جسم کی تمام ہڈیوں بلکہ مفاصل اور عضلاتِ بدن کی تشریح بھی مع تصاویر کے کی گئی ہے۔

اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، جن میں سے پہلے دو ابواب تشریح العظام پر ہیں۔ ابواب کی تقسیم حسب ذیل ہے :

۱۔ تشریح العظام : اس میں جسم کے بالائی حصے یعنی سر اور چہرے کی ہڈیوں کی مکمل تشریح کی گئی ہے۔

۲۔ دھڑ کی ہڈیاں : ۔ اس باب میں باقی جسم یعنی فقرات سے لے کر پیر تک کی ہڈیوں کی تشریح بیان کی گئی ہے۔

۳۔ تشریح المفاصل : ۔ اس باب کے ضمن میں جسم کے تمام مفاصل کی تشریح مع ان کے افعال کے بیان کی گئی ہے۔

۴۔ تشریح العضلات : ۔ اس میں جسم کے تمام عضلات کی مفصل تشریح بیان کی گئی ہے۔ یعنی ہر عضلہ کا مبداء، منتہی، اس کے عروق یعنی دموی وعصبی رسد نیز اس کے افعال مختصراً بیان کیے گئے ہیں۔

کتاب : تشریح الاحشاء (حصہ دوم)
مصنف : سید کمال الدین حسین ہمدانی
قیمت : ۱۹ روپے ۵۰ پیسے

یہ کتاب تشریح البدن الانسان کے سلسلے

کا دوسرا حصہ ہے۔ اس میں مصنف نے اعضاء بدن کی مفصل تشریح مع تصاویر کے بیان کی ہے۔ جس میں اعضاء کو تین زمروں میں رکھا ہے۔ اور انہی کے مطابق تین ابواب بنائے گئے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اعضائے نفسانیہ :۔ اس میں دماغ، نخاع، اعصاب و اعضائے حواس کی تشریح بیان کی گئی ہے۔

۲۔ اعضائے حیوانیہ :۔ اس ضمن میں اعضائے تنفس و اعضائے دورانِ خون کی تشریح بیان کی گئی ہے۔

۳۔ اعضائے طبعیہ :۔ اس میں اعضائے ہضم و اعضائے بول و تناسل (مردانہ و زنانہ) کی تشریح بیان کی گئی ہے۔

یہ کتاب طلبار کے لیے اس لیے بھی مفید ہے کیوں کہ اس میں اعضار کی تقسیم بہ لحاظ طب یونانی کی گئی ہے اور ان کی تشریح جدید تحقیقات پر مبنی ہے۔

کتاب: یونانی ادویہ مفردہ
مصنف: حکیم سید صفی الدین علی
قیمت: ۷ روپے ۵۰ پیسے

یہ ادویہ مفردہ پر ایک مکمل کتاب ہے جو نہ صرف طلبا بلکہ اطبّار کے لیے بھی بہت مفید ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر دوائے مفرد کے ساتھ اس کے بارے میں مزید تحقیقات سے، جو نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں وہ بھی بیان کی گئی ہیں۔

دوسری خصوصیت اس کی یہ ہے کہ تمام ادویہ کے آخر میں ان کے مشہور مرکبات کے نام بھی رقم کئے گئے ہیں۔

علاوہ ازیں تمام ادویہ مفردہ کی ماہیت، ان کے مزاج، افعال و مواقع استعمال طریقۂ استعمال اور مقدار خوراک بھی بیان کی گئی ہے۔ مزید برآں ایک علیحدہ باب میں کچھ اہم ادویہ کے مواقع استعمال بیان کئے گئے ہیں۔

کتاب کے آخر میں فرہنگ ادویہ ہے جس میں ادویہ کے مشہور طبّی نام انگریزی، مترادفات نیز ان کے نباتی و لاطینی نام بھی درج ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں کتابیں ترقی اردو بیورو ویسٹ بلاک نمبر۸ آر کے۔ پورم، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶ نے شائع کی ہیں۔

مزینہ عثمانی، دہلی

---

## بقیہ: ملاحظات

مشکلات سے پُر اس دنیا میں بھارت کو اپنی تاریخ، جغرافیہ اور پُر از ارتقائے باہم پر یقین رکھنے کی وجہ سے ایک کردار ادا کرنا ہے۔ اپنی ذمّہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے یہ حکومت جواہر لال نہرو اور اندرا گاندھی کے اصولوں اور بنیادی طریقۂ کار پر عمل کرے گی۔

گزشتہ کچھ ہفتوں کے دوران مجھے اپنے پیارے اور خوبصورت ملک کے سبھی حصوں کا دورہ کرنے کا موقع ملا۔ میں نے اپنے لاکھوں ہم وطنوں کو رو برو دیکھا۔ ہمارے لوگوں کی ثقافتی تنوع کے باوجود ملک ایک ہے۔ اس ملک میں پیدا ہونا اس ملک کی عظیم تہذیب کا وارث ہونا خود ایک بہت بڑا اعزاز ہے ہمیں ان لوگوں کے لیے بہت کچھ حاصل کرنا ہے اور ساتھ میں دنیا کو بہت کچھ دینا ہے۔ ہم ایک بہت مشکل دور سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے بوجھ زیادہ ہیں۔ ہمارا راستہ طویل اور دقّت طلب ہے۔ قومی مقاصد کے حصول کے لیے آپ کا تعاون انتہائی ضروری ہے۔

میں آپ کو نئے سال کی مبارکباد دیتا ہوں — کاش کہ یہ ہر ایک کے لیے خوشیاں لائے۔

میں وقتاً فوقتاً اپنے خیالات، اُمیدوں اور کشمکشوں میں آپ کو شریک کار کرتا رہوں گا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ میں آپ کی مشکلات، آپ کے خیالات آپ کی توقعات کو معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ہم سب ساتھ مل کر اس بوجھ کو اُٹھائیں گے اور اپنے بھارت کی تعمیر کی خوشی میں شریک ہوں گے۔ ●●

## وفیات

جناب رتن چند جین کی ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو اچانک موت واقع ہو جانے سے "آج کل" کے قارئین، مصنفین اور بہی خواہوں میں ایک ایسا خلا واقع ہوا ہے جو شاید کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔

رتن چند جین صاحب نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ گو عمر کے اواخر حصّے میں مبذول کی، تاہم مختصر سے عرصے ہی میں، انہوں نے انگریزی صحافت، ہندی ادب میں اپنا مقام بنا لیا تھا۔

جین صاحب ادب میں، ہندوستان کی تہذیبی قدروں کے پاسدار تھے۔ ہندوستانی عورت اُن کے افسانوں کا موضوعِ خاص تھا۔ ان کی کہانیوں کے کردار جیتے جاگتے اور ہماری آپ کے دن کی زندگی کا حصّہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس شمارے میں شامل اُن کی کہانی: "اندر چُپ باہر سنّاٹا" اس امر کی اچھی مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔

جین صاحب کے پسماندگان میں بیوہ، دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔

اُردو کے خوش فکر شاعر جناب رام کرشن مضطر کا ۱۵ دسمبر ۱۹۸۴ء کو نئی دہلی میں انتقال ہو گیا۔ موصوف ایک طویل عرصے سے فریش چلے آ رہے تھے۔

مضطر صاحب نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز دہلی سے شائع ہونے والے اردو روزنامہ "ملاپ" سے کیا تھا اور وہ "ملاپ" سے ہی ریٹائر ہوئے۔ وہ بڑے زود گو شاعر تھے۔

مضطر مرحوم کو اردو کے علاوہ جدید فارسی پر بھی مکمل عبور حاصل تھا۔ ادارہ ان مرحومین کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

# مکتوبات

بمبئی :

۵ نومبر ۱۹۸۴ء

محب مکرم۔

آپ کا خط تو کوئی ایک مہینہ پہلے مل گیا تھا، لیکن "آج کل" (اکتوبر کا شمارہ) کل کی ڈاک سے موصول ہوا۔ بس اسی کے انتظار میں آپ کو خط نہیں لکھ سکا۔ جب آپ کا خط ملا تھا، اُس وقت بھی میں بیدی صاحب کے گھر گیا تھا اطلاع دینے کہ 'من کہ' شائع ہو گیا ہے۔ اُس دن اُن کے بھائی سے بھی ملاقات ہوئی۔ دلی سے عیادت (بلکہ تیمار داری) کے لیے آئے ہوئے تھے۔ بیدی صاحب تو بات کرنے کے موقف میں بھی نہیں تھے۔ میں نے کچھ پوچھا تو گردن ہلا دی۔ اُن کے بھائی نے بعد میں بتایا کہ اب مرض لاعلاج ہو چکا ہے اور اُن کا ٹھہرنا بے سود ہے۔ کل پرچہ لے کر میں اُن کے گھر گیا۔ وہ غافل تھے۔ اُن کا وفادار ملازم ترلوچن بھی قریب ہی زمین پر سو رہا تھا۔ کمرے میں قضب کی اُداسی تھی۔ میں کوئی دس منٹ بیٹھا یعنی بیٹھ سکا اور چلا آیا۔ اب تو شاید وہ بول و براز کے لیے بھی اُٹھ بیٹھ نہیں سکتے ہیں۔ سینے کی تکلیف بھی بڑھ گئی ہے۔ اُن کی طرف اب تو نظر اُٹھا کر دیکھنا بھی مشکل ہے۔ اُن کی نواسی نے بتایا اُن کے لیے لوگوں کو پہچاننا اور اُن کی باتیں سمجھنا دشوار ہے۔ کچھ بولتے بھی نہیں ہیں۔ آپ نے اُن کے خاکے کے لیے لکھا ہے۔ لکھنے کو بالکل جی نہیں چاہتا۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ بیدی صاحب سے مجھے کس قدر محبت ہے۔ فروری میں میری بیٹی کی شادی ہوئی تو وہ اس میں شریک ہوئے تھے اور سب لوگوں نے انہیں گھیر لیا تھا۔ میں نہیں سمجھتا فروری کے بعد وہ کسی تقریب میں شریک ہو سکے۔ جب میں آپ کے پرچے کے لیے مواد حاصل کرنے اُن کے ہاں گیا تھا، ٹھیک تھے۔ خود ہی میز کے خانے میں سے تصویریں نکالیں اور میں نے ہی ان میں سے ایک تصویر چن کر آپ کو بھیجی۔ پرچہ آپ نے انہیں ضرور بھیجا ہوگا۔

خاکے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ کارٹونوں کے ساتھ تو بالکل نہیں۔ کوئی اور مضمون البتہ بھیجوں گا۔ خدا کرے آپ خوش و خرم ہوں۔

بیدی صاحب کی سوانح حیات پر آپ نے بڑی محنت کی ہے۔ میں نے یہ سب کچھ کہاں بھیجا تھا۔ آپ نے تو..

یوسف ناظم، بمبئی

## پسندیدہ

نومبر ۱۹۸۴ء کا پرچہ دیکھنے کو ملا۔ "بیچ کا فاصلہ" (بیر راجہ) افسانہ بہت پسند آیا۔ کیوں کہ میں زیادہ تر ادھر ہندی کی کہانیوں کو پڑھ رہا تھا، اس لیے میں سمجھ رہا تھا کہ اردو میں کہانیاں اتنی اچھی نہیں لکھی جا رہی ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے۔ "کمینہ مرد" (م۔ک۔ مہتاب) یہ بھی افسانہ بہت اچھا لگا۔ بہر کیف بیر راجہ نے ثابت کر دیا کہ اردو میں بھی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ غزلوں میں صرف نواب احسن صاحب کی غزل پسند آئی۔

تنویر سید

## حسین رشتے

"آج کل" دسمبر ۱۹۸۴ء کے آخری صفحے پر سیال صاحب کی صناعی نظر سے گزری۔ بے شک ان کی مصوری لفظ اور رنگ کے درمیان حسین رشتوں کی تعمیر میں جدید ترین اضافہ ہے۔

نسیم اختر، پٹنہ

## محنت کیاری

"آج کل" کا ستمبر ۱۹۸۴ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ تخلیقات معیاری اور اثر انگیز ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مختلف کیاریوں سے پھول توڑ کر اور سب کو ملا کر ایسا حسین اور دل کو لبھانے والا گلدستہ تیار کیا ہے کہ اس کی انفرادیت پر مہر ثبت ہو گئی ہے۔ غزل اور افسانے آپ کی ادبی بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ آپ کے حسنِ سلیقگی کی داد دیتا ہوں۔

جناب بشیر بدر کی غزل بہت اچھی لگی۔ خصوصاً یہ شعر تو میرے دل کو چھو گیا:

یہ آنسو ہیں انہیں پھولوں میں شبنم کی طرح رکھنا
غزل احساس ہے، احساس کا ماتم نہیں ہوتا

محمد نور الہدیٰ شیدائی
خالص پور کھلنا (بنگلہ دیش)

●●

Regd. No. D ( DN ) 103 　　Lic[illegible] ( DN )- 50 to post without pre-payment
R.N. 948 / 57 　　a[illegible] Civil Lines Post Office, Delhi.

Vol. 43 　 No. 7 　　AJKAL ( U[illegible]DU ) 　　February 198

تشکیلِ شعر: برجیندر سیال۔

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

(غالبؔ)

Publishedby the Director Publications Division, Patiala House, New Delhi-

آجکل

# JAWAHARLAL NEHRU AWARD FOR INTERNATIONAL UNDERSTANDING

صدر جمہوریہ شری ذیل سنگھ نے ۲۸ جنوری ۱۹۸۵ء کو وگیان بھون نئی دہلی میں منعقدہ ایک تقریب میں ہندوستان کی سابق وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو بعد از مرگ دیا گیا جواہر لال نہرو ایوارڈ برائے بین الاقوامی مفاہمت برائے ۱۹۸۴ء، اُن کے بیٹے، وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کو پیش کیا۔

تصویر میں: شری راجیو گاندھی ایوارڈ لیتے ہوئے۔ دائیں سے پیرا رجنٹائنا کے صدر عزت مآب راؤل الفونسن

نائب صدر جمہوریہ شری آر۔ وینکٹ رامن
۸ فروری ۱۹۸۵ء
کو نئی دہلی میں
بھارتی انجینئرنگ
تجارتی میلے
کا
افتتاح
کرتے ہوئے

اردو کا مقبولِ عام معتبر ماہنامہ

# آجکل
نئی دہلی

ایڈیٹر: راج نرائن راز

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابد کرہانی

جلد : ۴۳ | شمارہ : ۸ | مارچ ۱۹۸۵ء

قیمت : ایک روپیہ ۵۰ پیسے | فون: ۳۸۷۰۶۹ | پھاگن، چیتر شک سمت ۱۹۰۶-۱۹۰۷

## ترتیب



سرورق : جیون اڈلجہ

بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ ۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس منجال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :
ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ :
بزنس منیجر: پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اندرونِ ملک : زرِ سالانہ : ۱۵ روپے دو سال کے لیے : ۲۷ روپے تین سال کے لیے : ۳۸ روپے

# اکیسویں صدی کا بھارت

نظری اور عملی ہر لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک بھارت نے گذشتہ ماہ جنوری میں اپنی کامیاب ترین جمہوریت کی پینتیسویں سالگرہ منائی۔ ملک میں ہونے والے سرعام چناؤ نے اس کی جمہوری اساس کو مزید مضبوط بنایا ہے۔ حالیہ یوم جمہوریہ نے بھارت کی تاریخ میں ایک نیا باب کھولا ہے۔ ملک کے بالغ رائے دہندوں نے زمامِ اقتدار شری راجیو گاندھی کو سونپی ہے۔ جنہیں بھارت سرکار کے سب سے کم عمر وزیراعظم بننے کا اعزاز حاصل ہے۔ ان کی پرجوش قیادت میں بھارت کا یہ پہلا یوم جمہوریہ ہے۔ بھارت اب نئے عزائم، امنگوں اور نئے ولولوں کے ساتھ آگے بڑھتا جا رہا ہے اور کوئی عجب نہیں کہ ملک کے باشعور عوام بیسویں صدی کے ترقی پذیر ہند کو اکیسویں صدی کا ترقی یافتہ ملک بنا دیں۔ آیئے ہم چند منتخب شعبۂ ہائے زندگی میں بھارت کی ترقی کا جائزہ لیں۔

## عام چناؤ

بھارت میں جس ڈھنگ سے چناؤ ہوتے ہیں ان کی کوئی اور مثال دنیا کی کسی بھی جمہوریت میں دکھائی نہیں دیتی۔ لوک سبھا کے (۵۴۲) حلقوں میں پھیلی ہوئی بھارت کی ستر کروڑ کی آبادی کا نصف حصہ انتہائی پرامن ڈھنگ سے اپنے نمائندوں کو چن کر یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ نہ صرف جمہوریت کا دلدادہ ہے بلکہ امن کا پیمبر بھی۔ یہ بات ہر بار غلط ثابت ہوتی رہی ہے کہ دیہی عوام یا دیہی رائے دہندے سیاسی اعتبار سے ناخواندہ ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ گاؤں میں قدیم ترین پنچایت راج نظام کے باعث وہ غیر معمولی سیاسی شعور کے حامل ہیں اور ہر بار مرکز میں ایک مضبوط اور مستحکم سرکار بنانے کے لیے رائے دیتے رہے ہے۔ وہ مرکز میں مضبوط سرکار اس لیے بناتے ہیں کیونکہ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ مضبوط سرکاریں ان کے خود کے لیے خوشحالی، اطمینان اور سکون کا سبب بنتی ہیں۔ دیہی عوام کے ذہن میں قانون کا مطلب آفاتِ سماوی اور آفات ارضی سے آزادی ہے۔ جب وہ سیلاب، خشک سالی اور ڈکیتیوں سے دو چار ہوتے ہیں تو وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ایک مضبوط مرکزی حکومت ہی انہیں ان مصیبتوں سے راحت دلا سکتی ہے۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں یہ سوچا جا رہا تھا کہ اتنے بڑے ملک میں عام چناؤ کیسے ہوں گے۔ لیکن پہلے ہی چناؤ میں اپنے غیر معمولی حسن انتظام کے ذریعہ بھارت کے خود مختار چناؤ کمیشن نے ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ پہلا عام چناؤ انتہائی صاف ستھرے اور شاندار انداز میں منعقد ہوا۔ ہر بار عام چناؤ سابق کے مقابلے میں کامیاب تر ثابت ہوتا رہا۔ سنہ ۱۹۸۴ء کا چناؤ ہر لحاظ سے تاریخی رہا۔ اور رائے دہی کا تناسب بہت زیادہ بڑھ گیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ عوام میں سیاسی شعور اور جمہوریت کی بنیادیں مزید استوار ہوتی جا رہی ہیں۔

## سائنس اور ٹیکنالوجی پر ایک نظر

مرکزی سرکار نے سنہ ۱۹۷۱ء میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا ایک علیحدہ محکمہ قائم کیا جس کا مقصد سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلق پروگراموں پر عمل آوری کا جائزہ لینا تھا۔ اس محکمے نے ایک طرف سائنسدانوں کی مالی امداد اور مختلف ساز و سامان فراہم کر کے ان میں ایک نئی امید پیدا کی تو دوسری طرف سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ سائنس کو عام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، یہی وجہ ہے کہ سنہ ۱۹۷۱ء کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی میں شدت پیدا ہوئی اور آج ......... بھارت کے فضائی سائنسداں مواصلات، نشریات اور ریموٹ سنسنگ کے لیے فضا میں بہت بڑے سیارے چھوڑنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

## دوردرشن کے پچیس سال

دوردرشن نے حال ہی میں اپنے قیام کی سلور جوبلی منائی ہے۔ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہمارے ملک کا ٹیلی ویژن تفریحی پروگراموں کے بجائے تعلیمی اور معلوماتی پروگراموں پر زور دیتا رہا ہے لیکن اب تفریحی پروگراموں کو بھی وقت دیا جانے لگا ہے۔ ملک کا بہت بڑا حصہ اس وقت ٹیلی ویژن کے دائرہ کار میں آ گیا ہے۔ گاؤں گاؤں کو پروگراموں سے جوڑنے کے لیے کئی مقامات پر لو پاور ٹرانسمیٹر نصب کیے جا چکے ہیں۔ رنگین پروگرام بھی دکھائے جا رہے ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں ٹی وی کی خریداری کا عام آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اب صورتحال بالکل بدل گئی ہے اور عام لوگ بھی ٹی وی خرید رہے ہیں۔ مرکزی سرکار نے ٹیلی ویژن کی قیمت کو کم سے کم کرنے کے لیے مختلف اقدامات کئے ہیں جن میں ایکسائز ڈیوٹی میں بھاری چھوٹ بھی شامل ہے۔ ٹی وی کے پروگرام "کرشی درشن" سے عام کسانوں کو زبردست فائدہ ہو رہا ہے۔ اس پروگرام کے باعث وہ زراعت کی کئی نئی نئی تکنیکوں سے واقف ہو رہے ہیں۔

## بھارت میں نیوکلیائی پیداوار

بھارت آج دنیا کی مٹھی بھر قوموں میں سے ایک ہے۔ جس نے نیوکلیائی میدان میں مختصر سے عرصے میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ بھارت میں نیوکلیائی توانائی کے حصول کی کوششیں اب سے چالیس سال پہلے ہی شروع کی جا چکی تھیں جو صرف ترقی یافتہ ملکوں کا ہی خاصہ تھیں۔ بھارت یورانیم کی کھوج سے۔ لیکر نیوکلیائی توانائی کے مکمل حصول تک کی جانکاری رکھنے والا واحد ترقی پذیر ملک ہے جو اس توانائی کو پر امن مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا متمنی ہے۔ حیدرآباد کے نیوکلیر فیول کامپلکس نے مکمل نیوکلیائی فیول اور زیرکونی اسٹرکچرل میٹریل کی پیداوار شروع کر دی ہے۔

## زراعت میں ترقی کا تسلسل برقرار

بھارت نے زراعت کے میدان میں ترقی کا تسلسل برقرار رکھا ہے۔ ہر سال چاول اور دیگر اشیا کی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ سرکاری ایجنسیوں نے ۸۵-۱۹۸۴ء کے موجودہ مارکیٹنگ موسم کے دوران ۷ جنوری ۱۹۸۵ تک ۶ر۵۴ لاکھ ٹن سے زائد چاول وصول کر لیا ہے۔ یہ مقدار ۸۴-۱۹۸۳ کی اسی مدت کے دوران وصول کئے گئے ۷ر۹۸۴ لاکھ ٹن چاول سے ۳۴ر۶ لاکھ ٹن سے زائد ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس معاملے میں پنجاب سرفہرست ہے جس نے ۷ جنوری ۱۹۸۵ تک ۹۵ر۳۸ لاکھ ٹن چاول وصول کیا ہے۔ اس کے بعد ہریانہ کا نمبر آتا ہے جس نے ۴۴ر۷ لاکھ ٹن وصول کیا۔ اتر پردیش نے ۴۱ر۶ لاکھ ٹن، آندھرا پردیش نے ۶ر۵ لاکھ ٹن تامل ناڈو نے ۴ر۴ لاکھ ٹن اور مدھیہ پردیش نے ۰۷ر۱ لاکھ ٹن چاول وصول کیا ہے۔

## دیہی جوانوں کے لئے زبردست روزگار

۸۵-۱۹۸۴ سال کے لئے دیہی نوجوانوں کو روزگار فراہم کرنے کے مقصد کے تحت ۲۳۰ کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔ دیہی روزگار کے قومی پروگرام کے تحت مختلف ریاستیں اور مرکز کے زیر انتظام علاقے مل کر اتنی ہی رقم اپنے حصے کے طور پر ادا کریں گے۔ بے زمین افراد کو روزگار فراہم کرنے کے لیے (۵۰۰) کروڑ روپے مختص کئے جا چکے ہیں۔

## ہیروں کی عظیم الشان فروخت

بھارت نے ۸۵-۱۹۸۴ سال کے دوران بیرونی ملکوں کو ہیرے جواہرات اور قیمتی پتھروں کی دوسری اشیاء کے مقابلے میں زیادہ فروخت کی ہے۔ ہندوستان نے متذکرہ سال جو اشیا باہر بھیجی تھیں ان سب میں زیادہ آمدنی ہیرے جواہرات اور قیمتی پتھروں سے حاصل ہوئی تھی۔ ابتدائی اعداد و شمار کے مطابق بھارت کو ہیرے جواہرات اور قیمتی پتھروں کی فروخت سے گیارہ ارب ننانوے کروڑ چھبیس لاکھ روپیوں کی آمدنی ہوئی ہے۔ ۸۳-۱۹۸۲ میں بھارت کی طرف سے بیرونی ملکوں کو فروخت کی جانے والی اشیا میں ہیرے جواہرات کا دوسرا نمبر تھا جبکہ اس سال اسے ان کی فروخت سے سات ارب اڑسٹھ کروڑ آٹھ لاکھ روپے حاصل ہوتے تھے۔

## خام تیل دوسرے نمبر پر

خام تیل کی بیرونی ملکوں کو فروخت دوسرے نمبر پر رہی جس کی فروخت سے گیارہ ارب گیارہ کروڑ چھتیس لاکھ روپے حاصل ہوئے۔ تیار ملبوسات کی فروخت تیسرے نمبر پر رہی۔ جبکہ ۸۴-۱۹۸۳ء سال کے دوران پانچ ارب اٹھاسی کروڑ اکتالیس ہزار روپیوں کی مالیت کے کپڑے دوسرے ملکوں کو بھجوائے گئے۔ غیر ممالک کو پانچ ارب پچاسی کروڑ روپے مالیت کی چائے کی پتی بھجوائی گئی جسے ایکسپورٹ کے معاملے میں چوتھا مقام حاصل ہوا۔

## تعلیمی میدان میں!

بھارت نے تعلیمی میدان میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ ہماری تعلیم کا ابتدائی بجٹ کبھی صرف (۵۵) کروڑ روپے ہوا کرتا تھا لیکن آج یہ رقم بڑھ کر (۵۱۸۶) کروڑ روپے ہو گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اب ہر شخص پر دو روپے بیس پیسے کی جگہ سات روپے خرچ کر رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں سرکاری یونیورسٹیوں کی تعداد سولہ ہوا کرتی تھی لیکن ۱۹۸۲ میں ان کی تعداد ۱۳۴ ہو گئی ہے۔ آج چار لاکھ پچانوے ہزار پرائمری، ایک لاکھ بیس ہزار مڈل، ترپن ہزار سیکنڈری مسلمہ اسکول کام کر رہے ہیں۔ اسکول ٹیچرس کی تعداد جو ۱۹۴۷ میں چار لاکھ ستاسی ہزار ہوا کرتی تھی آج بڑھ کر اکتیس لاکھ چون ہزار ہو گئی ہے۔

مختلف میدانوں میں متذکرہ کامیابیاں ظاہر کرتی ہیں کہ ہم صحیح سمت میں اپنی حقیقی منزل کی طرف قدم بڑھاتے جا رہے ہیں۔ تو آئیے ہم سب اپنے عظیم روایتوں کے حامل ملک بھارت کو کامیابی و کامرانی کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل کر کے یہ ثابت کر دیں کہ

"ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا"

شمیم حنفی

# غالب اور نشاۃ ثانیہ

تحقیق و تنقید کی رائج الوقت انڈسٹری میں غالب ایک نہایت ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کے مداحوں کا حلقہ بہت وسیع اور رنگا رنگ ہے۔ دانشوروں اور نقادوں سے لے کر سیاسی مقررین، صنعت کاروں، فلم بینوں تک بھانت بھانت کا آدمی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ غالب اس کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ اس بے حد و حساب پسندیدگی کے اسباب پر غور کریں تو افسوس بھی ہوتا ہے۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، انیسؔ، پریم چند سب کے ساتھ یہ المیہ پیش آیا کہ انہیں بالعموم غلط اسباب کی بنا پر چاہا گیا۔ گویا کہ لوگوں کو فی الواقع یہ اصحاب نہیں بلکہ ان کے تئیں اپنی پسندیدگی کے اسباب عزیز ہیں۔ غالب کے معاملے میں یہ اسباب ثریا کی آوارگی اور غالب کی مے نوشی سے لے کر ان تغلق و تصوف تک کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔ ہمارا دھیان اس امر پر کم ہی جاتا ہے کہ کوئی شخصیت مستند بن جائے تو مظلوم بھی ہو جاتی ہے۔ ہمہ جہت اور اسی کے ساتھ ساتھ عام شہرت سے بہرہ مند ہو تو ہر کس و ناکس کا تختۂ مشق بھی بنتی رہتی ہے۔ ہم اس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ اس شخصیت کے واسطے سے ہماری نگاہ ایک نئے جہانِ معنی تک پہنچ رہی ہے۔ جب کہ بیشتر صورتوں میں ہوتا یہ ہے کہ ہم اپنے من چاہے تصورات اور تعصبات کی ڈور اس شخصیت کے گرد پھیلانے جاتے ہیں یہاں تک کہ ایک جال تیار ہو جاتا ہے۔ ادب کا عالم اور نقاد، تلاش کے اس موڑ پر خود کو مطمئن پاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس نے جس منطق کا بیڑا اٹھایا تھا وہ بالآخر بار آور ہوئی۔

غالب کی شخصیت اس لحاظ سے خاصی فیض رساں رہی ہے۔ انہوں نے نہ جانے کتنوں کو سرخرو کیا۔ یہاں تک کہ علم الاعداد اور نجوم و کیمیا کے ماہرین کو بھی۔ میں اتنا کم ظرف نہیں کہ علم و آگہی کے عزت داروں کی ہنسی اڑاؤں۔ اتنی بات تو میری سمجھ میں بھی آ جاتی ہے کہ ہر مشقت کی عطا کردہ بصیرت ہمیں حیات و کائنات کے کسی نہ کسی رمز کی خبر ضرور دیتی ہے، وہ بصیرت بھی جس کا سرچشمہ ایک نوع کی بے خبری رہی ہو۔ غالب کے سلسلے میں بھی مختلف علوم کے ماہرین اگر اپنے نتائج تک ہمیں لے جانا چاہتے ہیں تو یہ کچھ نامناسب بات نہیں۔ ہر ایک کو اپنی اپنی ریاضت کا قرض چکانا ہوتا ہے۔ مجھے بے کلی ہوتی ہے تو یہ سوچ کر کہ ریاضتوں اور مہارتوں کے حقوق کی ادائیگی کے چکر میں ہم اصل سچائی سے دور تو نہیں ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ خوشبو کی لہریں جریب سے نہیں ناپی جاتیں۔

غالب اپنی شخصیت اور ذہن کے اعتبار سے بلا کے مردِ آزاد تھے۔ انہیں اپنی آزادہ روی اور آزادہ طبعی کا غرور بھی تھا۔ یہ آزادگی غالب کا خمیر بھی تھی، ان کا ضمیر بھی۔ اس کا تحفظ وہ اپنے شعور اور جبلت دونوں کی سطح پر کرتے رہے۔ اس کوشش اور کھینچ تان میں خود غالب پر کیا بیت گئی۔ جاننے کے لیے ہمیں غالب کے سوچے سمجھے بیانات سے زیادہ ان کے فطری اور بے ساختہ اظہار پر تکیہ کرنا ہوگا۔ غالب کی تخلیقی شخصیت جس قدر پیچیدہ اور اسرار آمیز تھی، ان کا عام انسانی وجود آسانی و انکشاف اور رازمودہ کار۔ ایسی آزمودہ کاری ہاتھ آ جائے تو دنیا داری کے تمام دروازے خود بخود کھلتے جاتے ہیں۔ غالب نے یہ بات نہ اپنے آپ سے چھپائی نہ غیروں سے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ ایک ادنیٰ قسم کی کمزوری ہے، مگر وہ اس کمزوری کی طاقت کا گیان بھی رکھتے تھے۔ اسی لیے زندگی کے ایک کارگشا وسیلے کی صورت اپنی کمزوری کو برتنے میں غالب کبھی جھجکے نہیں۔

ہمارا سامنا اسی نقطے پر انیسویں صدی کی نشاۃ ثانیہ میں گھرے ہوئے

○ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اُس غالب سے ہوتا ہے، جیسے بعض اہلِ علم و عدان کے بجائے ذہن کا شاعر سمجھتے ہیں۔ فکری بیداری اور سائنسی عقلیت کے عشاق اُسے نشاۃِ ثانیہ کا نقیب کہتے نہیں تھکتے۔ ایسوں کا خیال ہے کہ غالب کا شعور جن عناصر سے مالامال تھا وہ سب کے سب ایک نئے ذہنی ماحول کے پروردہ تھے۔ اسی ماحول نے غالب کو اپنی روایت کی قید سے رہا کیا اور اُنہیں ایک نئی روایت کا ترجمان بنایا۔ یہ روایت تھی حیات و کائنات کے مسلّمہ اور معروف زاویوں پر ایک سوالیہ نشان قائم کرنے کی اور ظواہر سے آگے بڑھ کر موجودات کی ماہیت پر فلسفیانہ غور و خوض کی۔ اس خیال سے یہ تاثر خواہ مخواہ برآمد ہوتا ہے کہ ہم مشرقیوں کے یہاں نشاۃِ ثانیہ سے پہلے اس انداز سے دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کا کوئی چلن عام نہیں تھا۔ اہلِ یورپ کی اصطلاح میں یہ صدی Age of Reason یا عہدِ عقلیت تھی کہ اس کا ظہور اٹھارہویں صدی کی روشن خیالی (Age of Enlightenment) کے بطن سے ہوا تھا۔ خود غالب کے بعض فرمودات بھی اس مفروضے کو کمک پہنچاتے ہیں، خاص کر سرسید کی فرمائش پر آئینِ اکبری سے متعلق غالب کی تقریظ۔ اس تقریظ کا لب و لہجہ ایسا ہے، گویا غالب سرسید کی ذہنی تربیت کا فرض انجام دے رہے ہیں اور اُنہیں یہ بتا رہے ہیں کہ تبدیلی کو قبول نہ کرنا حقیقت سے انکار کے مترادف ہے۔ تعمیر و ترقی کے اس دور میں جب زخمے کے بغیر ساز سے آواز پیدا ہو رہی ہے، حروف پرندوں کی طرح گرم پرواز ہیں، تیل کے چراغ دکھائی نہیں دیتے مگر شہر کا شہر روشن ہے۔ یہ فیض ہے مردمِ ہشیار ہیں کے کار و بار کا۔ پھر بھلا مردہ پروری کیونکر مبارک ہو سکتی ہے ۔.. امر لائقِ توجہ ہے کہ جب کبھی غالب اپنے زمانے کے مصلحین کی سطح پر آئینِ روزگار کا ذکر کرتے ہیں، اُن کا لہجہ خاصا مکتبی اور مربیانہ ہو جاتا ہے۔ اس رویّے کی ایک اور فرسودہ مثال غالب کا وہ شعر[1] ہے جو اپنی عمومیت زدگی کے سبب ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ یہاں غالب فرزندِ آذر کے حوالے سے صاحب نظری اور دینِ بزرگاں کی چپقلش کا ذکر تقریباً اسی مربیانہ لہجے میں کرتے ہیں۔ بزرگی کا احترام بھی جوشِ پند میں دب کر رہ جاتا ہے۔ اصل میں تبدیلی کی شہادت اتنی مضبوط ہے کہ اُسے جھٹلانا آسان نہیں۔ مگر یہ شہادت جتنی مضبوط ہے اتنی ہی عامیانہ بھی ہے۔ کلکتہ کے قیام میں غالب نے تار برقی اور اسٹیمر اور نئے فیشن کی عورتوں اور صاف ستھرے سبزہ زار تک آئینِ روزگار کی تبدیلی کے بہت سے نشان دیکھے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس تجربے نے غالب کو واقعی اس حد تک متاثر کیا ہو کہ ذرا دیر کے لیے ماضی کے سارے رنگ ان کی نظر میں پھیکے پڑ گئے ہوں۔ لیکن یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ غالب نے یہ سفر کسی تخلیقی تجربے کی دریافت کے لیے نہیں کیا تھا۔ اُنہیں گورنر جنرل بااجلاس کونسل کی خدمت میں اپنی پنشن کی دفعہ پیش کرنی تھی۔ غالب نے "اسٹرلنگ صاحب" سکریٹری گورنمنٹ ہند" کی مدح میں قصیدہ بھی لکھا تھا۔ اس اُمید کے ساتھ کہ فیصلہ اُن کے حق میں ہوگا۔ بعض غالب شناسوں کا یہ خیال ہے کہ کلکتہ کا سفر غالب کے لیے ایک نئی فکری واردات بن گیا۔ مجھے اسی لیے مبالغہ آمیز محسوس ہوتا ہے۔ غالب کے اشعار اور مکاتیب میں اس "واردات" کا جہاں تہاں اظہار یا تو مصلحانہ کوشش کا نتیجہ ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک وقتی ارتعاش۔

یہ صحیح ہے کہ کلکتہ ہندوستان کی تہذیبی نشاۃِ ثانیہ کا پہلا اہم مرکز تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ دھیرے دھیرے جو ذہنی بیداری ملک بھر میں عام ہو رہی تھی اس کی بنیادیں بنگال جاگرن ہی نے فراہم کی تھیں، لیکن کلکتے میں غالب نے زندگی اور فکر کے اسالیب میں جس تبدیلی کا تماشا دیکھا، اُس کی حیثیت غالب ہی نہیں، باقی ماندہ ہندوستان کے لیے بھی ایک اطلاع کی نہیں تھی۔ یہ کچھ تو غالب گلی قاسم جان کی ایک ڈیوڑھی میں بیٹھے بیٹھے بھی جان سکتے تھے۔ ان کا یہ بیان کہ:

> ہندو مسلمان، جو اہلِ ہند، اگلے فتنہ و فساد سے بچے رہے ہیں اور اس کے وبا اور قحط کے دُکھ سہے ہیں وہ اپنی سلامتی و صحت پر خدا کا شکر بجا لائیں۔ نیا پاکیزہ اناج کھائیں۔ ___ ریل گاڑی کی صنعت کو دیکھیں، تارِ بجلی میں پیام کے پہنچنے کی سُرعت کو دیکھیں۔ مدرسوں کی رونق اور رواجِ علم کی کثرت ملاحظہ فرمائیں۔ حکّام کی مہربانیاں اپنی نسبت ملاحظہ فرمائیں۔ ملک سراسر بے خس و خاشاک ہو گیا ہے۔ قلمروِ ہند نمونۂ گلزار ہو گیا ہے۔ بہشت اور بیکنٹھ جو مرنے کے بعد متصوّر تھا، اب زندگی میں موجود ہے۔ وہ احمق ہے، وہ ناقدر دان ہے جو انگریزی عمل داری سے ناخوشنود ہے۔

۱۸۶۲ء میں سامنے آیا۔ مگر اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی غالب نے بارہا اس قسم کے مضامین باندھے تھے۔ یہ بیانات بنیادی طور پر سیاسی ہیں۔ رہبرانِ قوم بھی انتخاب یا ریفرنڈم کے موقعوں پر ایسی باتیں کچھ اسی انداز میں کہتے ہیں۔ علم کے جوش اور اپنی ذہانت کے سہارے آپ ان بیانات کی تہہ سے چاہے جتنی سنجیدہ بصیرت ڈھونڈ نکالیں، ان کی اپنی سنجیدگی ہمیشہ مشتبہ رہے گی۔ غالب ولایتی شراب کے دلدادہ تھے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ولایتی فکر اور دانش و حکمت کے سامنے سب کچھ بھلا بیٹھیں۔ کلچر نیا ہو یا پرانا، پروگرام بنا کر پیدا کیا جائے گا تو اس کی بنیادیں ہمیشہ کمزور رہیں گی۔ یہی وہ رمز تھا

---

[1] بامن میاویز اے پدر فرزندِ آذر را نگر ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

جسے نئی تعلیمی پالیسی کا نفاذ کرتے وقت لارڈ میکالے بھی سمجھ نہ سکے۔ ورنہ بنگال جاگرتی کی کہانی بنکم چندر چٹرجی اور رابندر ناتھ ٹیگور پر ختم نہ ہوئی ہوتی۔ اسی طرح غالب نے بجلی کے ملبے کی تعریف جی کھول کر کی۔ اس واسطے بھی کہ اس سے حکمران مغربیوں کی مدح میں ایک برجستہ گریز کی راہ روشن ہوتی تھی، مگر اپنے شب چراغ سے ان کی دل بستگی بدستور باقی رہی۔ اسے کھونے کا مطلب تھا آپ اپنے کو کھو دینا۔ یہ واقعہ بے سبب تو نہیں کہ غالب کی بصیرت کا سفر ان کے بہترین تخلیقی لمحات میں ہمیشہ جذبہ کی سطح سے شروع ہوتا ہے۔ اس سفر میں توانائی کی جو لہر ان کا ساتھ دیتی ہے وہ ایک داخلی توانائی کی لہر ہے۔ البتہ، غالب اپنے جذبے کی تنظیم اس ہوشیاری کے ساتھ اور ایک ایسے مدلل اور منطقی اصول کے مطابق کرتے ہیں کہ جذبہ آگہی میں منتقل ہو جاتا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ جذبے اور آگہی میں کسی ٹکراؤ کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ نتیجتًا دونوں باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے وجود کی گواہی دیتے ہیں۔

پھر ایک بات اور ہے غالب کے یہاں جذبہ اپنے بے مثال ضبط اور تنظیم کے سبب اگر عقلیت کے آہنگ کو جنم دیتا ہے تو اسی کے ساتھ ساتھ اپنے استعارانی اور غیر رسمی اظہار کی وساطت سے ایک انوکھی جادوئی فضا اور تخلیقی جذب کی تشکیل کا سبب بھی بنتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب اپنی جبلت اور اپنی حیات دونوں کے جبر سے آگاہ ہیں اور بیک وقت دونوں کے مطالبے پورے کرنا چاہتے ہیں۔

بلاشبہ ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کی خدمات بہت وسیع تھیں۔ ہمارے برطانوی حکمراں بقول مارکس تاریخ کے غیر شعوری اوزار تھے۔ جہاں انہوں نے ریل گاڑی بنائی وہیں بھول چوک میں ایسے حقائق کی تعمیر بھی کر گئے جن کا نتیجہ خود ان ہی کے حق میں خراب نکلا۔ مثال کے طور پر انگریزوں نے چھاپہ خانوں کو ترقی اس لیے دی تھی کہ تبلیغی لٹریچر کی اشاعت میں آسانی ہو۔ مگر ہوا یہ کہ اسی بہانے ہماری علاقائی زبانوں کو بھی پنپنے کا موقع مل گیا۔ جہاں انگریز اور انگریزیت کے قصیدے چھپے وہیں بنکم بابو کے آنند مٹھ اور رہبار تیندو کے بھارت درشن کی اشاعت بھی ہو گئی۔ اتنا ضرور ہے کہ اختلاف، انحراف اور بغاوت کے رویوں کو قدم جمانے کے لیے زمین کچھ دیر سے ملی شروع میں تو یہ حال دیکھا گیا کہ اس نشاۃ ثانیہ کے معمارِ اوّل راجہ رام موہن رائے تک کو کمپنی بہادر کی معمولی سی رواداری بھی گراں گزری۔ انگریزوں کے اس اقدام پر وہ معترض ہوئے کہ تعلیم کے میدان میں ذہین اور قابل یورپین اساتذہ پر ساری توجہ صرف کرنے کے بجائے تھوڑی بہت رقم سنسکرت اور عربی کی بحالی پر بھی صرف کر دی جائے۔ یہ واقعہ ۱۸۱۲ء کا ہے، جب لال قلعہ کے دربار سے اردو بازار تک مغلوں کی سطوت و شکوہ کا چراغ ابھی ایک دم خاموش نہیں ہوا تھا۔ مغلوں کی ابتری اور انگریزوں کے اقتدار میں اضافہ ہوا تو سرسید، راجہ رام موہن رائے سے بھی دس ہاتھ آگے پہنچ گئے۔ انہوں نے بقول خود "بلا مبالغہ سچے دل سے" یہ اعتراف کیا کہ:

"تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک
امیر سے لے کر غریب تک، عالم فاضل سے لے کر جاہل
تک انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے
مقابلے میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسی نہایت
لائق اور خوب صورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے
جانور کو۔"

سرسید کے قومی درد، ان کی خدمات اور خلوص کے آگے ہم آج بھی سر جھکاتے ہیں۔ مگر اس تمام کاروبارِ نفع میں چھپے ہوئے نقصان کو نہ سمجھنا بھی بڑی بدتوفیقی کی بات ہوگی۔ یہ رائے سرسید نے اس مغرور اور ضدی قوم کے بارے میں قائم کی تھی جو آج بھی میز کرسی اور چھری کانٹے کے مقابلے میں اپنا دسترخوان بچھائے ہوئے فخر کا احساس کرتی ہے۔ ایلیٹ کے اس قول کی معنویت کہ جب کوئی تہذیب خرابی سے دوچار ہوتی ہے تو سب سے پہلے اس کا دسترخوان اٹھتا ہے، آج کے فائیو اسٹار کلچر اور فٹ پاتھ پر چھوٹے چھوٹے کی یورش کے باوجود ابھی ختم نہیں ہوئی۔

موڈرن کلکتہ کو غالب نے بہشت اور بیکنٹھ کی مثال جس نظر سے دیکھا تھا۔ اب اس کے ایک اور زاویے پر دھیان دیجئے۔ اسی سفر میں بنارس کے چند روزہ قیام کے تاثرات چراغِ دیر کے واسطے سے ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ہزاروں سال کے ہندی تمدن کا یہ مرکز جو عبادت خانۂ ناقوسیاں ہے کعبۂ ہندوستان بھی ہے۔ مذہبی تقدس کے دائرے میں گھرا ہوا یہ شہر جہاں گنگا کی دودھیا لہروں میں عقیدت مندوں کے سڈول بدن جھل جھل کر رہے ہیں ایک بہشتِ خرم و فردوسِ معمور ہے غالب دعا کرتے ہیں کہ اللہ اسے بری نظر سے بچائے۔ خود کلکتہ میں رہتے ہوئے غالب کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ شہر بے مثال مادی کمال کے ساتھ ساتھ روحانی زوال اور ابتذال کی علامت بھی ہے۔ دنیاداری کے آداب اختیار کیے بغیر یہاں زندگی کرنا محال ہے (ساقی بزم آگہی سے مکالمہ)

گویا کہ ایک مسلسل کش مکش تھی جس نے مغل رئیس زادے کو نئے ذہنی اور تہذیبی معاشرے کے عطیات سے انکار اور اقرار دونوں کی راہ دکھائی اس کش مکش میں غالب خرابی کے ایک اعصاب شکن تجربے سے دوچار ہوتے۔ بھلا ہوا کہ انہوں نے اپنے اضطراب کی ایک منطق بھی دریافت کر لی۔ اسی اضطراب سے نمٹنے کا ایک وسیلہ غالب کا تصوف بھی ہے، جس سے کہیں وہ ایک حربے کا کام لیتے ہیں کہیں پناہ گاہ کا۔ جذبے کو عقل اور منطق کے مراحل سے گزارنے کا میلان غالب کے یہاں اتنا شدید ہے کہ وہ روحانی اور مابعد الطبیعاتی

تجربوں کی دلیل بھی مادی اور معروضی تجربوں میں ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ نشاۃِ ثانیہ کا پہلا اور آخری سبق یہ تھا کہ جو معاشرہ اس کی سرپرستی میں بن رہا ہے اُس پر اخلاقی تفکر کے سماجی معیار اور عقلیت کی بالادستی مسلّم ہے۔ اِس میلان کے مفسّروں نے عقلیت کا جو مفہوم وضع کیا تھا وہ اُن کے اخلاقی تصوّر کی طرح محدود بھی تھا اور ناقص بھی۔ فوری، اور مادی مقاصد کا تابع ہونے کی وجہ سے عقلیت کا یہ تصوّر، ہم مشرقیوں کی سائکی کا ساتھ بس اسی حد تک دے سکا جب تک ہمارے مصلحین کو یہ یاد کرنے کی مہلت نہیں ملی کہ مشرق مغرب کے زیرِ نگیں سہی، ہے تو مشرق۔ میکالے صاحب جس ہندوستانی کلچر کو خرافات کا پشتارہ کہتے تھے، اس کا ظہور بہر حال ہماری ہی صدیوں پرانی دانش کی تہہ سے ہوا ہے۔ اپنی روایات، روحانی اقدار اور اسالیبِ فکر کا کمبل ہم اُتار پھینکیں تو بھی یہ کمبل ہمیں نہیں چھوڑے گا۔ معاشرے کی تبدیلی کے ساتھ ذہن کی تبدیلی ناگزیر ہے۔ لیکن انسانی وجود محض ذہن نہیں ہوتا۔ ایسا ہوتا تو ہمارے فنی اور تخلیقی اور تہذیبی اظہار کے تمام سانچے کب کے ٹوٹ پھوٹ چکے ہوتے۔ سر سے پیر تک دماغ بننے کے بعد آدمی ایک تجرید میں منتقل ہو جاتا ہے اور محسوسات و مدرکات کے معاملے میں خاصا غبی۔ تجربہ کار عقل اُس دو دھاری تلوار کی طرح ہے جو دوسروں پر وار کرنے سے پہلے خود اپنے خالق پر حملہ آور ہوتی ہے یقین نہ آئے تو بیسویں صدی میں منطقی اثبات پسندوں کا حشر دیکھ لیجئے۔ اس کی معیت میں اچھا بھلا آدمی جس احساسِ تفاخر کا شکار ہوتا ہے اس کی سزا دوسروں کو دینے سے پہلے آدمی اپنے آپ کو دیتا ہے۔ انسانی معاملات میں اس پر ایک عجیب بے حسی طاری ہو جاتی ہے اور وہ برابر کی سطح پر زندگی سے آنکھیں چار کرنے کے لائق نہیں رہ جاتا۔

ابرِ گہر بار میں عقل کی ثنا و ستایش غالب نے بڑے پُرجوش طریقے سے کی ہے۔ عقل گھپ اندھیرے میں جلتا ہوا چراغ ہے۔ عقل سرچشمۂ حیات ہے۔ یونانیوں کی شبستاں میں اُجالا اسی چراغ سے ہوا۔ رومانیوں کی صبح اسی کے دم سے روشن ہے۔ عالمِ وجود کا اندھیرا اسی نے دُور کیا۔ شعر ہو کہ موسیقی ہر خزانے کی کنجی عقل ہی کے پاس ہے۔ عقل نے ہی بصیرت کی راہ درست کی ہے اور موجودات کا سارا قصّہ ترتیب دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ عقل سے مراد یہاں وہ گُر بے بہا نہیں ہے، جو انگریز اپنے ساتھ لائے تھے — علاوہ ازیں عقل کی کامرانیوں کا بیان غالب اگر اسی نقطے پر ختم کر دیتے تو بات ادھوری رہ جاتی۔ غالب اس سے آگے بھی جاتے ہیں اور ایسے جن اسرار سے پردہ اُٹھاتے ہیں، وہیں سے ان کا راستہ نشاۃِ ثانیہ کی معقولی بارگاہ عقلیت کے راستے سے الگ ہو جاتا ہے۔ یہاں اُس عقلیت کی جانب اشارہ مقصود ہے جو یورپی نشاۃِ ثانیہ کی چار سو برس پرانی روایت کے دورِ انحطاط میں ہم تک پہنچی۔ وہ بھی اس طرح کہ انگریزوں کی سیاسی اور اقتصادی برتری کا سایہ اُس کے سر پہ تھا اور اُس کا سابقہ اب جن انسانوں سے پڑا وہ ایک محکوم قوم کے افراد تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ کچھ کم انسان تھے۔ ایک تو محکوم، دوسرے حاجت مند۔ انتخاب کی آزادی سے بڑی حد تک محروم۔ غالب کی تخلیقی شخصیت اگر بہت توانا اور اُن کے احساسات بہت بیدار نہ ہوتے تو وہ بھی کسی نہ کسی گلّے میں شامل ہو گئے ہوتے۔ انہیں سنبھالا دیا ان کی انا نے جو زخموں سے چور تھی مگر مغرور تھی۔ ہزیمتیں اُٹھانے کے باوجود ہار ماننے پر تیار نہ ہوئی۔ دنیاداری کے داؤں پیچ سے آگاہی رکھتے ہوئے بھی غالب کی حیثیت اپنے معاشرے میں ایک Outsider کی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات عامیانہ باتیں کرنے کے بعد بھی غالب اپنی اشرافیت اور انفرادیت کا بھرم بنائے رکھتے ہیں۔ ہجومِ بے چہرگاں میں دُور سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ اُن کی محرومیٔ انا کا سفر کئی اجتماعی تجربوں اور تصورات کی تائید و تصدیق کے باوجود تنہائی کا سفر ہے۔

غالب کی بصیرت ایک ایسے فرد کی بصیرت تھی جو آپ اپنے سے برسرِ پیکار رہا۔ برگشتگی، بے حصولی اور بے مرکزیت کی ایک کیفیت اس کے ساتھ رہی؛ اسی لیے غالب کی بصیرت تحریک نہ بن سکی۔ اس کے برعکس سرسیّد کی بصیرت ایک آسودہ ذہن اور تاریخ کے محفوظ و معیّن اور مرکز جو دھارے میں شامل ایک پیدائشی قائد کی بصیرت تھی۔ غالب کی بصیرت اُس دَور میں بہتوں کے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ سرسیّد کی بصیرت تحریک اسی لیے بن گئی کہ اُسے اپنی تلاش کے ہر مرحلے کا علم تھا۔ اپنے سفر کے عواقب سے وہ آگاہ بھی تھی اور ان پر قانع بھی۔ کسی نے کہا ہے کہ تاریخ اپنی بیرونی ساخت اور سرشت کے اعتبار سے ایک طرح کی نثر ہوتی ہے۔ واضح، دولوک، مدلّل اور ابہام سے عاری۔ یہاں غالب کی فکر کا پورا نظام ہی تخلیقی اور شاعرانہ ہے۔ تاریخ کی طرف بھی اُن کا رویّہ مکمل ایجاب کا نہیں۔ انتخاب کا حق انہوں نے اپنے پاس رکھا۔ موجودات کی بابت تشکیک، تجسس اور استفسار ان کی فطرت کے عناصر تھے۔ کیا، کیوں اور کیسے کا ایک سلسلہ ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اور اس جانکاہ موڑ پر (۱۸۵۷ء) جب اُن کے سوالات خود اُن کی نظر میں بے اثر ہو جاتے ہیں تو غالب چُپ چاپ شاعری ہی سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔ یہ واقعہ محض اتفاقی نہیں کہ مغلیہ حکومت کے خاتمے اور انگریزی اقتدار کے باضابطہ اعلان کے ساتھ ہی غالب شعرگوئی سے کم و بیش تائب ہو گئے۔ نئے مادّی اور ثقافتی ماحول کی نثریت نے ہماری قومی تاریخ کو جو کچھ بھی دیا ہو، شاعر غالب بہر حال خسارے میں رہا۔ چنانچہ عقل کی کرشمہ سازیوں کا راگ الاپتے الاپتے غالب ابرِ گہر بار کے اختتامیے میں بھی اچانک الوہیت کے مسائل پر رواں ہو گئے تھے۔ عقل کے توسط سے تاریخ کی فتوحات کا قصّہ اب وہاں جا پہنچا، جہاں سے ہزیمتوں کی روداد شروع ہوتی ہے۔ عمِ خضرِ راہ

بن جاتا ہے۔ اب جس شب چراغ کی روشنی میں غالب رہا سہا سفر طے کرتے ہیں وہ بے روغن ہے پھر بھی روشن ہے کہ غم کی تب و تاب نے اُسے جلا دی ہے۔

به دانشں غم آموزگارِ من است
خزانِ عزیزاں بہارِ من است
چراغے نہ بے روغن افسردہ ختم
و لے بود کز تابِ غم سوختم
زیزداں غم آمد دل افروزِ من
چراغِ شب و اخترِ روزِ من

پیروی مغرب کے تو مسلمانہ جوش میں بہتوں کے نزدیک..... تہذیب کے رشتے مادّے کی دنیا کے پابند ہوتے جا رہے تھے۔ غالب کو تو بچا یا فنیٔ اظہار کے وسائلِ بیان کی خلاقانہ گرفت نے مگر سادہ نظر شارحین کے یہاں منطقی تعبیر کے نتیجے میں مابعد الطبیعاتی تجربے بھی ایک نوع کی سوقیت کا نشانہ بنے گئے۔ ہندو مصلحین نے یہ کہنا شروع کیا کہ فی الوقت وید پڑھنے اور فٹ بال کھیلنے میں فرق کرنا یوں غلط ہے کہ یہ دونوں عمل قوم کی صحت کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ ان حالات میں غالب کی معنویت اپنے تناظر کی وسعت کے سبب کہیں اور زیادہ گہری دکھائی دیتی ہے۔ عصریت بہت بڑی چیز سہی مگر یہ عصریت کا منصب اس سے بلند تر ہے۔ اس منصب تک رسائی ہماری ادبی تاریخ میں گنتی کے چند شاعروں کو نصیب ہوئی ہے۔ غالب بھی انہی میں سے ایک ہیں۔ اُن کے دَور کا قصّہ پرانا ہوا، غالب آج بھی نئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے باب میں نئے پرانے کا جھگڑا اُٹھتا ہی نہیں ہوتا۔ خود کو وہ عندلیب گلشنِ ناآفریدہ کہتے تھے ہر چند کہ حال تو حال ماضی بھی غالب کے شعور کی سرگرمی میں برابر دخیل رہا۔ حال میں زندگی کرنے کے باوجود ماضی کی جھلک ان کی سانسوں میں ہمیشہ گھُلی رہی۔ یہ ماضی کبھی بھی گئے زمانوں کا قیدی نہ بن سکا۔ اس کی حیثیت تاریخ کی نہیں روایت کی ہے، جو ماضی و حال کے امتزاج سے ایک نئی وحدت کا روپ اختیار کرتی ہے، جس کے تسلسل کا تار نہ تو ٹوٹتا ہے، نہ غالب کے حواس کی گرفت سے پل بھر کے لیے بھی چھوٹتا ہے۔ غالب کے جو اوصاف اُنہیں آج ہمارا ہم عصر بناتے ہیں اور آج کے دَور سے غالب کی معنویت کا رشتہ براہِ راست قائم کرتے ہیں، اُنہیں نظر میں رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ کے حصار سے نکلنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔

پچاس باتیں غالب نے اگر نشاۃِ ثانیہ کے رسمی تصور کی حمایت میں کہی ہیں تو کم سے کم ایک سو پچاس باتیں ایسی بھی کہی ہیں، جن سے اس تصور کی تردید ہوتی ہے۔ وہ ملک جو غالب کو بے خس و خار اور نمونۂ گلزار دکھائی دیا تھا اس کی بربادی کے قصّے بھی غالب نے بار بار رقم کئے ہیں۔ اپنے عہد کے کمالات کا رجز پڑھتے پڑھتے وہ اس کے نوحہ گر بھی بن گئے۔ انور الدولہ شفق کے نام ایک خط (اکتوبر ۱۸۵۸ء) میں غالب کا یہ جملہ بھی شامل ہے کہ "مونہہ بند ہوں، سر پٹکتا ہوں کہ جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں نہیں لکھ سکتا۔" دنیا داری کا جبر اُنہیں دل کی بات کہنے سے روکتا ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ ضمیر جب ٹوکتا ہے تو غالب یہ کہہ نکلتے ہیں۔

"وہ عزت اور ربط ضبط جو ہم میں رئیس زادوں کا تھا، اب کہاں! روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔"

(بنام تفتہ۔ ۱۲۔ مارچ ۱۸۵۸ء)

ایسا یوں سمجھو کہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے نہ جاہ و حشم رکھتے تھے۔

(بنام حسین مرزا۔ ۳۱ دسمبر ۱۸۵۹ء)

دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پُل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلّی کہاں! ہاں، کوئی شہر قلمروِ ہند میں اس نام کا تھا۔ (بنام مجروح ۲ دسمبر ۱۸۵۹ء)

اللہ اللہ دلّی نہ رہی اور دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں واہ رے حسنِ اعتقاد! ارے بندۂ خدا! اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں؟ اب شہر نہیں کیمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔

(بنام مجروح ۱۸۶۰ء)

اے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پہ کیا گزری۔ اموال کیا ہوئے۔ اشخاص کہاں گئے۔ خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا انجام کیا ہوا۔

(بنام مہر اوائل ۱۸۵۸ء)

اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں کون ہے جو آوے۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔

(بنام تفتہ۔ دسمبر ۱۸۵۷ء)

یہ آخری اقتباس ۱۸۵۷ء کا ہے۔ مگر غالب کے یہاں اندھیرے احساس کو صرف سن ستاون کے خلفشار کا وقتی ردِّ عمل سمجھنا نادانی ہوگی۔ سچ

احساس اتنے کم عمر نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بظاہر ایک لمحے کے احساس میں روح کی ساری سرگزشت سمٹ آتی ہے۔ غالب کی مُرثیہ لَے جو اُن کے قطعے "اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل" میں بہت اونچی نظر آتی ہے۔ اس نے یا اس سے مماثل دوسرے شعروں نے بہتوں کو گمراہ کیا ہے۔ ان اشعار کی زمانی ترتیب سے بے خبری کے سبب وہ اُسے مغلوں کے زوال کا ماتم سمجھ بیٹھے۔ اس امر پر غور کئے بغیر کہ ایک تو شاعری واقعات و سوانح کا ترتیب وار بیان نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ غالب کا غم اس درجہ فرومایہ نہیں ہے۔ گورنر جنرل کے نام ۱۸۶۵ء کی ایک درخواست کے مطابق غالب ملکۂ عالیہ کے درباری شاعر بننا چاہتے تھے۔ اور دربار میں بھی سب سے اونچی جگہ کے طلب گار۔ اس درخواست کا جواب غالب کو چیف سکتر گورنمنٹ پنجاب کی طرف سے یہ ملا وہ وائسرائے کے درباری شاعر مقرر کئے جا سکتے ہیں۔ کسی تقریب میں قصیدہ پیش کریں تو خلعت بھی پا سکتے ہیں۔ اس سے اُن کی اشک شوئی بھی ہو جائے گی اور "علوم شرقیہ کی حوصلہ افزائی" بھی۔ گویا کہ شاعری غالب کے لیے بس ایک کیریئر تھی اور ایسے حقیر اعزازات کے حصول کا ایک وسیلہ، جن کی طلب دنیا داروں کو اقتدار کے آستانوں پر تا عمر سجدہ گزار رکھتی ہے پھر "علوم شرقیہ کی حوصلہ افزائی" کا جو نادر نسخہ سکتر صاحب کے ذہن میں آیا تھا، اس کی تو داد نہیں دی جا سکتی۔ حُبِ جاہ اور دنیا کی طلب غالب کے یہاں اپنے کمال کے اعتراف کی معصومانہ خواہش تھی۔ وہ اس کا تقاضہ کرتے تھے اپنے حق کے طور پر، کسی مراعات کی صورت نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا اعزاز اور منصب بھی جب تک داووں پیچ کے بغیر اور بے مانگے نہ ملے، حیثیت میں اضافے کا نہیں، تخفیف کا ہی سبب بنتی ہے۔

چنانچہ غالب کبھی اپنی نظر میں سبک ہوئے۔ اس احساس نے اُنہیں خود سے بھی بیزار کیا اور اس دنیا سے بھی۔ جو ناقدرشناس اور ناسپاس تھی۔ اسے گوارا بنانے کا ایک راستہ غالب نے یہ نکالا کہ دنیا کے ساتھ اپنی ہنسی بھی جی بھر کے اُڑائی۔ اس ہنسی میں نوحہ گری کا گداز ہے۔ اس کی الم آلودگی غالب کے غم کی طرح اُن کے نشاط کو بھی ایک نیا معنی دیتی ہے اور اُسے نشاۃِ ثانیہ سے وابستہ محرومیوں اور کامرانیوں کے مروجہ مفاہیم سے زیادہ بلیغ بناتی ہے۔

نشاط اور کرب کا یہ ہولناک امتزاج عجیب بات ہے کہ ہندوستانی نشاۃِ ثانیہ کے دور میں ایک غالب کو چھوڑ کر، اُردو کیا، ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب میں بھی کہیں اور نہیں ملتا۔ تاریخ جب تک باطن پر وار د نہ ہو، ماہ و سال کی گردش سے آزاد نہیں ہوتی۔ غالب کے زمانے میں اردو یا ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے ادبی منظر نامے پر بیچ ایتی خیالات کا جو تسلط دکھائی دیتا ہے، افسوس کی بات ہے کہ اس سلسلے میں جس تشویش کا اظہار ہونا چاہیئے تھا، ہمارے بزرگوں کی سادہ طبعی کے سبب نہ ہو سکا۔ اُن کی خوش گمانیوں کی طرح اُن کا احساسِ محرومی بھی بہت سطحی اور کم معیار تھا۔ نشاۃِ ثانیہ نے انسانیت کو جو ایک سبق یہ پڑھایا تھا کہ حقیقت کا دائرہ مادی دنیا ہی میں ہر پھیر کے گردش کرتا ہے، اس کے قہر سے وہ اصحاب بھی نہ بچ سکے۔ جن کی تربیت کے بنیادی وسائل مشرقی تہذیب و تفکر کی عظیم الشان روایت نے مہیا کئے تھے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ وہ مغرب کو اپنے اندر جذب کرتے، مگر ہوا یہ کہ وہ بجائے خود مغرب میں جذب ہوتے گئے۔ نئی مشرقیت کو اپنے تحرک اور ارتقا کی جو رفتار میسر آنی چاہیے تھی وہ بہت سست رہی۔ مستثنیات سے قطع نظر عام وطیرے کی حیثیت اُنہی اقدار اور رویوں کو حاصل رہی، جن کی پُشت پناہی کے لیے تاریخ کا رسمی اور برسر اقتدار تصور موجود تھا۔ یہ تصور کسی نہ کسی حد تک غالب کے تمام معاصرین کے تخلیقی مزاج پر ضربیں لگاتا رہا۔ اس دَور میں نثر کی صنفوں کی اچانک مقبولیت اور شاعری پر نثر کو فوقیت دینے کا رجحان اسی تصور کا کرشمہ ہے۔ دین دنیا سے بے خبر شاعروں کو الگ کر کے بھی دیکھئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ایک پتھریلی نثریت ہمارے شاعروں کا مزاج بنتی جا رہی تھی۔ علی گڑھ تحریک سے پنجاب کی انجمن اشاعتِ مفیدہ تک اس تہذیبی اور تخلیقی سانحے کی روداد پھیلی ہوئی ہے۔ پتہ نہیں کیوں یہ اندوہ ناک لطیفہ ہمارے یہاں تا حال عام نہیں ہو سکا کہ انجمن اشاعتِ مفیدہ کے "ادبی منشور" کی ایک شق "حاکم اور رعایا کے مابین رشتۂ موانست کو ترقی دینا" بھی تھا۔

روحانی اضطراب اور تصادم کی یہ کیفیت جو اُنیسویں صدی کے آباد خرابے میں غالب کا تجربہ بنی۔ اس کے ارتعاشات ایک پُر پیچ سطح پر ہمیں اگر کہیں دکھائی دیتے ہیں تو سات سمندر پار غالب کے ایک مغربی معاصر کے یہاں۔ ہمارے مولانا حالی کی طرح فرانس کے بودلیر کا یقین بھی نشاۃِ ثانیہ کے اس تصور میں پختہ تھا کہ مادّہ ہی آخری حقیقت ہے اور یہ کہ خیال مادّے سے پیدا ہوتا ہے مگر اُس نے مابعد الطبیعاتی فکر کے نظام سے انکار نہیں کیا اور غالب ہی کی طرح اس کشمکش میں اُلجھا رہا، جو باطن کی سرزمین میں ایک زلزلے کا تاثر پیدا کرتی ہے۔ شاعر کا تخیل جب تک مادّی اشیاء کی بظاہر بے لوچ حقیقت کے نظام میں خلل انداز نہ ہو شاعر کیا؟ کذب کی تہمتیں اُٹھانے کے بعد بھی شاعر نے اپنی تخلیقیت میں لوگوں کا ایمان کمزور نہ ہونے دیا۔ اس اعتراف میں مادّی فکر کا سب سے بڑا اور انقلاب آفریں نقیب مارکس بھی شریک ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ مارکس کے نزدیک تشکیک کی حیثیت ایک اعلیٰ انسانی قدر کی تھی۔ یہ فیضانِ نظر مکتب کی کرامت تو ہونے سے رہا۔ اس عہد کے ہندوستانی دانشوروں کے حواس پر مطلقیت چھائی رہی۔ اثبات و نفی دونوں کی صورت میں ایک حلقے کا اصرار تھا کہ مغرب کی ہر شے شک و شبہے سے بالاتر

ہے۔ دوسرا حلقہ اس پر بہ ضد ہے کہ انگریزوں کی لائی ہوئی رحمت ہمارے لیے باعثِ زحمت ہے۔ یا تو سب کچھ آنکھیں بند کر کے قبول کیا گیا یا بے سوچے سمجھے مسترد کر دیا گیا۔ مستشرقین میں سر ولیم جونس سے لے کر میکس مُلر تک کوئی درجن بھر علماء ہندوستان کی گم شدہ عظمت کا سراغ لگاتے رہے۔ اُنھوں نے تو خیر بالواسطہ طور پر مشرقی ذہن اور ثقافت کی معنویت کو بحال کرنے اور نت نئی تعبیروں کے ذریعے اُسے کُہنگی کے الزام سے بچانے کی کوشش کی، مگر یہ بات بھی ایک مغربی مورخ (پرسیول اسپیر) ہی نے کہی ہے کہ جدید تعلیم و تمدّن کا مطلب مغربی طرزِ زندگی کی کورانہ تقلید ہو کر رہ گیا تھا اور یہ کہ مغلوں کے دورِ انحطاط کی تہذیب بھی دراصل ایک عظیم الشان ثقافتی ورثے کی تاریخ کا آخری باب تھی۔ یہ قول ہمارے اُن پُرجوش ہندوستانی مصلحین کی ذہنی ساخت اور شخصیت پر ایک مستقل طنز ہے، جو مشرقی علوم و افکار کے ذکر سے بھی شرمانے لگے تھے۔ ایک قلندر صفت مغربی دانشور کی یہ تنبیہہ تو لوگوں نے بہت دیر سے سنی کہ اپنی نجات کے لیے مغرب کو مشرق ہی کی راہ اپنانی ہوگی۔ مگر اس رویے کی داغ بیل غالبؔ کے زمانے میں پڑ چکی تھی۔ فرانس میں اشاریت پسندی، جرمنی میں اشاریت، انگلستان میں رومانیت کا بڑھتا ہوا حلقۂ اثر صنعتی تمدّن کے شورِ بے اماں میں ایک دماغی مورچے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادبی اظہار کی سطح پر استعارے اور علامت کی کارکردگی پر روز افزوں اعتماد عقلیت کے ہاتھ منتشر ہوتی ہوئی انسانی وجود کی وحدت کو ایک بار پھر بحال کرنے کی تخلیقی تگ و دو بھی تھی۔ اس رویے کو ہم انسانی تاریخ اور روایت کی سالمیت میں کھوئے ہوئے یقین کی بازیافت کا ایک موثر وسیلہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ کیسی ستم ظریفی ہے کہ مٹھی بھر لوگ جنھیں نشاۃِ ثانیہ کی پروردہ سوسائٹی اور اس کے ذیلی ادارے بگاڑنے میں ناکام رہے تا آشنائے عصر اور غریب الدیار کہلائے۔ سائنسی فکر کے علم برداروں کی نیک اندیشی نے غالبؔ کو اس الزام سے بچائے رکھا، مگر یہ سوچے بغیر کہ غالبؔ کی پیشانی کو عقلیت کے جس تاج سے سجایا جا رہا ہے غالبؔ کی روح اس کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہے۔ یہ ریبائش غالبؔ کی طبیعت سے میل نہیں کھاتی، اسی لیے اُن کی تخلیقی فکر اسے بار بار جھٹکتی ہے اور خود اپنے پر جھلاتی ہے کہ زمانہ سازی کے چکر نے یہ دن دکھائے۔

اس واقعے میں غالبؔ کے اندوہ، اُن کی کشمکش اور اضطراب کا بھید چھپا ہوا ہے۔ اسی واقعے کے سبب وہ زندگی کے ہر منظر، ہر شے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اپنی اُلجھنوں کو سلجھانے کا تقاضا کرتے ہیں تو اس غم سے جس کی وسعت آفاق گیر ہے اپنے نشاط کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس طرح کہ ایک دُکھ کا دریا اُنھیں راستہ دکھاتا جاتا ہے۔ کبھی ایک صبح کا خیر مقدم، کبھی داغِ فراقِ صحبتِ شب کا ماتم۔

۱۸۵۷ء کے ساتھ ایک نئے بھرے پُرے ماحول میں اپنی بیگانگی کا احساس جب اس حد کو پہنچا کر اب کچھ کہنا خود کو ضائع کرنا ہے تو غالبؔ دوستا عزیزوں، شاگردوں کو خط لکھ لکھ کر خود کو بہلانے لگے۔ وقت کے اسی منطقے پر اپنی ذات اور کائنات کے گُم شدہ حصّوں کی یاد شاعر غالبؔ کے سکوت اور تنہائی کی رفیق ٹھہرتی ہے۔ نشاۃ ثانیہ کی سرگرمیاں، جنھوں نے اُنیسویں صدی کے ذہنی ماحول کو مسلسل جگائے رکھا، اُن کے تئیں غالبؔ کی اُکتاہٹ اور تھکن کا تجزیہ کیے بغیر غالبؔ کو سمجھنا مشکل ہے۔ اُنھوں نے کہا تھا۔

کوئی نہیں ہے اب ایسا جہان میں غالبؔ<br>
کہ جاگنے کو ملا دیوے آ کے خواب کے ساتھ

یہ حسرت آفرینی حقیقت کے اُس مفہوم تک رسائی کی طلب کا تقاضا کرتی ہے۔ جو بیداری کے عمل کو ناکافی سمجھتی ہے۔ غالبؔ یہ جانتے تھے کہ بڑے تخلیقی کارنامے کی انجام دہی ایک اکیلی بیداری کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے چار و ناچار خوابوں کا سہارا لینا پڑے گا۔ پوری طرح جاگتی ہوئی آنکھ کثرتِ نظارہ میں گُم ہو جاتی ہے۔ ●

منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی مرحوم

# دلّی کی آبرو

جو برق و باد پہ قادر وہ اس قدر مجبور
کہ ایک سانس بڑھانے کا اختیار نہیں

قریباً پچیس تیس برس کی بات ہے "مخزن" کے کچھ محفوظ پرچوں کی ورق گردانی کر رہا تھا: ایک پرچے کے آخری صفحات میں بعض مستند شعراء کے کلام کا انتخاب درج تھا اس انتخاب میں حضرت آغا شاعر کا مندرجہ بالا شعر بھی شامل تھا۔

حضرت آغا شاعر کا نام سن رکھا تھا۔ شاید کبھی کسی رسالے میں ان کا کلام بھی دیکھا ہو۔ اب یاد نہیں مگر یہ شعر پڑھتے ہی دل و دماغ پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی اور میں افسر الشعراء کی عظمت کا اسی وقت قائل ہو گیا۔ جیر و قدر کے خشک مسئلے پر دلی کی ٹکسالی زبان میں ایسا شعر دیکھنے اور سننے میں اس وقت تک نہ آیا تھا۔ صاحبِ انتخاب کے حسنِ انتخاب کی بھی داد دینی پڑی۔

بچپنے میں غالباً البرٹ تھیٹریکل کمپنی کے کئی ڈرامے دیکھنے کا موقع ہوا۔ اس زمانے میں والد مرحوم ملک الشعراء حضرت افق لکھنوی حیات تھے۔ ان کے ایک شاگرد موہن لال مطلب اس کمپنی کے ڈائرکٹروں میں تھے اور کمپنی کے ساتھ خود بھی لکھنؤ تشریف لے گئے تھے۔ بچپن میں تو والد مرحوم کے ساتھ لاہور کی فضا میں سانس لیتا تھا تو مطلب صاحب کو دیکھا تھا۔ بڑے بھاری بھرکم تھے۔ شاید پانچ چھ من سے وزن کم نہ ہوگا۔ ہمارے مکان کی تنگ ڈیوڑھی سے ان کا نکلنا کچھ آسان نہ تھا۔ بہر حال یا تو مطلب صاحب نے اس تنگ راستے کی چوڑائی کی مروت میں اپنے موٹے پن کو دبایا۔ فربہی کو سرکشی سے روکا یا اس تنگ راستے نے ایک مہمان کے لیے کشادگی اختیار کرنا ہی مناسب سمجھا۔ مطلب صاحب یقیناً خود شاعر نہ تھے۔ متشاعر تھے کیونکہ ان کا کلام میرے پاس محفوظ ہے۔ اس میں بوئے کسے می آید کی صورت نظر آتی ہے اور وہ بوئے کسے بوئے افق ہے۔ اور کسی کی بو نہیں۔ تو اس کمپنی میں ایک ڈرامہ "حورِ جنت" کھیلا گیا۔ ڈراما میں نے بھی دیکھا۔ تمام سین ابتک نظر میں پھر رہے ہیں۔ اس وقت کیا سمجھ تھی کہ اس ڈرامے کا لکھنے والا اردو ادب کا ایک بہت بڑا شاعر ہے اس طرح بچپن میں میری غائبانہ ملاقات "حور جنت" کے ذریعہ ہوئی۔ اس کے بعد میں نے برق و باد پہ قدرت رکھنے والے انسان کی مجبوریوں کے ایک بے باک مبصر کی حیثیت سے آغا شاعر کو جانا۔

۱۹۲۷ء میں جب آب و دانہ کھینچ کر لاہور لے گیا۔ اس وقت میرے پرانے دوست سابق مرزا یاس عظیم آبادی اور موجودہ حضرت یگانہ چنگیزی بھی لاہور میں موجود تھے اور حضرت اصغر گونڈوی بھی لاہور کے کسی ادبی ادارے شاید مرکز اردو سے وابستہ تھے۔ منصبی حلقے کے ملاقاتیوں میں ایک کشمیری پنڈت تھے شعر کہتے تھے تخلص بانکے تھا۔ وہ افسر الشعراء آغا شاعر کے تلامذہ میں سے تھے۔ تر آدمی تھے۔ میری طرح خشک نہ تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت آغا لاہور تشریف رکھتے ہیں۔ اشتیاق دیدار چٹکیاں لینے لگا۔ حتیٰ کہ ایک روز میں بانکے صاحب کے مکان پر پہنچا تو بھنگ گھٹ رہی تھی۔ حضرت آغا شاعر اپنی مخصوص وضع قطع میں تھے۔ مجنونانہ کیفیت تھی۔ بانکے صاحب نے تعارف کرایا تو دفعتاً طبیعت بھر آئی۔ اٹھ کر میری طرف لپکے گلے لگایا اور رو رو کر فرمانے لگے۔ خدا رکھے اس وقت اپنے پرانے دوست افق مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی اور حیدرآباد کی وہ صحبتیں یاد آگئیں جن میں میں یعنی حضر آغا شاعر اور افق صاحب دونوں شریک ہوتے تھے۔

آغا صاحب کے دل میں والد صاحب کی یاد ابتک تازہ تھی اور اتنی شدت کے ساتھ، اس کا مجھے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ بہر حال مجھے انہوں نے اسی طرح گلے لگایا جس طرح کوئی باپ اپنے بیٹے کو پیار کرتا ہے۔ اس نظارہ نے مجھے بیحد متاثر کیا۔ ایک طرف آغا والد صاحب کا ذکر کر رہے تھے اور دوسری طرف ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔ اس سے آغا صاحب کے خلوص و محبت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ان کا دل بیحد رقیق تھا۔ ان کے دل میں ان کے معاصرین کو کس قدر جگہ حاصل تھی، اس کا ثبوت مجھے لاہور میں ملا۔

دفعتاً آغا شاعر کے تیور بدلے، جب سامنے بھنگ کا گلاس پیش کیا گیا۔ میں نے مجبوری ظاہر کی۔ کہنے لگے واللہ کیسے شاعر ہو میاں ذرا اس کو چکھ کر

وہ دیکھو۔ مگر جب انہیں بعد میں معلوم ہوا کہ میرا شین درست ہے
تو قاف تو بہت پیچھے ہے۔ خدا کی مار تم پر۔ کہاں باپ کے
پیچھے پڑے ہو

ہم اے افق نہ گرد رہیں کیوں شراب کے
دیکھو زمیں بھی پھرتی ہے گرد آفتاب کے

وہاں ان کا بیان نعمتوں سے محروم۔
بہرحال میری حالت پر ترس کھایا اور بڑی دیر
تک اس خشک مشربی پر ماتم کرتے رہے۔
حکم ہوا۔ اچھا تو کچھ "آفتاب" کے لیے لکھا کرو۔ "آفتاب"
دہلی کا ایک رسالہ اس زمانے میں نکلتا تھا جس کے ایڈیٹر
آغا شاعر کے شاگرد دیوان شرر تھے۔

جب دلی آیا تو حضرت آغا سے متعدد بار ملاقات ہوئی
اس زمانے میں آغا کا بانکپن اپنی اداؤں کو رفتہ رفتہ خیرباد
کہنے لگا تھا۔ ریاست جھالاواڑ سے اپنے قطع تعلق
کی خبر صد درجہ درد و کرب کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔ آنکھیں تو بات
بات میں آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھیں۔ دہلی کے ایک مشاعرے
میں غالباً میں نے ان کو پڑھتے ہوئے بھی سنا ہے۔ اگرچہ
وہ مشاعروں میں شرکت سے بالعموم محترز رہتے تھے۔

حضرت آغا کے پڑھنے کا انداز عجیب تھا لہجے میں
رعب و تحکم تھا۔ مشاعرہ پر چھا جاتے تھے۔ ان کا تحت اللفظ
پڑھنا ہزاروں ترنم ریزیوں پر بھاری تھا سننے والے
ساکت ہو جاتے تھے۔ کسی میں دم مارنے کی جرأت
نہ ہوتی۔ آغا شیر کی طرح محفل شعر و سخن میں گرجتے
تھے۔ آغا کا انداز خوانگی اگر کسی نے ان کے بعد پایا تو وہ
منشی مہاراج بہادر برق تھے۔ آغا شاعر کو اپنے دہلوی
تلامذہ میں اگر کسی پر فخر تھا تو منشی مہاراج بہادر برق پر۔

مجھے یاد ہے جب ۱۹۳۶ء میں برق صاحب کا انتقال
یک بیک پانی پت میں ہوا اور اس کی خبر آغا صاحب کو
ہوئی تو وہ بالکل اس طرح سراپا ماتم تھے جس طرح
کوئی باپ اپنے بیٹے کی دائمی جدائی پر زار زار سینہ کوبی
کرتا ہو۔ آغا کی وہ حالت میں نے دیکھی ہے۔ برق کی موت
کا کتنا صدمہ ان کو ہوا یہ ان کی ایک تحریر سے ظاہر ہے جو
ایک تعزیتی جلسے کے سلسلے میں آغا صاحب نے
مجھے بھیجی تھی۔

یہ جلسہ برق صاحب کی وفات پر ہندو کالج میں
مسز سروجنی نائیڈو کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا اس
کے بعد آغا صاحب کی نوازشیں براہ راست مجھ پر کئی سال
تک رہیں۔ میرے دوست شیو نرائن بھٹناگر نے جب
اپنے روزنامہ "وطن" کا سالنامہ شائع کرنا شروع کیا
تو اس کے حصہ نظم کی ترتیب میرے ہی سپرد کر دی۔
ملک کے مشاہیر ادیبوں اور شاعروں کے دربار تک سائل کی
حیثیت سے حاضر ہونے کا شرف مجھے "وطن" کی بدولت
حاصل ہوا۔

اس سلسلے میں ہر سال میں حضرت آغا کو تکلیف
دیتا تھا اور وہ برابر میری درخواست قبول کرتے تھے۔
اگرچہ ان کو اپنے ناسازگار حالات کچھ تنگ دستی اور کچھ
ضعیف العمری کے باعث اپنے دل و دماغ پر قابو
نہیں رہا تھا پھر بھی جو کچھ انہوں نے قلم برداشتہ لکھا
وہ "وطن" کے حوالے کر دیا۔ شیو نرائن بھٹناگر کی ذات
میں ہی کچھ عجب کشش ہے۔ ان کا حسن اخلاق سب کو
بیک نظر رام کر لیتا ہے آغا شاعر بھی شیو نرائن بھٹناگر
کے جوہر اخلاق سے مسخر ہو چکے تھے۔ وہ شیو نرائن کے
اخبار کو اپنا اخبار ہی کہتے تھے اور ہمارے اور آپ کے
سب کے وطن یعنی ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے تھے

عقیدتاً شیعہ تھے۔ حضرت علی اور شہید اعظم حضرت
امام حسینؑ کی مداحی میں زندگی صرف کی۔ مرثیے لکھے خود
خوب روئے اور دوسروں کو خوب رلایا مگر یہ عجیب بات
ہے کہ جس باکمال شاعر کی طبیعت اس قدر لاابالی ہو
جسکے پہلو میں عاشق کا دل ہو۔ جس کے مزاج میں رندوں
کی آوارگی ہو جس کا ایک ایک شعر زندگی کے طربیہ پہلو کا
غماز ہو جس کے نغموں کی نشاط آرائیاں آج بھی ہمیں وجد میں
لاتی ہوں وہ جب رونے پر آتا ہے تو کائنات کے ذرے
ذرے کو غم والم کی تصویر بنا دیتا ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ آغا شاعر کی تمثیل نگاری یا
ڈرامہ نگاری کی ابتداء کیسے ہوئی۔ بالعموم یہ تمثیل نگار
پہلے خود اداکار ہوتے ہیں اور بعد میں تمثیل نگار بن جاتے
ہیں یورپ کا تمثیل نگار شیکسپیر بھی اول اول اسٹیج
کا ایک فرد تھا اور کتنے ہی دوسرے تمثیل نگار ہر ملک
میں ایسے ملیں گے جن کی فنکاری ابتداء میں اداکاری کی مرہون منت
رہی ہے۔ آج بھی ہمارے ملک میں اکثر سینما ڈرامہ
ٹسٹ ایسے ہیں جنہوں نے پہلے اسکرین پر کام کیا ہے۔
پرتھوی راج اور راج کپور اس کی تازہ ترین اور روشن
ترین مثالیں ہیں۔ ممکن ہے جوانی میں آغا شاعر کو بھی اسٹیج
پر آنے کا موقعہ ملا ہو۔ کیونکہ جن حضرات نے آغا شاعر
کے اطوار و کردار کا مطالعہ کیا ہے وہ ان کے لب و لہجے
اور ان کے طریق عمل میں ایک اداکارانہ انداز پاتے ہیں۔
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرثیہ خوانی میں جذبات کی عکاسی
کے لیے جسمانی اشاروں اور حرکتوں سے کام لینے کے
باعث ان کے عام کردار و گفتار اداکارانہ ذہنیت پر بھی
اثر پڑا ہو لیکن مجھے ذاتی طور پر کبھی یہ ضرور
محسوس ہوا کہ آغا میں دانستہ یا نادانستہ طور پر اداکارانہ
انداز موجود تھا۔

آغا کی طبیعت رقیق ہونے کے باوجود غیور بھی
تھی۔ ان کی رقیق القلبی کے افسانے میرے سننے میں آئے
ہیں مجھے بتایا گیا ہے کہ انہوں نے اکثر اپنے سامنے
رکھے ہوئے دستر خوان کو حاجتمندوں اور بھوکی پیاسی
روحوں کی آسودگی کے لیے وقف کر دیا ہے اور خود خلیل اللہ
کی طرح فاقہ کشی میں دن گذار دیا ہے۔ میں نے یہ بھی
سنا ہے کہ جب کسی دولتمند قدرداں کی طرف سے
آغا کو نقدی پیش کی گئی تو وہ گھر آنے سے پہلے ہی ضرورتمندوں
اور مصاحبوں کے کام آ گئی۔ ایک شاعر کامل پھر رند مزاج
طبیعت فقیری میں بھی بادشاہت نہ کرتی تو کیا کرتی ––!

ہاں تو اس وقت تک میں نے آغا کی غزلوں کا
سیر حاصل مطالعہ نہیں کیا تھا۔ ارباب نشاط میں ان کی
غزلیں اکثر گائی جاتی تھیں اور بہت مقبول تھیں۔ لیکن
جب میں نے آغا شاعر کے فرزند ارجمند آغا سرخوش
کے رسالہ چمنستان میں پہلی مرتبہ ان کی غزلوں کے
کثیر التعداد نمونے دیکھے تو میں ان کی غزل گوئی کا پہلے
سے زیادہ قائل ہو گیا۔ اور داغ کے تمام برگزیدہ تلامذہ
کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اگرچہ
داغ کے برگزیدہ تلامذہ میں سبھی اپنی اپنی جگہ ایک
خاص حیثیت کے مالک ہیں لیکن آغا شاعر کی حیثیت

بقیہ ص ۳۵

آجکل۔ نئی دہلی۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوک سنگیت میں ایک ہی ساز نواز شہنائی تنہا بجاتا ہے اور اس کی لَے اور تال کے لیے دوسرا کلاکار ڈھول یا نگارا پر ضرب دیتا ہے۔ کبھی کبھی خوشی اور شادی بیاہ کی تقریبوں میں دو سے چار تک سازندے شہنائی مل کر بجاتے ہیں۔ کلاسیکی سنگیت میں بھی اس طرح کا ہی چلن ہے یوں تو یہ کام بڑا آسان لگتا ہے۔ تاہم یہ کام بڑا مشکل ہے۔ اجتماعی صورت میں یعنی ایک سے زیادہ سازندے شہنائی بجائیں۔ بہرحال شہنائی نواز کے حواس اور فن کی پرفارمنس اس کی پیش کش Performance پر ہوتی ہے۔ اس لیے ساز نواز کو بہت محنت، لگن اور ریاض سے اپنے فن کو جلا بخشنی ہوتی ہے۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تال قائم رکھنے کے لیے شہنائی کے ساتھ طبلہ نہیں بلکہ مردنگ بجائی جاتی ہے۔

## ناگاسورم :

ناگاسورم شہنائی کے قبیلے کا ساز ہے۔ اسے شہنائی کا حلیف کہہ سکتے ہیں۔ کوئی خوشی کی تقریب، کوئی تہوار، یا کوئی پوجا اس ساز کی تیز تیکھی دُھنوں کے بغیر نامکمل تصوّر ہوتی ہے۔ دو سے تین فٹ کی لمبائی کا یہ ساز لکڑی کو کھوکھلا کر کے بنایا جاتا ہے اور شہنائی کی طرح سے دوہرا نَے Double Reed سے بجایا جاتا ہے۔ اس کے بارہ سوراخ ہوتے ہیں، جن میں سات مطلوبہ سُر نکالنے کے کام آتے ہیں اور باقی سوراخ متواتر آہنگ اور سُر پیدا کرتے ہیں۔ ناگاسورم بھی کھلی فضا کا ساز ہے۔ اس سے نکلے ہوئے سُر کھلے ماحول میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اب جب کہ بند کمروں اور ہالوں میں بجانے کا رواج چل پڑا ہے تو ناگاسورم نواز بڑی مہارت اور احتیاط سے اس کی تیکھی اور تیز طرار صداؤں کو ....... modulate کرتا ہے۔ اس سے صدا کی رسائی بھی منضبط ہو جاتی ہے۔ یہ فن کارانہ صلاحیت بڑی محنت ......... اور ریاض سے حاصل ہوتی ہے۔ دکھنی بھارت نے کئی ممتاز ناگاسورم نواز پیدا کئے ہیں، جو بڑی خوبی اور سلیقہ سے اس ساز کا استعمال کرتے ہیں۔ اور دل پذیر پیرائے میں لوک سنگیت سے لے کر کلاسیکی سنگیت تک اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ناگاسورم کو ان ہی مشاق فن کاروں کی وجہ سے قومی درجہ میسر آچکا ہے — ناگاسورم ہی کی طرح کا ایک اور ساز ہے، جسے تن کرنا کہتے ہیں۔ جو ساخت و ہیئت میں چھوٹا ہوتا ہے۔ اگرچہ اس میں بھی اتنے ہی چھید ہوتے ہیں، جتنے کہ ناگاسورم کے، مگر صدا بڑی چیخنے والی پیدا کرتا ہے۔ ناگاسورم کا ذکر جب دکھنی بھارت کے موسیقی داں اور ساز شناس کرتے ہیں تو وہ کچھ اور بہ کم تر بادی سازوں یعنی اوتو، پونائی، شرتی اپانگ، تو میو وغیرہ کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ جن کا استعمال مقابلتہً نہایت محدود و مختصر ہوتا ہے۔

جہاں تال قائم رکھنے کے لیے شہنائی کے ساتھ مردنگ بجائی جاتی ہے۔ وہاں ناگاسورم کے ساتھ اسی قبیلے کا ایک ضربی ساز استعمال ہوتا ہے، جسے تاویل کہتے ہیں۔ تاویل ڈھول نما ضربی ساز ہے۔ جس کے دونوں سروں پر چمڑا لگایا جاتا ہے۔ ایک جانب تو اس چمڑے پر چھوٹی سی کرسی سے ضربیں لگائی جاتی ہیں تو دوسری سمت سے انگلیوں سے..... انگلیوں میں یا تو لوہے کے دائرے ہوتے ہیں یا انگوٹھیاں۔ تاویل بلند آہنگ ہوتا ہے اور اچھا تاویل نواز اُسے بڑی عمدگی سے بجایا کرتا ہے۔ عجب حسنِ اتفاق ہے کہ کشمیری سورنائی یا سُرنے کے ساتھ اسی قسم کا ڈھول نما ضربی ساز بجایا جاتا ہے، جسے وصول کہتے ہیں۔ تاویل ہی کی طرح وصول پر بھی ضربیں لگائی جاتی ہیں۔ اور مطلوبہ لے اور تال قائم کی جاتی ہے۔

نوبت، نفیری اور قرنائی وہ بادی ساز ہیں، جو امن و جنگ کے دنوں میں استعمال ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ نوابوں، راجوں، مہاراجوں، امیروں اور رئیسوں کی مقام گاہوں اور محلوں میں ایسے ساز نواز ملازم رکھے جاتے جو خاص موقعوں پر یہ ساز بجاتے۔ کسی کی آمد و اخراج یا جشن کے موقعوں پر یہ ساز نواز اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہتے۔ ایسے سازوں نے شہنائی اور ناگاسورم کی طرح قومی درجہ نہیں پایا ہے۔ یہ ساز علاقائی حدوں میں ہی محدود ہو کے رہ گئے ہیں۔ بادی سازوں کی بات یہیں ختم کرتے ہیں۔ کیونکہ جملہ اور مختلف النوع بادی سازوں کا ذکر قرینِ مصلحت نہیں ہے۔

آیئے ذرا ایک اور طرف نکل چلیں۔ ذرا کچھ زہی (Bow) سازوں کا جائزہ لیں۔ ان میں وہ ساز بھی ہیں جو لوک سنگیت میں متداول ہیں۔ اور وہ بھی جو شاستریہ سنگیت کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ ایسے سازوں میں سارنگی، دلربا، اسراج، سارندہ،

[illegible] (کمانچہ) پکھاواج، شہنائی، ستار، ڈھول، نگارہ [illegible] شامل ہیں۔ میں ان میں وائلن کو اس فہرست میں شامل نہیں کر رہا ہوں کیوں کہ بنیادی طور سے یہ مغربی موسیقی کا ساز ہے اور اس کا ماخذ بھارت نہیں ہے۔ البتہ وائلن کا ذکر کرناٹک سنگیت کے بیان میں کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ لائٹ میوزک، نیم کلاسیکی اور جدید طرز کی موسیقی کے فلمی سنگیت اور آرکسٹرا میں وائلن نے اپنا جائزہ اور اہم مقام پایا ہے۔ یوں تو مغربی موسیقی سے ہمارے ہاں کئی اور ساز مستعار لیے گئے ہیں، جن میں گٹار، ساکسوفون، کلارنٹ، کارنٹ، چیلو اور دوسرے ساز شامل ہیں۔ ان سارے سازوں اور دوسرے سازوں کا بیان دو مختلف صورتوں میں ممکن ہے۔ ایک یہ کہ ثقافتی اختلاط اور دوسرے یہ کہ نیشنل آرکسٹرا کی تربیت و تدوین۔ مغرب سے بھارت نے کئی مغربی ذہنی اور بادی لے کر اپنائے ہیں۔

ہاں تو ذہنی سازوں کی فہرست سے سب سے پہلے سارنگی کو لیتا ہوں۔ کیوں کہ مجھے تو یہ سارے سازوں میں رئیس ساز لگتا ہے کیوں کہ اس میں انسان کے گلے سے نکلے ہوئے ہر سُر کو من و عن پیش کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہاں مجھے ڈاکٹر مہدی فروغ سے اختلاف ہے جس نے صرف نے و مزمار کی صدا انسانی آواز سے قریب تر ہے۔ ہمارے ہاں سارنگی اس قیاس آرائی کا جواب پیش کرتی ہے۔

سارنگی کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو کشمیر میں سارنگ کے نام سے مشہور ہے اور کشمیریوں کا خیال ہے کہ یہ مہاراجہ سارنگ دیو کی ایجاد ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جو بنگال میں مروج ہے۔ یہ کسی حد تک کشمیری سارنگ سے بڑی ہوتی ہے۔ اس میں چار بنیادی تار اور چھ سے بارہ تک امدادی تار لگے ہیں۔ یہ سارنگی عام طور سے علاقائی یعنی بنگالی سنگیت میں سنگیت کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ تیسری قسم وہ ہے جو ہندوستانی کلاسیکی سنگیت میں اونچا مقام پا چکی ہے۔ اس سارنگی پر آگے چل کر ذرا تفصیل گفتگو ہو گی۔

کشمیری سارنگ صورت و ہیئت کے اعتبار سے اور مقابلتاً بہت مختصر سی ہے۔ جو لوک سنگیت اور لائٹ میوزک سے وابستہ ہے۔ عام طور سے سارنگ کی لمبائی ڈیڑھ فٹ تک ہوتی ہے۔ اس میں رودے اور فولاد کے دو تار اور ایک پیتل کا تار بنیادی اساس فراہم کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ آٹھ یا دس فولادی تار امدادی نوعیت کے ہوتے ہیں جنہیں اصطلاحِ عام میں طربیں کہتے ہیں۔ گز (Bow) لگ بھگ فٹ بھر لمبا ہوتا ہے، جس میں گھوڑے کی دُم کے بال لگائے جاتے ہیں اور سارنگی نواز دائیں ہاتھ سے گز بنیادی تاروں پر چلاتا ہے اور بائیں ہاتھ سے نغمہ کے سُروں کے مطابق اوپر کے حصّہ پر تاروں کو دباتا ہے۔ تار بھی اوپر سے نچلے حصّہ کی طرف کھونٹیوں سے بندھے ہوئے بیلنی (Bridge) سے لائے جاتے ہیں۔ بیلنی چمڑے کے اس حصّہ پر نصب ہوتی ہے جو نیم مخروطی صورت کا ہوتا ہے۔ چونکہ سارنگ صرف کشمیر ہی میں متداول ہے اس لیے اس کو علاقائی سازوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ حسنِ اتّفاق سمجھئے کہ ۱۹۷۰ء کے ستمبر مہینے میں جب کہ میں بلجیم کے دارالخلافہ برسلز میں یونسکو کی طرف سے متعیّن تھا تو مضافات میں جانے کا موقع ملا۔ جہاں مختلف قسم کے میوزیم ہیں۔ ایک میوزیم افریقی قوموں کی تاریخ سے وابستہ ہے۔ دوسرا زراعت کے مختلف مدارج اور آلاتِ کاشتکاری کی نمائش کرتا ہے۔ تیسرا ٹرانسپورٹ خاص طور سے ریلوے کی داستان کی جزئیات کا حامل ہے، چوتھا آلاتِ حرب و ضرب کا مسکن ہے اور دوسرے عجائب گھروں کے علاوہ ایک میوزیم دنیا بھر کے آلاتِ موسیقی کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ اس میوزیم ........ Musee Instrumental یا (Musiek Instrumenten Museum) میں ہندوستانی سنگیت کے لیے ایک گوشہ وقف کیا گیا تھا، جس میں وینا، ستار، ڈھول، نگارہ، کھڑتال، طبلہ، شہنائی اور دیگر سازوں کے ساتھ کشمیری سارنگ بھی رکھی ہوئی ملی۔ البتہ سارنگ کے ساتھ وائلن والا گز رکھا گیا تھا نہ کہ اس کا اصلی گز۔ جو لمبائی اور ہیئت میں مختلف ہے۔ بہرحال میں نے کیوریٹر Curator کی توجہ اس کمی یا غلطی کی طرف مبذول کرائی اور وزیٹنگ میں اپنے تاثرات میں یہ بھی لکھ دیا۔ بہرحال یہ جملہ معترضہ اطلاعاً لکھ دیا ہے اور توقع بارِ خاطر نہیں بنا ہو گا۔

## سارنگی

سارنگی کو کشمیری سارنگ کا بڑا کہیں تو بے جا نہ ہو گا۔ ہیئت اور ساخت اور طول و عرض میں سارنگی بڑی اور قوی ہے۔ اس میں گائیک کی آواز یا اس کے گلے سے نکلے ہوئے سُروں کی ہو بہو برابر کی صدا نکالنے کی صلاحیت ہے۔ لکڑی کو کھوکھلا کر کے بنایا جانے والا یہ ساز دو حصّے رکھتا ہے اوپری اور نچلا۔ نچلے حصّے، جسے بعض لوگ شکم کہتے ہیں پر سوکھا چمڑا لگایا جاتا ہے اور اوپر کے حصّے پر کھونٹیاں جن پر رودے، فولادی اور پیتل کے تار باندھے جاتے ہیں۔ ان تاروں میں بنیادی تار بھی ہیں اور امدادی تار بھی۔ تاروں کی تقسیم یوں ہے کہ تین یا چار بنیادی تار ہوتے ہیں، جن پر گز چلایا جاتا ہے اور مطلوبہ سُر نکالے جاتے ہیں۔ ان بنیادی تاروں میں دو یا تین رودے اور ایک فولاد کے ہوتے ہیں جو قدرے موٹے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ۱۸ سے ۲۴ تک پتلے فولادی تار امدادی نوعیت کے ہوتے ہیں، جنہیں ساز نوازوں کی اصطلاح میں طربیں کہتے ہیں۔ بنیادی تار سا پا سا ما یا سا گا کے سُروں سے ملائے جاتے ہیں۔ چار چار کھونٹیاں اوپری حصّے کے دونوں جانب نصب کی جاتی ہیں۔ چمڑے کے حصّے پر ایک بیلنی

Brid) ہوتی ہے جس پر سے تار گزارے جاتے
ور بچلے سرے پر باندھے جاتے ہیں۔ سارنگی نواز
، ہاتھ میں گز لے بنیادی تاروں کو بچلے حصے کے
ں چھیڑتا ہے۔ جہاں کہ چھڑ الگا ہوا اور بائیں ہاتھ
گلیوں کے ناخنوں سے بالائی حصے سے درمیانی حصے تک
اتھ مس کرتا یا دباتا ہے۔ اس عمل سے مطلوبہ سُول
ا ور گمک اور آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ
فیت سُروں کو جنم دیتی ہے۔

عام طور سے سارنگی ۳ فٹ لمبی اور آٹھ
چوڑی ہوتی ہے۔ اصل میں موجودہ سارنگی کے
میں آنے سے پہلے اسی طرح کے کچھ اور زہی سازوں
ر کتابوں میں ملتا ہے، جن میں گیارہ تار والا
اور ۲۴ تاروں والا ساز ڈیڑھ سو لی مختلف
ں میں متداول اور مروّج تھے۔ موجودہ سارنگی
ندائی صورت کو بعض ساز شناس دومنزہ بھی
رہے ہیں۔

سارنگی جہاں کلاسیکی گائیک کا ساتھ دیتی ہے
ں اسے تنہا (Solo) بھی بجایا جاتا ہے اور
ب بجایا جاتا ہے۔ گائیک کے سُر سے سُر ملانے میں
گی نواز بڑی چابک دستی اور فن کارانہ صلاحیت
ساتھ راگ کی باریکیاں اُجاگر کرتا ہے اور
طور سے گائک کی خوب صورتی بڑھاتا ہے۔ اس طرح
یہ صرف امدادی ساز ہی نہیں رہتا بلکہ گائیک
رح اپنی اہمیت شائقین اور اصحابِ فن پر واضح
ہے۔

سارنگی کلاسیکی سنگیت کے علاوہ نیم کلاسیکی
میوزک اور بعض خاص موقعوں پر لوک سنگیت
بھی استعمال ہوتی ہے۔ آرکسٹرا میں بھی اس
پنے لیے مخصوص جگہ بنائی ہے۔ اس طرح سارنگی
کلاسیکی موسیقی سے لے کر فلمی سنگیت تک اپنا
بنا چکی ہے۔ ایک بات کا مجھے ہمیشہ قلق رہا ہے
بہت کے اہل کاروں نے اس ساز کو کسی حد تک
آمادہ کیا ہے۔ کیوں کہ جب بھی قومی یا علاقائی
کسی بڑے آدمی کا سوگ منایا جاتا ہے تو سارنگی
نشر کرتے ہیں۔ شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ساز حزنیہ
ماحول کا ساز ہے۔ میں نے اپنی ۲۶ سالہ ملازمت
میں بھی کافی کوشش کی کہ یہ سارنگی سوگ کے ایام میں
نشر نہیں ہونی چاہیئے۔ مگر میں اقلیت میں تھا اور
ہوں، آواز موثر ثابت نہیں ہو سکی۔ شاید اس کی
وجہ یہ بھی تھی کہ اس ساز کا بدل میں بنا نہیں سکا جو
حُزن و ملال کے تاثرات بھی پیدا کرنے میں اپنی مثال
آپ ہے سارنگی نہ ہوئی کوئی ماتمی ساز ہوا۔

فن کار یہ ساز تنہا (Solo) بھی
بجاتے رہے ہیں اور ہمارے ملک میں ایسے موسیقاروں
کی کمی نہیں جو ایک روایت کا درجہ حاصل کر چکے ہیں ۔۔
کلاکاروں کے اس گروہ کے سالار استاد بندو خان (مرحوم) تھے۔
جو اس ساز سے باتیں کرواتے تھے اور خود بھی اس
سے باتیں کرتے تھے۔ جب بھی وہ اپنی دھن میں
بجانے لگتے تو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اپنی
غیر جاذب آواز میں بول وغیرہ بھی گانے لگتے۔ اس ادا میں
بھی ایک کشش ہوتی اور مجموعی ادائیگی پر کوئی غیر موزوں
اثر نہیں پڑتا۔ وہ گز اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے
اشتراک سے بے حد دل پذیر اور اعلیٰ سنگیت پیش کرتے کہ
سننے والا محوِ حیرت ہو جاتا۔ تحسین و آفریں کے کلمات
از خود زبان سے جاری ہو جاتے۔ یوں لگتا کہ تاروں
کے مَس سے سنگیت کے دھارے پھوٹ رہے ہیں۔
چار بنیادی تاروں (تین رودے اور ایک پیتل)
اور امدادی تاروں (طربوں) کی مہین و نازک جسامت
میں آہنگ و صدا کی دل نشیں کائنات پوشیدہ ہے۔
استاد بندو خان کی بات چلی ہے تو بتا دیں کہ وہ دلّی
کے مشہور سارنگی نواز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔
۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۵ء میں کراچی
(پاکستان) میں فوت ہوئے۔ ان کے سارنگیا خاندان
میں استاد ممّن خان اور استاد چاند خان کا بڑا
مرتبہ تھا۔ انہی کی تربیت اور ہدایت میں بندو خاں
نے کم سنی میں ہی سارنگی پر عبور حاصل کیا اور فن کا
مظاہرہ کرنے کے مواقع فراہم ہوئے۔ استاد بندو خاں
کچھ درویش صفت لاابالی طبیعت کے مالک تھے۔
ان کے کئی دل چسپ قصے مشہور ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے
کہ وہ اپنے ہی ساز میں اتنے ڈوبے رہتے تھے کہ
فرصت کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے اور تنہائی
میں بھی خوب خوب سارنگی بجاتے۔

مغربی موسیقی میں سارنگی کا حلیف وائلن تصور
ہے ........ ایک بھکاری یا میراثی سے لے کر
شاستریہ سنگیت کار تک سارنگی بجاتے پھرتے ہیں۔
ہندوستانی سنگیت اور ہلکی پھلکی موسیقی میں جائز مقام
پانے کے باوجود سارنگی دکھنی بھارت اور کرناٹک
سنگیت میں بار حاصل نہیں ہوا۔ وہاں تو اس کی جگہ
مغربی زہی ساز وائلن نے پائی۔

## اسراج :

یہ ساز بڑا دل چسپ ہے۔ صورت میں یہ سارنگی
اور ستار سے ملتا جلتا ہے۔ اس لیے یوں لگتا ہے کہ یہ
"تاروں والا مضرابی ساز ہے لیکن اصل میں یہ زہی ساز
ہے جو گز سے بجایا جاتا ہے۔ یہ ساز لگ بھگ تین فٹ
لمبا ہوتا ہے اس کے بھی ...... دو حصے ہوتے
ہیں، اوپری اور نچلا ــــ یہ بھی لکڑی کو کھوکھلا
کر کے بنایا جاتا ہے۔ اور اس پر ایک جھلی ہوتی ہے اور
اس میں بھی فولاد اور پیتل کے تار لگائے جاتے ہیں
۱۵ سے ۱۷ تک کھونٹیاں ہوتی ہیں، جن میں تار کس
دیئے جاتے ہیں۔ صدا سُہانی پیدا ہوتی ہے مگر
قدرے mettalic ۔ اسراج بنگال میں بے حد
مقبول رہا ہے۔ اور اکثر بنگالی موسیقی نواز گھرانوں
میں مروّج رہا ہے۔ اس کی ہر دل عزیزی کے اسباب
معلوم تو نہیں اور نہ ہی میرا ذہن ان کی ٹوہ میں لگا ہے۔
مگر اتنا ضرور معلوم ہے کہ اسراج رابندر ناتھ ٹیگور
کا محبوب ساز تھا۔ اور اسی لیے رابندر سنگیت کا ایک
اہم ساز بن گیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھگتی سنگیت میں
بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسراج تنہا Solo بھی
بجایا جاتا ہے اور گائک کے ساتھ بھی۔ اس ساز
میں بھی کچھ سارنگی جیسی صلاحیت ہے کہ گلے سے نکلے
ہوئے سُر کو پیش کرے!

## تارشہنائی

اسراج ہی کی طرح دو اور کم معروف ساز بھی ہیں ۔ جنہیں مندر بہار اور تار شہنائی کہتے ہیں۔ تار شہنائی میں بیتی کے نیچے ایک Sound Box ہوتا ہے ، جس سے صوتی ہیئت بدلنے میں مدد ملتی ہے ۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے تار شہنائی کو سُرلش چکرورتی نے ۱۹۳۶ء میں متعارف کرایا ..............

...... اب یہ سوچ رہے ہیں کہ یہ دو لفظ تار اور شہنائی دو الگ الگ قبیلوں یعنی ضربی اور بادی سازوں سے مستعار لیے ہیں ۔ اور ان دونوں کے امتزاج سے ایک ساز بن گیا ہے ۔ اس کی کیا وجہ ہے ؟ تو بات یوں ہے کہ نغماتی آہنگ میں اس سے جو صدا نکلتی ہے اس سے شہنائی کا گمان ہوتا ہے ۔ مگر تاروں کے ساتھ جب Sound Box کا اضافہ ہوا اور گز سے بجایا جانے لگا ۔ تو اس کا تار شہنائی کے نام سے بپتسمہ کرایا گیا ۔ ورنہ صورت و مزاج میں یہ اسراج کا ترمیم شدہ ایڈیشن ہے ۔

## دِل رُبا :

یہ ساز کچھ ستار سے ملتا ہے اور کچھ اسراج سے ۔ فرق اتنا ہے کہ ستار کے نچلے حصے میں کاسہ (Bowl) ہوتا ہے لیکن دلربا خالی اور کھوکھلی لکڑی سے تراشا جاتا ہے جس پر چمڑا منڈھ دیا جاتا ہے ۔ اسراج اور دوسرے کئی سازوں کی طرح یہ ساز بھی مسلمانوں کی کاوشوں سے وجود میں آیا ہے ۔ بنگال میں جہاں اسراج نے دلوں کو موہ لیا تھا ، وہاں شمالی اور شمال مشرقی بھارت میں دل ربا نے فن اور من میں جگہ بنائی ۔ اس ساز میں چار بنیادی تار اور بائیس امدادی تار (طربیں) سازندے کو مطلوبہ سُر پیدا کرنے میں مددگار ہوتے ہیں ۔ اس ساز کی لمبائی لگ بھگ ۳ فٹ اور شکم (نچلے حصے) کی چوڑائی ۶ انچ ہے ۔ جو گز استعمال ہوتا ہے اس کی لمبائی کوئی پونے دو ($1\frac{3}{4}$) فٹ ہوتی ہے ۔ چار بنیادی تار پیتل اور فولاد کے ہوتے ہیں اور طربیں حسبِ معمول محض فولادی تار کی ۔

## سارندہ :

سارنگی کے قبیلے کا یہ ایک اور ساز ہے جو بنگال (بھارت) صوبہ سرحد ، سندھ اور بلوچستان (پاکستان) میں بجایا جاتا ہے ۔ اس ساز کا نچلا حصہ قدرے بیضوی شکل کا ہوتا ہے اور بالائی حصہ کھلا ہوتا ہے ۔ اس میں رودے کے دو یا تین تار لگائے جاتے ہیں ۔ تین یا چار کھونٹیاں ہوتی ہیں ۔ ہیئت سے یوں لگتا ہے کہ انسانی کھوپڑی الٹی رکھی ہو اور گالوں کے حصے اور جبڑے اندر دھنسے ہوئے ہوں ۔ سارنگی اور اسراج کی طرح یہ بھی گز سے بجایا جاتا ہے ۔ یہ ساز اگرچہ بالعموم کلاسیکی سنگیت کے ساتھ نہیں بجایا جاتا ، مگر کبھی کبھی محدود پیمانے پر اس پر کسی راگ راگنی کی کوئی دھن پیش کی جاتی ہے ۔ اس ساز کی اصلی جگہ علاقائی سنگیت ہی میں ہے ۔ سارندہ تنبورا اور دھہ نور د میراثیوں کا محبوب ساز ہے ۔ س ۔ آر ۔ کلیان نے "سازہائے مجور" میں ایک ایسے ہی ایرانی ساز کا ذکر کیا ہے جو سارندہ کا ہم شکل تھا اس کا نام قیچک تھا ۔

سارندہ کے علاوہ چکارا بھی رہی ساز ہے ، جو بعض علاقوں کی موسیقی سے وابستہ رہا ہے مگر کلاسیکی سطح یا مقام حاصل نہیں کر پایا ۔

چکارا بھی اپنی نوعیت کا اپنا ساز ہے جو سارنگی کے قبیلے کا ہے ۔ چکارا ایک لمبے سے لکڑی کے ٹکڑے سے جو کھوکھلا کیا جاتا ہے ، بنتا ہے ، جس کے نچلے حصے پر چمڑا لگایا جاتا ہے ۔ اس پر بھی بیتی (Bridge) اسی طرح سے لگتی ہے ، جس طرح کہ سارنگی ، اسراج وغیرہ میں ۔ اس میں تین بنیادی تار لگتے ہیں ، جو یا تو رودے کے ہوتے ہیں یا گھوڑے کے بال کے ۔ امدادی تار پانچ ہوتے ہیں ۔

## سازِ کشمیر :

کشمیر کی کلاسیکی موسیقی ــــ صوفیانہ موسیقی ــــ میں واحد گز والا ساز سازِ کشمیر کے نام سے

قیصر قلندر

موسوم ہے ۔ اس ساز کی ہیئت و ساخت بڑی سا[...] ایک ڈیڑھ انچ قطر والے لکڑی کے بانس تما د[...] کے بائیں حصے میں کاسہ (صوفیانہ موسیقی میں پیال[...] ہوتا ہے اور کاسے کے نیچے ایک سخت موٹا گول[...] سیخ رہتا ہے ۔ سازِ کشمیر کے تین اعضا یا حصے ہ[...] دستۂ بالا ، دستۂ وسط اور دستۂ پائین کہ[...] ساز کی مجموعی لمبائی ۴ سے ۵ فٹ تک ہوتی ہے [...] حصے یعنی کہ فولادی سیخ کی لمبائی ۶ انچ کے برابر [...] کاسہ کے اوپر کا حصہ لگ بھگ ۳ - ۴ فٹ ہو[...] اس لحاظ سے کاسہ جو بیضوی شکل کا ہوتا ہے [...] قطر ۸ سے ۱۲ - انچ تک ہوتا ہے ۔ اس میں ر[...] کا ایک موٹا تار جو بنیادی آہنگ مہیا کرتا ہے [...] ۴ سے ۸ امدادی تار لگتے ہیں ۔ رودے کے تا[...] سنگ دو فولادی تار بھی لگائے جاتے ہیں ۔ گز[...] لگ بھگ $2\frac{1}{2}$ فٹ ہوتی ہے ۔ اس میں گھوڑے [...] دُم کے موٹے بال لگائے جاتے ہیں ۔ اصل س[...] ایرانی نژاد ساز ہے جو کشمیر کی صوفیانہ موسیقی [...] منسلک ہے ۔ یہ ساز صرف ایک ( [...]one متواتر آہنگ یا سُر مہیا کرتا ہے اور بس ۔ ا[...] سے بہت کم استفادہ کیا گیا ہے ۔ یہی ساز جو ا[...] کمانچہ کے نام سے موسوم ہے ، اتنی ترقی کر گیا [...] اب یہ آرکسٹرا کا ایک اہم رہی ساز بن گیا ہے [...] کا اہم سبب یہ ہے کہ کشمیر میں کوئی ادارہ ایسا نہ[...] سازِ کشمیر بجانے کی تربیت دی جا سکے ۔ ایرا[...] کئی اداروں میں یہ ساز (کمانچہ) سکھایا

# نذرِ اندرا

یہ چمن، یہ جشنِ فطرت کی انوکھی داستاں
یہ پہاڑیوں، ساگروں، صحراؤں، میدانوں کی دلکش سرزمیں
دیوتاؤں کی، خدا کی، بودھ کی، عیسیٰ کی، نانک کی زمیں
ان گنت انسان، تہذیبیں، مذاہب، داستانیں، بولیاں
جس میں ہر ہر دور میں نوعِ بشر نے
نت نئے انداز سے اپنی سجائی بستیاں
ہلکی ہلکی دھوپ میں کندن کی صورت جگمگاتی وادیاں
لمحہ لمحہ زندگی کا ہر عمل آگے رواں، پیہم دواں
کیا نہیں ہے اس جہانِ بیش و کم میں کیا نہیں
رنج محنت آشنا، خوشیاں عبادت آفریں
آج کیوں رنگِ چمن دھندلا گیا
ماہ تاباں بادلوں میں جا چھپا
پاؤں کیوں بادِ بہاری کے قلم ہونے لگے
غنچہ و گل کی جگہ کانٹے بہم ہونے لگے
ہائے کیا اُفتاد صحنِ بوستاں پر آ پڑی
کون وہ ظالم نظر تھی باغباں کو کھا گئی
وہ "اُشس[1]" کی پاک دیوی
صبح کے ماتھے پہ شبنم کی لڑی
زندگی کی ابتدا کا اذنِ عام
آسماں کے در دریچے کھولتی
محنت و الفت پہ اُکساتی
بہاروں کے سنہرے راگ گاتی
زندگی پوشاک پہنے نور کے رتھ پر سوار
مہرباں و کامراں
وید کے منتروں سے جیسے اُس وقت کے مسکانے لگی
یا کہ "اندر" دیوتا کا اک نیا سوروپ ہے
[illegible] کو جس نے استقامت بخش دی

گنبدِ افلاک کو قائم کیا
اور پھر ارض و سما اس کے قدم چھونے لگے
"سوم[3]" امرت پی کے جس نے آدمیت کو کیا آفاق گیر
خشک، بنجر ہو گئے تھے، کوہسار و مرغزار
بجلیاں تڑپیں، زمیں تپ تپ گئی
ہر طرف بادل، گرجتے، گونجتے بڑھنے لگے
تب کہا "اندر" نے بارش سے کہ "اب آزاد ہو"
اور "نکھرا دے زمین و آسماں"
بحر و بر جھومے، ہوائیں گل بداماں ہو گئیں
آ گئی نظروں کے آگے، منزلِ جہد و عناں
وہ نگارِ کشورِ ہندوستاں

مایہ دارِ محفلِ دانش وراں
ماضی و حال اور مستقبل کی وہ شیرازہ بند
عصرِ حاضر کی اُبھرتی خواہشوں، آسائشوں کی ترجماں
ہر تقاضے پر عمل کی پیش رو
جس نے سمجھے پاسداری کے اصول
غم گساری، جاں نثاری کے اصول
امتیازِ مرد و زن اک حرفِ باطل ہو گیا
عالمِ انسانیت کو ہمدمِ کامل ملا
وہ شعورِ این و آں
جس نے مستقبل کے کتنے راستے طے کر لیے
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے زمانے سر ہوئے
جس نے ہر امکان کو اپنے احاطے میں کیا
جس نے چھو لی گرمیِ اندیشہ سے نبضِ جہاں
اک امانت ہے لہو کا ایک اک قطرہ ترا
ایک اک ذرہ ہماری روح کا مقروض ہے
ہر گھڑی پیشِ نظر ہے عظمتِ ہندوستاں
تیرے خوابوں، تیرے ارمانوں کو پورا کر دکھانا ہے
جان و دل پر کھیل کر قرضے چکانا ہے ہمیں
دور گردوں، ٹوٹتے تاروں کا منظر ساز ہے
آج سیمائے زمیں سے اک ستارہ آسماں پرواز ہے
یہ ستارہ داستانِ ہند کی تقدیر کا اعجاز ہے
ناز ہے خاتونِ مشرق، ہم کو تجھ پر ناز ہے

---

[1] رگ ویدی زمانے کی عزیز ترین دیوی، جس کی حمد و ثنا سب سے زیادہ کی گئی ہے۔ کہتے ہیں ساری دنیا کے لٹریچر میں سب سے دلکش تصویر کشی اسی دیوی کی ہے۔ رگ وید میں اس دیوی کا ذکر کچھ انہی خصوصیات کے ساتھ آیا ہے، جو نظم میں ظاہر کی گئی ہیں۔ وہ سورج کی محبوبہ ہے، بہارِ حسن کی تابانی ہے، صبح کی خوشی اور زندگی ہے۔

[2] رگ وید میں فضائے بالا اور پھر اس زمین کا، فتح و کامرانی، سیرابی و شادابی کا سب سے اہم دیوتا مانا جاتا ہے۔ وہ ایک محبوب قومی دیوتا ہے اور رگ وید کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ اس کی ثنا پر مشتمل ہے۔

[3] ایک نباتاتی بیل سے یہ رس تیار ہوتا تھا، اور دیوتاؤں کی عبادت، نذر و قربانی میں کام آتا تھا اور اس کے بعد خود پی لیا جاتا تھا کہ وجودِ انسانی میں بھی وہی خدائی خصوصیات پیدا ہو جائیں۔

[illegible] مظفر ۱۴، بنجارہ ہلز، حیدرآباد (اے۔پی)

# دوہے

## بھگوان داس اعجاز

رے آیا کس گاؤں میں، کون کرم سنجوگ
دِشا بدلتے راستے، آنکھ بدلتے لوگ

آیا ہے بازار میں یہ کیسا ٹھہراؤ
خریدار خود بِک گیا، کرتے کرتے بھاؤ

من دُوِدھا میں ہی رہا، رین ہوئی یا بھور
بھیتر جھینگا ڈر اُمڑیں، باہر کاگا شور

ہوگی اک دن گھر مرے پھولوں کی برسات
میں پگلا اس آس میں ہنستا ہوں دن رات

بھانڈہ سب کے سامنے، دیا سہاگ نے پھوڑ
اولے اپنے گھر پڑے، برکھا چاروں اور

چاہا میں بھی توڑ دوں، تھکا کنکری مار
لیکن درپن جھیل کا ٹوٹا ہزاروں بار

لگتا ہے چہرہ مرا لوگ گئے ہیں بھول
مجھ سے پہلے چڑھائے گئے میرے بُت پر پھول


• ٹی-۱۵۱م-بلجیت نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸


# غزلیں

## رفیعہ شبنم عابدی

جس کی یاد میں عمر گنوائی، اک دنیا کو بھولی میں
جی کہتا تھا اُس سے کہہ دوں لیکن کیسے کہتی میں

میری ذات کا جس کی نظر سے اتنا گہرا رشتہ ہے
اُس کی آنکھ سمندر جیسی ہری بھری سی دھرتی میں

بند کواڑوں پر اک جانی پہچانی دستک جو سنی
چھوڑ کے بھاگی گرم توے پر یوں ہی جلتی روٹی میں

کس کا چہرہ دیکھ لیا تھا سوتے سوتے بچپن میں
خوابوں کی بے رنگ ندی میں برسوں ڈوبی اُبھری میں

سچ تو یہ ہے ایسے کب تک مل جُل کر چل سکتے تھے
کچھ تو تھا وہ بھی ہرجائی، تھوڑی سی تھی ضدّی میں

اُس نے جاتے جاتے شاید یوں ہی ادھر بھی دیکھا ہو
جاڑے کا موسم تھا پھر بھی سر سے پا تک بھیگی میں

میری مجبوری نے شبنم اس کو بدظن کر ڈالا
اس کی قسم تھی جان سے پیاری، جھوٹی کیسے کھاتی میں


• شعبۂ اردو، مہاراشٹر کالج، بمبئی ۴۰۰۰۰۸


## دیپک قمر

کسا ہے جسم انگوں میں بڑی ہی کسمساہٹ ہے
کھچے تاروں میں بینا کے بھری اِک جھنجھناہٹ ہے

تناور پیڑ کو موسم بدلنے کی خبر دے دو
ہوا میں ٹوٹتے پتّوں کی مدھم سرسراہٹ ہے

"تپسوی بن کے بیٹھا ہے ہمارے گھر میں سنّاٹا
جو ہم سے دور ہے اب بھی کسی قدموں کی آہٹ ہے

کھرا سونا ہزاروں سال کا ہے اپنی ہنسلی میں
نئے زیور کے تن پر تو سجاوٹ ہی سجاوٹ ہے

ہے ڈھلتی عمر میں بھی باڑھ سی چڑھتی اُمنگوں کی
چھپی کہرے میں، کرنوں کی ابھی تک کپکپاہٹ ہے

محبت لے کے سب کچھ دے گئی ہے ایک سارنگی
ہر اک دُھن میں کسی بھنورے کے دل کی گنگناہٹ ہے

دھنک کے سات رنگوں سے سبھی رس مل گئے ان میں
تری غزلوں کے پیمانوں میں گیتوں کی گھلاوٹ ہے


۱۸۵ - ابولین، میرٹھ ۲۵۰۰۰۱

## ایم. کوٹھیاوی راہی

بجائے شمع کوئی قمقمہ ہے کمرے میں
مگر اک عہدِ گزشتہ پڑا ہے کمرے میں

مری نوا مری آواز مر گئی شاید
سسکتے خواب کی بھیگی صدا ہے کمرے میں

ہماری سوچ ہمیں بولنے نہیں دیتی
کہ جب سے بند ہر اک فلسفہ ہے کمرے میں

دھواں دھواں سی اُداسی بجھی بجھی سی ہنسی
اک اجنبی سا مسافر رُکا ہے کمرے میں

چلے گئے تھے جو چھٹ کر وہ لوٹ آئے ہیں
مرے لیے درِ ماضی کھُلا ہے کمرے میں

نظر میں ڈال کے نظریں اُتر نہ دل میں مرے
اسی ادا سے وہ برسوں رہا ہے کمرے میں

■ قاضی پور خورد، گورکھپور

## سخاوت شمیم

ہم نے بنا لیا جو مکاں تیرے شہر میں
ذرّوں کو مل گئی ہے زباں تیرے شہر میں

ٹھہرے ہوئے ہوں جیسے بہاروں کے قافلے
اک سیلِ رنگ و بُو ہے رواں تیرے شہر میں

منصف بھی ہیں، گواہ بھی، قاتل بھی بے بدل
فریاد لے کے جائیں کہاں تیرے شہر میں

پہچانتے تھے لوگ جسے جس کے نام سے
وہ شخص اجنبی ہے میاں تیرے شہر میں

محسوس ہو رہا ہے کہ ہم وہ نہیں رہے
کتنا بدل گیا ہے سماں تیرے شہر میں

اک دشتِ بے اماں ہے تمنّا کا سلسلہ
اک راز بن گئی ہے فغاں تیرے شہر میں

شاید فصیلِ شہر ہو لے آبرو شمیم
ہوتا ہے ذکرِ امن و اماں تیرے شہر میں

■ مالپورہ ہاؤس، فتح ٹیبہ، جے پور-۳

## پرکاش تیواری

یہ زبوں خانہ کہاں، روح کا یہ ساز کہاں
شورِ حرماں میں تمنّاؤں کی آواز کہاں

خواہشیں دیکھتی ہی رہ گئیں آکاش کی اور
ان پرندوں کو میسّر پرِ پرواز کہاں

ظلمتوں نے عجب انداز سے گھیرا ہے مجھے
میری تقدیر کا دروازہ ہوا باز کہاں

موسمِ زرد کا سُوکھا ہوا اک پتّہ ہوں
ڈھونڈتے ہو شجرِ سبز کے انداز کہاں

آ، میں چھوڑ آؤں تجھے دُور بہت دور کہیں
تو کہاں زندگی، یہ عالمِ ناساز کہاں

بھاگتے پھرتے ہیں ہر سُو کہ ہے عالم ہی عجیب
ورنہ اس دشت میں یارائے تگ و تاز کہاں

اوڑھ کر چپ کی ردا بیٹھے رہو اے پرکاش
دل میں وہ درد کہاں، دل کی وہ آواز کہاں

■ ۱۴۲۔ سیکٹر XII آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲

# جمہوریت کے کروڑوں ستون

چار ہفتے پیشتر
دسمبر کے آخری ہفتے میں
ہمارے کروڑوں
شہری اور دیہاتی
بڈھے اور جوان
مردوں اور عورتوں نے
اُمڈ کر
اپنی حکومت
منتخب کی
اور آزاد ووٹ
اور جمہوریت کی طاقت کو
ایک بار پھر نمایاں کیا۔
جمہوریت اور آزادی
ہمارا بیش قیمت خزانہ
اور بے بہا ورثہ ہے۔
آئیے
اپنی جمہوریہ کی
35 ویں سالگرہ پر
اسے برقرار رکھنے
کا عہد کریں۔

## اتحاد اور مضبوطی کے ساتھ

davp 84/272

خواجہ احمد فاروقی

# مَن کہ...

: خواجہ احمد فاروقی خلف مولوی حسن احمد مرحوم ابنِ مولوی اسد اللہ ابن مولوی مظہر اللہ ابن مشیر الدولہ محقق الملک، نور اللہ خاں بہادر مناظر جنگ۔

دت: ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۷ء بمقام بچھراؤں ضلع مراد آباد (یوپی)

ہم: بی۔ اے انگریزی ادب۔ تاریخ یورپ تاریخ عہدِ مغلیہ۔ فارسی کے ساتھ۔
ایم اے انگریزی۔ ایم اے فارسی،
ایم اے اردو عربی کے ساتھ۔
پی ایچ ڈی اردو۔ مکتوباتِ اردو کا تاریخی ادبی ارتقا۔ دہلی یونیورسٹی ۱۹۵۳ء
تاریخ پی ایچ ڈی از پروفیسر حامد حسن قادری مرحوم سے

ہزار شکر کہ پی ایچ ڈی ہوئے خواجہ
بڑا صلہ ہے بڑی نعمتِ خدائے احد
یہ فی البدیہہ کہا قادری نے سالِ نشاط
کہ ڈاکٹر ہوئے کیا خوب خواجہ احمد
۱۹۵۳ء

موجودہ منصب: سینیئر فیلو انڈین کاؤنسل آف ہسٹاریکل ریسرچ۔ ہند

دوسرے عہدے: ۱۔ پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی
سبکدوشی: یکم نومبر ۱۹۸۲ء
تو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم
۲۔ ڈین۔ آرٹس فیکلٹی، دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۳ء تک
۳۔ چیرمین بورڈ آف ریسرچ اسٹڈیز، دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء تک
۴۔ راک فیلر ریسرچ اسکالر مغربی یورپ میں ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۸ء تک۔
۵۔ ہندوستانی ادب کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے وس کان سن یونیورسٹی امریکہ میں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۳ء تک۔
۶۔ ہندوستانی ادب کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے ماسکو، لینن گراڈ اور تاشقند یونیورسٹیوں میں۔ ۱۹۶۷ء
۷۔ اردو کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے فرانس میں ۱۹۶۸ء
۸۔ اردو کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے مغربی جرمنی میں ۱۹۷۱ء

تصنیفات اور تالیفات:

"میر تقی میر، حیات اور شاعری" مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۵۴ء
اس کتاب کو ۱۹۵۷ء میں ساہتیہ اکادمی کے ادبی انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ اس کو یوپی گورنمنٹ نے بھی اعلیٰ ادبی انعام سے نوازا۔
"کلاسکی ادب" تنقیدی مضامین مطبوعہ دہلی ۱۹۵۳ء
مرزا شوق لکھنوی مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۵۰ء مقدمہ از حضرت نیاز فتح پوری
مکتوباتِ اردو کا ادبی و تاریخی ارتقاء: مکتوباتی ادب کا جائزہ۔ تحقیقی مقالہ
نئی شاعری۔ مطبوعہ آگرہ، چار ایڈیشن شائع ہوئے۔ سندھیا حکومت نے ادبی انعام کا مستحق قرار دیا۔ ۱۹۶۰ء
ذوقِ جستجو: مطبوعہ لکھنؤ، ۱۹۶۷ء تیسرا ادبی انعام ملا۔
اردو میں وہابی ادب: مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء بین الاقوامی کانگریس آف اورینٹلسٹ این آربر امریکہ کا مقالہ
پیتنبو: فارسی سے انگریزی میں ترجمہ۔ مطبوعہ: ایشیا پبلشنگ ہاؤس دہلی، نیویارک، ۱۹۷۰ء بہ اشتراک پروفیسر رشم اور ڈاکٹر رسل ابیسم کے تبصرے
چراغِ رہ گزر: مطبوعہ دہلی ۱۹۶۸ء یوپی اردو اکادمی کا انعام ملا۔
یادِ یارِ مہرباں: مطبوعہ دہلی ۱۹۷۵ء دوسرا حصہ پریس میں۔
غدر کی کہانیاں: نیشنل بک ٹرسٹ آدان پردان منصوبے کے تحت
— میڈیا: مطبوعہ ساہتیہ اکادمی
آکسفورڈ مصور انگریزی اردو ڈکشنری مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ ۱۹۸۰ء

مخطوطات کی ترتیب و تدوین:

تذکرۂ سرور یا عمدۂ منتخبہ ۹۹۶ شاعروں کا تذکرہ۔ مؤلفہ سرور متوفی ۱۸۳۳ء مطبوعہ بمبئی ۱۹۶۱ء پنڈت جواہر لال نہرو کے نام معنون کیا گیا۔
کربل کتھا: فضلی کی قدیم نثر مطبوعہ دہلی مارچ ۱۹۶۱ء مع مقدمہ و فرہنگ و حواشی
گنجِ خوبی: از میر امن دہلوی مورخہ ۱۸۰۲ء مطبوعہ بمبئی ۱۹۶۶ء تنقیدی مقدمہ کے ساتھ
مرزا غالب کے غیر مطبوعہ فارسی خطوط تمکین کے نام۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۶۰ء
خدنگِ غدر: جنگِ آزادی کا روزنامچہ از معین الدین حسن۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۷۲ء مع مقدمہ
دیوانِ بقا: میر کے معاصر بقا اکبر آبادی کا کلام مطبوعہ دہلی مع مقدمہ
دیوانِ میر سوز: مطبوعہ دہلی ۱۹۶۳ء
دیوانِ قائم: مطبوعہ دہلی ۱۹۶۳ء
دلی اردو اخبار ۱۸۴۰ء کے چند فائل مقدمہ کے ساتھ شائع کیا گیا۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۷۲ء
انشائے اردو: ۱۸۲۸ء کی لکھی ہوئی قدیم نثر۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۷۳ء
قانونِ انشاء: انیسویں صدی [illegible]

مطبوعہ دہلی ۱۹۷۴ء
ارمغانِ آصف : آصف علی کی تحریریں مع مقدمہ
مطبوعہ مئی ۱۹۷۶ء وغیرہ وغیرہ
مرتبہ دیگر کتابوں کے لیے خاص ابواب لکھے : انگریزی میں
انڈین لٹریچر مطبوعہ آگرہ باب : اردو زبان و
ادب ۱۹۵۹ء میں چھپی۔
معاصر ہندوستانی ادب ساہتیہ اکادمی
باب : اردو
جامع تاریخ ہند جلد ۱۱، باب اردو
انڈین لٹریچر جلد ۱۶، شملہ کے انڈین انسٹی ٹیوٹ
سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔ باب: اردو
جامع تاریخ ہند : بابر سے اورنگ زیب تک :
اردو سے متعلق باب
اس کے علاوہ اسلامک کلچر انڈین پن۔
اسٹیٹسمین، ٹائمس آف انڈیا وغیرہ میں علمی و
ادبی مضامین شائع ہوئے۔
نگار، اُردو، ہمایوں، جامعہ، اردو ادب،
معارف، برہان، آج کل وغیرہ کے لیے مقالات
ان کے علاوہ ہیں جن کی تفصیل پیش کرنا دشوار ہے۔

انعام واکرام :
سندھیا گورنمنٹ، ساہتیہ اکادمی، یوپی اردو
اکادمی، یوپی گورنمنٹ، بہار اردو اکادمی،
میر اکادمی نے ادبی انعامات دئے اور کشمیر
یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے ۱۹۸۲ء میں
خلعتِ اعزاز عنایت کی

بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت :
دہلی یونیورسٹی کے نمائندے کی حیثیت سے مستشرقین
کی بین الاقوامی کانگریس منعقدہ میونخ جرمنی
۱۹۵۷ء۔ منعقدہ نئی دہلی ۱۹۶۴ء اور
این آربر امریکہ ۱۹۶۷ء میں شرکت کی اور
مقالے پڑھے۔
ایشیائی علوم کے کنونشن منعقدہ بوسٹن امریکہ
۱۹۶۱ء
ایشیاٹک کی بین الاقوامی ایسوسی ایشن پیرس ۱۹۵۸ء
۱۹۶۹ء میں کنوینر اور سکریٹری کی حیثیت
سے غالب سے متعلق بین الاقوامی سمپوزیم کی
ترتیب و تنظیم۔
ایشیائی ادبیات کے مذاکرہ مغربی برلن ۱۹۷۸ء
۱۹۸۰ء میں وڈبرک کالج کے مکالمہ سلی اوک۔
انگلستان میں شرکت۔
جولائی ۱۹۸۰ء میں یونی ورسٹی آف جمالیسٹ
میں سرسید احمد خاں پر مقالہ پڑھا
۱۹۷۲ء میں یونی ورسٹی آف سیلون کے تعلیمی فورم
میں شرکت کی
۱۹۸۲ء میں "مستشرقین اور اسلام" کے بین الاقوامی
سمپوزیم اعظم گڑھ میں شرکت کی اور مقالہ پڑھا۔

خصوصی اور توسیعی خطبات :
۱۹۶۱ء میں شکاگو یونی ورسٹی کے زیر اہتمام
سوامی ویویکانند لکچر۔
۱۹۶۸ء میں اکاڈمی آف سائنس پراگ
چیکوسلوواکیہ میں خطبہ۔
۱۹۷۶ء اور ۱۹۷۷ء میں بون اور برلن
میں اقبال پر لکچر
۱۹۶۱ء میں وسکانسن یونیورسٹی امریکہ میں
خصوصی لکچر : نیشنلزم اور اردو شاعری
نیز اسلام پر تین لکچر۔
اپریل ۱۹۸۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے
زیر اہتمام ہندوستانی علوم کے مرکز سینٹ انٹنی
کالج آکسفورڈ میں توسیعی خطبہ۔
مئی ۱۹۸۴ء میں یونیورسٹی آف لیڈز لیڈز
انگلستان میں خصوصی لکچر
جون ۱۹۸۴ء میں بین الاقوامی پین سمپوزیم
یوگوسلاویہ میں شرکت۔

خطبات، جو ہندوستان میں دئے گئے :
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی،
عثمانیہ یونیورسٹی، ڈائمنڈ جوبلی لکچر عثمانیہ
یونی ورسٹی، سینٹرل یونی ورسٹی حیدرآباد۔
جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، گورکھپور یونی ورسٹی
میسور یونی ورسٹی، ندوۃ العلماء، لکھنؤ
سے رنڈا ادس کانووکیشن ایڈریس۔

علمی و ادبی انجمنوں سے تعلق :
لائف ممبر کل ہند انجمن ترقی اردو
معتمد تنظیمی کمیٹی انٹرنیشنل سمپوزیم بہ سلسلہ جشن
صد سالہ مرزا غالب ۱۹۶۹ء
جنرل سکریٹری انڈو پاکستان کلچرل کانفرنس
افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو ۱۹۶۱ء
سکریٹری شعبۂ عربی و فارسی ۳۰ ویں کل ہند
تعلیمی کانفرنس۔
وائس چیرمین ادارہ مطالعات اقبال حیدرآباد
رکن مجلس ادارت : اسلامک کلچر حیدرآباد۔
فکر و نظر۔ نوائے ادب ۱۹۷۵ء
مشیر ادبی ساہتیہ اکادمی، گیان پیٹھ، غالب اکادمی
ممبر مجلس انتظامیہ ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۱۹۶۹ء، ۱۹۷۳ء، ۱۹۸۴ء، ۱۹۸۵ء
ممبر مجلس ادارت : اردو انسائیکلو پیڈیا
ترقی اردو بیورو، حکومت ہند
ممبر فلم ایوارڈ کمیٹی حکومت ہند ۱۹۶۳ء
ممبر ادبی بورڈ مولانا آزاد اورینٹل
ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد
ممبر یوپی اردو اکادمی، ممبر دہلی اردو اکادمی،
رائل ایشیاٹک سوسائٹی امریکن اورینٹل
سوسائٹی
ممبر مسلم یونی ورسٹی (علی گڑھ) کورٹ ۱۹۸۴ء
۱۹۸۵ء
ممبر مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف کی گرداوری
کمیٹی۔ ساہتیہ اکادمی صدر ڈاکٹر ذاکر حسین
ممبر: حضرت امیر خسرو انٹرنیشنل سمینار
ممبر: ترویجی، عثمانیہ، آگرہ، علی گڑھ، گورکھپور
لکھنؤ، الہ آباد، اودے پور، کانپور اور
میرٹھ کی یونی ورسٹیوں کے بورڈ آف اسٹڈیز
اور ریسرچ۔

(آگے صفحہ نمبر ۳۸ پر)

ستیش بترا

# ڈِزنی لینڈ
## انسانی تخیل کا نادر کرشمہ

یہ عجب اتفاق تھا جب ہم امریکہ پہنچے تو ڈسنی لینڈ سے دعوت نامہ پہلے سے ہی ہمارا منتظر تھا۔ ڈسنی لینڈ کو مقبول بنانے کے لیے وہاں کا ادارہ بڑی بڑی فرموں سے تعلقات قائم کر کے اُنہیں ایک معقول فیس کے عوض اپنا کارپوریٹ ممبر بناتا ہے، جس کی رُو سے کمپنی کے افسر اور ان کے پریوار باری باری طے شدہ دنوں پر ڈسنی لینڈ کی سیر کے لیے مدعو کئے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کے دوسرے مہمان، دوست و اقربا کے لیے بھی رعایتی شرحوں پر ٹکٹ مہیا کرنے کی سہولت ہے۔ ڈسنی لینڈ کا حالیہ داخلہ ۱۶ ڈالر فی کس ہے۔ اگرچہ اس فیس کے بعد آپ کو ڈسنی لینڈ میں واقع کسی شو یا کھیل کے لیے کسی اور ٹکٹ کے دام نہیں دینے پڑتے۔ اپنے ادارے کو مقبول بنانے اور مستقل آمدنی بڑھانے کے لیے ایسے کئی وسیلے امریکہ میں اختیار کئے جاتے ہیں۔ ہمارے بیٹے انیل کا بھی یہ دعوت نامہ ان ہی وسیلوں کی ایک کڑی تھا۔

امریکہ اور ڈسنی لینڈ قریب قریب لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو امریکہ کی سیاحت ڈِسنی لینڈ کی سیر کے بنا ادھوری ہے۔ ڈسنی لینڈ کو عموماً بچوں کی تفریح سے منسلک کیا جاتا ہے۔ لیکن صحیح تو یہ ہے کہ عمر، مرتبہ، جنس یا قوم کی کوئی بھی قید لگانا بے معنی ہوگا۔ دراصل ہر شخص کے اندرونی گوشے میں کہیں ایک بچہ چُھپا ہوتا ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں، یہ دوسری بات ہے۔ بہر حال جب ڈسنی لینڈ جانے والوں کی فہرست بنائی گئی تو اس میں دو بچے ضرور شامل تھے۔ میں اور میرا پوتا اشیش!

امریکہ میں عموماً سنیچر اور اتوار کی چھٹی رہتی ہے۔ اس لیے جانے والوں کی بھیڑ بھی انہی دنوں میں زیادہ رہتی ہے۔ اپنے دیش میں تو چھٹیوں کی بھرمار رہتی ہے۔ نہ بھی ہو تو لے سکتے ہیں، جب کہ امریکہ میں مشکل سے سال بھر میں تین یا چار چھٹیاں ہوتی ہیں۔ اور عام آدمی صرف دو ہفتہ سالانہ چھٹی کا حق دار ہوتا ہے۔ اب آپ انہیں سیر و سیاحت کے کام میں صرف کریں، گھر جائیں یا بیماری سے نپٹارا کریں، یہ آپ پر منحصر ہے — اور نہیں، بچھائیں اس کی آپ کو مکمل آزادی ہے! یہ تین چار قومی چھٹیاں بھی اس طرح سے طے ہیں کہ آپ انہیں سنیچر اتوار کے ساتھ جوڑ سکیں اور قدرے راحت محسوس کر سکیں۔ ان میں سے بھی دو چھٹیاں یوم آزادی — (۴ جولائی) اور کرسمس (۲۵ دسمبر) تو حسبِ معمول پر ہوتی ہیں۔ چنانچہ ویک اینڈ (Week End) پر بھیڑ کا بڑھنا لازمی ہے! اسی لیے ان چھٹیوں کے پروگرام بہت پہلے طے کرا لینا اور رہائش، آنے جانے کی ریزرویشن وغیرہ کا پہلے سے انتظام کر لینا قطعی لازمی ہوتا ہے۔ انہی باتوں کے پیش نظر انیل نے ہر ویک اینڈ کا پروگرام پہلے ہی سے بنا رکھا تھا۔

ڈسنی لینڈ میں دیکھنے کی اتنی چیزیں ہیں کہ لوگ عموماً وہاں دو دن گزارتے ہیں۔ ان کے لیے ہر درجہ اور ہر طرح کے ہوٹل موٹل موجود ہیں، جن میں ادارہ کا اپنا 'ڈسنی لینڈ ہوٹل' بھی ہے۔ ڈسنی لینڈ کیلیفورنیا کے سب سے بڑے شہر لاس اینجلز (Los Angeles) کے پاس ہی اناہیم کے مقام پر بنا ہے۔ یہ جگہ لاس اینجلز کی ایرپورٹ سے کچھ زیادہ دور نہیں۔ اگرچہ اس کے اوقات صبح نو بجے سے بارہ بجے رات تک کے ہیں۔ لیکن سنیچر کے روز یہ ایک گھنٹہ زائد یعنی صبح ایک بجے تک کھلا رہتا ہے۔ بہرحال یوں تو ہمارے شہر آکسنورڈ سے ۴۰ میل یعنی کار سے ڈیڑھ دو گھنٹے کے فاصلے پر واقع ہے۔ لہٰذا ہم آکسنورڈ سے صبح ۶ بجے روانہ ہوئے

○ 8-520/16، فریدآباد (ہریانہ)

... کھلنے کے اوقات تک ہم گیٹ پر پہنچ جائیں
... کی سہولت کے ساتھ واپس لوٹ سکیں۔
... ڈزنی لینڈ کے باہر کاروں، بسوں کی بھیڑ
... کے لیے ایک بہت ہی وسیع پارک بنا
... ہے۔ اسی بھیڑ میں اپنی کار کھوجنا بجاتِ خود
... ہے۔ لہٰذا یہ پارک کئی حصوں میں
... ہے۔ پارکنگ کی شرح ادا کرتے وقت
... مسٹر نالالٹ (۲۰۲) کی پرچی بھی ساتھ دی
... کیوں کہ پارکنگ کی جگہ مین گیٹ سے کافی دور ہے۔
... مین گیٹ تک پہنچنے کے لیے خوشنما بسوں کا
... انتظام ہے۔ اسی مقصد کے لیے آس پاس کے
... ہوٹلوں کے پاس سے گزرتی ہوئی ادارہ کی اپنی ریل
... گاڑی ہے۔ جو آپ کو ڈزنی لینڈ کے دروازے
... تک پہنچاتی ہے۔ ان ہوٹلوں میں داخلے کے
... ٹکٹ دستیاب ہیں۔ یہ ٹکٹ خرید لیں تو وقت
... بہت بچتا ہے۔ پھر اس گاڑی کی سیر بھی ٹکٹ کی
... طرح میں شامل ہے! مین گیٹ پر بچہ گاڑیاں
... اور معذور افراد کے لیے مخصوص گاڑیوں کی سہولت
... بھی ہے۔ اگرچہ ان کا کرایہ دینا پڑتا ہے۔

امریکہ بھر میں بلکہ تمام مغربی ممالک میں
معذور لوگوں کے لیے ہر طرح کے سہولیات مہیا
... کی جاتی ہیں۔ تاکہ جہاں تک ہو سکے وہ عام لوگوں کی
طرح زندگی کا لطف اٹھا سکیں۔ پارکنگ احاطے
... میں اُن کے لیے داخلے یا نکلنے والے راستے کے
قریب ہی اُن کی کاروں کے لیے جگہیں وقف ہیں،
تاکہ انہیں زیادہ دُور نہ جانا پڑے۔ علیحدہ لفٹ
... ٹوائلیٹ، معذور گاڑیوں کے چڑھنے اترنے کی
... سہولتیں، رعایتی ٹکٹ گھر موجود ہیں۔ کسی بھی عمارت
کی تعمیر کے وقت ان سبھی سہولیات کا خاص خیال رکھا
جاتا ہے۔ اس کی وجہ شاید وہ دو عالمی جنگیں ہیں
... اُن کی وجہ سے ... کے لیے ذمہ دار ٹھیرائی جا سکتی ہیں۔
... ہمارا ... ان دو عالمی جنگوں اور آزادی
... کی لڑائیوں سے (؟) جنگ کہنا درست نہ
... رہا ہے۔ عوامی لاپروائی

گھوڑا ٹرام کی سیر

اور کچھ شعور کی کمی کے باعث ہم نے اس مسئلے پر کچھ زیادہ توجہ بھی نہیں دی۔ شکر ہے کہ اب معذور افراد کے بارے میں ہمارا شعور دھیرے دھیرے جاگ رہا ہے۔ بہر حال ان ملکوں میں یہ تمام کوششیں یقینی طور پر قابلِ ستائش ہیں اور انسانی سطح پر ایک اطمینان کا احساس دلاتی ہیں۔

تو ہاں بات ہو رہی تھی ڈزنی لینڈ کی۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہی آپ کے سامنے اٹھارہویں اُنیسویں صدی کے انداز میں بنا ہوا امریکی بازار بہ نفسِ نفیس موجود ہے۔

سلیپنگ بیوٹی
و
الف لیلوی
قلعہ

سواری کے لیے گھوڑا ٹرام، پرانی وضع کی کاریں، اور دو منزلہ بسیں، پرانے ماڈل کا ٹن ٹن کرتا ہوا فائر انجن ـــــ گویا سبھی کچھ۔ بازار کے اختتام پر سلیپنگ بیوٹی کا الف لیلوی قلعہ آپ کو اپنی طرف بلاتا نظر آتا ہے۔ آپ کے سواگت کے لیے ڈسنی دنیا کے مشہور کردار مکی ماؤس، ڈونلڈ ڈک، گوفی، دیگر ساتھیوں کے ہمراہ اپنے اپنے انداز میں ٹہلتے، کودتے نظر آئیں گے وہ آپ کے بچوں سے آپ سے اشاروں میں ہنسی مذاق کریں گے۔ آپ اُن کے ساتھ اپنی تصویریں کھنچوائیں گے تاکہ ڈسنی لینڈ میں حاضری کے ثبوت میں اُنہیں بطور سند پیش کر سکیں۔ ایک الف لیلوی ماحول آپ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور آپ بچوں کے سے انداز میں ایک ہی ٹانگ پر ناچتے، ہاتھوں کو ہوا میں لہراتے، ان قدیمی سواریوں کا رُخ کرتے ہیں اور یہ ڈسنی کردار آپ کے بچوں کی اُنگلی پکڑے آپ کی منتخبہ گھوڑا ٹرام میں آپ کے ساتھ بٹھا دیتے ہیں اور کوئی اسٹیشن حیرت اور ترنگ کے عالم میں پکار اُٹھتا ہے۔ "ماما! چاکلیٹ! مکی ماؤس نے دیا!" اور وہ اس نادر خزانے کو کوہ نور کا ہیرا سمجھتے ہوئے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں محفوظ کر لیتا ہے!

امریکہ کے اس تاریخی بازار کے دونوں طرف دکانیں، ریستوراں وغیرہ بالکل اس طرح سے بنے ہوئے ہیں جیسے آپ درحقیقت سو سال ماضی میں لوٹ گئے ہوں۔ بے فکری کے اس ماحول میں آپ خود کو بھی اسی فضا کا ایک حصہ محسوس کرتے ہیں۔

قدیم زمانے سے سات کا ہندسہ کراماتی اور پُراسرار مانا جاتا رہا ہے۔ ڈسنی لینڈ بھی شاید اسی روایت کے مطابق سات حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ اس بازار کے علاوہ دوسرے حصے ہیں: طلسمی دیش، کل کی دنیا، سرحدی دیش، مہم جوئی کا دیش، نیو آرلینز اسکوئر اور "جوکھم دیش"۔ یہ ساتوں حصے ہر بچے کے تخیل کو پر لگا کر اُڑنے پر اُکسا سکتے ہیں۔ ان میں دیش بھگتی ہے، مہم جوئی کا جذبہ بھی، دلجوئی اور تفریح کے سامان اور آئندہ کل کی جھانکی بھی! یہ سبھی عناصر بچے کی مکمل تربیت کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

والٹ ڈسنی (Walt Disney) کا نام کارٹون فلموں سے جُڑا ہوا ہے۔ اس شخص نے بچوں کے ادب کی مشہور حکایتوں پر فلمیں بنائیں۔ "سنو وائٹ اور سات بونے"، "الائس ان ونڈر لینڈ"، "کنگ آرتھر اینڈ ہز کورٹ" اور نہ جانے کتنی ہی ایسی فلموں کو بچوں کی دلجوئی اور تفریح کے لیے بنایا۔ اُس نے حیوانی دنیا کے کئی کرداروں کو جنم دے کر انہیں زندہ جاوید کر دیا۔ مکی ماؤس، ڈونلڈ ڈک، گوفی وغیرہ وہ کردار ہیں، جن سے دنیا کے ہر کونے کے بچے واقف ہیں۔ اُپج اور تخلیق کے جذبات نے اُسے کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ بچوں کے روایتی جھولوں اور دوسرے کھیلوں کے علاوہ اُن کے دل بہلاوے کے لیے کئی نئے نئے سامان مہیا کئے جا سکتے ہیں۔ اور پھر، ۱۷ جولائی ۱۹۵۵ء کو ساٹھ ایکڑ زمین پر ان انوکھے خیالات نے ڈسنی لینڈ کا عملی روپ اختیار کیا۔ کچھ ہی برسوں کے بعد امریکہ کے مشرقی ساحل پر فلوریڈا میں اس سے بہت کچھ ملتا جلتا ۲۸۰۰۰ ایکڑ میں ڈسنی ورلڈ (Disney World) اور پھر امریکہ سے باہر جاپان میں "ٹوکیو ڈسنی لینڈ" بنا۔ یہ تینوں مرکز دنیا بھر کے بچوں کی تفریح، تعلیم اور جذبہ تجسس کی تشویش اور تکمیل کی یادگار اور مثالی نمونے قرار دیے جا چکے ہیں۔

اور اب تو اپنے دیش میں بھی سرکار اور کچھ صنعتی ادارے اس قسم کی سہولیات مہیا کرنے کے بارے میں نہایت سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں ــــ حال ہی میں دہلی کی نمائش گاہ پرگتی میدان میں واقع "اپو گھر" اسی سلسلے میں ایک چھوٹا ہی سہی لیکن اہم قدم ہے۔

ڈسنی لینڈ میں بچوں کو امریکہ [illegible] امریکی تہذیبی ورثہ سے جگہ جگہ واقفیت [illegible] ہے۔ ایک جگہ جنگل کے مختلف کرداروں کی [illegible] امریکہ کے پرانے لوک گیت سنوائے جاتے ہیں [illegible] شو میں آپ ایک آڈیٹوریم میں بیٹھ جاتے ہیں [illegible] روشنیوں سے نہائی اسٹیج پر شیر، بندر، بھا[illegible] آپ یہ گیت سنتے ہیں۔ روشنیاں بجھ جاتی اور آڈیٹوریم کا آڈیٹوریم اس گول اسٹیج [illegible] چوتھائی حصے میں گھوم جاتا ہے۔ آپ کے سا[illegible] ایک دوسرا سین ہے اور نئے جنگلی کردار گ[illegible] اور موسیقی پھر شروع ہو جاتے ہیں۔ کچھ اور گیت سننے کے بعد آپ کا آڈیٹوریم پھر گھوم جاتا۔ حتیٰ کہ آپ کا آڈیٹوریم اسٹیج کا چکر لگا کر وہیں پہنچ جاتا ہے، جہاں سے آپ کا سفر شروع ہوا تھا۔ اس طرح ایک ہی وقت میں چار روح[illegible] میں لوگ کوئی نہ کوئی سین دیکھ رہے ہوتے ہیں [illegible] آڈیٹوریم میں آنے اور باہر جانے والوں کا [illegible] ہر دس منٹ کے بعد پھر شروع ہو جاتا ہے۔ گیت عموماً سامعین کو یاد ہوتے ہیں اور وہ زبان میں اُنہیں گنگناتے رہتے ہیں۔ اُنہیں [illegible] طرح سے مل کر گانا بہت اچھا لگتا ہے۔ قومی و[illegible] میں شرکت کا احساس لوگوں کو اور قریب لے [illegible] ہے۔

اسی طرح پُرانے بیڑوں میں سوار آپ ا[illegible] کی مختلف ندیوں اور دریاؤں کی سیر کرتے ہیں۔ ان جنگلوں اور ندیوں میں گزرتے ہوئے ویسے محسوس کرتے ہیں جیسے امریکی آباو اجداد نے [illegible] ہوگا۔ مشہور امریکی مزاح نگار مارک ٹوین (Mark Twain) جس کا اپنا بچپن [illegible] ان دریاؤں اور جنگلوں میں گزرتے تھے ایک [illegible] اور قدیم کشتی میں آپ کا ساتھ دیتا معلوم ہو[illegible] آپ کو محسوس ہوتا ہے آپ اپنا [illegible] جوکھم دیش میں آپ [illegible] جنگل کی سیر کے لیے [illegible]

گائیڈ آپ کو ان پر اسرار جنگلوں اور وہاں
ے جانے والے جانوروں کی رونگٹے کھڑے کر دینے
ے انداز میں روداد بیان کرتا ہے ۔ اور پھر
راہِ مذاق ) آپ کو قسم دلواتا ہے کہ اگر یہ
ت ناک سفر خیریت سے طے ہو گیا' تو تمام
افر گائیڈ کو بیس ڈالر فی کس انعام دیں گے ۔ اس
رمیں میں جنگلوں میں پائے جانے والے قریب قریب
ی جانور ملے ۔ چنگھاڑتے ہوئے ہاتھی ، گرجتے
ر ، چھلانگیں مارتے ہرن ، درختوں سے لٹکے
نکارتے اژدہے ، نہاتے ہوئے گینڈے اور
رمیں جیتی و ہیل مچھلی اور خون خوار شارک مچھلی
یہ ہمارے گائیڈ نے بندوق کا نشانہ لگا کر
ل کر دیا ۔ یہ الیکٹرانک آلوں کا کمال تھا کہ
ز اور پلاسٹک سے بنے یہ جانور ربوٹ کے
بچنے سے پہلے ہی حرکت کرنے لگتے اور اُن کی
یپ شدہ آوازیں عین موقع پر گونج اٹھتیں۔
یل کا دل دہلا دینے والا حملہ بھی اسی پروگرام کی
ب کر دی تھی ۔ سچ پوچھیے تو ہم سب مسافر تو
م گئے تھے ۔ اور چھوٹے بچے بے اختیار چلا اُٹھے
تھے ۔ ایک بار تو ہم سب کو یقین ہو گیا تھا کہ
ائیڈ نے سلامتی سے سفر طے ہونے کے بیس ڈالر
یے کار نہیں مانگے تھے ۔

اس ڈر اور ہراس کا مداوا قریب کے
خوب صورت ہال میں ایک شو میں رنگ برنگی
پا ں ، پھول پر منڈلاتے بھنورے اور خوشی
جھومتے رنگین پرندوں نے گا کر کیا اور اس
مزا یہ کہ اس باغ میں لگے ہوئے فوّارے کبھی
بک کر ، کبھی بڑھ کر اور کبھی لہلہاتے ہوئے
کا ساتھ دے رہے تھے ۔ بہت ہی یادگار
ا رہا تھا ۔ متحرک گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے ہم
الائس (Alice) جادوئی دنیا ، سنو وائٹ
شاہ آرتھر کے پرستانی قلعوں میں اُن کی خوش
قتوں کو محسوس کیا ۔ اُڑتے ، جھکے ، کاٹتے پیالی
میں بیٹھ کر اپنا ۔ ہوا میں معلق اُڑتے ہوئے ہاتھی

جنگل کی سیر ـــــــ جہاں طرح طرح کے جانور آپ پر جھپٹنے کے لیے تیار ہیں

جہازوں کی سواری کی ۔ کلیجہ مونہہ کو آنے والے
رولر کوسٹر میں بیٹھ کر پہاڑوں ، وادیوں' ندی '
نالوں کو عبور کرتے ہوئے دم بھر میں بلندیوں اور

اور دم بھر میں عمیق غاروں میں سے گزر کر اس
برف زاد آدمی (Abominel Snowmen)
سے ایک اچھتی ملاقات بھی کی' جو عام لوگوں کے

ڈھلکتی ، گھومتی ، طشتریوں' پیالیوں میں بیٹھ کر سیر

'نصیب' میں نہیں ہے۔ راکٹوں میں اُڑ کر فضائی وسعتوں سے آنے والی کل کی دنیا کا نظارہ بھی کیا جہاں خلا میں عن قریب بستیاں آباد ہوں گی — آب دوز کشتیوں میں بیٹھ کر سمندر کے سینے میں مدفن رازوں سے بھی واقفیت حاصل کی۔ گزشتہ کل کے غرق شدہ اٹلانٹا براعظم اور اُن سمندری مچھلیوں اور جانوروں کا بھی نظارہ کیا، جو سطح آب پر شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے ہیں۔ سمندر کے نیچے اُن معدنیات اور پہاڑوں کو بھی دیکھا جو کسی آئندہ کل میں انسانی کاوشوں کا انتظار کر رہے ہیں اور جن پر ہماری آئندہ نسلوں کی زندگی کا دارومدار ہوگا۔ بلندیوں پر کیبل کار...... (Cable-Car) سے ڈسنی لینڈ کی مخلوق کا جائزہ لیا اور صرف ایک لائن پر چلنے والی گاڑی کی سیاحت بھی کی۔

'طلسمی دیش' میں ایک نہایت ہی حسین الف لیلوی قلعہ نما عمارت ہے، جس کے گیٹ میں ہر گھنٹہ بجنے سے پہلے کچھ سپاہی بینڈ سمیت برآمد ہوتے ہیں اور گھنٹہ بجانے کے بعد واپس اندر چلے جاتے ہیں۔ بارہ بجے چونکہ گھنٹہ بجنے کا طویل ترعمل ہوتا ہے، لہٰذا سیاحوں کا ایک سیلاب اس کو دیکھنے کے لیے اُمڈ پڑتا ہے۔ وقت سے دو منٹ پہلے زرق برق پوشاکیں پہنے سپاہیوں کا دستہ باہر نکلتا ہے۔ ایک نہایت ہی خوبصورت دُھن پر یہ سپاہی مارچ کرتے رہتے ہیں۔ اکثر لوگ اس دُھن کو ٹیپ کر لیتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا اشتیاق ہی رہا کیوں کہ ہمارے پاس کوئی ٹیپ ریکارڈر موجود نہ تھا۔

کچھ اسی سے ملتا جلتا عمل اپنے ہاں حیدرآباد کے مشہور سالار جنگ میوزیم میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ جہاں کلاک کی کھڑکی میں سے ایک آدمی باہر نکل کر گھڑیال پر ضربیں لگاتا ہے، لیکن یہاں وقت کے اس ہنگامے کے ساتھ ایک اور شو بھی منسلک ہے — ان دونوں دلچسپیوں کا مشترکہ مقام... It's a small small world ہے۔

کچھ سیڑھیاں اُتر کر آپ ایک نہر میں ایک موٹر کشتی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ لہراتی نہر جگمگاتے غاروں میں سے گزرتی ہے۔ جس کی دیواروں پر مختلف دیشوں کے بچّوں کی اپنی دنیا سجی ہے۔ کہیں آسٹریلین بچے کنگروسے کھیل رہے ہیں۔ تو کہیں چینی بچے کسی پیگوڈا کے سامنے۔ ہر دیش اپنی مخصوص عمارتوں، جانوروں اور روایتوں کی رُو سے آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ بھارت کے گُڑیا نُما بچّوں کے پس منظر میں تاج محل ہے۔ عرب کے بچّوں کے پیچھے اونٹ وغیرہ۔ اس شو کا مرکزی خیال ہے کہ دنیا کا کوئی بھی گوشہ ہو، بچے انسانی [illegible] کا ثبوت ہیں۔ اس بیس منٹ کی سیر میں آپ [illegible] دیش کے بچّوں سے ملاقات کر لیتے ہیں۔

عجیب و غریب اور پیارا سا شو ڈسنی لینڈ کی امتیازی دلچسپیوں میں سے ہے۔ اس [illegible] میں بجنے والی دُھنیں اکثر بچّوں کی نرسری رائمز (Nursery Rhymes) سے ملتی ہیں۔ آپ بچّوں کو ان دُھنوں پر گنگناتے گاتے اور ان ملکوتی نظاروں کو آنکھوں [illegible] سموتے دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے ان بیس منٹوں میں پورا ٣٦ فلموں کا رول ختم کر [illegible] لیکن پھر بھی بہت سے نظارے کیمرے کی آنکھ سے چھوٹ گئے۔ حسرت رہی کہ ہاتھ میں مووی کیمرہ ہوتا یا کم سے کم ایک فلیش سے لیس کیمرہ ہوتا تو شاید یہ تمام مناظر قلم بند ہو سکتے۔ [illegible] دوبارہ کشتی میں چکر لگانے سے بھی یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا، لیکن شیطان کی آنت کی طرح [illegible] قطاروں کو منتظر دیکھ کر حوصلے کا پست ہو جانا لازمی تھا۔

ایک حیارت ہم نے بھوتوں کے بسیرے

(Haunted Mansion) میں جانے لگی تھی۔
اس کے سامنے بھی بہت ملبا پیو لگا ہوا تھا
چونکہ اشیش کا ڈر جانا لازمی تھا لہٰذا اُسے اور
اس کی ماما کو ہم نے آئس کریم اور پاپ کارن کے
اسٹال کے حوالے کیا اور باقی 'قافلہ' اس لائن میں
لگ گیا۔ اس پُراسرار عمارت میں ہمارا داخلہ ایک
سجے سجائے کمرے میں ہوا، جہاں دیواروں پر قدِ آدم
تصویریں آویزاں تھیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے
ان تصویروں کے کئی کردار حرکت میں آ گئے۔ کسی
نے دھیرے سے منہ موڑ لیا۔ کوئی تیزی سے آنکھیں
جھپکنے لگا۔ اور کوئی قہر آلود نظروں سے ہم کو گھورنے
لگا۔ کوئی نہیں کوئی دیوار (نہ جانے یہ کسی تماشائی
کی تھی یا کمپیوٹر کنٹرول آلے کی) اور پھر فرش دھیرے
دھیرے بیٹھنے لگا۔ یہاں سے جان چھٹی تو دوسرے
کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں پر خفیف سی
روشنی میں بوسیدہ فرنیچر، مکڑی کے جالے صاف
دکھائی دے رہے تھے۔ دُور آتش دان میں آگ
کی لپٹیں پُراسرار طریقے سے جلتی بجھتی معلوم ہو رہی
تھی۔ یک دم جلتی مشعل کی لَو ایک مکار چہرے
پر پڑتی ہے، جس کے ہاتھ میں ایک اٹھا ہوا کلہاڑا
تھا، اس کے تیور سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ جان
مشکل سے بچے گی۔ دروازوں کی چرچراہٹ، دلوں
کو دہلا دینے والی چیخیں، کراہتی موسیقی، خاموشی
کے پُراسرار وقفے، جلتی بجھتی یا دھیمی سی روشنیاں
ڈراؤنے، مکار، جرائم پیشہ چہرے، جن کی کوئی
غیر متوقع حرکت آپ کے رونگٹے کھڑے کر دینے کے
لیے کافی تھی۔ سب سے زیادہ ہوش اڑانے والا
وہ آخری حصہ تھا۔ جہاں ایک صوفہ نما ٹرالی
میں [illegible] اندھیری [illegible] گردشوں میں کبھی تیز اور
[illegible] رفتار سے سفر کرتے ہیں۔ دیواروں پر
[illegible] آپ کو آئینہ
[illegible] محسوس ہوتا ہے
[illegible] آپ کے
ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا ہے۔ آپ کی

گھگھی بندھ جاتی ہے۔ ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں۔
بھلا بھوت بھی کبھی ہڈی پنجر کا ہوا ہے؟ وہ تو
ایک رُوح ہے! ایک لمس ہے! جسے آپ کے
ہاتھ محسوس کرنے سے قاصر ہیں۔ اور پھر اچانک
یہ ہالہ اسی طرح غائب ہو جاتا ہے جس طرح وہ
چپکے سے آپ کے پاس آ بیٹھا تھا۔ سامنے باہر نکلنے
والے راستے کی روشنی واضح ہوتی جا رہی ہے۔
آپ کی جان میں جان آ جاتی ہے۔ آپ شُکر
کرتے ہیں کہ آپ کو ان شیطانی آفتوں سے چھٹکارا
ملا۔

ڈسنی لینڈ کا ایک دستور ہے کہ وہ اپنے کسی
نہ کسی کردار کے اعزاز میں ہر دوپہر اور شام کو
ایک جلوس نکالتے ہیں۔ سال ۸۴ء میں ڈونلڈ
ڈک کی پچاسویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ بینڈ باجے
خوش نما جھانکیاں اور ناچتی گاتی لڑکیوں اور لڑکوں
کا یہ جلوس بہت ہی متاثر کُن ہے۔ کہیں کسی
جھانکی میں ایک بہت بڑا خوش نما کیک ہے۔
کہیں کہیں آئس کریم کی کون، کہیں رنگ دار
اونچی اونچی موم بتیاں اور کہیں ڈونلڈ ڈک
نہایت احترام کے ساتھ اپنے خیر اندیشوں کا
شکریہ ادا کر رہا ہے۔ جلوس کے ساتھ دوسرے
ممتاز ڈسنی کردار اپنے ساتھی کے اعزاز میں بڑے
بے تکلفانہ اور خلوص بھرے انداز میں جھومتے ناچتے
چلے جا رہے ہیں۔ جلوس کیا ہے پوری بارات
ہے۔ ہالی وُڈ کی شان و شوکت، ٹھاٹ اور
نمائشی صلاحیتوں کا آئینہ دار یہ ڈسنی کردار بچوں کو
فینسی ٹوپیاں، نمائشی کھلونے اور ٹافیاں بانٹتے
چلے جا رہے ہیں۔ اور انہیں اس جلوس میں شرکت
کی دعوت دے رہے ہیں۔ بہت سے بچے جن میں
اشیش بھی شامل ہے، ترنگ میں آ کر ناچ رہے
ہیں۔ کچھ بچے جلوس میں شامل بھی ہو جاتے ہیں۔
لیکن ان کے ماں باپ انہیں کھینچ کھینچ کر واپس لے
آتے ہیں تاکہ وہ کہیں کھو نہ جائیں۔
رات ہوتے ہی آتش بازی کا پروگرام شروع
ہو جاتا ہے۔ ہلکے دھماکوں کے درمیان آسمان کے
سینے پر رنگ برنگی لکیریں اور طرح طرح کے حسین و
رنگین نمونے اُبھرنے لگتے ہیں پھر آتش بازی کے پھولوں
کی جھڑی سے برسنے لگتی ہے اور پھر ایک دم
آسمان کی سطح پر درجنوں نقش و نگار اور بیل
بُوٹے ایک جال کی صورت میں بچھ جاتے ہیں۔ سحر زدہ
روشنیوں میں نہایا آسمان جگمگاتی گاڑیاں، راکٹ
جھولے، ہنڈولے، جادوئی محلوں اور ان کی
عمارتوں کے برجوں، گنبدوں، فصیلوں اور
میناروں کو روشن کرتا انہیں ایک پرستان بنا
دیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈسنی لینڈ پیار کی محنت
ہے، جو والٹ ڈسنی اور اس کے کئی ساتھیوں
نے بچوں کی تفریح و تربیت کے لیے صرف کی۔
ڈسنی لینڈ میں ہر سال نئے نئے کھیلوں اور دلچسپیوں
کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ڈسنی لینڈ کی مکمل شکل کیا
ہوگی۔ اس سوال کے جواب میں والٹ ڈسنی نے
کہا تھا "جب تک انسانی تخیل زندہ ہے، ڈسنی
لینڈ کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔"

ڈسنی لینڈ دیکھتے دیکھتے رات کے بارہ بج
چکے تھے، لیکن اشیش کا جوش و خروش اسی طرح
قائم تھا، لیکن جوں ہی ہم نے اُسے کار میں بٹھایا
وہ فوراً نیند کی گود میں لڑھک گیا۔

یوں تو ہم سب نے ڈسنی لینڈ کا پورا لطف
اٹھایا تھا، لیکن میں ایک بچے کا — جس کے لیے
ہی ڈسنی لینڈ بنایا گیا تھا، ردِ عمل جاننے کے لیے
بے قرار تھا۔ میں نے اگلے روز اشیش سے پوچھا
"ڈسنی لینڈ کے کرداروں، کھیلوں اور دلچسپیوں
میں اُسے سب سے زیادہ کیا پسند آیا تھا۔"
اس کا جواب تھا "ڈسنی لینڈ!"
یہ اس طرح کا شاطرانہ جواب تھا جیسا ایک
دوست سے سوال کرنے پر مجھے ملا تھا، میں نے اس
سے پوچھا تھا کہ لڑکیوں کے لباس میں سب سے
زیادہ کیا پسند تھا؟"
اس کا جواب تھا، "لڑکیاں!" ●●

شروَن کمار ورما

# سول لائنز

دینو دھوبی کی گھروالی موتیا بازسنگھ گرلھوالی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس گرماگرم خبر نے ٹھنڈے کمرے والے پرانے، پیلے بنگلوں میں حرارت پیدا کر دی تھی اور اُن کے برآمدوں میں اور لانز پر ابابیل کی طرح اُڑتی پھرتی تھی۔ ستانے بیٹھتی تو پھر اُڑا دی جاتی۔

اس ابابیل کو سب سے پہلے مسز رنجنا پاریکھ نے پکڑا تھا۔ اُس کے دھڑکتے دل کی گرمی نے رنجنا کو بڑا مزا دیا تھا۔ وہ اُنگلیاں جو اُون اور سلائیوں میں اُلجھی رہتی تھیں اور جنہیں دیکھ کر گوکل پانڈے نے کہا تھا "یہ اُنگلیاں نہیں رقاصائیں ہیں"——

تب لان میں بکھری سنہری دھوپ رنجنا کے لہو میں گھُل گئی تھی اور نشہ بن کر اُس کی بھنوراسی آنکھوں میں گنگنانے لگی تھی۔ مسٹر پاریکھ کے ہاتھ کی پیالی لبوں سے کچھ فاصلے پر رُک گئی تھی، اُس کی آنکھوں میں سورج بھری دوپہر کو ہی ڈوب گیا تھا۔ رنجنا نے اُن اُداس آنکھوں میں پھیلتا ہوا اندھیرا دیکھ لیا تھا۔ اور مسکرا کر گوکل پانڈے کو سمجھایا تھا۔ یہ حق صرف میرے خاوند کو ہے۔ گوکل پانڈے ایسے الفاظ اور مسکراہٹ کا فرق سمجھتا تھا۔ اس لیے ہنس دیا۔ مسٹر پاریکھ کے لبوں پر لپٹن چائے کی گرمی اور ذائقہ دوبارہ جی اُٹھا۔

ہوا یوں تھا کہ گھر میں کام کرنے والی مائی صبح صبح دینو کے گھر سے مسٹر پاریکھ کی قمیض پتلون لینے گئی۔ اور خالی ہاتھ اور پھٹی آنکھیں لیے اُلٹے پاؤں یوں بھاگی آئی، جیسے کوئی نہایت ہی شرمناک چیز دیکھ کر آئی ہو۔ کچھ دو منٹ تو اُسے سانس ٹھکانے لانے میں لگے، جب بات کرنے کے قابل ہوئی تو ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی:

"بی بی جی' دینو تو بولتا ہی نہیں، آنکھیں بھی نہیں کھولتا!"

رنجنا نے دینو کو کھانستے، بلغم تھوکتے اور دیر تک ہانپتے کئی بار دیکھا تھا۔ بالکل مسٹر نگم کی موٹر کی طرح، جسے گیئر بدل بدل کر پل چڑھانا پڑتا تھا۔ وہ موٹر تو ایسی مستری کے ہاں گئی کہ پھر واپس نہ آئی۔ اُسے شک ہوا کہ دینو کہیں "ٹیں" نہ بول گیا ہو۔ اُسے ایک دم صاحب کے قیمتی کپڑوں کا خیال آیا۔ دھوبی تو روز مرتے ہیں، لیکن امپورٹیڈ سلک شرٹ اور پتلون۔ چائے کا آخری گھونٹ حلق میں اُتار کر وہ برآمدے میں پہنچی گویا اُٹھا کر مکرجی بابو نے گیراج کی طرف دیکھا —— سناٹا چھایا تھا گیراج کے عین اوپر ایک چیل دائرے میں اُڑ رہی تھی۔ رنجنا ڈر گئی اور تیزی سے لان پار کر کے گیراج کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

ستی خالی تھی۔ استری ٹھنڈی اور دینو دیوار سے پیٹھ لگائے ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ آنکھیں بند، گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی۔ کالا، سوکھا، مریل سا دینو اسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔ موتیا کو دیکھ کر وہ سوچا کرتی۔ یہ رس بھری اس کھوسڑے پر! موتیا تھی جیسے باڑھ پر آئی ہو، کناروں سے ہی نکلی جاتی تھی۔ گوکل پانڈے کہتا تھا "یہ کالونی کو ڈبوئے گی"۔

"دینو" رنجنا نے ہمدردی اور دُکھ بھری آواز میں پکارا:

دینو نے چپچپاتی، بجھی سی آنکھیں کھول دیں۔ گھٹنوں سے اُٹھی دھوتی کو کھینچ کر ٹخنے تک درست کیا۔ رنجنا کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھا اور چہرہ چھپا رو دیا۔ رنجنا کو یہ عجیب سا لگا۔ پچاس سے اوپر کا، دنیا دیکھا مرد یوں رونے لگے تو پھر کچھ بہت برا ہوا ہے۔

"سب کچھ لے گئی سالی"۔ دینو نے پتا بھید کے بتایا۔

"کون کیا لے گئی"۔ رنجنا سب کچھ اس سے سننا چاہتی تھی۔

"موتیا بھاگ گئی سرکار"۔ دینو نے [illegible] طرح کہا [illegible] کپڑے اور چاندی [illegible] [illegible]

○ ۱۱/۱۸۰، کوچہ لمبھاں، امرتسر ۱۴۳۰۰۶

اور دلچسپ کہانی کا ناس مار دیا تھا، خبر بنا کر رکھ دیا تھا۔ نیلما سنجیدگی سے بولی۔

"کب کس کے ساتھ؟"

"رات دوا کے ساتھ حرام جادی نے مجھے کچھ پلا دیا۔ ہوش ہی نہیں رہا۔ اُس گڑھوالی چھوکرے کے ساتھ بھاگ گئی۔"

"وہ تو اس سے عمر میں دو تین سال چھوٹا ہوگا۔" رنجنا نے مسکرا کر کہا۔ پھر دونوں کے بارے میں سوچا ——— لگا، کوئی مہکا سا، خوش گوار جھونکا اُسے چھوتا ہوا گزر گیا ہے۔ اس کے سامنے جوان، مسکراتی ہوئی موتیا، سڈول اور ملائم بدن لیے آ گئی۔ اُس کے ساتھ تھا ناٹے قد، مگر مضبوط ہاتھ پاؤں اور گٹھے جسم والا خوش شکل بازسنگھ ——— بے فکر کبوتروں کے جوڑے کی طرح غٹرغوں کرتے ہوئے۔

"بڑی کمینی نکلی ———" پتہ نہیں یہ گالی تھی کہ شاباشی۔ "صاحب کے کپڑے؟"

"اندر دیکھ لوجی۔" دیوو نے پھر آنکھیں مُوند لیں۔

وہ لپکتی اندر چلی گئی۔ اس قمیض پتلون پر پورے دو سو روپے خرچ ہوئے تھے۔ اور موتیا کے فرار ہو جانے کے غم میں یہ نقصان تو برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گیراج جو کبھی موتیا کے چہکتے مہکتے وجود سے بھرا بھرا اور روشن روشن رہتا تھا، اب اُداس اور خالی تھا۔ سارے میں گھٹیا دیسی صابن، بلیچنگ پوڈر اور میلے کپڑوں کی بُو پھیلی تھی۔ بانس کی ڈھیلی چارپائی پر کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ فرش پر ٹرنک کھلا پڑا تھا، جیسے جلدی میں کھنگالا گیا تھا۔ کونے میں المونیم کے جھوٹے برتن بکھرے تھے۔ ایک مچھلی رہ گئی تھی۔ کم بخت جانے سے پہلے کھانا پکا کر لے گئی تھی ——— رنجنا مسکرا دی۔ اُس نے جلدی جلدی کپڑوں میں ہاتھ مارا اور قمیض پتلون برآمد کر لی۔

باہر آنے لگی تو کیل سے لٹکا لہنگا جیسے جی اُٹھا۔ یہ لہنگا موتیا اکثر پہنا کرتی تھی۔ جب وہ اس میں بھری بھری تو لگتی کی ساری ہی کچھا اور ہوتی جیسے باتیں کرنے لگتا ——— پھر جیسے سچ مچ موتیا لہنگے میں بھر گئی۔ اور چھما چھم بجا بجا کر مسکرانے لگی۔ سانولا گول چہرہ، چکنی مضبوط پنڈلیاں، ستارہ آنکھیں اور کسی ہوئی کمر اس مردود کمر نے کالونی کی گریجویٹ بیویوں کو خاصا پریشان کر رکھا تھا۔ مچھلی کی ساری چکناہٹ اور چمک اُس کے بدن پر پھیل گئی تھی۔ مدن جوگی بطخ کی طرح تیرتی چلتی تو رنجنا کا دھیان جاسوسی ناول تک سے ہٹ کر اپنی کمر کی طرف چلا جاتا ——— عجیب بات تھی ——— منوہر پاریکھ نے چار برسوں میں اُسے ایک بچہ بھی نہیں دیا تھا پھر بھی یہ کمر یوں پھیل گئی تھی جیسے برساتی گھاس ——— منوہر پاریکھ پوری سنجیدگی اور ذمہ داری سے کہتا ——— "اس میں میرا کیا قصور ہے۔ یہ کمر کا پھیلاؤ تمہیں اپنی نانی اور ماں سے ورثے میں ملا ہے ——— یہ تو وہ جانتی مانتی تھی۔ لیکن اُس کے نانا اور باپ نے گھر کے آنگن بچوں سے بھر دئے تھے اور یہ منوہر ——— سب کچھ ہوتا ہوا بھی کہیں سے خالی تھا ——— موتیا کی کمر نے اُسے سخت بیزار کر رکھا تھا۔ اور وہ جاندار کولھے۔ گیلی مٹی پر چلتی تو ایڑیوں کے نشان گہرے پڑتے۔

منوہر پاریکھ کو یہی سمجھ نہیں آتا تھا کہ سوکھی کھیچی ٹانگوں والا دیوو یہ سانولا آبشار کیسے سنبھالے گا۔ منوہر کیا، یہ تو اس کالونی کا ہی مسئلہ بن گیا تھا ——— تمام صاحب لوگ رتی اور وہسکی پر یہی معمہ حل کرتے، انعام کسی کو نہیں ملا تھا۔ کالونی کی دیسی میموں کو ایک ہی دُکھ کھائے جا رہا تھا کہ کمبخت کی کمر ایک ملی میٹر بھی نہیں بڑھی تھی۔ گوکل پانڈے کا خیال تھا کہ سرکار کو قیمتوں کی روک تھام کے سلسلے میں موتیا سے رجوع کرنا چاہیے ——— اکثر اس کی بے حوڑ کمر کی وجہ سے کالونی کے بنگلوں میں مہابھارت بھی ہو جاتا۔ بیویاں تلملا کر خاوندوں کی پھسلتی، بے ایمان نگاہیں دیکھتیں اور دھمکا کرتیں کہ وہ میکے چلی جائیں گی۔ صاحب لوگ خوشی خوشی اُنہیں ریلوے اسٹیشن تک پہنچاتے اور خالص ولایتی طریقے سے "سی آف" کرنے کو تیار رہو جاتے۔ یہاں تک کہ پیکنگ میں ان کا ہاتھ بٹاتے۔ تب ان دُوراندیش بیویوں کو گھر والوں کے پیٹ اور صحت کا ایسا بھیانک خیال آتا کہ ارادہ بدل کر صرف رونے پر اکتفا کرتیں۔

موتیا چھپاک سے غائب ہو گئی۔ پچکے، بدبو لہنگے کو کیل سے خالی لٹکتا چھوڑ کر رنجنا باہر آ گئی اب وہ دیوو اور اُس کے دُکھ کو بھول چکی تھی۔ بس کسی کو فوراً یہ خبر سنانا چاہتی تھی۔ اس لیے مکرجی بابو کے لان سے گزرتے ہوتے اُسے کھانسی آ گئی۔

مکرجی بابو اور اُن کی دھرم پتنی کھڑکی میں آ گئے۔

"سردی لگ گئی؟" مسز مکرجی نے بدلتے موسم کے لحاظ سے پوچھا۔

"نہیں ——— موتیا بھاگ گئی۔ بازسنگھ کے ساتھ۔"

"کیسے ———" مکرجی بابو پائپ سلگانا بھول گئے۔

"ام کو مالم تھا۔ موتیا ایک روج جرور بھاگے گا۔" مسز مکرجی بولیں۔

"تم اپنا جُبان بند کرو۔" مکرجی بابو سنجیدہ ہو رہے تھے۔ "بوہوت سیریس میٹر ہے اور تم رنجنا جی میٹنگ بلاؤ۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ ام لوگ آ جائیں گے۔" مسٹر مکرجی نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔

"دیدی، تمہارا ہاؤس میں ٹھیک رہے گا۔" رنجنا پھنسنا نہیں چاہتی تھی۔

"امارا گھور میں؟ نئیں بابا۔ ام پاسبل۔ ادھر امارا نا ورا ن لا آیا ہے۔ اس کا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پچھلا میٹنگ بھی ادھر ہوا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہمارے ہاں ہو جائے گی۔" رنجنا نے بات ختم کر دی۔ "گیارہ اور ایک کے بیچ۔ شام چار بجے کی ٹرین سے مسٹر پاریکھ کو جانا ہے۔"

"ام سب کو بول دے گا۔"

ناشتے کے بعد چو سات جوڑے رنجنا پاریکھ کے ڈرائنگ روم میں جمع ہوگئے۔ گوکل پانڈے چونکہ غیر شادی شدہ تھا، اس لیے سب سے آخر میں آیا اور کھڑکی کی سل پر بے فکری سے بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں مور کا پر تھا۔ عورتیں باتوں میں محو تھیں۔ مکرجی بابو پریشان تھے۔

"مسٹر بھنڈاری' آپ وہ کرنے والی ٹیوب لائٹ کیوں نہیں لگواتے ـــ" رانا نے کہا' وہاں گڑھا ہے۔ رات بے رات آنے والے۔ ابھی اس شام ـــ"

"آپ رات بے رات اُدھر کیا کرنے جاتے ہیں۔" شرما نے چوٹ کی "اب تو وہ ہار سنگھار کا پیڑ بھی سوکھ چکا ہے۔"

بھنڈاری انکم ٹیکس افسر ہے۔ اس کے ملنے والے اندھیرا کرکے ہی آتے ہیں۔"

"یہ اندھیرا کرکے' خوب ہے' مکرر۔"

"جناب' یہ مشاعرہ نہیں ہے۔ ہم ایک نہایت اہم اور سنجیدہ معاملے پر غور کرنے کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔"

"یہ اہم اور سنجیدہ معاملہ کیا ہے؟"

"موتیا باز سنگھ کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔"

"اس میں امارا کوئی دوش نہیں ہے۔"

مکرجی بابو کا پائپ بار بار بجھ رہا تھا۔ "ام نے تو دینو کو گیراج' آپ سب کے کمفرٹ کے لیے کرایہ پہ دیا تھا۔" "یہ کب اور کیسے ہوا؟" مسز شرما کانچی پورم ساڑی بھول گئی۔

"ام اُسے نکال دے گا۔"

"وہ تو نکل گئی۔" بھنڈاری بولا۔

"رنجنا' تم تھوڑا جاگنگ اور سائیکلنگ کیا کرو۔" مسز رانا نے کہا۔ "پیچھے سے ایک دم بھاری ہوگئی ہو۔"

"وہ ہینڈ لوم سینٹر والے کارپوریشن کی زمین پر بیٹھے ہیں۔" مسز بھنڈاری نے کہا۔ "مسز رنگا ناتھن تم اپنے ہزبینڈ سے بولو نا۔" مسز بھنڈاری کو سینٹر والے گہنے پر غصہ تھا۔ "بے ایمان نے ذرا رعایت نہیں کی۔ ایک دام پر اڑا رہا۔"

"کیا لوبیس گا جی۔ وہ چیئرمین کا سگے والا ہے۔"

مسز بھنڈاری بھی رنجنا کی کمر کے گرد ہوگئیں۔

"پلیز دھیان دیجیے۔" منوہر پاریکھ نے اونچی آواز میں کہا۔ "مجھے ٹرین پکڑنی ہے۔ آپ لوگ صرف آج کے ایجنڈے پر ہی بات کیجیے۔"

"وہی تو۔" مسز شرما نے آواز اونچی کی۔ "میں نے یہی تو پوچھا تھا، یہ سب کیسے اور کب ہوا۔"

"کوئی چشم دید گواہ ـــ" گوکل پانڈے کے ہاتھ میں اب تیتر کا پر تھا۔

"یہ مذاق نہیں۔ کالونی کی عزت کا معاملہ ہے۔" رانا نے زور دیا۔

"عزت سے آپ کی مراد اگر موتیا ہے تو وہ تو گئی۔" گوکل چہکا۔ "ساری کہانی بیان کی جائے۔"

"وہ تو موتیا اور باز سنگھ ہی بہتر بتا سکتے ہیں۔" گوکل نے کہا۔ "اور انہیں اس میٹنگ میں مدعو نہیں کیا گیا۔"

"یہ ہردوار یا متھرا کا گھاٹ نہیں ہے۔"

"آپ بتا دیں گے۔" گوکل نے ٹوکا۔

رنجنا نے گردن کو ہلکا سا خم دیا اور گوکل کو دیکھ کر ملائمت سے مسکرائی۔

"یہ اچھا نہیں ہوا۔" مسز چھینگانی کلب کا الیکشن لڑ رہی تھیں۔ "ہماری کالونی میں ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

موتیا کا کوئی خط تو نہیں پکڑا گیا باز سنگھ کے نام۔ مسز رانا کو یاد آگیا کہ مسز چھینگانی کی چھوٹی بھتیجی جو چھٹیوں میں یہاں آئی ہوئی تھی، کا پریم پتر پکڑا گیا تھا اور کہ وہ مسز چھینگانی کے خلاف کھڑی رہیں۔

"مسز پاریکھ' سب سے پہلے آپ کو اس کا علم ہوا۔ آپ ہی اس پر روشنی ڈالیے۔" بھنڈاری تماش بینی پر اُتر آیا تھا۔

اس بار گوکل کھڑکی سے کود کر رنجنا کے پاس آکھڑا ہوا اور وکیل کی طرح بولا۔ "مسز پاریکھ سے پہلے اس کا علم دینو کو ہوا تھا۔ اس کے بعد ان کے ہاں کام کرنے والی کو اور وہ کئی گھروں میں جاتی ہے۔ مسز پاریکھ کو صرف یہ اطلاع دینو سے ملی کہ موتیا باز سنگھ کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اور آپ کیا جاننا چاہتے ہیں؟"

"باز سنگھ بہت حرامی اور چالاک نکلا۔"

"مسٹر چھینگانی' آپ کا کیا خیال ہے۔ سیاست کا اونٹ اس مرتبہ کس کروٹ بیٹھے گا۔"

"ابھی دینو کے کھیت سے تو بچھڑا نکلا نہیں۔ آپ اونٹ بٹھانے لگے ہیں۔"

"نو پالیٹکس پلیز ـــ" شرما نے سختی سے کہا۔ "ہم سرکاری ملازم ہیں۔ ہمیں تو سیاست سے الگ رہنا چاہیے۔ ابھی تو موتیا کا مسئلہ۔"

"موتیا اور باز سنگھ دیکھنے تو شریف تھے۔"

"سوال یہ نہیں کہ شریف تھے یا بدمعاش۔ سوال کالونی کی ریپوٹیشن کا ہے۔ اگر یہ معاملہ پولیس میں گیا تو ہمارا کیا رول ہوگا ـــ کیوں مکرجی بابو ـــ"

"امارا کوئی دوش نہیں بابا۔" وہ بولے "ام نے آپ کے کمفرٹ کے لیے گیراج ـــ ام تو اس کو نکالنا مانگتا۔ ابھی' اسی سمے۔"

"کریم رول، مون بیکری کے اچھے ہوتے ہیں۔" پچھلی قطار میں بیٹھی مسز سکسینہ پہلی مرتبہ بولیں۔

"کریم رول کی نہیں، ہم اپنے رول کی بات کر رہے ہیں۔"

"موتیا ایک دم جوان چھوکری تھا اور دینو ـــ" مسز مکرجی بولیں۔

"آنکھیں تو ایسی چمک دار تھیں کہ۔"

"یہ کیس پولیس میں ہرگز نہیں جانا چاہیے۔"

"دینو غریب کے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں ہوں گے کہ پولیس دلچسپی سے تفتیش کر سکے۔"

"ابھی مجھے گاڑی پکڑنی ہے۔" منوہر پاریکھ نے کہا

"تو مسز سکسینہ آپ اس بارے میں کیا جانتی ہیں۔ باز سنگھ آپ کے ہاں کام کرتا تھا۔" بھنڈاری نے کہا۔ سکسینہ نے اُس کے خلاف رپورٹ لکھی تھی۔ سکسینہ ابھی تک خاموش تھا اور پچھلی قطار میں بیٹھا تھا کہ سے اپنی ترقی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بھنڈاری ہر میٹنگ میں اُسے زچ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ بظاہر مسکرا کر بولا۔

یہ باز سنگھ کا پرسنل معاملہ تھا اور نوکروں کے ذاتی معاملات مالکوں کی دخل اندازی سے باہر ہوا کرتے ہیں۔ آپ نے شاید کبھی نوکر نہیں رکھا۔

"ہم Human Dignity میں یقین رکھتے ہیں۔" مسز بھنڈاری نے کہا۔

"تبھی تو یہ اپنی ساس کو اپنے پاس رکھتی ہیں۔" مسز سکسینہ نے چوٹ کی۔

"کسی نے کبھی باز سنگھ اور موتیا کو ایک ساتھ تنہائی میں دیکھا تھا؟"

"وہ فلم کی شوٹنگ پر نہیں تھے۔" گوکل پانڈے کے ہاتھ میں اب طوطے کا پر تھا "اور اتنے بے وقوف بھی نہیں تھے کہ اپنی تنہائی کو Pollute کرتے۔"

"آپ کے ہاتھوں کے طوطے شاید اُڑ گئے ہیں۔" سکسینہ نے تیر چھوڑا

"جی، اور اب کمرے میں دیر سے ٹیں ٹیں کر رہے ہیں۔"

اس پر رنجنا کھلکھلا کر ہنس دی۔

"یہ سب کب اور کیسے ہوا؟" مسز شرما اپنے سوال پر اڑی تھیں۔

"مسٹر سکسینہ، جب آپ نے باز سنگھ کو نوکر رکھا تو کیا اُس کے تمام کوائف پولیس میں درج کرا دیے تھے۔ پولیس کمشنر نے بار بار لوگوں کی توجہ اِدھر دلائی ہے۔"

"میں نے سوچا اگر وہ ٹک گیا تو تمام ...... Formalities پوری کر دوں گا، لیکن وہ صرف اٹھارہ دن رہا۔"

"اٹھارہ دن تھوڑے نہیں ہوتے کئی ڈرامائی لڑائیاں لڑی گئیں اتنے دنوں میں۔ مہابھارت بھی ——" بھنڈاری نے کہا۔ "موتیا بھی آتی ہو گی کپڑے لینے دینے۔"

"میں میلے کپڑے نہیں سونگھتا پھرتا۔"

"خیر، کوئی تو اُسے لایا ہو گا آپ کے پاس۔ کون تھا وہ؟"

"وہ اکیلا آیا تھا۔" سکسینہ نے بتایا۔ "اس سے پیشتر وہ کمشنر صاحب کے ہاں کام کر چکا تھا۔ وہ سودا سلف چپراسی سے منگاتے تھے، اس لیے زیادہ دن وہاں ٹکا نہیں۔ وہ تو نوکر تھا۔ لوگ تو اپنی اولاد کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

سب جانتے تھے کہ سکسینہ کا بڑا لڑکا آوارہ تھا اور ایک عورت کا طلائی ہار اُتار کر بھاگتا ہوا پکڑا گیا تھا۔ سب نے مل کر معاملہ رفع دفع کرا دیا تھا۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ بھنڈاری پھر نہیں بولا۔

"ہم اس بحث سے ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں۔"

"اکثر میٹنگز کچھ ثابت کرنے یا کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے نہیں کی جاتیں۔" پانڈے کی آواز گونجی —— "ہم پڑھے لکھے لوگ ہیں بس گیٹ ٹو گیدر کا بہانہ چاہیے —— کیوں نہ ایک سب کمیٹی بنا دی جائے جو تمام تفصیلات ریکارڈ پر لے آئے۔" وہ مسکرایا۔ "میرے ذہن میں اس پرابلم کو لے کر کچھ سوال اُبھرے ہیں —— اجازت ہو تو عرض کر دوں۔" اس نے سب پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔ "پہلا سوال یہ ہے کہ دینو کو اس میٹنگ میں کیوں نہیں بلایا گیا۔ مسئلہ تو یہ اسی کا ہے۔"

"وہ جاہل گنوار کیا کرتا۔"

"کمال ہے۔ گھر دینو کا اُجڑا اور ——

خیر، دوسرا سوال یہ ہے کہ ہمارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ موتیا باز سنگھ کے ساتھ بھاگی ہے۔"

"واہ، وہ دونوں ہی غائب ہیں۔"

"شہر کے اور بھی بہت سے مرد عورتیں غائب ہو سکتے ہیں۔ کیا وہ سب فرار ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر لاما صاحب کا کُک بھی لاپتہ ہے۔"

"وہ لاپتہ نہیں ہے۔ میں نے اُسے برطرف کیا تھا۔"

"آپ بتائیں گے۔ اس وقت وہ کہاں ہے؟"

"جناب، یہ عدالت نہیں ہے۔" شرما نے کہا۔ "یہ بالکل غیر متعلق سوال ہے۔ دوسرے دینو خود کہتا ہے کہ موتیا ——"

"تو پھر دینو کو یہاں بلایا جائے۔" گوکل پانڈے نے زور دے کر کہا: "جس کی پرابلم ہے اُسے تو اعتماد میں لیا جانا چاہیے۔"

"وہ اس حالت میں نہیں ہے۔"

"تیسرا سوال یہ ہے کہ کس نے کب اور کہاں، ان دونوں کو ایک ساتھ یا بھاگتے دیکھا۔ ان کے ناجائز تعلقات کا علم اگر کسی کو تھا تو پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اور آخری بات یہ کہ موتیا بالغ تھی یا نابالغ؟"

"بالغ ——" کئی مردانہ آوازیں سنائی دیں۔

"اُس کے لچھن اچھے نہیں تھے۔" نسوانی آوازیں گونجیں۔

"لچھن سے مراد؟"

"میں سمجھتی ہوں مسٹر پانڈے اس میٹنگ کو سبوتاژ کرنا چاہتے ہیں۔" مسز شرما نے کھلی ہمت لگائی۔

"اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسی میٹنگ کر رہے ہیں جو مسز شرما کے خیال میں سبوتاژ ہو سکتی ہے۔ یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ موتیا باز سنگھ کے ساتھ بھاگی ہے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"یہی کہ ان میٹنگز سے کچھ نہیں ہو گا۔" پانڈے مسکرایا۔ "بوڑھے بیمار دینو نے موتیا کو پانچ سو روپے میں خریدا تھا۔ وہ اُس کی بیوی نہیں تھی۔ بالغ تھی،

ذن اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ۔ اور ہم کچھ کر نہیں سکتے۔"
"ہم تو اتنا چاہتے ہیں کہ معاملہ پولیس تک
اسئے ۔ کالونی کی عزت ـــ"
"دینو کو اس سے باز رکھنا چاہیئے۔"
"ہمارا گیراج خالی کرا دو بابا۔" مکرجی بابو
ئپ پھر بجھ گیا تھا۔
"کیوں نہ دینو کو اسپتال میں داخل کرا دیا
ئے۔"
"اس سے پہلے نئے دھوبی کا انتظام کر لینا
ہیئے ۔ جو محنتی اور ایمان دار ہو۔"
"یہ اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔"
"دیکھئے، مجھے چار بجے کی گاڑی سے جانا ہے۔"
ریار یکھ نے کہا۔
"تو ہم کس فیصلے پر پہنچے ـــ" پانڈے
سوال اٹھایا۔
کسی نے ادھر توجہ نہیں دی، اٹھ کر
نے لگے ۔
" رنجنا نے چاء کے ساتھ بسکٹ تک نہیں
ے۔" مسز رانا بولیں۔
"میں نے صندل اور روح افزا شربت سرو
ا۔" مسز شرما نے بتایا۔
"تمہارے گلاس بہت چھوٹے ہیں۔" مسز
ذاری کو یاد آیا۔
سب چلے گئے ۔ رنجنا کے ڈرائنگ روم میں
ی، سگریٹوں کے ٹکڑے اور راکھ ۔ چاء کی خالی
ال اور طوطے کا پر رہ گیا تھا۔
پانڈے، منوہر پاریکھ کو اپنی موٹر میں اسٹیشن
یا ۔ گاڑی جانے تک اس کے ساتھ رہا ۔ واپسی
ربار میں جا بیٹھا ۔ دو بوتل بیئر پی اور گھر آ گیا ۔
،، موتیا اور باز سنگھ کو بھول کر، سو گئی تھی ۔ دینو
س اسپتال میں پہنچا دیا گیا تھا ۔ گیراج پہ تالا پڑا تھا ۔
رجی بابو کے گھر سے بنگلہ موسیقی سنائی دے رہی

پانڈے کمرے میں ٹہلتا ٹہلتا اکتا گیا ۔ اکلوتا پلنگ
اداس فرنیچر اور آئی سی آئی کا لمبا چوڑا کلینڈر ـــ
بنا ہاتھ والے جگن ناتھ جی اسے خاموشی سے دیکھے جا رہے
تھے ۔ مکرجی بابو کے کمرے میں آٹھ ہاتھوں والی
'ماں کالی' کی تصویر تھی ۔ ٹھاکر صاحب کے کمرے
میں گنیش جی براجمان تھے ۔ شرما صاحب کے ہاں
بھولے شنکر تانڈو کر رہے تھے اور رھنڈاری نے
ہر کمرے میں لکشمی جی کو سجا رکھا تھا ۔ رنجنا نے اس کی
دیکھا دیکھی پنچھیوں کے پر جمع کرنا شروع کر دئے تھے۔
اتنے دیوی دیوتاؤں کے ہوتے ہوئے موتیا بھاگ گئی
تھی۔

وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا ۔ باہر اندھیرا گہرا
ہو رہا تھا ۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پاریکھ کے لان میں
آ گیا۔
"شی ـــ"
وہ چونکا ۔ کھڑکی میں رنجنا کھڑی تھی ۔ وہ ادھر
ہی چلا گیا ۔
"میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی ۔ اندر آ جاؤ۔"
"تم ہی باہر آ ؤ۔"
وہ باہر آ گئی ۔ وہ دونوں عشق پیچاں کی
بیل کے پاس برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے ۔
"کیا سوچ رہے ہو، اندر کیوں نہیں آتے ۔"
"اندر نہیں، میرے ساتھ چلو تاکہ ہم ایک
دوسرے کے خلا کو ہمیشہ کے لیے بھر سکیں۔
"کیا مطلب؟" رنجنا چونکی ۔
"چلو بھاگ چلیں ۔"
"نان سنس ۔" وہ پرے ہٹ گئی ۔ "مجھے موتیا
سمجھ لیا ہے!"
"موتیا اور باز سنگھ زندہ اور سچے انسان
تھے ۔" کہتا ہوا پانڈے اٹھا اور اپنے بنگلے کی طرف
چلا گیا اور اپنے اکلوتے پلنگ پر جا گرا، جہاں تکئے کے
نیچے پرندوں کے پر رکھے تھے اور بنا ہاتھ والے جگن ناتھ جی
اس کے انتظار میں تھے ۔
اس نے سارے پر بکھرا دئے ۔

●●

## بقیہ:۔ دلّی کی آبرو

ان سب سے جداگانہ ہے ۔ داغ کے تلامذہ میں جتنا
زیادہ متاثر میں ثاقب بدایونی اور آغا شاعر کے کلام
سے ہوا اتنا اوروں کے کلام سے نہیں ہوا ۔ یہ اپنی اپنی
پسند اور مذاق کا سوال ہے ۔ اس سے میرا ہرگز یہ مقصد
نہیں کہ داغ کے دوسرے باکمال تلامذہ کے ساتھ بے انصافی
کرکے میں ان کو اور ان کے مداحوں کو کسی قسم کا صدمہ
پہونچاؤں ۔ ثاقب بدایونی کی دنیائے تغزل اپنے عہد
کی ترجمانی کر رہی تھی مگر آغا شاعر اپنے عہد سے ذرا
آگے بڑھکر دنیائے شاعری میں قدم رکھ رہے تھے ۔
دہلی میں وہ اپنی انفرادیت کے اظہار سے کبھی گریز نہیں
کرتے تھے ۔ اور بیشتر یہی وجہ تھی ان کے مشاعروں سے دور
رہنے کی ۔ وہ زمانہ میں نے دیکھا ہے جب آغا شاعر
دہلی کے مشاعروں میں جانا اپنی ہتک سمجھنے لگے تھے ۔ بظاہر
حضرت سائل اور حضرت بیخود کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے تھے
لیکن وہ ان دونوں کے مقابلے خود کو افضل و برتر سمجھتے
تھے ۔ شاید یہی وجہ تھی ان تمام بزرگوں میں چشمک کی ۔
لیکن اب نہ آغا شاعر ہیں نہ سائل ۔ بیخود مرحوم
بھی چراغ سحری ہیں لہٰذا ان تینوں باکمالوں کی معاصرانہ
چشمک کا ذکر اچھا نہیں معلوم ہوتا مگر جسطرح میر و سودا ۔
انشا و مصحفی آتش و ناسخ ۔ انیس و دبیر کی فنکارانہ
نوک جھونک ہماری ادبی تاریخ کا دلچسپ اور ناقابل فراموش باب
ہے اسی طرح ہم آغا شاعر، سائل اور بیخود کی باہمی
چشمکوں کے ذکر کو تاریخی دلچسپی کا باعث سمجھتے ہیں ۔ یہ
چشمکیں جائز حدوں میں رہ کر بہت حسین ہوتی ہیں ۔ اور
بعض مرتبہ ان چشمکوں پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے
یوں تو آغا شاعر کا سارا کلام ان کو اس وقت
تک زندہ رکھے گا جب تک اردو زبان صفحۂ ہستی پر قائم
ہے لیکن حسنِ عقیدت تو مجھے یہ بھی کہنے پر مجبور کرتا ہے
کہ آغا شاعر کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے ان کا یہی ایک
شعر کافی ہے ؎

جو برق و باد پہ قادر وہ اس قدر مجبور
کہ ایک سانس بڑھانے کا اختیار نہیں

اسلم پرویز

# دشاؤں میں بٹے لوگ

سڑکیں چپ تھیں۔

اور سڑک کے اِس چھور سے اس چھور تک الیکٹرک پول زرخرید غلاموں کی طرح سر جھکائے ہوئے کھڑے تھے۔ سناٹا اپنی ٹانگوں میں گردن ڈالے سو رہا تھا۔ شہر کی چاروں دشائیں چپ تھیں۔ بستی کے سبھی لوگ پتھروں سے بنی عمارت کے اندر اپنے اپنے کمروں کی کھڑکیاں اور دروازے بند کیے بے سدھ سو رہے تھے۔ ان کے خراٹوں کی آوازیں کھڑکیوں پر چڑھے شیشوں سے ٹکرا کر اندر ہی اندر دم توڑ رہی تھیں۔

باہر سڑک کے درمیان کھڑے الیکٹرک پول کی مدھم روشنی میں تارکول کی ننگی سڑک چمک رہی تھی۔ کہیں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا سوائے ان چاروں کے جو اپنی اپنی دشاؤں کو چھوڑ کر اس چوراہے پر جمع ہوئے تھے، جہاں شہر کی چاروں دشائیں آکر ملتی تھیں۔ چاروں شطرنج کی مہروں کی طرح بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ ان کے جسم پر میلے چکٹ چیتھڑے جھول رہے تھے۔ اور دھول سے اٹے چہروں پر میلوں پیدل چل کر آئے ہوئے مسافروں جیسی تھکن نمایاں تھی۔ پلکوں پر سالہا سال کی گرد جمی ہوئی تھی اور آنکھوں سے مسلسل آنسو رواں تھے۔ الیکٹرک پول کی روشنی میں ان کے سائے بڑے پُراسرار اور ہیبتناک نظر آ رہے تھے۔ اپنی اپنی دشاؤں کی کہانیاں سنانے کے بعد چاروں بڑی دیر سے چپ تھے۔ کچھ دیر قبل جو کہانیاں ان کے ہونٹوں پر پانی سے نکلی ہوئی مچھلیوں کی طرح تڑپ رہی تھیں، اب دم توڑ کر سرد ہو چکی تھیں۔

"سڑک چپ ہے اور ......" پہلے نے سڑک کی چپ کو توڑتے ہوئے کہا۔

"سڑک چپ ہے اور پتھریلی عمارتوں کے اندر بستی کے سبھی لوگ گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں" دوسرے نے جملہ مکمل کیا۔

"سارے شہر میں ہم ہی ہیں، جو جاگ رہے ہیں" تیسرے نے کہا۔

"ہاں — سارے شہر میں ہم ہی ہیں جو زندہ ہیں" چوتھے نے کہا۔

چاروں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا۔ گردن جھکائی اور چپ ہو گئے —

بڑی دیر تک چپ رہے۔

ہم اپنی اپنی دشاؤں کی کہانیاں سنا لیں اور جی بھر کر باتیں کر لیں آؤ — آؤ اب کوچ کریں۔ پتہ نہیں کب اِن پتھریلی عمارتوں کی عقب سے سورج بلند ہو اور ہم سب پتھروں میں ڈھل جائیں۔ آؤ — اب کوچ کریں کہ سورج کی تمازت ہمارے جسموں کو پتھر بنا دے گی"

ٹھیک کہتے ہو کہ پتہ نہیں کب ......"

تینوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک دوسرے کے اندیشے کی تائید کی۔

اور پھر چاروں نے زمین پر اپنے پاؤں جما لیے۔ ان کی پلکوں پر جمی سالہا سال کی گرد بُھربُھری مٹی کی طرح جھڑنے لگی اور صدیوں کی سوئی ہوئی خاموشی ان کی شریانوں میں لوٹنے لگی۔

انھوں نے خاموش نگاہوں سے سامنے دیکھا شہر کی چاروں دشائیں ان کے قدموں پر آکر دم توڑ رہی تھیں۔ چاروں بڑی دیر تک بھیگی بھیگی آنکھوں سے اپنی دشاؤں کو دیکھتے رہے۔

"مجھے خوشی ہے کہ میرے ہاتھ پیر سالم ہیں" پہلے نے اپنے بازوؤں پر پھڑکتی مچھلیوں کو دیکھتے ہوئے کہا"

"میں دیکھ رہا ہوں کہ میری دِشا کے سبھی لوگوں کے ہاتھ پیر بانس کی طرح سوکھ چکے ہیں اور پیٹ غبارے کی مانند پھولتا جا رہا ہے۔ اب وہ کسی کام کے نہیں رہے۔ بالکل ناکارہ ہو چکے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں، اس بستی کے باہر جاتے ہی میں ناکارہ لوگوں کے درمیان رہنے سے بچ جاؤں گا۔"

"مجھے خوشی ہے کہ میرا چہرہ سلامت ہے" دوسرے نے اپنی دِشا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ میری دِشا کے لوگوں کے چہرے پتھر کی سِل کی طرح سپاٹ ہیں میں دیکھ رہا کہ ان کی آنکھوں، ہونٹوں اور کانوں کی جگہوں پر کالے اور گہرے سوراخ ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس بستی کی فصیل کو پھلانگتے ہی میں دھنک کے سات رنگوں دیکھ سکوں گا۔ سچائی کو اپنے ہونٹوں سے چھو سکوں اور چڑیوں کی مدھر چہچہاہٹ سن سکوں گا۔ میں د

۳/۱۶، صنوبر منزل، ہال روڈ کرلا بمبئی ۴۰۰۰۷۰

ہوں، اس پار جاتے ہی میں اپنے ہونٹوں، آنکھوں اور کانوں پر پٹی باندھنے سے بچ جاؤں گا۔

مجھے خوشی ہے کہ میری آتما، میرا احساس ابھی تک سانسیں لے رہا ہے تیسرے نے اپنی دِشا کی اور اشارہ کیا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ میری دِشا کے سبھی لوگ بے حس ہو چکے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں بستی کی بلند فصیل کو پھلانگتے ہی میں خوشی، غم، محبت، غصہ، نفرت، خوف، کراہیت اور بہت سے الفاظ کو معنی کا جسم دے سکوں گا۔"

"مجھے خوشی ہے کہ میں بچے پیدا کر سکتا ہوں"۔ چوتھے نے اپنی دشا کی جانب دیکھا۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ میری دِشا کے سبھی لوگوں کے ناف کے نیچے کا حصہ پتھر میں ڈھل چکا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس بستی کے گربھ سے نکلتے ہی میں عورت کے برھنہ جسم کو چھو سکوں گا۔ اور اس کی سوئی ہوئی سطح کو جگا سکوں گا۔

اور پھر اپنی آنکھوں سے امڈتے آنسوؤں کو میلی آستینوں سے پونچھ کر وہ چاروں ایک جانب چل پڑے۔ آس پاس کی دوکانوں کے شٹر گرے ہوئے تھے۔ سائین بورڈ چمک رہے تھے۔ آسمان میلے اور بوسیدہ کمبل کی طرح ایک افق سے دوسرے تک پھیلا ہوا تھا۔

سڑک کے دونوں طرف اونگھتے ہوتے پیڑ ان کے پیروں کی آہٹ پاتے ہی کھڑبڑا کر جاگ جاتے۔ مگر وہ سب کے سب اپنے ہونٹوں پر خاموشی کا بوجھ لیے سڑک کی چپ توڑتے، مختلف راستوں کو کاٹتے، سنگ میلوں کو پھلانگتے اور راستوں کی گرد جھاڑتے ہوئے آگے بڑھتے رہے ـــــ کہ چلتے رہنا ہی ان کی زندگی کا مقصد اور ان کے زندہ رہنے کا جواز تھا۔ نہ جانے کتنا فاصلہ ان کے تلوؤں کے نیچے سرک چکا تھا! اور نہ جانے کتنا باقی تھا!

اور بالآخر ان گنت گلیوں اور سڑکوں کو عبور کرنے کے بعد وہ اپنی منزل کے قریب پہونچ گئے۔ چاروں نے گردن اٹھا کر سامنے دیکھا۔

سنگلاخ چٹانوں سے تراشی ہوئی طویل و عریض فصیل ایک افق سے دوسرے افق تک پھیلی ہوئی تھی۔ فصیل اس قدر بلند تھی کہ آنکھوں نے اس کی بلندی کو ناپنے سے انکار کر دیا۔ چاروں بڑی دیر تک اپنی آنکھیں پھیلائے فصیل کی بلندی کو ناپنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن ہر بار ان کی آنکھوں کے ڈھیلے فصیل کے آخری سرے کو چھوتے بغیر ہی دوبارہ اپنے حلقوں میں لوٹ آتے۔ چاروں نے گھوم کر بستی کی جانب دیکھا اور اپنی آنکھیں اور ہاتھ آسمان کی جانب اُٹھا لئے۔

" اے خالق مجھے معاف کر کہ محنت کے لالچ نے مجھے اکسایا اور ناکارہ لوگوں کی محبت نے مجھے اُکتایا اور میں اپنی دِشا چھوڑ کر بستی پار جانے پر مجبور ہوا" پہلے نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

" اے خالق مجھے معاف کر کہ دھنک کے سات رنگوں، چڑیوں کی مدھر چہچہاہٹ اور سچائی کے لمس نے مجھے اکسایا اور اپنی دِشا چھوڑ کر بستی پار جانے پر مجبور ہوا" دوسرے نے بھیگی آنکھوں سے اپنی دشا کی جانب دیکھا۔

" اے خالق مجھے معاف کر کہ احساسات کے لالچ نے مجھے اکسایا اور میں اپنی دشا چھوڑ کر بستی پار جانے پر مجبور ہوا" تیسرے نے کہا۔

اے خالق مجھے معاف کر کہ بچے کے لالچ نے مجھے اکسایا اور ہیجڑوں و نامردوں کی محبت نے مجھے اُکتایا اور اپنی دشا چھوڑ کر بستی پار جانے پر مجبور ہوا" چوتھے نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

اور پھر چاروں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا۔ چاروں کی آنکھوں سے مسلسل آنسو رواں تھے۔

اے خالق ہمیں معاف کر کہ ہم جن سرحدوں کے نگہبان تھے۔ آج ہم انھیں منہدم کرنے جا رہے ہیں۔ اے خالق ہمیں معاف کر کہ ہم اپنی دشاؤں سے آنکھیں چرانے پر مجبور ہیں۔ اے خالق ہمیں معاف کر کہ ....." اس کے آگے ان کے گلے رُندھ گئے۔

چاروں نے نظر بھر کر فصیل کو دیکھا اور پھر اوپر چڑھنے لگے۔

لیکن کچھ اوپر پہونچنے کے بعد ہی ان کے پاؤں لڑکھڑائے اور وہ پھسل کر نیچے گر پڑے اور فوراً پہلو بدل کر کھڑے ہو گئے اور پھر دوبارہ اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر کچھ اوپر پہونچنے کے بعد وہ پھر پھسل کر اوندھے منہ گر پڑے۔ اس بار انھوں نے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن منہ کے بل زمین سے جا لگے۔

بڑی دیر تک وہ چاروں یونہی اوندھے پڑے رہے۔ ان کا جسم جگہ جگہ سے چھل چکا تھا۔ انگلیاں لہولہان تھیں۔ کپڑے تار تار ہو چکے تھے۔ سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں اور آنکھوں میں گدلا گدلا پانی اتر آیا تھا۔ ان کی ساری کوشش ساری محنت، بلند اور سپاٹ فصیل کے سامنے کسی پر کٹے پرندے کی مانند ہانپ رہی تھی انھوں نے فصیل کی جانب دیکھا تو ایک عجیب قسم کی بے بسی ان کے رونگٹوں میں جاگنے لگی

" قبل اس کے کہ پتھروں کی عمارت کی عقب سے سورج بلند ہو ہمیں اس فصیل کو پھلانگنا ہے کہ دھوپ کا لمس پاتے ہی ہمارے جسم پتھروں میں ڈھل جائیں گے" دوسرے نے پلٹ کر پتھریلی عمارتوں کی جانب دیکھا۔

تمام عمارتیں میلگجے اندھیرے میں کھڑی اونگھ رہی تھیں اور سڑک کے درمیان الیکٹرک پول اپنے دونوں ہاتھوں میں روشنیوں کے اوندھے پیالے لیے کھڑے تھے۔ قطرہ قطرہ روشنی پیالوں سے ٹپک کر سڑک پر پھیل رہی تھی۔

" لیکن فصیل کو پھلانگنا ناممکن ہے کہ یہ سانپ کی کھال کی طرح چکنی ہے" پہلے نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"اور ...... اور فولاد کی مانند سخت اور مضبوط" تیسرے نے کہا۔

"اور ...... آنکھیں اس کی بلندی کو ناپنے سے ....." اس کے آگے چوتھا کچھ نہ کہہ سکا۔ جملہ ٹوٹ کر اس کے ہونٹوں پر جھولنے لگا۔

چاروں نے گردن اٹھا کر ایک افق سے دوسرے افق تک پھیلی ہوئی فصیل کو دیکھا۔

ہمارے حوصلے فولاد سے زیادہ سخت اور فصیل

زیادہ بلند ہیں" دوسرے نے کہا۔" اور سورج نمودار ہونے سے قبل ہمیں اس فصیل کو پھلانگ لینا ہے۔ ورنہ دھوپ چمکتے ہی ہمارے جسم پتھرا جائیں گے"

" جوش سے چاروں کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ وہ نئے حوصلے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور اچھل کر دیوار سے چمٹ گئے۔

لیکن اس بار بھی وہی ہوا۔ کچھ اوپر پہنچتے ہی ان کے پاؤں لڑکھڑا جاتے اور پھسل کر وہ نیچے گر پڑتے اور فوراً پہلو بدل کر اٹھ کھڑے ہوتے اور پھر اوپر چڑھنے کی کوشش میں لگ جاتے۔ ہر بار وہ نئے حوصلے کے ساتھ اوپر چڑھتے۔ لیکن سانپ کی کھال کی طرح سپاٹ اور چکنی فصیل انھیں نیچے ڈھکیل دیتی۔

آخر کار وہ تھک کر چور ہو گئے۔ ان کا سارا جسم لہولہان ہو چکا تھا۔ کہنیاں چھل گئی تھیں۔ ہاتھوں اور پیروں پر جا بجا خراشیں تھیں۔ وہ کٹے ہوئے پیڑوں کی طرح زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے دھندلی دھندلی آنکھوں سے بستی کی جانب دیکھا۔

پتھریلی عمارتوں کی عقب سے دن کی سفیدی پھیل رہی تھی۔ رات کا غلاف دھیمے دھیمے اتر رہا تھا۔ انھوں نے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی، مگر تھکن سے ان کا جسم سیسے کی مانند وزنی ہو گیا تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا۔ آنکھوں میں خوف پنجہ گاڑے ہوئے تھا۔ انھوں نے گردن اٹھا کر فصیل کو دیکھا۔ اس بار بھی ان کی آنکھیں فصیل کے آخری سرے کو چھوئے بغیر اپنے حلقوں میں لوٹ آئیں۔

عین اس وقت پتھریلی عمارتوں کی عقب سے سورج نمودار ہوا اور پیلی سنہری دھوپ ساری بستی پر پھیل گئی۔ دھوپ چمکتے ہی ان کے چہرے کے تاثرات اپنی جگہ جامد ہو گئے۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں اور سارا جسم پتھروں میں ڈھل گیا۔

سورج دھیمے دھیمے اوپر چڑھنے لگا۔

پتھریلی عمارتوں کے دروازے دھیرے دھیرے کھلنے لگے۔ لوگوں کا ہجوم مکانوں سے نکل کر سڑک پر بکھر گیا۔ لیکن چوراہے پر پہونچتے ہی ان کی آنکھیں حیرت و استعجاب سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

مختلف چوراہوں پر جن نامور اور عظیم شخصیتوں کے مجسمے انھوں نے نہایت عزت و احترام اور عقیدت کے ساتھ نصب کیے تھے آج وہ اپنی جگہ سے غائب تھے۔

---

بقیہ : من کرم ...

نشریات :

نئی دہلی، واشنگٹن، تاشقند، ماسکو اور لندن بی بی سی سے۔

علمی سفر :

امریکہ، انگلستان، روس، مغربی جرمنی، فرانس، وے ٹی کن، ہالینڈ، یونان، سوئٹزرلینڈ، ناروے، چیکوسلوواکیہ، یوگوسلاویہ، اسپین، ایران، مصر، شام، عراق، اردن، ترکی، سعودی عربستان، جاپان، کناڈا، سری لنکا وغیرہ۔

پتہ : ۷۔ یونی ورسٹی روڈ، دہلی یونی ورسٹی ان کلیو، دہلی ۱۱۰۰۰۷

---

بقیہ :- تبصرے

فاعلات مفاعیل فعولن ایک نیا وزن وضع کیا گیا ہے (۲) فعولن کے مقابل میں فاعلن کا استعمال روا رکھا گیا ہے۔ عروض میں ان دونوں باتوں کا جواز نہیں ملتا۔ لیکن ان کو ایک دم ناجائز بھی نہیں کہا جا سکتا۔ زحاف عرج کی تخصیص کو اگر رد کر دیا جائے جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں ثابت کیا گیا ہے تو زحاف عرج کے عمل سے مفاعیل کو فاعلات اور فعولن کو فاعلن سے بدلا جا سکتا ہے۔ یہ میر کی غزل کا عروضی تجزیہ ہوا جس سے فنِ عروض میں نئے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ عروض میں تسکین اوسط اور معاقبہ کے تحت مفتعلن، مفاعلن اور مفعولن نیز مفاعلن اور مفاعیل کا اجتماع جائز ہے۔ میر کی غزل نئے جوازات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ میر کے کلیات میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ لیکن غزلیاتِ غالب میں اس قسم کی مثالیں نایاب ہیں۔ اس لیے عروضی تجزیے کی گنجائش نہیں ہے۔ میر واحد شخصیت ہے جس پر توجہ کی جانی چاہیے۔ اگر مصنفہ موصوفہ اس کے لیے وقت نکال سکیں تو اردو شعر و ادب پر احسان ہوگا۔

جیراداس فلک

---

مصنف: آر بھاردواج مترجم: سوامی حیدرآبادی

# یہ گھر مجھے خالی کرنا ہے

یہ دنیا فانی ہے، سب کچھ آنی جانی ہے، عارضی ہے، دائمی نہیں..."

جی نہیں! یہ میرے الفاظ نہیں ہیں۔ سارے سنسار کے صوفی سنت یہی کہتے آتے ہیں۔ اور آجکل کے سائنسداں بھی یہی کہتے ہیں کہ دنیا فانی ہے، آنی جانی ہے وغیرہ وغیرہ.......!

لیکن تعجب ہے کہ انسان اتنی موٹی بات بھی سمجھنے سے قاصر نظر آتا ہے اور عارضی اور فانی دنیا کے پیچھے بری طرح پڑا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ دیکھ چکا ہے کہ بڑی بڑی سلطنتیں مٹ گئیں، بڑے بڑے مہاتما تک سپردِ خاک ہو چکے، عام انسانوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ آج موجود کل غائب، تھوڑی دیر پہلے بھلا چنگا باتیں کرتا رہا اور پھر چل بسا۔ لیکن پھر بھی ........ کیوں؟ آخر کیوں انسان کو اس فانی دنیا سے اتنا لگاؤ ہے، اتنی چاہت ہے؟ ..... شاید یہی زندگی ہے۔

آپ سوچ رہے ہونگے کہ یہ سب کیا بکواس ہے۔ جی ہاں، آپ کے لیے شاید بکواس ہو، میرے لیے نہیں۔ میرا اشارہ اپنے ایک عزیز ترین مگر نادان دوست کی طرف ہے، جس سے میرا رات دن کا واسطہ ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے رحم آتا ہے اور غصّہ بھی۔

جی ہاں، بعض وقت اس پر اتنا غصہ آتا ہے کہ شاید ہی کسی پر آتا ہو۔ میں نے اسے کبھی پیٹا تو نہیں، مگر اتنی صلواتیں البتہ سنائیں، کہ وہ کبھی بھولے گا نہیں۔ عجیب بات ہے کہ مجھے اس شخص پر غصہ کے ساتھ ساتھ رحم بھی آتا ہے کیوں؟ ... شاید اس لیے کہ مجھے اس سے پیار ہے، بے حد پیار۔ ہاں! یہی وجہ ہو سکتی ہے۔

اسی پیار کی رو میں، میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی "بھائی میرے، تم کو ماننا پڑے گا کہ عمر میں نہ سہی، کسی اور لحاظ سے نہ سہی، کم از کم بدھی گیان میں تو میں تم سے بڑا ہوں۔ اس لیے میری بات مانو، اتنا لگاؤ، اتنی چاہت ٹھیک نہیں۔ اپنے آپ کو دنیا داری کے گورکھ دھندے سے ذرا الگ رکھو۔ یہ آس بڑی بلا ہے، ایک سراب ہے، جس کے پیچھے جتنا تم دوڑوگے اتنا ہی وہ دور ہوتا جائے گا۔ سونے کی ایک خوبصورت ہرنی ہے، جس نے سیتا جی کو ورغلایا تھا، اور تم جانتے ہو، نتیجہ کتنا بھیانک نکلا تھا...... ارے تمہاری پیشانی پر تو بل پڑنے لگے، گویا تمہیں میری باتیں پسند نہیں۔ ہاں بھئی حقیقت کڑوی لگتی ہے۔ لیکن یاد رکھو، یہ تجربہ کی باتیں ہیں۔ اپنے دل کو قابو میں رکھو، بھٹکنے نہ دو، اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ آگے تمہاری مرضی"۔

وہ خاموش سنتا رہا۔ شروع میں تو ذرا منہ بناتا رہا، لیکن چلتے وقت ایسا معلوم ہوا جیسے میری بات اس کے دل میں اتر رہی ہے، اور اسے میری باتوں پر یقین ہو

آنے لگا ہے۔ میں بہت خوش ہوا۔ دنیا میں سب کو س
تو میرے بس کی بات نہیں، کم از کم ایک شخص کو راہ را
پر لگا دیا تو کیا کم ہے؟ لیکن اس خوشی سے پوری طر
لطف اندوز ہونے بھی نہ پاتا کہ "کتے کی دم ٹیڑھی کی
والی بات ہو جاتی، اور وہ اپنی پرانی ڈگر پہ آجاتا۔
میں سوچنے لگتا ہوں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے
آخر کیوں؟ صرف ایک وجہ میری سمجھ میں آتی ہے۔ ان
دراصل آزاد نہیں ہے، بلکہ اپنے ماحول میں جکڑا ہوا
پابند ہے، اور اسی دائرہ میں گھومتا رہتا ہے۔ ہوس
ہے یہ اس کی پیدائشی کمزوری ہو، یا وہ ماحول کے زہ
حملوں سے نہ بچ پاتا ہو۔ یا خود اپنی مرضی سے ایس
کرتا ہو۔

مثال کے طور پر میرے اسی دوست کو لیجئے
چند سال پہلے کی بات ہے، ایک دن کہنے لگا کہ اسے
گھر خالی کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا وہ خود ہی خالی کر
چاہتا تھا یا گھر اسے نکال دینا چاہتا تھا۔ ذرا ٹھہ
وہ دن بھی مجھے یاد آگیا۔ ۱۹۷۰ء مارچ کی بیس تار
تھی، اتوار کا دن تھا، اور ہاں اس روز ساوگادی بھی تھی
یعنی سالِ نو کا پہلا دن۔ مجھے تعجب ہوا کہ بیٹھے بٹھا
تہوار کے دن اسے گھر خالی کرنے کی کیا سوجھی۔
سے میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس گھر میں
نہیں ہوتا۔ لیکن میں اپنے طور پر
تاوقتیکہ وہ خود بات نہ چھیڑے

پرت یوشا ۴ / ۵۷ آر بی برکت پورہ حیدرآباد ۵۰۰۰۲۷

آج کل، نئی دہلی۔

اس سے ایک دن پہلے ہم دونوں میں بڑی دیر
تک گفتگو ہوتی رہی۔ اس روز صبح بھی کچھ دیر باتیں ہوئیں
لیکن مجھے شبہ تک نہیں ہوا کہ وہ اسی روز گھر خالی کرنے
کا ارادہ رکھتا ہے۔ دوپہر ہوتے ہوتے وہ یکایک
بےچین سا ہو گیا اور کہنے لگا "بھائی صاحب' اب میں
یہ گھر خالی کر دینا چاہتا ہوں..... اسی وقت"

میں پریشان ہو گیا۔ پوچھا "اسی وقت؟.....
آج تو تہوار کا شبھ دن ہے"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟ مجھے تو گھر خالی کرنا ہی ہے"

"کیوں؟..... آخر کیوں؟"

وہ جواب دیئے بغیر گھر کی چار دیواری کو یاس سے
بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

مجھے اس کی بےچینی اور مایوسی دیکھ کر رحم سے
زیادہ غصہ آیا۔ اتنے دنوں میں سمجھاتا رہا کہ کسی چیز سے
لگاؤ نہ بڑھاؤ' اس گھر سے بھی نہیں۔ مگر اس نے سنی
ان سنی کر دی اور گھر کو خوب سجاتا سنوارتا رہا۔ آخر اب
گھر کو چھوڑنے کا خیال آیا تو بےچین ہو اٹھا۔

میں نے دلاسا دینے کی کوشش کی کہ ابھی
اس گھر کو خالی کرنے کی ضرورت نہیں' اس خیال کو چھوڑ دے
دوست احباب نے بھی یہی کہا۔ ان میں ایک ڈاکٹر صاحب
بھی تھے۔ انہیں کی نصیحت شاید کام کر گئی۔ اس نے
گھر خالی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس طرح بلا ٹل گئی۔

اس کے بعد بھی ہم اکثر ملتے رہے۔ جب
کبھی وہ مجھے دیکھتا مسکرا دیتا۔ میں بھی ہنس کر پوچھتا۔
"کیوں بھئی' کیا حال ہے؟ گھر خالی کرنے کا ارادہ پھر
تو نہیں کر رہے ہو؟"

وہ بڑی اداسی سے جواب دیتا "بھائی صاحب'
میں تو گھر خالی کرنا چاہتا تھا۔ مگر آپ لوگوں نے مجھے
روک لیا۔ شاید میری قسمت میں کچھ اور عرصہ اسی گھر میں
گزارنا لکھا ہے۔"

"دیکھو بھیا! اداس نہ ہو۔ یہ تو طے ہے کہ ایک
نہ ایک دن اس گھر کو چھوڑنا پڑے گا۔ مگر اس کے لیے
ابھی سے کیوں پریشان ہوتے ہو؟..... میری ایک
بات سنو۔ ہم تم عام انسان ہیں' ہم ہر کام اپنی مرضی کے
مطابق نہیں کر پاتے' اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی جائینگے۔
سنا ہے کہ بعض مہاتما ہیں جن میں اتنی شکتی ہوتی ہے کہ
وہ جو چاہے کر سکتے ہیں' پا سکتے ہیں۔ مگر تعجب کی بات
ہے کہ ان میں خواہشات ہی باقی نہیں رہتیں۔ ہم تو قسمت
کے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں ہیں۔ وہ جیسا چاہے نچائے۔
کیوں سچ ہے نا؟"

اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔ مگر معلوم ہوتا تھا
میری بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے۔

تقریباً چھ سال گزر گئے۔ اس عرصہ میں ہماری
ملاقاتیں بڑھتی گئیں' دوران گفتگو بھی بڑھنے لگا۔
دن بہ دن وہ میرے قریب تر ہوتا گیا۔ میں نے محسوس
کیا کہ اس کی باتوں میں' خیالات میں ایک نیا پن' ایک
خوشگوار سی تبدیلی آرہی ہے۔ میری خوشی کی انتہا نہ
رہی۔

اس سال کے شروع میں..... نہیں' ٹھہریئے'
ذرا یاد کر لوں۔ ہاں ۱۹۸۳ء جنوری کی چھ تاریخ تھی'
گوروار کا دن تھا۔ اس نے پھر اصرار کرنا شروع کیا کہ
اسے گھر خالی کرنا ہے۔ اس مرتبہ اس کے اصرار کی شدت
دیکھ کر سب ہی سمجھنے لگے کہ اب شاید وہ گھر خالی کر کے
ہی رہے گا۔ مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگا۔

لیکن کمال کی بات ہے' اس دفعہ بھی وہ گھر چھوڑ
نہیں سکا۔ شاید اس کی میعاد ختم نہیں ہوئی تھی۔

مجھے دیکھ کر حسب معمول مسکرانے لگا اور ادھر
ادھر دیکھنے لگا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ ہمارے سوائے
اور کوئی نہیں' تو سرگوشی میں کہنے لگا "بھائی صاحب' میں
ایک عرصہ سے آپ کو ایک راز کی بات بتانا چاہتا تھا'
مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے بتاؤں۔ اپنے آپ ہی میں
گھٹ کر رہ جاتا تھا۔ اب مجھ سے رہا نہیں جاتا' سوچتا
ہوں بتا ہی دوں۔ یہ گھر میرے لیے تنگ ہو گیا ہے۔ اس
میں میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ میں نے اپنی ضروریات اتنی بڑھالی
ہیں کہ اس چھوٹے سے گھر میں سما نہیں سکتیں۔ کسی
زمانے میں جبکہ میری ضروریات کا دائرہ وسیع نہ تھا' یہی
گھر مجھے محل سا معلوم ہوتا تھا لیکن اب نہیں..... مجھے ایک
ایسے گھر کی تلاش ہے جو کشادہ ہو' خوشحال ہو جس میں
میری ساری ضروریات پوری ہو سکیں'..... ایسا ایک
گھر میری نظر میں ہے۔ جو وشال ہے' کائنات جتنا
وشال' بس اب میری دلی خواہش یہی ہے کہ جلد از جلد
اس تنگ گھر کو چھوڑ کر اس وشال گھر میں منتقل ہو جاؤں
لیکن..... کیا کروں؟ مجبور ہوں' جب کبھی ارادہ کرتا ہوں'
آپ لوگ آڑے آجاتے ہیں' جانے نہیں دیتے....."

میں اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ کیا یہ وہی شخص
ہے جسے میں اپنے بچپن کا ساتھی سمجھے ہوا تھا.....
نہیں' یہ تو ایک گندھرب بالک ہے' جس نے ابھی ابھی جنم
لیا ہے' ایک مہان یوگی ہے جو ہمالیہ کی چوٹی پر بیٹھا' ایشور
کی یاد میں تپسیا کر رہا ہے' وہ آسمان ہے' جو ساری
کائنات پر پھیلا ہوا ہے' وہ فرحت بخش ہوا ہے' جو
وسیع ریگستانوں' گھنے جنگلوں اور بلند پہاڑوں پر سے
بہتی ہوئی آرہی ہے۔ ایک مخلص قطرۂ آب ہے جو کنول
کے پتے چمک رہا ہے۔

میں ایک زمانہ سے اسے دیکھتا آرہا ہوں' بچپن
سے ساتھ ہوں' بخوبی جانتا ہوں۔ مگر میں نے کبھی اسے ایسے
روپ میں نہیں دیکھا۔ وہ ایک ایسی مقدس ہستی
لگ رہا ہے۔ جو عنقریب اس جسد خاکی کو چھوڑ کر ساتویں
آسمان پر اڑنے والی تھی۔

معاف کیجئے' میں نے ابھی تک آپ کو یہ نہیں
بتایا کہ آخر وہ شخص ہے کون..... جی' ابھی بتاتا ہوں
..... دراصل' یہ کوئی اور نہیں' میں خود ہوں۔ جی ہاں'
سچ کہہ رہا ہوں' یہ میری اپنی کہانی' میری اپنی آپ بیتی ہے۔
لیکن..... لیکن آج تک میں یہ نہیں سمجھ پایا
کہ میرے اندر جو میں بیٹھا ہوا ہے' وہ کون ہے؟.....
کون ہے؟........

# نئی کتابیں
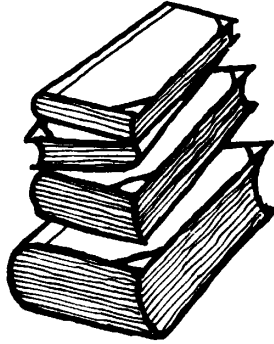
**شرارِ نغمہ** (مجموعۂ کلام)

مصنف :۔ گوپال متل

ناشر :۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲۔۔۔۱۱

قیمت :۔ پچیس روپے

گوپال متل کا تازہ مجموعۂ کلام "شرارِ نغمہ" اسی شعری حسیت کا تسلسل ہے جس سے ہم "صحرا میں اذان" کی وساطت سے متعارف ہوتے تھے۔ انتہائی کم گو ہونے کے باوجود گوپال متل باطنی طور پر متکلم ہیں۔ وہ آشوبِ سفر میں اب بھی مبتلا ہیں۔ وہ قنوطیت کے مدارج اور انسانی صورتِ حال کے تضادات کا اب بھی ذکر کرتے ہیں۔ اپنی اکثر نظموں کو وہ اب بھی عنوان کے تکلف سے آزاد رکھنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن تسلسل کے باوجود "شرارِ نغمہ" میں گوپال متل کے ہاں شعری تجربے میں مزید جزئیات و کیفیات جلوہ فرما ہوتی ہیں۔

"حرفے چند" میں گوپال متل فرماتے ہیں:

"سر انگشتِ حنائی کا تصور قائم رکھنا آسان نہیں۔ اس کے لیے جتن کرنا پڑتا ہے۔ صوفی اس جتن کو ریاضت کا نام دیتا ہے اور شاعر مشقِ سخن کا۔ میری شاعری بھی دل کو شوقِ فضول کی راہ پر لگانے کا ایک بہانہ ہے۔"

گوپال متل چونکہ زندگی کو اس کے تمام مکروہات کے ساتھ قبول کرتے ہیں، اس لیے ان کے اندر اور باہر اور ان کے پورے وجود میں مضطرب شاعر زندہ و پائندہ ہے:

وہ اک آوارہ و مجنوں
وہ اک شاعر
جسے اپنی شرافت کے تحفظ میں
کیا تھا قتل اک مدت ہوئی میں نے
وہی آوارہ و مجنوں
وہی شاعر
عدم کے گوشۂ تاریک سے باہر نکل کر
قہقہے مجھ پر لگاتا ہے
وہ کہتا ہے
کبھی اب بھی ہوتا ہے
کہ سعیِ خودکشی ناکام رہتی ہے۔

جسمانی صورت کے امکان کے باوجود شاعر کے ہاں ناکامیِ سعیِ خودکشی اس کے ذہنی و روحانی وجود کا جواز ہے۔ گوپال متل شاید اسی لیے "بوسۂ لب" کا بھی ذکر کرتے ہیں، "شوقِ فضول" کا، "خوابوں" کا، اور جذبوں کی رعنائی کا اور توانائی کا بھی:

تم سے مل کر مجھے ہوا محسوس
زندگی اتنی رائیگاں تو نہیں
یہ اس کا شہر ہے کوچہ نہیں ہے
ابھی سے اتنی کیوں وارفتگی ہے
تیری آنکھیں کہیں محرومِ بصارت تو نہیں
تجھ کو اب تک جو شبِ تار نظر آتی ہے
بہت مدت ہوئی بچھڑے ہوئے تم سے
مگر ہر رات اب بھی خواب میں آکر
وفا کے عہد کی تجدید کر جاتی ہو تم
چپکے سے کہتی ہو
افق کے اس طرف کچھ بھی نہیں
میں بھی نہیں، تم بھی نہیں، لیکن
افق کے اس طرف جو کچھ ہے وہ زندہ حقیقت ہے
افق کے پار ہی اپنا ملن ہوگا (ایک نظم صفحہ ۲۱)

کئی برس پہلے میرے ایک کرم فرما نے مجھے شعری طریقِ کار کے سلسلے میں ایک راز کی بات بتائی تھی۔ وہ یہ تھی کہ میں ہر مصرع لکھنے کے بعد سوچوں کہ کیا اس کے بغیر میری نظم مکمل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ میں نے اس مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کی یا نہیں لیکن یہ امر مسلّمہ ہے کہ گوپال متل کے ہاں مندرجہ بالا طریقِ کار کا انتہائی منضبط اور فنکارانہ استعمال ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ طوالت سے احتراز کرتے ہیں۔ ان کی مختصر نظمیں نہ تو Epigram ہیں، نہ چٹکلے، نہ معمے، نہ نثری یا شعری زائچے۔ وہ جذبے کی صداقت سے ہر لفظ کو منور کرنے کا فن جانتے ہیں۔ وہ حفظِ بدن اور حفظِ لباسِ کہنہ و فرسودہ سے زیادہ روح کی برہنگی کو پسند کرتے ہیں۔ وہ پتھر بن جانے سے سایہ بننا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی جملہ وابستگیوں کے باوجود شہرِ نو کے شاعر ہیں اور روایت کا گہرا بھرپور اور تہذیبی شعور رکھنے کے باوجود ماضی پرستی سے آزاد ہیں۔

شہرِ نو کو قبول کرنے اور اس کا جشن منانے کے بعد وہ اس کی زندگی کے لیے بھی دعاگو ہیں.... (آشاؤں کے دیپ جلاؤ، صفحہ ۴۴) اور جوت نہ بجھنے پائے (آرتی صفحہ ۵۱)

گوپال متل نے طنز اور Irony کا استعمال اپنی نظموں اور غزلوں میں بڑی چابکدستی کے ساتھ کیا ہے:

آ ہی پہنچا ہوں ترے در پہ گدائی کے لیے
کچھ نہ کچھ مجھ میں بھی توفیقِ عمل ہے تو سہی
وہ شخص کوئے ملامت میں دھوم تھی جس کی
سنا ہے زہر شرافت کا پی لیا اس نے
(نظم صفحہ ۴۳)

گوپال متل کی نظمیں اور غزلیں پڑھتے ہوئے مسلسل یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ان خوش قسمت شاعروں میں ہیں جو زوالِ عمر کے اثر سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوتے ہیں اور فی الواقع آویزش جذبہ و فراست میں اب بھی شرارِ نغمہ اور بوسۂ لب کی لذت سے سرگرم و سرفراز ہیں۔

"شرارِ نغمہ" ہر لحاظ سے قابلِ قدر اور قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔

بلراج کومل

## غبارِ صحرا

شاعر :۔ مہدی حسن ناصری

مرتب :۔ وقار ناصری ۔ قیمت ۲۵ روپے

ملنے کا پتہ :۔ وقار ناصری، شیش محل، حسین آباد، لکھنؤ

ڈاکٹر اعجاز حسین اور فراق گورکھپوری جیسے اکابرینِ ادب کے استاد مہدی حسین ناصری کو اب بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ وہ یگانہ، صفی، ثاقب اور عزیز جیسے ممتاز شعراء کی صف کے ایک اہم لکھنوی شاعر ہیں، جنہوں نے لکھنوی روایات کا پورا احترام کرنے کے باوجود تغزل میں تفکر کو بھی جگہ دی اور اپنے پرسوز لہجے سے بقول ڈاکٹر اعجاز حسین "تارِ رگِ جاں کو مضراب سے چھیڑ لیا ہے"۔ پیارے رشید جیسے استاد کا شاگرد ہونے کے ناطے ان کے کلام میں زبان و بیان کی تمام خوبیاں سمٹ آئی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ تخیل کی بلندی اور خیال کی ندرت اپنی انتہا پر نظر آتی ہے۔ جس زمانے میں ناصری مرحوم نے شاعری شروع کی، وہ لکھنؤ میں میر ولی غالب و میر کا دور تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ناصری غالب کی منزلت سے واقفیت کے ساتھ میر کے مرتبے کو بھی بخوبی پہچانتے ہیں اور دونوں کی اساتذہ کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کی شہرت اردو والوں نے اس مقطع تک محدود کر دی ہے:

ناصری قبر پہ عبرت کے لیے لکھوا دو
طول کھینچا ہے یہاں تک شبِ تنہائی نے

لیکن ان کا کلام حیرت آمیز ایسا پر تاثیر ہے کہ آج بھی دلوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ ان کا مجموعہ کلام "نذر احباب" اب سے پچاس سال قبل شائع ہوا تھا۔ "غبارِ صحرا" کے عنوان سے ان کی ۹۶۵ غزلیات کا انتخاب ان کے پوتے وقار ناصری نے اب نہایت سلیقہ سے شائع کیا ہے۔ اسے پڑھ کر لکھنؤ کے اس پرشکوہ دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جب ثاقب، صفی، عزیز، یگانہ، بیخود، ناصری اور آرزو جیسے اساتذہ کا کلام لکھنؤ کے گلی کوچوں میں گونج رہا تھا اور یہاں کی بزم آرائیوں کا شہرہ سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ مرتب نے ناصری مرحوم کے مداح سید حامد حسن بلگرامی کا مضمون "ناصریِ مرحوم" کتاب میں شامل کر کے "غبارِ صحرا" کو اور بھی وقیع بنا دیا ہے۔ ناصری مرحوم کو دردِ غم کی حدیث دل نشیں پیرائے میں سنانے والا ایک ایسا شاعر قرار دیا جا سکتا ہے جس نے پچاس قبل ایسی بہتر داری اختیار کی تھی جو آج کے دور کی خصوصیت ہے۔ ان کے ایسے ہی چند اشعار درج ذیل ہیں:

مجھ کو حیرت ہے کہ سب ہیں میرے حل کے داد خواہ
یعنی اک اجڑی ہوئی بستی کا آتنا نام ہے

جہاں ہے جوشِ تجلی جہاں تھا دورِ الست
ہمارے ساغر و مینا وہاں سے آتے ہیں

آئیں بلائیں ہجر کی راتیں بھی کٹ گئیں
نقشہ کھنچا رہا تری زلفِ دراز کا

جہاں میں ناصری انجامِ الفت کا بس اتنا ہے
مرا دنیا سے جانا اور ان کا اپنے گھر جانا

ملتا ہے مرے حل سے مزا حسنِ وفا کا
مر جائے گا تو آپ بہت یاد کریں گے

نیند سب کی کیوں اڑائی شب کو کیوں تڑپایا
مرنے والے تیرا مر جانا تو کچھ مشکل نہ تھا

کیا سنی گودِ غریباں سے فریاد کی
میں پکارا تم کو سارا شہر جب خاموش تھا

شہنشاہ مرزا

## کتاب :۔ خیمۂ خواب

شاعر :۔ اسعد بدایونی ۔ قیمت : بیس روپے

ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ جامعہ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ

اسعد بدایونی نئی نسل کے چند اچھے شاعروں میں سے ایک ہیں۔ ان کا کلام ہند و پاک کے مقتدر رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے، اب ان کا دوسرا مجموعۂ کلام شائع ہوا ہے یہ مجموعہ لطیف احساسات کی پیشکش اور لسانی نغمہ کاری کی بڑی عمدہ مثال سامنے لایا ہے۔ ان کی غزلیں نازک احساسات کی ایک دنیا معلوم ہوتی ہیں اس جہانِ احساس سے چند مناظر پیش کرتا ہوں۔ ذرا ان اشعار میں صبر و ضبط کی زیریں سطح دیکھئے کیسا دلسوز رنگ پیدا کر رہی ہے۔

مرے شجر تجھے موسم نیا بناتے رہیں
گلابِ صبر تری ٹہنیوں میں آتے رہیں

بس اک چراغ ہے اپنی متاعِ بیش بہا
سو شام آتی رہے، ہم اسے جلاتے رہیں

کبھی کبھی کوئی سورج طلوع ہوتا رہے
ردائے ابر میں تارے کبھی منہ چھپاتے رہیں

نرم لہجے کی اس جذباتی دلگیری کے علاوہ الفاظ کی نغمگی کو پہچاننا اور ہر مصرعے میں ایک مدھم سی لے پیدا کر دینا اس فنکار کی ایک اور دلکش صلاحیت ہے۔ غزل کے اکثر اشعار میں یہ چیز بڑے بھرپور انداز سے آتی ہے۔ مثلاً

ہر دھوپ کو تیرے روپ کی چھب، ہر رنگ کو تیرا رنگِ لب
ہر جھیل سمندر دریا کو، تری آنکھوں سے تعبیر کیا!

میں سیدھا سادہ بندہ تھا، مرا کام دکھوں کا دھندہ تھا
ایک روز اچانک موسم نے مجھ زندہ کو تصویر کیا

زندگی کے جبر، دشواریوں اور ناکامیوں نے اسعد سے کیسے کیسے شعر کہلوائے ہیں اور ان کے تخیل نے کیا کیا انوکھے پیکر تراشے ہیں:

پھر کوئی حسرت آنسو کی کشتی میں بیٹھ گئی
پھر آنکھوں کے دریا جاگے پھر تیوار چلے

کب بارش کی بوچھاروں سے چھت پر گھنگھرو بجیں گے
دیواروں پر کب ارزانی ہوگی سبزہ خوش منظر کی

میں جھوٹا حرف گواہی کا، میں کاذب لفظ کہانی کا
کیوں اب تک رشتہ باقی ہے مری آنکھوں سے حیرانی کا

ہمارے ملک میں نوجوان شاعروں کے نئے لب و لہجے کے حوالے سے اور احساس کی شاعری پر کمالِ قدرت

کے مظہر کے طور پر اسعد بدایونی کی شاعری ایک بہترین مثال ہے۔

ایم۔ آر قاسمی

**تیسری آنکھ** (افسانے) قیمت: پندرہ روپے

مصنف: معین شاہد

ناشر: مکتبہ آدرش، آنگلہ، بنیاد گنج، گیا۔

"تیسری آنکھ" معین شاہد کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے جس کی اشاعت بہار اردو اکیڈمی کے مالی تعاون کے ذریعہ عمل میں آئی ۲۱ افسانوں پر مشتمل یہ مجموعہ "میں اور میری تخلیق" کے عنوان سے مصنف کی زندگی کی بہت سی تفصیلات کو سمیٹے ہوتے ہے۔

"تیسری آنکھ" کے افسانوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مصنف اردو افسانہ اور خاص طور پر مختصر افسانے کی تکنیک سے اچھی طرح واقف ہے اور زندگی کی نبض پر اس کی حساس انگلیوں کی گرفت پوری طرح ہے۔ اور یوں زندگی کی ہر دھڑکن اور ہر کیفیت سے اسکی قلم کی شناسائی ہے "درد کا رشتہ" ہو "پیشن گوئی ہو" "دشت تنہائی ہو" یا "دو روٹی کی قیمت" ہو "ایک المیہ" ہو یا "نئے کوارٹر کا المیہ" ہو ان سب کہانیوں میں زندگی کے بے شمار رنگ اور بہت سے چھوٹے بڑے مسائل ہیں۔ چہار طرف لہو رستے گلابوں کی مہک میں سسکتی لرزتی وہ زندگی ہے جس میں ارمانوں اور تمناؤں کی تڑپ ہے، محرومیوں اور حسرتوں کا کرب ہے سرمایہ داری کا ظلم ہے اور مظلوم کی بزدلی ہے۔ کرداروں کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ معین شاہد کی کہانیوں کے کردار اسی دنیا میں رہنے والے، گوشت پوست کے زندہ، متحرک اور فعال کردار ہیں۔ ان میں جینے کی آرزو بھی ہے اور مر مٹنے کا حوصلہ بھی۔ ان کے یہاں دولت کی ہوسناکیاں بھی ہیں اور مفلسی کی آہیں بھی۔ یہاں تہہ در تہہ زندگی کی ہر پرت نہ صرف قاری کو متاثر کرتی ہے بلکہ اسے ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہے۔

اسلوبیاتی نقطہ نظر سے "تیسری آنکھ" کی کہانیاں پر کشش، سادہ اور واضح اسلوب کی حامل ہیں۔ مصنف کے پاس روزمرہ الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ ہے اور اسے اظہار بیان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ اس کی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اس کو وہ موثر انداز میں اس طرح کہہ گزرتا ہے کہ پڑھنے والوں کے لبوں سے خواہ دھیمی ہی سہی، آہ ضرور نکل جاتی ہے۔

شہناز انجم

## کتب خانہ داری۔ ایک تعارف

شہاب الدین۔ انصاری

ناشر: ترقی اردو بیورو، وزارت تعلیم۔ ویسٹ بلاک آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶ ۔ قیمت ۲۴ روپے

اطلاعات کو آج کے دور میں سائنسی ایجادات سے بھی زیادہ اہم حیثیت حاصل ہے۔ دراصل سائنسی پیش رفت کا انحصار بڑی حد تک اطلاعات کی برق رفتار فراہمی پر منحصر ہو کر رہ گیا ہے۔ کتب خانے اطلاعات کے کتب خانے ہیں، جہاں سے محققین اور عوام سبھی اپنی اپنی ضرورت کی اطلاعات حاصل کرتے ہیں۔ اطلاعات کی فراہمی میں تیز رفتاری اسی وقت ممکن ہے جب کتب خانے صحیح اور سائنسی ڈھنگ سے مرتب و منظم ہوں۔ کتب خانے کی ترتیب و تنظیم کے کام کو گذشتہ صدی کے آخری برسوں سے خصوصی اہمیت حاصل ہو گئی ہے اور کتب خانہ میں ملازمت کے لیے ایک مخصوص تعلیم و تربیت کی ضرورت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔

کتب خانہ داری کے موضوع پر انگریزی زبان میں کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے اور سائنس کی دوسری شاخوں کی طرح اس میدان میں ہونے والی پیش رفت کے جائزہ کے واسطے اب سالنامے بھی شائع ہونے لگے ہیں۔ اس موضوع پر شائع ہونے والے رسائل کی مجموعی تعداد اب سو سے اوپر پہونچ چکی ہے۔ لیکن اردو زبان میں ابھی تک اس موضوع پر کوئی جامع کتاب نہیں دستیاب تھی۔

پیش نظر کتاب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائبریرین جناب شہاب الدین انصاری نے ترقی اردو بیورو کی تحریک پر لکھی ہے۔ کتاب کے پہلے حصہ میں کتب خانہ کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ کتب خانہ کی ابتدا، اور اس کے عروج کے اس جائزہ میں عہد قدیم اور عہد وسطی میں یورپ امریکہ اور ایشیائی ممالک میں کتب خانوں کی ابتداء اور ان کی ترقی کے مختلف مراحل پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے۔ مصنف نے ہندوستان میں عہد قدیم میں موجود ٹیکسلا اور نالندہ کے کتب خانوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ مغربی ہندوستان میں پائے جانے والے جین عہد کے گیان بھنڈاروں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ہندوستان میں عام کتب خانہ کے قیام کا دور جدید ۱۸۳۵ء میں قائم کی گئی کلکتہ پبلک لائبریری سے شروع ہوتا ہے آزادی کے بعد کے دنوں میں عام کتب خانوں کی ترویج کے لیے اٹھائے جانے والے اقدام میں سب سے اہم قدم راجہ رام موہن رائے فاؤنڈیشن کا قیام ہے۔ ایک فلاحی ریاست میں عام کتب خانے کن خطوط پر چلنے چاہئیں اس کا سب سے قابل تقلید نمونہ ہمیں برطانیہ میں ملتا ہے۔ مصنف نے اپنے جائزہ میں مندرجہ بالا باتوں کے علاوہ برطانیہ اور امریکہ میں عام کتب خانہ تحریک کو بھی شامل کر کے اردو داں عوام کو ان ملکوں کے کتب خانہ نظام سے واقف کرایا ہے۔

عام کتب خانے سے استفادہ کا حق جملہ شہریوں کو ہوتا ہے اور اسی کی مناسبت سے ان کا ذخیرہ کتب کسی مخصوص موضوع پر تحقیقی کام کرنے والوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ اس کام کے لیے یونیورسٹی اور تحقیقی اداروں کے کتب خانے زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔ تعلیمی اداروں کے کتب خانے اپنے ذخیرہ کتب کے علاوہ تنظیم و ترتیب میں بھی عام کتب خانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔

کتب خانوں کی ایک دوسری قسم معلوماتی مرکز کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مرکز تعداد کتب کے اعتبار سے چاہے بڑے نہ ہوتے ہوں لیکن ان کا اپنے کاموں کو انجام دینے کا ڈھنگ بڑی حد تک مخصوص نوعیت کا ہوتا ہے اور اپنے کارکن میں اعلیٰ فنی صلاحیت کی ضرورت کا احساس دلاتا ہے۔ تعلیمی اداروں کے ساتھ کتب خانہ کی ابتداء اسکول سے ہی شروع کرنے کی ضرورت کو اب بڑی حد تک مان لیا گیا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارے ملک میں چند پبلک اسکولوں کو چھوڑ کر بیشتر میں موجود

کتب خانے محض خانہ پری ہیں۔ کم وبیش کچھ یہی حال کالج کتب خانوں کا بھی ہے۔ البتہ ملک میں یونیورسٹی کتب خانے نہایت مستحکم بنیادوں پر قائم ہیں۔ اس کی بڑی وجہ مشہور ماہر علم کتب خانہ پروفیسر ایس آر رنگاناتھن کی انتھک کوششیں ہیں۔ پروفیسر رنگاناتھن نے اپنے مطالعہ اور عملی نمونہ کے ذریعہ اس مضمون اور کتب خانہ کے پیشہ کو وہ وقار بخشا جو اسے کبھی مغربی ممالک میں بھی نہیں حاصل ہوا تھا۔ نظام درجہ بندی کے لیے انھوں نے جو نظری اساس مرتب کی اس کی بدولت ہندوستان کو دنیا کے جملہ ملکوں میں سرخروئی حاصل ہوئی۔ اس کتاب میں کلکتہ یونیورسٹی لائبریری کی کہانی کو اس کے ابتدائی دور سے بیان کیا گیا ہے اسے پڑھ کر ملک میں یونیورسٹی کتب خانہ کی تنظیم ان کے کام کے ڈھنگ اور انھیں درپیش مسائل کا ایک پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

قومی کتب خانے ملک کے ثقافتی ورثہ کے امین ہوتے ہیں۔ علمی حلقوں میں برٹش میوزیم کو جو مرتبہ اور حیثیت حاصل ہے اس سے ہم سب بخوبی واقف ہیں لیکن شاید یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ آج سے چند برس پہلے ہی عالمگیر شہرت کے اس ادارہ کی آزاد حیثیت ختم کردی گئی اور اب یہ برٹش لائبریری کا محض ایک شعبہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی طرح انڈیا آفس لائبریری (جس کی ہندوستان کو منتقلی کے لیے ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا آزاد کے زمانے سے کوششیں ہو رہی ہیں) بھی اب برٹش لائبریری کا ایک شعبہ ہے۔ امریکہ کی لائبریری آف کانگریس کے ذخیرہ کتب اور کاموں کی وسعت کا اندازہ کچھ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں کے ملازمین کی تعداد ۳۸۹۰ ہے۔ یہاں موجود مشترک کیٹلاگ سے امریکہ اور کناڈا میں پھیلے ہوئے سات سو کتب خانوں کے ذخیرہ کتب کی تفصیل مل سکتی ہے۔ مصنف نے یہ تفصیلات کتاب کے دوسرے حصہ میں دی ہیں۔

کتاب کے تیسرے حصہ میں پیشہ ورانہ تنظیم اور کتب خانہ تحریکیں ان کا رول، علم کتب خانہ داری کی تعلیم و تربیت کی دستیاب سہولیات، اس کے ماخذ و مواد اور درون خانہ انجام پانے والے کام وغیرہ موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔ کتب خانہ میں خود کار مشینوں کے استعمال کے امکانات کا جائزہ لیا گیا ہے، اور آئندہ دنوں میں لائبریرین کی کیا ذمہ داریاں ہونگی اس پر مختلف ڈھنگ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں یونیسکو منشور برائے کتب خانہ کا متن درج ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں کتب خانہ داری کی تعلیم و تربیت کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ آج ملک کی بیشتر یونیورسٹیوں میں کتب خانہ داری کی تعلیم کا بندوبست موجود ہے اور کئی یونیورسٹیوں نے تو پی ایچ ڈی سطح تک کی تعلیم کا بندوبست کیا ہے۔

اپنے مواد کے اعتبار سے اہم اس کتاب کی کتابت وطباعت پر توجہ کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔ ابواب کے آخر میں حوالہ جات کے اندراج کی اکثر ایک صفحہ چھوڑ کر کتابت کرائی گئی ہے جو درست نہیں ہے۔ اسی طرح انگریزی ناموں کو کاتب ہی سے لکھوایا گیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ انھیں ٹائپ کرا کر اپنی جگہ چسپاں کردیا جاتا۔ کتاب کی سرخیوں کے استعمال میں احتیاط کی ضرورت تھی۔ کتاب کے آخر میں اشاریہ بھی نہیں ہے۔

اپنی ان خامیوں کے باوجود کتب خانہ کے موضوع پر ایک بسیط اور جامع کتاب کے لیے مصنف اور ناشر دونوں لائق مبارکباد ہیں۔ یہ کتاب اردو زبان میں ایک مفید اضافہ ہے۔

کرشن کمار

نام کتاب :- "صاعقہ طور"

مصنف :- تاج پیامی

ناشر - اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد - (یوپی)

قیمت - پینتالیس روپے

"صاعقہ طور" تاج پیامی کی پہلی اور ہنگامہ خیز تنقیدی کتاب ہے جو بقول ان کے کلیم الدین احمد کے باطل تنقیدی نظریات کی تنقیح کے سلسلے میں لکھی گئی ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے دو دعوے کیے ہیں پہلا یہ کہ یہ کتاب کلیم صاحب کی مخالفت میں نہیں بلکہ ارد زبان اور اس کے شعراء وادباء کی جائز حمایت میں لکھی گئی ہے اور دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ یہ کتاب بالکل غیر جذباتی ہو کر اور بربنائے خلوص لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ دونوں د بالکل درست ہیں۔ چونکہ کلیم صاحب کو ہمیشہ یہ شکایت رہ ہے کہ ان کی بات کا کوئی مدلل اور نکتہ بہ نکتہ جواب نہیں د اس لیے تاج پیامی نے اپنی ہر بات کے ساتھ چند دانش کے حوالے دیے ہیں۔

کلیم صاحب نے اپنی تنقید کے ذریعہ اردو شع کو انگریزی شعراء کے مقابلے میں کمتر ٹھہرایا اور کہا کہ اردو ش ان خوبیوں سے محروم ہیں جو بزرگ شعراء میں ہونی چاہیے انھوں نے اردو کی مقبول ترین صنف شاعری یعنی غزل ک "نیم وحشی" قرار دیا۔ جناب تاج پیامی نے کلیم صاحب کے سار اعتراضات کا جواب اپنی کتاب میں چودہ ابواب بنا کر نہایت مہذب پیرایہ بیان میں دیا ہے انھوں نے کلیم صاحب نقطہ نظر کی کاٹ خود ان ہی کے پسندیدہ مغربی مصنفین او دانشوروں کے حوالے سے دیگر کلیم صاحب کے تنقیدی اد کی کمزوری کو واضح کرنے کی دلچسپ اور کامیاب کوشش کی ہے۔ اردو اور انگریزی زبان وادب کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

جناب تاج پیامی نے اپنی کتاب کو ہر طرح مدلل اور مؤثر بنانے کی کوشش کی ہے لیکن ایسا معلو ہے کہ انھوں نے اپنے قلم کی ساری طاقت کتاب کے آخ باب "غزل ایک مہذب ترین صنف شاعری ہے" پر صر کی ہے۔ جناب تاج پیامی کی تحریر صاف سادہ اور سلیس جس میں ادبی چاشنی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس کتاب کی ا خاصیت یہ بھی ہے کہ اس میں یونیورسٹی سطح کے اردو انگریزی کے طلبا کے لیے خاصا مواد فراہم کردیا گیا۔ غرض "صاعقہ طور" میں اچھی تنقیدی کتاب کی ساری خوبیا موجود ہیں۔

نعمان شوق

## غزلیاتِ غالب کا عروضی تجزیہ

مصنفہ - صغیر النساء بیگم

قیمت - ۵/۷ روپے

تقسیم کار - مکتبہ جامعہ - جامعہ نگر نئی دہلی

کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کی تمام غزلیات کی بحروں کے تعین کے ساتھ ساتھ ہر شعر کی تقطیع بھی درج کی گئی ہے۔ بحر کا نام اور زحافات کی تفصیل بھی دیدی گئی ہے۔ ڈاکٹر م۔ ن سعید اور محترمہ صغیر النساء بیگم نے شروع کے صفحات میں فن عروض اور تقطیع کے بارے میں چند بنیادی باتوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ شعر اگر عروض کے فراہم کردہ سانچوں کے مطابق ہے تو موزوں ہے اور یہ سانچے ہی ایسا آہنگ مہیا کرتے ہیں، جن سے نثر اور شعر کے درمیان امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ لیکن عروض کے ان سانچوں یعنی ارکان اور بحر کی تشکیل میں کون سے اصول کارفرما ہیں، ان کی طرف عروض کی کتابیں کچھ زیادہ رہنمائی نہیں کرتیں۔ عروض میں سبب خفیف وتد مفروق۔ وتد مجموع اور فاصلہ صغریٰ کی اصطلاحیں الفاظ یا اجزائے الفاظ میں حرکات و سکنات کی نشاندھی کرتی ہیں۔ اور ان کے مرکبات سے جتنے ارکان بنائے جاسکتے ہیں، بنائے گئے ہیں کسی اصول کا ذکر نہیں ملتا صرف چار ارکان مفعولُ۔ فاع لن۔ متفاعیلُ اور فاع متفا۔ چھوڑ دیے گئے ہیں۔ موخر الذکر دو ارکان میں ترکیب اور تکرار سے چار حرکات جمع ہو جاتی ہیں۔ اس لیے قابل ترک ہیں۔ مفعول اور فاع لن کے ترک کی وجہ ناقابل فہم ہے۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ (۱) سبب۔ وتد اور فاصلہ کی اصطلاح سازی آہنگ کے اصولوں کی مرہونِ منت نہیں۔ (۲) ارکان سازی میں بھی آہنگ کے اصول بروئے کار نہیں لائے گئے، جن کا تعین کیا جاسکے۔ کیونکہ حتی الامکان سبھی ارکان بنالئے گئے جو بنائے جاسکتے تھے۔

**بحروں کی تشکیل** سالم بحریں ارکان کی ترکیب و تکرار سے تشکیل دی گئی ہیں۔ اور مزاحف بحریں زحافات کے عمل سے ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ ان کی تشکیل میں بھی کسی اصول کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا۔ زحافات دو قسم کے ہیں (۱) عام (۲) مخصوص۔ زحافات کی تخصیص کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کیونکہ زحافات کے عمل سے جو موقوف الآخر مزاحف ارکان تشکیل پذیر ہوتے، ان کو صدر و ابتدا یا حشوین میں استعمال کرنے سے موقوف الآخر رکن متحرک الآخر میں بدل جاتا ہے۔ اس لیے اس کو عروض و ضرب سے مخصوص کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اس میں بھی آہنگ کے کسی اصول کا دخل نہیں ہے۔ جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے، ان میں موقوف درمیان میں بھی آتا ہے اور آخر میں بھی۔ لیکن ان کے لیے کوئی عروضی اصطلاع وضع نہیں کی گئی۔ اور نہ ان کا ارکان کی تشکیل میں کوئی دخل ہے۔ لیکن زحافات کے عمل سے اگر موقوف الوسط یا موقوف الآخر مزاحف رکن تشکیل پذیر ہوتا ہے تو اس پر کسی قسم کی پابندی لگانا بے معنیٰ ہے کیونکہ موقوف الوسط یا موقوف الآخر الفاظ کے استعمال پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ جس سے ان کو مزاحف ارکان کی طرح عروض و ضرب سے مختص کیا جاسکے۔ ڈاکٹر م۔ ن۔ سعید نے اپنے مضمون "فن عروض" میں غالب کا یہ شعر پیش کیا ہے ؎

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

محترمہ صغیر النساء بیگم نے اپنے مضمون "تقطیع اور اس کا طریقہ" میں یہ شعر درج کیا ہے ؎

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ان دونوں شعروں میں انداز۔ ناز اور بھیس موقوف الآخر الفاظ ہیں۔ لیکن مفاعی لُن اور فعولُن کے م اور ف متحرک کے مقابل آتے ہیں۔ اسی طرح مفاعی لُن اور فعولُن پر زحاف عرج کا عمل کیا جائے۔ تو فاع لاتن اور فاع لُن حاصل ہونگے۔ اور یہ دونوں موقوف الوسط مزاحف ارکان ہوں گے جس طرح نام ور اور کار گر موقوف الوسط الفاظ ہیں۔ ان کا میم اور رے موقوف ہونے کے باوجود فاعلُن کے ع متحرک کے مقابل آئیں گے۔ اسی طرح فاع لاتن اور فاع لُن موقوف العین ہونے کے باوجود فاعِ لاتن (فاعلاتن) یا فاعلن کے متحرک عین کے مقابل آسکتے ہیں لہٰذا اس لیے زحاف عرج کی تخصیص بے معنیٰ ہے۔

غزلیاتِ غالب کی بحروں کا تعین اور ہر شعر کی تقطیع پر کافی محنت صرف ہوئی ہے۔ اس کی تو داد دینی ہی چاہئے۔ لیکن اس کو عروضی تجزیہ نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ غزلیاتِ غالب کے تعلق سے فن عروض پر کوئی نئی روشنی نہیں پڑتی۔ اور کچھ نئے نکات سامنے نہیں آتے، جن سے نئے امکانات کا جائزہ لیا جاسکے۔ اس سے کہیں بہتر ہوتا اگر محترمہ موصوفہ کلیاتِ میر کو عروضی تجزیے کے لیے منتخب کرتیں۔ مثال کے طور کلیاتِ میر مرتبہ مولوی عبدالباری آسی سے ایک غزل پیش ہے۔ کلیاتِ میر صفحہ

غزل

(۱) تجھ عشق میں تو مرنے کو تیار بہت ہیں
مفعول فاع لات مفاعیل فعولن
یہ جرم ہے تو ایسے گنہگار بہت ہیں
مفعول فاع لات مفاعیل فعولن

(۲) اک زخم کو میں ریزۂ الماس سے چیرا
مفعول فاع لات مفاعیل فعولن
دل پر ابھی جراحتِ نو کار بہت ہیں
مفعول فاع لات مفاعیل فعولن

(۳) کچھ انکھڑیاں ہی اس کی نہیں اک بلا کہ بس
مفعول فاع لات مفاعیل فاع لن
دل زینہار دیکھ خبردار بہت ہیں
مفعول فاع لات مفاعیل فعولن

(۴) بیگانہ خو رقیب سے وسواس کچھ نہ کر
مفعول فاع لات مفاعیل فاع لن
فریاد سے تنک زباں سے تو پھر یار بہت ہیں
مفعول فاع لات مفاعیل فعولن

(۵) کوئی تو زمزمہ کرے میرؔ آسا دل خراش
مفعول فاع لات مفاعیل فاع لن
یوں تو قفس میں اور گرفتار بہت ہیں
مفعول فاع لات مفاعیل فعولن

اس غزل کے مطالعہ سے دو باتیں سامنے آتی ہیں (۱) مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن کی جگہ مفعول

بقیہ صفحہ [illegible] پر

# مکتوبات

## شکریہ

آج کل کا دسمبر نمبر باصرہ نواز ہوا۔ اردو صحافت نمبر کا حصّہ دوم اپنے معلوماتی مضامین کے لحاظ سے بصیرت افروز ہے۔ اس میں اردو صحافت کے بعض پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے، لیکن بعض مضامین میں کچھ غلطیاں اور فروگزاشتیں نظر آئیں جو تصحیح کی غرض سے پیشِ خدمت ہیں۔

"اردو صحافت، تکنیک، نئے تجربے اور مسائل" میں یہ ذکر کرنا رہ گیا ہے کہ رجسٹرار آف نیوز پیپرز کی ۱۹۸۰ء کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں اردو کے کتنے روزنامے، ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہنامے شائع ہو رہے ہیں[۱]۔

صفحہ ۲۵ پر ایک دوسرے مضمون میں لاہور کے اخبار عالم اور لکھنؤ کے اخبار اودھ کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان اخباروں کے صحیح نام عام اور اودھ اخبار تھے۔

'احسان' لاہور سے ڈاکٹر اقبال کی وابستگی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگر اس سے مراد علامہ اقبال ہیں تو یہ یقیناً محلِ نظر ہے۔

متحدہ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ سکندر حیات تھے نہ کہ مقتدر حیات جیسا کہ صفحہ ۲۶ پر درج ہے۔

صفحہ ۳۲ پر یہ بیان: دہلی اور گرد و نواح میں مسلمانوں کی بھاری تعداد جن ستہ خریدتی ہے بھی محلِ نظر ہے اور خلافِ واقعہ ہے۔

تیسرے مضمون: اردو اخبارات: ایک جائزہ میں بھی رجسٹرار نیوز پیپرز کی رپورٹ میں اخبارات اور جرائد کی تعداد دی گئی ہے لیکن روزناموں، ہفتہ واروں، پندرہ روزوں، ماہناموں، سہ ماہی جریدوں اور اخباروں کی تعداد نہیں بتائی گئی ہے[۲]۔

کان پور سے نور الآفاق نہ کہ نور الاخلاق شائع ہوا۔ اسی طرح سے ۱۸۸۳ء میں لکھنؤ سے ہندوستان نہ کہ 'ہندوستان اخبار' شائع ہوا۔

شیخ غلام محمد کے اخبار وکیل سے مولانا عبداللہ عمادی نہ کہ مولانا عبداللہ العمادی منسلک رہے۔

زمیندار سے غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک کئی برس تک بحیثیت ایڈیٹر منسلک رہے۔ اس کا ذکر نہ کرنا بڑی فروگذاشت ہے۔

روزنامہ ہمدم لکھنؤ کے مالک اولاً شیخ شاہد حسین قدوائی بیرسٹر اور بعد میں مہاراجہ علی محمد خاں آف محمود آباد رہے نہ کہ مولانا عبدالباری۔ اسی طرح سے بجنور کے مشہور معروف سہ روزہ اخبار مدینہ کے مالک مولوی مجید حسن تھے نہ کہ مولوی عبدالمجید۔

مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی سرپرستی میں ہفتہ وار 'پیغام' کلکتہ سے ستمبر ۱۹۲۱ء میں نکالنا شروع کیا نہ کہ ۱۹۳۱ء میں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی، مولوی ظفر الملک علوی اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کے ساتھ انہوں نے ۱۹۲۵ء میں ہفتہ وار "سچ" نکالا نہ کہ ۱۹۳۱ء میں جیسا کہ اس مضمون میں بیان کیا گیا ہے۔ اس اخبار کے منیجر مولوی ظفر الملک صاحب تھے۔ یہ اخبار ۱۹۳۳ء تک شائع ہوتا رہا پھر مولانا دریابادی نے قرآن مجید انگریزی شروع کیا۔ اس وجہ سے یہ اخبار بند ہوا اور مئی ۱۹۳۵ء میں عبدالرؤف عباسی ایڈیٹر روزنامہ 'حق' لکھنؤ کی منیجری میں یہ اخبار 'صدق' کے نام سے اور اکتوبر ۱۹۵۰ء سے "صدقِ جدید" کے نام سے یہ اخبار شائع ہوا اور اس کے مالک بھی مولانا مرحوم تھے۔

دہلی سے مشہور صحافی مولانا عبدالباقی نے "پیامِ وطن" بھی کئی برس تک نکالا اس کا اس مضمون میں کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔

صفحہ ۴۷ پر ایک اور مضمون میں مولانا حسرت موہانی کو عالم لکھا گیا ہے حالانکہ وہ عالم نہ تھے، شاعر اور سیاسی لیڈر تھے۔

مولانا شبلی کو مولانا آزاد کا دوست لکھنا صحیح نہیں ہے وہ مولانا آزاد کے استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔

جناب ابوسعید بزمی صاحب پر مضمون میں اُن کی ایک اہم تصنیف "جب خون بہہ رہا تھا" جو تقسیمِ ہند کے بارے میں ہے اور جس میں تقسیم کے بعد ہونے والے کشت و خون کا ذکر کیا گیا ہے، کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

محمد ہاشم قدوائی، علی گڑھ

## پہلا موقع

دسمبر کا آج کل مل گیا ہے۔ یہ شمارہ بھی مفید اور معلومات افزا ہے۔ اردو صحافت سے متعلق نہایت اچھے اور قابلِ قدر مضامین یک جا کر لیے

---

۱۔ ۱۹۸۱ء کے اعداد و شمار صحافت نمبر حصّہ اوّل مطبوعہ نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء میں موجود ہیں۔ (ادارہ)

۲۔ مطلوبہ تفصیل مضمون میں درج ہے۔ (ادارہ) صفحہ ۳۴

ہیں۔ کچھ مضامین اب جنوری کے شمارے میں آئیں گے۔ اس اردو صحافت سے متعلق ایک قیمتی سرمایہ یک جا ہو جائے گا۔ آج بھی اور آنے والے کل کو بھی صحافت سے متعلق مفید معلومات فراہم کرنے میں مدد دے گا۔ اردو صحافت کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ اتنے قیمتی مضامین یک جا ہو گئے ہیں۔ اس کام یابی پر دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔

لیکن ایک بات کہنے کی اجازت دیجئے کہ پہلے حصّہ کی طرح دوسرا حصّہ بھی اردو صحافت نمبر ۲ ہوتا تو نہایت اچھا ہوتا۔ اس میں تیسرے شمارے کے مضامین بھی شامل ہو جاتے تو اردو دنیا اسے اور بھی زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھتی۔ اور صحافت نمبر ۲ بھی پہلے نمبر کی طرح زیادہ معیاری اور پُر وقار بن جاتا۔ غالباً "خراجِ عقیدت" کے حصّہ کی وجہ سے صحافت نمبر ۲ کو دو حصّوں میں تقسیم کرنا پڑا۔

عبدالقوی دسنوی، بھوپال

## بے توجہی

کل ۲۸ دسمبر ۱۹۸۴ء کو جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو چند علمی و ادبی مسائل پر باتیں ہوئی تھیں۔ مختلف مضامین اور کتابوں میں تاریخوں اور واقعات کی صحت کے بارے میں جس بے توجہی اور بے پروائی سے کام لیا جاتا ہے، اس کا خاص طور پر میں نے ذکر کیا تھا۔ آپ سے رخصت ہو کر بس میں بیٹھا تو دسمبر کے "آج کل" کی ورق گردانی شروع کی، جب پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کے مضمون: "مولانا ابوالکلام آزاد اور ہفتہ وار پیغام" تک پہنچا تو پہلے ہی جملہ میں تاریخ کی ایک غلطی پر نظر پڑی۔ فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے:

"مولانا ابوالکلام آزاد رانچی میں پہلی بار قید و بند کی زندگی گزارنے کے بعد جب ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا ہوئے تو اب وہ منفرد اور معتمد صحافی ہی نہیں بلکہ نڈر، رہ نما اور بے باک سیاست داں بھی شمار کئے جانے لگے تھے۔" (صفحہ ۵)

رہائی کی یہ تاریخ صحیح نہیں ہے۔ وہ دسمبر ۱۹۱۹ء کے اواخر میں نہیں جنوری ۱۹۲۰ء کے اوائل بلکہ بالکل شروع میں رہا ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کے اجلاس میں شرکت نہ کر سکے، جو ۲۷ سے ۳۱ دسمبر تک امرتسر میں منعقد ہوئے تھے اور علی برادران، جو فاضل مضمون نگار کی تحریر کردہ تاریخ کے ایک روز بعد یعنی ۲۸ دسمبر کو رہا ہوئے تھے۔ ۳۰ دسمبر کی صبح کو امرتسر پہنچ گئے۔ اسی مضمون میں اور پہلے ہی صفحے پر مولانا آزاد کی ایک تحریر کا جو اقتباس نقل کیا گیا ہے، اس میں خود مولانا نے لکھا ہے کہ وہ جنوری ۱۹۲۰ء میں رہا ہوئے۔ ملاحظہ ہو: "جنوری ۱۹۲۰ء میں جب میں نظر بندی کے گوشۂ قید و بند سے نکلا"... مجھے حیرت ہے کہ خط کشیدہ تاریخ پر فاضل مضمون نگار کی نظر کیوں نہیں پڑی؟!

مولانا آزاد نے مذکورہ بالا اقتباس میں تاریخ نہیں لکھی ہے، مگر میری نوٹ بک کے مطابق مولانا کو یکم جنوری کو رہا کیا گیا تھا، لیکن آپ کو اس خط کے لکھنے سے قبل روزنامہ "ہمدم" (لکھنؤ) کو دیکھا تو اس سے معلوم ہوا کہ ان کی رہائی ۲ جنوری کو ہوئی تھی۔ خبر میں تاریخ کا جو عدد شائع ہوا ہے وہ واضح نہیں ہے۔ اسے دو بھی پڑھا جا سکتا ہے اور تین بھی، یہ خبر ذرا طویل ہے۔ اس لیے صرف ابتدائی حصّہ نقل کرتا ہوں، اس کی سرخی ہے: — مولانا ابوالکلام کی رہائی کی تصدیق" اقتباس ملاحظہ ہو:

> "مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کا ۵ جنوری کا ایک برقی پیام رانچی سے کل مولانا عبدالباری مدظلہ کو ملا ہے، جس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جناب مولانا عبدالباری صاحب کے مبارکباد رہائی کے تار کا شکریہ ادا کیا ہے اور اطلاع دی ہے کہ ان کی بحالی آزادی کے احکام ۲ جنوری کو رانچی میں پہنچے ہیں۔ ابھی یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کب رانچی سے نقل و حرکت فرمائیں گے اور کب کلکتہ تشریف لائیں گے۔"
>
> ("ہمدم" پنجشنبہ مورخہ ۸ جنوری ۱۹۲۰ء صفحہ ۳)

یہ خط صرف اسی تاریخ کی تصحیح کی غرض سے شروع کیا تھا، لیکن یہاں تک لکھنے کے بعد ذرا سانس لینے کے لیے دوسری مضامین پر سرسری نظر ڈالی تو جناب نند کشور وکرم صاحب کے مضمون "ہفتہ وار اخبارات": ایک جائزہ" میں متعدد غلطیاں نظر آئیں۔ عنوان سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس میں صرف ہفتہ وار اخبارات کا جائزہ لیا گیا ہے، مگر متعدد اخبارات ایسے ہیں جو ہفتہ وار نہیں ہیں اور بعض اہم ہفت روزہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، لیکن اُن سب کی نشان دہی کے لیے یہ خط بہت طویل ہو جائے گا۔ ایک یا دو غلطیوں کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔ صفحہ ۴۰ کے کالم دوم میں درج ہے۔ "فروری ۱۹۲۲ء میں مولانا محمد علی جوہر نے دہلی سے "ہمدرد" کی ابتدا کی۔ پہلے اس اخبار کا نام "نقیب ہمدرد" تھا۔ بعد میں تبدیل کر کے "ہمدرد" کر دیا گیا۔" پہلی بات یہ کہ "ہمدرد" اوّل دن سے ایک روزنامہ تھا، اس لیے اس مضمون میں سرے سے اس کے ذکر کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ دوسری بات یہ کہ اس روزنامے کا نام شروع سے آخر تک "ہمدرد" ہی رہا ہے۔ "نقیب ہمدرد" کبھی نہیں تھا۔ تیسری یہ کہ یہ اخبار ۱۹۱۲ء میں نہیں، جیسا کہ مضمون میں چھپا ہے (ممکن ہے کہ بارہ کا عدد کتابت کی غلطی ہو) بلکہ یہ روزنامہ ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو جاری ہوا۔ ان گذارشات کے بعد تھوڑی سی تفصیل ملاحظہ ہو، اس سے "نقیب ہمدرد" کی غلط فہمی دور ہو جائے گی۔

مولانا محمد علی اس روزنامے کو ٹائپ میں نکالنا چاہتے تھے چنانچہ ٹائپ کے لیے ایک بیرونی ملک کو آرڈر بھیج دیا گیا مگر اس میں تاخیر ہوتی چلی گئی، اس لیے دوست احباب کے مشورے پر ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو روزنامہ "ہمدرد" کے نام سے

کی طباعت میں ایک ورقہ اخبار شائع کر دیا گیا۔ جس پر جلد اور نمبر شمار کے بجائے "سلسلۂ خاص" درج ہوتا تھا۔ بعد میں اس کے حجم میں اضافہ بھی کیا گیا۔ چونکہ یہ سلسلۂ خاص اصل اخبار کا معنوی لحاظ سے نقیب تھا۔ اس لیے بعض لوگوں نے اُسے نقیب کے نام سے یاد کیا ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ اس اخبار کی پیشانی لفظِ نقیب کی کبھی مرہونِ منت نہیں ہوئی۔ جب بیروت سے ٹائپ آگیا تو یکم جون ۱۹۱۳ء سے اصل اخبار کی آٹھ صفحات پر اشاعت شروع ہوئی، جس پر پہلی جلد اور پہلا شمارہ درج کیا گیا۔

ایک بات اور اس مضمون میں روزانہ "ہمدم" (لکھنؤ) کا بھی ذکر ہے۔ میرے خیال میں یہ اخبار بھی 'ہمدم' کی طرح شروع سے روزنامہ تھا، اس لیے اس کا بھی یہاں ذکر نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ ناواقف حضرات اسے ہفت روزہ سمجھ لیں گے۔ دوماہی "اکادمی" (لکھنؤ) کے موجودہ مُدیر: مفتی محمد رضا انصاری صاحب نے اس رسالے کے سترت نمبر کے ایک مضمون "فرنگی محل اور اردو صحافت" میں اسی اخبار کے بارے میں لکھا ہے: روزنامہ "ہمدم" (لکھنؤ) جو ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا تھا، مختلف ہاتھوں اور ملکیتوں سے ہو کر ۱۹۴۴ء میں جمال میاں فرزند مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی ملکیت میں آیا اور فرنگی محل سے نکلنا شروع ہوا۔ (دوماہی اکادمی بابت نومبر ۱۹۸۱ء صفحات ۱۰۴-۱۰۵) اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شروع میں یہ اخبار کسی اور کی ملکیت میں تھا اور مکرم صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع سے ہی مولانا عبدالباری مرحوم کی ملکیت میں تھا۔ اسی کے ساتھ "مدینہ" (بجنور) کا بھی ذکر ہے اور اس کے مالک کا نام مولوی عبدالمجید درج ہے، صحیح نام محمد مجید حسن تھا، یہ اخبار یکم مئی ۱۹۱۲ء کو ایک ہفتہ وار کی حیثیت سے جاری ہوا۔ اور جنوری ۱۹۱۷ء سے سہ روزہ ہو گیا اور اسی حیثیت سے غالباً ۱۹۷۴ء میں بند ہو گیا۔

عبداللطیف اعظمی، دہلی

## مہمیز

"آج کل" پہلے صرف رسمیات نبھاتا تھا اب اس نے خیال کو مہمیز کرنا شروع کر دیا ہے اور اس لیے نئے شمارے کا انتظار رہتا ہے۔ جنوری ۱۹۸۵ء کے شمارے میں نند لال واتل کے مضمون: "کشمیر میں اُردو صحافت" میں کچھ سنگین قسم کی واقعاتی غلطیاں در آئی ہیں۔ مثلاً اُن کا یہ بیان کہ ملک راج صراف کا اخبار "رنبیر" مہاراجہ رنبیر سنگھ کے وقت میں جاری ہوا۔ سر تا پا غلط ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کا انتقال ۱۸۸۵ء میں ہوا اور "رنبیر" ۱۹۲۴ء میں شائع ہونا شروع ہوا۔ جس کے صرف ایک سال بعد رنبیر سنگھ کے بیٹے پرتاپ سنگھ بھی چالیس سال راج کرنے کے بعد انتقال کر گئے۔ اسی طرح انہوں نے "رنبیر" کی پیشانی پہ شائع ہونے والے شعر کو جس طرح نقل کیا ہے، ظاہر ہے وہ وزن سے خارج ہو جاتا ہے:

فخر ہم نامی ہے تجھ کو جب شری رنبیر کا
راستہ ہے بے خطر تیری ہمت و تدبیر کا

محمد یوسف ٹینگ، جموں

## نقشِ کوکن

دسمبر ۸۴ء کے شمارے میں اردو صحافت پر آپ کے معزز قلم کاروں کے مضامین دیکھے۔ سبھی مضامین معلومات افزا اور محققانہ تھے۔

ان مضامین میں بمبئی کے ماہناموں کا بھی ذکر آیا ہے۔ جیسے "صبحِ اُمید"، "شاعر"، "گلگن" وغیرہ مگر "نقشِ کوکن" جو یہاں کا ایک علمی، ادبی، مذہبی اور سماجی ماہ نامہ ہے۔ اور جس میں ہمیشہ کارآمد مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ ماہ نامہ ۱۹۶۲ء سے باقاعدہ شائع ہو رہا ہے۔

سمیع اللہ ——— بمبئی

## اُلجھی سُلجھی

میری نظم "لہو کا چراغ" کا بارہواں مصرعہ غلط شائع ہو گیا ہے۔

میرا مصرعہ یہ ہے:

جس کی سُلجھی ہوئی سیاست کا
ذکر تھا محفلِ سیاست میں

لیکن شائع اس طرح ہوا ہے

جس کی اُلجھی ہوئی سیاست کا
ذکر تھا محفلِ سیاست میں

اسی طرح پتہ میں بھی واٹ گنج کو وارث گنج تحریر کیا گیا ہے۔

ظہیر ناشاد، کلکتہ

---

لوک سبھا کے اسپیکر شری بلرام جاکھڑ
۸ رفروری ۱۹۸۵ء کو حیدر آباد میں منعقدہ
پانچ روزہ عالمی جشنِ مزاح
کا افتتاح کرتے ہوئے ۔ حیدر آباد میں
یہ جشنِ مزاح ۸ فروری تا ۱۲ فروری منایا گیا۔
اس میں ۲۰ ملکی و غیر ملکی زبانوں کے ۱۶۰
نمائندوں نے شرکت کی

مرکزی وزیرِ اطلاعات و نشریات
شری وی۔ این۔ گاڈگل،
۹ رفروری ۱۹۸۵ء
کو پانچ روزہ عالمی جشنِ مزاح کی ایک
تقریب میں
مزاحیہ فلموں کے میلے کا افتتاح
کرتے ہوئے ۔

دائیں سرے پر : عالمی جشنِ مزاح کے کارگزار
صدر جناب نریندر لوتھر
دیکھے
جا سکتے ہیں

(تصاویر : شاہ علی)

**Regd. No.** D ( DN ) 103
**R.N.** 948 / 57

Licensed U(DN) 50 to post without pre-payment
at Civil Lines, Post Office, Delhi.

ol. 43 No. 8 AJKAL (URDU) **March 1985**

تشکیلِ شعر:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا لیتے
عرش سے اِدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا
(غالب)

بریجندر سیال

Publishedby the Director Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001, Printed by the Manager, Govt. of India Photolitho Press, Faridabad.

اپریل ۱۹۸۵

# آجکل

ایک روپیہ ۵۰ پیسے

نائب صدر جمہوریہ شری آر۔ وینکٹ رمن ۶ مارچ ۱۹۸۵ء کو نئی دہلی میں اپنی رہائش گاہ پر منعقدہ ایک تقریب میں 'نشانت' کا اجرا کرتے ہوئے۔ 'نشانت' سرسید احمد خاں کے مشہور رسالہ "تہذیب الاخلاق" کا ہندی ترجمہ ہے، جو موصوف نے قومی یکجہتی اور آپسی اتحاد کے فروغ کے لئے شائع کیا تھا۔ تصویر میں: نائب صدر جمہوریہ "نشانت" کا پہلا نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سید حامد کو پیش کر رہے ہیں۔ (تصاویر: فدا علی)

انجمن ترقی اُردو ہند کے اہتمام میں ۹ اور ۱۰ مارچ ۱۹۸۵ء کو نئی دہلی میں مولانا سید سلیمان ندوی کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر دو روزہ کل ہند سمینار منعقد ہوا ـــــ دائیں: گورنر بہار جناب سید مظفر حسین [illegible] سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

# آجکل

نئی دھلی

ایڈیٹر
راج نرائن راز

| جلد : ۴۳ | شمارہ : ۹ | اپریل ۱۹۸۵ء |
|---|---|---|
| قیمت : ایک روپیہ ۵۰ پیسے | فون : ۳۸۷۰۶۹ | چیتر بیساکھ شک سمت ۱۹۰۷ |


## ترتیب



سرورق : الکانیتر

بزنس منیجر : ایل۔آر۔ بترہ — اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس منجال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :
ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ :
بزنس منیجر : پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اندرون ملک : زرِ سالانہ : ۱۵ روپے۔ دو سال کے لیے : ۲۷ روپے — تین سال کے لیے : ۳۸ روپے

ملاحظات

# دوسری اقتصادی اعداد و شماری

۱۹۸۰ء کی اقتصادی اعداد و شماری ملک ں تمام ریاستوں اور مرکزی انتظامیہ حلقوں میں ماسوائے سام کے (آسام میں ۱۹۸۱ء کی مردم شماری نہیں کی گئی) ۱۹۸ء کی مردم شماری کے سلسلے میں خانہ شماری کے ساتھ اتھ ہی کی گئی تھی۔ پہلی اقتصادی اعداد شماری میں صرف یر زرعی اداروں (ایسے ادارے جن میں کم از کم ایک سو ارکن باقاعدہ طور پر ملازم رکھے گئے ہوں) کو شمار کیا گیا تھا بکہ دوسری اقتصادی اعداد و شماری میں باغبانی سے متعلق اروں کے علاوہ باقی تمام زرعی و غیر زراعتی سرگرمیوں والے اروں کا شمار کیا گیا ہے۔

اقتصادی اعداد و شماری کے نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ قومی سطح پر (سوائے آسام کے) ایک کروڑ ۴۸ لاکھ ہزار ادارے (باغبانی کے علاوہ) مختلف اقسام کی اقتصادی رگرمیوں میں مصروف ہیں اور ان میں ۵ کروڑ ۳۵ لاکھ ہزار افراد کو روزگار حاصل ہے۔ ان کاروباری اداروں میں سے ایک کروڑ ۶۹ لاکھ ۳۰ ہزار (۹۲ فیصد) غیر زراعتی ام کرتے ہیں جب کہ باقی ۱۴ لاکھ ۸۰ ہزار (آٹھ فیصد) راعتی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ دیہات میں کام کرنے لے اداروں کی تعداد کل اداروں کے مقابلے میں ۶۱ فیصد ہے۔ غیر زرعی اور زرعی شعبے میں دیہی اداروں کا حصہ ترتیب ۵۸ اور ۸۸ فیصد ہے۔ کل اداروں میں مشترکہ ور پر چلائے جانے والے اداروں کا حصہ ۲۷ فیصد ہے جب کہ ایسے اداروں کا تناسب ۷۳ فیصد ہے جن ملکیت نجی ہے اور جنہیں گھر کے افراد مل کر چلاتے ہیں۔ زرعی اداروں میں سے ۴۸ فی صد اور غیر زرعی اداروں میں سے ۷۲ فی صد ادارے نجی ملکیت کے اور باقی مشترکہ ملکیت کے ہیں۔

اقتصادی اعداد و شماری میں شامل تمام اداروں میں عام طور پر کام کرنے والے ۵ کروڑ ۳۵ لاکھ ۸۰ ہزار افراد میں سے ۲۸ لاکھ ۸۰ ہزار (کل کا ۵ فی صد) زراعتی اداروں میں کام کرتے ہیں۔ زرعی اداروں میں روزگار کے لحاظ سے دیہی علاقوں کا حصہ ۸۶ فی صد ہے۔ غیر زرعی اداروں میں کام کرنے والے افراد کی تعداد ۵ کروڑ ۷ لاکھ ہے جو کل تعداد کے ۹۵ فی صد کے برابر ہے۔ غیر زرعی اداروں میں کام کرنے والے کل افراد میں سے دو کروڑ ۱۹ لاکھ ۵۰ ہزار دیہی علاقوں میں ہیں جن میں سے ۶۶ فی صد افراد اجرت پر کام کرنے والے محنت کش ہیں۔ شہروں میں واقع غیر زراعتی اداروں میں کام کرنے والے ۲ کروڑ ۸۷ لاکھ ۵۰ ہزار افراد کا دو تہائی سے کچھ زیادہ حصہ اجرت پر مزدوری کرنے والا ہے۔ ..............................

زراعتی اداروں میں بیس فی صد افراد ایسے ہیں جو اجرت پر کام کرتے ہیں۔ دیہی اور شہری زرعی اداروں میں کام کرنے والے کل افراد میں ان کا تناسب بالترتیب ۱۸ اور ۳۲ فی صد ہے۔

غیر زراعتی شعبے میں کل روزگار میں خواتین کا تناسب کاروباری اداروں کی نسبت نجی اداروں میں زیادہ ہے۔ نجی اداروں میں ان کی تعداد کل ملازموں کے پانچویں حصہ کے برابر ہے۔ شراکتی اداروں میں روزگار حاصل کرنے والوں میں ان کا تناسب آٹھویں حصے کے برابر ہے۔

ریاستوں اور مرکزی انتظامیہ علاقوں میں آندھرا پردیش، بہار، گجرات، کرناٹک، کیرل، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، تامل ناڈو، اترپردیش اور مغربی بنگال میں سے ہر ایک میں کل غیر زرعی اداروں اور ان میں عام طور پر کام کرنے والے کل افراد کی تعداد کم از کم ۵ فی صد ہے۔ مہاراشٹر ان ریاستوں میں سب سے آگے ہے۔ غیر زرعی اداروں میں عام طور پر کام کرنے والے کل افراد کا ۱۳ فی صد حصہ مہاراشٹر میں ہے۔ دوسرا مقام اترپردیش کا ہے۔ جس کا حصہ ۱۱ فی صد ہے۔ اور تیسرا مقام مغربی بنگال کا ہے۔ جس کا حصہ ۱۰ فی صد ہے۔ غیر زرعی اداروں کی تعداد کے لحاظ سے اترپردیش کو پہلا مقام حاصل ہے کیونکہ وہاں ۱۲ فی صد ادارے موجود ہیں۔ اس کے بعد مہاراشٹر اور تامل ناڈو کا نمبر ہے جہاں ایسے اداروں کی تعداد ملک کے کل اداروں کے دس دس فی صد کے برابر ہے۔ اس فہرست میں کیرل کا مقام سب سے نیچے ہے، جس کا حصہ اداروں کی کل تعداد اور ان میں کام کرنے والوں کے لحاظ سے پانچ فی صد ہے۔

تمام غیر زرعی اداروں کی ۱۲ بڑی بڑی سرگرمیوں کے لحاظ سے زمرہ بندی کی گئی تھی۔ ان کی سیکٹر وار تقسیم سے پتہ چلتا ہے کہ صنعت کاری اور مرمت، تھوک اور پرچون تجارت اور اجتماعی، سماجی و ذاتی خدمات دیہی و شہری دونوں علاقوں کے اداروں کی تعداد اور ان میں عام طور پر کام کرنے والے افراد کے نقطہ نگاہ سے سرگرمیوں کے سب سے اہم گروپ ہیں۔ قومی سطح پر بہار، کیرل اور لکشدیپ کے مرکزی انتظام والے علاقے کے سوا جہاں سے تفصیلی نتیجے ابھی موصول نہیں ہوئے، سرگرمیوں کے ان تین گروپوں کی تعداد کل اداروں میں ۸۹ فی صد اور ان میں عام طور پر کام کرنے والوں کا تناسب کل افراد کے ۸۰ فیصد کے برابر تھا۔

بہار، کیرل اور لکشدیپ کو چھوڑ کر باقی تمام ریاستوں اور مرکزی علاقوں کے تمام زرعی اور غیر زرعی نجی اداروں میں سے ۲۵ فی صد ادارے ذاتی ملکیت کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔ تقریباً ۷ فی صد ادارے موسمی نوعیت کے تھے۔ ۱۵ فی صد بجلی یا ایندھن سے متعلق تھے اور آٹھویں

آگے صفحہ ۱۴ پر

**کالی داس گپتا رضا**

# لالہ کیول رام ہوشیار اور رسالہ شمعِ عرفان

کیول رام ہوشیار ولد سلطان سنگھ، قوم کالیتھ، سکنہ دہلی۔ ولادت تقریباً ۱۸۲۲ء، وفات ۱۸۸۲ء اور ۱۹۰۵ء کے عرصے میں کسی وقت۔ شاید ۶۰ یا ۷۰ سال کی عمر پائی، گویا داغ، حالی، آزاد سے عمر میں کچھ بڑے اور غالب سے لگ بھگ ۲۵ سال چھوٹے تھے۔ غالب کے ایک خط بنام ہوشیار (مشمولہ اُردوئے معلّٰی) سے یہ غلط فہمی بھی پیدا ہوئی کہ ہوشیار، غالب کے شاگرد تھے۔ مگر یہ درست نہیں۔ تذکروں کے مطابق عربی اور فارسی کے علموں میں خوب ملکہ رکھتے تھے اور سیاق اسباق میں اپنے وقت کے استاد تھے۔

رسالہ 'شمعِ عرفان' جس کی صرف آخری دو قسطیں یہاں درج کی جا رہی ہیں، ہوشیار کی تقریباً ۸۰ تصانیف میں سے ایک ہے۔ قدرے بڑی تقطیع کے کُل ۲۸ صفحے ہیں، جن میں ۲۲۱ الفاظ (مفرد و مرکب) کی شرح کی گئی ہے۔

دیباچے کا مفہوم یہ ہے کہ بیشتر دواوین میں شاہد و مُل، ساغر و گُل، ساقی، صہبا، جام، شراب، غمزہ، خال، گیسو، قلندر، رند، سالک وغیرہ کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اگر ان کے ظاہری معنی مراد لیں تو اس سے فاسق خیال پیدا ہو سکتے ہیں لہٰذا اس رسالے میں تا مقدور تحقیق کرکے عام فائدے کے لیے الفاظ و کلمات کے عارفانہ معنی دیئے گئے ہیں۔

رسالہ کا متن فارسی میں ہے اور حواشی کے اشعار اردو میں ہیں۔ ان کے نیچے لمبی لکیر کے بعد مزید حاشیے، جو لفظ کی وضاحت میں معاون ہو سکتے ہیں، میں نے اضافہ کئے ہیں۔ کم و بیش تمام فارسی متن کو بھی میں نے اردو میں ڈھال دیا ہے۔ اس رسالے کو عارفانہ الفاظ کا ایک چھوٹا سا لغت کہنا بے جا نہ ہوگا۔

۱۲۱
## صاحبدل

مرشد سے کنایہ ہے

اہلِ دل، عارف، خداشناس، حق آشنا

(نظم طباطبائی) ؎

خدا ہی کو خبر ہے کیسے کیسے ہوں گے صاحبِ دل

## ۱۲۲ صاحبِ دیوان

"معشوقِ حقیقی و قضا و قدر" سے کنایہ ہے

شاعر، جس کا کلام، مطبوعہ یا غیر مطبوعہ، کتابی شکل میں جمع ہو چکا ہو۔

## ۱۲۳ صبا

ہوا، جو مشرق کی طرف سے آتی ہے۔ بہار اور تذکرۂ اولیا میں ہے کہ صبا وہ ہوا ہے، جو عرش کے نیچے سے اُٹھتی ہے اور صبح کے وقت چلتی ہے اس سے گُل کھلتے ہیں۔ عبدالرزاق کاشی کی اصطلاح میں صبا "نفحاتِ رحمانیت" ہے اور دیوانِ حافظ کی شرح میں الہام اور مکاشفۂ سبحانی ہے کہ اسے نفحۂ غیبی کہتے ہیں۔ اس کا کنایہ سالکِ کامل، رفیق، مرشد، ملک الموت، عالموں، فاضلوں سے کرتے ہیں۔ حافظ کہتا ہے ؎

نشانِ یار سفر کردہ از کہ پرسم باز
کہ ہر چہ گفت بریدِ صبا پریشاں گفت

□ ۴۳-اے، بی درشن، چوتھی منزل، نیپین سی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۳۶

ا عالموں فاضلوں نے مخالفت ہی کی ہے ؎

مے رسد بادِ صبا رقص کناں مے آید
خوش نسیم است کہ از مشرقِ جاں مے آید
با صبا ہمراہ بفرست از رُخت گلدستۂ
بوکہ بوئے بشنوم از باغ دبستانِ شما
اے صبا گر بجوانانِ چمن باز رسی
خدمتِ ما برساں سرو و گل و ریحاں را

---

وہ ٹھنڈی ہوا جو پچھلی رات یا صبح کو چلے۔
الاستعمال ۔ (جوش ملسیانی) ؎
خدا جانے صبا ہر روز کیا پیغام لاتی ہے
کہ پہروں کانپتے رہتے ہیں تنکے آشیانوں میں

## ۱۲ صبح

سالک پر حقیقت ظاہر ہونے کے وقت سے
ایہ ہے کہ اس وقت وہ بہت شور و غوغا کرتا ہے۔
ں سفیدی سے بھی عبارت ہے، جو آفتابِ حقیقت
دع ہونے سے پہلے سالک کے دل پر ظہور کرتی
ہے۔ "دریافتِ نیستی و فنا" اور ملکِ بقا کی
نے توجہ کرنے سے بھی عبارت ہے۔

---

تڑکا، سویرے کا وقت۔ (داغ) ؎
صبح ان مست نگاہوں کا نہ پوچھو عالم
جن میں تھا رات کا کچھ نشۂ صہبا باقی

## ۱۲ صبحِ دولت

وقتِ وصل سے کنایہ ہے

## ۱۲ صحبتِ یاراں

نفس و صدر کی صحبت سے کنایہ ہے، جو
لب اور مطلوب کے درمیان ہوتی ہے۔ حافظ
؎
صحنِ بستاں روح بخش و صحبتِ یاراں خوش است
وقتِ گل خوش باد کز وے وقتِ میخواراں خوش است

صحنِ بستاں یعنی دنیائے ذوق بخش اور
صحبتِ جسم و نفسِ خوش، یعنی اگرچہ ملکِ عدم
میں ہم وصل میں مستغرق ہیں لیکن اس کی قدر
نہیں جانتے ہیں۔ جب دنیا میں پہنچتے ہیں اور
فراق کی اذیت کو چکھتے ہیں تب قدرِ وصال ہوتی
ہے۔

## ۱۲۷ صراحی

مردِ روحانی اور عارفِ سبحانی سے کنایہ
ہے اور عبارت اس مقام سے کہ جہاں سالک
تحیر پذیر ہو جاتا ہے اور فتوحاتِ غیبی اس کے
دل پر وارد ہوتی ہیں۔ عارف کے باطن سے بھی
عبارت ہے۔ معنیِ اول میں حافظ ؎
دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیِ مئے ناب و سفینۂ غزل است
حاشیہ (انشا) ؎
کیا کام ہم کو سجدۂ دیر و حرم کے ساتھ
مستوں کا سر جھکے ہے صراحی کے خم کے ساتھ

---

؎
نشہ میں شب جو دیکھی اس بتِ مغرور کی گردن
صراحی کی تو ساقی نے پٹک کر چُور کی گردن

## ۱۲۸ صلاح

بالفتح، نیکو کار ہونا۔ دیوانِ حافظ کی شرح
میں درج ہے کہ صلاح کے معنی پرہیزگاری کے ہیں
اور عبارت ہے نتیجۂ ہستی سے۔ جب تک کوئی
اس ہستیٔ موہوم میں وجود پذیر نہ ہو اس کا نتیجہ
بھی وجود میں نہیں آتا۔ اس لیے اگر ہستی منظور
ہے تو خدا پرستی دُور ہے۔

---

مشورہ، رائے، اچھائی، نیکی وغیرہ جیسے
(ذوق) ؎
اس چشمِ مست کے ہیں خراباتیوں میں ہم
تقویٰ کہاں و زہد کجا و کجا صلاح

## ۱۲۹ صلیب

چلیپا (چلیب) کا معرب ہے جو اس صورت
✝ سے مشہور ہے۔ عیسائی لوگ اپنی دانست میں
اسے حضرت عیسیٰ کی شبیہہ جانتے ہیں اور اس کی
پرستش کرتے ہیں۔

---

بمعنی سُولی (میر) ؎
یہ رُتبہ آپ کا تھا کہ تھا عرش زیرِ پا
عیسیٰ کی بس بلندیٔ رفعت صلیب تھی

## ۱۳۰ صورت اللہ

انسانِ کامل سے کنایہ ہے۔

## ۱۳۱ صُوفی

صوف پوش یعنی پشمینہ پوش۔ پہلے پہل جس نے
صوف پہنا وہ آدم تھا۔ سالکوں کی اصطلاح میں
اُسے کہتے ہیں، جو دل کی غیر خدا باتوں کو نگاہ میں
رکھتا ہے اور وہ جو عبادت اور ریاضت میں رہے۔

---

پشم پوش، تارک الدنیا، درویش وغیرہ۔
پرہیزگار کو بھی کہتے ہیں (داغ) ؎
بزمِ دشمن میں، ہے آپ تو صوفی بن کر
سُرخ آنکھوں میں کہاں ہے اثرِ جامِ شراب

## ۱۳۲ صومعہ

عیسائی اور آتش پرست زاہدوں کا معبد۔
(شاد عظیم آبادی) ؎
میں درِ حرم کے شگاف سے تجھے جھانکتا ہوں یہی بہی ہوں
یہ نہیں تو پھر درِ صومعہ جو قریب ہو تو وہیں سہی

## ۱۳۳ طالب

جو لذّاتِ نفسانی اور طبعی خواہشوں پر عبور
رکھتا ہو اور روئے حقیقت سے پندارِ خودی کا پردہ
ہٹا دے اور کثرت سے وحدت کی طرف رواں ہو تاکہ

کامل انسان بن سکے۔ اس مقام کو مقامِ انسانی
کہتے ہیں کہ طالبوں کی جستجو کی انتہا یہی ہے۔

---

طلب کرنے والا، چاہنے والا۔ (تعشق) ؎
میں باغ میں ہوں طالب دیدار کسی کا
گل پر ہے نظر، دھیان میں رخسار کسی کا

## ۱۳۴ طرّہ

بمعنی گیسو و گوشۂ جامہ۔ دستار کا گوشہ۔
پیشانی پر چھوڑی ہوئی بڑی لٹ۔ شاعروں کی
اصطلاح میں طرّہ ان بالوں کو کہتے ہیں جو کندھوں
تک آئیں اور زیادہ دراز ہونے کی وجہ سے
پیچھے باندھے جائیں۔ چنانچہ یہ شعر انہیں معنوں
میں کشف اللغات میں آیا ہے ؎
یا غمزہ را بندے بدہ تا ترک غمازی کند
یا طرّہ را بندے بنہ تا ترک طرازی کند
اور اس فرقہ میں جذبۂ الٰہی سے کنایہ ہے کہ مشتاق
کو دولت کی طرف کھینچتا ہے۔
(حاشیہ) سودا ؎
طرّہ کے تیرے واسطے صد چوب شانہ وار
قمری گئی ہے کاٹنے شمشاد کی طرف

## ۱۳۵ طریقت

منازل اربعہ شریعت، طریقت، حقیقت،
........ معرفت میں سے ایک منزل ہے —
اصطلاحاً پیروں کے اُس طریقے کو کہتے ہیں جو اللہ
کے سالک سے مختص ہے۔ ؎
اسرار طریقت دیں چنیں است
رہ رو کہ طریق ما ہمیں است

---

تزکیۂ نفس، تصوّف کی ایک اصطلاح
(میر) ؎
یقیں مالزوہ احول ہیں جو ان دو کو جدا سمجھیں
نہیں ہے فرق مو بھر بھی، شریعت اور طریقت میں

## ۱۳۶ طوطی

مرشد سے کنایہ ہے۔ (حافظ) ؎
الا رے طوطیِ دانائے اسرار
مبادا خالیت شکر ز منقار

---

توتی کا معرّب۔ ایک مشہور پرندے کا نام۔
اس لفظ کے ساتھ کئی محاورے بھی وابستہ ہیں۔
جیسے طوطی کی آواز نقار خانے میں کون سنتا ہے۔
ذوقؔ ؎
صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقار خانے میں
طوطی بولنا (ذوقؔ) ؎
خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیّاد کا
وغیرہ وغیرہ۔

## ۱۳۷ عارف

اُسے کہتے ہیں کہ جس میں بطریق حالت و شہود
مشاہدہ الٰہی علامتیں پیدا ہو جائیں۔ اس صاحب
نظر کو بھی کہتے ہیں، جسے اللہ تعالیٰ ذات و صفات و
اسماء و افعال خود دیکھنے کے لیے بصیرت بخشتا ہے۔

---

جاننے والا، واقف کار، خدا شناس جیسے
(شاد عظیم آبادی) ؎
اساتذہ بھی وہ عارف جو اپنے وقت کے تھے
غرض کچھ اور نہ تھی حق کی معرفت کے سوا

## ۱۳۸ عاشق

کسی کی دوستی پر شیفتہ۔ اصطلاحاً اُسے کہتے
ہیں جو زبان کو ذکر میں، دل کو فکر میں، جان کو
مشاہدے میں مشغول رکھے اور تڑپتے ہوئے
دل، روتی ہوئی آنکھ، زرد چہرے، بکھرے ہوئے
بالوں کے ساتھ سر سے پا تک برہنہ ہو کر شب و
روز کوئے دوست میں جائے۔
حاشیہ (سودا)
سودا ہوا جب عاشق کیا پاس آبرو کا
سنتا ہے اے دِوانے جب دل دیا تو پھر کیا

---

کثیر الاستعمال

## ۱۳۹ عالم

بکسر لام وہ ہے جو علم الیقین کی وجہ
"ذات و صفات و اسمائے الٰہی" سے واقف
جاتا ہے۔

---

دانا، پڑھا لکھا، صاحب علم جیسے (عز
تھا وہ اک شاعر گراں مایہ
تھا یہ اک عالم علوم و فنون

## ۱۴۰ عَدو

ابلیس اور نفسِ امّارہ سے کنایہ اور دنیا
عبارت۔

---

بدخواہ، دشمن۔ رقیب کے معنی میں بھی
ہیں جیسے (شفیق) ؎
مری یہ حالت ہے زندگی بھر کی
کبھی عدو کی شکایت کبھی مقدّر کی

## ۱۴۱ عرق چیں

ایک مرکب کا نام ہے۔ محبوب حقیقی —
کنایہ ہے۔

---

پسینہ پونچھنے کی چیز۔ ایک قسم کی گول ٹوپی

## ۱۴۲ عشق

عشقہ سے مشتق۔ ایک قسم کی بیل جسے عشق
پیچاں کہتے ہیں۔ اس کے خواص میں ہے کہ جس
کو لپیٹ جاتی ہے، اُسے خشک کر دیتی ہے۔ ا
مناسبت سے ایسی حالت کو عشق کہتے ہیں کہ جسے

آتا ہے اُسے کمزور کر دیتا ہے ۔ اصطلاح میں محبت
حالات کو عشق کہتے ہیں ، جو ایک ہی ذات میں اکٹھی
ہو جاتی ہے اور یہ خبر حق کو نہیں ہوتی ۔ شیخ فخرالدین
عراقی نے عاشقی کا اطلاق احدیت پر کیا ہے ۔
حاشیہ ؎

عشق کا منصب لکھا جس دم مری تقدیر میں
داغ کی نقدی ملی ، صحرا ملا جاگیر میں

## ۱۴۲ عنقا

کشف اللغات میں بالفتح بمعنی سیمرغ ۔
وہ عورت اور مرد جس کی گردن لمبی ہوتی ہے ۔
تحتی زمانہ ۔ صاحب برہان کہتا ہے کہ عنقا
سیمرغ کو کہتے ہیں اور اسے عنقائے مغرب (بضم
میم ) پڑھتے ہیں اور مُغربیت ( دُور جانا ، الوکھی
چیز لانا ) کے سبب سے چیزوں پر نابود و معدوم کرنے
کا عمل کرتے ہیں ۔ ہر نا ملنے والی چیز سے کنایہ کرتے
ہیں ۔ تصوف کی اصطلاح میں ہیولیٰ (وحشت ،
خوف ) سے کنایہ کرتے ہیں ۔ کیوں کہ ہیولیٰ کو عنقا
کی طرح نہیں دیکھا جا سکتا ۔ ذاتِ پاک ، رب العباد
سے بھی عبارت ہے ۔ خاقانی ؎

مرا آئینۂ وحدت نماید صورتِ عنقا
مرا پروانۂ عزلت دہد ملکِ سلیمانی

## ۱۴۴ عید

مشاہدات کے زمانے کو کہتے ہیں کیوں کہ
سالکوں کے لیے یہ زمانہ صفاتِ الٰہی کی تجلّی کی
دریافت کا ہوتا ہے

---

خوشی کا دن ۔ لغوی معنی میں جو بار بار آئے
" چونکہ یہ ہر سال عود کرتی ہے اس وجہ سے عید
کہتے ہیں "
؎ اب چاہے چاند ہو کہ نہ ہو عید ہو گی

---

؎ تیرے گھر میں تو عید ، قائل ، ہوئی

## ۱۴۵ غبغب

گلے کے نیچے کی کھال اور کنایہ ہے حصولِ جذبۂ
عشق و محبت سے ۔ حافظ ؎

بنوش جام صبوحی بنالۂ دف و چنگ
ببوس غبغبِ ساقی بنغمۂ نے و عود

جامِ صبوحی کو دف و چنگ کے نالے کے ساتھ پی
یعنی نالہ کرنے والوں سے ہوشیار رہ اور نے و عود
یعنی مرشد کے بیان غبغبِ ساقی کو چوم جو جذبۂ
عشق کے حصول کے مترادف ہے ۔

---

ٹھُڈی کے نیچے کا لٹکا ہوا گوشت ۔ بیشتر
چاہِ غبغب مستعمل ہے ۔ جیسے (جلال) ؎
چاہِ غبغب سے نکلتے ہی ہوئی قید نصیب

## ۱۴۶ غزل

اس کلام کو کہتے ہیں جو اسرارِ وجود سے
آگاہی بخشتا ہے ۔ عارفوں اور مرشدوں کے
کلام سے عبارت ہے ۔

---

لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا ۔ اصطلاحاً
وہ باتیں جو عشق سے متعلق ہوں ۔ شاعری کی مشہور
صنف ۔ (غالب) ؎

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

## ۱۴۷ غمزہ

آنکھ سے اشارہ کرنا ۔ عاشقوں کی اصطلاح
میں محبوب کا آنکھ کھولنا اور غمزہ برہم ہونا اُسے
کہتے ہیں جو "حالتِ دلربائی" میں واقع ہوتا ہے ۔
آنکھ کا برہم ہونا کنایہ ہے عدمِ التفات سے
اور آنکھ کھولنا ۔ اشارہ ہے مردمی اور دلنوازی
کی طرف ۔

---

ناز ، نخرہ ، ادا کے معنی میں بھی آتا ہے بلکہ بیشتر
انہیں معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ (میر) ؎

ناز ، ادا ، آن ، حیا ، غمزہ ، کرشمہ ، شوخی
لے گیا دل کو اُڑا کر کوئی ان ساتوں میں

## ۱۴۸ غیبت

ناپید ہونا ، اصطلاحی معنوں میں میر سید حسینی
نے کیا خوب کہا ہے ؎

در تنگی باخود اندر کوئے او
کم شو از خود با بیا لے بوئے او
تا تو نزدیک خودی زیں حرف دور
غیبتے باید دگر باید حضور

---

غیر موجودگی ، پیٹھ پیچھے بدگوئی کرنا جیسے (فائز دہلوی)
؎ میرے ہی منہ پہ بدی صاف ہے غیبت میری

## ۱۴۹ غیر

اصلاحِ صوفیہ عالم کون کہ براسم غیریت و
سوائیت اطلاق کند "

---

بیگانہ ، الگ ، ان میل ، حرفِ نفی کی جگہ ، دگرگوں
جیسے حالت غیر ہو گئی ۔ رقیب کے معنی میں بھی آتا ہے ۔
جیسے (امیر) ؎

میری ہر بات میں ہیں سو سو عذر
غیر کی بات مان لیتے ہیں

## ۱۵۰ فراق

کسی سے جُدا ہونا ۔ اصطلاح میں فراق سے یہ
مراد ہے کہ اگر عاشق معشوق سے ایک لمحے کے لیے
جُدا ہوتا ہے تو وہ اس کے لیے سو سال کا فراق ہو گا اور
فراق غیبت کو بھی کہتے ہیں یعنی سالک کا اپنے وطنِ
اصل جو باطن ہے ، سے باہر آنا ۔ یعنی عالمِ ظہور میں آ جانا
فراق اور عالمِ ظہور سے واپس عالمِ بطون میں جانا وصال
ہے ؎

فراق روئے تو بسیار شد چہ چارہ کنم
مگر لباسِ حیاتی کہ ہست پارہ کنم

حاشیہ (نظیر) ؎
گئی مصیبتِ روزِ فراق سب یکبار
کہ اب قریب شبِ وصلِ یار آپہنچی

---

کثیر الاستعمال

## ۱۵۱ فرشتہ وش

صفاتی اسموں میں سے ہے۔ رحم و کرم والا۔ "صدر پرویش"

---

فرشتے کی مانند

## ۱۵۲ فقر

درویشی اور محتاجگی۔ سالکوں کی اصطلاح میں فنا فی اللہ سے عبارت ہے۔

---

فقیری، بے نیازی جیسے : ؎
اے رسؔا! پاتے ہی خرقہ فقر کا
دل حریر و پرنیاں دینے لگا

## ۱۵۳ فقیر

درویش اور محتاج۔ صوفیوں کی اصطلاح میں فقیر اس کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا محتاج نہ ہو جیسا کہ کہتے ہیں "الفقر لا یحتاج الی اللہ تعالیٰ" شیخ حریری نے کہا ہے کہ چونکہ فقیر نیستی کے سمندر میں غوطہ لگاتا ہے، اس لیے اسے کوئی حاجت نہیں رہتی۔

---

اہلِ فقر، بے نیاز جیسے ؎
ہم پلہ پھر بھی ہو نہ سکے اہلِ فقر کے
تولے گئے ہزار دفعہ سیم و زر سے ہیں

## ۱۵۴ فنا

"قوم وحدت" کے درمیان تفرقہ و تمیز کے زائل ہوتے سے عبارت ہے۔ کیوں کہ جب بصیرتِ رُوح، ذاتِ الٰہی کے مشاہدے میں جذب ہو جاتی ہے تو نورِ عقل جو کہ فرق ڈالنے والا ہے، نورِ ذاتِ الٰہی کے غلبے میں گم ہو جاتا ہے جیسے کہ تاروں کی روشنی، سورج نکلنے کے بعد۔

---

نیستی، بقا کی ضد جیسے (دبیر) ع
اس راہ میں بقا ہی بقا ہے فنا نہیں

## ۱۵۵ قاضی

حرص و آز سے کنایہ ہے

---

حاکمِ شرع، نکاح پڑھانے والا، طنزاً بڑا آدمی اجارہ دار کو بھی کہتے ہیں۔ جیسے (سحر) ع
قاضی ہیں آپ شہر کے یا کوتوال ہیں

## ۱۵۶ قد

قامت، سالکوں کی اصطلاح میں امتداد حضرت الٰہی سے عبارت ہے کہ "برزخ وجوب و امکان" ہے۔

---

جسم کی لمبائی، ڈیل ڈول، قدآور، قد آزاد، قد بالا وغیرہ کئی طرح استعمال میں ہے۔

## ۱۵۷ قدح

جام کا مرادف جس کا بیان پہلے آچکا ہے

---

بڑا پیالہ۔ (آتش) ع
دستِ مسیح میں ہے قدح آفتاب کا

## ۱۵۸ قرب

اس لفظ کے معنی میں کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

از خیالِ نفس ظلمانی بر آئے
تا شوی شائستہ قربِ خدائے
قربِ حق دوری بود از بود خویش
بے زبانِ خود تیابی سودِ خویش

---

نزدیکی، قریب ہونا (مہری چند اختر) ؎
جنھیں حاصل ہے تیرا قرب خوش قسمت سہی لیکن
تری حسرت لیے مرجانے والے اور ہوتے ہیں

## ۱۵۹ قطب

مہتر اور سالار۔ وہ کیلی جس کے اردگرد چکّی گھومتی ہے۔ ایک ستارہ کہ آسمان کا مدار اسی پر ہے۔ صوفیوں کی اصطلاح میں قطب اور غوث ایک ولی کا لقب ہے کہ تمام ولیوں کا سرخیل ہے اور اس کا نام عبداللہ ہے۔

## ۱۶۰ قفس

پنجرہ۔ جسم سے کنایہ ہے اور یہ لغت سینِ مہملہ (س) سے بھی ہے۔

حاشیہ (نظیر) ؎
توڑ کر پرواز کرتے ہم قفس کی تیلیاں
پر نہ تھیں اے ہم صفیرو! اپنے بس کی تیلیاں

## ۱۶۱ قلّاش

بالفتح و تشدید۔ ہر دو عالم سے مجرّد۔ بے نام و ننگ۔ سالکوں کی اصطلاح میں قلّاش اسے کہتے ہیں جو طریقت کی کسی تجلّی سے بیزار نہ ہو اور آہستہ آہستہ وحدت کے سمندر کو پی جائے اور ہل من مزید کا نعرہ مارے۔

---

مفلس، نادار (میر) ع
بادشاہ و وزیر سب قلّاش

## ۱۶۲ قلقل

فصاحت و بلاغت مقال سے کنایہ ہے

---

صراحی سے شراب یا پانی نکلنے کی آواز (ناسخ) ع

اُدھر ہے نغمۂ بلبل اِدھر شیشے کی قلقل ہے

## ۱۶۳ قلندر

اُسے کہتے ہیں جسے دو عالم سے "تجرید و تفرید" حاصل ہو۔ قلندر کا مذہب اس ذات سے عبارت ہے، جو نقوش و اشکال سے ماورا ہو کر روح کے مرتبہ تک ترقی کر جائے۔ قلندر، ملامتی اور صوفی میں یہ فرق ہے کہ قلندر کمال درجے کی تجرید و تفرید رکھتا ہے اور عبادت کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ ملامتی وہ ہوتا ہے کہ "کتمِ عبادت" کے لیے کوشاں ہو یعنی کچھ بھی ظاہر نہ کرے اور صوفی وہ جو "مشغول بخلق" نہ ہو اور اس کے رد و قبول پر دھیان نہ دے۔ ؎

قلندرانِ طریقت بہ نیم جو نخرند
قبائے اطلسِ آنکس کہ از ہنر عاریست

## ۱۶۴ قند

شیرینیٔ معروف۔ دنیا سے مراد۔ حافظ ؎

از جاشنیٔ قند مگو، ہیچ و از شکر
زاں رو کہ مرا بالبِ شیرینِ تو کام است

## ۱۶۵ کافر

بکسر فا، چھپانے والا۔ اصطلاحاً سالکوں کو کافر کہا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ کی تعینات دکثرت سے ڈھانپتا ہے۔ شیخ مغربی نے کیا اچھا کہا ہے۔

؎ ز روئے ذات بر افگن نقاب اسما را
نہاں باسم مکن چہرۂ مسمیٰ را

شاعر لفظ کافر کو بفتح فا استعمال کرتے ہیں اور یہ اس لیے ہے کہ اکثر نے کافر کو ظالم، بے رحم اور شوخ کے معنوں میں لیا ہے، اس لیے پہلے معنی میں احتیاطاً اور تمیز کے طور پر اعراب کو بدل دیا ہے۔

---

ستمگر، بے رحم، فتنہ انگیز، کم بخت معشوق جیسے (یگانہ) ؎

جنونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو کافر کی سادگی برستی ہے

## ۱۶۶۔ کبکِ خوش خرام

سالک اور معشوق سے کنایہ ہے:

---

کبکِ دری (خوش خرام تیتر، چکور) جیسے
(انیس) ؏

سارا چلن خرام میں کبکِ دری کا ہے

## ۱۶۷ کدو

آسمان سے کنایہ ہے اور وجودِ سالک سے عبارت ہے۔ حافظ ؎

ساقی بچند رنگ مے اندر پیالہ ریز
ایں نقش ہا نگر کہ چہ خوش در کدو بہ بست
یعنی وجودِ سالک میں یا آسمان میں۔

---

صراحی، کوزۂ شراب۔ اور بھی کئی معنی ہیں مگر یہاں ان کا اطلاق نہیں ہوتا۔

## ۱۶۸ کرشمہ

(بفتحتین) ناز۔ شرحِ مخزن میں چشم و ابرو کی حرکت کے معنی میں آیا ہے اور شاہدوں کی تجلیوں سے کنایہ ہے۔

---

آنکھ کا اشارہ، نرالی بات، چال، نشان، علامت۔ جیسے (حالی) ؎

نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ اک اُن کی جہالت کا تھا وہ

## ۱۶۹ کعبہ

گھر ہے "مسجودِ محمدیاں" اور واسطے کعبہ اس جہت سے کہتے ہیں کہ اس کا عرض، طول، بلندی سب برابر ہے۔ اسی طرح جسم کو کعبہ کہتے ہیں اور ظاہر پرستوں کے زہد و ورع سے کنایہ ہے۔ محبوبِ حقیقی سے بھی مراد ہے۔

حاشیہ (انشا) ؎

موقوف دیر و کعبہ نہیں ہے فتادگی
مخمور ہیں نشے میں جہاں گر پڑے پڑے

جوشؔ ملیح آبادی ؎

کعبہ کے گرد ایک کرن گھومنے لگی
رُوحِ محمدِ عربی جھومنے لگی

## ۱۷۰۔ کُفر

انکار کرنا اور چھپانا۔ صوفیوں کی اصطلاح میں کفر، کثرت کے چھپانے اور اپنی ہستی اور یقین کو ذاتِ الٰہی میں محو کر دینے کو کہتے ہیں۔

حاشیہ (سودا) ؎

نہ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے کام
مدعا ساقی سے اپنے ہمیں اور جام سے کام

---

خدا کا انکار (غالب) ؎

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر

ضد، ہٹ وغیرہ (دیا شنکر نسیم)

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

## ۱۷۱ کفرِ زلف

دنیا کی لذتوں سے مراد ہے اور اس کی ضد "مایۂ جاں" کے لفظ میں آگے آئے گی۔

## ۱۷۲ کمر

'میان' کا مرادف ہے جس کا ذکر آگے آئے گا

حاشیہ (سودا) ؎

دیوان میں سادی ہی جگہ چھوڑ دی ہم نے
مضمون یہ باندھا تری نازک کمری کا

(جرأت) ؎ صنم سنتے ہیں تیری بھی کمر ہے
کہاں ہے کس طرف ہے اور کدھر ہے

ذمہ اصطلاحات اور سائنس کی کتابوں [ کا ] اتنا بڑا کام سپرد کیا ہے کہ روزانہ بارہ گھنٹے کام کرنا پڑے گا۔ اب سفر کی تیاری کر رہا ہوں۔ کم سے کم ایک ماہ رہوں گا۔ والسلام۔

خیر طلب
عبدالحق

(۶)

انجمن ترقی اردو پاکستان
ہاسپٹل روڈ، کراچی
۳۰ ستمبر ۱۹۵۱ء

Phone: 2784

شفیقی زاد لطفہ - السلام علیکم

خط پہنچا حالات معلوم ہوئے۔ انشاء اللہ آپ کا ہسپتال بن کے رہے گا۔ چندے کی رقم فی الحال آپ کو نہیں ملے گی، لیکن کچھ دنوں کے بعد ضرور ملے گی۔ اور کام آپ کی حسبِ منشا پورا ہوگا۔

آج کل یہاں کا موسم بہت اچھا ہے اور یہاں کے قیام سے میری صحت کو فائدہ پہنچا ہے۔ پھل بکثرت ہیں۔ آڑو، انگور، سیب، ناشپاتی، سردہ وغیرہ ارزاں ہیں۔ ایک تندوری روٹی جو میں پوری نہیں کھا سکتا ایک آنے میں ملتی ہے اور بہت مزیدار ہوتی ہے۔

میں یہاں بلوچستان اردو کانفرنس کرنے کا ڈول ڈال رہا ہوں۔ اس لیے میرا قیام یہاں کچھ دنوں اور رہے گا۔

ریلوے ہسپتال کے ڈاکٹر اپنی مہربانی سے ہر روز نو دس بجے آکر اپنے ساتھ ہسپتال لے جاتے ہیں اور الٹرا وائیلیٹ ریز ...... Ultra violet rays کا عمل میرے گھٹنوں پر کرتے ہیں، اس سے درد میں تخفیف ہے۔ بیٹھے رہنے یا لیٹے رہنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی، البتہ زیادہ چلنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ روزانہ صبح شام ٹہلنے کو جاتا ہوں۔ ڈیڑھ ڈیڑھ میل بس زیادہ نہیں۔ چلنا اس لیے جاری رکھا ہے کہ اگر موقوف کر دوں گا تو رگیں سخت ہو جائیں گی اور چلنے پھرنے سے محروم ہو جاؤں گا۔

یہ ہماری عمر کی آخری منزل ہے، جہاں تک ہو سکے کچھ کرتے رہنا چاہیے۔

خیر طلب:
عبدالحق

۱؎ اگرچہ خط کے لیے انجمن ترقی اُردو۔ کراچی کا پیڈ استعمال کیا گیا ہے، لیکن مضمون سے ظاہر ہے کہ کوئٹے سے لکھا گیا ہے، جہاں جانے کے لیے پچھلے خط میں لکھا گیا تھا۔

(۷)

انجمن ترقی اردو پاکستان ۱؎
اسپتال روڈ، کراچی - ۱
مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۵۲

نمبر فون ۲۷۸۳
نمبر ۱۱۹۵

شفیقی و محبی - السلام علیکم

دو خط لکھے - ایک کا بھی جواب نہ ملا ۲؎، اس سے طبیعت بہت پریشان رہی اور آپ کی صحت کی طرف سے بہت اندیشہ لاحق ہو گیا۔ پھر خط لکھنے والا تھا کہ آپ کا پارسل ملا، جسے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اب جو کھول کر دیکھتا ہوں تو مولوی سلیمان اشرف مرحوم کی کتاب "الحج" نکلی۔ خط بہت تلاش کیا، نہ ملا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی۔ آپ نے اپنی حالت اور صحت مزاج سے مطلع نہ کیا۔ اس کتاب کے بھیجنے کا مقصد میں سمجھ گیا۔ یہ اشارہ ہے حج بیت اللہ کے عزم کا۔ افسوس اس سال ممکن نہیں۔ انجمن کی حالت نازک ہے۔ ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ دوسرے اس سال مکۂ معظمہ میں گرمی اس شدت کی ہوگی کہ حج عذابِ جان ہو جائے گا اور اس کا ثواب ایک چوتھائی بھی نہ رہے گا۔

مہربانی کر کے اپنی صحت و خیریت سے فوراً اطلاع کیجئے تاکہ رفع پریشانی ہو۔

خیر طلب
عبدالحق

دلکشا - پیٹرز روڈ
رام پیٹھ، مدراس

مشفقی و مکرمی - تسلیم

عنایت نامہ پہنچا۔ میں پٹنے سے آیا تو ناگپور جانا پڑا۔ اس کی وج

۱- پچھلے آٹھ خطوں میں سے دو سادہ کاغذ پر لکھے گئے ہیں۔ باقی پانچ انجمن کے مطبوعہ پیڈ پر جو انگریزی اور اُردو دونوں میں ہے۔ یہ آٹھواں خط جس پیڈ پر لکھا گیا ہے وہ صرف اُردو میں ہے۔
۲- پچھلے دونوں خطوں پر لکھا ہے کہ جواب بھیجا گیا، اس لیے راستے میں دونوں خط ضائع ہو گئے ہوں گے۔ پیشِ نظر خط پر بھی ۲۵ اپریل ۱۹۵۲ء کو لکھا گیا ہے: "جواب روانہ شد" ۱۲ ستمبر ۱۹۵۱ء کے خط کا جواب ۲۵ ستمبر ۱۹۵۱ء کو اور ۳۰ ستمبر ۱۹۵۱ء کے خط کا جواب ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو بھیجا گیا ہے۔

م کا ہجوم اس قدر ہو گیا تھا کہ خط کا جواب نہ لکھ سکا۔ اتنے میں مجھے
ں آنا پڑا۔ یہاں پہلے کچھ کام کر گیا تھا، مگر وہ کام اس سے آگے نہ
۔ اب میں نے انجمن کی شاخ کی ازسرِ نو تنظیم کی ہے۔ آج بعض مقامات
رسے پر جا رہا ہوں، جو مدرسے قائم کیے تھے، انہیں دیکھوں گا اور
جہاں ضرورت ہوگی، نئے مدرسے قائم کروں گا۔ اس صوبے میں مجھے
لز بنانے پڑیں گے۔ ان مقامات کو بھی ایک نظر دیکھ لوں گا۔

آپ کی شکایت بالکل بجا ہے، مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ روز بروز
بڑھتا جاتا ہے اور کرتے کرتے تھک جاتا ہوں، مگر ختم ہونے کو
آتا، اس لیے خطوں کا جواب وقت پر نہیں دے سکتا۔

انجمن کا دفتر دہلی منتقل ہوگا، جگہ کا فیصلہ اب تک نہیں ہوا۔ اس
ختلاف آپڑا ہے۔ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ نئی دلی میں ہو اور
گروہ کہتا ہے پرانی دہلی میں، کشمیری دروازے کے باہر۔ اب
جا کر قطعی فیصلہ کیا جائے گا۔

انگریزی لغت تیار ہو گیا اور چھپ گیا۔ صرف ضمیمہ باقی ہے۔
ں ایک ہفتہ میں چھپ جائے گا۔ انشاء اللہ اس مہینے کے آخر تک
شائع ہو جائے گی۔ اُردو زبان کا لغت تیار ہو رہا ہے، اس سے کئی
لگیں گے۔

انجمن کی منتقلی میں مجھے اپنی راحت اور تکلیف کا خیال نہیں، بلکہ
کے مستقبل کا خیال ہے۔ حیدر آباد میں رہی تو میرے بعد مر جائے گی،
مار ڈالیں گے۔ اب یہاں رہنا انتہا درجے کی بے غیرتی ہے۔ غرض
سے اسباب ہیں، جن کی وجہ سے مجھے انجمن کی خاطر حیدر آباد چھوڑنا
ہے۔

جس کسی نے آپ سے سر اکبر حیدری کے متعلق لکھا [کہا] ہے،
ن سے واقف نہیں۔ آج کل یہاں سے کسی اسلامی ادارے کو امداد
محال ہے۔ سر اکبر حیدری خود اس سے گھبراتے ہیں اور کونسل میں کئی
ن موجود ہیں، یہاں سے کسی قسم کی امید نہ رکھیے۔

یہاں میں نے ہندوؤں کو بھی اردو سکھانی شروع کر دی ہے۔ کے
لیے الگ جماعت قائم کی ہے۔ اس میں سب تعلیم یافتہ ہندو ہیں۔
ذوق سے پڑھ رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہمیں عربی فارسی الفاظ سکھاؤ،
ہندی سنسکرت الفاظ کی ضرورت نہیں۔ آج میں ایک مقام نادرم
جا رہا ہوں، وہاں ایک مسلم اسکول ہے، اس میں ہم نے اُردو لازم
ہے۔ قریب دو سو کے ہندو لڑکے بھی اس میں شریک ہیں اور سب
پڑھتے ہیں۔

مسلمان یہاں اُردو کے دلدادہ ہیں۔ جلسے کرتے ہیں۔ لڑنے مرنے

(آگے صفحہ ۳۷ پر)

Phone 2784

انجمنِ ترقیٔ اُردو پاکستان

ANJUMAN TARAQQI-E-URDU PAKISTAN

HOSPITAL ROAD, KARACHI.

No. ________ Dated ۱۹۵۱ء

شفیقی سلمکم — السلام علیکم

خط پہنچا۔ حالات معلوم ہوئے۔ ان شاء اللہ آپ کا
ہسپتال بن کے رہے گا۔ چندے کی رقم فی الحال آپ کو
نہیں ملے گی لیکن کچھ دنوں کے بعد ضرور ملے گی اور
آپ کی حسبِ منشا پورا ہوگا۔
آج کل یہاں کا موسم بہت اچھا ہے اور یہاں کے
قیام سے میری صحت کو فائدہ پہنچا ہے۔ پھل بکثرت ہیں
آڑو، انگور، سیب، ناشپاتی، سردے وغیرہ اور
ارزاں ہیں۔ ایک تنوری روٹی جو میں پوری نہیں
کھا سکتا ایک آنے میں ملتی ہے اور بہت مزیدار ہوتی ہے۔
میں یہاں بلوچستان اردو کانفرنس کرنے کا
ڈول ڈال رہا ہوں۔ اس لیے میرا قیام یہاں کچھ
دن اور رہے گا۔
ریلوے ہسپتال کے ڈاکٹر اپنی مہربانی سے ہر روز
نو دس بجے آکر اپنے ساتھ ہسپتال لے جاتے ہیں اور
الٹرا وائلیٹ ریز ultra violet rays کا عمل میرے
گھٹنوں پر کرتے ہیں۔ اس سے درد میں تخفیف ہے۔
بیٹھے رہنے یا لیٹے رہنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔
البتہ زیادہ چلنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ روزانہ صبح
شام ٹہلنے کو جاتا ہوں۔ ڈیڑھ ڈیڑھ میل اس سے زیادہ
نہیں۔ ٹہلنا اس لیے جاری رکھا ہے کہ اگر موقوف
کردوں تو رگیں سخت ہو جائیں گی اور چلنے پھرنے سے
محروم ہو جاؤں گا۔
ہماری عمر کی آخری منزل ہے۔ جہاں تک ہو سکے
کچھ کرتے رہنا چاہیے۔

مخلص
عبدالحق

[illegible] ۱۹۵۱

(مولوی عبدالحق صاحب کے ایک خط کا عکس)

حامد آفاق قریشی

# سوداؔ کی جاگیر کی تحقیق

دہلی میں مغلوں کے سلطنت کے زوال پذیر ہونے کے ساتھ ساتھ دربارِ اودھ اردو شاعری کا ایک عظیم مرکز و سرپرست بن کر سامنے آیا اور اُس کے دامن میں بہت سے شعرائے کرام اردو وابستہ رہے۔ اُنہیں میں سے ایک مرزا محمد رفیع سوداؔ تھے، جن کو پہلے اودھ کے تیسرے نواب شجاع الدولہ (۱۷۵۴ - ۱۷۷۵) اور پھر اُن کے جانشین نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ - ۱۷۹۷) کی سرپرستی حاصل تھی۔

شروع میں سودا کو آصف الدولہ کی سرکار سے نقد وظیفہ ملتا تھا۔ لیکن بقول شیخ چاند "سوداؔ کو نقد رقم حاصل کرنے میں درباری کارکنوں اور عاملوں کی بڑی منت سماجت کرنی پڑتی تھی اور خزانے سے رقم اس دشواری اور ذلت سے ملتی تھی کہ اس نے اس کی باربار شکایت کی۔ ایک قصیدے میں آصف الدولہ سے ان دقتوں کی شکایت کی اور نقد رقم کے عوض جاگیر سے سرفراز کرنے کی درخواست کی ہے[1]"۔

اس نظم سے غرض ہے مجھے عرضِ مُدّعا
مقصد مرا قلیل ہے پہنچے بالنعرام

اپنی تری جناب میں اتنی ہی عرض ہے
کس کس کا ملتجی ہوں کہا کر ترا غلام

انصاف ہے کہ ہو وہ عطا اس جناب کی
اور ان کی میں سماجت و منت کروں مدام

دیہات جو ہیں مصرفِ مطبخ کے اس میں سے
اس نقدی کے عوض ہو مجھے صحنکِ طعام

چنانچہ اس کے بعد اُنہیں نقد رقم کی بجائے ایک جاگیر عطا ہوگئی۔ ہم عصر تذکروں میں سے صرف "گلشنِ ہند" میں مرزا علی لطف نے لکھا ہے کہ یہ جاگیر چھ ہزار روپے سالانہ کی تھی[2]۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بعد کے لکھنے والوں نے چھ ہزار روپے سالانہ کا عدد علی لطف کے تذکرے سے لیا ہے۔

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں: سوداؔ کو یہ اعجاز اُن کی اور مرزا فاخر مکیں کی چشمک کے واقعہ کے بعد ملا تھا[3]۔ اس واقعہ کی مکمل اور صحیح تفصیلات میں اپنے مضمون "معرکہ مکین و سودا" میں پیش کر چکا ہوں[4]۔ ہم عصر اور ثانوی ماخذوں میں اس معرکے کی کوئی تاریخ نہیں دی ہوئی ہے۔ میں نے اپنے دو مضمونوں "سوداؔ و مکینؔ کی شکر رنجی کا واقعہ کب ہوا تھا؟[5]" اور "سوداؔ اور مکینؔ کی چشمک۔ تاریخ کا تعین[6]" میں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ واقعہ فروری تا دسمبر ۱۷۷۵ء کے مابین لکھنؤ میں ہوا تھا۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سوداؔ کو چھ ہزار روپے سالانہ کی جاگیر ۱۷۷۵ء میں ملی ہوگی۔ لکھنؤ میں تعینات انگریز ریذیڈینٹ نے ۱۷۸۰ء کے وسط میں اودھ کے جاگیرداروں کے بارے میں تفصیلات مہیا کر کے گورنر جنرل کی خدمت میں کلکتہ روانہ کی تھیں۔ اُن کی تفصیلات اس سال کے خفیہ مشوروں کے ریکارڈ میں جو کہ نیشنل آرکائیوز دہلی میں سیکریٹ کنسلٹیشن کے نام سے محفوظ ہیں، دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ۱۷۸۰ء تک سوداؔ کی جاگیر محض دو ہزار تین سو ستر (۲۳۷۰) روپیہ سالانہ تھی اور علی لطف اور آزاد دونوں کا بیان اس معاملے میں غلط ہے۔

سوداؔ کی وفات ۴ رجب ۱۱۹۵ھ مطابق ۲۶ جون ۱۷۸۱ء کو لکھنؤ میں ہوئی تھی[7]۔ لہٰذا یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ۱۷۸۰ء کے وسط سے لے کر سوداؔ کی وفات کے مابین کسی وقت ان کی جاگیر ۲۳۷۰ روپے سالانہ سے بڑھ کر

• بی - ۱۱ - ایل روڈ، مہانگر، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۶

۵ ہزار روپے سالانہ کر دی گئی ہوگی، لیکن ہم عصر واقعات سے اس کی نفی ہوتی ہے۔ ۱۷۷۰ء ہی سے اودھ کی ریاست مالی دشواریوں سے دوچار تھی۔ پہلے ۱۷۷۹ء و ۱۷۸۰ء میں سوکھا پڑا۔ جس کی وجہ سے ریاست کی آمدنی خاصی گھٹ گئی — پھر نواب پر انگریزوں کا بہت زیادہ روپیہ بقایا ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اودھ کی حفاظت کے لیے انگریزوں کی سپاہ فتح گڈھ اور کان پور میں رکھی گئی۔ جس کا تمام خرچ نواب کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ مختلف وجوہات کی بنا پر ہر سال اس میں سے کچھ روپیہ دینا باقی رہ جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۷۷۹ء کے اواخر تک یہ بقایا رقم بڑھتے بڑھتے ایک کروڑ چھتیس لاکھ بارہ ہزار ایک سو اٹھاسی روپے ہو گئی تھی۔ اُنہیں دنوں دکن میں مرہٹوں سے متعدد جنگوں میں انگریزوں کا کافی پیسہ خرچ ہوا۔ ان کی مالی حالت پتلی ہو گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے نواب پر اس روپے کی ادائیگی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً ۱۷۸۰ء کے وسط میں نواب کو اپنی سرکار کو چلانے کے لیے جو خرچ درکار تھا، اس میں بہت کٹوتی کرنی پڑی۔ ذاتی اخراجات بھی اس کی زد میں آ گئے اور کچھ لوگوں کو برطرف کرنا پڑا۔ اس طرح کی کٹوتیوں کے بعد جتنی بھی ملکی آمدنی تھی، انگریزوں کو دینا پڑی۔ تاہم ان کا پیسہ ادا نہ ہو سکا۔ ہر مہینہ جو پیسہ انگریزی سپاہ کے خرچ کے لیے دینا پڑتا تھا وہ برابر اس بقایا میں شامل ہو کر پھر بڑھنے لگا۔ ۱۷۸۰ء و ۱۷۸۱ء کے وسط تک یہی حالات رہے[۸]۔ اس کے بعد ۱۷۸۱ء کے باقی مہینوں اور ۱۷۸۲ء میں اس بقایا کی ادائیگی کے سلسلہ میں بیگماتِ اودھ کی لوٹ کا مشہور واقعہ ہوا۔ اس بیان سے یہ واضح ہے کہ ۱۷۸۰ء کے وسط سے لے کر سودا کی وفات تک نواب آصف الدولہ کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ سودا کی جاگیر کی مالیت کو بڑھا سکے۔

لہٰذا مذکورہ بیانات سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ بعہدِ آصف الدولہ سودا کی جاگیر محض ۲۳۰۰ روپے سالانہ تھی نہ کہ چھ ہزار جیسا کہ مرزا علی لطف نے اور اُن کی تقلید میں باقی لوگوں نے لکھا ہے۔

---

## حوالہ جات


۱۔ شیخ چاند: سودا (مکتبہ اردو ادب، لکھنؤ) ۱۹۷۱) صفحات ۷۹-۸۰
۲۔ گلشن ہند (پٹنہ ۱۹۷۰) ۶۲
۳۔ آبِ حیات (الہ آباد، ۱۹۷۶ء) ۱۵۱
۴۔ معارف، اعظم گڑھ (فروری ۱۹۸۳ء) ۱۱۵-۱۳۱
۵۔ ماہنامہ ساز سرمدی، دہرہ دون (جنوری ۱۹۸۳ء) ۱۸-۱۹
۶۔ نیا دور، لکھنؤ (جون ۱۹۸۳) ۳۷-۳۸
۷۔ شیخ چاند: سودا، ۸۴
۸۔ کیلنڈر آف پرشین کارس پونڈینس، جلد ۵ نمبر ۱۶۵۴، ۱۶۷۹، ۱۶۹۰-۱، ۱۷۳۹-۴۰، ۱۷۶۴، ۱۷۷۶، ۱۸۳۲، ۱۸۷۹، جلد ۶ نمبر ۲۱ اور سیکریٹ کنسلٹیشن ۱۳ دسمبر ۱۷۷۹ اور ۳ اپریل ۱۷۸۰ء


●●

---

### بقیہ: من کے ...

ان میں کتابچے بھی ہیں۔ ضخیم ناول بھی ہیں۔ اردو، انگریزی، ہندی تینوں زبانوں میں یہ کتابیں موجود ہیں۔ معلوم نہیں کس کتاب نے کتنے ذہنوں کو متاثر کیا۔

اردو تصانیف میں "انقلاب" ایک ضخیم ناول ہے۔

مختصر افسانوں کی کتابیں بھی درجن بھر کے قریب لکھی ہیں، جن میں "ایک لڑکی" جو پاکستان میں درجن بھر ایڈیشن سے زیادہ چھپ چکی ہے، مگر جس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ میں نے صرف ایک سو روپے میں (قبل از تقسیم) اس کا کاپی رائٹ بیچ دیا تھا۔ کیوں کہ اُس وقت میں گمنام تھا اور سو روپے بھی میرے لیے ایک بڑی رقم تھی۔ اس کے بعد "زعفران کے پھول" "پاؤں میں پھول" "میں کون ہوں" (فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں کہانیاں) "گیہوں اور گلاب" "نئی دھرتی نئے انسان" اور "نیلی ساڑھی" وغیرہ ٹائیٹل تو مجھے یاد ہیں اور بھی شاید ہوں گے۔ یہ سب کتابیں میرے پاس بھی نہیں ہیں۔ کچھ سب بک گئی ہیں۔ کچھ مدت ہوئے چھپی تھیں۔

سب سے مشہور ناول اردو میں "انقلاب" تھا جس کو پندرہ برس کے بعد جب اُس کا روسی ایڈیشن "سن آف انڈیا" (فرزندِ ہند) کے نام سے ۹۰،۰۰۰ کی تعداد میں بک گیا، تب بھی جب کوئی پبلشر اتنی ضخیم کتاب چھاپنے کو تیار نہیں تھا تب میں نے خود گیارہ سو کی تعداد میں اس کو اپنے خرچ سے چھاپا اور بیچنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے اجراء کی رسم اپنے ہی گھر پر کی۔ کوئی پچاس ساٹھ اردو کے ادیب، شاعر، ایڈیٹر، جرنلسٹ وغیرہ اکٹھے کیے۔ ہر ایک کو تحفتاً ایک ایک جلد دی۔ اُمید تھی کہ کچھ تو اُن میں سے "کچھ" اچھا یا بُرا اُس کے بارے میں لکھیں گے۔ مگر جب وہ لوگ لنچ کھا کر میرے گھر سے رخصت ہوئے تو (اس واقعہ کو سات برس گزر چکے ہیں!) آج تک کوئی ریویو بھی کسی نے نہیں لکھا! میں کسی کی شکایت نہیں کر رہا ہوں۔ ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں کہ اردو میں زیادہ ناول کیوں نہیں چھپتے۔

ادبی اعزازات: پدم شری

میر ایوارڈ (اردو اکیڈمی بھوپال کی طرف سے)

بہار اردو جرنلسٹس کا ایوارڈ برائے قومی یکجہتی مرحومہ اندرا گاندھی کے ہاتھ سے۔

ہریانہ گورنمنٹ سے بہترین اردو تصنیف کا انعام اور ایک شال۔

فلمی ایوارڈ: پریذیڈنٹ گولڈ میڈل "شہر اور سپنا" کو جو ۱۹۶۳ء کی بہترین فلم قرار دی گئی۔

کارلووی واری فلم فیسٹیول کا آرٹ اکادمی ایوارڈ۔ بہترین ڈائرکشن کے لیے۔

"شہر اور سپنا" کے لیے تین ایوارڈ۔ گولن (سپین) سنٹا باربرا (یو۔ایس۔اے) سیکنڈ پرائز۔

"فکسلائٹ" کو سونے کا انعام (اٹلی)

●●

سرداری لال نشتر

# ہماچل میں قدیم فنِ تعمیر

فنِ تعمیر کی قدیم تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ہماچل پردیش کی تعمیرات نہ صرف اپنی قدامت کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہیں بلکہ وہ پہاڑی نفاست اور صنعتی کمال کے ایسے بہترین شاہکار ہیں، جن کی نزاکت اور پرکاری دیکھ کر زمانہ قدیم کے پہاڑی معماروں کی ہنرمندی، چابکدستی اور جاں فشانی کی بے ساختہ داد دینا پڑتی ہے۔ انہوں نے اس حسین و جمیل کوہستانی علاقے کے مختلف حصوں میں جس خوبی کے ساتھ تعمیراتی کام انجام دئے، وہ واقعی حیرت انگیز ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد کے پہاڑی صناع کتنا اعلیٰ ذوق اور فن کا کس قدر سلیقہ رکھتے تھے۔

قدیم تعمیرات کا حسن، نزاکت اور نقاشی ہماچل پردیش کے سابق راجاؤں اور رجواڑوں کی گزشتہ عظمت اور فضیلت کی بھی بے اختیار یاد دلاتے ہیں کہ شاہانِ وقت اس فن کے کیسے قدردان اور دلدادہ تھے۔

قدیم پہاڑی معماروں نے اس پردیش کے تمام اضلاع کے صدر مقامات اور دوسری چھوٹی بڑی جگہوں کو محلات، قلعوں، مندروں اور دیگر متعلقہ عمارات سے مزین کیا، جو شان و شوکت میں ہندوستان کی دوسری عمارات سے شاید ہی کمتر ہوں گی۔ ان کا نمایاں طرزِ خاص خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ مقامی معماروں نے پہاڑی طرزِ تعمیر میں زیب و زینت اور نقش نگاری میں ایسی خصوصیت اور شانِ امتیاز پیدا کی کہ پہاڑی فنِ تعمیر کو چار چاند لگ گئے۔ ان بے مثل تعمیرات میں جس کمال خوبی سے بیل بوٹے اور نقاشی کا کام صحت اور حسنِ تناسب کے ساتھ کیا گیا ہے، وہ نہایت دل کش و دل فریب ہے۔ پہاڑ کی اس خوب صورت وادی میں شاید ہی کوئی باوقعت بستی ایسی ہو گی، جس میں تعمیری شان و شوکت کے دوچار نمونے موجود نہ ہوں — کئی جگہوں میں تو ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ان سے بہتر کہیں اور نظر نہیں آتیں۔

بہارستانِ فطرت میں پہاڑوں کا ایک عجیب مرتبہ ہے۔ ان کا نظارہ انسان کو کسی اور ہی عالم میں پہنچا دیتا ہے۔ انہی پہاڑوں کی چوٹیوں اور وادیوں میں زمانۂ قدیم کے تعمیر کردہ مندر انسان کو محوِ حیرت کر دیتے ہیں۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ ہماچل پردیش کے قدیم مندروں میں انہیں چٹانوں کا پتھر استعمال کیا گیا ہے۔

جانے وہ کس بلا کے لوگ تھے، جنھوں نے چٹانو[ں] کو کاٹ کر ایسے عظیم الشان مندر تعمیر کئے، جن[ہیں] دیکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ بلا کے باکما[ل] معمار و صناع تھے! ایک پتھر کو دوسرے [پتھر] کے آدھ میں وصل کر کے عمودی جوڑ کی بالک[ل] حفاظت کی گئی ہے۔ اس طرح سے جوڑ یا د[رز] کا معلوم کرنا تو درکنار چونے یا مسالے کا [کوئی] اثر معلوم نہیں ہوتا۔ ان مندروں کی طرزِ تعمی[ر] منقش، مرصع اور چمک دمک میں بے مثال [ہے] کہ بیان میں نہیں آسکتی۔ ہماچل پردیش [کے] قدیم مندروں اور مورتیوں کے مجسموں میں [ت]قدس اور پاکیزگی کا بھرپور تاثر دکھائی د[یتا] ہے۔ حسن و دل کشی کے ان نادر نمونوں کو د[یکھنے] سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے کے قدیم فنکا[ر] رقص کے بھی ماہر تھے۔ اس ضمن میں منڈی، [...] چمبہ، برمہور، کانگڑہ، بلاسپور اور لاہول [...] کے قدیم مندر بہترین سمجھے جاتے ہیں — ریاستوں میں بعض عظیم الشان مندر اس پردیش کے سابق راجاؤں کے بنوائے ہوئے ہیں۔ [...] تو سارے ہماچل کو بجا طور پر مندروں کی سرزمی[ن] کہا جا سکتا ہے، لیکن سرمور، کلو، منالی، [...] ہمیرپور، برمہور، کنور اور ضلع شملہ کے پرا[نے ...]

---

• ایلی-۱۱، مال روڈ، شملہ ۱۷۱۰۰۱

کانگڑہ کے قلعے میں بے جین مندر کی باہری منقش دیواریں

لاہول سپیتی کے "تابو مندر" کی سے قدیم مورتی

مندروں میں نہایت ممتاز اور جداگانہ پہاڑی طرزِ تعمیر کے جملہ عناصر پائے جاتے ہیں۔ اگر محض تعمیر کی کثرت اور نقش و نگار کی افراط ہی سے فن کی ضروریات پوری ہو جایا کرتیں تو ہندوستان کا کوئی بڑا علاقہ اس کے اتنے نمونے نہ پیش کر سکتا، جتنے ہماچل پردیش جیسے چھوٹے پہاڑی خطے میں یکجا ہیں۔

شاہی محلات، پُر شکوہ اور عالی شان عمارتوں، قلعوں، میناروں، ستونوں، استوپوں اور مقدس خانقاہوں کے علاوہ ہماچل پردیش میں فنِ تعمیر کے قدیم مندروں کی بہتات ہے — یہاں کے کچھ ہزار سے زائد بے مثال تاریخی مندر اپنی ساخت اور حسین سنگ تراشی کی وجہ سے پہاڑی طرزِ تعمیر کی کمال یادگار ہیں۔ ۱۲ سو سال پرانے کئی مندر تو ساتویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس زمانے کی عظیم فن کاری کے نمائندے وہ تاریخی مندر ہیں، جو ممتاز معمار گُگا نے چمبہ میں ۶۸۰ء صدی میں راجہ میرو ورمن کے عہد میں تعمیر کئے اور جو پہاڑی راجاؤں کے اوّلین دورِ فنِ تعمیر کے مظہر ہیں۔ ان مندروں کی خصوصیت مخروطی شکل کے وہ ستون ہیں، جو شان و شوکت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ ان کے علاوہ یونانی فاتح سکندرِ اعظم جو ۳۲۶ صدی عیسوی میں بیاس ندی کے کنارے تک آپہنچا تھا، "سکندر دھارا" کا نام اُس فاتحِ اعظم کے جاہ و جلال کی یاد تازہ کرتا ہے۔ گویا آثارِ قدیمہ اب قریب قریب معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔

ہماچل پردیش کے قدیم مندروں میں چمبہ کے منی مہیش، گنیش، لکشمن، نرسنگھ، کیلاش مندر اور منڈی کے ۵۰ مندروں میں

کِنور کے "بودھ مندر" کی گوتم بُدھ کی نادر مُورتی ▲

جوالامُکھی مندر ◄

بھوت ناتھ، ترلوک ناتھ، بیج وکترہ، سوریہ نارائن، دیوی مہادیو، بھگوتی، پدم سنبھو، تریش رشی، پراشر، شوجی اور رادھوری کے مندر پہاڑی فنِ تعمیر کے ایسے اچھوتے نمونے ہیں، جن کی نظیر شاید ہی اور کہیں ملے۔ ان مندروں کے علاوہ سُکیت میں کیدار مہا شو، سکھدیو، شیام کلی، جگن ناتھ مندر، سرموز میں رینو کا مندر، جیڑا دھار کا کرگل مندر، کانگڑہ میں جوالامُکھی مندر، بیج ناتھ کے شو مندر، برجیشور اور راندریشور مندر، لاہول میں بودھ مندر، چندر پربھا مندر، سپتی میں ڈاور اور تابو مندر اور کِنور میں چنڈی دیوی، ارُوا، بچار، گومپا کالم اور کردنگ مندر ایسے نایاب پتھروں سے بنے ہوئے ہیں، جن کو دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

ہماچل کے قدیم ترین اور خوب صورت مندروں میں "ادھوری کا مندر" اپنی شان کا نرالا مندر ہے۔ اس میں شوجی اور پاربتی کی مُورتیاں ایک "پہاڑی سِلا" سے ملحق کی گئی ہیں۔ تمام عمارت نفیس اور لاجواب نقش کاری کی مونہہ بولتی تصویر ہے۔ ایک اور عظیم اور عالی شان مندر بھوت ناتھ کے نام سے موسوم ہے۔ اس مندر کو ہماچل کا محافظ اور آفات سے بچانے والا تصوّر کیا جاتا ہے۔ یہ تاریخی مندر راجہ اجے سین کے عہدِ حکومت کی یادگار رہے۔ مہادیو اور بھگوتی کے مندر بھی اپنی صناعی اور خوب صورتی کے باعث دیکھنے کے قابل ہیں۔ پراشر جھیل کے کنارے تعمیر کردہ

پیگوڈا نُما مندر بھی پہاڑی فن کا ایک نادر نمو
ایک ٹیلے پر بنا ہوا یہ قدیم مندر اپنی مثال آ
ہماچل کا سب سے مشہور قدیم مندر لکشمی نا
کا مندر ہے، جس میں سنگِ مرمر کے خوبصورت
پاک بازی کے بہترین نمونے ہیں۔ اس کے اندر
کی لگی پلیٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عظیم مندر
میں چمبہ کے راجہ پرتاپ سنگھ نے بنوایا تھا۔
مندروں کی طرح یہ مندر بھی پہاڑی فن کار
کمالِ فن کا شاہکار ہے۔

ہماچل میں سب سے پرانا مندر کِنور کا "بودھ
ہے، جس میں مہاتما بُدھ کا قدیم ترین مجسمہ رکھا
ہے۔ جو قدامت اور توانائی کا مظہر ہے۔
د آگ
ہماچل

خواجہ احمد عباس

ذمہ اصطلاحات اور سائنس کی کتابوں [ کا ] اتنا بڑا کام سپرد کیا ہے کہ روزانہ بارہ گھنٹے کام کرنا پڑے گا۔ اب سفر کی تیاری کر رہا ہوں۔ کم سے کم ایک ماہ رہوں گا۔ والسلام۔

خیر طلب
عبدالحق

(۶)

انجمن ترقی اردو پاکستان
ہاسپٹل روڈ، کراچی
۳۰ ستمبر ۱۹۵۱ء

Phone: 2784

شفیقی زاد لطفہٗ ۔ السلام علیکم

خط پہنچا حالات معلوم ہوئے۔ انشاء اللہ آپ کا ہسپتال بن کے رہے گا۔ چندے کی رقم فی الحال آپ کو نہیں ملے گی، لیکن کچھ دنوں کے بعد ضرور ملے گی۔ اور کام آپ کی حسبِ منشا پورا ہوگا۔

آج کل یہاں کا موسم بہت اچھا ہے اور یہاں کے قیام سے میری صحت کو فائدہ پہنچا ہے۔ پھل بکثرت ہیں۔ آڑو، انگور، سیب، ناشپاتی، سردہ وغیرہ ارزاں ہیں۔ ایک تندوری روٹی جو میں پوری نہیں کھا سکتا ایک آنے میں ملتی ہے اور بہت مزیدار ہوتی ہے۔

میں یہاں بلوچستان اردو کانفرنس کرنے کا ڈول ڈال رہا ہوں۔ اس لیے میرا قیام یہاں کچھ دنوں اور رہے گا۔

ریلوے ہسپتال کے ڈاکٹر اپنی مہربانی سے ہر روز نو دس بجے آکر اپنے ساتھ ہسپتال لے جاتے ہیں اور الٹرا وائیلیٹ ریز ...... Ultra violet rays کا عمل میرے گھٹنوں پر کرتے ہیں، اس سے درد میں تخفیف ہے۔ بیٹھے رہنے یا لیٹے رہنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی، البتہ زیادہ چلنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ روزانہ صبح شام ٹہلنے کو جاتا ہوں۔ ڈیڑھ ڈیڑھ میل بس زیادہ نہیں۔ چلنا اس لیے جاری رکھا ہے کہ اگر موقوف کر دوں گا تو رگیں سخت ہو جائیں گی اور چلنے پھرنے سے محروم ہو جاؤں گا۔

یہ ہماری عمر کی آخری منزل ہے، جہاں تک ہو سکے کچھ کرتے رہنا چاہیے۔

خیر طلب،
عبدالحق

(۷)

انجمن ترقی اردو پاکستان[1]
اسپتال روڈ، کراچی -۱
مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۵۲

نمبر فون
نمبر

شفیقی و محبی ۔ السلام علیکم

دو خط لکھے۔ ایک کا بھی جواب نہ ملا[2]، اس سے طبیعت بہت [ ... ] رہی اور آپ کی صحت کی طرف سے بہت اندیشہ لاحق ہو گیا۔ سمجھ [ ... ] والا تھا کہ آپ کا پارسل ملا، جسے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اب دیکھتا ہوں تو مولوی سلیمان اشرف مرحوم کی کتاب "الحج" نکلی۔ خط [ ... ] کیا، نہ ملا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی۔ آپ نے اپنی حالت اور صحت مزاج۔ نہ کیا۔ اس کتاب کے بھیجنے کا مقصد میں سمجھ گیا۔ یہ اشارہ ہے حج [ ... ] کے عزم کا۔ افسوس اس سال ممکن نہیں۔ انجمن کی حالت نازک [ ... ] حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ دوسرے اس سال مکۂ معظمہ میں [ ... ] شدت کی ہوگی کہ حج عذابِ جان ہو جائے گا اور اس کا ثواب ایک [ ... ] بھی نہ رہے گا۔

مہربانی کر کے اپنی صحت و خیریت سے فوراً اطلاع کیجیے [ ... ] پریشانی ہو۔

ع

دلکشا ۔ پیٹرز روڈ
رام پیٹھ، مدراس

مشفقی و مکرمی ۔ تسلیم

عنایت نامہ پہنچا۔ میں پٹنے سے آیا تو ناگپور جانا پڑا۔

---

[1] اگرچہ خط کے لیے انجمن ترقی اردو۔ کراچی کا پیڈ استعمال کیا گیا ہے، لیکن مضمون سے ظاہر ہے کہ کوئٹے سے لکھا گیا ہے، جہاں جانے کے لیے پچھلے خط میں لکھا گیا تھا۔

۱۔ پچھلے آٹھ خطوں میں سے دو سادہ کاغذ پر لکھے گئے ہیں۔ باقی پانچ انجمن [ ... ] پیڈ پر جو انگریزی اور اردو دونوں میں ہے۔ یہ آٹھواں خط جس [ ... ] لکھا گیا ہے وہ صرف اردو میں ہے۔

۲۔ پچھلے دونوں خطوں پر لکھا ہے کہ جواب بھیجا گیا، اس لیے [ ... ] دونوں خط ضائع ہو گئے ہوں گے۔ پیشِ نظر خط پر بھی ۲۵ اپریل ۲ [ ... ] گیا ہے: "جواب روانہ شد" ۱۲ ستمبر ۱۹۵۱ء کے خط کا جواب ۲۵ ستمبر ۱ [ ... ] ۳۰ ستمبر ۱۹۵۱ء کے خط کا جواب ۷ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو بھیجا گیا ہے۔

کام کا ہجوم اس قدر ہو گیا تھا کہ خط کا جواب نہ لکھ سکا۔ اتنے میں مجھے
اس آنا پڑا۔ یہاں پہلے کچھ کام کر گیا تھا، مگر وہ کام اس سے آگے نہ
ا۔ اب میں نے انجمن کی شاخ کی از سرِ نو تنظیم کی ہے۔ آج بعض مقامات
دورے پر جا رہا ہوں، جو مدرسے قائم کئے تھے، انہیں دیکھوں گا اور
ل جہاں ضرورت ہو گی، نئے مدرسے قائم کروں گا۔ اس صوبے میں مجھے
مرکز بنانے پڑیں گے۔ ان مقامات کو بھی ایک نظر دیکھ لوں گا۔

آپ کی شکایت بالکل بجا ہے، مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ روز بروز
م بڑھتا جاتا ہے اور کرتے کرتے تھک جاتا ہوں، مگر ختم ہونے کو
یں آتا، اس لیے خطوں کا جواب وقت پر نہیں دے سکتا۔

انجمن کا دفتر دہلی منتقل ہو گا، جگہ کا فیصلہ اب تک نہیں ہوا۔ اس
اختلاف آ پڑا ہے۔ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ نئی دلی میں ہو اور
سرا گروہ کہتا ہے پرانی دہلی میں، کشمیری دروازے کے باہر۔ اب
یں جا کر قطعی فیصلہ کیا جائے گا۔

انگریزی لغت تیار ہو گیا اور چھپ گیا۔ صرف ضمیمہ باقی ہے۔
بھی ایک ہفتہ میں چھپ جائے گا۔ انشاء اللہ اس مہینے کے آخر تک
ب شائع ہو جائے گی۔ اردو زبان کا لغت تیار ہونا ہے، اس میں کئی
ل لگیں گے۔

انجمن کی منتقلی میں مجھے اپنی راحت اور تکلیف کا خیال نہیں، بلکہ
کے مستقبل کا خیال ہے۔ حیدرآباد میں رہی تو میرے بعد مر جائے گی،
وگ مار ڈالیں گے۔ اب یہاں رہنا انتہا درجے کی بے غیرتی ہے۔ غرض
بہت سے اسباب ہیں، جن کی وجہ سے مجھے انجمن کی خاطر حیدرآباد چھوڑنا
ا ہے۔

جس کسی نے آپ سے سر اکبر حیدری کے متعلق لکھا [کہا] ہے،
ان سے واقف نہیں۔ آج کل یہاں سے کسی اسلامی ادارے کو امداد
نا محال ہے۔ سر اکبر حیدری خود اس سے گھبراتے ہیں اور کونسل میں کئی
الف موجود ہیں، یہاں سے کسی قسم کی امید نہ رکھئے۔

یہاں میں نے ہندوؤں کو بھی اردو سکھانی شروع کر دی ہے۔
کے لیے الگ جماعت قائم کی ہے۔ اس میں سب تعلیم یافتہ ہندو ہیں۔
شوق سے پڑھ رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہمیں عربی فارسی الفاظ سکھاؤ،
یں ہندی سنسکرت الفاظ کی ضرورت نہیں۔ آج میں ایک مقام نادرم
دیکھنے جا رہا ہوں، وہاں ایک مسلم اسکول ہے، اس میں ہم نے اردو لازم
بھی ہے۔ قریب دو سو کے ہندو لڑکے بھی اس میں شریک ہیں اور سب
ردو پڑھتے ہیں۔

مسلمان یہاں اردو کے دلدادہ ہیں۔ جلسے کرتے ہیں۔ لڑنے مرنے

(آگے صفحہ ۳۷ پر)

انجمن ترقی اردو پاکستان

ANJUMAN TARAQQI-E-URDU PAKISTAN

HOSPITAL ROAD, KARACHI.

No. ____________ Dated ۱۹۵۱ء

شفیقی سلمکم اللہ - السلام علیکم

خط پہنچا - حالات معلوم ہوئے - ان شاء اللہ آپ کا
ہسپتال بن کے رہے گا - چندے کی رقم فی الحال آپ کو
نہیں ملے گی لیکن کچھ دنوں کے بعد ضرور ملے گی اور آپ
کی حسب منشا پورا ہوگا -

آج کل یہاں کا موسم بہت اچھا ہے اور یہاں کے
قیام سے میری صحت کو فائدہ پہنچا ہے - پھل بکثرت ہیں
آڑو ، انگور ، سیب ، ناشپاتی ، سردے وغیرہ اور
ارزاں ہیں - ایک تندوری روٹی جو میں پوری نہیں
کھا سکتا ایک آنے میں ملتی ہے اور بہت مزیدار ہوتی ہے

میں یہاں بلوچستان اردو کانفرنس کرنے کا
ڈول ڈال رہا ہوں - اس لیے میرا قیام یہاں کچھ
دن اور رہے گا -

ریلوے ہسپتال کے ڈاکٹر اپنی مہربانی سے ہر روز
نو دس بجے آکر اپنے ساتھ ہسپتال لے جاتے ہیں اور
الٹرا وائیلٹ ریز ultra violet rays کا عمل ہر دو
گھٹنوں پر کرتے ہیں - اس سے درد میں تخفیف ہے -
بیٹھے رہنے یا لیٹے رہنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی -
البتہ زیادہ چلنے میں تکلیف ہوتی ہے - روزانہ صبح
شام ٹہلنے کو جاتا ہوں - ڈیڑھ ڈیڑھ میل بس زیادہ
نہیں - چلنا اس لیے جاری رکھا ہے کہ اگر موقوف
کردوں تو رگیں سخت ہو جائیں گی اور چلنے پھرنے سے
محروم ہو جاؤں گا -

ہماری عمر کی آخری منزل ہے - جہاں تک ہو سکے
کچھ کرتے رہنا چاہیے -

مخلص
عبدالحق

[illegible]
۱۲ / ۱۳ نومبر ۱۹۵۱

(مولوی عبدالحق صاحب کے ایک خط کا عکس)

حامد آفاق قریشی

# سوداؔ کی جاگیر کی تحقیق

دہلی میں مغلوں کے سلطنت کے زوال پذیر ہونے کے ساتھ ساتھ دربارِ اودھ اردو شاعری کا ایک عظیم مرکز و سرپرست بن کر سامنے آیا اور اُس کے دامن میں بہت سے شعرائے کرام اردو وابستہ رہے۔ اُنہیں میں سے ایک مرزا محمد رفیع سوداؔ تھے، جن کو پہلے اودھ کے تیسرے نواب شجاع الدولہ (۱۷۵۴ - ۱۷۷۵) اور پھر اُن کے جانشین نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ - ۱۷۹۷) کی سرپرستی حاصل تھی۔

شروع میں سوداؔ کو آصف الدولہ کی سرکار سے نقد وظیفہ ملتا تھا۔ لیکن بقول شیخ چاندؔ سوداؔ کو نقد رقم حاصل کرنے میں درباری کارکنوں اور عاملوں کی بڑی منت سماجت کرنی پڑتی تھی اور خزانے سے رقم اس دشواری اور ذلت سے ملتی تھی کہ اس نے اس کی بار بار شکایت کی۔ ایک قصیدے میں آصف الدولہ سے ان وقتوں کی شکایت کی اور نقد رقم کے عوض جاگیر سے سرفراز کرنے کی درخواست کی ہے [1]۔

اس نظم سے غرض ہے مجھے عرضِ مُدّعا
مقصد مرا قلیل ہے پہنچے بانصرام

اپنی تری جناب میں اتنی ہی عرض ہے
کس کس کا ملتجی ہوں کہا کر ترا غلام

انصاف ہے کہ ہو وہ عطا اس جناب کی
اوران کی میں سماجت و منت کروں مدام

دیہات جو ہیں مصرفِ مطبخ کے اس میں سے
اس نقدی کے عوض ہو مجھے محنکِ طعام

چنانچہ اس کے بعد اُنہیں نقد رقم کی بجائے ایک جاگیر عطا ہوگئی۔ ہم عصر تذکروں میں سے صرف "گلشنِ ہند" میں مرزا علی لطف نے لکھا ہے کہ یہ جاگیر چھ ہزار روپے سالانہ کی تھی [2]۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بعد کے لکھنے والوں نے چھ ہزار روپے سالانہ کا عدد علی لُطف کے تذکرے سے لیا ہے۔

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں: سوداؔ کو یہ اعجاز اُن کی اور مرزا فاخر مکیںؔ کی چشمک کے واقعہ کے بعد ملا تھا [3]۔ اس واقعہ کی مکمل اور صحیح تفصیلات میں اپنے مضمون "معرکہ مکینؔ و سوداؔ" میں پیش کر چکا ہوں [4]۔ ہم عصر اور ثانوی ماخذوں میں اس معرکے کی کوئی تاریخ نہیں دی ہوئی ہے۔ میں نے اپنے دو مضمونوں "سوداؔ و مکینؔ کی شکر رنجی کا واقعہ کب ہوا تھا؟ [5]" اور "سوداؔ اور مکینؔ کی چشمک ۔ تاریخ کا تعین [6]" میں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ واقعہ فروری تا دسمبر ۱۷۷۵ء کے مابین لکھنؤ میں ہوا تھا۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سوداؔ کو چھ ہزار روپے سالانہ کی جاگیر ۱۷۷۵ء میں ملی ہوگی۔ لکھنؤ میں تعینات انگریز ریذیڈینٹ نے ۱۷۸۰ء کے وسط میں اودھ کے جاگیرداروں کے بارے میں تفصیلات مہیا کرکے گورنر جنرل کی خدمت میں کلکتہ روانہ کی تھیں۔ اُن کی تفصیلات اس سال کے خفیہ مشوروں کے ریکارڈ میں جو کہ نیشنل آرکائوز دہلی میں سیکریٹ کنسلٹیشن کے نام سے محفوظ ہیں، دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ۱۷۸۰ء تک سوداؔ کی جاگیر محض دو ہزار تین سو ستر (۲۳۷۰) روپیہ سالانہ تھی اور علی لُطف اور آزاد دونوں کا بیان اس معاملے میں غلط ہے۔

سوداؔ کی وفات ۴ رجب ۱۱۹۵ھ مطابق ۲۶ جون ۱۷۸۱ء کو لکھنؤ میں ہوئی تھی [7]۔ لہٰذا یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ۱۷۸۰ء کے وسط سے لے کر سوداؔ کی وفات کے مابین کسی وقت ان کی جاگیر ۲۳۷۰ روپے سالانہ سے بڑھ کر

• بی - ۱۱ - ایچ روڈ، مہانگر، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۶

چھ ہزار روپے سالانہ کر دی گئی ہوگی، لیکن ہم عصر واقعات سے اس کی نفی ہوتی ہے۔ ۱۷۷۹ء ہی سے اودھ کی ریاست مالی دشواریوں سے دوچار تھی۔ پہلے ۱۷۷۹ء ۱۷۸۰ء میں سوکھا پڑا۔ جس کی وجہ سے ریاست کی آمدنی خاصی گھٹ گئی ــــ پھر نواب پر انگریزوں کا بہت زیادہ روپیہ بقایا ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اودھ کی حفاظت کے لیے انگریزوں کی سپاہ فتح گڈھ اور کان پور میں رکھی گئی۔ جس کا تمام خرچ نواب کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ مختلف وجوہات کی بنا پر بہرحال اس میں سے کچھ روپیہ دینا باقی رہ جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۷۷۹ء کے اواخر تک یہ بقایا رقم بڑھتے بڑھتے ایک کروڑ چھتیس لاکھ بارہ ہزار ایک سو اٹھاسی روپے ہوگئی تھی۔ انہیں دنوں دکن میں مرہٹوں سے متعدد جنگوں میں انگریزوں کا کافی پیسہ خرچ ہوا۔ ان کی مالی حالت پتلی ہوگئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے نواب پر اس روپے کی ادائیگی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً ۱۷۸۰ء کے وسط میں نواب کو اپنی سرکار کو چلانے کے لیے جو خرچ درکار تھا، اس میں بہت کٹوتی کرنی پڑی۔ ذاتی اخراجات بھی اس کی زد میں آگئے اور کچھ لوگوں کو برطرف کرنا پڑا ــ اس طرح کی کٹوتیوں کے بعد جتنی بھی ملکی آمدنی تھی، انگریزوں کو دینا پڑی۔ تاہم ان کا پیسہ ادا نہ ہوسکا۔ ہر مہینہ جو پیسہ انگریزی سپاہ کے خرچ کے لیے دینا پڑتا تھا وہ برابر اس بقایا میں شامل ہو کر پھر بڑھنے لگا۔ ۱۷۸۰ء و ۱۷۸۱ء کے وسط تک یہی حالات رہے[۸]۔ اس کے بعد ۱۷۸۱ء کے باقی مہینوں اور ۱۷۸۲ء میں اس بقایا کی ادائیگی کے سلسلہ میں بیگماتِ اودھ کی لوٹ کا مشہور واقعہ ہوا۔ اس بیان سے یہ واضح ہے کہ ۱۷۸۰ء کے وسط سے لے کر سودا کی وفات تک نواب آصف الدولہ کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ سودا کی جاگیر کی مالیت کو بڑھا سکتے۔

لہٰذا مذکورہ بیانات سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ بعہد آصف الدولہ سودا کی جاگیر محض ۲۳۰ روپے سالانہ تھی نہ کہ چھ ہزار جیسا کہ مرزا علی لطف نے اور اُن کی تقلید میں باقی لوگوں نے لکھا ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ شیخ چاند: سودا (مکتبہ اردو ادب، لکھنؤ) ۱۹۷۱، صفحات ۷۹-۸۰
۲۔ گلشنِ ہند (پٹنہ، ۱۹۷۲) ۶۲
۳۔ آبِ حیات (الٰہ آباد، ۱۹۷۶ء) ۱۵۱
۴۔ معارف، اعظم گڑھ (فروری ۱۹۸۳ء) ۱۱۵-۱۳۱
۵۔ ماہنامہ ساز سرمدی، دہرہ دون (جنوری ۱۹۸۳ء) ۱۸-۱۹
۶۔ نیا دور، لکھنؤ (جون ۱۹۸۳) ۳۷-۳۸
۷۔ شیخ چاند: سودا، ۸۴
۸۔ کیلنڈر آف پرشین کارس پونڈینس، جلد ۵ نمبر ۱۶۵۴، ۱۶۲۹، ۱۶۲۷، ۱-۱۶۹۰، ۱۷۳۹-۴۰، ۱۶۹۴، ۱۷۷۶، ۱۸۳۲، ۱۸۶۹، جلد ۶ نمبر ۲۱ اور سیکریٹ کنسلٹیشن ۱۳ دسمبر ۱۷۷۹ اور ۳ اپریل ۱۷۸۰ء


●●

بقیہ: ص ...

ان میں کتابیں بھی ہیں۔ ضخیم ناول بھی ہیں۔ اردو، انگریزی، ہندی، تیلگو زبانوں میں یہ کتابیں موجود ہیں۔ معلوم نہیں کس کتاب نے کتنے ذہنوں کو متاثر کیا۔

اردو تصانیف میں "انقلاب" ایک ضخیم ناول ہے۔

مختصر افسانوں کی کتابیں بھی درجن بھر کے قریب لکھی ہیں، جن میں "ایک لڑکی" جو پاکستان میں درجن بھر ایڈیشن سے زیادہ چھپ چکی ہے، مگر جس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ میں نے صرف ایک سو روپے میں (قبل از تقسیم) اس کا کاپی رائٹ بیچ دیا تھا۔ کیوں کہ اُس وقت میں گمنام تھا اور سو روپے بھی میرے لیے ایک بڑی رقم تھی۔ اس کے بعد "زعفران کے پھول" "پاؤں میں پھول" "میں کون ہوں" (فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں کہانیاں) "گیہوں اور گلاب" "نئی دھرتی نئے انسان" اور "نیلی ساڑھی" وغیرہ ٹائیٹل تو مجھے یاد ہیں اور بھی شاید ہوں گے۔ یہ سب کتابیں میرے پاس بھی نہیں ہیں۔ کچھ سب بک گئی ہیں۔ کچھ مدت ہوئے چھپی تھیں۔

سب سے مشہور ناول اردو میں "انقلاب" تھا جس کو پندرہ برس کے بعد جب اس کا روسی ایڈیشن "سن آف انڈیا" (فرزندِ ہند) کے نام سے ۹۰۰۰۰ کی تعداد میں بک گیا تب بھی جب کوئی پبلیشر اتنی ضخیم کتاب چھاپنے کو تیار نہیں تھا تب میں نے خود گیارہ سو کی تعداد میں اس کو اپنے خرچ سے چھاپا اور بیچنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے اجراء کی رسم اپنے ہی گھر پر کی۔ کوئی پچاس ساٹھ اردو کے ادیب، شاعر، ایڈیٹر، جرنلسٹ وغیرہ اکٹھے کئے۔ ہر ایک کو تحفتاً ایک ایک جلد دی۔ اُمید تھی کہ کچھ تو اُن میں سے "کچھ" اچھا یا بُرا اُس کے بارے میں لکھیں گے۔ مگر جب وہ لوگ لنچ کھا کر میرے گھر سے رخصت ہوئے تو (اس واقعہ کو سات برس گزر چکے ہیں!) آج تک کوئی ریویو بھی کسی نے نہیں لکھا! میں کسی کی شکایت نہیں کر رہا ہوں۔ ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں کہ اردو میں زیادہ ناول کیوں نہیں چھپتے۔

ادبی اعزازات: پدم شری

میر ایوارڈ (اردو اکیڈمی بھوپال کی طرف سے)

بہار اردو جرنلسٹس کا ایوارڈ برائے قومی یکجہتی مرحومہ اندرا گاندھی کے ہاتھ سے۔

ہریانہ گورنمنٹ سے بہترین اردو تصنیف کا انعام اور ایک شال۔

فلمی ایوارڈ: پریذیڈنٹ گولڈ میڈل "شہر اور سپنا" کو جو ۱۹۶۳ء کی بہترین فلم قرار دی گئی۔

کارلووی واری فلم فیسٹول کا آرٹ اکادمی ایوارڈ۔ بہترین ڈائرکشن کے لیے۔

"شہر اور سپنا" کے لیے تین ایوارڈ۔ گولڈ (سپین) سنٹا باربرا (یو۔ ایس۔ اے) سیکنڈ پرائز۔

"تکلائٹ" کو سونے کا انعام (اٹلی)

●●

سرداری لال نشتر

# ہماچل میں قدیم فنِ تعمیر

فنِ تعمیر کی قدیم تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ہماچل پردیش کی تعمیرات نہ صرف اپنی قدامت کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہیں بلکہ وہ پہاڑی نفاست اور صنعتی کمال کے ایسے بہترین شاہکار ہیں، جن کی نزاکت اور پُرکاری دیکھ کر زمانۂ قدیم کے پہاڑی معماروں کی ہُنرمندی، چابکدستی اور جاں فشانی کی بے ساختہ داد دینا پڑتی ہے۔ اُنہوں نے اس حسین و جمیل کوہستانی علاقے کے مختلف حصوں میں جس خوبی کے ساتھ تعمیراتی کام انجام دئے، وہ واقعی حیرت انگیز ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد کے پہاڑی صنّاع کتنا اعلیٰ ذوق اور فن کا کس قدر سلیقہ رکھتے تھے۔

قدیم تعمیرات کا حسن، نزاکت اور نقّاشی ہماچل پردیش کے سابق راجاؤں اور رجواڑوں کی گزشتہ عظمت اور فضیلت کی بھی بے اختیار یاد دلاتے ہیں کہ شاہانِ وقت اس فن کے کیسے قدردان اور دلدادہ تھے۔

قدیم پہاڑی معماروں نے اس پردیش کے تمام اضلاع کے صدر مقامات اور دوسری چھوٹی بڑی جگہوں کو محلات، قلعوں، مندروں اور دیگر سلسلۂ عمارات سے مزیّن کیا، جو شان و شوکت میں ہندوستان کی دوسری عمارات سے شاید ہی کمتر ہوں گی۔ ان کا نمایاں طرزِ خاص خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ مقامی معماروں نے پہاڑی طرزِ تعمیر میں زیب و زینت اور نقش نگاری میں ایسی خصوصیت اور شانِ امتیاز پیدا کی کہ پہاڑی فنِ تعمیر کو چار چاند لگ گئے۔ ان بے مثل تعمیرات میں جس کمال خوبی سے بیل بوٹے اور نقّاشی کا کام صحت اور حُسنِ تناسب کے ساتھ کیا گیا ہے، وہ نہایت دل کش و دل فریب ہے۔ پہاڑ کی اس خوب صورت وادی میں شاید ہی کوئی با وقعت بستی ایسی ہوگی، جس میں تعمیری شان و شوکت کے دو چار نمونے موجود نہ ہوں — کئی جگہوں میں تو ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ان سے بہتر کہیں اور نظر نہیں آتیں۔

بہارستانِ فطرت میں پہاڑوں کا ایک عجیب مرتبہ ہے۔ ان کا نظارہ انسان کو کسی اور ہی عالم میں پہنچا دیتا ہے۔ انہی پہاڑوں کی چوٹیوں اور وادیوں میں زمانۂ قدیم کے تعمیر کردہ مندر انسان کو محوِ حیرت کر دیتے ہیں۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ ہماچل پردیش کے قدیم مندروں میں انہیں چٹانوں کا پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ جانے وہ کس بلا کے لوگ تھے، جنھوں نے چٹانوں کو کاٹ کر ایسے عظیم الشان مندر تعمیر کئے، جن کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ بلا کے باکمال معمار و صنّاع تھے! ایک پتھر کو دوسرے پتھر کے آدھ میں وصل کر کے عمودی جوڑ کی باکمال حفاظت کی گئی ہے۔ اس طرح سے جوڑ یا درز کا معلوم کرنا تو درکنار، چُونے یا مسالے کا بھی اثر معلوم نہیں ہوتا۔ ان مندروں کی طرزِ تعمیر منقّش، مرصّع اور چمک دمک میں بے مثال ہے کہ بیان میں نہیں آسکتی۔ ہماچل پردیش کے قدیم مندروں اور مورتیوں کے مجسّموں میں زہد، تقدس اور پاکیزگی کا بھرپور تاثر دکھائی دیتا ہے۔ حُسن و دل کشی کے ان نادر نمونوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے کے قدیم فن کار رقص کے بھی ماہر تھے۔ اس ضمن میں منڈی، سُکیت، چمبہ، برہمور، کانگڑہ، بلاسپور اور لاہول سپتی کے قدیم مندر بہترین سمجھے جاتے ہیں — ان ریاستوں میں بعض عظیم الشان مندر اس پردیش کے سابق راجاؤں کے بنوائے ہوئے ہیں۔ یوں تو سارے ہماچل کو بجا طور پر مندروں کی سرزمین کہا جا سکتا ہے، لیکن سرموڑ، کُلّو منالی، سندر نگر، رمپور، برہمور، کنور اور ضلع شملہ کے پرانے

• ایل ۔ ۱۱، مال روڈ، شملہ ۱۷۱۰۰۱

لاہول سپیتی کے "تابو مندر" کی قدیم مورتی

کانگڑہ کے قلعہ میں بے جین مندر کی باہری منقش دیواریں

مندروں میں نہایت ممتاز اور جداگانہ پہاڑی طرزِ تعمیر کے جملہ عناصر پائے جاتے ہیں۔ اگر محض تعمیر کی کثرت اور نقش و نگار کی افراط ہی سے فن کی ضروریات پوری ہو جایا کرتیں تو ہندوستان کا کوئی بڑا علاقہ اس کے اتنے نمونے نہ پیش کر سکتا، جتنے ہماچل پردیش جیسے چھوٹے پہاڑی خطے میں یک جا ہیں۔

شاہی محلات، پُر شکوہ اور عالی شان عمارتوں، قلعوں، میناروں، ستونوں، استوپوں اور مقدس خانقاہوں کے علاوہ ہماچل پردیش میں فنِ تعمیر کے قدیم مندروں کی بہتات ہے — یہاں کے کچھ ہزار سے زائد بے مثال تاریخی مندر اپنی ساخت اور حسین سنگ تراشی کی وجہ سے پہاڑی طرزِ تعمیر کی کمال یادگار ہیں۔ ۱۲ سو سال پُرانے کئی مندر تو ساتویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس زمانے کی عظیم فن کاری کے نمائندے وہ تاریخی مندر ہیں، جو ممتاز معمار گُگا نے چمبہ میں ۶۸۰ء صدی میں راجہ میرو ورمن کے عہد میں تعمیر کئے اور جو پہاڑی راجاؤں کے اوّلین دورِ فنِ تعمیر کے مظہر ہیں۔ ان مندروں کی خصوصیت مخروطی شکل کے وہ ستون ہیں، جو شان و شوکت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ ان کے علاوہ یونانی فاتح سکندرِ اعظم جو ۳۲۶ء۵ صدی عیسوی میں بیاس ندی کے کنارے تک آپہنچا تھا۔ "سکندر دھارا" کا نام اُس فاتحِ اعظم کے جاہ و جلال کی یاد تازہ کرتا ہے۔ گویا آثارِ قدیمہ اب قریب قریب معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔

ہماچل پردیش کے قدیم مندروں میں چمبہ کے منی مہیش، گنیش، لکشمی، نرسنگھ، کیلاش مندر اور منڈی کے ۵۰ مندروں میں

کنور کے "بودھ مندر" کی گوتم بدھ کی نادر مورتی ▲

جوالامکھی مندر ◄

بھوت ناتھ، ترلوک ناتھ، بیج وکترہ، سوریہ نارائن، دیوی مہادیو، بھگوتی، پدم سنبھو، تویش رشی، پراشر، شو جی اور رادھوری کے مندر پہاڑی فنِ تعمیر کے ایسے اچھوتے نمونے ہیں، جن کی نظیر شاید ہی اور کہیں ملے۔ ان مندروں کے علاوہ سکیت میں کیدار، مہا شو، سکھدیو، شیام کلی، جگن ناتھ مندر، سرموز میں رینو کا مندر، چوڑا دھار کا کرگل مندر، کانگڑہ میں جوالامکھی مندر، بیج ناتھ کے شو مندر، برجیشور اور ساندر یشور مندر، لاہول میں بودھ مندر، چندر پربھا مندر، سپتی میں ڈاور اور تابو مندر اور کنور میں چنڈی دیوی، ارُوا، نہار، گومپا، کانم اور کر دنگ مندر ایسے نایاب پتھروں سے بنے ہوئے ہیں، جن کو دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

ہماچل کے قدیم ترین اور خوب صورت مندروں میں "ادھوری کا مندر" اپنی شان کا نرالا مندر ہے۔ اس میں شو جی اور پاربتی کی مورتیاں ایک "پہاڑی سِلا" سے ملحق کی گئی ہیں۔ تمام عمارت نفیس اور لاجواب نقش کاری کی مونہہ بولتی تصویر ہے۔ ایک اور عظیم اور عالی شان مندر بھوت ناتھ کے نام سے موسوم ہے۔ اس مندر کو ہماچل کا محافظ اور آفات سے بچانے والا تصوّر کیا جاتا ہے۔ یہ تاریخی مندر راجہ اجے سین کے عہدِ حکومت کی یادگار رہے۔ مہادیو اور بھگوتی کے مندر بھی اپنی صناعی اور خوب صورتی کے باعث دیکھنے کے قابل ہیں۔ پراشر جھیل کے کنارے تعمیر کردہ پیگوڈا نما مندر بھی پہاڑی فن کا ایک نادر نمونہ ایک ٹیلے پر بنا ہوا یہ قدیم مندر اپنی مثال آپ ہماچل کا سب سے مشہور قدیم مندر لکشمی نار کا مندر ہے، جس میں سنگِ مرمر کے خوبصورت پاک بازی کے بہترین نمونے ہیں۔ اس کے اندر تا کی لگی پلیٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عظیم مندر ۸۲ میں چمبہ کے راجہ پرتاپ سنگھ نے بنوایا تھا۔ دیگر مندروں کی طرح یہ مندر بھی پہاڑی فن کار کمالِ فن کا شاہکار ہے۔

ہماچل میں سب سے پرانا مندر کنور کا "بودھ ہے، جس میں مہاتما بدھ کا قدیم ترین مجسمہ رکھا ہے۔ جو قدامت اور توانائی کا مظہر ہے۔ ...
دآنگ

خواجہ احمد عباس

نام: احمد عباس

والد کا نام: خواجہ غلام السبطین انصاری

تاریخ پیدائش: ۷ جون ۱۹۱۶ء پانی پت (ہریانہ)

تاریخ وفات: ابھی معلوم نہیں۔

والد کا انتقال: ۱۹۴۲ء میں بعارضۂ قلب فالج۔

تعلیم: پہلی سے چوتھی تک:
حالی مسلم ہائی اسکول قلندر صاحب شاخ۔
پانچویں سے ساتویں تک:
حالی مسلم ہائی اسکول، پانی پت۔
آٹھویں جماعت:
یونیورسٹی مڈل اسکول، علی گڑھ۔
نویں سے بارہویں تک:
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ انٹرمیڈیٹ کالج، علی گڑھ۔
تیرہ سے چودہ تک:
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
ایل۔ایل۔بی:
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایل۔ایل۔بی کا امتحان ختم کرتے ہی بمبئی آ گیا۔

بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی کے دوران "نیشنل کال" اور "ہندوستان ٹائمز" میں طویل چھٹیوں میں (بلا معاوضہ) کام کرتا رہا (۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۵ء تک)

علی گڑھ میں قوم پرست خیالات اور جواہر لال نہرو سے خط و کتابت کرنے کی وجہ سے "علی گڑھ میگزین" کا ایڈیٹر نہ بن سکا۔ سو اپنا ذاتی ہفتہ وار اخبار نکالا جو کافی مقبول ہوا اور جس کا نام تھا "علی گڑھ اوپینین"
" Aligarh Opinion "

قیمت فی پرچہ تھی دو پیسے۔ سالانہ چلا تھا سوا روپیہ۔

۱۹۳۵ء میں بمبئی کرانیکل میں کام کرنا شروع کیا۔ تنخواہ پچاس روپے ماہوار، جو تین سال میں پونے دو سو [ =/175 ] ہو گئی۔ دو سال فلم کرٹیک Film Critic رہے تو پبلک میں دھوم مچ گئی، مگر کمرشیل فلم پروڈیوسروں میں کہرام برپا ہو گیا۔ تب پروڈیوسروں نے چیلنج کیا کہ احمد عباس کی بجائے فلم کرٹیک کسی اور کو مقرر کیا جائے ورنہ اشتہار دینا بند کر دیں گے تب عباس کو بمع جوگ کے سنڈے ایڈیشن کا ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا۔ اسی میں اُنہوں نے ہفتہ وار Last Page شروع کر دیا۔ جو ۱۹۴۷ء میں بلٹز Blitz میں منتقل کر دیا گیا ——

تین سال بعد ہندی بلٹز نکلنا شروع ہوا اور میں نے "آزاد قلم" کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ "آزاد قلم" Last Page کا ترجمہ ہوتا ہے مگر اصلیت یہ نہیں ہے۔ "آزاد قلم" میں یہ سمجھ کر لکھتا ہوں کہ اس کو اُتر پردیش والے پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد جب اردو بلٹز نکلنا شروع ہوا تو میں نے "آزاد قلم" کو اردو ہندی دونوں کے لیے لکھنا شروع کر دیا۔ اور یہی کام اردو اور ہندی کالموں میں یگانگت پیدا کرتا ہے۔ یہ مضمون جو لاسٹ پیج Last Page سے قریب ہوتا ہے، بلکہ عام زبان لکھنے سے ہر ہفتہ ہندی والے اردو "آزاد قلم" میں کم سے کم (پانچ چھ) اردو الفاظ بدل دیتے ہیں۔ باقی "آزاد قلم" کی زبان سہل ہی ہوتی ہے گویا کہ یہ کالم ایک ہی سانچے میں ڈھلتے ہیں، جو اُتر پردیش، ........ مدھیہ پردیش اور راجستھان میں پڑھا اور سمجھے جاتے ہیں۔ گویا یہ بھارت کی دھرتی کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اب لاسٹ پیج کو نکلتے ہوئے سینتیس ۳۷ برس ہو چکے ہیں، میرے خیال میں یہ دنیا کا سب سے پرانا کالم ہے۔

اب میں فلم بنانے کے ساتھ ساتھ ہر ہفتے لاسٹ پیج اور "آزاد قلم" میں کافی فرق ہوتا ہے۔ بلحاظ مواد کے اعتبار سے "آزاد قلم" زیادہ تر ملک کی سماجی اُلجھنوں کے بارے میں ہوتا ہے، جب کہ لاسٹ پیج Last Page بین الاقوامی حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ مرتے دم تک یہی لکھنے اور کرنے کا ارادہ ہے۔ اگر زندگی نے اتنی وفا کی تو میرا خیال ہے کہ میرے دفعتاً مرنے کی وجہ سے بلٹز کا "لاسٹ پیج" لکھ کر مروں گا تاکہ اس کی سرخی یہ ہو "The Last Last Page" اور اُمید ہے کہ ایسی ہی سرخی اس کی ہو گی۔

شادی: ۱۹۴۰ء میں اپنی رشتہ دار مجتبائی خاتون سے ہوئی۔ بی۔اے تک پڑھی لکھی ——
ادب اور ڈرامے میں بہت دلچسپی تھی۔ اس لیے میری جرنلزم، ادب اور پیپلز تھیٹر کی سرگرمیوں میں بالکل حارج نہیں ہوتی تھیں۔ اچھی نبھ گئی۔ لگ بھگ پیدائش سے ہی اُنہیں Rheumatic heart کی شکایت تھی۔ اس لیے تقریباً بیس برس تک میرا ساتھ دینے کے بعد ۱۹۵۸ء میں دل کے آپریشن کے بعد اللہ کو پیاری ہو گئیں اور مجھے اکیلا چھوڑ گئیں۔

۱۹۴۷ء میں پانی پت کے مسلمانوں کو پاکستان جانا پڑا۔ میرے خاندان کی عورتوں کو پنڈت جواہر لال نہرو کے حکم سے ایک ملٹری ٹرک میں بھر کر دلی لایا گیا اور وہاں سے میرا ایک ہندو دوست من موہن جان پر کھیل کر اُن کو براہ ہوائی جہاز بمبئی لایا اور میری والدہ نے کہا "نہ یہ اچھے نہ وہ اچھے"۔ مگر ہوائی جہاز میں پہلی بار بیٹھ کر کہا "میں تو اب ہوائی جہاز ہی میں سفر کروں گی!"

قلمی دنیا میں، میں نے پہلا قدم اٹھایا جب

میں نے کچھ وقت بمبئی ٹاکیز کا پارٹ ٹائم پبلسٹی مینیجر بننا منظور کرلیا۔ اس حیثیت سے میں سیٹ پر بھی جاسکتا تھا اور جرمن ڈائرکٹروں کی تکنیک سمجھتا رہا۔ دل ہی دل میں ڈائرکٹر بننے کی خواہش پلتی رہی۔

**دنیا کا سفر** میں نے دوسری جنگِ عظیم سے پہلے ہی مکمل کرلیا۔ میں پہلے مشرق بعید گیا پھر شنگھائی میں جاپانی بربریت کا معائنہ کیا، تب جاپان گیا اور جاپان سے امریکہ پہنچا۔ راستے میں ایک ہی دن دو مرتبہ آیا۔ امریکہ میں اس وقت Depression ہو رہا تھا، اس لیے ایک کارٹون جیسے رپورٹر نے مجھ سے سوال کیا Is there Depression in India میں نے جواب دیا۔ "ہم کو تو انگریزوں نے اتنا depress کر دیا ہے کہ اب مزید ڈپریشن کی گنجائش نہیں۔ اسی سفر میں، میں نے دنیا بھر کے نوجوانوں کی ایک کانفرنس میں حصہ لیا اور جو...... Poughkeepsie (نزد نیویارک) میں ہوئی تھی۔ یہ Anti fasist نوجوانوں کو متحد کرنے کی آخری کوشش تھی۔

جب میں نیویارک سے فرانس آیا تو میرے ساتھ یس۔یس۔ نارمنڈی (S.S.Normandie) پر علاوہ تھوڑے سے اور مسافروں کے دنیا کے عظیم ناول نگار ارنسٹ ہنگوے بھی تھے جو اس وقت جمہوری سپین میں فاشسٹوں اور نازیوں سے لڑنے جا رہے تھے۔

انگلستان میں، میں نے اپنا P&O کا ٹکٹ بیچ کر براہ خشکی ہندوستان واپس آیا۔ راستے میں جرمنی ویانا، بڈاپیسٹ، کونس تنزا (Contenza) سے سٹیمر لے کر قسطنطنیہ آیا اور پھر خشکی کے راستے سے شام و عراق کے راستے سے کراچی واپس آگیا۔

۱۹۳۹ء میں بڑی جنگ چھڑ گئی۔ مگر ہندوستان میں کانگریس نے اس میں لڑنے مرنے سے انکار کر دیا۔

۱۹۴۲ء میں گاندھی جی نے "بھارت چھوڑو" Quit India تحریک شروع کر دی، جس میں بمبئی کے کانگریس ریڈیو میں میں نے بھی خفیہ کام کیا۔

۱۹۴۳ء میں فلم انڈسٹری میں پکچر بنانے کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ اس طرح پیپلز تھیٹر کو بھی ایک فلم کا لائسنس ملا۔ اس طرح مجھے پیپلز تھیٹر کی طرف سے "دھرتی کے لال" لکھنے ڈائریکٹ اور پروڈیوس کرنے کا موقع ملا۔ یہ پکچر بھی فرقہ وارانہ فسادات میں دب کر رہ گئی۔ مگر یہ فلم ستیہ جیت رائے کی پاتھر پنچالی سے ۸ برس پہلے ہندوستان کے سکرین پر آگئی تھی۔ شملہ کانفرنس سے فائدہ اٹھا کر اس کا ایک پریس شو کیا، جس میں امریکن انگریز کارسپانڈنٹ اور جو کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈر اس دن مصروف نہیں تھے، ان سب نے یہ پکچر دیکھی اور اس کو بہت پسند کیا۔ مسز سروجنی نائیڈو اور مسز شفیع جب آخیر میں نکلیں تو دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ رندھی ہوئی آواز میں مسز نائیڈو نے کہا: "میں تو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے لیڈروں سے کہوں گی کہ بجائے بات چیت میں وقت ضائع کرتے کے بیٹھ کر یہ پکچر دیکھیں جس سے اُن کو معلوم ہوگا کہ بنگال کے کال کے مارے ہوئے ہندو مسلمان کیسے رہتے ہیں۔"
مشہور فرانسیسی فلمی نقاد پروفیسر جارج سادول نے دنیا بھر کی سو بہترین فلموں میں اس کا شمار کیا۔ واضح رہے کہ اس فہرست میں ہندوستان سے صرف دو فلمیں رکھی گئی تھیں —— ہمارا "دھرتی کے لال" اور ستیہ جیت رائے کی "پاتھر پنچالی"

مگر ہندوستان میں یہ پکچر فرقہ وارانہ فسادات کے زمانے میں نہ چل سکی۔ مجھے اور میرے .... Co.producer کو تین برس تک اس فلم کے قرضے اُتارنے پڑے۔ اس لیے کوئی دوسری پکچر نہ بنا سکے۔

اگلی پکچر ہم تین چار برس بعد بنا سکے۔ یہ تھی "انہونی" جو خاصی کامیاب تھی مگر بہت کامیاب نہ ہو سکی۔ پھر یکے بعد دیگرے تیرہ چودہ پکچریں بنائیں۔ مگر کوئی بھی بہت کامیاب نہ ہوئی۔ مگر "شہر اور سپنا" کو پریزیڈنٹ گولڈ میڈل ملا۔ اور یہ سالِ رواں (۱۹۶۳ء) کی "بہترین" پکچر بن گئی۔ اس لیے تھوڑی بہت چلی۔ لوگ کہتے ہیں "عباس صاحب، آپ دوسروں کے لیے پکچریں لکھتے ہیں تو وہ کامیاب ہوتی ہیں، مگر آپ خود اپنی کہانی کو بناتے ہیں تو وہ "فیل" ہو جاتی ہے۔" میں جواب دیتا ہوں کہ "وجہ معقول ہے۔ میں راج کپور اور گلزار جیسا کامیاب ڈائریکٹر نہیں ہوں۔" لیکن اصل وجہ کچھ اور ہے۔ دوسرے ڈائریکٹر گانوں، ناچوں اور کامیڈی کا مصالحہ بھر دیتے ہیں، اس لیے "آوارہ" اور "شری چار سو بیس" کی طرح پکچر کامیاب ہو جاتی ہے (جیسے "آوارہ" سوویت یونین میں بھی مقبول ترین ہوئی وغیرہ وغیرہ
تصانیف: میں نے جرنلزم سے کتابیں لکھنے کو چھوڑ کر فلم لائن اختیار نہیں کی بیں اپنے سب کاموں کو —— بلٹز کا "آخری صفحہ" Last Page لکھنے کو، کتابیں لکھنے کو، فلم بنانے کو، ڈرامے لکھنے کو ایک ہی مقصد کے لیے استعمال کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ "مجھے کچھ کہنا ہے۔" اور اسی کو میں کبھی مضمون لکھ کر، کبھی کتاب لکھ کر، کبھی فلم بنا کر، کبھی ڈرامہ لکھ کر کہتا ہوں اور بار بار کہتا رہتا ہوں۔ کیا فائدہ ہوتا ہے؟ ایک چھوٹا طبقہ نوجوانوں کا جو مجھے اور میری تخلیقات کو پسند کرتا ہے اور وہ میری تصانیف پڑھ کر اور میری فلم دیکھ کر سوشلزم، انسان پرستی، عالمی امن کی طرف ہو جاتا ہے۔ یہ چند لوگ میری کاوشوں کا صلہ ہیں۔ اگر ان کی تعداد بڑھتی گئی تو میں اپنی زندگی کو کامیاب سمجھوں گا۔
میں نے اب تک کوئی ستر کتابیں لکھی ہیں

آگے صفحہ ۲۰ پر

# بخطِ شاعر

حفیظ میرٹھی

مہرباں وہ لبِ جو آج ہوا پانی پر
چھوڑ کر پاؤں سے احسان کیا پانی پر

نقش کا تو کبھی جادو نہ چلا پانی پر
رنگ کائی کا مگر جم کے رہا پانی پر

موجۂ مے سے تراشا ہوا اندازِ خرام
آپ چلتے ہیں کہ چلتی ہے صبا پانی پر

ہو گیا شیخ کی مہمان نوازی کا شکار
الٹا رند کو کرنا ہی پڑا پانی پر

لیجیے مل گئی بیچارے غریبوں کو دوا
پڑھ کے اک شخص نے کچھ پھونک دیا پانی پر

خون اس دورِ گرانی میں بہت سستا ہے
رات پھر گاؤں میں اک قتل ہوا پانی پر

جھیل میں ڈوب گیا جان سے بیزار بدن
تیرتا رہ گیا مٹی کا گھڑا پانی پر

یہ بتا کر کہ ملاحوں کی شرارت تھی حفیظ
دھر دیا ہم نے وہ الزام جو تھا پانی پر

حفیظ میرٹھی

## قمر اقبال

### لاجواب

تم ریاضی کی اک کتاب لیے
پوچھنے کچھ سوال آئی ہو

کیا نہیں اس کتاب میں موجود
ہر طرح کے سوال ہیں اس میں
کتنے اُلجھاؤ پیچ و خم کتنے
کتنی اشکال
جمع و تفریق

کتنے ہندسے ہیں دائرے کتنے
زاویوں کے ہیں سلسلے کتنے
کتنی قوسیں ہیں
کتنے زیر و زبر

کاش میں تم سے یہ بھی کہہ سکتا
سب سوالوں کا ہے جواب مگر
تم سے مشکل کوئی سوال نہیں

### بُت

مجھ سے اکثر وہ یہ بات کہتی رہی
آؤ اک دن چلیں
پتھروں کے دلوں کی بھی دھڑکن سنیں
سنگ تراشی کے شہکار سب دیکھ لیں
ہر تراشیدہ بُت انگلیوں سے چھوئیں
اور آنکھوں سے باتیں کریں
میں نے اس سے کہا
پتھروں میں ہے کیا ؟
آئینے میں کبھی
جائزہ خود کا تم نے لیا
میری آنکھوں سے خود کو تو دیکھو سہی
اور سوچو ذرا
کیا خدا سے بڑا کوئی فن کار ہے ؟
وہ مری بات پر
کھلکھلا کر ہنسی
اور ہنستے ہوئے شرم سے
خود بھی بُت بن گئی

### بُت شکن

ہر طرف بُت ہی بُت
اور میں بُت شکن
اپنے ہاتھوں میں تیشہ لیے
توڑتا آ رہا ہوں بُتوں کو
میں تیری طرف
سارے بُت ٹوٹ کر گر گئے
ایک بُت رہ گیا
وہ مری ذات ہے
آخری بُت گرائے گا جو
وہ ترا ہاتھ ہے

• مدیر معاون روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز، اورنگ آباد

## طالب چکوالی

دل کو پتھر بنا لیا ہے، میاں!
آخر ایسا بھی کیا ہوا ہے، میاں!

اتنا بدلے ہو تم کہ لگتا ہے
تم نہیں، کوئی دوسرا ہے، میاں!

زندگی اک کڑی پہیلی ہے
اس کا حل اس سے بھی کڑا ہے، میاں!

دل کو جامِ سفال سمجھے ہو
یہ تو جامِ جہاں نما ہے، میاں!

زرد پتّوں سے دوستی کر لو
اب تو پت جھڑ کا سامنا ہے، میاں!

زندگی کٹ رہی ہے اس کے طفیل
اس ہی کا تو آسرا ہے، میاں!

دوش کیا دیں کسی کو ہم طالب
کوئی چھوٹا، کوئی بڑا ہے، میاں!

## شاد نوحی

دلاسا دیتے ہیں خانہ خراب ہونے تک
یہ انتظار کے لمحے عذاب ہونے تک

اسی شجر میں چھپائے رہو بدن اپنا
کرن کرن سے جدا آفتاب ہونے تک

بکھیرتا رہا خوشبوئیں گھر کے آنگن میں
وہ سائے جیسا بدن محوِ خواب ہونے تک

جہاں بھی کوئی نوشتہ ملے اٹھا لینا
ورق ورق ہی رہوں گا کتاب ہونے تک

چلو ستاروں کی چھاؤں میں رت جگا کر لیں
جیے گا کون شبِ ماہتاب ہونے تک

بس اتنا یاد ہے سوچوں کے بہتے دریا میں
وہ شمع جلتی رہی زیرِ آب ہونے تک

## مبارک شمیم

یہ سب طلسمِ نظر ہے سنبھل کے دیکھو تو
حصارِ ذات کے باہر نکل کے دیکھو تو

سوادِ شام و سحر کیا خبر بدل جائے
نئی رُتوں کے لیے تم مچل کے دیکھو تو

تمہاری سمت بڑھے گا وہ مضطرب ہو کر
تم اس کی راہ میں دو گام چل کے دیکھو تو

اک عمر سے تھا یقیں جن کے لوٹ آنے کا
کدھر گئے وہ شب و روز کل کے دیکھو تو

جہاں تمہاری نظر ہے وہ اور منظر ہے
نظر کا زاویہ لوگو، بدل کے دیکھو تو

خدا گواہ کہ تم خود کو بھول جاؤ گے
نئے شعور میں اک بار ڈھل کے دیکھو تو

کبھی نکال کے دل سے تمام اندیشے
شمیم سوزِ تمنا میں جل کے دیکھو تو

● منوہر نواس، جے-۴۲، لاجپت نگر۳۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۴ ● نوح، ضلع گوڑگاؤں (ہریانہ) ● محلہ احمد پور، شاہ جہاں پور، یوپی

# غزلیں

## ناز قادری

شکوں نہیں تھا، مگر اتنا انتشار نہ تھا
ہمارے چاروں طرف خوف کا حصار نہ تھا

تمام عمر خزاں نے ہمارا ساتھ دیا
ہمارے سر پہ کبھی سایۂ بہار نہ تھا

ذرا سی ٹھیس لگی اور چھن سے ٹوٹ گیا
ہمارا شیشۂ دل سنگِ ریگ زار نہ تھا

ہر ایک ہاتھ سے پتھر مچل کے چھوٹ گیا
کہ جیسے شہر میں کوئی گناہگار نہ تھا

جسے قریب سے پڑھ کر کوئی سمجھ لیتا
فصیلِ شہر پہ چسپاں وہ اشتہار نہ تھا

ہوا کا ایک ہی جھونکا جسے مٹا دیتا
نواحِ ذات میں ایسا کوئی حصار نہ تھا

شریکِ غم تھا سلگتے وجود کا محور
ہزار کرب سہی نازؔ اشک بار نہ تھا

ہر ایک لفظ میں مضمر تھا دفترِ معنی
کہیں بھی نازؔ مگر حرفِ اعتبار نہ تھا

---

زمین پاؤں تلے، سر پہ آسماں بھی نہیں
تمہارے بعد کہیں گوشۂ اماں بھی نہیں

سکوت ایسا تو نازل کبھی ہوا ہی نہ تھا
ہمارے شہر میں اب غوغۂ سگاں بھی نہیں

رگوں میں گرمیٔ خوں ہے، نہ اشک آنکھوں میں
یہ کیسا وقت پڑا ہے، چراغِ جاں بھی نہیں

یہ کیا ہوا کہ ہمیں چپ سی لگ گئی یعنی
ہمارے سینے میں اب آتشِ فغاں بھی نہیں

پھر آئے گا بھی سر پہ ہمارے ابرِ شفیق
یقیں تو دور ہے، اس کا ہمیں گماں بھی نہیں

عجیب کوہِ الم سر پہ آپڑا اب کے
کہ اس سے بڑھ کے کوئی سخت امتحاں بھی نہیں

کہاں کہاں لٹی، کتنی لٹی متاعِ حیات
کہ اس سفر میں کچھ اندازۂ زیاں بھی نہیں

یہ کیسا موسمِ سفاک رو بہ رو ہے نازؔ
بہار کیسی کہیں وحشتِ خزاں بھی نہیں

---

سانس ہے کہ سفر کا آئینہ
الجھی الجھی ڈگر کا آئینہ

بکھرا بکھرا ہے عکسِ بام و در
ٹوٹا ٹوٹا ہے گھر کا آئینہ

چل رہی ہے ہوا بھی ساتھ مرے
لے کے گردِ سفر کا آئینہ

گرد کے بادلوں میں کھلا پایا
اپنے حسنِ نظر کا آئینہ

بیری زنجیر ڈھالنے والے!
دیکھ شام و سحر کا آئینہ

تو مری آنکھ سے بھی دیکھ کبھی
زخم ہر رہ گزر کا آئینہ

کرچیوں میں بکھر گیا کیسے!
آرزوئے بشر کا آئینہ

خاک میں مل کے آفتاب ہوا
کیا عجب شے ہے سر کا آئینہ

چشمِ شبنم سے پھوٹتی ہے کرن
کھل اٹھا برگِ تر کا آئینہ

ایک دستک میں چور چور ہوا
بند دیوار و در کا آئینہ

اپنی بے چہرگی پہ روتا ہے
اک دعائے اثر کا آئینہ

تہہ میں رکھتا ہے آگہی کی کرن
سنگسارِ ہنر کا آئینہ

نازؔ! کہتے ہیں تیرگی جس کو
ہے فقط رات بھر کا آئینہ


• غوث منزل، برہم پورہ، مظفرپور ۸۴۲۰۰۳

## دلیپ بادل

داستاں کرب کی ہر روز سناتے کیوں ہو؟
وادیٔ گُل ہے مجھے ایسے جلاتے کیوں ہو؟
نُور ہی نُور ہو، پھیلو گے جہاں جاؤ گے
پھر مجھے تیرہ شبی یاد دلاتے کیوں ہو؟
ریت میں جان ہے کتنی تمہیں معلوم تو ہے
ریت کے قصر مگر روز بناتے کیوں ہو؟
خاک سے پھول ہی کیا، تم بھی اگے ہو صاحب
یہ سمجھتے ہو تو پھولوں کو جلاتے کیوں ہو؟
جن کے ہاتھوں میں سدا تیغ و سناں تھیں بادل
داستاں درد کی تم اُن کو سناتے کیوں ہو؟

• ۴۲۵- چراغ دلی، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

## تمنا یوسفی

ترے پاس آکے بے کل ہو گئے ہیں
تجھے دیکھا تو پاگل ہو گئے ہیں
نہ دیکھو اور خوابوں کے جزیرے
جو دیکھے تھے، وہ دلدل ہو گئے ہیں
سجا لیتے تھے پلکوں پر جنہیں ہم
وہ آنسو آج بوجھل ہو گئے ہیں
اُدھر ساحل نظر آیا ہے لیکن
یہاں تو دست و پا شل ہو گئے ہیں
زمانے سے لڑیں گے اب کہاں تک
تمنا آپ پاگل ہو گئے ہیں

• ۳۷- ہانڈ مارکیٹ، امرتسر ۱۴۳۰۰۱

## جلال صدیقی

ورق، ورق میں لہو کے نشان کس کے ہیں
ترے بیان میں شامل بیان کس کے ہیں
نہ جانے کس کے تعاقب میں رات پھرتی ہے
نہ جانے سائے مرے درمیان کس کے ہیں
ہوا کے شور میں شامل صدائے گریہ ہے
سماعتوں پہ پڑے بادبان کس کے ہیں
فصیلِ شہر ہر اک لمحہ پھیلی جاتی ہے
درونِ شہر سمٹتے مکان کس کے ہیں
ہم ایسے خاک بسر آج کس سے یہ پوچھیں
زمیں کو ایسے ڈھکے آسمان کس کے ہیں

• شانتی کنج، واسع پور، پوسٹ آفس دھنباد
(دھنباد)

# غزلیں

## حبیب سوز

میر: اس موسم میں نکلا تھا سفر کو
تھی پتوں کی ضرورت جب شجر کو
ہیں چسپاں بام و در پہ یادگاریں
عجائب گھر بنا رکھا ہے گھر کو
ندی کا خشک چہرہ دیکھتے ہی
پرندے اُڑ گئے جانے کدھر کو
یہ سورج جب مری مٹھی میں ہوگا
اُجالے بانٹ دوں گا شہر بھر کو
دُھواں سا بھر رہا ہے سوز ہر سو
نظر آتا نہیں کچھ بھی نظر کو

• چیف ایڈیٹر "لمحے لمحے" الہ پور، بدایوں (یوپی)

## نجم عثمانی

نہ جانے کس لیے چہرہ لہو سے دھوتا ہے
یہ رات بھر مرے کمرے میں کون روتا ہے
ہر ایک گھر میں نمودِ سحر سے پہلے ہی
نہ جانے کون اُداسی کے بیج بوتا ہے
وہ جنگ باز ہے، میں امن کا پیمبر ہوں
یہ آگ پانی کا رشتہ بھی خوب ہوتا ہے
یہ کیسا روگ لگا ہے مجھے کہ اب دن رات
دماغ جاگتا رہتا ہے قلب سوتا ہے
سما گیا ہے وہ اس طرح میری رگ رگ میں
کہ اپنے آپ پہ اُس کا گمان ہوتا ہے

• سی۔ ایم۔ پی۔ ایف آفس، دھنباد (بہار)

## منصور عمر

وقت کے آذر بتا یہ سانحہ کیوں کر ہوا
ہم نے جس کو خود بنایا وہ خدا کیوں کر ہوا
شور ہے ہر سمت ادراک بھیڑ ہے چاروں طرف
پوچھتے ہو پھر بھی وہ ہم سے جدا کیوں کر ہوا
کرتا تھا دعویٰ خدائی کا اسی سے پوچھ لو
پانیوں کے بیچ آخر راستہ کیوں کر ہوا
وہ نیا کہہ کر جسے دُہرا رہا ہے بار بار
دنیا ہے صدیوں سے واقف پھر نیا کیوں کر ہوا
تیرے سر کا تاج جو بے سر ہوا تھا اے جبیل
میں تھا تیری خاکِ پا مجھ کو عطا کیوں کر ہوا

• سی۔ ایم کالج (ایل۔ این متھیلا یونیورسٹی) دربھنگہ
۸۴۶۰۰۴

# سان فرانسسکو
## قدرتی نظاروں کا شہر

لاس اینجلز سے سان فرانسسکو بذریعہ کار جانے کے لیے ہم نے وہ شاہراہ اختیار کی جو شانت مہاساگر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ یہ راستہ دوسرے راستوں کی نسبت زیادہ لمبا ہے، لیکن سمندر اور ساحل کے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہونے کی چاہ نے ہمیں یہ راستہ منتخب کرنے کے لیے اکسایا تھا۔ اکثر دوستوں نے بتایا تھا کہ سڑک کے نسبتاً تنگ ہونے اور دھند کے امکانات کی وجہ سے ہم دن بھر کی مسافت کے لیے تیار رہیں۔ جون کا مہینہ تھا لہٰذا دھند تو ہمیں ملی نہیں لیکن اس سے بچا ہوا بیشتر وقت ان دلفریب Lo Beaches نظارہ کرنے میں صرف ہو گیا۔ دن بھر کبھی سمندر، کبھی پہاڑیاں اور کبھی دونوں نے ہمارا ساتھ دیا۔ تیسرے پہر سان فرانسسکو سے تقریباً چالیس پچاس میل قبل کارمل بیچ (CARMEL BEACH) پر پہنچے جو اپنی فطری خوبصورتی اور رونق کی وجہ سے امریکہ بھر میں مشہور ہے۔ چھوٹے چھوٹے خوش وضع ہوٹل موٹل، اور بنگلوں کے سلسلوں کے درمیان گولف کورس، ٹینس کورٹ، بام مرغزاروں میں تفریح یا سستانے کے کئی دلفریب مقام تھے۔ کچھ ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے فطری نظاروں کے سحر کی گرفت سان فرانسسکو پہنچتے پہنچتے زیادہ مضبوط ہوتی جا رہی ہو اور پھر ایکایک شہر کے حسین خدوخال ابھرنے لگے۔

کسی جوان جسم کی خوشبو کی طرح، ہر شہر کی بھی اپنی ایک روح، ایک مہک ہوتی ہے۔ یہاں کا کھلا آسمان، تازہ بحری ہوائیں، پہاڑیوں کے سلسلے اور ہر طرف کشادگی کا احساس ہی شاید سان فرانسسکو کی روح ہے۔ امریکہ کے مغربی ساحل پر چالیس پہاڑیوں کے سلسلے پر آباد یہ شہر، ایک طرف شانت مہاساگر اور دوسری طرف خلیج سان فرانسسکو کے درمیان سر اٹھائے ایک روح پرور نظارہ پیش کرتا ہے۔ شمال مشرق اور شمال مغرب میں جدید انجینئرنگ کے دو شاہکار پُل بازوؤں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ شاید یہ ایک حسینہ کی انگڑائی

آبشار کی طرح گرتی ہوئی سڑکیں۔ چالیس پہاڑی سلسلوں کی ڈھلانوں پر بسے ہوئے شہر سان فرانسسکو کا ایک منظر

۲۵۰/۲ اے۔ ۱۲ فرید آباد۔ ۱۲۱۰۰۲

# من کہ...

نام : احمد عباس

والد کا نام : خواجہ غلام السبطین انصاری

تاریخ پیدائش : ۷ جون ۱۹۱۶ء پانی پت (ہریانہ)

تاریخ وفات : ابھی معلوم نہیں۔

والد کا انتقال : ۱۹۴۲ء میں بعارضۂ قلب فالج۔

تعلیم : پہلی سے چوتھی تک :
حالی مسلم ہائی اسکول قلندر صاحب شاخ۔
پانچویں سے ساتویں تک :
حالی مسلم ہائی اسکول، پانی پت۔
آٹھویں جماعت :
یونیورسٹی مڈل اسکول، علی گڑھ۔
نویں سے بارہویں تک :
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ انٹرمیڈیٹ کالج، علی گڑھ۔
تیرہ سے چودہ تک :
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ایل۔ ایل۔ بی :
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان ختم کرتے ہی بمبئی آگیا۔
بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کے دوران "نیشنل کال" اور "ہندوستان ٹائمز" میں طویل چھٹیوں میں (بلا معاوضہ) کام کرتا رہا (۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۵ء تک)

علی گڑھ میں قوم پرست خیالات اور جواہر لال نہرو سے خط و کتابت کرنے کی وجہ سے "علی گڑھ میگزین" کا ایڈیٹر نہ بن سکا۔ سو اپنا ذاتی ہفتہ وار اخبار نکالا جو کافی مقبول ہوا اور جس کا نام تھا "علی گڑھ اوپینین"
" Aligarh Opinion "

قیمت فی پرچہ تھی دو پیسے۔ سالانہ چندہ تھا سوا روپیہ۔

۱۹۳۵ء میں بمبئی کرانیکل میں کام کرنا شروع کیا۔ تنخواہ پچاس روپے ماہوار، جو تین سال میں پونے دو سو [ 175/= ] ہوگئی۔ دو سال فلم کرٹیک Film Critic رہے تو پبلک میں دھوم مچ گئی، مگر کمرشیل فلم پروڈیوسروں میں کہرام برپا ہوگیا۔ تب پروڈیوسروں نے چیلنج کیا کہ احمد عباس کی بجائے فلم کرٹیک کسی اور کو مقرر کیا جائے ورنہ اشتہار دینا بند کردیں گے تب عباس کو مع جوگ کے سنڈے ایڈیشن کا ایڈیٹر مقرر کردیا گیا۔ اس میں اُنہوں نے ہفتہ وار Last Page شروع کردیا۔ جو ۱۹۴۷ء میں بلٹز Blitz میں منتقل کردیا گیا ——
تین سال بعد ہندی بلٹز نکلنا شروع ہوا اور میں نے "آزاد قلم" کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ "آزاد قلم" Last Page کا ترجمہ ہوتا ہے مگر اصلیت یہ نہیں ہے۔ "آزاد قلم" میں یہ سمجھ کر لکھتا ہوں کہ اس کو اُتر پردیش والے پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد جب "اردو بلٹز" نکلنا شروع ہوا تو میں نے "آزاد قلم" کو اردو ہندی دونوں کے لیے لکھنا شروع کردیا۔ اور یہی کام اردو اور ہندی کالموں میں یگانگت پیدا کرتا ہے۔ یہ مضمون جو لاسٹ پیج Last Page سے قریب ہوتا ہے، ہلکی زبان لکھنے سے ہر ہفتہ ہندی والے اردو "آزاد قلم" میں کم سے کم (پانچ چھ) اردو الفاظ بدل دیتے ہیں۔ باقی "آزاد قلم" کی زبان سہل ہی ہوتی ہے گویا کہ یہ کالم ایک ہی سانچے میں ڈھلتے ہیں، جو اُتر پردیش، ......... مدھیہ پردیش اور راجستھان میں پڑھا اور سمجھے جاتے ہیں۔ گویا یہ بھارت کی دھرتی کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اب لاسٹ پیج کو نکلتے ہوئے سینتیس ۳۷ برس ہو چکے ہیں، میرے خیال میں یہ دنیا کا سب سے پرانا کالم ہے۔

اب میں فلم بنانے کے ساتھ ساتھ ہر ہفتے لاسٹ پیج اور "آزاد قلم" میں کافی فرق ہوتا ہے۔ تقسیم اور مواد کے اعتبار سے "آزاد قلم" زیادہ تر ملک کی سماجی اُلجھنوں کے بارے میں ہوتا ہے، جب کہ لاسٹ پیج Last Page بین الاقوامی حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ مرتے دم تک یہی لکھنے اور کرنے کا ارادہ ہے۔ اگر زندگی نے اتنی وفا کی تو میرا خیال ہے کہ میرے دفعتاً مرنے کی وجہ سے بلٹز کا "لاسٹ پیج" لکھ کر مروں گا تاکہ اس کی سُرخی یہ ہو "The Last Last Page" اور اُمید ہے کہ ایسی ہی سُرخی اس کی ہوگی۔

شادی : ۱۹۴۰ء میں اپنی رشتہ دار مجتبائی خاتون سے ہوئی۔ بی۔ اے تک پڑھی لکھی ——
ادب اور ڈرامے میں بہت دلچسپی تھی اس لیے میری جرنلزم، ادب اور پبلیز تھیٹر کی سرگرمیوں میں بالکل خارج نہیں ہوتی تھیں۔ اچھی نبھ گئی۔ لگ بھگ پیدائش سے ہی انہیں Rheumatic heart کی شکایت تھی۔ اس لیے تقریباً بیس برس تک میرا ساتھ دینے کے بعد ۱۹۵۸ء میں دل کے آپریشن کے بعد اللہ کو پیاری ہوگئیں اور مجھے اکیلا چھوڑ گئیں۔

۱۹۴۷ء میں پانی پت کے مسلمانوں کو پاکستان جانا پڑا۔ میرے خاندان کی عورتوں کو پنڈت جواہر لال نہرو کے حکم سے ایک ملٹری ٹرک میں بھر کر دلّی لایا گیا اور وہاں سے میرا ایک ہندو دوست من موہن جان پر کھیل کر اُن کو براہ ہوائی جہاز بمبئی لایا اور میری والدہ نے کہا "نہ یہ اچھے نہ وہ اچھے" مگر ہوائی جہاز میں پہلی بار بیٹھ کر کہا "میں تو اب ہوائی جہاز ہی میں سفر کروں گی!"

قلمی دنیا میں میں نے پہلا قدم اٹھایا جو

میں نے کچھ وقت بمبئی ٹاکیز کا پارٹ ٹائم پبلسٹی منیجر بننا منظور کرلیا۔ اس حیثیت سے میں سیٹ پر بھی جاسکتا تھا اور جرمن ڈائرکٹروں کی تکنیک سمجھتا رہا۔ دل ہی دل میں ڈائرکٹر بننے کی خواہش پلتی رہی۔

**دنیا کا سفر** میں نے دوسری جنگِ عظیم سے پہلے ہی مکمل کرلیا۔ میں پہلے مشرق بعید گیا پھر شنگھائی میں جاپانی بربریت کا معائنہ کیا، تب جاپان گیا اور جاپان سے امریکہ پہنچا۔ راستے میں ایک ہی دن دو مرتبہ آیا۔ امریکہ میں اس وقت Depression ہو رہا تھا، اس لیے ایک کارٹون جیسے رپورٹر نے مجھ سے سوال کیا Is there Depression in India میں نے جواب دیا "ہم کو تو انگریزوں نے اتنا depress کر دیا ہے کہ اب مزید ڈپریشن کی گنجائش نہیں۔ اسی سفر میں، میں نے دنیا بھر کے نوجوانوں کی ایک کانفرنس میں حصہ لیا اور جو...... Poughkeepsie (نزد نیویارک) میں ہوئی تھی۔ یہ Anti fasist نوجوانوں کو متحد کرنے کی آخری کوشش تھی۔

جب میں نیویارک سے فرانس آیا تو میرے ساتھ یس۔یس۔ نارمنڈی (S.S. Normandie) پر علاوہ تھوڑے سے اور مسافروں کے دنیا کے عظیم ناول نگار ارنسٹ ہنگوے بھی تھے جو اس وقت جمہوری سپین میں فاشسٹوں اور نازیوں سے لڑنے جا رہے تھے۔

انگلستان میں، میں نے اپنا P&O کا ٹکٹ بیچ کر براہ خشکی ہندوستان واپس آیا۔ راستے میں جرمنی ویانا، بڈاپسٹ، کونس تنزا (Contenza) سے سٹیمر لے کر قسطنطنیہ آیا اور پھر خشکی کے راستے سے شام و عراق کے راستے سے کراچی واپس آگیا۔
۱۹۳۹ء میں بڑی جنگ چھڑ گئی۔ مگر ہندوستان میں کانگریس نے اس میں لڑنے مرنے سے انکار کر دیا۔

۱۹۴۲ء میں گاندھی جی نے "بھارت چھوڑو" Quit India تحریک شروع کر دی، جس میں بمبئی کے کانگریس ریڈیو میں میں نے بھی خفیہ کام کیا۔

۱۹۴۳ء میں فلم انڈسٹری میں پکچر بنانے کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ اس طرح پیپلز تھیٹر کو بھی ایک فلم کا لائسنس ملا۔ اس طرح مجھے پیپلز تھیٹر کی طرف سے "دھرتی کے لال" لکھنے ڈائریکٹ اور پروڈیوس کرنے کا موقع ملا۔ یہ پکچر بھی فرقہ وارانہ فسادات میں دب کر رہ گئی۔ مگر یہ فلم ستیہ جیت رائے کی پاتھر پنچالی سے ۸ برس پہلے ہندوستان کے سکرین پر آگئی تھی۔ شملہ کانفرنس سے فائدہ اٹھا کر اس کا ایک پریس شو کیا، جس میں امریکن انگریز کارسپانڈنٹ اور جو کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈر اس دن مصروف نہیں تھے، ان سب نے یہ پکچر دیکھی اور اس کو بہت پسند کیا۔ مسز سروجنی نائیڈو اور مسز شفیع جب آخیر میں نکلیں تو دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ رُندھی ہوئی آواز میں مسز نائیڈو نے کہا "میں تو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے لیڈر رول سے کہوں گی کہ بجائے بات چیت میں وقت ضائع کرنے کے بیٹھ کر یہ پکچر دیکھیں جس سے اُن کو معلوم ہوگا کہ بنگال کے کال کے مارے ہوئے ہندو مسلمان کیسے رہتے ہیں"۔
مشہور فرانسیسی فلمی نقاد پروفیسر جارج سادول نے دنیا بھر کی سو بہترین فلموں میں اس کا شمار کیا۔ واضح رہے کہ اس فہرست میں ہندوستان سے صرف دو فلمیں رکھی گئی تھیں —— ہمارا "دھرتی کے لال" اور ستیہ جیت رائے کی "پاتھر پنچالی"

مگر ہندوستان میں یہ پکچر فرقہ وارانہ فسادات کے زمانے میں نہ چل سکی۔ مجھے اور میرے..... Co. producer کو تین برس تک اس فلم کے قرضے اتارتے پڑے۔ اس لیے کوئی دوسری پکچر نہ بنا سکے۔

اگلی پکچر ہم تین چار برس بعد بنا سکے۔ یہ تھی "انہونی" جو خاصی کامیاب تھی مگر بہت کامیاب نہ ہو سکی۔ پھر یکے بعد دیگرے تیرہ چودہ پکچریں بنائیں۔ مگر کوئی بھی بہت کامیاب نہ ہوئی۔ مگر "شہر اور سپنا" کو پریزیڈنٹ گولڈ میڈل ملا۔ اور یہ سالِ رواں (۱۹۶۳ء) کی بہترین پکچر بن گئی۔ اس لیے تھوڑی بہت چلی۔ لوگ کہتے ہیں "عباس صاحب، آپ دوسروں کے لیے پکچریں لکھتے ہیں تو وہ کامیاب ہوتی ہیں، مگر آپ خود اپنی کہانی کو بناتے ہیں تو وہ "فیل" ہو جاتی ہے"۔ میں جواب دیتا ہوں کہ "وجہ معقول ہے۔ میں راج کپور اور گلزار جیسا کامیاب ڈائریکٹر نہیں ہوں"۔ لیکن اصل وجہ کچھ اور ہے۔ دوسرے ڈائریکٹر گانوں، ناچوں اور کامیڈی کا مصالحہ بھر دیتے ہیں، اس لیے "آوارہ" اور "شری چار سو بیس" کی طرح پکچر کامیاب ہو جاتی ہے (جیسے "آوارہ" سوویت یونین میں بھی مقبول ترین ہوئی وغیرہ وغیرہ
تصانیف: میں نے جرنلزم سے کتابیں لکھنے کو چھوڑ کر فلم لائن اختیار نہیں کی۔ میں اپنے سب کاموں کو —— بلٹز کا "آخری صفحہ" Last Page لکھنے کو، کتابیں لکھنے کو، فلم بنانے کو، ڈرامے لکھنے کو ایک ہی مقصد کے لیے استعمال کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ "مجھے کچھ کہنا ہے۔" اور اسی کو میں کبھی مضمون لکھ کر، کبھی کتاب لکھ کر، کبھی فلم بنا کر، کبھی ڈرامہ لکھ کر کہتا ہوں اور بار بار کہتا رہتا ہوں۔ کیا فائدہ ہوتا ہے؟ ایک چھوٹا طبقہ نوجوانوں کا جو مجھے اور میری تخلیقات کو پسند کرتا ہے اور وہ میری تصانیف پڑھ کر اور میری فلم دیکھ کر سوشلزم، انسان پرستی، عالمی امن کی طرف ہو جاتا ہے۔ چند لوگ میری کاوشوں کا صلہ ہیں۔ اگر ان کی تعداد بڑھتی گئی تو میں اپنی زندگی کو کامیاب سمجھوں گا۔
میں نے اب تک کوئی ستر کتابیں لکھی ہیں
آگے صفحہ ۵۱ پر

# بہ خطِ شاعر

حفیظ میرٹھی

مہرباں وہ لبِ جُو آج ہُوا پانی پر
چھوڑ کر پاؤں سے احسان کیا پانی پر

نقش کا تو کبھی جادو نہ چلا پانی پر
رنگ کائی کا مگر جم کے رہا پانی پر

موجۂ مے سے تراشا ہُوا اندازِ خرام
آپ چلتے ہیں کہ چلتی ہے صبا پانی پر

ہو گیا شیخ کی مہمان نوازی کا شکار
اکتفا رند کو کرنا ہی پڑا پانی پر

لیجئے مل گئی بیچارے غریبوں کو دوا
پڑھ کے اک شخص نے کچھ پھونک دیا پانی پر

خون اس دورِ گرانی میں بہت سستا ہے
رات پھر گاؤں میں اک قتل ہُوا پانی پر

جھیل میں ڈوب گیا جان سے بیزار بدن
تیرتا رہ گیا مٹی کا گھڑا پانی پر

یہ بتا کر کہ گلاسوں کی شرارت تھی حفیظ
دھو دیا ہم نے وہ الزام جو تھا پانی پر

حفیظ میرٹھی

## قمر اقبال •


## لاجواب

تم ریاضی کی اک کتاب لیے
پوچھنے کچھ سوال آئی ہو

کیا نہیں اس کتاب میں موجود
ہر طرح کے سوال ہیں اس میں
کتنے اُلجھاؤ پیچ و خم کتنے
کتنی اشکال
جمع و تفریق

کتنے ہندسے ہیں دائرے کتنے
زاویوں کے ہیں سلسلے کتنے
کتنی قوسیں ہیں
کتنے زیر و زبر

کاش میں تم سے یہ بھی کہہ سکتا
سب سوالوں کا ہے جواب مگر
تم سے مشکل کوئی سوال نہیں

## بُت

مجھ سے اکثر وہ یہ بات کہتی رہی
آؤ اک دن چلیں
پتھروں کے دلوں کی بھی دھڑکن سُنیں
سنگ تراشی کے شہکار سب دیکھ لیں
ہر تراشیدہ بُت انگلیوں سے چھوئیں
اور آنکھوں سے باتیں کریں
میں نے اس سے کہا
پتھروں میں ہے کیا؟
آئینے میں کبھی
جائزہ خود کا تم نے لیا
میری آنکھوں سے خود کو تو دیکھو سہی
اور سوچو ذرا
کیا خدا سے بڑا کوئی فن کار ہے؟
وہ مری بات پر
کھلکھلا کر ہنسی
اور ہنستے ہوئے شرم سے
خود بھی بُت بن گئی

## بُت شکن

ہر طرف بُت ہی بُت
اور میں بُت شکن
اپنے ہاتھوں میں تیشہ لیے
توڑتا آ رہا ہوں بُتوں کو
میں تیری طرف
سارے بُت ٹوٹ کر گر گئے
ایک بُت رہ گیا
وہ مری ذات ہے
آخری بُت گرائے گا جو
وہ ترا ہاتھ ہے

---


• مدیر معاون روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز، اورنگ آباد

## طالب چکوالی

دل کو پتھر بنالیا ہے، میاں!
آخر ایسا بھی کیا ہوا ہے، میاں!

اتنا بدلے ہو تم کہ لگتا ہے
تم نہیں، کوئی دوسرا ہے، میاں!

زندگی اک کڑی پہیلی ہے
اس کا حل اس سے بھی کڑا ہے، میاں!

دل کو جامِ سفال سمجھے ہو
یہ تو جامِ جہاں نما ہے، میاں!

زرد پتّوں سے دوستی کر لو
اب تو پت جھڑ کا سامنا ہے، میاں!

زندگی کٹ رہی ہے اس کے طفیل
اس ہی کا تو آسرا ہے، میاں!

دوش کیا دیں کسی کو ہم طالب
کوئی چھوٹا، کوئی بڑا ہے، میاں!

## شاد لوحی

دلاسا دیتے ہیں خانہ خراب ہونے تک
یہ انتظار کے لمحے عذاب ہونے تک

اسی شجر میں چھپائے رہو بدن اپنا
کرن کرن سے جدا آفتاب ہونے تک

بکھیرتا رہا خوشبوئیں گھر کے آنگن میں
وہ سائے جیسا بدن محوِ خواب ہونے تک

جہاں بھی کوئی نوشتہ ملے اٹھا لینا
ورق ورق ہی رہوں گا کتاب ہونے تک

چلو ستاروں کی چھاؤں میں رت جگا کر لیں
جیے گا کون شبِ ماہتاب ہونے تک

بس اتنا یاد ہے سوچوں کے بہتے دریا میں
وہ شمع جلتی رہی زیرِ آب ہونے تک

## مبارک شمیم

یہ سب طلسمِ نظر ہے سنبھل کے دیکھو تو
حصارِ ذات کے باہر نکل کے دیکھو تو

سوادِ شام و سحر کیا خبر بدل جائے
نئی رُتوں کے لیے تم مچل کے دیکھو تو

تمہاری سمت بڑھے گا وہ مضطرب ہو کر
تم اس کی راہ میں دو گام چل کے دیکھو تو

اک عمر سے تھا یقیں جن کے لوٹ آنے کا
کدھر گئے وہ شب و روز کل کے دیکھو تو

جہاں تمہاری نظر ہے وہ اور منظر ہے
نظر کا زاویہ لوگو، بدل کے دیکھو تو

خدا گواہ کہ تم خود کو بھول جاؤ گے
نئے شعور میں اک بار ڈھل کے دیکھو تو

کبھی نکال کے دل سے تمام اندیشے
شمیم سوزِ تمنا میں جل کے دیکھو تو

---


• منوہر نواس، جے-۲۲، لاجپت نگر ۳۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۴ • نوح، ضلع گوڑگاؤں، (ہریانہ) • محلہ احمد پور، شاہ جہاں پور، یوپی

# غزلیں

## نازقادری

سکوں نہیں تھا، مگر اتنا انتشار نہ تھا
ہمارے چاروں طرف خوف کا حصار نہ تھا

تمام عمر خزاں نے ہمارا ساتھ دیا
ہمارے سر پہ کبھی سایۂ بہار نہ تھا

ذرا سی ٹھیس لگی اور چھن سے ٹوٹ گیا
ہمارا شیشۂ دل سنگِ ریگ زار نہ تھا

ہر ایک ہاتھ سے پتھر پھسل کے چھوٹ گیا
کہ جیسے شہر میں کوئی گناہگار نہ تھا

جسے قریب سے پڑھ کر کوئی سمجھ لیتا
فصیلِ شہر پہ چسپاں وہ اشتہار نہ تھا

ہوا کا ایک ہی جھونکا جسے مٹا دیتا
نواحِ ذات میں ایسا کوئی حصار نہ تھا

شریکِ غم تھا سلگتے وجود کا محور
ہزار کرب سہی نازؔ اشک بار نہ تھا

ہر ایک لفظ میں مضمر تھا دفترِ معنی
کہیں بھی نازؔ مگر حرفِ اعتبار نہ تھا

زمین پاؤں تلے، سر پہ آسماں بھی نہیں
تمہارے بعد کہیں گوشۂ اماں بھی نہیں

سکوت ایسا تو نازل کبھی ہوا ہی نہ تھا
ہمارے شہر میں اب غوغۂ سگاں بھی نہیں

رگوں میں گرمیٔ خوں ہے، نہ اشک آنکھوں میں
یہ کیسا وقت پڑا ہے، چراغِ جاں بھی نہیں

یہ کیا ہوا کہ ہمیں چپ سی لگ گئی یعنی
ہمارے سینے میں اب آتشِ فغاں بھی نہیں

پھر آئے گا کبھی سر پہ ہمارے ابرِ شفیق
یقیں تو دور ہے، اس کا ہمیں گماں بھی نہیں

عجیب کوہِ الم سر پہ آپڑا اب کے
کہ اس سے بڑھ کے کوئی سخت امتحاں بھی نہیں

کہاں کہاں لٹی، کتنی لٹی متاعِ حیات
کہ اس سفر میں کچھ اندازۂ زیاں بھی نہیں

یہ کیسا موسمِ سفاک رو بہ رو ہے نازؔ
بہار کیسی کہیں وحشتِ خزاں بھی نہیں

سانس ہے کہ سفر کا آئینہ
الجھی الجھی ڈگر کا آئینہ

بکھرا بکھرا ہے عکسِ بام و در
ٹوٹا ٹوٹا ہے گھر کا آئینہ

چل رہی ہے ہوا بھی ساتھ مرے
لے کے گردِ سفر کا آئینہ

گرد کے بادلوں میں گُھلا یا
اپنے حُسنِ نظر کا آئینہ

میری زنجیر ڈھالنے والے!
دیکھ شام و سحر کا آئینہ

تو مری آنکھ سے بھی دیکھ کبھی
زخمِ ہر رہ گزر کا آئینہ

کرچیوں میں بکھر گیا کیسے!
آرزوئے بشر کا آئینہ

خاک میں مل کے آفتاب ہوا
کیا عجب شے ہے سر کا آئینہ

چشمِ شبنم سے پھوٹتی ہے کرن
کھل اٹھا برگِ تر کا آئینہ

ایک دستک میں چُور چُور ہوا
بند دیوار و در کا آئینہ

اپنی بے چہرگی پہ روتا ہے
اک دعائے اثر کا آئینہ

تہہ میں رکھتا ہے آگہی کی کرن
سنگسارِ ہنر کا آئینہ

نازؔ! کہتے ہیں تیرگی جس کو
ہے فقط رات بھر کا آئینہ

• غوث منزل، برہم پورہ، مظفرپور ۸۴۲۰۰۳

## دلیپ بادل

داستاں کرب کی ہر روز سُناتے کیوں ہو؟
وادیٔ گُل ہے مجھے ایسے جلاتے کیوں ہو؟
نُور ہی نُور ہو، پھیلو گے جہاں جاؤ گے
پھر مجھے تیرہ شبی یاد دلاتے کیوں ہو؟
ریت میں جان ہے کتنی تمہیں معلوم تو ہے
ریت کے قصر مگر روز بناتے کیوں ہو؟
خاک سے پھول ہی کیا، تم بھی آگے ہو صاحب
یہ سمجھتے ہو تو پھولوں کو جلاتے کیوں ہو؟
جن کے ہاتھوں میں سدا تیغ و سناں تھیں بادل
داستاں درد کی تم اُن کو سُناتے کیوں ہو؟

• ۴۲۵۔ چراغ دلّی، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

## تمنا یوسفی

ترے پاس آکے بے کل ہو گئے ہیں
تجھے دیکھا تو پاگل ہو گئے ہیں
نہ دیکھو اور خوابوں کے جزیرے
جو دیکھے تھے، وہ دلدل ہو گئے ہیں
سجا لیتے تھے پلکوں پر جنہیں ہم
وہ آنسو آج بوجھل ہو گئے ہیں
اُدھر ساحل نظر آیا ہے لیکن
یہاں تو دست و پا شل ہو گئے ہیں
زمانے سے لڑیں گے اب کہاں تک
تمنا آپ پاگل ہو گئے ہیں

• ۳۷۔ ہاؤڈ مارکیٹ، امرتسر ۱۴۳۰۰۱

## جلال صدیقی

ورق، ورق میں لہو کے نشان کس کے ہیں
ترے بیان میں شامل بیان کس کے ہیں
نہ جانے کس کے تعاقب میں رات پھرتی ہے
نہ جانے سائے مرے درمیان کس کے ہیں
ہوا کے شور میں شامل صدائے گریہ ہے
سماعتوں پہ پڑے بادبان کس کے ہیں
فصیلِ شہر ہر اک لمحہ پھیلی جاتی ہے
درونِ شہر سمٹتے مکان کس کے ہیں
ہم ایسے خاک بسر آج کس سے یہ پوچھیں
زمیں کو ایسے ڈھکے آسمان کس کے ہیں

• شانتی کنج، واسع پور، پوسٹ آفس دھنباد
(دھنباد)

# غزلیں

## حسیب سوز

سیر: اس موسم میں نکلا تھا سفر کو
تھی پتّوں کی ضرورت جب شجر کو
ہیں چسپاں بام و در پہ یادگاریں
عجائب گھر بنا رکھا ہے گھر کو
ندی کا خُشک چہرہ دیکھتے ہی
پرندے اُڑ گئے جانے کدھر کو
یہ سُورج جب مری مُٹھی میں ہو گا
اُجالے بانٹ دوں گا شہر بھر کو
دُھواں سا بھر رہا ہے سوز ہر سُو
نظر آتا نہیں کچھ بھی نظر کو

• چیف ایڈیٹر "لمحے لمحے" الہ پور، بدایوں (یو پی)

## نجم عثمانی

نہ جانے کس لیے چہرہ لہو سے دھوتا ہے
یہ رات بھر مرے کمرے میں کون روتا ہے
ہر ایک گھر میں نمودِ سحر سے پہلے ہی
نہ جانے کون اُداسی کے بیج بوتا ہے
وہ جنگ باز ہے، میں امن کا پیمبر ہوں
یہ آگ پانی کا رشتہ بھی خوب ہوتا ہے
یہ کیسا روگ لگا ہے مجھے کہ اب دن رات
دماغ جاگتا رہتا ہے قلب سوتا ہے
سما گیا ہے وہ اس طرح میری رگ رگ میں
کہ اپنے آپ پہ اُس کا گمان ہوتا ہے

• سی۔ ایم۔ پی۔ ایف آفس، دھنباد (بہار)

## منصور عمر

وقت کے آذر بتا یہ سانحہ کیوں کر ہوا
ہم نے جس کو خود بنایا وہ خدا کیوں کر ہوا
شور ہے ہر سمت ادراک بھیڑ ہے جانے کس طرف
پُوچھتے ہو پھر بھی وہ ہم سے جُدا کیوں کر ہوا
کرتا تھا دعویٰ خدائی کا اسی سے پُوچھ لو
پانیوں کے بیچ آخر راستہ کیوں کر ہوا
وہ نیا کہہ کر جسے دُہرا رہا ہے بار بار
دنیا ہے صدیوں سے واقف پھر نیا کیوں کر ہوا
تیرے سر کا تاج جو بے سر ہوا تھا اے جمیل
میں تھا تیری خاکِ پا مجھ کو عطا کیوں کر ہوا

• سی۔ ایم کالج (ایل۔ این۔ متھیلا یونیورسٹی) دربھنگہ
۸۴۶۰۰۴

ستیش بترا

# سان فرانسسکو
## قدرتی نظاروں کا شہر

لاس اینجلز سے سان فرانسسکو بذریعہ کار جانے کے لیے ہم نے وہ شاہراہ اختیار کی جو شانت مہاساگر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ یہ راستہ دوسرے راستوں کی نسبت زیادہ لمبا ہے لیکن سمندر اور ساحل کے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہونے کی چاہ نے ہمیں یہ راستہ منتخب کرنے کے لیے اکسایا تھا۔ اکثر دوستوں نے بتایا تھا کہ سڑک کے نسبتاً تنگ ہونے اور دھند کے امکانات کی وجہ سے ہم دن بھر کی مسافت کے لیے تیار رہیں۔ جون کا مہینہ تھا لہٰذا دھند تو ہمیں ملی نہیں لیکن اس سے بچا ہوا بیشتر وقت ان دلفریب Lo Beaches نظارہ کرنے میں صرف ہو گیا۔ دن بھر کبھی سمندر، کبھی پہاڑیاں اور کبھی دونوں نے ہمارا ساتھ دیا۔ تیسرے پہر سان فرانسسکو سے تقریباً چالیس پچاس میل قبل کارمل بیچ (CARMEL BEACH) پر پہنچے جو اپنی فطری خوبصورتی اور رونق کی وجہ سے امریکہ بھر میں مشہور ہے۔ چھوٹے چھوٹے خوش وضع ہوٹل موٹل اور بنگلوں کے سلسلوں کے درمیان گولف کورس، ٹینس کورٹ یا مرغزاروں میں تفریح یا سستانے کے کئی دلفریب مقام تھے۔ کچھ ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے فطری نظاروں کے سحر کی گرفت سان فرانسسکو پہنچتے پہنچتے زیادہ مضبوط ہوتی جا رہی ہو اور پھر ایکا ایک شہر کے حسین خد و خال ابھرنے لگے۔

کسی جوان جسم کی خوشبو کی طرح ہر شہر کی بھی اپنی ایک روح، ایک مہک ہوتی ہے۔ یہاں کا کھلا آسمان، تازہ بحری ہوائیں، پہاڑیوں کے سلسلے اور ہر طرف کشادگی کا احساس ہی شاید سان فرانسسکو کی روح ہے۔ امریکہ کے مغربی ساحل پر چالیس پہاڑیوں کے سلسلے پر آباد یہ شہر، ایک طرف شانت مہاساگر اور دوسری طرف خلیج سان فرانسسکو کے درمیان سر اٹھائے ایک روح پرور نظارہ پیش کرتا ہے۔ شمال مشرق اور شمال مغرب میں جدید انجینئرنگ کے دو شاہکار پل بازوؤں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ شاید یہ ایک حسینہ کی انگڑائی

آبشار کی طرح گرتی ہوئی سڑکیں۔ چالیس پہاڑی سلسلوں کی ڈھلانوں پر بسے ہوئے شہر سان فرانسسکو کا ایک منظر

۲۵۰/۷-۱۶ فرید آباد۔ ۱۲۱۰۰۲

ہیں وہ بھی تو مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ یہ کہنے لگا نہیں صاحب
یہ ہم نہیں کریں گے کیونکہ خدشہ ہے کہ کنواریوں کا دھیان شادی
کی طرف چلا جائے گا اور اس طرح ہمارے رنڈوے
بیچارے گمراہ ہو جائیں گے۔ لیکن بیوائیں گیان حاصل کر چکی
ہیں۔ وہ یہ بیوقوفی ہرگز نہیں کریں گی۔

اچانک میری نظر ایک ایسے رنڈوے پر پڑی جو دوسروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ خوش نظر آرہا تھا۔ یوں تو سبھی رنڈوے اپنی خوشی کا اظہار کچھ اس طرح کر رہے تھے، جیسے کہہ رہے ہوں کہ جان بچی اور لاکھوں پائے۔ لیکن اس بھائی کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ جان بچی اور کروڑوں پائے ........ میرے دل نے کہا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ سب کالا ہی کالا ہے۔ دال تو بس نام کے برابر ہے۔ بات چیت سے پتہ چلا کہ بھائی دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ میں نے کہا یہ بے ایمانی کس لیے۔ کہنے لگا یہ بے ایمانی نہیں ہے اپنے مستقبل کو دیکھنے کی ایک معصوم سی کوشش ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیسے۔ کہنے لگا "یہ ٹھیک ہے کہ میری ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔ لیکن کبھی نہ کبھی تو ہوگی۔ بیوی آئے گی تو کبھی نہ کبھی پرلوک سدھارے گی۔ میں یہ دیکھنے آیا ہوں کہ جب ایسا ہوگا تو میری زندگی کیسی ہوگی۔ دل ہی دل میں میں نے اس کی دوراندیشی کی داد دی اور آگے چل دیا۔

پھر میری نگاہ ایک ایسی بیوہ پر پڑی جو ایک کے بعد ایک کے بعد ایک رنڈوے کے ساتھ کچھ اس خوش خرمی کچھ اس ولولے کے ساتھ ناچ رہی تھی، بغل گیر ہو رہی تھی جیسے کوئی حاتم طائی خیرات بانٹ رہا ہو۔ اور وہ بھی اس طرح جیسے یہ اس کی زندگی کا آخری دن ہو۔ میں نے پوچھا محترمہ آپ اس میٹنگ میں کیا لینے آئی ہیں۔ "لینے" وہ جھلا کر بولی۔ میں کچھ لینے نہیں آئی، میں تو کچھ دینے آئی ہوں۔ جب میں نے اپنے مرحوم شوہر سے شادی کی تو اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں دنیا بھر کی خوشیاں اس کی جھولی میں ڈال دوں گی۔ ابھی اس کی جھولی کا ایک کونہ بھی بھرنے نہ پایا تھا کہ اسے اوپر والے کا بلاوہ آگیا۔ اب میں ان تنہا لوگوں میں خوشیاں بانٹ کر ایک طرح سے اپنے خاوند کو دیا ہوا وعدہ پورا کر رہی ہوں۔ اس کی دلیل سن کر پہلے تو مجھے چکر آگیا۔ جب ذرا سنبھلا تو میں نے جھولی پھیلا کر کہا کہ محترمہ خوشی کا ایک ٹکڑا اس فقیر کی جھولی میں بھی ڈال دیجئے۔ اپنے مرحوم شوہر کی خوشی کی خاطر۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور کہا کہ تم لوگ گھر میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مانگنے سے باز نہیں آتے۔ میں نے کہا: کیا کریں کچھ شوق سے، کچھ مجبوری کے تحت۔ وہ مسکرائی اور میرا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دوسرا اپنی کمر میں لپٹا لیا اور ہم دونوں موسیقی کی تانوں میں کھو گئے۔

## بقیہ :۔ ملاحظات

حصے سے قدرے زیادہ ادارے درج فہرست ذاتوں کے افراد کی ملکیت تھے۔ جہاں تک زرعی و غیر زرعی شراکتی اداروں کا تعلق ہے ان میں سے ۵۱ فی صد موسمی تھے۔ ۳۳ فی صد بجلی یا ایندھن سے متعلق اور ۲۶ فی صد بناسکی کارگاہ کے کام کرتے تھے۔ ان میں سے دو فیصد سے کچھ زیادہ ادارے درج فہرست ذاتوں کے افراد کی ملکیت تھے۔ کل اداروں میں امداد باہمی انجمنوں اور نجی کمیٹیوں کا حصہ بالترتیب ۴ اور ۵ فی صد تھا۔

بیس سے کم افراد سے کام کرنے والے اداروں کی تعداد غیر زرعی شعبے میں ۹۵ فی صد اور ان میں کام کرنے والے کل افراد کا تناسب ان اداروں میں کل روزگار کے پچاس فی صد کے برابر تھا۔ تعمیراتی اور مرمت کی خدمتوں کے شعبے میں بڑے اداروں کا تناسب دو فی صد سے قدرے کم تھا۔ لیکن ان میں کام کرنے والوں کی تعداد تمام اداروں میں روزگار پانے والے کل افراد کے ۲/۳ حصے کے برابر تھی۔ تجارتی شعبے میں کل اداروں میں سے ۹۰ فی صد اور اس شعبے میں برسرروزگار افراد کا ۷۰ فی صد حصہ ایسے اداروں کا تھا جن میں کام کرنے والے افراد کی تعداد پانچ سے زیادہ نہیں تھی۔ اجتماعی، سماجی و ذاتی خدمتوں کے حلقے میں بڑے بڑے اداروں کا حصہ روزگار دینے کے لحاظ سے زیادہ تھا۔ اگرچہ ان بڑے اداروں کی تعداد کل اداروں کے مقابلے میں دو فیصد سے بھی کم تھی لیکن ان میں روزگار پانے والوں کی تعداد اس سیکٹر میں برسرروزگار افراد کے ۳۷ فی صد کے برابر تھی۔

## بقیہ :۔ سان فرانسسکو

نارٹن نے اپنے عہد میں کئی مزاحیہ "فرمان" جاری کیے لیکن مزاح کے لبادے میں بہت سی کارآمد اور معقول باتوں کا تذکرہ ان "فرمانوں" میں شامل تھا۔ ۱۸۸۰ء میں جب شاہ نارٹن اول کا انتقال ہوا تو تیس ہزار سے زیادہ لوگ اس کے جنازے میں شامل تھے یہ خوش مزاجی آج بھی قائم ہے۔

ہندوستان سے وابستہ مشہور انگریزی ناول نگار روڈیارڈ کپلنگ جو اپنے ناول کِم ( Kim ) اور جنگل بک (JUNGLE BOOK) کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ یہاں آیا تو اس نے کہا تھا ــــ اس شہر میں ایک ہی برائی ہے ــــ یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا"۔

## بقیہ :۔ نئی کتابیں

ریاستوں میں اردو کے لیے فضا بتدریج سازگار ہوتی جا رہی ہے۔ اس امر کی ایک مثال زیر نظر رسالہ فکرو ہے۔ ریاستی بھاشا سنسکرتی وبھاگ نے اس سہ ماہی ادبی جریدے کی اشاعت اکتوبر ۱۹۸۴ء سے کی ہے بھاشا وبھاگ اس سے قبل بھی اردو کتابیں شائع کرتا ہے۔ رسالہ کی اشاعت اس محکمہ کا لائق مبارکباد اقدام اس رسالے کے نگراں جناب شری نواس جوشی اور ایڈیٹر جناب دھرم پال عاقل ہیں۔

زیر نظر شمارے میں "افسانہ" مضامین، غزلیں، نظمیں گیت اور تبصرے شامل ہیں۔ اس شمارے کے قلم کاروں میں دلیش حیدر، کاشوناتھ سنگھ، کھیم راج گپت، بیکل اتساہی نازش پرتاپ گڑھی، حفیظ بنارسی، عبدالمتین نیازی، فاروق شفق، راجیش کمار اوج، ساغر اعظمی، ساحر سیالکوٹی، بزم پرشاد، شباب للت، ساغر پالمپوری شامل ہیں۔

نثر کے مقابلے میں شعری حصہ زیادہ ہے لیکن معیاری ہے۔ مضامین سرسری ہیں۔ نثری حصے کو مزید بہتر بنایا جاسکتا اسی طرح کتابت و طباعت پر بھی مزید توجہ کرنے کی گنجائش ہے۔

مدبرہ عثمانی

مظفر عازم (کشمیری نظم)

# الف

الف!
تیری قامت راست
میری آنکھوں کی بینائی

ب پ ت ث
کچھ نقطوں کے اوپر نیچے
اوندھے منہ افتادہ ہیں
ج اور چ ہیں ٹیڑھے میڑھے
ع اور غ ہیں آڑے ترچھے
د اور ذ ہیں پشت خمیدہ
ق اور ن کا پھولا پیٹ
ک ہو گ ہو
ل ہو م ہو
تیری راست نصیبی کس نے پائی ہے

تو ——
حرفوں کے اس صفحے پر
تنہا سیدھی قامت والا
اور میں ——
جس نے اس جھرمٹ میں
بس اک تجھ کو ڈھونڈ نکالا

تو بھی بے ہمتا ہے
اور میں بھی ممتاز

الف!
مری اک خواہش ابھری
تیرے نور کی مدح میں
اک سیپارا لکھوں
تیری یکتائی کو تحفہ پیش کروں
قلم اٹھا تو بات کا روزن بند ہوا
ب پ ت اور ث کو چھوڑوں
تو کیسے جوڑوں الفاظ

اس الجھن میں
تیری اکہری سیدھی قامت پلٹ پلٹ کر
چشم فلک نے کیا دیکھا . . . .

ب پ ت اور ث میں لیٹا
ع اور غ میں اُکڑوں بیٹھا
ق اور ن میں وا آغوش
ک اور گ میں خود ہی خود کو سہارا دینا

اچھر اچھر میں سب بھیس بدلتا
ایک ہی عشوہ طراز
لام کی کوکھ میں ایک الف ہے
اور الف میں ل اور ف

الف!
میرے تنہا خوش قامت
تیرے نام کی مدح کروں
کس اچھر سے کتنی کاٹوں
کس اچھر کو غیر کہوں

(اردو ترجمہ شاعر نے خود کیا ہے)

• ستیدہ کدل چوک، سری نگر ۱۹۰۰۰۲

تخلیق: بشنو دے
ترجمہ: نصر غزالی

## سوچتا ہوں درد میں
(کھابی جنتر نامے)

میں سوچتا ہوں، کتنے ہی سوچتے ہیں درد میں
جھوٹ ہی کیا سچائی اور حسن رہا ہے ہر زمانے میں؟
دوستی، محبت، دانائی کیوں جاں گسل درد میں
موت کے دھماکے سن سن ہلاکت کی بد دعا پہ
ہراساں چاروں طرف؟

کل آدمی شاید ہوس کے فطری تذبذب میں
آنچل کی چھاؤں چھوڑ کر جاتا تھا بے رحم
صحراؤں میں
آج بھی کیا وہ تصورِ زیست کی حریص پسپائی میں
گام زن ہے ترقی کے اونچے دفتروں کی سمت؟

▭▭

• ۵/۸۹ رپن اسٹریٹ، کلکتہ - ۱۶

مصنف: موہن کلپنا ● مترجم: لکشمن بھاٹیہ

# جھلک

جاڑے کی سرد رات تھی۔ ہم شوجی کے مندر کے پاس پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کے بیچ کوئی بات چیت نہیں ہو رہی تھی۔ ہوا پیپل کے پتوں کو چوم رہی تھی۔ پیپل چاندنی کو چوم رہا تھا۔ اور میں سندھو کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ ان میں ستاروں کی روشنی بھری ہوئی تھی۔

یکایک ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

سردی نے اپنا رنگ جمانا شروع کیا۔

اس نے میرے قریب آکر کوٹ کی جیب میں اپنا ہاتھ ڈالا تو ہاتھ آر پار نکل گیا۔ جیب پھٹی ہوئی تھی۔ سندھو کو معلوم نہیں تھا کہ یہ کوٹ میرا نہیں، بلکہ میرے دادا جی کا تھا۔ انھوں نے یہ کوٹ میرے والد کو دیا تھا اور اس طرح وہ میرے حصہ میں آیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"جیسی میری زندگی ہے!"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"نچلے متوسط طبقے کا فرد ہوں ...." اس نے ایک چھرا سا میرے سینے میں اتار دیا۔ سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "تم کوئی نوکری کیوں تلاش نہیں کر لیتے؟"

"نوکری ہی کے لیے تو مارا مارا پھر رہا ہوں۔"

"کہتے ہیں: اگر مرد چاہے تو زمین سے سونا بھی نکال سکتا ہے۔"

"اس کام کے لیے بھی اوزاروں کی ضرورت ہوتی ہے سندھو۔ بغیر اوزاروں کے زمین سے سونا تو کیا، کوئی شے بھی نکالنا دشوار ہے۔"

"پھر کیا ہوگا"؟ اس نے میرے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

"یہ تو میں نہیں جانتا سندھو تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤگی اس کا مجھے پورا یقین ہے۔ پر تم کیسی ہو! کبھی مجھ سے کچھ نہیں مانگا! شاید میں ہی ایسا ہوں، جو تمھیں کچھ بھی نہیں دے سکا۔ اچھا یہ تو بتاؤ سندھو، کیا تم نے کبھی بڑے سجے سجائے بنگلے میں رہنے اور کار پر گھومنے کے سپنے نہیں دیکھے۔

"تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ اس نے کچھ پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"سمجھا تو نہیں، لیکن سمجھنا چاہتا ہوں!

"کیا سمجھنا چاہتے ہو۔ یہی کہ میں کیسے گھر کا تصور رکھتی ہوں!"

"تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔"

"غلط میں سمجھ رہی ہوں یا تم؟"

"جو بات فطری ہے، سوچنی وہی چاہیئے۔

کیا تم آرام پسند زندگی کے خلاف ہو؟"

"ہمیشہ سادگی سے رہ کر اونچا سوچنا چاہیئے"

"نہیں" میں نے کہا۔ "ہمیشہ اونچا رہ کر گہرا سوچنا چاہیئے"

"اچھا بتاؤ کیا لاؤ گے میرے لیے۔

کئی بار کہہ چکی ہوں، میری تو ملازمت ہے۔ مجھی سے کچھ لے لیا کرو۔ تم نے ہمیشہ انکار ہی کیا۔ گھر سے بھی کچھ نہیں لیتے۔ گزارا کیسے چلاتے ہو؟ آج کے نوجوانوں کی تو تفریح تماشے، اخبار، سگریٹ ہی کی ضرورتیں پوری نہیں ہو پاتیں۔ لیکن تم؟ اچھا بتاؤ کیا لاؤ گے؟

"میں پچھلی بار بھی بس یہی سوچتا رہا کہ کیا لے جاؤں اور یہ کہ کہاں سے لوں لیکن دونوں باتوں کا جواب نہ پا سکا۔"

وہ زیر لب کوئی گیت گنگنانے لگی۔ میں سوچنے لگا، اس کے لیے ایک پھول لاؤں گا۔ باغ سے توڑ کر ہی لے آؤں گا۔ لیکن اس کا مول........؟ اور وہ ہنستے ہوئے کہے گی بس۔! یا شاید رو پڑے۔ اسے میری مجبوری کا احساس ہوگا۔ نہیں میں اُسے نہ ہنسنے دوں گا اور نہ رونے ہی۔ لیکن میں کروں بھی تو کیا؟ گھر سے تو کچھ بھی نہ لوں گا۔ اُدھار لے کر تحفہ خریدنا اور دینا مجھے قطعی پسند نہیں۔ ساری کتابیں بھی تو بیچ چکا ہوں۔ میرے پاس تو اپنا ایک اچھا پین بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں ہے!۔

آنکھوں میں ایک جلن سی محسوس ہونے لگی۔

پیپل کے پیڑ سے ایک پتا توڑ کر، اس پر اپنے دو آنسو رکھ کر اُسے دوں۔

"چپ ہو گئے!"

"سوچ رہا ہوں۔"

"اونچا یا گہرا۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"دونوں" اب میں بھی ہنس دیا۔

"کیا آسمان سے چاند اتار کر لے آؤ گے؟"

"دھرتی بھی تو ایک چاند ہی ہے۔ اگر کوئی اسے چاند پر جا کر دیکھے"

"تو کیا ستارے توڑ کر لاؤ گے؟"

"ان کی روشنی تو تمھاری آنکھوں میں پہلے ہی موجود ہے"

"تو پھر لاؤ گے کیا؟"

* گیتا بھون، سی ۴۶۵، الہاس نگر-۴-۲۱۰۰۴ (مہاراشٹر)
● بی-۲۶ پریس انکلیو ساکیت-دہلی ۱۱۰۰۱۷

"پان لے آؤں"

"پان" اس نے روز سے قہقہہ لگایا۔

"پان کا ذکر ویدوں، اپنشدوں، رامائن، مہابھارت اور بھاگوت پُران میں بھی ہے۔"

"اور گیتا میں؟"

گیتا مہابھارت ہی کا ایک حصہ ہے اور مہابھارت میں پان کا ذکر ہے"

"شاستروں کے مطابق پان کون کھاتا ہے عورت یا مرد؟"

"شاستروں میں تو صرف پان کی تعریف لکھی ہوئی ہے۔ کھاتے صرف دیوتا ہیں، جن کا تذکرہ سبھی بھارتی مہاکاویوں میں ہے!

"تم نے کیا اتنا کچھ پڑھ رکھا ہے؟"

"مجھے یہ سب ایک پنواڑی نے بتایا تھا۔"

وہ ہنسنے لگی۔

"اچھا لے آنا"

میں ایک چونی حاصل کرنے کی فکر میں تھا کہ چھوٹی بہن کی آواز سنائی دی۔ وہ بھابی کو کہہ رہی تھی کہ چائے کی پتی نہیں ہے اس لیے آج چائے نہیں بن سکی۔

بھابی نے کہا "تم راجو کو ایک اٹھنی دے دو تو کسی ہوٹل میں جاکے چائے پی لے۔ ہم نے نہیں پی تو کوئی بات نہیں۔ لیکن اگر چندر نے نہیں پی تو اس کے سر میں درد ہوجائے گا۔

شام کو اگر گھر میں چائے نہیں بنتی اور میں گھر میں رہتا ہوں تو ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔

راجو اٹھنی لے کر چائے پینے جارہا تھا کہ میں نے اسے آہستہ سے اپنے پاس بلالیا۔

اس نے قریب آکر کہا "بھیا مجھے کبھی چاء پلاؤگے نا"

میں جیسے چونک اٹھا میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ مجھے یہ اٹھنی دے دو تو میں خود ہی جاکر چائے پی آتا ہوں۔

"چار آنے تم لے لو اور چار آنے مجھے دیدو"

"اور چائے؟"

"نہیں چاہیئے"

"ماں پیٹ دے تو"

"میں جو ہوں ——"

رات کو پنواڑی کی دوکان پر آکر کھڑا ہوگیا۔

سوچا کہ ایک ٹھنڈا کیوڑی پان لوں گا، جس پر چونے کے علاوہ بہت مسالے ہوں گے۔ کہوں گا کہ پان پر زعفران، گلقند، الائچی اور پیپرمنٹ ضرور ڈالے۔

ابھی جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ اس ہاتھ کو ایک بچے نے آکر پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈبہ تھا۔

گڑگڑاتے ہوتے اس نے کہا۔ صاحب بھیک نہیں مانگتا بسکٹ بیچتا ہوں چار آنے کے نہیں دو آنے ہی کے لے لو۔ لیکن ضرور لے لو۔ خدا کے واسطے۔

میں نے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ "اس کے لیے تم زبردستی کیوں کر رہے ہو؟"

"میں سب کی منت کرتا ہوں"

"کیوں"

"لوگ بسکٹ نہیں خریدیں گے تو آبا ماریں گے۔ اور ماں بھی پیٹے گی" میں روز دو روپے کے بسکٹ بیچتا ہوں۔ سچ کہتا ہوں صاحب، گھر میں صرف میں ہی کمانیوالا ہوں۔"

"تم سب کو یہی کہتے ہو؟"

کبھی کبھی اور جو لوگ نہیں لیتے، ان کو۔ ہوٹل میں بسکٹ دو آنے کا ایک ہے اور میں چونی کے چار دیتا ہوں"

سوچا کہ کیا میں اپنی سندھو کو ایک پان بھی نہیں کھلا پاؤں گا؟

میں نے سونے کی انگوٹھی یا ہار کا وعدہ تو نہیں صرف ایک پان ہی کا وعدہ کیا ہے۔"

چاند نے جیسے اپنی کشش کھو دی۔ پیپل سے سنگیت کے سُر جیسے یکایک کھوئے گئے۔ ہوا بھی جیسے بے معنی ہونے لگی۔ پیپل کے پتے جیسے ہوا کو دھکیلنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں پریشان تھا۔

آج بہت اداس لگ رہے ہو، سندھو نے پوچھا۔

میں چپ!۔

"مجھ سے مل کر کیا تمھیں کوئی خوشی نہیں ہوئی؟"

چپ!

"اچھا بتاؤ۔ میں تمھارے لیے کیا لائی ہوں؟"

چپ!

"آج کیا کوئی المناک افسانہ پڑھ کر آئے ہو؟"

میرے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"مجھ سے ناراض ہو؟" وہ میرے بہت قریب آگئی۔ میں اس کے سانس گن سکتا تھا۔

"تم سے ناراض ہوکر کیا میں چین سے رہ سکتا ہوں؟"

اس نے ایک لمبی سانس لی۔ ایک لمحے بعد بولی

میں تمھارے لیے ایک پیسٹری لائی ہوں۔"

میں پھر بھی چپ رہا۔

"لیکن میرا پان؟"

"رہنے دو اسے اس میں رکھا ہی کیا ہے؟"

"رکھا کیا ہے! کیا نہیں لاتے ہو؟"

میں چپ!

"لیکن چندر مجھ سے ایسا کیا گناہ سرزد ہوا ہے، جس کی اتنی بڑی سزا دے رہے ہو؟"

میرا دل جیسے ڈوبنے لگا۔ پیار کا پہلا نذرانہ جو ایک بھکاری بھی آسانی سے لے سکتا تھا جسے اس نے محبت سے قبول بھی کیا ہوتا۔ میں تو وہ بھی نہیں لاسکا تھا۔ میں نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ "سندھو تم پیسٹری لائی ہو۔ میں بسکٹ لایا ہوں"۔

"بسکٹ میں نہیں کھاؤں گی"

تب میں نے مختصراً اسے بتایا کہ میں نے وہ بسکٹ کن حالات میں خریدے ہیں۔

حیران ہوکر وہ میرا منہ دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ لیکن آنسو ٹپکے نہیں۔

اچانک چاند میں کشش لوٹ آئی۔ پیپل میں سنگیت کے سُر جاگ اٹھے۔ ہوا پیپل کے پتوں کو اور پیپل چاندنی کو چومنے لگا۔

اس نے بسکٹ لیتے ہوئے کہا "چندر تم نے پان نہ لاکر اچھا ہی کیا۔ میں نے تم سے کچھ نہیں مانگا اور تم نے مجھے کیا دیا۔ تم مجھ کو سمجھے چندر؟ تم نے مجھے اس بسکٹ میں وہ کچھ دیا ہے جو راجا ہرشچندر نے رشی وشوامتر کو نہیں دیا ہوگا۔ سب کچھ ہی تو ہے اس میں!!"

## افسانوی ادب۔ تحقیق و تجزیہ

ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی ۔ نیو پبلک پریس دہلی
قیمت: ۳۰ روپے

ہمارے ادبی سرمائے میں شاعری کی تنقید پر جس قدر مواد ملتا ہے، اس کے مقابلے میں فکشن پر تنقید نا ہونے کے برابر ہے۔ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی کی یہ کتاب اس کمی کو بدرجہ اتم پورا کرتی ہے۔

اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں شامل مضامین داستان، ناول اور افسانے تینوں اصناف پر خاطر خواہ روشنی ڈالتے ہیں، باغ و بہار اردو کی اولین داستان ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ توجہ کی مستحق رہے گی۔ ڈاکٹر صدیقی نے اس کے مواخذ کے مسئلہ سے بڑی عالمانہ نظر اور تحقیقی جسارت کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ اور مدلل طریقے سے بعض نتائج اخذ کیے ہیں۔ کتاب پندرہ مضامین پر مشتمل ہے۔ ایک خوبی جو یک نظر قاری کو متاثر کرتی ہے وہ اس کتاب میں شامل تقریباً ہر مضمون کی علمی اور حد درجہ معروضی اور تحقیقی پیشکش ہے۔ ڈاکٹر صدیقی فکشن کے مطالعہ میں اس کی عہد بہ عہد تبدیل ہوتی ہوئی سماجی معنویت اور معاشرتی سیاق و سباق کو اس کی دوسری تمام خوبیوں پر ترجیح دیتے ہیں اور ان کا ایسا کرنا صحیح بھی ہے، اس لیے کہ افسانہ ۔ شاعری کا نعم البدل نہیں ہو سکتا، فکشن بحیثیت مجموعی ترغیبی ادب ہونے کے سبب اپنی سماجی افادیت کے پیش نظر ہی کوئی اعتبار حاصل کر سکتا ہے۔ بطور خاص جس مضمون نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ "جدید افسانوی ادب اور ماضی کی تخیئلی بازیافت" ہے۔

اس مضمون میں ڈاکٹر صدیقی نے عہد نو میں کیے جانے والے فنی اور تکنیکی تجربات کا بڑا خوبصورت جائزہ لیا ہے اور بعض اہم نتائج کی نشاندھی کی ہے۔ یہ خوبی یقیناً تمام مضامین کو پڑھتے وقت شدت سے محسوس ہوتی ہے لیکن بعض مضامین اپنی تازگی، نتائج کی ندرت اور فکر و نظر کی عمق اور زرخیزی کے لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس ضمن میں امراؤ جان ادا کا مطالعہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں بڑی باریک بینی کے ساتھ حقائق کا مطالعہ کیا اور ان تہذیبی اقدار کو جانچا اور پرکھا گیا ہے، جن میں سے کچھ ختم ہونا چاہتی ہیں اور کچھ مستقبل میں نمودار ہونے کے لیے بے تاب و بے قرار ہیں۔

۔ ڈاکٹر صدیقی کا نقطۂ نظر ایجابی، حقیقت پسندانہ اور حد درجہ انسانی ہے۔ وہ زندگی کے تمام مفروضات کا جائزہ انسانی زندگی کے تمام تر مصائب و مشکلات کا تجزیہ اس جدلیاتی صورتِ حال میں کرتے ہیں جو ہر عہد میں موجود رہی ہے لیکن اس کا عرفان اس قدر عام نہیں ہوا ہے۔

ان کی یہ کتاب اپنے علمی پائے کی بلندی اور ایک نادر و بیش قیمت تحقیقی دستاویز ہونے کے سبب اس قابل ہے کہ اس میں اٹھائے گئے مباحث سے فائدہ اٹھایا جائے اور مصنف کی راست گفتاری اور گہری سوجھ بوجھ کی داد دی جائے۔

عبید الرحمٰن ہاشمی

## کتاب:۔ دریچۂ گل

شاعر:۔ مختار شمیم
ناشر:۔ نکھار پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن، یوپی
قیمت:۔ دس روپے

"دریچۂ گل" نظموں کا انتخاب ہے۔ یہ نظمیں مختار شمیم کی فکری اور فنی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔

گویا اس کتاب کی رو سے شمیم ہمارے سامنے نظم نگار شاعر کی حیثیت سے آتے ہیں۔

"دریچۂ گل" سے قبل ان کا ایک شعری مجموعہ "نامۂ گل"، مصنف کی دوسری کتابوں کے مطابق ۱۹۷۲ء اور "آہٹیں" کے تحت ۱۹۷۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔ (جانے کون سال درست ہے؟) اس سلسلہ میں شاعر کے بقول "دوستوں نے اپنے تحسین افزا کلمات کے ساتھ ہی میری خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندھی بھی کی!"

"تحسین افزا کلمات" کسی بھی ذوق و شوق کے ارتقا اور نشو و نما میں ممد و معاون تو ہوتے ہیں، لیکن "دریچۂ گل" کی نظمیں بتاتی ہیں کہ مختار شمیم کی شاعری "تحسین افزا کلمات" کی مستحق تو ہے مگر اس کی رہینِ منت نہیں۔ بلکہ یہ اس کے ذوق و شوق اور طبعی رجحان کی علامت ہیں۔

"نامۂ گل" تو میں نے پڑھا نہیں، ہاں دریچۂ گل" سے جو کچھ مجھے نظر آتا ہے، "وہ گل" ہے۔ یعنی لفظِ "گل" کی شاعر کے یہاں ایک خاص اہمیت ہے (صرف نظم "دریچۂ گل" میں یہ لفظ سات بار اور پھر صفحات ۱۵، ۲۶، ۴۵، ۶۱، ۶۳، ۷۲، ۸۳، ۹۲، ۹۵ پر بار بار آیا ہے۔) ممکن ہے کہ "یہ گل" ان کے یہاں "شرارہ" اور شعلہ کی علامت ہو۔ کم از کم "دریچۂ گل" سے تو عصرِ جدید کے مسائل، انسان کی شکست خوردگی، مختلف قسم کے استحصال، محرومیت، کرب، تنہائی اور تشنگی کی "آنچ" آتی ہے ——

مختار شمیم کا کمالِ فن یہ ہے (بعض نظموں کے علاوہ) کہ انہوں نے اس "آنچ" کو آگ نہیں بننے دیا ہے۔ بلکہ "یہ آنچ" دلوں کو گرماتی اور جذبات کو تڑپاتی ہے، اس سے ذہن کو ایک روشنی ملتی ہے جس کی مدد سے ایک انسان اپنے آس پاس کی بکھری زندگی سے متعلق مسائل پر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

دوسری اہم بات جو شاعر کے یہاں ملتی ہے وہ حرفوں اور لفظوں کے نامعتبر اور بے معنی ہونے کا احساس ہے' (کاغذی ہے پیرہن! دداعیہ (فکر نو) جو شاعر کو بے چین اور مضطرب رکھتا ہے۔

نظم "پردیس میں" اختر شیرانی کی نظم "او دیس سے آنے والے بتا" کی یاد دلاتی ہے۔ مگر ان میں فرق یہ ہے کہ شیرانی کے یہاں صرف رومان ہے جب کے شمیم نے اپنے عہد کے ملکی و غیر ملکی مسائل کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے ——— مجموعی طور پر "دریچہ گل" کے شاعر سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

## کتاب :- آبشار

مرتب :- دھرم پال عاقل

ناشر :- لینگویجز اینڈ کلچر ڈپارٹمنٹ، ہماچل پردیش شملہ

قیمت :- ۱۲ روپے

اردو کے سلسلہ میں حکومت کی نظر عنایت نے اس زبان و ادب کی ترویج، اشاعت و ترقی کے امکانات کو وسیع اور اس کے مستقبل کو تابناک کیا ہے۔ مختلف ریاستوں میں اردو اکیڈمیوں کا قیام بھی اسی نوع کی ایک اہم کڑی ہے۔ لینگویجز اینڈ کلچر ڈپارٹمنٹ، ہماچل پردیش، شملہ بھی دراصل اسی نوعیت کا ایک ادارہ ہے جس کا قیام ۱۹۷۳ء میں عمل میں آیا اور اس کا مقصد بھی دوسری اردو اکیڈمیوں کی طرح اردو کی ترویج و اشاعت ہے ——— "آبشار" اسی کا عملی روپ ہے اور منزل کی جانب پہلا قدم بھی۔

اس میں شامل پیش لفظ جیسے وزیر اعلیٰ ہماچل پردیش نے تحریر کیا ہے، کے مطابق "گذشتہ سالوں میں یہاں کے سنسکرت، ہندی اور پہاڑی زبان کے شاعروں کے چند شعری مجموعے زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب محکمۂ لسانیات و ثقافت کے اردو شعبے کی پہلی ادبی پیشکش ہے۔"

ڈائرکٹر بھاشا سنسکرتی وبھاگ ہماچل پردیش نے "ہماچل پردیش اور اردو" کے تحت چند باتیں تحریر کی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماچل پردیش میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت کا باقاعدہ آغاز نومبر ۱۹۸۰ء سے ہوا اور اس سلسلہ میں ادبی تقاریب، مشاعروں اور اردو کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کیا گیا ہے۔ پردیش میں اب تک تین مشاعروں کا انعقاد ہو چکا ہے۔ یہ مشاعرے ۱۹۸۱ء میں دو اور ۱۹۸۲ء میں ایک بار ہوئے۔ شری نواس جوشی کے الفاظ میں "جہاں تک اردو کی اشاعت کا سوال ہے زیر نظر کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ یہ مجموعہ محکمے کے اردو مشاعروں میں پڑھی گئی غزلوں اور نظموں کے انتخاب پر مشتمل ہے اور "آبشار" کے حسین نام سے منظر عام پر آرہا ہے۔"

یقیناً یہ ایک اہم شعری انتخاب ہے۔ جس میں اہم اور کہنہ مشق شاعروں کے شانہ بشانہ نئے شعرا کی تخلیقات بھی سامنے آتی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ جدید و قدیم کا حسین امتزاج ہے۔ البتہ بعض نئے شعرا کی تخلیقات شامل نہ ہوتیں تو مناسب ہوتا۔ اس میں شامل "اے زندگی کی روشنی (مضطر)، جوش فراق (آزاد)، شانِ وطن (ظہور)، زندگی (قتیل باش)، حصار امن و سکون ہماچل (شباب للت)، نظم (زبیر رضوی) وغیرہ اچھی اور معیاری نظمیں ہیں۔ غزلوں میں ساحر ہوشیارپوری، خمار بارہ بنکوی، رشی پٹیالوی، مسعودہ حیات، راہی جےپوری، ارمان شہابی، خالد ناز اور دھرم پال عاقل وغیرہ متاثر کرتے ہیں۔ مگر بعض باتیں کھٹکتی ہیں، اس میں شامل شعرا کی تخلیقات میں بے اعتدالی ہے۔ ایک طرف تو کسی شاعر کی چار یا پانچ تخلیقات ہیں تو دوسری جانب کسی شاعر کی صرف ایک غزل یا اس کے چند اشعار ——— دوسری، اکثر تخلیقات اردو کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ کوئی نیا اور تازہ تاثر نہیں چھوڑتا۔

اس کی کتابت و طباعت کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ کاش "آبشار" صرف ہماچل پردیش کے شعراء کی تخلیقات پر مشتمل ہوتا اور اس صورت میں یہ "پہلی ادبی پیش کش" زیادہ کامیاب اور مناسب ہوتی۔

## کتاب :- پنجرے کے پنچھی

مصنف :- مانک ٹالا۔ قیمت ۲۵ روپے

ناشر :- موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مانک ٹالا نے "عرض حال" میں اپنے پچھلے دو افسانوی مجموعے (پیاسی بیل اور گناہ کا رشتہ) کا ذکر کرتے ہوئے زیر نظر کتاب کے متعلق لکھا ہے: "اس میں بھی کل مضامین کی تعداد اٹھارہ ہی ہے۔ ان کی آٹھ کہانیاں، آٹھ مزاحیہ مضامین اور دو خاکے ہیں۔" (اور پچھلی تخلیقات پر چند اہم تبصرے بھی) ص۸

یعنی ان کے نزدیک کہانی "مضامین اور خاکے مضامین" کے ہی زمرے میں آتے ہیں۔ اس کی وضاحت خود ان کے ہی الفاظ میں دیکھئے: "پہلے میں نے سوچا تھا کہ اس مجموعے میں "مزاحیوں" اور "افسانوں" کی ترتیب الگ الگ رکھوں۔ لیکن کچھ کہانی نما مزاحیے تھے اور کچھ کہانیاں پوری کی پوری طنز و مزاح سے بھرپور تھیں۔ چنانچہ میں نے انہیں علیحدہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ البتہ دونوں خاکے آخر میں دے دیئے ہیں" ص۸

یہ ان کی رائے ہے۔ اس سے اختلاف کی بہرحال گنجائش موجود ہے۔ اب خاکے کے متعلق بھی ان کے خیالات سنیئے :- "دوسرا خاکہ "خامہ خوں چکاں اپنا" ...... موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے اسے مکمل طور پر خاکہ نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ یہ آپ بیتی اور جگ بیتی کے بین بین ہے" ص۸

"تین بیویوں کا اکلوتا شوہر" جو دراصل کالی داس گپتا رضا کی شخصیت سے متعلق تعریفی مضمون ہے اور شاید اسی لیے مانک ٹالا اسے خاکہ کہتے بھی ہیں اور نہیں بھی۔ تاہم یہ خاکہ خاکہ نگاری کی تعریف پر پورا نہیں اترتا۔ یہاں رضا کی ایسی شخصیت نظر آتی ہے جو معائب اور ہر طرح کی کمزوریوں سے پاک ہے۔ ایسا ممکن نہیں کہ انسان میں صرف محاسن ہوں کوئی ایک بھی کمزوری نہ ہو۔ پھر اس تعریفی مضمون میں گپتا رضا کے علاوہ چند ایسے واقعات کا ذکر ہے، جن کا اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض دوسرے اقتباسات بھی آپ کو اس کتاب میں جابجا بلکہ جا بے جا مل جائیں گے۔ مثلاً ایک مزاحیہ مضمون "گھر یاد آیا" (جس میں مصنف سفر لندن کا ذکر کرتا ہے) پڑھ کر تعجب اور تاسف ہوتا ہے کہ ایک ادیب کو لندن میں صرف Soho، Sex اور Strip Tease ہی نظر آتے۔ یہاں ان کی ملاقات

اردو یا دوسری زبانوں کے ادیبوں، دانشوروں اور مفکروں سے نہ ہوئی، انہیں School of Oriental and African Languages یا BBC میں تبادلہ خیال کرنے کا موقع نہ ملا۔ وہاں اردو کی مختلف ادبی اور نیم ادبی انجمنوں نے ان کا استقبال نہ کیا۔ اگر کچھ تاثرات ان کے ذہن میں آئے بھی تو یہ کہ ——

"مڈل سیکس کا لفظی ترجمہ کیا جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے درمیانی جنس، لیکن معلوم نہیں کہ اس نام کے ساتھ ہندوستانی اور پاکستانی مہاجروں کو کیا انس ہے کہ وہ لوگ زیادہ تر اسی علاقے میں آکر بسے ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان کی مردانگی کی گواہیاں وہاں کی (لندن کی) نوجوان لڑکیاں اور حرامی بچے قسم کھائے بغیر دینے کو تیار ہیں" صہ۱۵

گویا لندن میں جنسی بے راہ روی یا برائیوں کے شکار اور ذمہ دار دراصل ہندوستانی یا پاکستانی ہیں، لندن کے عوام نہیں۔

دراصل یہ سارے مزاحیہ مضامین آورد کی صورت میں لکھے گئے ہیں۔ چنانچہ زبردستی مزاح اور طنز پیدا کرنے کی کاوش میں کچھ جملے اور الفاظ بعید از اخلاق و آداب اور کردار آگئے ہیں۔

میرا خیال ہے اس مجموعہ کو اس کے افسانوی حصہ کے باعث ہی پسند کیا جائے گا۔ کیونکہ "پنجرے کے پنچھی"، "خوالا مکھی"، "مستحق بہ حق دار رسید" اور "نام میں کیا رکھا ہے" وغیرہ اچھی کہانیاں ہیں۔

کاش مانک ٹالا "مزاحیہ مضامین کے لکھنے میں بھی آمد کے ان لمحوں کا انتظار کرتے" جن کے ہاتھوں کہانی کی تخلیق ہوتی ہے۔" صہ۹

کتاب: کلام حیدری بحیثیت افسانہ نگار
مصنف: ڈاکٹر اسلام عشرت
ناشر: انڈین لینگویجز پبلی کیشن، گیا
قیمت: ۲۰ روپے

ایک زمانہ تھا کہ بڑے سے بڑے ادیب یا شاعر کی اس کی حیات میں ناقدری اور اس کے فن سے بے توجہی عام تھی۔ یہاں تک کہ غالب اور میر بھی اس عدم توجہی کا شکار رہے۔ ورنہ میر کو یہ شکایت کبھی نہ ہوتی کہ ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

ہمارے ملک میں عموماً اور اردو میں خصوصاً کسی شخصیت کو قبل از موت انعامات، خطابات یا خراج تحسین کے قابل نہیں سمجھا جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں دنیا کے تمام شعبوں میں کئی خوشگوار تبدیلیاں آئی ہیں اور اردو ادب میں یہ تغیر آیا ہے کہ ہم اپنے ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں کی شناخت ان کی حیات میں ہی کرنے کی سعی کرنے لگے ہیں۔

"کلام حیدری بحیثیت افسانہ نگار" بھی اسی نوع کی ایک کاوش ہے۔ ان کی یہ سعی اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ انہوں نے کلام حیدری کے افسانوں کا بے لاگ متوازن اور غیر جانبدارانہ انداز سے تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالمنان نے "پیش لفظ" میں کلام حیدری کے افسانوں کے محرکات اور موضوعات پر مختصر مگر جامع بات کہی ہے۔ اگر وہ اپنے تنقیدی نقطۂ نظر کو مزید بروئے کار لاتے اور تفصیلی بحث کرتے تو افسانہ نگار کا تجزیہ اور بھی مفید ہو سکتا تھا۔

کلام حیدری اردو دنیا اور افسانے کا ایک ایسا نام ہے، جس کی تخلیقات تقریباً چالیس سال سے ہماری نظروں سے گذرتی رہی ہیں۔ اب تک ان کے چار افسانوی مجموعے (بے نام گلیاں، صفر، الف لام میم، گولڈن جبلی) منظر عام پر آچکے ہیں۔ وہ ماہنامہ "آہنگ" اور ہفتہ وار "مورچہ" کے مدیر ہیں۔ یہ کتاب ان کی ادبی خدمات کے صرف ایک ہی پہلو کو سامنے لاتی ہے جب کہ کلام حیدری نہ صرف افسانہ نگار بلکہ صحافی اور نقاد بھی ہیں۔

ڈاکٹر اسلام عشرت نے ان کی افسانہ نگاری کا جائزہ ان کے حالات زندگی کے تناظر میں لینے کی سعی کی ہے۔ کلام حیدری کی بیشتر کہانیوں میں جنگ آزادی اور حصول آزادی کی خواہش ملتی ہے۔ آزادی کے بعد کے واقعات، تقسیم ملک کا ناتمام احساس ان کے افسانوں کے خاص موضوعات ہیں۔

زیر نظر کتاب میں ان کے تین ہی افسانوی مجموعوں کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ ان کے چوتھے افسانوی مجموعہ کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔ حالانکہ اس کی اشاعت کو بھی ایک سال ہو گیا۔ مقالہ نگار قدرے اور کوشش کرتا تو یہ کتاب اور جامع اور بامقصد ہو سکتی تھی۔ ان کے افسانوں کا جس گہرائی اور وسیع تناظر میں مطالعہ کیا جانا چاہئے تھا، اس کتاب میں اس کی کمی ہے۔

میرا خیال ہے کلام حیدری کے بیشتر افسانوں میں پلاٹ، کردار یا موضوع سے زیادہ جملوں کی اہمیت ہے۔ یہ جملے اتنے بلیغ، اتنے فلسفیانہ، اتنے وسیع المعنی ہوتے ہیں کہ ایک افسانہ یا جملہ میں جانے کتنے افسانے چھپے ہوتے ہیں۔ مثلاً "آزادی منائی نہیں جاتی قادری۔ آزادی تو محسوس کی جاتی ہے۔!"

یہ کتاب کلام حیدری کی افسانہ نگاری اور ادبی خدمات کا نہ صرف اعتراف ہے بلکہ ان سے متعلق بحث و مذاکرہ کے نئے دروازے وا کرتی ہے۔

ارتضیٰ کریم

فکر و فن اور آثار کی رونمائی سے پہلے شمع روشن کرکے تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے ہماچل پردیش کے وزیر اعلیٰ جناب ویر بھدر سنگھ، بھاشا سنسکرتی وبھاگ کے ڈائریکٹر جناب شری نواس جوشی

فکر و فن (سہ ماہی)، قیمت: ایک روپیہ
بھاشا سنسکرتی وبھاگ، ہماچل پردیش، شملہ-۱۰۰۱ [illegible]

## ملاقات

### صحافت

صحافت پر تمام ہی مضامین اچھے ہیں۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے مغربی بنگال سے شائع ہونے والے قبل یا موجودہ ادبی رسائل کا ذکر نہیں کیا۔ فرحت شاہین نے بہار سے نکلنے اور جن بند ہونے والے اخبارات کی فہرست دی ہے ان میں ہفتہ وار "بہارا پرچم" دشمیم ربانی" کا نام بھی شامل ہے۔ قارئین کے لیے لااعلم عرض ہے کہ یہ اخبار پابندی کے ساتھ کشن گنج سے شائع ہو رہا ہے اور کبھی بھی بہت دنوں کے لیے بند نہیں ہوا۔

تیش بترا کا سفرنامہ اچھا لگا۔ بحری سفر کی رئیسی ہم متوسط طبقے کے ہندوستانیوں کے لیے الف لیلی کہانی پڑھنے کے مترادف ہے۔

رفیع حیدر انجم۔ ارار یا

### سہو

ہفت روزہ "اردو ایکشن بھوپال روزنامہ طرز پر ۱۹۸۳ء سے بلاناغہ نہایت پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے" جائزہ نگار اگر اپنے ہی کالج کی لائبریری (لائبریری سیفیہ کالج بھوپال) کا ہی جائزہ فرماتے تو ان کو ۱۹۸۳ء سے اب تک کے تمام شمارے نظر آجاتے۔

ڈاکٹر ایچ ماجد حسین بھوپال

فرحت شاہین کا مقالہ بعنوان "بہار میں اردو صحافت" پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ انہوں نے بڑی محنت وکاوش سے کام لیا ہے لیکن بعض اخبارات و رسائل کے نام چھوٹ گئے ہیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل ماہناموں کا ذکر چھوٹ گیا ہے۔

(۱) "طلبہ" بارا عیدگاہ پورنیہ (۲) "نہار" بیگنا کشن گنج پورنیہ (۳) "جام" کشن گنج پورنیہ (۴) "طوفان" بارا عیدگاہ پورنیہ (۵) "قافلہ" پورنیہ (۶) "اُفکار" محمدیہ پورنیہ (۷) غالب کٹیہار پورنیہ (۸) "الاحسان" کاشی باڑی ہاٹ کشن گنج پورنیہ

اس کے علاوہ بعض اخبارات و رسائل کے متعلق جو معلومات فراہم کیے گئے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں جیسے:-

(۱) ہفتہ وار "آئینہ" کشن گنج کا سن اجرا ۱۹۳۵ء بتایا گیا ہے حالانکہ "آئینہ" کا اجرا ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۶ء عمل میں آیا (۲) سہ روزہ و ہفتہ وار "انسان" کشن گنج (پورنیہ) کا سن اجرا ۱۹۵۱ء لکھا گیا ہے لیکن اس کی اشاعت کا آغاز ۱۹۴۸ء ہی میں ہوا

اسی طرح بند ہونے والے اخبارات و رسائل میں ہفتہ وار "بہارا پرچم" کشن گنج کا نام بھی شامل ہے حالانکہ وہ جاری ہے اور شمیم ربانی صاحب کی ادارت میں نکل رہا ہے اور اس وقت ضلع پورنیہ کا واحد اردو ہفتہ وار ہے۔

اکمل یزدانی جامعی پورنیہ

### معذرت

شین مظفر پوری کی کہانی "منشی ڈارلنگ" میں صفحہ ۳۹ کی آخری سطور کا تعلق دراصل صفحہ ۴۱ کے پارہ اول سے ہے اسی طرح صفحہ ۴۱ کی آخری سطور صفحہ ۴۰ سے منسلک ہیں۔

عزیز صدیقی۔ بھاگل پور

### پسندیدہ

ماہ جنوری ۱۹۸۵ء کا "آجکل" نظر نواز ہوا۔ غلام ربانی تاباں، باقی، مخمور سعیدی، علیم صدیقی صاحب کی غزلیں اور شین مظفر پوری اور محمد یعقوب اسلم صاحب کے افسانے بہت پسند آئے۔

غلام قادر خان۔ بمبئی

### بار خاطر

"من کہ" کی غیر حاضری بار خاطر ہے۔ میں تو کہوں گا کہ جب چل چلاؤ ہے سلسلہ تو سلسلہ چلے! "منشی ڈارلنگ" نے دل کی گہرائیوں میں گھر کر لیا۔ یتین صاحب کو دو Culture کے Contredict ion کی جلوہ سامانی میں قابلِ تحسین کامیابی ملی ہے۔ ........ "جل پریوں کا دیش" بہت ہی معلوماتی ہے۔ "پھیلتے سمٹتے فاصلے" کے بعد تیش بترا صاحب نے ایک بار پھر مسرور کیا۔ مخمور سعیدی، فرحت شاہین اور شانتی رنجن صاحبان کے علاوہ دیگر حضرات کی تخلیقات بھی لائق ستائش ہیں۔

تنویر اختر نور بیگو سرائے

### دُعا

لفظ سید میں نام کے حصے کی طرح استعمال کرتا ہوں، میرے تعلیمی کاغذات پر بھی یہی نام ہے۔ دوست اور عزیز بھی اسی نام سے پکارتے ہیں۔ اور مجھے اپنا پورا نام اچھا بھی لگتا ہے۔ دعا کر رہا ہوں کہ راز بھائی کو بھی اچھا لگنے لگے۔

سید محمد اشرف

### مُبارکباد

ماہ فروری ۱۹۸۵ء کا ماہنامہ "آجکل" میں جناب زیب غوری صاحب کی غزل "بہ خط شاعر" بہت پسند آئی۔ اور قیصر قلندر کا لکھا ہوا "آلاتِ موسیقی" نہایت ہی پسند آیا۔ اتنا بہترین و نمایاں شمارہ نکلنے پر میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیے۔ جناب محمد اشرف صاحب کا لکھا ہوا "افسانہ" "جنرل نالج سے باہر کا سوال" بہت پسند آیا۔

حمید الدین احمد ناز

نئی دہلی میں منعقدہ ایک تقریب میں پبلی کیشنز ڈویژن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیام سنگھ ششی، مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات
شری وی۔ این۔ گیڈگل کو ڈویژن کی شائع کردہ کتابیں پیش کرتے ہوئے۔

مرکزی وزیر تعلیم شری کے۔ سی۔ پنت ۱۶ فروری ۱۹۸۵ء کو نئی دہلی میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے اہتمام میں منعقدہ
بین الاقوامی غالب سیمینار کی افتتاحیہ تقریب میں انسٹی ٹیوٹ کی چیئرمین و ممبر پارلیمنٹ بیگم عابدہ احمد کو گلدستہ پیش کرتے ہوئے۔ اس
برس سیمینار کا موضوع غالب کے ایک ہم عصر شاعر حکیم مومن خاں مومن کی شخصیت اور شاعری تھا۔ بائیں: غالب
انسٹی ٹیوٹ کے سیکریٹری جناب محمد شفیع قریشی۔ (تصویر: فدا علی)

تشکیلِ شعر: برجیندر سیال

جاں درہوائے یک نگہِ گرم ہے اسد
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

(غالب)

Publishedby the Director Publications Division,Patiala House, New Delhi-110001, Printed by the Manager, Govt. of India Photolitho Press,Faridabad.

وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی کو وزیرِ اعلیٰ جموں و کشمیر جناب غلام محمد شاہ کی جانب سے ۲۱ مارچ ۱۹۸۵ء کو نئی دہلی میں دیے گئے عشائیہ کا ایک منظر۔ اس روایتی کشمیری دعوت میں ایک ہی ترامی' میں شری راجیو گاندھی کے ساتھ پردیش کانگریس کمیٹی (آئی) کے صدر مفتی محمد سعید، وزیرِ اعلیٰ جموں و کشمیر شری غلام محمد شاہ اور پارلیمانی امور کے مرکزی وزیرِ مملکت جناب غلام نبی آزاد کھانا کھاتے ہوئے۔

وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی ۱۶ اپریل ۱۹۸۵ء کو نئی دہلی میں آل انڈیا نیوز پیپرز ایڈیٹرز کانفرنس کے مندوبین سے خطاب کرتے ہوئے۔

حسرت نمبر


اُردو کا مقبولِ عام معتبر ماہنامہ

# آج کل

نئی دہلی

ایڈیٹر:
راج نرائن راز

| جلد : ۴۳ | شمارہ : ۱۰ | مئی ۱۹۸۵ء |
|---|---|---|
| قیمت : ایک روپیہ ۵۰ پیسے | فون : ۳۸۷۰۶۹ | بیساکھ جیشٹھ شک سمت ۱۹۰۷ |


## ترتیب



سرورق : سین گپتا


بزنس منیجر : ایل۔ آر۔ بترہ ۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس مینجال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :
ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ :
بزنس منیجر : پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اندرونِ ملک : زرِ سالانہ : ۱۵ روپے دو سال کے لیے : ۲۷ روپے تین سال کے لیے : ۳۸ روپے

## نوجوانوں کا سال

جوانی جو زندگی کی طویل ترین مدت ہے، خواب دیکھنے کی عمر ہوتی ہے۔ لیکن موجودہ حالات میں چند نوجوان ہی خواب دیکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ انہیں تلخ حقیقتوں اور مخالف ماحول کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر آج کی دنیا کل کا خواب ہے تو نوجوان کو بنی نوع انسان کے مستقبل کے متعلق خواب دیکھنے کا ایک موقع ملنا چاہیئے۔

۱۹۸۵ء کا برس نوجوانوں کے مسائل کے بارے میں مباحثوں، تبادلۂ خیال اور عمیق مطالعہ کے لیے وقف کیا گیا ہے تاکہ آئندہ برسوں میں وہ نہ صرف بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کریں بلکہ خواب بھی دیکھ سکیں۔

بچوں کا سال ختم ہو گیا ہے اور یہ نوجوانوں کا عالمی سال ۱۹۸۵ء جس کا آزمودہ موضوع 'شرکت، ترقی اور امن ہے' شروع ہے۔ سال ابھی شروع ہوا ہے، اور جب یہ ختم ہو جائے گا اور ہم سے خیر باد کہہ دیں گے تب تک بارہ ماہ کے سرگرم بحث مباحثے میں نوجوانوں پر کافی توجہ دی جا چکی ہوگی۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل میں کسی وقت کوئی سماجی تبدیلی آ جائے یا کوئی قانون بن جائے۔

نوجوان جن کی موجودگی بیک وقت دکھائی دیتی بھی ہے اور نہیں بھی دیتی ........

ترقی پذیر ملکوں کی معیشتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گھر ہوں یا کھیت کارخانے ہوں یا کوئی اور جگہ کام نوجوانوں کی ہی ایک ذمہ داری ہے اور کام کا بڑا حصہ وہی انجام دیتے ہیں۔ جوان لوگ دنیا بھر میں اور بالخصوص ترقی پذیر ملکوں میں محنت کش طبقے کا اہم حصہ ہیں۔

جہاں محنت پر مبنی پیداوار تمام اقتصادی شعبوں کی بڑی خصوصیت ہے، وہاں زیادہ تر کارکن نوخیز لڑکے اور بالغ نوجوان ہی ہوتے ہیں۔ وہ آج بھی کام کر رہے ہیں اور مستقبل میں اس سے بھی زیادہ کام کریں گے۔

نوجوان کی اس بھاری ضرورت اور اہمیت کے باوجود ترقی پذیر ملکوں میں نوجوانوں کو بھاری بے روزگاری، کم تر معیار زندگی اور دولت و مواقع میں وسیع پیمانے پر عدم مساوات کا سامنا ہے کیونکہ اقتصادیات میں نوجوانوں کا کردار غیبی ہے، اس لیے نہ اس کا شمار ہوتا ہے نہ اس کی قدر ہوتی، نہ اس کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے اور نہ اسے تسلیم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اقتصادی ترقی کے عمل میں نوجوانوں کے کردار میں ان کی کوششوں کو موثر ڈھنگ سے جوڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ درحقیقت نوجوانوں کے حالات اور خصوصی ضروریات سے مربوط ترقیاتی پروگرام اور پالیسیاں بہت تھوڑی ہیں۔

### نوجوان کون ہیں؟

ترقی پذیر ملکوں میں قریب ستر کروڑ لوگ (۲۰ فی صد) ۱۵ اور ۲۴ برس کی عمر کے اور قریب ۱۴۰ کروڑ لوگ ۱۵ برس سے کم عمر کے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ترقی یافتہ ملکوں میں ۱۵ برس سے کم عمر کے لوگوں کا تناسب بہت کم ہے اور تیزی سے گھٹ رہا ہے۔ بین الاقوامی تعریف کے مطابق نوجوان سے مراد وہ شخص ہے جو ۱۵ سے ۲۴ برس کا ہو، لیکن عملی طور پر ۱۰ سے ۳۰ برس کے افراد کو جوان کہا جاتا ہے۔ کچھ افراد کو دس برس کی عمر میں ہی گھر کی چھت کے سایہ سے بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ جب کہ کچھ لوگ ۳۰ برس کی عمر تک بھی اپنے کنبوں پر منحصر رہتے ہیں۔

ترقی کے عمل میں نوجوانوں کو اکثر اس لیے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ انہیں اس بات کا مناسب علم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ان کی صلاحیتیں کیا ہیں اور ترقی کا ان پر کیا اثر ہے۔ مزید برآں جب چھوٹے بچے پیدا ہوتے ہیں تو بڑوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

نوجوان جو کام کرتے ہیں وہ اس قسم کا ہوتا ہے کہ ترقی کے عمل میں انہیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر وہ غیر ہنرمند یا کم اجرتوں والے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ جس کے سبب اُن کی جگہ پر آسانی سے کسی اور کو لگایا جا سکتا ہے۔ وہ اتفاقیہ یا ثانوی درجے کے محنت کے کاموں پر غیر منظم کام کے احکامات پر لگاتار کام کرتے رہتے ہیں۔ صرف جب کبھی ان کا استحصال یا قاعدوں کا سخت غلط استعمال ہوتا ہے تو بچوں

کے تحفظ کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

اگرچہ یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ ۱۵ برس سے کم کے بچّے اسکولوں میں ہوتے ہیں، لیکن حقیقت بالکل مختلف ہے۔ کیوں کہ یہ بات امر مسلمہ سمجھ لی جاتی ہے کہ وہ اسکولوں میں ہیں، اس لیے ان کی محنت کو ایک اقتصادی وسیلہ خیال نہیں کیا جاتا۔ بنیادی تعلیم کی اشاعت کے باوجود دیہات کے سب بچّے خاص طور پر لڑکیاں پرائمری یا ثانوی تعلیم کے لیے نہیں جاتے۔ کارکنوں کی پیداواری صلاحیت اور معیار کو بلند کرنے کے لیے تعلیم اور تربیت کے معیار میں اصلاح بہت ضروری ہے۔ اسکول کی تعلیم اور کام کے نصابات میں رابطہ قائم کرنے کے لیے کوششیں کی جارہی ہیں تاکہ ایسے نصابات وضع کیے جاسکیں، جن سے سب لوگ اسکول کی فیس اور لباس کا خرچہ آسانی سے برداشت کرسکیں۔ اور تربیت ایسے کاموں کی دی جائے، جن کی منڈیوں میں مانگ ہے۔ صحت اور غذائیت کا تعلیم اور تربیت سے رابطہ قائم کرنے کے لیے بھی دنیا بھر میں توجہ دی جارہی ہے۔

چونکہ جوان لوگ ایک بہت بڑا وسیلہ ہیں۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ ان کے بارے میں یہ خیال پایا جاسکتا ہو کہ ان کی کوئی اقتصادی اہمیت نہیں۔ لیکن جب وہ بے روزگار ہوں، کم روزگار رہے ہوں یا اَن پڑھ ہوں تو ایسی حالت میں انسانی وسیلوں کا بڑے پیمانے پر نقصان ہوتا ہے لہٰذا مسلسل تنظیم اور باقاعدہ کوشش سے ہی انہیں ترقّی کے عمل میں ایک حقیقی متحرک اور واضح قوت بنایا جاسکتا ہے۔

## بچّے اور خواتین

ترقّی پذیر ملکوں کی ۸۰ فی صد آبادی بچّوں اور خواتین پر مشتمل ہے۔ لہٰذا جیسی خواتین ہوں گی ویسے ہی بچے ہوں گے۔ اگر خواتین پڑھی لکھی ہوں گی تو بچّے کم ہوں گے۔ اگر خواتین صحت مند ہیں تو بچّے بھی صحت مند ہوں گے۔ اگر عورتیں لڑکیوں کی بھی اتنی ہی قدر کریں جتنی لڑکوں کی کرتی ہیں تو سماج میں زیادہ برابری نظر آئے گی۔ جہاں تک ترقی کے عمل سے منسلک ہونے میں عورتوں اور نوجوانوں کو پیش آنے والے مسائل کا تعلق ہے، وہ بھی ایک جیسے نہیں ہیں۔ یہ کھیتوں میں کام کرتے ہوں یا باہر ان کا کام پورے وقت کا ہو یا موسمی۔ اس کا ترقیاتی منصوبہ بندی کرنے والوں کو پورا پورا شمار کرنا چاہیے۔ اسی طرح عورتوں اور نوجوانوں کے بارے میں بہتر اعداد و شمار اور اس کے کردار کی بہتر تشریح کی بھی ضرورت ہے۔ یہ بات فراموش نہیں کی جانی چاہیے کہ عورتیں اکثر اوقات اپنے بچّوں کو ساتھ لے کر کارخانے، گھریلو پیداوار یا بازار کے کاروباری عمل میں کام کرتی ہیں۔ بچّے ایک اقتصادی سرمایہ ہیں۔ کچھ حالات میں تو وہ تین برس کی عمر میں ہی سرمایہ ثابت ہوتے ہیں۔ لہٰذا اکثر ترقی پذیر ملکوں میں یہ بڑے کنبوں کی افادیت کی ایک دلیل ہے۔ لہٰذا ایک ایسے ترقیاتی ڈھانچے کی فوری ضرورت ہے، جس میں کاشت کار کنبے اور مزدوری کی منڈی دونوں میں خواتین اور نوجوانوں کے لیے گنجائش موجود ہو۔

## سال کے لیے تجاویز

ترقّی کے عمل میں خواتین اور نوجوانوں کے مفاد کو شامل کرنے کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کے لیے ضروری ہے کہ لگن رکھنے والے دانشوروں اور عاملوں کی ایک نئی کھیپ تیار کی جائے۔ ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ ٹھیک ٹھیک اور متحرک معلومات کی ایک بنیاد قائم کی جائے — جس میں خواتین اور نوجوانوں کے اقتصادی کردار کے بارے میں ان کی جنس، عمر، علاقے، کنبے کی معیشت، آمدنی، تعلیم وغیرہ پر مبنی اطلاعات شامل ہوں۔ جب جوان لوگ اپنے والدین کو بازار جاکر مال فروخت کرنے پر لگا دیتے ہیں یا موجودہ اور آئندہ پیداواری صلاحیت پر نوجوانوں کی تعلیم کا کیا اثر پڑتا ہے ان دونوں پہلوؤں کے ساتھ نوجوانوں اور خواتین پر ترقیاتی اثرات کا بھی وسیع پیمانے پر مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ ایسے پراجیکٹ اور پالیسیاں فوری طور پر تشکیل دینے کی ضرورت ہے۔ جن کا نوجوانوں اور خواتین کی پیداواری صلاحیت سے براہِ راست تعلق ہو۔ ذرائع کو مدِ نظر رکھ کر بنائی گئی تکنیک کی تربیت اور محض محنت کی بچت کی بجائے ٹکنالوجی پر زور دینے کے طریقے منتقلہ کو مہیا کیے جانے چاہئیں۔ تدریس کے عمل میں خواتین اور نوجوانوں کو شامل رکھا جائے اور "ترقّی کے لیے نوجوان" کا نعرہ "ترقّی کے لیے خواتین" کے نعرے کی ضمنی شاخ بن سکتا ہے۔

۱۹۸۵ء کا سال نوجوانوں کے بین الاقوامی سال کے طور پر اور خواتین کے اقوامِ متحدہ کے دہے کے اختتامی برس کے طور پر ایک مناسب وقت ہے، جب خواتین اور نوجوانوں کے بہت حد تک مشترکہ مفادات کو یکجا کیا جاسکتا ہے۔

---

آج کل کا "حسرت نمبر" پیشِ خدمت ہے۔ ضخامت کے اعتبار سے یہ مختصر ہے تاہم اس کے مضامین وقیع ہیں۔ ان میں مولانا حسرت موہانی مرحوم کے کردار، افکار اور اشعار کا بڑی حد تک نئے زاویوں سے مطالعے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ مولانا کے فکر و فن کے سبھی گوشوں پر محیط ہیں۔ مولانا کے مطالعے کے باب میں، جو بعض غلطیاں اور غلط فہمیاں راہ پاگئی تھیں، اُن کا اجمالی خاکہ بھی اس نمبر میں شریک ہے۔

اس نمبر کے سبھی قلم کار آپ کے جانے پہچانے ہیں اور حسرت شناسی میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ ان کی مساعی مشکور ہیں۔

ہم توقع کرتے ہیں کہ حسرت موہانی مرحوم کے مطالعے میں، اس نمبر سے نئی راہیں کھلیں گی۔ یہ نمبر آپ کو پسند آئے گا۔ یہ نمبر آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

حسرت موہانی

آن کہ...

# مولانا حسرت موہانی

عبداللطیف اعظمی
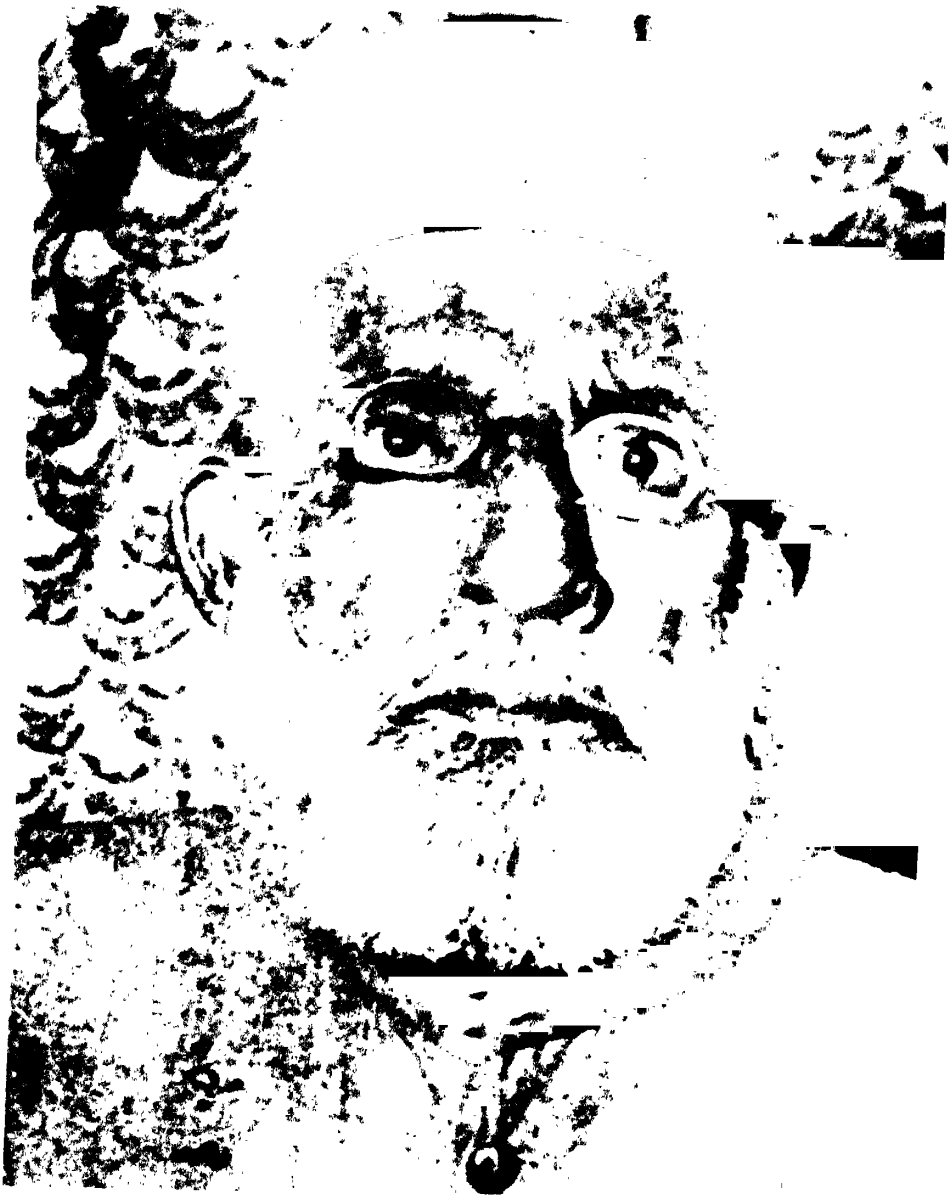
۱۸۸۰ء (۱۲۹۸ھ) سید فضل الحسن حسرت موہانی (ولد سید ازہر حسن) قصبہ موہان، ضلع اُناؤ (یوپی) میں پیدا ہوئے۔[1]

۱۸۹۳ء: بارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔

۱۸۹۴ء اردو مڈل کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔

۱۸۹۸ء: انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔

۱۸۹۹ء: ۱۵ مارچ: مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔

۱۹۰۱ء - ۲۰ مارچ: مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں بی اے سال اوّل میں داخلہ لیا۔

۱۹۰۳ء: ریاضی اور عربی کے اختیاری مضامین کے ساتھ سیکنڈ ڈویژن میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۰۳ء: خاندان ہی کی ایک تعلیم یافتہ اور منتظم خاتون نشاط النساء سے شادی ہوئی۔[2]

---

[1] مولانا حسرت موہانی کے سنہ پیدائش میں بالکل شروع ہی سے کافی اختلاف ہے۔ خود حسرت نے اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ البتہ ان کی زندگی میں سب سے پہلے ان کے حالاتِ زندگی کے متعلق ۱۳۳۰ھ/۱۸-۱۹۱۷ء میں جو تحریر شائع ہوئی تھی، اس میں سنہ پیدائش ۱۲۹۸ھ یعنی سنہ عیسوی کے لحاظ سے ۸۱-۱۸۸۰ء ہے۔ مولانا کی وفات کے فوراً بعد اور راقم الحروف کی معلومات کے مطابق سب سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۷۰ھ (مطابق ۲۲ جون ۱۹۵۱ء) کو گویا مرحوم کے چالیسویں کے موقع پر، جو مضمون لکھا تھا اور "واحسرتا" کے عنوان سے معارف بابت دسمبر ۱۹۵۱ء میں وفیات کے تحت شائع ہوا ہے۔ اس میں مرحوم کا سنہ پیدائش ۱۲۹۸ھ (مطابق ۱۸۸۰ء) درج ہے۔ البتہ سنہ وفات کے دوسرے سال جنوری و فروری ۱۹۵۲ء میں مولانا نیاز فتحپوری نے نگار (لکھنؤ) کا حسرت نمبر شائع کیا تو خود نیاز مرحوم نے "تذکرۂ حسرت" میں سنہ پیدائش ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء لکھا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا حسرت ہی کے خاندان کی ایک خاتون رابعہ بیگم نے بھی اپنے مضمون "حسرت کی خانگی زندگی" (مطبوعہ: سہ ماہی "اردو ادب" علی گڑھ کے حسرت نمبر میں یہی سنہ ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) لکھا ہے۔ مولانا جمال میاں نے بھی جو مولانا سے بہت قریب تھے اور انہیں کے مکان (فرنگی محل) میں ان کا انتقال ہوا تھا۔ یہی سنہ یعنی ۱۸۷۸ء لکھا ہے۔ جنوری ۱۹۶۹ء میں ڈاکٹر احمر لاری نے، حسرت موہانی پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے: "حسرت موہانی ـــــ حیات اور کارنامے" کے نام سے ایک وقیع تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ جو ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں موصوف نے ان مختلف سنین پیدائش میں سے، بہ دلائل ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۰ء کو ترجیح دی ہے۔ بعد کے لکھنے والوں نے، جو سنہ پیدائش ان کے سامنے آیا، بغیر کسی تحقیق کے اُسے اپنے مضمون یا کتاب میں درج کر دیا۔ مثلاً: "حسرت موہانی ـــــ ایک سیاسی ڈائری" (مطبوعہ ۱۹۷۷ء) کے مؤلف اثر بن یحییٰ انصاری نے ۱۸۷۵ء لکھا ہے۔ انگریزی کی ایک کتاب: "مسلمس اِن انڈیا" (از نریش کمار جین) مطبوعہ: ۱۹۷۹ء میں سنہ پیدائش ۱۸۷۸ء درج ہے (صفحہ ۱۹۵) حکومتِ ہند کی طرف سے انگریزی میں: "ڈکشنری آف نیشنل بایوگرافی" (ایڈیٹر: ایس۔ پی۔ سین) کے نام سے چار جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ جلد دوم میں مولانا کا سنہ پیدائش ۱۸۷۸ء ہے (صفحہ ۱۵۴) پاکستان سے ایک کتاب "مسلمانوں کی سیاسی تنظیم" (از: محمد حسام الدین خاں غوری) شائع ہوئی ہے (مطبوعہ: کراچی: ۱۹۸۰ء) اس میں مولانا کا سنہ پیدائش ۱۸۷۳ء ہے۔ (صفحہ ۲۱۱) ان تمام مختلف سنوں میں سے اسی سنہ کو میں بھی صحیح سمجھتا ہوں، جسے ڈاکٹر احمر لاری نے ترجیح دی ہے، یعنی ۱۸۸۰ء (اعظمی)

[2] حسرت کے بیشتر سوانح نگاروں نے ان کی شادی کا سنہ ۱۹۰۱ء لکھا ہے، مولانا کے خاندان کی ایک خاتون رابعہ بیگم نے اپنے مضمون "حسرت کی خانگی زندگی" میں اور حسرت کی صاحبزادی نعیمہ بیگم نے اپنے مضمون: "حسرت کی کہانی نعیمہ کی زبانی" میں ۱۹۰۳ء لکھا ہے۔ مولانا مرحوم کے بھتیجے اختر حسن نے ایک سیمینار میں اسی سنہ کی تائید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ بعض خاندانی روایات اور بیانات کی بنیاد پر ۱۹۰۱ء کے بجائے ۱۹۰۳ء صحیح ہے۔ مذکورہ بالا دونوں مضامین اور بیانات کی وجہ سے راقم الحروف بھی اسی کو صحیح سمجھتا ہے۔ (اعظمی)

۱۹۰۳ء : جولائی : علی گڑھ شہر سے "اُردوئے معلیٰ" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا۔ جوادبی کے ساتھ ساتھ سیاسی بھی تھا۔

۱۹۰۴ء دسمبر : کانگریس کے بیسویں اجلاس منعقدہ بمبئی، بہ صدارت سر ہنری کاٹن بتاریخ ۲۶۔۲۷ دسمبر میں بحیثیت ڈیلی گیٹ شرکت کی۔

〃 دسمبر : محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ۱۸ویں اجلاس منعقدہ لکھنؤ، بہ صدارت ماریسن' پرنسپل مدرسۃ العلوم، علی گڑھ' بتاریخ ۲۷ تا ۳۰ دسمبر میں شرکت کی۔

۱۹۰۵ء جنوری : 'اردوئے معلیٰ' میں کانگریس کے بیسویں اجلاس کی مفصل روداد مع تبصرے کے شائع کی۔

〃 : آل انڈیا انڈسٹریل کانفرنس منعقدہ بنارس میں شرکت کی اور اس کے بعد سے سودیشی کی حمایت شروع کر دی اور اس کے استعمال پر زور دینے لگے۔

〃 دسمبر : کانگریس کے اکیسویں اجلاس منعقدہ بنارس بہ صدارت : گوپال کرشنا گوکھلے، بتاریخ : ۲۷ تا ۳۰ میں شرکت کی۔

۱۹۰۶ء دسمبر : کانگریس کے بائیسویں اجلاس منعقدہ کلکتہ بہ صدارت دادا بھائی نوروجی بتاریخ ۲۶ تا ۲۹ دسمبر میں ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شرکت کی۔

۱۹۰۷ء جنوری : اردوئے معلیٰ میں "سودیشی اور بوئیکاٹ" کے عنوان سے مولانا کا مضمون شائع ہوا۔

〃 ۱۷ فروری : مولانا کی پہلی صاحبزادی نعیمہ بیگم پیدا ہوئیں۔

〃 : اُردوئے معلیٰ کے فروری و مارچ کے مشترک شمارے میں مولانا کا ایک مضمون، مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بارے میں شائع ہوا جس میں اس پر زور دیا کہ اس کو نیشنل کالج بنا دینا چاہیے اور اس کے انتظامیہ سے انگریزوں کا تعلق نہ ہو۔

۱۹۰۷ء جون : "مسلمانانِ ہندوستان کا پولیٹیکل مستقبل" کے عنوان سے مولانا کا ایک اہم مضمون اُردوئے معلیٰ میں شائع ہوا۔

〃 جولائی : اردوئے معلیٰ میں مولانا کا ایک مضمون : "بجٹ : ہندوستان اور مسٹر مارلے کی پالیسی" کے عنوان سے شائع ہوا۔

〃 دسمبر : کانگریس کے ۲۳ ویں اجلاس منعقدہ سورت بہ صدارت راس بہاری گھوش بتاریخ ۲۶، ۲۷ دسمبر میں شرکت کی۔

۱۹۰۸ء ۲۳ جون : اردوئے معلیٰ بابت ماہ اپریل (۱۹۰۸ء) کے ایک مضمون : "مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی" کی اشاعت پر علی گڑھ میں مولانا کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔

〃 ۴ اگست : عدالت نے دو سال قیدِ سخت اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا سنائی اپیل پر ہائی کورٹ نے سزائے قید میں ایک سال کی تخفیف کر دی، مگر جرمانہ بدستور برقرار رہا۔ فیصلے کی اسی تاریخ سے قیدِ سخت کا آغاز ہوا۔

۱۹۰۹ء ۱۹ جون : قید کی مدت سے تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے مولانا کو رہا کر دیا گیا۔

〃 اکتوبر : اردوئے معلیٰ کی اشاعت دوبارہ شروع ہوئی۔

۱۹۱۰ء جنوری : اردوئے معلیٰ میں مولانا کے مشہور مضمون : "مشاہداتِ زنداں" کی قسط وار اشاعت شروع ہوئی۔

〃 سر آغا خان کی رہنمائی میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تحریک شروع ہوئی تو مولانا نے بھی دوسرے قومی مسلم رہنماؤں کے ساتھ حکومت کی شرائط کی شدت کے ساتھ مخالفت شروع کی۔

۱۹۱۳ء ۱۲ مئی : پریس ایکٹ ۱۹۱۰ء کے تحت مولانا کے اردو پریس سے تین ہزار کی ضمانت طلب کی گئی۔

〃 ۱۹ مئی : ضمانت جمع نہ کرنے پر اردو پریس ضبط ہو گیا اور اردوئے معلیٰ کی اشاعت بند ہو گئی۔

〃 مئی : مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار اخبار : "الہلال" مورخہ : ۲۱ و ۲۸ مئی میں مولانا حسرت سے ضمانت طلب کرنے پر سخت تنقید کی۔

〃 اردوئے معلیٰ بند ہو جانے کے بعد شہر علی گڑھ کے محلہ رسل گنج میں مولانا نے سودیشی اسٹور کھولا، جس میں سودیشی کپڑے کے علاوہ ضروریاتِ زندگی کی دوسری چیزیں بھی ملتی تھیں۔

۱۹۱۴ء جولائی : علی گڑھ سے ایک سہ ماہی رسالہ "تذکرۃ الشعراء" جاری کیا، جس کے کل سات شمارے نکلے۔

۱۹۱۵-۱۶ء دسمبر و جنوری : مسلم لیگ کے آٹھویں اجلاس منعقدہ بمبئی بہ صدارت مولانا مظہر الحق بتاریخ ۳۰ دسمبر تا یکم جنوری میں مولانا نے شرکت کی اور ان کی ترمیموں اور تقریروں پر کھلے اجلاس میں اس قدر ہنگامہ ہوا کہ جلسہ ملتوی کرنا پڑا اور دوسرے روز یہ جلسہ تاج محل ہوٹل میں سخت پہرے میں منعقد ہوا۔

۱۹۱۶ء ۸ اپریل : مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی منعقدہ لکھنؤ میں شرکت کی اور قیام یونیورسٹی کے سلسلے میں حکومت کی شرائط کی شدید مخالفت کی۔

〃 ۱۳ اپریل : قانون نظربندی کے تحت علی گڑھ میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیئے گئے۔

〃 ۱۹ اپریل : علی گڑھ سے للت پور کی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

۱۹۱۷ء ۲۲ / ۲۳ مئی: شرائط نظر بندی کی حکم عدولی کے الزام میں مقدمے کی سماعت ہوئی اور تین تقریروں کے جرم میں دو دفعات کے تحت آٹھ آٹھ ماہ کی قید محض کی سزا ہوئی۔ مولانا نے اس کے خلاف اپیل کی۔
یکم جولائی: مولانا کی اپیل خارج ہوگئی۔ اور جھانسی جیل سے الٰہ آباد ڈسٹرکٹ جیل میں، پھر کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے میرٹھ جیل میں منتقل کر دیا گیا۔
۱۹۱۸ء ۲۱ مئی: قید سے رہا کر دیے گئے۔ مگر نظر بندی کا حکم برقرار رہا۔
" دسمبر: نظر بندی سے رہائی ملی اور مولانا موہان کے لیے روانہ ہوگئے۔
" دسمبر: کانگریس کا ۳۳واں اجلاس اور مسلم لیگ کا گیارہواں اجلاس دونوں دہلی میں ۲۶ سے ۳۱ دسمبر تک منعقد ہوئے۔ اور مولانا نے دونوں میں شرکت کی۔
۱۹۱۹ء: سہ ماہی تذکرۃ الشعراء کو دوبارہ جاری کیا۔
" : کانگریس کا ۳۴واں اجلاس بہ صدارت پنڈت موتی لال نہرو بتاریخ ۲۷ تا ۳۰ اور مسلم لیگ کا بارہواں اجلاس بہ صدارت حکیم اجمل خاں بتاریخ ۲۹ تا ۳۱ دسمبر اور آل انڈیا خلافت کانفرنس کا تیسرا اجلاس بہ صدارت مولانا شوکت علی، یہ تینوں اجلاس امرتسر میں منعقد ہوئے اور مولانا نے ان میں شرکت کی۔
۱۹۲۰ء: اوائل سال میں مولانا علی گڑھ سے کانپور منتقل ہوگئے۔
" ۱۸ اپریل: ٹریڈرز کانفرنس منعقدہ دہلی کی صدارت کی۔
دسمبر: کانگریس کا ۳۵واں اجلاس بہ صدارت راگھوا چاریہ بتاریخ ۲۶ تا ۲۹ اور مسلم لیگ کا تیرھواں اجلاس بہ صدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری بتاریخ ۳۰ و ۳۱ دسمبر ناگپور میں منعقد ہوئے اور مولانا نے اپنی بیگم کے ساتھ ان میں شرکت کی۔
۱۹۲۱ء ۲۷ اکتوبر: ممالک متحدہ کی صوبائی کانگریس منعقدہ آگرہ کی مولانا نے صدارت کی۔
" ۳ دسمبر: ممالک متحدہ کی صوبائی کانگریس کمیٹی کا ایک جلسہ مولانا کی صدارت میں منعقد ہوا۔
" دسمبر: آل انڈیا خلافت کانفرنس بہ صدارت حکیم اجمل خاں بتاریخ ۲۶ دسمبر کانگریس کا ۳۶واں اجلاس بہ صدارت حکیم اجمل خاں (قائم مقام) بتاریخ ۲۷، ۲۸ اور مسلم لیگ کا ۱۴واں اجلاس بہ صدارت مولانا حسرت موہانی بتاریخ ۳۰ و ۳۱ دسمبر منعقد ہوئے۔ آزادیٔ کامل کے بارے میں مولانا کا مشہور ریزولیشن ان تینوں پارٹیوں میں پیش ہوا۔ اور تینوں میں مسترد ہوگیا۔ ان اجلاسوں میں مولانا کے ساتھ ان کی بیگم بھی شریک ہوئی تھیں اور کانگریس کی سبجکٹس کمیٹی میں دونوں نے بحیثیت ڈیلی گیٹ شرکت کی تھی۔
۱۹۲۲ء: ۹، ۱۰ فروری: جمعیۃ العلماء کی پہلی مجلس عاملہ منعقدہ دہلی میں مولانا نے شرکت کی۔
" ۱۴ اپریل: خطبۂ صدارت مسلم لیگ منعقدہ احمد آباد اور دوسری تقریروں کے جرم میں مولانا کو کانپور میں گرفتار کر کے احمد آباد لایا گیا اور سابرمتی جیل میں رکھا گیا۔
" ۳ مئی: احمد آباد سیشن جج کی عدالت میں مولانا پیش ہوئے اور تین تقریروں کے جرم میں دفعہ ۱۲۱ اور ۱۲۴ الف کے تحت مقدمہ قائم کیا گیا۔ مولانا نے اپنی مدافعت میں فل اسکیپ کے ٹائپ شدہ ۱۳ صفحات کا عدالت میں تحریری بیان داخل کیا۔
۱۹۲۲ء ۴ مئی: مقدمہ کی سماعت ہوئی، پانچ ہندوستانیوں کی جیوری نے دونوں دفعات کے الزام سے بری کر دیا۔ مگر سیشن جج نے جیوری سے اختلاف کرتے ہوئے دونوں دفعات کے تحت دو دو سال کی قید سخت کی سزا کا حکم سنایا۔ دونوں سزائیں ایک ساتھ شروع ہوں گی۔ مولانا نے اس کے خلاف بمبئی ہائی کورٹ میں اپیل کی۔
" ۲۸ جون: بمبئی ہائی کورٹ میں اپیل کی سماعت شروع ہوئی۔
" ۱۱ جولائی: ہائی کورٹ نے دفعہ ۱۲۱ کے الزام سے بری کر دیا، مگر ۱۲۴۔الف کے تحت سزا بحال رکھی۔
" ۱۱ نومبر: یرودہ جیل میں منتقل کیا گیا۔
۱۹۲۳ء ۲۰ اگست: مولانا پر باہر سے چوری چھپے چٹھی وصول کرنے کے جرم میں جیل ایکٹ کے تحت مقدمہ قائم ہوا۔ مولانا نے مقدمہ کی منتقلی کی درخواست دی۔
" ۱۳ ستمبر: عدالت نے منتقلی کی درخواست مسترد کر دی۔
" یکم اکتوبر: سب ڈویژنل مجسٹریٹ نے زیرِ دفعہ تعزیراتِ ہند دو سال قید بامشقت اور زیرِ دفعہ ۴۲ ضابطہ جیل ۶ ماہ قیدِ محض کی سزا دی، بعد میں ڈھائی سال کی اس مدت کو تخفیف کر کے ایک سال کر دیا گیا اور قید سخت کو قید محض میں تبدیل کر دیا گیا۔
۱۹۲۴ء ۱۱ اگست: مولانا کو یرودہ جیل سے بمبئی جیل میں منتقل کیا گیا۔
" ۱۲ اگست: دو سال چار ماہ کی سزا کے بعد بمبئی (دکولابہ) جیل سے رہا کر دیا گیا۔ رہا ہونے کے بعد مولانا خلافت ہاؤس

گئے اور دوست احباب سے ملنے کے بعد کان پور کے لیے روانہ ہوگئے۔

۱۹۲۵ء ۲۸ جنوری: مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسے میں شرکت کی۔

" جنوری و فروری: علی گڑھ سے کان پور منتقل ہونے کے بعد پہلی مرتبہ اردوئے معلیٰ کا دو مہینے کا مشترک شمارہ شائع ہوا۔

" ۷ ستمبر: "تحفظ آثار متبرکہ وحجاز" کے جلسہ منعقدہ لکھنؤ کی مولانا نے صدارت کی۔

" ۲۴ دسمبر: آل انڈیا خلافت کانفرنس کے دو روزہ سالانہ اجلاس منعقدہ کانپور بہ صدارت مولانا ابوالکلام آزاد میں مولانا حسرت موہانی نے بحیثیت صدر مجلس استقبالیہ اپنا خطبہ پڑھا۔

" ۲۴ و ۲۵ کی درمیانی شب میں مولانا محمد علی کی تحریک پر مولانا حسرت کا خطبۂ استقبالیہ کانفرنس کی روداد سے خارج کر دیا گیا۔

" ۲۶ دسمبر: پہلی ہندوستانی کمیونسٹ کانفرنس منعقدہ کان پور بہ صدارت کامریڈ سنگر اویلو میں مولانا نے بحیثیت صدر مجلس استقبالیہ اپنا خطبہ پڑھا۔

۱۹۲۸ء: مولانا نے "مستقل" کے نام سے ایک روزانہ اخبار کان پور سے جاری کیا۔

" ۲۰ اگست: ایک اخباری بیان میں مولانا نے نہرو رپورٹ پر تنقید کی۔

" ۲۸ تا ۳۰ اگست: نہرو رپورٹ کی منظوری کے لیے بارہ دری قیصر باغ لکھنؤ میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں مولانا نے بھی شرکت کی اور رپورٹ پر اعتراضات کیے۔

۱۹۳۷ء ۸ اپریل: (۲۶ محرم ۱۳۵۶ھ) جمعرات کے دن بیگم حسرت موہانی کا دن کے گیارہ بجے انتقال ہو گیا۔

۱۹۳۷ء اکتوبر: مسلم لیگ کے ۲۵ ویں اجلاس منعقدہ لکھنؤ بہ صدارت قائد اعظم بتاریخ ۱۵ - ۱۸ میں مولانا نے شرکت کی۔ جس میں آزادیٔ کامل کی تجویز پیش کی، جو بالاتفاق منظور ہوئی۔

۱۹۳۸ء: مسلم لیگ خلافت کمیٹی کے مشترک وفد کے رکن کی حیثیت سے فلسطین کانفرنس منعقدہ قاہرہ (مصر) میں شرکت کی۔

" خاندان کی ایک بیوہ حبیبہ بیگم سے مولانا کا عقد ثانی ہوا۔

۱۹۳۹ء: دوسری بیوی سے مولانا کی صاحبزادی خالدہ بیگم پیدا ہوئیں۔

" وسط اپریل: کراچی، بصرہ، بغداد، بیروت اور مارسلیز ہوتے ہوئے لندن پہنچے۔

۱۹۴۶ء جولائی: مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کان پور کے علاقے سے یوپی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور یوپی کے نمائندے کی حیثیت سے دستور ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

۱۹۴۹ء ۱۶ جون: ریاست جموں وکشمیر کے نمائندے پہلی بار دستور ساز اسمبلی میں شریک ہوئے تو مولانا نے شیخ عبداللہ سے کہا کہ انہوں نے راجہ کی حکمرانی کو کیوں قبول کیا؟

" ۲۶ نومبر: صدر دستور ساز اسمبلی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے منظوری کے لیے دستور پیش کیا تو پورے کے پورے ایوان نے بڑی مسرت کے ساتھ حمایت میں آواز بلند کی۔ صرف مولانا حسرت نے مخالفت میں رائے دی۔

۱۹۵۰ء ۲۴ جنوری: منظور شدہ دستور پر دستخط کرنے کے لیے دستور ساز اسمبلی کا آخری اجلاس منعقد ہوا تو بیشتر ممبروں نے دستور پر اپنے دستخط ثبت کر دیے، مگر مولانا حسرت نے دستخط نہیں کیے۔

۱۹۵۱ء ۱۳ مئی (مطابق ۶ شعبان ۱۳۷۰ھ) ۱۲ بج کر ۲۵ منٹ پر لکھنؤ میں مولانا حسرت کا انتقال ہو گیا اور اسی روز شام کو فرنگی محل کے قبرستان انوارباغ میں سپرد خاک کیے گئے۔

۱۹۵ء ۱۴ مئی: پارلیمنٹ میں مولانا کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں اسپیکر جناب ماؤلنکر نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مولانا کی قومی خدمات پر روشنی ڈالی۔

---

## کتابیات:


۱۔ ڈاکٹر احمر لاری: حسرت موہانی — حیات اور کارنامے: مطبوعہ: لکھنؤ ۱۹۷۳ء

۲۔ مولانا جمال میاں: مقدمہ کلیات حسرت موہانی مطبوعہ: دہلی ۱۹۵۵ء

۳۔ قاضی عدیل عباسی: تحریک خلافت: مطبوعہ: نئی دہلی ۱۹۷۸ء

۴۔ محمد حامد علی: انتخاب مستقل: مطبوعہ: لکھنؤ ۱۹۸۳ء

۵۔ سید طفیل احمد منگلوری: محمڈن کالج ڈائریکٹری مطبوعہ: بدایوں ۱۹۱۳ء

۶۔ سید ظہور احمد: روداد اجلاس دواز دہم آل انڈیا مسلم لیگ منعقدہ امرتسر مطبوعہ: لکھنؤ

۷۔ دو ماہی اکادمی (لکھنؤ) یادگار حسرت نمبر (ایڈیٹر: سید علی جواد زیدی) بابت نومبر ۱۹۸۱ء

۸۔ عبداللطیف اعظمی، مضمون: حسرت موہانی اور قید فرنگ: دوماہی اکادمی (لکھنؤ) بابت ماہ مئی ۱۹۸۲ء

۹۔ مولانا حسرت موہانی: اردوئے معلیٰ (علی گڑھ، کان پور) مختلف فائلیں

۱۰۔ سید جالب دہلوی: روزنامہ "ہمدم" (لکھنؤ) مختلف فائلیں

۱۱۔ سہ روزہ "مدینہ" (بجنور) مختلف فائلیں


آگے صفحہ ۳۶ پر

وحید اختر

# حسرت کا مزاجِ سخن

حالی نے اصلاحِ شاعری اور خصوصاً غزل کو روایت سے آزاد کرنے کی جو تحریک شروع کی تھی، حسرت کی غزل اُس کا صالح ردِّ عمل ہے۔ حالی کے حملوں کے بعد غزل نے خود حالی کے رنگِ جدید میں جو قالب اختیار کیا، اُس سے تغزل کی رُوح مجروح ہوئی۔ وہ حالی جو اس طرح کے شعر کہہ سکتے تھے ؎

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں

اور ؎

ملتے ہی اُن کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

موعظانہ و مصلحانہ غزلیں لکھنے لگے۔ حالی غزل کو زندگی کے سچے تجربے اور سماجی مسائل سے منسلک کرنا چاہتے تھے۔ اور روایتی مضامین و ابتذال و تصنّع سے اُسے پاک کرنے پر مصر تھے۔ جدید غزل نے اقبال کے یہاں وہ آہنگ و اسلوب پایا، جو خود حالی اُسے نہ دے سکے تھے، لیکن اقبال کے معاصر اساتذۂ غزل میں یگانہ سے جگر تک اکثر اقبال کی غزل کو تسلیم نہ کر سکے۔ حسرت جنہوں نے خود حالی کی زندگی میں ان کے معیارِ نقد و سخن کو شدت سے ہدفِ ملامت بنایا، اقبال کے منکر نہ تھے۔ غزل ہی کے ذیل میں اُنہوں نے کہا ؎

ہیں شاد و صفی شاعر یا شوق و وفا حسرت
پھر ضامن و محشر ہیں، اقبال بھی وحشت بھی

یہ شعر حسرت کے دیوانِ اوّل میں ہے۔ یعنی وہ ابتدائے سخن ہی سے غزل اور مسائلِ حیات کی ہم آہنگی کے خالص غزل گویوں کی طرح منکر نہ تھے۔ منکر تو یگانہ بھی نہ تھے۔ مگر اُن کے معیار اور مزاج میں بے لچکی اور انانیت اس حد تک تھی کہ خود مجدّدِ غزل ہونے کے باوجود وہ اقبال ایسے مجدّد و موجد کو قبول نہ کر سکے۔ اس کے برخلاف حسرت کی نظر میں وسعت و رواداری اور اُن کے مزاج میں انتخابیت کا میلان تھا خود حسرت کا جب علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں حالی سے سامنا ہوا اور فرشتہ صفت بزرگ نے باغی و بے باک نو وارد کی تنقید کا ذکر کیے بغیر شفقت و مرحمت فرمائی تو حسرت کو بڑی ندامت ہوئی۔ اور اس کے بعد اُنہوں نے حالی کے خلاف نہیں لکھا۔ یہ واقعہ حالی کی شرافت اور حسرت کے پاسِ آداب و وضع داری کی دلیل ہے۔

حسرت دراصل شاعری کی نئی تحریک کے خلاف نہ تھے بلکہ وہ غزل کی اس روایت کے پاس دار تھے۔ جو روایت زدہ ہونے سے قبل فعال اور عصر آشنا رہ چکی تھی۔ اُن کے تجربۂ زیست کے دائرے میں وہ معاملاتِ حُسن و عشق بھی تھے، جنہیں حالی نے ابتذال اور صوفیانہ پن سے تعبیر کر کے غزل کے دفتر کو اس سے پاک کرنا چاہا تھا۔ حسرت نے شاعری کی جو اصناف بندی کی اُس میں فاسقانہ شاعری کو بھی اصرار کے ساتھ شامل کیا ہے۔ وہ اپنی شاعری کے اُس حصّے کو جو اُن کے منفرد رنگِ تغزل کا سب سے توانا اظہار ہے، اسی ذیل میں رکھتے ہیں۔ یہ معاملات اور عامۃ الورود وارداتِ حُسن و عشق کا بے جھجک، بے محابہ بیان ہے۔ یہیں اُنہوں نے حالی سے بغاوت کی۔ اُن کی معاملہ بندی ایک طرف گہرے عشق سے اور دوسری طرف تصوف سے مل جاتی ہے۔

حسرت حُسن و عشق کے فرق کو نہ مان کر دونوں کو لازم و ملزوم جانتے تھے اور اس معاملے میں اُن کی نظر حالی سے زیادہ وسیع اور اُن کا اپنا ذاتی تجربہ حالی ایسے

○ پروفیسر فلسفہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اظہار بہ نسبت شخص سے زیادہ سچا تھا۔ یا شاید حالی اس سچے تجربے کو اصلاحِ قوم کے جذبے کے تحت دبانا چاہتے تھے۔ جو بھی ہو اُن کی شاعری اس لاشعوری یا شعوری کوشش سے اکہری ضرور ہو گئی۔ حسرت نے اسی اکہرے پن کے خلاف اپنی آواز اپنی تنقید، غزل کی روایت کے دفاع اور اس سے بھی زیادہ مؤثر انداز میں خود اپنی غزل کے وسیلے سے اُٹھائی — وہ خود زندگی بھر اساتذہ کے قائل و مرید رہے۔ میر، قائم، مومن، نسیم، شاہ نصیر تسلیم، غالب، مصحفی، انشا اور جرأت سے لے کر نظیری و فغانی تک۔ سب کے رنگ ان کے یہاں جھلکتے ہیں اور وہ اس پر فخر کرتے ہیں۔ یہی نہیں اُنہوں نے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کو بھی ملا دیا ؎

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود
تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جن غزلوں کو اُنہوں نے خود پیرویِ مصحفی یا جرأت کہا ہے وہ پیروی نہیں بلکہ ایک نئے رنگ کی نمود ہے۔ یہ لہجہ منفرد ہے۔ آواز توانا اور تجربہ سچا۔ اس لحاظ سے اُن کی معاملہ بندی بھی انشا و جرأت یا لکھنؤ اور دہلی کے متاخرین شعرا سے مختلف ہے۔ حسرت نے پہلی بار بیسویں صدی کے اُس رویّے کا اظہار کیا جو جسم و روح اور عشق و جنس کی دوئی کا نہیں، وحدت کا قائل ہے۔ جنسی لذّت، تصوف زدہ، اپنی شاعری کے اثر سے گناہ ٹھہری تھی اور عشق کیا ہوس تک ے تجربے سے۔ بد شعرا جیسے امیر مینائی نے اُسے لطفِ سخن و قبولِ عام کا ذریعہ سمجھ کر جس طرح تصنع و تکلف آورد اور روایت زدگی بنا دیا تھا۔ حالی اس پر معترض تھے۔ حالی کے معترض حسرت نے اس روایت کو جو ابتذال تک پہنچ گئی تھی نیا خون دے کر عینِ عاشقی و جانِ ایمان بنا دیا۔ کہتے ہیں ؏

تصوف جانِ مذہب عاشقی جانِ تصوف ہے

اس طرح فاسقانہ شاعری، عاشقانہ و عارفانہ شاعری کے ساتھ یک جان ہو گئی ہے۔ اور یہ معمولی کارنامہ نہیں۔ حسرت کی شاعری کو عشق کی معصومی ہوس کے کھلنڈرے پن کی سطح کا شاعر کہنے والے غزل میں اُن کے اجتہاد کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے۔

حسرت کی شاعری اکہری نہیں، محض تکلف اور چٹخارے کی چیز نہیں، اس میں اس مردِ آزاد کی روح کا کرب اور راذیت کوشی بھی شامل ہے جو سیاست کے خارزار میں پا برہنہ ہر کارواں سے الگ چلتا اور چکّی کی مشقت سے گزرتا رہا۔ اُن کے دیوانِ ششم سے دیوانِ دہم تک یعنی ۲۲ء سے ۲۴ء تک کی پوری غزلیں جیلوں میں لکھی گئیں۔ ان میں اظہارِ ہوس ہے، جسم کی پکار ہے، روحِ عشق کا والہانہ پن اور سرمستی ہے۔ یہ غزلیں بیشتر رندانہ، بہاریہ اور عاشقانہ ہیں اور انہیں اس پر فخر ہے کہ یہ کل غزلیں اس زمانے میں لکھی گئیں جبکہ فقیر پر حکومت کی جانب سے ایک دوسرا مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ مگر اس کے سبب سے انشاء اللہ تعالیٰ کہیں پریشان خیالی کے نمونے نظر نہ آئیں گے"۔

دیباچہ طبعِ اوّل' دیوانِ حسرت حصہ ہفتم ۱۹۲۳ء

اس قید و بند کی محرومی میں عاشق نے مولا علی مشکل کشا سے دعا بھی کی تو گرفتاریٔ دنیا سے نجات کی ؎

جانِ حسرت ہے گرفتارِ مجاز
حکم انعامِ رہائی کیجیے

یہی رنگ اس سے بھی زیادہ نکھرا اور رچا ہوا ان کے دیوانِ اوّل میں ہے۔ جس کی بیشتر غزلیں علی گڑھ اور نینی کی جیلوں میں چکّی کی مشقت کے ساتھ کہی گئیں۔ روز چالیس سیر دانہ پیس کر اور موٹا جھوٹا آدھا پیٹ کھا کر جذبۂ عشق اور سرمستیٔ روح کو باقی رکھنے کے لیے شہدا کا سا یقین و ایمان اور جذبۂ تسلیم و رضا چاہیے۔ وہ جانتے تھے کہ اصل قید خود قیدِ ذات ہے، جو قید آزادی کے لیے خود انتخاب و قبول کی جائے۔ قید نہیں آزادی ہے ؎

غیر ممکن ہے ہم سے طاعتِ غیر
اے جفا کار، اے غریب آزار
رُوح آزاد ہے، خیال آزاد
جسمِ حسرت کی قید ہے بیکار

وہ جو طاعتِ غیر کے پابند ہیں، حصارِ مفادِ ذات کے قیدی ہیں، دام و قفس سے باہر رہ کر بھی ؎

دام اس میں بے خطا اُس میں قفس ہے بے قصور
شوقِ پابندی نہاں خود میرے بال و پر میں ہے

اس طرح عشق کی مانند سیاست بھی حسرت کے تجربۂ وجود کا لاینفک حصہ ہے۔ بظاہر اُن کے سیاسی اشعار میں وہ رچاؤ اور تغزل کی کیفیت نہیں، جو بعد میں اچھے ترقی پسند شعرا کے اشعار میں ملتی ہے۔ لیکن اُن کی سچائی سے انکار کفر ہو گا۔ وہ خالص سیاسی افکار و تصورات کو غزل کی زبان میں پہلی بار ادا کر رہے تھے۔ اقبال کی طرح اُن کے یہاں فلسفیانہ آہنگ بھی نہ تھا، اس لیے ان میں وہ بلند آہنگی نہیں۔ بعض اشعار تو سیدھے سادے بیانات معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ایک سچے شاعر کے تجربوں کو بحیثیتِ کُل سمجھنے کے لیے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بنیادی طور پر زندگی کے عامتہ الورود تجربات عشق کے جذبات اور جنس کے معاملات کے شاعر تھے۔ اُن کے عشق میں ... جو معصومیت اور سادگی ہے، وہی ان کی سیاست میں اور سیاسی شاعری کار فرما ہے۔ یہ اُن کا مزاج تھا۔ وہ کسی مابعد الطبعیاتی سطح پر گئے بغیر عامی اور روزمرّہ زندگی کی سطح پر عشق و ہوس، مذہب و سیاست، عرفان و مجاز کو برتتے رہے۔ اور اسی سطح پر شاعری میں اُنہیں زبان دی۔ یہ زبان احساس

کی ہے، جو تجربے کی آنچ سے روشن ہے، اس لیے جدید غزل کا دیباچہ ہے۔ اور اس طرح وہ حالی سے باغی ہو کر سچے تجربے کی سچی شاعری کے سچے ترجمان بن کر اُن کے ادھورے سلیشن کو پورا کرتے نظر آتے ہیں۔ غزل کی طہارت حالی کے خیال میں غزل کی روایتیت، ابتذال اور معاملہ بندی کے اخراج پر مبنی تھی۔ جب کہ حسرت نے روایت سے رشتہ برقرار رکھ کر اور جنس و معاملہ بندی کو سچے تجربے کا اظہار بنا کر غزل کو طیب و طاہر کیا۔ عشق طاہر ہو تو معاملاتِ عشق رجس کیوں کر ہو گئے اور سیاست بھی عشق ہی کا ایک اظہار ہو تو وہ غزل کے دائرے سے کیسے خارج ہو سکتی ہے ؎

وہ تم ہو، یا تمہارا درد ہو، کوئی ہو دنیا میں
کیا جس سے تعلق ہم نے پیدا، عمر بھر رکھا
کیا کیا نہ اُن کی یاد سے ہوں شرمسار ہم
فرصت کبھی جو کشمکشِ روزگار دے
خوشنودیٔ فجّار کے پیرو ہیں یزیدی
تقلیدِ شہِ کرب و بلا میرے لیے ہے
منصور کی سُولی پہ نمایاں ہوئی عظمت
ہے طنطنۂ اہلِ رضا دار پہ موقوف

ان اشعار میں عشق، تصوف اور سیاست باہم دگر آمیز ہو کر وجود کے معتبر تجربہ کی زبان بن گئے ہیں۔ اور یہی آمیزش اضداد حسرت کا بھی انفرادی مزاج ہے اور اُن کی شاعری کا بھی۔

حسرت کے اس منفرد مزاجِ سخن کو سمجھنے کے لیے اُن کی سیاسی زندگی اور عشقیہ تجربات پر الگ الگ بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ دو متوازی لکیریں ہیں بھی تو ایسی کہ جب حسرت کا تجربہ انہیں قطع کرتا ہے تو جتنے زاویے بنتے اور گوشے نکلتے ہیں، وہ متناظر ہیں یا ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اُن کا اور اُن کی شاعری کا مزاج داخلی تضادات اور خارجی اضداد کو وجود کے جدلیاتی عمل سے ترکیب دے کر وحدت بنا دیتا ہے۔

حسرت نے ہندوستانی نشاۃ ثانیہ اور اُس کے ساتھ عام ہوتی ہوئی جدوجہد آزادی کی فضا میں ہوش سنبھالا۔ مشروع کا رنگین پاجامہ پہن کر ایم۔ اے۔ او کالج آنے والا قصباتی شریف زادہ بباطن باغی تھا۔ وہ طالب علمی کے دور میں مظاہروں میں پیش پیش اور سزا یافتگان میں سرفہرست رہے۔ سیاسی قائدین میں وہ تلک سے متاثر ہوئے۔ جنہیں ڈیڑھ سال کی سزا ۱۸۹۷ء میں ملی۔ حسرت آزادی کی اس آواز کو اُٹھانے کے جرم میں تین بار خارج کیے گئے۔ لیکن ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے کر لیا۔ اور اردوئے معلیٰ جاری کیا۔ ۱۹۰۴ء میں تلک کے اصرار پر بمبئی کے خصوصی کانگریس سیشن میں شرکت کی۔ اور انھیں کے ساتھ بعد میں کانگریس لبرل گروپ سے لڑ کر اس سے علیحدہ بھی ہو گئے۔ سودیشی کے پُرجوش مبلغ بن کر اُنہوں نے حکومت کے خلاف آتشیں مضامین لکھے۔ ۱۹۰۸ء میں ایک مضمون کی اشاعت پر حسرت کو دو سال کی قیدِ بامشقت ہوئی اور پانچ سو روپے جرمانہ۔ اُن کی کتابیں نذرِ آتش کی گئیں۔ ان کا روزنامچہ قیدِ فرنگ ان صعوبتوں کی روداد ہے، جن سے حسرت گزرے۔ اُن کی گرفتاری کے وقت اُن کی بیٹی نعیمہ بیمار تھیں۔ حسرت کی بیگم نے جو ابتدائے عمر سے اپنی موت کے بعد تک حسرت کی غزلوں، معاملہ بندی اور عشقِ صادق کی مرکز رہیں، اُنہیں ہمت اور حوصلے سے ہر تکلیف کے برداشت کرنے کی نصیحت کی۔ اُنہوں نے لکھا کہ گھر کی فکر نہ کرو اور اپنی طرف سے کسی کمزوری کا اظہار نہ ہونے دو۔ بہت بعد کے ترقی پسند شعرا محبوب کو جہدِ زندگی و آزادی میں شریک ہونے کی اکثر نامقبول دعوت دیتے رہے۔ مگر حسرت کی محبوبہ و رفیقِ حیات نے خود اُنہیں آزادی کے راستے پر عشق فراموشی کا درس دیا — عشق تو اُن کے ساتھ رہا، مگر سیاست کی سختیاں محبوب کی امانت بن گئیں۔ یوں پہلی ہی آزمائش نے اُن کے عشق و سیاست کو ایک کر دیا۔ وہ پابندیِ صوم و صلوٰۃ اور مریدِ اولیائے کرام تو تھے ہی مذہب نے بھی اُنہیں صبر کا حوصلہ دیا۔ اس دور کے سیاسی اشعار کا لہجہ دیکھیے: ؎

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

---

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو
ہمتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر
قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنیٔ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر
حق سے بعذرِ مصلحت وقت پہ جو کرے گریز
اُس کو نہ پیشوا سمجھ اُس پہ نہ اعتماد کر
غیر کی جدوجہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوششِ ذاتِ خاص پر نازکر، اعتماد کر

اس غزل میں اقبال کا وہ خطیبانہ آہنگ بھی ہے، جو حسرت کے عشقیہ لہجے سے مختلف ہے۔ لیکن ان اشعار میں اُن کا طرزِ فکر نمایاں ہے۔ تقلید پر اجتہاد کو اور کوششِ غیر پر کوششِ ذات کو ترجیح دی گئی ہے، سیاسی موقع پرستوں کی قیادت کا انکار ہے — موقع پرست سیاست کے خلاف اُن کی لَے آگے چل کر اور تیز ہو گئی۔ وہ بین الاقوامی صورتِ حال سے بھی باخبر رہے یورپ میں سرمایہ داری کی ہوس ناک سابقت نے اُن سے کہلوایا ؎

یورپ میں جیسے پھیل گئی ہے وبائے حرص
چلنے لگے نہ سارے جہاں میں ہوائے حرص
ہے چین و کوریا کے مٹانے پہ مستعد
جاپان بھی ہوا ہے، مگر آشنائے حرص

لیکن کچھ اور ہوائیں بھی چل رہی تھیں، اُن کی جاں بخشی کا حسرت کو احساس تھا۔ وہ اپنے عہد کے تمام غزل گویوں میں قومی اور بین الاقوامی سیاسی حالات کا سب سے زیادہ اور گہرا شعور رکھتے تھے ؎

رفتہ رفتہ مٹ رہی ہے صرصرِ بیداد بھی
رنگ ہیں بوئے وفا میں نکہتِ برباد کے

اس دور میں انہوں نے اپنی مشہور غزل کہی:

رسمِ جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے
حبِ وطن مستِ خواب دیکھئے کب تک رہے

مصحفی نے بہت پہلے زوالِ اودھ سے قبل کہا تھا ؎

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ بھی تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

حسرت کہتے ہیں ؎

دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے

بلقان کی جنگ کے زمانے میں یثرب پر قبضے کی کوشش اور ترکی و اٹلی کی کشمکش پر انہوں نے ایک غزل لکھی۔ ہندوستان کی سیاست میں اُن کا تعلق انتہا پسندوں سے تھا۔ ۱۹۱۳ء میں مولانا کا پریس اور تمام چیزیں محض ۳ ہزار کے لیے ضبط ہوگئیں۔ اسی سال مسجد کانپور شہید ہوئی۔ حسرت نے دوسرے ترقی پسند قوم پرست مسلمانوں کے ساتھ مجلسِ احرار کی بنیاد ڈالی۔ اور رئیس احرار کہلائے۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران ۱۹۱۶ء میں حسرت مخالفِ حکومت سرگرمیوں کے الزام میں پھر گرفتار ہوئے۔ للت پور، الہ آباد، لکھنؤ، پرتاپ گڑھ اور فیض آباد کی جیلوں میں رہے پھر میرٹھ جیل بھیج دیے گئے۔ اس گرفتاری سے قبل ایک غزل میں انہوں نے تاج و فوج کا یوں مذاق اڑایا ؎

آج مملوکِ حق ہیں سب وہ شریر
کل تلک تھے ابھی جو صاحبِ تاج
غلبۂ کذبِ متحد معلوم
حق ہے بے خوفِ کثرتِ افواج

اکتوبر ۱۹۱۶ء کی ایک غزل میں کہا ؎

احرارِ وطن پرست و حق کوش
تھا جن سے دیارِ صدق آباد
سب ہوگئے بند، ایک حسرت
باقی ہے، ابوالکلام آزاد

گرفتاری میں فیضانِ اولیاء اللہ شہدائے کربلا اور آئمہ الی الاولیاء اللہ لاخوفٌ علیہم ولاہم یحزنون سے دل کو گرماتے رہے ؎

اہلِ ایماں رکھتے ہیں کامل یہ فتوائے جنوں
شانِ لاخوفٌ علیہم شیوۂ لاہم یحزنون

سب کے چھوٹنے کے بعد اپنی گرفتاری میں انفرادیت کا یہ جواز ڈھونڈا ؎

ہر چند کہ میں خلافِ جمہور نہیں
تقلیدِ عوام دل کو منظور نہیں
نزدیک ہے یہ کہ سب نظر بند چھٹیں
ایسے میں نہ چھوٹوں میں تو کچھ دور نہیں
(۱۹۱۷ء فیض آباد جیل)

اس گرفتاری میں جیلر کے صاحبزادے کی فرمائش پر ایک رنگین غزل لکھ دی ؎

روگ دل کو لگا گئیں آنکھیں
اک تماشا دکھا گئیں آنکھیں

اس کے بعد قیدِ فرنگ ثانی و ثالث کے درمیانی عہد میں بحالتِ نظر بندی ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۲ء بمقام کھٹور اور موہان اور بعض بحالتِ آزادی بمقام علی گڑھ اور کانپور لکھی گئیں۔ غزلیں حسرت کے منفرد اندازِ عشق سے ملو ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام پر رباعی کہی ؎

اربابِ فریب کی ہے یہ بھی اک چال
بے کار ہے بہترین و بہتر کا خیال
گنجائشِ بہتری غلامی میں کہاں
لاریب ہے اجتماعِ منذرین محال

بہتری کی تلاش انہیں میرٹھ جیل کے قیام کے دوران میں مارکسی علیمات تک لے گئی۔ اور انہوں نے ۱۹۱۷ء کے عہد آفرین انقلاب سے قبل مارکس پر جو لکھا اُسے برطانوی سامراج کے خلاف سازش کی آواز قرار دیا گیا۔ حسرت ہم رہانِ سفر کی سست قدمی سے بد دل ہوکر راستے بدل رہے تھے ؎

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلیِ ہم رہاں سے ہم

کچھ ایسی دُور بھی تو نہیں منزلِ مُراد
لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم

۱۸ - ۱۹۱۷ء

سیاسی اتھل پتھل کا زمانہ تھا۔ پارٹیاں ٹوٹ اور بن رہی تھیں ۱۹۱۹ء میں جلیانوالا باغ کے قتلِ عام نے خلافت کانگریس اور جمعیۃ العلماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ حسرت مسلم لیگ کے اجلاس میں شریک ہو کر مخالفِ برطانیہ پالیسی کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں حسرت خلافت کے مسئلے پر وائسرائے سے بات کرنے وفد کے ساتھ گئے، مگر اپنے ہاتھوں کو حاکم کے مصافحہ سے آلودہ کئے بغیر واپس آگئے۔ اس دور میں انہوں نے عدم تعاون کی تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ حسرت تلک اور مارکسی تعلیمات کے زیرِ اثر اور خود اپنی افتادِ طبع کے باعث ہمیشہ عوام سے قریب تر رہے۔ ان کی زندگی مفلسی، بے سروسامانی کی قلندرانہ اور فقیرانہ زندگی ہمیشہ رہی۔ ۱۹۲۵ء کے کانگریس سشن کانپور میں حسرت و بیگم حسرت نے کانپور میں مزدوروں کے ایک جلوس کی رہنمائی کی اور انہیں تحریکِ آزادی میں شامل کرنے پر زور دیا۔ اسی سال وہ کانپور منتقل ہو گئے۔ بیگم حسرت کانگریس ورکنگ کمیٹی کی رکن تھیں اور آزادی و عوام کی جدوجہد میں شوہر کی دستِ راست۔ ۱۹۲۱ء میں حسرت نے احمد آباد کانگریس سشن میں مکمل آزادی کی تجویز پیش کی۔ گاندھی جی بھی انہیں خاموش نہ کر سکے۔ یہ تجویز ۹ سال بعد لاہور سشن میں بالآخر پاس ہوئی۔ ۱۹۲۱ء میں حسرت کی آواز تنہا تھی۔ وہ سیاست میں موقع پرستی و مصلحت کے بالکل قائل نہ تھے۔ اسی لیے زندگی بھر سیاسی میدان میں رہنے کے باوجود ان کو وہ مقام نہ ملا جس کے وہ اپنی قربانیوں اور بے لوثی کی بنا پر مستحق تھے۔ ۱۹۲۵ء میں کمیونسٹ پارٹی کی فاؤنڈیشن کانفرنس کانپور میں ہوئی۔ حسرت استقبالیہ کمیٹی کے صدرنشین تھے۔ مولانا نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں کمیونسٹوں کے نظریے اور حب الوطنی کا پُرجوش دفاع کیا۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے جو کئی بار حج کا شرف حاصل کر چکا تھا ملکیت کے ادارے کے مخالف اور مساوات کے زبردست حامی تھے۔ اور اشتراکیت کو اسلام کا مغایر نہ سمجھتے بلکہ خود کو اشتراکی مسلم کہنے لگے تھے۔ اسی دور میں وہ ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۳ء میں پونے اور سابرمتی کی جیلوں میں رہے۔ اُن کی اسیری کا زمانہ ۱۹۲۴ء تک محیط ہے۔ اُن کے کلیات میں دیوانِ ششم سے دہم تک سب اسی قید کے زمانے میں لکھے اور ترتیب دئے گئے۔ اُنہوں نے تلک کی وفات پر مرثیہ غزل میں لکھا۔ مانٹیگو ریفارم کو فریب قرار دے کر دستور کے تین بنیادی اصولوں' قانون پر اختیارِ کامل، عاملہ اور مالیات پر پورے حق کی بات غزل کے فارم میں کی۔

(۱۹۲۱ء)
قیدِ ثالث کے دور میں تصنیف کئے ہوئے دیوانِ ششم میں لائڈ جارج کی شامت کی تاریخ نکالی: ع

مردک نام کا اُترا شحنہ

اور املاک کو قومیانے کی تائید میں کہا ؎

ملکی ہوئی جائدادِ شخصی — جاں بر نہ ہوا مفادِ شخصی

۱۹۲۴ء کی غزلوں میں یہ شعر ملتے ہیں ؎

دستور کے اصول مسلّم ٹھہر چکے
شاہی بھی رامِ غلبۂ جمہور ہو چکی
سرمایہ دار خوف سے لرزاں ہیں کیوں نہ ہوں
معلوم سب کو قوّتِ مزدور ہو چکی

---

تحریکِ حرّیت کو جو پایا قرینِ حق
ہر عہد میں معاونِ تحریک ہم رہے
خلقِ خدا کو مال کے شرکت کا مستحق
دربابِ ملک منکرِ تملیک ہم رہے

---

جسے کہتے ہیں اہمسا' اک اصولِ خودکشی تھا
عمل اس پہ کوئی کرتا' نہ کبھی عوام کرتے

گاندھیائی فلسفہ سے وہ منحرف ہو چکے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں اُنہوں نے یہ شعر کہا ؎

لازم ہے یہاں غلبۂ آئینِ سوویت
دو چار برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

---

گاندھی کی طرح بیٹھ کے کیوں کاتیں گے چرخہ
لینن کی طرح دیں گے نہ دنیا کو ہلا ہم

یہ اشعار دیوانِ دوازدہم میں ہیں جس کی ابتدا ترانۂ حج اور نعت سے ہوتی ہے۔ اس دیوان میں بیشتر غزلیں، حج، نعت اور منقبت میں ہیں۔ وہ غزل جس میں اردو غزل پہلی بار سوویت کے لفظ سے آشنا ہوئی۔ اس مطلع سے آغاز ہوتی ہے ؎

خود ہم کو بلانے لگے دے دے کے وہ قسمیں
باقی نہ رہا فرق کوئی عشق و ہوس میں

اسے حسرت کی طرفگیٔ طبع کہہ لیجئے۔ مگر یہ طرفگی سیاست سے مذہب تک ان کا بنیادی مزاج اور مسلک تھی۔

مذہب میں بھی حسرت کا رویہ راسخ العقیدگی کے ساتھ بغاوت کا ہے۔
ایک جگہ کہتے ہیں ؎

قولِ علی چو قولِ انگلیس
نامعتبر است و جاں ندارد

دوسری جگہ کہا ؎

وہاں بھی کیا نہیں اصنامِ پندار
تو کیوں مسجد سے بُت خانہ بُرا ہے

مذہب بھی اُن کے لیے مسلکِ عشق ہی ہے۔ واعظ و شیخ کے خلاف انہوں نے کئی ہجو آمیز رندانہ لہجے کی غزلیں لکھیں۔ وہ اختلافِ مذہب کو عشق کے طریقوں ہی کا فرق سمجھتے تھے ؎

طریقِ عشقِ جاناں ہے جُدا گبر و مسلماں کا
یہیں سے اختلافِ سبحہ و زنّار پیدا ہے

دیوانِ ہفتم کے دیباچے میں لکھتے ہیں ؎

"جن جن بزرگوں سے فقیر کو فیض پہنچا ہے۔ اُن میں سے اکثر کی جانب اس مجموعے میں کہیں نہ کہیں اشارہ موجود ہے۔ بزرگانِ دینِ اسلام کے علاوہ ایک موقع پر سری کرشن کا نام بھی آیا ہے۔ حضرت سری کرشن علیہ الرحمہ کے باب میں فقیر اپنے پیر اور پیروں کے پیر حضرت سیّد عبدالرزاق بانسوی قدس اللہ سرہٗ کے مسلکِ عاشقی کا پیرو ہے ؎

مسلکِ عشق ہے پرستشِ حُسن
ہم نہیں جانتے عذاب و ثواب"

وہ اشارہ یہ ہے : ؎

کچھ ہم کو بھی عطا ہو کہ اے حضرتِ کرشن
اقلیمِ عشق آپ کے زیرِ قدم ہے خاص
حسرت کی بھی ہو قبول متھرا میں حاضری
سنتے ہیں عاشقوں پہ تمہارا کرم ہے خاص

دیوانِ ہشتم میں بھجن ہے ؎

شیام نگر کی بھیک بھلی ہے
کیا کرہے لے راج پاٹ
پھولن سیج لسارکے حسرت
کری اوڑھ بچھاوت ٹاٹ

دیوانِ دہم ؎ موسے چھیڑ کرت نند لال
لیے ٹھاڑے ابیر گلال
تن من دھن سب وار کے حسرت
متھرا نگر چل دھونی رمائی

مسلکِ عشق کا یہ سالک وہابیت کے تعشف کے خلاف فیضِ قبور کا قائل و معترف رہا۔ زہد پر طنز کے یہ چھینٹے بھی دیکھتے چلیے ؎

یہ ظاہر کا سب زہد و تقویٰ ہے حسرت
حقیقت میں یاروں کا ہے یار واعظ

---

حشر میں بھی نہ ہو گا واعظ کو
گنہِ آرزوئے حور معاف

---

شوقِ مے دل میں لب پہ ہجوِ شراب
ہم پہ روشن ہیں سب جناب کے رنگ

اور یہ ضرب المثل بن جانے والا شعر ؎

رعنائیِ خیال کو ٹھہرا دیا گناہ
زاہد بھی کس قدر ہے مذاقِ سخن سے دُور

اُن کی فاسقانہ شاعری اسی رعنائیِ خیال کی ایک جھلک ہے اور اُن کی حُسن پرستی گناہِ صالح کی مثال ؎

ولایت کا دعویٰ نہیں مجھ کو لیکن
ہے اتنا کہ ہوں اک گنہگارِ صالح

گناہِ صالح میں دیدِ خوباں، حُسن پرستی، نظر بازی، چھیڑ چھاڑ، حتیٰ کہ بوسہ بھی جائز ہے۔ اُن کے عشق کا مرکز ایک اور محض ایک ہے —— وہی جس کے لیے انہوں نے یہ والہانہ غزل لکھی تھی ؎

یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے
دل ابھی بھُولا نہیں آغازِ الفت کے مزے
میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے
حُسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

اور اسی کے لیے انہوں نے بہترین عشقیہ شاعری بھی کی اور واسوخت نما غزلیں بھی کہیں اور جس کی موت کے بعد اس عشق و رفاقتِ گم گشتہ کا نوحہ بھی غزل میں کہتے رہے ؎

وجہ کیا خواب میں نہ آنے کی
شرم انہیں ہو نہ روٹھ جانے کی
مٹ گئیں آپ بھی مٹا کے مجھے
سختیاں خود بخود زمانے کی
اب نہ دل ہے نہ وہ ذخیرۂ شوق
توڑ دوں کنجیاں خزانے کی

یعنی کہنے کی ہے غرض نہ ہوس
اب کسی کو غزل سُنانے کی

---

غیر دیکھی ہے غمِ ہجر سے حالت میری
خواب میں آئے مٹانے کو شکایت میری

کیسے بھولوں میں خطاکار یہ کہنا اُن کا
یاد آئے گی مرے بعد نصیحت میری

دے کے جاں اپنی کیا تاب عصیاں مجھ کو
ربح کیا کیا یہ سہے اُس نے بدولت میری

فکر اور میرے خور و نوش کی اب تک حسرت
اُن سے چھوٹی ہے نہ چھوٹے گی رفاقت میری

یہ غزلیں ۱۱ مئی، ۱۹۳۷ء کو سفرِ حجاز کے دوران میں لکھیں۔ اُس وقت بیگم حسرت وفات پا چکی تھیں ؎

عاشقی کا حوصلہ بے کار ہے تیرے بغیر
آرزو کی زندگی دشوار ہے تیرے بغیر
دردِ دل جو تھا کبھی وجہِ مباہات و سرت
بہرِ حسرت موجبِ صد عار ہے تیرے بغیر

دو سال بعد ۱۹۳۹ء تک یہ یاد دل سے محو نہیں ہوئی ؎

یادِ یارِ بے نشاں آنے لگی
اور یہ پیرس میں کہاں آنے لگی

خلوتِ جنت سے با صد لطف و ناز
کامران و شادماں آنے لگی

اس مرکزِ عشق پہ قائم و دائم رہنے کے باوجود نگہِ عشق پیشہ دادِ حُسن دینے سے باز نہیں رہتی۔ پیرس میں یادِ یارِ بے نشاں، کا سرشار، حج کا مسافر جہاز میں خوبانِ لندن کے حُسنِ کم لو، کے اعتراف کے باوجود کہتا ہے ؎

وہ گرم ہو یا سرد ہو، خوشبو ہو کہ خوش رو
منظورِ نظر ہے دلِ بے تاب و تواں کا
یا کہیے کہ رہتا ہے بہر حال تصوّر
حسرت ہمیں لندن کی اسی آفتِ جاں کا

قبرص کی حسینہ کو داد دیتا ہے ؎

رعنائی میں حصّہ ہے جو قبرص کی پری کا
نظارہ ہے مسحور اسی جلوہ گری کا
رفتارِ قیامت یونہی کیا کم تھی، پھر اس پر
اک طرّہ ہے فتنہ تری نازک کمری کا

یونان کی کسی حسینہ سے تعلقِ خاطر موہان کی یونان سے نسبتِ دیرینہ یاد دلاتا ہے۔ روم کے قریب جہاز میں ایک حسینہ کی زلفِ معنبر کو چوم کر غزل کہی ؎

ہونٹوں کے قریب آئی جو وہ زلفِ معنبر
جھٹ چوم لیا ہم نے طبیعت ہی سے مانی
ہوتی جو خبر اس کو تو کیا کیا نہ بگڑتی
زد پائے غنیمت ہے کہ یہ بات نہ جانی
اٹلی میں تو کیا، میں تو یہ کہتا ہوں کہ حسرت
دنیا میں نہ ہوگا کوئی اس شکل کا ثانی

۱۹۴۱ء میں جہازِ رحمانی کے حسینوں کا گرویدہ ہو کر کہا ؎

دل ہے نازاں کہ تری صورتِ زیبا دیکھی
آنکھ حیران کہ اک حُسن کی دُنیا دیکھی
پہلے آنکھیں ہوئیں گرویدہ پھر آنکھوں کی طرح
چاہنے دل بھی لگا آپ کو دیکھا دیکھی

حسرت کی نگہِ حُسن پرست کی ہوسناکی بھی معصوم ہے۔ اللہ جمیل و یحب الجمال پر ایمان لانے والے خالص مذہبی شاعر انہیں کہہ گئے ہیں ؎

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو

یہی وہ رعنائی نگاہ ہے، جسے زہّاد گناہ ٹھہراتے ہیں اور حسرت گناہِ صالح۔ حسرت کی اس قبیل کی غزلیں پڑھ کر بعض ناقدین، اُن کے عشق کو بھی کھلنڈرا پن اور الشارہ و حرکات کی معاملہ بندی کے درجے کی شاعری کہتے ہیں۔ لیکن حسرت کی بہترین غزلیں وہ ہیں جن میں جسم کا بھرپور نغمہ بھی ہے اور عشق کا گہرا روحانی احساس بن گیا ہے۔ ایسی غزلوں کی اُن کے کلیات میں کمی نہیں —— اُنہوں نے بھرپور زندگی گزاری اور بھرپور شاعری کی۔ نئی غزل کے نبّامن سلیم احمد کی زبان میں یہ "پورے آدمی" کی غزل ہے صرف دماغ اور دل کی نہیں —— اگر حسرت بیسویں صدی کی غزل کو اس بے باکی، ارضیت اور جسمانیت سے آشنا نہ کرتے تو اختر شیرانی کے قبیلے کے رومانی شعراء کی سلطی و ریحانہ ہی موضوعِ سخن رہتیں۔ اُنہوں نے جسم کی شاعری کے لیے راہ ہموار کی، جس پر ترقی پسند اور جدید نظم نگار بھی چلے اور جدید غزل گو بھی۔ حیدرآباد کی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں جب ترقی پسند خود اپنے بعض ادیبوں کی عریانی و جنسیت کو فحاشی کا نام دے کر اظہارِ ندامت کر رہے تھے، حسرت نے اُن ملعونوں کی حمایت از روئے شرع ادب کھُل کر کی۔ یہ بوڑھا مولانا اُس وقت بھی جوانوں سے زیادہ جوان اور اپنے وقت سے آگے تھا۔

حسرت سیاست، مذہب اور شاعری تینوں میدانوں میں سب سے الگ ہو کر چلے اور ان تینوں کو اپنے مسلکِ عشق کی طرفگی سے یوں آمیز کیا کہ ان کی غزل ترقی پسند سیاسی شاعری اور جدید عشقیہ غزل کا نقطۂ آغاز بن گئی۔ ●●

نامی انصاری

# حسرت کی شاعرانہ انفرادیت

رئیس المتغزلین مولانا حسرت موہانی اپنی افتادِ طبع اور اجتہاد فکر و نظر کے اعتبار سے یگانۂ روزگار شخص تھے۔ اردو شاعری میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے غزل کو ایک نئی توانائی اور قوتِ فکر و نظر بخشی اور اردو غزل جو غالب کے بعد رفتہ رفتہ اپنے محور و مرکز سے ہٹ کر بے جا تکلفات اور زبان و بیان کی پینترے بازی کے سبب سر کے بل کھڑی ہو گئی تھی، حسرت نے اسے پھر اس کے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ لکھنؤ اسکول کی خارجیت نے غالب کے زمانے ہی میں غزل کی فکری بنیادیں ہلا دی تھیں۔ پھر داغ اور ریاض کے لذت پرستانہ رجحانات نے شاعری کے عام مذاق کو اس حد تک متاثر کیا کہ امیر مینائی جیسا متشرع عالم اور صوفی بھی خود اپنی شخصیت کی نفی کرتے ہوئے رندی و ہوسناکی کا ترجمان بن گیا۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی اردو غزل انحطاط، ابتذال اور رسمیات کے شکنجے میں اس طرح گرفتار تھی کہ خود اپنا اعتبار گنوا بیٹھی تھی۔ حسرت موہانی نے جب شاعری شروع کی تو ان کے سامنے حالی اور اقبال کے ترقی پسندانہ رجحانات کے علاوہ ہمعصر شاعری کے یہی انحطاطی نمونے تھے، مگر انہوں نے اپنی اجتہادی فکر و نظر کو بروئے کار لا کر غزل گوئی کے اس مریضانہ رویے کے برخلاف داخلی محسوسات کے فطری اظہار کے رویے کو اپنایا اور بہت جلد ان کی آواز غزل کے منظر نامے پر ایک نیا ساز و انداز لے کر ابھری اور دیکھتے ہی دیکھتے محبوبِ خلائق بن گئی۔ غزل کے فکری رویوں کو بدلنے میں حسرت کے دوسرے معاصرین اقبال، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، جگر مرادآبادی، یاس یگانہ اور صفی لکھنوی وغیرہ کی خدمات بھی جلیل القدر ہیں۔ مگر اولیت کا سہرا حسرت موہانی کے سر ہے اور اردو غزل کے احیاء کا کارنامہ بھی حسرت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

حسرت کے فکر و فن اور لب و لہجے پر غور کیجیے تو ایک نئی تازگی اور فکری توانائی کا احساس ہوتا ہے۔ چونکہ ان کا تصورِ حُسن و عشق مقتضائے فطرت کے عین مطابق ہے، اس لیے ان کے اندازِ بیان میں بھی ایسی معصومانہ بے ساختگی پیدا ہو گئی ہے، جسے تصنع اور بناوٹ سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے، مگر اس اجتہاد کے ساتھ ساتھ ان گنت تقلیدی لہریں بھی ان کی شاعری میں اس طرح ہلکورے لے رہی ہیں کہ حسرت کے لب و لہجے کی انفرادیت کے تعین میں کسی قدر دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس دشواری یا غلط فہمی کے پیدا کرنے میں خود حسرت کے اشعار کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ خاص طور پر اپنے مقطعوں میں جو انہوں نے اپنے طرزِ فکر پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس سے اکثر غلط فہمیوں کو راہ ملی ہے اور بیشتر نقادوں نے یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ حسرت ہر استاد کے رنگ میں شعر کہتے رہے مگر ان کا اپنا رنگ کچھ نہیں ہے۔ پرنسپل عبدالشکور اپنی مشہور تصنیف "حسرت موہانی" میں رقم طراز ہیں:

> "الغرض حسرت کے کلام میں اردو کے چند در چند باکمال اساتذہ کے رنگ کی جھلک کثرت سے موجود ہے۔ ان کے اشعار ہفت رنگ قوسِ قزح ہیں۔ ایک آئینہ خانہ ہیں۔ اس میں قسم قسم کے رنگ موجود ہیں اور طرح طرح کی صورتیں جلوہ گر پائی جاتی ہیں۔ ان کا کلام پھولوں کا ایک گلدستہ ہے، جس میں رنگ برنگ کے پھول موجود ہوتے ہیں اور اپنے ارد گرد مشام نوازی کرتے ہیں۔"

(حسرت موہانی تیسرا ایڈیشن مع اضافۂ جدیدہ ۱۹۵۴ء ص ۱۰۵)

○ ۷۱/۹۷، بریڈ، کان پور- ۲۰۸۰۰۱

محولہ بالا اقتباس میں عبدالشکور نے اگرچہ قوسِ قزح گلدستہ اور آئینہ خانہ کے تلازموں کی مدد سے اپنی بات کافی گھما پھرا کر کہی ہے، مگر مطلب یہی نکلتا ہے کہ حسرت کے کلام میں ہر استاد کا رنگ ملتا ہے، مگر خود ان کا اپنا رنگ کہیں نہیں ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اور زیادہ واضح الفاظ میں حسرت کے رنگِ سخن پر روشنی ڈالی ہے۔

"حسرت، میر کی سادگی اور سوز و گداز کے دلدادہ ہیں ...۔ مومن کی رنگینی، رندی اور سرمستی انہیں پسند ہے ...۔ تسلیم و نسیم کی صاف گوئی پر وہ فدا ہیں اور یہ خصوصیات ان کی شاعری نے ان ہی استادوں سے حاصل کی ہیں، لیکن حسرت ان تمام خصوصیات کو جمع کر کے چند قدم آگے بھی بڑھتے ہیں۔ جرأت کی معاملہ بندی انشا کی شوخی، غالب کی تعیش پسندی اور داغ کی ہوسناکی کے اثرات بھی ان کے تغزل میں کسی نہ کسی حد تک ضرور آئے ہیں۔"

ان آرا کا سرچشمہ (بالعقول مشتاق احمد یوسفی شہر چشمہ) کلامِ حسرت کا گہرا مطالعہ نہیں ہے۔ بلکہ خود حسرت موہانی کی غزلوں کے وہ مقطعے ہیں، جو انہوں نے اپنے دیوانِ اوّل و دوم میں درج کئے ہیں اور جن میں سے چند یہ ہیں۔

حسرت یہ وہ غزل ہے جسے سُن کے سب کہیں
مومن سے اپنے رنگ کو تُو نے مِلا دیا

---

شعر سچ تیرے، ہوئی مصحفی و میر کے بعد
تازہ حسرت، اثر و حسنِ بیاں کی رونق

---

شیرینیٔ نسیم ہے سوز و گدازِ میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لُطفِ سخن عام

---

نسیمِ دہلوی کو وجد ہے فردوس میں حسرت
جزاک اللہ! تیری شاعری ہے یا فسوں کاری

---

قائم ہے ترے دم سے طرزِ سخنِ قائم
پھر ورنہ کہاں حسرت، یہ رنگِ غزل خوانی

---

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبعِ حسرت نے اُٹھایا ہے ہر اُستاد سے فیض

قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ میر و مصحفی، غالب و مومن، تسلیم و نسیم اور قائم سے حسرت نے اپنی شیفتگی و دل بستگی کا اظہار صرف اپنے دیوانِ اوّل و دوم کے مقطعوں میں کیا ہے۔ جن میں ابتدا سے ۱۹۱۶ء تک کا کلام شامل ہے۔ دیوانِ سوم میں کسی شاعر کے تتبع کا دعویٰ نہیں ہے بلکہ خود اپنی ناقدردانی کا شکوہ ہے ؎

حسرت شعر گو ترا کوئی نہ قدرداں ملا
اب یہ بتا کہ میں ترے عرضِ ہنر کو کیا کروں

دیوانِ چہارم میں حسرت خود اپنی یکتائی کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں جب وہ کہتے ہیں ؎

تُو نے حسرت یہ نکالا ہے عجب رنگِ غزل
اب بھی کیا ہم تری یکتائی کا دعویٰ نہ کریں

دیوانِ پنجم میں یکتائی کی یہ لَے اور بھی تیز ہو جاتی ہے اور وہ بے ساختہ پکار اُٹھتے ہیں ؎

اثر جو نغمۂ حسرت میں ہے وہ اور کہاں
کلام دیکھ لیا سُن لیا ہزاروں کا

دراصل یہی وہ منزل ہے جہاں حسرت کا جذبۂ خود شناسی بیدار ہوتا ہے اور وہ خود اپنے رنگِ سخن کا اثبات کرنے لگتے ہیں۔ دیوانِ ششم میں صرف دو مقطعے ایسے ہیں جن میں فارسی کے اساتذہ سعدی و جامی اور نظیری و فغانی سے اظہارِ عقیدت کے ساتھ ساتھ خود شناسی بلکہ شاعرانہ تعلّی بھی نمایاں ہے ؎

حسرت اردو میں ہے غزل تیری
پرتوِ نقشِ سعدی و جامی

اردو میں کہاں ہے اور حسرت یہ طرزِ نظیری و فغانی

حسرت کے باقی دواوین اس قسم کے مقطعوں سے بالکل خالی ہیں۔ ان امور پر غور کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حسرت نے اپنے ابتدائی دَور میں جب کہ وہ قدیم شعرا کے دواوین کا غائر مطالعہ اور ان کے اشعار کا انتخاب کر رہے تھے تو وہ جن سے متاثر ہوتے تھے اس کا اظہار اپنے مقطعوں میں کر دیتے تھے، مگر جب عمر کے ساتھ ساتھ ذہنی پختگی اور بالغ نظری پیدا ہوئی تو خود اعتمادی بھی آئی اور پھر جب اپنے کلام پر انہوں نے مجموعی حیثیت سے نظر ڈالی تو ان کو اپنے طرز کی انفرادیت کا شدید احساس ہوا۔ جس کا بھرپور اظہار اس شعر میں ملتا ہے ؎

اثر جو نغمۂ حسرت میں ہے وہ اور کہاں
کلام دیکھ لیا سُن لیا ہزاروں کا

اس شعر میں "دیکھ لیا" اور "سُن لیا" کے کلیدی الفاظ اصل معنویت کے حامل ہیں۔ کیوں کہ یہ امر واقعہ ہے کہ حسرت نے سینکڑوں قدیم شعرا کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا اور مشاعروں میں سینکڑوں ہم عصر شاعروں سے ان کا کلام سنا تھا اور اس

کے بعد ان کو نئے حسرت کی اثر پذیری کا احساس ہوا تھا، اس لیے یہ مفروضہ کہ حسرت کا سب کلام مختلف اساتذہ کے رنگ میں ہے اور خود ان کا اپنا رنگ کچھ نہیں ہے، ایک غیر ذمہ دارانہ اور بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ علامہ نیاز فتحپوری نے غلط نہیں لکھا ہے کہ:

"اپنے عہد کے شعراء میں انہوں نے استاد، صفی، عزیز، محشر، جگر، اصغر، فانی، نظم طباطبائی سبھی کا ذکر نہایت اچھے الفاظ میں کیا ہے، لیکن خود ان کا (حسرت کا) رنگ شاعری ان سب سے الگ تھا۔ میں اس جگہ ان تمام شعراء کا مقابلہ یا موازنہ کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں کیوں کہ حسرت کی شاعرانہ انفرادیت کا تعلق جس چیز سے ہے وہ خود اس فرق و امتیاز کو متعین کر دیتی ہے جو حسرت اور ان تمام شاعروں کے کلام میں پایا جاتا ہے۔"

(حسرت کی خصوصیات شاعری۔ نیاز فتحپوری، مطبوعہ آج کل۔ اگست ستمبر ۱۹۸۱ء)

مگر موصوف نے اپنے فاضلانہ مقالے میں اس چیز کی نشاندہی نہیں کی جو حسرت اور ان کے دیگر معاصرین کے درمیان مابہ الامتیاز ہے۔

حسرت کی شاعری کے اکثر ناقدین ان کی شاعری کا جائزہ لیتے وقت ان کی آمد و آورد کی تقسیم میں اُلجھ جاتے ہیں۔ اور کلام حسرت کو خانہ خانہ تقسیم کر کے دیکھنے لگتے ہیں۔ آمد و آورد کی اس تقسیم کا تعلق قواعد اور فن سے تو ہو سکتا ہے۔ مگر حسرت کے سارے کلام کو اس پس منظر میں دیکھنے سے بہت سی غلط فہمیاں راہ پا جاتی ہیں۔ شاعری جذبے کی زبان ہے اور سلیقۂ اظہار کی مرہونِ منت۔ مگر اس میں فکری عناصر داخل کرنے کی شعوری کوشش کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے یہ مفروضہ کہ صرف آمد ہی کا شعر اچھا ہو سکتا ہے اور غور و فکر کے بعد موزوں کیا ہوا شعر اس درجہ کو نہیں پہنچ سکتا، غیر منطقی اور خلافِ واقع مفروضہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عاشقانہ، عارفانہ، ماہرانہ اور ناصحانہ وغیرہ کی تقسیم کلام حسرت کے افہام و تفہیم میں کچھ مدد نہیں کرتی بلکہ غیر ضروری مباحث میں اُلجھا دیتی ہے۔ اصل چیز تو ان عناصر کی جستجو ہے جن سے کلامِ حسرت کی شاعرانہ انفرادیت متعین ہوتی ہے۔

میرے خیال میں اس کے دو بنیادی ستون ہیں۔ ایک تو حسرت کا جذبۂ حُسن پرستی اور دوسرے لب و لہجہ کی بے ساختگی اور معصومیت۔ حسرت اس عشق کی گہرائی اور سوزِ غم کی لذت سے کوسوں دُور ہیں۔

سوز و گدازِ میر کے وہ کتنے ہی دلدادہ ہوں، مگر خود ان کی شاعری میں سوز و گداز نہ ہونے کے برابر ہے۔ فانی کی طرح یاس و حرماں کو انہوں نے کبھی بڑھ کر گلے نہیں لگایا۔ شاعری کی دنیا کا یہ عجیب واقعہ ہے کہ حسرت کی زندگی از اوّل تا آخر آلام و مصائب کا شکار رہی، مگر اپنی شاعری کو وہ غم کوشی کے اثرات سے صاف بچا لے گئے۔ اس کے برخلاف حسرت کے ہم عصر فانی کی زندگی کا بڑا حصہ لطف و انبساط اور خوش کامیوں میں بسر ہوا مگر اپنی شاعری میں انہوں نے غم پرستی کو اس طرح اوڑھنا بچھونا بنا لیا کہ یہی ان کا مخصوص یا خاص رنگِ شاعری بن گیا۔ حسرت کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے خانۂ دل کے طاقوں کو ویران نہیں ہونے دیا۔ ان میں ہمیشہ حسن و نظر کی شمعیں روشن رکھیں۔ ان کی حُسن پرستی کی فضا بہت محدود مگر بے حد معتبر ہے۔ اس میں پاکیزگی، معصومیت اور جسمانی تلذذ کا ایک حسین امتزاج ہے جو صرف حسرت ہی سے مخصوص ہے۔ جسمانیت اور لذتیت داغ کی شاعری میں آ کر حرص و ہوس کا وسیلۂ اظہار بن گئی ہے، مگر حسرت کی شاعری میں یہی جسمانیت ایک بے نام روحانیت سے سرشار ہو کر چیزے دیگر بن جاتی ہے۔ کہیں کہیں انہوں نے "شبر" اور "ثریا" کے نام بھی لیے ہیں مگر اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اُن کے حُسن پرستانہ جذبات ایک مکمل اکائی کی صُورت رکھتے ہیں۔ اور یہ جذبات وہی ہیں جن سے ان کی اصل شاعری کا خمیر اُٹھا ہے اور جن کی لے ان کی شاعری کے دَورِ شباب میں زیادہ تیز اور عمرِ آخر میں خاصی مدھم ہو گئی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، حسرت کے کلام پر تقلیدی اثرات نمایاں ہیں، مگر جہاں خود حسرت نے اپنے آپ کو دریافت کر لیا ہے وہاں ان کی انفرادیت بڑی بھرپور اور مستحکم ہو کر اُبھری ہے۔ خود کو دریافت کرنے کا یہ عمل اگرچہ روایتی تصورِ حُسن و عشق کی راہ سے آیا ہے، مگر جذبہ کی گرمی اور واقعیت کی روشنی نے مل کر اس عمل کو بہت پُرخیال اور معنی خیز بنا دیا ہے۔

حسرت کے موضوعاتِ شعری میں تنوع بہت کم ہے وہ باہر کی دنیا پر بھی بہت کم نگاہ ڈالتے ہیں بلکہ اپنے دل کے تہاں خانے میں ہی آسودگی کی تلاش کرتے ہیں۔ اس کی وجہ بظاہر یہی ہے کہ ان کے گرد و پیش کی فضا بڑی گھمبیر اور جفا پرور تھی۔ قید و بند کی صعوبتیں، ملک کی اندرونی چپقلشیں، سیاسی رفیقوں کی ناموافقت اور گھمبیر تنہائی کا احساس نیز قدم قدم پر معاشی دشواریاں ہر وقت ان کا تعاقب کرتی تھیں، اس لیے آسودگی (Contentment) کی تلاش ان کو اپنے وجود کے تہاں خانے میں کرنی پڑی۔ انہوں نے اپنی شاعری میں عمداً خارجی حالات سے چشم پوشی کی اور اپنے لہجے کی شیرینی اور حلاوت کو حالات کی تلخی پر قربان نہیں کیا۔ کلیاتِ حسرت میں ایسے اشعار کی تعداد قابلِ لحاظ ہے جن میں حسرت کے اسلوب کی نیرنگی اور طرفہ کاری اور ان کے لب و لہجہ کی انفرادیت نہ صرف نمایاں ہے بلکہ اپنے تشخص پر بھی اصرار کرتی ہے کہ یہ رنگِ سخن نہ کلاسیکی شعراء کے یہاں سے آیا ہے نہ ہم عصر شعراء کے یہاں سے بلکہ اس میں حسرت کے اپنے شخصی تجربوں کا عکس ہے، اظہارِ خیال کا اچھوتا پن ہے، سادگی و پرکاری کا معجزہ

ہے اور جذبات کے ترفع کا سحر کارانہ انداز ہے ۔ یہ رنگِ تغزل حسرت ہی سے مخصوص ہے اور ان کے رچے ہوئے احساسِ جمال اور عشقیہ جذبات کا آئینہ دار ہے :-

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حُسن کی بیداری کا

---

زیبائشِ حُسنِ دلبراں ہے یہ کم نگہی ، یہ کج کلاہی
پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

---

سیہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم
ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

---

خرد کا نام جنوں پڑ گیا ، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

---

تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

---

کچھ حد سے بڑھ چلی ہیں تری کج ادائیاں
اس درجہ اعتبارِ تمنا نہ چاہیے

---

رائیگاں حسرت نہ جائے گا مرا مشتِ غبار
کچھ زمیں لے جائے گی کچھ آسماں لے جائے گا

---

کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

---

شادماں تھا جو ترے رنجِ طرب کار سے دل
غمِ دنیا سے گراں بار نہ ہونے پایا

---

یہی عالم رہا گر اس کے حسنِ سحر پرور کا
تو باقی رہ چکی دنیا میں راہ و رسمِ ہشیاری

حسرت کا عشق ، حسرت کی حسن پرستی ، حسرت کے جذباتی تجربے بہت گہرے اور بہت پُر فن نہ سہی ، مگر ان میں ایک معصومانہ سادگی اور اظہار کی ایسی بے تکلفی ضرور ہے جو ان کے اشعار کو ایک نئی جہت اور ان کے اسلوب کو ایک مستحکم انفرادیت عطا کرتی ہے ۔ یہ ان کے پیشروؤں اور ہمعصروں دونوں سے الگ ہے اور یہی حسرت کا طرۂ امتیاز ہے ۔

بقیہ : حسرت ایک باغی

کسی ریاست کے والی کی حمایت کرتے نہیں دیکھا ۔ یہ بھی آپ ہی کی خصوصیت ہے ۔ اس پر مولانا نے کہا " وہ جو آپ کہا کرتے ہیں کہ میں مسلمان اور کانگریسی اور لیگی اور صوفی اور عاشق مزاج اور کمیونسٹ ہوں ، اس میں ایک چیز کا اضافہ اور کر لیجئے ۔ ہر مسئلہ اپنی جگہ ہے ۔ کمیونزم اپنی جگہ ہے اور مسلمانوں کی حمایت اپنی جگہ ہے ۔ اس صحبت میں ایک بڑے مزے کی بات مولانا نے فرمائی کہ اگر پاکستان ، افغانستان اور ایران بھی سوویت یونین میں شامل ہو جائیں اور تینوں ملکوں میں " جمہوریہ شورائیہ اشتراکیہ " کا نظام قائم ہو جائے تو روس میں ہماری اکثریت ہو جائے " میں نے کہا کہ تمہاری سے کیا مراد ہے " کہنے لگے " مسلمانوں کی " میں نے قہقہہ لگایا ۔ کہنے لگے آپ ہنستے کیوں ہیں ۔ میں نے کہا اکثریت تو جمہوریت میں ہوتی ہے ۔ ڈکٹیٹرشپ میں کیسی اکثریت ؟

ایک اور رنگ دیکھئے کہ عرصہ دراز سے ہر سال جنم اشٹمی کے موقعہ پر متھرا التزام کے ساتھ جاتے تھے ۔ متھرا اور برندابن کی زیارت کو بھی اپنی روحانی تقویت کے لیے ضروری سمجھتے تھے ۔

حسرت کے پورے دیوان میں موت کا ذکر شاذ ہی ہے ۔ ان کی شاعری کو ملک کی تاریخی قوتوں اور تحریکوں سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ حسرت کے دیوانِ اول کا ایک شعر ہے ۔

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھکو آرزو
ہمتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر

حسرت کی پوری زندگی تضادات سے بھری ہوئی ہے ۔ عبدالمجید سالک نے اسی لیے کہا ہے کہ مولانا عقائد سیاسی و مذہبی کے اعتبار سے عجیب معجون مرکب تھے ۔ مولانا شبلی نے کہا " تم آدمی ہو یا جن " پہلے شاعر تھے ، پھر پالیٹیشن بنے اور اب بنیے ہو گئے " کچھ بھی ہے ہر شخص ان کے خلوص ، سچائی ، نیک نیتی ، صاف گوئی ، عزم ، لگن ، کسر نفسی اور ایثار ، بے تابی ، دلیری ، اور جانبازی ، اولوالعزمی اور وطن پرستی کا دل سے قدرداں ہے ۔ تصنع ، بناوٹ ، ریاکاری انہیں چھو تک نہیں گئی تھی ۔ وہ ایک ٹھوس عملی انسان تھے ۔ ان کی ساری زندگی سراپا جد و جہد تھی ۔ ان کو نہانے ، کھانے ، کپڑے بدلنے کی فرصت ہی نہیں تھی ۔ وہ باغی تھے ۔ وہ مجاہد تھے ۔ عسرت اور غربت میں پوری زندگی گذار دی ۔ کسی کے طعن و طنز کی پروا نہیں کی ۔ مسلک سے قدم پیچھے نہیں ہٹایا ۔ کوئی طاقت ان کو اپنے ارادے سے متزلزل نہیں کر سکی ۔ کوئی شے ان کے جوش ۔ ولولے میں کمی نہیں لا سکی وہ نہ رکنا جانتے تھے نہ جھکنا ۔ نہ ٹلنا اور نہ حسرت ۔ ایک باغی انہیں کون کہتا ۔

*

عبدالمغنی

# حسرت کا تصورِ عشق

حسرت کے آخری دور کی ایک غزل مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۵۰ء کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

شوق کو دادِ حیا ملتی نہیں
وہ نگاہِ آشنا ملتی نہیں

بوئے کوئے یار سے بادِ صبا زعم
نکہتِ بادِ صبا ملتی نہیں

دیدنی ہے یہ مروت حسن کی
جرمِ الفت کی سزا ملتی نہیں

ان سے ملنے کی ہوس میں شوق کو
ڈھونڈتا ہے اور دعا ملتی نہیں

عاشقی سے خوئے نازِ حسنِ دوست
بر سبیل اعتنا ملتی نہیں

یہ بھی حسرت کیا ستم ہے عشق سے
حسن کو دادِ جفا ملتی نہیں

اب اس کے پہلو بہ پہلو بالکل ابتدائی دور کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

پڑھ کے تیرا خط مرے دل کی عجب حالت ہوئی
اضطرابِ شوق نے اک حشر برپا کر دیا

اب نہیں دل کو کسی صورت کسی پہلو قرار
اس نگاہِ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا

سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہِ سکوں
دردِ دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

یہ دونوں حسرت کی نہ تو بہترین غزلیں ہیں، نہ مشہور ترین اور ان کے اشعار بھی بہت منتخب قسم کے نہیں ہیں۔ لیکن دونوں غزلوں کے اشعار میں ایک خاص رنگ، ایک خاص ادا، ایک مخصوص انداز ہے، جو نصف صدی کے عرصے میں یکساں رہا ہے۔ یہی حسرت کا اسلوبِ سخن اور طرزِ تغزل ہے، جس کی پختگی اور رچاؤ داری شروع سے آخر تک قائم رہی، اس لئے کہ شاعر کے فن کا سرچشمہ اور فکر کا منبع ہمیشہ، ہر عمر اور ہر حالت میں ایک ہی رہا، خواہ جوانی کا عالم ہو یا پیری کا، چکی کی مشقت ہو یا مشقِ سخن، قید خانے کی چار دیواری ہو یا سیاست کا کھلا میدان، احباب کی محفل ہو یا اولیا کا مزار، جلوت ہو یا خلوت، مختلف کوائف میں حسرت کے تغزل کی شادابی، رعنائی اور رنگینی کا محرک بس ایک جذبۂ محبت ہے جو دوسروں کے لیے بہت آفاقی ہوتے ہوئے بھی حسرت کے لیے بالکل ذاتی ہے۔ ایک خالص، صادق اور پاکیزہ عشق شاعر کا وہ بسیط تجربہ ہے جس کی تہوں میں الفت کے وہ سارے عناصر مضمر ہیں جو انسان کے انفرادی و اجتماعی اُنس کے مظاہر ہیں۔ اسی لیے میں نیاز فتح پوری اور آلِ احمد سرور کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا کہ حسرت کی شاعری دراصل جو کچھ ہے جوانی کا خمار ہے اور اس کے بعد صرف طبیعت کا غبار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان نقادوں نے حسرت کے عشق کا ایک بہت ہی محدود تصور اپنے سامنے رکھا ہے اور وہ ایک عزیز و عفیف خاتون کے لیے شاعر کی محبت جو ازدواج کا استقلال و ثبات بھی رکھتی تھی۔ بلاشبہ اس محبت نے حسرت کو نشاطِ عشق کی دولت عطا کی اور وہ اس کی مے مرد افگن سے سرشار ہو کر نغمہ سنج رہے، مگر یہ محض عارضی و سطحی قسم کی جسمانی محبت نہ تھی درحقیقت یہ دلِ پرخوں کی اک گلابی تھی، جس کے نشے سے حسرت عمر بھر شرابی سے رہے۔ صرف جوانی میں نہیں، بڑھاپے میں بھی آتشِ عشق پر ان کا کوئی زور نہ چلتا تھا۔ جب وہ ایک بار دل کو لگ گئی تو بجھائے نہ بنی۔ شاعر کا پورا وجود اس آگ میں تپ کر شعلہ بن چکا تھا جو آخری سانس تک فروزاں رہا۔ حسرت کی عمر کا کوئی حصہ فانی کی طرح نزع کے عالم میں تو نہیں گزرا لیکن محبت ان کی رگ رگ سے برسوں اور زندگی کے آخری برس تک بھی لہو کھینچتی رہی۔ یہ بڑی پکی، گہری اور پھیلی ہوئی محبت تھی اور اس کے جنوں کا سلسلہ ذات سے کائنات تک دراز تھا۔

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی
مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

محبوب کے ستم سے خوش ہو کر اربابِ امتیاز میں شامل ہونے کی یہ تمنا ایک آفاقی عشق کی غماز ہے اور یہی محبت میں کامیابی کے باوجود فضل الحسن کے تخلص حسرت کی توجیہہ بھی۔ اس عشق کی سادگی و پرکاری ان اشعار میں ملاحظہ کیجیے:

یاد کرو وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا     باوجودِ حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا
عشقِ روز افزوں پہ اپنے مجھکو حیرانی نہ تھی     جلوۂ رنگیں پہ تجھ کو نازِ یکتائی نہ تھا
دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی     جب کہ تیرا حسن سرگرمِ خود آرائی نہ تھا
کیا ہوئے وہ دن کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق     ربط تھا دونوں میں گو ربطِ شناسائی نہ تھا

یہ سب اشعار اتنے پر معنی ہیں کہ انھیں بہ یک وقت مجازی و حقیقی عشق دونوں کے معنوں میں لیا جا سکتا ہے۔ یہ حسرت کے عشق کی ارضیت کی نفی نہیں، صرف اس کے حجم اور وزن میں اضافہ ہے۔ وہ اضافہ جس کی طرف ہمارے ناقدوں نے کم ہی توجہ دی ہے۔ ان کا سارا زور حسرت کی غزلوں میں ان کی محبت کی ذاتیات اور جسمانیات کی تلاش پر صرف ہوتا ہے اور وہ بہت لطف لے لے کر شاعر کے خانگی معاملات کی سراغ رسانی کیا کرتے ہیں۔ لیکن یہ محض سوانحی تنقید ہے، جس سے فن کی حقیقی قدر شناسی نہیں ہوتی۔ حسرت نے ضرور ایک عورت سے عشق کیا تھا اور شادی بھی، لیکن وہ بڑا مثالی اور پاکیزہ عشق تھا، جس میں یک سوئی، وفاداری، قناعت اور طمانیت تھی۔ خواہ اس کے احساسات میں جتنی بھی توانائی اور جذبات میں جتنی بھی رنگینی رہی ہو۔ یہ عشق ایک خاص تہذیب کی قدروں پہ مبنی اور اس کے آداب و حدود کے اندر تھا، اسی لیے اس کا ایک حسین اور دل کش نمونہ تھا۔ یہ کسی بوالہوس کی حسن پرستی نہ تھی۔ اس میں آبروئے شیوۂ اہل نظر کی پوری نگہ داشت تھی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ حسرت کے دل میں ایک بڑے عشق کا گداز تھا۔ وہ دلِ دردمند رکھتے تھے اور نگاہِ بلند۔ ان کے عشق میں سفلی نہیں، علوی احساسات و جذبات کارفرما تھے۔ اسی لیے حسرت کے تغزل کی جان جو جذبۂ بے اختیار شوق تھا، وہ محبوبہ کے بعد اور خود ان کے قویٰ میں اضمحلال کے باوجود بھی برقرار رہا۔

حسرت کے تصورِ عشق کی یہی وسعت ہے جو ایک طرف بزرگانِ دین کے ساتھ ان کی عقیدت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، جس کے بے شمار شواہد ان کے کلیات میں موجود ہیں، اور دوسری طرف غریبوں اور کم زوروں کے ساتھ ان کی ہمدردی، رفاقت اور حمایت کی صورت میں نمودار ہوتی ہے، جس کے شواہد ان کے کلام سے بھی زیادہ ان کی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ جنگ آزادی میں حسرت کی والہانہ و مجاہدانہ شرکت ان کے عشق کا ایک تیور تھا۔ اسی لیے اس میں حرارت بلکہ تمازت تھی جس نے ان کی شخصیت کو شعلہ اور پارہ دونوں بنا دیا تھا اور اس کے پرزور اضطراب میں وہ جلتے مچلتے رہے۔ آخر سیاست میں ان کے آتش زیر پا ہونے کا راز کیا ہے؟ جہادِ زندگی میں مولانا فضل الحسن کی بے قراریوں کی کوئی توجیہہ اس کے سوا ممکن نہیں کہ یہ ایک عاشق کی سیاست تھی اور اس کی ساری گرمیاں ایک جذبۂ الفت کی مرہونِ منت تھیں۔ وہی عشق جو ذاتیات میں سراپا جمال تھا سیاسیات میں سراسر جلال بن کر نمودار ہوا، اس لیے کہ ذاتی محبوب شوخ ہونے کے باوجود دل نواز تھا۔ جب کہ سیاسی حریف نہ صرف کج ادا بلکہ جفا پیشہ تھا چنانچہ محبوب کے ساتھ تو شاعر نے ساز کر لیا مگر حریف کے ساتھ ستیز ہی کرتے رہے اور ان کی زندگی ساز و ستیز کا ایک کارزار بن گئی۔ یہ حسرت کے عشق کی شجاعت تھی کہ انھوں نے محبت اور سیاست کے دونوں معرکے سر کیے، اگرچہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دلِ ناصبور میں کوئی بے نام سی خلش پھر بھی باقی رہی جو شاد کامیوں کے درمیان حسرت کا باعث ہوئی۔

حسرت کے تصورِ حریت کے سلسلے میں ان کے تصورِ سویت کا بھی چرچا کیا جاتا ہے اور اس کا سرا کھینچ کر اشتراکیت کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ان چند اشعار کا حوالہ خاص کر دیا جاتا ہے جو جون ۱۹۴۵ء میں کہے گئے تھے اور کلیات میں 'مقامِ اشتراکیت' کے عنوان سے درج ہیں، مثال کے طور پر:

معیشت میں بہر سو رنگِ فطرت ہے جہاں میں ہوں
اخوت ہے جہاں میں ہوں، سویت ہے جہاں میں ہوں
اصولِ اشتراک آئینِ بیت المال سے مشتق
اساس کارِ جمع و خرچِ ملت ہے جہاں میں ہوں

ان اشعار میں یارانِ اشتراکیت سویت کو روسی شوویت کا ترجمہ یا ترجمانی بتاتے ہیں اور اصولِ اشتراک کو اشتراکیت کا مترادف قرار دیتے ہیں۔ لیکن یقین معلوم نہیں کہ سویت عربی میں مساوات کو کہتے ہیں۔ اور مساوات ایک اسلامی تصور ہے، اسی طرح غور کرنے کی بات ہے کہ شاعر نے اصولِ اشتراک کو آئین بیت المال سے مشتق قرار دیا ہے اور یہ اسلام کے معاشی تصور کا اصطلاحی نام ہے۔ اس طرح صاف معلوم ہوتا ہے کہ حسرت نے اگر کسی وجہ سے اشتراکیت کی تحسین کی بھی ہو تو وہ اشتراکیت یعنی مارکسی یا لیننی اور روسی یا چینی کمیونزم کے لیے ہرگز نہیں ہے، بلکہ معاشی انصاف اور معاشرتی عدل کے متعلق مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کے اسلامی تصور کا ایک عکس ہے۔ بلاشبہ اس تصور کے بارے میں حسرت کو خوش گمانی تھی کہ اس کا ایک عکس کمیونزم میں بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ ایک بالکل جزدی بات ہے اور اسی قسم کی خوش فہمی ہے جیسی کمیونزم کے آغاز میں ۱۹۱۷ء سے اقبال کو ہوئی تھی اور انھوں نے اشتراکیت کا خیر مقدم اس توقع پر کیا تھا کہ معاشیات کا وہ نکتہ جو قرآنِ حکیم کے حکم قلِ العفو میں پوشیدہ ہے شاید دورِ حاضر میں اشتراکی روس کے ہاتھوں آشکارا ہو۔ مگر اقبال کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی اور وہ کمیونزم سے اتنے بیزار ہوئے کہ اپنے آخری دور کی نظم 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' میں انھوں نے کمیونسٹوں کو پریشان روزگار و آشفتہ سر تک کہہ دیا۔

یہ صحیح ہے کہ حسرت نے اس طرح اشتراکیت پر تنقید نہیں کی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ وہ اقبال کی طرح فکری تجزیہ کرنے کے عادی نہ تھے، لہٰذا وہ جزوی طور پر اشتراکیت کے نعرۂ مساوات کو اسلام ہی کا ایک عکس تصور کرتے تھے لیکن احتشام حسین نے اتنی سی بات پر حسرت کی اشتراکیت پسندی کی پوری عمارت کھڑی کر دی اور ان کی شاعری میں سرخ رنگ کی آب و تاب دریافت

کہ کے اسے کمیونزم کی سرخی کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ یہ جذباتی قسم کی نظریاتی تنقید کی بدترین مثال ہے۔ نقاد نے اس میں اپنی چشم سرخ کا رنگ زبردستی شاعر کے کلام پر طاری کر دیا ہے، ورنہ اگر صرف سرخ رنگ کی توجیہہ وتشریح کرنی ہو تو کیوں نہ کہا جائے کہ یہ شہادتِ کربلا میں شہدا کے خون کی سرخی ہے جس کا مجاہدانہ رنگ حسرت کے کلام میں عکس ریز ہے؟ یہ تو معلوم ہی ہے کہ سیاست میں حسرت کا انداز ایک شہید کا تھا اور وہ اپنے شوق شہادت میں انتہا پسند بھی واقع ہوئے تھے اس کے علاوہ عشق میں کچھ ان کی شوخیِ طبیعت اور کچھ محبوب کی شوخیِ ادا بھی ایک شوخ رنگ کی متقاضی تھی۔ جو سرخ ہی ہو سکتا تھا لہٰذا اس رنگ میں حسرت کے رنگِ طبیعت کے علاوہ کسی رنگ بالخصوص نام نہاد سرخ سویرے کی تلاش کارِ عبث ہے۔ حسرت کے تصورِ عشق کے اجتماعی پہلو میں اشتراکیت حاشیے پر ہو تو ہو عبارت میں نہیں۔

اس بحث سے واضح ہو جاتا ہے کہ حسرت کا تصورِ عشق اتنا ایک رخا اور محدود نہیں جتنا بعض قابلِ ذکر نقادوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ فی الواقع یہ ایک وسیع اور ہمہ جہت عشق ہے جس کا اظہار حسرت کی شاعری کے ہر دور میں ہوا ہے۔ یہی راز ہے حسرت کی غزلیات کے اس درجہ کثیر المقاصد ہونے کا کہ اس کے اشعار میں محبت سے سیاست، گھر سے جلسہ گاہ اور محفلِ یاراں سے مزارِ اولیا تک کے سارے کوائف بلا تکلف درج ہو گئے ہیں۔ مختلف مواقع پر کہے ہوئے متنوع احساسات وخیالات پر مشتمل ان اشعار کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حسرت کا تغزل درحقیقت ان کی شخصیت کا برملا اور بے محابا اظہار ہے۔ اور یہ شخصیت اپنی بنیادی سادگی کے باوجود بڑی بھرپور اور پہلو دار تھی۔ بڑے مرحلوں سے گزری تھی اور بڑے معرکوں میں رہی تھی، خود پُر شور تھی اور ایک پُر شور ماحول کا نمایاں جز تھی۔ ایسی شخصیت کا اظہار جس شاعری میں ہوگا ظاہر ہے کہ اس میں وسعتیں اور جہتیں ہوں گی اور ایسی شاعری کا جو بھی جذبہ یا جوہر ہوگا اس میں ضرور تہیں ہوں گی۔ حسرت کی شاعری کا مانا ہوا جذبہ وجوہر ان کا عشق ہے، جس کی تحریک پر ہی وہ اتنی بے ساختگی کے ساتھ اپنی زندگی کے ہر معاملے کا بیان غزل کے اشعار میں کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں صرف محبوبۂ دل نواز کی شان میں کہے گئے اشعار کو مایۂ فن سمجھنا اور زندگی کے دوسرے موضوعات پر کہے گئے اشعار کو قافیہ پیمائی یا نظم محض قرار دے کر رد کر دینا ایک غیر تنقیدی عمل ہوگا جس سے شاعر کے فن کی قدر شناسی ممکن نہ ہوگی۔ اوّل تو دونوں قسم کے اشعار غزلوں میں اس طرح ملے جلے ہیں اور ان کے مضمرات اس درجہ باہم پیوستہ ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے بالکل جدا کر دینا آسان نہیں۔ دوسرے اس طرح حسرت کی شاعری کو خانوں میں تقسیم کرنے سے کسی بھی خانے اور مجموعی طور پر پورے فنِ شاعری کے ساتھ انصاف نہ ہوگا۔ عاشق حسرت کو مجاہد حسرت سے یا مجاہد حسرت کو عاشق حسرت سے الگ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شاعر کی فنی شخصیت کی قوسِ قزح ٹوٹ جائے گی جس کے رنگوں کا امتزاج ہی جانِ تغزل ہے۔ اس رنگین امتزاج کے ختم ہو جانے سے ایک بہت ہی سادہ قسم کا روایتی محبت یا سیاست کرنے والا بالکل معمولی سا آدمی سامنے آئے گا جس کے اشعار میں فن کا کوئی خاص جادو، تغزل کا کوئی خاص طلسم اور شاعری کا کوئی سحر نہ ہوگا۔ پھر فقط مولانا فضل الحسن بی۔ اے سے ملاقات تو ہوگی، حسرت موہانی کا دیدار نہ ہوگا اس لیے کہ حسرت موہانی نام ہے ایک شخصیت کا جو اردو غزل میں اپنی ادائے خاص کے ساتھ رونما ہوئی اور اس کی شاندار روایت کا ایک ممتاز و منفرد جزو بن گئی۔ لہٰذا حسرت کا تصورِ عشق ان کی تصویرِ فن کے پردے پر ان کی زندہ و توانا اور مرکب رنگین شخصیت کا ایک نشان بن کر ابھرا اور شروع سے آخر تک ان کے طویل دورِ سخن میں ان کے فن کی جان و روح بنا رہا۔ اسی تصور کے بل پر حسرت کا یہ مشہور دعویٰ ہمارے سامنے آتا ہے:

تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی — اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

رسم عاشقی کی تہذیب کسی تہذیب کے عقائد و اخلاق کی آگہی اور پیروی کے بغیر ممکن نہیں اور حسرت کے اعتقاد و کردار کے متعلق دو رائے نہیں ہو سکتیں۔

---

محمد محسن

# حسرت کی غزل گوئی کا نفسیاتی پس منظر

مشہور ماہرِ نفسیات گسٹو ینگ کا قول ہے کہ انسانی فطرت خاکستری ہے، نہ سفید نہ سیاہ - امتزاجِ ضدین اس کا خصوصی وصف ہے۔ ہر شخص کے اندر دو جبنی کی متضاد تحریکیں کارفرما رہتی ہیں۔ ایک کا ماخذ شعور ہے اور دوسری کا سوتا لاشعور سے پھوٹتا رہتا ہے - شخصیت کی رنگارنگی ورتنوع کا راز ان کے امتزاج میں پوشیدہ ہے - آدمی کی روزمرّہ زندگی پر ان دونوں اقسام کی ترغیبوں کی اثراندازی کے نشانات نمایاں رہتے ہیں۔ شعوری تحریکیں عقل و دانش کی پابند ہیں۔ زندگی کی ذمّہ داریوں اور فرائض کی ادائیگی، خارجی اور داخلی ماحول کے ناگزیر تقاضوں کی تکمیل شعور کی عملداری میں داخل ہیں۔ توہم پرستی، قدیم رسم ورواج کا پاس، پس افتادہ قدروں اور عقیدت مندیوں، اساطیری روایتوں اور تصوّرات کی فرماں روائی، غیر متمدّن جبلی میلانات کی کارکردگی لاشعور کے کرشمے ہیں۔ شعوری اور لاشعوری دھاروں کا سنگم آدمی کی شخصیت کے اندر اس طرح ہے کہ اس کی حیثیت ہمارے لیے کچھ ایسی غیر معمولی نہیں ہوتی کہ ہماری توجّہ اس کی طرف خصوصی طور سے مبذول ہو۔ لیکن کچھ ایسی شخصیتیں بھی ہوتی ہیں، جن کے اندر ان دوگانہ تحریکوں کا تصادم ہمیں خصوصی طور پر متوجّہ کیے بغیر نہیں رہتا۔ یہ بجائے ایک دوسرے میں مدغم ہوجانے کے اپنے لیے جُداگانہ راہیں نکال لیتی ہیں۔ اور ان کی درمیانی خلیج ہمارے لیے ایک عقدۂ لاینحل بن جاتی ہے - ایسی شخصیتوں کو ہم افتراقی (Dissociated) یا دووصفی (Dual) شخصیتیں کہتے ہیں۔ اس طرح کے متضاد ذاتی اوصاف اور ان اوصاف سے وابستہ متناقض کردار اور اطوار کا کسی ایک شخص کے اندر وجود کسی طرح قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ دو مختلف شخصیتیں ایک ہی قالب میں ڈھال دی گئی ہیں۔

حسرت موہانی کی ایک طرف مثالی پارسائی اور پاکبازی، اخلاقی بلندی اور قلندرانہ اوصاف اور مجاہدانہ زندگی اور دوسری طرف ان کی ٹھیٹ عشقیہ غزل گوئی، ان ہی کی اصطلاح میں ہمارے لیے ان کی شخصیت کو طرفہ تماشا بنادیتی ہے۔

اس قحط الرجالی دور میں جب کبھی اقبالؔ کے مردِ مومن کا تصور ہمارے ذہن پر ابھرتا ہے تو حسرت موہانی کی رودادِ حیات سامنے آجاتی ہے طالبعلمی ہی کی زندگی سے انہوں نے حق کی پاسداری کے لیے جن مزاحمتوں کا مقابلہ کیا، جیسی صعوبتیں برداشت کیں، جن آزمائشوں سے انہیں گزرنا پڑا، اس کی مثال دوسرے مجاہدینِ آزادی کی زندگی میں مشکل سے ملے گی۔ اس وقت کی فرنگی حکومت نے ان پر جیسے عذاب نازل کیے، اور انہیں جیسی اذیتیں دی گئیں، کسی دوسرے مجاہدِ آزادی کو ان سے سابقہ نہیں پڑا۔ حکومت کے خلاف بغاوت کے الزام میں جو قیدِ بامشقت انہیں ۱۹۰۸ء میں جھیلنی پڑی، اس کی روح فرسا داستان انہوں نے اپنے اخبار اردوئے معلیٰ میں بالاقساط شائع کی تھی۔ ایک سال کی دراز مدّت تک روزانہ صبح سے شام تک چکی میں ایک من آٹا پیس کر انہوں نے جس صبر وشکر کے ساتھ شب و روز گزارے، اس کی مثال کسی مجاہدِ آزادی کی قید و بند کی زندگی میں نہیں ملتی۔ اس جاں فشانی اور مشقت کے باوجود انہوں نے رمضان کے پورے ماہ کے روزے بھی رکھے۔ عبادت گزاری، دین داری اور تقویٰ کی ایسی نادر مثال بھی مشکل سے مل سکے گی۔ بارہ بار حج اور حرمین شریف کی زیارت کی سعادت حاصل کی۔ انہوں نے باوجود اپنی غیر معمولی علمی صلاحیتوں اور استعداد کے جس

○ دارالامان، بھنور پوکھر، پٹنہ-۸۰۰۰۰۴ بہار

فقر و فاقہ کی زندگی گزاری اور حسِ استہلاکِ نفس اور حرص و ہوا پر قدرتِ کاملہ کا نمونہ پیش کیا۔ ویسی شانِ بے نیازی کی نظیر صرف قرونِ اولیٰ کے درویشوں اور صوفیوں کی سوانح حیات میں مل سکتی ہے۔

حسرت موہانی کی عدیم المثال قلندرانہ زندگی کے پس منظر میں جب ہم اُن کی شاعری کی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سخت حیرت و استعجاب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اُنہوں نے غزل کو حقیقی اور واقعاتی معاملاتِ حسن و عشق سے آشنا کیا۔ اردو غزل کی روایت سے ہٹ کر اُنہوں نے اپنی غزلوں کو امرد پرستی کے مریضانہ احساسات و جذبات سے عاری رکھا۔ ان کی غزلیں صنفِ نازک کے ناز و ادا، غمزہ و عشوہ، طرزِ التفات اور اندازِ تغافل، کج ادائی اور ستم ایجادی کی ترجمان ہیں۔ عشق اُنہوں نے ایک ہی بار کیا۔ اور وہ بھی اپنی بنتِ عم سے اور زندگی بھر اُنہیں کے ہو کر رہے۔ نہ اُنہوں نے کسی دوسری پردہ نشین خاتون سے پیمانِ وفا کیا اور نہ کسی شاہدِ بازاری کی زلفوں کے اسیر ہوئے۔ اس اعتبار سے بھی ان کی شخصیت دوسرے معروف شعراء سے جداگانہ ہے۔ غالبؔ نے ڈومنی سے عشق کیا۔ میرؔ ایک عطار کے لونڈے کو دل دے بیٹھے۔ داغؔ نے منی جان سے محبت کا سودا کیا۔ فانیؔ ایک طوائف کے گیسو کے اسیر رہے۔ یہاں تک کہ اقبالؔ بھی ایک عرصہ تک عطیہ بیگم کی محبت کے شکار رہے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی صرف عشقیہ غزل گوئی کو اپنی شعری صلاحیتوں کے اظہار کا وسیلہ نہیں بنایا۔ بقول نیازؔ فتح پوری "حسرت کی یہ خصوصیت کہ اُنہوں نے غزل کے سوا کسی اور صنفِ سخن کی طرف مطلق توجہ نہیں کی بہت کم کسی دوسرے شاعر میں پائی جاتی ہے۔" نیازؔ اسے ان کی یک رنگیٔ طبیعت پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن حسرتؔ کے جیسا پُرگو شاعر جس نے ایک تخمینے کے مطابق تقریباً سات ہزار اشعار کہے ہوں، کسی دوسری صنفِ شاعری کی طرف مائل نہ ہو اور صرف غزل کا شاعر ہو کر رہ جائے اور اس میں بھی صرف چلتے پھرتے معاملاتِ عشق اور رودادِ محبت کی سرحدوں کے آگے قدم نہ بڑھائے، اس کی توجیہہ اس آسانی سے نہیں کی جا سکتی۔ حقیقت میں حسرتؔ کو یک رنگ طبیعت کا مالک سمجھا جانا بھی درست نہیں ہوگا۔ ان کی دلچسپیاں اور کارنامے متنوع تھے۔ ان کے سیاسی رجحانات بھی ان کے مزاج اور افتادِ طبیعت کی رنگارنگی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کا جھکاؤ اشتراکیت کی طرف تھا اور وہ کانگریس کے زبردست حمایتی بھی رہے تھے۔ بعد میں کانگریس سے علیحدہ ہو کر مسلم لیگ سے وابستہ ہو گئے۔ حقیقت میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی داخلی ترغیب اُنہیں غزل گوئی کی حدوں سے نکلنے کا یارا نہیں دیتی تھی۔ اور غزل کے اندر بھی ان کے دائرۂ فکر اور سخن سنجی کی بے پایاں صلاحیت کو اس قدر محدود بنائے ہوئے تھی، جس کی مثال اُن جیسے کسی معروف و مقبول شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔

ان کی ساری غزلیں اُنہیں معاملاتِ حُسن و عشق، اُنہیں تصورات و جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں، جن کا تجربہ ہر اُس شخص کے حصے میں آتا ہے جو کبھی سراپا ناز و ادا کے دامِ الفت کا شکار رہا ہو۔ وہی ہجومِ شوق کی سرمستیاں، وہی لیل و نہارِ انتظار کی سخت گھڑیاں، وہی کوچۂ جاناں کی ہواداری، ناکامیاں، بدنامیاں اور رسوائیاں، معشوق کی کج ادائی اور بے اعتنائی کا شکوہ، التفاتِ نگہِ یار کی آرزو۔ بقول نیازؔ: "حسرتؔ کی شاعری میں نہ فلسفہ طرازی ہے، نہ معنیٰ آفرینی، نہ بلندیٔ خیال ہے، نہ جدتِ بیانی۔ وہ وہی باتیں کہتے ہیں جو عام طور پر سب کے دل میں گزرتی ہیں۔ لیکن کہتے اس انداز سے ہیں کہ سب کے دل میں اُتر جاتی ہیں۔" معاملاتِ حسن و عشق کی ترجمانی میں حسرتؔ عشقِ مجازی کی سرحدوں سے باہر نہیں نکلتے۔ ان کی شاعری کا ڈانڈا عرفانِ حقیقت سے ملانے کی کوشش محض ایک فعلِ عبث ہے۔ نیازؔ فتح پوری نے نہایت کھلے لفظوں میں اس کی وضاحت کی ہے"۔ ان کی محبت کی جولانگاہ اس دنیا سے بلند کوئی ایسی فضا نہیں ہے، جہاں جسم کا گزر محال ہو اور گوشت اور خون سے پیدا ہونے والے جذبات پر حسن کے دروازے بند ہوں۔ ان کا محبوب وادیٔ ایمن یا کوہِ طور کی مخلوق نہیں بلکہ اس سوسائٹی کا فرد ہے جو چلمن کی اوٹ، پردے کی آڑ، جھروکوں اور جھلملیوں سے کوٹھے پر آ کر اور موقع ہو تو نقاب اُلٹ کر بھی فریفتہ بنا سکتا ہے"۔

حسرت موہانی کی غزلوں کے بیشتر اشعار نیازؔ فتح پوری کے بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان کی مندرجہ ذیل مشہور غزل ممکن ہے عنفوانِ شباب کی اس رودادِ محبت کی بازگشت تصور کی جائے جب وہ اپنے بنتِ عم کے دامِ محبت میں گرفتار ہوئے تھے۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے

با ہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

بار بار اُٹھنا اُسی جانب نگاہِ شوق کا
اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ اُنگلی دبانا یاد ہے

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ مونہہ چھپانا یاد ہے

تجھ کو جب تنہا کبھی پاتا تو از راہِ لحاظ
حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے

چوری چوری ہم سے تم آ کر ملے تھے جس جگہ
مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

باوجودِ ادعائے اتقا حسرت مجھے
آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانا یاد ہے

اس غزل کی تخلیق سے پہلے کی اتنی ہی معروف اور پسندیدہ غزل، جس میں معشوق کی کج ادائی اور تغافل کا شکوہ اور عاشق پر اس کے ردِ عمل کی فن کارانہ ترجمانی پیش ہوئی ہے اس کی مخاطب بیگم حسرت کسی طرح تصور نہیں کی جا سکتیں۔

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے، اچھا خفا ہو جائیے

میرے عذرِ جرم پر ہرگز نہ کیجیے التفات
بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہو جائیے

خاطرِ محروم کو کر دیجیے محوِ الم
درپئے ایذائے جانِ مبتلا ہو جائیے

میری تحریرِ ندامت کا نہ دیجے کچھ جواب
دیکھ لیجے اور تغافل آشنا ہو جائیے

مجھ سے تنہائی میں گر ملیے تو دیجے گالیاں
اور بزمِ غیر میں جانِ حیا ہو جائیے

ہاں یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا
آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پُر جفا ہو جائیے

جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے
اب نہ ملیے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے

دل سے یادِ روزگارِ عاشقی دیجے نکال
آرزوئے شوق سے ناآشنا ہو جائیے

ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں
یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہو جائیے

بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد
اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جائیے

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر
اس سراپا ناز سے کیونکر خفا ہو جائیے

اسی طرح حسرت کی دوسری غزلوں کو بیگم حسرت کے ساتھ اُن کی مثالی ازدواجی رفاقت اور ربط و اتحاد کا غیر شاعرانہ فضا سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ ان غزلوں کے بیشتر اشعار کسی ایسے محبوب کی نشاندہی کرتے ہیں، جسے شاعر نے حقیقت کے سانچے میں کچھ اس انداز سے ڈھال دیا ہے کہ قاری اس مغالطے کا شکار ہو سکتا ہے کہ حسرت موہانی نے بھی کسی شاہدِ بازاری یا کم از کم پردے پردے میں کھل کھیلنے والی خریف زادی سے رسم و راہِ اُلفت کو اپنے لیے روا رکھا تھا۔ مثال کے طور پر حسرت کی غزلوں کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں:

عمر ہی کیا ہے وہ کم سن ہیں ابھی نام خدا
ان پہ مرتا ہے تو کچھ دن ہے ہمیں جینا ضرور

---

محفل میں اُن سے کی ہوں گستاخیاں کسی نے
پر وہ یہی کہیں گے "سب ہے قصور تیرا"

---

ہوئیں ناکامیاں، بدنامیاں، رسوائیاں کیا کیا
نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہوا داری

---

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حُسن کی بیداری کا

---

ہم نے کس دن تیرے کوچے میں گزارا نہ کیا
تُو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا

---

مٹتا ہے مٹانے سے حباب شوق کہیں تیرا
ہے پیشِ نظر ہر دم حُسنِ نمکیں تیرا

---

مجھ سے تم چھپنے لگے، اچھا کیا یوں ہی سہی
اور جو میں اب دیدۂ دل سے تمہیں دیکھا کروں

---

عرضِ کرم پہ ترکِ وفا بھی نہ کیجیے
ایسا نہ ہو کہ آپ ملا بھی نہ کیجیے
پھر کہیے کس اُمید پہ ہم زندگی کریں
جب آپ التفات ذرا بھی نہ کیجیے

---

پردے سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے
مشتاقِ دید اور بھی للچا کے رہ گئے
آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حُسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

---

گھر سے ہر وقت نکل آتے ہو کھولے ہوئے بال
شام دیکھو نہ مری جان سویرا دیکھو

---

تمتمانے کی خوب نظارہ بازی
مزہ دے گئی حُسن کی بے شعوری

---

نامُرادوں کو شاد کام کرو
کرم اپنا کبھی تو عام کرو
سب کی خاطر کا ہے خیال تمہیں
کچھ ہمارا بھی انتظام کرو
پُوچھتے ہیں وہ جاں نثاروں کو
تم بھی حسرت اُٹھو، سلام کرو

---

عشقِ بُتاں کو جی کا جنجال کرلیا ہے
آخر یہ میں نے اپنا کیا حال کرلیا ہے

---

دلِ مجبور بھی کیا شے ہے کہ در سے اپنے
اُس نے سو بار اُٹھایا تو میں سو بار آیا

---

سب سے چُھپتے ہیں چُھپیں، ہم سے تو پردہ نہ کریں
سیرِ گلشن وہ کریں شوق سے، تنہا نہ کریں

---

یہ اشعار میں نے نیاز فتح پوری کے انتخاب کلیاتِ حسرت سے اخذ کئے ہیں۔ ویسے اس انتخاب میں سیکڑوں ایسے اشعار ہیں، جن میں عشقِ مجازی کی ناکامیوں اور شادکامیوں، کلفتوں اور راحتوں، جذبات و احساسات کی برملا اور بلا تصنّع واقعیتی انداز میں ترجمانی کی گئی ہے۔ ساری کیفیات، تجربات اور معاملات کی عکاسی جن سے ہر وہ تہذیب یافتہ شخص آشنا ہوتا ہے، جس نے کبھی کبھی ازدواجی زندگی کی حدبندیوں سے باہر نکل کر حُسن و عشق کی حقیقی فضا میں سانس لینے کی جراتِ رندانہ کی ہے۔

حسرت کا رنگِ تغزّل اور ان کی شخصیت کے درمیان کا تضاد جو بادی النظر میں ایک معمہ ہے، اس کی نفسیاتی توجیہہ ینگ کا سطور بالا میں بیان کردہ قول کی روشنی میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ حسرت کی ذات، نفسیاتی ہم آہنگی اور بلوغت کے اُس نقطۂ عروج سے عبارت تھی، جہاں تک شاید صرف فرشتوں کی رسائی ممکن ہے۔ اُن کے نظامِ اقدار پہ ایک سوچے سمجھے فلسفۂ حیات اور نصب العین کی مکمل فرماں روائی تھی، جس کی وجہ سے ان کے اندر غیر معمولی یگانگت اور ہم رنگی کی مستقل کیفیت طاری تھی۔ خود تکمیلی (Self-actualisation) اور مثالی تصوّرِ ذات کے بالفعل اظہار (Self-fulfilment) نے اُنہیں زندگی کے سارے نشیب و فراز اور نچی تقاضوں سے اس حد تک بے نیاز کر دیا تھا کہ وہ ہر حال میں جمعیتِ خاطر اور آسودگیٔ قلب کی لازوال نعمتوں سے بہرہ ور تھے۔ ان کی ذات نفسِ مطمئنہ کے قرآنی تصوّر کی جیتی جاگتی تفسیر تھی، جس کا حصول نفسِ امارہ اور نفسِ لوّامہ پر شعوری ذات کی قدرتِ کاملہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ نہ کوئی ناشائستہ لاشعوری جنسی تحریک اور نہ اُس کی یاداشت میں ضمیر کی نیش زنی اُن کی خود تکمیلی کے احساس پر ضرب لگانے کی اہلیت رکھتی تھی۔ لاشعوری تحریکوں اور خصوصًا غیر تربیت یافتہ بے لگام جنسی ترغیب کی رو بہ کاری کے لیے سوائے اُن کی تخلیقی صلاحیت پر چھاپہ مارنے کے ساری دوسری راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ حقیقی معنوں میں تخلیقی کارنامے عمومًا وہی ہوتے ہیں جن کا سوتا لاشعور کے نہاں خانوں سے پھوٹتا ہے۔ بقول غالبؔ ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غالبؔ کے اس شعر میں غیب کا لفظ لاشعور کی علامتی نشاندہی کرتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ نفسیات کی ساری کوششوں کے باوجود اب تک اس کا یقین نہیں ہوسکا کہ تخلیقی کارناموں کے اساسی ماخذ کیا ہیں۔ سوائے اس کے کہ انہیں لاشعور سے منسوب کیا جائے اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ حسرت کی غزلوں کے مطالعہ میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان کی شعوری ذات کی حدبندیوں نے حسرت کے لاشعوری جنسی تقاضوں کو عشقیہ غزل گوئی کا رُوپ دھارن کرنے پر مجبور کر دیا تھا، جس کے لیے لاشعوری عوامل اور تصوّرات نے ان کی خداداد فنی صلاحیتوں سے ساز باز کر لی تھی۔ ●●

شارب ردولوی

# حسرت کی شاعری میں حسّی تلازمے

حسرت موہانی نے اپنی طبیعت کو'چلکی کی مشقت' اور'شاعری' کے فساد میں خود ایک 'طرفہ تماشا' قرار دیا ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو ان کی زندگی اور شاعری کا کوئی پہلو 'طرفگی' سے خالی نظر نہیں آتا۔ لیکن بعض وقت غیرارادی طور پر یا کسی خاص معنی میں استعمال کیا ہوا کوئی لفظ زندگی میں بہت اہم ہو جاتا ہے۔ ماہرینِ نفسیات اس طرح کے الفاظ کی کیا تاویلیں پیش کریں گے اور تحت الشعور و لاشعور کے کیسے کیسے نہاں خانوں کی پردہ دری کریں گے، مجھے نہیں معلوم۔ لیکن حسرت کی زندگی اور شاعری کا مطالعہ یہ ضرور ظاہر کرتا ہے کہ یہ بے ضرر سا لفظ ان کی زندگی میں ایک کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔

حسرت بڑی پہلو دار شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی شخصیت کا ایک پہلو ان کی سیاسی زندگی میں نظر آتا ہے۔ اور دوسرا پہلو ان کی شاعری میں۔ وہ صحافی بھی تھے اور محقق بھی۔ صوفی بھی تھے اور نقاد بھی۔ اسی لیے ان کی شخصیت کا مطالعہ بہت آسان نہیں ہے۔ حالانکہ یہ ان کی بہت بڑی خوبی ہے کہ شخصیت کے ان مختلف پہلوؤں میں ان کے یہاں کوئی تضاد نہیں ہے۔ یہ ان کے کردار کی ایک بہت بڑی صفت ہے۔ جو عام طور پر کم نظر آتی ہے۔ حسرت ہر جگہ اپنے ایک کردار، ایک رویے کے ساتھ ہی نظر آتے ہیں۔ ان کا ایک رویّہ، دوسرے رویّے کا مخالف ہونے کے بجائے معاون ہے اور اس میں ان کی 'طرفگی' کی شان دکھائی دیتی ہے۔ وہ ایک سادہ، سچّے اور ایمان دار شخص تھے کسی نے ان کے لیے 'کھرے انسان' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میرے خیال میں

○ ۵/۱۸ ڈی، ماڈل ٹاؤن، دہلی ۱۱۰۰۰۹

حسرت کے کردار کے اظہار کے لیے اس سے بہتر لفظ ملنا مشکل ہے۔" کھرے" میں سچائی کی تلخی بھی ہے، سادگی کی نرمی بھی۔ اپنے نظریے پر اڑے رہنے کی سختی بھی اور مصلحتوں سے سمجھوتہ نہ کرنے کی 'کج کلہی' بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام سادگی، نرمی اور احساسِ جمال کے باوجود جہاں نظریے کی بات آجاتی ہے وہاں وہ ٹوٹ تو سکتے ہیں، لیکن جھک نہیں سکتے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص قابلِ احترام اور ہر دل عزیز صوفی اور درویش تو ہو سکتا ہے، لیکن ہر دل عزیز سیاست داں یا صحافی نہیں ہو سکتا۔ جہاں سچائی، نظریہ اور دوستی وقت کی مناسبت اور مصلحت کے مطابق معنی بدلتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حسرت سیاست میں صرف صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ وہ کانگریس میں رہے، لیکن تقسیمِ ملک کے مخالف رہے۔ 'کٹر مسلمان' ہونے کے باوجود کمیونسٹ پارٹی کی ہم نوائی کی، لیکن اگر بین السطور کو دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ یہ مخالفت یا موافقت پارٹی یا اشخاص سے نہیں تھی بلکہ سچ کی ہم نوائی تھی۔ وہ پارٹی اور پارٹی ڈسپلن سے بلند تھے۔ اور ان کی نگاہ میں صرف حق پیروی کے قابل تھا، خواہ وہ کہیں بھی ہو۔ وہ چونکہ ذاتی مفاد اور مصلحت سے بلند تھے۔ اس لیے ہمیشہ نڈر اور بے باک رہے۔

حسرت کی شاعرانہ اہمیت کے بارے میں متضاد رایوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ کسی نے حسرت کی غزل کو اردو غزل گوئی کا معیار[1] قرار دیا اور کسی نے ان کی شاعری کو استادانہ تقلید[2]، اور اساتذہ کا تتبع[3] کہا۔ بعض لوگوں کی رائے

---

[1] رشید احمد صدیقی بحوالہ راج بہادر گوڑ اردو ادب حسرت نمبر

[2] مجنوں گورکھپوری بحوالہ حامدی کاشمیری اردو ادب حسرت نمبر ص ۹۵

[3] حامدی کاشمیری اردو ادب حسرت نمبر ص ۱۹۵

میں وہ بڑے آرٹسٹ[1] نہ تھے اور بعض کے خیال میں اُن کی شاعری میں تفکر اور گہرائی[2] نہیں ہے اور کسی کی نگاہ میں وہ رئیس المتغزلین[3]، اور کسی کی نگاہ میں اردو غزل کا احیا کرنے والے ہیں۔ ناقدین کی ان رایوں میں اختلاف کا اصل سبب یہ ہے کہ ان رایوں میں حسرت کی شاعری کے کسی ایک پہلو کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اگر مجموعی حیثیت سے حسرت کے کلام کا مطالعہ کیا جاتا تو اس طرح کا تضاد نہ نظر آتا۔

حسرت کے بڑے شاعر ہونے میں شبہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ——— اُنہوں نے اس وقت اردو غزل کو نئے انداز اور نئے لب و لہجے سے آشنا کیا جب کہ وہ تہذیبی زوال کا شکار ہو چکی تھی۔ حسرت اردو غزل کا ایک اہم موڑ ہیں۔ جنہوں نے جدید غزل کو تصنع اور خارجی لوازمات سے بڑی حد تک پاک کیا۔

حسرت غزل کے شاعر ہیں۔ اُنہوں نے غزل کو جس نئے اسلوب اور سادگی، بے تکلفی سے آشنا کیا ہے وہ حسرت کے عہد میں یا ان کے قریبی پیش رووں کے یہاں نہیں ملتی۔ حسرت نے غزل کو حقیقی جذبات سے قریب تر کرنے کی کوشش کی۔ حسرت سے پہلے کی غزل عام طور پر رعایتِ لفظی، جذبات کے پُرتصنع اظہار معاملہ بندی، اور خارجی وارداتوں کے اظہار کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ جرأت، انشا، مصحفی، داغ اور امیر کے عہد میں غزل نے جو صورت اختیار کی، اس کی تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس عہد میں غزل کا تفکر، رعایتِ لفظی اور معاملہ بندی کے خم و پیچ میں اُلجھ کر رہ گیا تھا۔

جمنا میں کل نہا کر جب اُس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے

امیر اتنا نہ چھیڑ اس کو سرِ شام
کہ شب بھر پیار کرنے کو پڑی ہے (امیر)

خیال کی یہ پہلو داری یا "چھیڑ چھاڑ" اکثر اوقات حدود سے تجاوز کر جاتی ہے۔ اس کے علاوہ محبوب کا تصور بھی حقیقی نہیں ہے، جس میں محبوب عیار، دغاباز، حیلہ ساز، قاتل، جفا جو، ستمگر اور بے حیا نظر آتا ہے۔ دراصل غزل میں محبوب کا یہ تصور ہو یا معاملہ بندی اور رعایتِ لفظی کے مضامین کی کثرت ان کا براہِ راست تعلق ہماری سماجی زندگی سے ہے۔ اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات نے ایک شاہد بازاری کلچر کو جنم دیا تھا، جو ایسے تمام لوگوں کی آماجگاہ تھی، جو نئے حقائق سے آنکھ ملانے کی جرأت یا تبدیلیوں سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ اسی نے محبوب کے تصور کو بالاخانے کی 'فاحشہ' کے تصور سے وابستہ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب محبوبہ کا تصور' ایک بازاری عورت کا تصور ہوگا تو عیاری، دغابازی، ستمگری، وعدہ خلافی کی باتیں اور ناف و کمر، لب و رخسار، دشنۂ مژگاں، زلفِ پیچاں اور تیرِ نظر کا ہی ذکر ہوگا۔ اردو غزل میں حسرت سے پہلے یہ رنگ اس قدر بڑھی کہ امیر مینائی جیسا صوفی شاعر بھی اس سے دامن نہ بچا سکا۔ حسرت نے محبوب کے اس تصور کو تبدیل کیا اور جذبے کی صحیح عکاسی کر کے غزل کو زیادہ مؤثر اور دل کش بنایا۔ یہ کہنا شاید صحیح نہ ہو کہ حسرت کے یہاں محبوب کے تصور میں شاہد بازاری کلچر کی جھلک ملتی ہی نہیں، اس لیے کہ ماضی قریب کی شعری روایت کو یک لخت تبدیل کر دینا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے حسرت کے یہاں اس کے اثرات کا پایا جانا ایک فطری بات ہے، لیکن حسرت نے جذبات نگاری اور معاملہ بندی کے فرق کو ملحوظ رکھا ہے۔ جذبات نگاری اور معاملہ بندی کے درمیان بہت تھوڑا سا فرق ہے۔ ذرا احتیاط کا دامن چھوٹ جائے تو دونوں کی سرحدیں مل جاتی ہیں۔ حسرت جذبے کی تصویر کشی میں شوخ تو ہو جاتے ہیں، لیکن اعتدال سے آگے نہیں بڑھتے۔ شوخی اور اعتدال کے اسی امتزاج نے حسرت کے یہاں ایسی جمالیاتی لطافت اور دل کشی پیدا کر دی ہے کہ سننے والا اُسے اپنے دل کی آواز محسوس کرتا ہے۔

حسرت نے محبوب کا جو تصور پیش کیا وہ ان سے پہلے اردو شاعری میں عام نہیں تھا۔ ان کا محبوب ہماری دنیا کا چلتا پھرتا اور جیتا جاگتا محبوب ہے۔ جو محبت کی کلفتوں اور عشرتوں میں برابر کا شریک ہے، جو غیر معمولی نہ ہوتے ہوئے بھی اہم ہے۔ اس لیے کہ اس میں ہمیں جانی پہچانی شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ سودا نے کہا تھا: ؎

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا

حسرت کا محبوب بھی اسی طرح ایک عام فرد ہے جو دوپہر کی دھوپ میں کوٹھے پر ننگے پیر بُلانے کے لیے آسکتا ہے۔ نیاز فتح پوری نے لکھا ہے کہ "ان کا محبوب وادیٔ ایمن یا کوہِ طور کی مخلوق نہیں بلکہ انہیں کی سوسائٹی کا فرد ہے جو چلمن کی اوٹ، پردے کی آڑ، جھروکوں اور جھلملیوں سے کوٹھے پر آکر اور موقع ہو تو نقاب اُلٹ کر بھی فریفتہ بنا سکتا ہے[4]"

حسرت بے حد حساس شاعر ہیں اور حسن بہ ہر رنگ انہیں متاثر کرتا ہے۔ وہ تمام کیفیتوں اور جذبات کو جس طرح محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح اور

---

[1] سید محمد عقیل، آکادمی۔ حسرت نمبر ص ۱۴۲
[2] اردو ادب، حسرت نمبر
[3] نیاز فتح پوری، "آج کل"، حسرت نمبر ص ۲۰
[4] "آج کل" حسرت نمبر ص ۶۱

ندت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ احساس کی اسی شدّت اور جمالیاتی
ت نے ان کے کلام میں خوب صورت حسّی تلازمے پیدا کئے ہیں۔ حسّی تلازمات
ن جمالیاتی احساس اور جذبے کی شدّت سے ہے۔ یوں تو محسوس کرنے کی
جبلّی طور پر ہر شخص کو ملی ہے۔ لیکن جذبہ اور ذوقِ جمال اس پر جلا کا کام
ہے۔ حسرت کے یہاں ان حسّی تلازمات کی شکل بڑی دل کش اور خوب صورت
جو بعض جگہوں پر حسّی پیکر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ حسّی پیکر تراشی اور حسّی
ے مختلف شعراء کے یہاں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ میر، غالب، مومن اور
سے شعراء نے بھی اس سے کام لیا ہے۔ لیکن جیسے جیسے غزل خارجیت اور
لہ بندی کا شکار ہوتی گئی۔ حسّی تلازمے کی لطافت اور احساس کی لطافت
ہوتی گئی۔ حسرت نے ایک بار پھر حواس پر حُسن کی اثر اندازی کو بڑے خوب صورت
میں پیش کیا۔ حسرت کی شاعری میں رنگ اور خوشبو کو بڑی اہمیت حاصل
۔ انہوں نے دوسری حسّوں کے تلازمے بھی استعمال کئے ہیں، لیکن حسِ شامّہ
ں باصرہ کے تلازمے زیادہ کثرت سے ملتے ہیں۔ اس کا یہ بھی سبب ہو سکتا ہے
رت کا Aesthetic Sense بہت بلند تھا اور یہ دونوں حسّیں
ف احساسات کی محرک ہیں، اس لیے جذبے کے اظہار میں حسرت نے
سے زیادہ کام لیا۔ مثلاً حسِ شامّہ سے متعلق یہ تلازمے ملاحظہ ہوں ؎

خوشبو ترے ملبوس کی لائی ہے کہاں سے
تجھ تک تو ہوا تھا نہ گزر بادِ صبا کا

---

سونگھی تھی جو اک بار وہ خوشبوئے گریباں
اب تک یہ اسی بوئے گریباں کا نشہ ہے

---

آج تک جس سے معطّر ہے محبت کا مشام
آہ کیا چیز تھی وہ پیرہنِ یار کی بُو

---

اک بار بس گیا جو کہیں اس کی باس میں
خوشبوئے حُسن برسوں رہی ہے لباس میں

---

محتاجِ بوئے عطر نہ تھا جسمِ خوب یار
خوشبوئے دلبری تھی، جو اس پیرہن میں تھی

---

پائی ہے جگہ پاک دامانِ نظر میں
خوشبوئے حیا نے تری چادر سے نکل کر

---

یہی لائی ہے اُڑا کر ترے ملبوس کی بُو
بے خودی ہائے تمنا کی صبا ہے باعث

---

حسرت کے لیے حُسن خوشبو ہے۔ اُنہیں خوشبو کا نشا ہے۔ وہ محبوب کے لباس کی خوشبو، اس کے جسم کی خوشبو، اس کے گریبان کی خوشبو ہی کو محسوس نہیں کرتے بلکہ خوشبوئے دلبری اور خوشبوئے حیا سے سرشار ہیں۔ خوشبو ان کی کمزوری ہے، ان کی مستی ہے۔ ان کی بے خودی اور سرمستی کا سبب ہے۔ خوشبو سے متعلق تلازمات کا جتنا خوب صورت استعمال حسرت نے کیا ہے، مشکل سے ان کے کسی ہم عصر کے یہاں نظر آئے گا۔ خوشبو سے یہ لگاؤ حُسن اور محبت کی اس لطافت کی نشاندہی کرتا ہے جو حسرت کے لاشعور میں بسی ہوئی تھی یعنی حُسن ان کے لیے ایسی چیز ہے جس میں کسی قسم کی کثافت کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ اسی لئے وہ شامّہ کے تلازمے کا استعمال بار بار مختلف انداز میں کرتے ہیں ؎

مشک و عنبر میں یہ تفریح کا سامان کہاں
پیرہن ان سے بھی کچھ بڑھ کے ہے خوشبو ترا

---

محبت کی جو یہ پھیلی ہے نکہت باغِ عالم میں
ہوئی ہے منتشر خوشبوئے یار آہستہ آہستہ

---

کیا کیا ہوس کو آتی ہے خوشبوئے آرزو
آنکھیں جب اپنی ملتے ہیں ان کی ردا سے ہم

---

آشنا ہو کے بوئے یار سے ہم
سخت بیزار ہیں تتار سے ہم

---

ہے بوئے شوق سے جو معطّر مشامِ جاں
ارماں نہیں ہوائے جناں کی شمیم کا

---

"گیسوئے دوست کی خوشبو" حسرت کے لیے "دو عالم کی بہار" ہے اور بوئے شوق سے ان کا "مشامِ جاں" اس طرح معطّر ہے کہ خوشبوئے جناں کا بھی ارمان نہیں۔

حسرت نے حسِ باصرہ کے تلازمات کو بھی بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ وہ باصرہ کے تلازمے کو عموماً رنگ کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔ حسرت کے یہاں رنگ کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ وہ رنگ اور خوشبو دونوں لطافتوں سے اپنے شعر میں

دل کشی پیدا کرتے ہیں۔ اُنہوں نے بعض اشعار میں شامہ اور باصرہ دونوں کے تلازمات کو یک جا استعمال کیا ہے۔ اور رنگ و خوشبو سے اشعار میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ باصرہ اور شامہ دونوں کے تلازمے جن اشعار میں استعمال ہوئے ہیں ان کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں: ؎

ہوس انگیز تمنا ہے لبِ یار کا رنگ
روشنی بخشِ نظر ہے مےِ گلنار کی بُو

تم نے بال اپنے جو پھولوں میں بسا رکھے ہیں
شوق کو اور بھی دیوانہ بنا رکھا ہے

حسرت کے جمالیاتی احساس اور حسی تلازمے کی یہ بھی بہت اچھی مثال ہے ؎

کیا کیجئے بیاں اس تنِ نازک کی حقیقت
خوشبو میں ہے گُل تُو تو لطافت میں ہے رنگ

اس طرح حسرت نے باصرہ اور شامہ کے تلازمات، خوشبو اور رنگ سے جو گُل کاری کی ہے وہ ان کے شدید احساس اور لطیف ذوقِ جمال کی نشاندہی کرتی ہے۔ حسرت نے بصری تلازمات کو علیحدہ بھی استعمال کیا ہے، جو ان کی انفرادیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں رنگوں کی کیفیت ملاحظہ ہو:[9]

زلفِ شب رنگ میں گلنار لباسی کی بہار
آج حسرت نے رُخِ یار میں کیا کیا دیکھا

---

دیکھا جو مجھے گرم نظر بزمِ عدو میں
وہ ڈانٹ گئے مجھ کو برابر سے نکل کر

---

رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنیں
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

---

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گُل سے چمن تمام

---

پیراہن اُس کا ہے سادہ رنگیں
یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

---

رنگ تیری شفق جمالی کا    اک نمونہ ہے بے مثالی کا

---

حسرت نے بصری تلازمات کو رنگ اور روشنی کے بنیادی تلازمے سے ترتیب دیا ہے، جسے کہیں وہ زُلفِ شب رنگ کہتے ہیں کہیں لباس کے رنگوں کی شوخی، کہیں شفق جمالی کہتے ہیں، کہیں گلنار لباسی اور کہیں آتشِ گُل کا دہکنا، رنگوں اور روشنی کے اس امتزاج کا اگر جائزہ لیجئے تو حسرت کے جذبے کی شدت کا احساس ہوگا۔ ان کے بعض کم مشہور اشعار میں بھی یہ شدت محسوس کی جا سکتی ہے ؎

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی
جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی

---

چمن میں بادِ بہاری بھی گُل کی آنکھوں سے
چلی کہ دیکھے تماشا تری سواری کا

---

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے
ہم نے اس شوخ کو مجبورِ حیا دیکھا ہے

---

کھِل گیا ہے ترے جمال سے رنگ    ترے ملبوس ارغوانی کا

---

ان مثالوں سے حسرت کے یہاں جذبے کو حسوں کے مختلف تلازمات کے ذریعے پیش کرنے کی لطیف کوشش ظاہر ہوتی ہے، لیکن یہ مثالیں صرف شامہ اور باصرہ سے متعلق ہیں۔ جب کہ حسوں میں سامعہ، لامسہ اور ذائقہ بھی شامل ہیں۔ حسرت کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں جس شدت سے شامہ اور باصرہ تلازمے ملتے ہیں۔ اس کا ایک حصہ بھی دوسرے حسوں سے متعلق تلازمے نہیں ہیں۔ ان کے انتخابِ کلام میں ذائقے سے متعلق کوئی تلازمہ نظر نہیں آیا اور لمسی اور سمعی تلازمے کے صرف دو دو اشعار مل سکے۔[11] کے مکمل دیوان میں ہو سکتا ہے کہ اس موضوع پر ایک دو شعر اور مل جائیں لیکن اس سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے جب کہ ان کے پیش روؤں کے یہاں لمسی اور سمعی ہی نہیں بلکہ ذائقہ سے متعلق تلازمے بھی بڑی تعداد میں مل جاتے ہیں مثلاً:

ذائقہ ہونٹوں کا بدلے گا نہ مِستی مَلیئے
ہوں گے یہ قندِ سیہ اب تو شکر پارے ہیں

---

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو    (مومن)

---

دَھول دھپّہ اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن    (غالب)

یا برابر رقص کر تلوار کی جھنکار پر
یا مسلسل نغمۂ خلخالِ محبوبہ پہ ناچ

س کے علاوہ شکر لب، فردوسِ گوش وغیرہ کی تراکیب ہماری شاعری میں بہت عام ہیں لیکن حسرت کے یہاں یہ نہ ہونے کے برابر ہیں اور جہاں سمعی یا لمسی تلازمے آئے ہیں' ان میں جذبے کی وہ شدت نہیں ہے جو اپنی طرف خصوصیت کے ساتھ متوجہ کر سکے۔ مثلاً لمسی تلازمے کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

بزمِ اغیار میں ہرچند وہ بیگانہ رہے
ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

---

سِکھا دی ہیں نرالی شوخیاں کچھ لطفِ جاناں نے
مرے دستِ تمنا کی شرارت بڑھتی جاتی ہے

یا سمعی تلازمے کے یہ دو شعر دیکھئے ؎

اک بار سُنی تھی سو مرے دل میں ہے موجود
اے جانِ تمنا تری تقریر ابھی تک

---

بن جاتی ہے دل میں خلشِ خارِ تمنا
جھنکار ترے پاؤں کے زیور سے نکل کر

اِن اشعار میں دستِ تمنا کی شرارت اور ہاتھ کا دبا دینا لمسی تلازمہ ہے اور قریباً دو جھنکار سمعی۔ یہ اشعار بھی حسرت کے اچھے انتخاب میں نہیں آتے۔ سوائے سمعی تلازمے کے ایک شعر کے جو ان کے شوخیٔ بیان کے ذکر میں کبھی کبھی پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حسرت کے یہاں سمعی، لمسی اور ذائقہ سے متعلق حسّوں کے تلازمے کیوں نہیں ہیں جب کہ ان سے پہلے کے لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ کے شعرا کے یہاں اس طرح کے اشعار اچھی خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ اس کا ایک سبب تو نفسیاتی ہو سکتا ہے یعنی ہر شخص میں ہر حس یکساں طور پر شدت نہیں رکھتی۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ حسرت کی زندگی میں ذائقہ اور لمس کی وہ اہمیت نہ رہی ہو جو شامہ اور بصارت کی تھی' اس لیے اس کا ذکر ان کے یہاں نہیں ملتا۔ لیکن تصوف کے رشتے سے سماع سے انہیں بے حد دلچسپی تھی۔ خوش الحان اور سازیچی آواز کو وہ پسند کرتے تھے۔ اس کے باوجود سمعی تلازمات ان کے یہاں نہیں ملتے۔ میرے خیال میں حسرت کے یہاں ان حسّوں کے تلازمات نہ ہونے کی وجہ نفسیاتی سے زیادہ سماجی ہے۔ چونکہ سمعی اور لمسی دونوں حس اردو شاعری اور بالخصوص غزل کی حد تک اس تہذیبی احاطے سے قریب ہیں جسے شروع میں شاید بازاری کلچر کا نام دیا گیا ہے اور حسرت غزل کو اس احاطے سے باہر لائے تھے۔ اس لیے مومن سے ایک تعلق ہونے کے باوجود ان کے یہاں نہ غیرتِ ناہید کی تان ہے اور نہ دیپک راگ اور پائل کی جھنکار اسی طرح جب تک محبوب بالاخانے کی زینت تھا، اس وقت تک ڈھول دھپّہ بھی تھا اور دست و بازو کا امتحان بھی۔ لیکن حسرت نے محبت کو ایک نئی فضا دی۔ جس میں گھر کی چار دیواریاں تھیں۔ معصوم اظہارِ تمنا تھا اور ناتجربہ کار عشق کی دھڑکنیں تھیں، اس لیے ان کے یہاں وہ کلچر اور وہ تلازمات بھی نہیں ملتے۔ حالانکہ 'ادعائے اتقا' کے باوجود میر کی طرح 'تاکنا جھانکنا' ان سے کبھی نہیں گیا، جو صرف زندگی ہی کی علامت نہیں حسرت کی عظمت کی بھی علامت ہے۔ ○ ○

---

بقیہ: آن کہ ... مولانا حسرت موہانی

---

## انگریزی مطبوعات :


۱۔ عبدالمعین زیدی : دی انسائیکلو پیڈیا آف دی انڈین نیشنل کانگریس (متعدد جلدیں)
۲۔ سید شرف الدین پیرزادہ : فاؤنڈیشنز آف پاکستان —— آل انڈیا مسلم لیگ ڈاکومنٹس ۱۹۰۶ء —— ۱۹۴۷ء پہلی جلد: ۱۹۰۶ء تا ۱۹۲۴ء - بلا تاریخ - دیباچہ: ۱۹۶۹ء دوسری جلد: ۱۹۲۵ء تا ۱۹۴۷ء انڈین ایڈیشن، نئی دہلی ۱۹۸۲ء
۳۔ ایس۔ چوبے : کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی آف انڈیا۔ مطبوعہ: نئی دہلی۔ ۱۹۷۳ء
۴۔ نریش کمار جین : مسلمس اِن انڈیا۔ جلد اوّل مطبوعہ نئی دہلی۔ ۱۹۷۹ء
۵۔ جگدیش شرما : انڈین نیشنل کانگریس — ببلیوگرافی: مطبوعہ: دہلی۔ ۱۹۵۰ء


---

مجیب رضوی

# حسرت کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری

حسرت موہانی کے مطبوعہ کلام میں شری کرشن کا اولین ذکر رسالہ "زمانہ" کانپور کے اکتوبر ۱۹۲۳ء کے شمارے میں شائع ان کی ایک غزل میں ملتا ہے۔ یہ غزل ۲۶ تا ۳۰ ستمبر ۱۹۲۳ء کے درمیان انھوں نے کہی تھی:

آنکھوں میں نورِ جلوۂ بے کیف و کم ہے خاص
جب سے نظر پہ اُن کی نگاہِ کرم ہے خاص
کچھ ہم کو بھی عطا ہو کہ اے حضرتِ کرشن
اقلیمِ عشق آپ کے زیرِ قدم ہے خاص
حسرت کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری
سُنتے ہیں عاشقوں پہ تمھارا کرم ہے خاص

ان اشعار میں عشق کے داتا کی حیثیت سے شری کرشن سے عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے اور اس میں اس بات کا بھی واضح اشارہ ہے کہ شری کرشن کی قربت کی خاطر حسرت متھرا میں حاضر ہوئے تھے (حسرت ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے تھے وہ ایک عرصہ سے شاعری کر رہے تھے۔ ۱۹۰۳ء سے 'اردوئے معلیٰ' کے مدیر بھی تھے۔ لیکن ستمبر ۱۹۲۳ء سے قبل اُن کے یہاں شری کرشن سے لگاؤ کا پتہ نہیں چلتا۔ بانسری بجیّا کی مورت دل میں بسانے کی وجہ خود حسرت نے اپنے دیوان ہفتم کے طبع اوّل کے دیباچے میں بتائی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "حضرت شری کرشن علیہ الرحمہ کے باب میں فقیر اپنے پیر اور پیروں کے پیر حضرت سید عبدالرزاق بانسوی قدس اللہ سرہٗ کے مسلکِ عاشقی کا پیرو ہے۔" لیکن اس مسلکِ عاشقی کے پیرو وہ عرصۂ دراز سے تھے۔ اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے ۴۵ سال کی عمر تک اس کا اظہار کیوں نہیں کیا؟ وہ کون سے محرکات تھے جنھوں نے سلسلۂ طریقت سے ملی چنگاری کو یکا یک شعلہ بنا دیا۔ اس کی وجہ ایک یہ ہو سکتی ہے کہ بانسہ میں حاضری دینے کی وجہ سے اس کے قرب و جوار میں پھیلے ہندی کے صوفی شعراء کے کلام سے وہ روشناس ہوئے ہوں۔ بانسہ ضلع بارہ بنکی میں واقع ہے۔ اسی ضلع میں واقع رودولی قصبہ مشہور بزرگ اور ہندی کے بلند پایہ شاعر حضرت عبدالقدوس گنگوہی کا وطن ہے۔ دریا باد ہنس جواہر نامی ہندی مثنوی کے خالق قاسم شاہ کا مسکن ہے۔ پریم چنگاری کے مصنف شاہ نجف علی سلونی بارہ بنکی کے باسی تھے۔ کاکوری میں قایم قادریہ سلسلے کی ایک شاخ کے بزرگ شاہ محمد کاظم قلندر ہندی کے زبردست شاعر تھے۔ انھوں نے 'شانت رس' کی تخلیق کی ہے۔ ان کے بیٹے شاہ تراب علی قلندر بھی صاحبِ دیوان ہندی شاعر اور صوفی بزرگ ہیں۔ حسرت نے فتح پور سہوا سے ہائی اسکول پاس کیا تھا اور وہ صوفی شاعر عبدالصمد مستا کی آرام گاہ ہے۔ حسرت سلسلۂ قادریہ کی ایک شاخ سے منسلک ضرور تھے لیکن وہ تمام بزرگوں کی درگاہ پر حاضری دینا باعثِ سعادت سمجھتے تھے۔ اس لیے ممکن ہے کہ اپنے پیر کی درگاہ کے اردگرد پھیلی خانقاہوں کی زیارت کے لیے وہ ان بزرگوں کی درگاہوں تک پہنچے ہوں اور ان میں پوشیدہ ہندی ادب کے خزانے سے متعارف ہوئے ہوں۔ چونکہ ان تمام صوفی شعراء کو شری کرشن سے عقیدت تھی اور شری کرشن کی عشقیہ داستان کو طرح طرح سے انھوں نے اشعار کا پیکر دیا ہے اس لیے اس کا امکانِ قوی ہے کہ حسرت کے دل پر اس کا اثر ہوا ہو اور وہ بھی شری کرشن کی گوپیوں میں شامل ہو گئے ہوں۔ قادریہ سلسلہ عام طور سے بہت ہی راسخ العقیدہ سمجھا جاتا ہے لیکن اس کی ہر شاخ کے بزرگ کے یہاں شری کرشن سے عقیدت ملتی ہے۔ اسی سلسلے کی کالپی اور مارہرہ شاخ کے پیر و مرشد حضرت برکات اللہ

● پروفیسر اور صدر شعبۂ ہندی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی

ی ہندی کے شاعر تھے۔ اور اپنے مجموعہ کلام "پریم پرکاش" میں انھوں نے اور شری کرشن کے عشق کے مضمون کو طرح طرح سے شعری قالب میں ڈھالا لیکن الفاظ سے بھرم میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ ان بزرگوں نے کرشن بھگتی اعری کی اصطلاحات کو خوب خوب استعمال کیا ہے لیکن اسے انھوں نے بانہ معنویت سے روشناس کرایا ہے۔ یہ لوگ نہ شری کرشن کو وشنو کا اوتار تے ہیں اور نہ ہی مجسم خدا۔ صوفی کے لیے کائنات ایک تکونی اکائی ہے۔ یہ حسن، عشق، ور ہجر سے تشکیل پاتا ہے لیکن تینوں ایک نقطے پر مل جاتے در بقول حضرت گیسو دراز عشق و عاشق و معشوق تینوں ایک ہو جاتے شری کرشن کا تصور مجاز اور حقیقت کا ایک انوکھا امتزاج ہے اور دونوں ایک ہو گئے ہیں اور حضرت کرشن کائنات کا وہ مرکز ہیں جہاں حسن عشق تحلیل ہو کر صرف کنہیا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ شری کرشن کے اسی تصور پر بزرگ شیدا ہیں۔ اُن کی حیثیت کے لیے کرشن اظہار اور ابلاغ کا ذریعہ اتے ہیں۔ یہ اظہار تمام تر علامتی ہے اور علامتوں کی روشنی میں ہی ان بزرگوں کے کلام کو پرکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

بانسے کے قرب و جوار میں واقع درگاہوں کی زیارت اور صوفیہ بزرگوں ہندی کلام سے روشناسی شری کرشن کی طرف حسرت کو مائل کرنے ہیں ہو سکتی ہیں ممکن ہے کہ حسرت کی طبیعت کا یہ رنگ محض بزرگوں کی روایت ردی ہی ہو۔ لیکن جس شدتِ جذبات سے انھوں نے شری کرشن کا ذکر اپنی ی میں کیا ہے اور ان سے جس ذاتی اور روحانی تعلق کا وہ بار بار اظہار تے ہیں اُس سے صاف ظاہر ہے کہ اس قسم کی والہانہ عقیدت محض روایت باہ سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس سے ذاتی جان پہچان کی بو آتی ہے۔ شری ہے سے حسرت کی یہ جان پہچان یقیناً گیتا کے ذریعہ ہوئی تھی۔ انھوں نے ! گیتا پڑھی تھی۔ اس بات کا واضح اشارہ ان کے ایک شعر میں ملتا ہے۔

رہندو کا مضبوط ہے جی ، گیتا کی یہ بات ہے دل پہ لکھی
خر میں جو خود بھی کہا ہے یہی ، پھر آئیں گے مہراج تلک

اس شعر میں صاف طور پر یہ بات بھی انھوں نے کہی ہے کہ گیتا کی اس کا انھوں نے مطالعہ کیا ہے جسے تلک نے لکھا تھا۔ گیتا میں بھگتی مارگ مارگ اور کرم مارگ کا فلسفہ ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ہر تفسیر والے نے اپنے نظریہ کے مطابق کسی ایک پہلو پر زور دیا ہے۔ تلک اپنی تفسیر میں کرم مارگ پر بے حد زور دیا ہے۔ کرم مارگ حسرت کے ذہن بیل کرتا ہے اور اس پیغام کو وہ قرآن کے عین مطابق پاتے ہیں۔ کلیات ت کے مرتب نے بھی اس بات کا اقرار ان الفاظ میں کیا ہے "ان کا تھا کہ گیتا میں وراگ اور تیاگ پر زور نہیں دیا گیا ہے بلکہ شری کرشن ی کرم یوگ کے فلسفہ کی تبلیغ کرتے تھے۔ اس لیے ان کے نزدیک اسلام اور گیتا کی تعلیمات میں جا بجا یکسانیت پائی جاتی ہے۔" ہمارے خیال میں اسلام اور گیتا کی تعلیمات کی مماثلت کا تصور وہ اصلی محرک ہے جس نے حسرت کو شری کرشن کا گرویدہ بنایا اور وہ بھی ان کی بانسری کی دھن پر رقص کر اٹھے۔ انھوں نے یقیناً گیتا کا مطالعہ تلک کے انتقال کے قبل کیا تھا کیونکہ اس کا اشارہ انھوں نے تلک کے انتقال پر لکھے اپنے اشعار میں کیا ہے۔

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ صوفیہ نے شری کرشن بھگتی کی اصطلاحات کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور اسے صوفیانہ معنویت سے مالا مال کیا ہے۔ اُن کا طریقہ اظہار علامتی ہے اور صوفیوں میں مستند علامتوں کی روشنی میں ہم حسرت کے عشق شری کرشن کو پرکھنے کی کوشش کریں گے۔ ان علامتوں کو ایک صوفی بزرگ حضرت عبدالواحد بلگرامی نے اپنی فارسی تصنیف حقائق ہندی میں مدلل طور پر بیان کیا ہے۔ اُن کی یہ کتاب ۶۷-۱۵۶۶ء میں لکھی گئی تھی۔ حقائق ہندی کی روشنی میں کلام حسرت کو سمجھنے کی جسارت ہم یہاں کر رہے ہیں۔

شری کرشن جی سے متعلق حسرت کے ہندی اور اردو اشعار میں شری کرشن اور اُس کے مترادف کنھائی، بنواری، مراری، گردھاری، بہاری، شیام، شام، برج موہن، منموہن، نند لال جیسے الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ حضرت عبدالواحد بلگرامی کا کہنا ہے کہ شری کرشن اور ان کے نام کے مترادف سے صوفیہ کی مراد رسالت پناہ سے ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ان الفاظ سے صرف انسان بھی مراد لیا جاتا ہے۔ کبھی اس سے ذات اور انسان کی وحدت کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور کبھی کبھی بتِ ترسا بچہ اور مغ بچہ کے معنیٰ میں بھی ان کا استعمال ہوتا ہے۔ حسرت کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ان الفاظ کے ذریعہ حقیقت المحمدیہ کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن عام طور سے ذات اور صفات کی وحدت کے اظہار کا کام انھوں نے ان الفاظ سے لیا ہے۔ شری کرشن کی شخصیت میں مجاز اور حقیقت کا امتزاج ان کے لیے بہت ہی دلکش ہے۔ حسرت نے خاص طور سے کنھیا لفظ کا استعمال معشوق کے مترادف کے طور پر کیا ہے۔ یہ اُن کی اپنی ندرت ہے۔ اس کا واضح اشارہ اُن کی ایک ہندی نظم میں ملتا ہے :

بغدادی دیا لو کھویّا ہم ہوں گریب ہیں پار جویّا
برہا کی ماری نپٹ دکھیاری
تاکن کب لگ دور سے نیّا
پار اُتار پیا سے ملاؤ رزاق پیا' بانسے نگریا کے بسیا
بانسے نگر کے فرنگی محل کے
ایکی نام کے دوئی کنھیّا
رزاق دہاب پیا بن حسرت ہمری تبھا کا ہے کون سنیّا

(ترچھی نظر لکھنؤ ۲ر فروری ۲۴ء)

حسرت کے اشعار میں متھرا، گوکل، بندرابن، برسانہ اور نندگام جیسے مقامات کا ذکر آیا ہے۔

متھرا کہ نگر ہے عاشقی کا — دم بھرتی ہے آرزو اسی کا
ہر ذرۂ سرزمینِ گوکل — دارا ہے جمالِ دلبری کا
برسانہ و نندگاؤں میں بھی — دیکھ آئے ہیں جلوہ ہم کسی کا
پیغامِ حیاتِ جاوداں تھا — ہر نغمہ کرشن بانسری کا
وہ نورِ سیاہ تھا کہ حسرت
سرچشمہ فروغِ آگہی کا

حضرت عبدالواحد بلگرامی کے مطابق برج، گوکل وغیرہ الفاظ اگر ہندوی کلام میں آئیں تو ان سے عالم ناسوت، کبھی عالم ملکوت یا کبھی کبھی عالم جبروت سے مراد لینی چاہیے۔ متھرا سے عارفوں کے غیر مستقل مقام کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے یہ مقام عالم ناسوت ہے اور یہاں سے سفر کر کے سالک دائمی مقام میں پہونچتا ہے جو عالم ملکوت اور عالم جبروت میں ہے لیکن حسرت ہمیں گوکل، برسانہ، نند گاؤں میں گھومنے کے بعد متھرا میں مقام کرتے ملتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ متھرا اُن کا دائمی مقام ہے اور یہ عالم ملکوت کے مترادف ہے۔ دوسرے مقامات سے ان کا سفر شروع ہوتا ہے اس لیے انھیں عالم ناسوت کی علامت ہی سمجھنا چاہیے۔ صوفیا کے یہاں شہر کی اصطلاح وجودِ مطلق کے کثرت میں ظہور کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

اپنی اس غزل میں حسرت نے پیغام، بانسری اور نورِ سیاہ کی اصطلاحات کا بھی استعمال کیا ہے۔ صوفیانہ اصطلاح میں پیام اور پیغام اُن چند کلماتِ مخصوصہ کو کہا جاتا ہے جو معشوق کی طرف سے عاشق کو سُنائے جاتے ہیں۔ اس طرح حسرت نے خود کو عاشق اور شری کرشن کو معشوق تصور کیا ہے کیونکہ پیغامِ حیاتِ جاوداں انھیں شری کرشن سے ملا ہے۔

تجلیات کے بہت سے رنگ صوفیا نے بتائے ہیں۔ اُن کی اصطلاح میں نورِ سیاہ یا نیلا بائیں جانب سے ظاہر ہو تو اُسے تجلّیٔ نفس سمجھنا چاہیے۔ ان بزرگوں کے مطابق نفسِ کل حقیقتِ المحمدیہ ہے کیونکہ جملہ عالم کی حقیقت و ماہیت یہی ہے۔ حسرت کے لیے یہ نورِ سیاہ فروغِ آگہی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نورِ سیاہ کی اصطلاح حقیقتِ المحمدیہ کے مترادف کے طور پر استعمال کی گئی ہے۔

حقائقِ ہندی کے مصنف کے مطابق بانسری یا اس کے مترادف اس بات کی علامت ہیں کہ یہ ساری کائنات اُسی وجودِ مطلق کی موسیقی کی آواز ہے۔ بین کا بھی مترادف ہے۔ حسرت نے شری کرشن کی بانسری کو انھیں معنیٰ میں استعمال کیا ہے۔ اُن کی بانسری حیاتِ جاوداں کا نغمہ سناتی ہے۔ مولانا روم کی نے

کی طرح ہجر کی داستان نہیں دہراتی۔

انھیں اشاروں سے رچے بسے جذبات کا اظہار حسرت نے اپنے ایک ہندی گیت میں بھی کیا ہے۔

من تو سے پریت لگائی کنھائی — کاہو اور کی سرت اب کاہیکا آئی
گوکل ڈھونڈھ بندرابن ڈھونڈھا — برسانے لگ گھوم کے آئی
تن من دھن سب وار کے حسرت — متھرا نگر چلی دھونی رمائی

(زمانہ کانپور، اکتوبر ۲۳ء)

صوفیا کی اصطلاح میں تیوہاروں جیسے دیوالی یا ہولی کے ذکر سے عشق کے لطف و انبساط کی کیفیت مراد لی جاتی ہے۔ یہ کیفیت معشوق کی مہربانی میسر ہوتی ہے لیکن چونکہ عاشق پر کرم کی یہ نظر کبھی کبھی ہوتی ہے اس لیے اس کی تاب نہیں لا پاتا۔ ہولی پر اشعار لکھ کر صوفیا نے اسی جذبے کی عکاسی کی ہے۔ ذات کے مختلف صفات و افعال و آثار میں ظاہر ہونے کو رنگ کہتے ہیں۔ حسرت کی ہولی میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے:

مو پہ رنگ نہ ڈار مراری — منتی کرت ہوں تہاری
پنیا بھرن کاہ جائے نہ دیہیں
شیام بھرے پچکاری
تھر تھر کانپت لاجن حسرت — دیکھت ہیں نر ناری

(۱۲ر مارچ ۲۴ء)

برہ، برکھارت اور بدریا کاری جیسی صوفیانہ اصطلاحات کا استعمال حسرت نے اپنے ایک گیت میں کیا ہے۔

کہاں جائے رہے گردھاری — اورن مل سدھ بھول ہماری
رووت دھووت تلپھت بلکت
برہ کی رین گئی کٹ ساری
جیا جات برکھارت حسرت — دیکھ دیکھ بدریا کاری

حضرت بلگرامی نے فرمایا ہے کہ برکھارت سے اُس عشق اور معارفت کی طرف اشارہ ہوتا ہے جس کا ذکر اس حدیث میں ہے "میں نے دوسرا بنایا اس وجہ سے کہ میں پہچانا جاؤں"۔ بدری غمام کے مترادف ہے۔ اس سے مراد وہ حدیث لی جاتی ہے جس کے مطابق تخلیقِ کائنات سے پہلے خدا مطلق ہلکے بادلوں میں تھا جس کے اوپر اور نیچے ہوا نہیں تھی۔ اس لفظ سے ثانوی حقیقتیں بھی مراد لی جاتی ہیں۔ کاری ظلمت کا مترادف ہے اور صوفی کی اصطلاح میں جو ادراک میں نہ آوے وہی ظلمت ہے۔ برہ یا ہجر کی تین قسمیں ہیں۔

عام سالک کے لیے یادِ خدا سے غفلت ہجر ہے، بندگانِ خاص کے لیے کبھی خودی کا دھیان ہجر ہے اور جو صوفی بقا باللہ کی منزل تک پہونچ جاتے ہیں اُن کے لیے اُن کا وجودِ خاکی ہجر ہے۔ اپنے اس گیت میں حسرت نے ہجر

کیفیت کو رودھوکر بھوگ لیا ہے اور ہلکے بادلوں میں پوشیدہ معشوق حقیقی کو دیکھنے کے خواہش مند بھی ہیں اور خوفزدہ بھی۔ حسرت نے حضرت ابوالحسن خرقانی کے قول کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بھی سبز بادل ذکرِ مولا اور اہلِ دل میں محبت کے محرکات کی علامت ہے اور ابرِ سفید سے پاکانِ دُنیا و آبِ رحمت مقصود ہے

بادہ و ساغر کہے بغیر اگر غالب کی بات نہیں بنتی ہے تو خوشبو و قبا کہے بغیر حسرت کا کام بھی نہیں چلتا۔ اس کا ذکر کسی نہ کسی طرح ان کی بیشتر غزلوں میں موجود ہے۔ یہاں مثالاً چند اشعار پیش ہیں۔

جنت کی ہوس ہو تو ہیں کافر، کہ پریشاں
اس شوخ کی خوشبوئے قبا میرے لیے ہے

★

راہِ جنت سے پھری عاشقِ مہجور کی روح
کچھ عجب چیز تھی اس بوئے قبا کی تاثیر

خوشبو یا اس کے دوسرے مترادف سے صوفی عشق سے لبریز دل کی خوشبو مراد لیتے ہیں۔ ابن عربی کے مطابق نفس کی قبا شریعت ہے، قلب کی طریقت، سِر کی حقیقت، روح کی عبودیت اور خفی کی محبوبیت ہے۔ حسرت کے کلام میں قبائے محبوبیت کا ذکر زیادہ ہے۔ انگیا اور کنچکی وغیرہ ملبوسات سے ہندی شاعری میں صوفیہ نے احوالِ عشق اور مقاماتِ معرفت کی نشاندہی کی ہے۔ اس طرح حسرت کی شاعری میں خوشبو اور قبا بھی اپنے علامتی معنیٰ میں استعمال ہوئے ہیں اور اُن کے عرفان کے مقامات کے تعین میں مددگار ہیں:

عرفان عشق نام ہے میرے مقام کا
حامل ہوں کس کے نغمۂ لے کے پیام کا

حسرت کی شاعری صوفیانہ اصطلاحات سے بھری ہوئی ہے۔ کہیں وہ اُن کا استعمال فنی چابکدستی سے کرپائے ہیں اور کہیں ان کی قے کرنے لگ جاتے ہیں۔ انھوں نے غیر شاعرانہ اصطلاحات سے بھی پرہیز نہیں کیا۔ وہ جنونِ محبت کے دیوانے ہیں۔ اُن کے سر میں سودائے حکمت نہیں ہے۔ حکمت بھی ایک صوفیانہ اصطلاح ہے جس سے مراد علم شریعت و طریقت ہے۔ وہ عشق میں سرمست تھے لیکن ریاضت، ذکر و فکر، ضرب حبس دم اور انفاس کے پابند نہیں تھے۔ وہ اپنے عشق کے ذریعہ اس مقام پر پہونچ گئے تھے جہاں دوسرے مشق و کوشش سے پہنچنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ عالم رویا میں انھیں رسول اکرم کی زیارت ہونے لگی تھی۔ گویا وہ صوفیوں کی زبان میں فنا فی الرسول کے درجے پر پہونچ چکے تھے۔ وہ اپنے اشعار میں کسی موجود سے ہم کلام نظر آتے ہیں۔ جیل کی تنہائی میں کسی کی موجودگی اور اس سے ہمکلامی زنداں کی کلفت کو اُن کے لیے بہشت بنادیتی ہے:

ہوتی ہے روز بارشِ عرفاں مرے لیے
گویا بہشتِ عشق ہے زنداں مرے لیے

حسرت نے اپنا بہت ہی مناسب تجزیہ کیا ہے:

خلوت میں وہ میخوار ہے جلوت میں نمازی

ان کی شاعری کو اسی پیمانے سے ناپنا چاہیے اور اپنی جذب کی حالت کو ہی انھوں نے زیادہ تر شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ اسی لیے خلوت میں میخواری اُن کی سِری کرشن پرستی کی غماز ہے۔

محمد عزیز الرحمٰن

# اکبر — حسرت موہانی کے معلمِ سیاست

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی نے جب دنیائے آب و گل کی دشت نوردی کا آغاز کیا اس وقت تک برصغیر ہند میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور تحریکِ ولی اللہی (وہابی تحریک) کے شعلے مدھم پڑ چکے تھے۔ سرزمین ہند میں برطانوی تسلط مستحکم ہو چکا تھا۔ کوئن وکٹوریہ کو "ملکۂ معظمۂ ہند" بنے تقریباً چوتھائی صدی کا زمانہ گذر چکا تھا۔ ہر دل پر قوتِ بازو اور دانش وری افرنگ کی رعونت کا سکہ بیٹھ چکا تھا۔ ہر آنکھ تہذیب و تمدنِ مغربی کی نیرنگیوں سے خیرہ ہو چکی تھی، اور محکومیت اور غلامی کو نوشتۂ تقدیر کے طور پر تسلیم کر چکی تھی۔ لیکن اس طاغوتی نظامِ سلطنت کے اندر چند بیدار اذہان ایسے بھی تھے جن کے اندر حریت کی رمق باقی تھی اور جو سموم فضا کی قید سے آزادی کے لیے تڑپ رہے تھے۔

نامساعد حالات اور کشمکشِ روزگار نے اہل ہند کو تین مختلف طبقات میں منقسم کر رکھا تھا۔ پہلا طبقہ ان حقائق پسند افراد پر مشتمل تھا جو غلبۂ افرنگ اور غلامیِ ہند کو روزِ روشن کی طرح ایک زندہ حقیقت کی شکل میں تسلیم کر چکے تھے۔ ان کے لیے ایسے ناگفتہ بہ حالات میں آقایانِ فرنگ کی جبہ سائی، ہمنوائی، خوشنودی و ہمرکابی کے سوا چارۂ کار نہ تھا۔ اپنے نصب العین کے حصول کے لیے یہ تمام سیاسی تحریکات سے دامن بچائے، نئی نسل کو علومِ جدیدہ سے آراستہ کرنے میں ہمہ تن مصروف تھے۔ اس طبقہ کی سربراہی سرسید احمد خاں اور ان کے رفقائے کار کے ہاتھوں میں تھی۔

دوسرا طبقہ ان محبانِ وطن کا تھا جو غیر ملکی تسلط کے اندر رہ کر محض چند آئینی اصلاحات اور داخلی مراعات کے متمنی تھے۔ اس عہد کے کانگریس کے بیشتر رہنما دادا بھائی نوروجی اور مہتہ وغیرہ انہیں مقاصد سے سرگرمِ عمل تھے۔ تیسرا طبقہ البتہ ایسے حریت پسند افراد کا تھا جو ہندوستان کی سیاسی غلامی، معاشی بدحالی، معاشرتی پستی اور ذہنی استحصال کے لیے غیر ملکی حکومت کو موردِ الزام قرار دیتے تھے۔ اسی لیے یہ ہر حال میں انگریزوں کے انخلا، غیر ملکی حکومت کے خاتمہ اور آزادیِ کامل کے لیے کفن بردوش ہو کر سرگرمِ عمل تھے۔ اس طبقہ کے فکری اور عملی افکار و عوامل میں تازہ خون تحریکِ ولی اللہی کے پروردہ علما، ادبا، شعرا اور مغربی بنگال کے مظلوم افراد پہنچا رہے تھے۔ اکبر الٰہ آبادی کی تربیت اسی مکتبِ فکر کے زیرِ سایہ ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ نئی نسل کے افکار و عوامل کی تہذیب و تربیت اور تزئین و تجمیل میں ہمہ تن مصروف تھے۔ لالہ لاجپت رائے کی حراست پر اکبر کے ان اشعار نے اس عہد کے نوجوانوں کے لیے تازیانۂ عبرت کا کام کیا ؎

لاجپت بھی ہوئے شاید کہ اسیر و محزوں<br>
پائے کوہاں کوئی زنداں میں نیا ہے مجنوں<br>
آئی آوازِ سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

اکبر نے پہلی بار اپنے اشعار کے ذریعہ تحریک سودیشی کا صور پھونکا جس پر ملک کے سیکڑوں ہزاروں لوگوں نے لبیک کہا۔ بنگال کی سودیشی تحریک جو ۱۹۰۷ء میں وجود میں آئی، انہیں افکار و تربیت کا نتیجہ تھی۔ تاریخ ہند میں اس تحریک کو تقسیم بنگال کی مخالفت سے تعبیر کرنا حریت پسند اذہان کی بے وقعتی کے مرادف ہے۔ آزادیِ ہند اور تحریکِ سودیشی کی حمایت میں جن جوانوں نے کفن بردوش حصہ لیا ان میں بال پال اور لال سرزمینِ بنگال کے سپوت بال اور پال (بپن چندر پال) اور پنجاب کے لالہ لاجپت رائے کے نام سرفہرست ہیں۔ جو تاریخِ آزادیِ ہند میں کانگریس کے گرم دل کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ حسرت موہانی نے اپنے فکر و عمل میں کانگریس کے ان گرم فریقوں کے ساتھ اپنی دائمی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔

"ہمارے خیال میں عقیدہ، قطعِ نظر اس کے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی، ایسی چیز ہے جس کو محض خوف اور مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کرنا اخلاقی گناہوں میں ایک بدترین گناہ ہے........ ہم پالیٹکس میں مسٹر تلک اور سرگروہ احرار بابو اروند گھوش کی پیروی اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں ........ گرم فریق کے رہنما........ اپنی تمام پولیٹکل کوششوں میں مذکورہ بالا اصول کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ ہمارے نزدیک حق پر ہیں۔" (اردوئے معلی، اکتوبر ۱۹۰۹ء)

کاشانۂ عزیز، ۲۲، جبار چک، بھاگل پور ۸۱۲۰۰۲ (بہار)

حسرتؔ کی تعلیم و تربیت علی گڑھ کے اس مکتبِ فکر میں ہوئی تھی جہاں
یانِ فرنگ کے اشارۂ چشم و ابرو پر جاں نثاری اور جاں سپاری حاصل کائنات
ان کے نقشِ قدم کی پیروی اور ذہنی، فکری اور عملی تقلید کو جزو ایمان سمجھا جاتا تھا
جہاں کسی بھی سیاسی تحریک کی حمایت کفر تھی۔ حیرت ہے کہ اسی صنم خانۂ ہند
ے حریت کعبہ کو حسرتؔ جیسا پاسبان کیسے مل گیا؟ جس نے نہ صرف سر سید
بنائی ہوئی ڈگر پر چلنے سے صاف انکار کر دیا بلکہ ملکی سیاست میں علی گڑھ کے
دِعمل کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کی۔ جس کے نتیجے میں انہیں حکومت
ے آہنی ہاتھوں نے علی گڑھ کا پہلا باغی قرار دے کر کالج سے نکالنے اور قید و بند
صعوبتوں سے دبانے کی کوشش کی۔ لیکن حسرت کے یقین محکم اور عمل پیہم کے
منے یہ حربہ کارگر نہ ثابت ہو سکا اور حسرتؔ کے دل میں حریت و وطن کا جذبہ اور
ں قوی تر ہوتا گیا۔

ان عوامل و افکار کی تلاش بھی ناگزیر ہے کہ ایسے جابرانہ نظام کے اندر
ر بھی حسرتؔ کے صنم خانۂ دل میں "نجات ہند کی آرزو" کا دیا کس طرح روشن ہوا؟
ر "نجاتِ ہند" کا سودا ان کے سر میں کب اور کیوں کر سمایا؟

ہم اس عہد کے کاملینِ ادب اور مفکرینِ سیاست کے کارناموں پر غائر نظر
یں تو ہمیں ان سوالوں کا جواب مل سکتا ہے ؎

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی
کہیں چھپتا ہے اکبرؔ پھول پتوں میں نہاں ہو کر

حسرتؔ کے ایک پیشرو اور مربی سید اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی (۱۸۴۵ء - ۱۹۲۱ء)
اپنے ساحرانہ اشعار کے ذریعہ آزادیِ وطن کا چراغ برسوں پہلے روشن کر رکھا تھا
کے طنزیاتی تیروں نے برطانوی استبداد کا سینہ چھلنی کر دیا تھا اور ان کے افکار
نظار کے ارتعاش نے ہزاروں قلب و نظر کو منور کر دیا تھا۔ علی گڑھ طریقۂ کار جن کے نزدیک
ل مذمت تھا اور برطانوی استحصالِ ذہنی اور فرنگی زرکشی کا انہیں شدید احساس تھا ؎

یہ بات غلط کہ ملکِ اسلام ہے ہند
یہ جھوٹ کہ ملکِ لچھمن و رام ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہِ انگلش
یورپ کے لیے بس ایک گودام ہے ہند

---

جس روشنی میں لوٹ ہی کی آپ کو سوجھے
تہذیب کی میں اس کو تجلی نہ کہوں گا
لاکھوں کو مٹا کر جو ہزاروں کو ابھارے
اس کو تو میں دنیا کی ترقی نہ کہوں گا [۱]

طانوی استحصال و زرکشی پر جتنی گہری نظر اکبر الٰہ آبادی کی تھی سر سید احمد خاں
کی نظر اتنی دور تک نہیں دیکھ پائی تھی

"سر سید کو غالباً غیر ملکی سرمایہ دارانہ استحصال کا پوری طرح علم نہ تھا
ورنہ وہ انگریزوں سے اتنی توقعات وابستہ نہ کرتے" [۲]

اکبرؔ نے ایسی فدویانہ ذہنیت کو اپنے طنزیاتی تیروں کا نشانہ بنایا ؎

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

رشید احمد صدیقی کہتے ہیں:-

وہ (اکبرؔ) سر سید سے آگے دیکھتے تھے اور ان سے زیادہ دیکھتے
تھے..... سر سید جس طرح اور جس حد تک مغربیت سے متاثر
تھے۔ اس سے نہ حالیؔ کو اتفاق تھا نہ شبلیؔ کو نہ نذیر احمد کو..... لیکن
پچاس سال بعد معلوم ہوا کہ جہاں تک مغربیت سے احتیاط برتنے کا سوال
تھا سر سید اور سید امیر علی دونوں سے یہ طبقہ زیادہ صاحب نظر نکلا...
سر سید کا سالک "مقامات میں کھو گیا" سر سید جس مغربیت کے حامی
تھے اس نے بالآخر خود اپنے سے پناہ مانگنی شروع کر دی....." [۳]

ہندوستان کی صنعت و حرفت اور تجارت کی زبوں حالی اور معاشی پستی کے لیے اکبرؔ
برطانوی نظام حکومت کو موردِ الزام ٹھہراتے، علوم جدید کے حصول کے موجودہ طریقۂ
کار کو قومی روح کے لیے سمِ قاتل اور کالجوں کو برطانوی کلرک سازی کا کارخانہ اور
ظالم و جابر حکومت کی خدمت گذاری کو ذہنی غلامی قرار دیتے تھے۔

یہ اکبرؔ کے مکتبِ فکر ہی کی کرامت کہی جا سکتی ہے جس نے مولینا فضل الحسن حسرتؔ موہانی
کے دائرۂ فکر و عمل کو وسیع سے وسیع تر بنا دیا۔ حسرتؔ نے جہاں ایک طرف اربابِ
علی گڑھ کی آقا پرستی کا مشاہدہ کیا تھا وہیں انہوں نے مغرب کی لائی ہوئی لعنتوں کا بھی بھرپور
تجربہ کیا تھا۔ ایم، اے۔ او کالج کے تلخ و تند ایامِ زندگی کی بھٹی نے حسرتؔ کے مشاہدات و
تجربات کو تپا کر کندن بنا دیا، جس کی روشنی میں انہوں نے جو لائحہ عمل اور جس عملی
زندگی کے لق و دق میدان کا انتخاب کیا، اس کا سلسلہ فکر اکبرؔ کے افکار و انظار سے
جا ملتا ہے۔ اکبر ہی کی طرح حسرتؔ کے نزدیک غیروں کی جدوجہد پر تکیہ کرنا
گناہِ عظیم تھا اور خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا موجبِ ننگ و عار۔ وہ
اردوئے معلی ستمبر ۱۹۰۳ء کے شمارہ تین میں سر سید کی گذشتہ پالیسیوں کا تذکرہ کرتے
ہوئے مسلمانوں کو دعوتِ فکر و عمل دیتے ہیں:-

"... ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا زمانے کی اب بھی وہی حالت
ہے جو سر سید کے وقت میں تھی۔ ہم کہتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر ننگ و عار
کا موجب کون امر ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی فلاح و بہبود کے لیے
خود کوشش نہ کریں بلکہ دوسروں کی حمایت پر بھروسہ رکھیں
اور اپنے جائز حقوق کے طلب کرنے سے صرف ایک خیالی نفع

---

[۱] کلیات اکبر، حصہ اول ص ۳۰۸
تبکل، نئی دہلی۔

[۲] معین احسن جذبی: حالی کا سیاسی شعور ص ۲ [۳] علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر ص ۱-۹

کی امید کی وجہ سے باز رہیں ۔"[1]

یہی وہ اوامر ہیں جو حسرت اور اکبر کے یہاں قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ارباب علی گڑھ کا طریقۂ فکر و عمل اور سیاسی تحریکاتِ ملکی سے روگردانی دونوں ہی کے نزدیک قابلِ مذمت ہیں۔ حصولِ آزادیٔ ہند کی راہوں میں اس عہد کے کانگریسی رہنماؤں کی اعتدال پسندی، دریوزہ گری اور فدویانہ طرزِ عمل سے دونوں ہی متنفر تھے۔ سودیشی تحریک کی فکری اور عملی حمایت اور حریت پسند افراد کی حوصلہ افزائی دونوں کے لیے طرۂ امتیاز تھا۔ اس طرح اکبر الٰہ آبادی حسرت موہانی کے پیشرو ہونے کی وجہ سے حسرت کے مربی اور معلمِ سیاسی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سودیشی تحریک کے سلسلے میں حسرت موہانی کے کارہائے نمایاں تاریخ ہند کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ لیکن اس حقیقت کا انکشاف تاریخ تحریک آزادیٔ ہند کے لیے باعثِ صد امتنان و تشکر ہوگا کہ حسرت کے سودیشی تحریک اور دیگر عوامل اکبر الٰہ آبادی کے فکر و نظر اور ہدایات کے رہینِ منت ہیں۔ کلیاتِ اکبر میں حسرت موہانی کے نام اکبر کا ایک منظوم مراسلہ مرقوم ہے ؎

تھا دلِ حسرت بھرا ارمان میں
ہم نے لکھ بھیجا انہیں موہان میں
بھائی صاحب رکھ دو تم اپنا قلم
ہاتھ میں لو اب تجارت کا علم
ہو چکی غیروں سے خویشی کی بہار
بس دکھاؤ اب سودیشی کی بہار
کام کو اٹھو چڑھاؤ آستین
لَا یُضِیعُ اللّٰہُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ

اس منظوم مراسلے کی بنیاد پر ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حسرت نے فکر و عمل کے میدان میں اکبر کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کیا۔ ان کے دل میں نجاتِ ہند کی آرزو، ظالم و جابر حکومت کی ملازمت سے روگردانی کا جذبہ اور ملکی مصنوعات و تجارت کے فروغ کی لگن ــــ اکبر کی فکر و نظر کی مرہونِ منت ہے۔

اگرچہ سودیشی تحریک ۱۹۰۵ء کی تقسیم بنگال کی مخالفت کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آئی لیکن اکبر کی تحریک سودیشی کی روح بنگال کی سودیشی تحریک سے قدرے مختلف تھی۔ غیر ملکی مصنوعات کے مقاطعے، دیسی مصنوعات کا استعمال اور قومی تجارت کے فروغ کے ذریعہ برطانوی زرکشی کی راہیں مسدود کر کے انگریزوں کا انخلا اکبر کے فکر و نظر میں اس تحریک کی اصل روح تھی۔ سودیشی تحریک کی اساس جن خیالات و نظریات پر تھی اس کے لیے ذہنی پس منظر اور اہلِ وطن کی قلب و نظر کی تہذیب و تربیت میں افکار و اشعارِ اکبر کی فسوں کاری نے غیر ملکی مصنوعات کی طلسماتی نیرنگیوں کے لیے "ردِ سحر" کا کام کیا ؎

دھن دیس کی تھی جس میں کاتا تھا اک دہاتی
بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

کے ذریعہ جو دعوتِ عمل دی تھی وہ تاڑنے والی قیامت کی نظروں سے تا دیر پنہاں نہ رہ سکی اور بالآخر طے یہ پایا کہ ملک کی فلاح و بہبود اور نجات ہند کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ اہل وطن صنعت و حرفت اور تجارت کے فروغ کی طرف آمادہ ہوں اور غیر ملکی مصنوعات کے مقاطعہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اسی لیے اکبر نے ببانگ دہل دیسی مصنوعات کے وسیع استعمال کی پر زور تلقین کی ؎

کیوں اپنے سر پہ زحمتِ بے سود لیجئے
کونسل کے بدلے گھر میں اچھل کود کیجئے
کھادی کے گھر میں بیٹھئے اور گائیے بھجن
کاشی سے جل پراگ سے امرود لیجئے

ہو وضع اپنے دیس کی مال اپنے دیس کا
بہتر ہے راہِ منزلِ بہبود لیجئے

اکبر نے نہ صرف تحریک سودیشی کی حمایت کی ہے بلکہ وہ اس تحریک کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں ؎

داخل مری دانست میں یہ کام ہے پُن میں
پہنچائیے گا قوت شجر ملک کی بُن میں
تحریک سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبر
کیا خوب یہ نغمہ ہے چھیڑا دیس کی دھن میں[2]

اس طرح اکبر الٰہ آبادی کو تحریک سودیشی اور تحریک ترک موالات کا باوا آدم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا

مولینا فضل الحسن حسرت موہانی جس بات کو درست اور حق سمجھتے اس پر خود عمل کرتے اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کی ترغیب دیتے۔ سودیشی تحریک کے باب میں اکبر کے ہدایات و ارشادات کا ان پر فوری اثر ہوا کہ "انہوں نے اپنے اور متعلقین کے اوپر غیر ملکی مصنوعات کو حرام کر لیا اور اس کے بعد اس تحریک کو وسعت دینے میں مصروف ہو گئے ۔"[3] "اور اکثر ایسا بھی ہوا کہ رات سردی میں کاٹ دی اور پائتانہ میں (میزبانوں کے ذریعہ) رکھے بدیسی کمبل کو ہاتھ نہیں لگایا"

سودیشی تحریک کے مقاصد کے حصول اور اس کی کامیابی کا راز اس امر میں پوشیدہ تھا کہ نظر کو خیرہ کرنے والی تہذیب حاضر کے جھوٹے نگوں کی برتری کو بے نقاب کر کے یورپ کی ذہنی برتری کی ردائے مرعوبیت کو چاک کر دیا جائے اور دیسی مصنوعات کی اہمیت اور قدر و قیمت کی طرف اہل وطن کو راغب کیا جائے

[1] کلیات اکبر حصہ اول ص۱۳۱ [2] حالات حسرت ص۲۷ [3] سید سلیمان ندوی معارف

مصنوعات کا انخلا اور ملکی تجارت کامیابی سے ہمکنار ہو سکے۔ اکبر نے
برتری کے رازہائے سربستہ سے مسلمانوں کو روشناس کرایا اور تجارت
ت پر زور دیا اور اس کے ذریعہ اپنی ترقی کی راہیں ہموار کرنے کی تلقین کی ؎

انگریز خوش ہے مالکِ ایروپلین ہے
ہندو مگن ہے اس کا بڑا لین دین ہے
بس اک ہمیں ہیں ڈھول میں پول اور خدا کا نام
بسکٹ کا صرف چور ہے لمنڈ کا چین ہے

ت اور کوشش ذاتِ خاص ۱ کا جو فلسفہ حسرت کو اکبر کے فکر و نظر کی روشنی میں ملا۔
ں کو حسرت نے بھی قوتِ بازو کے ذریعہ اپنی دنیا آپ پیدا کر کے زندگی گذارنے
ن دی ؎

غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوشش ذاتِ خاص پر ناز کر اعتماد کر

یابِ معلم اور خیر خواہ مربی کی حیثیت سے اکبر نے حسرت کو کارزار
کے تمام نشیب و فراز اور تحریک آزادیٔ ہند کے تمام رسم و راہِ منزل سے پوری
شناس کرایا اور اقوامِ عالم کی اصلاح و فلاح اور فلاکت و ادبار کے اسباب
ندھی کی ؎

پاتی ہیں قومیں تجارت سے عروج
بس یہی ان کے لیے معراج ہے
ہے تجارت واقعی اک سلطنت
زور یورپ کو اسی کا آج ہے
لفظ تاجر خود ہے اے اکبر ثبوت
دیکھ لو تاجر کے سر پر تاج ہے [۱]

م کی بس ابتدا ہی تھی کہ جب تجارت آپ نے کی ترک نوکری کر کے
ہند کی راہوں کے تمام مراحل اور دشوار گذار گھاٹیوں کے تعارف اور ان پر
نے کی راہیں جب متعین کر دی گئیں تو ایک سعادت مند اور بلند حوصلہ
کی طرح حسرت بحسب ہدایت "تجارت کا علم لیکر کارگہہ حیات میں کود پڑے
انہوں نے سودیشی تحریک میں عملاً حصہ اس طرح لیا کہ سودیشی اسٹور کے نام
سے سودیشی کپڑوں کی دوکان قائم کی اور چاہا کہ ملک میں اس کی
شاخیں جابجا قائم کی جائیں ...... ۔ ان کی تجارتی سرگرمی کو
دیکھ کر مولانا شبلی نے کہا تھا کہ "تم آدمی ہو یا جن؟ پہلے شاعر
تھے، پھر پالیٹیشین بنے اور اب بنئے ہو گئے۔" [۳]
اقتصادی خوشحالی اور معاشی خود کفالتی کی غیر موجودگی میں نجات ہند کا
خواب شرمندۂ تعبیر ہونا ممکن نہ تھا۔ اس لیے حسرت نے اکبر کی ہدایات کی روشنی
میں نہ صرف تجارت کا علم بلند کیا، بلکہ ملکی تجارت کے فروغ اور وسعت کے لیے
ملک کے مختلف مقامات کا دورہ بھی کیا اور بیشتر شہروں میں سودیشی مال کی دوکانیں
قائم کرائیں۔ اکبر نے ہندوستان کی ترقی کا جو راز ان پر ہویدا کیا تھا۔ انہوں نے
اس کے پیغام کو عام کر دیا۔ پرنسپل عبدالشکور لکھتے ہیں:-

"ملک کی سیاسی اور اقتصادی ابتری کی وجہ سے حسرت نے شروع
ہی سے سودیشی تحریک میں پورے اخلاص اور انتہائی سرگرمی سے
حصہ لیا اور اس کی تائید و حمایت کو اپنا اولین فرض تصور کیا......
اس تحریک کو مزید تقویت پہنچانے اور اس پیغام کو عام کرنے کے لیے
حسرت نے ایک سودیشی اسٹورس کی بنیاد ڈالی۔" [۴]

اکبر کے اشعار و افکار کی روشنی میں حسرت نے ظالم و جابر حکومت کی جبہ سائی سے
پرہیز، حقیقی ترک موالات، بدیسی مصنوعات کے مقاطعے کی تلقین، اپنے قوت بازو پر
بھروسہ، توقیر محنت، صنعت و حرفت اور تجارت میں کامیابی کا راز پایا حسرت
کہتے ہیں ؎

اٹھے ہیں جفا پیشگانِ مہذب
ہمارے مٹانے پہ تیار ہو کر
تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو
کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہو کر

ایک بیدار مغز اور ہوش مند سیاسی فرد کی حیثیت سے حسرت کی نظرِ دوررس
ان حقائق و شواہد کا مشاہدہ کر چکی تھی کہ یورپ کی تجارتی اور سیاسی عصبیت
اور تحکمانہ کبر و نخوت کے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ اہل ہند کی صنعت و
حرفت اور تجارت کو عروج ہو اکبر ہی کی طرح حسرت بھی اس راز سے واقف
تھے کہ دانایانِ فرنگ اس حقیقت سے غافل نہیں ہیں کہ ہندوستان کی صنعتی
بیداری ہندوستان میں غیر ملکی اقتدار کے لیے خطرات کا باعث بن سکتی ہے۔
اسی لیے ہندوستانی عوام کو علم و ہنر سے نابلد رکھ کر سرکاری دفاتر کی بھول بھلیوں
میں الجھائے رکھنا۔ ابتدا ہی سے آقایانِ فرنگ کی پالیسی رہی۔ مانچسٹر کے کاریگروں
کی خاطر ڈھاکہ کی ململ بنانے والے صناعوں کی دست بریدی سیاست افرنگ
کے اسی ذہن کی زندہ مثال ہے۔ ایسی مسموم فضا اور ایسے مخالف حالات میں بھی اکبر
اور حسرت دونوں ہی نے قوم میں خود اعتمادی پیدا کر کے ایسے علوم و فنون کے حصول
کی ترغیب دی اور صنعت و تجارت کے فروغ پر آمادہ کیا جن سے غیر ملکی اقتدار
کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جا سکے۔ آزادیٔ کامل کے حصول کے لیے اکبر ملک
کو خود کفیل دیکھنے کے متمنی تھے۔ سر شیخ عبدالقادر بار ایٹ لا نے بھی اکبر کی
ان مساعیٔ جمیلہ کا اعتراف کیا ہے:-

---

[۱] ...یات اکبر جلد اول، ص۵۸ [۲] کلیات اکبر حصہ دوم ص۲۹۹ [۳] نگار حسرت نمبر ۳ ص ۱۵۷ ء
...۵ء نئی دہلی۔

[۴] حسرت موہانی، عبدالشکور، ص ۱۷

"ان کے دل میں ہندوستان کی مادی ترقی دیکھنے کی خواہش تھی
اور وہ ملک کے صنعت و حرفت کو فروغ دینے کے حامی تھے"۔[1]

ملک کی اقتصادی ترقی حسرت کی نظر میں نجات ہند کے لیے ایک موثر ذریعہ تھی۔اس لیے انہوں نے ایک طرف اردوئے معلی کے ذریعہ اصلاح مذاق سیاست اور عامۃ الناس کے قلب و نظر کو صیقل کرنے کا بیڑا اٹھایا تو دوسری طرف جابر حکومت کی چاکری سے دامن بچاتے ہوئے فن و ہنر کے زور سے اقتصادی ترقی کی راہیں متعین کیں کہتے ہیں۔

قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنی ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر
اے کہ نجات ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو
ہمت سربلند سے یاس کا انسداد کر
خدمت اہل جور کو کر نہ قبول زینہار
فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر

حسرت کی جدوجہد آزادی کا یہ ایک نہایت ہی روشن باب ہے کہ وہ نہ صرف سامراجی طاقتوں کے خاتمہ اور انگریزوں کے انخلاء کے لیے زندگی بھر سرگرم عمل رہے بلکہ ملک کی معاشی بدحالی دور کرنے کے لیے تحریکیں بھی چلائیں۔ان کی ان کوششوں کے لیے اہل نظر نے انھیں ہمیشہ سراہا ہے۔

"ان کا خیال تھا کہ اقتصادی ترقی ایک بااثر ذریعہ ہے چنانچہ
اس عقیدے کی بنا پر انہوں نے اس تحریک کا بڑی گرم جوشی
کے ساتھ خیر مقدم کیا اور اس کو سرسبز کرنے کے لیے انہوں
نے اپنی عملی جدوجہد اس تحریک کے لیے وقف کردی"۔[2]

سلطنت علی گڑھ سے حسرت کی بغاوت کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بھی مروجہ طریقہ تعلیم کو اکبر کی طرح "کلرک سازی کا کارخانہ" سمجھتے تھے۔ جسے لارڈ میکالے نے حکومت برطانیہ کو سستے عمال ہمدست کرنے کے لیے ۱۸۳۵ء میں رائج کیا تھا اور جہاں قلب و نظر کا شکار کرکے آقایان فرنگ کی تملق بازی اور دریوزہ گری کی تعلیم دی جاتی تھی۔اسی لیے اکبر کی نظر میں:۔

"موجودہ طریقہ تعلیم میں ترمیم کی بہت ضرورت ہے۔اس نے
ہمیں نکما، بزدل اور پست بنا دیا۔اس تعلیم کو حاصل کرتے ہوئے
ہم کو ایک صدی گذر گئی اور اب تک اپنے ہاتھ سے ایک سوئی
بنانا نہیں آیا۔آئی تو خوشامد اور ضمیر فروشی۔"[3]

سرسید کے ایم۔اے۔او کالج کی راہیں مسلمانوں کے صرف ایک مخصوص طبقے کے لیے کھلی ہوئی تھیں اور عامۃ المسلمین کی کثیر تعداد علوم جدیدہ سے بے بہرہ تھی۔ اور جن لوگوں کی تعلیم وہاں جاری تھی انہیں نہ صرف "ادبی ذوق سے محروم ا
سیاسی بصیرت سے نابلد رکھا جاتا تھا بلکہ زیادہ زور ایسے وضع و لباس، آداب کھیل اور ورزشوں پر دیا جاتا تھا جن کے ذریعہ سے انگریز حاکموں کی خوشنو
اور قربت حاصل ہوسکے"۔[4]

سرسید احمد خاں جن دنوں مسلمانوں کو متذکرہ اعلیٰ تعلیمات سے مزین آراستہ کرنے میں سرگرم عمل تھے، اکبر الہ آبادی اس وقت بھی قوم کو فلاکت و
کے قعر مذلت سے نکالنے کے لیے ٹکنیکل تعلیم کی طرف راغب کرنے کی کوشش
تھے۔

دوڑاؤ تدبیر کے ریشے ؎ قوم میں پھیلیں فن اور پیشے
صناعی کے چلاؤ تیشے ؎ تاکہ کٹیں افلاس کے بیشے
انجینیری نہ آئے تو ایجاد کیا کریں ؎ قائم عروج قوم کی بنیاد کیا کریں
خامے سے کام لیتے ہیں بیکار عقل ہے ؎ یا ترجمہ ہے یا تو کتابوں کی نقل ہے

اس کے برعکس سرسید ٹکنیکل تعلیم کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کی راہوں میں سم ق
سمجھتے تھے۔معین احسن جذبی سرسید کی تعلیمی پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے ہیں:۔

انہوں نے ٹکنیکل ایڈوکیشن کی بھی شدید مخالفت کی اور اس کی
وجہ یہ بتائی کہ اس سے ہائی ایجوکیشن میں خلل پڑے گا"۔[5]

سرسید اور اکبر کے خیالات و نظریات میں بعد المشرقین ہے۔دونوں مختلف پیرایہ استادہ ہیں۔اکبر مسلمانوں کو صناعی اور ہنرمندی کے ساتھ ساتھ علوم م
سے آراستہ کرنے کے طرفدار تھے۔اس لیے وہ عامۃ الناس کو خطاب کرکے عام دیتے ہیں:۔

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو صنعتیں سیکھو ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے اطراف عالم میں سفر سیکھو
خواص خشک و تر سیکھو علوم بحر و بر سیکھو
خدا کے واسطے اے نوجوانو! ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو جوش میں آؤ!

حسرت موہانی سرسید کی بجائے اکبر کے مکتب فکر سے زیادہ قریب ہیں

ان کی یہ خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلمان
صنعت و حرفت اور تجارت و زراعت میں شریک ہوں"۔[6]

اس مفروضہ کی تائید اس حقیقت سے بھی ہوجاتی ہے کہ جب ۱۹۱۶ء میں مسلم یونیورسٹی کی منظوری ارباب حل و عقد کے زیر غور تھی تو اس وقت

---

[1] ادبی دنیا لاہور، جون ۱۹۲۹ء ص ۱۱ [2] حسرت موہانی: عبدالشکور، ص ۱۱ [3] بزم اکبر: قمرالدین بدایونی ص ۱۱

[4] آجکل، حسرت نمبر ۱۹۸۱ء ص ۹ [5] حالی کا سیاسی شعور، ص ۷ [6] کلیات اکبر، حصہ ۱ [7] حسرت موہانی، ص ۶۰

کی نظر صنعت و حرفت اور زراعت پر مرکوز تھی۔ ان کی آنکھوں میں ایک ایسی آزاد یونیورسٹی کا خواب تھا جس کی تعبیر انہوں نے ذیل کی رباعی میں پیش کی ہے ؎

ارباب فریب کی ہے یہ بھی اک چال
بیکار ہے بہترین و بہتر کا خیال
گنجائش بہتری غلامی میں کہاں
لاریب ہے اجتماعِ ضدّین محال

دراصل حسرتؔ ایک ایسی آزاد یونیورسٹی کا مطالبہ کر رہے تھے، جن سے کثیر تعداد میں ایسے مسلم اسکولوں اور کالجوں کا الحاق کیا جا سکے جن میں مسلمانوں کو تجارت، زراعت اور صنعت و حرفت کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست ہو پرنسپل عبدالشکور لکھتے ہیں کہ :۔

حسرتؔ ثانوی تعلیم کی اہمیت سے پوری طرح واقف تھے اور ان کی یہ خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلمان صنعت و حرفت اور تجارت و زراعت میں شریک ہوں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ جا بجا مسلم اسکول اور کالج کھولے جائیں اور ان کا الحاق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہو سکے۔ اس خیال کی بنا پر وہ اسکولوں کے الحاق کے حق کے بغیر مسلم یونیورسٹی کو زیادہ مفید نہیں سمجھتے تھے۔"[1]

اقتصادی معاملات میں نجات ہند کی دیگر آرزوؤں کی طرح حسرت کی یہ آرزو بھی پوری نہ ہو سکی لیکن جب تک وہ جیل کی چہار دیواری کے باہر رہے اپنے اس موقف پر جمے رہے۔ ان کی نظر بندی کے بعد ارباب علی گڑھ کو یونیورسٹی کے اس مشروط چارٹر کو قبول کرنا پڑا، جس کے دینے پر حکومت برطانیہ آمادہ تھی۔

حسرتؔ و اکبرؔ کی فہم و فکر، فراست و بصیرت یہاں بھی مشترک معلوم ہوتی ہے کہ برطانوی اقتدار کے عین عالم شباب میں ہندوستان کی مکمل آزادی اور انگریزوں کا انخلا خواب و خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ یہاں تک کہ کانگریس کے احمد آباد سیشن میں گاندھی جی بھی حسرت کی آزادی کامل کی تجویز سے ہراساں نظر آتے ہیں[2] لیکن اکبرؔ و حسرتؔ کی نظر دوررس ہندوستان کی مکمل آزادی کا نظارہ کر رہی تھی اکبرؔ بڑے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں ؎

بے حد بت خود آرا طناز ہو گیا ہے
لیکن زوال کا بھی آغاز ہو گیا ہے

حسرتؔ نے بھی ذیل کے اشعار میں ان ہی خیالات کا اعادہ کیا ہے ؎

دولتِ ہندوستان قبضۂ اغیار میں
بے عدد بے حساب دیکھیے کب تک رہے

[1] حسرت موہانی، عبدالشکور، ص ۲۰ [2] آجکل، ۱۹۵۳ء ص ۷ آجکل، نئی دہلی۔

ہے تو کچھ اکھڑا ہوا بزم حریفاں کا رنگ
اب یہ شراب و کباب دیکھیے کب تک رہے

سید سلیمان ندوی حسرتؔ کے متذکرہ خیالات کی تائید میں لکھتے ہیں :۔

"سیاسی عزائم کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز میں کرتے اور ہندوستان کی آزادی کی پیش گوئی جس یقین اور عقیدہ کی پختگی کے ساتھ کرتے اس پر ہم کو بڑا تعجب آتا اور سیاست کی ہر مشکل آسان نظر آنے لگتی۔"[3]

بیسویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی میں بھی ہندوستان کی آزادی کامل کا یقین حسرتؔ کے دل میں ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی طرح مستحکم ہو چکا تھا وہ اردوئے معلیٰ کے صفحات میں بھی اہل دانش و بینش کو دعوت فکر و عمل دیتے ہیں :۔

"دنیا کی رفتار اور اہل دنیا کا طبائع کا میلان صریحاً حریت کی جانب ہے۔۔۔۔ ارباب دانش و بینش کو یہ بات ماننا پڑے گی کہ فرنگی حکومت کا غیر طبعی نظام ہمیشہ کے لیے ہندوستان میں باقی نہیں رہ سکتا اور اپنی موجودہ صورت میں تو اس کا چند سال بھی قائم رہنا دشوار نظر آتا ہے۔۔۔۔"[4]

یہ ایک حقیقت ہے کہ اکبرؔ و حسرتؔ کے تعلقات نہایت ہی استوار تھے۔ ان دونوں کے درمیان سلسلہ مراسلت بھی قائم تھا۔ اکبرؔ کے بیشتر رفقا حسرتؔ کی ادارت میں شایع ہونے والے رسالہ اردوئے معلیٰ میں اشاعت پذیر ہوتے۔ اس لیے یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ حسرتؔ کے سیاسی شعور میں پختگی اور فکر میں گہرائی اور عمل میں گیرائی اپنے پیشرو اکبر الہ آبادی سے تبادلۂ فکر و نظر کے فیوض و برکات کے نتائج ہیں۔

ان گذارشات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مولینا فضل الحسن حسرتؔ موہانی میں سیاسی بصیرت، سرسید کے مکتب فکر سے اختلاف سیاست کے عملی میدان میں جرأت رندانہ اور عزم و حوصلہ اکبرؔ الہ آبادی کے اشعار و افکار نے بخشا اور یہ اکبرؔ ہی کے فیضانِ نظر کی کرشمہ سازی تھی کہ جس نے حسرتؔ کو ہندوستان کا ایک مایۂ ناز سپوت بنا دیا اور وہ جذبۂ صادق عطا کیا جس نے اس جابرانہ نظام حکومت میں رہ کر بھی مغلوبیت اور مرعوبیت کی دبیز چادر کو تار تار کر کے حسرتؔ کے دل میں نجات ہند کی طلب اور تڑپ پیدا کر دی۔ یہ وہی نشہ تھا جس نے حسرتؔ کے دل میں جنون کی شکل اختیار کر لی اور جسے ظلم و جور اور دار و رسن کی ترشی بھی نہ اتار سکی۔

ہمیں اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ اکبرؔ و حسرتؔ کی عملی زندگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان دونوں کی عملی زندگی کے کارناموں سے یہ تضاد اور بھی اظہر من الشمس ہو جاتا ہے۔ حسرتؔ موہانی کی مجاہدانہ شخصیت سراپا فعال تھی اور اکبرؔ کی عملی زندگی انفعالی حیثیت کی مالک تھی۔

[3] نگار، حسرت نمبر، ۱۹۵۳ء، ص ۱۱ [4] اردوئے معلیٰ، اکتوبر ۱۹۰۹ء

**رام لال نابھوی**

# حسرت موہانی ایک باغی

ذکر اس شخصیت کا ہے جسے دنیائے شاعری، دنیائے نثر، دنیائے صحافت کے علاوہ دنیائے سیاست مولانا حسرت موہانی کے نامِ نامی سے جانتی ہے۔

جیسا کہ عام مشاہدہ ہے کہ انسان کے ذہنی ارتقا اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں انفرادی اور اجتماعی قوتیں کام کرتی ہیں۔ اس کے شعور پر خارجی اور داخلی اثرات اپنا عکس ڈالتے ہیں۔ جسمانی اور نفسیاتی عناصر اثر انداز ہوتے ہیں۔ سماجی حقائق کی سرزمین میں اس کی انفرادیت نشو و نما پاتی ہے۔ آرٹ کے اظہار میں سماجی اثرات، انفرادی محسوسات، جذبات و تخیلات اور اختراعی ہنرمندی کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ جبلت اور پیدائشی خصلتیں، تعلیم و تربیت، خاندانی ماحول، روایت و ثقافت، شعور، تحت الشعور کا عمل اور ردعمل کردار کی تشکیل کرتے ہیں۔ انسان زمانہ سے اثر قبول کرتا ہے۔ زمانہ پر اپنے نقش بھی چھوڑتا ہے۔ علم و شعور کی مدد سے وہ ایک راستہ بناتا ہے۔ اسے چھوڑ دیتا ہے پھر نئے راستے کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔ حالات اور واقعات اس کی فطرت کو بدل دیتے ہیں۔ خیالات و احساسات اس کی دنیا کو ہی بدل دیتے ہیں؛ انسانی فطرت کبھی جذبات کے معمولی جھٹکے سے پاش پاش ہو جاتی ہے اور کبھی بڑے بڑے طوفان کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ صناع اپنی جد و جہد اور فن سے ایک ایسا پیکر تیار کرتا ہے جو منظم، مربوط، موزوں اور متناسب ہوتا ہے۔

فن کی استعداد فطری ہوتی ہے۔ فنکارانہ استعداد خدا کی دین ہے۔
فن میں فنکار کا مقام اس کے کارناموں سے متعین ہوتا ہے۔ جو اس کی شخصیت اور محنت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ادیب یا شاعر میں انسانیت بدرجہ اولیٰ ہوتی ہے کیونکہ وہ معمارِ حیات ہوتا ہے۔ ایک آدمی میں بہ یک وقت کئی آدمی سانس لیتے ہیں۔ کئی آدمی بہ یک وقت متصادم رہتے ہیں۔ ایک روشن دماغ میں کئی روشن دماغوں کی صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ شخصیت کے سبھی حصوں سے ملنا نہیں ہو سکتا ان شخصیتوں میں جو شخصیت غالب ہوتی ہے، وہی اس شخص کی شخصیت کہلاتی ہے۔

محلہ دیوان، نابھہ (پنجاب)

لہٰذا کسی فنکار کا فنی اور ذہنی مقام معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ذہنی ارتقا کا جائزہ لیا جائے اور اس کے کارناموں کا مطالعہ دیانت داری سے کیا جائے۔

سید فضل الحسن حسرت خلف سید اظہر حسن سال ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں موہان سے مڈل پاس کیا اور صوبے میں اول آئے۔ سال ۱۸۹۸ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول فتحپور ہسوہ سے انٹرنس کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ علی گڑھ کالج کے سربراہوں نے اس ذہین طالب علم کو محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج میں داخلہ لینے کے لیے علی گڑھ آنے کی دعوت دی۔ اس کالج کے بانی سر سید احمد خاں کالج کو انگریزیت کے رنگ میں رنگ چکے تھے۔ مروجہ اور مقبول لباس انگریزی وضع کا تھا۔

حسرت موہانی کالج میں داخل ہونے کے لیے علی گڑھ پہونچے۔ سر پر کلا بتونی ٹوپی، چارخانے کا پرانی وضع کا انگرکھا، مشروع تنگ پائجامہ۔ پائنچے ٹخنوں سے اوپر، پاؤں میں گھیتلی جوتی۔ ایک ہاتھ میں پاندان۔ دوسرے ہاتھ میں چھتری تھی۔ قد چھوٹا، بدن لاغر، گندمی رنگ۔ چیچک کے مٹے ہوئے داغ۔ آنکھوں پر عینک دیکھ کر کالج کے لڑکوں نے خالہ جان کی پھبتی کس ڈالی۔ ترقی پا کر خالہ اماں کہلانے لگے۔ حسرت کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ نہ انھوں نے اپنی وضع چھوڑی اور نہ اپنی قطع۔ ان کی عظمت اور فضیلت نے جادو کا اثر کیا اور تالیاں پیٹنے والے، ہا ہا۔ ہو ہو کرنے والے لڑکے ان کے گرویدہ بن گئے۔ اب وہ حسرت موہانی کہلائے جانے لگے۔ کسی سے مرعوب کیسے ہوتے، جب طبیعت میں بغاوت کے عناصر موجود تھے۔ کالج کے منتظمین نے بھی جان لیا کہ یہ حضرت کسی اور مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔

ابھی کالج میں ہی تھے کہ نمائش کے موقعہ پر ایک بانسری خرید لاتے۔ جب جی چاہا۔ جیسے جی چاہا۔ جس طرف جی چاہا اور جہاں جی چاہا بانسری بجانا شروع کر دیتے۔ طلبا نے اعتراض کیا۔ پڑھائی میں خلل پیدا ہونے کی شکایت کی حسرت ان سے الجھے تو نہیں لیکن احتجاجاً بیت الخلا میں چلے جاتے۔ جی کھول کر بانسری بجاتے

آپ اسے کیا کہینگے۔ طفلانہ معصومیت۔ کھلنڈرانہ اور بچکانہ پن یا طبیعت میں بغاوت۔

آہستہ آہستہ حسرت کے جوہر کھلنے لگے۔ اپنی ذہانت۔ جودت طبع۔ علمی فضیلت۔ تدبر اور باغیانہ طبیعت کی وجہ سے پورے کالج پر اپنی شخصیت کا سکہ بٹھادیا۔ بہ یک وقت انجمن اردوئے معلی کے معتمد۔ یونین کے سکریٹری نوڈ مانیٹر بن گئے۔ اپنی بات کہنے کا ڈھنگ انہیں آتا تھا۔ منوانے کا سلیقہ بھی جانتے تھے۔ ورنہ اتنے عہدے کیسے حاصل کرتے اور پھر ان پر قابض کس طرح رہتے۔

کالج میں قیام کے دوران ہی حسرت کی طبیعت میں آزادی کی تڑپ جاگ اٹھی۔ وہیں کا ایک واقعہ سنیے۔ ایک مرتبہ علی گڑھ کی کرکٹ ٹیم نے کسی انگریز کلب سے میچ جیت لیا۔ یونیورسٹی کے طلبا تھالیاں۔ لوٹے۔ گلاس بجا بجا کر رات کی تاریکی میں شور محشر بپا کر رہے تھے۔ حسرت نے اپنی زندگی میں نہ بیٹ چھوا تھا اور نہ گیند پھینکا تھا۔ شور سنتے ہی ایک شکستہ کنستر لئے کمرے سے نکلے۔ تیل کو مٹی کے حوالے کیا اور سب سے آگے اسے بجاتے پروفیسر ضیا کے نواب محسن الملک کی کوٹھی تک جا پہنچے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا نام فرد سیاہ میں لکھ دیا گیا۔ یہاں کسے پڑا

کالج میں ہی ایک ایسا واقعہ ہوگیا، جس سے حسرت کی زندگی میں ایک موڑ آگیا۔ انجمن اردوئے معلی کی طرف سے ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اس کے معتمد اور مہتمم حسرت تھے۔ مقتدر شعرا میں میر مہدی مجروح بھی شریک تھے۔ مجروح اپنی ضعیفی کے باوجود تشریف لائے تھے اور محفل میں سب سے ممتاز اور سب سے نمایاں تھے۔ امیر مینائی کے مشہور شاگرد گستاخ رامپوری نے اپنی طبیعت کے مطابق ایک غزل پڑھی، جس کا مقطع تھا

یہ مرض گستاخ کیسا تجھ کو پیدا ہوگیا
جس کی صورت اچھی دیکھی اس پہ شیدا ہوگیا

مشاعرہ کامیاب رہا لیکن جیسا کہ ہوتا آیا ہے۔ اس لیڈر سے بغض اور حسد رکھنے والے طلبا بھی تھے۔ کچھ ان کی آزاد اور مستغنی طبیعت سے نالاں تھے۔ موقعہ ہاتھ آتے ہی کالج کے پرنسپل مارسین کے پاس جاکر شکایت کی۔ گستاخ کے اس شعر کو نہ جانے کس طرح پیش کیا کہ مارسین حسرت کو پکڑ کر لے گئے اور سخت لہجے میں کہنے لگے کہ تمہارا مشاعرہ نہایت غیر مہذب اور مخرب الاخلاق تھا۔ حسرت نے نرم لہجہ اختیار کیا۔ لیکن مارسین چیختے اور چلاتے رہے۔ حسرت پھر کب رکنے والے تھے نہایت بیباکی سے کہہ دیا۔ ممکن ہے کہ آپ کے معیار اخلاق سے ایسا ہی ہو۔ ہمارے معیار اخلاق سے تو مشاعرہ میں کوئی خلاف تہذیب بات نہیں تھی۔ یہ بات سن کر مارسین آپے سے باہر ہوگیا اور انتہائی غیض و غضب میں کہنے لگا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ دنیا میں اخلاق و تہذیب کے دو دعویدار ہوں۔ کالج کے ٹرسٹیز کا اجلاس طلب کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ حسرت کو کالج سے نکال دیا جائے۔ نواب محسن الملک حسرت کی قابلیت اور مزاج دونوں سے آشنا تھے۔ تجویز میں یہ ترمیم کرادی کہ حسرت کو کالج سے تو نکال دیا جائے لیکن امتحان میں شریک ہونے دیدیا جائے۔ جس کالج میں عزت سے بلاتے گئے تھے اسی کالج سے نکال دیئے گئے۔ حسرت چاہتے تو جب جاتے پرنسپل کے منہ ہی نہ آتے یا پھر معافی مانگ لیتے۔ آرام سے پڑھائی مکمل کرتے۔ اچھا عہدہ حاصل کرتے اور عمر بھر آرام سے زندگی بسر کرتے۔ لیکن بغاوت ان کی رگ رگ میں بھری ہوئی تھی۔ وہ نہ دبنے والے تھے۔ نہ کھلنے والے ٹکرانا ان کی فطرت تھی۔

غلام احمد فرقت ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔

"میں نے کہا۔ مثلاً علی گڑھ کے طلبا میں جو شوخی اور شریفانہ شرارتیں آپ کے زمانہ طالب علمی میں رائج تھیں اور ان شریفانہ شرارتوں میں آپ کا کچھ حصہ رہا ہے؟"

بولے۔ میں گو اپنے ساتھیوں میں بہت شوخ مشہور تھا مگر وہاں کی activities میں زیادہ تر حصہ نہیں لیتا تھا۔ مگر پھر بھی ان سے گریز کرنا شرافت کے منافی سمجھتا تھا۔ چنانچہ میں بی اے کے دوسرے سال میں تھا تو میرے ایک ساتھی نے قریب کے ایک آم کے باغ سے آم توڑ لیا۔ اس پر باغ والے نے اس کو پکڑ لیا۔ یہ باغات یونیورسٹی کے تھے اور اس کی فصل بک چکی تھی۔ اس سے یونیورسٹی کی سالانہ آمدنی خاصی تھی۔ ساتھی کے پکڑے جانے پر میں اور میرے دو ایک ساتھی اور جمع ہوگئے۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے، وہ اس پر بولا۔ اس صاحب نے سارا باغ اجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں نے کہا۔ ایک آم توڑنے سے کہیں باغ اجڑتا ہے۔ اس پر تڑا کر بولا۔ باغ ایسے ہی اجڑتا ہے۔ اور کیا اسے اجاڑنے کے لیے ہاتھی آئینگے۔ مجھے غصہ آگیا۔ اور میں نے کہا کہ باغ اجڑا تو نہیں تھا۔ البتہ اب اجڑیگا۔ اس کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں کو جمع کرکے باغ پر دھاوا بول دیا۔ اور بری طرح باغ تباہ کرنا شروع کردیا۔ اس پر اچھی خاصی مار پیٹ ہوگئی۔ سب سے زیادہ اس نے مجھی کو مارا سب ساتھی تو بھاگ گئے۔ مگر وہ مجھے برابر مارے جارہا تھا۔ اور میں ہر بات پر میں سے ایک ڈھیلہ اٹھا کر آم کے درخت پر پھینکتا جاتا تھا اور اس کا ہاتھ نہیں رکتا تھا۔ میں کہتا تھا کہ جب چھوڑیگا تب بھی یہی کروں گا۔ اس پر وہ اور مارتا۔ آخر تھک کر اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ دیکھا آپ نے۔ مولانا نہیں تھکے۔

کالج سے نکالے جانے پر بھی حسرت نے علی گڑھ نہیں چھوڑا۔ کالج کے باہر ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لیا۔ دفتر اردوئے معلی کو ساتھ ہی رکھا اور شعر و ادب کا پرچہ جاری کردیا۔ پہلا پرچہ یکم جولائی ۱۹۰۳ء کو شائع ہوا۔ اسی سال علی گڑھ کالج سے عربی اور ریاضی کے ساتھ بی اے پاس کیا۔ پھر ایل ایل بی میں داخلہ لیا۔ وظیفہ کے لیے درخواست دی۔ بورڈنگ ہاؤس میں رہنے کی اجازت مانگی۔ مارسین سخت ناراض تھے۔ جب کچھ نہ ملا تو سلسلہ تعلیم منقطع کیا۔ اب ان کا کام ادب۔ شاعری۔ صحافت اور سیاست تھا۔ ۱۹۰۳ء سے ہی سیاسی مضامین لکھنے شروع کیے۔ دلچسپی کالج کے زمانے میں ہی پیدا ہوگئی تھی۔

علی گڑھ اس وقت انگریز پرستی کا مرکز تھا۔ وہاں بیٹھ کر اور وہاں کی فضا

میں حکومت سے ٹکرانا کوئی معمولی کھیل نہیں تھا۔ لارڈ کرزن جیسے سخت گیر حاکم کا زمانہ تھا۔ آزادی کے لفظ سے ہی لوگ ڈر جاتے تھے۔ حسرت نے ملک کو آزاد کرانے کا بیڑہ اٹھایا اور بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تو عین اپنی فطرت کے مطابق عمل کر رہے تھے۔

کانگریس میں ایک طرف اعتدال پسند تھے اور دوسری طرف انتہا پسند جن کے سربراہ لوکمانیہ تلک تھے۔ حسرت انتہا پسند گروہ میں شامل ہوگئے اور عملی زندگی کا آغاز ۱۹۰۴ء میں کیا۔ ۱۹۱۸ء تک کانگریس کے ہر اجلاس میں شریک ہوئے۔ اردوئے معلیٰ میں حسرت کی انتہا پسند پالیسی کا اظہار ہوتا رہا۔

اردوئے معلیٰ میں ایک مضمون کی اشاعت پر حسرت موہانی پر تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۱۲۴ (الف) کے تحت مقدمہ قائم ہوا۔ حسرت نے مضمون لکھنے والے کا نام بتانے سے انکار کر دیا اور پوری ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ مقدمہ سڈیشن قائم ہوا۔ دو سال قید سخت اور پانصد روپیہ جرمانہ کا حکم ہوا۔ حسرت نے جرمانہ ادا کرنے سے انکار کر دیا اور ان کا نادر و نایاب کتب خانہ محض ساٹھ روپیہ میں نیلام کر دیا گیا۔ یہ رقم جرمانے میں جمع کر لی گئی۔ قید خانے میں سختی کا برتاؤ تھا۔ حسرت کے جذبات کی ترجمانی ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیے

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
جو چاہو سزا دے دو تم اور بھی کھیل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی

اوپر ذکر ہوا ہے کہ حسرت کانگریس میں انتہا پسندوں میں شامل ہوگئے تھے اور تلک کو جنہوں نے یہ نعرہ دیا تھا کہ "آزادی میرا پیدائشی حق ہے اور میں اسے لیکر رہوں گا" اپنا رہبر مانا تھا۔ چنانچہ جب ۱۹۰۸ء میں تلک پر ایک مقدمہ سڈیشن چلا اور انہیں چھ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی تو حسرت نے لکھا:

اے تلک اے افتخارِ جذبۂ حبِ وطن
حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن
ناز تیری پیروی پر حسرتِ آزاد کو
اے تجھے قائم رکھے تا دیر ربِ ذوالمنن

جب حسرت جیل سے باہر آئے تو انہوں نے یہ مشورہ ماننے سے انکار کر دیا کہ وہ انتہا پسندوں کی بجائے اعتدال پسندوں کے ساتھ ہو جائیں چنانچہ اردوئے معلیٰ میں لکھا۔

"ہم پالٹیکس میں مسٹر تلک اور سرگروہ ادار بابو اروند گھوش کی پیروی اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں"

حسرت کو بیوی بھی ایسی ملی تھیں جنہیں حق کی خاطر اذیت اٹھانے میں لطف آتا تھا۔ حسرت "مشاہداتِ زنداں" میں ذکر کرتے ہیں کہ جب ۱۹۰۸ء میں یعنی شادی کے صرف پانچ برس بعد انہیں قید ہوئی تو بیگم صاحبہ نے انہیں لکھا کہ

"تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا خیال نہ کرنا۔ خبردار تم سے کسی طرح کمزوری کا اظہار نہ ہو۔"

غلام احمد فرقت ایک اور چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں۔

"۱۹۴۰ء میں جب کانگریس نے انفرادی ستیہ گرہ کی تحریک شروع کی اور لکھنؤ میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع تھا تو بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ مولانا جیل نہ جاتے امین الدولہ پارک میں شام کے وقت پارک کے دونوں طرف جیل کی لاریاں کھڑی رہتی تھیں۔ پارک میں کانگریسی لیڈر حکومت کے خلاف تقریریں کرتے اور لاریاں ان کو بھر بھر کر حوالات پہنچا آتیں۔ اس زمانہ میں امین الدولہ پارک ایسا بارونق نہیں تھا جیسا کہ اب ہے بلکہ اس میں بڑی بڑی گھاس اگی ہوئی تھی۔ مولانا اس پارک میں گرفتار ہوئے اور جس وقت گرفتار ہوئے جا رہے تھے اس وقت راقم الحروف وہاں موجود تھا۔ مولانا اپنی تقریر ختم کر کے جوں ہی چبوترے سے اترے۔ سپاہی ان کو پکڑنے کے لیے لپکے۔ پہلے تو مولانا نے سپاہیوں کو ایک طرح کی جھکائی دی اس کے بعد ایک دم زمین پر اوندھے لیٹ گئے۔ اور گھاس پکڑ لی۔ اب عالم یہ تھا کہ ایک طرف تو دو سپاہی مولانا کو اوپر کی طرف کھینچ رہے تھے اور دوسری طرف مولانا تھے کہ گوہ کی طرح زمین پکڑے تھے۔ آخر تین سپاہیوں نے زور لگا کر جو مولانا کو پوری قوت سے کھینچا تو جڑ سمیت مولانا اکھڑ آئے اور سپاہیوں نے مولانا کو پارک کے باہر لاری کے دروازے پر گود میں لا کر اس بے دردی سے لاری میں ٹھونس دیا جس طرح انجن میں کوئلہ جھونکا جاتا ہے مولانا نے نونِ غنہ کے ساتھ انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگایا اور راستے بھر نعرے لگاتے رہے۔ پھر جیل روانہ ہو گئے۔"

حسرت کانگریس میں شامل ہوئے۔ عدم تعاون اور ترک موالات کے زمانے میں اس کے ایک نہایت سرگرم اور بلند آہنگ کارکن تھے۔ اسی اثنا میں مسلم لیگ وجود میں آگئی تھی۔ مسلم لیگ کے جلسوں میں جانے لگے۔ کانگریس کے اجلاس میں بھی شرکت کرتے تھے اور مسلم لیگ کے جلسوں میں بھی۔ ایک وقت آیا کہ باضابطہ اور مستقل طور پر مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ مسلم لیگ کے جلسے کی صدارت کی۔ پاکستان کے موئید بنے۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر یو پی اسمبلی اور مرکزی دستور اسمبلی کے ممبر چنے گئے۔ ظاہر ہے کہ حسرت کے یہ دونوں کردار بحث طلب ہیں۔ چنانچہ مجنوں گورکھپوری اس سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

"حسرت کا مسلک دراصل کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے الگ تھا۔ وہ خود ہندوستان کی سیاسی جماعت کے گرم سے گرم فرقہ سے بھی زیادہ گرم تھے۔ وہ صحیح معنوں میں باغی تھے اور اس وقت تک بغاوت کرتے رہنا ان کا ایمان تھا جب تک ملک میں ایسا فطری نظام رائج نہ ہو جائے جو انسانی ناموس کی صیانت کے لیے لازمی ہو اور جس سے سارے بندگانِ خدا کی فلاح ہو سکے۔ وہ فرنگی حکومت کو غیر طبعی نظام سمجھتے تھے اور ان کو یقین تھا کہ ایسا نظام زیادہ عرصہ تک برقرار نہیں رہ سکتا اور فرنگی حکومت حسرت کو اپنے لیے بڑا خطرہ تصور کرتی تھی۔"

آگے چل کر مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں "وہ (حسرت) دیکھ رہے ہیں کہ مخفی خفیہ سازشوں سے مقصد حاصل ہونے میں دیر لگے گی اور تہہ خانوں میں رہ کر ہماری شورشیں نہ جانے کب بارآور ہوں اس لیے وہ ملک کی عوامی اور مسلم سیاسی جماعتوں میں شریک رہنا بھی ضروری سمجھتے تھے۔ اس میں ایک راز اور بھی تھا۔ حسرت ان سیاسی جماعتوں کی اعتدال پسندی یعنی بزدلی سے واقف تھے اور اس بزدلی کو سمجھتے رہنا اور اس کی مخالفت کرتے رہنا وہ ہر لحاظ سے اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس لیے جب کبھی ان جماعتوں میں سے کوئی جماعت کسی حد تک بھی ان کے اپنے نصب العین کے قریب آتی دکھائی دی تو وہ اس کے ساتھ ہو لیے۔

حسرت کا ہمیشہ وطیرہ یہ رہا ہے کہ کسی بھی مجلس میں شریک ہوتے، تو اپنی سی کہتے۔ خواہ کوئی دوسرا تائید کرے نہ کرے۔ ایک واقعہ اور سنیے۔

مسلم لیگ میں شامل ہونے کے بعد جب ایک گڈول مشن چودھری خلیق الزماں کی سرکردگی میں مصر بھیجا گیا۔ تو اس زمانے میں وہاں کے وزیر اعظم غاس پاشا تھے۔ اس مشن میں مولانا بھی شامل تھے۔ سب سے پہلے چودھری خلیق الزماں کی تقریر ہوئی۔ جس میں انہوں نے ہندوستان اور مصر کے قدیم تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے درمیان میں کہیں برطانوی سیاست کی تعریف کر دی۔ اس کا سننا تھا کہ اپنی نشست پر مولانا کی طبیعت غیر ہونے لگی۔ جیسے جیسے چودھری کی زبان سے برطانیہ کی مدح میں فقرے نکلتے۔ ویسے ویسے مولانا پر ہسٹریا کے دورے کی شدت زور پکڑتی جاتی۔

چودھری صاحب کے بعد دوسرا نمبر مولانا ہی کا تھا۔ چنانچہ پندرہ منٹ مولانا کو بھی تقریر کے لیے دیئے گئے تھے۔ آپ جب تقریر کرنے لگے تو آپ نے پورے پندرہ منٹ صرف چودھری صاحب کی مذمت کی اور ان کی تقریر کی تردید میں صرف کر دیئے۔ اس کے بعد جو رعایتی وقت دیا تھا اس میں براہ راست برطانیہ کی مذمت میں دل کی بھڑاس نکالی۔ دوران تقریر پہلے وقت کی گھنٹی بجی۔ اس گھنٹی کے وار کو مولانا نے خالی کر دیا۔ اس کے بعد دوسری گھنٹی بجی۔ پھر تیسری گھنٹی اور پھر مسلسل گھنٹیاں بجنی شروع ہوئیں مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا۔ مولانا برطانیہ پر گولہ باری کرتے رہے آخر میں جب مولانا اس پر بھی نہ مانے تو ان کو اٹھا کر کرسی پر لے جایا گیا۔ مگر مولانا کرسی اور اسٹیج کے درمیانی حصے میں بھی بولتے رہے۔ اس کے بعد کہاں کی دوستی اور کہاں کا گڈول مشن۔ وہ مصر سے ہندوستان چل پڑے اور ہندوستان آتے آتے کراچی میں چودھری صاحب کی مزید مذمت میں ایک لمبا چوڑا بیان اخبارات میں دے دیا جن میں مصریوں کی مذمت کم اور چودھری صاحب کی مذمت زیادہ تھی۔ فرقت رقم طراز ہیں کہ یہ بیان انھوں نے پڑھا تھا۔

حسرت ہر اس بات کی مخالفت کرتے جو ان کی طبیعت کے خلاف ہوتی۔ بے حد جذباتی تھے۔ وقت کی رفتار۔ حالات۔ مصلحت بینی ان کی ڈکشنری میں تھے ہی نہیں۔ مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ آگرہ میں جب سر آغا خاں نے تجویز پیش کی کہ کانپور کی مسجد کے معاملے میں لارڈ ہارڈنگ نے جو فیصلہ کیا ہے اس کا شکریہ ادا کیا جائے تو حسرت نے بڑی شدت کے ساتھ اختلاف کیا۔ ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کا جو اجلاس بمبئی میں ہوا وہاں بھی وہ اپنی اختلافی آواز پیش کرتے رہے۔ ادھر کانگریس میں چورا چوری کے واقعہ کے بعد ستیہ گرہ کا منصوبہ گاندھی جی نے ترک کیا تو حسرت نے صدائے احتجاج بلند کی۔ خلافت کانگرس میں شامل ہوئے۔ ان سے بگڑ گئے۔ اسے چھوڑ دیا۔ ۱۹۴۲ء میں جب تقسیم ہندوستان کی تجویز پر بڑی گرمجوشی کے ساتھ غور کیا جا رہا تھا۔ حسرت نے کہا کہ وہ پاکستان کے مؤید ہیں۔ لیکن پاکستان ڈومینین کو تسلیم نہیں کرتے۔ کانگرس میں تھے تو گاندھی جی سے بھڑ جاتے۔ مسلم لیگ میں آ گئے تو حقوق مسلمین اور پاکستان اور آزادی وطن کے مسائل پر جناح سے لڑ پڑتے۔ آزادی کے بعد ڈاکٹر امبیڈکر کا پیش کردہ آئین بھی انہیں پسند نہیں تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عمر بھر سیاست میں دلچسپی لینے اور لیڈر بننے کے باوجود وہ بطور سیاسی لیڈر کم پہنچانے گئے اور ان کی شہرت بطور شاعری کے ہی ہوئی۔ حالانکہ کانگرس کی ابتدائی تحریک۔ پہلی جنگ عظیم۔ حادثہ جلیانوالہ باغ۔ خلافت تحریک۔ دوسری جنگ عظیم قحط بنگال۔ تقسیم ہند۔ فسادات۔ سب ان کی نظروں کے سامنے ہوتے۔

ان کے مذہبی رجحانات کی طرف آیئے۔ کٹر قدامت پسند تھے۔ سنی تھے۔ صوفی تھے۔ نماز روزہ کے پابند تھے۔ ہر سال حج جاتے تھے۔ مزاروں پر حاضری دیتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان مذہبی فرائض کو رسمی نہیں قرار دیتے تھے۔ کمیونزم یا سوشلزم اور روس کے نئے نظام پر اردو میں سب سے پہلے ستائشی نظمیں لکھنے والے حسرت تھے۔ وہ کبھی سوشلسٹ اعتقادات۔ کبھی کمیونسٹ نظریات اور کبھی سوویت طرز حکومت کے مؤید بن جاتے۔ ۱۹۲۵ء میں پہلی کمیونسٹ کانفرنس کے صدر استقبالیہ کی حیثیت سے فرماتے ہیں۔

> "کمیونزم کی تحریک کاشتکاروں اور مزدوروں کی تحریک ہے۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ کمیونزم اور خوں ریزی اور فساد لازم و ملزوم ہیں۔ حالانکہ اس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم لوگ عدم تشدد کو صرف ضرورت اور مصلحت کی بناء پر جائز سمجھتے ہیں اور مہاتما گاندھی کی طرح اس کو ہر حالت میں بطور اصول لازمی قرار نہیں دیتے۔"

ان کی نظر میں سوویت نظام اسلام کے عین مطابق تھا اور اس میں مطلقاً کوئی مضائقہ نہیں کہ انسان کمیونسٹ ہو اور ساتھ ہی دل سے اور عمل سے اسلام کا پیرو بھی۔

حسرت پردے کی رسم کے سخت خلاف تھے۔ آزادی نسواں کی حمایت کرتے تھے اور یہ بات تب کی ہے جب ہندوؤں میں بھی پردے کی رسم عام تھی۔

اب ذرا یاں اسلام ازم کا خواب بھی دیکھئے۔ عبدالمجید سالک لکھتے ہیں

> "اس وقت مولانا ہندوستان کی دیسی قانون ساز میں نظام دکن کی حمایت کر رہے تھے۔ میں نے کہا۔ مولانا کسی کمیونسٹ کو

بقیہ ص۱۱ پر

احمر لاری

# حسرت موہانی
# ایک ممتاز صحافی

مولانا حسرت موہانی نے تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد بجائے سرکاری ملازمت یا کسی اور ملازمت کی طرف جانے کے، ملک و قوم اور زبان و ادب کی خدمت کو اپنا نصب العین بنایا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں دو جریدے "اردوئے معلیٰ" اور "تذکرۃ الشعرا" اور ایک اخبار "مستقل" نکالے۔ جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں حسرت نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، اسی طرح دنیائے صحافت میں بھی لافانی نقوش چھوڑے ہیں۔ حسرت بیک وقت ادب اور سیاست دونوں میدانوں کے شہسوار تھے، اس لیے صحافت کی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے انھوں نے ان دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھا۔ اپنے جرائد اور اخبار کے ذریعے انھوں نے ادب اور سیاست دونوں کی خدمت کی اور اردو ادب اور ہندوستانی سیاست کو وسعتِ ذہن اور بلندیِ نگاہ عطا کی۔ صحافت کے میدان میں حسرت کا اصل کارنامہ "اردوئے معلیٰ" ہے۔ اس لیے اس مقالے میں اسی جریدے کی روشنی میں حسرت کی صحافت کا جائزہ لیا گیا ہے۔

حسرت علی گڑھ تحریک کے پروردہ تھے اور اس کے باغی بھی۔ اس لیے حسرت کی صحافت کا صحیح تناظر میں جائزہ لینے کے لیے علی گڑھ تحریک اور بالخصوص سرسید کی صحافت پر ایک طائرانہ نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں مسلمانوں کا جو زوال شروع ہوا تھا، وہ ۱۸۵۷ء میں مکمل ہو گیا۔ سیاسی زوال کے علاوہ جو انحطاط مسلمانوں کی مذہبی، سماجی اور تمدنی زندگی میں رونما ہوا، وہ اس سے بھی بدتر تھا۔ ان حالات میں سرسید اپنے مٹھی بھر رفیقوں کے ساتھ آگے بڑھے اور انھوں نے مسلمانوں کی اصلاح کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ انھوں نے صرف سیاسی میدان ہی میں مسلمانوں کی رہبری نہیں کی، بلکہ مذہبی، سماجی اور تمدنی شعبوں میں بھی رہنمائی کی۔

سرسید نے مغربی تعلیم کی اشاعت کی طرف خاص طور سے توجہ کی۔ علی گڑھ کالج کے قیام سے قبل انھوں نے مرادآباد اور غازی پور میں مدرسے قائم کیے اور غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جو ان کے تبادلے کے ساتھ ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ منتقل ہو گئی۔ ۱۸۶۶ء میں انھوں نے "انسٹیٹیوٹ گزٹ" نکالا، جس میں سیاسی، سماجی اور علمی مضامین شائع ہوتے تھے۔ سرسید کی ان کوششوں نے باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی جو علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہے۔

علی گڑھ تحریک اپنی مکمل شکل میں ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ شروع ہوئی۔ ۱۸۶۹ء میں سرسید انگلستان گئے اور وہاں مغرب کی ترقیوں کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ جب انھوں نے انگلستان اور ہندوستان کا موازنہ کیا تو دیکھا کہ ہندوستان ترقی کے میدان میں کتنا پیچھے ہے۔ چنانچہ ۱۸۷۰ء میں جب وہ ہندوستان لوٹے تو انھوں نے انگریزی کے مشہور جرائد اسپکٹیٹر (Spectater) اور ٹیٹلر Tatler کی طرز پر ایک جریدہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں سیاسی، سماجی، علمی، اخلاقی اور مذہبی ہر قسم کے مضامین خود بھی لکھے اور اپنے ہم خیال احباب اور رفقا سے بھی لکھوائے۔ ان مضامین کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور انھیں زمانے کے مطابق ڈھالنا تھا۔ اس سلسلے میں قدامت پسند طبقے کی طرف سے مخالفت بھی ہوئی، مگر سرسید نے اس کی پروا نہیں کی۔

مسلمانوں میں سماجی انقلاب اور ذہنی بیداری بڑی حد تک علی گڑھ تحریک کی رہینِ منت ہے۔ لیکن علی گڑھ تحریک سے جہاں بہت سے فائدے ہوتے، وہاں کچھ نقصانات بھی پہنچے۔ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ

● شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور (یو۔پی)

مغربیت کے سیلاب میں بُری طرح بہ گیا اور اپنے مذہب، اقدارِ حیات اور زبان و ادب سے بیگانہ ہونے لگا۔ اس کے خلاف آواز بلند کرنے والوں میں شبلی، اکبر، اقبال، محمد علی جوہر اور ابوالکلام آزاد کے ساتھ ساتھ حسرت بھی تھے۔ علاوہ ازیں حسرت نے سرسید کے سیاسی خیالات سے بھی اختلاف کیا۔ اس اجمال کی تفصیل آگے آئے گی۔

بی اے کا امتحان دیتے ہی (۱۹۰۳ء)، نتیجے کا انتظار کیے بغیر حسرت نے اردوئے معلیٰ کے لیے ڈکلریشن داخل کر دیا۔ اس کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۰۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ رسالہ اپنی زندگی میں کئی نشیب و فراز سے گزرا اور بہ تفصیلِ ذیل نکلتا رہا:

**پہلا دور** ـــــ جولائی ۱۹۰۳ء تا جون ۱۹۱۳ء (علی گڑھ)
(درمیان میں مئی ۱۹۰۸ء تا ستمبر ۱۹۰۹ء
حسرت کی گرفتاری کے سبب عارضی طور
پر بند رہا۔)

**دوسرا دور** ـــــ جنوری ۱۹۲۵ء تا مارچ ۱۹۴۲ء (کانپور)

اردوئے معلیٰ بہ یک وقت ادبی جریدہ تھا اور سیاسی بھی۔ حسرت نے اس کا ایک اہم مقصد درستی مذاق قرار دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو ادب مغربی ادب سے متاثر ہو رہا تھا اور اردو اِس حلقے میں اپنے قدیم کلاسکی سرمائے سے بیزاری بڑھ رہی تھی۔ حسرت نے اس بات کو محسوس کیا کہ اگر ہم اپنے قدیم ادبی سرمائے سے منہ موڑ لیں گے تو اپنے ادب کو ترقی کی صحیح راہ پر نہیں لگا سکیں گے۔ اس لیے انھوں نے "اردوئے معلیٰ" میں شعراء کے تراجم لکھ کر اور ان کے جامع انتخابات مرتب کر کے ماضی کے بہترین ادبی سرمائے کو نہ صرف محفوظ کرنے کی کوشش کی بلکہ اسے نئی معنویت بھی عطا کی۔

"اردوئے معلیٰ" کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس کے صفحات میں سیکڑوں معروف اور غیر معروف شعرا کے حالاتِ زندگی محفوظ ہیں۔ حسرت نے صرف اساتذہ اور ممتاز شعرا کے حالات ہی نہیں لکھے ہیں، بلکہ ان کے تلامذہ اور دوسرے درجے کے شعرا کے حالاتِ زندگی قلم بند کیے ہیں۔ اس طرح کتنے ہی شعرا کو انھوں نے گمنام ہونے سے بچا لیا۔ حسرت نے ۱۰۷ شعرا کے تراجم خود لکھے ہیں اور ۱۶ شعرا کے تراجم دوسروں سے لکھوائے ہیں۔ یہ تراجم تذکروں کے خطوط پر لکھے گئے ہیں۔ وہ دراصل "اربابِ سخن" کے نام سے ایک تذکرہ ترتیب دینا چاہتے تھے، جو بوجوہ مکمل نہ ہو سکا۔ حسرت نے شعرا کے حالاتِ زندگی کی فراہمی میں تقریباً تمام دستیاب تذکروں سے مدد لی ہے۔ انھوں نے خاندانِ مومن و نسیم دہلوی کے شعرا اور معاصرین کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بیشتر ذاتی معلومات پر مبنی ہے۔ حسرت نے قدیم شعرا کے حالاتِ زندگی میں عموماً ایجاز و اختصار کو پیشِ نظر رکھا ہے، مگر خاندانِ مومن و نسیم دہلوی کے شعرا اور معاصرین کے حالاتِ زندگی نسبتاً تفصیل سے لکھے ہیں۔ قدیم شعرا کی شخصیت نگاری میں بھی حسرت نے اختصار سے کام لیا ہے۔ مگر اختصار کے باوجود چند لفظوں میں انھوں نے ان شعرا کے جیتے جاگتے مرقعے پیش کر دیے ہیں۔ خاندانِ مومن و نسیم دہلوی کے شعرا و نیز ہم عصر شعرا کی شخصیت نگاری میں حسرت نے طویل تذکروں کا انداز اپنایا ہے اور ان کی شخصیت کے ہر پہلو پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

حسرت کے تراجم کا اہم ترین حصہ اس کی تنقید ہے۔ ان کی تنقید کا انداز قدیم تذکروں کی طرح مشرقی ہے۔ مشرقی طرزِ تنقید میں زبان و بیان کو اہمیت حاصل ہے۔ یہ بات خصوصی توجہ کی مستحق ہے کہ مغربی طرزِ تنقید تک رسائی کے باوجود حسرت نے مشرقی طرزِ تنقید کو اپنایا ہے اور شعرا کے کلام پر اپنی آرا کے اظہار میں زیادہ تر زبان اور اسلوبِ بیان کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حسرت کی نظر زبان و بیان کی خصوصیات پر زیادہ پڑتی ہے، مگر وہ معنوی خصوصیات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ حسرت نے اپنی تنقیدوں میں استادی اور شاگردی کے رشتے کو بڑی اہمیت دی ہے۔ انھوں نے اکثر و بیشتر شاگرد کے کلام میں استاد کے رنگِ سخن کی نشاندہی کی ہے اور ان اثرات کو واضح کیا ہے جو رشتۂ تلمذ کے سبب اس کے کلام پر مرتب ہوئے۔

"اردوئے معلیٰ" میں حسرت نے شعرا کے کلام کے انتخابات بھی شائع کیے۔ انھیں انتخابات کی بنیاد پر انھوں نے گیارہ جلدوں میں "انتخابِ سخن" مرتب کیا، جس میں تقریباً دو سو شعرا کا کلام شامل ہے۔ حسرت نے یہ انتخابات قلمی و مطبوعہ دواوین، بیاضوں اور تذکروں کی مدد سے مرتب کیے ہیں۔ انھیں مرتب کرنے میں انھوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ہر غزل کے انتخاب میں غزل کی ہیئت برقرار ہے۔ اس کی وجہ سے جہاں یہ نقصان ہوا کہ کمزور اشعار بھی انتخاب میں جگہ پا گئے، وہاں یہ فائدہ بھی ہوا کہ اس طرح زیادہ شعری سرمایہ محفوظ ہو گیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ انتخابات بیشتر غزل پر مشتمل ہیں۔ ان میں دوسرے اصناف کو بہت کم جگہ ملی ہے۔ ہاں جدید دور کے نظم گو شعرا کے انتخاب میں نظمیں کافی تعداد میں منتخب کی گئی ہیں۔

یہ انتخابات کئی لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک تو یہ کہ تھوڑے صفحات میں اردو کا تمام بہترین شعری سرمایہ سامنے آجاتا ہے، اور یہ انتخابات دواوین اور کلیات کے مطالعے سے بڑی حد تک بے نیاز کر دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے ذریعے عام لوگوں کی رسائی بھی کلاسکی ادب تک ہو جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ ان میں ایسے معاصر شعرا کے انتخابات بھی شامل ہیں جن کا مجموعۂ کلام اس وقت تک مرتب نہیں ہوا تھا۔ ایسے شعرا کے کلام کی ابتدائی نوعیت کو سمجھنے اور ان کے کلام کی تاریخی ترتیب میں ان انتخابات سے

بڑی مدد ملے گی۔ چوتھے یہ کہ ان سے خود حسرت کی شخصیت اور ان کے ذوقِ شعری پر روشنی پڑتی ہے۔

حسرت نے ان انتخابات کے ذریعے نہ صرف یہ کہ بہت سے کم مشہور یا غیر معروف شعرا کو روشناس کرایا ہے، بلکہ کئی اساتذہ کو بھی نئی زندگی دی ہے۔ حسرت نے جس وقت یہ انتخابات مرتب کیے اس وقت تک حاتم، مظہر، سوز، قائم، مصحفی اور جعفر علی حسرت جیسے مشہور و معروف شعرا کے دواوین غیر مطبوعہ اور کمیاب بلکہ نایاب تھے۔ حسرت کے یہ انتخابات بڑی حد تک جامع ہیں اور ان سے متعلقہ شعرا کی خوبیوں اور خامیوں کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان انتخابات سے بعد کے نقادوں کو بھی بڑی مدد ملی ہے اور انھوں نے انھیں انتخابات کی بنیاد پر بہت سے شعرا کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

تذکرہ نگاری اور انتخابِ کلام کے علاوہ حسرت نے اردو کے قدیم سرمائے کو زندہ کرنے کے سلسلے میں " اردوئے معلیٰ " سے اور بھی کام لیے ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے شاعروں، ادیبوں، صاحبِ ذوق حضرات اور خود اپنی بیاضوں کے انتخاب شائع کیے۔ " اردوئے معلیٰ " کے پہلے شمارے میں مولوی سید آلِ حسن موہانی اور منشی مسعود احمد ضمیر مینائی کی بیاضوں کا انتخاب شائع کرتے ہوئے انھوں نے بیاضوں کی افادیت پر ایک نوٹ بھی شائع کیا تھا۔

بیاضوں کا انتخاب " اردوئے معلیٰ " کے تقریباً ہر شمارے میں شائع ہوتا تھا اور ان میں اردو اور فارسی دونوں ہی زبانوں کے اشعار ہوتے تھے۔ یہ بیاضیں نہ صرف صاحبِ بیاض کے مذاقِ سخن کی آئینہ دار ہیں، بلکہ ان سے اس دور کے مذاقِ سخن کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ حسرت کو اپنے زمانے میں سخن گوئی اور سخن فہمی کی ناقدری کی شکایت تھی۔ اسی لیے وہ بیاضوں کا انتخاب شائع کرتے تھے تاکہ لوگوں میں پھر ذوقِ سخن گوئی اور سخن فہمی پیدا ہو۔ علاوہ ازیں ان کے پیشِ نظر نئی پود کے شاعروں اور ادیبوں کی ذہنی تربیت بھی تھی۔

تذکروں، دواوین اور بیاضوں کے علاوہ حسرت نے کچھ قدیم گلدستے بھی فراہم کیے تھے۔ ان کے پیشِ نظر کم و بیش اٹھارہ گلدستے تھے، مگر وہ " اردوئے معلیٰ " میں صرف مندرجہ ذیل پانچ گلدستوں کا تعارف کرا سکے :

(۱) گلدستۂ شعلہ، ضمیمہ انوار الاخبار، لکھنؤ (شمارہ ستمبر ۱۹۱۱ء)

(۲) گلدستۂ ریاض، خیر آباد (دو قسطوں میں :
شمارہ اکتوبر ۱۹۱۱ء ؛ نومبر ۱۹۱۱ء)

(۳) نتیجۂ سخن، کلکتہ (تین قسطوں میں : شمارہ جنوری ۱۹۱۲ء ؛
فروری مارچ ۱۹۱۲ ؛ اپریل ۱۹۱۲ء)

(۴) پیام یار، لکھنؤ (تین قسطوں میں : شمارہ مئی ۱۹۱۲ء ؛
جون ۱۹۱۲ء ؛ جولائی و اگست ۱۹۱۲ء

(۵) فتنۂ عطر فتنہ، گورکھپور (شمارہ جنوری ۱۹۱۳ء)

" اردوئے معلیٰ " کی بہاریں تو بیشتر حسرت کے خونِ جگر کی رہینِ منت ہے، مگر اسے اپنے دور کے تمام اہم ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل تھا۔ " اردوئے معلیٰ " میں حسرت کے علاوہ شبلی، امداد امام اثر، شاد عظیم آبادی، شرر، چکبست، نظم طباطبائی، نواب رائے (پریم چند)، محبوب الرحمٰن کلیم، امیر احمد علوی اور احسن مارہروی وغیرہ کے ادبی اور تنقیدی مضامین شائع ہوئے۔ یہ مضامین نہ صرف یہ کہ بے حد وقیع ہیں، بلکہ ان سے اس دور کے ادبی ذوق کو پرکھنے اور تنقیدی شعور کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ علاوہ ازیں " اردوئے معلیٰ " کے پہلے دور میں کچھ افسانے، انشائیے اور سفرنامے بھی شائع ہوئے۔ ان میں سجاد حیدر یلدرم کے انشائیے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

" اردوئے معلیٰ " کے حصۂ نظم میں جہاں قدیم رنگ کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں، وہیں جدید رنگ کا کلام بھی چھپتا تھا۔ پہلے پرچے کے حصۂ نظم کے شروع میں حسرت نے جو نوٹ لکھا تھا وہ شعری تخلیقات کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کا پوری طرح آئینہ دار ہے۔ انھوں نے اپنے کو قدیم اور جدید کے خانوں میں محصور نہیں کیا تھا۔ وہ غزلوں میں انفرادیت اور نظموں میں تسلسلِ بیان کے قائل تھے۔ اسی کسوٹی پر وہ شعری تخلیقات کو پرکھتے تھے اور جو کلام اس کسوٹی پر پورا اترتا تھا اسے " اردوئے معلیٰ " میں جگہ دیتے تھے۔ " اردوئے معلیٰ " میں جہاں اساتذہ کا کلام چھپتا تھا، وہیں نئے شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا تھا، بشرطیکہ وہ معیاری ہو۔

" اردوئے معلیٰ " میں ہر طرح کے علمی موضوعات جیسے سوانح، تاریخ، فلسفہ، سائنس، اخلاق اور تمدن وغیرہ پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان میں کچھ مضامین تو طبع زاد ہوتے تھے اور کچھ عربی، فارسی اور انگریزی کے ترجمے ہوتے تھے۔ یہ مضامین اس دور کے اہم اور مستند ادیبوں کے تراوشِ قلم کا نتیجہ تھے۔ حسرت کو اس بات کا احساس تھا کہ سرسید اور ان کے رفقا کی کوششوں کے باوجود اردو ابھی علمی نقطۂ نظر سے تہی مایہ ہے۔ اس لیے انھوں نے اس قسم کے مضامین شائع کر کے نہ صرف اردو کے علمی سرمائے میں اضافہ کیا، بلکہ اردو داں طبقے میں علمی ذوق بھی پیدا کیا۔

(۲)

جیسا کہ اس سے قبل ذکر آ چکا ہے، " اردوئے معلیٰ " ادبی جریدے کے علاوہ سیاسی جریدہ بھی تھا۔ اس کے پہلے ہی شمارے میں " پولیٹیکل سائنس " کے عنوان سے قاضی تلمذ حسین گورکھپوری کا ایک علمی مضمون شائع ہوا تھا، جو پولیٹیکل سائنس کے ممتاز پروفیسر سیلی کے ایک لکچر کا خلاصہ تھا۔ گویا حسرت نے پہلے ہی شمارے سے مسلمانوں کی سیاسی تربیت کا کام شروع کر دیا تھا۔ جنوری ۱۹۰۴ء کے شمارے کے اڈیٹوریل نوٹس میں لکھتے ہیں " اس ضمن میں یہ بھی بیان کر دینا ضروری ہے کہ ہم آئندہ مسلمانوں کے لیے کانگرس میں شامل ہونے

کی ضرورت پر اپنے خیالات ظاہر کریں گے۔" اس طرح حسرت نے "اردوئے معلیٰ" کو بالواسطہ کانگرس کا ترجمان بنا دیا۔

"اردوئے معلیٰ" میں پہلا سیاسی مضمون "مسلمان اور پالیٹکس" کے عنوان سے فروری ۱۹۰۴ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ مضمون شیخ عبداللہ بی۔ اے (علی گڑھ) کا تحریر کردہ تھا۔ اس مضمون کے ذریعے شیخ عبداللہ نے مسلمانوں کو ایک سیاسی انجمن کی ضرورت کا احساس دلایا تھا اور انھیں یہ مشورہ دیا تھا کہ بلا تاخیر ایک سیاسی انجمن قائم کرنی چاہیے کیونکہ سیاسی انجمن" بطور ایک درسگاہ کے ہوگی جس کے ذریعے سے ہم قوم میں عمدہ اور قابل اشخاص پیدا کر سکیں گے جو قوم کے بھروسے کے قابل ہوں گے۔"

مارچ ۱۹۰۴ء کے شمارے میں "مسلمانوں کی کانگرس سے علاحدگی" کے عنوان سے "حق پسند" کے فرضی نام سے اور اپریل ۱۹۰۴ء کے شمارے میں "مسلمان اور کانگرس" کے عنوان سے "مسلمان" کے فرضی نام سے دو سیاسی مضامین شائع ہوئے۔ حسرت جیسے بے باک اور حق گو انسان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ فرضی نام سے اپنے مضامین شائع کرتے۔ اس لیے قیاس یہ کہتا ہے کہ یہ مضامین ان کے ہم خیال دوستوں کے لکھے ہوئے ہوں گے۔ یہ دونوں مضامین کانگرس کی موافقت میں تھے اور ان میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ کانگرس میں شامل ہو کر ملک و قوم کی خدمت کریں۔

خود حسرت کا پہلا سیاسی مضمون کانگرس کی موافقت میں بعنوان "نیشنل کانگرس اور پولیٹکل ایجی ٹیشن" اردوئے معلیٰ کے شمارہ ستمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انھوں نے لکھا تھا:

"ہم دیکھتے ہیں کہ وہ زمانہ دور نہیں جب کہ تعلیم یافتہ مسلمانانِ بمبئی و مدراس کی طرح شمالی ہندوستان کے مسلمان بھی کانگرس سے ہمدردی کا عملی اور اعلانیہ اظہار کرنے لگیں گے۔ اعلانیہ کا لفظ قابلِ لحاظ ہے۔ یعنی اس لیے کہ دل ہی دل میں تو ہر ذی ہوش اور تعلیم یافتہ مسلمان کانگرس کے مقاصد سے متفق ہونے پر مجبور ہے۔

ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ اس زمانے میں بھی کانگرس کی شرکت کو مسلمانوں کے حق میں مضر سمجھتے ہیں' ان کے پاس سوا اس کے اور کوئی قوی دلیل نہیں ہے کہ ہم سرسید کی پالیسی کے پیرو ہیں؛ اگر کوئی شخص ان سے اس معاملے میں بحث کرے تو یقیناً اس بحث کا خاتمہ ان کے اس قول پر ہوگا کہ ابھی تم کو دنیا کا تجربہ نہیں ہے۔ تم کو ابھی ان معاملات کی کیا خبر؟ ان سے تو کچھ ہم ہی خوب واقف ہیں' کیونکہ ہم نے سرسید کی آنکھیں دیکھی ہیں۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ حسرت نے اس بنیاد کو نشانہ بنایا' جس کی آڑ میں مسلمانوں کو کانگرس میں شرکت سے روکا جاتا تھا؛ انھوں نے اس مضمون میں آگے چل کر اس بات سے بحث کی ہے کہ اب وہ حالات نہیں رہے جو سرسید کے زمانے میں تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو عملی سیاست میں حصہ لینا چاہیے اور اپنی کوئی الگ سیاسی تنظیم قائم کرنے کی بجائے کانگرس میں شریک ہو کر اس کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہئیں۔ حسرت کے کئی اور سیاسی مضامین "اردوئے معلیٰ" میں شائع ہوئے' جن میں سے چند اہم مضامین کے عنوانات یہ ہیں:

(۱) مسلمان اور کانگرس (شمارہ نومبر ۱۹۰۴ء)
(۲) مسلمان اور پالیٹکس (شمارہ ستمبر ۱۹۰۶ء)
(۳) سودیشی تحریک اور بائیکاٹ (شمارہ جنوری ۱۹۰۷ء)
(۴) فریق نرم کی بعض غلط فہمیاں (شمارہ اگست ۱۹۰۷ء و ستمبر ۱۹۰۷ء) (دو قسطوں میں)
(۵) ہندوستان کے پولیٹیکل قیدی (شمارہ مئی ۱۹۱۰ء)

ان کے علاوہ حسرت نے کانگرس کے سالانہ جلسوں کی روداد بھی شائع کیں۔ اپنے جریدے یا دوسرے اخبارات و جرائد میں شائع ہونے والے سیاسی مضامین پر تبصرے کیے اور انگریزی اخبارات و جرائد کے اچھے سیاسی مضامین کے ترجمے چھاپے۔ الغرض انھوں نے ہر ممکن طریقے سے مسلمانوں کی سیاسی تربیت کی اور انھیں کانگرس میں برادرانِ وطن کے دوش بدوش لا کر کھڑا کر دیا۔

سب سے پہلے حسرت ہی نے ہندوستانی سیاست میں ستیاگرہ یا Passive Resistance کا نعرہ بلند کیا۔ اپنے مضمون "بیچینی کے آثار" (مطبوعہ اردوئے معلیٰ، مئی ۱۹۰۷ء) میں پنجاب اور بنگال کی شورش کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

"ہم لوگوں کا فرض ہے کہ امرِ حق کے اظہار میں باک نہ کریں اور صداقت کی آخری فتح پر یقینِ کامل رکھتے ہوئے راہِ حق میں جو مصائب پیش آئیں ان کو بہ کشادہ پیشانی برداشت کریں اور خوب سمجھ لیں کہ آزادی کی دولت آسانی سے نہیں حاصل ہوا کرتی ......... سردست ہمارے نزدیک ہر محبِ ملک کو انگریزی تشدد کے مقابلے میں مزاحمت دفاعی یعنی Passive Resistance کی پالیسی

پر کاربند ہوکر انگریزی مال کے خریدنے، بلکہ انگریزوں کو کسی قسم کی مدد پہنچانے سے قطعی انکار کر دینا چاہیے۔"

حسرت کو صرف ہندوستان ہی کی سیاست سے دلچسپی نہیں تھی، بلکہ وہ بین الاقوامی سیاست خصوصاً مسلم ممالک کی سیاست میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ اس کا ثبوت "اردوئے معلیٰ" کا مصطفیٰ کامل نمبر (شمارہ فروری و مارچ ۱۹۰۸ء) ہے، جو مصر کے سیاسی رہنما مصطفیٰ کامل کی وفات پر نکالا گیا تھا۔ وہ مسلم ممالک کی سیاسی، سماجی، تعلیمی اور تہذیبی زندگی کے متعلق بھی معلومات فراہم کرتے تھے۔ طرابلس، مصر، بلقان اور حجاز کے مسائل پر "اردوئے معلیٰ" میں کئی مضامین شائع ہوئے۔

"اردوئے معلیٰ" کے دوسرے دور میں حسرت کے کئی خطبات صدارت اور خطبات استقبالیہ بھی شائع ہوئے، جن سے ان کے سیاسی نقطۂ نظر کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ جمعیتہ العلمائے کانپور کے زیر اہتمام علمائے صوبہ متحدہ کا ایک جلسہ ۸ و ۹ اگست ۱۹۳۱ء کو الہ آباد میں منعقد ہوا تھا، جس کی صدارت حسرت نے کی تھی۔ انھوں نے خطبۂ صدارت میں اپنے سیاسی مسلک کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی:

"ہندوستان کے متعلق میرے سیاسی نصب العین کا حال سب کو معلوم ہے کہ میں آزادی کامل سے کم کسی چیز کو کسی حالت میں منظور نہیں کرسکتا، اور آزادی کامل بھی وہ جس کا دستور اساسی امریکہ یا روس کے مانند لازمی طور پر (۱) جمہوری (۲) ترکیبی اور (۳) لامرکزی ہو، اور جس میں اسلامی اقلیت کے تحفظ کا پورا سامان بھی بصراحت تمام موجود ہو۔"

(شمارہ جولائی و اگست ۱۹۳۱ء)

"اردوئے معلیٰ" میں حسرت کے مضامین کے علاوہ مولوی برکت اللہ خاں، گنگا پرشاد ورما، حاجی محمد موسیٰ خاں اور ملا عبدالقیوم حیدرآبادی کے مضامین بھی کانگریس کی حمایت میں برابر چھپتے رہے۔ اس کے علاوہ گوپال کرشن گوکھلے، بال گنگا دھر تلک اور سری اربندو گھوش وغیرہ کی اہم تقریروں کے اقتباسات بھی برابر دیے جاتے تھے۔ حسرت نے ایک مضمون میں وہ تمام آیات قرآنی ایک جگہ جمع کر دی تھیں جو غیر مسلموں سے تعاون یا عدم تعاون کے موضوع سے تعلق رکھتی تھیں اور ان سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ دنیوی معاملات میں ان سے اشتراک کی قرآن سے اجازت موجود ہے۔

المختصر "اردوئے معلیٰ" پہلا اردو جریدہ ہے جس نے ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں میں قومیت پر مبنی سیاسی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اس وقت مسلمانوں کی کانگریس دشمنی اور حکومت کی بیجا خوشامد و تملق کی پالیسی کے خلاف آواز بلند کی، جب کہ انگریز پرستی مسلمانوں کا طرۂ امتیاز تھی اور کانگریس کی ہم نوائی کفر سے کم نہ سمجھی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کے قدامت پسند حلقے اور علی گڑھ کے صاحب اقتدار طبقے کی طرف سے "اردوئے معلیٰ" کی شدید مخالفت کی گئی۔ علی گڑھ کالج کے طلبہ کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ "اردوئے معلیٰ" نہ خریدیں اور حسرت کی دوکان پر نہ جائیں۔ اس پر حکومت کا عتاب بھی نازل ہوا۔ پہلی بار اپریل ۱۹۰۸ء کے شمارے میں "مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کرنے کے جرم میں حسرت پر مقدمہ چلا اور انھیں دو سال کی قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ اسی موقع پر انھوں نے کہا تھا —

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

دوسری بار مئی ۱۹۱۳ء میں حسرت کے پریس سے تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی، جس کی وجہ سے انھیں اپنا پریس اور ساتھ ہی "اردوئے معلیٰ" کو بھی بند کرنا پڑا۔ لیکن ان تمام مخالفتوں کے باوجود حسرت کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہیں آئی۔ وہ اپنے مسلک پر برابر قائم رہے اور جب تک ہوسکا "اردوئے معلیٰ" کے ذریعے اپنے سیاسی خیالات کی برابر تبلیغ کرتے رہے۔ حسرت نے "اردوئے معلیٰ" کے ذریعے جو سیاسی پیغام دیا تھا وہ آج بھی ملک و قوم کے لیے مشعل راہ ہے ●●

ریحان غنی

# تحریکِ آزادی میں اُردوئے معلّٰی کی خدمات

اُردو میں "صحافت" اب ایک باضابطہ صنف بن گئی ہے۔ لیکن ابھی اس نے صرف ایک سو اسکٹھ بہاریں ہی دیکھی ہیں۔ کسی صنف کے لیے ایک سو اسکٹھ سال کی مدت زیادہ نہیں ہوتی۔ حالات کے نشیب و فراز کے باوجود اردو میں اس صنف نے تیزی سے ترقی کی۔ جس وقت اردو میں صحافت کا آغاز ہوا تھا، اس وقت اردو کے بجائے فارسی زیادہ پڑھی جاتی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ "جامِ جہاں نُما" جسے اردو کا پہلا اخبار کہا جاتا ہے، کی حیثیت فارسی اخبار کے ضمیمہ کے طور پر تھی۔ اس فارسی کے توسط سے یہ صنف اردو میں آئی۔ اور تیزی سے ترقی کرتی گئی۔ حالانکہ جس دور میں اردو صحافت کا آغاز ہوا تھا وہ دَور ہندوستان کی تاریخ کا انتہائی ہنگامہ خیز دَور تھا۔ انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستانی عوام میں نفرت کا جذبہ اُبھر رہا تھا۔ اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے ۱۸۵۷ء کے غدر کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ہندوستان کو انگریزوں کی گرفت سے نکالنے کی یہ پہلی جنگی کوشش تھی۔ جس میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے۔ لیکن اس جنگ میں اُنہیں ناکامی ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں پر ناقابلِ بیان حد تک مظالم ڈھائے۔ ایک انگریز افسر نے لکھا ہے کہ انبالہ سے دلّی تک ہزاروں بے قصور دیہاتیوں کو انگریزوں نے مار ڈالا۔ ان کے جسموں کو سنگینوں سے چھیدا جاتا تھا۔ تھامسن نے لکھا ہے کہ دلّی کے کچھ مسلمانوں کو ننگا کر کے اور زمین سے باندھ کر سر سے پاؤں تک جلتے ہوئے تانبے کے ٹکڑوں سے اچھی طرح داغ دیا جاتا[1] ایسے وقت میں مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر کی ادارت میں دہلی سے "دہلی اردو اخبار" نکل رہا تھا جس میں انگریزوں کے مخالفانہ پروپیگنڈوں کا جواب رہتا تھا اور پورا اخبار جنگی خبروں سے بھرا رہتا تھا، لیکن یہ اخبار زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکا اور ایک انگریز کو قتل کر دینے کے الزام میں مولانا باقر کو پھانسی دے دیے جانے کے بعد بند ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء ہی میں ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اخبارات کی آزادی سلب کر لی اور اس کے بعد بڑے پیمانے پر اخبارات کے خلاف کارروائیاں کی گئیں، جس کا خاص نشانہ اردو اور فارسی کے اخبارات اور رسائل بنے۔ اس کے نتیجے میں بیشتر اردو اخبارات و رسائل بند ہو گئے۔ اور اردو صحافت کی مرکزیت بھی ختم ہو گئی۔ پھر جب حالات معمول پر آئے تو نئی تیاریوں کے ساتھ مختلف مقامات سے اردو کے بے شمار اخبارات و رسائل منظرِ عام پر آئے۔ جن میں اودھ اخبار (لکھنؤ) اخبار سائنٹیفک سوسائٹی (علی گڑھ) پٹنہ ہرکارہ (پٹنہ) اخبار الاخیار (مظفرپور) تہذیب الاخلاق (علی گڑھ) صادق الاخبار (دہلی) قیصر الاخبار (الہ آباد) نسیم سحر (پٹنہ) اودھ پنچ (لکھنؤ) پیامِ یار (لکھنؤ) الپنچ (پٹنہ) اور دلگداز (لکھنؤ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ان اخبارات و رسائل کے لب و لہجہ، مضامین اور اندازِ بیان میں نمایاں فرق پیدا ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں کسی نے رسالہ کے اجرا کا مقصد "مسلمانوں کو کامل درجہ کی سولیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کرنا"[2] قرار دیا۔ کسی نے محض ملکی خبروں اور علمی و فنی موضوعات پر مقالے شائع کرنے تک ہی اپنے صفحات کو محدود رکھا اور کسی نے سیاست کو ظرافت کا جامہ پہنا کر پیش کیا۔ لہٰذا اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو کے اخبار نویسوں میں کوئی ایسا اخبار نویس نظر نہیں آتا جس نے اپنے اخبار و رسائل میں کھُل کر سیاسی مضامین شائع کئے ہوں اور عوام کو سیاسی طور پر بیدار کرنے کی کوشش کی ہو۔

○ دارالغنی، شاہ گنج، مہندرو، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶

جب بیسویں صدی کا سورج طلوع ہوا تو اس کے ساتھ ہی ہندوستان کو غیر ملکی حکومت کے شکنجے سے آزاد کرانے کی جد وجہد بھی بتدریج تیز ہوتی گئی۔

ایسے وقت میں علی گڑھ کے ایک نوجوان گریجویٹ جنہیں ہم سید فضل الحسن حسرت موہانی کے نام سے جانتے ہیں، اردو صحافت میں ایک روشن اور درخشندہ ستارے کی طرح نمودار ہوئے۔ انہوں نے اردوئے معلیٰ کے نام سے ایک رسالہ جاری کر کے مسلمانوں میں ملک کو آزاد کرانے کی تحریک سے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "اردوئے معلیٰ" حسرت کا ادبی رسالہ تھا۔ جس کا پہلا شمارہ یکم جولائی ۱۹۰۳ء کو علی گڑھ سے مطبع احمدی میں چھپ کر منظرِ عام پر آیا۔ یہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا کرتا تھا۔ اس کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور جولائی ۱۹۰۳ء سے اپریل ۱۹۰۸ء تک۔ اس مدت کے درمیان مئی ۱۹۰۸ء سے ستمبر ۱۹۰۹ء تک اس رسالے کی اشاعت حسرت موہانی کی گرفتاری کے سبب بند رہی۔ دوسرا دور اکتوبر ۱۹۰۹ء سے جون ۱۹۱۳ء تک (جولائی ۱۹۱۳ء سے دسمبر ۱۹۲۴ء تک یہ رسالہ بقول حسرت موہانی حکومت کے جبر واستبداد کا شکار رہا) اور تیسرا دور جنوری ۱۹۲۵ء سے مارچ ۱۹۴۲ء تک۔ اس کے بعد اس کی اشاعت بند ہوگئی۔

تیسرے دور میں اردوئے معلیٰ کا دفتر علی گڑھ سے منتقل ہوکر کان پور چلا آیا تھا اور حسرت موہانی نے بھی یہیں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اس طرح اردوئے معلیٰ مجموعی طور پر چھبیس سال تک ادبی رسالہ ہونے کے باوجود ہندوستان کو آزاد کرانے کی تحریک میں پیش پیش رہا۔ اس نے نہ صرف کانگریس کے حق میں فضا بنائی بلکہ انگریزوں کے سیاسی عزائم کا پردہ فاش کیا اور اپنے قارئین کے دل میں ملک سے سچی محبت اور ہمدردی کا جذبہ بھی پیدا کیا۔ اردوئے معلیٰ نے اپنے قارئین کو بتایا کہ صرف تعلیم کی طرف توجہ دینے سے کام نہیں چلے گا۔ بلکہ مسلمانوں کو سماجی اور سیاسی طور پر بھی کافی باشعور ہونے کی ضرورت ہے۔ اس نے مسلمانوں کو کانگریس سے قریب تر کرنے کی اس لیے کوشش کی کہ اس وقت یہی واحد جماعت تھی جس نے تحریکِ آزادی کی قیادت سنبھال رکھی تھی۔ چنانچہ برصغیر کے ممتاز محقق قاضی عبدالودود نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ حسرت کے رسالہ اردوئے معلیٰ نے ہی انہیں پکا کانگریسی بنادیا[6] حسرت موہانی چونکہ آزادیٔ کامل کے علمبردار تھے اور وہ اپنے ملک کو انگریزوں کی گرفت سے مکمل طور پر آزاد دیکھنا چاہتے تھے، اس لیے انہوں نے اردوئے معلیٰ میں ایسی ہی تحریریں پیش کیں، جن سے تحریکِ آزادی کو تقویت ملتی ہو۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے دل سے خواہاں تھے۔ اور وہ اپنے ملک پر غیر ملکی حکومت کے تسلط سے بے حد پریشان رہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اردوئے معلیٰ میں ایک جگہ یہ لکھا کہ ____

"____ چنانچہ خوابیدہ براعظم ایشیا میں بھی ہندوستان کے سوا اور کوئی بڑا ملک اس وقت آزادی کی نعمت سے محروم نہیں ہے۔ پس عقلِ سلیم کسی طرح باور نہیں کرسکتی کہ تمام عالم میں صرف ہندوستان ہی ایک ایسا ملک باقی رہے جس کی قسمت میں محکومیٔ دوام کی ذلت لکھ دی گئی ہو ____"

ملک کو اسی ذلت سے نکالنے کے لیے اردوئے معلیٰ نے اپنی اشاعت کے روزِ اوّل سے ہی اپنے قارئین کو سیاسی تربیت دینا شروع کردی تھی۔ کیوں کہ اس رسالے کی پہلی ہی اشاعت (یکم جولائی ۱۹۰۳ء) میں "پولٹیکل سائنس" کے عنوان سے قاضی تلمذ حسین گورکھپوری کا ایک مضمون ملتا ہے۔ اس کے بعد اردوئے معلیٰ نے فروری ۱۹۰۴ء میں مسلمان اور پولیٹکس کے عنوان سے سب سے پہلا اور باضابطہ سیاسی مضمون شائع کیا۔ اس کے بعد پھر اس میں سیاسی مضامین کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ حسرت موہانی چونکہ صرف ایک صحافی ہی نہیں بلکہ جنگِ آزادی کے ایک سپاہی بھی تھے، اس لیے انہوں نے اپنے رسالے کے ذریعہ سودیشی تحریک کو بھی کافی تقویت پہنچائی اور لوگوں کو ولایتی چیزیں ترک کرنے کی بھرپور ترغیب دی۔ اردوئے معلیٰ نے اس سلسلے میں مضامین شائع کر کے لوگوں کو بتایا کہ اس تحریک کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ قوی الاثر ہونے کے ساتھ ہی ساتھ مروجہ قانونِ حکومت کے بھی کسی طرح خلاف نہیں ہے۔ کیوں کہ اشیا کی خریداری افراد کی مرضی پر موقوف ہے جس میں حکومت کا جبر ودخل کسی طرح چل نہیں سکتا[5] اس کے ساتھ ہی اس رسالہ نے ولایتی چیزوں کا بائیکاٹ کئے جانے کی حمایت میں علمائے کرام کے فتوے بھی شائع کئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردوئے معلیٰ کو اس کی قیمت ادا کرنا پڑی۔ اور یہ رسالہ انگریزی حکومت کے جبر واستبداد کا شکار ہوگیا۔ حسرت کے .... "اردو پریس" سے بھی جس میں رسالہ چھپتا تھا، .... دیسی تحریک کو تیز کرنے اور انگریزی چیزوں کا بائیکاٹ کرنے کے الزام میں تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی۔ اور رقم کی عدم ادائیگی کی صورت میں اردو پریس ضبط ہوگیا۔ پھر نتیجہ کے طور پر اردوئے معلیٰ بند ہوگیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے اخبار "الہلال" کے دو مسلسل شماروں میں طویل اداریہ لکھ کر حکومتِ برطانیہ کی اس جابرانہ کارروائی کی شدومد کے ساتھ مخالفت کی اور تفصیل سے اردوئے معلیٰ کی مالی حالت نیز حسرت موہانی کی اولوالعزمی کا ذکر کیا۔ انہوں نے لکھا کہ ____

"گورنمنٹ اس سے بے خبر نہیں کہ اردو پریس اور اس کے مالک کی حالت کیا ہے؟ ____ ڈیڑھ دو روپے ماہوار کرائے کا ایک جھونپڑا ہے، جس کے اندر ایک

چھوٹی سی جھونپڑی ہے ایک کوٹھری ہے اور باہر بھی
اتنی ہی مکانیت ہے۔ اندر وہ فقیر حریت مع
اپنی کوہ عزم وثبات بیوی کے خود رہتا ہے اور
باہر کاٹھ کا دستی پریس اور دو چار پتھر ہیں۔ بسا
اوقات ایسا ہوا ہے کہ خود اسی نے اپنے ہاتھوں
سے اردوئے معلیٰ کی کاپیاں لکھی ہیں۔ خود ہی
تیقر پر جمائی ہیں اور خود ہی پریس چلا کر چھاپا ہے۔
یہ کل کائنات اردو پریس اور اس کے ملک
کی ہے۔ کوئی دوسرا ذریعۂ آمدنی نہیں اور
نہ اس کی طبع غیور کسی کی شرمندۂ احسان ہونا پسند
کرتی ہے۔ اردوئے معلیٰ کے دو چار سو خریدار
ہیں۔ اس کی قیمت سے شاید چند روپے مہینے میں
بچ رہتے ہیں اور اسی سے دو وقت کی روٹی کما کر یہ کشتۂ
آزادی کی بے خودی اور دولتِ لازوالِ حق وصداقت
کی غذائے غیر فانی سے مست رہتا ہے"[6]
نا ابوالکلام آزاد کے اس ادارئے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حسرت موہانی
سروسامانی کے عالم میں اردوئے معلیٰ نکالتے تھے۔

اس وقت میرے سامنے یکم جولائی ۱۹۰۳ء سے اپریل ۱۹۱۳ء
کے اردوئے معلیٰ کے شمارے ہیں۔ ان شماروں میں مندرجہ ذیل
ی مضامین ملتے ہیں۔

| | | |
|---|---|---|
| پولیٹیکل سائنس | از تلمذ حسین گورکھپوری | (یکم جولائی ۱۹۰۳ء) |
| مسلمان اور پالیٹکس | از شیخ عبداللہ | (فروری ۱۹۰۴ء) |
| مسلمان اور کانگریس | از حق پسند | (مارچ ۱۹۰۴ء) |
| مسلمان اور کانگریس | از مسلمان | (اپریل ۱۹۰۴ء) |
| مسلمان، کانگریس اور پولیٹکل ایجی ٹیشن | از حسرت موہانی | (ستمبر ۱۹۰۴ء) |
| مسلمان اور کانگریس | | (نومبر ۱۹۰۴ء) |
| مسلمان اور پالیٹکس | از حیدر علی قریشی | (دسمبر ۱۹۰۴ء) |
| نیشنل کانگریس اور مسلمان | از حسرت موہانی | (مارچ ۱۹۰۵ء) |
| پارٹی پالیٹکس | از مسلمان | (اگست وستمبر ۱۹۰۵ء) |
| ۱۰ پولیٹکل خودکشی | از گنگا پرشاد ورما | (اکتوبر ۱۹۰۶ء) |
| ۱۱ کانگریس اور مسلمان | از حق پسند | (مئی ۱۹۰۶ء) |
| ۱۲ ہندوستانی مسلمان در ہندوستان (فارسی) | از محمد برکت اللہ | (مئی ۱۹۰۶ء) |
| ۱۳ طالب علم اور پالیٹکس | از طالب علم | (اگست ۱۹۰۶ء) |
| ۱۴ مسلمانانِ ہند کا پولیٹکل مستقبل | از حسرت موہانی | (جون ۱۹۰۷ء) |
| ۱۵ مشاہداتِ زنداں | از حسرت موہانی | (کئی قسطوں میں) |
| ۱۶ ہندوستان کے پولیٹکل قیدی | از حسرت موہانی | (مئی ۱۹۱۰ء) |
| ۱۷ پولیٹکل نوٹ | از حسرت موہانی | (ستمبر ۱۹۱۲ء) |
| ۱۸ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے | از احمد رضا خاں بریلوی | (اپریل ۱۹۱۳ء) |

مذکورہ بالا تمام مضامین کو ایک نظر دیکھنے سے یہ بخوبی اندازہ کیا
جا سکتا ہے کہ اردوئے معلیٰ نے مسلمانوں کی کس طرح سیاسی تربیت کی اور پھر اس
سیاسی تربیت کے نتیجہ میں اس سے ملک وقوم کو کیا ملا۔ یہ اردوئے معلیٰ ہی تھا
جس نے قوم کو سیاسی حالات کے تغیر وتبدل سے گاہے گاہے باخبر رکھنے کی کوشش
کی۔ اردوئے معلیٰ بہت ہی نازک دور میں جاری ہوا۔ جب پورے ملک میں
سیاسی انتشار پھیل چکا تھا اور لوگوں کو اس سیاسی انتشار سے بچانے کی انتہائی
ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ ہی انگریزوں کو اپنے پیروں کے نیچے سے زمین
سرکتی ہوئی بھی نظر آ رہی تھی، جس کی وجہ سے وہ باا ثر اخبارات ورسائل
پر سخت نگاہ رکھنے لگے تھے۔ ایسے وقت میں اردوئے معلیٰ کے صفحات میں
سیاسی مضامین کی اشاعت یقیناً جرأت کا کام تھا، لیکن اس رسالے
نے ہمیشہ حق کی آواز بلند رکھی اور مسلسل ایسے ایسے مضامین شائع کرتا رہا جن
سے انگریزی حکومت کی پالیسی کی نقاب کشائی ہوتی رہی۔ اس کے علاوہ
اس رسالے نے انگریزی حکومت اور اس کی پالیسیوں پر وقتاً فوقتاً تنقیدیں
کیں اور اس طرح عوام کو بیدار کر کے اس نے تحریکِ آزادی میں بھرپور
حصہ لیا۔

## حواشی

۱۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ طفیل احمد منگلوری صفحہ ۶۴
۲۔ تہذیب الاخلاق۔ سرسید احمد خاں یکم شوال ۱۲۸۷ھ
۳۔ روزانہ قومی آواز (پٹنہ) ۷ اگست ۱۹۸۳ء
۴۔ اردوئے معلیٰ نومبر ۱۹۰۹ء
۵۔ اردوئے معلیٰ فروری ومارچ ۱۹۱۳ء
۶۔ الہلال۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۲۱ مئی ۱۹۱۳ء

## عبداللطیف اعظمی

# غلطی ہائے مضامین

مولانا حسرت موہانی اُن خوش نصیب شاعروں، مصنفوں اور صحافت نگاروں میں سے ہیں، جن کے بارے میں اچھی خاصی تعداد میں کتابیں اور بہت سے مضامین لکھے گئے ہیں اور اُن کے صدسالہ یوم پیدائش کے موقع پر، ان کی یاد میں متعدد سیمینار منعقد کیے گئے۔ اردو کے ممتاز رسالوں نے خصوصی شمارے شائع کیے۔ مگر مجھے شکایت ہے کہ ان کی سیاسی خدمات اور خیالات پر بہت کم لکھا گیا اور جو کچھ لکھا گیا، ان میں معروضیت کی بجائے عقیدت اور مبالغے سے کام لیا گیا۔ واقعات اور تاریخوں کی صحت کو بالعموم نظر انداز کر دیا گیا اور اُنہیں ایک افسانوی شخصیت کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔

میں نے حسرت موہانی کا جب مطالعہ شروع کیا تو مجھے دو خامیاں خاص طور پر محسوس ہوئیں۔ ایک یہ کہ ان کی حیاتِ زنداں کی طرف پوری توجہ نہیں کی گئی۔ پہلی مرتبہ جب وہ گرفتار ہوئے تھے اور اُنہیں قید و بند کی سزا ملی تھی تو دوست، احباب اور عقیدت مندوں کی فرمائش پر خود اُنہوں نے اپنی رہائی کے تقریباً چھ ماہ کے بعد، اپنے ماہ نامہ "اردوئے معلیٰ" میں "مشاہداتِ زنداں" کے عنوان سے زمانۂ قید کے حالات قسط وار شائع کیے۔ اس کے بعد دو مرتبہ اور مرحوم گرفتار ہوئے اور قید یا نظر بندی کی سزائیں ہوئیں، مگر ان کے بارے میں نہ تو خود مرحوم نے لکھا اور نہ کسی اور نے، جس کی وجہ سے ان کے سوانح نگاروں کے پیشِ نظر صرف پہلی قید کی تفصیلات اور تکالیف تھیں، اس لیے وہ اسی پر اعتماد کرنے پر مجبور تھے۔ اور دوسری سزاؤں کو اسی پر قیاس کر لیا کرتے تھے۔

○ ۳۳۹- ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

مرحوم کی صدسالہ تقریبات کے زمانے میں پہلی مرتبہ راقم الحروف نے ان دونوں سزاؤں کے واقعات اور ان کی تفصیلات کے بارے میں مختلف اخبارات کی مدد سے ایک مبسوط مضمون لکھا جو یوپی کی اردو اکادمی کے دوماہی رسالہ "اکادمی" بابت ماہ مئی ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ ماہ نامہ "آج کل" کے اسی شمارے میں حسرت کی زندگی کی اہم تاریخیں شائع ہو رہی ہیں، اُمید ہے کہ ان کی اشاعت سے وہ خلا کسی حد تک پُر ہو جائے گا جو خدمات پر نہ لکھنے کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے۔ کم از کم اہم تاریخیں یک جا مل جائیں گی۔ میں نے پوری کوشش کی ہے ان میں کوئی غلطی نہ ہو، پھر بھی تحقیق میں سو فی صدی صحت کا دعویٰ کرنا ممکن نہیں ہے۔ صحیح تحقیق کے معنی صرف یہی ہوتے ہیں کہ حقیقت کی تلاش کے جتنے امکانات ممکن ہوں ان سے پوری دیانت کے ساتھ کام لیا جائے، سو اس کی میں نے کوشش کی ہے۔

دوسری خامی جو مجھے محسوس ہوئی وہ یہ ہے کہ حسرت کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، ان میں تاریخوں اور واقعات کی کافی غلطیاں ہیں. اس طرح کی غلطیاں ان کے معاصرین کے حالات میں بھی ملتی ہیں چنانچہ مولانا محمد علی جوہر پر مجھے کام کرنے کا موقع ملا تو "غلطی ہائے مضامین" کے عنوان سے ایک مستقل مضمون لکھنا پڑا۔ مگر حسرت کے یہاں ان کے معاصرین کے مقابلے میں ایک خاص بات میں نے یہ محسوس کی کہ بعض لوگوں نے افسانہ طرازی کی کوشش کی ہے۔ ماہ نامہ آج کل کے مدیرِ محترم راج نرائن رازؔ صاحب سے ضمناً جب اس کا ذکر آیا تو اُنھوں نے اس پہلو پر لکھنے کی فرمائش کی، مگر اُنھوں نے جو وقت دیا وہ موضوع کی اہمیت اور تحقیق کی دشواریوں کے لحاظ سے ناکافی تھا۔ پھر بھی میں اس لیے تیار

نیاکہ ریسرچ کا سلسلہ تو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس وقت جو خامیاں
جائیں گی وہ بعد میں دُور کی جا سکتی ہیں ۔ فی الحال جس قدر اہم غلطیوں
نشان دہی) اور ان کی صحت ممکن ہے وہ کر دینی چاہیئے ۔ اسی نقطۂ نظر
میر یہ مضمون لکھ رہا ہوں ۔

مولانا حسرت موہانی اور مولانا محمد علی جوہر پر کام کرنے کے بعد
ں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ غلطیوں کی بڑی وجہ یہ ہے کہ شروع شروع
ں کسی نے جو کچھ لکھ دیا ، بعد میں لوگوں نے تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں
جھی ۔ اور انہیں باتوں کو وہ دُہراتے رہے ۔ اور اگر کسی بھاری بھرکم
خصیت نے لکھا ہے تو اس سلسلے میں ہمارا اصول یہ ہے کہ : " خطائے
زرگاں گرفتن خطا است "۔ نیا ذہن بالعموم اس اصول کا قائل نہیں ہے ۔
ر تحقیق کی راہ میں جو دشواریاں ہیں ان کو قبول کرنے یا ان کا سامنا کرنے
ہمت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے ۔ اس لیے پچھلی باتوں کو دُہرا دینے
ں عافیت سمجھتے ہیں ۔ حسرت کی وفات کے بعد جہاں تک میرا مطالعہ ہے
ب سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی نے مرحوم کے چالیسویں کے موقع
یعنی ۷ار رمضان ۱۳۷۰ھ مطابق ۲۲ رجون ۱۹۵۱ء کو ایک تعزیتی مضمون
ما ، جو اسی سال دسمبر کے ماہ نامہ " معارف " ( اعظم گڑھ ) میں وفیات
تحت " وا حسرتا " کے عنوان سے شائع ہوا ( صفحات : ۴۵۸-۴۷۵)
ی مضمون ماہ نامہ " نگار " ( لکھنؤ ) کے حسرت موہانی نمبر بابت جنوری و فروری
۱۹۵ء میں " حسرت کی سیاسی زندگی " کے عنوان سے شائع ہوا ۔ پچھلے
ال ساہتیہ اکاڈمی ( دہلی ) سے مولانا حسرت موہانی پر ایم ۔ حبیب خاں
ایک مختصر سی کتاب شائع ہوئی ہے ۔ جس میں موصوف نے سید صاحب
ے اس مضمون کے بارے میں لکھا ہے کہ : " یہ مضمون سب سے پہلے
نگار " کے حسرت نمبر میں شائع ہوا تھا " ( صفحہ ۴۷ ) یہ صحیح نہیں ہے ۔
ی طرح " نگار " کے " حسرت نمبر " کا سنہ بھی غلط ہے ۔ ۱۹۵۱ء نہیں ۱۹۵۲ء ہے ۔ سید صاحب
ا یہ تعزیتی مضمون ان کے مجموعۂ مضامین : " یادِ رفتگاں " ( مطبوعہ :
راچی ۔ جنوری ۱۹۵۵ء ) میں بھی شامل ہے ۔ نیز نومبر ۱۹۸۱ء میں
پی کی اردو اکاڈمی کے دوماہی رسالہ " اکادمی " ( لکھنؤ ) کا یادگار حسرت نمبر
شائع ہوا تو " یادِ رفتگاں " کے حوالے سے " وا حسرتا " ہی کے عنوان سے
مضمون شائع کیا گیا ہے ۔

## لطی کی پہلی مثال :

اس میں شبہ نہیں کہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی شخصیت بہت
ند ہے اور ان کی علمی و ادبی خدمات ناقابلِ انکار اور ناقابلِ فراموش ہیں مگر
فاق سے زیرِ تذکرہ تعزیتی مضمون میں بہت سی تاریخی اور واقعاتی غلطیاں
ہیں ۔ جن کی طرف ...... مولانا کی بھاری بھرکم شخصیت کی وجہ سے کسی
کی نظر نہیں گئی ۔ اور بعد کے لکھنے والے بغیر سوچے سمجھے ان غلطیوں کو دُہراتے
رہے ۔ بعض مصنفوں اور مضمون نگاروں کے الفاظ اور جملے تک وہی ملیں گے
جو سید صاحب نے لکھے ہیں ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں : " پانچ برس تک
اُردوئے معلیٰ نکلتا رہا ۔ ۱۹۰۸ء میں ایک بے نام صاحبِ قلم کا ایک
مضمون : مصر کے نامور لیڈر مصطفےٰ کامل کی موت پر شائع ہوا ، جس میں مصر
میں انگریزوں کی پالیسی پر بے لاگ تنقید تھی ...... پاداش میں حسرت مرحوم
کو دو برس قیدِ سخت کی سزا ہوئی ...[۵]" اس اقتباس میں دو غلطیاں ہیں :
۱ ۔ جس مضمون کو حکومت نے قابلِ اعتراض سمجھا تھا وہ مصطفےٰ کامل کے بارے
میں نہیں تھا بلکہ اس کا عنوان تھا : " مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی " جو
اردوئے معلیٰ کے اپریل ۱۹۰۸ء ( جلد ۱۰ ۔ شمارہ ۴ ) میں شائع ہوا تھا اور
" مصطفےٰ کامل نمبر " اس سے تین ماہ قبل جنوری ۱۹۰۸ء ( جلد ۱۰ ۔ شمارہ ۱ ) میں
شائع ہوا تھا ۔
۲ ۔ اسی طرح سزا کی مدت بھی صحیح نہیں ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ زیریں عدالت
سے دو سال کی سزا ہوئی تھی ، مگر اپیل پر یہ سزا تخفیف ہو کر صرف
ایک سال کی رہ گئی تھی ۔ سید صاحب کی اس غلطی کا دوسروں پر کیا اثر پڑا ،
چند مثالیں اس کی ملاحظہ ہوں ۔ [illegible]رت موہانی ـــــ ایک سیاسی ڈائری "
کے مؤلف لکھتے ہیں : " مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلیٰ میں تحریکِ
مصر پر انگریزوں کی گندی پالیسی کے خلاف ، مصری حریت پسند " مصطفےٰ کامل
کی موت پر " کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا ، جس کی پاداش میں مولانا
حسرت کی گرفتاری عمل میں آئی ...... عدالتِ عالیہ نے مولانا حسرت کو
دو سال کی قیدِ سخت اور پانچ سو روپے جرمانے کا حکم سُنایا[۶] " اس اقتباس
میں خط کشیدہ لفظ پر بھی غور فرما لیجئے ۔ " عدالتِ عالیہ " سپریم کورٹ کا ترجمہ
کیا جاتا ہے جس کا اس زمانے میں وجود ہی نہیں تھا ، اگر ہوتا بھی تو شاید
اس کی نوبت ہی نہ آتی ۔ دوسری مثال ملاحظہ ہو ۔ ایم ۔ حبیب خاں صاحب
کی کتاب کا اوپر ذکر آ چکا ہے ۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے ، اس
میں اور سید صاحب کی عبارت میں بہت کم فرق ہے ۔ لکھتے ہیں : " پانچ سال
تک " اردوئے معلیٰ " پابندی سے نکلتا رہا ۔ انہوں نے ۱۹۰۸ میں مصر کے مشہور
لیڈر مصطفےٰ کامل کی موت پر ایک نمبر شائع کیا ، جس میں ایک مضمون
" مصر میں برطانیہ کی پالیسی " پر بھی تھا ۔ حکومتِ برطانیہ نے ایڈیٹر " اردوئے
معلیٰ " کو باغی قرار دیا ۔ اس جرم کی پاداش میں حسرت کو عدالت نے دو برس
کی سزا اور پانچ سو روپے جرمانہ کیا[۷] " تیسری مثال : حسرت موہانی کے قریب
ترین عزیز اختر حسن صاحب نے لکھا ہے : " مصر میں انگریزوں کی حکمتِ عملی کے
زیرِ عنوان اردوئے معلیٰ میں شائع ہونے والے ایک مضمون کے سلسلے میں

۲۳ جون ۱۹۰۸ء کو حسرت پر مقدمہ چلا اور ۴ اگست ۱۹۰۸ء کو انہیں دو سال کی قید با مشقت اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ اس دَور کا آخری پرچہ جولائی ۱۹۰۸ء کا شمارہ تھا، جو مصطفےٰ کامل نمبر کی شکل میں شائع ہوا تھا۔[۵۳] اس مضمون میں بعینہٖ یہی بات صفحہ ۴۵ پر بھی دُہرائی گئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلی عبارت میں مصطفےٰ کامل نمبر کا شمارے کا سنہ ۱۹۰۸ء درج ہے اور دوسری جگہ ۱۹۰۷ء ہے۔ اور اُردوئے معلیٰ کے جس شمارے میں قابلِ اعتراض مضمون شائع ہوا تھا، اس کا مہینہ جون لکھا ہے، جب کہ صحیح مہینہ اپریل ہے۔ چوتھی مثال: ڈاکٹر راج بہادر گوڑ لکھتے ہیں: "۱۹۰۸ء میں اردوئے معلیٰ میں انگریزوں کے خلاف ایک سخت مضمون شائع ہوا، یہ مضمون تھا: "مصری حریت پسند مصطفےٰ کامل کی موت پر"... مولانا پر سڈیشن (بغاوت) کا جرم عائد ہوا اور ۴ اگست ۱۹۰۸ء کو دو سال کی قید با مشقت اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔[۵۴] اسی مضمون میں آگے چل کر فاضل مضمون نگار نے مولانا کی رہائی کا سن ۱۹۱۰ء لکھا ہے (صفحہ ۱۲۷) حالانکہ رہائی کا سنہ ۱۹۰۹ء اور تاریخ ۱۹ جون ہے۔

## غلطی کی دوسری مثال:

سید صاحب لکھتے ہیں: "آگرہ کے اجلاس مسلم لیگ منعقدہ ..... ۱۹۱۴ء میں، جو مسجد کان پور کے ہنگامے کی مصالحت کے بعد ہی ہوا تھا، حسرت شریک تھے۔ اور میں بھی اس اجلاس میں شریک تھا۔ سردیوں کا زمانہ تھا، شب کے جلسے میں مصلحت پسندوں نے لارڈ ہارڈنگ کے شکریے کا ریزولیوشن پیش کیا۔ یہ وہ موقع تھا جب ان مصلحت پسندوں کے ساتھ بہت سے احرار بھی ان کی تائید میں تھے۔ ایسے نازک موقع پر صرف دو نوجوان اس کی مخالفت میں اُٹھے: ایک حسرت موہانی اور دوسرے مولوی عبدالودود بریلوی مرحوم۔[۵۵] اب اس کی بازگشت ملاحظہ ہو: ڈاکٹر احمر لاری اپنے تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں: (مسجد کانپور کے) "قضیئے کے اختتام کے بعد مسلم لیگ کا جو اجلاس آگرہ میں منعقد ہوا (دسمبر ۱۹۱۳ء) اس میں حسرت بھی شریک تھے۔ اس اجلاس میں جب آغا خان نے مسجد کانپور کے فیصلے کے متعلق لارڈ ہارڈنگ کے شکریے کی قرار داد پیش کی تو مستبدین کے علاوہ اکثر احرار نے بھی اس کی تائید کی، لیکن حسرت جیسا حریت پسند اور حق گو اس قسم کی قرار دادوں کی تائید کب کر سکتا تھا۔ بقول سید سلیمان ندوی، اس نازک موقع پر[۵۶]..." (اس کے بعد مذکورہ اقتباس کے آخری جملے درج ہیں) سیاسی ڈائری کے مؤلف لکھتے ہیں: ..."آگرہ میں مسلم لیگ نے اپنا اجلاس منعقد کیا۔ مولانا حسرت بھی اس اجلاس میں شریک ہوئے (جو گرفتار ہونے سے رہ گئے تھے) اور جب مسجد شہید گنج کے تصفیے پر لارڈ ہارڈنگ کا شکریہ ادا کرنے کا ریزولیوشن پیش ہوا تو مولانا حسرت نے بڑی سختی سے اس کی مخالفت کی۔[۵۷]......

اس اقتباس میں خط کشیدہ الفاظ غالباً کتابت کی غلطی ہے۔ اور مسجد کانپور کی جگہ مسجد شہید گنج چھپ گیا ہے۔ اختر حسن صاحب فرماتے ہیں: "۱۹۱۴ء میں مسلم لیگ کے آگرہ کے اجلاس میں کان پور کی مسجد کا قضیہ طے کرنے کی ستائش کرتے ہوئے ایک ریزولیوشن پیش کیا گیا۔ حسرت نے بہت شدت کے ساتھ اس ریزولیوشن کی مخالفت کی۔[۵۸] فرنگی محل لکھنؤ کے فرزند ارجمند اور اب پاکستانی شہری اور مولانا حسرت کے مخلص عقیدت مند مولانا جمال الدین عبدالوہاب المعروف جمال میاں سید صاحب کے حوالے سے لکھتے ہیں: "۱۹۱۴ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس آگرہ میں منعقد ہوا۔ اس میں مولانا حسرت نے حصہ لیا — کان پور کی مسجد کا قضیہ (طے) کرانے کے سلسلے میں لارڈ ہارڈنگ کے شکریے کا ریزولیوشن جب اس اجلاس میں پیش ہوا تو مولانا حسرت نے اس کی مخالفت کی۔[۵۹]

مذکورہ بالا اقتباسات کو آپ نے ملاحظہ فرما لیا۔ یہ ارشادات کتنے اہم لوگوں کے ہیں۔ مگر یہ معلوم کرکے آپ کی کیا کیفیت ہوگی کہ ۱۹۱۴ء میں مسلم لیگ کا سرے سے کوئی اجلاس ہوا ہی نہیں۔ مشہور مسلم لیگی سر سید رضا علی اپنی خود نوشت سوانح حیات: "اعمال نامہ" میں لکھتے ہیں: "۱۹۱۴ء میں جنگِ یورپ کے باعث مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس نہیں ہوا تھا۔"[۶۰] مزید ثبوت کے لیے ملاحظہ ہو: چارٹ آف آل انڈیا مسلم لیگ سیشنز ۱۹۰۶ء تا ۱۹۴۳ء شائع کردہ فاؤنڈیشنز آف پاکستان مولفہ سید شریف الدین پیرزادہ۔ انڈین ایڈیشن ۱۹۸۲ء: ساتواں اجلاس مسلم لیگ منعقدہ آگرہ بتاریخ ۳۰ و ۳۱ دسمبر ۱۹۱۳ء اور آٹھواں اجلاس مسلم لیگ منعقدہ بمبئی بتاریخ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء (جلد دوم صفحہ ۶۰۸)

یہ نہ سمجھا جائے کہ سید صاحب مرحوم اور دوسرے حضرات سے غلطی صرف سنہ کی ہوئی ہے، بلکہ پورا واقعہ ہی بے بنیاد ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسجد کان پور کے قضیے کو خوش اسلوبی سے طے کر لینے کی خوشی میں وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کے شکریے کا ریزولیوشن سر آغا خاں نے ۱۹۱۴ء میں نہیں ۱۹۱۳ء میں پیش کیا تھا۔ اور اس کی حمایت راجہ سر محمد علی محمد خاں آف محمود آباد نے کی تھی اور یہ ریزولیوشن بغیر کسی اختلاف کے بالاتفاق پاس ہو گیا تھا۔[۶۱] مولانا حسرت موہانی غالباً اس اجلاس میں شریک بھی نہیں ہوئے تھے۔ زیرِ حوالہ کتاب (فاؤنڈیشن آف پاکستان) کی انڈکس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حسرت نے پہلی بار مسلم لیگ کے آٹھویں اجلاس منعقدہ بمبئی بتاریخ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء تا یکم جنوری ۱۹۱۶ء میں شرکت

تھی ۔ البتہ مولوی عبدالودود ضرور شریک ہوئے تھے ۔ جن کا تذکرہ
م فاؤنڈیشن آف پاکستان میں ابوالکلام مولوی سید عبدالودود لکھا
ہے ۔ اور جو بریلی ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کے سکریٹری تھے ۔ انہوں نے اس اجلاس
، دوسری نشست کے اختتام پر نواب وقار الملک بہادر کا ایک خصوصی پیغام
ھ کر سنایا تھا، جو وہ خود دے کر آئے تھے۔[۱۳]

## چند متفرق غلطیوں کی مثالیں :

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کی تحریک شروع ہوئی تو فاؤنڈیشن
کمیٹی کے ممبران اور مسلم رہنماؤں میں دو گروہ پیدا ہو گئے ۔ ایک گروہ
حکومت کی شرائط کے خلاف تھا ۔ اور اسے اپنی شرطوں پر اصرار تھا ۔ یہ
گروہ احرار کے نام سے موسوم تھا ۔ دوسرا گروہ حکومت کی شرطوں کو قبول کرنے
کے لیے بالکل تیار تھا ۔ پہلے گروہ میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی،
مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا مظہر الحق وغیرہ شامل
تھے ۔ مگر ۱۹۱۷ء میں جب بیشتر قومی رہنما نظر بند یا قید میں تھے تو ۸ر
اپریل ۱۹۱۷ء کو علی گڑھ میں نواب بھوپال پرنس حمید اللہ خاں کی صدارت
میں مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا ایک جلسہ منعقد ہوا تو دوسرے گروہ
کو موقع ملا ۔ اور انہوں نے ڈاکٹر انصاری اور مولانا مظہر الحق کو بھی اپنا ہم
خیال بنا لیا ۔ اور حکومت کی شرطوں پر مسلم یونیورسٹی کا قیام منظور کر لیا ۔ اس پس
منظر میں ڈاکٹر احمر لاری کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو : "حسرت جب جیل اور
نظر بندی سے رہا ہو کر آئے تو انہیں یہ بات معلوم ہوئی اور یہ بھی پتہ چلا کہ
مولانا مظہر الحق، جن کا جماعتِ احرار سے تعلق تھا، اس معاملے میں پیش
پیش تھے ۔ حسرت کو مخالف گروہ کے رہنماؤں سے زیادہ مولانا مظہر الحق
سے شکایت تھی ۔ انہوں نے ایک قطعے میں جس کا پہلا شعر ذیل میں درج
ہے، ان سے بیزاری کا اظہار بڑے (پُر) زور الفاظ میں کیا ہے۔[۱۴] ..."
ڈاکٹر لاری کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ رہائی کے بعد مولانا حسرت کو اس کی اطلاع
ملی اور اس وقت مولانا مظہر الحق کے خلاف قطعہ کہا تھا، بلکہ جیل ہی میں
اس فیصلے کی اطلاع مل گئی تھی اور اسی وقت انہوں نے زیر تذکرہ شعر کہے تھے ۔
اور ان اشعار میں صرف مولانا مظہر الحق کا ہی ذکر نہیں ہے بلکہ ڈاکٹر انصاری
کا بھی ذکر ہے ۔ چنانچہ یہ اشعار کہنے کے بعد جیل ہی سے ماہنامہ "الناظر" (لکھنؤ)
کو اشاعت کے لیے بھیج دئے تھے ۔ اور مولانا کی رہائی سے تقریباً ڈیڑھ سال
پہلے جون ۱۹۱۷ء کے شمارے میں یہ اشعار "مسلم یونیورسٹی کا فیصلہ" کے
عنوان سے "الناظر" میں چھپ چکے تھے ۔ ڈاکٹر لاری نے صرف مطلع درج
کیا ہے ۔ ہم تمام اشعار ذیل میں نقل کرتے ہیں :

گو بظاہر شیر ہوں، باطن میں بودے دل کے ہیں
مظہر الحق نام ہے، پیرو مگر باطل کے ہیں
قوم کو اپنی ہی دنیا مل کے دشمن سے شکست
یہ نتیجے آپ ہی کی فکرِ لاطائل کے ہیں
ناز تھا شوقِ شہادت پر ابھی کل تک جنہیں
دست و بازو آج گویا خود وہی قاتل کے ہیں
مل چکی سرکار استبداد میں جائے امام
حوصلے کار اس تجویز بے حاصل کے ہیں
پائیں گے البتہ آغا خانِ ثانی کا خطاب
گر یہی انداز ان کے فہم ناقابل کے ہیں
مظہر و انصار نے مل کر یہ ثابت کر دیا
ہم میں اب بھی کچھ نمونے ناظم و کامل کے ہیں
کیوں نہ ہو خطرے میں حسرت قافلہ احرار کا
راہزن ہوں جب وہی جو راہ زن منزل کے ہیں

(الناظر صفحہ ۲۵)

یہ بات نامکمل رہے گی اگر یہ وضاحت نہ کر دی جائے کہ جب
مسلم لیگ کے گیارہویں اجلاس منعقدہ دہلی بتاریخ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۸ء میں ڈاکٹر
انصاری نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں ملک کی تحریکِ آزادی کا حق ادا کر دیا اور
مولانا حسرت نے ڈاکٹر انصاری کے خلوص کی گرمی محسوس کی تو انہیں معاف کر دیا ۔
اور ان کی تعریف میں پانچ شعر کہے جن کا مطلع ہے :

خطبۂ لیگ ہے کفارہ گنہگاری کا
اب ہمیں شکوہ نہیں ڈاکٹر انصاری کا

بیگم حسرت موہانی نشاط النساء بیگم کی وفات ۸ر اپریل ۱۹۳۷ء کو
ہوئی ۔ اس کا ایک واضح اور قطعی ثبوت یہ ہے کہ سہ روزہ مدینہ (بجنور)
نے ۱۷ر اپریل ۱۹۳۷ء کے شمارے میں مرحومہ کی وفات پر تعزیتی نوٹ
لکھتے ہوئے اطلاع دی ہے کہ : "۸ر اپریل جمعرات کے یوم مبارک
میں ۱۱ بجے دن کے انتقال فرمایا ۔" (صفحہ ۲) لیکن بعض لوگوں نے غلطی
سے ان کی تاریخ وفات ۱۸ر اپریل ۱۹۳۷ء لکھی ہے ۔ مثلاً ڈاکٹر لاری
نے اپنے تحقیقی مقالے میں لکھا ہے : "۱۸ر اپریل ۱۹۳۷ء (مطابق ۲۵ محرم
۱۳۵۶ھ) کو بیگم حسرت نے وفات پائی ۔" موصوف نے مولانا حسرت کے
مضمون مطبوعہ اردوئے معلیٰ بابت فروری تا اپریل ۱۹۳۷ء کا حوالہ دیا ہے ۔
یہ شمارہ ہمارے یہاں نہیں ہے ۔ اس لیے میں اس کی تصدیق نہ کر سکا، مگر

اس اطلاع میں جو ہجری تاریخ درج ہے، اس کی عیسوی تاریخ ۸ ر اپریل ہے نہ کہ ۱۰ ر اپریل۔ غالباً ڈاکٹر لاری کی اتباع میں عتیق صدیقی مرحوم اثر بن یحییٰ انصاری اور راقم حبیب خاں نے بھی یہی غلط تاریخ اپنی کتابوں میں لکھی ہے[۳۶]

عتیق صدیقی صاحب مرحوم کا اردو کے اچھے اور قابلِ ذکر محققین میں شمار ہوتا ہے۔ اور انہوں نے چند ایسی کتابیں لکھی ہیں جو تحقیق کے لحاظ سے خوب ہیں۔ مگر حسرت موہانی ان کے کبھی ممدوح ہیں اور کبھی کبھی وہ بھی افسانوی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کے محتاج نہ وہ خود ہیں اور نہ حسرت موہانی۔ ذرا ان کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو: "حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی میں جب پہلی بار تقریر کرنے کے لیے حسرت کھڑے ہوئے تو پورے ایوان نے تالیاں بجا بجا کر ان کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ اس وقت آئین ساز اسمبلی کے نائب صدر ایچ۔سی۔ مکرجی صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے حسرت کے اس پُرتپاک خیر مقدم کو دیکھ کر کہا تھا" مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی ہے کہ یہ ایوان اس ملک کے تئیں مولانا حسرت موہانی کی عظیم الشان قربانیوں کو بھولا نہیں ہے۔ موصوف پہلے شخص ہیں جنہوں نے مادرِ وطن کے لیے آزادئ کامل کا مطالبہ کیا تھا۔" اس دعوے کے لیے نہ کوئی ثبوت نہ کوئی حوالہ۔ اس کی تصدیق کے لیے دستور ساز اسمبلی کی سرکاری روداد کے ہزاروں صفحات کی مجھے ورق گردانی کرنی پڑی۔ مگر سخت مایوسی اور ناکامی ہوئی۔ اس پہیلی کو سلجھانے کے لیے اُنہوں نے دو اتے پتے لکھ دیئے ہیں، اُنہیں سے تھوڑی سی آسانی ہوئی، ایک یہ کہ جب وہ پہلی مرتبہ دستور ساز اسمبلی میں تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے، دوسرے یہ کہ اُس وقت نائب صدر ایچ۔سی۔ مکرجی صدارت فرما رہے تھے۔ اس اتے پتے پر تلاش کرنے کے بعد صرف اتنا معلوم ہوا کہ حسرت موہانی جب پہلی مرتبہ کسی ریزولیوشن یا کسی مسئلے میں ترمیم پیش کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو کوئی تالی نہیں بجی اور نہ ممبروں میں سے کسی نے خوشی اور مسرت کا اظہار کیا اور نائب صدر مکرجی نے اگر کوئی خیر مقدم کیا تو صرف اس قدر کہ انہیں تقریر کرنے سے روک دیا اور فرمایا کہ ضابطے کے مطابق کوئی ترمیم نہیں پیش کی جا سکتی۔ عتیق صدیقی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مولانا تیسرے درجے میں سفر کرتے تھے اور ان کی جیب میں فرسٹ کلاس کا پاس ہوتا تھا۔ جذباتی لحاظ سے یہ بات صحیح ہو سکتی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ حسرت کے زمانے تک پاس کا رواج شروع نہیں ہوا تھا۔

جناب حبیب خاں نے لکھا ہے: "ہندوستان کا دستور ۲۶ر جنوری ۱۹۴۹ء کو قانون ساز اسمبلی میں منظوری کے لیے پیش کیا گیا تو اتفاق رائے کے لیے اسپیکر نے دریافت کیا کہ "کیا ہندوستان کا یہ نیا دستور آپ سب حضرات کو منظور ہے؟" سب نے نئے دستور کی حمایت میں ہاتھ اُٹھا دیئے۔ لیکن اچانک پورے ایوان میں ایک آواز گونجی: "مجھے منظور نہیں"۔ یہ تنہا آواز اس مردِ مجاہد کی تھی، جس نے ۱۹۲۱ء میں احمد آباد کانگریس کے اجلاس میں ہندوستان کی کامل آزادی کی تجویز پیش کی تھی۔" (حسرت موہانی۔ صفحات ۲۶-۲۷)

مختصر اقتباس میں چار غلطیاں ہیں جن کے نیچے خط کھینچ دیا گیا ہے۔ پہلی یہ کہ ۲۶ر جنوری کو نہیں، ۲۶ر نومبر ۱۹۴۹ء کو دستور مکمل طور پر منظور کیا گیا تھا۔ دوسری یہ کہ دستور ساز اسمبلی میں "اسپیکر" کا کوئی عہدہ نہیں تھا۔ تیسری یہ کہ ہاتھ اُٹھا کر اظہارِ رائے نہیں کیا گیا بلکہ فیصلہ آواز کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔ چوتھی یہ کہ دستور ساز اسمبلی کی منظور شدہ سرکاری روداد کے مطابق، دستور کی مخالفت میں کوئی آواز بلند نہیں ہوئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ صدر اسمبلی ڈاکٹر راجندر پرشاد کی اجازت اور ارشاد پر ڈاکٹر امبیڈکر نے مکمل دستور ایوان کے سامنے منظوری کے لیے پیش                اور پورے ایوان نے طویل، پُرجوش اور پُرمسرت تالیوں کے ذریعے اپنی منظوری دی۔ اس کے بعد ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بحیثیت صدر، دستور پر اپنے دستخط ثبت فرمائے (ملاحظہ ہو آفیشیل رپورٹ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی۔ جلد ۱۱۔ صفحہ ۹۹۵)

دستور ساز اسمبلی کے سلسلے میں بہت سی ایسی باتیں مولانا حسرت کی طرف منسوب کی گئی ہیں جو یا تو بے بنیاد ہیں یا جن میں بہت زیادہ مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً (۱) ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات و خیالات کی اُنہوں نے زبردست اور صحیح نمائندگی کی۔ (۲) اُنہوں نے اپنا الاؤنس کبھی نہیں لیا۔ (۳) دستور کی تکمیل کے بعد جب آخری مرتبہ رائے لی گئی تو مولانا نے مخالفت میں رائے دی۔ کسی نے یہاں تک لکھا کہ اختلافی نوٹ لکھا (۴) دستور پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ ان تمام مسائل پر لکھنے کے لیے کم از کم اتنے ہی صفحات کی ضرورت ہے جتنا اب تک لکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ان سب کے بارے میں تفصیل سے لکھا جائے۔ اس لیے ان کے بارے میں انتہائی اختصار کے ساتھ نمبروار عرض کرتا ہوں:

۱۔ دستور ساز اسمبلی کی کارروائیوں کو غور سے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ بعض بہت ہی اہم مسائل کے مواقع پر مولانا خاموش رہے۔ اس وقت صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا وہ یہ کہ زبان کے مسئلے پر جب اسمبلی کے اندر اور اس کے باہر اخبارات میں گرما گرم بحثیں ہو رہی تھیں تو اُنہوں نے ان میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔

۲۔ الاؤنس نہ لینے کے سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی کم زوری کا اندازہ دو باتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے وزیرِ مالیات غلام محمد صاحب کے حوالے سے، پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے کہ جب وہ ہندوستان آئے تو وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا اور غلام محمد صاحب دوسرے روز خود اس "درویش" کے آستانے پر گئے مگر مولانا راضی نہ ہوئے[۳۸] اس کی اصلیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ میری معلومات اور تحقیق کے مطابق غلام محمد صاحب پہلی مرتبہ ۲۷ر جنوری ۱۹۵۰ء کو ہندوستان آئے تھے۔ جب دستور ساز اسمبلی کا کام ختم

ہوگیا تھا، ۲۹ر کی صبح کو دہلی آئے اور اسی روز سہ پہر میں کراچی کے لیے روانہ ہوگئے۔ پنڈت جی سے صرف ایک گھنٹہ کی ملاقات ہوئی۔ کیا اس مختصر ملاقات میں یہ ممکن ہے کہ وہ مولانا حسرت کے الاؤنس کا مسئلہ پیش کرتے جس کی بظاہر کوئی اہمیت نہیں تھی؟! دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مولانا کے ساتھی اور دوست قاضی محمد عدیل عباسی کے بیان کے مطابق مولانا یوپی اسمبلی سے بھتہ وصول کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں: "ہم دونوں یوپی اسمبلی کے ممبر تھے۔ ایک دن ہم دونوں ہی اکاؤنٹ آفس ٹی اے لینے گئے ۹؎" یہ ہو سکتا ہے کہ مولانا یوپی اسمبلی سے اپنا بھتہ لیتے ہوں اور دستور ساز اسمبلی (دہلی) سے نہ لیتے ہوں، لیکن کہیں سے بالکل نہ لیتے ہوں تو ان کا خرچ کیسے چلتا، اس لیے کہ ان کی کوئی اور آمدنی نہیں تھی۔

۳۔ دستور ساز اسمبلی کی کارروائی میں نہ تو مولانا کی مخالفت کا ذکر ہے اور نہ اختلافی نوٹ کا۔ سرکاری روداد کے مطابق بغیر کسی اختلاف کے بالاتفاق دستور منظور کیا گیا۔

۴۔ میں نے دستور کے اس نسخے کو دیکھا ہے جس پر ممبروں کے دستخط ہیں۔ ظاہر ہے پورے تین سو دستخطوں کو پہچاننا بڑا مشکل کام ہے، لیکن جہاں یہ خیال ہے کہ مولانا کے دستخط نہیں ہیں وہاں میرا یہ بھی خیال ہے کہ بعض اور ممبروں کے بھی دستخط نہیں ہیں۔ اصل میں دستخط کے لیے بہت محدود وقت مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے ختم ہونے کے بعد صدر اسمبلی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اعلان کیا کہ اگر کسی کے دستخط رہ گئے ہوں تو وہ بعد میں کر سکتے ہیں، اس کے بعد انہوں نے دوسری کارروائی شروع کر دی۔ ایک نکتہ اور قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ دستور ساز اسمبلی میں پہلی مرتبہ شرکت کرنے پر ہر ممبر کو دستخط کرنے ہوتے تھے۔ مگر اس کی روداد میں مولانا کے دستخط کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ دراصل مولانا اس قسم کی رسمی کارروائیوں سے بے نیاز تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی طرح دستور پر بھی مولانا کے دستخط نہ ہوں۔ جسے کچھ لوگوں نے ایک مسئلہ بنا دیا۔ بہر حال اس سلسلے میں باوجود کوشش کے مولانا کا کوئی بیان مجھے نہیں ملا۔ دستور پر دستخطوں کا ذکر آگیا ہے تو یہ بھی عرض کر دوں کہ اردو میں صرف مولانا ابوالکلام آزاد نے دستخط کیے ہیں۔ یہاں تک کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم نے بھی انگریزی میں کیے ہیں۔

افسوس کہ وقت کی تنگی اور مضمون میں گنجائش کی کمی کی وجہ سے دستور ساز اسمبلی کی کارروائیوں کے سلسلے میں مجھے اختصار سے کام لینا پڑا۔ انشاء اللہ پھر کبھی تفصیل سے مع ضروری حوالوں کے اس کے بارے میں الگ سے مضمون لکھوں گا۔ آزادیٔ کامل کے سلسلے میں مولانا حسرت نے کانگریس اور خلافت کانفرنس میں جو ریزولیوشن پیش کیے تھے اور اجلاس مسلم لیگ میں ان کے استرداد پر جو تجویز پیش کی گئی تھی، ان کے بارے میں بھی جذباتی طور پر لکھا گیا ہے اور حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس پر لکھنے کے لیے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ اس پر لکھنے کی کوشش کروں گا۔

## کتابیات


۱۔ مولانا سید سلیمان ندوی: مضمون: واحسرتا۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۴۶۰

۲۔ اثر بن یحییٰ انصاری: حسرت موہانی ـــ ایک سیاسی ڈائری صفحہ ۳۸

۳۔ ایم۔ حبیب خاں: حسرت موہانی۔ مطبوعہ: دہلی ۱۹۸۴ء صفحہ ۴۱

۴۔ اختر حسن: دوماہی اکادمی لکھنؤ۔ یادگار حسرت نمبر بابت نومبر ۱۹۸۱ء۔ مضمون: حسرت موہانی اور اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۷

۵۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ: سہ ماہی اردو ادب دہلی۔ حسرت نمبر۔ مضمون، حسرت موہانی ـــ ایک مجاہدِ آزادی صفحہ ۱۴۳

۶۔ سید سلیمان ندوی: حوالہ سابق۔ صفحات ۴۶۵۔۴۶۶

۷۔ ڈاکٹر احمر لاری: حسرت موہانی ـــ حیات اور کارنامے۔ مطبوعہ: لکھنؤ۔ ۱۹۷۳ء صفحات ۱۰۱۔۱۰۲

۸۔ اثر بن یحییٰ انصاری: حوالہ سابق صفحات ۶۵۔۶۶

۹۔ اختر حسن: حوالہ سابق صفحات: ۲۷۔۲۸

۱۰۔ مولانا جمال میاں فرنگی محل: کلیاتِ حسرت: پیش گفت۔ مطبوعہ: دہلی ۱۹۵۹ء صفحہ ۲۱

۱۱۔ سر سید رضا علی: اعمال نامہ۔ مطبوعہ: دہلی۔ دسمبر ۱۹۴۳ء صفحہ ۳۴۸

۱۲۔ سید شریف الدین پیرزادہ: فاؤنڈیشن آف پاکستان ـــ آل انڈیا مسلم لیگ ڈاکومنٹس۔ پہلا حصہ ۱۹۰۶ء تا ۱۹۲۴ء مطبوعہ: کراچی ۱۹۶۹ء ریزولیوشن نمبر ۱۶ صفحہ ۳۲۰

۱۳۔ ایضاً صفحہ ۳۱۳

۱۴۔ ڈاکٹر احمر لاری: حوالہ سابق صفحہ ۹۸

۱۵۔ ایضاً۔ صفحہ ۱۴۷

۱۶۔ عتیق صدیقی: بیگم حسرت موہانی۔ صفحہ ۸۴۔ اثر بن یحییٰ انصاری: حسرت موہانی ـــ ایک سیاسی ڈائری ۷۱ اور ایم۔ حبیب خاں: حسرت موہانی: صفحہ ۴۱

۱۷۔ عتیق صدیقی: حسرت موہانی قیدِ فرنگ میں۔ مطبوعہ: دہلی ۱۹۸۲ء صفحہ ۱۴۹

۱۸۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد: آنکھیں ترستیاں ہیں۔ مضمون: حسرت موہانی مطبوعہ: دہلی فروری ۱۹۸۱ء صفحات: ۱۷۳۔۱۷۴۔

۱۹۔ قاضی محمد عدیل عباسی: نذرِ مقبول۔ مضمون: حسرت موہانی۔ صفحہ ۱۱

## داد

آپ نے 'آج کل' کو آجکل بے حد معیاری، وسیع المشرب، خوش نظر اور دیدہ زیب بنا دیا ہے۔ ہر شمارے پر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ زیادہ اس لیے نہیں لکھتا کہ مجھ پر عزیز پروری کا الزام نہ لگا دیا جائے۔ اور نظر لگے نہ کہیں۔

علی جواد زیدی، لکھنؤ

## خوش گوار

ویسے تو 'آج کل' میں آپ کی آمد سے ہی خوش گوار تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، لیکن اِدھر نئے لکھنے والوں کی شمولیت نے ماحول کو مزید خوش گوار بنا دیا ہے۔

فروری کے شمارے میں بیدی پر دل سے نہیں لکھا گیا۔ قیصر قلندر صاحب کے مضامین ہمیشہ معلومات افزا ہوتے ہیں۔ امیر قزلباش اور قاسمی کی غزلوں کے اشعار اچھے لگے۔ محمد اشرف کا سوال جنرل نالج سے باہر کا سہی، مگر ہے بہت معقول۔ علی امام نقوی کا افسانہ بھی خوب ہے۔ دراصل یہ سب حضرات مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے افسانے کو علامتوں کے پنجے سے آزاد کرا لیا ہے۔ من کہ اور بخطِ شاعر اچھے سلسلے ہیں۔ اور انہیں جاری رہنا چاہیئے۔

فاروق بخشی، غازی آباد

## خوشی

یہ خوشی کی بات ہے کہ 'آج کل' میں آپ ملک کے علاقائی ادب اور فنونِ لطیفہ کو خاطر خواہ نمائندگی دے رہے ہیں۔ یہ نیا اقدام مختلف صوبوں کے علم و ادب کو جاننے اور ان کے متعلق اہم واقفیت بہم کرنے کے علاوہ آپس میں ہم آہنگی اور یک جہتی کے جذبے کو فروغ دے

سرداری لال نشتر

## بے حد پسند

فروری ۱۹۸۵ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس کے دو مقالات " جادوگر بیدی " اور راجندر سنگھ بیدی —— خطوط کے آئینے میں" بے پسند آیا۔ "من کہ" کے تحت آپ جو مضامین نکال رہے ہیں اس میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ غزل کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم امیر قزلباش کی غزل کا یہ شعر بے حد پسند آیا

شعر سنا اور بھُو کا مر
اس خدمت کو جاری رکھ

محمد معین الدین، پو

## دادِ دشمن

'آج کل' پر آپ واقعی بہت محنت کر رہے ہیں اور اپنی ادا " دُور بینی" اور فنی صلاحیتوں سے آپ نے اِسے ایک باوقار، بامع اور تاریخی حیثیت کا پرچہ بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی داد تو آ کے دشمن بھی دیتے ہیں۔

پریم کمار نظر، ہوشیا

## تلافی

مارچ ۱۹۸۵ء کا شمارہ قدرے تاخیر سے موصول ہوا، مگر مشم کے مطالعہ کے بعد رسالہ دیر سے ملنے کی تلافی ہو گئی۔ بترا صاحب کا خوب ہے۔ بہت دل چسپی سے پڑھا۔ شرون کمار ورما کا افسانہ بھی ایک عمدہ افسانہ ہے اور سماج کی چھپی ہوئی بُرائی کی اچھی عکاسی ساحر صاحب کی غزل بھی شان دار ہے۔

انوار انصاری،

## افادیت

مارچ ۱۹۸۵ء کے "آج کل" میں قیصر قلندر صاحب کا مضمون "آلاتِ مو دل چسپ اور معلوماتی ہے، مگر سارنگی کے ضمن میں جس مشہور فنکار کا ذکر ہوا بندھو خاں نہیں، بندو خاں ہیں۔ مذکورہ آلاتِ موسیقی کے ساتھ اگر اُن کی بھی دی جاتیں تو مضمون کی افادیت اور بڑھ جاتی۔

محمد توحید الحق،

کل ہند اردو سیمینار : اردو طباعت واشاعت : مسائل اور امکانات۔ نئی دہلی ۲۳ ، ۲۴ مارچ ۱۹۸۵ء ——— وزیر مملکت برائے امورِ خارجہ جناب خورشید عالم خاں افتتاحی تقریر فرما رہے ہیں۔ اسٹیج پر تشریف فرما ہیں، (دائیں سے بائیں) جناب ابوالحسن (ٹکنیکل ڈائرکٹر سیمینار) جناب کرشنا کرپلانی (چیئرمین نیشنل بک ٹرسٹ) جناب علی سردار جعفری اور جناب او۔ کے۔ سی گرووړ (جوائنٹ ڈائرکٹر این۔ بی۔ ٹی)
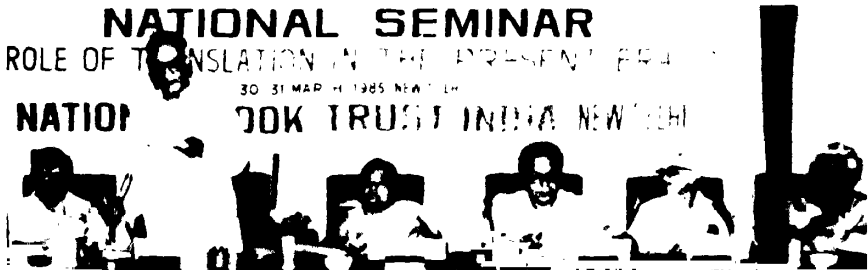
قومی سیمینار : عہدِ جدید میں ترجمے کی اہمیت و افادیت، نئی دہلی ۳۰ ، ۳۱ مارچ ۱۹۸۵ء ——— افتتاحی تقریب میں نیشنل بک ٹرسٹ کے چیرمین استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے۔ اسٹیج پر تشریف فرما ہیں : وزیرِ مملکت برائے امورِ داخلہ شریمتی رام دُلاری سنہا، ڈاکٹر لوک ناتھ بھٹاچاریہ (ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ) جناب سیموئل اسرائیل (ٹکنیکل ڈائرکٹر سیمینار) ڈاکٹر سید اسد علی (جوائنٹ ڈائرکٹر این۔ بی۔ ٹی) بائیں سرے پر او۔ کے۔ سی گرووړ (جوائنٹ ڈائرکٹر این۔ بی۔ ٹی)

R.N. 948/57

at Civil Lines, Post Office, Delhi.

Vol. 43 No. 10 AJKAL (URDU) May 1985

تشکیلِ شعر: برجیندر سیال

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(غالبؔ)

Published by the Director Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001, Printed by the Manager, Govt. of India Photolitho Press, Faridabad.

جون ۱۹۸۵ء

ایک روپیہ ۵۰ پیسے

وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی نے ۱۳ مئی ۱۹۸۵ء کو
نئی دہلی میں سابق صدرِ جمہوریۂ ہند شری فخرالدین
علی احمد مرحوم کی ۸۰ ویں سال گرہ کے موقع پر قومی
یومِ اتحاد کی تقریب کا افتتاح فرمایا۔
تصویر میں: شری راجیو گاندھی گلہائے عقیدت
پیش کرتے ہوئے۔

مرکزی وزیرِ اطلاعات ونشریات شری وی۔ این
گیڈگل ۱۲ مئی ۱۹۸۵ء کو نئی دہلی میں منعقدہ
ایک تقریب میں بھارتیہ گیان پیٹھ کا ۱۹۸۳ء
کے لیے مورتی دیوی ادبی انعام شری سی۔ کے۔
ناگا راجا راؤ کو پیش کرتے ہوئے۔ یہ انعام موصوف
کو ان کے کنڑ ناول پٹّاما دیوی شانتلا دیوی پر
دیا گیا ہے۔

اردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہنامہ

# آجکل
نئی دہلی

ایڈیٹر:
راج نرائن راز

فون: ۳۸۷۰۶۹
جلد: ۴۳ شمارہ: ۱۱
قیمت: ایک روپیہ ۵۰ پیسے

جون ۱۹۸۵ء

جیٹھ۔اساڑھ شک سمت ۱۹۰۷

## ترتیب



سرورق: آر۔ سارنگن

بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ

اسسٹنٹ ڈائرکٹر: (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ مینجال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

ترسیلِ زر کا پتہ:
بزنس منیجر: پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

اندرونِ ملک: زرِ سالانہ: ۱۵ روپے دو سال کے لیے: ۲۷ روپے تین سال کے لیے: ۳۸ روپے

# ملاحظات

## ناوابستہ تحریک ٹھوس اقدام کی حامی

وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی نے ۱۹ اپریل ۱۹۸۵ء کو نئی دہلی میں ناوابستہ ممالک کے کوآرڈی نیٹنگ بیورو کی وزراء کی سطح کے غیر معمولی اجلاس کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا: "ایک سو سے زیادہ اقوام کے نمائندے آج نمیبیا کی حمایت کے واحد مقصد سے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ نمیبیا کی بہادر قوم اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ بھارت کو اس اجلاس کی مہمان نوازی پر فخر ہے۔ اس موقع پر ہم جنوب مغربی افریقی عوام کی تنظیم کے صدر اور نمیبیا کی حقیقی آواز مسٹر سام نوجوما کی موجودگی کی قدر کرتے ہیں۔ اور ان کا پُرجوش خیر مقدم کرتے ہیں۔

بھارت نے اپنے آپ کو ہمیشہ افریقہ کے قریب سمجھا ہے۔ صدیوں سے بھارت اور افریقہ کے ساحلوں کے درمیان جہاز رانی ہوتی آ رہی ہے۔ جس سے تجارت اور تعاون کے رشتے استوار ہوئے ہیں۔ نوآبادیاتی نظام کی لعنت ہم دونوں پر حاوی رہی۔ جس سے ہم سیاسی طور پر ایک دوسرے کے قریب آئے۔ مہاتما گاندھی اس باہمی رابطے کی ایک علامت تھے۔ افریقہ کی تجربہ گاہ میں مہاتما گاندھی نے عدم تشدد پر مبنی عوامی عمل کا بیش قیمت ہتھیار وضع کیا، جس سے بعد ازاں انہوں نے ہندوستان کی آزادی حاصل کی۔

آج سے کچھ روز بعد بانڈونگ میں ۱۹۵۵ء کی افریشیائی کانفرنس کی تیس ویں سالگرہ کی یاد میں ایک اجلاس ہو رہا ہے۔ شری جواہر لال نہرو نے بیس برس پہلے بانڈونگ میں جو الفاظ کہے تھے وہ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا: "اب ایشیا اور افریقہ میں کوئی جی حضوری نہیں رہے گا۔" افریقہ کے بارے میں انہوں نے کہا تھا: گزشتہ کئی سو برسوں سے افریقہ میں ایک لامتناہی المیہ کی جو صورتِ حال بنی ہوئی ہے۔ اس سے زیادہ تکلیف دہ کوئی دوسری بات نہیں ہو سکتی۔

المیہ کی یہ صورتِ حال بدستور بنی ہوئی ہے۔ اگرچہ بانڈونگ کانفرنس کے بعد افریقہ میں یکے بعد دیگرے کئی ممالک آزاد ہوئے ہیں، لیکن وحشیانہ اقتصادی استحصال اور انسانی جذبوں کی پامالی کے عمل کے اثرات وہاں اب بھی موجود ہیں۔ افریقہ کے بہت بڑے حصوں میں آج جو خشک سالی، قحط ——— مصائب اور اموات کا سایہ نظر آتا ہے، وہ صرف نامہربان موسم کے یا متعلقہ سرکاروں کی صلاحیت کی کمی ........ کے سبب نہیں بلکہ یہ نوآبادیاتی نظام کے تھوپے ہوئے عدم توازن کے مسلسل اثرات کے سبب ہے۔ طاقتور ملکوں نے ان نوآزاد ملکوں کو اقتصادی طور پر خودکفیل ہونے سے روکنے کے لیے جو پالیسیاں اختیار کیں، ان سے صورتِ حال اور بھی نازک ہو گئی ہے۔ نوآبادیاتی نظام کی گرفت ابھی ختم نہیں ہوئی۔ علاوہ ازیں نمیبیا اور جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کا براہِ راست حملہ جاری ہے۔ ناوابستہ تحریک کے ہم تمام ممالک کی نوآبادیاتی نظام کے خلاف تاریخی لڑائی جاری ہے۔ دو برس پہلے اسی ایوان میں ہم نے ساتویں ناوابستہ چوٹی کانفرنس کے موقع پر نمیبیا کے عوام کے ساتھ ہمدردی اور حمایت کا اعلان کیا تھا۔ ہم اس اعلان کا آج اعادہ کرتے ہیں۔

ایک سو برس سے اوپر ہوتے، جب سامراج نے نمیبیا پر اپنی حریصانہ نظر ڈالی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے جنوبی افریقہ کی بالواسطہ اور بلاواسطہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ جنوب مغربی افریقہ کو ہڑپ لے اور اپنا پانچواں صوبہ بنالے۔ آج وہاں سرکار کی فوجی طاقت ایک نئی حد کو چھو رہی ہے اور وہاں ہر بارہ باشندوں کے لیے ایک فوجی موجود ہے۔ جو غالباً نوآبادیاتی نظام کی تاریخ میں ایک ریکارڈ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس فوجی طاقت کا مقصد نمیبیا کے عوام کو خوف زدہ کرنا ہو کہ وہ 'SWAPO' تنظیم کی حمایت کرنا بند کر دیں۔ ایک اقلیتی سرکار اتنی دیر سے اقوامِ متحدہ جیسے عالمی ادارے کی ہدایات کی خلاف ورزی کیسے کر رہی ہے؟ یہ دوسری طاقتوں کی کھلی اور در پردہ امداد کے بغیر ممکن نہیں۔ اقوامِ متحدہ نے بار بار نمیبیا کی اقلیتی سرکار کا بائیکاٹ کرنے کے لیے کہا ہے، لیکن اس کی یہ اُمید بار بار ناکام رہی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا عالمی ادارہ نمیبیا کے مظلوم اور غریب عوام کا ساتھ دے گا یا اس کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ کیا اقوامِ متحدہ جو اب اپنے قیام کے چالیسویں برس میں ہے، اپنی اخلاقی اور سیاسی ذمہ داریاں پوری کرے گی یا فوج اور

اقتصادی دبدبہ حق کو دبائے رکھے گا۔

اقوام کی متحدہ ذمہ داری ہے کہ وہ ایک بار پھر بڑے زور سے نمیبیا کی آزادی کی حمایت کا اعادہ کرے۔ جنوبی افریقہ اقوام متحدہ کے کردار کو پس منظر میں دھکیلنے کے لیے جو سچا و پرپیش کر رہا ہے، ان کی مزاحمت کی جانی چاہیے چنانچہ ناوابستہ تحریک کا یہ اجلاس اعلان کرتا ہے کہ نمیبیا کی آزادی اقوام متحدہ کی سیدھی ذمہ داری ہے۔ سلامتی کونسل کو ۱۹۷۳ء کی قرارداد نمبر ۳۸۵ نافذ کرانے کے لیے نئے طریقے تلاش کرنے چاہئیں — کیونکہ نمیبیا کے مسئلے کے پُرامن تصفیے کے لیے واحد قابل قبول بنیاد یہی قرارداد ہے۔ ہم نمیبیا کے مسئلے کے کسی داخلی تصفیے کی غیر حقیقی اسکیم کی حوصلہ افزائی اور اقوام متحدہ کو نظرانداز کرنے کی کوششوں کے مخالف ہیں۔

وہ سلامتی کونسل کے صدر کو فوری تار ارسال کرے جس میں پریٹوریا کی اقلیتی سرکار کی غیر قانونی کارروائی کی پُرزور مذمت کی جائے اور مانگ کی جائے کہ سلامتی کونسل ۱۹۷۸ء کی قرارداد نمبر ۴۳۵ کو پورے طور پر نافذ کرنے کے بارے میں اپنے عہد کا اعادہ کرے۔ نمیبیا میں عبوری سرکار کا اعلان نمیبیا کے عوام بلکہ ساری بین الاقوامی برادری کی کھلی توہین ہے۔ یہ معاملہ صرف اظہارِ افسوس کا نہیں بلکہ سلامتی کونسل کے اختیار اور ساکھ کو درپیش چیلنج کا مقابلہ کرنے کا سوال بن گیا ہے۔ سواپو تنظیم نے نمیبیا کے عوام کی تحریک کی رہنمائی کی ہے۔ ہم اس کے بہادر رضاکاروں کی دلیری کی داد دیتے ہیں۔

ہمیں نمیبیا میں عبوری سرکار کے قیام کی کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دینا چاہئے اور چونکہ سواپو نمیبیا کی عوام کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ لہٰذا اُسے اپنی جدوجہد جاری رکھنے کے لیے اور زیادہ سیاسی و مادی امداد ملنی چاہیئے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم سواپو سے اپنی حمایت کا اظہار نمیبیا کی آزادی کے لیے ناوابستہ ممالک کے فنڈ میں امداد کے ٹھوس وعدوں کے ذریعے کریں۔ مجھے خوشی ہے کہ بھارت سرکار نے نئی دہلی میں سواپو تنظیم کے نمائندے کو پورا سفارتی درجہ دینے کا فیصلہ کیا ہے —

ہتھیاروں کی دوڑ بند کرنے کے بارے میں بڑی طاقتوں کی بات چیت کے اعلان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور توقع ہے کہ یہ بات چیت ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے کی حالت پیدا نہیں کرے گی۔ ہتھیاروں کی تحقیق کا کام مسلسل جاری ہے، اس لیے آج ترک اسلحہ کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اگرچہ ساری دنیا زندگی کے لیے محفوظ ہونی چاہیئے۔ لیکن دنیا کا ہر خطہ آج امن اور وقار کے لیے پکار رہا ہے۔ ناوابستہ ممالک کا کوئی اجلاس بھی فلسطین کے عوام کی تکلیفات اور جدوجہدِ آزادی کے بارے میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ہم پھر سے پی۔ ایل۔ او کی حمایت کا اعلان کرتے ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا اور جنوب مغربی ایشیا میں کشیدگی اور تصادم جاری ہے۔ مرکزی امریکہ کی آزادی اور امن کو خطرہ ہے۔ ہم مرکزی امریکہ کی کوششوں کی حمایت ...... کا اعادہ کرتے ہیں۔ ایک اور خطہ جہاں سلامتی کے ماحول میں ابتری آئی ہے، بحر ہند کا خطہ ہے۔ وہاں فوجی اڈے بن رہے ہیں۔ یہ خطہ لازماً امن کا خطہ رہنا چاہیئے۔

ہر چیز جو امن پر اثر انداز ہوتی ہے اور اقوام کی آزادی کے لیے خطرہ بنی ہے، ناوابستہ ممالک کی تحریک کے لیے تشویش کا باعث ہے تاہم اس اجلاس کی توجہ کا مرکز نمیبیا ہے۔ اس کی آزادی کا عمل تیز ہونا چاہیئے۔ ہمیں اس اجلاس میں عمل کا ایک ایسا پروگرام وضع کرنا چاہیئے جس سے نمیبیا کے مجاہدین کو پتہ چلے کہ ناوابستہ تحریک ٹھوس اور عملی اقدام کی حامی ہے۔ ہم جنوبی افریقہ اور نمیبیا کے عوام کو یہ پیغام بھیجنا چاہتے ہیں کہ آپ ہم میں سے ہی ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں اور ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گے۔

م۔م۔ راجندر

# گنگو دادا کا اسکول

گنگو دادا کا اسکول کلکتے سے بیس میل پرے ہپریا گاؤں میں تھا اور میں اسی گاؤں سے دو میل کے فاصلے پر لٹینوں کی چمنیوں کی فیکٹری میں اسسٹنٹ منیجر تھا۔ گنگو دادا ماسٹر بننے سے پہلے ہماری فیکٹری میں ملازم تھے۔ ایک روز کام رتے کرتے ان پر فالج کا دورہ پڑا اور وہ دو مہینے ہسپتال میں ہے۔ اس حملے میں ان کی دونوں ٹانگیں بیکار ہو گئیں تھیں۔ نگو دادا کی عمر اس وقت صرف پچیس سال کی تھی۔ اس افسوسنا ور بے وقت سانحے نے تمام فیکٹری اور گاؤں والوں کو بے حد داس بنا دیا تھا قدرت نے جوانی میں ہی جبکہ ان کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی گنگو دادا کو ایک مجبور اور معذور انسان بنا دیا تھا چونکہ نگو دادا کی معذوری کسی مشینی حادثے کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی س لیے فیکٹری انہیں کسی قسم کا معاوضہ نہیں دے سکتی تھی۔ اہم ان کے علاج پر سارا روپیہ فیکٹری نے خرچ کیا اور فیکٹری کے الکوں نے انہیں اپنی جیب سے اتنا روپیہ دیا کہ ان کے لیے ایک پہیوں دار کرسی آگئی اور ایک چھوٹا سا نیم پختہ مکان بھی بن گیا۔ س مکان میں گنگو دادا نے بچوں کا ایک اسکول شروع کر دیا تھا۔

گنگو دادا اب چالیس سال کے ہو گئے تھے۔ اس بھیانک سانحے کے بعد یہ پندرہ سال ان کے لیے کئی صدیاں بن کر گزرے تھے۔ گنگو دادا جب فیکٹری میں کام کرتے تھے تو میٹرک فیل تھے مگر آج وہ کلکتہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے تھے اور انھوں نے ایجوکیشن ٹریننگ کا ڈپلومہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ اگرچہ یہاں ایک سرکاری اور ایک فیکٹری کا بچوں کا اسکول بھی تھا جن میں فیس نہیں لی جاتی تھی مگر گنگو دادا کا اسکول زیادہ مشہور تھا۔ اس وقت ان کے اسکول میں ایک سو سے زیادہ بچے پڑھتے تھے اور وہ ہر ایک بچے سے دو روپے ماہوار فیس لیا کرتے تھے۔ ان کے اسکول میں چھپریا کے علاوہ پاس کے دیہات کے بھی کافی بچے پڑھنے آتے تھے۔ اپنے مکان کے سامنے کی کھلی زمین پر انہوں نے سات آٹھ سائے دار درخت لگوا لیے تھے اور ان کی کلاسیں گرمیوں میں ان کی ٹھنڈی چھاؤں اور جاڑوں میں کھلی دھوپ میں لگتی تھیں۔ بارش میں بچے اندر کے دونوں کمروں اور برآمدوں میں بیٹھتے تھے۔ انہوں نے اور گاؤں کے آدمیوں اور اسکول کے بچوں نے مل کر گارے اور کچی اینٹوں کا ایک اور لمبا کمرہ بھی بنا لیا تھا اور اب بچوں کے اسکول کے لیے جگہ کافی ہو گئی تھی۔

ان کے اسکول کا نام ودیا مندر تھا اور سچ مچ گنگو دادا کا اسکول ایک مندر تھا۔ ویسی ہی شانتی اور چھایا اور وہی لگن اور عقیدت کا جذبہ۔ گنگو دادا گاتے بھی تھے اور اب تو ان کے گلے میں ایک خاص مٹھاس اور سوز آگیا تھا اور دن میں کم سے کم دو مرتبہ وہ بچوں کو پرارتھنا کرایا کرتے تھے پہلے فضا میں گنگو دادا کی مدھر پرسوز آواز ابھرتی اور پھر بچوں کی پیاری مترنم آواز گونج اٹھتی اور ایسا لگتا کہ ساری فضا ایک نئی ہی پاکیزگی اور معصومیت میں ڈھل رہی ہے۔ اگرچہ گنگو دادا کا اسکول فیکٹری سے صرف دو میل کے فاصلے پر تھا۔ مگر میں صرف شروع شروع میں ہی چند بار گنگو دادا کا حال پوچھنے گیا تھا۔ جب گنگو دادا اپنے گھر میں جم گئے تو پھر مصروفیت یا کاہلی نے یہ اجازت نہیں دی کہ کبھی کبھار گنگو دادا سے ملنے چلا جاؤں۔ گنگو دادا بھی اس کے بعد صرف ایک بار ہی اپنی پہیوں والی کرسی کو ہاتھوں سے دھکیل کر فیکٹری آئے تھے مگر وہ تو بڑے مجبور تھے۔ مگر گنگو دادا کی خبریں فیکٹری میں برابر پہنچتی رہتی تھیں کہ اب پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان دے رہے ہیں، اب بی اے میں بیٹھیں گے اور اب ایم۔ اے کی تیاری کر رہے ہیں۔ میں اور فیکٹری کے دوسرے افسر اور سب ہی کام کرنے والے گنگو دادا کے حوصلے کی داد دیتے کہ کس جواں مردی سے زندگی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور مشکلات پر قابو پا رہے ہیں۔ اور پھر جب انھوں نے ایم۔ اے کے بعد ٹریننگ کا ڈپلومہ بھی لے لیا تو فیکٹری نے اپنے ہی اسکول میں رکھنا چاہا مگر گنگو دادا نے اپنا ودیا مندر نہیں چھوڑا۔

ایک روز میں صبح سویرے چھپریا گاؤں میں گیا۔ مجھے فیکٹری کے مزدوروں کے ایک لیڈر سے جو ایک سیاسی کارکن تھا اور چھپریا کا ہی رہنے والا تھا، کچھ کام تھا۔ میں اس سے مل کر آرہا تھا تو گنگو دادا کی مسحور کن آواز کانوں میں پڑی۔ انھوں نے اسکول میں پرارتھنا شروع کر دی تھی اور بچوں کی آواز بھی ان کی آواز کے ساتھ مل کر آنے لگی میرے قدم بے ساختہ گنگو دادا کے سکول کی طرف بڑھ گئے۔ گنگو دادا ایک چھوٹے سے کچے چبوترے پر آنکھیں بند کیے ہوئے بیٹھے تھے۔ اور پرارتھنا کرا رہے تھے۔ گنگو دادا اتنے تبدیل ہو گئے تھے کہ اگر میں ان کے بارے میں سنتا نہ رہتا تو انہیں پہچان نہ پاتا۔ انھوں نے سادھوؤں کی طرح سر کے بال اور ڈاڑھی بڑھا رکھی تھی اور دھوتی اور کرتے پر ایک کھدر کی شال اوڑھ رکھی تھی۔ چہرے پر بے پایاں شانتی اور سکون تھا چبوترے پر ہی ان کے برابر میں ان کی بیساکھیاں رکھی تھیں اور کوئی دو قدم پر ان کی ہاتھوں سے گھما کر چلانے والی کرسی یا سائیکل رکھی تھی۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور

۶۸۔ چترا وہار دہلی ۔ ۹۲۔۰۰۱۱

اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا اور جب پریڈ ختم ہو گئی تو گنگو دادا بولے۔

"میں آپ کو یاد ہی کر رہا تھا۔ اگلے اتوار کو ٹیلے کے اوپر بچوں کی دوڑ ہو گی۔ یہ جو ٹیلہ آپ سامنے دیکھ رہے ہیں، اس پر"
میں نے ٹیلے کی طرف دیکھا۔ یہ خاصہ اونچا تھا، جیسے ایک چھوٹی سی پہاڑی ہو۔ گنگو دادا کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ گنگو دادا بولے:

"آپ اتوار کو صبح نو بجے آجائیں اور بچوں کے جوش کو بڑھا دیں۔ آپ شاید یہ سوچ رہے ہیں کہ کھلے میدان کے بجائے ٹیلے کے اوپر کیوں دوڑیں اور ٹیلے پر تو بچے زیادہ سے زیادہ چڑھ سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ بچے ہندوستان کا مستقبل ہیں۔ انہوں نے ہی بڑے ہو کر ملک کی تعمیر کرنی ہے اور انھیں سخت آزمائش سے گزرنے اور مشکلات پر قابو پانے کے موقعے ابھی سے ہی ملنے چاہئیں۔ میدان میں تو سبھی دوڑ لیتے ہیں مگر میں تو انہیں نیچے سے دوڑ لگا کر ٹیلے کو سر کرنے کا حوصلہ دینا چاہتا ہوں۔ اور پھر کسی بھی اونچائی تک پہنچنا ہی ہم سب کا مقصد چاہتا ہوں۔ اور پھر کسی بھی اونچائی تک پہنچنا ہی ہم سب کا مقصد ہونا چاہیے"

اتوار کو میں نو بجے گنگو دادا کے اسکول میں پہونچ گیا۔ بچے اکٹھے ہو گئے تھے اور کچھ کے والدین بھی آئے ہوئے تھے۔ گنگو دادا اپنے کمرے میں سے باہر نکلنے کی کوشش میں کچھ گھسٹتے سے نظر آئے تو میں ان کی مدد کو آگے بڑھا مگر انہوں نے مسکرا کر مجھے منع کر دیا کہ ہاتھ نہ لگائیے۔

گنگو دادا کی چونکہ دونوں ٹانگیں مفلوج تھیں اس لیے وہ بغیر بیساکھیوں کی مدد کے نہ چل سکتے تھے اور نہ کھڑے ہو سکتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک کوئی آدمی ان کی بیساکھیاں ان کو نہ پکڑا دے یا وہ خود ہاتھ بڑھا کر انہیں نہ پکڑ لیں ان کے کھڑے ہونے کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ مگر آج تو گنگو دادا صرف اپنی قوتِ ارادی سے گھسٹ گھسٹ کر اپنی کرسی کے پاس آئے اور خود ہی بمشکل تمام اس پر بیٹھ گئے۔ پھر کونے میں پہنچ کر انہوں نے وہاں رکھی ہوئی اپنی بیساکھیاں اٹھالیں اور انہیں کرسی میں بنی ہوئی جگہ پر رکھ لیا اور پھر مجھے مسکرا کر ٹیلے کی طرف چلنے کو کہدیا۔ بچے اور ان کے والدین تو میرے آتے ہی ٹیلے کی طرف چل پڑے تھے۔

ٹیلے کے اوپر بچوں کی دوڑ قابل دید تھی۔ ہم عمر بچوں کی قطاریں باری باری دوڑ کر ٹیلے پر چڑھیں اور متعدد بچے کافی چڑھائی کے باوجود ہانپتے ہوئے اوپر دوڑ کر چڑھے اور ٹیلے پر پہلے ہی سے لگاتے گئے ایک جھنڈے کو چھو کر برق رفتاری سے نیچے اترے۔ ہر بچے میں جوش بھرا ہوا تھا اور وہ ٹیلے پر سب سے پہلے پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا اور جب لڑکے جلد یا بدیر چوٹی پر پہنچ کر جھنڈا چھو لیتے تو گنگو دادا کا چہرہ مسرت سے تمتما اٹھتا۔ وہ ٹیلے کے دامن میں پیچھے کو ہٹ کر اپنی کرسی پر بیٹھ کر یہ سارا خوبصورت نظارہ دیکھ رہے تھے۔

جب بچوں کی دوڑ ختم ہو گئی اور ہم جیتنے والے بچوں کو انعام دینے کی سوچ رہے تھے کہ گنگو دادا نے ہمیں یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ ٹیلے پر میں بھی چڑھوں گا اور یہ کہہ کر وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور بیساکھیوں کے سہارے کھڑے ہو گئے۔

ہم سب جانتے تھے کہ گنگو دادا بیساکھیوں کے سہارے سیدھی زمین پر تھوڑا بہت چل تو سکتے تھے لیکن ٹیلے کے اوپر چڑھنا تو ان کے لیے ناممکن سا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے نیچے گرنے کا زبردست اندیشہ تھا۔ اس لیے میں نے اور دوسرے لوگوں نے انہیں بہت سمجھایا کہ وہ یہ کوشش نہ کریں مگر وہ نہ مانے اور بولے کہ بھئی میں دوڑ تو نہیں سکتا لیکن آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے کی کوشش تو کر سکتا ہوں۔ جس جگہ سے آگے نہ چڑھ سکا وہیں سے نیچے اتر آؤنگا۔ ان کے مصمم ارادے بلکہ ضد کو دیکھتے ہوئے میں نے اور کچھ لوگوں نے ان کے ساتھ اوپر جانے کی خواہش ظاہر کی تاکہ دقت پڑنے پر ان کی مدد کر سکیں مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

اس کے بعد میں نے انسانی عزم اور قوتِ ارادی کا جو منظر دیکھا وہ زندگی بھر فراموش نہیں کر سکوں گا۔ جالا بننے والی مکڑی کو تو بار بار اونچائی سے گرتے اور پھر چڑھتے دیکھا تھا مگر یہ منظر کچھ عجیب تھا کہ گنگو دادا معذور ہوتے ہوئے بھی ٹیلے پر چڑھ رہے تھے اور بار بار اپنی بیساکھیوں سمیت گر رہے تھے اور اٹھ کر پھر چڑھ رہے تھے! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بے جان جسم صرف قوتِ ارادی کے سہارے اوپر گھسٹ رہا تھا۔ گنگو دادا کو گیارہ بجے ٹیلے پر چڑھنے کے لیے چلے ہوں گے اور گرتے پڑتے تقریباً سو انسانی قدموں کا یہ فاصلہ ..... سوا بارہ بجے تک طے کر کے وہ چوٹی پر جھنڈے کو چھو چکے تھے اور نیچے تالیوں کی گونج نے ان کی بلند ہمتی کا استقبال کیا تھا۔

واپسی میں گنگو دادا بیٹھ کر اور تقریباً گھسٹ کر نیچے آئے اور اس میں بھی آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ اور جب وہ زمین سے تقریباً دو قدم اوپر تھے اور انہوں نے بیساکھیوں کے سہارے کھڑے ہو کر اترنے کی کوشش کی تو وہ گر پڑے۔ ہم نے دوڑ کر انہیں اٹھا لیا اور ایک آدمی ان کی کرسی لے آیا۔ ان کے تھوڑی سی چوٹ لگ ہی گئی۔ مگر وہ مسکرا رہے تھے اور ہم سب نے ان کے گرد ایک گھیرا سا بنا لیا تھا۔

ہمارے پاس بچوں کو بطور انعام دینے کے لیے بہت سے رومال، مٹھائی کی گولیاں، پنسلیں اور کہانیوں کی کتابیں تھیں جو ہم نے گنگو دادا کے ہاتھ سے انہیں تقسیم کرا دیں۔ جب بچے اور ان کے والدین خوشگوار کھیل کے بعد روانہ ہو گئے تو میں اور فیکٹری کے ایک دو کارکن گنگو دادا کی سائیکل کو ہاتھوں سے دھکیلتے ہوئے گنگو دادا کو ان کے اسکول تک لے آئے۔ وہ اپنی کرسی پر سے اتر کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ وہ اپنے اسکول کے بچوں کی کامیابی پر بڑے خوش تھے اور بولے۔

"مجھے اپنے اس چھوٹے سے سکول اور اپنے بچوں پر بڑا ناز ہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ کتنی ہمت اور پھرتی سے دوڑ کر ٹیلے پر چڑھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب بچے اتنا حوصلہ رکھتے ہوں تو بڑوں کا حوصلہ اپنے آپ بلند ہو جاتا ہے۔ مجھے ہی دیکھئے، جب سے میری ٹانگیں ناکارہ ہوئیں اس ٹیلے پر چڑھنے کے خواب دیکھ رہا تھا اور آج بچوں کی وجہ سے پندرہ برس بعد یہ خواب پورا ہو گیا۔ مجھے اتنی خوشی حاصل ہوئی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ جب مجھ جیسا اپاہج بھی ٹیلے پر چڑھ سکتا ہے تو یہ بچے تو سو سو بار چڑھیں گے"

میں نے مسکرا کر گنگو دادا کی طرف دیکھا اور اپنے دل میں کہا۔

"گنگو دادا آپ تو پہلے بھی زندگی میں سیکڑوں بار ٹیلے کے اوپر چڑھ چکے ہیں۔ آپ معمولی ورکر تھے اور آج ایک مثالی ٹیچر ہیں۔ آپ نے اپنی حوصلہ شکن معذوری میں بھی بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں حاصل کر لی ہیں۔ آپ نے آج جسمانی طور پر محض اپنی قوتِ ارادی سے ٹیلے پر چڑھ کر ہمت مرداں مددِ خدا کے مقولے کو سچ کر دکھایا ہے۔ آپ کا یہ سکول گاؤں کا ایک چھوٹا سا اسکول ہی ہی مگر اس کے بچے آپ جیسا استاد پا کر سو سو بار زندگی میں ٹیلوں پر چڑھیں گے"

●●

علی جواد زیدی

# مولانا اختر علی تلہری

ایک زمانے میں اہم شہروں سے نسبت دے کر شاعر اور ادیب اپنے مستند ہونے کا گویا اعلان کرتے تھے۔ ان شہروں میں دلی اور لکھنؤ خصوصیت سے نمایاں تھے۔ وہ لوگ بھی جو ترکِ سکونت کر کے ان شہروں میں جا بستے۔ اپنی نئی وطنیت یا سکونت پر فخر کیا کرتے تھے، کیوں کہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ مصحفی کی طرح کے استاد یہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ ع: "دلی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں"؟
مصحفی خود امروہہ کے رہنے والے تھے، لیکن یہ افتخار کیا کم تھا کہ دلی دیکھ چکے تھے! کچھ ایسے بھی شاعر ہوتے تھے، جن سے نسبت پانے میں شہر فخر محسوس کرتے تھے۔ میر و غالب ہی کو لے لیجیے کہ دونوں کا وطن اکبر آباد (آگرہ) تھا، لیکن دلی والے بضد ہو کر ان کو اپنے شہر کی وطنیت کا تاج پہناتے ہیں۔ درآں حالے کہ میر کو تو دلی میں اماں بھی نہ ملی اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دلی کے باہر گزرا۔ اور 'جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے'! خود میر نے وطنیت نہ سہی دلی کے قیام کو مقامِ افتخار میں پیش کیا:

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

جب ان شہروں کی سیاسی اور خصوصاً ثقافتی اہمیت گھٹنے لگی اور دور افتادہ شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں بھی جوہر قابل ملنے لگا تو یہاں والوں کے ذہنوں میں اس خیال کا آنا فطری تھا کہ ہم بھی اپنے قصبہ اور گاؤں کا نام روشن کریں۔ چنانچہ بجنوری اور امیٹھوی کا بھی اضافہ ناموں کے آگے ہونے لگا اور شہروں سے استناد حاصل کرنے کا سلسلہ ختم ہوا۔ موجودہ دور میں ایسے کئی قصبے اور دیہات ہیں جن سے کسی شاعر یا ادیب کی نسبت اس دور افتادہ مقام کے لیے باعثِ عزت بن جاتی ہے۔ انہیں میں اتر پردیش کے ضلع شاہ جہاں پور کے ایک گوشہ میں بسا ہوا تلہر بھی ہے۔ اس کے نام کو اختر علی تلہری نے شہرتِ دوام بخشی ہے اور یہ فخر ایسا ہے کہ اس سے چھینا نہیں جا سکتا؛ یہ بات اور ہے کہ خود تلہر یا شاہ جہاں پور کو آج یہ احساس عام طور پر نہ ہو کہ اُن کے دامن میں چھپا ہوا یہ موتی کتنا بیش قیمت تھا!

اختر علی تلہری کا نام ایک زمانے میں تو ادب کے ہر مبتدی کی زبان پر تھا۔ آج کے مبتدیوں کا حال مجھے معلوم نہیں، لیکن منتہی اب بھی ان کی مثال دیا کرتے ہیں۔ پہلے تو وہ خاموشی اور گوشہ گیری پر قانع رہے، لیکن ان کی شورانگیز طبیعت کے جوہر دھیرے دھیرے کھلنے لگے۔ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ یہ "گل افشاں" کے قلمی نام سے وہی ہفتہ وار "سرفراز" لکھنؤ میں ایک مستقل مزاحیہ کالم "سرِ دلبراں" کے عنوان سے لکھا کرتے ہیں:

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اور جب یہ "حدیثِ دیگراں" "گل افشاں" کی زبانِ قلم سے بیان ہو تو اس کی دل آویزی کا کیا کہنا۔ مولانا نے "گل افشاں" پھولوں میں طنزِ لطیف کے نازک کانٹے بھی چھپائے رکھتے تھے، لیکن ان کی چبھن بھی تبسم آفریں ہوتی تھی۔
یہ مستقل کالم وہ اپنے دستِ مبارک سے لکھتے تھے، ایسے خط میں جسے یا تو خود مولانا پڑھ سکتے تھے یا پھر "سرفراز" کے وہ واحد کاتب جن کی آنکھیں ہر ہفتے اس کالم کے مسودے کو پڑھتے پڑھتے اتنی مشاق ہو گئی تھیں کہ وہ چار ٹیڑھی میڑھی لکیروں سے وہ الفاظ کی اصلی ہیئت اور ماہیت کا پتہ لگا لیتے تھے۔ یہ شانِ خط شہر لکھنؤ کے ایک اور تعلقہ دار ڈپٹی کلکٹر کو مل گئی تھی۔ تعلقہ داری نے

● ۶۳ ڈالی باغ کالونی، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

اُن کے خط کو سونے پر سہاگہ بنا دیا تھا۔ صرف اُن کا پی۔ اے اُن کی تحریر پڑھتا اور معنی نکالتا تھا۔ ایک بار وہ چھٹی پر گیا تو اُس کے عوض دوسرا پی اے آیا۔ جب شانِ خط اُس کی سمجھ میں بالکل نہ آئی تو اس سے یوں ڈرا جیسے یہ جناتی خط ہو۔ وہ ان تعلقہ دار ڈپٹی کلکٹر کی خدمت میں حاضر ہوا "حضور، یہ ابتدائی الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے"۔ گل افشاں ہوئے: "اگر پی۔ اے نہیں پڑھ سکتا تو پھر کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ خیر، تمہاری سمجھ میں جو کچھ آئے، لکھ لاؤ"۔ مولانا خدانخواستہ تعلقہ دار تھے نہ ڈپٹی کلکٹر کہ اپنا لکھا خود بھی نہ پڑھ سکیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ جتنے بڑے عالم تھے اتنے ہی بدخط بھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ آخر عمر میں مہاتما گاندھی کی تحریروں میں بھی یہ کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اگر سوئے ادب نہ ہو تو عرض کروں کہ مولانا اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی تھے۔

آج کل کے زمانے میں خوش خط ہونا نوادر سے ہے۔ لڑکا پینسل، سلیٹ سے شروع کرتا ہے، پھر بال پوائنٹ پہ آ جاتا ہے۔ اب تو فاؤنٹین پین اور قلم کا رواج بھی اُٹھتا جا رہا ہے۔ کلک کی نوک پلک درست کرنے کی بات کون کرے۔ نہ لوگ "جی" نب کی لچک سے واقف رہ گئے ہیں نہ 'پی' نب کی صلابت سے، لیکن مولانا تلہری عربی فارسی کے منتہی تھے۔ اُنہوں نے تختی کی مشق کی ہو گی۔ خوش نویسی سیکھی ہو گی۔ وہ زمانہ تو اختیاری مضامین کا تھا۔ اور نہ آئے دن کی تعلیمی اور تدریسی تجربہ پسندی کا۔ ہر چیز لازمی تھی۔ حد یہ کہ تیمی اُستاد بھی، پھر یہ شانِ خط کس بات کی غماز ہے؟ مولانا کا ذہن بے حد تیز اور درّاک تھا۔ ذہن کی تیزی کو قلم کی تیزی چھو بھی نہیں پاتی تھی۔ میرے خیال میں تیز رو خیال کو کسی نہ کسی طرح گرفت میں لے لینے کی کوشش میں شانِ خط ناہموار ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ بگڑ گئی۔ مجھے مولانا کے مکتوب الیہ ہونے کا شرف دو بار حاصل ہوا ہے۔ ان خطوں کو مولانا نسبتاً ہاتھ روک کر لکھتے تھے، لیکن میں ان کا چشم دید گواہ ہوں کہ نہ چار جگہ آنکھ اور ذہن پر زور دیئے بغیر مطلب روائی نہیں ہوتی تھی۔

اختر علی تلہری نے بہت کچھ لکھا۔ ان کی بہت سی چیزیں چھپیں، بہت کچھ غیر مطبوعہ بھی ضرور رہ گئی ہوں گی۔ لیکن خود مولانا پر بہت کم لکھا گیا۔ اس میں کچھ تو اُن کی بے پروائی کو دخل ہے اور کچھ ان کے جاننے والوں کی کوتاہ قلمی کو۔ اور اب سونی صد قصور اُن کے ہمراں علم مکرم صاحب نتو صاحب زادے ڈاکٹر آفتاب اختر کا ہے کہ وہ "قطب از جا نمی جنبد" بنے بیٹھے ہیں۔ وہ ادیب جو مولانا سے واقفیت اور علاقہ رکھتے ہیں، کم ہوتے جا رہے ہیں۔ مولانا کے مجموعے اگر آج کم یاب ہیں تو کل نایاب ہو جائیں گے اور یہ ایک ادبی سانحہ ہو گا۔ میں نے کئی بار آفتاب اختر صاحب کو اس طرف متوجہ بھی کیا اور اُنہوں نے ہر بار مضامین کو یکجا کرنے اور انہیں منظرِ عام پر لانے کا وعدہ بھی کیا۔ تازہ ترین وعدہ بھی کئی ماہ پرانا ہو چکا ہے۔ شاید یہ چند سطریں اُن کی یقینی صلاحیتوں اور عمل کی قوتوں کو بیدار کرنے کا وسیلہ بن سکیں۔ ہاں تو قصور واروں کی فہرست میں، مجھے بھی شامل کیجئے۔ میں نے اُن کی زندگی ہی میں اُن پر کچھ لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن اس لیے نامکمل رہ گیا کہ بنیادی مواد کی فراہمی نہ ہو پائی۔ پہلے خود مولانا کے استغنا نے راستہ روکا۔ پھر آفتاب صاحب کی سہل انگاری نے ادھر عبادت بریلوی کی یادداشتوں کی اشاعت کے سلسلے میں مولانا کی یاد پھر آئی۔ خدا عبادت کا بھلا کرے کہ اُنہوں نے اس فرضِ کفایہ کی طرف مجھے متوجہ کر دیا۔

بنیادی مواد کے معاملے میں صورتِ حال اب بھی اُمید افزا نہیں جو یکجا ہو سکا وہ بس اتنا ہے کہ اختر علی تلہری نسب کے سیّد اور تلہر ضلع شاہ جہاں پور (اتر پردیش، ہندوستان) کے رہنے والے تھے۔ عربی و فارسی کی رسمی تعلیم کی تکمیل مدرسۂ عالیہ رام پور میں کی، لیکن اُنہوں نے علم اور تحقیق کی پیاس کبھی بجھنے نہ دی۔ آخر عمر تک پڑھتے پڑھاتے، دوسروں کو غلطیوں پر ٹوکتے اور علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ پیشے کے اُستاد تھے۔ بنیادی طور پر عالم اور ادیب تھے۔ ضمناً شاعری بھی کر لیا کرتے تھے۔ بہت اچھے عربی داں تھے۔ فارسی اور اردو ادب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ لوگ آپ کو اکثر علامہ تلہری کے نام سے یاد کرتے تھے، جو آپ کے تبحرِ علمی کو دیکھتے ہوئے ہر اعتبار سے آپ کو زیب دیتا تھا۔ ان سب کے باوجود آپ خالص مولوی تھے ہر چند کہیں کہ تھے، نہیں تھے ویسے ہم سبھی آپ کو مولوی صاحب کہتے تھے، لیکن آپ کو صرف اس لیے مولوی کہا جاتا تھا کہ آپ علومِ عربیہ اور علومِ اسلامیہ کے ماہر تھے۔ حدیث، فقہ، تفسیر، فلسفہ، منطق، ادب، سیرت، تواریخ، علم کلام، علم النفس، عروض، صرف و نحو، بیان و بدیع، تاریخِ ادب — غرض وہ سب کچھ حاصل کر چکے تھے، جس کے حصول پر کسی بھی مولوی کو ناز ہو سکتا تھا۔ لیکن آپ نے دستارِ فضیلت بندھنے کے بعد جشنِ دستاربندی کو علم کی منزلِ آخر تسلیم نہیں کیا بلکہ یہ دستار بھی اُتار کر رکھ دی اور اس کی جگہ سیاہ مخملی ٹوپی پہن لی، جو رام پور سے اُن کے علاقے کی یاد دلاتی تھی۔

اب آپ انگریزی پڑھنے کی طرف متوجہ ہوئے کیوں کہ نئے تعلیم یافتہ حضرات مولویوں کو یہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ وہ نہ تو فلسفۂ جدید جانتے ہیں نہ منطق جدید۔ علامہ انگریزی زبان کی اچھی خاصی صلاحیت پیدا کرنے کے بعد فلسفۂ مغربی حاصل کرنے میں لگ گئے اور صرف ذاتی جدّ و جہد سے مغربی فلسفے اور منطق استقرائی پر عبور حاصل کر لیا۔ جدید علم النفس پر کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ذہانت کا یہ عالم تھا کہ مشہور فلسفی کانٹ کی کتاب

CRITIQUE OF PURE REASON
لیسق سے عمیق مطالب کو پانی کرکے بیان کرسکتے تھے۔ حالانکہ یہ فلسفے کی
یق ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اُدھر کارل مارکس کی داس کیپٹال
ھ ڈالی۔ زاہدانِ تنگ نظر سے لے کر مجددین اور ترقی پسندوں تک
مناظرے اور قلمی مجادلے کر ڈالے۔ مولویوں تک سے نوک جھونک ہوئی۔
ں میں وہ سلسلۂ مضامین بھی شامل ہے۔ جس میں انہوں نے ذاکری
معاصرہ پینے کے خلاف عقلی اور نقلی دلائل کے انبار لگا دئے تھے۔ یہ نوک
ونک مولانا سید ظفر مہدی گہر مرحوم مدیر "سہیل یمن" سے ہوئی تھی۔ اگرچہ
ث کا خاتمہ آپ نے "اعترافِ شکست" کے عنوان سے کرلیا، لیکن شانِ
ریر کہہ رہی تھی کہ اعترافِ شکست نہیں اعلانِ فتح تھا۔ مولانا کے گھر کا ماحول
رہبی تھا۔ اُنہیں عربی پڑھا کے گھر والے چاہتے تھے کہ اُنہیں مفتی یا کم سے
طبیب بنائیں، لیکن یہ بن گئے استاد اور وہ بھی انگریزی اسکولوں کے۔
ں آزاد ماحول میں اُن کی طباعی کو اپنے جوہر دکھانے کا پورا موقع ملا۔ بعض
ر یبقی حضرات تو اُنہیں مخالف علماء کے گروہ میں گننے لگے!

اگر عرفان عباسی کی روایت صحیح مانی جائے تو ان کی ولادت اور
فات دونوں ہی ایک تاریخ یعنی ۲۱ اپریل کو ہوئی۔ ولادت ۱۹۰۲ء میں
ر وفات ۱۹۷۱ء میں۔ ۶۹ برس کی عمر کوئی بڑی عمر نہیں ہے، لیکن جن لوگوں کو
فری دنوں میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ گواہی دیں گے کہ اُنہیں
ہی کچھ اور کرنا تھا اور وہ کرنا بھی چاہتے تھے۔ خوش درخشید و لے
دولتِ مستعجل بود! کاش یہ عمر اور وفا کرتی! اور کاش! اور کاش!!

علامہ تلہری کو انگریزی اسکولوں میں ذہنی اعتبار سے کھلی فضا
ملی اور دو دہائیوں سے زیادہ کی طویل مدت تک لکھنؤ میں قیام کا موقع ملا۔
لکھنؤ میں ان کی ملاقات تین اور ادیبوں سے ہوئی۔ بعض نجی حلقوں میں یہ لوگ
دبی "اربابِ اربعہ" کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔ یہ ارباب تھے:

۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب ۲۔ سید علی عباس حسینی
۱۔ خواجہ اطہر حسین ۴۔ اور خود سید اختر علی تلہری

ان میں سے تین نے تو کافی شہرت پائی، لیکن خواجہ اطہر حسین کے بارے میں یہ
بات شاید چند ہی افراد جانتے ہوں گے کہ یہ خاموش کم نویس اور عزلت پسند
بزرگ وہی ہیں، جنہوں نے لکھنؤ کے مرحوم ماہنامہ ادب میں رند کے فرضی نام
سے کئی بلند پایہ مزاحیہ مضامین لکھ کر بہت سے اربابِ نقد و تبصرہ کو اپنی طرف متوجہ
کرلیا تھا۔ ان ارباب میں مولوی ثاقب حسین صاحب بھی تھے، جو جوبلی کالج میں
عربی فارسی پڑھاتے تھے۔ خوش مزاج اور یار باش! وہ برابر پانچویں سوار ہوں
میں شامل ہونے کی کوشش کرتے، لیکن سچ پوچھیے تو ادبی اکتسابات کے معاملے
میں وہ اس مختصر گروہ کے فرد نہیں معلوم ہوتے تھے۔ خدانخواستہ گھس بیٹھے

بھی نہیں تھے۔ بلکہ ان کی اتنی اہمیت تو بہرحال تھی کہ تلہری صاحب کی کسی کتاب
پر (نام یاد نہیں آتا) تعارفی حالات اُنہیں کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ
ثاقب صاحب کی مخطوطات پر اچھی نظر تھی اور غالباً اس تعلق کا ایک کاروباری
پہلو بھی تھا۔ کم از کم مسعود صاحب کے یہاں اس غرض سے آنا جانا رہتا
تھا۔ اختر علی صاحب کی طرح ثاقب صاحب بھی عربی کے منتہی تھے۔ یہ
زندہ دل لوگ تھے اور بے حد نجی محفلوں میں وقت گزاری کے لیے تاش سے بھی
شغل کرلیا کرتے تھے۔ اور یہ بالکل متحقق ہے کہ بازی کبھی نہیں لگاتے تھے۔

گفتگو کچھ پٹڑی سے اُتر گئی۔ یہ ان تمام اصحاب کے بارے میں لکھنے کا
محل نہ تھا، لیکن ان کی طویل، پائیدار اور بے لوث دوستیوں کے بارے میں
لکھنا ضروری ہے۔ اس میں جزوی اختلافاتِ مزاج کے باوجود بڑی مماثلتیں
تھیں اور ان مماثلتوں پر اٹوٹ دوستیوں نے جلا کر دی تھی۔ یہ سب متوسط
طبقے کے شریف گھرانوں میں پڑھے اور پلے، سب نے عربی و فارسی سے
تعلیم کی ابتدا کی اور بڑا حصہ لکھنؤ میں گزارا، مگر سب غیر لکھنوی تھے۔ سب
نے مذہبی ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ اور ایک انحطاط پذیر نظام کی
گود میں ذوقِ ادب کی پرورش کی اور حریتِ خیال کو اپنایا اور اپنے اپنے حلقۂ
سکار کے اندر رجعت پسندی سے ٹکرائے۔ سب قوم پرور خیال کے حامی رہے
اور اس سلسلے میں بیک وقت انگریزی حکومت کے عتاب کا شکار رہے۔
(صرف مولوی ثاقب حسین کی ذات وہ استثنا تھی، جس سے کلیہ غلط ثابت ہوتا
ہے)

یہ حکایت بھی یہیں کہہ دئے جانے کے قابل ہے۔ پہلے ذکر آچکا ہے
کہ مولوی اختر علی تلہری "سرفراز" میں "سرِ دلبراں" کے عنوان سے مستقل کالم
لکھا کرتے تھے۔ اس کے مدیر خواجہ اسد اللہ اسدؔ جالب دہلوی کے ساتھ کے
صحافی تھے۔ ان میں باہم دوستانہ تھا اور اسی دوستی کی بنا پر تلہری کسی معاوضہ
کے بغیر یہ کالم پابندی سے لکھتے رہے اور وہ بھی اپنے ہی خط میں۔ ایسے خط
میں جس کی نقل ناممکن ہے؛ لکھ کر اخبار کو بھیج دیا کرتے تھے۔ اس کالم میں
کبھی کبھی سرکاری پالیسیوں پر چوٹیں بھی ہوتی تھیں۔ خاص کر ممالکِ اسلامیہ
سے متعلق برطانوی پالیسی پر اکثر نکتہ چینی ہوتی۔ دو ایک بار جب تلہری صاحب
شہر میں نہ ہوتے یا بیمار ہوتے تو یہ کالم علی عباس حسینی بھی لکھ دیا کرتے تھے۔
ان کی اصلیں بھی خواجہ اسد کے پاس تھیں۔ ایک بار کچھ ان بن ہوگئی تو خواجہ اسد
نے سابقہ تعلقات اور صحافتی روایات کا خیال کئے بغیر یہ تحریریں حکومت
تک پہنچا دیں۔ وہاں دیر کیا ہوتی کہ اندھیرے تک سے گریز نہ تھا۔ ان لوگوں کو
خبر ہوئی، دوڑ دھوپ کی گئی۔ کافی پیروی ہوئی، لیکن تیر کمان سے چھوٹ
چکا تھا۔ ملازمت بچ گئی۔ لیکن کم سے کم سزا یہ ملی کہ تینوں کو دور دراز مقامات
پر بھیج دیا گیا۔ اب اربابِ اربعہ چار سمتوں میں بٹ گئے۔ شیرازہ بکھر گیا۔

مسعود صاحب تو یونی ورسٹی میں تھے اور سیاست اور صحافت دونوں سے
الگ تھلگ ۔ وہ اس لپیٹ میں نہ آسکے ۔ لیکن وہ اکیلے رہ گئے ۔

مولانا کی بے شمار معرکہ آرائیوں میں ترقی پسندی کے خلاف محاذ آرائی
قابلِ ذکر ہے ۔ اس سلسلے میں بھی مولانا نے داس کیپٹال کی سنگلاخ زمین کو
پہلے پانی کر چکے تھے ۔ اس کے بعد ترقی پسندی کے خلاف ان کی مناظرانہ تحریریں
رسائل میں چھپنے لگیں ۔ اس ضمن میں کشن پرشاد کول، جعفر علی خاں اثر اور
تلہری کے مابین خاصا رابطہ قائم ہوگیا تھا ۔ یہ تینوں اکثر و بیشتر لکھنؤ میں
اردو کتابوں کی مشہور دوکان دانش محل (امین الدولہ پارک) پر جمع
ہوکر خیال آرائی اور متعلقہ تحریروں پر تبصرے کیا کرتے تھے ۔ تلہری اور کول
تو روز ہی آجاتے اور اثر گاہے گاہے ادھر بھی ہو لیتے ۔ اکثر غلام احمد
فرقت بھی آجاتے ۔ وہ نظر باقی گفتگو کو بھی ان حضرات کی بزرگ داشت
کے ساتھ ساتھ اپنے قہقہوں میں ڈبونے کی کوشش کرتے ۔ علامہ تلہری
نے مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین سبھی کو اپنی تنقیدی گرفت میں لیا ۔
لیکن ذاتی تعلقات میں فرق نہیں آنے دیا ۔ احتشام حسین کے ساتھ تو گویا روز
کا اُٹھنا بیٹھنا تھا ۔ وہ بھی وضع دار تھے کہ اصولی مخالفت اور ذاتی مخالفت
میں امتیاز کرنا جانتے تھے ۔

راقم الحروف مولانا کے نیازمندوں میں تھا ۔ انٹرمیڈیٹ (ابتدائے)
میں اُن سے تین دن فارسی پڑھی تھی ۔ وہ بھی اس لیے کہ ہمارے وہ
مولانا جو فارسی پڑھاتے تھے اور جنہیں لوگ اُن کے آبنوسی رنگ کی بنا پر
کالج (گورنمنٹ جوبلی انٹر کالج) بھر میں "کالے مولوی صاحب کہتے تھے" ۔
اتفاقیہ چھٹی پر چلے گئے تھے اور اُن کے عوض ہمارا فارسی کلاس بھی مولانا کے
سپرد ہوگیا تھا ۔ کالے مولوی صاحب بھی فارسی ادب پر اچھی نظر رکھتے تھے ۔
اُستاد بھی اچھے تھے اور ہم اُن کے طریقۂ تدریس سے مطمئن بھی تھے لیکن
تین دن میں معلوم ہوگیا کہ علامہ تلہری "چیزے دیگر" ہیں ۔ اب تو لوگ شاید
ہی یقین کریں گے، لیکن ہمارے زمانۂ طالب علمی تک تین دن کی اُستادی
بھی عمر بھر کی نیازمندی کے لیے کافی تھی ۔ میں ہمیشہ اُن کا احترام کرتا رہا اور
آج بھی کرتا ہوں ۔ جب وہ ترقی پسندی کے خلاف صف آرا ہوئے تھے تو
میں کالج چھوڑ کر یونی ورسٹی پہنچ چکا تھا ۔ انہیں ترقی پسندی کے بارے میں
خود میرے خیالات معلوم تھے اور میں ذاتی احترام کے سبب سے اس موضوع
پر اُن سے دوبدو بحث نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ کبھی کبھی مجھ سے چھیڑ کر
بحث کرنے کے موڈ میں آجاتے ۔ اگر میں ہاں ہوں میں بات ٹالنے کی بھی کوشش
کرتا تو وہ نہ ملتے اور پھر باقاعدہ بحث ہوجاتی ، لیکن کم از کم مجھ سے اُن کا اختلاف
ولائے مولویانہ نہیں، فلسفیانہ سطح پر ہوتا ، نہ میں نے اپنا موقف بدلا نہ انہوں نے
اپنا، نہ میں نے احترام ہاتھ سے جانے دیا نہ انہوں نے استادانہ شفقت میں کمی کی
نہ خواہ مخواہ اپنی بات منوانے پر بضد ہوئے ۔ ہم دونوں کو معلوم تھا کہ کس منزل
پر بحث کا رُخ موڑ دینا چاہیئے ۔

اختر علی تلہری صاحب نظمِ معریٰ اور نظمِ آزاد سے کبھی خوش نہیں تھے ۔
وہ تجربہ پسندی کو حدود کے اندر ہی روا رکھتے تھے ۔ چنانچہ "ماورا" کی اشاعت
کے بعد جب غلام احمد فرقت نے "مداوا" لکھی تو مقدمہ لکھنے پر آمادہ ہوگئے
اور اُن کی خیالات کی سند میں یہ تحریر آج بھی پیش کی جاسکتی ہے ۔
میں نے بھی کچھ آزاد نظمیں لکھی تھیں اور علی عباس حسینی کے گھر پر نجی نشستوں
میں سنائی بھی تھیں ۔ اُس وقت اُن سے داد بھی ملی تھی ۔ اگرچہ انہوں
نے دو ایک بار یہ بھی کہا کہ جب تم اتنی اچھی پابند نظمیں لکھ لیتے ہو تو ان تجربات
میں کیوں اُلجھتے ہو؟ آخر آخر، شاید اُن کی تمام مخالفتوں کی شدت کم
ہوگئی یا مجھے سرپھرا سمجھ کر یا ناقابلِ اصلاح قرار دے کر انہوں نے خاموشی
اختیار کرلی ۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے !

میرا کوئی مضمون نکلتا، کوئی نظم شائع ہوتی، کوئی کتاب چھپتی تو
ضرور پڑھتے ۔ میں بھی لکھنؤ جاتا تو انہیں ہدیۂ شاگردی کے طور پر پیش کرتا ۔
اپنے کچھ مضامین میں میرا بھی ذکر شفقت آمیز لہجے میں کیا ہے ۔ ہمیشہ ہمت
افزائی کرتے ، دل بڑھاتے ، کبھی کوئی مقام محلِ نظر ہوتا تو شفقت سے خط
کے ذریعے نشاندہی کرتے ۔ میں نے "نیا دور" میں "آپ سے ملیے" کے
عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا ۔ اس میں جناب سید مسعود حسن
رضوی ادیب پر ایک مضمون لکھا ۔ اس ہلکے پھلکے معلوماتی خاکے میں ممدوح
کی مونچھوں کا ذکر غالباً کچھ اس انداز سے آگیا تھا کہ اُستاد مرحوم نے دبی ہوئی
شکایت کے لہجے میں تلہری صاحب سے ذکر کیا ۔ شاید تشبیہ غلط ہوگئی تھی ۔
یہ تاثراتی چیز تھی، کچھ تحقیقی نہ تھی ۔ مسعود صاحب میرے محترم اُستاد تھے ۔ میرے
خیال کے شائبے میں بھی یہ بات نہ تھی کہ کوئی ناقابلِ لحاظ گوشہ بھی ان کی گرانیِ طبع
کا باعث ہوگا، بہرحال جب یہ مضامین کسی عنوان سے کتابی شکل میں شائع
ہوئے تو میں نے تلافی کردی ۔ علامہ تلہری نے بہت ہی سنجیدگی سے مسعود صاحب
کی شکایت "باریش بابا ہم بازی" کی یاد دلاتے ہوئے کی تھی ۔ اگرچہ وہ میری
زندگی کا ایسا دور تھا کہ ع نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
لیکن شاگردی کے معاملے میں، میں باگ روک بھی لیتا تھا ۔

اختر علی تلہری کی شخصیت میں بڑی دلکشی تھی ۔ ظاہری لباس سے بے پروا،
کبھی خشخشی داڑھی بڑھی ہوئی، بلکہ اگر میری نظر نے دھوکا نہیں دیا تو کبھی اس
سے بھی بے نیاز ۔ "حلقِ لحیہ" کی حدوں کو چھوتی ہوئی ، کبھی انگریزی قطع کے چھوٹے
بال، سوکھے اور بے ترتیب، کبھی سیاہ مخملی ٹوپی اس طرح غلط انداز روئیے پر نصب
صلیب پر چڑھی ہو، کبھی شیروانی شکن آلود ، بٹن گلے تک بند ، لیکن ذہن ہمیشہ
باترتیب ۔ عدلیوں کی نکھری ہوئی روایات کا حامل ۔ انہوں نے تنقیدی کاوش پر کوئی

بات نہیں مانی اور ٹوکنے پر آگئے تو اپنے ساتھی اور دوست اور میرے اُردو کے اُستاد حامد اللہ افسر کی کتاب "نقد الادب" کو اصل سے نقل ثابت کرکے رکھ دیا۔ ان سے بگاڑ مول نے لیا اور ہم لوگوں کو ضیق میں مبتلا کر دیا۔ جو دونوں کے نیاز مند تھے۔ اُلجھن دراصل ہمارے ذہنوں کی پیداوار تھی ورنہ اختر علی تلہری جو کچھ لکھتے تھے، تول کر لکھتے تھے اور اُس پر کبھی افسوس نہیں کرتے تھے۔ یہی انداز اُنہوں نے اپنے سلسلۂ مضامین "محاسبے" میں بھی باقی رکھا۔ بے رو رعایت اکثر ہم عصروں کو اُن کی غلطیوں پر ٹوکا۔ اور غلطیاں ایسی جن کی نشاندہی سے بڑے لکھوں نے اکتساب فیض کیا۔

ہمیشہ آن بان سے جیے اور شان سے رہے۔ استغنا کی شان تھی، مگر علم کا غرور نہ تھا۔ کبھی کسی کا بُرا نہیں چاہا۔ کوشش یہی رہی کہ ہو سکے تو مدد ہی کرتے چلیں۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔ اُن پر بال بچوں اور شریفانہ رکھ رکھاؤ کا بوجھ بہت تھا۔ اُس زمانے میں لکھنا پڑھنا "نقصانِ مایہ اور شماتتِ ہمسایہ" کا سودا تھا۔ اُنہوں نے بڑی خودداری سے دونوں کو گوارا کیا اور پنشن پانے کے بعد بھی رکھ رکھاؤ میں فرق نہ آنے دیا۔ نہ کسی سے دبے نہ کسی کے آگے جھکے۔ وہ کھرے اور بے لچک تھے، لیکن ضدی نہیں تھے۔ لچک اس لیے نہیں تھی کہ بے سوچے سمجھے رائے قائم نہیں کرتے تھے۔ خود نہ بدلنے کے باوجود دوسروں کے خلوص عقیدہ کو بھی تسلیم کرتے تھے اس لیے وَمَا عَلَيۡنَآ اِلَّا الۡبَلٰغ۔ (ہمارا کام صرف اپنی بات پہنچا دینا ہے) کہہ کر خاموش ہو جاتے تھے۔ کبھی لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡن (تمہارے لیے تمہارا مذہب، میرے لیے میرا دین) کہہ کر بحث کی تلخیوں کو بھلا دینے کی کوشش کرتے۔ یہ سب اس لیے ممکن تھا کہ اُن میں عالمانہ وسیع النظری بھی تھی۔

مولانا نے بحثوں میں حصے لیے ہیں، محاسبے کیے ہیں، لیکن اُن کا نقطۂ نظر منفیانہ نہیں تھا۔ وہ صالح تنقیدی نظر رکھتے تھے۔ بہت ستھرا ذوق تھا۔ باریک سے باریک نقطوں تک ذہن فوراً منتقل ہو جاتا تھا۔ جمالیاتی احساس بیدار تھا اور روایت کے ساتھ جدید رجحانات پر بھی نظر تھی، اس لیے وہ قدامت پرستی سے نفرت کرتے رہے اور قمر رئیس تک نے یہ گواہی دی کہ "ادب، زندگی اور مذہب کے عام مسائل میں وہ ایک واضح، روشن اور ترقی پسندانہ نقطۂ نظر رکھتے تھے ـــــ وہ ترقی پسندی کے مخالف نہیں، انتہا پسندی کے مخالف تھے۔"

اُنہتر برس پر پھیلی ہوئی زندگی میں کم از کم چالیس برس تک اُنہوں نے ادبِ اُردو کی بے لوث خدمت کی۔ اس عرصہ میں اُنہوں نے کئی یادگار تصانیف چھوڑیں ان میں "مقالاتِ تلہری" "تنقیدی شعور" "شعر و ادب" "شہادتِ علی" "مذہبی تصورات" اور "مولانا مودودی کا نظریۂ سیاست" وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔

ان کے علاوہ بہت سے بیش بہا مضامین کتابی صورت میں طبع ہونے کو باقی ہیں۔ شعری ذخیرہ غیر مطبوعہ پڑا ہے اور شاید زیرِ لب یہ کہہ رہا ہے ؎
بیا و ریدگر این جا بود سخن دانی

●●

---

## بقیہ : مکتوبات

---

اخبارِ کشمیر چند دوسرے اخباروں کے ساتھ "کشمیر چھوڑ دو تحریک" کے خلاف لکھتے تھے۔ یہ تحریک ۱۹۴۶ء میں ڈوگرہ شاہی کے خلاف کھلی آواز تھی۔ اس کے اسباب و عوامل پر میں یہاں بات نہیں کروں گا پھر کسی وقت ہی۔

قیصر قلندر، سرینگر

## صورتِ حال

محبی عبداللطیف اعظمی صاحب اگر میرے مضمون کو ٹھنڈے دل سے پڑھتے۔ خود غور کرتے کہ مضمون نگار نے اس اقتباس کو اپنے مضمون میں شامل کرنے کے باوجود ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کی تاریخ کیوں تحریر کی ہے اگر اس پر غور کرنے کا موقع نہ تھا تو مجھے لکھتے۔ میں اپنے مطالعہ کے نتائج سے اُنہیں آگاہ کرتا۔

اب ملاحظہ کیجیے مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن جلد اوّل میں تحریر کرتے ہیں:

"۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو حکومت نے مجھے رہا کر دیا اور اب طباعت و اشاعت کی تمام رکاوٹیں راہ سے دُور ہو گئیں ...."

[ ترجمان القرآن جلد اوّل : دیباچہ طبع اوّل : ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی ص ۲۲ ]

مولانا کی اس تحریر کو میں کیوں کر غلط کہہ سکتا ہوں۔ البتہ پہلے اقتباس:

"جنوری ۱۹۲۰ء میں جب میں نظر بندی کے گوشۂ قید و بند سے نکلا ...."

یہ جب میں نے پہلے غور کیا تھا تو مجھے "گوشۂ قید و بند" سے مولانا کا اشارہ "رانچی" سمجھ میں آیا تھا۔ جہاں سے وہ جنوری ۱۹۲۰ء میں رخصت ہوئے تھے۔

از راہِ کرم اس خط کو "آج کل" کے کسی قریبی شمارہ میں جگہ دیں تاکہ قارئین صحیح صورتِ حال سے آگاہ ہوں۔

عبدالقوی دسنوی، بھوپال

●●

اعجاز علی ارشد

# اُردو افسانہ اور علامت

علامت نگاری اب اردو میں خاصی معروف ہو چکی ہے، اس لیے اس کے حدود اور مفہوم کی وضاحت زیادہ ضروری نہیں معلوم ہوتی۔ یہ بات بھی اکثر لوگوں کو معلوم ہے کہ علامتیں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔...... J.A.Cuddon نے ان صورتوں کی وضاحت کرتے ہوئے .......... A dictionary of Literary terms میں لکھا ہے:

"As far as particular objects are concerned, this kind of symbolism is often private and personal. Another kind of symbolism is known as the 'transcendental. In this kind concrete images are used as symbols to represent a general or universal ideal World of which the real world is a shadow."

گویا علامتوں کی ایک صورت تو آفاقی یا Universal ہوتی ہے اور ایسی صورت میں علامت کے مفاہیم نہ صرف متعین ہو جاتے ہیں بلکہ اکثر لوگوں کے علم میں ہوتے ہیں۔ دوسری صورت وہ ہوتی ہے، جسے ہم ذاتی یا شخصی کہہ سکتے ہیں اور اس صورت میں علامتوں کا مفہوم عام نہیں بلکہ نا معلوم ہوتا ہے اور تخلیق کار کے ذہن میں محفوظ رہتا ہے۔ ایک تیسری صورت آرکی ٹائپی ہوتی ہے جو اجتماعی لاشعور کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ان تینوں صورتوں کی تخلیق کا بنیادی سبب یہی ہے کہ زندگی کی طرح تخلیقی قوت بھی "برہنہ حرف نہ گفتن" کی طرف مائل رہی ہے۔ اس لیے جیسے جیسے تجربے اور مشاہدے کی نوعیت پیچیدہ ہوتی جاتی ہے، علامت شاعری سے ہوتے ہوئے نثر کی طرف قدم بڑھاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ شاعری کے اثرات لازمی طور پر نثر پر بھی پڑتے ہیں۔ خصوصًا وہ نثر جو شاعری کی طرف بڑھنا چاہتی ہے، اس کے لیے شاعری کے اثرات قبول کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نثر نگار اپنے تخلیقی رویے کے سبب شعراء کی صف میں چلے جاتے ہیں۔ اور اگر انہیں عمومی نثر نگاروں کی بزم میں بٹھانے کی کوشش کی جائے تو بالکل اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ اردو میں بھی جب علامت کی طرف توجہ بڑھی تو نثر میں لکھنے والے فن کاروں نے عام طور پر علامت کی طرف بڑھنے میں آسودگی محسوس کی۔ یہ آسودگی کچھ تو اس احساس کا نتیجہ تھی کہ ان کے پیچیدہ تصورات، خیالات، تجربات اور مشاہدات اکہرے، بیانیہ انداز میں یک رُخے معنی میں اسیر ہو کر بے جان ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے تخلیقی عمل کا بھی یہ تقاضا تھا کہ وہ معنی کے اکہرے پن پر اکتفا نہ کریں بلکہ اپنے بیان، تحریر یا تخلیق کو مفہوم کی جہتوں کے اعتبار سے وسیع تر کر دیں۔ مختلف اصناف نثر سے تعلق رکھنے والے تمام فن کاروں کے لیے تو خیر یہ ممکن نہ تھا کہ وہ علامت کے پیچ و خم سے گزر سکیں کیوں کہ اس کا گہرا تعلق ابہام سے بھی ہے۔ یہ صورت انشائیہ میں پیدا نہیں ہو سکتی تھی، نہ ہی تنقیدی نگارشات اس رویے کی متحمل ہو سکتی تھیں۔ عملی اور تدریسی پس منظر رکھنے والے مضامین بھی اس کی خو نہیں اختیار کر سکتے تھے اور ادبِ لطیف میں بھی اس کی گنجائش بہت کم تھی۔ لیکن افسانوں، ناولوں اور نثری ڈراموں میں علامت کی نمو کے امکانات بہت زیادہ تھے۔ چونکہ افسانہ نگاروں کی صف شاعروں کی صف سے قریب سمجھی جاتی ہے لہٰذا ان لوگوں کے لیے فطری امر تھا کہ وہ اپنی تخلیقات کو علامت کے رویے سے ہمکنار کرتے۔ مجھے اردو افسانے میں علامت کے برتاؤ کی کوئی تاریخ نہیں مرتب کرنی ہے کیوں کہ یہ عمل خاصا وسیع اور دقت طلب ہے، لیکن علامت کے بعض ایسے جوہروں کی نشان دہی میرا مقصد ہے جو اردو افسانے میں تیزی سے جگہ بناتے جا رہے ہیں۔

اردو افسانے کے تدریجی ارتقا کو ذہن میں رکھا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے

○ صدر شعبۂ اردو، بی۔ این کالج، پٹنہ یونیورسٹی

کہ علامت اس وقت بھی اس صنف میں اپنا قدم جما رہی تھی جب اس کا چلن عام نہ تھا۔ یوں تو ترقی پسندی علامت کے خلاف سینہ سپر رہی ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ علامت کے رویے سے بہرہ ور افسانے ترقی پسندی کے دور میں ہی منٹو اور کرشن چندر نے لکھے۔ جنس سے منٹو کا شغف معلوم و معروف ہے اور اس کے دوسرے افسانوں کی طرح "پھندنے" کا موضوع بھی یہی ہے، مگر یہ افسانہ جنسی دباؤ کی ایک شدید کیفیت کی پیش کش کے باوجود علامت کے کئی پہلو اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس میں قصے کی ڈور کہیں کہیں اُلجھ بھی جاتی ہے۔ لیکن اندازِ بیان بہرحال علامتی ہے۔ بلیاں، نارنگیاں، انڈا دینے والی مُرغیاں، عورتیں اور ازار بند وغیرہ ساری چیزیں جنس کی علامت کے طور پر اُبھرتی ہیں۔ اور منٹو جنسی جذبات و کیفیات کے عمل اور ردِ عمل کو پہلی بار علامتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہیں پر کرشن چندر کے افسانے "مُردہ سمندر" کا میں خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گا کیوں کہ یہ ایک ترقی پسند کے قلم سے نکلا ہوا علامت پر مبنی افسانہ ہے اور بیانیہ کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ "مُردہ سمندر" اُردو کے اوّلین علامتی افسانوں میں ایک ہے۔ یاد آتا ہے کہ یہ افسانہ سب سے پہلے ماہ نامہ "صنم" پٹنہ کے افسانہ نمبر ۱۹۶۰ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اگر بعد کے شماروں کی ورق گردانی کی جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ اس افسانے پر کیسی کیسی نکتہ چینی کی گئی۔ سب سے پہلا وار تو اس کے مفہوم کے سلسلے میں اس کے خالق پر ہوا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ افسانہ لایعنی ہے اور محض ٹھٹھول اور مذاق کی خاطر کرشن چندر نے اُسے افسانہ کہہ کر شائع کروا دیا ہے، لیکن حقیقت امر بالکل خلاف تھی۔ "مُردہ سمندر" وہ پہلا علامتی افسانہ تھا جس میں بے یقینی، زندگی کی پژمردگی، اس کی بے معنویت اور قدروں کے انہدام کی کہانی پیچیدہ تخلیقی رویّے سے دوچار ہو کر سامنے آئی تھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ ترقی پسندی کو ان باتوں سے کبھی سروکار نہیں رہا اور "مُردہ سمندر" میں عام زندگی کا عکس نہیں ہے بلکہ تحکمانہ، جابرانہ، آمرانہ اور تشدد دانہ نظامِ حیات جسے بورژوائی نظامِ حیات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس کے خلاف بالواسطہ انداز میں اپنے رویّے کا اظہار ہے۔ چلیے یہی سہی۔ دراصل یہی علامت ہے۔ کیوں کہ اس افسانے میں کرشن چندر کہیں Fix نہیں ہوتا۔ مردہ سمندر، تاش کا پتہ، اور تاش کے کھلاڑی ایک نوع کی شخصی علامتیں ہیں، جن کا مفہوم واضح اور متعین نہیں ہے۔ نتیجے کے طور پر اس افسانے کی دنیا اتنی وسیع ہو گئی ہے کہ مردہ سمندر ابعادِ معنی کے لحاظ سے نئی نئی تفہیمی تاویلات سے گزر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تجربے اور مشاہدے کی نوعیت جب علامت کا چولا پہن لیتی ہے تو ہر لفظ ایک جہانِ معنی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ ایسے میں "مردہ سمندر" میں ان امور کے علاوہ جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے، اور بھی پہلو سامنے آئیں تو یہ غیر فطری نہیں ہے کیوں کہ علامت کا رویّہ اختیار کرنے والے فن کار کا تناظر اتنا وسیع اور اتنا لچکدار ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے آنے والے مفہوم کا احاطہ کرنا آسان نہیں ہوتا اور لوگ اپنے اپنے طور پر مفاہیم کی دنیا آباد کرنے میں مسرت محسوس کرتے ہیں۔

کرشن چندر کے "مُردہ سمندر" یا منٹو کے "پھندنے" کے علامتی اوصاف کو الگ کیجیے تو پھر وہ افسانے سامنے آئیں گے، جو ابھی ابھی لکھے جا رہے ہیں اور جن کی بنا پر ہی اردو افسانے میں علامت کی تفہیم کا عام سلسلہ شروع ہوا ہے۔ ایسے افسانوں کی تعداد خاصی ہے، اس لیے کہ ہر نیا افسانہ نگار شاید حالات کے دباؤ کے تحت یہ محسوس کر رہا ہے کہ عام بیانیہ افسانے جن میں معنیٰ کی تہ داری نہ ہو وہ زمانے کی چیز نہیں سمجھے جائیں گے۔ اس لیے وہ اپنے طور پر علامت کی طرف بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ مجھے ابھی اس سے بحث نہیں کہ ایسے کتنے ہی افسانے لایعنی اور بے معنی سے ہیں۔ کیوں کہ ان کے لکھنے والے علامت کے مطالبات سے واقف نہیں ہیں نہ ہی اس کے کیف و کم سے بخوبی واقف ہیں۔ لیکن چند ایک افسانہ نگاروں کے بارے میں یہ بات نہایت وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ علامتی ادب کے مفہوم سے آشنائی کے بعد ہی ایسی تخلیقی صورت سے اپنا رشتہ استوار کر رہے ہیں۔ ایسے افسانہ نگاروں میں میری رائے میں سریندر پرکاش کی ایک جگہ ہے کہ اُنھوں نے بڑے اعتماد سے بعض نئے امکانات کے افسانے تخلیق کیے۔ "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" یا "بدو شک کی موت" ان کے علامتی افسانے کی حدیں مقرر نہیں کرتے۔ بلکہ "بجوکا" جیسا افسانہ بھی ان کی علامت کے پیچ و خم کو ظاہر کر رہا ہے۔ میں نے ترقی پسندی کے دور کے "مُردہ سمندر" اور "پھندنے" کا ذکر کیا ہے۔ اب "بجوکا" میں ان کی نئی تاویلات دیکھیے۔ گئودان کے کردار ہوری سے کون واقف نہیں ۔۔ لیکن اس ہوری کی نئی تشکیل "بجوکا" میں ہو رہی ہے۔ افسانے کے قوام میں وہ اسپرٹ موجود ہے جو گئودان کی اسپرٹ رہی ہے، لیکن کسان تو سدا کا مفلس ہے۔ اسے اپنی نگرانی تو کبھی کرنی ہی نہیں آئی۔ نہ ہی اُسے اپنی مختصر سی پونجی کا بچاؤ کرنا آیا چنانچہ خود ہوری کے کھیت کا نیا نگہبان، جسے اس نے اپنے ہاتھوں اپنے کھیتوں کی رکھوالی کے لیے کھڑا کیا تھا، جان دار بن جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں از خود درانتی آجاتی ہے اور فصل پکنے پر وہ خود کو بڑے اعتماد، طاقت، حوصلے اور مسرت کے ساتھ فصل کے چوتھائی حصے کا حق دار قرار دیتا ہے۔ پنچایت بھی اس کی طاقت اور اہلیت سے خائف ہے اور فیصلہ اس کے حق میں ہی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب ہوری کو کسی پر اعتماد نہیں۔ Intruder بہرحال Intruder ہوتا ہے۔ خواہ وہ بے جان ہی کیوں نہ ہو۔ ہوری اپنے آپ کو ہی "بجوکا" بنانا چاہتا ہے۔ کسی اور کو نہیں، تاکہ اس کی فصلیں اسی کی رہیں۔ کسی اور کی نہ ہو جائیں۔ افسانے کا مزاج اور ڈھنگ ایسا ہے کہ اس سے کتنے ہی مفاہیم وابستہ کیے جا سکتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ہر معنیٰ اپنے آپ میں اتنا اہم ہوگا کہ آسانی سے رد نہیں کیا جا سکے گا۔ علامت کا مطالبہ بھی یہی ہے۔ ایسے رویّے کے علمبردار واقف ہیں کہ کس طرح قدیم صنمیات، اسلاف

کے تخلیق کردہ کردار آرکی ٹائپی طور پر نہیں بلکہ نجی علامات بن کر نئے لبادے میں معنیٰ کے نئے افق کی تعمیر کے لیے بروئے کار لائے جاتے ہیں - اس کی اعلیٰ مثال "یولی سس" ہے اور ادنیٰ مثال "بجوکا" اس افسانے کی اختتامی سطور ملاحظہ ہوں :

"سنو --- یہ شاید ہماری زندگی کی آخری فصل ہے - ابھی ہتھل کھیت سے کچھ دُوری پر ہے - میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں اپنی فصل کی حفاظت کے لیے کبھی "بجوکا" نہ بنانا --- اگلے برس جب ہل چلیں گے، بیج بویا جائے گا اور بارش کا امرت کھیت میں سے کونپلوں کو جنم دے گا تو مجھے ایک بانس پر باندھ کر کھیت میں کھڑا کر دینا --- بجوکا کی جگہ پر --- میں تب تک تمہاری فصلوں کی حفاظت کروں گا جب تک ہتھل آگے بڑھ کر کھیت کی مٹی کو نگل نہیں لے گا اور تمہارے کھیتوں کی مٹی بھر بھری نہیں ہو جائے گی - مجھے وہاں سے ہٹانا نہیں، وہیں رہنے دینا تاکہ جب لوگ دیکھیں تو انہیں یاد آئے کہ بجوکا بے جان نہیں ہوتا - آپ سے آپ اُسے زندگی مل جاتی ہے اور اس کا وجود اُسے درانتی تھما دیتا ہے اور اس کا فصل کی ایک چوتھائی پر حق ہوتا ہے -

ہوری نے کہا اور پھر آہستہ آہستہ اپنے کھیت کی طرف بڑھا - اس کے پوتے اور پوتیوں نے اُسے ایک بانس سے باندھنا شروع کیا اور باقی سب لوگ یہ تماشا دیکھتے رہے - بجوکا نے اپنے سر پر رکھا شکاری ٹوپ اُتار کر سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنا سر جھکا دیا۔"

اب اس افسانے کی دوسری سطح یعنی زبان کی علامت پر غور کیجئے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جو الفاظ استعمال کئے گئے وہ تو بالکل سامنے کے ہیں، لیکن معنویت بالکل الگ ہے - افسانے کی طلسمی فضا' واقعے کی سنسنی خیزی کی وجہ سے نہیں بلکہ پرانے لفظوں میں نئی روح پھونکنے کے باعث ہے - یہ وہ تیور ہے جسے سمجھے بغیر کوئی علامتی افسانہ لکھا ہی نہیں جا سکتا - کوئی بھی محسوس کر سکتا ہے کہ ایک عام سا لفظ "بجوکا" علامتی اظہار میں کیا سے کیا ہو گیا ہے، اور ایک زندہ کردار کے طور پر اُبھر گیا ہے' جس کے پیچھے تاریخ، روایات اور فلسفے کے تانے بانے موجود ہیں -

یوں تو مزید کئی افسانوں کے علامتی پہلوؤں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے، لیکن میں نے انہی افسانوں کا انتخاب کیا ہے جن میں بیانیہ زیادہ ٹوٹتا نہیں ہے - ایسے ہی افسانوں میں سلام بن رزاق کا افسانہ "کالے ناگ کے پُجاری" بھی ہے - اس میں ایک طلسماتی فضا میں ان استحصال پسند قوتوں کی کہانی پیش کی گئی ہے، جو ہزاروں غریب انسانوں کو اپنے جبر و استبداد کا شکار بنا کر سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر سسکنے کے لیے چھوڑ دیتی ہیں - ایسی قوتیں ہر دور میں موجود رہی ہیں - اور آج بھی ہیں - یہ دوسری بات ہے کہ ان کی شکلیں مختلف رہی ہیں - اور ان کے کارندے بھی مختلف صورتوں میں ہمارے سامنے آتے رہے ہیں - وقتاً فوقتاً ان قوتوں کے خاتمے سے متعلق بیانات بھی سامنے آتے رہتے ہیں - مگر حقیقت وہی ہے جو اس افسانے کے قصہ گو بُوڑھے نے افسانے کی آخری سطروں میں بیان کی ہے:-

--- "تمہارا شبہ درست ہے - میں نے محض ڈبے میں بیٹھے لوگوں کا خوف دُور کرنے کی غرض سے جھوٹ بولا تھا ورنہ حقیقتاً کالے ناگ کے پُجاری آج بھی زندہ ہیں اور اُن کا خونی کاروبار بھی اسی طرح جاری ہے۔"

ظاہر ہے کہ میں نے معنی کی ایک سطح اپنے طور پر قائم کی ہے جو کالے ناگ کے آفاقی تصور سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہے - لیکن معنی کی اور بھی سطحیں قائم کی جا سکتی ہیں کیوں کہ افسانے میں گرچہ علامت کا پردہ کہیں کہیں اُٹھ بھی جاتا ہے مگر مجموعی طور پر علامتی رنگ معنی کی کئی سطحیں پیدا کرنے میں کامیاب ہے -

علامت کا جو تعلق نئے اردو افسانے سے ہے، اس کا جائزہ میں نے صرف چار افسانوں کے حوالے سے لیا ہے - ظاہر ہے کہ یہ موضوع خاصا تفصیل طلب ہے - اس لیے اس مختصر سے مطالعے کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ دوسرے افسانے جن کا یہاں ذکر نہیں ہے وہ قابلِ ذکر نہیں - میرا مدعا بس اتنا تھا کہ علامت کی کارکردگی کی توضیح کی جائے اور اس توضیح کے لیے میں نے متعلقہ افسانے تجزیے کے لیے منتخب کئے - یہ بھی ممکن تھا کہ میں ان افسانوں کے علاوہ کچھ دوسرے افسانے سامنے رکھتا - اور انہیں نتائج تک پہنچتا جو اس مقالے میں برآمد کئے گئے ہیں - کیوں کہ جیسا کہ میں نے ابتدا ہی میں اشارہ کیا ہے، موجودہ دور کے بیشتر تخلیقی نثر نگار انہیں فنی حربوں کے استعمال کی طرف مائل ہیں جو شاعروں کے ساتھ مخصوص رہے ہیں - افسانہ نگاروں کی فہرست سازی سے میں نے دانستہ احتراز کیا ہے - ویسے کسے معلوم نہیں کہ بلراج مین را، رتن سنگھ، جوگندر پال، احمد ہمیش، رشید امجد، غیاث احمد گدی، اقبال مجید، کلام حیدری، احمد یوسف، کنور سین، ظفر اوگانوی، انیس رفیع، شوکت حیات، عبدالصمد، م۔ق۔خان اور دوسرے کتنے ہی افسانہ نگار علامت کو اپنے طرزِ اظہار کا وسیلہ بنائے ہوئے ہیں - ■■

جیراملاس فلک

# میر کی عروض شناسی

عروض میں ارکان کی تشکیل سبب خفیف۔ وتد مفروق و مجموع اور فاصلہ صغریٰ کی ترکیب و ترتیب سے ظہور پذیر ہوئی ہے۔ ایسے ارکان وضع کرنے سے احتراز کیا گیا ہے۔ جن میں چار حرکات پے در پے واقع ہوتی ہیں۔ دو مفروقی ارکان مفعول اور فاع لن کو بھی ارکان کی تشکیل میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ جتنے ارکان ممکن تھے وہ سب بنالئے گئے۔ انہیں ارکان کی ترکیب و تکرار سے انیس سالم بحریں ترتیب دی گئی ہیں اور مزاحف ارکان سے مزاحف بحریں مرتب کی گئی ہیں۔ مزاحف ارکان زحافات کے گورکھ دھندے میں پڑے بغیر بھی وضع کئے جا سکتے تھے۔ مثلاً:

دو حرفی ــــ فع

سہ حرفی ــــ فاع۔ فعلُ۔ فَعَل

چار حرفی ــــ فَعِلُن۔ فعْلن۔ فعول۔ فعول یا مفاع

پانچ حرفی ــــ فَعِلان۔ فعْلان۔ فَعِلاتُ۔ مفعول

چھ حرفی ــــ مفتعلن۔ مفاعلن۔ مفاعیل۔ فاعلات (فاع لات)

سالم ارکان ــــ مفاعی لن۔ مُس تف علن۔ فاعلاتن (فاع لاتن)۔ مفعولاتُ (مُس تفع لن)

مُتَفَاعِلُن۔ مَفَاعِلَتُن۔ فعولن۔ فاعلن

اس طرح کی ارکان سازی سے عروض کی کافی حد تک تسہیل ہو جاتی اور زحافات کی تخصیص بے معنی ہو جاتی ہے زحافات کی تخصیص دو قسم کی ہے۔ (۱) رکن کے کس حصے پر واقع ہوگا (۲) مزاحف رکن کا مقام استعمال کیا ہوگا۔ یعنی صدر و ابتدا۔ حشوین یا عروض و ضرب لیکن اس تخصیص کی کوئی وجہ کہیں بیان نہیں کی گئی۔

زحافات میں دو زحاف ایسے ہیں جو عروض کے مسلمہ اصول متحرک کے مقابل متحرک اور ساکن کے مقابل ساکن کی ترتیب کو بدل دیتے ہیں۔ (۱) تسکین اوسط (۲) معاقبہ۔ اوّل الذکر کے تحت مُفتَعِلُن اور مفعولن یا فَعِلاتُن اور مفعولن کا اجتماع جائز ہے۔ فَعِلُن اور فعْلن ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو سکتے ہیں۔ فعلُ فعولن کو فعْلن فعْلن میں بدلا جا سکتا ہے۔ مفعول مفاعیل کو مفعولن مفعول اور مفاعیل مفاعیل کو مفاعیلن مفعول میں بدل سکتے ہیں۔

معاقبہ کے ذریعہ مفتعلن اور مفاعلن کا اجتماع جائز ہے۔ مفاعیل اور مفاعلن کا اجتماع بھی جائز ہے، لیکن مفتعلن مس تف علن سے مفاعیل مفاعی لن سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کا اجتماع نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح مفتعلن اور فعلاتن کا بھی اجتماع نہیں کیا جاتا کیوں کہ ایک مس تف علن ہے اور دوسرا فاعلاتن سے حاصل ہوتا ہے حالانکہ دونوں تسکین اوسط سے مفعولن بن جاتے ہیں جہاں معاقبہ اور تسکین اوسط دونوں کا عمل ہوتا ہے۔ وہاں مفتعلن۔ مفاعلن اور مفعولن تینوں کا اجتماع جائز ہے۔ رباعی میں مفعول اور مفاعلن کا اجتماع جائز ہے۔

| | |
|---|---|
| مفعول مفاعیل مفاعیل فَعَل | مفعول مفاعلن مفاعیل فَعَل |
| مفعولن مفعول مفاعیل فَعَل | مفعولن مفاعلن مفاعیل فَعَل |

یہ مسلمہ امر ہے کہ ان اجتماعات سے وزن میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

تسکین اوسط سالم ارکان اور مزاحف ارکان پر برابر استعمال ہوتا ہے۔ مزاحف ارکان کی مثالیں اوپر درج ہیں متفاعلن کو مس تف علن اور مفاعلتن کو مفاعی لن میں بدلا جا سکتا ہے اس کو اضمار اور عصب بھی کہتے ہیں۔

● بی۔ ۲۴۳، سارتھ موتی باغ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۱

لیا گیا ہے۔ اس کو مزاحف ارکان پر لاگو نہیں کیا گیا۔ فعلن پر اس
حاف کے عمل سے فَعل اور فعل حاصل ہوتے ہیں۔ ان کا اجتماع جائز ہونا
چاہیے۔ مفعولن اس زحاف کے تحت فعولن اور فاعلن بن جاتے ہیں۔
(فاع لن)
ان کے اجتماع سے وزن میں فرق نہیں پڑ سکتا۔ واضح رہے کہ خبن اور طے
عام زحافات ہیں۔ مس تف علن سے ایک مزاحف وزن :۔

مفعولن مفعولن مفعولن مفعولن
مطوی مسکن مطوی مسکن مطوی مسکن مطوی مسکن

(مفعولن)

اس پر طے کا دوبارہ عمل ہونے سے وزن:

فاعلن (فاع لن) فاعلن (فاع لن) فاعلن (فاع لن) فاعلن (فاع لن)
مطوی مسکن مطوی مطوی مسکن مطوی مطوی مسکن مطوی مطوی مسکن مطوی

(مفعولن)

اس پر خبن کا عمل ہونے سے حاصل شدہ وزن :۔

فعولن فعولن فعولن فعولن
مطوی مسکن مخبون مطوی مسکن مخبون مطوی مسکن مخبون مطوی مسکن مخبون

مندرجہ بالا دونوں اوزان فاعلن چار بار اور فعولن چار بار کا اجتماع جائز ہونا چاہیے کیوں کہ از روئے عروض خبن اور طے کا اجتماع جائز ہے۔
جیسے : مفتعلن۔ مفاعلن اور مفاعیل اور مفاعلن۔

زحاف عَرَج کے عمل سے رکن کے آخر سے وتد مجموع کے متحرک دوم کو ساکن کیا جا سکتا ہے۔ اس پر دو پابندیاں ہیں:۔ (۱) رکن کے آخر میں واقع وتد مجموع پر وارد ہوگا (۲) مزاحف رکن عروض و ضرب میں استعمال ہوگا۔ یہ پابندیاں اس لیے لگائی گئی ہیں کیوں کہ وتد مجموع کا متحرک دوم ساکن کرنے سے جو مزاحف اکائی حاصل ہوتی ہے۔ وہ موقوف الآخر بن جاتی ہے۔ اور رکن کے شروع یا وسط میں نیز صدر و ابتدا یا حشوین میں واقع ہونے سے متحرک ہو جاتی ہے۔ اس گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے ایک اور وزن کا مطالعہ کیا جائے۔
وزن یہ ہے :۔

۔ مفعولاتُ کے مزاحف ارکان پر یہ وزن مشتمل ہے

مفعول فاع لاتُ مفاعیلُ فاع لُن

مرفوع مطوی مخبون مکشوف مطوی

یاد رہے کہ مطوی اور مخبون کا اجتماع جائز ہے۔ اس طرح فاع لاتُ اور مفاعیلُ کا اجتماع جائز ہوگا۔ مفعولاتُ سے مکشوف مخبون فعولن

مکشوف مطوی مکشوف مخبون

اور خبن عام زحافات ہیں۔ کشف کا زحاف عروض و ضرب سے مخصوص ہے۔ لہٰذا ان کے اجتماع میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ یہ وزن بحر مضارع کے سالم ارکان مفاعی لن۔ فاع لاتن۔ مفاعی لن۔ فاع لاتن سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ وزن یہ ہے :۔

مفعول فاعِ لاتُ مفاعیل فاع لُن
اخرب مکفوف مکفوف محذوف

لیکن اس میں فاع لات اور مفاعیل نیز فاع لن اور فعولن کے اجتماع کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ یہ مفاعی لن اور فاع لاتن سے الگ الگ حاصل ہوں گے۔ ایک رکن سے حاصل نہیں ہوں گے۔ جب کہ اوّل الذکر وزن کے سارے ارکانِ مزاحف صرف مفعولاتُ سے حاصل ہو جاتے ہیں۔ مولوی عبدالباری آسی کی مرتب شدہ کلیاتِ میر کے صفحہ ۱۱۱ پر یہ غزل درج ہے۔

## غزل

۱۔ تجھ عشق میں تو مرنے کو تیار بہت ہیں
مفعول فاع لات مفاعیل فعولن

یہ جرم ہے تو ایسے گنہگار بہت ہیں
مفعول فاع لات مفاعیل فعولن

۲۔ اک زخم کو میں ریزۂ الماس سے چیرا
مفعول فاعِلات مفاعیل فعولن

دل پر ابھی جراحتِ لوکار بہت ہیں
مفعول فاع لات مفاعیل فعولن

۳۔ کچھ انکھڑیاں ہی اس کی نہیں اک بلا کہ بس
مفعول فاع لات مفاعیل فاع لن

دل زینہار دیکھ خبردار بہت ہیں
مفعول فاع لات مفاعیل فعولن

۴۔ بیگانہ خو رقیب سے وسواس کچھ نہ کر
مفعول فاع لات مفاعیل فاع لن

فرماوے تنک زباں سے تو پھر یار بہت ہیں
مفعول فاع لات مفاعیل فعولن

۵۔ کوئی تو زمزمہ کرے میرا سا دلِ خراش
مفعول فاع لات مفاعیل فاع لات

یوں تو قفس میں اور گرفتار بہت ہیں
مفعول فاع لات مفاعیل فعولن

مطلع اس وزن پر بھی تقطیع ہو سکتا ہے:

تجھ عشق میں تو مرنے کو تیار بہت ہیں
مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

یہ جرم ہے تو ایسے گنہگار بہت ہیں
مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

دوسرے اور تیسرے شعروں کے پہلے مصرعوں کو بھی اس وزن پر تقطیع کیا جاسکتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میرؔ کی غزل کو کس وزن کے تحت لایا جائے۔ مفعولات کے مزاحف ارکان سے ترتیب شدہ وزن کسی بحر کے تحت درج نہیں ہے، لیکن از روئے عروض اس کی تشکیل بالکل ٹھیک ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ غزل کو بحرِ ہزج کے وزن مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن پر سمجھا جائے اور اس میں زحاف خَرَج کا عمل مانا جائے۔ اس طرح مفاعیل کو زحاف خَرَج سے فاع لات اور فعولن کو فاع لن میں بدلا جاسکتا ہے اور ان دونوں کا اجتماع جائز ہوگا، لیکن اس طرح زحاف خَرَج شروع کے وتدِ مجموع پر وارد ہوگا نہ کہ آخر کے وتد پر۔ چونکہ زحافات کی تخصیص کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی۔ اس لیے قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اور نہ اس کے جواز پر بات چیت ہو سکتی ہے۔ قیاس یہ ہے کہ ایک جیسے مزاحف اوزان کی الجھن سے بچنے کے لیے ایسا کیا گیا۔ حالانکہ اس کا آہنگ کے کسی ضابطے سے کوئی تعلق نہیں، جس طرح کہ ارکان اور بحروں کی تشکیل میں بھی آہنگ کا کوئی فارمولہ کار فرما نظر نہیں آتا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زحاف خَرَج پر لگائی گئی پابندی بھی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ موقوف الآخر مزاحف ارکان کو عروض و ضرب سے مخصوص کر دینا تاکہ موقوف درمیان میں آنے سے متحرک نہ ہو جائے بالکل ناجائز اور نامناسب ہے۔ کیوں کہ سیکڑوں الفاظ مثلاً راز۔ ساز۔ ناز۔ جوش۔ ہوش۔ سازگار۔ نام دار، کام، نام۔ گرد۔ غبار۔ بہار۔ سوال۔ جواب۔ نیاز۔ کلام۔ پیام۔ شور۔ جور۔ غیر۔ خیر۔ نیک۔ خراب۔ جان۔ جہان وغیرہ کسی لفظ پر یہ پابندی نہیں لگائی جاسکتی کہ وہ عروض و ضرب ہی میں استعمال ہوگا اور درمیان میں نہیں آئے گا کیوں کہ یہ موقوف الآخر الفاظ ہیں اور حرفِ موقوف حرفِ متحرک میں بدل جائے گا۔ اس طرح موقوف الآخر مزاحف ارکان پر بھی یہ پابندی ٹھیک نہیں ہے۔ اگر دیگر زحافات کے تحت مفاعیل اور فاع لات یا فعولن اور فاع لن کا اجتماع جائز ہے تو زحاف خَرَج کے تحت ایسا کیوں نہیں کیا جاسکتا۔ صرف ایسی جگہ اس کا وارد کرنا ٹھیک نہیں، جس جگہ اس کے وارد ہونے سے چار یا زیادہ حرکات لگاتار واقع ہوں۔ کیوں کہ ارکان کی تشکیل میں اس کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اور ثقالت کے پیشِ نظر ضروری ہے۔ لیکن باقی صورتوں سے محروم رکھنا ضروری نہیں۔ اس کے ساتھ ہی صفحہ ۲۰۸ پر ایک غزل کا مطلع دیکھیے: ص

دل دوریِ چمن میں جو ہم شام کریں گے
مفعول فاع لات مفاعیل فعولن

تا صبح دو صد نالہ سرانجام کریں گے
مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

غزل کے باقی اشعار مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن کے وزن پر ہیں مصرع اول اس طرح لکھ سکتے تھے: ع: دل دوریِ گلشن میں جو ہم شام کریں گے۔ اس طرح یہ مصرع مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن پر تقطیع ہو جاتا، لیکن میرؔ کا گلشن کی جگہ چمن لکھنا ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے ایسا دانستہ طور پر کیا ورنہ میرؔ کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ اس غزل میں تو بلاشبہ زحاف خَرَج استعمال کیا گیا ہے کیوں کہ پابندیوں سے قطع نظر اسی زحاف سے مفاعیل کو فاع لات میں بدلا جاسکتا ہے۔

میرؔ کے کچھ ایسے اشعار قابلِ توجہ ہیں، جو دو طرح تقطیع ہوتے ہیں۔ ایک تقطیع اصل رکن سے ہوتی ہے۔ دوسری اس رکن سے جو زحاف خَرَج کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے

صفحہ ۲۱۱ ص

کب بندگی میری سی بندہ کرے گا کوئی
مفعول مفاعی لن مفعول مفاعی لن
مفعول فاع لاتن

جانے ہے خدا اس کو میں تجھ کو خدا جانا
مفعول مفاعی لن مفعول مفاعی لن

ڈھب دیکھنے کا ایدھر ایسا ہی تمہارا تھا
مفعول مفاعی لن مفعول مفاعی لن
مفعول فاع لاتن

جاتے تو ہو پر ہم سے ٹک آنکھ ملا جانا
مفعول مفاعی لن مفعول مفاعی لن

صفحہ ۲۶۲

کیا جانے کبھی بوسِ لبِ یار کی لذت
مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

جب تک جئیں گے ہم کو رہے گا وہ مزا یاد
مفعول مفاعیل مفاعیل فعولان
مفعول فاع لات

صفحہ ۲۸۷

مطلق نہیں گنجائش اب حوصلے میں اپنے
مفعول مفاعی لن مفعول مفاعی لن
مفعول فاع لاتن

آزار کوئی کھینچے یوں کب تئیں بس ظالم
مفعول مفاعی لن مفعول مفاعی لن
مفعول فاع لاتن

صفحہ ۶۷۶

سہرے کہاں تک پڑیں آنسوؤں کے چہرے پر

مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن

فاع لات

گریہ گلے کا ہو بار دیکھیے کب تک رہے

مفتعلن فاع لات مفتعلن فاعلن

اس سرے سے اُس سرے داغ ہی ہیں صدر میں

مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن

فاع لات فاع لات

ان بھی گلوں کی دیکھئے بہار کب تک رہے

مفتعلن فاع لات مفتعلن فاعلن

صفحہ ۴۱۶

ہشیار تھے سب دام میں آئے نہ ہم آوانہ

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولان

تھی رفتگی سی مجھ کو گرفتار ہوا میں

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

مفعول فاع لات

کیا چیتنے کا فائدہ جو شیب میں چلتا

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

مفعول فاع لات

سونے کا سماں آیا تو بیدار ہوا میں

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

صفحہ ۴۳۵

بے پردہ نہ ہوتا تھا اسرارِ محبت کو

مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن

عاشق کشی ہے حیب سے ہے عشق کی رُسوائی

مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن

مفعول فاع لاتن

صفحہ ۴۷۱

یا گفتگو کا میری نہ کرتے تھے کبھو ذکر

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولات

مفعول فاع لات

یا یہ سخن اب آوسنے ہے تکرار میں صاحب

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

رکھتی ہے تکھا ساتھ مٹا دینے کا میرا

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

مفعول فاع لات

جوہر نہیں ہے آپ کی تلوار میں صاحب

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

مفعول فاع لات

یہ عرض مری یاد رہے بندگی میں میر

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولات

مفاعیل فاع لان

جی بچتے نہیں عشق کے اظہار میں صاحب

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

صفحہ ۵۷۷

تھے نو خطوں کی خاک سے اجزا جو برابر

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

مفعول فاع لات

ہو سبزہ نکلتے ہیں تہِ خاک سے اب تک

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

تاحد نظر چھا رہے ہیں لالۂ صد برگ

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولان

فاع لات

جنگل بھرے ہیں سب گلِ تر پاک سے اب تک

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

فاع لات

صفحہ ۲۶۹

ہم بھی اب ترکِ وفا ہی کریں گے کیا کریے

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

مفاعلن

جنس یہ بکتی نہیں آپ کی سرکار کے بیچ

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلان

صفحہ ۲۷۳

ہم نہ کہتے تھے نہ مل منبچوں سے اے زاہد

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

مفاعلن

ابھی تسبیح دھری تھی تری دستار کے پاس

فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلان

صفحہ ۲۷۹

حسب قسمت سبھوں نے کھائے ترے تیغ کے زخم

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلان

مفاعلن

ناکس اک نکلے ہمیں خوں کے سزاواروں میں

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

صفحہ ۳۱۶

صحبت آخر ہے ہماری نہ کرو بسیار افسوس

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلان

متصل ہو سکے تو ہم سے ملاقات کرو

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

فاعلن

دیدنی ہے یہ ہوا شیخ جی سے کوئی کہے

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

مفاعلن

کہ چلو میکدے تک تم تو کرامات کرو

فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

صفحہ ۴۱۶

حسن ایک (اک) چیز ہے ہو دین کہ تو ہو ناصح

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

ایسی شے سے کوئی بھی ہاتھ اٹھاتا ہے میاں

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

مفاعلن

صفحہ ۶۳۴

ہو بخود تو کسی کو ڈھونڈ نکالے کوئی

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

مفاعلن

وہی خود گم ہوا جو اس کا طلب گار ہوا

فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

مفاعلن

صفحہ ۳۷۵

کیوں کر گلی سے اس کی میں اٹھ کے چلا جاتا ہاں خاک میں ملنا تھا لوہو میں نہاتا تھا

مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن

مفعول فاع لاتن

کب اور غزل کہتا میں اس زمیں میں لیکن

مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن

مفعول فاع لاتن

پردے میں مجھے اپنا احوال سنانا تھا

مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن

صفحہ ۳۷۶

کہتے نہ تھے ہم واں سے پھر آ چکے جیتے تم

مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن

میر اس گلی سے تم کو زنہار نہ جانا تھا

مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن

مفعول فاع لاتن

صفحہ ۳۷۸

لڑکے جہاں آباد کے یک شہر کرتے نا نہ

مفعول مفاعیل مفاعیل فاعلان

آجاتے ہیں بغل میں اشارہ جہاں کیا

مفعول فاع لات مفاعیل فاعلن

مندرجہ بالا شعروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مفاعیلن اور فاع مفاعیل اور فاع لات ۔ نیز فعلاتن اور مفاعلن کا اجتماع زحاف خرج کے تحت کیا گیا ہے اور پابندیوں کو نظر انداز کیا گیا ہے ۔ ان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ خرج شدہ ارکان کے استعمال سے حروف علت کا سقوط کم ہو جاتا ہے اور روانی بڑھ جاتی ہے ۔

صفحہ ۴ پر میر کی ایک غزل ہے، جس کا مطلع ہے ؎

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

فعلن فاع فعولن فعلن فاع فعولن فاع فعل

دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

فعلن فعلن فاع فعولن فعلن فاع فعول فعل

عام طور پر اس غزل اور اس قسم کی دوسری غزلوں کی تقطیع بحر متقارب سے کی جاتی ہے ۔ جس کے ارکان یہ ہیں:

فعل فعول فعول فعولن — فعل فعول فعول فعل

پہلا نصف — دوسرا نصف

مفعولات کے مزاحف ارکان سے اس کا یہ وزن مقرر کیا جا سکتا ہے

فاع فعول فعول فعولن — فاع فعول فعول فعل

پہلا نصف — دوسرا نصف

ان دونوں اوزان میں کوئی فرق نہیں اور ان کی تسکین اوسط کی رو سے

حسبِ ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ فعِلُ فعول فعول فعولن (فاعِ) ۲۔ فعلن فعلُ فعولن فعلن (فاعِ)

۳۔ فعلن فعلُ فعول فعولن (فاعِ) ۴۔ فعلن فعلن فعلُ فعولن (فاعِ)

۵۔ فعلن فعلن فعلن فعلن ۶۔ فعلُ فعول فعولن فعلن (فاعِ)

۷۔ فعلُ فعولن فعلن فعلن (فاعِ) ۸۔ فعلُ فعولن فعلُ فعولن (فاعِ) (فاعِ)

نمبر ۱ کو چھوڑ کر باقی تسکین اوسط کی صورتیں ہیں۔

دوسرے نصف کی صورتیں:

۱۔ فعلُ فعول فعول فَعَل (فاعِ) ۲۔ فعلن فعلُ فعول فَعَل (فاعِ)

۳۔ فعلن فعلن فعلُ فعل (فاعِ) ۴۔ فعلن فعلن فعلن فع

۵۔ فعلُ فعولن فعلُ فَعَل (فاعِ) (فاعِ) ۶۔ فعلُ فعولن فعلن فع (فاعِ)

۷۔ فعلُ فعول فعولن فع (فاعِ) ۸۔ فعلن فعلُ فعولن فع (فاعِ)

نمبر ۱ کو چھوڑ کر باقی تسکین اوسط کی صورتیں ہیں:

مصرعِ اوّل کی تقطیع پہلے نصف کے وزن نمبر ۲ اور دوسرے نصف کے نمبر ۵ کے مطابق ہے۔

مصرعِ دوم کی تقطیع پہلے نصف کے وزن نمبر ۴ اور دوسرے نصف کے وزن نمبر ۲ کے مطابق ہے۔

اسی غزل کے کچھ اور شعر ملاحظہ ہوں:۔

سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں

نمبر ۴ پہلا نصف — نمبر ۷ دوسرا نصف

بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

نمبر ۵ پہلا نصف — نمبر ۲ دوسرا نصف

کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام

نمبر ۵ پہلا نصف — نمبر ۶ دوسرا نصف

کوچہ کے اس باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

نمبر ۵ پہلا نصف — نمبر ۱ دوسرا نصف

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے

نمبر ۱ پہلا نصف — نمبر ۶ دوسرا نصف

رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

نمبر ۸ پہلا نصف — نمبر ۳ دوسرا نصف

صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیف ہوا لے آئی تھی

نمبر ۸ پہلا نصف — نمبر ۶ دوسرا نصف

رُخ سے گُل کو مول لیا قامت سے سرو غلام کیا

نمبر ۴ پہلا نصف — نمبر ۲ دوسرا نصف

اگر کلیاتِ میر میں صرف یہی غزل ہوتی تو ان اوزان سے کام چل جاتا، لیکن میر نے کچھ اور غزلیں لکھ کر مزید غور کرنے پر مجبور کر دیا۔ صفحہ ۳۴۷ پر یہ شعر دیکھئے۔ سہ

آگے خط سے دماغ تمہارا عرش پہ تھا سو دے ہی تم

فعلن فاعِ فعول فعولن فاعِ فعولن فعلن فع

نمبر ۳ پہلا نصف — نمبر ۶ دوسرا نصف

پاؤں زمیں پر رکھتے تھے تو خدا یہ منت رکھتے تھے

فاعِ فعولن فعلن فعلن فعول فعلن فعلن فع

نمبر ۷ کا پہلا نصف — فعول فاعِ فعول فَعَل

اس شعر کے تین حصے تو مندرجہ بالا اوزان پر تقطیع ہو جاتے ہیں، لیکن چوتھا حصہ ان کے تحت نہیں آتا۔ اس کا وزن فعول فاعِ فعول فَعَل قرار پاتا ہے اور تسکین اوسط سے اس کی صورت فعول فعلن فعلن فع بن جاتی ہے۔

صفحہ ۵۱۱

صبر کہاں جو تم کو کہیئے لگ کے گلے سے سو جاؤ

بولو نہ بولو بیٹھو نہ بیٹھو کھڑے کھڑے ٹک ہو جاؤ

فعول فعلن فعلن فع

اس شعر میں بھی فعول فاعِ فعول فَعَل کی تسکین اوسط کے ذریعے بننے والی صورت فعول فعلن فعلن فع سے تقطیع ہو سکتی ہے۔

صفحہ ۴۹۴

چُپکے سے کچھ آجاتے ہو آنکھیں بھر بھر لاتے ہو

میری گزرتی کیا ہے دل پر کڑھا کرو ہو اکثر تم

فعول فعلن فعلن فع

اس میں بھی خط کشیدہ حصہ فعول فعلن فعلن فع سے تقطیع ہوتا ہے جو فعول فاعِ فعول فَعَل کی بذریعہ تسکین اوسط ایک صورت ہے۔ صفحہ ۴۶۱

جیسے سلام کسی کو کرنا سجدہ ہی ہو جاتا ہے
فعول فاع فعولن فعْلن

سرجا دے گو اس میں میرا سر نہ فرو میں لاؤں گا
اس میں بھی خط کشیدہ حصّہ فعول فاعِ فعولن فعلن پر تقطیع ہوتا ہے جو تسکینِ اوسط کے ذریعے فعول فاعِ فعول فعولن کی صورت بنتی ہے۔
صفحہ ۵۹۰
بڑے بڑے ستے گھر جن کے یاں آثار ان کے یہ ہیں اب
فعول فعْلن فعْلن فعْلن

میرؔ شکستہ دروازے ہیں گری پڑی نہ دیواریں ہیں
فعول فعْلن فعْلن فع

خط کشیدہ حصّے فعول فاعِ فعول فعولن اور فعول فاعِ فعول فَعَل کی ان صورتوں پر تقطیع ہوتے ہیں جو تسکین اوسط سے تشکیل پذیر ہوتی ہیں۔
مندرجہ بالا ساری غزلوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس کا وزن مفعولات کے مزاحف ارکان سے ابھر کر اس طرح بن جاتا ہے۔

| فعول | فاعِ | فعول | فعولن |
| --- | --- | --- | --- |
| مرفوع مجنون | مطوی اصلم | مرفوع مجنون | مکشوف دمجنون |
| فعول | فاعِ | فعول | فَعَل |
| مرفوع مجنون | مطوی اصلم | مرفوع مجنون | اصلم دمجنون |

زحاف عَرَج سے اس کی صورت یہ ہو جائے گی:
فاعِ فعول فعول فعولن فاعِ فعول فعول فَعَل
اس طرح اصل وزن فعول فاع فعول فعولن فعول فاعِ فعول فَعَل کے ساتھ دو اور صورتوں کا اضافہ ہو جائے گا:
۱۔ فعول فعلن فاعِ فعولن (۲) فعول فعلن فعلن فعلن
پہلا نصف
اور اسی طرح دو صورتیں دوسرے نصف کی:
۱۔ فعول فعلن فاعِ فَعَل (۲) فعول فعلن فعلن فع
دوسرا نصف
ان کو ملا کر کُل گیارہ صورتیں ہو جائیں گی جن میں پہلے سے مذکورہ آٹھ صورتیں بھی شامل ہیں:
صفحہ ۴۲۷/۴۳۶
قسمت میں جو کچھ کہ بدا ہو دیتے ہیں وہی انسان کو
غم و غصہ ہی ہم کو ملا ہے خوبی اپنی قسمت کی
فعِلن فعلن فاع فعولن

خط کشیدہ حصّے میں فعول کی جگہ فَعِلُن (عین متحرک) استعمال کیا ہے۔ یہ زحاف عَرَج کا برعکس استعمال ہے۔ چونکہ فَعِلُن (عین متحرک) زحاف عَرَج کے عمل سے فعول میں بدل جاتا ہے اور اس سے وزن میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لیے میرؔ نے فعول کو فَعِلُن (عین متحرک) سے بدل دیا ہے۔
۲۔ ہاتھ گلے میں اُن نے نہ ڈالا میں یہ گلا جا کا ٹونکا
غم و غصہ سے دیکھے ہوں گا آپ ہی (آپھی) گلے کا ہار اپنا
فعلن فعلن فاع فعولن
مذکورہ بالا شعر کی طرح اس میں بھی فعول کو فَعِلُن (عین متحرک) میں بدل دیا گیا ہے۔ صفحہ ۳۵۴
ان بن ہی کے سبب ہیں اس لالچی سے سارے
مفعول فاع لاتن مفعول فاع لاتن

یاں ہے فقیری محض وہاں چاہیے ہے اسباب
مفعول فاع لات مفاعیل فاعلیّان
فاع لات مفاعیل کو تسکین اوسط سے فاع لاتن مفعول میں بدلا جا سکتا ہے۔ یہاں برعکس فاع لاتن مفعول کو فاع لات مفاعیل میں بدل دیا گیا ہے۔
صفحہ ۳۹۸
حرف و سخن کرے ہے کس لُطف سے برابر
مفعول فاع لاتن مفعول فاع لاتن

سلکِ گہر بھی صدقے کئے اس کی گفتگو پر
مفعول فاع لاتن فَعِلاتُ فاع لاتن
فَعِلاتُ (عین متحرک) کو تسکین اوسط سے مفعول میں بدلا جا سکتا ہے۔ یہاں اس کے برعکس مفعول کو فَعِلات (عین متحرک) سے بدل دیا گیا ہے۔
ان شعروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرؔ زحاف عَرَج اور تسکین اوسط کو نہ صرف عام زحافات کی طرح استعمال کرتے ہیں بلکہ ان کو پلٹ کر بھی استعمال کرتے ہیں کیوں کہ اس سے وزن یا آہنگ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گو اس معکوس استعمال کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

میرؔ کے کلام۔ مفعولات سے حاصل شدہ وزن اور دلائل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زحاف عَرَج پر لگائی گئی پابندیاں بے معنی ہیں اور اس کو عام زحاف کی طرح استعمال کیا جانا چاہیے۔ ہر وتد اس کا عمل ہو سکتا ہے اور مزاحف رُکن ہر مقام پر آ سکتا ہے سوائے ایسی جگہ لاگو نہیں ہونا چاہیے جہاں چار یا زیادہ حرکات لگاتار واقع ہو جائیں۔ زحاف عَرَج کے عام استعمال سے اردو اور ہندی عروض کا اتصال ہو سکتا ہے اور عروض کی تشکیل جدید کی جا سکتی ہے۔ اس طرح میرؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے عروض کو نئی راہ دکھائی ہے۔ کیونکہ بقول میرؔ ؎ مستند ہے میرا فرمایا ہوا ●●

# خطِ شاعر

ناصر زیدی

○

تجھ کو یہ وہم ہے کہ وہ تیری نظر میں ہیں
طوفانِ برق و باد، ہر اِک شجر میں ہیں

شاید کبھی ہماری ضرورت پڑے تجھے
اب تک اسی خیال سے ہم رہگزر میں ہیں

صحبت بھی اہلِ علم کی کرتی ہے سربلند
ہم بے ہنر ہیں حلقۂ اہلِ ہنر میں ہیں

جھک جائے وہ جبیں تو ہمیشہ جھکی رہے
کچھ ایسی لذتیں بھی مرے سنگِ در میں ہیں

شیشے کے گھر بھی اپنی جگہ خوشنما سہی
لیکن جو راحتیں مرے مٹی کے گھر میں ہیں

محفل تمام جن کی نظر پر ہے ملتفت
ناصرؔ! ہمیں ہے فخر اُن کی نظر میں ہیں

○

وہ مرے غم کا مداوا نہیں ہونے دیتا
ذرّۂ درد کو صحرا نہیں ہونے دیتا

ساتھ رکھتا ہوں ہمیشہ تری یادوں کی دھنک
میں کبھی خود کو اکیلا نہیں ہونے دیتا

زخم بھرتا ہے، نیا زخم لگانے کے لیے
کیا مسیحا ہے کہ اچھا نہیں ہونے دیتا

جس کے انجام سے ٹوٹے مرا پندارِ انا
میں وہ آغاز دوبارا نہیں ہونے دیتا

روک دیتا ہوں اُمڈتے ہوئے طوفاں ناصرؔ!
قطرۂ اشک کو دریا نہیں ہونے دیتا

ناصر زیدی
۲۵ مارچ ۱۹۸۵ء
دفترِ "آجکل" دہلی میں

**وامق جونپوری**

# غزل در غزل

**اشاریہ** — پروفیسر کلیم الدین احمد جب فارغ التحصیل ہو کر ولایت سے لوٹے تو انہوں نے اپنی پہلی تصنیف میں غزل کو اردو شاعری کی ایک نیم وحشی صنف قرار دیا۔ بزعم خود غزل کی حیثیت پر وہ بٹہ لگایا کہ جیسے اب وہ کہیں کی نہ رہی۔ دوسری جانب پروفیسر صاحب کے مخالفین اور غزل کے موافقین نے ان سے دل کھول کے قلمی جنگ کی اور جی بھر کے تبادلۂ طعن و تشنیع ہوا۔ اور بالآخر نا اتفاقی پر اتفاق ہو گیا۔ یہ کوئی اتفاقیہ امر بھی نہ تھا۔ نتیجہ بالکل فطری اور منطقی تھا۔ سبب اس کا یہ تھا کہ ہر دو فریق کا تصورِ نیم وحشت اس کے لغوی معانی جنگلی پن اور غیر مہذب UNCULTURED ہونے سے عبارت تھا۔ دونوں ہی نے نیم وحشی قبائل کی طرزِ زندگی، عادات و اطوار، حرکات و سکنات، نفسیات و خصوصیات، مزاج میں رنگا رنگی، شہری آلودگی URBAN POLLUTION سے پاک صاف، مجرد تہذیب اور اُن کے کوائف کو نظر انداز کرتے ہوئے غزل کو غلط روشنی میں پیش کیا۔ جس کے تناظر میں کوئی فیصلہ کن نتیجہ برآمد ہونا ممکن ہی نہ تھا۔

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

غرض کہ دونوں فریق بہم فاتح اور نیم مفتوح اپنے اپنے کو سمجھتے رہے اور کسی نے اس طرف توجہ نہ دی کہ ع : غزل کا حُسن ہی ہے اس کی نیم وحشت میں
ان خیالات کو گھما پھرا کر میں اپنے ذہن میں ترتیب دے ہی رہا تھا اور قلم کو حرکت دینے ہی والا تھا، ایک دن میرے ہم وطن شاعر اور ادیب ہوش جون پوری جو زیادہ تر غزلیں کہتے ہیں ملنے آ گئے۔ جب میں نے ان سے غزل پر ڈھائے گئے مظالم کا ذکر کیا اور اس ضمن میں اپنی تھیسس THESIS کو ان سے روشناس کرایا تو مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے وہ دو قدم آگے بڑھ گئے۔ اور غزل کو نیم وحشی نہیں بلکہ قطعی وحشی مزاج صنفِ شاعری کہنے پر انہوں نے زور دیا اور مجھ کو ترغیب دلائی کہ میں غزل کی اس بازیافت ....... REDISCOVERY پر ایک بسیط مقالہ لکھوں۔ میرا موڈ پہلے سے بن چکا تھا اس لیے میں نے جواب دیا۔ نہیں بھئی میں مقالہ پر غزل کہوں گا اور غزل کی بازیافت پر مقالہ آپ لکھیں گے۔ چنانچہ غزل در غزل پیش خدمت ہے اور ہوش کے مقالہ کا انتظار۔

مگر یاد رہے کہ اس نظریے میں غزل کو نظم پر کسی طرح کی فوقیت دینا یا دونوں میں کوئی صنفی رقابت پیدا کرنا مقصود نہیں ہے۔ میری نظر میں غزل اور نظم دونوں برابر اہمیت کی حامل اصنافِ شاعری ہیں۔ یہ تو شاعر کے ذوق یا صلاحیت یا رجحان پر مبنی ہے کہ وہ ایک ہی صنف کو اپنی تخلیقات کی ترسیل کا ذریعہ بناتا ہے یا دونوں اصناف کو روبہ کار لاتا ہے۔ — وامق

وہ دور دور ہی رہتا ہے زندگی جیسے
مگر نگاہوں سے چھنتا ہے روشنی جیسے
وہ ہم سے ٹوٹ کے ملتا ہے غیر ملکوں میں
وطن میں فاصلے رکھتا ہے اجنبی جیسے
سفید کپڑوں میں ملبوس کتنی بد روحیں
بدل کے چہرے نکلتی ہیں آدمی جیسے
ہے آبِ تیغ ہی آبِ حیات ورنہ فرات
جو خود ہو قید شہیدوں کی تشنگی جیسے
زبورِ شوق جو ملتی نہیں تو کانوں پر
غزل میں ہے وہ صحیفوں میں نغمگی جیسے

## مطلع

غزل ہے روحِ ادب بے قرار سی جیسے
بساطِ نظم، ثقافت میں ہو ڈھلی جیسے
غزل کا حُسن ہی ہے اس کی نیم وحشت میں
غزل ہے ترکش و گل پوش جنگلی جیسے
نشانہ تانے ہوئے ہر غزل کا مطلع خود
چھپا درخت پہ بیٹھا ہو سنتری جیسے
مثال، وحشی قبیلوں میں صنفِ نازک کی
مسی چٹانوں پہ آزر کی بت گری جیسے
غزال چشم ستمگر کڑی کمان سا قد
کبھی گریزاں کبھی نخلِ آہنی جیسے
شباب اس کا چھلکتی شراب کا ساغر
خطاب اس کا کسی شوخ کی ہنسی جیسے
قیام اس کا کسی رہ گزر کا سنگِ نشاں
خرام اُڑھ پہ چڑھتی ہوئی ندی جیسے
کبھی چھلاوہ کبھی شعلہ اور کبھی شبنم
کبھی وہ لڑتی ہے آپس میں چو مکھی جیسے

ہے اس کا فطری تلوّن ہی اس کی عین صفت
ہوا ہو قاعدے قانون سے بَری جیسے

وہ رقص کرتی ہے اپنے حدود میں رہ کر
ہزار راہوں پہ چلتی ہے راگنی جیسے

فریب کاری سے اس کی ٹھٹھک جبلّی ہے
بندھے شکار سے مشکوک شیرنی جیسے

"نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو"
نگاہِ بد کے لیے ہے وہ خیرگی جیسے

گوارہ کر نہیں سکتی وہ قربِ نامحرم
پلک جھپکتے ہی اُڑ جاتی ہے پری جیسے

وہ کھُل کے سامنے نظارگی میں آتی نہیں
ہو رمزیت کے جھروکوں میں وہ چھُپی جیسے

پھٹی پھٹی ہوئی آنکھیں سکوتِ استعجاب
جو مونہہ لگے تو چہکتی ہے بانسری جیسے

بدلتی رہتی ہے اسلوب اپنی وحشت کا
کبھی سراب کبھی آبِ زندگی جیسے

وہ دھوپ بن کے گزرتی ہے دشت سے تو کبھی
وہ کھیت کرتی ہے گاؤں میں چاندنی جیسے

غزل کے شعر میں تہہ داریوں کی سرگوشی
کنارِ آب بُلاتی ہو جل پَری جیسے

پتے کی بات سُناتی ہے نرم لہجے میں
اشاروں اور کنایوں میں مخبری جیسے

زباں پہ اس کی نہیں کوئی حرف مصنوعی
زبان اس کی اصالت میں ہو ڈھلی جیسے

جو خونِ دل اُسے دے دو تو چند قطروں پر
رگوں میں تیرنے لگتی ہے وہ سُوئی جیسے

وہ قابو میں نہیں آتی کہ اس کی آزادی
کہیں نہ جال میں پھنس جائے مثنوی جیسے

عجیب منطقِ اضداد کا ہے مجموعہ
ٹکی ہو موت کے ہاتھوں پہ زندگی جیسے

وہ تیرگی میں چمکتی ہے زاغِ دل کی طرح
وہ دن میں دیکھتی ہے خواب فلسفی جیسے

وہ چاند تاروں پہ اس طرح ڈالتی ہے کمند
کبھی وہ آگے ہے اور پیچھے روشنی جیسے

قدم قدم پہ مسائل قدم قدم پہ لہو
ہر اس کا نقشِ قدم بیسویں صدی جیسے

وہ اپنے حکم کے تابع بنا کے رکھتی ہے
کنیز حلقہ بگوش اس کی شاعری جیسے

سمجھ میں آئے نہ آئے دلوں کو بھاتی ہے
ہو آرٹیں کہیں چھپا ہک رہی جیسے

بدلتے رنگوں کے جامے مناسبت کے ساتھ
بدلتی رہتی ہے اقدارِ زندگی جیسے

کھُلا دماغ تغیر پذیر اس کی سرشت
گزرتے لمحۂ تاریخ کی گھڑی جیسے

وہ اونچ نیچ کو شہروں کے خوب جانتی ہے
تبھی تو دل میں ہے اس کے برابری جیسے

نئی ترنگ نئے رنگ روپ کا آہنگ
خمیر اس کی فطانت کا ساحری جیسے

کبھی جمال کبھی غسلِ آتشِ سیال
کبھی وہ لمس مجسم سپردگی جیسے

کبھی شکنتلا کے بھیس میں نکلتی ہے
کبھی ہے رائیڈر ہیگرڈ کی وہ "شی" جیسے

کبھی وہ کبک دری ہے کبھی عقاب نظر
جو سدھ گئی تو چلے ساتھ مورنی جیسے

وہ خوشبوؤں میں پلی ہے گلوں میں رہتی ہے
مزاج رکھتی ہے الھڑ سی نوری جیسے

لگاتی ہی نہیں مونہہ ایسے ولیوں کو وہ غزال
دراز دستوں کے آگے چھوئی مُوئی جیسے

جو لگ گئی کسی نااہل کے وہ ہاتھ کبھی
تو مُردہ پائی گئی کر کے خودکشی جیسے

مذاق اُڑاتی ہے زاہد کا باتوں باتوں میں
ہے دستِ رند میں بوتل شراب کی جیسے

وہ جان دیتی ہے اہلِ جنوں کے شکووں پر
بلا کی دشمنِ جاں اس کی دوستی جیسے

جوانِ ذہن کے ہاتھوں میں اک اُپی تلوار
جو سب سے رہتی ہے یکساں کھنچی کھنچی جیسے

مفکروں کے لیے رزمگاہِ امکانات
تو عاشقوں کے لیے یار کی گلی جیسے

غزل سے ملتا ہے آوارہ حوصلوں کا سُراغ
غزل ہے خانہ بدوشوں کی زندگی جیسے

غزل کہو تو یہ محسوس ہوتا ہے واثق
چھُری کو کاٹ رہی ہو کوئی چھُری جیسے

## شجاع خاور

غم تو جنگل ہے کوئی باغ لگا
دل بھی، لگ جائے گا' داغ لگا

گہری سازش ہے' کچھ سراغ لگا
دوستوں کی طرف دماغ لگا

چل دئے ہم فنا کے رستے پر
رہ گیا خواہشوں کا باغ، لگا

ہم بھی نادم ہوئے وفا پہ تری
تیرے کردار کو بھی داغ لگا

فارسی پڑھ گئے شجاع جو ہم
ہر پیالہ ہمیں ایاغ لگا

---

کہتا ہوں آسمان کو فیاض ۔۔۔ دیکھئے
اسلوب دیکھئے مرا انداز دیکھئے

چہرہ کسی کا سنئے اور آواز دیکھئے!
مفہوم پھر بتاؤں گا ۔۔۔ الفاظ دیکھئے

زورِ بیان کیوں مرے ٹوٹے پروں پہ ہے
ایمان کی تو یہ ہے کہ پرواز دیکھئے

اب یہ بھی قتل و خون کے بالکل خلاف ہیں
زندہ ہیں اپنے شہر کے جاں باز دیکھئے

یاروں نے دشمنوں سے بنالی' مگر شجاع
ہم دوستوں سے ہو گئے ناراض ۔۔۔ دیکھئے!

---

دماغ اب آپ ہی خود دیکھئے کیا مجھ بشر کا ہے
یہ سب زنجیریں پاؤں میں ہیں اور سودا سفر کا ہے

وہاں پر دل جگر کی بات بھی سنتا نہیں کوئی،
یہاں پر مسئلہ ہی اصل میں دل اور جگر کا ہے

ضرورت سخت اس پتھر کی ہے شیشوں کی بستی میں
ذرا معلوم تو ہو کیا ارادہ اپنے سر کا ہے

سبھی طوفان کی زد پر ہیں جب اور صاف ہے نقشہ
تو پھر کیا پوچھنا یا رو ہوا کا رخ کدھر کا ہے

کہاں سے ابتدا کیجے بڑی مشکل ہے درویشو!
کہانی عمر بھر کی اور جلسہ رات بھر کا ہے

---

میں صوتی قوافی کو جائز سمجھتا ہوں۔
شجاع

ایس۔ پی ہیڈکوارٹرز، پولیس ہیڈکوارٹرز، پانا جی، گوا

## ابوالحسنات حقی

آسماں کیا ہر بلندی زیرِ بستر پر اور میں
رفتہ رفتہ بجھ گئے سب طاق و منظر اور میں

بڑھ رہا ہے دائرہ کرتا ہوا سیلابِ رنگ
اس کے منظر میں نہیں ہے کائنہ سر اور میں

راستے میں اب نہیں ہیں منزلیں اور سنگِ میل
رکھ گئیں تاریکیاں سینے پہ پتھر اور میں

رقصِ بے تابی میں آنکھیں اور بازو شل ہوئے
ہر طرف ہیں خواہشوں کے اتنے پیکر اور میں

موج اپنے ساتھ اک اک نقشِ پا لیتی گئی
سامنے ہے تہہ بہ تہہ گہرا سمندر اور میں

اس کے ہوتے مجھ کو لگتا تھا کہ گھر بھی چاند سا
سوچ میں میلا ہوا سب فرش و بستر اور میں

کیا تماشہ ہے کہ سب اک دوسرے کی زد پہ ہیں
وقت کے سفاک ہاتھوں میں یہ نشتر اور میں

ہر قدم پر مسترد کرتی ہوئی کرنوں کی لکیر
چل رہی ہے میرے میرے برابر اور میں

چاندنی کی گود میں تھی دست و بازو کی کشاد
ہر طرف بکھرا پڑا تھا ایک زیور اور میں

---

● خانقاہ شریف، بیگم گنج، دادمیاں کراسنگ، کان پور

تمام رنگ وہی ہے مگر شراب تھی اور
ہماری مست روی پہلے کچھ خراب تھی اور

مجھے بہت تھا اندھیروں میں اک چراغِ وصال
کہ شب تو تھی ہی مگر ظلمتِ سحاب تھی اور

یہ آب جو مرے جل تھل کو کیا سمیٹے گی
میں جس میں ڈوب گیا تھا وہ سطحِ آب تھی اور

سفر ہے اب بھی فصیلِ جنوں کے سائے میں
سرِ وجود مگر تلخیٔ شباب تھی اور

میں ہنس رہا تھا سزا و جزا کے منظر پر
کہ میری فرد میں رعنائیِ عذاب تھی اور

میں پوچھتا تھا کہ کیا ہے جزائے حسنِ عمل
تری خموشی مری بات کا جواب تھی اور

نہ لکھ کے خوف زدہ ہوں نہ پڑھ کے شرمندہ
ترا قلم بھی الگ تھا مری کتاب بھی اور

ترے بدن سے الگ میرے تحریروں سے بھی دور
وہ روشنی میں کوئی پیکرِ بے حساب تھی اور

وہ دھیرے دھیرے مرے اس قدر قریب ہوا
کہ اس کے ہوتے مجھے خواہشِ نقاب تھی اور

چمن میں غنچۂ صد رنگ کھل رہا تھا تو کیا
کہ تو قریب تھا، خوشبو تری گلاب تھی اور

یہ کس سے محوِ تکلم تھے برگِ گل سے وہ ہونٹ
کہ خواب کو حسنات آرزوئے خواب تھی اور

## رفیق الزماں

کتنا پوشیدہ ہواؤں کا سفر رکھا گیا
آنے والے موسموں سے بے خبر رکھا گیا

آج بھی پھرتا ہوں اس کی جستجو میں ہر طرف
کون سی بستی میں آخر میرا گھر رکھا گیا

چند مبہم خواب آنکھوں میں لیے پھرتا ہوں میں
اور کیا میرے لیے زادِ سفر رکھا گیا

دوستو میں کچھ مری پہچان تو باقی رہے
اس لیے مجھ میں عجب رنگِ ہنر رکھا گیا

اس ہتھیلی پر چمکتی ریت کے ذرّے ہیں اب
جس ہتھیلی پر کبھی گنجِ گہر رکھا گیا

نوکِ نیزہ پر کبھی، طشتِ رعونت میں کبھی
ہر تماشے کے لیے میرا ہی سر رکھا گیا

میرا اپنا خوف ہی کیا کم تھا لیکن اے رفیق
میری اپنی ذات میں کس کس کا ڈر رکھا گیا

---

● معرفت بھارت ٹریڈرس، ۱۲۷/۱۱۱ سی، بریانہ روڈ، کانپور

آغا سہیل

# قیامت کا انتظار

ابوداؤد نے سرِ منبر خطبہ دینے والے کو بغور دیکھا اور پھر مجمع پر نگاہ ڈالی اور بے لقینی میں سر ہلایا۔ عبا سمیٹی اور صحنِ مسجد سے نکل آیا، اُسے سخت کوفت تھی کہ اولی الامر وہ بات نہیں کہہ رہا تھا، جو اُسے کہنا چاہیے۔ اور مجمع وہ بات نہیں سُن رہا تھا جس کی توقع میں وہ یہاں جوق در جوق کھنچ کر آیا تھا لیکن بات جس ڈھب سے کہی جا رہی تھی اس میں ایسی مرکک تھی کہ کوئی مطلقاً دَم نہیں مار سکتا تھا۔ آمنّا و صدقنا کہنے پر ہر ایک مجبور تھا۔ لیکن یہ تو وہ منافقت تھی، جسے انتہائی ہوشیاری اور کمال مکاری سے حاکم نے لفظوں کے الٹ پھیر میں چھپا دیا تھا اور مجمع کے ایک ایک فرد نے اس مکر کو سمجھ لیا تھا۔ اور جس مکر سے بات کہی گئی تھی وہ اس کی تہہ تک پہنچ گئے تھے، مگر وہ خود بھی منافق تھے انھیں اپنی جان، اپنا مال، اپنی عزّت عزیز تھی۔ اور گو وہ زبان سے اقرار کرتے تھے کہ ہمیں ایمان سب سے زیادہ عزیز ہے، لیکن دراصل ان کا ایمان وہ نہ تھا جو وہ ظاہر کرتے تھے بلکہ وہ تھا، جس کا وہ اظہار نہیں کرتے تھے اور نہ کر سکتے تھے۔ اور حاکمِ وقت کا بھی یہی حال تھا کہ جو وہ ظاہر کرتا تھا، وہ نہ تھا اور جو وہ چھپاتا تھا دراصل وہ وہی تھا۔ گویا حاکم اور محکوم دونوں ایک دوسرے کے دلوں کے بھید جانتے تھے، لیکن دونوں نے مکر سے اپنی اپنی بات پر منافقت کا پردہ ڈال رکھا تھا اور ایک دوسرے کی گھات میں لگے ہوئے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ کس کا پردہ پہلے چاک ہوتا ہے اور کون پردہ رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

ابوداؤد مردِ قلندر تھا، سچا تھا، اندر باہر سے یکساں تھا، مکر اور منافقت نہیں کر سکتا تھا، اس لیے اُٹھ کر چلا آیا، رات کے اندھیرے میں کنکروں پتھروں سے ٹھوکریں کھاتا چلا جا رہا تھا، پیچ و تاب کھاتا اور جی ہی جی میں کھولتا ہوا، مونہہ ہی مونہہ میں بڑبڑا رہا تھا:

"اے ربِّ کریم دیکھا، دیکھا تُو نے یہ تجھ سے بھی کتنے منافق ہیں۔ یہ دنیا کی فانی دولت، عزّت اور شہرت کے خواہاں ہیں۔ یہ اندر ہی اندر لات و ہُبل کے پرستار ہیں۔ یہ تیرے نام کی آڑ میں اپنی خواہشوں کو پورا کرنے والے ہیں۔ یہ بندگانِ ہوا و ہوس ہیں۔ اے ربِّ کریم! کیوں مجھے اس گروہ میں پیدا کیا؟"

معاً کچھ لوگ دوڑتے ہوئے آئے اور عقب سے اُسے جا لیا۔ سیاہ عباؤں میں لپٹے ان چاروں نے جلدی جلدی تعارف کرایا "بخدا ابوداؤد ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم ابواسد، ابوسعد، عبدالرحمٰن، منّاف ــ"

ابوداؤد بولا۔ "جاؤ جاؤ مجھے دق نہ کرو، اکیلا چھوڑ دو۔"

"قسم ہے اس رب کی، جس نے یہ اندھیری رات بنائی، اور قسم ہے اُس رب کی جو چمکتے سُورج سے رات کے اندھیرے کو ختم کر دیتا ہے کہ ہم حاکمِ اعلیٰ صرف اللہ کو سمجھتے ہیں اور اسی کی حاکمیت کو برحق جانتے ہیں اور ہم اطیعوا اللہ و اطیعو الرسول کے بعد اطیعوا اولی الامر پر اسی حالت میں یقین رکھتے ہیں کہ جب حاکم خود بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہو۔" ان میں سے ایک نے کہا اور ابوداؤد کی عبا پکڑ کر اُسے روک لیا۔ "ابوداؤد بخدا ہم تم کو اپنا رہبر مانتے ہیں۔"

ابوداؤد نے کہا۔ "ابواسد، ابوسعد، عبدالرحمٰن اور منّاف سُنو اور کان کھول کر سُنو کہ دنیا کی دولت اور ہوس نے سینوں کی فراخی ختم کر کے دلوں کو تنگ کر دیا ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے اعمال اپنی اپنی قبر میں لے کر جائے گا؛ میرا راستہ وہی ہے جو خدا اور

---

• ۲۳ ۔ ایف-سی کالج، لاہور (پاکستان)

رسول کا پسندیدہ راستہ ہے۔ میں کسی کو مجبور نہیں کرتا، نہ خدا نہیں کرتا۔"

"آؤ ہم اُس ٹیلے پر چڑھیں جہاں کھجور کے درختوں کے سیاہ سائے موجود ہیں اور زمین پر جھکتے ہوئے آسمان کے ستارے چمک رہے ہیں۔ کچھ دیر میں چاند نکل آئے گا۔ ہم بیٹھ کر باتیں کریں گے اور شب بیداری کی حالت میں کوئی حل تلاش کریں گے۔" ابواسد نے کہا۔ مگر ابوسعد نے جواب میں کہا۔ "نہیں، وہ ہمیں سازشی سمجھ کر گرفتار کریں گے۔ عبدالرحمٰن کے گھر چلو، پہاڑ کی کھو میں چھپا ہوا گھر ہے۔ محفوظ ہے۔"

مگر ابوداؤد نے زچ ہو کر کہا، "بھائیو اپنے اپنے گھروں کو جاؤ اور اپنے اپنے طور پر سوچو۔ کل رات عشا کے بعد ہم اسی جگہ ملیں گے اور پھر کسی کے گھر میں محفوظ ہو کر مباحثہ کریں گے کہ کچھ حل نکل آئے۔"

پانچوں اسی جگہ سے منتشر ہو گئے اور دوسری شب عشا کے بعد اسی جگہ یک جا ہوئے اور عبدالرحمٰن کے گھر پہاڑ کی کھو میں جمع ہو گئے اور ان میں سے ایک نے کہا۔" قسم ہے اپنے رب کی کہ جس کے قبضے میں ہماری جانیں ہیں کہ کل سے ہماری آنکھوں کی نیند حرام ہے اور ہم سمجھ رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔" اے ابوداؤد، کیا نہیں دیکھا تم نے کہ ہماری آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں اور سوچتے سوچتے ہمارے دماغ ماؤف ہو گئے ہیں۔ نانِ شعیر کا ایک ٹکڑا، کھجور کا ایک دانہ بھی ہمارے حلق سے نہیں اُترا۔"

ابوداؤد نے کہا۔" یہ تو کچھ بھی نہیں ہے بھائیو، ڈرو اُس وقت سے کہ رزق ہم سے بھاگے گا اور ہم رزق کی کھوج میں دربدر پھریں گے کیوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ رزق اُن قوموں سے چھن جاتا ہے جو ملّت کے مفادات کو ذاتی مفادات پر قربان کر دیتی ہیں؛ جو بیت المال کو اپنا جیب خرچ بنالیتی ہیں اور اے بھائیو تمہاری آنکھوں میں وہ چمک میں دیکھ رہا ہوں جو ملّت کے مفادات کے تحفظ کے لیے ذاتی مفادات قربان کر دینے کے جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔"

سب نے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر قسمیں کھائیں، عہد کیے اور رات کے اندھیرے میں بچھڑ گئے۔ دوسرے روز نمازِ عشا کے بعد وہ ایک ساتھ مسجد سے نکلے اور اُنھوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں اُس چمک کو دیکھ کر اپنے اپنے عہد دہرائے اور اپنے اپنے گھروں میں پہنچ گئے۔ اور اپنے اپنے انداز سے سوچنا شروع کیا اور سوچنے کے عمل میں شب بیداری ان سب کا معمول بن گئی۔

ایک رات ان پانچوں میں سے ایک کے گھر ایک سرکاری کارندہ آیا اور سونے کے دیناروں کے توڑے دے کر رُخصت ہو گیا اور کہا کہ خلیفہ نے کہا ہے کہ اس بات کا کسی سے ذکر نہ کیا جائے۔ دوسرے روز شام کو عشاء کے بعد وہی شخص ان دوستوں سے یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ آج اس کا مزاج ناساز ہے۔ دوسرے روز دو آدمیوں کا اور تیسرے روز تین آدمیوں کا مزاج ناساز ہوا۔ آخر میں ابوداؤد تنہا رہ گیا تو خلیفہ کا آدمی سونے کے دیناروں کے توڑے لے کر آیا اور اس سے بھی یہی بات کہی۔ ابوداؤد نے توڑے واپس کر دئے اور کہا کہ "میں اس راز کی ضمانت دینے سے قاصر ہوں کیوں کہ یہ بیت المال کا ایک جُز ہے اور اس کے مالک عوام الناس ہیں۔ خلیفہ کو اس کا اختیار نہیں ہے۔" دوسرے روز عشاء کے بعد ابوداؤد نے تمام دوستوں کو روک کر یہ بات بتائی تو اُس نے دیکھا کہ آج ان کی آنکھوں میں وہ چمک نہیں ہے، جو پہلے روز تھی بلکہ اسے ان آنکھوں میں اجنبیت کی ایک ایسی جھلک نظر آئی جو پہلے نہ تھی اور جو صاف چغلی کھا رہی تھی کہ ان کے معاہدے میں دراڑ پڑ چکی ہے، ان کے قلوب بدل چکے ہیں۔

ابوداؤد نے کہا۔" دوستو تم بدل گئے ہو، تمہارے قلوب کی روشنی بجھ چکی ہے۔ تمہاری آنکھوں میں دنیاداری کی چمک اور طمع جھلک رہی ہے ـــــ اور سنو کہ جب حسینؓ کو اپنے قاصد جناب مسلم کی شہادت کی اطلاع ملی تھی تو راوی نے کہا تھا کہ حضرتؓ لوگوں کے دل تو آپ کے ساتھ ہیں، مگر تلواریں یزید کے ساتھ ہیں اور سنئے کہ حسینؓ نے سفر پھر بھی ترک نہ کیا تھا ـــ میں تن تنہا بھی اس راستے پر چلنے کو تیار رہوں۔ کل بھی تیار تھا اور آج بھی تیار رہوں، کیوں کہ یہی صراطِ مستقیم ہے۔"

ان چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا اپنی اپنی عبا سمیٹی اور کچھ کہے سُنے بغیر ابوداؤد کو اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ پس ابوداؤد نے اس روز سے تن تنہا شہر پناہ کے درّے پر ایک سنگ گراں کو اپنا مستقر قرار دے کر جا بیٹھنے اور بیٹھے رہنے کو معمول بنا لیا۔ وہ نہ کسی سے بولتا، نہ کسی سے کچھ کہتا تا کہ ایک دن حاکمِ وقت اپنے راہوار پر بیٹھا ہوا ابواسد، ابوسعد، عبدالرحمٰن اور مناف کی معیت میں اُدھر سے گزرا اور اُن سبھوں نے ابوداؤد کا استہزا کیا اور خوب قہقہے لگائے اور اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ ابوداؤد گویا دیوانہ یا سودائی ہے۔ حاکمِ وقت نے پوچھا کہ "اے ابوداؤد، تو شہر پناہ کے درّے پر بیٹھا ہوا روزانہ کس کا انتظار کرتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی آیا چاہتا ہے اور اب آیا کہ جب آیا۔ گویا اس کے پیروں کی چاپ کی آواز تیرے کانوں میں آ رہی ہے۔"

ابو داؤد نے کہا " اے اولی الامر تو نے صحیح کہا، بخدا اس کے پاؤں کی چاپ میں سن رہا ہوں۔"

حاکم نے کہا " وہ کون ہے ؟"

ابو داؤد نے مسکرا کر کہا " وہ وہی ہے جسے تو بھی جانتا ہے اور میں بھی اور یہ سب بھی، بلکہ ہر ایک جانتا ہے، مگر تیرے خوف سے کوئی اُسے زبان پر نہیں لاتا اور تجھے معلوم ہے کہ اس کا آنا برحق ہے۔"

یہ جواب سُن کر سب نے قہقہے لگائے اور چلے گئے۔ صرف اُن کے قہقہوں کی بازگشت دیر تک فضا میں مرتعش رہی اور ابو داؤد کا ذہن ماؤف رہا۔ ذہن کے پردے پر دُھند چھائی رہی۔ بمشکل تمام گرتا پڑتا وہ اپنے غار تک پہنچا۔ اس کی بیٹی نے کہا۔" کیا بات ہے میرے باپ۔ میں آج آپ کو خستہ اور مضمحل دیکھ رہی ہوں۔"

ابو داؤد نے کہا " اے بیٹی! ذرا یہ تو بتا کہ کیا میں اپنے حرکات و سکنات سے دیوانہ، مجنوں یا سودائی نظر آتا ہوں؟" اُس نے باپ کو بغور دیکھ کر بہ تحقیق کہا " مطلقاً نہیں میرے باپ۔" ابو داؤد ہنسا اور بولا " لاریب تو سچی ہے۔ میں دیوانہ نہیں ہوں لیکن عن قریب دیوانوں کی صف میں بٹھا دیا جاؤں گا۔"

کچھ روز کے بعد حاکم وقت نے ابو داؤد کو بلایا اور بھرے ہوئے مجمع میں ایک بلند مقام پر کھڑا کر کے لوگوں کو بتایا کہ" ابو داؤد باغی ہے۔ اور اولی الامر کی اطاعت میں سرکشی اور تمرد سے کام لیتا ہے اور اس کی آنکھوں میں جو چمک ہے وہ اُس کی بغاوت کا پتہ دیتی ہے۔" پس قاضی نے آنکھیں پھوڑ دینے کا فتویٰ دیا اور آناً فاناً ابو داؤد کی آنکھیں پھوڑ دی گئیں۔ ابو داؤد گرتا پڑتا اپنے غار میں پہنچا اور درد اور کراہ سے سارا غار گونجنے لگا۔ اُس کی بیٹی نے بہت ماتم کیا اور باپ کی تیمار داری میں لگ گئی۔ بارے مدت کے بعد ایسا ہوا کہ ابو داؤد ٹٹول ٹٹول کر چلنے پھرنے لگا۔ ایک روز اُس نے اپنی بیٹی سے کہا کہ " اے جانِ پدر! مجھے شہر پناہ کے دروازے پر لے چل۔" وہ لے گئی، ابو داؤد نے ٹٹول کر اُس چٹان کو پہچانا اور اُس پر جا بیٹھا اور بیٹی سے کہا " اب تو جا۔ شام کو مجھے آکر لے جانا۔" بیٹی نے کہا " اے میرے باپ، آپ یہاں بیٹھ کر کیا کریں گے۔ آپ کی آنکھیں بجھ چکی ہیں۔ آپ تو کسی کو آتے جاتے دیکھ بھی نہیں سکتے۔"

ابو داؤد نے کہا " تو سچ کہتی ہے جانِ پدر۔ مگر میں سُن تو سکتا ہوں ——— مجھے معلوم ہے کہ آنے والے کے قدموں کی چاپ سُن کر میں تجھے بلکہ سب کو بتا سکتا ہوں کہ جس کا انتظار ہے وہ پہنچ گیا ——— اور یاد رکھ کہ اُسے ضرور آنا ہے اور میں اُس کا استقبال کروں گا۔ انہیں اندھی اور بے نور آنکھوں سے۔ میں اس کے پیروں کی چاپ پہچانتا ہوں، اندر میرے دل کی آنکھیں اُسے دیکھ رہی ہیں۔"

⊘ ⊘

---

## بقیہ : نئی کتابیں

---

اور آپ اُس وقت تک اپنے آپ کو گرفت سے آزاد کرنا پسند نہیں کریں گے جب تک مضمون ان فقروں پر ختم نہ ہو:

" لہٰذا مسافر نے ہم سے آکر اخبار طلب کیا اور پوچھا" کیا آپ کے پاس بقیہ ہیروئن سہاگ گئی ہے؟" ہم نے جواب دیا " وہ تو ہے، لیکن مجھے بقیہ "محکمے میں رشوت" کی ضرورت ہے اور بقیہ "ہیروئن ..... لے جائیے۔"

پوری کتاب میں بارہ تیرہ مضمون ہیں (کسی مزاحیہ کتاب میں اس سے زیادہ ہونے بھی نہیں چاہئیں) سب کے موضوع ہمارے جانے پہچانے ہیں کیونکہ ہمارے ہی معاشرے کے ہیں مگر موضوع کی مزاحی رُوح ہماری جانی پہچانی نہیں ہے۔ وہ مسیح انجم کی مزاح شناس نگاہ کی پیداوار ہے۔ کس موضوع کو کس زاویہ سے پکڑا جائے اور اس پر مزاح کا رنگ کس اسلوب سے چڑھایا جائے؟ یہ مسیح انجم ہی جانتا ہے اور ہمیں یہ جانکاری اس کے بانکپن، دیدہ دلیری، نوکیلے پن، شگفتگی وغیرہ کے اظہار سے ہی ہوتی ہے ——— اور جس مصنف کے پاس اظہار اور اسلوب کی انفرادیت ہو، وہ جو کچھ بھی کہہ دے ہمیں داد دینا پڑتی ہے۔

اگر میں یہ کہنا چاہتا کہ اردو طنز و مزاح کے ماضی و حال میں یہ کتاب ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے تو میں اسے اپنی ناآگاہی سمجھتا۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ مسیح انجم کہیں گمراہ نہ ہو جائے۔ میرے لیے تو بس یہی منزل خوش گوار ہے کہ اول تو مسیح انجم کم لکھتا ہے اور طنز و مزاح کا قافلہ جو اردو میں رواں دواں ہے، مسیح انجم اُن میں سے الگ ایک اُبھرتا نکھرتا "چنانچہ" ہے۔

ناشر زندہ دلانِ حیدرآباد ہے اور ۱۲۸ صفحات کی کتاب کی قیمت ۵۰ روپئے نہیں صرف بارہ روپے ہے۔

فکر تونسوی

●●

بلراج ورما

# آگ، راکھ اور کُندن

اُٹھا لا ہو چکا تھا۔ دُور دراز سے آئے ہوئے چھوٹے بڑے سب رشتہ دار اپنے اپنے گھروں کو لَوٹ گئے تھے۔ ایک دو روز بعد جب اُس کے ماں باپ بھی چلے جائیں گے تو وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچّوں کے ساتھ اکیلی رہ جائے گی۔

جس عورت کے ایک دو چھوڑ پورے چھ بچّے ہوں، وہ اکیلی کیسے کہی جا سکتی ہے؟ مگر وہ اکیلی ہی تھی۔ تینوں بڑے بچّے اُس کے مرحوم شوہر کی پہلی یعنی اس کی سوتن کی اولاد تھے، جو بے چاری کب کی مر چکی تھی۔

جو اُس کے لیے کبھی تھی ہی نہیں۔ اُسے سوتن کہہ کر یاد کرنا غالباً واجب نہیں، مگر سوتن، سوتن ہی ہوتی ہے۔ وہ زندہ ہو یا مُردہ ـــــ ایسی کون عورت ہے اس یُگ میں جو پتی کی پہلی بیوی کی بے ماں اولاد کو اپنی اولاد سمجھے۔ اس نے بھی ان بچّوں کو اپنی اولاد کبھی نہیں مانا۔ نہ شادی کے پہلے دن، جب اسے ان بچّوں سے ملوایا گیا تھا۔ نہ اپنی ازدواجی زندگی کے دس برسوں میں کبھی۔

رانا صاحب جب زندہ تھے تو وہ سب سے بڑے رانا صاحب یعنی اُس کے سسر جی کی کوٹھی میں مل کر رہتے تھے۔ رانا صاحب اس سے عمر میں کم از کم بیس سال بڑے تھے۔ مگر چونکہ وہ رانا صاحب تھے۔ خاندانی رئیس اور حکومت کے ایک بڑے عہدہ دار۔ لہٰذا اس فرق پر سوائے اس کے کسی نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ دیکھنے میں وہ اپنی عمر سے کئی سال کم دکھائی دیتے تھے۔ جب کہ پورنیما اپنی غیر معمولی تندرستی اور قد و قامت کی وجہ سے اپنی اصلی عمر سے کافی بڑی لگتی تھی۔ لہٰذا دونوں کی عمر میں خاصا فرق ہوتے ہوئے بھی دوسرے دیکھنے والوں کو کوئی ایسا غیر معمولی نہ لگتا تھا۔

شادی کی پہلی رات ہی رانا صاحب نے پورنیما کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ بھرپور مرد ہیں اور جب اُس نے بچّوں کی بات اُٹھائی تھی تو اُنہوں نے مسکرا کر کہا تھا کہ وہ سچے راجپوت ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ وہ تب تک ضرور زندہ رہیں گے جب تک اُسے بھی ایسے ہی تین بچّوں کی ماں نہ بنا دیں گے۔

کوٹھی کی غیر معمولی شان و شوکت۔ بڑے رانا اور رانی صاحبہ کی پدرانہ شفقت اور خود رانا صاحب کی غیر معمولی شخصیت سے پورنیما اتنی متاثر تھی کہ اُس نے پھر کبھی اپنی کم عمری اور اپنے شوہر کی ادھیڑ عمری کا سوال نہیں اُٹھایا۔ عقلمندی اسی میں تھی کہ وہ وِدھی کے وِدھان کو دل و جان سے مان کر ایک شریف عورت اور بڑے گھر کی شکر بہو کی طرح اس گھر کی مان مریادہ کے مطابق ہی اپنے آپ کو ڈھال کر چلے۔ مگر زندگی تو کم بخت ایک شیشہ ہے جس میں بھی کوئی بال آ جائے تو کبھی نہیں مٹتا۔ ہمیشہ اسی طرح بنا رہتا ہے۔ پہلا بال تو اندرا کی پیدائش تھی۔ اس کی یہ پہلی اولاد لڑکی تھی جب کہ اس کی سوتن کی پہلی اولاد لڑکا تھی۔ رنجیت، رانا رنجیت سنگھ بہادر جو بارہ سال کی عمر میں ہی گھوڑے کی سواری کرنا سیکھ گیا تھا اور اب ماشاءاللہ ایک عمدہ اور منجھا ہوا گھڑ سوار تھا۔

جب چار سال بعد ایک ساتھ منوج اور دلیپ پیدا ہوئے تو شیشے میں آیا ہوا بال کچھ کم گھناؤنا لگنے لگا۔ یہ جڑواں بچّے عام جڑواں بچّوں کی طرح شکل و صورت میں ایک جیسے تھے۔ رانا صاحب نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ شادی کے چھ سالوں میں جب کہ رانا صاحب کی پہلی بیوی نے تین بچّے چار چار سال کے وقفے کے بعد یعنی پورے دس برسوں میں جنے تھے۔ اب پہلی سے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی تو پورنیما نے بھی رانا پریوار کو ایک لڑکی اور دو لڑکے پیش کر دیئے تھے۔ یہ جڑواں بچّے دیکھنے میں تو اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح گورے چٹّے اور توانا تھے، مگر شکل و صورت کے اعتبار سے بالکل انوکھے تھے۔ ان کے خدوخال رانا پریوار کے کسی فرد سے نہ ملتے تھے۔

اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا کہ رانا صاحب

---

● ۲۴-ڈی۔ میور وہار، پاکٹ ۲، دہلی ۹۱

کی صحت آہستہ آہستہ گرنے لگی۔ بیمار رجمائی کو دیکھنے
آئی تھی پورنیما کی ماں۔ مگر اپنے چند روزہ قیام
میں ہی شیشے میں اور ہر رجیوں بال ڈال گئی۔
گھر کا زیور — راناصاحب کی ماں کا، اُن
کی مرحومہ بیوی کا اور خود پورنیما کے اپنے زیورات
حفاظت کی غرض سے مقامی بینک کے لاکر میں رکھے
رہتے تھے، جس کی چابی راناصاحب کے پاس
رہتی تھی یا پورنیما کے پاس۔ بڑے گھر کے زیور سب
کچھ نہیں ہوتے، مگر خاصے کی چیز ہوتے ہیں۔ سونا
تو تھا ہی ساتھ میں ہیرے موتی اور جواہرات بھی
تھے۔

گھوڑوں کی سواری راجپوتوں کا خاندانی
شوق ہوتا ہے۔ گھوڑوں سے لگاؤ کے ساتھ
راناصاحب کو گھڑ دوڑ کا بھی چسکا تھا، جو ہوتے
ہوتے ان کی زندگی کا سب سے بڑا ولولہ بن گیا تھا۔
ریس میں کبھی جیت ہوتی ہے تو کبھی ہار۔ پچھلے ایک
دو سال سے ہار کا پلڑا نسبتاً بھاری ہوتا جا رہا
تھا۔ لوگوں کا اور اُن کے ماں باپ کا بھی خیال تھا
کہ ان کی علالت کی وجہ یہ کم بخت ریس ہی ہے۔
جس دن دل کے دورے سے اُن کی موت
ہوئی اُس سے ایک دن پہلے اُنہوں نے منوج
اور دلیپ کی تیسری سال گرہ بڑی دھوم دھام
سے منائی تھی۔ دوسرے دن ریس میں محض ایک
ہزار روپے کی رقم گنوا دینے ہی سے وہ مٹی ہو گئے —
لاکھوں کے مالک رانا بہادر کے لیے ایک ہزار روپے
کی حقیر رقم اتنی گہری چوٹ ثابت ہو سکتی ہے، ایسا
کوئی بھی نہ سوچ سکتا تھا۔ مگر راز جلد ہی فاش
ہو گیا۔ بینک میں صرف دس ہزار روپے کی رقم
بچی تھی۔ اور لاکر میں دبی زیورات بچے تھے جنہیں
آسانی سے فروخت نہ کیا جاسکتا تھا۔
ماں باپ نے اُسے میکے چلنے کے لیے کہا۔
مگر اُس نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ لاکر
سے زیورات نکال لینے کا مشورہ اُسے اس کی ماں
نے ہی دیا تھا، مگر اُس نے اپنی ماں کو کبھی نہ بتایا کہ
اُس نے زیورات سنبھال لیے ہیں۔ ساس سسر نے
ودھوا بہو کو سراہا۔ ہر کسی سے اس کی تعریف کی۔
وہ ان کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتی بلکہ ان کے بڑھاپے
کا سہارا بن کر رہنا چاہتی ہے۔ جس نے سُنا سراہا۔
بڑے گھر کی بہو بیٹیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔

راناصاحب کے ماتحت پریم جی جو اُن
کے اچھے خاصے دوست بھی تھے۔ ان کے گھر اکثر
آیا جایا کرتے تھے۔ راناصاحب کی زندگی چونکہ
خاصی مصروف تھی وہ پورنیما کو اکثر پریم جی کے
ساتھ سینما وغیرہ بھیج دیا کرتے تھے۔ پریم جی
آج بھی ایک وفادار دوست کی طرح اُن کا ہر حکم بجا
لاتے۔ راناصاحب کی وفات کے بعد پریم جی نے
بڑی دوڑ دھوپ کر کے پورنیما کو اپنے دفتر
میں ایک معقول ملازمت دلادی۔ نوکری دلانے
میں پریم جی کے علاوہ بڑے راناصاحب کا بھی
ہاتھ تھا۔ کبھی خود بھی وہ اس دفتر کے بڑے
عہدہ دار رہ چکے تھے۔ نوکری نے پورنیما کی
بیوگی کا غم ہی ہلکا نہ کیا تھا بلکہ اُسے ایک قطعی
نئی قسم کی شخصیت بھی عطا کر دی تھی۔ یہ نئی
شخصیت جو ظاہر ہے کہ خود برداری اور خود
پروری یعنی بغیر کسی کی مدد اور سہارے کے
اپنی بسر اوقات کر سکنے کے اطمینان سے پیدا
ہوئی تھی۔ اچھی بھلی پورنیما کو چند ہی مہینوں میں
ایسی خود غرض، مغرور، بد دماغ اور خود پرست
بنادیا کہ اُس کے شوہر کے والدین اور پہلی
بیوی کی اولاد کا اعتماد اس کی ذات سے قطعی اُٹھ
گیا اور اُنہوں نے یہی غنیمت سمجھا کہ شہر کی جائیداد
کا بٹوارہ کر دیا جائے۔ اُس کے سسر کے لیے،
جو ایک شریف آدمی تھا، بہو کا یہ باغیانہ رویہ
ناقابلِ برداشت تھا۔ بہو کو خود کفیل بنانے کے
لیے وہ اب اپنے آپ کو کوسنے لگے۔ اس بڑے شہر
میں جہاں سینکڑوں لوگ اُن کو جانتے پہچانتے
تھے، اپنے بیٹے کی بہو کو الگ کر دینا اُن کے لیے کسی
طرح ممکن نہ تھا۔ نتیجتاً اُنہوں نے کوٹھی بیچ دی۔
اور بیٹے کی پہلی اولاد کو لے کر اپنے آبائی گاؤں میں
منتقل ہو گئے۔ مکان اُن کی اپنی کمائی تھا۔ پھر بھی
اُنہوں نے اُسے فروخت کرنے سے جو رقم ملی تھی،
اُس کا ایک معقول حصہ پورنیما کی اولاد کے نام
بینک میں جمع کرا دیا تھا تاکہ بچے جب بڑے ہوں
تو ان کی تعلیم اور شادی بیاہ پر اُنہیں اچھی خاصی
مدد مل جائے۔

رنجیت اور اس کا چھوٹا بھائی سنجیت چند
ہی برسوں میں یکے بعد دیگرے فوجی افسر بن گئے اور
بڑی بیٹی سوشیلا کا بیاہ بھی ایک اچھے کھاتے
پیتے گھرانے میں ہو گیا۔

پورنیما نے اپنی سسرال کو ایسے فراموش
کر دیا جیسے وہ تھے ہی نہیں۔ لوگ حیران تھے کہ بیوہ
ہوتے ہوئے بھی نہ اُس نے ماتھے کی بندیا اُتاری اور
نہ منگل سوتر۔ بس مانگ میں سیندور بھرنا بند کر دیا۔
کیونکہ اس طرح اپنے بالوں کی خوب صورتی بگاڑنا
اُسے اچھا نہ لگتا تھا۔

پریم جی جو رفتہ رفتہ سیڑھی در سیڑھی چڑھتے
چڑھتے اب خود بھی ایک بڑے افسر بن گئے تھے —
رانا پریوار سے پرانی دوستی نبھائے جا رہے تھے۔
اُنہوں نے پورنیما کو اپنے یونٹ میں لے لیا تھا۔ پورنیما
ایک گھنٹہ دیر سے دفتر جاتی اور دو گھنٹے پہلے گھر
لوٹ آتی۔ اُس کے دفتر میں کوئی قابلِ ذکر
کام نہ تھا۔ پریم جی جب بھی فرصت ملتی چلے آتے۔
جب تک من ہوتا ٹھہرتے۔ وہ بچوں سے ایسے گھل
مل گئے تھے جیسے وہ اُن کے حقیقی چچا ہوں۔ دفتر
میں اور سرکاری ملازمین کی اس کالونی میں،
جہاں پورنیما کو سرکار کی طرف سے رعایتاً کوارٹر
مل گیا تھا، ہر قسم کے چرچے ہوتے۔ مگر وہ اس
قسم کی چرچا سے بے نیاز اپنے ڈھنگ سے اپنی خوشی
کے لیے جی رہی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے دن سینما
جاتی۔ شہر میں کوئی ہنگامہ ہو، کوئی اچھا کلچرل پروگرام
ہو، وہ ضرور دیکھتی۔ اکثر پریم جی کے ساتھ۔
کبھی کبھار اکیلی یا اپنی ہی کسی کلاسی پڑوسن یا دفتر کی ساتھن

کے ساتھ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ ڈھیروں سونا تھا۔ خاصی رقم بینک میں بھی جمع تھی اور پرسے معقول ماہانہ تنخواہ اور پریم جی کی سرپرستی۔

پریم جی کی بیوی کو بریسٹ کینسر تھا۔ اس کا کوئی بچّہ نہ تھا۔ کینسر کی مریضہ کب تک جیتی ہے۔ اب پورنیما کو بس اسی کا انتظار تھا۔ لیکن یہ عورت جانے کس مٹی کی تھی کہ دو آپریشن ہو جانے کے باوجود مرنے کا نام نہ لیتی تھی۔ پورنیما جانتی تھی کہ زندگی کی سانسیں اوپر والا گنتا ہے اور موت کا دن بھی وہی طے کرتا ہے۔ مگر وہ پریم جی کی ہو کر رہنے کے لیے اتنی بے قرار تھی کہ اکثر ان سے جھگڑا کر بیٹھتی۔

"جب تک تیری بیٹی کا بیاہ نہیں ہو جاتا ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ کھلم کھلا میاں بیوی بن کر رہنا کسی صورت مناسب نہیں۔ لاکھ اڑچنیں کھڑی ہو سکتی ہیں۔ ہمارے لیے اسی طرح شرافت کا بھرم بنائے رکھنا ضروری ہے۔" پریم جی اُسے اکثر سمجھاتے۔ وہ بڑے محتاط اور سمجھدار قسم کے صلاح کار تھے۔

دونوں اڑچنیں برابر بنی ہوئی تھیں۔ لڑکی ابھی معصوم بچّی تھی اور پریم جی کی بیوی ضرورت سے زیادہ سخت جان۔

اُن کا یہ رشتہ کوئی ایسا خفیہ نہ تھا مگر پریم جی کی نیک نامی کی ساکھ اور شہرت اور سماج میں اُن کا ایک معزز مقام ایسے پردے تھے، جن کی آڑ میں سب کچھ چھپا رہتا تھا۔ اکثر لوگ پورنیما سے ان کے غیر معمولی لگاؤ کو ان کی خاندانی شرافت اور ایک پرانے مہربان دوست کی بیوہ کے لیے ہمدردی سمجھتے تھے۔ جو اصلیت سے واقف تھے وہ بھی چُپ رہتے۔ پریم جی بے حد محتاط قسم کے آدمی تھے۔ پورنیما بھی اُن ہی کی طرح پردے کے پیچھے رہنے کا ہُنر جانتی تو لوگوں کو دونوں کے اصلی رشتہ کے بارے میں ذرا بھی شک نہ ہوتا۔ مگر پورنیما سمجھتی تھی طبعیت شیخی خور تھی اور پریم جی کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اُس نے ماتھے کی بندیا اور منگل سوتر نہ اُتارا تھا۔

"میں اپنے آپ کو بیوہ نہیں سمجھتی۔ رانا میرے والد کے برابر تھے۔ میں نے اُنہیں کبھی شوہر نہیں مانا۔ کم ازکم تم سے ملنے کے بعد نہیں۔ میرے لیے تم ہی سب کچھ تھے، ہو اور رہو گے۔ رانا کو ہمارے تعلقات کا علم تھا، مگر وہ اپنی راجپوتی آن بان کی وجہ سے اس حقیقت سے جان بوجھ کر منکر بنے رہے۔ یہ فریب اُن کے لیے ضروری تھا۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو قتل کرنے کی بجائے وہ خود ہی ہمارے راستے سے ہٹ گئے۔"

"تم سمجھتی ہو اُنہوں نے خودکشی کی تھی؟"

"سمجھتی نہیں، میں جانتی ہوں کہ اُنہوں نے خودکشی کی تھی۔"

"تم مغالطے میں ہو۔ وہ ایک کامیاب آدمی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُن کے لیے تمہیں اپنے راستے سے ہٹا دینا ذرا بھی مشکل نہ تھا۔"

"تم بھولتے ہو کہ وہ ایک شفیق باپ بھی تھے اور جانتے تھے کہ کم ازکم اندرا اُنھا کی اپنی بیٹی ہے۔"

"اور تمہارے جُڑواں تمہارے؟"

"کوئی اندھا بھی ایک نظر دیکھ کر بتا دے گا کہ تم ہی اُن کے باپ ہو۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اُنہوں نے اپنے لیے موت کی سزا اپنے لیے خود طے کی تھی۔"

"وہ ایک ذہین، خود شناس اور خوددار آدمی تھے۔ اس کے علاوہ اُن کے پاس دوسرا راستہ بھی کہاں تھا۔ وہ دل کے مریض تو تھے ہی۔ مجھ ایسی عورت کو اپنے راستے سے ہٹانے کی بجائے، خود میرے راستے سے ہٹ جانا اُنہوں نے زیادہ مناسب سمجھا۔ میں کیسی سہی، کتنی بُری سہی، مگر میں اُن کی چہیتی بیٹی کی ماں تھی اور میری جاں بخشی کے لیے یہ کافی تھا۔"

"تم بڑی ظالم عورت ہو پورنیما۔ خدا قسم کبھی کبھی تو مجھے بھی تم سے خوف آنے لگتا ہے۔"

"میں نے تم سے محبت کی ہے۔ میں تمہارے ایک معمولی اشارے پر بھی مرنے کو تیار ہوں۔ کبھی آزما کر دیکھ لینا۔"

اندرا بڑی سمجھدار بچی تھی۔ کچھ بچے اپنی عمر سے پہلے بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسی ہی لڑکی تھی۔ ہاتھوں اور پاؤں پر آلتا پوتنا، ناخنوں کو ہمیشہ سرخ بنائے رکھنا اور رنگ برنگے کپڑے پہننا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اُسے پریم انکل سے بھی بے حد نفرت تھی، مگر وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ وہ جب گھر میں آتے وہ خود پڑوس میں کسی نہ کسی سہیلی کے گھر چلی جاتی۔

پریم جی اُس کی سال گرہ بڑی دھوم دھام سے مناتے تھے۔ اُسے نئے نئے کپڑے لا کر دیتے۔ ہر سال گرہ پر پچھلے کی نسبت بڑا کیک بنوا کر لاتے۔ مگر اس کے رویّے میں کبھی کوئی فرق نہ آتا۔ وہ اُنہیں اپنے مرحوم باپ کا قاتل سمجھتی تھی، جیسے اگر اُس کا بس چلتا تو زندہ زمین میں گاڑ دیتی۔ مگر وہ ایک چھوٹی سی معصوم بچّی تھی۔ اُس کی سہیلی کے باپ کی ترقی ہوئی تو وہ لوگ اس کالونی کو چھوڑ کر ایک دوسری کالونی کے نسبتاً بڑے فلیٹ میں منتقل ہو گئے۔ اُسے اپنی یہ سہیلی بڑی عزیز تھی، اُسے وہ اپنے گھر کی ہر بات بتا دیتی تھی۔

"کہاں تمہارے ماں باپ ہیں رالو اور کہاں میری یہ نرلج ماں۔ بھگوان قسم رالو، مجھے تو اس کلٹا کو ماں کہتے ہوئے بھی لجا آتی ہے۔"

پریم جی کی بیوی اسپتال میں تھی۔ یہ اُس کا آخری بڑا آپریشن تھا۔ بے چاری بہت کمزور ہو گئی تھی۔ ہسپتال چونکہ پورنیما کے کوارٹر کے قریب تھا لہٰذا پریم جی اب اکثر وہیں رہ جاتے تھے۔ اُنہیں دنوں اس کی سہیلی کا بیاہ آ گیا۔ ایک ہی بار کہنے پر کہ وہ اپنی سہیلی کے گھر مہینہ بھر رہنا چاہتی ہے، اُسے اجازت مل گئی۔ سہیلی کے ماں باپ اور بھائی بہن حیران تھے کہ اس پورے مہینے میں کبھی ایک بار بھی اس کی ماں نے آ کر اس کی خبر نہ لی تھی۔ ایک دن اُسے خبر ملی تھی کہ پریم جی اس مابین پورے طور پہ پورنیما

کے گھر آ چکے تھے۔ اسپتال کے قریب ہونے کا بہانہ کافی تھا۔ وہ ہر روز دو بار ہسپتال جاتے۔ کبھی کبھی پورنیما بھی اُن کے ساتھ مسز پریم جی کی مزاج پرسی کے لیے چلی جاتی۔ ایسے موقعوں پر وہ نہایت سادہ لباس میں ملبوس ہوتی۔ نہ کبھی لپ اسٹک کرتی نہ بندیا لگاتی، جو اُسے بے حد عزیز تھی۔ مرتی ہوئی اُس عورت کا دم دیکھنے والا ہوتا۔ وہ پورنیما اور اپنے شوہر کے تعلقات سے بے خبر نہ تھی۔ مگر مجال ہے جو اُس نے کبھی بھولے سے بھی یہ ظاہر ہونے دیا ہو۔ عورت کے لیے یہ شرم کی بات ہوتی ہے، مگر وہ چُپ چاپ سب سہے جاتی تھی۔ اُسے اب صرف اپنی موت کا انتظار تھا۔

اس کا آپریشن ہوا۔ کینسر کی مریضہ کب بچتی ہے۔ جو وہ بچتی۔ آپریشن والے دن وہ دن بھر شوہر سے باتیں کرتی رہی۔ یہ شکتی کہاں سے آگئی تھی اس میں وہ نہ جانتی تھی۔ مرنے سے پہلے اُس نے اپنے شوہر سے نہ جانے کیا کیا کہا کہ اُس کے بعد پریم جی نے پورنیما کے ہاں آنا جانا بالکل بند کر دیا۔ وہ دفتر میں بھی اُس سے بات نہ کرتے۔ پھر ایک دن پورنیما نے سُنا کہ ان کا ٹرانسفر ہو رہا ہے کہیں دُور دراز۔ پورنیما نے بیماری کا بہانہ کرکے چھٹی لے لی۔ گھر بیٹھ گئی۔ اُسے یقین تھا کہ پریم جی اُسے دیکھنے آئیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

چھٹی کے بعد وہ دفتر گئی تو پریم جی جا چکے تھے۔ گھر بار سب خالی کرکے۔ مجھے اُن کے جانے کا اتنا غم نہیں جتنا اس بات کا ہے کہ وہ مجھ سے بغیر کچھ کہے سُنے چلے گئے۔ کاٹھ کی ہانڈی کو ایک دن تو جلنا ہی تھا۔ میں ان سے پریم کرتی تھی۔ اور اس پریم پر میں نے اپنی سونے کی گرہستی نچھاور کر دی"۔ اپنی ہمراز سہیلی سے باتیں کرتی وہ سارا دن روتی رہی۔

چند ہی دنوں میں لوگوں نے دیکھا کہ اس کی زندگی کا رنگ ڈھنگ بالکل ہی بدل گیا ہے۔ اب وہ ہمیشہ سادہ سفید لباس میں دفتر جاتی۔ وقت پر جاتی وقت پر آتی اور سارا دن جی لگا کر کام کرتی۔ بندیا لگانا یا ناخنوں پر نیل پالش تو ایک طرف اُس نے لپ اسٹک کا استعمال بھی ایک دم ترک کر دیا تھا۔ پورے گھر کا ماحول بدل گیا۔ اس تبدیلی سے کوئی مطمئن تھا تو وہ تھی اندرا۔

کئی مہینوں کے بعد پونم کو پریم جی کا ایک خط ملا۔ لکھا تھا:

پورنیما جی!

ایک قتل کا بوجھ آدمی کو عمر بھر بدحواس کئے رکھنے کے لیے کافی ہوتا ہے، میرے سر پر تو دو خون ہیں۔ میں نے کبھی نہ سمجھا تھا کہ مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے۔ میں نے اس کی محبت کی بے قدری کی تھی اور وہ جو ایک اچھی بھلی تندرست عورت تھی بیمار رہنے لگی اور پھر ایسی بیمار ہوئی کہ .... تم ساری کہانی جانتی ہو۔

میں تمہارا بھی اتنا ہی قصوروار ہوں جتنا مرنے والی کا۔ وہ کیسے گھُل گھُل کر مری غالباً رانا صاحب بھی اسی طرح گھُل گھُل کر مرے تھے۔ مرنا تو سب کو ہی ہے۔ تم نے بھی مرنا ہے۔ میں نے بھی مرنا ہے، مگر ایسا مرنا بھی کیا؟

ہم نے مِل کر ایک شریف آدمی اور ایک شریف عورت کو مار ڈالا۔ ہم دونوں قاتل ہیں۔ یہ سچائی مجھ پر اُس دن آشکار ہو گئی تھی، جس دن میری بیوی نے یہ دنیا چھوڑی۔ اس سے پہلے میں نے ایسا کیوں نہ سوچا؟ حقیقت میں میں اندھا تھا۔ اندھا بھی اور بہرہ بھی!

میں نے تمہاری سونے کی گرہستی کو آگ میں جھونک دیا اور ایک ایسے آدمی سے بے وفائی کی جو مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا تھا۔ مجھ پر پورا بھروسہ رکھتا تھا۔ جس کی مہربانیوں کا صلہ میں سات جنم نہیں لوٹا سکتا۔ میں آج جو کچھ ہوں رانا صاحب کی بدولت۔

ہاں پورنیما۔ میں اپنے آپ کو تمہارے شوہر اور اپنی بیوی کا قاتل سمجھتا ہوں۔ جیسے آدمی کے لیے مر جانا بھی کافی سزا نہیں میں تل تل بوند بوند مرنا چاہتا ہوں تاکہ ا[illegible] ناکارہ زندگی کے جتنے دن بھی باقی ہیں اُنہیں میں میرے گناہوں کا کفارہ ہو سکے رانا صاحب بہت عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ میں ایک معمولی۔ بے حد ادنیٰ قسم بڑے ہی چھوٹے دل والا آدمی ہوں۔ ان طرح چُپ چاپ جام شہادت پی جانا م[illegible] جیسے حقیر اور بزدل آدمی کے لیے ممکن بھی نہیں۔ لہٰذا میں نے ہر روز سو بار مرنے کی س[illegible] چُنی ہے اپنے لیے۔

تمہارے شوہر کے دونوں بیٹے آج کل ادھر پُونا ہی میں قیام فرما ہیں۔ بڑا فوج میں میجر ہے۔ چھوٹا کپتان۔ فرشتہ ایسے دو بچوں کے باپ اور دیویوں ایسی بیویوں کے شوہر ہیں۔ دونوں ادھر میرے پڑوس میں رہتے ہیں۔ سچ مچ بڑے پیارے بچے ہیں، جیسے ایک بڑے آدمی کی اولاد ہونی ہے۔

تمہارے شوہر کی بڑی بیٹی بھی اسی شہر میں آباد ہے۔ اس کا شوہر ایک رولنگ اسٹیل مل کا مالک ہے۔ راجہ آدمی ہے بیٹی لاکھوں میں کھیلتی ہے۔

ان بچوں کے برعکس تمہارے بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچ سوچ کر میں اکثر بوکھلا جاتا ہوں۔ ماں کے گناہوں کا سایہ اولاد پر پڑنا لازمی ہے۔ خدا کرے ایسا نہ ہو اور تمہارے بچے بھی ان بچوں کی طرح پھولیں پھلیں۔

تم مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ کبھی ادھر اپنے بچوں کے ہاں آنے کا پروگرام بناؤ تو مجھے اطلاع کر دینا تاکہ میں اپنا منحوس چہرہ لے کر کہیں روپوش ہو جاؤں۔ تم سے آنکھ ملانے

لی سکت اب مجھ میں نہیں ہے۔

بہتر ہے کہ ہمیں جتنے دن اور دھرتی کا بوجھ بنے رہنا ہے ایسے ہی چلتے رہیں اور جب اپنے بنانے والے کے گھر جائیں تو اس تسلی کے ساتھ کہ اپنے گناہوں کا اقرار کر کے ہم اُس کے رحم و کرم کے کچھ تو حق دار ہو ہی گئے ہیں۔

تم نے مجھے ہمیشہ یقین دلایا ہے کہ تمہارے جُڑواں بچے میرے ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو خدا ان کو بچائے۔ تم عورت ہو۔ ماں ہو۔ تم سچائی کو میری نسبت زیادہ جانتی ہو۔ تمہاری بات پر اعتبار کر کے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان دونوں بچوں کی پرورش میرا فرض ہے۔ میں یہ فرض مرتے دم تک پورا کرتا رہوں گا۔ دس ہزار کا چیک بھیج رہا ہوں۔ اسی طرح جب ممکن ہوگا کچھ نہ کچھ بھیجتا رہوں گا۔ اپنے گناہ کے کفارے کے طور پر۔ اسے لوٹا کر مجھے مزید ذلیل نہ کرنا۔ یہ میری التجا ہے۔

تمہاری بیٹی اندرا اپنے باپ کی بیٹی ہے۔ اس کی نگاہوں میں، میں نے نفرت کے شعلے لپکتے دیکھے ہیں۔ راجپوت کا خون۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اُدھر تھا تو میں اُس سے خوف کھاتا تھا۔ اب اِدھر اتنی دُور ہوں تو بھی اس کی نگاہوں کا بے بس غصہ یاد کر کے اکثر کانپ جاتا ہوں۔ وہ لڑکا ہوتی تو میرا خون کر دیتی۔ رانا صاحب کی اس بیٹی کے لیے ان کا دیا ہوا تمہارے پاس بہت کچھ ہے۔ ایشور اسے سُکھی رکھے اور وہی تقدیر بھی دے جو اس کا حق ہے۔

تمہارے ساس سسرا بھی زندہ ہیں بہت بُوڑھے ہو گئے ہیں بے چارے۔ تم مناسب سمجھو تو اُنہیں اپنے پاس لے آؤ یا خود ان کے پاس چلی جاؤ۔ میں جانتا ہوں تمہیں ملازمت کی ضرورت نہیں۔

میں آسیب تھا، تمہاری اور تمہارے پیارے بچوں کی زندگیوں پر۔ مجھے تسلی ہے کہ میرے منحوس سائے سے وہ اب محفوظ ہیں۔

تمہارا گناہ گار

پریم جی

اُس شام اندرا اسکول سے لوٹی تو دیکھا کہ ماں نے رو رو کر اپنی صورت بگاڑ لی ہے۔ آج صبح ہی وہ مقامی بیوٹیشین سے سر کے بال اور چہرہ سیٹ کروا کر لوٹی تھی، کتنے ہی دنوں بعد۔ آنسوؤں نے اس کی آنکھوں کا کالا کجرا اور چہرے پر پُتی کریم اور پاؤڈر کی تہوں میں عجیب و غریب دراڑیں ڈال دی تھیں۔ جیسے پہاڑوں سے اُچھلتی کُودتی پانی کی دھارائیں نیچے میدانوں میں پہنچ کر اِدھر اُدھر چھوٹی چھوٹی نالیوں میں بٹ جاتی ہیں۔

اندرا نے اس سے پہلے ماں کو کبھی ایسی حالت میں نہ دیکھا تھا۔ اس کے باپ کی میت پر بھی وہ خاصی روئی پیٹی تھی، مگر ایسے نہیں۔ آج بھی دیکھا تو اس کے دل میں رحم نام کا کوئی جذبہ نہ اُبھرا۔ اُس کی نفرت میں اضافہ ہی ہوا۔ کم از کم پچاس روپے خرچ کر کے اس نامنہجار نے شام کے کلچرل پروگرام میں شریک ہونے کے لیے اپنے چہرے کو بنایا سنوارا تھا۔ جو ظاہر ہے کہ سب کے سب برباد گئے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کے باپ کی یاد میں نہیں اپنے ناپاک عاشق کی یاد میں آنسو بہا رہی ہے، جو اندرا کی نگاہوں میں ایک نہایت نامناسب فعل تھا۔ وہ چُپ چاپ دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ اور بغیر کچھ کھائے پیے کچھ ایسے ہی خیالات کے بوجھ تلے دبی دبی سو گئی۔

گھنٹہ دو گھنٹہ بھر کی نیند کے بعد اُس کی آنکھیں کھُلیں تو دیکھا کہ گھر میں مکمل سناٹا ہے نہ ریڈیو چل رہا ہے نہ ٹی وی۔ البتہ دوسرے کمرے سے دھیمی دھیمی سسکیوں کی آواز ضرور آ رہی تھی۔

کیا وجہ ہے یقیناً کوئی غیر معمولی حادثہ ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے پریم جی انکل کے مرنے کی خبر آئی ہو۔ اس خیال کے آتے ہی اس کا دل بھر آیا، جو بھی ہو اس کی تصدیق اس کا دل بھی کرتا تھا کہ پریم انکل غیر معمولی آدمی تھے اور اس کی ماں سے بے حد پیار کرتے تھے۔

تھے ؟

یعنی کہ ؟

وہ دوڑی دوڑی ماں کے کمرے میں گئی اور اس سے لپٹ کر خود بھی رونے لگی۔ پوریما جو ابھی تک ہولے ہولے سسک رہی تھی۔ بیٹی کا پیار پا کر ایک دم پھوٹ پڑی۔ کسی نے کسی سے کچھ نہ کہا۔ کچھ نہیں پوچھا۔ بس روتی رہیں۔ ایک دوسرے سے چمٹ کر۔ اکیلا ایک اندرا نے بھی وہ لفافہ دیکھ لیا اور ایک ہی نظر میں سمجھ گئی کہ اس منحوس لفافے میں پریم انکل کی موت کی خبر تھی۔

تو کیا جسے وہ ناجائز تعلق سمجھتی تھی درحقیقت ایک سچی محبت تھی۔ نئے اور پرانے ساتھ کی درجنوں کتابیں پڑھ چکنے کے بعد وہ جان گئی تھی کہ آدمی کبھی کبھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی زندگی کے وہ رشتے سچے اور درست ہوتے ہیں جنہیں آدمی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر قبول کر لیتا ہے۔

..... شادی براہ تو رسمی اور سماجی بندھن ہوتے ہیں۔ وہ رشتہ داری اور دوستی کا فرق بھی سمجھنے لگی تھی۔ اُس کا باپ اس کی ماں کا رشتہ دار تھا دوست نہیں تھا۔

اُسے اپنے مرحوم باپ سے بے انتہا محبت تھی مگر وہ یہ بھی جان گئی تھی کہ اُنہوں نے اس کی ماں سے بیاہ کر کے اس پر ظلم کیا تھا۔ ایک طرح سے اُنہوں نے اپنی دولت اور اپنے بڑے رتبہ کی بنا پر اُس کی ماں کو خریدا تھا۔ اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس کے نانا نانی اُس کے دادا دادی کے سامنے سمدھیوں کی نہیں، حقیر فقیروں کی طرح اُٹھتے بیٹھتے اور بات چیت کرتے تھے۔ یہ نمبرداری یا سلیقہ نہ تھا۔ سمدھیوں میں برابر کا رشتہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے سنگین برتاؤ کے پس پردہ غالباً کوئی ایسا جرم، کوئی ایسا گناہ تھا،

جس کی نوعیت سے ناواقفیت کے باوجود وہ کسی طرح جان گئی تھی کہ یہ ایک طرح کا اعترافِ جرم تھا۔ اُس کی ماں جو آج بھی ایک حسین و جمیل عورت تھی، شادی سے پہلے یعنی اپنے کنوارے پن میں یقیناً بے حد حسین رہی ہوگی۔ ایسی کہ جسے کوئی بھی شریف زادہ بیاہ لیتا۔ مگر اس کے ماں باپ نے اس کی شادی ایک ایسے آدمی سے کر دی تھی۔ جو اس سے کم از کم بیس سال بڑا تھا اور تقریباً اتنے ہی سال شادی شدہ زندگی گزار چکا تھا۔ بحیثیت اُس کا بڑا بھائی اس کی ماں کی ہی عمر کا تھا۔ یقیناً اس کے نانا نے اس کی ماں کا سودا کیا تھا۔ روپے لے کر لڑکی دینا بڑی گھٹیا حرکت ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ اپنے داماد اور اس کے والدین کے سامنے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ غریب تھے تو کیا ہوا! غریبی میں بھی آدمی کو اپنی عزّت کا پاس ہوتا ہے بلکہ غریب کو تو اپنے وقار کا خاص دھیان رہتا ہے۔ وہ جب کبھی اس کی ماں کو ملنے آتے تھے، ماں اُن سے سیدھے مونہہ بات نہ کرتی تھی۔ وہ کسی طرح ایک دو دن رہ کر لوٹ جاتے تھے۔ اُسے شک تھا کہ وہ اپنی بیٹی اور نواسے نواسی کو دیکھنے کی غرض سے نہیں کچھ نہ کچھ مانگنے کے لیے ہی آتے تھے اور بھک منگوں کی طرح جو ملتا لے کر لوٹ جاتے۔ ماں کو ان کی موجودگی بڑی کھلتی تھی۔ اس کے برعکس اس کے دادا دادی کی شخصیتوں میں بڑا وقار تھا۔ آج کل وہ بہت کم آتے تھے۔ مگر جب بھی آتے ڈھیر سی چیزیں لے کر آتے تھے۔ گھر کا گھی، گڑ، شکر، چاول، دالیں، اپنے کھیتوں کا اناج اور روپے پیسے بھی۔ اُن کو اپنی بیوہ بہو سے آج بھی پوری ہمدردی تھی۔ پوتوں اور پوتی پر وہ جان چھڑکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس مہنگائی کے زمانے میں پانچ چھ سو روپے کچھ نہیں ہوتے۔ اتنی رقم میں تین بچوں کی پرورش، پڑھائی وغیرہ بہت مشکل ہے۔ کھیتوں سے ان کی آمدنی کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔ دادا کی پنشن البتہ خاصی تھی۔ لہٰذا وہ جب آتے ہزار دو ہزار کی رقم ماں کو تھما جاتے۔ ماں خود ہی اُن کے ساتھ رہنے کو تیار نہ تھی۔ ورنہ وہ کبھی اُسے اکیلی نہ چھوڑتے۔

زمین آسمان کا فرق تھا اُس کے دادا دادی اور نانا نانی میں۔ مگر اس کے دادا دادی نے بھول کر بھی کبھی کوئی ایسی حرکت نہ کی تھی، جس سے ظاہر ہو وہ اُس کے نانا نانی کا مناسب احترام نہیں کرتے۔

روتے روتے تھک کر جب اس کی ماں بالآخر سو گئی تو وہ خط اُٹھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُس کے بھائی، جو پرلے درجے کے لوفر تھے، ابھی تک گھر نہ لوٹے تھے۔ جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں گئی وہ بھی حسبِ معمول شور مچاتے آدھمکے۔ اُس نے اُنگلی کے اشارہ سے اُنہیں چپ کرا دیا اور جو کچھ بھی گھر میں تھا، کھلا پلا کر سُلا دیا۔ خط کا ذکر نہیں کیا۔ بس اتنا ہی بتایا کہ ماں کو تیز بخار ہے۔ اور بڑی مشکل سے کسی طرح سو پائی ہے۔ وہ ماں کے غصّے سے واقف تھے۔ روز پٹتے تھے، مگر آوارگی سے باز نہ آتے تھے۔ ہر شام تبھی گھر لوٹتے جب محلّہ کا کوئی لڑکا ان کے ساتھ کھیلنے کو تیار نہ ہوتا۔

بھائیوں کو سُلا کر اور پوری طرح سے اطمینان کر کے کہ سب سو گئے ہیں، اُس نے لفافہ کھولا اور خط پڑھا ——— ایک بار ——— دو بار ——— تین بار ——— کتنی ہی بار اس کی آنکھیں بھیگیں۔ مگر خط میں نہ جانے ایسا کیا تھا کہ بار بار پڑھے جانے کے باوجود تسلّی نہ ہوتی تھی۔ آخر خط کا لفظ لفظ اُس کے ذہن میں جم کر رہ گیا۔ حفظ ہو گیا تو زندگی میں اپنی نئی سچوایشن اس کے سامنے ایک مکمّل تصویر بن کر آشکارا ہو گئی ——— اُس نے سوچا کہ وہ خط کو وہیں چھوڑ آئے جہاں سے اُٹھایا تھا تاکہ اس کی ماں کا بھرم کہ کسی نے اس خط کو دیکھا نہیں بنا رہے۔ پھر اُسے خیال آیا کہ ماں غالباً خود ہی چاہتی تھی کہ وہ یہ خط پڑھ لے۔ نہیں تو وہ اُسے کہیں چھپا بھی سکتی تھی۔ آخر بہت دیر تک سوچتے سوچتے وہ خط کو اپنے سینے پر رکھے رکھے سو گئی۔

دوسرے دن جب ماں بیٹی کی آنکھیں ملیں تو وہ نہ وہ ہمراز سہیلیوں کی آنکھیں تھیں ——— اُس نے ماں کو ایسے چمٹا لیا اپنی چھاتی سے گویا بیٹی نہ ہو، اپنی ماں کی ماں ہو۔ ماںمتا کیا ہوتی ہے؟ پیار کیا ہوتا ہے۔ اس چھوٹی سی جان کو اس کا پہلا تجربہ ہو رہا تھا۔ پر ماں کو بیٹی کا یہ انوکھا آلنگن بڑا اچھا لگا۔ کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی وہ دیوار جو برسوں سے ماں بیٹی کے درمیان بنتی اور بلند ہوتی جا رہی تھی، ایکا ایک نہ جانے کہاں پست ہو گئی۔

ماہ و سال سے چلے آ رہے، زندگی کے بکھرے بگڑے شب و روز دھیرے دھیرے بدلنے سُدھرنے لگے۔ لڑکوں میں بھی خاصی تبدیلی آگئی۔ اب کی بار جب اس کے نانا نانی آئے تو ماں اُن سے بے رُخی سے نہ بولی۔ اُنہیں پوری عزت دی مگر جب وہ لوٹنے لگے تو اُس نے بیٹی کے سامنے اُنہیں دو ہزار کی رقم تھماتے ہوئے بڑے تحمّل سے کہا "میری التجا ہے کہ آپ پھر کبھی مجھے اپنے درشن نہ دیں۔ آپ کو اپنی بیٹی کے پورے دام مل چکے ہیں۔ اس رقم کو آخری قسط سمجھ کر اب آپ مجھے بھول جائیں۔ میری رگوں میں آپ کا خون تھا، اسی وجہ سے میں نے ایک بڑے گھر کی مریادا بھنگ کی، اب میں اپنے ہر اُس قصور کو جس کی وجہ سے میری گرہستی اُجڑی ہے، اپنے بھگوان کے سامنے رکھ کر پرائشچت کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے آپ لوگوں سے کوئی گلہ نہیں، صرف اپنے بنانے والے سے شکایت ہے کہ اُس نے مجھے آپ کے گھر میں پیدا کیا۔"

یہ بات اُس نے اندرا کے سامنے کہی تھی۔ اندرا جس کے تیج پرتاپ کے سامنے ہر غلط حرکت کرنے والا خود بخود سرنگوں ہو جاتا تھا، جھک جاتا تھا۔ وہ لوگ بھی چپ چاپ اُٹھے اور چلے گئے۔ کہاں گئے۔ کسی کو کچھ پتہ نہ چلا ——— (آگے صفحہ ۴۲ پر)

# یونیورسل اسٹوڈیوز ـــــ پرچھائیوں کا دیش

لاس اینجلز کی ترقی اور اہمیت میں کسی دوسری چیز کا دخل ہو یا نہ ہو، لیکن یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ امریکہ کی تین چوتھائی فلمیں ہالی وڈ ہی میں بنتی ہیں۔ جو کہ لاس اینجلز شہر کا ایک حصّہ ہے؛ جہاں کبھی ہالی نام کی سدابہار جھاڑیاں پائی جاتی تھیں (شاید آج بھی مل جاتی ہوں گی) اس کے پتّے نوکیلے اور خاردار ہوتے ہیں اور اس کے سرخ پھول گھروں میں سجاوٹ کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اب تو یہ 'خارزار' جنگل دنیا بھر کا فلمی مقدس مقام بن چکا ہے۔

ہالی وڈ کا نام ہی جوان لڑکے لڑکیوں کی دھڑکنیں تیز کرنے کے لیے کافی ہے اور بہت سے لوگوں کے لیے اُن کے سنہرے سپنوں کی تکمیل! لہٰذا لوگوں کا قصہ ہے جو امریکہ جائے، کیلی فورنیا تک پہنچے اور ہالی وڈ دیکھنے کی آرزو سے بیگانہ رہے! یہ بات دوسری ہے کہ ہالی وڈ مختلف لوگوں کے لیے مختلف معنی رکھتا ہو۔ میرا مقصد تو نہایت معصومانہ تھا ـــــ کچھ جان کاری۔ کچھ تجسس کی تکمیل۔

نیر آپا نے جو لاس اینجلز ہی میں رہتی ہیں، یونیورسل اسٹوڈیوز دیکھنے کی پُرزور سفارش کی تھی۔ اُن کے مطابق ڈِسنی لینڈ جیسی تفریح گاہ کو دیکھتے دیکھتے ٹانگیں جواب دے دیتی ہیں، لیکن یونیورسل اسٹوڈیوز کا بیشتر حصّہ تو آرام دہ ٹرام نما بس میں یا گدے دار سیٹوں میں دھنسے دھنسے ہی دیکھا جا سکتا تھا۔ مجھے تو یہ خاصی معقول وجہ معلوم ہوئی۔ لہٰذا ہم نے نیر آپا کے اس مشورے سے استفادہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔

وقت: صبح دس بجے۔ بروز: اتوار۔

جگہ: یونیورسل اسٹوڈیوز کا گیٹ۔ قافلے میں وہی ہم سب لوگ۔ آل ہمارا بیٹا۔ مدھو ہماری لاڈلی بہو۔ ترپت ہماری گرہستی کی بے تاج ملکہ۔ خاکسار اور ہم دونوں کا چہیتا پوتا اشیش ـــــ خالص ہالی وڈ اسٹائل میں کاؤبوائے سوٹ پہنے ہوئے (سنتے ہیں امریکی پریذیڈنٹ رونلڈ ریگن نے بھی اپنے فلمی کیریر کا آغاز انہی کاؤبوائے فلموں سے کیا تھا۔) اور تماشائیوں کی ایسی ہی قطار در قطار مگر منظم بھیڑ!

بہ ہر حال ساڑھے دس بجے تک ہم اندر تھے یعنی اسٹوڈیو میں (کسی اور معنی میں نہیں) اسٹوڈیوز کی سیر دو حصّوں میں بٹی ہے ـــــ ایک وہ جس میں ٹرام آپ کو اسٹوڈیوز کے مختلف حصّوں میں لے جاتی ہے۔ اور دوسرا وہ جہاں مختلف قسم کے شو آپ کی دلجوئی کا سامان بنتے ہیں۔ صاف ستھری خوب صورت ٹرام کی گدے دار نشستوں نے میری بیوی کو متوجہ کیا۔ لہٰذا ہم نے ٹرام کے سفر ہی کو فوقیت دی۔

ٹرام ہمیں گیٹ سے اسٹوڈیو کے اُس حصّے میں لے گئی، جہاں ہم نے ہالی وڈ کا ڈھول کا پول کھلتے دیکھا۔ اسٹار ٹریک (Startrek) اور اسٹار وارز (Star Wars) خلا اور کائنات میں بسی دوسری دنیاؤں سے متعلق وہ فلم سیریز ہیں جو ہندوستان کیا دنیا بھر کے ٹی۔ وی اور سینما میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ اسٹوڈیو کے ایک فلور پر خلا کا سیٹ بنا ہوا تھا۔ کچھ چھت سے لٹکے اور کچھ پس منظر میں کاغذ، پلاسٹک اور ربڑ کے سورج چاند، مرّیخ، زہرہ اور دیگر تارے و سیارے بنے تھے اور سیٹ عین وسط میں معلق تھا ایک خلائی جہاز جس میں ایک ہٹا دینے والی سیڑھی کے ذریعے داخلہ تھا۔ تماشائیوں میں سے ایک مرد اور ایک عورت کو (عورتوں کے برابری حقوق کا خیال رکھتے ہوئے) اس خلائی جہاز میں جانے کی دعوت دی گئی۔ ان دونوں کو خلائی سوٹ پہنا کر (بنا کسی ترتیب یا ٹریننگ کے!) اس جہاز میں بٹھا دیا گیا۔ الیکٹرانک آوازوں اور جلتی بجھتی روشنیوں کے درمیان، اس جہاز کو اوپر نیچے جھٹکے دیے گئے تاکہ جہاز کے خلائی سفر کا بھرم پیدا کیا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی پراجیکٹروں سے غالباً فلم چلا کر یا اسٹیج کے منظر کو تیزی سے سرکا کر خلا میں رفتار کا یقین دلایا گیا۔ چند ہی لمحوں میں یہ خلائی مسافر اسٹیج پر واپس اُتر آئے، جب کہ اسٹیج، خلا میں معلق جہاز اور ہم میں سے کوئی بھی ایک قدم تک نہ سرکا تھا!

ایک دوسرے سیٹ پر ہالی ووڈ کی یادگار فلم کانگ (King Kong) کا ایک منظر تھا، جس ایک لمبی اونچی گوریلا نما شخصیت، نیویارک کی بدوش عمارتوں کو مٹھی میں پکڑ پکڑ کر مسل تھا۔ کچھ ایسے ہی جیسے مشین سے چلنے والے کھلونے! یاد ہے کہ ۱۹۳۷ء میں اس فلم کو دیکھ کر ہم ان رہ گئے تھے۔ ہم سوچتے ہی رہ گئے تھے کہ یہ سے ممکن ہوا ہوگا۔

آڈیٹوریم سے نکل کر ہم اپنی اپنی ٹراموں جا بیٹھے۔ ہر ٹرام کے ساتھ ایک گائیڈ تھا۔ جو قدم قدم پر ہم کو ہالی ووڈ کے پُراسرار رازوں کی واقفیت کرا جا رہا تھا۔ اب یہ ٹرام ہمیں اُن گوداموں میں سے گزارتی ہوئی گئی، جہاں مختلف دوروں سے متعلق سامان پڑا تھا۔ قدیم روم اور یونان کے در و دیوار، سنگِ مرمر کے فوارے اور مجسمے، عالی شان عمارتوں کے مختلف وضع کے ستون جو تخیل کی پرواز کو اثر لگاتے تھے، افریقی اور میکسیکو کے قدیم دیوتاؤں کے مجسمے، چین اور جاپان کے پگوڈا، طرح طرح کے جوتے، کپڑے، نیزے، تلواریں، توپ اور بندوقیں ہر عہد کے قدیم زرہ بکتر۔ غرض سارے کا پورا عجائب گھر آپ کی آنکھوں کے سامنے بکھرا پڑا تھا۔ یہ سب سامان ہالی ووڈ کی مشہور یادگار فلموں میں استعمال ہو چکا تھا اور ہوتا رہے گا۔ گائیڈ ان تمام ساز و سامان سے وابستہ فلموں کے نام گنواتا جا رہا تھا۔ ٹرام اب ان گوداموں سے نکل کر کھلے میں آگئی تھی۔ دائیں بائیں جھاڑیاں اور بیابان تھا، جہاں اشارہ پاتے ہی کسی کھیت کھلیان میں مصنوعی آگ لگا دی جاتی۔ کہیں کوئی قدیمی ریلوے لائن کا منظر تھا، جہاں پرانے زمانے کے انجن اور ڈبے کسی حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔ کہیں جھیلیں اور پہاڑیاں تھیں، کہیں وہ خستہ حال پل تھا، جس کے ستون آپ کی نظروں کے سامنے گرنے لگ جاتے۔ کہیں ٹرام کے گزرنے کے ساتھ ساتھ پل بیٹھنا شروع کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہم سب کے دل بھی! ٹرام کسی نہ کسی طرح پل پار کر لیتی ہے۔ اور وہ تمام گرے ہوئے ستون خود بخود بحال ہو جاتے ہیں۔ کہیں آپ کسی سُرنگ میں سے گزرتے ہیں۔ تو سُرنگ گھوم جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ٹرام بھی! عورتوں کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔ کچھ سینوں کو تھام لیتی ہیں! ہر مرحلے کے بعد کچھ کھسیانی ہنسی کی آوازیں! بچوں کو اس سیر میں بہت مزا آرہا ہے!

ایک مقام وہ بھی تھا، جہاں ٹرام رُک جاتی ہے۔ سامنے گاؤں کی عمارتوں کے بیچ ایک بہت بڑا سا احاطہ ہے۔ لوگ ان عمارتوں کے برآمدوں میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یکا یک بجلی کڑکتی ہے اور موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی ہے ــــ بارش سے بچنے کے لیے لوگ اپنی اپنی چھتریاں کھول کر ان عمارتوں میں پناہ لیتے ہیں۔ کوندتی بجلیوں کے درمیان بارش کا زور اور بھی بڑھ جاتا ہے اور پھر ایک دم بپھرتے پانی کا ریلا ان عمارتوں کے بیچوں بیچ سے اُچھلتا، ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔ جیسے کوئی باندھ ٹوٹ گیا ہو۔ پانی کے اس ریلے میں بہا کر لے جانے والی بے پناہ طاقت ہے۔ آپ کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ تیزی سے بڑھتا ریلا پل بھر میں آپ کی ٹرام کو بھی بہا کر لے جائے گا۔ ٹرام کی سواریوں کے چہرے زرد ہو جاتے ہیں، لیکن جب یہ بپھرتا ریلا آپ کی ٹرام سے چند گز دُور رہ جاتا ہے، سامنے سڑک میں شگاف ہو جاتے ہیں اور سارے کا سارا پانی ان شگافوں میں سما جاتا ہے۔ سب اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔ کڑکتی بجلی اور بارش بند ہو جاتی ہے اور آپ کی ٹرام اپنے اگلے پڑاؤ کی طرف بڑھ جاتی ہے۔

ٹرام کئی سڑکوں کے درمیان سے گزرتی ہے۔ جب کہ دونوں کناروں پر مختلف شہروں کی نمائندہ وضع کی عمارتیں بنی ہیں۔ اور یہ لندن کی اسٹریٹ ہے تو یہ پیرس کی اور یہ میکسیکو کی۔ اسی مخصوص اسٹائل اور ساخت کی عمارتیں! وہیں کے نام اور انہیں زبانوں میں لکھے سائن بورڈ! ان عمارتوں کا سامنے والا حصہ ہر تفصیل کے ساتھ مکمل ہے۔ ان کے عقب میں مت جھانکیے گا ورنہ بانس بلّی ووڈ کے ڈھانچے ہی ملیں گے۔ ان میں سے ہر سڑک کسی نہ کسی مشہور فلم کے لیے فلمائی گئی ہے۔ انہیں سڑکوں کے ساتھ ساتھ وہ کوٹھیاں اور بنگلے بھی ہیں، جو ہالی ووڈ کے مشہور اداکاروں اور کبھی کبھار ان کے معاشقوں کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔

ٹرام اب ایک پُرسکون جھیل کے کنارے سے گزرتی ہے۔ جھیل کے اندر ایک کشتی میں بیٹھا کوئی شخص مچھلی پکڑنے والا کانٹا لٹکائے اطمینان سے ایک کتاب پڑھنے میں مشغول ہے۔ اچانک جھیل میں پانی بھرنا شروع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ ٹرام کے پہیے پانی میں ڈوب جاتے ہیں۔ اچانک جھیل میں سے ایک خونخوار وہیل جست لگا کر ٹرام پر حملہ کر دیتی ہے۔ تڑاپ! وہیل کا اندازہ غلط نکلا اور وہ ٹرام سے کچھ دُور ہی پانی میں گر جاتی ہے۔ یہ وہیل Jaws فلم کی جانی پہچانی آدم خور وہیل ہے۔ پانی کی لہریں اُٹھتی ہیں اور وہ مچھلی پکڑتا ہوا شخص کشتی سمیت اس مدوجزر کی نذر ہو جاتا ہے۔ ٹرام میں بیٹھے ہوئے مسافروں کے کپڑے پانی میں بھیگ جاتے ہیں۔ پھر پانی سڑک پر سے ہٹنے لگتا ہے اور ٹرام دھیرے سے چل دیتی ہے۔ وہ خونخوار وہیل جھیل کے دوسرے گوشے میں نمودار ہو جاتی ہے اور وہ اُلٹی ہوئی کشتی مچھلیاں پکڑتے ہوئے شخص کے ساتھ کتاب سمیت پھر سطحِ آب پر معمول کی طرح تیرنے لگ جاتی ہے۔ وہ کمبخت کتاب پڑھنے میں اتنا مصروف ہے کہ وہ آپ کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

کچھ ہی دیر میں ٹرام اُس پڑاؤ پر پہنچتی ہے، جہاں پیڑوں میں گھرے ہوئے ریستوراں اور ستانے کے لیے کئی مقام ہیں۔ یہاں ٹھہرتے

ساکن کار اور پھسلتے نظارے
پچھلی سیٹ پر : راوی اور بے تاج ملکہ ترپت
اگلی سیٹ پر مدھو اور ڈرائیور کی نشست پر آشیش
کیمرے کے پیچھے : اتل
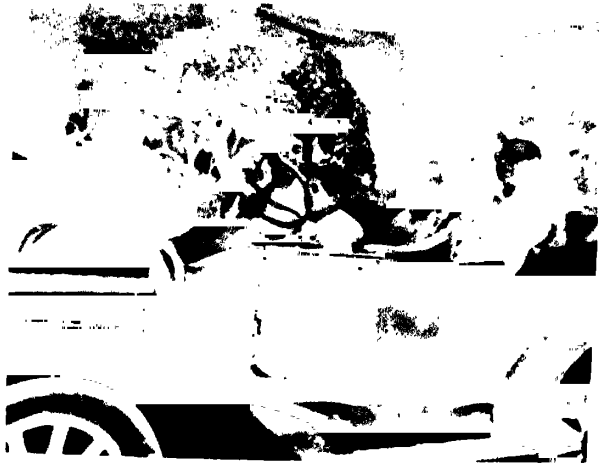
مقتل : شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے
بیوی کے اصرار پر زیادہ اور
بہو کے اصرار پر کم
ہم نے
یہ گردن زنی بھی
قبول کر لی

سے گرتا پانی بھی ہے اور آس پاس کا نظارہ کرتے کے لیے اونچائی پر ایک وسیع دالان بھی۔ یہاں طرح طرح کے ماحول میں فوٹو کھینچنے اور کھنچوانے کا اہتمام ہے۔ ایک سلاخ دار قید خانے کا سیٹ ہے، جس میں داخل ہو کر آپ اپنے آپ کو خطرناک مجرم بھی ثابت کر سکتے ہیں۔ میرا پوتا آشیش میرے جیل کے اندر جانے پر بہت اصرار کرتا ہے لیکن آخر میں وہ بے چارہ خود ہی پھنس جاتا ہے! ایک اور سیٹ ہے: جہاں پوری فیملی ایک پرانی فورڈ کار میں بیٹھ سکتی ہے۔ اور تیزی سے بدلتا پس منظر ساکن کار کے چلنے کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ چونکہ ماحول معصومانہ تھا۔ ہم سب نے اس کار میں بیٹھ کر فوٹو کھنچوائی۔

ایک اور جگہ اسپانوی گردن زنی کا سیٹ تھا، جہاں ملزم کے سر اور ہاتھ بنی ہوئی کھڑکیوں میں سے باہر نکالے جاتے۔ پاؤں تو خیر اس سیٹ میں پہلے سے ہی موجود تھے۔ البتہ سر پھنسانے کی ضرورت تھی۔ آپ ذرا اندازہ لگائیے کہ سر نکالتے ہی اگر کوئی تیز کلہاڑے کا وار کرے تو واقعی روح کانپنے کا سامان تھا!

چاروناچار بیوی کے اصرار پر زیادہ اور بہو کی رضامندی پر کم ہم نے یہ گردن زنی بھی قبول کر لی۔ نتیجے کے طور پر آئندہ پشتوں کو غیرت دلانے کے لیے یہ دل سوز نظارہ کیمرہ بند کر لیا گیا۔ ایک اور جگہ پر ایک رومن رتھ میں بیٹھ کر آپ کسی جولیس سیزر کی طرح فاتح عالم قرار دیئے جا سکتے تھے! جلوس تو خیر آتے جاتے لوگوں کی بھیڑ کی صورت میں موجود تھا لیکن یک زبان ہو کر نعرے لگانے والے تو اتل اور میری بیوی کے علاوہ اور کوئی نہ تھے!

اس ہاف ٹائم کے بعد شوز دیکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلا شو اے ٹیم کا تھا۔ جن بچوں اور بزرگوں کو امریکن ٹیلی ویژن میں کبھی کوئی دلچسپی رہی ہے، وہ اے ٹیم کے نام اور کارناموں سے بخوبی واقف ہیں۔ اے ٹیم ان سرپھرے جاں باز کے گروہ کا نام ہے، جو کسی بھی مظلوم کی پکار سن کر اس کی مدد کرنا اپنا فرضِ اولین سمجھتے ہیں۔ اسٹین گن بندوقوں، پستولوں سے لیس، جیپوں، موٹر سائیکلوں پر سوار یہ پلک جھپکتے ہی آپ کو (اگر آپ مظلوم ہیں) بدمعاشوں کے چنگل سے چھڑانے کے لیے آموجود ہوتے ہیں

اور خالص فلمی اسٹائل میں ان بدمعاشوں کی وہ پٹائی کرتے ہیں کہ بس دیکھتے ہی بنتی ہے۔ فلموں میں تو کٹ اور پس منظر کا سہارا لے کر تماشائیوں کو ورغلانا بہت آسان ہے لیکن یہاں تو آپ کی آنکھوں کے سامنے ہی دیدہ دلیری کے وہ جان دار رونگٹے کھڑے کر دینے والے مناظر حاضر تھے کہ ان پر یقین کرنا مشکل تھا۔ بیس فٹ کی چھلانگ دوڑتی جیپوں کی ٹکر اور آخری لمحے پر بچاؤ، موٹر سائیکل کے ہوا میں کودتے اور دلدلوں کو پار کرنے کے نظارے کسی زندہ سرکس کی طرح آپ کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ دل چسپی پیدا کرنے کے لیے یہاں بارود تھا! آگ بھی تھی اور شیکسپیئر بھی!

ایسا ہی ایک اور شو سٹنٹ مینز شو (Stunts Men's Show) یہاں بھی کہانی کے کردار اسی پھرتی، سوجھ بوجھ اور جان بازی کا دلیرانہ ثبوت دیتے ہیں، لیکن یہاں سیٹ ایک "ویسٹرن اسٹریٹ" کا تھا۔ جس میں ایک ہوٹل، ڈانس ہال، ریستوراں، اسٹور، سبھی کچھ موجود تھے۔ گولیاں، بندوقیں اور پستولیں یہاں بھی تھیں۔ دو منزلہ عمارتوں سے کود پھاند اور دو چار منٹ میں گولیاں برسنے کے منظر عام تھے۔ کچھ کردار خون سے (غالباً یہ ٹماٹر ساس ہی ہوگی) بار بار نہائے جاتے۔ شو شروع ہونے سے پہلے چارلی چپلن قسم کا ایک کردار تماشائیوں کو ان کی سیٹوں تک پہنچانے کی آڑ میں کبھی ان کے بچوں کو انگلی پکڑے نہایت معصومانہ طور سے والدین سے الگ لے جاتا۔ یا کبھی کبھار کسی عورت سے اشاروں ہی اشاروں میں یا شکلیں بنا کر مزاح کا سامان مہیا کرتا رہا۔ یہ سب کچھ اس طرح سے کہ بے چارہ شکار تو اس کی حرکتوں سے بے خبر رہتا۔ جب کہ باقی تماشائی اس کی حرکتوں کو دیکھ کر محظوظ ہوتے رہتے۔

ایک اور شو خالص ہالی وڈ اسٹائل کے علاوہ قدیم زمانے کے سیٹ پر دکھایا گیا۔ مدھم سرخ زرد روشنیوں کی لو میں یہ ایک ہزاروں سال پرانی پریم کہانی کو اپنائے ہوئے تھا۔ اس میں شہزادہ بھی تھا شہزادی بھی۔ قدیم دیوی دیوتا اور جادوگر بھی۔

روایت و حکایت (ہالی وڈ اسٹائل میں) اس میں شہزادہ بھی تھا شہزادی بھی، قدیم دیوی دیوتا اور جادوگر بھی!

تلواروں کی جھنکار، جادوئی کھیل اور دیوی دیوتاؤں کے معجزے بھی۔ ایسی کہانیاں اپنے مخصوص رنگ لیے ہوتی ہیں۔ کچھ لوگوں کو ایسی کہانیاں پسند آتی ہیں۔ خصوصاً بچوں کو۔ بہرحال ہم سب کو اس شو نے کچھ زیادہ متاثر نہیں کیا۔

سب سے زیادہ دل چسپ شو "کومیڈی اسکرین ٹیسٹ شو" تھا، جس میں شو میں حاضر تماشائیوں ہی میں سے اداکاروں کا انتخاب کیا جاتا ہے اور آپ کے سامنے فلما کر یہ فلم اسی شو میں آپ کو دکھائی بھی جاتی ہے۔ اسٹیج پر کہانی کو فلمانے کے لیے کئی ایکشن سیٹ لگائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک سیٹ بینک کا تھا جسے بعد میں معمولی سی تبدیلی کے بعد بیٹھنے کی دکان بنا دیا جاتا ہے۔ ایک وہ جہاں گھوڑے تماشائیوں نشستیں تھیں۔ ایک سیٹ جھیل کا تھا، جس کے سامنے کے حصے شیشے کے بنائے گئے تھے اور ایک ہوا میں معلق ہیلی کاپٹر کا۔ کہانی کچھ اس طرح کی ہے۔ ایک بینک میں ڈاکہ ڈالا جاتا ہے اور ڈاکو ایک تھیلی میں نقدی لے کر گھوڑے پر فرار ہو جاتے ہیں۔ بینک میں موجود ہیرو ان کا پیچھا کرتا ہے۔ ڈاکوؤں کو مجبوراً تھیلی پھینک دینی پڑتی ہے۔ جو جھیل میں مچھلیاں پکڑتے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کے جوڑے کی کشتی میں گر جاتی ہے۔ ڈاکو اور پیچھا کرتے ہوئے ہیرو کو تھیلی حاصل کرنے کے لیے جھیل میں کودنا پڑتا ہے۔ جب کہ وہ ادھیڑ عمر کا جوڑا اس تھیلی کو لے کر اپنے گھر چلا جاتا ——— راستے میں انہیں بیکری سے کچھ سامان خریدنا ہوتا ہے۔ ڈاکو اور نوجوان ان کے تعاقب میں بیکری پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں چھینا جھپٹی میں کریم سے لدے کیک ایک دوسرے کے چہروں پر فراخ دلی سے پھینکے جاتے ہیں۔ بہرحال ڈاکوؤں کا سردار تھیلی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ پلان کے مطابق ایک ہیلی کوپٹر سے فرار ہونے کے لیے بھاگ نکلتا ہے۔ پیچھا کرتا ہوا نوجوان ہیلی کوپٹر کے ساتھ لٹک جاتا ہے اور بالآخر تھیلی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اختتام میں پولیس اُسے انعام سے نوازتی ہے۔ ساری کہانی مار دھاڑ

ودا ایکشن سے بھرپور ہے۔ اور اداکاروں کو بولنے کی مہلت ہی نصیب نہیں ہوتی۔

اس کہانی کو فلمانے کے لیے ۳۰-۲۵ اداکاروں کی ضرورت تھی۔ ہر تماشائی کی دلی خواہش تھی کہ وہ کسی نہ کسی کردار کے لیے چن لیا جائے۔ ڈاکوؤں کے سردار کے کردار کے لیے انل بہت کوشاں تھا لیکن قسمت سے ہمارے قریب بیٹھے ہوئے ایک نہایت موٹے تازے نیگرو کو چن لیا گیا۔ ہمارے ہاں سے انل کے حق میں احتجاج ہوا کہ اس موٹے نیگرو کو چننے سے گھوڑے کی زندگی کے خطرے میں پڑنے کا امکان تھا لیکن کسی نے ایک نہیں سنی۔ البتہ بینک میں کیشئر کے رول کے لیے مدھو کا انتخاب ضرور ہو گیا۔ بیچارے چار سالہ پوتے اشیش کا اصرار تھا کہ وہ بطور کیشئر اسسٹنٹ ضرور جائے گا۔ آخر ذمہ داری کا معاملہ تھا۔ اُسے سمجھایا گیا کہ اسکرپٹ میں کیشئر کے اسسٹنٹ کا کوئی رول نہ تھا۔ یوں بھی اگر اس نے جوش میں آکر کہیں اس نیگرو پہلوان پر ممی کو بچانے کی غرض سے حملہ کر دیا تو اسکرپٹ اور تمام فلمی کہانی کا ڈھیر ہو جائے گا۔ آخر کار اُسے دو چاکلیٹ کی رشوت دے کر منا لیا گیا۔ ڈاکوؤں کے ساتھیوں کے رول کے لیے ہم میں سے کوئی تیار نہ تھا۔ ماہی گیر کی بیوی کے رول کے لیے میری بیوی جانا چاہتی تھی لیکن میں اسے کسی اور کی بیوی بنتے کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ پیچھا کرنے والے نوجوان ہیرو کے انتخاب کے لیے انل نے سب سے اونچا ہاتھ کھڑا کیا۔ لیکن سامنے والی قطار میں ایک نوجوان تمام امریکی آداب محلس کو خیرباد کہتا اپنی سیٹ پر ہی کھڑا ہو گیا تھا جس سے ڈائریکٹر کی نظر انل جیسے خوب رو نوجوان پر پڑ نہ سکی۔ یہ یقیناً اس صدی کی سب سے بڑی ناانصافی تھی! اس کے بعد ہم لوگوں کے دل بجھ جانے لازمی تھے۔ لہٰذا کسی بھی اور انتخاب کے لیے ہم نے بطور پروٹسٹ ہاتھ ہی کھڑا نہیں کیا۔ البتہ اشیش اپنا ہاتھ ہر بار ضرور کھڑا کرتا رہا، لیکن اُس بیچارے کی عمر کا کوئی رول ہی نہ تھا۔

ان تمام نووارد برینڈنیو (Brand New) اداکاروں کو اُن کی پوشاکیں پہنادی گئیں اور فلم کی شوٹنگ شروع ہو گئی۔ سب سے مزے دار تو گھوڑوں کی دوڑ تھی جب کہ ساکن گھوڑا نما نشستوں پر ایکٹروں کو بٹھا کر انہیں گھوڑوں کو 'سرپٹ' بھگانے کی اداکاری کرنا تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اداکار اپنی دانست میں گھوڑوں کو بھگا رہے ہیں۔ لیکن سیٹ پر کوئی بھی گھوڑا حرکت ہی نہیں کرتا البتہ اُن کے پیچھے لگے ہوئے اسکرین کو جس پر پہاڑ، درخت اور ٹیلے بنے ہوئے تھے، ضرور سرپٹ بھگایا جا رہا تھا۔ اسی طرح ہیلی کوپٹر سے لٹکا ہوا ہیرو ایک سیڑھی پر کھڑا سچائی کا رنگ دینے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ جھیل کی بلوری دیواروں میں سے ڈاکوؤں اور ہیرو کی پانی میں کشمکش اور دھکا پیل کے مناظر بھی خوب رہے۔

یہ سارا ایکشن پلے کوئی تیس منٹوں میں ہماری آنکھوں کے سامنے ہی فلمایا گیا اور آخری سین فلمائے جانے کے فوراً بعد ہی یہ دس پندرہ فٹ لمبائی کی تیار فلم اسکرین پر دکھائی جانے لگی۔ اسٹیج سے ہمیں بتایا گیا کہ فلم کے تمام اداکاروں کے نام Credits کے طور پر فلمانے کا سلسلہ جاری تھا اور ایک گھنٹے کے بعد جن تماشائیوں کو اس فلم کے پرنٹ درکار تھے، وہ سو ڈالر فی پرنٹ جمع کرانے پر وہ حاصل کر سکتے تھے۔

ہم ہندوستانیوں کے لیے سو ڈالر ابھی خاصی رقم تھی۔ لہٰذا مدھو اور ہم سب نے اس کا فلمی چہرہ اسکرین پر ہی دیکھنے پر اکتفا کی۔ اس کا صرف ایک کلوز اپ تھا —— دہشت زدہ چہرہ! مدھو کا کہنا تھا وہ سچ مچ اس کالے بھجنگ نیگرو کے تیور دیکھ کر ڈر گئی تھی جب اُس نے اس سے کیش کی تھیلی چھین لی تھی! وہ اس چہرے کو محفوظ کر کے اشیش کو کسی 'کسر نفسی' میں مبتلا نہ کرنا چاہتی تھی۔

یونیورسل اسٹوڈیوز کی سیر کا یہ آخری شو تھا، لیکن داخلہ ٹکٹوں پر انعام نکالنے کی رسم ابھی باقی تھی۔ یہ انعامات صرف بچوں کی ٹکٹوں تک ہی محدود تھے۔ اشیش کا نام یقیناً انعامی فہرست میں تھا۔ اُسے ایک رنگ دار ٹی شرٹ ملی، جس کے سینے پر لکھا تھا: "خبردار! مجھے اے ٹیم کا تعاون حاصل ہے!"

بیچارے انل اور مدھو کی شامت —— وہ بیچارے اب اشیش کو ڈانٹ ڈپٹنے کے بنیادی حق سے بھی محروم ہو چکے تھے۔

●●

بیت لال

# کچھ مسکراہٹ کے بارے میں

بچپن میں اردو کا قاعدہ پڑھا کرتے تھے
کا ابتدائی درس کچھ اس طرح تھا : "ماں بچے
د میں لیے بیٹھی ہے ۔ باپ پاس بیٹھا حقہ
رہا ہے ۔ جب بچہ بار بار مسکراتا ہے تو ماں
پ کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔" وغیرہ وغیرہ ۔
یا بچے کی مسکراہٹ پر ماں باپ دونوں جان
چھڑکنے کو تیار ہو جاتے ہیں ۔ یا یوں کہیے کہ
ں بچے کی مسکان میں دونوں جہان کی خوشیاں
یب ہو جاتی ہیں ۔

مسکراہٹ بچے کی ہو یا بڑے کی یہ زندگی
ایک بہت بڑی سعادت ہے جو ہر فرد و بشر
حصے میں نہیں آتی ۔ ہر مسکراہٹ سمندر کی
ں کی طرح آگے پھیلنے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔
ہرین نفسیات کا قول ہے کہ ہنستا ہوا انسان
سروں کو بھی ہنسنے کی دعوت دیتا ہے اور
ہنسی کا دوسرا نام ہے مسکراہٹ ۔ جس کی ہر جہت'
حالت میں اپنی ملائمت اور نرمی کے سبب دلکش
ر دل نواز ہوتی ہے ۔

مصور اور سنگ تراش اپنے شاہکاروں
ں بنائی ہوئی تصویر یا تراشے ہوئے پیکر کو لازماً
کراتا پیش کرتے ہیں ۔ اور سچ پوچھیے تو بغیر مسکان
کے مجسمے یا شبیہہ کی قدر و قیمت ہی کیا ہے ۔ یہی
وجہ ہے کہ مہاتما بدھ اور مونا لیزا کے مجسموں
میں چھپی مسکراہٹ آج ایک تاریخی حیثیت اختیار
کر چکی ہے ۔ ان دونوں کی زیر لب مسکراہٹ میں
جو دل کشی اور حسن پنہاں ہے ۔ اُس کی گہرائی
تک آج تک کوئی قدر دان پہنچ نہیں سکا ——
مسکراہٹ دراصل مصوری اور سنگ تراشی میں ایک
فنی کاریگری کا کام کرتی ہے — جب کسی تصویر
یا مجسمے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلا دی جائے تو
اُس میں جان پڑ جاتی ہے ۔ بھگوان بدھ کا مجسمہ
ہو یا سرسوتی کی تصویر ' ذرا غور سے دیکھیں تو آپ
کو ایک نیا حسن اور وقار اُن کی مسکراہٹ میں
ملتا ہے ، جو بڑے سے بڑے فنی کمال پر بھی
بھاری ہونے کا حکم رکھتا ہے ۔

ویسے مسکراہٹ مونا لیزا کی ہو یا [illegible] کی ۔
سرسوتی کی ہو یا لکشمی کی ۔ نفتو کی ہو یا رمضانی
کی ۔ اس کا ایک ہی رنگ ہے ایک ہی انداز ' ایک
ہی دل کشی ، ایک ہی حسن اور وہ یہ کہ ہر ایک کا دل
موہ لیتی ہے ۔ افسردہ کو بھی شگفتہ بنا دیتی ہے ۔
اس لیے ہر قیمت پر اس مسکراہٹ کو بنائے رکھنے
کا بلکہ نبھائے رکھنے کا نام ہی زندگی ہے ۔ بلکہ یوں
سمجھیے کہ اگر دنیا میں زندگی بسر کرنی ہے ' اسے
ہر طرح سے خوش گوار بنانے کی مساعی کرنی ہے تو
ہر طرح کے طور طریقوں سے مسکراہٹ پیدا کرنا ہوگی ۔

مسکراہٹ کے لیے جب دو لب وا ہوتے
ہیں تو ایک لکیر سی اُبھر آتی ہے ۔ یہ لکیر یوں ہی
پیدا نہیں ہو جاتی ، یہ اس کی ذات کے اندر کی
خوشبو اور خوش گوار نظریۂ حیات سے پیدا ہوتی
ہے ۔ اس لکیر کو ہم صرف مسکراہٹ کہہ سکتے ہیں ۔
کئی بار یہ لکیر پھیلتے پھیلتے بڑھتی جاتی ہے اور ایک
قہقہہ کی صورت میں بدل جاتی ہے ۔ اس صورت
میں کچھ آواز بھی پیدا ہوتی ہے ، جس میں آہنگ
تو نہ سہی ایک اونچی آواز ضرور ہوتی ہے ۔ یہ آواز
باچھوں کے بوجھ سے دفن ہو جاتی ہے ۔ یہ جب
ہوتا ہے جب مسکرانے والے کی باچھیں تو پوری طرح
کھل جاتی ہیں ، لیکن قہقہے سے آواز پیدا
نہیں ہوتی ۔ اسے بے آواز قہقہہ کہہ سکتے ہیں ۔ اور جب
آپ گلا کھول کر بلند آواز میں ہا ہا کرنے لگیں ' یہاں تک
کہ آپ کی بتیسی بھی نظر آنے لگے تو اسے مسکراہٹ
دنداں نما کہہ سکتے ہیں ۔ ایک ہلکی لکیر سے دنداں
نما تک مسکراہٹ کے کئی رُوپ ہیں ۔ کچھ خوش باش
لوگوں کا خیال ہے کہ مسکراہٹ تکلف اور قہقہہ
بے تکلفی کی علامت ہے ۔ اور یہ قول ایک حد تک
صحیح بھی ہے ۔

مسکراہٹ بڑا اثر رکھتی ہے اس میں کچھ خرچ
نہیں ہوتا اور مخاطب آپ کی مسکراہٹ یا آپ


ڈی ۔ ۴۱ ۔ گل مُہر پارک ، نئی دہلی ۱۱۰۰۴۹

مخاطب کی مسکراہٹ پر گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کسی اجنبی انسان کے پاس جو آپ کا کچھ فائدہ کر سکتا ہو، بڑی توقعات لے کر چلے جائیں تو آنحضرت آپ کی بات یا دلیل یا عرض داشت پر مسکرا دیں تو سمجھ لیجیے کام بن گیا۔ مسکراہٹ کا وار شاذ ہی خالی جاتا ہے۔ یہ عموماً حلال کر کے ہی دم لیتی ہے۔

ستم یہ ہے کہ مسکراہٹ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ صبر و قناعت، ضبط اور توکل پر خدا والا انسان ہی مسکراہٹ پیدا کر سکتا ہے۔ ورنہ ہر انسان اگر دنیاوی جھمیلوں میں کھو جائے تو اُسے اپنی ہی سُدھ بُدھ نہیں رہتی۔ ایسا بھلا مانس کیا مسکراہٹ پیدا کرے گا۔ کچھ یہ بھی صحیح ہے کہ انسان جتنا زیادہ ذہین، ذی حس اور پڑھا لکھا ہوگا، کچھ متین اور خشک رویّہ اپنائے گا جب کسی سے مخاطب ہوگا تو اس کی پیشانی پر سنجیدگی اور سکوت کے بل پڑنے لگیں گے۔ گفتگو کرے گا تو موبنہ بسور کر، کبھی کبھی ناک چڑھا کر اور بالعموم یوں صورت بنالے گا کہ آپ بے ساختہ کہہ اُٹھیں: "کیوں صاحب، آپ کیا رو رہے ہیں یا اُداس ہیں؟"

اس لمحہ اگر کوئی منچلا پاس بیٹھا ہوگا تو فوراً جواب دے گا "جناب' یہ رو نہیں رہے، ان کی شکل ہی ایسی ہے"۔ تو ایسی شکل والے افراد ہمارے سماج میں بکھرے ہوئے ہیں، جن کا مسکراہٹ سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ ان پر محض مسکرا دینا مناسب ہوگا۔

ابن الوقت، خود غرض اور مفاد پرست لوگ مسکراہٹ کو ایک فن کی طرح برتتے ہیں۔ ان کی مسکراہٹ کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ محض اپنے مفاد کا حصول۔ چنانچہ اگر پھیکی یا جھوٹی مسکان سے اگر ایسے صاحب کچھ مسکراہٹ کا تاثر پیدا کرنا چاہیں تو آپ شیکسپیئر کے مقولے کو ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ جو فرماتے ہیں: "کوئی مسکرائے۔ مکرّر مسکرائے اور مسکراتا ہی جائے تو سمجھ لیجیے کہ وہ آدمی ولین (VILLAIN) ہے۔"

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مسکراہٹ زندہ دلی کی علامت ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر انسان زندہ دل نہیں ہوتا۔ دوسروں کے واسطے مسکراہٹ کے ذریعے خوشی کے احساس کو زندہ و جوان رکھنا بڑے ظرف کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنتوں — مہاتماؤں اور صوفیوں نے اسے بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ ایسے پہنچے ہوئے لوگ بلکہ مہاپرش دل و جان سے مسکراتے ہیں۔ سماج کے ہر فرد کو خوش رکھنے کی خاطر اور اُسے نفسیاتی توانائی دینے کے لیے ضرور مسکراتے ہیں۔ ہر وقت ہر ہر مسئلے اور ہر حالت میں ایسے عظیم انسانوں کی کوئی شبیہ ملاحظہ کر لیجیے۔ ان کی مسکراہٹ پر آپ فدا ہونے کو تیار ہو جائیں گے۔ سنت کبیر داس تو ایک قدم اور آگے بڑھنے کے حق میں تھے۔ وہ تو مست ملنگ تھے ہی اور ان کا نظریۂ حیات بھی دنیا داری سے کوسوں دور تھا۔ اسی لیے انہوں نے فرمایا ہے کہ ہر حال میں مسکرانا تو چاہیے ہی۔ خواہ آدمی کی بساط ہو یا نہ ہو ہاں اگر بن پڑے تو مسکرانے کی بجائے ناچنا چاہیے۔

ایک ماہرِ نفسیات کا کہنا ہے کہ مسکراہٹ روح کی طرح ہر طرح کی ملاوٹ سے پاک و صاف رہتی ہے۔ اس میں بناوٹ کو دخل بہت زیادہ نہیں ہوتا۔ یہ بالعموم سونے کی طرح کھری ہے۔ جس پر ملمع کاری ممکن نہیں۔ اگر کچھ لوگ کاروباری یا سماجی مصلحت کی وجہ سے شگفتوں کی کھینچا تانی سے اگر مسکراہٹ کا انداز یا رنگ پیدا بھی کر دیں تو دور دیدہ نگاہیں اصلیت بھانپ لیتی ہیں — بالفرض آپ نہ بھی بھانپ سکیں تو بھی مسکراہٹ کی ہمہ گیریت پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ سونا آخر سونا ہے۔

بنیادی طور پر یہ باور کرنا پڑے گا کہ مسکراہٹ کا خمیر روح کے سکون اور قلب میں رواداری کے مادّے سے ہی تیار ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ والے لوگوں کے ہونٹوں پر اداسی یا یاس کی بجائے مسکراہٹ ثبت ہوتی ہے اور یہی پہچان ہے اللہ والوں کی روحانیت کی معراج کی۔ اُن کے صدقِ دل کی، اُن کے عرفان و آگہی کی، اُن کی طہارت و پاکیزگی کی۔ سوامی وویکانند ایک جگہ لکھتے ہیں: "اگر آپ ہر وقت خوش گوار موڈ میں مسکراتے رہیں تو آپ کا یہی رویّہ آپ کو خدا کا قرب نصیب کرائے گا۔ اس طرح کی قربت بڑی سے بڑی ریاضت اور پاکیزگی اور بندگی سے حاصل نہیں ہو سکتی۔"

فلم ہو یا ناول، سماجی زندگی ہو یا گھریلو زندگی جب ایک محبت بھرے دل سے محبت کا اظہار مقصود ہو تو یہ اظہار مسکراہٹ کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ خصوصاً دو اجنبی کرداروں یا دو محبت کرنے والوں میں مسکراہٹ اوّلین تعارف کا فرض و حق ادا کرتی ہے اور پھر یہ مسکراہٹیں بڑھتی جاتی ہیں اور ان مسکراہٹوں سے ہی ایک دن محبت کا تاج محل تعمیر ہو جاتا ہے۔ یہ بات الگ کہ ہر عاشق اپنی محبوبہ کے لیے اور ہر خاوند اپنی بیوی کے لیے تاج محل تعمیر کرانے کی توفیق نہیں رکھتا۔ اگر شاہ جہاں یہ توفیق رکھتا تھا تو اس کی مسکراہٹ تو امر ہو گئی۔ اور تاج محل میں ڈھل گئی۔ آج اسی تاج محل کی دیواروں کے سائے میں شادی شدہ جوڑے حتّٰی کہ بوڑھے مرد اپنی بوڑھی رفیقۂ حیات کے ساتھ مسکراتے ہوئے اپنی تصویر کھنچواتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے محبت اور مسکراہٹ کی ایک یادگار اپنی تصویر کی صورت میں محفوظ کر لی۔ مسکراہٹ کو ریکارڈ کرنے کا کیا جواز نکالا ہے آج کے لوگوں نے۔

کچھ سنجیدہ اور کج فہم لوگ مسکراہٹ کو بے وقوفی، دنیا داری یا لاپروائی کی پہچان قرار دیتے ہیں۔ آپ نے کسی پاگل کو قریب سے دیکھا ہے۔ اس کا مشاہدہ کیا ہے؟ وہ ہر وقت آپ کو کھلکھلاتا ملے گا لیکن

پاگل کی مسکراہٹ بالکل جداگانہ انداز کی ہوتی ہے۔ اسے اپنی یا سماج کی زندگی یا کسی قدر کی سمجھ ہی نہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ اگر آپ ہر بات دل پہ لگانا چھوڑ دیں تو مسکرانے کی گنجائشیں بڑھ جاتی ہیں۔ دل پہ لگانے کی بات بھی نقطۂ نظر کی بات ہے۔ جو لوگ زندگی کے نشیب و فراز میں مسکرانے کی اہمیت جانتے ہیں وہ ضرور مسکراتے ہیں۔ انہیں زندگی میں آئے دن کے حادثات و دشواریاں حواس باختہ نہیں کر سکتیں۔ وہ قید حیات میں بند غم کو ایک ضروری حصّہ تصور کرتے ہیں۔ ایسے خیالوں میں لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک کی ایک خوب صورت مثال پیش کرتا ہوں۔ وہ زمانہ برطانوی سامراج کا تھا۔ کچھ کانگریسی دیش بھگتوں نے پونہ میں موصوف کی ساٹھویں سالگرہ کی تقریب و جلسہ کا اہتمام کیا۔ جب جلسہ پورے جوبن پر تھا اور خود لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک حاضرین سے خطاب کر رہے تھے۔ اسی لمحہ ایک پولیس آفیسر اُن کے وارنٹ گرفتاری لے کر آ پہنچے۔ لوک مانیہ جی کو اشارہ سے بلایا گیا۔ انہوں نے حاضرین سے معذرت پیش کرتے ہوئے دو چار منٹ کے لیے رخصت لی اور اسٹیج سے اُتر کر پولیس آفیسر سے اپنے وارنٹ حاصل کئے۔ اُسے بڑے خلوص سے کرسی پیش کرتے ہوئے اپنے خطبہ کو ختم کرنے کی اجازت چاہی اور فوراً ہی لوک مانیہ جی ڈائس پہ پہنچ کر اپنی تقریر میں دوبارہ لگ گئے۔ اس طرح انہوں نے اپنی تقریر بڑے اطمینان سے ختم کی اور جب فارغ ہوئے تو ڈائس سے مسکراتے ہوئے نیچے اُتر آئے۔ اور پولیس آفیسر کو خطاب کرتے ہوئے کہا "چلیے صاحب، میں حاضر ہوں" ایسے حالات میں کتنے آدمی مسکرا سکتے ہیں۔

مسکراہٹ اور تہذیب ہم جولی ہیں۔ اگرچہ ان کا اپنا انداز، اپنی کیفیت اور اپنا رنگ ہے۔ ویسے آج کے سائنسی دور میں انسانی تہذیب بہت آگے نکل آئی ہے۔ ہزاروں میل کی مسافت طے کر چکی ہے اور بیرونی سسٹم میں بھی پار کئے ہیں۔ کئی منازل کو عبور کر کے اس کی پیش رفت جاری ہے۔ یہ صرف اس وجہ سے کہ آج کا انسان اپنی انفرادی و مجلسی زندگی کو ترقی و تعمیر پذیر دیکھنا چاہتا ہے۔ ایسی ترقی و تعمیر کی دوڑ میں انسان نے اپنی مسکراہٹ تو بڑی حد تک قربان کر دی ہے نہ وہ ستانا جانتا ہے نہ سانس لینا۔ چنانچہ اس کے لیے تو یہ بہت ضروری ہے کہ اپنے موڈ کو موافق و خوش گوار رکھنے کے لیے مسکرائے ضرور۔ اس طرح کی مسکراہٹ سے ایک تازگی، شگفتگی اور توانائی نصیب ہو سکتی ہے۔ اور یاسیت کی جگہ اُمید افزا فضا اور نظریہ پروان چڑھ سکتا ہے۔

آج کے انسان کو زندگی بسر کرنے کا آرٹ بھی آنا ضروری ہے۔ صرف ہماہمی اور مشینوں کی طرح بھاگ دوڑ ہی زندگی کا جواب نہیں اور زندگی کا آرٹ روپے پیسے، جلال و حشمت یا علم و حکمت سے نہیں آتا۔ مسکراہٹ قائم رکھنے اور اُسے نبھانے کے لیے دانستہ مساعی اور اپنے تئیں نیک نیتی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب یہ فرد کے اختیار و مرضی پر رہا کہ وہ مسکراہٹ سے توانائی اور تازگی حاصل کرنا چاہتا ہے یا نہیں۔

ایک طبقے کا خیال ہے کہ مسکراہٹ زندگی میں دھوپ چھاؤں کی طرح چلتی ہے۔ گولڈ اسمتھ مسکراہٹ کو ایک شراب سے تشبیہ دیتے ہیں، جو عمر اور علم کے ساتھ زوال پذیر ہوتی رہتی ہے۔ ویسے بیشتر ادیبوں اور مفکروں نے مسکراہٹ کے حق میں بڑے بڑے دلائل پیش کئے ہیں اور سنجیدہ فلسفیوں، مذہبی رہنماؤں اور مفکروں نے یہ جتلانے کی کوشش کی ہے کہ مسکراہٹ ہماری شخصیت کے نہاں خانے میں موجود ہوتی ہے۔ ہاں، یہ اُن لوازمات سے حاصل نہیں ہوتی، جو ہماری تفریح کا سامان پیدا کرتی ہیں۔ لیکن ایک بات صاف ہے کہ اگر ہماری روح مسکراہٹ کا جواز ڈھونڈے تو ہمیں زندگی کی ہر شے، قدرت کے ہر منظر، سماج کے ہر فرد سے تفریح و سکون میسر ہو سکتا ہے اور دُکھ نام کوئی چیز ہماری زندگی میں نہیں رہتی۔

روحانی مشاہیر اور اہلِ باطن نے مسکراہٹ کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا ہے کہ جس طرح اہلِ باطن دنیا میں اپنی مسکراہٹ کا جواز نکال لیتے ہیں، اُ طرح عام انسانوں کو بھی اپنی مسکراہٹ کا جوا تلاش کرنا ہو گا۔ اگر ہر حال میں مسکرانا اور راضی اپنا مطمع نظر ہو جائے، تو مسکراہٹ انسان کے قد چومتی ہے۔ ہر راضی بہ رضا مطمع نظر اپنانے کے بڑے ضابطے، صبر، استقلال اور حوصلے کی ضرور ہے اور اسی لیے مسکراہٹ کی ڈگر کٹھن معلوم ہو ہے اور بقول اقبال صاحب

ع : یہ کام ہیں انہی کے جن کے حوصلے ہیں ز

## بقیہ: آگ، راکھ اور کندن

کیوں کہ وہ اپنے گاؤں کبھی نہ لوٹے تھے۔

ہفتہ بھر بعد اُس شام ماں دفتر سے لو تو دیکھا کہ بیٹی اور دونوں بیٹے نہا دھو کر ا کپڑے پہن کر تیار بیٹھے ہیں۔ ماں نے سوالیہ نگا اُٹھائی تو اندرا نے مسکرا کر کہا "آج ہم سینما دیکھ چلیں گے۔"

پورنیما نے مسکرا کر کہا "کس خوشی میں؟"

"میں کلاس میں اوّل آئی ہوں۔ منوج او دلیپ بھی پاس ہو گئے ہیں۔"

پورنیما نے تینوں بچوں کو اپنے ساتھ چپٹ اُس کے آنسو اور مسکراتا چہرہ دیوار پر ٹنگی رانا صاحب کی تصویر سے مخاطب تھا، جیسے کہہ رہا ہو: "دیکھ پھر سے ویسا ہی ہو گیا ہے جی۔ تم دیکھ رہے ہو

ڈاکٹر کے وینکٹپ پوٹپ / راشد جمال فاروقی

# وہ بہادر

اساڑھ کا مہینہ۔ رات کے تقریباً آٹھ بجے کا وقت۔ گہرا اندھیرا آنکھوں میں چبھ رہا ہے۔ بارش کی بوچھار جسم میں پھریری اٹھا رہی تھی۔ سوبتا گوڑا دالان میں ایک دری پر بیٹھے لیمپ کی روشنی میں کچھ حساب کتاب دیکھ رہے تھے۔

باہر سے لنگا ہاتھ میں لالٹین تھامے آکر بولا۔" مالک! ندی کا پانی ساتویں سیڑھی تک چڑھ آیا ہے۔"

سوبتا گوڑا گھبرا کر ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور "چلو ذرا دیکھ آئیں" کہہ کر کمبل لپیٹ کر چل پڑے۔ سوبتا گوڑا لنگا کی طرف مڑ کر بولے "کل پانی کہاں تک چڑھا تھا؟"

لنگا بولا۔" کل اتنا پانی نہیں آیا تھا۔ آٹھویں سیڑھی تک ہی بہہ رہا تھا۔ پھر بھی سنا ہے کہ سارا کورے ہلّی بہہ گیا ہے۔ نچلے گھر والے رنگپّا گوڑا کا لڑکا ملا ہی نہیں۔ بڑا انرتھ ہو گیا۔"

گوڑا کے چہرے پر خوف کی لکیریں ابھر آئیں۔ گمبھیر ہو کر بولے "آج اوپر کیسی بارش ہے۔ تمہیں کچھ پتہ ہے؟"

"سنا ہے اوپر بہت زور کا مینھ برس رہا ہے۔ شرنگیری کی طرف تو پانی ایک منٹ کو بھی نہیں تھما۔" یہ کہہ کر لنگا لالٹین کی طرف دیکھ کر بولا "مالک! اِدھر دیکھئے پانی پانچویں سیڑھی پر بھی چڑھا آ رہا ہے۔" گوڑا نے نیچے دیکھا تو ان کا دل بیٹھنے لگا۔ چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ وہ گھبرا اٹھے۔ دونوں لوٹ کر گھر آئے۔

سوبتا گوڑا کی بیوی ناگمّا نے پوچھا۔ "کیا ہے رے لنگا! لالٹین لے کر باہر گئے تھے؟ ندی بہت چڑھ آئی کیا؟"

"ہاں ماں جی، ندی میں بے حساب باڑھ آ رہی ہے اور اوپر زوروں کی بارش ہو رہی ہے۔ سارا کورے ہلّی بہہ گیا ہے۔ بیچارے نچلے گھر والے رنگپّا گوڑا کا رامو ابھی تک ملا نہیں۔"

سوبتا گوڑا نے دالان سے پکارا "لنگا" لنگا کو کم سنائی دیتا تھا۔ اس نے سنا نہیں۔ انہوں نے پھر پکارا۔ تب ناگمّا بولی "اے لنگا۔ دیکھ باہر وہ پکار رہے ہیں، جا۔" لنگا اپنے لنگڑے پاؤں کو ٹیڑھے ٹیڑھے رکھتا چل دیا بے چارہ۔ اس کا سیدھا پاؤں بائیں پاؤں سے تھوڑا چھوٹا اور پتلا تھا۔ لنگا نے دالان میں جا کر پوچھا "کیا ہے مالک! کیوں پکارا ہے؟"

گوڑا بولے۔" ذرا دیکھ کر تو آ۔ اب پانی کہاں تک آ گیا؟"

لالٹین کی بتی اونچی کر کے کمبل کی اوٹ لے کر وہ ندی کی طرف چل پڑا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی گوڑا نے ناگا کو پکارا۔ آٹھ برس کا لڑکا بھٹی کے پاس سے بھاگا آیا۔ کھمبے کی آڑ میں کھڑے ہو کر اس نے پوچھا۔

"کیا ہے مالک؟"

گوڑا نے پوچھا "سارے مویشی باندھ دئے تا؟"

"ہاں مالک سب باندھ دئے ہیں۔ تِنگا اور ناٹا بیل دونوں گوٹھ آئے ہی نہیں۔"

"جانے دے۔" کہتے ہوئے گوڑا تکیہ کے سہارے ادھ لیٹے ہو گئے۔

لنگا اپنے بیٹے ناگا کے ساتھ گوٹھ میں چلا گیا۔ تب تک ناگمّا نے پانی رکھ پتّل لگا دیے۔ سوبتا نے اٹھ کر لوٹے کے پانی سے کُلّی کی اور کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ تِمّو اور سیتا دونوں بچے باہر آ کر لالٹین کی روشنی میں گپتیں ہانکنے لگے۔ لنگا اور ناگا بھی گوٹھ سے اٹھ کر آ گئے۔ اور ہاتھ پیر دھو کر وہیں لکڑی کے ایک تختے پر بیٹھ گئے۔ لنگا اور ناگا کے ساتھ تِمّو اور سیتا

● لے۔ ۱۲۵۸۔ آئی۔ ڈی۔ پی۔ ایل' ویربھدر' دہرہ دون ۲۴۹۲۰۲

بڑی بے تکلفی تھی۔ رمتو نے پوچھا: "لِنگا، ...ری پوری طرح چڑھ آئی ہے؟"

لِنگا بولا "نہیں بھیا۔ ہمیشہ جیسی ہی ہے"۔

سیتا نے ان باتوں کی طرف دھیان نہیں ... وہ خالی الذہن تھی، لیکن جب اس کی ...یں لِنگا کے ہاتھوں اور پیروں کی گانٹھوں پر ...، تو وہ پوچھ بیٹھی۔

"لِنگا یہ نشان کیسے ہیں تیرے پیروں ہاتھوں کی گانٹھوں پر؟"

لِنگا کا مونہہ فق ہو گیا۔ وہ گُنگ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ اپنی کہانی سنانے ... لِنگا جیسے سیدھے سادے آدمی کی جیل خانے ...ات سن کر تمو کے پھول جیسے دل پر بجلی سی ...۔ اس نے پوچھا "کیا؟ تم بھی جیل گئے تھے؟ ...دن بھلا مالک تھا، جس نے تمہیں جیل بھیجا؟

"میں پہلے ماون پلی میں رنگ نایک ...ھر کا کام کرتا تھا۔ کیا کریں بھیا جی۔ ایسے ...یے لوگوں کی صحبت میں پڑ کر شراب پینے کی ...پڑ گئی۔ ایک دن صبح صبح چڑھالی۔ دماغ چڑھ گیا۔ پتہ نہیں کلال نے اس میں کیا ...دیا تھا نشہ تیز کرنے کو۔ مالک کے بیٹے کا ...شیش نایک ہے۔ ان کو بھی چڑھی ہوئی تھی۔ ...یچھے سے کہیں سے آئے اور جو مونہہ میں آیا بکنے ...۔ مجھے بھی نشے میں یاد نہیں رہا کہ مالک ...، بیٹے ہیں۔ میرے بھی جو مونہہ میں آیا بک گیا۔ ...ر میں دونوں میں ہاتھا پائی ہوئی۔ اُنہیں ...ت چوٹ لگی۔ اُنہوں نے رپٹ کر دی۔ میں ...یب آدمی تھا، اس لیے جیل ہو گئی۔"

آخری دو جملے کہتے کہتے اس کا گلا رُندھ ...ا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ بچوں کی طرح ...نے لگا۔ سیتا کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ تمو ...ہ سوچتا ہوا خاموش رہا۔ لِنگا کا دل ذرا شانت ...وا تو "کتنے برس کی جیل ہوئی تھی؟" تمو نے ...چھا۔

"دو سال کی بھیا جی"۔ "کیا اس کے بعد بھی کچھ سُکھ ملا؟" "وہ بھی نہیں! سارے رشتہ داروں نے مجھے دھتکار دیا۔ جیل جرکاٹ کر آیا تھا۔ میں بیٹے کو ساتھ لیے بھٹکتا رہا۔ بعد میں کسی نے کہا۔ شولور سومنا گوڑا کے یہاں چلا جا۔ سو یہاں آ گیا۔ تمہارے رحم دل پتا جی نے روٹی کپڑا دے کر مجھے بچا لیا۔"

لِنگا کے کہانی ختم کرتے ہی تمو نے ایک طویل سانس بھر کر کہا۔ "لِنگا! اب تم ہمارا گھر چھوڑ کر کبھی نہ جانا۔ ناگا بھی یہیں رہے گا۔"

بجلی، آندھی اور بارش کا آسیب رات بھر ناچتا رہا۔ گھر میں سب سو گئے۔ صرف لِنگا اور سومنا صحن میں بیٹھے جاگتے رہے۔ دونوں بار بار جا کر ندی کا پانی دیکھ آتے۔ پانی بڑھتا ہی آ رہا تھا۔ گوڑا نے پوچھا—— "لِنگا، ناؤ کہاں بندھی ہے؟ شاید گھر چھوڑنا پڑ جائے؟"

لِنگا ذرا گھبرا کر بولا۔ "اُس تُرش آم کے پیڑ کی جڑ سے باندھی تھی۔ شاید پانی وہاں تک چڑھ آیا ہوگا۔ اب وہاں کیسے پہنچ پائیں گے؟" یہ کہہ کر وہ لالٹین لے کر بھاگا۔ سومنا بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگے۔ پانی آم کے پیڑ تک آ پہنچا تھا۔ دونوں کو کچھ دیر تک کچھ بھی نہیں سوجھا۔ چُپ چاپ ندی کی طرف دیکھتے رہے۔ اتنے میں گھر کے پچھواڑے کچھ گرنے کی آواز سنائی دی — دونوں اس طرف بھاگے۔ گھر کی دیوار گر پڑی تھی۔ پانی آنگن میں بھر رہا تھا۔ گوڑا کو لگا کہ اب دیر کرنے میں تباہی ہے۔ اُنہوں نے گھر کے تمام لوگوں کو جگایا وہ سب آدھی نیند میں ہی باہر کی طرف بھاگ آئے۔ ہوا کے تیز جھونکوں میں لِنگا کی چیخ اُبھری۔ "مالک! رسّی پکڑ کر کھینچیے"۔ گوڑا نے ایسا ہی کیا۔ ناؤ کنارے پر آ گئی۔ لوگ اندر سے چلّانے لگے۔

"لِنگا ناؤ کو دروازے پر لگاؤ"۔ نوکرانی سومکا مونہہ پھاڑے ہانپتی کانپتی بھاگی چلی آ رہی تھی۔ گوڑا کو دیکھتے ہی چیخ اُٹھی۔ "اوپر والی دیوار گر پڑی ہے۔ صحن میں پانی گھس آیا ہے۔" گوڑا فوراً صحن میں آئے اور بولے۔ "تم سب پھاٹک کی طرف بھاگو جلدی سے۔ لِنگا ناؤ لا رہا ہے۔ اے ناگا تو اِدھر آ۔" ناگا دوڑ کر آیا۔

ناگمّا، تمو، سیتا، لوکما، سومکا کی بیٹی داستما سبھی پھاٹک کی طرف دوڑے۔ سومکا بچّے کے لیے چھوٹی پوٹلی لانے کے لیے گئی تو لوٹی ہی نہیں۔ گوڑا بولے۔ "ناگا ایک پیٹی اُٹھا۔"

اُس نے ایک پیٹی اُٹھائی۔ دوسری گوڑا نے اُٹھالی۔ لِنگا سب کو ناؤ میں بٹھا کر اس کا سرا پکڑے کھڑا تھا۔ گوڑا نے دونوں پیٹیاں ناؤ میں رکھ دیں اور ناگا کو بھی اُٹھا کر ناؤ میں بٹھا دیا۔ اور اُچھل کر ناؤ میں چڑھ گئے۔ لِنگا کو بلاتے ہوئے اُنہوں نے چپّو سنبھال لیا۔ سیتا ناگمّا سے بولی۔ "ماں! سومکا کہاں ہے؟"

تبھی گھر گرنے کی آواز میں ایک چیخ کی آواز بھی سُنائی دی۔ داستما نے بھی سومکا کی اُمید چھوڑ دی۔

ناؤ بہت چھوٹی تھی صرف پانچ چھ آدمیوں کے بیٹھنے بھر کی اور اس وقت اس میں سات عدد گھُسے تھے۔ اوپر سے دو پیٹیاں بھی۔ لِنگا کے لیے جگہ ہی نہیں تھی۔ وہ کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ ناؤ بہ حفاظت کنارے تک نہ پہنچ پائے گی اس بارے میں تشویش تھی۔ دیر تک سوچتے دیکھ کر گوڑا نے لِنگا کو ڈانٹا۔ "اے لِنگا دیر کیوں کر رہا ہے، جلدی آ"۔ لِنگا بولا۔ "مالک! جگہ ہی نہیں ہے۔ پہلے ہی ناؤ میں وزن زیادہ ہے۔ اگر میں بھی بیٹھ گیا تو ناؤ پار کیسے لگے گی؟"

گوڑا کو غصّہ آ گیا۔ لِنگا کو زور سے ڈانٹ کر ناؤ پر آنے کا حکم دیا۔ لِنگا چُپ چاپ ناؤ کے سرے کنارے پر چپّو سنبھال کر بیٹھ گیا۔ گوڑا نے اپنی بندوق سے دس بارہ گولیاں داغ دیں۔ ناؤ چل پڑی۔ تیز بارش، ہوا اور اندھیرے میں گولیوں کی بازگشت سے میلیناڈ کے گمبھیر پربت کانپ

اُٹھے۔ دُور کے گاؤں میں لوگ جاگ اُٹھے اور اس آواز پر تبصرے کرنے لگے۔ دو میل دُور لوگے ہل کے گھر میں رام گوڑا اور سدّھے گوڑا جاگ رہے تھے اور حیران ہو کر ہر طرف دیکھنے لگے۔ سدّھے نے رام سے پُوچھا :

"بھیّا، بندوق کی آواز سُنائی دی نا؟"

رام گوڑا نے پُوچھا "کدھر سے آئی تھی ؟"

"لال مٹی کے ٹیلے کی طرف سے آئی لگتی ہے۔"

"شاید نہیں ! مجھے لگتا ہے یہ آواز شولور کی طرف سے آئی تھی۔"

"کہیں باڑھ واڑھ تو نہیں آگئی۔ چار چھ آدمی ساتھ لے کر چلتے ہیں۔"

گوڑا نے ناؤ میں رکھی ہوئی دونوں قیمتی پیٹیاں اُٹھا کر پھینک دیں۔ پھر بھی وزن کم نہ ہوا۔ عورتوں اور بچّوں نے رام رام چلّانا شروع کر دیا۔ ناؤ پاگلوں کی طرح چکّر کھا رہی تھی۔ ایک بار پانی بھی آگیا اور ناؤ ڈوبتے ڈوبتے بچی۔ عورتوں اور بچّوں کی چیخ پکار سے لِنگا کا دل بیٹھنے لگا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اب ناؤ بیٹھ جائے گی۔ وہ ناؤ کو بچانے کی ترکیب سوچنے لگا۔ وہ سوچتے سوچتے بہت سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے چپّو چلانا بند کر دیا۔ اندھیرا ایسا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اگر وہ ندی میں کُود جائے تو وزن کم ہو جائے گا۔ اور سب لوگ بہ حفاظت کنارے پہنچ جائیں گے۔ جب دنیا نے اُسے چور کہہ کر دھتکار دیا تھا تو جس نے اُسے سہارا دیا اُس کے خاندان کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیے۔ اُس نے چپکے سے چپّو ناؤ میں رکھا اور کُودنے کو تیار ہو گیا کہ ناگا کے خیال نے اُس کے قدم پکڑ لیے ــــ وہ ایک پل رُکا۔ ناؤ میں پھر رام رام کا شور ہوا۔ اور وہ بھی رام رام کہتا ندی میں کُود گیا۔ اس شور وغل، ہوا، بارش اور اندھیرے میں یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو سکی۔ وزن کم ہوتے ہی ناؤ آرام سے چل نکلی۔ گوڑا بولا "لِنگا، اب بھگوان کی کِرپا سے ناؤ ٹھیک چل رہی ہے۔" بھگوان کی کِرپا میں لِنگا کی کِرپا بھی شامل تھی ؛ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ اتنے میں عورتیں اور بچّے روشنی روشنی پکار اُٹھے۔ سوبنّا گوڑا نے مُڑ کر دیکھا تو پاس ہی ندی کے کنارے پانچ چھ لالٹینیں نظر آئیں۔ روشنی میں دس بارہ آدمی نظر آئے ــــ بندوق چلنے کی آوازیں بھی آئیں۔ ناؤ آہستہ آہستہ کنارے سے جا لگی۔

نوگے ہل کے سدّھے گوڑا اور رام گوڑا دوڑ کر آئے اور سنبھال کر سب کو ناؤ سے اُتارا۔ سوبنّا گوڑا "اُف" کہتے ہوئے ناؤ سے اُترے۔ سب خوش تھے کہ چلو کنارے لگے۔ اس خوشی کے موقع پر لِنگا کی یاد نہ آنا کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ناگا رو رہا تھا۔ سدّھے گوڑا نے پوچھا "کیوں بیٹا، کیا ہوا ؟" وہ بلک بلک کر روتے ہوئے بولا۔ "پتاجی !"

سوبنّا کا چہرہ فق ہو گیا۔ جھٹ سے اُٹھ کر اُنھوں نے لِنگا کو پکارا۔ جنگل میں بازگشت گُونجی۔ لیکن لِنگا کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ گاؤں کی طرف بھاگے۔ وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ ظالم ندی گھور اندھیرے میں موت کا اندھا کنواں بنی ہوئی تھی۔ ان کا دل کانپ اُٹھا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ لِنگا کا نام لے کر پھپھک پڑے۔ ناگا بھی بے تحاشا رو رہا تھا۔ تمّو اور سیتا بھی رونے لگے۔

"ہمارے گھر کی روشنی چلی گئی !" کہہ کر سوبنّا گوڑا بین کرنے لگے۔ لِنگا کی غیر متوقع اور انجان موت پر وہ سب لوگ بے حد اُداس تھے۔ کسی کی سمجھ میں بھی نہ آیا کہ لِنگا کیوں کر ندی کا شکار ہوا۔ چار چھ آدمی کناروں پر تلاش کے لیے چلے گئے۔

رامے گوڑا نے سب سے نوگے ہل چلنے کے لیے کہا۔ راستے بھر لِنگا کی گمشدگی کا تذکرہ ہوتا رہا اور وہ سبھی نوگے ہل پہنچ گئے۔

صبح ہوئی۔ بارش ابھی جاری تھی۔ تھکا ہوا چُور سوبنّا گوڑا بستر پر لیٹے لیٹے رامے اور سدّھے کو گزشتہ رات کی قیامت خیزیاں بتاتے رہے۔

اتنے میں آنگن میں شور مچا "لِنگا آگیا لِنگا آگیا !"

سوبنّا اُٹھ کر باہر بھاگے۔ دوسرے تمام لوگ ان کے پیچھے پیچھے باہر کی طرف بھاگے۔ واقعی لِنگا آگیا تھا۔ ناگا دوڑ کر "پتاجی" کہہ کر اس سے لپٹ گیا۔ لِنگا کا پورا جسم کیچڑ میں لت پت تھا۔ نقاہت کی وجہ سے وہ کانپ رہا تھا۔ جلدی جلدی اُس کے کپڑے بدلوائے گئے۔

بعد میں سوبنّا گوڑا نے اس کے بستر کے پاس بیٹھ کر پُوچھا "لِنگا یہ سب کیوں ہوا ؟"

لِنگا نے بہت نحیف آواز میں جواب دیا "چپّو چل رہا تھا مالک ! ایک بار ناؤ نے جھٹکا دیا اور میں پھسل کر ندی میں جا گرا۔ ناؤ پکڑنی چاہی، لیکن وہ آگے نکل گئی تھی۔ تھوڑی دیر تیر کر نکلا تو بھگوان کی کِرپا سے زمین ملی۔ کھڑا ہوا تو پانی کمر تک تھا۔ ویسے ہی کھڑا رہا۔ صبح تک ندی اُتر گئی۔ آپ کے احسانات کا بدلہ ابھی چکانا تھا۔"

گوڑا بولے "ارے چپّو چلانے والا پھسل کر گرا تو چپّو ناؤ میں کیسے رہ گیا ؟"

"پتہ نہیں مالک ! بھگوان ہی جانے"

●

## قلم اور آواز

مصنف : اندرجیت لال

قیمت : ۳۰ روپے

ناشر : سلوچنا پرکاشن، نئی دہلی

ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

بچوں کے ادیب کی حیثیت سے اندرجیت لال نمایاں شہرت کے مالک ہیں ۔ اس میدان میں بارہا حکومت کی طرف سے اُن کی غیر معمولی خدمات کا اعتراف ہوا ہے ۔ دراصل بچوں کے ادیب دو طرح کے ہوتے ہیں ۔ ایک وہ جو جرم، جاسوسی یا تخئیلی قصّہ کہانیوں کی شکل میں بچوں کا دل بہلاتے ہیں یا اُن کے ذوقِ تجسّس کی تسکین کرتے ہیں ـــــ دوسرے وہ جو قومی، تعلیمی اور تہذیبی ضرورتوں کے تحت بچوں کو اپنی حیات افروز تحریروں کی شکل میں ایسی غذا بہم پہنچاتے ہیں، جو اُن کے ذہن، شعورِ حیات اور جذبات کی تربیت کرتی ہے اور ان کی بہترین صلاحیتوں کو اُجاگر کر کے ان کے کردار کی تشکیل کرتی ہے ۔

اندرجیت لال دوسری قسم کے ادیب ہیں ۔ اُنہوں نے سائنس، زراعت، ادب اور قومی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو لے کر بچوں کے لیے بڑی خیال انگیز اور دلچسپ کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے بیشتر انعام پا چکی ہیں ۔

زیرِ نظر تصنیف "قلم اور آواز" ایسے سنجیدہ مضامین پر مشتمل ہے جو نسبتاً بڑے بچوں کو ذہنی غذا فراہم کرتی ہے ۔ اس میں سائنس اور ادب کے علاوہ فنونِ لطیفہ کو بھی موضوع بنایا گیا ہے ۔ میرے نزدیک اس کتاب کا سب سے اہم اور دلچسپ مضمون : " اور بات اپنی " ہے ۔ اندرجیت لال نے اس مبسوط مضمون میں، جو انشائیہ کے پیرایہ میں لکھا گیا ہے، خود اپنی زندگی اور مشاغل کی داستان رقم کی ہے ۔

یہ مضمون اردو کے ایک ممتاز اور باکمال ادیب کی زندگی کو سمجھنے میں بڑی اہمیت کا حامل ہے ۔ اندازِ بیان انتہائی دلچسپ ہے ۔

اس کتاب میں ابتدائی چار مضامین فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھتے ہیں چونکہ مصنّف کو مصوری سے خاص شوق رہا ہے ۔ اس لیے پہلے مضمون میں اُنہوں نے جدید فنِ مصوری کے بعض نکتوں کو بڑی وضاحت سے سمجھایا ہے ۔ دوسرا مضمون عہدِ حاضر کے ایک دقیق موضوع "جمالیات" کے بارے میں ہے ۔ اس میں ہیگل اور کیٹس سے لے کر سارتر تک فن و ادب کی جمالیات کے بارے میں بنیادی تصورات پر روشنی ڈالی ہے ۔ لیکن یہاں وہ کروچے کی اظہاریت اور حسن کی اضافیت کے تصورات سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں ۔ تصورِ حسن کے ارتقائی عمل اور اس کی افادیت کے تصورات پر اُنہوں نے روشنی ڈالی ہے ۔ عہدِ حاضر میں مارکسی جمالیات کے بارے میں بھی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ اندرجیت لال نے ان کے حوالے سے اس موضوع کا احاطہ نہیں کیا اور اس طرح یہ مضمون ادھورا رہ گیا ہے ۔ تاہم ہمارا فنِ تعمیر" اور" سائنس میں نظریاتی ارتقاء" اس کتاب کے اہم مضامین ہیں ۔ یہ مضامین بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے معلوماتی بھی ہیں اور خیال افروز بھی ۔ ان کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان کے قدیم فنِ تعمیر اور ایرانی و وسط ایشیائی فنِ تعمیر کے مختلف اسالیب میں عہدِ مغلیہ میں ایسا حسین امتزاج پیدا ہوا اور وہ ایسے کمال تک پہنچا کہ اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی ۔

ادب اور سائنس اور ممتاز نقاد شاعر ٹی ۔ ایس ایلیٹ پر مضامین بھی قیمتی معلومات بہم پہنچاتے ہیں ۔ ادب اور سائنس دونوں کی تعریفیں متعین کر کے اُنہوں نے بتایا ہے کہ دونوں میں کوئی بیر نہیں ۔ اس لیے کہ دونوں کی بنیاد خیال ہے ۔ نیا خیال دونوں کو امارت بخشتا ہے ۔ دونوں کے راستے مختلف ہیں، لیکن منزل ایک ہے ۔ دونوں ہی انسان کی خدمت گزاری کا ذریعہ ہیں ۔

اندرجیت لال کے یہ مضامین اردو کے نوجوانوں کی ہمہ جہتی تربیت کرتے ہیں اور عہدِ حاضر کے علوم و فنون کے بارے میں ایک مربوط عقلی زاویۂ نگاہ پیش کرتے ہیں ۔

## دھواں دھواں

شاعرہ : نسیم نکہت

قیمت : ۲۰ روپے

ناشر : نسیم نکہت، بالمقابل شاہی دواخانہ، وکٹوریہ گنج لکھنؤ ۲۲۶۰۰۴ (یو۔پی)

نسیم نکہت کے مجموعۂ کلام " دھواں دھواں " کا مطالعہ اس حقیقت کی تلخی کو کچھ کم کر دیتا ہے کہ ہم عصر ادب میں ہندوستان کی نوجوان خواتین اپنی شناخت کم قائم کر پائی ہیں ۔ لکھنؤ کی یہ حساس اور اداس لڑکی جو بچپن سے تنہائی اور آزردگی کا شکار رہی اور خود کا

جس کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ اب موسموں اور فطرت کی معصوم اداؤں کو اپنا ہم نوا بنا کر اس نے انکشاف ذات کی ایک نئی وادی میں قدم رکھا ہے۔

تنہائی، محرومی اور اداسی کے اس کربناک سفر کی روداد نسیم نکہت کے اس مجموعۂ کلام میں کہیں روشن اور کہیں دھندلے حروف میں لکھی نظر آتی ہے۔ بے شک ان کا کلام انکے اپنے سلگتے وجود کی شکست و ریخت کا آئینہ ہے لیکن بین السطور میں ان لاکھوں ہندوستانی خواتین کی محرومیوں اور صعوبتوں کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے، جو مردوں کے اس بے رحم سماج میں جنم لیتی ہیں۔

غزل ہو یا نظم نسیم نکہت نہایت سادہ اور بے ساختہ لب و لہجہ میں اپنی بات کہنے پر اصرار کرتی ہیں۔ آراستگی، صناعی یا بعض جدید شعراء کی طرح لفظوں کے ہیر پھیر سے وہ کام نہیں لیتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کہیں کہیں اُن کے اظہار و ادا میں خام، کھردرا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا خود انہیں اعتراف ہے۔ لیکن اُن کے پاس کہنے کو اتنا کچھ ہے اور اُن کے تجربات میں ایسی تہہ داری ہے کہ کسی صورت اُن کو الفاظ میں ادا کر دینا بھی ایک سچے فن کار کی طرح اُن کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ فنی اظہار کے دوسرے مسائل فکر و کاوش اور مشق کے ساتھ خود حل ہو جائیں گے۔

ایک مشکل ردیف میں یہ غزل دیکھئے:

گھلوں میں پھیلا ہے سنسان بن کا سناٹا
بہت مہیب ہے ایک بدن کا سناٹا

کوئی صدا کوئی آہٹ سکوت کو توڑے
گُلوں پہ بوجھ بنا ہے چمن کا سناٹا

میں پچھلی رات اکیلی تھی اپنے آنگن میں
مجھے ڈراتا رہا میرے من کا سناٹا

ہوس تھی چاند کے دل میں سحر کی کیوں نکہت
عروسِ شب کو ملا ہے کفن کا سناٹا

ان اشعار میں سادگی کے باوجود شدّتِ احساس اور معنی کا جہاں آباد ہے۔ ہر امیج اور ہر استعارہ میں تازہ کاری کا احساس ہوتا ہے اور یہ بھی کہ ان اشعار میں ایک ایسی تخئیلی فضا، ایسا لہجہ نکھر رہا ہے، جیسے اپنی انفرادیت کو منوانے میں دیر نہیں لگے گی۔ یہاں یہ واضح رہے کہ نسیم کوئی بہت کہنہ مشق شاعرہ نہیں ہیں۔ وہ لکھنؤ یونیورسٹی کی طالبہ ہیں اور شاعری کے میدان میں نو وارد ہی کہی جائیں گی۔ اُن کے اشعار سے واضح ہے کہ انہوں نے اپنے غم گزیدہ اور شکستہ وجود کے حوالے سے نئے شعری پیکر تراشے ہیں۔

افتادگی، ذلت اور کرب و اذیت کا یہ احساس جو ان کے پیشتر اشعار میں نمایاں ہے انفرادی ہو کر اجتماعی جہت رکھتا ہے۔ ان کے لفظی پیکر اس سماج میں عورت کی انتہائی مظلومی اور بے بسی کا دردناک نوحہ سناتے ہیں۔ اس طرح کے تاثر آفریں اور تہہ دار اشعار نسیم کی غزلوں میں کثرت سے مل جاتے ہیں۔

نسیم نکہت کی نظموں میں بھی یاس و محرومی خوابوں کی شکست اور جذباتی آویزش کے نقوش کہیں روشن اور کہیں دھندلے دکھائی دیتے ہیں۔ رومانی وفور نے یہاں بکھراؤ کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے اور مجموعی اعتبار سے ان نظموں میں تاثر کی وہ وحدت اور شدّت نہیں ہے جو غزل کے اشعار میں ملتی ہے۔ بعض نظموں مثلاً "سچ" میں ایک سے زیادہ وزن استعمال ہوئے ہیں، جس سے معنوی تسلسل مجروح ہوتا ہے۔ اس کے باوجود چند نظمیں جن میں سماجی اور صنفی شعور جھلکتا ہے، دلوں کو چھوتی ہیں۔ مثلاً "کالی چادر" میں ایک اشاراتی ڈرامائی فضا کی تخلیق بڑی مہارت سے کی گئی ہے۔

بلا شبہ نسیم نکہت کا یہ مجموعہ بعض فنی کمزوریوں کے باوجود دہ میں ایک ذہین اور باشعور شاعری کے طلوع کی بشارت ہے۔ بقول پروفیسر شبیہ الحسن اس دھواں دھواں زندگی میں یہ ایک کامل اور منظم ہیئت کو پانے کی سنجیدہ جستجو ہے۔ اس تلاش میں اگر سنجیدگی اور انہماک قائم رہا تو ضرور بارآور ہوگی اور اس نئی آواز میں مایوسی کے بجائے وہ مقدس برہمی اور سرکشی بھی پیدا ہوگی جو زندگی کو بدلنے کی تڑپ سے پیدا ہوتی ہے۔

قمر رئیس،

## چنانچہ

مصنف: مسیح انجم

قیمت: ۱۲ روپے

ناشر: زندہ دلان، محبوب گاہ، معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد

مسیح انجم کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "چنانچہ" جب چھپ کر شائع ہو گیا تو مسیح انجم اس کے حقوق کی ملکیت سے محروم ہو گیا۔ کیونکہ وہ حقوق قارئین کی طرف منتقل ہو گئے۔ ہر مصنف جس کا ناتہ قارئین سے ہو، اُس کا یہی حشر ہوتا ہے۔

جب آپ کتاب خریدیں گے تو پڑھیں گے بھی ضرور۔ کیوں کہ پڑھے بغیر آپ یہ فیصلہ نہیں کر سکیں گے کہ آپ نا اہل تھے یا دانشمند؟ دانشمندی اُس وقت خطرے میں پڑ جاتی ہے جب آپ "چنانچہ" کے کسی بھی مزاحیہ مضمون کی شروعات کی پانچ چھ سطریں پڑھیں گے تو آپ کا جی چاہے گا، اس کی بجائے دوسرا مزاحیہ مضمون پڑھیں، لیکن دوسرے مضمون پر بھی حالات کچھ پہلے سے بہتر نہیں رہیں گے۔ تیسرے پر بھی، چوتھے پر بھی ... کیونکہ سبھی مضامین مسیح انجم نے ہی سوچے اور تحریر کئے ہیں —— پس ثابت ہوا کہ سبھی مضامین اوریجنل ہیں۔ کسی دوسرے مزاح نگار کی نقل کو اپنی تخلیق نہیں سمجھا گیا۔

اگر آپ صبر اور برداشت کی قوت رکھتے ہیں تو (اور کئی حضرات واقعی رکھتے ہیں) تو چھ سات سطروں کا کڑوا گھونٹ اُتار لیجئے۔ آٹھویں سطر سے مسیح انجم کا قلم آپ کو خود بخود گرفت میں لے گا۔ (باقی صفحہ پر)

# مکتوبات
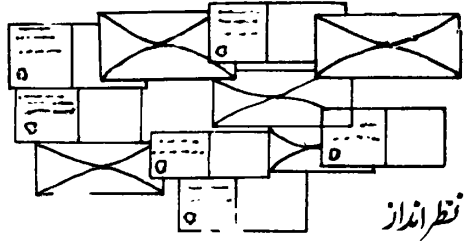
## نظر انداز

جنوری کے شمارے میں نندلال واتل کا مضمون جموں وکشمیر میں اردو صحافت نظر سے گزرا۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ یوں لگتا ہے کہ واتل صاحب نے کسی خاص فکر و تجسس کے بغیر یہ مضمون قلم برداشتہ لکھا ہے اور اس میں بہت سے اخبارات اور صحافیوں کو یکسر نظر انداز کیا گیا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ واتل صاحب صحافی ہیں اور پچھلے کئی برسوں سے صحافت سے وابستہ رہے ہیں، مگر اُن سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس قسم کا مضمون لکھ کر تاریخی اور دیگر حقائق و شواہد کو نظر انداز کر دیں گے۔ اُنہوں نے خاص طور سے آزادی سے قبل اردو صحافت کو چھوا نہیں۔ رنبیر دستا اور مارتنڈ کے علاوہ انہیں کوئی اخبار یاد نہیں آیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح سے اُنہوں نے آج کل کے قارئین کو جموں وکشمیر کی تاریخِ صحافت کے اہم باب سے محروم کر دیا۔

کشمیر میں ۱۹۳۲ء کی تحریکِ آزادی کے بعد ہی یہاں کے مسلم دانشور طبقے نے یہ محسوس کیا کہ انہیں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے کسی اخبار کا سہارا لینا ضروری ہے۔ اس لیے ایک ہفتہ وار اخبار نکالنے کی اسکیم بنائی گئی تو غالباً ۱۹۳۲ء ہی میں اخبارِ دستا کے بعد ہفتہ وار صداقت شائع ہونے لگا، جس کی مجلسِ ادارت میں مولانا محمد سعید مسعودی، مولوی غلام مصطفےٰ، پیر حسام الدین اور ایس۔ کیو۔ قلندر اور دیگر صحافی شامل ہوئے۔ کیوں کہ اس اخبار میں اکثریتی طبقے کی مشکلات و مصائب کے علاوہ اُن کے مطالبات کا بدستور ذکر ہوتا رہا تو ڈوگرہ مہاراج کی سرکار کو اخبار کی پالیسی پر اعتراض ہوا اور اشاعت بحکم گورنر کشمیر بند کر دی گئی۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد جب بعض مسلم زعماء جیل میں تھے تو ایس۔ کیو قلندر کی ادارت میں ہفتہ وار "حقیقت" چھپنا شروع ہوا۔ یہ دونوں اخبار سری نگر سے چھپتے رہے۔ جموں سے 'پاسبان' اور دیگر اخبارات چھپنے لگے، جن میں عالمی کوائف کے ساتھ ساتھ مجلسی، معاشی اور ادبی خبریں ہوا کرتیں۔ اول اول پاسبان اور دیگر اخبارات نے میانہ روی اختیار کی، مگر جب ڈوگرہ سرکار نے استبداد و استحصال کی پالیسی تیز تر کر دی اور مسلم اکثریت کو خاص طور سے نشانہ بنانے کا منصوبہ بنایا تو اُنہوں نے بھی سرکار پر نکتہ چینی کرنا شروع کر دی۔ 'پاسبان' کے ایڈیٹر و مالک معراج الدین احمد تھے اور اُن کے ساتھ اللہ رکھا ساغر۔

جموں میں میرپور اور پونچھ سے بھی اخبار نکالے گئے، ان کا بھی ذکر واتل صاحب نہیں کر پائے۔

"حقیقت" پر جب سرکاری عتاب نازل ہوا تو 'البرق' اور 'جہانگیر' دو مختلف نظریوں کے ہفتہ وار چھپنا شروع ہوئے۔ 'البرق' کے ایڈیٹر و مالک مولوی محمد عبداللہ وکیل کے فرزند ایم۔ اے۔ صابر تھے اور 'جہانگیر' ایس۔ کیو۔ قلندر نکالنے لگے۔ یہ وہی 'البرق' ہے جو بعد میں دینا ناتھ مست نے خرید لیا تھا۔ اس بیچ میں محی الدین نے 'رہبر' نکالنا شروع کر دیا۔ اُدھر نیشنل کانفرنس کے قیام کے بعد مولوی محمد یوسف شاہ کی مسلم کانفرنس کے زیر اثر اخبار نکلنا شروع ہوا۔ غالباً اُس کا نام ملّت رکھا گیا۔ جو آزادی سے قبل تک چھپتا رہا۔

آزادی سے پہلے کے اخباروں میں واتل صاحب نے "ہمدرد" کا ذکر کیوں نہیں کیا، جو شیخ محمد عبداللہ، مولوی محمد سعید مسعودی، ڈاکٹر ایس۔ ایس۔ نشاط اور پنڈت پریم ناتھ بزاز کے اشتراک سے شائع ہوا اور اسی اخبار کے لوکل سیلف گورنمنٹ ایشوع نے سرگوپالاسوامی آئینگر کی وزارتِ عظمیٰ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس شمارے میں مہجور کشمیری کی وہ مشہور نظم "ولو ہا باغوانو....!" چھپ گئی تھی جس نے کشمیری نوجوانوں میں نیا ولولہ اور نیا شعور پیدا کر دیا تھا اور آزادی کی تحریک کو ایک نیا موڑ ملا تھا۔ غالباً ۱۹۳۹ء میں یہ خاص نمبر جس میں جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس، سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور دیگر سیاسی زعماء کے پیغامات اور تصاویر مختلف رنگوں میں چھپ گئی تھیں۔ آزادی کے بعد چونکہ پریم ناتھ بزاز کشمیر سے باہر سکونت اختیار کر گئے تو غلام رسول عارف نے 'ہمدرد' کی ملکیت اور ادارت حاصل کی اور اب بھی 'ہمدرد' چھپتا ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ کیشپ بندھو کے اپنے اخبار کا بھی ذکر نہیں کیا گیا۔

"خدمت" اس وقت وجود میں آیا جب مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدل دیا گیا اور اکثر ریاستی زعماء نے شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں اس تاریخی اجلاس میں فیصلہ کیا کہ ریاستی سیاست کو وسیع تر مفاد کے لیے نیا موڑ دینا ضروری ہے۔ جس میں بادشاہ خان نے بھی مبصر کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔

میں خط کو مقالے کی صورت نہیں دینا چاہتا، اس لیے کئی دوسرے اخبارات اور صحافیوں کا ذکر نہیں کروں گا، صرف یہ کہوں گا کہ ۱۹۴۶ء میں جب میں "خدمت" کے ادارے سے منسلک ہوا تو انہی دنوں پریم ناتھ کند 'کشمیر' نکال رہے تھے جسے رام چند رکاک وزیرِ اعظم کی پشت پناہی حاصل تھی۔ (آگے صفحہ ۱۰ پر)

غلام نبی ڈار

شری کے. سی. پنت ، مرکزی وزیرِ تعلیم ۱۴ رمئی ۱۹۸۵ء کو، نئی دہلی کے نیشنل میوزیم آڈیٹوریم میں منعقدہ ایک تقریب میں، سینٹرل ہندی ڈائریکٹوریٹ کے شائع کردہ ہندی، گجراتی، انگریزی لغت کی رونمائی کرتے ہوئے۔ اس موقع پر شری پنت نے اردو ہندی، ہندی آسامی اور ہندی مراٹھی لغات کی رسمِ اجرا بھی ادا فرمائی۔

مرکزی وزارتِ امورِ خارجہ کے وزیرِ مملکت جناب خورشید عالم خاں ۳ رمئی ۱۹۸۵ء کو سابق صدرِ جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی ۱۶ ویں برسی کے موقع پر اُن کے مزار واقع جامعہ نگر (اوکھلا) پر گلہائے عقیدت پیش کرتے ہوئے۔

Regd. No. D (DN) 103
R.N. 948/57

Licensed U(DN) 50 to post without pre-payment
at Civil Lines, Post Office, Delhi.

ol. 43 No. 11 AJKAL (URDU) June, 1985

تشکیلِ شعر: بریجندر سیال

ہندوستان کی بھی عجب سرزمین ہے — جس میں وفا و مہر و محبت کا ہے وفور
جیسا کہ آفتاب نکلتا ہے شرق سے — اخلاص کا ہوا ہے، اسی ملک سے ظہور
ہے اصلِ تخمِ ہند سے اور اس زمین سے — پھیلا ہے سب جہان میں یہ میوہ دُور دُور

غالبؔ

Publishedby the Director Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001, Printed by the Manager, Govt. of India Photolitho Press, Faridabad.

ایک روپیہ ۵۰ پیسے

جولائی ۱۹۸۵ء

اِس شمارے کے قلم کار:

مظفر حسین برنی، حیات اللہ انصاری، عبدالمغنی،
جوگندر پال، شارب ردولوی،
چودھری محمد نعیم، تپش بترا، حکیم منظور،
نشتر خانقاہی، حیات لکھنوی۔
نگار عظیم، بھوانی پرشاد مشر، کیدار ناتھ کومل،
انجم عثمانی، جیرام داس فلک۔

دہلی ہوائی اڈے پر صدر جمہوریہ ہند شری ذیل سنگھ اور وزیر اعظم شری راجیو گاندھی، سری لنکا کے صدر عزت مآب جناب جے وردھنے کے ساتھ ۔ موصوف یکم جون ۱۹۸۵ء کو آپسی مسائل پر بات چیت کے لیے دہلی تشریف لائے تھے ۔

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی ۵ ر جون ۱۹۸۵ء کو قاہرہ، فرانس، الجیریا، برمڈا اور امریکہ کے اپنے سرکاری دورے پر روانگی سے قبل دہلی ہوائی اڈے پر اپنے رفقاء کے ساتھ۔

اردو کا مقبولِ عام معتبر ماہنامہ

# آجکل

نئی دھلی

ایڈیٹر:
راج نرائن رازؔ

| جلد : ۴۳ | شمارہ : ۱۲ | جولائی ۱۹۸۵ء |
| --- | --- | --- |
| قیمت : ایک روپیہ ۵۰ پیسے | فون : ۳۸۷۰۶۹ | اساڑھ۔شراون شک سمت ۱۹۰۷ |


## ترتیب



سرورق : جیون اڈلجہ


بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ ۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس منچال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :
ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ :
بزنس منیجر: پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اندرونِ ملک : زرِ سالانہ: ۱۵ روپے — دو سال کے لیے: ۲۷ روپے — تین سال کے لیے : ۳۸ روپے

ملک کے بعض حصوں میں تشدد، دہشت پسندی اور دہشت گردوں کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ یہ بڑا تکلیف دہ ہے۔ مختلف سطحوں پر اس کے بڑے دور رس نتائج سامنے آرہے ہیں۔ سب سے پہلے تو جان کی سلامتی ہے۔ جان ہے تو جہان ہے اور جب غیر یقینی حالات کے باعث جان کے لالے پڑ رہے ہوں تو کاروبار کا کیا حال ہوگا؟ آپ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔ غور کریں تو جان کی سلامتی اور کاروبارِ زندگی ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مارکاٹ کی وارداتوں سے بچنے یا امن و امان قائم رکھنے کے لیے لگائی گئی پابندیوں کرفیو وغیرہ سے بے بس ہو کر گھر میں بیٹھے رہیں تو بھی سلامتی ایک لمبے عرصہ میں ممکن معلوم نہیں ہوتی۔ کمائیں نہیں تو کھائیں کیا اور کھائیں نہیں تو جان کی سلامتی کیسے ممکن ہو۔ کمائی اقتصادی اور معاشی کاروبار سے ہے۔ گھر میں بیٹھ کر اقتصادی کام دھندا کیسے چلے گا۔ اقتصادی و معاشی ضرورت صرف ان ہی لوگوں کی نہیں ہوتی جو کام دھندوں میں لگے ہوتے ہیں۔ بلکہ ان لوگوں پر انحصار کرنے والے ان کے بال بچوں کی بھی ہوتی ہے۔

پہلی نظر میں تو یہ معاملہ فرد کا اور پھر افراد کا معلوم ہوتا ہے، لیکن فرد یا افراد ہمارے سماج کا، ہمارے معاشرے کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ اس طرح تشدد اور دہشت گردی کسی خاص فرقے کے افراد پر ہی نہیں بلکہ پورے سماج پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ملک کے کسی ایک حصہ میں سماج پر اثر انداز ہونے والے واقعات کا اثر ملک کے سبھی علاقوں میں اور سبھی ریاستوں کے لوگوں پر پڑتا ہے۔ اس بات کی وضاحت ہم ایک مثال سے بخوبی کر سکتے ہیں۔ آپ ملک کی کسی بھی خوش حال ریاست کا تصور کریں اور غور کریں کہ وہ اپنی مختلف ضروریات میں کس حد تک خود کفیل ہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ دوسری ریاستوں پر انحصار رکھے بغیر خوشحال سے خوشحال ریاست بھی بہت سے معاملات میں ادھوری ہے۔ پوری تو وہ جبھی ہوتی ہے، جب باقی ریاستوں کے ساتھ مل کر ملک کی ایک اکائی کا حصہ بنتی ہے۔ پنجاب ہی کو لیں۔ سبز انقلاب نے بلاشبہ پنجاب کو ملک بھر کا اناج گودام بنا دیا ہے، لیکن روزمرہ ضروریات کی دوسری چیزیں مثلاً کپڑا، کوئلہ، شکر، تیل وغیرہ اسے ملک کی دوسری ریاستوں سے منگوانی پڑتی ہیں۔

جب انتشار ایک ریاست میں پھیلتا ہے تو اس کا اثر دوسری ریاستوں پر اس طرح پڑتا ہے کہ اس ریاست میں مال بھیجنے کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ متاثرہ ریاست میں مال کی قلت مہنگائی اور گرانی کا باعث بنتی ہے اور مال تیار کرنے والی ریاست میں مال کی کھپت نہ ہونے کی وجہ سے کاروبار مندا ہونے لگتا ہے۔ مال کی تیاری کی رفتار سست کرنا پڑتی ہے۔ اور یہ سارا عمل اور ردِ عمل بدی کے ایک چکر کی طرح رفتہ رفتہ پوری قوم کو متاثر کرنے لگتا ہے اور پوری قوم کی خوشحالی پر اثر انداز ہوتا ہے۔

تشدد میں جان کا ہی نہیں، مال کا بھی نقصان ہوتا ہے۔ بسیں ہوں یا کھیت کھلیان یا کل کارخانے یہ سب کسی فرد یا افراد کی ملکیت تو ہو سکتے ہیں مگر اپنے طور پر پورے ملک کا اثاثہ ہوتے ہیں۔ ان کو پہنچنے والا نقصان ہر صورت میں سبھی افراد کا اور پورے ملک کا نقصان ہے۔ اس سے جو تباہی واقع ہوتی ہے، اس کا نتیجہ بے روزگاری اور بے روزگاری کا اثر مزدور یا کاریگر پر نہیں بلکہ اس سے تعلق رکھنے والے سبھی لوگوں پر پڑتا ہے۔ ان تمام باتوں سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ تشدد، مارکاٹ اور توڑ پھوڑ وغیرہ کی وارداتیں ایسی ہیں کہ جن کے نتیجے میں ہمارے سماج کے بے گناہ لوگ تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔

اس مرحلے پر ایک سوال ہمارے لیے مزید پریشانی کا باعث بنتا ہے۔ کیا کسی بھی جمہوری ملک اور خاص طور پر بھارت جیسے ملک میں جسے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کا شرف حاصل ہے، تشدد کی کوئی گنجائش ہے؟ تشدد اور جمہوریت دو متضاد چیزیں ہیں۔ جمہوریت کے معنی ہیں عوام کا اتفاق رائے۔ خواہ عوام کسی عقیدے کے پیرو ہوں، کسی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں اور کسی علاقے یا ریاست میں رہتے ہوں۔ تشدد جمہوریت کی نفی ہے۔ جمہوریت ایک مت ہے — تشدد انتشار کا باعث بنتا ہے۔ ظاہر ہے ہمارے آئین میں اور ملک کے سیاسی ڈھانچے میں اس کی کوئی گنجائش نہیں اور اگر ایسے میں ہم اپنی ثقافتی زندگی پر ایک نظر ڈالیں، مذہبی، اخلاقی اور سماجی اقدار پر غور کریں تو ہم محسوس کریں گے کہ رنگارنگی میں یک رنگی رکھنے والی ثقافت میں تشدد کی قطعی گنجائش نہیں۔ رواداری، بُردباری، تحمل اور میل ملاپ ہی ہماری سماجی ہم آہنگی کی اساس ہیں۔ ہمارے مذاہب اور صوفی سنتوں نے ہمیں

اس کا درس دیا ہے ۔ یہی ہماری میراث ہیں ۔ ان کی حفاظت ہمارا فرض ہے ۔ مذہب بیر رکھنا نہیں سکھاتا ۔ مذاہب کی مثال مختلف راستوں جیسی ہے ' جو ایک ہی منزل تک پہنچتے ہیں ۔ مختلف نسل ، فرقے اور مذاہب کے ماننے والے مختلف رنگوں کی مثال ہیں ' جو ایک ساتھ سج جائیں تو دھنک بن جاتی ہے ۔ مثالی ہم آہنگی کی مثال ہو جاتی ہے ۔
یہ بھی سوچیں کہ تشدد سے کوئی مسئلہ حل ہوتا یا ہو سکتا ہے ؟ یقیناً نہیں ۔ یہ صرف مسائل کا باعث بنتا ہے ۔ فرد ، افراد اور پورے ملک کی سلامتی اور ترقی کا راز اسی میں ہے کہ تشدد سے پوری طرح گریز کیا جائے ۔ (م ۔ ع)

## وفیات

### الحاج حافظ محمد یوسف دہلوی

اردو کے مشہور قلم صحافی اور شمع گروپ رسائل کے مدیر اعلیٰ جناب الحاج حافظ محمد یوسف دہلوی کا ۲۴ ؍ مئی ۱۹۸۵ء بروز جمعہ کو نئی دہلی میں انتقال ہو گیا ۔ موصوف ایک طویل عرصے سے فراش چلے آ رہے تھے ۔

حافظ صاحب مرحوم نے اردو میں فلمی صحافت کو جو وقار اور معیار بخشا ' وہ اردو صحافت کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا اور ہمیشہ یاد رکھا جائے گا ۔
حافظ صاحب مرحوم نے ۱۹۳۹ء میں دہلی سے فلمی رسالہ شمع کا اجراء کیا ۔ ۱۹۴۶ء میں یہ رسالہ نولکھا آفسیٹ سے شائع ہونے لگا ۔ ان تھک محنت ، اٹوٹ لگن اور خوب سے خوب تر کی مساعی نے ، ۱۹۵۴ء میں شمع کو ہندوستان کا سب سے کثیر الاشاعت رسالہ بنا دیا ۔ اس وقت اس کی اشاعت ایک لاکھ سے زیادہ تھی ۔ ان کے ادارے سے متعدد رسائل ' بچوں کا رسالہ کھلونا ، خواتین کے لیے ماہ نامہ بانو ، اردو ڈائجسٹ شبستاں ، ماہ نامہ مجرم اور ہندی رسالہ سشما ' شائع ہوتے ہیں ۔
اردو زبان و ادب ، اور بالخصوص اردو کی فلمی صحافت کے تئیں جو خدمات حافظ صاحب مرحوم نے انجام دیں وہ اردو کی تاریخ صحافت کا روشن باب ہیں ۔ ادارہ اُن کے ماتم میں سوگوار اور متعلقین کے غم میں برابر کا شریک ہے ۔

### مولانا سعید احمد اکبر آبادی

اُردو ادب اور صحافت کو ایسا ہی ایک ناقابلِ تلافی نقصان مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی موت سے پہنچا ہے ۔ موصوف ایک طویل عرصے سے بیمار چلے آ رہے تھے ۔ اُن کا انتقال کراچی میں ہوا ۔
مولانا سعید احمد ایک روشن خیال عالم تھے ۔ علم دین اور علم دنیا دونوں میں سرفراز ۔ تحریر ' تقریر پر یکساں قادر ۔ دونوں تازہ کار ، شگفتہ اور دل پذیر ۔ مولانا مرحوم نے متعدد کتابیں تصنیف کیں ۔ جن میں سے بعض کو شہرت دوام حاصل ہوئی ۔ وہ ندوۃ المصنفین کے ماہ نامہ بُرہان کے مُدیر تھے ۔ بقول جناب احمد سعید ملیح آبادی : " وہ ایک درویش ، مست قلندر ، ایک سادہ سا انسان ، جاہ و حشم سے دُور ، نمائش اور بناوٹ سے عاری ' تعارف نہ کرایا جائے تو شکل و صورت سے عام آدمی جیسا غیر اہم لگے ، مگر بولنے لگیں تو پھول جھڑیں ، علم و حکمت کے موتی گریں ۔ لکھے تو عقل و دانش کے ایوانوں میں چراغ جلیں ۔۔ غرض مرنے والے میں بہت سی خوبیاں تھیں " ۔
ادارہ آج کل دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں کی بارش ان کی لحد پر کرے اور متعلقین کو صبر و سکون عطا فرمائے ۔ آمین

### بھوانی پرشاد مشر

ولادت : ۲۹ ۔ مارچ ۱۹۱۳ء ؛ وفات : ۲۰ ۔ فروری ۱۹۸۵ء

پنڈت بھوانی پرشاد مشر کی موت کے ساتھ ہندی شاعری کا ایک دَور جو گاندھی واد سے موسوم ہے ' ختم ہوا ۔ وہ بھوانی بھائی کے نام سے ہر دل عزیز تھے ۔ اُن کی شاعری نصف صدی پر محیط ہے ۔ اُن کے بارہ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔ ان میں "گیت فروش" "بُنی ہوئی رسّی" " اندھیری کویتائیں" " خوشبو کے شلالیکھ" اور "نیلی ریکھا تک" قابلِ ذکر ہیں

انہیں ساہتیہ اکادمی ' مدھیہ پردیش شِکھر پرسکار جیسے متعدد انعامات و اعزازات سے نوازا گیا ۔ زندگی کی آخری سانس تک شاعری کرتے رہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ شاعری ہی اُن کی موت تھی ۔ اُن کی شاعری اور زندگی میں کوئی فرق نہیں تھا ۔ اُن کی شاعری کی عظمت کو نقادوں نے پہچانا نہیں ، جس کے وہ مستحق تھے ۔ اُن کی شاعری اور بول چال کی زبان میں کوئی فرق نہیں تھا ۔ وہ پچھلے بیس سال سے دل کے مرض میں مبتلا تھے ۔ ہر بار موت کو دھوکا دیتے رہے بالآخر ساتویں بار موت جیت گئی ۔ ہندی جدید شاعری میں اُن کی موت سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اُس کا پُر ہونا محال ہے ۔

منظفر حسین برنی

# مولانا سید سلیمان ندوی

اردو زبان کی علمی روایات کا تسلسل پورے مشرق سے جڑا ہوا ہے۔ عربی میں علمی تحقیق کی ڈیڑھ ہزار سال پر پھیلی ہوئی شان دار تاریخ ہے، تو فارسی میں شعروادب کا ایسا گنج گراں مایہ موجود ہے جس میں فردوسی، حافظ، سعدی، اور رومی جیسے کتنے لعلِ شب چراغ جگمگا رہے ہیں۔ یہ ساری تکوینی اور تحقیقی روایات، تہذیب ومعاشرت کی چھلنی میں چھن چھن کر اردو زبان کے دامن تک پہنچی ہیں۔ اس لیے خواہ اردو کی عمر ڈیڑھ دو سو سال سے زیادہ نہ ہو، مگر اس کی علمی وتہذیبی روایات دو ہزار برسوں پر پھیلی ہوئی ہیں، اس لیے ان میں تب وتاب ہے اور یہی سبب ہے کہ عہدِ زوال میں بھی یہ زبان اپنی نشوونما سے محروم نہیں رہی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر سے مغربی افکار نے بھی ان علمی روایات میں جِلا اور تازگی پیدا کی ہے۔ اس لیے اردو کی کوئی علمی شخصیت جسے مشرقی علوم یعنی عربی وفارسی کے علمی خزانوں سے استفادہ کا موقع ملا ہو، اور جس نے جدید مغربی افکار سے بھی کسی .... نہ کسی حد تک فیض حاصل کیا ہو، اس میں ایک خاص جامعیت کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا علم وسیع بھی ہوگا، گہرا بھی۔ فکرانگیز دروح پرور بھی ہوگا اور بوقلموں وشاداب بھی۔

اس علمی جامعیت کا سب سے شان دار مظہر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی شخصیت ہے۔ ان کے کمالات کا ایک مختصر تقریر میں تو کیا، ضخیم کتابوں میں بھی احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ عالم بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، صاحبِ طرز انشا پرداز بھی، مورخ بھی ہیں، جغرافیہ داں بھی، لسانیات کے رمز آشنا بھی ہیں، عمرانیات کے دقیقہ رس بھی، وہ نقاد ہیں، محقق ہیں، مبصر ہیں، صحافی ہیں اور صوفی بھی۔ علومِ اسلامیہ میں ان کے درک وبصیرت کا اعتراف علامہ اقبال نے ان لفظوں میں کیا تھا:

> "آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے
> اونچے زینے پر ہیں اور وہ عالم ہی نہیں، امیر العلماء ہیں
> مصنف ہی نہیں، رئیس المصنفین ہیں۔ ان کا وجود علم و
> فضل کا ایک دریا ہے جس سے سیکڑوں نہریں نکلی ہیں۔
> اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں۔"

ان کے بارے میں ڈاکٹر اقبال کا یہ ریمارک بھی ضرب المثل کی طرح مشہور ہو گیا ہے کہ "علوم اسلامی" کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سید سلیمان ندوی کے سوا اور کون ہے؟" علوم اسلامی کے بہت سے باکمال عالم اور محقق گزشتہ صدیوں میں پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی بیش بہا علمی کاوشوں سے اردو زبان کے خزانے کو شان دار اور بھرپور بنا لیا ہے۔ اگر آپ موازنہ کریں گے تو پائیں گے کہ مولانا سید سلیمان ندوی کی شان ہی کچھ اور ہے۔ وہ کسی میدان میں بند نہیں ہیں اور جدھر نکل جاتے ہیں اپنے نقشِ پا چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسے نقشِ پا کہ ع

سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد شد

علوم قرآنیہ، تفسیر، حدیث، سیرت، فن رجال، تاریخ اسلام، تاریخ افکار اسلامی، منطق وفلسفہ، علم الکلام، علم لغت، غرض ماضی کے شان دار تہذیبی ورثہ کا کوئی ایسا اہم پہلو نہ رہا ہوگا جس میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی بصیرت اور گہری فراست کا ثبوت نہ دیا ہو۔ اس کا اندازہ اس بات

---

● گورنر ہریانہ، ہریانہ راج بھون، چنڈی گڑھ (یو ٹی)

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی صد سالہ سال گرہ کے موقع پر انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیرِ اہتمام منعقدہ سیمینار کا افتتاحیہ خطبہ

سے ہو جائے گا کہ اپنے خطوط میں علامہ اقبال جن کو مشرقی اور مغربی علوم دونوں پر عبور حاصل تھا، مولانا سید سلیمان ندوی سے مختلف علمی اور ادبی امور میں بہت ہی عجز و انکساری کے ساتھ معلومات حاصل کرتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ مولانا کے جوابات اب تک منظرِ عام پر نہ آسکے ورنہ علم و ادب کا ایک چمنستان کھل جاتا۔

ان کی تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے۔ اُنہوں نے ۱۹۱۶ء میں "ارض القرآن" جیسی محققانہ کتاب دو جلدوں میں لکھی، جس میں اُن مقامات اور اقوام و قبائل کی تاریخی و اثری تحقیق ہے، جن کا حوالہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ لینڈ آف دی بائبل پر ایسے کئی کام ہو چکے ہیں اور زیادہ تر اُن لوگوں نے کئے ہیں جن کا تعلق ارض شام اور فلسطین کی حفری مہموں (EXCAVATIONS) سے رہا ہے، لیکن ان کی تحقیقات میں برابر رد و بدل ہوتی رہی ہے۔ اور آج سے بیس پچیس سال قبل مصر میں جو ذخیرہ PAPYRI کا دریافت ہوا اس نے تو بیشتر محققوں کو اپنی کتابوں پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے EXCANVATIONS کی عملی مہموں میں حصہ نہیں لیا۔ مگر جغرافیۂ قرآنی کے سلسلے میں جن نتائج تک وہ ۱۹۱۶ء میں پہنچ گئے تھے، ان میں نہ کوئی اہم اضافہ ہو سکا ہے نہ کسی تحریر کو مکمل طور پر رد کیا جا سکا ہے۔

ان کا دوسرا اور سب سے اہم کارنامہ جو انہیں ہمارے علماء کی صف . . . . میں سب سے ممتاز و مفتخر رکھے گا وہ سیرۃ النبیؐ ہے۔ اردو زبان میں ایک جامع اور مکمل کتابِ سیرت لکھنے کا پلان علامہ شبلی مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری دور میں بنایا تھا اور اس کی سرپرستی ریاست بھوپال کی علم دوست فرماں روا نواب سلطان جہاں بیگم نے کی تھی۔ شبلی نے بڑی لگن اور عقیدت کے ساتھ اس کام کو شروع کیا تھا اور کہا تھا:

عجم کی مدح کی عبّاسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتمؐ
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

اُنہوں نے تمام معروف و غیر معروف مستند ماخذوں سے سیرتِ طیبہ کا مواد اکٹھا کرنا شروع کیا۔ پہلی جلد مرتب ہو چکی تھی۔ دوسری جلد ابھی پوری طرح مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ علامہ شبلی کو سفرِ آخرت کا بلاوا آ گیا۔ اُنہیں اپنے اس منصوبے کی تکمیل کا بہت خیال تھا، مولانا سید سلیمان ندوی اس وقت دکن کالج پونہ میں لیکچرر تھے، علامہ شبلی نے اُنہیں بلایا، اور وصیت کی کہ جس طرح بھی ہو اس منصوبے کو مکمل کر دیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اُستاد کے حکم کی تعمیل کی، اور کالج کی ملازمت ترک کر کے سیرت النبیؐ لکھنے میں مشغول ہو گئے، پھر اُنہوں نے جس شان سے اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا وہ آپ سب جانتے ہیں۔ دنیا کی کسی زبان میں ایسی جامع اور منفرد کتاب سیرت کے موضوع پر موجود نہیں ہے۔ صرف یہی ایک کارنامہ مولانا سید سلیمان ندوی کی حیاتِ جاوداں کی ضمانت بن سکتا تھا۔ مگر ان کے قلم سے نکلی ہوئی ہر کتاب کا یہی عالم ہے کہ وہ ان کے فضل و کمال اور بے مثال صلاحیتوں پر گواہ بن گئی ہے۔

سیرۃ النبیؐ کی پانچ جلدوں میں اُنہوں نے جس طرح سیرت اور فلسفۂ سیرت کو پیش کیا ہے، اسے پڑھ کر یہ تاثر ہوتا ہے کہ اب اس موضوع پر لکھنے کی گنجائش نہیں رہی ہے۔ مگر اس خیال کی تردید بھی مولانا سید سلیمان ندویؒ کر سکتے تھے۔ اُنہوں نے اکتوبر، نومبر ۱۹۲۵ء میں سیرت ہی کے موضوع پر آٹھ لیکچر دئے۔ جو خطبات مدراس کے نام سے چھپے ہیں، ان میں جدید تعلیم نوجوانوں اور مغربی فکر سے متاثر مسلمانوں کو اپنا مخاطب بنایا ہے، اس لیے تمام انداز وہی ہے جو ایک مغرب زدہ ذہن کو اپیل کر سکتا ہے۔ یہ خطبات انگریزی اور عربی میں ترجمہ ہو کر بھی مقبول ہوئے ہیں اور عربی ترجمہ پڑھ کر عرب علماء نے بھی اعتراف کیا ہے کہ اس انداز کی کوئی کتاب سیرتِ طیبہ کے موضوع پر عربی زبان میں بھی موجود نہیں ہے۔

سیرت کے علاوہ وہ سوانح نگاری کے میدان کے بھی شہسوار ہیں۔ "حیاتِ مالکؒ" (۱۹۱۷ء) "سیرتِ عائشہؓ" (۱۹۲۴ء) اور "حیاتِ شبلی" (۱۹۴۳ء) اُنہیں اردو کا بہترین سوانح نگار ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

اُنہوں نے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی فرمائش پر مارچ ۱۹۲۹ء میں عرب و ہند کے تعلقات پر جو لیکچر دئے تھے وہ آج تک اس موضوع پر سب سے زیادہ مفصل، عالمانہ اور محققانہ خطبات ہیں۔ مارچ ۱۹۳۰ء میں اُنہوں نے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کے ایماء پر "عربوں کی جہاز رانی" پر چار لیکچر بمبئی میں دئے، جن سے اس موضوع پر بہت سی باتیں پہلی بار سامنے آئیں۔

عربی زبان پر ان کی قدرت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُنہوں نے ۱۹۱۲ء میں طلبہ کی رہنمائی کے لیے جدید عربی کی ایک لغت چند ماہ میں تیار کر لی تھی، جس میں اخبارات و جرائد میں استعمال ہونے والی زبان کا اندراج کیا گیا ہے اور برسوں تک اردو میں یہ واحد لغت رہی، جس سے جدید عربی کے الفاظ کو سمجھا جا سکتا تھا۔

فارسی میں ان کی گہری واقفیت کا حال "خیام" سے معلوم ہوتا ہے۔ خیام پر مشرق و مغرب میں بہت کام ہوا ہے، مگر مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی تحقیقات سب سے ممتاز ہیں۔ اقبال نے یہ کتاب دیکھ کر کہا تھا کہ اب اس موضوع پر برسوں تک کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکے گا۔ یہ کتاب ۱۹۳۳ء میں چھپی تھی۔ آدھی صدی سے زیادہ عرصہ تو گزر گیا ہے اور کوئی اسکالر نہ ایران میں نہ ہندوستان میں، اس پر ایک سطر کا اضافہ نہیں کر سکا ہے البتہ انگلستان میں

ایک مشہور جدید شاعر ROBERT GREVES نے رباعیات کے ایک قدیم نسخہ پر کچھ تحقیق کی ہے، جو ایک ایرانی امیر کے قبضہ میں تھا، لیکن اس کا درجہ علامہ سید سلیمان ندوی کی معرکتہ الآرا تصنیف کے مقابلہ میں درخورِ اعتنا نہیں۔

یہ ان کی چند تصانیف کے نام ہیں۔ ان کے علاوہ اردو زبان اور لغت سے متعلق مسائل پر ان کے مضامین "نقوشِ سلیمانی" اپنی جداگانہ شان رکھتے ہیں۔ وہ لسانیات کے مردِ میدان نہیں تھے۔ اور یہ ایک جدید ترین شاخ ہے، جس میں اب تو سائنسی آلات اور کمپیوٹر کی مدد سے ریسرچ ہو رہی ہے۔ سید صاحب نے لسانیات اور علم اللغۃ (فیلالوجی) میں بھی جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے زمانے کے مسائل کو دیکھتے ہوئے حد درجہ قابلِ تعریف کوشش ہے۔

اس کے علاوہ انہوں نے جولائی ۱۹۱۶ء سے رسالہ "معارف" شائع کیا۔ اور چالیس سال تک اس کے ایڈیٹر رہے۔ اس میں شذرات کے علاوہ "یادِ رفتگاں" کا بھی ایک کالم لکھتے تھے۔ "باب الانتقاد" میں سیکڑوں کتابوں پر عالمانہ تبصرے کئے۔ اور "معارف" کا ایسا بلند علمی معیار قائم کر دیا کہ اردو کا کوئی دوسرا مجلّہ اس کی رفعت کو نہیں پہنچ سکا۔ "معارف" میں جو علمی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں، ان کی وجہ سے اس رسالہ کے فائل اب علوم مشرق کی ایک بھرپور انسائیکلو پیڈیا نظر آتے ہیں۔ اگر انہی مضامین کو معمولی قطع و برید کے بعد ابجدی ترتیب میں شائع کر دیا جائے تو نہایت اعلیٰ پایہ کی انسائیکلو پیڈیا بنی بنائی موجود ملے گی۔

موضوع بہت وسیع ہے اور مجھے اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ہے۔ پھر بھی مولانا سید سلیمان ندوی کی شخصیت، سیرت اور علمی کارناموں کے اتنے وسیع اور رنگا رنگ پہلو نگاہوں کے سامنے آتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا سخت دشوار ہے۔ کیا کہا جائے کیا نہ کہا جائے۔ ع

خاموشی در ثنائے تو حدِ ثنائے تست

سید صاحب انشا پرداز بھی ایسے تھے کہ سیرت النبیؐ میں انہوں نے اپنا اسلوب علامہ شبلی نعمانی کے اسلوب سے ملا دیا ہے اور آج یہ تمیز کرنا دشوار ہے کہ علامہ شبلی کا قلم کہاں ہے اور مولانا سید سلیمان ندوی کہاں بول رہے ہیں۔ اسی طرح جب انہوں نے مولانا آزاد کے اخبار الہلال میں علمی و سیاسی موضوعات پر مضامین لکھے تو ایک دھوم مچ گئی۔ "الہلال" میں مضمون نگار کا نام نہیں ہوتا تھا، اس لیے ساری تحریریں مولانا آزاد ہی کی سمجھ لی گئیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جن بعض مضامین نے اپنے زمانے میں بے حد مقبولیت حاصل کی اور مولانا آزاد کی تحریر سمجھ کر انہیں "مقالاتِ آزاد" کے مجموعوں میں شامل کر لیا گیا۔ وہ مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے لکھے گئے تھے۔ ان میں "اسلام اور سوشلزم" (البلاغ فروری ۱۹۱۱ء) "الحریۃ فی الاسلام" (الہلال، جون ۱۹۱۳ء تا اکتوبر ۱۹۱۳ء)

"مشہد اکبر" (الہلال، اگست ۱۹۱۳ء) کا بطور مثال ذکر کیا جا سکتا ہے۔

مولانا کو شعر و سخن سے باضابطہ تعلق تو نہیں رہا۔ البتہ طبیعت موزوں پائی تھی۔ مثال کے طور پر سفر گجرات کے دوران جب بھروچ پہنچے اور دریائے نربدا کے کنارے کھڑے ہوئے تو جذبات کے تلاطم نے ایک خوبصورت نظم کی شکل اختیار کر لی۔ چند اشعار[1] ملاحظہ ہوں ؎

نربدا! اے نربدا! اے جادۂ بحرِ عرب
گرچہ تو ہندی ہے، لیکن زادۂ بحرِ عرب

تو گزشتہ کاروانوں کا نشانِ راہ ہے
ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے

رشتۂ ہند و عرب تجھ سے ہوا تھا استوار
تیرے ساحل کا ہر اک ذرّہ ہے اس کی یادگار

تو ہے دریائی پری، یا شاہدِ عالم ہے تو
اس سمندر کے گلے کی شہ رگِ اعظم ہے تو

تیرا ہر قطرہ حیاتِ نو کا اک سرشار جام
اس تنِ آبی میں تیرا خون دوڑانا ہے کام

مولانا کا مجموعۂ کلام "ارمغانِ سلیمان" کے نام سے کراچی میں چھپ چکا ہے۔
یہاں[2] یہ بھی عرض کر دوں کہ مولانا شروع شروع میں عربی میں بھی شعر کہتے تھے۔

اسی طرح جب جگر مرادآبادی کا کلام پہلی بار سنتے ہیں تو اس کی مستی اور سرشاری سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ کلامِ جگر کے مجموعہ "شعلۂ طور" پر ایک بے مثال تعارف لکھتے ہیں۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"جگر مستِ ازل ہے، اس کا دل سرشارِ الست ہے، وہ محبت کا متوالا ہے اور عشقِ حقیقی کا جویا، وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بت خانہ کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو، اور خم خانہ کے بادۂ کیف سے خود فراموش ہو کر بزمِ ساقی کوثر تک پہنچنا چاہتا ہے۔ جگر بظاہر سرشار مگر درحقیقت بیدار ہے، اس کی آنکھیں پرخمار مگر اس کا دل ہشیار ہے اور کیا عجب کہ خود جگر کو بھی اپنے دل کی خبر نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے کلام میں اثر نہ ہوتا۔"

کیا طرزِ ادا ہے، کیا ندرتِ بیان ہے، کیا روانی ہے اور کیا حسین تجزیۂ کلامِ جگر ہے۔

(آگے صفحہ ۲۹ پر)

---

[1] نقوشِ سلیمانی ص ۲۷۲
[2] نقوشِ سلیمانی ص ۴۶۳

ر المغنی

# مولانا سید سلیمان ندوی بحیثیت ادیب

اُردو ادب کا دَورِ زرّیں وہ تھا، جب عربی و فارسی کے علمارآ
ب یاری میں مصروف تھے اور بالعموم عربی و فارسی سے نابلد انگریزی
ں کا دور شروع نہیں ہوا تھا۔ یہ علماء فقط ادیب اور انشار پرداز اور
شاعر نہیں تھے بلکہ محقق اور دانش مند ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی
ی شخصیتیں رکھتے تھے۔ اور اجتماعی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے
۔ ان کی زندگی کا ایک اعلیٰ مقصد تھا اور وہ چند اقدارِ حیات کے علمبردار
۔ قارئین کے لیے ان کی حیثیت معلّمِ اخلاق کی تھی اور وہ کچھ اصولوں کی
اکے لیے کوشاں تھے۔ یہ صورتِ حال نثر میں بہت نمایاں تھی۔ سرسید
لیچھ لکھا، تعمیرِ ذہن اور تہذیبِ اخلاق کے لیے۔ شبلی کی تنقید و تحقیق، ان
رتیخ و سیرت نگاری کا بھی ایک حصہ ہے۔ حالی نے شعر و شاعری کی اصلاح
اِاٹھایا۔ نذیر احمد کو تربیتِ کردار کی فکر تھی، چنانچہ ان کی ناول نگاری کا
ما نہ وہی تھا جو ان کے ترجمۂ قرآن کا۔ جب کہ محمد حسین آزاد نے شعرائے اُردو
ذکرے کو بزرگوں کا تبرک بنا دیا اور اسے آبِ حیات کا مقدس نام دیا۔
ادب کے یہ ستون بہ یک وقت عالم اور ادیب دونوں تھے۔ انہوں نے
ادب کے لیے لکھنے کا تصور کبھی نہ کیا بلکہ ادب کو زندگی کے وسیع تر مقاصد
یغ کا ذریعہ بنایا۔ لہٰذا ادب میں ان کی ساری فن کاری اپنی مخصوص فکر
ثر ترین ابلاغ کے لیے تھی۔ اس ابلاغ کی تاثیر میں زیادہ سے زیادہ اضافہ
ہ اور اسے درجۂ کمال تک پہنچانے کے لیے دَورِ زرّیں کے اردو ادیبوں نے
، و بیان کا حسین سے حسین تر پیرایہ اختیار کیا اور نثر کی نوک پلک اس
درست کی کہ وہ اظہار کی شستگی اور شائستگی میں شاعری کے مقام پر
یہی وجہ ہے کہ غالب اور اقبال کے اس درمیانی دَور میں شاعری کے

بجائے نثر ہی غالب ذریعۂ اظہار بنی رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس عہد میں ہمارے عالم ادیبوں نے تخلیقی نثر کا ایک نمونۂ کمال پیش کیا۔ اس ادبی صورتِ حال کی بہت اچھی وضاحت جارج برنارڈ شا کے حسبِ ذیل تنقیدی بیان سے ہوتی ہے:-

> ایک سچا اور اصلی اسلوب کبھی اسلوب کے لیے نہیں ہوتا۔ تاثیرِ بیان اسلوب کا اوّل و آخر ہے۔ جس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے اس کا کوئی اسلوب نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ جس کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہے وہ اسلوب کی طاقت کو وہاں تک پہنچائے گا، جہاں تک بات کی اہمیت اور اس کا اعتقاد اسے لے جائے گا۔
>
> (دیباچہ مین اینڈ سپرمین)

یہ جملے شا نے اپنے اس خیال کی تشریح کرتے ہوئے لکھے ہیں کہ "فن برائے فن کے لیے ایک جملہ تحریر کرنے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ یہ ایک لایعنی اور لاحاصل کاوش ہوگی۔ الفاظ کھلونے اور منتے نہیں ہیں۔ معانی کے نقوش اور تصورات کے علایم ہیں۔ لہٰذا اسلوبِ بیان وہی معتبر و مؤثر ہے، جو کسی وقیع مواد کا پیرایہ ہو اور حسین ترین پیرایہ وہی ہوگا جو وقیع ترین مواد پر مشتمل ہو۔ مواد کی اس وقعت کا ہی ایک حصہ وہ نقطۂ نظر ہوتا ہے، جو ادیب کے اندر ایک جذبۂ اظہار پیدا کرتا ہے۔ یہی جذبہ اپنے مواد کے متعلق ادیب کے ذہن میں ایک اعتقاد کو راسخ کرتا ہے اور اعتقاد کی طاقت اسلوب کی توانائی اور رعنائی کا باعث ہوتی ہے۔ سرسید، شبلی، حالی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کے نقطۂ نظر، جذبے اور اعتقاد سے ہم واقف ہیں۔ ان کے متنوع اسالیب کا جمال و کمال ہماری تاریخِ ادب کی ایک متاعِ گراں مایہ ہے۔ سید سلیمان ندوی اس متاعِ گراں مایہ کے امانت دار ہیں۔

---

وارثی کنج، عالم گنج، پٹنہ، ۸۰۰۰۰۷ (بہار)

وہ بھی اپنے پیش روؤں کی طرح عالم و محقق اور ایک سماجی شخصیت تھے۔ وہ زندگی کا ایک نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ اپنے مقاصد کی تبلیغ ان کے پیشِ نظر تھی۔ یہ ان کا جذبۂ ابلاغ تھا، جس نے انہیں مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال کی طرف مائل کیا۔ انہیں ادب کی ایک روایت ورثے میں ملی تھی۔ اس ورثے کو فروغ دینے کے لیے انہوں نے ایک پورے دارالمصنفین کی تشکیل کی اور 'معارف' کو اس کا ترجمان بنایا۔ اس ادارے نے اشاعتِ علوم کے لیے ایک خاموش تحریک چلائی۔ اس تحریک ادبیات کا جو سلسلہ قائم ہوا وہ آج تک جاری ہے۔ ان ادبیات کی ایک نمایاں خصوصیت ان کے اسلوبِ نگارش کی ادبیت ہے۔ اس ادبیت نے تاریخ، سیرت، جغرافیہ اور فلسفے میں ادب کے گل بوٹے کھلائے ہیں، جن کی شگفتگی اور عطر بیزی نے ثقہ سے ثقہ علوم اور دقیق مباحث کو لطیف اور دل کش بنا دیا ہے اس طرح اس بھرپور ادبی خاموشی سے خالص ادبی موضوعات کو علم و آگہی سے مالامال کر دیا ہے۔ اس ثروت مندی سے تنقید میں تحقیق کا وزن پیدا ہو گیا ہے جب کہ تحقیق تنقید کی چاشنی سے بہرہ ور ہے۔ علم و ادب کی یہ ہم آہنگی دونوں کے لیے باعثِ اعتبار ہے۔ اس اعتبار میں ایک وقار اور سب سے بڑھ کر استناد ہے جس سے تحریر کے اندر پائیداری آتی ہے اور بصیرت و افادیت کا ایک مرقع تیار ہوتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی خالص ادبی تصنیفات دو ہیں۔ ایک خیام دوسرے نقوشِ سلیمانی۔ پہلی کتاب مشہور فارسی شاعر کی حیات اور شاعری پر حرفِ آخر ہے اور اس موضوع پر دنیا کی کسی زبان میں اس سے بہتر کوئی تنقید یا تحقیق آج تک لکھی نہیں گئی۔ دوسری کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو فاضل مصنف نے مختلف مواقع اور متنوع لسانی و ادبی موضوعات پر تحریر کئے۔ دونوں سے ایک ایک اقتباس کا مطالعہ کرنا کافی ہوگا:

"ایک شاعر و خطیب میں سب سے بڑا نازک فرق
یہی ہے، شاعر دنیا کو صرف اپنا دل دکھلاتا ہے،
خطیب سامعین کے دل دیکھتا ہے اور ان کے خیالات و
جذبات کو متاثر کرنا چاہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ تمام
بڑے بڑے شعراء کا ایک خاص رنگِ مذاق ہے،
جس کے مطابق وہ اپنے کلام کو فروغ دیتے ہیں۔"
(داکبر کا ظریفانہ کلام' ـــ نقوشِ سلیمانی ص ۱۶۳)

"خواجہ حافظ کی طرح دنیا میں کتنے خوش قسمت بادہ پرست
ہیں، جن کی شراب کو لوگوں نے شرابِ معرفت سمجھا
ہے، لیکن ایک بدقسمت خیام ایسا ہے جس کی شراب
کو دوست و دشمن سب یہی بھٹی والی شراب سمجھتے ہیں
اور انہوں نے یہ تصور کیا ہے کہ وہ ایک رندِ مے خوار تھا!
جو ہمیشہ مست و سرشار رہتا تھا، جس کے ادھر اُدھر
ٹوٹی صراحی اور پیالوں کے ٹکڑے پڑے رہتے تھے مگر
کیا واقعہ ایسا ہی ہے؟"
(خیام کی شراب' ـــ خیام ص ۳۳۱)

پہلے اقتباس میں ایک تنقیدی نکتہ بہت باریک بینی اور دقیقہ سنجی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، شاعر دنیا کو صرف اپنا دل دکھلاتا ہے، خطیب سامعین کے دل دیکھتا ہے۔ اس بیان میں معانی کی بلاغت بھی ہے اور الفاظ کی فصاحت بھی یہ متانت اور سلاست کی شیرازہ بندی ہے، جس میں دانائی اور خوش طبعی ہم آمیز ہیں۔ اس طرزِ بیان سے ایک اور نکتہ یہ نکالا گیا: 'یہی سبب ہے کہ تمام بڑے بڑے شعراء کا ایک خاص رنگِ مذاق ہے۔' یہ تنقید کی دروں بینی ہے جو شاعری کی دروں بینی کی تشریح کر رہی ہے۔ اس تشریح کا ایک ایک لفظ تولا ہوا ہے، اس لیے کہ گہرے غور و فکر کا نتیجہ اور وسیع مطالعے کا حاصل ہے ـــ فقط انشا پردازی کی ترنگ محض رائے زنی نہیں ہے۔ یہ اقتباس ۱۹۳۳ء کی تحریر ہونے کے باوجود جدید ترین ادبی بصیرت کا آئینہ دار ہے اور شاعر و خطیب کے درمیان وہ حدِ فاصل معین کرتا ہے جو آج تسلیم شدہ ہے۔ یہ استواری ایک علمی نقد و نظر کی آگہی پر مبنی ہے۔

دوسرا اقتباس تحقیقی تنقید یا تنقیدی تحقیق کا نمونہ ہے، جس میں طریقِ اظہار نے مفہوم کی ثقاہت کو ایک پُرلطف مرقع بنا دیا ہے: 'ایک بدقسمت خیام ایسا ہے کہ اس کی شراب کو دوست و دشمن سب یہی بھٹی والی شراب سمجھتے ہیں اور انہوں نے یہ تصور کیا ہے کہ وہ ایک رندِ مے خوار تھا، جو ہمیشہ مست و سرشار رہتا تھا، جس کے ادھر اُدھر ٹوٹی صراحی اور پھوٹے پیالوں کے ٹکڑے پڑے رہتے تھے۔' یہ ایک دل چسپ اور فکر انگیز عبارت ہے، جس میں خیال کو تصویر کا آب و رنگ عطا کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں فارسی تراکیب کے ساتھ ساتھ ہندوستانی الفاظ کا انتخاب اور ان کی ترتیب ایک بے خطا ادبی ذوق کے ساتھ کی گئی ہے، جس کی چاشنی قاری کے احساس کو تازہ کر دیتی ہے اور وہ مصنف کے منصوبے کے مطابق موضوع کے متعلق فرسودہ تصورات کے برخلاف کچھ نئے خیالات پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ بہ یک وقت منطق اور لطفِ کلام کی فتح ہے۔ اس طرح شرابِ علم جامِ ادب میں ڈھل گئی ہے۔

زیرِ بحث اقتباسات کے لفظیاتی تجزیے سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی کی نثر میں لسانی عناصر کی ترکیب ایک خاص توازن پر مبنی ہے اور یہی توازن بحیثیتِ زبان اردو کی انفرادیت کا نشانِ امتیاز ہے۔

اس امتیاز کی تشریح اور اس کے معیار کی تعیین میں سب سے بڑا حصہ خود مولانا کا ہے۔ تقریباً نصف صدی قبل جب خاص اس موضوع پر بحث و نزاع کا بازار گرم تھا، موصوف نے ایک قولِ فیصل ارشاد کیا:

"یہی وجہ ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی وغیرہ کے جو ہزاروں لفظ ہماری زبان میں آگئے ہیں، وہ ہماری زبان کے قاعدوں پر چڑھ کر ہماری زبان کی شکل و صورت اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔"

(تمہید — نقوشِ سلیمانی ص۴۱-۴۴)

"ہمارا یہی کہنا ہے اور ہم نے بار بار یہی کہا ہے کہ زبان وہ ہے جو چلن میں ہے، جو ہندوستان میں عام بولی کی حیثیت سے بولی اور لکھی جارہی ہے اور جس کو ہندو مسلمان بول اور سمجھ رہے ہیں اور لفظوں کی جانچ کا طریقہ شبد ساگر اور قاموس نہیں ہیں بلکہ ہمارے گھر اور بازار اور راستے اور گلی ہیں۔"

(ہماری زبان — نقوشِ سلیمانی ص۵۸-۳۵۰)

یہ ایک ایسے ماہرِ لسانیات کی رائے ہے، جو عربی اور فارسی کا مسلم الثبوت، مستند اور مشہور زمانہ عالم ہے۔ خود اس کی عبارت کے الفاظ یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ اس عالم کو ایک کامل السخن ادیب کی طرح اپنی زبان کے محاورات پر مکمل عبور تھا اور وہ اپنی قدرتِ بیان سے ہر قسم کے افکار و احساسات کا اظہار فصیح ترین نیز بلیغ ترین انداز سے کر سکتا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج ہماری زبان کی جو شکل و صورت ہے، اس کی تعمیر و ترقی میں مولانا سید سلیمان ندوی کا حصہ اردو کے بڑے سے بڑے ادیب سے ذرا بھی کم نہیں اور مولانا کو بلا خوفِ تردید اردو ادب کے معماروں اور ستونوں میں ایک کہا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں علامہ سید سلیمان ندوی نے ایک تاریخی رول ادا کیا ہے۔ وہ بجا طور پر شبلی کے جانشین سمجھے جاتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کی نثر میں انشا پردازی کا عنصر ہے۔ نذیر احمد کی نثر محاورہ بندی کا شکار ہے۔ سرسید کی نثر کا آہنگ ہموار نہیں ہے۔ حالی کی نثر میں نفاست کی کمی ہے۔ شبلی کی نثر دبیز و متین ہونے کے ساتھ ساتھ شستہ و شگفتہ ہے۔ یہی علمی نثر کا سب سے معیاری نمونہ ہے، جس میں تخلیقی وقار کے ساتھ ساتھ تخلیقی جمال نمایاں ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی نثر اسی وقار و جمال کا مرکب ہے۔ اور بحیثیت ادیب یہی ان کے اسلوب کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس امتیاز میں چند ہم عمر یا کم عمر معاصرین بھی شریک ہیں۔ مثال کے طور پر ابوالکلام آزاد، عبدالحق، اور ابوالاعلیٰ مودودی گرچہ جزوی طور پر کچھ نہ کچھ فرق ان سب کے درمیان پایا جاتا ہے۔ ابوالکلام آزاد کی نثر پر تنقید کے ناروا حملے بہت ہو چکے ہیں، مگر وہ سب کچھ ناواقفیت اور کچھ نادانی پر مبنی ہیں۔ یارانِ تنقید نے بیشتر الہلال والبلاغ اور تذکرہ کی عبارتوں کو سامنے رکھ کر رائے زنی کی ہے جب کہ بعض حضرات نے غبارِ خاطر اور کاروانِ خیال کو بھی مطالعہ میں شامل کر کے تنقیدی تعصبات میں قدرے توازن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ترجمان القرآن کو اس سلسلے میں اکثر نظر انداز کر دیا گیا۔ حالانکہ ابوالکلام کی نثر کا عروج اور بہترین نمونہ یہی ہے۔ اس میں غبارِ خاطر کی بعض عبارتوں کا غبار بھی دھل کر ایک مصفّا و مزکیّٰ بالکل سلیس، لطیف اور واضح شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ یہ اردو نثر کی وہ پُر وقار اور جمیل شکل ہے جو شبلی کے مکتبِ ادب سے منسوب کی جاتی ہے۔ عبدالحق کی وابستگی حالی کے مکتبِ فکر سے بتائی جاتی ہے، لیکن عبدالحق کی نثر میں نفاست کی وہ کمی نہیں جو حالی کے یہاں پائی جاتی ہے۔ یہ نثر اس ناہمواری سے بھی پاک ہے، جو سرسید کے طرزِ بیان میں موجود ہے بلکہ اس میں وہی ہمواری و استواری اور وقار و جمال ہے، جو شبلی کی خصوصیت ہے۔ لہٰذا ادبی اسلوب کے اعتبار سے سید سلیمان ندوی اور عبدالحق ایک ہی قبیلے کے افراد ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ سید سلیمان ندوی کے یہاں شگفتگی زیادہ ہے۔ اور عبدالحق کے یہاں شستگی زیادہ ہے — ابوالاعلیٰ مودودی نے شبلی کی علمی نثر کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ ان کی کثیر تصانیف کا حکیمانہ اسلوب نہایت محکم و موثر ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی نفاست کی چاشنی سے لبریز ہے۔ اس اسلوب کی متانت میں وہ خشکی نہیں، جو مثال کے طور پر عبدالحق کے یہاں پائی جاتی ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے اگر ہم عبدالحق سے قطع نظر کر لیں تو شبلی، ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی اور ابوالاعلیٰ مودودی کے ہاتھوں اردو نثر کا ارتقا جس ترتیب سے ہوا ہے اس میں ایک نقطۂ مشترک چاروں کی وہ بے پناہ علمیت ہے جس کا مقابلہ اردو کا کوئی دوسرا ادیب نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ افسانہ و ناول اور انشائیہ اور خاکہ کی دنیا سے تعلق رکھتا ہو یا تنقید و تحقیق سے۔ ان چاروں کی علمیت کی تہ میں ایک طرف زبردست تفکر ہے تو دوسری طرف اس کے اظہار کے لیے ویسا ہی جذبۂ تبلیغ ہے۔ اردو کے یہ ادبا اپنے دور اور معاشرے میں ایک انقلاب یا کم از کم ہمہ جہت اصلاح چاہتے تھے اور اس مقصد کے لیے ذہن و کردار کی عام تربیت ان کا نشانہ تھا۔ وہ اپنے قارئین کے دل و دماغ پر اثر انداز ہو کر پوری زندگی کو ایک رُخ دینا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تہذیبی اقدار اور اخلاقِ عامہ کو اپنا موضوع بنا کر الٰہیات و دینیات کے وہ مباحث ادب میں پیش کیے، جو براہِ راست انسانی وجود کی گہرائیوں کو اپیل کرتے ہیں۔ چنانچہ چاروں کی ادبیت کا بہترین نمونہ یا تو قرآن کی تفسیر میں

پایا جاتا ہے یا رسولؐ کی سیرت میں۔ شبلی کی سیرت النبیؐ، ابوالکلام آزاد کا ترجمان القرآن اور ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن اردو نثر کے عظیم ترین شاہکار ہیں۔ اسی طرح سید سلیمان ندوی کے ادبی اسلوب کا اوج کمال سیرت پر لکھے ہوئے ان کے خطبات مدراس میں دیکھا جا سکتا ہے۔ گرچہ انہوں نے سیرت النبی کی متعدد جلدیں بھی تصنیف کیں اور ارض القرآن کے نام سے قرآن میں درج مقامات کی تفسیر بھی لکھی۔ خطبات کے پانچویں باب کا عنوان ہے "جامعیت" اس میں صفحہ ۹۴ سے ۹۶ تک سیرت رسولؐ کی جامعیت کا تجزیہ جن لفظوں میں کیا گیا ہے وہ ہمارے ادب کے بہترین شہ پاروں میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں۔ ذیل میں ان کا ایک مختصر اقتباس دیا جاتا ہے :

"غرض ایک ایسی شخصی زندگی، جو ہر طائفۂ انسانی اور ہر حالتِ انسانی کے مختلف مظاہر، اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو، صرف محمد رسول اللہ صلعم کی سیرت ہے — اگر دولت مند ہو تو مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو۔ اگر غریب ہو تو شعیب ابی طالب کے قیدی اور مدینہ کے مہمان کی کیفیت سنو۔ اگر بادشاہ ہو تو سلطانِ عرب کا حال پڑھو۔ اگر رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو۔ اگر فاتح ہو تو بدر و حنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ۔ اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکۂ احد سے عبرت حاصل کرو۔ اگر تم استاد اور معلم ہو تو صفہ کی درسگاہ کے معلم قدس کو دیکھو۔ اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ۔"

اس عبارت کی خطابت اگر کسی ایک عنصر پر مبنی قرار دی جا سکتی ہے تو وہ ادبیت ہے۔ شاعری میں منتخب الفاظ کی نغمہ ریز تنظیم ذہنوں کو چھوتی ہے۔ اور نثر میں منتخب الفاظ کی پُر اثر ترتیب دماغوں کو متاثر کرتی ہے — فقروں اور جملوں کی ترکیب کا ایک آہنگ دونوں حالتوں میں ہوتا ہے — بہرحال اس آہنگ کی تحریک و تاثیر ان احساسات کی بدولت ہوتی ہے جو شاعر اور ادیب کی روح کی گہرائیوں سے بلند ہوتے ہیں اور ان کے قارئین یا سامعین کی روح کی گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں۔ اس طرح الفاظ متکلم اور مخاطب کے درمیان معانی کی ترسیل کا وہ عمل پوری کامیابی کے ساتھ ادا کرتے ہیں، جس کے لیے ان کی تخلیق ہوئی ہے۔

زیر نظر اقتباس کا تنقیدی تجزیہ واضح کرتا ہے کہ ایک ایک نکتہ ایک ایک جملے میں ادا کیا گیا ہے اور ہر نکتے کا مواد کوئی واقعہ ہے، جس کی حقیقت و اہمیت پر زور دینا مقصود ہے۔ تقریباً ہر جملہ ایک نئے فعل پر ختم ہوتا ہے اور مختلف جملوں کو لڑیوں کی طرح ایک دھاگے میں پرونے والا ہر جملے کے شروع میں 'اگر' کا وہ شرطیہ ہے جو قاری کی توجہ پیش آنے والے بیان کی طرف مبذول کر کے اوّل تا آخر یکسانی اور یکسوئی کے ساتھ قائم رکھتا ہے۔ اس طرح ایک کردار کے متنوع پہلوؤں کا نقشہ لفظوں اور جملوں کی پیہم تبدیلی کے ساتھ ایک مربوط انداز میں کھینچا جاتا ہے۔ یہ ایک مرقع ہے، جس کے آب و رنگ کی تابانی نثر سے وہی کام لیتی ہے جو بصورتِ دیگر شاعری سے لیا جا سکتا تھا، لیکن اس میں شاعری کے رموز و علائم اور قافیہ و ردیف کا طلسم نہیں ہے۔ بس سیدھے سادے واقعات کو صاف صاف ایک جوش اور روانی کے ساتھ رقم کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک بہت اچھی طرح لکھی اور گڑھی ہوئی نثر کا جادو ہے اس میں شائستگی بھی ہے اور شستگی بھی۔ متانت بھی ہے اور نفاست بھی۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی تحریروں کی اس ادبیت کا موازنہ اگر ان کے ایک صاحبِ اسلوب سمجھے جانے والے معاصر مہدی افادی کی ادبیت سے کیا جائے تو اصلیت و حقیقت بہت واضح ہو جائے گی۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مہدی افادی کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے لہٰذا وہ سارا زور کہنے کے انداز پر صرف کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس معاملے میں جتنا زیادہ زور لگاتے ہیں، حقیقت و اصلیت سے اتنے ہی دور چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو زیور وہ بہت کوشش سے گھڑ کر ہمارے سامنے لاتے ہیں وہ کسی بھی قیمتی دھات سے بالکل خالی ہوتا ہے۔ اور اس کی ساری چمک دمک محض ظاہری اور کھوکھلی ہوتی ہے۔ یہ چھوٹے نگوں کی ریزہ کاری یا مینا کاری ہے۔ اس کے برخلاف سید سلیمان ندوی کی تحریروں کی سطح پر اٹھنے والی موجیں ایک بحرِ ذخار کا پتہ دیتی ہیں۔ جس کی تہہ کا ہر صدف ایک گوہرِ نایاب رکھتا ہے اور جب یہ تھوڑی سی غوطہ زنی سے نکلتا ہے تو اس کی آب و تاب میں ایک فطری تازگی اور شادابی ہوتی ہے۔ سید کا ادب انشا پردازی کا تماشا نہیں۔ علم و دانش کا فصیح و بلیغ اظہار ہے۔ ان کے پاس کہنے کی اور کام کی کچھ باتیں ہیں، جنہیں وہ بہت اچھی طرح کہتے ہیں۔ اور اپنی معلومات کو ادب پارہ بنا دیتے ہیں۔ جب کہ مہدی صرف ادب پارہ بنانے کی فکر و کاوش کرتے ہیں۔ اور معلومات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ سید کے کچھ مقاصد ہیں اور مہدی بے مقصد ہیں۔ سید کے دماغ میں جو روشنی ہے، اس سے مہدی کا ذہن خالی ہے۔ سید ایک واضح نقطۂ نظر سے حیات و کائنات کو دیکھتے اور دکھاتے ہیں، جب کہ مہدی حیات و کائنات پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے یا زحمت گوارا نہیں کرتے۔ مہدی کے نزدیک وسیلۂ اظہار (MEDIUM) ہی پیغام ( MESSAGE ) ہے، لیکن سید پیغام کو پیغام سمجھتے ہیں اور اس کی ترسیل کے لیے موثر ترین وسیلۂ اظہار کی تلاش کرتے ہیں۔ سید کا مطمح نظر افادیت

آگے ۲۹ پر

شارب ردولوی

# سید سلیمان ندوی کی تنقید نگاری

کسی جنگ میں شکست یا کسی قوم کی زندگی میں کسی بڑے سانحے کا ردِ عمل دو صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ صبر و سکون کی تلاش میں ماضی کی بازیافت اور اس کے سہارے جینے کی خواہش، دوسرے سطحی ذریعوں سے خوشی و مسرت کی تلاش نغمہ و نے اور شراب و شاہد میں آلامِ روزگار اور کھوئی ہوئی عظمتوں کو بھول جانے کی کوشش۔ ایک تیسری صورت ناانصافی کو قبول نہ کرنے، ظلم کے آگے سر نہ جھکانے اور اپنے حق کے لیے جدّ و جہد کو مسلسل جاری رکھنے کی بھی ہے، لیکن یہ صورت شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ عام طور پر ایسی صورت میں ماضی، مذہب اور تصوّف یا عیش کوشی ہی سہارا بنتی ہے۔ ہندوستان میں بھی انتزاعِ سلطنتِ مغلیہ اور ہنگامۂ غدر کے پسپا ہو جانے کے بعد کچھ اسی طرح کی صورت پیدا ہوئی۔ ملک کے دانشوروں نے تعلیم اور ماضی کی بازیافت کی خاص طور پر مضمحل طبیعتوں میں تاریخ کی تدوین اور مذہبی عظمتوں کے بیان سے دلوں میں گرمی اور جھکے ہوئے سروں میں کج کلاہی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ـــــ اسی لیے ہنگامۂ غدر کے بعد تقریباً نصف صدی تک عملی اور علمی سطح پر اگر کوئی چیز سب سے زیادہ فعال نظر آتی ہے تو وہ اسکولوں، مدرسوں، درس گاہوں کا قیام اور تاریخ و مذہب، فقہ و سیرت کی کتابوں کی تدوین، تحریر، ترجمہ اور اشاعت ہے۔ ان کوششوں کے بعض اہم اور تاریخ ساز نتائج بھی نکلے، جن میں اردو نثر کا معیاری اظہار کا درجہ پانا اور اردو میں ادبی تنقید کی ابتدا شامل ہیں۔

یہ اتفاق ہے کہ تذکروں کے تبصرے، رائے زنی، نکتہ چینی اور معاصرانہ چشمک کے بعد حالی اور شبلی نے اردو تنقید کو ایک معیار اور تنقیدی رایوں کو توازن بخشنے کی کوشش کی۔ یہاں آزاد کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی جو ایک اہم درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تذکروں یا آزاد کی تاریخی و تنقیدی کاوشوں کے فوراً بعد حالی اور شبلی کے یہاں اردو تنقید میں ایک جست نظر آتی ہے۔ اب تک کسی چیز کی اچھائی یا برائی کے لیے کوئی معیار یا اصول نہیں تھا۔ شبلی نے اس کی بنیاد فنی اور جمالیاتی قدروں پر رکھی حالی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور سوسائٹی کو شامل کر کے ادبی تخلیق کا رشتہ زندگی سے جوڑ دیا۔ حالانکہ حالی کے یہاں ساری بحث کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ بڑی حد تک اخلاقی ہے، لیکن انہوں نے آنے والوں کے لیے مطالعے کی ایک نئی راہ ہموار کی۔ شبلی نے فنی و جمالیاتی قدروں پر شاعر کے کلام کو پرکھا۔ علم کلام اور بدیع و بیان کی روشنی میں اس کے محاسن اور معائب پر روشنی ڈالی، لیکن اس پورے عہد اور اس کے فوراً بعد آنے والے رجحانات کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں غالب رجحان تاثراتی تنقید کا نظر آتا ہے۔ خود شبلی اور حالی کے یہاں بھی بہت سی جگہوں پر تاثراتی رجحان غالب ہے۔ حالانکہ انہیں عام اصطلاح میں، تاثراتی نقاد کہنا درست نہیں ہوگا۔ حالی و شبلی کے بعد کے عہد کو ضرور تاثراتی و جمالیاتی عہد کہا جا سکتا ہے۔ شاید اس کا سبب وہ سماجی و سیاسی حالات تھے جن میں ادب مسرت و انبساط حاصل کرنے کا ایک ذریعہ رہ گیا تھا اور جب ادب صرف لطف و مسرت کے حصول کے لیے ہو تو اس کی قدروں کے پیمانے بھی مسرت و انبساط کی بازآفرینی سے آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔

تاثراتی تنقید کا بنیادی کام کسی فن پارے سے حاصل ہونے والے لطف و انبساط کے تاثر کا اظہار ہے۔ وہ مصنف کی تخلیق کی پیچیدگیوں میں اُلجھنے کے بجائے اس پر اپنے ردِ عمل یا تاثر کا اظہار کرتی ہے۔ وہ کسی اچھائی یا برائی کے لیے کوئی سبب پیش نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ تاثراتی نقاد ایک خاص طرح کی توصیفی لفظیات کا استعمال کرتا ہے، جس کے لیے اگر کسی منطقی استدلال کو دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو کوئی تشفی بخش جواب حاصل نہ ہوگا۔
حالی اور شبلی کے بعد ایک عرصہ تک اردو تنقید میں کوئی بڑا نام نظر نہیں

• ڈی ۱۸/۵ - ماڈل ٹاؤن، دہلی ۱۱۰۰۰۹

آتا۔ اس کا بنیادی سبب وہی ہے جس کی طرف ابتدائی سطروں میں اشارہ کیا جاچکا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد اپنی تاریخ، مذہب، فقہ اور تعلیم کی طرف توجہ زیادہ کی گئی۔ اسلاف کے کارنامے اور اُن کی تاریخ کو محفوظ رکھنے کی کوشش زیادہ ہوئی۔ عملی سطح پر ادب اور ادبی تفہیم کی کوشش کی حیثیت ثانوی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی اور حالی کے بعد ان کے ادبی ورثا میں کوئی بڑا نقاد نظر نہیں آیا۔ شبلی نے ندوہ اور دارالمصنفین میں بہت سے ایسے عالم، محقق، مورخ، دانشور، سوانح نگار اور سیرت نویس پیدا کیے جن کا نام علم و ادب کی دنیا میں بڑے احترام سے لیا جاتا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شبلی کے شاگردوں کے سلسلے کے علاوہ کوئی دوسرا سلسلہ مشکل سے ملے گا، جس نے اس عظیم ورثے کو تقریباً ایک سو سال تک اسی طرح جاری رکھا ہو۔ اور اس میں اضافے کے عمل کو رُکنے نہ دیا ہو، لیکن یہ بات یقیناً تعجب کی ہے کہ ان کی ادبی و تنقیدی وراثت کا کوئی اچھا حامل نہیں ملا۔ دبستانِ شبلی میں مولانا عبدالسلام ندوی کا نام اردو تنقید کے سلسلے میں لیا جاتا ہے، لیکن ان کی بھی اولین ترجیح تاریخ، فقہ اور سیرت ہی ہے، اسی لیے انھیں ادبی نقاد سے زیادہ صحابۂ کرام کی سیرت لکھنے کی بنیاد ڈالنے والا سمجھا جاتا ہے۔ ان کی مذہبی تصنیفات پر "اقبال کامل" اور "شعر الہند" کو فوقیت اور برابری کا درجہ حاصل ہو یا نہیں لیکن ان کی تنقیدی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

سید سلیمان ندوی کا تعلق بھی تاریخ، سیر، فقہ اور تحقیق سے ہے، جہاں تک زبان و ادب کا تعلق ہے۔ وہ ایک بڑے انشا پرداز اور صاحبِ طرز مصنف ہیں۔ زبان کے بارے میں ان کے مضامین، ان کی لسانی بصیرت، عمیق مطالعے اور مسائل پر مکمل گرفت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ وہ ایک ممتاز عالم، سوانح نگار، مورخ اور محقق ہیں، لیکن ادبی نقاد کی حیثیت سے ان کا دائرہ محدود رہے۔ ان کے علمی ادبی تاریخی اور تحقیقی کارنامے (۳۰) تیس سے زائد جلدوں پر مشتمل ہیں، جن میں اگر تنقیدی مضامین کو تلاش کیا جائے تو مقدمات کو ملا کر ان کی تعداد دس یا بارہ سے زائد نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ بعض ممتاز ادیبوں اور شاعروں کے انتقال پر ادارتی نوٹ یا وفیات ہیں، جن کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہے۔ اس طرح ان کے علمی کارناموں میں ادبی تحقیق و تدوین کا حصہ تو قابلِ ذکر نکل آئے گا۔ لیکن تنقید کا حصہ بہت کم ہے۔ ان کی ادبی تنقید کے سلسلے میں اگر کسی چیز کو شمار کیا جاسکتا ہے تو وہ "نقوشِ سلیمانی" کے دو مضامین "اکبر کا ظریفانہ کلام" اور "ہاشم علی کا مجموعۂ مراثی" ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً دس گیارہ مقدمات ہیں جو انھوں نے مختلف مجموعوں اور کتابوں پر لکھے ہیں۔ مضامین تعداد میں کم ہیں، لیکن اپنے اسلوب، زبان کی لطافت و پاکیزگی اور سلجھے ہوئے اندازِ بیان اور اپنے تاثراتی و جمالیاتی رنگ کی وجہ سے پڑھنے والے کو متاثر کرتے ہیں۔ جمالیاتی ناقدین میں بعض نظریۂ اظہاریت کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں شعر اظہار کی ایسی شکل ہے جس کی تہوں تک پہنچنا اور اس کے رموز و علائم کو واضح کرنا نقاد کے فہم و ادراک سے باہر ہے۔ بعض شعراء نے بھی اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ؎ شعر مرا بہ مدرسہ کہ بُرد۔ یا جوش نے تو بڑے سخت الفاظ میں یہ بات کہی ہے کہ ؎

رحم اے نقادِ فن یہ کیا ستم کرتا ہے تو
کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو
منطقی کانٹے پہ رکھتا ہے کلامِ دل پذیر
کاش اس نکتے کو سمجھے تیری طبعِ حرف گیر
یعنی اک بے پر لب ناقد کو کھلنا چاہیے
پنکھڑی پر قطرۂ شبنم کو تُلنا چاہیے

جوش نے سیف و سبو کے دیباچے میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور اپنی نظم "نقاد" میں تو انھوں نے اُسے ادب ناآشنا تک قرار دے دیا ہے۔ ادب کے بارے میں یہ رویہ رومانی اور تاثراتی شعراء کے یہاں ہی پایا جاتا ہے، جہاں شاعری یا ادبی تخلیق آسمانی قوت اور غیر ارادی عمل کا نتیجہ ہے۔ جس میں ایسی حسین و رنگین کیفیت اور مدہوش کر دینے والی فضا ہے، جس کا لطف تو لیا جاسکتا ہے، بیان نہیں کیا جاسکتا۔ تاثراتی تنقید بھی فنی تخلیق کے بارے میں کوئی تجزیہ نہیں کرتی بلکہ تخلیق سے مرتب ہونے والے تاثرات کو قلمبند کر دیتی ہے۔ مثلاً مکاتیبِ مہدی کے مقدمے کو ملاحظہ کیجیے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:۔

> "مہدی مرحوم کے خطوط پر تبصرہ کرنا اور ان کی خوبیوں کو ایک ایک کرکے دکھانا ایسا ہی ہے جیسے خوش رنگ اور خوشبو دار پھول کی ایک ایک پنکھڑی کو توڑ کر کوئی ستمگار قدرت کی صناعی کی داد دے۔۔۔۔۔ بہتر سے بہتر صورت نزاکت و لطافت کی ان تصویروں کے لیے یہی ہے کہ دُور ہی سے ان کی خوش نمائی، خوش رنگی، خوش قامتی اور خوشبو کی تعریفیں کی جائیں اور ان سے لطف اٹھائے اور دوسروں کو لطف اٹھانے دے۔" [1]

اس اقتباس سے اندازہ ہوگا کہ وہ ادبی تخلیق کے بارے میں تحلیل و تجزیے کے قائل نہیں تھے بلکہ وہ اس کے مجموعی تاثر سے محظوظ ہوتے اور دوسروں کو محظوظ کرنا چاہتے تھے۔

تاثراتی تنقید کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں نقاد مصنف سے بلند قامت

---

[1] نقوشِ سلیمانی۔ سید سلیمان ندوی۔ ص ۳۷۹، ۳۷۸

نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی زبان، اسلوب اور طرزِ نگارش سے ایسی فضا پیدا کرتا ہے کہ اس فضا میں مصنف کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ مثلاً مہدی افادی کے بارے میں یہ دو اقتباسات ملاحظہ کیجیے:۔

"آزاد کی ادبی نفاست و لطافت اور نذیر احمد کی
چہل اور خوش طبعی اگر یکجا دیکھنا ہو تو مہدی مرحوم کی قلمی
مخلوق دیکھئے۔"[1]

یا

"مرحوم کا قلم حد سے زیادہ چلبلا اور البیلا تھا۔
نوکِ قلم پر جو بات آجاتی وہ ناگفتنی بھی ہوتی تو گفتنی
ہو کر نکل جاتی اور پھر اس طرح نکلتی کہ شوخی صدقے
ہوتی اور متانت مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیتی۔"[2]

تاثراتی تنقید ایک مقام پر پہنچ کر "تخلیقی تنقید" کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے، جسے تاثرات کے اظہار کی فنی معراج کہا جا سکتا ہے۔ یعنی جس جگہ کوئی تنقیدی کاوش اپنی دل کشی اور زبان کی چاشنی میں تخلیق کے برابر پہنچ جائے۔ امریکی نقاد اسپنگارن نے اپنی تنقید کو تخلیقی تنقید کہا ہے اور اسے فنی تخلیق کی کیفیت کی بازیافت قرار دیا ہے۔ یعنی تخلیقی عمل میں احساس و جذبے کی جس کیفیت سے فن کار گزرا ہے۔ اسی کیفیت سے نقاد کو بھی گزرنا چاہیئے۔ اسی صورت میں وہ اس کی بازآفرینی میں کامیاب ہو سکے گا۔

سید سلیمان ندوی نے اپنے مضامین میں ہر جگہ تخلیقی کیفیات کے اس سرور کو، سرمستی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کا ذوقِ سلیم اتنا بلند اور زبان پر انہیں اس قدر قدرت ہے کہ وہ بڑی کامیابی کے ساتھ اس فضا کو پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً اس وقت کے ایک نو وارد شاعر، جگر مرادآبادی کے مجموعۂ کلام "شعلۂ طور" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ :۔

"جگر مستِ ازل ہے۔ اس کا دل سرشارِ الست ہے۔
وہ محبت کا متوالا ہے اور عشقِ حقیقی کا جویا۔ وہ مجاز
کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بت خانے کی
گلی سے کعبے کی شاہراہ تک۔ خم خانے کے بادۂ
کیف سے خود فراموش ہو کر بزمِ ساقیٔ کوثر تک پہنچنا
چاہتا ہے۔"[3]

[1] نقوشِ سلیمانی۔ سید سلیمان ندوی صفحہ ۳۸۰
[2] " " " " ۳۸۵
[3] " " " " ۴۳۱

سید سلیمان ندوی کی [illegible] ۱۹۲۲ [illegible] کا تصور کیجیے۔ ان کی یہ رائے اس وقت ہے جب وہ خود اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ "جگر کی شاعری کے معنوی خیالات بہت مختصر ہیں۔ وہ انہیں الٹ پلٹ کر دہراتے رہتے ہیں" (صفحہ ۴۳۰) لیکن جب وہ ان کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں تو تاثرات کا ایک دریا موجزن نظر آتا ہے۔ یہ بالکل الگ بات ہے کہ سید سلیمان ندوی کے متذکرہ جملے ادب کی ایک بہت بڑی پیش گوئی ثابت ہوئے جو اس وقت میرا موضوع نہیں ہے۔

سید سلیمان ندوی نے دو جلدوں میں مکاتیبِ شبلی مرتب کیے۔ یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ تھا کہ ہزاروں خطوں کو جمع کر کے انہوں نے ترتیب دیا اور شائع کیا۔ مکاتیبِ شبلی کا مقدمہ بھی ان کی تنقید نگاری کی ایک اہم مثال ہے۔ اس مقدمے میں انہوں نے خطوط کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ذاتی خطوط اور مکاتیب انسان کی حقیقی شکل و صورت کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔" (صفحہ ۳۶۵) انہوں نے خطوط کو سوانح نگاری کا بھی ایک اہم ذریعہ قرار دیا ہے، لیکن جب وہ شبلی کی خطوط نگاری پر رائے دیتے ہیں تو تاثراتی اظہار سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں :۔

"وہ چند لفظوں میں جو جادو پھونک دیتے ہیں، اس
زمانے کے سامری سیکڑوں منتروں میں وہ روح پیدا
نہیں کر سکتے۔"[1]

یا

خطوط کی ترتیب و انتخاب کے سلسلے میں انہوں نے تین اصولوں کو پیشِ نظر رکھا تھا۔ اول وہ خطوط جن میں کوئی ذاتی یا سوانحی واقعہ ہو، دوسرے علمی، اصلاحی و قومی مسئلے کا ذکر تیسرے انشا پردازی کا نمونہ ہو اور پھر لکھتے ہیں کہ :۔

"ان ہی تین اصولوں کی رہبری میں ہزاروں خطوط
کے انبار سے یہ چند دلنے چھانٹ کر الگ کیے ہیں
ورنہ ایک سچے مومن کے نزدیک قرآن کی سب
سورتیں برابر ہیں۔"[2]

اس جملے کو جتنی بار پڑھئے، ایک نیا لطف آئے گا۔ زبان کی دل کشی اور مثال کی جرأت پر طبیعت وجد کرے گی اور عرصے تک اس کا تاثر ذہن پر رہے گا۔ لیکن اپنے شدید تاثر اور دل کشی کے باوجود یہ جملہ شبلی کی خطوط نگاری کو پیش کرنے سے بہرحال قاصر ہے۔

شبلی سے مولانا سید سلیمان ندوی کو جس طرح کی عقیدت تھی، اس لیے

[1] و [2] نقوشِ سلیمانی۔ سید سلیمان ندوی۔ صفحہ ۳۷۲۔۳۷۳

ان کا تاثراتی ہو جانا فطری بات تھی ۔ انہوں نے جہاں بھی شبلی کا ذکر کیا ہے ،
وہ تاثرات میں بہہ گئے ہیں۔ شبلی کے انتقال پر جو مضمون اُنہوں نے لکھا تھا
وہ بھی تاثراتی تنقید کی بہت اچھی مثال ہے ۔ ان کا یہ مضمون یادِ رفتگاں میں
شامل ہے ۔ جس میں لکھتے ہیں :

"ہندوستان کی سیر حاصل زمین نے علوم وفنون میں
جو بالیدگی پیدا کی اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں تاہم مختلف
دوروں میں کلام واسرارِ شریعت میں بحر العلوم اور
شاہ ولی اللہ ، ادب و معانی میں قاضی عبدالمقتدر
ملک العماد دولت آبادی اور ملا محمود جون پوری ، فلسفہ
منطق میں ملا نظام الدین اور ملا محب اللہ بہاری
ادب وشاعری میں مسعود سعد سلمان خسرو اور فیضی
تاریخ وخبر میں ضیا برنی ، ابوالفضل اور آزاد بلگرامی
کو پیدا کیا لیکن اس کے آغوش کا آخری فرزند (شبلی) وہ
تھا جو ملا محمود بھی تھا اور فیضی بھی ۔ محب اللہ بھی اور
کم از کم وہ یگانہ انفراداً ان میں شروع کے دو ایک
کو چھوڑ کر اکثر کے برابر اور مجموعاً ان میں سے اکثر سے
بہتر تھا ۔" ؎۱

سید سلیمان ندوی کے تنقیدی مضامین میں "اکبر کا ظریفانہ کلام" ان کا
سب سے اہم مضمون ہے ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہی مضمون اُنہوں نے
تنقیدی مضمون کی حیثیت سے لکھا تھا ۔ ورنہ باقی تمام مقدمات ہیں ۔ مضامین
کے سلسلے میں ہاشم علی برہان پوری کا مجموعہ مراثی "دیوانِ حسینی" بھی ہے ، جس پر
انہوں نے باقاعدہ مضمون لکھا ہے ، اس کی حیثیت تحقیقی مضمون کی ہے ، جس
میں ولی دکنی کے ایک معاصر شاعر کے مرثیوں کا تعارف کرایا گیا ہے ۔ اکبر کے
ظریفانہ کلام میں اکبر کے کلام کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے اُنہوں نے اکبر کی ظرافت
کے سات عناصر بتلائے ہیں ۔ یہ مضمون ان کا یقیناً ایک اہم تنقیدی مضمون
ہے ۔ اُنہوں نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے کہ :

"میر صاحب کا احسان یہ ہے کہ اُنہوں نے سعدی ...
اور خیام کے مغز سخن کو امانت کے الفاظ اور سید انشا
کی بولی میں اس طرح ادا کیا کہ وہ نہ صرف تفریح طبع
اور واہ واہ کا سامان رہا بلکہ اس کی تہہ میں پند و
موعظت ، اخلاقی تعلیم ، سیاسی نکتے ، فلسفیانہ اسرار

---

؎۱ یادِ رفتگاں سید سلیمان ندوی صفحہ ۹، ۱۰

مذہبی مسائل اور اجتماعی مباحث بھی نظر آنے لگے ۔" ؎۱

ان کے مقدموں میں بعض ایسے مقدمے بھی ہیں جن میں کوئی تنقیدی
رائے نہیں دی گئی ہے ۔ مثلاً گلستانِ امجد ، خمستان ، عطرِ سخن ، حقیقتِ علمی
شاعری اور مسدس حالی وغیرہ اسی طرح یادِ رفتگاں میں اُنہوں نے یوں تو بہت
سے شعرا اور ادیبوں کے بارے میں لکھا ہے ، لیکن عام طور پر ان کے انتقال پر صرف
اظہارِ افسوس کیا ہے ۔ ان کے فن پر کوئی رائے نہیں دی گئی ہے ۔ یہاں تک کہ
مولانا عبدالحلیم شرر ، شاد عظیم آبادی ، وحیدالدین سلیم ، مولانا طباطبائی ، سجاد حیدر
یلدرم اور حسرت موہانی جیسے حضرات کے بارے میں کسی تنقیدی رائے کا اظہار
نہیں کیا گیا ہے ۔ صرف پریم چند کے انتقال پر چند سطروں میں ان کے اسلوب اور
دیہاتی تمدن کی تصویر کشی کا ذکر ہے اور اقبال کے انتقال پر مخصوص تاثراتی انداز
میں تبصرہ ہے جس میں لکھتے ہیں :

"اقبال صرف شاعر نہ تھا وہ حکیم تھا ، وہ حکیم نہیں
جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں
کے خوشہ چیں بلکہ وہ حکیم جو اسرارِ قدرت کا محرم اور
رموزِ فطرت کا آشنا تھا ۔ وہ نئے فلسفے کے ہر راز کو
اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا تھا ۔ یعنی بادۂ انگور کو نچوڑ
کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا ۔" ؎۲

سید سلیمان ندوی کے بارے میں شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا
ہے کہ :-

"وہ اگرچہ قدیم تعلیم کے نمائندے تھے ۔ ان کی تعلیم و
تربیت تمام تر پرانے ماحول میں ہوئی تھی ۔ لیکن ان
کے قلب میں بڑی وسعت تھی ۔ وہ جدید خیالات اور
رجحانات اور اس کے طور طریقوں سے پوری طرح واقف
تھے ..... اس لحاظ سے وہ قدیم وجدید کا سنگم تھے ۔" ؎۳

اس اقتباس پر سید سلیمان ندوی کی مذہبی تاریخی و تحقیقی اور سوانحی
تصنیفات کی روشنی میں کسی تبصرے کا اہل میں اپنے کو نہیں سمجھتا ، لیکن تنقید کے
سلسلے میں یہ ایک حقیقت ہے کہ اُنہوں نے اپنی تمام مذہب پرستی ، سیرت نگاری
تاریخ نویسی کے باوجود ایک کھلے ہوئے ذہن کے ساتھ ایک آزاد مفکر کی طرح
نئی چیزوں کو قبول بھی کیا اور برداشت بھی کیا جو معمولی بات نہیں ہے ۔

---

؎۱ نقوشِ سلیمانی ۔ سید سلیمان ندوی صفحہ ۱۴۶
؎۲ یادِ رفتگاں ۔ " " " صفحہ ۲۱۱
؎۳ حیاتِ سلیمان صفحہ ۶۸ بحوالہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات ڈاکٹر خورشید نعمانی ۔

محمود اسرائیلی کے مجموعۂ کلام 'خیاباں' پر مقدمہ لکھتے ہوئے انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ فردوسی نے محمود کو نہیں بلکہ محمود نے فردوسی کو پیدا کیا۔ یعنی زمانے کے حالات اور تبدیلیاں بڑے شعرا اور بڑی شاعری کے وجود میں آنے کا سبب بنتے ہیں۔ جو زمانہ فتوحات، کشاکش اور تصادم کا زمانہ ہوگا۔ اس زمانے کے شعرا کے کلام میں صداقت کا زور اور واقعیت بیان کا جوش ہوگا۔ دوسرے معنی میں انہوں نے شاعری کو اپنے زمانے کے حالات کا تابع قرار دیا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ :۔

"شاعر انقلاب کے نئے آثار اور نتیجوں سے بے خبر نہیں
وہ غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کی تکلیفوں سے
بھی رنجیدہ اور سرمایہ داروں کی بے رحمیوں سے بھی
ملول ہے۔" [1]

یہ مقدمہ انہوں نے ۱۹۳۷ء میں لکھا تھا۔ اس کا انداز اس کا لب و لہجہ اور اس کا نقطۂ نظر سب ان کے تمام مضامین اور مقدموں سے مختلف ہے۔ اس میں نہ تاثراتی جوش ہے اور نہ الفاظ کی رومانی فراوانی۔ ظاہر ہے کہ یہ مضمون ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس کے انعقاد کے بعد کا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ قدیم طرز کے مولوی ہونے کے باوجود انہوں نے اس جدید تحریک کا کس طرح اثر قبول کیا۔

اس کے علاوہ ایک اور جدید اثر ان کے یہاں نفسیاتی رجحان کا نظر آتا ہے، جسے ARCHITYPAL نقطۂ نظر کہتے ہیں اور جو مشہور ماہرِ نفسیات یونگ کی دین ہے۔ زیر بحث مضمون مکاتیب مہدی کا مقدمہ ہے، جو ۱۹۳۸ء میں تحریر کیا گیا تھا۔ اس وقت تک یونگ کے نفسیاتی نظریات مغربی دنیا میں تو پھیل چکے تھے، لیکن ہندوستان اور بالخصوص یہاں کے علما ان نظریات کے رموز سے کس حد تک واقف تھے، اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے، لیکن مہدی افادی کے خطوط پر گفتگو کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ :۔

"مرحوم کی تحریر کا ایک کمال یہ تھا کہ وہ تلمیحوں سے اکثر
کام لیتے تھے۔ تلمیح کا فلسفہ ہے کہ ایک خاص شخص یا واقعے
سے متعلق صدیوں کے خیالات کی موروثی رفتار جو تفصیلات
اور جزئیات کا ذخیرہ پیدا کرتی ہے۔ وہ پورا کا پورا ایک
لفظ یا واقعے کے اندر سمٹا رہتا ہے۔" [2]

یہاں پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے یونگ کے نقطۂ نظر کا ترجمہ کر دیا ہے۔ ان دونوں اقتباسات کے پیش کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ مولانا سید سلیمان ندوی حقیقت میں جدید و قدیم کا سنگم تھے۔ کسی نئی بات کو قبول کر لینا آسان نہیں ہے، لیکن وقت، زمانے اور تاریخ و تہذیب کی تبدیلی اور تبدیلی کے اس عمل پر ان کی نگاہ تھی۔ اپنے تمام مذہبی علم اور مولویت کے باوجود ان تبدیلیوں کے بہتر عناصر کو قبول کر لینے کی ان میں ہمت و جرأت تھی۔ سید سلیمان ندوی کا شمار بنیادی طور پر ادب کے ناقدین میں کرنا خود ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ لیکن ان کے تنقیدی مضامین و مقدمات اردو میں تاثراتی تنقید کی ایک اچھی مثال ہیں۔

---

[1] نقوشِ سلیمانی۔ سید سلیمان ندوی صفحہ ۴۶۰ - ۴۵۹

[2] " " - " " " " ۳۸۶

---

## بقیہ : مکتوبات

ثابت کیا ہے کہ سودا کی جاگیر بعہد آصف الدولہ محض ۲۲۷۰ روپے سالانہ کی تھی نہ کہ چھ ہزار کی۔ بے شک موصوف نے مقالے کی تیاری میں کافی چھان بین سے کام لیا ہے۔ سرداری لال نشتر کا مضمون عمدہ ہے۔ خواجہ احمد عباس کا من کہ ... بہت خوب ہے۔ ستیش بترا کے مشاہدہ و بیان دونوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ محسوس ہوا کہ ان کے ذہن میں فوٹو کیمرے کا لینس، ان کی نوکِ قلم کیمرے کا سوئچ اور آج کل کے صفحات فلم کی ریلیں ہیں۔

شاداب رضی، بھاگلپور

---

چودھری محمد نعیم

# میر کی مثنوی "گنجینۂ راز" کا مصنّف کون ہے؟

( ۱ )

ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کے ذخیرے میں میر تقی میر کے کلیاتِ اُردو کے کئی اہم نسخے ہیں[۱]۔ ان میں سے ایک (سوسائٹی کلکشن ۶۵-۱۱) کی جلد دوم میں میر کا فارسی کلام بھی ہے۔ ترقیمہ کی عبارت کے مطابق یہ نسخہ دہلی میں کسی محمد خاں صاحب کے لیے ۱۲۱۲ ہجری میں تیار کیا گیا تھا۔ چونکہ اس کی تیاری میں خاصا اہتمام کیا گیا ہے، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ یہ محمد خاں کوئی اہم ہستی رہے ہوں گے۔ کاتب نے دو جگہ اپنا نام محمد امین بیگ بتایا ہے۔ سوسائٹی کے قبضے میں آنے سے پہلے یہ نسخہ فورٹ ولیم کالج کی ملکیت تھا اور اندرونی شواہد بتاتے ہیں کہ اسی نسخہ کو بنیاد بنا کر کالج کے منشیوں نے کلیاتِ میر کا وہ متن تیار کیا تھا جو کالج کی طرف سے ۱۸۱۱ء میں شائع ہوا۔

اس نسخے کے دیوانِ فارسی کے حصے میں (جس پر کاتب نے عنوان "دیوانِ پنجم" دیا ہے) غزلیات اور رباعیات کے بعد آخر میں دو مثنویاں بھی ہیں — ان پر کوئی عنوان نہیں دیا گیا ہے۔ پہلی مثنوی تو وہی ہے، جس کا متن ڈاکٹر نیّر مسعود نے نقوش (لاہور) کے "میر نمبر ۳" میں شائع کیا ہے اور جس کا پہلا شعر ہے[۲]

لے صبا گر سوئے دہلی بگذری      ہم چو صرصر آہ مگذر سرسری

دوسری مثنوی تاحال غیر مطبوعہ ہے۔ اس کی دریافت کی خبر مارچ ۱۹۸۵ء میں قومی آواز (لکھنؤ) میں شائع ہوئی تھی اور یہ بتایا گیا تھا کہ یہ مثنوی دراصل بھگوت گیتا کا مختصر اور آزاد ترجمہ ہے۔ میرا خیال تھا کہ باقاعدہ محشّٰی تنقیدی متن تیار کر کے، تفصیلی مقدمے کے ساتھ اسے شائع کر دوں گا، لیکن گزشتہ دو ماہ میں تحقیق کے دوران چند ایسے انکشاف ہوئے کہ میرے لیے ضروری ہو گیا کہ اب تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کی اشاعت فوری کر دی جائے تاکہ اہلِ علم کے قیمتی مشوروں سے میں مستفید ہو سکوں۔

( ۲ )

یہ دوسری مثنوی ۵۳۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ اگرچہ اس کی ابتدا میں کوئی عنوان نہیں دیا گیا ہے، لیکن آخر کے ایک شعر میں اس کا نام "گنجینۂ راز" بتایا گیا ہے۔ ساتھ ہی شاعر کا تخلص میر بھی ملتا ہے۔ وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو[۳]

ابتدا:

۱۔ رئیسی بپرسید از برہمن      کہ ای واقف حادثاتِ کہن

۲۔ اگر جنگ کر کست واری بیاد      بیاں کن کہ چوں اتفاق اوفتاد

۳۔ دو لشکر چساں باہم آویختند      چہ کیں بود تا خون ہم ریختند

۴۔ نصیب کہ گردید فتح و ظفر      کہ افتاد برخاک داڑدنہ سر

۵۔ بگفتا کہ ای خلق عالم پناہ      بہ بستند از ہر دو سو صف سپاہ

۶۔ چو پور لوّا از دور انبوہ دید      بسوے درونہ باندوہ دید

۷۔ کہ یکبرہ بیں کثرت پاندوان      چہ طور ست ترتیب صفہای شان

۸۔ دو صد مردہ مرد لیست سالار فوج      جگر دارش رونق کار فوج

اختتام:

۵۳۰۔ پی تام این مثنوی سر بجیب      فرو بردہ بودم کہ ہاتف زغیب

۵۳۱۔ ندا داد در برگ طرب ساز کن      مسمی بہ گنجینۂ راز کن

۵۳۲۔ اگر میر بر خود شکستن بجاست      دلِ در فقیری لبی بدنماست

۵۳۳۔ بدرگاہ ایزد سپاسی بکن      برائی قبول التماسی بکن

---

• دی یونیورسٹی آف شکاگو، فاسٹر ہال، ۱۱۳۰- ایسٹ ۵۹ اسٹریٹ، شکاگو
الی نوائس ۶۰۶۳۷ (یو- ایس- اے)

۵۲۴۔ در الفاظ بندی خطا جرم نیست — تغافل کن و دشمنانہ (نہ) الیست

۵۲۵۔ پذیرفتنی عرمن درخوراست — زبانم دگراین (زبان) دیگرست

۵۲۶۔ خطائی دگرار بچشم آیدت — بلیغ اندک انصاف میبایدت

۵۲۷۔ کہ کم خوردہ ام آہ کم خفتہ ام — جگر سفتہ ام کاینقدر رگفتہ ام (گفتہ ام)

اس مثنوی کا متن مخطوطے کے فولیو ۸۲۹ ب سے ۸۴۷ ب تک ہے۔ ختم پر ڈیڑھ صفحہ خالی چھوڑ کر فولیو ۸۴۸ ب سے "فیض میر" کی عبارت نقل کی گئی ہے اور اوپر عنوان دیا ہے "من نثر" — مثنوی یک بیک شروع ہوتی ہے۔ اور ۱ب سے ۸۲۹ب تک گیتا کے مضامین نظم کئے گئے ہیں۔ چنانچہ کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا کہ اس ترجمہ کی تحریک کیونکر ہوئی۔ شاعر نے خود اپنے شوق سے تصنیف کیا یا کسی رئیس کی فرمائش پر۔ مثنوی کا نام "گنجینۂ راز" اسم تاریخی بھی نہیں جو اس سے تاریخ تصنیف کا پتہ چلے۔

## (۳)

ظاہر ہے سب سے پہلا سوال یہی اُٹھتا ہے کہ کیا یہ مثنوی واقعی میر کی تصنیف ہے؟ اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کے لیے ہم مندرجہ ذیل شواہد پیش کر سکتے ہیں:

۱۔ یہ مخطوطہ میر کی حیات میں تیار کیا ہوا ہے۔ اگرچہ اس وقت میر کو دہلی چھوڑے ہوئے لگ بھگ پندرہ برس ہو چکے تھے لیکن تب تک میر کی شہرت اتنی مستحکم ہو چکی تھی کہ ان کا مصدقہ کلام دہلی کے ادب نواز حلقوں میں آسانی سے دستیاب رہا ہوگا۔ یہ نسخہ جس اہتمام سے تیار کیا گیا ہے اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ میر کی شعری تصنیفات بہت سعی سے نقل کی گئی ہیں (نثری تصانیف میں سے صرف دو اس نسخے میں شامل ہیں: "فیض میر" اور "نثر دریائے عشق")

۲۔ دیوانِ فارسی میں جو غزلیات ہیں وہ وہی ہیں جن کو ڈاکٹر نیر مسعود نے تین مختلف نسخوں کی مدد سے مرتب کر کے "نقوش" میں شائع کیا ہے۔ نسخۂ کلکتہ میں ان غزلیات کے بعض مصرعوں پر ۲ کا نشان بنا کر حاشیہ پر اس شعر یا مصرع کی دوسری شکل کاتب کی تحریر میں ملتی ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس کے سامنے ایک سے زیادہ نسخے رہے ہوں گے۔ مثلاً ایک غزل کا مطلع متن میں اس طرح ہے ؎

نکردیم گشت چمن یک نفس — بحرماں بسر رفت اوقات وبس

حاشیہ پر پہلے مصرع کی یہ شکل ملتی ہے۔ ع

نداریم رنگ از چمن ہم نفس

یہ صورت "گنجینۂ راز" کے متن میں بھی دو جگہ ملتی ہے لیکن کچھ فرق کے ساتھ ؎

۱۳۰۔ جزائی عمل یافتن خوب نیست — کہ ایں راہ واصل مطلوب نیست

متن میں "یافتن" پر خفی خط میں "بدل" لکھ کر اوپر حاشیہ پر "خواستن" لکھا ہے۔ یہ ممکن ہے محض کاتب کی اپنی غلطی کی تصحیح ہو۔ دوسری مثال یہ ہے ؎

۴۳۰۔ (ک) نگیش چشم دل وا بکن — بہر رنگ اورا تماشا بکن

یہاں پہلا لفظ کرم خوردہ ہے، مگر اس پر خفی خط میں "بدل" لکھا ہے۔ حاشیہ پر لکھا ہے "بکر نگیش"۔

۳۔ مثنوی میں شاعر نے اپنا تخلص میر بتایا ہے اور آخر کے اشعار جو اوپر نقل کئے گئے ہیں ان کا لہجہ میر محمد تقی میر کا جانا پہچانا لہجہ ہے۔ خاص طور پر مثنوی کے آخری شعر کا ؎

۵۲۷۔ کہ کم خوردہ ام آہ کم خفتہ ام — جگر سفتہ ام کاینقدر گفتہ ام

۴۔ مزید برآں گیتا کے مضامین کے ترجمے کے جو اشعار ہیں ان میں بھی بہت سے الفاظ اور محاورے ایسے ملتے ہیں جن کو اہلِ نظر اکثر میر کے اسلوب کی نشاندہی کے لیے انتخاب کرتے آئے ہیں۔ میں نے "گنجینۂ راز" کی ایک قلمی نقل تیار کی تھی اور اُسے ڈاکٹر نیر مسعود کے معائنے کے لیے دیا تھا۔ موصوف نے بھی ایسے متعدد مقامات کی نشاندہی کی ہے۔ چند مثالیں پیش ہیں ؎ (خاص الفاظ خط کشیدہ ہیں)

۸۸۔ نکردید معلوم اسرار جوک — نیامد ازین بی تہاں کار جوک

۱۱۲۔ غرض آشنا بند و بی چشم و رو — سراپا دخل جملہ تن آرزو

۲۸۷۔ بتمکین دل خلق از جا برد — چو شوخی کند دل زدلہا برد

۵۔ دہلی میں قیام کے دوران میر کے اہم ترین قدر دان ہندو تھے یعنی راجہ جگل کشور اور راجہ ناگر مل۔ ممکن ہے کہ ان کی صحبت میں میر کی توجہ اس کام کی طرف گئی ہو۔ میر سنسکرت سے ناواقف تھے۔ لیکن ان کے زمانے میں گیتا کے فارسی نثر میں تراجم موجود تھے۔ ایک تو وہ مختصر ترجمہ جو اکبری عہد کے ترجمۂ مہابھارت المعروف بہ "رزم نامہ" میں ملتا ہے اور دوسرا مکمل ترجمہ جس کو کبھی فیضی سے منسوب کیا گیا ہے اور کبھی ابوالفضل سے اور جس کے متعدد نسخے دنیا کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) کے ذخیرے میں بھی موجود ہے، جس کو محمد اجمل خاں نے ۱۹۵۹ء میں مرتب کر کے انجمن روابط فرہنگی ہند دہلی نو (Indian Council For Cultural Relations, New Delhi) کی طرف سے شائع کیا تھا۔ یہ نسخہ ۱۲۶۰ھ کا تحریر شدہ ہے اور اس میں مترجم کا نام نہیں دیا گیا ہے۔[۵] اس متن کا سب سے قدیم نسخہ جو اب تک میرے علم میں آیا ہے

وہ انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں ہے۔ Ethe, 1950 اس پر تاریخ کتابت "محرم ۱۰۸۳ ہجری" درج ہے۔ مترجم کا نام اس میں بھی نہیں ملتا ہے۔ یہ مخطوطہ لکھنؤ میں خریدا گیا تھا اور بہت ممکن ہے رچرڈ جانسن کے قبضے میں رہا ہو، جن کو ہم سودا کے تعلق سے جانتے ہیں۔ اسی کتب خانے میں اسی ترجمہ کا ایک اور نسخہ ہے، جس پر رچرڈ جانسن کے دستخط اور تاریخ July, 1778 موجود ہے۔ (Ethe, 1949) اس میں بھی مترجم کا نام نہیں اور نہ تاریخ کتابت درج ہے (یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ راقم کی نظر سے اب تک پانچ قلمی نسخے گیتا کے نثری ترجمے کے گزرے ہیں اور ہر ایک کے متن میں معمولی ردوبدل ملے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی ترجمہ ایک ہی ہے۔ بدقسمتی سے راقم کو ابھی تک رزم نامہ میں درج گیتا کے اجزا کا کوئی مخطوطہ دیکھنے کو نہیں مل سکا ہے۔ لندن میں اس کا موقع تھا، لیکن مجھ سے غفلت ہوگئی۔ بہرحال کوشش جاری ہے۔)

اب کچھ ان نکات پر بھی غور کیجئے جن کی بنا پر "گنجینۂ راز" کو میر کی مثنوی نہیں کہا جا سکتا۔

۱۔ "نقوش" کے مذکرہ بالا خاص نمبر میں میر کے دیوانِ فارسی کے تین مختلف اور معتبر نسخوں کا مکمل متن شائع کر دیا گیا ہے۔ ان تینوں نسخوں میں یہ مثنوی نہیں ملتی۔

۲۔ میر نے اپنے بارے میں اچھی خاصی معلومات چھوڑی ہیں لیکن نہ تو "ذکرِ میر" اور نہ "نکات الشعراء" میں اس ترجمہ کا ذکر ملتا ہے۔ اس طرح میر کا حال لکھنے والے تمام تذکرہ نگار اس سے غیر واقف ہیں۔ آخر کوئی تو اس کا ذکر کرتا۔

۳۔ میر کی کسی تحریر میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا، جو ہندو دھرم سے اُن کی واقفیت یا دلچسپی کا مظہر ہو۔ ایسی حالت میں اُنہیں خود سے تحریک ہونا قرینِ قیاس نہیں اور اگر کسی کی فرمائش پر لکھی گئی ہوتی تو ظاہر ہے اس کا ذکر مثنوی میں لازماً ہوتا۔

یہ تینوں نکات قطعیت کے حامل ہیں، مگر میر کی پہلو دار اور حیرت خیز شخصیت سے عقیدت کی بنا پر دل ضرور چاہتا ہے کہ یہ ترجمہ میر کا ہو۔ میر کے قلم سے ہمیں کیا کچھ نہیں ملا ہے: تذکرۃ الشعرا، آپ بیتی، فحش لطائف، صوفیانہ حکایات، شکار نامے، منظوم قصے۔ غرض کہ اسی جذبے سے مجبور ہو کر میں نے یہ مان لیا کہ مثنوی "گنجینۂ راز" میر محمد تقی میر اکبر آبادی کی تصنیف ہے۔ چنانچہ اس "دریافت" کا اعلان کر کے میں مزید کام میں لگ گیا۔ کچھ ہی دن بعد میں لندن پہنچا، جہاں انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کی لائبریریوں میں کئی اہم چیزیں ملیں۔ لیکن اہم ترین چیز ایک مطبوعہ کتاب تھی۔ جو ڈاکٹر خالد حسن قادری نے اپنے ذاتی ذخیرے سے نکال کر دی۔ اس کتاب نے میری تحقیق کو ایک بالکل نئی راہ پر ڈال دیا۔ شکاگو پہنچ کر میں نے اس راہ پر چلنا شروع کیا۔ لیکن ابھی زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ لونیورسٹی لائبریری میں حسنِ اتفاق سے ایک اور کتاب مل گئی۔ اس کے صرف ایک اندراج نے پوری بساط ہی الٹ دی اور مجھے اس سوال سے دوچار کر دیا جو اس مضمون کا عنوان بنا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ذیل میں اسی زمانی ترتیب سے پیش کی جا رہی ہے تاکہ عبرت کے ساتھ تفریح بھی ہو۔

## (۴)

قادری صاحب نے جو کتاب مجھے دی اس کا نام ہے "بشریمد بھگوت گیتا، بزبانِ فارسی از: فیضی"۔ مرتب کا نام ہے: محمد شفیع کمبوہ۔ مقامِ اشاعت لاہور ہے اور اگرچہ تاریخِ اشاعت نہیں دی گئی ہے مگر "دیباچہ" کی تاریخ "یکم دسمبر ۱۹۴۱ء" ہے۔ یہ ۱۳۱۱ اشعار کی طویل مثنوی گیتا کا مکمل ترجمہ ہے۔ اس کے متن میں کوئی ثبوت اس دعوے کا نہیں کہ یہ فیضی کی تصنیف ہے۔ مرتب نے اسے فیضی سے اس بنا پر منسوب کیا ہے کہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کے ذخیرے میں اسی نوعیت کا ایک قلمی نسخہ ہے، جس کے سرورق پر فیضی کا نام لکھا ہوا ہے اور جو ۱۲۸۸ ہجری میں دہلی میں قلمبند ہوا[۶] مزید یہ کہ "اسی نوعیت کا" ایک نسخہ قاضی محمد منیر صدیقی (نارووال پنجاب) کے پاس تھا، جس کا اردو منظوم ترجمہ "اسرارِ معرفت" کے نام سے انہوں نے ۱۹۲۱ء میں لاہور سے شائع کیا تھا۔ خود محمد شفیع کمبوہ صاحب نے جو متن شائع کیا ہے وہ ایک معمولی پمفلٹ کی صورت میں لاہور کے ایک تاجر کتب میسرز رام پرشاد نرائن دت بیرون لوہاری دروازہ نے شائع کیا تھا۔ اسی کی تصحیح کر کے اعلیٰ کتابت اور طباعت کے ساتھ "ہندو مسلم اتحاد کی یاد کو تازہ کرانے والے اس بہترین تحفہ" کو محمد شفیع کمبوہ صاحب نے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ مرتب نے ابتدا میں دیباچہ کے علاوہ خلاصۂ مطالب وغیرہ بھی لکھا ہے اور متن کو الگ الگ ابواب کی شکل میں عنوانات دے کر ترتیب دیا ہے (ہم اب آسانی کے لیے اس کتاب کو "مثنوی گیتا" کے نام سے یاد کریں گے۔)

اس کی ابتداء کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

۱/۱۔ طرازندۂ داستانِ کہن     بدیں ساں بیفگند طرحِ سخن
۱/۲۔ کہ پرسید دہر تراشت از سنجی ایں     کہ کر کھیت رشکِ بہشتِ بریں
۱/۳۔ بود مزرعۂ آخرت در جہاں     دریں جا رسیدند چوں کوراں
۱/۴۔ دگر پانڈواں از پئے کارزار     چہا نست ایں قصہ اے ہوشیار

۱/۵۔ جوابش چنیں گفت کاے بادشاہ بہ بستند ہر دو صفوفِ سپاہ
۱/۶۔ چو فرزندِ تو فوج دشمن بدید بہ نزد درونا اچارج رسید
۱/۷۔ بگفتش بریں لشکر پانڈوال نظر کن کہ ترتیب دارد چساں
۱/۸۔ درشٹدیومن ہست سالارِ فوج جگر دار لیش رونقِ کار فوج

جی ہاں، مجھے بھی سخت حیرت ہوئی، جب میں نے یہ اشعار پڑھے۔ اور ان میں گنجینۂ راز کے ابتدائی الفاظ کی گونج سنائی دی اور یہ حیرت بڑھتی چلی گئی جب پورے پورے مصرعے اور اشعار دونوں میں مشترک ملے۔ کسی قدر احتیاط سے مقابلہ کرنے پر پتہ چلا کہ لگ بھگ چار سو اشعار ایسے ہیں جو کم و بیش دونوں مثنویوں میں مشترک ہیں۔ اپنی گنجینۂ راز کے ۱۳۷ اشعار کی نشاندہی "مثنوی گیتا" میں نہ ہو سکی۔ لیکن اس کا امکان ہے کہ مزید غور کرنے پر یہ تعداد کم بھی ہو جائے۔ موخر الذکر گیتا کا مکمل اور مفصل ترجمہ ہے اور اس کے نو سو سے اوپر مزید اشعار مترجم کی قادر الکلامی اور گیتا کے متن سے بخوبی واقفیت کا اعلان کر رہے ہیں۔ وہ گیتا کی ایک ایک بات کو تفصیل کے ساتھ اپنے ترجمے میں پیش کرنے کا خواہاں ہے۔ اس کا مقصد مطالب کا خلاصہ پیش کرنا نہیں۔ چنانچہ گیتا کی ابتدا میں جو بہت سے سردارانِ فوج کے نام گنوائے گئے ہیں، ان کی تفصیل سے اس نے احتراز نہیں کیا ہے بلکہ کچھ اضافہ ہی کر دیا ہے۔ مندرجہ بالا آٹھ اشعار گیتا کے ابتدائی تین اشلوکوں کا ترجمہ ہیں۔ اس میں نہ صرف راجہ دھرت راشٹر اور ان کے رتھ بان اور گیتا کے راوی سنجے کے نام اصل کے مطابق بتا دیے گئے ہیں۔ بلکہ ایک انتہائی اہم فقرہ "کرکشیترے دھرم کشیترے" بھی احتیاط سے واضح کر دیا گیا ہے۔ (اس کو نثری تراجم میں مزرعۂ نیکوکاری" کہا گیا ہے) مزید براں ۱/۸ میں "درشٹدیومن" اصل پر اضافہ ہے۔ کیوں کہ وہاں صرف "درویدکا بیٹا" کہا گیا ہے۔ اور اس کے اصل نام سے واقفیت اس بات پر دلیل ہے کہ شاعر مہابھارت کی تفصیلات سے خوب واقف ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ "گنجینۂ راز" کے مصنف نے ۱/۶ میں "درونہ" نام استعمال کیا ہے۔ جب کہ گیتا میں صرف "آچاریہ" بمعنی "استاد" استعمال ہوا ہے، لیکن جب ہم اس نثری ترجمہ کو دیکھتے ہیں جس کے مخطوطے متعدد لائبریریوں میں ہیں اور جس کے ایک متن کو محمد اجمل خاں نے شائع کیا تھا تو اس میں اول الذکر مقام پر "پسر درویدؔ" اور موخر الذکر مقام پر "درونہ چارج" ملتا ہے۔ چنانچہ یہ قیاس غلط نہیں معلوم ہوتا کہ گیتا کی تفصیلات کی حد تک "مثنوی گیتا" کے مصنف کی معلومات "گنجینۂ راز" کے مصنف سے زیادہ ہیں۔

ایک اور احساس محض انہی آٹھ اشعار کے مطالعے سے ہی ہونے لگتا ہے، وہ یہ کہ اگر "مثنوی گیتا" کا مصنف تیرہ سو اشعار کی مثنوی لکھنے پر قدرت رکھتا ہے، لیکن ساتھ ہی وہ معمولی شعری تقاضوں سے غفلت بھی برت سکتا ہے۔ مثلاً ۱/۲ کے دونوں مصرعوں میں "کہ" کی تکرار بری لگتی ہے یا اسی بیت کے مصرعِ ثانی میں "رشکِ بہشتِ بریں" کا فقرہ محض بھرتی کا ہے۔ زبان اور بیان دونوں مجموعی طور پر گنجینۂ راز کے مقابلے میں کم زور ہیں اور جب ہم ان اشعار کو دیکھتے ہیں جن کو اوپر میر کے مخصوص اسلوب کے تعلق سے نقل کیا گیا تھا تو صورت خاصی خیال انگیز ملتی ہے۔

## "گنجینۂ راز"

۸۸۔ نکرد دید معلوم اسرار جوک
نیا مد ازیں بی تہاں کار جوک

۱۱۳۔ غرض آشنایند دبی چشم درو
سراپا دغل حیلہ تن آرزو

۲۸۷۔ بتمکین دل خلق از جا برد
چو شوخے کند دق زدلہا برد

## "مثنوی گیتا"

۲/۸۲۔ کجا ہست معلوم اسرار جوگ
نہ آید ازیں مردماں کار جوگ

۳/۷ غرض آشنایند اہل دول
ندارند کارے بغیر از دغل

"گنجینۂ راز" کی ۲۸۷ کے مماثل کوئی بیت "مثنوی گیتا" میں نہیں ملتی۔ یہی نہیں بلکہ ۲۸۷ سے قبل اور بعد کی دس پندرہ ابیات کی مماثل ابیات نہیں ملتیں۔ اور سبب اس کا صرف یہ ہے کہ ان ابیات کے مطالب کی نشاندہی خود گیتا میں نہیں کی جا سکتی یا کم از کم میں اب تک معذور رہا ہوں۔ ترتیب کے اعتبار سے ان ابیات کا تعلق گیتا کے اسکھوریا

باب کے ابتدائی اشلوکوں سے ہونا چاہیے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں: ۔ے

۲۸۴۔ بگویم من از شیوۂ خویشش
چہ پرسی ز اندازۂ محبوبیتش

۲۸۵۔ کجے نکہت و کا (۵) گل کہ بہار
بصد رنگ در جلوہ است آں نگار

۲۸۶۔ چو سیل بہار است سیلان او
برنگیں خرامی است میلان او

۲۸۷۔ بتمکین دل خلق از جا برد
چو شوخی کند دق ز دلہا برد

۲۸۸۔ قیامت زباں دادۂ دیدنش
بلا...... بخود دیدنش

۲۸۹۔ سپہر بریں کرد سر رفتہ
زمیں ز آتش شوق دل تفتہ

۲۹۰۔ قیامت ادا فتنہ در سر کسے
بلا بر ملا بر سر آ در کسے

الغرض "مثنوی گیتا" کے مطالعے اور "گنجینۂ راز" سے اس کا مقابلہ کرنے کے بعد میں مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچا۔

۱۔ "گنجینۂ راز" کو "مثنوی گیتا" پر نہ صرف نظم کی خوبی کی بنا پر فوقیت حاصل ہے بلکہ زمانی اعتبار سے اولیت بھی حاصل ہے۔

۲۔ "مثنوی گیتا" کے مصنف کے سامنے "گنجینۂ راز" کا متن موجود تھا۔ اور اُس نے ایک خاص مقصد کے تحت اپنے پیش رو کی تخلیق کو آزادی سے اپنی مثنوی میں سمو لیا ہے۔ کہیں بجنسہٖ اور کہیں رد و بدل کے بعد۔ اس طرح اُس نے گیتا کا ایک مکمل اور مفصل ترجمہ کر ڈالا۔ ایسا کرتے ہوئے جہاں اُس نے اپنے پیش رو کے لگ بھگ چار سو اشعار رکھ لیے اور اس کے تخلص کو باقی نہ رکھا، وہیں اُس نے نو سو اشعار کا اضافہ کرنے کے باوجود اپنا نام یا تخلص ظاہر کرنا نامناسب نہ سمجھا۔ چنانچہ اس تصنیف کا مقصد ثواب کا حصول رہا ہو تو ہو، دنیا میں شہرت حاصل کرنا نہ رہا ہوگا۔

۳۔ ظاہر ہے کہ "مثنوی گیتا" فیضی کی تصنیف نہیں۔ یہ نہ تو فیضی کے کلیات کے کسی مخطوطے میں ملتی ہے اور نہ اس کا ذکر ابوالفضل یا عبدالقادر بدایونی نے کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس مثنوی کا کوئی نسخہ انیسویں صدی سے قبل کا ابھی تک میرے علم میں نہیں آیا ہے۔

۴۔ چنانچہ "گنجینۂ راز" میر کی اپنی تصنیف ہے، سرقہ نہیں اور اس کی تصنیف کے وقت میر کے سامنے متداول نثری ترجمہ کا کوئی متن ضرور رہا ہوگا۔

یہ دو اہم خوش کن نتائج اخذ کرنے کے بعد میں پھر متن کی تصحیح اور متعلقہ تحقیق کے کام میں لگ گیا۔ کچھ ہی ہفتے گزرے تھے کہ دوسرا انکشاف ہوا۔

## (۵)

میں شکاگو یونیورسٹی لائبریری میں ان فہارس کی تلاش کر رہا تھا، جن میں مختلف کتب خانوں میں پائے جانے والے فارسی مخطوطات کے متعلق معلومات ہیں۔ ان فہارس میں حسنِ اتفاق سے ڈاکٹر اسپرنگر کی تیار کردہ "فہرست مخطوطات عربی، فارسی و ہندوستانی در کتب خانہائے پادشاہ اودھ" (انگریزی) بھی مل گئی ہے۔ میں نے یہ کتاب لندن میں دیکھی تھی۔ لیکن تب جلدی میں تھا۔ اور چونکہ اس کتاب میں کوئی اشاریہ یا فہرست مطالب نہیں، اس لیے سرسری ورق گردانی کر سکا تھا۔ اس وقت میں ذکرِ میر کے بارے میں معلومات تلاش کر رہا تھا اور محض اتفاق سے میر کے سلسلے میں جو اندراج پہلا نظر پڑا وہ "کلیاتِ میر" (اُردو) کے بارے میں تھا۔ جس میں "ذکرِ میر" کا تذکرہ بھی تھا۔ تب میں نے اسی پر اکتفا کر لی تھی۔ اب جو کتاب دوبارہ ہاتھ لگی تو پتہ چلا میر کی تصانیف کے بارے میں تین مختلف اندراجات ہیں: "نکات الشعرا" (ص۱۴۵) "کلیاتِ میر" (ص۶۲۷) "دیوانِ میر" (ص۵۰۹) مؤخر الذکر اندراج کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

> "دیوانِ میر۔ اس میں ایک مصرع تاریخ ("کرد تمام") موجود ہے، جس سے ۱۲۰۴ ہجری تاریخ نکلتی ہے۔ یہ غالباً وہی میر تقی ہے، جس کا ذکر ص۱۴۵ پر کیا جا چکا ہے۔
>
> اندراجات:- غزلیات، ۲۱۰ صفحات، ۱۱ ابیات فی صفحہ۔ رباعیات اور فردیات، ۴ صفحات۔ ابتدا ہے
>
> اے ز انعام تو واشد غنچۂ امکان ما
> آب در جو دارد از لطف تو باغ جان ما
>
> موتی محل: اس ذخیرے میں ایک اور "دیوانِ میر" موجود ہے، جس کی تاریخ کتابت ۱۱۷۹ ہجری ہے۔ اس میں غزلیات کے ۲۸۰ صفحات ہیں اور ہر صفحہ پر ۱۳ ابیات ہیں۔ ابتدا ہے

الٰہی جوشِ طوفاں بخش چشم اشکبارم را
سحاب دجلہ افشاں کن رگ ابر بہارم را

قصائد در مدح شاہ عنایت اللہ ۔ مخمس، رباعیات اور منظوم قصے۔ ۸۰ صفحات ۔ میں یہ معلوم کرنے سے قاصر رہا ہوں کہ یہ دیوان کس میر کا ہے ۔ اسی ذخیرہ میں ایک مثنوی "گنجینۂ راز" بھی ہے، جس کے ۳۶ صفحات ہیں اور ہر صفحہ پر ۱۱ ابیات ہیں ۔ اس کا مصنف بھی میر ہے، لیکن اس کی شناخت بھی نہیں ہو سکی ہے ۔ ابتدا سے

رئیسے بپرسید از برہمن
کہ اے واقفِ حادثاتِ کہن "

اسی کتاب میں ص۱۷۴ پر ایک اور اندراج ملا: "مجموعِ نیاز تصنیفِ میر" اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو: ۔

"مجموعِ نیاز ۔ یہ میر غالباً وہی میر تقی نہیں ہے ۔ اس مجموعہ میں مشہور شعرا کے مختلف موضوعات پر اشعار جمع کر دئے گئے ہیں ۔ لیکن کسی طرح کی سوانحی معلومات نہیں دی ہیں ۔ موضوعات کی ترتیب ابجد کے لحاظ سے کی گئی ہے ۔ ابتدا:
مخفی و محتجب نماند کہ بندہ میر نیاز مند دیرینہ خیال .....
۲۹۸ صفحات ۔ ۱۵ سطور کتابت ۱۱۶۵ ہجری ۔
کتب خانہ موتی محل۔"

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے اپنی کتاب "میر تقی میر : حیات اور شاعری" میں ایک "کلیاتِ میر فارسی" کا ذکر کیا ہے، جس کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں ہے اور جس کی تاریخ کتابت ۱۲۱۴ ہجری ہے ۔ اس میں حاشیہ پر کاتب کے ہی قلم سے لکھا ہے : "مقابلہ نمودہ شد اصل نسخہ کہ بخطِ مصنف علیہ الرحمۃ بود با حضرت شاہ عبداللطیف روز چہار شنبہ ہفدہم شہر ربیع الآخر ۱۲۱۴ ہجری۔" اس نسخہ کی پہلی غزل کا پہلا مصرع ہے: ع

الٰہی جوشِ طوفاں بخش چشم اشکبارم را

یہ غزل میر تقی میر کے مصدقہ دیوانِ فارسی میں نہیں اور نہ وہ پانچ دیگر غزلیں ہیں، جن کی نشاندہی فاروقی صاحب نے کی ہے ۔ ان کی اطلاع کے مطابق اس کلیات میں ایک قطعہ بھی درج ہے : "در صفت مے خانہ و بعد ملازمت مرشد کامل ہادی آگاہ دل شیخ زمانہ شاہ عنایت اللہ القادری قدس سرہٗ۔" ایک قصیدہ اور کچھ منظوم حصوں کی بھی انہوں نے نشاندہی کی ہے ۔ غالباً لکھنؤ کے نسخہ کی طرح آصفیہ کے نسخہ میں بھی مثنوی "گنجینۂ راز" شامل نہیں ورنہ وہ اس کا ذکر ضرور کرتے ۔

## (۶)

بہرکیف اب یہ تو ثابت ہو گیا کہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں کوئی شاعر، جس کا تخلص میر تھا، موجود تھا یا کم از کم جس کی تین تصانیف (دیوانِ فارسی، مثنوی گنجینۂ راز ، اور مجموعِ نیاز ) کے نسخے موجود تھے ۔ اس کو قادریہ طریقے سے عقیدت تھی ۔ اور ایک دوسرے معروف قادری، شہزادہ داراشکوہ کی طرح اس کو ہندو دھرم سے بھی ذہنی اور جذباتی تعلق تھا۔ اغلب ہے کہ اس کا وطن شمالی ہند تھا ۔ لکھنؤ میں اس کی تین تصانیف کی موجودگی سے یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ اودھ سے تعلق رکھتا ہو ۔ اس کی شاعری کے مرتبے کا صحیح اندازہ تو اس کا کلیات دیکھنے پر ہی ممکن ہوگا ۔ صرف "گنجینۂ راز" کے مطالعہ سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ فارسی محاورے پر اُسے نمایاں عبور ہے اور متصوفانہ خیالات کو حیتی اور رواتی کے ساتھ نظم کر سکتا ہے ۔ اس کا کلام ضرور قابلِ توجہ ثابت ہوگا ۔

اس "میر ثانی" کے ممدوح شاہ عنایت اللہ قادری کی شناخت ابھی تک نہیں ہو سکی ہے ۔ اعجاز الحق قدوسی نے تذکرۂ صوفیائے پنجاب میں خزینۃ الاصفیاء کے حوالے سے ایک شاہ عنایت قادری شطاری (متوفی ۱۱۴۱ھ ) کا ذکر کیا ہے، جن کا مزار لاہور میں ہے [9] اگر یہ وہی بزرگ ہیں تو ممکن ہے "میر ثانی" کا وطن بھی پنجاب یا کم از کم دہلی رہا ہو ۔ اس کا لکھنؤ اور دہلی میں غیر معروف ہونا معنی خیز ہے ۔ اس کی تصانیف لکھنؤ اور دہلی میں موجود تھیں ۔ مگر اس کی شناخت لوگوں کی یادداشت سے معدوم ہو چکی تھی ۔

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے یہ مضمون اہلِ علم کی اطلاع اور ان کی آرا ر سے خود کو مستفید کرنے کی غرض سے شائع کیا جا رہا ہے ۔ "گنجینۂ راز" کے سلسلے میں ابھی بہت کچھ کہنا ہے، جو انشاء اللہ متن کی اشاعت کے وقت عرض کیا جائے گا ۔ متن کی تصحیح کا کام جاری ہے لیکن اس کی اشاعت سے قبل اس کے مصنف "میر ثانی" کے بارے میں مزید بہت کچھ جاننا ہوگا ۔ کتب خانۂ آصفیہ میں موجود اس کی کلیات دیکھنی ہوگی ۔ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ایک گمنام منظوم ترجمہ راماین (Bthe 1970) دیکھنا ہوگا ۔ سلسلۂ قادریہ کے تذکرے دیکھنے ہوں گے ۔ عبدالرحمٰن چشتی (متوفی ۱۰۹۴ھ ) کا گیتا کا صوفیانہ ترجمہ "مراۃ الحقائق" دیکھنا ہوگا ۔ فارسی شعراء کے تذکرے تلاش کرنے ہوں گے ۔ ظاہر ہے یہ سب کام وقت طلب ہیں مگر میں تنہا کرنا بھی چاہوں تو نہیں کر سکتا ۔ امید ہے کہ اربابِ علم اس کام میں میری مدد

فرمائیں گے ۔

## حواشی

۱۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے اردو مخطوطوں کی فہرست ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے ۔ اس لیے وہاں موجود مختلف کلیاتِ میر کے بارے میں کچھ معلومات ذیل میں دی جا رہی ہیں :

۱۔ ۹۹۶ ۔ U (ذخیرۂ سوئم) : یہ نسخہ چھوٹے سائز کا صاف نستعلیق میں ہے ۔ چوڑا حاشیہ ہے اور حاشیہ پر اشعار متن کے خط میں اضافہ کئے گئے ہیں جو کہیں کہیں کٹ گئے ہیں ۔ غالباً اصل سائز بڑا رہا ہوگا ۔ املا خاصا قدیم ہے ۔ ٹ کو "ٹ" لکھا ہے ۔ ۳۱۱ اوراق ہیں ۔ آخر میں کوئی ترقیمہ نہیں ۔ اگرچہ لگتا یہی ہے کہ کتاب ختم ہو چکی ہے ۔ اس میں صرف غزلیات اور رباعیات شامل ہیں رباعیات کی تعداد ۹۲ ہے ۔ ایک خصوصیت یہ ہے کہ غزلیات کے الگ الگ دواوین کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے بلکہ ایک ردیف کی تمام غزلوں کو یکجا کر دیا گیا ہے ۔ ردیف "د" اور ردیف "ر" کا نمونتہً تفصیلی جائزہ لینے پر پتہ چلا کہ صرف دیوانِ اوّل اور دیوانِ دوم کی غزلوں کو یکجا کیا گیا ہے ۔ شاید یہ بات بھی اس کی قدامت کی طرف اشارہ کرتی ہے آخری صفحہ پر تین مہریں ہیں، جن میں دو خاصی بڑی ہیں اور جن میں تاج بھی بنا لگتا ہے ، لیکن ان کو اس طرح مسخ کر دیا گیا ہے کہ اب پڑھی نہیں جاتیں ۔ تیسری مُہر نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کی ہے ۔

"خوش است مہر کتبخانۂ سلیمان جاہ
بہر کتاب مزین بنقش بسم اللہ"

۱۲۴۴

۲ ۔ ۶۵ ۔ U (ذخیرۂ سوسائٹی) : یہ دراصل دو مختلف کلیات ہیں، جن کو غلطی سے ایک نمبر دے دیا گیا ہے ۔ البتہ ان کے اوراق پر جو نمبر بعد میں دے گئے ہیں وہ الگ الگ اور صحیح ہیں ۔ وضاحت کے لیے اُن کو "۶۵ ۔ الف" اور "۶۵ ۔ ب" کہا جائے گا ۔

"۶۵ ۔ الف" فولیو سائز کی دو جلدوں پر مشتمل ہے ۔ پہلی جلد میں ۳۹۸ اوراق ہیں، دوسری میں ۴۶۷ ۔ کل تعداد ۸۶۵ ہے ۔ اوّل اور آخر کے صفحات پر کالج کی مُہر لگی ہے ۔ : "کتاب کالج فورٹ ولیم" کاغذ عمدہ ہے ۔ اور نستعلیق کتابت بھی صاف ستھری ہے لوح کے گُل بوٹوں کا کام بھی اچھا ہے ۔ جلد اوّل کی ابتدا میں قصائد ہیں پھر دیوانِ اوّل کی غزلیات پھر ہفت بند، مخمس وغیرہ کے بعد دیوان دوئم اور سوئم ۔ جلد دوئم (فولیو ۳۹۹ تا ۸۶۵) کی ابتدا میں رباعیات کے بعد مثنویات شکار نامہ وغیرہ ہیں پھر کثیر تعداد میں مراثی ۔ اس کے بعد دیوان چہارم جو جملہ اصناف سخن کا حامل ہے ۔ اس کے خاتمہ پر فولیو ۵۱۷ ب پر ایک ترقیمہ ہے : جلد اوّل از کلیات میر تقی زاد اللہ قدرہ و منزلہ از دست احقر العباد محمد امین بیگ ساکن دہلی اتمام یافت ۔ جس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً موجودہ جلد بندی قدیم نہیں ۔ فولیو ۵۱۷ ب سے دیوانِ فارسی شروع ہوتا ہے مگر اس پر عنوان دیا ہے ۔ "دیوانِ پنجم" شروع میں غزلیات ہیں ۔ ان کے بعد دو طویل مثنویاں ۔ نظم فارسی کے بعد فیض میر ہے اور آخر میں "دریائے عشق" کی فارسی نثر ۔ فولیو ۸۱۵ الف پر دوسرا اور زیادہ مکمل ترقیمہ ہے ۔ جس کی عبارت حسب ذیل ہے ۔

"تمت تمام شد کلیات میر برای خاطر داشت محمد خاں صاحب
سلمہ اللہ تعالیٰ از دست احقر العباد محمد امین بیگ ساکن دہلی

در ۱۲۱۲ ہجری اتمام یافت ۔

اے کریم از کرم رساں بہ بہشت
ہر کہ گفت ہر کہ خواند ہر کہ نوشت"

یہ وہی نسخہ ہے جس کو بنیاد بنا کر فورٹ ولیم کالج کے منشیوں نے ۱۸۱۱ء کا تاریخی ایڈیشن تیار کیا تھا ۔ حاشیہ پر اضافے اور متن میں جابجا تصحیح ایک سے زیادہ لوگوں کی تحریر میں ملتی ہے ۔ یہ نسخہ انتہائی اہم ہے ۔ اسی نسخہ میں "گنجینۂ راز" کا متن ہے ۔

"۶۵ ۔ ب" کی بھی دو جلدیں ہیں ۔ پہلی میں ۴۸۸ اوراق ہیں ۔ دوسری میں ۲۷۵ یعنی کل ۷۶۳ اوراق ہیں ۔ کاغذ معمولی اور خط شکستہ ہے ۔ فورٹ ولیم کالج کی مُہریں اس پر بھی ہیں ۔ جلد اوّل میں اردو کے دیوانِ اوّل اور دوئم ہیں ۔ جلد دوئم میں دیوانِ سوئم اور چہارم کے بعد پہلے "ذکرِ میر" پھر "فیضِ میر" اور آخر میں "دریائے عشق" کی فارسی نثر ہے ۔ تاریخ کتابت یا کاتب کا نام نہیں ملتا ۔ ایک بات ضرور قابلِ ذکر ہے کہ فارسی نثر کی تینوں کتابوں میں غیر معروف الفاظ کے معنی فارسی ہی میں دئے گئے ہیں ان کو سُرخ روشنائی سے عموماً عبارت کے تسلسل ہی میں درج کیا گیا ہے ۔ یہ معنی بیشتر وہی ہیں جن کو "ذکرِ میر" کے مطبوعہ نسخے میں نقل کیا گیا ہے ۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ نسخہ اٹاوہ میں (جو مطبوعہ کی اصل ہے) یہ معنی ہمیشہ یا تو بین السطور یا حاشیہ پر دئے گئے ہیں اور متن میں محض شکل لفظ پر نشان لگا دیا گیا ہے ۔ سرسری مطالعہ کے دوران اس نسخہ میں کوئی تحریر کالج کے منشیوں کی نظر نہیں آئی ، لیکن کالج ایڈیشن سے مقابلہ کرنے پر پتہ چلا کہ اس نسخہ کے اندراجات بھی مرتبین نے استعمال کئے ہیں ۔

۳ ۔ ۵۹ ۔ U (ذخیرۂ سوسائٹی) یہ اردو کے دیوانِ ششم کا مخطوطہ ہے چھوٹے سائز کا صاف نستعلیق ۔ کُل اوراق ۱۰۶ ہیں ۔ اس پر بھی کالج کی مُہر ہے ۔

ابتدا : ع

فلک نے پیس کر سُرمہ لگایا

اختتام ؎

عجب عشق اک شعبدہ باز ہے
موافق کبھی گاہ ناساز ہے

۲۔ "مخطوطہ دیوانِ فارسی (نسخۂ رضوی)" از ڈاکٹر نیّر مسعود رضوی نقوش میر تقی نمبر ۳۔ شمارہ نمبر ۱۳۱۔ اگست ۱۹۸۳ء۔ ص ۳۵ تا ۲۷۳۔
اس متن کی تیاری میں نسخۂ رضوی، نسخۂ رام پور اور کسی حد تک نسخۂ ادارۂ ادبیات اردو (حیدر آباد) استعمال کیا گیا ہے۔ موخرالذکر کا مکمل عکس بھی اس شمارہ میں شامل ہے۔

۳۔ کوشش کی گئی ہے کہ مثنوی "گنجینۂ راز" کے اشعار اصل املا میں نقل کئے جائیں۔

۴۔ پورے نسخہ میں تخلص کو کسی طرح نمایاں نہیں کیا گیا ہے۔ ص ۵۳۴ میں (نہ) کاتب سے چھوٹ گیا ہے۔ ص ۵۳۵ میں (زباں) میں ب کا نقطہ نہیں ہے۔

۵۔ ایشیاٹک سوسائٹی مخطوطہ نمبر ۱۴۰۷ مطبوعہ کتاب کا نام ہے: بگوت گیتا (ترجمۂ فارسی) تالیف محمد اجمل خاں، تصحیح محمد کامگار پارسی۔ مخطوطہ میں اس کا نام "آبِ زندگی" دیا ہے۔

۶۔ ایشیاٹک سوسائٹی مخطوطہ نمبر ۹۱۷ - نہ تو مترجم کا نام ملتا ہے۔ اور نہ ترجمہ کی تاریخ۔ کاتب کا نام کندن لال سیتا ہے اور تاریخ کتابت ۱۸۷۱ء ہے۔ پہلے سادے صفحے پر فیضی کا نام لکھا ہے، مگر مرتب فہرست (اوالزو) کے خیال میں یہ نسبت محض فرضی ہے۔ تعدادِ اشعار وہی لگتی ہے جو مطبوعہ متن میں ہے۔ پہلا شعر ہے ؎

طراز ندۂ داستانِ کہن
بدینساں بیفگند طرح سخن

۷۔ A Catalogue of the Arabic, Persian and Hindustany Manuscripts, of Libraries of the King of Oudh by A.Sprenger, M.D. Vol.I Calcutta, 1854

اشپرنگر ایشیاٹک سوسائٹی کے مخطوطہ زیرِ بحث سے واقف ہے۔ وہ لکھتا ہے: " ایشیاٹک سوسائٹی میں میر تقی کی تصانیف کا ایک خوب صورت مخطوطہ موجود ہے، جس میں اس کی فارسی نثر کی تصانیف بھی شامل ہیں۔" اشپرنگر مزید لکھتا ہے کہ " میر کی دو نثری کتابیں لیعقوب سہسرام سے حال میں شائع ہوئی ہیں۔" ص ۶۲۷ یہ کون سی کتابیں تھیں اور کس نے شائع کی تھیں، کاش کچھ پتہ چل سکتا۔

۸۔ میر تقی میر: حیات اور شاعری از: ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی علی گڑھ ۱۹۵۴ء۔ ص ۵۹۴ تا ۵۹۶

۹۔ تذکرۂ صوفیائے پنجاب از: اعجاز الحق قدوسی۔ کراچی ۱۹۶۲ء ص ۴۰۶ تا ۴۰۷۔ محمد دین کلیم نے مدینۃ الاولیا، (لاہور ۱۹۷۶ء) میں آپ کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے (ص ۱۸۵ تا ۱۸۷) مشہور پنجابی عارف اور شاعر سید بلھے آپ کے ہی مرید تھے۔ آپ کا وطن قصور تھا۔ ●●

ستیش بترا

# مادام تساد کا مومی عجائب گھر

لندن پہنچنے پر مجھے جس چیز کو دیکھنے کی شدید ترین خواہش تھی، وہ نہ تو قدیم تاریخ میں سانس لیتا ہوا شاہی بکنگھم پیلیس تھا، نہ ٹیمز ندی میں عظیم ایوانِ برٹش پارلیمنٹ کا ہلکورے لیتا ہوا عکس، نہ وہ ٹاور آف لندن جہاں کا ہر گوشہ تواریخی واقعات سے اٹا پڑا ہے اور جہاں ہمارا بیش قیمت ہیرا کوہِ نور، دوسرے شاہی تاجوں اور خزانے کے ساتھ محفوظ ہے نہ برٹش لائبریری اور میوزیم، جہاں دنیا بھر کا تہذیبی سرمایہ نہایت قرینے اور خوش اسلوبی سے رکھا ہے اور دنیا کے ہر گوشے سے آنے والے مدبروں، فن کاروں، صحافیوں اور محققین کا منتظر ہے۔ بلکہ وہ تھا:

مادام تساد MADAME TUSSAUD

کا انمول مومی عجائب گھر!

یوں تو مغربی ملکوں میں مومی عجائب گھروں کی بھرمار ہے، لیکن جو بین الاقوامی شہرت مادام تساد کے عجائب گھر کو نصیب ہوئی وہ کسی دوسرے عجائب گھر کا مقدر نہیں ——— یہ الگ بات ہے کہ اس شہرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، کئی مومی عجائب گھروں نے یہ نام ناجائز طور پر اختیار کر لیا ہے۔ حالانکہ سوائے ہالینڈ میں واقع ایمسٹرڈیم کے کسی اور عجائب گھر کا اس ادارے سے کوئی تعلق نہیں۔

ارتقا کی منزل ہی سے جب انسانی ہاتھ اور انگلیاں مٹی سے مس ہوئیں، انہوں نے فن کی دنیا میں نقش و نگار کھلائے۔ روزمرہ کے خوش نما برتنوں سے لے کر مورتی اور کلا کے نادر نمونے بنائے ——— کھردرے پتھروں کو چھوا، تو کئی لافانی مجسمے تراش ڈالے۔ دھات پر طبع آزمائی کی تو ایک نئی دنیا تخلیق کر ڈالی۔ کاغذ پر تصویر کشی کی تو اسے اپنے تخیل کا آلۂ کار بنا ڈالا۔ اور ان انگلیوں نے موم کی لچک کو محسوس کیا تو وہ پیکر تراشے کہ اصل اور نقل میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔

مادام تساد کا یہ حیرت انگیز عجائب گھر وسط لندن کے بیکر اسٹریٹ اسٹیشن سے بالکل جڑا ہوا ہے۔ بیکر اسٹریٹ کا نام لیتے ہی کانن ڈائل .... (CONAN DOYLE) کے مشہور سراغ رساں کردار شرلک ہومز کا خیال آجاتا ہے کیونکہ اس سے متعلقہ کہانیوں کے بموجب اس کی رہائش بھی اسی بیکر اسٹریٹ میں تھی۔ اس کردار کے پرستار آج بھی اس کی رہائش کی کھوج کرتے، اس اسٹریٹ کا چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ اس تجسس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ادارے نے تو شرلک ہومز نام کا کیفے بنا دیا ہے۔ جہاں یہ "روایت" کے طور پر مشہور کر دیا ہے۔ شرلک ہومز اور اس کا ساتھی ڈاکٹر واٹسن کافی ناشتے کے لیے یہاں آیا کرتے تھے۔

ہم گرچہ اس سے پیشتر بھی امریکہ کناڈا گھوم چکے تھے۔ لیکن لندن آنے کا یہ ہمارا پہلا موقع تھا۔ ہم اپنی عزیزہ کے ہاں لندن کے گرد و نواح ہانسلو ...... (HONSLOW) میں ٹھہرے ہوئے تھے، جو بقول ایک مقامی ادیب کے (درمیانی جنس MIDDLE SEX) کا لفظی ترجمہ میں ہیتھ رو (HEATHROW) ایرپورٹ اور ہندوستانی لندن یعنی ساؤتھ ہال کے قریب ہی واقع ہے۔ ہانسلو ٹھہرنے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ یہاں سے آپ لندن کی زمین دوز برقی گاڑی کے ذریعے جسے ٹیوب ریلوے بھی کہا جاتا ہے، شہر کے کسی بھی حصے میں جلد از جلد پہنچ سکتے تھے۔ بسوں سے سفر بھی ممکن تھا، لیکن بسوں کے نمبر اور اوقات یاد کرنا خواہ مخواہ ذہن پر بوجھ ڈالتا تھا۔ لندن بھر میں ان زمین دوز گاڑیوں کا ایک مکمل جال بچھا ہے اور یہ پورا نقشہ دس بارہ رنگوں کی لائنوں میں بٹا ہوا ہے۔ ہر رنگ ایک مختلف سروس کی نشاندہی کرتا ہے لہٰذا مطلوبہ اسٹیشن پر نظر ڈالنے سے ہی آپ اپنا راستہ بآسانی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ پہلے بلیو لائن (BLUE LINE) پر (جسے پکارڈلی PICCARDLY لائن بھی کہا جاتا ہے) ہانسلو سے گرین پارک اسٹیشن تک چلے آئیے۔ یہاں سے 'گرے' (GRAY) لائن جسے "جوبلی" لائن بھی کہا جاتا ہے منتقل ہو جائیے اور وہاں سے ایک اسٹیشن چھوڑ کر

'بیکر اسٹریٹ' ہے۔ ہر ڈبے میں انہیں مخصوص رنگوں میں کھپے ریلوے کا نقشہ (MAP) ملے گا۔ اس لیے صحیح جگہ پر پہنچنے میں کسی نووارد کو زیادہ دشواری نہیں ہونی چاہیے۔ میں "نہیں ہونی چاہیے" اس لیے کہہ رہا ہوں، کیوں کہ میں خود ان رنگوں کے جھمیلوں میں اکثر بھٹک جاتا تھا، لیکن ہماری شریمتی جی کا شاید ان رنگوں اور اپنے مزاج میں کوئی انجانا رشتہ تھا، جو پل بھر میں ہی کسی مطلوبہ جگہ پر پہنچنے کا مختصر ترین راستہ کھوج نکالتا تھا!

اب یہ کہنا مشکل ہے کہ ان زمین دوز گاڑیوں کا سارا راستہ ہی زمین دوز ہو۔ جب ہانسلو سے روانہ ہوتے ہیں تو آپ دن کے اُجالے میں اچھے خاصے زمین کے اوپر بنے ہوئے اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوتے ہیں، لیکن نہ جانے کس مقام پر یہ گاڑی سُرنگ پوش ہو جاتی ہے۔ اور دن کی روشنی جگمگاتی ٹیوب لائٹوں کی روشنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان زمین دوز گاڑیوں کو ٹیوب ریلوے اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ پٹریاں ریلوے اسٹیشنوں سمیت محرابی سرنگوں کا حصّہ بن جاتی ہیں۔ یہاں کی گاڑیاں نہایت ہی خوش نُما اور آرام دہ ہیں۔ مخملی چوڑی چوڑی نشستیں عہدِ وکٹوریا کی یاد دلاتی ہیں۔ جب کہ عورتیں عموماً فربہ اندام اور مَردوں کے کُولہے فراخ ہوا کرتے تھے۔ کچھ ایسا احساس ہوتا ہے کہ آپ ہندوستان میں حال ہی میں چلائی گئی "محل بر دار گاڑی" (PALACE ON WHEELS) پر چلے جا رہے ہیں — چُست وردیوں میں ملبوس بیروں کی فوج کے بغیر! شاید اس گاڑی کی قدر بیروں کی فوج کی وجہ سے ہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ لندن کی گاڑیوں کے کرائے خاصے زیادہ ہیں۔ لیکن صاحب یہ لندن ہے! سیاحت کو فروغ دینے کے لیے دفتروں کے اوقات کے بعد یعنی دس بجے کے بعد کی گاڑیوں میں صرف تین پونڈ میں آپ کو سارا دن گھومنے پھرنے کا ٹکٹ مل سکتا ہے۔ اسی ٹکٹ کی شرح میں آپ لندن کے کسی بھی کونے میں گاڑی یا مخصوص لال رنگ کی بسوں کے ذریعے جتنی بار چاہیں آ جا سکتے ہیں۔ یہ تین پاؤنڈ اس لیے بھی کچھ زیادہ مہنگے معلوم نہیں ہوتے کیونکہ ہانسلو سے پکاڈلی تک آنے جانے کا معمولی کرایہ بھی دو پونڈ ہے۔ اس پر اگر آپ اسٹیشن سے گھر تک کے لیے بس لینا چاہیں تو وہ کرایہ الگ!

جب ہم بیکر اسٹریٹ پہنچے، تو وہاں پہلے سے ہی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ اکثر لوگ کھانے پینے کی چیزوں سے لیس تھے۔ اپنے ہاں لوگ کرکٹ میچ کے لیے جایا کرتے ہیں۔ مغربی دیشوں میں ریستوراں وغیرہ کافی مہنگے ہیں۔ لہٰذا لوگوں کا اپنے ساتھ لنچ یا ناشتہ لے جانا معمولات میں شامل ہے۔ خصوصاً بچّوں کی صحبت میں تو جہاں منٹ منٹ پر کھانے پینے کو چاہیے۔ یہ بالکل ناگزیر ہے۔ ہمیں بھی اپنے ساتھ ناشتہ 'جوس' یا کولا وغیرہ لے جانے کی تاکید کی گئی تھی۔ ایک ہاتھ میں کیمرہ اور دوسرے میں فلیش، کندھے سے لٹکا ناشتے کا تھیلا! ہماری شریمتی جی تو اپنے بیگ نما پرس کو ہی مشکل سے سنبھال پاتی تھیں۔ اب اس بیگ میں کیا کیا ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے۔ اس کی تفصیل پھر کبھی اطمینان سے بیان کروں گا۔

یہ مومی عجائب گھر دو منزلوں اور ایک تہ خانے میں بٹا ہوا ہے۔ شروعات بالائی منزل سے ہوتی ہے۔ جہاں آپ ایک متحرک زینے ...... (ESCALATOR) کے توسط سے پہنچتے ہیں۔ اندر داخل ہوتے ہی آپ دیکھتے ہیں کچھ ڈرامائی منظر برطانوی تاریخ کے اوراق سے نکل کر آپ کی آنکھوں کے سامنے آ موجود ہوتے ہیں۔ یہ اسکاٹ لینڈ کی ملکہ میری ہیں جو ملکہ ایلزبتھ اوّل کی سوتیلی بہن ہے اور جسے مقتل میں لے جانے سے پہلے تیار کیا جا رہا ہے۔ خادماؤں کے چہروں پر خوف اور اداسی کے سائے لہرا رہے ہیں، جب کہ ملکہ میری کا چہرہ سنجیدہ ہے۔ لیکن شاہی جلال سے تمتما رہا ہے۔ فوجی عدالت ایک معصوم لڑکے سے اُس کے باپ کی نقل و حرکت کے بارے میں سوال کر رہی ہے — یہ خوب صورت شہزادہ نہایت وقار اور حوصلے سے جواب دے رہا ہے، جب کہ اس کی بڑی بہن سپاہی کی حراست میں پیچھے کھڑی سسکیاں لے رہی ہے! دو شہزادے سہمے ہوئے سے حراست کے دوران اپنی ناگزیر موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ شاہ جیمز اوّل کی پارلیمنٹ کو بارود سے اُڑا دینے کی سازش کرنے والا گائی فاکس (GUY FAWKES) کل دباتے وقت بڑے انہماک سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے! ہر مومی کردار زندہ! جذبات کی مکمّل عکاسی کرتا ہوا! اپنے عہد کی ایک زندہ حقیقت! تاریخ کے یہ اوراق پھڑپھڑاتے سنائی دیتے ہیں۔ یہاں تاریخ کوئی بے جان کتاب نہیں، جیتی جاگتی حقیقت کی طرح آپ کے سامنے موجود ہے۔

پھر ایک کشادہ باغ! یہاں باقاعدہ ایک پارٹی ہو رہی ہے۔ پھول پودوں اور فوارے کی منڈیر پر بیٹھی یا پاس کھڑی نہ جانے کتنی عالمی شخصیتیں۔ کہیں ہالی وڈ کی مشہور ایکٹریس صوفیہ لارین ہے تو کہیں سنسنی خیز داستانوں کی خالق اگاتھا کرسٹی۔ کہیں اُن میں حقیقت نگاری اور خوف و ہراس کے جذبات بھر دینے والا مشہور فلمی ڈائریکٹر الفریڈ ہچکاک اور کہیں ماضی کی ملکۂ حُسن لزا منیلی (LIZA MINNELI) چبوترے کے کنارے بڑے ہی دل کش انداز میں بیٹھی کسی کا انتظار کرتی ہوئی! سینکڑوں تماشائی اپنے محبوب کرداروں کے ساتھ ایسے پوز میں تصویریں کھنچواتے نظر آتے ہیں کہ وہ بھی — تصویر میں ہی سہی مادام تساد کی آرٹ گیلری کا حصّہ نظر آئیں — شاید یہ سوچ کر، جو ہاتھ آئے وہی غنیمت ہے۔ اس آرٹ گیلری میں ویسے تو شاید انہیں کبھی جگہ نصیب نہ ہو گی۔

آگے بڑھیے تو اس دنیا کے ہیرو نظر آتے ہیں — کہیں اندھیرے میں ٹینس میچ پر کمنٹری ہو رہی ہے — پھر اچانک روشنی عالمی شہرت یافتہ جانے پہچانے کھلاڑی جان میکنرو JOHN MCENROE اور بورگ

(BORG) پر پڑتی ہے جو میچ کے وقفوں میں سستا رہے ہیں۔ کہیں وہ سراپا شعلہ اداکار و رقاص ایلوس پریسلے (ELVIS PRESLEY) جو اپنے وقت میں لاکھوں دلوں کی دھڑکن تھا اور ہر لڑکی اس پر فدا تھی، جوش و خروش سے گٹار بجاتا دکھائی دیتا ہے۔ روشنی اور آواز کے منظر نہایت اثر انگیز ہیں۔

اس کے بعد آپ ایک بہت بڑے ہال میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں قدم رکھتے ہی آپ کی نگاہ انقلاب فرانس کے دور کی ملکہ میری اینٹونٹ (MARIE ANTONETTE) شاہ لوئی XVI ولی عہد اور شہزادی پر پڑتی ہے، جو صوفوں پر آرام فرما رہے ہیں۔ کہیں ملکہ ایلزبتھ اوّل اپنے شاہی جلال کے ساتھ کھڑی ہیں۔ کہیں بے چارا ہنری ہشتم اپنی چھ بیویوں کے ہجوم میں گم سا دکھائی دیتا ہے۔ کہیں ملکہ وکٹوریہ اپنی تمام تر سنجیدگی کے ساتھ رونق افروز ہیں، کہیں ایڈورڈ ہفتم اپنی ملکہ الیگزانڈرا کے ساتھ! کہیں وہ بدنصیب چارلس اوّل ہے جسے خود سری اور بیوقوفیوں کی وجہ سے اپنا سر گنوانا پڑا۔ یہاں سگار سمیت چرچل بھی موجود ہیں اور ہندوستان کا آخری وائسرائے اور پہلا گورنر جنرل پنڈت لوئی مونٹ بیٹن بھی۔ یہاں ابراہم لنکن بھی ہے اور رونلڈ ریگن بھی۔ پنڈت نہرو بھی اور اندرا گاندھی بھی۔ پوپ پال دوئم بھی اور شاہ حسین بھی۔ غرض یہ کہ ہر وہ شخصیت موجود ہے، جو صفحۂ ہستی پہ اپنا نام چھوڑ گئی ہے یا تاریخ کو ایک نیا موڑ دے رہی ہے۔

فن کاروں اور ادیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں ڈنمارک کے مشہور کہانی کار ہنس کرسچین اینڈرسن جنہوں نے بچوں کو کئی ناقابلِ فراموش کہانیاں دی ہیں اور مشہور مصوّر اور فن کا پیبلو پکاسو... (PABLO PICASSO) یہ دونوں فن کار کرسیوں پر بیٹھے ہیں، اپنی اپنی خیالی دنیا میں کھوئے ہوئے۔ ایک کرداروں کی دنیا میں تو دوسرا رنگ و اسلوب کی دنیا میں!

مشہور ٹینس کھلاڑی جان میکنرو اور بورگ کھیل کے وقفوں میں سستا رہے ہیں۔

ہال کے آخر میں ایک سین ہے پرنس آف ویلز اور موجودہ ولی عہد پرنس چارلس کی شادی کا۔ اس میں چارلس اور ان کی دلہن لیڈی ڈائنا اسٹیج پر ایسے کھڑے ہیں، جیسے وہ رسوم شادی کے بعد ابھی ابھی ویسٹ منسٹر چرچ سے سیدھے آ رہے ہیں۔ ان کے عقب میں اسٹیج پر ہی کھڑے ہیں ملکہ ایلزبتھ دوم اور ڈیوک آف ایڈنبرا اور سیڑھیوں کے نیچے پرنس چارلس کی دادی ملکہ میری جن کے روم روم سے اس جوڑے کو دیکھ کر خوشی پھوٹ رہی ہو۔

اس عمارت کے نچلے حصے میں ٹرافالگر کی لڑائی میں حصہ لینے والے ایڈمرل نیلسن کے جہاز ایچ۔ ایم۔ ایس وکٹری کے کچھ نظارے ہیں۔ ایڈمرل نیلسن کو کون نہیں جانتا۔ انہوں نے نپولین جیسے فاتح کو شکست دے کر انگریزی وقار کو پھر ایک بار بحال کر دیا تھا۔ اس بحری لڑائی میں جس جانفشانی سے اس جہاز کے آٹھ سو سپاہی اور جہازی لڑے، جن حالات کا انہوں نے سامنا کیا وہ انگریزی تاریخ کا سنہری باب ہے اور ہمیشہ یاد رکھے جانے کے قابل۔ انہی ناقابلِ فراموش نظاروں میں ہے نیلسن کی موت! پس منظر میں ہیں جہازیوں کی آوازیں چیخیں، بار بار گولے پھٹنے کا شور و غل لڑائی کا سماں باندھ دیتے ہیں۔

▲ مادام تُساد اپنے ایام جوانی میں

◀ "خون و دہشت" گیلری میں بانس پر آویزاں ایک سر

تہہ خانے میں "خون و دہشت" کے ہولناک، بدحواس کرنے والے مناظر ہیں، جن کا براہ راست تعلق مادام تساد اور ان کے عہد سے ہے۔ مادام میری گراس ہولٹز (MARIE GROS HOLTZ) جو کہ بعد میں مادام تساد کہلائیں ۱۷۶۱ء میں فرانس میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ایک جرمن سپاہی تھے جو اس کی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو گئے — یہ مادام تساد کی خوش قسمتی تھی کہ اُن کی والدہ کو فلپ کرٹس (PHILLIPE CURTIUS) کے ہاں جو موم کے ماڈل بنانے میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے، نوکری کرنی پڑی اور اس طرح سے چھ سالہ میری کو بچپن ہی سے اس کام کو سیکھنے کا موقع ملا۔ سترہ سال کی عمر میں ان کو مشہور مفکر مصنف والتیرے .... (VOLTAIRE) کے ماڈل بنانے کا موقع ملا۔ دو سال بعد وہ شاہ لوئی XVI کی بہن کی اتالیق مقرر کی گئیں اور اس طرح اُنہیں شاہی آداب سیکھنے اور شاہی قربت سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔

فرانسیسی انقلاب کے عذاب کے پہلے شکار شاہ لوئی اور میری اینٹونٹ ہی تھے۔ بے شمار امراء وزراء پھانسی پر چڑھائے گئے، لیکن مادام تساد اپنے فن کے باعث محفوظ رہیں۔ انہیں نئی سرکار کی طرف سے گردن زنی کے شکار لوگوں کی مومی شبیہیں بنانے کا کام ملا۔ یہ بڑے دل گردے کا کام تھا۔ اُنہیں مومی شبیہوں میں سے چند آج بھی اس خون و دہشت کی گیلری میں موجود ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ شروع سے آج تک اس عجائب گھر کا بنیادی حصہ رہا ہے۔ ۱۷۹۴ء میں ڈاکٹر کرٹس کی موت کے بعد ان کے مومی شاہکار میری کو ورثے میں مل گئے۔ اگلے سال میری کی شادی ایک سول انجینئر فرانکواس تساد سے ہوگئی۔ یہ شادی کچھ زیادہ کامیاب نہ تھی۔ ادھر فرانس میں بھی کچھ حالات زیادہ سازگار نہ تھے۔ مادام تُساد کو انگلینڈ میں اپنا مستقبل زیادہ روشن نظر آیا اور شہرت کی خواہش سند اور دلواتی اپنے تمام فنی اثاثے اور ایک لڑکے سمیت انگلینڈ منتقل ہو گئی۔ وہ اپنے شاہکاروں کی انگلینڈ بھر میں نمائش لیے گھومتی رہی۔ وہ ایک کامیاب کاروباری عورت تھی۔ فرانس کی شاہی خاندانی تربیت اس کے کام آئی اور اُس نے برٹش شاہی خاندان اور دوسرے بارسوخ لوگوں کے مومی ماڈل بنانے شروع کر دیئے۔ ۱۸۳۵ء میں ۷۴ سال کی عمر میں اُس نے بیکر اسٹریٹ میں اپنے مومی عجائب گھر کی شروعات کی۔ ۱۵ سال بعد جب اُس کی موت ہوئی تو اس کا نام عام ہو چکا تھا۔ مرنے سے قبل اُس نے اپنے شاہکار اپنے دو بیٹوں جوزف اور فرانکوائس میں بانٹ دیئے تھے۔ ۱۸۴۴ء میں جوزف کی موت کے بعد فرانکوائس کے بیٹے جوزف رینڈل تُساد نے اپنے دو بھائیوں کے ساتھ اس اثاثے کو بیکر اسٹریٹ اسٹیشن کے قریب ایک نئی تعمیر شدہ عمارت میں منتقل کر دیا۔ جہاں یہ عجائب گھر آج بھی موجود ہے۔

جوزف رینڈل نے بھی اپنی دادی کی طرح خداداد صلاحیتیں پائی تھیں۔ اور اب اُس کے اپنے شاہکار اس مومی عجائب گھر کے سرمائے میں شامل تھے۔ اس کی موت کے بعد ۱۸۸۹ء میں اس کے بیٹے جان تھیوڈور نے اسے ایک پبلک لمیٹڈ کمپنی کی شکل دی۔ ۱۹۲۵ء میں اس عجائب گھر میں اچانک آگ لگ جانے کی وجہ سے بہت نقصان ہوا۔ لیکن تین سال کے اندر ہی یہ عجائب گھر نئے شاہکاروں اور دیگر اضافوں کے ساتھ پھر تماشائیوں کی توجہ کا مرکز تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں بھی اسے پے درپے کئی بار نقصان پہنچا۔ لیکن یہ ہر بار نئے اضافوں اور پہلے سے بھی زیادہ پُرکشش شاہکاروں کے ساتھ آن موجود ہوا۔ ۱۹۶۷ء میں اس خاندان کے آخری نام لیوا برنارڈ تساد کی موت کے بعد، اس کا مادام تساد کے خاندان سے تانا ٹوٹ گیا اور آج اس کا نظام وہی جان تھیوڈور تساد کی تشکیل کی ہوئی پبلک لمیٹڈ کمپنی چلا رہی ہے۔ اس نام کے طلسم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آج تقریباً ہر مغربی ملک میں اس نام سے مومی عجائب گھر موجود ہیں، لیکن حقیقتاً مادام تساد کے ادارے کے صرف دو ہی عجائب گھر ہیں۔ لندن میں اور ہالینڈ کی راجدھانی ایمسٹرڈم میں۔ آخرالذکر عجائب گھر ۱۹۷۰ء میں کھولا گیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مادام تساد کے عجائب گھروں میں ہر مجسمہ مادام تساد یا اس کے خاندان کے کسی فرد کی ذاتی تخلیق نہیں ہے، لیکن اس ادارہ کے ساتھ کئی نامور فن کار وابستہ رہے ہیں جن میں چند ایک نے اپنے فن پارے دوسرے مومی عجائب گھروں کو بھی دے ئے ہوں گے، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ تساد خاندان کے اکثر لوگ بذاتِ خود فن کار تھے اور کئی مرتبہ تو سب بھائی بہن ان شاہکاروں کی تخلیق اور انہیں نکھارنے میں لگے رہے ہیں۔ یہ روایت آج بھی موجود ہے، جب کہ تساد خاندان موجود نہیں۔ اب ذرا یہ دیکھیں کہ یہ مجسمے کیسے تخلیق کئے جاتے ہیں۔

مادام تساد کی اس آرٹ گیلری میں وہی لوگ جگہ پا سکتے ہیں، جو یا تو شاہی خاندان سے وابستہ ہیں یا وہ شخصیتیں جو اپنے دائرۂ کار میں امتیازی حیثیت حاصل کر چکی ہیں۔ ہر ایسی شخصیت کا انتخاب کرنے کے بعد اس شخص کی عادات اور مخصوص اظہاری علامات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بنائے جانے والے پوز کا تعین کر کے اس شخصیت کا جسمانی ناپ لیا جاتا ہے پھر اسی پوز کے مطابق دھات کے فریم پر چکنی مٹی سے اس کے دھڑ کو تشکیل کیا جاتا ہے۔ چکنی مٹی سے بنے ہوئے سر کو بارہ حصوں میں تقسیم کر کے ایک پلاسٹک کا خول تیار کر لیا جاتا ہے۔ ان حصوں کو باری باری نکال کر موم بھرنے کی غرض سے انہیں از سر نو لگا دیا جاتا ہے۔ جب گرم موم ٹھنڈی اور سخت ہو جاتی ہے تو پلاسٹر کے خول سے یہ حصے نکال لئے جاتے ہیں۔ اس دوران دھڑ کے پلاسٹر کے سانچے کے اندر فائبر گلاس (FIBRE GLASS) پگھلا کر ڈال دیا جاتا ہے۔ پلاسٹر گرید نے پر فائبر گلاس کا جسم تیار مل جاتا ہے۔ ہاتھوں کا سانچا براہِ راست شخصیت کے اپنے ہاتھوں سے ہی بنایا جاتا ہے۔ موم سے بنے سر میں شیشے کی آنکھیں فٹ کر دی

سلیپنگ بیوٹی کی خوب صورت شہزادی۔ جس کے سینے کا زیر و بم اس کے زندہ ہونے کا بھرم پیدا کرتا ہے۔

جاتی ہیں اور ایک ایک کر کے سر کے بال مومی سر میں دھنسا دئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بالوں کو دھو کر مناسب وضع سے تراش لیا جاتا ہے۔ موم کو صحیح رنگت دینے کے لیے واٹر کلر اور میک اپ کا مناسب استعمال کیا جاتا ہے۔ اکثر ان ماڈلوں کو وہی کپڑے پہنائے جاتے ہیں، جو شخصیت خود استعمال کرتی ہے۔ ماڈل کو مکمل طور سے تیار کرنے میں عموماً تین چار ماہ لگ جاتے ہیں۔

مادام تساد کا ادارہ ہمیشہ موقع شناس رہا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جب ایڈ ورڈ ہشتم مسز سمپسن کی خاطر تخت سے دستبردار ہو گئے تھے تو گیلری میں مسز سمپسن اور شاہ ایڈ ورڈ کے مجسمے تیار تھے اور ان پر امتیازی روشنی پڑتے ہی شاہ ایڈ ورڈ کی ریڈیو پر دی ہوئی متعلقہ تقریر بھی سنائی جاتی تھی۔ گانا بجاتا ایلوس پریسلے

اور جان میکنرو اور بورگ کی ٹینس میچ کی کمنٹری آج بھی تماشائیوں میں سنسنی پیدا کر دیتی ہے۔

عین ممکن ہے کہ کسی آئندہ کرکٹ کے برطانوی دورے پر سنیل گواسکر کا مجسمہ بھی تماشائیوں کو دیکھنے کو ملے! مادام تساد کی گیلری میں جگہ پانے کا اعزاز، امتیازی دنیا میں جگہ پانے کے مترادف ہے!

مجھے اس عجائب گھر میں سب سے زیادہ جس چیز نے متاثر کیا۔ وہ "سلیپنگ بیوٹی" کا منظر ہے۔ ایک عالی شان شاہی پلنگ پر یہ حسینہ بے خبری کی نیند سو رہی ہے۔ اس کے سینے کا زیروبم دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ بالکل اسی طرح سانس لیتی ہے جیسے کوئی بھی زندہ فرد۔ اُس پر قدرے جُھکا ہوا شہزادہ اُسے بغور دیکھ رہا ہے، یوں تو عجائب گھر کے سبھی مجسمے صورتِ اظہار اور منجمد حرکات کی وجہ سے گوشت پوست کے معلوم ہوتے ہیں، لیکن سانس کے اس زیر و بم کو آنکھ جھٹلا نہیں سکتی۔ اس حسینہ کی شبیہہ فرانس کی مشہور پری چہرہ مادام بیری (MADAM BERRY) کی عکاسی کرتی ہے۔ شاہ XV کی محبوبہ تھی۔ ۱۸۳۷ء میں اس ماڈل کی انگیا کے نیچے ایک گھڑی نما آلہ لگا کر سانس کے زیروبم کا بھرم پیدا کیا تھا۔ ان دنوں یہ آلہ بجلی سے چلتا ہے۔

جب ہم اس منظر کو دیکھ رہے تھے تو چند پاکستانی عورتیں بُرقعہ پہنے اس ماڈل کو دیکھنے کی غرض سے آگے بڑھیں۔ نظر پڑتے ہی ایک زنانہ آواز ماحول کی خاموشی کو چیرتی ہوئی گونجی۔ "ہائے میں مرجاواں! ایہہ بھیڑی تے ساہ پئی لیندی اے!" (ہائے میں مرجاؤں یہ کمبخت تو سانس لے رہی ہے!) مجھے شدید احساس ہے کہ پنجابی لفظ 'بھیڑی' کا ترجمہ 'کمبخت' بہت ناقص ہے اور وہ اصل لفظ کی رُوح تک نہیں پہنچتا۔ لیکن ایک ہاتھ نقاب کو اُٹھائے کُھلا مونہہ اور تجسس بھری چیختی ہوئی آواز مادام تساد کے آرٹ کے لیے وہ خراجِ تحسین تھا، جو کسی بھی تحریر پر بھاری ہے!! (زیرِ تصنیف سفرنامہ "سمٹتے فاصلے" کا ایک حصہ)

## بقیہ: قوسِ قزح

اُس نے لڑکی کو بستر سے اُتار کر دروازے کے باہر دھکیلا ہے اور خود بھی پاش پاش دھوپ کو پیروں تلے روندتے ہوئے اُس کے پیچھے ہو لی ہے۔

بابا نے دودھ کے ساتھ سونے کی گولی نگل لی ہے اور کمبل اوڑھ کر سیدھا لیٹ گیا ہے۔

"اس گھر کے لوگ کتنے نیک ہیں، رام آسرے۔"

"ہاں، رام آسرے۔"

"ان سے میرا کوئی رشتہ ناتا نہیں، پھر بھی کیا مجال، میرے کھانے پینے میں ناغے کی نوبت آجائے؟"

"ہاں رام آسرے۔"

●●

## بقیہ: مولانا سید سلیمان ندوی

مولانا سید سلیمان ندوی ندوۃ العلماء سے بھی وابستہ رہے اور اس کے مجلّہ 'الندوہ' کی ادارت کئی بار انہیں سونپی گئی۔ وہاں وہ تفسیر، فقہ اور حدیث کا درس بھی دیتے رہے، پھر انہوں نے دارالمصنفین اعظم گڑھ کو ایک بے مثال علمی ادارہ بنانے میں اپنی زندگی کا بہترین حصہ وقف کر دیا۔ آج بھی ندوۃ العلماء یا دارالمصنفین کا جو علمی وقار ہے اس میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کی بے لوث خدمات کا بہت بڑا حصہ ہے، انہیں شاگردوں اور مخلص رفیقوں کی بھی ایک ایسی جماعت مل گئی کہ ان حضرات نے دنیا کے طمطراق سے آنکھیں بند کر کے قلندرانہ وضع میں ساری زندگی گزار دی اور علم کی خدمت کرکے مگن رہے۔

انہوں نے قابلِ رشک وقار و تمکنت کے ساتھ پوری زندگی صرف کتابوں اور کتب خانوں کے درمیان گزاری اور اب وہ ہمیشہ ان کتب خانوں میں زندہ رہیں گے اور ان کی کتابوں کی ایک ایک سطر ان کے علم و فضل اور پاکیزہ مذاق کی گواہی دیتی رہے گی۔ ●●

## بقیہ: سید سلیمان ندوی ـ بحیثیت ادیب

ہے اور افادی کہلانے والے کا اندازِ نظر بڑی نشاط کوشی۔ لہٰذا سید سلیمان ندوی کی ادبیت فطری و اصلی ہے۔ اور مہدی افادی کی ادبیت مصنوعی و نقلی۔

ادیب کی حیثیت سے مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ مطالعہ ادب کے وسیع ترین معنوں میں کیا گیا ہے اور اسے محض چند ادبی اصناف میں محدود نہیں سمجھا گیا ہے۔ درحقیقت ہر وہ تحریر یا تقریر ادب ہے، جس میں ادب کے نقوش کلام FIGURES OF SPEECH کا استعمال ایک سلیقۂ فن کے ساتھ کیا گیا ہو ــــ چنانچہ جس چیز کو تخلیقی نثر کہتے ہیں وہ افسانہ و ناول، انشائیہ و خاکہ اور ڈرامہ کی طرح تحقیق و تنقید میں بھی ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے، خواہ یہ تحقیق و تنقید مسائلِ ادب کی ہو یا مسائلِ حیات کی۔ اگر اندازِ بیان ادبی ہے تو سیاست اور معیشت کے مضامین بھی ادب پارے ہیں۔ ادبی اندازِ بیان کے لیے حسنِ اظہار اور تربیت یافتہ آہنگ کافی ہے۔ یہ اندازِ بیان جتنے وسیع مواد کی ترسیل کا وسیلہ ہوگا اس کی اہمیت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ صاحبِ طرز ادیب اجتماعی علوم پر مشتمل تصانیف کے اندر بھی پائے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بعض بہترین نثاروں کا موضوع یہی اجتماعی علوم تھے۔ چنانچہ ادیب کی حیثیت سے جارج برنارڈ شا کی شہرت جتنی اس کے نثری ڈراموں پر مبنی ہے اتنی ہی اس کے علمی دیباچوں پر۔ مولانا سید سلیمان ندوی ایسے ہی ایک ادیب تھے ان کی تحریروں کی ادبیت افسانہ و ناول یا انشائیہ و تنقید کے مصنفوں سے کسی طرح کم نہ تھی بلکہ اپنی ہمواری و استواری کے لحاظ سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ اردو تنقید اس واقعے کو جتنی جلدی تسلیم کرلے اردو نثر میں طبع آزمائی کرنے والوں کے لیے اتنا ہی اچھا ہوگا۔ اس لیے کہ انہیں معیارِ فکر و فن کے لیے ایک وسیع تر نمونۂ ادب مل جائے گا۔

●●

حیات اللہ انصاری

# میں کہ...

نام: محمد حیات اللہ انصاری

قلمی نام: حیات اللہ انصاری (لبعض ابتدائی دَور کی نگارشات کے ساتھ محمد حیات اللہ انصاری بھی درج ہے۔)

والد کا نام: مولوی وحید اللہ انصاری

خاندان: علمائے فرنگی محل

سلسلۂ نسب: حضرت ابوایوب انصاری صحابیِ رسولؐ سے ملتا ہے۔

تاریخِ ولادت: یکم مئی ۱۹۱۱ء

مقامِ ولادت: فرنگی محل، لکھنؤ

تعلیم: ۱۔ ۱۹۲۶ء میں فرنگی محل (لکھنؤ) سے علومِ شرقیہ (درسِ نظامیہ) میں مولانا کی سند۔

۲۔ ۱۹۲۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضلِ ادب۔

۳۔ ۱۹۲۹ء میں پرائیویٹ طور پر یوپی بورڈ سے ہائی اسکول کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

۴۔ ۱۹۲۹ء میں طالب علم کی حیثیت سے جوبلی انٹر کالج (لکھنؤ) میں انٹر کے پہلے سال میں داخلہ لیا اور باضابطہ طور پر دو برسوں تک کالج کا طالب علم رہا۔ ۱۹۳۱ء میں چیچک نکل آنے کے باعث بورڈ کے امتحان میں شامل نہ ہو سکا۔

بعد ازاں ۱۹۳۲ء میں پرائیویٹ طور پر یوپی بورڈ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

۵۔ ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سیکنڈ ڈویژن میں بی۔ اے۔ عملی زندگی کا آغاز اور مختلف اخبارات کا اجرا اور اُن کی ادارت۔

۱۹۳۷ء میں کانگریس پارٹی کے ہفتہ وار اخبار "ہندوستان" (لکھنؤ) کا اجراء اور ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۲ء اخبار سے بحیثیت مدیر وابستگی۔

۱۹۴۵ء میں ASSOCIATED JOURNALS کے زیرِ اہتمام روزنامہ "قومی آواز" (لکھنؤ) کا اجرار اور ۱۹۴۵ء تا جون ۱۹۷۲ء اخبار سے بحیثیت مدیر وابستگی۔ ۱۹۷۳ء میں مرکزی کانگریس پارٹی کے ہفت روزہ اخبار "سب ساتھ" (دہلی) کا اجراء۔ تین سال تک اس اخبار سے بحیثیت مدیر وابستہ رہا۔ ۱۹۷۶ء میں اس عہدے سے مستعفی ہو گیا۔

فلمی دنیا سے وابستگی: ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۵ء

اس امر کی کوشش کی کہ جنگِ آزادی کے موضوع پر کوئی فلم بنائی جائے۔ اس غرض سے "نیچا نگر" کہانی لکھی۔ چیتن آنند کو ہدایت کاری اور رشید انور کو پروڈیوسر بننے پر آمادہ کیا۔ فلم ۱۹۴۵ء میں تکمیل کو پہنچی۔ یہ پہلی ہندوستانی فلم ہے جس کو کانس (فرانس) کا بین الاقوامی اوّل انعام ملا۔

شادی اور اولادیں: ۱۹۳۶ء میں میرٹھ کے ایک معزز گھرانے کی خاتون سلطانہ بیگم سے شادی ہوئی۔ سلطانہ بیگم لاہور یونیورسٹی سے گریجویٹ ہیں۔ ان کے افرادِ خاندان نے تحریکِ آزادی میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

اولاد: ۱۔ مشیت اللہ ۲۔ سدرۃ المنتہیٰ

ادارہ تعلیم گھر اور دستخطی مہم: ۱۹۵۲ء میں اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے اور تعلیمِ بالغان کے لیے ادارہ تعلیم گھر قائم کیا۔

۱۹۵۲ء میں یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کیے جانے کے لیے ۲۰½ لاکھ دستخطوں کی فراہمی کی اور ان کو ایک عرض داشت کی صورت میں مکمل کر کے ڈاکٹر ذاکر حسین صدر انجمن ترقی اردو ہند کی قیادت میں صدرِ جمہوریۂ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں پیش کیا۔ فی الوقت اردو کو یوپی کی دوسری سرکاری زبان تسلیم کیے جانے کے لیے کوشش جاری ہے۔

تخلیقی سفر کا آغاز:- ۱۹۲۵ء میں نیلی چھتری (از ظفر عمر) سے متاثر ہو کر ایک نیم جاسوسی اور نیم رومانی نوع کا ناول لکھا۔ ایک ناشر اس کی اشاعت پر مصر بھی تھا، لیکن معیارِ ذوق بدل گیا اور اس کی اشاعت قبول نہ کی۔ اور ناول نذرِ آتش کر دیا گیا۔ گویا یہ پہلی تخلیقی کاوش تھی۔

پہلا مطبوعہ افسانہ: "بڈھا سود خوار"
جامعہ جون ۱۹۳۰ (جو کسی مجموعہ میں شامل نہیں)

دوسرا افسانہ: بیوقوف
جامعہ ۱۹۳۱ء دہلی (جو کسی مجموعہ میں شامل نہیں)

افسانوی مجموعے:

۱۔ انوکھی مصیبت اشاعتِ اوّل ۱۹۳۹ء لکھنؤ

(آگے ملاحظہ ہو)

# بہ خطِ شاعر

## نشتر خانقاہی

## غزل

کل سمیٹے گا، مزارع صبح کا، سوایا ہوا
دانہ دانہ رات کے کھلیان کا بکھرا ہوا

آ کہ، اب اِس کھوکھلے پن پر ہنسیں بے ساختہ
تیرے آنسو طے شدہ تھے، میرا غم سوچا ہوا

اس نے کیا کہا کہ میری روح چھلنی ہو گئی
دوست تھا، اظہارِ ہمدردی سے آسودہ ہوا

سانحہ یہ جسم کے جلنے سے تھا سنگین تر
اس کے ہونٹوں پر ملا، اک قہقہہ چپکا ہوا

اک طرف سوکھی ہوئی، پودے کی پیلی پتیاں
اک طرف، روشن مکانوں میں نگر جلتا ہوا

اب کی برکھا میں یہ ٹوٹی پتیاں کافی نہیں
آندھیاں اٹھنے کو ہیں، دل بہت ٹھہرا ہوا

نشتر خانقاہی

حکیم منظور

# تین نظمیں

## خواب ۔ فسانہ

پیڑ کا مفہوم و معنیٰ تن برابر سبز پتّے، قد برابر کے ثمر
بارشیں وہ جن سے سوکھے کھیت، تشنہ کام آنگن،
سارے ہی سیراب ہوں
برف وہ جو کوہساروں کے برہنہ تن کو ڈھانپے
دھوپ وہ جو نم زمیں سے فصلِ گل کو دے جنم
کیا ہوا! جو خوشبوؤں کے لمس کی حامل نہ ہو
کیسی مٹّی! جو کسی کمہار کے ہاتھوں نہ پیکر بن سکے
بات کرتا ہی رہوں ۔ خواہش ۔
مگر ملتے نہیں ہیں قافیے

قافیے مل بھی اگر جائیں تو کیسے بات ہو
ہر کسی کے بات سننے کا ہے اک معیار اپنا
بات کرنے کا مرا بھی اپنا اک معیار ہے

ہر کوئی تنہا یہاں ہے اور یوں لگتا ہے
جیسے قافلہ سالار ہے
ہر کسی کے خوں میں پریاں بس گئی ہیں
اُس پہ پریوں کی کہانی، خواب آور، خواب خزاب
میں اگر معیار سے اپنے اُتر بھی جاؤں لیکن
دوں کسی کا کیا جواب
اندھے کو 'مکہ دکھانا' نے گنہ ہے نے ثواب
پیڑ، بارش، برف، مٹّی، دُھوپ، خوشبو زا ہوا
صرف پریوں کی کہانی،
اک فسانہ ایک خواب

## انتظار

تلاطُم ۔ نہ موجیں، نہ کشتی، نہ ساحل سلامت
سکوں بس جُھلستی ہوئی دُھوپ، سب کچھ نمک
بدن بھر نمک
ہوا بھر نمک
موج تا موج سارا نمک
اگر چاند چہرہ برابر نمودار ہو، تو یہ منظر ذرا سے
توقّف میں بدلے
نئی سیپیاں، جن میں تازہ گُہر ہوں،
وہ مونہہ اپنا کھولیں
مگر چاند چہرہ برابر نمودار اکثر تو ہوتا نہیں ہے
میری آنکھ میں بیشتر بس تلاطم نمک زا سکوں
سمندر! میں تجھ سے کوئی بات کہنا کبھی چاہوں
تو کیسے کہوں
کہ چہرہ برابر نمودار ہوتا ہے جو چاند وہ چاند میرا نہیں
کُھلی بات ہے یہ علامت نہیں، استعارا نہیں
سمندر! ترا مجھ سے کیا کوئی رشتہ نہیں؟
سمندر! نہیں جو مرے پاس اِک چاند تو کیا ہُوا
مجھے تو کوئی حرف ایسا دے جس سے نئی سیپیاں
جن میں تازہ گُہر ہوں
وہ مونہہ اپنا کھولیں
تری اس سخاوت کا میں منتظر ہوں
"سمندر سخاوت" کا میں منتظر ہوں!

---

• ۵ ۔ پرتھوی راج روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۱

## سنگ آمد و سخت آمد

گئے موسموں کا تاثّر مری بستیوں کے تعلق سے کیا تھا
میں کس سے کہوں؟
ثمر دار یا بے ثمر سارے ہی پیڑ خاموش ہیں
رواں بہتے دریا ہوں یا بند جھیلیں،
شگوفوں کے آنگن، چمن زار، یا آبشاروں کی بستی
میں واقف ہوں جن سے، میں جن کی زباں جانتا ہوں
وہ جاگیں تو اُن سے کوئی بات پوچھوں ۔
وہ سارے ہی مدہوش ہیں
شفق، شام، شب، صبح
ان میں کوئی بات بدلی نہیں ہے
وہی دوپہر ہے، وہی اس کی جلتی ہوئی اور
روشن نگاہیں
وہی راستے، جن کے پاؤں نہ سر ہیں
وہی بے اماں خوشبوئیں، جن کے مامن نہ مسکن
نہ گھر ہیں
گئے موسموں کا تاثّر مری بستیوں کے تعلق سے کیا تھا
میں کس سے کہوں کون مجھ سے کہے
میں اک کم عمل جس کو تقویٰ کے معنی کبھی آتے نہیں
میں دلدار ہوں، کیا ہُوا، دست نادار ہوں
مری بات کیا سوچ کر کوئی سننے پہ آمادہ ہو
میں جانتا ہوں کہ کو دکھ دلوں کا میں آزار ہوں
میں لب اپنے کھولوں اگر ایک بھی شخص دل سادہ ہو
میں اُس سے کہوں
نئے موسموں کی جبیں پر شکن کس لیے ہے
تاثّر گئے موسموں کا مری بستیوں کے تعلق سے کیا تھا۔

# غزلیں

## حیاتؔ لکھنوی

کئی ستارے یہاں ٹوٹتے بکھرتے ہیں
ہم اپنی سطح سے آخر کہاں ابھرتے ہیں

نہ جانے کتنے عذابوں میں مبتلا ہم ہیں
اسی لیے تو نئی آرزو سے ڈرتے ہیں

ہم ایک بار جیا نہ کر سکے تجھ کو
ہزار رنگ تری جستجو میں بھرتے ہیں

یہ جگنوؤں کی چمک روشنی نظر بھر کی
ہوا میں اڑتے پرندے کہاں ٹھہرتے ہیں

تمام دن تری یادوں کی چاندنی پھیلے
تمام رات ترے قافلے گزرتے ہیں

میں کوئی بہتا ہوا بیکراں سمندر ہوں
اک آئینے میں ہزار آئینے ابھرتے ہیں

نفس نفس کے لیے سلسلے تلاش کرو
ہمیشہ لوگ یہاں قربتوں پہ مرتے ہیں

وہ پستیاں اسی انسان کا مقدر ہیں
بلندیوں سے فرشتے جہاں اترتے ہیں

حیاتؔ کچھ تو کہو دوستوں کی محفل میں
غموں کی بھیڑ میں اپنے بھی غم نکھرتے ہیں

---

وہ خواہشوں کا اثاثہ تھا، عمر بھر کا گیا
جو مدتوں میں بنا تھا مزاج گھر کا گیا

بتا رہی ہے مجھے راستوں کی ویرانی
وہ اک غبار تھا جو حلقۂ اثر کا گیا

نہ منظروں میں کبھی باقی رہی پذیرائی
کچھ اعتبار بھی مجھ سے مری نظر کا گیا

بجھی بجھی سی روش ہے تھکے تھکے سے قدم
وہ ولولہ بھی ترے ساتھ اب سفر کا گیا

کھلی فضا جہاں پائی اڑان بھر آئی
عجب عذاب تھا مجھ پہ جو بال و پر کا گیا

ان آندھیوں نے وہ منظر دکھائے ہیں مجھ کو
جو ایک خواب تھا پھولے پھلے شجر کا، گیا

کچھ آنسوؤں میں چھلکتے تھے زندگی کے چراغ
وہ سلسلہ بھی مگر اپنی چشم تر کا گیا

نہ جانے کیوں مجھے محسوس [illegible]
تمام شہر سے احساس خیر و شر کا گیا

---

جب چاہو مٹا دو یہ اجازت ہے ہماری
اک بے در و دیوار عمارت ہے ہماری

احساس یہ رہتا ہے خدا جانے کہاں تک
آتے ہوئے لمحوں کو ضرورت ہے ہماری

جو غم بھی جہاں دیکھا ہمیں اپنا لگا ہے
جس آنکھ میں آنسو ہے امانت ہے ہماری

وہ شہر طلسمات مبارک تمہیں یارو
یہ اجڑی ہوئی بستی غنیمت ہے ہماری

پرچھائیں کسی کی بھی گوارا نہیں کرتے
آئینے میں محدود بصارت ہے ہماری

پستی و بلندی کے فسانوں سے ہمیں کیا
ہر حال بسر کرنے کی عادت ہے ہماری

ہم کس سے کہیں کون سنے حال ہمارا
ہر شے پہ تو چھائی ہوئی حالت ہے ہماری

پاتے ہیں ہمیں لوگ حیاتؔ اپنی روش پر
اس دہشتِ تجسس میں کرامت ہے ہماری

---

● امامیہ ہال پنچکوئیاں روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

جوگندر پال

# قوسِ قزح

باھر دنیا کا مونہہ دُھوپ سے دھل گیا ہے تو ٹھنڈی کا سارا میل گھر کے پچھواڑے بابا کی کوٹھری میں بہہ آیا ہے۔ بابا اپنے بستر پر بیٹھے بدن کو کمبل سے اچھی طرح لپیٹنے لگا ہے اور اپنی اس کوشش میں کمبل کو ایک طرف کھینچتا ہے تو بدن کا کوئی اور حصہ ننگا ہو جاتا ہے۔

"کمبل تمہارا کب تک ساتھ دے گا، رام آسرے؟" بابا کو آج کل سوچنے بچار نے پر بھی سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے، اسی لیے جو کچھ اُسے سوچنا ہوتا ہے، وہ اُسے بول بول کر آپ سے کہہ دیتا ہے۔ "اندر ہی گرمی نہ رہے تو باہر سردی کیا اور گرمی کیا؟"

"نہیں، رام آسرے، اتنی گرمی تو باقی ہے"! وہ اپنے آپ کو سمجھاتا ہے کہ "سردی محسوس ہوتی رہے۔"

"ہاں رام آسرے، شُکر ہے کرنی والے کا، سردی سے ٹھٹھروں بھی نہیں تو یہی لگے مر چکا ہوں۔"

لیکن جب سے بابا چلنے پھرنے سے معذور ہوا ہے، اُس وقت سے وہ خوش بھی ہے کہ دم نکلتے ہی میرا پھیرے آپ ہی آپ چلنا پھرنا ہو جائے گا۔ ہُو — ہُو — ہُو — چند روز پہلے کسی اتوار کی سہ پہر کو وہ ضعف کی غنودگی میں لیٹے لیٹے اچانک بے اختیار ہنسنے لگا۔ اُسے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنا سارا بوجھ دھرتی پر چھوڑ آیا ہے اور اپنی ہنسی کے اندر ہی اندر کھنکھناتے جا رہا ہے اور خلاؤں کو عبور کر کے ساتویں آسمان پر بھگوان کے قدموں میں آ پہنچا ہے۔ بابا اپنی غنودگی سے باہر آ کے بستر پر سیدھا ہو کے بیٹھ گیا اور بہ آوازِ بلند بھگوان کی آرتی گانے لگا — اوم جے جگدیش ہرے — سوامی جے جگدیش ہرے — پتا جے جگدیش ہرے۔

گھر کے ایک حصے میں سے ایک آدمی اور ایک عورت ہڑبڑا کر دوڑتے ہوئے، اُس کی کوٹھری میں گھس آئے۔

"کیا ہوا ہے بابا؟ — کیا —؟"

"پتا جے جگدیش ہرے —"

"کم سے کم اُن کے آرام کا دھیان کرو، جس کے گُن گا رہے ہو۔" مرد نے تلخ ہو کر بابا کو مخاطب کیا۔ "کیوں اُس بے چارے کی سہ پہر کی نیند خراب کر رہے ہو؟"

عورت نے مرد کو پیچھے دھکیل دیا اور بابا کو جھٹک کر بستر پر لٹا دیا، اور پھر اُس کے مونہہ میں سونے کی گولی گھسیڑ کر اُس وقت تک پانی کو پرے نہ ہٹایا، جب تک گولی بابا کے حلق سے نیچے نہ اُتر گئی۔

سو کر بھی بابا کی آنکھیں بدستور کھُلی رہیں — اور مونہہ بھی — اوم جے جگدیش ہرے — سوامی جے جگدیش ہرے — اور سوامی آخر جب سونے کی گولیوں کے ساتھ، اس کی رگ رگ میں سرایت کر گئے تو اُس سے پرسن ہو کر ساکشات پُوچھنے لگے، بول بچہ، کیا چاہتا ہے؟ — اور بھگوان کے اس بوڑھے بچے کے ہونٹ جواب کے لیے پھڑکے، مَوت۔

مگر بھگوان نے بابا کو سدا چھوٹی سی موت دی، جس سے بیدار ہو کر وہ اپنے سر میں بوجھ محسوس کیا کرتا ہے۔ آنکھوں میں اندھیرا اور بدن میں ٹوٹن۔

"کوئی بات نہیں، رام آسرے۔" وہ اپنی ڈھارس کے لیے گیتا کا اُپدیش دہرانے لگتا ہے۔ "اپنے دھرم کا پالن کئے جاؤ اور پھل کی ابھلاشا مت رکھو۔"

سورج کی ایک ننھی منی شعاع نہ معلوم کدھر سے بھٹکتی ہوئی بابا کی کوٹھری کی خنک دُھند میں گھُس آئی ہے اور اپنا گھر بار بھُول کر کھیلنے لگی ہے، جس سے اُس کے آس پاس کے مَیلے مَیلے ذرّات روشنی کے نقطے بن کر چمک اُٹھے ہیں۔

"ہو — ہو ہو — ہہ —!"

"کیوں رام آسرے، اسی طرح ہنستے جاؤ گے تو رونے کا دَم کہاں سے لاؤ گے؟"

● ۲۰۴، منڈاکنی انکلیو، کالکاجی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

"میری چھوٹی بہن بڑی نٹ کھٹ تھی رام آسرے۔"

"جن چھوٹی بہنوں کو پیار ملے، وہ بڑی پیاری بڑی نٹ کھٹ نکل آتی ہیں۔"

"ہاں میری بہن جیواں بھی اُجالوں کی نٹ کھٹ گڑیا تھی۔ جس دن ہمارے گھر میں مٹی کا تیل نہ ہوتا، بابوجی کہتے، فکر کاہے کی؟ جیواں کو باندھ کر کھڑا کر دو، سارے گھر میں روشنی ہی روشنی ہو جائے گی۔ ——وہ —— سورج کی وہ شعاع دیکھو رام آسرے۔

——ہوہو —— ہو —— ہ! ——"

"ہنس رہے ہو، یا رو رہے ہو، رام آسرے؟"

"تمہیں کیا معلوم ہو رہا ہے؟"

"مجھے معلوم ہو رہا ہے رو رہے ہو۔"

"جو روتے ہوئے بھی ہنس رہے ہوں، رام آسرے، انہیں کبھی مت ٹوکو۔"

"بستر پر پڑ جانے سے پہلے بھی بابا سے مشکل سے ہی چلنا پھرنا ہو پاتا تھا۔ دو قدم آگے دھرتا تھا تو چار قدم آپ ہی آپ پیچھے اُٹھ آتے تھے۔ سو چند سال اسی طرح چل چل کے بابا سے اپنے پیچھے ہی پیچھے پہنچا ہوا اور یہاں پہنچ کر اس کے پاؤں جواب دے گئے تو اس نے یہیں ڈیرا ڈال لیا۔

"ہو —— ہوہو —— ہ!"

"رونے کیوں لگے ہو، رام آسرے؟"

"ہینہ ابھی ہمارے پڑوس کے محلے تک ہی پہنچا تھا کہ ہمارے گھر کا رنگ برنگا فانوس بجھ گیا۔"

"ہاں، رام آسرے، اسی لیے تمہارا لڑکپن اندھیرے میں ہی ہاتھ پیر مارتے ہوئے بیتا۔"

"کیا تم نے کبھی کسی فانوس کو بجھتے ہوئے دیکھا ہے؟"

"ہاں، تمہاری ننھی سی بہنا کو جو دیکھا۔"

"ارے ہاں، تمہیں تو معلوم ہوگا فانوس کی سوئی سوئی تاب میں سے کس طرح اچانک جادو کی لکیریں پھوٹنے لگتی ہیں اور سر جوڑ جوڑ کر چھلاوہ سی بن کر دیکھنے لگتی ہیں اور ——"

"میں چاہتا تھا موت سے پہلے ایک بار وہ جی بھر کر رو تو لے۔"

"ہو —— ہوہو —— ہو —— ہا ——"

"تم بھی رونے لگے ہو۔ یا شاید ہنس رہے ہو۔"

"ہاں، رام آسرے، میرا بس چلے تو تمہارا سارا رونا میں ہی ہنس لوں۔"

"تم کتنے اچھے ہو رام آسرے؟"

بابا اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے میں لیے ہوئے ہے اور دونوں کو دفورِ محبت سے دبائے جا رہا ہے اور اس دباؤ سے اُسے بڑا سکھ محسوس ہو رہا ہے۔

"وہ دن مجھے ہمیشہ یاد رہے گا رام آسرے۔ سیڑھیوں سے گر کر مجھے بہت چوٹیں آئی تھیں۔ اور لوگ میرے علاج کی فکر میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ مگر تم نے سبھوں کی نظریں بچا کر میرے زخم ہی اپنے وجود پر لے لیے ——"

"زخموں کو چھوڑو۔ میں تو تمہاری موت بھی چپکے سے اپنے اوپر لے لوں گا۔"

"نہیں، رام آسرے، میرا بھلا چاہتے ہو تو اب میرے چل بسنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا کرو۔"

"ہاتھ اُٹھیں تو اُٹھاؤں۔ چلو اب ذرا سو جائیں۔"

بابا نے شاید سو جانے کے بعد سو جانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ کیوں کہ وہ اس طرح زور سے خرّاٹے لیے جا رہا ہے، جیسے اُسے سوئے ہوئے ایک پورا ایک بیت چکا ہے —— بابا ابھی اپنا مڈل کا امتحان بھی نہیں دے پایا ہے کہ اس کے بابوجی سورگ باش ہو گئے ہیں اور آج اُن کی تیرہویں پر پگڑی کی رسم ادا کی جا رہی ہے۔ بالا سا بابا بڑے بوڑھوں کے جمگھٹے میں بیٹھا ہے اور پنڈت نے اُسے سنسکرت کے شلوکوں کا ارتھ سمجھا سمجھا کر اس کی نئی ذمہ داریاں گنوائی ہیں اور پھر اس کے منڈھے ہوئے کچے کچے سر پر بابوجی کا اتنا بڑا پگڑ باندھ دیا ہے کہ اُسے آپ ہی اپنا باپ بنے بغیر کوئی چارہ نہیں رہا ہے۔ وہ بے فکری سے اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر جیسے جانا چاہتا ہے۔ اور وہ جہاں بھی ہو وہ بے اختیار اس کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ مگر اس کے قریب پہنچتے ہی کسی انجانے گناہ کے احساس سے نظریں جھکائے آگے گزر جاتا ہے۔

اپنے سپنے کی اس طرف بابا کی عمر مشکل سے چودہ سال کی ہے، مگر یہاں دوسری طرف وہ چوبیس برس کا ہو گیا ہے اور اس کی بیوی چلا چلا کر کہہ رہی ہے —— ماں —— ماں —— ماں! —— یہی رٹ لگائے جانا تھا تو میرے ساتھ شادی کیوں کی؟

"ارے بھئی ——"

"میں ارے بھئی نہیں ہوں۔ تمہاری بیوی ہوں۔"

"مگر ——"

"مگر وگر کیا؟ اگر تمہاری ودھوا ماں ہی تمہاری سب کچھ ہے تو جاؤ اُسی سے شادی کر لو۔"

تڑاک!

بابا نے بے قابو ہو کر اپنی بیوی کو پہلا اور آخری تھپڑ رسید کیا ہے اور پھر تاسف سے اپنی ہتھیلیاں ملنے لگا ہے۔

"آسو! —— آسرے! ——"

بابا اپنی بیوی کے پہلو میں سوتے سوتے ہڑبڑا کر جاگ پڑا ہے —— "ننکے کی ماں! ——" مگر ننکے کی ماں نے نیند میں پہلو بدل لیا ہے۔

"آسو —— وا! ——"

بابا اپنی ماں کی کوٹھری کی طرف بھاگا ہے۔ اور وہاں پہنچ کر اُس نے دیکھا ہے کہ ماں کے سرہانے دیا جل رہا ہے، مگر وہ بجھ چکی ہے۔ —— آسو! —— نہ جانے ماں نے اُسے کہاں سے پکارا ہے —— آسو! —— وہ کئی سال سے اس آواز کا پیچھا کر رہا ہے اور آخر اس نے اپنی دم توڑتی ہوئی ماں کو جا لیا ہے اور اُسے اپنی بانہوں میں لے لیا ہے۔ سینے سے بھینچ لیا ہے۔ اس کے چاندی کے بالوں پر ہاتھ پھیر رہا ہے —— ماں! —— ننکے کی ماں! —— ننکے کی ماں نے آنکھ کھولی ہے

اور اپنے تڑپتے ہوئے شوہر کو مادرانہ شفقت سے دیکھا ہے اور بجھ گئی ہے۔ مگر اس کے سرہانے دیا بدستور جل رہا ہے۔

بابا کی آنکھ کھل گئی ہے۔

"میں ماں سے مل کر آ رہا ہوں رام آسرے۔"

"اور سوئے رہتے رام آسرے تو ابھی تک اس سے مل رہے ہوتے۔"

"ہاں، اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ ہمیشہ کی نیند سو جاؤں۔"

"تاکہ کمبل ہٹائیں تو اندر سے رام آسرے غائب ہو۔"

"ہر — ہر ہر — ہ — !"

بابا کی ہنسی کی آواز سن کر سورج کی شعاع خوشی سے اُچھل کر اس کے سامنے کی دیوار سے آ لگی ہے اور بابا کی طرف ہاتھ پھیلا کر پھسلنے لگی ہے۔

اور بابا اپنے دل و دماغ میں اس کی طرف دو قدم آگے اور چار قدم پیچھے اُٹھاتے ہوئے اس سے اور پرے ہو گیا ہے اور وہیں سے ہنسے جا رہا ہے۔

"بابا — بابا! —" ایک چار پانچ سالہ پھول جیسی لڑکی دوڑتی ہوئی بابا کے کمرے میں داخل ہوئی ہے تو اس کی آنکھوں میں ایک پورا باغ اُگ آیا ہے۔

لڑکی کے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بابا کے خون میں تمازت بھر آئی ہے۔

"آؤ بیٹھ جاؤ بیٹی —"

"تھوڑی دیر پہلے میں یہاں آئی تھی بابا، اور تمہارے کمبل کو بھی ہلا کر دیکھا تھا، تم کہاں چلے گئے تھے؟"

"میں رام آسرے کے ساتھ چلا گیا تھا بیٹی —"

"مگر تم تو چل پھر نہیں سکتے بابا۔"

"اسی لیے تو رام آسرے کے ساتھ گیا تھا۔"

"رام آسرے کون ہے بابا؟"

"تمہارا بابا، بیٹی، اور کون؟"

سامنے کی دیوار پر دھوپ کے مونہہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا ہے اور وہ لڑھک کر فرش پر آ گری ہے۔

"ارے چوٹ تو نہیں آئی؟"

"کیسے؟" لڑکی نے مڑ کر دیوار کی طرف دیکھا ہے اور وہاں کسی کو نہ پا کر پھر بابا کی طرف متوجہ ہو گئی ہے۔

"بابا، انگلینڈ سے پپا کی چھٹی آئی ہے۔"

"کیا تمہارا پپا انگلینڈ گیا ہوا ہے؟"

"کیوں، کیا تمہیں معلوم نہیں بابا؟" لڑکی بابا کے اور قریب کھنچ آئی ہے۔ "پپا اگلے سنڈے کو واپس آ رہے ہیں۔ میرے لیے وہ ڈھیر ساری چیزیں لا رہے ہیں۔"

کیا تمہاری ممی بھی تمہارے پپا کے ساتھ گئی ہوئی ہے؟"

"کیوں، تمہیں معلوم نہیں بابا؟ ممی تو یہیں ہے۔ یہ دیکھو، ممی نے آج مجھے اس طرح کے چار چاکلیٹ دیئے تھے۔" لڑکی نے ایک چاکلیٹ بابا کے مونہہ میں ڈال دیا ہے۔

"یہ میں نے تمہارے لیے رکھ لیا تھا۔"

دھوپ نے فرش پر سے بابا کی طرف ہاتھ پھیلایا ہے۔ "بابا مجھے بھی۔"

"چل ہٹ!" بابا چاکلیٹ کو جلدی جلدی چوسنے لگا ہے۔ مگر اتنے میں چاکلیٹ اس کے مونہہ سے نکل کر فرش پر جا گرا ہے۔

لڑکی نے پھر پیچھے مڑ کر دیکھا ہے اور کسے معلوم، کیا سوچ کر ہنسنے لگی ہے۔ "کوئی بات نہیں بابا۔ میں تمہیں ممی سے اور لا دوں گی۔ میری ممی بڑی اچھی ہے۔"

"ہاں بیٹی۔"

"مگر میرے پپا ممی سے بھی اچھے ہیں بابا۔"

"ہاں بیٹی۔"

"اور میں اُن دونوں سے بھی اچھی ہوں۔"

باغ کی خوشبوؤں سے بابا کے نتھنے چوپٹ کھل گئے ہیں تو اس کا ذہن اُڑ کر ساتویں آسمان میں جا پہنچا ہے اور اس نے بے اختیار اُونچے اُونچے گانا شروع کر دیا ہے۔ "اوم جے جگدیش ہرے۔"

"نہیں بابا، آرتی نہیں، مجھے وہی کہانی سناؤ۔"

"کون سی کہانی بیٹی؟"

"اُسی بوڑھے بابا کی، اور کون سی؟"

"اچھا، وہ؟"

"میں بھی کہانی سنوں گی بابا۔" دھوپ نے بابا کو پھر مخاطب کیا ہے۔

"آؤ، تم بھی قریب سرک آؤ۔" بابا نے اُسے جواب دیا ہے۔

"کون؟" لڑکی نے اب کے کوٹھری میں چاروں طرف نظر دوڑا کر تعجب سے پوچھا ہے۔

"لو، سنو۔ اُس بابا کا ایک بڑا پیارا سا ننھا منا بیٹا تھا، جسے وہ پیار سے نِکا کہا کرتا تھا — آرام سے بیٹھ جاؤ۔" دھوپ خوشیِ سماعت سے گول مول ہو کے بابا کے بستر میں لڑھک آئی ہے۔ "ہاں، تو نِکا بابا کی اکلوتی اولاد تھا۔"

لڑکی نے بابا کو ٹوکا ہے۔ "میں بھی تو اپنے پپا کی — نہیں ممی کی — نہیں، پپا کی ہی اکلوتی اولاد ہوں۔"

"ہاں بیٹی، آگے سنو — اچانک نِکے کی ماں مر گئی اور بوڑھا بابا —"

"نہیں بابا۔" لڑکی نے اُسے پھر ٹوکا ہے۔ "بابا اُس وقت بوڑھا تھوڑا ہی تھا۔"

"ہاں، بوڑھا تو اُس وقت ہوا، جب بوڑھا ہوا۔ جب نِکے کی ماں مری تو بابا ابھی جوان ہو گا۔ نِکے کی ماں بابا سے ہر وقت لڑتی جھگڑتی رہتی تھی اور اس کی ڈانٹ ڈپٹ سننا بابا کو بہت اچھا لگنے لگا تھا، اسی لیے جب اس کا آخری وقت آ پہنچا اور وہ بے بسی سے چُپ چاپ مسکرا کر رہ گئی تو بابا آنکھوں میں آنسو بھر کے اس سے کہنے لگا نہیں، بھلی

لوگ، ایسے نہیں۔ کوئی ٹرائکرٹک لول سناؤ۔ میرا جی خوش ہو جائے گا۔"

بابا کی کہانی سنتے ہوئے دھوپ بڑے انہماک سے لمبی ہو ہو کے ایک درخشندہ لکیر میں کھچ آئی ہے اور لڑکی اُس کے چہرے کے عین نیچے کسی ریشمی گٹھری کی مانند کھلی پڑی ہے۔ "پھر کیا ہوا بابا؟"

"پھر کیا ہونا تھا بیٹی؟ نکّا ابھی دودھ پیتا بچہ تھا۔ اُس کی ماں کے مرنے کے بعد بابا اُسے دن رات سینے سے لگائے پھرتا اور وہ پھر بھی رونے لگتا تو بابا اپنے آپ کو کوسنے لگتا کہ اُس کے بھی نکّے کی ماں کی طرح دودھ بھری چھاتیاں کیوں نہیں پھوٹ آتیں ——"

"چھاتیاں تو صرف ماؤں کے ہوتی ہیں۔ جیسے میری ممی کے ہیں نا بابا؟"

"نہیں بیٹی، بھگوان نے بابا کی سُن لی اور اُس کے بھی چھاتیاں پھوٹ آئیں اور وہ نکّے کی ماں بن کے اُس کے پالن پوسن میں جُٹ گیا اور پھر نکّا اُگ اُگ کر بڑا ہوتا چلا گیا اور بابا سوکھ سوکھ کر چھوٹا، مگر بابا کو یہی معلوم ہوتا رہا کہ وہ جوں کا توں ہرا بھرا ہے اور آندھی طوفان میں بھی نکّے کے بدلے میں اسی طرح لہرا تا رہے گا۔"

ہوا کے چند تند جھونکے کھڑکی کے پردے کو اُڑا کر اندر گھس آئے ہیں اور اُنہوں نے دھوپ کو بستر سے اُٹھا کر دیوار پر پٹخ دیا ہے۔ مگر وہ چوٹ کھا کر دم توڑنے کی بجائے بڑے مزے سے وہاں پینگ جھولنے لگی ہے۔

"پھر کیا ہوا بابا؟" دھوپ نے پینگ جھولتے ہوئے خاموشی کو توڑا ہے۔

"پھر؟ —— پھر یہ ہوا کہ واقعی ایک لال آندھی اُٹھی اور سب کچھ اُڑا لے گئی۔"

دھوپ نے اپنا پینگنا روک لیا ہے۔

"نکّا؟" لڑکی نے پوچھنے کے لیے مونہہ کھولا ہے۔

"نکّا مر گیا بیٹی۔"

دھوپ یک لخت اپنی پینگ سے فرش پر آگری ہے اور پاش پاش ہو گئی ہے۔

"بابا کا نکّا بھی مر گیا اور اس کی بہو بھی اور۔"

"اُن کے کوئی بچہ نہیں تھا؟"

"تمہاری طرح ایک پھول سی بچی تھی، جو بابا سے بہت پیار کرتی تھی۔ وہ بھی مر گئی بیٹی۔" بابا نے اپنی پھٹی پھٹی نظریں فرش پر جمالی ہیں اور دھوپ کے ٹکڑے ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں میں گھسنے لگے ہیں۔ اور اس سے وہاں جمع ہوتے ہوئے پانی میں قدرت کے ساتوں رنگ جھلملانے لگے ہیں۔

بابا گویا اپنے آپ کو سمجھانے کے لیے بول رہا ہو۔

"نہیں۔ یہ سب کچھ یوں نہیں ہوا، جیسے میں نے بتایا ہے۔ بابا کا بیٹا اور بہو پوتی اُس کی بے خبری میں ہی تھوڑا تھوڑا مرتے رہے اور بڈھے کھوسٹ کو اس وقت پتہ چلا، جب وہ گھر میں اکیلا رہ گیا۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے بابا؟"

"ایسا ہی ہوتا ہے بیٹی۔" بابا کی آنکھوں میں ساتوں رنگوں کی آب ٹپک پڑی۔ "سارا گھر جوں کا توں بسا ہوتا ہے اور کسی کو کسی کی موت کا پتہ ہی نہیں چل پاتا۔"

لڑکی کی معصوم حیرت اس کی آنکھوں میں کسی ننھی منی مچھلی کی طرح بے سمت تیرنے لگی ہے۔ "فکر کیوں کرتے ہو بابا؟ کہانیاں کوئی سچی تھوڑا ہوتی ہیں؟"

"بیت جائیں تو سچی کیوں نہیں ہوتیں؟" بابا نے اُسے جواب دیا۔ "بابا اپنے ڈراؤنے خوابوں کے آگے آگے بے تحاشا دوڑ کر اپنی کھاٹ پر آ گرتا اور ہانپ ہانپ کر اکیلے گھر میں اپنے بیٹے کو پکارنے لگتا اور پکار پکار کر تھک جاتا تو اُسے ڈھونڈنے کے لیے کھاٹ سے اُٹھ کھڑا ہوتا، مگر آگے پیچھے ہی لڑکھڑا کر رہ جاتا اور واپس کھاٹ پر بیٹھ کر اپنی سور کھتا پر بے بسی سے ہنسنے لگتا کہ مرے ہوؤں کو کیا معلوم کہ اُنہیں کون بلا رہا ہے؟"

بابا نے کچھ دیر چُپ سادھے رکھی ہے تو لڑکی نے پُوچھا ہے "پھر؟ کیا ہوا، بابا؟"

"پھر؟" بابا کی بقیہ کہانی اُس کے ذہن میں گھومتے ہوئے کہیں اوٹ میں ہو لی ہے اور وہ گویا بڑبڑاتے ہوئے اُسے ڈھونڈ رہا ہے۔ "پھر کیا ہونا تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو لیا، مگر ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ بابا کا بیٹا اور اس کی بہو اور پوتی کبھی کبھار بابا کو ویسے ہی گھر میں چلتے پھرتے دکھائی دینے لگتے۔ بس فرق یہ تھا کہ نہ تو وہ بابا کی طرف سر اُٹھاتے اور نہ اُس سے بات کرتے۔ بس اپنے ہی دھیان میں اِدھر سے اُدھر گزر جاتے۔"

"بابا کی پوتی، بابا؟" لڑکی سہم جانے کے باوجود پُوچھے بغیر نہیں رہ سکی ہے۔ بابا لڑکی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگا ہے۔ "ہاں، اس کی پوتی تو اُسے مُڑ مُڑ کر دیکھتی تھی مگر وہ اُسے کھینچ کر آگے لے جاتے۔" بابا نے لڑکی کو اپنے بازوؤں میں لپیٹ لیا ہے۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے بابا۔"

"اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟ آؤ، بھگوان کی آرتی گاتے ہیں۔ تمہارا سارا ڈر دُور ہو جائے گا۔ بولو —— اوم جے جگدیش ہرے ——"

لڑکی نے بابا کے ساتھ آرتی گانا شروع کر دیا ہے اور اُنہیں سنتے ہوئے فرش پر بکھرے ہوئے دھوپ کے ٹکڑوں نے بھی اُن کے سُر میں اپنا سُر ملا لیا ہے۔

"تم بھی گاؤ، رام آسرے۔ سوامی جے جگدیش ہرے —— پتا جے جگدیش ہرے ——"

اس دوران لڑکی کی ماں دودھ کا گلاس لیے تیز تیز کمرے میں داخل ہوئی ہے۔ "اتنا اودھم کیوں مچا رکھا ہے بابا؟" اُس نے دودھ کا گلاس اور ایک گولی بابا کی طرف بڑھائی ہے۔ "یہ لو، اِسے دودھ کے ساتھ نگل جاؤ اور سو جاؤ —— چلو اُترو، سرلی کئی بار کہہ چکی ہوں یہاں بابا کے کمرے میں مت آیا کرو۔"

( آگے ص۴۹ پر )

نگار عظیم

"ایک پوز کھنچوا سکتا ہوں ؟"

"ضرور ––– آئیے ––– اندر تشریف لائیے ۔"

"شیشہ ہوگا ؟" اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں ۔

"جی ہاں ––– اندر تشریف لے جائیے ۔ تیار ہو جائیں تو کہہ دیجیے گا" ––– پہلی ہی نظر میں مجھے محسوس ہوا تھا کہ یہ شخص کسی فلمی ہیرو سے کتنی مناسبت رکھتا ہے ––– بالکل ڈپلی کیٹ –––

"یس میڈم" ––– چند منٹ بعد اندر سے آواز آئی ۔

پردہ ہٹا کر میں اندر چلی گئی ––– کیمرہ درست کیا ۔ وہ ابھی تک شیشے میں اپنے بال سنوار رہا تھا ۔

"معاف کیجیے گا ––– یہ آپ کا شیشہ ––– ذرا ...... ایک فٹ اور اونچا ہونا چاہیے تھا ۔ مجھے کافی جھکنا پڑ رہا ہے ۔

میں نے دیکھا واقعی اُسے اپنے گھٹنے موڑنے پڑ رہے تھے ۔ اس کا قد بہت اُونچا تھا ۔ میں نے اسٹول اس کی طرف بڑھا دیا ۔ اسٹول پر بیٹھ کر بڑے آرام سے وہ اپنے بال درست کرنے لگا ۔

تیار ہو کر وہ فوٹو کے لیے بیٹھ گیا اور میں اس کا چہرہ فوکس میں کرنے لگی ۔ مختلف زاویوں سے میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا ۔

"ذرا سائیڈ پوز لیجیے گا ––– میرا چوکھٹا ویسے ہی ذرا" ––– اور پھر وہ خود ہی مسکرانے لگا ۔

مختلف اسٹائل میں، اُس نے ایک پوز کی جگہ کئی پوز کھنچوائے ۔ بڑا شوقین معلوم ہوتا تھا ۔

"میرا نام سکندر ہے ––– مجھے بُل کہتے ہیں ۔ میرے فادر کا چشموں کا بہت بڑا کاروبار ہے" ––– پوز کھنچواتے وقت اُس نے خود ہی بتایا ۔

"کیا آپ اپنا نام نہیں بتائیں گی ؟"

"جی ––– اس کی ضرورت نہیں ۔"

"میڈم ضرورت تو مجھے فوٹو کی بھی نہیں ۔ میں تو صرف آپ کو دیکھ کر ––– خیر چھوڑیئے ۔"

میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا ––– اس کی آنکھوں سے کچھ عجیب سا محسوس ہوا ۔

میں نے جلدی جلدی رسید کاٹ کر اُسے ٹالنے کی کوشش کی ۔ اس کے اس انداز کو دیکھ کر میں نے ایڈوانس بھی چھوڑ دیا ۔

"کیا آپ مجھ سے دوستی کر سکیں گی ؟" اُس نے دایاں ہاتھ میری طرف بڑھایا ۔

"اے مسٹر ––– ذرا ہوش میں آئیے ۔"

"کیا میں آپ کو بے ہوش لگ رہا ہوں ؟"

اس کا ہاتھ ابھی تک بڑھا ہوا تھا ۔

"یہ فوٹو گرافر کی دوکان ہے ۔ کوئی دوستی کا اڈہ نہیں ۔" میں نے غصہ سے کہا ۔

"تو پھر دوستی کے اڈے پر کب ملاقات ہوگی ؟"

"آپ بہت ڈھیٹ ہیں ۔"

"شکریہ ––– اس القاب کے لیے ۔"

"آپ جانتے ہیں کہ نہیں ––– شرم نہیں آتی آپ کو ایسی باتیں کرتے ––– "

"شاید میں نے کوئی بات کبھی ایسی نہیں کہی ۔"

"دیکھیے آپ غلط سمجھ رہے ہیں ––– میں ایک شریف لڑکی ہوں ––– شادی شُدہ ہوں ––– آپ چُپ چاپ یہاں سے چلے جائیں تو بہتر ہے ۔"

"ارے تو پھر اتنے غصہ کی کیا بات ہے ––– شادی شُدہ ہیں تو کیا ہوا ؟ ––– دوستی ––– صرف دوستی ––– " اُس نے پھر ہاتھ بڑھایا ۔

"میں آخری بار کہتی ہوں ، آپ دوکان سے باہر ہو جائیں ورنہ مجھے کوئی اور انتظام کرنا پڑے گا ۔"

"آپ تو ایسے چلا رہی ہیں کہ جیسے میں ––– اچھا ناراض نہ ہوئیے ۔ میں چلتا ہوں ––– گڈ بائی ––– " اور اس نے ایک ہی جھٹکے سے میرا ہاتھ کھینچ

---

● ۵۸ - سی / ۲۳۷ - بٹلہ ہاؤس ، جامعہ نگر ، نئی دہلی ۲۵

اپنے ہونٹوں سے لگایا اور پل بھر میں یہ جا وہ جا۔
مارے غصّے کے میں اندر سے کسی بھٹی کی طرح سُلگنے لگی۔ کمبخت اب کی بار آجائے تو جُوتوں سے خبر لوں گی۔ یہ مجال! یہ ہمت ہوئی کیسے؟ سمجھتا کیا ہے خود کو؟ ہوگا ہیرو ـــــ اپنے لیے ـــــ کتنے پھرتے ہیں ایسے نہ جانے ـــــ میں غصّہ میں نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتی رہی ـــــ گھنٹوں تک میری رگوں کا خون کھولتا رہا۔

فوٹو گرافی کی دوکان کھولے مجھے تقریباً چار سال گزر چکے تھے، لیکن ایسے سرپھرے سے پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔

کئی دن بعد وہ پھر اسی طرح موجود تھا۔ نشہ سے آنکھیں سُرخ تھیں۔ ایک مرتبہ پھر مجھے خوف کا احساس ہوا، لیکن تمام تر قوت جمع کی، اس کی طرف نہایت غصیلی نظروں سے دیکھا۔

"میرے فوٹو تیار ہیں؟" اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پُوچھا۔

"جی ہاں ـــــ یہ لیجئے ـــــ اور یہ بِل۔ پیسے دیجیے اور براہِ مہربانی اسٹوڈیو سے باہر ہو جائیے۔"

"کیا ہوا؟؟؟" اُس نے اپنے فوٹو دیکھتے ہوئے انجان بن کر ایسے پُوچھا، جیسے اس کو پتہ ہی نہیں کہ وہ کر کے کیا گیا تھا۔

"واہ ـــــ مان گئے اُستاد ـــــ کیا پوز کھینچے ہیں ـــــ" اس نے اپنے ایک ایک پوز کو ذرا دُور ترچھا کر کے دیکھا۔

"چند پوز اور کھینچیں گی؟؟"

"جی نہیں ـــــ" میں نے کہا ـــــ "اسٹوڈیو سے باہر ہو جائیے۔"

"پلیز صرف چند پوز ـــــ"

"کہہ دیا نا ـــــ نہیں ـــــ چلے آتے ہیں، جانے کیسے کیسے شرابی ـــــ"

"جی کیا کہا ـــــ"

"یہی ـــــ کہ میں آپ کے فوٹو نہیں کھینچوں گی۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

"تو میں بھی نہیں جاؤں گا ـــــ نکالیے کیسے نکالتی ہیں ـــــ" اور وہ بڑے آرام سے صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ میں چرس بھرنے لگا۔

"کمال ہے۔" اس نے اپنے کندھے اُچکائے۔ "ارے آپ کیسی دوکان دار ہیں؟؟ ـــــ کیا خاک بزنس کریں گی ـــــ کسٹمرس سے اس طرح پیش آتی ہیں ـــــ کون آئے گا آپ کے یہاں؟ ـــــ"

"نہ آئیں ـــــ میں کوئی بھوکی نہیں مر رہی ہوں ـــــ شوق میں کام کرتی ہوں ـــــ مجھے آپ جیسے کسٹمرس بالکل نہیں چاہئیں ـــــ جو خود بھی پاگل ہوں اور دوسروں کو بھی پاگل کرنا چاہیں۔"

"ارے آپ اتنا برا کیوں مان رہی ہیں ـــــ میں کوئی حرکت کروں تو سڑک پر کھڑا کر کے جُوتے لگوا سکتی ہیں۔ جو چاہیں کرا سکتی ہیں۔ اُس پیدا کرنے والے کی قسم، میرا یقین تو کیجیے۔ ـــــ"

اس کی اس قسم میں نہ جانے کیا اثر تھا ـــــ میرا دل نرم پڑنے لگا۔

"اب تو فوٹو کھینچ دیجئے۔" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چُپ رہو ـــــ مسکرانے کی ضرورت نہیں۔"

"اوہ ـــــ اس پر بھی پابندی ہے ـــــ سوری ـــــ ویری سوری ـــــ"

اُس نے اپنے سات پوز کھنچوائے ـــــ سگریٹ پھُونکتے، مرغولے اُڑاتے ـــــ چشمہ لگا کے۔ مجنوں کا انداز بنا کے۔ اسمگلر بن کے ـــــ بیچ بیچ میں وہ مجھے خود بھی ڈائریکشن دیتا جاتا۔ "دیکھئے، آپ کے کیمرے کا کمال جب ہے، جب میں بالکل اسمگلر لگوں۔ یہ بریف کیس بالکل اسی سائیڈ میں۔ میری آنکھیں وحشت زدہ ـــــ اور قدم ـــــ اس طرح ـــــ باقی آپ خود ہی دیکھ لیجئے ـــــ" یہ کہہ کر وہ ہر اسٹائل سمجھا کر خود ہی مسکرا پڑتا۔ کسی پوز میں قمیص اُتار کر کندھے پر ڈال لیتا کسی میں کالا رومال سر پہ پٹی بنا کر باندھ لیتا۔ کسی میں گلے میں بہت ساری مالائیں پہن لیتا۔ کسی میں گلے میں موٹا سا کالا ڈھاگا پہن لیتا۔ پوز بناتا اور پوچھتا: "یہ کیسا رہے گا؟"

سفید چادر کندھوں پر اوڑھتا۔ بہت ساری مالائیں گلے میں پہنتا اور ہاتھوں میں لٹکاتا۔ کھُلے سینے اور کھُلے بازوؤں سے دونوں بازو آسمان کی طرف پھیلاتا اور پُوچھتا "کیسا لگے گا؟"

"بہت عمدہ۔ بس ذرا گردن بھی تھوڑی سی اُوپر ہی رکھیں اور ایسا تاثر دیں کہ خدا سے مخاطب ہیں۔"

"گڈ گڈ ـــــ یس ـــــ ریڈی ـــــ تھینک یو ـــــ"

اس طرح وہ جب بھی آتا میرے کئی گھنٹے برباد کر جاتا۔ لیکن ایک اچھا ماڈل ہاتھ آجانے سے میرے آرٹ کو کچھ تسکین ضرور محسوس ہوتی۔ ورنہ تو پاسپورٹ سائز کھینچتے کھینچتے اپنے کام سے بور ہونے لگی تھی۔

اور پھر ایک دن ـــــ "دیکھیے اب تو میں آپ کو بالکل پریشان نہیں کرتا؟ میں نے آپ کی بات مان لی ـــــ لیکن آپ نے میرا دل توڑا ہے۔ میری دوستی قبول نہیں کی ـــــ"

"پھر وہی بیہودہ باتیں ـــــ تم آخر سمجھتے کیوں نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آخر تم چاہتے کیا ہو؟؟"

"پیار۔ صرف پیار۔ محبت۔ جس پر فرشتے بھی سجدے کرتے آئے ہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ آپ میرے لیے کیا ہیں ـــــ میں آپ کی بہت عزّت کرتا ہوں ـــــ"

"بکواس بند کرو۔ بس تمہارے تھپڑ رسید کر دوں گی۔ سمجھے ـــــ میں بچّہ نہیں جو تمہارے جھانسوں میں آجاؤں گی ـــــ"

"کیا کہا ـــــ جھانسہ ـــــ"

"میڈم برداشت کی کوئی حد ہوتی ہے ـــــ کیا آپ خود کو بہت خوب صورت سمجھتی ہیں؟ کیا آپ دوسروں کے جذبات کو صرف ایک ہی نظریہ سے تولتی

ہیں۔ کیا کیا ہے میں نے آپ کے ساتھ؟ یہی کہ صرف محبت اور دوستی کے چند لمحے مانگے تھے ۔ یہ بھی آپ ہیں جو میں نے اتنی باتیں برداشت کر لی ہیں ۔ مجھے پتہ ہے، سب عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں ۔ آپ سوچتی ہیں میں شراب پیتا ہوں؟ نہیں میں نے کبھی نہیں پی ـــــ میں اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔"

"اوہ ـــــ اسی لیے بگڑ گئے ہو ـــ" میں نے طنز کیا ـــــ

"نہیں، میں صرف خود کو بھولنا چاہتا ہوں۔ ـــ میں نے ایک لڑکی کو چاہا تھا۔ پروین ـــــ ہاں اُس کا نام پروین تھا۔ لیکن وہ کبھی اپنی نہ ہو سکی تھی۔ آپ سوچتی ہیں۔ میں آپ سے ـــ کچھ ایسا ویسا چاہتا ہوں۔ توبہ توبہ ـــ لیکن اس میں بھی آپ کا قصور نہیں۔ ہر خوبصورت لڑکی ایسا ہی سوچ لیتی ہے۔ آپ بھی بس اتنا ہی سوچ سکیں۔ میں تو کچھ اور ہی سوچ کر یہاں آیا تھا۔ میں نے آپ سے ـــــ آپ سے ـــــ آپ کو دیکھ کر لگا تھا جینے کا سہارا مل جائے گا ـــ یہ دیکھیے ـــ یہ فوٹو دیکھ رہی ہیں آپ؟" اس نے اپنی پاکٹ پرس سے ایک چھوٹی سی تصویر نکالی۔ "یہ مجھے بچپن ہی میں چھوڑ کر چلی گئیں ـــــ دیکھا آپ نے ـــ" حیرانی سے میری آنکھیں پھیلنے لگیں ـــــ وہ بالکل میری ہی ہم شکل تھی ـــــ اگر میں اپنے بالوں کے بیچ بالکل سیدھی مانگ نکال لوں تو کوئی فرق نہ رہے گا۔" دیکھ لیا ـــــ" اُس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا ـــــ" یہ میری ماں تھی ـــــ یہ سب کچھ میں آپ کو مرعوب کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں ۔ بلکہ دل کے کسی کونے میں ایک کسک سی موجود تھی ۔ شاید وہ نکل جائے ۔ اسی جذبہ کے تحت میں نے آپ کا ہاتھ چُومنے کی جسارت کی تھی ۔ میں جا رہا ہوں ۔ کبھی نہیں آؤں گا!"

مجھے محسوس ہوا وہ مجھ سے بہت بلند ہے ۔ اپنے قد سے بھی کہیں اُونچا ـــــ" سکندر سکندر۔ سُنو ـــــ سُنو ـــــ جب اولاد جوان ہو جاتی ہے تو دوست بن جاتی ہے ـــــ ہاتھ بڑھاؤ۔ مجھے تمہاری دوستی قبول ہے۔" ●●

---

## بقیہ: مَن کہ ...

---

۲۔ بھرے بازار میں — اشاعتِ اوّل ۱۹۴۶ء لاہور

۳۔ شکستہ کنگورے — اشاعتِ اوّل ۱۹۵۵ء دہلی

**ناول:**

۱۔ 'لہو کے پھول' پانچ جلدوں میں (صفحات ۲۶۰۸) ۱۹۶۹ء کتاب دان لکھنؤ

۲۔ مدار (ناولٹ) ۱۹۸۰ء کتاب دان لکھنؤ

۳۔ گھروندا — ۱۹۸۲ء کتاب دان لکھنؤ

ناولٹ مدار کا ترجمہ ORBIT کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے۔ بعض وجوہ کی بنا پر اس کا اجرا عمل میں نہ آسکا۔ جلد ہی ترجمہ کے منصۂ شہود پر آنے کی توقع ہے۔

**تنقید:** ن۔ م۔ راشد پر

**ترجمہ:** امیر خسرو (انگریزی سے اردو) از پروفیسر محمد حبیب (مطبوعہ ہندوستانی اکاڈمی، الہ آباد)

دس دن میں اردو اور دس دن میں ہندی: بالغوں کے لیے اردو زبان سیکھنے کا ایک کم مدت اور انقلابی طریقہ انتہائی محنت، تحقیق و تفحص کے بعد ایجاد کیا، جو ۱۹۵۷ء میں "دس دن میں اردو" کی شکل میں منظرِ عام پر آیا۔ ان ہی خطوط پر ہندی سیکھنے کا طریقہ بھی ایجاد کیا جو دس دن میں ہندی کے نام سے موسوم ہے۔

**زیرِ طبع:** ۱۔ خلاص (متفرق افسانوں کا مجموعہ)

۲۔ خود نوشت سوانح حیات

۳۔ قرآن پاک کی تلاوت کے لیے مرا سلاتی درس۔ دس دن میں اردو کے انداز پر (SELF TAUGHT) بذریعہ اردو، ہندی اور انگریزی۔

**مختلف ممالک کے سفر:** ۱۹۵۰ء میں جرنلسٹ ڈیلیگیشن میں شریک ہو کر مصر کا سفر۔ ۱۹۶۰ء میں امریکہ کا تین ماہ کا سفر واپسی پر آئرلینڈ، انگلینڈ، فرانس، پولینڈ، روس، برلن، سوئٹزرلینڈ، ترکی، ایران، پاکستان وغیرہ ممالک کی سیاحت کی۔

۱۹۶۲ء میں مشرقی اور مغربی پاکستان کا سفر۔

۱۹۶۴ء میں حکومتِ ہند کے خیرسگالی مشن پر مصر، الجیریا، نائجیریا، مراکش، گھانا کی سیاحت۔

۱۹۶۵ء میں حکومتِ عراق کی دعوت پر عراق کا پندرہ روزہ دورہ، وہاں عربی میں قرآن پر تقریر بھی کی۔

۱۹۶۷ء میں فریضۂ حج سے مشرف ہوا۔

۱۹۷۱ء میں تھائی لینڈ ملائشیا، انڈونیشیا اور سنگاپور کی سیاحت کی۔

**رکنیت:**

۱۔ صوبہ کانگریس کمیٹی — ۱۹۴۶ء

۲۔ یو۔پی قانون ساز اسمبلی ۱۹۵۲ء تا ۱۹۶۶ء

۳۔ راجیہ سبھا — ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۲ء

۴۔ راجیہ سبھا — ۱۹۸۲ء تا حال

۵۔ کُل ہند انجمن ترقی اردو کا لائف ممبر نیز مجلسِ عاملہ کا ممبر — ۱۹۵۵ء تا حال

**اعزازات و انعامات:**

۱۹۶۶ء میں قرآن صدی کے سلسلے میں مراکش یونیورسٹی نے اعزازی طور پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی۔

۱۹۷۰ء میں کُل ہند ساہتیہ اکاڈمی نے "لہو کے پھول" کی تخلیق پر پانچ ہزار روپے کے انعام اور تمغے سے سرفراز کیا۔ ●●

بھوانی پرشاد مشر

# گیت فروش

جی ہاں حضور، میں گیت بیچتا ہوں
میں طرح طرح کے
گیت بیچتا ہوں
میں سبھی قسم کے گیت
بیچتا ہوں

جی مال دیکھیے دام بتاؤں گا
بے کام نہیں ہے، کام بتاؤں گا
کچھ گیت لکھے ہیں مستی میں، میں نے
کچھ گیت لکھے ہیں پستی میں، میں نے
یہ گیت سخت سر درد بھلائے گا
یہ گیت پیا کو پاس بلائے گا
جی، پہلے کچھ دن شرم لگی مجھ کو
پر پیچھے عقل جگی مجھ کو
جی، لوگوں نے تو بیچ دئے ایمان
جی، آپ نہ ہوں سن کر زیادہ حیران
میں سوچ سمجھ کر آخر
اپنے گیت بیچتا ہوں
جی ہاں، حضور میں گیت بیچتا ہوں
یہ گیت صبح کا ہے، گا کر دیکھیں
یہ گیت غضب کا ہے، ڈھا کر دیکھیں
یہ گیت ذرا سونے میں لکھا تھا
یہ گیت وہاں پونے میں لکھا تھا
یہ گیت پہاڑ پر چڑھ جاتا ہے
یہ گیت بڑھائے سے بڑھ جاتا ہے
یہ گیت بھوک اور پیاس بھگاتا ہے
جی، یہ مسانے میں بھوت جگاتا ہے
یہ گیت بھوال کی ہے ہوا حضور
یہ گیت تپ دق کی ہے دوا حضور
میں سیدھے سادے اور اُلٹے پلٹے
گیت بیچتا ہوں
جی ہاں حضور، میں گیت بیچتا ہوں

جی، اور گیت بھی ہیں، دکھلاتا ہوں
جی، سننا چاہیں، آپ تو گاتا ہوں
جی، چھند اور بے چھند پسند کریں —
جی، امر گیت اور وہ جو ترتے مریں
نہ، بُرا ماننے کی اس میں کیا بات
میں پاس رکھے ہوں قلم اور دوات . . .
اِن میں سے تمہارے نہیں، نئے لکھ دوں؟
اِن دِنوں کہ دوہرا ہے کوی دھندا
ہیں دونوں چیزیں ولیت، قلم کندھا
کچھ گھنٹے لکھنے کے، کچھ پھیری کے
جی، دام نہیں لوں گا اس دیری کے
گیت بیچتا ہوں
جی ہاں حضور، میں گیت بیچتا ہوں
جی گیت جنم کا لکھوں، مرنے کا لکھوں
جی گیت جیت کا لکھوں، شرن کا لکھوں
یہ گیت ریشمی ہے، یہ کھادی کا
یہ گیت پت کا ہے، یہ وادی کا
کچھ اور ڈیزائن بھی ہیں، یہ علمی —
یہ لیجیے چلتی چیز، نئی فلمی
یہ سوچ سوچ کر مر جانے کا گیت
یہ دوکان سے گھر جانے کا گیت
جی نہیں، دل لگی کی اس میں کیا بات؟
میں لکھتا ہی رہتا ہوں دن رات
تو طرح طرح کے بن جاتے ہیں گیت
جی روٹھ کر من جاتے ہیں گیت
جی بہت ڈھیر لگ گیا، ہٹاتا ہوں
گاہک کی مرضی، اچھا جاتا ہوں
میں بالکل انتم اور دکھاتا ہوں —
جی، بھیتر جا کر پوچھ آئیے آپ
ہے گیت بیچنا ویسے بالکل پاپ
کیا کروں، مگر لاچار ہار کر
گیت بیچتا ہوں
جی ہاں، حضور، میں گیت بیچتا ہوں

شمشان، فوراً، پسند نہیں آئے، موت کا، آخری

# میں چلاّنا چاہتا ہوں

میں چلاّنا چاہتا ہوں
مگر میری زبان کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے
شاید زبان ہے نہیں اب میرے مونہہ میں

میری تمام باتوں کا ایسا ہی کچھ ہو گیا ہے
میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں
مگر کر نہیں پاتا
جیسے میں ایک اُمید سے جو
گھر رہی ہے ڈرنا چاہتا ہوں
مگر ڈر نہیں پاتا

ڈر کے لیے من ضروری ہوتا ہے
وہ میرے پاس بچا نہیں ہے

میں نے ایک دوست سے یہ کہا
تو وہ بولے، شاید
اور پھر ذرا رُک کر کہا
دیر آید درست آید

میں اسے سن کر
چلاّنا چاہتا ہوں
مگر میری زبان کو کیا ہو گیا ہے
زبان ہے نہیں اب میرے مونہہ میں!

ترجمہ: کیدار ناتھ کومل

• ای-۹۷- سروجنی نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۳

# نئی کتابیں

نام کتاب: **سرگزشتِ آصف** (شاعری کا انتخاب)
مرتب: پروفیسر ہارون الرشید
ناشر: مغربی بنگال اردو اکیڈمی۔ ۱۷۔ سندر موہن ایونیو، کلکتہ
قیمت: ۱۲ روپے

"سرگزشتِ آصف" مرحوم آصف بنارسی کی سوانح اور کلام کے مختصر انتخاب پر مشتمل ہے، جسے ڈھاکہ کے پروفیسر ہارون الرشید نے مرتب کیا ہے۔

آصف مرحوم ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ انہوں نے مغربی بنگال اور بنگلہ دیش میں ایک مدت تک اردو شعر و ادب کی خدمت خاموشی اور دلجمعی سے انجام دی۔ آصف مرحوم جناب رضا علی وحشت کے شاگردوں میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

آصف مرحوم گرچہ بنارس میں ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے، مگر صغر سنی میں اُن کے والد نے کلکتہ میں سکونت اختیار کرلی، اس لیے اُن کی تعلیم و تربیت وہیں ہوئی اور اُنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مغربی بنگال میں شعر و ادب کا چراغ روشن رکھنے میں گزارا۔

آصف مرحوم شعرا کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے، جس میں شاعری مونہہ کا مزہ بدلنے کا نہیں، زندگی کا مزاج بدلنے کا نام ہوتی ہے۔ ان کی شاعری معاملاتِ حسن و عشق، تصوف، شوخی و رندی اور تکلفِ زبان پر مشتمل ہے اور ان سب پر مستزاد ندرت بیان۔ چند اشعار دیکھئے:

افسانہ میرے دل کا اب تک ہے اک حقیقت
حالانکہ ہر حقیقت افسانہ ہوگئی ہے

خیال آتا ہے جب آشیاں بنانے کا
نظر کے سامنے بجلی سی کوند جاتی ہے

افتادِ طبع نے مری بخشا اسے دوام
گو دل میں تیرے غم کا گزر ناگہاں ہوا

حُسن نے باندھا ہے ناقابلِ تسخیر طلسم
اپنے افسونِ نظر سے مرے افسانے تک

مرتب نے حیات اور شاعری کو دو الگ حصوں میں تقسیم کرکے "حیات" کے تحت "پیدائش اور خاندان" "شاعری کا آغاز" "خدمات اور تلامذہ" وغیرہ کی تفصیلات درج کی ہیں۔ اور "شاعری" کے تحت مضامین کے اعتبار سے شاعری کی خصوصیات پر نظر ڈالی ہے۔ اس طرح شاعر کی ذات و صفات اور شاعرانہ کارنامے سب اختصار کے ساتھ اس کتاب میں یک جا کر دئے گئے ہیں جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

کلام کا انتخاب خود شاعر کا کیا ہوا ہے۔ چنانچہ مرتب نے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

"... یہ انتخاب خود آصف مرحوم کا ہے۔ ایک مقالہ لکھنے کے سلسلے میں مرحوم نے یہ تمام غزلیں (آخری تین غزلوں کے سوا) اور رباعیاں منتخب کرکے اور اپنے ہاتھ سے نقل کرکے مجھے عنایت کی تھیں..." (ص۹)

زیرِ نظر انتخاب میں ۱۸ غزلوں کے علاوہ سات رباعیاں شامل ہیں۔ کتاب کا نام خود شاعر کے اس شعر سے لیا گیا ہے:

آصف کی سرگزشت قلمبند جب ہوئی
اس بُت کا نام زیبِ سرِ داستاں ہوا

کتابت اور طباعت معیاری ہے۔ اس خوبصورت اور مفید کتاب کی اشاعت کے لیے مرتب اور مغربی بنگال اردو اکیڈمی شکریہ اور مبارکباد کے لائق ہیں۔

نام کتاب: **سطحِ آئینہ** (شاعری)
شاعر: سہیل واسطی
ناشر: مغربی بنگال اردو اکیڈمی، ۱۷، سندر موہن ایونیو کلکتہ۔
قیمت: ۱۲ روپے

"سطحِ آئینہ" سہیل واسطی مرحوم کے کلام کا مجموعہ ہے، جسے قیام ہاشمی صاحب نے بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ سہیل واسطی ان شعرا میں سے تھے، جنہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اپنے سیاسی اور سماجی نظریات سے ہم آہنگ کرکے ان سے عملی زندگی میں جہد کا کام لیا۔ ان کے شاعرانہ ترقی پسند نظریات بعض نام نہاد ترقی پسندوں کی طرح صرف "گفتن" تک محدود نہ تھے بلکہ اُنہوں نے اپنی عملی زندگی ایک سچے ترقی پسند ادیب کی طرح گزاری۔ اپنے نظریات اور اصولوں سے وابستگی کی پاداش میں ان کو بہت خسارے جھیلنے پڑے، مگر اُنہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ان کے نظریات یا اصولوں سے کسی کو اختلاف ہو یا اتفاق، لیکن کسی اصول پر بہر صورت قائم رہنا کم بڑی سعادت نہیں ہے۔ اپنی زندگی میں جتنے زخم سہیل مرحوم کو کھانے پڑے اُن کا شمار آسان نہیں

۱۹۶۳ء کے فرقہ وارانہ فسادات نے ان کا سب کچھ
چھین لیا۔ ترقی پسند خیالات کی وجہ سے کالج سے
نکالے گئے، معاشی مشکلات کا سامنا کیا، مگر اپنے نظریات
سے مونہہ نہ موڑا۔ کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ کردار کی یہ
بلندی اسی شخص کا مقدر ہو سکتی ہے، جو صابر دل اور
جاگتے ذہن کے ساتھ ذاتی مفادات سے بلند
ہو کر اجتماعی مفادات کے لیے کام کرنے کی ہمت
کر سکتا ہو۔

سہیل مرحوم جس طرح اپنی سماجی زندگی میں
کھرے اُترے اُسی طرح اپنے فن میں بھی کھرے رہے۔
گوکہ ان کی شاعری میں کوئی ایسی انوکھی بات نہیں جو
اس دور کے شاعروں میں انہیں بہت ممتاز کر سکے، مگر
ان کے خلوص اور سچائی نے ان کی شاعری کو مؤثر بنا دیا
ہے۔ اور فن کا متاثر کُن ہونا فن کی کامیابی ہے :

۵۔ خاک سمجھے کوئی میری انفرادی حیثیت
کس نے دیوالی میں دیکھیں دیپکی پرچھائیاں

دنیا کی اس دیوالی میں ان کے حصے میں روشنی
کم اور آگ زیادہ آئی، جس کی جلن وہ تا عمر محسوس
کرتے رہے۔ شاید اسی لیے طنز کی تلخی ان کی بیشتر
نظموں سے عیاں ہے۔ لیکن اس تلخی نے اُنہیں
مایوسی کی حد کو نہیں پہنچایا اور ان کا شاعرانہ رویہ
محزونیت کے باوصف رجائیہ ہے۔

یوں تو اس مجموعہ کی بیشتر نظمیں اپنا ایک
تاثر رکھتی ہیں، مگر اس مجموعہ کی طویل نظم "خواب"
ایک ایسی نظم ہے، جس کا شمار اردو کی موضوعاتی
نظموں کی دنیا میں خاصا نمایاں ہونا چاہیے۔ فنی
اعتبار سے بعض مختصر نظمیں بھی اپنی استعاریت اور
اشاریت کے سبب بہت خوب صورت ہیں۔ ایسی
ہی ایک نظم "کتے" ہے، جس میں طنز کی کاٹ ہے اور
بھرپور تاثر بھی۔

کتاب کے آغاز میں رضوان واسطی صاحب
کا "سہیل واسطی — ایک تعارف" زبان کی چند
خامیوں کے باوجود بھرپور معلوماتی اور تاثراتی ہے۔
جس سے شاعر کی زندگی کے بہت سے گوشوں پر کماحقہٗ
روشنی پڑتی ہے۔

مجموعی طور پر سہیل واسطی کی شاعری قابلِ قدر
ہے اور مرتب و ناشر اس خوب صورت کتاب کی
اشاعت کے لیے باذوق قاری کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

نامِ کتاب : **بے چہرہ لوگ** (افسانے)
مصنف : اوصاف احمد
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
قیمت : ۱۵ روپے

"بے چہرہ لوگ" اوصاف احمد صاحب کے
سولہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں سے کچھ
"داد" کے مستحق ہیں تو کچھ "دُہائی" کے۔ اس
لیے کہ چند افسانوں سے قطع نظر بیشتر افسانے کچی عمر
کی اُبھری جذباتیت کا نتیجہ ہیں۔ بے شک مصنف
کا اندازِ بیان قاری کو الفاظ کی رَو میں بہائے جاتا
ہے، بشرطیکہ قاری بھی فکر کی سطح سے بے نیاز
ہو۔ بیانیہ انداز کی وجہ سے جہاں ایک طرف
تحریر READABLE ہو پائی ہے، تو دوسری
طرف کہانیاں اکہری ہو گئی ہیں۔ بنیادی طور پر اس
مجموعہ کی زیادہ تر کہانیاں صرف عنوانات کے
اعتبار سے مختلف ہیں ورنہ بباطن کہانی صرف ایک
ہے، جس کے صرف چند گوشے ہیں۔ اپنے وطن
(قصبہ / گاؤں) سے بڑے شہر میں آبسنے سے پیدا شدہ
صورتِ حال، کچی عمر میں گزرے جذباتی لمحوں کا سطحی
بیان اور بس — زیادہ تر کہانیاں صرف انہی پہلوؤں
کا احاطہ کرتی ہیں۔ یہ مصنف کی آپ بیتی کا حصہ
معلوم ہوتی ہیں۔ "آپ بیتی" کی کہانی کہنا نہ تو معیوب
ہے اور نہ غیر افسانوی رویہ بشرطیکہ آپ بیتی کو
کہانی میں ڈھالنے کے فن پر عبور حاصل ہو، مگر یہاں
زیادہ تر آپ بیتی کہانی نہیں بن پائی۔ نتیجتاً تحریر
"پُرلطف آپ بیتی" کے بیان سے آگے نہیں بڑھ پائی۔
اچھا ہوتا اگر مصنف اس کو افسانوں میں تقسیم نہ کر کے
صرف آپ بیتی ہی رہنے دیتے یا پھر اگر فکشن کا
پیرایہ اختیار کرنا اتنا ہی ضروری تھا تو ایک ناولٹ
کی فارم اپناتے تو شاید موضوع کی یکسانیت
اتنی واضح نہ ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ کئی افسانے
صرف اس لیے افسانوں کی فہرست میں ہیں کہ وہ
اس مجموعہ میں شامل ہیں ورنہ وہ صرف ہلکے پھلکے
مضمون ہیں، جن میں مصنف نے اپنے بارے میں
اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔ اس کی مثال ہیں:
"کرچیں" اور "میری اور اس کی کہانی" بھی۔
کئی جگہ موضوع کی یکسانیت کے علاوہ الفاظ کی یکسانیت
بھی اسی کی گواہ ہے :

"..... میں ایک بزدل اور کم ہمت آدمی ہوں...."
(افسانہ "کرچیں")

"... میں ایک سہل پسند، آرام طلب، ڈرپوک اور
سمجھوتہ باز آدمی ہوں..." (پس لفظ "آخری الفاظ")

"بے چہرہ لوگ" میں شامل تحریر کو ایک چیز
اور جو مضامین سے قریب اور افسانے سے دُور
کرتی ہے وہ وضاحتی اندازِ بیان ہے۔ ایک
بات کہنے یا ایک تاثر کے اظہار کے لیے طویل پیرایہ
اختیار کیا گیا ہے۔ نتیجہ میں اشاریت (جو مختصر
افسانے کی خصوصیت ہے) تہہ داری دم توڑ دیتی
ہے۔ اور تحریر مضمون کی حد میں داخل ہو جاتی ہے۔
اس مجموعہ میں شامل "رات گئی بات گئی" اور "پس
پردہ" کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ مذکورہ
دونوں افسانے نہ صرف یہ کہ "افسانے" ہیں بلکہ "اچھے
افسانے" ہیں۔ اور اسی لیے اچھے ہو سکے ہیں کہ اس
میں مصنف نے نہ تو الفاظ کو بے لگام کیا ہے اور
نہ وضاحت کو قریب آنے دیا ہے۔ ان دو افسانوں
کی موجودگی میں مصنف سے یہ توقع کرنا بے جا نہ ہوگا
کہ اگر وہ اس صنف کی طرف سنجیدگی سے توجہ کریں
تو افسانے کی دنیا میں ایک اچھے افسانہ نگار کا اضافہ
ہو سکتا ہے۔ تاہم "بے چہرہ لوگ" کی اشاعت

لحاظ سے غنیمت ہے کہ یہ کلام موزوں کے ڈھیر
ہوعوں کی بھیڑ میں کم از کم اپنے آپ کو پڑھوا لینے
لی نثر تو ہے۔

کتاب اترپردیش اردو اکیڈیمی کے مالی
اون سے شائع ہوئی ہے۔

ام کتاب: **دیوانِ لُطف** (تحقیق)
رتب: ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ
اشر: ادارہ شعر و حکمت، ریڈ ہلز، حیدرآباد
یمت: ۲۵ روپے

"دیوانِ لُطف" مرزا علی لُطف مولف "تذکرہ گلشنِ ہند" کے کلام کی تدوینی شکل ہے، جسے ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے تحقیق و کاوش سے مدون کیا ہے اور جدید تحقیق کے اصولوں کی روشنی میں متنی تقابل کیا ہے۔

مرزا علی لُطف میر اور سودا کے ہم عصر تھے جان گلکرسٹ کی فرمائش پر اُنھوں نے فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کے لیے علی ابراہیم خاں کے "گلزارِ ابراہیم" کا ترجمہ گلشنِ ہند کے نام سے کیا تھا، جو ان کی شہرت کا باعث بنا۔ مرزا علی لُطف کو زیادہ تر لوگ "گلشنِ ہند" کے توسط سے ایک تذکرہ نگار کی حیثیت سے جانتے تھے۔ ڈاکٹر اکبر کی تحقیق سے ان کا شاعرانہ پہلو بھی سامنے آیا۔ اور محقق موصوف نے تحقیق و کاوش سے لُطف کے کلام کے مخطوطے کو دریافت کر کے اس کو مرتب کیا ہے۔

مرتب نے ایک مفید کام یہ بھی کیا کہ پیچیدہ الفاظ کے معانی کے تعین کی کوشش کی اور پرانے پیچیدہ املا کو موجودہ مروجہ املا میں تبدیل کیا۔ متنی تنقید کے اصول کے مطابق یہ ضروری بھی تھا۔ بقول ڈاکٹر غلام عمر خاں: "..... قدیم متن کی تدوین کے دوران جب تک کسی شعر میں کسی پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے لفظ کی صوتی شکل اور اس کے معنی پوری طرح متعین نہ ہو جائیں، شعر قابلِ فہم نہیں بنتا۔ متنی نقّاد کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قدیم متن کو عہدِ حاضر کے قاری کے لیے قابلِ قرأت اور قابلِ فہم بنا کر پیش کرے۔ اگر نقّادِ متن کسی اُلجھے ہوئے حصّے کو حل کیے بغیر اسی حالت میں درج کر کے گزر جاتا ہے تو وہ مصنّف کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے اور قاری کو دھوکہ دیتا ہے۔ یہ طریقۂ کار تدوینِ متن کی ذمہ داری کے یکسر منافی ہے۔ قدیم اور دشوار متن میں بعض ایسے مقامات در پیش ہو سکتے ہیں جو متنی محقق کی پوری سعی کے باوجود کُھل نہ سکے ہوں، لیکن ایسی صورت میں تحقیقی دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے مقامات کی نشاندہی کر دی جائے اور اس امر کی وضاحت بھی کہ متن کے متذکرہ حصّے کو کھولنے میں کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ اس قسم کا اعتراف تحقیقی کوشش کو با وقعت اور قابلِ اعتماد بنا دیتا ہے۔"

لُطف سودا کے شاگرد تھے یا نہیں؟ یہ بات بحث طلب رہی ہے۔ مرتب نے اس پہلو پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ مرتب نے اپنے مبسوط مقدمہ میں لُطف کے اشعار کا تقابل ہم عصر شعراء کے اشعار سے کر کے لُطف کا شعری مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مرتب نے بیشتر جگہ تحقیقی دیانت داری سے کام لیا ہے، تاہم کچھ بیانات بغیر ثبوت کے رہ گئے ہیں۔ مثلاً: "لُطف کو کالج کی ملازمت باضابطہ نہیں مل سکی تھی۔" کتاب "اُنیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" سے جاوید نہال صاحب کی مندرجہ بالا رائے نقل کر کے اظہارِ خیال کیا گیا ہے کہ: "... حقیقت یہ ہے کہ لُطف نے ملازمت کے حصول کی کوشش ہی نہیں کی۔ اگر وہ چاہتے تو ہمہ وقتی منشی کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ ان کی قابلیت سے متاثر تھے۔ اور شیر علی افسوس جو ان کے دوست اور بہی خواہ تھے انگریز حکام اور کالج کے عہدہ داروں سے اچھے مراسم رکھتے تھے...." شیر علی افسوس سے دوستی کی بنا پر ان کو ملازمت مل جاتی مگر انھوں نے ملازمت کی کوشش ہی نہیں کی۔ یہ صرف گمان ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اچھا ہوتا اگر بے ثبوت بیانات سے احتراز کیا جاتا۔ لُطف کی تاریخ وفات کا متنازعہ مسئلہ بھی آرا کی نقل تک ہی چھوڑ دیا گیا ہے اور مزید تحقیق کے ساتھ ان کی تاریخ وفات کا تعین مرتب نے نہیں کیا۔ تاہم کتاب کی اہمیت طلبہ، محققین، اساتذہ اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے مسلّم ہے۔ جس کے لیے ڈاکٹر مرزا علی اکبر بیگ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

نام کتاب: **تجلیاتِ ولی** (انتخابِ شاعری)
شاعر: ولی کاکوی (مرحوم)
ناشر: سید ریاض الرحمٰن، رحمٰن ہاؤس، فرزیر روڈ، پٹنہ
قیمت: ۱۵ روپے

"تجلیاتِ ولی" سید شاہ ولی الرحمٰن کاکوی مرحوم کے کلام کا انتخاب ہے جسے ان کے صاحبزادے سید ریاض الرحمٰن صاحب نے مرتب کر کے بہار اردو اکیڈیمی کے مالی تعاون سے شائع کیا ہے۔

مرتب نے لکھا ہے "..... اپنی زندگی میں وہ (ولی مرحوم) چند مجبوریوں کے باعث اپنی ادبی نگارشات کا مجموعہ شائع کرانے سے قاصر رہے اور انہیں اس کی حسرت تا زندگی رہی۔ لہٰذا حقِ فرزندی سمجھتے ہوئے ان کے کلام کا مجموعہ مرتب کر کے پیش کر رہا ہوں....." (عرضِ مرتب)

ولی مرحوم مضافات جہاں آباد میں واقع ضلع گیا کے قریب موضع کاکو میں ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ جو ایک مردم خیز خطہ ہے۔ ادبی ذوق ورثہ میں پایا۔ ان کے والد سید شاہ غفور الرحمٰن اپنے زمانے کے مستند شاعر اور نثر نگار تھے۔ ولی مرحوم نے جون ۱۹۶۲ء میں انتقال فرمایا۔ وہ حضرت شاد عظیم آبادی کے باقاعدہ شاگرد تھے؛ مگر رنگِ شاعری کے اعتبار سے علامہ اقبالؒ سے متاثر تھے۔ چند اشعار دیکھیے:

دل کو جنوں سرشت کر، عزم کو سرفراز کر
رہروِ عشق تب کہیں قصدِ حریم ناز کر
تیری ادا کو ہے فروغ میرے جنونِ شوق سے
حسن پہ اپنے کیوں ہے ناز عشق پہ میرے ناز کر

سکوں محال ہے دنیا میں نوعِ انساں کو
ہنوز برسرِ کیں ہیں ہلاکو و چنگیز
طریقِ عشق میں سنگِ گراں ہیں دیر و حرم
ہٹا کے راہ سے پتھر خرام کو کر تیز
ولی عجیب ہے اقبال کا یہ درسِ عمل
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

انہوں نے نظمیں بھی لکھیں، غزلیں بھی اور قطعات و رباعیات کے علاوہ نثر بھی لکھی۔ ان کے ادبی کارناموں سے نگار، معارف، ندیم اور نقوش وغیرہ کے شمارے مزین ہیں۔ حضرت نیاز فتحپوری اور آثر لکھنوی جیسے اساتذہ ان کی ادبی شخصیت اور کارناموں کے معترف تھے۔ ان کا کلام تصوف، فلسفہ اور عشق میں رچا بسا ہے۔ بقول پروفیسر کلیم عاجز:

"... ولی ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے زندگی کی نئی آوازوں، نئی پکاروں، نئے تقاضوں میں تصوت کی سنہری سہانی آواز شامل کرکے نئی زندگی کی رفتار و گفتار میں بھی دلکشی اور رعنائی پیدا کر دی۔ ولی صوفی بھی ہیں فلسفی بھی۔ مجاہد بھی ہیں عاشق بھی۔ شاعری میں عشق تو مرکزی آہنگ ہے جس طرح اقبال نے عشق کو زندگی کی رگ و پے میں دوڑا کر ارتقا کے تمام لوازمات اور وسائل سے فیض یاب ہونے کا سلیقہ بخشا۔ ولی بھی اس راز سے آشنا ہیں۔ وہ کردار کو عظیم بلندیوں اور رفعتوں سے آشنا کرنا چاہتے ہیں اور اس کوشش میں رفقائے کار اور شرکائے راہ کی حیثیت سے وہ فلسفہ اور تصوف اور ذہنی اور فکری جہاد حقائق اور معارف حکمت و اخلاق سب کو نہایت فنکارانہ اور شاعرانہ انداز میں ساتھ رکھتے ہیں ؎

گرم سفر ہے صبح و شام تیرا مسافر دوام
راہ کی سختیاں وہی کثرتِ نقشِ پا وہی
عشق بھی ہے جنوں بدوش حسن بھی ہے چمن فروش
حیرتِ چشمِ تر وہی جلوۂ خود نما وہی —"

"تجلیاتِ ولی" میں ولی مرحوم کے تعارف میں پروفیسر کلیم الدین احمد مرحوم کا مختصر مگر جامع مضمون "ذکرِ ولی" کے عنوان سے اور ولی کاکوی کے عنوان سے پروفیسر ذکی الحق صاحب اور پروفیسر کلیم عاجز صاحب کے مضامین بھی شامل ہیں، جو اس انتخاب کی وقعت میں اضافہ کا حکم رکھتے ہیں۔ ان مضامین سے شاعر کے فن اور شخصیت دونوں پر کماحقہٗ روشنی پڑتی ہے جو قاری کے لیے مفید ہے۔

نام کتاب: **"تاریخ ناگپور"**
مصنف: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل
قیمت: ۱۰ روپے
ملنے کا پتہ: ساحل، محمد علی روڈ، مومن پورہ، ناگپور

"تاریخ ناگپور" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ناگپور کی تاریخ ہے، جس میں قدیم تاریخ سے لے کر "سیتا بلڈی قلعہ" پر ترنگا لہرانے تک کی داستان مختصر انداز میں بیان کی گئی ہے۔ کتاب مختصر ہے اس لیے اس کو ابواب میں تقسیم نہیں کیا گیا ہے جیسا کہ تاریخ کی ضخیم کتابوں میں ادوار کے اعتبار سے ابواب کی تقسیم مروج ہے بلکہ مختلف عنوانات کے تحت مختصر بیان سے کام لیا گیا ہے۔ ناگپور کی وجہ تسمیہ کے ذیل میں درج ہے کہ: "..... ناگپور کی وجہ تسمیہ مختلف بیان کی جاتی ہیں۔ لیکن زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ چونکہ یہ علاقہ ناگ پھنی کے درختوں سے گھرا ہوا تھا، اس لیے ناگپور کے نام سے یاد کیا جانے لگا — شاہ جہاں کے ہم عصر مورخ عبدالحمید لاہوری نے اپنی مشہور تصنیف "بادشاہ نامہ" میں سب سے پہلے اس علاقہ کو ناگپور کے نام سے یاد کیا ہے ...." اچھا ہوتا کہ دیگر وجوہاتِ تسمیہ بھی لکھ دی جاتیں اور "قرینِ قیاس" کا فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا جاتا۔ غالباً اختصار کے پیشِ نظر دیگر وجوہاتِ تسمیہ درج نہیں کی گئیں۔

"تاریخ ناگپور" دراصل مصنف کے پی ایچ ڈی کے مقالے "ناگپور میں اردو" کا ایک حصہ ہے۔ اسی کا ایک اور حصہ "کامٹی کی ادبی تاریخ" کے نام سے شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پذیرائی پا چکا ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے بارے میں مصنف کا دعویٰ ہے کہ "... دیوگڑھ کے حکمرانوں کی اتنی جامع تاریخ اس سے پہلے کسی زبان میں منظرِ عام پر نہیں آئی ...." مصنف کے اس دعوے کی تردید یا تصدیق تو تاریخ داں اور تاریخ نویسوں کا حصہ ہے، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنف کا تحقیقی ذوق تربیت یافتہ اور تہذیب کا حامل ہے۔

یہ صرف تاریخی کتاب ہے۔ اس کا "ناگپور میں اردو" سے کوئی تعلق ظاہری نہیں ہے۔ یقیناً مکمل مقالہ میں کوئی ایسا باب ضرور ہوگا جو تاریخ ناگپور کو اردو اور اردو ادب کے ارتقا سے منسلک کرتا ہوگا۔ تاہم یہ کتاب اپنی الگ مفید حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب میں نقشے شامل کر کے اُسے اور مفید بنا دیا گیا ہے۔ طباعت اور کتابت اوسط درجہ کی ہے۔

نام کتاب: **"نغمے ٹوٹے خوابوں کے"** (شاعری)
شاعرہ: روپا مہتہ نغمہ قیمت: ۱۵ روپے
ناشر: اشوک مہتہ، اندر بھون، والکیشور، بمبئی

"نغمے ٹوٹے خوابوں کے" روپا مہتہ نغمہ کی شاعری

یہ مجموعہ ہے جو طباعت و کتابت کے ان تمام آرائشی
لوازمات سے مزین ہے، جو کسی بھی کتاب یا کتاب نما
چیز کو بہت سی کتابوں کے درمیان "پہلے اٹھالنے"
کے لائق بنا سکتے ہیں۔ بہترین گٹ اَپ، اعلیٰ درجہ کی
کتابت و طباعت اور خوب صورت جلد۔ کاش
"نغمے ٹوٹے خوابوں کے" اتنی ہی خوب صورت شاعری
کی حامل ہوتی۔ مجموعے میں غزلوں کے علاوہ کچھ نظمیں
ہیں۔ کتاب کے آغاز میں سلمان رضوی صاحب کے
"سفر تاریک راتوں کا" کے عنوان سے مقدمے کے
علاوہ مصنفہ کی طرف سے" دو باتیں میری طرف سے"
بھی شامل ہیں۔ مگر "شاعرانہ واستادانہ" مقدمے
سے لے کر شاعری تک صورتِ حال ہر جگہ تقریباً
یکساں ہے۔ اکہری، بے ڈھب زبان، کلامِ موزوں
زبان و بیان کے تعلق سے شاعرہ نے یکسر انفرادی
رویہ اختیار کیا ہے۔ ممکن ہے جو زیادہ اختراع
پسند حضرات کے لیے قابلِ قبول ہو۔ تاہم سنجیدہ قاری
کو اس کتاب میں نہ صرف احتیاط سے کام لینا ہوگا
بلکہ یہ طبعِ نازک پر گراں بھی گزر سکتا ہے۔

مقدمہ نگار کا دعویٰ ہے کہ "..... زندگی
کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کے یہ تیور نغمہ کی
شاعری کے علاوہ اردو کی کسی شاعرہ کے یہاں نظر
نہیں آتے.....؛" (ص۹)

مصنفہ نے لکھا ہے کہ وہ مصوری کرتی
ہیں اور سنگیت سے واقفیت کے علاوہ گلوکارہ بھی
ہیں۔ ان کی اپنی ہی آواز میں ان کی اپنی آٹھ غزلوں
کا ایل پی اسٹیریو کیسیٹ بہت مقبول ہوا ہے۔
یا ہیں یہ خال خال ایسے اشعار بھی مل جاتے
ہیں جو اس کلامِ موزوں کے ریگستان میں چھوٹے
سے نخلستان کا مزہ دے جاتے ہیں۔ اور یہ وہیں
ممکن ہوا ہے، جہاں شاعرہ اپنی فطری صنفی نزاکت
کے رنگ کو برقرار رکھ سکی ہیں۔ مثلاً:

میں ترا پیار آزماؤں گی
وعدہ کر لوں گی اور نہ آؤں گی

---

باتوں باتوں میں تم نے توڑ دیا
میرا دل تھا، مجھے خبر نہ ہوئی

شعلۂ گل بنا یہ جسم جب چھوا تم نے
اب مہکنے کے سوا کوئی راستہ نہ رہا
(انجم عثمانی)

نام کتاب: **ہندی غزل سن رچنا** (ایک پریچے)
علمِ عروض ہندی میں
قیمت: ۱۲ روپے
مصنفہ: رام پرشاد شرما مہرشی
تقسیم کار: رام پرشاد شرما مہرشی
۶/۱۲ لیورلا ہاؤسنگ سوسائٹی، چمبور، بمبئی ۴

کتاب میں اردو عروض کو ہندی میں پیش کرنے
کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر ہندی لپی میں اردو عروض
کے قواعد و ضوابط پیش کر دیے جاتے تو کوئی مضائقہ
نہیں تھا، لیکن اس میں اردو عروض کے اجزائے اولیہ
سبب خفیف۔ وتد مفروق و مجموع اور فاصلۂ صغریٰ
کو ہندی عروض کے ماترائی نظام میں ڈھالنے کی بھی
سعی کی گئی ہے تاکہ ہندی کے اہلِ قلم مستفید ہو سکیں۔

**ماترائی نظام کے اصول:**

۱۔ ہر اکھشر (حرفِ مفرد) ایک ماترا شمار ہوتا ہے۔
اس کی علامت (۱) ہے۔ جیسے: بن = ۱+۱
۲۔ لگھو ماترا گنتی میں نہیں آتی۔ زیر (इ)، زبر
(अ)، پیش (उ) کو لگھو ماترا مانا جاتا ہے۔
۳۔ اکھشر + گرو ماترا (حرفِ معلول) کی دو ماترائیں
شمار ہوتی ہیں۔ اس کی علامت (۲) ہے۔
औ، ओ، ऐ، ए، ऊ، ई، आ
گرو ماترائیں کہلاتی ہیں۔ جیسے: کا۔ کے۔
کی میں ہر ایک (۲) کے برابر ہے۔

## انحراف

۱۔ دو حروفِ مفرد کو ایک حرفِ معلول کے برابر مانا
گیا ہے۔ جیسے کا اور کل دونوں کو علامت
(۲) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیوں کہ اردو عروض
میں دونوں کو سبب خفیف کہتے ہیں۔
۲۔ **وتد مفروق** — صدر و ابتدا اور حشوین میں
کام اور گرم کو (۲+۱) کی علامت کے
تحت رکھا گیا ہے۔ عروض و ضرب میں (۳)
کی علامت دی گئی ہے۔
۳۔ **وتد مجموع** — چمن (۱+۱+۱)، صبا (۱+۲)
دونوں کو علامت (۳) کا درجہ دیا گیا ہے۔
جو عروض و ضرب کے کام اور گرم کے برابر ہے۔
۴۔ **مقام شعر یعنی صدر و ابتدا**۔ حشوین عروض و
ضرب کا ماتراؤں کی گنتی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔
اس لیے ان کی علامتیں بدلنے کا سوال ہی
پیدا نہیں ہوتا۔
۵۔ **ماترائی نظام میں** (۳) اور (۴) کی
کوئی علامت مستعمل نہیں۔ کتاب میں بہار
کلام وغیرہ الفاظ کو عروض ضرب میں علامت
(۴) کے تحت شمار کیا گیا ہے۔ وتد مفروق
(عروض و ضرب میں) اور وتد مجموع کے لیے
علامت (۳) کا استعمال کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا انحرافات کی وجہ سے ہندی
اور اردو اہلِ قلم دونوں کے لیے اس کتاب
کی افادیت مشکوک ہے۔

جیرام داس فلک

## اہم

ماہ اپریل ۱۹۸۵ء کا آج کل مجھے پچھلے شماروں کی طرح اور بھی بہت پسند آیا — اس کی خاص وجہ "من کہ..." کے صفحات پر خواجہ احمد عباس کے حالاتِ زندگی سمٹ آئے تھے۔ تصویر بھی خوب ہے، مگر عباس صاحب نے اپنی تخلیقات وتصانیف کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی سوانح عمری یعنی آپ بیتی جو اُنہوں نے انگریزی میں بعنوان "I AM NOT AN ISLAND" ("میں ایک جزیرہ نہیں ہوں") اور ہفتہ وار 'بلٹز' کے آخری صفحات کا مجموعہ انگریزی میں بعنوان "COLLECTION OF LAST PAGES" کا ذکر کرنا بھول گئے۔ بہرکیف اُن کی آپ بیتی اور اس مجموعہ کا ذکر "من کہ" میں چھوٹ گیا ہے جو عباس صاحب کی زندگی کا اہم جزء ہے اور قارئین کے لیے نہایت ہی معلوماتی۔

افسانوں میں صبیحہ انور کا افسانہ "ایک اندھیرا راستہ" بہت ہی پسند آیا۔ لیش سروج کی "گڑھی کی آواز" دلیپ سنگھ کا "جنتی جُدائی" اور ستیش بترا کا سفرنامہ "سان فرانسسکو" انتہائی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ دوسرے مضامین میں امیر حسن نورانی کے مرتب کردہ مولوی عبدالحق کے خطوط پسند آئے۔

محمد اعظم شاہد، کولار (کرناٹک)

## چابکدستی

ماہ اپریل ۱۹۸۵ء کا ماہنامہ آج کل نظر نواز ہوا۔

صبیحہ انور صاحبہ نے اپنے افسانے "ایک اندھیرا راستہ" میں فرسودہ رسموں کے گھناؤنے پن کا اظہار جس چابکدستی سے کیا ہے، وہ اُن کا ہی خاصہ ہے۔ کالی داس گپتا رضا کا مضمون بہت اچھا تھا۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ رضا صاحب اسی طرح نادر مقالات مہیا کرکے ہمارے ذہن کو روشنی بخشنے میں اہم رول ادا کریں گے۔

امیر حسن نُورانی کا مضمون "مولوی عبدالحق کے خطوط" بھی خاصا تھا۔ اس طرح عام قارئین تک مولوی صاحب کے خطوط پہنچ گئے۔

نشتر صاحب کا مضمون "ہماچل میں قدیم فنِ تعمیر" نہایت ہی معلوماتی ہے۔

قمر اقبال کی نظمیں اچھی تھیں، لیکن طالب چکوالی صاحب کی غزل نے لُوٹ لیا۔ خاص کر اس شعر نے ؎

"زرد پتوں سے دوستی کر لو
اب تو پت جھڑ کا سامنا ہے میاں"

علاقائی ادب پارے شائع کرکے آپ علاقائی ادب کی بھی خدمت کر رہے ہیں۔ اس کے لیے واقعی آپ مُبارکباد کے مستحق ہیں۔

منظور احمد، حضرت بل (کشمیر)

## حقیقت

اپریل ۱۹۸۵ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔

رسالہ شمع عرفان، عبدالحق کے خطوط، من کہ (خواجہ احمد عباس) بُت، بُت شکن، سان فرانسسکو، الف، جھلک بے حد پسند آئے۔ 'جھلک' کا آخری جملہ پڑھتے ہوئے میری آنکھیں بھی پُرنم ہوگئیں۔ جناب خواجہ احمد عباس نے اپنی زندگی کے اکثر گوشے اُجاگر کرکے قارئین کو حیرت میں ڈال دیا۔ جناب خواجہ احمد عباس نے اردو ناول انقلاب کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ناول ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر بھی سینکڑوں کی تعداد میں نہیں بکتے۔

مُہتر کار داری، بھٹ کل

## قابلِ ستائش کاوش

ماہ اپریل ۱۹۸۵ء کا آج کل نظر نواز ہوا۔ سرداری لال نشتر کا لکھا ہوا "ہماچل میں قدیم فنِ تعمیر" پسند آیا۔ "من کہ" کی حیثیت اپنی جگہ منفرد ہے — قمر اقبال صاحب کی نظمیں لاجواب، 'بُت اور بُت شکن' قابلِ داد تخلیقات ہیں۔ مبارک شمیم، ناز قادری، دلیپ بادل، حبیب سوز، منصور عمر کی غزلیں اور صبیحہ انور کا افسانہ "ایک اندھیرا راستہ" لیش سروج کا "گڑھی کی آواز" نہ صرف بہت پسند آئے، بلکہ قابلِ ستائش کاوشوں کے نتائج کہے جا سکتے ہیں۔ تبصرے تقریباً حق ادا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

شیر افگن، راویر، ضلع جلگاؤں

## منطقی انداز

ماہنامہ آج کل بابت اپریل ۱۹۸۵ء نظر نواز ہوا۔

حامد آفاق قریشی نے بڑے منطقی انداز میں اور تمام ممکنہ شواہد کی روشنی میں

آگے صفحہ ۱۵ پر

قاہرہ میں ۶ر جون ۱۹۸۵ء کو وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی اور مرکزی وزارتِ امورِ خارجہ کے وزیرِ مملکت شری خورشید عالم خاں مصر کے صدر جناب حسنی مبارک، وزیرِ اعظم جناب کمال حسن علی اور وزیرِ خارجہ جناب عصمت عبدالمجید کے ساتھ سرکاری بات چیت کرتے ہوئے

---

ہوا بازی اور ٹرانسپورٹ کے مرکزی وزیرِ مملکت شری ضیاءالرحمٰن انصاری ۷ر جون کو دہلی کی ضروریاتِ نقل و حمل سے متعلق ایک میٹنگ میں خطاب کرتے ہوئے۔
تصویر میں: دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر شری ایم۔ ایم۔ کے۔ ولی اور پلاننگ کمیشن کے ممبر جناب عابد حسین بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

Vol. 43 No. 12 AJKAL (URDU) July 1985



تشکیلِ شعر: بریجندر

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

(غالب)

Publishedby the Director Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001, Printed by the Manager, Govt. of India Photolitho Press, Faridabad.